جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ
گمراہ
پانچواں حصہ

ایک مردم گزیدہ، زمانے کے ستم رسیدہ، وقت کے ٹھکرائے ہوئے نوجوان کی داستان۔ نا آسودہ جذبوں کی تسکین اور آتشِ انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرائم اس کے پیروں کی ناقابلِ شکست زنجیر بن گئے۔

[illegible]

میں اس گولے کے دھوئیں کی نذر ہوا تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ آپی نے بھی کچھ روز پہلے پولیس کی گاڑی کے اندر ایسا ہی بم پھینک کر سپاہیوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بھی مجھے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اُن کی بھی ساری توانائیاں اس دھوئیں نے سلب کر لی تھیں۔ وہ بھی بعد میں یہی سوچتے ہوں گے کہ آخر اُن سے میرے خلاف کیوں نہ کچھ ہو سکا۔ وہ تو اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہوں گے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ مجھے اب اس ساری کتائی کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ آدمی جب بے ہوش ہوتا ہے تو اس پر بلاشبہ موت ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ موت فی نفسہٖ ایک بہت ہی خوش آئند تجربہ ہے۔ آدمی کے محسوسات ہی جب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو پھر کوئی اسے نیزے پر بھی لٹکا دے تو اُسے اس بات کی کیا پروا رہتی ہے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ میں بھی بس دیکھتے ہی دیکھتے اپنے وجود سے نکل کر باہر جا ٹھہرا تھا۔ اب نہ روح تھی، نہ روح کا قالب۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ماضی، حال اور مستقبل کا ادراک ہی مجھ سے چھن گیا تھا۔ اس تجربے سے گزر کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ موت آدمی پر ایک ایسا سکوت طاری کر دیتی ہے جس سے اسے بیدار کیا جائے تو وہ کیفیت اُسے بے تحاشا پریشان کر دیتی ہے۔ اس بیرے نے پھر مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا، کیسے مجھے اس نے ملک اشرف کی کوٹھی سے نکالا، کن راستوں سے گزارا اور کیسے گزارا۔ وہ ساری کیفیتیں میرے اوپر سے گزر گئی تھیں مگر مجھے اُن کا احساس تک نہیں تھا۔ جب آدمی کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے تو پھر اس پر ابدیت کی نیند چھا جاتی ہوگی اور وہ نیند اور اس کا قرار ایسا ہے کہ گرد و پیش میں ہونے والے کسی بھی واقعہ کا عکس ذہن قبول نہیں کرتا۔ میں سچ کہوں تو بات اتنی سی ہے کہ میں نے اس تھوڑے سے عرصے میں موت کا دروازہ دیکھ لیا تھا اور وہ بڑا ہی پُرسکون دروازہ تھا۔ میں وہاں سے شاید لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ لوگ شراب پی کر خود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ بھنگ، یہ چرس، یہ افیون، یہ ہیروئن کے سارے نشے شاید اسی لیے ایجاد کر لیے گئے ہیں کہ آدمی اپنے دُکھوں کو بھول کر اس کیفیت سے گزر جانا چاہتا ہے جو اسے دم نہیں مارنے دیتی۔ وہ موت ایسی سناٹے سے بھری ساعتیں اسے بے حد عزیز ہو جاتی ہیں۔ وہ ان میں بار بار خود کو گم کر دینے کی آرزو کرتا ہے اور۔۔۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جیسے موت آ جائے، وہ تو شاید ہمیشہ کے لیے پُرسکون ہو جاتا ہے۔ سارا جھگڑا تو اس رگِ احساس کا ہے، اسے جو میں مسل دیا کرتا تھا تو وہ بھی میرے ہدف کو کسی ایسی ہی انجانی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہوگا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بڑے ہی آراستہ پیراستہ کمرے میں پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ وہ لوگ جس حال میں بھی مجھے وہاں تک لائے تھے، اس حال میں لا کر انہوں نے مجھے پلنگ پر ڈال دیا تھا اور میرے اوپر لحاف دے کر انہوں نے میرے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ

دیے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن بازو کا درد ایک دم ابھر آیا تھا۔ شاید میرے زخم پر انجانے میں کسی نے انگلی مار دی تھی۔ میری اس قید کی علت نمائی ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کھڑکی کے پردوں سے باہر شاید سورج کئی ہاتھ اوپر آچکا تھا۔ روشنی نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں شاید ساری رات ہی اس اندوہناک کیفیت میں مبتلا رہا ہوں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالا اور لحاف الگ پھینک کر میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ میرے ہاتھ مجھے حرکت نہیں کرنے دیتے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔ میرے زخم سے اب پہلے ایسی ٹیسیں نہیں اٹھتی تھی۔ شاید اس کا زاویہ اب زیادہ بہتر ہو گیا تھا۔ کپڑے کی رگڑ اس پر نہیں پڑ رہی تھی۔

میرا بریف کیس وہیں رہ گیا تھا۔ لان میں جب اندھیرا پھیلا تو میں اسے وہیں چھوڑ کر بڑے صاحب تک جا پہنچا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کے ہاتھ آیا ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ ہر طرف ایک قیامت صغریٰ کا سا نقشہ کھنچ گیا تھا۔ ایسے میں میرا بریف کیس کسی کے ہاتھ بھی آسکتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو رسّی کی گرفت سے آزاد کرنے کوشش کی مگر وہ گرہ کچھ زیادہ ہی مضبوط ہو گئی۔ آدمی بندھا ہو تو اس کی سوچ بھی غلام ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ ایک بازو ایسا زخمی تھا کہ پنجوں پر میرا کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ بھوک نے الگ مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ میں ملک اشرف کے ہاں سے بھی کوئی چیز نہیں کھا سکا تھا۔ ایک وہ سروری خانم کی نوازش نے مجھے اب تک بچائے رکھا تھا۔ مگر وہ کھانا تو لگتا تھا کب کا ہضم ہو چکا ہے۔ پیٹ میں اس بھوک نے افراتفری مچا رکھی تھی۔ شاید یہ اس بے ہوشی کا اثر تھا کہ میرے خون میں اس کی وجہ سے کوئی کیمیادی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی ورنہ میں نے اتنی بھوک تو کبھی بھی محسوس نہیں کی تھی۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے اس حد تک نیچے جھکا دیا کہ ذرا سی کوشش سے میں سارے جسم کو ان کی قوس میں سے گزار سکتا تھا مگر پھر میری ہمت جواب دے گئی۔ زخم پھر سے ٹیسیں دینے لگا تھا۔ درد سوا ہو گیا تھا۔ میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور پلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کوئی بیس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ بے بسی کے ایک شدید احساس سے لرز کر میں ایک بار پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہاتھوں کو میں نے اپنی کمر پر سے اس طرح گزارا کہ میرا سارا جسم اُن میں سے گزر گیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ میرے سامنے آگئے تھے اور رسّی بھی میرے سامنے آگئی تھی۔ کسی اناڑی نے اسے باندھا تھا گرہیں میرے دانتوں کی زد میں تھیں۔ ایک ایک کر کے میں نے اس کے سارے پیچ کھول دیے۔ چند ہی لمحوں بعد میں اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں رسّی کے کھلتے ہی پلنگ سے اُتر گیا۔ میرے بوٹ ابھی تک میرے پاؤں میں موجود تھے۔ شاید ان کو کھولنے کا انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مگر میرا پستول وہ مجھ سے چھین چکے تھے۔ میری جیب میں سگریٹ اور ماچس موجود تھے اور چند نوٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ قمیص کی جیب میں پڑے تھے۔ میں نے شیروانی اتار کر اپنا زخم دیکھا۔ پٹی ابھی تک زخم کو ڈھانپے ہوئے تھی اور اب وہ ٹیسیں بھی نہیں اٹھ رہی تھی۔ پلنگ سے اُتر کر میں دروازے تک جا پہنچا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر میں نے باہر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان کھڑکیوں پر لوہے کی موٹی سی گرل لگی ہے وہاں سے بچ کر نکل جانا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔

وہ کمرہ شاید اس کوٹھی کی خواب گاہ تھا۔ قدِ آدم آئینہ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ سنگھار میز بھی وہاں موجود تھی مگر اس پر آرائش کا کوئی سامان نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر دروازے تک جا پہنچا اور دھاڑتے ہوئے میں نے اس کو کھٹکھٹا دیا۔ ایک عذاب الیسی کیفیت میرے ذہن پر سوار تھی۔ کوئی بھی میرے سامنے آجاتا میں اس کے ٹکڑے کر دیتا۔ مجھے یوں باندھ لینا اُن لوگوں نے آسان سمجھ لیا تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کو بے ہوش کر کے وہاں لے آئے ہیں۔ وہ شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ میں کوئی سردار کریم نواز قسم کی کوئی چیز ہوں۔ مجھے اغوا کر لینے میں درحقیقت اُن کا یہی جذبہ کارفرما تھا کہ میں نے بڑے صاحب کو ان کی گولیوں سے کیسے بچا لیا۔ وہ مجھ سے شاید یہی بات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میری بار بار کی دستک کے باوجود کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ دروازہ آہنی تھا اور اُسے توڑ لینا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ میں مایوس ہو کر واپس پلنگ پر جا بیٹھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک میز پڑی تھی جس پر کچھ اخبار، کچھ رسالے اور کچھ کتابیں دھری تھیں۔ اُن کو میں نے کھول کر دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ اس کوٹھی کے مکین بائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور۔۔۔ اور بڑے صاحب سے ان کی پرخاش کی وجہ بھی یہی تھی۔ وہ انہیں اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ اُن کا فلسفہ یہی تھا کہ جو از خود راستہ نہیں دیتا اسے گرا دیا جائے ۔۔۔ وہ کتابیں یہی کچھ بتاتی تھیں۔ اُن کو جستہ جستہ پڑھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے دشمن کو کسی بھی طرح معاف کر دینے کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو ملکی سیاست میں تلخی پیدا کرتے تھے۔ اب تک انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنا قبلہ درست کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ہر حال میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے اور میں ان کے درمیان خواہ مخواہ ہی جا پھنسا تھا۔ میں نے ایک کتاب، زیادہ تفصیل سے پڑھنی شروع کر دی۔ وقت تو بہر حال کسی طرح کاٹنا ہی تھا۔ کیوں نہ میں اُسے اُن کے فلسفے کے مطالعہ میں صرف کروں۔ کوئی پون گھنٹہ اسی طرح کٹ گیا۔ میرے سگریٹ اس عرصے میں میرے بہت کام آئے۔ کتاب کے کوئی بیس صفحات میں پڑھ چکا تھا کہ کسی نے دروازے پر ہاتھ ڈالا۔ کوئی آدمی اس کا تالا کھول رہا تھا۔ میں نے کتاب الگ رکھ دی۔ باہر ایک سے زیادہ آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ دروازے کا تالا کھول کر انھوں نے اس کا ہینڈل گھمایا تو میں دیوار کے ساتھ جا ٹھہرا۔ کاش میرا بازو زخمی نہ ہوتا مگر اس کے باوجود میرے حوصلے کی دیوار بہت اونچی تھی۔ میں اُن سے اب بھی نپٹ سکتا تھا۔ دروازہ ایک دم کھل گیا اور تین آدمی بیک وقت کمرے میں داخل ہوئے۔ میں اُس وقت پٹ کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ اندر آنے والے آدمیوں میں سے ایک شخص قد کاٹھ میں میرے برابر ہی تھا۔ وہ بڑا سا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ دوسرے دو آدمی درمیانے قد کے تھے اور کوٹ پتلون میں ملبوس تھے۔

" اوئے مقصود! وہ تو یہاں نہیں ہے۔" اچانک اس نے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ تینوں کے ہاتھوں میں پستول موجود تھے۔ وہ ان کے اندرونی خوف کا مظہر تھے۔ اس آدمی کی نگاہ اچانک مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹک سا گیا۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

" اچھا! تو تم یہاں کھڑے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تم نے رسّی کھول لی ہے۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس اثنا میں ایک آدمی نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ اوور کوٹ میں ملبوس آدمی نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا " کیا حال ہیں آپ کے سردار کریم نواز صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہم نے بہت زحمت دی مگر مجبوری تھی۔ وہاں کیوں کھڑے ہیں، بیٹھ جائیں۔ آئیں ادھر اس کرسی پر بیٹھیں۔" اس کا لہجہ بہت ہی شستہ اور مصفّا تھا۔

" آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟ میں نے آپ کا کوئی نقصان نہیں کیا۔ مجھے کیوں باندھ لیا ہے آپ نے؟"

" کوئی خاص ہی کام تھا آپ سے ہمیں ۔۔ بیٹھیں نا، ہم ابھی آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ میرا خیال ہے، آپ نے ابھی تک 'بیڈ ٹی' بھی نہیں لی ہو گی۔"

" جی نہیں ۔۔ مجھے چائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اچانک ہی میں نے گالی بکتے ہوئے کہا۔ مجھے ایک دم غصہ آگیا تھا۔

" لو دیئے! یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟ ابے جانتا ہے تو کس سے مخاطب ہے کتے کے بچے۔" مقصود نے میری طرف بڑھتے ہوئے بڑے غضبناک انداز میں کہا مگر وہ مجھ تک پہنچا نہیں، بس ایک جھپکی دے کر چپ ہو گیا۔

" یہ مرتضیٰ علی وارثی ہیں۔ شہر کے بہت بڑے صنعتکار۔ انہیں جھک کر سلام کرو۔" دوسرے آدمی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

" ان کی صنعت کو میں خوب سمجھ گیا ہوں۔ شیخ مرتضیٰ علی وارثی صاحب واقعی قابلِ عزت ہیں۔"

" ناراض نہ ہوں سردار صاحب! ادھر تشریف رکھیں۔ مقصود میاں! ان کے لیے چائے لے آؤ اور کچھ کھانے کو بھی۔ دراصل مجھے یہاں آنے میں دیر ہو گئی۔ ورنہ میں صبح ہی آجاتا۔" اس نے ایک کرسی کھینچ کر آگے بڑھائی۔

میں دیوار سے ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھے اُن سے بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے تھی۔ اتنا تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کوٹھی خالی تھی اور وہاں کوئی اور شخص نہیں رہتا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے شاید اسی لیے وہاں ڈال دیا تھا کہ انہیں اس کوٹھی میں کسی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کوئی میری مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا اور وہ اسی سہولت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ورنہ میری دستک پر کوئی نہ کوئی سامنے آجاتا۔

میں کرسی پر بیٹھا تو مقصود اسی وقت دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تیسرا آدمی ابھی تک پستول تانے کھڑا تھا اور اس کی شکل یہ بتا رہی تھی کہ وہ گولی چلانے میں دیر نہیں کرے گا۔ وارثی صاحب نے اسے صحیح کام پر لگا رکھا تھا۔

" آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے؟" وارثی صاحب نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

" جی نہیں۔ مگر یہ سراسر کمینگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

" آپ نے اپنے بڑے صاحب کو گولیوں سے بچا کر ہماری مشکلات میں اضافہ کر دیا ہے سردار صاحب! اور ہمیں آپ سے یہی گلہ ہے۔"

" وہ میرا فرض تھا وارثی صاحب! مگر آپ کو اُن سے کیا دُکھ پہنچ رہا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

" اسے چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ ہمارے آدمیوں کو آپ نے کیسے شناخت کر لیا۔ اب وہ علی نواز کو ناری، وقار الٰہی جنجوعہ اور سعید الدین کو گرفتار کر چکے ہیں۔ اُن کے پاس ثبوت تو کوئی نہیں ہے مگر عبدل اور کبیر کو پکڑ کر وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ بڑے صاحب پر گولی ان لوگوں نے چلوائی ہے۔ وہ رات سے پولیس کی حراست میں ہیں اور اُن کا سراغ آپ ہی نے دیا تھا مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ خطا وار وہی ہیں؟"

" میرا اندازہ تھا وارثی صاحب!"

" نہیں۔ مجھے اس اندازے کی وجہ معلوم ہونی چاہیے۔"

" میں نے بتایا ہے نا، بارود کی بو اُن بیروں کے ہاتھوں سے

برابر آ رہی تھی۔

"آپ کے پاس صرف یہی ایک وجہ تھی؟"

"جی ہاں اور میرا اندازہ غلط نہیں نکلا ہے۔"

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میں میانوالی سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"کیا آپ کا نام یہی ہے یا کچھ اور؟ مجھے اس میں شک ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں بہرحال بڑے صاحب کے جانثاروں میں شامل ہوں اور آپ کا کھوج لگا کر میں نے انھیں صحیح راہ پر لگا دیا ہے اور وہ جلد ہی آپ تک بھی پہنچ جائیں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارا انتظام اتنا بودا نہیں ہے۔ شاید وہ تینوں آدمی آج شام تک چھوٹ جائیں مگر آپ کے بارے میں ہمیں صحیح معلومات ہونا چاہئیں۔ کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کا نام سردار کریم نواز نہیں ہے؟"

"جی میرا نام یہی ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ اس قدر وطن فروش آدمی ہیں۔ آپ نے حکومت کو شکست دینے کے لیے انڈیا کے لوگوں سے سازباز کر رکھی ہے۔ ڈھلوں صاحب کو آپ کی پارٹی کی ایما پر ہی بھنڈاری نے اغوا کرایا تھا۔ کچھ اور آدمی بھی آپ کی زد میں ہیں اور مجھے اُن کے ناموں کا علم ہے۔ ڈھلوں صاحب کو میں ہی سہسرام کے گردوارے سے رہا کروا کر لایا ہوں اور آپ کو شاید معلوم نہیں کہ اب آپ کی ساری سازش میری سمجھ میں آ گئی ہے — آپ بہت نقصان میں رہیں گے وارثی صاحب! یہ بات یہاں ہی ختم نہیں ہوگی۔"

"ہوں، تو ڈھلوں صاحب کو آپ نے رہائی دلوائی ہے — بہت خوب! آپ واقعی حیرت انگیز آدمی ہیں۔ ہم جلدی ہی اُن دوسرے آدمیوں کو بھی اپنی راہ سے ہٹا دیں گے۔ ان لوگوں کا ظلم اب زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔ انھیں اپنے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔ بہرحال آپ ناشتہ کر لیں، اس کے بعد آپ سے بات ہوگی۔"

اسی وقت مقصود چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گیا تھا۔ وہ ٹرے اُس نے میرے سامنے رکھ دی، بولا "ناشتہ کرو میاں! پھر پتہ نہیں شام تمھیں کہاں آئے۔ تم واقعی بہت کاریگر آدمی ہو مگر ہم بھی تم سے کم نہیں ہیں، کیوں وارثی صاحب؟"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں چائے بنا کر پیش کرو۔" وارثی صاحب کا پستول اب تک مجھ پر تنا ہوا تھا اور اُن کا تیسرا ساتھی دیوار کے ساتھ لگا کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ میں انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ سے کسی بھی مزاحمت کی توقع رکھتا تھا۔ ایک خالص مجرمانہ ذہنیت اس کے رویّے سے ظاہر تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے اُن لوگوں نے بہت سوچ سمجھ کر ملازم رکھا تھا جس کی انگلی پستول کی لبلبی پر ہمہ وقت بے چین رہتی تھی۔ آدمی کو مار دینا اس کی سب سے بڑی ہابی معلوم ہوتی تھی۔

مقصود نے چائے پیالی میں ڈال دی، بولا "یہ بروک بانڈ ہے میاں! آدمی کو اندر سے سرشار کر دیتی ہے۔ تمھیں ایک دم چُست بنا دے گی۔ پیو اور بھول جاؤ کہ تم ایک آزاد آدمی بھی ہو۔ ہم تمھیں باندی بنا کر رکھیں گے۔ کیوں بھئی بٹ صاحب؟" اُس نے تیسرے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا مگر اس نے مقصود کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بٹ کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ مجھے اسی وقت گولی مار دیتا۔ ایک اشارے کی ضرورت تھی اسے۔ قد اس کا اگرچہ درمیانہ تھا مگر ہڈ کاٹھ کا وہ بہت مضبوط نظر آتا تھا اور مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کی تربیت پر کسی استاد نے بہت محنت کی ہے۔ وارثی صاحب کی پارٹی میں اس کی شمولیت بے جواز نہیں تھی۔ جس فلسفے پر وہ عمل کر رہے تھے اس میں انھیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت تھی۔

میں نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے اور پھر سگریٹ سلگا کر اُن کے سامنے بیٹھ گیا، یوں جیسے میں وہاں دعوت کھانے آیا ہوں۔

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟ میرا خیال ہے کہ اب تو آپ کو میرے راستے سے ہٹ جانا چاہیے۔ مجھ سے آپ جو پوچھنا چاہتے تھے، پوچھ چکے ہیں۔"

"نہیں۔ ہم ابھی آپ کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کریں گے۔ بھنڈاری کے سوا اور کس سے ملے ہیں آپ؟"

"آپ کا وہ ملہوترا بھی اب اگلے جہان میں آپ کی جان کو رو رہا ہوگا۔ اسے میں نے ہی ہلاک کر دیا تھا۔ وہ بہت بڑا مہرہ تھا نا آپ کا، مگر یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ دشمن آپ کو بھی موقع ملنے پر ختم کر سکتا ہے؟"

"ہوں، تو ملہوترا کو بھی آپ ختم کر چکے ہیں۔ اس ہیلی کاپٹر کو بھی آپ ہی پاکستان لائے تھے؟"

"جی ہاں۔ اب تو آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ اس خاکسار کا نام کیا ہے اور پیشہ کیا ہے۔" میں نے نہایت جمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرے ہاتھوں میں پھر سے خارش ہونے لگی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں اسے چیر پھاڑ کر اس کے ٹکڑے کر دوں۔ ایک ہولناک عذاب میں اُن لوگوں نے اتنے سارے آدمیوں کو ڈال رکھا تھا اور یہ سب کچھ وہ سیاست کے نام پر کر رہے تھے۔ ملک کی قیادت حاصل کرنے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرنا جائز سمجھتے تھے اگرچہ ان کے مدمقابل بھی اُن سے کچھ کم نہیں تھے۔ ہادی علی کا قتل اس کی مثال تھا — رحمت علی پر بھی ان کا وار بلاوجہ نہیں تھا مگر... مگر... اس مرتضیٰ علی وارثی نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔ بھوکے بھیڑیے کی طرح وہ میرے سامنے پستول تان کر بیٹھا تھا جیسے میں نے اس کے باپ کو مار دیا ہو۔

میری بات سن کر وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"تو گویا وہ تم ہی تھے۔ تم نے پہلے ملہوترا کو ختم کر دیا، پھر بھنڈاری کو ذلیل کرتے رہے مگر یہ سب کچھ تم کس کی ایما پر کر رہے ہو؟ کیا معاوضہ ملتا رہا ہے تمھیں؟"

"معاوضہ تو مجھے ڈھیر سارا ملا ہے وارثی صاحب! انھیں ایک آدمی کو مارنے کا معاوضہ دس لاکھ روپے تھا۔"

"دس لاکھ! میں تمھارا نام ابھی تک نہیں جان سکا۔"

"نام میں کیا رکھا ہے وارثی صاحب! میں تو جس کسی کے ساتھ سودا کرتا ہوں بس کر ہی لیتا ہوں مگر نقد۔ میں ڈھلوں صاحب کو چھڑا لایا تو اس کے مجھے دس لاکھ روپے ملے ہیں۔"

"مگر یہ رقم کون دیتا رہا ہے تمھیں؟"

"مالک دیتے رہے ہیں جناب! بڑے صاحب موجود ہیں — اشرف صاحب ہیں اور بھی کئی لوگ ہیں۔ سب کچھ اُن کے پاس ہے، وہ کیا نہیں کر سکتے؟"

"ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ یوں ضائع کیا جا رہا ہے۔ میں تمھارا یہ بیان اخبار میں چھپوا دوں گا۔ تمھیں عدالت کے سامنے پیش کر دوں گا۔ اُن کی ایسی تیسی اُن بڑے صاحب کی۔"

"مگر آپ کو یہ بھی تو بتانا پڑے گا وارثی صاحب کہ آپ کا انڈیا کے کچھ لوگوں سے کیا تعلق ہے اور بھنڈاری جیسے لوگ آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"ڈیم اِٹ۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔ تم کرائے کے قاتل ہو۔ آخر کیا ہو تم؟ کوئی عہدہ دے رکھا ہے انھوں نے تمھیں؟"

"جی نہیں۔ عہدہ تو میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ میں بس اُجرت لیتا ہوں اپنے کام کی اور بہت کھری اجرت ملتی ہے مجھے۔ کام بھی تو فوراً کر دیتا ہوں۔"

"تمھیں... تمھیں سہسرام کا پتہ کس نے دیا؟ کیسے جا پہنچے تھے تم وہاں؟"

"یہ ایک الگ سوال ہے۔ میں اپنے ذرائع آپ کو نہیں بتا سکتا۔ ہاں آپ کا کوئی کام پھنسا ہو تو مجھے بتائیں۔ رقم معقول ہوگی تو وہ بھی ہو جائے گا۔ میں کسی پارٹی کے ساتھ نہیں ہوں وارثی صاحب!"

"سہسرام میں تمھیں کسی نے نہیں روکا؟ اس گوردوارے میں تم کیسے گھس گئے؟"

دو ایک سنگھوں کو مارنا پڑا تھا مجھے۔ اُن کے دوست بھی شاید تباہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ..."

"بکواس بند کرو۔ تم نے وہاں جا کر ہمیں بھی ذلیل کروا دیا ہے۔ مجھے نام بتاؤ اس آدمی کا جس سے تم نے سہسرام کا پتہ معلوم کیا تھا۔"

"اسے گولی مار دیں گے آپ؟ کیا کریں گے اس کا؟ وہ بھی اپنی جان کے خوف سے مجھے سب کچھ بتا گیا تھا ورنہ میں اس کا بھی گلا گھونٹ دیتا۔ مجھے بڑی معقول رقم ملی تھی، میں اسے کیسے چھوڑ دیتا۔"

"زیادہ بک بک کرا دیے! خواہ مخواہ پھنے خانی دکھا رہا ہے تو۔ ابھی ہمارا ایک معمولی بیرا تمھیں پکڑ کر ادھر لے آیا تھا۔ اس کی باتوں پر نہ جائیں وارثی صاحب! یہ خواہ مخواہ شیخی مار رہا ہے۔" قادر بٹ نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، یہ غلط کہہ رہا ہے؟"

"بالکل غلط۔ مجھے اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں ہے۔"

"مگر بٹ! یہ تو دیکھ کہ ڈھلوں وہاں موجود تھا، اس ملک اشرف کی کوٹھی میں۔ اگرچہ وہ زخمی بھی تھا مگر تھا تو وہیں۔ میں پوچھتا ہوں وہ ڈھلوں زخمی کیسے ہو گیا؟"

"وہ فساد اس کے گھر میں مچا تھا مگر میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، وہ اس کا نجی معاملہ ہے۔"

"ٹھیک ہے استاد! تمھارے لیے ہمارے پاس بھی ایک کام ہے مگر ابھی نہیں۔ تمھیں چند دن انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تم ادھر ہی رہو گے۔ اس کو ادھر گیراج کے ساتھ والے بیرونی کمرے میں ڈال دو مقصود! ہمارے گھر والے بھی بس آنے ہی والے ہیں۔"

"جی بہت بہتر۔ چل اوئے اٹھ یہاں سے۔ تجھے میں دوسری کھولی پر باندھتا ہوں۔" مقصود نے مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں پھر آ جاؤں؟ آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو مزدور

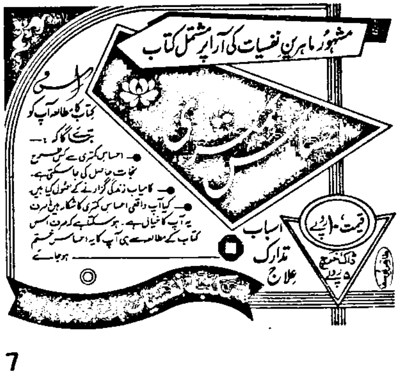

"آدمی ہوں وارثی صاحب!" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ تو اب بالکل آزاد تھے مگر ان کی گولیوں کا خوف مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا تھا اور قادر بٹ کی نظروں کا مفہوم میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ پستول سے وہ مجھے پہلے ہی محروم کر چکے تھے۔

"نہیں۔ ابھی تم یہیں رہو گے اور ہمارے مہمان بن کر۔ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارے اس زخم کا بھی ہم علاج کرا دیں گے۔"

"یہ زیادتی ہے وارثی صاحب! آپ اپنے لیے مصیبت کھڑی کر رہے ہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ انھیں آپ بھولے نہیں ہوں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میرا کام اتنا خفیہ ہوتا ہے کہ آج تک کسی کو پتہ نہیں چل سکا ہے کہ وارثی ہے کون؟ بس اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ ادھر یہاں سے نکل چلو۔" پستول اس نے اب تک نیچے نہیں کیا تھا۔

انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میری ذرا سی آزادی یا ان کی ذرا سی غفلت اُن کے لیے عذاب بن سکتی ہے۔ میں انھیں معاف تو نہیں کر سکتا تھا مگر وہ تارے جو ٹھنڈے ہو چکے تھے، وہ سحر جو گزر چکی تھی، میں کبھی جوں کی توں واپس نہیں لا سکتا تھا۔ رات کو اگر میں کسی طرح بیدار ہو جاتا تو شاید میں کھڑکی توڑ کر باہر نکل جاتا۔ میرا ایک ہاتھ تو کام کرتا ہی تھا۔ گرل بھی پختہ ارادے کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے مگر اب اُن سے کوئی فساد پیدا کر لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اُن لوگوں نے مجھے اس کمرے سے نکالا اور ایک راہداری میں سے گزار کر عقبی صحن میں گیراج کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ کمرہ کوٹھی سے کچھ فاصلے پر تھا اور میرا خیال ہے کہ اپنے ڈرائیور کو وہ لوگ وہیں سُلاتے تھے۔ کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ دو کرسیاں اور میز بھی وہاں رکھی تھیں اور عقبی دیوار کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی موجود تھا۔

وارثی راستے ہی میں رہ گیا۔ مقصود اور قادر بٹ مجھے کمرے میں پہنچا کر واپس ہونے لگے تو اچانک بٹ نے پلٹ کر کچھ ایسے خوفناک انداز سے مجھ پر گولی چلائی کہ میں اگر بیٹھ نہ جاتا تو وہ شاید میرے ماتھے میں جا گھستی۔ وہ ہنسنے لگا۔ بڑی مکروہ ہنسی تھی اُس کی۔ مقصود بھی ہنسنے لگا۔

"یہ اس بات کی یاد دہانی ہے کہ تم بندے کے پتروں کی طرح یہاں رہو گے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ گولی کا دھماکہ ابھی تک کمرے کی فضا میں گونج رہا تھا۔ اُن کا وہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ گولی جو اس کی انگلی تلے دبی تھی اس نے بالآخر چلا ہی دی۔ مجھے وہ مکمل طور پر خوفزدہ کر دینا چاہتے تھے۔ اس گولی کا مطلب یہی تھا۔

وہ باہر نکلے تو میں نے صورتِ حال کا ایک بار پھر گہری نظر سے تجزیہ کیا۔ اُن کے تشدد سے تو میں خود کو بچا لایا تھا مگر وہاں بے بس ہو کر پڑے رہنے سے تو کام نہیں بنتا تھا۔ اُن کو روک لینا بہت ضروری تھا۔ وہ تو کسی بھی وقت بڑے صاحب کے علاوہ کسی پر بھی ہاتھ اٹھا سکتے تھے اور وہ لوگ ان کے ارادوں سے قطعًا باخبر نہیں تھے۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل النور سے جو میرے آئے ہیں، وہ دراصل وارثی جیسے لوگوں کے تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں اور انھوں نے حکومت کے چیدہ چیدہ لوگوں کو قتل کرنے کا ایک باقاعدہ منصوبہ بنا رکھا ہے۔ وہ شیر دل آہو، ڈھلوں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ذریعے اگر دوسری پارٹی کے افراد کو تہ تیغ کروا سکتے تھے تو ان کی اس کارروائی کے جواب میں دوسروں نے بھی اُن کی تباہی کا سامان پیدا کر رکھا تھا اور یہ بہت ہی خطرناک بات تھی۔ سیاست میں ایسی دہشت گردی تو ملک کے مستقبل کو تباہ کر سکتی تھی۔ مگر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا تو کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ جس فساد میں اُن لوگوں نے مجھے ڈال دیا تھا اس سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں بھی اُن کے نزدیک بہت اہم آدمی ہوں مگر انھیں کیا پتہ کہ میری اصلیت کیا ہے اور میں اُن دونوں کے اڑنگے میں پھنس کر کس قدر پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے تو کوئی عہدہ، کوئی رتبہ نہیں چاہیے تھا۔ میرے تو اپنے ہی مسائل اتنے زیادہ تھے کہ میں اُن کی سیاست کے کسی نسخے میں کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔ ایک وہ میری ماں جائی آسیہ مجھے مل جاتی اور بینک سے مجھے میرا روپیہ واپس دے دیا جاتا تو میں شاید عالیہ کو بھی معاف کر دیتا اور کسی طرف منہ اٹھا کر چل دیتا۔ مجھے تو اُن سے کوئی غرض رکھنی ہی نہیں تھی۔ وہی بہت کافی تھا کہ میں ڈھلوں صاحب کو سہسرام سے چھڑا لایا تھا۔ اب مجھے کسی کے پیچھے نہیں بھاگنا تھا۔ میری بلا سے وہاں تو تم بسے کہ ہما بسے۔ میں اس بٹ ایسے کمینے شخص کی زبان انگلی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ وہ کسی اور مقام پر ہوتا اور مجھ سے اس طرح بات کرتا تو میں اس کی زبان کھینچ لیتا۔ آبی اگ اسپتال میں پڑا میری جان کو رو رہا ہوگا۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں کس مخمصے میں پھنس گیا ہوں۔ میں تو بینک سے روپیہ نکلوانے نکلا تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک پلنگ پر بیٹھا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اس سروری خانم نے الگ مجھے حیران کر رکھا تھا۔ میرے بچے کی ماں بن کر اس نے ایک نیا فساد کھڑا کر دیا تھا۔ وہ دن زیادہ دور نہیں تھا جب آہو اسے طلاق دے دے گا مگر ایسی صورت میں وہ جاگیر سے کیسے منسلک رہ سکے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور سروری خانم اس بات پر آمادہ نظر

آتی تھی کہ وہ آہو سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے۔ یہی اس کا عندیہ تھا۔ اس نے صاف صاف ہی یہ بات مجھ سے کہہ دی تھی۔ اور... یہ ایسا معاملہ تھا جس پر آہو کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اس کی تو ساری حیثیت ہی ختم ہو جاتی۔ ہادی علی کے قتل کا ایک اہم دشمن اس نے میرے ہاتھوں ختم کروا دیا تھا مگر سب سے زیادہ فائدہ اُسے جاگیر پر مکمل اختیار حاصل کر لینے سے ہوا تھا ورنہ وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ میری سوچ مجھے طرح طرح ڈنک لگا رہی تھی۔ ان پارٹیوں کی سیاست میں پھنس کر میں خواہ مخواہ ہی مارا گیا تھا۔ اب یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ وارثی کی پارٹی کا بھارت کے چند لوگوں سے بڑا گہرا رابطہ قائم تھا اور وہی تھے جو انھیں برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے اپنی فہرست میں بہت سے نام لکھ رکھے تھے۔ عالیہ تو محض ایک ذریعہ تھی اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی اُن کے مقاصد کی تکمیل میں ایک مہرے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اصل مقابلہ تو بڑے صاحب اور وارثی کی پارٹی کے درمیان تھا اور اس بیچ خدا معلوم کون کون سے نام آتے تھے۔ میں خدا سے یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے مجھے اس مخمصے سے نکال دے۔ سیاست کی جھلا بور مجھے راس نہیں آ سکتی تھی۔

کوئی دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ کمرے کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ اس میں سے میرے لیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔ غسل خانے میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا مگر اس میں سے میرا نکل جانا ناممکن تھا۔ دیواریں سنگین تھیں اور اُن سے محض ٹکرایا جا سکتا تھا۔ اُن کو توڑ دینا کسی آدمی کے بس میں نہیں تھا۔ تاوقتیکہ وہ کوئی بڑا سا اوزار لے کر ان اینٹوں کو وہاں سے اکھاڑ دیتا۔ نہ میرے پاس کوئی ایسا اوزار تھا، نہ میں قادر بٹ کے پستول سے بچ سکتا تھا۔ یہ بات بھی کسی طرح ممکن نہیں تھی کہ وارثی مجھ سے یہ کہتا کہ تم باہر نکل کر فلاں آدمی کو قتل کر دو۔ وہ ایسا پاگل نہیں تھا۔ وہ محض مجھے طفل تسلیاں دے رہا تھا۔ خود کو مطمئن کر رہا تھا۔ وہ اس خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ کاش یہ آدمی اُن کی پارٹی میں شامل ہوتا تو اُن کے لیے کام کرتا مگر یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

اس وقت وارثی صاحب کے گھر والے کوٹھی میں واپس آ گئے تھے۔ بچوں کی اور عورتوں کی آوازیں مجھے برابر سنائی دے رہی تھیں۔ وہ شاید کہیں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی گاڑی شاید کوٹھی کے سامنے والے حصے میں کھڑی تھی۔ وہ عقبی گیراج کی طرف نہیں آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کوٹھی کا پچھلا حصہ دوسری سڑک پر کھلتا تھا اور اس طرف کا گیراج کسی دوسری گاڑی کے لیے مخصوص تھا۔ میرے کمرے کے آگے کوئی پہریدار نہیں کھڑا تھا۔

وہ لوگ مجھے وہاں باندھ کر باہر نکل گئے تھے اور دوبارہ مجھے نظر نہیں آئے۔ میں پلنگ پر بیٹھا اپنے حال پر کڑھتا رہا۔ اب اس کے سوا چارہ کوئی نہیں تھا۔ میری تقدیر مجھے عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار کر گئی تھی۔ مجھے جس آزادی کی ضرورت تھی، وہ اچانک ہی سلب کر لی گئی تھی اور میں اس میں کسی کو قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ سارا کیا دھرا میری اپنی قسمت کا تھا ورنہ وہ سفید لباس میں ملبوس بیرا ایک دم اندر آ کر مجھے کیسے بے بس کر دیتا۔ قادر بٹ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایک معمولی بیرے نے مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔

میرا خیال ہے اس وقت دو بج رہے تھے کہ اچانک دو بچے عقبی گیراج کی طرف نکل آئے۔ اس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے کھول کر اندر گھس گئے۔ اُن میں سے ایک لڑکی تھی اور دوسرا لڑکا۔ میں دروازے کی جھری کے سامنے کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ عمریں اُن کی یہی کوئی نو دس سال کی ہوں گی۔ اُن کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ لڑکے کا نام غیاث تھا۔ وہ لڑکی کو جینا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ گیراج میں گھسے تو لڑکا بولا۔ "یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے مجھے اس کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں ہوتا۔ ہم یہاں چھپ نہیں سکتے ہیں۔"

"تو پھر کیا خیال ہے۔ یہ کمرہ نہ کھول لیں؟ اس پر تو تالا لگا ہے۔ یہ بڑا سا۔ اسے کیسے کھولیں گے؟"

"تم یوں کرو کوئی چابی لے آؤ۔"

"نہیں بھئی! امی ماریں گی، اُن کی نیند خراب ہوگی۔"

"ارے نہیں۔ وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔ چابیاں کہیں اِدھر اُدھر رکھی ہوں گی۔"

"میں خاک کوشش کروں کوئی چابی نہیں ہے گھر میں تم خود دیکھ لو جا کر۔"

"تو پھر میں اپنے گھر سے لے آتی ہوں، تم اِدھر ہی بیٹھو۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں تمھارا یہاں انتظار کرتا ہوں، جلدی آ جانا۔"

"بس میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ گیراج سے باہر نکل گئی۔ وہ اسکول کی یونیفارم میں ہی ساتھ کی کوٹھی سے وہاں آ گئی تھی۔ لڑکی باہر نکلی تو غیاث نے گیراج کا دروازہ بند کر دیا اور پرے کچھ دور گھاس پر جا بیٹھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ اس عمر میں سگریٹ بھی پینے لگا تھا۔ میرے سامنے اس نے ایک کنگ سائز سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ اسے ابھی دھواں سمیٹنے کی عادت نہیں پڑی تھی بس منہ سے دھواں نکال کر وہ خوش ہو رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اُسے زبردست کھانسی آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر سگریٹ پرے پھینک

دیا۔ میں جھری کے سامنے کھڑا اس کی تمام حرکتیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ جیسے ہی انھوں نے میرا دروازہ کھولا، میں انھیں حیران پریشان چھوڑ کر وہاں سے نکل جاؤں گا۔ کوئی دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اچانک مجھے عمارت کی طرف سے ایک آدمی اس کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، بولا "شاہ جی! یہ۔۔۔۔۔ یہ دروازہ تو کھول دیں ذرا۔ میری کچھ کتابیں اندر رہ گئی ہیں۔"

"وہ کیسے رہ گئیں اندر، کیا کرتے رہے ہو تم یہاں؟"

"میں یہاں پڑھتا رہا ہوں مگر آج اس پر تالا لگا ہے۔"

"اس کی چابی میرے پاس نہیں ہے، وارثی صاحب کے پاس ہوگی۔"

"کوئی اور چابی تو لگ سکتی ہے۔ پلیز ذرا کوشش کرو مستان شاہ! آخر ہمارے ڈرائیور ہو تم۔"

"نہیں میرے پاس کوئی چابی نہیں ہے۔ میں اس گیراج سے جیک لینے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گیراج میں جا گھسا۔ مگر ابھی وہ اندر ہی تھا کہ جینا واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا یہ بڑا سا گچھا تھا۔

"لو۔ ان میں سے کوئی چابی ضرور لگ جائے گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا مگر ابھی پرے سرک جاؤ۔ ڈرائیور اندر ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ذرا انتظار کر لو نا۔ اُدھر جھاڑیوں میں چھپ جاؤ۔" مگر ابھی وہ وہاں سے ہٹنے نہیں پائی تھی کہ ڈرائیور گیراج سے باہر نکل آیا۔ جینا پر نظر پڑتے ہی اس کا رنگ بدلنے لگا۔

"تم۔۔۔ تم یہ تالا کھولنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔ دیکھو ذرا یہ ان میں سے کوئی چابی لگتی ہے کہ نہیں۔" غیاث نے چابیوں کا گچھا اس کی طرف پھینک دیا۔

"یہ جینا ہے نا؟"

"ہاں۔ تم سے ڈر کر بھاگ رہی ہے۔"

"کیوں بھاگتی ہے یہ پگلی کہیں کی۔ بلاؤ اسے ادھر۔" مستان شاہ نے جینا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت جھری کے بالکل سامنے تھے۔

غیاث جینا کو آواز دے کر بولا "ہے! رک جاؤ۔ اپنا یہ مستان شاہ یہ دروازہ کھول دے گا۔" لڑکی وہیں رک گئی اور واپس لوٹ آئی۔

"ان میں سے تو کوئی چابی نہیں لگ سکے گی۔ تم جاؤ غیاث! وارثی صاحب کے کمرے میں الماری کی نچلی دراز میں سے چابیاں نکال لاؤ۔ اس کی چابی وہیں پڑی ہے۔"

"اچھا تو پھر میں وہی لے آتا ہوں۔"

"ہاں شاباش جاؤ۔ اور دوسرے گیراج سے آٹھ نمبر کی چابی بھی لے آنا، مجھے ضرورت ہے۔"

غیاث اسی وقت وہاں سے اٹھ گیا۔ لڑکی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس مستان شاہ کی موجودگی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر اس نے یوں کیا کہ جیب سے ٹافیوں کا ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہے! یہ لو ٹافی کھاؤ۔ میں تم دونوں کے لیے لے آیا تھا۔ لو یہ۔"

اس کا منہ بن گیا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے چل دی۔ لڑکی کو جاتے دیکھ کر مستان شاہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔ کچھ دیر وہ اپنی جگہ کھڑا رہا پھر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

میں نے گھبرا کر پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر میری دستک کی آواز شاید اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔

غیاث ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی آنٹی نے اسے روک لیا تھا یا وہ کسی اور کام میں الجھ گیا تھا۔ کوٹھی اور گیراج کے درمیان کا فاصلہ ویران پڑا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دروازے پر بڑے زور سے دستک دی مگر وہ آواز پھر کمرے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ میری بے بسی دیدنی تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ وہ جو شدنی ہے اسے تو غلام جیلانی بھی نہیں روک سکتا۔ اس کے ارادے کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ بیس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ غیاث واپس نہیں آیا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھے اپنی گردن پر سوار نظر آتا تھا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ غیاث بھی اس طرف لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ کسی اور آدمی کی صورت بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ عین اس وقت مجھے دو لڑکیاں سامنے سے گزرتی نظر آئیں وہ کمرے کے سامنے سے نکلیں تو میں نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس آواز کو سن کر وہیں رک گئیں وہ بھی یہی کوئی گیارہ بارہ سال کی عمر کو پہنچ رہی تھیں۔

"ادھر کون ہے بھئی! یہ دروازہ کون بجا رہا ہے؟"

"ارے! اندر تو کوئی ہے مگر باہر سے تالا لگا ہے۔ آؤ عصمی دیکھیں ذرا۔"

"نہ بابا! مجھے تو ڈر لگتا ہے شاہدہ! آؤ آنٹی کو بتاتے ہیں۔ شاید یہ کوئی بھوت ہے۔"

"بھوت کہاں ہوگا یہاں۔ آؤ دیکھیں تو سہی۔"

"یہ دروازہ کھولو بیٹی! میں یہاں بند ہوں۔" وہ مجھ سے کوئی آٹھ قدم دور تھیں۔ میری آواز سن کر وہ ایک دم عمارت کی

طرف بھاگ گئیں۔ کوئی دس منٹ بعد مجھے عمارت کے عقبی برآمدے میں سے ایک گوری چٹی دراز قد عورت باہر آتی دکھائی دی۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی اُن کے ساتھ تھیں اور غیاث بھی آنکھیں ملتا ہوا اُن کے پیچھے آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس کی ماں نے پکڑ کر بستر میں ڈال دیا تھا اور وہ لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ اب جو اُس نے شور سنا تو ماں کے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔ عورت ان بچوں کو ساتھ لے کر میرے کمرے کی طرف آئی مگر دروازے پر تالا دیکھ کر بولی۔

"ارے! اس پر تالا لگا ہے یہاں کون ہو سکتا ہے بھلا؟" میں نے اس کی آواز سن کر ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تو وہ حیرت زدہ ہو کر آگے بڑھ آئی۔

"کون ہے اندر؟"

"جی میں ہوں سردار کریم نواز۔ وہ وارثی صاحب مجھ کو یہاں بند کر گئے ہیں۔ یہ دروازہ کھول دیں پلیز!"

"وارثی صاحب! آپ کو کیوں بند کر گئے ہیں وہ۔ کیا جرم ہے آپ کا؟" وہ دروازے کے پاس آ گئی اور جھری کے اندر دیکھنے لگی۔ میں سامنے ہی کھڑا تھا مگر اندر اندھیرے کی وجہ سے وہ مجھے پوری طرح نہ دیکھ سکی۔ عین اس وقت عمارت کے شرقی حصے میں ایک کار دندناتی ہوئی ہماری طرف آ گئی۔ اس میں وارثی صاحب اور اُن کے دونوں ملازم موجود تھے۔ قادر بٹ اور مقصود۔ کار انھوں نے تیزی سے دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وارثی صاحب نے بیگم کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا آپ آ گئے، اندر ایک آدمی بند ہے کہتا ہے آپ نے اسے یہاں قید کر دیا ہے۔"

"بکتا ہے وہ۔ کسی نے باہر سے تالا لگا دیا ہوگا، اسے تو ہم یہاں آرام کرنے کے لیے بٹھا گئے تھے۔ ہمارا دوست ہے یہ۔ سردار کریم نواز۔ آپ جائیں اندر بیٹھیں۔ چلو بیٹے تم بھی اندر جاؤ۔" وارثی نے غیاث کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر قادر بٹ کو میرے کمرے کی چابی دے کر بولے "سردار صاحب کو باہر نکالو بھئی! وہ کب تک اندر بند رہیں گے۔ یہ تالا پتہ نہیں کون لگا گیا ہے۔" اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولے "تم چلو سلمیٰ! بچوں کو اندر لے جاؤ۔"

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئے اور کمرے کے سامنے کوئی آدمی نہ رہا تو قادر بٹ نے بڑی احتیاط سے میرے کمرے کا تالا کھول دیا مگر اس حال میں کہ اس نے اور وارثی صاحب نے مجھ پر پستول تان لیے تھے مگر اب کی بار میں اُن کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بن سکتا تھا۔ کرسی کا ایک دستہ میں پہلے ہی اکھاڑ چکا تھا جیسے ہی بٹ نے تالا کھولا تو میں دروازے کے بائیں طرف ہو گیا۔

اس نے فوراً ہی دونوں پٹ کھول دیے مگر جیسے ہی وہ دائیں ہاتھ میں پستول لیے اندر داخل ہوا میں نے پوری قوت سے کرسی کا دستہ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ اس کی نظر ابھی اندھیرے سے پوری طرح متعارف ہو ہی رہی تھی کہ ہاتھ پر ضرب پڑنے سے پستول اس کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے بٹ کی گردن دونوں ہاتھوں میں لے کر کچھ اس طرح دبائی کہ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ وہ ایک دم کٹی پتنگ کی طرح جھول کر نیچے گرنے لگا۔ وارثی اس سے چار قدم پیچھے تھا۔ میں نے بٹ کو بانہوں میں لے کر اس کا پستول ہاتھ میں اٹھا لیا۔ عین اس وقت وارثی میری زد میں آ گیا۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے بٹ کا پستول اس پر چلا دیا۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں لگی۔ ایک گولی اس نے بھی چلائی مگر وہ بٹ کی کمر میں لگی۔ قادر کو زمین پر ڈال کر میں نے دوسری گولی بھی وارثی کی طرف داغ دی۔ وہ دروازے کے باہر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ گولیوں کی آواز دور دور تک سنائی دے گئی تھی۔ سلمیٰ اور اس کے بچے مجھے تیزی سے برآمدے میں سے نکلتے دکھائی دیے مگر میں اس وقت تک اپنا کام کر چکا تھا۔ میں دروازے سے نکلا اور وارثی کے جسم کو پھلانگتا ہوا عقبی حصے کی طرف بڑھا اور گیراج کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں پچھلے حصے تک جا پہنچا۔ سلمیٰ اور اس کے بچے چیختے ہوئے وارثی کی طرف بڑھے تو میں اس وقت تک دیوار پھلانگ کر سامنے کی سڑک پر جا پہنچا تھا۔ میری گولیاں وارثی کو اور اس کی گولی قادر بٹ کو ختم کر گئی تھیں۔ اب میری سوچ کے زاویے زیادہ واضح ہو گئے تھے۔ مجھے سڑک بھی نظر آتی تھی اور اس کے اردگرد بنی کوٹھیاں بھی۔ میں گرد و پیش کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگا تھا۔ پستول میں نے دیوار پھلانگنے کے بعد جیب میں ڈال لیا تھا۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد مجھے ایک رکشا دکھائی دیا۔ اسے میں نے ہاتھ دے کر ٹھہرایا۔ اور اس کے اندر بیٹھ کر میں نے کہا۔ "چلو میاں! مجھے ذرا مال روڈ کی طرف لے چلو۔" آپی کا کلینک وہیں تھا اور یہ بہت ضروری تھا کہ میں اس کو حالات کے اس نئے رُخ سے آگاہ کر دیتا۔ میں اس کو وہاں بے سہارا چھوڑ آیا تھا۔ پتہ نہیں میرے بعد اس پر کیا گزری ہوگی۔ ڈاکٹر تو روپے کے بغیر کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے اور پھر ایسے پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر۔ کچھ ہی دیر بعد میں آپی کے کلینک تک جا پہنچا۔ رکشے کو فارغ کر کے میں آپی کے کمرے میں جا گھسا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ ایک دم بستر سے اچھل گیا۔ اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔

"یار! یہ۔۔۔ یہ تو کہاں چلا گیا تھا جیلانی! تو سمجھتا ہے

مجھے۔ امرتسر میں بھی تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور اب بھی تیرا یہی حال ہے۔“ آبی نے اپنا کمبل ٹانگ پر پھیلاتے ہوئے دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیے۔

”مجھے افسوس ہے آبی! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں مگر یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں تھا۔“ میں نے اُسے بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

”تجھے نہیں پتہ ہے جیلانی! میں تیرے بغیر پاگل ہو جاتا ہوں۔ آخر ایسا کیا کام تھا تجھے؟ تو مجھے فون ہی کر دیتا۔“

”کچھ ایسی ہی بات تھی آبی! ٹھہر میں یہ دروازہ بند کر دوں۔“

”اسے کھلا رہنے دے۔ کنڈی نہ لگا۔ وہ۔۔۔ الماس ہے نا! مجھے اس کا انتظار ہے۔“

”وہ یہاں آ رہی ہے؟“

”نہیں۔ بلکہ میں نے اُسے آج فون کیا تھا۔ وہ گھر پر ہی مل گئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ وہ چار بجے آ جائے گی۔“

”یہ اچھا کیا ہے تم نے۔ ٹھیک طرح بولی تھی کہ نہیں؟“

”ہاں۔ بڑی محبت سے بول رہی تھی۔ شکوہ اسے یہ ہے کہ میں نے اتنے عرصے سے اسے بھلا رکھا ہے۔“

”اس سے شادی کر لو آبی! یہ بہت ضروری ہے۔“

”نہیں یار! یہ بوجھ مجھ سے نہیں اٹھ سکے گا۔ وہ میرے بس کی چیز نہیں ہے۔ پتہ نہیں کون کون اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ بھی میرا خیال ہے سمجھ چکی ہے کہ آبی اس کے کام کا آدمی نہیں ہے۔“

”خیر دیکھ لیں گے۔ آ تو لینے دے اسے۔ میں خود اس سے بات کروں گا مگر یہ بتا کہ وہ روپیہ جو تو کراچی سے لایا تھا، وہ کس حساب میں جمع کیا تھا؟“

”وہ۔۔۔ میں نے الگ حساب کھول دیا تھا۔ تمھارا نمبر مجھے یاد نہیں رہا تھا۔“

”یہ بہت اچھا کیا ہے تم نے۔ بہت ہی اچھا ہوا ہے یہ۔ خدا کا شکر ہے ہم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”بات یہ ہے آبی کہ میری رقم پولیس کے ہاتھ آ گئی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سارے واقعات اسے سنا دیے۔

وہ ٹکٹکی باندھ کر میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ یوں جیسے وہ پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہو۔ ٹھہر ٹھہر کر اس کی آنکھیں ساکت ہو جاتی تھیں۔ میں جب خاموش ہوا تو وہ بڑے ہی دلگیر لہجے میں بولا ”یہ ہماری قسمت ہے جیلانی! اس میں کسی کا دوش نہیں ہے مگر تو فکر نہ کر۔ روپیہ میرے حساب میں جمع ہے۔ میں نے تجھے بہلانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ وہ تیرے حساب میں ڈال دیا گیا ہے۔ واقعی ہم بہت بڑی مصیبت سے بچ گئے ہیں مگر وہ روپیہ ہے ابھی بینک میں۔“

”اس کی پروا نہ کرو۔ اس تک تو تم آسانی سے پہنچ سکتے ہو مگر میرا روپیہ برباد ہو گیا۔“

”نہیں یار! اس مینیجر کا تو میں پیٹ چاک کر دوں گا۔ فکر نہ کر ہم اس سے کل ہی مل لیں گے۔ بارہ چودہ لاکھ کی بات ہے، وہ تو ہر وقت بینک میں جمع رہتا ہے۔ کسی نوٹس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔“

”کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا پڑے گا مگر اب یہ بتا کہ میں کیا کروں؟ وارثی اور قادر بٹ کو تو میں ختم کر آیا ہوں۔“

”بہت اچھا کیا ہے تم نے۔ اُن سے تم اس طرح ہی بچ سکتے تھے۔ جہاں سو وہاں سوا سو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خون ہمارے سر ہے۔ ایک ہی بار حساب دے لیں گے۔“

”مگر یار! اس بڑے صاحب کو اگر میں نہیں بچاتا تو وہ تو میدان مار گئے تھے۔“

”اُن سے بھی نپٹ لیں گے ہم۔ اُن بیروں کی تو تکا بوٹی کر دیں گے ہم۔ سمجھا کیا ہے اُن لوگوں نے ہمیں۔“

”اور میری وہ پچاس ہزار کی رقم بھی وہیں رہ گئی۔ پتہ نہیں وہ ملتی بھی ہے کہ نہیں۔“

”مل جائے گی ورنہ بڑے صاحب سے لے لیں گے۔ ابھی ہم الماس سے مل لیں پھر تم کل صبح اُن کے پاس چلے جانا مگر ہماری زندگی سالی کنیر کا پھول ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس عالیہ کا بھی پتہ چلا کہ نہیں؟“

”نہیں یار! اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی مجھے۔“

”دیکھ! تو ابھی شام کو ملک اشرف کے ہاں فون کر۔ اگر ڈھلوں صاحب وہاں ہوں تو انھیں ادھر ہی بُلا لے۔ میرا خیال ہے وہ رقم اُن کے پاس ہو گی۔ بریف کیس میں دھری تھی نا؟“

”ہاں۔ اُن سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی تک وہاں ہی ہوں۔ ویسے تیرا حال کیسا ہے؟“

”میں پہلے سے بہتر ہوں مگر ابھی میں چل نہیں سکتا۔ کوئی پانچ چھ دن اور لگ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی اب ادھر ہی ٹھہرتا ہوں۔ تو تندرست ہو جائے تو پھر ہم بینک چلیں گے۔ اس وقت تک تو معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔“

”ہاں۔ مارو اس مینیجر کو پکڑ کر۔ بدمعاش نے سخت بددیانتی کی ہے۔ میرا خیال ہے اس کی کسی عزیزہ کو اٹھا لو۔ سالا خود ہی روتا آئے گا۔“

”سیدھی طرح کام نہیں بنا تو مجھے یہی کرنا پڑے گا۔“

چار بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ کسی نے آبی کے کمرے پر دستک دی۔ ہم دونوں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دوسری دستک پر آبی نے کہا ”اندر آ جائیں۔“

دروازے کا پٹ کھلا تو میں سمجھا کمرے میں نور کی بارش ہونے لگی ہے۔ ہمارے سامنے الماس کھڑی تھی۔ وہ کلینک تک تنہا آئی تھی۔ وہ آسمانی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی جس پر اس نے بہت خوبصورت سا اسی رنگ کا کوٹ اوڑھ رکھا تھا۔ آبی کو مریضوں کے بستر پر دیکھ کر ذرا دیر کے لیے وہ ٹھٹکی مگر پھر ایک دم آگے بڑھ آئی، بولی ”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کی صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی آپ۔۔۔ آپ اسلم آبی ہیں نا؟“

”اس میں کوئی شک ہے آپ کو؟ بیٹھیں اور ان سے ملیں۔ انھیں جانتی ہیں نا آپ؟“

”جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں، آپ کا کیا حال ہے جیلانی صاحب؟“

”جی میں بالکل ٹھیک ہوں اگرچہ میرا بازو بھی زخمی ہے۔“

”کمال ہے۔ ایسی کون سی جنگ لڑی ہے آپ نے، ہوا کیا تھا؟“

”بس ایسے ہی کچھ فساد ہو گیا تھا۔ آپ کہیے، میرا خیال ہے آپ منگنی کے بعد آبی سے پہلی بار مل رہی ہیں۔“

”ہاں، بات کچھ ایسی ہی ہے۔ انھوں نے بھی تو کمال کر دیا ہے۔ میرا کبھی انھیں خیال ہی نہیں آیا۔“

”جی نہیں۔ آپ کے بارے میں جب بھی پتہ کیا یہی معلوم ہوا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ کبھی آپ کہیں ہوتی ہیں کبھی کہیں۔“

”میں واقعی بہت مصروف رہی مگر مجھ سے ملنا کیا مشکل تھا۔ گاڑی اور ہوائی جہاز ہر طرف چلتے ہیں۔ اس عرصے میں مجھے آپ کی والدہ سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے ناراض ہی گئی ہیں۔“

”وہ آپ کی زیادتی تھی الماس! انھیں آپ کو ماں کا درجہ دینا چاہیے تھا۔“

”مجھے احساس ہے مگر ان کا رویہ بہت ہی غلط تھا۔ میرا خیال ہے، وہ مجھے سمجھ ہی نہیں سکی ہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا توقع رکھتی تھیں۔“

”ان کو راضی رکھنا آپ کا فرض ہے الماس! وہ واقعی آپ سے مل کر خوش نہیں ہوئیں۔“

”میں انھیں منا لوں گی آبی صاحب! مگر یہ بتائیں کہ آپ ہیں کس چکر میں اور آپ کے ارادے کیا ہیں؟“

”ارادے کچھ بھی نہیں۔ جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا۔“

”میرا تو خیال ہے ہمیں اس ہفتے شادی کر لینی چاہیے۔ پھر آپ اطمینان سے پردے دار بیبیوں کی طرح گھر بیٹھا کریں اور میں کام کروں گی۔“

”جی نہیں بلکہ آپ کو یہ فلم سازی چھوڑنی ہو گی اور میری جاگیر پر جا کر رہنا ہو گا۔“

”سوچیں گے، پہلے تو آپ بیاہ کی تاریخ مقرر کریں۔“

”ٹھیک ہے، میں ماں جی سے بات کر لوں گا پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔ ابھی تو شاید مجھے پانچ چھ دن یہاں رہنا پڑے۔“

”ہاں۔ اُن سے مشورہ تو بہت ضروری ہے۔ شادی نہایت سادہ طریقے سے ہو گی۔ میں دھوم دھڑکا پسند نہیں کرتی۔ امید ہے آپ بھی یہی چاہتے ہوں گے۔“

”وہ بھی دیکھ لیں گے۔ آپ یہ سنائیں کہ وہ آپ کا بہاول پوری عاشق تو پھر نہیں آیا؟“

”آیا تھا اور اس نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری شادی پر کوئی بدمزگی پیدا کرے۔“

”آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“

”وہ۔۔۔ وہ مجھے چاہتا ہے جناب! اور کیا چاہتا ہے۔“ الماس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے انھیں جان بوجھ کر تنہا چھوڑا اور پلنگ سے اٹھ کر میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ میں نے اچھی طرح بھیڑ دیا۔ تاکہ وہ اطمینان سے بات کر سکیں۔

بہت دن پہلے آبی اپنی ماں کے سامنے کہہ چکا تھا کہ وہ الماس سے اب کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اس کے دل میں وہ پہلا سا جوش، جذبہ نہیں رہ گیا تھا مگر اب وہ جیسے ہی اس کے سامنے آئی وہ پگھل کر پانی ہو گیا بلکہ اُس نے خود اسے فون کیا تھا کہ وہ آئے اور اُس سے کلینک میں مل لے۔ وہ بیمار ہے، زخم خوردہ ہے، کئی گولیاں اس کے جسم میں دھنس گئی ہیں۔ یہی کچھ بتایا ہو گا اس نے اور الماس اس کے حجلۂ ویراں میں قیامت بن کر آ دھمکی تھی مگر اداکارہ میں جس عورت کی آبی کو تلاش تھی، وہ اسے الماس کے وجود میں کہاں مل سکتی تھی۔ اس میں خود بینی اور خود نمائی کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ کسی مرد کو شوہر کے روپ میں دیکھ ہی نہیں سکتی۔ پتہ نہیں آبی نے کیسے اس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ الماس کو آبی کی اصل زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہو گا مگر پھر بھی وہ ابھی تک اس رشتے کو توڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ خدا جانے وہ اس سے کیا چاہتی تھی۔ خبر یہ بھی مشہور تھی کہ اس کی بہت سی فلمیں ناکام ہو چکی تھیں اور اب فلمساز اسے پہلی سی توجہ نہیں دیتے تھے۔ اُسے دوسرے درجے کی اداکارہ سمجھنے لگے تھے اور شاید اسی وجہ سے اُس نے آبی کو اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا۔

میں کلینک کی عمارت سے نکل کر باہر لان میں جا ٹھہرا۔ میرے بازو میں اس وقت درد اٹھنے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کلینک کے کسی ڈاکٹر سے زخم پر پٹی کروا لوں گا۔ کچھ دوا کی بھی مجھے ضرورت

تھی۔ ابھی میں وہاں سے ہٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک ٹیکسی گیٹ کے اندر آتی دکھائی دی۔ شام کے جھٹپٹے نے عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور بتیاں جل گئی تھیں۔ وہ ٹیکسی مجھ سے چند قدم دور آکر رُک گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سے مستان شاہ باہر نکل رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ دے کر فارغ کیا تو میں ایک دم اس کے پاس جا پہنچا۔ ٹیکسی آگے نکلی تو اس نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور عمارت کے اندر کی طرف جانے لگا۔

"مستان شاہ جی!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم رک گیا اور مجھے بڑے غور سے دیکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے، مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟"

"ہاں۔ تمھارا نام مستان شاہ ہی ہے نا؟"

"جی، جی۔ یہی نام ہے میرا۔ آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہیں الگ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ کوئی خاص کام ہے آپ کو ادھر؟"

"جی ہاں۔ میرا بھائی یہاں کام کرتا ہے، کرمان شاہ! میں اسے ملنے آیا ہوں۔"

"آؤ ادھر میرے ساتھ اور میرا خیال ہے ہم عقبی حصے میں بیٹھتے ہیں تم سے مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میرے بازو کی گرفت اس کے شانے پر مضبوط ہو گئی تھی۔"

"وہ شاید اس کا عادی نہیں تھا۔ میرا ہاتھ اس نے بڑی آہستگی سے شانے پر سے ہٹا دیا، بولا "کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے میں... میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ چلو اِدھر۔ یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔ مجھے تمھاری صحت خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ آؤ۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ خیر چلیں کوئی بات نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ عمارت کے عقبی لان تک جا پہنچا۔ "اب فرمایئے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جناب! میں بہت جلدی میں ہوں۔"

"میں بھی بہت عجلت میں ہوں مستان شاہ جی! آؤ اِدھر بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے لان کے کنارے ایک بنچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "لو۔ یہ سگریٹ پیو اور مجھے بتاؤ کہ تم یہاں اپنے بھائی کے پاس کیوں آئے ہو؟"

"کیا مطلب؟ وہ میرا بھائی ہے جناب! میں اس سے جب چاہوں مل سکتا ہوں۔"

"مجھے سارے واقعات کا علم ہے مستان شاہ!" میں نے خواہ مخواہ اسے مرعوب کرنا چاہا۔ اس نے جس انداز سے جینا کو چاکلیٹ دینے چاہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "لڑکیوں کے بارے میں تمھارے سارے چکر مجھے معلوم ہیں۔"

"یہ... مگر آپ ہیں کون؟ یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہے؟" اس کا رنگ ہلدی ہونے لگا۔ میرا خیال ہے وہ لرزنے لگا تھا۔

"اگر تم مجھے وارثی صاحب کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکو تو میں تمھاری بچت کی کوئی صورت دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ میں... میں کیا بتاؤں ان کے بارے میں؟"

"یہی کہ وہ مقصود اور قادر بیٹ کیا کام کرتے ہیں۔ وارثی صاحب کی سیاسی سرگرمیاں کیا ہیں؟ ہوٹل النور کے بارے میں تمھیں کیا کچھ معلوم ہے۔ ویسے میں تمھیں یہ بتا دوں کہ...۔" میں نے چاہا کہ میں وارثی صاحب کی موت کی خبر اسے دے دوں، مگر پھر میں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ خبر اسے سب سے آخر میں معلوم ہونی چاہیے تھی۔

"مگر مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے یہ بات صحیح آدمی کو بتائی ہے؟"

"تم مجھ پر بے دھڑک اعتبار کر سکتے ہو مستان شاہ! میں تمھارا رازدار ہوں۔"

"جی، جی! میں سمجھ رہا ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ نا آخر وہ لوگ کیا کرتے رہتے ہیں۔ کل شام ملک اشرف کی کوٹھی میں ایک نجی دعوت میں گولی چل گئی تھی۔ بہت سے لوگ مر گئے تھے تمھیں پتہ ہے اس بات کا؟"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے اور وہ ہوٹل النور کے بیروں کا کام تھا۔ دراصل بیروں کی شکل میں وارثی صاحب کی پارٹی کے چار آدمی وہاں جا گھسے تھے۔ وہ... وہ بڑے صاحب کو مار دینا چاہتے تھے مگر ان کی سازش ناکام ہو گئی۔"

"مجھے ملک اشرف کی کوٹھی سے کس نے اغوا کیا تھا؟"

"اس کا مجھے علم نہیں۔ وہ کار مقصود چلاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وہی لوگ لائے تھے۔"

"ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت ہے!"

"دیکھیں، ہوٹل النور سے معشوق علی، غوث، نذیر اور محسن آئے تھے بیروں کے روپ میں وہ دراصل اس پارٹی کے کارکن ہیں اور ایسے دہشت گرد ہیں کہ پولیس اب تک ان کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔ ان کو حسنین لنگاہی صاحب کی پناہ حاصل ہے۔"

"حسنین لنگاہی! یہ کون صاحب ہیں؟"

"یہ وزیر آباد کے ایک صنعت کار ہیں۔ ان کا کارخانہ گکھڑ کے قریب ہے اور وہ چاروں آدمی انہی کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔"

"ہوں، حسنین لنگاہی۔ رہائش ان کی کہاں ہے؟"

"وزیر آباد میں۔ بڑی سڑک پر پیٹرول پمپ سے باہر ان کی کوٹھی ہے۔"

"ہوں۔ اور کچھ؟"

"میں آپ کو بتا تو دوں مگر مجھے ڈر لگتا ہے، ان کے ارادے بہت ہی غلط ہیں۔"

"تمھیں ڈر کس بات کا ہے؟ میں نے.... دراصل میں نے اس کمرے سے نکلتے ہوئے وارثی کو ختم کر دیا تھا۔ وہ میرا راستہ روک رہا تھا۔ میرا خیال ہے میں نے مقصود کو بھی قتل کر دیا تھا۔"

"واقعی! یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ وہ میرا راستہ روک رہے تھے۔ مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ان سے میں اسی طرح جان چھڑا سکتا تھا۔ مقصود کا پستول بھی میں ساتھ لے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے پستول نکال کر اسے دکھایا۔

اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا، بولا "وہ... میں نے وارثی صاحب کی باتیں سنی ہیں۔ آج صبح وہ حسنین بھی وہیں تھا اور محسن بھی، وارثی صاحب کی کوٹھی میں۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

"دوسری پارٹی کا ایک اجلاس کل ہونے والا ہے، ساہیوال میں۔ کل صبح دس بجے۔"

"اچھا! پھر، تمھیں کیسے پتہ چلا؟"

"وہ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔ حسنین سے وارثی صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس اجلاس میں پہنچ کر کوئی دھماکہ خیز بم وہاں رکھ دیں۔ دراصل وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ پارٹی کے تمام سرکردہ لوگوں کو ایک ہی جلسے میں ختم کر دیا جائے۔"

"نہیں یار! وارثی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو بقول آپ کے اب اس دنیا میں نہیں رہا مگر وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"اچھا پھر۔ طے کیا ہوا؟"

"حسنین کو وارثی صاحب نے اس کام پر آمادہ کر لیا تھا۔ اسے انھوں نے دو لاکھ روپے بھی دے دیے تھے اور طے یہ پایا تھا کہ حسنین اکیلا ہی یہ کام کرے گا۔"

"وہ کس طرح؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ میرا خیال ہے کہ حسنین تنہا یہ کام نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے رامے اس کے ساتھ ہو۔"

"رامے! یہ کس بلا کا نام ہے؟"

"یہی وہ آدمی ہے جس کے ذریعے رات ملک اشرف علی کے ہاں ان بیروں کو پستول مہیا کیے گئے تھے، امرتسر کا رہنے والا ہے۔"

"امرتسر کا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہے میں وہی آپ سے کہہ رہا ہوں۔ انہیں ان سوروں کی بھی مدد حاصل ہے۔ وہاں کوئی بھنڈاری صاحب ہیں۔ ایس کے بھنڈاری، وہ ان کی ہر طرح مدد کر رہا ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔ تم نے بہت زبردست معلومات فراہم کی ہیں۔ مستان شاہ! میں تمھارا شکرگزار ہوں مگر یہ بتاؤ کہ وہ کوناری صاحب کیا چیز ہیں؟ ملک اشرف کی کوٹھی میں وہ بھی موجود تھے۔"

"وہ بھی وارثی صاحب کے پاس اکثر آتے رہتے ہیں اور وہ پارٹی کے بڑے اہم رُکن ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ حکومت کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ کھل چکا ہے جس میں سعید الدین، علی نواز کوناری، وقار الٰہی جنجوعہ، مرتضیٰ علی وارثی اور خدا معلوم کون کون لوگ شامل ہیں۔ تمھیں یقین ہے کہ ساہیوال میں وہ لوگ دھماکا ضرور کریں گے؟"

"اگر جلسہ وہاں ہوا تو رامے اور حسنین وہاں ضرور پہنچیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کہیں اِدھر اُدھر جانے کے بجائے میرے ساتھ رہو۔ میں تمھیں تحفظ دوں گا۔ میرے ساتھ آؤ۔" یہ کہہ کر میں مستان شاہ کو ساتھ لے کر کلینک سے باہر نکل گیا۔

اس نے مجھے بڑی ہی خوفناک بات بتائی تھی۔ ان کی سازش اگر کامیاب ہو گئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس جلسے میں بڑے صاحب بھی شامل ہوں گے۔ اجلاس بہت اہم تھا۔ مستان شاہ سے تو مجھے یہی معلوم ہوا تھا۔ ضروری تھا کہ میں ستناجا صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیتا۔ وہی ایسے آدمی تھے جو اس کارروائی کو رکوا سکتے تھے۔ کلینک سے نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ہم اسی وقت ستناجا کی کوٹھی کی طرف چل دیے۔ ان سے میرا ملنا بہت ضروری تھا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" مستان شاہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس معاملے کا تدارک کرنا ہے مستان شاہ! ورنہ تو پارٹی تباہ ہو جائے گی۔ دشمن کے ہاتھ تو بہت ہی لمبے ہو گئے ہیں۔"

"مگر ہم جا کہاں رہے ہیں؟ آپ مجھے کسی نئی مصیبت میں نہ پھنسا دیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا تمھیں۔ میں تمھارے ساتھ ہوں بھائی! تم میری پناہ میں ہو۔ کوئی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"ٹھیک ہے سردار صاحب! آپ بہرحال مجھے اگر جانے دیتے تو یہ آپ کی مہربانی ہوتی۔"

"تم فکر نہ کرو مستان شاہ!"

"مگر آپ کا اس سے کیا تعلق ہے۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"وارثی نے مجھے بلا وجہ اغوا نہیں کیا تھا۔ بس اب تم چپ چاپ بیٹھے رہو۔ جس آدمی سے میں تمھیں ملوا رہا ہوں اس کو تم سب کچھ تفصیل سے بتا دو گے۔"

ستناجا صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر ہم نے ٹیکسی کو فارغ کیا اور گیٹ پر کھڑے آدمی تک جا پہنچے۔ وہ کوئی دوسرا آدمی تھا جس نے اس سے پہلے مجھے نہیں دیکھا تھا۔

"میرا نام سردار کریم نواز ہے۔ میں ستناجا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ ٹھہریں میں اُن کو اطلاع دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کیبن میں رکھے فون پر ستناجا صاحب سے بات کی، بولا۔ "کوئی صاحب ہیں سردار کریم نواز۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

دوسری طرف سے پتہ نہیں اسے کیا کہا گیا، وہ فون بند کر کے تیزی سے باہر نکلا اور بولا۔ "چلیں صاحب! وہ فوراً آپ کو اندر آنے کا کہہ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں ساتھ لے کر عمارت کی طرف چل دیا مگر اس عرصے میں ستناجا صاحب خود بڑے دروازے پر آچکے تھے۔ سپاہی انھیں دیکھ کر وہیں رُک گیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

ستناجا صاحب ہمیں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے برآمدے تک اتر آئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "سردار صاحب! یہ۔۔۔ یہ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ نے تو ہمیں بالکل پاگل کر دیا۔"

"میں ایک مخمصے میں پھنس گیا تھا ستناجا صاحب! السلام علیکم۔ یہ میرے دوست ہیں مستان شاہ۔ آپ کو ان سے ملوانے کے لیے لے آیا ہوں۔"

"مستان شاہ! یہ کون صاحب ہیں؟ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

"یہ۔۔۔ منحرف آدمی ہے۔ وارثی اور سعید الدین کا ساتھی۔ مجھے یہ اتفاقاً مل گیا تھا اور اس کے پاس بہت سی خبریں ہیں۔"

"اچھا! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ آئیں اندر چلتے ہیں۔ یہ آپکو کہاں سے مل گئے؟" یہ کہہ کر وہ ہمیں ساتھ لے کر اپنی نشستگاہ میں جا پہنچے اور تمام بتیاں روشن کر کے بولے۔ "آپ ادھر بیٹھیں اور چائے پی لیں۔" انھوں نے دیوار کے ساتھ لگی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کا ایک مریل سا چرمگ ملازم دروازے میں نمودار ہوا تو وہ بولے "ان کے لیے چائے لے آؤ صمدو، ہو سکے تو کافی بنا لانا۔" صمدو واپس ہوا تو انھوں نے صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیں، یہ سگریٹ پییں اور بتائیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟"

میں نے ایک سگریٹ خود لیا اور دوسرا مستان شاہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "ستناجا صاحب! بات یہ ہے کہ کیا کل ساہیوال میں پارٹی کا کوئی جلسہ ہو رہا ہے؟"

"کل تو نہیں البتہ بدھ کی شام کو وہاں ایک اجلاس ہو رہا ہے جس میں اہم لوگ شامل ہوں گے۔"

"اور آج پیر وار ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مستان شاہ کی اطلاع غلط نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟ اسے ہمارے اجلاس سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟" ستناجا صاحب سگریٹ کے دھوئیں کو دیر تک سینے کے اندر گھمانے پھرانے کے قائل تھے اور اس عرصے میں دھواں مسلسل اُن کے نتھنوں سے خارج ہوتا رہتا تھا۔

"یہ ہمارے دشمنوں کے کیمپ سے تعلق رکھتا ہے جناب! اور اس کی اطلاع یہ ہے کہ ساہیوال کے اجلاس میں اب کی بار وہ کوئی زبردست دھماکہ خیز بم رکھ دیں گے۔ مستان شاہ یہی اطلاع دے رہا ہے۔"

ستناجا صاحب اُچھل کر صوفے سے کھڑے ہو گئے اور سگریٹ کو بڑے غصے سے ٹرے میں مسل کر ایک گمبھیر گالی دیتے ہوئے بولے۔ "ان کی یہ جرأت! میں ایک ایک کو پھانسی لگوا دوں گا۔ یہ۔۔۔ یہ ہماری حکومت ہے۔ کوئی مذاق نہیں ہے مگر اس کے پاس اس الزام کا ثبوت کیا ہے؟"

"یہ۔۔۔ یہ وارثی صاحب کا ڈرائیور تھا جناب اور ایک چکر میں پھنس کر ہماری طرف آگیا ہے۔" یہ کہہ کر میں ستناجا صاحب کو ساتھ لے کر کمرے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ اب ہمارے اور مستان شاہ کے درمیان فاصلہ کوئی آٹھ فٹ کے قریب تھا اور وہ ہماری باتیں سن نہیں سکتا تھا۔ میں نے ستناجا صاحب کو وہ تمام باتیں بتا دیں جو مجھے مستان شاہ سے معلوم ہوئی تھیں۔ ان کی حیرت دم بدم بڑھتی چلی گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت بُرا ہو گا سردار صاحب! اجلاس کے لیے تو ہم نے سب لوگوں کو اطلاع دے دی ہے اور دن بیچ میں ایک رہ گیا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آپ کسی نہ کسی طرح یہ اجلاس ملتوی کرا دیں۔"

"مگر کیسے؟ میرے پاس ثبوت کیا ہے؟"

"انھیں بتا دیں کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اجلاس میں زبردست تباہی مچے گی۔ اس عرصے میں آپ رامے اور حسنین کو گرفتار کر لیں اور دوسرے چار آدمیوں کو بھی۔"

"نہیں سردار صاحب! وہ کوناری، جنجوعہ اور سعید الدین ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ہم اُن پر ہاتھ نہیں ڈال سکے۔ کوئی ثبوت بھی تو ہمارے پاس نہیں تھا۔"

"اور وہ کبیر اور عبدل، اُن کا کیا بنا؟"

"وہ ابھی تک حوالات میں ہیں۔ پولیس نے اُن پر بہت تشدد کیا ہے مگر وہ ابھی تک کچھ نہیں بولے ہیں۔ وہ صاف انکار کرتے ہیں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا حالانکہ اصل مجرم وہی ہیں، انھیں رامے نے پستول مہیا کیے تھے۔ حسنین بھی اُن کا ساتھی ہے۔"

"مگر ان کا پتہ تو آپ کے پاس بھی نہیں ہو گا۔"

"نہیں۔ مگر مستان شاہ سے ہم پوچھ سکتے ہیں۔"

"تو اس سے پوچھیں کہ یہ لوگ کہاں رہتے ہیں اور یہاں وہ کس کی پناہ میں ہیں۔"

"اس سلسلے میں آپ سب سے پہلے تو قادر بٹ اور مقصود کو گرفتار کریں۔ وارثی صاحب کو تو میں ختم کر آیا تھا۔ وہ کسی طرح میری جان ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔"

"خدا ہی خیر کرے، حالات پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جائیں۔ بہر حال میں اُن دونوں کو تو آج ہی گرفتار کر لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت مستان شاہ کی طرف لپکے، بولے۔ "یہ بتائیں شاہ جی! کہ یہ لوگ کس کی پناہ میں ہیں اور اس وقت کہاں ملیں گے؟ میرا مطلب ہے کہ قادر بٹ، مقصود، حسنین اور رامے کس کی ایما پر یہ کام کر رہے ہیں؟"

"اُن کا صحیح ٹھکانا مجھے معلوم نہیں ہے۔ یہ صرف وارثی صاحب ہی بتا سکتے تھے مگر سردار صاحب کا کہنا ہے کہ وہ انہیں ہلاک کر چکے ہیں۔"

"تو پھر ہم اُن پر کیسے ہاتھ ڈال سکتے ہیں؟ ان کا ٹھکانا تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے، میں وارثی صاحب کو ساتھ لے کر کوئی دو ہفتے پہلے میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں گیا تھا۔ وہ معمولی سا ہوٹل ہے ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ رامے ہمیں وہیں ملا تھا۔"

"کیا نام ہے اس ہوٹل کا؟"

"کہکشاں ہوٹل۔ بہت سے لوگ وہاں رہتے ہیں، بہت سستا ہوٹل ہے۔"

"رامے کا حلیہ کیا ہے؟"

"مولویوں ایسی صورت ہے اُس کی۔ داڑھی رکھے ہوئے ہے۔"

"ہوں۔ اس ہوٹل کو بھی ہم دیکھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے رامے ابھی تک وہیں ہو۔"

"اس کو اگر آپ پکڑ سکیں تو ہمیں اُن لوگوں کے خلاف ایک ٹھوس ثبوت مل سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی نولکھا تھانے میں فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں جا گھسے جب وہ واپس آئے تو بولے "میں نے آدمی وہاں بھیج دیے ہیں۔ رامے کا حلیہ بھی انھیں بتا دیا ہے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے؟"

اچانک ستناجا صاحب مجھے بھی بازو سے پکڑ کر کمرے کے ایک کونے میں لے گئے۔ بولے "مجھے یہ بتائیں کہ آخر یہ اپنے مالک سے متنفر کیسے ہو گیا؟ آخر اس کے راز ظاہر کر دینے میں کونسی مصلحت ہے؟ میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"بس سمجھ لیں کہ اس کی وارثی صاحب سے بن نہیں سکی۔ کوئی لڑکی بیچ میں آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے اُن سے الگ ہو گیا۔"

اتنے میں صمدو چائے لے کر اندر آگیا اور برتن میز پر پھیلانے لگا۔ وہ کھانے کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مستان شاہ اس روز دوپہر کا کھانا نہ کھا سکا تھا۔ وہ ان چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ ہم نے بھی چائے کی ایک ایک پیالی لی اور اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھ کر پینے لگے۔ ستناجا صاحب کسی گہری سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے بڑے اجلاس کو کیسے ملتوی کر دیں۔ کیسے کہہ دیں کہ اس اجلاس میں شریک ہونے والوں کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ وہ بڑے صاحب کو تو ملک اشرف کے ہاں سے بچا کر لے گئے تھے۔ یہ حادثہ بالکل تازہ تھا اگر اسی کی بنا پر وہ پارٹی کے مختلف لوگوں کو مطلع کر دیتے کہ وہ اجلاس محفوظ نہ ہو گا تو شاید وہ صورتِ حال کو بگڑنے سے بچا سکتے تھے۔ ایک ہی بہانہ اجلاس کو ملتوی کر دینے کے لیے بہت تھا مگر بڑے صاحب شاید کبھی بھی اس کو منظور نہ کرتے۔ وہ بہت ضدی اور خود سر آدمی تھے۔ کسی ہم ایسے لفنگے کی بات پر پارٹی کا اتنا اہم اجلاس کیسے ملتوی کر دیتے۔ پھر بھی میں سمجھتا تھا کہ اتنے بڑے خطرے کی موجودگی میں پارٹی کے اتنے بڑے بڑے عہدیداروں کو اجلاس میں بلا لینا کسی بھی طرح درست نہیں تھا۔

"صمدو! اِن کو ساتھ لے جا کر ادھر کمرے میں سُلا دو۔ شاہ جی! میں نے آپ کے ٹھہرنے کا یہیں بندوبست کر دیا ہے۔"

مستان شاہ نے ہونقوں کی طرح ان کو دیکھا اور بولا۔ "نہیں جناب! میں بھلا یہاں کیسے سو سکتا ہوں؟"

"آپ ابھی ادھر ہی رہیں گے شاہ جی! فکر نہ کریں آپ کے تحفظ کی ضمانت میں دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر ستناجا صاحب نے

فون پر کسی سے بات کی۔ کوئی گل زاد خان ہیڈ کانسٹیبل تھے، وہ انہی کو ہدایت کر رہے تھے کہ جس آدمی کو وہ بھیج رہے ہیں اس کا وہ ہر طرح خیال رکھیں۔

"آپ جائیں شاہ جی! یہاں آپ کو گھر ایسا آرام ملے گا۔ کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

صمد و نے اُن کے حکم کی تعمیل کی اور مستان شاہ کو وہاں سے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ مستان شاہ ذہنی طور پر اس قدر مغلوب اور عاجز آ چکا تھا کہ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں رہ گئی تھی — یہی وجہ تھی کہ اُس نے بس اُچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر وہ باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ستناجا صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو ساتھ لے کر ابھی اسی کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں، میں خود اس کی تفصیل معلوم کروں گا۔"

"مگر یہ اچھی بات نہ ہو گی۔ پتہ نہیں وہ کیسا آدمی ہے، کتنے گُر گے اس کے پاس ہیں، اس پر ہم دونوں حاوی نہ ہو سکیں گے۔"

"مجھے نہیں جانتے ہیں آپ سردار صاحب! یہ وردی میں نے بلا وجہ نہیں پہن رکھی ہے، یہ عہدہ مجھے بخشش میں نہیں ملا ہے۔ پارٹی کے دشمنوں تک مجھے خود پہنچنا پڑتا ہے۔"

"اجلاس کا آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اُن کی وردی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کا بھی بندوبست کر لوں گا۔ بڑے صاحب سے آج ہی رات میری ملاقات ہو گی۔ وہ خود دیکھ لیں گے ——— اطلاع آپ کی مجھے درست ہی معلوم ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ لباس تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آئے تو اس وقت وردی اُتار آئے تھے — مجھے ساتھ لے کر وہ عمارت سے باہر نکلے اور پھر کار گیٹ سے باہر نکال کر مال روڈ پر ڈال دی۔ میکلوڈ روڈ وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔

"آپ اگر وردی میں ہوتے تو زیادہ بہتر تھا۔"

"نہیں۔ میں اس حلیے میں ٹھیک ہوں۔ وردی تو خواہ مخواہ لوگوں کو چوکنا کر دیتی ہے۔" انھوں نے اپنی جیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا پستول بھر کر ساتھ لے آئے تھے اور وارثی کا ہتھیار ابھی تک میرے پاس موجود تھا۔

میکلوڈ روڈ سے ابھی ہم کچھ دُور ہی تھے کہ ستناجا صاحب پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ بولے۔ "پارٹی میں آپ کا خاص مقام ہے سردار صاحب! آپ نے دو بہت بڑے دشمنوں سے ہماری جان چھڑائی تھی، اسی لیے بڑے صاحب آپ کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں مگر جو کہانی آپ نے سُنائی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ ملک اشرف کے ہاں سے آپ کو کیسے اُٹھا کر لے گئے؟"

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔ وہ بڑے ذلیل لوگ ہیں ستناجا صاحب! ہر حربہ استعمال کر جاتے ہیں۔"

"افسوس تو یہ ہے کہ وارثی صاحب ختم ہو گئے، کسی کو آپ پر شک تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ وہاں بھی عینی شاہد کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں تنہا ہی مجھ پر آ چڑھے تھے۔ میرا خیال ہے میں نے قادر بٹ کا بھی کام تمام کر دیا تھا۔ اس کی میں نے گردن دبا دی تھی۔"

"ہوں۔" وہ جب 'ہوں' کہتے تھے تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی لہو کا گھونٹ حلق سے نیچے اُتار رہے ہیں۔ کوئی بات اُن کے دل میں گہری جاگزیں ہو جاتی تھی تو وہ ایک لمبی سی 'ہوں' کر کے رہ جاتے تھے۔

گاڑی میکلوڈ روڈ کی طرف مُڑی تو وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ کہکشاں ہوٹل اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اتنا بھی سستا ہوٹل نہیں تھا وہ جتنا مستان شاہ بتا رہا تھا۔ لوگ وہاں بڑے قرینے سے رہ رہے تھے۔

ہم جب اس کے گیٹ پر پہنچے تو معلوم یہ ہُوا کہ پولیس وہاں سے ہو کر نکل چکی تھی۔ اُن کی تفتیش بھی تو یونہی سی تھی۔ راعے نام کا کوئی آدمی اُن کو وہاں کیسے مل سکتا تھا۔ وہ اتنا پاگل تو نہیں تھا کہ سامنے اپنے نام کی تختی لگا کر اندر بیٹھ رہتا۔ وہ کئی پردوں میں چھپا ہوا ہو گا، اپنے اردگرد اس نے کئی اسرار پیدا کر رکھے ہوں گے۔ اس کو پہچان لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ ہاں آدمی کی چھٹی حس زیادہ ہی بیدار ہو تو پھر اس تک پہنچا جا سکتا تھا۔

ہوٹل کی عمارت تین منزلہ تھی۔ سب سے نچلے حصّے میں ایک بڑا سا ہال بنا ہوا تھا۔ کار مقفل کر کے ہم جب اندر پہنچے تو ہال میں ہمیں کئی لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے نظر آئے۔ گاہک کچھ زیادہ متمول نظر نہیں آتے تھے۔ چار چار آنے کی چائے پر گھنٹوں بیٹھنے والے لوگ اُن میں زیادہ تھے۔ بیرے مستعد تھے اور میزوں پر کھانا پہنچا رہے تھے۔ ہال کے اردگرد جو کمرے بنے تھے وہ بھی کرائے پر دے دیے گئے تھے۔ اور اُوپر کی دونوں منزلیں تو تھیں ہی اسی کام کے لیے۔ وہاں بھی عارضی اور مستقل رہائش رکھنے والے لوگ موجود تھے اور کسی بھی کمرے کا کرایہ بیس روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ ابھی سمے میں اِتنی سادہ ستی نہیں پھیلی تھی، ابھی عام آدمی اس افراتفری میں مبتلا نہیں ہوا تھا جس نے آج ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ کر رکھا ہے۔

ستناجا صاحب ہال کے اندر بیٹھے ہوئے تمام لوگوں پر اچٹتی سی نظر ڈال کر بولے۔ "کیا خیال ہے کسی چہرے پر آپ کی نظر ٹکتی ہے؟"

"جی نہیں۔ ہمارا مطلوب یہاں نہیں ہے جناب! ان میں سے کوئی بھی مجھے نہیں جچا ہے۔"

"کیا حلیہ بتایا تھا مستان شاہ نے اس آدمی کا؟"

"وہی لمبی سی داڑھی، مولویوں ایسا حلیہ۔"

"مگر یہ اس کا اصل حلیہ نہیں ہو گا۔ آئیں ذرا کاؤنٹر پر چلتے ہیں۔"

"جی نہیں، ان کو بلا وجہ شک میں نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"یہ بہت ضروری ہے سردار صاحب! کاش ہمیں اس آدمی کا اصل نام معلوم ہوتا۔" یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر پر جا پہنچے۔ استقبالیہ پر ایک نوجوان بڑی بے پروائی سے کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا تھا مگر جیسے ہی ہمیں اس نے دیکھا فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ستناجا صاحب کے چہرے کا رعب آدمی کو خواہ مخواہ ہی متاثر کرنے لگتا تھا۔

"فرمایئے؟" ستناجا صاحب نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

اسے دیکھ کر وہ ایک دم کرسی سے اُٹھ گیا۔ بولا۔ "حکم کریں سر! آپ نے یہاں آنے کی کیسے زحمت فرمائی؟ اس سے پہلے بھی دو آدمی ہمارا ہوٹل دیکھ چکے ہیں۔"

"کیا کہتے تھے وہ؟"

"بس وہ ایسے ہی کسی مشتبہ آدمی کی تلاش میں تھے مگر نام انھوں نے نہیں بتایا۔ یہ رجسٹر بھی وہ دیکھ چکے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ یہ رجسٹر مجھے دے دیں بیٹھیں سردار صاحب! ذرا یہ رجسٹر دیکھ لیں پھر چلتے ہیں۔" ستناجا صاحب نے رجسٹر سامنے رکھ لیا۔ مختلف کمروں میں مختلف آدمی ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی کو اتنے سارے لوگوں میں پہچان لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ اچانک ستناجا صاحب کو کوئی بات یاد آئی تو انھوں نے فون اٹھا کر کسی سمت نمبر گھمائے۔ بولے۔ "ہیلو گل زاد!"

ریسیور پر دوسری آواز بھی واضح سُنائی دے رہی تھی۔

"جی۔ میں ہوں سر! گل زاد خان۔"

"دیکھو ذرا اس نئے آدمی سے جو میں نے تمھارے حوالے کیا تھا پوچھ کر یہ بتاؤ کہ کہکشاں ہوٹل کے کس کمرے کا وہ ذکر کر رہا تھا؟"

"جی میں ابھی بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ریسیور میز پر ڈال کر کسی طرف نکل گیا۔ کوئی چار منٹ بعد واپس آ کر بولا۔ "جی وہ کہہ رہا ہے کہ وہ دوسری منزل تھی اور کمرہ نمبر پینتالیس۔"

"اچھی طرح یاد ہے اُسے؟"

"جی ہاں۔ اس کا یہی خیال ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وارثی صاحب وہیں گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے، اوکے۔" یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا۔ اتنا اہم نکتہ ہم مستان شاہ سے پوچھنا ہی بھول گئے تھے۔ پولیس کے آدمی بھلا اس کے بغیر کیا کر سکتے تھے۔ ستناجا صاحب نے رجسٹر پرے پھینکا اور بولے۔ "شکریہ بھئی! میرا خیال ہے ہم اس آدمی سے کمرے میں جا کر مل لیتے ہیں مگر یہ بتاؤ کہ یہ شخص ہے کون؟" ستناجا صاحب نے رجسٹر پھر اپنے سامنے رکھ لیا۔

"کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"یہ شخص جو پینتالیس نمبر کمرے میں رہ رہا ہے؟"

"مگر۔۔۔ مگر یہ کمرہ تو کئی دِنوں سے خالی ہے سر! یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا۔" اس نے رجسٹر اپنے سامنے رکھ کر اس کمرے کے اندراجات دیکھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، ذرا غور سے دیکھیں۔"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں سر! مگر ٹھہریں، ایک آدمی یہاں چھ مہینے پہلے آیا تھا، پھر اُس نے کمرہ بدل لیا۔ اب وہ نو نمبر کمرے میں موجود ہے اور وہ پہلی منزل پر ہے۔"

"کیا نام ہے اس شخص کا؟"

"حکیم عبدالرحمٰن۔ جی ہاں حکیم عبدالرحمٰن نام ہے اس کا اور وہ مختلف قسم کی دوا بیچتا ہے۔ خاصی گاہکی ہے اس کی۔ اخبار میں اشتہار بھی دیتا ہے مگر اسے تو یہاں رہتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں۔"

"مثلاً؟ کتنا عرصہ ہوا ہے اُسے یہاں رہتے ہوئے؟"

"یہی کوئی چار مہینے۔"

"کیا وہ پہلے پینتالیس نمبر میں رہتا تھا؟"

"جی نہیں۔ وہ ہمیشہ سے نو نمبر میں رہا ہے۔ صرف چند

دن کے لیے اس نے پینتالیس نمبر کمرہ لیا تھا۔ اس کے دو دوست یہاں آ ٹھہرے تھے مگر وہ صرف تین دن یہاں رہے اور پھر چلے گئے۔"

"کیا نام تھا اُن کا؟"

"ان کا نام... ٹھہریں... میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔ یہ دیکھیں، عبدالغنی نام تھا اُس کا۔ کمرہ اُسی کے نام بُک تھا۔"

"ہوں... ٹھیک ہے۔ ہمیں اس سے مل لینا چاہیے۔ آئیں سردار صاحب! میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ہوگا۔"

"جی ہاں کبھی کبھار ہی وہ شام کو باہر نکلتا ہے۔" نوجوان نے رجسٹر میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اسی وقت نو نمبر کمرے کی طرف چل دیے۔

"کیا خیال ہے آپ کا یہ وہی آدمی نہیں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ اب وہ ملے تو بات ہو۔ اندازے سے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے، بالکل ہو سکتا ہے۔ اس کی موت آئی ہے۔"

جب ہم نو نمبر کمرے کے سامنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کے دروازے پر تالا لگا ہے۔ صاحب خانہ کہیں باہر جا چکا تھا۔ ہوٹل سے باہر جانے کے دو راستے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے عقبی دروازہ استعمال کیا ہو۔ اس دروازے پر بھی ایک چوکیدار ہر وقت موجود رہتا تھا۔ گھوم پھر کر ہم نے نچلی منزل سے خود کو روشناس کرایا اور پھر ستنا جا صاحب نے جیب سے ایک خاص قسم کی چابی نکال لی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے تالے پر کام کر جاتی تھی۔ چمڑے کا غلاف کھول کر انھوں نے بڑے اطمینان سے وہ چابی قفل پر آزمائی اور وہ راہ دے گیا۔ چابی فوراً ہی کام کر گئی تھی۔

دروازہ کھول کر ہم یوں کمرے میں جا گھسے جیسے ہم وہیں رہائش رکھتے ہیں مگر... مگر یہ دیکھ کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ اس کمرے میں پلنگ پر قادر بٹ کی لاش پڑی تھی۔ ایک خنجر اس کے سینے میں گہرا دھنس چکا تھا اور ہاتھ پاؤں اس کے یوں کھلے تھے جیسے موت نے ان کو سمیٹنے کی بھی مہلت نہ دی ہو۔ اس کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ منہ کھلا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بے خیالی میں بستر پر لیٹا تھا کہ کسی نے اس کے سینے میں دستے تک خنجر اندر دھنسا دیا۔

ستنا جا صاحب نے فوراً پلٹ کر دروازہ بند کیا اور بولے "یہ... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سردار صاحب! اس آدمی کو آپ جانتے ہیں؟"

"یہ تو قادر بٹ کی لاش ہے جناب! کسی نے اسے مار دیا۔"

اس کے آس پاس کوئی اور ہتھیار نہیں تھا۔ قاتل نے شاید اس کا پستول بھی قبضے میں لے لیا تھا۔ کمرے میں پلنگ کے ارد گرد مختلف شیشیاں رکھی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے خانوں میں اور اُن پر دواؤں کے نام لکھے تھے۔ کچھ اشتہار بھی وہاں پڑے تھے۔ کمرہ بلاشبہ کسی حکیم کا مطب دکھائی دیتا تھا۔ قاتل عجلت میں جو کچھ بھی سمیٹ سکا وہاں سے لے کر باہر چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ کمرے کو تالا بھی لگا گیا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ قادر بٹ کو مرے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس کی لاش کے نیچے خون کا تالاب لگا ہوا تھا۔ بستر پر خون، بستر سے نیچے خون۔ وہ بہت پلا ہوا آدمی تھا۔ اُسے مارنے کے لیے ڈھیر سارے حوصلے کی ضرورت تھی۔ ستنا جا صاحب نے کھلی الماری میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں طب کی کئی کتابیں رکھی تھیں۔ بڑی احتیاط سے انھوں نے کتابوں کو الگ الگ کر کے دیکھا مگر وہاں سے انھیں کام کی کوئی چیز نہیں ملی۔ ایک رجسٹر میں مریضوں کے نام پتے لکھے تھے۔ وہ بھی انھوں نے کھنگال کر دیکھ لیا۔ کمرے میں کسی بھی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کی ملکیت رہا ہے۔ اس لاش کے سوا ہر شے جوں کی توں رکھی تھی۔ یہاں تک کہ فرش پر بچھی گہرے نیلے رنگ کی دری پر بھی کسی کے قدموں کے نشان موجود نہیں تھے۔ قاتل نے قادر بٹ کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ کمرہ کوئی سربستہ راز نہیں تھا۔ ہر شے ہمارے سامنے تھی۔ پلنگ سے کچھ دور دو چار کرسیاں رکھی تھیں جن کے سامنے میز پر بھی کئی طب کی کتابیں اور انگریزی اردو رسالے رکھے تھے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ سارے ہی شواہد ہمارے لیے بیکار ثابت ہو رہے تھے۔ عین ممکن ہے قادر بٹ خود حکیم صاحب کو ختم کرنے کے لیے وہاں پہنچا ہو۔ گولی کی آواز دھماکا پیدا کرتی تھی۔ اس نے حکیم صاحب کے لیے خنجر استعمال کرنا بہتر سمجھا ہوگا مگر اسے مہلت نہ مل سکی اور حکیم صاحب نے اسی کے خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا ہو۔ ستنا جا صاحب خاص طور پر آگے جھک کر خنجر کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ اسے جسم سے باہر نکالنے کے حق میں نہیں تھے۔ معاً ان کی نظر پلٹی، بولے "یہ... خنجر دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے ایم وی ہے یہ۔"

"ہاں۔ آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے مگر اس کی ساخت بھی تو دیکھیں، ایسے خنجر یہاں کون بناتا ہے؟"

"یہ... یہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ... یہ... یہ تو گورکھا سپاہیوں کا خنجر ہے سردار صاحب! میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اس کا دستہ یہی بتاتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، پاکستان میں کہیں ایسے خنجر نہیں بنتے۔"

"تو... اس کا مطلب تو نہیں کہ حکیم عبدالرحمن کوئی غیر ملکی ہے؟"

"داڑھی کے نیچے سے کوئی کسی کو کیسے پہچان سکتا ہے۔ میں نے اُسے دیکھا ہوتا تو ایک بات تھی مگر ٹھہریں ذرا، یہ دیکھیں پلنگ کے نیچے ایک ٹرنک بھی پڑا ہے۔"

ستنا جا صاحب ایک دم نیچے بیٹھ گئے۔ ٹرنک سامنے ہی تھا۔ وہ انھوں نے باہر نکال لیا۔

"یہ... یہ تو واقعی بہت کام کی چیز ہے۔ اسے کھولیں ذرا۔ یہ لیں چابی۔"

"اسے بھی آپ ہی کھولیں، تالے کا زاویہ آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔" وہ ٹرنک کو سیدھا کر کے اس میں چابی گھمانے لگے۔ تالا کھل گیا تو انھوں نے اس کا ڈھکنا اُوپر اُٹھا دیا۔

"ارے! اس میں تو زنانہ کپڑے بھی ہیں۔ یہ دیکھیں۔ اور یہ... یہ بھی تو دیکھیں یہ ڈائری کیا کہتی ہے؟"

میں نے وہ ڈائری ٹرنک سے نکال لی۔ اس کی جلد میں حکیم عبدالرحمن کی تصویر لگی تھی۔ آدمی کتنا ہی عیار کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں مار ضرور کھا جاتا ہے اور وہ تصویر حکیم صاحب کو ہم پر عیاں کر گئی تھی۔ چہرے مہرے سے وہ واقعی کوئی گورکھا ہی معلوم ہوتا تھا۔ چپٹی ناک، ہونٹ بھنچے بھنچے سے۔ آنکھیں قدرے باہر کو نکلی ہوئی مگر اندر سے سلی ہوئی۔ بال گھنے مگر متوازی — چہرے سے بلا کی ذہانت ٹپکتی تھی۔

"تو یہ ہیں حکیم عبدالرحمن — مگر یہ... یہ بدمعاش یہاں کیا کرتا رہا ہے؟"

میں نے ڈائری کی ورق گردانی شروع کر دی مگر نہ مجھے وہ زبان آتی تھی نہ ستنا جا صاحب کو۔

ہم دونوں ہی "صمٌ بکمٌ" ہو کر رہ گئے۔ کچھ دیر بعد ستنا جا صاحب بولے "اس کا کیا کریں؟ اسے کون پڑھ سکتا ہے؟"

"یہ ہمارے بہت کام کی چیز ہے ستنا جا صاحب! اسے آپ جیب میں رکھ لیں۔"

"ہاں۔ کسی سے اس کو پڑھوانا پڑے گا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہماری جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے وہ کئی قسم کا زہریلا پانی

الف لیلیٰ ڈائجسٹ کے

دلچسپ ترین سلسلے کتابی شکل میں

شیخ کرامت کی سرگزشت جو اس نے بسترِ مرگ پر بیان کی

ہمزاد
(مکمل)

قیمت ۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے

- ایک پُراسرار شخصیت کی کہانی جس کیلیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا
- اُس شخص کا قصہ جس کے چہرے کی عمر ۱۳۰ سال تھی اور بقیہ جسم کی عمر ۲۵ سال
- ہمزاد مسخر کرنے کے طریقے۔

ہر دل عزیز شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے ایک سنسنی خیز سرگزشت

جال
(مکمل)

قیمت ۱۵ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے

- ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔
- جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔
- دُنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں۔
- اس پر نہ کوئی گولی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

دونوں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز کراچی

دیتے رہے ہیں۔"

"خدا ہی خیر کرے ستنا جا صاحب! مجھے تو بہت سے لوگ قبروں کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔"

"ان کپڑوں کے نیچے بھی تو دیکھیں۔ یہ چند تصویریں تو آپ نے نہیں دیکھی ہیں۔ یہ دیکھیں۔ بس یہیں آپ مات کھا گئے ہیں اور ان پر غور کریں۔" میں نے زنانہ کپڑوں کے پہلو میں ٹرنک کی دیوار میں پھنسی چار تصویریں اُن کے سامنے رکھ دیں۔ وہ کسی ایک ہی خاتون کی تصویریں تھیں اور مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تھیں۔ اُن کا انداز بڑا ہی بے ساختہ اور دلفریب تھا۔

ستنا جا صاحب نے وہ تصویریں ایک طرف رکھ دیں۔ بولے "یہ عورت۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کون ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس ٹرنک میں اِن کا کیا کام؟"

"ٹرنک کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ اِن سے اس ٹرنک کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے، آپ بھی اس پر زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔"

"مگر۔۔۔ کیا یہ اس حکیم عبدالرحمٰن کی۔۔۔"

"جی ہاں بات تو ایسی ہی لگتی ہے اس پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے اس چوتھی تصویر پر۔ مگر مجھ سے یہ پڑھی نہیں جاتی۔ آپ اسے پڑھیں ذرا۔"

"اسے تو خیر آپ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ 'وِد لَو فرام سیلے' مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکیم صاحب کی منظورِ نظر ہے؟ ٹرنک اُلٹا دیں، دیکھیں اس میں اور کیا کچھ ہے۔"

اُن کے کہنے کے مطابق میں نے ٹرنک کی تمام چیزیں باہر نکال دیں۔ اس میں سے ہمیں مختلف مریضوں کے خطوط ملے اور انہی میں وہ خط بھی شامل تھا جو کسی ایس وی ڈار صاحب نے لکھا تھا۔ اس خط میں حکیم صاحب سے اپنے مشن کو آگے بڑھانے کی بات کی گئی تھی۔ مگر چند سطروں کا وہ خط ہمارے لیے بہت قیمتی تھا۔ اس پر امرتسر کے ڈاکخانے کی مُہر تھی۔ وہ سرحد پار سے بھیجا گیا تھا مگر مکتوب نگار نے اس پر اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ حکیم صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ایک بار پھر متعلقہ لوگوں سے مل لیں۔

خط پر کوئی ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ ڈالی گئی تھی اُسے ستنا جا صاحب نے جیب میں رکھ لیا۔ بولے "یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی خوفناک ہو گیا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے بڑی ترتیب سے ٹرنک کی چیزیں اس میں ڈال دیں اور اُسے دھکیل کر پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ اور پھر کمرے کی ہر شے کو بغور دیکھتے ہوئے بولے "مجھے یہ بتائیں سردار صاحب! آپ نے کہا تھا کہ اس قادر بٹ کو آپ نے آخری بار گیراج میں دیکھا تھا اور آپ کا خیال تھا کہ آپ اسے قتل کر چکے ہیں؟"

"میرا اندازہ غلط نکلا۔ یہ اس جھٹکے کو برداشت کر گیا ہوگا۔"

"یہ تو ظاہر ہی ہے مگر اسے حکیم صاحب کی طرف کس نے بھیجا، وہ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی نہ کوئی تو اس بات کا دھیان رکھتا ہوگا کہ کس کو کس وقت ختم ہو جانا چاہیے۔"

"یہ بڑا اہم سوال ہے جناب! میں تو صرف وارثی صاحب ہی کو ختم کر سکا تھا مگر دوسرے لوگ تو ابھی زندہ ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ مخالف گروپ کے دوسرے آدمی؟"

"جی ہاں، کوناری صاحب ہیں، جنجوعہ صاحب ہیں سعیدالدین ہیں اُن سب کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔"

"ہاں، یہ تو ہے پولیس نے اُن لوگوں کو رہا کر کے اچھا نہیں کیا۔ مگر اُن پر کوئی الزام ثابت بھی تو نہیں ہوتا تھا اور پھر اخباروں میں جو واویلا مچتا ہے اس کی وجہ سے انہیں چھوڑ دیا گیا۔"

"آئیں یہاں سے نکل چلیں اور پولیس کو اطلاع دے دیں۔ وہ خود اس لاش سے نپٹ لیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے چاروں تصویریں جیب میں رکھ لیں اور کمرے کی ہر شے کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے نکل آئے۔ دروازے کو ستنا جا صاحب نے حسبِ سابق تالا لگا دیا۔ کسی بات سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کمرے میں کسی کی لاش پڑی ہے۔ راہداری میں کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ رات بھی تو زیادہ ہو چکی تھی۔

راہداری سے نکل کر ہم کاؤنٹر پر نہیں رکے۔ ستنا جا صاحب نے ہوٹل کے کسی آدمی سے کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر سیدھے کار تک جا پہنچے۔ بولے "میں ان میں سے کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔ گھر پہنچ کر میں پولیس کو اس طرف بھیجوں گا۔ پتہ نہیں کون بے وقوف یہاں آئے تھے رامے کے بارے میں پوچھنے کے لیے۔"

"وہ معاملے کی اصل نوعیت کو سمجھ نہیں سکے ہوں گے، کوئی خاص بات بھی تو انھیں معلوم نہیں ہوگی۔"

"ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے بہر حال یہ قتل ہمارے لیے بہت اہم ہے اس رامے کا ہمیں ضرور پتہ ملنا چاہیے اس حکیم کے روپ میں خدا معلوم وہ کیا کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے کار کا دوسرا دروازہ کھولا اور میں اُن کے ساتھ جا بیٹھا۔ وہ سارا راستہ بالکل خاموش رہے مجھ سے انھوں نے پھر کوئی بات نہیں کی میری اپنی سوچ مفلوج ہوئی جاتی تھی۔ میں اُن کے پاس یرغمال کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

کوٹھی پر پہنچ کر مجھے ستنا جا صاحب نے اپنی نشست گاہ میں بٹھایا اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہ فون پر پولیس سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ کوئی آدھے گھنٹے بعد واپس آئے تو بہت تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے صمد اُن کے پیچھے کھانا بھی لے آیا۔ وہ اس نے میز پر پھیلا دیا تو ستنا جا صاحب بولے "آئیں سردار صاحب! لعنت بھیجیں اس سارے قصے پر، کھانا کھا لیں پہلے۔"

"کیوں کیا ہوا خیر تو ہے نا؟ آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"ہاں۔ بڑے صاحب سے بات ہوئی ہے میری۔ انھیں تو اس مستان شاہ کی خبر سن کر چکر آ گیا۔ پہلے تو مجھ پر خوب خوب برسے، اُن کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میری حماقت کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر پھر بات کچھ اُن کی سمجھ میں آ گئی۔"

"کیا یہ اجلاس اب بھی ہوگا؟"

"عین ممکن ہے وہ تاریخ بدل دیں۔"

"اسی میں اُن کا بھلا ہے ستنا جا صاحب! ورنہ دشمن کامیاب ہو جائے گا۔ پتہ نہیں وہ کیا منصوبے بنا کر بیٹھے ہیں۔"

"دیکھا جائے گا سردار صاحب! پولیس نے اب تک

کہکشاں ہوٹل میں وہ لاش دیکھ لی ہوگی۔ میں انھیں سب کچھ بتا آیا ہوں ــــ شروع کریں۔ حالات بہت ہی پریشان کن ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے اب؟"

"کیا مطلب؟"

"میں... میں یہ کہہ رہا ہوں ستناجا صاحب! کہ میں کیا کروں؟ مجھے پولیس کے چکر سے آپ کیسے بچائیں گے؟"

"ہاں یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا میرا خیال ہے کہ ہم آپ کی موت کی خبر مشہور کر دیتے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں تو پھر بھی اُن کے سامنے رہوں گا۔"

"دیکھیں سردار صاحب! ہم کسی جگہ پولیس مقابلے میں دو آدمیوں کو مروا دیں گے اور یہ خبر مشہور کر دیں گے کہ ہم نے جیلانی اور اسلم آبی کو ختم کر دیا ہے، یہ بات کچھ بھی مشکل نہ ہوگی۔"

"مگر وہ کون لوگ ہوں گے اور پھر پولیس کو کیسے یقین دلائیں گے آپ؟ وہ... وہ میں تو نہیں ہوں گا۔"

"یہ سب کچھ ممکن ہے اُن کے چہرے ہم مسخ کر دیں گے اور بس۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں کریں، میری جان بہرحال پولیس کے ہاتھوں سے چھڑوا دیں ورنہ وہ مجھے چین نہیں لینے دیں گے۔"

"ہاں۔ یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ میں یہ بات بڑے صاحب کو بھی بتا دوں گا کیونکہ وہ ہر قیمت پر آپ کا تحفظ چاہتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔"

"ہاں۔ ایک بات اور ــــ میری کچھ رقم بینک میں پھنس گئی ہے، وہ مجھے واپس ملنی چاہیے۔"

"اس کا بھی میں کل بندوبست کر دوں گا، فکر نہ کریں، چیک بک ہے آپ کے پاس؟"

"نہیں۔ میں ایسی چیز کہاں سنبھال سکتا ہوں۔"

"اس کا بھی سوچ لیں گے۔ ہاں آپ کا بریف کیس میرے پاس ہے، وہ اشرف علی کے ہاں رہ گیا تھا نا، وہ میں لے آیا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ورنہ میں تو اس کی فاتحہ پڑھ چکا تھا۔"

"نہیں۔ وہ محفوظ ہے ورنہ افراتفری تو وہاں زبردست مچی تھی۔ اب آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے بستر لگوا دیتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر طے کیا کیا ہے آپ نے میرے بارے میں؟ یہ بڑا اہم سوال ہے جناب!"

"میں آج ابھی یہاں سے اُٹھ کر بڑے صاحب سے ملتا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں، پولیس بہرحال آپ کا پیچھا تب ہی چھوڑے گی جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ غلام جیلانی مر چکا ہے۔"

"پھر یہ بہتر نہ رہے گا کہ وہ پولیس مقابلہ پہلے ہو جائے؟"

"ہاں۔ میں اس بارے میں غور کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں ہے، میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔ ابھی صمدو کے ساتھ چلے جائیں، یہ آپ کو بستر پر پہنچا دے گا میں بہرحال ابھی نہیں سوؤں گا، مجھے بڑے صاحب سے ملنا ہے۔ وہ دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئے تو صمدو نے مجھے مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ کمرہ بالکل الگ اور عمارت کے بائیں ہاتھ بنا تھا۔ غسل خانے کی سہولت بھی وہاں موجود تھی اور بستر نرم تھا، بے حد نرم اور ملائم۔ کمرے میں ہیٹر بھی جل رہا تھا۔ سارے ہی آرام وہاں موجود تھے مگر جس گھمنگھیری نے مجھے باندھ رکھا تھا وہ مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ میں کرسی کھینچ کر ہیٹر کے پاس جا بیٹھا۔

صمدو میرا بریف کیس لے آیا، بولا۔ "یہ ستناجا صاحب نے دیا ہے، کہہ رہے تھے کہ میں اسے آپ کو دے دوں۔"

"تمھاری مہربانی ہے یار! لاؤ اِدھر، یہ تو بہت قیمتی بریف کیس ہے۔" میں نے شکریے کے ساتھ وہ بریف کیس وصول کیا۔ صمدو باہر نکلا تو میں نے اس کو کھول کر نوٹ گنے، وہ پورے ہی تھے اور اس میں سگریٹ بھی دھرے تھے۔ وہ میں نے اپنے سامنے رکھ لیے۔

میں بڑی دیر تک خیالات میں کھویا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے نیند نے آگھیرا اور میں بتی اور ہیٹر بند کر کے بستر میں جا گھسا۔ کئی راتوں سے میں کسی صحیح بستر پر آنکھ نہیں لگا سکا تھا اب جو میں نے لحاف اوڑھا تو معلوم ہوا کہ اُن راتوں کی ساری اُجڑی نیندیں مجھ پر آ چڑھی تھیں، میں جلد ہی ہر شے سے بے نیاز ہو گیا۔ میں جو خود ایک فتنہ ہو چکا تھا، میرا سو جانا ہی بہتر تھا۔ مجھے نیند ہی آ جانی چاہیے تھی کہ میرا جاگنا سو فتنوں کو بیدار کرتا تھا کہ میری تقدیر مجھے دردر کے دھکے کھلا رہی تھی۔ میں بہت پینٹھی باندھ کر گھر سے نکلا تھا۔ بدن کو آگ کے گولے میں رکھتا تھا مگر اس کے باوجود میرے دشمنوں کا تیر سیدھا میرے کلیجے میں آ دھنستا تھا۔ میں بندر گھاؤ کا شکار ہو گیا تھا، میرے زخم سدا ہرے رہنے لگے تھے۔

صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا خیال ہے صبح کے چھ بجے رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر بتی جلائی تو جسم میں مجھے ایک عجیب سی تازگی اور

توانائی محسوس ہوئی۔ میرا زخم اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے جو کیپسول دیے تھے وہ میں مسلسل کھا رہا تھا۔ یہ انہی کا اعجاز تھا کہ میں اب بازو کو زیادہ آسانی سے چلا سکتا تھا۔ رات نیند نے مجھے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ میں نے کمرے کی کنڈی بھی نہیں چڑھائی تھی۔ ویسے بھی وہ گھر ایسا تھا کہ جہاں مجھے کسی قسم کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ میرے لیے صمدو نئے کپڑوں کا ایک جوڑا میز پر رکھ گیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے وہ کپڑے پہن لیے۔ شیروانی البتہ وہی تھی۔ پتہ نہیں ستناجا صاحب کو اِن چیزوں کا کیسے خیال آ گیا۔ انھوں نے میرے لیے ایک بہت عمدہ قسم کا مکیشن بھی کرسی کے پاس رکھوا دیا تھا۔ شاید انھیں میرے سادے سے ہی لباس پر اعتراض تھا۔ میں بندکشاد کا مارا آدمی خدا معلوم کیسے ان کی نظروں میں کھُب گیا تھا۔ مجھ پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہو چکے تھے۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں سات بجے تک بالکل تیار ہو کر ہیٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ میرا اُن دِنوں ایک ایک دن ایک ایک صدی ہو کر گزر رہا تھا۔ صبح مجھے کہیں ملتی تھی اور رات کہیں آتی تھی۔ کسی روز میں کئی کئی حوادث سے گزر کر بے گھر، بے در ہو کر رات کو تھک ہار کر ایسے اجنبی بستر پر سو جاتا تھا جو مجھے صبح تک بے چین رکھتا تھا مگر اُس رات ستناجا کے گھر پر پہلی بار سوتے میں میرا شعور بھی سوتا رہا اور لاشعور بھی۔ مجھے کسی کے خواب نے پریشان نہیں کیا۔ میں باڑی میں سوتے طوطے ایسی گہری نیند سویا تھا۔

کوئی سوا سات بجے ستناجا صاحب میرے کمرے میں آ گئے۔ وہ بھی تیار ہو کر آئے تھے۔ وردی وہ بالعموم نہیں پہنتے تھے۔ کام اُن کا ایسا ہی تھا کہ وہ محفل میں کوئی بہت بڑے جاگیردار نظر آتے تھے، وہ ایسا ہی لباس پہنتے تھے، بولے "کیا حال ہیں سردار صاحب! نیند تو ٹھیک طرح آئی کہ نہیں؟"

"جی میں بہت گہری نیند سویا ہوں۔ یہ بستر ہی ایسا تھا کہ خواب خرگوش کا مزہ آ گیا۔"

"بس ٹھیک ہے، اب آپ ناشتہ کر لیں۔ میں صمدو سے کہہ آیا ہوں، وہ یہیں ساری چیزیں لے آئے گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئے اور ہیٹر تاپنے لگے۔

"آپ بڑے صاحب سے ملے تھے؟"

"جی ہاں۔ میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے اور وہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا ہے۔"

"اس قادر بٹ کے بارے میں بھی بتایا ہوگا آپ نے؟"

"ہاں۔ وہ سارا معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہے مگر یہ بتائیں آپ رہنے کہاں ہیں؟"

"کہیں بھی نہیں ــ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے میں ہر شے سے بے نیاز کر دیا گیا ہوں۔"

وہ ہنس دیے، بولے "گھر تو آپ کا کوئی نہ کوئی ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس معاملے پر غور کیا ہے، میرا خیال ہے آپ کوئی گھر لے لیں بلکہ خرید لیں۔"

"مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا؟" میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"سردار صاحب! مجھے معلوم ہے آپ کئی سال سے اِس حال میں رہ رہے ہیں۔ شاید اس عرصے میں آپ اپنی والدہ سے بھی نہیں مل سکے ہیں، آپ کی بہن بھی آپ کو نہیں مل سکی ہے۔ وہ ملنا بھی چاہے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ آپ کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے ــــ میں آپ کے بارے میں بہت سی بلکہ ساری ہی باتیں جانتا ہوں۔ آپ کا اپنا گھر ہوگا تو آپ کی اپنی ایک حیثیت ہوگی۔ اس میں آپ پابندی سے رہنا سیکھ جائیں گے۔ ہو سکے تو آپ شادی کریں، یہ بہت ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں تبدیلی آئے۔ گھر بار سے ہی آدمی کا اصل رشتہ پہچانا جاتا ہے ــــ میں آج آپ کو بینک سے روپیہ بھی نکلوا دوں گا۔ ابھی ہم نو بجے وہاں جائیں گے وہ روپیہ وہاں سے نکلوا کر سردار کریم نواز کے نام سے کسی اور بینک میں رکھوا دیں۔ سمجھ لیں کہ آج سے آپ کا یہی نام ہے، پرانا نام ترک کر دیں۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے ستناجا صاحب! ایسی حالت میں کہ پولیس ہر وقت مجھے نگاہ میں رکھتی ہے، وہ میرے پاؤں زمین پر نہیں آنے دیتے۔ میں جب تک اپنی ہمشیرہ کو واپس نہیں لاتا، میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں پھانسی کی کوٹھری سے بھاگا آدمی کیسے اپنا گھر بسا سکتا ہوں، یہ ناممکن ہے ستناجا صاحب! مجھے ایسی آزمائش میں نہ ڈالیں، میں کسی گھر میں بندھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"نہیں۔ ہم نے ساری صورتِ حال پر غور کیا ہے سردار صاحب! گھر پھر بھی ضروری ہے۔ اس عرصے میں اپنی بہن کی بھی تلاش جاری رکھیں مگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ سے ہم کہاں مل سکتے ہیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے مگر آپ کو ہم یہاں بھی نہیں رکھ سکتے۔ کسی بیرک میں سپاہیوں کے ساتھ یا ملازموں میں آپ کا گزارا نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہے آپ ڈھلوں صاحب کے ساتھ بھی رہ سکتے ہیں مگر آپ کی حیثیت وہاں کیا ہوگی، کبھی غور کیا ہے آپ نے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے ستناجا صاحب! مگر... یہ بات میرے جی کو نہیں لگتی ہے۔"

"کوئی آپ کو کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ غلام جیلانی کو ہم چند دن میں ختم کر دیں گے۔ یہ نام مہابانی صاحب میں کسی قبر کا کتبہ بن جائے گا اس کے بعد آپ اطمینان سے سردار کریم نواز بن کر زندگی گزار سکتے ہیں۔ میری بات سمجھ جائیں، یہ موقع آپ کو پھر نہیں مل سکے گا۔ کوئی اور ستناجا پیدا نہیں ہوگا، نہ پھر کوئی بڑے صاحب ایسا مہربان آپ کو مل سکے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں تیار ہوں کوئی چھوٹا سا گھر میں لے لیتا ہوں۔"

ستناجا صاحب خوش ہو گئے۔ بولے "آپ کو میں ٹیلیفون بھی لگوا دوں گا۔ آپ سے ہم برابر رابطہ قائم رکھیں گے، رہ گئے ہمارے دشمن تو ان سے بھی ہم نپٹ لیں گے۔"

اتنے میں صمد و ہمارے لیے ناشتہ لے آیا۔ برتن اس نے میز پر پھیلائے تو ستناجا صاحب بولے: "اس مستان شاہ کو بھی ناشتہ کروا دیا ہے کہ نہیں؟"

"جی ہاں۔ سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس نے کھا لیا ہے مگر وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اسے یہاں سے جانے کی اجازت کب ملے گی؟"

"نہیں، اسے ابھی ادھر ہی رکھو۔ گل زاد خان سے کہہ دو کہ وہ اس پر نظر رکھے وہ بہت کام کا آدمی ہے۔" ستناجا صاحب نے بڑے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک پائپ بھر کر پیتے رہے اس وقت تک ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

"میرا خیال ہے آپ کو میں گلبرگ میں مکان لے دیتا ہوں۔"

"جہاں بھی مل جائے ٹھیک ہے شادمان زیادہ بہتر جگہ ہے۔"

"جہاں بھی ہو آپ کو پانچ لاکھ روپیہ تو خرچ کرنا پڑے گا۔"

"وہ میں کر دوں گا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔"

"تو چلیں پھر ہم ابھی بینک چلتے ہیں میرا خیال ہے وہ منیجر زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرے گا میرا کارڈ اس کے لیے بہت کافی رہے گا۔ محض اپنے بھائی کو ترقی دلانے کے لیے اس نے یہ چکر چلایا تھا مگر اس طرح تو بھائیوں کو ترقی نہیں ملتی۔ پولیس الگ ذلیل ہو گئی کہ اس سے ایک معمولی سے آدمی کو روکا نہیں جا سکا مگر اسے کیا پتہ کہ غلام جیلانی کیا چیز ہے۔" ستناجا صاحب میرے بارے میں ایسی رائے رکھتے تھے کہ میں اس پر جتنا بھی فخر کرتا کم تھا۔

عمارت سے باہر نکلنے سے پہلے انھوں نے مجھے ایک بہت عمدہ قسم کی قراقلی ٹوپی پہنا دی اور عینک مجھے دے کر بولے "یہ پہن لیں اور یاد رکھیں، آپ سردار کریم نواز ہیں اور آپ کا وطن ڈیرہ غازی خان ہے۔"

"جی بہت بہتر۔ نام تو میرے بہت سے ہیں مگر یہ سب سے بہتر رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ عینک مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں۔ آپ کا حلیہ کچھ بدلا بدلا سا ہونا چاہیے تاکہ کسی کو علم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ پھر رہے ہیں۔"

ہم جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو اچانک انھوں نے پوچھا۔

"کیا آپ نے اپنے زخم پر بینڈیج کروائی تھی؟"

"جی نہیں موقع ہی نہیں ملا۔ البتہ کیپسول ضرور کھا رہا ہوں۔"

"یہ زیادتی ہے، پٹی تو بہت ضروری ہے سردار صاحب! چلیں، پہلے میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کار سیدھی ایک ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ کلینک جیل روڈ پر واقع تھا اور اس کے عقب کی آبادی میں اس ڈاکٹر کی بھی کوٹھی موجود تھی جس کو آخری بار میں نے ملتان سے آتے ہوئے گاڑی میں دیکھا تھا اور جس کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات تھے مگر وہ بھی میرا ماضی ہو کر رہ گئی تھی۔

کلینک میں جب ہم داخل ہوئے تو وہاں مریضوں کی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو زیادہ فیس دے سکتے تھے۔ ان کے لیے ڈاکٹر عظمت نے الگ کیبن بنا رکھا تھا، ان کو نمٹانے کے بعد ہی وہ عام مریضوں کی طرف توجہ دیتا تھا۔ ستناجا صاحب مجھے ساتھ لے کر اس کیبن کی طرف بڑھے تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے دیکھتے ہی دو آدمی ایک دم اپنی جگہ سے اچھل سے گئے حالانکہ میں انھیں بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ میں ان کے قریب سے گزرا تو ان کے چہرے کا تحیر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دونوں انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ باپ بیٹا تھے۔ انداز اور رویہ ان کا ایسا ہی تھا۔ ہم کیبن کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے مگر نظر میری انہی پر تھی۔ وہ شیشے میں بھی مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر عظمت ستناجا صاحب کو جانتا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سب کام چھوڑ کر ہماری طرف آ گیا۔

"آپ نے کیسے زحمت فرمائی جناب! خیریت تو ہے نا؟"

"جی، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ ہمارے دوست ہیں۔ ان کا بازو زخمی ہو گیا ہے اگر آپ پٹی کر دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"گڈ! یہ زخم کیسے آ گیا انہیں؟ آئیں جناب! میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں آدمی اب بھی ہماری طرف متوجہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے بہت پرانے واقف کار ہوں۔ کوئی ایسی ہی بات تھی ان کے رویے میں کہ میں پریشان ہو کر رہ گیا۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟

ڈاکٹر نے زخم دیکھ کر کوئی وجہ پوچھے بغیر میری مرہم پٹی کر دی۔ جب وہ پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا۔ تو مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا: "میرا خیال ہے یہ گولی کا زخم ہے؟"

"جی ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ پولیس کے لوگوں کو اور کس بات کی توقع رکھنی چاہیے۔ زخم گولی کا ہی ہے۔ یہ کب تک بھر جائے گا؟"

"میرا خیال ہے کہ ایک دو پٹیوں کی اور ضرورت ہو گی۔ دوا آپ کھا رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ دوا تو کھا رہا ہوں، ڈاکٹر نے مجھے کیپسول دیے تھے۔"

"وہ ٹھیک رہیں گے۔ زخم اب بہت بہتر ہے۔"

"کتنے پیسے دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ستناجا صاحب آ گئے، یہی بہت کافی ہے۔ اچھا خدا حافظ!"

یہ کہہ کر وہ پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ پٹی خود اس نے میرے بازو پر باندھی تھی حالانکہ یہ کام اس کے ماتحت بھی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر مجھے یہ عزت اس نے دی کہ خود اٹھ کر اس نے میرا زخم باندھ دیا۔

جب میں ستناجا صاحب کے ساتھ کیبن سے باہر نکلا تو وہ دونوں آدمی ایک دم ہمارے پیچھے دکان سے باہر آ گئے۔

"میں نے کہا بھائی صاحب!" ان میں سے ایک آدمی نے ہمیں آواز دے کر ٹھہرا لیا۔ ستناجا صاحب بھی انھیں نہیں جانتے تھے اور میرے ذہن میں ان کا کوئی پچھلا پرانا عکس نہیں ابھر رہا تھا۔

"جی، کچھ ہم سے کہا ہے آپ نے؟"

"جی ہاں۔ وہ در اصل...... آپ......"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے معمر آدمی کے گلے میں حرف پھنستے دیکھ کر کہا۔

"آپ...... آپ رہا کیسے ہو گئے جناب! پولیس نے پکڑا نہیں آپ کو؟" دوسرے آدمی نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو میاں! ہوش میں تو ہو۔ کیسی پولیس کیسی رہائی۔ دماغ تو درست ہے نا تمھارا!؟"

"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ ہی تھے جس نے شیخوپورہ سے آتی بس میں دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ آپ نے بس کو سڑک پر سے ایک پگڈنڈی پر اتار لیا تھا۔ ہم اسی بس میں بیٹھے ہوئے تھے۔"

"کیا بات ہے برخوردار! جانتے ہو تم کس سے مخاطب ہو یہ سردار کریم نواز ڈی ایس پی ہیں کیا بکواس کرتے ہو تم؟ کس بس کی بات کرتے ہو گدھے! بیٹھو ادھر گاڑی میں میں تم دونوں کو تھانے لے چلتا ہوں، چلو۔" ستناجا صاحب نے ایک دم گرجتے ہوئے کہا اور اس آدمی کا بازو پکڑ کر انھوں نے اسے کار کی طرف دھکیل دیا۔

"تم بھی آؤ بڑے میاں! پکڑیں سردار صاحب اسے بھی۔ ان دونوں کو تھانے پہنچا دو۔"

وہ پریشان ہو کر کار کے پاس جا پہنچے مگر رنگ ان کا پیلا پڑ گیا تھا۔ "ہمیں معاف کر دیں جناب! یہ میرا بھتیجا ہے، اسے سخت غلطی لگی ہے۔ ہم معافی چاہتے ہیں جناب سے۔ اس کی مت ماری گئی تھی۔"

"مت ماری گئی تھی! تم کہاں کے تفتیشی افسر بن گئے ہو۔ کس بس کی بات کرتے ہو تم؟"

"وہ جی در اصل ہم فیصل آباد سے ایک بس میں لاہور کی طرف آ رہے تھے۔ وہ واقعہ آپ نے بھی اخبار میں پڑھا ہو گا۔ ڈاکو نے شیخوپورہ کے قریب بس روک کر اس میں سوار دو آدمیوں کو ہمارے سامنے گولی مار دی تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا ڈاکٹر اختر اور دوسرا اس کا باپ تھا۔ میرا یہ بھتیجا بھی میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو سمجھا کہ وہ آپ ہی تھے۔ بس اتنی سی بات پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میں بھی ذلیل ہو کر رہ گیا۔ بندے بندے میں فرق اسے معلوم ہی نہیں ہوتا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں میاں جی! للہ معاف کر دیں۔"

"ہوں...... تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے جاؤ اپنا کام کرو۔" ستناجا صاحب نے ان دونوں کو دکان کی طرف دھکیل دیا اور مجھے ساتھ لے کر گاڑی میں جا بیٹھے مگر وہ ذہنی طور پر سخت الجھ چکے تھے۔ انھیں یقین آ چلا تھا کہ جس بس کا وہ ذکر کر رہے تھے، اس کو ہم لوگ ہی اغوا کر کے لے گئے تھے۔

گاڑی چلی تو وہ سامنے سڑک پر نظریں جما کر بولے: "یہ کیا کہہ رہے تھے سردار صاحب! کیا اس بس میں آپ بھی سوار تھے؟"

"نہیں جی، بکواس کرتے ہیں یہ لوگ۔ پتہ نہیں کون آدمی تھے یہ، دونوں پاگل نظر آتے ہیں مجھے۔"

"ایسا نہیں ہے سردار صاحب! کسی کو بلاوجہ دوسرے کے بارے میں خواب نہیں آتے ہیں۔" ان کی نگاہ اب بھی سڑک پر جمی تھی اور ان کی کار کا رخ مزنگ تھانے کی طرف پھر چکا تھا۔ پتہ نہیں ان کے ذہن میں کیسی آندھی چلنے لگی تھی۔ میں نے بھی تعرض نہیں کیا حالانکہ ان کی نیت کو میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے سوچا جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے ـــ یہ ہر روز کی بک بک ختم

ہو جانی چاہیے۔ میں ان سب سے لڑائی مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ قدم قدم پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان سب کو روک لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ستناجا صاحب خدا جانے میرے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ بلاشبہ وہ مجھے مجرم سمجھتے تھے مگر ان کے نزدیک میرے نامۂ اعمال میں ایسا کوئی گھٹیا جرم درج نہیں تھا جو مجھے میرے ضمیر کی عدالت میں مجرم ثابت کر سکے لیکن ان دو آدمیوں کو اس قدر گرجدار آواز میں ڈانٹ دینے کے باوصف وہ مجھے تھانے کی طرف لے چلے تھے تو مجھے ان کا ہاتھ نہیں روکنا چاہیے تھا۔ وہ جو کچھ سوچ رہے تھے ٹھیک ہی سوچ رہے تھے۔

"کچھ بتایا نہیں آپ نے! یہ الزام وہ آپ پر کیسے لگا رہے تھے کوئی ثبوت تو ہوگا ان کے پاس؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب ستناجا صاحب! بہرحال میں حاضر ہوں، آپ تھانے ہی جا رہے ہیں نا؟"

بریک پر انھوں نے ایک دم پاؤں جما دیا اور گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کر بولے "مجھے بتائیں سردار صاحب! اصل معاملہ کیا ہے؟ وہ دونوں آدمی غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ کسی نے اخبار میں دونوں قاتلوں کی تصویریں بھی چھپوا دی تھیں، یہ اس واقعے کے چوتھے روز کا ذکر ہے۔"

"وہ تصویریں تو آپ نے بھی دیکھی ہوں گی؟"

"جی ہاں۔ چلیں۔ میں وہ آپ کو بھی دکھاتا ہوں مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ مہربانی آپ ہی نے کی تھی۔ پولیس پر بہت زیادہ لعن طعن ہوئی تھی اس واقعہ پر۔" یہ کہہ کر انھوں نے کار کا رخ موڑا اور کچھ ہی دیر بعد ہم اخبار کے دفتر میں جا پہنچے۔

"یہاں سے ہم پورے سال کا اخبار دیکھ سکتے ہیں، آئیں میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر دفتر میں جا پہنچے اور لائبریری میں جا کر انھوں نے پرانے اخبار اپنے سامنے رکھ لیے۔ "بیٹھ جائیں سردار صاحب! کبھی کبھی آدمی کو فوراً ہی لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں میرے دل میں ابھی بڑی گنجائش ہے میں پہاڑ ایسا غم بھی سینے پر سہار سکتا ہوں مگر تہمت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"یہ تہمت نہیں ہے اگر وہ یقین کے ساتھ سب کچھ نہیں کہہ سکتے تو میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شک بے وجہ نہیں تھا۔ بیٹھیں ذرا اور یہ دیکھیں۔" انھوں نے اخبار میرے سامنے ڈال دیا۔ وقوعے سے اگلے روز کے اخبار میں اختر اور اس کے والد عبدالغنی کی خون میں لت پت لاشوں کی تصویریں وہاں موجود تھیں۔ دونوں ماں بیٹی ان کی لاشوں پر نوحہ کناں تھیں۔ اس گھر کی تصویر بھی اخبار میں چھپی تھی جہاں وہ رہتی تھیں۔ گھر کا پتہ بھی اس میں درج تھا مگر اس روز اخبار میں وہ لوگ یہ نہیں بتا سکے تھے کہ قاتل کون تھے مگر چوتھے روز کے اخبار میں بس کے اندر بیٹھے کسی آدمی نے ہماری جو تصویریں اتاری تھیں، وہ اخبار میں بڑے جلی عنوان سے شائع کی گئی تھیں مگر وہ تصویریں ایسی تھیں کہ میرا اور آبی کا عقب ہی ان میں واضح نظر آتا تھا۔ ہمارے چہرے کیمرے کی نگاہ میں نہیں آئے تھے اور یہ بڑی اچھی بات تھی مگر ان تصویروں میں کبھی نہ کبھی چیز سے تو یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کس کا عقب ہے۔ آبی کا بایاں کان اور رخسار اس میں جھلک رہے تھے اور اس کے بال بھی۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ کیا یہ تصویریں غلط ہیں، جعلی ہیں؟"

"جی نہیں۔ بظاہر تو یہ اصلی ہی لگتی ہیں مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہماری تصویریں ہیں؟"

"ہاں، یہ تو ثابت نہیں ہو سکتا ہے مگر آپ کا چہرہ مجھے بہت کچھ بتا رہا ہے سردار صاحب! بہتر ہے کہ آپ مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیں ورنہ میرے اعتماد کو بہت زیادہ ٹھیس پہنچے گی میں آپ کو تحفظ دے رہا ہوں۔ آپ کا ہر الزام میں سڑک پر ڈال دوں گا مگر مجھے اصل بات بتا دیں۔ یہ بہت ضروری ہے آئیے اب باہر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے اخبار الگ رکھے اور مجھے ساتھ لے کر وہ دفتر سے باہر نکل آئے۔

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

قیمت: =/۱۵ روپے ◎ ڈاک خرچ: =/۵ روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مر گیا تھا لیکن اس کی لاش مندر کے تہہ خانے میں اصل حالت میں موجود تھی۔
- سونا گھاٹ کے علاقے پر اس مردہ پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ ہر جگہ زندہ نظر آتا تھا۔
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آکر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کر لیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟
ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔
اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

انکا مکمل، دو حصے	اقابلا مکمل، دو حصے	غلام روحیں مکمل
قیمت فی حصہ ۲۰ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت فی حصہ ۱۵ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت ۱۰ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے

میں ان کے سامنے بہت ہی خجل ہو رہا تھا۔ مجھ سے قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو میرا سر بوجھل ہونے لگا۔ اعتراف کا لمحہ آ گیا تھا۔ لازم تھا کہ میں ان کے سامنے سب کچھ کہہ دیتا۔ شہادتیں سب میرے خلاف جاتی تھیں مگر ابھی تک ہم پردے میں تھے۔ نہ آبی کو وہ جانتے تھے نہ تصویروں کے وسیلے سے مجھے پہچان سکے تھے۔ اک حرفِ شک تھا جس نے ان کے ذہن میں افراتفری مچا رکھی تھی۔ میں چاہتا تو انھیں وہیں ہاتھ ڈال کر تہس نہس کر سکتا تھا مگر ان کو ہلاک کر دینا اپنے محسن کو ہلاک کر دینے کے مترادف تھا۔ وہ میری ڈھال بن رہے تھے۔ ان کو میں کیسے ختم کر سکتا تھا؟

"کیا سوچا ہے پھر آپ نے؟ مجھے نہیں بتائیں گے آپ کہ ہوا کیا تھا؟"

"میں ... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا ستناجا صاحب! چلیں کسی جگہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم لارڈز میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیں، یہ بہت ضروری ہے۔ سزا جزا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ہم تو محض ایک وسیلہ ہیں مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں کسی کے حکم کا بندھا آپ کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہوں۔ اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی ورنہ میں ایسا تو نہیں تھا۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم لارڈز میں جا بیٹھے۔ چائے کا آرڈر دے کر ستناجا صاحب نے پائپ سلگا لیا، بولے "اب بتائیں کہ ہوا کیا تھا۔ یہ سمجھیں کہ آپ کا دوست آپ کے سامنے بیٹھا ہے میرے عہدے کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ شاید میں آپ کو بتا سکوں کہ پھر کوئی آدمی آپ پر ایسا شک کرے تو آپ کو کیا کرنا ہوگا۔"

میں نے بابا عبدالغنی اور ڈاکٹر اختر سے اپنے خونی تعلق کا ذکر اس کے سامنے چھیڑ دیا۔ میری آواز میں عجیب سا ارتعاش ابھر آیا تھا۔ میرے انتقامی جذبے نے ابھی تک سکون نہیں پایا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کو جان سے مار کر میں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا ہوں۔ وہ آخری وقت تک یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ اپنی کہانی کے تمام ابتدائی حصے میں نے ستناجا صاحب کے گوش گزار کر دیے۔ جتنی کہانی وہ سننا چاہتے تھے وہ میں نے انھیں سنا دی۔

"جی ہاں۔ یہی کچھ ہوا ہے۔ ان کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ہمارے زخم ابھی تک ہرے ہیں نہ آسیہ مجھے مل سکی ہے اور نہ ہمارا وہ سکون واپس مل سکا ہے۔ ایک گھر تین تیرہ ہو کر رہ گیا صرف عبدالغنی کی غلط ضد کی وجہ سے۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں ہی ان کا قاتل ہوں ستناجا صاحب! مگر بات وہیں ختم نہیں ہوئی ہے پتہ نہیں میں اور کیا کچھ کر دوں۔"

ستناجا صاحب نے ایک لمبی سی "ہوں" کی اور پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کا پائپ بجھ گیا تھا۔ چائے بنا کر انھوں نے پیالی میری طرف سرکا دی، بولے "میرا خیال ہے ان کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔"

"میں اگر منصف بن جاؤں تو میں یہ کہوں گا کہ آپ عبدالغنی کی بیوی کو قصاص دے دیں، اس کا کچھ حصہ اختر کی بیوی کو بھی مل جائے گا۔ میں یہی کر سکتا ہوں ورنہ آپ قانون کے سامنے تو جوابدہ ہیں ہی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اس بات پر کیسے راضی ہوں گے؟"

"میں انھیں کسی ذریعے سے راضی کر لوں گا۔ آپ نے دو نہیں، پانچ زندگیاں تباہ کر دی ہیں۔ اختر کی بیوی، اس کی بہن اور اس کی ماں زندہ درگور ہو گئی ہوں گی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں ان کے سامنے کیسے جا سکتا ہوں، کوئی بھی نہیں جا سکتا ہے۔"

"میرے ساتھ چلیں اور بینک سے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر خود اس رقم کو لفافے میں بند کر کے اختر کے گھر ڈال دیں اس پر لکھ دیں کہ یہ رقم قصاص کے طور پر قبول کر لیں۔ مجھے یقین ہے، وہ اعتراض نہیں کریں گی۔ آپ کو ان کے سامنے جانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"ٹھیک ہے ستناجا صاحب! اگر بینک میں سے رقم مل گئی تو میں یہ بھی کر لیتا ہوں، ابھی چلیں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم بینک جا پہنچے۔ ستناجا صاحب مجھے مسلسل تسلیاں دے رہے تھے۔ میں اندر سے لرز رہا تھا۔ میں پھر اس قفس میں جا پہنچا تھا جس کی تیلیاں توڑ کر میں کئی لوگوں کو برملا زخمی کر کے باہر نکلا تھا۔ اس روز کا سارا قصہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا مگر ستناجا صاحب کی وجہ سے مجھے اس مینجر سے پھر بات کرنے کی جرأت ہو رہی تھی۔ جیسے ہی ہم اس کے کیبن میں پہنچے ستناجا صاحب نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا اور تمام پردے پوری طرح گرا دیے تاکہ باہر سے کسی کی نظر اندر نہ آ سکے۔ مینجر مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "تو آپ ہیں ستناجا صاحب! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"جی۔ اور ان کو آپ جانتے ہوں گے، صبح کسی جگہ سے آپ کو فون بھی ملا ہوگا؟"

"جی ہاں ملا تھا مگر۔۔۔ اب کیا حکم ہے؟"

"حکم تو کوئی نہیں۔ ان کے حساب میں جتنی بھی رقم ہے، وہ انھیں دے دیں، آج اور ابھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی بھی آدمی کی رقم پر آپ کو اختیار نہیں ہے۔ ان کو میں حوالات سے اٹھا کر خاص طور پر یہاں لے آیا ہوں۔ ان سے ہم الگ نمٹ لیں گے مگر ان کی رقم ان کے حوالے کردیں اور انھیں فوراً چیک دے دیں۔"

"جی بہت بہتر۔ میں ابھی ان کا حساب دیکھ لیتا ہوں، ان کے حساب میں اس وقت ساڑھے دس لاکھ روپیہ موجود ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک چیک میری طرف سرکا دیا مگر وہ بہت مضطرب نظر آتا تھا۔

"میں نے سُنا ہے کہ بینک کی طرف سے آپ پر بھی ایک مقدمہ چلنے لگا ہے۔" ستناجا صاحب بولے۔

"جی ہاں۔ ان لوگوں نے مجھے معطل کردیا ہے اور میں آج شام یہاں کا چارج ہینڈ اوور کردوں گا۔ نئے منیجر صاحب بھی بس آنے ہی والے ہیں۔"

"الزام کیا ہے آپ پر؟"

"اختیارات کا ناجائز فائدہ۔ اس معاملے کی ساری صورت جب اُن کے علم میں آئی تو انھوں نے مجھے بینک کے اعتماد کو مجروح کرنے کے جرم میں ایک چارج شیٹ دے دی۔"

"ہوں۔ اور یہ کام غالباً کسی بڑے آدمی کے کہنے پر کیا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ورنہ تو میں نے بلاشبہ پولیس کی مدد کی تھی۔"

"ہوں۔ آپ چیک اندر بھیجیں اور رقم یہاں ہی منگوالیں۔" منیجر نے وہ چیک چپراسی کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ رقم وہیں لے آئے۔

کچھ ہی دیر بعد چپراسی رقم لے کر کیبن میں آگیا۔ ستناجا صاحب نے خود وہ رقم گنی مگر اس عرصے میں وہ بہت زیادہ محتاط رہے اور منیجر کی ہر حرکت کو انھوں نے نگاہ میں رکھا۔ میرا ہاتھ بھی پستول پر ہی جما رہا۔ مجھے وہاں سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ منیجر کسی بھی وقت ہمیں پریشان کرسکتا تھا مگر وہ چپ ہی رہا۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہوگئی تھی۔ اس چارج شیٹ نے اس کی نوکری خطرے میں ڈال رکھی تھی۔ وہ ہم سے کوئی آں بان شاں نہ کرسکا۔

رقم گن کر انھوں نے مجھے دے دی اور بولے۔ "منیجر صاحب! آپ نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے ورنہ آج آپ کی یہاں لاش ہی نظر آتی مگر یاد رکھیں، میں ستناجا نہیں ہوں، یہ کارڈ جعلی تھا اور اب ہم جا رہے ہیں، اپنی اصل رقم کے ساتھ۔" یہ کہہ کر ستناجا صاحب نے منیجر کے سر پر ماتھے کے اوپر کھڑے ہاتھ کی ایک ایسی خوفناک ضرب لگائی کہ وہ الٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگا اور پھر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل سکی۔ کیبن کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ہم دروازہ کھول کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئے اور سیدھے گاڑی میں جا بیٹھے۔

"آپ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ستناجا صاحب!"

"یہ بہت ضروری تھا سردار صاحب! وہ آدمی جو دوسروں کے اعتماد کو مجروح کردیتا ہے اسی لائق ہے۔ اگر یہ حرکت میرے ساتھ ہوتی تو میں شاید اُسے روز اسے جان سے مار دیتا۔ اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں اس کے پاس آیا ہوں۔ چلیں اب ہم ڈاکٹر اختر کے گھر چلتے ہیں۔"

گاڑی کی رفتار انھوں نے خاصی تیز کردی تھی۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ آدمی جس کو اس قدر بڑا عہدہ ملا ہوا ہے اور جس نے اتنا اونچا مقام حاصل کرلیا ہے، دور کہیں ماضی کے کسی حصے میں خود کوئی بہت بڑا مجرم تو نہیں رہ چکا ہے ورنہ آخر اس منیجر کو ایسی سزا دینے کا کیا حق حاصل تھا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ اس ضرب سے مدمقابل صاف ڈھیر بھی ہوسکتا ہے؟ اس کی صدائے بازگشت بھی کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ محض ایک وہم سا تھا جو میرے دل میں اُبھر رہا تھا مگر میں اس وہم کی کسی بھی جگہ سے تصدیق نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہی نہیں تھا۔

اخبار میں سے ڈاکٹر اختر کا موجودہ پتہ اس نے ازبر کرلیا تھا اور اب ہمارا رُخ نواں کوٹ کے گورنمنٹ کوارٹرز کی طرف تھا۔ چند ہی منٹ بعد ہم منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ ڈاکٹر اختر کو جو سرکاری مکان ملا تھا وہ ایک بہت بڑی عمارت کی دوسری منزل پر تھا اور اس کے گھر کے لوگ ابھی تک اس میں رہائش رکھے ہوئے تھے۔ کم از کم ایک سال تک وہ اس میں رہ سکتے تھے۔ قانون یہی تھا۔

"ان سے اندر چل کر بات کرتے ہیں ہمیں چار لاکھ روپیہ ہر حال میں اُن کے حوالے کرنا ہوگا۔ اُن کے نہ ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"مگر وہ مجھے پہچان لیں گے۔"

"اپنے منہ پر رومال رکھ لیں اور خود کو اُن پر ظاہر نہ کریں۔ بات آپ ہی کریں گے۔" یہ کہہ کر ستناجا صاحب نے دروازے پر دستک دے دی۔ چند ہی لمحوں بعد ایک نحیف و نزار عورت مُودار ہوئی۔ لگتا تھا وقت نے اس کی کمر ہی دوہری کردی ہے۔ اُس کے پیچھے اس کی بیٹی بھی تھی اور بہو بھی۔ میں نے منہ پر رومال ڈال رکھا تھا۔

"کیا یہ مرحوم عبدالغنی صاحب کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔ میں۔۔۔ میں اُن کی بیوی ہوں، مرحوم کی بیوہ۔"

"ہمیں آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے ماں جی! میرا نام ہاشم خان ہے اور میں تھانے سے آیا ہوں۔"

"تھانے سے۔۔۔ ارے تو اندر آجائیں نا! مٹو گڑ بولا یہ تھانے سے آئے ہیں، آئیں بھائی جی!" یہ کہہ کر وہ دروازے سے الگ ہٹ گئیں۔

گھر کی حالت ڈیوڑھی سے ہی ظاہر تھی ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ کوئی بھی چیز قرینے سے رکھی نظر نہیں آتی تھی۔ ہم اُن کی نشست گاہ میں پہنچے تو ماحول کی ویرانی کا احساس اور زیادہ بڑھنے لگا۔ صوفے بے رنگ ہو رہے تھے۔ کرسیوں پر دھول جمی تھی، غلاف میلے ہو رہے تھے۔ کسی بھی شے میں ہمیں زندگی کی رونق نظر نہیں آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جینا بھول گئی ہوں اور اب صرف موت کی آس میں زیست کرتی ہوں۔ بیواؤں کے گھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب آدمی کی امید ہی ختم ہو جائے تو پھر اس کے ماحول سے وحشت ہی وحشت ابھرتی نظر آتی ہے۔ اُن کا بھی یہی حال تھا۔

"ماں جی! ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کے شوہر اور بیٹے کے قاتل کون ہیں مگر ایک خبر ایسی ہے جو ہم سب کے لیے بڑی حوصلہ افزا ہے اور ہم وہی آپ کو سنانے آئے ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے کہ ہماری پولیس کیا کچھ کرسکتی ہے۔ اب کوئی خبر میرے لیے امید افزا نہیں ہے، کوئی بھی نہیں۔ ہماری بدنصیبی اب کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ یہ قبر تک ہمارا ساتھ دے گی۔" تائی نے دوپٹے کے پلو میں اپنے آنسو سموتے ہوئے کہا۔ وہ شاید بہت زیادہ بیمار رہی تھی۔ سانس اس کا دھونکنی کی طرح چلتا تھا۔ یہی حال اُس کی بہو اور بیٹی کا تھا۔ وہ بھی سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھیں۔

"ایسا نہ کہیں ماں جی! ہمیں دراصل نامعلوم قاتلوں کی طرف سے قصاص کی رقم ملی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ آپ تک پہنچا دیں۔ دو لاکھ روپیہ بھیجا ہے انھوں نے۔"

وہ کچھ بھونچکا سی رہ گئیں۔ اپنے کانوں پر انھیں اعتبار نہیں آیا۔ بولیں۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! وہ ہیں کون؟ آخر پولیس انھیں پکڑتی کیوں نہیں ہے؟"

"وہ خود سامنے نہیں آئے۔ کسی ذریعے سے انھوں نے یہ رقم بھیجی ہے اور فون پر پیغام دیا ہے کہ یہ رقم ہم آپ تک پہنچا دیں۔ اگر آپ انھیں وہ خون معاف کردیں تو یہ قصاص وہ آپ کو دینے پر راضی ہیں۔"

"میں تو بیوہ ہو ہی چکی ہوں۔ میری بہو کا بھی سہاگ اُجڑ چکا ہے۔ پولیس اُن کو نہیں ڈھونڈ سکی تو میں یہ کام کیسے کرسکتی ہوں؟ لے دے کر اب یہ رقم ہی رہ گئی ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کتنی رقم بتائی ہے آپ نے؟"

"دو لاکھ۔" میں نے زبان دبا کر کہا۔

"میں بہو سے مشورہ کرلوں پھر آپ کو بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"آپ رقم کو اتنا کم کیوں بتا رہے ہیں؟" ستناجا صاحب نے دبے لہجے میں کہا۔

"میں ان کا امتحان لے رہا ہوں، ویسے ان کو چار لاکھ ہی دے دوں گا، آپ فکر نہ کریں۔"

تائی جلدی ہی واپس آگئیں، بولیں۔ "ٹھیک ہے بھائی جی! ہمیں منظور ہے۔ وہ از خود یہ رقم دے رہے ہیں تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ اُن کی گردن کٹوا کر مجھے کیا مل جائے گا۔ ان کی موت آئی تھی سو وہ مر گئے۔ آپ رقم دے دیں۔"

"دو لاکھ روپے ہیں یہ مگر صرف ایک آدمی کے۔ دوسرے کے لیے بھی انھوں نے دو لاکھ ہی دیے ہیں۔ یہ رکھ لیں اور ہمیں باقاعدہ چار لاکھ کی رسید دے دیں جس میں آپ لکھ دیں کہ یہ رقم آپ نے بطور قصاص وصول کرلی ہے۔"

"رسید آپ خود ہی لکھ لیں، میں دستخط کردوں گی۔" میں نے چار لاکھ روپے اُن کے سامنے ڈال دیے۔ بڑھیا کے ہاتھوں میں جان آگئی تھی۔ لگتا تھا اس کے دلدّر دور ہوگئے ہیں۔ رقم کو بڑی بے تابی سے اس نے اپنے دوپٹے میں ڈالا اور دوسرے کمرے میں جا گھسی۔

کوئی دس منٹ میں ہم نے ایک رسید تیار کرلی۔ جب ہم نے اُسے بلوایا تو اندر آکر تائی نے اس رسید پر فوراً ہی دستخط کردیے۔ اس کا رنگ بدل رہا تھا۔ چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔ دراصل آدمی کو کوئی نہیں روتا ہے، اس مفاد کو روتا ہے جو اُس کی موت کی وجہ سے اسے حاصل نہیں رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت اس بیوہ کی تھی۔ کہاں تو اس سے ہلا نہیں جاتا تھا مگر کہاں یہ حالت ہوگئی کہ وہ بڑے حوصلے سے ہمیں بڑے دروازے تک چھوڑنے بھی آئی۔ وہ بار بار ہمارا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ ہم نے ان پر اتنی بڑی مہربانی کردی تھی۔ حالانکہ پولیس کے بارے میں اس کے خیالات نہایت ہی خراب تھے۔

"دیکھیں ماں جی! رسید پر آپ دستخط کرچکی ہیں۔ قصاص

آپ نے وصول کر لیا ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ اس رقم کا کسی سے ذکر نہیں کریں گی۔ ورنہ لوگ آپ کو بُرا بھلا کہیں گے کہ آپ نے بندے بیچ دیے۔"

"میں کیوں ذکر کروں گی، میری مت ماری گئی ہے؟ میں کل ہی یہ مکان چھوڑ دوں گی اور کوئی دوسرا مکان خرید لوں گی یہ رقم ہمارا بہت ساتھ دے گی۔"

"ہاں بس یہی بہتر ہے' اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر ہم اسی وقت وہاں سے نکل کر گاڑی میں جا بیٹھے۔ ستناجا صاحب بہت خوش تھے۔ اتنی بڑی رقم میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی مگر انھیں یہ خوشی تھی کہ وہ ضائع نہیں ہوئی کام آ گئی ہے۔ ایک اجڑے ویران گھر کو پھر سے بسانے کے لیے وہ رقم ڈھیر سارا کام کر سکتی تھی۔

"آپ نے بہت اچھا کیا ہے سردار صاحب! رقم کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اصل چیز ان عورتوں کی بحالی ہے' مجھے خوشی ہے کہ آپ کا ہاتھ رقم دیتے وقت لرز نہیں رہا تھا۔"

"آپ نے قیمت ہی اُن کی یہی لگائی ورنہ میں دس لاکھ بھی انھیں دے سکتا تھا۔"

"نہیں۔ یہی بہت کافی ہے' بڑھیا اس سے سو کام لے سکتی ہے۔ چلیں' اب گھر چلتے ہیں۔ میں فون پر کسی دلّال سے بات کروں گا تاکہ آپ کے لیے وہ کوئی مکان ڈھونڈ دے۔"

"ہاں۔ چلیں اب تو میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک چار دیواری میری بھی ہونی چاہیے۔"

"مگر اس سے فائدہ آپ جب ہی اٹھا سکتے ہیں جب ہم غلام جیلانی کو کسی پولیس مقابلے میں ختم کر دیں۔"

"دیکھیں کیا ہوتا ہے' یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جناب! بہرحال میں بھی کوشش کروں گا آپ بھی دیکھیں۔"

"ہاں۔ سوچنا پڑے گا۔ ورنہ جیتے جی تو آپ اس شہر میں نہیں رہ سکتے ہیں آپ کی تصویر ہر تھانے میں اتر جانی چاہیے کہ غلام جیلانی نہ مانا۔"

حیرت مجھے یہ تھی کہ تائی مجھے بالکل پہچان نہیں پائی تھی۔ اس کی بہو تو مجھے جانتی ہی نہیں تھی مگر اس کی بیٹی تو میرے لیے اجنبی نہیں تھی مگر ان میں سے کوئی بھی ادھر دھیان نہ دے سکا کہ ان کے باپ اور بھائی کا قاتل تو ان کے سامنے بیٹھا ہے اور وہی ان سے قصاص کی بات بھی کر رہا ہے۔ تقدیر کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جس گھرانے نے ہمیں دھتکار دیا تھا اس کے اپنے افراد اب اس حال میں تھے کہ زمین انھیں جگہ نہیں دیتی تھی ورنہ وہ اس میں سما جاتے۔ وہ لوگ جو بیٹے کے لیے دلھن کے ساتھ اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کرتے تھے ایسے نیچے گر گئے تھے کہ ان سے دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ ان کے چہروں پر نحوست برس رہی تھی۔ یہی وہ عورت تھی جس نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ عبدالغنی کو اس نے ایسا پارہ کھلا دیا تھا کہ وہ ہم سے بات کرنے پر راضی نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ لاکھ روپیہ دو گے تو آسیہ کی ڈولی اٹھے گی اور اب یہ حال ہو گیا تھا کہ میں انھیں قصاص میں چار لاکھ روپیہ دے رہا تھا۔

ستناجا صاحب گھر نہیں گئے بلکہ وہ گلبرگ کے ایک دلّال کے پاس جا پہنچے۔ اس کا نام نگران احمد تھا اور وہ ستناجا صاحب کو پہلے سے جانتا تھا۔ ہمیں بڑے تپاک سے ملا تو ستناجا صاحب نے اس سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "نگران صاحب! یہ سردار کریم نواز ہیں' میرے دوست اور انھیں کوٹھی کی ضرورت ہے۔ ادھر گلبرگ میں کوئی ہو تو دکھا دیں۔"

"کوٹھیاں بہت ہیں جناب! آپ تشریف رکھیں ہم بیٹھے کس لیے ہیں آخر؟"

"یہ سودا آج ہی مکمل ہونا چاہیے۔ کوٹھی نئی ہو، عمدہ ہو۔ آگے پیچھے باغ ہونا چاہیے۔ کمرے اس میں پانچ ہونے چاہئیں۔ ڈرائنگ ڈائننگ الگ۔ روپے کی آپ فکر نہ کریں۔"

"یعنی' یہ سودا آج ہی ہونا چاہیے مگر کتنے روپے آپ خرچ کر سکتے ہیں؟" اس نے ہمارے سامنے عمدہ قسم کے سگریٹ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے جا یار! ان کے لیے چائے تو لے آ بھائی پھیرو!" اس نے دکان کے برآمدے میں دروازے کے پاس بیٹھے آدمی سے کہا۔ وہ اس کا ذاتی ملازم تھا۔ بڈھا آدمی تھا۔ لمبا سا لنڈے کا کوٹ پہن کر سٹول پر بیٹھا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر دوسری طرف نکل گیا۔

"تو یہ بھائی پھیرو ہے۔ اچھا نام رکھا ہے آپ نے اس کا۔ نگران صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ وہ جائداد نقص سے پاک ہونی چاہیے۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ روپے آپ کتنے خرچ کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کوئی تین لاکھ۔ ہم چار پانچ پر بھی بات کریں گے۔" میں نے براہِ راست اس کو جواب دیا۔

"ہاں۔ مگر جتنی بھی رعایت ہو سکے اچھا ہے۔"

نگران احمد نے ہمیں چھ سات کوٹھیوں کے بارے میں بتایا! وہ سب گلبرگ میں ہی تھیں۔ ان کے نقشے بھی اس کے پاس موجود تھے۔ اچانک میری نظر ایک نقشے سے الجھنے لگی۔ محسوس مجھے یہ ہوا جیسے اس نمبر کا ذکر میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ اس کا نقشہ وہی تھا، بالکل وہی۔ اس کے لان' اس کی عمارت' اس کا محلِ وقوع سب کا سب میرا دیکھا ہوا تھا مگر نام اس کا کوئی نہیں تھا۔

"یہ.... یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"اس کی قیمت زیادہ ہے۔ اس کا مالک ایک ڈاکٹر ہے مگر آج کل وہ یہاں نہیں رہتا ہے امریکہ چلا گیا ہے اور وہ اسے بیچ رہا ہے۔"

"کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا؟"

"اس کا نام ڈاکٹر عالیہ ہے' یہ کوٹھی اسی کی ہے' اس کے خاوند کا نام ڈاکٹر دمن ہے۔ وہ کچھ ہی دن پہلے امریکہ چلے گئے ہیں اور اب وہ وہیں رہیں گے۔"

"ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دمن۔ ہوں.... " میرا جگر پھر تلنے لگا۔ یوں لگا جیسے نگران احمد نے میرے سینے میں بھالا دے مارا ہو۔ مگر پھر بھی میں نے توقف کیا، خود کو بت سنبھالا۔ ستناجا صاحب میری اس کیفیت کو سمجھ گئے۔ بولے "یہ.... میرا خیال ہے نگران صاحب کہ.... خیر آپ اس کی قیمت بتائیں۔"

"وہ اس کوٹھی کے دس لاکھ مانگ رہے ہیں مگر میں سات پر سودا کروا سکتا ہوں۔"

"مجھے ان کا پتہ بتا سکتے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ مختار نامہ وہ ڈاکٹر تسکین حیدری کے نام لکھوا گئے ہیں' ان کا ایک بہت بڑا کلینک ہے 'شفابار کلینک'۔ اسے دراصل تین آدمیوں نے مل کر خریدا ہے۔"

"شفابار کلینک! آپ سن رہے ہیں نا ستناجا صاحب!"

"جی ہاں۔ میں سن رہا ہوں بلکہ سمجھ بھی رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر تسکین ہی اب اس جائداد کو بیچ سکتے ہیں۔"

"بالکل، ابھی دوپہر کو ہی ان کا فون آیا تھا۔ ڈاکٹر عالیہ نے انھیں واشنگٹن سے فون کیا ہے کہ وہ اس کوٹھی کو جس قدر جلدی ہو سکے' بیچ دیں۔ بہت امیر لوگ ہیں وہ۔ اپنا سارا سرمایہ امریکہ لے جا رہے ہیں۔"

"بس آپ مجھے یہ کوٹھی دلوا دیں نگران صاحب! بات ہو گئی سمجھیں' میں اسے خرید لوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو پھر دس لاکھ منظور ہیں آپ کو؟"

"آپ تو سات لاکھ کہہ رہے تھے؟"

"میں کوشش کروں گا۔ کوٹھی بہت ہی عمدہ ہے' آپ دیکھ لیں چل کر۔ اس کی چابی نوکر کے پاس رہتی ہے۔ میں بہرحال کوشش کروں گا کہ سات لاکھ میں بندوبست ہو جائے۔"

"کیا نام ہے اس نوکر کا؟"

"حیدر۔ دراصل وہ ڈاکٹر صاحب کا بہت پرانا ملازم ہے۔ کوٹھی کی دیکھ بھال وہی کرتا ہے' بعد میں وہ کسی اور جگہ منتقل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے! آپ ہمیں وہ کوٹھی دکھا دیں نگران صاحب! اور ابھی چلیں۔ ہم یہ سودا کر ہی لینا چاہتے ہیں۔" اتنے میں بھائی پھیرو چائے لے کر اندر آ گیا مگر ہم اسی وقت وہاں سے اٹھ گئے۔

"چائے رہنے دیں۔ پھر کبھی پی لیں گے۔ اٹھیں ستناجا صاحب!" میں نے مکان سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ آئیں نگران صاحب! کوٹھی ہم ابھی دیکھ لینا چاہتے ہیں۔" کچھ ہی دیر بعد ہم کار میں بیٹھے ڈاکٹر عالیہ کی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ وہی کوٹھی جس نے پہلی ہی رات مجھے زندگی کے بالا بلند پہاڑ سے نیچے گرا دیا تھا۔ ماضی کی ان گنت تلخ یادیں میرے ذہن میں ابھرنے لگیں۔ وہ کیسی رات تھی پروردگار کہ اس میں پہلی بار میری تقدیر نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں مکمل طور پر اس فاحشہ کے جنگل میں جا پھنسا تھا اور اب یہ کیسا دن آیا ہے کہ میں اسی کوٹھی کو خریدنے کے لیے وہاں جا رہا ہوں جس کے دروازے پر حیدر بیٹھا ہو گا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی چونک اٹھے گا۔ شاید وہ کسی نہ کسی طرح عالیہ کو بتا دے کہ کوٹھی کا خریدار کون ہے کس نے نگران احمد سے بات کر لی ہے' اس پر تو موت وارد ہو جائے گی۔ اب تو اسے میری صورت سے خوف آنے لگا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک تو نہیں کیا تھا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم اس سے شفابار میں مل چکے تھے اور اب پھر میں اس کی طرف جا رہا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ عالیہ کی کوٹھی ہمارے ہاتھ بیچنا پسند نہیں کرے گا۔ اسے یہ کہاں منظور ہو گا کہ اس کا خریدار وہ آدمی بنے جو کسی رات وہاں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا اور اب وہ چوری کے مال سے اسے خریدنے کے قابل ہو چکا تھا۔ ایک تیز دھار چونک عالیہ بھی میرے لیے ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اسے جب معلوم ہو گا کہ میں وہ کوٹھی خریدنا چاہتا ہوں تو وہ اس سودے ہی سے منکر ہو جائے گی۔ لازم تھا کہ میں صورتِ حال کو اس حد تک خراب نہ ہونے دوں۔

ابھی ہم راستے ہی میں تھے کہ میں نے دبی زبان میں ستناجا صاحب سے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ ہی کوٹھی دیکھ آئیں۔ مجھے یہاں ایک ضروری کام ہے۔ ادھر اس ہوٹل کے پاس مجھے اتار دیں۔ میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ملازم مجھے جانتا ہے۔"

وہ میرے ساتھ اگلی نشست پر سٹیئرنگ ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ میری طرف جھک کر بولے "آپ کے سر میں درد ہے تو سر پیٹ لیں' یہ تولیہ سر پر رکھ لیں۔ ابھی ہم واپس آ کر

کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔ آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے سردار صاحب!" یہ کہہ کر انھوں نے ڈیش بورڈ سے نکال کر ایک تولیہ مجھے دے دیا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ایک نظر وہ کوٹھی ضرور دیکھ لوں۔ وہ تولیہ میں نے اچھی طرح سر پر لپیٹ لیا۔ یوں کہ اب میرا منہ بھی اس میں سے پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب ہم کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو مجھے وہ چیتا یاد آ گیا۔ بہت ہی ہولناک لمحہ تھا وہ میری زندگی کا۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے دانت پہلے ہی نکالے جا چکے ہیں۔ عالیہ نے اسے مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کی دہشت سے پریشان ہو کر بھاگ جاؤں گا مگر ایسا نہ ہو سکا اور وہ پہلے مرحلے میں بالکل ہی بے بس ہو گئی۔

گھنٹی کی آواز سن کر حیدر نے دروازہ کھول دیا تھا۔ نگران احمد سے وہ اچھی طرح واقف تھا، بولا۔ "کہیے! کیسے آئے ہیں آپ! کوئی خریدار ہیں یہ؟"

"ہاں یہ سردار کریم نواز صاحب ہیں اور یہ ستناجا صاحب۔ کوٹھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ بیگم صاحبہ تو واشنگٹن جا پہنچی ہیں۔"

"جی ہاں، وہ تو شاید اب وہیں رہنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ آئیں جناب!" حیدر واقعی موٹا ہو چکا تھا۔ سارا دن بیکار بیٹھا اینڈتا رہتا تھا۔ رہنے کے لیے اتنی عمدہ کوٹھی ملی ہوئی تھی اسے۔ وہ بھلا تر و تازہ کیوں نظر نہ آتا۔ تولیے نے میرا بھرم رکھ لیا تھا۔ وہ مجھے قطعاً پہچان نہ سکا۔ روز ملنے والا آدمی ہو تو اسے پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہوتا ہے مگر لباس کے رعب داب اور سرداری کے لفظوں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ ہمیں عمارت کی طرف لے گیا اور ایک ایک کمرہ کھول کر دکھانے لگا۔ میں نے اس کا حجرہ بھی دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں رہائش رکھتا تھا۔ کوٹھی میں سے ضروری سامان نکالا جا چکا تھا۔ اب وہاں وہ سیف موجود نہیں تھا جس نے مجھے برباد کر دیا تھا مگر فریج، گیزر اور اس قسم کی دوسری چیزیں وہاں اب تک موجود تھیں۔ ہم تمام حصوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہاں سے چپ چاپ واپس چلے آئے۔ نگران احمد کی تقریر مسلسل جاری تھی۔ وہ ہمیں اس عمارت کے فوائد بتا رہا تھا۔ ایک رٹا رٹایا اس کا سبق تھا جو وہ بڑی روانی سے دہراتا تھا۔

جب ہم کار میں بیٹھ کر واپس ہوئے تو میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے نگران صاحب! اگر سات لاکھ روپے انہیں منظور ہوں تو ہم سے بات کریں۔ ہم تیار ہیں۔"

"جی میں کوشش کروں گا۔ مجھے اپنا فون نمبر بتا دیں۔ آج ہی شام میری ڈاکٹر تسکین سے ملاقات ہوگی۔"

ستناجا صاحب نے اپنا فون نمبر اسے بتا دیا اور پھر ہم اس کو دکان کے سامنے اتار کر ستناجا صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیے۔ بھوک نے ہم دونوں کو پریشان کر رکھا تھا اور میرا خیال ہے کہ ستناجا صاحب اس معاملے میں کسی قسم کی تاخیر برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے افراتفری مچا دی اور ملازم کو یہ لاؤ وہ لاؤ کے آلام و مصائب میں ڈال کر پریشان کر دیا۔ وہ بے چارا چند ہی منٹوں میں دوڑ دوڑ کر پاگل ہو گیا۔ اس عرصے میں انھوں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ اب وہ زیادہ تازہ دم نظر آنے لگے تھے۔ ساری چیزیں میز پر دھر دی گئیں تو پھر انھیں چین آیا اور مجھے سامنے بٹھا کر انھوں نے کھانے میں ہاتھ ڈال دیا۔

اچانک انھیں کچھ یاد آ گیا تو انھوں نے فون سامنے رکھ لیا اور گارڈ کے لوگوں سے ملا کر بولے۔ "اوئے گل خان! کیا ہوا اس مستان شاہ کا؟"

"وہ تو جی میں نے تھانے کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ کہہ گئے تھے نا۔" فون پر دوسری طرف کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"اچھا کیا۔ وہ چیخا تو نہیں؟"

"جی نہیں۔ بس چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ وارثی صاحب کا قتل بھی اسی پر ڈال دو، میں تھانیدار سے خود بات کروں گا۔ ویسے میں نے اسے صبح ہی سمجھا دیا تھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا ہے جناب! وہ ہمارے بہت کام آ سکتا تھا۔"

"نہیں سردار صاحب! اسے روکنا اچھا نہیں تھا۔ اسے خاص پارٹی کے سپرد کیا گیا ہے وہ اس سے بڑی باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی مگر وہ ہمارے ہاتھ میں رہتا تو زیادہ بہتر تھا۔"

"کھائیں جی کھانا کھائیں۔ وہ خود بھگت لے گا سالا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ کوٹھی آپ کے لیے بہت اچھی رہے گی۔"

"جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے مگر وہ عالیہ کی کوٹھی ہے۔"

"اس کا پتہ بھی کر لیں گے اور اسے اب میں خود کسی بہانے یہاں بلواؤں گا۔ کوئی چکر چلانا پڑے گا۔ سنا ہے وہ بہت بڑی کبیر عورت ہے۔"

"جی ہاں۔ بہت روپیہ کمایا ہے اس نے میرے گرو نے بھی۔ کم از کم دس لاکھ وصول کیے ہوں گے۔"

"اس سارے معاملے کا مجھے صحیح علم نہیں تھا۔ اب آپ ملے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ بہت ذلیل لوگ ہیں اور اب امریکہ میں جا بیٹھے ہیں۔ انہیں تو چوک میں کھڑا کر کے گولی مار دینی چاہیے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر کوئی کچھ کرے تو سہی۔ اگر وہ یہاں رہ جاتی تو میں خود اس سے نمٹ لیتا۔ وہ میری وجہ سے ہی یہاں سے بھاگی ہے۔"

"خیر، دیکھ لیں گے ہم۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پارٹی کا اجلاس جو پتا در میں ہوگا، کیا وہ محفوظ رہے گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، اس معاملے میں مستان شاہ ہی بتا سکتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ ان کا راز فاش ہو چکا ہے۔"

"آپ کی سوچ درست نہیں ہے۔ وہ اب بھی وہی کام کریں گے مگر ذرا بچ بچا کر۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ ہم نے سعید الدین پر لاہور میں سخت نگرانی شروع کر دی ہے۔ علی نواز کو ناری کو بھی گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے اور وقار الٰہی کو بھی۔"

"چلیں اتنا تو ہوا۔ دیکھیں اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مگر میرے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"آپ کا نام میں پولیس کی فہرست سے ضرور کٹوا دوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ دو آدمی ہی ضائع کرنا ہوں گے نا۔ ایسے بہت سے مل جاتے ہیں۔ ابھی تو آپ کوٹھی کا قبضہ لینے کی کوشش کریں۔"

"یہ کام تو کل ہو جائے گا مگر میں اس حیدر کے سامنے نہیں جاؤں گا، وہ سالا شور مچا دے گا۔"

"میرا خیال ہے اس کو میں آج ہی گرفتار کروا دیتا ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ افیونی تو مجھے وہ لگتا ہی ہے۔ اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں آپ نے۔"

"آپ کا مشاہدہ کمال کا ہے جناب! وہ واقعی افیون کھاتا ہے۔"

"تو بس پھر ٹھیک ہے۔ میں اسے آج ہی پانچ دس دن کے لیے حوالات بھیج دیتا ہوں۔ پھر آپ سودا طے کر لیں۔"

"بس یہ ٹھیک ہے۔ اب میں سارا معاملہ خود سنبھال لوں گا۔"

"آپ اب آرام کریں۔ یہ کمرہ آپ کے اور صرف آپ کے لیے ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو میرے ملازم سے کہہ دیں اور مجھے اجازت دیں۔ مجھے بڑے کام کرنے ہیں ابھی۔"

کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے مجھے میرا کمرہ دکھا دیا اور میری ضرورت کی ساری چیزیں وہاں رکھوا دیں۔

پانچویں دن تک میں نے نگران احمد کے ذریعے ڈاکٹر تسکین کو سات لاکھ روپیہ دے دیا۔ حیدر کو ان لوگوں نے اسی شام کوٹھی سے گرفتار کر کے حوالات بھیج دیا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی تردد نہیں کرنا پڑا۔ رجسٹری میں نے سردار کریم نواز کے نام سے لکھوائی۔ کوٹھی میں فون جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ کچھ پلنگ، صوفے، کرسیاں، قالین اور روزمرہ استعمال کی دوسری چیزیں ڈاکٹر تسکین نے وہیں رہنے دیں۔ اس کے پاس ان کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ اس عرصے میں ستناجا صاحب بہت مصروف رہے۔ میری ضرورت کے لیے انھوں نے ایک جیپ مجھے دے دی تھی۔ وہ میں اپنے استعمال میں لاتا رہا۔ کوٹھی کا قبضہ جب مجھے مل گیا تو میں ستناجا صاحب سے رخصت لے کر چھٹے روز صبح ہی صبح نئی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔

ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ حیدر وہاں آ ٹپکا۔ وہ کوٹھی کے بھڑے ہوئے گیٹ میں سے اندر آ گیا مگر جب اس نے برآمدے کے اندر بڑے دروازے پر مجھے دیکھا تو ٹھٹک گیا، بولا۔

"یہ... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں بھائی جیلانی!"

"اوئے تو حوالات سے کیسے باہر آ گیا؟ جیل نہیں بھیجا انھوں نے تجھے؟"

"مگر... مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ کوٹھی میں نے خریدی ہے بچے! تو نے دیکھا نہیں تھا مجھے۔ نگران احمد کے ساتھ میں ہی یہ کوٹھی دیکھنے آیا تھا۔"

"اچھا! مگر... نہیں بھئی! میں... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تولیہ تم نے جان بوجھ کر سر پر لپیٹ رکھا تھا۔"

"ہاں۔ اور تو دھوکا کھا گیا ہے نا یہی بات؟ مگر یاد رکھ میں یہ کوٹھی خرید چکا ہوں، اب تیرا یہاں کوئی حق نہیں ہے۔"

"پر میرا سامان، میری چیزیں تو مجھے دے دو۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ تمھارا کمرہ ابھی تک میں نے نہیں کھولا ہے، پر تو یہاں آ کیسے گیا؟ تجھے تو پولیس والے پکڑ کر لے گئے تھے؟"

"ڈاکٹر تسکین نے میری ضمانت دی ہے۔ اب شاید مقدمہ چلے مگر میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے چھڑا ہی لیا ہے۔"

"کیا الزام تھا تجھ پر؟"

"وہ کہتے تھے کہ میں افیون اور ہیروئن بیچتا ہوں۔ حالاں کہ میں افیون صرف کھاتا ہوں۔ میرے اپنے اتنے پیسے خرچ ہو جاتے ہیں اس مصیبت پر۔"

"کوئی ہیروئن نکلی ہوگی نا تیرے کمرے سے۔"

"یہ تو ان کا حربہ ہے، کسی کے کمرے میں بھی ایسی چیز ڈال کر اسے پکڑ سکتے ہیں مگر میں نے ایسا جرم نہیں کیا۔"

"اچھا دیکھ! تیری ملازمت کا اب کیا ہوگا؟"
"میں ڈاکٹر تسکین کے پاس چلا جاؤں گا۔"
"تجھے حیرت نہیں ہوئی کہ یہ کوٹھی میں نے کیسے خرید لی؟"
"حیرت تو ہے مجھے مگر کیا کر سکتا ہوں میں؟"
"تم عالیہ کو خبر نہیں دو گے؟"
"اب میں اسے خبر دے بھی دوں تو کیا ہوگا؟ سودا ہو چکا ہے قبضہ دیا جا چکا، اب کیا ہو سکتا ہے؟"
"آدمی تو واقعی بہت سمجھ دار ہے حیدر! کیا یہ ممکن نہیں کہ تو ادھر ہی رہ جائے۔ میں تجھے اپنے ہاں ملازمت دیتا ہوں۔"
"میں کیا کروں گا یہاں؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔
"تو... تو میرے لیے کھانا پکائے گا، اس گھر کو صاف ستھرا رکھے گا، تجھے میں چار سو روپے دیا کروں گا۔"
"چار سو! سچ کہہ رہے ہو تم؟"
"ہاں بھئی! وہاں سے کیا ملتے تھے تم؟"
"وہ مجھے دو سو روپے دیتی تھیں ڈاکٹر عالیہ۔"
"تو پھر کیا خیال ہے، چار سو تو بہر حال بہت اچھے ہیں اور روٹی، پانی، کپڑا، لتا الگ۔"
"اگر ایسا ہو جائے تو پھر کیا بات ہے؟"
"تو پھر سمجھ کہ تیرے دن پھر گئے۔ آج سے تو ہمارا نوکر، اور ہم تیرے مالک۔ کیا خیال ہے؟"
وہ ہنس دیا۔ بولا: "میں... میں ٹھیک سن رہا ہوں نا؟"
"ہاں یار! تو ٹھیک ہی سن رہا ہے۔ تیرے لیے میں سیر بھر افیون بھی لا رکھوں گا، مزے کرے گا تو۔ ایک دم عیش ہو جائیں گے تیرے۔"
"بس ٹھیک ہے۔ میں... میں تمھیں کیا کہا کروں گا؟"
"میرا نام سردار کریم نواز ہے۔ جیلانی تو یونہی لوگ کہہ دیا کرتے تھے مجھے، ورنہ میں بہت بڑا زمیندار ہوں حیدر! تو ہماری جاگیر دیکھے تو حیران رہ جائے۔"
"ٹھیک ہے سردار صاحب! مجھے منظور ہے۔ جب یہ کوٹھی بنی تھی میں جب سے اس میں رہ رہا ہوں۔ یہاں سے اپنا سامان اٹھاتے مجھے بہت دکھ ہوتا۔ عجیب بات ہے، مالک اسے چھوڑ کر کہیں اور جا بسے مگر خدا نے میری لاج رکھ لی۔" وہ یوں بول رہا تھا جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں جا پہنچا اور مجھے اس دروازے میں دیکھ کر بولا: "اللہ کی شان ہے سردار صاحب کبھی آپ اس دروازے میں چور کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔"
"ہاں۔ اور اپنا گردہ کٹوا کر باہر نکلا تھا۔ عجیب دن تھے وہ بھی مگر دیکھ حیدر! تجھے قسم کھانی ہوگی کہ تو میرے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تجھے معلوم ہے میں کیسا آدمی ہوں۔"
"آپ جیسی قسم کہیں میں کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے تو ڈاکٹر عالیہ اور دشمن کے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ حالانکہ اُن کے جرم کو میں اچھی طرح جانتا تھا پھر میں آپ کے بارے میں کسی سے کیا کہہ سکوں گا۔"
"شاباش۔ مجھے یقین ہے حیدر! کہ تم اس وعدے پر سختی سے کاربند رہو گے۔ یہ لو یہ پانچ سو روپیہ رکھ لو اور ضرورت کی تمام چیزیں اکٹھی کر لو۔ اب ہم دونوں یہاں رہیں گے۔"
وہ رقم اس نے میرے ہاتھ سے پکڑ لی۔ بولا: "اگر آپ کہیں تو میں سارا سودا سلف اکٹھا ہی لے آؤں۔"
"ہاں یہی کرو مگر پہلے جھاڑ پونچھ کر دو اور پھر کل صبح بازار سے فرنیچر بھی خرید لاؤ۔ یاد رکھو میں اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں کروں گا، یہ سارا سلسلہ تمھیں ہی چلانا ہوگا۔"
"ایسا ہی ہوگا سردار صاحب! بالکل ایسا ہی ہوگا۔ میں تو خود اچھی چیزوں کو ترس گیا ہوں۔ اب تو میں کھانے سے بھی عاجز آ چکا تھا۔"
"تو جاؤ پھر یہ چیزیں لے آؤ۔ میں جلدی ہی گاڑی بھی خرید لوں گا پھر تمھیں بہت آرام رہے گا۔ گاڑی چلا لیتے ہو کہ نہیں؟"
"جی ہاں۔ ڈرائیونگ تو میں بہت اچھی کر لیتا ہوں۔ ٹانگ تو میری بائیں خراب ہے اور وہ بھی معمولی سی۔"
"بس ٹھیک ہے اب تم بازار جاؤ اور یہ چیزیں لے آؤ۔ مگر یاد رکھو کہ تم نے قسم کھائی ہے اور دوسری بات یہ ہے بچے کہ اب میں پولیس کے محکمے کا ایک بہت بڑا افسر بن چکا ہوں اگر تم نے میرے ساتھ کوئی ہیرا پھیری کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"
"پولیس افسر بن چکے ہیں آپ؟" اس کی حیرت دیدنی تھی۔ آنکھیں اس کی خانوں سے باہر نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔
"ہاں اور میرے ساتھ جو آدمی تھا وہ خفیہ پولیس کا بہت بڑا عہدیدار ہے۔" میں نے اس کے پہیے سے ہوا بالکل ہی خارج کر دی۔
"مجھے معلوم ہے سردار صاحب! آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ میں آپ کے ہر راز کی حفاظت کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ دو تھیلے اٹھا کر اسی وقت باہر نکل گیا۔
اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے ٹیلیفون اٹھایا اور آبی کے کلینک کے نمبر گھما دیے مگر وہاں سے معلوم یہ ہوا کہ آبی رات کو وہاں سے رخصت ہو گیا تھا اور وہ تمام بل بھی ادا کر گیا ہے۔ کلینک کے کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کے زخم بالکل ٹھیک ہو چکے تھے مگر وہ اپنا پتہ بتا کر نہیں گیا۔ ایک خاتون البتہ اس کے ساتھ تھی اور وہ برقع پہنے ہوئے تھی۔
میرے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ میں نے اسی وقت الماس کے گھر فون کیا۔ دوسری طرف سے کسی ملازمہ نے ریسیور اٹھایا۔
"ہیلو! یہ میڈم الماس کا گھر ہے؟"
"جی ہاں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"
"میڈم الماس سے۔"
"مگر آپ ہیں کون؟"
"میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں۔"
"جی میں انھیں ابھی بلاتی ہوں۔"
کچھ دیر ریسیور خاموش رہا۔ پھر الماس کی آواز ابھری۔ بڑی مترنم، بڑی پُرکیف، کھنکتی چاندنی جیسی آواز میری سماعت کو ترو تازہ کر گئی۔
"ہیلو۔"
"جی میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ میرا دوست اسلم آبی کہاں ہے؟"
"مگر آپ کو میں نہیں جانتی۔"
"یہ ضروری نہیں ہے میڈم! آپ غلام جیلانی کو تو جانتی ہیں۔"
"جی ہاں۔"
"اور وہ اس روز شام کو آبی کے کمرے میں موجود تھا جب آپ وہاں پہنچی تھیں۔"
"جی ہاں۔ میں نے انھیں دیکھا تھا۔"
"بس اسی کے حوالے سے میں پوچھ رہا ہوں، وہ کہاں ہے اس وقت، وہ ہمارا یار؟"
"اوہ! اب سمجھی۔ دیکھیں جی وہ کل شام اپنے گاؤں گئے تھے۔ اپنی والدہ کو لانے کے لیے۔ پرسوں ہماری شادی ہو رہی ہے۔ کل صبح وہ ہمارے گھر آ جائیں گے اور شادی بڑے ہی سادہ طریقے سے ہوگی اور آپ کا آنا بہت ضروری ہے اُن کے اصل سرپرست تو آپ ہی ہیں نا۔"
"اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تھے؟"
"جی ہاں۔ علاج انھیں بہت اچھا مل گیا تھا۔"
"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہماری بھی شادی کروا دیں؟"
"مجھے کیا پتہ۔ آپ کی میرج بیورو سے بات کریں۔ الماس تو ایک ہی تھی اور اب وہ بھی جا رہی ہے۔" اس کی آواز کا لوچ آدمی کو حیران کر دیتا تھا مگر جب وہ شوخی پر اترتی تھی تو پھر سیدھی دل میں اترتی تھی۔
"وہ بہت خوش نصیب آدمی ہے میڈم! ابھی تو وہ اپنی جاگیر پر گیا ہے آئے گا تو میں اس سے بات کروں گا کہ وہ اپنے دوست کے لیے جیسے بھی ہو سکے آپ سے پرے ہٹ جائے۔"
"اللہ! کیا بات ہے آپ کی۔ اگر آپ غلام جیلانی ہیں اور آپ کو ایسا ہی شوق تھا تو آپ نے ان کی جگہ اپنا نام کیوں درج نہیں کروایا؟"
"بس یہ میری کم نصیبی ہے میڈم! اس میں جرأت زیادہ تھی۔ حوصلہ بھی زیادہ تھا۔ قوتِ اظہار بھی مجھ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔" اس کا سانس جب ہنسی سے نکلا تو مدھر تان بن کر نکلا۔
"آپ... آپ بڑا دلخراش مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ اچھا خدا حافظ۔ کل صبح فون کریں۔ میں بھی آجکل کہیں نہیں جا رہی ہوں گھر ہی پر ہوتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
میں دیر تک ریسیور کو تکتا رہا۔ ایک بڑا ہی خوش آہنگ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ عورت کبھی کبھی آدمی کی کتنی ضرورت بن جاتی ہے۔ اس شام مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا۔ اور میں تھا کہ مجھے جرأتِ اظہار کی کمی نے ہی مار لیا تھا۔ ایسے میں مسند آراء مجھے بہت یاد آئی مگر اس سے بھی زیادہ وہ عورت جو میرے بچے کی ماں بن گئی تھی۔ شیر دل آہو کی بیوی سروری خانم! وہ میرے ذہن میں ابھری تو اس کے ساتھ ہی وہ بچہ بھی ہمک کر میری گود میں آ بیٹھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فون میرے سامنے تھا، میں نے آہو کا نمبر گھمایا۔ ریسیور پر کسی خاتون کی آواز ابھری۔ آواز میں عجیب سی نغمگی تھی مگر سہمی سمٹی سی۔ جیسے گردِ پیش سے اسے دھڑکا لگا ہو۔ "ہیلو" کے الفاظ یوں کہے گئے جیسے کوئی اپنی آواز بکھرنے سے بچا رہا ہو۔
"ہیلو! کون؟"
"جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"
"پہچانا نہیں آپ نے۔ میں وہی آپ کا اختر شیرانی ہوں۔"
"اوہ! آپ! کہاں ہیں اس وقت آپ؟"
"اپنے گھر میں۔"
"کس جگہ؟ میں فوراً آپ سے ملنا چاہتی ہوں، بات بہت بگڑ گئی ہے۔"
"کیا مطلب؟ کیسی بات؟"
"بس کچھ ہے نا۔ مجھے بتائیں آپ کہاں ہیں اس وقت؟"

سرداری کی آواز میں تیزی آگئی تھی۔ جیسے وہ میرے ہی فون کی منتظر بیٹھی تھی۔

"کوئی اور تو نہیں ہے وہاں؟"

"جی نہیں اس وقت اور تو کوئی نہیں ہے مگر وہ شام کو آجائیں گے۔"

"آپ کا مطلب آہو سے ہے؟"

"جی ہاں۔ بتائیں مجھے آپ یہاں آسکتے ہیں ابھی اور اسی وقت؟"

"مگر وہ آجائے گا تو پھر کیا ہوگا؟"

"اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ میں خود آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔ اچھا ہوا آپ آہو کے سامنے نہیں آئے ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔"

"دیکھیں، میں گلبرگ میں ہوں۔ کوٹھی نمبر سات سو انیس۔ اور میں یہاں ہی رہتا ہوں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے میں آرہی ہوں میرا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جس انداز سے وہ بول رہی تھی اس سے میں یہی سمجھا کہ وہ کسی زبردست مشکل میں پھنس گئی ہے اور اسے کسی بھی پہلو چین نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ کن حالات سے دوچار تھی۔ میں فون سے ہٹ کر کوٹھی کے مختلف کمروں میں گھوم گیا۔ کئی کمروں میں دو دو پلنگ بچھے تھے اور بستر بھی ان پر موجود تھے۔ بستر کیا تھے، نیند کا خمار ہاتھوں میں لیے سونے والے کے منتظر تھے۔ فوم کے نرم نرم بیڈ آدمی کو خواہ مخواہ اپنی طرف بلاتے تھے اور وہ سردیوں کے دن تھے جن میں لحاف سے آدمی کی محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ آبی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھا کہ اسے اللہ نے وہ نعمت دے دی تھی۔ یا دے دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس سے آدمی کی تکمیل ہو جاتی تھی مگر میں ابھی بس ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد حیدر واپس آگیا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر آیا تھا اور چیزوں سے خوب لدا پھندا تھا۔ تمام چیزیں اس نے ٹیکسی سے اتار کر باورچی خانے میں پہنچا دیں اور ڈرائیور کو رخصت کرنے کے بعد میرے پاس پہنچا۔ بولا "سرکار صاحب! میں آپ کے لیے ڈھیر سارا گوشت اور مرغ لے آیا ہوں۔ کپل بھی اور مکھن بھی۔ باورچی خانے کی ہر شے میں خرید لایا ہوں اب آپ بے فکر ہو جائیں۔"

"بے فکر تو میں ہمیشہ ہی سے ہوں حیدر! اب تو یوں کر کہ ڈھیر سارا گوشت پکا دے میرے ایک مہمان آرہے ہیں آج۔"

"بس ابھی لیں جناب اور یہ لیں! آپ کے لیے میں سگریٹ بھی لے آیا ہوں اور پائپ بھی۔ سگار کی ضرورت ہو تو وہ بھی حاضر ہے۔"

"ابے پانچ سو روپے میں تو کیا کیا کچھ خرید لایا ہے؟"

"خرید ہی نہیں لایا بلکہ ڈھیر ساری رقم بچا بھی لایا ہوں۔ ابھی آپ کو حساب کر کے بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا گھسا۔

اگر مجھے سرداری خانم کا انتظار نہ ہوتا تو میں اسی وقت آبی کے گاؤں جا پہنچتا مگر اس نے مجھے باندھ لیا تھا۔ میں ایک بار پھر مختلف کمروں میں رکھی چیزیں قرینے سے لگانے لگا۔ گھر ایک عجیب نعمت ہے۔ آدمی کو اس کی چاردیواری میں پہنچتے ہی ہر شے کو قرینے سے دیکھنے کی آرزو ہونے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ چاردیواری اس کے دل میں اتر آتی ہے۔ وہ اس سے برائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ گھر جس میں لوگ دو گھڑی رہ کر آگے نکل جاتے ہیں، بڑا ہی بدنصیب گھر ہوگا کہ اس کے در و دیوار سے کسی کو محبت نہیں ہوتی۔ ایسے گھر کرائے کے گھر ہوتے ہیں مگر ایسا کیوں ہے کہ کرائے کے گھروں سے بھی لوگوں کو محبت ہونے لگتی ہے حالانکہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جلد یا بدیر وہاں سے اٹھ جانا ہوگا۔

سامان حالانکہ وہاں زیادہ نہیں تھا پھر بھی سب چیزیں میں نے بہت سوچ سمجھ کر ادھر ادھر لگا دیں۔ کچھ کمرے بالکل ہی خالی تھے۔ میں نے سوچا صبح سب سے پہلے یہی کام کروں گا کہ وہاں ہر کمرے میں مناسب فرنیچر لگا دوں گا۔ روپیہ میرے پاس صرف ڈیڑھ لاکھ باقی بچا تھا اور وہ بہت تھا۔ ڈھیر ساری چیزیں اس سے خریدی جا سکتی تھیں اور ابھی مجھے آبی سے آدھی رقم وصول کرنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرے گا اور آدھا روپیہ میرے حوالے کر دے گا۔ ہاں اگر الماس نے اسے زیادہ نہیں نچوڑا تو پھر ہی وہ میرے کام آسکے گا ورنہ نہیں۔ آدمی کی برین واشنگ جس طرح بیوی کر سکتی ہے کوئی بڑے سے بڑا پولیس افسر بھی نہیں کر سکتا۔ دماغی شفاخانے بھی اس معاملے میں ناکام رہتے ہیں۔ بیوی شے ہی ایسی ہے اور اگر چوری میں ہی کامیابی ملتی ہو تو پھر وہ اپنے آدمی کو فن کار بنا دے گی۔ دوسروں کے تجربات مجھے یہی بتاتے تھے۔

کوئی پون گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ لان کی تنہائی گونجنے لگی۔ بہت دور گیٹ پر کسی نے گھنٹی بجا دی تھی۔ حیدر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اتنا لمبا چوڑا فاصلہ طے کرنا ایک مسئلہ تھا مگر اسے شاید عادت تھی۔ میں اسے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھتا رہا۔ اس وقت شام اندھیرے میں بدلنے سے پہلے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ گیٹ پر مجھے ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ حیدر نے دروازہ کھولا تو ایک عورت بچے کو ہاتھوں میں سنبھالتی ہوئی اندر آگئی۔ وہ سرداری خانم تھی اور وہ پہلی مہمان تھی جو اس شام میرے گھر آئی تھی۔ پتہ نہیں حیدر سے اس نے کیا بات کہی، وہ فوراً ہی گیٹ بند کر کے سرداری کی طرف بڑھا اور اس بچے کو ہاتھوں میں لے کر اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ میں عمارت کے بڑے دروازے سے نکل کر برآمدے میں جا ٹھہرا۔

وہ لمبا چوڑا لان عبور کر کے وہاں تک پہنچے تو مجھے دیکھ کر سرداری کے قدم ایک دم تیز ہو گئے اور بڑی بے تکلفی سے بولی۔ "السلام علیکم جناب! آپ کا گھر اتنی دور ہے کہ گجرات جانا زیادہ آسان لگتا ہے۔"

"آپ کی مہربانی ہے جو آپ آگئیں۔ حیدر ان کے لیے اچھی سی کافی بناؤ اور بیڈروم میں لے آؤ۔"

"جی بہت اچھا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ چائے بناؤں یا کافی۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف نکل گیا۔

"آئیے سرداری خانم! آئیے یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ میں نے چند ہی دن ہوئے خرید لیا ہے۔"

"اچھا! یہ تو بہت خوبصورت کوٹھی ہے، اللہ اتنا سنگِ مرمر! کسی نے بڑے شوق سے بنوائی ہوگی۔"

"ہوگی سے کیا مطلب! بنوائی ہے۔ فرش دیکھیں کتنے خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے آدمی یہاں ہی لیٹ رہے۔"

"ہاں۔ اس کی ہر شے میں ایک حسن ہے۔" سرداری نے عمارت کے اندر سے گزرتے ہوئے ہر چیز کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دو ایک دن میں اس کو سامان سے بھر دوں گا۔ کل فرنیچر بھی لے آؤں گا۔ گھر تو آدمی کی بڑی اہم ضرورت ہے سرداری خانم!"

"ہاں گھر واقعی بہت ضروری ہے، لے گھر بھی کوئی آدمی ہوتا ہے؟"

"میں اسے ساتھ لے کر سیدھا بیڈروم میں جا پہنچا۔ بچہ اس نے حیدر سے پہلے ہی لے لیا تھا مگر مجھ سے اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا اور وہ آنے سہلانے اسے میرے سامنے کر رہی

تھی۔ آخر اس نے بچے کو بستر پر ڈال کر اس کے اوپر لحاف ڈال دیا۔ "مجھے حیرت ہے جیلانی صاحب! ایسا صابر بچہ ہے کہ ذرا نہیں روتا بس چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔ بھوک لگے تو پھر غوں غوں کرنے لگتا ہے۔"

"بالکل آہو جیسی عادت ہے اس کی۔ وہ بھی مشکلات سے ذرا نہیں گھبراتا اور روتا تو وہ بالکل ہی نہیں ہے۔"

"لعنت بھیجیں اس پر جی! کمال کرتے ہیں آپ۔ کہاں رام رام کہاں ٹیں ٹیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا برقع اتار کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ اب بھی بلاخیز حسن کی مالک تھی۔ اللہ نے اسے شاید اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ صحت اس کی اتنی اچھی تھی کہ خون گویا اس کی جلد سے ٹپکتا نظر آتا تھا مگر اتنی ساری حسن و خوبی کے باوجود وہ مجھے اس گھڑی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ پتہ نہیں ایسی کیا بات تھی۔ ایک انقباض کی کیفیت نے مجھے گھیر لیا تھا۔ دل اس کی طرف اس انداز سے راغب نہیں ہو رہا تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ اور... اور مجھے معلوم ہے کہ.... جس الزام کی زد میں وہ مجھے لا چکی تھی وہ سارے کا سارا خراب کا مرہونِ منت تھا میری اپنی مرضی اس میں شاید ہرگز شامل نہیں تھی۔ میں نے بھی اس کو ابھی تک اس صورتِ حال کے دوسرے رُخ سے متعارف نہیں کروایا تھا۔ وہ یہی سمجھ کر میرے پاس آگئی تھی کہ وہ مجھے جیت لے گی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟ بیٹھیں نا۔ آپ کا فون سُن کر دل اچھلنے لگا تھا۔ پتہ نہیں میں آپ کے بغیر کیوں اتنی بے چین رہنے لگی ہوں۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے سرودی خانم! اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں مگر میں اس سارے معاملے کا مفہوم نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

وہ ٹک ٹک میرا منہ تکتی رہی، بولی "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"میرا مطلب یہ ہے سرودی خانم! کہ آپ شادی شدہ عورت ہیں۔ شیر دل آہو کی سالہا سال کی محنت رنگ لائی ہے۔ اسے اللہ نے بیٹا دیا ہے۔ وہ.... وہ اس سے دست کش ہو جائے۔ ذرا سوچیں تو۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں جیلانی! وہ.... وہ اس کا باپ نہیں ہے اور وہ اس بات کو سمجھ رہا ہے۔"

"اگر ایسا نہیں ہے تو بھی وہ اس کا باپ ہے۔ قانونی طور پر وہ اس کا باپ ہے اور اسے خوش ہونا چاہیے کہ وہ باپ بن چکا ہے۔"

"مگر وہ خوش نہیں ہے اگرچہ میں نے ابھی اسے کوئی بات نہیں بتائی ہے لیکن وہ مجھ سے بار بار پوچھتا ہے۔ بچہ تو عمر کے ساتھ ساتھ سو رنگ بدلتا ہے مگر اس کی شباہت کے ساتھ صرف باپ ہی کو ملایا جا سکتا ہے اور میں مجرم بن گئی ہوں۔ آپ کی بھی اور آہو کی بھی۔"

"اگر اسے یقین ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو پھر وہ کیسے آپ کو گھر میں رہنے دے گا؟"

"وہ مجبور ہے۔ ہمارے والد کی جاگیر اس کو کچھ نہیں کرنے دیتی ورنہ وہ اب تک خدا جانے کیا کر چکا ہوتا۔ میں اس کا دماغ پڑھ چکی ہوں۔ وہ.... وہ شاید مجھے اور اس بچے کو قتل کروا دے وہ یہی سوچتا ہے۔ وہ.... وہ مسند آرا سے شادی کر لے گا۔ ابھی وہ بدنصیب اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ.... یہ اُس کی بھول ہے سرودی بیگم! یہ تو ممکن ہے کہ وہ آپ کی زندگی ختم کر دے مگر وہ مسند آرا پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہ نہیں ہو گا۔ اِس کی اسے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

"میں یہی تو کہہ رہی ہوں۔ اس کو باندھ لیں جیلانی! ورنہ وہ ہماری زندگیوں میں زہر گھول دے گا۔ آپ اسے نہیں سمجھتے ہیں۔ اس نے خفیہ طریقے سے مسند آرا کو کسی کے ہاتھ خط لکھ کر بتا دیا ہے کہ ہادی علی کو آپ نے قتل کیا تھا اور وہ اب آپ کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی، اسے آپ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اگرچہ وہ کر کچھ نہیں سکتی۔ آہو نے اُسے ایسی دواؤں پر ڈال دیا ہے جو ہیروئن سے زیادہ خطرناک ہیں لیکن وہ آپ کا نام سننا پسند نہیں کرتی ہے۔"

"اور وہ جو کسی سکھیر سے اس کی شادی کی بات چل رہی تھی؟"

"وہ بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ سکھیر ابھی ہادی علی کی جاگیر پر نظر رکھتا ہے، وہ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہا ہے۔ لگتا ہے وہ سالہا سال سے بیمار ہے۔"

"پھر.... پھر اب کیا ہو گا؟"

"میں.... میں آپ کے پاس اسی لیے آئی ہوں جیلانی! ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ یہ بچہ آپ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔ آہو کو ہمارے درمیان نہیں رہنا چاہیے!"

"ہوں۔ تو تم میرے پاس اس کے قتل کی تجویز لے کر آئی ہو!"

"ہاں۔ یہی سمجھ لیں۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ وہ.... وہ جاگیر آپ کی منتظر ہے جیلانی! مجھ سے یا مسند آرا سے شادی کر کے آپ ہم سب کو بچا سکتے ہیں۔"

"مگر آپ کہتی ہیں کہ مسند آرا میرا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی ہے؟"

"اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ خدا نے یہ راستہ آپ کے لیے بنا دیا ہے پھر آپ کیوں اپنے حق سے دستبردار ہوتے ہیں؟ خدا ہی جانتا ہے یہ بچہ اُس نے مجھے کس لیے دیا ہے میں اس کے لیے آپ سے خود کو وابستہ کرنا چاہتی ہوں یہ بہت ضروری ہے جیلانی! میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور یہی حال اس کا ہو گا۔ اس کی پیدائش میں ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا مگر اس کی پرورش ہم ہی کر سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں جیلانی! مجھے مایوس نہ کریں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سرودی خانم! میں سمجھ رہا ہوں مگر.... مگر.... یہ سب میرے بس میں نہیں ہے۔ میں صدیوں سے مسند آرا کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے اور کب سے میری تلاش میں تھی۔ میں.... میں بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ.... آپ تو بلاوجہ ہی راستے میں آگئی ہیں۔ وہ.... وہ سارا قصور اُس شراب کا ہے۔ ہاں اسی کا تھا۔ ورنہ میں.... میں ایسا نہیں تھا۔ کسی کی امانت میں خیانت میں نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معاف کر دیں سرودی خانم! یہ بوجھ مجھ سے نہیں اٹھ سکے گا۔"

"تو.... تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ہم دونوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے؟ آپ کے دل میں ہماری کوئی وقعت نہیں ہے؟"

"ہے۔ بہت وقعت ہے مگر آپ پہلے مسند آرا کو راضی کریں پھر میں اس سے ملوں گا۔ پھر.... پھر شاید میں آہو کو بھی راستے سے ہٹا دوں اور سکھیر کو بھی۔"

"وہ راضی نہیں ہوتی ہے۔ میں اس سے بار بار پوچھ چکی ہوں۔ وہ اپنے باپ کے قاتل سے شادی کے لیے کسی بھی طرح راضی نہیں ہے جیلانی! میں دیکھ چکی ہوں۔"

"پھر تو بہت مشکل ہے سرودی خانم! میں کیوں یہ گناہ اپنے سر لوں۔ مجھے.... مجھے تو صرف مسند آرا کی ضرورت ہے جب وہ ہی نہیں ہے تو پھر.... پھر آپ کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"ایسا نہ کہیں جیلانی! ذرا اس بچے کو دیکھیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ آہو کے ہاتھوں قتل ہو جائے؟" اس نے بچہ پلنگ سے اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بچہ حیرت انگیز طور پر مجھ سے مشابہہ تھا۔ سرودی کو بھی احساس تھا کہ وہ کس بوجھ تلے دب گئی ہے۔ بچے کو باپ کی ضرورت تھی اور سرودی کو ایسے خاوند کی جو واقعی اس بچے کو اپنا بیٹا کہہ سکے اور آہو اس پھیر میں آ کر نالتو ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ایک ہولناک منصوبہ بنا بیٹھا تھا اور سرودی خانم ایک الگ محشرِ خیال دل میں سنوار بیٹھی تھی۔ حل اس کا یہ تھا کہ آہو کو قتل کر دیا جاتا۔ یا پھر سرودی اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتی۔ تیسری اور آخری صورت یہ تھی کہ سرودی خود اپنے بچے کو ہلاک کر دیتی یا کسی یتیم خانے میں دے آتی اور یہ دونوں باتیں اسے منظور نہیں تھیں چہ جائیکہ وہ اپنے قتل پر صبر کر کے بیٹھ رہتی اور اب وہ اسی مخمصے کے حل کے لیے میرے پاس آئی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ میں اس کو بیوی بنا لوں مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ آہو اسے طلاق دے دیتا لیکن بیچ میں ہادی علی کی جاگیر اس کے پاؤں کی زنجیر بن چکی تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر جاگیر سے وہ کسی طور بھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی طبیعت کے اس لالچ کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ آدمی جو پارٹی کے کہنے پر ہی سہی، اپنے سسر کو مروا سکتا ہے تاکہ اس کے نتیجے میں وہ اتنی بڑی جاگیر کا مالک بن سکے تو پھر اس سے دوسرے مرحلے پر کسی قسم کی غفلت کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ دوسری انتہا بھی ضرور چھو سکتا تھا۔

بچہ میں نے سرودی کے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ وہ اب تک بالکل خاموش تھا۔ میں نے فوراً ہی بچہ سرودی کے حوالے کر دیا۔ "یہ.... یہ بچہ میرا امتحان بن کر رہ گیا ہے۔ اسے آپ میرے سامنے مت لایا کریں سرودی.... یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیوں نہ لاؤں میں اسے آپ کے سامنے؟ کیا قصور کیا ہے اس نے؟ اس کا کیا قصور ہے جیلانی! مجھے بتائیں۔" اس کا لہجہ تلخ ہونے لگا۔ رنگ اس کا غصے کی وجہ سے سُرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ رونے لگی۔

"روتی کیوں ہیں آپ! کیا چاہتی ہیں آخر؟ مجھے بتائیں تو سہی۔ ابھی تو آپ آہو کی منکوحہ ہیں پھر میں ایسے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں.... میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ ہم دونوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ وہ.... وہ کسی بھی وقت ہم پر وار کر سکتا ہے۔"

"ایسا نہ سوچیں سرودی! میرا خیال ہے آہو یہ سب کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ آپ گھر سے کیسے نکلی ہیں؟"

"میں کبری سے کہہ آئی تھی کہ میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں، منا بیمار ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو رہا ہے۔"

"اس کی واپسی سے پہلے مجھے گھر پہنچ جانا چاہیے۔"

اتنے میں حیدر کافی کی پیالیاں لے کر اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر سرودی نے اس کی طرف سے رُخ پھیر کر بچے کو گود میں لے لیا۔ حیدر معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے پیالیاں میز پر رکھیں تو میں نے کہا "حیدر جاؤ ذرا کوئی ٹیکسی روکو۔ انھیں بادامی باغ جانا ہے۔"

"جی بہت بہتر سردار صاحب! ٹیکسی رکی تو میں آپ کو گھنٹی دے دوں گا۔"

"ہاں۔ ہم گیٹ پر آجائیں گے۔"

وہ باہر نکلا تو میں نے پیالی اٹھا کر خود سروری کو دے دی۔ "یہ رونا ٹھیک نہیں ہے سروری! آپ تو بڑی حوصلہ مند عورت ہیں۔"

"پر۔۔۔ پر میں تھک گئی ہوں۔ مسند کا بھی یہی حال ہے اس کو بھی آہو چین نہیں لینے دیتا۔ حالات بہت خراب ہیں جیلانی! میں آپ کو بتا نہیں سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے کسی طرح یہ پانچ چھ دن نکال لیں۔ پھر میں کوئی تدبیر سوچوں گا۔ آہو کو قتل کرکے ہم پولیس سے بچ نہیں سکیں گے۔ بڑے صاحب اُن کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔"

"کچھ بھی کریں جیلانی! مگر اس آدمی سے میرا پیچھا چھڑا دیں۔ میں آپ کے بچے کی ماں بن کر کہہ رہی ہوں۔"

"یہ تو خیر مفروضہ ہے بہرحال میں سوچوں گا سروری! کوئی نہ کوئی تدبیر کرلیں گے ہم مگر مجھ سے آپ شادی کی بات نہ کریں۔ یہ ناممکن ہے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ پھر بکھرنے لگی۔ کافی اُس سے پی نہیں گئی۔ پیالی اُس نے ویسی کی ویسی ہی میز پر رکھ دی۔ آنکھیں اس کی جھرنا بن گئیں۔ آنسو اس کے لبِ شیریں کو چھونے لگے۔ اسے رونا آتا تھا اور ایسے میں وہ اور زیادہ حسین نظر آنے لگتی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں تسلی کے دو بول اُسے دے دوں جس سے اس کی انا کی تسکین ہو جائے اور وہ جو بھر بھر کر بکھرتی تھی نا اسے کچھ سکون پہنچا دوں مگر میرا دل ہی نہیں مانتا تھا۔ میں اس سے کیسے کہہ دیتا کہ میں اسے زندگی کا مرکز مان لوں گا۔ کیسے میں اس سے یہ وعدہ کرلیتا کہ میں مسند آرا کو چھوڑ کر اس سے بیاہ رچا لوں گا۔

"رونہیں نہیں سروری! مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ پولیس ہر وقت میرے پیچھے لگی رہتی ہے۔ تھانوں میں میری تصویریں لگی ہیں۔ میں تو کسی بھی وقت دریا برد کردیا جاؤں گا۔ میں آپ کے کام کا آدمی نہیں ہوں سروری! اسی لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس راہ پر نہ چلیں۔ میں خود اپنا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آپ کو کیسے سہارا دے سکوں گا؟ یہی وجہ ہے کہ میں آج تک مسند آرا کے پاس نہیں پہنچا۔"

عین اس وقت گھنٹی بج اٹھی۔

"آئیں! حیدر نے ٹیکسی روک لی ہے۔ اطمینان رکھیں، آہو آپ کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ آئیں کوئی نہ کوئی تدبیر ہم ضرور کرلیں گے۔" وہ ایک ٹھٹھرتی سی نگاہ مجھ پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ بچہ اُس نے لاش کی طرح دونوں بازوؤں پر ڈال رکھا تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ اس مست ملنگ بچے کو میرے دروازے پر ہی نہ ڈال دے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ چپ چاپ گیٹ سے نکلی اور ٹیکسی میں جا بیٹھی۔

"آئیں میرے ساتھ بیٹھیں مجھے گھر تک تو چھوڑ آئیں۔"

شام گہری ہو چلی تھی اور شاید اسے تنہا جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

"حیدر! ادھر آؤ۔ تم بی بی کے ساتھ چلے جاؤ۔ اور یہ لو کرایہ۔ واپسی میں بھی ٹیکسی پر آجانا۔"

سروری دنگ رہ گئی، اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کروں گا۔ حیدر نے مجھ سے سو روپیہ لیا اور ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"چل بھئی! ذرا جلدی کر مجھے واپس بھی آنا ہے۔"

ٹیکسی روانہ ہوگئی تو میں گیٹ بند کرکے کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑا اس ویران سڑک کو دیکھتا رہا جب ٹیکسی کی سُرخ بتیاں میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو میں بہت ہی تھکے تھکے قدم اُٹھاتا ہوا اپنے حجلۂ ویراں میں جا بیٹھا۔ سروری ٹھیک ہی کہتی تھی، آہو کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ جاگیر پر اپنا قبضہ مکمل کرنے کے لیے اسے بلاشبہ اب مسند آرا کی ضرورت تھی اور اس کام کے لیے اسے سروری سے جان چھڑا لینا ہی بہتر نظر آتا ہوگا اور وہ بدنصیب عورت اب اپنے ہی جال میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ وہ ایک ایسے بچے کی ماں تھی جسے آہو بھی سمجھتا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے مگر جب اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ بچہ کس سے منسوب ہے تو پھر وہ یقیناً سروری پر کاری وار کرے گا کہ وہ اس کی عزت سے کھیل گئی تھی۔ مگر کیا میں سروری کو تنہا چھوڑ دینے میں حق بجانب ہوں گا؟ کیا وہ اس گرداب سے بچ کر نکل سکے گی؟ ایسے میں عورت کا تو خدا ہی حافظ ہوتا ہے، اس کی عیاری اور مکاری بھی اس کے کام نہیں آسکتی ہے۔ ہاں اگر وہ خود آہو کو زہر دے دے تو یہ ایک الگ بات ہے مگر اتنا حوصلہ وہ کہاں سے لائے گی۔

حیدر کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آگیا، بولا "صاب جی! میں انھیں گھر چھوڑ آیا ہوں۔"

"اندر بھی گیا تھا تو؟"

"جی نہیں! وہ بس گلی میں اتر گئی تھیں اور میں اسی ٹیکسی

میں واپس آگیا ہوں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"جی کوئی نہیں۔ میرا خیال ہے وہ بچاری سارا راستہ روتی ہی رہی تھیں۔ پتہ نہیں انھیں کیا پریشانی تھی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ اب کھانا لے آؤ۔ بہت دیر ہوگئی ہے اور سنو، ٹیکسی کا کرایہ کس نے دیا تھا؟"

"جی میں نے خود دیا تھا۔ انھیں تو شاید کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ کھانا بس اِدھر ہی لے آؤ۔ یہ ڈائننگ ٹیبل کا تصور مجھے پاگل کردیتا ہے یہاں ہی لے آؤ بس۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے ڈاکٹر عالیہ کو میں نے کبھی ڈائننگ ٹیبل کے بغیر کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ بڑی تیس مار خاں عورت تھی جی وہ بھی۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا گھسا۔

حیدر نے کھانا میرے پلنگ کے قریب تپائی پر رکھ دیا مگر ابھی میں پہلا لقمہ ہی اٹھا سکا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ بڑی زیادتی کی بات تھی۔ آدمی گھر میں کہیں بھی ہو، ٹیلیفون آجائے تو اسے سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف بھاگنا پڑتا ہے۔ فون بڑی رحمت ہے، آدمی کا سارے جہاں سے تعلق قائم رہتا ہے مگر اس کے باوجود اس کی گھنٹی رگوں میں خون خشک کردیتی ہے۔ میرا تو خاص طور پر بُرا حال ہو جاتا ہے۔ میں دوسرا لقمہ نہ اٹھا سکا۔ وہ گھنٹی میرے لیے زحمت بن گئی تھی۔

"دیکھ حیدر! کون ہے یہ؟ میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہے۔ مجھے اس سے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

حیدر فون کی طرف بڑھا تو معلوم ہوا کہ دوسری طرف ستناجا صاحب ہیں۔

"یہ کوئی ستناجا صاحب ہیں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں کھانا چھوڑ کر فون کی طرف لپکا۔ "کون صاحب ہیں؟"

"میں ستناجا بول رہا ہوں بھئی! کیا کر رہے ہیں اس وقت؟"

"میں کھانا کھا رہا تھا۔ کوئی حکم؟"

"ذرا دیر کے لیے ادھر آجائیں۔ میری کوٹھی پر ایک بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔"

"ابھی آجاؤں؟"

"ہاں ہاں بھئی! پہلے کھانا کھالیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"جی ٹھیک ہے میں کوئی آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ پتہ نہیں ایسی کون سی اہم بات تھی جس کے لیے وہ مجھے بلا رہے تھے۔ زندگی ویسے ہی دھوپ چھاؤں بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا انھیں میری اس قدر ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ میں نے جلدی جلدی کھانا حلق سے نیچے اتارا اور لباس تبدیل کرکے میں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے چل دیا۔

ستناجا صاحب اس وقت گیٹ سے باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے یہی محسوس ہوا کہ اس آدمی کا ماضی نہایت گھناؤنا اور شرمناک ہوگا۔ اس کے چہرے کی کرختگی مجھے یہی بتاتی تھی۔ اس کی آنکھ میں سؤر کا بال تھا یا جانے کیا بات تھی۔ اسے دیکھ کر اندر سے میں بھی لرز جاتا تھا۔ مجھے ٹیکسی سے اترتا دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھے، بولے "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"خیر تو ہے نا؟"

"ہاں خیر ہی ہے۔ آئیں اندر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور تمام کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کرکے بولے "آپ سے میں نے کہا تھا نا کہ پولیس کے کاغذات سے میں آپ کا نام کٹوا دوں گا۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ پھر کیا کیا ہے آپ نے؟"

"مجھے ابھی ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے تھانہ فیروز والا سے اطلاع ملی ہے کہ پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے نہر کے قریب دو آدمی مار دیے ہیں، پولیس مقابلے میں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے، کون لوگ تھے وہ؟"

"تھانیدار کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکو تھے۔ پولیس نے انھیں للکارا تو انھوں نے سپاہیوں پر فائر کھول دیا۔ اس مقابلے میں دو ڈاکو ہلاک ہوگئے۔"

"اچھا پھر، اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"بات اتنی سی ہے کہ اُن میں سے ایک کا نام ہم غلام جیلانی رکھ لیتے ہیں۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہ ہوگا۔ دوسرے کا نام اسلم آہی ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں گویا مر چکا ہوں۔ غلام جیلانی زندہ نہیں رہا ہے۔"

"ہاں آپ کی بہتری کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ اس طرح آپ زیادہ اطمینان سے زندگی گزار سکیں گے۔ کون جانے پولیس کے ریکارڈ میں کس کس آدمی کو مار دیا گیا ہے۔" اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا "وہ۔۔۔ وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا اب؟"

"آپ اپنی کوئی تصویر، کوئی انگوٹھی، کوئی شناختی کارڈ

یا اس قسم کی کچھ اور چیزیں مجھے دے دیں۔ میں اُن کو لاشوں کی جیبوں میں ڈال دوں گا۔"

"ہاں۔ یہ بات آپ نے صحیح کہی ہے۔ کیا وہ لاشیں ابھی تک وہیں پڑی ہوئی ہیں؟"

"ہاں۔ انھیں پولیس نے ابھی تک نہیں اُٹھایا ہے۔ تھانیدار مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس قسم کی گنجائش پیدا کرے۔ میرا خیال ہے ہمیں ابھی وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں مگر آپ کی کوئی چیز میری جیب میں نہیں ہے۔ میری اپنی شناخت کا بھی ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میرا خیال ہے اس بارے میں زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اب اُٹھ جائیں۔ کیا کچھ ہے آپ کے پاس؟"

میں نے اپنی انگوٹھی اُتار کر اُن کے سامنے رکھ دی۔ اس پر میرا نام لکھا تھا۔ وہ بہت دنوں سے میرے ہاتھ میں تھی۔ ویسی ہی ایک انگوٹھی بہت عرصہ پہلے آپی نے بھی بنوائی تھی۔ دونوں پر ہمارے نام کا مخفف تحریر تھا۔

انگوٹھی ستنا جا صاحب نے اٹھالی اور اس پر لکھا نام پڑھ کر بولے "ہاں یہ ٹھیک رہے گی۔ اس کو کسی بھی لاش کی انگلی میں پہنا دیں گے مگر سوال یہ ہے کہ ان لاشوں کو روندا کیسے جائے۔ تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے؟"

"میری توہین نہیں ہونی چاہیے ستنا جا صاحب، میں تو مر ہی چکا ہوں مگر میرے مُردے کو خراب نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں جی! یہ بھی کوئی بات ہے۔ آئیں میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر انھوں نے ڈرائنگ روم سے مجھے اٹھایا اور باہر نکل کر جیپ میں جا بیٹھے۔ وہ جیپ انھیں سرکاری طور پر ملی تھی اور اس پر وہ دُور دراز کا سفر کر جاتے تھے۔

فیروز والا پہنچ کر وہ سیدھے تھانے جا پہنچے۔ تھانیدار اکرم لودھی شاید انہی کا منتظر تھا۔ ان کو دیکھ کر فوراً ہی باہر نکل آیا۔ اُن سے بڑے تپاک سے مِلا، بولا "کیا خیال ہے ستنا جا صاحب! میں نے وہ معاملہ آپ کے کہنے پر روک رکھا ہے۔"

"آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم وہ لاشیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں آپ نے اٹھوایا تو نہیں؟" وہ دبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تھانے کے اور لوگ اُن سے واقف نہیں تھے۔

"جی نہیں۔ وہ ابھی تک وہیں پڑے ہیں۔ دو سپاہی میں نے وہاں بٹھا رکھے ہیں۔"

"یہ بہت اچھا کیا آپ نے! پہلے وہ لاشیں ہم خود دیکھیں گے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے برآمدے سے ہٹ کر اپنے کمرے سے ٹوپی اٹھائی اور اُسے سر پر پہن کر ہمارے ساتھ چل دیا۔ جیپ ستنا جا صاحب خود چلا رہے تھے۔

"وہ آدمی کون ہے ستنا جا صاحب! آپ اس پر بہت مہربان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہے کوئی آدمی! بڑے صاحب اس پر مہربان ہیں۔ کرتا تو وہ کچھ بھی نہیں، نہ ڈاکو ہے، نہ چور، نہ اسمگلر، نہ جیب کترا۔ بس بدنام زیادہ ہو گیا ہے۔" ستنا جا صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خوش ہو رہے تھے کہ وہ اس رات مجھے ان تمام بدنامیوں سے بچا رہے تھے جو میرا مقدر ہو چکی تھیں۔ مجھے اس سارے معاملے کی نوعیت بہت ہی عجیب نظر آتی تھی۔ وہ لوگ کیا کرتے ہوں گے جن کے نام سرکاری ریکارڈ سے مٹا دیے جاتے ہیں۔ ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہوگا۔ وہ کسی پر کیسے ثابت کر سکتے ہوں گے کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ اُن پر تو کوئی اور ہی نام لاد دیا جاتا ہے جیسے میں اپنے ساتھ کر رہا تھا۔ کبھی میرا نام ہاشم خان تھا۔ اب میں سردار کریم نواز بن چکا تھا۔ کئی اور نام بھی مجھ پر حاوی ہو گئے تھے اور میں سوچتا تھا کہ اتنے سارے حصوں اور ناموں میں بٹ کر اصل غلام جیلانی تو ختم ہی ہو چکا تھا۔ کبھی مجھے ضرورت پڑی تو میں کیسے ثابت کر سکوں گا کہ میں ابھی مرا نہیں۔ جنگل بیلے میں ملنے والی کسی لاش کی تصویر اخبار میں چھاپ دینے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ فلاں آدمی کی لاش ہے مگر وہ اس بات پر مصر تھے کہ اخبار میں لاش کے نیچے میرا ہی نام لکھا ہوگا تو اس کی مصلحت ستنا جا صاحب ہی بہتر جانتے تھے۔ بلاشبہ یہ بہت اچھی بات تھی کہ وہ میرے سارے اعمال نامے پر ایک دم قلم پھیر دینا چاہتے تھے۔ مجھے ان تمام گناہوں کی سزا جزا سے محفوظ کر لینا چاہتے تھے جو مجھ سے سرزد ہو چکے تھے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ یہ غلام جیلانی جو اُن کے سامنے پھر رہا ہے کبھی جیل میں پھانسی کی کوٹھری تک بھی پہنچ چکا ہے۔ انھیں وہ قتل بھی یاد نہیں رہیں گے جو مجھ سے ہو چکے تھے۔ کچھ بھی تو انھیں میرے ماضی کے بارے میں یاد نہیں رہے گا۔ غلام جیلانی کی موت کے ساتھ ہی اس کی فائل بھی پرانے ریکارڈ میں رکھ دی جائے گی اور ستنا جا صاحب یہی چاہتے تھے۔ تاکہ میں زیادہ آزادی سے ان کے درمیان بیٹھ سکوں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ نکتہ بڑے صاحب نے خود ان کے کان میں ڈال دیا ہو؟ مجھے تو یہی نظر آتا تھا ورنہ ستنا جا صاحب مجھ پر ایسی مہربانی نہ کرتے۔ اور اب وہ اکرم لودھی کو بھی مجھ سے متعارف نہیں کروا رہے تھے۔ میری انگوٹھی اس وقت انہی کی جیب میں تھی اور میں تصوّر کے آئینہ خانے میں اس لاش کو دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کو وہ لوگ غلام جیلانی کے نام سے مشہور کر دیں گے۔ اس کی تصویر کے نیچے میرا ہی نام لکھا ہوگا۔ کوئی زندہ ہونے کے باوجود مردہ تصوّر ہونے لگے تو ایک طرح سے اس کی زندگی کا سارا تانا بانا کٹ جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ آدمی کون ہوگا جس کی لاش منوں مٹی تلے دب جائے گی مگر اس کے گھر والوں کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ اُن کا وہ آدمی کس طرف نکل گیا۔ اس کی ماں بہن بیٹی اور بیوی زندگی بھر اُس کی منتظر رہیں گی مگر وہ کبھی لوٹ کر گھر نہیں جا سکے گا اور کوئی انھیں نہیں بتا سکے گا کہ وہ آدمی کس کی درندگی کی نذر ہو گیا۔ کون اس کو جڑ سے اکھاڑ کر لے گیا؟ پتہ نہیں وہ بے گناہ تھا یا گناہ گار۔ کوئی کسی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔ قاتل سامنے بھی ہو تو بھی وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کا خنجر تھا جو مقتول کے دل میں اُتر گیا مگر وہاں سب کچھ پولیس کے سامنے بلکہ اُن کے منصوبے کے تحت وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اُن کی لاشوں پر اکرم لودھی نے دو سپاہی پہرے کے لیے بٹھا رکھے تھے۔

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ انوکھا منفرد اور حیرت انگیز۔ اور ہم اسی تماشے کو دیکھنے کے لیے فیروز والا تھانے سے نکل کر نہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نہر کی پٹری پر کچھ دیر چلنے کے بعد اکرم لودھی نے جیپ کا رُخ دائیں ہاتھ مڑوا دیا۔ ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہم درختوں کے ایک جھنڈ تک جا پہنچے۔ جیپ کی روشنیاں ہمیں راستہ دکھا رہی تھیں۔ ایک ٹارچ اکرم لودھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"گاڑی یہاں روک دیں ستنا جا صاحب! مقابلہ ادھر ہی ہوا تھا۔ اس جھنڈ کے پاس۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم جیپ سے اتر کر گھنے درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے جھنڈ کی دُوسری طرف نکل گئے تو اکرم لودھی کے قدم ایک دم رُکنے لگے۔ دونوں سپاہی زمین پر آڑے ترچھے پڑے تھے، یوں جیسے وہ مر چکے ہوں مگر لاشیں وہاں کہیں بھی نہیں تھیں۔

"یہ... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ستنا جا صاحب! وہ... وہ لاشیں تو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان سپاہیوں کو کیا ہوا؟ یہ زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔" ستنا جا صاحب نے لاشعوری طور پر اپنا پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ اکرم لودھی ٹارچ سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ روشنی کو گھما کر اس نے دونوں سپاہیوں پر نظر ڈالی اور اُن کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔

"لگتا ہے یہ دونوں بے ہوش ہیں۔"

"میرا خیال ہے ان کے سروں پر ضرب لگائی گئی ہے۔" ستنا جا صاحب نے ان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھی پھر یہاں آئے تھے۔ وہ دونوں لاشیں اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کتنے آدمی تھے وہ؟"

"وہ چار آدمی تھے۔ چھوٹتے ہی ان لوگوں نے ہم پر گولی چلا دی۔ کسی سوال جواب کا موقع ہی نہیں ملا۔ جواب میں ہم نے بھی اُن پر فائر کھول دیا۔ میرے ساتھ پانچ آدمی تھے۔ دو کو میں یہاں بٹھا کر تھانے واپس چلا گیا مگر... یہ تو بہت بُرا ہوا ستنا جا صاحب! سپاہیوں کی بندوقیں بھی وہ لوگ اُٹھا کر لے گئے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جنگل ہمارے لیے محفوظ ہے۔ رات بہت تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

"خود کو بچائیں ستنا جا صاحب! یہاں سے نکل چلیں۔ وہ پلٹ کر پھر حملہ کر سکتے ہیں۔" میں نے صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ستنا جا صاحب کی توجہ اس تاریکی کی طرف دلائی جو ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی مگر ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں کسی نے عقبی سمت سے گولی چلا دی۔ جنگل اس گولی کی آواز سے لرز اٹھا۔ میں نے ستنا جا صاحب کو ایک دم نیچے گرا دیا۔ دوسری گولی ہمارے وجود کو چیر سکتی تھی۔

"اوئے اکرم لودھی! تو بچ کر نہیں جا سکتا ہے۔" کسی نے تھانیدار کو للکارتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "تو ہمارے دو آدمی مار چکا ہے۔ یہاں ہم تیرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔" اس کے ساتھ ہی تڑ تڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ لوگ اندھیرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اکرم لودھی کے حوصلے کی میں داد دیتا ہوں، پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ ایک درخت کی اوٹ لے کر اس نے اُن آوازوں کی سمت اندھا دھند دو گولیاں چلائیں مگر اپنے مدِمقابل کے اصل ٹھکانے کا تو اسے بھی علم نہیں تھا۔ وہ اُسے نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس کی گولیوں کا یہ اثر ہوا کہ ذرا دیر کے لیے دُوسری طرف سناٹا سا چھا گیا۔ میں اور ستنا جا صاحب ابھی تک زمین پر لیٹے تھے۔ آوازیں اب قریب ہو گئی تھیں۔ وہ ہمیں للکارتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک بار پھر اُن لوگوں نے اکرم لودھی کو للکارتے ہوئے دو گولیاں چلائیں۔ مگر اندھیرا اُن کے لیے بھی اتنا ہی دبیز تھا۔ وہ بھی بہت محتاط انداز سے اپنا حلقہ ہمارے گرد تنگ کر رہے تھے۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ گولیاں صرف ایک ہی آدمی چلا رہا تھا۔ پتہ نہیں اُن کی تعداد کیا تھی۔ اگر یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو اُن سے نمٹنا زیادہ آسان ہوتا۔

"آپ ادھر ہی بیٹھے رہیں۔" یہ کہہ کر میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لیا اور زمین پر گھسٹتے ہوئے میں ایک درخت کی اوٹ میں جا پہنچا۔ اب وہ آدمی مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا جس کی اسٹین گن ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہو رہی تھی۔ دوسرے لوگ مجھے ابھی تک نظر نہیں آئے تھے۔

"سامنے آ جاؤ اکرم لودھی! تم تجھے زندہ واپس نہیں جانے دوں گا۔" اس آدمی نے پھر تھانیدار کو للکارا۔ اس کی آواز ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کتنا ہے۔ جیسے ہی اس نے آواز بلند کی، میں نے پستول کی نال بلند کی اور اس میں سے دو گولیاں چلا دیں مگر وہ اتنا بے خبر نہیں تھا، وہ ایک دم زمین پر لیٹ گیا۔ گولیاں اس کے اوپر سے گزر گئیں۔ عین اس وقت دوسرے آدمی نے میرے پستول سے نکلتے شعلوں کو دیکھ کر مجھ پر گولی چلا دی مگر یہ اس کی بھول تھی۔ مجھے ان شعلوں کا احساس تھا۔ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ گولیاں سیدھی درخت کے تنے میں لگیں اور بجھ گئیں۔ ان کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے، اب وہ بہت زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ عین اس وقت مجھے اپنے سامنے روشنی سی روشنی نظر آنے لگی۔ ستناجا صاحب اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر جیپ تک جا پہنچے تھے اور انھوں نے اس کی ہیڈ لائٹس جلا دی تھیں۔ میں اس گھڑی درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ روشنی ہوئی تو سامنے کا سارا منظر اُجالے میں نہا گیا۔ وہ دو آدمی تھے اور دونوں ہی اسٹین گنوں سے مسلح تھے۔ روشنی کی اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ستناجا صاحب نے اپنا پستول ان پر داغ دیا۔ وہ بے خبری میں مارے گئے تھے۔ ابھی وہ پلٹ بھی نہیں سکا تھا کہ گولی اس کے پہلو میں گھس گئی اور وہ اسٹین گن سمیت زمین پر لُڑھک گیا۔ دوسرے آدمی نے اپنے ساتھی کا یہ حال دیکھا تو وہ پاگلوں کی طرح جیپ کی طرف گولیاں برسانے لگا مگر اسے زیادہ مہلت نہیں ملی۔ میں سامنے ہی تو تھا۔ جیسے ہی وہ پلٹا میں نے گولی اس کی گردن میں سے گزار دی۔ وہ بھیانک چیخ مار کر اچھلا اور پھر اوپر نہیں اُٹھ سکا۔ موت نے اسے وہیں آ لیا تھا۔ وہ جنگل ان کے لیے ہلاکت کا سامان بن گیا تھا۔ جیسے ہی وہ آدمی نیچے گرا ستناجا صاحب جیپ سے ہٹ کر اس کی طرف دوڑے مگر اس طرح جیسے کوئی چیتا ہزار احتیاطیں بروئے کار لا کر شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ اس عرصے میں اکرم لودھی بھی درخت کی اوٹ چھوڑ کر آگے نکل آیا۔ مگر اس کی موت نے اسے مہلت نہیں دی۔ نیچے گرے ہوئے آدمی نے نزع کے عالم میں اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اسٹین گن اٹھائی اور میرے سامنے اس نے اکرم لودھی کو چھلنی کر دیا۔

میری اور ستناجا صاحب کی گولیاں ایک ساتھ چلیں، وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا مگر اس کی گولیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ اکرم لودھی چیختا ہوا پیچھے ہٹا اور پھر دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ اس جوان کی موت واقعی پولیس مقابلے کی موت تھی۔

میں اور ستناجا صاحب دوڑ کر اس کے پاس پہنچے مگر وہ اس وقت تک آخری ہچکی لے چکا تھا۔ گولیاں سب کی سب اس کے وجود کے اندر گہری دھنس گئی تھیں۔ موت نے اسے اپنے دریدہ بدن کو سمیٹنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ اس کا منہ درد کی شدت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے جیلانی صاحب! میں اس لیے تو ادھر نہیں آیا تھا۔" ستناجا صاحب نے اکرم لودھی کی کھلی آنکھیں بند کر دیں۔

میں وہاں سے ہٹ کر ان آدمیوں کی طرف نکل گیا جن کی آوازوں سے تھوڑی دیر پہلے جنگل دہل رہا تھا۔ وہ اکرم لودھی سے انتقام لینا چاہتے تھے اور اپنے اس منصوبے میں وہ بہت کامیاب رہے تھے مگر یوں کہ بدلے کی دھن میں وہ اپنی بھی جانیں گنوا بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں ان دو سپاہیوں کو انھوں نے قتل کیوں نہیں کیا تھا؟ سوچتے ہوں گے کہ ان کا کیا ہے، یہ تو محض حکم کے پابند ہیں۔ ان میں سے ایک کی لاش اُدھڑ گئی تھی۔ اتنی گولیاں اس پر چلی تھیں کہ اس کا بدن چھلنی ہو رہا تھا۔ اتنے میں ستناجا صاحب بھی وہاں آ گئے۔ حیرت ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو نہیں بیٹھے تھے۔ انھوں نے دونوں آدمیوں کی تلاشی لی مگر ان کی جیبوں سے سگریٹ، ماچس اور ساڑھے چار سو روپوں کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ اپنی شناخت ان لوگوں نے بھی ساتھ نہیں رکھی تھی۔ وہ بھی اس جنگل میں بے نشان ہی پہنچے تھے۔ شاید ان کے استاد نے انہیں یہی بتایا ہو۔ دونوں بہت پتلے ہوئے مضبوط قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ شاید وہ دونوں بھائی تھے۔ بال ان کے گھنگھریالے تھے اور دونوں نے ایک ہی طرز کی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ ستناجا صاحب نے وہ رقم ان کی جیبوں ہی میں رہنے دی اور انگوٹھی نکال کر انھوں نے ایک آدمی کی انگلی میں پہنا دی۔

"مرنے کے بعد یہ آدمی غلام جیلانی بن گیا ہے۔"

"ایسا نہ کریں ستناجا صاحب! مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"وحشت! اس جنگل میں اور کیا ہو گا؟" یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس کو دو حصوں میں کاٹ کر ایک پر انھوں نے قلم نکال کر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس میں وہ منظر مجھے بڑا ہی ہولناک دکھائی دیتا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"اس کو غلام جیلانی بنا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے کاغذ کا ایک پُرزہ مجھے دے دیا، بولے "اسے پڑھ لیں، یہ اس کی جیب میں رہے گا۔"

اس رقعے پر ستناجا صاحب نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے لکھا تھا۔

"پیارے غلام جیلانی! تم آج رات ہیں فیروز والا میں ٹھنڈی رکھ میں ملو۔ اپنے اوزار وغیرہ ساتھ لیتے آنا۔ ایک زبردست پروگرام تمھارا منتظر ہے۔ اسلم آبی کو بھی ساتھ لے آنا، یہ بہت ضروری ہے۔

نوٹ:۔ تمھارا علیا گدری۔"

"یہ خط ہے جو غلام جیلانی کو علیا گدری نے لکھا اور وہ سیدھا ٹھنڈی رکھ پہنچ گیا۔" یہ کہہ کر انھوں وہ رقعہ دُہرا کر کے سامنے پڑے آدمی کی جیب میں ڈال دیا اور۔۔۔ اور پھر میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ستناجا صاحب نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں اور پھر وہ اس لاش کی طرف لپکے جو اب اندھیرے میں مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک موٹا سا ڈنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"اس کا چہرہ مسخ کر رہا ہوں جیلانی صاحب! یہ ہمارا پروگرام تھا۔"

کوئی دس منٹ بعد انھوں نے اکرم لودھی کی ٹارچ جلا دی۔ میرے سامنے پڑے آدمی کا چہرہ انھوں نے بُری طرح مسخ کر دیا تھا، اتنا کہ اب اس کا پہچان لینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جانور نے اس کو بھنبھوڑ ڈالا ہو۔

"آؤ اب واپس چلتے ہیں۔ موت برحق ہے اور اس سے کسی آدمی کو مفر نہیں۔"

"مگر۔۔۔ مگر اکرم لودھی کا کیا کریں۔ یہ۔۔۔۔ اس کو اٹھا لینا چاہیے۔"

"نہیں۔ یہ سارا کام پولیس کرے گی، ہمیں اب یہاں کچھ نہیں کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ جب وہ جیپ کو وہاں سے ہٹا کر نہر کی پٹری پر جا چڑھے تو بولے "کبھی کبھی آدمی کو حیوان بھی بننا پڑتا ہے مگر اس مُردے کی بے حرمتی تو بہت ضروری تھی سردار کریم نواز صاحب! ورنہ لوگ اسے پہچان لیتے۔" ان کا چہرہ اتنا کرخت ہو گیا تھا کہ مجھے ان سے خوف آنے لگا تھا۔ ان جیسا آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنے بڑے عہدے پر فائز تھے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر بے رحم اور سنگدل بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں اکرم لودھی کی موت کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا۔ ایک منٹ کے لیے بھی وہ اس کے لیے سوگوار نہیں ہوئے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ جنگل میں مر گیا ہے، اس کی لاش رات کے اندھیرے میں درندوں کی نذر ہو جائے گی۔ کوئی اس کے پیچھے گھر کی دہلیز کے اندر بیٹھا بے طرح پریشان ہو گا۔ اس کے بیوی بچے اس کے بغیر برباد ہو جائیں گے۔ کوئی ماں ہو گی جو اکرم لودھی کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ وہ زندگی بھر سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہے گی۔ کوئی بیوی ہو گی جسے اپنے شوہر کی موت زندہ درگور کر دے گی۔ کسی بات کا انھیں احساس نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب جھلے ان کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سے بار بار گزر چکے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی اور وہ سب کچھ انہوں نے مجھے ایک نئے قالب میں ڈھالنے کے لیے کیا تھا۔ وہ مجھے سردار کریم نواز کی حیثیت سے دیکھنے کی آرزو میں مرے جاتے تھے۔ اس کام کے لیے انھیں کچھ بھی کرنا پڑتا وہ کر جاتے اور وہاں اس ٹھنڈی رکھ میں تو انھوں نے مُردوں کی شناخت ہی بدل دی تھی اور اپنے ایک اہم عہدیدار کو خود مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے زیادہ تو انھوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ مگر۔۔۔ مگر میرے لیے وہ سب کچھ ایک اچنبھے سے کم نہیں تھا۔

جب ہم فیروز والا پہنچے تو وہ بولے "یہ جیپ اپنے ساتھ لے جائیں اور سیدھے اپنی کوٹھی چلے جائیں۔ میں رات ادھر ہی گزاروں گا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی۔۔۔۔"

"ہاں ہاں، مجھے یہاں ہی رہنا چاہیے۔ اکرم لودھی مر گیا ہے، چار آدمی وہاں موت کے گھاٹ اُتر گئے ہیں اور میں موقعے کا گواہ ہوں اور پولیس افسر بھی ہوں، ٹھیک ہے نا؟ اب آپ جائیں۔" یہ کہہ کر وہ جیپ سے اُتر گئے۔ اسٹیئرنگ انھوں نے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ میں ہکا بکا ہو کر ان کے کہنے کے مطابق جیپ ساتھ لے کر سیدھا لاہور جا پہنچا۔ وہاں میرا اب کوئی کام نہ تھا۔ مجھے اپنے ہی گھر پر یہ رات گزارنی چاہیے تھی۔ میرے وجود کی ساری سلوٹیں کھل گئی تھیں۔ میں۔۔۔ میں شاید واقعی سردار کریم نواز بن چکا تھا۔ غلام جیلانی کو میں شاید جنگل میں دفن کر آیا تھا۔ میرے پاؤں میں بندھی چھوٹی کا چمڑا اُدھڑنے لگا تھا۔ میں۔۔۔ میں ایک نئے قالب میں ڈھل رہا تھا۔ اب کوئی ایسا نہیں تھا جو مجھے غلام جیلانی کہہ سکے اور شاید اسلم آبی بھی وہیں رہ گیا تھا۔ ستناجا صاحب نے ایک تیر سے دو شکار مار لیے تھے۔ آبی کو بھی انھوں نے پولیس کے ریکارڈ سے ہمیشہ کے لیے نکلوا دیا تھا۔ وہ بھی اب بڑے اطمینان سے زندگی گزار سکے گا۔ ستناجا صاحب نے ہماری ساری ہی مشکلیں آسان کر دی تھیں مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ انھوں نے کیوں کیا؟ آخر انھیں ہم سے ایسی کیا ہمدردی ہے۔ کوئی کسی کے لیے یوں تو جاں سپاری اور جاں نثاری کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ آخر ان کے ذہن میں علیا گراری کا نام کیسے آیا؟ کیا وہ جانتے تھے کہ وہ لوگ اس کے ساتھی ہیں؟ اُس آدمی کو جس کی سارے صوبے میں دھوم مچی تھی، بہت بدنام آدمی تھا وہ کئی قتل اور کئی ڈاکے پولیس نے اس کے کھاتے میں ڈال رکھے تھے مگر وہ اب تک اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے۔ البتہ وہ ستنا جا صاحب کو بہت یاد تھا۔ اُن کی بدقسمتی میں پھنس کر وہ بھی شاید برباد ہو گیا تھا۔ ایک اور گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ غلام جیلانی کا دوست تھا۔ اسے خط لکھ کر اس نے ٹھنڈی رکھ بلوایا تھا یہ کہہ کر کہ ایک زبردست پروگرام اس کا منتظر ہے۔ اسلم آبی کو بھی اس نے بلوایا تھا۔ اس غلام جیلانی کی جیب میں رقعہ تو یہی ظاہر کرتا تھا۔ اب پولیس باقی معاملات کو خود سنبھال لے گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس کی موت کن حالات میں واقع ہو گی۔ ٹھنڈی رکھ نے سب کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور وہاں سے صرف میں اور ستنا جا ہی بچ سکے تھے مگر کس لیے؟ اس بات کا جواب مجھے معلوم نہیں تھا۔ پتہ نہیں میری خمپارہ تقدیر مجھ سے کیا کچھ چاہتی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں جیپ میں سوار بالآخر رات کے بارہ بجے اپنے گھر پہنچا۔ حیدر اس وقت جاگ رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر وہ فوراً ہی باہر آ گیا اور گیٹ کھول کر بولا "آپ کہاں چلے گئے تھے سردار صاحب؟ میں تو سخت پریشان تھا۔"

"کیوں۔ کیوں پریشان تھا تو؟ یہ عورتوں جیسی عادتیں چھوڑ دے۔ کوئی کسی کے لیے پریشان نہیں ہوتا ہے حیدر سا" میں نے جیپ کو گیٹ سے گزارتے ہوئے کہا۔

حیدر بن رہا تھا۔ مجھ پر یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ واقعی بہت پریشان رہا ہو۔ یہ بھی اُن کا حق ہے جو آپ کی پناہ میں ہوتے ہیں انھیں آپ سے زیادہ آپ کی فکر ہوتی ہے۔ کم از کم اس کے اظہار میں وہ غفلت نہیں برتتے ہیں اور اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ آپ کے پیچھے کوئی تو ایسا ہے جو آپ کو یاد کرتا ہے آپ کی سلامتی کی دعائیں کرتا رہتا ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ اس سے آدمی کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ اسے کارزارِ حیات میں زیادہ دلجمعی سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

لباس تبدیل کر کے میں اسی وقت بستر میں جا گھسا۔ حیدر بہت پوچھتا رہا کہ میں چائے پی لوں، قہوہ پسند ہو تو وہ بنا دے مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ مجھے تنہائی کی ضرورت تھی۔ ایسی تنہائی کی جو مجھ پر ماضی اور مستقبل کے سارے راز عیاں کر دے۔ میں بستر پر لیٹ کر بہت دیر تک صورتِ حال کی اس نئی ڈگر پر غور کرتا رہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ستنا جا صاحب کا رویہ میرے لیے بدستور حیرت انگیز تھا۔ اُن کو سمجھ لینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نہ اُن کے ماضی سے واقف تھا نہ حال سے مگر جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ بڑا ہی پریشان کن تھا۔

اگلا پورا دن میں نے اسی طرح بستر میں لیٹے لیٹے گزار دیا۔ حیدر سارا دن میری خدمت میں لگا رہا۔ حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ میں کسی کو فون بھی نہ کر سکا۔ بس بے حس و حرکت ہو کر بستر پر لیٹا رہا جیسے زندگی ساکن ہو گئی ہو۔ میں سانس بھی لیتا تھا تو اُس پر دوہری دھار کے خنجر کا شبہ ہوتا تھا۔ پچھلی رات کا ہولناک منظر بار بار میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے۔ کیا کرنے جا رہے تھے مگر اُن کی لاشیں ہی وہاں رہ گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی شناخت ہی بدل دی گئی تھی۔ اُن کے مسخ چہرے ٹھہر ٹھہر کر میرے تصور میں ابھرتے تھے۔ ستنا جا صاحب نے کمال کر دیا تھا۔ ایک شمہ برابر جلد بھی ان کے چہرے پر سالم نہ رہ سکی تھی۔ غلام جیلانی کو انھوں نے مکمل طور پر مسخ کر دیا تھا اور یہی حال اسلم آبی کا کیا تھا۔ پروردگار! میں کیسے کیسے ہولناک منظر دیکھنے کے لیے زندہ رہ گیا ہوں۔ کوئی گولی ایسی نہیں جو میرے دل میں اُتر سکے؟ اس روز میں نے مرنے کی کیسی کیسی آرزو نہیں کی۔ ایک اس اسیبہ کا خیال آتا تھا تو یہ آرزو اور زیادہ گہری ہونے لگتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہو گی اور کہاں ہو گی۔ میں اُسے ساری دنیا میں ڈھونڈ آیا تھا مگر وہ کہیں مل ہی نہ سکی تھی۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔ کاش اس بہن جی نے ہی میری کچھ مدد کی ہوتی مگر... مگر وہ بھی آں باں شاں کر کے رہ گئی۔ ایک اس کا پردہ ہی مجھے لے ڈوبا تھا۔ اس کو میں سمجھ سکا تھا اور نہ آبی اور ہم حیران پریشان ہو کر وہاں سے نکل آئے تھے۔ کاش... میں اس تک پھر پہنچ سکتا۔ میں نے سوچا کہ اس ستنا جا صاحب کے جھنجھٹ سے جیسے ہی مجھے فرصت ملی میں اس کی طرف پھر جاؤں گا تاکہ میں دیکھ تو سکوں کہ وہ کیا چیز ہے۔ اور پردے کی وہ اتنی زیادہ پابند کیوں ہے؟ اس کا اتنا پتہ مجھے اپنی اسیری کے دوران ملا بھی تھا مگر فوزیہ نے وہ برباد کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ بہن جی کے کسی آدمی نے وہ رقعہ جان کے کھانے کے اندر رکھ دیا تھا جس کا علم فوزیہ کو نہ ہو سکا ورنہ وہ مجھے بتا نہ دیتی کہ بہن جی کے آدمی اس سے ملے تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی بتا دیتی مگر میری وہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

اگلے دن صبح سویرے حیدر اخبار لے آیا۔ وہ اس کے ہی صفحے میں گم تھا۔ بولا "حد ہو گئی سردار صاحب! یہ دیکھیے خبر پڑھیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار میرے سامنے ڈال دیا۔ ٹھنڈی رکھ کا قصہ بالآخر چھپ گیا تھا۔ پچھلی رات تو انھیں خبر بھی نہ ہو سکی ہو گی مگر اب غلام جیلانی اور اسلم آبی کی مسخ شدہ لاشیں میرے سامنے تھیں۔ ایک طرف اکرم لودھی مرا پڑا تھا۔ دونوں سپاہی بھی بے ہوش تھے۔ سب کی تصویریں چھپی تھیں اور وہ سارے کا سارا قصہ ٹھنڈی رکھ سے تعلق رکھتا تھا۔ اخبارات نے لکھا تھا کہ کل رات فیروز والا کے قریب ٹھنڈی رکھ بس میں چار ڈاکو پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے ایک کا نام غلام جیلانی تھا اور دوسرے کا اسلم آبی۔ غلام جیلانی وہ مفرور مجرم تھا جو پھانسی کی کوٹھڑی سے فرار ہو گیا تھا۔ پولیس کو ایک عرصے سے اس کی تلاش تھی مگر وہ ایسا عیار مجرم تھا کہ وہ کئی بار ان کے ہاتھ آ کر بھی فرار ہو گیا۔ پچھلے دنوں پولیس نے اسے گرفتار بھی کیا تھا مگر وہ پھر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی گرفتاری پر پولیس نے پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔ پرسوں رات فیروز والا کے تھانیدار اکرم لودھی گشت پارٹی کے ساتھ ٹھنڈی رکھ کے قریب سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے ڈاکوؤں کو للکارا جس پر ان کے درمیان فائرنگ ہوئی جس سے چاروں ڈاکو ہلاک ہو گئے۔ اکرم لودھی بھی اس مقابلے میں شہید ہو گئے۔ ان کے دو سپاہی زخموں سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئے۔

غلام جیلانی کی جیب سے ایک رقعہ ملا ہے جو اُسے علیا گراری نے لکھا تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی منصوبہ بنا کر کسی جگہ ڈاکا ڈالنے جا رہے تھے کہ پولیس نے اُن کو نرغے میں لے لیا۔ دوسرا آدمی اسلم آبی تھا۔ دوسرے دو ڈاکوؤں کا پتہ نہیں چل سکا۔ پولیس اُن کے بارے میں تفتیش کر رہی ہے۔ غلام جیلانی اور اسلم آبی کے چہرے اس حد تک مسخ ہو چکے تھے کہ انھیں پہچان لینا مشکل تھا مگر اس رقعے کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلام جیلانی ہی تھا۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ اس ساری کہانی میں ستنا جا صاحب کا ذکر کہیں نہیں آیا تھا، کسی بھی جگہ نہیں۔ پولیس افسروں نے اکرم لودھی کی بیوہ کو پچاس ہزار روپے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ اکرم لودھی اس کا ہر طرح حقدار تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ستنا جا صاحب نے جان بوجھ کر اس قصے سے اپنا نام حذف کروا لیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ غلام جیلانی اور اسلم آبی اب ہر لحاظ سے مُردہ تصور کیے جائیں گے۔ اب پھر کہیں دوبارہ اُن کا نام نہیں لیا جائے گا۔ سارے پولیس ریکارڈ پر اب قلم پھیر دیا جائے گا۔ کسی بھی مقام پر ان دونوں کو زندوں میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ گویا میں اس روز نیا جنم لے رہا تھا۔ اب میرا نام سردار کریم نواز ہو چکا تھا۔ اور اسی نام کی تختی میری کوٹھی پر لگی تھی۔ اب غلام جیلانی سے میرا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا مگر کیا ایسا ممکن تھا؟ کوئی اپنے ماضی سے کیسے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ سات جنم تو آدمی کو ملتے ہی ہیں۔ ہندو دیو مالائیں تو اور بھی بہت کچھ بتاتی ہیں۔ سنا ہے آٹھویں جنم میں تقدیر بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ شاستروں میں یہی لکھا ہے پھر وہ سانپ بنے کہ ریچھ اس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کیا میں بھی آٹھویں جنم میں پہنچ چکا تھا؟ میں زندہ تھا، میرا ماحول وہی تھا۔ وہ ماں بھی زندہ تھی جس نے مجھے جنم دیا۔ وہ معاشرہ بھی اپنی تمام تر آلائشوں کے باوجود زندہ تھا جس نے مجھے پالا تھا۔ پھر وہ کیسے سمجھ لیں گے، کیسے برداشت کر لیں گے کہ یہ شخص جو اب سردار کریم نواز کہلانے لگا تھا وہی چہرہ لے کر پھر اُن کے سامنے پھر رہا ہے جس کو وہ مردہ سمجھ رہے ہیں۔"

اخبار میں نے الگ ڈال دیا۔ حالات میرے ساتھ عجیب سی لپاڈکی کھیلنے لگے تھے۔ ابھی ستنا جا صاحب کی جیپ میرے ہی پاس تھی۔ بیچ میں سے اتنا سارا وقت گزر گیا تھا مگر انھوں نے ابھی تک مجھے فون بھی نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہے تھے۔ اب تک انھوں نے گاڑی کیوں نہیں منگوائی تھی؟ اس بات کا ذکر انھوں نے بڑے صاحب سے بھی ضرور کیا ہو گا۔ عین ممکن ہے کہ میری اصل شناخت مٹا دینے کا مشورہ بڑے صاحب نے ہی دیا ہو مگر وہ مجھے کس نسخے میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آخر مجھ سے میرا ماضی چھین کر انھیں کیا مل سکتا تھا۔ ڈھلوں صاحب ہی مجھ سے مل لیتے تو بات کھل کر سامنے آ جاتی۔

نو بجے تک میں لباس تبدیل کر کے باہر لان میں جا بیٹھا۔ کوٹھی کے خالی خالی ڈھنڈار کمرے مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ حیدر بڑی جی جان سے میری خدمت میں لگا رہتا تھا۔ میرے جوتے بھی اس نے چمکا دیے تھے اور لباس بھی اس نے مجھے بے داغ پہنا دیا تھا۔ وہ پوچھتا ہی رہا کہ میرے کندھے پر زخم کیسے آیا ہے مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ اس کی باتوں سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے مگر کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ اطمینان سے ساری بات کہہ سکے جو اس کے ذہن میں افراتفری مچا رہی ہے۔ تھا وہ بہت ہی سادہ لوح آدمی۔ اور اب وہ خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے لیے وقف کر چکا تھا مگر میرے اپنے جھمیلے اتنے زیادہ تھے کہ میں اس کو سامنے بٹھا کر اس کے وجود کو نہ کھول سکا۔ میں نے سوچا میں آج

رات اس سے عالیہ کے بارے میں وہ سب کچھ پوچھ لوں گا جو اسے معلوم ہے۔

کوئی سوا نو بجے اچانک گیٹ پر ایک کار آ ٹھہری۔ لان سے گیٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ کار کا دروازہ کھلا تو معلوم ہوا کہ سامنے ستناجا صاحب کھڑے ہیں۔ حیدر نے دوڑ کر گیٹ کھولا تو وہ کار کو وہیں چھوڑ کر اندر آ گئے۔ وہ اس وقت وردی میں نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ یونہی ٹہلنے کے لیے نکلے ہیں۔ میں اٹھ کر ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چھوٹتے ہی بولے۔ "آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ میرے سامنے ہی رکھا ہے۔ آپ کے کارنامے کی تفصیل میں نے پڑھ لی ہے۔"

"میرا نہیں، یہ آپ کا کارنامہ تھا۔ اصل میں تو مجھے آپ ہی کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ستناجا صاحب کہ آپ نے میری عمر بڑھا دی ہے۔"

"یہ بہت ضروری تھا سردار صاحب! بڑے صاحب کی مجھ کو یہی ہدایت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ کو ہر الزام سے محفوظ کر دوں۔"

"مگر... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چاہتے تھے۔"

"ان کی مصلحتیں وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، مجھے تو حکم کی تعمیل کرنی تھی سو وہ میں نے کر دی۔"

"کسی نے بھی انھیں نہیں پہچانا؟"

"نہیں۔ کوئی بھی ان کا وارث پیدا نہیں ہوا۔ ویسے بھی غلام جیلانی کا وارث کون ہو سکتا ہے۔ میں آج آپ کو ایک خاص کام پر بھیج رہا ہوں اگر آپ تیار ہوں تو میں کہوں۔"

"آپ حکم کریں۔ اب تو آپ کے سوا مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے سردار صاحب! ہم دراصل یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ لوگ جو ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں انھیں ہم اس سازش سے پہلے ہی ختم کر دیں۔"

"یہ بڑا نیک کام ہوگا مگر یہ ہوگا کس طرح؟"

"اس حسین لنگاہی کا ذکر سنا تھا آپ نے؟"

"جی ہاں۔ مستان شاہ بتا رہا تھا۔"

"اصل میں ان کا سرغنہ وہی ہے۔ میں نے اپنے طور پر تفتیش کی ہے۔ کوثر جنجوعہ اور سعید الدین اس کے ساتھ ہیں۔ ان کو ہم نے چھوڑا تو معلوم ہوا کہ کل شام وہ سیدھے حسنین لنگاہی کے پاس پہنچے تھے۔"

"اچھا پھر؟ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ایک تو ہمیں ان لوگوں کی خفیہ بات چیت کا ریکارڈ چاہیے۔ یہ کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ ایک انتہائی طاقتور ٹیپ ریکارڈر میں آپ کو دے دوں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو آپ حسنین کو بے بس کر دیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ یوں کہ آپ کسی نہ کسی طرح اس کی دونوں بیٹیوں کو اغوا کر لائیں۔ وہ خود ہاتھ جوڑتا ہوا ہمارے پاس آئے گا۔"

"یہ کام آپ کسی پولیس والے کے سپرد کیوں نہیں کر دیتے؟"

"نہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔"

"مگر ان کا طریق کار بھی وہی ہوگا اور میں بھی انھی کی طرح کام کروں گا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہو سکے تو آپ اس کی کسی بیٹی سے دوستی کر لیں۔ ایسا نہ ہو تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔"

"مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا؟"

"فائدہ یہی ہوگا کہ حسنین بھول ہی جائے گا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ اس کی ساری ستیا دھری رہ جائے گی۔"

"مگر یہ اچھی بات نہ ہوگی، یہ بڑی کمینی حرکت ہوگی۔"

"مگر یہ حرکت بہت ضروری ہے۔ دشمن کو ایسی جگہ مارنا چاہیے جہاں اسے پانی نہ ملے۔"

"ویسے تو میں آپ کا ہاتھ بندھا غلام ہوں ستناجا صاحب! مگر سوچ لیں آپ بدنام ہو سکتے ہیں، وہ بہت واویلا مچائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہوگی کہ اس میں ہمارا کوئی دخل ہے۔ لڑکیاں بالغ ہیں اور کچھ ہاتھ پیر بھی مارتی رہتی ہیں۔ کالج میں پڑھ رہی ہیں۔ ایک ایف اے میں ہے اور دوسری بی اے میں۔"

"کس کالج میں پڑھتی ہیں؟"

"گجرات جاتی ہیں روز۔ کار ان کے پاس موجود ہے۔ ایک کا نام ریحانہ ہے اور دوسری کا جمیلہ۔"

"یہ ساری باتیں آپ کو معلوم ہیں تو آپ خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نہیں حضور! کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہوگا۔"

"بڑے صاحب کو اس بارے میں علم ہے؟"

"نہیں۔ یہ کام کر کے میں انھیں بتا دوں گا پھر حسین لنگاہی خود ہاتھ جوڑتا ہوا آئے گا۔"

"پھر اسے یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا بلکہ الٹا ہم اسے اپنا احسان مند بنا لیں گے کہ ہماری پولیس نے کیسا شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ لڑکیاں برآمد کروا لی ہیں۔"

"گویا مجھے اس معاملے میں براہ راست ان لڑکیوں پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں ڈالنا چاہیے، ضرور ڈالیں۔ وہ پھر آپ کو کہاں پہچان سکیں گی جب وہ برآمد ہو جائیں تو ہم کسی کو بھی ان کے سلسلے میں جیل بھجوا سکتے ہیں، یہ کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔"

"مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔"

"نہیں سردار صاحب! اس میں سوچنا کیا ہے بس کن فیکون والی بات ہونی چاہیے۔"

"اس کا اصل فائدہ کسے اور کیسے ہوگا؟"

"فائدہ یہ ہوگا کہ ہم حسنین لنگاہی پر احسان دھر کر اسے اپنا ممنون بنا کر اس کی پارٹی سے الگ کر سکتے ہیں۔ جب اس کی مغویہ بیٹیاں اسے مل جائیں گی تو وہ بڑے صاحب ہی کا نام جپے گا۔ بڑے صاحب نے اسے بڑے لالچ دیے ہیں مگر وہ ابھی تک انھی کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔"

"پھر وہ بہت معقول آدمی ہوگا، کیا خیال ہے؟"

"ہو سکتا ہے اور ہاں، بڑے صاحب نے آپ کے لیے ایک کاروبار بھی تجویز کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یعنی میں کوئی کاروبار بھی کر سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں! آپ کو وہ امپورٹ لائسنس دلانا چاہتے ہیں۔ جاپان سے آپ کوئی بھی چیز امپورٹ کریں اور آرام سے زندگی گزاریں۔"

"امپورٹ لائسنس! نہیں ستناجا صاحب! میں... مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"تجربے پر لعنت بھیجیں، آپ یہ کام کر آئیں پھر میں آپ کو لائسنس لے دوں گا۔ بڑے صاحب کے ایک اشارے کی ضرورت ہے۔"

"یہ کام مجھے کب کرنا ہوگا؟"

"بس آج ہی ادھر نکل جائیں۔ باقی باتیں آپ خود ہی سوچ لیں گے، بس اس سارے معاملے میں ہمارا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔ میں آج دوپہر کو یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

اتنے میں حیدر چائے کا سامان لے کر آ گیا۔ ستناجا صاحب نے اس سے ساری چیزیں لے کر میز پر رکھیں تو ان کا ارادہ دیکھ کر میں نے حیدر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ لان سے نکلا ستناجا صاحب بولے۔ "آپ میری یہ کار ساتھ لے جائیں۔ سارے کاغذات اندر موجود ہیں۔ لڑکیوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کریں۔ میں اس کام کے لیے آپ کو چھ دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اس میں دو پستول اور دس ہزار روپیہ بھی موجود ہے کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اپنا بریف کیس انھوں نے میرے سامنے رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے آپ اب بے فکر ہو جائیں۔ لڑکیوں میں سے ایک کا نام ریحانہ اور دوسری کا جمیلہ بتایا ہے نا آپ نے؟"

"ہاں۔ یہی نام ہیں ان کے۔ حسنین کو پوری طرح بے بس کر دیں سردار صاحب! ہم یہی چاہتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

کچھ ہی دیر بعد ستناجا صاحب نے کار لان میں سے گزار کر کوٹھی کے سامنے کھڑی کر دی۔ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی اس میں موجود تھا۔ وہ بھی انھوں نے مجھے دے دیا اور خود جیپ لے کر اسی وقت باہر چلے گئے۔ یوں جیسے وہ اپنے کسی بڑے ہی معتمد آدمی کو یہ فرض سونپ گئے ہوں۔ اور کہہ گئے ہوں کہ اس کے بغیر اس کی نوکری محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

دراصل وہ بڑے ہی بااختیار آدمی تھے۔ بڑا عہدہ تھا ان کا۔ کچھ اور لوگ بھی انھوں نے ایسے پال رکھے ہوں گے جن سے وہ مختلف نوعیتوں کے کام لیتے تھے مگر ان کا ذکر انھوں نے مجھ سے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ باہر نکلے تو میرے ذہن میں ایک بار پھر شدید خلجان ابھرنے لگا۔ میں مجبور تھا کہ ان کے حکم کی پابندی کرتا۔ مجھے انھوں نے اسی طرح باندھ لیا تھا۔ میری کوئی اپنی مرضی نہیں رہ گئی تھی۔ اب تو انھیں غلام جیلانی کے ٹھکانے کا بھی علم تھا۔ وہ کسی بھی وقت میرے پاس آ سکتے تھے۔ فون کا نمبر بھی انھیں معلوم تھا۔ ان سے بچ کر میں کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوٹھی بھی انھوں نے مجھے اسی لیے دلوا دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہمہ وقت ان کے سامنے رہوں۔ انھیں معلوم تھا کہ روپے پیسے کی مجھے کوئی کمی نہیں ہے۔ انھیں میرے کسی کام کا معاوضہ دینے کی بھی مجبوری نہیں تھی۔ گویا میں ایک طرح سے بلا تنخواہ ان کا ادنیٰ ملازم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ میں سمجھ رہا تھا مگر کر میں کچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ تا آنکہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں سے بھاگ جاتا۔ ایسی جگہ سر چھپا لیتا جہاں سے وہ مجھے کوشش کے باوجود تلاش نہ کر سکتے مگر میں یہ نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی مجھے یہ امید تھی کہ میں کسی نہ کسی روز آسیہ کو ڈھونڈ لوں گا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی تھی۔ اب بھی وہ کسی جگہ بیٹھی میری منتظر ہوگی۔ اب بھی اسے یہی آس ہوگی کہ میں کسی نہ کسی راستے چلتا ہوا اس تک ضرور پہنچوں گا۔ اس کی آس، اس کی امید مجھ سے ہی وابستہ تھی مگر کسی کو بھی وہ اپنا پتہ بتا کر نہیں گئی تھی۔ ایسے میں میں

ڈھونڈتا تو کہاں ڈھونڈتا، پھر بھی توقع میں یہی کرتا تھا کہ میں اچانک کسی دن اس کے پاس جا پہنچوں گا۔ وہ مجھے مل جاتی تو پھر میں اطمینان سے اس تارِ عنکبوت کو کاٹ دیتا جو سندرا کے گرد جالے کی طرح بُن چکے تھے۔ اسے بھی میں ہی آہو اور سکھیوں کے چنگل سے چھڑا سکتا تھا مگر یہ جب ہی ممکن تھا جب میں اپنے جھمیلے سے فرصت پا سکتا۔ کوئی اتنا سارا بوجھ اٹھا کر زندگی کے اصل منبع کی طرف کیسے لوٹ سکتا ہے۔ یہ ناممکن تھا۔

اب اس حسین لنگاہی کے معاملے نے مجھے یوں آدبایا تھا کہ میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ محسوس مجھے ہو رہا تھا کہ میں اپنے تمام تر جذباتی ہیجان کو الگ رکھ کر اس کام کو اپنے ذمے لوں گا تو زیادہ بہتر رہوں گا۔ مجھے ہر حال میں بڑے صاحب کو خوش رکھنا تھا ورنہ میرے لیے کسی طرح بھی زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اُن کی خوشنودی میں ہی میری زندگی کا راز مضمر تھا اور اب تو وہ مجھے امپورٹ لائسنس بھی دینے پر آمادہ تھے۔ پھر میں اُن کا اتنا سا کام بھی نہ کروں تو اس کے کیا معنی ہوں گے۔ مجھے ہر حال میں ستناجا صاحب کے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ کسی کام کے جواز اور عدمِ جواز کو الگ رکھ دوں۔ مجھے یہ سوچنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ حکم کیا ہے صرف اس کی انجام دہی میرا فرض ہونا چاہیے تھا اور بس۔ میں حالات کے شکنجے میں کچھ اس طرح پھنس چکا تھا اور میرے جرائم کچھ اس طرح ان دونوں کے علم میں آچکے تھے کہ میرا نیا قالب بھی مجھے لرزہ براندام کر دیتا تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھے گردن سے پکڑ کر تختۂ دار تک پہنچا سکتے تھے۔ اُن کے سامنے میری نظریں ہمیشہ کے لیے نیچی ہو گئی تھیں۔

دوپہر تک میں نے رختِ سفر باندھا اور حیدر کو خرچ کے لیے پانچ سو روپے دے کر میں نے گاڑی کا رُخ وزیرآباد کی طرف موڑ دیا۔ مجھے ستناجا صاحب کی وجہ سے اب ایک نیا مگر بڑا ہی پریشان کن مرحلہ درپیش تھا جس کو میں انتہائی مجبوری میں سرانجام دینے نکلا تھا ورنہ میری گردی جان وہیں کی وہیں نیلام کر دی جاتی۔ پہلی بار میں اپنی زندگی بچانے کے لیے ایک ایسا گناہ کرنے نکلا تھا جس میں میرے معتوبین کا قطعاً کوئی قصور نہ تھا۔ اپنے دل کی تسلی کے لیے بہرحال میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ دونوں بیبیاں میرے ہاتھ آگئیں تو میں انھیں ذرہ بھر تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اُن سے بڑی مروت سے پیش آؤں گا اور انھیں محض ایک امانت سمجھوں گا کہ انھیں میں ایک ایسی پریشانی میں ڈال رہا تھا جس کی وجہ کسی بھی طرح

حقدار نہیں تھیں۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ ستناجا صاحب اتنے بڑے عہدے پر فائز تھے، اتنا بالا بلند مقام تھا اُن کا۔ اور ایک زمانہ اُن پر انحصار کرتا تھا مگر وہ اندر سے ایسے سفلے نکلے اور ایسے کام پر مجھے مجبور کر گئے کہ میرے پاس اس کا کوئی جواز ہی نہیں تھا مگر وہ جو میں نے کہا ہے نا کہ اُن کے ماضی سے میں قطعاً ناواقف ہونے کے باوجود یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی وہاں رکھے گئے تھے اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کا ماضی کیا ہے۔ جس انداز سے انھوں نے بینک منیجر کو بے ہوش کیا تھا وہی میرے لیے اُن کو سمجھنے کے لیے بہت کافی تھا مگر کوئی تو ایسا ہو گا جو اُن کو اچھی طرح جانتا ہو گا۔ جب ہی تو اُن کو وہ ملازمت مل گئی تھی اور اب انھوں نے مجھے اپنا نائب بنا لیا تھا۔

ایک کام مجھے یہ سونپا گیا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح اُن کی خفیہ بات چیت کو ریکارڈ کر لوں مگر یہ کس طرح ممکن تھا؟ کوناری جنجوعہ اور سعیدالدین اگر وہاں ہوئے تو وہ تو مجھے فوراً ہی پہچان لیں گے۔ ملک اشرف کے ہاں جو کچھ ہو چکا تھا وہ انھیں اچھی طرح یاد تھا۔ میری صورت بھی انھوں نے وہیں دیکھی تھی۔ اب میں براہِ راست اُن سے کیسے بات کر سکتا تھا؟

وزیرآباد پہنچ کر حسین لنگاہی کی کوٹھی میں نے اچھی طرح دیکھ لی۔ وہ نظام آباد اور وزیرآباد کے درمیان مشرقی سمت میں واقع تھی۔ اس کے دائیں بائیں ایک دوسرے سے ہٹ کر کچھ اور کوٹھیاں بھی تھیں البتہ درمیان میں کئی پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ عقبی حصہ ابھی آباد نہیں تھا۔ اُن کے عقب میں ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کوٹھی کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد میں نے وہ رات اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گزاری۔ دل میرا اس واردات کے لیے قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ ضمیر کی آواز مجھے بار بار ملامت کرتی تھی مگر ان کا حکم ہی ایسا تھا کہ اس سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے دن میں صبح سویرے اٹھ کر حسنین کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ کار میں نے سڑک سے اُتار کر عقبی راستے کے چوک میں کھڑی کر دی اور خود میں اس میں سے اتر کر حسنین کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کوئی سوا آٹھ بجے کوٹھی کے گیٹ میں سے ایک سرخ رنگ کی کار نکلی۔ اس میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک اسٹیئرنگ کو سنبھالے ہوئے تھی اور دوسری اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی۔ اُن دونوں کو دیکھ کر میں جھینپ سا گیا۔ دونوں بڑی ہی شوخ و شنگ نظر

آتی تھیں۔ زلف بریدہ، جدید وضع کے کپڑے پہنے ہوئے وہ کار میں یوں بیٹھی تھیں جیسے تفریح کے لیے باہر نکلی ہوں۔ کوئی ڈرائیور بھی اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ ستناجا صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے کہ وہ بہت آزاد طبیعت لڑکیاں ہیں اور کار بھی خود ہی ڈرائیو کرتی ہیں۔ اُن سے نپٹ لینا شاید میرے بس میں نہیں تھا۔ شکل صورت کی بھی وہ اچھی تھیں۔ مگر میں انھیں حسین ہرگز نہیں کہوں گا۔ بس گوارا سی شکل تھی اُن کی۔ مگر اُن کا بناؤ سنگار انھیں سب سے الگ اور منفرد بناتا تھا۔ جیسے ہی وہ درمیانی سڑک سے نکلیں میں اپنی کار میں بیٹھ کر اندھے کتے کی طرح اُن کے پیچھے لگ گیا۔ آدمی کی مجبوری بھی اسے کیسے کیسے دن دکھاتی ہے۔ ستناجا صاحب کہہ رہے تھے کہ میں اُن سے دوستی کر لوں یعنی اُن کا خیال تھا کہ وہ کوئی ایسی ہی گری پڑی لڑکیاں تھیں جنھیں کوئی بھی گمراہ کر سکتا تھا۔ یہ اُن کی محض خام خیالی تھی۔ ان لڑکیوں کے تیور ہی جداگانہ تھے۔ مجھے پتہ نہیں اُن کے لیے کیسے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ کسی کو اور خاص طور پر لڑکیوں کو اغوا کر لینا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ اور ستناجا صاحب نے مجھے اُن کی طرف یوں بھیج دیا تھا جیسے وہ راستے میں پڑی ہوں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ حسین لنگاہی کو ذلیل کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی پارٹی سے الگ کر دیا جائے۔

سرخ کار بسوں کے اڈّے کی بھیڑ کو چیرتی ہوئی آگے نکلی تو میں بھی کچھ فاصلہ دے کر اُن کے پیچھے چل دیا۔ اُن کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کوئی اُن کا تعاقب کر رہا ہے۔ گجرات تھا ہی کتنی دور، دس میل کا فاصلہ کار کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ راستہ بسوں اور کاروں سے یوں معمور تھا کہ ان کی اتنی ساری بھیڑ پریشان کر دیتی تھی۔ پلکھو کا پل گزرا تو وہ چناب کے پل پر جا چڑھیں۔ وہاں سے آگے نکلیں تو ریلوے کا پھاٹک پار کر کے وہ دیکھتے ہی دیکھتے گجرات کی حدود میں داخل ہو گئیں۔ میں درمیان میں دو گاڑیوں کا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے چل رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی کار میرے تعاقب میں چلی آرہی ہے۔ عقب نما میں کار کو اپنے پیچھے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ دودھیا رنگ کی ٹیوٹا گاڑی تھی۔ اس کے ڈرائیور کو میں نہیں جانتا تھا اور ابھی صرف میں اسے ہی دیکھ سکا تھا۔ درمیان میں چلنے والی بس دائیں ہاتھ سے آگے نکلی تو ایک اور کار نے اس کی جگہ لے لی جس کی وجہ سے میں ابھی تک اس کار کے دوسرے لوگوں کو نہ دیکھ سکا۔ سرخ رنگ کی کار اس عرصہ میں خاصی آگے نکل گئی۔ میں نے اپنی رفتار ایک دم تیز کر دی مگر جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر

حیرت ہوئی کہ سفید کار اب بالکل میرے عقب میں چل رہی تھی۔ اور اس میں جو دوسرا آدمی بیٹھا تھا اسے بھی میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ اُن کی کسی حرکت سے بھی مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر میرے پیچھے آرہے ہیں۔ اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں سرخ کار کو نگاہ میں رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر لڑکیاں شہر میں داخل ہو کر بازار کی بھیڑ کو چیرتی ہوئی کالج تک جا پہنچیں اور کار کو سیدھا گیٹ کے اندر لے گئیں مگر جیسے ہی میں نے اپنا رُخ بدلا تو میں نے دیکھا کہ سفید کار مجھ سے کچھ فاصلے پر ٹھہری تھی۔ دونوں آدمی بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ سالے میرے ہی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ دونوں آدمی چہرے مہرے سے تو بہت ہی شریف نظر آتے تھے۔ پوری آستین کے سوئیٹر وہ پہنے ہوئے تھے اور قمیص شلوار میں ملبوس تھے۔ پہلے تو مجھے یہی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے حسنین لنگاہی نے انھیں لڑکیوں کی حفاظت پر مامور کر رکھا ہو اور اب جو انھوں نے مجھے اُن کے پیچھے کالج تک جاتے دیکھا ہے تو وہ مجھے کوئی بڑا ہی مشتبہ آدمی سمجھ رہے تھے مگر پھر مجھے خیال آیا کہ لڑکیوں نے سارا راستہ ایک بار بھی مُڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیدھی اپنے دھیان میں چلتی رہیں تو مجھے اپنا پہلا خیال بدلنا پڑا۔ وہ لوگ اسی روز میرے پیچھے لگے تھے اور پتہ نہیں کہاں سے وہ میرا تعاقب کر رہے تھے۔ اُن کو یوں دور سے دیکھ کر سمجھ لینا ناممکن تھا۔

میں نے کار کو موڑ کر اس کا رُخ ذرا دیر کے لیے شہر کے مشرق کی طرف کر دیا۔ اور مزے مزے سے اسے شہر سے باہر لے چلا۔ میں چاہتا تھا کہ اُن کی اصل نیت معلوم کر لوں مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ میرے پیچھے نہیں آتے لیکن ابھی میں چھٹے میل پر پہنچا تھا کہ وہ کار ایک دم دندناتی ہوئی میری طرف آئی۔ رفتار اس کی بہت ہی تیز تھی۔ میں سمجھا وہ پیچھے سے میری کار کو ٹکر مار دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار اور زیادہ آہستہ کر کے اسے سڑک سے اُتار لیا۔ گاڑی کے خانے سے میں نے پستول نکال لیا تھا۔ ایک اُن میں ایسا تھا جس پر سائلنسر لگا تھا۔ اسے میں نے اٹھا کر ران کے نیچے دبا لیا مگر وہ میرے پاس رُکے نہیں۔ ہنستے ہوئے میرے قریب سے زُوں زُوں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اُن کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ چند ہی لمحوں میں میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں کوئی تین فرلانگ آگے بڑھا ہوں گا کہ میری کار کے ٹائر پھسلنے لگے۔ پچھلا پہیہ پنکچر ہو چکا تھا۔ میں نے کار روکی اور اتر کر پچھلا پہیہ دیکھنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ سڑک پر نوکیلی دھا

والے دس بارہ کیل بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گوکھرو ایسے کیل تھے۔ کئی سمتوں سے ٹائر کو دبوچ لیتے تھے۔ میری کار کا ایک نہیں دو پہیے پنکچر ہو چکے تھے۔ اور اُن میں سے ہوا خارج ہو چکی تھی۔ ان کیلوں کو میں نے سڑک پر سے ایک ایک کرکے اٹھا لیا۔ کوئی دو درجن کیل وہاں بکھرے گئے تھے۔ اور دل میرا یہ کہتا تھا کہ انھیں کسی نے جان بوجھ کر وہاں ڈال دیا ہے تاکہ میں درمیان میں ہی لٹک کر رہ جاؤں حالانکہ اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں تھی۔ سڑک دونوں طرف سے بالکل ویران نظر آتی تھی اور میری کار وہاں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک ٹائر ہوتا تو میں اُسے تبدیل بھی کر سکتا تھا مگر وہاں تو دو ٹائر بیٹھ گئے تھے اور کار میرے لیے بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ میں تو سر پیٹ کر رہ گیا۔

سڑک پر سے میں نے وہ تمام کیل اٹھا کر کنارے پر ڈھیر کر دیے تھے۔ اچانک ایک سوزوکی مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ شہر جا رہی تھی۔ اسے ہاتھ دے کر میں نے ٹھہرا لیا۔ تو ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا ”کیا بات ہے بھا جی! خیر تو ہے؟“

”یار کیا کہوں، میری کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں، کسی نے سڑک پر کیل پھیلا دیے تھے۔ اب میں یہاں پریشان ہو رہا ہوں۔“

”یہ تو بڑی گڑبڑ کی بات ہے، کیا کریں گے آپ اب؟“

”تم کچھ میری مدد کر دو تو میں یہ ٹائر نکال کر گجرات لے جاتا ہوں۔“

”تو یہ بات ہے۔ آؤ یارو! یہ بڑی نیکی کا کام ہے، کچھ ان کی مدد کر دو۔“ اس نے سوزوکی میں بیٹھے دو آدمیوں سے کہا اور وہ تینوں میرے ساتھ مل کر گاڑی کے ٹائر نکالنے لگے۔ یہ کام کوئی بیس منٹ میں ہو گیا۔ کار کے نیچے ہم نے کچھ اینٹیں رکھ دیں اور پھر میں کار کا سارا سامان بریف کیس میں رکھ اُن کے ساتھ سوزوکی میں جا بیٹھا۔ تینوں ٹائر میں نے اپنے سامنے رکھ لیے۔

شہر پہنچ کر میں نے وہ ٹائر مرمت کروائے اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کار کی طرف چل دیا مگر۔۔ مگر جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ میری گاڑی جل کر راکھ ہو چکی تھی، یوں کہ اس کا پہچان لینا بھی مشکل تھا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے باؤ جی! یہ آپ کی گاڑی ہے؟“

”ہاں۔ یہ۔۔۔۔ یہ میری ہی گاڑی ہے مگر اسے آگ کس نے لگا دی؟ حیرت ہے۔“

”یہ تو کسی بھی کام کی نہیں رہی۔ اس کا تو کوئی پرزہ بھی سلامت نہیں ہے۔“ ڈرائیور نے گاڑی کے چاروں طرف گھوم کر کہا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی اور میرا تو یہ حال ہو گیا تھا جیسے کسی نے میری گردن کاٹ ڈالی ہو۔ بلاشبہ یہ کام انہی لوگوں کا تھا جو ہنستے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے تھے جو میرے تعاقب میں خدا جانے کہاں سے لگے ہوئے تھے۔ وہ گاڑی رات بھر ہوٹل کے باہر کھڑی رہی مگر وہاں اُسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا مگر اب جو انھیں موقع ملا تو اپنا ہاتھ دکھا گئے۔ غیظ و غضب کی ایک ایسی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی کہ میرا چہرہ دیکھ کر ڈرائیور بھی لرز گیا۔ اور مجھ سے کچھ کہے بغیر وہ ٹیکسی کے اندر جا بیٹھا۔ ٹائر ابھی تک اس کی ڈکی میں دھرے تھے جن کو چڑھا لینے کی نوبت نہیں آئی۔

سوال یہ تھا کہ وہ لوگ تھے کون؟ کیا ضد تھی انھیں مجھ سے۔ کار کی اس ”ہلاکت“ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو سر بلاہ مارا گیا تھا۔ کار کے بغیر تو میں کسی بھی کام کا نہیں رہ گیا تھا اور وہ لوگ مجھے کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ کیا انھیں میرے ارادوں کا علم ہو گیا تھا۔ کیا وہ بھی جانتے تھے کہ میں کس لیے ان لڑکیوں کے تعاقب میں لگا ہوں؟ کیا کوئی اور آدمی بھی اس راز سے واقف ہو سکتا ہے جو ستنا جا صاحب کے لبوں سے نکلا اور میرے دل میں اتر گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر پھر بھی اُن کا رویّہ مجھے یہ بتاتا تھا کہ وہ مجھے جانتے تھے میرے ارادوں سے بھی واقف تھے مگر کیسے!

گاڑی کا فاتحہ پڑھ کر میں پھر ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ ”چلو یار! مجھے شہر لے چلو میرے ساتھ تو بہت زیادتی ہو گئی ہے۔“

”آپ تھانے میں رپورٹ کر دیں باؤ جی! یہ تو آپ کے کسی دشمن کا کام معلوم ہوتا ہے۔“

”پتہ نہیں کون تھا وہ۔ بہرحال اب شہر ہی جانا پڑے گا۔“ میں نے مایوس ہو کر کہا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کا رُخ موڑا اور شہر کی طرف چل دیا۔ حیرت اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھی اور میں تو اندر سے چُرمُر ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے سارے منصوبے پر پانی پھر رہا تھا۔ میں ستنا جا صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اُن کی لاکھوں کی گاڑی میں نے برباد کر دی تھی اور میرے ذمے جو کام انھوں نے لگایا تھا وہ بھی بیچ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کار کے بغیر میں اُن کا تعاقب کیسے کر سکتا تھا اُن سے تو راستے ہی میں بات ہو سکتی تھی مگر وہ موقع بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ایک طیش تھا جو مجھے سر سے پاؤں تک جلاتا چلا جا رہا تھا۔ آدمی کی بے بسی تو جب ہی دیکھنی چاہیے جب اس سے کوئی اس کا وسیلۂ سفر و ظفر ہی چھین لے۔

کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور نے مجھے زنانہ کالج کے سامنے

اتار دیا، بولا ”آپ تھانے نہیں جائیں گے؟“

”ابھی نہیں۔ میں کچھ سوچ لوں پہلے۔ یہ ٹائر اسی دوکان پر رکھ دو جہاں سے ہم نے اٹھائے تھے۔ میں خود اُن سے لے لوں گا۔“

”جی بہت بہتر۔ وہ اگر پوچھیں تو میں انھیں کیا بتاؤں؟“

”کہہ دینا کہ وہ گاڑی ہی جل گئی جس کے یہ ٹائر تھے۔“

میں نے ڈرائیور سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر میں دوسری طرف چل نکلا۔ کالج میرے سامنے تھا مگر اس کے اندر تو میں جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے پیچھے ہٹ کر میں ایک چائے خانے میں جا بیٹھا۔ مجھے کالج میں چھٹی ہو جانے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

چائے کی پیالی کا آرڈر دے کر میں نے سامنے رکھے اخبار پر نظریں جما دیں مگر لفظ میری نظروں میں گڈمڈ ہو رہے تھے میری نظر بھی غصے کی وجہ سے تلملا رہی تھی۔ کوئی چیز مجھے سیدھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک ایسے مخمصے میں اُن لوگوں نے مجھے پھنسا دیا تھا کہ میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں اُن لوگوں کو ادھیڑ کے رکھ دیتا۔ چائے خانے میں کئی اور آدمی بھی بیٹھے تھے اور وہ اپنی دنیاداری کی باتوں میں مصروف تھے۔ جن پر میں توجہ بھی نہ دے سکا۔ ایک آدمی اچانک چائے خانے میں داخل ہوا اور میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سرمئی رنگ کا لنڈے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس کے کندھوں پر جھول رہا تھا۔ اس پر اس نے ٹائی بھی لگا رکھی تھی اور ہاتھ میں اس نے میرے ہی جیسا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ وہ اس نے میز کے نیچے رکھ دیا۔ میرا بریف کیس بھی وہیں دھرا تھا۔ چائے کے لیے کہہ کر وہ آدمی اخبار گھسیٹ کر پڑھنے لگا۔ کالج میں چھٹی ہونے میں ابھی دیر تھی اور مجھے وہاں بیٹھ کر گاڑی کے جل جانے کا بھی ماتم کرنا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان لڑکیوں سے بات کرنے کے لیے میں کوئی ٹیکسی کرائے پر لے لوں گا۔ اگرچہ وہ وہاں زیادہ تعداد میں نظر نہیں آتی مگر چائے خانے کے باہر دو ایک ہر وقت موجود رہتی تھیں ڈرائیور چائے کے لیے وہاں بار بار آتے تھے۔ وہ آدمی کوئی بیس منٹ وہاں بیٹھا۔ اس دوران اس نے چائے کے ساتھ سموسے بھی کھائے تھے اور پھر بڑے اطمینان سے وہ بل ادا کر کے باہر نکل گیا میں اس گھڑی اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ اور اخبار کا ایک صفحہ میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔ میں اس کی عبارتوں پر غور کرنے کے بجائے اس صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا جس نے میرے لیے جینا حرام کر دیا تھا۔ مجھے اس دوران بس موہوم سی بات کی طرح یاد ہے کہ اس آدمی نے بل ادا کر دیا تھا اور بس۔ اور بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کس ہاتھ میں۔ اس کی آمد و رفت کو میں نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ میں کوئی تین گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں نے چار بار چائے پی۔ لوگوں کی ڈھیروں باتیں سنیں مگر یاد ایک بھی نہیں رہی۔ پتہ نہیں وہ کیا کیا کچھ کہتے رہے۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے کہ کالج کا گیٹ کھل گیا۔ میں نے فوراً ہی میز کے نیچے سے اپنا بریف کیس اٹھایا اور لڑکیوں کے ریلے کی طرف دیکھتا ہوا میں چائے خانے سے نکل گیا۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ میں ایک دم اس میں جا بیٹھا۔

اس کا ڈرائیور چائے خانے کے باہر بیٹھا چائے پی رہا تھا مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیا، بولا ”کہاں جائیں گے چوہدری صاحب؟“

”مجھے وزیرآباد جانا ہے بھئی! تم جلدی سے چائے پی لو۔“

یہ کہہ کر میں پھر لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ عین اس وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ سفید کار ایک بار پھر گیٹ سے ذرا ہٹ کر آ کھڑی ہے۔ میں غصے سے پاگل ہو کر پستول کے لیے بریف کیس کھولنے لگا مگر۔۔۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو وہ میرا بریف کیس ہی نہیں تھا۔ اُف میرے خدا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔ وہ بدمعاش غلطی سے میرا بریف کیس اٹھا کر چلتا بنا تھا۔ وہ لنڈے کا کوٹ پہننے والا کسی کلرک کا پتر۔ میرے وجود میں آگ سی لگ گئی۔ میرے ساتھ اس روز بہت ہی زیادتی ہو رہی تھی۔ اس کا بریف کیس میرے سامنے کھلا پڑا تھا اور اس میں چند کتابیں، ایک پھٹی پرانی بنیان، ایک جوڑا قمیص شلوار اور پلاسٹک کے لفافے میں بند ایک سلیپر کا جوڑا تھا اور بس غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ وہ دونوں آدمی سفید کار میں بیٹھے ہنس رہے تھے اور میرے حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔ میرے پاس ہتھیار بھی کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ رقم بھی سو وہ الگ چلی گئی۔ اس کے تو مزے ہی ہو گئے ہوں گے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ بھی انہی لوگوں کا ساتھی ہو۔ مگر یہ خیال جلدی ہی محو ہو گیا۔ کیونکہ چائے خانے کی طرف انھوں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سالا کوئی اور ہی غیر حاضر دماغ آدمی تھا جس نے بے خیالی میں اپنے بریف کیس کی جگہ میرا اٹھا لیا اور اب وہ گھر پہنچ کر ہنس رہا ہو گا کہ اسے دس ہزار بھی مل گئے اور دو پستول بھی جن میں سے ایک بہت ہی قیمتی تھا۔ اور کچھ گولیاں بھی۔

کالج سے لڑکیاں برابر نکل رہی تھیں۔ وہ سفید کار ایک کونے میں کھڑی رہی۔ اچانک سُرخ کار مجھے گیٹ سے نکلتی دکھائی دی۔ میں نے اپنا مفلر نکال کر سر پر لپیٹ لیا۔ اس طرح کہ اس میں میرا منہ بھی چھپ گیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی شیروانی بھی اتار دی۔ میرا ڈرائیور اس وقت تک اسٹیئرنگ

سنبھال چکا تھا۔ شیروانی کے نیچے میں نے پوری آستین کا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ میرا حلیہ کچھ تو بدل ہی گیا تھا۔

"چلوں صاحب جی؟"

"ہاں چلو، مگر اس طرح کہ اس سرخ رنگ کی گاڑی کو نگاہ میں رکھنا ہے اور اس سفید کار کو بھی۔"

"وہ جو کونے میں کھڑی ہے؟"

"ہاں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی نکلے گی۔"

ڈرائیور خاصا سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے فاصلہ دے کر ٹیکسی سرخ کار کے پیچھے لگادی مگر اتنی جگہ دے کر کہ درمیان میں سے کئی گاڑیاں آگے نکل سکتی تھیں۔ سفید کار کالج کی دیوار سے ہٹی اور لڑکیوں کی کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اب بھی میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑکیاں ان سے واقف نہیں ہیں۔ اندازہ میرا یہی تھا۔ اب جو میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کار میں دو نہیں چار لڑکیاں موجود ہیں۔ ٹیکسی خاصی آگے بڑھ گئی تھی اور اب میں ان چاروں کو ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ریلوے پھاٹک سے گزر کر سرخ کار دائیں ہاتھ نکلی۔ وہ سڑک سامنے کے مختلف گاؤں کی طرف جاتی تھی اور کار میں سوار وہ لڑکیاں شاید وہیں سے بس میں روزانہ کالج جاتی تھیں اور اب وہ انھیں چھوڑنے کے لیے جا رہی تھیں۔ میں نے ٹیکسی وہیں روک لی۔

"چلو اب مجھے وزیر آباد لے چلو۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! ان کے پیچھے نہیں جانا ہے اب؟"

"نہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔" مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ سفید کار بھی بڑی شاہراہ پر رک گئی تھی۔ وہ بھی اب ان لڑکیوں کے پیچھے نہیں جا رہے تھے۔ ان کا رویہ ایسا تھا کہ نہ مجھے احساس ہونے دیتے تھے کہ وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں، نہ وہ لڑکیاں سمجھ سکی تھیں کہ وہ ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ میرے پاس ثبوت کوئی بھی نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کچھ کر چکے ہیں۔ نہ میں نے انھیں سڑک پر کیل بکھیرتے دیکھا، نہ گاڑی کو آگ لگاتے، مگر مجھے یقین تھا کہ اصل بدمعاشی انہی کی تھی لیکن میں ان پر یونہی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ ان کی شکلیں میں اب اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک ان کو میں للکار نہیں سکا تھا۔ بسوں اور کاروں کا ایک ہجوم تھا جو ہر وقت بڑی شاہراہ پر چلتا رہتا تھا۔ ایسے میں ان دو آدمیوں کو روک لینا آسان نہیں تھا۔ اس میں ہزار قباحتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ جیسے ہی میرے ڈرائیور نے گاڑی وزیر آباد کی طرف بڑھائی، وہ دونوں بہت تیزی سے ہمارے قریب آ گئے۔ اتنا قریب کہ ٹیکسی کو سڑک چھوڑنی پڑی مگر وہ آگے نہیں بڑھے۔ ٹیکسی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے آدمی نے کہا۔ "سوہنیو! اس مفلر سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی دوپٹہ اوڑھ لو۔ تمھاری شربتی اکھیاں بہت سوہنی ہیں، پر مکھڑا بھی تو دکھاؤ!" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اور کار کو بھگا کر آگے لے گیا۔ اس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔ گاڑی چند ہی لمحوں میں خاصی آگے نکل گئی۔

"ان کا پیچھا کرو بھئی! معلوم تو کریں کہ ان کی پسند کیا ہے۔" میں نے مفلر اتار کر آگے رکھ لیا۔ اب ان سے کسی پردے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ ڈرائیور بھی جوان آدمی تھا۔ اسے بھی میرا خیال ہے طیش آ گیا تھا۔ اس نے گاڑی ایک دم تیز کر دی۔ وہ لوگ اس وقت تک چناب کا پل عبور کر کے وزیر آباد جانے والی پرانی سڑک پر جا پہنچے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے غصے سے گاڑی لے جا کر ان کے قریب کھڑی کر دی۔ ایک گھنا جنگل سا ہمارے اردگرد کھڑا تھا۔

"اوئے تم یہ کیا بکواس کر کے آئے ہو ادھر؟ کیا چاہتے ہو تم؟" ڈرائیور نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"اوئے جا! تو کون میں خواہ مخواہ۔ اصل بات تو میں نے اس سے کی ہے، تیری سواری کے ساتھ۔ یہ منہ کیوں چھپا رہا تھا؟"

میں نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ جلتے ہی میں نے ان کی کار کا دروازہ کھول دیا۔

"ہاں بھئی! یہ قصہ کیا ہے استاد! تمھیں کیا چیز سوہنی لگتی ہے؟" مگر جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا اس کا تنا ہوا پستول میرے سامنے آ گیا۔

"مجھ سے بچ ہی جاؤ تو بہتر ہے استاد! ابھی تو تمھاری گاڑی ہی جلی ہے کہیں تمھیں بھی ادھر ہی نہ رہنا پڑے۔"

اس کی آواز میں ایسا اعتماد تھا کہ میں نے ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ اس کی گولی کسی بھی لمحے اپنی جگہ سے سرک سکتی تھی۔

وہ چپ نہیں ہوا۔ اس نے دروازہ پھر کھول دیا، بولا۔ "بہتر ہے تم یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی لنگاہی صاحب کے دروازے پر نہ آنا اور نہ اس سرخ کار پر نظر رکھنا، ورنہ بہت گھاٹے میں رہو گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا بریف کیس بھی تم نے ہی اٹھایا تھا؟"

"اس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔ تم اگر مجھے یہ بتادو کہ رات تم لنگاہی صاحب کی کوٹھی پر کیوں آئے تھے اور تم نے ان لڑکیوں کا تعاقب کیوں کیا ہے تو ہو سکتا ہے میں تمھیں کوئی بہتر راستہ بتا دوں۔"

"یہ بات تو میں پھر کبھی تمھیں بتاؤں گا پنکے! ابھی تو تم اس پستول پر ناچ رہے ہو۔ ایسے میں چپ ہوں۔" یہ کہہ کر میں ٹیکسی کی طرف بڑھا تو اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور پچھلی نشست کے کنارے تک آ کر اس نے دایاں ہاتھ کار سے باہر نکالا مگر ابھی وہ گاڑی سے نکل ہی رہا تھا کہ میں نے پلٹ کر ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ اس کا آدھا دھڑ دروازے میں پھنس گیا تو میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو کلائی سے پکڑ کر کار کے پچھلے حصے سے لگا دیا۔ میرا پورا زور دروازے کو بند کرنے میں صرف ہو رہا تھا جس میں اس کی گردن پھنس گئی تھی۔ بائیں ہاتھ سے میں نے پستول اس کے ہاتھ سے گرا دیا۔ مگر اس کے لیے مجھے دروازہ زیادہ ہی قوت سے بند کرنا پڑا۔ اس اثنا میں دوسرا آدمی لپک کر ایک دم باہر آ گیا مگر اس وقت تک پستول میرے قبضے میں آ چکا تھا۔

اس نے باہر نکلتے ہی ایک لمبی سی سلاخ میرے کندھے پر مارنی چاہی مگر میں نے دروازہ ایک دم کھول کر اس کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ ہاتھ اس کا ابھی اوپر ہی اٹھ رہا تھا کہ میں نے ان دونوں کو پستول کی زد میں لے لیا۔

"ہاں تو اب بتاؤ بیٹے کہ وہ گاڑی تم نے کیسے جلا دی؟ اس پر تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے میرا۔"

اتنے میں ٹیکسی ڈرائیور بھی باہر نکل آیا اور بڑے غضبناک انداز سے بولا۔ "مار دو جی ان کتنے کے بچوں کو۔ مت چھوڑو انھیں۔ گولی مار دو بس۔ یہ انسان کے پتر بالکل نہیں ہیں۔"

"بتایا نہیں تم نے، وہ گاڑی کیسے جلا دی تم نے؟ کیا ضد تھی تمھیں مجھ سے؟"

"اس کو آگ میں نے لگائی تھی۔ ہم تمھیں بے بس کر دینا چاہتے تھے۔ تم رات بھی لنگاہی صاحب کی کوٹھی پر آئے تھے پھر تم ہوٹل میں جا سوئے۔ کیا لینے آئے ہو تم یہاں؟ مت ڈراؤ اس پستول سے ہمیں۔" اس آدمی کو اب بھی اپنی آواز کے تحکم پر پورا یقین تھا۔ اس کے اعتماد کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ اپنی گردن وہ اب بھی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔ دروازے کا بوجھ اس پر زیادہ ہی پڑ گیا تھا۔

"رات تو ہم نے تمھیں کچھ نہیں کہا مگر جب تم صبح سویرے وہاں جا پہنچے تو ہم تمھیں سبق سکھانے کے لیے باہر نکل آئے۔ کیوں ان لڑکیوں کا پیچھا کر رہے تھے تم؟"

"کیا بات ہے تمھاری! یوں پوچھ رہے ہو جیسے میں تمھارے باپ کا غلام ہوں۔" میں نے آگے بڑھ کر اس آدمی کے سینے پر پستول رکھ دیا اور بائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "لاؤ میں اسے دبا دوں۔ تمھاری گردن نازک معلوم ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی رگ مسل دی۔ اسے ایک معمولی سے جھٹکے کی ضرورت تھی۔ وہ پشت کے بل گرا اور آدھا گاڑی کے اندر جا پڑا۔ دوسرا آدمی حیرت زدہ ہو کر کار کے ساتھ لگ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ اس دوران دو تین بسیں ہمارے قریب سے شاں شاں کرتی گزر گئیں مگر کسی نے ہماری طرف دھیان نہیں دیا۔ اگر دیا بھی تو وہ رکے نہیں۔

"اس کا نام کیا ہے برخوردار اس آدمی کا؟"

"یہ حکیم خان ہے۔ لنگاہی صاحب کے ہاں ملازم ہے۔" اس نے قدرے تردد سے کہا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت نمایاں ہونے لگی تھی۔

"اور تم؟"

"میرا نام اختر ہے۔ میں بھی ان کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔"

"اور یہ فیکٹری کا ہی کام ہے جو تم کر رہے ہو؟ تم نے کیا سوچ کر میری گاڑی جلا دی؟ تم یوں کرو کہ اب یہ گاڑی میرے پاس چھوڑ جاؤ اور لنگاہی صاحب کو بتا دو کہ ہوا کیا تھا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔"

"ان سے پوچھ ہی کون رہا ہے۔ ان کو جا کر صرف اتنا بتا دو کہ تم نے کیا کر دیا اور پھر ہم نے کیا کر دیا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ میں یہ گاڑی تمھیں نہیں دے سکتا۔" وہ ایک دم دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھالنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر گاڑی سے کھینچا اور اس کے منہ پر ایک جھانپڑ دے کر اسے پرے گرا دیا۔ دوسرے آدمی کو بھی میں نے گاڑی سے نکال دیا۔ وہ تو بے ہوش ہی تھا۔ اسے میں نے اسی حالت میں کھینچا اور لے جا کر درخت کے نیچے پھینک دیا۔ اختر ایک بار پھر گرمی کھا کر اٹھا تو میں نے اسے خوفزدہ کرنے کے لیے گولی اس کے پاؤں میں ماری۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا۔ گولی زمین میں جا دھنسی تھی۔ دوسری بار اسے میرے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

میں نے جیب سے ماچس نکالی اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ اپنی گاڑی پرے لے جائے۔ جیسے ہی وہ وہاں سے ہٹا میں نے سفید کار کو آگ دکھا دی۔ پیٹرول ٹنک اس کا شعلہ

پہنچا تو وہ چِتا کی طرح جلنے لگی۔ اگرچہ اس کے اندر مردہ کوئی نہیں تھا۔

"اس کو بچالو میاں جی! خدا کے لیے اسے روکو۔ یہ کار تباہ ہو جائے گی۔" اختر نے ڈرائیور کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا مگر وہ بس جلتی ہوئی گاڑی کو حسرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"تمھیں میری گاڑی یاد نہیں رہی، اسے کیوں جلا دیا تھا تم نے؟" میں نے پلٹ کر اختر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو رہا تھا مجھ سے کہ مجھے سامنے دیکھتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا مگر ابھی وہ درختوں کے جھنڈ میں چند قدم ہی نکلا ہوگا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اس کو ہوا میں اچھال کر زمین پر گرا دیا۔ حیرت ہے کہ میرے بازوؤں میں ایسی قوت کہاں سے ابھر آئی؟ اس کا وزن کم از کم ڈیڑھ من تو ضرور ہی ہوگا۔ وہ زمین پر گرا تو میں نے اس کی رگیں مسل دیں۔ اس کا بے ہوش ہو جانا ہی بہتر تھا۔

جب میں دوبارہ ٹیکسی کے پاس پہنچا تو اس وقت تک کار بڑی حد تک جل کر بھسم ہو چکی تھی۔ اور ڈرائیور اسٹیئرنگ پر بیٹھا وہاں سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔

"اب تم جاؤ یار! پتہ نہیں مجھے اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ جاؤ تم یہ لو اپنا کرایہ۔" میں نے سو روپیہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میرے پاس تو کھلا نہیں ہے۔"

"بس ٹھیک ہے یہ سو ہی لے جاؤ۔ شاباش! اور دیکھو کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔ سمجھے! ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گے۔"

"جی ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی یہ بات یاد رہے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کا رخ گجرات کی طرف موڑ لیا۔

جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں وہاں سے فوراً ہی وزیر آباد کی طرف چل دیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ پھر کوئی بس وہاں سے گزرے گی پھر وہ سارا تماشا ان کی نظر میں آ جائے گا۔

وزیر آباد وہاں سے کوئی ایک میل دور تھا۔ میں نے سڑک چھوڑ دی اور ریلوے لائن کے ساتھ چلتا ہوا شہر جا پہنچا۔ سرخ رنگ کی کار ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

اس ستنا جا صاحب نے مجھے ایک زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا ورنہ وہ میرا راستہ نہیں تھا مگر اب تو میں نے اوکھلی میں سر دے ہی دیا تھا، دھماکوں سے ڈر کر تو بات نہیں بن سکتی تھی۔ وزیر آباد پہنچ کر میں اسٹیشن کے قریب ایک اور ہوٹل میں جا دبکا۔ کمرہ جو مجھے ملا، وہ چھوٹا سا تھا مگر میری ساری ضرورتیں وہاں پوری ہوتی تھیں۔ یہ تو اچھا تھا کہ کچھ رقم میری جیب میں موجود تھی۔ ورنہ تو میں مارا ہی گیا تھا۔ اس شریف آدمی نے مجھے تباہ ہی کر دیا تھا۔ سالا میرا بریف کیس ہی اٹھا کر چل دیا۔ اور میری بھی ایسی مت ماری گئی تھی کہ مجھے اس گھڑی کسی بات کا دھیان ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ تو میرے سامنے ہی چائے خانے سے نکلا تھا۔ بریف کیس بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ میرے ہی مال پر ہاتھ صاف کر چکا ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر میں خود سے پھر الجھنے لگا۔ صورتِ حال بہت ہی پریشان کن ہو گئی تھی۔ ان لڑکیوں کے اغوا کے لیے مجھے کوئی اور طریقہ ہی آزمانا پڑے گا۔ ایک کار میرے پاس ہونا بہت ضروری تھا مگر وہ میں اس وقت کہاں سے لے سکتا تھا؟

رات کے گیارہ بجے تو میں نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ مجھے اب وہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لیے میں نے بل بھی ادا کر دیا۔ اور پیدل ہی میں بازار سے گزرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ شہر کا نقشہ ایسا ہے کہ وہاں ایک ہی بازار یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے جس کے دونوں طرف آبادی ہے۔ تحصیل کے پاس پہنچ کر میں نظام آباد کی طرف مڑ گیا۔ بازار تو شام ہی ویران ہو جاتا ہے اور پھر وہ سردیوں کی راتیں تھیں۔ رات بارہ بجے وہاں صرف پہریدار ہی نظر آتے تھے جو جگہ جگہ آگ جلا کر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ تم کدھر جا رہے ہو۔ دراصل میرا لباس ہی میرے لیے بڑی اوٹ ثابت ہو رہا تھا۔

میں جب اس کوٹھی کے سامنے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ گیٹ کے اندر بنے کیبن میں ایک پہریدار کھڑا تھا۔ وہ بچارا ساری رات وہیں کھڑا پہرہ دیتا رہتا تھا۔ میں ایک دم اس کے سامنے جا پہنچا تو اس نے اپنی دونالی بندوق جان بوجھ کر اوپر اٹھالی۔ حالانکہ اس کے بوجھ سے عاجز آ کر اس نے بندوق دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ گیٹ کا ایک پھاٹک کھول کر وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ میں کوٹھیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی نام کو تلاش کر رہا ہوں۔ حسین لنگاہی کے نام کی تختی تو میرے سامنے تھی۔ باہر آ کر وہ بولا "کیا بات ہے میاں جی! کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

"میں حسین لنگاہی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں بھائی! لاہور سے آیا ہوں، وہ میرے خالو ہوتے ہیں۔"

"وہ تو میاں جی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کچھ فساد ہو گیا تھا آج۔ اس کے لیے وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ گوجرانولہ گئے ہوئے ہیں۔"

"فساد! کیا مطلب، کوئی خون خرابہ ہو گیا تھا یہاں؟"

"جی بات کچھ ایسی ہی تھی۔ کسی نے ان کی گاڑی جلا دی اور اس میں سوار دو ملازموں کو بھی بے ہوش کر دیا۔ دریا کے پاس جو جگہ ہے وہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ آپ ابھی آ رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی! نو بجے جو گاڑی لاہور سے چلتی ہے میں اس میں آیا ہوں۔ تم یوں کرو کہ ہماری خالہ جان کو اطلاع دے دو۔ کہنا کہ غلام فرید آیا ہے لاہور سے۔"

"جی بہت بہتر۔ میں انھیں جگا کر اطلاع دے دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ جاگ ہی رہی ہوں، لنگاہی صاحب کا انھیں انتظار ہے۔"

یہ کہہ کر وہ گیٹ کے اندر جانے لگا تو میں نے اس کے پاس پہنچ کر پیچھے سے اس کی گردن کی رگیں کچھ اس طرح مسل دیں کہ وہ اوندھے منہ زمین پر جا پڑا اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اس کو فوراً ہی میں نے کھینچ کر کیبن کے اندر ڈال دیا۔ سرخ رنگ کی کار گیراج میں کھڑی تھی جس کا دروازہ کوئی نہیں تھا اور وہ میرے بہت کام آ سکتی تھی۔

میں عمارت کی طرف بڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ برآمدے سے آگے بائیں ہاتھ کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ میں کسی جاگتے ہوئے آدمی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی میں وہاں رکا نہیں بلکہ سیدھا اس کمرے تک جا پہنچا۔ اس کی کھڑکیاں میرے سامنے ہی تھیں۔ ان کے شیشوں میں سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی اس وقت بھی مطالعے میں مصروف تھی۔ شاید اس کے امتحان سر پر آ پہنچے تھے۔ کتابیں اس نے میز پر پھیلا رکھی تھیں۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔ کمرے میں بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا اور وہ سادہ سے لباس میں کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ دوسری لڑکی کمرے کے عقبی حصے میں بستر پر لیٹی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی اس تک یوں پہنچ رہی تھی جیسے کوئی خواب میں دور افق پر پو پھٹتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ وہ دونوں لڑکیاں ایک ہی کمرے میں موجود تھیں اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی والدہ کس کمرے میں ہے۔

عین اس وقت لڑکی نے کتاب الگ رکھی اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولنے لگی۔ جیسے ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھولا میں کھڑکی سے ہٹ کر ایک دم اس کے پیچھے جا پہنچا۔ وہ ابھی دوسرے کمرے کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی جلد کی ملائمت نے مجھے حیران کر دیا۔ میری انگلیاں ایک دم اس کی رگِ احساس کو مسل گئیں۔ وہ تلملا کر رہ گئی اور پھر میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں بھی وہ جھپکنا بھول گئی تھی۔ اس کو اٹھا کر میں نے برآمدے میں دیوار کے ساتھ ڈال دیا اور پھر کھلے دروازے سے میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ دوسری لڑکی بے سدھ ہو کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کو اٹھا لینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر اس کو جگا لینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوتے میں اس کی رگِ احساس مسل دی۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں تک آ کر واپس چلی گئی۔ اسے اس مرحلے سے گزار کر مجھے سخت دکھ ہوا۔ وہ حسین تو ہرگز نہیں تھی مگر ایک عجیب سا تقدس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی زلفیں بھی تراشیدہ تھیں مگر اس کے باوجود وہ مجھے پاکیزگی کی حامل معلوم ہوتی تھیں۔ ایسی ہستی جو گناہ و ثواب کے تصور ہی سے ناآشنا ہو۔ یہی حال دوسری لڑکی کا تھا۔ اسے بستر سے اٹھا کر جب میں کتابوں سے لدی پھندی میز تک پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ جس لڑکی کو میں نے پہلے اٹھایا تھا، وہ ریحانہ تھی اور دوسری لڑکی کا نام جمیلہ تھا۔ میز پر کار کی چابیاں رکھی تھیں جیسے کسی نے انہیں یونہی بے خیالی میں وہاں ڈال دیا ہو۔ وہ چابیاں میں نے اٹھا لیں اور جمیلہ کو اٹھا کر میں سرخ کار تک جا پہنچا۔ اس کے بعد میں نے ریحانہ کو برآمدے سے اٹھایا اور اسے بھی کار کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ ایک ان میں سے اگلی پچھلی سیٹوں کے بیچ میں گر گئی۔ دوسری نشست پر ہی پڑی رہ گئی۔

کار کو میں نے وہیں اسٹارٹ نہیں کیا بلکہ اسے دھکا دے کر میں گیٹ سے باہر لے گیا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا ورنہ کوٹھی کے اور لوگ بیدار ہونے کی صورت میں کوئی نیا فساد کھڑا کر سکتے تھے۔

کار کو کوٹھی سے باہر نکال کر میں نے گیٹ بند کیا اور پھر اس کو اسٹارٹ کر کے میں اسی وقت وہاں سے چل دیا۔ یہ مرحلہ میرے لیے بہت ہی آسان ثابت ہوا تھا۔ سارا کام آپ ہی آپ ہوتا چلا گیا تھا۔ کسی نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی۔ کچھ ہی دیر بعد میں بڑی شاہراہ پر جا نکلا۔ اب میرے لیے کوئی مشکل باقی نہیں رہ گئی تھی مگر میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔ میں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔ دو معصوم سی، بے گناہ اور بے ضرر لڑکیوں کو یوں اٹھا لینا کوئی جوانمردی کی بات نہیں تھی۔ میں اس پر کبھی کوئی فخر نہیں کر سکتا تھا، کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ چوراچکوں ایسی بات تھی۔ کسی مال کو ادھر سے ادھر کر دینا کوئی کمال کی بات تو نہیں ہوتی۔ یہی حال ان لڑکیوں کا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اس مرحلے سے گزر گئی تھیں ورنہ ان کا گناہ کیا تھا مگر میری یہ مجبوری تھی کہ میری جان کی ڈور

دوسرے کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وہ مجھے کوئی گھٹیا سے گھٹیا کام کرنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ میں بس ایک مجہول سا آدمی بن کر رہ گیا تھا۔ محض ایک کھلونا، ایک مہرہ۔ جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی اور اس عذاب سے میں جب ہی چھوٹ سکتا تھا جب میں ایک بار پھر اپنی شناخت کھو دیتا مگر یہ میرے بس میں نہیں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابھی مجھے ستناجا صاحب کے ہاتھوں کیسی کیسی ذلتیں اور سہنا ہوں گی۔ کوئی کیا کہہ سکتا تھا مگر حالات کچھ ایسے ہی تھے کہ میں اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور میری یہی بے بسی اس کو طاقتور بنا رہی تھی۔

صبح تین بجے میں لاہور جا پہنچا۔ حیدر اس وقت گہری نیند میں تھا۔ میں نے بار بار گھنٹی بجائی۔ تب جا کر کہیں اس کی آنکھ کھلی اور وہ دوڑا ہوا گیٹ تک آپہنچا۔ جب اس نے تالا کھول کر مجھے دیکھا تو بولا "آپ کہاں سے آرہے ہیں سردار صاحب۔ میں تو گہری نیند میں تھا۔"

"بہت پریشان کرتے ہو تم! ہٹو پیچھے اور یہ گیٹ بند کردو۔" یہ کہہ کر میں کار کو لے کر کوٹھی کے اندر جا پہنچا۔ جب حیدر واپس مڑا تو مجھے اس نے ریحانہ کو پچھلی نشست سے اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا۔

"یہ کون ہیں صاب جی! یہ کہاں سے مل گئی آپ کو؟"

"چپ رہو! ان کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اور ریحانہ کو لے جا کر میں نے بستر پر ڈال دیا۔ جب میں جمیلہ کو بھی اندر لے گیا تو حیدر ایک بار پھر میرے پاس جھک آیا، بولا "یہ کون ہیں آخر صاب جی! کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی فکر مت کرو۔ بس صبح شام تم ان کا دھیان رکھو گے۔ ابھی تو یہ بے ہوش ہو رہی ہیں جب یہ ہوش میں آئیں تو انھیں جس چیز کی ضرورت ہو دے دینا۔ ویسے میں بھی ادھر ہی ہوں۔"

"مگر یہ ہیں کون؟"

"تم سے مطلب؟ جاؤ تم اب سو جاؤ۔ میں خود ان کا دھیان رکھوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے دونوں لڑکیوں کے ہاتھ کھینچ کر کمر پر باندھ دیے اور پھر ان کے ٹخنوں پر بھی رسی چڑھا دی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ جاگ گئیں تو بہت شور مچائیں گی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی سوتے میں ان کو اغوا کرلے گا۔ اس کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد میں نے کمرہ چاروں طرف سے مقفل کردیا اور پھر ایک کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ نیند نے میرے وجود کو سنگسار کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ بلاشبہ میری زبردست فتح تھی۔ میں اتنے سارے فساد میں ہاتھ ڈال کر لڑکیوں کو یوں لے آیا تھا جیسے لوگ مکھن میں سے بال نکال لیتے ہیں مگر اس میں میرے لیے فخر و مباہات کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس کے بارے میں کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیکھو میں کیا کر آیا ہوں، مجھے دیکھو میرے وجود میں زبردست ہلچل مچی تھی۔ ضمیر کی ملامت الگ مجھے رسوا کر رہی تھی مگر پھر بھی میں سو ہی گیا کہ نیند چیونٹی کا کپڑا ہے جو سر پر آتے ہی آنکھیں مُندنے لگتی ہیں۔

صبح میں آٹھ بجے جب بیدار ہوا تو حیدر نے بتایا کہ دونوں لڑکیاں ابھی تک بے ہوش ہیں۔ انھیں نیند کے فریب میں مبتلا ہوئے آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تو ان کو ہوش آجانا چاہیے تھا۔ حیدر انھیں کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھتا رہا تھا۔ حیرت اس کے منہ پر صاف لکھی نظر آتی تھی۔ جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ آخر یہ لڑکیاں ہیں کون؟ اور ہماری کوٹھی میں کیسے آگئیں؟

نیند سے بیدار ہوتے ہی میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر ستناجا صاحب کو میں نے فون کردیا۔ وہ اس وقت گھر پر ہی تھے، میری آواز سن کر بولے "کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟"

"اپنے گھر سے۔"

"کیا مطلب؟ یعنی آپ واپس بھی آگئے؟"

"ہاں۔ مکمل واپس آچکا ہوں۔"

"اور وہ ہمارا کام؟"

"میں نے آپ کا کام تمام کردیا ہے جناب!"

"واقعی! کمال ہے، حد ہوگئی۔ میں ابھی آپ کی طرف آرہا ہوں۔ اپنی کوٹھی میں ہیں نا آپ؟"

"جی ہاں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

ابھی میں نے ناشتہ کیا ہی تھا کہ ستناجا صاحب میرے پاس آپہنچے۔ سُرخ کار انھوں نے باہر ہی دیکھ لی تھی مگر اپنی کار وہاں نہ پا کر انھیں بڑی حیرت ہوئی مگر جس خوش خبری کو سننے کے لیے وہ بے چین ہو رہے تھے وہ تو میں لے آیا تھا۔

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے بھئی! مجھے یقین نہیں آتا۔ کہاں ہیں وہ لڑکیاں؟" وہ صوفے پر دھنس کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ساتھ کے کمرے میں ہیں، کھڑکی میں جا کر دیکھ لیں!"

وہ اُٹھے اور پہلو کے کمرے کی کھڑکی سے جا لگے۔ لڑکیاں ابھی تک بے سُدھ پڑی تھیں۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ مر ہی نہ گئی ہوں میرے آپریشن کا انداز بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ہاتھ ذرا گہرا دھنس گیا تو دوسرے کی جان پر بن آتی تھی۔ میں بھی ستناجا صاحب کے پاس جا ٹھہرا۔ اور پھر میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

"لڑکیاں تو بہت نوخیز ہیں اور فیشن ایبل بھی۔"

"ہاں۔ مگر ان پر زیادہ تبصرہ نہ کریں تو بہتر ہے، یہ میری امانت ہیں ستناجا صاحب اور میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ انھیں جیسے بھی ہو سکا، جلد ہی واپس چھوڑ آؤں گا۔"

"وہ تو ظاہر ہی ہے، ہم کوئی ان کا اچار تو نہیں ڈالیں گے مگر آپ کے کمال کی میں داد دیتا ہوں سردار صاحب!"

اس وقت میں لڑکیوں کی نبضیں دیکھ رہا تھا۔ دونوں تندرست و توانا تھیں۔ البتہ اُن کا سانس اب بھی بھاری تھا مگر نظر یوں آتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔

"آئیں اب۔ یہ خود ہی ہوش میں آجائیں گی۔ ان کو یہاں ہی رکھنا ہے کہ کہیں اور لے جانا ہے؟"

"نہیں ان کو ادھر ہی پڑا رہنے دیں۔ یہ قصہ جلدی ہی ختم ہو جائے گا۔ حسنین لنگاہی خود چیختا ہوا آئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اس کا دھیان رکھیں۔ آئیں اب چائے پی لیں۔"

"ناشتہ تو میں کر آیا ہوں مگر یہ بتائیں میری گاڑی اب کہاں ہے؟"

"اس کا قصہ نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ چالان ہوگیا تھا کہیں؟"

"جی نہیں۔ بلکہ گاڑی ہی ختم ہوگئی۔"

"ختم ہوگئی! نہیں بھئی، مذاق نہ کریں۔ بڑی قیمتی کار ہے وہ۔ کہاں رکھی ہے آپ نے؟" ستناجا صاحب نے میری بات کو مذاق سمجھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں، ہوا یہ ہے کہ...." میں نے شروع سے لے کر ساری بات انھیں تفصیل سے بتا دی۔

وہ بڑے غور سے میرے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے۔ میں چپ ہوا تو اُن کا مزاج برہم ہونے لگا، بولے "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سردار صاحب! گاڑی کیسے جلا دی اُن لوگوں نے۔ آپ سے کوئی بریف کیس بھی چھین کر لے گیا۔ یہ میں کیسے مان لوں؟"

"مان ہی لیں تو اچھا ہے ستناجا صاحب! اسی میں ہماری بہتری ہے۔ اگر چاہیں تو میں آپ کو نئی گاڑی لے کر دے سکتا ہوں۔ دس ہزار کی تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے، وہ میں ابھی آپ کو لوٹا سکتا ہوں۔"

میرے لہجے کی چبھن انھوں نے فوراً ہی محسوس کر لی۔ اپنی آواز کو ایک دم خوشگوار بناتے ہوئے بولے "چلو جو ہوا سو ہوا۔ لعنت بھیجیں اس قصے پر۔ آپ کو تو وہ نہیں پہچان سکے نا؟"

"جی نہیں۔ میری بچت بس اسی میں تھی مگر عین ممکن ہے کہ وہ مجھے پہچان گئے ہوں۔ بلاوجہ تو وہ میرے پیچھے نہیں آسکتے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ آپ پر کسی اور طرح ہاتھ ڈالتے۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ بڑے صاحب کو میں یہ خبر دے دوں۔ سارا زور اب ہم اسی بات پر صرف کر رہے ہیں کہ حسنین لنگاہی کو اس پارٹی سے الگ کردیں۔ میں یہاں سے وزیر آباد فون کر سکتا ہوں؟"

"کرلیں۔ مگر کس سے بات کریں گے آپ؟"

"میں تھانے میں فون کروں گا۔ آج کی تازہ خبر پوچھوں گا۔" یہ کہہ کر وہ فون کی طرف بڑھ گئے۔ وزیر آباد انھیں جلدی ہی مل گیا۔

"ہیلو! میں ڈی ایس پی سندھاوا بول رہا ہوں۔ تھانیدار صاحب کو فون دے دو۔" دوسری طرف سے کوئی سپاہی ان سے مخاطب تھا۔ اس نے فوراً ہی فون تھانیدار کو دے دیا۔

"کیا حال ہے ڈار صاحب! راضی تو ہیں؟" میں نے دوسرے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ وہ کسی زمانے میں دوسرے کمرے میں پڑا ہوتا تھا مگر اب وہ میری ہی میز پر دھرا رہتا تھا۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں سر! آپ نے کیسے یاد فرمایا؟"

"ویسے ہی میں پوچھ رہا تھا، کوئی تازہ خبر؟"

"کچھ بھی نہیں۔ سب اوکے ہے جناب! البتہ حسنین لنگاہی ہے نا یہاں کا؟"

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے؟"

"سر! اس کی دونوں بیٹیاں کسی نے اغوا کر لی ہیں۔ وہ بیچارا بہت سر پیٹ رہا ہے۔ بھاگتا ہوا صبح سویرے میرے پاس آیا۔ میں نے رپورٹ تو درج کر لی ہے مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گئی کہاں ہیں، اُن کی کار بھی غائب ہے۔"

"اچھا! یہ کیسے ہوگیا؟ وہ دونوں ہی غائب ہیں؟"

"جی ہاں۔ پہریدار بھی بے ہوش پڑا تھا۔ اسے صبح جا کر کہیں ہوش آیا۔ اُن کی ماں کو بھی خبر نہیں ہے۔ وہ دوسرے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔"

"کمال ہے، ان کا پتہ کرو بھئی! وہ تو بہت اہم آدمی ہیں۔ یہ کیسے ہوگیا۔ ورنہ تو وہ ہمیں بہت پریشان کریں گے۔"

"جی مجھے معلوم ہے مگر واردات کا کوئی سراغ بھی تو ملے۔ کل سنا ہے کسی نے ادھر دریائے چناب پر لنگاہی صاحب

گاڑی جلادی۔ اس میں اختر اور حکیم خان سوار تھے۔ دونوں ہی درختوں کے نیچے بے ہوش ملے مگر ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ واردات کس نے کی۔ ایک گاڑی گجرات میں بھی کل جلادی گئی تھی مگر اس کا مالک تھانے نہیں پہنچا۔"

"اچھا پھر؟ اس کی اطلاع تمھیں کیسے ملی؟"

"یہ بات ہمیں اختر اور حکیم خان نے بتائی ہے۔ وہ گاڑی انھوں نے جلائی تھی۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں، جس کے بدلے میں اس آدمی نے اُن کی گاڑی جلادی۔"

"مگر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہونی چاہیے تھی نا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے رندھاوا صاحب! وہ دونوں آدمی یہ بتاتے ہیں کہ وہ شخص کار میں لنگاہی صاحب کی لڑکیوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے پرسوں رات ان کی کوٹھی کا بھی جائزہ لیا اور پھر کل صبح سویرے وہ وہاں جا ٹھہرا۔ جیسے ہی لڑکیاں باہر نکلیں، وہ اُن کا گجرات تک تعاقب کرنے لگا۔ اختر اور حکیم خان نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ سارا قصہ وہیں سے شروع ہوا تھا۔"

"کہیں وہی آدمی لڑکیوں کو اغوا کرکے نہ لے گیا ہو؟"

ستناجا صاحب نے اس معاملے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

"عین ممکن ہے یہی بات ہو مگر اُسے نہ وہ لوگ جانتے ہیں، نہ ہم۔ بہرحال ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دو راتیں اس آدمی نے یہاں ہوٹل میں بھی گزاری ہیں۔"

"اس کا پتہ کرو بھئی۔ یہ تو بہت بُری بات ہے۔ حسنین صاحب اب کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ وہ آج ہی گورنر صاحب سے ملیں گے۔ ان کی لڑکیوں کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ قیامت مچادیں گے۔"

"وہ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں جس کی بیٹیاں گم ہو جائیں، وہ کچھ بھی کرے تھوڑا ہے۔" اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

"آپ نے تھانیدار کی باتیں سن لی ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ آپ کو شاید میری بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔"

"کچھ اس کی صداقت پر مجھے شبہ تھا مگر اب دور ہو گیا ہے بہرحال امید رکھیں، حسنین لنگاہی لاہور آ ہی رہا ہوگا۔"

"ہاں۔ اس سے بہت سوچ سمجھ کر بات کریں۔ کسی کو میرے گھر کا پتہ آپ نہیں دیں گے۔"

"کوئی پاگل تھوڑی ہیں ہم۔ بس اُسے آ لینے دیں۔ بڑے صاحب سے اس کی ملاقات ضرور ہوگی۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔"

"بہتر ہے میرا خیال ہے وہ لڑکیاں جاگ گئی ہیں۔"

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر میں حیدر کی طرف لپکا۔ وہ بھی دیوار کے ساتھ کھڑا اُن کی آوازیں سُن رہا تھا۔

"دیکھ اوئے حیدر! ادھر آ۔ یہ جو لڑکیاں ہیں نا، ان کے سامنے تم منہ پر کوئی کپڑا باندھ کر جاؤ گے سمجھے۔ کوئی جراب چڑھا لینا یہ منحوس چہرہ اُن کو مت دکھانا۔ اب جاؤ دوسری طرف کے دروازے میں سے اُن سے بات کرو۔"

"جی بہت بہتر۔ میں واقعی جراب چڑھا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جا گھسا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس نے چہرے پر سیاہ رنگ کی جراب پہن رکھی تھی۔ اس نے دوسری طرف سے جا کر کمرے کا دروازہ کھولا تو میں اور ستناجا صاحب اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑے تھے اور اُن کی باتیں اور ان کی صورتیں ہم صاف دیکھ سکتے تھے۔

حیدر نے دروازہ کھولا۔ تو دونوں ایک دم اور زیادہ چیخنے لگیں۔ "یہ ہمیں کس نے باندھا ہے یہاں؟ کون تھا وہ بدمعاش ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"آہستہ بولیں مس! بہت آہستہ۔ آپ کالو بلا جن کے قبضے میں ہیں۔ وہی رات آپ دونوں کو اٹھا کر ادھر لے آیا تھا۔"

"ذرا یہ میرے ہاتھ کھولو۔ میں تمھاری بوٹیاں نوچ لوں گی آخر تم ہو کون؟ کیوں پکڑ لیا ہے تم نے ہمیں؟ اب جن کا رعب دیتے ہو ہمیں۔"

"آپ کو بہت بھوک لگی ہوگی۔ میں آپ کے لیے ناشتہ لاتا ہوں۔"

"بھائی خدا کے لیے ہمیں بتاؤ کہ ہم کہاں ہیں، کس نے ہمیں یہاں لا ڈالا ہے؟"

"میں تو خود نہیں جانتا ہوں ہمشیرہ! میں تو خود اغوا شدہ آدمی ہوں۔ آپ کی خدمت وہ مجھے سونپ گئے ہیں۔"

"کون سونپ گئے ہیں یہ خدمت؟ آخر وہ ہیں کون؟ ہم سے انھیں کیا ضد تھی؟"

"ہو سکتا ہے آپ انھیں پسند آ گئی ہوں ہمشیرہ، کوئی کیا کہہ سکتا ہے حکم اُن کا یہ ہے کہ میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔"

"تکلیف کی بات کرتے ہو۔ ہمارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ کہہ رہے ہو۔"

"اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ ابھی آپ ناشتہ کرلیں پھر آرام سے سو رہیں۔ یہاں کوئی بچے وغیرہ نہیں ہیں جو آپ کی نیند میں خلل ڈالیں۔"

"ہمیں نہیں کرنا ہے ناشتہ۔ یہ بکواس بند کرو۔ اور فوراً ہمارے ہاتھ کھول دو۔" جمیلہ کچھ زیادہ ہی بے صبر ہو رہی تھی۔

ستناجا صاحب وہاں سے ہٹ گئے اور مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے جا کر بولے۔ "ان سے بہت ہوشیار رہنا۔ لڑکیاں بہت تیز لگتی ہیں بہرحال میرا خیال ہے کہ ان کو ہم جلدی ہی چھوڑ دیں گے۔ میں آپ کو شام کے وقت فون کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے بھی ابھی کوئی کام نہیں ہے۔ میں ساری رات کا جاگا ہوا ہوں، ابھی آرام کروں گا۔" میں نے ستناجا صاحب کو لان تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ وہ جیپ میں آئے تھے اسی میں واپس چلے گئے مگر اپنی کار کا ملال اُن کے چہرے سے عیاں تھا۔

ستناجا صاحب کا دوسرا فون مجھے شام کو چار بجے ملا۔ مجھے انھوں نے فوراً ہی اپنی کوٹھی آنے کے لیے کہا تھا۔ حیدر نے اس عرصے میں خدا جانے اُن لڑکیوں کو کیسے رام کر لیا۔ وہ دوبارہ نہیں بولیں۔ میرا خیال ہے اس نے انھیں افیون کی گولی کھلا دی تھی۔ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا کہ کمرے سے پھر اُن کی آواز نہیں ابھری۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھا تو وہ ایک بار پھر گہری نیند میں تھیں اور یہ اچھی بات تھی ورنہ خواہ مخواہ کا فضیحتا ہوتا رہتا۔

میں حیدر کو بہت زیادہ محتاط رہنے کا کہہ کر کوٹھی سے باہر نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ستناجا صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ وہ میرے ہی انتظار میں باہر کھڑے تھے۔ میرا لباس دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔ بولے۔ "آپ اس لباس میں بہت خوبصورت لگ رہے ہیں سردار صاحب!"

"جی ہاں۔ مجھے آپ نہیں بنائیں گے تو اور کون بنائے گا بہرحال اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں آج آپ کو بڑے صاحب کے ہاں لے جا رہا ہوں۔ چلیں جیپ میں بیٹھیں۔"

"اچھی طرح سوچ لیں، یہ آسان کام نہیں ہے جناب!"

"کیا مطلب؟ کوئی ہمیں روک نہیں سکتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بیٹھیں۔"

مجبوراً میں ان کے ساتھ جیپ کی اگلی نشست پر جا بیٹھا مگر طبیعت میری یہی چاہ رہی تھی کہ میں وہاں سے بھاگ نکلوں۔ کہاں میں، کہاں بڑے صاحب اور ان سے میری ملاقات۔ وہ بھی اُن کے خاص دفتر میں۔ بات بالکل ہی انمل بے جوڑ سی لگتی تھی۔ وہ جو میرے اندر کا آدمی تھا، وہ تو لرز کر رہ گیا۔ کوئی ایسی ویسی بات وہاں ہو گئی، کسی نے مجھے پہچان لیا میرے فن کی داد وہاں دے دی تو ایسے میں میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ مگر جب ستناجا صاحب کہہ رہے تھے تو پھر وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔

"آپ کی اطلاع کیا ہے؟"

"حسنین لنگاہی لاہور پہنچ چکا ہے اور آج پانچ بجے بڑے صاحب سے اس کی ملاقات ہوگی۔"

"گڈ۔ پھر تو چانس ہے، وہ یقیناً اپنی پارٹی تبدیل کرلے گا۔"

"ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے سیاست سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر جائے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

گاڑی کچھ ہی دیر بعد بڑے صاحب کے دفتر میں جا پہنچی۔ سپاہیوں نے ستناجا صاحب کو گاڑی میں دیکھ کر کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ بلکہ انہیں سلام کرکے آگے نکلنے دیا۔ اُن کی وجہ سے مجھے بھی کسی کو روکنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ستناجا صاحب نے جیپ بڑی عمارت کے سامنے پہنچ کر روک دی اور مجھے ساتھ لے کر وہ بڑے اطمینان سے بڑے دروازے کے اندر چلے گئے۔ اونچی اونچی چھتوں، ستونوں اور محرابوں سے سجی وہ عمارت دیکھنے والے کو حیران کرتی تھی۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس عمارت نے بڑے بڑے جابر حکمرانوں کو دیکھا تھا۔ اُن کے جاہ و جلال، ان کے رعب و دبدبے اور اُن کی سطوت کو اپنے وجود میں جگہ دی تھی اور اب یہ سارا سلسلہ میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے مجھے یہ ہو رہی تھی کہ وہ غلام جیلانی جو پولیس کے نام سے لرز لرز جاتا تھا، قانون جس کے لیے ایک آہنی شکنجے ایسی حیثیت رکھتا تھا، وہ غلام جیلانی ایک نئے قالب میں ڈھل کر اتنا نڈر اور بے باک ہو چکا تھا کہ وہ انہی لوگوں کے درمیان جا رہا تھا جن کے پاس اس کی گردن گروی رکھ دی گئی تھی۔ میرے اعمال تو ناگفتنی تھے۔ اُن پر میں کسی طرح بھی فخر نہیں کر سکتا تھا مگر میرے وہی کارنامے مجھے ایک نئی زندگی دے گئے تھے۔ میں سردار کریم نواز کی حیثیت سے یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے میرا قد سارے جہان سے بالا بلند ہو چکا ہو۔ کوئی میرے دلی اضطراب کو سمجھ نہیں سکے گا۔ کوئی ہاتھ تھا، کوئی غیر مرئی ہاتھ جو مجھے پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ بات سمجھا رہا تھا کہ آگے مت جاؤ۔ تمھارا پردہ چاک ہو جائے گا۔ پھر تمھیں کوئی سنبھالنے والا بھی نہیں رہے گا۔ کوئی تمھاری یہاں ضمانت بھی نہیں دے سکے گا۔ اس کانٹوں بھری سیج سے بچ جاؤ جیلانی! تمھارے لیے یہی بہتر ہے مگر اس کے باوجود میرے قدم آگے ہی بڑھتے رہے۔ میں کہیں بھی نہیں ڈگمگایا کہ ستناجا صاحب میرے ساتھ تھے اور وہ میرا حوصلہ بڑھاتے جا رہے تھے۔

بالآخر ہم بڑے صاحب کے دفتر میں جا گھسے۔ دفتر کیا تھا، ایک شہنشاہی تھی۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایرانی قالین بچھا تھا جس میں پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی ہی جانفزا خوشبو آدمی کا والہانہ استقبال کرتی تھی۔ کمرے کے چاروں طرف بہت عمدہ قسم کے صوفے بچھے تھے۔ درمیان میں ایک چوڑی چکلی مہاگنی کی میز بچھی تھی۔ جس کے سامنے وہ کرسی تھی جس پر بڑے صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ بالا بلند اونچی قد آور کرسی اور وہاں اس وقت دو آدمی موجود تھے۔ وہ ستناجا صاحب کو دیکھ کر اٹھ گئے۔

"یہ حسنین لنگاہی صاحب ہیں۔" انھوں نے جنبی سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔ آنکھیں خشک اور ویران۔ بالوں میں اس نے کنگھی تو کر رکھی تھی مگر وہ بھی بے آب تھے۔ لباس اس کا بہت عمدہ تھا مگر اس میں بھی ایک عجیب سی ابتری نظر آتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ آدمی پہروں روتا رہا ہو۔

"ان سے میرا تعارف نہیں۔" ستناجا صاحب نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے بھائی ہیں مرسلین لنگاہی۔"

"اوہ، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ سردار کریم نواز ہیں۔ بڑے صاحب سے ملنے کے لیے میرے ساتھ ہی چلے آئے۔"

انھوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا مگر ان دونوں کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ایک اندرونی اضطراب تھا جس نے انھیں بے بس کر رکھا تھا۔

"خدا کے لیے ستناجا صاحب میری کچھ مدد کریں۔ میں برباد ہو گیا ہوں۔" حسنین لنگاہی نے کہا۔

"خیر تو ہے حسنین صاحب! ہوا کیا ہے آخر؟" ستناجا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میری دونوں بیٹیاں۔ اوہ میرے پروردگار! رات کوئی انھیں اغوا کر کے لے گیا ہے۔ میں تو جیتے جی مر گیا۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔"

"ارے! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! بیٹیاں غائب ہو گئیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کون آدمی تھا وہ؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے، رات کو میں گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔" انھوں نے ہمیں واقعات کی تفصیل بتانا شروع کی۔ "ان کو ایک باقاعدہ سازش کے ذریعے اغوا کیا گیا ہے ستناجا صاحب! مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ آدمی کون تھا اور کس کا بھیجا ہوا تھا۔ یہ میری بدنصیبی تھی کہ میں گھر پر موجود نہیں تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا حسنین صاحب! انتہائی برا ہوا۔ آپ کی عزت کو للکارا گیا ہے۔ کسی پر شک تو ہو گا آپ کو؟"

"مجھے کسی پر شک نہیں ہے جناب! میں کیا کہوں۔ جن لوگوں نے کل اس آدمی کو دیکھا تھا انھیں میں ساتھ لے آیا ہوں، وہ باہر دفتر میں بیٹھے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"وہ میرے ملازم ہیں، اختر اور حکیم خان۔ انھوں نے کل اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔ گجرات تک وہ لڑکیوں کے پیچھے گیا۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ میری بدنصیبی یہ تھی کہ میں ان دونوں ملازموں کو ساتھ لے کر رات گوجرانوالہ چلا گیا، انھیں کل شام تک ہوش نہیں آیا تھا۔"

"وہ بے ہوش کیسے ہو گئے؟ کوئی بھنگ پی گئے تھے وہ؟"

"نہیں جی! ان کا کہنا یہ ہے کہ اس آدمی نے ان کی گردن دبائی تھی جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ پتہ نہیں وہ کیسا آدمی تھا میرے دونوں ملازم کل کہیں شام کو آٹھ بجے ہوش میں آئے۔ مجھے بڑے صاحب سے ملا دیں ستناجا صاحب! میں بڑی آس لے کر آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، ان سے آپ ضرور مل لیں مگر ایسا تو نہیں ہے کہ وہ لڑکیاں خود ہی......"

"یہ نہ کہیں۔ ایسا ظلم نہ کریں ستناجا صاحب! خدا کے لیے ان کو اور رسوا نہ کریں۔ میں اپنی بیٹیوں کو جانتا ہوں، وہ ایسی ہرگز نہیں ہیں ستناجا صاحب! وہ ایسی نہیں ہیں۔"

"میں نے تو ویسے ہی بات کی ہے حسنین صاحب! مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ آپ نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ بھی میری بدنصیبی کی انتہا ہے کہ مجھے بیٹیوں کی تلاش میں وہاں جانا پڑا۔ اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو گی۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے تھے۔ میں انھیں کیا جواب دیتا۔ میں ان کا والد ہوں ستناجا صاحب! مجھ سے پوچھیں کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ ان کی ماں کا رونا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ کیا ہو گیا ہے جناب! میں کہاں جاؤں؟"

اس کے بھائی نے اسے صبر کرنے کے لیے کہا۔ مگر اسے کیسے چین آ جاتا۔ صبر تو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ذرا دیر رک کر وہ پھر بولا۔ "اختر نے جس کار کو گجرات میں آگ لگائی، وہ اسی آدمی کی کار تھی جو لڑکیوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ آج ہم وہاں بھی گئے تھے۔ اس کار کا نمبر مجھے مل گیا ہے مگر وہ پورا نمبر نہیں ہے۔ صرف دو سو باسٹھ پڑھا جا سکتا ہے۔ ایل ای بھی واضح تھا مگر پورے نمبر ہم نہیں پڑھ سکے۔ سب کچھ جل گیا تھا۔"

"اوہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دکھائیں وہ نمبر۔" ستناجا صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔ ان کا رنگ ایک لمحے کے لیے تو اڑ گیا تھا۔ میں نے معاملے کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ آگ کتنا ہی جلا دیتی، اس ڈھانچے میں سے کوئی نہ کوئی چیز تو ایسی رہ گئی ہوگی جس سے کار کی ملکیت کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔ حسنین نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بلاشبہ ہماری ہی کار کا نمبر تھا۔ چار دو چھ دو نمبر اسے ملا تھا اور وہ لاہور میں رجسٹر ہوئی تھی۔ اس کے کاغذات بھی گاڑی میں موجود تھے۔ وہ نمبر ہم دونوں نے بڑے غور سے دیکھے۔

"گاڑی میں اس کے کاغذات بھی تو موجود ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ وہ سب کچھ جل گیا تھا صرف نمبر پلیٹ سے ہم یہ نمبر حاصل کر سکے ہیں۔ باقی سب کچھ بھسم ہو چکا تھا۔"

"اختر کو تو نمبر یاد ہو گا؟"

"جی نہیں اس نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا۔"

"میرا خیال ہے ہم اس نمبر سے گاڑی کے مالک کا پتہ کر سکتے ہیں مگر اس کا پہلا نمبر غائب ہے۔"

عین اس وقت ایک چپراسی کمرے میں آیا اور بولا۔ "اس وقت صاحب آپ سے نہیں مل سکیں گے، انھیں اچانک اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے اور وہ ایئرپورٹ چلے گئے ہیں۔"

حسنین کا رنگ پیلا ہونے لگا۔ وہ ایک بار پھر کرسی سے اٹھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ یہ خبر سن کر وہیں جان دے دے گا۔ مرسلین نے اسے سنبھالا اور بولا۔ "آپ پریشان نہ ہوں بھائی! حوصلہ رکھیں۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں، حادثے ہو جاتے ہیں۔ کوئی اور مصیبت آ جاتی ہے۔ ان سے ہم کل بھی مل سکتے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی کو حوصلہ تو نہیں ہارنا چاہیے، یہی تو اس کا اثاثہ ہے۔ اسے ہی وہ کھو دے تو پھر اس کے پاس کیا بچتا ہے۔

"کچھ کریں ستناجا صاحب! خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میری بیٹیاں مجھے واپس دلا دیں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں حسنین صاحب! میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ ابھی اگر لاہور میں ہیں تو اپنا فون نمبر مجھے دے دیں۔ میں آپ سے پھر بات کروں گا۔"

"ہاں ہاں، یہ میرا فون نمبر ہے میں اپنے بھتیجے کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا فون نمبر انھیں دے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں وہاں سے نکل کر باہر چلے گئے۔ جیسے ہی کمرے میں تخلیہ ہوا، بڑے صاحب کا چپراسی دروازے کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ ہم بھی وہاں سے اٹھ کر جیپ میں جا بیٹھے۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ گاڑی مکمل طور پر جل گئی تھی مگر یہ نمبر تو کچھ اور ہی بتاتا ہے۔"

"میرا تو یہی خیال ہے، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"فکر کی بات بہرحال نہیں ہے۔ وہ گاڑی مجھے کچھ ہی دن پہلے تحفے میں ملی تھی۔ اس کے مالک کراچی میں رہتے ہیں۔ ابھی کاغذات میرے نام منتقل نہیں ہوئے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ورنہ تو ہم اپنا پتہ وہاں چھوڑ آتے تھے۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اس پر کراچی کا نمبر درج ہے اور وہ بھی انھیں پورا نہیں مل سکا۔ خدا نے ہماری عزت رکھ لی ہے آئیں اب چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر ستناجا صاحب نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ جب ہم ان کے دفتر سے باہر نکلے تو ستناجا صاحب بولے۔ "وہ ایک اسمگلر کی کار ہے۔ ایسی تو وہ کئی کاریں جلا سکتے ہیں آپ بہرحال پریشان نہ ہوں۔"

"مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اس کی تسلی کے لیے کچھ کریں۔"

"میں آج یا کل کسی کو اس کی طرف بھیجوں گا۔ اسے ہم مجبور کر دیں گے کہ وہ سیتا سے باز آ جائے۔ ورنہ اس کی لڑکیاں اسے کبھی واپس نہیں ملیں گی۔"

"مگر اس کا مقابلہ کس سے ہو گا؟"

"وہ برکت علی وحید سے پنجہ لڑا رہا ہے اور ہم یہی نہیں چاہتے ہیں۔ بڑے صاحب کا راستہ تو صاف ہو چکا ہے ورنہ وہ ہادی علی انھیں بھی ذلیل کر دیتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شیر دل آپ کے لیے کام کر رہا تھا؟"

"ہاں۔ بڑے صاحب سے اس کی بہت گاڑھی چھنتی ہے مگر آج کل وہ ہے کہاں؟ مجھے بہت دنوں سے نظر نہیں آیا۔"

"وہ اپنے گاؤں گیا ہو گا مگر اس کے بیوی بچے تو یہاں ہی ہیں۔ کیا اس ہادی علی کا نام آپ نے اسے دیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ سب کام میرے ہی سپرد ہوتے ہیں۔"

"آپ کمال کے آدمی ہیں ستناجا صاحب! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہادی علی کا قتل آپ کے ایما پر ہوا ہے مگر آپ سے میری ملاقات ہو ہی گئی۔"

"ہاں سلیقے سے کام کرنے والے آدمی بہت کم ملتے ہیں۔ آپ کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ بالکل درست نکلا۔ واقعی آپ بڑی ہوشمندی سے کام کرنے والے ہیں ورنہ ہم حسنین کو کیسے قابو کر سکتے تھے؟"

"آپ کو خدا کا خوف نہیں ہے ستنا جا صاحب!" میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ انھوں نے جیپ کو ایک دم بریک لگائے یوں جیسے میری اس بات نے انھیں شدید صدمہ پہنچایا ہو۔ مگر پھر فوراً ہی بریک پر سے پیر ہٹاتے ہوئے وہ بولے۔

"آپ کا مطلب کیا ہے سردار صاحب! خیر تو ہے۔ اپنا بھی اعمالنامہ دیکھ لیا کریں کبھی۔"

"وہ تو میرے سامنے ہی رہتا ہے مگر۔۔۔ خیر دفع کریں۔"

"نہیں نہیں بات کریں آپ۔ میں آپ کو جواب دوں گا۔"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سراسر ظلم ہے۔ ایک ایسے آدمی کو بے بس کر دینا جس نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔"

"مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ آپ نے جب ان لڑکیوں کو اٹھایا تو اس وقت آپ کے ذہن میں کیا تھا؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں مجبور ہوں ستنا جا صاحب! اور میری مجبوری کو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ میں بندوق میں رکھی گولی ہوں، جدھر آپ چاہیں گے چلا دیں گے۔"

"چلیں اچھا ہے آپ کو یہ احساس تو ہے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں گے تو ہم آپ کو زندگی کا سفر آسانی سے گزارنے میں ہر قسم کی مدد دیں گے اور یہی ہمارا آپ سے وعدہ ہے۔"

اتنے میں جیپ میری کوٹھی تک جا پہنچی۔ ستنا جا صاحب نے اس کا رخ موڑا تو میں نے کہا۔ "لڑکیوں کو نہیں دیکھیں گے آپ؟"

"نہیں سردار صاحب! ان سے تو بچ کر ہی رہیں اور خود کبھی ان کے سامنے نہ جائیں۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ ان کو آپ کی شکل کبھی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا آپ فکر نہ کریں۔ حیدر کو بھی میں نے سمجھا دیا تھا۔"

یہ کہہ کر میں نے ان سے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ کر میں نے گیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجا دی۔

حیدر نے آکر جب دروازہ کھولا تو وہ مجھے بہت ہی پریشان نظر آیا۔

"کیا بات ہے حیدر! خیر تو ہے؟ تمھارا منہ کیوں لٹک رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔ وہ لڑکیاں مسلسل رو رہی ہیں۔ انھوں نے کھانے پینے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہیں کہ ہمیں واپس چھوڑ۔۔۔"

"ایسے ہی بکتی ہیں وہ۔ ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا ہے۔ تم نے انھیں اپنا چہرہ تو نہیں دکھایا؟"

"جی نہیں۔ میں جراب پہن کر ان کے سامنے جاتا ہوں۔ میں نے چاروں طرف سے مقفل کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کھول لیے ہیں اور پھر بھی۔ پتہ نہیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ تو میں ان کے پاس جاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔"

جو گرہ میں نے لگائی تھی، دو آدمیوں کے لیے اس کا کھول لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کی ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ باہر بہرحال نہیں نکل سکتی ہیں۔

"ہاں۔ اسی لیے تو میں نے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ مگر سردار صاحب! ان کا کرنا کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، چار چھ دن بعد ہم انھیں چھوڑ دیں گے۔"

"مگر انھیں یقین ہی نہیں آتا۔ میں نے تو انھیں کہا مگر وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں ہیں۔"

"ان کے کمرے میں مت جانا ورنہ وہ پاگل ہو کر تمھیں جان سے مار دیں گی۔ جو کچھ انھیں دو کھڑکی میں سے اندر رکھ۔۔۔"

"جی بہت بہتر۔ میں یہی کروں گا۔ مجھے بھی ان سے سخت ڈر لگتا ہے، وہ بہت بپھری ہوئی ہیں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اگر وہ کھانا مانگیں تو انھیں۔۔۔ کچھ پھل بھی ان کے سامنے رکھ دو۔ انھیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

کوٹھی کے اندر پہنچ کر میں لباس تبدیل کر کے پلنگ پر جا بیٹھا۔ حیدر نے کھانا تیار کر رکھا تھا، وہ اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ لڑکیاں تیسرے کمرے میں تھیں اور وہ اب تک اتنا رو چکی تھیں کہ اب ان سے مزید رویا نہیں جا رہا تھا۔ کھانے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں ان کو دیکھنے چل دیا۔ کھڑکی میں سے میں انھیں دیکھ سکتا تھا، اس کے پردے ڈال دیے گئے تھے۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں مکمل اندھیرا تھا، اس لیے میں انھیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی پلنگ پر بیٹھی تھیں، کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ ان کی تنہائی نے انھیں چاروں طرف سے نرغے میں لے رکھا تھا۔ دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور آنکھیں ان کی بہت ہی ویران نظر آتی تھیں ۔۔۔۔ حیدر نے کھانے پینے کا جو سامان رکھ دیا تھا وہ سامنے میز پر جوں کا توں رکھا تھا۔ کمرے میں ابھی تک کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اتنی باتیں کر چکی تھیں اور اپنے حال پر اتنا رو چکی تھیں کہ اب شاید کہنے سننے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ واقعی بہت تنہا رہ گئی تھیں۔ ابھی اس اسیری کی انہیں کوئی وجہ بھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ انھوں نے بہت سوچا ہوگا۔ اس آدمی کا بھی انھیں انتظار ہوگا جو انھیں زبردستی گھر سے اٹھا کر لے آیا۔ ان کا خیال ہوگا کہ وہ شراب کی بوتل ہاتھ میں لے کر اچانک ہی ان کے کمرے میں آ جائے گا۔ اس کی ہوس اسے شیطان بنا دے گی۔ انھوں نے بہت سوچا ہوگا کہ وہ خود کو اس کی دست برد سے کیسے بچا سکیں گی۔ کوئی جوان لڑکیوں کو یوں ہی تو اغوا نہیں کرتا۔ ایسے لوگ ابلیس زادے بن جاتے ہیں۔ انھیں بھی یہی خطرہ ہوگا۔ پتہ نہیں خود کو بچانے کے لیے اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے کیسی کیسی باتیں سوچی ہوں گی۔ کمرے کا سناٹا بڑا گمبھیر ہو گیا تھا۔ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ انھیں کیوں اغوا کیا گیا ہے اور وہ آدمی ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے ابھی تک ان کے سامنے کیوں نہیں آیا۔ ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی مگر میں مجبور تھا، ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

تھک ہار کر میں پھر اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ میرا کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس سے زیادہ برودت مجھے اپنے دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ آدمی حالات کی اسیری کا مقابلہ کیونکر کر سکتا ہے۔ ہر زنجیر اسے پہاڑ نظر آتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ سکون مجھے ایک پل کے لیے بھی نہیں تھا۔ وہ اگر پریشان تھیں تو ان سے زیادہ میں نڈھال ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ میری ہی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھیں مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ میری بے بسی دیکھیں، وہ میرے سامنے تھیں، انھیں میں اس اسیری سے رہائی بھی دلا سکتا تھا مگر پھر بھی میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا۔۔۔ کیا یہ صرف اس لیے نہیں تھا کہ میری اپنی جان گروی رکھی گئی تھی اور میں اپنے لیے اپنی مرضی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا؟ کہ۔۔۔ غلام جیلانی جب سردار کریم نواز بن گیا تو غلام جیلانی کی ساری صفات بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئیں۔

کھانا کھا کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ زندگی ہارتی جا رہی تھی۔ حوصلے اور عزم کی طنابیں کٹنے لگی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ میری وہ ساری رات سوچوں میں کٹ گئی۔ اندیشہ ہائے دور و دراز نے مجھے یوں نرغے میں لے رکھا تھا کہ ایک پل کے لیے بھی میری آنکھ نہ لگی۔ وہ میری کہانی کا عنوان، وہ میری بہن آسیہ تو نظروں سے ایسی اوجھل ہوئی تھی کہ اب اس کے بارے میں سوچنا بھی مجھے دوبھر معلوم ہوتا تھا مگر۔۔۔ مگر اس جیسی یہ دو بہنیں بھی تو تھیں جو کسی کے وجود کا حصہ تھیں اور انہیں میں باندھ کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ کوئی ان کے لیے اتنا ہی پریشان ہوگا جتنا میں تھا مگر جب میرے دل میں ان کے لیے کوئی ہمدردی کا جذبہ نہیں اٹھ رہا تھا جب میں سب کچھ کرنے کے باوجود ان کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا تو پھر۔۔۔ پھر جس حال میں آسیہ پھنسی تھی وہ اسے کیسے کاٹ سکتی تھی۔ کسی نے اس پر بھی بہت پہرے بٹھا رکھے ہوں گے۔ نہ اس کی آواز مجھ تک پہنچتی تھی، نہ میرا حرفِ مدعا اس تک پہنچ رہا ہوگا۔ یہ کیسی بے بسی ہے پروردگار! اپنی تمام تر نیتوں کی نیکی اور ارادے کی پختگی کے باوجود ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے تو کیا یہی آدمی کی تقدیر ہے؟

میری ساری رات انہی سوچوں میں غلطاں گزر گئی۔ اور میں بغیر آنکھ جھپکے صبح سویرے یوں اٹھ گیا جیسے میں ساری رات چلتا رہا ہوں۔ بدن میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ بستر کی بے پناہ نرمی مجھے اور زیادہ تھکا گئی تھی۔

غسل خانے میں جا کر میں کتنی ہی دیر تک پانی سے کھیلتا رہا مگر میں نے محسوس کیا کہ جب دل ہی مطمئن نہ ہو تو خارجی چیزیں کوئی آرام نہیں دیتی ہیں۔ سارا سکون تو دراصل وجود کے اندر ہوتا ہے مگر کوئی مجھ ایسا یہ اطمینان، یہ سکون کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا تو اس روز پہلی بار میں نے کلّے دار پگڑی پہنی۔ حیدر میری شیروانی کو دیکھ کر میرے لیے چار پگڑیاں لے آیا تھا اور کلاہ بھی۔ پگڑی میں نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر باندھی اور اونچا شملہ لہرا کر میں نے گردن پر پھیلا لیا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ پگڑی مجھے سج گئی ہے۔

حیدر میرے لیے چائے لے آیا۔ مجھے یوں بنا سنورا دیکھ کر بولا۔ "اللہ! آپ کو تو یہ پگڑی بہت ہی اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں۔ آئینہ بھی یہی کہتا ہے۔ حالانکہ یہ میں نے پہلی بار باندھی ہے۔"

"کمال ہو گیا ہے سردار صاحب! آپ کو کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ تھوڑی سی کالک ماتھے پر لگا لیں۔"

"ابے! عورتوں والے حربے استعمال کر رہا ہے تو میرے ساتھ۔۔۔ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"ٹھیک ہی ہیں جی۔ کھانا انھوں نے کھا لیا تھا۔ میز خالی پڑی ہے۔ پھر وہ سو گئی تھیں اور ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔"

"چلو اچھا ہے، انھیں خود ہی اس قید کی عادت پڑ جائے گی۔ ذرا ناشتہ بھی لے آؤ۔"

حیدر بہت کام کا آدمی تھا۔ گھر گرہستنوں کی طرح کام کرتا تھا۔ صبح سویرے ہی اُٹھ کر گھر کے کام دھندے میں جُت جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے روک کر اچھا ہی کیا تھا۔ ورنہ میں کوئی بھروسے کا آدمی کہاں سے تلاش کر سکتا تھا۔

اگلے چار دن میرے اس طرح گزرے کہ میں گھر کے ایک کونے میں چپ چاپ پڑا رہا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ ایک اخبار ہی سارے جہان سے اپنا تعلق برقرار رکھنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ میرے کہنے پر حیدر نے تین اخبار لگوا لیے تھے۔ اُن کی خبریں دل میں ہراس پیدا کرتی تھیں۔ اخبار والوں کو حسنین لنگاہی کی بیٹیوں کے اغوا کی خبر مل گئی تھی اور وہ اُسے خوب مرچ مسالا لگا کر چھاپ رہے تھے مگر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میری گاڑی کا اصل نمبر کیا ہے۔ پولیس اس سلسلے میں اپنی تفتیش میں مصروف تھی۔ کئی مشتبہ آدمیوں کو انھوں نے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اخبار نے لڑکیوں کی تصویریں بھی چھاپ دی تھیں۔ اتنی ساری دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی اخبار یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کسی کو بھی اصل بات کی خبر نہیں مل سکی تھی۔ کچھ اور خبریں بھی اس دوران اخبار میں چھپتی رہیں بڑے صاحب کے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں۔ پتہ مجھے چلتا رہتا تھا کہ کون اس وقت کیا کر رہا ہے۔ ہر اخبار میں حسنین لنگاہی کا بیان چھپتا تھا ۔۔۔ وہ دُہائی دے رہا تھا کہ اُسے اس کی بیٹیاں واپس کی جائیں۔ پتہ نہیں یہ اپیل وہ کس سے کرتا تھا ۔۔۔

ان لڑکیوں نے بالآخر اپنی اسیری سے شاید صلح کر لی تھی۔ حیدر کو پھر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ انھیں صبح، دوپہر، شام دُنیا جہان کا ہر پھل مہیا کرتا تھا۔ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ غسل خانہ اُن کے کمرے کے ساتھ موجود تھا۔ انھیں کسی بھی شے کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی سُرخ کار میں نے عقبی گیراج میں بند کر کے مقفل کر دی تھی۔ لڑکیوں کا رویّہ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ صابر و شاکر ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ اب وہ بات بات پر روتی بھی نہیں تھیں اور یہ اچھی بات تھی۔ حیدر کا نقاب ویسے کا ویسا ہی رہا۔ جراب میں اُس نے آنکھوں کے لیے دو سوراخ بنا لیے تھے اور اسے اوڑھ کر کھڑکی میں سے اُن تک ہر چیز پہنچا دیتا تھا۔

مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ لڑکیاں اپنی اس قید کو بالآخر برداشت

کر چکی تھیں۔۔۔

اس عرصہ میں ستناجا صاحب ایک بار بھی میری طرف نہیں آئے۔ نہ اُن کا فون آیا۔ میں نے جان بوجھ کر اُن کو فون نہیں کیا لیکن اس دوران مجھے اتنا ضرور محسوس ہوا تھا کہ میری کوٹھی کے گرد مختلف آدمی وقفے وقفے سے مشتبہ حالت میں پھرتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی آ جاتا تھا، کبھی کوئی۔ مگر وہ کوئی ایسی حرکت بھی نہیں کرتے تھے جس سے میں اُن کو روک کر پوچھ سکتا۔ وہ کوٹھی کے قریب بھی نہیں آتے تھے۔ بس دور ہی دور سے دیکھتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی وہ پہرہ قائم رہتا تھا اور یہ بڑی ہی پریشانی کی بات تھی۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ حیدر کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ کوئی اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ سودا لینے کے لیے بازار جاتا تو کوئی نہ کوئی اس کے تعاقب میں ضرور رہتا تھا۔ اُن کے حلیے بھی طرح طرح کے تھے۔ کبھی تو کوئی آدمی میلا کچیلا کمبل اوڑھ کر سڑک پر بیٹھ رہتا۔ وہ دوپہر کو واپس جاتا تو کوئی آدمی چھابڑی لے کر کوٹھی سے ذرا دور سڑک پر بیٹھ کر بیر بیچنے لگتا۔ حالانکہ وہاں سے زیادہ لوگ نہیں گزرتے تھے۔ رات کو وہ کمبل والا فقیر پھر اِدھر اُدھر کسی جگہ دھونی رُما کر بیٹھ جاتا اور صبح تک وہاں رہتا۔ میں ان کی یہ حرکتیں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ یہی حال حیدر کا تھا مگر ہم نے زبان نہیں کھولی۔ میں نے چاہا کہ میں ستناجا صاحب سے اس سلسلے میں بات کروں مگر پھر میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ وہ لوگ جب تک براہِ راست کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے، انھیں چھیڑنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

میرے اور ستناجا صاحب کے سوا کسی اور کو قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکیاں وہاں بند ہیں۔ اس راز میں ہمارا کوئی شریک نہیں تھا۔ اس کے باوجود اُن مشتبہ لوگوں کو کوٹھی کے گرد پھرتے دیکھ کر مجھے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے میں ہی نہیں اور کئی لوگ اس راز سے واقف ہیں اگر واقف نہیں ہیں تو بھی وہ میری کوٹھی پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور یہ بہت ہی بری بات تھی۔ پتہ نہیں وہ ہم سے کیا چاہتے تھے۔

انھیں وہاں پھرتے ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔

چوتھی رات کا ذکر ہے۔ حیدر اپنے کمرے میں جا سویا تھا۔ لڑکیاں اس وقت گہری نیند میں تھیں۔ میرا خیال ہے اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور مجھے ابھی تک نیند نہیں آئی تھی۔ میں [illegible] ہی سے بستر پر لیٹ گیا تھا مگر کوئی دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھل گئی اور میں ایک رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ وقت کسی طرح گزر ہی نہیں رہا تھا۔ سگریٹ پی پی کر میرا برا حال ہو چکا تھا مگر اس کے سوا مجھے کوئی بھی اور چیز میسر نہیں تھی اور شراب سے مجھے سخت نفرت تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے دن جیسے گزر رہے تھے میں انھیں شراب میں غرق کر دیتا۔ ایسی ہزاروں ساعتیں آدمی کو میسر آتی ہیں جب وہ ہوش کے بجائے مدہوشی کو زیادہ ترجیح دیتا ہے مگر میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

میرے ٹیبل لیمپ کی روشنی اچانک بجھ گئی ۔۔۔ بتی اچانک چلی جائے تو آنکھوں میں کچھ دیر کے لیے تو ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں۔ اس گھپ اندھیرے سے جان چھڑانے کے لیے میں نے موم بتی جلا لی مگر موم بتی کی تلاش کے دوران کسی نے اچانک میرے کمرے کے دونوں دروازے باہر سے بند کر دیے۔ یُوں جیسے کچھ لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے ۔۔۔ مگر میں اُن کو محسوس نہ کر سکا۔ میں تڑپ کر بستر سے اٹھا اور جوتوں میں پاؤں پھنسا کر غسل خانے میں جا گھسا۔ وہ دُہرا غسلخانہ تھا جس کے بیچ میں آئینے کا دروازہ لگا تھا اور اس کا دُوسرا دروازہ عقبی کمرے میں کھلتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں طرف کے رہنے والے اسے استعمال کر سکتے تھے۔ پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ایک ایک قدم میں بہت سنبھل سنبھل کر اٹھا رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر میں نے سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ تو اس وقت مجھے ایک آدمی لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ کھولتا نظر آیا۔ چابیاں اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ تالے پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ ان کے عقب میں برآمدے کے آخری کونے میں ایک آدمی پستول تانے کھڑا تھا۔ دروازہ میں نے ذرا سا کھول رکھا تھا۔

اس آدمی نے بالآخر تالا کھول لیا۔ ابھی وہ ارل کھینچ ہی رہا تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ وہ سیدھی اس کی ران میں لگی۔ پستول اس نے تالا کھولنے کے لیے منہ میں لے رکھا تھا مگر وہ اس سے کام نہ لے سکا۔ وہ اچھل کر پیچھے گرا۔ پستول اس کے مُنہ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ اتنے میں دُوسرے آدمی نے ایک دم آگے بڑھ کر برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر میری طرف گولی چلا دی مگر میں اسے دیکھ چکا تھا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ گولی دروازہ چیر کر آگے نکل گئی۔ اس کا ایک پٹ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جیسے حیرت سے کسی کے ہونٹ کھل گئے ہوں۔ پہلی گولی کو ناکارہ دیکھ کر اس نے فاصلہ کم کرنے کے لیے دُوسرے ستون کا سہارا لینا چاہا مگر اُسے موقع نہ مل سکا۔ میرا خیال ہے میری نظر اس کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ میری دُوسری گولی اس کے دائیں بازو پر لگی۔ اگلی گولی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ گرتے ہوئے پستول کو بائیں ہاتھ میں دبا کر تیزی سے پیچھے بھاگا۔

"اُٹھ جا اوئے! بھاگ چل یہاں سے۔" اُس نے دُوسرے آدمی کو پکارتے ہوئے کہا اور پھر وہ لان کی طرف بھاگ لیا۔

میں نے دُوسرے آدمی کو فرش سے اُٹھتے دیکھ کر برآمدے میں پہنچ کر اس کا پستول پاؤں کی ٹھوکر سے دُور پھینک دیا۔ اس عرصے میں حیدر بھی جاگ چکا تھا اور وہ لڑکیاں بھی بیدار ہو کر چیخنے لگی تھیں۔ میں نے جاتے ہی اس آدمی کو گریبان سے پکڑ کر اوپر اُٹھا لیا اور اُسے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ وہ ران کے زخم کی وجہ سے اس وقت تک نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ دوسرے آدمی کے پیچھے جاؤں مگر اس اثنا میں وہ بہت دُور جا چکا ہو گا مگر نہیں، عین اس وقت مجھے باہر لان میں کسی موٹر کی گھر گھر سنائی دی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گاڑی لے کر آئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح عقبی کمرے کا دروازہ غسل خانے کے رستے کھول کر اس طرف لپکا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حیدر ہاتھ میں پستول لیے اس گاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا۔ وہ قدرے لنگڑا آدمی بے مثال جرأت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی گاڑی کے ٹائر پر گولی چلا دی۔ ایک زبردست دھماکے سے ٹائر پھٹ گیا تو وہ آدمی فوراً ہی کار سے نکل کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ حیدر نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی مگر اس عرصے میں کار کی اوٹ لے کر میں اس پر گولی چلا چکا تھا۔ میری گولی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس نے گیٹ کے قریب پہنچ کر بائیں ہاتھ سے ہم پر گولی چلا دی۔ اُس وقت میں اور حیدر کار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ گولی کی آواز چاروں طرف گُونج گئی اور وہ اس کے ساتھ ہی گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"تو نے تو کمال کر دیا ہے حیدر! یہ پستول تجھے کہاں سے ملا؟"

"یہ بہت دنوں سے میرے پاس ہے سردار صاحب! مگر یہ تھے کون؟"

"پہلے یہ گیٹ بند کر لیں۔ اس کا دُوسرا ساتھی اندر ہے آؤ اُسے دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سڑک پر ایک نگاہ ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ آدمی اس عرصے میں وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

جب میں حیدر کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا تو وہ آدمی اس وقت تک اپنی ران کا خون بند کرنے کے لیے اپنا رومال پھاڑ کر زخم سے ذرا اُوپر پٹی باندھ رہا تھا۔

"جاؤ حیدر! اس کی مرہم پٹّی کا سامان لاؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے چاہا کہ بتی جلا دُوں مگر وہ تو پہلے ہی میٹر اُلٹا چکے تھے اور کمرے میں صرف وہ موم بتی جل رہی تھی جو میں نے بجلی کے چلے جانے پر جلا دی تھی۔

حیدر اپنے کمرے سے پٹّی کا سامان لے آیا، بولا "اگر

گولی اندر ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔"

"خون بند کرنے کی کوشش کرو، باقی یہ خود دیکھے گا۔ کیوں اوئے کیا نام ہے تیرا؟ تیری ماں رہتی ہے یہاں؟ کیوں آیا ہے تو یہاں؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ حیدر اس کے زخم کو دیکھ کر اس پر اب پٹی باندھ رہا تھا۔ شلوار اس نے اوپر اٹھا لی تھی۔

"کیوں میاں! بولتے کیوں نہیں ہو؟ سانپ سونگھ گیا ہے تمھیں۔ کچھ اور چاہتے ہو ہم سے؟" میں نے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔ خاصا پلا ہوا جوان تھا وہ اور آنکھیں اس کی نیلگوں تھیں۔ پتہ نہیں اُسے کس نے بھیجا تھا وہاں؟

"وہ۔۔۔ وہ مجھے اکبر صاحب نے بھیجا ہے۔"

"یہ کون ذاتِ شریف ہے؟ کیا کرتا ہے یہ اور تم کیا چاہتے تھے؟"

"میرا نام صفدر ہے۔ میں دراصل ان لڑکیوں کے لیے آیا تھا۔ اکبر صاحب کا حکم تھا کہ میں انھیں قتل کر دوں۔"

"مگر کیوں؟ کیا ضد تھی اُسے ان لڑکیوں سے؟ اور یہ اکبر ہے کون؟" میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس نے پھر منہ بند کر لیا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو؟" میں نے اس کو پھر بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔

"وہ۔۔۔ ہماری پارٹی کے سیکرٹری ہیں۔"

"اچھا پھر؟ انھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ لڑکیاں ہمارے پاس ہیں؟"

"انھوں نے کسی طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ یہ لڑکیاں آپ کے پاس ہیں۔"

"یہ بڑی حیران کن بات ہے۔ مگر وہ کیوں چاہتے تھے کہ تم انھیں قتل کر دو؟"

"دراصل انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ان لڑکیوں کو واپس کر دیں گے۔ اس فساد کو اور زیادہ بڑھانے کے لیے اور آپ کی دونوں پارٹیوں کے درمیان اور زیادہ نفرت پیدا کرنے کے لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ ان لڑکیوں کو واپس کریں۔ اسی لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ہمیں یہ حکم تھا کہ ہم ان لڑکیوں کو یہاں سے اٹھا لیں اور ان کو یا کسی چکلے میں ڈال دیں یا قتل کر دیں۔"

"آخر اس کا مقصد کیا تھا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟"

"مطلب یہ تھا کہ پارٹی اچھی طرح بدنام ہو جائے اور دوسری حسنین لنگاہی کی پارٹی اور زیادہ شد و مد سے حکومت کی مخالفت کرے جس سے ہماری پارٹی بہت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ اکبر کو یہ راز کیسے معلوم ہو گیا؟"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ ہمیں تو جو حکم دیا گیا ہے، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔" اس نے اپنی ران پر پٹی بندھواتے ہوئے کہا۔ گولی اس کے جسم میں نہیں تھی حیدر دیکھ چکا تھا۔ وہ گوشت پھاڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی ستناجا صاحب کو فون کر دیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ریسیور فوراً ہی اٹھا لیا۔ وہ کوئی سپاہی تھا، بولا "کون صاحب ہیں؟"

"دیکھو! میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں، مجھے ستناجا صاحب سے ابھی اور اسی وقت بات کرنی ہے، بہت ضروری پیغام ہے۔"

"جی وہ تو اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے وہ جاگ نہیں رہے ہوں گے۔ انھیں جگا دو۔ کہو کہ ایک بہت ضروری پیغام ہے۔"

"مگر آپ ہیں کون؟ کیا کہوں ان سے؟"

"بس انھیں میرا نام بتا دو۔ یہی کافی ہے۔"

"جی میں کوشش کرتا ہوں، آپ مجھے ڈانٹ پڑوا دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے ستناجا صاحب کی خواب آلودہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون صاحب ہیں؟"

"میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں، آپ جس حال میں بھی ہیں ابھی میرے پاس پہنچ جائیں۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"بس خیر نہیں ہے، ایک منٹ کی دیر نہ کریں یہاں ایک آدمی میں نے پکڑا ہے وہ اس چیز کے لیے آیا تھا جو میرے پاس امانت رکھی ہوئی ہے۔"

"کیا کہا! یعنی کوئی آدمی آیا تھا آپ کے ہاں؟ میں ابھی آ رہا ہوں، میرا انتظار کریں اور آنکھیں کھول کر رکھیں، کوئی اور چکر نہ چل جائے۔" انھوں نے کہا۔

صفدر نڈھال سا ہو کر فرش پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ایک پستول حیدر کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔ اس کی پٹی کا کام ختم ہو چکا تھا اور اب ہم بھی ستناجا صاحب کے آنے کا منتظر تھا۔ میرے ذہن میں اس کا دیکھ کر زبردست ہلچل مچ رہی تھی پستول کی لبلبی پر بار بار میری انگلی تڑپ رہی تھی۔ اس آدمی نے مجھے اتنا اشتعال دلا دیا تھا۔

میں اس کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کسی کا مہرہ تھا کوئی آدمی باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہماری محنت کا پھل چرا لینا چاہتا تھا۔ تاکہ فساد اتنا بڑھ جائے کہ کوئی اسے مٹا نہ سکے۔ کوشش کے باوجود اخبار میں ان لڑکیوں کی خبر کی اشاعت نہ روکی جا سکی تھی اور وہ معاملہ پھیل کر اتنا گمبھیر ہو چکا تھا کہ اسے سمیٹ لینا مشکل نظر آتا تھا۔ مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ بڑے صاحب کو اس حد تک بدنام اور ذلیل کر دیا جائے کہ وہ پھر کبھی سیاست کا رخ نہ کریں۔۔۔ ایک نہیں کئی فریق اس جھگڑے میں ملوث تھے۔ وہ بھارت کی کسی پارٹی سے بھی مدد لے رہے تھے۔ ان کے اندر بھی سر پھٹول ہو رہا تھا۔ آپس میں بھی وہ دست و گریباں ہو رہے تھے اور اب سارا نزلہ ان لڑکیوں پر آ گرا تھا جو پتہ نہیں کیسے وہ صدمہ جھیل رہی تھیں۔۔۔ ان کی آہیں اور سسکیاں ابھی تک ہمیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کو حوصلہ دے سکے۔ ان کے آنسو پونچھ سکے۔ وہ ایسی بدنصیبی میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ میں چاہنے کے باوجود اب ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے کمرے کا دروازہ دوبارہ بند کیا جا چکا تھا۔

کوئی بیس منٹ بعد ستناجا صاحب ہمارے پاس آ پہنچے۔ وہ بالکل تنہا تھے اور شب خوابی کے لباس میں ہی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں آ پہنچے تھے۔ حیدر نے اپنا پستول جیب میں رکھا اور انھیں میرے کمرے میں لے آیا۔ ان کی نظر صفدر پر پڑی تو حیران ہو کر بولے "یہ۔۔۔ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"آپ اسے جانتے ہیں آپ؟"

"نہیں، میں اسے نہیں جانتا مگر یہ زخمی کیسے ہو گیا؟"

"میں نے اسی کے لیے تو آپ کو یہاں بلایا ہے۔ یہ آدھی رات کو یہاں ڈاکا ڈالنے آیا تھا۔"

"کیا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے تمام تفصیلات انھیں بتا دیں تو ان کا رنگ ایک دم پیلا ہونے لگا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کچھ اُسے کیسے معلوم ہو گیا؟ وہ تو صبح و شام مجھے ملتا ہے، دفتر میں دن رات اس کا مجھ سے رابطہ رہتا ہے، وہ ہمارے ساتھ ہی کام کرتا ہے مگر یہ ہو کیا رہا ہے سردار صاحب! وہ دوسرا آدمی کون تھا؟"

"وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا بھاگ نکلا ہے، اس کی گاڑی البتہ باہر رہ گئی ہے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ اکبر صاحب کی ہمدردیاں کسی اور پارٹی سے ہیں اور ہم نے انھیں ساری باتیں بتا رکھی ہیں۔ اُف میرے مولا! آدمی اتنا منافق بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ اس کا تو مجھے آج ہی پتہ چلا۔ ہمارے دوست ہی ہماری کمر میں خنجر مار رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی ٹیلیفون کی طرف لپکے۔ پتہ نہیں انھوں نے کس کا نمبر ملایا۔ چھوٹتے ہی بڑے مرعوب کن لہجے میں بولے "سکندر علی! میری بات غور سے سنو۔۔۔ آج اور ابھی سپاہیوں کو ساتھ لے کر اکبر صاحب کو گرفتار کر لو کسی قسم کی رو رعایت مت کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور دونوں بیٹوں کو بھی حراست میں لے لو۔ تمھیں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، وجہ میں تمھیں بعد میں بتا دوں گا۔ کسی کاغذ پتر کی فکر مت کرو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جمیل بھٹی کو ساتھ لے جاؤ۔" یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ برآمدے میں نکل گئے۔ اتنی سردی کے باوجود ان کا پسینہ بہہ نکلا تھا، بولے "ان لڑکیوں کا کیا کریں؟ میں انھیں ابھی کسی اور جگہ بھی نہیں رکھ سکتا۔"

"ان کی آپ فکر نہ کریں ان کی حفاظت میں کر سکتا ہوں۔"

"مجھے آپ سے یہی امید ہے سردار صاحب! آپ نے ہمیں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے ورنہ یہ ہمیں سارے جہان میں بدنام کر دیتے۔ یہ پتا ایسا ان کے ہاتھ آ جاتا کہ ہم سب ذلیل ہو کر رہ جاتے۔ میں ابھی اس آدمی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس کو کس کر باندھ دیں اور گاڑی میں ڈال دیں۔"

"جی بہت بہتر۔ میں اس کی ابھی مشکیں کس دیتا ہوں۔"

"اگر ہو سکے تو ان لڑکیوں کو کسی زیادہ محفوظ کمرے میں ڈال دیں۔ یہ بہت ضروری ہے، یہ گاڑی میں صبح یہاں سے اٹھوا لوں گا۔"

"آپ فکر نہ کریں، ایسا ہی ہو گا۔"

"بس ٹھیک ہے، اسے باہر لے آئیں۔"

کچھ ہی دیر بعد حیدر نے اس کی مشکیں باندھ دیں اور ہم دونوں نے اُسے اٹھا کر جیپ میں ڈال دیا۔ حیدر نے اچھا کیا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا تاکہ وہ کوئی شور نہ مچا سکے۔ ستناجا صاحب اسے ساتھ لے کر اسی وقت وہاں سے نکل گئے۔

جب میں دوبارہ کمرے میں پہنچا اور حیدر بڑا گیٹ بند کر کے واپس آیا تو بولا "سردار صاحب! میری مانیں تو ان لڑکیوں کو یہاں سے ہٹا دیں۔"

"پھر کہاں رکھیں انھیں؟ زیادہ محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے؟"

"آپ کو شاید اس کوٹھی کا اصل نقشہ نہیں دکھایا گیا۔ اس کے نیچے ایک بہت عمدہ تہہ خانہ ہے۔ ان لڑکیوں کو وہاں ڈال دیں۔ اس کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔"

"اچھا! یہ بات تو تم نے مجھے ابھی بتائی ہے چلو ذرا تہہ خانہ دکھاؤ مجھے۔ مگر پہلے اس کا سوئچ تو کھولو، اس بجلی کا۔"

"ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ میں ابھی کھولتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ سوئچ واقعی اُن لوگوں نے الٹا رکھا تھا، اُسے حیدر نے سیدھا کیا تو بتیاں جلنے لگیں۔

"چلیں، میں آپ کو تہہ خانہ دکھاتا ہوں۔"

رات کے پچھلے پہر میں حیدر کو ساتھ لے کر کوٹھی سے باہر نکلا تو ایک عجیب سا حزن میرے ذہن پر طاری ہو رہا تھا۔ حیدر کا رخ دوسرے گیراج کی طرف تھا جس میں کوئی گاڑی بند نہیں تھی۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھولا اور بتی جلا کر بولا۔ "اس تہہ خانے کا دروازہ اس گیراج کی پچھلی دیوار کے ساتھ ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کسی نے بھی اس تہہ خانے کا ذکر مجھ سے نہیں کیا تھا۔"

"آپ کو پورا نقشہ وہ نہ دکھا سکے ہوں گے۔ ویسے بھی مجھے معلوم ہے، یہ تہہ خانہ بعد میں بنایا گیا تھا۔ اسی لیے اس گیراج کے نیچے ہے ورنہ یہ بڑی عمارت کے نیچے ہوتا۔" یہ کہہ کر وہ گیراج کی عقبی دیوار کے پاس جا پہنچا۔ بجلی کے سوئچ بورڈ پر ہی چند بٹن لگے تھے۔ اُن کو حیدر نے اس طرح گھمایا کہ گیراج میں لگے تینوں بلب جلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ کی طرف فرش سرکنے لگا اور چند ہی لمحوں بعد وہاں کوئی چھ فٹ مربع جگہ پیدا ہو گئی۔ اب ہمارے سامنے ایک خوبصورت سیڑھی تھی جو گھوم کر نیچے اترتی تھی۔

"یہ ہے تہہ خانہ۔ میرا خیال ہے لڑکیاں یہاں بہت محفوظ رہیں گی۔" یہ کہتے ہوئے حیدر نیچے اُترنے لگا۔ "آپ بھی آ کے دیکھ لیں۔"

"ہاں چلو۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ میں نے یہ مصیبت کیوں مول لے لی ہے، مجھے کیا فائدہ ہو گا ہے حیدر! ان کی بددعا البتہ مجھے ضرور لگ جائے گی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ویسے ہے سراسر یہ ظلم۔ لڑکیاں پاگلوں ایسی حرکتیں کرنے لگی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھی عبور کر گیا۔ میں بھی تہہ خانے میں اتر گیا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ میں انھیں کہاں سے لایا ہوں؟"

"میں نے ان سے پوچھ لیا تھا۔ ان کی حالت پر مجھے بہت ترس آتا ہے۔"

"اس ترس کی وجہ سے انھیں چھوڑ نہ دینا۔ وہ کسی کی امانت ہیں۔ اِن کے بارے میں جوابدہ ہوں حیدر! یہ میری آزمائش نہ بن جائیں۔"

حیدر نے تہہ خانے کی بتیاں جلا دیں تو مجھے معلوم ہوا کہ دونوں گیراجوں کے نیچے ایک وسیع کمرہ بنا ہوا تھا جس میں پلنگ بھی موجود تھے اور کرسیاں بھی۔ دائیں ہاتھ بہت خوبصورت صوفہ لگا تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا قالین بچھا تھا اور اس کی چھت میں ہر طرف آئینے لگے تھے۔

"یہ... یہ سارا سامان یہاں کیسے اتارا گیا ہے بھئی؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اس کا دروازہ اور کشادہ کیا جا سکتا ہے جس سے بڑی جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ سامان اسی راستے سے لایا گیا تھا۔ کمرے میں ہر شے موجود ہے، غسل خانہ بھی ہے اور فریج بھی، یہ دیکھیں!" حیدر نے مختلف چیزیں مجھے دکھلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت خوبصورت جگہ معلوم ہوتی ہے بھئی! کمال ہے یہاں کون رہتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ کبھی کبھار میں اس کی صفائی کر دیتا تھا۔ یہاں ہوا کا بہت اچھا انتظام ہے۔ دیواروں کے اندر روشندان نصب ہیں۔"

"میرا خیال ہے ہم لڑکیوں کو لا کر یہاں ٹھہرا دیتے ہیں۔ آدمی کی ہر ضرورت یہاں پوری ہوتی ہے۔"

"جی۔۔۔ ہر شے کا یہاں بندوبست موجود ہے۔ غسل خانہ بھی موجود ہے البتہ باورچی خانہ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا تم خود انھیں پہنچا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی ادھر ہی رہا کروں۔ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر یہاں پڑا رہوں۔ میں بہت دکھی ہو گیا ہوں حیدر! مجھے ان مصیبتوں سے بچا سکتے ہو تو بچا لو۔" میں نے فوم کے پلنگ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ حیرت تھی کہ وہاں تہہ خانے کی چھت پر فرش نما آئینے سجے تھے اور اُن میں چھت کے نیچے ہونے والی ہر حرکت کا عکس دیکھا جا سکتا تھا۔

"ایسا نہ کہیں صاب جی! آدمی کو کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔ بھلائی نہ کر سکے تو برائی ہی سہی۔ آدمی کا لہو گرم رہتا ہے۔"

"نہیں حیدر! میں بہت تھک گیا ہوں، بہت ہی تھک گیا ہوں۔ اور... اور میں ابھی تک اپنی ایک بھی الجھن دور نہیں کر سکا ہوں، یہ ہے نا میری بے بسی کی انتہا۔"

"آپ ویسے ہی پریشان ہو رہے ہیں سردار صاحب! کاش مجھے اللہ نے آپ ایسی صلاحیتیں دی ہوتیں تو میں زمین میں آرپار چھید ڈال دیتا۔"

"بس مجھ سے یہی نہیں ہو سکا ہے حیدر! ٹھیک ہے انھیں تم ادھر لے آؤ۔ مجھ سے اُن کی وہ چیخیں نہیں سنی جاتی ہیں۔ انھیں راستے کا علم نہیں ہونا چاہیے، ان کی آنکھیں بند کر کے انھیں یہاں لانا ہو گا۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اٹھ گیا۔

"تیرا کیا خیال ہے حیدر! اس تہہ خانے میں عالیہ کیا کرتی تھی؟"

"کچھ نہ پوچھیں صاب جی! یہ تہہ خانہ اس کے بہت کام آتا تھا۔"

سیڑھیاں عبور کر کے ہم گیراج کے فرش تک جا پہنچے تو حیدر نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنے بستر میں لیٹ چکا تھا۔ میں ان لڑکیوں کے سامنے ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُن سے میں بے حد شرمندہ تھا، نادم تھا۔ ایسا نادم کہ میں اپنی صورت ہی سے بیزار ہو گیا تھا۔ افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ میں نے آخر ستنا جا صاحب کی یہ بات کیسے مان لی۔ کسی مرد کے اغوا کی بات ہوتی تو شاید میں اس میں فخر بھی محسوس کرتا۔ پھر میں شاید کسی انعام کا بھی مستحق بن سکتا تھا مگر ان عاجز اور مسکین لڑکیوں کو وہاں لا کر میں نے کون سا معرکہ سر کر لیا تھا۔ اُن کی حالت تو ایسی تھی کہ وہ گھر کے اندر بھی ماں باپ بھائی بہنوں کی ڈانٹ ڈپٹ میں رہتی ہوں گی۔ ان کی وہ کار، ان کا کالج، ان کی زندگی کی دوسری شوخیاں تو محض ایسی ہی تھیں جیسی اُن پرندوں کی ہوتی ہیں جو بہار کے موسم میں پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بس کسی پھول کو الٹ دینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ بیچاری کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہوں گی۔۔۔ انھوں نے تو صرف گھر سے کالج تک کا ہی رستہ دیکھا تھا۔ انھیں کیا پتہ ہو گا کہ اس دنیا میں غلام جیلانی ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو ہنستے کھیلتے آدمی کا گلا دبا کر اسے بے ہوش کر لیتے ہیں اور پھر اسے جہاں جی چاہتا ہے اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے وہ دونوں آدمی آخر کس لیے میرے پیچھے آئے؟ انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں کرنا کیا چاہتا ہوں؟ میری کار انھوں نے کیسے جلا دی؟ یہ ایسی گرہ تھی جسے میں ابھی تک نہیں کھول سکا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں دعوت کا منظر پھر ابھرنے لگا۔ ایک ایک چہرہ اب میرے سامنے تھا مگر اُن میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے ہی آدمی میری نگاہ میں ابھر آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس حسینہ بنگلہ ہی کو تو میں نے وہاں بالکل نہیں دیکھا تھا۔ پھر ایسی کیا وجہ تھی کہ اس کے وہ ملازم کار لے کر میرے پیچھے چل نکلے۔ ایک رات میں نے وزیر آباد میں گزاری تھی۔ اس کا بھی انھیں علم تھا۔ وہ وہاں بھی میرا پیچھا کرتے رہے تھے مگر انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرا وہاں جانا خالی از علت نہیں ہے۔ محض ایک موہوم سے اندازے کی بنا پر تو وہ میری کار نہیں جلا سکتے تھے۔ وہ دونوں آدمی پھر میری نظروں میں ابھرنے لگے تو مجھے ایک دم یہ احساس ہوا کہ ان میں سے ایک آدمی کو میں نے دعوت میں بیرے کے لباس میں دیکھا تھا۔ ہاں۔۔۔ وہ وہی شخص تھا اور وہ ہر کام بڑی مستعدی سے کر رہا تھا مگر دن اتنے گزر گئے تھے کہ میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وہی آدمی تھا جو اس وقت میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہا تھا۔ اُن کو اگر میں اس روز بے ہوش نہ کر دیتا تو شاید وہ میرا منصوبہ کسی بھی طرح کامیاب نہ ہونے دیتے۔۔۔

اسی ادھیڑ بن میں پھنسا پھنسا میں گہری نیند میں کھو گیا۔ وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ حیدر نے لڑکیوں کو تہہ خانے میں پہنچا دیا ہو گا۔ اس وقت صبح کے سات بجے ہوں گے کہ گیٹ پر کسی نے بڑے زور سے گھنٹی بجا دی۔ میں اس آواز پر ایک دم بستر سے تلملا کر اٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ستنا جا صاحب ہوں گے۔ ابھی میں جوتا پہن ہی رہا تھا کہ حیدر میرے کمرے میں آ گیا۔ اس کی بھی آنکھیں نیند میں غلط نظر آتی تھیں۔ بولا۔ "معلوم ہوتا ہے باہر پولیس کھڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیسی پولیس؟"

"میں نے کھڑکی میں سے دیکھ لیا ہے۔"

"وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"ان کو میں نے تہہ خانے میں ڈال دیا ہے اور دوسرے کمرے میں سے اُن کے سارے نشانات مٹا دیے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم دیکھو، وہ کیا کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے ستنا جا صاحب کو فون کیا مگر معلوم یہ ہوا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک بات تھی۔ اُن کا مل جانا بہت ضروری تھا مگر اب میں اُن سے کوئی مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فون بند کر کے میں پھر پلنگ پر جا بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پولیس میرے دروازے پر کیا لینے آئی ہے؟ کیا انھیں اطلاع مل چکی ہے کہ لڑکیاں اسی

کوٹھی میں بند ہیں۔ صفدر کے ساتھی نے وہاں سے نکلتے ہی پولیس کو خبردار کر دیا تھا۔ آخر یہ قصہ کیا تھا؟ چند ہی منٹ بعد حیدر، پولیس کے ایک انسپکٹر اور چار سپاہیوں کو لے کر اندر آ گیا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ میرے پاس آ پہنچا۔

"کیا کہتے ہیں وہ لوگ؟"

"وہ گلبرگ تھانے سے آئے ہیں اور ان کی اطلاع یہ ہے کہ وہ لڑکیاں یہاں ہی ہیں۔ وہ کوٹھی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"کوئی وارنٹ ہے اُن کے پاس؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر انسپکٹر جلیل یہ کہہ رہے ہیں کہ انھیں ڈی ایس پی مسکین خان کا حکم ہے کہ وہ کوٹھی کی تلاشی لے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ انھیں سنبھالو۔ میں بھی آ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے بوٹ پہنے اور ان کے سامنے جا پہنچا۔ انسپکٹر جلیل کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میرے لباس کی تراش خراش اور میرے بے پناہ اعتماد کو دیکھتے ہوئے وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، بولا "میں معافی چاہتا ہوں سردار صاحب! مگر مجبوری ہے۔ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ حسنین لنگاہی صاحب کی لڑکیاں یہاں رکھی گئی ہیں۔ میں آپ کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ ہمارے کئی آدمی آپ کی کوٹھی کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہمیں اپنا فرض۔۔۔۔"

"چپ رہو انسپکٹر! تمھاری باتیں ہمیں حیران کرتی ہیں، اُن لڑکیوں کا یہاں کیا کام ہے؟ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمھیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"یہ ڈی ایس پی مسکین خان کا حکم ہے۔"

"مگر انھیں یہ خواب کیسے آ گیا؟ اُن لڑکیوں سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ کوئی بات تو ڈھنگ کی کرو۔ جانتے ہو یہ کس کی کوٹھی ہے؟"

"جی! مجھے معلوم ہے، یہ سردار کریم نواز کی کوٹھی ہے اور میں انہی سے مخاطب ہوں، مگر یہ میرا فرض ہے۔"

"میں تمھیں روک نہیں رہا ہوں انسپکٹر! صرف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ نتیجے کے تم ذمے دار ہو گے۔ یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے، تم تلاشی لے سکتے ہو۔" یہ کہہ کر میں بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ چاروں سپاہی اسی وقت کوٹھی کے تمام حصوں میں پھیل گئے۔ انسپکٹر میرے سامنے ہی بیٹھا رہا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

میں نے اُسے سگریٹ پیش کیا تو بولا "میرا خیال ہے ہم سے پہلے یہ کوٹھی ڈاکٹر دھمن کے پاس تھی۔"

"جی ہاں، میں نے کچھ ہی روز پہلے خریدی تھی مگر ہوا کیا ہے انسپکٹر صاحب! آخر ان لڑکیوں کو ہوا کیا ہے؟"

"انھیں حسنین لنگاہی کے گھر سے اغوا کر لیا گیا۔ آپ نے تو اخبار پڑھا ہو گا؟"

"ہاں۔ کچھ کچھ مجھے بھی معلوم ہے مگر آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے۔ میں آخر کیسے مجرم بن گیا؟"

"ہمیں صبح سویرے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔ اُس آدمی نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"ہوں، فون پر اطلاع ملی تھی اور تم یہاں چلے آئے بے سوچے سمجھے چلے آئے، یہ بھی نہیں دیکھا کہ یہ کوٹھی ہے کس کی۔"

اتنے میں وہ سپاہی خالی ہاتھ کمرے میں واپس آ گئے۔

"کیا ہوا؟ کچھ خبر ملی؟" انسپکٹر نے انھیں گھورتے ہوئے

"جی نہیں۔ ہم نے کوٹھی کا ہر حصہ دیکھ لیا ہے۔ گھر میں اس نوکر کے سوا کوئی اور آدمی نہیں ہے۔"

"مگر ہماری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی ہے۔ دوسرا فون ہمیں اکبر صاحب کا ملا تھا، وہ تو جھوٹ نہیں بول سکتے ہیں۔"

"اکبر صاحب ہے یہ۔۔۔۔ یہ کون ذات شریف ہیں؟"

"کوئی ہیں۔ آؤ منشی جی! ایک نظر مجھے بھی یہ کوٹھی دیں۔" یہ کہہ کر وہ ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حیدر دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ لیا۔ اب جو میں نے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے یہ شک گزرا کہ کہیں وہ لوگ گیراج تک نہ جا پہنچیں۔ حسنین لنگاہی کی گاڑی وہیں کھڑی تھی۔ اس کا کوئی جواز میرے پاس موجود نہیں تھا۔ کمرے اور برآمدے کے فرش پر سے حیدر نے تمام خون صاف کر دیا تھا۔ اس طرف سے میں بالکل مطمئن تھا مگر بات وہیں رکتی نظر نہیں آتی تھی مگر اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جلیل صاحب کوٹھی کے مختلف کمروں میں جھانک لینے کے بعد اب گیراج کی طرف جا رہے تھے۔ میں بڑی ہی غلط صورت میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ کاش، میں نے وہ گاڑی وہاں نہ رکھی ہوتی، کسی اور جگہ اسے پھینک آتا مگر اب تو کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ گیراج پر پہنچ جانے سے پہلے ہی جلیل صاحب نے حیدر کو میری طرف واپس بھیج دیا۔ میں بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی کے سامنے کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ کلیجہ منہ کو اچھل کر حلق میں آنے لگا تھا۔ پولیس بے وقت وہاں تھی۔ حیدر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ دُور سے سپاہی دوران لان کے ساتھ والے برآمدے میں کرسیوں کے قریب جا کھڑے ہوئے تھے۔ میرے قریب آ کر حیدر بولا "وہ گیراج کی چابی مانگ رہے ہیں۔"

"کہہ دو اُن سے کہ گیراج کی چابی ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ ستناجا صاحب کے پاس ہے مگر ٹھہرو۔ میں خود بات کرتا ہوں اُن سے۔" یہ کہہ کر میں حیدر کو وہیں ٹھہرا کر جلیل صاحب کی طرف لپکا۔ سگریٹ اب بھی میرے ہاتھ میں سلگ رہا تھا اور میرا پستول ابھی تک میری جیب میں تھا۔ دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو میں اُن دونوں کو بے ہوش کر کے دُوسرے سپاہیوں کو کسی بہانے وہاں سے ٹرخا دیتا۔ یا پھر گیراج کی چابی انھیں دے دیتا مگر دونوں صورتوں میں خرابی زیادہ تھی۔

"انسپکٹر صاحب! اس گیراج کی چابی تو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں ہر حال میں یہ دونوں گیراج دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ایک کی چابی تو میرے پاس موجود ہے مگر یہ دوسرا گیراج ستناجا صاحب نے لے رکھا ہے۔ اُن کی گاڑی یہاں کھڑی ہے۔"

"کیا! کیا مطلب؟ یعنی وہ ستناجا صاحب جو۔۔۔۔"

"ہاں ہاں وہی۔ آپ اُن سے معلوم کر سکتے ہیں اس گیراج کی چابی انہی کے پاس ہے۔"

"کمال کی بات کرتے ہیں آپ۔ انھیں اس گیراج کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے پاس ٹیلیفون ہے؟"

"ہاں۔ فون موجود ہے۔ آئیں میں آپ سے اُن کی بات کرا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُن دونوں کو ساتھ لیکر اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور اُن کے سامنے ہی میں نے فون کے نمبر گھما دیے۔ اس وقت تک آٹھ بج چکے تھے۔ فون کسی سپاہی نے اٹھایا۔

"دیکھیں میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں۔ میں ستناجا صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"سردار کریم نواز! وہ ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے بھی فون کیا تھا؟"

"جی ہاں، وہ میں ہی تھا۔"

"میرا خیال ہے وہ آپ ہی کو فون کر رہے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے فون رکھ دیں، میں نے انھیں بتا دیا تھا۔"

اُس کے کہنے کے مطابق میں نے فون رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ستناجا صاحب تھے۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے جناب! معاملہ یہ ہے کہ یہاں پولیس کے کچھ لوگ آئے ہیں، وہ میرے گھر کی تلاشی لے چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کہیں وہ۔۔۔۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے، وہ دراصل آپ کے گیراج کی چابی مانگ رہے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا بھی ہے کہ اس میں اُن کی گاڑی بند ہے مگر وہ کچھ سنتے ہی نہیں ہیں۔"

"اوہ میں سمجھا۔ کیا نام ہے انسپکٹر کا؟"

"انسپکٹر جلیل۔"

"ہوں۔ انھیں فون پر بلائیں۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں مگر یہ وہاں کیسے آ پہنچے؟"

"آئیں انسپکٹر صاحب، ستناجا صاحب سے بات کریں۔"

جلیل خان نے فوراً ہی ریسیور تھام لیا۔ "سر! میں انسپکٹر جلیل احمد خان بول رہا ہوں۔ دراصل ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ حسنین لنگاہی کی دونوں بیٹیاں یہاں رکھی گئی ہیں۔ مجھے ڈی ایس پی صاحب نے یہ حکم دیا تھا کہ میں یہاں کی تلاشی لوں۔۔۔۔ جی جی! سر! میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ سردار کریم نواز کی کوٹھی ہے مگر۔۔۔ سر! وہ گیراج۔۔۔۔ جی جی سر! بہت بہتر سر! مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ آپ کا گیراج ہے۔"

میں اس عرصے میں فون کے دوسرے ریسیور تک جا پہنچا تھا جو اگلے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ ستناجا صاحب کہہ رہے تھے۔ "ڈیم اٹ! بالکل پاگل ہو تم۔ ذرا سی عقل تم استعمال کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ سردار صاحب تمھیں شکل صورت سے ایسے نظر آتے ہیں؟ وہ گیراج میں نے اپنی گاڑی کے لیے اُن سے لیا تھا۔ تمھیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی سر! مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"کوٹھی میں سے تمھیں کوئی چیز ملی؟ کوئی ایسا نشان یا کوئی اور بات؟"

"جی نہیں۔ لڑکیاں کوٹھی میں نہیں ہیں، میں سب دیکھ چکا ہوں سر!"

"بس ٹھیک ہے۔ زیادہ تفتیش خانی کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا۔ وہ بہت زیادہ جھنجلائے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود اس معاملے میں زیادہ ہی ملوث ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اکبر صاحب کو وہ گرفتار کروا چکے تھے اور ابھی وہ وہیں سے واپس آئے تھے۔ ریسیور فون پر رکھ کر جلیل احمد خان سیدھے ہوئے اور اپنے کندھے جھٹکاتے ہوئے بولے "چلو بھئی! وہ گیراج تو واقعی ستناجا صاحب نے اپنے لیے لے رکھا ہے۔ رپورٹ لکھ دیں منشی جی کہ تلاشی کے دوران ہمیں یہاں سے کسی لڑکی کا نشان تک نہیں ملا ہے۔" اس دوران میں کمرے میں آ کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی

بولا۔ مجھے افسوس ہے سردار صاحب! کہ میں نے آپ کو بلاوجہ تکلیف دی۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں انسپکٹر! مگر اتنا یاد رکھو کہ پھر تم کسی دروازے میں یوں نہیں گھسو گے ورنہ تمھاری اس پیٹی کی خیر نہیں رہے گی۔"

"مجھے معلوم ہے جناب! آؤ بھئی! اب ہم چلتے ہیں۔"

"کوئی چائے شائے کوئی جل شل کچھ تو پینے جائیے۔"

"جی نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ سپاہیوں کے ساتھ اسی وقت گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ان کی جیپ باہر دروازے کے قریب کھڑی تھی۔

حیدر جب انھیں رخصت کر کے واپس آیا تو اس نے بڑے ہی سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے یہ مصیبت ٹل گئی۔ میں لڑکیاں اگر تہہ خانے میں نہ ڈال دیتا تو ہمارے پاس اس کا کوئی بہانہ نہ تھا۔"

"ہاں تم نے بہت اچھا کیا ہے حیدر! ایک بڑی مصیبت سے میری جان چھڑا دی ورنہ تو یہ لوگ مجھے لے ڈوبے تھے۔"

"ویسے میں یہ عرض کروں گا سردار صاحب کہ ان لڑکیوں سے جتنی جلدی ہو جان چھڑا لیں ورنہ فساد بڑھ بھی سکتا ہے۔"

"میں یہی کروں گا حیدر! میں اس مصیبت کو کہاں سنبھال سکتا ہوں۔ تمھیں لڑکیوں سے کوئی دل چسپی ہے؟"

"توبہ توبہ کریں سردار صاحب! خدا ان سے بچا کر رکھے۔ میں بس لنڈورا ہی بھلا۔"

"یہ اچھی بات ہے حیدر! ورنہ میں سمجھتا تھا کہ شاید ان کی بے بسی پر تمھاری رال ٹپک رہی ہو گی۔"

"جی نہیں۔ یہ میرا محکمہ ہی نہیں ہے۔ ساری زندگی میں نے ان کو بس دور سے دیکھا ہے۔ عالیہ نے یہاں بڑا اودھم مچا رکھا تھا مگر میں آنکھیں بند کر لیتا تھا۔"

"ٹھیک ہے تم بھی اب ناشتہ تیار کرو اور اپنے ہتھیار کا خیال رکھو۔ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"جی بہت بہتر۔ ناشتہ میں ابھی تیار کر دیتا ہوں۔"

میں اس ساری صورتِ حال سے سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اس ذہنی تکدر کو دور کرنے کے لیے میں غسل خانے میں جا گھسا۔ پانی گرم تھا اور آرام دیتا تھا۔ خاصی دیر تک میں وہاں نہاتا رہا۔ سیری ہی نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس غسل خانے کے دروازے سے نکلتے ہوئے بھی مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ آدمی کو کبھی کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا مگر غیر مرئی حالات کا انقباض اس قدر جان لیوا ثابت ہوتا ہے اور وہ اس کے رگ و ریشے کو اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا سے لرز لگتا ہے۔ میرا یہ حال تھا کہ میں خود ایک بھیانک جرم کے ارتکاب کے بعد خود کو اگر غیر محفوظ سمجھتا تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ آخر ستنا جا صاحب کب تک مجھے اس سولی پر لٹکا رکھیں گے؟ ان سے پہلے شیرا مجھے ذلیل کر چکا تھا۔ اس کے قبضے سے میں نکلا تو سید ڈھلوں کی گرفت میں جا پھنسا۔ وہ بھی مجھ سے یہی کام لینے تھے اور اب میں ستنا جا صاحب کے جھانسے میں آ گیا تھا۔ مژدہ میرے لیے یہ تھا کہ بڑے صاحب مجھ سے بہت زیادہ ہیں۔ یہ انہی کی مہربانی تھی کہ اب شاید پولیس کے ریکارڈ میں غلام جیلانی کو مُردہ تصور کر لیا گیا تھا۔ مگر اب جو کام وہ مجھ سے لے رہے تھے وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پتہ نہیں میرے لیے کیسے کیسے منصوبے بنا کر بیٹھے تھے۔ اس جلیل احمد کو تو میں نے جوں توں کر کے گھر سے نکال دیا تھا مگر جس انداز سے وہ لان میں کھڑی پنکچر گاڑی کو دیکھ رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اطلاع کنندہ کی بات کا پورا پورا اعتبار تھا مگر اسے کوٹھی میں آگے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں بہت ہوشیار آدمی تھا بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ اسے ستنا جا صاحب نے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور وہ ان کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا اور ابھی مجھے نہیں پتہ تھا کہ اپنے دوسرے حملے میں وہ میرے خلاف کیا کچھ کرے گا۔ میری بات کا اعتبار تو اسے بالکل نہیں آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایک بار پھر میری کوٹھی میں ضرور آئے گا۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا ہی تھا کہ ستنا جا صاحب کا فون آ گیا۔

"کیا حال ہے سردار صاحب؟"

"جی میں ٹھیک ہی ہوں۔"

"دوبارہ تو نہیں آئے وہ؟"

"جی نہیں ساب تک تو کوئی نہیں آیا۔"

"میں نے مسکین خان سے بھی بات کی تھی۔ اب آپ کے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ لڑکیاں اب کہاں ہیں؟"

"میں نے انھیں گیراج کے نیچے تہہ خانے میں ڈال دیا مگر ستنا جا صاحب اس کا فائدہ کیا ہوا؟ اس آدمی کا رویہ کہ نہیں؟"

"آج پھر اس کی بڑے صاحب سے ملاقات ہو گی۔ پاس وہ تین بار آ چکا ہے کسی ذریعے سے میں نے اس سے ہے کہ میاں اپنا رویہ بدل لو تو ہم تمھارے کام آ سکتے ہیں۔

"پھر کیا کہا ہے اس نے؟"

"اس نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ آج شام کو چار بجے وہ پھر آئے گا۔ دیکھیں کیا کہتا ہے مگر وہ بہت پریشان ہے، پاگلوں ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔"

ظاہر ہے غیرت مند آدمی ہے۔ بہر حال میں شام کو ضرور آؤں گا۔"

"میرا ایک آدمی آپ کی طرف آ رہا ہے گیراج میں رکھی کار اسے دے دیں۔ تاکہ پھر کوئی پریشانی نہ ہو۔"

"کیا نام ہو گا اس کا؟"

"اسلام دین نام ہے اس کا۔ گاڑی آپ اسے دے دیں۔"

"ٹھیک ہے، میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے آپی کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے الماس کے گھر فون کر دیا۔ دوسری طرف سے فون آپی نے ہی اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر مجھے نشہ سا آ گیا۔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا مل جانا بلاشبہ ملاقات مسیحا سے بہتر ہوتا ہے۔

"ارے آپی! تیرا بیڑا غرق۔ تو کہاں ہے پیارے! یہ قصہ کیا ہے آخر؟"

"بکواس نہ کر اوئے! میں خود ہر جگہ تجھے ڈھونڈ چکا ہوں۔ پتہ نہیں تو کس چکر میں ہے۔"

"میں تو یہاں ہی ہوں بھائی! دیکھ! تو جس حال میں بھی ہے نا بس وہاں سے فوراً چل دے۔"

"مگر کہاں؟ تو کس جگہ سے بول رہا ہے کیا میں تمھارا نام لے سکتا ہوں؟"

"تو ابھی تک نہیں سمجھا۔ دیکھ میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں اور میرا کوٹھی نمبر لکھ لے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے گلبرگ کا پتہ اسے بتا دیا اور اپنا فون بھی اسے دے دیا۔

"بس میں ابھی آیا۔ تیری تلاش میں تو میں کئی کنوؤں میں جھانک چکا ہوں بس میں آ ہی رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

حیدر اس وقت باورچی خانے میں جا گھسا تھا۔ آپی کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے پاس آ پہنچا۔ آتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ خلوص سے بھرپور آدمی پہلے سے کہیں زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"تم بہت کمزور ہو گئے ہو یار! یہ کوٹھی کس کی ہے؟ اور تم یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ میرا خیال ہے میں اسے پہلے بھی

دیکھ چکا ہوں۔“

”یہ عالیہ کی کوٹھی ہے بھئی!“ یہ کہہ کر میں نے اس دوران جو کچھ ہو چکا تھا، دم اسے بتا دیا۔ وہ سامنے بیٹھا بڑی حیرت سے میری باتیں سنتا رہا۔

میں چپ ہوا تو بڑے تعجب سے اپنے گرد و پیش کو دیکھا اور پھر دیوانہ وار آئینے کے سامنے جا ٹھہرا۔ اس میں میرا عکس بھی ابھر رہا تھا۔ بولا ”تو غلام جیلانی ہی ہے نا۔“

”تیرا کیا خیال ہے تو کسی بہروپیے سے مل رہا ہے۔ اپنے یہ ایکٹنگ بند کر دے اور مجھے بتا کہ اب آئندہ کیا ہوگا؟“

”وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟“

”وہ اُدھر تہہ خانے میں بند ہیں۔“

”خوبصورت ہیں؟“

”نہیں میرے معیار پر تو پوری نہیں اترتی ہیں اور تیرا معیار بھی میرا خیال ہے خاصا اونچا ہے۔“

”اُن کو باندھ کر رکھو، اِدھر حسین لنگاہی کو میں جانتا ہوں کئی سال پہلے تابیے نے اس کے گھر ڈاکا ڈالا تھا۔“

”اچھا؟ یہ کب کی بات ہے؟“

”جب تابیا زندہ تھا۔ مجھے بھی اس ڈاکے میں اس نے بتیس ہزار دیے تھے۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ اڑایا تھا اس نے۔“

”تو یہ بات ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ تھے۔“

”ہاں۔ راستہ اسے میں نے ہی دکھایا تھا مگر میں کوٹھی کے اندر نہیں گیا تھا۔ یہ وہی ہے نا جس کی کوٹھی وزیرآباد اور نظام آباد کے درمیان میں واقع ہے؟“

”ہاں ہاں، بالکل وہی ہے۔“

”لنگاہی نے بہت شور مچایا تھا مگر وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ بڑا امیر کبیر آدمی ہے وہ۔“

”ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے، اب کیا کہتا ہے وہ؟“

”آج شام کو اس سے ملاقات ہوگی۔“

”اچھا یہ بتا کہ پولیس کے ریکارڈ میں میں بھی مر چکا ہوں کہ نہیں؟“

”تمھارا بھی پتا میں نے صاف کروا دیا تھا۔ تمھارے جرائم بھی تو کم نہیں ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے یقین کیسے آئے گا۔ صرف اپنا نام بدل لینے سے کام بن جائے گا؟“

”ہاں میرا تو یہی خیال ہے ستناجا صاحب نے مجھے الف آئی آر کی رپورٹ دے دی تھی۔ وہ میں نے سنبھال کر رکھی ہے۔“

”تو پھر سمجھ لو کہ آج سے میرا نام۔۔۔ میرا نام۔۔۔ کیا ہونا چاہیے بھئی؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔“

”تمھارا نام۔۔۔ میرا خیال ہے تم حسن علی گردیزی بنو۔ بڑا بھاری بھرکم نام ہے۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بس تم آج سے مجھے اسی نام سے پکارو گے۔ اسلم آبی سمجھو ختم ہو چکا ہے۔“

”آدمی کا نام درحقیقت جاگیرداروں ایسا ہونا چاہیے اگلے پر رعب پڑ سکے۔“

”چلو اب تم مجھے وہ لڑکیاں دکھاؤ۔“

”میرا خیال ہے حیدر انھیں کھانا دینے جائے گا تو تم انھیں دیکھ سکو گے مگر کیا کرو گے انھیں دیکھ کر؟ بہت ہو رہی ہیں بے چاری۔ مجھے تو بہت ترس آتا ہے ان پر۔“

”تو پھر چھوڑ دو نا انھیں، کیوں باندھ رکھا ہے یہاں؟“

”حسین لنگاہی اپنا مذہب بدل لے تو پھر میں یہ کر سکتا ہوں۔“

”کیا کہتا ہے وہ؟“

”آج شام اس سے ملاقات ہوگی میرا خیال ہے تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“

”کیا حرج ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تمھارے ستناجا ہیں کیا چیز؟“

کچھ دیر بعد اسلام دین بھی وہاں آ گیا۔ وہ ستناجا کا کوئی سپاہی تھا۔ میں نے اسے گیراج میں سے گاڑی نکال دے دی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”مجھے یہ حکم ہے کہ میں ان میں کھڑی گاڑی بھی ساتھ لے آؤں۔ میں اس کا ٹائر بدل لیتا ہوں۔“

”مگر اسے کون چلائے گا؟“

”یہ دوسرا آدمی چلائے گا، اسے ڈرائیونگ آتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، جلدی کرو اور اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔“

وہ گاڑی کا ٹائر اتارنے لگے اور ہم دونوں لان میں ٹہلنے لگے۔

”یار تم یہ بتاؤ اس الماس کا کیا ہوا؟ تم تو اس سے ... کر رہے تھے۔ میں تمھاری تلاش میں اس کے گھر فون کیا تو اس نے کہا، پرسوں تمھاری اس کے ساتھ شادی ہو رہی ہے۔“

”اس نے مذاق کیا ہوگا۔ وہ پھر بہت مصروف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شادی اکتوبر میں کریں گے۔“

”یعنی اگلے اکتوبر کو؟“

”ہاں۔ مگر وہ عورت میری ماں کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی ہے، وہ اس سے بہت نالاں ہیں۔ تمھیں آسیہ کے

کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں۔ میں تو اس کے بارے میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔ اب یہ ستناجا صاحب مجھے اس فساد میں پھنسا بیٹھے ہیں۔“

”ان پر لعنت بھیجو یار جی! جس لائسنس کی وہ بات کرتا ہے وہ بالکل بیکار ہے۔ ہمیں اتنے سارے روپے کی کیا ضرورت ہے؟ بینک میں ہمارے نام جو روپیہ پڑا ہے، وہی بہت ہے۔ اسے بھی شاید استعمال کرنے کی نوبت نہ آئے۔ یہ دنیا ہمارے لیے نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے تم نے یہ کوٹھی بھی خواہ مخواہ ہی خریدی ہے۔“

”یعنی تیرا مطلب کہ۔۔۔۔“

”ہاں وہ اپنے بھائی اقبال نے کہا نہیں ہے کہ تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر۔“

”تیرا جواب نہیں ہے گردیزی صاحب یعنی درویشی ہو تو ایسی۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سردار صاحب! ہمارا نام پولیس کے ریکارڈ سے ختم ہو گیا ہے مگر ستناجا صاحب کے دماغ سے تو محو نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو ہمیں جانتے ہیں، وہ تو ہمیں معاف نہیں کریں گے اور پھر وہ کسی بھی دن ہمارا نامۂ اعمال ہمارے سامنے لا سکتے ہیں۔ ایسی دولت کا ہمیں کیا فائدہ جو ہمارے کام نہ آسکے۔ نہیں سردار صاحب! اس ثبوت سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

”بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو آبی!“

”آبی نہیں، گردیزی صاحب۔“

”ہاں گردیزی صاحب! دراصل میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ آپ کا اسمِ گرامی بدل گیا ہے۔“

آبی کھل اٹھا، بولا ”یہ بڑا عجیب سا تجربہ ہے۔ تجھے بھی محسوس ہوتا ہوگا کہ ماں کا دیا ہوا نام آدمی کبھی نہیں بھول سکتا ہے۔“

”میری بات نہ کر گردیزی صاحب! مجھے۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کسی ماں نے مجھے جنا ہی نہیں تھا۔ میں اس سے ملنے گیا تھا، اُدھر حکّے سوالن میں، یاد ہے نا تمھیں مگر وہ مجھے یوں ملی جیسے کوئی دور پار کے رشتے داروں سے ملتا ہے۔“

”وہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی مگر۔۔۔ جیلانی ہو سکتا ہے وہ تم سے بہت زیادہ ناراض ہو۔ تیری ہی وجہ سے اُن دونوں کی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ بھرا پُرا گھر اجڑ گیا ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو آبی! مگر میرا اس میں کیا دوش تھا؟ میں تو آسیہ کے لیے نئی زندگی خریدنے نکلا تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے یہ۔“

”مگر وہ ایسا نہیں سمجھتی ہے جیلانی! وہ تمھیں ہی قصوروار سمجھتی ہوگی ورنہ مائیں تو ایسی نہیں ہوتی ہیں۔ میری ماں کو دیکھو، میں نے تین عورتیں اس کے حوالے کی ہیں۔ وہ اُن کا بھی ویسے ہی خیال رکھتی ہے جیسا میرا۔ وہ انہیں بیٹیوں کی طرح چاہنے لگی ہیں۔ وہ لڑکیاں واپس جانے پر رضامند ہی نہیں ہیں حالانکہ وہ گاؤں میں رہ رہی ہیں۔“

”حیرت تو مجھے یہی ہے گردیزی صاحب! میں ماں کو منانے کی کوشش کروں گا، یہ بہت ضروری ہے بھائی! ورنہ تو میری عاقبت بھی خراب ہو جائے گی۔“

”وہ تو ہو ہی چکی ہے سردار صاحب! کیسی باتیں کرتے ہو۔ اپنے اعمال پر نگاہ ڈالو، سیدھے دوزخ میں جاؤ گے، دابا جھنڈہ۔“

کچھ ہی دیر بعد ہمیں پجیرو گاڑی کا انجن چلنے کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے اس کا ٹائر بدل لیا تھا۔ اسلام دین ان دونوں گاڑیوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تو میں نے ان کے پیچھے گیٹ بند کر دیا۔ جرم کا ایک اور بڑا ثبوت ہم نے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

ابھی ہم دوپہر کا کھانا کھا کر ہی بیٹھے تھے کہ گیٹ کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ حیدر لپک کر باہر نکلا تو اس کے پیچھے ہم بھی برآمدے میں جا ٹھہرے مگر حیدر نے گیٹ جیسے ہی کھولا، چار آدمی برق رفتاری سے اندر آ گئے۔ حیدر انھیں روکتا ہی رہ گیا۔ مگر وہ رکے نہیں۔ اس سے کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے جس سے مطمئن ہو کر حیدر نے بڑے اطمینان سے گیٹ بند کیا اور ان کے ساتھ چلتا ہوا وہ برآمدے کی طرف آنے لگا۔ وہ چاروں آدمی اس کے عقب میں آ رہے تھے۔ اُن کی چال ڈھال میں عجیب سا تفاخر تھا۔ وہ ہر مشکل کو عبور کر لینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ چاروں شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور ان پر انھوں نے کوٹ پہن رکھے تھے۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہم اُن کی ہر حرکت کا بڑے اطمینان سے جائزہ لے سکتے تھے۔ مگر ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ کسی بُری نیت سے کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئے، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ آدمی جو اُن کی رہنمائی کر رہا تھا اس کا نام دانی تھا۔ اسکو میں نے صرف دو بار دیکھا تھا۔ اس کا ناک نقشہ میں تقریباً بھول گیا تھا۔ وہ میرے سامنے لپکتا ہوا چلا آ رہا تھا اور اس کے ساتھی کوئی اور نہیں تھے بلکہ اس کے اڈے کے پرانے ساتھی تھے! تینوں نے گاڈی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے ہم پر ریواز گارڈن کی کوٹھی پر حملہ کر دیا تھا۔

دانی کو اپنے سامنے دیکھ کر میں تلملا کر رہ گیا۔ دیر بہت ہو چکی تھی میرا پستول کمرے میں پڑا تھا ورنہ شاید میں اس کا استقبال کسی اور رنگ میں کرتا۔ حیرت ہے کہ آبی کا پستول بھی بریف کیس میں رکھا تھا اور وہ بھی وہاں نہتا ہی کھڑا تھا اور وہ اتنے قریب آ چکے تھے کہ ہم ذرا سی بھی مہلت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ جب میں نے دانی کو پہچانا تو اس وقت فاصلہ صرف چھ قدموں کا باقی رہ گیا تھا۔ دانی نے مجھے وہاں برآمدے میں کھڑے دیکھا تو وہ خود حیران رہ گیا۔ وہ میری صورت کو اب تک نہیں بھولا تھا۔ اس کے پیچھے جاکھی کھڑا تھا وہ بھی ششدر رہ گیا۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ملاقات مجھ سے ہو جائے گی مگر دونوں پست پاپی قسم کے لوگ تھے۔ دانی نے بھی اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور جاکھی نے بھی ۔۔۔ دونوں نے بڑی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دانی نے برآمدے کے ستون کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”السّلام علیکم سردار صاحب!“ اس کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی تھی اور وہ مسکرانے لگا۔

”جی۔۔۔۔ وعلیکم السّلام، فرمائیے کیسے تشریف لائے ہیں آپ؟“ میں نے اُن کو جان بوجھ کر فاصلے پر رکھتے ہوئے کہا اور اُن پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں انھیں پہچان گیا ہوں۔

”کچھ کام تھا آپ سے سردار کرم نواز آپ ہی کا نام ہے نا!“

”جی ہاں اور یہ میرے دوست ہیں حسن علی گردیزی۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے آپ؟“

”جی کیوں نہیں۔ انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ حیدر! ہم ابھی آ رہے ہیں۔“

”جی نہیں ۔۔۔۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی آئیے دراصل ہم بہت جلدی میں ہیں، دو منٹ کی بات ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر میں نے آبی سے کہا۔ ”گردیزی صاحب! اندر سے میرا پائپ لے آئیں میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں، تمباکو بھی لے آئیں۔“

آبی میری بات سمجھ کر فوراً ہی میری خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ اور میں اُن کو ساتھ لے کر نشست گاہ کی طرف بڑھا۔

”حیدر! ان کے لیے چائے بناؤ بھئی! کچھ کھانے کے لیے بھی ساتھ لے آنا۔“ مگر ابھی ہم برآمدے سے نکل کر نشست گاہ تک پہنچے ہی تھے کہ مجھے حیدر کی چیخ سنائی دی۔ ایک آدمی نے اس کے سر پر ایسا مکا مارا کہ وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ اس کی چیخ ہی برآمدے میں کانپتی رہ گئی تھی جیسے ہی وہ نیچے گرا، دانی کے ساتھی نے ایک دم اپنے نیفے سے نیپالی خنجر باہر نکال لیا۔ ویسا

ہی ایک خنجر دانی کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ وہ اس وقت دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ جس آدمی نے حیدر کو نیچے گرایا تھا، وہ دانی کا یار جاکھی تھا۔ اس نے ہاتھ پر مکا چڑھا رکھا تھا۔ بائیں ہاتھ میں اس نے نیفے کے سامنے میں سے خنجر نکال لیا تھا اور اب وہ تینوں مجھے گھیر کر کھڑے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کا چوتھا ساتھی کہاں گیا۔ اس کو شاید اُن لوگوں نے آبی کے پیچھے بھیج دیا تھا۔

”چلیں سردار صاحب! بات کمرے میں بیٹھ کر ہو گی۔ آپ بڑے عزت دار آدمی ہیں، صوفے پر بیٹھ کر بات کریں گے بہتر ہو گا۔“

”میرا خیال ہے حیدر نے کوئی بدتمیزی کی ہو گی؟“ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔ بڑی غلط حرکت کی تھی اس نے، پھر لگتا ہے مجھے۔“ جاکھی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ کو وہ راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور دن کو براہ راست اپنے شکار پر حملہ کرتے تھے اور انھیں معلوم اس وقت وہ کس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اُن کے خنجر اُن کے اضطراب کا پتہ دیتے تھے۔ ابھی تک اُن میں سے پستول کسی نے باہر نہیں نکالا تھا۔ میرا خیال ہے انھیں یہ معلوم تھا کہ پستول کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

دانی نے نشست گاہ کا دروازہ کھول دیا اور دھکیلتے ہوئے وہ تینوں کمرے میں گھس گئے۔

”تشریف رکھیں سردار صاحب! بات ہم زیادہ لمبی نہیں کریں گے، وقت ہمارے پاس بہت کم ہے۔ بیٹھیں۔“ مجھے صوفے کے پاس پہنچاتے ہوئے کہا اور خود وہ تینوں پاس کے صوفوں کو گھسیٹ کر میرے اردگرد بیٹھ گئے۔

”آپ کا چوتھا ساتھی کہاں ہے؟“

”وہ بھی آ رہا ہے، دراصل وہ آپ کا پائپ لینے گیا ہے تمباکو بھی لے آئے گا۔“ جاکھی نے خنجر کی دھار آزماتے ہوئے اس بدمعاش کو معلوم بھی تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے مگر اس کے حوصلے کو دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ دانی کے اب لمبے لمبے بال اُگ آئے تھے جب میں نے اُسے تھا تو اس نے سر پر استرا پھروا رکھا تھا۔

”بات یہ ہے سردار صاحب کہ ۔۔۔۔ ان کو بتا کہ ہم کس لیے آئے ہیں؟“

”یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہو گا۔ خیر میں ہی بات

”یہ خنجر آپ نے کس لیے نکال لیے ہیں؟ کوئی

آپ کو مجھ سے؟“

”یہ ہماری عادت ہے سردار صاحب، بس ایسے ہی ان کو ہم سامنے رکھتے ہیں ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ دراصل صحیح بات دوسرے کے منہ سے نکلوانے کا ایک اوزار ہے کیوں دانی صاحب! یہی بات ہے نا؟“

”یہ بندے کا صحیح طریقے سے آپریشن کر دیتا ہے۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو استاد! یہ واقعی آپریشن کا ایک ذریعہ ہے۔“ جاکھی نے جواب دیا۔ وہ تینوں مسکرا رہے تھے۔ انھیں قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کسی پرائے گھر میں بیٹھے ہیں اور وہاں اُن پر کوئی بھی افتاد پڑ سکتی ہے، وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی سے پہلے ہی پوچھ چکے تھے کہ گھر میں میرے سوا اور کوئی نہ ہو گا۔ آبی کی موجودگی نے انہیں پریشان کیا تھا مگر اس کا علاج انھوں نے ڈھونڈ لیا تھا۔ چوتھا آدمی انھوں نے اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا تھا۔

”بات یہ ہے سردار صاحب کہ آپ ۔۔۔ آپ حسنین لنگاہی کو جانتے ہیں نا۔ وہ جو وزیر آباد میں رہتے ہیں، وہ دراصل دانی صاحب کے ’غریبی‘ عزیز ہیں۔“

”قریبی عزیز ہیں۔“ دانی نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے کہا۔

”ہیں غریبی عزیز۔ اس لیے کہتا ہوں کہ وہ کروڑوں میں کھیلتے ہیں اور آپ بس ہزاروں میں، اس لیے ۔۔۔۔۔۔ ہاں تو وہ ان کے اپنے آدمی ہیں۔ سمجھیں کہ لنگاہی صاحب اُن کے خالہ زاد بھائی ہیں۔“

”اچھا پھر؟ مجھ سے یہ بات کیوں کہتے ہیں آپ؟“

”بات یہ ہے میرے عزیز کہ لنگاہی صاحب کی دو بیٹیوں کو اغوا کر لیا گیا ہے اور ہم انہی کے سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ ہمیں وہ لڑکیاں واپس دے دیں، ورنہ آپ سے سچ اگلوانے کے لیے ہمیں یہ اوزار استعمال کرنا پڑے گا۔ ہاں! آپ ۔۔۔ بہت ہی یعنی بہت ہی زیادہ سوچ سمجھ کر جواب دیں سردار صاحب۔“ جاکھی اب بھی مسکرا رہا تھا اور اس کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میرا مستخر اڑا رہا ہو۔

”میرا خیال ہے جاکھی نے بات واضح کر دی ہے۔ لنگاہی میرے بھائی ہیں برادرِ عزیز! اور اُن کی عزت میری عزت ہے۔“ دانی نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”یہ مت سوچیں سردار صاحب کہ ہم یونہی اندر آ گئے ہیں، آپ کا فون ہم نے کاٹ دیا ہے اور کوٹھی کے تمام دروازے بند ہیں۔ آپ تنہا ہیں۔ آپ کا دوست بے دست و پا ہو چکا ہے۔ مظلوم حسین کو ہم نے اسی لیے اس کے پیچھے بھیج دیا تھا۔ اس لیے جواب بہت سوچ سمجھ کر دیں۔“ جاکھی کے پُر اعتماد لہجے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

جس صوفے پر میں بیٹھا تھا، اس کے عقب میں مینٹل پیس پر کئی قسم کی آرائشی چیزیں رکھی تھیں جن میں سے دو تلوار نما خنجر بھی موجود تھے۔ مگر وہ اس طرح رکھے تھے کہ ایک ٹھپے سے انھیں جوڑ دیا گیا تھا اور وہ ٹھپے کے ساتھ ستارہ و ہلال کے نشان کے گرد گویا چمکتی تلواروں کا کام دے رہے تھے۔ انھیں میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اُن خنجروں کو چمڑے کے غلافوں میں سمیٹ دیا گیا تھا۔ اُن کے دستوں کو بڑی آسانی سے کھینچا جا سکتا تھا۔۔۔ دوسری چیز اسی ستارہ و ہلال کے اوپر ایک بڑی خاصی لمبی تلوار کی دھار بھی بہت تیز تھی۔ اس تک بھی میں بہت آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے ابھی تک اُن چیزوں کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی تھی۔ یا پھر ہو سکتا ہے وہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ مجھ پر وہیں بیٹھے بیٹھے غالب آ جائیں گے۔

”اچھا تو آپ دانی صاحب ہیں مگر ابھی تک آپ نے اپنا حدودِ اربعہ مجھے نہیں بتایا۔ یہ جاکھی ہے اور یہ کوا کون ہے آپ کے ساتھ؟“

”زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے سردار جی! آپ دانی کو نہیں جانتے مگر سارا شہر جانتا ہے۔ یہ آدمی کو کھڑے کھڑے چیر دیتے ہیں۔ یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ یہ یہاں خود موجود ہیں ورنہ ہم تو تمھیں دوسری بات کی بھی مہلت نہ دیتے۔ ہمیں بتاؤ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟“

”مگر تم کن لڑکیوں کی بات کرتے ہو؟ میرے ساتھ تو کئی ایک رہتی ہیں۔“

”بکواس نہ کرا دئے! تم سمجھتے ہو کہ ہم تمھیں پہچان نہیں سکے ہیں۔ تم ہمارے اڈے پر بھی آ چکے ہو۔ کسی وجہ سے اس دن میں نے تمھیں چھوڑ دیا تھا مگر آج نہیں۔ آج معاملہ ہی کچھ اور ہے غلام جیلانی! مجھے ابھی اور اسی وقت وہ لڑکیاں واپس کر دو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“

”تو تم گاڈی کے یار ہو۔ تمھیں پتہ ہے میں نے اُس کا کیا حشر کر دیا تھا؟ پھر بھی تم یہاں چلے آئے۔“

عین اُس وقت اُن کا ساتھی مظلوم حسین، آبی کو نیم بیہوشی کی حالت میں کھینچتا ہوا کمرے میں گھسا۔

”اس کو سنبھالو جاکھی! اس بدمعاش نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔“ مظلوم حسین، آبی کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے فرش پر گھسیٹ رہا تھا اور اُس کی اپنی حالت یہ تھی کہ اس کی کمر اور اس کی گردن لہولہان ہو رہی تھی۔ اُن کو اس حال میں دیکھتے ہی میں نے

صوفہ پیچھے اُلٹ دیا اور ایک زبردست جھٹکے سے اس کو میں نے دانی کی طرف اُچھال کر تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر دانی شاید سمجھ چکا تھا۔ وہ پہلے ہی صوفے سے اٹھ کر میری طرف لپکا۔ جیسے ہی اس نے خنجر بلند کیا میں نے کئی ہاتھ اوپر اُچھل کر اس کے منہ پر بوٹ کی ٹھوکر لگائی۔ وہ تیورا کر پیچھے گرا۔

جاکھی مظلوم حسین کی طرف جانے کے بجائے جیب سے پستول نکال کر بولا "رُک جا ورنہ بندر کی اولاد ورنہ میں تمہیں چھید کر رکھ دوں گا" یہ کہتے ہوئے اس نے ایسے انداز میں گولی چلائی کہ جان بوجھ کر اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔

"دوسری گولی تیرے اندر دھنس جائے گی پُتر! ہم یونہی نہیں آئے ہیں یہاں"

میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ جاکھی چاہتا تو وہ میرے سینے میں آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ مظلوم حسین اس وقت تک آبی کو کھینچ کر کمرے میں لا چکا تھا۔

"بتاؤ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟" دانی نے اس عرصے میں خود کو سنبھال کر اپنا خنجر میرے پہلو سے لگا دیا تھا۔ اس کی کھوڑی سوج گئی تھی۔

"وہ لڑکیاں اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔ میں سارے کمرے دیکھ آیا ہوں" مظلوم حسین نے چیختے ہوئے کہا۔ زخموں نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا پھر بھی ابھی تک وہ ہوش و حواس قائم رکھے ہوئے تھا۔

"اوئے شکرے جا اُس حیدر کو دیکھ۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے، اس سے پوچھ وہ لڑکیاں کہاں ہیں" وہ پھر بھونکا۔ شکرا اُن کے تیسرے آدمی کا نام تھا جو خنجر لیے میرے سامنے جاکھی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

"بہتر ہے غلام جیلانی تو خود ہی بتلا دے کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"مجھے کسی لڑکی کا علم نہیں ہے، میں کسی کے بارے میں تمہیں نہیں بتاؤں گا"

"اوئے کیوں تیری موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔ بدمعاش! ہمیں لنگا ہی صاحب نے خود بتایا ہے۔ رات بھی یہاں دو آدمی آئے تھے، وہ جو بھاگ گیا تھا، اس کی زبان کو تم نہ روک سکے۔ پولیس بھی یہاں آئی تھی۔ ہمیں سب پتہ ہے سالے! بہتر ہے تو خود ہی بول دے ورنہ تم تینوں کو ہم ختم کر دیں گے۔ جاکھی کی آواز نے کمرے میں اندھیر مچا رکھا تھا۔

آبی اس وقت تک بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔ خدا معلوم اسے مظلوم حسین نے کیسی ضرب لگائی تھی بظاہر اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔

جاکھی کی نظر برابر مجھے ٹٹول رہی تھی۔ اس کو پُر مجھ پر سوار دیکھ کر دانی نے ایک دم اپنا خنجر پیچھے ہٹا لیا بولا "اس کو سنبھال جاکھی! یہ کوئی حرکت کرے تو بے دھڑک اسے گولی مار دے۔ یہ گاڈی کا قاتل ہے۔ وہ بدلہ بھی اس سے ضرور لیں گے"

یہ کہہ کر وہ دروازے میں جا ٹھہرا۔ شکرا حیدر کو سے گھسیٹ کر وہاں تک لے آیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ "اسے سنبھالو دانی صاحب! میں پانی لاتا ہوں"

"پانی کی ضرورت نہیں ہے، وہ گاڑی اندر لاؤ۔ ہم تینوں کو باندھ کر لے جائیں گے۔ ان کی تلاشی ہم اڈے پر کریں گے" شکرا تیزی سے گیٹ کی طرف چل دیا۔ ابھی تک جاکھی نے پستول کی زد میں لے رکھا تھا۔ دانی غصے سے پیچھے لوٹا اور آتے ہی اس نے کوٹ کی جیب سے باریک نائیلون کا بنا ہوا ایک گولا سا نکالا اور خنجر کو پھر ہاتھ میں لے کر اس نے جاکھی کو اشارہ کیا۔ وہ پہلو بدل کر اس طرح آگے بڑھا کہ اب اس کی نالی سیدھی میرے سینے کی سمت تھی۔ دانی نے اس کے قریب جا کر گولے کو پھیلایا تو جال ایسی صورت اختیار کر گیا۔ وہ کچھ اتنی تیزی سے اس نے طرف پھینکا کہ میں کوشش کے باوجود اپنا سر اس سے نہ بچا سکا۔ جیسے ہی وہ میرے اوپر آیا، میرا سر اور میرے دونوں بازو اس کے حلقے میں آتے چلے گئے اور میں اس کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ جال کی رسّی اس کے ہاتھ میں تھی۔ جونہی دانی نے جھٹکا دیا میں اس جال میں پوری طرح رہ گیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں کوشش کے باوجود اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ جال پوری طرح اب مجھے اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ اس طرح میں اتنا بے بس کبھی بھی نہ تھا۔ غلام جیلانی زندگی میں عاجز ہو کر رہ گیا تھا۔ دانی نے جال کی گرہ کچھ اتنی تیزی سے تنگ کی کہ میں اس میں مکمل طور پر بندھ گیا۔ اب کچھ بھی باقی رہ گیا تھا۔ نہ کوٹھی، نہ حیدر، نہ آبی۔ کچھ بھی نہیں اور مجھ سے دُہرا انتقام لے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں گاڈی اور اس کے ساتھیوں کو کتنی بے دردی سے قتل کر چکا تھا اور اب اُن کا مجھ سے ایسا معاملہ آ پڑا تھا کہ اُن کے مطابق لنگا ہی اس دانی کا خالہ زاد بھائی تھا اور لڑکیاں اُن کی رشتے دار تھیں۔ مگر میں اُن کو لڑکیوں کا کیسے بتا دیتا۔ یوں تو میں اپنی غیرت کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ اس تشدد کے سامنے تو میں سر نہیں ڈال سکتا تھا۔ آخر

پہلے کے حالات بھی انہیں معلوم تھے کہ دو آدمی رات کو بھی وہاں آتے تھے۔ یہی کی وجہ سے تھا کہ بالآخر لنگا ہی کو بھی علم ہو گیا تھا کہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ ستنا جا صاحب نے اکبر صاحب کو تو گرفتار کر لیا تھا مگر انہیں کیا معلوم کہ وہ بات کہاں کہاں تک پھیل چکی ہے۔ ہمارے دشمنوں نے کسی نہ کسی طرح لنگا ہی کو بھی خبردار کر دیا ہو گا۔ جب پولیس بھی ناکام ہو گئی تو پھر انھوں نے دانی جیسے نامی گرامی بدمعاش کو بیچ میں ڈال دیا اور اب میں اپنے ہی عمل کے ردعمل میں پھنسا ہوا تھا۔ آبی کو وہاں بلوا کر میں نے خواہ مخواہ ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ وہ آرام سے اماں کے گھر بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اسے اپنا پتہ بتا دیا اور اب میری وجہ سے حیدر بھی ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ ہوش میں ہوتا تو شاید اتنے سارے تشدد کو برداشت ہی نہ کر سکتا اور پہلے ہی ہلے میں بتا دیتا کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں لیکن میں اور آبی تو اُن کو یہ نہیں بتا سکتے تھے۔ ایسے مرحلے تو ہماری زندگی میں روز ہی آتے تھے۔ دانی ہم سے یہ بات کسی بھی طرح اگلوا نہیں سکتا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد گاڑی کی آواز لان میں سنائی دینے لگی تو دانی بولا "ان سب کو گاڑی میں ڈال دو جاکھی۔ ایک ایک کر کے باہر لے آؤ" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جال کی گرہ اس نے کچھ اس طرح بند کر دی تھی کہ میں اندر سے کسی صورت اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ حیدر اور آبی کو گاڑی میں پھینکنے کے بعد شکرے اور جاکھی نے مجھے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھ جیپ لائے تھے۔ مجھے بھی انھوں نے آبی کے ساتھ ہی دُہری تہری حالت میں گاڑی کے اندر پھینک دیا اور پھر دانی، جاکھی کو ساتھ لے کر کوٹھی کے مختلف حصوں کی تلاشی لینے کے لیے واپس چلا گیا مگر کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دونوں منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ انھیں وہاں سے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

"چلو بھئی! کوٹھی کے اندر تو مجھے وہ لوگ نظر نہیں آئے۔ یہ خود ہی بتا دیں گے کہ وہ کہاں گئی ہیں" دانی کی آواز مجھے سنائی دی۔ جیپ کے گرد انھوں نے پردے تان لیے تھے۔ گاڑی کو کوٹھی سے باہر نکال کر انھوں نے گیٹ پر تالا لگا دیا اور ہم تینوں کو وہاں سے باندھ کر وہ آگے چل دیے۔ گاڑی شکرا چلا رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔

آدمی کے قویٰ آہستہ آہستہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاید اس کی سوچ کو بھی کیڑا لگ جاتا ہے۔ وہ پہلی سی تندی تیزی اس میں باقی نہیں رہتی۔ کچھ ایسی ہی بات تھی کہ اس روز ہم بس ڈھے ہی گئے۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنا کوئی بھی پینترا اُن کے خلاف استعمال نہ کر سکا۔ جاکھی کے پستول نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے پاس بھی پستول ہوتا تو بھی شاید میں اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتا اور... اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں ایک ایسی حرکت کا مرتکب ہو چکا تھا کہ مجھے اپنی بنیاد بہت ہی کمزور نظر آتی تھی۔ چوری کا مال کوٹھی میں ہی موجود تھا۔ دو معصوم لڑکیوں کو ہم نے بدترین اذیت سے گزار دیا تھا۔ اُن کی حراست بالکل بے جواز تھی۔ اُن کا تو کوئی قصور ہی نہ تھا۔ وہ بالکل بے گناہ ماری گئی تھیں۔ اگر کسی کو حسین لنگا ہی ہی سے ضد تھی تو اس کا انتقام اسی سے لیا ہوتا۔ اس کی اولاد کو یرغمال بنانے کی کیا ضرورت تھی مگر میں معاملے کے اس پہلو پر غور ہی نہ کر سکا اور ستنا جا صاحب کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا جس کی ڈوری اب دانی کے ہاتھ آ گئی تھی۔ دراصل آدمی کا حوصلہ اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ کہیں باہر سے اس کو حوصلہ نہیں ملتی ہے جب اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے تو اس کی ضرب میں بھی تباہ کن قوت پیدا ہو جاتی ہے مگر اس روز یہی چیز میرے پاس موجود نہیں تھی۔ میں کسی طرح بھی حق پر نہیں تھا۔ یہ وہی دانی تھا جس کے بھانجے کو بسوں کے اڈے پر میں نے اس کے دشمنوں سے بچا لیا تھا۔ اور جب میں اس کے پاس پہنچا تو باوجود اس کے کہ وہ مجھے پہچان چکا تھا، جاکھی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ غلام جیلانی ہے مگر دانی نے مجھے نکل جانے دیا تھا۔ حالانکہ گاڈی کے قتل کے بعد ہم پر اس نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس نے پوری کوٹھی رات کے پچھلے پہر جلا کر راکھ کر دی تھی۔ اگر ہم بھاگ کر ایم اے او کالج میں نہ جا گھستے اور اس کے ہاتھ آ جاتے تو شاید وہ ہماری زندگی کا آخری دن ہوتا مگر اس نے اپنے گھر پر مجھے پہچان لینے کے باوجود چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ میں اس روز اس کا مہمان بن کر گیا تھا مگر اب وہ جس انداز سے ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ اس میں برحق تھے۔ اس کا ان کے پاس ایک جواز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز ہم برباد ہو کر رہ گئے۔ پتہ نہیں آبی کو کیسی ضرب لگی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی جیپ میں اوندھا پڑا تھا۔ یہی حال حیدر کا تھا۔ وہ بھی ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ سر کی چوٹ نے دونوں کو ذلیل کر دیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر میں کسی بھی طرح اس جال کو کاٹ نہ سکا۔ حد یہ ہے کہ اس پر میرے دانت بھی کام نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ میں ان تاروں کو کئی بار منہ میں دبا کر زور لگا چکا تھا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ جاکھی میرے سامنے ہی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

اس نے میری وہ حرکت دیکھ لی۔ اسے شبہ ہوا کہ کہیں میں اس جال کو دانتوں سے نہ کاٹ دوں۔ اس نے ذرا جھکائی دے کر پستول کا وزنی دستہ میری کھوپڑی پر دے مارا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ پھر مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ میں بھی ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ ایسے میں آدمی کی روح کہاں چلی جاتی ہے اس کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہو سکا۔ یوں لگا، جیسے میرے حواس مختل ہونے کے بعد مجھے بے پناہ سکون میسّر آ گیا ہو۔ سارے خدشے، سارے اندیشے، ساری اذیتیں جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ بے ہوشی کا شاید سب سے بڑا فائدہ آدمی کو یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کسی بات کی اسے سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ یہ بے ہوشی بڑھ کر موت کی صورت اختیار کر لیتی ہو گی اور اگر موت ایسی ہی صورت میں آدمی پر وارد ہوتی ہے تو میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ سکون پرور بات کوئی نہ ہو گی۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی تھا۔ آدمی کو کسی بیماری سے نجات دلانے کے لیے ڈاکٹر لوگ اس کی چیر پھاڑ کرتے ہیں تو پہلے اسے بے ہوش کر لیتے ہیں۔ ایسے میں وہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصّہ کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔ کیا وہ بے ہوشی بھی موت ہی کا ایک حصّہ نہیں ہے۔ سارا دُکھ تو اسی احساس کا ہے۔ جب اس کی رگ مسل دی جاتی ہے تو پھر تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ میرے اپنے ہاتھوں سے جو لوگ موت ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتے تھے اور جب میں ان کی رگِ احساس مسل دیتا تھا تو وہ بھی کسی ایسی ہی بے کراں سناٹوں سے لبریز دنیا میں جا پہنچتے ہوں گے۔ جب ہی تو ان میں سے کئی ایک کو اپنی آنکھیں بند کر لینے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔

پتہ نہیں، میں کب تک اس حال میں گم رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اذیت کا ایک عجیب سا احساس مجھے ڈسنے لگا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ گرد و پیش سے متعارف ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ دانی نے مجھے ایک تین فٹ، چھ فٹ پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ ایسے پنجرے میں جس کے اندر میں نہ لیٹ سکتا تھا، نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس کی سلاخیں انگلی برابر موٹی تھیں۔ اس کے اندر میں اکڑوں ہو کر بیٹھنے کی گنجائش نکال سکتا تھا مگر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرہ بھی کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہی کوئی آٹھ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہو گا اور اس میں ایک بلب لگا ہوا تھا۔ بڑا ہی دھیما، بڑا ہی کمزور۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وقت کتنا گزر چکا ہے۔ میری جیب میں سگریٹ ماچس اور ڈیڑھ ہزار روپے نقد، رومال اور ایسی ہی کچھ اور چیزیں پڑی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری گھڑی بھی کلائی پہ بندھی تھی۔ میرا لباس اگرچہ چرمُر ہو چکا تھا مگر وہ بھی جوں کا توں موجود تھا۔ بوٹ بھی پاؤں میں پھنسے تھے اور میری کسی بھی ذاتی چیز کو لوگوں نے نہیں چھیڑا تھا۔ کوٹھی کی چابی البتہ دانی کی جیب میں تھی مگر... مجھے یقین تھا کہ وہ کسی بھی طرح لڑکیوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈر مجھے یہی تھا کہ وہ بچاریاں کہیں بھوک کی وجہ سے نہ مر جائیں۔ بہت عرصے سے رکھے فریج کے پھلوں پر وہ کوئی ایک ہفتہ تو گزار سکتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا ہم انہیں کھلا آئے تھے مگر شام اور اس سے اگلی صبح وہ کیا کریں گی؟ انہیں حیدر کا انتظار رہے گا مگر وہ تو دانی کی قید میں تھا۔ اسے ان لوگوں نے شاید کسی ایسے ہی پنجرے میں بند کر دیا ہو گا۔ یہی حال آپی کا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اسے دانی نے کہاں رکھا تھا — سب کچھ ہی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ سیر کو سوا سیر کھا جاتا ہے تو میرے ساتھ بھی کچھ ہوا تھا۔ ایک بڑا درندہ مجھ پر آ جھپٹا تھا۔ دانی کو میں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی مگر اب مجھے معلوم ہوا تھا کہ دانی کس بلا کا نام ہے۔ اس کا نام بھی یونہی مشہور نہیں ہو گیا تھا اور پولیس بھی اس سے بلاوجہ خوف زدہ نہیں رہتی تھی۔ شہر میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا مگر میری راہ میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا مگر اب مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ جب مجھ پر پستول ہتھوڑے کی طرح استعمال کیا گیا، اس وقت دن کے دو بجے تھے اور اس وقت اگر اگلا روز نہیں ہو گیا تھا تو شام کے سات بج چکے تھے۔ ابھی تک ان میں سے کوئی آدمی میری طرف نہیں آیا تھا۔

رات کے نو بج گئے۔ اس پنجرے نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نہ سیدھا بیٹھ سکتا تھا، نہ اس میں پیر پھیلا کر لیٹ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے میرا اندازہ ہی غلط تھا۔ وہ لمبائی میں شاید ساڑھے چار فٹ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس میں ٹانگیں نہیں پھیلا سکتا تھا۔ مجھے دانی نے واقعی زبردست شکنجے میں کس دیا۔ کوئی سوا نو بجے جاکھی مجھے دروازہ کھول کر اندر آتا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ وہ میرے لیے کھانا لایا تھا۔

"کیا حال ہیں شیر کے بچے! پنجرا اچھا ہے نا؟"

"میں زندہ رہا تو ایک دن تجھ سے بدلہ ضرور لوں گا جاکھی! اس دانی کو بلا ادھر، میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"دانی صاحب کو اتنی فرصت کہاں بچے! اگر وہ تمہارے پیچھے پھرتے رہیں۔ تیرا چارج انہوں نے مجھے دے دیا ہے۔ یہ تیرے لیے میں کھانا لایا ہوں۔ مجھے امید ہے یہ تجھے پسند آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے پنجرے کی سلاخوں میں بنے ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے پہلے روٹیاں میرے آگے رکھیں مگر اس طرح کہ پستول اس کے دائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ پھر اس نے دو پلیٹیں میرے سامنے رکھ دیں۔ ایک گلاس بھی اس نے ٹرے میں سے اٹھا کر اندر رکھ دیا۔ نگاہیں اس کی میرے چہرے پر جمی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ اپنے اسی خوف کی وجہ سے اس کی انگلی تلے دبی لبلبی کسی بھی وقت بھڑک سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ ویسے بھی وہاں اتنی گنجائش کہاں تھی۔ سلاخیں بہت تنگ تھیں اور وہ سوراخ صرف اتنا سا تھا کہ اس میں سے چھوٹے سائز کی پلیٹیں ہی اندر رکھی جا سکتی تھیں۔ گلاس خالی تھا اور جگ ابھی تک ٹرے میں تھا۔

"یہ گلاس سیدھا کرو بچے! میں اس میں ذرا پانی ڈال دوں۔"

میرا پیاس کی وجہ سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کی بات کو غنیمت سمجھ کر میں نے گلاس سیدھا کیا تو اس نے بڑی احتیاط سے دو سلاخوں میں سے جگ کے ذریعے اس میں پانی ڈال دیا مگر اس طرح کہ پانی سلاخوں کو چھو تک نہیں سکا تھا۔

"تم نے ایک کنبے کو تباہ کر دیا ہے جیلانی! مجھے حیرانی ہے کہ اس کنبے سے تمہیں کیا دشمنی تھی؟"

میں نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ اس کی بات نے میری پیاس ایک دم بھڑکا دی تھی۔ مجھے بھی اس بات کا احساس تھا کہ حسنین لنگاہی سے مجھے کیا ضد تھی۔ کیوں میں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی مگر جاکھی کے منہ سے وہ لفظ سن کر میرے حلق میں کانٹے سے بھر گئے۔

"بتایا نہیں تم نے، کیا ضد تھی تمہیں ان سے؟"

"تم ایسا سوال مجھ سے پوچھ رہے ہو جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"بہتر ہے جیلانی! ہمیں بتا دو کہ وہ لڑکیاں تم نے کہاں رکھی ہیں؟ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارے دونوں ساتھی

بھی بالکل خاموش ہیں۔ شاید انہیں پتہ ہی نہ ہو مگر تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ کھانا کھاؤ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے دیوار کے ساتھ لگی کرسی کھینچ کر میرے قریب کر لی۔ یوں کہ اس کی انگلی سیدھی میری آنکھ میں دھنس سکتی تھی۔

بھوک نے مجھے اس گھڑی بے چین کر رکھا تھا۔ اس کے سوال سے صرفِ نظر کر کے میں نے کھانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک پلیٹ میں بکرے کا گوشت رکھا تھا اور دوسری میں مرغ کا سالن، روٹیاں بھی تازہ تھیں۔ گویا انہوں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ ان کے اسیروں کو کھانا اچھا ملنا چاہیے۔ حیرت کی بات تھی کہ دونوں سالن بہت لذیذ تھے۔

"تم نے کہیں انہیں بیچ تو نہیں دیا؟"

"تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں نے کہا تو ہے کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔"

"پاگل ہو تم! کچھ ہوش کی دوا لو۔ تم ایسے لوگوں کے جال میں پھنس گئے ہو جنہیں دو سو اکہتر قتل معاف ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ تم ہی تھے۔ ہم سب کچھ سن چکے ہیں پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تم نہیں تھے۔"

"کیا معلوم ہے تمہیں؟ کون میرے خلاف گواہی دے سکتا ہے؟ کس نے دیکھا ہے مجھے؟" میں نے تیسری روٹی پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ مجھے خدا جانے کیوں یہ یقین تھا کہ اس پنجرے کی سلاخوں سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ جس سے میرا تعلق ابھی ختم نہیں ہوا۔ میں وہاں سے کسی نہ کسی دن رہائی ضرور پالوں گا۔ وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ خیال میرے ذہن میں کیسے پیدا ہو رہا تھا مگر میں نے اسی امید پر پنجرے میں رکھے کھانے پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں بہت پُر امید تھا۔ حالانکہ حالات ایسے ہرگز نہیں تھے۔

"تمہیں یاد ہے، کچھ روز پہلے تم ایک دعوت میں شریک ہوئے تھے؟"

"ہاں، اس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔"

"وہاں تمہارے بڑے صاحب پر گولی بھی چلی تھی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"اور اس سازش کا نزلہ بیچارے بیروں پر گرا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"وہ دو آدمی جنہوں نے تمہیں حسینہ لنگاہی کی کوٹھی کے گرد پھرتے دیکھا تھا، ان میں سے ایک شخص اس دعوت میں شریک تھا اور اس نے تمہیں پہچان لیا تھا۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"تم خاک سن رہے ہو۔ یہ اکڑ پھکڑ معمول جاؤ جیلانی! تم یہاں سے مٹی ہو کر باہر نکلو گے۔ تم پر قبر سے زیادہ بڑا پردہ آ گرا ہے۔ تم دانی کو نہیں جانتے ہو۔ بہت دنوں بعد ایک بڑے پرندے کو پکڑنے کے لیے اسے خود تمہاری کوٹھی پر جانا پڑا۔ جہاں تم سردار کریم نواز بن بیٹھے ہوئے۔"

"تم یہ باتیں نہ ہی کہو تو بہتر ہے۔ اس کا حشر گاڑی سے زیادہ بُرا ہو گا۔ آگے کی بات کرو۔ پھر کیا ہوا ہے روٹیاں صرف تین ہی تھیں۔"

"اور بھی مل سکتی ہیں اور سالن بھی۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے میں سے باہر جھانک کر کسی کو آواز دی کہ وہ کچھ روٹیاں اور سالن اور لے آئے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ واپس آ گیا اور تین روٹیاں اور سالن کی پلیٹ پنجرے میں رکھ کر بولا "کھاؤ، معلوم ہوتا ہے تمہیں بھوک زیادہ لگتی ہے۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ کچھ لوگوں کی بھوک رنج و غم سے بڑھ جاتی ہے۔"

"باتیں تو تم بہت عمدہ کر لیتے ہو حالانکہ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا تم صرف ایک پاکٹ مار ہو۔ کیا کچھ معلوم ہے تمہیں؟"

"اس کا نام غلام فرید ہے۔ وہ رات تم نے ہوٹل میں گزاری۔ وہ لوگ تمہارے تعاقب میں لگے رہے مگر رات ان کا داؤ نہ چل سکا۔ اگلے دن تم نے لڑکیوں کا گجرات تک تعاقب کیا تو وہ تمہارے ساتھ ساتھ چلتے رہے تم سمجھے وہ بھی لڑکیوں کے تعاقب میں ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ حقیقت میں وہ برابر تمہیں دیکھ رہے تھے۔ تمہاری گاڑی کو آگ انہوں نے ہی لگائی تھی۔ پتہ نہیں انہوں نے تمہیں جان لو کیوں نہیں مار دیا۔ ایک موقع بھی ملا، چناب پل کے پاس مگر تم نے ان کو بے ہوش کر دیا۔ یہ کام تم کیسے کر لیتے ہو تمہارے بارے میں انہوں نے بڑی عجیب بات بتائی۔ دانی صاحب بھی حیران ہیں۔"

"یہ بھی ایک فن ہے جاکھی! تیرے جیسا اناڑی کبھی نہیں سیکھ سکتا۔"

وہ مسکرا دیا، بولا "بہت بڑے بدمعاش ہو تم معلوم ہے مگر جس رات تم نے لڑکیوں کو اغوا کیا، رات کوٹھی میں لنگاہی صاحب موجود تھے نہ کوئی اور۔ معلوم ہی نہیں تھا کہ تم ان کو تباہ کر دو گے۔ دوبارہ بھی کرو گے۔ وہ تو اپنے آدمیوں کے علاج کے لیے گوجرانوالہ گئے ہوئے تھے کہ تمہارا داؤ چل گیا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟ تم انکار کر سکتے ہو؟"

"جب تمہیں اتنا کچھ معلوم ہے تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"یہی بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ رات جو دو آدمی وہاں گئے، انہوں نے ان لڑکیوں کو خود دیکھا تھا مگر اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ کہاں غائب کر دیا ہے تم نے انہیں؟ یاد رکھو جیلانی! لنگاہی سے دانی کی بڑی قریبی عزیز داری ہے، وہ اس کے لیے تمہیں جان سے مار سکتا ہے اور کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا جاکھی! تمہیں کیا پتہ تم نے کس مصیبت کو اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ حیدر اور گردیزی نے کھانا کھایا کہ نہیں۔ انہیں کہاں رکھا ہے تم نے....؟"

"وہ بھی ادھر ہی ہیں، دوسرے کمرے میں اور وہ بھی ایسے ہی پنجروں میں بند ہیں اور نڈھال ہو رہے ہیں۔ مگر تم انہیں نہال کر سکتے ہو، اپنی جان چھڑا سکتے ہو۔ ہمیں ان لڑکیوں کا پتہ بتا دو تو ہم تمہیں آج ہی چھوڑ دیں گے۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا جیلانی! بالکل اچھا نہیں ہو گا۔"

"اس پنجرے میں مجھے بند کر کے تم یہ سوال مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ جس میں میں نہ بیٹھ سکتا ہوں، نہ کھڑا ہو سکتا ہوں۔ مجھے برابر اشتعال بھی دلاتے ہو اور یہ سوال بھی پوچھ رہے ہو۔ کیسے بھولے آدمی ہو تم۔ اس حال میں تو میں لڑکیوں کے بارے میں تمہیں کبھی بھی کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔ جاکھی! تم ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دانی صاحب کو بتا دیتا ہوں تمہیں اگلے حکم کا انتظار کرنا ہو گا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر پستول مجھ پر تان لیا اور پنجرے میں سے برتن نکالنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تمام چیزیں سمیٹ کر باہر نکل گیا۔

میری ابتلا کی گھڑی تو ابھی آئی ہی تھی۔ پنجرہ مجھے راہ نہیں دیتا تھا۔ میں اس میں اکڑوں ہو کر بیٹھا تھا، اس طرح کہ میرا سر بہت نیچے جھک گیا تھا۔ پاؤں میں بیٹھ کر پسار سکتا تھا مگر لیٹ کر نہیں۔ میں نے سگریٹ سلگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی پتہ نہیں مجھے کیسے اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑے۔ دانی نے خدا جانے کیا کچھ سوچ رکھا تھا مگر میں اپنے منہ سے ان لڑکیوں کے بارے میں کوئی بات انہیں بتا نہیں سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ حیدر یا آپی سے پوچھ لیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی مگر مجھے غیرت آتی تھی۔ میں...... میں کیسے کہہ دیتا کہ انہیں میں نے کہاں رکھا ہے۔ یہ ناممکن تھا۔ اتنی ساری زیادتی کے بعد میں ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کا بھی کوئی توڑ ان لوگوں نے ڈھونڈ رکھا ہو گا۔

رات بھر میں اس پنجرے میں اپنے زانو سینے سے لگا کر پڑا رہا۔ اس حال میں کہ میرے نیچے بھی سلاخیں تھیں اور اوپر بھی، جن میں سے ہوا کاٹتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ میری شیروانی نے اس رات مجھے بہت کام دیا مگر پھر بھی وہ بہت ناکافی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اوڑھنے کے لیے کمبل بھی نہیں دیا۔ ہاتھ کو تکیہ بنا لینا تو آسان ہے مگر اس کے سہارے رات تو نہیں گزاری جا سکتی۔ ایسی صورت میں کہ نیچے سے سلاخوں کا جال پسلیوں میں چھید ڈال رہا ہو۔ ایسی اذیت ناک رات میں نے اس سے پہلے کبھی بسر نہیں کی تھی مگر نہیں، نیند مجھے پھر بھی آ گئی۔ سارے دن کی اتنی ساری تکلیف کے بعد وہ نیند ایک خوش آئند تجربہ تھی۔

جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی سات بجا رہی تھی۔ میں اپنے دردیلے جسم کو سمیٹتا ہوا اٹھ بیٹھا مگر کمرے میں پھیلی بدبو ناقابلِ برداشت ہو چلی تھی۔ کوئی پون گھنٹے تک میں اسی طرح سلاخوں سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ آٹھ بجے میرے محبس کا دروازہ پھر کھلا۔ جاکھی میرے لیے ناشتہ لے آیا تھا مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے منہ پھیر لیا۔

"اف یہ بدبو! اوئے تو یہاں کیا گندگی پھیلاتا رہا ہے۔ یہاں تو بیٹھنا مشکل ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اسی وقت واپس چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ایک بھنگن کو اندر بھیج دیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات کیے بغیر کمرہ صاف کیا اور پھر میرے استعمال کے لیے ایک

برتن پنجرے کے پاس رکھ دیا۔ وہ برتن رکھتے ہوئے اس نے پہلی بار مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

"ہُن تسیں ایہہ برتن استعمال کرنا۔ ایدی لوٹی پنجرے وچ جاسکدی اے۔"

"بڑی مہربانی ہے بی بی! جو تو ایسا سوچتی ہے۔ اسے تو خود ہی اٹھایا کرے گی؟"

"ہاں۔ میں صبح شام آیا کراں گی۔ ایدے نال ڈھکن وی لگا اے۔" اس کی آواز دھیمی تھی بہت دھیمی۔ جس میں بلا کی نرمی تھی۔ اگرچہ وہ میلے کا کام کرتی تھی، پھر بھی وہ اپنے لباس کی تراش خراش سے دوسروں کو متوجہ کرسکتی تھی۔ اس کا چہرہ میں ابھی تک نہیں بھولا ہوں اور بال اس کے سر پہ اتنے تھے کہ ایک لوٹا ان سے بھر سکتا تھا۔ اپنا کام کرکے وہ باہر نکل گئی۔ اسے باہر گئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ جاکھی اندر آگیا اور پنجرے کے سوراخ میں سے وہ مجھے چائے، انڈے اور ڈبل روٹی دینے لگا۔

"تجھے میری طرف کون بھیجتا ہے جاکھی؟"

"میں خود آتا ہوں۔ یہ دانی صاحب کا حکم ہے۔ ویسے بھی مجھے بندھا ہوا آدمی اچھا نہیں لگتا ہے مگر مجبوری ہے، تمہیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ تم کیا کرچکے ہو۔ اب بھی وقت ہے۔ ہمیں بتادو، ورنہ ہم تمہاری کوٹھی جلا کر راکھ کردیں گے کوئی چیز وہاں سلامت نہیں رہے گی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب میں ہی نہیں رہوں گا تو پھر اس کوٹھی کو میں کیا کروں گا۔"

"کہنا آسان ہے بچے! مگر جب ہم نے اسے آگ دکھائی تو پھر تمہیں محسوس ہوگا۔ پھر تم چیختے پھروگے۔ چائے پی لو، ورنہ ٹھنڈی ہوجائے گی۔"

"ہوسکے تو میرے لیے دو پیکٹ سگریٹ کے بھیج دینا اور ایک کمبل بھی۔ رات گزارنی مشکل ہوگئی تھی۔"

"اس کی عادت ڈالو جیلانی! پتہ نہیں تمہیں کتنی دیر کہاں رہنا پڑے مگر بہتر ہوگا کہ ہمیں ان لڑکیوں کا پتہ بتادو۔"

"میں نے کہہ دیا ہے تمہیں کہ ان کے بارے میں مجھ سے کچھ مت پوچھنا۔"

"تمہیں احساس نہیں ہے جیلانی! ہم تمہاری کھال ادھیڑ سکتے ہیں استاد! تم نے...... تم اس راتب کے بھی حقدار نہیں ہو۔ پتہ نہیں دانی صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اسی وقت باہر نکل گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے

دانی نے مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ جس طبع کا آدمی تھا اس سے تو میں یہی توقع رکھتا تھا کہ اسے دیر کسی بھی قسم کی قطعاً پسند نہیں تھی۔ وہ فوری فیصلوں کا عادی معلوم ہوتا تھا مگر...... میں تو اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں جگہ انہیں بتا دیتا تو وہ لڑکیاں لے آتے اور پھر وہ میرا کاٹ کر رکھ دیتے پھر کسی دیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ جا یہی چاہتا تھا اور میں اپنا یہی پتا ان سے بچا لینا چاہتا رات بھر تو میں اسی ارادے پر قائم تھا مگر جیسے ہی جاکھی نکلا، اس کے تیور دیکھتے ہوئے مجھے اپنا یہ ارادہ بدلنا پڑ یہ خیال جتنی تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا اور جسے میں اپنی حراست کے بعد سے اپنا سب سے بڑا دفاع سمجھ وہ اتنی ہی تیزی سے تحلیل ہونے لگا۔ صورتحال کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان لڑکیوں کے بارے میں دانی کو کچھ نہ بتا کر میں ان کی زندگیاں ہی خطرے میں نہیں ڈال رہا تھا بلکہ اپنا مستقبل بھی تباہ کررہا تھا۔ دا اس سے کم پر کبھی راضی نہ ہوگا۔ وہ خود کہہ چکا ہے کہ لڑ اس کا بھائی لگتا ہے، خالہ زاد بھائی۔ وہ اس کے لیے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس آہنی محبس میں مجھے بھسم کرکے رکھ دے گا۔ میں بتا صاحب کے سامنے اتنا جواب دہ نہیں تھا، جتنا دانی کے سامنے۔ وہ تو میری کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ ان اطلاع دینے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ بالآخر میں نے کرلیا کہ میں دانی کو بتا دوں گا کہ وہ لڑکیاں کہاں رکھی گئی میں ذاتی طور پر اس سودے بازی سے کچھ بھی اخذ نہیں کر تھا۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ میں نے آپی کو خواہ مخواہ اس میں پھنسا دیا تھا۔ وہ آتے ہی ان کے ہتھے چڑھ گیا کسی وجہ سے۔ اس کی رہائی مجھے اپنی جان سے بھی عزیز تھی۔

پنجرے کی سلاخیں ٹھنڈی یخ ہورہی تھیں۔ کمر کچھ ایسا ہی سیلن زدہ تھا۔ حالات ایسے تھے کہ میں ہر طر سے پسپا ہوکر رہ گیا تھا۔ دانی کو گاڈی اور اس کے سا کے قتل کا مجھ سے انتقام لینا تھا مگر جاکھی اس کا ذکر کررہا تھا۔ اسے ابھی صرف ان لڑکیوں کا پتہ مطلوب کوئی پندرہ منٹ بعد جاکھی واپس آگیا مگر اس حال ایک چابک اس کے ہاتھ میں تھا اور دو آدمی اس کے میں آرہے تھے۔ جاکھی غضب ناک ہورہا تھا۔ اس کے

والے آدمی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں ایک حسنین لنگاہی تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ وہ پاگل ہوچکا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہ گیا تھا۔

"کہاں ہیں میری بیٹیاں؟ تم کہتے تھے، وہ یہاں بند ہیں۔ تم جھوٹ بولتے تھے مجھ سے۔ کہاں ہے جمیلہ میری بیٹی اور ریحانہ کہاں ہے؟ یہ کس کمرے میں لے آئے ہو تم مجھے۔ یہ... یہ اس پنجرے میں میری لڑکی بند ہے۔ کون ہے یہ؟"

"یہ دیکھو جیلانی! یہ ہے وہ آدمی جس کو تم نے برباد کردیا ہے۔ کوئی علاج ہے تمہارے پاس اس کے مرض کا۔ یہ پاگل ہوچکا ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے پتہ ہے تم دانی ہو میرے بھائی ہو۔ تم مجھے میری بیٹیوں سے ملوا دوگے نا؟ بولو کہاں ہیں میری بیٹیاں ہوں میں...... میں سیاست سے توبہ کرتا ہوں دانی! بالکل توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کردو بڑے صاحب! میں تمہارا غلام ہوں مجھے کوئی پارٹی نہیں چاہیے۔ مجھے صرف میری بیٹیاں دلوادو بڑے صاحب! میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے اور ذلیل نہ کرو۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ "خدا کے لیے میری بات سنو۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ میری عزت ہیں۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟ کسی نے انہیں کچھ کہا تو نہیں ہے نا؟ آپ چاہیں تو میں اپنا کارخانہ آپ کے حوالے کرسکتا ہوں۔ بے شک مجھ سے سب کچھ لے لیں۔ میں تیار ہوں بڑے صاحب!"

"اسے دیکھو جیلانی! تم نے اسے کس حال تک پہنچا دیا ہے؟ میں تمہاری کھال کھینچ لوں گا۔ اب بھی موقع ہے منہ سے بول دو کہ تم نے انہیں کہاں رکھا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے جاکھی! میں تو پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ لڑکیاں میری کوٹھی کے بائیں گیراج کے نیچے تہہ خانے میں ہیں۔ گیراج کی عقبی دیوار پر سوئچ بورڈ لگا ہے۔ وہ حیدر کھول سکتا ہے۔ اسے ساتھ لے جاکر لڑکیوں کو وہاں سے نکال لو۔ وہ رات سے بھوکی ہوں گی۔ انہیں فوراً وہاں سے نکال لو۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ کوٹھی کا چپہ چپہ ہم نے چھان مارا مگر ان کا پتہ نہیں ملا اور وہ تہہ خانے میں بند ہیں۔"

"دانی! یہ کیا کہہ رہے ہیں، یہ بڑے صاحب! میری بیٹیوں کی بات کررہے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

"آئیں لنگاہی صاحب! آئیں۔ میں آپ کو آپ کی بیٹیوں سے ملاتا ہوں، آئیں میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر اسی وقت باہر نکل گیا۔ میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس بوجھ نے مجھے اپنی ہی نظروں میں ذلیل کررکھا تھا۔ میں تشدد کے سامنے سر جھکا دینے کا عادی نہیں ہوں مگر ساری جمع تفریق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میں ان لڑکیوں کو روک کر کیا کروں گا؟ ان سے مجھے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ ان کی وجہ سے ان کا باپ پاگلوں ایسی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ شاید واقعی پاگل ہوچکا تھا۔ اس کو میں نے ہی اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ تھانے سے، پولیس سے، بڑے صاحب سے ہر جگہ سے مایوس ہوکر وہ اپنی فریاد لے کر دانی کے پاس آپہنچا تھا اور وہی اس کے کام آیا تھا۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر ایسا پٹخا تھا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ دانی واقعی بہت کاریگر آدمی تھا۔ اس لحاظ سے کہ اسے معلوم تھا کہ کس وقت اسے کیا کرنا ہے اور اب میں اس کی حراست میں بے بس ہوکر پڑا تھا۔ کوئی بات میرے اختیار میں نہیں رہ گئی تھی۔

دروازہ کوئی ایک گھنٹے بعد پھر کھل گیا۔ اب میرے سامنے جاکھی کھڑا تھا اور اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی جس کی نوک پر آدھ انچ لمبی کٹاری بندھی تھی اور دانی اس کے پیچھے آرہا تھا۔ دونوں کے چہرے غضبناک ہورہے تھے۔

"ہوں۔ تو وہ لڑکیاں تہہ خانے میں ہیں۔ یہی کہا تھا نا تم نے؟"

"ہاں، کیوں کیا ہوا؟ ملیں نہیں تمہیں؟"

"کمینے! تو ہم سے جھوٹ بول رہا تھا۔ تیری کوئی ماں وہاں موجود نہیں تھی۔ ذلیل! یہ پنجرہ بھی تیری کمینگی ختم نہیں کرسکا ہے۔" دانی نے وہ چھڑی ہاتھ میں لے کر سیدھی میری ران میں دے ماری۔ اف میرے خدا۔ اس کی وہ آدھ انچ لمبی کٹاری میرے گوشت میں دھنس کر باہر نکلی تو اس کے ساتھ ہی خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ میں درد سے نڈھال ہوکر پنجرے میں اوندھا ہوگیا مگر اس نے اسی پر بس نہیں کی۔ اس پنجرے کی سلاخوں میں سے اس نے وہ چھڑی بار بار میرے جسم میں اتاری اس طرح کہ میرا وجود چھلنی ہوکر رہ گیا۔

"کتے! تو سمجھتا ہے ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ تیری تو یہاں سے لاش ہی نکلے گی جیلانی! بتا یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی تجھے؟"

"اوہ خدا کے لیے دانی! ہاتھ روک لو۔ مجھے باندھ کر مار رہے ہو ذلیل آدمی! یہ بہادری ہے تمہاری۔" میں نے ذرا چیختے ہوئے کہا۔

"تمہارا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ تمہیں سچ بولنا ہوگا جیلانی!

ورنہ میں تمہیں اسی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔ بتا، یہ جھوٹ کیوں بولا تو نے؟"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ لڑکیاں وہیں تھیں۔"

"پھر وہ کہاں چلی گئیں۔ ہم نے تہہ خانہ دیکھ لیا ہے۔ وہاں ان کا نشان تک نہیں ملا۔ تمہاری موت آئی ہے میرے ہاتھوں جیلانی! میں تمہیں یوں نہیں چھوڑ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر وہ چھڑی میرے بازو میں گھونپ دی۔ اب تک وہ میرے جسم پر کئی زخم لگا چکا تھا مگر وہ ننھے منے چھوٹے سے چاقو ایسی کٹاری اپنی لمبائی کے برابر ہی زخم ڈالتی تھی۔ جو میری جلد سے نیچے نہیں اترتا تھا مگر پھر بھی وہ مجھے نڈھال کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔

"بتاؤ اگر وہ تہہ خانے میں تھیں تو اب کہاں چلی گئی ہیں! کون ان کے پیچھے لگا ہوا تھا؟"

"ہاتھ روکو دانی! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ان کے بارے میں صرف ایک آدمی کو علم تھا۔" میں نے اپنے بازو کے زخم پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور وہ کون ہے؟ بتاؤ ورنہ اس چھڑی کا پھل اور لمبا ہو سکتا ہے۔ میں اسے اور زیادہ گہرا دھنسا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چھڑی کے دستے کو گھمایا تو اس کا پھل کوئی چھ انچ لمبا ہو گیا۔

"یہ دیکھ رہے ہو نا تم! اس کی تم ایک بھی ضرب نہ سہہ سکو گے۔"

اس پھل کو دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ "اس سے مجھے مت ڈراؤ۔ میں تو خود مرنے کی آرزو کرتا ہوں دانی! مگر۔۔۔۔ ان لڑکیوں کے بارے میں صرف ستناجا صاحب کو معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے وہ انہیں لے گئے ہوں۔"

"ستناجا صاحب! یہ۔۔۔۔ یہ وہی آدمی ہے نا جو بڑے صاحب کے لیے غیر قانونی کام کرتا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ یہ وہی آدمی ہے۔"

"مگر اس کا ان لڑکیوں سے کیا تعلق ہے؟"

"مجھے افسوس ہے دانی! کہ یہ کام میں نے انہی کے اشارے پر کیا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم نے کیوں ایک ہنستے بستے گھر کو ویران کر دیا۔ کیا ضد تھی ستناجا کو ان سے؟"

"وہ دراصل حسنین لنگاہی کو مغلوب کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کے حلقے میں آ جائے۔"

"تو یہ بات ہے۔ یہ سب کچھ سیاست کے نام پر کیا گیا ہے۔

مگر۔۔۔۔ مگر وہ لنگاہی بے چارا تو پاگل ہو گیا ہے۔" اس نے چھڑی جاکھی کو تھما دی۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ بہت نیچے جا پہنچی تھیں۔ وہ نظریں جو آج تک کسی کے سامنے نیچی نہیں ہوئی تھیں۔ میری دونوں رانیں بھی زخمی تھیں اور دونوں بازو بھی۔ ابھی تک اس نے کوئی ضرب میرے سینے اور کمر پر نہیں لگائی تھی۔ یہ اس کی مہربانی تھی مگر ان زخموں سے جو میں سہہ چکا تھا، میرا بہت سا خون بہہ نکلا تھا۔ میرے کپڑے خون میں تر ہو گئے تھے۔ حالانکہ ہر زخم صرف آدھ انچ گہرا تھا۔ مگر خون تو زخموں کو سیراب کرنے کے لیے وہاں بھی مل جاتا ہے۔

دانی کو شاید اس کا احساس تھا کہ میں شدید زخمی ہو چکا ہوں۔ میرے چہرے پر کھنڈی زردی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ میں اگرچہ چیخا نہیں تھا۔ درد کا شدید احساس ہونے کے باوجود میرے آنسو نہیں بہے تھے مگر دانی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ میری قوتِ برداشت بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، بولا: "اس ستناجا کو بھی حساب دینا پڑے گا جیلانی! وہ بھی اسی طرح تمہارے ساتھ پنجرے میں بند ہو گا۔ لڑکیاں اسی کے پاس ہیں۔ اگر وہ ہمیں نہیں ملیں تو آج شام اس کی لاش اسی جگہ پڑی ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔ میں زخموں کی وجہ سے زیادہ ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ کسی بات کا مجھے ہوش ہی نہیں تھا۔ میری بلا سے وہ ستناجا صاحب کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ دانی کے وسائل کا مجھے علم تھا۔ اس کی قدرت کے کرشمے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا حملہ تابڑ توڑ ہوتا تھا۔ وہ حالات کا بہت گہری نظر سے تجزیہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتا تھا اور اسے عملی جامہ پہنا کر ہی دم لیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ستناجا صاحب ہی تھے جنہوں نے مجھے کوٹھی سے غائب پا کر لڑکیوں کو وہاں سے نکال لیا ہو گا مگر انہیں وہ کہاں رکھ سکتے تھے، اس بات کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ خدا ہی خیر کرے لنگاہی کی آہیں کام کر گئی تھیں اور اب پتہ نہیں یہ دانی کس کس کے گھر اجاڑ دے گا۔ ایک درندہ حرکت میں آ چکا تھا۔ اپنے بھائی کی بیٹیوں کو بچانے کے لیے وہ پتہ نہیں کیا کر گزرے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ رانوں میں لگے زخم زیادہ ہی ٹیس دے رہے تھے اور ان پر رکھا کپڑا بار بار تر ہو رہا تھا۔

دانی کو وہاں سے نکلے کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک معمر آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ "سنا ہے تم زخمی ہو گئے ہو؟"

"ہاں میاں جی! یہ مرہم مجھے دے دیں، میں خود ہی اسے لگا لیتا ہوں۔"

"یہ لو۔ زخموں کو اسپرٹ سے صاف کر کے یہ مرہم لگا لو، اور اسے اپنے پاس رکھو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اس کی پھر ضرورت پڑے۔" وہ میرے پنجرے کے قریب ہو کر بولا۔

اس نے مرہم چھوٹے سے سوراخ میں سے اندر گزار دیا اور پھر وہ اسی وقت واپس چلا گیا۔

میرے لیے وہ مرہم تریاق ثابت ہوا۔ زخموں پر لگتے ہی اس نے عجیب طرح کی ٹھنڈک پہنچائی۔ میں نے اسے زخموں پر پھیلا دیا۔ بازوؤں کا زخم زیادہ عذاب نہیں دیتا تھا البتہ میری رانوں اور پنڈلیوں میں شدید تکلیف تھی جو آہستہ آہستہ آرام پانے لگی اور میں پنجرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔ ایسے میں جاکھی کے دیے ہوئے سگریٹ میرے بہت کام آئے اور میں دیر تک ان سے دل بہلاتا رہا۔

ہوش مجھے جب ہی آیا ـــــــ جب سہ پہر ڈھلنے پر میرے کمرے کا دروازہ پھر سے بج اٹھا۔ میرے سامنے جاکھی کھڑا تھا۔ اس کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا وہ خدا معلوم کیا خبر لایا تھا اور اس کے تیوروں میں میری تقدیر کی کتنی شکنیں پنہاں تھیں۔ یہ خدا کی شان تھی کہ جاکھی جیسا آدمی مجھے مغلوب کر چکا تھا جسے میں اگر ایک دھکا دے دیتا تو اس کا سارا وجود اکھڑ کر رہ جاتا۔ میرے کپڑے ابھی تک خون آلود تھے اور وہ خون کسی ایک جگہ نہیں تھا۔ میری شیروانی بھی ان کی زد میں تھی اور شلوار بھی۔ ایک وہ بھنگن تھی جو کمرے میں سے غلاظت اٹھانے کے لیے آ جاتی تھی اور بس۔ اس کا رویہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کوئی خوف تھا جس نے مسلسل اس کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا اور اب وہ جاکھی میرے لیے تقدیر کا چابک بن گیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا مجھے چند لمحوں تک گھورتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ میرے قریب آ گیا۔

"ہوں۔ تو تم زخموں کو سجا کر بیٹھے ہو۔ مگر یہاں تمہاری کوئی ماں بہن نہیں ہے جیلانی! جو ان پر ماتم کرے گی۔"

"مجھ سے بہت سوچ سمجھ کر بات کرو جاکھی! پتہ نہیں میں اب تک کیوں تمہیں سمجھا نہیں سکا۔ زبان کو قابو میں رکھو۔"

"ورنہ کیا کر لو گے تم میرا؟ بڑے صاب کے چمچے! کتے! تمہیں بڑی ملتی ہے تو تم حرکت میں آتے ہو۔ تمہارا وہ ستناجا ہمیں ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ سارا دن ہم اس کی تلاش میں پھرتے رہے ہیں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جاؤ اس سے پوچھو کہ اس نے لڑکیاں کہاں رکھی ہیں۔"

"وہ تو ہم اس سے پوچھ ہی لیں گے جیلانی! مگر اس کے ساتھ ہم تمہارا ابھی یہ ڈراما ختم کر دیں گے۔ تمہیں میں ستناجا کے سامنے گولی ماروں گا۔ میں نے اس کا عہد کر رکھا ہے۔"

"ایسا نہیں ہو گا جاکھی! تم نے حیدر اور آبی کو کہاں رکھا ہے؟"

"ان سے تو ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ بس لمبی مدت کے لیے اپنی جیل میں رکھیں گے اور پھر چھوڑ دیں گے۔ ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں ہے۔"

"تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟ ساری بات تو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"ابھی کہاں؟ ابھی تو تمہیں ہم لیموں کی طرح نچوڑ دیں گے جیلانی! کتنی رقم لی تھی تم نے سرکار سے اس کام کی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں رقم لے کر کام نہیں کرتا ہوں۔"

"اور کیا کرتے ہو؟ آخر کیا کرتے ہو تم؟"

"دیکھ، میں پھر تم سے کہہ رہا ہوں جاکھی! مجھے طیش نہ دلا۔" میں نے پہلی بار اپنا ہاتھ سلاخوں میں سے نکالنے کی کوشش کی۔ جاکھی پنجرے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ فوراً ہی وہاں سے پرے ہٹ گیا اور پھر اس نے کوٹ کے نیچے سے اپنا خنجر باہر نکال لیا۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ میرا ہاتھ ہی نہ زخمی کر دے اس لیے میں نے فوراً ہی اپنی انگلیاں واپس کھینچ لیں۔

"مجھے معلوم ہے تم نے ہم سے پھر جھوٹ بولا ہے۔ ابھی دانی صاحب آتے ہیں تو پھر ہم تم سے بات کریں گے۔"

وہ خنجر کی دھار پر انگلی پھیر رہا تھا مگر پھر اچانک ہی وہ پنجرے کے عقب کی طرف جھکا اور اس نے چاہا کہ میری کمر پر زخم ڈال دے مگر میں ایک دم سرک کر دوسری طرف ہو گیا۔ اس کا خنجر اس وقت تک دو سلاخوں کے اندر آ چکا تھا۔ ایک لمحے کی تو بات تھی۔ میں نے خنجر کے پھل پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس طرح کہ میرا رومال میرے ہاتھ پر لپٹا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اسے باہر کھینچنا چاہا مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خنجر دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ میری گرفت اس پر اتنی مضبوط تھی کہ جاکھی کوشش کے باوجود اسے باہر نہ کھینچ سکا۔

"تو یہ بات ہے۔ تیرے ہاتھوں میں واقعی زبردست قوت ہے مگر میں ان کو کاٹ کر رکھ دوں گا جیلانی! تیری انگلیاں میں یوں نہیں رہنے دوں گا۔" ٹوٹے ہوئے خنجر کا دستہ ہی اب اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا اور اس کا پھل پنجرے کے فرش پر پڑا تھا۔

عین اسی وقت دانی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شکستہ خنجر جاکھی کے ہاتھ میں دیکھا تو کہنے لگا۔

"یہ کیسے ٹوٹ گیا ہے جاکھی؟"

"جیلانی نے اس کا پھل توڑ دیا ہے۔ اس کی گرفت اب بھی بہت مضبوط ہے۔"

"تم اس کے ساتھ مسخری مت کرو۔ تمہیں پتہ ہے یہ کس دھات کا بنا ہوا ہے۔ میں نے اسی لیے اس کو پنجرے میں ڈالا تھا۔ اس سے براہِ راست ٹکر لے کر میں اپنے بندے ضائع نہیں کروانا چاہتا تھا۔"

"مجھے خوشی ہے دانی! کہ تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے مگر تم زیادہ دن تک مجھ پر حاوی نہیں رہو گے۔ مجھے آج دوپہر کا کھانا بھی نہیں ملا ہے۔ پانی کا ایک گھونٹ تک تم نے نہیں دیا ہے مجھے۔"

"یہ غلط بات ہے جاکھی! میں اپنے اڈے میں کسی آدمی کو بھوکوں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کو زخم سے مار دینا تو بہتر ہے مگر اس کو بھوکا تو نہ رکھو!"

"جی میں...... میں ان لوگوں سے کہہ تو گیا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کیا وجہ ہوئی ہے۔ اس گدھے کو پتہ بھی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" یہ کہہ کر جاکھی لوٹتے ہوئے خنجر کو لے کر اسی وقت باہر نکل گیا۔

دانی کونے میں رکھی کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم ابھی تک ستناجا تک نہیں پہنچ سکے ہیں مگر یہ کچھ بھی مشکل کام نہیں ہے۔ آج یا کل ہم اسے ضرور پکڑ لیں گے مگر یہ سارا قصہ مجھے پھر سے بتاؤ۔ یہ چکر کیا ہے آخر؟"

میں نے اسے تفصیل بتانا چاہی تو وہ ایک دم بور ہو گیا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ وہ لڑکیاں میری عزیز ہیں اگر انہیں کچھ ہو گیا، کسی نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو پھر پتہ نہیں میں کیا کر دوں۔ جب تک ہمیں ستناجا نہیں مل جاتا میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر پھر خیر نہیں ہو گی۔"

"تم اس پنجرے میں رہنا پسند کرو گے، میرا سارا جسم درد کرنے لگا ہے۔ تم اسی طرح لوگوں کو ذلیل کرتے رہتے ہو۔"

"زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اسی سلوک کے مستحق ہو اور ابھی پتہ نہیں آگے کیا کچھ ہو گا۔ کل شام تک مجھے لڑکیاں نہیں ملیں تو اپنی خیر مت سمجھنا۔ ابھی تو گاڈی سے کیا ہوا وعدہ بھی مجھے پورا کرنا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ دروازے میں جھنگن

آ ٹھہری تھی۔ وہ شام کا کوڑا اٹھانے آئی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کا ڈبا بھی تھا جسے وہ کمرے میں چھڑکنا چاہتی تھی مگر دانی کو سامنے دیکھ کر وہ وہاں رُک گئی۔

"اتنی زیادہ صفائی کی ضرورت نہیں ہے یہاں۔ صبح آ جانا۔ سمجھیں! بلکہ تم ناظر کو ادھر بھیجو، ناظر مسیح کو۔ تم نہ آیا کرو ادھر۔" دانی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔ کمرے کی فضا اب بھی بہت متعفن ہو رہی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔ صبح شام وہاں سے وہ جھنگن ساری غلاظت اٹھا لیتی تھی۔

"کیا تم مجھے آبی اور حیدر سے ملا سکتے ہو؟"

"تم اسے اپنے ماما کا گھر سمجھتے ہو، کتے! ابھی تو تمہارے پہلے ہی زخم صحیح نہیں ہوئے ہیں اگر ستناجا میرے ہاتھ نہ آیا اور تیری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو پھر سمجھ لے جیلانی تیرا حشر بہت بُرا ہو گا۔"

"ستناجا نہیں ملا تو اس کا غصہ مجھ پہ نکال رہے ہو، پنجرہ کھولو اور پھر دیکھو میں تمہارا کیا حال کرتا ہوں۔ جاؤ، ان سے پوچھو کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ اسی نے انہیں وہاں سے نکالا ہو گا۔"

"مظلوم حسین کو تمہارے دوست نے شدید زخمی کر دیا۔ اس کا زخم اتنا خراب ہو گیا کہ اسے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا اور اب ہم آبی کو بھی کبھی باہر نہیں جانے دیں گے۔ تم نے ہمیں پاگل کر دیا ہے۔"

اتنے میں جاکھی پھر ہمارے کمرے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم تھا۔ جس نے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔

"اوئے تلنگے! یہ کیا حرکت ہے۔ اسے کھانا کیوں نہیں دیا گیا؟"

"وہ جی مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔ جاکھی صاحب نے اب بتایا ہے۔"

"اب یہ راتب دے دو اسے۔ بعد میں برتن اٹھا لینا یہاں سے۔ اسے صبح و شام کھانا پہنچانا تمہارا کام ہے۔"

"جی! یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میں آخر ہوں کس لیے، میں اس کا گھر پورا کر دیا کروں گا۔"

"آؤ جاکھی ادھر! میری بات سنو۔" یہ کہہ کر دانی تیزی سے باہر نکل گیا۔ جاکھی اور تلنگا بھی اس کے پیچھے تھے۔

پنجرے کے اندر پوری ٹرے تو نہیں جا سکتی تھی،

نے روٹیاں اور چھوٹی سی پلیٹ سوراخ میں سے گزار کر اندر رکھیں، اور پھر پانی کا گلاس بھی اٹھا لیا۔ مجھے اس پنجرے نے ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ سوراخ وہ بہت ہی تنگ تھا۔ جیسے کسی بڑے چوہے دان کا ہوتا ہے اور باہر کی دنیا تک میری رسائی صرف اسی سوراخ سے ہی ممکن تھی۔

کھانا کھا کر میں نے پھر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ پنجرے کی سلاخیں اب زیادہ ٹھنڈی ہونے لگی تھیں اور مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ دانی کا منصوبہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکیاں حاصل بھی کر سکے گا کہ نہیں اور پھر اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ ان لڑکیوں کی قسمت پر بھی اب مجھے افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بیٹھے بٹھائے تباہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کا قصور کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ محض لنگاہی کی بیٹیاں ہونے کے ناتے سے اس حال کو جا پہنچی تھیں۔ مجھے بھی تقدیر نے ان کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ایک دن اچانک ہی ان کے تعاقب میں نکل جاتا۔ کوئی نہ کوئی گناہ ان سے بھی ضرور سرزد ہو چکا تھا جس کی یہ سزا انہیں مل رہی تھی مگر یہ میرا محض ایک وہم تھا۔ ایک طفل تسلی کی بات تھی۔ ان لڑکیوں پر جو آفت نازل ہوئی اس کا محرک کوئی اور تھا۔ مقصد بھی کچھ اور تھا مگر ہاتھ تو میرے ہی کٹنے چاہئیں تھے کہ میں نے ہی ان کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ گھونسلے سے باہر نکل کر چڑیا کا بوٹ پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ ان بچاریوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی گھر کی منڈیر سے باہر جا پڑی تھیں۔ وہ کتنی ہی صحیح سالم کیوں نہ رہ گئی ہوں۔ کوئی ان کی بات پر اعتبار نہیں کرے گا اور یوں میں براہِ راست ان کی مکمل تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ ترس مجھے اس لنگاہی پر بھی بہت آتا تھا۔ وہ پاگلوں ایسی باتیں کرنے لگا تھا۔ اسے صورتوں کی بھی پہچان نہیں رہ گئی تھی۔ وہ ہر ایک سے اپنی بیٹیاں واپس مانگتا تھا۔ شاید بڑے صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ بالآخر وہ اسے اپنے راستے سے ہٹا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اگلے چار دن میرے اسی طرح گزرے کہ نہ دانی میرے پاس آیا نہ جاکھی۔ کھانا وہ مجھے تین وقت دے دیتے تھے مگر اس طرح کہ وہ تلنگا تین روٹیاں اور دال مجھے پنجرے کے سوراخ کے اندر سے مہیا کر دیتا تھا اور بس۔ وہ جھنگن بھی دوبارہ ادھر نہیں آئی۔ ایک مرد البتہ صبح شام تلنگے کے ساتھ اندر آ جاتا تھا اور کمرے کے فرش پر پاؤڈر ڈال جاتا تھا۔ اس پنجرے نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ کوئی کمبل بھی ان لوگوں نے مجھے

نہیں دیا۔ حالانکہ دانی انہیں کہہ بھی چکا تھا۔ پتہ نہیں اس کی بات پر انہوں نے عمل کیوں نہیں کیا۔ میں ساری رات سردی سے ٹھٹھرتا رہتا تھا۔ زخم مجھے الگ پریشان کیے ہوئے تھے مگر میں ان پر بار بار دوا لگاتا رہتا تھا۔ جو اب پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو رہے تھے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے یارو کہ پنجرے کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ میرا لباس میل سے اَٹ گیا تھا۔ مجھے منہ دھونے کے لیے بھی پانی نہیں ملتا تھا۔ میرے لیے سب کچھ ہی گویا ختم ہو چکا تھا۔ نہ پانی، نہ تازہ ہوا، نہ اعضا کی حرکت۔ کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا میرے پاس۔ دانی نے مجھے اپاہج بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں پنجرے میں آنے کے باوجود بھی یہی سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گا۔ میرے گناہ کو، میرے عیب کو، میرے اس جرم کو کسی اور کا جرم سمجھ لے گا کہ میں اس کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا۔ لڑکیوں کو میں نے ابھی تک چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا میرے دل میں بہت احترام تھا۔ وہ میرے لیے ایسی ہی قابلِ احترام تھیں جیسی آسیہ۔ میں نے حیدر کو بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرے اور وہ بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا۔ میرے دل میں ندامت بھری ہوئی تھی۔ میں کسی عورت کو یوں بےبس ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر دلوں کا حال تو خدا کو ہی معلوم تھا۔ دانی اس سے کیسے واقف ہو سکتا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے اپنی شیطانیت کی وجہ سے ہی ان کو اٹھا لیا تھا اور اب تک پتہ نہیں میں انہیں کس حال میں پہنچا چکا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھے دال روٹی پر ٹرخانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سالن جو پہلے دن مجھے ملا، وہ بس خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا۔ اب مجھے دن رات ایک ذلیل کھانے پر ہی صبر کرنا پڑ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں اس نے چھڑی کے پھل سے میرے جسم پر کئی زخم ڈال دیے تھے جو اگرچہ اب تک بھر چکے تھے لیکن اس کے باوجود درد سے بھرے رہتے تھے۔ تاوقتیکہ ان پر انگور آ جاتا۔ میں جسم کو پوری طرح حرکت بھی نہیں دے سکتا تھا۔

پانچویں رات کو میرے محبس کا دروازہ ایک بار پھر کھل گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ کمرے میں کسی نے بڑا بلب جلا دیا تو میں ایک دم پنجرے کے سوراخ دار فرش سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میرے سامنے جاکھی اور دانی کھڑے تھے۔

"اٹھ جائیے! دیکھو ہم کیا لائے ہیں۔" جاکھی نے مجھے للکارتے ہوئے کہا۔

"اندر لے آؤ اوئے اس ستناجا صاحب کو، بڑا افسر بنا پھرتا ہے یہ۔" جاکھی نے دوسرے کمرے میں کھڑے کسی آدمی

سے کہا۔

اچانک دو آدمی ایک ڈولی سی اٹھائے اندر آگئے۔ وہ بھی ایک پنجرہ ہی تھا۔ جس کی چھت پر لمبا سا پائپ لگا تھا جسے دو آدمی اٹھائے ہوئے تھے اور اس ڈولی میں ستناجا صاحب دُہرے ہو کر لیٹے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ گردوپیش کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مجھ پر ان کی نظر پڑی تو وہ حیرت زدہ سے رہ گئے۔ وہ اس وقت عام کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے گلے میں محض ایک سویٹر باقی رہ گیا تھا۔

ڈولی ان دو آدمیوں نے لا کر میرے پنجرے کے قریب رکھ دی۔

"یہ تمہارا چمچہ ہے جیلانی، ستناجا صاحب! اس سے ملو۔ بیچارا یہاں تنہا پڑا ہے۔" جاکھی نے ڈولی کو ذرا سا ہلا کر ستناجا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں اس کا بہت زبردست خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔" ستناجا صاحب نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔ وہ ڈولی میں اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ انہوں نے سلاخوں میں سے باہر نکال لیے تھے۔

"خمیازہ تو بھگت ہی لیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ ستناجا صیب! کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟ تمہیں ہم اسی لیے یہاں لائے ہیں۔ کون سی فلم دیکھی ہے تم نے آج؟"

"تمہیں معلوم ہی ہے مگر تم کن کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

"لنگاہی صاحب کی بیٹیاں! تمہیں پتہ ہے لنگاہی صاحب پاگل ہو چکے ہیں۔ تمہارے بڑے صاحب نے بھی ان کی مدد نہیں کی۔ اسی لیے ہم تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔ اس کے بعد ہی میں فیصلہ کروں گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ تم لنگاہی صاحب کے ہمدرد ہو۔ مگر یاد رکھو میں تمہیں ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا خواہ تم کچھ ہی کر لو اور یاد رکھو کہ میرا نام ستناجا ہے تم جیسے میں نے کئی کھیل کود میں اڑا دیے ہیں۔" وہ ڈولی میں سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اٹھ کیسے سکتے تھے۔ ڈولی میرے پنجرے اتنی ہی بڑی تھی اور اس کی چھت بہت نیچی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہاتھ بڑھا کر جاکھی کی ٹانگ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور الٹ گیا۔ یہ دیکھتے ہی دانی نے پستول تان لیا۔

"اس کو چھوڑ دو۔ ورنہ ابھی تمہارا قصّہ ختم ہو جائے گا۔"

ستناجا صاحب نے اس کے تیور دیکھے تو جاکھی کی ٹانگ انہوں نے چھوڑ دی۔ ایک عجیب سا بے بسی کا احساس ان کے چہرے پر امڈ آیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سردار صاحب! ان کو بتا دو کہ جو یہ چاہتے ہیں، وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرا خیال ہے۔ آپ ان لڑکیوں کا پتہ بتا دیں ستناجا صاحب! ہم اپنی بات منوا نہیں سکتے ہیں۔" میں نے ان کو اس قدر عاجز دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔"

دانی نے جیسے ہی یہ بات سنی۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور ان دو آدمیوں کو جو ڈولی اندر لائے تھے، مخاطب کر کے بولا۔

"اس کا دروازہ کھول دو، ذرا ستناجا کو باہر آنے دو۔"

انہوں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھلا ستناجا صاحب کو اس نے گریبان سے پکڑ کر باہر نکال لیا اور پھر...... پھر جو کچھ بیت گئی ہیں وہ لفظوں میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ دانی اور جاکھی کے ہاتھ میں چابک تھے۔ جس سے ان دونوں نے ستناجا صاحب کی کمر ادھیڑ ڈالی۔ وہ کمرے میں چاروں طرف چیختے پھرے مگر ان دونوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرے کی فضا گھٹی گھٹی سی تھی۔ حالت یہاں تک ہو گئی کہ ستناجا صاحب کا سویٹر پھٹ گیا۔ ان کی قمیص بھی جھیر جھیر ہو کر رہ گئی مگر ان کا ہاتھ پھر بھی نہیں رکا۔ یہاں تک کہ ستناجا صاحب نڈھال ہو کر زمین پر گر گئے۔

"اب بتاؤ ستناجا صیب! وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ بچّے! تم نے استاد کا ہاتھ دیکھا ہی نہیں تھا۔"

اس تشدّد نے ستناجا صیب کو پیس کر رکھ دیا تھا اور میں اپنی جگہ چرمر ہو کر رہ گیا۔ میں بھی اگر ایسی ہی بات کہتا اور ان کے سامنے سچ نہ بولتا تو شاید وہ میرا حال اس سے بھی زیادہ ابتر کر دیتے۔

"بتاؤ کتّے! میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔" دانی پھر بھونکا۔

"وہ..... لڑکیاں گڑھی شاہو کی ریلوے کالونی میں ہیں۔ سترہ نمبر کوارٹر میں سپاہی گل محمد کی تحویل میں۔"

"کوارٹر نمبر سترہ، سپاہی گل محمد، لکھ لو جاکھی! یہ نمبر یاد رکھنا۔" دانی مسکرانے لگا۔

"مجھے یاد رہے گا دانی صاحب! مجھے یاد ہے، بالکل یاد ہے۔"

"تو چلو پھر، اس کو پنجرے میں بند کر دو اور تھوڑی مرہم بھی لگاؤ اسے۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔" چابک اب اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور ستناجا صاحب پر اس نے پستول تان لیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے ستناجا صاحب کو اٹھا کر پنجرے میں ڈال دیا اور پھر اس کے دروازے پر تالا چڑھا کر دونوں ہی باہر نکل گئے۔ دانی اور جاکھی ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ ستناجا صاحب کا حال بہت ہی بُرا ہو چکا تھا۔ ایک چابک ان کے چہرے پر ایسا پڑا تھا کہ ان کی دائیں مونچھ کے بال اڑ گئے تھے۔ کمر بھی مسلسل ضربوں سے ادھڑ کر رہ گئی تھی اگرچہ خون نہیں نکلا تھا مگر پھر بھی ان کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی۔ یہی حال ان کی پیٹھ اور ٹانگوں کا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں آدمی واپس آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں مرہم کی لمبی سی شیشی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں دو کمبل۔ ایک اس نے مجھے دے دیا۔ اس طرح کہ تنگ سی سلاخوں میں سے اس نے جوں توں کر کے گزار ہی دیا۔ یہ ان کی مہربانی تھی ورنہ میں تو سردی سے پاگل ہو رہا تھا۔ ویسا ہی ایک کمبل اس نے ستناجا صاحب کو دے دیا اور پھر مرہم کی شیشی انہیں تھما دی گئی۔

"یہ مرہم لگا لو۔ چابک کی ضربوں کو آرام دیتی ہے۔ صبح پھر تمہاری پریڈ ہو گی اور اگر وہ لڑکیاں ہمیں نہیں ملیں تو پھر پتہ نہیں کیا ہو جائے۔" دانی نے ڈولی کو پوری طرح ہلاتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے گھور کر دیکھتا رہا اور پھر اپنے تینوں ساتھیوں کو لے کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ انہوں نے جیسے ہی دروازہ اپنے پیچھے بند کیا۔ میں نے ستناجا صاحب کو آواز دی۔ وہ بڑی ہی نحیف و نزار آواز میں بولے۔

"جی!"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہی ہوں سردار صاحب! مگر میں ان سے خوفناک انتقام لوں گا۔ ایسا انتقام جسے یہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

کمرے کی بتی ابھی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں مجھے ستناجا صاحب کا سُتا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مرہم ان کے ہاتھ میں تھا مگر وہ اسے کمر پہ مل نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی جو حصّہ ان کے ہاتھ تلے آیا وہاں انہوں نے مرہم لگا دیا۔ کوئی پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے تو وہی معمر آدمی دروازہ کھول کر اندر آ گیا جو مجھے دوا فراہم کرنے آیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں گلاس پکڑ رکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ستناجا صاحب کے ہاتھ سے دوا لے کر ان کی کمر پہ مَلنا شروع کر دی۔ جب وہ پوری طرح اس کا لیپ چابک کی ضربوں پہ کر چکا تو بولا: "یہ دودھ پی لیں باؤجی! اس سے اندر کی چوٹ کو آرام ملے گا۔"

"تیری مہربانی ہے بھائی جو تو یہ دودھ لے آیا ہے۔ کیا یہ دانی کی بیوی نے دیا ہے؟" میں نے اس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ منہ کھول کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ بولا: "تمہیں یہ تمیز سکھائی ہے تمہاری ماں نے۔ تیری بتی ابھی تک نہیں بجھی۔ صبح میں تمہارا ابھی بندوبست کر دوں گا۔ یہ ہماری مہربانی ہے کہ ہم زخم کی مرہم بھی دے دیتے ہیں۔ ورنہ تمہارے جیسے یہاں کئی آئے اور ختم ہو گئے۔ کسی نے ان پنجروں میں انہیں پوچھا بھی نہیں۔"

"پر بابا! تیرا عہدہ کیا ہے یہاں؟ تو یہاں ڈنگر ڈاکٹری کس لیے کرتا پھرتا ہے۔"

"مجھے دانی نے ہی بھیجا ہے۔ تم دونوں نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ لنگاہی صاحب نے گھر میں الگ اودھم بچا رکھا ہے۔ کیوں اتنا ظلم کرتے ہو کسی کی بیٹیوں کے ساتھ؟ تمہاری بھی ماں بہنیں ہوں گی۔ مرد ہو تو مردوں سے پنجہ لڑاؤ۔ عورتوں کا بھلا کیا قصور ہے؟"

"ہم پنجروں میں نہ ہوتے تو تم ہم سے یوں بات نہ کرتے میاں جی! جاؤ اب سو رہو۔ ہمیں بھی آرام کرنے دو۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

دوا کی شیشی اس نے ستناجا صاحب کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ جب وہ دودھ پی چکے تو وہ گلاس اٹھا کر بڑی غضبناک حالت میں باہر نکل گیا۔

اس دوا نے ستناجا صاحب کو بہت آرام دیا۔ وہ کمبل کھول کر پنجرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کے حواس اب بحال ہونے لگے تھے، بولے: "کوئی سگریٹ ہے آپ کے پاس؟"

"ہاں! چند ایک باقی رہ گئے ہیں۔ یہ لیں، پئیں اور اپنی اس مجازی موت کو یاد رکھیں جو آ کر پلٹ گئی ہے۔" میں نے دو سگریٹ سُلگا کر ایک ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں سردار صاحب! مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔"

"مگر ہوا کیا ہے۔ آپ کیسے ان کے ہاتھ آ گئے؟"

سے کہا۔ میں فلم کا آخری شو دیکھ کر نکلا تھا۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ کر مال روڈ پر سے گزر کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو میرے آگے پیچھے دو گاڑیاں آ ٹھہریں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ چار آدمی ایک دم مجھ پر آ چڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں اس وقت کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے اپنا پستول باہر نکال لیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے میرا دروازہ کھولا، میں نے ان پر گولی چلا دی مگر گولی سینے پر لگنے کے باوجود میرے سامنے جو آدمی کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا۔ اس نے مجھے دوسری گولی چلانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے دروازے میں سے کسی نے کار میں گھس کر ایک دم میرے سر پر کوئی وزنی چیز دے ماری۔ جس سے میں بالکل بے ہوش ہو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اس پنجرے میں بند تھا۔ مجھے یہ لوگ جلدی ہی ہوش میں لے آئے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک انہوں نے مجھے دوسرے کمرے میں رکھا اور پھر ادھر لے آئے مگر یہ بتائیں کہ ان لڑکیوں سے ان کا کیا تعلق ہے؟" ستنا جا صاحب نے دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہا۔

"دانی کہتا ہے کہ وہ لڑکیاں اس کی عزیز ہیں۔ لنگاہی دراصل اس کا خالہ زاد بھائی ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔ جب ہی تو اس نے ہم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں نے جب آپ کی کوٹھی سے فون پر کوئی جواب نہ سنا تو میں خود وہاں جا پہنچا مگر کوٹھی میں الو بول رہے تھے۔ آپ کی بات مجھے یاد تھی۔ میں نے گیراج کے نیچے بنے تہہ خانے کا رخ کیا۔ دونوں لڑکیاں مجھے وہیں مل گئیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں پولیس افسر ہوں تو وہ ایک دم خوش ہو گئیں اور اسی وقت میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان کو ساتھ لے کر میں گل محمد کے کوارٹر میں پہنچا اور لڑکیوں کو وہاں ایک کمرے میں بند کر کے میں چلا آیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دو بار مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار میرے دفتر میں بھی یہ آ گئے تھے۔ دوسری بار پرسوں شام ان لوگوں نے سر بازار مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"اب کیا سوچا ہے آپ نے! ہم کب تک یہاں بندھے رہیں گے۔ میرا دوست آبی بھی ان کی قید میں پڑا ہے۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ پتہ نہیں یہ کیا کریں گے ہمارے ساتھ۔ بظاہر تو ان کی نیت نیک معلوم نہیں ہوتی، انہیں پتہ ہے کہ میں افسر ہوں۔ مجھے تو یہ ضرور ہی گولی مار دیں گے۔"

"میں خود حیران ہوں۔ یہ کمرہ ہی کیا کم تھا کہ ہمیں یہ پنجرے بھی مل گئے ہیں۔"

"میں زندہ رہا تو ان سے ضرور نمٹوں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دانی اس قسم کے دھندے کرتا ہے۔ باہر گیٹ پر اس نے خواجہ طاہر علی دانی کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ اس کو اچھی طرح جانتا ہوں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لنگاہی کا عزیز ہے۔"

"یہ تو کوئی بہت بڑا مجرم ہے ستنا جا صاحب"

"خدا گواہ ہے سردار صاحب! مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔"

"اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میرا نام غلام جیلانی ہے اور میرے دوست کا نام اسلم آبی ہے۔"

"آپ کی کوئی یادداشت ہو گی اس کی۔"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

ستنا جا صاحب پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے "اس دوا نے تو بہت آرام دیا ہے سردار! میرا خیال ہے یہ بدن کو سن کر دیتی ہے۔"

"ہاں! یہ بھی ان کی مہربانی ہے کہ دوا ضرور فراہم کر دیتے ہیں۔ مجھے انہوں نے چھوٹی سی آدھ انچ کی برمے سے مارا تھا۔ میرے جسم پر بھی کئی زخم ہیں مگر اب وہ بھر چکے ہیں۔"

"خدا ہی رحم کرے ہمارے حال پر۔ ہم بہت ہی غلط لوگوں میں پھنس چکے ہیں۔" ستنا جا صاحب نے خود ترسی کے انداز میں کہا اور پھر بدن پر کمبل ڈال کر پنجرے کے اندر لیٹ سے گئے۔ ان کی حالت پر مجھے بہت رحم آتا تھا مگر ان کے لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کی وجہ سے اور وہ میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے تھے۔ جس کا علاج ہمارے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

باقی رات اسی طرح آنکھوں میں گزر گئی۔ یہاں تک کہ جب موتی ٹھنڈے ہونے لگے تو ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ کمبل ہمارے لیے بہت سہارا تھے اور وہ پہلی رات تھی جو مجھے وہ راحت نصیب ہوئی۔ ورنہ تو میں سردی میں ٹھٹھر کر ہی رہ گیا تھا مگر ابھی میں ٹھیک طرح نیند نہیں کر سکا تھا کہ اچانک مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں ابھی تک روشن تھا۔ مگر میرا دھیان آنکھ کھلتے ہی دروازے کی طرف جا پڑا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ دروازے کے تو سامنے ناظر مسیح کی بیوی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی، نہ ٹوکرا۔ وہ دروازہ بند کر کے کسی قسم کی آواز کیے بغیر اندر آ گئی۔ نظر اس کی میرے چہرے پر جمی تھی۔ وہ پلکتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی "تسیں غلام جیلانی او ناں؟"

"ہاں میرا یہی نام ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"تسیں ..... بس ایتھوں چلے جاؤ۔ دانی تہانوں وڈھ دینا چاوندا اے۔"

"اوئے! پر تو کون ہے بی بی؟"

مگر اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے پنجرے کے تالے میں چابی گھما دی۔ "تسیں ریٹا نوں جاندے او ناں۔"

"ہاں ہاں! وہ جو راوی روڈ پر کلینک میں کام کرتی تھی۔"

"ہاں! او میری ماسی دی دھی سی۔ پر اوہنوں گاڈی نے قتل کر دتا۔"

"کمال کی بات ہے۔ بی بی تم تو میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن رہی ہو۔"

"ایہہ میرا فرض سی باؤ جی! تسیں ریٹا نوں بچا نہ سکے، پر میں تہانوں بچا لوانگی۔ گاڈی نوں قتل کر کے وی تسیں ریٹا نوں نہ بچا سکے۔ تسیں ایتھوں چھیتی نکل جاؤ۔ سمجھنا مریم ریٹا دے کم آ گئی۔"

"تیرا یہ احسان تو میں کبھی نہ بھول سکوں گا مریم! تو اس دانی کے پاس کیسے رہ رہی ہے؟"

"میرے مرد کولوں اک گلتی ہو گئی سی۔ بس او دوویں ایتھے آں۔" اس نے پنجرے کا دروازہ پورا کھول دیا۔ میں کمبل سمیٹ کر اس میں سے باہر نکلا تو مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں تک قبر میں بند رہا ہوں۔ اپنے ہاتھ پیر پھیلا کر میں نے اپنا بدن سیدھا کیا۔ زخم تو اب مندمل ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں میرے خون میں کوئی ایسی بات تھی کہ کوئی زخم زیادہ دیر تک ہرا نہیں رہتا تھا۔ وہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی اور دوسرے پنجرے کی چابی اس کی پوروں میں پھنسی تھی۔

"میں ..... میں تمہیں اس وقت کیا انعام دوں۔ بہرحال مجھے ..... مجھے یاد رہے گا۔ ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"تسیں بہت چنگے آدمی او باؤ جی! ریٹا تہاڈی بہت تعریف کردی سی۔ پر او مر ای گئی۔ او بڑے فخر نال تہاڈا ناں لیندی سی۔" یہ کہہ کر اس نے ستنا جا صاحب کے پنجرے کا بھی تالا کھول دیا۔ وہ ابھی تک گہری نیند میں تھے۔ مریم نے انہیں ہلایا تو وہ ایک دم جاگ اٹھے۔

"ستنا جا صاحب اٹھ جائیں اور خدا کی اس بندی کا شکریہ ادا کریں۔ اس نے سارے ہی تالے کھول دیے تھے۔"

وہ بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالتے ہوئے ڈولی میں سے باہر آئے مگر ان سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"یہ ..... یہ کون ہے۔ اس نے پنجرہ کیسے کھول دیا۔"

"یہ اس کی مہربانی ہے ستنا جا صاحب! میں پھر تمہیں بتاؤں گا۔ خود کو سنبھالیں۔" یہ کہہ کر میں نے ان کو بازوؤں میں لے لیا۔ ان سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔

"ہمارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"او تیجے کمرے وچ نیں۔ اوہناں نوں وی کڈ لو۔ پتہ نئیں ایتھے کیہہ ہو جاوے۔"

"پر تیرا کیا بنے گا۔ تو کیا کرے گی؟ تیری تو وہ گردن کاٹ دیں گے۔"

"میں وی تہاڈے نال ای چلاں گی۔ ناظر مسیح نوں میں راتیں دس دتا سی۔ او ایتھوں راتیں نکل گیا سی۔"

"چلو پھر! ہمیں دکھاؤ، وہ لوگ کہاں ہیں۔"

"ایہہ لو۔ ایہہ اپنے کول رکھ لو۔ ایہہ دانی دا ریوالور اے ....."

"اوئے۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے بی بی! تمہارا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے بتی بجھا کر دروازہ کھول دیا۔ دوسرا کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس میں سے گزر کر ہم آگے نکلے تو بیچ کا دروازہ مقفل ملا۔ مریم میرے پیچھے آ رہی تھی، بولی۔

"او ایس کمرے وچ بند نیں۔ ایہہ لو چابی۔" اس نے اندھیرے میں مجھے ٹٹول کر چابی میرے ہاتھ میں دے دی۔ اس کی قربت مجھے عجیب سا سہارا دیتی تھی، جیسے وہ کوئی فرشتہ ہو جو ہماری حفاظت کر رہا تھا۔

اس عورت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس جیسی تو میں نے کوئی بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے تیسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو مریم نے آگے بڑھ کر اس کی بتی جلا دی۔ ہمارے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں جن پر آبی اور حیدر سوئے ہوئے تھے۔ ان کے جسم آزاد تھے۔ کسی شے سے بندھے ہوئے نہیں تھے۔ فرش پر میرے قدموں کی چاپ سن کر آبی نے کمبل میں سے سر اونچا کیا تو اس کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ بستر پر سے اچھل کر اٹھا مگر میں نے اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ستنا جا صاحب دوسرے کمرے میں ہی رہ گئے تھے۔ ان سے زیادہ چلا نہیں جا رہا تھا۔

آبی ایک دم میرے پاس پہنچا اور دبی آواز میں بولا۔

"تم یہاں کیسے آ گئے ہو بھئی! یہ قصہ کیا ہے؟"

"اس حیدر کو جگاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکل جانا ہے۔"

وہ تیزی سے پلٹا اور حیدر کا کمبل کھینچ کر بولا۔ "اوئے اٹھ جا کھوتے دے پتر۔ یہ دیکھ کون آیا ہے۔" آبی ایک دم خوش ہو گیا تھا۔ حیدر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا مگر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بچے! بولنا بالکل نہیں ہے۔ بس اٹھ جاؤ۔"

اس نے تیزی سے بوٹ پہنے۔

آبی بھی اپنے بستر کی طرف بڑھا اور بوٹ پہننے لگا "حد ہو گئی۔ یعنی ان کتوں نے ہمیں واقعی باندھ لیا تھا۔" وہ دبی آواز سے بولا۔

بوٹ پہن کر وہ دونوں ہمارے ساتھ باہر آ گئے۔ میں نے ستناجا صاحب کو پھر بانہوں میں لے لیا اور ہم پانچوں اس کمرے سے نکل کر باہر کی طرف لپکے مگر مریم نے ہمیں روک لیا، بولی۔

"تسیں پچھوں دی سمت نکلو۔ ایتھے دو بندے ہر ویلے پہرہ دیندے نیں۔"

"اب تم فکر نہ کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں اور آبی کمرے کا دروازہ کھول کر ایک دم برآمدے میں جا پہنچے۔ دونوں پہرے دار اس وقت گہری نیند میں تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان کے ہتھیار وہیں کہیں رکھے تھے۔ میں نے ایک کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو اس کا پستول میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کا چیمبر کھول کر میں نے دیکھا تو وہ گولیوں سے لبالب بھرا تھا۔ وہ میں نے آبی کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرے آدمی کے پاس ایک خنجر تھا۔ وہ اس نے بستر پر اپنے ساتھ لٹا رکھا تھا۔ اس کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ دونوں کو وہیں چھوڑ کر ہم صحن میں اترے تو معلوم ہوا کہ اڈے کی عمارت تین طرف سے بنی ہوئی تھی اور دروازہ بالکل سامنے تھا۔

مگر جیسے ہی ہم نے وہ دروازہ کھولا، ہمیں ایک جیپ گلی میں رکتی نظر آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر دانی بیٹھا ہوا تھا۔ ستناجا اور مریم کو ہم نے دروازے کے اندر روک دیا۔ اس وقت تک صبح کی روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ آدمی سیاہی سفیدی میں تمیز کر سکتا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ہم دروازے میں ہی رک گئے۔ ہمیں ابھی تک دانی دیکھ نہیں سکا تھا کہ ہم کون ہیں۔ جیپ سے اتر کر وہ دونوں لڑکیوں کو سہارا دے کر آگے بڑھا تو ہمیں جاکھی اور تلنگا نظر آئے۔ وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ چل رہے تھے۔

جیسے ہی وہ ہمارے سامنے آئے، میں نے ایک دم گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا مگر گولی اس کا کچھ بگاڑ سکی تھی۔ میری گولی کے ساتھ ہی آبی نے دو گولی جاکھی پر چلائی اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا بل گر گیا۔ دانی نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے فوراً جیپ کی اوٹ لینا چاہی۔ لڑکیاں خوف زدہ ہو کر جا لگیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دانی کوئی آہنی ہوئے ہے اور یہ بڑی ہی خطرناک بات تھی۔ تلنگا زمین پر گر گیا۔ یوں جیسے وہ بے جان ہو چکا ہو۔ ایسے موقعوں پر پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ اندھا دھند جیپ بڑھا اور اس کی چھت پر جا چڑھا۔ اس طرح کروٹ پر لیٹ کر دانی کو آسانی سے شکار کر سکتا تھا۔ جیسے ہی دانی نظر آیا اس نے دو گولیاں اس پر چلائیں۔ ایک کے سر میں لگی اور دوسری کندھے میں۔ اس وقت میں انجن کے سامنے سے گزر کر دانی تک جا پہنچا تھا۔ کو مزید گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تلنگا وقت تک جیپ کے نیچے گھس چکا تھا اور غیر میں اسے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دانی نیچے گرا تو میں نے کا پیر پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ لرزنے لگا تھا۔ موت میرے ہاتھ سے بندھی تھی۔ پستول دیکھ کر اس جان نکل رہی تھی۔

"چل، ہمارے ساتھ چل خبیث آدمی! چل اندر۔"

میں نے اسے پکڑ کر جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ جا اس گھڑی بے جان کھلونا بن چکا تھا۔ ستناجا، حیدر اور کو میں نے آواز دے کر باہر بلایا۔ گولیوں کی آواز سن کر کے اندر بڑی دبڑ دبڑ ہونے لگی تھی۔ جس سے گھر تینوں تیزی سے ہمارے پاس آ گئے اور دوڑ کر جیپ آ چڑھے۔

ستناجا صاحب میرے ساتھ بیٹھ گئے اور آبی لڑکیوں کو ساتھ لے کر پچھلے حصے میں جا بیٹھا۔ ڈرائیونگ پر بیٹھتے ہی میں نے انجن سٹارٹ کر دیا اور جیپ آگے چل دیا۔ گلی کافی چوڑی تھی۔ مجھے کہیں رکنا نہیں کچھ ہی دیر بعد ہم بڑی سڑک پر جا پہنچے وہاں سے فاصلہ یہی کوئی دو میل ہو گا۔ گلی سے نکلتے وقت میں محسوس کیا کہ دونوں طرف سے آنے والے لوگ خوف دیواروں اور کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے کسی نہ ہوئی کہ وہ کوئی واویلا کرے، یا شور مچا سکے۔

تلنگے کو آبی نے پستول کی زد میں لے رکھا تھا اور ستناجا صاحب میرے پاس بیٹھے کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھیں کہ ان سے رویا بھی نہیں جاتا تھا۔ آبی ان کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور تلنگے کو اس نے دائیں بازو میں دبوچ رکھا تھا۔ وہ ایک ایک کا چہرہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور خود اتنا سنجیدہ ہو رہا تھا جیسے وہاں سب کے چھرا گھونپ دے گا۔

جیپ کچھ ہی دیر بعد گلبرگ جا پہنچی۔ حیدر نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا اور ہم سیدھے برآمدے میں جا پہنچے۔ لڑکیوں کو میں نے حیدر کے حوالے کیا۔ اس نے مریم کو بھی ان کے ساتھ ہی دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ میں آبی اور ستناجا صاحب اب کمرے میں باقی رہ گئے تھے۔

"سردار صاحب! مجھے اب جانے دیں۔ بڑے کام کرنے ہیں مجھے۔ دونوں لڑکیاں مجھے دے دیں۔ میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

"تو چلیں پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی! مگر اب ہو گا کیا؟ اس شکرے اور مظلوم حسین کو تو ہماری کوٹھی کا علم ہے۔"

"آپ بھی یہاں سے نکل جائیں۔ یہی بہتر ہے۔ ہفتہ دس دن کہیں اور گزار لیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پھر یہاں آئیں گے۔ وہ نہ آئے تو پولیس کو یہاں لے آئیں گے۔ گھر کا میں اسی لیے مخالف ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ دانی اور جاکھی کو ہم نے ختم کر دیا ہے۔ ہم زبردست مشکل میں پھنس گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گئے۔ وہ سخت پریشان نظر آتے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں میں ابل رہی تھی۔ چہرہ ان کا بے حد تھکا تھکا سا نظر آتا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ لڑکیاں ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی تھیں ستناجا صاحب کی عزت خطرے میں تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ معاملہ اس حد تک خراب ہو جائے گا اور خود وہ چابک کی ضربوں سے ابھی تک نڈھال ہو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دہشت زدہ لڑکیوں کو مریم اور تلنگے سمیت وہاں سے جیپ میں بٹھا کر گھر چلے گئے۔ ان سے اسٹیئرنگ سنبھالا نہیں جاتا تھا۔ پھر بھی وہ انہیں ساتھ لے کر نکل گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی اس وقت اس قدر ذہنی انتشار میں مبتلا تھے کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ یہ اچھا تھا کہ تلنگے کو آبی نے رسی میں جکڑ دیا تھا۔ ورنہ وہ انہیں راستے میں ہی صاف کر دیتا۔

جب ذرا مطلع صاف ہوا تو آبی بولا۔ "آخر یہ فساد اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جناب سردار گنڈا سنگھ جی! کتنے نفلوں کا ثواب ہوا ہے آپ کو؟"

"میں کیا کرتا آبی! ذرا سوچو تو۔ وہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

"پہلے بھی وہ تم سے کئی کام لے چکے ہیں۔ مگر وہ تمہارے کام پھر بھی نہیں آئے۔ تھانے میں اپنی حیثیت تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے مگر اب تو صورتِ حال بالکل ہی مختلف ہو چکی ہے۔ وہ ہمارے نام بھی بدل چکے ہیں۔"

"اس سے کیا ہونا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ نئی کھال کے اندر تم کیا ہو۔ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں پھر باندھ سکتے ہیں۔ ان پر لعنت بھیج دو جیلانی اور یہ کوٹھی چھوڑ دو۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ٹیلیفون بھی کٹوا دو۔ کوئی اپنا گروہ تو نہیں بنا بیٹھے ہو تم جو تمہاری حفاظت کرے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو آبی! میں اس سارے قصے سے ہی نکل جاؤں گا۔ بس کھانا کھا کر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"گویا وہ تمہیں ناشتہ کرنے دیں گے۔ پاگل ہو تم۔ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ تم ایسے لوگ ستناجا کو کئی اور بھی مل سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر آبی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ حیدر اس وقت باورچی خانے میں ہمارا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ آبی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ میں وہاں سے نکل چلوں۔ دانی اور جاکھی کو قتل کر کے ہم لاہور شہر میں رہ نہیں سکتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کس وقت ہمیں کہاں للکار بیٹھے۔

"کیا خیال ہے۔ ہم الماس کے ہاں نہ چلے جائیں؟"

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ چلو ہم ابھی وہیں جا ٹھہرتے ہیں۔" آبی نے شیشے پر سے پردہ ہٹا کر لان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی باقاعدگی سے سیراب نہ ہونے کی وجہ سے اجڑتا جا رہا تھا۔ گھاس اور پھولوں کی کیاریاں سوکھتی جا رہی تھیں۔ مگر مجھے زندگی فرصت دیتی تو میں ان کی پرورش

کرتا اور حیدر بھی میری مصروفیتوں کی وجہ سے ان دنوں الجھ کر رہ گیا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ستنا جا صاحب تھے، بولے "سردار صاحب!"

"جی میں بول رہا ہوں۔"

"دیکھیں میں پولیس کے دو آدمی بھیج دیتا ہوں۔ وہ آپ کی کوٹھی پر پہرہ دیں گے۔ آپ وہیں ٹھہرے رہیں۔ کہیں اِدھر اُدھر نہ نکل جائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ دانی کے آدمی پھر آپ پر حملہ کریں گے۔" ان کی آواز بہت ہی کمزور تھی۔

"دو سپاہی کیا کر لیں گے جناب! ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔"

"ایسا نہ کریں تو اچھا ہے بابا! ورنہ میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ ابھی ابھی مجھے پتہ چلا ہے کہ آج صبح مرید کے کے قریب کسی نے سعیدالدین، وقار الٰہی اور علی نواز کونائی کو گولی ماردی ہے۔ ان کا ڈرائیور بھی شدید زخمی ہے۔"

"یہ کیسے ہو گیا؟ کچھ سمجھ رہے ہیں آپ میری اس بات کو؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ان کی لاشیں مرید کے تھانے میں پڑی ہیں۔ قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

"آپ کی مراد بر آئی ہے جناب! مبارک ہو۔" میری اس بات کا اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے فون ایک دم بند کر دیا۔

آبی دوسرے ریسیور پہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بڑے ہی زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ کون لوگ تھے بھئی؟ کیسی مبارک باد دے رہے ہو اس آدمی کو؟"

"یہ دوسری پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کے پیچھے بھی انہوں نے کوئی آدمی لگا رکھا ہو گا۔ پتہ نہیں اس ملک کا کیا بنے گا آبی؟"

"پہلے تو اپنی جان کی خیر مناؤ اور یہاں سے نکل چلو۔"

"حیدر نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔ وہ کھا کر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں غسل خانے میں جا گھسا اور غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ میرے زخم بڑی حد تک درست ہو چکے تھے۔ آئینے میں آخری بار جھانک کر میں آبی کے سامنے جا بیٹھا۔ حیدر اس وقت میز پہ ناشتہ رکھ رہا تھا۔

"چشم بد دور! بہت خوبصورت لگ رہے ہو آج"

"میں بہت دنوں بعد نہایا ہوں آبی! تم بھی نہا لو، لباس بدل لو۔ بہت میلے ہو رہے ہو۔"

"ہاں۔ میں بھی یہی کروں گا۔ کچھ نہیں یار زندگی کا سارا رومانس ہی ختم ہو گیا ہے۔ کچھ مزہ نہیں آ رہا ہے۔"

"مجھے بھی اس سرکاری دھندے سے نفرت ہو گئی ہے آبی! میں کوئی خوشی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ جا... مجھے امپورٹ لائسنس دینا چاہتے ہیں۔"

"اس کی امید نہ رکھو جیلانی! یہ سب باتیں بس... ہی ہیں۔"

ناشتہ کرنے کے بعد آبی بھی غسل خانے میں گھسا۔ حیدر سے کہہ کر میں نے ایک نیا جوڑا اس کے لیے غسل خانے میں پہنچا دیا۔

جب آبی باہر نکلا تو وہ بھی تازہ دم نظر آ رہا تھا۔ اس کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی، بولا "تم نے... کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ وہ عورت وہاں نہ ہوتی تو... حشر ہو جاتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"مگر وہ تھی کون یار! کیوں اس نے ہمیں دانی سے چھڑا لیا ہے۔"

"وہ..... وہ دراصل ریٹا کی رشتے دار تھی... معلوم تھا کہ اس سے میرا کیا تعلق تھا۔ گاڑی کے... اسے علم تھا۔"

"تو یہ بات تھی۔ میں بھی کہوں کہ وہ تم پہ کیسے مہربان ہو گئی ہے۔ وہ بڑے انعام کی مستحق تھی... میں اسے کم از کم ایک لاکھ روپیہ دینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ ابھی تو وہ... صاحب کے ہاں جا ٹھہری ہے۔"

"وہ رقم اس تک پہنچا دینا۔ یہ بہت ضروری..."

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ گیٹ پہ لگی گھنٹی... حیدر نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ وہاں چا... اور ایک حوالدار کھڑے ہیں۔ انہیں ستنا جا صاحب... کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا۔ وہ بندوقیں اٹھائے... برآمدے تک آ گئے۔

"یہ کیا قصہ ہے جیلانی! تم نے منع بھی کیا تھا..."

"مگر پھر بھی اس نے یہ آدمی ہماری طرف..." آبی نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آتی۔" یہ کہتا ہوا میں برآمدے میں جا پہنچا۔

"السلام علیکم سردار صاحب! میرا نام عبدالکریم ہے۔ مجھے ستنا جا صاحب نے بھیجا ہے۔"

"وعلیکم السلام ——— تمہیں کس لیے بھیجا ہے انہوں نے۔ ایسی کیا بات ہو گئی ہے یہاں۔"

"یہ تو وہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ حکم ہے کہ میں آپ کی کوٹھی کا پہرہ دوں۔"

"مگر ہم تو یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"مجھے یہ حکم ہے کہ میں آپ کو بھی باہر نہ جانے دوں۔ کیونکہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ آپ کے دشمن آپ کی تلاش میں ہیں۔"

حیرت سے میرے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ حوالدار کا لہجہ بڑا بے تکلف تھا اور تیور اس کے یہی بتا رہے تھے کہ اسے کئی اور باتوں کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

میں تیزی سے کمرے میں جا کر فون کی طرف لپکا۔ جب میں نے ستنا جا صاحب کے نمبر گھمائے تو دوسری طرف سے ان کے کسی ملازم نے فون اٹھایا۔

"میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں۔ مجھے ستنا جا صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"جی وہ تو ہسپتال گئے ہیں۔ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہوا انہیں؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کے سارے جسم پر نیل ابھر آئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں چابک سے مارا ہے۔ بہت بُری حالت تھی ان کی۔ ان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

"کس ہسپتال میں ہیں وہ؟"

"وہ میو ہسپتال میں ہیں۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں معلوم کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ آبی میری باتیں سن رہا تھا، بولا۔

"میرا خیال ہے رات کا چابک اپنا اثر دکھا گیا ہے۔"

"بات تو ایسی ہی لگتی ہے مگر یہ سپاہی یہاں کیا کریں گے؟ ان کی بھی تو بات سنو۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں بھی سب کچھ سن رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ہماری نگرانی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔"

"مگر یہ ہماری توہین ہے آبی! میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بداعتمادی کی علامت ہے۔"

"تم... تم اپنی حیثیت پر غور کرو جیلانی! ستنا جا تم پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہے۔ تمہارے ہاتھ ان کے کئی راز آ چکے ہیں۔ وہ تمہیں کیسے کھلا چھوڑ دے گا؟" آبی کی یہ بات سن کر میں نڈھال سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ستنا جا صاحب سے یہ اُمید نہیں رکھتا تھا۔ انہیں مجھ پر اگر اعتماد ہی نہیں رہ گیا تھا تو پھر تو بنیاد ہی ختم ہو گئی تھی۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ ان پر بھی بھروسہ نہیں کرتے جو ان کے کہنے پر خون بہانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

عبدالکریم نے تین سپاہیوں کو کوٹھی کے اطراف میں پھیلا دیا تھا اور خود ایک سپاہی کے ساتھ برآمدے کی کرسیوں پہ بیٹھ چکا تھا اور اب وہ حیدر سے چائے کے لیے کہہ رہا تھا۔ گویا اس نے وہاں اپنا اڈا جما لیا تھا اور اسے یہ حکم تھا کہ وہ ہمیں بھی کہیں نہیں جانے دے گا۔ یہ عجیب قسم کی پہریداری تھی کہ ہم بھی اس کی تحویل میں آ گئے تھے۔ یہ پابندی مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر برآمدے میں جا پہنچا۔ آبی میرا منشا سمجھ رہا تھا۔ وہ بھی میرے عقب میں آ ٹھہرا۔

"اچھا کریم صاحب! ہم تو ذرا باہر جا رہے ہیں۔ آپ یہاں کا دھیان رکھیں۔ حیدر آپ کے لیے کھانا تیار کر دے گا۔ دراصل ہم ستنا جا کی خبر لینے جا رہے ہیں۔ وہ اسپتال میں داخل ہو گئے ہیں۔"

وہ ایک دم کرسی سے اُٹھ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بادشاہو! ہمیں تو انھوں نے ہی یہاں بھیجا ہے۔ وہ اسپتال کیسے جا پہنچے؟"

"وہ اچانک بیمار ہو گئے۔ میں نے فون پر معلوم کیا ہے۔"

"مگر سردار صاحب! مجھے یہ حکم ہے کہ..."

"تم بھاڑ میں جاؤ۔ میرے ہی گھر میں تم مجھے نظربند کرنا چاہتے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ میری کوٹھی ہے اور مجھے کسی پہرے دار کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ سوچ لیں بادشاہو! مجھے دوسرا حکم بھی ملا ہے کہ اگر آپ میری بات نہ مانیں تو میں زبردستی آپ کو روک لوں۔ ہمارے چار سپاہی گیٹ کے باہر بھی کھڑے ہیں۔"

"یہ کیا بدمعاشی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ یعنی ہم یہاں نظربند ہو کر رہیں گے۔"

"بدمعاشی نہ کہیں بادشاہو! یہ قانون ہے اور مجھے حکم ہے کہ..."

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گیٹ کے باہر سڑک کی دوسری طرف بھی مسلح سپاہی کھڑے تھے اور انھیں خاص مقصد کے لیے وہاں بھیجا گیا تھا، پتہ نہیں ستنا جا صاحب چاہتے کیا تھے؟ کیا میرا کھیل ختم ہو چکا

تھا، جو کام وہ مجھ سے لینا چاہتے تھے وہ اب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ پابندی آخر مجھ پر کس لیے عائد کی گئی تھی۔

"آئیں سردار صاحب! آئیں۔ ان سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" آبی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے کمرے کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی جان خطرے میں ہے سردار صاحب! ہمیں بلا وجہ یہاں نہیں بھیجا گیا ہے۔ جب وہ خطرہ ٹل جائے گا تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے بادشاہو!" عبدالکریم نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میری اسیری کے دن قریب آگئے ہیں۔ ستنا جا صاحب جو کام مجھ سے لینا چاہتے تھے وہ لے چکے تھے مگر اس کے بعد جو حالات سامنے آئے، ان کی وجہ سے وہ مجھ پر مزید بھروسہ کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کسی کی بندوق میں گولی بن جانے کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ آبی بھی سخت پریشان تھا۔ ستنا جا صاحب، ہم سے سب کچھ ہی چھین کر لے گئے تھے۔ وہ لڑکیاں ان کے لیے بھی مصیبت کا سبب بن گئی تھیں۔ ان کے لیے اتنے سارے خون خرابے کی جواب دہی مشکل ہوگئی تھی مگر میرے دروازے پر پولیس بٹھا دینے کا کیا مطلب تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس وقت تین سپاہی کوٹھی کے عقبی حصے میں پھر رہے تھے۔ حوالدار اور اس کا ساتھی برآمدے میں تھے اور چار سپاہی سڑک پر کھڑے تھے۔ ہمارے لیے حالات بڑے ہی جاں سوز ہوگئے تھے۔ آبی بھی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ہمارے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ ثواب اور انعام کے بجائے میں ایک نئے عذاب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کہاں تو وہ میرے لیے کسی امپورٹ لائسنس کی بات کرتے تھے اور کہاں یہ عالم تھا کہ انھوں نے مجھ پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ میرے دل کو پنکھا لگ گیا تھا۔ میں فوری طور پر ستنا جا صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ بھی کوٹھی پر موجود نہیں تھے۔ کوڑے کی ضربوں نے بالآخر انھیں بستر پر ڈال دیا تھا۔ پتہ نہیں انھیں ہوا کیا تھا۔

اچانک آبی اپنی سوچ کی گرہ سے باہر نکلا اور دروازے میں پہنچ کر بولا۔

"حیدر ان کے لیے کھانا پکا ڈ بھئی! یہ ہمارے مہمان ہیں کیوں حوالدار صاحب؟"

"ہم تو یہی کہہ رہے ہیں بادشاہو! مگر آپ کچھ اور ہی سوچتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم حیدر کو بازار بھیج کر آپ کے لیے مرغا وغیرہ منگوا لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔ ہمارا سپاہی اس کے ساتھ جائے گا۔ جیپ ہے ہمارے پاس۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اوئے حیدر! ادھر آ ذرا..." آبی نے حیدر کو آواز دی۔ وہ اس وقت بھی باورچی خانے میں گھسا تھا۔ فوراً باہر آگیا تو آبی نے اسے دو سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ "جا یار ان کے لیے مرغا لے آ۔ میرا خیال ہے پانچ سیر کافی رہے گا۔ آ ادھر تھیلا ساتھ لے لو۔ کوئی اور چیز تو نہیں منگوانی ہے سردار صاحب؟"

"یار میرے لیے سگریٹ بھی لے آنا اور یہاں یہ سب چیزیں بھی لے آؤ میں تمھیں لکھ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں حیدر کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

"دیکھ حیدر! ان کے کھانے میں ڈالنے کے لیے یہ دوا بھی لے آنا، سمجھے۔ ان سالوں نے ہمیں پاگل کر دیا ہے۔" میں نے حیدر سے دبی زبان میں کہا اور کاغذ کا پرزہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"جی بہت بہتر۔ یہ پرچی مجھے دے دیں۔" اپنی ضرورت کی اور چیزیں بھی میں نے اس میں لکھ دی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پلسیے بہت بڑے پیٹو ہوتے ہیں۔

اگر میں ان کا گلا دباتا تو وہ اتنے سارے لوگ تھے کہ ان سے نمٹنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

دوپہر کا اس وقت ایک بج رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ حیدر اس وقت تک بازار سے تمام چیزیں لا کر مہمانوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ ستنا جا صاحب کی کوٹھی سے کوئی آدمی بول رہا تھا۔

"میں ستنا جا صاحب کی کوٹھی سے انسپکٹر ارشد بول رہا ہوں۔ یہاں عبدالکریم ہوں گے، ان سے بات کروا دیں۔"

"اس کو بلائیں گر دیزی صاحب! اس مصیبت کو..." میں نے آبی سے کہا۔

"ادھر آؤ حوالدار جی! آپ کا فون ہے۔"

عبدالکریم اندر آیا تو معلوم ہوا کہ اسے چار آدمیوں کو واپس بلا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

"چلو اچھا ہے۔ ان چار آدمیوں کی جان تو چھوٹی۔ جاؤ ان سے کہہ دو کہ وہ چھٹی کریں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے ان کی طرف چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں سپاہی جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ کھانا اس وقت تک تیار ہو چکا تھا۔ حیدر نے ردّ بوری وہ دوائی ملا دی جس سے ان کا ذائقہ ذرا سا نمکین ہو گیا تھا۔ حوالدار اور اس کے ساتھی جم کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں اور آبی ان کی خدمت میں جُت گئے۔ حیدر کو ہم نے جان بوجھ کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

"آپ بھی بیٹھیں نا بادشاہو!"

"آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔"

میرے بادشاہ! آپ ہماری راکھی کر رہے ہیں۔" آبی نے پلیٹیں ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ میں گلاسوں میں پانی بھرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوائی کوئی دس منٹ میں ہی اپنا اثر دکھانے لگتی ہے بات صرف چند ہی لمحوں کی تھی۔ ہم ان کی قید سے آزاد ہونے ہی والے تھے۔ بڑے آئے تھے ہماری نگرانی کے لیے۔ ایک ایک کی صورت دیکھ کر مجھے طیش آتا تھا۔ ایسی منحوس شکلیں تھیں ان کی کہ میرا جی چاہتا تھا، خود میں ان کا گلا دبا دوں۔ مگر اصل فساد کی جڑ تو ستنا جا صاحب تھے۔ آبی ٹھیک ہی کہتا تھا کہ میں چیتے پر سوار ہو گیا ہوں۔ اب کبھی نیچے نہیں اُتر سکوں گا۔ ان پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔

مرغے کی ٹانگیں ان کے سامنے تھیں اور وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔

دوا کا ذائقہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بے دریغ روٹیاں الٹتے رہے۔ میرا خیال ہے ان میں سے ہر ایک نے چھ چھ روٹیاں تو ضرور ہی کھائی ہوں گی۔ مرغا بھی ان کے سامنے بہت زیادہ تھا۔ ہم نے تو دس بارہ آدمیوں کا کھانا پکایا تھا مگر اب وہ صرف پانچ ہی رہ گئے تھے۔ ابھی کھانا اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ عبدالکریم کا چہرہ ایک دم پیلا ہونے لگا۔ یہی حال دوسروں کا ہوا مگر وہ کھانے سے ہاتھ پھر بھی نہیں کھینچ رہے تھے۔

ہم ان کو برابر پلیٹیں بھر بھر کر دے رہے تھے۔ ساتویں روٹی ان میں سے بہر حال کوئی بھی نہ کھا سکا۔ ان پر غشی طاری ہونے لگی اور وہ سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ابھی وہ اصل بات سمجھ بھی نہیں سکے تھے کہ ان میں سے تین آدمی بے ہوش ہو گئے۔ سب سے پہلے عبدالکریم نڈھال ہوا۔ اس کے بعد باقی سپاہی۔ آبی نے ان کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں مگر کسی کے پاس بھی پانچ چھ روپوں سے زیادہ کی رقم نہیں نکلی۔ سب کے سب پھکڑ تھے۔

"میرا خیال تھا کہ ان کے پاس کچھ نہ کچھ رقم ضرور ہو گی مگر یہ تو بھکاری ہیں۔"

"چل اب یہاں سے نکل چل آبی! ایک بار میں ستنا جا سے مل لوں پھر میں اس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔"

"کہاں ہوگا وہ...؟"

"میو اسپتال میں پڑا ہے۔ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے آبی! پھٹے جوتے کی طرح اس نے مجھے اتار پھینکا ہے۔ اوئے حیدر! تم ان کا دھیان رکھو۔ ہو سکے تو آدھ گھنٹے بعد ستنا جا صاحب کی کوٹھی فون کر دینا کہ یہ بے ہوش ہو چکے ہیں۔"

"جی بہت بہتر۔ میں یہی کہوں گا کہ یہ کھانا کھاتے میں بے ہوش ہو گئے مگر آپ کے بارے میں انھیں کیا بتاؤں؟"

"کہہ دینا کہ ہم پہلے ہی یہاں سے نکل چکے تھے۔"

"جی ٹھیک ہے۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم کیا ہے۔ یہ دو ہزار روپے رکھ لو۔ تمھیں کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کوٹھی کا دھیان رکھو۔" پانچوں سپاہی اس وقت تک کرسیوں سے کھسک کر فرش پر گر چکے تھے۔

"ان کو اسی طرح پڑا رہنے دو۔ اس دوا سے آدمی مرتا بالکل نہیں ہے۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی ضرورت کی چیزیں بریف کیس میں بند کر لیں۔ میں اور آبی وہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ کسی ایسی جگہ جہاں ہم پھر ستنا جا صاحب کا نام نہ سن سکیں۔ بہت غلامی کر لی تھی میں نے ان کی اور اس کا میں خمیازہ بھی بھگت چکا تھا۔ وہ کسی کے دوست نہیں تھے۔ صرف اپنے مطلب کے یار تھے۔ ان سے دوستی ہو ہی نہیں سکتی تھی اور کچھ نہ ہو سکا تو ہماری حفاظت کے بہانے اس نے ہم پر پولیس مسلط کر دی تاکہ ہم بندھ کر بیٹھے رہیں۔ وہ کوٹھی میرے لیے قید خانہ بن گئی تھی۔ ایک نیا پنجرہ جو دانی کے پنجرے سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ ستنا جا صاحب نے وہ کوٹھی مجھے اسی لیے خریدنے پر مجبور کیا تھا کہ میں ان کے سامنے رہ سکوں گا اور ذرا سی بھی چوں چراں نہ کر سکوں گا مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ میں ان پابندیوں کا عادی نہیں ہوں۔ میں تو جیل میں ٹک کر نہیں بیٹھا۔ زندگی تو میرے لیے ایک رقصاں کھیل تھی جو مجھے چاروں طرف گھماتی رہتی تھی۔ میں بھلا کیسے وہاں بندھ کر بیٹھ رہتا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ اب کی بار میں سیدھا امریکہ نکل جاؤں گا۔ اس دشمن ادریالیہ کو میں نے نہیں مارا تو گویا کچھ کیا ہی نہیں۔ وہ مجھے بدترین اذیتوں میں مبتلا کر کے خود مزے کر رہے تھے ان کا تو قطرہ قطرہ کر کے خون نکال لوں گا میں۔

"اب کیا ارادے ہیں سردار صاحب؟"

"تو تو کم سے کم مجھے سردار صاحب نہ کہا کر۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس نام پر۔ میں تیرے لیے صرف غلام جیلانی ہوں آبی! صرف غلام جیلانی...!"

ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر آئی۔ بولا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے بھائی! ہم... ہم اپنی ذات کو کیسے بدل سکتے ہیں اپنے حلقے سے کبھی بھی کوئی شخص باہر نہیں نکل سکا ہے۔ یہ قسمت کا حصار ہے۔ اسے توڑنا بہت مشکل ہے۔"

حیدر اس وقت برآمدے میں سے اندر آرہا تھا۔

"اچھا حیدر! ہم جا رہے ہیں اور پتہ نہیں ہمارا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ بس تم اس کوٹھی کی حفاظت کرتے رہو۔" میں نے حیدر سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں سردار صاحب! میں تو اس کوٹھی کا غلام ہوں۔"

میرے لیے سارے ہی دن ایک جیسے ہیں۔"

ابھی ہم اس سے رخصت ہو کر برآمدے میں سے نکل کر لان تک پہنچے ہی تھے کہ آبی ایک دم رُک گیا اور کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک آدمی دیوار پھاند کر اندر آگیا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اس کی شکل وصورت ہمارے لیے بالکل اجنبی تھی اور وہ ہاتھ میں ہلکی سی اسٹین گن اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کو دیکھ کر ہم ٹھٹھر کر رہ گئے مگر ابھی وہ ہمیں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس کے پیچھے دو اور آدمی دیوار پھاند کر اندر آگئے۔ تو... تو... اس کا مطلب یہ تھا کہ ستنا جا صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، ہماری جان واقعی سخت خطرے میں تھی اور وہ خطرہ ہمارے سروں پر منڈلانے لگا تھا۔ اس حال میں کہ ہمارے محافظ اندر بے ہوش پڑے تھے۔ وہ سپاہی اسی لیے کوٹھی کی عقبی دیوار کے پاس پھرتے رہے تھے، کہ انھیں خطرہ اگر کوئی تھا تو وہیں سے تھا۔

ہم تیزی سے برآمدے کی طرف لوٹ گئے۔ پناہ کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں تھی۔ پستول اگرچہ ہمارے پاس موجود تھے اور وہ گولیوں سے لبالب بھرے تھے پھر بھی ان سے بچنے کے لیے ہمیں کسی اوٹ کی، کسی آڑ کی ضرورت تھی اور وہ تینوں کے تینوں مشین گنوں سے مسلح تھے۔

آبی نے مجھے کھینچ کر کوٹھی کی غلام گردش سے گزارا۔ پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

"یہ دانی کے خون کا بدلہ لینے آئے ہیں جیلانی! ان کے تیور مجھے بہت خطرناک لگتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا جس میں ہم نے لڑکیوں کو ٹھہرایا تھا۔ میں اب انھیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ پھیل کر کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ کوٹھی میں دانی کا بھتیجا ڈگی پھر رہا تھا۔ اسے میں نے بادامی باغ کے لاری اڈے پر اس کے دشمنوں سے بچایا تھا اور یہ اسی کی وجہ تھی کہ اس روز دانی نے مجھ پہ ہاتھ نہیں ڈالا تھا مگر اب وہ اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے مجھ پر خود چڑھ دوڑا تھا مگر اس سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس کا دوسرا ساتھی کوئی اور نہیں بلکہ گل خان تھا۔ وہ شیرا ایسے لمبے لمبے پنجوں والا آدمی جو بہن جی کے گروہ کا سرغنہ تھا اور وہ اب ڈگی کے ساتھ مل کر مجھے تباہ کرنے آگیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں پاگل ہو گیا۔ میرا جی چاہا میں ایک دم اس کے سامنے جا پہنچوں اور اس کی آنکھوں کو بوسہ دوں کہ ان آنکھوں نے ایک دن آسیہ کو دیکھا تھا اور وہ بہن جی کا آدمی تھا۔

وہ ابھی برآمدے سے دور ہی تھے کہ میں لپک کر راہداری میں بنی چھوٹی سی سیڑھی کھڑی کر کے کوٹھی کی چھت پر جا پہنچا۔ آبی بھی میرے پیچھے تھا۔ جب ہم نے چھت پر قدم رکھا تو آبی بولا۔ "اب خیر ہے۔ ہم ان سے اب زیادہ بہتر طریقے سے لڑ سکتے ہیں۔"

"تم نے پہچانا نہیں۔ یہ تیسرا آدمی بہن جی کا کارندہ گل خان ہے۔ وہ پتہ نہیں ڈگی کے ساتھ کیسے آگیا۔"

"یہ ڈگی کون ہے؟"

"یہ دانی کا بھتیجا ہے۔ اس کا جگا ٹیکس یہی وصول کرتا ہے۔"

"یہ وہی تو نہیں ہے جس سے تم لاری اڈے پر ملے تھے؟"

"ہاں۔ اس کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں مگر یہ گل خان ادھر کیسے آگیا۔"

اتنے میں وہ تینوں آدمی راہداری میں آپہنچے۔ کوٹھی اندر بالکل سنسان دکھائی دے رہی تھی پھر بھی اس کے دو دروازے کھلے تھے۔ وہ کمرہ جس میں سپاہی بے ہوش پڑے تھے، بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ اس کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ میرا خیال ہے حیدر اس وقت بھی باورچی خانے میں گھسا ہوا تھا۔ اس کی جرأت کی میں داد دیتا ہوں۔ وہ سپاہیوں کے بے ہوش ہونے پر بھی پریشان نہیں ہوا تھا۔

ڈگی، گل خان اور اس کا تیسرا ساتھی راہداری میں سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کے کمرے تک جا پہنچے، اب وہ ایسے مقام پر تھے کہ ہم دونوں کی گولیاں ان کے جسم سے پار ہو سکتی تھیں۔ آبی سے صبر نہیں ہو سکا۔ ڈگی جیسے ہی اس کی زد میں آیا اس نے گولی اس کی کلائی میں سے گزار دی۔ دھماکا "تنا آنا فانا" ہوا کہ کوٹھی لرز اٹھی۔ اسٹین گن ڈگی کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا پڑی اور وہ ہاتھ کو رانوں میں دباتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو گل خان! میں تمھیں پہچان گیا۔" میں نے اپنی آواز کا تمام تر تحکم ان کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔ وہ لرز کر رہ گئے۔ چھپنے کے لیے ان کے پاس کوئی جگہ نہیں تھی۔ جہاں سپاہی بے ہوش پڑے تھے وہاں پہنچنے کے لیے بھی انھیں اوٹ کی ضرورت تھی مگر ہم ان کے سر پر کھڑے تھے۔

"سُنا نہیں تم نے گل خان! ہتھیار پھینک دو۔ اب تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"تم... تم مجھے کیسے پہچانتے ہو؟" گل خان نے ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"تم بہن جی کے پاس سے آئے ہو نا۔ مجھے نہیں جانتے میں غلام جیلانی ہوں۔" اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اپنی گن الگ پھینک دی۔ اب وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کی آخری گھڑی قریب آپہنچی ہو۔

آبی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا اور بولا "تم سب ہتھیاروں سے الگ ہو جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں تان رکھا تھا اور اپنے بے خطا نشانے کی دھاک وہ ان پر پہلے ہی بٹھا چکا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر اس نے تینوں ہتھیار پاؤں کی ٹھوکر سے یکجا کیے اور ان کو دور پھینک کر بولا۔ "تم نیچے آجاؤ یہاں۔ میرا خیال ہے یہ مجھے بھی پہچانتا ہے۔"

"آپ آبی صاحب ہیں نا؟" گل خان بولا۔

"ہاں۔ تم سے فرید پور میں ملاقات ہوئی تھی مگر تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟"

"یہ... یہ میری غلطی تھی آبی صاحب! مجھے نہیں پتہ تھا کہ دانی..."

"ہاں۔ اس کے کرتوت ہی ایسے تھے مگر تم لاہور کب آئے؟" آبی نے حیرت زدہ ڈگی کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ بھی گل خان اور آبی کی باتوں پر ششدر رہ گیا تھا۔ بڑے غضب ناک انداز میں بولا۔ "کتے! تم ان سے ملے ہوئے تھے۔ ان کو بچانے آئے تھے تم؟"

"بک نئیں اوئے ڈگی! یہ میرے لیے بڑے محترم لوگ ہیں۔ میں ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ تو اپنی جان کی خیر منا۔ تو بھی سن لے اوئے قادر! میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اتنے میں میں بھی ان کے پاس جا پہنچا اور تینوں ہتھیار اٹھا کر میں نے بازو میں ڈال لیے۔

باتیں پھر کر لینا۔ پہلے اس ڈگی کا علاج کرو۔ زخم زیادہ گہرا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ڈگی کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس میں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اتنے میں حیدر راہداری میں نمودار ہوا۔ وہ اس گولی کی آواز سے پریشان ہو کر کسی جگہ دبک کر بیٹھ گیا تھا۔

"اوئے حیدر! اِدھر آ اور اس مصیبت کو لے جا۔ اس کی مرہم پٹی کر...؟"

"تم جاؤ قادر، ڈگی کے ساتھ اور بھول جاؤ کہ تم ان سے انتقام بھی لے سکتے ہو۔" گل خان نے بڑی کڑک دار آواز میں انھیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ گل خان نے ڈگی کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا تو قادر بھی اس کا ساتھ... دینے لگا۔

ان دونوں کو ہم نے الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ اس طرح کہ آبی پستول تان کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ گل خان کو میں نے دوسرے کمرے میں بٹھا لیا۔ اس سے میں بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اب کھل کر مسکرانے لگا تھا۔ بولا "خدا کا شکر ہے کوئی

غلط بات نہیں ہوگئی۔ ورنہ میں کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔"

"اس دانی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"وہ۔ وہ میرا استاد تھا جیلانی صاحب! میں پہلے اس کے گروہ میں شامل تھا مگر پھر میں میانوالی کی طرف نکل گیا۔ مسولینی کے ساتھ۔"

"وہ کہاں ہے آج کل؟"

"وہ بہن جی کے پاس ہے۔"

"کیا کر رہا ہے وہ وہاں؟"

"مزے کر رہا ہے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں ہے کہ بہن جی نے مکرم علی گورایا کی حویلی پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"وہ کس طرح بھئی...؟"

"دراصل وہ جو تجمل حسین ہے نا جو آپ کے ساتھ قید تھا۔"

"ہاں ہاں۔ وہ جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو چکا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی۔ آپ کو پتہ ہے اس کی شکل گورایا سے کتنی ملتی جلتی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اس کی شکل واقعی گورائے سے بہت ملتی تھی۔"

"اس کو بہن جی نے قندھار لے جا کر مکرم علی گورایا بنا دیا ہے۔ اب وہ وہاں بہن جی کے اشاروں پر ناچ رہا ہے اور بہن جی حویلی کی مالک بن کر بیٹھ گئی ہیں۔"

"کمال ہے۔ مجھے تو اس کا علم ہی نہیں تھا۔ میں اپنی بہن آسیہ کی تلاش میں ماں جی کے پاس بھی گیا تھا مگر وہ مجھے وہاں بھی نہیں ملی۔"

یہ بات تو آپ کو بہن جی ہی بتا سکتی ہیں کہ آسیہ اس وقت کہاں ہوگی مگر اس کو میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

"تم ڈگی کے ساتھ کیسے یہاں آگئے؟"

"دراصل آسیہ کا بچہ اس شب خیر نے غائب کر دیا ہے۔ میں اس کی تلاش میں یہاں آیا تھا مگر وہ ابھی تک مجھے نہیں ملی۔ ڈگی سے روز میری ملاقات ہوتی ہے۔ آج صبح اس نے مجھے بتایا کہ کسی نے دانی کو ادر جاکھی کو مار دیا ہے۔ اس پر میں بھی بپھر گیا اور اس کے ساتھ چل نکلا۔ مگر شکر ہے مجھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوا ورنہ بہت خرابی پیدا ہو جاتی۔ میں بہن جی کو کبھی مُنہ نہ دکھا سکتا۔"

"ویسے ہمیں پتہ تھا کہ دانی کے آدمی یہاں حملہ ضرور کریں گے۔ یہ پولیس یہاں پہرے کے لیے آئی تھی مگر یہ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو گئے۔"

"کوئی چیز کھلا دی ہوگی کسی نے۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں ان کا یہاں آنا پسند نہیں تھا۔ اس ڈگی سے کہو یہ یہاں سے چلا جائے۔"

"ان دونوں کو کچھ دنوں کے لیے باندھ کر رکھیں۔ ورنہ... کو آرام نہیں لینے دیں گے۔"

"میں انھیں گرفتار کروا دیتا ہوں۔ یہ تو کچھ بھی مشکل... ہے۔ تیری دعا سے پولیس اپنی داس ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ آپ کی سال چھ مہینے کے لیے ان... جان بچی رہے گی۔ شہر میں دانی کے قتل کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔"

"چرچا تو ہوگا ہی۔ کوئی میرا نام تو نہیں لیتا؟"

"نہیں۔ کسی کو اصل بات کا پتہ نہیں ہے۔"

اتنے میں آبی کے کہنے پر حیدر نے کسی ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ ہم کمرے میں باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر برآمدے میں آ پہنچا۔ مجھے حیرت تھی کہ ڈگی اور قادر کی موجودگی میں انھوں نے ڈاکٹر کیسے بلا لیا مگر معلوم ہوا کہ آبی نے ان دونوں کی مشکیں کس کر... اسٹور روم میں ڈال دیا تھا اور یہ اچھی بات تھی ورنہ ہم ان سے... کہ ان سپاہیوں سے؟

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر نے آبی اور حیدر سے کیا پوچھا... نے کیا جواب دیا۔ میرا خیال ہے حیدر کا وہ پرانا واقف تھا۔ اسی... نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ بلکہ سپاہیوں کو اس نے گاڑی میں ڈالا... حیدر کو ساتھ لے کر اسی وقت باہر نکل گیا۔ شاید سپاہیوں کی حالت... اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

ان کے نکلتے ہی آبی میرے پاس آگیا۔ بولا۔ "ڈاکٹر انھیں... کلینک میں لے گیا ہے۔ حیدر کو وہ جانتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ان کی... ٹھیک نہیں ہے۔"

"یار کہیں دوا اس نے زیادہ تو نہیں ملا دی تھی آٹے میں؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ روٹیاں بھی ساتھ لے گیا۔"

"حیدر نے وجہ کیا بتائی ہے؟"

"اس نے کہا، مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"یہ اچھا ہے کہ وہ شفا بار کلینک میں گئے ہیں۔ حیدر... نمٹ لے گا۔ بیٹھو تم ادھر۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہمیں گل خان ادھر... ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ آسیہ کا بچہ اس شب خیر نے غائب...

"اور وہ خود کہاں ہے؟"

"اس کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے اور یہ بچے کی تلاش میں... آیا تھا۔"

"کہ ہمارے تعاقب میں چل نکلا۔" آبی نے... ہوئے کہا۔

"ہم تو فالتو فنڈ میں ہی مارے گئے تھے اس نے... اسے نہیں پتہ تھا کہ یہ کن لوگوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے تم نے؟"

"پہلے تو ہم بہن جی سے ملیں گے پھر اصل بات کا پتہ چلے گا۔ کیوں گل خان اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"میں بس تنہا ہی آیا ہوں۔ میرا خیال تھا میں شب خیر سے مل کر بچے کی منہ مانگی قیمت اسے دے دوں گا مگر وہ ملی ہی نہیں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ شب خیر کو بھی ہم تلاش کر لیں گے۔ تم ہمارے ساتھ قندھار چلنے کی تیاری کرو۔"

"میں تو تیار ہی ہوں۔ آج ہی چل دو۔ میرا کیا ہے۔"

"تم اب پہلے ستنا جا صاحب سے مل لو جیلانی! پھر ہم میانوالی اطمینان سے جا سکتے ہیں۔"

"تو چلو پھر ہم ابھی ستنا جا صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی بیمار کیوں نہ ہوں۔"

"مجھے کیا حکم ہے پھر؟" گل خان نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم اکیلے ہی اسپتال چلے جاؤ، میں یہاں ٹھہرتا ہوں گل خان کے پاس۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ تو پھر میں چلا۔" یہ کہہ کر میں اسی وقت کوٹھی سے باہر آگیا۔ جب میں اسپتال پہنچا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ انکوائری سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ستنا جا صاحب کو گورا وارڈ میں رکھا گیا ہے۔

انھیں دل کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا مگر اب وہ بڑی حد تک سنبھل گئے ہیں۔

بالآخر میں پوچھتے پوچھتے ان کے کمرے تک جا پہنچا۔ دروازے پر دو سپاہی کھڑے تھے اور اندر ستنا جا صاحب اس وقت تنہا تھے۔ ان کی بیگم واپس جا چکی تھیں۔

جب میں دروازہ کھول کر کمرے میں پہنچا تو وہ اس وقت سیب کھا رہے تھے۔ کسی نے انھیں بتا دیا ہوگا کہ سیب مفرحِ قلب ہوتا ہے ورنہ وہ اتنی رغبت سے پھل نہیں کھاتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بستر سے اٹھ گئے اور پاؤں میں سلیپر پھنسا کر میری طرف بڑھے مگر میں نے انھیں آگے بڑھ کر روک دیا۔

"آپ آرام سے بیٹھیں ستنا جا صاحب! آپ یہاں کیسے آپہنچے؟ یہ جگہ تو آپ کے لیے نہیں تھی۔"

"کیا پوچھتے ہیں سردار صاحب! اس لنگاہی کے معاملے نے میرے اعصاب کچل دیے ہیں۔"

"آخر ہوا کیا تھا؟ میں بھی تو کچھ سنوں۔"

وہ ایک سیب میری طرف بڑھا کر بولے۔ "آپ بھی کھائیں سردار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکیاں میرے لیے اتنا بڑا پرابلم بن جائیں گی۔ دانی نے جب گل محمد کے کوارٹر پر رات کو حملہ کیا تو اس وقت اس گل محمد نے اپنے یاروں کو بھی وہاں بُلا رکھا تھا۔ لڑکیاں یہ بتاتی ہیں کہ ان تینوں نے ان کی عزت لوٹ لی۔ وہ یہی کہتی ہیں۔ یہی بات انھوں نے دانی سے کہہ دی۔ اس پر اس خبیث نے گل محمد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو وہیں گولی مار دی۔ یہ بہت بڑی قیمت ہے سردار صاحب جو ہم سے لی گئی۔ میرا بُرا ہو۔ میں نے دانی کے تشدد سے عاجز آکر گل محمد کا پتہ اسے بتا دیا۔ جب دانی واپس آیا تو اس کا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے مگر فائدہ کیا ہوا؟ ان تمام باتوں سے میں نے بڑے صاحب کو آگاہ کیا تو وہ مجھ پر برسنے لگے۔ بہت ناراض ہیں وہ مجھ سے۔ بس یہی وجہ ہے کہ مجھے دل کا دورہ پڑ گیا اور میں یہاں آ لیٹا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ستنا جا صاحب! تین آدمی اور ہلاک ہو گئے۔"

"ہاں۔ اُن کے قتل کا مجھے بہت افسوس ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دانی کے کچھ آدمی آپ پر بھی حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اور زیادہ خطرناک بات تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے، اسی لیے میں نے وہ سپاہی آپ کی طرف بھیج دیے۔ وہ لوگ آپ کی طرف تو نہیں آئے تھے؟"

"جی ہاں، آئے تھے۔" یہ کہہ کر میں نے انھیں ساری تفصیل بتا دی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ سارا قصہ ہی غلط ہو گیا۔ لڑکیاں بھی برباد ہو گئیں اور حسین لنگاہی بھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔"

"کیوں؟ کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہ واقعی پاگل ہو چکا ہے بھئی کسی کو وہ پہچانتا بھی نہیں ہے۔ بازاروں میں نکل جاتا ہے۔ پتہ نہیں لوگوں سے کیا کچھ کہتا پھرتا ہے۔ میں تو سردار صاحب اپنے ضمیر کا مجرم بن کر رہ گیا ہوں۔ بڑے صاحب کو بھی میں نے ناراض کر لیا۔ وہ... وہ آپ کا بھی نام سُننا پسند نہیں کرتے ہیں اب۔"

"حالانکہ یہ سب کچھ آپ نے انہی کے مشورے سے کیا ہے۔"

"تجویز میری ہی تھی۔ بڑی بے دلی سے انھوں نے ہاں کہی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ صورتِ حال اتنی خوفناک ہو جائے گی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے جھٹکا زیادہ شدید نہیں تھا۔ ورنہ تو میرا دل مجھے لے ڈوبا تھا۔" ستنا جا صاحب سے نظر اونچی نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ وہ بہت ہی کبیدہ خاطر ہو رہے تھے۔ بولے "میں کس کس بات کا جواب دوں گا خدا کو اور بڑے صاحب کو اور اب آپ سناتے ہیں کہ پانچ سپاہی وہاں بے ہوش ہو گئے ہیں۔"

"ہاں۔ ان کا علاج ہو جائے گا۔ ان کی فکر نہ کریں۔ مجھے معلوم ہے وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"خدا ہی خیر کرے۔ مجھے یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں

کون کس وقت اس کمرے میں گھس کر مجھے گولی مار دے۔ اسی لیے یہ دو سپاہی میں نے یہاں بٹھا رکھے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ دشمن تو آخر دشمن ہوتا ہے۔"

"واقعی آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بارے میں بھی آپ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔"

ان کے آنسو بہ نکلے۔ جنہیں انھوں نے فوراً ہی میز کی چادر سے پونچھ ڈالا مگر پھر بھی وہ خود کو روک نہ سکے۔ اس روز وہ واقعی اپنے گناہوں پر بہت پشیمان تھے۔ اتنے سارے لوگ ان کی وجہ سے تہ تیغ ہو گئے تھے۔ محض اس لیے کہ بڑے صاحب کی کامیابی یقینی ہو جائے۔ وہ سارے ہی راستے اسی محل کی طرف جاتے تھے مگر ہر قدم دوسروں کے لہو میں ڈوب ڈوب جاتا تھا اور یہی بات اب ستناجا صاحب کو پریشان کر رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں خاموش کرایا ورنہ وہ روتے ہی جا رہے تھے۔ جب ذرا ان کا گریہ تھما تو بولے۔

"بس... شاید نوکری سے بھی نکال دیا جاؤں۔ بڑے صاحب کا خیال ہے کہ میں ان کی بے عزتی کا سبب بن رہا ہوں یعنی یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں...."

"دفع کریں۔ یہ سارا معاملہ ہی غلط ہو گیا ہے۔ یہ بتائیں کہ وہ لڑکیاں اب کہاں ہیں؟"

"وہ میرے گھر میں ہیں۔ میں انہیں جلدی ہی واپس کر دوں گا۔ اگر لنگا ہی پاگل نہ ہو جاتا تو اسے خود بلا کر اس کی امانت اسے واپس کر دیتا مگر اب میں کسی ذریعے سے انہیں وزیر آباد بھیج دوں گا۔"

"اور وہ جو ڈُگی اور قادر میرے گھر میں ہیں۔ میں ان کا کیا کروں؟"

"میرا خیال ہے انہیں گرفتار کروا دیں۔ میں ابھی تھانے فون کر دیتا ہوں۔ وہ انہیں آ کر لے جائیں گے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ ان دونوں کو سال چھ مہینے کے لیے قید کروا دیں۔ وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک تو وہ کیا ہوں گے۔ جیل سے نئے نئے کرتب سیکھ کر نکلیں گے۔ البتہ آپ کی جان بچی رہے گی۔"

"آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ بڑے صاحب آپ سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی دھمکی دے رہے ہوں گے آپ کو۔"

"نہیں جی! وہ بہت سنجیدہ تھے۔ اتنا سنجیدہ تو میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، کر دکھاتے ہیں۔" ستناجا صاحب کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے تھے۔

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے ستناجا صاحب مجھے یہ بتائیں کہ جنجوعہ اور کوناری کا کیا قصہ ہے ان کے پیچھے کون لگا تھا؟"

"وہ بات میرے لیے ایک الگ مصیبت بن گئی ہے۔ ان کے پیچھے میں نے جیل سے ایک آدمی لگا رکھا تھا۔ جو ہے اس کا۔ اس اللہ کے بندے نے ان کو ایک ہی جگہ کر دیا ہے حالانکہ میں نے اسے کہا تھا کہ ان کی موت الگ الگ موقعوں پر ہونی چاہیے۔ اگر وہ کسی حادثے میں مرتے تو بات تھی۔ خدا ہی میرے گناہ معاف کرے۔ میں نے ان پر ظلم کیا ہے سردار صاحب! خدا کو میں کیا جواب دوں گا" کہہ کر وہ پھر چادر میں منہ چھپا کر رونے لگے۔

"اس کام کے لیے تو بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے ستناجا صاحب! آپ کا یہ رونا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"یہ دل کا دورہ مجھے مار بھی سکتا ہے۔ آدمی کی ہی کیا ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ یہاں ہی پڑا رہ جاتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ کس لیے کیا ہے۔ لوگ ہم پر نام دھریں گے ہم کس کس کو جواب دے سکیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل غلط ہوا ہے۔"

"لعنت بھیجیں اس سارے قصے پر ستناجا صاحب! جس کی موت آتی ہے، وہ مر جاتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوتا ہے۔ قتلِ عمد کا کوئی جواز نہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ویلیم کی دو گولیاں اٹھا کر منہ میں رکھ لیں پانی کا گلاس لینے کے لیے اٹھنے لگے مگر میں نے انہیں روک دیا اور خود اٹھ کر انہیں پانی دے دیا۔

"آپ کی مہربانی ہے سردار صاحب مجھے.... میرے جسم پر اتنے نیل پڑ چکے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ ہو سکتا ہے یہ دل کا عارضہ مجھے اسی وجہ سے ہو گیا ہو۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کسی صدمے نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ دانی کے چابک نے مجھے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ گل محمد کا پتہ ورنہ میں اسے نہ دیتا۔"

"دفع کریں اس قصے کو۔ یہ سزا جزا کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہاں جائیں گے تو بھگت لیں گے۔ اپنے دل کو مطمئن رہنے دیں۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں آج جا رہا ہوں۔"

"وہ کس لیے؟"

"مجھے پتہ چلا ہے کہ آسیہ اُدھر ہی کہیں بیٹھی ہے۔ اس کو ڈھونڈنا بہت ضروری ہے۔ میں تو اسی کے لیے ہی اس راہ پر چل نکلا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں اعتراض تو نہیں کر سکتا۔ آپ وہاں سے ہو آئیں مگر آپ کو جلدی لوٹنا ہو گا۔ اندازاً کتنے دن لگ جائیں گے وہاں؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے پندرہ دن لگ جائیں۔"

"یہ بہت زیادہ ہیں۔ اگر وہ آپ کو نہیں ملتی تو پھر میں اپنے آدمی اس کے پیچھے بھیجوں گا۔ انٹیلی جنس کے ذریعے تو وہ جیل سے بھاگی ہوئی عورت ہے اور اب وہ اگر کسی چار دیواری میں جا بیٹھی ہو تو اس کو ڈھونڈنا ناممکن ہو گا مگر پھر بھی معلوم تو کیا جا سکتا ہے۔"

"بس میں اسی لیے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلدی ملاقات ہو گی۔"

"میں ابھی شفا بار فون کر کے معلوم کرتا ہوں، وہ سپاہی کہیں شور ہی نہ مچا دیں۔ ان کو سنبھالنا بھی بہت ضروری ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

"جی خدا حافظ۔ آپ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ دونوں سپاہی دروازے کے دائیں بائیں اسٹول بچھا کر بیٹھے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر موت نے وہ راستہ دیکھ لیا تو پھر وہ دو باوردی آدمی اس کو کیسے روک سکیں گے اور ستناجا صاحب کی جان کے تو کئی دعویدار تھے۔ کس کس کو لگام ڈال سکیں گے۔

اسپتال کی فضا بہت سوگوار تھی۔ شہر کا بھی یہی حال تھا۔ مجھے کس طرف کوئی خوشی جھکتی نظر نہیں آئی۔ دراصل خوشی ایک اندرونی جذبے کی مرہونِ منت ہے۔ دل میں وہ لہر نہ اٹھے، وہ جذبہ سرد ہو جائے تو پھر ماحول میں پاس ہی پاس گھُلی نظر آتی ہے۔ خوشیاں کوئی درآمد شدہ جنس ہرگز نہیں ہیں۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا گلبرگ جا پہنچا۔ اس سفر میں مجھے کوئی دو گھنٹے لگ گئے ہوں گے۔ میں نے گیٹ کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا تو مجھے سامنے حیدر نظر آیا۔ وہ واپس آ چکا تھا۔ میں نے گیٹ کھولا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

"ان کا کیا حال ہے بھئی اب؟"

"وہ ٹھیک ہو گئے ہیں مگر وہ حوالدار مجھے ذلیل کر رہا تھا آخر اسے کسی نے ٹیلی فون کیا جسے سن کر اس کا غصہ کم ہو گیا ورنہ وہ بہت طیش میں تھا۔"

"فون کس نے کیا تھا اسے؟"

"پتہ نہیں۔ اس کے کسی افسر کا فون تھا۔ بہت سر سر کر رہا تھا۔"

"تم ابھی آئے ہو؟"

"جی ہاں کوئی دس منٹ ہوئے ہیں۔ میں نے کلینک سے نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور یہاں آ گیا۔"

"وہ ڈُگی کہاں ہے؟"

"وہ دونوں اندر ہی ہیں۔ ان کا کیا کریں ہم؟"

"ان کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ انہیں پولیس لے جائے گی۔ میں نے ستناجا صاحب سے کہہ دیا تھا۔"

یہ کہہ کر میں اندر چلا گیا۔ اس وقت آبی اور گل خان چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آبی نے پیالہ میز پر رکھ دیا مگر وہ ڈگمگانے لگا۔ آبی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گُم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "کیا کر آئے ہو اب؟ ایک تو تمہاری یہ تدبیریں ہمیں لے ڈوبی ہیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے یار؟ مجھ پر خواہ مخواہ ہی گرم ہو رہے ہو۔"

"بالکل بکواس آدمی ہو تم! آخر کیا ضرورت تھی تمہیں ان کا چمچہ بننے کی۔ مار مار کر انہوں نے ہمیں ڈُنبہ بنا دیا۔ وہ تمہارا ستناجا مرا نہیں ابھی؟"

"یار وہ تو ابھی زندہ ہے۔ خدا کے لیے کچھ سوچ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں کیا سوچوں اس کو چابک مار مار کر دانی نے تباہ کر دیا۔ تمہارے زخم بھی میں دیکھ چکا ہوں۔ آخر تمہیں یہ سوجھی کیا۔ اب بھگتو بیٹھ کر۔ اپنے گھر میں چور بن کر رہ گئے ہو۔ دانی کسی ایک آدمی کا نام نہیں ہے۔ تم سے وہ بدلہ ضرور لیں گے۔ ڈُگی نہیں تو کوئی اور آ جائے گا۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا آبی! تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔"

"وہ گولی میرے ہی ہاتھ سے چلی تھی۔"

"موقعے کا گواہ کوئی نہیں ہے۔ سب کچھ وہیں ختم ہو گیا تھا اور ہم کون سے یہاں جم کر بیٹھے رہیں گے۔ پولیس ابھی ان دونوں کو لے جائے گی تو ہم بھی یہاں سے دفع ہو جائیں گے۔ خس کم جہاں پاک ہم سیدھے قندیار ہی چلے جائیں گے۔"

"وہاں تمہاری کون سی ماسی بیٹھی انتظار کر رہی ہے؟ ایک وہ بڈھی پھاپھاں بن جی ہو گی۔ اس سے تمہیں کیا مل

جائے گا۔ وہ پردے دار خاتون۔ وہ کیوں ہماری مدد کرنے لگی۔ اس کے لیے تم نے کیا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔"

"میں آسیہ کے لیے اس سے ضرور ملوں گا آبی! وہ اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کر سکتی ہے۔"

"کچھ نہیں یار! یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ آسیہ کو بھول جاؤ۔ اس کے پیچھے پھرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا کو مٹھی میں بند کر رہا ہو۔"

"نہیں۔ یہ محض تمہارا خیال ہے۔ ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔ گل خان بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔"

"جو جی میں آئے کرو۔ میں تو اس سارے سلسلے سے ہی بیزار ہوں۔ تمہیں بھلا یہ کوٹھی خریدنے کی کیا ضرورت پڑی تھی آخر؟"

"تم خود ہی تو کہتے تھے کہ ہمارا ایک گھر ہونا چاہیے۔"

"مگر یہ کوئی گھر نہیں ہے۔ یہ پولیس کا اور چوروں کا اڈا بن چکا ہے۔ ہمیں ایسے گھر کی ضرورت نہیں تھی جس میں خون کا طوق بھی ہماری گردن میں پڑا رہے اور جس میں کوئی بھی آدمی اندر آ کر ہم پر گولی چلا سکے۔ میں نے ایسے گھر کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس کو بیچ دو جیلانی! یا تم اسے آگ لگا دو۔"

وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں سمجھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں گے۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر اسے باہوں میں لے لیا۔ وہ اپنے آپ سے بھی بے زار ہونے لگا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے باہوں میں لیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تم سمجھتے ہو، میں بہت خوش ہوں۔ تم نے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ اس الماس کا کیا بنا؟ وہ مجھے آج کل پر ٹرخا رہی ہے۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا ہے۔ اسے بھی میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے آبی! وہ ہمیشہ سے ایسی تھی۔ وہ سارا محض ایک ڈرامہ تھا۔ وہ کبھی تم سے شادی پر آمادہ نہیں ہوگی۔ تمہاری والدہ بھی اسے سمجھ چکی ہے۔ اسے بھول جاؤ۔"

"میں اسے کیسے بھول جاؤں۔ کتنے سارے پیمان اس نے کر رکھے تھے۔ اب تک میں اسے چار لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ اسے میں کیسے بھول جاؤں جیلانی! اس نے میرے دل میں گہرے زخم ڈال دیے ہیں۔"

"آخر وہ کہتی کیا ہے؟"

"بس مجھے آج کل پر ٹال رہی ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ وہ لے کر اس نے اپنی فلم شروع کر دی ہے۔"

"تو پھر امید رکھو کہ وہ تمہاری ہی رہے گی۔ قندھار سے آنے کے بعد میں خود اس سے ملوں گا۔ پھر تمہاری شادی کا بھی میں کر دوں گا۔ بیٹھ جاؤ اور دفع کرو اس قصے کو۔"

گل خان ہماری باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا، بولا۔ "یہ تم کس کا ماتم کر رہے ہو بھائی؟ طوائف کو کوٹھے سے کوئی بھی سلامت نہیں اتارا۔ تم شاید الماس ایکٹریس کی بات کرتے ہو۔ وہ کیسے تمہاری ہو جائے گی۔ اس کا کچھ کچھ تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ ہیرا منڈی کی عورت ہے۔"

"رہنے دو یار! تم اپنی معلومات اپنے ہی پاس رکھو۔ او حیدر! دیکھ گیٹ پر کون آیا ہے؟" میں نے گھنٹی کی ٹرن ٹرن سن کر حیدر کو آواز دی۔ وہ گھر میں ہوتا تھا تو گیٹ اور برآمدے کے درمیان اس کا سارا وقت بھاگنے میں ہی گزر جاتا تھا۔ معلوم ہوا کہ تھانے سے چار سپاہی اور ایک انسپکٹر آئے ہیں۔ ان کو حیدر ہمارے ہی کمرے میں لے آیا۔

"آئیے انسپکٹر صاحب! میرا خیال ہے آپ کو ستناجا صاحب نے بھیجا ہے۔"

"جی ہاں۔ سردار کریم نواز آپ ہی ہیں۔"

"جی۔ یہ میرے دوست ہیں علی حسن گردیزی اور یہ دوست ہیں گل خان۔"

"مجھے ڈگی اور قادر کو گرفتار کرنے کا حکم ملا ہے۔ کہاں ہیں اس وقت؟"

"جی وہ ادھر ہی ہیں۔ حیدر ان کو اسٹور روم دکھا... ہم نے ان کی مشکیں کس کر باندھ دیا تھا۔ وہ ہمیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے گھر آ کر انہوں نے ہم پر حملہ کیا۔" واقعات کی تمام تفصیل اسے بتا دی۔ جتنی میں ضروری سمجھا۔ مگر مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ ڈگی بھی منہ میں زبان رکھتا ہے اور یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے میں وہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا۔ پولیس بعد میں آ کر انہیں پکڑ لیتی تو کم از کم وہاں نہ ہوتا۔ جیسے ہی انہوں نے ڈگی اور قادر کو باہر نکالا اور انہیں ہتھکڑی لگا دی تو ڈگی بڑے غصے کے لہجے میں بولا۔ "آپ نے یہ پوچھا نہیں کہ ہم نے ان پر حملہ کیا؟ یہ دانی کے قاتل ہیں۔ انہوں نے جاکھی کو بھی مارا۔ دانی میرے انکل تھے۔ میں ان کو کیسے معاف کر دیتا۔ آپ پولیس افسر ہیں کہ اصل بات پر نگاہ ہی نہیں ڈالتے۔"

"یہ سب بکواس تم تھانے جا کر کر سکتے ہو۔

ان کو بھی وہیں بلوا لوں گا۔ ابھی تو تم اتنی بات یاد رکھو کہ تم نے ان کے گھر میں آ کر ان پر حملہ کیا ہے اور اسی جرم میں تمہیں بند کر رہا ہوں۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "سردار صاحب! آپ تینوں بھی تھانے پہنچ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ مجھے آپ کے بیان کی ضرورت ہے۔"

"جی بہت بہتر۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ کیا زیادہ بہتر نہ ہوگا کہ میں صبح آ جاؤں؟"

"ہاں۔ صبح ہی آ جائیں۔ ان کو تو ہم ابھی بند کر دیں گے۔"

"میں نہیں جاؤں گا تھیم! اس بات کا یہاں ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ قاتل ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ یہ انکل دانی اور جاکھی کے قاتل ہیں۔" ڈگی نے چیخ کر کہا۔ اور ہتھکڑی میں سے ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ گویا وہ ٹوٹ بھی سکتی تھی۔

تھانیدار اس کا یہ رویہ دیکھ کر ایک دم بھڑک اٹھا، بولا۔ "اوئے کھوتے دے پتر سیدھا ہو کر آگے لگ جا ورنہ تیرا ادھر ہی پلستر کر دوں گا میں۔ جانتا ہے میں کون ہوں؟" یہ کہہ کر اس نے تڑاخ تڑاخ دو بید اس کی کمر پر دے مارے۔ سپاہیوں نے اسے دھکیل کر آگے لگا لیا تھا۔ قادر بھی اس کے ساتھ ہی گھسٹتا چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ وہ تھانیدار ایک خاص حکم کے تحت وہاں آیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ڈگی کی زبان بھی وہ سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ دانی کا قاتل کون ہے مگر اس نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا اور ہمیں صبح تھانے پہنچنے کا حکم دے کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہاں ابھی تک ستناجا صاحب کا حکم چل رہا تھا اور ان کا خیال تھا کہ وقت نے انہیں کبڑا کر دیا ہے اور بڑے صاحب ان سے ناراض ہو گئے ہیں، وہ ان کا محض وہم تھا۔

مگر اس سارے قصے میں، میں بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ دانی اور جاکھی کے قتل اور حسینن لنگاہی کی ذہنی حالت دیکھ کر میں اپنے آپ سے اس قدر الجھ چکا تھا کہ غالبہ کی کوٹھی سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ پتہ نہیں یہ میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا یا کیا بات تھی، مجھے ٹھہر ٹھہر کر آسیہ کا خیال آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی دلدل میں دھنس چکی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ اس کا سر بھی اندر چھپ جائے گا۔ ایسے بے اتھاہ پانی میں، ایسی تاریکی میں جس تک میں کبھی نہ پہنچ سکوں گا۔ اندازہ میرا یہی تھا۔ شاید یہ بے کے خون کی ہنکاریں بول رہی تھیں۔ کوئی ان میں برابر شعلے بھڑکا رہا تھا۔ یہ سکے اور آسیہ کے خون کی پکار تھی جو مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ پچھلے آٹھ پہر سے یہ ساتھ ہی ہو رہا تھا مگر میں نے اس کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میں تھپک تھپک کر اس خیال کو سلا دینا چاہتا تھا کہ آسیہ کا نگہبان میں تو نہیں ہوں، کوئی اور قوت ہے کوئی اور غیر مرئی طاقت ہے جو اس کی اندھیرے جالے میں حفاظت کرتی ہے مگر اس روز میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا کہ اس کے بارے میں نہ سوچنے کے باوجود مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور دل میرا یہی کہتا تھا کہ جس قدر جلدی ہو سکے آسیہ تک پہنچ جاؤ۔ اسے تمہاری سخت ضرورت ہے مگر یہ بات میرے بس میں کہاں تھی۔ اس کے باوجود میں ٹھہر ٹھہر کر بھڑکنے لگتا تھا۔

تھانیدار ڈگی اور قادر کو لے کر گیٹ سے باہر نکل گیا تو جیسے ہی حیدر کمرے میں آیا، میں نے اسے قریب بلا کر کہا "دیکھ حیدر! ہم ایک بہت ضروری کام سے باہر جا رہے ہیں۔ تم یہ پانچ ہزار روپے رکھ لو اور کوٹھی کا خیال رکھو۔ کسی کا فون آئے تو اسے کہہ دینا کہ میں کہیں باہر گیا ہوں سمجھے!"

اس نے نوٹ مٹھی میں بند کرتے ہوئے مجھے بڑی ہی سراسیمہ نگاہ سے دیکھا اور بولا "خیر تو ہے کوئی مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے؟"

"اوئے بیٹھ لئے! ہم خود بہت بڑے گناہ گار ہیں، حیدر تو ہمارا مقابلہ کہاں کر سکتا ہے تو کوٹھی کا دھیان رکھ اور بس، یہی بہت ہے۔" آبی نے ایک دم بڑے ہی پیار سے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ دراصل حیدر نے وہ بات ہی ایسے انداز میں کہی تھی کہ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

"یہ بات نہیں ہے حیدر! مسئلہ کچھ اور ہے جس کے لیے ہم بھی نکل جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا پتہ تمہارے پاس نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی پیغام کوئی اطلاع ملے تو اسے لکھ کر رکھ لو اور بس۔"

"جی بہت بہتر۔ آپ جلدی آ جائیں گے نا؟ آپ کے آنے سے یہاں بڑی رونق لگ گئی تھی مگر لگتا ہے اب بکھر رہی..."

"دفع کر یار! تو خود ہی یہاں بھنگڑا ڈالا کر۔ چل بھئی اٹھ جا اب۔ ورنہ وہ لوگ ہمیں پھر کسی مصیبت میں پھنسا دیں گے۔" آبی نے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی چند ضروری چیزیں بھی اس میں رکھ دی تھیں جس میں کوٹھی کی رجسٹری بھی شامل تھی۔ وہ بریف کیس اٹیچی جیسا تھا۔ ہماری ضرورت کے لیے وہی بہت کافی تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں، آبی اور گل خان کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ حیدر نے ہمیں دو کمبل دے دیے تاکہ رات کے سفر میں ہمیں آسانی رہے۔

کوئی دس قدم چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم اسٹیشن جا پہنچے۔ آبی بھی الماس کی دھول کو ذہن سے جھٹک کر

میرے ساتھ یکسو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اب اُسے بھی وہ شہر جچ نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے الماس سے اس کی طبیعت اُکتا چکی تھی۔ وہ شاید اس کے ہر ایک انداز سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا' منزل جب نہیں ملتی تھی تو اس کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا تھا۔ مگر جب وہ کسی مقصد کو یا اس کے حصول جیسے کو بھی حاصل کر لیتا تھا تو اس کی طبیعت اُچاٹ ہونے لگتی تھی۔ وہ اپنی قسمت کو پوری طرح مجھ سے وابستہ کر بیٹھا تھا۔ اور احساس نے مجھے یہی ہوتا تھا کہ وہ میرے بغیر تنہا زندگی کرنے کا تصور ہی کھو بیٹھا ہے۔ گاڑی رات گیارہ بجے چھوٹتی تھی۔ ہم تینوں فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے کر اس میں جا بیٹھے۔ ہمیں ہر حال میں کل تک قندیار پہنچنا چاہیے تھا کہ وہ بہن جی وہیں تھی جس سے آسیہ آخری بار ملی تھی۔ اب کی بار شاید وہ مجھے نہ ٹرخا سکے جس عذاب سے میں گزر گیا تھا اس کا وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب میں اس برقع پوش سے اس کا نقاب ضرور چھین لینا چاہتا تھا۔ آسیہ کو اس نے ہی کہیں اِدھر اُدھر ڈال دیا تھا۔ ورنہ وہ کوئی ایسی چھوٹی موٹی نہیں تھی۔ اور اب گل خان کو اس نے آسیہ کے بچے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے لاہور بھیجا تھا مگر وہ بے چارہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ اسے اپنی ناکامی کا بہت افسوس تھا مگر اس کے پلے ہی کچھ نہیں تھا۔ خدا معلوم اُس شب خیر نے بچے کو کہاں رکھا تھا مگر سوال یہ تھا کہ آخر بہن جی کو اتنے دنوں بعد آسیہ کے بچے کا خیال کیسے آ گیا؟ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ آسیہ کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتی ہے مگر ہم پر اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں اُس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس کی کون سی غرض اس میں پوشیدہ تھی۔ میں تو آسیہ کا سگا بھائی تھا' اس لیے ہلکان ہو رہا تھا' ساری زندگی میں نے اس کے لیے ہی تج دی تھی۔ یہ جو کچھ بھی مجھے پیش آیا' یہ سب اسی کی بدولت تھا۔ وہ بیچ میں نہ آتی، وہ کہیں ساحل پر آباد ہو کر بیٹھ جاتی تو مجھے زمانے کے اس گہرے پانیوں میں حیران پریشان پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو کچھ بھی ہوا سب آسیہ کی وجہ سے ہوا مگر وہ ابھی تک میرے لیے معمّا بنی ہوئی تھی۔ اور اب میں ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ وہ سراب بن کر رہ گئی تھی۔

آبی کا موڈ اس وقت بہت اچھا تھا۔ وہ جو عجیب سی انقباض کی کیفیت اس پر کوٹھی میں طاری تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ ماڑی انڈس کی گاڑی جب چلی تو اس نے سیٹ پر یہاں سے وہاں تک پاؤں پھیلا لیے اور سگریٹ کا پیکٹ کھول کر اس نے شراب کی بوتل کی طرح سامنے رکھ لیا۔ گل خان نے اُوپر برتھ پر ڈیرا جما لیا تھا اور اب وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ مرنجان مرنج قسم کا آدمی ہے۔ مل گئی تو کاری ورنہ بیچاری۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ ہم نے بھی پھر اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ساری باتیں آپ ہی آپ قندیار جا کر کھل سکتی تھیں اس لیے ہم نے اُسے سونے دیا۔ ڈبے میں ہمارے ساتھ کوئی اور نہیں تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ آدمی کو کبھی کبھی اپنی تنہائی بہت ہی عزیز ہو جاتی ہے۔

آبی نے دو سگریٹ سلگا کر ایک میرے حوالے کر دیا ... ہے وہ گیا نہیں تھا۔ بولا "یہ بتا جیلانی کہ تیرے یہ زخم اتنی جلدی کیسے مندمل ہو جاتے ہیں؟ کتنی چھریاں ماری تھیں ... نے تجھے؟"

"میں خود حیران ہوں بھئی! میرے زخم بالکل ٹھیک ہو ... ہیں۔ دراصل دانی اندر سے بہت اچھا آدمی تھا ورنہ وہ چھری ... بھی ہو سکتی تھی۔"

"آدمی تو واقعی وہ بہت اچھا تھا جیلانی! تمھیں تو پتہ نہیں کسی زمانے میں تاہیا بھی اس کے پاس رہ چکا ہے' اس کی ... کا مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ وہ میری گولی تھی جو اُس کے ... میں سے گزر گئی تھی۔"

"تم ایسا نہ کرتے تو وہ ہمیں وہاں سے کبھی نکلنے نہ دیتا ..."

"مگر وہ مریم تمھیں کیسے مل گئی؟ وہ تمھاری دوستی ..."

"یعنی تیرا کیا خیال ہے اب میں ...گنوں سے بھی لاڈ کرتا پھرتا ہوں؟"

"بھئی اس میں کیا حرج ہے' لوگ کرتے ہیں بھئی ... سے کرتے ہیں اور ویسے بھی کہتے ہیں کہ کھنگن کے عشق سے آدمی کی آنکھیں کبھی دکھنے نہیں آتیں۔"

"بک بک مت کر آبی! یعنی تو مجھے اب یہ مشورہ دے رہا ہے۔"

"مشورہ کیا ہے' وہ تیری دوست تھی جب ہی تو تجھے وہاں سے رہائی دلا دی۔"

"نہیں بھئی! وہ دراصل ریٹا کی رشتے دار تھی ہاں۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"مگر وہ دانی کے ہاں کیا کرتی تھی؟"

"وہ اس کے اڈے کی ملازم تھی۔ مجھے اس نے خود ... تھا میرا خیال ہے کہ ......"

"اور میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے ریٹا کے جنازے ... بھی دیکھا تھا۔ کئی عورتیں بھی وہاں جمع تھیں اور یہ بھی ان ... شامل تھی۔ ہاں بالکل یہ وہی تھی' اب سمجھا۔ واقعی وہ مزدور ریٹا کی رشتے دار ہوگی مگر ہمارے وہ بہت کام آئی۔ ورنہ ہم وہاں ہی مارے جاتے۔"

"افسوس مجھے یہ ہے کہ میں اُن لڑکیوں کی حفاظت نہ کر سکا' وہ بے خبری میں ماری گئیں۔"

"ہاں۔ یہ واقعی بڑی افسوسناک بات ہے جیلانی! وہ کنواری لڑکیاں برباد ہو گئیں اور ان کا باپ پاگل ہو گیا۔"

"اسی لیے تو میں لاہور سے بھاگ آیا ہوں' اُن کی بددعا مجھے لے ڈوبے گی۔ ستنا جلنے مجھ سے بہت ہی غلط کام کروا دیا۔ اس کا اب کوئی سدِباب بھی نہیں ہو سکتا۔"

"تو یہ تلا کیا کر جیلانی! نماز پڑھا کر' بہت پاپی ہو چکا ہے تو۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابے تو چپ رہ۔ بڑا آیا مولوی عبدالرحیم بن کر۔ میں نے کیا کیا ہے بھلا۔ ان لڑکیوں کو خود اپنی حفاظت کرنی چاہیے تھی میں نے تو اُن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"تو ویسے ہی بے کار آدمی ہے' تیرا کیا ہے۔ بہر حال استغفار پڑھا کر' تیرے لیے یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا بریف کیس کھول لیا۔ اس میں شراب کی ایک بوتل' کچھ سوڈا اور دو گلاس رکھے تھے۔

"کیا خیال ہے' ہو جائیں دو گلاس؟"

"تیرا کیا بنے گا آبی! یعنی اب تو شراب بھی پینے لگا ہے؟"

"یہ سب الماس کی مہربانی ہے' اس نے مجھے یہ کام بھی سکھا دیا۔ قسم خدا کی ایسا عمدہ جام بناتا ہوں نا میں کہ تو خوش ہو جائے گا۔"

"نہ بھائی! یہ بوتل تم اپنے پاس ہی رکھو' حد ہو گئی۔ یہ ہمیں راس نہیں آ سکتی ہے۔ آبی! اسلام میں تو یہ بالکل منع ہے۔ آبی! یہ کام یہاں نہیں ہو گا' مت کھولنا اس بوتل کو۔ ہم سفر میں ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھین لی۔

"یار! یہ مجھے دے دے۔ تجھے کیا پتہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ شربت ہے جیلانی، دیکھ کوئی گڑبڑ نہ کر دینا۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم مجھ سے بھڑ گیا اور میرے ہاتھ سے بوتل چھیننے لگا مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ میری بائیں کلائی پر پڑا' مجھے ٹیسیں آنے لگیں۔ وہ اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا تھا مگر اس کے تیور دیکھ کر میں نے اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔ بوتل اُس نے میرے ہاتھ سے جھپٹ لی' بولا "تم بہت خراب آدمی ہو جیلانی! آج کی رات بھی تم مجھے پینے نہیں دیتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے بوتل کا کاگ کھول دیا اور دونوں گلاس اس نے بڑی سی طرح بھر لیے' ایک اس نے میری طرف کھسکا دیا۔

"پی جیلانی! اُن لوگوں کے نام پر پی جو ختم ہو چکے ہیں۔ میرے نام پر پی کہ مجھ سے زیادہ برباد اور تنہا آدمی کوئی نہ ہوگا" مگر مجھے وہ زہر کا جام معلوم ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ ہی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ وہ ایسی شے تھی جسے میں نے آج تک ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بدترین حالات میں بھی میں اس کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس آگ میں وہ کیسے سکون تلاش کر رہا ہے۔ شاید وہ آبی مجھ سے جدا ہو چکا تھا جسے میں عزیز رکھتا تھا۔ الماس نے خدا معلوم اسے کس سانچے میں ڈھال دیا تھا حالانکہ وہ اس کے ساتھ چند ہی دن گزار سکا تھا مگر وہی دن اس کے لیے عیب بن کے رہ گئے تھے۔ عورتیں ایسی بھی چال باز ہوتی ہیں کہ وہ آدمی کو چکر دے کر اس کا مغز ہی پھیر دیں ___ ہر عورت اپنے بچے کو صرف اور صرف نیکی کی راہ دکھاتی ہے' وہ کبھی بھی نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ کوئی بری راہ دیکھے مگر وہ اس آدمی کی ماہیتِ قلبی ضرور بدل دیتی ہے جو اس کی باہوں میں آ گرے ___ اور الماس نے آبی کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔ اُسے شراب کی اور جوئے کی بھی عادت اس نے ڈال دی تھی۔ آبی کی باتوں سے میں یہی اندازہ لگا سکا تھا۔ وہ گھوڑ دوڑ کا بھی ایک دن ذکر کر رہا تھا میرا خیال یہ ہے کہ الماس نے اس سے چار لاکھ روپے لے کر کسی ایسی ہی مد میں خرچ کر دیے تھے اور اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ فلم بنا رہی ہے۔ اس گرداب نے آبی کو کوئی ایسا ہی چکر دیا تھا۔

آبی نے گلاس کو ہاتھ میں لے کر میری طرف دیکھے بغیر منہ سے لگا لیا اور اُسے خالی کر کے بولا "تو یہ نہیں پیے گا؟"

"نہیں بھائی! مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"ٹھیک ہے' ایک نمبر بے وقوف آدمی ہو تم..... اسے کوئی حوصلے والا ہی پی سکتا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آدھی بوتل چڑھا لی۔ وہ کسی طرح پیچھے ہی نہیں ہٹ رہا تھا۔ اس عرصے میں گل خان گہری نیند میں کھو چکا تھا۔ میں دوسری سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکتا رہا۔ اس شراب نوشی میں کسی بھی طرح میں آبی کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ حالت اس کی یہ ہو گئی کہ اس کی آنکھیں اُبلنے لگی تھیں، چہرہ سرخ ہو چکا تھا مگر ابھی اسے ہوش تھا۔ اس نے آدھی بوتل بند کر کے بڑے سے بریف کیس میں ڈالی جس کے اندر اس نے نوٹوں کا بڑا سا لفافہ بند کر رکھا تھا اور پھر بریف کیس کو سر کے نیچے رکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس شراب نے اسے برہم نہیں کیا

تھی۔ وہ ابھی تک اپنے آپ میں تھا اور اس کا ذہن اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

"تو بھی سو جا جیلانی! یہ بتی بجھا دے اور دروازہ بھی اندر سے اچھی طرح بند کر دے۔ اب سو رہنا ہی بہتر ہے۔"

"بہت بہتر جناب عالی! اگر پولیس اندر آ گئی تو میں آپ کے بارے میں کیا کہوں؟"

"کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ جاگیر پر گیا ہوں۔ کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ کہہ میری بیوی مر گئی ہے اس کے جنازے میں گیا ہوں۔"

"بیوی کیسے مر گئی آپ کی؟ الماس تو زندہ ہے۔"

"وہ مر ہی چکی ہے میرے لیے اور یہ میں اسی کے ماتم میں اتنی ساری پی گیا ہوں۔ ہاں یہ اسی کے نام کی تھی۔"

اس کی آنکھیں اور زیادہ مندتی جا رہی تھیں۔ میں نے تمام دروازے اندر سے بند کر کے بتی بجھا دی اور کمبل اوڑھ کر سمیٹ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ دوسرا کمبل گل خان نے اوڑھ لیا تھا۔ آبی کو اپنی ہی کھال میں لیٹنا پڑا مگر میرا اندازہ یہ تھا کہ اسے کسی لحاف یا کمبل کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے وجود میں آگ بھر گئی تھی۔ الماس کے نام کی آگ۔ آبی اس کے ساتھ لمبی سی رنگ رلیاں منا کر آ رہا تھا اور گزرتے ہوئے ایک ایک لمحے نے اسے جو زخم دیے تھے اب وہ ان پر پھاہے باندھ رہا تھا۔

رات کا سفر اس لحاظ سے اندھی گہری غار سے مشابہ ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کس وقت گزرا۔ کمبل اس رات میرے بہت کام آیا اور میں اسے اوڑھ کر لمبے بدن ہو کر لیٹ گیا مگر وہ نیند اتنی گہری نہیں تھی۔ گاڑی کی کھڑکھڑ نے بار بار مجھے جگایا۔ میں پھر اپنے وجود کو بھینچ کر سو جاتا تھا۔ آبی کے خراٹے البتہ زیادہ ہی واضح تھے اور یہی حال گل خان کا تھا۔ وہ تو برتھ پر ایسا لیٹا کہ میں سمجھا وہ اب صبح ہی اٹھے گا۔ پتہ نہیں وہ کون سی جگہ تھی اور ہم کہاں سے گزر رہے تھے کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ڈبے کے اندر مجھے ایک ہیولا سا ناچتا نظر آیا۔ میں سمجھا گل خان اٹھا ہے یا آبی کسی ضرورت سے بیدار ہوا ہے مگر نہیں۔ میرا یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ جب میں نے پوچھا: "کیا بات ہے بھئی! کدھر جا رہے ہو؟" تو اس نے جواب نہیں دیا بلکہ ایک دم پلٹ کر میری طرف جھپٹا۔ میرے لیے اس کا وہ رویہ حیران کن تھا۔ کمرے میں تاریکی ایسی تھی کہ باہر سے چاندنی اس میں رس گھول رہی تھی۔ جیسے ہی وہ میری طرف جھپٹا میں نے ایک دم کمبل اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ وہ ذرا دیر کے لیے ٹھٹکا اور پھر میری طرف جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا جسے وہ میرے سینے میں اتار دینا چاہتا تھا۔ میں

ایک دم سر کو نشست کے دوسرے حصے میں جا پہنچا۔ جوتے میں نے پہن رکھے تھے اور یہ اچھی بات تھی۔ وہ اپنی ہی جھونک میں بڑھا تو میرا خیال تھا کہ میں اس ثنا میں اس کی دست برد سے محفوظ ہو چکا ہوں مگر یہ میری خام خیالی تھا۔ اس نے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچی اور پورے کا پورا میرے اوپر آ پڑا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ جیسے اس کا خنجر اوپر اٹھا، میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر کچھ اس طرح مروڑی کہ وہ خنجر آپ ہی آپ نیچے گر گیا مگر اس عرصے میں اس کا بایاں ہاتھ میری گردن پر آ پڑا تھا اور ۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ جانتا تھا کہ گردن کی کون سی رگ کیسے کام کرتی ہے۔ وہ کوئی چھ فٹ اونچا آدمی تھا اور اس کا وزن برابر مجھے یہ احساس دلا رہا تھا کہ میں اسے کر پرے نہیں پھینک سکتا ہوں۔ اب اس کا سارا زور میری گردن پر تھا مگر میرا دایاں ہاتھ ابھی کام کر رہا تھا۔ اس کی کلائی میری گرفت میں آئی تو میں نے پوری قوت سے اس کو اس طرح پکڑا کہ اس کی کلائی اپنی گرفت کھو بیٹھی۔ کوئی ہڈی اس کی تڑاخ سے ٹوٹ گئی تھی۔ ایک سسکاری سی اس کے منہ سے نکلی تو میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر فرش پر پھینک دیا۔ تب مجھے معلوم ہوا وہاں کوئی دوسرا آدمی بھی تھا اور وہ آبی کے سر کے نیچے سے بریف کیس نکال کر لیٹرین کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اوئے آبی! اٹھ جا تیرا بیڑہ غرق۔ وہ تیرا بریف کیس لے جا رہے ہیں۔" میں نے تیزی سے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا مگر میں اسے چلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو محض دھمکانے کے لیے میں نے اس کے قدموں میں چلائی مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا اس نے ڈبے کی دیوار تک پہنچ کر ایک دم کئی تختے اپنی جگہ سے گرا دیے۔ گولی کی آواز بھی اسے نہ روک سکی تھی۔ جیسے ہی ہوا وہ اس کھڑکی میں سے بریف کیس سمیت باہر نکل گیا اور ڈبے کے بمپر پر جا چڑھا۔ میں ابھی اس کھڑکی تک ہی تھا کہ کسی نے میری ٹانگ کھینچ لی۔ وہ آدمی جو فرش پر منہ پڑا تھا ایک دم مجھ پر آ پڑا تھا۔ میں بھی اوندھے منہ گر گیا اور اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے تختوں کے بیچ میں سے باہر چھلانگ لگا دی مگر اس نے چھلانگ لگانے سے پہلے جیب سے مٹھی بھر ریت نکال کر میری آنکھوں میں یوں دے ماری کہ میں ایک لحظے کے لیے تو اندھا ہو کر رہ گیا۔ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں ریت کو آنکھوں سے جھاڑتا ہوا ایک بار پھر ان تختوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری نظر کام نہیں کر رہی تھی عین اسی وقت گل خان

نیچے اتر آیا۔ صورت حال کو سمجھتے ہوئے وہ ایک دم میرے پاس آ گیا مگر اس کی بھی شکل مجھ سے پہچانی نہیں جاتی تھی۔ ان دونوں کے ہیولے سے مجھے بمپر پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندازے سے ان پر گولی چلا دی مگر وہ ایک دم نیچے بیٹھ گئے اور ان کے حوصلے کی میں داد دیتا ہوں۔ وہ ملل بھی لے اڑے تھے اور اپنی جانیں بھی بچا لے گئے تھے۔ ایک گولی میں نے مجھ سے ان کی طرف داغ دی مگر عین اس وقت گاڑی کسی پل پر سے گزرنے لگی۔ سامنے پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا مگر میری آنکھوں میں بھتے سے ناچ رہے تھے۔ کوئی شے صاف سیدھی نظر نہیں آتی تھی۔ گاڑی پل کے عین بیچ میں پہنچی تو ان دونوں نے ایک دم نیچے چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ پستول کو جیب میں رکھ کر میں تختوں میں سے گزر کر تیزی سے بمپر پر جا پہنچا۔ میں کسی صورت میں بھی ان کو اس مال غنیمت کے ساتھ وہاں سے فرار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ابھی گاڑی پل کے اوپر ہی تھی کہ میں نے بھی ان کے پیچھے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا۔ پانی سرد تھا اور اس کی یخ بستگی ہڈیوں تک سرایت کرتی جاتی تھی مگر میں اس پانی سے پناہ مانگتا کہ ان کا پیچھا کرتا۔ جواب تیزی سے بائیں کنارے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں پانی میں کودا تو پہلی ڈبکی میں بہت نیچے چلا گیا مگر پھر سانس روک کر میں اوپر اٹھا اور ان کا تعاقب کرنے لگا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں ان کے پیچھے کود گیا ہوں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ میں کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتا ہوں، گاڑی سے ان کے پیچھے چھلانگ بھی لگا سکتا ہوں۔ ان کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ وہ مشاق تیراک معلوم ہوتے تھے۔ پانی کو وہ بڑی آسانی سے چیر رہے تھے۔

ابھی میں ان کے پیچھے دس گز ہی آگے گیا ہوں گا کہ وہ دونوں غوطہ لگا گئے۔ اب وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے مگر ان کی سمت کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ نہر کے دائیں کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ ہماری رقم بھی اسی بریف کیس میں بند تھی اور کوٹھی کی رجسٹری بھی۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے بے حد اہم تھیں، ان کا ہاتھ سے نکل جانا ہمارے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ پتہ نہیں وہ اپنے طور پر ہمارے پیچھے آئے تھے یا کسی اور نے انہیں بھیجا تھا۔ دل میرا یہی کہتا تھا کہ وہ اٹھائی گیرے ہیں اور گاڑیوں میں اکیلے دکیلے مسافروں ہی سے معاملہ کرتے ہیں۔ میں کوئی پانچ منٹ تک سطح آب پر انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے دم خم

نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کوئی اتنی دیر تک پانی میں کیسے رہ سکتا ہے مگر نہیں وہ کتنے کے نیچے پانی میں اس طرح چل رہے تھے کہ ان کی ناک پانی سے اوپر تھی اور وہ بڑے اطمینان سے سانس لے سکتے تھے۔ مگر مجھے صرف ایک ہی آدمی نظر آیا۔ ابھی میں اس کے پیچھے لپک ہی رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے قریب ہی کہیں کوئی بڑی سی لہر اٹھ رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے کسی نے مجھے گھسیٹ کر پانی کی تہہ میں پہنچا دیا۔ دوسرا آدمی کوئی زبردست قسم کا غوطہ خور تھا اور اب وہ مجھ سے الجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے پانی میں ہی ختم کر دینے کی سوچ رکھی تھی مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ میرے جسم کو لگا میں نے سانس روک کر تیزی سے اپنا خنجر اس کے پیٹ میں دھنسا دیا۔ یہ ایسا اضطراری اور فوری عمل تھا کہ میں اس کے نتیجے پر غور ہی نہیں کر سکا۔ خنجر لگتے ہی اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے اسے کھینچ کر پانی کی سطح پر پہنچایا تو اس کے ساتھ ہی پانی میں رنگ گھلنے لگا۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ دوسرا خنجر مارنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ زخم اس کی پسلی میں لگا تھا اور اتنا گہرا تھا کہ چند ہی لمحوں میں اس کی لاش پانی پر تیرنے لگی۔ وہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر کنارے کی طرف دھکیلا۔ اس عرصے میں اس کا ساتھی بریف کیس سمیت نہر کے کنارے جا لگا تھا اور گاڑی پل سے کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے جا کر ٹھہر گئی تھی۔ اس میں سے کئی آدمی نیچے آ گئے تھے اور اب وہ پل کی طرف دوڑ رہے تھے مگر ہم اس وقت تک پل سے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ دور جا چکے تھے۔

جیسے ہی دوسرا آدمی بریف کیس لے کر کنارے پر پہنچا میں نے تیزی سے اس کے ساتھی کو کھینچ کر پانی سے نکالا اور پھر اسے وہیں ڈال کر میں بلا خیز رفتار سے اس کی طرف لپکا۔ پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور فاصلہ میرے اور اس کے درمیان یہی کوئی پچاس قدموں کا تھا مگر اس کی رفتار مجھے حیران کرتی تھی۔ پانی میں اس قدر بھیگ جانے کے باوجود وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس ہتھیار کوئی نہیں ہے مگر میں حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے وہاں سے بھاگ نکلے مگر جب اس نے محسوس کیا کہ میری رفتار کا مقابلہ وہ نہیں کر سکے گا تو وہ کوئی سو قدم آگے نکل کر پھر نہر میں کود گیا۔ یہ بڑی ہی ذلیل حرکت کی تھی اس نے۔ مجھے پھر پانی میں اترنا پڑا۔ اور یہی میں نہیں چاہتا تھا مگر اس کو جب میں نے بریف کیس سمیت پانی میں غوطہ لگاتے دیکھا تو

میں نہر میں اُترنے کے بجائے اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا اور اس کے اندازے کے برعکس جیسے ہی وہ مجھے دوبارہ پانی کے اوپر نظر آیا، میں نے اس کو تاک کر گولی چلا دی۔ میرا خیال ہے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ اگر اس طرح بریف کیس سمیت پانی میں ڈوب جاتا تو میں اسے کہاں تلاش کر سکتا تھا مگر گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی اس نے پھر پانی میں سر ڈال دیا۔ اب وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاڑی میں موجود پولیس کے سپاہی اور دوسرے لوگ پل کے پاس پہنچ کر اب میری طرف آ رہے تھے مگر اُن کو یکسر نظر انداز کر کے میں نے ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میں بریف کیس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔ پستول پوری طرح بھیگ چکا تھا مگر اس کے باوجود وہ کام کرتا تھا۔

اس نے جب مجھے دوبارہ پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا تو اپنا رُخ اس نے اب کی بار پھر نہر کی بائیں طرف موڑ لیا۔ پانی کا بہاؤ وہاں پہنچ کر بہت کم ہو گیا تھا۔ پل کی رکاوٹ جو تلاطم پیدا کرتی ہے وہ اب پانی میں مفقود ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ آڑا ترچھا ہونے کے بجائے سیدھا دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اس طرح کہ اس کا مجھے صرف سر ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس تک پہنچنے کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہاتھ میں کوئی معمولی سی چیز بھی ہو تو وہ تیراکی کی تیزی میں معاون ثابت نہیں ہوتی اور اس کے لیے وہ بریف کیس مصیبت بن گیا تھا۔ کوئی تین منٹ کے توقف کے بعد میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس نے یوں کیا کہ اس تعاقب سے پریشان ہو کر میرا بریف کیس پوری قوت سے پانی میں اُچھال دیا۔ مجھے یہی دھڑکا لگا تھا کہ پانی تو کوئی چیز واپس نہیں دیتا ہے میری ساری دوڑ دھوپ رائیگاں جا رہی تھی مگر جیسے ہی اس نے بریف کیس ہاتھ سے اُچھالا میں سدھائے ہوئے کتے کی طرح سیدھا اس کی طرف لپکا اور بیشتر اس کے کہ وہ پانی کی تہہ میں جا بیٹھتا میں نے غوطہ لگا کر اسے پکڑ لیا۔ میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ اس کے لیے میں نے کیا کیا جوکھم نہیں اٹھایا تھا۔ ایک آدمی مار دیا تھا، دوسرا ابھی میری زد میں تھا اور میں اسے بھی شاید گولی مار دیتا مگر ابھی میں اسے تاک ہی رہا تھا کہ اس نے بریف کیس دور پھینک دیا اور اب وہ اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر کنارے پر جا پہنچا اور بلا تیز رفتاری سے سامنے کی فصلوں کی طرف بھاگ رہا تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ میں وہاں تک اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہی بہت تھا کہ میں نے کتے کے منہ سے چوزہ واپس لے لیا تھا۔ وہ اسے ڈال کر بھاگ نکلا تھا اور میں دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس کے لیے میرے دل سے دعائے خیر ہی نکل رہی تھی۔ جب میں بریف کیس لے کر دائیں کنارے پر پہنچا تو اس وقت تک ریل کے سپاہی گل خان کے ساتھ وہاں آ گئے تھے۔ چند لوگ اس آدمی کے پاس کھڑے تھے جو میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا۔

"میں نے گاڑی رکوائی تھی سردار صاحب! وہ گردیزی صاحب بھی ادھر آ رہے ہیں۔" گل خان نے صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے مجھے دوسرے نام سے پکارا۔

"انہیں ہوش آ گیا تھا اس گردیزی کو؟"

"ہاں جی۔ بریف کیس تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، یہ تو میں نے لے لیا ہے مگر وہ آدمی بھاگ گیا۔"

"یہ معاملہ کیا ہے میاں جی؟" ایک سپاہی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو تم وہ ہمارا یہ بریف کیس لے کر بھاگ رہے تھے۔"

"اس آدمی کو آپ نے زخمی کیا ہے جی؟"

"جی ہاں۔ میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن وہ نائب محرر صاحب آ رہے ہیں، اُن کو اس واقعے کی تفصیل بتائیں۔"

"اوئے جا یار! اس گاڑی میں ایسے ایسے لوگ چلتے ہیں اور تمھیں پتہ تک نہیں چلتا۔ تم کیا کر لو گے اب؟" میں بریف کیس گل خان کے حوالے کر کے اپنے کپڑے نچوڑنے لگا۔ اتنے میں نائب محرر آبی کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں آ پہنچا۔ آبی نے بریف کیس دیکھ لیا تھا، وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کوئی زیادہ نقصان تو نہیں ہوا سردار صاحب؟"

"ہاں شاید ایک بندہ مارا گیا ہے میرے ہاتھوں۔"

"وہ مرا نہیں ہے، کچھ زیادہ ہی زخمی ہے مگر بچ گیا ہے۔ فرسٹ ایڈ والوں نے سنبھال لیا ہے مگر سردار صاحب آپ نے کمال کر دیا ہے۔ آپ کیسے کود گئے ان کے پیچھے؟" وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں۔" نائب محرر نے نہر کی دوسری سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

"یا حضرت! کیا خیال ہے اس کا پیچھا نہیں کریں گے؟" میں نے نائب محرر کے پاس ہو کر کہا۔

وہ میرے لہجے کے طنز کو سمجھ گیا مگر اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا پتہ ہمیں دوسرے آدمی سے مل جائے گا۔"

"میرا خیال ہے آپ کو تو پتہ ہی ہو گا وہ باقاعدگی سے گاڑی میں سفر کرنے والے لوگ ہیں اور آپ کا سفر خرچ بھی نکلتا رہتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! انہیں کیسے پتہ ہو گا؟"

"نہیں نا جی! آپ ماشاءاللہ پولیس والے ہیں، آپ تو جانتے ہی ہیں نا کہ مسافروں کے ساتھ کیسے کیسے ہیرے دار چلتے ہیں، آپ نے گاڑی لیبٹ ہو رہی ہے۔" میں نے نائب محرر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ تلملا کر دگیا میرے ساتھ وہ چلا تو سہی مگر میرا ہاتھ اس نے فوراً کندھے سے جھٹک دیا۔

"آپ بہت سوچ سمجھ کر بات کریں میاں جی! میں آپ کی ہر بات نوٹ کر رہا ہوں۔"

"ضرور نوٹ کریں بھائی جی، ضرور کریں مگر بہتر یہ ہو گا کہ اس گاڑی کو اللہ کے سپرد کر دیں اور آپ اس کے ساتھ نہ چلا کریں۔ آپ کے سامنے مسافروں کا مال غائب ہو جاتا ہے، بندے مر جاتے ہیں، گاڑی رک جاتی ہے مگر آپ بس دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ کیا فائدہ ہے آپ کا اس گاڑی کے ساتھ چلنے کا، بتاؤ مجھے؟ میں تم سے پوچھتا ہوں نائب محرر صاحب!" میرا لہجہ ایک دم تلخ ہو گیا تھا۔

وہ کوئی بہت ہی پرانا پاپی قسم کا سپاہی تھا۔ میرے اس سوال پر مسکرانے لگا، بولا۔ "ہم کیا کریں میاں جی! یہاں تو ہر تیسرا آدمی چور ہے، ہم کس کس کا ہاتھ پکڑیں۔ آپ کو بھی اگر کوئی ایسا بریف کیس مل جائے تو آپ بھی اسے نہیں بخشیں گے، کیا نام کہ جو یہ کام کریں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی جی! بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ آپ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔" آبی نے میرے اور محرر کے درمیان آ کر کہا۔

"کوئی افسر ہے تمھارا ادھر گاڑی میں؟"

"جی نہیں۔ آٹھ سپاہی میرے ساتھ ہوتے ہیں اور بس۔ ویسے ہر بڑے اسٹیشن پر ہمارے افسر موجود ہوتے ہیں۔ ہم سرگودھا پہنچ کے آپ کو ان سے ملوا دیں گے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے ملنے کی۔ میں نے اپنا بریف کیس واپس لے لیا ہے اور بس۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔"

"آپ میری سمجھ میں نہیں آتے ہیں حضور! کیا نام کہ آپ ہم پر رُعب جما رہے ہیں۔"

"اس کا پتہ تو تم کو خود ہی چل جائے گا۔ میں دیکھوں گا کہ تمھاری نگرانی میں کیسے کیسے ڈاکے پڑتے ہیں یہاں۔ میں اسے تمھاری ہی ذمے داری سمجھتا ہوں۔" باتیں کرتے ہوئے ہم اس زخمی آدمی کے پاس جا پہنچے۔ اسے وہ اس وقت تک اسٹریچر پر ڈال چکے تھے اور اس کے پیٹ پر پٹیاں بندھی تھیں۔

"اوئے کیا نام ہے تیرا! کتے کے بچے! تم نے اُدھر سنا ہے گاڑی کا ڈبا پھاڑ دیا ہے۔" محرر ایک دم طیش میں آ گیا مگر وہ آدمی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے وہ ہوش ہی میں نہیں تھا۔ محرر کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ سپاہیوں نے اسٹریچر اٹھا لیا اور ہم تیز تیز قدموں سے گاڑی تک جا پہنچے۔

آبی بہت خوش تھا۔ اس نے گل خان سے بریف کیس لے لیا۔ ڈبے میں داخل ہو کر اس نے میرے کپڑے اتروا دیے اور مجھے کمبل اوڑھا دیا۔ وہ مجھ سے بڑی ہمدردی جتا رہا تھا۔ کپڑے اس نے ڈبے میں اِدھر اُدھر پھیلا دیے۔ اس عرصے میں سپاہی ڈبے کا جائزہ لیتے رہے۔ آبی اُن کے پیچھے کٹے ہوئے تختوں کے قریب جا پہنچا۔

"میرا خیال ہے اب تک تو آپ سب کچھ سمجھ ہی چکے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔ دیکھ لیا ہے ہم نے۔"

"یہ سرکاری گاڑی ہے۔ ڈبا بھی سرکاری ہے، اس کے تختے بھی سرکاری ہیں مگر یہ نئی کھڑکی چوروں کے لیے ہے اور چوروں ہی نے بنائی ہے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟"

"میں سمجھ رہا ہوں، یہ بریف کیس کھولیں ذرا۔"

"جی نہیں۔ اسے تو آپ رہنے ہی دیں۔ اس میں ہماری رقم محفوظ ہے، کچھ کپڑے ہیں اور بس۔"

"اسے کھولیں بھی سہی۔ اسے ہم ثبوت کے طور پر پیش کریں گے۔"

"ہاں ہاں۔ یہ ابھی رہی تھی! جو مال چور نہیں لے جا سکے، وہ ہم آپ کو دے دیں، ہے نا یہی بات؟"

"مگر اس آدمی کے زخمی ہونے کی وجہ بھی تو یہی بریف کیس ہے، وہ مر بھی سکتا ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے، اسے مر ہی جانا چاہیے۔ بہرحال آپ اپنی کارروائی مکمل کریں اور یہاں سے دفع ہو جائیں۔" آبی نے بڑے ہی درشت لہجے میں کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم بات کس طرح کرتے ہو مجھ سے، کیا نام کہ میں ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"اور میں ایک مسافر کی حیثیت سے تمھیں جواب دے رہا ہوں۔ کارروائی مکمل کرو اور جاؤ۔" آبی نے بڑے ہی ترش لہجے میں کہا۔

"یہ ایسے ہی کہہ رہے ہیں آپ سے۔ ان کی بات کا بُرا نہ منائیں، لکھیں، آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ قصہ ختم کریں۔" گل خان نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا اور

ان کو ساتھ لے کر نشست پر بیٹھ گیا۔ سرگودھا اسٹیشن آنے تک وہ ہمارے بیان لکھتے رہے۔ اس عرصے میں گل خان انھیں سگریٹ بھی پلاتا رہا۔ میں اور آبی الگ ہو کر بیٹھے رہے۔ ہم اس معاملے کو درصل وہیں ختم کر دینا چاہتے تھے۔

اٹیچی کیس میں سے ہم نے تمام قابلِ اعتراض چیزیں نکال لی تھیں۔ مجھے ستنا جا صاحب نے دو شناختی کارڈ مہیا کر دیے تھے، ان کو میں نے اندر کی جیب میں رکھ دیا۔ ایک کارڈ آبی کا بھی تھا جس پر علی حسن گردیزی لکھا تھا۔

ہمیں ان کے ساتھ اسٹیشن پر اترنا پڑا اور وہ ہمیں ساتھ لے کر اپنے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا پہنچے۔ وہ اس وقت اسٹیشن پر ہی موجود تھا اور مجھے یہ دیکھ کر زبردست دھچکا لگا کہ وہ آدمی آبی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اگرچہ آبی کا حلیہ کچھ بدلا ہوا تھا مگر اس کی نظر آبی کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔ پھر بھی وہ براہِ راست ہم سے مخاطب نہیں ہوا۔

"کیا بات ہے شفیع، کیسے آئے ہو؟"

"سر! گاڑی میں دو ڈاکوؤں نے ان لوگوں کا بریف کیس چرا کر نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ ان کا نام سردار کریم نواز ہے اور یہ علی حسن گردیزی ہیں۔ سردار صاحب نے ان کا تعاقب کیا اور ان میں سے ایک آدمی کو زخمی کرنے کے بعد ان سے اپنا بریف کیس واپس لے لیا۔ میں نے ان کے بیان لکھ لیے ہیں اور یہ کاغذات دیکھ لیں۔ دوسرا آدمی فرار ہو چکا ہے۔"

"جب ہی گاڑی لیٹ ہو گئی۔ بیٹھیں جناب! یہ بریف کیس جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہی چوری ہوا تھا؟"

"جی ہاں۔ مجھے ان کے پیچھے نہر میں چھلانگ لگانا پڑی۔ وہ ڈبے کے تختے کاٹ کر اندر آئے تھے۔ وہ تو بہت ذلیل قسم کے لوگ ہیں۔ گاڑی میں سفر کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے میرا خیال ہے میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں، ان کا نام اسلم آبی ہی ہے نا؟"

"جی نہیں۔ آپ کو دھوکا ہوا ہے، میں کسی آبی کو نہیں جانتا۔" آبی نے ایک دم حیرت زدہ ہو کر کہا۔ وہ ابھی تک اس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو پہچان نہیں سکا تھا مگر اس کی آنکھوں سے میں نے جو اندازہ لگایا وہ بالکل درست نکلا۔ آبی اس انکشاف پر اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ کسی نے اسے پہچان لیا ہے اور شاید اس کے کسی پرانے جرم سے بھی وہ شخص واقف تھا۔ نام اس کا شبیر احمد تھا۔ اس کے نام کی تختی باہر دروازے پر لگی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ سارے معاملے کو سمجھ لینے کے بعد اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اپنا پتہ ہمیں لکھوا دیں۔ مقدمے کی پیروی کے لیے آپ کو کچھ زحمت اٹھانا پڑے گی۔ دوسرے آدمی کو ہم تلاش کر لیں گے۔"

"جی بہت بہتر۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ یہ گاڑی [illegible] نہیں سکتے ہیں ہمیں جلدی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بریف کیس میں سے دونوں کارڈ اس کے سامنے رکھ دیے۔ اسلم آبی کا کارڈ دیکھ کر وہ پھر جھنجلا سا گیا۔ اس کا چہرہ کسی گہرے تردد کی عکاسی کرتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جس آدمی کو وہ اپنے سامنے دیکھ رہا ہے وہ اسلم آبی نہیں بلکہ حسن علی گردیزی ہے مگر کارڈ تو یہی بتاتا تھا۔ ستنا جا صاحب نے اس کی رہائش بھی مجھ سے الگ دکھائی تھی۔

"کمال ہے صاحب! چہرے اتنے بھی ہم شکل ہو سکتے ہیں حالانکہ مجھے یقین ہے کہ..... خیر، ان کا نام پتہ تفصیل سے لکھ لیں شفیع صاحب۔"

"وہ میں نے پہلے ہی لکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟"

"جی نہیں! ہم اللہ کے فضل سے بالکل محفوظ ہیں" میں نے آبی کو اپنے ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس عرصے میں ان لوگوں نے وہ ڈبا گاڑی سے الگ کر لیا تھا جس کے تختے کٹ چکے تھے۔ ان کے لیے یہ سنگین واردات تھی جس کی وجہ سے ڈبے کا الگ کرنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا مگر شبیر احمد کے کمرے سے باہر نکلتے ہی گل خان بولا۔ "میری مانیں تو یہ گاڑی چھوڑ دیں۔ ہم ٹیکسی کار میں سفر کر لیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ آئیں گردیزی صاحب! لعنت بھیجیں اس گاڑی پر۔ گل خان ٹھیک کہتا ہے!"

شبیر احمد ہمارے ساتھ پلیٹ فارم تک آ گیا۔ اس نے ڈبے کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "آپ شاید دروازے اندر سے بند کر لیے تھے۔"

"جی ہاں۔ یہ تو بہت ضروری تھا مگر میرا خیال ہے یہ ڈبا انہوں نے پہلے ہی کاٹ رکھا تھا۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ بہرحال اب آپ کی گاڑی نکلنے والی ہے۔" اس نے ہم سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ سپاہی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دو

بالآخر اس سے الگ ہو کر گاڑی میں جا بیٹھے مگر ہم وہاں سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

"ہم اب اس گاڑی میں سفر نہیں کریں گے۔ کوئی کار ہم باہر سے لے سکتے ہیں۔" میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی! اچھا خدا حافظ۔"

اس سے جان چھڑا کر ہم تیز تیز قدموں سے تقریباً بھاگتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

"یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے تھے سردار صاحب! میرا خیال ہے وہ شبیر احمد مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔"

"شکر کرو، یہ کارڈ ہمارے پاس تھے۔ ستنا جا صاحب کو دعا دو ورنہ وہ تمھیں وہیں باندھ لیتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ چور کون تھے؟ کچھ ان کا بھی علم ہے تمھیں؟ وہ بڑے انتظام سے اندر آئے تھے۔ کیا وہ صرف نوٹ چرانا چاہتے تھے؟"

"تمھارا کیا مطلب ہے؟ اور کیا چیز تھی ہمارے پاس؟"

"وہ رجسٹری جو پلاسٹک کے لفافے میں ہونے کی وجہ سے بچ گئی ہے۔ کہیں وہ تو ان کی نظر میں نہیں تھی؟"

"نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کسی کو اس رجسٹری سے کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"پھر بھی! ذرا سوچو تو سردار صاحب! بات اتنی سی نہیں ہے کسی نے ان کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہو گا۔"

"مگر ایسا کون ہو سکتا ہے؟" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "گل خان! کوئی کار دیکھو۔ تم تو اس شہر سے زیادہ واقف ہو۔"

"جی میں ابھی کار لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔

"بتاؤ نا آبی! تمھیں یہ شک گزرا کیسے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر صرف نوٹوں کے لیے وہ اتنی پریشانی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے شفا بار کلینک کا وہ مختارِ عام اس بات کا ذمے دار ہو۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمھارا خیال غلط ہے۔"

"رجسٹری ابھی تک تم نے سرکاری ریکارڈ میں درج نہیں کروائی۔ اس کا انتقال نہیں ہو سکا۔ وہ ابھی تک عالیہ کی ملکیت ہے۔ محض اسٹام فروش کے لکھ دینے سے تو بات نہیں بن سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر..... میں نہیں مانتا آبی! میں نے اسے رقم ادا کر دی ہے۔ اس کے دستخط گواہوں کے سامنے ہوئے تھے کوئی تماشا تو نہیں ہے یہ؟"

"تماشا بھی ہو سکتا ہے استاد! میرا یہ خیال ہے کہ صرف نوٹوں کے لیے ہم پر یہ حملہ نہیں ہوا ہے بہرحال واپسی پر ہی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے۔ دنیا کی جو فطرت ہے وہ تجھے کیا معلوم۔"

وہ شاعری کر رہا تھا۔ اس نے ایسا نکتہ اٹھایا تھا کہ میں خود سکتے میں آ گیا تھا۔ اگر ایسی ہی کوئی بات ہوتی، کسی نے کوٹھی پر دوبارہ قبضہ جمانے کی سوچ رکھی ہے اور وہ مجھے وہاں سے نکال دینے کا راستہ تلاش کر رہا ہے تو..... تو..... میں کیا کر سکوں گا؟ سوائے اس رجسٹری کے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کوٹھی پر میں اپنی ملکیت اسی سے ثابت کر سکتا تھا جو ابھی تک ایک طرح سے کچی دستاویز تھی۔

"میں واپسی میں اسے کچہری میں پیش کر دوں گا۔ آبی! یہ بہت ضروری ہے، اس کا میرے نام انتقال بھی ضرور ہونا چاہیے۔"

"سوچ لو معاملہ کچھ زیادہ ہی چکردار معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام تھا اس چور کا جسے تم زخمی کر آئے ہو؟"

"تمھیں بتایا تو تھا اس نے! فیروز نام ہے اس کا۔"

"اس سے ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھی کا نام کلیم تھا۔"

"ہاں۔ اس نے یہی بتایا تھا۔"

"ٹھیک ہے! ابھی تو وہ اس کا علاج کرائیں گے۔ بعد میں جیل میں ہم اس سے مل سکتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ستنا جا صاحب ہی اس کوٹھی کے چکر میں ہوں؟"

"نہیں یار! کیسی باتیں کرتا ہے تو! وہ ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا ہے، ہرگز نہیں۔"

"بہرحال تمھیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے جیلانی!"

"دیکھ، اب کی بار ہمیں عہد کرنا ہو گا کہ نہ تو مجھے جیلانی کہے گا نہ میں تجھے آبی۔ میں سردار کریم نواز ہوں اور تم علی حسن گردیزی ہو۔"

"چلو یونہی سہی مگر ہم اپنا پچھلا ریکارڈ جلا تو نہیں سکتے ہیں۔"

"یہ ہو چکا ہے گردیزی صاحب! یہ ہو چکا ہے۔ ہماری وجہ سے وہ آدمی ٹھنڈی رکھ میں مار دیے گئے تھے۔"

"کسی دن اس کا بھی امتحان ہو جائے گا۔ آؤ شاید گل خان کار لے آیا ہے۔" اس نے ایک نیلگوں رنگ کی کار میں گل خان کو آتے دیکھ کر کہا۔

بھوک نے ہمیں نڈھال کر رکھا تھا۔ گاڑی سے بیٹھنے کے بعد ہم وہاں سے آ گئے۔ نکل کر اسٹیشن کے باہر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا پہنچے۔ ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم قندیار کی طرف چل دیے۔ گل خان نے کار پورے دن کے لیے کرائے پر لے لی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم اس روز کہاں کہاں سے گزریں گے۔ ہماری پہلی منزل میانوالی تھی جہاں ہم شب خیر سے ملنا چاہتے تھے۔

"تیرا کیا خیال ہے گل خان! شب خیر گھر پر ہوگی؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں سردار صاحب! میری اطلاع تو یہ تھی کہ وہ بچے کو ساتھ لے کر لاہور گئی ہے مگر وہ وہاں بھی نہیں ملی۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں اور چلی گئی ہو۔"

"نہیں۔ وہ گھر پر ہی ہوگی۔ ہمیں اس سے بچہ لینا چاہیے۔ بچے کو وہ اپنے پاس رکھ کر کیا کرے گی؟ کیوں گردیزی صاحب؟"

"آپ سمجھ دار آدمی ہیں سردار صاحب! میں۔ بالغ بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔" آبی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے یہ سفر اب کی بار کچھ عجیب سا لگ رہا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میری رگوں میں کیسی اینٹھن ابھر رہی ہے اور میں آسیہ کے بارے میں کس قدر پریشان ہوں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اس نے کوٹھی کے معاملے میں خواہ مخواہ ہی میرے دل میں شک پیدا کر دیا ہے ورنہ وہ چور محض پیلے کے لیے ہی ہم پر جھپٹے تھے۔ ان کا رجسٹری سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ مگر آبی کے ذہن کو کیا کہیے وہ ستنا جا صاحب کو بھی معاف نہیں کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ انہی میں سے کسی نے محض اس رجسٹری کے لیے انہیں ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ پتہ نہیں ایسے ایسے خیالات اس کے دماغ میں کیسے ابھر آتے تھے۔ میرا خیال ہے اسے کسی بھی آدمی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ ہر شخص کو شبہے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس پر یہ کیفیت پہلے تو کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ اندازہ میرا یہی تھا کہ وہ الماس کی صحبت میں رہ کر ایسا ہو گیا تھا۔ بے اعتباری اس کا مسلک بن گئی تھی۔ اس جان بار نے اس کے ساتھ کوئی نیکی بھی تو نہیں کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ آبی کا نیکی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے گردیزی صاحب! آپ ہم سے نظر ملا کر بات نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں یار! تیرے پیچھے لگ کر میں تباہ ہو گیا ہوں، کیا ملا اس دوڑ دھوپ سے؟"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں پاگل تو نہیں ہوں، کسی مقصد کے لیے ہی جان لڑا رہا ہوں۔"

"یہ دنیا بندر کی آشنائی سے پیاری ہے! پتہ نہیں تو کن لوگوں پر اعتبار کر لیتا ہے، مجھے تو کوئی ایسا نہیں ملا۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ الماس نے تیرے اندر کا کوئی ... توڑ دیا ہے جو آدمی کو آدمی سے باندھتا ہے ورنہ تو یہ دنیا بہت حسین ہے۔"

ڈرائیور کوئی مجہول قسم کا آدمی تھا۔ منہ پر اس نے داڑھی سجا رکھی تھی۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہوگی۔ اس نے ہماری باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور یہ اچھی بات تھی۔

"محض تیرا خیال ہے بھائی! ورنہ اب تک ہمیں کیا مل سکا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ذرا اپنا حاصل جمع تو دیکھ! اور یار گردیزی نہ کہا کر ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یعنی نہ تو جیب رہا اور نہ میں آبی۔ لعنت بھیج ان کارڈوں پر۔"

"بات تو تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہے۔"

گل خان سارا راستہ آنکھیں بند کیے سیٹ کی پشت سے ٹیکا کر لیٹا رہا۔ اس نے ہماری کسی بات میں دل چسپی ظاہر نہیں کی۔ جب ہم میانوالی پہنچے تو اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ ہم نے سیدھی شب خیر کے مکان کے سامنے جا ٹھہرائی۔ ہم تینوں ہی اس کے دروازے پر جا پہنچے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر بے آباد نہیں ہے۔ دستک دینے پر ایک بڑی ہی شوخ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ دوپٹے سے بری طرح الجھ رہی تھی اور اس سے اپنا وجود سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور ہماری نظروں کی تاب نہ لا کر فوراً ہی تختے کے پیچھے چھپ گئی۔ آبی اسے دیکھ کر کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو گیا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ملنا تو آپ ہی سے تھا مگر آپ چھپ ہی گئیں۔"

"یہ بات نہیں ہے بی بی! ہمیں شب خیر سے ملنا ہے۔ وہ گھر پر ہی ہیں؟" میں نے آبی کی بات کو الٹتے ہوئے کہا۔

آبی کی آنکھوں کا اضطراب اس لڑکی کو دیکھ کر بڑھ گیا تھا۔ پتہ نہیں اس کی روح کس چیز کی طلبگار تھی۔ اس کو سیر چشم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حسن و شباب کو اس نے جب بھی یکجا دیکھا، اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ نہ معلوم وہ عورت سے کس چیز کی امید رکھتا تھا جو اسے اب تک نہیں مل سکی تھی۔ لڑکی نے تختہ فوراً سیدھا کر دیا اور آ کر بولی۔ "ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ کا نام کیا بتاؤں انہیں؟"

"ہاں یہ بڑی اہم بات ہے۔ کہیں سردار کریم نواز اور علی حسن گردیزی آئے ہیں۔"

"جی بہت بہتر۔ آپ ذرا انتظار کریں۔" اس نے آبی کے فقرے کو یاد رکھا تھا اور اب وہ اسے ایک خاص نظر سے دیکھ کر لوٹ رہی تھی۔ رنگ اس کا گندمی تھا۔ مگر نقشے کے اعتبار سے وہ بڑی ہی منفرد اور یکتا نظر آ رہی تھی اور شب خیر کے مکان کا سامنے کا حصہ ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں اس وضع دار نے ایک خوبصورت باغ لگا رکھا تھا جس میں اب رنگ رنگ کے پھولوں نے طوفان مچا رکھا تھا۔ میں اگر کمبل اوڑھے ہوئے نہ ہوتا تو میرا حلیہ صاف ہی بتا رہا تھا کہ میں پانی میں ڈوب کر باہر آیا ہوں۔ یہ بات اس لباس کی ہر ٹوٹی ہوئی کریز سے ظاہر تھی۔ البتہ آبی بہت عمدہ لباس میں تھا اور تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔

"دیکھ آبی! تیری نظر تجھے لے ڈوبے گی۔ یعنی ہر عورت تیرے لیے تر نوالہ بن جائے، آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

"میں دراصل خدا کی صنعت کا پرستار ہوں۔ جہاں حسن دیکھتا ہوں نثار ہو جاتا ہوں۔ فن کار کا قدردان ہوں۔ ہر اچھی بات پر، ہر اچھے نقش پر، ہر سرمہ سا آنکھ کی سیاہی پر قربان ہو جاتا ہوں اور تو نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھی ہیں؟"

"تیرا بہت نٹے منہ آبی! کہیں نہ کہیں تو مجھے ضرور ذلیل کروائے گا۔ یعنی اب اس لڑکی پر بھی تو کرم نوازی کرنا چاہتا ہے؟"

"تو کیا حرج ہے؟ آخر کو وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ سانچے میں ڈھلی ہوئی لگتی ہے۔ اس کا ایک ایک نقش اس کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔"

اتنے میں وہ لڑکی پھر ہمیں نظر آئی۔ اب کی بار اس کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ دوپٹہ اب بھی اس کو ڈھانپنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

"آئیں جناب عالی! اندر آ جائیں۔ خانم آپ کی منتظر ہیں۔"

ہم نے قدم دروازے میں ڈال دیے۔ اس نے تختے جوڑ کر کنڈی لگائی اور ہمارے عقب میں آنے لگی۔ آبی جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا۔ مجھے اور گل خان کو اس نے آگے کر دیا تھا۔ اب وہ لڑکی کے عین عقب میں چل رہا تھا۔

"کیا میں آپ ہی سے آپ کا اسم مبارک معلوم کر سکتا ہوں؟" فاصلہ بیچ میں یہی کوئی دس پندرہ قدم کا ہوگا اور وہ اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"آپ ہی کا؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کسی راہگیر سے بھی میرا نام پوچھ سکتے ہیں؟" لڑکی نے ایک دم دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بڑے دم خم سے پوچھا۔ ایسے میں وہ اور زیادہ حسین نظر آنے لگی تھی اور حیرت ہے کہ اس کی نظریں اب سیدھی آبی کے چہرے پر جمی تھیں۔ میں اور گل خان دونوں رک سے گئے تھے۔

آبی جھینپ سا گیا اور بات کو الٹتے ہوئے بولا۔

"یہ اپنے سردار صاحب ہیں نا، یہ پوچھ رہے تھے کہ..... ورنہ میں تو کسی آپ جیسی کو لفٹ ہی نہیں دیتا۔"

"تو یہ خود نہیں بول سکتے ہیں؟ آپ لیڈیز سے ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کریں جناب عالو صاحب! ہاں۔"

"آئیں گردیزی صاحب! آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں، عورتوں سے ان کا نام اور عمر نہیں پوچھنی چاہیے آبی۔" میں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا اور ان کو ساتھ لے کر آگے چل دیا۔

آبی دراصل اس مکان میں رچی بسی بدمعاشی کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس لڑکی پر بھی مہربان ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بھی وہاں کسی خاص غرض سے رہ رہی ہے۔ شب خیر کے ہاں کسی کا ٹھہرنا بے وجہ نہیں ہوتا تھا اور پھر کسی ایسی ہرنی کا اس جنگل میں آنا اور کلیلیں کرنا بے مقصد نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی جرأت اسی وجہ سے سہ چند ہو گئی تھی۔

ہم اگلے چند لمحوں کے بعد شب خیر کی نشست گاہ میں جا پہنچے۔ کوئی آدمی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔

اس لڑکی نے ہمیں بڑے تپاک سے نشستوں پر بٹھایا، بولی "خانم ابھی آ رہی ہیں۔ دراصل گھر میں مرد کوئی بھی نہیں ہے، خانم نے سب کی چھٹی کرا دی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں مردوے بالکل بھروسے کے لائق نہیں ہوتے۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔"

"آپ کہیں تو میں یہاں ملازمت کے لیے تیار ہوں، دن رات آپ کی خدمت کیا کروں گا بخدا کسی تنخواہ کے بغیر۔"

"جی شکریہ۔ ایسے تو یہاں اس دوارے پر بہت آتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گئی۔

"یار! کبھی تو خاموش رہ لیا کر۔ یعنی یہ کوئی موقع ہے ایسی باتوں کا، کیوں گل خان؟" میں نے آبی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ بادشاہ آدمی ہیں جناب! رنگ رلیے۔ کبھی میں

بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اب تو بے کاری کی عمر میں آ گیا ہوں۔" گل خان نے اس دروازے کو بڑی حسرت سے تکتے ہوئے کہا۔ جس میں وہ لڑکی غائب ہوئی تھی۔

"تیرا بھی جواب نہیں ہے پیارے! یعنی تیرے دل میں بھی وہی حسرت جاگ رہی ہے جو اس کو بھٹکاتی ہے۔"

اتنے میں نشست گاہ کا عقبی دروازہ کھلا ——— کسی نے موتیوں کے پردے کو ذرا ہلایا تو اس میں سے عجیب سی موسیقی ابھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی شب خیر اندر آ گئی۔ ایک اور لڑکی اس کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ شب خیر کے قدم ہی بتلا رہے تھے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر ہمیں دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ اس کے فراخ اور حسین ماتھے پر سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ اسے دیکھ کر ہم اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ محض احتراماً مگر اسے ہم یاد تھے، بہت اچھی طرح یاد تھے۔

"آپ؟ ... آپ پھر یہاں آ گئے، کیا کام ہے آپ کو مجھ سے اب؟" اس کا لہجہ بہت ہی ترش تھا۔ وہ بیٹھی نہیں، لڑکی کا سہارا لیے وہ ہمارے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ بیٹھ تو جائیں خانم! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بیٹھ جائیں ہم آپ کو پریشان کرنے نہیں آئے۔"

"پھر کیوں آئے ہیں آپ یہاں! کوئی اور مصیبت کھڑی کرنا چاہتے ہیں میرے لیے؟" یہ کہہ کر وہ بالآخر صوفے پر بیٹھ ہی گئی۔

"سلمیٰ! ان کے لیے فریج سے بوتلیں نکال دو، برف بھی ساتھ لیتی آنا۔" وہ اپنی اس ملازمہ سے بڑے سلیقے سے بات کر رہی تھی۔ وہ لڑکی فوراً ہی عقبی کمرے میں جا گھسی۔

"مجھے آپ کی آمد سے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"اس روز کی بدمزگی کا ہمیں بھی بہت افسوس ہے خانم! مگر آپ سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے یہ دوست گردیزی صاحب آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔"

"جی نہیں۔ اصل بات بتائیں کہ آپ کیسے آئے ہیں۔ آج آپ یہاں کسی بات پر اعتراض نہیں کر سکیں گے۔ یہاں آپ کو اب صرف ایسے لوگ ملیں گے جو اس پیشے میں رہ کر خوش رہتے ہیں۔ میں کسی پر جبر یا زیادتی نہیں کرتی ہوں۔ اب میں اپنی نظریں زیادہ کھلی رکھتی ہوں۔"

"ہمیں خوشی ہے خانم! آدمی کو کسی بھی کام کے لیے ناتجربے کار لوگ بھرتی نہیں کرنے چاہییں اور پھر آپ کا یہ مشکل کام ۔۔۔ اس میں تو بڑے مشکل مراحل آتے ہیں، کیوں گردیزی صاحب؟"

وہ نظر بھر کر مجھے دیکھنے لگی اور پھر مسکرا دی۔ بولی۔ "آپ نے اب تک اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا۔"

"وہ ... وہ دراصل ہم پھر آسیہ کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔ سنا ہے اس کا بچہ ابھی تک آپ کے پاس ہے؟"

"نہیں۔ اسے میں نے بہن جی کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے مجھے پچاس ہزار روپیہ دے دیا تھا۔ یہ چند دن پہلے کی بات ہے۔ اس کے عوض میں نے بچہ اس کے آدمیوں کے حوالے کر دیا ہے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے! کیا آسیہ خود یہاں آئی تھی؟"

"نہیں۔ اس کا تو مجھے پتہ ہی نہیں چل رہا مگر وہ بہن جی اس بچے کے بارے میں بہت پریشان تھیں، ان کے دو آدمی یہاں آئے تھے مرشد علی اور شمشاد خان۔ بچہ میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔"

"کوئی تحریر وغیرہ تو لے لی ہو گی آپ نے؟"

"ہاں! میں نے ان سے لکھوا لیا تھا۔ وہ پرچہ میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ پچاس ہزار روپے دے گئے تھے۔"

"وہ پرچہ کہاں ہے؟ اگر آپ مجھے دکھا دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔ ویسے آپ لاہور کس لیے گئی تھیں؟"

"نہیں تو ۔۔ میں لاہور تو نہیں گئی تھی۔ میرے گھٹنے میں اور ٹخنے میں درد رہنے لگا ہے۔ اس کے لیے میں کوئی دس دن راولپنڈی ہسپتال میں رہی ہوں۔ کس نے کہا ہے کہ میں لاہور گئی تھی؟"

میں نے گل خان کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھا تو وہ آگے جھک کر بولا۔ "میں ... مجھے بہن جی نے ہی کہا تھا۔ آپ کو میں سانڈہ میں نبی بخش چوہدری کے گھر دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں بہن جی کو کس نے یہ اطلاع دی تھی۔ میں وہاں خوار ہوتا رہا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ بہن جی نے آپ کو ادھر کیوں بھیجا۔ کب گئے تھے آپ لاہور؟"

"کوئی دس پہلے میں وہاں گیا تھا۔"

"حیرت ہے! مگر خیر اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کوئی آدمی پھر میری طرف نہیں آیا۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ کوئی مرشد علی اور شمشاد خان یہاں آئے تھے مگر ایسے تو کسی آدمی کو میں نہیں جانتا۔ بہن جی کے پاس تو اس نام کا کوئی شخص نہیں ہے۔"

"مجھے کیا پتہ؟ وہ پہلی بار میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں پچاس ہزار روپے لوں گی۔ یہ سن کر وہ چلے گئے اور جب دوبارہ واپس آئے تو وہ رقم لے کر آئے تھے۔ میں نے رسید لکھوا کر بچہ ان کے حوالے کر دیا۔"

اتنے میں سلمیٰ سوڈے کی بوتلیں لے کر اندر آ گئی تھی۔ ان کو کھول کر اس نے گلاسوں میں الٹ دیا مگر مجھے گل خان کی باتوں نے پریشان کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نام کا وہاں کوئی آدمی ہی نہیں ہے تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ میں نے گلاس اٹھا تو لیا مگر ذہن میرا الجھ کر رہ گیا تھا۔ آپی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"سلمیٰ! جاؤ ذرا وہ میرا بیگ لے آؤ۔ وہ رسید میں نے اسی میں رکھی تھی۔"

سلمیٰ فوراً ہی عقبی کمرے سے اس کا بیگ لے آئی۔ اسے شب خیر نے کھول کر ہمارے سامنے ایک بھاری بھرکم کاغذ رکھ دیا۔ وہ واقعی بچے کی وصولی کی رسید تھی جس پر دو آدمیوں نے آسیہ کے حوالے سے دستخط کیے تھے۔ مگر بہن جی کا اس میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ رسید بالکل ہی بیکار تھی، اس کی کوئی قانونی حیثیت ہی نہیں تھی اور حیرت مجھے یہ تھی کہ شب خیر ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتی تھی اور بچہ اس نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ رسید میں نے گل خان کو دکھائی مگر وہ نیم خواندہ آدمی اس میں سے کچھ بھی اخذ نہ کر سکا۔ اسے میں نے واپس شب خیر کے حوالے کر دیا۔

"گل خان! تم ابھی گاڑی لے کر نکل جاؤ اور بہن جی سے معلوم کرو کہ وہ بچہ ان کے پاس موجود ہے کہ نہیں ۔۔ ابھی چلے جاؤ۔ انہیں البتہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کا ذکر نہیں کروں گا مگر ان سے ملنا بہت ضروری ہے ورنہ تو پتہ نہیں حالات کیا ہو جائیں۔" گل خان نے گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اتنی تیزی سے اس نے گلاس چڑھایا کہ وہ ہانپنے لگا تھا۔ پھر وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ڈرائیور باہر گاڑی میں بیٹھا تھا۔

"یہ لو، دو سو روپے رکھ لو، کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔" آپی نے جیب سے نوٹ نکال کر اس کو دے دیے اور وہ اسی وقت مکان سے باہر چلا گیا۔

شب خیر نے بیگ میں رسید ڈال کر سلمیٰ کے حوالے کر دیا۔ اور وہ وہاں سے برتن اٹھا کر کمرے میں چلی گئی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟"

"میرے معدے میں درد رہنے لگا ہے، بڑی دوائیں کھائی ہیں۔ ہسپتال سے واپس آنے پر یہ درد اٹھا ہے۔"

"میرا خیال ہے کچھ دواؤں کا اثر ہو گا۔" اس طرحدار عورت کو یوں بیمار دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ وہ ... وہ کچھ بھی تو نہیں کرتی تھی۔ محض ... محض طالب کو مطلوب سے ملا دینے کا اہتمام کرتی تھی اور یہی اس کی روزی کا ذریعہ تھا۔ ورنہ ... ورنہ تو وہ کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔ پتہ نہیں میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا اضطراب دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ وہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر ایک دھندا کرتی تھی، ایسا دھندا جس سے بڑے بڑے فساد برپا ہو سکتے تھے مگر فساد تو بازار میں آلو چھولے کی دکان کھول لینے پر بھی ہو سکتا ہے ——

درد اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے سامنے ہی صوفے پر دراز ہو گئی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں تھا۔ میں ... میں چاہتا تھا کہ اسے آرام آ جائے۔ وہ ... وہ مجھے ایک دم اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی پینتیس چالیس سال کے درمیان ہو گی۔ میرا اندازہ شاید بہت ہی غلط تھا —— ساری کی ساری وہ چاندی کے رنگ میں ڈھلی نظر آتی تھی۔ میں اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس کا ہاتھ پیٹ پر جما تھا۔ اس کے فم معدہ میں شدید درد تھا۔

"شب خیر! یہ ہاتھ ہٹائیں جہاں درد ہے، وہ جگہ مجھے دیکھنے دیں۔"

وہ حیرت زدہ سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر لوٹ گئی۔

"آپ ... آپ کیا کریں گے؟"

"میرا خیال ہے ... مگر ذرا مجھے دیکھنے تو دیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے پیٹ کی طرف بڑھا دیا۔ آپی بھی سخت متعجب ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج مجھے یہ سوجھ کیا رہی ہے۔ شب خیر کے درد کا بھلا میں کیا علاج کر سکوں گا۔ حالت اس کی یہ ہو گئی تھی کہ درد کی ٹیس سے اس کا چہرہ ہلدی ہو گیا تھا اور اب وہ درد کی زیادتی کی وجہ سے صوفے کو نوچنے لگی تھی۔ میں نے اس کے معدے کے عین اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ذہن میں اس بابے کالے خان کا تصور ابھر آیا تھا۔

جو بڑے دکھوں کا ماندہ ہی تھا۔ حالانکہ وہ خود ٹانگوں سے مفلوج ہو رہا تھا۔ جب ہی میں نے اس کے معدے پر ہاتھ رکھا مجھے اس مقام پر عجیب سی ہلچل محسوس ہوتی۔ کوئی رگ تھی جو تڑپ رہی تھی مگر۔۔۔ نہیں میرے ہاتھ کا وزن جوں جوں بڑھا وہ۔۔۔ وہ پرسکون ہوتی چلی گئی۔ ہاں آپ کو یقین نہیں آئیگا یارو۔۔۔ وہ شب خیر یوں ہو گئی جیسے اسے ایک دم کسی نے آرام پہنچا دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں جن میں درد کی شدت نے گہرا کرب پیدا کر دیا تھا، اب مندنے لگی تھیں۔ کوئی تین منٹ تک میں نے اس کے پاس بیٹھ کر، اس کے معدے کو ہاتھ سے دبائے رکھا۔ اچانک اس کی مندی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں عجوبہ روزگار شخص ہوں۔ اس کے دیدوں کا تحیر مجھے حیران کرنے لگا تھا۔ وہ صوفے پر سے ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"یں۔۔۔ مجھے آرام آ گیا ہے سردار صاحب! یہ کیا کر دیا ہے آپ نے؟ میں تو بالکل تندرست ہو گئی ہوں۔ یہ۔۔۔ آپ کے ہاتھوں میں کیسی شفا ہے، اوہ یہ ہاتھ یہاں ہی رہنے دیں۔ لگتا ہے میں کبھی بیمار تھی ہی نہیں۔"

"میرا خیال درست نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کو آرام آ جائے گا۔ یہ بڑا جان لیوا درد ہوتا ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اس کی آنکھوں کا تحیر اور گہرا ہو گیا۔ اس نے صوفے سے نیچے قالین پر ڈھلک کر میرے ہاتھ پکڑ کر چومنے شروع کر دیے۔

"یہ ہاتھ۔۔۔ یہ اتنے برکت والے ہاتھ ہیں۔۔۔ مجھے آرام آ گیا ہے جناب! سلمیٰ! ادھر آ ری! دیکھ مجھے آرام آ گیا ہے۔" اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ تشکر کا ایک ایسا گہرا احساس اس پر طاری ہو گیا کہ وہ میرے دونوں ہاتھوں کو کسی بھی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ شب خیر کے چہرے کی رنگت سلمیٰ نے جو دیکھی تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ آبی بھی میرے پاس آ ٹھہرا اور مجھے یوں دیکھنے لگا، جیسے اس نے مجھے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ پتہ نہیں میں کیسے اس شب خیر تک جا پہنچا تھا۔ ایسے ہی ایک بے چینی تھی جو اس کے اتنے سارے کرب کو دیکھ کر میرے دل میں جاگی اور مجھے اس تک لے گئی اور میں نے اپنا ہاتھ اس کے معدے پر رکھ دیا کہ درد کا منبع تو وہی جگہ تھی اور اب وہ تمام دواؤں سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ آپ ہی آپ بستر علالت سے اٹھ گئی تھی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں جناب! لگتا ہے جیسے میں کبھی بیمار تھی ہی نہیں۔ سلمیٰ ان کے ہاتھ کا کرشمہ دیکھو معدے پر ہاتھ رکھا اور میں تندرست ہو گئی، ورنہ میں کئی دنوں سے کچھ کھا نہیں سکتی تھی۔" وہ اب ہنسنے لگی تھی۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا خانم کہ آپ کو آرام آ گیا ہے مگر اس میں میرا کوئی اعجاز نہیں ہے، ایسا نہ سمجھیں۔"

"کیوں نہ سمجھیں سردار صاحب آپ نے تو مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے آخر؟" آبی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی حیرت بھی دیدنی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، ایسے ہی میرا خیال تھا کہ ان کو چھو کر درد کی جگہ پر ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہیے مگر اللہ نے انھیں آرام دے دیا۔" میں کچھ شرمسار سا ہو کر واپس دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

"یہ۔۔۔ میرے دوست دراصل خانم! یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ابلیس کو بھی تو خدا نے غیر معمولی طاقتیں دے رکھی ہیں اور یہ وہی ہیں۔"

"ارے تو بکواس نہ کیا کر۔ لا ادھر سگریٹ نکال۔ جائیں خانم اب آپ آرام کریں۔"

"آرام تو میں روز ہی کرتی ہوں جناب سردار صاحب! آج تو ہمارے کام کا دن ہے۔ آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے کھانا بنواتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خوشی اور انبساط کے ہلکورے میں ناچتی ہوئی اندر چلی گئی۔

آبی اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ "عورت خوش ہو تو وہ ماحول کو کتنی تیزی سے اجال دیتی ہے، اسے دیکھو ذرا، یہ کتنی پریشان تھی مگر اب اس کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔"

"ہاں شاید وہ مجھے کوئی بہت ہی درویش صفت آدمی سمجھ رہی ہے۔"

"ہاں بات یہی ہے مگر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ تمھارے ہاتھ میں ایسی کیا گیدڑ سنگی ہے؟"

"پتہ نہیں اس سے پہلے بھی لاہور میں یہ واقعہ پیش آ چکا ہے وہ جو لکھوڈیر کا ڈرائیور تھا، اس نے بھی یہی محسوس کیا تھا اس کی لڑکی سخت بیمار تھی مگر وہ میرے ہاتھوں سے ایک دم شفا پا گئی۔"

"ہاں تم نے بتایا تھا، مگر میں نے خیال ہی نہیں کیا۔ کسی سیانے کو تمھارا ہاتھ دکھانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے تم واقعی کوئی کرنی والے آدمی بن چکے ہو۔"

"دیکھ تو اس قسم کی بکواس نہ کیا کر۔ تجھے تو پتہ ہے تجھ سے تو کوئی بات نہیں چھپی ہے کہ میں کس قسم کا درویش ہوں۔ کیا خیال ہے تیرا، کوئی مجھ ایسا آدمی اس راستے پر چل سکتا ہے؟

ہو سکتا ہے خدا نے تمھیں یہ تاثیر دے رکھی ہو۔ چور سے لوگ قطب بن جاتے ہیں، ہو سکتا ہے تم بھی۔۔۔۔"

"نہیں ادے! خواہ مخواہ چکر نہ دے مجھے۔۔۔ دراصل خانم کو ایک محبت بھرے، پرخلوص ہاتھ کی ضرورت تھی۔ وہ صدیوں سے کسی ایسے ہاتھ کے لیے ترس رہی تھی جب میں نے اس کے معدے پر ہاتھ رکھا تو میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ تہہ دل سے یہ میری آرزو تھی۔ اس ہاتھ میں بڑا خلوص تھا، ایسا کہ وہ اس کی نسوں میں اتر گیا۔ اس میں میرا اعجاز کوئی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے مگر تم اس خانم کے سامنے اب ایسے ہی پیر بنے رہو۔ کیا حرج ہے؟ ذرا خاطر مدارات ہوتی رہے گی۔"

"ہاں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے، اب وہ تمھاری سمجھو داسی بن کر رہے گی۔"

"مگر یار وہ لڑکی پھر نظر نہیں آئی؟"

"وہ جو دروازے پر آئی تھی؟"

"ہاں۔ میں اسی کے انتظار میں ہوں، اس کا ناک نقشہ، اس کا فریم ورک نہیں دیکھا تم نے، بڑی قاتل شے تھی وہ۔"

"ہاں اس کی تو پولیس میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے کہ یہ قتل عمد کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"بعض نکتے تمھاری بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئی؟"

"آ جائے گی، ادھر ہی ہو گی کہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے لاہور میں اس آدمی کا پتہ کیوں نہیں کیا جس سے گل خان، شب خیر کے بارے میں پوچھنے گیا تھا؟" آبی نے اچانک موضوع بدل دیا۔

"مجھے پتہ تھا یار! کہ وہ لاہور میں نہیں ہو گی۔" یہ گل خان ایسے ہی گل مار رہا تھا۔ لاہور کی سیر کے لیے اس نے بہن جی سے بہانہ کیا ہو گا، ورنہ تو یہ دانی کے شکنجے میں پھنسا تھا۔"

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر بہن جی کو وہ بچہ نہ ملا ہوتا تو اب تک وہ شب خیر کا پیٹ چاک کر چکی ہوتی۔"

"یہی مجھے حیرانی ہے۔ گل خان آ جائے تو معلوم ہو۔ ہم اس کی واپسی پر ہی قندیار جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ وہ سالی ابھی تک باہر نہیں نکلی ہے آخر یہ قصہ کیا ہے؟" آبی کا ذہن ابھی تک اس لڑکی کے گرد گھوم رہا تھا جس کا ابھی نام تک معلوم نہیں تھا۔

"اس بریف کیس کو لے جا کر باہر دھوپ میں ڈال دے سارے نوٹ اور کپڑے بھیگ چکے ہیں۔"

"ہاں، یہ بہت ضروری ہے تم ادھر ہی بیٹھو اور اس کا دھیان رکھو۔ میں اس کو دھوپ میں ڈالتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ شب خیر کے باغ کی طرف نکل گیا۔

اچانک شب خیر کی ملازمہ سگو باہر آ گئی۔ وہ میرے لیے کباب بنا کر لائی تھی۔ پلیٹ بھری ہوئی تھی جس کے ساتھ دوسری پلیٹ میں چٹنی اور سلاد تھا۔ اس نے مجھے بڑے مودب طریقے سے سلام کیا اور بولی۔ "یہ لیں، یہ کباب کھائیں۔ خانم ابھی آتی ہیں۔"

"تم کہاں تھیں؟ ہم تو بہت دیر سے آئے ہوئے ہیں۔"

"میں برتن دھو رہی تھی، اتنا سارا تغار لگا رہتا ہے یہاں۔"

"وہ۔۔۔ وہ کون تھی جس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا تھا؟"

"وہ صاعقہ ہے۔"

"اوہ! ٹھیک ہے، تھوڑا پانی بھی لا دو۔ ان میں مرچیں تو زیادہ نہیں ہیں؟"

"مرچیں تو ان میں تیز ہی رکھی جاتی ہیں مگر بڑے مزیدار بنے ہیں، یہ کھائیں۔ میں پانی لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے لوٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ صاعقہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ اُف میرے خدا! اس کی شان ہی نرالی ہو گئی تھی۔ وہ تنگ سی شلوار قمیص میں ملبوس تھی جس کا رنگ بنفشئی تھا۔ وہ ہاتھ میں گلاس اور جگ پکڑے ہوئے تھی۔ گلاس اور جگ لا کر اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ عطر پتہ نہیں وہ کون سا استعمال کرتی تھی۔ کمرہ اس کی خوشبو سے لد گیا تھا۔ گلاس میز پر رکھ کر وہ بولی۔ "کوئی اور خدمت؟"

"خدمت؟ یعنی میں اور آپ سے خدمت لوں گا؟ کیوں مذاق کرتی ہیں آپ؟ اگر آپ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں، یہ زیادہ بہتر ہو گا۔"

"وہ۔۔۔ وہ دراصل ہمارے باغ میں گھاس زیادہ اُگ آئی ہے، اسے کاٹ دیں تو مہربانی ہو گی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ اس وقت وہ اپنی چاندی کی انگوٹھی سے کھیل رہی تھی۔ خدا جانے کون وہ انگوٹھی اسے پہنا گیا تھا۔

"میں نے گردیزی صاحب کو بھیج دیا ہے، وہ اس وقت باغ میں یہی کام کر رہے ہیں۔"

"سچ!"

"ہاں ہاں! چلیں تو جا کر دیکھ لیں۔"

"اچھا میں بھی دیکھ کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔

وہ باہر نکلی تو میں نے کباب کھانے شروع کر دیے، اسے پتہ تھا کہ کس وقت کس سے کیسا مذاق کرنا چاہیے مگر وہ گھاس کی بات کر رہی تھی یعنی میں اسے گھس کھدا نظر آتا تھا۔ حد ہو گئی۔ اور ہم وہاں سردار کرم نواز بن کر گئے تھے۔ کوئی ایسی سے بھلا کیا کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ جن قدموں سے باہر گئی تھی انہی قدموں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس آ گئی مگر حیرت اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

"وہ۔۔۔ انھوں نے تو ڈھیر سارے نوٹ اپنے سامنے پھیلا رکھے ہیں۔ اللہ! تو یہ اتنے نوٹ! یہ ان کے اپنے ہیں نا؟"

"تو اور کیا ڈاکا مارا ہے انھوں نے؟"

"توبہ توبہ میں تو ڈر ہی گئی۔ اتنے نوٹ تو جوانوں کے پاس نہیں ہونے چاہئیں۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں ہونے چاہئیں۔ وہ بہت امیر آدمی ہے۔"

"جوان۔۔۔ جوان خراب ہو جاتے ہیں جناب! ہاں! اُن کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں، اُن سے آپ وہ نوٹ لے لیں۔" وہ اپنا سانس دبا کر بولی۔ آنکھیں اس کی رنگوں کی ہولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی اُن پر سفیدی غالب آ جاتی تھی، کبھی سیاہی اور کبھی وہ سُرخ ہو جاتی تھیں۔ پتہ نہیں اس میں کیا بھید تھا۔ اس کی آواز کا لوچ مجھے حیران کرتا تھا۔ وہ کہیں اداکارہ ہوتی تو کشتوں کے پشتے لگا دیتی۔ محفلوں کی محفلیں لُوٹ لیتی۔

"یہ کباب کھائیں، بیٹھ جائیں ادھر۔ صاعقہ نام ہے نا آپ کا؟"

"ہائے! آپ کو میرا نام کس نے بتا دیا؟" وہ دوسری کرسی کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اور بڑی دلنواز ادا سے کباب کو چٹنی میں بھگونے لگی۔

"آپ نے اتنے نوٹ کبھی نہیں دیکھے؟"

"جی نہیں اور مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب ہی تو میں نے اُن کو بلایا نہیں۔ دُور سے دیکھ کر آ گئی ہوں۔ کچھ وہ پاگل پاگل سے لگتے ہیں مجھے۔ نوٹوں کو بھلا دھوپ میں سکھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ بھیگ گئے تھے بھئی! بریف کیس نہر میں گر گیا تھا۔"

"وہ اُن کا اپنا ہی ہے نا! کہ نہر میں سے ملا ہے؟ کبھی لوگ اس قسم کی نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔" اس نے آنکھیں جھپکائیں جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

"اور مجھ سے پوچھ رہی ہو۔"

"پھر میں انھیں بلا کر لاتی ہوں، میرا خیال ہے کہ وہ کچھ پچھ کر کے ضرور ہیں۔ ایک نوٹ اٹھا کر سورج کی طرف کر رہے تھے۔"

"خدا کے لیے! اچھے خاصے آدمی کو آپ پاگل سمجھ رہی ہیں، اسے پتہ چل گیا تو وہ آپ کو جان سے مار دے گا۔ غصے کا وہ بہت سخت ہے۔ ہاں۔ یہ لیں یہ کباب کھائیں۔"

اتنے میں شب خیر کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ اب لباس تبدیل کر کے آئی تھی۔ چہرہ اس کا اب بہت تر و تازہ نظر آتا تھا، جس پر اس نے خاصی لیپا پوتی کر رکھی تھی۔

"یہ کباب کھائے ہیں آپ نے؟"

"جی ہاں بہت عمدہ ہیں۔ خاص طور پر جب صاعقہ بیٹھ کر کھلا رہی ہوں۔"

"آپ کے لیے دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ کیسی لڑکی ہے؟ آپ کے خیال میں؟"

"خانم! خدا کے لیے، یعنی آپ ان سے رائے لے رہی ہیں، میرے بارے میں۔"

"تو کیا ہرج ہے۔ یہ گاتی بہت اچھا ہے سردار صاحب مگر مجھے یہ بتائیں کہ جب آپ پہلے آئے تھے تو آپ نے اپنا نام کچھ اور بتایا تھا۔"

"نام میں بھلا کیا رکھا ہے خانم! اس وقت میں نے آپ کو یونہی اپنا نام ہاشم خان بتایا تھا، ورنہ میرا اصلی نام وہ نہیں تھا۔"

"کچھ بھی ہو۔ سردار صاحب آپ میرے لیے بہت قابل احترام آدمی ہیں۔ ایک لڑکی کو بھی آپ یہاں سے لے گئے تھے مگر میں نے اس پر بھی مٹی ڈال دی۔"

"آپ یہ بتائیں کہ آسیہ کے بچے کے عوض آپ نے پچاس ہزار روپے کیوں طلب کیے تھے؟"

"اُسے بہن جی نے منگوایا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنے روپے دے سکتی ہیں۔ ورنہ آسیہ کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا اور پھر میں نے اس کی بہت خدمت کی تھی۔"

"ہوں۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ہر چیز کو سودا سمجھنا آپ ہی کا کام ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہے۔"

"یہ آپ کے دوست کہاں گئے ہیں؟"

"وہ باہر بیٹھے اپنے نوٹ سُکھا رہے ہیں، خانم! اُن کا بریف کیس بھرا پڑا ہے نوٹوں سے۔" صاعقہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ اس کی ہر بات میں شوخی جھلکتی تھی۔

"کیا کہا؟ نوٹ سکھا رہے ہیں، کیا وہ بھیگ گئے تھے؟"

"ہاں! ہمارا بریف کیس پانی میں گر گیا تھا۔"

وہ فوراً ہی صوفے پر سے اٹھ گئی۔ میرا خیال ہے وہ اس کی بات سُن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر وہ عقبی کمرے میں جا گھسی۔ صاعقہ بھی اس کے پیچھے نکل گئی۔ کوئی دس منٹ بعد جب خانم واپس آئی تو وہ مسکرا رہی تھی۔

"آپ ٹھیک ہی کہتے تھے، آپ کے دوست واقعی نوٹ سکھا رہے ہیں، بڑا روپیہ ہے اُن کے پاس۔"

"ہاں! اس کا باپ تازہ تازہ مرا ہے۔ اس کی جائداد بیچ کر وہ کسی ایسے ہی ڈیرے کی تلاش میں تھا کہ اُسے آپ مل گئیں۔"

"ہم تو ہر طرح سے حاضر ہیں سردار صاحب! وہ جتنی دیر چاہیں یہاں رہیں۔ یہاں اب چھ لڑکیاں رہتی ہیں، ہر ایک کی اپنی قیمت ہے۔"

"خیر وہ بھی دیکھ لیں گے ہم۔ میرا خیال ہے کہ گل خان جلدی واپس آ جائے گا۔"

"اسے کم سے کم آنے جانے میں ہی چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ وہ سہ پہر کو واپس آئے گا۔ آپ اتنے میں کھانا کھائیں۔ میں نے سُگو سے کہہ دیا ہے۔"

"اب آپ کے درد کا کیا حال ہے؟"

"درد تو بالکل ختم ہو گیا ہے سردار صاحب! آپ کے ہاتھ نے تو معجزہ دکھایا ہے میں اس بات کو کبھی نہ بھول سکوں گی۔ مجھے تو آج تک کوئی ایسا نہیں مل سکا تھا۔ آپ مجھے کوئی خدمت بتائیں، مجھے دلی خوشی ہو گی۔"

"جی نہیں! میں تو آسیہ کی تلاش میں پھر رہا ہوں خانم! کاش! وہ مجھے مل جاتی۔"

"وہ پھر کبھی یہاں نہیں آئی۔ میں نے تو پھر اس کی صورت ہی نہیں دیکھی ہے۔ میں ذرا باورچی خانے تک جا رہی ہوں، آپ آرام کریں۔ میرا خیال ہے میں آپ کے لیے دوسرے کپڑے نکلوا دیتی ہوں، آپ کا یہ لباس تو بہت ہی میلا ہو چکا ہے۔"

"ہاں! اگر ایسا ہو جائے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں نہانا بھی چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بندوبست کر دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر عقبی کمرے میں جا گھسی۔ کچھ ہی دیر بعد صاعقہ میرے لیے ایک نئی قمیص شلوار اور ایک عمدہ قسم کا سوئیٹر لے آئی۔

"یہ لیں جناب! اسے پہن لیں غسل خانے میں نہانے کا سامان موجود ہے نہا بھی لیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ صاعقہ! آپ تو پی آئی اے سے بھی زیادہ مہمان نواز ہیں۔"

"جی ہاں، مگر وہ نئے کپڑے نہیں دیتے اور ناشتہ آدمی کو گھر سے لے جانا پڑتا ہے۔"

"اُن کی میزبان خاتون تو مثالی ہوتی ہیں نا۔" میں نے اس سے کپڑے لے لیے۔

"جی ہاں۔ بہرحال آپ نہا لیں اور پہلے اپنی قل ھو اللہ پڑھ لیں، کیا پتہ آدمی کی بتی کہاں گل ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟ کیا میرے مر جانے کے امکانات غسل خانے میں زیادہ ہیں؟"

"آپ۔۔۔ آپ آدھے تو مر ہی چکے ہیں۔ آپ کی آنکھیں یہی بتا رہی ہیں، ذرا آئینے میں اپنی شکل ضرور دیکھ لیں۔"

"میں آپ کو نیم مردہ نظر آتا ہوں؟ کیسی بات کرتی ہیں آپ؟"

"آئی تو میں بھی مر چکی ہوں۔" اس نے بڑے تجاہل انداز میں یہ بات کہی اور باہر نکل گئی۔

میرا خیال ہے شب خیر نے اُسے ہمارے بارے میں کوئی اور سبق پڑھا دیا تھا کیونکہ نوٹ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے اور اب وہ جاذبیت کی مرتکب ہونے لگی تھی۔ کہاں تو وہ دوپٹے سے ہی الجھتی پھر رہی تھی اور یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ پردے کی بہت پابند ہے اور غیر کے سامنے منہ نہیں کھولتی اور کہاں اب یہ حال تھا کہ وہ اپنے نیم مردہ ہونے کی خبر مجھے سنا رہی تھی اور دوپٹے نام کی کوئی چیز اس کے جسم پر نہیں تھی۔ یہ بھی اس عشوہ فروش کی ایک ادا تھی جسے میں نے دل سے قبول کر لیا تھا۔۔۔ اس جیسی تو میں نے کوئی خال خال ہی دیکھی تھی مگر۔۔۔ مگر جانے کیا بات تھی دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی وزن تھا، ان تُلا وزن جو مجھے اوپر نیچے اوپر نیچے لیے جاتا تھا۔

صاعقہ دروازے میں پہنچ کر دوسری طرف نہیں گئی بلکہ نشست گاہ میں لوٹ آئی، بولی۔ "آپ کو پتہ ہے غسل خانہ کہاں ہے؟"

"جی نہیں۔ میں نے تو یہ مکان اب تک اندر سے نہیں دیکھا ہے۔"

"ہاں۔ آدمی کو اور مکان کو سمجھنے کے لیے اس کو اندر سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے آئیے میرے ساتھ۔" وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف لوٹ گئی مگر اس شوخ دیدہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنا دایاں ہاتھ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ اپنی انگلی مجھے تھماتی ہوئی بولی۔ "اب! اچھے بچوں کی طرح چپ چاپ میرے پیچھے آ جائیے۔"

"یہ ابھی رہی۔ آپ کی انگلی کی بھی تو ایک قیمت ہو گی۔"

"یہ آپ کو نمونے کے طور پر دکھائی گئی ہے آپ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔" وہ اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی مگر ہونٹ اس نے سختی سے بند کر لیے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مجھے ایک راہداری میں سے گزار کر غسل خانے تک

لے گئی، بولی "اب آپ آنکھیں کھول لیں اور اندر گھس جائیں، خدا حافظ" اس نے اپنی انگلی چھڑاتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے نکل گئی۔

غسل خانے پر شب خیر کی محنت میرے لیے حیران کن تھی۔ اس کی دیواروں کے زیریں حصے پر خوبصورت سفید ٹائلیں لگی تھیں۔ اور اُن کے اوپر چاروں طرف قدِ آدم آئینے لگے تھے۔ جن کی وجہ سے آئینہ جھلملاتا نظر آتا تھا۔ غسل خانے میں خوشبو چھڑک دی گئی تھی۔ ایک ٹب دیوار کے ساتھ نصب کر دیا گیا تھا جس میں نیم گرم پانی ڈال دیا گیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہت ہی حسین اور دلآویز غسل خانہ تھا۔ میں بہت دیر تک اس ٹب میں بیٹھا نہاتا رہا۔ پانی وہاں سرد بھی موجود تھا اور گرم بھی۔ اور شب خیر کو معلوم تھا کہ اس کے گاہک کی پسند اور ناپسند کیا ہے۔ پتہ نہیں وہ اتنے اونچے پیمانے پر اپنا دھندا اس شہر میں کیسے چلا رہی تھی حالاں کہ وہ بڑے غیرت مند لوگ تھے۔ ایسی عورتوں کو تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی آگے نہیں نکلنے دیتے تھے مگر وہ وہاں موجود تھی۔ اور اس کے گاہک کہاں کہاں سے اس گھر میں آتے تھے، اُن کی وہاں کوئی بھیڑ بھاڑ بھی نہیں تھی مگر جو کوئی بھی آتا تھا کیسے بھر کر لاتا تھا، اور نہیں نہال رہتا تھا۔ اس گھڑی بہرحال ہمارے سوا وہاں کوئی موجود نہیں تھا اور یہ اچھی بات تھی۔

میں نے نہا کر نیا لباس بدلا اور پھر راہداری میں سے ہوتا ہوا واپس نشست گاہ میں پہنچ گیا۔

اس وقت تک آبی کمرے میں واپس آچکا تھا اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے نئے لباس میں دیکھ کر بولا "یار! یہ کپڑے تمھیں کہاں سے مل گئے؟ میانوالی کا یہ کرتا تو تمھیں بہت سجتا ہے۔"

"ہاں۔ وہ صاعقہ دے گئی تھی مجھے۔ میں نے سوچا چلو نہا ہی لیتے ہیں مگران کا غسل خانہ اتنا خوبصورت ہے کہ اس کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔"

"ہاں ایسی چیزوں پر تو تمھیں بہت دھیان دینا چاہیے۔ یہ نوٹ اور باقی چیزیں میں نے سکھا دی ہیں، اب تم بیٹھو، میں بھی نہا لیتا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ شب خیر کا ڈائننگ روم بھی منفرد تھا۔ ہمارے سامنے صاعقہ، سلمیٰ، سطوت، بشریٰ اور چنار کو بٹھا دیا۔ ان تینوں سے وہ پہلی بار ہمارا تعارف کروا رہی تھی۔ وہ بھی نک سک سے بہت ہی درست لڑکیاں تھیں مگر ان میں وہ شوخی اور چنچلتا مفقود تھی جس کی صاعقہ کے وجود میں دھوم مچی تھی۔ اُن کی عمریں بھی اٹھارہ اور پچیس سال کے درمیان ہوں گی۔ رکھ رکھاؤ البتہ ہمیں بہت متاثر کرتا تھا۔ چنار تو مجھے ہی پُروقار نظر آتی۔ پتہ نہیں شب خیر نے انھیں کہاں سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر نظر آتی تھی ... ہوگئی۔ ایک ایک کے چہرے سے آرتی اُتار رہا تھا ... ایسا جمگھٹا اس نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ پتہ نہیں اس وقت الماس بھی یاد آ رہی تھی کہ نہیں۔ وہ سب موجود تھیں ... خوبیاں بھی جداگانہ تھیں، چنار کے بارے میں شب خیر ... وہ بہت اچھا گاتی ہے۔ سطوت خالصتاً اردو زبان ... اور اس کا لب و لہجہ بتاتا تھا کہ وہ کوئی اور زبان نہیں جانتی ... بشریٰ البتہ سندھی بھی سمجھتی تھی اور پنجابی بھی۔ اسے ہندکو ... بھی اور پشتو بھی مگر وہ زیادہ تر پنجابی ہی میں بات کرتی ...

"یہ نورتن آپ نے کیسے جمع کر لیے ہیں خانم! میں تو ... دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

"یہ سب میری بیٹیاں ہیں، کماؤ بیٹیاں۔ یہ میرا ... رکھتی ہیں اور میں انھیں جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہوں ... گریجویٹ ہے سطوت اور چنار بھی پڑھی لکھی ہیں۔"

"بس ایک میں ہی اَن پڑھ ہوں ان میں ورنہ تو ... پی ایچ ڈی ہیں سردار صاحب! ہاؤ ڈو یو لائک دیٹ ..." صاعقہ نے چنار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے سامنے تو کسی کا دیا نہیں جل سکتا ہے ... آپ نے شاید آئینہ نہیں دیکھا ہے ایک عرصے سے۔"

"ہاں۔ وہ بھی تڑاک سے ٹوٹ جاتا۔ اک نظر ... کی بات تھی۔" آبی نے لقمہ دیا۔ وہ پانچوں میز کی دوسری ... اس طرح بیٹھی تھیں کہ صاعقہ، چنار، بشریٰ اور سطوت سامنے تھیں دائیں بائیں سلمیٰ اور شب خیر بیٹھی تھیں ... ہماری خدمت پر مامور تھی۔

کھانا بہت عمدہ پکا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ... نشست گاہ میں جا بیٹھے مگر یوں کہ میرے ساتھ صرف ... ہی وہاں تک آئی۔ آبی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن سے کوئی بات طے کر لی تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ دوسرے ... کی طرف چلا گیا۔

شب خیر کا خیال درست نکلا۔ گل خان کوئی ... چار بجے واپس آیا۔ اس طرح کہ اس کی بدحواسی دیدنی تھی ... دروازے پر رُک کر وہ سیدھا نشست گاہ میں آگیا ...

"غضب ہوگیا سردار صاحب! وہ بچہ تو بہن جی ... نہیں پہنچا ہے۔"

"یہ کیا کہتے ہے آپ! وہ آدمی جو میرے پاس آئے تھے اُن میں سے ایک کا نام شمشاد تھا اور دوسرے کا مرشد۔ وہ مجھ سے یہی بتا کر گئے تھے، کاغذ پر اُن کے دستخط موجود ہیں۔"

"آپ کے ساتھ بھی شاید دھوکا ہوا ہے خانم! سندھو اور مسولینی میرے ساتھ آئے ہیں اور باہر کار میں بیٹھے ہیں۔ وہ تو آپ کے پاس نہیں آئے تھے؟"

"اچھا انھیں اندر بلائیں، ٹھہریں میں خود دیکھتی ہوں۔ نہیں جی، آپ بھی دیکھیں انھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے!" یہ کہہ کر وہ مجھے اور گل خان کو ساتھ لے کر تیزی سے باہر نکلی۔ کار ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اور وہ دونوں آدمی اس میں موجود تھے۔ ایک سندھو دوسرا مسولینی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی کار سے باہر آگئے۔

"کیا وہ لوگ یہی تھے؟" گل خان نے پوچھا۔

شب خیر پاگل ہو گئی، بولی "نہیں نہیں ... یہ تو وہ آدمی نہیں ہیں خان صاحب! یہ تو وہ آدمی نہیں ہیں۔"

"یہی تو ہم پوچھتے ہیں بی بی! آخر وہ تھے کون؟ بہن جی کا نام لے کر انھوں نے بچہ آپ سے لے لیا۔ کتنے پیسے دیے تھے انھوں نے آپ کو؟" مسولینی ایک دم غضبناک ہونے لگا۔ "میں پوچھتا ہوں وہ کون لوگ تھے؟ بہن جی تو تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ بتاؤ کیا حلیہ تھا اُن کا؟"

شب خیر کا رنگ پیلا ہونے لگا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھال رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ ٹھہرا دیا مگر اس کا ذہن ہی قابو میں نہ تھا۔ میں نے انھیں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آئیں اندر چل کر بات کرتے ہیں مسولینی آپ بھی اندر آجائیں۔"

"السلام علیکم ہاشم صاحب! اس چکر میں میں آپ کو بھی نہ پہچان سکا۔" اس نے بڑے تپاک سے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"اچھا تو یہ ہاشم صاحب ہیں۔" سندھو نے میری طرف بڑھ کر کہا۔

"آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں میرا خیال ہے خانم کے ساتھ کسی نے زبردست دھوکا کیا ہے۔"

میں اُن کو ساتھ لے کر نشست گاہ میں لوٹ آیا۔ کار کا ڈرائیور باہر ہی رہ گیا تھا۔ شب خیر کی پریشانی سہہ چند ہو گئی تھی۔ وہ نشست گاہ میں آئی تو سہی مگر یوں جیسے وہ باؤلی ہو گئی ہو۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا سردار صاحب! وہ کون تھے آخر؟ اپنا نام وہ شمشاد اور مرشد ہی بتا رہے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ انھیں بہن جی نے بھیجا ہے، پہلے دن میں نے ان کو ٹال دیا کہ میں پچاس ہزار سے کم نہیں لوں گی۔ وہ چلے گئے مگر دوسرے دن وہ رقم بھی لے آئے، میں نے بچہ اُن کے حوالے کر دیا۔ شک کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نام وہ برابر بہن جی کا لے رہے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے ساتھ اتنا بڑا فریب ہو رہا ہے۔"

وہ صوفے پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ اس نے آنکھوں پر ڈال لیا تھا۔ شاید وہ رونے لگی تھی۔ اس کی آواز تھرتھرا سی گئی تھی۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا چھانے لگا۔ سندھو اور مسولینی بھی حیرت زدہ تھے۔ انھیں بہن جی کے غصّے کا علم تھا۔ وہ تو زمین آسمان ایک کر دیتیں۔ پتہ نہیں بچے کے بارے میں وہ کیا سوچ رہی تھیں۔

میں نے گل خان سے پوچھا "تمھاری بہن جی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"جی ہاں! میں اُن سے مل کر آیا ہوں۔ بچے کے بارے میں سُن کر وہ سخت پریشان ہو گئی تھیں۔ اگر وہ خود پردے میں نہ ہوتیں تو شاید وہ میرے ساتھ ہی آجاتیں۔ میں تو اب ان کا سامنا نہیں کر سکتا۔"

"اور ہم کہاں کر سکتے ہیں؟ وہ تو سخت طیش میں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے سے اتنی دل چسپی کس کو ہو سکتی ہے، کیوں کوئی اس کے لیے اتنی رقم خرچ کرے گا؟" سندھو نے میرے چہرے کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں سندھو! آخر وہ تھے کون؟ انھیں بچے سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟"

اتنے میں آبی بھی عقبی کمرے کی نشست گاہ میں واپس آگیا۔ ہم سب کو یکجا دیکھ کر اس کا ذہن اُلجھنے لگا۔ گل خان بھی اس کے سامنے تھا۔ اُسے دیکھ کر بولا "کیا خبر لائے ہو گل خان! خیر تو ہے، یہ مسولینی اور سندھو بھی آگئے ہیں کیا حال ہیں آپ کے؟"

"ٹھیک ہی ہیں حضور! مگر یہ بچے کا معاملہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

"بہن جی اس کے بارے میں بالکل لاعلم ہیں، بچہ تو کوئی اور ہی آدمی لے گیا ہے۔"

"کیا! یعنی وہ بہن جی کے پاس نہیں پہنچا ہے؟" آبی نے حیرت سے کہا۔

"نہیں۔ خانم کے ساتھ کوئی زبردست دھوکا کر گیا ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ اس کو دیکھو بھئی! وہ آسیہ تو پاگل

ہو جائے گی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوئی ہے۔"

"کہاں دیکھیں؟ وہ کوئی اپنا پتہ چھوڑ گئے ہیں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، اِس بچے میں اور کسے دل چسپی ہو سکتی ہے؟ وہ کتنے کے بچے خانم کو پچاس ہزار روپے بھی دے گئے ہیں۔" آبی بھی نڈھال سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

شب خیر ابھی تک دوپٹے میں منہ چھپا کر بیٹھی تھی۔

"آپ کو تو معلوم ہوگا کہ کوئی اور اِس بچے میں کیسے دلچسپی لے سکتا ہے؟" مسولینی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ گولیوں سے اَٹی پیٹیاں باندھ کر آئے تھے جو اُن کے پستولوں سے لگی گلے سے لٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی بہت زیادہ خونخوار آدمی تھے۔ اُن کے چہروں سے ایسی بہیمیت برستی تھی کہ اُن کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ گل خان کا بھی یہی حال تھا مگر وہ مسلسل سفر کی وجہ سے تھکا تھکا سا نظر آتا تھا۔

"کچھ بتائیں ہمیں ہاشم صاحب! ہماری یہ مشکل آپ ہی حل کر سکتے ہیں ورنہ ہم بہن جی کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام لاکھو لاشاری کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا ہے، وہ۔۔۔ وہ اس بچے کا باپ ہے یارو! اب تم سے کیا پردہ۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ آسیہ ہماری بہن ہے۔ وہ جیل میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح لاشاری کے ہاتھ آ گئی۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہ بچہ میرا خیال ہے اُسی کے پاس ہوگا۔" آبی نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جو میرے حلق تک آ کر واپس چلی جاتی تھی۔ مجھے اُن تینوں آدمیوں کے سامنے بہرحال شرمسار ہونا تھا۔ وہ دن بھی میری تقدیر میں تھا کہ میں اُن لوگوں کے سامنے نظریں جھکا لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا کہا آپ نے! آسیہ آپ کی بہن تھی، سگی بہن؟" مسولینی نے پوچھا۔ سگریٹ کا دھواں اس کے گلے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"ہاں۔ یہ بہت المناک کہانی ہے مسولینی صاحب! مگر حقیقت یہی ہے۔"

"یہ لاشاری کون ہے؟ اس کا کچھ اتا پتہ معلوم ہے آپ کو؟"

"ہاں۔ وہ سندھ میں رہتا ہے، ہم اس سے مل چکے ہیں، وہ ہمارے ساتھ ہی آ رہا تھا کہ اُسے پولیس نے زخمی کر کے قید میں ڈال دیا۔ میرا خیال ہے اب وہ پھر چھوٹ گیا ہے اور سیدھا وہ اپنے بچے کے پیچھے لپکا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔" آبی نے دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دیتے ہوئے کہا۔

شب خیر نے یہ بات سُنی تو بولی "کیا حلیہ ہے اس کا؟"

"جوان آدمی ہے، کوئی چھ سوا چھ فٹ قد ہے اُس کا۔ بہت طرحدار جوان ہے خانم۔"

"نہیں نہیں، وہ لوگ جو میرے پاس آئے تھے ان کا ... نہیں تھا۔ اُن میں سے ایک ناٹے قد کا آدمی تھا، قد اس کا ... فٹ ہوگا مگر بہت گٹھے ہوئے بدن کا تھا۔ دوسرا اس سے کوئی چار انچ زیادہ اونچا ہوگا۔ ایک کے ماتھے پر زخم ... نشان تھا۔ انھوں نے قمیص شلوار پہن رکھی تھیں اور نیچے انھوں نے پستول ڈال رکھے تھے۔ گاڑی بھی ان کی تھی، نیلے رنگ کی، شاید ٹیوٹا تھی۔"

"ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ وہ۔۔۔ میرا خیال ہے لاشاری کے آدمی ہوں گے۔ کیا خیال ہے سردار صاحب" آبی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میری آنکھوں میں ... دیکھ کر وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ مجھے اپنے اردگرد ... سُرخی نظر آ رہی تھی۔ وہ لاشاری جسے میں سندھ کے ... میں زخمی چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ جو میری گولی کی زد سے ... جس نے آسیہ کے لیے بڑے آنسو بہائے تھے جیسے ... وہ کسی نہ کسی طرح اس کے پاس رہ جائے۔ وہ پھر میرے ... ابھر آیا تھا اور اب میں اسے ایسی حالت میں دیکھ رہا ... میرے خنجر اُس کے بدن میں گہرے دھنسے ہوئے تھے ... کا خون فوارے کی طرح بہتا نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" گل ... نے اپنے بڑے بڑے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میرے چہرے کے بدلتے رنگ ... سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اُسے کیا معلوم کہ اس گھڑی ... قدر زخمی ہو رہا تھا۔

وہ بچہ آسیہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور یہ ... بچے کی وجہ ہی تھی کہ لاشاری اُس کے پیچھے دیوانے کی طرح بھاگتا رہا تھا اور اب وہ اُسے لے اُڑا تھا۔ بچے کی گمشدگی آسیہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ لاشاری کا مقصد پورا ہو گیا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا تھا کہ لاشاری اپنا ... نہیں چھوڑتے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا خواہ وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی چھلکے نہیں گئے۔ بُرائی کی ... نہیں چلے۔ اپنا خون وہ باندھ کر رکھتے ہیں۔ کسی کے ... بھلے گئے، یہی چیز ان کو بچاتی چلی آ رہی ہے۔ اُن کی ... ہمت اور دلیری صرف اسی وجہ سے بے مثل ہے کہ وہ خود کو ہر قیمت پر بچا کر رکھتے ہیں اور اگر کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو پھر وہ بچے کو جان دے کر بھی واپس ... ہیں۔ وہ یہی کہہ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہر قیمت ...

اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ بچے کی ولادت کے بعد وہ آسیہ کو جیسے چاہے گا ذلیل کر سکے گا مگر وہ اس مرحلے پر پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ آئی تھی اور اب وہ بے بس کر دی گئی تھی۔ لاکھو اپنا دوسرا مقصد بھی پورا کر چکا تھا۔ اور کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کا ہاتھ روک سکے۔

مجھے افسوس ہے یارو کہ میری یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے مگر۔۔۔ مگر اسے کیا کہیے کہ میں۔۔۔ میں اپنے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور کامیابی تو کوئی شرط بھی نہیں ہے۔ میں کہوں میرا سفر ہی ختم نہیں ہو رہا تھا تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ ناکامیاں بھی تو زندگی کا حصہ ہیں۔ مجھے نہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ میرے وجود کا ہر حصہ کیسے بکھر کر مجھ سے الگ ہوتا چلا گیا۔ کیسے کیسے زخم میں نے اس راہ میں اٹھائے اور ابھی مجھے پتہ نہیں یہ پہاڑ ایسی زندگی مجھ سے کیا کیا کچھ طلب کرے۔ وہ ناجائز بچہ تھا مگر کیا محض اس کو ناجائز کہہ دینے سے میری بہن آسیہ کا تعلق اس سے ختم ہو سکتا تھا؟ اس کو جنم دے کر وہ آپ ہی آپ لاشاری سے منسلک ہو گئی تھی۔ اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں عورتیں ایسی ہوں گی جو دل میں نہ نہ کہتے ہوئے بھی نکاح کے ایجاب و قبول میں شامل سمجھ لی جاتی ہیں۔ کوئی نہیں جو اُن کے دل کی نہیں نہیں کو سمجھ سکے۔ انھیں علم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ دھکا اور دھوکا ہو رہا ہے۔ وہ اس ڈولی سے نفرت کرنے کے باوجود اس میں بیٹھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ کتنے نکاح ہیں جو دل کی رضامندی سے کیے جاتے ہیں۔ دو فیصد بھی نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب کوئی عورت ماں بن جاتی ہے تو خدا بھی نہیں چاہتا ہے کہ اس کا بچہ اس سے یوں نوچ کر الگ کر دیا جائے۔ پھر۔۔۔ پھر یہ لاشاری کو ایسی جرأت کیسے ہوئی کہ اس نے ایک ماں کو اس کی ممتا کے جذبے سے محروم کر دیا تھا۔ میری سوچ اسی ایک نکتے پر رک گئی تھی۔ وہ کیسا ہی سوہنا جوان کیوں نہ ہوتا، دونوں طرف سے وہ زیادتی کا مرتکب ہوا تھا اور وہ پھل بھی اُچک کر چلتا بنا تھا۔ جب آسیہ نے یہ بات سنی ہوگی تو اس پر تو موت وارد ہو گئی ہوگی۔ ایسے میں اس کے آنسو کس نے پونچھے ہوں گے؟ مجھے اپنے چاروں طرف خون ہی خون بکھرا نظر آتا تھا۔ میں لاشاری کی کھال کھینچ لینا چاہتا تھا مگر میری بے بسی دیکھیں، میں ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں گل خان! وہ۔۔۔ وہ لاشاری ہی ہے۔ ہاں، لاکھو لاشاری۔ میں۔۔۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔ یہ آسیہ کا قرض ہے جو مجھے ادا کرنا ہوگا۔" میں لاشعوری طور پر پستول نیفے کی تہہ سے نکال کر مُنہ تک لے گیا اور اُسے چوم کر میں نے تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے اور میری بہن کو ایک اور خوفناک مرحلے سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی ممتا کا جذبہ بار گیا تھا اور میں ہمشیرہ کی محبت میں فنا ہونے جا رہا تھا۔ پھر میری آزمائش کے دن آ گئے تھے۔ شب خیر کا وہ آرام دہ گھر میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے اُٹھ جانا چاہیے تھا۔ میں اِن لوگوں کی محبتوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا جو اگرچہ پیسے کے لیے تھیں مگر پھر بھی وہ دل کو ایسا سکون پہنچاتی تھیں جسے مدتوں فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے پھر لاشاری کی تلاش میں نکلنا تھا اور اب کی بار شاید میں اسے زندہ نہ چھوڑوں کہ وہ جس رشتے میں مجھ سے منسلک ہو گیا تھا، وہ اور زیادہ بے ثبات نظر آنے لگا تھا۔ آسیہ اُس کی بن بیاہی دلھن، غلام جیلانی کی سگی بہن سر پیٹ کر رہ گئی ہوگی۔ لاشاری کے گھر کا پتہ اسے بھی معلوم تھا۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے پہلے ہی اس کے تعاقب میں نہ نکل گئی ہو۔

"تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے گل خان کہ آسیہ اس وقت کہاں ہے؟"

"اُسے تو ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے سردار صاحب! ایک بہن جی ہی اس کا نام لیتی ہیں ورنہ وہ کوئی سچ مچ کی چیز تو نہیں ہے۔" گل خان نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ وہ محض ایک وہم ہو کر رہ گئی ہے۔ آؤ پہلے مجھے بہن جی سے ملوا دو اور وہ خود کیوں اس بچے کے لیے اتنی پریشان ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے سردار صاحب! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے ساتھ فریب کر رہے ہیں۔ ورنہ میں بچہ انھیں کبھی نہ دیتی۔" شب خیر نے اپنی شرمندگی کو مٹاتے ہوئے بالآخر منہ سے دوپٹہ اتار دیا۔ وہ واقعی رو رہی تھی اور اس کی آنکھیں پتہ دیتی تھیں کہ اسے بھی اس پریشانی نے کُملا کر رکھ دیا تھا۔

"چل یار! اُٹھ یہاں سے، ہمیں آج ہی بہن جی سے مل لینا چاہیے۔ پتہ نہیں کس کس کی موت آئی ہے ہمارے ہاتھوں۔" آبی نے مجھے صوفے پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ پھر بولا "اُٹھ جا اب! اس قصے کو ختم ہونا چاہیے۔ آسیہ اُدھر ہی ہوگی، مجھے یقین ہے بہن جی ہمیں زیادہ دیر تک بیوقوف نہیں بنا سکیں گی۔"

"بہت سوچ سمجھ کر بات کریں بھائی جی! بہن جی کے بارے میں ہم ایک لفظ سننے کو تیار نہیں ہیں۔ اُن سے زیادہ آسیہ کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہوگا۔" مسولینی نے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ اس کا چہرہ کم از کم یہی بتا رہا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے مسولینی صاحب! دراصل..... آخر بہن جی کو صحیح بات بتانے میں کیا حرج نظر آتا ہے؟" آبی نے اس کے تیور دیکھ کر ٹھٹکتے ہوئے کہا۔

"آؤ یارو، ہمیں اُن سے مل ہی لینا چاہیے۔" گل خان نے کہا۔ وہ تینوں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا خانم! ہمیں اجازت دیں ہم پھر آئیں گے آپ نے ہماری بڑی عزت افزائی فرمائی ہے۔" آبی نے بڑے کھنکتے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ یہ میرا فرض تھا۔ میں بہرحال آپ کے لیے چشم براہ رہوں گی، آپ واپسی پر یہاں ضرور آئیں۔"

"آپ کی نوازشیں ہمیں ضرور یاد آئیں گی خانم! ہم واپسی پر ضرور آئیں گے۔" یہ کہہ کر آبی خانم سے پوچھے بغیر ہی عقبی کمرے میں جا گھسا۔ اس عرصے میں میں اُن تینوں کو ساتھ لے کے صحن میں نکل آیا۔ گاڑی دروازے کے باہر کھڑی تھی اور اُس وقت شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا۔ ڈرائیور بیچارہ پریشان ہو رہا تھا جب ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ "صاحب جی! میں نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ میرا خیال ہے مجھے اب آپ جانے دیں ہوٹل اور انتظام کر لیں گے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ چلو ہم تمہیں کسی ہوٹل میں کھانا کھلاتے ہیں مگر ابھی ہمارا سفر تو ختم نہیں ہُوا۔"

"مجھے دفع کریں جی آپ سے بھی بال بچے ہیں۔ میں زیادہ دیر تک اُن سے دُور نہیں رہ سکتا۔"

"نہیں یار! یہ تو اچھا نہ ہوگا۔ بس کل صبح ہم تمہیں ضرور چھوڑ دیں گے، یہ وعدہ رہا تم سے۔" میں نے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ گل خان، سندھو اور مسولینی پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور چپ ہی رہ گیا پھر اس نے کچھ نہ کہا۔

کوئی دس منٹ بعد آبی بھی باہر آ گیا اس کے پیچھے دروازہ صاعقہ نے بند کیا۔ ایک ہیجانی مسرت آبی کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اگلی سیٹ پر میرے ساتھ ہی آ بیٹھا۔

"سواریاں زیادہ ہو گئی ہیں کیا خیال ہے؟"

"ہاں مگر کوئی بات نہیں۔ چھ آدمی بھی بیٹھ سکتے ہیں۔" ڈرائیور نے اس اثنا میں گاڑی بڑی سڑک پر ڈال دی تھی۔ ایک جگہ رُک کر ہم نے اسے ہوٹل سے کھانا کھانے کی اجازت دے دی۔ سندھو اور مسولینی بالکل چپ تھے۔ گل خان کا بھی یہی حال تھا۔ لگتا تھا اُن کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ بہن جی کا سامنا کرتے ہوئے انہیں خوف آ رہا تھا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دیں گے۔ وہ ایک عجیب قسم کا عذاب سہہ رہے تھے۔ وہ تو اپنی اس بہن جی کے لیے جان دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ پتہ نہیں اُس نے اُن کی کس انداز سے تربیت کی تھی۔ [illegible] بہن جی نے کیسا عہدِ وفا لیا تھا۔ اس کے سوا وہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کا مظاہرہ بھی میں پچھلی بار دیکھ چکا تھا۔ [illegible] نے مکرم علی گورایا کو بے دریغ مار دیا تھا۔ ذرّہ بھر رحم نہیں کیا۔ جب وہ اس کی حویلی پر چڑھ دوڑے تھے تو اس وقت [illegible] ان کی یہی حالت تھی۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتے تھے مگر [illegible] نڈھال ہو رہے تھے۔ وہ بہن جی کو کیا جواب دیں گے؟ وہ [illegible] کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ وہ ایسی جگہ آ رُکے تھے جہاں [illegible] پستول اور خنجر کام نہیں دیتے تھے مگر جہاں اُن کے ہتھیار [illegible] ہوتے وہاں اُن کی عقلیں بھی اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ کاش وہ کھولاشاری کہیں آس پاس ہی ہوتا تو وہ اس سے [illegible] ہی واپس جاتے مگر اب تو وہ سراب ایسی کیفیت اختیار کر گیا [illegible] ایسے میں وہ اپنے نادیدہ دشمن سے کیا کہتے؟ اس نے جس [illegible] شب خیر کو لوٹ لیا تھا، وہ ایسی بات تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب وہ بہن جی کی طرف خالی ہاتھ لوٹ [illegible] تھے اور یہی ندامت انہیں کھائے جا رہی تھی۔ میرا بھی یہی حال [illegible] میں بھی تو بہن جی کے پاس خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ میں بھی اس کا [illegible] نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں میں اُسے راستہ ضرور سمجھا سکتا تھا۔ [illegible] بتا سکتا تھا کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے۔ اس کی انہیں خبر تک ہو گی مگر شاید..... شاید آبیہ نے اسے بتا دیا ہو۔ کوئی [illegible] بھی تو اس بہن جی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا [illegible] شب خیز لاہور گئی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ بات غلط تھی مگر وہ [illegible] سے غائب ضرور رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہسپتال میں ٹھہری تھی۔ ایسے میں اگر بہن جی نے بچے کے بارے میں سوچا [illegible] تو غلط نہیں کیا تھا۔ وہ اُس سے ہر قیمت پر بچے کو واپس لینا چاہتی تھی۔ اور اسی لیے اُس نے گل خان کو لاہور بھیجا [illegible] یہاں وہ سانڈہ میں کسی نبی بخش چوہدری کو ڈھونڈتا رہا۔

جب ہم قندیارہ پہنچے تو اس وقت رات ہو چکی تھی۔ حویلی کا دروازہ بند تھا اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا [illegible] حویلی کے کُتے چھتوں پر چھوڑ دیے گئے تھے، وہ سڑک [illegible] تک جاتی تھی، سنسان پڑی تھی۔ اس حویلی پر کسی وقت [illegible] گورایا کا راج تھا اور اب گل خان کہتا تھا وہاں بہن جی کا [illegible] ہے یہ بڑی ہی عجیب بات تھی مگر وہ مرحلہ تو گزر چکا تھا۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو ڈیوڑھی کے اُوپر کھڑے [illegible] غضبناک آواز میں بھونکے مگر مسولینی نے انہیں آواز دے کر خاموش کر دیا۔ وہ اُن سب کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس کی آواز سن کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ مسولینی نے دروازہ کھلوایا تو ہمارے سامنے غوث محمد کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اور آبی کو دیکھا تو بہت حیران ہُوا۔ پتہ نہیں وہ اس رات سندھو اور مسولینی کے ہاتھوں کیسے بچ گیا تھا۔

"آپ..... آپ کیسے آئے ہیں جناب؟"

"یہ ہمارے ساتھ آئے ہیں بہن جی سے ملنا چاہتے ہیں۔" سندھو نے کہا۔

"وہ..... وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آج شام وہ گاڑی میں بیٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔"

"باہر چلی گئی تھیں مگر کہاں؟ ہم تو انہیں یہاں ہی چھوڑ کر گئے تھے۔" سندھو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔

"آپ جب گئے ہیں تو اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ صفدر اور کاظم کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی تھیں۔ صفدر کہہ رہا تھا کہ شاید وہ چند دن باہر رہیں کسی ضروری کام سے گئے ہیں۔" غوث محمد نے ہمیں بڑی ڈیوڑھی میں سے گزار کر مہمان خانے تک پہنچا دیا۔ غوث محمد کی بات سن کر آبی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ہم اسی بات بہن جی سے مل لینا چاہتے تھے مگر وہ حویلی میں موجود ہی نہیں تھی۔

"کیا وہ..... وہ گورایا صاحب بھی گھر پر نہیں ہیں؟" مسولینی نے غوث محمد کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"وہ تو گھر پر ہی ہیں مگر وہ اپنے کمرے میں ہوتے ہیں۔ اُن تک تو صرف ذکیہ ہی جا سکتی ہے اور کسی کو اُن کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہے۔" غوث محمد نے مہمان خانے میں رکھے صوفوں کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ وہاں شاید بہت دنوں سے کوئی آدمی نہیں ٹھہرا تھا۔ ہم سب بے جان سے ہو کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ یوں جیسے ہم اب کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

"جاؤ وہ ڈرائیور باہر بیٹھا ہے اس کی گاڑی گیراج میں رکھواؤ اور اس کے لیے کسی جگہ بستر لگا دو۔" سندھو نے غوث محمد سے کہا اور بڑے صوفے پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اُسے بھی بہن جی کی اس اچانک غیر حاضری نے پریشان کر دیا تھا۔ مسولینی اور گل خان کا بھی یہی حال تھا۔

غوث محمد باہر نکلا تو آبی بولا۔ "اس کا کیا مطلب ہے سردار صاحب جی! کچھ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"بھئی وہ کسی کام سے گئی ہوں گی۔ کل تک شاید آ جائیں۔"

"نہیں! میں تم سے متفق نہیں ہوں بھائی! معاملہ کچھ اور ہے۔ کیا وہ پہلے بھی اسی طرح باہر چلی جاتی تھیں؟"

"جی نہیں۔ ایسا تو کوئی واقعہ مجھے یاد نہیں ہے۔ آخر ہم کس لیے ہیں سردار صاحب! ہم تو اُن کا ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں پھر انہیں باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟" مسولینی نے کہا۔

"خیر دیکھ لیتے ہیں کہاں سونا ہے ہمیں؟" آبی نے بریف کیس اپنے سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اِدھر ہی سو رہیں۔ ہم کل تک انتظار کریں گے، یہ ساتھ کے کمرے خالی ہیں، میں بستر بچھا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی کھانا شانا نہیں مل سکے گا؟" آبی نے پوچھا۔

"کیا کہتے ہیں، کھانا کیوں نہیں ملے گا۔ ہم دراصل دوسری طرف سوتے ہیں۔ غوث محمد آ جائے تو میں اُس سے کہتا ہوں۔" سندھو نے خجالت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

کوئی دس منٹ بعد غوث محمد واپس آ گیا تو سندھو نے کہا۔ "بھائی ایک تو ان کے لیے کھانا منگوا دو اور پھر ان کا بستر ساتھ کے کمروں میں لگا دو۔ سمجھے، انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اب ہم چلتے ہیں سردار صاحب، صبح آپ سے ملاقات ہو گی۔"

"جی بہت بہتر۔ مگر ایک بات کا خیال رکھیں، پچھلی دفعہ جب ہم یہاں ٹھہرے تھے تو اس غوث محمد نے ہمارے ہتھیار یہاں سے چرا لیے تھے۔"

"غوث محمد اب پہلا سا غوث محمد نہیں ہے جناب! آپ بالکل فکر نہ کریں، آپ کی کوئی چیز یہاں سے نہیں ہلے گی۔"

ہم نے باری باری اُن تینوں سے مصافحہ کیا اور وہ اسی وقت حویلی کے دُوسرے حصے میں چلے گئے۔

غوث محمد نے کوئی آدھے گھنٹے میں ہمارے لیے کھانا منوا دیا۔ بستر بھی اُس نے بچھا دیے تھے۔ ڈرائیور کے لیے اس نے کھانا اس کے کمرے میں رکھوا دیا۔

غوث محمد سب کاموں سے فارغ ہو کر واپس آیا تو میں نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "اِدھر بیٹھ جا غوث محمد! مجھے یہ بتا کہ اس مکرم علی گورایا کو ہُوا کیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا باؤ جی! وہ ایک دم سے بدل گئے ہیں۔ گھر کا سارا نظام بدل گیا ہے۔ کئی نوکر ڈسمس ہو چکے ہیں۔ عورتیں بھی یہاں سے نکال دی گئی ہیں، اب تو صرف بہن جی کا راج ہے جو چاہتی ہیں، وہ کرتی ہیں۔"

"مگر یہ ہُوا کیسے! یہ بہن جی یہاں کیسے آ گئی ہیں؟ یہ کون ہیں آخر؟"

"ان کے بارے میں بھی مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کہتے ہیں۔۔۔ گورایا صاحب کی بہن ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ جاگیر جتنی بھی باقی رہ گئی ہے اس پر اب بہن جی کا حکم چلتا ہے۔ اور گورایا صاحب ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ سیر شکار، فنون، عیش عشرت سب خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ گورایا صاحب بس سارا دن کمرے ہی میں بند رہتے ہیں۔"

"ہوں۔ تمہیں کیوں نہیں نکالا انھوں نے؟"

"یہ اُن کی مہربانی ہے ورنہ مجھے یہی ڈر تھا۔ اب تو خیر میری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور میں خوش ہوں۔"

"مگر یہ انقلاب آیا کیسے؟ گورایا صاحب کو اس راستے پر کس نے لگا دیا ہے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، انھیں کسی چیز سے کوئی غرض ہی نہیں رہی ہے۔"

"اور یہ گل خان، سندھو اور مسولینی کیا کرتے ہیں؟"

"یہ بھی ادھر ہی رہتے ہیں، بہن جی ہر معاملے میں ان سے ہی مشورہ کرتی ہیں۔ صفدر اور کاظم بھی اِن کے ساتھ ہیں، سچ پوچھیں تو مجھے اس سارے معاملے میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"کیا گورایا صاحب کی بیوی کوئی نہیں ہے؟" میں نے غوث محمد کو اور زیادہ کریدنے کی کوشش کی۔

"پتہ نہیں ان کی طبیعت کیسی ہے۔ تین بیویوں کو طلاق دے چکے ہیں، کوئی عورت انھیں راس ہی نہیں آتی۔"

"اُن سے کوئی بچہ بھی نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ بچہ کوئی نہیں ہوا۔ ورنہ شاید وہ انھیں طلاق نہ دیتے۔"

"ہوں۔ تم ذرا ہمارے ساتھ چل سکتے ہو؟ ہم گورایا صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مگر اس کی اجازت نہیں ہے۔ بہن جی نے ہمیں سختی سے منع کر رکھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، تم کوشش تو کرو۔"

"جی نہیں۔ اس وقت میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اُن کا کمرہ کس طرف ہے؟"

"کمرہ تو سامنے ہی ہے مگر وہاں اس وقت صرف ذکیہ ہی جا سکتی ہے۔ میں آپ کی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا، وہ مجھے ذلیل کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے غوث محمد! اب تم جاؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

وہ جب باہر نکل گیا تو میں نے آبی کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "آبی! میرا خیال ہے ہمیں کل تجمل حسین سے مل لینا چاہیے، وہ ہمیں پہچان تو لے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر فائدہ کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے بہن جی نے گورایا کو اسی لیے مروا دیا تھا تاکہ وہ تجمل حسین کو جما سکیں۔ وہ اپنی اس سازش میں بہت کامیاب ہیں۔" آبی نے ...

"یہ تو ٹھیک ہے مگر میں کچھ اور باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ گورایا کا کوئی اور عزیز رشتے دار ہے ...

"مگر تم کیوں پوچھنا چاہتے ہو؟ بہن جی خود دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ وہ پھر رہی گی۔" آبی نے ایک بار پھر مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو مگر مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ آسیہ اِس وقت کوٹھی میں موجود بھی ہے کہ نہیں۔ ذکیہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔"

"ہاں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ بات ہو سکتی ہے ... نے ہمیں پاگل کر دیا ہے۔ گل خان اور اس کے ساتھی بھی ... بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں مگر ہم یہ بات صبح بھی معلوم کر سکتے ہیں، کیا خیال ہے تمہارا؟"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نڈھال سا ہو کر بیٹھ رہا۔ ... نہیں تقدیر مجھے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ سامنے کا راستہ ... تاریک دکھائی دیتا تھا۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے کچھ ہی دیر بعد تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کیں اور ایک بار پھر ہم اجنبی بستروں پر دراز ہو گئے تھے۔ بدن پر بڑی تھکن چڑھی تھی۔ جلد ہی ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ خس کم جہاں پاک۔ ہم ایسے آدمیوں کا ... رہنا ہی بہتر تھا۔ ہماری بیداری ہزار فتنے پیدا کرتی تھی۔ آنکھیں دردمندی کا راستہ دکھاتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کاش میں اور آبی اندھے ہوتے مگر اس سے بھی کیا ہوتا تھا، ہماری باقی حسیات تو بدستور کام کرتی رہتیں۔ اور آدمی ان پانچ اندریوں کی وجہ سے عذاب سہتا رہتا ہے۔ کوئی ان سے جیتے جی کیسے چھٹکارا پا سکتا ہے۔

کہنے کو تو میں سو گیا مگر وہ نیند بہت ہی کچی تھی۔ کروٹ بدلتے ہی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ آسیہ پھر میرے تصور میں ابھرنے لگی تھی مگر میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا اور خدا جانے وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ اس تک پہنچنے کے باوجود میں اس سے بہت دور تھا۔ بہن جی کی غیر حاضری میں میرا اس حویلی کے اندر داخل ہونا، قدم رکھنا صحیح نہیں تھا۔ پھر بھی میں بستر سے اٹھ گیا۔ اپنی

دوہری دھار کا خنجر اور پستول جیب میں ڈال کر میں نے کمبل اوڑھا اور کنڈی نہایت آہستگی سے نیچے گرا کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ حویلی چاندنی میں نہا گئی تھی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ حویلی کے کتے بدستور صحن میں اور چھتوں پر موجود تھے، ان سے بچ کر نکل جانا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ حویلی کے صحن میں دو پہریدار بھی موجود تھے۔ اور وہ مسلح تھے۔ انہیں رات کو حویلی کی نگرانی کا فرض سونپا گیا تھا۔ میں مہمان خانے کے سامنے بنے برآمدے میں جا ٹھہرا۔ وہاں سے میں صحن کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ حویلی کا صحن برابر بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ مہمان خانہ سب سے نچلی روش پر بنا تھا۔ ڈیوڑھی اس سے نیچے تھی۔ تیسرے اور سب سے بلند قطعے پر حویلی کا اصل حصہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا درمیان میں ایک بڑی دیوار احاطہ کیے ہوئے تھی۔ پہریدار اس دیوار سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے اور ان کو چونکائے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ مایوس ہو کر میں پھر اپنے کمرے کی طرف لوٹ آیا۔ رات کو حویلی کے اندر جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہاں ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ مجھے زیادہ پریشانی اُن کتوں کی طرف سے تھی۔ وہ مجھ پر اچانک ہی چھتوں سے کود پڑتے تو اُن سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔ لاچار ہو کر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ خدا جانے نقب زن اپنے مقصد میں اتنی ساری رکاوٹوں کے باوجود کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ جو پکڑے جاتے تھے تو اس کی وجہ سے اُن کے فن میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ کسی اور ہی سبب سے گرفتار ہو جاتے تھے۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو اُس وقت غوث محمد دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

آبی اس کی آواز سن کر جز بز ہونے لگا۔ وہ جب اندر آیا تو آبی لحاف میں سے مُنہ نکال کر بولا۔ "اوئے ککڑ شاہ! کیا مصیبت ہے، کیوں صبح سویرے جگا دیا ہے تم نے ہمیں؟ ابھی تو سوئے تھے ہم۔"

"باؤ جی! آٹھ بج رہے ہیں یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟"

"وہ بہن جی آئی ہے کہ نہیں، ایک تو اس نے ہمیں ذلیل کر دیا ہے۔" اس نے لحاف الگ پھینک کر سگریٹ کا پیکٹ پکڑ لیا۔ اور سگریٹ کو تیلی دکھا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ معلوم ہوتا تھا اسے بہت گہری نیند آتی ہے مگر اس کا مغز ٹھکانے پر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یوں بول رہا تھا جیسے وہ اپنی سسرال میں آیا ہوا ہو۔ انداز اس کا یہی تھا۔

"وہ تو ابھی نہیں آئی ہیں البتہ باہر دو پولیس انسپکٹر آئے ہوئے ہیں۔"

"پولیس انسپکٹر! وہ کیا کرنے آتے ہیں یہاں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"وہ گورایا صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اندر اطلاع بھجوا دی ہے۔"

"یار سوچ سمجھ کر بات کرنی تھی اُن سے، پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ وہ کیسے آ گئے ہیں۔ ٹیکسی میں یہاں پہنچے ہیں۔ ڈرائیور باہر بیٹھا ہے گاڑی کے اندر۔"

"تو جاؤ پھر گورایا صاحب کو بلاؤ۔ مگر ٹھہرو، پہلے گورایا سے ہم مل لیتے ہیں، اب تو وہ جاگ گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ آئیں پہلے آپ اُن سے مل لیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اور آبی کو حویلی کے عقبی حصے میں لے گیا جہاں اُس تجمل حسین گورایا کو بہن جی نے ٹھہرا رکھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک دینے پر کسی نے کنڈی کھول دی۔ وہاں تجمل حسین بڑے خوبصورت لباس میں ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ہمیں فوراً ہی پہچان لیا۔ مگر اس کو دیکھ کر ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ خوش نہیں ہے، اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں کھنچی تھیں۔

"آئیے جناب آئیے۔ آپ کو تو میں بہت یاد کرتا تھا۔ فرید پور میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں۔ آپ کا حافظہ بہت تیز ہے گورایا صاحب! کہیے کیا حال ہے آپ کا؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ آبی بھی میرے ساتھ تھا اور ہمیں اس شخص کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی جسے بہن جی نے کاٹھ کا اُلو بنا کر رکھ دیا تھا۔ غوث محمد باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ گورایا صاحب کا بے حد و حساب احترام اُسے کوئی فالتو بات کرنے کی جرأت نہیں دیتا تھا۔ انسپکٹر کے بارے میں پیغام اس نے پہلے ہی پہنچا دیا تھا اور مزید کچھ کہنے کی وہ جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

"غوث محمد! اُن انسپکٹروں کے لیے چائے پہنچا دی ہے کہ نہیں؟"

"جی میں اُن کا خیال رکھ رہا ہوں سرکار! آپ کو جب بھی فرصت ہو اُن سے مل لیں۔"

"ہاں ہاں۔ ہم جلدی آئیں گے، تم اُن کے پاس بیٹھو۔ آئیے جی، یہ قصہ تو کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔" اس نے حسب عادت دروازے کی کنڈی اندر سے بند کر لی۔ غوث محمد وہاں سے فوراً ہی ٹل گیا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟ آپ کے لیے تو یہ بند حویلی بہت مفید رہی۔ بادشاہ بن کر بیٹھ گئے ہیں یہاں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ایسا بادشاہ جس کی حکومت صرف اس چار دیواری تک محدود ہے۔ بیٹھیں۔" اس نے دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آخر معاملہ کیا ہوا ہے؟"

"پتہ نہیں، آپ کو شاید معلوم ہوگا مکرم علی گورایا پھر مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے آپ اس کی جگہ لے چکے ہیں، عیش کریں۔"

"میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں جناب! کیا نام ہے آپ کا مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔"

"میرا نام سردار کریم نواز ہے اور یہ علی حسن گردیزی ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"آپ کے فرائض کیا ہیں یہاں، میرا مطلب ہے کہ آپ کے ذمے کیا کیا ڈیوٹی لگی ہے؟" آبی نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت بری زندگی ہے گردیزی صاحب! میں قیدی بن کر رہ گیا ہوں۔ ایک وہ ذکیہ یہاں نہ ہوتی تو میں پاگل ہو گیا ہوتا۔ مجھے نہ کہیں آنے کی اجازت ہے نہ جانے کی۔ ہر چیز مجھے کمرے ہی میں مہیا کر دی جاتی ہے۔ پتہ نہیں میرا کیا بنے گا، میں بہت پریشان ہوں سردار صاحب!"

"وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ آپ کچھ فلسفی فلسفی سے لگتے ہیں مجھے مگر یہاں تکلیف کیا ہے میرا مطلب ہے کہ وہ آپ سے بان بٹواتے ہیں کہ چکی پسواتے ہیں؟" آبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا جیسے اس تجمل حسین گورایا کی حالت پر وہ بہت خوش ہو۔

"کوئی ایک تکلیف ہے یہاں! میں کھلا آسمان نہیں دیکھ سکتا۔ صحن میں قدم نہیں دھر سکتا۔ مجھے بند کمرے میں ورزش کے لیے مجبور کیا جاتا ہے، وہ دیکھیں ورزش کا سامان ۔۔۔ تاکہ میں صحت مند بھی رہوں اور ان کے حکم کی تعمیل بھی کرتا رہوں۔"

"چھوڑیں جی۔ اور کیا چاہیے آپ کو بھلا؟"

"نہیں گردیزی صاحب! آزادی بڑی چیز ہے مگر مجھے مجبور کیا جاتا ہے کہ میں خود کو مکرم علی گورایا کہوں، سب کو یہی بتاؤں۔ وہ خود کتے کا بچہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے ۔۔۔ مصیبت میری جان کو آ گئی ہے۔"

"باہر دو انسپکٹر آئے ہوئے ہیں۔ غوث محمد بتا رہا تھا کہ ایک کا نام غلام محمد ہے اور دوسرے کا افسر علی۔ وہ کسی تفتیش کے سلسلے میں آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے سامنے کیا کہیں گے آپ؟"

"میں بدنصیب کیا کہہ سکتا ہوں، یہی کہوں گا کہ میں مکرم علی گورایا ہوں اور یہ حویلی میری ہے۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے گورایا صاحب!" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی۔ یہ کوئی زندگی ہے سالی۔ ایک ذکیہ صبح شام میرے گرد پھرتی رہتی ہے، مجھ سے چہلیں کرتی ہے، ویسے تو وہ بہت اچھی ہے، میری خدمت کرتی ہے مگر بندے کا جب دل بجھ گیا ہو تو کیا فائدہ۔"

"بلکہ بے بسی بھی۔" آبی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر اب وہ بہن جی کہاں گئی ہیں؟"

"وہ ۔۔۔ خدا ہی خیر کرے۔ کاظم اور صفدر اپنے ہتھیار ساتھ لے گئے ہیں۔ خدا جانے کس کی شامت آئی ہے گردیزی صاحب خدا کے لیے کسی طرح میری جان چھڑا دیں۔ میں خود بھی نکل سکتا تھا مگر وہ پھر مجھے پکڑ لیں گے۔ اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ اب میں خود کو مکرم علی گورایا ہی کہلاؤں گا۔ مجھ سے قرآن شریف پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے لی تھی بہن جی نے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟"

"اور اس پر وہ سندھو اور صفدر اور کاظم الگ میری جان کھاتے رہتے ہیں۔ صبح شام پستول دکھاتے ہیں مجھے کہ خبردار جو میں نے ہاں ناں کی تو۔"

"یعنی آپ ہاں ناں بھی کرتے ہیں؟"

"سمجھا بھی کریں سردار صاحب، وہ مجھے دھمکاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے سالی، اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔"

"ویسے آپ کی صحت بہت اچھی ہو گئی ہے اور سیاہ شیروانی تو آپ کو بہت ہی سجتی ہے، دولہا لگتے ہیں۔" آبی نے اس کی حالت زار پر اور خوش ہو کر کہا۔

"بس میری یہ شباہت ہی مجھے لے ڈوبی ہے۔ میں اتنا عرصہ کوٹھری میں بند رہا اب میں باہر نکلا ہوں تو اس کمرے میں قید کر دیا گیا ہوں۔ افسوس تجمل حسین تباہ ہو گیا ہے۔" اس نے واقعی سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔

"کہیں ان انسپکٹروں کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کہہ دینا ورنہ بہت برا ہو گا۔"

"توبہ کریں جی۔ مجھے جو سبق پڑھایا گیا ہے وہی دہراؤں گا!"

"آیئے پھر ان سے بھی مل لیں۔"

"میرا خیال ہے کہ پہلے بہن جی واپس آ جائیں پھر میں ان سے ملتا ہوں۔"

"وہ کہاں انتظار کرتے رہیں گے، ان کو جلدی یہاں سے رخصت کرنا ہے۔"

"چلیں پھر ۔۔۔ مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا لینے آئے ہیں یہاں۔"

"ہم پہلو کے کمرے میں بیٹھیں گے، ابھی ہم ان کے سامنے نہیں گئے ہیں اس لیے ہمارا آپ ان سے ذکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے! چلیں پھر۔ یہ پستول میرا مجھے دے دیں۔ یہی حکم ہے مجھے کہ میں یہ پستول باندھ کر رکھا کروں ہاں۔ بالکل مجہول ہو کر رہ گیا ہوں میں۔ خدا اس گورائے کو تباہ کرے۔ میں تو پاگل ہو گیا ہوں۔"

"اللہ خیر کرے گا گورایا صاحب! آپ اس کے بھائی ہیں، جاگیر کے اصل وارث۔" یہ کہہ کر ہم اسے ساتھ لے کر باہر آ گئے۔ کوٹھی کے دوسرے قطعے پر ہمیں غوث محمد مل گیا۔ تجمل حسین کو ہم اس کے حوالے کر کے مہمان خانے کے عقبی حصے سے ہوتے ہوئے بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں جا بیٹھے۔ وہاں سے ہم ان کی ساری باتیں سن سکتے تھے۔ درمیان میں ایک کھڑکی لگی تھی جس کے پردے ہمارے لیے اوٹ کا کام دیتے تھے۔

تجمل حسین بالآخر بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ غوث محمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ تجمل حسین نے آنکھوں پر سیاہ عینک لگا لی تھی تاکہ وہ لوگ اس کی آنکھوں کے رنگ کی وجہ سے کوئی نیا نکتہ پیدا نہ کر لیں۔ گورایا کی آنکھیں ہلکی سی نیلگوں تھیں۔ جب کہ تجمل حسین کو خدا نے سیاہ آنکھیں عطا کی تھیں۔

"السلام علیکم یا حضرت! آپ کیسے تشریف لے آئے ہیں صبح صبح!" تجمل حسین نے بڑے وضع اور کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس جی! یہ کار سرکار چلنے ہی نہیں دیتا میرا نام افسر علی ہے اور یہ ہیں انسپکٹر فرید احمد، کیا حال ہیں آپ کے بیٹھیں۔" ان میں سے ایک نے بڑے تپاک سے کہا جب تجمل حسین آرام سے بیٹھ چکا تو وہ آدمی جس نے اپنی ٹوپی ابھی تک نہیں اتاری تھی، بولا۔ "ہمیں دراصل ایک خاص کام کے سلسلے میں آنا پڑا ہے۔ ڈی ایس پی میانوالی کے حکم سے ہم یہاں آئے ہیں، ان کا یہ آرڈر آپ بھی پڑھ لیں۔"

"آپ خود ہی بتا دیں کیا لکھا ہے اس میں؟"

"اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اس حویلی میں سندھو نام کا ایک اشتہاری مجرم چھپا ہوا ہے، ہماری اطلاع یہ ہے کہ کل اسے میانوالی میں دیکھا گیا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا تھا جب ہمارے مخبر نے اس کا پیچھا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں اترا ہے۔"

"ایسے ہی بکواس کی ہے کسی نے۔ یہاں کسی ایسے مجرم کا کیا کام؟ ہم تو ایسے لوگوں کو خود پولیس کے حوالے کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔" تجمل حسین نے بڑے ہی یقین کے ساتھ یہ بات کہی۔ اس کی ذہنی بلوغت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آواز اس کی ایک دم مرعوب کن حد تک بلند ہو گئی تھی۔

"دیکھیں گورایا صاحب! ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم آپ کی حویلی کی تلاشی لیں، یہ بہت ضروری ہے۔ اگر وہ آدمی اندر ہے تو اسے ہمارے حوالے کر دیں۔"

"حویلی آپ کے سامنے ہے مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔ ہم نے کبھی کسی کو اندر جھانکنے کی اجازت نہیں دی ہے، یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر کیا کریں، یہ تو مجبوری ہے۔"

"کوئی مجبوری نہیں ہے آپ کی۔ میں خود یہ بات لکھ کر دے سکتا ہوں کہ سندھو نام کا کوئی مجرم یہاں نہیں چھپا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ آ گئے ہیں حویلی کی تلاشی لینے۔ ہمارے مرتبے کا بھی آپ نے کوئی خیال نہیں کیا ہے کوئی تصویر ہے آپ کے پاس اس مجرم کی؟"

"جی ہاں۔ تصویر بھی ہے، یہ دیکھیں۔"

"ہوں۔ بالکل غلط ۔۔۔ اس حلیے کا کوئی آدمی یہاں نہیں آیا ہے۔ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں مگر میں کھری بات کہتا ہوں۔ ڈی ایس پی صاحب سے بھی ہم معذرت چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دیں کہ اگر ایسا ہی شک ہے تو وہ خود آ جائیں، ان کی خدمت ہمارا فرض ہے مگر ایسا الزام تو وہ ہم پر نہ دیں۔ ہم کوئی چوروں ڈاکوؤں کو پناہ دیتے ہیں؟" تجمل حسین کی اداکاری نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اسے حویلی کے وقار اور رکھ رکھاؤ کا بھرپور احساس تھا۔ اگرچہ وہ ہمارے سامنے اس نئی زندگی کے بارے میں سخت پریشانی کا اظہار کر رہا تھا مگر بیٹھک میں جو کردار وہ ادا کر رہا تھا وہ ہم دونوں کے لیے حیرت کا باعث تھا۔

دونوں انسپکٹر پریشان ہو گئے۔ ان سے بات بنائے نہیں بنتی تھی۔ تجمل حسین نے انھیں مرعوب کر لیا تھا۔ انسپکٹروں نے اس کی

اصل کو پہچانا ہی نہیں ویسے بھی انھوں نے شاید اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اب وہ اس کی دلیل کے سامنے کچی ترکاری کی طرح کٹ کر رہ گئے تھے۔

"آپ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر اک ذرا اپنے ملازموں کو ہمارے سامنے سے گزار دیں، ہم کہہ تو سکیں گے کہ ہم نے حویلی دیکھ لی ہے۔"

"اس کی بھی کوئی سند نہیں ہے۔ بہرحال میں دیکھتا ہوں مگر تمام لوگ گھر پر موجود نہیں۔ آپ کے مخبر نے کیا کہا ہے؟"

"اس کی رپورٹ یہ ہے کہ سندھو بھی اس کار میں بیٹھا تھا جس میں چار آدمی اور بھی موجود تھے۔"

"تو پھر آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی اگر وہ رات کو آیا تھا تو اسے اسی وقت پکڑنا چاہیے تھا، آپ کس انتظار میں بیٹھے رہے؟ بہرحال اب کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"آپ پھر اس رپورٹ پر دستخط کر دیں تاکہ ہماری یہاں حاضری تو ثابت ہو سکے۔" انسپکٹر نے بہت بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ تجمل حسین نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔

"ہاں یہ میں کر سکتا ہوں، آپ رپورٹ لکھیں۔ ارے غوث محمد! ان کی کوئی خاطر مدارت بھی کی کہ نہیں؟"

"جی میں نے چائے پلا دی تھی انھیں اور جو آپ حکم کریں۔"

"ٹھیک ہے، میں خود دیکھ لیتا ہوں۔" غوث محمد دروازے تک آ کر واپس چلا گیا۔

کچھ دیر انسپکٹر کاغذ پر کچھ لکھتا رہا اور پھر اس نے وہ کاغذ تجمل حسین کے سامنے رکھ دیا، اسے اچھی طرح پڑھ کر انہوں نے دستخط کر دیے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے حویلی کی تلاشی لی تھی۔"

"جی ہمیں یہی حکم تھا اور یہی بات ہم نے اس میں لکھ دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ غوث محمد ہمارے منشی پیار علی کو بلا ادھر۔"

"جی بہتر۔" یہ کہہ کر غوث محمد دوسری طرف نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد ایک بھاری تن و توش کا آدمی اندر آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد تجمل حسین اٹھ کر اس تک پہنچا اور اسے دروازے سے باہر لے گیا۔ پتہ نہیں وہاں جا کر اس نے پیار علی سے کیا کہا۔

تجمل حسین خود تیزی سے حویلی کی طرف نکل گیا اور منشی بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کوئی بیس منٹ بعد واپس آیا تو وہ پلاسٹک کے دو بڑے بڑے لفافے اٹھائے ہوئے تھا۔ انسپکٹروں کے پاس واپس آ کر بولا۔ "آپ آئے ہیں، یہ ہماری عزت افزائی ہے، گورایا صاحب نے آپ کے لیے دو تھان بھیجے ہیں یہ دھنی پور کا کھدر ہے۔ امید ہے اسے آپ پسند کریں گے، ہمارے جولاہوں نے تیار کیے ہیں۔"

"ارے نہیں، اس کی کیا ضرورت تھی بھئی۔"

"جی نہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے جو کوئی بھی پولیس کا یہاں آتا ہے، ہم اس کی خدمت ضرور کرتے ہیں۔"

"ہاں، میں تین سال پہلے بھی یہاں آیا تھا ان لوگوں نے جب بھی مجھے یاد رکھا تھا۔" اس انسپکٹر کا نام افسر علی تھا۔ بڑی خوشی سے وہ تھان پکڑ لیے اور بڑے ہی تشکر میں بولا۔ "گورایا صاحب سے ہمارا بہت بہت شکریہ، اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی مگر ان کی مہربانی سمجھ کر رکھ... اور اب ہم جا رہے ہیں ان سے ہمارا سلام کہہ دینا۔"

دونوں وہاں سے اٹھ گئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گئے۔ منشی بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلا گیا۔ گاڑی تو باہر کھڑی تھی وہ اس میں بیٹھے اور اسی وقت وہاں سے چل دیے۔

منشی جب واپس آیا تو سیدھا تجمل حسین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے معلوم ہوا کہ غوث محمد نے ان تینوں کو جگا دیا تھا اور اب وہ بیٹھک کے عقبی کمرے میں بیٹھے ساری باتیں سن رہے تھے جو تجمل حسین اور ان انسپکٹروں کے درمیان ہوئی تھیں۔ ان کو یوں لکھوا ادھر دیکھ کر میں نے کہا۔ "بھئی سندھو! وہ تمھیں لینے آئے تھے، آخر معاملہ کیا ہے یہ۔ بڑی مشکلوں سے گورایا صاحب نے تمھاری جان چھڑائی ہے۔"

"بہت ہی کمینے تھے وہ۔ بہن جی یہاں ہوتیں تو ان کو نہ جانے دیتیں۔"

"وہ تیرے بڑے پرانے گاہک ہیں تو کب تک انھیں مجرم بنا رہے گا۔ جا ان کا گھر پورا کر دے۔" مسولینی نے دونوں ٹانگیں بستر پر دراز کرتے ہوئے کہا۔

"گھر تو میں ایسا پورا کر دوں گا کہ وہ یاد ہی رکھیں۔" سندھو سخت طیش میں تھا۔

"اگر تجمل حسین مضبوطی سے اپنے موقف پر نہ ڈٹا رہتا تو یہ سندھو کو چھوڑ کر نہ جاتے۔"

ابھی کوئی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ بہن جی کی کار کا ہارن بجنے لگا۔ غوث محمد اس کی آواز پہچانتا تھا۔ ہم سب ایک دم دروازے کی طرف بھاگے۔ دروازہ کھلا تو ان کی کار اندر چلی آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس وہ عورت بیٹھی تھی جیسے وہ سب نے دیکھا تھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دروازے میں سے گزر کر کار مہمان خانے کے سامنے جا ٹھہری۔ ہم نے اسے یہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ کار سے باہر نکلیں تو ان کی وہ چابک ایسی برستی آواز گونجی۔ اس کا لہجہ اس روز بھی پشتو کی غمازی کر رہا تھا۔ لفظوں کو اسی طرح چبا چبا کر ادا کر رہی تھی۔

"یہ کیا جمگھٹا لگا رکھا ہے تم نے گل خان اور یہ لوگ کب آئے ہیں یہاں؟"

"ہم شب خیر کے پاس ٹھہرے تھے۔ کل رات یہاں پہنچے ہیں بہن جی!" میں نے جان بوجھ کر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ گاڑی کے اندر پچھلی سیٹ پر کوئی اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور اس بیران لوگوں نے سفید چادر ڈال رکھی تھی۔

"کاظم! اس کو سیدھا لے جا کر کوٹھری میں بند کر دو۔" اس کا یہ حکم سنتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی اور وہ کار کو ان کوٹھریوں کی طرف موڑ کر لے گئے جن میں ہم بند رہ چکے تھے۔

"یہ کون ہے بہن جی؟" گل خان نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"یہ لاشاری کا ساتھی حمید کاٹھی ہے شب خیر سے بچھڑ کر انہی لوگوں نے لیا تھا۔ میں اسے راولپنڈی سے پکڑ کر لائی ہوں، مجھے افسوس ہے کہ بچہ میرے ہاتھ نہیں آ سکا۔ تمھیں یاد ہے یہ شخص چھ دن پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ گورایا صاحب سے گھوڑا خریدنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اسے شب خیر کا پتہ کس نے بتا دیا؟" یہ کہہ کر وہ حویلی کی عمارت کی طرف چل دی۔

پہلی بار میں نے اسے چلتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں گل خان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ آسیہ کی چال ہے اس کو تو میں ساری زندگی گھر میں چلتے دیکھتا رہا تھا۔ میں اسے کیسے بھول جاتا۔ اس کی رفتار میں ذرا سی ڈگمگاہٹ آ گئی تھی مگر وہ قصداً بھی ہو سکتی تھی مگر میرا دل یہ کہتا تھا کہ وہ آسیہ ہی ہے۔ بالکل وہی قد کاٹھ، وہی اٹھان، ویسی ہی بازوؤں کی حرکت جن کو وہ برقعے میں بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی۔ وہ کوئی دس قدم چلی ہو گی کہ اچانک رکی اور بولی۔ "آپ وہاں کیوں رک گئے ہیں؟ میرے ساتھ آئیں۔" اس نے ہمیں براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی! بہتر، ہم آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اور آبی اس کے پیچھے چل دیے۔ اس کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ گل خان، سندھو اور مسولینی بھی ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔

"آبی! تو نے دیکھا، یہ... یہ تو آسیہ ہے۔ میں اسے پہچان چکا ہوں۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"نہیں یار! تجھے دیکھ کر بھی اس نے تیری طرف وہ توجہ نہیں دی جس کا تو مستحق ہے۔"

"کوئی مصلحت ہو گی، بہرحال مجھے یقین ہے کہ یہ آسیہ ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے آبی نے بے سوچے سمجھے ایک دم پلٹ کر گل خان کو گردن سے پکڑ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ فوراً ہی گندی غلیظ گالیوں پر اتر آیا۔ جیسے گل خان نے اس کی زبردست توہین کر دی ہو۔ اس کا وہ بے تحاشا شور سن کر بہن جی یک لخت رک گئیں۔ سندھو اور مسولینی بھی سخت حیران تھے کہ آخر یہ ہوا کیا ہے؟

بہن جی بھی تیزی سے ہماری طرف لوٹ آئیں۔ "یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو چھوڑ دیں گل خان کو۔" مگر آبی کا ہاتھ نہیں رکا۔ اس نے حیرت زدہ گل خان کو ایک دم بہن جی پر الٹ دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا سختی سے ہاتھوں میں جکڑا نقاب الٹ گیا۔ آبی نے فوراً ہی گل خان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بہن جی اپنا نقاب سیدھا کرنے لگی۔

آبی نے تیزی سے اس کے قریب ہو کر دبی زبان میں کہا۔ "ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے بہن جی! بس ہم یہی چاہتے تھے، اب بے شک نقاب اوڑھ لیں۔"

آسیہ نے فوراً ہی نقاب چہرے پر ڈال لیا اور گل خان کو پرے ہٹاتی ہوئی زمین سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے آبی کی بات ہی نہ سنی ہو۔ "ادھر آؤ گل خان! انھوں نے تم پر ہاتھ کیوں اٹھایا ہے؟"

"میں خود حیران ہوں بہن جی! پتہ نہیں انھیں کیا ہو گیا تھا۔"

"مجھے معاف کر دے یار! دیکھ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میں سمجھا کوئی دشمن میرے سامنے آ گیا ہے میرا مغز ہی پھر گیا تھا۔ دیکھ میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔" آبی نے فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی! اگر تیری یہی مرضی ہے تو یوں ہی سہی ورنہ میں نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔ میری اس گردن پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔" وہ اپنے دونوں بڑے بڑے ہاتھ گردن پر پھیر کر بولا۔

"اس کا علاج کراؤ باؤ جی! کسی ڈاکٹر سے معائنہ کراؤ اس کا، یہ تو نیم پاگل لگتا ہے مجھے، خواہ مخواہ ہی گل خان پر چڑھ دوڑا۔" سندھو بولا۔

"دفع کرو یار! میرا خیال ہے اس کو غلطی لگ گئی ہے آؤ اندر چلتے ہیں۔" میں نے بھی گل خان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

آسیہ اس دوران برقعے کو پوری طرح کس چکی تھی وہ پھر

ہمارے آگے آگے چل دی مگر اب اس کی چال میں وہ لٹکن نہیں تھی جس کا مظاہرہ وہ پہلے کرتی آئی تھی۔

میں اس کی صورت شاید صدیوں بعد دیکھ رہا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ میرے لیے اس کا دل ذرا بھی نہیں دھڑکا تھا ورنہ وہ بھی تو مجھے شاید صدیوں بعد دیکھ رہی تھی۔ بڑے کمال کی بات تھی، حالانکہ بہنوں کے دل بہت نرم ہوتے ہیں اور اسے معلوم تھا کہ میں اس کے بغیر کس حد تک پریشان رہا ہوں مگر وہ کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔ ہم راہداری میں ہی کھڑے رہ گئے۔

"گل خان! اب تم تینوں آرام کرو۔ میں ان سے کچھ بات کروں گی۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی ہے میری غیر حاضری میں؟"

"جی دو انسپکٹر آئے تھے، سندھو کی تلاش میں مگر گورایا صاحب نے انھیں واپس بھیج دیا۔ وہ حویلی کی تلاشی لینا چاہتے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ سندھو کو بہر حال انھوں نے بچا لیا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے میں گورایا صاحب سے پوچھ لوں گی، خدا حافظ۔" اس کے کمرے میں کھڑکیوں کے تمام پردے کھنچے ہوئے تھے اور اندر شاید وہ بلب جلا کر اپنا کام چلاتی تھی۔

جب وہ تینوں واپس چلے گئے تو بہن جی نے ان کے بارے میں ہم سے پوچھ کر کہ وہ چلے گئے ہیں کہ نہیں، اپنی ملازمہ ذکیہ کو بلا لیا۔ وہ کوئی بڑی ہی جواں سال عورت تھی۔ جثے کی بھاری بھرکم مگر کام میں بہت تیز طرار۔ وہ چند ہی لمحوں بعد راہداری میں آئی اور بولی "جی بہن جی! کیا حکم ہے؟"

"راہداری کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دو۔ کسی کو اندر مت آنے دو۔"

"جی بہتر۔ پر یہ دو آدمی کھڑے ہیں یہاں۔"

"ان کو ادھر ہی کھڑا رہنے دو اور دروازے بند کر دو۔"

اس کا لہجہ اب بھی پشتو بولنے والوں ایسا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس نے کہاں سے اپنا لیا تھا۔ جب ذکیہ دونوں طرف کے دروازے بند کر کے درمیانی دروازے سے دوسری طرف نکل گئی تو بہن جی نے اپنا دروازہ کھول دیا۔ "آئیں بھائی جان اندر آ جائیں۔"

میں آبی کے ساتھ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، وہ پاگلوں کی طرح میرے گلے لگ گئی۔ یوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ایسے ایسے بین کرنے لگی کہ میرا دل کٹنے لگا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آسیہ! ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے ہیں، کیا یہ سب کچھ ہماری تقدیر میں تھا؟"

"کوئی کیا کہہ سکتا ہے بھائی جان! صبر کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔" اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی۔

"تمھیں... تمھیں یہ کیا سوجھی؟ فرید پور میں تم نے سے پردہ کیوں کیا؟ اب بھی تم خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتیں"

"بس... میں اپنی صورت سے نفرت کرتی ہوں بھائی... میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں، میں آپ کے لائق کہاں رہ گئی"

آسیہ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو چکی تھی، جینے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں تر و تازہ نظر اور اب اس نے برقع اتار کے الگ پھینک دیا تھا۔ وہ گہرے نسواری کھدر میں ملبوس تھی۔ پاجامہ بھی کھدر کا تھا اور بھی۔ جوتے اس نے بہت مضبوط پہن رکھے تھے جو دیکھنے کے اعتبار سے نازک ہرگز نہیں کہلا سکتے تھے۔ بال بھی بڑی سادگی سے چوٹی میں باندھ رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی معرکہ سر کرنے کے لیے یہ لباس پہن رہی ہو۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا تو الماری میں سے اس نے سارے پھل نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیئے، بولی "ماں کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہی ہیں۔ میں ان سے ملا تھا۔ وہ ماموں کے گاؤں میں الگ مکان لے کر رہ رہی ہیں۔"

"ان کا حال کیا ہے؟"

"جو ایک پالے پوسے بچوں سے محروم ہونے والی ماں کا ہو سکتا ہے۔ ایک خاصی بڑی رقم میں نے انھیں دی تھی، اس سے کام چلا رہی ہیں۔"

"ہوں۔ کسی دن میں بھی ان کے پاس جاؤں گی۔"

"لگتا ہے تمھیں جینے کا سلیقہ آ گیا ہے، اس حویلی پر کیسے قبضہ کر لیا تم نے؟"

"گورائے کو مار دینے کے بعد تجمل حسین کو میں نے بنا دیا۔ وہ بہت جان چھڑاتا ہے مگر میں نے اسے کہہ دیا کہ اگر اس نے بغاوت کی تو وہ اس کی زندگی کا آخری"

"ہاں۔ ہم اس سے مل چکے ہیں۔ کہتا وہ یہی ہے مگر سمجھ دار آدمی ہے۔ آج دو انسپکٹروں کو اس نے پھر منشی کے ذریعے اس نے کھدر کے دو تھان بھی دیئے کہ وہ آئے ہیں تو خالی ہاتھ نہ جائیں۔"

"ہاں۔ میں نے اسے پہلے ہی سب کچھ سمجھا دیا پولیس کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا چاہیے اور یہ یہاں سے ہم کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے ہیں۔"

"یہاں بہت سے نوکر چاکر بھی تھے؟"

"ان کو میں نے نکال دیا ہے۔ ڈر مجھے صرف اس پہلے منشی کا ہے، منشی ولایت خان کا۔ وہ کہیں ہمارے لیے مصیبت نہ بن جائے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اسے اصل صورت حال کا پتہ چل گیا تھا مگر یہ میرا خیال ہے، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"پھر تو اس کو پکڑنا چاہیے تھا۔"

"وہ بس غائب ہی ہو گیا حالانکہ ان لوگوں کو میں نے بار بار اس کے پیچھے بھیجا ہے۔"

"اس جاگیر کی آمدنی کیا ہو گی تمھارے خیال میں؟"

"سات آٹھ لاکھ روپے سالانہ تو ضرور ہی ہو گی۔ تمام کاغذات میں نے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں۔ مزارع وہی ہیں کیونکہ گورایا بھی وہی ہے۔"

"چلیں، یہ اچھا ہے مگر اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں ادھر ہی رہوں گی، ان گنت لوگ دنیا میں فریب کی زندگی گزارتے ہیں، یہ جاگیر اب میرے قبضے میں ہے، میں اس پر اپنا قبضہ قائم رکھوں گی۔"

"کیا مکرم علی گورایا کا کوئی عزیز نہیں ہے؟"

"ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کوئی آدمی لندن میں رہتا ہے، وہ اس کا تایا زاد بھائی ہے، فرحت اللہ گورایا۔ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"اس کا کیا کرو گی تم! وہ آ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

"میں اسے بھی تہ تیغ کر دوں گی۔ یہ لوگ میرے کس دن کام آئیں گے؟ ان کو میں کام مہیا کرتی رہتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ یعنی کوئی فیکٹری کھول رکھی ہے تم نے؟" میں نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکا زنی۔ یہ ان کا پیشہ ہے اور میں ان کو پناہ دیتی ہوں یہاں یہ بڑے معزز آدمی بن کر رہتے ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ پھیرا یہ ضرور لگا لیتے ہیں۔"

"وہ کس طرف؟"

"مختلف ضلعوں کا، کسی نہ کسی زمیندار یا صنعت کار کا پتہ میں انھیں بتا دیتی ہوں۔"

"اور وہ روپیہ کہاں جاتا ہے؟"

"آدھا میری جیب میں اور آدھا ان کا۔ بالعموم یہ چار چار کے گروہ میں باہر نکلتے ہیں۔ بڑے امیر ہو چکے ہیں یہ۔ کسی نے پنجاب میں اور کسی نے سندھ میں زمینیں خرید لی ہیں۔"

"کمال کی بات ہے آسیہ! تمھیں یہ راستہ کس نے دکھا دیا؟ میں تو سمجھتا تھا تم بہت ہی مظلوم حالت میں کسی جگہ پڑی ہو گی۔"

"زمانے کی گردش نے مجھے یہ راستہ دکھا دیا۔ دنیا صرف طاقت کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ میں کب تک مار کھاتی رہتی؟ جیسے ہی مجھے موقع ملا، میں نے یہ گروہ بنا لیا۔ اس میں سب سے زیادہ کام صفدر نے کیا ہے۔ گورائے کے ہاں سے رقم چرا کر میں نے اس کے حوالے کر دی تھی کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے اپنا گروہ تیار کرے اور یہ کام اس نے بہت جلدی کر لیا۔ مجھے اس نے لوگوں کے درمیان بہن جی مشہور کر دیا۔ میری وفاداری کی قسم بھی ان سے لے لی اور اب یہ اپنا حصہ پا کر مجھے دعا دیتے ہیں۔ میں... میں وہ آسیہ نہیں ہوں بھائی جان! میں بہت بدل گئی ہوں۔"

"وہ تو ظاہر ہی ہے، بدلنا اور کیا ہوتا ہے، کیوں آبی؟"

"میں کیا کہوں بھئی! میں تو ان کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ کہاں تو یہ بہت مظلوم تھیں، اب خود ظالموں کی صف میں کھڑی ہو گئی ہیں۔"

"آپ بہت چالاک آدمی ہیں جناب آبی صاحب! آپ نے بڑی ہوشیاری سے مجھے بے نقاب کر دیا ہے ورنہ شاید میں آج بھی آپ کے سامنے نہ آتی۔"

"ہاں۔ اندازہ میرا بھی یہی تھا مگر اب ان کا بچہ کہاں ہے؟"

"اس شب خیر کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ بچہ، لاشاری کے پاس ہے، اس کے یہ دو آدمی بہت دنوں سے ادھر پھر رہے تھے مگر میں انھیں سمجھ ہی نہ سکی۔ اس نے راولپنڈی میں اپنے ٹھکانے کا ذکر غوث محمد سے یوں ہی بے خیالی میں کر دیا تھا۔ اسی لیے میں کل کار لے کر اس کے پاس جا پہنچی۔ صفدر اور کاظم نے اسے جاتے ہی چھاپ لیا مگر افسوس کہ دوسرا آدمی میرے ہاتھ نہیں لگا۔ میرا خیال ہے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ پہلے ہی لاشاری کے پاس جا چکا تھا۔"

"اب کیا ارادے ہیں آپ کے؟"

"کل میں ان کو لاشاری کے پاس مزدور بھیجوں گی، اسے بچہ واپس کرنا ہو گا ورنہ وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اس سے شادی کر لیں؟ وہ بہت آزردہ ہو رہا تھا۔" آبی نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"اس کو میں اور آزردہ دیکھنا چاہتی ہوں اس خبیث آدمی کو۔ وہ خود روتا ہوا یہاں آئے گا۔"

"ایسا نہ کریں۔ اس نے آپ سے کہا بھی تھا کہ آپ اس کے پاس رہ جائیں۔ وہ تو پہلے ہی رو چکا ہے کیوں جیلانی؟"

"ہاں۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے آپی! اس کا جرم قابلِ معافی ہے بشرطیکہ وہ بچے سمیت یہاں آ جائے۔"

"آپ بھی اس کی سفارش کرتے ہیں بھائی جان! —— آپ کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟" اس نے منہ بگاڑ کر کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔"

"میری غیرت ہی کہاں رہ گئی ہے بہن جی! میرا پہلا قدم ہی میری بے غیرتی کی دلیل بن گیا تھا۔"

"اور آپ میرے بیاہ کے لیے روپیہ لانے نکلے تھے، ہے نا یہی بات؟"

"ہاں۔ بس مجھ سے وہی غلطی ہو گئی ایسی غلطی کہ میں پھر سنبھل ہی نہیں سکا۔"

"اور اب میرے پاس ڈھیروں روپیہ جمع ہے میرا خیال ہے، آپ تو ابھی تک خالی ہاتھ ہی پھر رہے ہوں گے کیوں بھائی جان؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، بینک میں ہم دونوں کے نام کوئی ستر لاکھ روپیہ جمع ہے کیوں آپی اتنا تو ہو گا؟"

"ہاں۔ اتنی مارا ماری کے بعد ہم اس کے مالک بن سکے ہیں۔" آپی نے سگریٹ سُلگا لیا۔ آسیہ کے چہرے سے وہ نظریں نہیں ہٹا رہا تھا، بولا "یار، یہ تمہاری بہن ہی ہے نا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"اور کیا کہوں اسے؟ یہ تو سب کی بہن جی بن بیٹھی ہے، خدا اسے نظرِ بد سے بچائے، اب اس لاشاری کے ساتھی کا کیا کرنا ہے؟"

"اُسے میں چابک سے ماروں گی، وہ خود بتلائے گا کہ انھوں نے بچہ کہاں رکھا ہے شب خیر نے وہ زبردست دھوکا کیا کہ گئے، اسے پچاس ہزار بھی دے گئے۔"

"وہ تو مزے میں رہی مگر خیر لاشاری کو ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔ ہماری وجہ سے وہ ایک جگہ شدید زخمی ہو گیا تھا۔" میں نے آسیہ کو اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اُسے تو مر جانا چاہیے تھا اُس بے غیرت کو۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی ہوں بھائی جان! طاقت تو اب ہی میرے ہاتھ میں آئی ہے۔"

"نہیں، اسے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہو گا۔ میں بھی اسی خیال کا حامی ہوں، کیوں جیلانی؟"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔"

ہم کوئی دو گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھے رہے — اپنی اپنی ہڈ بیتی ایک دوسرے کو سُناتے رہے۔ وہ بیچاری میری باتوں پر کبھی رونے لگتی تھی اور کبھی قہقہہ لگاتی تھی۔ میری اور اُس کی تقدیر ایک جیسی تھی۔ اس نے سلاخوں کے پیچھے رہ کر جو ظلم سہے تھے، وہ مجھے کھُلے عام بھرے مجمع میں بار دنی بازاروں میں سہنے

پڑے تھے۔ فرق کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی تقدیر کی شاکی میں بھی۔ اور اب وہ اس جاگیر پر ہر حیثیت میں قابض رہنے سوچ رہی تھی جب وہ باتیں کر کر کے تھک گئی تو بولی "ٹھیک ہے اب آپ آرام کریں اور میرے لائق کوئی ہو تو بتائیں۔ یہ میرے ساتھی بڑے دلیر اور سُورما قسم کے شیر کی آنکھیں نکال سکتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ کوئی بات ہوئی تو ہم ضرور بتائیں گے۔"

ہم دونوں آسیہ سے اجازت لے کر باہر آ گئے میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ وہ بڑی بہادر اور قوی ابھری تھی۔ ذہن بھی اس کا بہت وسیع ہو گیا تھا اور معلوم تھا کہ اپنا حکم کس طرح منوایا جاتا ہے۔

آسیہ سے میری ملاقات کا دن بہت بڑا دن تھا۔ دن کے لیے میں نے ہزاروں دن سولی پر لٹک کر گزارے، ایسی سُولی جو میری جان کا فیصلہ نہیں کر پائی تھی کیسے کڑے گمبھیر لمحے میں نے جھیل لیے تھے، ایسے لمحے جن کی اذیتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا مل جانا اور صحیح سالم مل جانا میرے لیے ناقابلِ بیان خوشی کا سبب بن رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی ایک ہی گرُدے پر زندہ تھی لیکن اس کی صحت بہت عُمدہ ہو چکی تھی۔ وہ کھدر کے لباس میں بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی اور یہی میری سب سے بڑی آرزو تھی کہ میں جب اُسے دیکھوں تو بس دیکھتا رہ جاؤں کہ وہ میری بہن وہ حُسن و خوبی کا مرقع تھی۔ وقت نے اس سے بہت کچھ لیا تھا۔ اس کا دھیما دھیما لب و لہجہ اُس کے وجود کی وہ اداس اُس کے دل سے کسی کے گھر کا چراغ بن جانے کی آرزو۔ آن جانی چھت تلے رہ کر نُور بکھیرنے کا ارمان، وہ سب چھن چکا تھا۔ اب وہ ایک نئی آسیہ تھی جس کا پرانی آسیہ سے اتنا سا تعلق باقی رہ گیا تھا کہ اُس کے قالب پر اُس کا ڈھالا ہوا تھا۔ ورنہ اس کی زبان، اُس کا پشتونی لہجہ، اس کی سنگی ساتھی، اس کا وہ رعب، وہ دبدبہ سب کے لیے بالکل اُسے زندگی نے جو نیا سبق پڑھایا تھا، وہ اسے ازبر کر چکی تھی۔ اُسنے شاید گھوڑے کی پیٹھ پر اور خیمے کی زندگی کا مزہ اُسے معلوم تھا کہ اس کو کہاں اور کس وقت کیسے چھپنا ہے۔ ہمیں معلوم بھی نہ ہو سکا تھا اور حمید کلہری کو اپنے تیر کا نشانہ بنا لیا تھی۔ اس کی معلومات وسیع تھیں۔ اس علاقے کے سے وہ واقف ہو چکی تھی جب شب خیر کے پاس گل خان مایوس لوٹا تو اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ

اور وہ حمید کلہری تک جا پہنچی، اس کا یہ جھپٹنے کا انداز مجھے بہت پسند آیا۔

میں اور آپی اپنے کمرے میں واپس آ گئے اور پیر کھول کر بستر میں جا بیٹھے۔ آپی مسکرا رہا تھا کسی گہری سوچ میں کھو کر وہ ایسا ہی ہو جاتا تھا۔

"تیرا کیا خیال ہے جیلانی، یہ آسیہ ہی ہے نا؟"

"ہاں بھئی! یہ وہی ہے مگر یہ وہ آسیہ تو نظر نہیں آتی جسے میں جیل سے نکال لایا تھا۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا ہے وہ ڈاکوؤں کی سردار بن بیٹھی ہے۔" آپی نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! میرا خیال ہے اُن کو اس نے اپنی حفاظت کے لیے یہاں رکھا ہوا ہے۔"

"عین ممکن ہے بات یہی ہو۔ مگر اب ہم کیا کریں؟ اس کا منصوبہ تو یہ ہے کہ وہ اس جاگیر پر قابض رہنا چاہتی ہے۔"

"یہ تو بہت خطرناک بات ہو گئی بھئی! کوئی اس مکرم علی کا بھائی بند، کوئی اس کے عزیز رشتے دار تو ضرور ہوں گے وہ کیسے برداشت کریں گے اس بات کو؟" آپی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اس کا بندوبست تو وہ کر چکی ہے۔ تحمل حسین آخر کس لیے میں کام آئے گا؟"

"وہ تو بہت بد دل ہو رہا ہے، اُس کی باتیں سُنی نہیں ہیں تم نے، اُسے تو ہول آتا ہے۔"

"ایسے ہی بکواس کرتا ہے وہ۔ اگر وہ باز نہیں آتا تو پھر کسی دن اس کی موت کی خبر مشہور کی جا سکتی ہے۔" میں نے آپی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مکرم علی گورایا کے عزیزوں کو ہم کیسے روک سکتے ہیں؟"

"اس کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ تحمل حسین سے گورایا کی حیثیت سے ساری جاگیر بہن جی کے نام لکھوائی جا سکتی ہے۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مگر بہن جی کی حیثیت کیا ہو گی؟"

"ہاں۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ میں آج شام کو اُس سے بات کروں گا، اس بہن جی سے، اس نے تو کمال کر دیا ہے۔" میں نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ میں بھی اسے بہن جی ہی کہنے لگا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ مجھے اس معاملے میں آسیہ کی کامیابی بہت ہی مشکوک نظر آتی تھی۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ آسیہ نے تحمل حسین سے اپنا کیا رشتہ استوار کیا تھا؟ کسی

نے بھی مجھے یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ اس حویلی میں کے سوا کسی اور نام سے بھی پہچانی جاتی ہے۔ اگر وہ تحمل حسین کو اپنا شوہر بنا کر پیش کرتی ہے تو پھر معاملہ کچھ کا کچھ ہو سکتا تھا۔ ابھی اسے جاگیر پر قبضہ کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پتہ نہیں کتنے گاؤں اس جاگیر میں شامل تھے۔ آمدنی کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ پانچ چھ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا حساب وہ لگا چکی تھی۔ مگر اس سے آگے کی بات کا مجھے علم نہیں تھا۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ جب آپی نے گل خان کو بہن جی پر اُلٹا دیا تھا اور اس کا نقاب اُس کے چہرے سے ہٹا تو اُس وقت گل خان، ہسو لینی اور سندھو نے ایک دم نظریں جھکا لی تھیں۔ اُن میں سے کسی نے بھی اس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہن جی کو کوئی بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہستی سمجھ رہے ہیں۔ اُن کی نگاہ اوپر نہیں اٹھی تھی تاوقتیکہ بہن جی خود ہی اپنا نقاب درست کر کے اُٹھ نہیں گئی — وہ گم صم ہو کر کھڑے رہے، یہاں تک کہ گل خان نے پلٹ کر آپی پر بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بھی نگاہیں جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ اتنا احترام، اتنی عزت، اس قدر رعب و دبدبہ بہن جی کے لیے اُن لوگوں کے دل میں کیسے پیدا ہو گیا؟ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے آپی بھی اس وقت اسی نکتے پر غور کر رہا تھا، بولا —

"یار! تم نے اُن کا رویہ دیکھا، وہ کیسے صمٌ بکمٌ ہو کر بہن جی کے سامنے کھڑے رہے، یہ کرشمہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں آپی! کوئی سالا ہمیں ایسا نہ ملا جو ہمارا اس قدر احترام کرتا ہو۔ لگتا ہے اُن کو بہن جی نے ذہنی طور پر پوری طرح جکڑ رکھا ہے۔"

"تیرا احترام تو کیا ہو گا، اُلٹے جُوتے ہی پڑتے ہیں تجھے مگر یہ بھی دیکھو کہ اس شب خیر کو بھی قطعاً معلوم نہیں ہے کہ آسیہ ہی بہن جی بن گئی ہے۔"

"ہاں۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے بھئی! وہ بھی یہی سمجھ رہی ہے کہ آسیہ اور بہن جی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔"

"حالانکہ۔۔۔ نتھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ آر ون اینڈ دی سیم تھنگ۔"

"دفع کر یار! جتنا بھی اس معاملے پر غور کرتا ہوں، یہ بات اُلجھتی جا رہی ہے کسی طرح اس تحمل حسین کو ادھر بلا۔ میں ذرا اُس سے کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اُس سے بھی مل لیں گے مگر ہم کسی چکر میں نہ پھنس جائیں؟"

ہے کہ بہن جی کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ پولیس کا یہاں پھیرا بہت رہتا ہے اور وہ بلا وجہ نہیں آتے ہیں۔"
"کیا خیال ہے آسیہ کو یہاں سے لے کر کہیں اور جگہ منتقل کردیں؟"
"اور وہ یہ بات مان لے گی؟ نہیں یار جی! وہ اس حویلی کو کسی طرح بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگی۔" آبی نے میرے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر کیا کریں، ہم بھی ادھر ہی ڈیرا جمالیں؟"
"میرا تو خیال ہے کہ ہم شب خیر کے ہاں جا ٹھہرتے ہیں، وہاں ہمارے لیے رہائش اور خوراک کا بہت اچھا انتظام ہوسکتا ہے۔" آبی نے کہا۔
"تو ویسے ہی بیڑا غرق آدمی ہے، ابھی تک تیرا دھیان وہیں پھنسا ہے، سامنے کی بات پر غور کر آبی! لگتا ہے ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔"
"تم یہاں بہن جی کا تبتنی ابن کر بیٹھ جاؤ۔ تجمل حسین کی نوک پلک سنوارو اور عیش کرو۔"
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے آبی! بہرحال دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔"
آسیہ دوبارہ ہمارے سامنے نہیں آئی۔ غوث محمد نے ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا مگر ہم اُن کے مہمان خانے میں پھر بھی بے آسرا ہو کر بیٹھے رہے۔ اس لحاظ سے کہ گھر کا کوئی اور آدمی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہاں تک کہ گل خان، سندھو اور مسولینی بھی اس طرف نہیں آئے۔ ہم سمجھ ہی نہیں سکے کہ وہ لوگ کرتے کیا ہیں اور کس لیے انھوں نے ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے، حالانکہ ہم اُن سے ہزاروں باتیں پوچھنا چاہتے تھے مگر حویلی میں سارا دن خاموشی چھائی رہی۔ ایک گمبھیر سناٹا تھا جس نے وہاں کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ بڑا ہی صبر آزما دن تھا جسے کسی نہ کسی طرح ہم نے گزار ہی لیا۔ اور رات کو ہم دونوں قبلہ رو ہو کر سو رہے، یہ آبی کا مشورہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر رات آدمی کو قبلہ رُو ہو کر سونا چاہیے۔ کیا پتہ کس وقت جان نکل جائے۔ اُس رات بھی اس نے مجھ سے یہی بات کہی اور پلنگوں کا رُخ اس نے شمالاً جنوباً کرنے کے بعد اپنا منہ قبلے کی طرف پھیر لیا۔
"میں تیری یہ بات سمجھ نہیں سکا ہوں آبی! تو ہر جگہ یہی کوشش کرتا رہتا ہے، آخر قصہ کیا ہے؟"
"بھائی! میں گناہ گار آدمی ہوں کیا پتہ میری پھوک کس وقت نکل جائے اس لیے میں سوتے میں بھی موت سے بے خبر نہیں رہتا ہوں۔ کم سے کم میرا منہ تو قبلے کی طرف رہنا چاہیے۔"
"اور نماز، زکوٰۃ، حج اور دُوسری چیزیں تیرے صاحب کے ذمے ہیں؟ آج تک تُو نے سجدہ نہیں کیا، یوں قبلہ رُو ہونے کا فائدہ؟"
"یار ایک تو تیری یہ حجت بازی مجھے اچھی نہیں، آخر کو میں مسلمان ہوں، فرشتے تو مجھے گرز مار مار کر چلا دیں گے کہ بتا تو کہاں کا مسلمان ہے؟ کیا ثبوت ہے تیرے، پانچوں کلمے سُنا۔ اور مجھے صرف ایک ہی یاد ہے۔"
"وہ بھی بہت کافی ہے۔"
"میرے دل میں آج کل چنار بسی ہوئی ہے، میں شب خیر کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ ایک تو سال ہی ختم ہو گئی۔ کیا خیال ہے میں غوث محمد سے کہوں؟ میں شاید شراب مل جائے۔"
دفع کر آبی! لعنتی تو اب ان پر بھی ثابت کرے گا، شراب بھی پیتا ہے۔ سالے یہ بھی تیرے خلاف قیامت روز گواہی دیں گے اور میں تو ضرور ہی کہوں گا کہ اس کا منہ سُونگھو، یہ دُنیا میں شراب پیتا رہا ہے۔"
آبی کھلکھلا کر ہنس دیا، بولا "تو پہلے ہی دو... جا چکا ہوگا، بیلائی! تو کچھ نہیں کر سکے گا وہاں۔ یار! سُن رہا ہے تو؟"
"ارے! یہ تو کسی گاڑی کی آواز ہے، لگتا ہے کوئی ... سے گزر رہا ہے۔"
"کیا وقت ہو رہا ہے تیرے پاس؟"
"بارہ بج رہے ہیں بھئی! اتنی رات گزر گئی۔"
"پتہ نہیں یہ گاڑی کہاں جا رہی ہے، میں ... کہ یہ قصہ کیا ہے؟"
"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے پاؤں میں پھنساتے ہوئے کہا اور پھر ہم تیزی سے ... سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچے مگر اس وقت تک کار ... میں داخل ہو چکی تھی اور غوث محمد دروازہ کھولنے آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں مکمل ... چھایا ہوا تھا۔ کار کی اندر کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ البتہ ... میں روشن بلب اس کار کو نمایاں کر رہا تھا۔ وہ بہن جی کی ... تھی اور اس میں گل خان، سندھو اور مسولینی بیٹھے ... اور حیرت مجھے یہ ہو رہی تھی کہ کار کی اگلی نشست پر ... بہن جی براجمان تھیں۔
"یہ کیا قصہ ہے بھئی! یہ لوگ اس وقت کہاں ..."
"میں خود حیران ہوں آبی! اس وقت بھلا باہر جانے کی کیا تُک ہے؟"
"پھر دا! غوث محمد سے معلوم کرتے ہیں، اس کو ضرور پتہ ہوگا۔"
اتنے میں غوث محمد کار کو راستہ دینے کے بعد دروازہ بند کرکے پیچھے ہٹا تو ہم اندھیرے میں سے نکل کر اس کے سامنے جا پہنچے۔ دونالی بندوق اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی اور وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ ہمیں اُس نے دیکھا تو ایک لحظے کے لیے ٹھٹک گیا مگر پھر وہ سنبھل کر آگے بڑھا، بولا۔
"ارے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟"
"بس نیند نہیں آ رہی تھی اسی لیے ہم باہر نکل گئے مگر اس کار میں باہر کون نکلا ہے؟"
"وہ... وہ بہن جی تھیں، کسی کام سے باہر گئی ہیں۔"
"اس وقت!" آبی نے پوچھا۔ وہ غوث محمد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
"کوئی کام ہوگا نا انھیں! میں تو پوچھتا نہیں۔ مالک ہیں، جہاں جی چاہے جا سکتی ہیں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے غوث محمد! مگر......... اُن کے ساتھ کون گیا ہے؟"
"کوئی بھی نہیں! وہ اکیلی ہی گئی ہیں۔" غوث ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم سے نظر ملا کر بات نہیں کر رہا تھا۔
"مگر میرا خیال ہے اس میں گل خان اور مسولینی بھی تھے۔"
"ہاں ہاں۔ وہ تو ان کے ساتھ ہوتے ہی ہیں، سندھو گاڑی چلا رہا تھا۔ میرا خیال ہے اب تو آپ کو بھی سو جانا چاہیے۔"
"سو جائیں گے بھئی! سو جائیں گے، ان کا یوں رات کو باہر جانا ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے غوث محمد! تمھیں تو پتہ ہوگا کہ یہ قصہ کیا ہے؟" میں نے غوث محمد کو اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ آبی نے بڑی مروّت سے اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔
"تیرا جواب نہیں ہے غوث محمد، آخر تُو سوتا کس وقت ہے؟"
"بس سو ہی لیتا ہوں جی! دن کو مجھے چار چھ گھنٹے مل جاتے ہیں سونے کے لیے۔"
"لے یہ سگریٹ پی۔ کہیں سے چائے مل سکتی ہے؟"
"جی ہاں۔ مل سکتی ہے، میں ساری چیزیں ادھر ہی لے آتا ہوں، اسٹوو بھی ہے میرے پاس۔"
"پھر تو مزے ہی آگئے، لے آ یار، ساری چیزیں لے آ۔"
آبی خوش ہو گیا، وہ اس معاملے پر غوث محمد سے بعد میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یُوں کیا کہ اپنے کمرے سے وہ دودھ، چائے کی پتی، پانی اور اسٹوو ہمارے پاس لے آیا اور بڑی جانفشانی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔
"یار غوث محمد! تو یہ بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ آخر بہن جی کا اس وقت باہر جانا خالی از علت نہیں ہے۔"
"میں کیا بتاؤں خان جی! وہ لوگ دراصل آج رنرک گئے ہیں۔ مسولینی کوئی خبر لایا تھا جس کو سُن کر بہن جی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔"
"کیا خبر لایا تھا مسولینی؟" آبی نے بڑی بے تابی سے پُوچھا۔
"اس کا تو مجھے پتہ نہیں ہے، میں اُن سے کیسے پوچھ سکتا ہوں؟"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر مسولینی تو شاید آج باہر ہی نہیں نکلا۔"
"وہ باہر گیا تھا جی! آپ تو اپنے کمرے ہی میں بیٹھے رہے۔"
"یہ رنرک ہے کہاں؟"
"یہ جگہ یہاں سے کوئی ساٹھ میل دُور ہے۔ پکی سڑک وہاں تک جاتی ہے، اینٹوں کی بنی ہوئی سڑک ہے۔ کار کے لیے ٹھیک ہی ہے۔"
"ہوں، مگر وہاں ہے کیا؟ کوئی پیر فقیر رہتا ہے وہاں کہ گانا بجانا ہوتا ہے؟ آخر یہ لوگ آدھی رات کو وہاں گئے کیوں ہیں؟"
"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جناب! میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔"
"تم بہت گھنّے آدمی ہو غوث محمد! تمھیں پتہ ہے ساری بات کا پتہ ہے مگر منہ نہیں کھولتے ہو۔"
"قرآن کی قسم مجھے بالکل پتہ نہیں ہے۔" اس نے بڑی سادگی

ہپناٹزم "ہپناٹزم کے عملی طریقے" اور "ذاتی ہپناٹزم" کے بعد ایک اور نئی کتاب
ایک ماہرِ علم کے قلم سے
قیمت: ۱۵ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے
ہپناٹزم کے بارے میں آج تک کی تمام تحقیقات کا نچوڑ۔
جدید طریقے اور مشقیں۔
ہپناٹزم کی مشقوں کے لیے مکمل لائحہ عمل اور پورا پروگرام۔
بے شمار قارئین کے ہزاروں سوالوں کے جواب۔
ہپناٹزم کے موضوع پر ایک مکمل کتاب جس میں مصنف کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں
مکتبۂ نفسیات
پوسٹ بکس ۹۴۳۰ کراچی

سے کہا یوں جیسے وہ واقعی اس بارے میں قطعی لاعلم ہو۔

"ٹھیک ہے بھئی! لاؤ چائے ادھر کرو۔" آبی نے مایوس ہو کر کہا۔ غوث محمد کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر تمام برتن وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آبی تھک ہار کر بستر پر لیٹ گیا، بولا "دفع کرو یار! اس معاملے پر زیادہ مغز پچی نہ کرو۔ وہ واپس آئیں گے تو پتہ چل جائے گا۔"

"مجھے فکر سی لگی ہے آبی! آسیہ کو اس وقت باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہے، اسے چاہیے تھا وہ مجھے بتا کر جاتی۔"

"کیا بتا کر جاتی یار! اس کی اپنی زندگی ہے جسے وہ اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہے تمہارے آنے سے وہ اسے چھوڑ تو نہیں سکتی۔"

"مگر وہ میری بہن ہے آبی! اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہاں پہنچ چکا ہوں۔"

"اگر وہ تمہیں کوئی ایسا درجہ نہیں دینا چاہتی ہے تو تم کیا کر سکتے ہو؟"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے کوئی کسی کے معاملے میں کیسے دخل دے سکتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو آبی لعنت بھیجو اس قصے پر۔" یہ کہہ کر میں بھی بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نے اس وقت تک ہمیں نڈھال کر دیا تھا۔ آبی تو جلدی ہی سمندروں کی آگ بجھانے نکل گیا مگر میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پتہ نہیں ذہن کیوں اس قدر الجھ گیا تھا۔ آسیہ کے رویے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اُن تینوں آدمیوں نے یا تو اسے نرغے میں لے رکھا تھا اور اُسے ملنے نہیں دیتے تھے، اس سے جو کام چاہتے تھے کروا لیتے تھے یا پھر عین ممکن ہے آسیہ نے ہی انہیں نئے نئے راستے سجھا دیے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ کسی واردات کے لیے باہر نکلے ہیں ورنہ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ آسیہ آدھی رات کو یوں مجھے بتائے بغیر نکل جاتی۔ میں حویلی میں موجود تھا اور میں یوں ہی بلاوجہ تو اس تک نہیں جا پہنچا تھا۔ اسے کوئی بھی بات مجھ سے چھپانی نہیں چاہیے تھی مگر حالت یہ تھی کہ اس نے حمید کلہوڑی کے بارے میں بھی مجھ سے کوئی مزید بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ بچے کے بارے میں وہ بہت پریشان تھی۔ میرا کیا تھا میں نے تو آسیہ کے لیے ہی یہ سب دکھ اٹھائے تھے مگر میرا خیال ہے اُسے ان کی کوئی قدر نہیں تھی۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ وہ مجھ سے یوں ملی تھی جیسے کوئی دیرینہ دوست اچانک سامنے آ جائے اور بس۔ اس کے دکھ درد، اس کے مسائل، اس کا ماضی، اس کا مستقبل دوسرے کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اسے آپ زیادہ سے زیادہ ایک رات کا کھانا اور سونے کے لیے بستر دے دیتے ہیں اور بس۔ میرا او[ر آسیہ] کا اس حویلی میں یہی حال تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ہم دونوں [یہاں] سے نکل جاتے۔ وہ اپنے معاملات کی خود ذمے دار تھی۔ وہ خو[د] اُن سے نمٹ سکتی تھی۔ اس کا برا بھلا وہی بہتر سمجھ سکتی تھی جب تو اس نے ہم سے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیسے کیسے جا[نے] خیالات میرے ذہن میں آ کر دم توڑ گئے۔ میں ماں کا رو[پ] دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی مجھ سے اجنبیوں کی طرح ملی تھی جیسے پر بہت پہلے مٹی ڈال چکی ہو اور اب وہ مزید اس کے بارے [میں] سوچنا نہ چاہتی ہو کہ مُردے تو آخر مُردے ہوتے ہیں۔ ان [پر] پتھر چن دینے کے بعد کون یاد رکھتا ہے کہ وہ کون تھا اور [اس] نے دوسروں کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ کیسے کیسے مرحلوں سے کس کس طرح ہلکان ہو کر نکلا ہے۔ اس بات پر کسی کا دھیا[ن] جاتا۔ میں آسیہ کی رہائی کے لیے ساری کاوش عبادت سمجھ کر [کر] رہا مگر اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سب کچھ تو اس کی [نظر] میں کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا میری محبت، میرے خلوص، میری ہمدردی میں کوئی کمی رہ گئی تھی؟ بہن کے لیے میرا پر[یشان] رہنا اور سالہا سال تک پریشان رہنا بیکار ہی چلا گیا؟ کی[ا] اس کے دل میں میرے لیے وہ پیار نہیں جاگا جس کا سہارا لے [کر] میں پہاڑوں سے جا ٹکرایا۔ وہ ایسی کیوں ہو گئی تھی؟ کیا [اسے] یہ پسند نہیں ہے کہ میں اس کے پاس رہوں، اس کے معاملات [میں] دخل دوں، آخر وہ... وہ ایسی کیوں ہو گئی ہے؟

یونہی سوچتے سوچتے کروٹ پر کروٹ لیتے صبح کے [...] بج گئے اور میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ رات کی میان سے [صبح کی] تلوار باہر آنے لگی تھی۔ صبح طلوع ہونے کے آثار نمایاں [ہو] گئے تھے۔ کھلی کھڑکی میں سے آسمان اب ڈھلتے ٹمٹماتے [ستاروں] کا آنگن بن چکا تھا کہ عین اس وقت کسی نے بڑے درو[ازے] پر دستک دی۔ غوث محمد اس وقت گہری نیند میں تھا مگر [میں] ہی اٹھ گیا مگر اس سے پیشتر کہ وہ باہر نکلتا، میں کمرے [سے نکل کر] ہوا برآمدے سے گزر کر ڈیوڑھی کے دروازے تک جا پہنچا۔ "کو[ن] بھئی!"

"میں ہوں سندھو! دروازہ کھولیں سردار صاحب۔"

"اوہ! تو یہ تم ہو۔" میں نے دروازے کے تینوں [کنڈے] کھول کر تختے کو پیچھے ہٹا دیا۔ میرے سامنے سندھو [بڑی] پریشان حالت میں کھڑا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، چہرے [پر ہوائیاں] اڑی ہوئی، کپڑوں پر گرد جمی ہوئی۔ کار اس کے [پیچھے کھڑی] تھی۔

"کیا ہوا، خیر تو ہے سندھو یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"بوہت بُرا ہوا سردار صاحب، بہت بُرا ہوا۔ ہم..... چلیں اندر چل کر آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔"

اس کا ذہنی اضطراب اسے دم لینے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔

اتنے میں غوث محمد بھی وہاں آ پہنچا۔ میں نے سندھو کو ڈیوڑھی میں سے گزار کر اپنے کمرے میں پہنچایا۔ اس حال میں کہ ایک طرف سے اسے غوث محمد نے سنبھال رکھا تھا۔

ہماری آواز سن کر آبی بھی اٹھ بیٹھا۔ وہ نیند پوری کر چکا تھا۔ جب بتی جلی تو اس نے سندھو کو دیکھ کر کہا۔ "اسے کیا ہوا ہے بھئی! یہ تو اچھا بھلا گیا تھا یہاں سے۔"

"بوہت لفڑا ہو گیا ہے گرڈیزی صاحب! اُدھر ہم ٹرنک گئے تھے۔ خبر مسولینی لایا تھا کہ اُدھر آج رات افیم کا پیسہ آ رہا ہے، ہاں پچاس لاکھ روپیہ! وڈو کے پاس اور پہرہ کوئی نہ ہوگا مگر وہ تو سب کے سب مسلح تھے۔ ہماری پیش ہی نہ چل سکی اور وڈو بہت کمینہ آدمی ہے۔ بہن جی وہیں پھنس کر رہ گئیں۔ گل خان اور مسولینی بھی وہیں ہیں اور صبح وہ ان کو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ہم تباہ ہو گئے سردار صاحب! ہم سالا کچھ بھی نہ کر سکا۔ کا رکے کر اِدھر بھاگ آیا۔ کیا کر سکتا تھا ہم۔ آپ لوگ کچھ کر سکیں تو ان کو بچا لیں۔"

"دُر فٹے منہ تیرا۔ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ کتے! تم نے بہن جی کو مروا دیا ہے۔"

آبی بستر سے اٹھ گیا اور پاؤں بوٹوں میں پھنسانے لگا۔

"اس کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"مسولینی نے۔ اور بہن جی فوراً تیار ہو گئیں۔ ہم بارہ بجے یہاں سے نکلے تھے۔ تباہ ہونے کے لیے نکلے تھے۔ ہم کو پانی پلاؤ غوث محمد! ہماری جان نکلی جاتی ہے۔ اوہ خدایا یہ کیا ہو گیا؟"

"تم بچ کر کیسے نکل آئے، وہیں مر گئے ہوتے۔" آبی نے کمبل اپنے گرد اوڑھتے ہوئے کہا۔

جان تو میری بھی نکل گئی تھی۔ سندھو نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی تھی۔ "وہ وڈو ہے کون؟ کیا دھندا ہے اس کا؟"

"وہ ذات کا لوہار ہے، پر اب اس کے دن پھر گئے ہیں۔ کئی سال سے وہ افیم کا کاروبار کرتا ہے، بڑی بلڈنگ بنا لی ہے اس نے ٹرنک میں اور پولیس سے اس کا خاص یارانہ ہے۔"

"ہوں! تمہارا کیا خیال ہے، پولیس وہاں آ چکی ہے؟"

"نہیں، مگر وہ یہی کرے گا۔ بہت ذلیل کا پُتر ہے وہ، مجھے پتہ ہے۔"

"کار میں پیٹرول ہے؟"

"جی ہاں، ٹینکی فل ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چلو، دیکھتے ہیں کیا کر سکتا ہے۔"

میں نے بھی کمبل اوڑھ لیا۔ باہر کی ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔

"ہتھیار ہیں تمہارے پاس؟" آبی نے اپنا پستول دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے بہت بے بضاعت تصور کر رہا تھا۔

"ہاں۔ میں آپ کو اسٹین گنیں لا دیتا ہوں۔"

"جاؤ پھر۔ جلدی کرو، پتہ نہیں وہاں حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔"

سندھو اسی وقت غوث محمد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کی اپنی اسٹین گن بھی وہیں کہیں موقعۂ واردات پر ہی رہ گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ واپس آیا تھا۔

"مجھے پہلے ہی سے یہ خدشہ تھا جیلانی! آسیہ نے بہت راستہ اختیار کیا ہے، وہ اس کام کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔ کپڑے پہننے اور نقاب اوڑھ لینے سے کوئی ڈاکو تھوڑی بن جاتا ہے۔ بالکل خبطِ دماغ عورت ہے وہ۔"

"پتہ نہیں یہ مشورہ اسے کس نے دیا تھا حالانکہ عاقل عورت ہے وہ۔ بچی نہیں ہے کہ سمجھ نہ سکے۔"

"اس نے پہلے بھی کئی وارداتیں کی ہیں۔ اس حویلی پر بھی اسی طرح ہی قابض ہوئی ہے۔ یہی اس کے لیے بہت کافی تھا مگر اس کا لالچ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ وہ کس لیے؟ کس کے لیے کام کر رہی ہے؟ میں تو نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"آدمی پاگل ہو جائے تو اس کا کیا علاج ہے۔ پتہ نہیں سے وہ کیا کچھ سیکھ کر باہر نکلی ہے، خدا ہی خیر کرے۔"

دل میرا بھی اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کا رویہ عجیب تر ہو گیا تھا اور وہ پتہ نہیں وڈو کیا چیز تھا۔ دولت کی حفاظت کون نہیں کرتا۔ کسی کے پاس لاکھوں ہوں تو کوئی اسے ہوا بھی نہیں لگوا تا ہے پھر آسیہ اس پر جا پہنچی۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے آدمی مقرر کر رکھے، سارا معاملہ ہی مجھے بہت الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہونے والی تھی۔ میں اور آبی تو موٹے بادل پر کھڑے تھے، پاؤں کہاں سیدھے پڑ سکتے تھے۔ ایک تدبیر بھی جو ہم کر رہے تھے، ورنہ خدا معلوم وہاں کے حالات کیا سے کیا ہوں۔ اگر وہ افیون کا کاروبار کرتا تھا تو بلاشبہ اس کے ہاتھ بہت ہوں گے۔ اس نے گاؤں میں سب سے اونچی بلڈنگ بنائی تھی۔

نمٹ لینا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر پولیس بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی تو پھر ہم دونوں بھلا کس گنتی شمار میں آ سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس وڈو لوہار نے کسی بزرگ کا بال گھر کی دہلیز میں دفن کر رکھا ہو جو اسے بتا دیتا ہو کہ دولت کا دھیان رکھ، کوئی تیری طرف آ رہا ہے۔ ایسے ٹونے ٹوٹکے بھی بعض اوقات کام آ جاتے ہیں اور اب وہ گل خان، مسولینی اور بہن جی کو پکڑ بیٹھا تھا۔ وہ موتی چور ایسی آسیہ اس کے دام میں پھنس گئی تھی۔ ایسے میں ہم کیا کر سکیں گے؟ سیکڑوں سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے تھے۔ آبی الگ شدید پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ پستول کھول کر اس نے گولیاں گنیں اور اسے نیفے میں پھنسا کر بولا۔ "تیرا کیا خیال ہے، یہ ہمارا آخری پھیرا نہیں ہے؟"

"نہیں یار! اتنا مایوس نہ ہو، وہ بھی آدمی ہیں کوئی جن تو نہیں ہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ میں وصیت نامہ نہ لکھ دوں؟"

"ہاں ضرور لکھ دو۔ کہہ دینا کہ جیلانی میرا وارث ہے۔ اپنے بیوی بچے بھی میرے نام لکھ دینا۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"اور کیا کروں میں؟ آسیہ، آسیہ، آسیہ، زندگی کا کوئی اور عنوان ہی نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے بھی یہی نظر آتا ہے۔ موت ہمارا مقدر بن چکی ہے مگر... مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ جانا تو ہوگا ہی۔ اسے ہم وڈو کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اسے کیا پتہ جال سے کیسے باہر آتے ہیں، یہ دھندا تو اس کے لیے بالکل ہی نیا ہے۔"

آبی مسکراتا رہا مگر اس کی مسکراہٹ میں جو طنز تھا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہ میرا جی دار ساتھی، وہ خلوص کا مارا آبی میرے لیے ہر جگہ جان لڑانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ جب بستر سے اتر کر بوٹ پہن رہا تھا تو اس وقت اس کے چہرے پر ایسا عزم نظر آتا تھا کہ وہ میرے لیے پہاڑوں سے بھی ٹکر لینے پر آمادہ ہے۔ ایسے میں کوئی مشکل اس کی راہ نہیں روک سکتی تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی مگر اب جو طنز اس کے چہرے سے عیاں تھا تو وہ اس تقدیر پر تھا جو ہمیں پتہ نہیں کہاں سے کہاں لیے پھرتی تھی۔

سندھو جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین اسٹین گنیں تھیں اور ان کی گولیوں کی تین لڑیاں بھی۔ وہ اس نے ہمیں دے دیں۔ سالا پکا ہوشیار تھا کہ پتہ نہیں کیا وجہ تھی وہ رکھ ہمیشہ رکھتا تھا اور یہ ایسی مصیبت تھی کہ جس سے ہم بچ نہیں سکتے تھے۔ شکر ہے کہ شادی پر شکرانہ کا شربت۔

اسٹین گن سنبھال کر آبی بولا۔ "چل بھئی! تو پرندے کی طرح گھر لوٹ آیا ہے یہی بڑی بات ہے، چل نکل باہر۔"

"میں کیا کرتا گرڈیزی صاحب، جس جگہ تجوری رکھی تھی اس کمرے کا دروازہ تو کھل گیا۔ آسانی سے کھل گیا پر پھر ایک اور دروازہ اس پر آ گرا۔"

"چل آ گے لگ۔ ایک دم پاگل آدمی ہے تو۔"

چند ہی ثانیوں میں ہم ڈیوڑھی سے نکل کر کار میں جا بیٹھے۔ اس وقت تک صبح کے موتی ٹھنڈے ہونے لگے تھے، اجالا اتنا واضح تھا کہ ہم ایک دوسرے کو بخوبی پہچان سکتے تھے۔

"اب بتاؤ سندھو کہ ہوا کیا ہے وہاں؟" آبی نے کار میں پھیلتے ہوئے کہا۔

"کیا کہوں میاں جی! بہن جی کے ساتھ گل خان اور مسولینی بلڈنگ پر چڑھ گئے۔ اُن کی تجوری دوسری منزل پر ہے۔ دروازہ اس کا نرم سا ہے، وہ انھوں نے کھول لیا۔ کسی کو جگانے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، اوپر سے ایک اور دروازہ دھاں کر کے نیچے گرا اور وہ تینوں اندر۔ مرغے کی طرح بند۔ اوپر سے تین آدمی فوراً دروازہ پر آ گئے۔ وڈو بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اُن کی کوئی مدد بھی نہ کر سکا۔ کسی نے میری گردن پر بندوق رکھ دی۔ اس کو میں نے بڑی مشکلوں سے روکا اور سیدھا آپ کی طرف بھاگا۔"

"کیوں ہماری طرف کیا تھا؟ ہم کون سے لاٹ کین لگے ہیں یہاں؟" آبی نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس سالے کی 'ر' ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔

"کیا کہوں جی! مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں۔ بہن جی کے دوسرے آدمی آج کسی اور طرف نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ لمبی چھٹی پر گئے ہیں۔"

"سن رہے ہیں سردار صاحب! یہ حال ہے سندھو کا اور گئے تھے ڈاکا ڈالنے۔"

"پر میں کیا کرتا صاحب جی! وہ دروازہ تو کڑکی کی طرح ٹھاؤں ٹھپ نیچے گر گیا۔ آواز جب ہی آئی جب وہ اندر پھنس چکے تھے۔"

"میرا خیال ہے جیلانی کہ بہن جی کو ہر امیر آدمی سے نفرت ہو چکی ہے۔ وہ ان کا نام ہی برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ اسے روپے کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ورنہ وہ یوں منہ اٹھا کر نہ چل دیتی۔ پتہ نہیں اب اس کی گلو خلاصی کیسے ہوگی؟"

"بہرحال دیکھتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ بہت

ٹیڑھی کھیر۔"

عین اس وقت ہمیں چار گھڑ سوار کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتے نظر آئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ سڑک پر آ چڑھے۔ وہ کوئی پولیس کے سپاہی تھے اور اُن کا رُخ بھی اُدھر ہی تھا جدھر ہم جا رہے تھے۔ ہماری کار تک تو وہ بہرحال نہ پہنچ سکے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم اُن سے خاصے آگے نکل چکے تھے کہ آبی بولا۔

"کیا خیال ہے سندھو! یہ سپاہی رزمک ہی نہیں جا رہے؟"

"ہو سکتا ہے، بالکل ہو سکتا ہے۔ رُخ اِن کا اسی طرف کو نظر آتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم گاڑی آہستہ کرو۔ انھیں پاس سے گزرنے دو۔"

سندھو نے ہمارے کہنے پر کار آہستہ کر لی۔ کچھ ہی دُور جا کر گھڑ سوار ہماری گاڑی کے قریب آ کر آگے نکل گئے۔ ہم نے کار ان کے ساتھ ساتھ رکھی۔ چند قدم آگے جا کر میں نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے میاں جی! یہ رزمک کدھر ہے؟"

"اسی سڑک پر ہے۔ کوئی پندرہ میل دُور ہو گا۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔" اُن میں سے ایک آدمی نے میرے قریب آ کر کہا۔ وہ کوئی ہیڈ کانسٹیبل قسم کی چیز لگتا تھا۔

"بڑی مہربانی جناب کی۔ آپ سے وہیں ملاقات ہو گی۔"

یہ کہہ کر میں نے سندھو سے کہا کہ کار آگے بڑھا لے۔

"کیا ارادے ہیں تمھارے؟ روکنا ہے ان کو؟" آبی نے پوچھا۔

"ہاں اِن سے کام لینا چاہیے بھئی! یہ وردیاں کس دن کام آئیں گی؟"

کار ہم نے اُن سے کوئی دو فرلانگ آگے نکال لی اور ہم اس میں سے نکل کر باہر کھڑے ہو گئے۔ اسٹین گنیں ہم نے سندھو کے حوالے کر دیں اور اسے کہہ دیا کہ کوئی گڑبڑ نظر آئے تو انھیں بے دریغ استعمال کرے۔ آبی اچانک یوں کار کی ڈگی پر گرا جیسے وہ بے ہوش ہو رہا ہو۔ اس وقت وہ ہمارے قریب آ چکے تھے، آبی کو یوں گرتے دیکھ کر وہ رُک گئے اور چاروں کے چاروں گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ اُن سے درخواست ہی میں نے اس طریقے سے کی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکے۔ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "کیا ہوا انھیں؟ یہ تو شاید بے ہوش ہو گئے ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ ہی دیکھیں انھیں کہ ہوا کیا ہے۔"

"شریف صاحب! آپ ان کو دیکھیں، آپ تو ہومیو پیتھ بھی ہیں۔" اس نے دوسرے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ آبی کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔ اس دوران شریف صاحب بھی مزید آگے آ گئے۔ وہ بھی آبی کے پپوٹے کھول کر دیکھنے لگے جو کسی طرح کھل ہی نہیں رہے تھے۔ آبی یوں ہو گیا تھا جیسے وہ صدیوں سے بیمار ہو۔

"بات یہ ہے ہدایت صاحب کہ اِن کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ کوئی بہت غمناک خبر سُنی ہے انھوں نے۔ کیا نام ہے ان کا جناب؟"

"وہ جی علی حسن گردیزی۔ مگر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے یہ۔"

"نہ بتاتے ہوں تو الگ بات ہے۔ یہ دیکھیں نا ہدایت جی! نبض بہت ہی آہستہ چل رہی ہے۔ خون کا دورہ بھی کم ہو رہا ہے۔ انھیں آپ اسپتال لے جائیں۔" وہ دونوں ایک بار پھر آبی پر جھک گئے۔ اس اثنا میں، میں نے آگے بڑھ کر کمبل کی اوٹ میں ہاتھ بڑھائے اور اُن دونوں کی جھکی ہوئی گردنوں کی نسیں [illegible] وہ ایک دم آبی پر جا گرے، دونوں ہی بے ہوش ہو چکے تھے۔

"اوئے یہ کیا ہُوا ہے بھئی! ذرا اِن کو دیکھو میاں۔ شریف صاحب اور ہدایت صاحب کو۔ یہ بھی بے ہوش ہو گئے۔" میں نے ایک دم دہائی مچا دی۔ اُن کے دونوں ساتھی تیزی سے آگے بڑھے اور اپنے بیمار ساتھیوں کو دیکھنے لگے۔ انھوں نے باری باری انھیں کار کی ڈگی پر سے ہٹایا اور پرے لے جا کر [illegible] ڈال دیا۔ اب وہ اُن کی ہتھیلیاں مسلنے لگے تھے۔ انھوں نے [illegible] کے بھاری بھرکم بوٹ بھی اتار دیے۔

"اوئے ذرا اِن کے پیروں پر مالش کر پیر علی! یہ تو بڑا ہی بُرا ہُوا۔ راستے ہی میں بیمار ہو گئے ہیں یہ دونوں۔"

"اور ابھی ہمیں رزمک بھی جانا ہے، وٹو صاحب کا [illegible]"

"اوئے بیڑہ غرق! پتہ نہیں یہ کیسی مصیبت آ پڑی ہے۔ ہم راستے ہی میں رہ گئے ہیں۔" وہ زور زور سے شریف صاحب کے پیروں کی مالش کرنے لگے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ایک ہاتھ کو ہی مالش کرنے لگا۔ اچانک وہ دونوں [illegible] کے اور زیادہ قریب ہو گئے اور اب وہ اس کے سر پر مالش کرنے لگے تھے۔ انھیں یوں اتنا قریب دیکھ کر میں نے اُن دونوں کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ ایک پر دایاں اور دوسری پر بایاں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں نے اُن کی رگیں مسل دیں۔ وہ دونوں [illegible] ہاتھوں پر ہی جھول گئے۔ یوں ہو گئے جیسے وہ سالہا سال سے [illegible] لیے ہوں۔ مردہ حالت میں جی رہے ہوں۔ دونوں کو میں نے [illegible] پر لٹایا اور پھر سندھو میرا اشارہ پا کر تیزی سے باہر آ گیا۔ [illegible] بے ہوشی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُن چاروں کو ہم نے اٹھا کر [illegible] اندر بٹھایا۔ اب سوال یہ تھا کہ اِن کے گھوڑوں کا کیا کریں۔

"اِن کو میں بھگا دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ تم یوں کرو سندھو کہ اِن سب کو لے جا کر کہیں کسی درخت کے ساتھ باندھ دو۔ شاید ہمیں اِن کی ضرورت [illegible]"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے سندھو گھوڑوں کو لے کر سامنے کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس وقت تک ہم نے ان چاروں کی وردیاں اتار لی تھیں۔ آبی اُن پر طرح طرح کے فقرے کس رہا تھا۔ جو وردی اُسے ملی وہ تو گویا اسی کے لیے بنی تھی۔ اپنے کپڑے اتار کر ہم نے الگ باندھ لیے۔ سندھو جب واپس آیا تو بولا "کمال کر دیا ہے آپ نے۔ میری وردی کہاں ہے؟"

"اِن دونوں میں سے کوئی پہن لو، یہ دونوں وردیاں تمھاری ہیں۔" آبی نے پھر اس کی نقل اتاری۔

وہ کچھ گھبرا سا گیا، بولا "یار! میرا مذاق تو نہ اڑاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ سندھو لباس تبدیل کر چکا تو بولا۔ "یار! میں تو بہت حیران ہوں یہ بے ہوش کیسے ہو گئے؟ کیا کیا ہے تم نے اِن کے ساتھ؟"

"کہو تو تمھیں بھی بے ہوش کر دیں، مزے ہی مزے ہیں اِس بے ہوشی میں اور اس نیم خوابی میں۔ کیوں سردار صاحب؟"

"بس ٹھیک ہے یار! اس کو ابھی زندہ ہی رہنے دو۔ دیکھو سندھو تم ان چاروں کو اٹھا کر اِدھر کھیت میں ڈال دو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کار ہی اُدھر لے چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کچھ ہی لمحوں بعد وہ اُن درختوں کے پاس جا پہنچا جہاں وہ گھوڑے باندھ آیا تھا۔ باری باری اُس نے چاروں سپاہیوں کو زمین پر ڈال دیا اور پھر وہ سڑک پر آ چڑھا۔ وہ پولیس کی وردی پہن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ جوتے اسے ذرا بڑے تھے مگر پھر بھی وہ اُن سے کام لے سکتا تھا۔

"اب کیا حکم ہے جناب؟"

"دیکھو! میں ہیڈ کانسٹیبل ہوں ہدایت اللہ۔ یہ شریف صاحب ہیں اور تمھارا نام ہے پیر علی۔ سمجھے! یہ سب نام یاد رکھنا، بس اب سیدھے رزمک جا پہنچو۔"

"میں پیڑ علی ہوں۔ ٹھیک ہے، ہاں پیڑ علی۔ مجھے یاد رہے گا۔"

"ابے پیڑ علی نہیں۔ پیر علی۔ یہ وہ پیڑ نہیں ہے جو دل میں ہوتی ہے۔" آبی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جی مجھے یاد ہے۔"

"سندھو ہم تمھیں بالکل نہیں کہیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح بہن جی کو چھڑا لیں صاحب جی! ورنہ میں تو وہیں جان دے دوں گا۔"

"ہاں بڑے آئے جان دینے والے۔ سالے اُن کو وہیں مار کر مر جاتے، واپس کیوں آ گئے تھے؟"

"مرنا تو آسان تھا، پر اُن کو چھڑا کیسے لیتا؟ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔"

"کیا بات ہے؟ آپ بہت پریشان ہیں سردار صاحب؟"

"کچھ نہیں آبی! میں سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟ یہ خرابی ہمارے خون میں موجود تھی؟ بہن جی نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا؟ ذرا سوچو تو اس کی تربیت کس نے کی ہے؟"

آبی نے پولیس کا بیگ اپنے زانو پر رکھ کر بڑے زور کی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے جیلانی! تم اپنا شجرۂ نسب دیکھو، ہو سکتا ہے تمھارے بزرگ سب کے سب پھانسی چڑھ گئے ہوں یا کسی نے انھیں جنگ و جدل میں مار دیا ہو۔"

"کوئی کیا کہہ سکتا ہے میرا باپ تو بہرحال بہت شریف آدمی تھا۔ اتنا مجھے پتہ ہے۔"

"اوئے بکواس نہ کر تو! تیرا باپ بہت شریف آدمی تھا، حد ہو گئی۔ پھر۔۔۔ پھر تو اتنا بڑا حرام خور کہاں سے آ گیا؟ تیری کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ پانچوں عیب شرعی تیرے اندر موجود ہیں اور راسخ ہو چکے ہیں۔"

"اچھا چلو مان لیا کہ میرے اندر عیب موجود ہیں، پر یہ بتا کہ یہ بہن جی نے اتنے سارے گُر کہاں سے سیکھ لیے؟ اب وہ ڈاکا زنی پر اُتر آئی ہے اور اس پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہے۔"

"ہاں یہی تو میں حیران ہوں۔ اس گل خان اور مسولینی نے ہی اسے یہ پٹی پڑھائی ہے، اُن کو تو میں آج ہی برخاست کرتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے خان جی! اصل میں بہن جی کا ایک مشن ہے، وہ اس کے مطابق عمل کرتی ہیں۔" سندھو نے ہماری باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"خاک مشن ہے اس کا۔ خواہ مخواہ اپنی جان مصیبت میں ڈال لی ہے۔"

"مگر صاحب جی! بات کیا ہے آخر۔ بہن جی آپ کی کیا لگتی ہیں؟ آپ کی باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی سگی بہن ہیں۔"

"کچھ ایسا ہی معاملہ ہے سندھو! وہ میری سگی بہن ہے۔" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ وہ عقب نما میں مجھے بخوبی دیکھ رہا تھا۔

"ہوں، اب سمجھا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں آپ کے پاس ٹھیک ہی آیا ہوں۔ ایسے وقت میں آپ سے زیادہ اُن کی مدد کون کر سکتا ہے۔"

کوئی آدھے گھنٹے میں ہم رزمک جا پہنچے۔ گاؤں کیا تھا کہ بڑا ہی رُوح پرور اور خوش کُن منظر تھا۔ اس کی دو عمارتیں خاص طور پر سیدھی نظر میں اُترتی چلی جاتی تھیں۔ ایک وہاں کی مسجد اور دوسری

وڈو لوہار کی رہائش گاہ جو گاؤں کے شمالی حصے میں تھی۔ اس گاؤں میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ گھر ہوں گے۔

سندھو نے بڑی جرأت سے کار اس عمارت کے سامنے کھڑی کر دی۔ اُس کی تینوں منزلیں ہمارے سامنے تھیں۔ سندھو بولا۔ "یہ ہے وہ عمارت! وڈو اسی میں رہائش رکھتا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ تجوری دوسری منزل میں رکھی ہے۔"

"تم کمند ڈال کر اوپر چڑھے تھے؟"

"جی ہاں، ورنہ دروازے تو سب بند تھے۔"

عمارت کے اندر جانے کے لیے بڑا دروازہ عین وسط میں بنا تھا جس کے اندر پہنچ کر سیڑھیاں اوپر اٹھتی تھیں۔ سندھو نے کار سے نکل کر بے دھڑک دروازہ کھٹکھٹایا۔ پولیس کی وردی اسے بھی سج گئی تھی۔ میں اور آبی بھی کار سے باہر نکل گئے۔ پولیس کا بستہ آبی کے ہاتھ میں تھا۔ سردیوں سے بچنے کے لیے ہم نے وردیوں پر کمبل اوڑھ لیے تھے اور اسٹین گنیں قمیصوں کے نیچے ڈال رکھی تھیں، اس طرح کہ انھیں ہم فوراً ہی استعمال میں لا سکتے تھے۔

دوسری دستک پر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ کئی لوگ اِدھر اُدھر سے ہمیں دیکھ کر کار کے قریب آ گئے تھے۔ میرا خیال ہے، سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ وڈو نے ڈاکوؤں کو پکڑ رکھا ہے۔ ان کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ دروازے پر وڈو کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے شکل و شباہت سے وہ آدمی مجھے دوسرے علاقے کے معلوم ہوتے تھے۔ سروں پر کالی لُنگی کی پگڑیاں اور واسکٹیں یہی بتاتی تھیں۔ میں اور آبی سندھو کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وڈو نے ہاتھ پھیلا دیے۔ بولا۔ "آیئے جناب! آیئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ ٹھیک وقت پر آ گئے ہیں۔"

"ہم تو فوراً ہی چل دیے تھے وڈو صاحب! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ شریف صاحب ہیں اور یہ بشیر علی ہیں۔ میرا نام ہدایت اللہ ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل ہوں۔"

"وہ ابھی تک کمرے میں بند ہیں۔ تینوں مسلح ہیں، اُن کو کمرے سے باہر نکالنا بھی مشکل ہے جناب! میں نے اسی لیے آپ کو بلایا ہے۔"

"چلیں موقعے کا معائنہ کرائیں مگر یہ ہیں کون؟ آپ کے گھر کیسے آ گئے؟" میں نے وڈو کے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ شہامد خان ہے اور یہ سلور خان۔ ہمارے دوست ہیں، مردان سے آتے ہیں۔ آئیں میں آپ کو وہ کمرہ دکھاتا ہوں، دراصل اس کے اوپر بھی ایک شٹر قسم کی چیز لگی رہتی ہے۔ دروازے کے

اوپر۔" اس نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تجوری کمرے میں ہوتی ہے، بڑا با پردہ کمرہ ہے جناب! خبر نہیں انھیں اس کا پتہ چل گیا۔"

"تجوری میں کیا کچھ ہے؟"

"کچھ رقم تھی اس میں۔ کاروبار کے سلسلے میں تو ہر وقت رہتی ہے۔"

"کتنی رقم ہوگی وہ؟"

"یہی کوئی پچاس لاکھ۔ دراصل مجھے کراچی جانا تھا۔ پرانے جہاز خرید کر انھیں توڑ کر بیچ دیتا ہوں۔ چار آدمیوں کی چھوٹی سی شراکت ہے۔ یہ رقم میں نے اسی لیے رکھی تھی مگر یہ بیچ میں آ گئی۔"

اب ہم سیڑھیاں طے کر چکے تھے۔ سامنے دائیں ہاتھ پر بھی کمرے تھے اور بائیں ہاتھ بھی۔ اُن کے سامنے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ تجوری بائیں ہاتھ کے درمیانی کمرے میں تھی اور اس میں شٹر گرا ہوا تھا۔ دروازہ اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ وڈو مکان کا دروازہ بند کر آیا تھا اور کوئی غیر متعلقہ آدمی اُوپر نہیں چڑھا تھا۔ ہم اطمینان سے وہاں بات کر سکتے تھے۔ آبی بار بار خاص پولیس کے انداز سے وردی درست کر رہا تھا۔ نگاہ اس کی چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ اگر ہم کمبل نہ اوڑھے ہوتے تو شاید ہم اپنے ہتھیار اُن سے نہ چھپا سکتے مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ہمیں اُن سے ہتھیار چھپا لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آبی نے اس بات کا اندازہ کرتے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچ کر کمبل الگ رکھ دیا اور اسٹین گن نکال لی۔ وڈو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ سمجھا ہوگا کہ اب پولیس کو شاید ایسے ہتھیار مل چکے ہیں جو ڈاکوؤں کے ہتھیاروں سے کہیں بہتر ہیں۔ اس کی دیکھا دیکھی سندھو نے بھی اسٹین گن ہاتھ میں لے لی، اور وہ دونوں شٹر کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

آسیہ اندر بندھ کر رہ گئی تھی۔ یہی حال گل خان اور اس کے ساتھیوں کا تھا۔ سپاہی جو ہتھکڑیاں لائے تھے وہ سندھو نے بیلٹ سے لٹکا رکھی تھیں۔

"دروازے پر دستک دیں ذرا۔" میں نے وڈو سے کہا۔

وہ آگے نہیں بڑھا۔ شہامد خان اور سلور خان بھی وہیں رہے۔ میرا خیال ہے آسیہ نے انھیں بے حد خوفزدہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کمرے کے سامنے پہنچتے ہی ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

"اوئے اگر تم زندہ ہو تو ہماری بات غور سے سنو۔ میں ہدایت اللہ جیلانی ہیڈ کانسٹیبل تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم سب سے فوراً باہر نکل آؤ۔ شٹر کی کنڈیاں جو اندر لگی ہیں انھیں کھول دو اور اپنے ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔"

میری آواز سن کر کمرے میں افراتفری سی مچ گئی۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا ہوگا، وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ غلام جیلانی بھی اُن کے پاس پہنچ سکتا ہے۔

"میری بات سن رہے ہو کہ نہیں۔ میں تمھیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں، یہ وڈو صاحب کا گھر ہے۔ تم یہاں ڈاکا ڈالنے آئے تھے مگر اپنی موت خود مر گئے ہو۔ اپنے ہتھیار پھینک کر فوراً باہر نکل آؤ۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم پر کوئی وار نہیں کرے گا۔" یہ گل خان کی آواز تھی اور بڑی ہی پُراعتماد تھی۔

"میں ہدایت اللہ جیلانی ہیڈ کانسٹیبل تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو اور قانون کی مدد کرو۔ تمھارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں جس میں سے ایک منٹ گزر چکا ہے۔"

چند لمحوں تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ پھر مجھے شٹر کی کنڈیاں کھسکنے کی آواز سنائی دی۔ پانچویں منٹ پر ان لوگوں نے اندر سے ہاتھ ڈال کر شٹر اوپر اٹھا دیا۔ دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ میرے سامنے گل خان اور مسولینی کھڑے تھے اور وہ اپنے ہتھیار مجھے پیش کر رہے تھے۔ دونوں بہت ہی سنجیدہ اور متین سی صورتیں بنائے ہوئے تھے اور اُن کے پیچھے بہن جی تھی۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں ملبوس۔ اس نے کمر پر پیٹی باندھ رکھی تھی اور نقاب اس نے ایسا ڈال رکھا تھا کہ جو شدید قسم کی تگ و دو میں بھی کھل نہیں سکتا تھا۔ وہ سب کو دیکھ سکتی تھی مگر کوئی دوسرا اس کے چہرے پر نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ ہاتھوں پر اس نے چرمی دستانے پہن رکھے تھے اور وہ بھی دونوں ہاتھوں سے اپنی اسٹین گن ہمارے سامنے رکھ رہی تھی۔ آبی نے آگے بڑھ کر اُن سے ہتھیار لے کر بازو پر ڈال لیے۔

میرے اشارے پر سندھو نے آبی سے ہتھکڑی لے کر پہلے گل خان کے ہاتھ میں ڈالی پھر مسولینی کے ہاتھ میں۔ جب وہ دونوں باہر نکل آئے تو پھر سندھو نے آگے بڑھ کر بہن جی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔ وہ جب باہر نکلی تو اس کے پاؤں میں ٹخنوں کے اُوپر تک اٹھے مضبوط بوٹ فرش پر کھٹ کھٹ کر رہے تھے۔ اس کا سر اُٹھا ہوا تھا اور مجھے دیکھ کر خدا معلوم وہ کیا سوچ رہی تھی۔

وڈو اسے دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔ بولا۔ "یہ۔۔۔۔۔ عورت ہے، اوہ خدایا!"

"زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے وڈو! تم سے اب تھانے چل کر بات ہوگی۔" گل خان نے بڑے غضبناک انداز سے کہا۔ وہ تینوں اب دیوار کے ساتھ جا لگے تھے اور میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔

"کیا نام ہے تمھارا اوئے! بڑے زوردار طریقے سے بات کرتے ہو۔ بلکہ بھونکتے ہو۔ کیا لینے آئے تھے تم یہاں؟"

"اِدھر ایک تجوری ہے۔ ہم اس کے لیے یہاں آئے تھے۔" گل خان نے اسی کھنکتے لہجے میں کہا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"میستے خان۔"

"اور اس کا؟"

"زور آور جوہان۔"

"اور یہ عورت کون ہے تمھارے ساتھ؟"

"یہ فردوس ہے۔ یہ ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ ہم سب اسے ہمشیرہ کہتے ہیں۔"

"لکھو بھئی شریف! یہ بستہ کھولو۔"

آبی نے زمین پر پھسکڑا مار کر بستہ کھول لیا۔ اس میں کئی قسم کے کاغذات رکھے تھے۔ ایک رجسٹر پر دو کاغذ چڑھا کر اس نے اُن تینوں کے نام لکھے، ولدیت لکھی اور رزمک آنے کا مقصد اور دُوسری تفصیلات لکھیں۔ سارا بیان گل خان نے دیا۔

"جلدی کرو میاں! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

آبی نے میری یہ بات سُن کر کاغذ تہہ کر لیے۔

"چلیں جی! ساری تفصیل میں نے درج کر لی ہے۔"

"آپ اس پر وڈو صاحب کے بھی دستخط کروا لیں اور ان سب کے انگوٹھے لگوا لیں۔"

اس کارروائی سے فارغ ہوتے ہی میں نے اُن سے کہا۔ "اب تم تینوں نیچے اُترو۔ آپ بھی آئیں وڈو صاحب!"

وہ اس وقت تک تجوری کے پاس جا پہنچا تھا۔ اُسے شہامد خان اور سلور خان کے سامنے کھول کر بولا۔ "شکر ہے، رقم تو بچ گئی ہے۔ اگر یہ شٹر نہ گرتا تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں نے سب کچھ لکھ لیا ہے۔ یہ تو اب گئے دس دس سال کے لیے۔" آبی نے بستہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"چلو اوئے! تمھاری اس ہمشیرہ نے تو مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔ اس سے تو ہم تھانے چل کر بات کریں گے۔" میں نے وڈو کو سُنانے کے لیے کہا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اندر کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

جب وہ سیڑھیوں کی طرف چلے تو وڈو بولا۔ "اس کا بُرقع تو

اتروائیں۔ میں دیکھوں تو سہی کہ یہ شے کیا ہے؟"

اس کی بات سنتے ہی گل خان نے پلٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایسا رپٹا مارا کہ وہ دیوار سے جا لگا۔

"بدمعاش! تو ہمشیرہ کا برقع اتروائے گا۔ تیرا تو میں ادھر ہی بھرکس نکال دوں گا سالے۔" اس کی آواز کی گھن گرج سے برآمدہ دہلنے لگا۔ شاہد اور سلویر نے دلّو کو سنبھالا مگر وہ بولے کچھ نہیں۔ دولت کی ریل پیل نے ان کے حوصلے اتنے پست کر دیے تھے کہ وہ گل خان کے تھپڑ کا بھی جواب نہیں دے سکتے تھے۔

میں نے اچانک اپنی اسٹین گن سیدھی کر لی۔ "دیکھ اٹے چوہڑے! خبردار! جو تو نے دلّو صاحب پر ہاتھ اٹھایا۔ چلو سیدھی طرح نیچے اترو۔ تم بھی دلّو صاحب زبان روک کر رکھو۔"

"او جی پیر میں نے ان کو کیا کہا ہے ہدایت صاحب! یہ تو خواہ مخواہ ہی گرم ہو گیا ہے۔"

"بس بس۔ زیادہ تپنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ان سب کو میں نے الگ کر کے سیڑھیوں میں سے گزارا۔ سندھو نے جاتے ہی گاڑی کی نشست سنبھال لی۔

"آپ کے پاس گاڑی ہے؟"

"جی ہاں۔ میں اس میں آ جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے گل خان، مسولینی اور بہن جی کو گاڑی میں بٹھایا۔ اور ہم چھ کے چھ اگلی پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر اسی وقت زرنک سے باہر نکل آئے۔ دلّو اپنے گیراج سے گاڑی نکلوانے کے لیے دوسری طرف چلا گیا تھا۔

جب ہم زرنک سے باہر آئے تو آبی ایک دم ہنسنے لگا، بولا۔ "اوئے ہدایت! تُو تے! شکر کر تو آج زرنک سے بچ کر نکل آیا ہے، کوئی نیکی کام آ گئی ہے تمھارے۔"

اس وقت آسیہ اگلی سیٹ پر میرے بائیں جانب کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی، وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یہ رونے کا مقام ہے بہن جی! تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔ رات کو بارہ بجے میں نے تمھیں باہر نکلتے دیکھا تو میرا ماتھا جب ہی ٹھنکا تھا۔ آخر ضرورت کیا تھی آپ کو وہاں جانے کی؟"

مگر بہن جی کی ہنسی نہ رک سکی۔

"آپ کو یہ وردیاں کہاں سے مل گئیں؟ سندھو بھی پولیس مین بن بیٹھا ہے۔"

"بہن جی ادھر چار کمبیسے مل گئے تھے ہمیں گھوڑوں پر سوار تھے وہ۔ ان کو پکڑ کر لقمان صاحب نے ان کا گلا ایسا دبایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہم نے ان کی وردیاں پہن لیں اور وہ ہمیں فٹ بھی آ گئیں۔ ہمارا ان کا سائز ایک جیسا تھا۔"

"ویسے ہوئی بہت بری ہے ہمارے ساتھ۔ اگر اس شیطان کا پتہ ہوتا تو اس کا بھی ہم بندوبست کر لیتے۔" گل خان نے کہا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"دراصل دلّو کی آنکھ کھل گئی تھی۔ شتر اسی نے گرایا تھا اس کتے نے۔ کاش یہ سندھو ہی کسی کام آ سکتا۔"

"میری اپنی پھینکڑی پھسل ہو گئی تھی بھئی! وہ تو اچھا ہے کہ سیڑھیاں کھلی تھیں۔ میں ڈانگ کھا کر نیچے اتر گیا اور کار میں بیٹھ کر نکل آیا ورنہ وہ میرا حشر کر دیتے۔"

"تیرا حشر تو اب ہوگا سندھو! اتنے جوتے ماروں گا واپس جا کر کہ تو یاد ہی کرے گا۔" مسولینی بہت طیش میں تھا۔

"تمھیں یہ راستہ چھوڑ دینا چاہیے آسیہ! یہ بہت غلط بات ہے۔ میں تمھیں عافیت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتہ ہے تمھارے لیے میں نے کیسی کیسی خاک چھانی ہے۔ یہ تباہی کا راستہ ہے آسیہ! میری بہن!" میں نے آسیہ کو دبی زبان میں سرزنش کی۔

"ان کو کام تو دینا ہے نا مجھے! ورنہ یہ مجھے ہی کھا جائیں گے۔ ان کا گروہ اسی طرح ہی میری مٹھی میں رہ سکتا ہے۔"

"ان پر لعنت بھیجو! میں ان میں سے ایک ایک کو ختم کر سکتا ہوں۔ کوئی مجبوری نہیں ہے ان کی۔ میں کہاں تمھارے پیچھے پاگل ہوتا پھروں گا۔ یہ راستہ تمھیں چھوڑنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے حویلی میں پہنچ کر بات کریں گے۔" آسیہ نے بحث سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ راستہ وہی تھا جہاں سے ہم گزرے تھے۔ دلّو ہماری روانگی کے پتہ نہیں کتنی دیر بعد زرنک سے چلا تھا، ابھی تک وہ ہمیں نظر نہیں آیا تھا۔

"میرا خیال ہے سندھو کہ ہمیں بہت تیز چلنا چاہیے۔ بڑی سڑک پر پہنچنے کے بعد قندیار کی طرف جاتے ہوئے ہمیں دلّو نے دیکھے تو اچھا ہے ورنہ ہمیں لمبا چکر کاٹنا پڑے گا۔" میں نے سندھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوڑ میں دلّو کا منتظر ہوں۔ اس کو بھی ادھر کاٹ کر ڈال دیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تم تیز چلو۔"

اس نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا اور گاڑی کو وہ ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑانے لگا۔ وہ بہت اچھا ڈرائیور تھا اور سڑک کی اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف تھا۔

راستے میں بالآخر ہم اس مقام پر جا پہنچے جہاں ہم نے پولیس کے آدمیوں کو بے ہوش کر کے ڈال دیا تھا۔ جھنڈ کے قریب کئی دیہاتی جمع تھے اور سپاہیوں کو ہوش میں لانے کی کوشش

کر رہے تھے مگر میں نے ان کی بتی پوری طرح گل کر رکھی تھی۔ وہاں رکے بغیر ہم آگے نکلتے چلے گئے۔ سپاہیوں کے گھوڑے بھی وہیں موجود تھے مگر میرا خیال ہے ان دیہاتیوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا ہوگا کہ وہ پولیس کے سپاہی ہیں کیونکہ ان کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ اس کا محکمہ کیا ہے۔ ان کی ساری چیزیں تو ہم سمیٹ کر لے آئے تھے۔

گاڑی بالآخر قندیار جا پہنچی۔ وہ جنگل میں کھڑی یک و تنہا حویلی دور سے بہت ہیبت ناک اور پراسرار نظر آتی تھی۔ اس کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ منظر اس کا مجھے ہمیشہ ہی بہت حسین دکھائی دیا۔ میرا خیال ہے کہ آسیہ بھی اسی لیے اس پر مرمٹی تھی۔ وہ بھی کسی ایسی ہی تنہائی کی متلاشی تھی جو اسے بالآخر مل ہی گئی اور یوں ملی کہ وہ بلا شرکت غیرے اس کی مالک بن بیٹھی تھی مگر وہ اب جس راستے پر چل رہی تھی وہ امن کا سلامتی کا صلح کا راستہ نہیں تھا۔ اس میں جا بجا کھائیاں تھیں۔ گہری گھاٹیاں تھیں اور ان میں دبی بلائیں تھیں جو اسے اپنی سمت بلا رہی تھیں مگر وہ انھیں سرتاسر نظر انداز کر کے آگے بڑھ رہی تھی۔ جو مجھے کسی بھی طرح منظور نہیں تھا۔ میری اتنی عمر گزر گئی تھی مگر میں نے کبھی اس قسم کی چوری چکاری کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں تو پرائے پیسے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ آبی نے بھی بالآخر راستی اختیار کر لی تھی۔ وہ بھی ڈاکا زنی سے توبہ کر کے میرے ساتھ اس طرح منسلک ہو گیا تھا کہ پھر اس کے ذہن میں کبھی بھی دوسروں کو ان کی کمائی سے محروم کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہی رقم اس کے لیے کافی تھی جو ہم نے عالیہ سے چھین لی تھی۔ اگر ہم اسی پر انحصار کرتے تھے تو یہ ہماری نیک بختی کی نشانی تھی۔ روپے کی اصل چنبک ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی۔ ہمیں کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ہم جو ساری ساری رات آنکھوں میں گزار دیتے ہیں زاہد شب زندہ دار کی طرح تو ہمیں ان سیاہ راتوں میں اٹھ کر کسی کے چاول چھکے کر دینے چاہییں۔ آبی کے ماتھے سے بھی وہ چنڈال بال ختم ہو چکا تھا جو اسے چوری اور ڈاکا زنی پر اکساتا رہتا تھا اور یہ بڑی اچھی بات تھی مگر جب میں آسیہ کو اس دلدل میں دھنسا دیکھتا تھا تو میرا دل مٹھی میں گھٹتا تھا۔ حالانکہ وہ پڑھی لکھی عورت تھی۔ لڑکی تو اب وہ رہ ہی نہیں گئی تھی مگر پھر بھی وہ جو ہتر کے کھاتے میں پڑی ہوئی تھی۔ چور لیک پر چینا فخر سمجھتی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے اب تک یاد ہے کہ اس میں عجیب سا طنز اور تفاخر جھلکتا تھا۔ بلکہ میں کہوں کہ اس میں تمسخر زیادہ تھا تو یہ بات زیادہ قرین قیاس تھی۔ آسیہ کا ذہن اس قدر بدل جائے گا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گاڑی سے نکل کر حویلی میں سرتا پا راز کی طرح داخل ہوئی، اس حال میں کہ اس کا سیاہ لبادہ دیکھنے والوں کو حیران کرتا تھا۔ اس کی کمر پر بندھی بیلٹ اسے اور زیادہ خوش نما بناتی تھی۔ نقاب اس نے اب کی بار لبادے کے ساتھ ہی سی لیا تھا۔ میں اسے برقع اس لیے نہیں کہہ رہا کہ اس میں کوئی بات ایسی تھی جو اسے برقعے سے میز کرتی تھی اور وہ جون آف آرک بنی حویلی کے پہلے قطعے سے نکل کر ٹھک ٹھک کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں، آبی، گل خان، سندھو اور مسولینی اس کے پیچھے درباریوں کی طرح چل رہے تھے۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے برابر ہو کر چل سکے۔ آسیہ کا ٹھاٹھ مجھے حیران کرتا تھا۔ اس کی نخوت نے مجھے اور آبی کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا حالانکہ تھوڑی ہی دیر پہلے ہم اسے بہت بڑی مصیبت سے بچا کر لے آئے تھے مگر اس کی چال یہ بتاتی تھی کہ وہ ہماری احسان مند قطعی نہیں تھی۔ مجھے یہی احساس ہو رہا تھا۔

"گل خان اب تم ذرا آرام کرو۔ میں ذرا بھائی صاحب سے بات کروں گی۔ تم بھی جاؤ مسولینی اور سندھو کو بھی لے جاؤ۔ آئیں بھائی صاحب میرے کمرے میں چلیں۔" یہ کہہ کر وہ حویلی کے تیسرے قطعے پر بنے اپنے خوبصورت اور آرام دہ کمرے میں جا گھسی۔ میں اور آبی بھی اس کے پیچھے تھے۔ اس نے جاتے ہی وہ سیاہ لبادہ اتار دیا۔ اس کے نیچے وہ پھر کھدر ہی میں ملبوس تھی۔ البتہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک عمدہ سویٹر پہن رکھا تھا اور بس۔ اس کا چہرہ تر و تازہ گلابوں کی خبر دیتا تھا۔ بال اس نے جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ ہاتھ پاؤں اس کے زیور کی آلائش سے مبرا تھے۔ پورے بازو کے سویٹر سے باہر جھانکتی اس کی کلائیاں مجھے کبھی ید بیضا کا احساس دلاتی تھیں۔ پتہ نہیں اس میں اس قدر تازگی اور شگفتگی کہاں سے در آئی تھی حالانکہ جب میں نے اسے پہلے دیکھا تھا تو وہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔ اس وقت تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جاں کنی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ بالکل دھان پان سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہڈیوں کی مٹھ۔ چٹکی مارو تو ہوا میں اڑ جائے۔ مگر اب اس کے پاؤں کا ٹھہراؤ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک آہنی عزم جھلکنے لگا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے ہمیں دوسرے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر اس نے اپنی ملازمہ کو بلایا۔ وہ اس کی تالی کی آواز سمجھتی تھی، بولی فوراً ہی عقبی دروازے سے اندر آ گئی۔

"ہمارے لیے ناشتہ لاؤ لولی! بڑی سخت بھوک لگی ہے۔ اتنے میں تھوڑی سی چائے نہ پی لی جائے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔" آبی نے اس کے سامنے نہایت بے تکلفی

سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ بوا اُسی وقت پیچھے ہٹ گئی تو آسیہ نے پہلی بار مجھے نظر بھر کر دیکھا۔ "ہاں تو بھائی جان اب بتائیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں میرا بھائی اتنے دنوں بعد مجھے ملا ہے مگر میں کیسی ناشکری ہوں کہ آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی۔"

"دیکھو آسیہ بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ تمھیں معلوم ہے میں کیا کہنا چاہتا ہوں، یہ غنڈہ گردی ختم کر دو۔"

میری یہ بات سُن کر وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے ہونٹوں کی ندی کے عقب میں اس کے دانت موتیوں کی لڑیاں بن رہے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت ہی خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کے انداز میں ایسی دلربائی پیدا ہو گئی تھی کہ میں نے اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ اس کی تعریف مجھے نہیں کرنی چاہیے۔ وہ میری ماں جائی بہن تھی۔ اُس سے بات کرتے ہوئے بھی مجھے حذر محسوس ہوتا تھا مگر اس کی جو انفرادیت تھی وہ تو اپنا آپ خود ہی منواتی چلی جاتی تھی۔

"آپ اگر مجھے یہ نصیحت نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے بھائی جان! میں وہ آسیہ نہیں ہوں قطعاً نہیں ہوں۔"

"کوئی نیا جنم لیا ہے تم نے؟ یہ تمھارا لہجہ پشتو نی کیسے ہو گیا؟ کوئی زبان سیکھ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنا اب و لہجہ ہی بدل لو۔"

"یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جیل کے اندر اتنی ساری عورتیں یہ زبان بولتی تھیں کہ مجھے مجبوراً اپنا لہجہ بدلنا پڑا اور اب تو عادت بن گئی ہے۔ صرف اسی سے اندازہ لگائیں کہ میں آپ کی بہن کہاں کھو گئی ہوں۔"

"یہ پاگل پن ہے تمھارا۔ تم جو کچھ بھی بن جاؤ مجھے منظور ہے مگر یہ ڈاکا زنی بند کر دو۔ میں اپنی ساری دولت تمھارے حوالے کر سکتا ہوں مگر خدا کے لیے یہ راستہ چھوڑ دو۔"

"کیوں چھوڑ دوں یہ راستہ؟ نیکی مجھ سے اب بھولے سے بھی سرزد نہیں ہوگی۔ میں شرافت کو اپنے لیے شر اور آفت سمجھتی ہوں، مجھے دنیا نے کیا دیا ہے آخر؟ میری کہانی سنیں تو آپ سر پیٹ لیں۔ فائدہ ہی کیا ہے؟ طاقت اور صرف طاقت سے ہی اس جنگل میں جیا جا سکتا ہے اور میں اسی سے کام لوں گی۔"

"تم گرفتار ہو جاؤ گی آسیہ! ابھی ہم رزمک نہ پہنچتے تو وہ دلّو تمھارا بندوبست کر چکا تھا۔ تم چوہے دان میں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ ایسا کبھی بھی وقت ہو سکتا ہے پھر جو تمھارا حشر ہوگا وہ تم خود اندازہ کر سکتی ہو۔ جیل کے اس ڈاکٹر کا قتل ابھی تک تمھارے ذمے ہے۔ پولیس کو ہر وقت تمھاری تلاش رہتی ہے۔ تم نے گورائے کو مار دیا — اب شاید حمید کلہری کی باری ہے اور پتہ نہیں کس کس پہ ہاتھ صاف کیا ہے تم نے۔ مجھے بتاؤ یہ سب کون بھگتے گا؟ بہتر ہے یہ حویلی چھوڑ کر والدہ کے پاس چلی جاؤ۔ اس کو سہارا دو۔ وہ بہت دکھی ہو چکی ہے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اور میرے دوست آبی نے تمھاری رہائی اور تمھاری تلاش میں جتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں اُن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ اب تو ہمیں آرام لینے دو۔ کب تک ہم تمھارے پیچھے پاگل ہوتے پھریں گے۔" میں یہ بات کہہ رہا تھا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سُن ہی نہ رہی ہو۔ اُٹھ کر دوبارہ غسل خانے میں چلی گئی۔ ایک گہری طنز بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر مسلسل رقصاں تھی جیسے وہ مجھے کچھ سمجھ ہی نہ رہی ہو۔ مجھ سے گویا اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ کیا یہ سب کچھ اس لیے نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑی حویلی کی مالک بن گئی تھی اور اس کے اصل مالک کو مار کر اب یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے راستے کے سارے کانٹے چُنے جا چکے ہیں اور ایسا کوئی نہیں ہے جو اس کی تیس مار خانی کے لیے خطرہ بن سکے۔ خدا اس آسیہ کے چہرے سے نور اُڑا دے۔ میری ماں! کیسی بدنصیب بیٹی جنی ہے۔ وہ میری کسی بات پر دھیان ہی نہیں دے رہی تھی۔

آبی میری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا، بولا "یار! تو کس چکر میں پڑا ہے۔ یہ آسیہ تیری بات کیسے مان لے؟ اتنی بڑی حویلی اور جاگیر کی وہ مالک بن چکی ہے، وہ یہ سب کیسے چھوڑ دے؟ اس کی سازش پر تو غور کر۔ وہ تجھ سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئی ہے، پہلے ہی وار میں اس نے پچھاڑ کا لیا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے میں اسے یونہی چھوڑ دوں گا؟"

"یہی کرنا ہوگا۔ اس کی کسی بات میں دخل مت دو۔ بس دیکھتے رہو۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اس کو ان سانپوں سے بچاؤ۔ یہی بہتر ہے۔ یہ تین آدمی اُسے صبح شام کسی نہ کسی واردات پر اُکساتے رہتے ہیں، اُن کا قلع قمع کرو۔"

"ٹھیک کہتے ہو آبی! اصل بدمعاش تو یہی ہیں۔ یہ گل خان، یہ مسولینی اور یہ سندھو۔"

"ناشتہ کر کے اپنی جگہ پر جا بیٹھو۔ چار آٹھ دن یہاں گزار پھر دیکھو کہ ہوتا کیا ہے، یوں ہی اُسے نصیحتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

آسیہ کوئی بیس منٹ بعد غسل خانے سے باہر آگئی۔ اتنے میں بوا نے ہمارے سامنے ناشتہ رکھ دیا۔ چائے بھی اس کے ساتھ تھی۔

"آئیں، یہ ناشتہ کر لیں پہلے دفع کریں۔ لا یہ آپ کا یار میرے بھائی ہیں مگر میرا خیال ہے آپ کے یہ دوست آپ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ یہ تو اب تک کچھ نہیں بولے۔"

"خاک سمجھ دار ہے یہ میری طرح جگہ جگہ دھکے کھاتا پھرا آیا رہ! اس تعریف کا تو حقدار بالکل بھی نہیں ہے مگر آسیہ نے کہا

ٹھیک ہی ہوگا۔"

"سوال یہ ہے بھائی جان کہ اس لاشاری کا کیا کریں؟ وہ بلال احمد کو چھین کر لے گیا ہے اور وہ ہر قیمت پر مجھے واپس ملنا چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا آبی صاحب جناب والا تبار!" آسیہ نے آبی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ اُس کے اس طرزِ تخاطب پر پریشان سا ہو گیا۔ "کچھ مجھ سے کہا ہے آپ نے؟" آبی نے گرم گرم انڈے کو کھولتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ میں اپنے بچے کی بات کر رہی تھی۔ میں... مجھے افسوس ہے بھائی جان مگر میں اُسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتی۔ کیوں آبی صاحب قبلہ؟ ہر چند وہ..."

"میں سمجھ رہا ہوں بی بی، بالکل سمجھ رہا ہوں۔ اگرچہ وہ ناجائز ہے مگر ہے تو اپنا ہی نا۔"

آسیہ نے اس کی بات کا قطعاً بُرا نہیں منایا، بہت سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میں... کیا مجھے خود وہاں جانا پڑے گا؟"

"ظاہر ہے ہم... بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے لاشاری چاہتا تھا کہ آپ اُس سے شادی کر لیں۔"

"پھر... پھر تو مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ میں اس آدمی کو اپنا شوہر بنا لوں جس نے میری بے بسی سے فائدہ اٹھایا؟ نہیں آبی صاحب! ایسا نہیں ہو سکتا۔ اُسے تو میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گی اور یہاں بلوا کر — آپ دیکھتے رہیں۔"

"کیا کریں گی آپ؟"

"میں ان تینوں کو کل صبح سندھ بھیج دوں گی، یہ خود نمٹ لیں گے اُس سے۔"

"واہ سبحان اللہ! کیا بات کی ہے آپ نے۔ کیا خیال ہے جیلانی؟ ہے نا وہ کیا کہتے ہیں، ایک دم ونڈر فل آئیڈیا۔ کہ آسیہ اُسے خود گولی مارے گی۔ ایک دم ڈرامے کا کلائمکس ہوگا یہ۔ ویسے اس ڈاکٹر کو آپ نے کیسے مار دیا؟"

"وہ... وہ تو اسی لائق تھا بھائی جان! پتہ نہیں کتنی قیدی عورتیں اس نے تباہ کر دی تھیں۔ ایسا انجکشن لگاتا تھا کہ عورتوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ ایک دن وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ کسی ایک کو ان لوگوں نے بڑی سخت سزائیں دیں۔ جو ظلم و بے ہودگی وہ کرتے تھے آپ کے سامنے میری زبان پر نہیں آ سکتا۔ وہ ذلیل ہو جاتی تھیں مگر انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اُن کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکوں گی آبی صاحب! اس کی عمر یہی کوئی ہر روز پندرہ سال ہوگی۔ نام اس کا صاجیاں تھا۔ سرائے عالمگیر کی رہنے والی تھی۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو مار دیا تھا۔ اس سے وہ سارا سارا دن اتنا کام لیتی تھی کہ وہ ہلکان ہو گئی تھی جب کہ اس کی دو سوتیلی بہنیں گھر میں سارا دن آرام کرتی تھیں۔ اسی زیادتی کی وجہ سے صاجیاں نے ایک دن اپنی سوتیلی ماں کو کنوئیں میں گرا دیا۔ اُن دنوں وہ سات سال کی جیل کاٹ رہی تھی۔ اور اس ڈاکٹر نے اس کو بھی اسی طرح تباہ کر دیا تھا۔ جب بات پھیلی تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ابھی پانچویں مہینے میں پہنچی تھی کہ جیل کے لوگ اس پر پل پڑے۔ وہ خوبصورت بھی بہت تھی۔ سب سے پہلے وہ سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ یہ صدمہ جھیل کر وہ باہر نکلی تو اگلے دن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے اسے اپنی کوٹھی پر بلوا لیا۔ وہاں سے وہ روتی دھوتی نکلی تو پھر اس کے ضبط کے سارے بند ہی ٹوٹ گئے۔ وہ جیل کے سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کا رونا بلکنا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ایک عورت کمالو وہاں تھی اور وہ اس کی دوست بنی ہوئی تھی۔ وہ جیل میں افیون کا دھندا کرتی تھی۔ صاجیاں ایک رات سپاہیوں کے کوارٹر سے واپس آئی تو اس نے افیون نگل لی۔ وہ اس زندگی سے عاجز آگئی تھی۔ آخر اس نے پیچھا چھڑا لیا۔ اس کی لاش پر ساری ہی عورتیں بے حد روئیں۔ مگر کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے چُپکے سے پلیٹی کے بہانے باہر لے جاتے تھے اور جب وہ واپس آتی تھی تو اتنی نُچی کھسی ہوتی تھی کہ سارے جہان کے آنسو مل کر بھی اس کا دُکھ نہیں بانٹ سکتے تھے اور یہ سب کچھ اس ڈاکٹر کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایسے بہت سے واقعات میرے علم میں تھے، میں اسے کیسے معاف کر دیتی۔ اس کی سو زندگیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں ختم کر دیتی۔ اُس درندے تک میرا پہنچنا بہت ضروری تھا۔ ابھی یہ قصہ زندہ ہے، میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ، سپرنٹنڈنٹ اور اس کے سپاہیوں کو معاف نہیں کروں گی۔ موقع ملتے ہی انہیں تباہ کر دوں گی۔ بس یہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ پولیس میری تلاش میں ہے اور جیل کے اندر عورتوں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ کوئی اُن کا حامی نہیں۔ ہر کوئی انہیں گوشت کی بوٹی سمجھتا ہے۔ وہ ہر روز لٹتی ہیں مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ کئی تو ایسی ہیں جو جان بوجھ کر تھوڑی سی رعائتیں حاصل کرنے کے لیے سُولی چڑھ جاتی ہیں مگر سب کی سب تو ایسی نہیں ہیں۔ میں اُن سب کا انتقام جیل کے لوگوں سے ضرور لوں گی۔ یہ ایک ایک دن ضرور ہوگا۔ میں اُن دنوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی ہوں۔" اس کا لہجہ آزردہ ہونے لگا اور اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ وہ اب بھی اندر سے ایک نرم و نازک عورت ہی تھی۔ اب بھی اس کا دل اتنے سارے مظالم پر تڑپ اُٹھتا تھا۔ وہ سب کچھ جب اسے یاد آتا تھا تو وہ لہو روتی تھی۔ "آپ مجھے کیسے روک لیں گے بھائی جان! میں... میں نے عورتوں کو اس قدر ذلیل ہوتے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی کسی کی ماں، بہن اور بیٹیاں ہیں مگر کسی کو اُن سے ہمدردی نہیں ہے، کوئی اُن کے آنسو نہیں پونچھ سکتا۔ وہ اپنے کسی نہ کسی جرم کی سزا بھگتنے کے لیے اندر گئی ہیں مگر اُن کی سزا سہ چند ہو جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو آسیہ! مگر تم کس کس سے بدلہ لوگی۔ وزیر آباد میں تمھارے ساتھ یہی ڈرامہ کھیلا گیا پھر بھی تم کچھ نہ کر سکیں۔ ہر جگہ عورت ذلیل ہو رہی ہے۔ مردوں نے اُسے واقعی کھلونا سمجھ رکھا ہے مگر یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ پولیس کو اب اس ڈرائیور نے تمھارا حلیہ تیار کر رکھا ہے۔ وہ تمھیں دیکھنے پر پہچان بھی لے گا۔ تمھاری گرفتاری پر شاید کچھ انعام بھی مقرر ہے، بہتر ہے تم اس سارے معاملے سے الگ ہو کر کسی جگہ گھر بسا کر بیٹھ رہو۔ اپنی چار دیواری کے اندر تم سے کوئی تمھارے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔ بہتر یہی ہے آسیہ! پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے فراموش کر دو آسیہ! تم اس کام کے لیے نہیں بنی ہو۔ تم سے کوئی جواب بھی نہیں بن پائے گا میری بہن! یہ سارا قصہ چھوڑ دو۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا سر ایک دم پیچھے ہٹا لیا۔ اُس کا سارا بدن تپنے لگا تھا۔ اندر سے اٹھتے غیظ و غضب کے ایک طوفان نے اُسے گھیر لیا تھا۔

وہ غضبناک آواز میں بولی۔ "آپ اپنی یہ نصیحت اپنے پاس رکھیں۔ میں اُن سب لوگوں سے انتقام لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گی، یہ میرا عہد ہے جو میں نے دل میں کر رکھا ہے۔ اس ڈرائیور کو بھی میں ختم کر دوں گی تاکہ وہ مجھے پہچاننے کے لیے زندہ نہ رہے۔ میرے حملے ایسے ہی ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ کھدر کا لباس میں نے بلاوجہ نہیں پہن رکھا ہے۔ مجھے بھی نرم و نازک چیزیں اچھی لگتی ہیں مگر میرے اندر کی عورت مر چکی ہے، مجھے فوری طور پر بیس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ دو گاؤں ہیں لاڈلی اور تانبہ ۔۔ وہ مکرم علی گورایا نے گروی رکھ دیے تھے عیسیٰ خیل کے ایک صنعتکار کے پاس۔ وہ میں ہر حال میں چھڑا لینا چاہتی ہوں کیونکہ وہ میری جاگیر کا حصہ ہیں اگر آپ کے پاس یہ رقم ہے تو مجھے قرض دے دیں! میں آپ کو لوٹا دوں گی ورنہ مجھے کسی بینک کو لوٹنا پڑے گا۔ میرے پاس صرف آٹھ دن باقی ہیں۔"

"اتنی رقم تو تم نے کہا تھا کہ تمھارے پاس بھی موجود ہے؟"

"نہیں۔ وہ میں نے اپنے گروہ میں بانٹ دی تھی۔ کوئی پچیس آدمی میرے ملازم ہیں جو زیادہ تر فرید پور میں رہتے ہیں۔"

"تم کس حیثیت میں وہ رقم واپس کرو گی؟"

"مکرم علی گورایا زندہ ہے۔ تجمل حسین کو اسی لیے تو یہاں رکھا گیا ہے۔"

"تجمل حسین سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟"

"میں اس کی بہن ہوں اور بس۔"

"مگر گورائے کی کوئی بہن تھی بھی کہ نہیں؟"

"اس کی ایک بہن زندہ ہے مگر وہ اپنے میاں کے ساتھ لندن میں رہتی ہے اور اس سے کبھی ملنے نہیں آئی مگر میں خود کو تجمل حسین کی سگی بہن نہیں ظاہر کر رہی ہوں۔ بہن جی تو مجھے سب لوگ کہتے ہی ہیں!"

"پھر تم اس جاگیر کی وارث کیسے بن سکتی ہو؟"

"ہو سکتا ہے میں اس کو اپنا شوہر مشہور کر دوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تجمل حسین میری مٹھی میں بند ہے۔"

"مگر وہ خوش نہیں ہے۔"

"بکتا ہے وہ، اس کی زندگی کا دار و مدار ہی اسی بات پر ہے کہ وہ میرے کہنے پر عمل کرے۔" آسیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اگر میں اس کی بیوی کی حیثیت سے یہ کام نہ کر سکی تو میرا یہ پردہ بہت کام آئے گا۔ لندن سے اس کی بہن سکینہ آئی تو اس کو ختم کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا، اس کے شوہر سمیت۔ سنا ہے اس کا بھی کوئی نہیں ہے۔" میں یہاں سکینہ کی حیثیت سے گورائے کی وارث بن رہی ہوں۔"

"تو تمھیں اس وقت بیس لاکھ روپے کی ضرورت ہے؟"

"ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس وٹو کے ہاں ہم اسی لیے گئے تھے مگر وہ بات بن نہیں سکی۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔"

"بلکہ زیادہ ہی دینے پڑے۔ چار چیلے بے ہوش ہو گئے۔" آبی ہماری باتوں میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔

"آپ نے انھیں بے ہوش کیسے کر دیا؟ آدمی اتنا ڈھیٹ ہے کہ چھوٹی موٹی ضرب اُسے کچھ بھی نہیں کہتی اور آپ کے تو چٹ پٹ بے ہوش پڑے تھے۔"

"یہ میرے پیر اُستاد کا کرشمہ ہے۔ جیلانی کا۔ اِس کے ہاتھ میں ایسا اعجاز ہے کہ جسے چاہے بے ہوش کر دے۔"

"ہاں۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا ورنہ تمھاری جان مصیبت میں آ جاتی۔"

"مگر سوال تو وہی ہے کہ آپ نے بیہوش کیسے کر دیا؟"

"کسی دن آپ کو بھی پتہ چل جائے گا۔ اپنی گردن اس سے بچا کر رکھیں۔ یہ چاہے تو چیتے کو بھی دن میں تارے دکھا سکتا ہے۔"

"اچھا! یہ گُر مجھے بھی بتا دیں بھائی جان! مجھے تو اس کی آج کل بے حد ضرورت ہے۔" آسیہ اب مسکرانے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اب نرمی جھلکنے لگی تھی۔

"بتا دیں گے، بتا دیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تک جو ہم زندہ ہیں تو محض اس جنتر منتر کی وجہ سے ایسا ہے۔ تو پھر تمھیں ہم بیس لاکھ روپیہ دے دیں، یہی کہا ہے نا تم نے؟"

"ہاں۔ وہ بہت خوبصورت گاؤں ہیں، انھیں میں کسی صورت ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتی۔"

"کیا خیال ہے آبی! تم لاہور جا کر یہ رقم لا سکتے ہو؟"

"اس میں کیا حرج ہے، ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی،

ٹھیک ہے میں تمھیں چیک دے دیتا ہوں، تم کار میں چلے جاؤ اور رقم لے کر واپس آ جاؤ۔"

"جیسے تمھاری مرضی مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا؟"

"معاہدے کی رو سے دونوں گاؤں تین سال کے لیے گروی رکھے گئے تھے۔ یہ مدت آٹھ دن بعد ختم ہو جائے گی اور رقم کی مجھے انھی دنوں ضرورت ہو گی۔"

"ٹھیک ہے بی بی! رقم تمھیں مل جائے گی۔ یہ بینک لوٹنے کا ارادہ ترک کر دو۔ وہ کیا کہا تھا تم نے کہ یہ غنڈہ گردی نہیں چلے گی۔"

"ہاں یار! حد ہو گئی۔ یعنی اب یہ بینک بھی لوٹتی پھرے گی، غضب خدا کا۔ اس طرح تو یہ بالکل ہی اشتہاری مجرم بن جائے گی۔"

آسیہ ایک بار پھر قہقہہ لگانے لگی، بولی۔ "اگر آپ رقم نہیں دیں گے تو پھر کچھ نہ کچھ تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔ میرا خیال ہے، اب آپ آرام کریں، میرا تو نیند سے بُرا حال ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔ واقعی اب تم آرام کرو۔ کاش میں رات ہی تمھیں روک لیتا مگر تم بہت تیزی سے نکل گئی تھیں۔" میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ آبی کی نظر آسیہ کے چہرے الجھ رہی ہے مگر مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے اس نے فوراً ہی اپنی نشست چھوڑ دی۔ اس کے چہرے پر خجالت سی ابھرنے لگی تھی۔ یہ میرا وہم تھا یا کیا تھا مجھے آبی کی نظر میں وہ خمار جھلکتا دکھائی دیا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔

"چلو بھئی! اسے آرام کرنے دو۔ یہ بیچاری ساری رات جاگتی رہی ہے۔"

"ہاں چلو۔ انھیں واقعی گہرے آرام کی ضرورت ہے۔" آبی کی آواز اپنی نہیں تھی۔ وہ شاید وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی وہ اٹھ گیا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا جیسے وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر کا ہو جائے گا۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ میرا خیال ہے آسیہ نے بھی اس کی نظر کا مفہوم سمجھ لیا تھا، بولی۔ "آپ کے دوست کی آنکھیں تو ٹھیک ہیں نا؟ مجھے ان میں کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"لگتا ہے جیسے اس کی پتلیوں میں مسلسل ایک حرکت نمایاں رہتی ہے۔"

"اس نے کنٹیکٹ لینز لگوا رکھے ہیں ورنہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتا ہے۔"

"کیا واقعی؟ اس کی اُسے اتنی جلدی کیسے ضرورت پڑ گئی؟"

"اس کی اپنی نظر نہیں ہے، کسی سے مستعار لے رکھی ہے۔"

"اوہ! تو یہ قصہ ہے جیسے میں کسی کے گردے پر چل رہی ہوں، ہے نا عجیب بات؟ اور آپ بھی ایک ہی گردے سے کام چلا رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ تمھاری صحت پہلے سے اچھی ہو چکی ہے۔"

"خدا بھلا کرے اس لیڈی ڈاکٹر کا۔ ورنہ میں تو ختم ہی ہو گئی تھی۔ میں دوپہر کے کھانے پر آپ کو اندر بلوا لوں گی۔"

"ٹھیک ہے، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں بھی باہر نکل گیا۔ اس سے ہم نے بہت سی باتیں کر لی تھیں جن سے اس کو سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد ملی تھی۔ اب ہم زیادہ اعتماد کے ساتھ اس سے گفتگو کر سکتے تھے۔ اس سارے جہان کی بہن جی کے ساتھ۔

میں برآمدے میں پہنچا تو آبی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، بولا۔ "اس آسیہ نے مجھے حیران کر دیا ہے جیلانی! اس کے لیے ہم نے کشتوں کے پشتے لگا دیے مگر یہ تو وہ آسیہ نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔"

"ہاں۔ یہ اتنی بدل جائے گی، اس کا مجھے احساس ہی نہیں تھا۔ بہرحال پھر بھی یہ ہماری بہن ہے، اس کو بچا لینا ہمارا فرض ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اسے کسی تحفظ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس نے تو خود ایک فہرست تیار کر رکھی ہے ایسے لوگوں کی، جنھیں وہ ختم کر دینا چاہتی ہے۔"

"ہاں دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں بہرحال اسے روکوں گا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ماضی کو بھول جانا چاہیے۔"

"اُس کا تو خیال ہے کہ وہ بدمعاش لوگ اب بھی جیل میں وہی کچھ کرتے ہیں جو اُس نے دیکھ رکھا ہے۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں آبی کو ساتھ لے کر مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ غوث محمد نے اس عرصے میں وہاں کی ہر شے جھاڑ پونچھ دی تھی۔ ہم لحاف اوڑھ کر بستر میں جا گھسے۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا۔ اُس حیرت کدے میں بات بات پر حیران ہونے کے بجائے ہمارا سو جانا ہی بہتر تھا۔

وہ تو اچھا تھا کہ راستے میں ہمیں کسی نے للکارا نہیں ۔۔ وہ وٹو بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ ہم کس طرف نکلے ہیں ورنہ حویلی تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ بھی بڑی اہم بات تھی کہ بہن جی ہمیشہ رات کے وقت باہر نکلتی تھی اور عام لوگوں سے میل ملاپ پسند نہیں کرتی تھی اور کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا، اسے ہم نے وٹو کے مکان پر بھی بے نقاب نہیں کیا تھا اور باہر نکلتے ہی ہم نے اسے ہتھکڑی لگا لی تھی۔ البتہ گل خان اور مسولینی کو وہ لوگ پہچان چکے تھے۔ اُن سے وہ کسی بھی وقت دو دو ہاتھ کر سکتے تھے۔ مگر اُن کے بارے میں ہمیں کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کسی بھی طرح

حویلی کا پتہ کسی کو نہ بتاتے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ لوگ حویلی میں محفوظ نہیں تھے۔ اپنی کسی بھی حرکت سے وہ پولیس کی زد میں آ سکتے تھے مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ آسیہ ہماری کوئی بات ماننے پر تیار نہیں تھی اور آبی ٹھیک کہتا تھا کہ اُسے اِن سارے آدمیوں سے بچا لینے کی ضرورت تھی۔ وہی لوگ اُسے طرح طرح کے راستے دکھاتے تھے اور اب انھوں نے بینک لوٹنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر موقع ملا تو میں اُن چار، پانچ سرکردہ آدمیوں کو بینک پر دھاوا بول دینے کا مشورہ دوں گا اور اس طرح انھیں وہیں گرفتار کروا کر آسیہ سے الگ کر دوں گا۔ چھوٹے لوگ خود ہی پرے ہٹ جائیں گے مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ آسیہ یہی سمجھے گی کہ ہم محض بیس لاکھ روپیہ بچانے کے لیے یہ حرکت کر رہے ہیں۔ آبی بھی مجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آبی کی آنکھوں میں وہ خمار کیسا تھا؟ جو ایک دم بھڑک اُٹھا تھا۔ کیا وہ آسیہ کے بارے میں کوئی غلط سوچ اپنے ذہن پر سوار کر بیٹھا تھا؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے ورنہ۔۔۔ وہ میری دوستی سے محروم ہو جائے گا۔ میں۔۔۔ میں آسیہ کو ہر قیمت پر اس سے بچا لینا چاہتا تھا۔ اس کے سارے عیب مجھے اچھے لگتے تھے کہ وہ میرا دوست تھا مگر یہ بات میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے کسی معاملے میں کبھی نہیں روکا تھا۔ ہر جگہ وہ منہ مارتا پھرتا تھا مگر۔۔۔ مگر آبی یہاں ایسا نہیں کر سکے گا، یہ ناممکن تھا۔ میں اُسے سختی سے روک دوں گا۔ اُس سے میری دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔ میں ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا تھا اور یہ بات آبی کو معلوم تھی۔

ہم کوئی تین بجے سو کر اٹھے تو غوث محمد سے کہہ کر ہم نے کھانا وہیں منگوا لیا اور حیرت مجھے یہ ہوئی کہ آسیہ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید اُسے بھی یہ بات سوجھ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوئی تھی ورنہ اس نے کہا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر ہمیں اندر بلوا لے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

اگلے دن صبح سات بجے ہمیں غوث محمد نے جگا دیا۔

"آپ کو بہن جی نے اندر بلوایا ہے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔"

آبی ایک دم بستر سے اُٹھ گیا اور پاؤں میں بوٹ پھنسانے لگا۔ "خیر تو ہے میاں! یہ صبح صبح ہماری پیشی کس لیے کروا رہے ہو؟"

"کوئی کام ہوگا بھئی! تم بھی منہ ہاتھ دھو لو پھر اندر چلتے ہیں۔ تم جاؤ غوث محمد! کہو کہ ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

کوئی پندرہ منٹ میں ہم تیار ہو کر اندر چلے گئے۔ آسیہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ مسولینی اور گل خان بھی وہیں تھے۔ آسیہ سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس تھی اور اس کے دونوں کارندے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ اُن کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ آسیہ کے سامنے بالکل ہی مجہول سے بن جاتے تھے جیسے اُن کے منہ میں ... ہی نہ ہو۔

"آئیے بھائی جان! بیٹھیں۔ یہ مسولینی خبر لایا ہے کہ ... کے تمام لوگوں کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ اُن میں اس کے اپنے گھر ... بھی شامل ہیں۔"

"کیا کر لیا ہے؟"

"اغوا کر لیا ہے۔ کوئی دو سو آدمی رہتے تھے وہاں۔ ... گھر ویران پڑے ہیں۔ نہ کوئی عورت نظر آتی ہے نہ مرد۔ ... سمیت کوئی انھیں اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مسولینی تو خواب تو نہیں دیکھ ... کسی اور گاؤں میں تو نہیں جا گھسا؟"

"نہیں جی! وہ میرا ہی گاؤں ہے۔ کل سہ پہر میں گیا تو گاؤں میں اُلّو بول رہے تھے۔ وہاں کوئی آدمی مجھے ... نہیں آیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی! میں نے تو ایسا کبھی دیکھا ... آپ کو یقین آ گیا ہے بہن جی؟" میں نے مسولینی کو بغور ... ہوئے کہا۔ وہ واقعی بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"ہاں اس کی بات پر شبہہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اس کا اپنا گاؤں ہے اور وہ بھی گروی رکھا ہوا ... وہ علی جو کارخانی سے چھڑا لینا چاہتے ہیں۔"

"کتنے آدمی رہتے ہیں وہاں؟"

"یہی کوئی پچاس ایک گھر ہوں گے۔ نفر کوئی ڈھائی ... ہوتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں گئے؟ سارے ... اور ویران پڑے ہیں جیسے کوئی بلا انھیں اٹھا کر لے گئی ..."

"کسی سے پوچھا تھا تم نے؟"

"میں قریب کے گاؤں تانبہ بھی گیا تھا۔ وہ سخت ... ہیں یہاں تک کہ لاڈلی کا پہریدار بھی اغوا ہو چکا ہے۔"

"اور وہ گاؤں ہماری جاگیر کا حصہ ہے۔ مزارعے وہاں ... گئے تو باقی کیا رہا، اور وہ ہمارے پکّے بند مزارعے تھے۔" ... یوں کہا جیسے وہ پشتینی جاگیردارنی ہو اور اس کا کام ہی ... اور اپنی بات منوانا ہو۔ بالکل اس کا انداز ایسا ہی تھا۔ تمکنت تھی اس کے لہجے میں جس سے کبر جھلکتا تھا۔ ... کیوں ہو گئی تھی۔

"دیکھو مسولینی تم گل خان اور ہمارے بھائی جان کے ساتھ جاؤ۔ یہ آبی صاحب تو آج ایک کام سے لاہور جا رہے ہیں۔ ... صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرو گے کہ آخر ہوا کیا ہے۔

تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا ہے آپ ان کے ساتھ چلے جائیں گے نا؟"

"ہاں۔ اس میں کیا حرج ہے میں وہ گاؤں بھی دیکھ لوں گا۔ سیر ہی سہی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ گاڑی گل خان چلائے گا۔ سندھو کو ادھر ہی رہنے دو۔ اب آپ جائیں بھائی جان! آبی صاحب! آپ کب تک لاہور جائیں گے؟"

"میں ابھی نکل جاتا ہوں میرا کیا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے اِن کو بڑی سڑک پر اتار دینا۔ یہ بس میں سوار ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر آسیہ وہاں سے اُٹھ کر عقبی کمرے میں چلی گئی جیسے اس کا کام ختم ہو چکا ہو اور جو اسے کہنا تھا وہ کہہ چکی۔ اس دماغ دار کو قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ وہ حکم کس کے سامنے چلا رہی ہے۔ وہ غلام جیلانی کی حیثیت ہی کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

"آؤ بھئی! یہ بہن جی کا حکم ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں ان تینوں کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

کوئی ایک گھنٹے میں ہم نے ناشتہ وغیرہ کر کے سفر کی تیاری مکمل کر لی۔ بریف کیس میں سے کچھ رقم میں نے جیب میں رکھی اور کچھ آبی نے الگ کر لی اور اسے الماری میں بند کر کے ہم کار میں بیٹھ کر حویلی سے باہر نکل گئے۔

آبی کچھ تذبذب میں تھا، بولا "یار! اس چکر میں ہم کہیں بالکل ہی برباد نہ ہو جائیں معاملہ کچھ سیدھا بیٹھتا نظر نہیں آتا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا بھائی! بے فکر رہو۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اتنی بڑی رقم ہم کسی علی جو کارخانی کو دے کر یہ کیسے ثابت کر سکیں گے کہ گاؤں بہن جی کی ملکیت ہیں؟"

"وہ تو بڑے دعوے سے یہ بات کہتی ہیں۔ وہ خواہ مخواہ تو گروی مال چھڑا نہیں رہی ہیں۔"

"تم بھی نرے بدھو میاں ہو۔ بہن جی کو اس چکر سے نکالو۔ ہاں میں بتا رہا ہوں تمھیں۔ انھیں سخت غلط فہمی ہے۔"

"نہیں آبی! یہ بات نہیں ہے چاروں گرہیں اس نے بڑی مضبوطی سے باندھ رکھی ہیں۔ ہمیں اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔"

"روپے میں تمھارے حساب سے نکلواؤں گا۔"

"ہاں ہاں چیک میں نے تمھیں اسی لیے دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے خدا ہی خیر کرے، مجھے تو بہرحال خیر نظر نہیں آتی۔"

"تیرا مغز پھر گیا ہے پیارے! ورنہ ہوگا کچھ نہیں۔ وہاں جا کر کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں وہ ستناجا نہ مل جائے تمھیں۔ اسے فون بھی نہیں کرنا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ تمھاری طرح میں کرائے کا ٹٹو نہیں ہوں۔"

"چلو یہ بھی اچھی بات ہے۔ مگر وہ مجھے کوئی لائسنس وغیرہ دینا چاہتا تھا۔ خیر وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ابھی تو اس مصیبت سے نمٹو۔"

بڑی سڑک پر پہنچ کر ہم نے آبی کو کار سے اتار دیا مگر وہ بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ مجھ سے اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"یہ لاڈلی گاؤں کتنی دُور ہے یہاں سے؟"

"یہی کوئی تیس میل ہوگا۔ راستہ البتہ بہت خراب ہے۔"

"چلو دیکھ لیتے ہیں۔ تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو مسولینی؟"

"جی ہاں، میری بیوی اور بچے بھی وہاں نہیں ہیں میاں جی! پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔"

"تمھارا وہاں دبدبہ تو بہت ہوگا۔"

"دبدبہ تو بہت ہے مگر اس کا فائدہ کیا ہوا؟ انہیں کیا پتہ کہ میرا اصل پیشہ کیا ہے۔ میں نے انھیں کبھی نہیں بتایا کہ میں کام کیا کرتا ہوں۔ انھیں یہی معلوم ہے کہ میں کوئی تجارت کرتا ہوں۔"

"تم کس وقت اپنے گاؤں گئے تھے؟"

"کل چار بجے مگر پنڈ تو اجڑا پڑا تھا۔ جانو کوئی دیو پھر گیا ہو۔ کسی گھر میں کوئی بندہ نہیں تھا۔ آٹے گندھے ہوئے پراتوں میں پڑے تھے۔ ہانڈیاں چولھوں پر جل رہی تھیں۔ لگتا تھا ان لوگوں کو زبردستی وہاں سے اٹھا لیا گیا تھا۔ میں تو حیران رہ گیا۔ کتے ہی وہاں رہ گئے تھے جو گلیوں میں بلکتے پھر رہے تھے۔ اب تک تو ہر شے کا صفایا ہو چکا ہوگا۔ آس پاس کے لوگ ہر چیز اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔"

"اچھا! یہ حال ہو گیا تھا گاؤں کا؟ اور وہ گاؤں آپا صاحب کی جاگیر کا حصہ ہے اسی لیے بہن جی پریشان ہیں۔" گل خان نے حیران ہو کر کہا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے بھلا اس بکھیڑے میں کیوں پھنسا دیا گیا ہے مگر ان کی بہن جی کا یہی حکم تھا۔ مجھے چاروناچار وہاں جانا ہی پڑ رہا تھا لیکن اس میں عقلمندی کی بات کوئی نہیں تھی۔ لوگ تو لٹتے ہی رہتے ہیں۔ چوریاں ہوتی ہیں، ڈھور ڈنگر ہانک لیے جاتے ہیں۔ ہیضہ پھیل جاتا ہے کوئی اور مصیبت آ جاتی ہے۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ جاتے ہیں کوئی ان کی کیسے مدد کر سکتا ہے۔ پتہ نہیں آبی کو لاہور بھیج کر میں نے اچھا کیا تھا کہ نہیں۔ وہ فیصلہ بھی بس یوں ہی ہو گیا تھا۔ کیونکہ رقم ہمارے پاس موجود تھی اور وہ بھی ہماری محنت کی کمائی نہیں تھی۔ ایسے ہی وہ ہمارے ہاتھ لگی تھی اور اب ہم اسے آسیہ کی طرف منتقل کر رہے تھے کہ اسے گروانے کی عیاشی میں خرچ کی گئی بیس لاکھ کی رقم کسی علی جو کارخانی کو واپس کر کے دونوں گاؤں واپس لینے تھے۔ وہ اس کے پاس گروی رکھ دیے گئے تھے اور اب یہ خبر مل رہی تھی کہ لاڈلی گاؤں اجڑ چکا ہے

اس کے مزارع وہاں سے بھاگ نکلے ہیں۔ کیوں بھئی! انھیں وہاں کیا تکلیف تھی؟ اس پانی سے اُن کے جوڑوں میں درد اٹھتا تھا کہ کوئی اور بات تھی؟ وہ کیوں گاؤں چھوڑ کر بھاگ نکلے؟ یہ ناممکن تھا کہ کسی آدمی نے انھیں وہاں سے زبردستی اٹھا کر ٹرکوں میں ڈالا اور وہاں سے لے اُڑا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جیتے جاگتے صحیح سالم انسان تھے۔ کوئی نشہ پلا کر تو انھیں بے ہوش نہیں کر دیا گیا تھا۔ مسولینی کہتا تھا کہ اس کے بیوی بچے بھی غائب تھے۔ تو یہ ساری بپتا اُن پر کہاں سے آ پڑی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیا وہ ایسے ہی گناہ گار لوگ تھے؟ کہ خدا نے ان کی رسی اتنی تنگ کر دی اور ایک دم انھیں زمین سے اٹھا لیا کہ آؤ میں تمھارا حساب کرتا ہوں۔ یہ تمھارے گناہ ہیں، تمھاری رگ رگ میں بہت پھڑکتی تھی۔ تم کم تولتے تھے۔ جھوٹ تمھاری نس نس میں بھرا تھا۔ امانت میں خیانت کرتے تھے۔ جھوٹی گواہی دیتے تھے، لو پڑھو، یہ تمھارا نامۂ اعمال ہے کیا دوزخ تمھارا صحیح ٹھکانا نہیں ہے؟

راستہ اب بھی بہت زیادہ ناہموار تھا۔ ایک پگڈنڈی پر سے ہو کر ہم گزر رہے تھے۔ وہ میری زندگی کی طرح ایسی اونچ نیچ سے بھری تھی کہ ہم اندر بیٹھے کبھی دائیں طرف لڑھک جاتے تھے اور کبھی بائیں طرف۔

بالآخر ہم لاڈلی جا پہنچے۔ اس کے ہرے بھرے سایہ دار درخت مہمانوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔ گاؤں کے باہر ایک بڑا وسیع باغ تھا جس میں طرح طرح کے پھل دار درخت لگے تھے۔ اس کا رقبہ بلاشبہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا مگر ان درختوں کے نیچے کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ باغ کے اندر روشیں بنی تھیں۔ جیسے وہ کوئی سیرگاہ ہو مگر اس گھڑی وہاں ایسی ویرانی چھائی ہوئی تھی کہ گل خان اس کے اندر سے کار کو گزار کر سیدھا گاؤں تک جا پہنچا۔

یہی کوئی پچاس ساٹھ گھر اس گاؤں کو گاؤں بناتے تھے۔ چار گلیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح مسجد کے سامنے پھیلی تھیں۔ ہر گلی میں کوئی پندرہ گھر ہوں گے، بہت ہی صاف ستھرے، لپے پُتے۔ ہر گھر میں شہتوت، آم یا بکائن کا درخت موجود تھا۔ ہر گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ کسی کو وہاں تالا لگانے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ حالت یہ تھی کہ کمروں کے دروازے بھی چوپٹ کھلے تھے۔ ان کے چولھے چوکے ویسے کے ویسے ہی دھرے رہ گئے تھے۔ مسولینی ٹھیک کہتا تھا۔ ہانڈیاں چولھوں پر ہی چڑھی رہ گئی تھیں اور آٹے گندھے ہوئے پراتوں میں رکھے تھے۔ لگتا تھا کوئی ایسی ہی غضب کی ہوا چلی تھی جس نے کسی کو دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ حالت یہ تھی کہ کئی صحنوں میں جوتے پہننے کی بھی لوگوں کو اجازت نہیں [illegible] وہ بھی جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ ہم نے تقریباً سارے ہی گھر [illegible] لیے۔ انھیں شاید گھر کی کوئی چیز بھی ساتھ لے جانے کی توفیق [illegible] ہوئی تھی۔ اُن کے حقے بھی بھرے کے بھرے رہ گئے تھے۔ ڈھو[illegible] پہ مجھے بہت ترس آیا۔ بہت سے رسّہ تڑا کر بھاگ نکلے تھے۔ کئی ایسے تھے جو کلّوں سے بندھے حیران پریشان کھڑے تھے۔ سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ گاؤں میں عجیب سی ویرانی [illegible] میں نے جنوں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ کسی بستی پر اترا[illegible] اسے اپنے انتقام کا نشانہ بنانا چاہیں تو وہ اُن لوگوں کو ا[illegible] تباہ برباد کر دیتے ہیں، کسی کو نہیں بخشتے۔ مگر یہاں تو جن نہ[illegible] تھا۔ کئی جگہوں پر مجھے محسوس ہوا کہ لوگوں کے ساتھ دھینگا[illegible] بھی ہوئی ہے۔ ایسے نشانات ملتے تھے مگر کسی کا خون مجھے نظر نہ آیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ مسولینی ہمیں ساتھ لے کر ایک ایسے [illegible] میں داخل ہوا جس کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی اس کے لبوں [illegible] آہ نکل گئی۔

”یہ... یہ میرا گھر ہے۔ یہ دیکھیں اس کے بھی دروازے کھلے ہیں۔ میری بیوی زینب اور دو بچے کلّو اور بیو سب کے سب غائب ہیں۔ یہ دیکھیں یہ اُن کے کھلونے ہیں۔“ اس کی آنکھیں [illegible] نکل آئی تھیں۔ اُس نے باورچی خانہ بڑے ڈھنگ سے بنایا تھا [illegible] چینی کے برتن دو الماریوں میں لگے تھے۔ چولھے میں آگ بجھ [illegible] پرات میں آٹا موجود تھا اور ہانڈی چولھے سے اتار لی گئی تھی [illegible] کی جگہ توا اُس پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ پیڑھی بھی وہاں موجود [illegible] پر بیٹھ کر اس کی بیوی زینب روٹیاں پکاتی تھی۔ قریب [illegible] کے ساتھ کچھ کھلونے پڑے تھے معلوم یہ ہوتا تھا کہ انہیں [illegible] سے ایک دم اٹھا لیا گیا تھا اور ایسے حال میں کہ اُن کا پرسان حال [illegible] نہیں تھا۔ دوسرے گاؤں کے لوگوں کو خبر ہی نہ ہوسکی ہوگی [illegible] پر کیا گزر گئی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں کو بھی انھوں [illegible] ایک ساتھ باندھ لیا تھا۔ پتہ نہیں انھیں کیسے انھوں نے گاؤں [illegible] بلوا لیا ہوگا۔ کوئی تو ایسا ہوتا جو ہمیں بتا سکتا کہ وہاں ہوا کیا [illegible] ایسے ہی منظم طریقے سے انھوں نے دو ڈھائی سو افراد کو پکڑ[illegible] کہ ہم اُن کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکے۔ اس معمے کا کوئی [illegible] نظر نہیں آتا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں کوئی نہ کوئی فرد بیمار بھی [illegible] کوئی وہاں سے غیر حاضر بھی ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ [illegible] کو پکڑ کر لے گئے اور وہ تھے کون؟ کس کے ہاتھ میں اتنا [illegible] کہ وہ اتنے اونچے پلے پورے سایہ دار درخت کو جڑوں سمیت [illegible] چلتا بنے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ قریبی گاؤں کے کسی آدمی [illegible] اُدھر جھانک کر نہیں دیکھا تھا کسی کی صورت ہمیں وہاں نظر [illegible]

”کل جب تم یہاں آئے تھے مسولینی تو اور بھی کوئی آدمی یہاں موجود تھا؟“

”جی نہیں۔ مجھے کوئی ملا ہی نہیں۔“

”پھر تم نے کسی سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟“

”یہاں سے گھبرا کر میں تانیہ جا پہنچا مگر انھیں کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ وہ گاؤں یہاں سے پانچ میل دور ہے۔ وہ بھی سخت حیران ہوئے۔ وہ اس معاملے کو دیکھنے کے لیے میرے ساتھ لاڈلی آئے۔ مگر اُن کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید جنوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے۔ کسی کو یہاں کی کوئی چیز چرانے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ رستے جنوں کی توں موجود ہے۔“

”کیا تم نے مسجد کے آس پاس پہیوں کے نشان دیکھے ہیں؟ وہ ٹرکوں کی لکیریں ہیں۔“

”ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ کم و بیش پانچ چھ ٹرک وہاں ٹھہرے ہوں گے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟ کیا یہ لوگ ٹرکوں میں لاد دیے گئے تھے؟“

”ہوسکتا ہے میاں جی یہی بات ہو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”عین ممکن ہے کہ اِن لوگوں کو رات کے وقت یہاں سے اغوا کیا گیا ہو۔ یہ اندر بندھے ڈھور ڈنگر تو یہی بتاتے ہیں۔ کھانا تو بالعموم یہ لوگ رات کو پکاتے ہوں گے۔“

”جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ ایسا ہی وقت ہوگا، جب سب لوگ گھروں میں موجود ہوں گے۔“ مسولینی نے چونکتے ہوئے کہا۔ اس نے معاملے کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں میاں جی! بات کچھ ایسی ہی ہے۔“

”پھر کیا خیال ہے تمھارا! یہ ٹرک کدھر نکلے ہوں گے؟“

”میری مانیں تو ہمیں ان ٹرکوں کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اور پولیس کو بھی اطلاع دے دیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”میرے سامنے پولیس کا نام مت لو گل خان! اتنا بڑا حادثہ ہوگیا اور اب تک اُن کا یہاں کوئی آدمی نہیں پہنچا۔ چلو تم گاڑی اسٹارٹ کرو۔“ میں نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ہماری اسٹین گنیں کار کے اندر رکھی ہوئی تھیں۔ پستول اور چھرے ہماری جیبوں میں موجود تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے طاقتور لوگ ہیں جنھوں نے ایک پوری بستی کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے آئے تو ہم تین آدمی کیا کرسکیں گے۔ اگر وہ مقصد مجھے معلوم ہوتا تو پھر میں کہہ سکتا تھا کہ ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ بہت ہی دیدہ دلیر لوگ تھے۔ ان کو للکارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ ٹرک لے کر آئے اور ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ گئے۔ ابھی ہم کار میں بیٹھے ہی تھے کہ پیچھے سے ہمیں گلی میں سے کسی نے پکار کر کہا۔ ”او بھائی! میری بات سنو! خدا کے لیے ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔“

ہم تینوں یہ آواز سن کر کار سے باہر نکل آئے۔ گلی میں ہمیں ایک آدمی ایک عورت کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا نظر آیا۔ وہ بہت زیادہ بیمار دکھائی دیتا تھا۔ عورت بڑی مشکلوں سے اُسے سنبھالے ہوئے تھی۔ دونوں جوان دکھائی دیتے تھے مگر مرد کی سکت ختم ہو رہی تھی اس سے دو قدم بھی سہارے کے بغیر نہیں چلا جاتا تھا۔ اُن کو اس اجاڑ بستی میں زندہ دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے دو مُردے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے برزخ میں سے گزر رہے ہوں۔ ہم تینوں تیزی سے اُن کی طرف بڑھے۔ مرد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ عورت بھی آبدیدہ ہو رہی تھی۔ اس تنہائی، اور ویرانی نے انھیں بھی کچل ڈالا تھا۔

”اوئے خیراں! یہ تو ہے! پر یہ کون ہے تیرے ساتھ؟ اسے تو میں نے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔“ مسولینی نے اس لڑکی کو پہچانتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارا مہمان ہے میرے خالو کا لڑکا تاج دین۔ اسے بہت سخت کس چڑھی ہے چاچا۔ پتہ نہیں اس کا کیا بنے گا۔“

”پر آس گاؤں کے لوگ کہاں چلے گئے؟ تو کیسے بچ گئی؟ یہ قصہ کیا ہے خیراں؟“ مسولینی نے اس مرد کو سہارا دے کر کار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہ پوچھ چاچا۔ یہ پرسوں شام کی بات ہے۔ رات عشا کی نماز کے بعد وہ گاؤں پر آ چڑھے۔ اُن کے پاس ٹرک تھے، پانچ ٹرک اور وہ پندرہ سولہ آدمی تھے۔ بندوقیں اُن کے پاس تھیں۔ وہ گلیوں میں پھیل گئے چار چار کی ٹولی بن کر اور ہر گھر کے تمام لوگوں کو وہ بندوق کے زور پر ہانک کر لے گئے۔ کسی کو بھی انھوں نے نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی لاد کر لے گئے۔ لوگوں نے بہت شور مچایا مگر وہ گولیاں چلا رہے تھے۔ ہوائی فیرنگ۔ تاج دین اس وقت اندر کی کوٹھری میں تھا۔ میرے باپو اور میری ماں اور میرے چھوٹے ویروں کو انھوں نے آگے لگا لیا۔ میں انھیں نظر نہیں آئی۔ میں کوٹھری میں جا گھسی تھی۔ پردے کے پیچھے چھپ کر میں نے اپنی جان بچائی۔ تاج دین بھی وہیں چھپ گیا، ان لوگوں نے سارے گاؤں کو پکڑ کر ٹرکوں میں لاد دیا۔ وہ منہ پر نقاب پہنے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے منڈاسے باندھ کر آئے تھے صرف ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ہر ایک کے پاس بندوق تھی۔ وہ روتے بلکتے بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔“

”مگر وہ تھے کون؟“

”کچھ پتہ نہیں ہے چاچا! وہ بلائیں تھیں جو اس گاؤں کو برباد کر

گئیں۔ اس خوف سے تاج دین بیمار ہو گیا۔ مجھے بھی کل سے کس نے آلیا ہے۔ اس کو بھی کس چڑھا ہے۔ آپ کی آواز سن کر ہم بڑی مشکلوں سے کوٹھری سے باہر نکلے ہیں۔ پتہ نہیں میرے ویر منیر اور صنوبر کا کیا حال ہو گا۔ میرے باپو کو بھی وہ باندھ کر لے گئے اور میری اماں کو بھی۔

"کل سے کوئی آدمی یہاں نہیں آیا؟"

"نہیں! کوئی بھی نہیں آیا اور پھر ہمیں ہوش ہی کہاں تھا۔ ایسی کس چڑھی کہ اٹھنا مشکل ہو گیا۔ خدا کے لیے ہمیں کوئی دوا لا دو۔ تاج دین بہت بیمار ہے۔"

"اس پر لعنت بھیج، یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں بتا وہ کہتے کیا تھے؟" مسولینی نے جھک کر کہا اور تاج دین کو اس نے زمین پر بٹھا دیا۔ وہ خاصا ہٹا کٹا جوان تھا مگر ایک ہی دن میں بخار نے اسے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ اس سے کھڑا ہونا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

"کچھ بھی نہیں چاچا! یہی کہتے تھے کہ یہ گاؤں چھوڑ دو۔ اللہ کا یہی حکم ہے ورنہ یہاں زلزلہ آئے گا اور تم سب مر جاؤ گے۔ ہاں وہ یہی کہہ رہے تھے۔ وہ اللہ رسول کا نام بھی لیتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کیسے لوگ تھے۔" یہ کہتی ہوئی وہ لڑکھڑا کر میری طرف گری۔ اسے میں نے سنبھالا تو پتہ چلا کہ اسے بھی کم از کم ایک سو تین ڈگری کا بخار ہے۔ وہ تپش سے پھنک رہی تھی۔ تاج دین کا بھی یہی حال تھا۔ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جاتی تھیں۔ وہ زمین پر پڑا ادھ موا نظر آتا تھا۔

"ان کے لیے پانی لاؤ گل خان فٹا فٹ! کوئی گھڑا مل جائے تو وہ بھی لے آنا۔"

گل خان اسی وقت ایک گھر میں جا گھسا۔ اس عرصے میں خیراں کو میں سنبھالے رہا۔ اس کی عمر بھی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی۔ بہت جوان عورت تھی وہ مگر اس کے انداز سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اسے اپنی جان کی فکر نہیں تھی۔ بس وہ تاج دین کے لیے زیادہ پریشان تھی۔ بار بار اسی کا نام لے رہی تھی۔ ان دونوں کے لیے میرے دل میں گہری ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔ کسی جوان کا یوں بیماری کے ہاتھوں موت کے منہ میں جا گرنا کوئی خوشگوار بات نہیں ہے اور وہ تو ابھی بہت ہی جوان تھے۔ خیراں جیسی بھرے بھرے بدن اور گندمی رنگ کی سڈول عورت کا اس طرح مر جانا بڑا ہی اندوہناک ہوتا۔ تاج دین کی حالت دم بدم غیر ہوتی جا رہی تھی۔ دوا ہمارے پاس کوئی بھی نہیں تھی کسی حکیم یا کسی ڈاکٹر کا مل جانا کارِ دارد تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ ہم اسے کوئی دوا لا دیں مگر ایسا ہم کہاں سے کر سکتے تھے؟

گل خان ایک گھڑا اور ایک بڑا سا گلاس لے کر باہر آ گیا۔ پتہ نہیں میرے دل میں اس وقت ان کے لیے کیسی ہمدردی جاگ رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر میری طرف بڑھایا۔ تو میں نے اسے زمین پر ... اپنی انگلی پھیر دی اور پھر اس کا ایک گھونٹ خود پی کر کہا "خیراں! یہ تم پی لو۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی۔ سارا ہی پی لو۔"

اس نے بڑی ہی بے چارگی کی نگاہ سے مجھ کو دیکھا اور بولی "نہیں پہلے تاج دین کو پلا دیں۔ اس کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ میاں جی! اس کو کوئی دوا بھی ضرور لا دیں۔"

میں نے وہ گلاس تاج دین کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر حواس اس کے ابھی زندہ سلامت تھے۔ میرے ہاتھوں کا ... محسوس کر کے اس نے گلاس پکڑ لیا۔

"اسے بسم اللہ کر کے پی جاؤ تاج دین! اللہ کرے گا تم ... ہو جاؤ گے۔" میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ دونوں اسی وقت ... ہو جائیں۔ ان کی حالت واقعی مخدوش تھی۔

تاج دین نے منہ سے گلاس لگایا اور سارا پانی پی گیا۔ ایک ... آہ اس کے لبوں سے نکلی اور گلاس اس نے زمین پر گرا دیا۔ پانی کیا ... چڑھا تھا یا کیا ہوا تھا، وہ بالکل ہی بے سدھ ہو گیا۔ اس کو ... بے طرح نڈھال دیکھ کر خیراں تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے ... جا بیٹھی۔ جس انداز سے اس نے تاج دین کا سر اوپر اٹھا کر اپنے ... پر رکھا، میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اس کی اپنی حالت حالانکہ اتنی خراب تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں تاج دین کی حالت ... آنسو لرزنے لگے اور پھر اس کے رخسار تر ہونے لگے۔

"تجھے کیا ہو گیا تاج دین؟ دیکھ تیری کیا حالت ہو گئی ہے۔"

"تم یہ پانی پی لو۔ گل خان اندر سے کچھ نمک مل سکے تو لے آؤ۔"

وہ ایک بار پھر گھر میں جا گھسا۔ پتہ نہیں اسے نمک کہاں سے کیسے مل گیا۔ جب وہ باہر آیا تو بولا "یہ لیں سردار صاحب! یہ لیں نمک بھی مل ہی گیا ہے۔"

میں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لے کر اس میں سے تھوڑا نمک گلاس میں ڈالا اور اسے اٹھا کر میں پھر خیراں کے پاس جا پہنچا۔ تاج دین ابھی تک بے سدھ پڑا تھا اور اس کا سر خیراں نے اپنے زانو پر رکھا تھا۔ مجھ سے گلاس لے کر اس نے ایک ہی ڈیک میں پی لیا۔ یوں جیسے وہ بہت زیادہ پیاسی ہو۔ ایک بار پھر وہ تاج دین پر جھک گئی اور اس کے ہاتھوں پر مالش کرنے لگی مگر ابھی کوئی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کی نڈھال آنکھوں میں چمک سی لہرانے لگی۔ یہی حال تاج دین کا ہوا۔ وہ بھی آنکھیں پھڑپھڑانے لگا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کھول کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیراں اس پر سخت حیران ہو رہی تھی۔ اس کی اپنی نبضیں معمول پر آنے لگی تھیں۔ اچانک تاج دین زمین پر سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا حال ہے اب تمہارا؟"

"جی... میں... میرا خیال ہے میں تندرست ہو گیا ہوں صاحب جی۔ یہ... دیکھیں کس تو اتر گئی ہے۔" وہ اپنی کلائی ٹٹولتے ہوئے بولا۔ اس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں اور داڑھی ابھی اسے نہیں آئی تھی۔ خیراں کا بھی یہی حال تھا۔ زندگی اس پر بھی بہت مہربان نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی بہاروں میں بدلنے لگی۔ کوئی پانچ ہی منٹ میں تاج دین زمین سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی خیراں بھی کھڑی ہو گئی۔

"صاحب جی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے جی! میں... میں تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

"اور میں بھی جی! یہ دیکھیں میری نبض دیکھیں۔" اس نے اپنی کلائی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

اس کی نبض معمول پر آ چکی تھی۔ پھر میں نے تاج دین کی نبض دیکھی، وہ بھی اس کی صحت کا پتہ دیتی تھی۔ اب وہ دونوں میرے سامنے گنگ سے ہو کر کھڑے تھے، ان کی آنکھوں میں ایسا تشکر ابھر آیا تھا کہ باید و شاید۔ میں نے ان جیسی شکر گزار آنکھیں پھر کبھی نہیں دیکھیں اور پھر وہ... وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور انھوں نے ایک دم میرے قدم چوم لیے۔

"کیا کرتے ہو بھئی! ہٹاؤ یہ قصہ! اللہ نے تمھیں صحت دے دی ہے، بس یہی بہت کافی ہے۔"

"آپ نے ہمیں نئی زندگی دی ہے خان جی! یہ آپ کے ہاتھ کا فیض تھا۔ وہ پانی تھا کہ آبِ کوثر۔ اوہ میرے خدایا... آپ میرے سامنے کھڑے ہیں، میری کھال کی جوتی آپ نہیں پہن رہے ہیں۔ انھیں جھک کر سلام کرو تاج دین! یہ اللہ کے بڑے ہی برگزیدہ آدمی ہیں۔" خیراں نے ایک بار پھر میرے قدموں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں خیراں! یہ کیا کرتی ہو تم۔ چلو گل خان انھیں کار تک لے چلو۔"

مسولینی اور گل خان بھی سخت حیران تھے، ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بلند و بالا پہاڑ کو دیکھتا ہے اور اپنی ہستی کو رائی کے برابر سمجھ رہا ہو۔

"سردار صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا سرکار! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ایسے کرنی والے آدمی ہیں۔ سرکار، مجھے بھی اپنا غلام بنا لیں۔ یہ بندے مر رہے تھے، آپ کے ہاتھوں جی اٹھے۔ یہ... یہ کیسے ہو گیا ہے سرکار!؟"

"دیکھتے ہو تم! یہ بیمار تھے۔ پانی نے انھیں شفا دے دی اور بس۔ چلو اب کار میں بیٹھو۔ خیراں تم بے فکر ہو جاؤ۔ تمھارے ماں باپ اور بھائی سب مل جائیں گے۔"

"مجھے تو اب کوئی دکھ ہی نہیں رہا سرکار! میرے مائی باپ، بھائی بہن سب آپ پر قربان۔ میں تو اب آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔ مجھے اور کیا چاہیے میرے نصیب جاگ اٹھے۔ تاج دین میں آباد ہو گئی۔ پنڈ اجڑا تو کیا ہے مجھے سرکار کا دیدار نصیب ہو گیا ہے۔ دیکھیں، میری نبض دیکھیں۔ میں بیمار کہاں تھی۔ تو بھی دیکھ کتنا چنگا بھلا ہو گیا ہے۔" خیراں نے تاج دین کا رخ پھر میری طرف موڑ دیا۔ شاید وہ پھر میرے قدموں کو ہاتھ لگانا چاہتی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس جیسی ان پڑھ عورت کی زبان ایک دم اس قدر رواں ہو گئی تھی کہ وہ مجھے تم سے آپ اور آپ سے سرکار کہنے لگی تھی۔ نئی نئی باتیں اسے سوجھنے لگی تھیں۔ اس نے مجھ جیسے بدکار کو سرکار بنا دیا تھا۔

"آپ ذرا رکیں سرکار! میرے گھر میں ہر چیز موجود ہے۔ میں آپ کے لیے کھانا پکا دیتی ہوں۔ آئیں میرے ساتھ۔ چاچا ان سے کہو۔ اس گاؤں میں برکت آ جائے گی، ان کے کھپے سے یہ گاؤں آباد ہو جائے گا۔ انھیں کہو چاچا۔ تم بھی ان سے عرض کرو تاج دین! سرکار ذرا رک جائیں۔" اس نے کار کے قریب پہنچ کر ہم سب کو روکتے ہوئے کہا۔

میری انا اس کے لفظوں سے کسی برق رفتار گھوڑے پر سوار نہیں ہوئی۔ میں اس سے شرمندہ ہوا جاتا تھا۔ خجل ہونے لگا تھا۔ اس نے غلام جیلانی کو واقعی جیلانی سمجھ لیا تھا۔ وہ بڑے دکھوں کا ماندری جس کے نام سے مجھے غلامی کی نسبت تھی۔ خیراں مجھے اس کے روپ میں دیکھنے لگی تھی۔ پیر خود کہاں اڑتے ہیں، یہ تو مرید ہیں جو انھیں مسلسل دور بلاتے رہتے ہیں اور وہ اڑتے چلے جاتے ہیں۔"

"خیراں ٹھیک کہتی ہے سرکار! ذرا رک جائیں، کھانا کھا کر چلتے ہیں۔" مسولینی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی! چلو ہم اس کے گھر چلتے ہیں۔ آؤ۔ تمھارا کیا حال ہے اب تاج دین؟"

"سرکار! میں تو ایسا ہو گیا ہوں کہ کبھی بیمار ہی نہ تھا۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"یہ زیادتی ہے بھئی! ایسا نہ کرو۔ تمھیں کیا پتہ میں کتنا گناہ گار آدمی ہوں۔ چلو مجھے اپنا گھر دکھاؤ خیراں۔" اپنا نام میرے منہ سے سن کر وہ مچلتی ہوئی آگے چلنے لگی۔ کپڑے ان دونوں کے میلے ہو رہے تھے مگر ان میں خیراں کا وجود چمکتا نظر آتا تھا۔ بلاشبہ وہ گاؤں کی الھڑ اکھڑ مٹیار کسی کو بھی گمراہ کر سکتی تھی اور تاج دین تو کوئی شے ہی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی اپنے ہی راز و نیاز میں مصروف ہوں گے۔ پچھلی کوٹھری میں کہ گاؤں پر حملہ ہو گیا اور وہ وہیں کوٹھری میں چھپ کر جان بچا گئے۔ ورنہ وہ انھیں بھی کہاں چھوڑنے والے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی بھی گھر سے ان لوگوں نے کوئی چیز

نہیں اٹھائی تھی۔ سب کچھ وہیں پڑا رہ گیا تھا۔ انھیں ضرورت تھی تو صرف آدمیوں کی۔ پتہ نہیں وہ سالے کون سا اہرام بنا رہے تھے اور کہاں۔ انھیں صرف نفری کی ضرورت تھی جو انھیں یہاں سے یکجا مل گئی اور وہ انھیں باندھ کر لے گئے۔ ان جیسا کاریگر تو میں نے ایک بھی نہیں دیکھا تھا۔ اکا دکا لوگ راہ چلتے اغوا ہو جاتے تھے، ان کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ کوئی کسی جگہ سے ان کے ہاتھ آجاتا تھا، کوئی کسی جگہ سے مگر ایسا تو کبھی نہیں دیکھا کہ ایک گاؤں کا گاؤں ہی وہ اپنے عتاب میں لے لیں اور سب کو باندھ کر چل دیں کہ چلو ادھر گولی چل رہی ہے، تم اس کا سامنا کرو۔ ایسا تو میری دید شنید میں کبھی نہیں آیا اور وہ گوریا کی وارث آسیہ کا گاؤں تھا۔ وہ خود اگر ہمارے ساتھ آتی تو شاید وہ منظر، وہ ویرانی، وہ دہشت، وہ سناٹا، وہ سر نہوڑائے کھڑے ڈھور ڈنگر، وہ مسجد کے اداس مینار، وہ چاروں بے آباد گلیاں، وہ بڑ کا صدیوں پرانا درخت، وہ کھیت وہ باغ اور اس میں پھیلی ویرانے کی بُوباس اسے بھی پاگل کر دیتی۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کی حرکتِ قلب بند ہو سکتی تھی۔ اچھا ہوا وہ میرے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اسے اعتماد تھا کہ اس کا بھائی اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی ہے۔ وہ ہزاروں صدمے سہہ چکا ہے اور ہزاروں ہی مزید بھی سہہ سکتا ہے۔ اس کا یہی خیال تھا اور اسی وجہ سے مسولینی کے ساتھ وہ خود لاڈلی گاؤں میں نہیں آئی تھی مگر اب وہ جو کچھ سنے گی، وہ بھی اس کو سکتے میں ڈالنے کے لیے بہت کافی ہوگا۔

خیراں بالآخر گلی کے آخری حصے میں پہنچ کر ایک گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔ وہ وہیں رہتی تھی۔ اس گھر کے صحن میں بندھی اس کی بھینس اسے دیکھ کر ایک دم ڈکرانے لگی تو خیراں تیزی سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بولی "فکر نہ کر چینی! سرکار آگئے ہیں، تیرے سارے دلدّر دُور کر دیں گے۔ تیرے لیے ابھی چارہ منگواتی ہوں۔ ہے تاج دین! جا ذرا اس کے لیے دو بھتے برسیم لے آ۔ یہ بچاری کب سے بھوکی بندھی ہے۔"

تاج دین نے یہ بات سنی تو بولا "ٹھیک ہے، لا وہ درانتی اور جال مجھے دے دے۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی دونوں چیزیں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کی وہ کھوئی ستیا لوٹ آئی تھی اور اس کا رنگ بھی اب بدلنے لگا تھا۔ پتہ نہیں اس پانی میں کیا خاصیت تھی کہ بلاشبہ وہ انھیں نئی زندگی دے گیا تھا اور میں حیران تھا کہ آخر ایسی بھی کیا بات تھی۔ یہ "واردات" میرے ہاتھوں تیسری بار مکمل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے مجھے لکھوڈیر میں بھی یہی حادثہ پیش آیا تھا۔ پھر شب خیر کے قرِ معدہ کا درد میرے ہاتھوں ٹھیک ہوا اور اب یہ تاج دین اور خیراں میرے سامنے تھے اور ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ خیراں دوڑ دوڑ کر ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ ہمارے لیے اس نے صحن میں چارپائیاں ڈال کر سفید چادریں بچھا دیں۔

"یہ کون ہے مسولینی؟"

"یہ گوریا صاحب کے مزارعے فتح محمد کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں کا نام سیراں ہے۔ دو بھائی ہیں اس کے، ایک منیر اور ایک صغیر۔ کام سارا فتح محمد ہی کرتا ہے، اب بیٹے بھی ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اچھی گزر ہو رہی ہے ان کی۔"

خیراں اپنا غم بھول کر میری خدمت میں جُت گئی تھی۔ کسی نے کہا نو تو ایشور نہیں تو پتھر۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ خیراں نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ میں اس کے جھانسے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ بلا سے وہ کتنی ہی میری خدمت کر لیتی۔ میں تو وہی تھا جو تھا۔ من آنم کہ من دانم۔ ایسی بات نہیں تھی مگر وہ اس بات پر تُلی بیٹھی تھی کہ میرا دل راضی کر کے رہے گی۔ خدا جانے میرے بارے میں کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ ہم ایک اجاڑ اور ویران گاؤں کے کھنڈر پر بیٹھے تھے۔ ہمیں آگے کی سوچنی چاہیے تھی۔ ہمارے اور ان مظلوموں کے درمیان شاید صدیاں حائل ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں مگر خیراں ان سب کا غم بھلا کر ذات میں فنا ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے ہمارے ہاتھ دھلائے، پھر وہ روٹیاں لے آئی۔ بیسن میں گندھی ہوئی تازہ روٹیاں جن کے ساتھ گھی بھی تھا۔ وہ اس نے الگ پیالیوں میں ڈال رکھا تھا۔ مکھن وہ پچھلے دو دن سے نہ بنا سکی تھی۔ بھینس تو اس کی بچھڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ عین ممکن ہے اس کا دودھ اس نے کٹے کو پلا دیا ہو کہ خود وہ اس کے نیچے بیٹھنے کے قابل نہیں تھی اور نہ تاج دین میں اتنی ہمت تھی۔ پورا گھر سنسان پڑا تھا۔

"کھائیں سرکار! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آگئے۔ اب مجھے امید ہے کہ وہ سب بھی واپس آجائیں گے۔ جب آپ ان کو تلاش کرنے نکلیں تو وہ واپس کیسے نہیں آئیں گے۔ ظالموں پر خدا کا قہر ٹوٹے۔ انھوں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔"

"مگر تمھیں تو وہ چھوڑ ہی گئے۔"

"میں۔۔۔ وہ دراصل سرکار! میں کوٹھری میں نہ ہوتی تو کبھی نہیں بچ سکتی تھی۔"

"اور وہ بھی تاج دین کے ساتھ۔"

"دفع کریں جی سرکار اسے۔ وہ کیا ہے، وہ تو بس مہمان ہے نا۔ ہمارے حصے کی مار وہ بھی کھا لیتا۔ اسے کس چیز کی کمی ہے۔ اور یہ بھی ہے نا عجیب بات! گویا دونوں اکٹھے ہی مرنے کو تھے کہ آپ آگئے۔"

خدایا! اس عورت کی زبان اتنی تیز کیوں چلتی ہے۔ لگتا تھا جیسے ہانی انفیمر اس کے سامنے جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے جسے دیکھتے ہی اس کے لب ہلنے لگتے تھے۔

"تمھارا حال کیا ہے اب؟"

"میری نبض دیکھیں، میں تو نو برنو ہو گئی ہوں۔" اس نے اپنی کلائی میرے بائیں ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ میرے دونوں ہاتھ گھی میں تر ہو رہے تھے۔ کلائی اس کی پھر سے ہری بھری ہو گئی تھی۔ نرم و گداز اور دھڑکتی ہوئی۔ اس کی نبض بالکل معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے کلائی ٹٹول کر چھوڑ دی۔

ابھی ہم نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ تاج دین واپس آگیا۔ وہ بھینس کے لیے چارہ لے آیا تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ باہر کی تازہ ہوا نے اس پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔

"اچھا خیراں! اب ہم چلتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو تلاش کرنا ہے۔ تم دونوں ادھر ہی رہو اور گاؤں کا خیال رکھو۔ ہم تمھیں اطلاع دیں گے۔"

"چاچا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں تمھاری خدمت کرتی رہوں گی۔ یہاں رہ کر میں کیا کر سکوں گی۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ تم ادھر ہی رہو۔ گاؤں کا خیال رکھو۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے اور تم اس گاؤں کی بیٹی ہو۔ پھر تاج دین بھی تمھارے ساتھ ہوگا۔ میں کچھ اور آدمیوں کو یہاں بھیج دوں گا۔ وہ ڈھور ڈنگروں کو چارہ پانی دیتے رہیں گے۔ آئیں سرکار! بس اب چلنے کی کریں۔"

خیراں جان بوجھ کر میرے قریب آگئی۔ وہ بے تحاشا آگے بڑھی اور میرے ہاتھ چومتے ہوئے بولی "سرکار! آپ واپس ضرور آئیں۔ اس گھر کو بھول نہ جائیں۔ میں۔۔۔ مجھے ہمیشہ آپ کا انتظار رہے گا۔ اللہ آپ کے درجے بلند کرے، یہ کرشمہ تو میں نے آج ہی دیکھا ہے۔"

"چھوڑ بی بی! تو کس چکر میں پڑ گئی ہے۔ میں بہرحال واپس ضرور آؤں گا مگر ان لوگوں کو ساتھ لے کر۔ تنہا نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسولینی کے ساتھ اسی وقت باہر آگیا۔

گل خان ہمارے عقب میں چل رہا تھا، بولا "یہ عورت تو آپ کا کلمہ پڑھنے لگی ہے۔"

"کام بھی انھوں نے ایسا ہی کیا ہے کہ کوئی یقین ہی نہیں کرے گا۔ آپ کو کسی پیر فقیر کی دعا ہے سردار صاحب! بالکل یہی بات ہے۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہو۔ یہ میرے ہاتھ کی کرامت نہیں ہے۔ ان کے دل میں جینے کی خواہش ہی اتنی تیز تھی کہ وہ بیماری کو الٹ دینا چاہتے تھے۔ اس میں کرشمے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ دونوں اب میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کا تحیر اب مجھے بھی حیران کرتا تھا مگر میں تو جو کچھ بھی تھا ان کے سامنے تھا۔ مجھ پر خدا کیسے اتنا مہربان ہو سکتا تھا۔ میں تو خود دکھوں کی پنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔ میں کسی کا درد کیسے بانٹ سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں کہیں سکھ چین کی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ میری تقدیر یوں پائینچے سے نہ نکلی پڑتی۔ میری پت، میری لاج، میری شرم وہ آسیہ میری سگی بہن اس درخت کی شاخوں پر کیوں جا بیٹھتی جو اسے پھر کسی بڑے ہی جان لیوا معرکے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

ہم کار میں جا بیٹھے مگر سوال یہ تھا کہ ہم جائیں کدھر؟ گل خان بھی فکرمند تھا اور مسولینی بھی۔ ہم ایک عجیب سی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ آسیہ کی آرزو نہ ہوتی، اسے لاڈلی گاؤں کے مزارعوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس راہ پر کبھی قدم نہ رکھتا، کبھی نہیں۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا۔

"کیا کریں سردار صاحب! پتہ نہیں وہ لوگ کس طرف نکلے ہیں؟"

"میں خود حیران ہوں مسولینی! تلاش تو اس شے کی ہوتی ہے جس کا ٹھکانا معلوم ہو مگر خیر تم گاڑی چلاؤ۔ ٹرک اسی طرف نکلے تھے۔ خیراں یہی بتا رہی تھی۔"

"وہ تو کوٹھری میں بندھی رہی، اس نے کہاں دیکھا ہوگا انھیں؟"

"کوئی بات نہیں، پیچھے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔"

ابھی گل خان نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ گلی میں مجھے خیراں بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ لگتا تھا وہ اڑ رہی ہے۔ دو چھلانگوں میں اس نے گلی عبور کی اور سیدھی ہمارے پاس آپہنچی۔ وہ سیدھی میرے سامنے آرکی، بولی "سرکار! ادھر آئیں میرے ساتھ۔ ان کا ایک آدمی سخت پھیپڑ ہو چکا ہے۔ میں نے دیکھا ہے، وہ ابھی زندہ ہے، اس کو پکڑ لیں سرکار! شاید اس کے پاس بندوق ہے مگر گولیاں کوئی نہیں ہیں۔ میں خود دیکھ کر آئی ہوں۔"

ہم تینوں فوراً ہی کار سے باہر نکل آئے۔

"ادھر آئیں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔ وہ بہت زخمی ہو رہا ہے۔"

"چلو اس کو تو ضرور دیکھنا چاہیے۔"

"سرکار! اس نے کرم علی کو مار دیا ہے، اس کی لاش وہاں پڑی ہے پچھلی کوٹھری میں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"

"اچھا! کوئی آدمی بھی مار دیا ہے اس نے؟"

مسولینی اس کی بات توجہ سے سن رہا تھا، کرم علی کے بارے میں سن کر بولا "اس کا بیڑا غرق۔ کرم علی کو کیسے مار دیا اس نے؟" اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ اب وہ ہم سب سے آگے تھا اور دوڑنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد خیراں ہمیں اپنی گلی کے عقب میں لے گئی۔

وہاں سے ایک مکان کے فاصلے پر دُوسری گلی شروع ہوتی تھی۔ پہلے ہی دروازے پر وہ رک گئی۔ "سرکار یہ وہ اسی مکان میں ہے۔ وہ کرم علی کے سب گھر والوں کو لے گئے۔ پتہ نہیں اس پر گولی کس نے چلائی ہے۔"

وہ سب بہت محتاط ہو کر دروازے میں داخل ہوئے مگر خیراں کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ صحن میں سے گزر کر کمرے میں جا گھسی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ گل خان اور مسولینی بھی مسلح تھے۔

"وہ اس کوٹھری میں ہے سرکار! میں تو اسے دیکھتے ہی خوفزدہ ہو کر باہر نکل آئی۔ کرم علی بھی اندر ہی ہے۔"

ہم اس کے کہنے کے مطابق بڑی احتیاط سے کوٹھری کی طرف بڑھے مگر مسولینی سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک دم اندر جا گھسا۔ سامنے دیوار کے پاس وہ آدمی بیٹھا تھا۔ اس حال میں کہ اس کی رانیں بھی زخمی تھیں اور بائیں پسلی بھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت ہی نڈھال ہو چکا تھا مگر اپنی بے تحاشا تندرستی کی وجہ سے وہ ابھی تک زندہ تھا۔ دو راتیں اور ایک دن اس نے کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیے تھے۔ اس کے اردگرد گندم کے دانے پھیلے ہوئے تھے۔ شاید وہ انھی پر گزارا کرتا آ رہا تھا۔ زخموں پر اُس نے چولھے کی راکھ مل رکھی تھی مگر خون ان میں پھر بھی رواں تھا۔ اُس کی بے پناہ قوتِ برداشت ہی اس کے کام آ گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اپنی بندوق سنبھال لی۔

"خبردار وہیں رُک جاؤ اوئے! ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔"

"تیرا تو ہم قیمہ کر دیں گے ذلیل آدمی! تُو ہے کون؟ اور یہ کرم علی کو کیا ہوا؟ کیسے مار دیا تم نے اسے؟" مسولینی بہت تپا ہُوا تھا۔ اس کی بندوق کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ ایک دم اس پر جا چڑھا اور اس کے لمبے لمبے بال پکڑ کر اسے زمین سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بول وہ کون لوگ تھے؟ اور کہاں چلے گئے؟" یہ کہہ کر اُس نے اس آدمی کو پھر زمین پر پٹخ دیا۔ اس طرح کہ اس کی بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ وہ ویسے بھی لاٹھی بن چکی تھی۔ گولیاں اس کے پاس باقی نہیں رہی تھیں۔ خیراں ٹھیک کہتی تھی، وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ گئی تھی۔

"بتا اوئے تو کون ہے؟ کیا کرنے آیا تھا یہاں؟"

اُس آدمی نے زخموں کی ٹیسوں سے پریشان ہو کر ہائے کہا اور زمین پر اوندھا ہو گیا۔

"ٹھہر جا مسولینی! اس کو دم لینے دے، دیکھ تو اس کا خون کتنا بہہ چکا ہے۔"

"میں کیا کروں؟ میرے پاس کون سی دوا ہے جو میں اس کا علاج کروں گا۔ اس کو ادھر ہی جان سے مار دینا چاہیے۔ بول اوئے! تو چوہڑا ہے کون؟" مگر وہ جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔

اتنے میں خیراں اس کے لیے گلاس میں پانی لے آئی۔

"اسے یہ پانی پلا دیں۔ میں گھر سے روٹی لاتی ہوں سرکار! اسے مرنے نہ دیں۔ اس کا جینا بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر وہ گلاس میرے ہاتھ میں دے کر اسی وقت باہر نکل گئی۔ میں نے پانی اس کی طرف بڑھایا تو گلاس پر ہاتھ پڑتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس ذرا سی محنت سے وہ ہانپنے لگا تھا۔ پانی پی کر وہ تشکر آمیز نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ اس کی مونچھیں خاصی بڑی تھیں اور لبوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پانی پیتے وقت وہ گلاس میں ڈوب گئیں۔

"میں نے اسے مار دیا۔ بالکل مار دیا میرے پاس وہی گولی رہ گئی تھی مگر اس نے مرتے مرتے بھی مجھے مار دیا۔ یہ سارے زخم مجھے اسی نے لگائے ہیں اِس چھرے سے جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مجھے باہر بھی نہیں نکلنے دیا۔ مجھے مارتا ہی چلا گیا۔ اللہ! میری توبہ۔ میرا کتنا خون بہہ گیا ہے اور یہ میرا گھٹنا" وہ اپنی پسلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"پر تو ہے کون! جلدی بتا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں دلدار شاہ ہوں اور ذات کا نیازی۔ تم نہیں جانتے ہو مجھے؟ پاگل ہی ہو گئے! ایک زمانہ مجھے جانتا ہے۔"

"پر تو یہاں آیا کیسے؟ وہ لوگ کیا ہوئے؟ انھیں کون اُٹھا لے گیا ہے؟" مسولینی سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کے بال پکڑنے کے لیے پھر آگے بڑھا تو میں نے اُسے روک دیا۔ اس کا پستول اس آدمی کر... میں لیے ہوئے تھا۔

"وہ سب چلے گئے۔ اب وہ پہاڑ کے پیچھے ہوں گے۔ وہاں... کھُد رہی ہے۔ انھیں ضرورت تھی۔ بہت سے آدمیوں کی ضرورت تھی۔"

"پہاڑ کے پیچھے! کس پہاڑ کے پیچھے؟ یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہاں سے بہت دُور۔ وہ دریائے سندھ میں سے نہر نکال رہے ہیں۔ انھیں مزدوروں کی ضرورت تھی۔"

"کس جگہ؟ ہمیں وہاں پہنچنا ہے، بتا وہ کون سی جگہ ہے؟"

"وہ کیرل میں ہوں گے، ان کا کیمپ ہیں ہے۔ وہ مجھے بھی... انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پر تم وہاں کیا کرو گے؟ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ اُن کے پاس کوئی ہزار آدمی ہوگا۔ ان کا پہرہ بہت سخت ہے۔ اُن سے تم اپنے آدمی نہیں چھڑا سکو گے۔ کبھی نہیں۔" وہ ہانپنے لگا۔ اتنے میں خیراں روٹی لے کر واپس آ گئی۔

"یہ کیا کہتا ہے سرکار!"

"کچھ بتا رہا ہے۔ کہتا ہے وہ لوگ کیرل چلے گئے ہیں۔ دو اسے۔"

مگر جیسے ہی خیراں نے اس کے سامنے روٹی رکھی تو مجھے... ہوا کہ اس آدمی کا گھٹنا ٹوٹ چکا تھا اُس کی ٹانگ ہو... وہ وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔ چھرے کے زخم تو اتنے گہرے نہیں تھے جتنے وہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کرم علی نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے دلدار کا گھٹنا بھی توڑ دیا تھا۔ روٹیوں کی چنگیر اس نے کھینچ کر اپنے سامنے رکھی۔ خیراں اچار لے آئی تھی۔ دلدار نے سات وقت کے بھوکے کی طرح اُسے نگلنا شروع کیا۔ وہ لقمے کو چبانا بھی بیکار سمجھ رہا تھا۔ گھٹنا اس نے چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس کا درد شاید بہت ہی ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے منہ سے سسکاری سی نکل جاتی تھی۔ روٹی کھا کر اُسے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر ڈھیر سارا پانی پی کر بولا۔ "بیٹھو ادھر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کیرل کدھر ہے۔ تمھارے پستول میں گولیاں تو ہوں گی۔ اتنی مہربانی کرو مجھے جان سے مار دو۔ یہ تمھاری مہربانی ہو گی۔"

"زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بتاؤ وہ جگہ کہاں ہے؟ گولی تو ہم تجھے ضرور ہی مار دیں گے، تیرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" گل خان نے پہلی بار اپنا شیر ایسا پنجہ اس کی گردن پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اسے میں نے اب تک اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ساری صورتِ حال سمجھ لینے کے بعد وہ اس قدر غضبناک ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے کوئی صحیح سالم آدمی ہوتا تو وہ اس کو ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ دلدار کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں۔

"مجھے مار دو۔ مار ڈالو مجھے۔ میں نے تمھارا بندہ مار دیا ہے۔ چلاؤ گولی۔ میں تو خود چاہتا ہوں۔"

اس کا سارا بدن گل خان نے کھینچ کر اوپر اٹھا لیا تھا۔ گردن پر اس کی گرفت ذرا اور سخت ہوتی تو شاید دلدار وہیں مر جاتا۔ گل خان نے اُسے زمین سے اوپر اٹھا کر پھر نیچے گرا دیا۔ اس کا گھٹنا جو ٹانگ سے جھول رہا تھا دُوسری ٹانگ کے نیچے آ گیا۔ درد کی ٹیس نے اُسے پاگل کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے زخمی گھٹنا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ وہ ایسی تکلیف تھی جو اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی گل خان سے جان چھڑانے کے لیے بولا۔ "کیرل پہاڑپور کے پاس ایک جگہ ہے تمھارے سب آدمی وہاں ہوں گے۔ نذر شاہ کا یہی حکم تھا۔ وہی اس نہر کا ٹھیکیدار ہے۔"

"اس کو چھوڑ دو گل خان! آؤ میرے ساتھ بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ لوگ کہاں ہوں گے۔"

گل خان نے پیچھے ہٹ کر اس کا پستول سے نشانہ لینا چاہا مگر میں نے اس کا بازو نیچے گرا دیا۔ "نہیں! اس کو یونہی مرنے دو۔ اور خیراں! تم کرم علی کی لاش تاج دین سے کہہ کر اٹھوا لو۔ یہ اگر مر جائے تو اس کو بھی دبا دینا۔"

"سرکار! مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ میرے ماں باپ بھی تو وہیں ہیں!"

"تم ادھر ہی رہو۔ آؤ گل خان! اور دفع کرو اسے۔" مگر مسولینی کو میں نہ روک سکا۔ اس نے پلٹ کر پستول کی گولی دلدار شاہ کے سینے میں اتار دی۔ یوں لگا جیسے اس کا کوئی ارمان پورا ہو گیا ہو۔ وہ وہیں سینے پر ہاتھ رکھ کر زمین بوس ہو گیا۔ مگر اُن دونوں کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ مسولینی تو بہت تپا ہوا تھا۔ خیراں بھی ہمارے پیچھے لپکتی چلی آئی۔ مگر جب اس نے میرے تیور دیکھے تو سر جھکا کر دُوسری طرف نکل گئی۔ تاج دین اس کے لیے بہت کافی تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ہے مسولینی!"

"کیا اچھا نہیں کیا ہے، اس پر تو کتے چھوڑ دینے چاہییں تھے۔ پُورا گاؤں تباہ کر دیا ہے انھوں نے۔" مسولینی نے زہرخند کیا۔

جلدی ہی ہم لاڈلی سے نکل کر کچی پکی سڑکیں عبور کر کے چشمہ بیراج جا رُکے۔ وہاں سے ہم جب عمر خیل پہنچے تو اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔ ہم سارا راستہ بالکل خاموش رہے۔ گل خان اور مسولینی اپنی سوچوں میں ڈوبے رہے۔ مجھے بھی وہ سفر بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔ اتنی ساری جانوں کے تحفظ کے لیے ہم پہاڑپور جا رہے تھے مگر سامان ہمارے پاس کوئی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اور کچھ نہیں تو میری اس کرامت ہی کا ذکر کریں گے مگر نہیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب ہیں۔ رات کا کھانا ہم نے عمر خیل میں ہی کھایا اور پھر وہاں سے ہم کہیں رُکے بغیر پہاڑپور کی طرف چل دیے۔ کار آرام دہ تھی مگر راستے بہت ہی ناہموار اور پریشان کُن تھے۔ کبھی کبھی تو ہم کچے راستوں پر جا چڑھتے تھے۔ مگر کیرل کی خبر ہمیں مجبور کرتی تھی کہ ہم پہاڑپور جانے کے بجائے کسی قریبی راستے سے گزر کر کیرل جا پہنچیں۔ مسولینی کے حوصلے کی میں داد دیتا ہوں۔ اس کے چہرے پر کوئی تھکن نہیں تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اُن لوگوں نے اتنی دُور سے بیگار کے لیے لاڈلی پر حملہ کیا تھا۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ علی جو نے انھیں اس گاؤں کا پتہ دیا ہو۔ سوچتا ہو گا کہ رقم واپس نہ ہونے کی وجہ سے گروی گاؤں جلدی ہی معاہدے کے مطابق اس کی ملکیت بن جائے گا۔ ایسے میں اگر پرانے مزارع وہاں بیٹھے رہے تو اس کی دال وہ مشکل ہی سے گلنے دیں گے۔ اس جگہ وہ کوئی آدمی بسانا چاہتا ہو گا۔ ورنہ کسی نہر کے ٹھیکیدار کو اتنی دُور سے آدمی لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارا پورا دن اس سفر میں گزر گیا تھا۔ مگر ابھی تک ہمیں اس جگہ کا علم نہ ہو سکا تھا جس کی تلاش میں ہم سرگرداں تھے۔ کار کچے پکے اور ناہموار راستوں پر جا چڑھی تھی۔

بالآخر مسولینی نے کار ایک گاؤں کے سامنے روک دی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہم ایک طویل سفر طے کر آئے تھے۔

"میں یہاں کسی سے پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیرل ہے کہاں؟"

کہیں اس دلدار شاہ نے ہمیں چکر ہی نہ دیا ہو۔"

"ہاں ضرور، پوچھو۔ پہاڑ پور تو یہاں سے ابھی کوئی چالیس میل دُور ہوگا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔" گل خان نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

وہ اس سفر سے واقعی تھک گیا تھا۔ اتنی دیر تک ایک ہی جگہ بے حس و حرکت بیٹھے رہنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آپی میرے ساتھ ہوتا تو میرا بھی دل لگا رہتا۔ اسے کچھ نہ کچھ سوجھتی ہی رہتی تھی۔ اس کے بغیر تو مجھے ہر شئے اداس نظر آتی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں لاڈلی میں خیراں کو بتا آتا کہ کوئی شخص وہاں آئے یا بھن جی اُدھر آنکلیں تو وہ اُن کو ہمارا پتہ بتلا دے مگر اس بات کا مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا اور اب ہم ایک لق و دق میدان میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ بستیاں بہت دُور دُور تھیں۔ زیادہ تر لوگ اونٹوں اور خچروں پر سفر کرتے تھے۔ راستے ویران پڑے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہمیں کوئی کوئی آدمی ہی دوران سفر میں نظر آیا ورنہ بالعموم سڑکیں، پگڈنڈیاں پہلے سنسان ہی دکھائی دیے۔

سگریٹ بھی کوئی مزہ نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم آخری سفر پر روانہ ہو چکے ہیں اور ایسا کوئی نہیں ہے جو ہمارا ساتھ دے سکے۔ ہم تین مُردے ہیں اس کار میں پھنس کر کسی غیر مرئی طاقت کی زد میں آ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

مسولینی کچھ ہی دیر بعد گاؤں سے بکتا جھکتا واپس آگیا، بولا۔

"وہ چوکیدار کہہ رہا تھا کہ کیرل یہاں سے کوئی چالیس میل دور ایک پہاڑی کا نام ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ گاڑی اُدھر لے چلتے ہیں۔"

"یہ کوئی جیپ تو نہیں ہے کار ہے جس کا پہلے ہی ستیاناس ہو چکا ہے۔"

"ارے تو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اگر راستے ہی میں ختم ہو گئی تو پیدل چل لیں گے آدمی کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے کیوں گل خان؟"

"ہمارا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ اندھے کتے ہرنوں کا شکار — پتہ نہیں بھن جی نے ہمیں کیوں اس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ بھئی مسولینی! تیرے تو بیوی بچے ہیں اب اُن پر قل ھو اللہ پڑھو اور گھر چلو۔ اللہ کا مال تھا اسی طرف چلا گیا۔"

"گل خان! تمھیں شرم آنی چاہیے۔ کوئی تمھاری ماں بہن کو اُٹھا لیتا تو پھر۔۔۔ پھر کیا کرتے تم؟"

"یہ دیکھ کہ وہ اکیلے نہیں ہوں گے، پورا گاؤں اُن کے ساتھ ہے وہ جہاں ہوں گے خوش ہوں گے۔ ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ رات ہم اس گاؤں کی مسجد میں گزار لیتے ہیں۔"

"نہیں گل خان! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ چلو مسولینی، اب گاڑی کیرل کی طرف لے چلو۔ راستہ تو تمھیں معلوم ہو گا۔"

"ہاں خان جی! چوکیدار نے بتا دیا ہے مگر وہ کچھ عجیب سی بات کہہ رہا تھا کہ کیرل میں حکومت کوئی خاص کام کر رہی ہے اور کسی کو اس علاقے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ڈھکوسلا ہے یہ۔ جو اُن لوگوں نے خواہ مخواہ مشہور کر رکھا ہے تاکہ عام آدمی وہاں نہ جا سکیں۔ تم گاڑی اسٹارٹ کرو۔ وہ کوئی بڑے ہی خنزیر قسم کے لوگ ہیں اُن سے تو ہمیں ضرور نمٹنا چاہیے۔"

مسولینی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی، بولا "چوکیدار کہتا ہے کہ سپاہی وہاں ہر جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ کم سے کم بیس بیس میل کا علاقہ اُن کے قبضے میں ہے جگہ جگہ انھوں نے چوکیاں قائم کر رکھی ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو، میں سب دیکھ لوں گا۔ بھن جی نے ہمیں بلاوجہ اِدھر نہیں بھیجا ہے، وہ لوگ کسی زبردست مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ یہاں کوئی پختہ سڑک بھی ہوگی اس کا پتہ کرو۔ اس گاؤں کا کیا نام ہے؟"

"یہ تارا گڑھ ہے چوکیدار نے یہی بتایا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد مسولینی نے کار اس گاؤں کے قریب کر لی تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک کچی سڑک مغرب کی طرف جاتی ہے۔ ہم اس پر جا چڑھے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ رات زیادہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

گل خان نے تمام شیشے بند کر دیے، بولا "تو بھی کوئی سگٹ شگٹ پی لے مسولینی! پتہ نہیں کس نے یہ تیرا نام رکھ دیا تھا۔ سنتے ہیں کہ اصل مسولینی کو تو پھانسی ہو گئی تھی۔ کیوں خان جی! میری تاریخی معلومات صحیح ہیں نا؟"

"ہاں ہاں۔ وہ بیچارہ اسی طرح مرا تھا شکست کھا گیا تھا جنگ میں مگر تھا وہ بہت دل گردے کا آدمی۔"

"سُنا ہے اس کا ایک ایک گردہ دو دو کلو کا تھا۔" گل خان مذاق کے موڈ میں تھا۔

"یہ تجھے کس نے بتایا ہے بھئی؟ کیوں مذاق کرتے ہو؟"

"نہیں جی! اس کا بعد میں چیر پھاڑ کیا گیا تھا پتہ نہیں یہ اپنا مسولینی کیسے بچ گیا۔ مگر یہ ہے بھی تو نقلی۔"

"چپ رہ یار! مجھے غصہ نہ دلا۔ میں خود پاگل ہو رہا ہوں تجھے مسخری سوجھ رہی ہے۔"

"ہاں بھئی! یہ بڑی بات ہے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں" میں نے مسولینی کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔

"تو فکر نہ کر یار! یہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ ہوگا۔ سب کو ہم فیصل کر کے رکھ دیں گے، اتنا کہ وہ پھر سر اٹھا نہ سکیں گے۔" میں نے اسٹین گن کھول کر اس کے چیمبر کی گولیاں گنیں۔

"اُن سے تو میں ایسا بدلہ لوں گا کہ اُن کا بیج ہی ختم ہو جائے گا۔ اُن کتوں سے۔" مسولینی کی گرفت اسٹیئرنگ پر اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

چوکیدار نے ٹھیک ہی کہا تھا، بالآخر ہم ایک ایسے مقام پر جا پہنچے جہاں ہمارے سامنے بلندی پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن بنا ہوا تھا اور اس کے سامنے دو آدمی باہر کھڑے تھے۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں ان کا ملیشیے رنگ کا لباس ہمیں یہی بتاتا تھا کہ وہ کسی گارڈ کے آدمی ہیں۔ چار کتے اُن کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ دُور سے موٹر کی آواز سن کر وہ ایک دم چونک اُٹھے تھے۔ جیسے ہی ہم اُن کے قریب پہنچے، کتوں نے ایک دم جست لگائی اور کار کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ بہت خونخوار قسم کے کتے تھے۔ بلڈاگ قسم کے۔ اُن کے پیچھے وہ دو آدمی بھی آگے بڑھ آئے۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے جن کو ایک آدمی نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور پھر کار کے قریب آ کر بولا "کیا بات ہے کہاں جا رہے ہو تم؟" اس کی بندوق کا رُخ مسولینی کی طرف تھا۔

"ہم کیرل جا رہے ہیں اور ہمیں ندر شاہ سے ملنا ہے۔"

"ندر شاہ سے؟ کیا کام ہے تمھیں اُن سے؟" وہ کچھ مرعوب سے لہجے میں بولا۔

"ہم لاہور سے آئے ہیں ڈار سنز کے مالکوں کا پیغام لے کر۔" میں نے لاہور کی ایک پرانی فرم کا نام لیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہروں، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے پرانے ٹھیکیدار ہیں اور اُن کے مالک کا نام عباس ڈار تھا۔

"ڈار سنز! دیکھیں یہ جگہ آؤٹ آف باؤنڈ ہے۔ کوئی بھی اس کے اندر نہیں جا سکتا۔ یہ حکومت کا آرڈر ہے۔ میں آپ کو آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"بھائی! تم ہماری بات سمجھو۔ ہمیں یہاں ندر شاہ سے ملنا ہے۔ دلدار شاہ کو جانتے ہو نا تم؟"

"دیکھیں بھائی جی! آپ کار واپس لے جائیں۔ ندر شاہ اس وقت آپ سے نہیں مل سکتے۔ یہاں اندر فوج رہتی ہے کسی کو اِدھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو بھائی! فوج یہاں کیا کر رہی ہے؟ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور عباس ڈار نے ہمیں اسی لیے بھیجا ہے۔"

"میں تمھاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں پہلے کرنل صاحب سے بات کر لوں، آؤ۔" یہ کہہ کر وہ کیبن کی طرف پلٹ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ کیبن میں ایک چھوٹی سی میز پر وائرلیس کا سامان پڑا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا مگر پھر میز پر رکھ دیا۔ بولا "میں اس وقت انھیں کیسے جگا دوں، بہتر ہے آپ صبح نو بجے آجائیں۔"

"کیا کہتے ہو بھائی جی! یہ پیغام بہت اہم ہے۔ صبح تک نہیں ٹالا جا سکتا ہے، کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اچھا ٹھہرو۔ میں میجر قدیم خان سے بات کرتا ہوں۔ وہ اس وقت ڈیوٹی پر موجود ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو! میں سرفراز بول رہا ہوں آؤٹ پوسٹ سے۔"

"ہاں پھر۔ کیا ہوا ہے تمھیں؟" دوسری طرف سے کسی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ وہ آواز اتنی بلند تھی کہ مجھے بھی سنائی دے گئی۔

"وہ جی کوئی آدمی آئے ہیں لاہور سے۔ وہ کرنل ندر شاہ سے ملنا چاہتے ہیں، ابھی اور اسی وقت کہتے ہیں انھیں لاہور سے عباس ڈار نے بھیجا ہے۔"

دوسری بار کوشش کے باوجود میں جواب نہیں سن سکا مگر پھر وہ اسی لہجے میں بولا "میں کسی عباس ڈار کو نہیں جانتا۔ اُن تینوں کو اُدھر ہی روکو میں خود آ کر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر دوسری طرف سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس آدمی نے لالٹین کی روشنی میں مجھے پھر بڑے غور سے دیکھا، بولا "تم تین آدمی ہو؟"

"ہاں، کیا کہا ہے انھوں نے؟"

"اپنے ساتھیوں کو بھی اِدھر بلا لو۔ میجر قدیم خان خود آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر بندوق اٹھا لی۔ انداز اس کا ایسا تھا کہ وہ آسانی سے میرا نشانہ لے سکتا تھا۔ وہ میز کی دوسری طرف کھڑا تھا۔

"اُن کو اندر بلا لو۔ آواز دو انھیں۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک دم بیچ کی میز اس کی طرف اتنی تیزی سے الٹ دی کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کیبن کی دیوار کی طرف اُلٹ گیا۔ اتنی سی مہلت میرے لیے بہت کافی تھی۔ میں تیزی سے اس کے پاس پہنچا تو اس وقت وہ بندوق اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ایسا خوفناک جھانپڑ دیا بائیں ہاتھ کا کہ اس کا جبڑا دوسری طرف نکل گیا۔ ایک عرصے کے بعد میں نے وہ ہاتھ آزمایا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔ نچلا جبڑا ایک دم دائیں طرف نکل گیا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی گردن مسل دی اور پھر وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جیسے دمِ مرگ کسی کو کسی کی آمد کا انتظار رہ گیا ہو۔ اس کو وہاں گرا کر میں کیبن سے باہر نکلا تو دوسرا آدمی ابھی تک گل خان اور مسولینی کو بندوق کی زد میں لیے کھڑا تھا اور چاروں کتے اس کے گرد یوں چوکنے کھڑے تھے کہ اس کے ذرا سے اشارے پر مدِمقابل پر پل پڑتے۔ اس آدمی کی ایک نظر کیبن پر بھی مگر اندر کا منظر وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کو قابو کرنا میرے لیے بہت ضروری تھا کہ اتنے میں مجھے دوسرے

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ قدیم خان تھا۔

"ہے! تمھارا ساتھی تمھیں اندر بلا رہا ہے۔ کہتا ہے ان دونوں کو بھی ساتھ لے کر کیبن میں آجاؤ۔" میں نے کیبن سے دو قدم باہر نکل کر کہا۔ "اُس نے قدیم خان سے بات کر لی ہے۔"

میری آواز سن کر وہ تیزی سے بولا۔ "چلو تم دونوں باہر آجاؤ اور کیبن میں چلو۔" اس نے گل خان اور مسولینی کو مخاطب کیا مگر وہ دونوں باہر نہیں نکلے۔

"سنتے نہیں ہو تم! باہر آجاؤ۔" وہ پھر بھونکا۔ اس اثنا میں میں اس کے پاس جا پہنچا۔ کار ہم سے کوئی آٹھ قدم دور تھی اور میں اس وقت اس آدمی کے پہلو بہ پہلو جا ٹھہرا تھا۔ اس کی بندوق کا رخ سیدھا کار کی طرف تھا۔ وہ لمحہ میرے لیے بہت غنیمت تھا۔ وہ میری طرف سے بالکل ہی بے نیاز ہو گیا تھا کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن کی رگ مسل دی۔ وہ بے خبری ہی میں مارا گیا اور یوں زمین پر جھول گیا جیسے وہ نیند سے سرشار ہو رہا ہو۔ اس کو فوراً ہی میں کھینچ کر کیبن کی طرف لپکا اور اسے کیبن کے عقب میں ڈال دیا۔

اُن دونوں کی بندوقیں اٹھا کر میں نے اندر رکھ دیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اب زیادہ قریب آگئی تھیں۔ کوئی سامنے سے ٹیلے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پتہ نہیں وہ کتنا فاصلہ طے کر کے آیا تھا۔ بائیں جانب ایک گھنا جنگل دکھائی دیتا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ ٹیلے اور پہاڑی کے عقب میں کیا ہے۔ اس اثناء میں گل خان اور مسولینی بھی کار سے باہر نکل آئے۔ اسٹین گنیں انھوں نے ہاتھوں میں سنبھال رکھی تھیں جیسے وہ شکار پر جھپٹنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ کتوں کے سامنے گل خان نے باہر نکلتے ہی گولی چلا دی۔ یوں کہ وہ بے آواز گولی تھی۔ اس کے پستول پر سائلنسر لگا تھا۔ چاروں کتے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پتہ نہیں وہ پستول اس نے کہاں سے لیا تھا۔ ابھی وہ کتوں سے فارغ ہو کر آگے نکلے ہی تھے کہ ٹیلے کے عقب سے تین آدمی الگ الگ گھوڑوں پر سوار دوڑتے نظر آئے۔ تینوں کے گھوڑے سفید تھے۔ چاندنی میں وہ مجھے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیے۔ تینوں ملیشیا کے کپڑوں میں ملبوس تھے جن پر سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے سوئیٹر پہن لیے تھے۔ سب سے اگلا آدمی قدیم خان تھا۔ انھوں نے بڑے کرّوفر سے پستول گلے سے لٹکا رکھے تھے جیسے وہ جگہ اُن کی جاگیر ہو اور جس کے اندر وہ جس کو چاہیں جانے سے روک سکتے ہوں۔ اُن کو سامنے سے جھپٹتا دیکھ کر گل خان اور مسولینی فوراً ہی کار کی اوٹ میں دبک گئے۔ اس طرح کہ اُن کے ہتھیار اب سامنے نظر نہیں آتے تھے۔ اگرچہ دونوں قد کاٹھ کے اعتبار سے ایک جیسے تھے اور انھیں کار کی اوٹ میں دور سے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

میں کیبن کے دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔ وہ آئے اور سیدھے کار کی طرف بڑھے مگر میں نے انھیں رکنے کے لیے کہا۔

"کیا تم قدیم خان ہو؟" میرا لب و لہجہ شاید بہت ہی نامانوس تھا۔ وہ تینوں فوراً رک گئے۔ اس طرح کہ اب میں کیبن کی طرف سے اور گل خان کار کی طرف سے انھیں نرغے میں لے سکتے تھے۔

"کون ہو تم؟ کیا لینے آئے ہو یہاں؟"

"میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تم قدیم خان ہو؟"

"ہاں، ہو۔ تم نے سرفراز سے سن لیا ہوگا۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ کیبن میں بندھا پڑا ہے قدیم خان! یہ تم میجر کب بن گئے؟"

"میں پوچھتا ہوں تم ہو کون؟ جانتے ہو یہ فوجی علاقہ ہے؟"

"یہ جھوٹ ہے، نہ تم میجر ہو نہ یہ علاقہ فوجی ہے۔ مجھے بتاؤ، یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس اثنا میں مسولینی اور گل خان اسٹین گنیں سیدھی کر کے اپنی طرف متوجہ کر چکے تھے۔ "بہتر ہے کہ تم تینوں اپنے ہتھیار پھینک دو اور گھوڑوں سے اتر آؤ۔" مسولینی نے انھیں خبردار کرتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں کے توقف سے اس کی آواز پھر سناٹے کو کاٹنے لگی۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اس نے پھر انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اب اس کی اسٹین گن اور زیادہ خوفناک ہو گئی تھی۔

"قدیم خان میں تمھیں آخری موقع دیتا ہوں، اپنے ہتھیار پھینک دو۔" میں نے اب کی بار مسولینی کی آواز سے کہیں زیادہ [illegible] ہوئے لہجے میں کہا۔ چاند اس گھڑی بہت نیچے جھک آیا تھا۔ مشکل کا کوئی حل اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور موت انھیں سامنے نظر آ گئی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ گولیوں سے ہم اُن کے گھوڑے بھی ہلاک کر سکتے تھے۔

"تم چاہتے کیا ہو آخر؟ تمھارا مقصد کیا ہے؟" بالآخر قدیم خان نے ہمت کر کے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ گھوڑے اُن کے ایک دوسرے کے بالکل قریب کھڑے تھے۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا کتے! قدیم خان سن رہے ہو کہ نہیں؟" مسولینی نے کار سے دو قدم آگے نکل کر کہا۔ اس کی للکار کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اُن تینوں نے اپنے پستول گولیوں سمیت اتار کر سامنے پھینک دیے۔

"گھوڑوں سے نیچے اتر آؤ۔ اور وقت ضائع مت کرو۔" گل خان نے انھیں پھر یاد دلایا۔ گولی چلا کر ہم وہاں مزید افراتفری نہیں مچانا چاہتے تھے، کہیں لوگ متوجہ ہو جاتے۔ گل خان کا تحکمانہ لہجہ اثر کر گیا اور وہ گھوڑوں سے اتر آئے۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ گل خان اور مسولینی تیزی سے اُن کے پاس جا پہنچے۔ "ہاتھ اوپر اٹھا لو اور کیبن کی طرف چلو۔ جلدی کرو۔" گل خان نے اُن کے گھوڑوں کی لگامیں یکجا کرتے ہوئے کہا۔ مسولینی نے اِن تینوں کو اسٹین گن کی زد میں لے لیا تھا۔ وہ بری طرح بے بس ہو گئے تھے اور اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ قدیم خان کوئی پرانی طرز کا وحشی نظر آتا تھا۔ اس نے ڈاڑھی بھی بڑھا رکھی تھی اور مونچھیں بھی۔ ایک غضبناک تیوری ہر وقت اس کے ماتھے پر چڑھی رہتی تھی۔ بال بھی اس کے خاصے لمبے تھے۔ اس نے گل خان کی بات پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے ہاتھ اٹھائے۔ دوسرے دونوں آدمیوں نے بھی ہاتھ اونچے کر لیے۔ انھیں دھکیل کر مسولینی کیبن کی طرف لے آیا۔

"ان کی مشکیں کس دو گل خان! اور انھیں اندر ڈال دو۔" میں نے اُن کے لیے دروازہ خالی کرتے ہوئے کہا۔ مسولینی انھیں پھر اسٹین گن کے دستے سے ہانکتا ہوا کیبن میں داخل ہو گیا۔

گل خان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رسّی کہاں سے لے۔ اس نے کیبن میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو ایک کونے میں بجلی کے تاروں کا گچھا نظر آیا، بولا۔ "یہ ٹھیک رہیں گی؟"

"ہاں، کیا ہرج ہے، جو بھی ملے بہتر ہے۔"

میرا اشارہ پاتے ہی اس نے جیب سے چھرا نکال کر تار کے ٹکڑے کر دیے۔ اس اثنا میں مسولینی ان تینوں کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا چکا تھا اور وہ لوگ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ چکے تھے۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور اس کو ابھی اس حال میں بہت دیر تک رہنا تھا۔

تار کے کٹتے ہی گل خان نے سب سے پہلے قدیم خان کو جھنجوڑتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ پھر وہ اس کے پاؤں جکڑنے لگا تو اس نے آخری داؤ کے طور پر اپنی جان چھڑانے کے لیے الٹی ہوئی میز پر سے کود جانے کی سوچی مگر گل خان اس کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے قدیم خان کے پیٹ میں گھونسا دے مارا۔ وہ اسے برداشت ہی نہ کر سکا۔ وہ آرام پسند اور تن آسان آدمی کچھ بھی نہ کر سکا۔ اسے صرف اپنا حکم منوانا آتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے اپنے پیچھے کیسی کیسی داستانیں بکھیر رکھی تھیں۔ کس کس مظلوم کو اس نے اس کی عزت و آبرو اور انا سے محروم کیا ہوگا۔ گل خان کی ایک بھی ضرب برداشت نہ کر سکا اور پیر بندھوا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی ہمارے لیے زیادہ پریشانی کا سبب نہیں بنے۔ انھیں گل خان نے اطمینان سے باندھ کر الگ ڈال دیا۔ وہ بے چارے منہ سے کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ حالانکہ وہ ہوش میں تھے اور ہماری باتیں سن رہے تھے۔ اُن سب کو بے بس کر کے ہم تینوں کیبن کے اندر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں اُن تینوں کے چہرے ہمارے سامنے تھے۔ انھیں یقین ہی نہیں تھا کہ کوئی اُن کو یوں ایسے [illegible] میں ڈال سکے گا۔ وہ گرجتی برستی گھٹا کی طرح اس فضا پر [illegible] ہوئے تھے۔ قدیم خان کے بازو پر بھی تمغے لگے ہوئے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ وہ بالکل جعلی ہیں۔ دونوں سپاہی بھی جیبوں کے عین اوپر بارڈر سیکورٹی فورس کے سپاہیوں ایسے نشان لٹکائے ہوئے تھے۔ وہ بھی نقلی تھے۔ کون پوچھتا ہوگا اُن سے وہاں آ کر کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور میرا خیال ہے کہ عہدے بھی اُن کے ویسے ہی تھے۔ کوئی میجر کہلاتا تھا تو کوئی کرنل۔ ہو سکتا ہے کوئی اُن میں جرنیل بھی بن چکا ہو۔

"تو تم میجر قدیم خان ہو۔ یہ کیسی [illegible] فوج بنالی ہے تم نے یہاں؟ یہ قصہ کیا ہے خان صاحب؟ میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے قدیم خان کے گھٹنے پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ اپنی ٹانگیں اس نے بہت ہی بیہودہ طریقے سے پھیلا رکھی تھیں۔ گھٹنے پر پاؤں پڑتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں اس کی خمار آلود نظر آتی تھیں جیسے وہ پوری بوتل چڑھا آیا ہو۔

"ہم چترال ملیشیا کے آدمی ہیں اور یہاں نہر کی کھدائی کا کام دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے سوچ سمجھ کر بات کرو۔ یہاں کرنل نذر شاہ کا حکم چلتا ہے، سمجھے! ہٹا دو یہ پیر۔ وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔ کسی بھی وقت وہ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

اُس کی یہ بات سن کر میں اپنی ہنسی نہ دبا سکا۔ اس کا انداز بڑا ہی مؤثر تھا مگر وہ صورتِ حال سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

"چترال ملیشیا! گڈ! اچھی گھڑی ہے تم نے۔ اور یہ 'لاڈلی' گاؤں کے لوگ تم نے کہاں کھپائے ہیں؟ ان کی عورتیں، اُن کے بچے! کہاں ہیں وہ سب؟"

"اُن سے ہمیں کیا واسطہ؟ میں کسی لاڈلی گاؤں کو نہیں جانتا۔ کن لوگوں کی بات کرتے ہو تم؟"

"اسے بتاؤ مسولینی بلکہ اسے بتاؤ کہ اُن میں تمھارے بیوی بچے بھی شامل تھے۔ اُن لوگوں میں جو رات کو ٹرکوں میں لاد کر یہاں لائے گئے اور اُن میں اور بھی بہت سے شامل تھے۔ کوئی ڈھائی سو نفر بنتے ہیں وہ۔ انھیں کہاں رکھا ہے تم نے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس یہاں نہر کی کھدائی کے لیے پانچ سو مزدور ہیں، وہ مختلف حصوں میں کام کرتے ہیں اور ہم انھیں باقاعدہ مزدوری دیتے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو قدیم خان! مگر ہمارے سامنے یہ سب نہیں چلے گا۔ ابھی تم یہاں بندھ کر بیٹھے ہو بھیڑ کے بچے کی طرح۔ ہم اس سے آگے بھی جا سکتے ہیں۔"

"میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ وہ تمھیں خود دیکھ لیں گے۔"

عین اُس وقت وائرلیس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس مصیبت کو ہمیں وہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔

"ہیلو!" میں نے جی کڑا کر کے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو، کون ؟" کسی کی تحکم آمیز آواز اُبھری۔
"سرفراز۔"
"یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے ؟"
"کچھ گلا خراب ہے میرا، بات کیا ہے ؟"
"نائن ٹو ون ڈی کے۔" اس سالے نے اپنا کوڈ ورڈ دیتے ہوئے کہا۔
"اوئے بات کر دیار! نائن ٹو ون ڈی کے۔ یہ ٹائم ہے کوئی ایسی باتوں کا، مجھے نیند آ رہی ہے۔"
"ہوں! تو تم سرفراز ہو۔ کوئی خاص بات ؟ میجر قدیم ادھر ہی گئے ہیں ؟"
"ہاں۔ وہ ہمارے پاس آئے تھے، اب آگے نکل گئے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وائرلیس بند کر دیا۔ میرا یہ وہم تھا کہ میں نے اس کی تسلی کر دی ہے۔ بات کر کے میں نے خود کو اس کے سامنے بے نقاب کر دیا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی حفاظت کا مکمل انتظام کر رکھا تھا اور دن رات وہ وائرلیس کے ذریعے ایک دوسرے کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ ہم ایسے سانپوں کے نرغے میں آ گئے تھے جو شکار پر چپکے سے حملہ کرتے ہیں۔ ہم کوئی اسم اعظم پڑھ کر ان سے نمٹ سکتے تھے۔ کیونکہ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ لوگ اس جگہ کر کیا رہے ہیں۔ قدیم خان نے تو لاڈی سے بالکل ہی لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔
"یہ کون تھا قدیم خان! وائرلیس پر ؟"
"مجھے کیا پتہ۔ میں تو پیغام نہیں سُن رہا تھا۔"
"تو بات کس طرح کرتا ہے پیارے۔ جانتا ہے تو کس کے قبضے میں ہے ؟" میں اس کو پکڑنے کے لیے نیچے جھکا مگر گل خان نے مجھے روک دیا۔
"یہاں سے نکل چلو سردار صاحب، یہ اچھی جگہ نہیں ہے۔ وہ جنگل بہتر رہے گا۔"
"نہیں۔ وہ اسی جنگل میں رہ رہے ہیں۔ وہاں ہر قدم پر خطرہ ہوگا۔ مجھے تو یہ بھیڑیے نظر آتے ہیں، بے گناہ لوگوں کا خون چوسنے والے۔ آؤ ہم کار میں بیٹھ کر آگے نکلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے وائرلیس کے تار کاٹ دیے اور پھر گل خان اور مسولینی کو لے کر تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ اس حال میں کہ ان دونوں نے قدیم خان کو ڈولی ڈنڈا بنا کر اُوپر اٹھا لیا تھا۔ ہمیں فوراً وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ کیبن کا وائرلیس ہمارے لیے بڑی بربادیاں لا سکتا تھا۔ اور اُن کی قوت کا ہمیں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا۔
کار میں قدیم خان کو ڈالتے ہوئے گل خان بولا۔ "میرا خیال ہے ہم سیدھے آگے نکلتے ہیں۔"
"تم دونوں کچھ دُور جا کر اُتر جاؤ۔ میں اس پہاڑی کے پیچھے جا کر خود پتہ کرتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔"
"جی نہیں۔ آپ اکیلے نہیں جائیں گے۔" گل خان نے انداز میں کہا۔
"تو پھر کار کو کسی جگہ چھپا دو۔ ہم پیدل چلیں گے۔ پتہ نہیں کیا ہو جائیں۔"
کار چند ہی لمحوں بعد ٹیلے کے پاس جا پہنچی۔ اُن کے گھوڑے ابھی اپنے سواروں کے بغیر کھڑے تھے۔ گل خان نے کار پھر واپس
"کیا کرتے ہو بھئی! مجھے یہاں اتار دو۔"
"نہیں! یہ گھوڑے قبضے میں لے لیں سردار صاحب۔ اُدھر جنگل کے قریب کھڑی کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے نیچے اتار دیا اور خود گاڑی کو جنگل کی طرف لے چلا۔ چند منٹ بعد ہم گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ تیسرے گھوڑے کی مسولینی نے پکڑ لی اور ہم تیزی سے جنگل کی طرف بھاگے۔ میں گل خان نے کار ایک درخت کے نیچے جھاڑیوں کی اوٹ کھڑی کر دی۔ قدیم خان اس میں بندھا پڑا تھا۔ ایک ایک لمحہ ہمارے لیے بہت قیمتی تھا۔ وائرلیس پر جو بات میں نے کی تھی وہ ان کا اور زیادہ پختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس طرف چڑھ دوڑیں۔ ابھی تک ہم اس جگہ کو صحیح طور پر سمجھ نہیں
گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم جنگل کے کنارے کنارے دوڑتے ہوئے ٹیلے کے پاس سے گزر گئے۔ سامنے کوئی چھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک پہاڑی تھی۔ ابھی تک ہمیں وہاں کوئی آدمی نظر نہیں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا مگر جیسے ہی ہم ٹیلے کے پاس ہو کر نکلے تو ہمیں آوازوں کا ایک بے ہنگم شور سنائی دیا یوں ہوا جیسے بے شمار آدمی کسی جگہ اکٹھا ہو کر آوازوں کا طوفان اٹھا رہے ہوں۔ اُن آوازوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم بالآخر پہاڑی کے قریب جا پہنچے اور یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں گل خان اور مسولینی کے درمیان کھڑا تھا۔ پہاڑی کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ چھوٹے چھوٹے درخت نیچے سے اُوپر تک اسے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ آواز پہاڑی کی دوسری طرف سے اُٹھ رہی تھی اور اب وہ زیادہ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ ابھی ہم پہاڑی کی جانب بڑھے ہی تھے کہ ایک لرزہ خیز آواز نے ہمیں جکڑ لیا۔ کوئی بڑے ہی مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "رُک جاؤ۔ تم ہماری زد میں ہو۔" اس وقت ہمارے پستول نیفے میں اور اسٹین گنیں کندھوں سے لٹکی تھیں۔ ہم نے گھوڑے وہیں روک دیے۔ آواز کچھ زیادہ دور سے نہیں آ رہی تھی۔ ہم تینوں گھوڑوں سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں ہمیں درختوں کے اندر کئی آدمی حرکت کرتے نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور اُن کا رُخ ہماری طرف

اُن کی تعداد چھ تھی اور تین تین کی ٹولیوں میں بٹ کر ہماری جانب آ رہے تھے۔ اُن سے ہم نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ برابر آگے بڑھتے چلے آئے۔ "اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔"
اس مرحلے کے لیے ہم ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھے۔ اسی لیے ہم نے اپنے پستول نیفوں میں چھپا لیے تھے۔ لہٰذا وہ ہم اُن پر کسی طرح ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آدمی کو ایسی حالات میں کچھ نہ کچھ تو بچا کر ضرور رکھ لینا چاہیے۔ اگر انہوں نے ہماری تلاشی لینے کی کوشش کی تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ بہرحال ان کو مطمئن کرنے کے لیے ہم نے اسٹین گنیں الگ رکھ دیں۔ تین آدمی ایک دم ہمارے سامنے آ گئے۔ اب تک وہ درختوں کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ وہ بھی ملیشیے میں ملبوس تھے البتہ اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں، صرف ایک آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "کون ہو تم ؟ اور یہ گھوڑے کہاں سے لیے ہیں تم نے ؟" اس کی صورت بھی اُس قدیم خان ایسی تھی۔ داڑھی اور مونچھیں اس نے بھی بے تحاشا پال رکھی تھیں مگر اس کے چہرے سے ایسی سفاکی جھلکتی تھی کہ میں سمجھا کہ اس نے شاید ہی کبھی کسی کو معاف کیا ہوگا۔
"یہ آوارہ پھر رہے تھے، ہم نے پکڑ لیے۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا۔
"اور وہ میجر قدیم خان کہاں ہے ؟"
"اُن کا ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ ہم تو نذر شاہ سے ملنے آئے ہیں، ڈا صاحب کا ایک پیغام انہیں دینا ہے۔"
"کیا نام ہے تمہارا ؟"
"میرا نام غلام جیلانی ہے، یہ گل خان اور مسولینی ہیں میرے دوست۔"
"آؤ میں تمہیں نذر شاہ سے ملواتا ہوں۔ یہ چترالی ملیشیا کا یونٹ ہے اور ہم یہاں نہر کی کھدائی کے لیے آئے ہیں۔" اس نے اشارے سے دور کے سپاہیوں سے کہا کہ وہ زمین پر پڑے ہمارے ہتھیار اٹھا لیں۔ وہ جب اسٹین گنیں اٹھا چکے تو وہ آدمی بولا۔ "میرا نام طاہر علی ہے اور میں صوبیدار ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ اگر کوئی اور ہتھیار تمہارے پاس ہے تو وہ بھی ہمیں دے دو۔"
"اس کی فکر نہ کریں، اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" ابھی شاید بات کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے اشارے پر اس کے ساتھی نے گل خان کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ گل خان بدک کر پیچھے ہٹا تو ہنستے ہنستے اُن کے تین آدمی ہمیں للکارنے لگے۔ "سیدھے کھڑے رہو اور تلاشی دو۔ ہم کسی آدمی کو ہتھیار لے کر اندر نہیں جانے دیتے۔" تلاشی کے دوران اُن کے نیفوں سے پستول برآمد ہو گئے۔ طاہر علی میری طرف لپکا اور اپنا پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اس نے میرے نیفے پر ہاتھ ڈال دیا۔ پستول وہاں بھی موجود تھا۔ وہ اس نے ہنستے ہوئے نکال لیا۔ "تم تو کہتے تھے کہ اب تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"
"یہ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے رکھے ہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، ان کو ہمارے پاس رہنے دیں۔"
"صفی اللہ تم آؤ، ہم پوسٹ کے کیبن کو دیکھو۔ میجر صاحب اُدھر ہی ہوں گے۔ اُن کے سامنے ہم ان سے بات کریں گے۔ آؤ میاں، میں تمہیں نذر شاہ سے ملاتا ہوں۔" پستول کی بات وہ گول ہی کر گیا۔ اب اس کے تین سپاہی ہمارے گرد تھے اور تین گھوڑوں پر سوار ہو کر کیبن کی طرف نکل گئے۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی خطرناک تھی۔ میں نے قدیم خان کے ساتھیوں کو بے ہوش نہیں کیا تھا اور خود قدیم خان ہماری کار میں بندھا پڑا تھا۔ وہ لوگ جب واپس آئیں گے تو ہمارے پاس اُن کے ساتھیوں کی اس حالت کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔
طاہر علی کے ساتھ بہرحال ہم چل دیے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ وہاں کی اصل صورتِ حال سے آگاہ ہونے کے لیے وہ مرحلے تو ہمیں طے کرنے ہی تھے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اُن کے اسیر ہو کر آگے جائیں گے۔ طاہر علی نے مجھے پستول کی زد میں لے رکھا تھا۔ گل خان اور مسولینی بھی بے بس ہو گئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم پہاڑی کو دائیں ہاتھ سے عبور کر کے ایک بڑے سے کوارٹر کے سامنے جا پہنچے۔ ایک بڑے سے برآمدے کے عقب میں چھ کمرے بنے تھے۔ برآمدے میں لالٹینیں جل رہی تھیں۔ دو مسلح سپاہی وہاں پہرا دے رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کوارٹر کے عقب سے اب وہ بے ہنگم شور کہیں زیادہ واضح طور پر سنائی دے رہا تھا۔ مگر ابھی ہم اس کا براہِ راست جائزہ نہیں لے سکے تھے۔
"سوار محمد! ذرا چھ نمبر کھول دو۔ یہ آدمی آج رات وہاں رہیں گے۔" طاہر علی نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔
"یہ جانور کہاں سے پکڑ لائے آپ! خیر تو ہے ؟"
"ہاں! خیر ہی ہے۔ یہ شاہ صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے ملاقات صبح ہی ہو سکے گی۔" سپاہی نے اسی وقت کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔
"چلو اُدھر! رات یہاں گزارو۔ صبح تمہاری سب لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی، چلو۔" اس کی آواز ایک دم تحکم آمیز ہو گئی۔ جیسے پہلی بار اس پر ہماری نیت کا انکشاف ہو رہا ہو۔ گل خان اور مسولینی نے بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اگر یونہی چوہے کی موت مرنا تھا تو تم ہمیں ادھر کیوں لائے تھے اور وہ بھی ایسی بے سروسامانی میں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ان سے براہ راست ٹکرائے بغیر ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ اتنے سارے لوگوں کی

مصیبت ختم کرنے کے لیے اگر ہم تین آدمی قربان بھی ہو گئے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہو گا۔ محض اس لیے کہ وہ آسیہ کا گاؤں تھا۔ اور جو لوگ اس جبر کا شکار ہوئے تھے، وہ اس کے مزارع تھے اور انہیں امید تھی کہ گاؤں کا مالک اُن کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ اس کے سوا تو ہمارا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ گل خان اور مسولینی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم اگر چاہتے تو ان چھ کے چھ آدمیوں کو باہر سپاہی کے سامنے ہی ڈھیر کر دیتے مگر یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ اتنے سارے لوگوں کا خون بہا کر بھی ہم اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتے تو پھر اس خونریزی کا کیا فائدہ تھا؟ کمرے میں ایک دری بچھی تھی اور چار کمبل ایک کونے میں تہہ کر کے رکھے تھے۔

طاہر علی نے فوراً ہی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: "تھوڑی سی رات باقی ہے، یہ گزر جائے تو صبح تم سے ملاقات ہو گی۔ ویسے تمہارے آنے کا اصل مقصد میں سمجھ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا ہے سردار صاحب! ان کو ہم وہیں ختم کر سکتے تھے، ہتھیار بھی ضائع کر دیے، یہ اچھی بات نہیں ہوئی ہے۔"

"کچھ نہیں گل خان! مجھے اس خونریزی سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ ہم کس کس کو مار سکتے ہیں؟"

"ہم ان سب کو تہہ تیغ کر سکتے تھے مگر آپ نے موقع ضائع کر دیا۔ بالکل ضائع کر دیا۔ اب ان کی قید میں پڑے رہیں گے، یہ ہمیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے ساتھی جو کیبن میں بے ہوش ہیں وہ ہوش میں آتے ہی ان کے کان بھر دیں گے۔"

"اللہ ہی بہتر کرے۔ میں نے اسی لیے ہاتھ روکا کہ میں اس قتل و غارت گری سے متنفر ہو چکا ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں، اللہ نے میرے ہاتھ میں کیسی شفا رکھ دی ہے۔ میں۔۔۔ اب میں کیسے کسی کو قتل کر دوں؟ ہاں۔ اُن کے رنغنے پہ میرا ہاتھ بڑا تو پھر وہ بچ کر نہیں جا سکے گا مگر شاید یہ میری بہت بڑی غلطی تھی، تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔" میں ان دونوں سے سخت شرمندہ تھا۔ گل خان بار بار ہاتھ مل رہا تھا، یہی حال مسولینی کا تھا۔ وہ اپنے بڑے شیر کے پنجے ایسے ہاتھ دیکھ کر اپنی بے بسی پر شدید کرب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وقت اُن کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک بڑا ہی غلط فیصلہ، بڑے ہی غلط وقت پر ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم واقعی وہاں چوہے کی موت مرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ساری رات ہماری آنکھوں میں گزر گئی۔

مسولینی بھی شدید ذہنی عذاب میں مبتلا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دونوں مجھ سے نفرت کرنے لگے تھے کیونکہ اس وقت صبح کے چار بجے تھے کہ گل خان ایک دم بدتمیزی پر اتر آیا۔ بہت غضبناک ہو کر بولا۔ "تم نے ہمیں مروا دیا ہے۔۔۔ تم بڑے سردار بنے پھرتے ہو۔ تمہیں کیا پتہ نیند کیا ہوتی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں گل خان! ذرا دن تو نکل لینے دو۔"

"پھر کیا کر لو گے تم! اوّل درجے کے احمق ہو تم۔ خواہ مخواہ تم اس چوہے دان میں آ پھنسے ہو ورنہ ہم ان کو تہس نہس کر دیتے۔"

"تم مجھے گالی بھی دو گے؟ سن رہے ہو مسولینی! میں گالیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"وہ ٹھیک کہتا ہے، تم بالکل گدھے ثابت ہوئے ہو۔ ہم اُن کے آدمی بے ہوش کر دیے، پھر اُن کی قید میں آ پھنسے۔ کیا کر لیا تم نے؟ ذرا اس بات پر غور کرو۔ میرا بس چلے تو میں تمہارا منہ نوچ لوں۔ صرف بہن جی کا لحاظ ہے ورنہ میں تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں۔" وہ اور زیادہ تپ چکا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تم دونوں اپنی یہ بکواس بند رکھو؟ میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے، یہی بہتر تھا۔"

"کیا بہتر تھا؟ یہی کہ ہم یہاں کتے کی موت مریں گے۔ ہمیں بیڑیاں پہنا کر اُدھر نہر کی کھدائی میں جوت دیں گے۔ سارا دن کام کریں گے۔ تمہیں تین آدمی اور مل جائیں گے مفت کے۔ تم کیا کر لو گے یہ مشقت؟ ڈھو لو گے بوجھ؟ اس بیگار کو کیا سمجھتے ہو تم؟ بڑے بڑے پناہ مانگتے ہیں اس سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مسولینی مگر۔۔۔۔۔"

گل خان چمک کر آگے بڑھا اور بولا: "کیا اگر مگر لگا رکھی ہے تم نے؟ کیوں پھنسا دیا ہے تم نے ہمیں؟ بولو۔ کیا لگتا تھا تمہارا طاہر علی؟ اس کو دیکھتے ہی تم اتنے نرم ہو گئے کہ سیدھے اس کے جال میں آ پھنسے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم ایسے خبیث کو ہم نے اپنا سردار بنا لیا۔ میں بہن جی کو بھی جواب دے لوں گا۔" غضبناک ہو کر اپنے دونوں ہاتھ میرے گریبان پر ڈال کر مجھے فرش پر سے اٹھا لیا۔ "بولو کیا لگتا تھا وہ تمہارا؟ تم نے ہمارے ہتھیار الگ رکھوا دیے اور اُن کے آگے لگ گئے بھیڑ کی طرح۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے منہ پر دائیں ہاتھ سے تھپڑ مارنے کی کوشش کی مگر میں نے ایک دم اس کی ناک پر ٹکر مار دی۔ وہ ایسی ٹکر تھی کہ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ شاید اس کا دماغ ہل گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے میرا گریبان چھوٹ گیا۔ وہ ذرا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پھر وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس حالت میں اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا جسے اس نے مجھ پر دوبارہ حملہ کرنے سے پہلے اپنی آستین سے صاف کر لیا تھا۔

"اوئے یہ کیا کرتے ہو گل خان! چھوڑ دو اسے۔ لڑائی بند کرو یار، ہم پہلے ہی سخت مصیبت میں ہیں۔" مسولینی نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی مگر گل خان نے مجھے اڑنگا دے کر

گرا لیا۔ وہ بہت زیادہ غضبناک ہو چکا تھا، اور پتہ نہیں اس کی نیت کیا تھی۔ اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ ضرور میرے سینے میں گھونپ دیتا۔

اس نے چیختے ہوئے کہا: "پرے ہٹ جا مسولینی! میں اس کی حماقت کا مزہ اسے چکھا کر رہوں گا۔" یہ کہہ کر کہنی اس نے میری آنکھ پر مارنی چاہی۔ اس کا ارادہ سمجھتے ہی میں نے بڑی مشکل سے اپنا چہرہ بچایا۔ ورنہ وہ مجھے اندھا ہی کر دیتا۔ کہنی اس کی میرے کندھے پر لگی۔ اس کو یوں پاگل ہوتے دیکھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے پتہ بھی نہیں چل سکا ہو گا، جب میں نے اس کی رگیں مسل دیں۔ وہ ایک دم بے سُدھ ہو گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کی آنکھیں تو کھلی رہ ہی گئی تھیں مگر اس کی زبان بھی باہر لٹک گئی تھی۔ یہ بڑی خوفناک علامت تھی۔ گل خان کو اس راہ سے نہیں گزرنا چاہیے تھا۔ میں نے جب اسے پرے ہٹایا تو وہ لاش کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

"یہ۔۔۔ اسے کیا کر دیا ہے تم نے؟"

"اس کی نبض دیکھو، یہ مجھے مار دینا چاہتا تھا۔ یہی ارادہ تھا اس کا۔"

"اوئے سردارا! تیری ایسی تیسی۔۔۔ تو نے اسے جان سے مار دیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" مسولینی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سر پر زبردست مکا لگایا۔ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ ایک لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور بائیں ہاتھ سے میں نے مسولینی کے جبڑے پر گھونسا دے مارا۔ اس گھونسے کی قوت کا مجھے اندازہ تھا۔ میں پورے کا پورا کھینچ کر اپنی مٹھی میں منتقل ہو جاتا تھا۔ مسولینی اُلٹ کر نیچے گر گیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کو دیکھ کر مجھے دہشت ہونے لگی۔ اس کا نچلا جبڑا اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا اور وہ بھی شاید بیہوش ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک میں اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر میں نے اس کے جبڑے پر بایاں پاؤں رکھ کر اس کا چہرہ درست کر دیا ورنہ وہ اسی حالت میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ ان دونوں نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کوئی پانچ منٹ بعد میں نے دیکھا کہ گل خان کا منہ بند ہو چکا ہے اور اس نے زبان اندر دبا لی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور اس کی نبضیں اب کام کرنے لگی تھیں۔ سانس اس کا البتہ بہت کھینچ کھینچ کر آ رہا تھا، پھر بھی اس کے زندہ رہنے کی امید قائم ہو گئی تھی۔ ان دونوں نے میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ میں ان سے ایسا سلوک نہ کرتا تو وہ مجھے اس رات زندہ نہیں رہنے دیتے۔ دونوں کا مغز الٹ چکا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ میں نے جان بوجھ کر ان کو اس پریشانی میں پھنسا دیا ہے حالانکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ ہاں اتنا میں نے ضرور کیا تھا کہ جب طاہر علی میرے سامنے آیا تو میں نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں تھا۔ شاید اس کی قسمت اچھی تھی یا یہ ممکن ہے میرے ذہن پر اس گھڑی کوئی بہت ہی واضح قسم کی سچائی جاری ہو چکی ہو۔ خیراں کو جس طرح میرے ہاتھ سے شفا ہو گئی تھی، جس طرح شب خیر کو میں نے دورے سے نجات دلا دی تھی۔ وہ سارا معاملہ ایسا تھا کہ جس کی وجہ سے میرا ذہن الجھتا چلا گیا تھا اور میں اس بارے میں اب زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا۔ مجھے خدا نے کسی ایسی ہی طاقت سے نواز رکھا تھا جس کا میں ابھی تک ادراک ہی نہ کر سکا تھا ورنہ وہ طاقت تو موجود تھی اور وہ ایسی قوت تھی جو مجھے دوسرے لوگوں سے بالا بلند کرتی تھی۔ میں اگر چاہوں تو کسی بھی آدمی کو اس کی تندرستی واپس لوٹا سکتا ہوں۔ کسی بھی درد کو ہاتھوں کی پوروں سے چن سکتا ہوں۔ یہ بات میں نے آزمائی تھی۔ تین بار میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس اجڑے ویران گاؤں "لاڈلی" سے جب میں نکلا تو میں اسی سوچ میں گم تھا کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔ میرے وجود میں ایک اور غلام جیلانی موجود ہے جسے قتل و غارت گری سے نفرت ہے۔ یہ راستہ میرا نہیں ہے، مجھے واپس ہو جانا چاہیے تاکہ میں کسی جگہ بیٹھ کر لوگوں کی اطمینان سے خدمت کر سکوں۔ ہزاروں لاکھوں انسان بستر مرگ پر پڑے ہوتے ہیں، انہیں شفا کی ضرورت ہے۔ اور میں انہیں شفا دے سکتا ہوں۔ یہ مسیحائی مجھے مل گئی ہے، مجھے اس اعجاز سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔

شاید یہی وہ خیال تھا جس کے زیر اثر میں نے طاہر علی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے۔ گل خان کو میری یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ بادل ناخواستہ اپنا سب کچھ وہاں پھینک کر میرے ساتھ تو آ گئے مگر میرے خلاف اُن کے دل میں گرہ پڑ گئی اور کمرے میں آتے ہی وہ مجھ پر پل پڑے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ ان دونوں پر میں بہت زیادہ انحصار کرتا تھا اور وہ میری ہر بات مانتے بھی چلے آ رہے تھے۔ مگر اب وہ ایسے باغی ہوئے تھے کہ مجھے جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ میں بھلا اُن کے ہاتھوں یوں تر نوالا کیسے بن جاتا؟ ان کا یہی علاج تھا جو میں نے کر دیا۔

کوئی دس منٹ بعد مسولینی کو ہوش آ گیا اور وہ فرش سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا جبڑا شاید ابھی تک اپنی جگہ پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ بار بار اپنے منہ کا زاویہ درست کر رہا تھا مگر مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کھلی کھڑکی میں سے آوازوں کا بے ہنگم شور زیادہ واضح سنائی دیتا تھا۔ آدمی مجھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کوارٹر کے عقبی حصے کی دیوار سدِ راہ تھی مگر اتنا مجھے معلوم تھا کہ میں آوازوں کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ وہ لوگ

زیادہ دور نہیں تھے۔ مسولینی اور گل خان کو اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ شاید وہ کسی بھی مقام پر اس طرح کسی ایک آدمی سے پسپا نہیں ہوئے تھے۔ میں بھی اُن سے کب نمٹ سکا تھا۔ کسی کو کسی خاص داؤ پیچ سے زیر کر لینا تو کوئی اہم کارنامہ نہیں تھا۔ شیر کو لوگ راستے میں گڑھا کھود کر نیچے گرا لیتے ہیں جس پر وہ تنکوں کی چھت ڈالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شیر جب وہاں سے گزرے گا تو بچ نہیں سکے گا۔ میں اگر مسولینی پر اپنا آہنی مکا استعمال نہیں کرتا، اگر گل خان کا گلا نہ دبا دیتا تو وہ دونوں میرے لیے مصیبت بن گئے ہوتے۔ شاید وہ اپنی جھوک میں مجھے وہیں ختم کر دیتے۔ یہ بات اُن کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھی۔ لیکن اب وہ سمجھ گئے تھے کہ اُن کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔ اُن کی ہیبت میں نے ختم کر دی تھی۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے۔ میں نے جس طرح خود کو اُن لوگوں کے حوالے کر دیا تھا اس میں کوئی عقلمندی کی بات ہرگز نہیں تھی۔ اور اب خدا معلوم اس کمرے میں بند ہونے کے بعد وہ ہم سے کیا سلوک کریں۔ میں اُن کا ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے اُن کو ختم کر دینے میں اتنا گریز کیوں تھا حالانکہ میں ایسا کر سکتا تھا مگر اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ خالی ہاتھ وہ بھی نہیں تھے۔ اور وہ زیادہ دبیز اوٹ میں کھڑے تھے اور میں اپنے ہی گھولے میں پڑا تھا۔ اس سوچ میں پڑا تھا کہ میں درویش بن چکا ہوں اور میرے ہاتھ میں مسیحائی پیدا ہو چکی ہے۔ میں مریضوں کو شفا دے سکتا ہوں پھر میں کسی کی جان کیوں لوں؟ مگر اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وہ فیصلہ بالکل غلط تھا۔ گل خان ٹھیک ہی کہتا تھا۔

ابھی مسولینی کو ہوش میں آئے پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ باہر دروازے پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے فوراً ہی اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ جب وہ باہر کا ارل کھول چکے تو دروازہ پیٹنے لگے۔ طاہر علی مجھے گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔

"دروازہ کھول اوئے۔ ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔"

اُس کی آواز سن کر مسولینی دروازے کے پاس جا پہنچا۔ برآمدے میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہ تختے کی جھریوں میں سے جھانک کر بولا۔

"باہر قدیم خان اور اس کے ساتھی کھڑے ہیں۔ ہماری کار وہ ادھر ہی لے آئے ہیں۔" کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔"

مسولینی کا لہجہ بہت زخمی تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ بڑبڑایا۔ "آپ نے اچھا نہیں کیا ہے سردار صاحب! ان سے بھگتیں۔ اب آپ ہی بھگتیں۔ ہم نے کبھی ایسی ذلت نہیں اٹھائی تھی۔"

"مجھے افسوس ہے مسولینی! میرا فیصلہ واقعی بہت غلط تھا۔"

یہ کہتے ہوئے میں کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس کے سامنے کوئی جالی یا سریے نہیں لگے تھے۔ بائیں ہاتھ پر بھی ایک دیوار تھی اور سامنے بھی۔ لگتا تھا کوارٹروں کے پیچھے کوئی دس فٹ چوڑا صحن بنا تھا اور غسل خانے بھی وہیں بنائے تھے۔ مگر ان تک پہنچنے کے لیے ہمارے کمرے میں کوئی راستہ نہیں رکھا گیا تھا۔ دروازہ دھڑا دھڑ بج رہا تھا اور اسے وہ کسی بھی وقت توڑ سکتے تھے۔ برآمدے میں کوئی تیرہ چودہ آدمی جمع ہو گئے تھے اور بہت زیادہ غضبناک ہو رہے تھے۔

"آؤ مسولینی میں باہر نکل رہا ہوں۔"

"مگر اس گل خان کا کیا کریں؟"

"اس کو پڑا رہنے دو۔ آؤ۔" یہ کہہ کر میں کھڑکی میں سے دوسری طرف کود گیا۔ مسولینی نے میرے کہنے کے مطابق میں سے چھلانگ لگا دی۔ مگر عین اس وقت بائیں ہاتھ کی دیوار پر مجھے دو آدمی اوپر آتے دکھائی دیے۔ دیوار اونچی تھی اور وہ بھی سہارا ہی تلاش کر رہے تھے کہ مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹین گن نظر آ گئی جسے اس نے دیوار پر رکھ دیا تھا تاکہ چڑھنے میں آسانی رہے۔ میں نے اُچک کر وہ اسٹین گن پکڑ لی اور پھر اوپر کو میرا مغز الٹنے لگا۔ وہ ہماری جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ایسے میں جاں بخشی دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں تھی۔ میرے ذہنی طلاطم نے مجھے پھر وحشی بنا دیا تھا۔ جیسے ہی وہ اوپر اٹھا میں نے اس پر گولی داغ دی۔ ایک بھیانک چیخ مار کر وہ دیوار سے کھسک گیا۔ اس کی چیخ میں ایسی تلملاہٹ تھی جو چاروں طرف آگ لگا گئی۔ اُن لوگوں نے طیش میں آ کر دروازہ توڑ دیا۔ مگر میں اور مسولینی اس وقت تک عقبی دیوار پر جا چڑھے تھے۔ کمرے میں گھستے ہی اُن لوگوں نے گل خان کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تو اس سے کوئی تعرض کرنے کے بجائے وہ کھڑکی کی طرف لپکے مگر میں اور مسولینی اس وقت تک دیوار کی دوسری طرف چھلانگ لگا چکے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ نیچے گہرائی ہے۔ دیوار پہاڑی کے بالکل آخری حصے پر تھی جس پر سے جانے کے بعد کوئی شاید ہی زندہ سلامت بچتا ہوگا۔ ہم نیچے گرے کہ پانچ منٹ تک ہمیں کسی بھی چیز نے سہارا نہیں دیا۔ میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ اتفاقاً ہی میرے ہاتھ لگی اور اب میں اسی پر تکیہ کر رہا تھا۔

عین اُس وقت دیوار کے اوپر سے کسی نے ہم پر گولی چلائی مگر ہم تو مسلسل نیچے کھسک رہے تھے۔ کوئی بھی گولی کارگر نہیں ہوئی۔ پہلی باڑھ کے بعد ایک منٹ کے وقفے سے لبلبی پر جا پڑے مگر اس عرصے میں ہم بہت نیچے جا چکے تھے پہاڑی کی تلہٹی میں۔۔ اور اب ہمیں وہ شور سمجھ میں آنے لگا تھا۔ لوگ واقعی نہر کی کھدائی میں مصروف تھے۔ بے شمار لوگ جو گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں اس مٹی کے ساتھ

اُن کی تعداد کوئی تین سو تو ضرور ......

تھے ــــ وہ مردوں پر مٹی لاد لاد کر کناروں تک پہنچا رہے تھے کہیں ہوگی۔ وہ ... کہیں گدھے بھی دکھائی دیتے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو ہاتھوں میں چابک لیے اُن کے گرد گھوم رہے تھے۔ رات کے اس حصے میں وہ منظر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ نہر کا پاٹ کوئی پانچ سو گز چوڑا تو ضرور ہی تھا۔۔ وہ ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے اور وہ جو اُن سے یہ بیگار لے رہے تھے اُن کا غم و غصہ دیکھنے کی چیز تھا۔ کئی ایک تو ان میں سے گھوڑوں پر سوار تھے۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں ان کی آوازیں اور ان آوازوں کی ماتمی لے مجھے سب کچھ سمجھا رہی تھی ـــ مسولینی ان سب کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، بولا "یہ... یہ... ان میں سے تو کئی لوگ میرے گاؤں کے ہیں۔" اس کی آواز بہت ہی گلوگیر ہو گئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ انھیں ہی بیگار کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔"

"مگر... مگر ان میں عورت تو کوئی نظر نہیں آتی۔"

"اتنی دور سے شاید ہمیں نظر نہ آ رہا ہو۔ آؤ آگے چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں کپڑے جھاڑتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ ہمارے عقب سے اب گولیوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

شاید انھوں نے اپنا پینترا بدل لیا تھا اور وہ کسی دوسری راہ سے ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے۔ ہمیں پناہ کی ضرورت تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اُن سے تنہا کیسے نپٹ سکیں گے؟ اور اُن کے اتنے بڑے شیطانی کارخانے کو کیسے بند کر سکیں گے۔ اتنی گولیاں وہاں چل گئی تھیں اور اُن کی گونج چاروں طرف یوں پھیل گئی تھی کہ اردگرد کے چرند پرند حیران ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں اور بھٹوں سے باہر نکل آئے تھے مگر نہر کی کھدائی میں مصروف لوگوں کو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اُن کے گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ایسی آوازوں کے عادی ہو چکے تھے اور وہ اسے روزمرہ کا معمول سمجھتے تھے ورنہ وہ دہل جاتے، اپنے ہاتھ روک لیتے۔ وہ مٹی اٹھاتے اٹھاتے رک جاتے۔ اور ایک دوسرے سے اتنا تو ضرور پوچھتے کہ کس کی زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ گولی کس پہ چلی تھی۔ کون نیا قیدی آیا ہے اور کس نے جان، جان کی قربانی کو پیش کی ہے؟ کچھ نہ کچھ تو وہ ضرور ہی کہتے۔ مگر نہیں۔۔ ان کے لبوں کی آوازیں ہتھوڑوں کی ٹوں ابھر رہی تھیں اور وہ اپنے کام میں اتنے بے حد مصروف کہ چند چابک والے اُن کے اردگرد موت کے شکنجے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے اور وہ اس الاہرم کی تعمیر میں اُن کا مصروف تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ بیگار میں پکڑے ہوئے لوگوں کو فرصت نہیں تھی کہ وہ ٹوکری پھینکتے اور جان دے دے۔ ... بات ہی نہیں ہوتی تھی کہ گولیوں والے بھی وہاں موجود ... کھانا جانتے ہی نہیں تھے۔

عین اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کچھ گھڑسوار بہت تیزی سے پہاڑی کا چکر کاٹ کر اس طرف آ رہے ہیں جہاں ہم کھڑے تھے۔۔ اُن کی تعداد دس تو ضرور ہی ہوگی اور وہ ہماری تلاش میں وہاں تک آ پہنچے تھے۔ اُن سے براہ راست ٹکرا جانا ہمارے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ میری اسٹین گن میں صرف دو گولیاں موجود تھیں۔ مسولینی بالکل خالی ہاتھ تھا اور ہمارے سامنے ایک جُتے شیر آ گئی تھی جسے بہر حال ہمیں پاٹ دینا تھا۔ ہمارے دشمن سرتاسر مسلح تھے اور انھیں انتقامی جذبے نے پاگل کر رکھا تھا۔

"آؤ مسولینی! ہم اُدھر جنگل کی طرف نکلتے ہیں۔ آؤ ورنہ یہ ہمیں جان سے مار دیں گے۔" میں نے جھاڑیوں میں کہنیوں کے بل لیٹتے ہوئے کہا۔ ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ مسولینی بھی میرے ساتھ جھاڑیوں میں لیٹ کر آگے بڑھنے لگا۔

جنگل آہستہ آہستہ بہت گھنا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں اور مسولینی دبیز جھاڑیوں کے بیچ میں سے کہنیوں کے بل لیٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ حالت ہماری یہ ہو گئی کہ دونوں کے ہاتھ اور کہنیاں چھل گئے۔ کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ مگر ہم کسی مضبوط اور محفوظ پناہ کی تلاش میں مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ جنگل اب اس قدر گھنا ہو گیا تھا کہ اوپر ہمیں آسمان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس میں شیشم، کیکر، جنڈ اور اس قسم کے درخت جا بجا راستہ روکتے تھے اور وہ اتنے قریب قریب اُگے تھے کہ ہمیں یہی احساس ہوتا تھا کہ اُن کے بیچ میں سے گزرنا مشکل ہوگا۔ جھاڑیاں اس قدر زیادہ تھیں اور اُن کی بیلیں یوں پھیلی ہوئی تھیں کہ میں اور مسولینی ہانپنے لگتے۔ اب نہر ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ لوگ اوٹ میں چلے گئے تھے مگر اُن کا شور اب بھی وہاں تک سنائی دیتا تھا۔

اچانک ہمیں ایک دم فراخی کا احساس ہونے لگا۔ جنگل کے اندر بڑھ کا ایک بہت پرانا درخت اگا تھا جس کے نیچے کوئی جھاڑی نہیں اُگی تھی۔ جہاں جہاں تک اس کا سایہ جاتا تھا وہاں تک زمین بالکل سفید تھی۔ ہم وہاں پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اسٹین گن میں نے سوئیٹر کے نیچے دبالی تھی۔ مسولینی نے ایک لمبی آہ بھری، بولا "یہ چھیٹنگ تو بہت مہنگی پڑی ہے۔ تم نے بہت زیادتی کی ہے سردار جی! ورنہ ہم اُن سے وہیں نپٹ سکتے تھے۔" اس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہہ نکلا تھا جسے اس نے اپنی دونوں آستینوں سے پونچھ لیا۔ اس کی بائیں کہنی بھی چھل گئی تھی اور زیادہ ہی چھل گئی تھی۔ "کرالنگ" کرنا ایک باقاعدہ فن ہے اور ہم دونوں ہی اس میں اناڑی ثابت ہوئے تھے۔

"دفع کرو یار! اس بات کو بھول جا۔ میں تمھیں کہہ چکا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔"

"کیا فائدہ ہوا؟ ہم گل خان کو وہاں چھوڑ آئے ہیں۔"

"وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ بہر حال اگر اسے انھوں نے گولی نہیں ماری تو پھر ہم اسے بچا لیں گے۔ فکر نہ کرو۔"

عین اس وقت ہمیں سامنے کی جھاڑیوں میں سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ آواز عورت کی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنے مدِمقابل کو موٹی موٹی گالیاں دے رہی ہے۔ ابھی ہم صورتِ حال کو سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک آدمی اُن جھاڑیوں میں سے کسی کو کھینچتا ہوا برگد کے درخت کے نیچے آ گیا۔ ابھی ہم دُوسری طرف گھنی جھاڑیوں میں سے نکلے ہی تھے۔ فاصلہ اتنا تھا کہ وہ فوراً ہی ہمیں نہ دیکھ سکا۔ اس نے عورت کو کھینچ کر چھٹکی ہوئی چاندنی کے سائے میں پھینک دیا۔ وہ کوئی بہت ہی جوان عورت تھی جس کو اس نے وہاں لا ڈالا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ بھی تیزی سے جھاڑیوں میں سے نکلا اور بولا ”کیوں شور مچاتی ہے سوہنیے! دیکھ رات کتنی سُندر ہے۔ تیری طرح کیوں شیر خان کیا کہتی ہے یہ۔“

”ایسے ہی بکواس کرتی ہے خود ہی راضی ہو جائے گی۔ لا وہ بوتل کہاں ہے؟“

”یہ رہی بوتل۔ چل تو منہ اُدھر کر پہلے میں اس سے بات کروں۔ اس جیسی تو سارے کیمپ میں کوئی نہیں ہے کیوں نکیے! یہ تیرا نام کس نے رکھا ہے؟ تو اب بکی تو نہیں ہے جوان ہو گئی ہے۔ چل اوئے منہ اُدھر کر۔ یہ بوتل لے جا اُدھر۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”نہیں یار! پہلے میں اس سے بات کروں گا۔ اٹھا کر تو میں ہی لایا ہوں تو خواہ مخواہ گیدڑ مولنا آدمی اِدھر چلا آیا ہٹ پرے۔“

”اچھا تیری مرضی! لا ایک گھونٹ مجھے پلا دے۔ بند کرو یہ رونا دھونا نہیں چلے گا۔ چاؤں چاؤں کر رہی ہے جب سے۔“ شیر خان نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے مُنہ پر دے مارا۔ اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سن ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی اور وہ دو بھیڑیے اسے سموچا نگل جانے کے لیے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے مسولینی!“

”تم دیکھ رہی رہے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟“

”گولیاں دو رہی ہیں میرے پاس اور میں انھیں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“ یہ کہہ کر میں بلا خیز رفتار سے لپکتا ہوا شیر خان کے پاس جا پہنچا اور جاتے ہی میں نے اس کی کمر میں ایسی ٹھوکر لگائی کہ وہ سر کے بل اچھلتا ہوا دُوسری طرف جا گرا۔ وہ بے بس عورت درمیان میں جھول کر رہ گئی تھی۔ اور اگر میں وہاں نہیں پہنچتا تو پھر کچھ بھی باقی نہ بچتا۔ آبرو میں اسی طرح لٹتی ہیں۔ میری دگرد گڑ سے پریشان ہو کر تنے کے پیچھے چھپا ہانڈا ایک دم وہاں سے اٹھا اور مجھے شیر خان کی کمر پر ٹھوکر لگاتے دیکھ کر بولا ”اوئے تو کون ہے کتے کے بچے! تو مارا لگتا ہے نکی کا۔“ ابھی وہ اتنی ہی بات کہہ پایا تھا کہ مسولینی نے اسے پیچھے سے لپک کر اس طرح دبوچ لیا کہ پھر وہ بات ہی نہ کر سکا۔ مسولینی نے اسے زمین سے کئی ہاتھ اوپر اچھال کر نیچے پھینکا۔

تب اس کو احساس ہوا کہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ اس اثنا میں میں نے اسٹین گن سیدھی کر لی تھی۔ شیر خان اس [illegible] چاندنی کے سائے میں مجھے دیکھ کر سُن ہو گیا۔ وہ جہاں لڑھکا تھا وہاں سے اُٹھ ہی نہ سکا۔

”اُٹھ جا شیر خان! اب ہمت ہے تو اِدھر آ۔ یہ نکی تیرے سامنے ہے آ اِدھر۔“ میں نے اسے للکارتے ہوئے کہا۔ اس عرصے میں مسولینی نے ہانڈے کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے مارتا ہوا [illegible] کے پاس لے آیا۔

”لے بی بی! اس کے منہ پر تھوک۔ اس بدمعاش نے [illegible] کہاں سے اٹھایا تھا؟“

”اُدھر۔۔۔ جنگل میں اِن لوگوں نے عورتوں کا کیمپ [illegible] ہے بھائی جی! میں اپنی ماں کے پاس سوئی تھی۔ اس نے میرے [illegible] کپڑا باندھ کر مجھے وہاں سے اٹھا لیا۔ وہاں سے ہر روز ہی [illegible] عورتیں اٹھالی جاتی ہیں۔ وہ انھیں دن کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بدنصیب لوگ۔۔۔“ نکی نے کہا۔

شیر خان نے اسٹین گن دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا [illegible] تھے۔ اس کی بوتل نکی کے قریب ہی پڑی رہ گئی تھی۔ زمین پر [illegible] بوتل اس نے غضبناک کیفیت میں اوپر اٹھالی اور اس کا پیندا [illegible] پر مار کر الگ کر دیا۔ اب بوتل کا ڈھانچہ اس کے ہاتھ میں تھا جسے [illegible] نے ڈھکنے کی سمت سے پکڑ لیا تھا۔ وہ بہت طاقتور عورت [illegible] اگر عام حالات میں وہ ان میں سے کسی ایک کو تھپڑ مار دیتی [illegible] میرا خیال ہے وہ دوبارہ نہیں اٹھ سکتا مگر اس رات وہ بے [illegible] گئی تھی کہ وہ دو تھے اور اُن کے پاس کوئی ہتھیار بھی ضرور ہو [illegible] جن کو ابھی تک انھوں نے ہم پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ بھی [illegible] شیرنی کی طرح شیر خان کی طرف بڑھی جو میری اسٹین گن کے [illegible] لرز رہا تھا۔ بوتل کا ڈھانچہ اپنی جگہ ایک خوفناک ہتھیار [illegible] تھا۔ نکی جوشِ انتقام میں ایک دم شیر خان کے پاس جا پہنچی [illegible] لرزتے کانپتے مجہول صورت آدمی کے بال پکڑ کر اس نے بوتل [illegible] منہ پر دے ماری۔ ایک دو بار۔ شیر خان چیختا ہی رہ گیا [illegible] کی اس نے خود کو بچانے کی مگر نکی نے اسے مہلت ہی نہیں [illegible] سارا چہرہ اس نے لہولہان کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے [illegible] کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی مگر نکی نے وہاں بھی [illegible] لگا دیے یہاں تک کہ شیر خان منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میرا [illegible] وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ایسے ہی غضبناک انتقام کا مستحق [illegible] نکی نے اس کی سزا میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ وہ مارتی جاتی [illegible] تھی۔ ”یہ لے یہ تیری ماں کے نام کا۔ یہ تیری بہن کے نام کا۔ یہ تیری بیٹی کے نام کا۔ سہرا اسے دیکھ میں تیرا قیمہ کر دوں [illegible]

اس کی آواز میں ایسی ماتمی لے اُبھر رہی تھی، اس کے دل سے اپنی بے بسی کے خلاف ایسی صدا اٹھ رہی تھی کہ اس کے وہ الفاظ اس کی ترجمانی سے قاصر تھے۔ وہ اس بدنصیب کو کیمپ کے اندر کسی جگہ سوتی ہوئی ماں کے پہلو سے اُکھاڑ کر لے آئے تھے۔ وہ انھیں وہاں بھی چین نہیں لینے دیتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس کس کو لا کر وہاں بے آبرو کر چکے تھے مگر شاید اس رات اُن کا یومِ حساب آ پہنچا تھا۔ مجھے گولی چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ نکی نے خود ہی اپنا انتقام لے لیا تھا۔

اس عرصے میں مسولینی نے ہانڈے کی دونوں ٹانگیں کھول کر اس طرح بیچ میں پاؤں دے رکھا تھا کہ اس کے بازو جب وہ مروڑتا تھا تو ہانڈے کی کمر چٹخنے لگتی تھی۔ وہ اوندھے مُنہ پڑا تھا اور مسولینی نے اس پر زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

نکی نے جب دیکھا کہ شیر خان بے ہوش ہو چکا ہے تو وہ تیزی سے ہانڈے کی طرف لپکی مگر میں نے اسے روک لیا۔

”ابھی نہیں بی بی! ابھی نہیں ذرا رکو۔ اس سے ہمیں کچھ پوچھ لینے دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”آپ نہ آتے تو میں بھی آج تباہ ہو گئی تھی۔ یہ لوگ دن رات کتوں کی طرح کیمپ میں منڈلاتے رہتے ہیں کوئی وقت دیکھا نہیں

دیکھئے۔ کل ستی پر جو بیت گئی تھی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ بچاری شریف خان اور کملا بو کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ اپنے ہی لہو میں ڈوب گئی تھی۔ سارا کیمپ تھر تھر کرتا تھا۔" بچی نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے جوڑ دیے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ نکلے تھے۔

"مت رو بچی! مت رو۔ ایسا نہیں ہوگا اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب ایسا نہیں ہوگا میری بہن! یہ بتا وہ کیمپ ہے کہاں؟"

"وہ ادھر جنگل کے اندر تالاب کے پیچھے ایک جہنم ہے جس میں عورتوں کو باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس کس جگہ سے لائی گئی ہیں۔ ان کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ہوگی۔ اُن میں بچیاں بھی ہیں اور بوڑھی عورتیں بھی اور جو اُن میں جوان ہیں وہ ان کا لقمہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ پتہ نہیں کتنے ہیں، تین تین چار چار کی ٹولیوں میں آتے ہیں اور وہاں سے جسے چاہتے ہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں پانچ دن پہلے یہاں آئی تھی میرا گھر فیاض پور میں ہے" یہ گاؤں ادھر دریا کے پار ہے۔ وہاں سے یہ مجھے اور میری ماں کو اٹھا کر لے آئے۔ ہم اس روز شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ رہے تھے کہ ان لوگوں نے ہمیں ٹرک میں ڈال لیا اور یہاں لے آئے۔ ہم جیسی یہاں بہت سی ہیں۔ اس جنگل میں انھوں نے قیامت مچا رکھی ہے۔ بھائی جی! ہمارے نصیب ہمیں برباد کر گئے۔ کسی سے کیا شکوہ کریں۔"

"اور یہ کیمپ کہاں ہے؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ ادھر جنگل کے اندر انھوں نے ایک جگہ کو صاف کر لیا ہے جس کے گرد خاردار تار بچھائے گئے ہیں۔ اُن تاروں کے ارد گرد ان لوگوں نے بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں تاکہ کوئی عورت باہر نہ جا سکے۔ اس خاردار تار کے پیچھے میرا اندازہ ہے کہ کوئی ڈیڑھ دو سو عورتیں جمع ہیں۔ آج ہی مجھے ایک عورت بشیرن نے بتایا ہے کہ وہ لاڈلی گاؤں سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی ہیں، جو اسی گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ سُنا ہے اس گاؤں کے سارے مردوں کو بھی یہ اٹھا لائے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ مردوں کو انھوں نے الگ کر کے خدا جانے کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ عورتوں کے کیمپ میں نہیں آ سکتے ــــ عورتوں سے یہ سارا دن قالین بافی کرواتے رہتے ہیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے کیمپ سے کچھ دُور ایک کارخانہ بنا رکھا ہے۔ ہر عورت کو وہاں دس بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ رات کو پہرے دار اُن عورتوں کو لے کر کیمپ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کل میری بھی باری ہے۔ مجھے آج ان کا ایک بڑا دیکھ گیا تھا۔ اس کو یہ لوگ سر سر کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کل مجھے قالین بافی کے لیے نہیں بلکہ اس کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ لوگ لے جائیں گے۔ مگر اس ہانڈے اور شیر خان نے صبح کا بھی انتظار نہیں کیا اور مجھے یہ کیمپ سے اٹھا کر ابھی یہاں لے آئے ہیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے بھائی جی! میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں میں تو تباہ ہو گئی تھی۔ میری زندگی تو برباد ہو گئی ہے۔" وہ پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔ اس عرصے میں ہانڈے کی چیخیں برابر اٹھتی رہیں۔ مسولینی نے اس کی کمر پر سے پاؤں نہیں اٹھایا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو کھینچ کر وہ مسلسل ہانڈے کی کمر کے کڑاکے نکال رہا تھا۔ بچی چپ ہوئی تو ٹوٹی ہوئی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک بار پھر غضبناک ہو کر ہانڈے کی طرف بڑھی مگر میں نے اسے روک دیا۔

"ابھی نہیں میری بہن! ابھی نہیں۔ ہمیں اس ہانڈے سے کچھ پوچھ لینے دو۔ پھر تم اس سے جو چاہو سلوک کر سکتی ہو بے شک گولی مار دینا اسے۔"

"اچھا۔ یہ بندوق دے دیں گے نا آپ مجھے؟"

"ہاں دے دیں گے مگر صرف ایک گولی کے لیے۔ اس میں زیادہ گولیاں نہیں ہیں۔ اوئے اس کو اٹھا ذرا مسولینی اور سیدھا کر کیا کہتا ہے یہ بھیڑیے کی اولاد؟"

مسولینی نے ہانڈے کے بال پکڑ کر اسے زمین سے اوپر اٹھا لیا اور پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے ہانڈے کے دونوں بازو کھینچ کر کمر کے پیچھے یک جا کیے۔ اس کا بہت برا حال ہو رہا تھا۔ مسولینی نے اس کے سارے ہی کس بل نکال دیے تھے۔ اس نے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر جگہ اس کی تلاشی لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی دونوں بغلوں کے نیچے خنجر چھپائے ہوئے تھا۔ وہ مسولینی نے نکال کر بچی کی طرف پھینک دیے۔

"مجھے حیرت ہے کہ ان کے پاس کوئی اور ہتھیار کیوں نہیں ہے"

"ہو سکتے ادھر کہیں باورچی وغیرہ ہوں گے ورنہ ان کے پاس ہتھیار تو ضرور ہوتے۔ کیوں ہانڈے تو یہاں کیا کر رہا تھا بے" میں نے اس کے گریبان کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی دہشت ابھر آئی تھی کہ باید و شاید۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنے علاقے میں یوں نہیں للکارتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ کسی چترالی ملیشیا کا رعب و دبدبہ ان لوگوں نے یوں پھیلا رکھا تھا کہ کسی کو وہاں تک آنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی اور اب وہ اس حال میں وہاں پکڑے گئے تھے کہ ایک بے بس عورت اُن کا تر نوالہ بننے کو تھی کہ ہم وہاں جا پہنچے۔

"تم بولتے کیوں نہیں ہو بیارے! اس عورت کو کہاں سے لائے ہو تم؟"

"وہ جی۔ ـ ـ ـ یہ ہمارے کیمپ میں رہتی ہے جناب!"

"وہ تو یہ بتا ہی چکی ہے۔ تم اسے کہاں سے لائے تھے"

"وہ جی وہ اپنا فرزند علی ہے نا جی! وہ لایا تھا ان کو نیا نیا۔ اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔"

"ہوں۔ تم کیا کرتے ہو کیمپ میں؟"

"جی میں اُدھر کارخانے میں انسٹرکٹر ہوں۔"

"گڈ۔ اور یہ لوگ یہاں کس نے بھرتی کر رکھے ہیں؟"

"جی میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھ جاؤ ہانڈے! ان عورتوں کو یہاں کون لایا ہے؟"

"مجھے نہیں پتہ ہے جناب! میں تو یہاں قالین بافی کا کام کرتا ہوں۔"

"تمھیں کتنے پیسے ملتے ہیں؟"

"وہ میری مزدوری جمع کر رہے ہیں، کہتے ہیں سال بعد حساب ہوگا۔ مجھے انھوں نے پچاس روپے روز پر ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"تمھیں یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"کوئی دس مہینے اور دس دن ہوئے ہیں جناب۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جی میں لاہور میں رہتا ہوں۔"

"خود آئے تھے یا لائے گئے تھے؟"

"وہ جی میرا ایک یار مجھے یہاں لے آیا۔ کہتا تھا وہاں زیادہ پیسے ملیں گے۔"

"ہوں۔ یہ چترالی ملیشیا کسے کہتے ہیں؟"

"جی وہ سرکاری فوج ہے جناب! نہر کی کھدائی کروا رہی ہے۔"

"چترالی ملیشیا نام کی کوئی فوج نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ فوج کو بدنام کرنا چاہتے ہو؟"

"جی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"اور یہ قدیم خان؟"

"جی وہ میں نے سنا ہے، وہ ان سب لوگوں کے انچارج ہیں۔"

"نہر کا ٹھیکہ کس کے پاس ہے؟"

"وہ جی کوئی نصر اللہ جان کلسوانی ہیں، اُن کے پاس ہے۔"

"کہاں رہتا ہے وہ؟"

"جی مجھے نہیں معلوم۔ اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے، کہتے ہیں وہ لاہور کا رہنے والا ہے۔"

"گڈ۔ تم بہت بھلے آدمی ہو۔ قدیم خان سے پہلے ہی تم بچی کو لے اڑے۔ یہ کیا بات ہے؟"

"وہ جی بس یہ شیر خان کی بدمعاشی ہے۔ یہی مجھ سے کہتا تھا کہ بچی کو اڑا لو۔ آج رات یہ اپنی ماں کے پاس سوئی ہوئی تھی کہ ہم نے اس کے منہ پر کپڑا ڈال کر اسے اٹھا لیا۔"

"اور کتنی عورتیں اِدھر لا چکے ہو تم؟"

"کوئی بھی نہیں جناب! یہ۔ ـ ـ ـ یہ پہلا موقع ہے، مجھے تو اس شیر خان نے مروا دیا ورنہ میں تو ایسا آدمی نہیں ہوں جناب۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ اُدھر اُن کوارٹروں میں کون لوگ رہتے ہیں؟"

"ملیشیا والے رہتے ہیں جناب! اُن کی تعداد کوئی پچاس کے قریب ہوگی۔ وہی نہر کی کھدائی کرواتے ہیں، اُن کے پاس ڈھیر سارا اسلحہ ہے۔ کھٹاک سے گولی چلا دیتے ہیں۔ کوئی نہ نکر نہیں کر سکتا ہے۔ کام دن رات جاری رہتا ہے۔ پچاس میل لمبی نہر کا ٹھیکہ ہے اُن کے پاس۔"

"اور مزدور وہ کہاں سے لیتے ہیں؟"

"پتہ نہیں جی! یہ تو انھیں ہی معلوم ہوگا۔ اب مجھے معاف کر دیں بھا جی! میں بچی سے معافی مانگتا ہوں سرکار! پھر میری توبہ ہے جناب! مجھے تو شیر خان نے مروا دیا، ورنہ بھا جی میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ تم ادھر ہی ٹھہرو مسولینی! اس شیر خان کا دھیان رکھو میں ذرا کیمپ دیکھ لوں۔ آؤ ہانڈے میرے ساتھ۔ تم بھی آؤ بچی۔"

"مگر بھا جی! آپ کیسے جا سکیں گے وہاں؟ کیمپ کے گرد تو بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

"کوئی دروازہ تو ہوگا؟"

"وہ تو ہے جی، پر وہاں پہرے دار کھڑے ہیں۔ دن رات نگرانی ہوتی ہے جی۔"

"اور تم وہاں سے کیسے نکل آئے تھے؟"

"دوسرا دروازہ بھی موجود ہے جو کارخانے کی طرف جاتا ہے مگر وہاں بھی پہرے دار کھڑے رہتے ہیں۔"

"دیکھو مسولینی! یہ ہوش میں ہے کہ نہیں؟" میں نے شیر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک اوندھے منہ پڑا تھا۔ اور اس کا ڈھیر سارا خون تالاب کی صورت میں اس کے سر کے نیچے جمع ہو رہا تھا۔ چاند اس وقت کچھ زیادہ ہی تابناک ہو گیا تھا، جا تو سوئی پھینکو تو ڈھونڈ لو۔ مسولینی نے شیر خان کو جاتے ہی الٹ دیا۔ مگر۔ ـ ـ مگر وہ تو شاید ختم ہی ہو چکا تھا۔ اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔

میں ہانڈے کا خیال بھلا کر تیزی سے اس کی طرف لپکا تو ہمیں یوں دوسری طرف متوجہ دیکھ کر ہانڈا ایک دم وہاں سے بھاگ نکلا۔ اتنی تیزی سے وہ جھاڑیوں میں جا چھپا کہ مسولینی کوشش کے باوجود اس کو نگاہ میں نہ رکھ سکا۔ یہ بڑی ہی خطرناک بات تھی۔ میں بچی اور شیر خان کو وہیں چھوڑ کر لپکتا ہوا جھاڑیوں میں جا نکلا۔

ہانڈا مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ ابھی زیادہ دور نہیں نکلا ہوگا۔ اس کی بھی دو ہی ٹانگیں تھیں اور اس کو ڈھونڈ لینا ہمارے لیے بے حد ضروری تھا۔ وہ ہمارے لیے کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔

مسولینی دائیں ہاتھ نکلا اور میں بائیں ہاتھ۔ ہانڈا اس وقت سے فائدہ اٹھا رہا تھا جو نہ اس کا ساتھ دے رہا تھا نہ ہمارا۔ وہ کسی کا بھی ساتھ نہیں دیتا تھا اور صبح بھی اب کچھ زیادہ دُور نہیں رہ گئی تھی۔ کسی اذان کا تو وہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور وہ لوگ آسیہ کی جاگیر ایک پُورا گاؤں تاراج کر کے وہاں جا پہنچے تھے جہاں پولیس بھی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اُن کوارٹروں کے باہر انھوں نے جلی حروف میں چترال ملیشیا کا بورڈ آویزاں کر رکھا تھا۔ وہ میں نے خود پڑھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چترال ملیشیا نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں تھا مگر یہ ساری باتیں تو بعد کی تھیں۔ اوّلین مسئلہ تو میرے لیے ہانڈے کی تلاش کا تھا اور سامنے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اونچے اونچے فلک گیر درخت تھے۔ راستہ روکتی ہوئی بیلیں تھیں۔ اُن سے بچتا بچاتا میں تیزی سے آگے بڑھا تو اچانک کچھ فاصلے پر ایک پتھر اچھل کر نیچے گر گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ ہانڈا ابھی تک یہیں تھا۔ وہ جان بوجھ کر مجھے غلط راستے پر لگا دینا چاہتا تھا مگر جیسے ہی میں اس پتھر کی طرف لپکا کسی نے پوری قوت سے ایک اور پتھر میری طرف پھینکا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پاؤں سے لپٹی جھاڑی کو ہٹانے کے لیے میں اس وقت نیچے جھک گیا تھا ورنہ میرا سر پھٹ چکا ہوتا۔ میں نے وہیں جھاڑیوں سے لپٹ کر درختوں پر نظر جما دی۔ میرے سامنے ایک اُونچا پیڑ تھا جس کی گھنی شاخوں میں سے مجھے ہانڈے کے پاؤں جھانکتے دکھائی دیے۔ وہ بدمعاش ہم سے ابھی کچھ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اسے درخت یاد آئے اور وہ اُن پر جا چڑھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اسٹین گن سیدھی کی، تو ہانڈے نے پھر ایک پتھر میری طرف پھینکا۔ اب کی اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ پتھر میری ٹانگ پر لگا تو میں نے ہانڈے کو للکارتے ہوئے کہا۔ "نیچے اُتر آ ہانڈے! ورنہ تو میری گولی کی زد میں ہے۔ نیچے اُتر آ۔" مگر میری بات پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ایک اور شاخ کا سہارا لیا اور تیزی سے دُوسرے درخت پر جا چڑھا۔ شہتوت کا درخت اس کے لیے زبردست سہارا بن گیا تھا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی تیزی سے اُٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ کسی باندر کی اولاد چھپکلی کی طرح جھول کر آگے نکل گیا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ کس طرف بڑھ رہا ہے۔ ابھی وہ تیسرے درخت پر ہی چڑھ سکا تھا کہ میں اس تک جا پہنچا۔ وہ میری زد میں تھا۔ اس کو مار لینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر جانے کیا بات تھی میرا ہاتھ لبلبی پر جا کر مڑ جاتا تھا۔ کیا وہ خدا خوفی تھی؟ کیا میں اندر سے بدل گیا تھا؟ اس لمحے مجھے یہ احساس ہُوا کہ میں اسے مار نہیں سکوں گا۔ میری بندوق لاٹھی بن گئی تھی۔ ہانڈا تیزی سے اگلی شاخوں تک جا پہنچا تو میں نے اسٹین گن کندھے پر لٹکائی اور اس کا تعاقب کرنے کے لیے درخت پر جا چڑھا۔

"ہانڈے رُک جا ورنہ میں تجھے گولی مار دُوں گا۔" مگر اس نے میری بات نہیں سُنی بلکہ پلٹ کر اس نے ایک اور پتھر میری طرف دے مارا۔ وہ میرے سینے پر لگا۔ ضرب خاصی شدید تھی مگر میں سہہ گیا اور بالآخر میں اس شاخ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا آخری سرا پکڑ کر وہ اگلے درخت تک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاخ کو میں نے پُوری قوت سے جھٹکا جو دیا تو وہ اگلے درخت تک پہنچنے سے پہلے ہی نیچے جھول گیا۔ اب وہ بالکل میرے نیچے تھا۔ شاخ بہت زیادہ جھک گئی تھی۔ میں نے اس کی گرفت کمزور کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کا ساتھ دیتا ہُوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا، چیختے ہوئے بولا۔

"مجھے معاف کر دو بھاجی! مجھے چھوڑ دو میرا کوئی قصور نہیں ہے بھاجی مجھے چھوڑ دو۔" وہ بکنے لگا تھا۔ اس کی آواز سن کر مجھے طیش آنے لگا اور میں نے پوری قوت سے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔

"ذلیل! ایک چور دُوجے چتر! تو میرے ساتھ چلے گا کہ نہیں؟" میں نے اس کی گردن پر پنجہ گاڑتے ہوئے کہا۔

"چلوں گا، ضرور چلوں گا۔ پر بھاجی میرا قصور کوئی نہیں ہے۔ میں نے تو بچّی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"وہ تیری ماں ابھی تک وہاں بیٹھی ہے ہانڈے! چل اُدھر آ لگ۔" میں نے اُسے اپنے سامنے ہانکتے ہوئے کہا۔ اور اسٹین گن کو ہاتھ میں لے کر اسے بڑ کی طرف لے چلا۔ اس عرصے میں مسولینی خدا جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا پھر بچّی کے پاس جا ٹھہرا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

"شکر ہے یہ تمھیں مل گیا ہے یہ جولاہے کا پتر۔ ورنہ میں سمجھا کہ یہ گیا ہاتھ سے، اسے میرے حوالے کرو میں اس کا تختہ توڑ دوں گا۔ کیوں اوئے کیا سمجھ کے بھاگا تھا تو ہائیں!" مسولینی نے ہانڈے کو بالوں سے پکڑ کر زمین سے کئی ہاتھ اوپر اچھال کر نیچے پھینکا۔ وہ بیچارہ چیختا چلاتا پھر اُٹھا، بولا۔

"مجھ کو معاف کر دیو بھاجی! مجھ کو چھوڑ دیو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے! آؤ بچّی! اس شیر خان کو ادھر ہی لیٹنے دو۔ آؤ میری بہن اور یہ رات ہمیشہ یاد رکھنا۔ ظلم کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالنا۔ پور پور کٹ جانا۔ تمھیں میری یہی نصیحت ہے۔"

"وہ۔۔۔۔ وہ تھے بھاجی! اور میں تنہا عورت ذات۔۔ ان کتوں سے کیسے اپنی جان بچا لیتی۔"

"جان کی کوئی قیمت نہیں ہے میری بہن! تم اپنی آبرو سے ہاتھ دھو رہی تھیں اور یہ بھیڑیے یہی چاہتے تھے۔ جان سے مارنے کی دھمکی دے کر تمھیں لُوٹ لینا چاہتے تھے اور تم نڈھال ہو گئیں۔ ایسا کبھی مت کرنا خواہ تمھاری زندگی پتال جنتر پر رکھ دی جائے۔ تمھاری ماں کیسی بدنصیب ہے کہ وہ تمھارے پیچھے بھی نہ آ سکی۔"

"وہ کیسے وہاں سے نکلتی؟ کیمپ کے اردگرد تو سرنگیں بچھی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے مگر وہ کیوں رُک گئی؟ وہ کسی سرنگ سے مر جاتی تو میں سمجھتا اس نے اپنی بیٹی کی عزت بچا لی ہے۔ اس کی زندگی میں تو تجھ پر یہ حرف نہ آتا۔"

"کیا کہتے ہو تم! وہ بیچاری کیا کر سکتی تھی۔ تم نے سنا نہیں سینتالیس میں سکھوں نے کیسی کیسی آبرومند عورتوں کو ماں باپ کے سامنے ذلیل کر دیا اور وہ میری بہنیں اُن کے سامنے نڈھال ہو گئیں اور پھر وہیں رہ گئیں۔ سکھوں کے بچے انھوں نے جنے، مغویہ بن گئیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیونکہ انھیں اپنی جان عزیز تھی۔" یہ کہتے ہوئے مسولینی نے ایک زبردست ہاتھ ہانڈے کی گردن پر مارا۔ وہ آڑا ترچھا ہو کر چل رہا تھا اور بہانہ وہ یہ کرتا تھا کہ جھاڑیاں اسے راستہ نہیں دیتی ہیں۔

"سیدھا ہو کے چل اوئے کھوتے دے پتر! اترے یہ دونوں چھرے میرے ہاتھ میں ہیں، یہ دونوں میں تیری کمر میں گھسیڑ دوں گا۔"

ہانڈا گردن پر ضرب پڑنے سے سیدھا ہو کر چلنے لگا۔ پتہ نہیں اسے کیمپ تک جانے میں کیا قباحت نظر آتی تھی۔ اور ابھی تک اس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ اُن سرنگوں سے کیسے بچ کر باہر نکل آتے اور بچّی کو بھی اٹھا لاتے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

"کیوں بھئی ہانڈے! یہ قصہ کیا ہے، تُو اس کیمپ سے کیسے باہر نکلا؟ تجھے پتہ ہے کہ باہر سرنگیں بچھی ہیں؟"

"وہ جی دراصل ناہم کیمپ کے کنارے پر لگے ایک درخت پر جا چڑھے تھے۔ بچّی کو باہر لانے کے لیے ہمیں بڑے جتن کرنے پڑے۔ ہمارا رسّہ ابھی تک درخت پر لٹکا ہو گا۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ دیکھ دھیان سے چل، یہ کوئی قبر ہے کیا؟" مسولینی نے ایک بڑے سے گڑھے کے پاس رُکتے ہوئے کہا۔ ہانڈے نے بھی وہاں پہنچتے ہی قدم روک لیے تھے۔ گڑھے پر ڈھیر سارا ملبہ پڑا تھا۔ کچھ گھاس پھوس اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے ہانڈے! کس گدھے نے تیرا یہ نام رکھ دیا تھا؟" مسولینی نے سخت بدمزہ ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ جی دراصل یہ بھی ایک ذات ہے ہندوؤں کی۔ پھر ہم مسلمان ہو گئے اور اب میرا نام افضل ہے اور ہانڈا میری ذات گوت۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اب اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بے بس ہو چکا ہے۔ ہم اُسے وہاں سے جانے نہیں دیں گے۔

"میں پوچھتا ہوں یہ گڑھا کیسا ہے؟" مسولینی نے نیچے جھانک کر کہا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ دراصل اُن لوگوں کی قبر ہے جو کیمپ میں مر جاتے ہیں۔ یہاں اس برسات میں ہیضہ پھیل گیا تھا۔ بہت سی عورتیں مر گئی تھیں۔ یہ اُن کی قبر ہے۔"

"ہیضے سے مر گئی تھیں اور وہ یہاں دفن کر دی گئیں، کتنی ہوں گی تیرے اندازے کے مطابق؟"

"وہ جی بھاجی دراصل کوئی اسّی کے قریب عورتیں مر گئی تھیں۔ سارا کیمپ ہی اُجڑ گیا تھا۔ اب جا کے ذرا رونق ہوئی ہے۔"

"ہوں۔ مرد بھی مرے ہوں گے؟"

"جی وہ بھی مرے تھے مگر وہ اُدھر نہر کے قریب ہی دفن کر دیے گئے۔ اُن کی تعداد تو دو سو کے قریب تھی۔ ایسی قبریں تو اس جنگل میں کئی ہیں۔"

"جب ہی اِن کو نئے مزدوروں کی ضرورت پڑی ہو گی۔ ہُوں! ٹھیک ہے بچّے! چل اب آگے چل۔" مسولینی نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اور ہم بچّی کے ساتھ گڑھے کے کنارے کنارے چل کر آگے بڑھ گئے۔ کوئی ڈھائی فرلانگ تک ہمیں وہ جنگل عبور کرنا پڑا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ہانڈے کو ماروں، اتنا کہ اس کا پوست اتار دوں مگر ابھی ہمیں اس کی ضرورت تھی۔ وہ ہمیں اس دھندے میں ملوث بہت سے چہرے دکھا سکتا تھا۔ ایسے چہرے جو بظاہر بڑے خدا ترس ہوں گے۔ بہت پلاؤ زردہ کھانے والے شریف بھلے مانس۔ آنکھوں میں حیا اور مروت رکھنے والے مگر اندر سے مسلح۔ ایسے مسلح کہ دل میں زہر بھرے پُونک لیے پھرتے ہوں گے۔ وہ آدمی کو اس کی جڑ سمیت بستیوں سے اکھاڑ لاتے ہوں گے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئے۔ کسی کو خبر نہیں ہو گی کہ زندہ ہیں کہ مُردہ۔ اُن کے عزیز و اقارب انھیں رو دھو بیٹھے ہوں گے۔ شہر شہر، قریہ قریہ اُن کے لیے ڈونڈی پٹی ہو گی۔ کوئی سمجھا ہو گا اس کا بیٹا، اس کا باپ، اس کی بیوی، اس کی ماں اس سے ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔ اخباروں میں اشتہار چھپتے ہوں گے مگر کوئی بھی اُن میں گھر لوٹ کر نہ جا سکا کہ واپسی کے سارے راستے ان بیگار لینے والوں نے بند کر رکھے تھے۔ وہ شکار کے منہ میں ایسا پوزمال ڈالتے تھے کہ اسے نہ اپنے اصل کی خبر رہتی تھی نہ اخیر کی۔ وہ اسے بے لباسی کا لباس پہنا دیتے تھے۔ نہر پر کام کرنے والے لوگ ایسے ہی ہوں گے۔ وہ جو عورتیں کیمپ میں موجود تھیں ان کا حال بھی یہی ہو گا۔ وہ سب سے پہلے آدمی کی عزت پر حملہ کرتے تھے پھر اس سے اس کی انا، اس کی خودداری۔۔۔۔۔ چھین لیتے ہوں گے۔ وہ کیسے سنگدل لوگ تھے اور بچّی کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی۔ اس کے پھولوں کا پُولن اُترنے ہی والا تھا کہ ہم وہاں جا پہنچے تھے ورنہ کون اُن کی مدد کو آتا ہو گا۔ اتنے دور دراز علاقے تک کس کی رسائی ہو گی؟ یہ تو جیلانی ہی تھا جو بہن کی جاگیر کے ایک گاؤں کو پھر سے آباد کرنے کے لیے اس طرف نکل آیا تھا۔ یہ پھوڑا تو میرے ہی سر میں نکلا تھا اور میں ایسا یوتن کا مارا آدمی تھا کہ آسیہ کے حکم کا پابند ہو کر رہ گیا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیسی پہاڑ والی کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ اور میری راہ کی مشکلات کیا کیا ہوں گی اور مجھے کیسی کیسی کھائیاں عبور کرنی پڑیں گی۔

اب ہم اس جگہ جا پہنچے تھے جہاں سے جنگل صاف کر کے عورتوں کا کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ ہانڈے نے ہمیں کوئی سو گز دور روک لیا۔ اسے ہماری نہیں بلکہ اپنی زندگی عزیز تھی۔ یہ اچھی بات تھی کہ اس نے بارودی سرنگوں کے بارے میں ہمیں پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ شیر خان زندہ ہوتا تو شاید وہ ہمیں ان کے بارے میں کچھ نہ بتاتا۔ اس کی آنکھ میں مجھے سؤر کا بال نظر آتا تھا۔ بہت چالاک آدمی تھا وہ۔ اچھا ہوا اسے نکی نے ختم کر دیا۔ اس کا مغز ہی کھول دیا۔ ورنہ وہ ہمارے لیے مصیبت بن جاتا۔ جان بوجھ کر وہ ہمیں ان سرنگوں کی طرف دھکیل دیتا۔ ان جانے میں آدمی سے کوئی بھی بھول ہو سکتی ہے مگر جو جانتا ہے اس کے کہنے پر عمل کر کے کسی کو بھی کھائی کھڈے میں اتارا جا سکتا ہے کہ جو نہیں جانتا اور بے کھٹکے آگے بڑھا جاتا ہے جاہل ہے اور جہالت ظلم ہے، اپنی جان پر بھی اور اپنے عقب میں آنے والوں کے لیے بھی۔

ہانڈے نے ہمیں ایک درخت کے پاس روک دیا۔ کیمپ کی کیفیت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا برآمدہ سا تان دیا گیا تھا جس کے اندر فرش پر بستر بچھے تھے۔ اس برآمدے کے گرد سردی سے بچنے کے لیے ایک چار انچ چوڑی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ اور آدمی کے سارے پنج پاتر اس کے سامنے رکھ دیے گئے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت کئی عورتیں اس برآمدے سے باہر کھڑی تھیں اور کسی معاملے پر شور مچا رہی تھیں۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ کوئی بوڑھی ہے۔ نکی نے اسے دیکھا تو رونے لگی۔

"یہ میری ماں ہے۔ میری بدنصیب امبڑی۔ وہ میرے لیے رو رہی ہے، مجھے اس شیر خان نے اس سامنے کے درخت کے ذریعے اوپر کھینچ لیا تھا۔ وہ دیکھیں وہ رسّا ابھی تک سامنے نظر آ رہا ہے۔"

"ہوں، اور یہ ہانڈا بھی اس کے ساتھ تھا؟"

"ہاں۔ اس نے تو میرے منہ پر کپڑا باندھا تھا۔"

"ہوں۔ نکی تم چاہو تو اس رسّے کی مدد سے واپس جا سکتی ہو۔" میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جی بڑی مہربانی آپ کی بھائی جی! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میری ماں میرے بغیر مر جائے گی۔" اس نے پھر بڑی عاجزی سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"فکر نہ کرو۔ یہ ظلم جلدی ختم ہو جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو بھائی جی! اللہ آپ کو ہمت دے یہاں کوئی نہیں ہے جو ان بدنصیبوں کی آواز سن سکے میرے ویر!" اس کے پھر آنسو بہہ نکلے۔

"ایسا نہیں سوچتے! اللہ سے ہر وقت مدد مانگتے رہنا چاہیے۔ بہن جی! وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔" اس کی آنکھیں جھرنا بن گئی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر میرے بھی آنسو بہہ نکلے۔ میں کیسے ان لوگوں کی مدد کر سکوں گا پروردگار! مجھے جرأت دے ہمت دے۔ ورنہ تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ اتنے سارے انسان، یہ عورتیں، مرد، یہ بوڑھے، یہ بچے آخر یہ کس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں میرے مولا! ان ظالموں کو تو غرق کیوں نہیں کر دیتا۔ دریا ابل کر اوپر تک کیوں نہیں چڑھ آتا؟ ان سب کو تہس نہس کر دینے کے لیے کیا تیرے پاس ایک بھی چھل، ایک بھی لہر باقی نہیں رہ گئی ہے؟ میرے پروردگار تو... تو آخر کس بات کا، کس دن کا، کس جان کے زیاں کا انتظار کر رہا ہے؟ یہ... یہ تو بہت ہی نحیف، بہت ہی کمزور اور بڑے ہی بے جان لوگ ہیں۔ ان کا جرم ہی یہی ہے کہ یہ ضعیف ہیں۔ اپنا دفاع نہیں کر سکتے اور یہی بات ان کی اسیری کا سبب بن گئی ہے مگر... مگر تو نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا پھر... پھر تو ان کی مدد کیوں نہیں کرتا؟ یہ جو بستیوں سے نکال دیے گئے، ان سے ان کے گھروں کی چھتیں چھین لی گئیں، جو اپنے آنگن سونے چھوڑ آئے، جو ہر شے سے محروم کر دیے گئے۔ آخر تو ان کی فریاد کیوں نہیں سنتا ہے کیا... جنگل کا قانون ہی اس دنیا میں رائج رہے گا؟ کیا اسے کوئی نہیں بدل سکے گا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور نکی کی عاجزی اور حلیمی، اس کی انکساری، اس کے وہ جڑے ہوئے ہاتھ اور ریزہ ریزہ ہو کر بہتی ہوئی آنکھیں مجھے جینے نہیں دیتی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہاتھ میں بھری اسٹین گن لے کر نکل جاؤں اور ان سب کو تہس نہس کر دوں جو اتنے سارے لوگوں کی اس قدر ذلت و رسوائی کا سبب بنے ہوئے ہیں مگر میں ابھی کیمپ کے اس کنارے کھڑا ایک یکہ و تنہا آدمی تھا جس کے حوصلے کی داد تو دی جا سکتی تھی مگر جس کی قوت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا، سوائے خدا کے۔ جس کو گواہ بنا کر میں سوچتا تھا کہ میں اب کسی کا خون نہیں بہاؤں گا کہ میرے ہاتھ میں تو خدا نے مسیحائی بھر دی ہے۔ اعجاز دے دیا ہے سحر آفرینی بخش دی ہے۔ میں کسی پر ہاتھ نہ اٹھانے کا وعدہ اپنے دل میں کر رہا تھا مگر... میرے سامنے اتنے سارے لوگ رسوا ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی جان اور آبرو کچوں کا قصہ بن گئی تھی۔ اور... اور انہیں دیکھ کر میں پھر سے وحشی بننے لگا تھا۔ میرے اندر ایک جنوں خیز آگ بھڑکنے لگی تھی۔ میں تو صرف لاڈی کے لوگوں کو واپس لینے آیا تھا مگر میں دیکھتا تھا کہ وہاں ان جیسے ہزاروں لوگ تباہ ہو رہے تھے۔ ان گنت ایسے تھے جن کی قبریں بن چکی تھیں اور ان میں وہ بے نام و نشان دبا دیے گئے تھے۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو براہ راست ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہوں گے مگر ہانڈا ان کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ بہت ایسے تھے جنہیں ہیضے نے مار دیا تھا کیونکہ ان کیمپوں میں حفظان صحت کے کسی اصول کی پیروی ہی ناممکن تھی اور ارد گرد گھنا جنگل تھا جو ملیریا اور دوسری ہر قسم کی بلاؤں سے پٹا ہوا... اور کوئی نہیں تھا جو ان امراض پر پیسہ خرچ کرے۔

عورتوں کے اس جمگھٹے کو سامنے دیکھ کر نکی تیزی سے درخت کی طرف لپکی۔ درخت کی شاخیں خاردار تار کے اوپر سے گزر کر خاصی آگے نکل جاتی تھیں۔ نکی بڑی مشکلوں سے ان شاخوں تک پہنچی اور پھر وہ دھم سے نیچے کود گئی۔ خاردار تاروں کے باہر کوئی دس فٹ تک وہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں اور ہم ابھی تک اس حد سے خاصے دور تھے۔ جیسے ہی وہ کیمپ کے احاطے میں اتری عورتوں نے اسے دور سے دیکھ کر دہائی مچا دی اور اس کی ماں عورتوں کے جھرمٹ میں دوڑتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

"تو کہاں چلی گئی تھی نکی؟ اور یہ چادر تجھے کس نے پہنا دی ہے میری بچی! کیا حال ہو گیا ہے تیرا؟" اس کی ماں بلکتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"میں ٹھیک ہوں ماں! اللہ کے ایک نیک بندے نے مجھے بچا لیا۔ وہ اب خود ان سے نمٹے گا تو فکر نہ کر ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"پر تیرا حال کیا ہو گیا ہے، یہ چادر تجھے کس نے دی ہے؟"

"یہ اسی کی چادر ہے جو مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ میرا بدلہ اللہ نے لے لیا ہے۔ وہ شیر خان تھا ماں جی! اور دوسرے کا نام ہانڈا ہے۔"

ابھی یہ بات نکی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ چار پہرے دار ہاتھوں میں چابک لیے ان عورتوں کی طرف بڑھے اور انہوں نے کسی سے کچھ پوچھے بغیر ان پر چابک برسانے شروع کر دیے۔

وہ بے چاری چیختی چلاتی ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے چابک برسانے کی وجہ پوچھتی۔ عورتیں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں، ان میں نکی بھی تھی اور اس کی ماں بھی۔ وہ چاروں گرانڈیل جوان ان پر عذاب بن کر نازل ہو رہے تھے۔ ان کے چابک کسی بھی طرح نہیں رکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کیمپ کے اس حصے میں کس لیے جمع ہیں۔ کوئی دس ہی منٹ میں انہوں نے میدان صاف کر دیا۔ عورتیں چیختی چلاتی ہاہاکار مچاتی ہوئی برآمدے کے اندر گھس گئیں۔

"سب مل کے ڈرامہ لگا بیٹھیاں نیں، خبردار! جے کوئی باہر نکلی تے گوڈے بھنڈیاں گے۔" ایک آدمی ہنکارتے ہوئے بولا۔ وہ اب اپنا لمبا چابک لپیٹ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر فارغ ہوا ہو۔

پھر وہ چاروں برآمدے سے باہر کھڑے اس درخت کی طرف دیکھنے لگے جس کے ذریعے نکی نیچے اتری تھی۔

"اوئے گوبے! اس درخت کو کٹوا دے کل۔ آری پھروا دے اس پر ورنہ کوئی اور مصیبت آ جائے گی۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ کل میں اس کا بندوبست کر دوں گا پر یہ نکی بچ کر کیسے نکل آئی ہے؟"

اب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے تھے۔ خاردار تار سے وہ کوئی دس ہاتھ دور ہوں گے کہ سوہنی نے کچھ سوچے سمجھے بغیر خنجر سیدھے ہاتھ میں لیا اور ان کی طرف پھینک دیا۔

اس طرح کہ وہ سیدھا اس آدمی کے سینے میں جا اترا جس نے اپنا چابک تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ خنجر لگتے ہی بھیانک چیخ مار کر زمین پر گر گیا۔ ہاتھ اس کا خنجر کے دستے پر تھا مگر وہ اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ بہت تگڑے جُثّے کا آدمی تھا وہ، خنجر کی ایک بھی ضرب نہ سہہ سکا۔ وہ جیسے ہی نیچے گرا دوسرے آدمی ایک دم چونک کر پیچھے ہٹے مگر مسولینی تو شاید پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرا خنجر پھر ان کی طرف پھینک دیا۔ وہ بھی کارآمد ثابت ہوا اور دوسرے آدمی کی کمر میں دھنس گیا۔ اس کا رخ برآمدے کی طرف تھا۔

وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تو دوسرے آدمیوں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر مسولینی میرے روکنے کے باوجود درخت کے اگلے حصے پر جا چڑھا تھا اور اب وہ کیمپ میں اتر رہا تھا۔ اس کے پاس ہتھیار کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی عورتوں پر یہ ظلم و ستم برداشت نہ کر سکا تھا۔ اس نے شاخوں پر جھول کر کیمپ کے احاطے میں چھلانگ لگا دی۔

دوسرے دونوں آدمی اس عرصے میں بھاگ کر برآمدے کے بائیں نکڑ تک جا پہنچے تھے جہاں ان کے ہتھیار پڑے تھے مگر مسولینی نے ان کو دم نہیں لینے دیا۔ وہ اپنے دونوں خنجر زخمیوں کے جسموں سے کھینچ کر ان کی طرف لپکا۔ اس عرصے میں وہ دونوں سنبھل چکے تھے۔ مسولینی جیسے ہی آگے بڑھا، انھوں نے اسے تاک کر گولی چلا دی۔ ایک نہیں دو گولیاں مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ مسولینی ایک دم کتنی ہاتھ اوپر اچھل کر برآمدے کی دیوار تک جا پہنچا۔ وہ انھیں بڑی بے نقط سنا رہا تھا۔ اب مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے اسٹین گن سیدھی ہاتھ میں لی اور پیشتر اس کے کہ وہ دوسری گولی چلاتے، میں نے ان کو اپنی گولی میں پرو لیا۔ مگر میں صرف ایک ہی آدمی کو روک سکا تھا۔ گولی کی آواز سے سناٹا کھلکھلا اٹھا۔ برآمدے کے اندر چھپی عورتیں چیخنے لگیں۔ جنگل کے چرند پرند بھی پریشان ہو گئے۔ مسولینی نے دوسرے آدمی کو وہاں سے بھاگتے دیکھا تو ایک دم آگے بڑھ کر اس کے ساتھی کی بندوق اٹھائی اور چوتھے پہریدار کو للکار کر گولی چلا دی۔ وہ اس وقت تک بڑے گیٹ کے قریب پہنچ چکا تھا، وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس سے اٹھا ہی نہ جا سکا۔ گولی اس کی گردن میں سے گزر گئی تھی۔ مسولینی نے بھاگ کر اس کی بندوق اٹھالی اور بڑی گرجدار آواز میں بولا: "تم ادھر آجاؤ سردار صاحب! یہ چاروں ختم ہو چکے ہیں اور کوئی مجھے نظر نہیں آتا۔"

"میں اندر نہیں آؤں گا۔ بہتر ہے تم واپس آجاؤ۔"

"اب ان عورتوں کی حفاظت ہم کریں گے، آپ یہاں آجائیں۔"

میں نے دیکھا کہ مسولینی نے ہانڈے کو عجیب انداز سے باندھ رکھا تھا۔ اس طرح کہ جب وہ درخت پر چڑھا تو اس نے ہانڈے کے دونوں بازو اٹھا کر ایک شاخ کے ساتھ رسی سے باندھ دیے تھے اور وہ بے چارہ زمین سے کئی ہاتھ اوپر درخت کے ساتھ جھول رہا تھا۔ پتا نہیں مسولینی کو وہ رسی کہاں سے مل گئی تھی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہانڈا اندر کا منظر دیکھنے کے لیے درخت کے ساتھ جھول رہا ہے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ مسولینی نے اس کے ہاتھ اس چھوٹی سی رسی سے کس کر باندھ دیے ہیں۔ ایسے میں اسے ٹھیک نشانے پر گولی چلا کے مار دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا حالانکہ ایک گولی میرے پاس موجود تھی۔

میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ رسی کی گرہ ڈھیلی کر کے میں نے اسے اوپر اٹھایا اور دھڑام سے کیمپ کے اندر پھینک دیا۔ فاصلہ شاید زیادہ تھا یا اسے توقع کم تھی، وہ نیچے گرا تو چیخنے لگا۔ میں نے اسے سیدھا ہی گرایا تھا مگر وہ الٹے سر کے بل گرا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ مسولینی نے مار مار کر ویسے ہی اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ جیسے ہی وہ نیچے گرا میں نے بھی شاخ پر جھول کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ اسٹین گن میرے ہاتھ میں تھی مگر اب اس میں صرف ایک گولی باقی رہ گئی تھی۔ اس کا پچھلا سرا ہانڈے کی ٹانگ سے لگا تو وہ اور زیادہ چاؤں چاؤں کرنے لگا۔

"اٹھ اوئے! میرے ساتھ چل۔۔۔ اٹھ۔" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹا اور کھینچ کر کیمپ کی عمارت کی طرف لے گیا۔ مسولینی اس وقت تک ہر طرف سے فارغ ہو کر برآمدے کے قریب جا کھڑا تھا، بولا: "مجھے ڈر ہے گولیوں کی آواز سے سب طرف تہلکہ مچ گیا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔ بہرحال اسے سنبھالو اور اندر چلو۔ یہ کئی ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ہانڈے کو اس کے حوالے کیا اور بے دھڑک ہو کر اندر جا گھسا۔ عورتیں اس وقت تک چیخ رہی تھیں۔ پہریداروں نے انھیں اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سب کی سب بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ کمرے یوں بنے تھے اس بڑے سے برآمدے کے اندر کہ دس دس فٹ پر چار انچ کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ میں جب اندر پہنچا تو وہ چیخ شور مچانے لگیں۔ وہ سمجھیں کہ میں بھی کوئی پہریدار ہی ہوں۔

"چپ رہو اور میری بات غور سے سنو۔" میں نے بلند آواز سے انھیں منہ بند رکھنے کے لیے کہا۔ ذرا دیر کے لیے ان کا واویلا تھما تو میں نے کہا: "تم میں سے لاڈلی گاؤں کی عورتیں الگ ہو جائیں۔ ہمیں گورایا صاحب نے بھیجا ہے تمھاری مدد کے لیے۔"

میری یہ بات سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ایک بوڑھی عورت لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں ہاتھ نچاتی ہوئی اٹھی اور بولی: "خدا ان کا بیڑا غرق کرے، یہ ہمیں گاؤں سے باندھ کر لے آئے ہیں۔ پتر! اللہ تیرا بھلا کرے گا، ہم تو تباہ ہو گئے تھے۔

اماں جی! اپنے آپ کو سنبھالو، وہ شاید ادھر آجائیں۔ گولی کی آواز ان تک بھی پہنچی ہو گی۔ اگر وہ آئیں تو تمھیں تھوڑی دیر کے لیے ہمیں کہیں پناہ دینی ہو گی۔"

"تو فکر نہ کر پتر! بڑی جگہ ہے یہاں۔" بڑھیا نے ہانڈے کو غضبناک انداز سے دیکھتے ہوئے کہا: "اس کو پکڑ لو اس ذلیل کو۔" یہ کہتی ہوئی وہ ہانڈے کی طرف لپکی مگر میں نے اسے روکتے ہوئے کہا: "اس کو ہم کافی سزا دے چکے ہیں، اسے باندھ کر اندر ڈال دیں ماں جی!"

"نہیں نہیں مجھے جانے دو، ورنہ یہ میری بوٹیاں نوچ لیں گی۔ بھاجی مجھے معاف کر دو۔" مگر اس اثنا میں پانچ چھ عورتیں اس کو پاگلوں کی طرح وہاں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ وہ بچی کی ہمدرد تھیں اور ہانڈے سے پہلے ہی پرخاش رکھتی تھیں۔ جاتے ہی انھوں نے ہانڈے کو دھن ڈالا۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا مگر وہ کسی طرح اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

"ہم اس کو ختم کر کے ہی دم لیں گے، اس کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔"

"یہ مر جائے گا بے چارہ۔ بس کرو، اسے چھوڑ دو۔" مگر وہ بہت زیادہ طیش میں تھیں۔ پتا نہیں وہ لکڑی کیسے اس عورت کے ہاتھ آ گئی۔ وہاں دو دیے جل رہے تھے۔ اس عورت نے ان کی روشنی میں ہانڈے کے سر پر تڑاخ سے وہ لکڑی دے ماری۔ وہ اس کی آخری چیخ تھی جو کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

اس عرصے میں مسولینی نے لاڈلی کی تمام عورتوں کو جمع کر لیا تھا۔ ان میں کوئی بیس کے قریب بچے بھی تھے۔ باقی عورتوں میں بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی۔ ان میں سے بیشتر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لاڈلی کی عورتیں کوئی ساٹھ کے قریب تھیں اور ان میں مسولینی کی بیوی بھی شامل تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح بین کرنے لگی۔ اس کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ مسولینی کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ کئی اور عورتیں بھی اس بین میں شامل ہو گئیں۔ دونوں بچے اپنی ماں سے لپٹ کر رو رہے تھے۔

"مت رو زینب! مت رو۔ میں ان سب کو تباہ کر دوں گا۔ میرے گاؤں کی عورتیں اس حال کو پہنچ گئی ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔" مسولینی نے سسکتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت ہمیں کیمپ کے باہر کئی آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

"وہ آ گئے ہیں بھاجی! ان کو روکو۔" مسولینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پہریداروں کی بندوقیں وہ اٹھا لایا تھا اور ان کے میگزین گولیوں سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔

عورتیں ایک دم سہم گئیں اور دیوار کے ساتھ جا لگیں۔ وہ بچوں کو اپنی اوٹ میں لے رہی تھیں کہ ایک گرجدار آواز کمروں کے سامنے گونجی: "سب عورتیں باہر نکل آئیں اپنے بچوں کے ساتھ۔ کوئی اندر نہ رہے۔"

یہ آواز سن کر مسولینی میرے قریب آ گیا۔ لالٹین کی روشنی سے ہم اس وقت خاصے دور تھے۔ باہر والوں کی نظر ہم پر نہیں پڑ رہی تھی۔

"سنا نہیں تم نے، سب کی سب باہر نکل آؤ۔" یہ کہہ کر وہ شخص دروازے سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے اردگرد کوئی دس آدمی موجود تھے۔ ایک بڑا ہی صبر آزما مرحلہ آ گیا تھا۔ مسولینی نے دو بندوقیں مجھے تھما دی تھیں جن میں سے ایک میں نے اسٹین گن سمیت کندھے سے لٹکا لی تھی۔ عورتیں ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگیں۔ کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان سے کہہ سکے کہ ان کے درمیان دو آدمی بھی موجود ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ ہم ان کو بچانے کے لیے آئے ہیں مگر ہمیں یوں کمرے میں محصور دیکھ کر وہ ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگیں۔

"ان چوکیداروں کو کس نے مارا ہے؟" وہ آدمی پھر بھونکا۔ اس وقت تک چھ عورتیں باہر نکل چکی تھیں۔ وہ ایک دم رک گئیں۔ ان میں وہ بڑھیا بھی شامل تھی جس نے ہانڈے کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تھی۔

وہ پھر ہاتھ نچا کر بولی: "وہ گولیاں درخت کی طرف سے آئی تھیں۔ اس درخت کی طرف سے۔" بڑھیا نے زمین پر پڑا ایک روڑا اٹھا کر خاردار تاروں کے باہر پھینک دیا۔ روڑا زمین پر گرتے ہی کئی دھماکے ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا یہاں تک کہ چار سرنگیں پھٹ گئیں۔ ان کی آواز اس قدر دہشت ناک تھی کہ باقی عورتیں دروازے کے قریب رک کر پیچھے لوٹ آئیں۔ میں مسولینی کو ساتھ لے کر اب دیوار کی اوٹ میں جا کھڑا تھا، اس طرح کہ ہم ایک چھوٹی سی کھڑکی میں سے اپنے سامنے کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ دھماکوں کی آواز چاروں طرف پھیل گئی تھی جس سے ایک بار پھر جنگل میں افراتفری سی مچ گئی۔

"باہر نکلو! میں کہتا ہوں سب کی سب باہر نکل آؤ۔" اس آدمی نے پھر بڑی دہشت ناک آواز میں کہا: "ابھی کرنل صاحب اس کیمپ کا معائنہ کریں گے۔ تم نے یہ کیا کر دیا ہے بڑھیا! ادھر بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

"مجھے بھی پتا ہے، زیادہ چیخو مت۔ لاؤ اس کرنل کو ادھر لاؤ، میں خود اس سے بات کروں گی۔"

اس آدمی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا ایک زبردست چھانٹا بڑھیا کے منہ پر دے مارا۔ وہ پریشان حال عورت اس ضرب کو [illegible] نہیں کر سکتی تھی۔ [illegible] کر نیچے جا گری اور اس کے ساتھ ہی [illegible] چلا دی۔ اُف میرے

پروردگار! اُس کا غیظ و غضب دیدنی تھا۔ رُوپہلی چاندنی میں وہ آدمی گولی کھاتے ہی اُچھل کر نیچے گرا اور اس کی بندوق کئی گز دُور جا پڑی۔ عورتیں پھر پاگلوں کی طرح کمرے کی طرف بھاگیں، مسولینی کی گولیاں اب اپنے سامنے کھڑے آدمیوں کی طرف لپک رہی تھیں، وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایک دم زمین پر لیٹ گئے۔ کئی ایک دائیں بائیں بھاگے مگر اس نے آٹھوں کے آٹھوں راؤنڈ ان پر خرچ کر دیے اور پھر وہ جنون خیز انداز سے میری کندھے والی بندوق پر جھپٹا۔ سامنے جو چار آدمی لیٹ گئے تھے وہ اب ہم پر گولیاں برسا رہے تھے مگر ہم اوٹ میں کھڑے تھے۔ اُن کا کوئی بھی نشانہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ تین آدمی مسولینی نے پھر ڈھیر کر دیے۔ اُن کی ملیشیے کی وردیاں چاندنی میں مجھے خون اُگلتی نظر آ رہی تھیں۔

کیمپ بڑا ہی دلدوز خونی منظر پیش کر رہا تھا۔ مسولینی نے حق ادا کر دیا تھا مگر میں ابھی تک لبلبی پر اُنگلی دھرے خاموش کھڑا تھا۔ میرے دل میں وہ اُبال، وہ جوش پیدا ہی نہیں ہو رہا تھا جو مجھے اُن پر گولی چلانے کی ترغیب دیتا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے سامنے کوئی انوکھا تماشا ہو رہا ہو۔ وہ بقولِ خود "چترال ملیشیا" کے سپاہی تھے جو ایک ایک کر کے وہاں ڈھیر ہو گئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی خاردار تار کے قریب سے لیٹ کر گیٹ کی طرف نکل سکا مگر مسولینی نے اُسے بھی نہیں جانے دیا۔ وہ برق رفتاری سے باہر نکلا اور تاک کر اس پر گولی چلا دی۔ وہ بے چارہ سکڑ کر اکٹھا ہوا اور پھر سیدھا لیٹ گیا۔ بندوق ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی مگر وہ اس سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ مسولینی پھر کمرے میں آ گھسا اور بڑے ہی پُرجوش لہجے میں بولا۔ "تم سب دُوسرے کمرے میں چلی جاؤ اور بچوں کا خیال رکھو، میں سب کو دیکھ لوں گا، ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ جاؤ اُدھر۔"

عورتیں ابھی تک مسلسل چیخ رہی تھیں مگر ایک وہ بڑھیا تھی جو مسولینی کو دعائیں دے رہی تھی۔ اور وہ لاڈلی گاؤں سے تعلق رکھتی تھی:

"ان کا خون پی لو مسولینی! کسی کو مت جانے دو۔ تم سے میں خوش، میرا خدا خوش۔ ان شُہدوں نے ہماری عزتوں پر ہاتھ ڈالا ہے وہ ہاتھ توڑ ڈالو۔ توڑ ڈالو وہ ہاتھ۔" بڑھیا بہت طیش میں آ گئی تھی۔ مسولینی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ اب وہ سب عورتیں درمیانی کمرے میں جمع تھیں۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ آنے والا لمحہ اُن سے کیا سلوک کرے گا؟

انھیں وہاں جمع کر کے مسولینی نے اندر کا دروازہ بند کر دیا۔ باہر پہریداروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ کھڑکی میں سے نظر ڈال کر بولا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں سردار صاحب! یہ سب ہی قابل تھے۔ ہاں۔۔ یہ بھی میرے گاؤں ضرور گئے ہوں گے۔ ٹرک ان کے بغیر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کیمپ کے گیٹ سے باہر ہمیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی لوگ تھے جو ہماری تلاش میں پھرتے ہوئے پہاڑی کی تہلٹی کے نیچے ہمیں نظر آئے تھے۔ اور اب وہ عورتوں کے کیمپ تک آ پہنچے تھے۔ اُن کو دیکھتے ہی مسولینی نے اپنی بندوق کا رُخ گیٹ کی طرف پھیر لیا۔ قدیم خان اُن کی رہنمائی کر رہا تھا —— اُن کی تعداد کوئی سولہ کے قریب تھی۔ گیٹ پر پہرے دار موجود نہیں تھا۔ اس کی لاش گیٹ سے ذرا اندر کیبن کے قریب اوندھی سیدھی پڑی تھی۔ قدیم خان نے اسے دیکھتے ہی گھوڑے کا رُخ ایک دم پھیر لیا۔ ابھی تک وہ مسولینی کی بندوق کی زد میں نہیں آیا تھا۔ گولی چلتی تو وہ اِدھر اُدھر نکل جاتی۔ قدیم خان نے تمام گھڑسواروں کو رُکنے کا اشارہ دیا۔ اور خود گھوڑے سے اتر گیا۔ پتا نہیں اُس نے گھڑسواروں کو کیا حکم دیا تھا۔ وہ چار چار کی ٹولیوں میں خاردار تار سے کوئی دس فٹ کا فاصلہ رکھ کر پھیلنے لگے یہاں تک کہ انھوں نے سارے کیمپ کا محاصرہ کر لیا۔ اس کارروائی کے بعد وہ خود اُن کے قریب سے گزرتا ہوا عین اس درخت کے سامنے آ گیا جہاں سے ہم کیمپ میں کودے تھے۔ چاندنی نے ہر شے کو اُجال دیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم قدیم خان کو سائے میں بھی دیکھ سکتے تھے۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اُن کے سامنے جو لاشیں بکھری ہوئی ہیں وہ کس کے تار برقی کا جواب ہیں اور اُن کے حریفوں کی تعداد کیا ہے۔ مسولینی کی اُنگلی لبلبی میں پڑے پڑے سُن ہو گئی ہوگی۔

وہ بولا۔ "کیا کروں سردار صاحب اسے بھون دوں؟"

"پہلے دیکھو کہ یہ کرتے کیا ہیں۔" شاید اندر کھڑی عورتیں اس محاصرے کو اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ قدیم خان کے سپاہی اس دس فٹ کے حلقے سے دور رہنے پر مجبور تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہاں سُرنگیں بچھی ہیں مگر وہ اتنی گھنی نہیں تھیں۔ قدیم خان نے کچھ دُور اُدھڑی ہوئی زمین بھی دیکھ لی تھی جو سُرنگوں کے پھٹنے سے نمودار ہوئی تھی —— اور اب صورتِ حال کا انھی سُرنگوں کے حوالے سے جائزہ لے رہا تھا۔ وقت اس گھڑی ایک ایک کا دامن پکڑ کر رو رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگلا لمحہ بالکل غیر یقینی تھا۔ قدیم خان سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُن پر کبھی ایسی آفت بھی آ سکتی ہے۔ سامنے اس کے بڑے ہی معتمد چودہ سپاہیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ مسولینی نے اپنے گاؤں کی رسوائی کا بدلہ لے لیا تھا اور ابھی اس کی لبلبی میں بڑی جان تھی۔ اس کے دل میں مر مٹنے کا ارمان سُلگ رہا تھا کہ دُوسرے کمرے میں اس کی بیوی، اس کی عزت موجود تھی۔ اُجڑی اُجڑی

ویران آنکھوں والی مُٹیار، جسے فخر تھا کہ وہ مسولینی کی بیوی ہے مگر اب وہ سارا فخر، ساری خوشی اس حصار میں پہنچ کر ختم ہو گئی تھی اور مسولینی کو اُس کے آنسوؤں نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہاتھ کھلا رکھے۔ موت کو یوں بانٹ دے کہ کوئی ظالم زندہ نہ بچ سکے مگر قدیم خان کو یہ سب کچھ منظور نہیں تھا۔

اُس نے اپنے سپاہیوں کو بیس فٹ اور پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ وہ خاصی منظم تنظیم تھی اور حیرت مجھے یہ تھی کہ سپاہی اس کا ہر حکم بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔ سپاہی فوراً ہی کوئی پچیس تیس فٹ پیچھے ہٹ گئے۔ قدیم خان کو معلوم تھا کہ ہم جو کوئی بھی تھے، عورتوں کے کیمپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم ان سپاہیوں کی تمام بندوقیں اٹھا کر اپنے استعمال میں لا سکتے تھے جو اُن کے کام نہ آ سکی تھیں اور ابھی تک ہمارے سامنے بکھری پڑی تھیں مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم تعداد میں کتنے ہیں۔ یہ بات اُسے معلوم ہوتی تو شاید صورتِ حال بالکل ہی مختلف ہوتی۔ وہ دو چار آدمی مروا کر ہمیں بڑی آسانی سے زیر کر سکتا تھا مگر اس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ آہستہ آہستہ وہ سپاہیوں کو کیمپ کے خاردار تاروں سے پچاس فٹ دُور لے گیا۔ اب وہ ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کیمپ کے عقب میں اس نے کتنے آدمی، کس فاصلے پر ٹھہرائے ہیں۔ صورتِ حال کچھ زیادہ ہی خوفناک ہو گئی تھی۔

"میں ذرا اپنی بیوی کو دیکھ آؤں، آپ دھیان رکھیں۔ جو بھی سامنے آئے اسے گولی مار دیں۔"

"ہاں دیکھ آؤ۔۔ میں خیال رکھوں گا۔" میں نے اس بے در کھڑکی میں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ مسولینی اس وقت وسطی کمرے میں جا گھسا۔ اس کی بیوی وہیں موجود تھی۔ بہت بین کیے تھے اُس نے، پھر بھی ابھی اس کے دل میں بڑے طوفان جمع تھے۔ وہ مسولینی کو بتانا چاہتی تھی کہ اُن پر وہاں کیا کیا ظلم ہوئے ہیں مگر اس کو اسے موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ مسولینی کی گولیاں کیسے کیسے رعنا جوانوں کو خاک و خون میں نہلا گئی تھیں۔ وہ سب کے سب میرے سامنے اوندھے ترچھے پڑے تھے مگر قدیم خان اُن کو وہاں سے اٹھوا نہیں سکا تھا۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کو وہاں سے لے کر پیچھے ہٹ گیا تھا کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہم تعداد میں کتنے ہیں۔ یہی بات ہمارے لیے ڈھال بن گئی تھی مگر کون کہہ سکتا تھا کہ اگلا لمحہ ہمارے لیے کیسا صبر آزما آنے والا ہے۔ دشمن کے منصوبوں کا تو آدمی کو علم نہیں ہوتا۔ تقدیر کا یہی حال ہے۔ اس سے بھی آدمی کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کہ وہ آناً فاناً میں آدمی کو بے بس کر دیتی ہے۔ مسولینی کمرے کی طرف لوٹ گیا تو میں نے اوٹ میں ہو کر سگریٹ سُلگا لیا اور اسے مٹھی میں دبا کر کش لگانے لگا۔ دشمن کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ قدیم خان کسی نئے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے ہم سے وہ وقت لے رہا ہے جس کی اس کو اشد ضرورت تھی۔

میں کوئی ایک گھنٹے تک وہاں کھڑا سُوکھتا رہا مگر اس دوران میرے سامنے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ کوئی پتا تک نہیں ہلا۔ اور یہی حال میرے عقب کا تھا۔ مسولینی پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ میں سمجھا شاید وہ بیوی پر پڑنے والی مصیبت کی تفصیل سُننے بیٹھ گیا ہے۔ اسی خیال کے زیرِ اثر میں کھڑکی سے ہٹ کر کیمپ کے وسطی کمرے کی طرف چل دیا۔ مگر۔۔۔ پہلا کمرہ عبور کر کے جب میں آگے بڑھا تو مجھے عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہیں۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ کیمپ میں تو عورتوں کی خاصی تعداد تھی جن میں بچے بھی تھے۔ اس کمرے کو عبور کر کے جب میں وسطی کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اتنا بڑا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ صرف اُن کے بستر زمین پر بچھے تھے۔ دریاں اور بوریاں۔۔ اور ضرورت کی دوسری چیزیں۔ آدمی کہیں بھی ہو، کیسے ہی حالات سے دوچار ہو، سامان اس کی اشد ضرورت بن جاتا ہے اور وہ سامان تو وہاں موجود تھا مگر اس کو برتنے والے وہاں سے چلے گئے تھے۔ مسولینی کا بھی وہاں کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ میرے لیے یہ زیادہ حیرت کی بات تھی۔

میں تیزی سے اگلے کمرے میں جا گھسا مگر وہ بھی خالی پڑا تھا۔ روشن رات ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ باہر چاندنی ماتھے میں کوئی بڑا ہی دردناک گیت گا رہی تھی۔ اندر سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس کیمپ کو یوں ایک دم اُجاڑ اور تنہا دیکھ کر میرا اعتماد اور یقین بھی درہم برہم ہونے لگا۔ آپ جانیں، یارو! ابھی آپ ایک بھرا پُرا گھر دیکھتے ہیں جہاں آدمی ہی آدمی بھرے ہوں، ان کی خوشیاں ان کے غم آپ کے دل سے ہم آہنگ ہوں، پھر آپ دیکھیں کہ وہاں سے وہ سب لوگ اچانک ہی غائب ہو گئے ہیں تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ میں پاگلوں کی طرح اُن کے فرش پر بچھے بستر، وہ دریاں، وہ بوریاں، وہ بوسیدہ سے کمبل اٹھا اٹھا کر دیکھتا تھا کہ آخر وہ لوگ کیا ہوئے؟ انھیں وہاں سے کوئی کیسے اٹھا کر لے گیا؟ وہ ایک دو تو نہیں تھے۔ اُن کی تعداد کم سے کم سوا سو تو ضرور ہی ہوگی۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ سب کیسے وہاں سے اٹھ گئے اور کیوں اٹھ گئے کہ کسی نے آواز تک نہیں نکالی! کسی نے مجھے ہی خبردار کر دیا ہوتا۔ مسولینی تو یہی کوئی گھنٹہ بھر پہلے مجھ سے الگ ہوا تھا۔ میں ابھی وہ بستر اٹھا اٹھا کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک کرخت دار آواز گونجی۔

"اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اُوپر اٹھا لو۔" میں اس وقت ایک کمبل اٹھانے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ اس آدمی کے صرف پاؤں ہی مجھے نظر آئے۔ جیسے ہی اُس نے آواز بلند کی، میں نے تیزی سے اٹھتے ہوئے اس پر گولی چلا دی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ گولی سیدھی اس کے پیٹ میں لگی اور اسٹین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مگر

اس کے ساتھ ہی کسی نے تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میں بھی اگر فوراً تیزی نہ دکھاتا تو اس رات شاید وہیں ختم ہو جاتا۔ دروازہ جیسے ہی کھلا، میں نے ایک ہی جست میں اس کا تختہ پھر بند کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں نے گرے ہوئے سپاہی کی اسٹین گن اٹھا لی۔ وہ جدید طرز کی اسٹین گن بہت ہلکی بھی تھی اور زیادہ سے زیادہ دو سوا ہاتھ لمبی ہوگی۔ دروازہ ابھی پوری طرح بند نہیں ہوا تھا کہ میں نے اس میں سے اندھا دھند اسٹین گن کی گولیاں گزار دیں۔ چند سیکنڈ میں مطلع صاف ہو گیا۔ میں نے جب پوری طرح دروازہ کھولا تو میرے سامنے دو آدمی اوندھے پڑے تھے اور دونوں شدید زخمی تھے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتا۔ اُن کا لباس بھی پہلے مارے جانے والوں ایسا ہی تھا۔ تینوں کے تینوں ملیشیے کی شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور پاؤں میں سب نے پشاوری چپل پہن رکھے تھے۔ میں نے جاتے ہی پاؤں ایک سپاہی کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کا دایاں بازو شدید زخمی ہو گیا تھا۔

"کون ہو تم اور یہ سب لوگ کدھر چلے گئے ہیں؟ اٹھو اور مجھے بتاؤ انھیں کون لے گیا ہے یہاں سے؟"

اس کا رنگ ہلدی ہو چلا تھا۔ گردن پر میرا بوجھ بڑھا تو وہ زمین پر بایاں ہاتھ رکھ کر اُٹھنے لگا۔ "وہ۔۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ مجھے نہ مارنا۔۔۔ وہ۔۔۔ سب کی سب عورتیں سُرنگ کے راستے نکل گئی ہیں۔"

"اور وہ میرا ساتھی، وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی اُن کے ساتھ ہے، اُسے قدیم خان نے گرفتار کر لیا ہے۔ خدا کے لیے یہ بندوق پیچھے ہٹا لو۔" اُس نے میری اسٹین گن کی نال سینے پر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سُرنگ کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ کمبل ہے نا، اس کے نیچے دروازہ ہے۔" اس نے کمرے کی داہنی دیوار کے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسے دھکا دے کر میں نے کونے تک پہنچا دیا۔ "کھولو اُس دروازے کو۔ یہ کمبل اُٹھاؤ۔" اُس نے میرے کہنے کے مطابق فرش پر پڑا کمبل اٹھایا۔ تو اُس کے نیچے مجھے لکڑی کا ایک تختہ سا نظر آیا۔

"وہ۔۔۔ وہ اسی راستے سے باہر نکلے ہیں۔"

"کون آیا تھا یہاں؟"

"اکرو اور شمیر آئے تھے۔ انھیں قدیم خان نے بھیجا تھا۔ وہ اُن عورتوں کو ہانک کر لے گئے۔"

"اب کہاں ہوں گے وہ؟"

"یہ سُرنگ کوئی پچاس فٹ لمبی ہے۔ اس سے گزر کر کچھ سیڑھیاں آتی ہیں۔ وہاں سے پہاڑی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جنگل کے اندر ہی اندر چل کر قالینوں کا کارخانہ آتا ہے، وہ سب عورتیں وہیں گئی ہوں گی۔"

"ہوں۔۔۔ نیچے اُترو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ سمجھے، تم اتنے زخمی نہیں ہو جتنا ظاہر کر رہے ہو۔ چلو۔" میں نے اُسے تختہ اٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے اتار دیا۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مگر ابھی ہم سیڑھیوں سے اُترے ہی تھے کہ باہر سے ہمیں قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے کچھ اور ساتھی اندر آ رہے تھے۔ میں نے تختہ بند کر دیا۔ اور اس آدمی کو آگے ہانکتے ہوئے اس سُرنگ میں داخل ہو گیا جس میں سے ایک آدمی جھک کر اطمینان سے گزر سکتا تھا۔ سُرنگ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں لالٹین ساتھ نہیں لایا تھا۔ میری اسٹین گن کی نال بہر حال اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے نال کو اور زیادہ دباتے ہوئے کہا۔

"میرا نام شیشہ خان ہے۔"

"ہوں۔۔۔ ان عورتوں کو یہاں کیوں رکھا ہوا ہے انھوں نے؟"

"جی یہ۔۔۔ قالین بافی کا کام کرتی ہیں۔ ایک بہت بڑا کارخانہ ہے یہاں پر، اس جنگل میں۔"

میں نے اُسے دامن سے پکڑ کر روک دیا۔ "مالک کون ہے اس کا؟"

"اُف میرا بازو سُن ہو رہا ہے۔ خون زیادہ بہہ رہا ہے۔" وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے تیلی جلا کر اس کا بازو دیکھا۔ وہ میری گولی سے اُدھڑ کر رہ گیا تھا۔ کہنی سے اُوپر تک خون ہی خون نظر آتا تھا۔ اس کے سوئیٹر کی آستین رنگین ہو گئی تھی جسے میں نے پھاڑ کر الگ کر دیا۔

"ٹھہرو، گلے سے یہ مفلر اتار کر مجھے دو۔ میں تمھارے بازو کو کس کر باندھ دیتا ہوں۔" میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے گلے سے مفلر اتار دیا۔ وہ ریشمی مفلر تھا جسے میں نے اس کے بازو پر اس طرح باندھ دیا کہ زخم تک اس کا خون نہ پہنچ سکے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ مفلر اتنا کس کر بندھ گیا تھا کہ اس کا خون رُکنے لگا۔

"میں بچ جاؤں گا نا جناب؟ دراصل ملیشیا کا یہ لباس اس نہر کی کھدائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کھدائی کوئی ایک سال سے شروع ہے۔ ہماری یونٹ کا کرنل کمانڈنٹ صغر خان ہے، اُن کا قدیم خان ہے، مجھے انھوں نے ہی بھرتی کیا تھا۔"

"کتنے آدمی ہوں گے اُن کے پاس؟"

"یہی کوئی ستر اسّی آدمی ہیں۔ ہم مزدوروں کی دن رات نگرانی کرتے ہیں ورنہ وہ بھاگ جاتے ہیں۔ ہمیں حکم ہے کہ ہم کسی بھی بھاگتے ہوئے آدمی پر گولی چلا سکتے ہیں۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ اس سارے کام کا اصل مالک کون ہے؟"

"میرا خیال ہے کئی آدمیوں کا اس میں حصّہ ہے۔ کروڑوں روپے کا ٹھیکہ ہے۔ ایک حاجی عبداللہ ہے، ایک اشرف صاحب ہیں۔ وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ پھر ایک صاحب ہیں محسن ستناجا صاحب، وہ بھی اس میں حصّے دار ہیں۔"

"کیا کہا تم نے، ستناجا صاحب! اُسے تم کیسے جانتے ہو؟"

"وہ بھی ایک بار یہاں آئے تھے۔ پھر ایک صاحب ہیں اصغر علی، وہ تو رہتے ہی یہاں ہیں، ویسے گھر اُن کا شاہدرہ میں ہے، لاہور کے پاس۔"

"اصغر علی! یہاں کس جگہ رہتا ہے وہ؟"

"قالینوں کے کارخانے کے عقب میں انھوں نے مکان بنوا رکھے ہیں۔ چھوٹا سا گھر ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔ نہر تو ابھی لمبی ہی کُھدی ہے، مگر اُن کی رہائش ادھر ہی ہوگی۔"

"تو یہ بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں واقعی بہت سے حصّے دار ہیں۔ چلو ذرا مجھے وہ کارخانہ دکھاؤ۔"

وہ فوراً ہی زمین پر سے اُٹھ گیا اور میرے آگے جُھک کر چلنے لگا۔ میرا مغز برابر اُلٹتا جا رہا تھا۔ وہ ستناجا صاحب کا نام بھی لے رہا تھا اور اشرف صاحب کا بھی۔ یعنی بڑے بڑے اہم آدمی اس ٹھیکے میں حصّے دار تھے اور انھیں اجازت تھی کہ جتنا چاہیں لوگوں سے بیگار لیں اور بڑے صاحب اس معاملے میں بالکل چُپ تھے۔ جب ہی تو میں دیکھتا تھا کہ اخباروں میں اکثر کسی نہ کسی آدمی کا بیان آتا رہتا تھا۔ ہر بیان کے آخر میں یہی لکھا ہوتا تھا کہ انھیں کوئی نشہ آور دوا پلا کر اغوا کیا گیا تھا اور جب اُن کی آنکھ کھلی تو وہ کسی جنگل میں پڑے تھے یا وہ اپنی کوشش سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔ مگر کہاں سے اور کیسے، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا ——————

لاڈلی گاؤں کے لوگوں کا اغوا بھی کسی ایسے ہی سلسلے کی کڑی تھا کیونکہ ہیضے کی بیماری پھیلنے سے یہاں بہت سے مزدور مر گئے تھے اور نئے مزدوروں کی ضرورت تھی، لہٰذا ان خرکاروں نے لاڈلی گاؤں پر دھاوا بول دیا، مگر یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں اشرف صاحب بھی حصّے دار ہیں اور ستناجا صاحب بھی۔ یہ بات تو اب شیشہ خان نے بتائی جو اس گروہ کا بڑا ہی باخبر کارکن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس کے لیے اور کس کے نام پر یہاں کام کر رہا ہے۔ اب اس کے بازو میں جو زخم کا مُنہ پڑ چکا تھا تو وہ بولنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سارا کام جو وہاں ہو رہا ہے، ظلم اور زیادتی کے ذیل میں آتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ مزدوروں سے بیگار لی جاتی ہے۔ انھیں دن رات کولھو کے بیل کی طرح چلایا جاتا ہے، مگر حالت یہ تھی کہ اُن کو شاید دو وقت کا کھانا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ عورتوں کی بےبسی دیکھ کر تو میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا مگر کوئی اُن کا وہاں پُرسانِ حال نہیں تھا۔ میری سوچ کے زاویے دُور دُور تک پھیل رہے تھے اور میں اتنے اہم اور معزز لوگوں کو جب اس میں ملوث دیکھتا تو میرا خون کھول اٹھتا تھا۔ کیا بڑے صاحب کو یہ بات معلوم تھی؟ اگر معلوم تھی تو پھر وہ کیوں خاموش تھے؟ شیشہ خان بےچارہ یہ سمجھ کر وہاں بھرتی ہوا ہوگا کہ وہ ایک نہر کی کھدائی کا کام تھا، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور اگر جانتا بھی تھا تو وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کام

کی اچھائی یا برائی کے بارے میں سوچنا اس کا کام نہیں تھا مگر میں اس کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا اور اب میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس ظلم اور زیادتی کا ہر قیمت پر مقابلہ کروں گا۔ کہ وہ میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں اُسے ایک مقدس مشن سمجھ کر سرانجام دُوں گا۔ اگرچہ یہ محض اتفاق تھا کہ میں اس جھمیلے میں پھنس گیا تھا مگر۔۔۔ مگر وہ۔۔۔ وہ میرے ہی بھائی تھے، میری ہی بہنیں تھیں جو اس بیگار میں تنہا ماری جا رہی تھیں۔

اب شیشہ خان مجھے اس کارخانے کی طرف لے جا رہا تھا جہاں دنیا کے بہترین قالین بُنے جاتے تھے۔ اس جنگل کے قریب دریا بہتا تھا۔ جہاں اُن کی بہترین طریقے سے دُھلائی ہو سکتی تھی، اور کام کے لیے ایسی عورتیں انھیں مل گئی تھیں جن سے بیگار لی جا سکتی تھی۔ مگر وہ جو نہر کی کھدائی میں مصروف تھے، اُن کا حال تو میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کس حالت میں زندگی گزارتے تھے، کیسے جیتے تھے اور کیسے مرتے تھے۔ اُن پر ان لوگوں نے اپنا چابک کیسے کیسے برسایا ہوگا۔ یہ سب باتیں تو ابھی میرے علم میں نہیں تھیں۔ آسیہ نے اچھا ہی کیا تھا کہ مجھے اتنے بڑے کام کے پیچھے لگا دیا تھا۔ میرا خیال ہے، اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کو کس عذاب میں جھونک رہی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ ممکن ہے وہ لوگ خود ہی لاڈلی سے اُٹھ کر کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ کسی بڑے جاگیردار نے انھیں بڑا لالچ دے کر ٹرکوں میں لدوا لیا ہو۔ وہ شاید یہی سمجھ رہی تھی مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے بھائی کو کس جہنم کی طرف بھیج رہی ہے۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگی کہ لاڈلی کے بےگناہ لوگ ایسے عذاب میں جل بھن رہے ہوں گے۔

ہم اس اندھیرے کے جہنم میں سے باہر نکلے تو شیشہ خان نے اپنی کمر سیدھی کی۔ اس کا خون ابھی تک رِس رہا تھا مگر اب پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔ اس کا مفلر ابھی تک کام دے رہا تھا۔ ہم ایک کھوہ کے بیچ میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں دیوار کی طرح بڑے بڑے بھربھرے پتھر دکھائی دیتے تھے جن پر سبزہ اُگا ہوا تھا۔ اس کے درمیان سے گزر کر ہم آگے بڑھے تو بائیں ہاتھ کو ایک پگڈنڈی دکھائی دی۔

"یہ رستہ کارخانے کی طرف جاتا ہے۔"

"اور وہ مکان بھی ادھر ہی ہے جس میں اصغر علی رہتا ہے؟"

"ہاں، وہ کارخانے کے پچھلے حصے میں ہے۔"

"کیا وہ اس وقت وہاں موجود ہوگا؟"

"میرا خیال ہے وہ گھر پر ہی ہوگا۔ وہ اکثر اوقات اُدھر ہی رہتا ہے۔"

"کبھی تم نے ستناجا صاحب کو دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔ اکہرے بدن کے ادھیڑ عمر آدمی ہیں۔ اشرف صاحب کے ساتھ آیا کرتے ہیں۔"

"اکہرے بدن کے! مگر وہ تو ستنا جا صاحب نہیں ہیں۔"

"اُن کا یہی نام ہے۔"

"میں جن ستنا جا صاحب کو جانتا ہوں وہ اکہرے بدن کے نہیں ہیں۔ بہرحال میں دیکھ لوں گا، چلو مجھے وہ کارخانہ دکھاؤ۔"

"مجھ میں تو ہمت نہیں رہی ہے۔ اس زخم نے نچوڑ لیا ہے مجھے۔" وہ پھر زمین پر بیٹھنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ صحیح کہہ رہا تھا مگر میں اس کو یوں کھلا تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"تمہیں بہرحال میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس میں میں کوئی بھی رو رعایت نہیں کر سکتا۔" میں نے اسٹین گن کی نال اس کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ میری دھمکی کو سمجھ گیا تھا، فوراً ہی اٹھ گیا۔

"چلیں۔ میں تو مجبور ہوں کہ آپ کا حکم مانتا رہوں۔" وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر گھنے جنگل میں جا گھسے۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہاں ابھی تک ان کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ جو مر گئے تھے، وہی ان کے لیے بہت بڑی عبرت کا سامان بن گئے تھے ——— مگر قدیم خان اتنا بودا ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے دشمن عورتوں کے کیمپ میں موجود تھے مگر کتنے؟ اس کی وہ ضمانت فراہم نہ کر سکا ہوگا۔ اگر مسولینی اُس کے ہاتھ آگیا تھا تو اس نے بلاشبہ اس سے پوچھ لیا ہوگا کہ اس کے ساتھ کون تھا۔ یہ بات اس سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ لامحالہ وہ میرے لیے کسی نہ کسی جگہ گھات لگا کر ضرور بیٹھا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ جنگل میں گھستے ہی میں بہت محتاط ہو گیا تھا۔ شیشہ خان پر اعتبار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ جس راستے پر مجھے چلا رہا تھا اُس کے صحیح ہونے کی بھی میرے پاس کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مگر میں اس سلسلے میں بالکل مجبور تھا ——— وہ ایک پگڈنڈی پر کانپتا لرزتا چلا جا رہا تھا اور وہاں جنگل اتنا گھنا تھا کہ راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ چاندنی نیچے اُترتے اُترتے کانپ جاتی تھی۔

اچانک شیشہ خان بے دم ہو کر زمین پر ڈھے گیا۔ اُس کا خون آہستہ آہستہ اتنا زیادہ بہہ گیا تھا کہ وہ اب میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اپنی ہی بندوق کی نال جب کسی دوسرے کے ہاتھ میں جا کر اپنی ہی کمر سے آ لگے تو پھر حوصلہ باقی نہیں رہتا ہے۔ پھر بھی وہ میرا ساتھ دیتا رہا تھا مگر جنگل میں چند ہی قدم چلنے کے بعد وہ تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"اب ... تم آگے چلے جاؤ۔ میں ... میں چل نہیں سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے پگڈنڈی پر ہی سر ڈال دیا۔ اس کی حالت بڑی ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اسے علاج کی ضرورت تھی مگر فوری علاج کا بندوبست وہاں کیسے ہو سکتا تھا، یہ ناممکن تھا۔ گھنے جنگل کی تاریک رات نے مجھے الگ بے بس کر رکھا تھا کہ اس میں چاندنی کا گزر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر شیشہ خان کو کمر پر لاد لیا۔ اس طرح کہ

اس کا زخمی بازو آرام سے میرے کندھے تک لٹک سکے۔ کے لیے اُٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی صابر و شاکر تھا۔ اللہ کا نام لے کر میرے کندھے پر سوار ہو گیا۔ سرکاری فرض کی ادائیگی کے دوران زخمی ہوا ہے اور اس کے لیے اگر اس کی جان بھی چلی جاتی تو اُسے افسوس نہ ہوتا۔ نبض دیکھ لی تھی۔ وہ بہت ہی مدھم ہو رہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں بے ہوش نہ ہو جائے۔ کوئی سو قدم میں آگے چلا ہوں گا کہ مجھے احساس ہونے لگا، شیشہ خان بے ہوش ہو چکا ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ اُس کے زخم کا علاج اور اس کے جسم کی حفاظت ضروری تھی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک جگہ چاندنی کھیت ہوتی نظر آئی۔ وہاں درخت موجود نہیں تھے، شاید انہیں کسی نے کاٹ دیا تھا۔ بس وہی وہ جگہ گھاس کے لیے ہی رہ گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے اسے گھاس پر لٹا دیا۔ اس کی نبض دیکھ کر مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ دم کا مہمان ہے۔ ایسی حالت میں اسے چھوڑ دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ جنگل میں سانپ، بچھو، کیڑے اور سو قسم کی الا بلا ہوگی، اسے ان سے بچانا بھی بہت ضروری تھا۔ اور وہ تنہا آدمی تھا جو مجھے وہاں تک کھینچ لایا تھا۔ وہ ایک طرح سے اس علاقے میں میرا رہنما بن گیا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری صحیح راہنمائی کر رہا ہے۔ سامنے وہ بے ہوش پڑا تھا اور میری بے بسی دیدنی تھی کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کارخانے کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ تمام عورتیں کہاں ٹھہری ہیں اور مسولینی زندہ بھی ہے کہ ختم ہو چکا ہے۔ شیشہ خان نے جس صغر علی کا پتا مجھے دیا تھا وہ بھی کہیں ادھر ہی رہتا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کے گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا اور اس کو راستے میں چھوڑ دینا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایسی حالت میں کہ وہ ابھی زندہ تھا۔

میں کوئی ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شیشہ خان کا بازو میں نے دوسری بار کس کر باندھا اور اس کے زخم پر میں نے ہاتھ رکھ دیا۔ یوں جیسے میں اس خون کو روک دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ مشاہدہ اور تجربہ تھا کہ وہ بات جو میں دل سے چاہتا تھا اور اس کے ہو جانے کے لیے میں خلوصِ نیت سے چاہتا تھا۔ تو وہ ہو جاتی تھی۔ شب خیر میں نے یہی نسخہ استعمال کیا۔ میری توجہ کا ارتکاز ناممکن کو ممکن بنا دیتا تھا۔ لاڈلی گاؤں میں یہ کرشمہ دکھا چکا تھا۔ پتا نہیں شیشہ خان کے لیے میرے دل میں ہمدردی اُمڈ آئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے تک میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اس کا وہ خون جو قطرہ قطرہ رِس رہا تھا، بند ہو جائے۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ میرا ہاتھ جوں جوں اُس کے زخم پر پھرتا رہا، اس کا خون بند ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا زخم بس ایک عام سا زخم بن کر رہ گیا۔ جو دوا کا محتاج ہو۔ گولی اس کا بازو چھید کر آگے نکل گئی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ میری توجہ کا ارتکاز بڑھتا چلا گیا۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ اٹھ جائے، اپنی کمزوری پر غالب آ جائے۔ اور آپ کو یقین کر حیرت ہوگی اور میں بھی اپنی جگہ حیران ہوں کہ وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگا۔ اس وقت تک پو پھٹ چکی تھی۔ اجالے نے اندھیرے کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ رات، وہ تاریک رات بالآخر ختم ہو گئی تھی۔

شیشہ خان نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ میرا ہاتھ اس کے ماتھے پر دھرا تھا۔ میں کوئی جنتر منتر نہیں پڑھ رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی۔ بس میری توجہ کی بات تھی جس کا سارا ارتکاز، سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ اور اپنے پاؤں پر چل سکے۔

"اُٹھ جاؤ یار! تم تو بے ہوش ہو گئے تھے۔ دیکھو تمہارا خون بہنا بند ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو اپنا زخم دیکھ لو۔" اس نے میری بات سنی تو ایک دم اسے اپنا وجود یاد آ گیا۔ وہ گھاس بھی اسے محسوس ہونے لگی جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔

"میں ... میں زندہ ہوں نا؟"

"ہاں ہاں۔ تم زندہ اور تندرست ہو بھائی! اب اُٹھ جاؤ دیکھو صبح ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔ میں بھی یہ اجالا دیکھ سکتا ہوں۔ لگتا ہے صبح زیادہ دور نہیں ہے۔ تم نے مجھے شاید بہت دور سے بلایا ہے۔"

"اچھا! کیا محسوس کر رہے تھے تم؟"

"مجھے یوں لگا جیسے میں بڑے سکھ کی نیند سو رہا ہوں۔"

"کوئی خواب وغیرہ تو نہیں دیکھا تم نے؟"

"خواب! پتا نہیں۔ کئی آدمی میرے ساتھ تھے اور وہ بہت خوش تھے جیسے ان کی کوئی بہت بڑی آرزو پوری ہو گئی ہو۔ اور وہ مجھے روک رہے تھے۔ جی ہاں بالکل روک رہے تھے۔ مجھے وہ سارا منظر خواب ایسا محسوس ہوتا ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہاری بے ہوشی نے تمہیں وہ منظر دکھایا ہو گا۔ اب بتاؤ وہ لوگ کہاں ہوں گے جن تک مجھے پہنچنا ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔"

"وہ زیادہ دور نہیں ہیں۔ یہاں سے کوئی تین فرلانگ پر وہ کارخانہ ہے جس کے آگے وہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ اس سے پرے اُس پہاڑی کے آخر میں اصغر علی کا ڈیرا ہے۔"

"مجھے تم اُس تک لے چلو۔ عورتوں سے میں پھر بات کروں گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔ "خون تو تمہارے کپڑوں پر بھی لگ گیا ہے۔"

"ہاں۔ اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے تمہیں کندھے پر اُٹھا لیا تھا۔ تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا تو مجھے ساری زندگی افسوس رہتا۔ آدمی کو مار دینا چاہیے یا پھر اسے بچا لینا چاہیے۔ تم بچ سکتے تھے، اس لیے میں نے تمہیں اٹھا لیا تھا۔"

"مگر ... میں ٹھیک کیسے ہو گیا؟ یہ خون کیسے بند ہو گیا؟"

"بس یہ اللہ کی مہربانی ہے، اُس نے تمہیں بچا لیا۔" اس کا دھیان اپنی اسٹین گن کی طرف نہیں تھا۔ میں بھی اب اسے مزید دھچکا پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے آرام سے میرے آگے کارخانے کی دیوار سے خاصا ہٹ کر جنگل کے اندر اندر چلتا رہا۔

"یہ ہے وہ کارخانہ۔ عورتیں یہاں ہی لائی گئی ہیں کیونکہ وہ کیمپ میں محفوظ نہیں تھیں اور ہم تمہارے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم تعداد میں کتنے ہو۔ بہت سے آدمی تم نے مار دیے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ بہت ضروری تھا۔ ورنہ وہ ہمیں ختم کر دیتے۔ ایسے میں کئی عورتیں بھی مر جاتیں۔ اسی لیے ہم نے ان کو پہل کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔"

"میلے تم نے کمال کر دیا ہے۔ وہ تمہارا ساتھی اب اُن کے قبضے میں ہے ——— قدیم خان اُس سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ اُس کو ہمارے آدمیوں نے اچانک ہی بے بس کر دیا تھا۔"

"بعد میں تم میری تلاش میں وہاں آئے تھے؟"

"ہاں ——— ہمیں حکم تھا کہ ہم جیسے بھی ہو سکے تمہیں زندہ یا مُردہ حالت میں اُن کے سامنے پیش کر دیں۔"

"وہ تو ظاہر ہی ہے، اچھا ہوا میں نے تمہیں مہلت نہیں دی۔"

"ہاں۔ تمہارے ساتھی نے نہیں بلکہ ایک عورت نے تمہارے متعلق بتا دیا تھا۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے بروقت ٹریگر کیوں نہیں دبایا۔"

"اب بھی تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ تم لبلبی نہ دبا سکے۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک کام نہ کر سکے ہو؟"

"ہاں۔ میرا اندازہ غلط نکلا اور تم نے میرے دو ساتھی مار دیے، محکم علی اور مسکین۔ وہ میرے دوست تھے۔ بڑا وقت ہم نے اکٹھے گزارا ہے۔"

"اس بات کا مجھے بھی افسوس ہے کہ وہ تمہارے دوست تھے۔ تم نے ابھی تک میرا نام نہیں پوچھا ہے؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ پتا نہیں تم کس لیے یہاں آئے ہو اور کیا کھاتے ہو؟ اتنے آدمی مار کر تم زندہ کیسے بچ گئے ہو؟"

"چلو دفع کرو۔ یہ باتیں پھر کبھی ہوں گی، یہ مکان دیکھ رہے ہو تم؟"

"ہاں۔ اصغر علی خان یہاں ہی رہتا ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے تم میرے آگے آگے چلو۔ دستک تم دو گے۔" میں نے ایک پہاڑی طرز کے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

شیشہ خان نے اُس دم بدم تیز ہوتی ہوئی صبح کی روشنی میں بڑے غور سے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ میں ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔ میری کوئی بھی کل سیدھی نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود میری نظروں میں چھپا آہنی عزم اسے متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بولا۔ "تم یہ اسٹین گن بھی اندر لے جاؤ گے؟"

"ہاں۔ یہ میرا تعارف ہے۔ ہتھیار ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ اِس کے بغیر تو شاید میں کچھ بھی نہیں۔"

"مگر اصغر علی خان ہتھیار پسند نہیں کرتے، وہ بہت شریف آدمی ہیں۔"

"ہاں۔ اُن کی شرافت کی تو میں بھی قسم کھا سکتا ہوں۔ تم دستک تو دو۔" اُس وقت سورج نہیں نکلا تھا۔

"میں اُن سے کہوں گا کہ وہ تمھارے زخم کے علاج کے لیے کچھ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ میں تمھارے حوالے ہی سے اُن سے ملوں گا۔" میں نے اسٹین گن اپنی کمر کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازے پر دستک دے دی۔ کوئی دو منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا لب و لہجہ میانوالی کے علاقے کی چغلی کھاتا تھا۔

"کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"بھائی! ذرا دیکھو، یہ سپاہی شدید زخمی ہے، اِس کا علاج بہت ضروری ہے اور اصغر علی صاحب اگر اندر ہیں تو اُن سے کہو کہ سردار کریم نواز آئے ہیں۔"

"سردار کریم نواز! میں انھیں اطلاع دیتا ہوں، کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"بس تم انھیں اطلاع پہنچا دو۔ سردار کریم نواز آئے ہیں۔"

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ عورتوں کے کیمپ میں رات کو ہونے والی افراتفری کی اطلاع انھیں ابھی تک نہیں ملی تھی۔ قدیم خان نے سوچا ہوگا کہ وہ خود ہی اس فساد سے نمٹ لے گا اور پھر عین ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کے آرام میں مخل نہ ہونا چاہتا ہو۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی ورنہ وہ ان لوگوں کو اُس فائرنگ کی اطلاع ضرور دے دیتے۔ وہ ڈراما تو رات بھر ہوتا رہا تھا۔

ہم کتنے ہی جانکاہ مرحلوں سے گزر آئے تھے۔ کئی لوگوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ کئی گھر اُجڑ گئے ہوں گے۔ بہتوں کو تو وہ پہلے ہی اجاڑ چکے تھے۔ وہ سب لوگ بے خاناں ہی تو تھے جو اُن کی بیگار کے لیے وہاں جمع کر دیے گئے تھے۔ کبھی وہ بھی گھر بار والے ہوں گے۔ اُن کے بھی عزیز و اقارب اُن کی راہ دیکھتے ہوں گے مگر وہاں تو وہ بے نام ہو کر رہ گئے تھے اور لفنگے اُن پر حکمرانی کرنے لگے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ پھر کھلا۔ بڑے میاں نے باہر نکل کر کہا۔ "آئیے صاحب! ان کو بھی اندر لے آئیں۔ میرا خیال ہے کہ میں اِن کے زخم پر دوا لگا سکتا ہوں مگر یہ زخمی کیسے ہو گئے؟" میں نے شیشہ خان کو اشارے سے منع کر دیا کہ وہ اسے اصل بات نہیں بتلائے۔ پتا نہیں وہ میرا معمول بن گیا تھا۔ اب تک وہ میرے ہر حکم پر لبیک ہی کہتا چلا آیا تھا۔ چُپ رہ گیا مگر مجھے یہ ڈر ڈسنے لگا کہ اُس نے اگر اندر جاتے ہی اصغر علی کو ساری بات بتا دی تو پھر معاملہ زیادہ ہی خوفناک ہو سکتا تھا۔

ہم چھوٹے سے دس فٹ کے صحن کو عبور کر کے کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا جیسے ہم کسی بہت ہی پُرفضا جگہ پر آ گئے ہیں۔ کمرہ ہر آسائش سے مزین تھا اور اس میں بڑی ہی جان فزا خوشبو بکھیر دی گئی تھی۔ شیشہ خان کو ساتھ لے کر میں صوفے پر جا بیٹھا۔ فرش پر سُرخ رنگ کا خوبصورت قالین بچھا تھا۔ میں سمجھا کہ میں لاہور کی کسی بہت ہی عالیشان کوٹھی میں جا بیٹھا ہوں۔ وہ ...... لوگ جہاں بھی جاتے تھے، اپنے لیے ایک خاص معیار کو ہر قیمت پر برقرار رکھتے تھے۔ اور پھر اصغر علی جیسے آدمی کے لیے تو یہ کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ شیشہ خان کا خیال تھا کہ وہ بہت امیر آدمی ہے۔ اس کے پاس اپنا ہوائی جہاز موجود ہے اور وہ جس جگہ ہمیشہ ہیلی کاپٹر میں آتا ہے اور اب بھی اس کا ہیلی کاپٹر کسی جگہ ضرور کھڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ درست تھا اور یہ اچھی بات تھی کہ وہ مجھے اِس مکان میں مل گیا تھا۔ مجھے اُس سے ہی بات کرنی تھی کہ سرغنہ تو اس سارے سلسلے کا وہی تھا اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس جیسے افراد کی کارستانی کا ہی نتیجہ تھا۔ ورنہ اس ویرانے میں آنے کی انھیں کیا ضرورت تھی؟

بڑے میاں نے کچھ ہی دیر بعد دواؤں کا ایک صندوقچہ سامنے رکھا اور شیشہ خان کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ "یہ تو شاید گولی لگی ہے۔ وہ بازو چیر کر آگے نکل گئی ہوگی مگر یہ خون کیسے بند ہو گیا؟ اس مفلر کی وجہ سے رُک گیا ہے ورنہ تو یہ کبھی کا مر چکا ہوتا۔ کیوں شیشہ خان؟"

بڑے میاں نے اُس کا سوئیٹر اور قمیص اُتروائی اور اس کا زخم صاف کرنے لگا۔ اس کے پاس واقعی مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ "یہ گولی کیسے لگی ہے آپ کو؟" اس نے پھر پوچھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

"میں یہ اسٹین گن صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی۔ شکر ہے کہ میرے گلے سے نہیں گزر ی۔"

بڑے میاں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

ابھی شیشہ خان کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر وہ اٹھا ہی تھا کہ اس کی نظر اسٹین گن پر جم کر رہ گئی۔ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ...... یہ بندوق ......؟"

"یہ میری ہے بابا جی! میں یہاں پر سپاہی ہوں۔ میری وردی نہیں دیکھتے ہیں آپ!" شیشہ خان نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "اس میں اب کوئی گولی نہیں ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

اس کے اطمینان کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔" پٹی میں نے باندھ دی ہے میرا خیال ہے آپ کا ان سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بندوق بھی ساتھ لے جائیں۔"

"جی ہاں ۔۔ جی نہیں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جی میں چلا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ اسٹین گن کی طرف بڑھا دیا۔ مگر میں اس پر کیسے راضی ہو جاتا۔ دونوں ہی آدمی میری نظر میں غلط ہو گئے تھے۔ اُن کے برج الٹ دینا ہی بہتر تھا۔ بندوق ہاتھ سے چھوڑنے کے بجائے میں نے شیشہ خان کی گردن پر پنجہ ڈال دیا وہ میری طرف جھکا ہوا تھا۔ جیسے ہی میری انگلیاں اس کی گردن میں دھنسیں، وہ بے بس ہو کر قالین پر گر گیا۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ بڑے میاں حیران پریشان کھڑے تھے۔ وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے ہوا کیا ہے؟

"ارے دیکھو بابا جی! یہ تو شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ بڑے میاں تیزی سے شیشہ خان کی طرف لپکے۔ مگر جیسے ہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، میں نے اُن کی گردن کی رگ بھی مسل دی۔ ڈبا دھڑام سے اُن کے ہاتھ سے نیچے گرا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں اصغر علی اس وقت اندر نہ آ جائے۔ اسی خوف کی بنا پر میں نے اُن دونوں کو قالین پر گھسیٹتے ہوئے غسل خانے کا رُخ کیا اور اس کا دروازہ کھول کر میں نے اُن دونوں کو اندر بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور اسٹین گن صوفے کے نیچے ڈال کر میں اصغر علی کا انتظار کرنے لگا۔ سورج اُس وقت تک خاصا نمایاں ہو گیا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے اس کی شعاعیں اندر آنے لگی تھیں۔ عورتوں کے ہجوم کا تصور میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ پتا نہیں قدیم خان نے کارخانے میں بلا کر انھیں کس اذیت میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ کیمپ کے اندر کسی زبردست حملے کے خوف سے عورتوں کو وہاں سے نکال لیا گیا ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ کوئی عورت گولیوں کی زد میں آ کر ہلاک ہو جائے۔ کتنے ہی سپاہیوں کی لاشیں اُس نے خاردار تار کے قریب دیکھ لی تھیں وہ اس کو دشمن کے کسی بڑے حملے کا نتیجہ تصور کر رہا تھا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہاں تو صرف میں اور مسولینی ہی موجود تھے۔ اور اب وہ مسولینی کو بھی ساتھ ہی لے گیا تھا جس نے خدا معلوم اسے کیا کچھ بتا دیا ہوگا۔ مگر حالات مجھے یہ بتا رہے تھے کہ قدیم خان ابھی تک اصل صورتِ حال سے قطعی بے خبر تھا۔ لہٰذا وہ اب تک ہمارے خلاف اپنی پوری طاقت لگا چکا ہوتا مگر بڑے میاں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک وہ بات اس مکان تک نہیں پہنچی تھی۔

ابھی کوئی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا۔ ایک صاحب عمدہ قسم کا گاؤن پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ نہا کر آئے ہیں۔ اُن کے گھنے بالوں میں تازہ تازہ کنگھی پھری نظر آتی تھی۔ عمر اُن کی یہی کوئی پینتیس سال ہو گی۔ قد اُن کا چھ فٹ سے اُوپر ہی نکل رہا تھا۔ گھنی بھوؤں کے نیچے اُن کی کرنجی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چھوٹا سا دہن جس کے نیچے ٹھوڑی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ شیو بھی اُن کا تازہ تازہ ہی بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر قدرے حیران ہو کر بولے۔ "میرا نام اصغر علی خان ہے۔ شاید میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کے لیے واقعی اجنبی ہوں۔ میرا نام سردار کریم نواز ہے۔ میں لاہور سے آیا ہوں۔"

"آپ کی حالت بہت دگرگوں ہو رہی ہے۔ کسی نے حملہ کیا تھا آپ پر؟ آپ کے کپڑے بھی خون آلود ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

"دراصل راستے میں مجھ پر کچھ آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اُن سے جان چھڑا کر میں بڑی مشکلوں سے آپ تک پہنچا ہوں۔"

"ہوں ۔۔ پتا نہیں یہ نور دین کہاں گیا ہے، وہ دواؤں کا ڈبا لے کر اِدھر آیا تھا۔"

"جی ہاں ۔۔ ڈبا تو وہ یہاں رکھ گئے ہیں، شاید کسی کام سے باہر نکل گئے ہوں۔"

ابھی میں یہ بات کر ہی رہا تھا کہ اندرونی دروازہ پھر کھل گیا۔ میرے سامنے ملک اشرف کھڑے تھے، بڑے صاحب کے خاص معتمد۔

"ارے آپ! سردار کریم نواز صاحب! آپ یہاں کیسے آ گئے؟ اور یہ حالت کیا بنا رکھی ہے آپ نے؟ ہائیں، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں حضرت!" وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر بولے۔ "یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں حضرت! یہ میرے پرانے مہربان ہیں اصغر صاحب! استنا جلکے بڑے بھائی کے دوست ہیں یہ۔"

"آپ کی نوازش ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں، میں دراصل ایک خاص کام سے یہاں آیا تھا۔"

"بیٹھیں ۔۔ مجھے بتائیں کام کیا ہے بھئی۔ اصغر صاحب! یہ تو بڑے صاحب کے بھی بہت با اعتماد دوست ہیں۔"

"اچھا! کمال ہے۔ ٹھہریں میں ان کے لیے ناشتہ منگواتا ہوں۔"

"ہاں ہاں بھئی! ان کی حالت بھی تو دیکھیں۔ میرا کوئی سوٹ وہاں پڑا ہوگا۔ وہ انھیں دے دیں۔ مگر آپ کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

"راستے میں کچھ لوگوں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اُن سے بچ بچا کے یہاں پہنچا ہوں۔"

"آپ زخمی تو نہیں ہیں نا؟"

"جی نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"نور دین کو بلائیں جی! آپ بیٹھیں یہاں۔ اِن سے تو خوب ملاقات ہوئی، حد ہو گئی۔ دراصل ہم نے یہاں نہر کی کھدائی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہم چار حصے دار ہیں۔ کام زور شور سے ہو رہا ہے۔ میں بھی کبھی کبھار اِدھر آ جاتا

ہُوں۔اور کیسے کیا حال ہیں آپ کے؟" ملک اشرف نے اصغر علی کو سامنے کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔" یہ بتائیں کہ آپ آئے کیسے ہیں — کام کیا تھا آپ کو؟"

"وہ .... دراصل میرے ایک عزیز ہیں گورایا صاحب، خندیار کے جاگیر دار ہیں۔ اُن کے گاؤں لاڈلی سے کچھ دِن پہلے رات کے وقت تمام لوگوں کو عورتوں سمیت کسی نے ٹرکوں میں لاد کر اغوا کر لیا تھا۔ میں اُن کی تلاش میں آیا تھا۔ سُنا ہے وہ لوگ یہاں لائے گئے ہیں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" دونوں کے رنگ فق ہو گئے۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انھیں میری بات پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"نہر تو یہاں سرکاری خرچ پر کھُد رہی ہے اور اُس کا ٹھیکہ آپ کے پاس ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ لاڈلی گاؤں سے کسانوں کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے سردار صاحب! کسی نے آپ کو غلط بتایا ہے۔ ہم نے باقاعدہ ایک ٹاسک فورس بنا رکھی ہے۔ کسی اور آدمی کو ہم بھرتی نہیں کرتے اور پھر یونہی کسی گاؤں کے لوگوں کو یہاں کام پر لگانا تو بے معنی ہے، کیوں اصغر صاحب! کیا کہہ رہے ہیں یہ صاحب؟"

"اِن کو غلط فہمی ہوئی ہے ملک صاحب! ہماری افشاں کنسٹرکشن کمپنی کو تو ایک دُنیا جانتی ہے۔ وہ کسان یہاں کس لیے لائے گئے ہیں، کچھ پتا ہے آپ کو؟"

"وہ کسان ہی نہیں، اُن کی عورتیں اور بچّے بھی اغوا کر کے یہاں پہنچا دیے گئے ہیں اور اُن سے آپ بیگار لے رہے ہیں ملک صاحب! اِن کی عورتوں سے آپ قالین بافی کرواتے ہیں — یہ ہے وہ کام جس کے لیے وہ یہاں لائے گئے ہیں۔" میں نے اُن کی سماعت کو سُن کر کے رکھ دیا اور صوفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک دم اسٹین گن نکال کر سیدھی کر لی — میرا مغز اُلٹنے لگا تھا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں جناب ملک صاحب! آپ ایسے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جس کی نہ کوئی داد ہے نہ فریاد۔ اور — اور میں نے سنا ہے کہ ستنا جا صاحب بھی آپ کے ساتھ شامل ہیں اور ہوٹل النور کے حاجی عبدالستار بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے صاحب پر حملے کے لیے اس شام وہ بیرے آپ کے ایماء پر کوٹھی میں لائے گئے تھے؟ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

اُن دونوں کی حالت دیدنی تھی۔ اُن کے رنگ زرد ہو گئے تھے اور صغر علی نے جب وہ بندوق دیکھی تو اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ فوراً ہی اُٹھ کر بھاگ نکلتا۔

"میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے ہیں آپ؟ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس نہر کی کھدائی کا ٹھیکہ آپ نے لیا ہے پھر ان بے گناہ لوگوں کو بیگار میں کیوں پکڑ لیا ہے؟ کس لیے آپ نے ان کے بھرے پُرے گھر برباد کر دیے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ بتائیں مجھے کہ اس کا حساب کون دے گا؟"

"یہ ..... یہ ..... یہ بات یہ ہے سردار صاحب! کہ ....."

"آپ نے یہاں ایک پیرا ملیشیا بھی قائم کر رکھی ہے۔ وہ فوج کی وردیوں میں ملبوس لوگ یہاں حکومت کر رہے ہیں۔ وہ قدیم خان اور قیصر علی، وہ کیا کر رہے ہیں یہاں؟ یہ یونٹ آپ نے کیسے قائم کر لیا؟ رات ہم نے اُن کے بارہ چودہ آدمی مار دیے۔ عورتوں کے کیمپ میں لاشیں پڑی ہیں۔ اور آپ کو کچھ خبر ہی نہیں۔ آپ مزے سے یہاں سوتے رہتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"ہمیں افسوس ہے سردار صاحب! مگر دراصل یہ کھُدائی ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ اور اسی لیے ہم نے لوگوں کو بیگار پر لگا لیا ہے۔ ویسے ہم اُن کے راشن پانی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اِن کی رہائش کے لیے باقاعدہ کوارٹر بنا رکھے ہیں اور پھر جب کام ختم ہو گا تو ہم انھیں مزدوری بھی دے دیں گے۔ دراصل ہم اُن سے کوئی بے ایمانی نہیں کر رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے آپ کی ملک صاحب! اور آپ کے انصاف کی۔ آپ اکٹھی مزدوری انھیں دے دیں گے۔ ویری گڈ۔ مگر ان کو غلام کس نے بنایا ہے؟ اُن کی مرضی کے خلاف انھیں اغوا کر کے یہاں کون لایا ہے؟ اور آپ ظاہر یہ کر رہے ہیں کہ نہر بہت تیزی سے کھُد رہی ہے۔ آپ نے کروڑوں روپیہ صرف کر دیا ہے مگر حالت آپ کی یہ ہے۔ انھیں یہاں اور بُلائیں اُس قیصر علی اور قدیم خان کو۔ ابھی اور اسی وقت بُلائیں۔ میں ایک ایک سے اس ظلم کا بدلہ لوں گا۔ آپ نے اِتنے سارے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے کوئی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا، اور ہیں آپ بڑے معزز شخص۔ بڑا نام ہے آپ کا۔ بڑی شہرت ہے سارے علاقے میں۔ اُٹھیں —"

"ہمیں زیادہ ذلیل نہ کریں سردار صاحب! اور یاد رکھیں کہ آپ کا ماضی بھی مجھے معلوم ہے۔ بہتر ہے یہ بندوق پھینک دیں اور آرام سے بات کریں۔" ملک اشرف نے پہلی بار اپنی آواز میں طنطنہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کا رنگ لوٹنے لگا تھا۔

میں نے اسٹین گن کا نچلا حصہ اُس کے مُنہ پر مارتے ہوئے کہا۔ "اپنے ماضی کو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ مگر میں نے گاؤں کے گاؤں لوٹ کر برباد نہیں کیے ہیں۔ کسی کی بہو بیٹی کو یوں ذلیل نہیں کیا ہے۔ مجھے تو ہر حال میں مرنا ہی ہے مگر یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے جس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم دونوں اندر چلو۔ مجھے دکھاؤ کہ اُن سے کیسے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُن دونوں کو اپنے آگے ہانک لیا اور اندرونی دروازے میں سے گزار کر اگلے کمروں میں لے گیا۔ سامنے ایک راہداری سی بنی ہوئی تھی جس کے فرش پر خوبصورت دری بچھی تھی اور اس کے سامنے تین کمرے تھے۔ تین بیڈ روم اور جب میں پہلے کمرے میں اُن کو دھکیل کر آگے بڑھا تو سامنے میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ اس کے آگے دیوار پر اشرف کا پستول ٹنگا ہوا تھا مگر اُن دونوں کو اس تک پہنچنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ پستول کام نہیں آئے گا صغر علی! اُن کو بلاؤ یہاں انٹرکام پہ اُن سے بات کرو۔ میں اُن سے یہاں ہی بات کرنا چاہتا ہوں — نہیں فون کرو ملک اشرف! اُن کو بلاؤ۔ اِدھر سُن نہیں رہے ہو تم؟"

"یہ — یہ کام نہیں کرتا ہے یہ انٹرکام کل سے خراب ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تم دونوں دُوسرے کمرے میں چلو۔" یہ کہہ کر میں اُن کو ہانکتا ہوا دُوسرے کمرے میں لے گیا۔ اُن کے جسم تھر تھر کانپنے لگے تھے۔ دونوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اُن کی ایک ایک حرکت پر میں نگاہ رکھ رہا تھا۔ ہم دُوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہاں صغر علی کا پستول موجود تھا جو میں نے فوراً اپنے قابو میں کر لیا۔

دروازے سے ذرا آگے نکل کر وہ دونوں چُپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ میں نے اصغر علی کے کمرے میں رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا، وہ مجھے درست معلوم ہوتا تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ ایک دُوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے اُن لوگوں نے کوئی مقامی قسم کا سلسلہ وہاں بنا لیا تھا جس کا کسی اور جگہ سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اسٹین گن کا رُخ اُن کی طرف رکھ کر میں نے ریسیور کان پر رکھ لیا۔ ٹیلیفون میں گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ پھر کسی نے دوسری طرف سے ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو ہیلو! ہیڈکوارٹر سے۔"

"دیکھو میں صغر علی خان کے گھر سے بول رہا ہوں۔ قیصر علی اور قدیم خان سے کہو کہ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

"یس سر! میں اُن کو ابھی اطلاع دیتا ہوں اور کوئی حکم سر؟"

"اور کچھ نہیں، اُن سے کہو وہ فوراً یہاں آ جائیں۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔

"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟" ملک اشرف نے مجھ سے بڑے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

"وہ تمھارے پرخچے اُڑا دیں گے، تم انھیں نہیں جانتے ہو، اُس قدیم خان اور قیصر علی کو۔" اصغر علی بولا۔

"میں انھیں دیکھ چکا ہوں۔ پتا نہیں انھوں نے رات تمھیں اطلاع کیوں نہیں دی، ورنہ اپنے آدمیوں کا حشر وہ دیکھ چکے ہیں۔"

"مگر تمھارا مطلب کیا ہے آخر؟"

"میں اُن بدنصیبوں کی رہائی چاہتا ہوں ملک اشرف! ..... سب کی رہائی — اور اُن کی پریشانیوں کا معاوضہ — اس سے کم پر بات نہیں ہو گی، سمجھے تم! ایسے گدھ ہو تم کہ کسی کی بربادی کا تمھیں احساس تک نہیں ہے۔ وہ روتی بلکتی مائیں، وہ اُن کے بچے، ان کے عزیز و اقارب سب کے سب تم نے بیگار پر لگا دیے۔ یہ کام تم کس کے کہنے پر کر رہے ہو؟ کیا بڑے صاحب بھی اس میں شامل ہیں؟ —"

میں نے سامنے کھڑے ملک اشرف کے پاس پہنچ کر اُس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ میری نال کا رُخ اُن سب کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ ملک اشرف میں اتنی جان ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مزاحمت کر سکتا۔ وہ سر کے بل قالین پر گر گیا۔

"تمھارا وہ لوز زین اُدھر غسل خانے میں بند ہے ملک اشرف! وہ ابھی واپس نہیں آ سکے گا۔ مت سوچو کہ کوئی تمھاری مدد بھی کر سکتا ہے۔"

ملک اشرف اور اصغر علی بے دم ہو کر میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور میرا دھیان دروازے کی طرف لگا تھا۔ گھر میں صرف پانچ آدمی موجود تھے جن میں سے دو کو میں بے جان کر چکا تھا اور اب دو آدمی اور تھے، جو مجھے مطلوب تھے۔ جن کی وجہ سے وہ سب لوگ اتنی ساری اذیتیں سہہ رہے تھے۔

قدیم خان اور قیصر علی سے نمٹنے کے لیے لازم تھا کہ میں ان دونوں کو باندھ کر ڈال دیتا۔ ورنہ وہ میرے لیے مصیبت بن سکتے تھے۔ جیسے ہی میں اسٹین گن سیدھی کر کے اُن کی طرف بڑھا، اصغر علی ایک دم کونے میں جا پہنچا اور وہاں رکھی ہاکی اُس نے اُٹھا لی، جیسے وہ اس سے گولی کا مقابلہ کر سکتا ہو۔

"یہ ہاکی پھینک دو اصغر علی! یہ تمھارے کسی کام نہیں آ سکتی — میرے پاس آؤ یہاں — سُنا نہیں تم نے!" میں نے دو قدم ملک اشرف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور ایک دم اُس کی گردن پر بائیں ہاتھ کی سیدھی ضرب لگائی۔ وہ اُلٹ کر فرش پر گرا تو حالت اس کی یہ ہو گئی کہ جیسے وہ سکتے میں مبتلا ہو گیا ہو مگر بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں دوبارہ اس کے پاؤں پر کھڑا کر سکتا تھا لیکن مجھے اُس کی طرف دوبارہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اصغر نے اس کی حالت دیکھ کر ہاکی پھینک دی گویا وہ مرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ رنگ اس کا پھیکا پیلا ہونے لگا۔ بار بار اس کی نظر ملک اشرف پر جا ٹھہرتی تھی۔ عین اُسی وقت بڑے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری تو میں نے اصغر علی کو اسٹین گن کی نال دکھا کر آگے ہانک لیا۔ اس کا صحن میں جانا کسی بھی طرح درست نہیں تھا، میں پھر بھی اُسے دروازے تک لے گیا۔

"تم نے اگر آواز نکالی تو اچھا نہیں ہو گا۔" ایسے میں نے دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے بائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔

قدیم خان اور قیصر علی ایک دم اندر آ گئے۔ انھیں یہ قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ کسی مہیب خطرے سے دوچار ہو جائیں گے۔ دونوں کی وردیوں پر پستول لٹک رہے تھے مگر وہ جیسے ہی دروازے میں داخل ہوئے میں نے بہت ہی کڑکتی آواز میں کہا۔ "تم دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔ ورنہ یہاں تمھاری لاشیں ہی نظر آئیں گی قدیم خان!"

وہ دونوں ایک دم ایڑیوں پر گھوم گئے۔ میری نظریں قدیم خان سے ملیں تو وہ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ مگر بندوق کی نال دیکھ کر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پستول پر بھی ہاتھ نہ ڈال سکا۔ قیصر علی

کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں مجھے سامنے دیکھ کر گنگ ہو گئے تھے۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو قیصر علی! یہ میرا حکم ہے قدیم خان! تو نے مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اصغر علی کو گھسیٹ کر اُن کے سامنے پھینک دیا۔ اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ان کے قریب جا کر گرا۔ قدیم خان اور قیصر علی نے پریشان ہو کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"چلو اُدھر کمرے میں چلو۔" میں نے اُن دونوں کے پستول اُن کی ہیٹیوں سے نکال لیے۔ "چلو! سنا نہیں تم نے۔" میں نے قدیم خان کو بوٹ کی ٹھوکر سے آگے بڑھایا۔ اصغر علی بھی فوراً اٹھ گیا اور ان کے ساتھ کمرے میں پہنچا۔ ملک اشرف کو وہاں نیم بے ہوش دیکھ کر اُن کی ہوا کچھ اور سرکنے لگی۔

"دیکھو قیصر علی! وہ رسّی دیکھ رہے ہو نا تم! اُسے اٹھاؤ اور ان تینوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ مگر جلدی کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" بڑی میز کے نیچے میں نائیلون کی رسّی دیکھ چکا تھا۔

قیصر علی کے لیے یہ بڑی صبر آزما بات تھی۔ قدیم خان اور اصغر ہنچر کر رہ گئے تھے۔ ملک اشرف اُن کے پاؤں میں گرا ہوا تھا۔ حیرت انھیں یہ تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اتنے سارے لوگوں کو کون بے بس کر سکتا تھا؟

"سنا نہیں تم نے قیصر علی! وہ رسّی اٹھاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سر کے اوپر سے گولی گزار دی۔ اس طرح کہ اُس کے سر کے بال بھی وہ چھین کر لے گئی۔ وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ خوف سے اُس کا چہرہ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ وہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور نائیلون کی رسّی لے کر اُس نے سب سے پہلے قدیم خان کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔ پھر اس نے اصغر کو باندھا۔ اس طرح کہ میرے کہنے کے مطابق ہی اس نے عمل کیا۔ آخر میں اس نے ملک اشرف کو جکڑ دیا۔ رسّیاں مضبوط بندھی تھیں مگر اُن کا زور دیکھنے کے لیے میں نے اُن کو اچھی طرح کھینچ کر دیکھ لیا۔ کسر صرف یہ رہ گئی تھی کہ اگر رسّی کچھ بچ جاتی تو اُن سب کو یکجا کر کے اُس میں باندھ دیتا۔ میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر قدیم خان کے منہ سے لگا دیا تھا۔

"اُن سے کہو، اپنے سپاہیوں سے کہ وہ مزدوروں کا خیال چھوڑ کر فوراً اس مکان پر پہنچ جائیں، کتنی تعداد ہے اُن کی؟"

"وہ اسّی کے قریب ہیں مگر رات تمھارے حملے میں گیارہ آدمی مر گئے تھے عورتوں کے کیمپ میں اور بہت سے زخمی ہو گئے تھے۔"

"ہوں۔ اور اُن کا تمھیں بہت افسوس ہے مگر تم نے اتنے سارے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے، لاڈلی گاؤں سے ان کسانوں کو تم ہی لاتے تھے نا؟ اُن میں سے کتنے ہی مر گئے ہوں گے اب تک۔ تم اُن کی عورتوں کو بھی اٹھا لائے اور بچوں کو بھی۔ یہ سب کچھ تم نے اِن لوگوں کے ایما پر کیا مگر تمھیں اس کی بڑی قیمت ادا کرنی ہو گی قدیم خان! اپنے سپاہیوں سے کہو کہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ جائیں۔ لو، اس ریسیور میں بولو۔"

"ہیلو، ہیلو! صابر! میں قدیم خان بول رہا ہوں۔ اصغر جی بھی میرے ساتھ ہیں۔" میں نے اسٹین گن کا رُخ اس کی طرف کیا ہوا تھا اور قیصر اس وقت اُن کے عقب میں کھڑا تھا۔ ضرورت پڑتی تو میں اُن تینوں کو ایک ساتھ ختم کر سکتا تھا۔ اسٹین گن کا چیمبر گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

پتا نہیں دُوسری طرف سے قدیم خان نے کیا سنا۔ وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ میں نے ریسیور فوراً ہی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"ہیلو صابر! کیا بات ہے؟" نام میں اس آدمی کا بھی سن چکا تھا اور وہ آپریٹر تھا۔ کسی ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے نہر کا منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

"سر! اِدھر زبردست فائرنگ ہو رہی ہے، پتا نہیں وہ کون آدمی ہیں جو چن چن کر ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ مزدوروں نے بھی بغاوت کر دی ہے۔"

"کون لوگ ہیں وہ، یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر! ہمارے کوئی پندرہ سپاہی مر چکے ہیں، حملہ آور الگ الگ مورچے بنا کر بیٹھے ہیں۔ میں انھیں نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ آپ فوراً آ جائیں سر! حالات بہت خراب ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔" ریسیور رکھتے ہی میں نے اُن چاروں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ مگر اشرف علی اور قدیم خان کے پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔

"ان کے پاؤں کھول دو۔ جلدی کرو۔ ہاتھ اسی طرح رہنے دو۔" قیصر علی نے نائیلون کی رسّی اُن کے پاؤں سے اتار دی۔ اب وہ چل سکتے تھے۔ ملک اشرف کو میں نے تھپڑ مار مار کر سیدھا کھڑا کر لیا تھا مگر اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔

"نہر کی طرف چلو۔ وہاں گولی چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فراڈ کا پتا چل گیا ہے۔ چلو۔" یہ کہہ کر میں اُن کو ہانک کر باہر لے آیا۔ وہ اپنی جیپ میں وہاں تک پہنچے تھے۔

"تم گاڑی چلا لیتے ہو کہ نہیں؟" میں نے قیصر علی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مجھے چلانی نہیں آتی۔"

"ٹھیک ہے۔ قدیم خان! تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ جلدی کرو۔ تمھارے حامی اُدھر آ گئے ہیں۔" میں نے قدیم خان کے ہاتھ کھول دیے، یوں کہ اُن سب کو میں نے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود پیچھے جا بیٹھا۔ "نہر کی طرف چلو! اور مت سمجھو کہ میں تمھارے ساتھ رعایت نہیں کروں گا۔ میں تمھیں مزدوروں کے سامنے گولی مار دوں گا۔ یہ کون ہے اصغر میاں! وہ تمھارے کیسے حصے دار بن گئے؟ یہ وہی نہیں ہے جو بہت بڑا پولیس افسر ہے؟"

"جی نہیں! وہ اُن کے بھائی ہیں۔ اس ٹھیکے میں ان کا حصہ تھا۔ انھیں بھی اس کا حساب دینا پڑے گا۔ تم کسی طور پر معافی کے حقدار نہیں ہو۔ گاڑی ٹھیک طرح سے چلاؤ قدیم خان!" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ جھٹکے بہت دے رہا تھا۔ سڑک پہاڑی کے گرد چکر کاٹتی ہوئی نیچے اُترتی تھی۔ کوئی بیس منٹ میں ہم نہر کے قریب جا پہنچے۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ حملہ آور جیپ دیکھتے ہی بھڑک نہ اٹھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اس خیال کے زیرِ اثر میں نے جیپ کو ایک درخت کے نیچے روک لیا۔ صابر آپریٹر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نہر کے اندر بڑی افراتفری مچی تھی۔ تمام مزدور وہاں سے نکل کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور فائرنگ کا تبادلہ نہر کے پہرے داروں اور حملہ آوروں کے درمیان ہو رہا تھا۔ جو نہر کے دائیں حصے کی طرف مورچہ بند تھے۔

نہر کے پہرے دار نشیب میں تھے اور کوئی اوٹ نہ ہونے کی وجہ سے پسپا ہو رہے تھے۔ اُن کی تعداد کوئی چالیس کے قریب تو ضرور ہی ہو گی۔ وہ لیٹ کر، بیٹھ کر، بکھر کر پھیل کر ہر طرح سے اُن گولیوں کا جواب دے رہے تھے جو اُن پر مٹی کے اونچے اونچے ٹیلوں کے پیچھے سے چلائی جا رہی تھیں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ فائرنگ بہت ہی کارگر ثابت ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک ایک کر کے پہرے داروں کے مورچے خاموش ہو رہے تھے۔ نہر واقعی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔

اچانک کچھ مزدور گروہ کی صورت میں ایک ٹیلے سے نمودار ہوئے۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا مگر نہیں۔ وہ کوئی دس بارہ آدمی تھے جن کے بیچ میں ایک سیاہ پوش عورت کھڑی تھی۔ میری اسٹین گن کا رُخ اب بھی اُن چاروں کی طرف تھا جو ونڈ اسکرین میں سے اس سارے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بلاشبہ قندبار کی نئی جاگیردارنی بہن جی تھی اور وہ سب اس کے ساتھی تھے جنھوں نے صبح سویرے ہی وہاں دھاوا بول دیا تھا۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ ہم تمھیں بھون کر رکھ دیں گے۔" ایک گرجدار آواز نہر کے آر پار گونجنے لگی۔ "میں تمھیں دو منٹ کا وقت دیتا ہوں۔ ہتھیار پھینک کر کھڑے ہو جاؤ۔ ان ٹھیکیداروں کے لیے اپنی جانیں مت ضائع کرو۔"

وہ سب کے سب اسٹین گنوں اور بندوقوں سے مسلح تھے اور ہم چونکہ بلندی پر کھڑے تھے۔ اس لیے وہ ہمیں نظر آ رہے تھے ورنہ وہ ٹیلے کے پیچھے اس طرح چھپے تھے کہ سامنے نہر کے اندر کھڑے سپاہی انھیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہ آواز پھر فضا میں بلند ہوئی۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا۔ "ایک منٹ ختم ہو چکا ہے۔ صرف ایک منٹ باقی ہے۔ اس کے بعد میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔"

بلندی سے گولیاں برسنی بند ہو گئی تھیں۔ وہ ذرا سا وقفہ دے رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ بے چاروں کے خون سے ہاتھ نہ رنگے جائیں۔ اِن بے چاروں کا کوئی قصور بھی تو نہیں تھا۔ وہ کسی کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ اُن ٹھیکیداروں کے مفاد کا تحفظ کر رہے تھے۔ مگر وہ ٹھیکیدار تو میرے قبضے میں آ چکے تھے۔ ایک نیم بے ہوش تھا، دُوسرا بھی میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اور اُن کے میجر اور کمانڈنٹ بھی وہیں تھے۔ سپاہی کسی قیادت کے بغیر ہی اپنا تحفظ کر رہے تھے اور وہ بے جان ہو چکے تھے۔

دُوسرا منٹ نہیں گزرا تھا کہ وہ سب کے سب ہاتھ فضا میں بلند کر کے ہتھیاروں سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی بہن جی اور اس کے ساتھی ٹیلوں کے عقب سے باہر نکل کر نہر کے اندر پہنچ گئے۔ وہ بہن جی کو چاروں طرف سے اپنی حفاظت میں لے کر نیچے آئے تھے۔ ان میں سندھو بھی تھا اور طاہر بیگ بھی۔ کئی ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھے میں نے قدیم خان سے کہا۔ "گاڑی چلاؤ قدیم خان! مجھے اُن تک پہنچنا ہے ورنہ یہ سب لوگوں کو مار دیں گے۔"

اس نے ایک جھٹکا دے کر جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ جیپ کو سامنے دیکھتے ہی بہن جی کے ساتھیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ وہ پہرے داروں کی اوٹ میں کھڑے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ جیپ اُن کی طرف کیوں آ رہی ہے۔ میں نے کچھ فاصلے پر جیپ روک کر اُن چاروں کو نیچے اتارا اور اسٹین گن کا رُخ ان کی طرف رکھتے ہوئے میں بھی نیچے اُتر آیا۔ سندھو نے مجھے دیکھا تو پاگلوں کی طرح وہ میری طرف لپکا۔

"اوہ سردار صاحب آپ! یا اللہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"تم ٹھیک ہی دیکھ رہے ہو۔ اِن سے ملو۔ یہ نہر کے ٹھیکیدار اصغر علی خان ہیں اور یہ ملک اشرف ہیں۔ یہ ان کے ساتھی قدیم خان اور یہ کیمپ کمانڈنٹ قیصر علی۔ سنبھالو اِن کو۔ ساری بدمعاشی انھی لوگوں کی ہے۔" میں نے ان چاروں کو گن کی ضرب سے سندھو کے سامنے دھکیل دیا۔

"ہوں۔ تو یہ ہیں وہ علاقے کا ناسور۔ اِن کی وجہ سے لاڈلی گاؤں اُجڑا ہے۔ اِن سے کوئی رعایت مت کرو سردار صاحب! گولی مار دو انھیں۔"

آسیہ اوٹ میں کھڑی تھی۔ وہ اُن سب سے منفرد اور الگ نظر آتی تھی اور سر سے پاؤں تک سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ ایک صرف اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں جن پر مہین نقاب پڑا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھی اور میرے سامنے پہنچ کر بولی۔ "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں سردار صاحب! آپ نے ایک فوج جتنا کام کر ڈالا ہے تنِ تنہا۔ مجھے آپ پر فخر ہے سردار صاحب!"

"یہ بہت ضروری تھا بہن جی! میں نے ان کے سارے خانے دیکھ

لیے ہیں۔ آپ ان پہریداروں کو باندھیں اور تمام مزدوروں اور عورتوں کو اکٹھا کریں۔ یہ لوگ تو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہیں۔"

"ہاں۔ مجھے یہی کرنا ہوگا، پہلے ان سے تعارف تو کروا دیں۔ وہ گل خان کہاں ہے؟ آپ کے ساتھ مسولینی بھی تھا؟"

"بتاؤ انھیں وہ گل خان کہاں ہے؟ وہ تمھارے کوارٹر میں بے ہوش ہو گیا تھا اور وہ میرا ساتھی مسولینی کہاں ہے؟"

"اسے میرے سپاہیوں نے گولی ماردی تھی عورتوں کے کیمپ میں۔ اس کی لاش کارخانے میں ہے۔" قدیم خان بڑبڑایا۔

"ہوں۔ تو تم نے اسے گولی ماردی تھی عورتوں کے کیمپ میں۔ بہت اچھا کیا تم نے۔ مگر۔۔۔۔" میں تڑپ کر اس کی طرف بڑھا مگر بہن جی نے مجھے روک دیا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ وہ گل خان کہاں ہے؟"

"وہ کوارٹر میں پڑا ہے اور ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔" قدیم خان خوف سے بہت ہی پیلا ہو گیا تھا۔ اصغر، اشرف اور قیصر کا بھی یہی حال تھا۔ مگر بہن جی نے میرا ہاتھ روک دیا ورنہ میں مسولینی کی موت کا سن کر انھیں وہیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔

"ان سب کو کوارٹروں کی طرف لے چلو۔ آپ جیپ میں آئی ہیں؟"

"ہاں۔ یہ بڑا گندہ سفر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا آپریشن کامیاب رہا۔" آسیہ نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ مزدور چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ سپاہی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ ابھی تک اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ سندھو نے یوں کیا کہ ایک بڑا سا رسا لے کر ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ اس کار خیر میں ہمارے ساتھیوں نے بھرپور حصہ لیا۔ جب ہم ان کو باندھ چکے تو مزدور مختلف سمتوں سے ہماری طرف آنا شروع ہو گئے۔ ان کی تعداد کوئی تین سو تو ضرور ہی ہوگی۔ ان کی حالت دیکھ کر ترس آتا تھا۔ ذلت کی انتہائی گہرائیوں میں وہ گرے نظر آتے تھے۔ کسی کے تن پر کوئی ڈھنگ کا کپڑا نہیں تھا۔ ان کی داڑھیاں اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا انھیں حجام سے ملے عرصہ گزر چکا ہے۔ پیٹ ان کے اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ لاڈلی گاؤں کے کسان تھے، بدنصیب لوگ۔ وہ آسیہ کو نہیں جانتے تھے، ابھی تک ان کا تعارف ادھورا ہی تھا۔ وہ حیرت سے ہم سب کو دیکھ رہے تھے اور سب کے سب آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے تھے۔ خدا معلوم انھیں کیسی کیسی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

اچانک ان میں سے آٹھ دس آدمی ایک دم قدیم خان پر جھپٹ پڑے۔ اسے وہ ہماری گرفت سے چھین کر پرے لے گئے۔ ہم انھیں روکتے ہی رہ گئے۔ ہمارے سامنے ہی انھوں نے قدیم خان کو دھن ڈالا۔ کوئی اسے مکے مار رہا تھا، کوئی لاتیں۔ ہر کسی کو اس کے جسم کی ایک بوٹی چاہیے تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے اس کے لیے دل میں بے پناہ غیظ و غضب روکے بیٹھے تھے۔ میں فوراً آگے بڑھا۔ سندھو اور آسیہ نے بھی انھیں روکا مگر مٹھی بھر گوشت وہ سب چاہتے تھے۔ قدیم خان کا گوشت۔ اور وہ انھوں نے نوچ لیا۔ اس طرح کہ اس کے بازو، اس کی ٹانگیں انھوں نے ادھیڑ ڈالیں۔ جسم سے الگ الگ کر دیں۔ اس کے لیے انھیں کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کے ہاتھ ہی کافی تھے۔ ایک ایک کر کے انھوں نے قدیم خان کے سارے اعضا الگ کر دیے۔ بڑا روح فرسا منظر تھا۔ آدمی کو گولی سے مار دینا تو بڑی بہادری کا کام ہے۔ ایک ذرا سا سوراخ اور بس۔ آدمی ختم۔ مرنے والے کے دل میں یہ حوصلہ باقی رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے گولی لگی ہے۔ ورنہ وہ مر سکتا تھا۔ مگر۔۔۔ مگر جب ایک بڑے گدھ پر چڑیاں جھپٹ پڑیں تو پھر کوئی نہیں جانتا کہ انجام کیا ہوگا۔ چند ہی منٹوں میں ا[illegible] قدیم خان کا پیٹ تک ادھڑ چکا تھا۔ وہیں ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے منہ سے چلو بھر [illegible] اور پھر منہ پر پھیر کر بولا۔ "لے آج میری قسم پوری ہو گئی۔ قدیم خان، آج میں نے اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لے لیا ہے۔ وہ تیری ہی گولی سے مرا تھا اور اسے تو نے اسی نہر میں دفن کر دیا تھا۔" وہ بلند آواز میں چیخ رہا تھا جیسے اس کی عید ہو گئی ہو۔ میں یہ لرزا دینے والا منظر دیکھ کر کانپ اٹھا۔ یقیناً وہ لوگ قدیم خان جیسے ظالم سے اتنے ہی زیادہ بیزار اور مشتعل تھے اور کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے کہ [illegible] نہ کر سکے۔ شدید انتقامی جذبہ میرے نزدیک اچھی بات نہ تھی مگر انھیں روکنے پر قادر بھی نہ تھا۔ آسیہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ وہ اس خوفناک منظر کو برداشت نہ کر سکی تھی۔ کیمپ کمانڈر قیصر علی کی حالت دیدنی تھی۔ وہ اپنے انجام سے لرز اٹھا تھا اور [illegible] پر موت سے پہلے ہی موت طاری ہو گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ خودکشی کر لیتا۔ یہی حال اشرف کا تھا۔

"ان عورملتوں کو دیکھو سردار صاحب! پتا نہیں وہ کہاں ہیں ان لوگوں نے۔" سندھو نے قدیم خان کی لاش سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ سارا کیمپ کھنگال دو۔ کوئی آدمی یہاں نہیں رہنا چاہیے ان ظالموں کے پاس۔"

بہن جی کے ساتھیوں نے ان کے چھ آدمی مار دیے تھے اور بہت سے شدید زخمی تھے۔ مزدور اب بھی بپھرے ہوئے تھے، ان کا مطالبہ تھا کہ ہم سب مجرموں کو ان کے حوالے کر دیں۔ مگر میں قدیم خان کا حال دیکھ چکا تھا۔ ہم سب تیزی سے جیپ میں سوار ہو گئے۔ اشرف اور قیصر کو سندھو اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے قابو کر لیا۔ سارے معاملات میں نے طاہر بیگ کو سمجھا دیے۔ وہ بھی آسیہ کا آدمی تھا اور مجھے خاصا سمجھدار نظر آتا تھا۔

ہم سیدھے قالین بافی کے کارخانے کی طرف چل دیے۔ مسولینی کی لاش بھی وہیں تھی۔ مزدور پیدل ہی ہمارے پیچھے چل دیے اور درمیانی راستہ عبور کر کے وہ پہاڑی کے عقب میں جا پہنچے۔ وہ راستہ اتنا چھوٹا تھا کہ جب ہم جیپ میں وہاں پہنچے تو اس وقت مزدور بھی پہنچ رہے تھے۔

کارخانہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔۔۔۔ وہاں ان لوگوں نے لاکھوں کے قالین تیار کر رکھے تھے اور انھیں وہ شہر بھیجنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ کوئی دس آدمی وہ کارخانہ چلا رہے تھے۔ اون کا ایک بڑا گودام وہاں موجود تھا اور وہ عورتیں جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو ہوگی، اس وقت وہاں کام کر رہی تھیں۔ ان کے بچے اس بڑے سے وسیع دالان کے سامنے صحن میں پڑے بلک رہے تھے۔۔۔ ان کی خود ساختہ ملیشیا کے دو سپاہی چابک لیے کر ان عورتوں کے گرد گھوم رہے تھے۔ کسی کو اگر وہ بیکار دیکھتے تھے تو اس کی چمڑی ادھیڑ دیتے تھے اور ان میں زیادہ تعداد لاڈلی گاؤں سے تعلق رکھتی تھی۔

سندھو بہت بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی ان دونوں چابک سواروں کو بچھا کے رکھ دیا۔ وہ چیختے ہی رہ گئے مگر ان کی بات سننے والا کوئی وہاں تھا ہی نہیں۔ عورتوں کو بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے جسم میں بھی جان نہیں تھی۔ وہ کھانا جو انھیں دیا جاتا تھا وہ کتے بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ بہن جی کے ساتھیوں نے دوسرے آٹھ آدمیوں کو پکڑ کر الگ ڈال دیا۔ مسولینی کی لاش بھی ہمیں ایک گڑھے میں سے مل گئی۔ ان گدھوں نے اس بیچارے پر مٹی بھی صحیح طریقے سے نہیں ڈالی تھی۔ اس کو آسیہ نے باقاعدہ تجہیز و تکفین کے بعد قبر کھدوا کر دفن کرا دیا۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو عورتوں اور مردوں کے چار ٹرک ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ٹرک انھوں نے کیمپ کے قریب ہی کھڑے کر رکھے تھے۔ بہت سی عورتیں اور مرد مختلف علاقوں سے اغوا کیے گئے تھے۔ ان کے بارے میں ضروری ہدایتیں دے کر ہم نے انھیں اسی وقت وہاں سے رخصت کر دیا اور خود ہم اصغر علی کے مکان میں جا پہنچے۔

ملک اشرف کے لیے وہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ شیشہ خان اور نور دین ابھی تک غسل خانے میں بند تھے۔ ان کی بے ہوشی کا بھی سندھو نے یہ علاج ڈھونڈا کہ ان کے سر پر پانی ڈال دیا۔ شیشہ خان نے مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں۔ اس لیے میں نے سلطانی گواہ کی حیثیت دے کر سندھو کی سزا سے بچا دیا ورنہ وہ اسے بھی گولی مار دینا چاہتا تھا۔

اس مکان سے نکل کر ہم ہیڈ کوارٹر جا پہنچے۔ وہ سارے کا سارا چکر ملیشیا کا فراڈ اب ہماری سمجھ میں آ رہا تھا۔ ان کا سارا خرچ ٹھیکیدار برداشت کر رہے تھے اور اس منصوبے پر ان کے اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر کچھ تھے بھی تو وہ قالینوں کی صنعت سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ وہ کارخانہ کوئی دو سال سے چل رہا تھا۔ اس کی تمام تر آمدنی چاروں ٹھیکیداروں، قدیم خان اور قیصر علی خان کے درمیان تقسیم ہو جاتی تھی۔ پتا نہیں اس کارخانے کا مشورہ انھیں کس نے دیا تھا؟ اس میں البتہ وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ قالین وہ ایسے خوبصورت بناتے تھے کہ ایرانی قالینوں کو مات کرتے تھے۔ آسیہ نے ان کو اٹھوا کر ٹرکوں میں لاد لیا کہ اس کی حویلی ایسے قالینوں کا اصل ٹھکانا تھی۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ حویلی کے ہر حصے میں بچھ سکتے تھے اور اس وقت وہ مفت مل رہے تھے۔ آسیہ ان کو ٹرکوں میں رکھوا کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ پہلی بار میں نے ایک عرصے کے بعد اس کی ہنسی کی آواز سنی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اجڑے ویران گھروں کی چیزیں لوگ کتنے شوق سے اٹھا لیتے ہیں۔ وہ واقعی خالص دنیادار بن چکی تھی اور قند یار کو اس نے اپنا مرکز مان لیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس جاگیر سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھی۔۔۔ ایسی دولت کسی کے ہاتھ آ جائے تو وہ اسے کیوں چھوڑ دے؟ تاوقتیکہ اسے کوئی مجبوری نہ آ پڑے۔ آدمی مستقبل کے لیے نسخے ہی باندھتا چلا جاتا ہے۔

جب ہم قدیم خان کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچے تو اس وقت تک وہ بالکل ویران ہو چکا تھا۔ کسی نے وہاں کے تمام رجسٹر جلا دیے تھے اور وہ صابر آپریٹر بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ وہ ٹیلی فون کا خودکار نظام ابھی تک برقرار تھا۔ مگر اس کے تار جگہ جگہ سے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ گل خان کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ جس کمرے میں ہم اسے چھوڑ آئے تھے، وہ بھی ویران پڑا تھا۔ میں نے سب جگہ دیکھ لیا مگر گل خان کا نشان نہ ملا۔ یہ ہمارا بہت بڑا نقصان تھا۔ اگرچہ وہ میری ہی وجہ سے وہاں رہ گیا تھا مگر اس کو یوں لاپتا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آسیہ اس کے لیے کچھ زیادہ ہی پریشان تھی لیکن اس کا علاج میرے پاس کوئی بھی نہ تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ہم اسے تلاش نہ کر سکے۔

نہر کا کام بند ہو چکا تھا اور کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہاں پہ کیا گزری؟ وہ خودکار نظام بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکا ہوگا کیونکہ وہ صرف اندرونی رابطے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ جب ہم وہاں سے چلے تو آسیہ کے حکم کے مطابق خود ساختہ ملیشیا کے تمام سپاہیوں کو ایک ٹرک میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ ان کی نگرانی طاہر بیگ کر رہا تھا۔ ملک اشرف، اصغر علی اور قیصر علی کو ہم نے اپنی کار میں ڈال لیا۔ جو ابھی تک ہیڈ کوارٹر کے عقب میں موجود تھی۔ اس جگہ کسی بھی آدمی کو ہم نے رہنے نہیں دیا۔۔۔ سب کو اٹھا کر ہم سیدھے لاڈلی کی طرف چل دیے۔ آسیہ نے اپنی جیپ میں اپنے خاص آدمیوں کو بٹھا لیا۔ وہ پندرہ آدمی لے کر آئی تھی۔ اور وہ سب کے سب بچ گئے تھے۔ کوئی بھی اس کا ساتھی ضائع نہیں ہوا تھا۔ اسے لاڈلی گاؤں کی اس بیمار لڑکی سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہم کس طرف نکلے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ راتوں رات وہاں سے چل کر اس پہاڑی پر پہنچ گئی تھی جس پہ نام نہاد ملیشیا کا ہیڈ کوارٹر قائم

تھا۔ وہ خود ساختہ تنظیم اغوا شدہ لوگوں کے لیے مصیبت کا نشان بن گئی تھی مگر بالآخر ہم نے اسے تباہ کر دیا۔

طاہر بیگ مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگوں کو مختلف مقامات پر اتار کر لاڈلی کی طرف چل دیا۔ آسیہ بھی اس کے پیچھے تھی اور سب سے آخر میں میری کار جس میں وہ تینوں خبیث رسیوں میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔ کار کی ڈرائیونگ کے لیے آسیہ نے مجھے اپنا ایک آدمی دے دیا تھا اور وہ اچھا ڈرائیور تھا۔ اس کا نام مجھے اب یاد نہیں رہا۔ وہ خود کو منہاس کہلواتا تھا۔ اور اس بات پر بہت ناز کرتا تھا کہ وہ مغلوں کی نسل میں سے ہے۔

کار لے کر میں سیدھا قندیار جا پہنچا کہ مجھے اس ملک اشرف سے حساب لینا تھا۔ حیرت ہے کہ وہ اس پہاڑی کے قریب نہر کی کھدائی کا جائزہ لینے کے لیے تن تنہا وہاں آپہنچا تھا۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی کہ وہ لاہور سے باہر گیا ہوا ہے۔ اپنے کسی منشی مشدی، کسی چپراسی تک کو وہ ساتھ نہیں لایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود کو وہاں بہت مطمئن اور آسودہ سمجھتا تھا کیونکہ اس جگہ اس کے مطلب کی ہر شے اسے مہیا ہو جاتی تھی۔

قندیار پہنچ کر میں نے ان تینوں کو کوٹھری میں بند کروا دیا۔ غوث محمد میرا یہ حکم سن کر چکرایا تو بہت مگر میں نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ قیدی اسی قابل ہیں۔ ان کا جرم ہی ایسا ہے۔

"پر سردار صاحب! یہ مجھے کوئی بڑے خاص آدمی نظر آتے ہیں۔ بڑا رعب داب ہے ان کا۔ دیکھتے نہیں آپ! وہ کیا نام ہے اس کا ملک اشرف، اسے دیکھیں ذرا۔" اس نے مجھ سے دبی زبان میں کہا۔

"ابے! اگر میں کہوں کہ یہ گل خان کے قاتل ہیں تو کیا کرے گا تو؟ یہ مسولینی کے بھی قاتل ہیں میں اپنے ان دونوں ساتھیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سردار صاحب! پر دیکھیں نا، بات کچھ میرے دل کو لگتی نہیں ہے بہن جی بہت ناراض ہوں گی۔"

"کیوں ناراض ہوں گی وہ؟ یہ انہی کا حکم ہے پیارے! تو ان کو کوٹھری میں ڈال دے۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! جیسے آپ کی مرضی۔"

اس وقت وہ تینوں رسیوں میں جکڑے ہوئے راہداری میں بندھے بیٹھے تھے۔ غوث محمد باہر نکلا تو صفدر اور کاظم بھی وہیں آ گئے۔ غوث محمد ان کو ساتھ لے کر پھر میرے کمرے میں آ گیا۔

"آؤ بھئی! تم دونوں کہاں تھے؟ ادھر ایک نیا پلٹ کر رہ گئی ہے، تم بہن جی کے ساتھ کیوں نہیں گئے ہو؟"

"ہم دراصل ایک اور کام سے اٹک گئے ہوئے تھے۔ آپ کب آئے اور بہن جی کہاں ہیں؟"

"وہ لاڈلی گاؤں تک گئی ہیں۔ دیکھو تم یوں کرو کہ ان تینوں آدمیوں کو کوٹھری میں بند کر دو۔ یہ بہن جی کا حکم ہے۔ ان میں ایک ملک اشرف ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے وہ۔"

"کیا؟ کیا کہا آپ نے؟"

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ان لوگوں نے گل خان اور مسولینی کو قتل کر دیا ہے بہن جی آ کر خود فیصلہ کریں گی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔"

"گل خان اور مسولینی کو قتل کر دیا ہے۔ مگر وہ کس طرح؟ یہ سب کیسے؟" صفدر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہ ساری کہانی تمھیں بعد میں بتاؤں گا، پہلے ان کو ادھر حوالات میں بند کرو۔ ان ذلیلوں کو لے جاؤ انھیں ورنہ میں خود انھیں گولی مار دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم لے جاتے ہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ اوئے غوث! ذرا دیکھ تو سردار صاحب کی حالت کیا ہو رہی ہے، ان کو کپڑے لا کر دے اور ان کے نہانے کا بندوبست کر۔" یہ کہہ کر وہ دونوں راہداری میں نکل گئے اور ان تینوں کو ہانکتے ہوئے کوٹھریوں کی طرف لے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد جب غوث محمد واپس آیا تو میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ بھوک اور نیند نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ وہ میرے لیے کھانا لے آیا جسے کھا کر میں نے کمرہ اندر سے بند کیا اور بے سدھ ہو کر سو گیا۔ سارے ہی خیالات میں نے ذہن سے نکال دیے تھے اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ کسی کو قطعاً معلوم نہیں تھا کہ نہر کی کھدائی کرنے والوں پر کیا گزری۔ ان اغوا شدہ لوگوں کو رہا کرانے والے کون تھے۔ سب کچھ اندھیروں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ پولیس چھان بین بھی کرتی تو وہ شاید ہم تک کبھی نہ پہنچ سکتی کیونکہ وہ کیمپ ہم نے پوری طرح ویران کر دیا تھا اور یہی بہتر تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت دن کے نو بج چکے تھے اور میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا مگر بیچ میں ایک رات جو اتنی ساری کا بارائی میں گزری اس کے نشان ابھی تک میرے چہرے پر ثبت تھے۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو غوث محمد مجھے راہداری میں سے گزرتا دکھائی دیا۔ اسے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا، بولا۔

"سردار صاحب! بڑی نیند لی آپ نے۔ کل سے سوئے ہوئے تھے۔"

"میں بہت تھک گیا تھا یار جی! ان قیدیوں کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں۔ البتہ شور بہت مچاتے ہیں۔"

"کھانا بھی دیا ہے انھیں کہ نہیں؟"

"وہ تو جی دے دیا۔ اپنا باؤ جمل ان پر پہرہ دے رہا ہے۔"

"باؤ جمل! یہ کون ہے؟ یہ نام کس نے دیا ہے اسے؟"

"وہ گل خان کا پرانا یار ہے۔ دو مہینے بیمار رہ کر کل ہی تو آیا ہے اسپتال سے۔"

"کمال کرتے ہو غوث محمد! لوگوں کو ان کے صحیح ناموں سے پکارا کرو۔"

"اس کا نام ویسے باؤ جمال ہے، ایسے ہی ہم اس کو باؤ جمل کہتے ہیں۔"

"وہ بہن جی واپس آئی ہیں کہ نہیں؟"

"جی نہیں، ابھی تک تو نہیں آئی ہیں۔ ویسے صفدر اور کاظم لاڈلی گئے ہیں صبح سے۔"

"اور وہ ہمارے گردیزی صاحب؟" اچانک ہی مجھے ان کا خیال آ گیا۔

"ان کو بھی میں نے نہیں دیکھا۔ آتے تو آپ کے سامنے ہوتے۔"

"تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے غوث محمد! جا میرے لیے ناشتہ واشتہ لے آ۔ اتنے میں ذرا نہا لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں ابھی ناشتہ لے آتا ہوں۔"

نہا دھو کر میں اطمینان سے صاف ستھرا ہو کر کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ ایسی تیسی اس دنیا کی، ایک تیر کی طرح میں اس میں سے گزر گیا تھا۔ اس کا سارا وجود میں نے پھاڑ ڈالا تھا۔ یہاں سے وہاں تک اس کے اندر کی ہر شے باہر آ گئی تھی۔ کہاں وہ غلام جیلانی، بینک کا ادنیٰ ملازم اور کہاں یہ سردار کریم نواز۔ حد ہو گئی ہے اور موت کا تو ایک دن معین ہی تھا۔ سو وہ مجھے ابھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کا بہت پیچھا کیا۔ بہت آگے تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔ مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی اور وہ دل کی چبھن ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر دھمتن اور عالیہ۔ کہ میری اس گمراہی کے اصل ذمے دار تو وہی لوگ تھے اور اب وہ امریکہ جا بیٹھے تھے۔ ان سے خدا سمجھے، میں کیا کروں؟ ان کو نیست و نابود کیے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ موت میرے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ مگر ہر بار ایک ہی خیال میرے ذہن پر منڈلاتا رہا۔ مجھے ان سے انتقام ضرور لینا ہے۔ ان کو مارے بغیر میں مر گیا تو پھر۔۔۔ پھر تو میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ کہ جینا تو ایک ہی بار ہے۔ طیش مجھے یوں آتا تھا کہ وہ۔۔۔ ایسے چالباز لوگ تھے کہ ہر بار میرے ہاتھ سے بچ نکلتے تھے اور میں بس ہاتھ ہی ملتا رہ جاتا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان تک کیسے پہنچوں اور امریکہ میرے لیے بالکل ہی ایک اجنبی ملک تھا۔ سن ہی رکھا تھا کہ ادھر ایک ایسا ملک ہے جس کا دارالحکومت واشنگٹن ہے اور وہیں نیویارک بھی ہے مگر محض نئے سے کیا ہوتا تھا اور وہ لوگ بھی وہیں کہیں رہتے تھے۔ کوئی مطب کھول کر بیٹھے ہوں گے وہاں۔ دھمتن ادھر بھی لوگوں کے گردے کھول کھول کر دیکھتا ہوگا اور جو کوئی ان میں اچھا نظر آتا ہوگا وہ اسے کاٹ لیتا ہوگا۔ کیسی منحوس شکل تھی اس کی۔ ان گنت لوگوں کو اس نے تباہ کر دیا تھا۔ آدمی کو خدا نے دو دو چیزیں دی ہیں۔ اگر دائیں آنکھ بہت ضروری تھی تو بائیں بھی اس نے دے دی تھی کہ چلو یہ اسٹپنی کا کام دے گی۔ اس نے ایک بازو دیا تو دوسرا بھی ساتھ لگا دیا کہ کام چلتا رہے، آدمی کہیں بس نہ ہو جائے۔ دو ٹانگیں بھی دے دیں کہ اگر ایک کھو جائے، کٹ جائے، مفلوج ہو جائے تو ایک ٹانگ سے کام چلاتا رہے پلس ایک بیساکھی۔ جو ٹانگ اتنا ہی کام دینے لگتی ہے۔ آدمی کی ایسی بے بسی تو خدا کو کبھی منظور ہی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بیساکھی وہ خود ایجاد کر لے گا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور دھمن ایسا رذیل تھا کہ وہ اپنے کلینک میں جا کر آدمی کی ایسی کانٹ چھانٹ کر دیتا تھا کہ بس دیکھتے رہو۔ کاش وہ میرے ہاتھ آ جاتا۔ مگر وہ اب تک میرے ہاتھ سے بچتا چلا آ رہا تھا اور اب یہ لوگ میرے سامنے آئے تھے۔ ملک اشرف، حاجی عبدالستار، ستناجا اور اصغر علی۔ کوئی ان سے پوچھے کہ یہاں تم یہ کیا دھندا کر رہے ہو۔ دراصل انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ایسا ناشکرا کہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتا۔ اس کی ہوس کی کھوپڑی کبھی پُر ہوتی ہی نہیں۔ یہاں تک کہ مخلوقات میں اپنے شرف سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور وہ ستناجا صاحب! معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی ان کا بھائی ہے محسن ستناجا اور اسے اس لالچی آدمی نے ان کا حصے دار بنا دیا تھا۔ کوئی آوارہ سا آدمی ہوگا وہ محسن جسے ستناجا صاحب نے ٹھیکے دار بنا دیا۔ تاکہ وہ اس کے لیے لمبی لمبی رقمیں پیدا کرتا رہے۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ یہ وہی ملک اشرف تھا جس کے گھر میں بڑے صاحب پر حملہ ہوا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس سازش میں اصل بڈھا اسی نے لگایا ہوگا ورنہ ایسی نقب زنی کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور بڑے صاحب اس دام میں پھنس کر رہ گئے۔ انھیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ ان کے دوست کیسے کیسے ستم ڈھاتے ہیں۔ وہ مریل بیل کی طرح ان کے آگے سر ڈال کر رہ گئے اور وہ دوست ان کی کمر میں ایسا چھید ڈال گئے کہ وہ مدتوں اس کی یاد نہ بھلا سکیں گے۔ پھر وہ کسی محفل میں یوں اتنے بے محابا اور اتنے آزاد ہو کر نہیں گئے ہوں گے۔ ملک اشرف ایسے بغل کے دشمن تو خدا کسی کو نہ دے۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ان تینوں کو میں آسیہ کے سامنے گولی ماروں گا۔ ان کا جینا بہت سوں کی موت کا سبب بنتا تھا۔ انھیں ہر حال میں مر ہی جانا چاہیے تھا کہ وہ اسی لائق تھے۔

ذہن الجھتا ہے تو پھر سوچ کے ان گنت دھاگے ایک دوسرے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ میں کتنی ہی دیر تک وہاں بیٹھا صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ ابھی مجھے مسند آرا تک بھی پہنچنا تھا۔ ایک بے تحریر معاہدہ میں نے اس سے بھی کر رکھا تھا۔ میں اس کی طرف نہیں گیا تو اس کے دشمن اسے بالآخر تباہ کر دیں گے۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر ڈٹی ہوئی تھی۔ جانے وہ کیسے اپنے آپ کو بچا سکی ہو گی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ اس کے دشمنوں میں اسے مار دینے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح

وہ زندہ رہے۔ تاکہ تمام زمینوں کا قبضہ وہ اس سے لے سکیں۔ اس کے جینے کا اس کی زندگی کا بھی ایک راز تھا۔ ورنہ وہ اب تک اسے ختم کر چکے ہوتے۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر چٹان بنی ہوئی تھی۔ شیر دل آہو کا منصوبہ ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور میں اس کے گھر میں ایک اور چنگاری بھڑکا کے چلا آیا تھا۔ وہ ایسے بچے کا باپ بن گیا تھا جسے دیکھ دیکھ کے وہ خون کے آنسو روتا ہو گا۔ عین ممکن ہے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہو مگر پھر... پھر تو اس کا ان کے گھرانے سے تعلق ہی ختم ہو جاتا۔ جسے وہ کسی بھی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی بڑی بے عیب اور بے سقم تھی۔ اس میں سے تیر بھی نہیں گزر سکتا تھا مگر مجھے تو اس تک ضرور ہی پہنچنا تھا۔ میں اگر مسند آرا کو نہ بھی اپناتا تو بھی اس کے تعلقِ خاطر کی بنا پر میرا فرض تھا کہ میں شیر دل آہو کو اس کے راستے سے ہٹا دیتا۔ ورنہ وہ گھر پورے کا پورا تباہ ہو جاتا۔ میری سوچ کے زاویے بہت زیادہ پھیل رہے تھے کہ اتنے میں غوث محمد ناشتہ لے کر اندر آ گیا۔

ابھی میں ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اس کی دھمک ان کمروں میں سنائی دی تھی۔ غوث محمد فوراً ہی باہر نکل گیا جب وہ واپس آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آبی اس کے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ عمدہ قسم کا سوٹ اس نے زیب تن کر رکھا تھا۔ بڑی چمک دمک آ گئی تھی اس کے چہرے پر۔

”اوئے بیڑہ غرق تو کہاں مر گیا تھا آبی! حد ہو گئی۔ ادھر تیری بڑی سخت لوڑ تھی ہم کو۔“ میں نے ناشتہ پرے رکھ کر اُسے بانہوں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

”اوئے اتنا نہ دبا یار۔ یہ کوئی شرافت ہے۔ میں پتا نہیں کہاں کہاں سے دھکے کھاتا آ رہا ہوں۔“

”تیرے بغیر تو یہ سارا علاقہ سُونا سُونا لگتا تھا آبی! آ بیٹھ ادھر، ناشتہ کر لے۔ تو ٹیکسی میں آیا ہے؟“

”ہاں۔ اسے میں نے فارغ کر دیا ہے۔ تو یہاں دُولہا بنا بیٹھا ہے اور اُدھر ستناجا صاحب کا قتل ہو رہا ہو گا آج۔“

”کیا! یعنی وہ...؟“

”ہاں ہاں بھئی! اس کا ہارٹ فیل ہو گیا گدھے کا۔ اسپتال میں دوسرا دورہ پڑا اور وہ ختم۔“

”اچھا! یہ اچھی خبر نہیں سنائی ہے تم نے آبی! اس کو روک لینا تھا۔ ابھی تو مجھے بڑے حساب لینے تھے اُس سے۔“

”اب اللہ میاں خود حساب لے لیں گے اس خبیث سے۔ میں تو خیر وہاں نہیں گیا مگر خبر مجھے مل گئی تھی۔ ایسے ہی فون کر بیٹھا تھا میں وہاں۔“

”مگر یہ کوئی اس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے، کب [illegible] ہوا وہ؟“

”جس دن میں یہاں سے گیا، اُسی روز صبح کے وقت [illegible] نے دنیا کو خدا حافظ کہہ دیا۔“

”چلو اچھا ہی ہوا۔ وہ میری گولی سے بچ گیا۔ یار! [illegible] بہت ذلیل آدمی نکلا۔“

”کیوں؟ کیا کیا ہے اُس نے؟ اور یہ ناشتے [illegible] بُھربُھرے پراٹھے کس نے پکا دیے؟ بہن جی کا کام ہو گا یہ؟“

”نہیں یار! وہ تو یہاں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے یہ [illegible] کام ہے۔“

”ہاں۔ باورچی خانہ اُسی کے حوالے ہے۔“

”دفع کر اُسے۔ تو یہ دیکھ کہ یہاں ہوا کیا ہے قسم [illegible] کی، میں تو سوچتا ہوں کہ اب مر جانا چاہیے۔“

”او رہنے دے میاں! تیرے جیسا آدمی یہاں سے جلدی نہیں جا سکتا ہے۔ پر خیر یہ بتا ہوا کیا ہے؟“

”بیٹھ جا ادھر! تیرا یہ سوٹ بھی میں دیکھ رہا ہوں [illegible] جانتا ہوں تو کہاں سے ہو کر آیا ہو گا۔ تو چین سے بیٹھ [illegible] سکتا ہے؟“

”دراصل یار! میری جوانی ضائع جا رہی ہے۔ دیکھو [illegible] میری عمر بھی تو نکلی جاتی ہے اور تو ٹھہرا سادھو سنت آدمی [illegible]“

”وہ روپیہ بھی لایا ہے کہ نہیں؟“

”وہ میں لے آیا ہوں بلکہ کچھ زیادہ ہی لے آیا ہوں [illegible] نے بریف کیس تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”چلو یہ اچھا ہوا، گروی گاؤں تو ہم چھڑا لیں گے [illegible] رقم سے، مگر پتا ہے ہوا کیا ہے؟ وہ لاڈلی گاؤں ہے [illegible] نے اس کے تمام لوگوں کو اغوا کر لیا تھا۔“

”اچھا! یعنی تمہارا مطلب کیا ہے آخر؟ کوئی وہ [illegible] تھے کہ جیب میں آ گئے۔“

”سُرمے دانی نہیں، سُرمہ تھے وہ لوگ۔“ یہ کہہ کر [illegible] تمام واقعات اسے سنا دیے۔ میری باتوں میں وہ اتنا [illegible] ناشتہ بھی بھول گیا۔ میں خاموش ہوا تو اس کی حیرت کا [illegible] اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

”اور یہ سب کچھ تم نے کر لیا! یعنی تم نے؟“

”ہاں۔ اور کیا کوئی فوج تھی میرے ساتھ۔“

”تو پاگل کر دے گا مجھے! اور وہ ملک اشرف اب [illegible] کوٹھریوں میں بند ہے؟“

”ہاں۔ اس کو میں باندھ لایا تھا۔ ابھی بہن جی [illegible]

[illegible] سے بات ہو گی۔“

”بڑی حیرت کی بات ہے [illegible]! آدمی کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ملک اشرف کی شکل دیکھو اور [illegible] کرتوت دیکھو۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے ہی کسی کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔“

”تجھے پتا ہے حیدر کے پاس ایک انگریز آیا تھا۔ اس کا نام ولسن ہے۔ وہ بار بار تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”ولسن! یہ کس بلا کا نام ہے پیارے؟ میں نے تو آج تک اس کا نام نہیں سُنا ہے۔“

”مجھ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ صرف ایک ہی بار آیا تھا۔ اپنا پتا بھی وہ چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ وہ پھر آئے گا مگر میرے سامنے نہیں آیا۔ حیدر سے میں کہہ آیا ہوں کہ اگر وہ پھر آئے تو اس کو تہہ خانے میں بند کر دے اور ہمیں اطلاع دے دے۔ اپنا پتا میں اسے دے آیا ہوں۔“

”پتا نہیں وہ کون تھا؟“

”بھئی تو آدمی بھی تو انٹرنیشنل قسم کا ہے۔ انڈیا تک تیری دھوم ہے، میرا خیال ہے اب تیرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ تیرے پیچھے کوئی لمبا جال لے کر چل رہا ہے۔“

”تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے تو بھی قابلِ گردن زدنی ہے آبی! میں اکیلا خدا کے سامنے نہیں جاؤں گا۔“

”چلو دیکھ لیں گے۔ اچھا! یہ بھی سنو! حیدر نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ امریکہ سے واپس آ رہے ہیں۔ اُن پر وہاں کوئی زبردست مقدمہ بن گیا ہے۔ یہ بات اسے ڈاکٹر دھمن کے ملازم مستقیم نے بتائی ہے۔ ان دونوں کو چار مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ دو مہینوں کے بعد واپس آ جائیں گے۔“

”پھر تو بات ہی آسان ہو گئی۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے سوچ رہا تھا کہ اس تک کیسے پہنچوں۔ اُسے آ لینے دو۔ مگر یہ مستقیم کون ہے؟ اس کا نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا؟“

”یہ ان کا بہت پرانا ملازم ہے۔ سوات خان کے ساتھ ہوتا تھا۔“

”پھر تو حیدر کو وہ خط لکھ سکتا ہے۔ کسی کام کے لیے کہا ہے اس نے؟“

”نہیں، بس اطلاع ہی دی ہے اس نے۔ کہہ رہا تھا کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔“

”تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے آبی! میں تو اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں غوث محمد کے ساتھ کوٹھریوں کی طرف نکل گئے۔ وہ تینوں ایک ہی جگہ بند کیے گئے تھے اور باؤ جبل ان کی کوٹھری کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ غوث محمد نے ان کے لیے پانچ چھ کمبل اندر پہنچا دیے تھے کہ کہیں وہ رات کو سردی محسوس نہ کریں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور سلاخوں کے سامنے آ ٹھہرے۔ چہرے سب کے بجھے ہوئے تھے۔ ایک ہی رات کی اسیری نے ان کے کس بل نکال دیے تھے۔ ملک اشرف بلکنے لگا۔

”خدا کے لیے سردار صاحب! مجھے چھوڑ دیں۔ میرا خاندان برباد ہو جائے گا۔ مجھے بڑے سرمائے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“

”تو تُو ہے ملک اشرف۔ تیرا جواب نہیں ہے بھائی! تجھے اچھی سوجھی، لاڈلی گاؤں سے بندے ہی چُرا لیے۔ اس کا تمہیں مشورہ کس نے دیا تھا؟“ آبی نے باؤ جبل سے بندوق لے کر ملک اشرف پر تان لی۔

”وہ... جسکانی ہے۔ یہ مشورہ اس نے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے گاؤں سے سب آدمی اٹھا کر لے جاؤ۔“

”آدمی تم بہت اچھے ہو بھئی! بڑی آسانی سے اعتراف بھی کر لیتے ہو۔“ ملک اشرف شرمندہ سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ تو آبی نے کہا۔ ”میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ستناجا صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ سارا قصہ ہی ختم ہو گیا ہے ملک اشرف جی!“

وہ ٹکر ٹکر آبی ـــــ کا منہ دیکھنے لگا مگر اس کے لیے یہ خبر کوئی بڑی خبر نہیں تھی۔ اگر محسن ستناجا مر جاتا تو ایک بات تھی۔

”اس کا بھائی محسن کہاں ہو گا؟ میرا خیال ہے۔ اُسے بھی اطلاع دے دی جائے۔“

”وہ وہیں ہو گا۔ بڑے ستناجا صاحب نے ہی اُسے ہمارے ساتھ حصے دار بنایا تھا۔“ ملک اشرف نے منحنی آواز میں کہا۔ ”چلو چھٹی ہوئی۔ حصے کا ٹنٹا ہی ختم ہو گیا۔“

”تم نے کتنے روپے کا بِل اوپر والوں کو دے رکھا ہے؟“

”وہ کوئی ایک کروڑ اسّی لاکھ کا بِل ہے، افشاں کنسٹرکشن کمپنی کے نام کا۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ ملک اشرف پھر اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گیا۔

”بات یہ ہے ملک اشرف المخلوق صاحب کہ وہ بِل ہم وصول کرنا چاہتے ہیں، ما بدولت کاغذات اس کے لیے آپ تیار کریں گے۔ سمجھتے ہیں نا آپ! آپ سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں میرے [illegible] شاہ! آپ ماشاء اللہ بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔“ آبی نے ایک نئی پخ نکال لی تھی۔ اس کے ذہن کی میں داد دیتا ہوں۔ اس نے صورتِ حال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ملک اشرف کا ایک نیا استعمال دریافت کر لیا تھا اور نسخہ بھی اس نے سوچ لیا تھا۔ اس کا خیال صحیح تھا۔ کیمپ

کے تمام رجسٹر اور کاغذات تو ان لوگوں نے جلا کر بھسم کر دیے تھے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان لوگوں سے کوئی مالی فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ بات آبی کے ذہن میں ہی آ سکتی تھی کہ انھوں نے کوئی بل بھی خزانے میں جمع کرایا ہوگا۔ اب تو ملک اشرف ہمارے لیے بہت ہی قیمتی شے بن چکا تھا۔ اسے مار کر تو ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بڑی ہی حماقت کی بات ہوتی۔

"کیا خیال ہے پھر؟ آپ تیار ہیں اس کے لیے ملک اشرف المخلوق صاحب؟"

"میرے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔ وہ سب کچھ جل چکا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس کا بھی کوئی حل ہم سوچ لیں گے اور پھر ہمیں کرنا ہی کیا ہے۔ ہمارا آدمی آپ کے ہاتھ کی رسید لے کر وہاں جائے گا اور چیک لے آئے گا۔ آپ کے حساب میں کوئی اور رقم بھی تو ہوگی۔ کیا خیال ہے آپ کا عالی جاہ؟" آبی کا لہجہ زیادہ ہی طنزیہ ہو گیا تھا اور ملک اشرف کے ساتھ کھڑا اصغر علی بھی اس کو سمجھ رہا تھا۔

"جی نہیں۔ ہمارے حساب میں کوئی رقم نہیں ہے۔"

"جھوٹ نہ بولیں میرے بادشاہ! ایسا نہ کریں۔ ہم یتیم اور لیسر لوگ ہیں، ہماری مدد آپ کا فرض ہے۔ دیکھیں نا، آپ کو مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کا صلہ دے گا۔ ملک صاحب! دیکھیں نا آپ کی جلد کتنی نازک ہے۔ اس پر دھبے پڑ جائیں گے۔ یہ خراب ہو جائے گی میرے بادشاہ!" آبی نے ملک اشرف کی گردن پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ گہری چٹکی۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگا تو آبی نے پھر اُسے گریبان سے پکڑ کر سلاخوں کے قریب کر لیا۔ اس کی گردن ایک دم نرم ہو گئی تھی۔ "آپ بڑی قد آور شخصیت ہیں ملک اشرف الاشراف صاحب! ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ اس کو سمجھائیں اصغر علی خان صاحب! اس کو سمجھائیں۔ یہ زمانے کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتے اور اب تو یہ نیچ کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، افشاں کنسٹرکشن کمپنی کے حساب میں کتنی رقم ہوگی بھائی جی؟" آبی، اشرف کو چھوڑ کر اصغر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں ہے جناب! یہ سارا کام ملک صاحب ہی کرتے ہیں، انھیں ہی معلوم ہوگا۔"

"پھر بھی کچھ نہ کچھ تو پتا ہوگا آپ کو۔ مثلاً آخری بار آپ نے کتنی رقم حاصل کی تھی۔"

"ایک لاکھ روپیہ دیا تھا انھوں نے۔"

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ آپ نے ٹھیکے میں کتنی رقم جمع کرائی تھی؟ میرا مطلب ہے آپ کا فرداً فرداً سرمایہ کتنا اس میں ہے؟"

"صرف سیکیورٹی ہم نے جمع کرائی تھی پچاس لاکھ روپے جس میں سے ہر حصے دار کے ساڑھے بارہ لاکھ تھے۔"

"گڈ۔ اور پھر آپ کو آمدنی شروع ہو گئی۔ اندازاً کتنی رقم لے چکے ہیں اب تک؟"

"جی، یہی کوئی تیس لاکھ روپے۔"

"ویری گڈ۔ باقی رقم کا بل اب دیا ہے آپ نے ایک کروڑ اسی لاکھ کا — واہ واہ کتنے نیک لوگ ہیں آپ، بات صحیح صحیح بتا دیتے ہیں۔ واللہ آپ ہر طرح سے ہماری داد کے حقدار ہیں۔ صرف ساڑھے بارہ لاکھ جمع کروا کر اب آپ ہر حصے دار کو پینتالیس پینتالیس لاکھ مل جائے گا اور پچیس آپ ہر آدمی کو لے کے دے چکے ہیں۔ آپ کے تو وارے نیارے ہو گئے حضور پُرنور۔ بڑی بات ہے۔ ہم تو گدھے ہی ہانکتے رہے۔ بھینسوں سے یاری لگاتے رہے، کیوں صاحب؟ بڑی ہی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اوئے کیا ہے تیرا بھائی پہریدار؟"

"یہ باؤ جمال ہے۔ ویسے اس کو باؤ جھل بھی کہتے ہیں۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے اس کی۔" میں نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آبی ہنس دیا، بولا۔ "یہ غوث محمد بھی اوّل درجے کا ہے۔ کیوں اوئے! تجھے وہ ایسا کیوں کہتا ہے؟"

"وہ جی، ایسے ہی بکتا ہے باؤ جی! میرا نام بگاڑتا ہے۔ میرا نام محمد جمال ہے جی!"

"دیکھ جمال میاں! ان کا بہت خیال رکھ میرے بھائی۔ سونے کا انڈہ دیتی ہیں یہ مرغیاں! خوب خاطر تواضع کرنا ان کی، کوئی دس بارہ آنے تجھے بھی ہم دیں گے۔ اچھا ملک جی! اب اجازت دیں ہمیں، آپ کو بڑی زحمت دی ہم نے۔" آبی نے اشرف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

پھر ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ جب ہم کمرے میں پہنچے تو آبی بولا۔

"بات یہ ہے جیلانی! کہ یہ بل ان لوگوں نے لاہور دفتر میں جمع کرایا ہوگا۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ ان سے کاغذ کیسے لکھوائیں۔ تم کہتے ہو کہ وہ سب کچھ جل گیا ہے؟ رقم اتنی بڑی ہے کہ...!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر... ہمیں کرنا بھی کیا ہے۔ اشرف یا اصغر علی خان سے ہم اتھارٹی لیٹر لے لیتے ہیں۔ وہ چیک دے دیں گے۔"

"پتا یہ کرنا ہے کہ افشاں کمپنی ہے کہاں۔ اس کے دفتر کسی آدمی کو بھیج کر ہم چیک منگوا سکتے ہیں پھر ان کا حساب بھی دیکھ لیں گے۔ ان سے کسی چیک پر دستخط کروانا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔" آبی کی رال زیادہ ہی ٹپکنے لگی تھی اس رقم پر۔

"مگر آبی! ہم اتنا روپیہ لے کر کیا کریں گے آخر؟ ایک دن تو ہمیں مر ہی جانا ہے۔"

"یار تو کیسی نکمی باتیں کرتا ہے! کمال ہے! روپیہ کس کو بُرا لگتا ہے۔ ہائیں! ان لوگوں نے اس روپے کے لیے گاؤں کے گاؤں اجاڑ دیے۔ کیا کچھ نہیں کیا ہے انھوں نے؟ صرف روپے کی خاطر تو یہ ہنگامہ تھا! اور دیکھ تو مرنے کی باتیں نہ سوچا کر! عین عالم شباب میں، ہاں۔ لے یہ سگریٹ پی۔ یہ خالص امریکن ہے۔"

"بس تیرا بیڑہ ایسی ہی حرکتوں میں غرق ہو جائے گا۔ میں تجھے سمجھا کے تھک گیا آبی!"

"اپنی فکر کرو بینڈو صاحب! بقراط کو نقل پڑھانے بیٹھ گئے ہو۔ اوئے میں تجھے سیدھا راستہ دکھا رہا ہوں۔"

"بکواس نہ کیا کر اوئے! ہاں سب جانتا ہوں تیرے سیدھے راستے کو۔"

"ٹھیک ہے بھئی! مگر میرا دل بہت ڈرتا ہے تیرا حشر دیکھ کر۔" یہ کہہ کر وہ بستر پر بوٹ سمیت دراز ہو گیا۔ وہ ایسے مسکرا رہا تھا جیسے اُسے اپنے جنت میں جانے کا پختہ یقین ہو۔

"اور تیرا جو حشر ہوگا اس کے بارے میں کیا خیال ہے تیرا؟"

"اوئے دیکھ، میرا خیال ہے بہن جی آ گئی ہیں، باہر ہارن بج رہا ہے گاڑی کا۔" وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آواز تو میں بھی سن رہا ہوں۔ میرا خیال ہے غوث محمد وہیں ہوگا۔" آبی ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا اور سیدھا غسل خانے میں جا گھسا۔ اپنی شکل دیکھ کر وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ وہ اس سوٹ میں بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

"دیکھ تو آسیہ کے سامنے میرے ساتھ غلط مذاق مت کیا کر، ہاں میں اچھا لگ رہا ہوں نا؟"

"بہت اچھے! لگتا ہے ابھی ابھی بارات لے کر آئے ہو۔ مگر یہ آسیہ کے بارے میں تجھے یہ خیال کیسے آیا؟"

"وہ... وہ... نہیں یار! بُری بات ہے۔ وہ کیا سوچے گی کہ ایسا شہدا، لفنگا دوست ہے اس کا۔ بھائی کچھ رکھ رکھاؤ بھی تو ضروری ہے اور اب وہ جاگیردارنی بن چکی ہے۔"

"چل ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گا۔ لے وہ اِدھر ہی آ رہا ہے۔"

آسیہ اپنے سیاہ لبادے میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر آ گئی۔ کاظم، صفدر اور سندھو اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ چہرے پر اس نے وہی نقاب ڈالا ہوا تھا جس میں سے اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں اور وہ تازہ دم دکھائی دیتی تھی۔

"السلام علیکم! ارے آبی صاحب آپ! کب آئے آپ لاہور سے؟ آپ کے کیا حال ہیں بھائی صاحب؟"

"جی میں صبح ہی آیا ہوں۔"

"یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔ وہ... وہ رقم لے آئے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔ بالکل لے آیا ہوں۔"

"وہ ہم پر قرض ہوگی۔ بعد میں آپ کو دے دوں گی۔ صفدر! تم آج علی جو کارخانی صاحب کو بُلا لاؤ۔ میں یہ قصہ آج ہی ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی بہت بہتر! میں اسے آج بُلا لوں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم تینوں اب جاؤ آرام کرو۔ میں ان سے ذرا بات کروں گی۔ شاباش بہت تھک گئے ہو گے تم۔"

"نہیں بہن جی! رات تو ہم بہت آرام سے رہے۔ بڑی گہری نیند آئی ہمیں۔ اچھا خدا حافظ!" صفدر نے کہا اور وہ تینوں اسی وقت حویلی کے اندر چلے گئے۔ غوث محمد راہداری میں کھڑا تھا۔

"غوث محمد! ذرا ہمارے لیے کافی تو بنوا دو — ذکیہ سے کہو۔ وہ بنا دے گی۔"

"ابھی لایا بہن جی! ابھی لایا۔" یہ کہتے ہوئے وہ خود حویلی کی طرف نکل گیا۔

"لاڈلی پھر سے آباد ہو گیا ہے۔ اس کی رونقیں لوٹ آئی ہیں۔ وہ لوگ اتنے خوش تھے واپس آ کر کہ میں بتا نہیں سکتی۔"

"ان کا کوئی آدمی ضائع تو نہیں ہوا؟" "چار آدمی مر گئے تھے کیمپ میں اور پانچ عورتیں ختم ہو گئیں۔ وہ بیمار ہو گئے تھے۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔"

"مجھے تو پتا ہی نہیں چلا اور جیلانی تنہا ہی وہاں جا پہنچا۔ مگر بڑا حوصلہ ہے اس کا بی بی! اس کی باتیں سن کر تو میں حیران رہ گیا۔" آبی بولا۔

"ہاں۔ ہمارے پہنچنے تک انھوں نے اُن کی جڑ کاٹ ڈالی تھی۔ ہمیں تو صرف چند راؤنڈ چلانے پڑے اور بات ختم ہو گئی۔ میں نے ان پہریداروں کو گاؤں والوں کے حوالے کر دیا۔ وہ دو سال تک ان کی خدمت کریں گے۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ ان سے خوب کام لو۔ کام نہ کریں تو

خوب مارو انھیں۔ ایک ایک کرکے تمام پہریدار میں نے مختلف گھروں میں بانٹ دیے ہیں۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ وہ انھیں فرار نہ ہونے دیں۔ رات کو باندھ کر رکھیں اور دن کو جکڑ کر باہر لے جایا کریں۔" آسیہ بہت خوش تھی۔ اتنی خوش کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

"اور اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوگا بھائی جان! میں دیکھ لوں گی۔ کیمپ سے جو آدمی بھی بچ کر نکل گیا وہ ہماری نشاندہی نہیں کرسکتا۔ ہاں وہ لاڑلی گاؤں تک جاسکتا ہے مگر جو اغوا کرنے والے تھے، وہ سب ہم باندھ کر لے آئے ہیں۔ کوئی پوچھے گا تو میں سنبھال لوں گی اسے۔ وہ رقم کہاں ہے حضرت صاحب!" آسیہ نے آبی کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ حضرت صاحب کا لفظ اس کے لیے بالکل ہی نیا تھا۔ وہ بھی چکرا کر رہ گیا۔ پھر بھی وہ اٹھا اور بریف کیس لے جاکر اس نے آسیہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے اندر ٹھسا ٹھس نوٹ بھرے تھے۔

"کتنے ہیں یہ؟"

"یہ کل اٹھائیس لاکھ ہیں۔ یہی میرے حساب میں موجود تھے، وہ میں لے آیا۔"

"اور آپ کیا کریں گے؟"

"ہمارا اللہ مالک ہے۔ ویسے ایک اور آسامی ہم نے ڈھونڈ لی ہے۔ بہت تگڑی آسامی ہے وہ۔"

"کیا مطلب؟ کیسی آسامی؟"

"یہ اپنا ملک اشرف ہے نا، یہ بڑے کام کا بندہ نکلا ہے اللہ کے حکم سے، بڑی رقم ہے اس کے پاس۔"

"اچھا! پھر؟ وہ ہمیں کیسے دے دے گا؟"

"اس کا طریقہ بھی ہم نے سوچ لیا ہے، انھیں بتاؤ جیلانی! کہ وہ معاملہ کیا ہے۔" آبی نے بحث سے جان چھڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

میں نے سارے حالات گوش گزار کردیے۔ جب میں چپ ہوا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "یہ حضرت صاحب کی تجویز ہے گویا، مجھے بھی اچھی لگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک کروڑ اسّی لاکھ کے مالک تو اب بن ہی سکتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ بندے کی تو یہی دُعا ہے کہ خدا آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔" آبی نے گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگا۔ "ویسے ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ یہ نوٹ بھی مجھ پر بوجھ ہی تھے، سو یہ بار بھی آج اُتر گیا۔ وہ رقم بھی ہم آپ ہی کو دے جائیں گے بی بی! ہمیں کیا لینا دینا ہے ایسی رقموں سے۔ کیوں جیلانی؟"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارا کیا ہے۔ یہاں سے نہ گے تو کسی اور گھر جا بیٹھیں گے۔"

"نہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے بھائی صاحب! آپ اب کہیں مستقل بسیرا کرلیں۔ میں بہرحال ماں جی کو بھی کسی دن بلوالوں گی اور ہم بڑے آرام سے یہاں رہیں گے پھر ہم آپ اور حضرت صاحب کی شادی کردیں گے۔ کیوں جناب! ٹھیک کہ نہیں؟"

"نہ نہ بی بی! کہاں میں! اور کہاں شادی اور پھر بچے پھر ان کے بچے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کوئی اور کام بتائیں مجھے ا ہمیں قانون کو بھی حساب دینا ہے۔"

"وہ بھی دے لینا۔ ہم بڑے سے بڑا وکیل کرسکتے ہیں، اس کے لیے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ ہم دے سکتے، اس کے بارے میں مت سوچیں۔ ویسے میں ملک اشرف سے بات کروں گی؟"

"ایسا نہ کریں۔ ہم انھیں سوچنے کے لیے بہت سا مواد آئے ہیں۔ کل پھر ان سے بات ہوگی۔ اس کے بعد آپ کو اختیار حاصل ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کرسکتے ہیں۔ پھر بھائی جان! بیل منڈھے چڑھ جائے گی نا؟"

"اس کی فکر نہ کرو بہن جی! ویسے یہ اچھا فراڈ شروع کر ہے تم نے۔ سارے جہان کی بہن جی بن گئی ہو۔ کیوں آبی؟"

"یہ ان کی ہمت ہے کہ اتنے سارے جوانوں کی بہن بن گئی ہیں اور وہ ان کا پانی بھرتے ہیں۔ ورنہ اس قماش لوگ کس کے میت ہوتے ہیں۔"

"میں ان کی کمزوریاں سمجھ گئی تھی، میرے بہت کام آ ہیں یہ لوگ، اب میں صفدر اور طاہر بیگ کو کسی دن لندن بھیج دوں گی۔ تاکہ گوریا کی اس بہن جی کا صفایا کردیں۔ اس سے مجھے بہت خطرہ ہے۔"

"کیا خیال ہے، میں اور آپ نہ چلیں لندن؟ میرا دل بہت چاہتا ہے وہاں جانے کو۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ اگر ناکام لوٹے تو پھر اس کے بارے میں بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ ہم تینوں وہاں جاسکتے ہیں۔ اس کو مارنا نہیں ہے، دونوں میاں بیوی کو ایسی دوا کھلانا ہے جس سے وہ دونوں پاگل ہوجائیں یا اپنے ماضی کو بھول جائیں۔" آسیہ کی باتیں سن کر میں اب حیران ہونے لگا تھا۔ وہ کیا بن گئی تھی! کیا منصوبے بنانے لگی تھی؟

"ہاں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اگر آدمی کے گردے تبدیل کیے جاسکتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ہوسکتا۔ میں نے سُنا ہے ایسی دوا

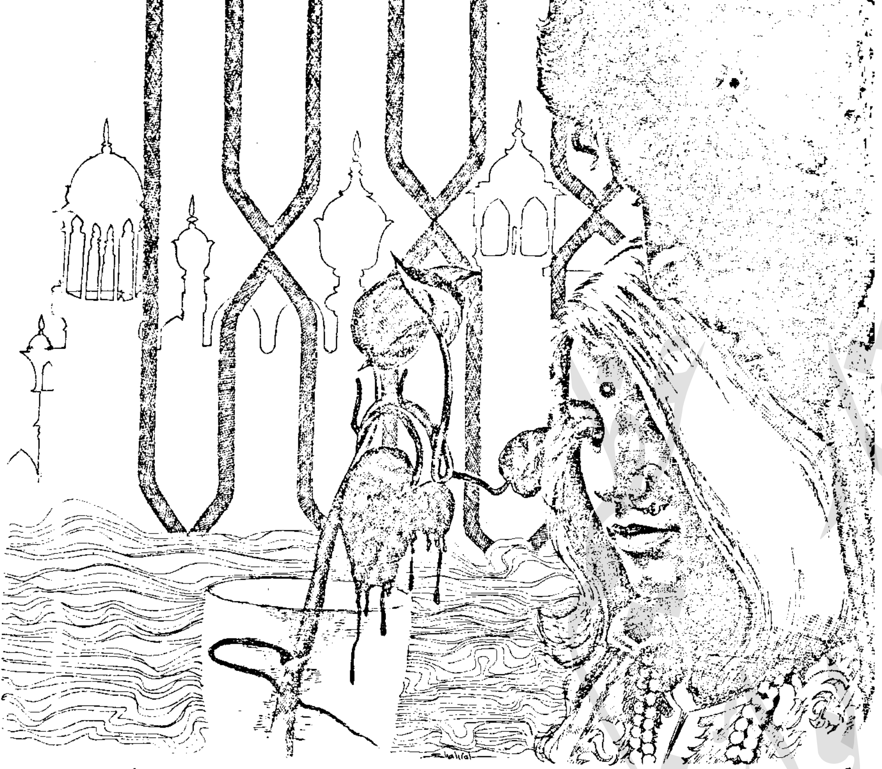

مل جاتی ہیں۔" آبی نے اس معاملے میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایسا ہی تھالی کا بینگن تھا، اِدھر اُدھر ڈولتا ہی رہتا تھا۔

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

اتنے میں غوث محمد کافی کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تو ہم چپ ہوگئے۔ اور پھر آسیہ پیالیوں میں کافی ڈالنے لگی۔ غوث محمد ہمیں خاموش دیکھ کر فوراً ہی وہاں سے سرک گیا۔ رمز شناس ملازم تھا۔ موقعے کی نزاکت کا بروقت خیال رکھتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو میں نے راہداری میں جاکر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بہت دور نکل گیا ہے۔ یہ اچھی بات تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو مالکوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں آگئی تو سن لی، ورنہ نہیں۔

کافی ختم کرکے آسیہ نے بریف کیس اٹھایا اور بولی۔ "یہ اٹھائیس لاکھ روپیہ ہے نا، اندر جاکر میں گن لیتی ہوں۔ بہرحال آپ کا یہ قرض ہے ہمارے ذمے اور ہم اس کی واپسی کے پابند ہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو آسیہ! میں اسے خود واپس کردوں گا۔ بس جاؤ تم عیش کرو۔ ایک صرف تمھارا یہی تو حق ہے مجھ پر۔ باقی سب کچھ تو ختم ہوچکا ہے۔ جیسے بھی ہو ماں جی کو یہاں بلالو۔ میں بھی ان سے مل لوں گا۔"

"میں یہی کروں گی۔ جلد ہی کسی کو وہاں بھیج دوں گی۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ باہر نکلنے لگی تو آبی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس سے بریف کیس لے لیا۔

"لائیں، میں اسے اندر رکھ آتا ہوں۔ خاصا وزنی ہے یہ۔"

آسیہ نے ہاتھ سے بریف کیس لینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بولی۔ "ارے آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں حضرت صاحب!"

"میرا نام آبی ہے بی بی! اسلم آبی۔ اور یہ بریف کیس آپ کے کمرے تک پہنچانا میرا فرض ہے۔" یہ کہہ وہ آسیہ کے ساتھ حویلی کے اندر چلا گیا۔

آبی کا یہ رویّہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آسیہ بھی اُسے برابر حضرت صاحب کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی اور آبی نے یوں کیا تھا کہ میرے حساب میں سے رقم نکلوانے کے بجائے اس نے اپنے حساب میں سے روپیہ اسے لا دیا تھا اور اس بات پر وہ بہت خوش تھا۔ اس کی نیّت کو تو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خوش مزاج کتنا ہوگیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا اور میں وہاں بیٹھا پاگل ہوتا رہا مگر آبی واپس نہیں آیا۔ وہ بریف کیس چھوڑنے گیا تھا بہن جی کے ساتھ۔ میں بس بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا۔ آخر تنگ آکر میں خود اٹھا، مگر ابھی میں جوتے پہن ہی رہا تھا کہ آبی ہنستا، مسکراتا واپس آگیا۔ مجھے جوتوں میں پاؤں پھنساتے دیکھ کر بولا "کیوں بھئی! یہ کدھر کی تیاریاں ہیں؟ کہاں جا رہے ہو؟"

"میں تمھاری طرف ہی جا رہا تھا۔ یہ تم بریف کیس چھوڑنے گئے تھے کہ اب لوٹ کر آئے ہو؟"

"ہاں۔ ارے میں اُدھر ذرا گورایا صاحب کے پاس جا بیٹھا تھا بھئی! اسے ڈربے میں بند کر رکھا ہے بہن جی نے۔ یار! اس آدمی کا بڑا حوصلہ ہے۔ پانچ سال تک وہ بند کوٹھری میں قید رہا اور اب وہ پھر قیدی بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ذرا شطرنج کی بازی ہوگئی تھی ایک۔"

"یعنی تم بہن جی کے ساتھ نہیں تھے؟"

"کہاں بھئی! اس نے تو جاتے ہی کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے سوچا چلو گورایا صاحب سے ہی مل لیتا ہوں، سو میں مل آیا مگر تمھارا دماغ کیوں خراب ہوگیا ہے۔ وہ میرا روپیہ تھا جو تو نے مجھے دیا تھا اور میں نے اس کو دے دیا۔ قصہ ختم۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں سمجھا تو شاید پھر ملک اشرف کے پاس جا پہنچا ہے۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔

"نہیں یار! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اس سے کل مل لیں گے ہم۔ اسے کچھ سوچنے کا موقع دینا چاہیے۔"

پتا نہیں ایسا کیوں تھا میرے دل میں شک کی گرہ بیٹھ گئی تھی۔ میں آبی کو ابتدا میں ہی خبردار کر دینا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ پھر بھی میرا اندازہ تھا کہ شاید وہ متنبہ ہوگیا ہو۔ ہر بات ضروری تو نہیں کہ کہہ ہی دی جائے۔ چپ رہ کے بھی ایسی باتیں سمجھائی جا سکتی ہیں۔ پھر میں یقین سے تو ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آسیہ تو بہت ہی بدل گئی تھی۔ اس کے لہجے کا بھاری بھر کم ہونا مجھے بہت کھٹکتا تھا۔ وہ واقعی خود کو جاگیردارنی سمجھنے لگی تھی اور اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کا بڑا بھائی اسے دیکھ رہا ہے۔ آبی کو جس بے تکلفی سے وہ حضرت جی کہہ کر مخاطب کر رہی تھی، اس کی وجہ سے میرے دل میں سو قسم کے خدشات ابھرنے لگے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی اس نے اپنے بیٹے بلال احمد کا بھی پھر ذکر نہیں کیا تھا اور وہ لاکھو لاشاری کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔ کم سے کم میں تو یہی اندازہ لگا سکا تھا۔ کئی روز سے میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ اس موضوع پر وہ بات ہی نہیں کرتی تھی کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ عورت کی الجھی ہوئی فطرت کو سمجھ چکا ہے۔ میرے سامنے آسیہ ایک نئے رنگ روپ میں ہو... میں سوچ رہا تھا، کسی ایسے جال میں اس نے پاؤں رکھ... پھر نکلنا مشکل ہو جائے تو میں اُسے کیسے بچا سکوں گا... ایک بالکل ہی نئے چکر میں پھنسا دے گی جو بالآخر میری اور... کی دوستی کے خاتمے پر ہی جا کر رکے گا اور یہی وہ بات تھی... سے میں بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔

رات کے کھانے پر مجھے آسیہ نے اپنے کمرے میں ... تو اس دعوت پر خوش ہوگیا۔ وہ اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک ... بھر کر لے آیا تھا۔ اس میں سے اس نے مجھے بھی ایک شلوار ... نکال کر دے دی۔ قد میرا اس کا برابر ہی تھا۔ میں نے ... کا سوٹ نکال کر پہن لیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کا وہ ... چیزوں سے لدا پھندا تھا جس میں وہ کئی قسم کی خوشبوئیں ... لایا تھا۔ ایک شیشی کھول کر اس نے مجھے بھی خوشبو میں نہلا دیا... خود بھی اس نے اپنا لباس اسی خوشبو میں بھگو لیا۔

"تیرا کیا خیال ہے، اس خوشبو سے معطر ہو کر تو اپنے ... کی بدبو چھپا لے گا؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

"پتہ نہیں، لیکن اب میں سوچتا ہوں، انسان کو ہمیشہ ... صاف رہنا چاہیے۔ خبر نہیں کب موت کا فرشتہ گدی ناپ لے... صورتیں بھی اب تو خراب ہو چکی ہیں۔"

"وہ کیسے؟ ابھی تو میں دوبارہ نہا کر نکلا ہوں۔"

"نہانے سے کیا ہوتا ہے پیارے! اصل چیز تو روشنی ... ہے جس کا عکس چہروں پر ابھر آتا ہے تو گنگا جل میں بھی نہا... تو بھی گندہ ہی رہے گا۔"

"اپنے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟"

"میں تو تجھ سے زیادہ ہی گناہگار ہوں جیلانی! میرے ... دل پر بوجھ بڑھنے لگا ہے۔ میرا خیال ہے اب میں نماز پڑھ... گا۔ کہتے ہیں نماز آدمی کو برائیوں سے روکتی ہے؟"

"ہاں۔ یہ اچھی بات ہے۔ کسی مسجد میں بیٹھ جا، لیکن ... کے لیے کیا ضرورت ہے اتنے سُچے کپڑوں کی اور اتنی ... خوشبو کی؟"

"یہ تو ذرا دوسروں کو قائل کرنے کے لیے ہے... سمجھ میں کہاں آئیں گی میری باتیں۔"

"تو چل پھر، میں بھی دیکھتا ہوں کہ تیرا رُخ کس ... ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک پستول نیفے میں اڑسا اور اس ... ساتھ حویلی کے اندر کی طرف چل دیا۔

آسیہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ بلکہ وہ حویلی کے ... ہال میں بیٹھی تھی جس کے اندر ایک لمبی سی میز کے گرد ... کرسیاں لگی تھیں اور وہاں وہ تنہا نہیں تھی بلکہ ایک ... ڈی بھی وہاں موجود تھا۔ اس کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کیونکہ ... نے بھی ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"آئیے حضرت صاحب!" وہ آبی سے مخاطب تھی۔ پھر اس آدمی سے بولی "یہ حسن علی گردیزی ہیں کارخانی صاحب! اور یہ ہیں سردار کریم نواز، ہمارے بھائی! ان سے ملیں یہ علی جو کارخانی ہیں۔" آسیہ نے کرسی پر سے اٹھ کر اپنے سامنے بیٹھے آدمی سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی طرّے دار پگڑی باندھے ہوئے تھا اور اس نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ سر سے پاؤں تک وہ مجھے کوئی بہت ہی بانکا، سجیلا آدمی نظر آتا تھا۔ عمر اس کی بھی کوئی پینتیس سال ہوگی۔ کارخانی صاحب نے اٹھ کر ہم سے بڑے پُرتپاک انداز سے ہاتھ ملایا۔ بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بیٹھیں۔"

آسیہ اس وقت بھی سیاہ لبادے میں ملبوس تھی اور نقاب اس نے ایسا پہن رکھا تھا کہ کوئی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"دراصل میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے تاکہ گورایا صاحب نے آپ سے جو رقم اُدھار لی تھی۔ وہ واپس کر دوں۔ دیکھیں نا، دن بھی تو بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ یہی کوئی چار دن۔"

"جی ہاں۔ میں تو سمجھا تھا شاید آپ کو ان دیہات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی مگر آپ نے تو رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"یہ بہت ضروری تھا۔ گورایا صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ابھی یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ آپ کاغذات لے آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ میں لے آیا ہوں، مجھے آپ کے آدمی نے بتا دیا تھا۔"

"لیں بھائی جان! یہ رقم گن کر انھیں دے دیں۔ پورا بیس لاکھ۔ وہ کاغذ دکھائیں ذرا مجھے۔"

کارخانی نے ایک فائل کھول کر دو کاغذ آسیہ کی طرف بڑھائے۔ وہ انھیں کچھ دیر تک بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ اس عرصے میں مَیں نے بریف کیس میں سے رقم نکال کر گن دی۔ اور بیس لاکھ روپے میز پر ڈال دیے مگر اس طرح کہ کارخانی کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"ویسے میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہوں گی، وہ یہ کہ لاڈلی گاؤں کے لوگوں کو آپ نے وہاں سے کیوں اٹھوا دیا اور وہ کیرل کیسے پہنچ گئے؟" آسیہ نے اچانک ایک نیا ہی سوال ڈال دیا۔

"میں... نے... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں! میں انھیں بھلا کیوں اٹھواتا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" کارخانی سٹپٹا سا گیا۔

"یہ ہو چکا ہے۔ پولیس نے انھیں بڑی مشکلوں سے نہر کی بیگار سے نکالا ہے اور اب وہ اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔ یہ کام آپ کے ایما پر ہی ہوا تھا۔ اس بات کے گواہ موجود ہیں۔"

"کیسے گواہ؟ میں نے کسی سے یہ نہیں کہا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ مجھے اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

"آپ اصغر علی خان کو جانتے ہیں؟"

"جی نہیں... وہ... جی ہاں۔ ان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مگر... وہ کیا کہہ سکتے ہیں اس بارے میں۔ یہ غلط ہے۔" اس آدمی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ہم سے آنکھ ملانے سے گریزاں تھا۔

"کیا میں اصغر علی کو یہاں بُلاؤں؟ اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ آپ نے ہی اسے لاڈلی گاؤں سے بندے اٹھوانے کے لیے کہا تھا۔ آخر آپ چاہتے کیا تھے؟" آسیہ نے پوچھا۔

"میں... میں کیا چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بھئی مجھے ان لوگوں سے کیا ضد ہو سکتی تھی۔"

"دیکھ لیں، میں ابھی اصغر علی کو بلوا لیتی ہوں۔ کیا خیال ہے، آپ اس کا سامنا کر سکیں گے؟"

"دیکھیں بی بی! مجھے ذلیل نہ کریں۔ یہ رقم میرے حوالے کریں اور بس۔ یہ کاغذ آپ رکھ لیں۔ رسید میں آپ کو لکھ دیتا ہوں۔ سودا اسی طرح ہوا تھا۔ نہ آپ نے اس کام میں رخنہ ڈالا، نہ میں نے۔ گاؤں آپ کو واپس مل رہے ہیں اور مجھے میری رقم۔ لائیں میں رسید تیار کر دیتا ہوں۔" وہ جلد از جلد اپنی جان چھڑا رہا تھا۔

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے پہلے اس بات کا تصفیہ ہو جانا چاہیے۔ اگر آپ ایسا نہیں چاہتے ہیں تو میں یہ کاغذ پھاڑ دیتی ہوں اور یہ رقم واپس بریف کیس میں رکھ دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتی ہیں۔ میں آپ پر دعویٰ ٹھونک دوں گا۔ مذاق سمجھا ہے آپ نے۔ کوئی آدمی ایسے ہی آپ سے کہہ دے تو آپ مان لیں گی۔ مجھے اصغر علی خان کی گواہی نہیں چاہیے۔ یہ رقم میرے حوالے کر دیں اور بس۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی ہوئی رقم ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف کھینچنا چاہی مگر میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں یہ پوچھتی ہوں کہ اُدھر کیرل میں لاڈلی کے پانچ آدمی مارے گئے۔ چار عورتیں وہاں ختم ہوگئیں۔ ان کے گھر اُجڑ گئے۔ آخر یہ سب کیوں کیا ہے آپ نے؟ ان مرے ہوئے لوگوں کی ذمے داری کون لے گا؟"

"میرا اس میں کوئی دوش نہیں ہے۔ جس نے انھیں

اٹھایا، وہی اس کا ذمے دار ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ تو اپنے گھر سے آج پولیس اسٹیشن جانے کے لیے نکلے تھے نا؟ راستے میں آپ کو کسی نے میرا پیغام دیا اور پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بجائے آپ اِدھر آ گئے۔ کسی کو پتا نہیں ہو گا کہ آپ کہاں گئے ہیں۔ یہ کاغذات آپ نے میانوالی میں اپنے دوسرے مکان سے لیے اور کار میں بیٹھ کر اِدھر آ گئے۔ یہی کیا ہے نا آپ نے؟"

"جی نہیں۔ میں نے اپنے ملازم شبیر کو بتا دیا تھا کہ میں گورایا صاحب کے ہاں جا رہا ہوں، قندیار۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ مجھے گورایا صاحب کی طبیعت کا علم تھا۔ وہاں کوئی آدمی تو ہے جو جانتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔"

"چلیں یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ بہر حال آپ کو ہم چار چھ دن یہاں رکھ کر معلوم کر لیں گے کہ آپ کی قندیار میں آمد کا کس کس کو علم ہے۔ اس کے بعد یہ بیس لاکھ روپیہ ہم لاڈلی گاؤں میں مرنے والوں کے لواحقین کو دے دیں گے اور آپ کا اللہ حافظ ہے۔ آپ ہمارے مہمان رہیں گے ان شاء اللہ۔ صفدر کو بلانے کے لیے آسیہ نے میز کے کونے میں لگی گھنٹی بجا دی۔

صفدر عقبی دروازے سے فوراً ہی اندر آ گیا۔ کاظم بھی اس کے ساتھ تھا۔ کارخانی کا رنگ اُڑنے لگا۔ وہ اس صورتِ حال کے لیے کسی بھی طرح تیار نہیں تھا اور وہ تھا کوئی بہت ہی سیٹھ قسم کا آدمی۔ ایسے اٹرنگے کا اُسے علم ہی نہیں تھا۔

"یہ رقم بریف کیس میں ڈال دیں بھائی جان!" آسیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذات پھاڑ کر پُرزہ پُرزہ کر کے نیچے ٹوکری میں پھینک دیے۔ میز پر کھانا دھرے کا دھرا رہ گیا۔ وہ بڑی دبنگ آواز میں بولی "اس کو لے جاؤ اُدھر اور سات نمبر میں بند کر دو۔ میں اس سے چھ دن بعد پھر ملوں گی۔ بڑا ناز ہے اسے اپنی دولت پر۔ یہ جب تک مجھے پچاس لاکھ روپیہ نہیں دے گا، میں اس کی جان نہیں چھوڑوں گی۔"

صفدر اور کاظم شکرے ایسی تیزی سے کارخانی کی طرف بڑھے اور جاتے ہی انھوں نے اسے بانہوں میں بھر کر اوپر اٹھا لیا۔ وہ چیختا ہی رہ گیا۔ مگر آسیہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی رہی اور وہ دونوں اس آدمی کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ اس حال میں کہ کاظم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تاکہ وہ زیادہ شور نہ مچا سکے۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا ہے بی بی! اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ شرارت کارخانی کی تھی؟" آبی جو اس سارے تماشے میں چپ چاپ تھا۔ بول پڑا۔

"میں قیصر خان سے پوچھ چکی ہوں۔ وہ خود کہتا ہے کہ لاڈلی گاؤں کا راستہ قدیم خان کو اسی نے دکھایا تھا۔ یہ ... چاہتا تھا کہ وہ لوگ وہاں سے اٹھ جائیں۔ تاکہ یہ اپنے ... کے آدمی وہاں آباد کر سکے۔"

"ہوں۔ اور اب آپ اس سے پچاس لاکھ روپے تاوان لینا چاہتی ہیں؟"

"ہاں۔ یہی میری شرط ہے۔"

"اور ایک کروڑ اسّی لاکھ روپیہ آپ ملک اشرف ... بھی چاہتی ہیں۔" آبی مسکرا رہا تھا مگر اس مسکراہٹ میں طنز زیادہ تھا۔

"ہاں۔ اس کا پتا تو آپ نے ہی دیا ہے مجھے۔ نہ جانے وہ بیل منڈھے چڑھتی ہے کہ نہیں۔"

"فرض کریں کہ وہ بھی آپ کو مل جاتا ہے تو پھر؟"

"پھر کیا ہے۔ مل جائے تو ہم آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ دولت آتی کس کو بُری لگتی ہے حضرت جی!"

"میں آپ سے متفق نہیں ہوں بی بی! یہ سراسر زیادتی ہے۔ آپ ریت کی دیوار پر کھڑی ہیں، آپ کی بنیاد ہی کوئی نہیں ہے۔ ابھی اس کیرل کیمپ کے بارے میں تحقیقات ہوئیں تو ہم سب مارے جائیں گے کیونکہ وہاں آپ سے بہت زیادتیاں ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔ پولیس آپ تک ضرور پہنچے گی۔

"یہ راستہ چھوڑ دو بہن جی! میری بھی یہی گزارش ہے آپ سے۔ آبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے" مجھ سے بھی چپ نہ رہا جا سکا۔

"آئیے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ آئیے۔" یہ کہہ کر وہ بریف کیس میں رقم ڈالنے لگی۔

جب وہ اسے بند کر چکی تو آبی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ بولا "یہ بریف کیس مجھے دے دیں بہن جی! آپ کو اس کی ضرورت ہی نہیں رہی ہے تو پھر فائدہ ہی کیا ہے" یہ بڑا ہی عجیب مرحلہ تھا۔ آبی کا چہرہ کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میز پر پھیلا تھا اور مسکراہٹ بھی اس کے لبوں سے غائب ہو چکی تھی۔

"میرا خیال ہے، یہ رقم ابھی میرے پاس ہی رہنے دیں۔ زیادہ بہتر ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بات جیلانی نے بھی سنی تھی۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ خیال آپ ہی آپ آگیا تھا کہ ہو سکتا ہے کارخانی نے ہی یہ شرارت کی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت

اسے نہیں مل سکا تھا پھر آپ اس پر کیوں اتنا اصرار کرتی ہیں۔ آپ نے کارخانی صاحب کو خواہ مخواہ اِدھر بند کر دیا ہے۔ اس کا آپ کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے بھائی جان؟" آسیہ نے میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے آبی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ یہ کارخانی کی شرارت ہے۔"

"مگر میں پوچھ چکی ہوں۔ قیصر علی نے خود مجھے بتایا ہے۔ وہ تو زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ خود جا کر پوچھ لیں اس سے۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ مگر آپ یہ رقم تو ہمیں واپس کر دیں۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔" آبی نے میری توقع کے بالکل ہی برعکس آسیہ کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ کسی ایسی بے جواز زیادتی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے سامنے ہی ہو رہی ہو اور وہ اس کا تدارک نہ کر سکے۔

"ٹھیک ہے۔ یہ لیں رقم آپ رکھ لیں۔ ضرورت پڑی تو میں آپ سے لے لوں گی۔" آسیہ نے بادل ناخواستہ وہ بریف کیس آبی کی طرف بڑھا دیا۔ میں کسی طرح بھی اس معاملے کو صاف نہیں کر سکتا تھا۔ "چلیں اب کھانا کھا لیں۔" وہ میز سے ہٹ کر دروازے کی طرف نکلتی ہوئی بولی۔

"جی نہیں۔ آپ ہمارا کھانا ہمارے کمرے میں بھجوا دیں، یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر آبی تیزی سے چلتا ہوا آسیہ کے قریب سے باہر نکل گیا۔ اس کا یہ رویّہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ آسیہ بھی پریشان ہو گئی۔ میں لپکتا ہوا آبی کے پیچھے چل دیا۔ مگر وہ اس عرصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

میں دروازے میں داخل ہوا تو وہ بہت بپھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "یہ ہے وہ عورت جس کے لیے ہم اتنا ہلکان ہوتے رہے ہے۔ یہ لالچ کی گٹھری ہے، اسے روپے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ دھوکے سے ایک جاگیر کی مالک بن بیٹھی ہے اور کیا چاہیے اسے؟"

"آرام سے آپی! آرام سے۔ اتنے تلخ نہ ہو جاؤ۔ دوسرے کی بات بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں کیا سمجھوں؟ کیا رہ گیا ہے باقی سمجھنے کے لیے؟ میں بہرحال آج یہاں سے نکل جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے صبح تمہارے دل میں یہی خیال ابھرا تھا کہ شاید میں آسیہ کو پسند کرنے لگا ہوں، میں بھی کچھ ایسی ہی بات سوچ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ شاید وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی ہے مگر۔۔۔ مگر میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔ کوئی عورت ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کارخانی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے، بالکل بے گناہ ہے۔ کیا تم یہی نہیں سوچ رہے تھے صبح؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو آپی! میں بالکل یہی سوچ رہا تھا۔ اور یہ بات مجھے پسند بھی نہیں تھی۔ اچھا ہوا تم نے خود ہی میری غلط فہمی دور کر دی ہے۔"

"اس قدر حریص عورت ہے وہ کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جیلانی کی زندگی نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ دولت اور دولت یہی اس کا ایمان بن چکا ہے۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی پھر بھی وہ یہ پلاٹ کہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ حالانکہ میرے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان نوٹوں کی ہیں۔۔۔ نہیں یار! ایسی بہن کا بھائی ہونا بھی غلط ہے، اپنا اوپر ظلم ہے یہ۔"

"پھر میں کیا کروں آپی! پھر بھی وہ۔۔۔" اس نے میری بات مکمل نہ ہونے دی۔

"بہرحال تم یہ سمجھ لو کہ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم میرا ساتھ دیتے ہو یا نہیں دیتے ہو، اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں اور اس کی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"فکر نہ کرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میرا اپنا یہاں جی نہیں لگتا۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ عین ممکن ہے وہ اصغر علی خان درست کہہ رہا ہو اور گاؤں کے لوگوں کو کارخانی کے ایما پر ہی اغوا کیا گیا ہو۔"

"اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں، وہ کون سا دور ہے۔" اتنے میں غوث محمد ہمارے لیے کھانے کا بڑا سا طشت لے کر اندر آ گیا، بولا "کھانا کھا لیں سردار صاحب! بہن جی تو اپنے کمرے میں بند ہو گئی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی۔۔۔ آؤ گرد ڈیزی صاحب! پہلے کھانا تو کھا لیں۔"

"تم کھاؤ یار! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"او دفع کر۔ تو کس چکر میں پڑ گیا ہے! اپنی اپنی نیت کا پھل ہے کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ چل آ میرے بھائی کھا لے۔"

غوث محمد اس وقت پانی لینے کے لیے واپس جا چکا تھا۔ بڑی بے دلی سے کھانے میں ہاتھ ڈالا اور سوچ سوچ کر لقمے اٹھانے لگا۔

"یہ عجیب بات ہے جیلانی! میں نے بخدا سوچ لیا تھا کہ اس سے شادی کر لوں گا۔ ہاں میری یہی نیت تھی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ وہ بہت دکھی ہے، اس نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ اس کے لیے کیسے ہلکان ہوتے رہے۔ مگر وہ جس انداز سے تمہیں پہلی بار ملی، جس طرح وہ ماں جی کا ذکر کرتی ہے، جس نظر سے وہ دنیا کو دیکھتی ہے وہ میرے لیے حیران کن ہے۔ کبھی! نہ اس میں قناعت ہے، نہ صبر، نہ شکر ۔۔۔۔۔۔ وہ عزتِ نفس بھی نہیں رکھتی ہے۔ میں تو اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ وہ جو عورت ہونے پر فخر ہوتا ہے، وہ بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ ایک بچے کی ماں ہے مگر اس کا وہ عجیب طریقے سے ذکر کرتی ہے۔ یوں بات کرتی ہے جیسے اپنے گردے کے آپریشن کا ذکر کر رہی ہو۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہو۔"

اتنے میں غوث محمد واپس آ گیا اور ہمارے پاس جگ اور گلاس رکھ کر راہداری کی طرف نکل گیا۔ میں نے کہا ہے ناکہ وہ بہت ہی کام کا ملازم تھا۔ چہرے دیکھ کر سمجھ جاتا تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو میں نے کہا۔

"بات یہ ہے آپی! کہ تم شاید اسے بہت ہی غلط سمجھے ہو۔ ایسی ہے نہیں۔"

"دفع کرو جی! وہ جیسی بھی ہے ٹھیک ہے۔ ابھی کھانا کھا کر ہم اس کے پاس ضرور جائیں گے۔ جھوٹ سچ کا وہیں سے پتا چل سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ بات یہ نہیں ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم نے کھانے سے فارغ ہو کر بریف کیس الماری میں بند کیا اور سگریٹ سلگا کر ہم کوٹھڑیوں کی طرف چل دیے۔ بادوجمل اس وقت بھی وہاں پہرہ دے رہا تھا۔ ہاتھ میں بندوق لیے برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہتا۔ ہمیں دیکھ کر ذرا تن کر کھڑا ہو گیا، بولا "صاب جی! میں نے ان کو ڈنر کھلا دیا ہے، ان تینوں کو اور پانی بھی ڈال دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا ہے تم نے۔ ان کو سگریٹ شگریٹ بھی پلایا کرو۔"

"وہ بھی دے دیے ہیں۔ یہ بہن جی کا حکم تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ہم سلاخوں کے سامنے جا ٹھہرے۔ کوٹھڑی کے اندر ہلکا سا بلب جل رہا تھا اور ویسا ہی بلب برآمدے میں روشن تھا۔ ہمیں سامنے دیکھ کر وہ اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کی داڑھیاں بڑھ آئی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت دنوں

بیمار ہوں۔

"اصغر صاحب! ذرا ادھر آئیں، آپ سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔" میں نے اصغر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر دروازے کے پاس آ ٹھہرا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپی کو بتایا "یہ اصغر علی ہیں۔" پھر اس سے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ ادھر کوئی ٹھیکیدار نذر شاہ بھی تھا جو وہاں کرنل بنا ہوا تھا؟"

"ہاں وہ بھی موجود تھا مگر وہ اس وقت کیمپ میں نہیں تھا جب آپ نے حملہ کیا۔"

"ہوں۔۔۔ لاڈلی گاؤں سے بندے اٹھانے کا مشورہ تمہیں کس نے دیا تھا؟"

"دلدار شاہ نے، وہ بھی واپس نہیں آیا۔"

"یہ کون تھا؟"

"اس نے دو سو مزدور اپنے ذمے لے رکھے تھے۔"

"اور اُسے تم کرنل نذر شاہ کہتے تھے ؟"

"جی ہاں — وہ ملیشیا میں کام کرتا تھا۔"

"قدیم خان کا عہدہ کیا تھا ؟"

"وہ پہلے میجر کہلاتا تھا۔ پھر کچھ لوگ اسے کرنل کہنے لگے اور وہ کرنل ہو گیا۔"

"ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اس معاملے میں علی جو کارخانی کا نام کیسے آگیا ؟"

"وہ ... وہ قیصر علی کا دوست ہے اور بس۔"

"کیا یہ اس کا مشورہ نہیں تھا ؟"

"جی نہیں۔ قیصر علی کو صرف اتنا پتا تھا کہ وہ گاؤں گوہر ایا صاحب نے اس کے ہاتھ گروی کر رکھا ہے اور بس ——— دلدار شاہ نے خود ہی یہ تجویز رکھی کہ مزدور وہاں سے لائے جائیں۔"

"مگر تم نے کسی کو بتایا ہے کہ اس بات کا مشورہ کارخانی نے دیا تھا ؟"

"سچ پُوچھیں تو یہ بات مجھ سے کہلوائی گئی تھی۔ شاید وہ دو آدمی یہی چاہتے تھے۔ ورنہ میں نے ان سے یہ نہیں کہا۔ خود ہی انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو گا۔"

"ہوں۔ لاہور میں تمھارا دفتر کہاں ہے ؟"

"مال روڈ پر ہے۔" پھر اس نے مکمل پتا بھی بتا دیا۔ "مال روڈ کے عقب میں ایک بلڈنگ بھی ہے۔"

"ہوں۔ دیکھو ہم تم سے اِس بِل کی تفصیل مانگتے ہیں، جو سرکاری دفتر میں جمع ہے غالباً محکمۂ انہار کے دفتر میں ہو گا ؟"

"جی ہاں ہمارے چار بِل پھنسے ہیں وہاں۔ اور ایک صاحب ہیں اس دفتر میں غیاث ملسیانی۔ وہ چیف انجینیئر ہیں۔ چیک انہی کے دفتر سے ملتا ہے۔" صغر علی نے بڑے اطمینان سے مجھے ساری بات بتا دی۔ وہ کسی بھی معاملے کو اب اخفاء میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ شاید انہوں نے یہی طے کر رکھا ہو کہ اگر وہ ہماری ہر بات کا صحیح جواب دیتے رہے تو عین ممکن ہے ان کی جلد گلو خلاصی ہو جائے۔

"تو یہ بات ہے دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ وہ لوگ ہم سے غلط بیانی کر رہے تھے۔" آپی نے بڑے طنز سے مجھے مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں ؟ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔"

"جی نہیں۔ ویسے اگر آپ ہم پر کرم کریں تو اس عذاب کو ختم کر دیں، یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔ ہمارا جرم تو واقعی بہت بڑا ہے مگر براہِ راست ہم اس میں ملوث نہیں ہیں۔"

"نہیں بیلے، ہم سے کوئی رعایت مت مانگو۔ ہاں — یہی بہت ہے کہ ہم نے تمھاری گردن نہیں اُتاری۔ ابھی تم بہت دن تک یہاں رہو گے۔" یہ کہہ کر میں اور آپی وہاں سے ہٹ گئے۔ پہریدار سے کہہ آئے کہ وہ اُن پر کڑی نگرانی رکھے۔ کارخانی کو کمرہ نمبر سات میں بند کر دیا تھا مگر ادھر ہم نہیں گئے۔

"دیکھا تم نے ! آسیہ ہم سے جھوٹ بول رہی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے آپی ! اس نے شاہد، صفدر اور کاظم کو اُن کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے اس سے غلط بیانی کی ہو گی۔"

"چلو ٹھیک ہے ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو مگر اب کیا ارادے ہیں تمھارے ؟" اس کا غصہ بڑی حد تک ڈھل گیا تھا۔

"میرا خیال ہے ان سے وہ چیک کی رقم لے لینی چاہیے۔ وہ محنت کا مال ہے، ہمیں نہ ملا تو یہ خود لے جائیں گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کیا خیال ہے ہم صغر علی کو لاہور نہ لے جائیں ؟ اُس سے کاغذ پر دستخط کروانے ہوں گے۔"

"ہاں — یہ ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی ہرج بھی نہیں۔"

"تو پھر بہن جی سے بات کرو۔ اس کی اجازت ضروری ہے۔"

"ہاں۔ میں بات کرتا ہوں اس سے۔ تم ادھر اپنے کمرے میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں آسیہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"وہ اس وقت سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کھڑکی کے شیشے میں سے مجھے دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور مسکراتی ہوئی بولی۔ "آپ کے دوست کا غصہ کم ہوا، نہیں ؟"

"پاگل ہے وہ۔ خواہ مخواہ تمھاری نیّت پر شبہہ کر رہا تھا، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ تم نماز پڑھ کر ہٹی ہو ؟"

"ہاں۔ آپ نے پہچان لیا۔ کیا کروں ؟ کسی طرح چین ہی نہیں آتا ہے۔ بھیّا ! ہم نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ میں ہر وقت دروازوں کے پیچھے بند رہتی ہوں مگر روح کو قرار نہیں ہے اپنے ان ساتھیوں سے بھی مجھے خوف آتا ہے کسی کی نیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ... میں بہت پریشان ہوں بھائی ! یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کسی پہلو چین نہیں آتا۔ میں نے زبردستی اپنے لیے یہ جگہ بنائی ہے مگر پولیس کا خوف مجھے پاگل کیے رہتا ہے۔ یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا ؟"

"تمھارے کچھ کام ہی غلط ہیں آسیہ ! اب کارخانی کو اندر بند کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"دیکھیں ! اس کا نام وہ نہیں لیتے مگر یہ ساری شرارت اُسی کی ہے۔ سجدا اسی کی ہے اور اسے چھوڑ دینا کسی بھی طرح صحیح نہ

ہو گا۔ یہ لوگ اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ پولیس میں جا کر بھی نہیں، یقینوں سے ہمیں پریشان کر سکتا ہے اور دلدار شاہ نے بے ... اس نے لاڈلی بھیجا تھا۔"

"کارخانی سے روپیہ لے کر بھی ..."

"وہاں۔ اس پر میں بھروسہ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن یہ گھر واپس نہیں پہنچا تو وہ پولیس میں رپٹ درج کرا سکتے ہیں۔ قندیارہ کا پتا ان کو بتا سکتے ہیں۔"

"میں نے بتایا نا کہ اس کے پیچھے میں نے دو آدمی بھیجے تھے۔ پہلے نے کہا کہ آپ کو تھانیدار نے بلایا ہے۔ دوسرے نے راستے میں کہا کہ آپ آج ہی اپنے کاغذ لے کر قندیارہ چلے جائیں۔ راستے میں اس کی دوسری بیوی کا مکان ہے۔ وہاں سے اس نے کاغذ لیے اور جب یہ تھانے پہنچا تو ایس ایچ او وہاں نہیں تھا۔ اُدھر سے یہ ادھر نکل آیا۔ گاڑی اس کے پاس اپنی ہے۔"

"مگر اپنی دوسری بیوی کو تو یہ بتا آیا ہو گا ؟"

"اتفاق سے اُس کی دوسری بیوی گھر میں موجود نہیں تھی اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ اس مکان کی چابی ہمیشہ اس کے پاس رہتی ہے۔"

"دیکھ لو۔ بہر حال خطرہ اس میں بہت ہے۔"

"میں آپ کی اس ہمدردی کی بہت شکر گزار ہوں بھائی جان ! سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں کبھی آزادی کا منہ نہ دیکھ سکتی۔ آپ جب مجھے ملے تو میں آپ کے سامنے کھُل کر رو بھی نہ سکی۔ میں ایسی منزلوں تک پہنچ چکی ہوں کہ نہ میں رو سکتی ہوں اور نہ ہنس سکتی ہوں۔ بہر حال آپ حکم کریں، اس وقت میرے کمرے میں کیسے آ گئے آپ ؟"

"ہم دراصل یہاں سے کل صبح نکل جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر وہ ایک کروڑ اسّی لاکھ روپیہ ہے جو بلوں کی صورت میں کسی دفتر میں پھنسا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ صغر علی کو یہاں سے لے جائیں۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لے جائیں اُسے۔ بے شک کسی نہر میں پھینک دیں۔ البتہ اُن بلوں میں میرا کچھ حصّہ ہو تو وہ مجھے دے دیں کیونکہ میرے گاؤں نے اس معاملے میں بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ ٹھیک ہے، ہم اسے تین حصّوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک حصّہ تمھارا ہو جائے گا مگر یہ اتنا روپیہ تم کرو گی کیا ؟"

"روپیہ ہی تو سب سے بڑی طاقت ہے بھیّا ! یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے ہمیں روپیہ مِلا تو تمھیں پہنچ جائے گا۔ بہر حال ہم بھی اُسے لے کر یہاں سے چل دیں گے۔ تمھاری گاڑی میں۔ باقی لوگوں کا کیا سوچا ہے تم نے ؟"

"وہ یہاں پڑے رہیں گے، روٹی پانی انھیں ملتا رہے گا، اور بس۔ ضرورت پڑی تو ہم اُن کو مار بھی سکتے ہیں۔"

"ہم پھر آئیں گے، اُس وقت تک اُن کی حفاظت کرنا ——— ماں جی کو تم کب یہاں بُلوا رہی ہو ؟"

"میرا خیال ہے اگلے ہفتے میں بُلوا لوں گی — ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ حمید کلھری کو رے کر مجھے لاکھو لاشاری تک پہنچنا ہے۔ میرا بچہ اُس کے پاس ہے اور اس سے پہلے میں جیل کے لوگوں سے نمٹنا چاہتی ہوں۔ ایک ایک کو میں گولی مار دوں گی۔ میں اُن کا وجود ہی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اور پھر ؟ ... پھر کیا کرو گی ؟"

"پھر اگر مقدر نے ساتھ دیا تو میں اِدھر ہی رہوں گی ورنہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو جاؤں گی، میں یہی چاہتی ہوں۔"

"خدا تمھاری حفاظت کرے۔ مگر راستہ تم نے بہت ہی خطرناک اختیار کر لیا ہے۔"

"اپنے اُن حضرت سے کہنا کہ وہ غصّہ تھوک دیں، مجھے اُن کے روپے کا لالچ نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا ہو سکتا ہے کل کلاں کو میرا ارادہ بدل جائے تو میں کارخانی صاحب کو چھوڑ دوں اور روپیہ انھیں دے دوں۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا، اس کو چھوڑ دینا ہی اچھا ہے، اب میں چلتا ہوں۔"

"اوہ بھیا ! کیا آپ یہاں نہیں رہ سکتے ؟ میں بہت تنہا ہو جاتی ہوں بھیّا ! خدا میں ایک دن پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ ایک دم جذباتی ہو گئی اور میرے گلے سے لگ کر خوب روئی۔ اتنا کہ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ جب وہ دِل کی بھڑاس نکال چکی تو بولی "آپ کہیں تو ہم سب یہاں اکٹھے رہ سکتے ہیں، یہ ہمارا نیا گھر ہے ویر جی ! میں اکیلی یہاں بہت پریشان ہوتی ہوں۔"

"اس بارے میں بھی سوچ لیں گے آسیہ ! تم ماں جی کو یہاں بلا لو۔ پھر میں بھی دیکھ لوں گا۔ اگر یہ جاگیر ہماری ہو سکے تو پھر اور کیا چاہیے ہمیں۔ آپی کا یہ روپیہ اِدھر ہی رہے گا، اُسے تم جہاں چاہو استعمال کر سکتی ہو۔ اس کو میں اپنے حساب سے یہ رقم دے دوں گا۔ بس اتنا خیال رکھو کہ تمھارے سبب سے کوئی اور مشکل پیدا نہ ہو جائے۔ لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دو بہنا ! یہی بہتر ہے، انھیں معاف کر دو۔" میں نے بہن کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ بہت ہی آزردہ ہو رہی تھی ———

"میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں نے تو اب پانچ وقت کی نماز بھی شروع کر دی ہے، شاید اسی طرح میرے دِل کو سکون مِل جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ تم زیادہ فکرمند نہ رہا کرو۔ صبح ہم اصغر علی کو لاہور لے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میری کار لے جائیں، میں دوسری استعمال کر لوں گی۔"

"اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر راہداری میں نکل آیا اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر کے بتی بجھا دی۔

میں راہداری میں نکلا تو کچھ ہی دُور تجمل حسین کا کمرہ تھا۔ اور اس کی بتی جل رہی تھی۔ میں ابھی اُس کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں نے دیکھا، تجمل حسین اپنے دروازے پر کھڑا ذکیہ سے سرگوشیوں کچھ کہہ رہا تھا پھر ذکیہ واپس چلی گئی راہداری کی بتیاں اس وقت بجھی ہوئی تھیں۔ تجمل حسین دروازے سے آگے نہیں نکلا۔ ذکیہ کا کمرہ راہداری کے دائیں طرف تھا۔ وہ اس میں جا گھسی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے میرے لیے یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ چند لمحوں تک تو میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ ذکیہ اس گھڑی بہت عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھی اور وہ آسیہ کی بہت ہی معتمد ملازمہ تھی۔ ان دونوں کے درمیان یہ راز و نیاز کسی نئے عذاب کا پیش خیمہ نہ ثابت ہوں کیونکہ تجمل حسین بہرحال وہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ کوٹھری میں نہیں ڈالا گیا مگر اس پر مسلسل نگرانی رکھی جاتی تھی اور ابھی تک وہ ذہنی طور پر خود کو اس ماحول میں ڈھال نہیں سکا تھا اور ذکیہ کا معاملہ یوں تھا کہ وہ جانتی تھی کہ وہاں بہن جی کس حیثیت میں رہ رہی ہیں وہ اس صورتِ حال سے کسی بھی وقت فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں اس راز و نیاز کے معاملے کو آسیہ کے علم میں لے آؤں؟

میں کچھ زیادہ نہ سوچ سکا۔ اُلٹے پاؤں میں پھر آسیہ کے دروازے تک جا پہنچا۔ جیسے ہی میں نے ہلکی سی دستک دی، کسی نے فوراً ہی اُٹھ کر بتی جلا دی۔ "کون ہے؟" آسیہ نے پوچھا۔

"میں ہوں آسیہ! ذرا دروازہ کھولو ایک بہت ضروری کام ہے مجھے۔"

میری آواز پہچان کر اُس نے دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا، خیر تو ہے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا آسیہ! کہ ابھی ابھی میں نے ذکیہ کو تجمل حسین کے کمرے کے باہر دیکھا ہے۔ راہداری میں اندھیرا تھا، اُن کو میں نے خود دیکھا ہے۔ مجھے تو یہ بات بہت ہی عجیب سی لگتی ہے۔ وہ کسی سازش میں تو مصروف نہیں؟"

آسیہ کا رنگ ایک دم سرخ ہونے لگا۔ "یہ بڑی خوفناک بات ہے بھتیا! اس نمک حرام سے میں سمجھ لوں گی۔"

"یہ ہے کون آخر؟ یہاں کیسے آگئی؟"

"یہ اُن تین عورتوں میں سے ایک ہے جنھیں میں یہاں لے آگئی تھی کیونکہ یہ بہت پریشان تھی۔ یہ ملتان کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ خاصی پڑھی لکھی ہے، بہت روتی تھی میرے سامنے کہ یہ مکرم علی گورایا سے بہت تنگ تھی۔ دُوسری دو عورتیں بھی اِدھر ہیں اور یہ گھر کو سنبھالے ہوئے ہیں مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ... خیر میں ابھی دیکھتی ہوں۔"

"نہیں، اس وقت نہیں۔ تم اس پر نگاہ رکھو۔ کل بھی تجمل حسین سے بات چیت کرے گی، وہاں اُسے تم پکڑ سکتی ہو۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں بہت محتاط رہوں گی۔ میں... ان دونوں نے کوئی گڑبڑ کی تو میں ان دونوں کو گولی مار دوں گی۔ ہاں۔ کوئی مذاق سمجھا ہے انھوں نے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تمھیں میں نے خواہ مخواہ پریشان کیا۔ اب تم آرام کرو۔" یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ جب میں آبی کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت تک بستر میں لیٹ چکا تھا مگر جاگ رہا تھا۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے۔ کیا کہانی چھیڑ بیٹھے تھے وہاں؟"

"کچھ نہیں یار! بس اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں اُس سے پوچھ آیا ہوں، اس نے کہا ہے کہ اصغر علی کو بے شک لے جاؤ۔ چاہو تو دریا میں پھینک دو، مجھے کیا ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہی کہا ہے اُس نے۔ اتنی دولت اس سے برآمد ہو سکے تو اور کیا چاہیے اُسے۔ کچھ حصہ بھی مانگا ہوگا اُس نے؟"

"تیسرا حصہ مانگتی ہے وہ، میرا خیال ہے اُسے دے دینا چاہیے۔"

"ہاں، ساٹھ لاکھ روپیہ۔ یہی رقم بنتی ہے نا؟"

"ہاں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ تمھارا بریف کیس بھی ہم چھوڑ جائیں گے۔ وہ روپیہ میں تمھیں لاہور جا کر دے دُوں گا۔"

"ارے رہنے دے مجھے ضرورت نہیں ہے روپے کی۔ تیرے میرے پیسے کوئی دو نہیں۔ بہرحال صبح ہم یہاں سے چل دیں گے۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ مگر آبی! ایک بات معلوم کر کے میں ڈر گیا ہوں۔ وہ تجمل حسین ہے نا، اس نے ذکیہ سے کچھ ساز باز کر لی ہے۔ میں نے خود ذکیہ کو اس کے کمرے کے باہر دیکھا ہے۔"

"ارے، یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔"

اسے میں نے تفصیل بتائی تو وہ ہنسنے لگا، بولا۔ "تجمل حسین بھی اب کیا کرے۔ خالی بیٹھا تنگ آگیا ہوگا، سوچتا ہوگا کہ کچھ جوڑ توڑ ہی کرنا چاہیے۔"

"نہیں یار! یہ گٹھ جوڑ اچھا نہیں ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں وہ کوئی سیاپا ہی نہ ڈال دیں۔"

"کیا سیاپا؟ کچھ نہیں ہوگا یار جی!"

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں بہت ڈرتا ہوں۔ آسیہ کا مستقبل مجھے محفوظ معلوم نہیں ہوتا۔"

"تو پھر اسے کہو یہاں سے نکل جائے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جائے۔ دنیا بڑی وسیع ہے میرے چیتا!"

"وہ نہیں مانتی ہے، وہ ہر قیمت پر یہاں رہنا چاہتی ہے۔"

"تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔ اور سو رہو۔"

"ٹھیک ہے یار! اب سو ہی رہنا بہتر ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بتی بجھا کر بستر میں دبک گیا۔ نیند نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے تکیے پر سر رکھا اور پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

⊛

جب میری آنکھ کھلی تو اُس وقت بڑے دروازے پر بڑے زور کی دستک ہو رہی تھی۔ میں گھبرا کر بستر سے اُٹھ گیا۔ وہ دستک غیر معمولی قسم کی تھی۔ باہر صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ میں نے آبی کو ہلا کر جگا دیا۔

"اوئے آبی! یہ دستک کیسی ہے بھئی! کوئی مسلسل دروازہ کھٹکھٹاتا جا رہا ہے۔"

آبی نے بھی وہ کھٹ کھٹ سُن لی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھئی! کون ہے آخر یہ؟ کون ہو سکتا ہے اس وقت؟ میرا خیال ہے پانچ بج چکے ہیں۔" آبی نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ غوث محمد وہیں سوتا تھا۔ اس نے وہ دستک سُنی تو بندوق اٹھا کر راہداری میں سے گزرتا ہوا بڑے دروازے تک جا پہنچا۔ اور ہوش ہمیں جب ہی آیا، جب ایک اُونچا لمبا بُرج ایسا آدمی پولیس کی وردی میں ملبوس راہداری میں آ دھمکا۔

ہمارا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہم باہر نکلنے ہی کو تھے کہ اُس نے ہمیں بڑی نخوت سے آداب کہا اور بولا۔ "میں ڈی۔ ایس۔ پی میانوالی کہردار نیازی ہوں۔ ہم اس حویلی کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ میرے سپاہی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ براہِ کرم آپ گورایا صاحب کو اطلاع کر دیں۔"

"یہ تلاشی آپ کس سلسلے میں لے رہے ہیں جناب! آپ تو ایک پوری گارد لے کر آ گئے مگر کیوں؟ آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کا رویہ بڑا ہی متکبرانہ سا تھا۔ وہ گورے چٹے رنگ کا آدمی عجیب نخوت سے مونچھیں پھڑکاتا تھا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے ملک اشرف، اصغر علی خان اور اس کے دُوسرے ساتھیوں کو اس حویلی میں قید کر رکھا ہے۔ ہم اُن کی رہائی کے لیے آئے ہیں۔ حویلی کی تلاشی کے وارنٹ میرے پاس ہیں۔ کوئی آدمی مزاحمت نہ کرے۔ آپ کا نام؟"

"میرا نام سردار کریم نواز ہے اور یہ میرے دوست حسن علی گردیزی ہیں۔ غوث محمد! تم مکرم علی گورایا صاحب کو اندر اطلاع دے دو، سمجھے!"

"جی ٹھیک ہے۔ آئیں آپ اندر تشریف رکھیں۔" میں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ دو انسپکٹر بھی تھے۔ وہ بھی اندر آ گئے۔ سپاہی راہداری میں رُک گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

غوث محمد کوئی دس منٹ بعد واپس آ گیا، وہ ہانپ رہا تھا۔ "جی میں نے گورایا صاحب کو اطلاع دے دی ہے، وہ اِدھر ہی آ رہے ہیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ حویلی میں کون کون رہتا ہے؟"

"جی ہم تو خیر مہمان ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے مکرم علی گورایا کے سوا یہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔ ایک ان کی ہمشیرہ ہیں، کچھ ملازم ہیں اور بس۔"

"آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟"

"گورایا صاحب ہمارے دوست ہیں۔ کبھی کبھی ہم اُن کے پاس آ جاتے ہیں۔"

"ہوں۔ اِن کے نام لکھیں فقیر احمد صاحب! اور تمھارا کیا نام ہے؟"

"جی غوث محمد میرا نام ہے۔"

"تم کب سے یہاں ہو؟"

"جی میں تو دس سال سے یہاں ہوں جناب! گورایا صاحب کی خدمت کرتا ہوں اور بس۔"

آبی کے چہرے سے تردّد نمایاں ہو رہا تھا۔ سگریٹ سلگا کر اُس نے پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں اُس کی پریشانی کا سبب سمجھ رہا تھا۔ پولیس بالآخر ہم تک آ پہنچی تھی۔ انھیں کسی نہ کسی ذریعے سے کیرل کی واردات کا پتا چل چکا تھا اور وہ تینوں آدمی اندر موجود تھے۔ اُن کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ عین ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ ہوں جو مجھے بھی پہچان لیں۔ کوئی ایسے معاملے میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اور وہ کہردار نیازی کہہ رہا تھا کہ انھوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میرے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا مگر میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اُن کے شک کو میرا فرار اور زیادہ سنگین بنا سکتا تھا۔ آبی کو تو خیر وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ اس موقعے پر لاہور میں تھا۔

مگر میں۔۔۔میں اپنی صورت کیسے چھپا لیتا؟ یہ بڑا ہی غلط پیچ پڑ گیا تھا اور ہم اس صبح اصغر علی خان کو لاہور لے جانا چاہتے تھے۔

"جن لوگوں کا نام آپ لے رہے ہیں، اُن کا اس حویلی سے کیا واسطہ ہے نیازی صاحب؟"

"وہ۔۔۔ دراصل اُدھر کیرل میں پہاڑیوں کے قریب ایک بڑی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں نے تمام ٹھیکیداروں کو، اور مزدوروں کو اور ہر شے کو تباہ کر دیا ہے۔ ملک اشرف بھی وہیں تھے، وہ بھی اُن کے ہتھے چڑھ گئے۔ ہمیں یہ اطلاع کل شام ہی ملی۔ ہم اس سلسلے میں لاڈلی بھی گئے تھے اور اب ہم وہاں سے ہی آ رہے ہیں۔"

"لاڈلی گاؤں کے لوگوں نے کیا کہا ہے؟"

"وہ کہتے ہیں کہ ان سب کو کسی نے ٹرکوں میں ڈالا اور لے جا کر کیرل میں نہر کی کھدائی پر لگا دیا مگر اُن کی بات کا یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کوئی ایک آدھ آدمی بیگار میں پکڑا جاتا ہے کہ پورا گاؤں؟ اتنے آدمی ہضم نہیں ہو سکتے۔ ہمیں وہیں سے معلوم ہوا ہے کہ اس گاؤں کا تعلق اس حویلی سے ہے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ٹھیکیدار نذر شاہ نے بتائی ہیں، وہ بھی ہمارے ساتھ آیا ہے، باہر کھڑا ہے۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ ٹھیکیداروں کے کوئی چالیس کے قریب چوکیدار بھی وہاں سے غائب ہیں مگر گاؤں والے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتلاتے۔ خیر ہم سمجھ لیں گے اُن سے۔ وہ۔۔۔ وہ گورایا صاحب کہاں ہیں؟"

"جی بس وہ آ ہی رہے ہیں۔ میں انہیں اطلاع دے آیا ہوں۔" غوث محمد بولا۔

میری جان ہوا ہو رہی تھی۔ کوئی دم بھر کی مہلت مجھے دے دیتا تو میں اُن لوگوں کو کسی طرح اُن کوٹھریوں سے ہٹا دیتا مگر نیازی کے سپاہی سامنے لان میں پھر رہے تھے کیونکہ وہ بالکل کھلا پڑا تھا۔ مہمان خانے کے قریب سے گزر کر وہ وہاں جا ٹھہرے تھے اور اُن کی تعداد کا مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا۔ ہمارے کمرے کی ہر شے البتہ بڑی محفوظ تھی۔ آپی نے اپنا سب کچھ الماریوں میں بند کر رکھا تھا اور فرش کے ایک کونے میں اس کا ٹرنک اور بریف کیس دھرا تھا۔ مجھے اُس کی بھی فکر لگ گئی تھی۔ پتا نہیں اُن کا طریق کار کیا تھا۔ "اگر اجازت ہو تو میں اُن کو بلا لاؤں؟"

"نہیں۔۔۔ آپ براہ کرم اِدھر ہی بیٹھیں، وہ خود آ جائیں گے۔"

"کیا مجھے بھی آپ مشکوک سمجھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے اپنے لیے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ تھانیدار بہت مؤدب طریقے سے بیٹھے تھے اور اُس کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔

کوئی ایک منٹ بعد تجمل حسین گورایا وہاں آ پہنچا۔ آسیہ بھی اس کے ساتھ تھی مگر وہ اس صبح اپنے سیاہ لبادے میں ملبوس نہ تھی بلکہ اُس نے خوبصورت گلابی رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا اور بہت تر و تازہ دکھائی دیتی تھی۔ تجمل حسین بھی اپنی شیروانی پہن آیا تھا۔ نیند یا تھکن اُس کے چہرے سے قطعاً عیاں نہیں تھی۔

"السلام علیکم جناب! میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔۔۔ آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔ آئیے۔" یہ مکرم علی گورایا ہیں اور یہ اُن کی بہن ہیں، لندن سے آئی ہوئی ہیں۔" شاہ نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

نیازی اپنی جگہ سے اٹھ گیا، بولا۔ "میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں گورایا صاحب! مگر مجھے یہ حکم ہے کہ میں اس حویلی کی تلاشی لوں۔"

"وہ کس سلسلے میں جناب! یعنی پولیس میرے گھر کی تلاشی لے گی!"

"مجبوری ہے جناب! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ملک اشرف وغیرہ آپ کی حویلی میں بند ہیں اور ہم اُن کو برآمد کرنے آئے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ بالکل غلط ہے، کیوں بہن جی! یہ سراسر الزام ہے۔ ہمارا کیا تعلق ہے اُن سے!"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ آپ کو صرف اطلاع دینے کی ضرورت تھی۔ باقی کام ہم خود کر لیں گے۔ اپنے گھر کے تمام افراد کے، جو یہاں موجود ہیں، اُن کے نام لکھوائیں، پھر ہم اپنا کام شروع کریں گے۔"

"دیکھیں آپ سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔"

"حضور! میں عرض کروں۔ تلاشیاں لندن میں بھی ہوتی ہیں مگر اس طرح وہاں کوئی شب خون نہیں مارتا ہے۔" آسیہ بولی۔

"اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم لاڈلی بھی جا چکے ہیں اور وہاں سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ نام لکھیں۔ آپ تلاشی ضرور لیں۔ لیکن اس سے آگے کی ذمے داری آپ کی ہو گی۔ آج تک کسی کو اس حویلی کی یوں تلاشی لینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ مکرم علی گورایا ہے میرا نام!"

"میں جانتا ہوں جناب! آپ نام لکھوائیں۔"

حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ دونوں بہت ہی مطمئن نظر آتے تھے۔ اور اُن کے اطمینان کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی مگر وہ میرے علم میں نہیں تھی۔ آسیہ کو معلوم تھا کہ حالات کس قدر سنگین ہو سکتے ہیں۔ ہم تو اس کو آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ وہاں ہمارے ٹھہرنے کا مقصد ہی یہی تھا۔ ہم کیرل بھی اسی لیے گئے تھے کہ اُس کے گاؤں کو اجڑنے نہ دیں۔ ہم اس کے لیے کیا کچھ نہیں چاہتے تھے۔ مگر۔۔۔ مگر وہ خود اپنے لیے ایسے حالات پیدا کر رہی تھی کہ ہماری ساری تدبیریں ناکام

"نہیں جناب! میں آپ کو حویلی کی تلاشی دیتا ہوں۔۔۔ تم مولی جو تی کھیں۔ میرے ساتھ آؤ غوث محمد! اور آپ براہ کرم اِدھر ہی بیٹھیں، میں ان کی غلط فہمی دُور کر دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر تجمل حسین بڑے تحمل اور اطمینان سے نیازی کے ساتھ کمرے سے نکلا تو وہ دونوں انسپکٹر بھی باہر چلے گئے۔ راہداری میں ہی اُن کے وجود سے خالی ہوئی، میں کرسی آگے بڑھا کر آسیہ کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"بہن جی! یہ قصہ کیا ہے؟ آپ مسکرا رہی ہیں! آپ کو پتا ہے وہ کوٹھریوں میں موجود ہیں۔ ان کو کسی طرح وہاں سے ہٹا دیں۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"وہ ہٹائے جا چکے ہیں۔ وہ تینوں بھی اور وہ کارخانی بھی۔ اُن کے ساتھ حمید کلہری بھی تھا۔"

"اچھا! یہ کیسے ہوا؟ انھیں کس نے وہاں سے ہٹا دیا؟"

"رات ایک بجے مجھے طاہر بیگ نے اطلاع دے دی تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اسے ہم نے لاڈلی میں بیٹھا رکھا تھا۔ کاظم اور صفدر کو میں نے فوراً ہی اس کام پر لگا دیا۔ اب مطلع بالکل صاف ہے، یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ سیاہ لبادے والی بھی انھیں نظر نہیں آئے گی۔ وہ انھیں رات دو بجے کار میں ڈال کر باہر لے گئے تھے۔ اب وہ کسی گھنے جنگل میں ہوں گے۔"

"اوہ۔ اب میں سمجھا۔ سُن رہے ہو آپی! یہ ہماری بہن ہے۔ ہم تو بس پاگل ہی رہے۔ یہ سگریٹ مجھے دے۔ حد ہو گئی۔ اور یہ تجمل حسین، اُن کا پارٹ دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا ہوں۔ شیروانی کیسی عمدہ لگی ہے اس پر۔"

"ہاں۔ اس کی میں دن رات بریفنگ کرتی رہتی ہوں۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔"

کوئی پون گھنٹے بعد وہ سب لوگ بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ انھیں کوئی بھی مطلوبہ آدمی نہیں مل سکا تھا۔ نیازی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ بڑی بے دلی سے کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر اس کا دھواں چھت کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "تو وہ یہاں نہیں ہیں، اُن میں سے ایک آدمی بھی یہاں نہیں ہے۔ کیا آپ کو اطلاع مل چکی تھی؟"

"میرا خیال ہے اب آپ کو اپنا سفر شروع کر دینا چاہیے۔ براہ کرم کوئی اور بات مت کریں۔ میں آپ کے اس رویے کی شکایت اوپر والوں سے بھی کر سکتا ہوں۔ اس حویلی کا ہی لحاظ کیا ہوتا آپ نے۔ چلو تم شیرو! تم اندر جاؤ۔" تجمل حسین نے بڑے ہی کڑوے لہجے میں کہا۔ اس نے نیازی کے اعتماد کی بنیاد ہی ہلا ڈالی تھی۔

"اوپر والوں سے! ہوں۔۔۔ ضرور شکایت کریں۔ میں بہرحال اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اُس نذر شاہ کو اِدھر بلاؤ بلاول خان!" اُس نے ایک سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کا ابھی وہاں سے نکلنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"کچھ پانی مل سکے گا مجھے؟"

"اوہ، یہ بات تو مجھے یاد ہی نہیں رہی۔ غوث محمد! صاحب کے لیے پانی لاؤ، اور اندر جا کر کہو کہ ان سب کے لیے ناشتہ تیار کریں۔ آپ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" آسیہ نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ناشتے کی۔ میرا خیال ہے ہمارا کام ختم ہی ہو چکا ہے۔" نیازی نے کہا۔ اتنے میں نذر شاہ اندر آ گیا۔ دراصل اسے نیازی نے اس لیے اندر بلایا تھا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اس نے کیرل میں کس کس کو دیکھا ہے مگر وہ تو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ چالیس بیالیس سال کا بھاری بھر کم آدمی تھا جس کی توند بڑھی ہوئی تھی اور کوٹ کے اندر نہیں چھپتی تھی۔ اُس کی مونچھیں مُنڈی ہوئی تھیں۔ البتہ داڑھی اسے خوب سجتی تھی۔

"ہم نے حویلی کی تلاشی لے لی ہے نذر شاہ! اِدھر تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

نذر شاہ نے ہم تینوں کے چہرے بڑے غور سے دیکھے اور پھر دروازے سے آگے نکل کر بولا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! آپ کی اور میری اطلاع تو یہی تھی، ویسے بڑے اندھیر کی بات ہے نیازی صاحب! نہر کا سارا کام بند ہو چکا ہے۔ نہ کوئی سپاہی نظر آتا ہے نہ مزدور۔ اور وہ لوگ بھی غائب ہیں۔ دلدار شاہ کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"پتا چل جائے گا شاہ جی! ضرور پتا چلے گا، بہرحال کوئی خاص بات؟"

"جی نہیں۔ میں نے اِن لوگوں کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا گورایا صاحب! اجازت دیں، انشاء اللہ پھر کبھی اچھے حالات میں ملاقات ہو گی، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ زبردستی گورایا صاحب سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ انسپکٹر اور سپاہی اُس کے پیچھے تھے۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ دو جیپیں بھر کر وہاں آئے تھے مگر انھیں سخت ناکامی کا سامنا ہوا۔ ہم باہر نکل کر انھیں دُور تک جاتا دیکھتے رہے۔ نیازی بہت الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پولیس کی گویا شامت آ گئی تھی۔ ملک اشرف جیسے بڑے آدمی کا اغوا ہو جانا اُن کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔

حویلی تو ویسے ہی سائیں سائیں کرتی رہتی تھی، جب سے آسیہ نے وہاں ڈیرا جمایا تھا، رونقوں کو ترس گئی تھی۔ پہلے حویلی کی اصل

نفری تو اس کے ملازم تھے اور وہ محفلیں جو گورایا صاحب کا دل بہلاتی تھیں مگر آسیہ نے اُن سب کی چھٹی کرا دی تھی۔ اب تو وہاں بس پانچ سات آدمی ہی موجود تھے اور انہیں کاردار نیازی دیکھ چکا تھا مگر اس سلسلے میں وہ بولا کچھ نہیں۔ تجمل حسین کو مکرم علی گورایا نہ سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ہُو بہُو مکرم علی گورایا تھا، اور اس کی اداکاری بھی کمال کی تھی۔ آسیہ نے اسے کوئی ایسی دوا کھلا دی تھی جس سے اُس کی آواز بھی بہت حد تک بدل چکی تھی۔ اور یہ بہت اچھی بات تھی۔ مگر۔۔۔ ہم۔۔۔ ہماری واپسی میں رخنہ پڑ چکا تھا۔

"یہ بتائیں مجھے بہن جی! کہ وہ لوگ واپس کب آئیں گے؟"

"اس کی میں ضمانت نہیں دے سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کا ابھی یہاں سے دُور رہنا بہت ضروری ہے' ان پولیس والوں کو نہیں جانتے ہیں آپ! کسی نہ کسی آدمی کو یہ ادھر ضرور چھوڑ جائیں گے۔ اب کچھ دنوں کے لیے ہماری تمام کارروائیاں بند۔" وہ اس وقت میرے اور آبی کے درمیان کھڑی تھی اور باقی سب لوگ وہاں سے ہٹ چکے تھے' یہاں تک کہ تجمل حسین بھی۔

"پھر۔۔۔ ؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہم اس روپے کی بات نہ کریں؟"

"کیوں نہ کریں۔ ایک چیک ہی تو لینا ہے۔ اُن کے دفتر کا بھی آپ کو علم ہے کسی نہ کسی طرح وہ چیک ضرور حاصل کر لیں اور پھر اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے حساب میں جمع کروا لیں اور بس۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہمیں تیار ہو جانا چاہیے؟" آبی نے پوچھا۔

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" آسیہ ہنستی ہوئی بولی۔ اب وہ آبی کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"مگر ہم یہی چاہتے ہیں بہن جی۔۔۔"

"حضرت صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ یہاں ہی ٹھہریں، اور اس کام پر بھائی جان کو لگا دیں۔ ابھی تو آپ لاہور سے آئے ہیں۔" وہ آبی کی بات کاٹ کر بولی۔

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اس دوران اس شخص کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ رات بہت سیخ پا بلکہ چراغ پا ہو رہا تھا یہ۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اُن سب باتوں کی معافی! نہ تو میں للہی ہوں حضرت صاحب! ورنہ۔۔۔ کیلے کھانے والی تھی بھلا میں، آپ نے دوسرا عیب مجھ میں کیا ڈالا تھا؟"

"اوچھڈو جی! کوئی ہور گل کرو۔ جا یار! واقعی تو ہی لاہور چلا جا۔ اگر تو اس چکر میں قید بھی ہو گیا نا تو میں تجھے چھڑا تو سکوں گا۔ کسی نہ کسی کو باہر تو ضرور رہنا چاہیے کیوں۔۔۔ بہن جی۔۔؟"

آبی نے جی کی ی کو زیادہ ہی دبلتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ درحصل میں آپ کی ہر بات سے متفق ہونے لگی ہوں حضرت جی!"

"ٹھیک ہے بھئی! خدا تمہیں اور زیادہ اتفاق دے۔ اگر ہی متفق ہو جاؤ۔" میں نے اپنی جھینپ چھپاتے ہوئے کہا۔ دونوں نے میرا بیڑہ غرق کرنے کی سوچ رکھی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا میرا خیال تھا کہ مجھے اُن کو موقع فراہم کرنا چاہیے تاکہ مجھے معلوم تو ہو سکے کہ وہ دونوں چاہتے کیا ہیں۔ پھر میں ٹھیک طرح سے تدارک کر سکوں گا اور اُن کا اچھی طرح علاج کر دوں گا۔"

"اچھا میں ذرا ناشتہ تیار کرواتا ہوں بھئی! تم ادھر آ بیٹھو۔ وہ کہاں ہیں وہ لڑکیاں؟ رات میں نے اُن کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی راہداری میں بہن جی۔۔۔" آبی نے آسیہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ اس کی ڈھٹائی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ آسیہ سے خواہ مخواہ ہی بے تکلف ہونے لگا تھا۔

"حضرت صاحب! وہ میری خادمائیں ہیں۔ اُن کی صرف جُوتی ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

"کھادمائیں! کیا آپ اُن سے کھاد کا کام لیتی ہیں۔ اُن ماؤں بہنوں سے؟ میں بھی ذرا انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو کہیں جا یار! آج ان کا باورچی خانہ دیکھتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ ناشتہ ذرا جلدی بھیج دینا۔ اور زیادہ دیر نہ لگانا وہاں' ورنہ بہت ماروں گا میں تجھے۔"

"بس میں ابھی آیا۔ چلیں بہن جی۔" یہ کہہ کر وہ آسیہ کے ساتھ دوسری طرف چل دیا۔ صحن میں انہیں اکٹھا دیکھ کر مجھے عجیب احساس ہوا۔ کاش آبی میرا دوست نہ ہوتا۔ اگر وہ رشتے کی تلاش میں اچانک ہی میرے سامنے آ جاتا تو شاید میں آسیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔ مگر اب نہیں۔ اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے پینترا بدل لیا تھا۔ کسی بات کا بھی آبی کو احساس نہیں رہا تھا۔

وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں تھکے تھکے قدم اُٹھاتا کمرے میں چلا گیا۔ آبی میرے لیے کئی خبریں لایا تھا۔ کوئی وسیم تھا جو مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ستنا جا صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ بڑے صاحب سے رابطے کا میرے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ بھی مجھ سے چھن گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ امریکہ میں کسی جگہ چار مہینے کی قید بُھگت رہے ہیں اور بعد میں اُن لوگوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ پھر۔۔۔ پھر وہ پاکستان آ جائیں گے۔ یہ بہت اچھی خبر تھی۔ میں اپنے انتقام کا عہد پورا کر سکوں گا۔ میں انہیں کسی بھی صورت بخشنا نہیں چاہتا تھا۔ اُن کا نام میرے ذہن میں آتے ہی

میرے سینے میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ پتا نہیں ابھی تک اُن سے میرا سامنا کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ اِدھر آسیہ نے الگ مچا رکھا تھا۔ وہ مجھے مسلسل ڈراتی رہتی تھی کہ وہ ایک دن اپنے دشمنوں سے ضرور بدلہ لے گی۔ وسائل بھی اس کے پاس موجود تھے۔ بڑے آدمی تھے اس کے پاس۔ ایسے ایسے جن کا وہ ذکر ہی نہیں کرتی تھی۔ اور بھی کئی منصوبے تھے اس کے۔ اگر وہ اُن پر عمل کرنا شروع کر دے تو پھر۔۔۔ پھر کیا ہو گا؟ وہ کسی بھی مصیبت میں پھنس سکتی تھی ——— یہی وجہ تھی کہ میں اُسے روکتا آیا تھا۔ مگر۔۔۔ وہ کھری مت کی عورت، جانتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ وہ کسی دن لاکھو لاشاری کو بھی باندھ کر لا سکتی تھی۔ اور اُس کی یہ آرزو بھی کہ وہ اپنے آدمیوں کو لندن بھیج دے جہاں وہ گورایا کی بہن کو ختم کر سکتے تھے۔ کتنی خوفناک صورتِ حال بنتی تھی میرے ذہن میں۔۔۔ اور۔۔۔ اور اب وہ آبی ——— گویا ہماری دوستی میں بھی وہ رخنہ ڈالنا چاہتی تھی۔ پروردگار! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری اپنی عافیت بھی مجھے مخدوش نظر آتی تھی۔ کوئی کیا کہہ سکتا تھا کہ میرے دشمن مجھے کب تختہ دار تک پہنچا دیں۔ صرف سردار کریم نواز بن جانے سے تو بات نہیں بنتی تھی۔ چہرہ تو میں وہی لیے پھرتا تھا جو بہت سے لوگوں نے دیکھ رکھا تھا۔ میں کیا کروں میرے خدایا! زندگی ایک مسلسل عذاب بنتی جا رہی تھی۔

میں نہا دھو کر لاہور جانے کے لیے تیار ہو بیٹھا تو آبی غوث محمد کے ساتھ میرے لیے ناشتہ لے کر واپس آ گیا' وہ بہت خوش تھا۔

"اوئے جا تو پانی شانی لے آ غوث محمد! زبردست قسم کے تیرے کے پراٹھے بنوا کر لایا ہوں۔ آج کا ناشتہ ذرا "ہیوی" ہونا چاہیے کیونکہ تو سفر پر جا رہا ہے پیارے!"

"تو گویا تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے؟"

"یار! میں بہت تھکا ہوا ہوں' تو ویسے بھی بہت سمجھ دار آدمی ہے، پیارے! یہ کام تو ہی کر سکتا ہے یار۔"

میری تمام تر کوشش کے باوجود آبی میرے ساتھ لاہور جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسی روز کوئی گیارہ بجے کے قریب قذافیہ سے نکل کر میانوالی چل دیا۔ آسیہ کے پاس کار اس روز کوئی بھی نہیں تھی۔ وہ شاید کاظم اور صفدر لے گئے تھے۔ قیدیوں کو وہاں سے ہٹانے کے لیے میرے ساتھ صغر علی بھی نہیں تھا حالانکہ وہی اکثر مجھے اتنی بڑی رقم کا چیک دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ ملک اشرف بھی اُنہی کی تحویل میں تھا اور مجھے احساس تھا کہ چاروں طرف ڈونڈی پٹ گئی ہو گی۔ پولیس کو خبردار کر دیا گیا ہو گا۔ وہ بات چھپائے نہیں چھپ سکتی تھی۔ پولیس بلاوجہ گورایا کی حویلی میں نہیں گئی تھی۔ ان کی معلومات کا ایک پنا و سیدہ ہوتا ہے سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم کیرل سے تمام لوگوں کو گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ مثلاً وہ آپریٹر تھا، وہ بھی بھاگ گیا تھا۔ کئی ٹھیکیدار بھی اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔ بہت سے اُن کی ملیشیا کے سپاہی بھی اس افراتفری میں وہاں سے بھاگ گئے ہوں گے۔ ہم کوشش کے باوجود اس راز کو اخفا میں نہیں رکھ سکے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ پولیس ایک بار پھر گورایا کی حویلی میں ضرور جائے گی۔ لاڈلی گاؤں سے انہیں جو معلومات حاصل ہوتی ہوں گی' وہ ان سے سو طرح کا کام لے سکتے تھے۔

میں نے بہرحال لاہور جانے کی سوچ رکھی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں بڑے صاحب کو اس سازش میں ملک اشرف اور حاجی عبدالستار کے ملوث ہونے کی اطلاع دے دوں۔ یہ بہت ضروری تھا ورنہ وہ اُن کے ہاتھوں کسی بھی دن تباہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں ملک اشرف اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر بہت زیادہ اعتبار تھا۔ اس اعتبار کو ختم ہونا چاہیے تھا ——— جنہیں آپ دوست سمجھتے ہیں' وہی مارِ آستین بن جائیں تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

میانوالی سے گاڑی میں بیٹھا تو اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ آسیہ سے آتے وقت میں ایک سائلنسر لگا پستول لے آیا تھا اور وہ میری جیب میں تھا۔ درحصل مجھے گولی کی آواز پریشان کر دیتی تھی۔ اس کا وہ خوفناک دھماکا بڑی افراتفری مچا دیتا تھا ——— اور سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ مقتول اس کی آواز سن کر موت سے پہلے ہی مر جاتا تھا اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہمیشہ اپنے پاس ایک "چُپ شاہ" ضرور رکھتا تھا اور وہ میرے بہت کام آیا ——— جب میں صبح سویرے لاہور پہنچا تو اُس فضا میں سانس لے کر خوشی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا تنہائی اور بے بسی کا احساس مجھ پر طاری تھا۔ میں اس شہر سے کتنی ہی بار ذلیل ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب میں پھر اسی بستی میں جا پہنچا تھا جس کے شب و روز میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں بڑے صاحب سے ملنا چاہتا تھا مگر یہ بات یوں ناممکن ہو گئی تھی کہ ستنا جا صاحب فوت ہو چکے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کا بھائی محسن کہاں ہو گا۔ البتہ حاجی عبدالستار کو میں ڈھونڈ سکتا تھا کہ وہ ایک ہوٹل چلا رہا تھا۔ ان سب کی نشاندہی بہت ضروری تھی لیکن معاملہ تو بڑے صاحب سے ملنے کا تھا۔ اس کی مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ خدا گواہ ہے مجھے روپے پیسے کا لالچ ہرگز نہیں تھا۔ اگر وہ رقم مجھے مل جائے تو میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ ساری کی ساری آسیہ کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے

آرام کے لیے میں ہر کام کر سکتا تھا۔ وہ جاگیردارنی بن کر رہے، میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ میں اُسے اب ہر لحاظ سے آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ اور میری آرزو تھی کہ اسے کسی چیز کی تمنا نہ رہ جائے۔ وہ یہ نہ کہے کہ فلاں شے میری دسترس سے باہر ہے۔ اور یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ میں اب اگر جینے کی آرزو کرتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی مجھے دھمّن اور عالیہ سے انتقام لینا تھا۔ یہ دو ہی مقاصد میرے سامنے رہ گئے تھے۔ ایسے میں مسند آرا کو بھی میں بھلا سکتا تھا اور بشیر دل آہو کو بھی کہ ان سے میں کوئی غرض بھی نہ رکھتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

جب میں اپنی کوٹھی پہنچا تو اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ دروازہ حیدر نے کھولا مجھے پہچان کر اس نے بڑے تپاک اور ادب سے سلام کیا، بولا: ”آپ نے بہت دن لگا دیے سردار صاحب! میرا پیغام مل گیا تھا آپ کو؟“

”وہ جو تم نے آبی کو دیا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”ہاں وہ پیغام تو مل گیا تھا۔ دوبارہ تو وہ آدمی ادھر نہیں آیا؟“

”جی نہیں۔ البتہ وہ.... وہ آئی ہوئی ہے۔“

”وہ کون بھئی! یہ تو کسی زنانی کی بات کر رہا ہے نا؟“

”جی ہاں۔ وہی تو ہے، وہ سروری خانم۔ وہ کل دوپہر سے یہاں پڑی ہے۔ اس کی اپنے شوہر سے لڑائی ہو گئی ہے تیسری جنگِ عظیم۔“

”ابے نہیں۔ وہ بھلا یہاں کیسے آسکتی ہے جبکہ اسے معلوم ہے کہ میں لاہور میں نہیں ہوں۔“

”وہ اِدھر ہی ہے سردار صاحب! میں تو اس کی منتیں کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے مگر وہ مانتی ہی نہیں ہے۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ کچھ کھلایا پلایا بھی اُسے کہ نہیں؟“

”بہت جی۔ ڈھیروں پھل لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔“

”تیرا بھی جواب نہیں ہے حیدر! تیری ٹانگ اسی لیے سیدھی نہیں رہ سکی، کہ تو ہر کام میں جلدی کرتا ہے۔“

اب ہم عمارت کے قریب جا پہنچے تھے۔ حیدر نے لپک کر دروازہ کھولا تو مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے تمام کمروں میں بھینی بھینی خوشبو بکھیر دی ہے۔ وہ خوشبو مجھے اُس کا پتا دیتی تھی۔ حیدر نے گھر کو بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس کمرے کے باہر جا پہنچا جس میں سروری خانم سوئی ہوئی تھی۔ پھر بولا: ”یہ تو ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔ کہیں تو جگا دوں؟“

”نہیں۔ میں پہلے اپنا حلیہ تو درست کر لوں۔ تم میرے کپڑے نکالو۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے پلٹ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ گرم پانی کی اُن دنوں ضرورت ہی نہیں تھی اور میں بہت تھکا ہوا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک میں پانی سے کھیلتا رہا۔ جب میں غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو حیدر میرے لیے نئے کپڑے نکال کر رکھ چکا تھا۔ انھیں پہن کر میں آئینے کے سامنے جا ٹھہرا۔ غلام جیلانی تو رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وقت نے میرا حلیہ ہی بدل دیا تھا۔ میرے چہرے پر عجیب سی سنگدلی اور بے مہری اتر آئی تھی۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ میں خود اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ ان کی سنگینی دیکھنے والے کو لرزہ براندام کر سکتی تھی اور یہ بڑی ہی عجیب بات تھی۔ میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میرا چہرہ اس قدر دہشت ناک ہو جائے۔ مگر مگر وہ جو کہتے ہیں کہ آدمی کا پیشہ اسے اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے اور اس کی ذات بہت پیچھے رہ جاتی ہے تو وہ بات سچ نظر آتی تھی۔ ورنہ تو جولاہا بھی آدمی ہی ہوتا ہے مگر اس کا کام اس سے مردانگی چھین لیتا ہے جو قدرت نے ودیعت کی ہوتی ہے۔ لوہار میں لوہے ایسی مضبوطی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے جیسے کبھی آپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا۔ ایک ہیرا پھیری اس کی عادت بن چکی ہوتی ہے۔ اور میں.... میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قدرت نے کس سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں تو بہت سے لوگوں کو زندگی کی حد سے پار پھینک چکا تھا۔ کتنوں کا خون میری گردن پر تھا۔ اور اسی تناسب سے میرا چہرہ دہشتناک ہو گیا تھا۔ اور.... اور پتا نہیں کس کس کو میں کس حال میں موت کی دار و گیر تک پہنچا دوں۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ پھر بھی وہ لباس اس بات کا پتا دیتا تھا کہ ابھی میرے اندر کی شرافت مری نہیں ہے۔ اس میں ابھی کچھ زندگی کی رمق باقی ہے اور میں زندگی کی کشش محسوس کرتا ہوں۔ یہ.... یہ جب ہی ممکن ہوتا ہے جب دل میں تازگی کا احساس زندہ ہو۔

حیدر نے میرے لیے ناشتہ تیار کر دیا۔ مالک کے لیے اس کی خدمت بڑی ہی بے لوث ہوتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کس وقت اسے کیا کرنا ہے۔ وہ عالیہ کی بھی اسی طرح خدمت کرتا ہوگا۔ وہ در اصل اس کوٹھی کا ملازم تھا۔ اس کا مالک کوئی بھی ہوتا، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں باہر لان میں دیکھ چکا تھا تمام درخت اور پودے ہرے بھرے تھے۔ وہ اُن پر بڑی توجہ دیتا تھا۔ انھیں صبح صبح پانی سے نہلا دیتا تھا۔ ہر پھول، ہر غنچے کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ فلاں جگہ اتنے پیسے خرچ ہو گئے اور فلاں اُفتاد آ پڑی، نہیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہتا تھا اور اس کی یہی ادا مجھے بھی پسند آ گئی تھی۔ مالک اسے جو کام میں لگا دیتا تھا وہ اسے دل و جان سے کرنے لگتا تھا۔

میں ناشتہ کر چکا تو وہ بولا: ”میں نے بیگم صاحبہ کو جگا دیا ہے۔“

”انھیں میرے بارے میں بھی بتا دیا ہے کہ نہیں؟“

”جی نہیں۔ وہ جب باہر آئیں گی تو خود دیکھ لیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خود اُن سے مل لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں سروری کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے بڑا بلب روشن کیا تو اس وقت وہ اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ دروازہ میں نے بے آواز کھول دیا تھا۔ روشنی زیادہ تیز ہوئی تو وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔

”ارے آپ! کب آئے آپ؟ کیا حال ہیں آپ کے؟“

”میں تو ٹھیک ہوں مگر آپ یہاں کیسے آ گئیں؟“

”آپ کا کیا خیال ہے، مجھے اور کہاں جانا چاہیے تھا؟“ یہ کہہ کر وہ بستر سے اٹھ گئی اور اپنی ساری کا پلّو درست کرتی ہوئی بولی۔ ”آہو سے بچے کو بچا لینے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ بہت خونخوار ہو چکا ہے۔“

”کیا مطلب؟ آخر وہ کہتا کیا ہے؟“

”وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ یہ بچہ میں نے کس سے لیا ہے؟ اس نے مسند آرا کو زندہ درگور کر رکھا ہے، اسے اب کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ مجھ پر اس نے دو بار حملہ کیا ہے اور یہ کل ہی ہوا۔ پہلی بار صبح اس نے مجھے ناشتے میں زہر دینے کی کوشش کی مگر میں بچ گئی۔ ارادے کا رنگ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں بچ گئی ہوں تو گیارہ بجے کے قریب مجھے نچلے کمرے میں بند کر کے آگ لگا دی۔ میرے ساتھ منا بھی تھا۔ خود وہ فوراً ہی گھر سے نکل گیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ کبیری جلدی واپس آ گیا۔ اسے آہو نے کسی لمبے کام پر باہر بھیج دیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو اس نے کمرہ کھول کر مجھے باہر نکالا اور کمرے کی آگ بجھائی۔ میں نے جب یہ حالات دیکھے تو اسی وقت گھر سے نکل آئی اور یہاں آ گئی۔ کیا مجھے یہاں بھی نہیں آنا چاہیے تھا؟“

”اوہ! تو یہ بات ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا ہے سروری خانم! بہرحال اب میں آہو سے ضرور بات کروں گا۔ پانی تو واقعی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔“ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

وہ اب تک اس فریب میں مبتلا تھی کہ میں اسے اپنا لوں گا۔ اس کے لیے نہیں تو اس کی جاگیر کی خاطر ہی سہی۔ مسند آرا کے بارے میں شاید وہ مجھے ہمیشہ یہ بُری خبر سناتی تھی تاکہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں۔ میں نے دل میں کہا کہ ٹھیک ہے بابا لوگ، میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ وہ لڑکی جس کے باپ کو میں نے قتل کیا، وہ میری بیوی کیسے بن سکتی تھی؟ یہ ناممکن تھا۔ پھر بھی ان دونوں کو آہو کے شر سے بچانا بہت ضروری تھا۔

”ٹھیک ہے سروری خانم! آپ یہاں آرام کریں۔ مجھ کو ایک ضروری کام ہے وہ میں کر آؤں تو پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اسے حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ بلاشبہ وہ بہت خطرناک عورت تھی۔ میں اس کے عزائم سے خوب واقف تھا۔ ایک بار میں اس کے چنگل میں آ گیا تھا مگر اب... مگر اب یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

کمرے سے باہر نکل کر میں نے ٹیلیفون پر ستنا جا صاحب کے نمبر گھما دیے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی وہ لوگ اسی کوٹھی میں مقیم ہوں گے اور یہ خیال صحیح نکلا۔ فون اُن کی بیگم نے اٹھایا تھا۔

”دیکھیں بیگم صاحبہ! میں سردار کریم نواز بول رہا ہوں۔ اور آج ہی لاہور آیا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ ستنا جا صاحب کا انتقال ہو گیا۔“

”جی ہاں۔ اُن کا اسپتال ہی میں انتقال ہو گیا۔ دل کا تیسرا دورہ ایسا پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔“

”ان کی موت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ میرا خیال ہے اُن کے بھائی محسن ستنا جا تو آپ کے پاس ہوں گے، میں در اصل تعزیت کے لیے آنا چاہتا تھا۔“

”جی ہاں۔ وہ ابھی باہر نکلے ہیں، کوئی ایک گھنٹے تک واپس آئیں گے، آپ آ جائیں۔ کوٹھی کا نمبر تو آپ کو معلوم ہی ہے۔“

”جی ہاں مجھے معلوم ہے، وہ کس وقت واپس آئیں گے؟“

”کوئی ایک گھنٹے تک کسی کام سے مغل پورہ گئے ہیں، آپ ایک گھنٹے بعد آ جائیں۔“

”جی بہت بہتر۔ اچھا خدا حافظ۔ اللہ آپ کو صبر عطا کرے۔“

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ جب میں فون سے الگ ہوا تو پتا چلا کہ سروری خانم میرے قریب کھڑی ہے۔ وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ ابھی تک اس کے چہرے پر نیند کا خمار چھایا ہوا تھا۔ لگتا تھا اس نے گہری نیند لی ہے۔ اور یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ ایک عورت جو اپنے شوہر کی نظروں سے گر چکی ہو، اسے نیند کیسے آ جاتی ہے۔ جس کا سارا ماضی اندھیرے میں گم ہو چکا ہو جس کا حال بھی بے یقینی کا شکار رہو۔ اور جس کے مستقبل کا بھی کوئی پتا نہ ہو،.... ایسی عورت کی آنکھ کیسے لگ جاتی ہے! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی میرے ذہن میں طرح طرح کے شکوک ابھرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ آہو ایسا احمق تو کبھی بھی نہیں تھا۔ وہ... وہ سروری کو کیسے قتل کر دیتا جب کہ اس کو ایک بچے کی تو بڑی تمنا تھی۔ ایسا آدمی تو چاہے گا کہ اس کے ہاں ایک بچہ ہو، اُسے وہ اپنا متبنّیٰ بنا سکتا تھا۔ جاگیر پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لیے وہ یہی چاہتا تھا۔ وہ سروری پر کیسے حملہ کر سکتا ہے، یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عین ممکن ہے یہ عورت جھوٹ بول رہی ہو محض ڈراما کر رہی ہو۔ آہو گھر نہیں ہوگا تو یہ کسی وجہ سے اٹھ کر میرے ہاں چلی آئی۔

حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں، پھر؟۔۔ پھر بھی وہ۔۔۔۔

”لے تے حیدر! ابے کبھی تو کوئی صحیح کام بھی کر لیا کر۔ اِن کا ناشتہ کہاں ہے؟“ میں نے حیدر کو آواز دے کر کہا۔

”وہ جی۔۔۔ میں ابھی لے آتا ہوں، پر میرا خیال تھا، پہلے یہ برش وغیرہ کریں گی۔“

”ہاں۔ وہ تو کریں گی ہی۔ جا اِن کے لیے پانی گرم رکھ دے غسل خانے میں۔“

”وہ تو جی گیزر لگا ہے۔ بٹن دبانے کی دیر ہے کہ۔۔۔۔“

”ٹب بھر دے ذرا۔ انھیں اشنان میں کوئی دِقت نہ ہو۔“

وہ ٹک ٹک میرا منہ تک رہی تھی میرا خیال ہے اس کو مسکرانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا، بولی ”آپ اندر تو آئیں ذرا۔ بڑی باتیں کرنی ہیں مجھے آپ سے۔“

”بات یہ ہے دراصل کہ مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ میں بس دو گھنٹے تک آ جاؤں گا۔ آپ بیٹھیں، باتیں تو پھر بھی ہو سکتی ہیں۔“ میرے رویّے سے وہ اور زیادہ حیران ہو گئی۔ ایسا رُوکھا تو میں شاید کبھی بھی نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گئی۔

حیدر ابھی تک سامنے ہی کھڑا تھا، بولا ”اب کیا حکم ہے میرے لیے؟“

”اوئے بیٹھ جا یار! مجھے یہ بتا کہ وہ وِلسن ہے کس قماش کا آدمی؟“

”ولسن! وہ تو سردار صاحب کوئی انگریز لگتا ہے مجھے۔ قد اس کا کوئی چھ فٹ دو انچ ہو گا۔ گورا چٹا، بڑا صحت مند، داڑھی مونچھ مُنڈی ہوئی۔ ہر وقت سوٹ میں ملبوس۔ گاڑی بھی اس کے پاس نئی ہے، فورڈ گاڑی۔ اور اس کا ٹیلیفون نمبر بھی میرے پاس ہے۔“

”یہ مجھے کیوں نہیں بتایا تم نے؟ لا وہ نمبر کہاں ہے؟ حد ہو گئی تیری بھی! جلدی لا وہ نمبر۔“

حیدر اپنے کمرے سے ایک ڈائری لے آیا۔ اور مجھے اس کا ایک صفحہ تھماتے ہوئے بولا ”اس کے گھر سے ایک بہت ہی سُریلی آواز فون اٹھاتی ہے۔ میں نے معلوم کیا تھا میرا خیال ہے وہ۔۔ اس کی بیوی ہو گی ـــــ اس کی آواز اتنی خوبصورت ہے کہ اپنے تو بارہ ہی بج گئے۔“

”اوئے چپ کر۔ پتا نہیں تو کیسے کیسے خواب دیکھتا رہتا ہے!“

”لو بولو۔ میں نے دیکھا ہی کہاں ہے اس کو سردار صاحب! ویسے میرا خیال بالکل ٹھیک ہے آپ دیکھ لینا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تو خود فون کر۔“ میں نے ٹیلیفون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جھینپ سا گیا مگر پھر بھی اُس نے نمبر گھما دیے۔

”ہیلو!“

پتا نہیں دوسری طرف سے اسے کیا جواب ملا کہ اس نے فوراً ہی ریسیور مجھے تھما دیا، بولا ”خود بات کریں، دوسری طرف وہی قیامت ہے۔ ہاں۔ لگتا ہے لتا منگیشکر بول رہی ہے۔“ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ آواز کسی خاتون کی تھی سنجیدگی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ اُردو میں بات کر رہی تھی۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے جناب!“

”میں مسٹر وِلسن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کا نام؟“

”سردار کریم نواز۔“

”ہوں۔ میں اُن سے کہہ دوں گی۔ دراصل وہ کل شام سے یہاں نہیں ہیں۔ کام کیا ہے آپ کو؟“

”میں آپ سے کیا عرض کروں، آپ کا گھر کہاں ہے؟“

”ہم گلبرگ میں رہتے ہیں۔ فردوس مارکیٹ کے عقب میں چھ سو چار نمبر میں۔“ اس کی آواز میں واقعی ایک عجیب قسم کی نغمگی تھی۔ جسے لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”تو پھر میں اُن سے کب مِل سکوں گا؟“

”میرا خیال ہے آپ شام کو چھ بجے اُن سے مِل لیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔ میں اس زحمت کی معافی چاہتا ہوں خاتون! خدا نے آپ کو بہت مترنم آواز دی ہے۔“ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شاید کچھ چونک سی گئی ہو گی۔

”کیا کہا آپ نے! میری آواز! آپ کو آوازیں پرکھنے کا شوق ہے؟“ ریسیور سے اس کی طنزیہ آواز اُبھری۔

”نہیں مگر ایک اچھی چیز کو اچھا کہہ دینا چاہیے۔ اگرچہ آپ کا لب و لہجہ انگریزی ہے مگر ہماری زبان آپ کی آواز پر بہت سجتی ہے۔“

”جی شکریہ!“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اسے کسی نے یہ احساس نہیں دلایا تھا ورنہ وہ اس قدر نہ چونکتی۔ اس کی آواز میں اچانک تحیّر اُبھر آیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں ستنا جا صاحب کی کوٹھی جا پہنچا۔ اس طرح کہ ایک چھرا میرے نیفے میں بند تھا اور میرا پستول جیب

[میں] پڑا تھا اپنے ساتھ میں فالتو گولیاں بھی لے گیا تھا۔ مجھے کسی بھی وقت اُن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں رکشے سے اُترا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں سے تمام سپاہی ہٹا لیے گئے تھے۔ کیمپ ویران پڑا تھا۔ اندر باہر کوئی مونچھوں والا مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ ستنا جا صاحب کا ملازم گیٹ کھولنے کے لیے باہر آیا۔ میں نے جب اسے اپنا نام بتایا تو معلوم ہُوا کہ اندر میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ انھیں بتانے کے لیے عمارت کی طرف نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی برآمدے میں نکلا۔ صورت شکل تو اس کی ستنا جا صاحب سے قدرے مختلف تھی۔ مگر پھر بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن کا بڑا بھائی ہے بڑے گٹھے ہوئے ورزشی جسم کا آدمی تھا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ملازم کو بھیج کر مجھے اندر بلوا لیا۔ جب میں اُس کے سامنے پہنچا تو بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بولا ”سردار کریم نواز؟“

”جی ہاں۔ میں نے صبح فون کیا تھا۔“

”آیئے۔ بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ آپ ستنا جا صاحب کے بہت قریبی دوست ہیں۔ اُن کی تو اب یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔“ برآمدے میں ایک کار کھڑی تھی، وہ مجھے اس کے قریب سے گزار کر اندر لے گیا اور ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر بولا ”میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دیتا ہوں۔“

”جی شکریہ! اُن سے میرا سلام کہیں۔“

وہ باہر نکلا تو میں نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا۔ میں اُس آدمی کو وہاں سے اُٹھا لینا چاہتا تھا۔ وہ ملک اشرف کا ساتھی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے بارے میں ابھی تک کسی شبہے میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بہت اچھی بات تھی۔ میں اُسے بڑے صاحب کے سامنے ننگا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ رقم جو مجھے مطلوب تھی، اس کی وساطت سے بڑی آسانی سے مِل سکتی تھی مگر فضا اس گھر کی اتنی ماتمی سی تھی کہ وہاں میں اُس پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ جہاں سے جنازہ اُٹھے وہاں سے کسی کو اِس طرح اٹھا لینا کسی بھی طرح زیب نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو سکا میں اسے وہاں سے اغوا کر لوں گا کہ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار ہی نہیں تھا۔

بیگم صاحبہ کوئی پانچ منٹ میں وہاں آ گئیں۔ اُن کا چہرہ بُجھا بُجھا سا تھا۔ اُن کے حُلیے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسلسل رو رہی ہیں۔ لباس اُن کا معمولی سا تھا جس پر انھوں نے سرمئی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ بڑی متانت سے آئیں اور مجھ سے کچھ دُور کرسی پر بیٹھ گئیں محسن بھی اُن کے قریب ہی جا بیٹھا۔

”میں ایک کام سے باہر گیا ہوا تھا، مجھے اس بات کی خبر ہی نہیں ہو سکی بی بی! آخری بار میں ستنا جا صاحب سے اسپتال میں ملا تھا۔“

”بس جی! اللہ کی مرضی یہی تھی۔ وہ اسپتال میں ہی تھے اور انھیں پہلے سے بہت افاقہ تھا۔ اُن کی طبیعت بہتر بھی ہو رہی تھی مگر پھر اچانک ہی انھیں دورہ پڑا اور وہ بچ نہ سکے ـــ میں اُس وقت گھر میں تھی۔ بس دو گھنٹے پہلے میں وہاں سے نکلی تھی۔ بچّوں کی دیکھ بھال بھی تو ضروری تھی۔ یہ نہیں پتا تھا کہ وہ میری اُن سے آخری مُلاقات ہو گی۔“ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

”واقعی اب تو اُن کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں جی! کچھ آپ کو پتا ہے کہ اُن کے جسم پر وہ نشان کیسے تھے؟ جیسے کسی نے چابک سے پیٹا ہو۔ میں تو اب تک کچھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔“ محسن نے کہا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا، آپ نے وہ نشان دیکھے تھے؟“

”جی ہاں۔ غسلِ میّت کے وقت میں پاس ہی کھڑا تھا۔ بڑے نِشان تھے اُن کے جسم پر۔“

”آپ نے کسی سے پوچھا ہوتا ہے۔“

”پوچھا تو تھا مگر کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ اب بھابی یہ کہتی ہیں کہ انھیں کسی نے اغوا کر کے مارا تھا۔ وہ کون آدمی تھا؟ آپ مجھے نام بتا سکیں تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔“

”میرا خیال ہے بی بی جی کو پتا ہے کہ کون لوگ تھے؟“

”جی نہیں۔ مجھے ستنا جا صاحب نے کچھ نہیں بتایا اور پھر پولیس کے بھی کسی آدمی کو علم نہیں ہے۔ جن لوگوں کو وہ اُس روز یہاں لائے تھے وہ بھی کوئی چار پانچ گھنٹے بعد یہاں سے چلے گئے۔ میں اُن سے بات ہی نہ کر سکی۔“

”چلیں دفع کریں۔ اُن کا کام ہی ایسا تھا۔ اونچ نیچ تو ایسے کاموں میں ہو ہی جاتی ہے۔ لعنت بھیجیں، آپ معلوم کر کے کیا کریں گے؟ آئیں پہلے دُعا مانگ لیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھا دیے وہ بھی اس دعا میں میرے شریک ہو گئے اور پھر آمین کہہ کر ہم نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے اس بارے میں زیادہ تعرض نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں سب کچھ معلوم تھا، مگر وہ اس بات کو محسن سے چھپا لینا چاہتی تھیں، وجہ پتا نہیں کیا تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی ہوں گی کہ محسن خود کو کسی ایسے فساد میں پھنسا لے جس سے وہ نکل نہ سکے۔

بیگم صاحبہ باہر نکلیں تو محسن بولا ”میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔“

”جی نہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ مجھے اپنی گاڑی میں ڈراپ کر دیں، مجھے گلبرگ پہنچنا ہے۔“

"اس میں کیا ہرج ہے، چلیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"بہت شکریہ آپ کا۔" میں اس کے ساتھ ہی برآمدے میں نکل آیا۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو وہ بولا۔ "میرا خیال تھا، آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کون لوگ تھے، وہ بدترین سزا کے مستحق ہیں۔" اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھلنے لگیں۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا عقب نما میں دیکھ رہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ چین سے بیٹھنے والا سُست اور کاہل آدمی نہیں تھا۔ ایسے میں اُن لوگوں کے بارے میں بتا دیتا تو شاید وہ کسی اور رُخ سے اُنہیں زِک پہنچاتا۔ مگر اصل آدمی تو اب وہاں رہ ہی نہیں گیا تھا۔ میں کسے موردِ الزام ٹھہراتا مگر اندازہ میرا یہی تھا کہ اسے غصہ بہت زیادہ تھا۔ اس نے بھائی کی میت کو دیکھا تھا۔ اس پر نیلے نیلے نشان اس کی سمجھ میں نہیں آتے ہوں گے۔ شک کا ایک کانٹا اس کے دل میں ایسا چُبھا تھا جو اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا تھا اور شاید وہ مجھے بھی اس معاملے میں موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا یا ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ کیونکہ ہم... ایک دُوسرے سے پہلی بار مِل رہے تھے۔ اور اس کے نام کی شہرت تو میں نے کیرل میں سنی تھی۔

کار جب میری کوٹھی کے سامنے پہنچی تو میں نے اُسے روک لیا۔

"میں یہیں رہتا ہوں محسن صاحب! آپ کچھ چائے وغیرہ پی کر جائیں، میں دروازہ کھلواتا ہوں۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔ بھابی گھر میں اکیلی ہوں گی۔ کوئی نہ ہو تو پھر وہ رونا شروع کر دیتی ہیں۔"

"ارے نہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی؟ آئیں تو سہی۔" یہ کہہ کر میں نے کار سے اُتر کر گھنٹی بجا دی۔ حیدر کوئی تین منٹ میں وہاں پہنچ گیا اور محسن نے گاڑی لے جا کر پورچ میں کھڑی کر دی۔ حیدر جب گیٹ بند کر کے واپس آیا تو ہم ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ اس کوٹھی کی زیبائش دیکھ کر حیران ہو رہا تھا، بولا۔ "یہ آپ کی اپنی کوٹھی ہے؟"

"جی ہاں۔ یہی میرا غریب خانہ ہے۔ ستناجا صاحب میرے ساتھ ہی تھے جب یہ کوٹھی میں نے خریدی۔ وہ بے چارے خود سودا کروانے میں پیش پیش تھے۔" "او بے حیدر! دیکھ ذرا اندر کوئی ٹھنڈا بھی رکھا ہے کہ نہیں۔ پھر ان کے لیے چائے بنا۔"

"ایسا بھی کیا تکلف ہے۔ میرا ارادہ بس اب جانے کا ہے۔"

"جی نہیں۔ چائے تو ضرور پی لیں جناب محسن صاحب! آپ بھی ستناجا کہلاتے ہیں؟"

"مجھے یہ شوق تو نہیں ہے پھر بھی لوگ کہہ ہی دیتے ہیں۔ ایسے ناموں میں بھلا کیا رکھا ہے محترم! آدمی کی ذات تو پیسہ ہو کر رہ گئی ہے، صرف پیسہ۔ ہے کہ نہیں؟"

"ہاں یہ بات تو آپ نے صحیح کہی۔ روپیہ ہی سب کچھ ہو کر رہ گیا ہے ورنہ آدمی کا حسب نسب بھی تو کوئی چیز ہوتا تھا۔ اب دیکھیں نا، اِس پیسے کے لیے لوگ کیسے کیسے دھندے کرتے ہیں۔ کوئی واپڈا کا ٹھیکہ لیتا ہے، کوئی نہروں کا۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ تو ہے ہی۔ میں بھی دراصل ٹھیکیداری ہی کرتا ہوں مگر آج کل ہم ایک زبردست مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ہم نے کیرل کے قریب اُدھر پہاڑیوں میں ایک نہر کا ٹھیکہ لے رکھا تھا مگر کل صبح معلوم ہوا کہ وہاں سے ڈاکوؤں نے تمام مزدور اغوا کر لیے۔ ہمارے سپاہی بھی ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں۔ پولیس اُن کا پیچھا تو کر رہی ہے مگر ابھی تک صحیح آدمیوں تک وہ بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے ہم پر یوں ہاتھ ڈالا ہے۔"

"اچھا! یہ کیسے ہو گیا؟ میں نے ایسا کبھی نہیں سُنا کہ ساری لیبر ہی اغوا ہو گئی ہو۔ کچھ عورتیں بھی اُن کے ساتھ تھیں؟"

"جی ہاں۔ دراصل کیرل کے قریب ہم نے قالین بافی کا کارخانہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ اپنے ایک دوست ہیں صغر علی۔ وہ اِس سے بہت نفع کماتے ہیں۔ کچھ ہمارا بھی اس میں حصہ ہے۔ مگر...... وہ ڈاکو ان سب کو ہانک کر لے گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ یہ ہوا کیسے۔ میں تو بھائی جان کے انتقال کی وجہ سے گھر میں بندھا ہوا ہوں ورنہ میں خود معلوم کرتا کہ ہوا کیا ہے!"

"یہ تو بڑی لرزہ خیز خبر سُنائی ہے آپ نے محسن صاحب! آخر وہ کون لوگ تھے، کچھ اندازہ تو ہوگا آپ کو؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ کاروباری رقابت کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک اور پارٹی دراصل یہ ٹھیکہ لینا چاہتی تھی۔ سرفراز حسین اینڈ کمپنی والے۔ یہ گوجرانوالہ کی پارٹی ہے مگر ٹھیکہ ہمیں مل گیا کیونکہ ہمارے ریٹ کم تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ سب کچھ انہی لوگوں نے کیا ہے۔" محسن نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"یہ سرفراز حسین والے کون ہیں؟"

"کروڑپتی لوگ ہیں جی! مگر یہ اپنی اپنی قسمت ہے نا، ٹھیکہ ہمیں مل گیا۔ اُف! یہ ٹینشن بھی بڑی خراب چیز ہے۔ کئی دنوں سے میں کلب نہیں جا سکا ہوں، پٹھے اکڑ گئے ہیں اور ورزش چاہتی ہے کہ آدمی روز سامنے آئے، ورنہ اپنا بدن کھو دیتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ ورزشی آدمی کے لیے آرام سے بیٹھ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے، ویسے آپ یہ بتائیں کہ آپ کا یہاں کوئی دفتر بھی تو ہوگا؟"

"کیوں نہیں جی! خاصا بڑا دفتر ہے۔ کوئی دس بارہ آدمی کام کرتے ہیں وہاں۔ اُدھر مال روڈ کے نزدیک۔ بیڈن روڈ کے عقب میں ہمارا دفتر ہے۔"

"وہ جو افشاں کنسٹرکشن کمپنی ہے، اس کا بورڈ بھی وہاں لگا ہے۔"

"جی ہاں۔ وہی دفتر ہے ہمارا۔ وہاں آج کل میں صرف دو چار گھنٹے ہی بیٹھتا ہوں ورنہ اس سے پہلے تو سارا دن وہیں گزر جاتا تھا مگر بھائی صاحب کے انتقال کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا!"

"ظاہر ہے۔ اتنا بڑا صدمہ سہہ کر کوئی کیسے اپنے آپ میں رہ سکتا ہے؟ آپ وہاں کیا کام کرتے ہوں گے؟ میرا مطلب ہے صرف بیٹھنا ہی ہوتا ہوگا۔"

"نہیں جی! ہزار کام ہوتے ہیں۔ سرکاری دفتروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آج کل دیکھیں نا جی، آپ کا خدا بھلا کرے، ہمارے ایک کروڑ اسّی لاکھ روپے کے بِل پھنسے ہیں وہاں۔ اِن میں واپڈا والے بھی ہیں اور محکمہ انہار والے بھی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا! کیا کہتے ہیں وہ لوگ؟"

"کچھ نہیں جی۔ ہتھی مانگتے ہیں وہ۔ بیس پرسنٹ پتی اور اللہ جانتا ہے ہمیں بچتا کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ لیبر لے جاتی ہے۔ اس کا ریٹ سُن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ چالیس روپے فی آدمی لے جاتا ہے روز کے۔ پھر اُن کا کھانا پینا، اُن کا اوڑھنا بچھونا ہمارے ذمے۔ وہ بیمار ہوں تو ان کی دوا دارو الگ کرو۔ کوئی ایک مصیبت ہے۔ وہاں اُن کی دیکھ بھال کے لیے ہمیں سپاہی بھی رکھنے پڑتے ہیں ورنہ وہ بھاگ لیتے ہیں۔"

"اچھا! وہ بھاگ بھی جاتے ہیں؟"

"ہاں جی۔ کوئی ایک مصیبت ہو تو کہوں۔ آج کل خارج کا چکر ہے، مزدور فارن کے حساب سے پیسے مانگتا ہے ورنہ کہتا ہے اپن تو سعودی عرب جائیں گے۔ وہ امیر ملک ہیں۔ یہاں سے دس بیس گنا زیادہ اُجرت دیتے ہیں مگر آپ دیکھیں نا جی کہ ہم کہاں سے دے سکتے ہیں اتنے پیسے۔ اور بیس پرسنٹ دفتر والے الگ سمجھاتے ہیں۔ حساب لگائیں نا کہ ایک کروڑ اسّی لاکھ کا بیس پرسنٹ کہاں جا پہنچتا ہے۔"

"کمال ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات سنائی ہے آپ نے۔ وہ کون لوگ ہیں آخر؟ اُن کو اینٹی کرپشن کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

"نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہم سب چور ہیں۔ ہمارے اور ڈاکوؤں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔"

"پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ڈاکو بھی ٹھیک ہی ہوں گے کہ وہ آپ کی لیبر ہی لے گئے۔"

"نہیں جی! اس میں کسی بڑے سرمایہ دار کا ہاتھ ہے ورنہ کسی عام ڈاکو کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی ہے۔ ناممکن۔ کاش بھائی صاحب زندہ ہوتے تو اب تک اُن کا کلیجہ نکال چکے ہوتے۔ وہ بڑے حوصلہ مند افسر تھے۔ یہ ٹھیکہ بھی دراصل انہی کی مہربانی سے ملا تھا۔ کچھ اس میں ملک اشرف صاحب نے بھی نمایاں کام کیا۔ وہ بڑے اثر و رسُوخ کے آدمی ہیں۔"

"کیا وہ لاہور ہی میں ہیں؟"

"جی نہیں۔ کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ بس ایک دو روز میں آ جائیں گے مگر مجھے بڑی بُری خبریں مل رہی ہیں۔"

"کیسی خبریں؟ یعنی ملک اشرف صاحب کے بارے میں؟"

"جی ہاں۔ کہتے ہیں کہ ڈاکوؤں نے انہیں بھی اغوا کر لیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑے رعب و دبدبے کے مالک ہیں، ہے کہ نہیں؟"

"ضرور ہیں جی! اس میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔" میں نے ایک سگریٹ سلگا کر اُسے دے دیا اور ایک خود منہ میں لگا لیا۔ بات کچھ زیادہ ہی پُرلطف ہو گئی تھی اور میں اپنے مقصد کے زیادہ قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنے میں حیدر ہمارے لیے رُوح افزا بنا کر لے آیا تھا۔ دِن بسنت بہار سے بھی بہت آگے کی خبر دیتے تھے اور اب ٹھنڈا شربت بھی مزہ دینے لگا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا گلاس اُٹھا لیا۔ محسن کا بات کرنے کا انداز مجھے بہت پسند آیا۔ پتے کی بات کرتا تھا اور پوچھ بھی لیتا تھا کہ ایسا ہے کہ نہیں! یعنی وہ مخاطب کو خواہ مخواہ اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

حیدر وہاں سے جانے لگا تو میں نے اُس سے کہہ دیا کہ وہ چائے بھی بنا کر لے آئے۔

"آپ سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے محسن صاحب! آپ پتے کی بات کرتے ہیں، آپ کا تجربہ بہت وسیع ہے۔"

"جی شکریہ! دراصل یہ سب بھائی صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میں...... من آنم کہ من دانم۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟... ٹھیکیداری بہت مشکل کام ہے۔"

"یہ تو ہے۔ اور محنت کے بغیر روپیہ کہاں کمایا جا سکتا ہے۔ ویسے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے بِل پھنسے کہاں ہیں؟"

"کیا بتاؤں جی! دو بِل تو واپڈا کے پاس ہیں، ایک اسّی لاکھ کا اور دُوسرا بیس لاکھ کا۔ وہاں ایکسین کوئی نیا آ گیا ہے۔ اس نے پھڈا ڈال دیا ہے کیونکہ اس کو تو ہم کمیشن نہیں دے سکے تھے۔ وہ جو پہلا ایکسین تھا، وہ اب تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ صاحب اپنا حصّہ مانگتے ہیں۔ بس سارا جھگڑا اسی پر ہے۔ وہ اعتراض پر اعتراض کیے جاتا ہے اب ہم کیا کر سکتے ہیں، ہے کہ نہیں؟ خیر آج کل میں

اُسے بھی راضی کرلیں گے ہم۔"
"وہ کیسے؟"
"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ میں تو خیر نہیں، البتہ پانچ پرسنٹ تو دے ہی دیں گے۔" بات کرنے کا انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسے کوئی بڑا ساہوکار اور کھرا کاروباری ہو۔
"اور باقی بل کہاں ہیں؟"
"وہ تو خیر پاس ہو گئے ہیں۔ شاید کل تک چیک مل جائیں۔ ایک پینتیس لاکھ کا ہے اور دوسرا پینتالیس کا۔ کل تک مل جائیں گے۔"
"ان چیکوں کا کیا کرتے ہیں آپ! میرا مطلب ہے سرکاری خزانے سے لیتے ہوں گے؟"
"جی ہاں۔ اپنے حساب میں جمع کروا لیتے ہیں اور وہ آپ ہی کیش ہو جاتا ہے۔"
"حساب کتاب تو آپ کے پاس ہی ہوگا؟"
"جی ہاں۔ یہ سب کام میرے ذمے ہیں، سارا لینا دینا اور یہ سب دھندا میں ہی چلاتا ہوں۔"
"ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ کا تجربہ بھی تو بہت زیادہ ہے، ایسے کاموں کے لیے کوئی چلتی رقم قسم کے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، ہے کہ نہیں؟"
"جی ہاں۔ کچھ دال دلیہ کر ہی لیتا ہوں۔ ورنہ ملک اشرف وغیرہ جیسے لوگ یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔ اصغر صاحب بھی بس یوں ہی ہیں۔ انھیں تو بس عیاشی سے ہی فرصت نہیں، عیش کرتا ہے پٹھا۔"
"ہاں، یہ تو ہے، کہتے ہیں نا کہ ساون کے اندھے کو ہری ہری سوجھتی ہے۔ ہے کہ نہیں؟"
"ٹھیک کہا آپ نے۔ ویسے مجھے آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی ہے سردار صاحب! آپ کا اخلاق اور خلوص دیکھ کر مجھے بھائی صاحب کی یہ ادا پسند آئی کہ وہ ہمیشہ مخلص لوگوں سے تعلقات بڑھاتے تھے۔"
"جی ہاں۔ یہ خوبی تو اُن میں تھی۔ بڑے مردم شناس آدمی تھے وہ۔ کیا خیال ہے، میں آج آپ کے ساتھ نہ چلوں؟ دیکھتا ہوں اتنے لمبے چوڑے چیک کیسے ہوتے ہیں اور ان دفتروں میں کیا ہوتا ہے۔ یہ کچھ مجھے بھی تجربہ ہو جائے گا۔"
"آں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ آپ بھائی صاحب کے دوست تھے تو میرے بھی دوست ہیں۔ ضرور چلیں، ابھی تو زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔"
"تو پھر چلیں۔ دوپہر کا کھانا ہم اِدھر ہی کھائیں گے۔ میں جلدی سے کہہ دیتا ہوں۔ میری ایک عزیزہ آئی ہوئی ہیں، وہ بھی اُس کی مدد کریں گی۔"
"کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی ہے ابھی؟"
"جی نہیں بس فرصت ہی نہیں ملی۔ آئیے کہیں دیر ہی نہ ہو جائے۔ ویسے اِن دو بلوں کا کمیشن آپ نے اُن کو دے دیا ہوگا؟"
"جی ہاں۔ اس سے تو ہم فارغ ہو گئے۔ سب لوگوں کو بھگتنا دیا ہے ہم نے۔"
یوں ہی ہم باتیں کرتے ہوئے گاڑی کی طرف چل دیے۔ دوسرے کمرے میں شیشے کے پیچھے سے سروری ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ محسن اُسے دیکھ کر ایک دم رُک گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگی تھیں۔ کسی بات کا دھیان دیے بغیر وہ سیدھا شیشے کے سامنے جا ٹھہرا، تو سروری نے فوراً منہ پھیر لیا۔ محسن کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا، وہ میری طرف پلٹا اور بولا۔ "یہ۔۔۔۔ شیر دل آہو کی بیگم یہاں کیا کر رہی ہیں؟ آپ کی عزیزہ ہیں یہ؟"
"جی ہاں۔ یہ کل سے آئی ہوئی ہیں۔ آپ کب سے جانتے ہیں انھیں؟"
"میں بھائی صاحب کے ساتھ اکثر ان کے گھر جاتا رہا ہوں۔ حیرت ہے آپ کا انھوں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"
"آپ سے میرا ذکر تو ستنا جا صاحب بھی نہیں کرتے ہوں گے؟" اس اثنا میں سروری بیگم اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔
"یہ بھی آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ میرا خیال ہے آہو صاحب بھی یہاں آتے ہوں گے۔"
"کبھی کبھار آ ہی جاتے ہیں، میرے دوست بھی ہیں اور عزیز بھی۔ آئیے دیر ہو جائے گی۔"
"ہاں چلیں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں نِکل گیا۔
*
ہم جب واپڈا آفس پہنچے تو اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ محسن مجھے ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ اس کے چیک تیار رکھے تھے۔ ایک پینتالیس لاکھ کا، دوسرا بتیس لاکھ کا۔ تین لاکھ انھوں نے کسی وجہ سے کاٹ لیا تھا اور اس کا محسن کو پہلے سے علم تھا۔ دونوں چیک لے کر ہم اسی وقت بینک چلے گئے۔ اور محسن نے انھیں کمپنی کے حساب میں جمع کروا دیا۔
"میرا خیال ہے کہ بینک سے سارا لین دین آپ ہی کرتے ہوں گے؟"
"جی نہیں۔ چیک میرے اور حاجی عبدالستار کے دستخطوں سے بینک جاتے ہیں۔ رقم جمع کروانے کے لیے کوئی بھی جا سکتا ہے!"
"چلیں یہ اچھا ہے، دراصل کاروبار سے ہی زندگی بنتی ہے ورنہ اِدھر اُدھر ملازمتوں میں تو نری ذلت ہے۔"
"بالکل جناب! چلیں میں آپ کو اپنا دفتر دکھاتا ہوں۔"
"ضرور جی۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ کاش آپ کے بھائی صاحب زندہ ہوتے۔ اب تو بس اُن کی یاد ہی رہ گئی ہے، وہ میرے بغیر ایک قدم نہیں چلتے تھے۔ آخری دنوں میں تو میرے بہت قریب آ گئے تھے۔" میں نے بڑے ہی تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ مگر میرے تصور میں اس وقت وہ رقم بھر رہی تھی۔ ستتر لاکھ روپے کی رقم۔ اور اب مجھے اس کے لیے دلی مجھ دو بڑا دینی چاہیے تھی۔ مگر وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ مجھے اُن سے ایک چیک لکھوانا تھا جس پر ان دونوں کے دستخط موجود ہوں۔ اس کے بغیر تو میں بینک میں نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی مجھے احساس تھا کہ بینک میں اصل رقم کل ہی آئے گی پھر میں اُسے آسانی سے نِکلوا سکوں گا۔ مگر زیادہ بہتر یہ تھا کہ میں کسی اور نام سے کوئی اکاؤنٹ کھولوں اور اس میں وہ چیک جمع کروا دوں اور پھر مزے ہی مزے تھے۔ محسن کو میں ہر حال میں کسی قسم کے شک و شبہے سے دُور رکھنا چاہتا تھا اور وہ تھا بھی کوئی بہت ہی نیک دل انسان۔ اُس نے اب تک میری ہر بات پر اعتبار کر لیا تھا اور یہ بڑی مناسب بات تھی۔ اپنا اعتبار میں اس پر بٹھا چکا تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ میں اصغر علی کو لاہور نہیں لایا تھا۔ ورنہ میرے لیے سو قسم کے جھمیلے پیدا کر دیتا۔ اس کی نگرانی آسیہ کر رہی تھی اور یہی بہتر تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اب وہ دُور کہیں گھنے جنگلوں میں اس کے ساتھیوں کے قبضے میں ہوں گے۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ بہتر اور کیا ہو سکتا تھا اور ملک اشرف بھی انھی میں شامل تھا جسے میں کسی بھی وقت بڑے صاحب کے سامنے لا سکتا تھا۔ میں تو صبح گیا ہی اسی غرض سے تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں ستنا جا صاحب کے حوالے سے بڑے صاحب سے مل سکوں مگر میرے ہاتھ محسن آ گیا۔ ایسی صورت میں کہ چیک کے سلسلے میں میری راہ کے سارے کانٹے اُس نے خود ہی چن لیے تھے۔ اور اب صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ پھر وہ رقم لے کر میں وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد ہم افشاں کنسٹرکشن کمپنی کے دفتر جا پہنچے ایک چار منزلہ عمارت کے نچلے حصے میں اُن کا دفتر تھا۔ محسن وہاں داخل ہوا تو کمرے میں موجود چاروں آدمی کھڑے ہو گئے۔ وہ اُسے سلام کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے مگر محسن نے کوئی توجہ نہیں دی، سیدھا اپنے کمرے میں جا گھسا۔
"بیٹھیں سردار صاحب! یہ ہے میرا دفتر۔ ارے شبیر ادھر آ ذرا۔" اس نے چپراسی کو آواز دی۔ کمرہ واقعی بہت عمدہ طریقے سے سجا تھا۔ صوفے بہت آرام دہ تھے۔ بڑی میز کے گرد قرینے سے کرسیاں لگی تھیں اور بائیں ہاتھ پر دو دو فون رکھے تھے۔ اتنے میں شبیر وہاں آ گیا۔
"جی سر! میں حاضر ہوں۔"
"تو کہاں تھا بھئی! سارا دفتر لگا ہے اور تو غائب۔"
"وہ جی میں ذرا سگریٹ لینے گیا تھا سر! آپ کو میں نے دیکھ لیا تھا سر! اسی لیے بھاگا آیا ہوں سر!"
"جا ہمارے لیے چائے لے آ ذرا۔ ایک دم گرما گرم ہونی چاہیے کچھ کھانے کے لیے بھی لے آنا۔" یہ کہہ کر وہ جم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
"اب بتائیں سردار صاحب! آپ کی کیا خدمت کریں۔ دوپہر کا کھانا تو ہم کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔"
"ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔ ایک عجیب سی افراتفری سی مچ گئی تھی میرے ذہن میں۔ دفتر کا دوسرا کمرہ کلرکوں نے سنبھال رکھا تھا۔ اگرچہ درمیان میں دیوار تھی، پھر بھی ہماری آواز اُن تک پہنچ سکتی تھی۔ میری کسی کارروائی کے دوران شور شرابے کے نتیجے میں وہ چونک کر اندر آ سکتے تھے مگر پھر بھی مجھے اسے وہیں دبوچ لینا چاہیے تھا۔ یہی بہتر تھا۔ مگر۔۔۔ مگر مجھے ابھی حاجی عبدالستار سے بھی ملنا ہوگا۔ اُن کے دستخط بھی تو بہت ضروری تھے۔ اُس کا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا، مال روڈ پر ہی تھا۔ چیک لے کر میں اس کے پاس جا سکتا تھا تاکہ وہ بینک کے لیے قابلِ قبول ہو جائے۔
شبیر چائے اور کچھ بسکٹ ہمارے سامنے رکھ کر باہر نکلا تو میں نے چائے پر توجہ دینے کے بجائے اس سے کہا۔ "محسن صاحب! یہ۔۔۔ یہ دیکھ رہے ہیں نا آپ! اس میں سائیلنسر لگا ہے، آواز بالکل پیدا نہیں کرتا ہے اور آپ کو اپنی صحت بھی بہت عزیز ہے۔ بہتر ہے اپنے ہاتھ اُوپر اٹھائیں۔" میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔
"یہ۔۔۔۔ یہ کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے مجھے اپنے اِس قدر قریب دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پستول دیکھ کر لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے۔ حیرت سے منہ اس کا کھل گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔
"آپ کی آواز بالکل نہیں نکلنی چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا بایاں بازو کھینچ کر کمر سے لگا دیا۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ! دیکھیں میں ایسا مذاق بالکل پسند نہیں کرتا ہوں۔"
"یہ مذاق نہیں ہے محسن صاحب! میں بہت سنجیدہ ہوں۔ اس دراز سے چیک بک نکالیں اور اس پر ایک کروڑ روپے کا چیک لکھ دیں۔ یہ لیں۔" میں نے اُس کی دراز کھینچ کر باہر نکالی اور پوری کی پوری میز پر رکھ دی۔
"یہ۔۔۔۔ یہ سراسر زیادتی ہے آپ کی۔"
"کوئی بات نہیں محسن صاحب! جس کام پر آپ کا کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا، جس کمپنی کے مزدور بیگار کرتے ہوں اور نہر بھی کھُدر رہی ہو، اسے ایسے چیک لکھ دینے چاہییں۔"
"آپ۔۔۔۔ آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ ہم ایسی دھاندلی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔"
"کوئی بات نہیں۔ آپ کہہ دیں کہ آپ سے پستول کی نال پر

چیک لکھوایا گیا تھا۔ جلدی کریں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ابھی مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ میں نے چیک بک اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ میں آپ کے دستخط بھی دیکھ چکا ہوں، جلدی کریں۔" اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہ گئی ہے۔ حالانکہ وہ بہت تندرست و توانا جثے کا آدمی تھا۔ مگر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ دفتر کا کوئی آدمی اندر نہ آ جائے۔ میں اسے مفلوج بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ایسے میں وہ میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے بڑی ہی بے دلی سے وہ چیک بک سامنے رکھی۔

"کیا کروں میں؟"

"ایک کروڑ روپے کا چیک لکھ دیں۔ نہ پائی کم، نہ پائی زیادہ۔"

"اور پھر آپ مجھے گولی مار دیں گے، ہے کہ نہیں؟" رنگ اس کا اور زیادہ سفید ہونے لگا۔

"نہیں ایسا نہ سوچیں، میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ بس جلدی کریں۔" پریشان ہو کر اس نے چیک سامنے رکھا اور بولا "کس کے نام لکھ دوں یہ چیک؟"

"محمد اسلم شیرازی کے نام۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا مگر یہ چیک لے کر آپ اپنی قبر کھود رہے ہیں۔" اس نے ایک کروڑ روپے کا چیک لکھ کر اس پر دستخط کر دیے۔

"شکریہ محسن صاحب! اب دوسرے دستخط میں عبدالستار سے کرواؤں گا۔ دیکھیں نا، یہ آپ کی گردن کتنی صراحی دار ہے۔ ورزش نے اسے اور خوبصورت بنا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی رگیں مسل دیں۔ وہ یوں ہو گیا جیسے نزع کے عالم میں ہو، وہ کرسی پر ڈھیر ہونے لگا۔ کمرے کے عقب میں غسل خانہ میں دیکھ چکا تھا۔ محسن کو میں نے بانہوں میں بھرا۔ وہ اچھا خاصا موٹا آدمی تھا۔ ورزش بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ اسے میں لے آگے لے جا کر غسل خانے میں بند کر دیا۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں نے چیک بک جیب میں رکھی ...... چیک دوسری جیب میں ڈالا اور پستول نیفے میں اڑس کر کمرے کا جائزہ لیا۔ سارا کام صرف دس منٹ میں مکمل ہو گیا تھا اور دستخط اس نے اصل ہی کیے تھے۔ میں نے بینک میں اسے دستخط کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے دروازہ باہر سے بند کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ چپراسی اس وقت دروازے پر موجود نہیں تھا۔ اسے کہیں الگ بیٹھ کر گپ شپ لگانے کی عادت تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ کوئی بھلا کب تک بند دروازے کے سامنے کھڑا رہ سکتا ہے۔ اور اسے وہ تنخواہ بھی کیا دیتے ہوں گے

جو وہ ان کا پہرہ دے سکتا۔ ویسے محسن جتنا جا بہت ہی باظرف اور مہذب آدمی تھا۔ اپنے بھائی سے قطعاً ہی مختلف، پابند وضع، دوستی کا بھرم رکھنے والا۔ بے چارے نے سارا کام دس منٹ میں مکمل کر دیا۔ میرے لیے کوئی فساد کھڑا نہیں کیا۔ میں نے کہا، اوپچے کر لو۔ تو اس نے کر لیے۔ میں نے کہا چیک لکھ دو، اس نے وہ بھی لکھ دیا۔ کوئی ہیر پھیر کی بات نہیں کی۔ کچھ تلخ و ترش باتیں تو وہ کرتا ہی رہا مگر اس سے کیا ہوتا ہے بھلا۔ میں نے کچھ ان باتوں کا برا نہیں منایا۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ اصل چیز تو وہ چیک تھا اور اب وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اچھا تھا کہ دفتر میں کسی آدمی نے اندر نہیں جھانکا ورنہ گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ گولی چلانا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ مگر میں کسی بے گناہ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی پر ہاتھ اٹھاؤں۔ دراصل میرے دل میں اپنے ہاتھ کے کرشمے کی بدولت جو پاکیزگی کی طہارت کا احساس جاگ اٹھا تھا، اس کی وجہ سے میرا دل اب یہی چاہتا تھا کہ میں وہ دھندا ہی چھوڑ دوں اور کسی اور طرف نکل جاؤں۔ اور روز بھی میرے ساتھ یہی ہوا۔ محسن غسل خانے سے صحیح سلامت آ جائے گا مگر جب تک وہ کوئی بیان دینے کے قابل ہو گا، میں اسے کسی نہ کسی طرح گرفتار کروا دوں گا کہ نہر کے اس ٹھیکے میں جتنے بھی حصے دار تھے، میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ وہ سب کے سب بڑے صاحب کے دشمن تھے۔ اور ان کا قلع قمع کرنے کی تدبیر میں نے سوچ لی تھی۔ ایک اس چیک کا ٹنٹا ختم ہو جاتا تو پھر میں اس طرف توجہ دیتا۔ میں تنہا آدمی بھلا کہاں کہاں جا سکتا تھا۔

مال روڈ پر نکل کر میں پیدل ہی النور جا پہنچا۔ وہ خاصا معروف ہوٹل تھا اور مالک کے کارندے بڑے مستعد۔ اس کے بیرونی در پر میں خاص طور پر گہری نظر ڈالتا ہوا آگے نکل گیا۔ کاؤنٹر پر ایک ریسیپشنسٹ کھڑی تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک معمر آدمی لوگوں کے نام اور پتے درج کر رہا تھا۔ معلوم یہ ہوا وہ سب لوگ وہاں رہنے کے لیے جمع ہیں۔

"محترم! میں حاجی عبدالستار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، وہ کہاں ہوں گے؟"

"وہ... وہ اپنے کمرے میں ہیں، دوسری منزل پر چھیالیس نمبر کمرے میں۔ مگر آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میں افشاں کنسٹرکشن کمپنی سے آیا ہوں۔"

"جی ٹھیک ہے۔ آپ چھیالیس نمبر میں چلے جائیں۔" وہ پھر رجسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوسری منزل پر جا چڑھا۔ چھیالیس نمبر کمرہ سامنے ہی تھا اور اس کی بالکنی میں کھڑے ہو کر ہوٹل کا اندرونی منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو چند ہی لمحوں بعد ایک زنانہ آواز آئی۔

"کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"حاجی صاحب سے۔ مجھے ملک اشرف نے بھیجا ہے۔"

"آ جائیں، حاجی صاحب موجود ہیں۔" سامنے سبز مخملی رنگ کا قالین بچھا تھا۔ جیسے کوئی سبزے پر چل رہا ہو۔ بڑی بہار تھی اس قالین پر۔ دائیں بائیں صوفے بچھے تھے اور سامنے بڑے سے فوم کے پلنگ پر تکیہ لگا کر حاجی عبدالستار بیٹھے تھے، حقے کی نے منہ سے لگائے۔ وہ نقرئی حقہ بھی کمرے کی سجاوٹ کا حصہ بن گیا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ۔ عمر یہی کوئی چالیس پینتالیس سال کی ہو گی۔ ہلکی ہلکی داڑھی تھی ان کی اور مونچھیں صفاچٹ۔ سر پر بال کچھ زیادہ لمبے تھے جیسے پٹے رکھے ہوئے ہوں۔ وہ پہلی بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ جانے کیا بات تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آؤ برخوردار! کیسے آئے ہو۔ خیر تو ہے نا؟"

"جی خیر ہی ہے حاجی صاحب قبلہ! میرا نام محمد اسلم شیرازی ہے۔ مجھے ملک اشرف صاحب نے بھیجا ہے میانوالی سے۔"

"تو... تو وہ وہاں موجود ہیں نا؟ ہم تو بڑی غلط خبریں سن رہے ہیں بھئی! وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ آؤ بیٹھو۔" انھوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی سبز رنگ کے مخمل میں لپٹا تھا۔ میں اس پر بیٹھا تو یوں لگا جیسے میں نیچے دھنس گیا ہوں۔ بڑا آرام ملتا تھا ان صوفوں پر بیٹھ کر۔ حیرت ہے کہ کمرے کا رنگ بھی ہلکا سبزی مائل تھا اور کھڑکیوں کے شیشے بھی۔ "وہ ہیں کہاں آج کل؟ نہ خط، نہ فون، کچھ بھی نہیں۔ آخر بات کیا ہوئی ہے؟"

"جی مجھے تو اس کا علم نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ سر پر پٹی سی باندھ رکھی تھی انھوں نے۔ کہتے تھے چوٹ لگ گئی ہے ورنہ تو وہ ٹھیک ہی تھے۔ انھوں نے مجھے یہ چیک دے کر بھیجا ہے کہ آپ سے دستخط کرواؤں۔ محسن صاحب نے تو اس پر دستخط کر دیے ہیں۔ یہ مجھے اشرف صاحب کو دینا ہے۔" میں نے چیک ان کے سامنے رکھ دیا۔ اسے پڑھ کر وہ حیران سے رہ گئے۔

"یہ... یہ تو ایک کروڑ روپے کا چیک ہے! یہ کیسے دینا ہے آخر! اور... محسن صاحب نے بھی اس پر دستخط کر دیے! یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"اس کا تو مجھے علم نہیں ہے حاجی صاحب! یہ چیک وہ بہرحال مانگ رہے ہیں۔"

"محمد اسلم شیرازی! یہ کون ذات شریف ہیں؟ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ٹھہریں ذرا میں محسن صاحب سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فون کی طرف جھکے جو ان کے سرہانے کے ساتھ تپائی پر رکھا تھا۔

"ایسا نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے فون کی طرف جھپٹا اور اسے ان کے ہاتھ سے کھینچ کر میں نے پستول ان کے سامنے کر دیا۔ "آپ بڑے سمجھدار آدمی ہیں حاجی صاحب! کیا فائدہ شور مچانے کا۔ دیکھیں نا، بڑے صاحب پر اس روز آپ اور ملک اشرف نے حملہ کروا دیا۔ یہ تو ان کی قسمت تھی کہ وہ بچ گئے۔ ورنہ تو وہ ختم ہو گئے تھے۔ اب آپ کی نہر کی کھدائی بند ہو چکی ہے۔ ڈاکوؤں نے وہ کیمپ لوٹ لیا ہے۔ نام نہاد ملیشیا بھی ختم ہو چکی ہے تو ایسے میں یاروں کا حصہ تو نکلنا ہی چاہیے نا۔ ویسے ملک اشرف بھی ہماری قید میں ہے۔ آپ کا بھی ان شاء اللہ جلدی ہی جھٹکا ہو جائے گا۔ بڑے صاحب کو میں نے خبر کر دی ہے مگر اس چیک پر دستخط ضرور کر دیں۔ پتا نہیں پھر آپ کا کیا حال ہو میرے حاجی صاحب!" میں نے چیک ان کے سامنے رکھ دیا۔ پستول کی نال میں نے ان کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔ "ذرا جلدی کریں، میں انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔" میں نے اس کو پوری طرح دھمکاتے ہوئے کہا۔

"وہ بے بس ہو کر میرا منہ تکنے لگا، بولا "تو... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کیمپ سے ہمیں صحیح خبر ملی تھی۔"

"کوئی خبر کبھی غلط بھی ہوتی ہے۔ یہ لیں، یہ آپ کا قلم۔ میرا خیال ہے اتنے بڑے چیک پر پہلے کبھی نہ چلا ہو گا۔" میں نے اس کی خوشبودار واسکٹ کی جیب سے قلم نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ویسے میں آپ کے دستخط دیکھ آیا ہوں۔ اگر گڑبڑ کی تو اچھا نہ ہو گا۔ پلیز! جلدی کریں ورنہ شاید آپ کی عمر وفا نہ کرے۔"

"نہیں، میں دستخط نہیں کروں گا، ہرگز نہیں۔"

"میں روح کھینچ قسم کا آدمی ہوں...... کسی کو نہیں بخشتا ہوں۔ یہ دیکھیں۔ کہیں تو آپ کی کلائی ابھی توڑ دوں۔" میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی بائیں کلائی پکڑ کر پوری قوت سے دبا دی۔ ذرا سا زور میں اور ڈالتا تو وہ تڑاخ سے ٹوٹ جاتی۔ وہ درد سے کراہتے ہوئے بولا "ادھر لاؤ، میں دستخط کر دیتا ہوں۔"

"جلدی کریں۔ یہ سائلنسر لگا پستول ہے۔ آواز بالکل نہیں دیتا۔" میں نے اس کی نال حاجی صاحب کے کان میں ڈال دی۔ انھوں نے نہایت ہی بے بسی کے عالم میں چیک پر دستخط کر دیے۔ بات بن رہی تھی مگر ابھی تو بڑے مرحلے باقی تھے۔ کون جانے یہ بیل منڈھے چڑھتی بھی تھی کہ نہیں۔ روپے کے لیے لوگ جان پر

کھیل جاتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ مگر وہ جو چیک پر دستخط کر چکے تھے، ایسے نادان اور ایسے آسان نہ تھے۔ کچھ نہ کچھ تو وہ بھی سوچ چکے ہوں گے۔ وہ اگلے مرحلے پر میرے سامنے دیوار کھڑی کر سکتے تھے۔ میں چالا دیکھ کر تو وہاں نہیں آیا تھا۔ کسی کو میں اپنا ہاتھ کبھی نہیں دکھا سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگلی گھڑی مجھ پر کیسی گزرے گی۔ ایک حال یہ تھا جس کو میں سو احتیاطوں سے باندھ کاٹ کر رکھ رہا تھا۔ جیسے ہی حاجی صاحب نے دستخط کیے، میں نے اُن کی گردن پر پنجہ گاڑ دیا۔ اور وہ بستر پر ہی جھول کر رہ گئے۔ حقے کی نے انھوں نے پہلے ہی الگ رکھ دی تھی۔ وہ چاندی کی نے جس کے پیچھے پلاسٹک کا پائپ لگا تھا، اُن کی جدائی میں سر ڈال کر بستر سے نیچے گر گئی تھی۔ میرا خیال ہے حاجی صاحب پر میرا ہاتھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا اور ایسا شاید میں نے عمداً کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ہوش میں آئیں۔ وہ بستر پر جھول گئے تو میں نے انھیں کھینچ کر سیدھا کیا۔ مگر ابھی میں اُن پر کمبل ڈالنے ہی لگا تھا کہ دروازہ پھر کھُل گیا۔ وہ لڑکی پھر مجھے اندر آتی دکھائی دی۔

"اچھا ہوا آپ آ گئیں۔ ان کو دیکھیں کیا ہو گیا ہے انھیں؟ بیٹھے بٹھائے بے ہوش ہو گئے ہیں۔"

"اوئی میں مر گئی۔ یہ بے ہوش ہو گئے! مگر کیسے؟ یہ تو اچھے بھلے تھے۔"

"ہاں۔ اور بڑے چاق و چوبند بھی تھے یہ حاجی صاحب۔ اِن کو دیکھیں کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔ یا خود انھیں یہاں سے لے جائیں۔ ان کا علاج بہت ضروری ہے۔" اس نے میری دوسری بات نہیں سُنی۔ فوراً ہی باہر نکل گئی۔ جب وہ دوبارہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ہوٹل کا منیجر اور دو بیرے بھی تھے۔ مجھے اس نے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پتا نہیں وہ لوگ شاید اوپر ہی آ رہے تھے۔

"کاظمی صاحب! خدا کے لیے انھیں دیکھیں۔ پتا نہیں انھیں کیا ہو گیا ہے۔ ان کے گھر فون کر دیں۔"

کاظمی نے انھیں سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔ جب اس کی نگاہ گردن پر پڑی تو بہت حیران ہوا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ جب ڈاکٹر کو فون کر رہا تھا تو اس وقت بھی اس کی نظر حاجی صاحب کی گردن پر ٹکی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہاں میرے پنجے کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔

"انھیں ڈاکٹر کو دکھائیں کاظمی صاحب! میں ابھی آتا ہوں۔"

"آپ ذرا ٹھہریں جناب! ڈاکٹر کو بتانا ہوگا کہ ان کی یہ حالت کیسے ہو گئی۔ آپ تو ان کے پاس موجود تھے۔"

"جی ہاں۔ میں ادھر ہی تھا۔ بیٹھے بیٹھے یہ اپنی گردن پر ہاتھ مارنے لگے جیسے ان کا دم گھٹ رہا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے ہوش ہو گئے۔"

"ہوں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے۔ مگر یہ...... ان کی گردن پر... کوئی اپنی ہی گردن یوں نہیں دبا سکتا ہے۔ میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اصل ضرورت ڈاکٹر کی ہے۔"

"وہ بھی آ رہا ہے۔ براہِ کرم آپ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"یہ آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے بات ایسی ہی ہے۔" اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ دونوں بیرے دروازہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کاظمی کی باتوں نے اُن کے دلوں میں کچھ ادھر ہی شکوک پیدا کر دیے تھے۔ اور جہاں تک میں سمجھ سکا تھا، ہوٹل النور کے بیرے کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر وہاں خاصا خرچ اُٹھتا تھا ورنہ اُن میں ایسی جرأت کہاں تھی کہ ملک اشرف کے ہاں بڑے صاحب پر حملہ کر دیتے۔ کاظمی نے یوں کیا کہ حاجی صاحب کے قریب سے ہٹ کر میرے سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ نظر اس کی بہت تیز تھی۔ تھا تو وہ پنتالیس کے پیٹے میں، مگر اس کی عقل خوب کام کرتی تھی۔ اِتنا اندازہ میں لگا چکا تھا کہ ان کے پاس سے ہتھیار کسی کے پاس بھی نہیں تھے۔ وہ بس یونہی وہ خبر سُن کر اندر آ گئے تھے۔ میں نے خواہ مخواہ ہی دیر کر دی۔ فوراً ہی وہاں سے نکل جاتا۔ خواہ مجھے خاتون کو دھکا ہی دینا پڑتا۔ میں وہاں سے جان چھڑا سکتا تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ اپنا ہتھیار دکھائے بغیر میں اب وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اور کاظمی بھی مجھے گھور رہا تھا۔ ایک نظر اس کی بیروں پر تھی، جو میرا راستہ روکے کھڑے تھے۔

"میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے۔ اپنا حکم اپنے پاس ہی رکھیں کاظمی صاحب!" یہ کہہ کر میں نے پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ "بہتر ہے تم دونوں ایک طرف ہٹ جاؤ، جلدی کرو۔ میں جانتا ہوں اس روز بڑے صاحب پر حملہ کرنے میں تم بھی شامل تھے۔ اور یہ فیصلہ ہو کر رہے گا کہ تم ابھی تک باہر کیوں ہو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" میں نے جان بوجھ کر ایک بیرے کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔ ٹھک کی سی آواز پیدا ہوئی اور وہ دروازے کے ساتھ گر گیا۔ دوسرا بیرا فوراً ہی کاظمی کی طرف لگا۔ کاظمی بھی پریشان ہو گیا تھا اور وہ خاتون تو لرزنے لگی تھی۔ میں نے آخری نظر اُن پر ڈالی۔ صورتِ حال زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔

"چلو تم تینوں اُدھر چلو، اس غسل خانے میں جلدی کرو۔" میں نے کاظمی کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ خاتون فوراً غسل خانے تک جا پہنچی۔ بیرے نے بھی اس کی پیروی کی۔ پھر پستول کو دیکھ کر ان کی ہمت ہی ختم ہو گئی تھی، وہ تینوں غسل خانے تک پہنچے تو میں نے زخمی بیرے کو ٹانگ سے گھسیٹ کر وہاں تک پہنچایا۔ حیرت ہے کہ خاتون نے غسل خانے کا دروازہ خود کھول لیا۔ وہ اس صورتِ حال کی وجہ سے پاگل ہو گئی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے اُن کی طرف ایک اور گولی چلا دی۔ مگر میں کسی کا نشانہ نہیں لے رہا تھا لیکن وہ بہت خوفزدہ ہو کر فوراً ہی غسل خانے میں گھس گئے۔ اُن کے کھڑے ہونے کے لیے وہاں کافی جگہ موجود تھی اور اس میں سے باہر نکلنے کا دروازہ صرف ایک ہی تھا۔ وہ جیسے ہی اندر گھسے میں نے باہر کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور پھر میں ٹیلیفون کے تار کاٹ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ مگر ذہن میرا بُری طرح الجھ رہا تھا۔ میں دو غلطیاں کر آیا تھا۔ ایک تو محسن کو میں نے اپنا گھر دکھا دیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ چار چھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آتا تو سیدھا میرے گھر پہنچ جاتا۔ یہ اچھی بات نہیں ہوئی تھی۔ دوسری غلطی مجھ سے یہ ہو گئی تھی کہ میں ان بیروں کو خبردار کر آیا تھا کہ بڑے صاحب پر حملے میں وہ بھی شامل تھے۔ خواہ مخواہ ہی اُن کے دل میں بڑے گھر کا خوف پیدا کر آیا تھا۔ یہ دونوں باتیں غلط تھیں اور ابھی چیک ... یہ حاصل کرنے میں کئی مرحلے باقی تھے۔

حاجی عبدالستار کے غسل خانے میں کھڑے اُن لوگوں کی آوازیں باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ سیڑھیاں اُتر کر میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ دفتر بالعموم دو بجے بند ہوتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کینٹ کے لوگ بھی اس وقت تک چلے جاتے ہوں گے۔ مگر جب میں بیڈن روڈ پر پہنچا تو مجھے شبّر ایک چائے خانے میں داخل ہوتا نظر آیا۔ اس کا وہاں مل جانا ہی بہت غنیمت تھا۔ دفتر سے وہ اکثر غیر حاضر ہی رہتا تھا۔ پتا نہیں وہ اسے پیسے کس لیے دیتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میری اس سے اس وقت ملاقات ہو رہی تھی۔ جب وہ اندر جا کر کرسی پر جم کر بیٹھ گیا تو میں ارد گرد کا جائزہ لے کر اس کے پاس جا پہنچا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ گیا۔

"ارے آپ! سر آپ کیسے آ گئے اس ہوٹل میں؟ یہ تو غریب لوگوں کا چائے خانہ ہے سر!"

"نہیں یار! تجھے دیکھ کر میں اِدھر آ گیا۔ میں نے سوچا، تمھیں کچھ چائے شائے ہی پلا دیتا ہوں۔ کچھ پیسے بھی ہیں تمھارے پاس کہ نہیں؟"

"کہاں جی! یہ نوکری تو بس ایسی ہی ہے۔ سو سوا سو روپیہ ملتا ہے، اللہ جانے کیسے گزر بسر ہوتی ہے۔ پھر بیڑی، پان، چائے کا خرچہ الگ ہے۔ اِس سے تو میں جان نہیں چھڑا سکتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی بُری خبر سُنائی ہے تم نے۔"

"کیا کہوں جی! بیوی بے چاری الگ لوگوں کے برتن بھانڈے مانجھتی ہے۔ مر کھپ کر وہ بھی ستر اسّی لے آتی ہے۔ ایک جنجال میں پھنسا ہوں سر! یہ کوئی زندگانی تو نہیں ہے نا سر!"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو شبّر! آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔ نہ اُسے مرنا سوجھے، نہ جینا۔ تمھاری حالت دیکھ کر مجھے بہت ترس آتا ہے۔ تمھارے مالک تو کروڑوں کما رہے ہیں۔"

"کماتے ہیں سر! بہت کماتے ہیں مگر ہم ہی بے غیرت ہیں۔ کلرکوں کو پونے دو سو دیتے ہیں۔ کوئی ایسا ہوگا جس کی تنخواہ چار سو ہو گی، بہت خسیس لوگ ہیں یہ۔ اِن میں سے ایک تو بڑا...... عہدیدار ہے، وہی ملک اشرف۔ اوّل درجے کا گھٹیا آدمی ہے وہ۔ پیسہ گر جائے تو منہ سے اٹھا لیتا ہے۔"

"یہ لو شبّر! یہ پانچ سو روپے رکھ لو۔ تمھارے کام آئیں گے۔ بھلے آدمی نظر آتے ہو تم مجھے، یہ رکھ لو۔"

"پانچ سو! ارے سر کیوں مذاق کرتے ہیں؟ میں نے آپ کی کونسی خدمت کی ہے بھلا۔ پتا نہیں وہ محسن صاحب کہاں نکل گئے۔ دفتر میں آپ کے ساتھ ہی آئے تھے۔ پھر پتا نہیں کدھر نکل گئے؟"

"کسی کام سے چلے گئے ہوں گے، میں تو اسی وقت واپس آ گیا تھا، اب پھر یہاں آیا ہوں، ایک کام تھا مجھے۔ تم کب چھٹی کرتے ہو؟"

"دفتر تو تین بجے تک ہے۔ مجھے بھی خیر بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہاں رات کو کون ہوتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ بڑی رونق ہے یہاں۔ اور پھر دفتر میں کوئی خاص چیز تو ہوتی نہیں۔ فائلیں ہی فائلیں ہوتی ہیں اور بس۔ کیوں کوئی خاص کام تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا میں۔ لو چائے پیو۔"

اس دوران بیرے نے چائے لا کر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ شبّر نے نوٹ جیب میں ڈال لیے، بولا۔ "سر میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ سچی کہوں تو یہ پہلا موقع ہے، کہ میں نے اتنے سارے نوٹ اکٹھے ہاتھ میں لیے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھیں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ جب تک گزارا کرو۔ کبھی ضرورت پڑے تو

میری کوٹھی آجانا۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے شادمان کا پتا دے دیا۔ حالانکہ اس سے میرا تعلق کوئی نہیں تھا۔

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں سر! میں حاضر ہوں۔ آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے سر!“

”بتائیں گے بھئی بتائیں گے۔ میرا خیال ہے ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔ آؤ اٹھو۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں چلتے ہیں۔“ چائے ہم پی چکے تھے اور کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ میں اُسے ساتھ لے کر کیری ہوم میں جا گھسا۔ اس میں جگہ تو زیادہ نہیں تھی مگر کھانا وہ بہت اچھا پکاتے تھے۔ اور شبّر حیران تھا کہ میں اس پر اس قدر مہربان کیسے ہو رہا ہوں۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر میرا چہرہ غور سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت ہی ٹوٹا پھوٹا اندر سے پھوڑا آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ترس آتا تھا۔ شکل صورت کا بھی اچھا تھا اور گفتگو تو اس کی بہت نستعلیق سی تھی۔

جب میں ڈھیر سارا کھانا اس کے سامنے رکھوا چکا تو اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں، بولا ”یہ۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہمارے ہی لیے ہے سر! ہم کھالیں گے اتنا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔“

”ہاں بھئی، کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج تم یہاں سے کھانا گھر بھی لے جاؤ۔ بھابی بھی کیا یاد کریں گی۔ انہیں بھی یہ سب کچھ ملنا چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ نہیں؟“

”یہ ہو تو سکتا ہے مگر میرے پاس برتن کوئی نہیں ہے۔“

”برتن کی کیا ضرورت ہے، یہ ڈبوں میں بند ہو سکتا ہے۔ کھاؤ اور پروا مت کرو۔ آج میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ کچھ ہی دیر بعد اسے یقین آنے لگا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔

”یہ بتاؤ کہ دفتر کی چابیاں کس کے پاس ہوتی ہیں؟“

”دفتر کی چابیوں کا ایک گچھا تو اکاؤنٹنٹ صاحب کے پاس ہے اور دوسرا میرے پاس۔ مجھے صبح سویرے آکر دفتر کھولنا پڑتا ہے نا سر!“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دراصل ادھر محسن صاحب کے کمرے میں، میں اپنی ایک چیز بھول آیا ہوں۔ ایک فائل ہے جو کسی کی نظر میں نہیں آنی چاہیے۔ دراصل میں وہ وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں اور یہ کام کوئی چار بجے کے قریب ہی ہو سکتا ہے۔ جب دفتر بند ہو جائے تب۔“

”کوئی خاص بات ہے اس فائل میں سر؟“

”ہاں۔ وہ میرے کاروبار سے متعلق ہے اور محسن صاحب کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے ٹھیکے میں کیا نرخ لکھے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ دراصل ہم ایک بہت بڑی عمارت کے لیے ٹینڈر دے رہے ہیں اور میں اپنا راز اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ وہ ٹھیکہ اسے مل جائے گا۔“

”میرا خیال ہے، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں، یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

”ہم چار بجے وہاں چلیں گے۔“ اُسے راضی ہوتا دیکھ کر میں نے کہا۔

”اب کیوں نہیں؟ دفتر کھلا ہے تو کیا ہے۔ بلکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔ محسن صاحب کا کمرہ میں نے بند کیا تھا۔“

”نہیں۔ چار بجے بہتر ہے۔ محسن صاحب اپنی گاڑی تو ساتھ لے گئے ہوں گے؟“ میں نے جان بوجھ کر کہا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی گاڑی گیراج میں کھڑی ہے۔

”گاڑی تو ادھر ہی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ شاید وہ جلدی واپس آجائیں۔“

”ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔ خیر دیکھ لیں گے۔ اب تم دفتر جاؤ۔ میں یہاں ہی بیٹھتا ہوں۔“

وہ چند لمحے اور وہاں بیٹھا رہا، پھر بڑی رازداری کے لہجے میں بولا ”سر! کوئی اور بات تو نہیں ہے میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔ کوئی جگہ تو نہیں چاہیے آپ کو؟“

”نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے شبّر! میں ایسا آدمی نہیں ہوں پیارے! مجھے صرف وہ فائل چاہیے اور بس۔“

”ٹھیک ہے سر! میں چار بجے آپ کے پاس آجاؤں گا۔ آپ ادھر ہی بیٹھیں۔“

”میں ادھر چار نمبر کیبن میں بیٹھا رہوں گا۔“

”بس ٹھیک ہے، ویسے وہاں لوگ لیڈیز کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔“

”پروا نہیں۔ میں اکیلا ہی ٹھیک ہوں۔“

وہ اسی وقت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اور میں ہال سے نکل کر کیبنوں کی طرف چل دیا۔ میں نے چار نمبر کیبن میں داخل ہونا چاہا تو ایک بیرے نے مجھے روک لیا، بولا ”صاب جی! یہ صرف فیملی والوں کے لیے ہے۔“

”میری فیملی آرہی ہے بھئی! میں انتظار کروں گا۔ تم تھوڑی کافی اندر بھیج دو۔“

”بہت بہتر سر! میں ویسے ہی کہہ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اس وقت سوا دو بج چکے تھے۔ میں کافی اور سگریٹ سے دل بہلاتا رہا۔ کیبن آرام دہ تھا۔ اس میں میز کے دونوں طرف چار کرسیاں رکھی تھیں اور اس کا دروازہ جب آدمی بند کر لیتا تو یکسوئی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ بیس منٹ گزر گئے مگر کوئی بھی نہیں آیا۔ آتا بھی کسے تھا وہاں۔ میں برباد ترین آدمی، ہر قدم۔ میں۔۔۔ میں تو کسی سے کوئی تعلق پیدا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ناممکن تھا۔ کوئی مجھ پر اعتبار بھی کر لیتا تو میں اس کے ساتھ دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اور عورتوں کی صحبت تو مجھے کبھی بھی راس نہیں آئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر۔۔۔ پھر میں سیدھا سنارا کی طرف نہ چل دیتا کہ اس سے زیادہ تو مجھے کوئی بھی ہستی عزیز نہیں تھی۔ مگر بار بار کوئی غیر مرئی قوت میرے قدم پکڑ لیتی تھی۔ اور میں سر تھام کر وہیں بیٹھ رہتا تھا ورنہ وہ کوئی زیادہ دور تو نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا تو بیرے نے بڑی آہستگی سے کیبن کا دروازہ کھولا اور مجھے یوں تنہا بیٹھے دیکھ کر اور میری آنکھوں میں بھرے خواب دیکھ کر وہ چہرہ شناس بولا ”آپ کی فیملی نہیں آئی؟“

”نہیں یار! میں تو ابھی تک اُن کی راہ دیکھ رہا ہوں۔“

”کافی اور لا دوں؟“

”ہاں ضرور لا دو۔ کچھ اور نہیں تو کافی ہی سہی۔“

”ابھی لا دیتا ہوں اور فیملی بھی آپ کی ابھی آجائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ بڑی خبیث قسم کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے واپس چلا گیا۔ پھر واپس آیا ”میں فیملی بھیج دوں؟“

”تو باز نہیں آئے گا۔ مجھے کسی فیملی کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میرے لیے کچھ اور کافی بھیج دے۔ تیری مہربانی ہوگی۔“

ٹھیک چار بجے شبّر میرے پاس آگیا۔ سلام دعا کے بعد وہ بولا ”چلیں سر! میرا خیال ہے چار بج گئے ہیں مگر محسن صاحب کی گاڑی ابھی تک گیراج میں کھڑی ہے۔“

”ہو سکتا ہے، وہ کسی کام سے دور نکل گئے ہوں۔ چلو اب دروازے تو تم نے بند کر دیے ہوں گے؟“

”جی ہاں۔ مگر میں انہیں کھول لوں گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں انہیں اکثر کھول لیتا ہوں۔ صفائی تو مجھے ہی کروانی ہوتی ہے نا۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ آؤ۔“ یہ کہہ کر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہم دفتر جا پہنچے۔ شام زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ شبّر نے بڑے اطمینان سے دروازہ کھولا اور مجھے گزار کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ وہ میرے ساتھ ہی محسن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اسے روک دینا چاہتا تھا مگر اس نے میری سنی ہی نہیں۔ سیدھا اندر چلا گیا۔۔۔۔ ایک فائل میز کے دائیں طرف رکھی تھی۔ وہ میرے لیے بالکل ہی بیکار تھی مگر پھر بھی میں نے اسے اٹھا لیا۔

”یہ رہی وہ فائل شبّر! میں اسے یہاں ہی بھول گیا تھا اور یہ ابھی تک ادھر ہی پڑی ہے۔ میرا خیال ہے محسن نے دیکھی نہیں ہوگی۔“

”چلیں اچھا ہے، یہ آپ کو مل تو گئی۔“

”یار! تو رک یہاں، میں ذرا پیشاب کر لوں۔ یہ فائل پکڑ۔“ میں نے وہ فائل اس کے ہاتھ میں دے کر غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ابھی تک مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ فائل پر ”ریڈ پیپر“ لگا تھا اور وہ یونہی ہاتھ لگانے سے کھل نہیں سکتی تھی۔ مگر اس کی توجہ فائل پر نہیں، میری طرف تھی۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو سامنے محسن بے ہوش پڑا تھا، اس حال میں کہ اس کے وجود سے فرش بھرا ہوا نظر آتا تھا۔

”اف۔ اوئے شبّر! ادھر آ ذرا۔۔۔۔ یہ کیا قصہ ہے بھئی!“ میں نے اُسے وہیں سے آواز دی اور خود میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ وہ لپکتا ہوا میرے پاس آگیا اور کھلے دروازے میں محسن کو دیکھ کر لرزنے لگا۔

”یہ۔۔۔۔ یہ تو ہمارے مالک ہیں سر! انہیں کیا ہو گیا ہے؟

یہ۔۔۔۔ یہ بے ہوش کیسے ہو گئے؟“

”مجھے کیا پتا۔ ادھر آ، نکال انہیں باہر۔ ذرا ہاتھ ڈال ان کے سر کے نیچے۔“ میں نے محسن کو ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ شبّر بھی میرے ساتھ لگا اور ہم نے اسے غسل خانے سے کھینچ کر باہر قالین پر ڈال دیا۔

”یار! یہ تو بڑی گڑبڑ کی بات ہے۔ انہیں کس نے بے ہوش کر دیا؟ ان کی نبض تو ابھی چل رہی ہے۔“

”ہاں۔ وہ تو میں بھی دیکھ چکا ہوں سر! ہو سکتا ہے ان کے کسی دشمن نے یہ کام کیا ہو۔“

”وہ تو ظاہر ہے۔ کوئی دوست تو یہ کام نہیں کر سکتا مگر ایسا نہ ہو، کہیں یہ الزام ہم پر ہی آجائے۔“

”پھر۔۔۔۔؟ کیا کریں سر؟ تھانے اطلاع نہ کر دیں؟“

”پاگل ہے تو۔ وہ تو سیدھا ہمیں ہی پکڑ لیں گے کہ آخر ہم اس وقت دفتر میں کیوں گھسے؟ کیا جواب ہو گا ہمارے پاس؟“

”پھر۔ پھر تو بہت مشکل ہے سر! کوئی حل ڈھونڈیں اس کا۔“

”دیکھ میرے دوست ہیں۔ میں انہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ ان کے پاس کار کی چابی تو ہوگی؟“

”جی ہاں ضرور ہوگی۔ گاڑی تو ابھی نیچے ہی کھڑی ہے۔“

”بس ٹھیک ہے، تو ٹھہر، میں دیکھتا ہوں۔ ہاں۔ یہ رہی چابی۔ اب تو ان کو اٹھا۔ ہم انہیں لے جا کر باہر گاڑی میں ڈال دیتے ہیں پھر میں انہیں گھر لے جا کر خود ان کا علاج کراؤں گا۔“

”ہاں۔ یہ بہتر رہے گا۔ اٹھائیں پھر۔“

”چل بھئی! یہ مصیبت بھی ہمیں ہی جھیلنی تھی۔۔۔۔“ میں نے

محسن کو کندھے پر ڈالا اور شبر کے ساتھ فوراً ہی بڑے دروازے پر جا پہنچا۔

”دیکھ تو انھیں سنبھال۔ میں گاڑی نکال کر ادھر لے آتا ہوں۔“ شبر نے محسن کو بانہوں میں لے کر دیوار کے ساتھ ڈال دیا۔ وہ کسی طرح ٹیک بھی نہیں لگا سکتا تھا بس لیٹتا ہی جاتا تھا جیسے وہ ابدی نیند سو چکا ہو۔ میں نے گیراج کھول کر گاڑی باہر نکالی اور پھر اتر کر گیراج بند کر کے تالا لگا دیا۔ تقریباً سارے ہی دفتر اس وقت تک بند ہو چکے تھے۔ ہمارے آس پاس کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو گیراج سے نکلتی کار پر توجہ دے سکے کہ کاریں تو گیراج سے نکلا ہی کرتی ہیں۔ میں نے جا کر گاڑی دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کر دی۔ اور اس کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد میں نے محسن کو شبر کی مدد سے کار میں ڈالا اور اس کو ساتھ لے کر میں اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

”تم بھی میرے ساتھ چلو شبر! آدمی کا دارو آدمی۔ کیا خیال ہے؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ مالک بچ جائیں، بس میرے لیے تو یہی بہت کافی ہے۔“

”تو پھر انھیں پیچھے بیٹھ کر سنبھالو اور ہو سکے تو ان کو اچھی طرح ڈھانپ لو۔ ان کو موسم سے بچانا بہت ضروری ہے۔ پتا نہیں کب سے بے ہوش ہیں یہ۔“

”جی بس آپ فکر نہ کریں، یہ کمبل میں ان پر ڈال دیتا ہوں۔“ اس نے گاڑی کے عقبی حصے سے ایک ہلکا سا کمبل اٹھا کر محسن کو اڑھا دیا۔ وہ کسی اپنی ہی ضرورت کے لیے کمبل کو کار میں ڈالے رکھتا تھا۔ اس وقت وہ ہمارے بہت کام آ رہا تھا۔ گاڑی کو اسی وقت میں عقبی گلی سے نکال کر مال روڈ کی طرف لے گیا اور پھر وہاں سے اسے میں نے میکلوڈ روڈ پر ڈال دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں خطرے کے مقام سے دور جا چکا تھا۔ مال روڈ پر چڑھنے کے بجائے میں مزنگ چوک کی طرف سے نکلا اور جیل روڈ پر سے ہوتا ہوا گلبرگ جا پہنچا۔ اب میری طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اندر اگر محسن بے ہوش پڑا تھا تو سامنے کی سیٹ پر بیٹھے میرا بھی اندر سے افراتفری کے مارے برا حال ہو رہا تھا مگر ابھی میرے حوصلے کی لو بہت بلند تھی۔ اور میں سوچ سکتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

”دیکھو شبر! تم یوں کرو کہ یہیں اتر جاؤ اور یہ لو ہزار روپے ہماری طرف سے ہماری بھابی کے لیے کوئی عمدہ سا تحفہ لے جانا۔“

”جی میں سمجھا نہیں۔“

”نہ سمجھنا زیادہ بہتر ہے شبر! یہ میرے دوست ہیں۔ میں خود ان کا علاج کروا لوں گا۔ تم جب کل دفتر جاؤ تو کسی سے یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ محسن صاحب کہاں ہیں ورنہ پولیس تمھیں بھی پکڑے گی، سمجھے! بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے میں بالکل چپ رہو۔ محسن صاحب دو چار دن بعد خود ہی دفتر آ جائیں گے۔“

”ویسے تو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی ان لوگوں نے کبھی کوئی ہمدردی نہیں کی ہے مگر... بہرحال میں آپ کی نیت نہیں سمجھ سکا ہوں۔“

”ہماری نیت پر زیادہ غور نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ لو یہ رکھ لو۔“ میں نے ایک ہزار کے نوٹ اس کو دیتے ہوئے کہا۔ کار میں نے سڑک سے اتار کر کچی جگہ پر کھڑی کر دی تھی ــ الٹے نمبر پر پھنستے ہوئے تھے جس کی وجہ سے محسن پر براہِ راست کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

”سر! یہ رقم تو آپ رہنے ہی دیں اور مجھے یہاں اتار دیں۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ... آپ انہیں اپنے کسی مقصد کے لیے اغوا کر لائے ہیں اور اب مجھے صرف ایک ڈیڑھ ہزار دے کر ٹالنا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوگا۔“ اس نے پہلی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر میں سؤر کا بال اگ آیا تھا۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ اس سے تو بہت پہلے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے تھا۔ ایسے نچلے آدمی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک آہنی عزم اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا جیسے وہ مجھے زیر کر رہا ہے۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ اب میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا میں اسے قتل کر دیتا۔ یا بے ہوشی کی نیند سلا دیتا۔

”تو پھر کیا مرضی ہے تمھاری؟ کچھ رقم ادا کر دوں تمھیں؟“

”اگر دینا ہی ہے تو مجھے پچاس ہزار روپیہ دے دیں ورنہ مجھے یہاں اتار دیں۔“

”تو پھر آگے آ جاؤ۔ میں تمھیں رقم گن دیتا ہوں۔ اتنے پیسے میرے پاس موجود ہیں، ادھر اندر سے ہی آ جاؤ۔“ میں نے ایک نوٹوں کا رقم کا بنڈل اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ وہ تیزی سے اگلی سیٹوں کے درمیان میں سے ٹانگیں پھیلا کر اگلی نشست پر آ بیٹھا۔ وہ ایک دم خوش ہو گیا تھا۔ رقم میرے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں، بولا ”اس کو جہاں چاہیں لے جائیں سر! مجھے کیا؟ آپ مجھے صرف پچاس ہزار روپیہ دے دیں اور بس میں کوئی بکواس نہیں کروں گا ــ اس نوکری پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔“

”تو پھر لو۔ یہ رقم گنو۔“ میں نے ہزار روپے کے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ یہ میں اسے پہلے ہی دے رہا تھا مگر اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا لیکن اب وہ ان نوٹوں کو بڑے شوق سے گننے لگا تھا۔ کچھ نوٹ میں نے اور نکال لیے اور جیسے ہی اس نے گردن

... نے اس پر پنجہ ڈال دیا۔ آدمی کی مزاحمت ہوتی ہی کتنی ... گلی ذرا گہری دبی تو اس نے سر ڈال دیا۔ اسے میں نے فوراً ... کے پیچھے ڈالا اور گاڑی لے کر میں سیدھا اپنی کوٹھی جا پہنچا۔ ... کر حیدر فوراً باہر نکل آیا۔

کار کا رخ میں نے گیراج کی طرف پھیر دیا۔ حیدر کی چھٹی ... بہت زیادہ ہی تیز تھی میرے قریب پہنچ کر کھڑکی میں سے ... جھکتے ہوئے بولا ”خیر تو ہے سردار صاحب! یہ کچھ سواریاں ... نظر آتی ہیں مجھے آپ کے ساتھ۔“

”ہاں ان کو تہ خانے میں ڈال دینا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ ... کے اندر ہی گاڑی کھلے گی۔“ وہ اسی وقت کھولنے لگا تھا۔ ... ہم نے کار اندر پہنچائی تو اس نے دونوں دروازے کھول دیے۔ ... اس نے محسن کو باہر نکالا پھر شبر کو۔

”یہ کون لوگ ہیں سردار صاحب؟“

”یہ بہت اونچے لوگ ہیں بھئی! اور بڑے کام کے بھی۔ یہ بہت ... یہاں رہیں گے ان کا کھانا دانا تمھارے ذمے ہوگا۔“

”اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ ایسا دانا ڈالوں گا انھیں کہ یہ ... ناہی بھول جائیں گے۔“

ان دونوں کو ہم نے تہ خانے میں اتار کر قالین پر ڈال دیا۔ تہ خانہ اب بھی بہت صاف ستھرا تھا۔ حیدر اس کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔

”دیکھ لیں جناب! تہ خانہ بالکل صاف ستھرا ہے۔ میں دو تین ... روز بعد ادھر بھی آ جاتا ہوں۔“

”اچھا کرتے ہو، کیا پتا کون مہمان یہاں آ رہے ــ ان ... کو رات دس بجے دیکھ لینا۔ آؤ ذرا ان کے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ ... دو اور بس۔“

”ابھی لیں جی! ایسے باندھوں گا کہ ہل نہیں سکیں گے، ویسے ... یہ ہیں کون؟“

”چھوڑ یار! تو ان کا پتا لے کر کیا کرے گا۔ یہی کافی ہے کہ ... یہ ہمارے مہمان ہیں۔“

”پھر بھی جی! ان کے گھر والوں کو تو اطلاع دے دینی چاہیے ورنہ وہ پولیس کے چکر میں پڑے رہیں گے۔ لگتے تو مجھے یہ بہت ... ہی شریف لوگ ہیں۔“

”بہت شریف! کیا بات ہے تمھارے اندازے کی۔“ اس نے ... دونوں کی مشکیں اچھی طرح کس کر باندھ دیں اور پھر ہم تہ خانہ ... بند کر کے باہر نکل آئے۔

”وہ... وہ بی بی ابھی یہاں ہی ہے؟“

”بالکل یہاں ہے۔ وہ تو اپنی کشتیاں جلا کر آئی ہے کہتی ہے اب مجھے رہنا ہی یہاں ہے۔“

”یار! اس سے میں بہت تنگ آیا ہوں حیدر! کچھ اس کا بندوبست کر۔ کیا خیال ہے، میں تیرا اس کے ساتھ نکاح نہ پڑھوا دوں؟“

”او جی! مجھے تو معاف ہی رکھیں جناب! کیوں آپ مجھے تباہ کروانا چاہتے ہیں؟ یہ نوکری بھی میں پھر نہ کر سکوں گا۔“

”تیری نوکری بھی پکی رہے گی میاں! بڑی مالدار عورت ہے اور سخی بھی ہے۔ قسم اللہ کی تیرے تو دن پھر جائیں گے حیدر! بہت اچھا موقع ہے پیارے! میں اسے منا لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ تیار بھی ہو جائے گی۔ تیری وہ تعریف بھی کر رہی تھی۔“

حیدر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ بولا ”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں سردار صاحب! آپ بات کریں اس سے۔ مجھے سولی پہ چڑھانا ہی چاہتے ہیں تو مجھے منظور ہے۔ مگر آپ یہ سوچ لیں کہ......“

”بک نہیں اوئے! تیری پرواز سے کوئی مقام زیادہ اونچا نہیں ہے بہرحال، دیکھ تو آج ذرا پہل تو کر۔“

”کہیں مروا نہ دیں مجھے۔ میں تو بھاگ بھی نہیں سکتا اس ٹانگ کی وجہ سے۔“

”بھاگنا تو عشق میں بالکل منع ہے پیارے! وہ کیا کہتے ہیں کہ جب عشق کیا تو ڈرنا کیا۔ سنا ہے نا وہ گانا تم نے! آج ایک عشقیہ تو پیش کر دیا ہے۔“

”جی! وہ... وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے آج ہی نام سنا ہے اس کا۔“

”یہ بھی ہونا ہے۔ بہرحال آج تم اس سے بات تو کرو۔“

”کیا آپ... میرا مطلب ہے واقعی سیریس ہیں؟“

”تو اور کیا میں بکواس کر رہا ہوں ــ ہم تمھارا گھر آباد دیکھنا چاہتے ہیں پیارے! تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔“

”ٹھیک ہے جی! میں دیکھوں گا کہ وہ کیا کہتی ہے۔“

حیدر نے میری بات پکی طرح پلے باندھ لی، مجھے یقین ہو گیا، وہ آج کچھ نہ کچھ سلسلہ جنبانی ضرور کرے گا۔

ہم جب عمارت میں داخل ہوئے تو سروری خانم اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھی بچے کو فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بچے کو بانہوں میں لے کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ نے بڑی راہ دکھائی، کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”کچھ کام تھا مجھے۔ آپ کہیں، دن اچھا گزرا؟“

”جی بس گزر ہی گیا۔ ابھی تو میں یہاں بالکل محفوظ ہوں مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں...... آہو صاحب کو آپ کے گھر کا فون نمبر نہ مل جائے۔ وہ میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے اور وہ

ڈائری وہیں رہ گئی ہے۔“

”دیکھیں جی ...... ! میں آپ سے پھر کہوں گا کہ ابھی آپ واپس چلی جائیں۔ جس طرح بھی ہو سکے آہو کو رام کریں۔ میرے اپنے جھمیلے اتنے زیادہ ہیں کہ میں کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکتا۔“

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ وہ مجھ پر دو بار حملہ کر چکا ہے، مجھے مار دینا چاہتا ہے۔“

”پھر تو میں کہوں گا کہ آپ یہاں سے سیدھی ڈھلوں صاحب کے پاس چلی جائیں۔ میں جیسے ہی فارغ ہوا، آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کی صلح کرا دیں۔“

”وہ ... وہ دراصل ... میں کیا کہوں، اس سے میری صلح نہیں ہو سکتی۔“

”اچھا! تو یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ ڈھلوں صاحب کے پاس چلی جائیں؟“

”ہاں، یہ میں کر سکتی ہوں مگر میں اُن سے کیا کہوں گی؟ میرا تو گھر تباہ ہو گیا ہے۔“

”ایسا گھر جس میں آہو صاحب موجود ہیں۔“

”ہاں۔ اس کو تو میں اب اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھتی ہوں۔ آپ ... آپ ... پلیز! آپ اس مسند آرا کو تو بچائیں۔“

”وہ کس طرح؟ میں کیا کر سکتا ہوں بھلا۔ آپ نے ہی بتایا ہے کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا علاج ہو سکتا ہے اور اُسے آہو کے کرتوت بتلائے جا سکتے ہیں۔“

”خیر، میں دیکھ لوں گا۔ اس سے بھی میں مل لوں گا مگر بہتر ہے کہ آپ یہاں نہ رہیں۔ پتا نہیں یہاں کیا حالات ہو جائیں۔ کل میں بہر حال یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اچھا ٹھہریں، میں آہو کو فون کرتا ہوں، اسے میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتا ہے۔“

”نہیں نہیں۔ پلیز ... آپ اُسے فون نہ کریں، وہ بدک جائے گا۔ اس جانور کو مت چھیڑیں۔“

”نہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں اُسے فون کر لیتا ہوں۔“ سروری کا رنگ ایک دم بدلنے لگا۔ میرے ذہن میں جو شک کا تیر اُلجھا ہوا تھا اور گہرا ہونے لگا۔ وہ ... وہ مجھ سے سچ نہیں بول رہی تھی اور اب اُس کی تصدیق کا وقت آ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کہیں۔ تو پھر یہ طے رہا کہ آپ ابھی ڈھلوں صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ میں آپ کو وہاں لے چلوں گا۔ مجھے بھی اُن سے ایک کام ہے۔“

”ہاں۔ اس کے لیے میں تیار ہوں۔ آپ فارغ ہو جائیں تو ہم اکٹھے ہی وہاں چلے جائیں گے۔“

”بہتر ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے کوئی مسٹر ولسن ہیں، ان کے پاس جا رہا ہوں۔ حیدر اتنی دیر آپ کے پاس رہے گا۔ بیبے کوئی چائے شائے تیار کر دو بھئی!“ حیدر ابھی تک وہاں کھڑا ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، انھیں وہیں چھوڑ کر ایک بار پھر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ چھ بجنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا کہ مجھے ایک رکشا نظر آ گیا، اور میں اس میں بیٹھ کر ولسن کی طرف چل دیا۔ کار میں نے کوٹھی ہی میں رہنے دی کہ پتا نہیں وہاں حالات کب کیا ہو جاتے۔

ولسن کا گھر گلبرگ کے بڑے ہی بارونق علاقے میں تھا مگر چونکہ وہ عقبی گلیوں میں رہتا تھا اس لیے وہاں ماحول خاموش سا تھا۔ اس سارے علاقے کی خوبی یہ تھی کہ آدمی بہت چند تھے۔ کوٹھیاں بڑی بڑی تھیں۔ بسنے والوں کو وہاں جو سناٹا پسند رہتا تھا اس کا اثر دن بھر قائم رہتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی موٹر کا ہارن اس خاموشی کو توڑ جاتا تھا۔ ورنہ ہمہ وقت وہاں چپ کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ لوگوں کے کتے بھی بہت سمجھ دار تھے، گیٹ کے اندر رہتے تھے۔ اور بس کبھی کبھار ایک بھاؤں بھک کر کے چپ ہو جاتے تھے۔ جیسے وہ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہوں۔

جب میں ولسن کے دروازے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس بادشاہ نے ایک بہت ہی تنومند اور بے جین کتا پال رکھا تھا۔ گیٹ کے اندر ڈیرا جما رکھا تھا اور وہ سلاخوں میں سے منہ نکال کر جب بھونکتا تھا تو اندر باہر ایک بھونچال سا آ جاتا تھا۔ وہی اس گیٹ کا پہرے دار تھا۔ مجھے گھنٹی بجانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس وقت شام ہو گئی تھی۔ مگر گیٹ منور تھا۔ اس کے دونوں بلب روشن تھے اور اندر لان میں بھی روشنی ہو رہی تھی جو بہت آگے پورچ تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ کوٹھی بڑے قرینے سے بنائی گئی تھی۔ اگرچہ لان چھوٹا سا تھا مگر گیٹ کے اوپر سے دیکھنے پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ کتے کی بھاؤں بھاؤں پر ایک کالا بھجنگ آدمی باہر نکلا۔ میرا خیال ہے اس کے آبا و اجداد افریقہ سے آئے ہوں گے ——— ورنہ اس کا حلیہ کچھ تو تبدیل ہو جاتا۔ اس نے آتے ہی کتے کو پچکار کر پیچھے ہٹایا اور اس کی زنجیر کسی کیل سے باندھ کر گیٹ پر آ پہنچا۔ پھر مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یور نیم پلیز؟“

”یار! تو میری زبان میں بات نہیں کر سکتا؟ مجھے انگریزی نہیں آتی ہے۔“

”نو انگلش، نو فرنیچ؟“

”نو۔ مسٹر ولسن گھر پر ہیں؟“

”ویس، ولسن ناٹ اِن دی ہاؤس۔ یور نیم پلیز؟“

”سردار کریم نواز۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ میرا خیال ہے تم ساری بات سمجھ رہے ہو مگر جان بوجھ کر میری زبان میں بات نہیں کرتے ہو؟“ میں نے گیٹ کے قریب ہو کر سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے دو ہی منٹ میں زچ کر دیا تھا۔ خواہ مخواہ کسی انگریز کے بھانجے کا بھتیجا بنا ہوا تھا۔

وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر چونکا اور مسکراتے ہوئے خالص پنجابی میں بولا۔ ”میں مسز ولسن کو اطلاع دیتا ہوں۔ آپ اِدھر ہی ٹھہریں۔“ اب وہ دانت نکوسنے لگا تھا۔ نجانے سے ...

”اب ہوئی نا بات۔ تم ایسے ہی لارڈ ہیسٹنگز بنے ہوئے تھے۔ جاؤ میرا نام بتاؤ مسز ولسن کو۔“ وہ اسی وقت پلٹ گیا مگر ابھی وہ آدھے راستے پر ہی پہنچا تھا کہ ایک اونچے لمبے قد کی گوری چٹی عورت اس کے سامنے آ گئی اور اس سے بات کر کے وہ فوراً ہی گیٹ کی طرف بڑھ آئی۔

”ہیلو۔ سردار کریم نواز؟“

”جی آپ کا خادم۔ آپ کے اس نوکر نے بڑا وقت ضائع کر دیا۔ کہتا تھا مجھے انگریزی کے سوا کوئی بات سمجھ نہیں آتی مگر مادام! وہ ٹھیٹھ پنجابی بھی سمجھ لیتا ہے ———“ میں اس کی صورت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ گیٹ کے اوپر سے مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں وہاں اپنا معائنہ کرانے آیا ہوں۔ بالآخر اس نے دروازہ کھول دیا۔

”آیئے تشریف رکھیں۔ ولسن ذرا دیر کے لیے باہر گئے ہیں۔ آپ کے لیے کہہ گئے تھے۔ میرا خیال ہے آپ اُن کا انتظار کر سکتے ہیں۔“

”جی ہاں، کیوں نہیں۔ میں تو انہی سے ملنے آیا ہوں۔ مگر زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کو بھی اس بہانے دیکھنے کا موقع مل گیا ہے۔ آواز تو آپ کی فون پر سن چکا تھا۔ آپ کی زباں دانی نے مجھے حیران کر دیا ہے۔“

”اوہ نو ... اُردو اور پنجابی تو بہت خوبصورت زبانیں ہیں سردار صاحب! اور مجھے ان سے محبت ہے۔“

”واقعی! بڑی حیرت کی بات ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہماری زبان کو اتنا اچھا سمجھتی ہیں۔“ ہم مجھے لان کے قریب سے گزار کر کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ اس کا ڈرائنگ روم نفاست کا مرقع تھا۔ ہر شے بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ دیواروں پر بہت خوبصورت مناظر کی تصویریں لگی تھیں۔ جو اس کے ذوق کی آئینہ دار تھیں۔

"بیٹھیں! ڈارک! ان کے لیے چائے بنا دُ۔" اس نے دروازے میں کھڑے اُس نوکر سے کہا جو ہماری گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ "یس میڈم!" کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔

وہ میرے سامنے ہی ایک سُبک سی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی، بولی "مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا سردار صاحب! بلکہ آپ کو فون کرنے کے بعد میں آپ کی زیادہ منتظر تھی۔ دراصل اچھے لوگ ہر شے میں کوئی نہ کوئی خوبی دیکھ لیتے ہیں۔ سگریٹ پیتے ہیں آپ؟"

"جی۔۔۔ میں پیتا تو ضرور ہوں مگر آپ۔۔۔ آپ شاید پسند نہ کرتی ہوں۔"

"نہیں، میرا خیال نہ کریں۔ بلکہ مجھے سگریٹ پینے والے لوگ اچھے لگتے ہیں، پئیں۔" یہ کہہ کر اُس نے میز کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔

"آپ کی مہربانی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ اتنی خوش خلاق ہیں ویسے آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ مسٹر ولسن مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے آپ کے بارے میں انھیں بتا دیا تھا مگر انہیں کوئی کام پڑ گیا۔ یہی کوئی تین بجے وہ باہر چلے گئے۔ اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔" اس کی آنکھیں بلّی کی آنکھوں ایسی تھیں۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔ صحت بھی اُس کی بہت عمدہ تھی اور وہ بڑے اعتماد سے بات کرتی تھی۔ اُس کی آواز میں جو موسیقی جھلکتی تھی، اس کے بارے میں اسے میں پہلے ہی بتا چکا تھا اور اس پر وہ میری ممنون بھی تھی مگر اُس کی یہ بات سن کر مجھے افسوس ہوا۔ وہ مجھے صحیح صورتِ حال بتانے سے گریزاں تھی۔ اور شاید مسٹر ولسن بھی عمداً باہر نکل گئے تھے میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ مسز ولسن فوراً ہی اس کی طرف لپکی۔

فون دُوسرے کمرے میں تھا۔ میں کوشش کے باوجود اُس کی گفتگو نہ سُن سکا۔ جب وہ واپس آئی تو بولی "مجھے افسوس ہے سردار صاحب! مسٹر ولسن آج آپ سے نہیں مل سکیں گے بلکہ وہ تین دن تک گھر نہیں آ سکیں گے کسی کام سے وہ شہر سے باہر چلے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ وہ شہر میں نہیں ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ فون انھوں نے گوجرانوالہ سے کیا تھا۔"

"وہاں انھیں کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"بس ایسا ہی ہے اپنے کاروبار کے سلسلے میں پھرتے رہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ وہ آج رات اسلام آباد جا رہے ہیں۔ اور تین دن بعد واپس آئیں گے۔"

"مجھے حیرت ہے خاتون! حالاں کہ میں نے انھیں اپائنٹ بھی کر دیا تھا۔ کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے؟"

"نہیں۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا؟ وہ تو آپ سے ملنے کے لیے خود آپ کے گھر گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انشاء اللہ تین دن بعد پھر آؤں گا۔ وقت میں نہیں بتا سکوں گا، جیسے ہی موقع ملا، میں آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے اُٹھ گیا۔

"آپ چائے تو پیتے جائیں۔"

"جی نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے ولسن ہوں گے تو چائے بھی پی لیں گے۔"

میں اس کے ڈرائنگ رُوم سے باہر نکل آیا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر مرئی سی حرکت میرے ساتھ فرد ہو رہی ہے۔ یونہی میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی مگر اُس کا ادراک نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر نکل آئی "مجھے افسوس ہے آپ ولسن سے نہیں مل سکے۔ پلیز آپ اس کا خیال نہ کریں۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر عین اُسی وقت مجھے کسی سمت سے تیز روشنی سی چہرے پر پڑتی نظر آئی۔ یُوں لگا جیسے کوئی میرا فوٹو لے رہا ہے۔ وہ شعلہ بس ایک لمحے کے لیے چمکا اور بجھ گیا۔ میرے قدم وہیں رُک گئے، وہ شعلہ پھر نہیں اُبھرا۔ میرے سامنے برآمدے کے بالکل آخر میں ایک کمرہ بنا تھا جس کا شیشے کا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ میں سمجھا شعلہ شاید وہاں سے چمکا ہے مگر دروازہ بند تھا اور اس کے سامنے پردے تنے تھے۔

"یہ۔۔۔ مسز ولسن! یہ کون آدمی ہے جو میری تصویریں لے رہا ہے؟"

"ارے نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے آپ سے کس نے کہا؟"

"کہنے کی کیا بات ہے، یہ کیمرے کا بلب چمکا تھا ابھی۔"

"نہیں سردار صاحب! بجلی چمکی ہو گی۔ دیکھیں نا آسمان پر بادل چھا رہے ہیں۔" اس نے برآمدے سے باہر نکل کر کہا۔ میں نہیں بھیلا دیں جیسے وہ پھوار کو محسوس کر رہی ہو۔

"یہ دیکھیں ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی ہے۔ دیکھیں تو۔"

میں برآمدے میں نکلا تو واقعی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ میں کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مسز ولسن بڑی معصوم سی بنی میرے سامنے کھڑی تھی۔

"اچھا اب اجازت دیں۔" یہ کہہ کر میں ہلکی ہلکی بارش میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا۔ اور ان کے باہر کا دروازہ بند کر لیا۔ میرا ذہن مسلسل اس چمکارے میں اُلجھا ہوا تھا۔ بارش تو بھی اسی وقت ہی برسنا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ میرا وہم ہو۔ ان لوگوں کو میری تصویر سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ عین ممکن ہے انھوں نے کمرے کے اندر سے کسی خفیہ کیمرے سے میری تصویریں اُتار لی ہوں مگر میں اس سلسلے میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اس ولسن نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک رکشا مل گیا۔ اور میں اس میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی جا پہنچا۔ غصہ مجھے بہت آ رہا تھا کہ میرا پھیرا بالکل ہی بیکار گیا۔ میں ولسن کو ذہن سے کسی طرح بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کا وجود میرے لیے کسی نئے خطرے کا باعث بن رہا تھا۔ اس سے مجھے اُس رات نمٹ لینا چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ گھر میں موجود تھا اور جان بوجھ کر میرے سامنے نہیں آیا۔ اس شام اُس نے میری تصویروں پر ہی اکتفا کیا تھا۔

خیر دیکھا جائے گا۔ وہ کوئی ہوّا تو نہیں تھا آخر آدمی ہی تھا۔ اس سے نمٹ لینا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ حیدر اُس وقت باورچی خانے میں تھا اور سروری خانم کمرے میں بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میں سیدھا اس کے پاس جا پہنچا۔ بارش نے مجھے زیادہ نہیں بھگویا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ پتا نہیں وہ مجھے سامنے دیکھ کر اتنی مسرت کیوں محسوس کرتی تھی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔

"چلیں سروری خانم! اب تیار ہو جائیں، میں آپ کو اُٹھوال صاحب کے ہاں چھوڑ آتا ہوں۔"

"پہلے آپ کھانا تو کھا لیں۔ باہر اچھی خاصی بارش ہو رہی ہے ایسے میں سفر کیا مزہ دے گا۔ ہم صبح چلے جائیں گے۔"

"نہیں خانم! اسی وقت بہتر ہے۔ ابھی کھانا کھا کر چل دیں گے۔" میں نے بڑی ہی سرد مہری سے کہا، وہ پریشان سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ آپ کے لیے میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور آپ کو پروا ہی نہیں ہے میری۔"

"مجھے افسوس ہے سروری خانم! میں۔۔۔ میں اس گورکھ دھندے میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ براہِ کرم آپ واپس چلی جائیں۔ میں پچھلی تمام باتوں پر لعنت بھیجتا ہوں میرے لیے اس بارش کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ بہرحال تیار ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کے چہرے کے سارے چراغ بجھنے لگے۔ وہ میرے پیچھے آئی اور میرا راستہ روک کر بولی "آپ کو میری کوئی پروا نہیں ہے"

"نہیں بی بی! میرا آپ سے کوئی واسطہ نہیں ہے بہتر ہے اپنا آپ گھر کے پاس واپس چلی جائیں۔"

"ٹھیک ہے، میں چلی جاتی ہوں، دیں چلی جاتی ہوں۔ مگر۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ آہو نے آپ سے کوئی بے ہودگی کی تو میں ذمے دار نہ ہوں گی۔ وہ آپ کے خلاف لمبے چوڑے منصوبے بنائے بیٹھا ہے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے اُس کی۔ کہہ دیں اس سے، جو ہو سکے وہ کر لے۔ میں نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ میں اس کا گھر پھونک دُوں گا، اس کا کیا رعب دیتی ہیں آپ مجھے۔"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے تیزی سے اندر چلی گئی اور چند ہی لمحوں بعد وہ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر بچے کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"میں نے آپ جیسا بے مروّت آدمی کوئی نہیں دیکھا ہے۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے کنی کتراتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"اوئے حیدر! جا انھیں گھر چھوڑ آ۔ کوئی رکشا لے لینا۔" میں نے حیدر کو آواز دے کر اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جتنی جلدی وہاں سے نکل جاتی، اتنا ہی اچھا تھا۔ حیدر لپکتا ہوا باہر چلا گیا۔ اور لان میں سے گزر کر سروری کا بھاری بھرکم بیگ خود اٹھا کر آگے آگے چلنے لگا۔

وہ سڑک پر پہنچے تو میں نے آہو کو فون کر دیا۔

وہ اس وقت گھر پر ہی تھا۔ بڑی ترنگ بھری آواز میں بولا۔

"ہیلو! کون ہے؟"

"میں غلام جیلانی ہوں آہو صاحب! کیسے ہیں آپ؟"

"اوئے! آپ کو میں کیسے یاد آ گیا بھائی جی! خیر تو ہے، کہاں ہیں آپ اس وقت؟"

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"ہوں۔ آپ کی بیگم کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ تو اپنی کسی عزیز کے پاس گئی ہے فیصل آباد۔ کبری بھی اس کے ساتھ ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اچھا! حیرت ہے۔ دراصل میں نے انھیں فیصل آباد میں ہی دیکھا تھا۔ کیا وہ آپ سے ناراض ہو کر گئی ہیں؟"

"نہیں تو۔ یہ کس نے کہا آپ سے؟"

"میں نے انھیں روک کر پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں، آپ نے انھیں زہر دینے کی کوشش کی مگر وہ بچ گئیں۔ پھر آپ نے اسی روز انھیں کمرے میں بند کر کے آگ لگانے کی کوشش کی۔"

"بکواس، بالکل بکواس۔ یہ بالکل غلط ہے، وہ سروری ہی تھی؟"

"ہاں ہاں، میں انھیں کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گئی۔ اس کے ذہن نے خوامخواہ ہی ایسی باتیں سوچ لی ہیں ورنہ یہاں سے تو وہ ٹھیک ٹھاک گئی تھی اور کبری بھی اس کے ساتھ تھا۔"

"اور کہیں، کیا حال ہیں آپ کے؟"

"میں ٹھیک ہوں بھائی! آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بہت بڑا راز ہے میرے پاس، اور وہ بھی بڑے صاحب کے بارے میں ہے۔"

"اچھا! تو پھر آپ میرے گھر آ جائیں۔ لعنت بھیجیں پرانی باتوں پر۔ آپ میرے محسن ہیں جیلانی صاحب!"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کی طرف آ رہا ہوں۔ یہ بات آج بڑے صاحب کو بتانی بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ ابھی میں پیچھے ہٹا ہی تھا کہ حیدر مجھے اندر آتا دکھائی دیا۔ "اوئے تو ان کے ساتھ نہیں گیا؟"

"نہیں صاب جی! وہ... بس مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

"کیا غلطی ہو گئی؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"وہ... اس نے مجھے تھپڑ مار دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ اوئے تو کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں کر بیٹھا؟"

"وہ جی مجھے موقع مل رہا تھا جی! بارش بھی ہو رہی تھی، آپ نے بھی مجھ سے کہہ رکھا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ کچھ بات بنی پھر کہ نہیں؟"

"نہیں جی۔ وہ بہت ذلیل عورت ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتلائے گا بھی کہ نہیں؟" میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"وہ جی... دراصل میں نے اس سے کہا کہ چل میں تجھے کسی ہوٹل میں چائے پلاتا ہوں بس وہ اس بات پر بھڑک اٹھی۔ میں نے اس کی منت بھی کی مگر وہ تو پاگل ہو گئی۔ تڑاخ تڑاخ اس نے میرے منہ پر تھپڑ دے مارے اور مجھ سے بیگ چھین کر آگے نکل گئی۔ کچھ ہی دور اسے رکشا مل گیا اور وہ اس میں بیٹھ کر آگے چلی گئی۔"

"ہت تیرے حیدر کی ایسی تیسی۔"

"بس جی غلطی ہو گئی۔ آپ نے بھی میرا خیال ہے، مجھے اچھا مشورہ نہیں دیا تھا۔"

"اوئے چاچا! مشورہ تو بہت اچھا تھا مگر تو ہے ہی نکما آدمی۔ چل خیر کوئی بات نہیں، تیرے لیے میں کوئی اور بندوبست کر دوں گا، جا اب کھانا لے آ۔"

وہ پریشان سا ہو کر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اس کی حالت پر مجھے بہت ترس آتا تھا۔ بے چارا ساری عمر ترستا رہا۔ کوئی اس کا مونس تھا نہ غمخوار۔ اس کوٹھی کی نوکری پر ہی قناعت

کرتا چلا گیا۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے باہر بھی کوئی زندگی ہے جو اس کے لیے نئی راہیں لیے ہوئے تھی۔ کیسا بدقسمت آدمی تھا وہ، اور اب جو اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کے منہ پر لگے جنھیں وہ دیر تک سہلاتا رہے گا۔ اور پھر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ میں نے سوچا، میں اس کے لیے کوئی بندوبست کر ہی دوں تو اچھا ہے۔ اس کی تنہائی ختم ہو تو اس کا دل بہل جائے گا۔ کوٹھی میں کام کر کے اسے زیادہ خوشی محسوس ہو گی۔

کھانا کھا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور گیراج سے محسن کی گاڑی نکال کر باہر نکل گیا۔ میں دراصل اسی رات اس گاڑی کا رنگ تبدیل کروا دینا چاہتا تھا۔ وہ میرے بہت کام آ سکتی تھی۔ اسے قندیل بھی لے جا سکتا تھا۔ نئی گاڑی بھی میں دے سکتا تھا مگر اس سے فائدہ ہوتا۔ وہ پھر مجھے کسی نہ کسی جگہ چھوڑ دینا پڑتی۔ میرا کیا، میں تو وہ لٹو ہو کر رہ گیا تھا جس کا پیندا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایک کیل پر گھومتا ہے۔ جیسے ہی وہ کیل غیر متوازن ہوتی ہے گر جاتا ہے۔ میں گاڑی کہاں خرید سکتا تھا۔

میں جب آہو کے گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، میرے لیے دروازہ کبری نے ہی کھولا۔

"اوئے کبری تو! یہ کیا چکر ہے استاد؟"

"اوستاد تو! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ گاڑی تو بڑی زبردست ہے تیرے پاس! کیسے آئے ہو؟"

"میں آہو سے ملنے آیا ہوں۔ پر مجھے یہ بتا کبری کہ... گھر پر ہی ہے نا؟"

"ہاں اوپر ہے۔"

"اور ان کی بیگم؟"

"وہ فیصل آباد گئی ہوئی تھیں۔ کوئی ایک گھنٹہ پہلے واپس آئی ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔"

"بکواس کرتا ہے تو! ابے وہ فیصل آباد کب گئی تھیں اور تو اتنے دن کہاں رہا؟ مجھے سب پتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔"

"ادھر آ جا استاد! اندر بیٹھ۔ میں آہو کو اطلاع دیتا ہوں۔" کبری نے مجھ سے آنکھ چراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی بجھ گیا تھا۔ جیسے ان کا راز فاش ہو گیا ہو۔ جب وہ مجھے کمرے میں بٹھا چکا تو میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بولا "استاد! خدا کے لیے چپ ہی رہنا۔ بی بی، پتا نہیں کہاں سے خوار ہو کر آئی ہیں۔ میں بھی تین دن سیر سپاٹے کرتا رہا اور آج بی بی کے ساتھ گھر آیا ہوں۔ مگر تجھے کیسے پتا چلا ہے؟"

"سنا ہے آہو نے سردری خانم کو مارنے کی کوشش کی

تھی، پہلے اسے زہر دیا پھر کمرے میں آگ لگا دی؟"

"نہیں یار! وہ تو اس کی بہت ہی عزت کرتا ہے، یہ بات تجھے کس نے بتائی ہے؟"

"میں نے یہی سنا ہے۔ صحیح بات بتا دے تو بہتر ہے۔"

"نہیں استاد! یہ بالکل غلط ہے کسی نے جھوٹ کہا ہے۔"

"ابے تمھاری تو اب شان ہی نرالی ہے، بڑے لمبے ہاتھ مار رہے ہو تم۔"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے پیارے! جا آہو کو اطلاع دے کہ جیلانی آیا ہے۔"

"تیرے پاس کوئی پیسے ہوں گے؟"

"پھر وہی ذلالت! اوئے تو ایسا منگتا کیوں ہو چکا ہے کبری؟"

"بس یار! دھندا ہی نہیں چلتا۔ بہت مندا جا رہا ہے آجکل۔"

"کوئی نیا کام شروع نہیں کیا ہے تو نے؟"

"یہی تو بتا رہا ہوں تجھے۔ بہت پریشان ہوں آج کل۔"

"اچھا اچھا! دیکھیں گے تیری پریشانی بھی۔ جا آہو صاحب کو اطلاع دے۔"

وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد آہو نیچے آ گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد بولا "تم کہتے تھے کہ تم نے سردری کو فیصل آباد میں دیکھا ہے یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ کل کی بات ہے۔ میں کسی رکشا کی تلاش میں تھا کہ کچہری روڈ پر وہ مجھے مل گئیں۔ کیوں کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"ہاں ویسے تو خیر ہی ہے، وہ واپس آ گئی ہیں مگر حیرت ہے کہ تم سے ملنے کی بات وہ نہیں کرتی ہیں۔"

"وہ کچھ پریشان نظر آتی تھیں، ہو سکتا ہے انھیں یاد نہ رہا ہو۔"

"نہیں اسے یاد بھی آ گیا تھا مگر میرے بتلانے کے بعد۔ خیر تم یہ بتاؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟ تمھاری کوئی اطلاع ہی نہیں ملی تھی بہت دن سے۔"

"بس ایسے ہی میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بات یہ ہے آہو صاحب کہ اس روز بڑے صاحب پر جن لوگوں نے حملہ کیا تھا اس سلسلے میں کوئی گرفتاری بھی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"کئی لوگ پکڑے گئے تھے، ابھی بھی اندر ہیں مگر وہ کچھ بولتے نہیں ہیں، کسی نے بھی اعتراف نہیں کیا ہے۔"

"ہوں۔ دیکھیں اس سازش میں تین آدمی شریک تھے۔ ایک حاجی عبدالستار۔ وہی النور ہوٹل والا۔ دوسرا ملک اشرف۔"

"کیا؟ ملک اشرف! نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی ہوا ہے۔ تیسرے آدمی کا مجھے صحیح پتا نہیں ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ مرحوم ستنا جا صاحب تھے اور ان کے ساتھ محسن ستنا جا کا نام بھی لیا جاتا ہے۔"

"نہیں یار! ایسا اندھیر نہیں ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو بات ہے۔ یہ بھیس بدل کر بڑے صاحب کا خاتمہ بالخیر چاہتے تھے۔"

"کوئی ثبوت؟"

"میں نے انھیں پکڑ کر باندھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حاجی صاحب تو بہت بیمار ہوں گے یا مر چکے ہوں گے۔ ملک اشرف بھی میرے قبضے میں ہے اور محسن بھی۔ حاجی صاحب، اور محسن تو لاہور ہی میں ہیں البتہ ملک اشرف ذرا دور ہے۔"

"کہاں؟"

"میانوالی میں۔ اور میں اسے لا سکتا ہوں۔"

"یہ تو بہت بری خبر سنائی ہے تم نے جیلانی! کیا انھوں نے خود تسلیم کیا ہے؟"

"ہاں۔ یہی بات ہے، وہ اقرار بھی کر چکے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات ہے۔ ملک اشرف پر وہ بہت بھروسہ کرتے ہیں۔"

"کرتے رہیں مگر حقیقت یہی ہے آہو صاحب! اور ہمیں بڑے صاحب کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"وہ تو میں ضرور کروں گا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے، ذرا مجھے تفصیل بتاؤ۔"

"میں تفصیل میں نہیں جا سکتا، مجھے آپ بڑے صاحب کے پاس لے چلیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں پہلے بھی ان سے مل چکا ہوں دو بار۔ اور میں ساری تفصیل انھیں خود بتانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔ البتہ میں انھیں اطلاع دے سکتا ہوں۔ اگر وہ دونوں آدمی نہیں ملے تو؟"

"ملیں گے کیوں نہیں۔ وہ لاہور ہی میں ہیں۔ اچھا یوں کریں کہ پہلے انھیں گرفتار کروا دیں۔"

"نہیں۔ ٹھہرو۔ میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں، مجھے بڑے صاحب تک بات پہنچانے دو۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت صحن میں نکل گیا۔ کبری میرا خیال ہے، اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ آہو اوپر چلا گیا تو اس کے قدموں کی آواز پہچان کر وہ میرے کمرے میں آ گیا۔

”کیا بات ہے اوستاد! کوئی خاص گھپلا ہے؟“

”نہیں۔ میں آہو سے ملنے آیا تھا اور بس۔ تم کہو حالات کیا ہیں؟“

”ٹھیک ہی ہیں۔ قسم اللہ کی تم اِدھر رہ جاؤ۔ تمھارا ایسا بندوبست کروں گا کہ ہمیشہ اس خادم کو یاد رکھو گے۔“

”نہیں کبری! یہ نہیں ہوگا۔ یہ رکھ لو البتہ۔“ یہ ایک ہزار روپیہ ہے میرے پرانے دوست ہو تم۔ ویسے یہ بتاؤ وہ مائی کہاں ہے اب؟“

”وہ... وہ تو یہ جگہ ہی چھوڑ گئے۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔ پر یہ اچھا ہی ہوا۔“

”ہاں۔ انھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ ایک کام کر سکتے ہو تم؟“

”حکم کرو بادشاہو! میں تو آپ کا داس ہوں۔“

”اوئے بیٹھ اوئے! ابھی سے آپ جناب کرنے لگا۔ روپے میں بڑی طاقت ہے بھئی! اچھا ایک بات بتا، کوئی ایسی خاتون مل سکے گی جو ہماری کوٹھی میں ملازمہ کے طور پر رہ سکے۔ دراصل اُدھر ہمارا ایک آدمی بھی ہے۔ مجھے اس کی تنہائی کا خیال ہے۔ کوئی معقول عورت ہو تو اس کا نکاح بھی پڑھوا دیں گے۔“

”میرا خیال ہے میں بندوبست کر سکتا ہوں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ اس عورت کو لے کر تم اس جگہ آجاؤ، یہ پتا میں لکھ رہا ہوں۔ میرا ایک ملازم ہے حیدر! دراصل میں اس کے لیے بات کر رہا ہوں۔“

”فکر ہی نہ کر اوستاد! میں صبح نو بجے پہنچ جاؤں گا۔ ملازمہ بھی ساتھ ہوگی۔ میرا خیال ہے اس سے وہ نکاح کرے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”بس ٹھیک ہے، جو مرضی ہے کرنا بس لے آنا۔“ میں نے اپنا پتا اس کو لکھ کر دے دیا۔ ”مگر دیکھ! کسی کو میرے اس پتے کا بھید نہیں بتانا ہے۔“

”تو فکر ہی نہ کر پیلے رے! میں کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔“ اتنے میں آہو واپس آگیا۔

”چل اوئے بدبخت! بھاگ یہاں سے۔ یہ جب بھی آتے ہیں تو ان کے کان میں بالی ڈالنے بیٹھ جاتا ہے، ہٹ پرے۔“ کبری کچھ نہیں بولا۔ آہو سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ —— اسی وقت باہر نکل گیا۔ آہو نے دروازہ کھلا رکھا اور صحن میں نظر ڈال کر بولا۔ ”سالا اُوپر چلا گیا ہے۔ ایک تو میں اس سے بہت تنگ ہوں۔ بات یہ ہے جیلانی! کہ تم ان دونوں کو میرے ساتھ لے کر ابھی گلبرگ تھانے جا سکتے ہو؟“

”ہاں۔ میرا خیال ہے ایسا ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر چلو، ہم ابھی نکل جاتے ہیں۔“

”مگر ٹھہرو۔ پہلے النور ہوٹل فون کر کے معلوم کر لو کہ حاجی صاحب اب کیسے ہیں؟“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ ٹھہرو، میں فون نیچے منگوا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ صحن میں نکلا اور پانچ ہی منٹ بعد وہ فون نیچے لے آیا۔ اور اس کا پلگ لگا کر اس نے ہوٹل النور فون کیا۔

”ہیلو۔۔ ہوٹل النور؟“... ”لیں بات کریں۔“ آہو نے فون مجھے دے دیا۔ دوسری طرف سے منیجر بول رہا تھا۔

”دیکھیں، میں محسن ستناجا بول رہا ہوں۔ حاجی صاحب کا کیا حال ہے اب؟“

”وہ ابھی تک اسپتال میں ہیں جناب! اور انھیں ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔“

”کس اسپتال میں ہیں؟“

”وہ گنگا رام اسپتال میں ہیں۔ کمرہ نمبر چوبیس۔“

”ان سے ملنے کی اجازت ہے؟“

”آپ کو شاید مل جائے، ویسے وہ اجازت نہیں دیتے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انھیں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

”ہمیں اس کام کے لیے پولیس کی ضرورت ہوگی آہو صاحب! وہی انھیں گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”اس کا بندوبست بھی ہو چکا ہے، مجھے بتائیں کہ وہ محسن کہاں ہے؟“

”محسن، گلبرگ کی ایک کوٹھی میں پڑا ہے اور میں اسے ابھی یہاں منگوا سکتا ہوں۔“

”تو پھر منگوائیں اسے۔ یا پھر اپنے آدمی سے کہیں کہ وہ اسے ساتھ لے کر گلبرگ تھانے پہنچ جائے۔“

”ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ وہ محسن کو کس آدمی کے پاس پہنچائے؟“

”انسپکٹر قدیر کے پاس۔ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

میں نے اسی وقت حیدر کو فون کر دیا۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ بڑے ڈرے سہمے لہجے میں بولا۔ ”ہیلو...... ہیلو۔“

”اوئے دیکھ اوئے! زیادہ ہیلو ہیلو کی لوڑ نہیں ہے مجھے۔“

”جی! جی میں سمجھ گیا۔“

”دیکھ، وہ محسن صاحب ہیں نا؟“

”جی... جی۔ میں سُن رہا ہوں۔“

”اس کو ابھی وہاں سے نکال اور کسی رکشا ٹیکسی میں ڈال کر گلبرگ تھانے پہنچا دے۔ انسپکٹر قدیر صاحب کے پاس پہنچا

کرائے ایسا کرنے کا حکم ملا تھا اور بس۔“

”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟“

”نہیں۔ وہ انسپکٹر تمھیں تھانے کے باہر سڑک پر ہی مل جائے گا مجھے! فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہ کام کر کے گھر واپس چلے جانا۔“

”جی ٹھیک ہے۔ پر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”یار آہو صاحب! بات گڑبڑ ہو جائے گی ہمیں خود ہی جانا پڑے گا۔“ میں نے فون روک کر کہا۔

”ہاں۔ تمھاری یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ اتنے میں میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ آدمی ہوش میں ہوگا نا؟“

”نہیں۔ وہ ہوش میں شاید نہ ہو۔“ میں پھر فون پر حیدر سے مخاطب ہوگیا۔ ”حیدر! تو اسے نکال کر باہر گیٹ پر ڈال دے ہم ابھی آرہے ہیں، ٹھیک ہے؟“

”ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ میں اسے نکال کر گیٹ پر پہنچا دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں اور آہو اسی وقت کمرے سے باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے گلبرگ کی طرف چل دیے۔ بارش اس وقت بھی ہلکی ہلکی برس رہی تھی۔ اور موسم بہت ہی خوشگوار ہوگیا تھا۔ مگر میں ایسے عذاب میں پھنسا تھا کہ کوئی موسم بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اور آہو تو ایسا آدمی ہوگیا تھا جو ہر وقت نفع نقصان کے سوال نکالتا رہتا تھا کہ اس معاملے میں سود کیا ہے اور زیاں کیا ہوگا۔

ہم گلبرگ پہنچے تو اس وقت تک حیدر ملزم کو گیٹ پر لا چکا تھا۔ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور وہ تھوڑا تھوڑا ہوش میں آرہا تھا۔

”یہ کوٹھی کس کی ہے؟“

”بس اپنی ہی ہے۔ میرا ایک دوست رہتا ہے یہاں۔ ہماری سواری سامنے ہی ہے۔“ کار کو سامنے دیکھ کر حیدر نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اس کی مدد سے محسن کو گاڑی کی عقبی نشست پر ڈالا اور ہم اسی وقت وہاں سے آگے نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے محسن کو انسپکٹر قدیر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ تھانے کے باہر سڑک پر کھڑا تھا۔ میں کار کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ ساری بات آہو نے کی اور محسن کو سڑک پر ڈال کر میرے پاس آبیٹھا۔

”چلو بھئی! پولیس کے آدمی اب گنگا رام پہنچ چکے ہوں گے باقی کا کام وہ خود کریں گے۔ یہ بتاؤ کہ ملک اشرف کو تم کب یہاں لا سکتے ہو؟“

”اس کے لیے مجھے تین دن کی مہلت چاہیے۔ وہ میانوالی میں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جمعرات کو تمھارا انتظار کروں گا۔ آج پیر ہے۔“

”میں اس سے بہت پہلے آجاؤں گا، آپ بے فکر رہیں۔“

”یہ کار کس کی ہے؟ میرا خیال ہے میں نے اسے پہلے ستناجا کے پاس دیکھا تھا۔“

”یہ انھی کی ہے محسن صاحب کی، مجھے ذرا سیر سپاٹے کے لیے دے رکھی تھی۔“

”تیرا بھی جواب نہیں ہے جیلانی! پتا نہیں تو کس چیز کا بنا ہوا ہے۔“

”میں آپ کا خادم، آپ کے بال بچوں کا خادم! ارے ہاں مجھے یاد آیا، آپ کو مبارک ہو۔ اللہ نے آپ کو لڑکا دیا ہے۔“

”شکریہ! تم نے شاید اسے سرور کی گود میں دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ چلیں آپ کی مراد بر آئی۔ نسل چل نکلی، یہ بہت اچھی بات ہے۔“

”ہاں یار! میں تو مایوس ہو چکا تھا لیکن اللہ بڑا کارساز ہے۔“

”بچہ تو ایک بھی بہت ہوتا ہے آہو صاحب! ہو بہو آپ کی تصویر ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تھا اسے۔ بہت پیارا لگتا ہے۔“

”ہاں۔ اس کی ماں کو بھی تو دیکھو۔ اور پھر... خیر ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ کیا خیال ہے تمھارا؟“

”جی کیوں نہیں۔ آپ تو اب بھی کمال کرتے ہیں۔ بڑا نور ہے آپ کے چہرے پر۔“

”بس اللہ کی مہربانی ہے۔ میرا خیال ہے آج رات تم میرے ہاں گزار لو۔“

”نہیں۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ میں البتہ آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ بتائیں آہو صاحب کہ آپ کی سالی مسند آرا کا کیا حال ہے؟“

”مجھے پتا ہے تم کیوں پوچھتے ہو اس کے بارے میں۔ مگر اس کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ اسے پاگل خانے بھجوا دوں۔“

”کیوں ایسی کیا بات ہوئی ہے؟“

”اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے میرے بھائی! سچی بات تو یہ ہے کہ اب وہ کسی بھی کام کی نہیں رہی۔ سکھیرا سے اس کی منگنی کی تھی مگر وہ بھی بددل ہو چکے ہیں۔“

”ہوں۔ اس کی صحت کی خرابی میں آپ کا بھی بڑا ہاتھ ہے آہو صاحب!“

"آدمی کو اپنا راستہ صاف رکھنا چاہیے بھائی! یہ بڑی اہم بات ہے۔ سمجھتے ہو نا تم! ہادی علی سے میری رشتے داری بے وجہ نہیں تھی۔"

"بڑے کاریگر آدمی ہیں آپ! حیرت ہے اتنی بڑی زمینداری آپ پی گئے۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے۔" میرے دل میں آیا کہ میں کسی جگہ کار کو ٹکرا کر آہو کا ستیاناس مار دوں۔ مگر پھر... کچھ سوچ کر میں چپ ہی رہ گیا۔ آہو نے میری بات کا جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔ "ویسے آپ نے بڑے صاحب سے بات کی تو وہ کیا کہتے تھے؟"

"میں نے تمھارا نام لے دیا تھا۔ وہ بڑے حیران ہوئے مگر اس سلسلے میں جو تفتیش وہ کر رہے ہیں، اس میں ان لوگوں کا نام شامل کر کے انھیں خوشی نہیں ہوگی۔ کہہ رہے تھے کہیں خواہ مخواہ تو ان کو نہیں پھنسوا رہے ہو۔ میں نے انھیں کہہ دیا کہ اس بارے میں آپ کا یار ہی ثبوت لایا ہے۔"

"پھر کیا بولے وہ؟"

"کچھ نہیں۔ کہا کہ ہم ان کو حراست میں لے لیتے ہیں۔"

"آپ ان سے میری ملاقات نہیں کروا سکتے؟"

"اس کا انحصار پولیس کی تفتیش پر ہے۔ اگر بات سچ نہ نکلی تو پھر شاید آپ کو پریشانی اٹھانی پڑے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ بڑے صاحب کے یہی خیر خواہ ان کی تباہی چاہتے ہیں۔ یہ بات میں ثابت کر سکتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد میں آہو کو اس کے گھر کے دروازے پر اتار کر واپس آگیا۔ رات کچھ زیادہ ہی بیت گئی تھی اور میں بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ میں سیدھا اپنی کوٹھی جا پہنچا۔ حیدر ابھی تک میرا منتظر تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آگیا، بولا "اس کا کیا بنا سردار صاحب؟"

"اسے میں پولیس کے حوالے کر آیا ہوں، وہ شبّر کیسا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہی ہے۔ میں نے اسے کھانا کھلا دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بہت دہائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا بچے! ابھی تو تجھے یہیں رہنا پڑے گا۔ یہ بڑی بڑی گالیاں دے رہا تھا، مجھے بھی اور آپ کو بھی۔"

"چلو، چھلنے، دو دن یہاں رہے گا تو اس کا کچھ ریسٹ ہی ہو جائے گا۔ اسے سگریٹ بھی دینے تھے۔"

"وہ بھی میں دے آیا ہوں۔ اور اس کے دونوں پاؤں میں دیوار کی زنجیر سے باندھ آیا ہوں۔ آدمی وہ بہت من چلا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ اس کا خیال رکھو۔ اور یہ دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے سو رہو۔ ٹیلی فون کا ریسیور بھی الگ رکھ دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں خوابگاہ میں جا کر لیٹ گیا اور ذہن سے سارے خیالات جھٹک کر میں گہری نیند میں کھو گیا۔ سوچنے کے لیے اب کیا باقی رہ گیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک مجھے آسیہ کی فکر تھی مگر اب وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے جاگیردارنی بن بیٹھی تھی۔ اور مجھے امید تھی کہ اپنا کردار بخوبی نباہتی رہے گی —— اور اب تو آئی بھی دلیل تھا۔ میری فکر اس کی وجہ سے ایک اور رخ اختیار کر گئی تھی۔ مگر پھر میں نے سوچا ٹھیک ہے جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ آسیہ اپنا نفع نقصان خود سوچ سکتی ہے۔"

❋

صبح جب میں بستر سے اٹھا تو اس وقت سات بج چکے تھے اور میری ساری کسلمندی دور ہو چکی تھی۔ حیدر اس وقت باورچی خانے میں تھا۔ دو چار برتن جو سالے ان میں اکٹھے ہوتے، انھیں وہ صبح ہی صبح دھو لیتا تھا۔ میں نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا تو وہ میرے لیے چائے لے آیا۔ اس وقت پونے آٹھ بج رہے تھے کہ گیٹ کی گھنٹی ٹرانے لگی۔

"دیکھ یار کون آیا ہے اس وقت۔ خدا خیر ہی کرے میرا خیال ہے کہ آدمی کے لیے گھر بھی ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ اس گھنٹی سے تو میں بہت ذلیل ہو گیا ہوں۔ میری دوڑیں ہی لگی رہتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کہ اس کے ساتھ آہو کا ملازم کبری چل رہا تھا اور اس کے عقب میں ایک دراز قد عورت برقعے میں لپٹی ہوئی آ رہی تھی۔ میں تو انھیں دیکھ کر اچھل سا گیا۔ کبری ایک نمبر کا شیطان تھا۔ وہ سیدھے ڈرائنگ روم آ گھسے۔ حیدر انھیں روکتا ہی رہ گیا مگر کبری کو وہ روک ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آتے ہی نہایت بے تکلفی سے السلام علیکم کہہ کر مجھ سے یوں ہاتھ ملایا جیسے وہ میرا لنگوٹیا یار ہو۔

"کیا حال ہیں اوستاد! بڑے ٹھاٹھ ہیں تمھارے۔"

میں نے بڑی کڑی نظر سے اسے گھورا تو وہ ایک دم مؤدب ہو گیا۔ "کیا بکتے ہو! کیا سمجھا ہے تم نے مجھے؟" وہ لہجے کی سرزنش سے بالکل ہی دہل گیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب! وہ دراصل میں ان کو آپ کی خدمت میں لایا تھا۔ میں نے کہا کہ نو بجے سے پہلے ہی کہ صبح چلو نا۔"

"بیٹھو! ان کو بھی ادھر بٹھاؤ۔ تمھیں تمیز سکھانی پڑے گی کبری! کسی آدمی سے بے تکلفی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اسے اپنا مخاطب کرو۔ میں تمھاری کھال ادھیڑ سکتا ہوں۔ آخر کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟" میں نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔

اُس نے ایک دم طیش دلا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اتنی بڑی کوٹھی میں داخل ہو رہا ہے، اسے معلوم تھا کہ وہاں میں کس حیثیت میں بیٹھا ہوں، اسے اپنے مرتبے کا بھی علم تھا۔ اس کے باوجود وہ اس طرح بات کرتا تھا جیسے میں اس سے بہت دبتا ہوں۔ کبھی بھی وقت اس نے مجھے اوستاد کے لفظ کے بغیر مخاطب نہیں کیا تھا۔ مگر اس روز تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ بھی میرے اس موڈ کو سمجھ گیا۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔

"میں۔۔۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں جناب! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں آئندہ بہت محتاط رہوں گا۔"

"تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو کبری! لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھنے والے انسان! یہ میرا گھر ہے۔ میں اس کوٹھی کا مالک ہوں۔ یہ حیدر میرا ملازم ہے، اس سے پوچھ! ہم کون ہیں؟ یہاں کوئی۔۔۔ کبھی اندر نہیں جھانک سکتا ہے۔ تیرے جیسے سات سو آدمی میں یہاں دیوار میں چنوا سکتا ہوں۔ آخر تم ہوتے کون ہو اس طرح مجھے مخاطب کرنے والے؟ تم نے دیکھا حیدر! اس کا طرزِ تخاطب؟"

"دفع کریں جی! اصل بات پوچھیں اس سے۔ مجھے تو یہ کوئی کم ذات نظر آتا ہے۔"

"تمہارے لیے اس کو لایا ہے میں نے اسے کل کہا تھا کہ ہمیں حیدر کے لیے۔۔۔ بیوی کی ضرورت ہے۔ اب پتا نہیں یہ کیسے اٹھا لایا ہے صبح صبح۔ یہ برقع اتار دو بی بی!" لڑکی سر سے پاؤں تک شٹل کاک برقعے میں مستور تھی یہاں تک کہ نہ اس کے ہاتھ نظر آتے تھے نہ پاؤں۔

"میں کیا کہوں سر! مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل اس لڑکی کو میں راوی روڈ سے لایا ہوں۔ اس کے ماں باپ حیات نہیں ہیں۔ ایک بھائی ہے، سو وہ اندھا ہے، یہ اس کے پاس رہتی ہے۔ وہ تو مانگ کر بھی گزارا کرے گا، مگر یہ بے سہارا ہی رہ جائے گی۔ اگر آپ کے گھر میں اسے جگہ مل جائے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہو گی۔ میرا خیال ہے حیدر صاحب اس کے لیے بہت موزوں آدمی ہوں گے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ تم ٹھیک طرح سے آتے، بندے کے پتروں کی طرح بات کرتے تو ہم تمہیں پہلے چائے کا پوچھتے پھر کوئی بات کرتے۔ بہر حال ٹھیک ہے۔ بی بی بیٹھ جاؤ ایک طرف۔"

"برقع اتار دے بالی! یہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔" لڑکی ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اس نے نقاب الٹ دیا۔ لڑکی خاصی قبول صورت تھی۔

اس کا رنگ گندمی تھا مگر چہرے کے نقوش میں۔۔۔ بلا کا تیکھا پن تھا۔

حیدر نے اس کو دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔۔۔۔ وہ شاید شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ بالی نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ حیرت تو واقعی ہمارے چہروں پر لکھی گئی تھی۔ میں نے بھی اسے دیکھنے کے بعد نظریں پھیر لیں۔

"نقاب اوڑھ لو بی بی!" میں نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ کبری! اور لو یہ چائے پیو۔ حیدر! بی بی کو بھی چائے دو۔"

اس نے چھوٹی تپائی پر چائے کے برتن اور ڈھیر سارے بسکٹ، مکھن، انڈے اور توس اس کے سامنے رکھ دیے۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ پتا نہیں اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔ ایک تحیر تھا جس سے وہ کسی بھی طرح جان نہیں چھڑا سکا تھا۔

"کھاؤ بالی! دراصل میں اسے صبح سویرے بس میں بٹھا کر لے آیا۔ ٹیکسی رکشا تو میں لے نہیں سکتا تھا نا۔۔۔" کبری کی ہر تان روپے کی تنگی پر ٹوٹتی تھی۔

"بہانہ کیا کیا تم نے؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے اس کے بھائی سے کہہ دیا کہ ایک بیگم صاحبہ ہیں، ان کے پاس میں اسے لے جا رہا ہوں ملازمت کے لیے۔"

"وہ کچھ زیادہ شکّی مزاج آدمی تو نہیں ہے؟"

"ہو گا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اس کو بہر حال میں نے کہہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے میں تمہاری شادی کروا دوں۔ دراصل میں نے اسے ساری بات بتا دی تھی۔ اور۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ اپنے گھر سے چھری بھی ساتھ لیتی آئی ہے۔ یہ مجھے راستے میں دکھا رہی تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"کیا کہا؟ چھری ساتھ لائی ہے!"

"جی ہاں۔ کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو یہ چھری مار کر مر جائے گی۔"

"مارے گی کسی کو نہیں؟"

"اتنا حوصلہ اس میں نہیں ہے۔ کیوں بالی؟" کبری نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ نقاب کے نیچے ہی نیچے چپ لبوں تک لے جا رہی تھی۔ بالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حیدر کو وہ البتہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ

نظروں میں تول رہی ہو۔ کبری نے شاید اسے پہلے بتا دیا ہو گا کہ جس آدمی سے وہ بات کرنے نکلا ہے اس کا نام حیدر ہے۔

"ہماری کوٹھی ڈھونڈنے میں زیادہ دقت تو نہیں ہوئی؟"

"خاصی دقت ہوئی جی! بس اسٹاپ سے آپ کا گھر بہت دور ہے، دو تین جگہوں سے پوچھنا پڑا۔"

"ٹھیک ہے، مجھے تو ایک بہت ضروری کام ہے کبری! تم یوں کرو کہ اس کو یہاں چھوڑ جاؤ۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری میں اپنے سر لیتا ہوں۔ یہ حیدر کے ساتھ کوٹھی میں رہے گی۔ بہتر ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پرکھ لیں۔ اگر باہم رضامندی ہو گئی تو بہتر ہے ورنہ پھر۔۔۔۔ پھر سوچنا پڑے گا۔ بہر حال یہ لو یہ پانچ سو روپے تم رکھ لو، اور لو بی بی یہ ہزار روپے ہیں۔ یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ سمجھو یہ تمہارا اپنا گھر ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ تمہارے اور حیدر کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ فیصلہ ہم شام کو کریں گے۔ تم اس کا بہت خیال رکھو گے حیدر! میں اس کے لیے جوابدہ ہوں۔" یہ کہہ کر میں فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر خواب گاہ میں جا گھسا۔ بالی ایک منفرد معصوم سی لڑکی، کبری کی ہر بات پر اعتبار کر گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ اس کے اندھے بھائی نے اس پر بے پناہ اعتماد کر کے بالی کو اس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

میں خواب گاہ میں جا کر چند منٹ تک یونہی ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا اور پھر گھبرا کر میں ان کی طرف لوٹ گیا۔۔۔۔۔ اضطراب کا شکار تو میں پہلے ہی سے تھا۔

وہ دونوں اس وقت ذرا ہٹ کر آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔

"میری بات سمجھ گئے ہو نا حیدر!" میں نے ایک بار پھر تنبیہہ کی۔ "یہ اگر چاہیں تو انہیں فوراً ان کے گھر پہنچا دینا۔ سمجھے! یہ ہماری مہمان ہیں۔ ہر طرح ان کا خیال رکھو۔ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، دوپہر کو ملاقات ہو گی۔۔۔ اور تمہارے کیا ارادے ہیں کبری؟"

"جی۔۔۔ جی میں بھی بس چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔۔۔ میں تمہیں شہر میں اتار دوں گا۔ شام کو پتا کر لینا۔ سمجھے۔" یہ کہہ کر میں باہر کی طرف چل دیا۔ کبری میرے پیچھے آ رہا تھا۔

کبری کو ساتھ بٹھا کر میں نے گاڑی باہر نکال لی۔ اور اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تو کیسے کیسے خوبصورت گھر اجاڑتا رہتا ہے کبری! سمجھ میں آتی ہے یہ بات؟"

"میں سن رہا ہوں جیلانی صاحب!"

"دیکھ تو مجھے جیلانی نہیں، آج سے سردار کریم نوانہ کہا کرے گا۔ سمجھا! یہ بہت اہم بات ہے۔"

"جی بہت بہتر۔ میں خیال رکھوں گا۔"

"اور پھر کبھی تو مجھے اُستاد نہیں کہے گا۔ سمجھا! تجھے نہیں پتا کہ میں کون ہوں۔"

"مجھے یاد رہے گا سردار صاحب! میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگ چکا ہوں۔"

"ہاں اب بتا کہ تو آخر یہ سلسلہ کب بند کرے گا؟"

"یہ اپنی ضرورت کی بات ہے سردار صاحب!"

"یہ تو ٹھیک ہے کبری! مگر اس معصوم کو دیکھ۔ میں نے ایسی لڑکیاں کم دیکھی ہیں اور تم اسے لے آئے ایک ملازم کے لیے۔ ذرا سوچا ہوتا تم نے۔ آخر وہ کیا کہتی ہو گی دل میں۔"

"اس کی سوچ کوئی اتنی اونچی نہیں ہے سردار صاحب! وہ دو وقت کی روٹی اور ایک چھت چاہتی ہے سر چھپانے کے لیے۔ اسے پتا ہی نہیں ہے اپنی اہمیت کا۔"

"ان کا گزارا کس طرح ہوتا ہے؟"

"بھائی اندھا ہے نا، کچھ مانگ تانگ کر لے آتا ہے اور بس۔ مگر اب بالی اس پر تیار نہیں، وہ کہتی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے شام کو آنا پھر تم سے بات ہو گی۔ یہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے کہ نہیں؟"

"بس ایسے ہی چار چھ جماعتیں پڑھی ہو گی مگر ہے یہ شہر کی رہنے والی۔ ہمیشہ یہاں ہی رہی ہے۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ لو اب تم بس میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا شام کو انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے کبری کو سڑک کے کنارے اتار دیا اور خود میں بینک جا پہنچا۔ میرا اپنا حساب اُسی بینک میں موجود تھا اور وہ محمد اسلم شیرازی کے نام سے کھلا تھا۔

منیجر مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ کوئی نیا آدمی تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا اکاؤنٹ نمبر کیا ہے تو اس نے میرے لیے اسی وقت چائے منگوالی۔ میں نے ایک کروڑ روپے کا وہ چیک اس کے سامنے رکھ دیا۔

"مجھے یہ روپیہ ہر حال میں آج چار بجے تک دے دیں، تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔ صرف اسّی لاکھ کی ضرورت ہے مجھے۔"

"ضرور لے لیں جناب! میں ابھی اسے اُوپر بھجوا دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہم چار بجے سے پہلے ہی ادائیگی کر سکتے ہیں۔"

اس نے چیک لے کر نئے حساب میں جمع کروانے کے لیے بھیج دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں چائے پی کر وہاں سے باہر نکل آیا۔

ایک بڑا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نہ تو محسن اور نہ حاجی عبدالستار ابھی اس قابل ہوئے ہوں گے کہ وہ اس چیک کا کسی سے ذکر کر سکتے کیونکہ وہ دونوں پولیس کی تحویل میں تھے' اور یقیناً وہ جان بوجھ کر اس چیک کا معاملہ زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ملک اشرف اور صغر علی بھی حراست میں لیے جا چکے ہیں۔ شاید وہ کوئی بیان بھی نہ دے سکیں تاوقتیکہ پولیس ان پر نسخہ نمبر اکیس استعمال نہیں کرتی ہے۔ اندازہ میرا یہی تھا میں بڑی آسانی سے چاہے بھی بینک جا کر وہ روپیہ نقد کر سکتا تھا مگر یہ خوف میرے دل سے نہ نکل سکا کہ اگر ان میں سے کسی نے بھی اپنے دستخطوں میں ذرا سی گڑبڑ کر دی ہو گی تو اس کا بینک کے لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ اور پھر اُلٹی آنتیں گلے پڑنے لگیں گی۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو جائے۔ جب تک روپے مل نہیں جاتے میں مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ صورتِ حال بڑی ہی غیر یقینی تھی۔

میرا خیال ہے میں نے محسن اور حاجی صاحب کے سلسلے میں بہت جلد بازی سے کام لیا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ میں رقم وصول کیے بغیر ہی انہیں آہو کے ذریعے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ یہ بڑی ہی غلط بات تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں چیک کیش کروانے کے بعد، ان کا پتا کسی کو بتاتا۔ مگر اب میں کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔

میں اِدھر اُدھر پھرنے کے بجائے سیدھا ہال روڈ جا پہنچا۔ ہمارا وہ پرانا مستری وہاں سے بستر گول کر چکا تھا اور میں گاڑی کسی اور آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ چار و ناچار میں اپنی کوٹھی جا پہنچا۔ معلوم یہ ہوا کہ حیدر اس لڑکی کے ساتھ لان میں گھومتا پھر رہا ہے۔ اسے اشارہ تو میں دے ہی گیا تھا۔ پٹھے نے میرے نکلتے ہی ایک فاختئی رنگ کا ولائتی سوٹ پہن لیا تھا اور وہ اُسے سجتا بھی تھا۔ ٹائی بھی اس نے نئی لگا رکھی تھی۔ اِک ذرا ٹانگ اس کی سیدھی ہوتی تو وہ کئی جوانوں کو مات کر سکتا تھا۔ اور وہ بی بی بھی اس کے ساتھ بڑے اطمینان سے لان میں گھوم رہی تھی —— میرے ہارن کی آواز سن کر حیدر نے گیٹ کھولا تو اس وقت بالی اس کے ساتھ عقبی لان کے بائیں حصے میں کھڑی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اس نے برقع اتار کر سرخ چادر اوڑھ لی تھی۔

حیدر گیٹ بند کر کے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"کیوں بے، یہ کیا ہو رہا ہے' بڑا ڈیوک آف ذِنڈسر بنا ہوا ہے۔"

"ابھی تو وہ' کیا کہتے ہیں... کورٹ مارشل کا پہلا حصہ ہی شروع ہوا ہے۔"

"اوئے کورٹ مارشل نہیں، کورٹ شپ کہتے ہیں اسے۔"

"بس جی دعا کریں' بزرگوں کی دعا کی ضرورت ہے۔"

"اوئے تو گھاس تو نہیں کھا گیا کہیں۔ یہ بتا کوئی رضامندی نکاح کی صورت پیدا ہوئی کہ نہیں؟"

"ابھی کہاں جی! بس وہ شرماتی بہت ہے۔ کبھی بات کا جواب ہی نہیں دیتی۔"

"کہیں وہ گونگی تو نہیں ہے؟" میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کر دی۔

وہ ہنستا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ لگتا تھا وہ بہت خوش ہے۔ "گونگی نہیں ہے جی! سب سمجھتی ہے۔ پر آپ نے اس کا دماغ فرش معلّا پر پہنچا دیا ہے۔"

"اوئے حیدر! خدا کے لیے عرشِ معلّا کہتے ہیں بھئی! ایسے ہی بکتا چلا جاتا ہے۔ کیا کہہ دیا ہے میں نے اسے؟"

"جی آپ نے اس کو اپنا مہمان جو کہہ دیا تھا سردار صاحب! بار بار آپ اس کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے رہے ہیں، بس سارا قصہ وہیں سے خراب ہو گیا۔ ورنہ اس کو تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ شے کیا ہے۔"

"نہیں حیدر! وہ اسی لائق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ بات ہم نے اس کے منہ پر کہہ دی۔ ویسے وہ کہتی کیا ہے؟"

ہم اس عرصے میں ڈرائنگ روم میں جا پہنچے تھے۔

"میں اُسے یہاں ہی لے آتا ہوں۔" مگر اتنے میں وہ خود ہی سہمی سمٹی ہوئی برآمدے میں آتی دکھائی دی۔ اور دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ ایک نظر اس نے ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر سر جھکا کر ایک کونے میں جا ٹھہری۔

"کیا بات ہے بالی! آپ کو کوئی بات نہیں کرنی آتی ہے؟"

"جی... میں... میں کیا کہوں' آپ ابھی آئے ہیں نا؟"

"ہاں۔ آپ لان میں ٹہل رہی تھیں۔ آئیں ادھر صوفے پر بیٹھ جائیں۔ ہمارے ہاں عورت تو کوئی بھی نہیں ہے...... سارے کام حیدر ہی کر دیتا ہے۔ جانے دیں ان کے لیے کافی بنا دے۔ ایک دم گھامڑ آدمی ہے تو۔" حیدر میری بات پر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ لباس اس نے ابھی تک وہی پہن رکھا تھا جس میں نیلا اور سفید رنگ نمایاں تھا۔ پاؤں میں جوتی اس نے بہت ہی نفیس سی پہن رکھی تھی اور وہ پاؤں کسی گنوار کے نظر نہیں آتے تھے۔

"آپ کا یہاں دل تو نہیں گھبرایا؟"

"جی نہیں۔ میں یہاں باغ میں ٹہلتی رہی۔ بہت خوبصورت باغ ہے آپ کا۔" اس کی آواز میں نغمگی تھی مگر اس پر کسی مردانہ آواز کا شائبہ پڑتا تھا۔ پتا نہیں یہ میرا احساس تھا یا کیا بات تھی۔ ایسی آواز میں نے بہت کم سنی تھی مگر پھر بھی اس کی نسوانیت

انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ذرا سا کرارا پن اس میں آ گیا تھا۔ جو دیر تک آدمی کو یہ احساس دلاتا تھا کہ اس نے ایک مؤثر آواز سنی ہے۔

"حیدر آپ کے ساتھ تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیسا لگا یہ آدمی آپ کو؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اس کے ساتھ خوش رہ سکیں گی کہ نہیں؟"

"جی! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ بھئی وہ... وہ درخواست کنندہ ہے۔" — وہ میرا مفہوم سمجھ کر ہنس دی۔ "وہ چھری آپ کے پاس تھی؟"

"جی ہاں۔ وہ تو اب بھی ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔" اس نے ایک تیز دھار کٹار تیزی سے نکال کر مجھے دکھا دی۔ اس پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے وہ کٹار غلاف سے الگ کی' میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چکا چوند دیکھی جیسے وہ ساری روشنی اس دھار کی محتاج ہو۔ پھر وہ کٹار اس نے فوراً ہی غلاف کے اندر رکھ کر اسے احتیاط سے رکھ لیا۔

"یہ کٹار کیوں لیے پھرتی ہیں آپ؟"

"آپ کو کبری نے بتا تو دیا تھا۔"

"ہوں۔ تو... پھر... کیا ارادے ہیں آپ کے؟ حیدر کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟"

"وہ... وہ آپ کا بٹلر... مجھ سے مذاق کر رہے ہیں آپ... کیا مجھے واقعی حیدر کے بارے میں اپنی رائے بتانی ہو گی؟"

"اس میں کیا ہرج ہے بی بی! اسی بات کا تو آپ کو موقع دیا جا رہا ہے۔"

"میں بہرحال شام کو یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ کی اس مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔

"ارے! آپ تو جا رہی ہیں۔ بیٹھیں بھئی! ابھی ہماری گفتگو مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میری طرف ایک نظر ڈال کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

"ہوں۔ تو آپ کے بھائی نابینا ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ مجھ سے کوئی بیس سال بڑے ہیں' پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ پھر ایک تیز بخار آیا، کوئی سولہ سال پہلے اور وہ اس سے اٹھے تو اندھے ہو چکے تھے۔ گھر کی ساری پونجی ہم نے آہستہ آہستہ خرچ کر لی۔ یہاں تک کہ مکان کا آدھا حصہ بھی بیچ دیا۔ اور جب وہ بھی نہ رہا تو وہ بازار میں جا بیٹھے۔ ان کے اچھے دنوں میں میں نے چھٹی تک تعلیم حاصل کی تھی مگر پھر آگے نہ پڑھ سکی۔ اور گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ کوئی چار پانچ مہینے سے کبری نے بھائی سے دوستی بڑھائی اور یہ ہمارے گھر بھی آنے لگا۔ پانچ دس روپے کی مدد بھی یہ کر دیتا تھا۔ آج یہ بھائی سے کہہ کر مجھے ساتھ ہی لے آیا۔ کہہ رہا تھا کہ یہ میری شادی کروا دے گا۔" وہ باتیں کرنے پر آئی تو اس نے ایک دم دریا ہی بہا دیے۔

"آپ کے حالات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے بی بی! کبری شاید آپ کو صحیح بات نہیں بتا رہا تھا۔" میں نے اسے مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور کبری کا جغرافیہ بھی اسے سمجھا دیا۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ... میں بھائی کو بتا دوں گی کبری کیا چاہتا تھا۔ میں اسے ضرور بتاؤں گی۔ اچھا کیا جو میں چھری ساتھ لے آئی۔ کوئی برا وقت آتا تو اسے میں واقعی سینے میں مار کر مر جاتی۔" وہ واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ ایک اس کے آنسو نظر نہیں آتے تھے' ورنہ روہانسی تو ہو گئی تھی۔ اتنے میں حیدر کافی لے کر اندر آ گیا۔

"آئیں بی بی! دفع کریں۔ یہ لیں کافی پئیں۔ ویسے حیدر اچھا آدمی ہے بہت محنتی ہے' وفادار ہے۔ بلکہ وہ... وہ کیا کہتے ہیں، کتے کی طرح وفادار ہے۔ جی جان سے محنت کرتا ہے۔ ایماندار ہے' خیانت نہیں کرتا۔ گھر بہت اچھی طرح سنبھالتا ہے اور زیادہ خرچ بھی نہیں کرتا۔"

"بات یہ ہے جی! کہ... مجھے شوہر کی ضرورت ہے۔ کسی ملازم کی نہیں۔ آپ کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہیں۔"

"کیوں بھئی حیدر! کیا بات بنی پھر؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔ اب تو تم دونوں ہی موجود ہو۔"

"کیا بتاؤں جی! جو فیصلہ یہ کریں' مجھے منظور ہے' ویسے میرا خیال ہے کہ پچاس فیصد کام تو ہو ہی چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ کیسے؟ یہ تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہیں۔"

"میرا مطلب ہے جی کہ میں تو بہرحال راضی ہوں' آگے ان کی مرضی۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ خیر بیٹھو تم بھی چائے پیو۔ میں اک ذرا فون کر لوں۔" یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں رکھے فون تک جا پہنچا۔ گنگا رام اسپتال کا نمبر مجھے جلدی ہی مل گیا۔ پتا یہ چلا کہ حاجی عبدالستار ابھی تک بے ہوش تھا اور پولیس نے اس کے کمرے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حالات ٹھیک ہی جا رہے تھے میرے۔ چیک کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ خود کو شیر دل آہو ظاہر کرتے ہوئے ان کے بڑے تھانیدار سے نمبر ملانے کے لیے کہا۔

وہاں کوئی میاں عبدالغفور صاحب بیٹھے تھے۔ وہ آہو کا نام اچھی طرح جانتے تھے مگر شاید فون پر کبھی ان سے بات نہیں کر سکے تھے۔

بولے "ہیلو! میاں عبدالغفور اسپیکنگ۔"
"میں شیر دل آہو بول رہا ہوں میاں صاحب! کیسے کیا حال ہیں؟"
"جی ٹھیک ہوں، حکم؟"
"میں اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہا تھا، محسن کے بارے میں۔ کیا حال ہے اس کا؟"
"ٹھیک ہی ہے جی! مگر وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ ہم نے اسے کرسچین اسپتال میں بھیج دیا ہے۔ اس پر شاید کسی نے بہت زیادہ تشدد کیا ہے، یہ کام کس نے کیا ہوگا آخر؟ وہ آپ کو کہاں سے ملا تھا؟"
"وہ مکر کر رہا ہوگا۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے اُس پر تشدد نہیں کیا ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے آہو صاحب! اُس کا گلا دبایا گیا ہے۔ اس کی آواز نہیں نکلتی ہے اور غش اُسے بار بار آتا ہے۔"
"دیکھیں، ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، اُن کا کیا خیال ہے؟"
"اُسے وہاں بھیجے کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ دیکھیں، وہ کیا کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ یہاں آ جائیں اور ہاں حاجی صاحب کا بھی سنا ہے یہی حال ہے۔ انھیں تو دل کا دورہ پڑا ہے، پتا نہیں وہ جانبر بھی ہو سکیں گے کہ نہیں۔"
"اللہ ہی خیر کرے۔ ہم تو پھنس کر رہ گئے ہیں۔ بات بڑی ہی اہم ہے۔ بہرحال ایک دو روز تک دوسرے دو آدمی بھی آپ کے حوالے کر دیے جائیں گے، تب ہی آپ کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔"
"آپ پھر یہاں آ رہے ہیں کہ نہیں؟" اُس نے بڑی تاکید سے کہا۔
"میں کوشش کروں گا۔ جیسے ہی میں فارغ ہوا وہاں ضرور آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے تو صرف اپنے چیک کی فکر تھی۔ دستخط انھوں نے میرے سامنے کیے تھے اور وہ بہرحال ٹھیک ہی تھے مگر پھر بھی مجھے کلّی اطمینان تو جب ہی ہو سکتا تھا جب وہ چیک کیش ہو جاتا۔
میں پھر بالی کے پاس جا بیٹھا۔ دیکھنے میں وہ بہت کم گو اور شرمیلی سی نظر آتی تھی مگر جب میں نے اس کی باتیں سنیں تو مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ وہ اتنی بھی سادہ و معصوم نہیں تھی۔ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر اُس نے بہت سے سبق سیکھ رکھے تھے۔
حیدر ابھی تک اس کے پاس بیٹھا تھا اور جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔
"اوئے حیدر! جا بابا! خدا کا واسطہ، اب تو اِن کی جان چھوڑ۔ یہ کورٹ مارشل بعد میں کر لینا۔ جا ہمارے لیے کوئی کھانا شانا تیار کر۔ انھیں اب آرام کرنے دے۔"
وہ فوراً ہی بدک کر کھڑا ہو گیا، بولا "لو۔ بھلا میں کیا کر رہا ہوں، ان کو کافی پلا رہا تھا میں۔ آپ نے خود ہی کہا تھا۔ چل بالی! تو میرے ساتھ باورچی خانے میں چل۔ میں تجھے بہت اچھی اچھی باتیں بتاؤں گا۔ چل شاباش۔"
"اوئے بک نہیں اوئے! بڑا آیا اچھی اچھی باتیں بتانے۔ بیٹھی رہیں جی آپ یہاں۔"
"میرا... میرا خیال ہے کہ..." اس کا جملہ نامکمل رہ گیا۔ برتن اُٹھانے لگا۔ منہ اس کا پھول کر کپّا ہو گیا تھا۔ اسے میری دخل اندازی پسند نہیں آئی تھی۔ برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھنے کے بعد وہ بولا "دیکھو جی! میرے پاس ساٹھ ہزار روپیہ ہے۔ وہ میں ان کو حق مہر میں دے دوں گا۔ زیور بھی ہے میرے پاس، کوئی میرا بھی تو مزدور ہی ہوگا۔ وہ بھی میں اِن کو دے دوں گا۔ آپ کو اس شادی پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو کوئی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔"
"پھر تو بات ہی بن گئی ہے حیدر! میں اسی لیے پریشان تھا بھئی! میرا خیال ہے اب تو بالی مان جائے گی اور نکاح بھی پکا ہوگا۔ کیوں حیدر؟"
"پکا جی! ایک دم پکا۔ مولوی بلاؤں گا میں۔"
"اپنی بات سے پھر و گے تو نہیں تم؟"
"نہیں جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زندگی بھر ساتھ نبھانا ہے، مل جل کے رہنا ہے۔ چل بھئی اُدھر باورچی خانے میں اکٹھے روٹی پکائیں گے۔" اس اثناء میں بالی نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ وہ گویا حیدر کی کوئی بات سُننے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ جب وہ زیادہ ہی مُصر ہُوا تو وہ چادر وہیں پھینک کر جھٹ پٹ کرتی ہوئی...... کمرے میں جا گھسی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔
"دیکھا تو نے! یہ ہے تیری باتوں کا نتیجہ۔ وہ بگڑ گئی ہے۔ اب سنبھال اسے۔"
"میں دیکھ لوں گا جی۔ اُسے آپ پروا نہ کریں کسی بات کی۔" یہ کہہ کر وہ برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ بالی نے مجھے حیران کر دیا تھی۔ حیدر واقعی اس کی نظر میں جچ نہیں سکا تھا مگر اس کی کیا خبر کہ کوئی اور بھی اس کی نگاہ میں پورا اُتر سکا تھا کہ نہیں۔
دوپہر کے کھانے پر وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکی۔ حیدر بڑی مشکلوں سے دروازہ کھلوایا اور کھانا اسے وہیں پہنچا دیا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو بہت خوش تھا، بولا "میں نے اُسے کھانا دے دیا ہے، بڑی ضدی ہے سردار صاحب! پر ٹھیک ہو جائے گی۔ اگر یہ نہیں مانی تو میں خود اس کے بھائی سے بات کروں گا۔ آخر کو میں کوٹھی میں رہتا ہوں اور پھر آپ کا ملازم ہوں۔ کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہوں میں۔ شام کو میں کبری کے ساتھ جاؤں گا۔ دیکھوں گا وہ اندھا کیا کہتا ہے۔"

شام کو اُسے کبری کے ساتھ واپس بھیج دینا ہی بہتر ہے۔ اُس تیرا جوڑ نہیں ہے حیدر! میں تیرا کوئی اور بندوبست کر دوں گا۔"
"نہیں جی۔ مجھے تو یہی پسند ہے، آپ دیکھتے تو رہیں۔" یہ کہہ کر حیدر وہاں سے باہر نکل گیا۔
میں وہاں سے اُٹھ کر بالی کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ کھانا ختم کر چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے برتن سمیٹ کر الگ رکھ دیے۔
"بالی! آپ یوں کریں کہ آج اپنے گھر چلی جائیں۔ میرا خیال ہے حیدر آپ کو پسند نہیں آیا۔"
"شاید آپ بھی ایسا نہیں چاہتے ہیں اور اگر مجبوری کی بات ہے تو پھر میری پسند ناپسند کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے اگر حیدر سچ کہتا ہے اور اس کے پاس اتنے روپے ہیں تو وہ یہ ذمے داری نبھا سکتا ہے۔"
"ہاں! کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمھیں پچھتانا پڑے، اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"
"پیٹ بڑا پاپی ہے سردار صاحب! سوچ بچار سے کیا حاصل ہوگا، دو وقت کی روٹی کا سہارا تو ہر صورت میں ضروری ہے۔"
"تو پھر ٹھیک ہے، اپنے بھائی سے بات کر لو۔ حیدر کو بھی ساتھ لے جاؤ، وہ خود اس سے سارے معاملے طے کرے گا۔" یہ کہہ کر میں فوراً ہی وہاں سے باہر آ گیا۔ جو بات وہ کہہ رہی تھی وہ واقعی مجھے پسند نہیں تھی اور تصویر کا دوسرا رخ میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی ایسے سہارے کی متلاشی تھی جو اس کے لیے دائمی ثابت ہو سکتا۔
میں ایک بار پھر اپنے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ "اوئے حیدر! اِدھر آ ذرا۔" وہ میری آواز پر لپکتا ہوا چلا آیا۔
"جی سردار صاحب! کیا حکم ہے جی؟"
"اوئے سب سے پہلے مجھے یہ بتا کہ تیرے پاس ساٹھ ہزار روپے کہاں سے آ گئے اور یہ سونے کا زیور بھی تیرے پاس ہے۔ یہ قصہ کیا ہے آخر؟"
"کچھ روز پہلے عالیہ اور ڈاکٹر دھمتن دے گئے تھے۔ عالیہ کے زیوروں کا ایک ڈبا بھی اِدھر ہی رہ گیا تھا۔ پھر میری عمر بھر کی تنخواہ۔ میرا خرچ تو کوئی تھا نہیں، پھر بخشیش الگ مل جاتی تھیں کلینک سے۔"
"ہوں۔ تو پھر تو تیری شادی ہو سکتی ہے۔"
"بالکل ہو سکتی ہے جناب! اور اس بالی کو تو اب میں جانے نہیں دوں گا خواہ... خواہ لگ جائیں ہتھکڑیاں... آپ دیکھیں نا جی! دیر تک وہ میرے ساتھ لان میں گھومتی رہی تو کوئی وجہ ہی تھی نا۔"
"ٹھیک ہے، وہ فون اِدھر لا۔" ایک دم بڑا اغرق آدمی ہے تو۔ اُس نے فون لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔
اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے بینک کے نمبر گھما دیے۔ مینجر ترمذی سیٹ پر موجود تھا۔ پتا یہ چلا کہ وہ چیک کی رقم منگوا چکا ہے، بولا "آپ ابھی آ جائیں، میں رقم دے دوں گا۔ میں نے اپنا اسپیشل میسنجر بھیجا تھا جناب! آپ تو ہمارے بہت پرانے کسٹمر ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور گاڑی لے کر اسی وقت بینک کی طرف چل دیا۔ بات بن رہی تھی۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ سارا کام میرے منصوبے کے عین مطابق طے پا گیا تھا اور اب میں رقم لے کر بڑے اطمینان سے قندیار جا سکتا تھا۔ ایک مشکل مرحلہ بحسن و خوبی مکمل ہو گیا تھا۔
میری بہن بھی آزاد ہو گئی تھی اور ہمیں خوشحالی بھی حاصل ہو چکی تھی اور یہ آسودگی اسی طرح مل سکتی تھی۔ کوئی ہمیں چھپّر پھاڑ کر نہیں دے سکتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک سب تیرگی کی زد میں، ہم آ چکے تھے وہ اس طرح ہی چھٹ سکتی تھی۔ یہ تیسری رقم تھی جو میرے ہاتھ آ رہی تھی۔ دھمتن بھی اسی راستے کا مسافر تھا۔ وہ سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ سرجن بن کر لوگوں کے گردے کاٹ لیا کرتا تھا۔ یعنی وہ سارے کا سارا گردن زدنی تھا۔ اس کی کوئی بھی حرکت درست نہیں تھی۔۔۔ پھر عالیہ اسے مل گئی تھی اور وہ انسان کا گوشت کھا جاتے تھے۔ وہ یہی کر رہے تھے۔ اُن کی رقم ہضم کر لینا تو بہت ہی جائز تھا اور اس سے پہلے جو رقم مجھے ملی وہ اسمگلنگ کے کسی بادشاہ کی تھی۔ وہ بھی بہت دلوں میرے کام آئی۔ اس نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور اب... اب وہ ایک گروہ تھا، ایک مکمل گروہ جو ہنر کی کھدائی کا ٹھیکہ لیتے تھے۔ لوگوں کو بیگار پر لگا کر کام لیتے تھے اور پیسہ انھیں وہ ایک بھی نہیں دیتے تھے۔ البتہ اُن کے بل کروڑوں کو چھو رہے تھے۔ اگر میں کچھ رقم اس میں سے کسی طرح لے اڑا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔
میں جب بینک پہنچا تو اس کے سامنے کا دروازہ بند تھا۔ عقبی گلی کے سامنے میں نے گاڑی کھڑی کی اور دوسرے چھوٹے دروازے سے میں مینجر کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔
"لیں شیرازی صاحب! رقم آ گئی ہے۔ آپ چیک لکھ دیں تو میں منگوا دیتا ہوں۔"
"چیک تو میرے پاس کوئی نہیں ہے، دراصل میں اس جھنجھٹ میں پڑتا ہی نہیں ہوں۔ کبھی کبھی رقم نکلواتا ہوں۔ آپ مجھے لوز چیک دے دیں۔" اُسے خاصی حیرت ہوئی پھر بھی اُس نے ایک لوز چیک مجھے دے دیا۔ کوئی پندرہ منٹ میں مجھے اُس نے رقم گنوا دی جسے میں نے بریف کیس میں بند کیا اور اسی وقت وہاں سے باہر نکل آیا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا، میں

لوٹ کر گھر نہیں گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے ٹنکی بھروائی اور پیٹرول پمپ کے فون پر میں نے کوٹھی کے نمبر گھما دیے۔ فون حیدر نے اٹھایا۔

"اوئے حیدر! یہ تو ہے؟"

"جی! جی! میں بول رہا ہوں۔"

"دیکھو! میں شام کو گھر نہیں آ رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ دو تین دن بعد آؤں گا، سمجھے! بالی کو گھر بھیج دینا۔ کوئی بے ایمانی نہیں کرنی ہے، سمجھ گئے ہو کہ نہیں؟"

"جی ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں باجے گاجے سے بیاہ کراؤں گا اُسے، آپ فکر نہیں کریں۔"

"اچھا ٹھیک ہے گھر کا خیال رکھنا اور گولی ذرا چھوٹی۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور سیدھا میانوالی کی طرف چل دیا۔ میں جلد از جلد سبیہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اُسے بڑی ضرورت تھی رقم کی۔ ڈھیر سارا روپیہ وہ اپنے حساب میں دیکھنا چاہتی تھی اور میں نے اس کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں بالکل آزاد ہوں گا۔ جس طرف چاہوں گا نکل جاؤں گا۔ وہ جو اس گاڑی کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے سکتے تھے، وہ اپنے ہی عذاب میں پھنسے تھے۔ انھیں اس کی فرصت ہی نہ ہوگی۔ گاڑی کے کاغذات اندر موجود تھے اور یہ اچھی بات تھی۔

اب کی بار میں نے قندھار جانے کے لیے راولپنڈی کا راستہ اختیار کیا۔ رات کو گیارہ بجے میں راولپنڈی پہنچا تو میں کچھ تھک سا گیا تھا۔ کھانا کھا کر میں وہیں ... ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ جب میں بستر پر لیٹا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے آرام کی بہت ضرورت تھی۔ بند بند درد کرتا تھا۔ چھ گھنٹے کی ڈرائیو تک آدمی کو ویسے ہی پاگل کر دیتی ہے۔ ہوٹل وہ بہت عمدہ تھا۔ مجھے بریف کیس کے بارے میں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ میں تمام کھڑکیاں دروازے اندر سے بند کر کے سو گیا۔

صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ بریف کیس محفوظ تھا اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ کسی نے راستے میں مجھ پر...... حملہ نہیں کیا تھا ورنہ ہر بار مجھے کسی نہ کسی عذاب سے ضرور گزرنا پڑا تھا۔ میں نے نہا دھو کر نیا جوڑا پہنا اور آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر کوئی آٹھ بجے ناشتہ کرنے کے بعد ابھی میں اخبار ہی دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب مجھے وہ کمرہ چھوڑ دینا چاہیے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ بیرا برتن اٹھا کر واپس جا چکا تھا۔ اُسے لوٹ آنے کی ایسی کیا ضرورت تھی۔ دستک بہت ہلکی سی تھی۔ اچانک اس میں تیزی آ گئی۔ دروازہ تو کھلا ہی تھا مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی کنڈی نہیں لگی ہے۔ تیسری دستک پر میں نے کہا۔ "کون ہے بھئی۔ دروازہ کھلا ہے، اندر آ جاؤ۔"

میری آواز سنتے ہی اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور وہ ایک دم اندر آ گیا۔ میں اُسے بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کوئی خاتون تھی۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس وہ خاتون بلا خیز رفتار سے اندر آئی۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیا تھا۔ آسمانی رنگ کے اسکرٹ میں ملبوس وہ خاتون بہت ہی جلدی میں معلوم ہوتی تھی۔ بال اس کے سنہرے رنگ کے تھے۔ اور عمر بھی کوئی بیس بائیس سال ہوگی۔

وہ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ لیے ہوئے میری طرف بڑھی اور بولی۔ "پلیز! میری ایک امانت اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ بریف کیس ہے۔ میں بس آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔" کوئی جواب سنے بغیر اس نے وہ بریف کیس میرے پلنگ پر ڈال دیا۔ اور جتنی تیزی سے وہ اندر آئی تھی اتنی ہی تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ میں اُسے بھاگنا ہی کہوں گا۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں نے اخبار الگ رکھا اور بریف کیس کی طرف دھیان دیے بغیر میں دروازہ بند کر کے راہداری میں جا نکلا۔ وہ خاتون اس وقت سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف لپکا مگر وہ اس قدر تیزی سے سیڑھیاں عبور کر گئی کہ جب میں پہلے زینے پر قدم رکھ رہا تھا تو وہ اس وقت ہوٹل کے بڑے دروازے تک جا پہنچی تھی۔ اسے آواز دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ نیچے ہال میں دو چار آدمی ہی بیٹھے تھے جن کو ایک بیرا بھگتا رہا تھا۔ اس خاتون کی افراتفری نے مجھے حیران کر دیا تھا اور وہ میرا اتنا زیادہ اعتبار کرتی تھی کہ اپنی ایک امانت میرے پاس رکھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے بہت عرصے سے جانتی ہو اور اُسے معلوم ہو کہ میں ایماندار آدمی ہوں۔ امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔ یہ بات گویا میرے ماتھے پر لکھی تھی۔ ابھی میں نیچے جانے کا سوچ رہا تھا کہ مجھے بڑے دروازے میں چار سپاہی اور ایک انسپکٹر نظر آئے۔ وہ بھی بہت تیزی میں تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوتے اور سیدھے کاؤنٹر تک جا پہنچے۔ اُن کو کاؤنٹر کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں سیڑھیاں عبور کر کے ہال میں جا پہنچا اور ان کی طرف توجہ دیے بغیر کاؤنٹر کے قریب جا ٹھہرا۔ انسپکٹر کوئی بہت ہی تیز طرار آدمی تھا۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر میں کاؤنٹر پر رکھے اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگا۔

"میرا نام وکیل احمد ہے۔ انسپکٹر وکیل احمد۔ آپ میرے ساتھ آئیں، مجھے کمرہ نمبر پچیس کی تلاشی لینی ہے۔"

"تلاشی! خیر تو ہے؟" کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔

"کون ٹھہرا ہوا ہے وہاں؟"

"ایک خاتون ہیں مس آرمینیا۔ امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر ہیں۔"

"ہوں! ہمارے ساتھ آئیں اور کون ہے ان کے ساتھ؟"

"اور تو کوئی نہیں ہے ان کے ساتھ۔ وہ تنہا ہیں۔"

"آئیں آپ! ہم اُن سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ کاؤنٹر کے اندر کھڑا آدمی اپنی درازیں مقفل کر کے ان کے پیچھے چل دیا۔ چاروں سپاہی اس کے عقب میں تھے۔ ہال میں بیٹھے آدمی انھیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر انسپکٹر کے پیچھے چل دیے۔ میں نے بھی اخبار الگ رکھ دیا۔ تماشا دیکھنے کا حق تو سب کو ہوتا ہے مگر میری حیثیت کچھ زیادہ ہی اہم ہو گئی تھی کہ مس آرمینیا نے ایک امانت میرے پاس رکھ دی تھی۔ اور خود وہ وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ بس میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ کوئی اچانک ہی آپ کے کمرے میں گھس آئے اور آپ کی طرف کوئی چیز پھینک کر کہے کہ جناب اسے سنبھالیں، میں ابھی واپس آ کر اسے لے جاؤں گا اور پھر وہ ایک دم باہر چلا جائے تو آپ بھی گم صم ہو کر رہ جائیں گے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اردو بول رہی تھی۔ جی ہاں، ایسی اردو جس کی شین قاف بڑی حد تک درست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ مگر یوں کہ ان بالوں کی برہمی میں بھی ایک سلیقہ تھا، ایک ادا تھی۔ اس کا ہلکا سا سراپا مجھے یاد رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ہونٹ لپ اسٹک کی آلائش سے بالکل پاک تھے۔ اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ میر کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ اُن کی نازکی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ بس اتنی سی بات مجھے یاد ہے کہ اُن آنکھوں کی طرف دیکھنے کی مجھے بہت ہی کم توفیق ہوئی تھی۔ قد اس کا کسی طرح بھی پونے چھ فٹ سے کم نہ ہوگا اور اگر میں کہوں کہ وہ سرو قد تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا مگر اس کا آندھی طوفان کی طرح آنا اور واپس جانا ایسا نہ تھا کہ میں اسے فراموش کر سکتا۔ اور وہ ایک امانت میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس بریف کیس میں کسی کا کٹا ہوا سر ہے کہ اس کا دل آشفتہ جو اس میں بند ہو کر قرار پا گیا تھا۔ عین ممکن ہے اس میں بہت بڑی رقم ہو مگر یارو کوئی اتنی بڑی رقم یونہی پھینک کر نہیں جا سکتا جب کہ اُسے معلوم ہو کہ اس کا مخاطب اُس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ مجھ پر تو اس کے رویے نے حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔

جب انسپکٹر سیڑھیاں طے کر چکا تو وہ سیدھا پچیس نمبر کمرے کی طرف چل دیا۔ کاؤنٹر کے آدمی کا نام مرزا منور تھا۔ اس کا نام مجھے یوں معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے لپکتے ہوئے ہوٹل کے مینیجر نبی احمد نے اُسے پکار کر کہا تھا۔

"او مرزا صاحب! کیا بات ہے؟ یہ انسپکٹر صاحب کس لیے آئے ہیں؟" نبی احمد کے ساتھ دو بیرے بھی اوپر آ رہے تھے۔ مرزا منور وہیں رک گیا۔

"یہ وکیل احمد صاحب آئے ہیں، صدر تھانے سے۔ کہتے ہیں کہ انھیں پچیس نمبر کمرے کی تلاشی لینی ہے۔"

"اس کا حکم انھیں کس نے دیا ہے؟ انہیں روکو۔ ہوٹل اس لیے نہیں ہوتے کہ وہ پولیس کے لیے اکھاڑہ بن جائیں۔" اس نے بڑے طمطراق سے کہا۔ وہ خاصا بالا بلند آدمی تھا۔ آواز میں بڑا ٹھسا تھا۔ میرا خیال ہے قد اس کا چھ فٹ ضرور ہی ہوگا۔ وہ عام سی قمیص شلوار میں ملبوس تھا جس پر اس نے چینی طرز کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں پانچ سو پچپن کا ڈبا اور ماچس لیے وہ یوں سیڑھیاں طے کر رہا تھا جیسے وہ انسپکٹر کو روک سکتا ہو۔ وکیل احمد وہیں رک گیا۔ چاروں سپاہی اس کے عقب میں ٹھہر گئے۔ مرزا منور اُن کے نرغے میں تھا۔

وکیل احمد کچھ نہیں بولا۔ بڑی دلچسپی سے وہ نبی احمد کو گھورتا رہا۔ وہ جیسے ہی اوپر پہنچا، وکیل احمد نے اپنا پستول تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو میاں! مجھے نہیں جانتے ہو؟"

"میں اس ہوٹل کا مالک ہوں وکیل صاحب! اور میرے مہمان بڑی عزت کے مالک ہیں۔ اور آپ ان کی تلاشی لینے آ گئے ہیں، کوئی وارنٹ ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں۔ وارنٹ بھی مل جائے گا، مجھے یہ حکم ہے کہ میں اس کمرے کی تلاشی لوں اور جو کچھ بھی ملے اسے قبضے میں لے لوں۔"

"یہ نہیں ہوگا انسپکٹر صاحب! یہ سراسر زیادتی ہے۔ میرے کسی کسٹمر کے ساتھ آپ یہ نوازش نہیں کر سکتے۔ آپ واپس چلے جائیں...... اور...... اور تلاشی کے لیے باقاعدہ وارنٹ لے کر آئیں۔ میں آپ سے کہے دیتا ہوں۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو آپ کی دھمکی میں آ جائیں گے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو نبی احمد! مجھے یہ تلاشی لینا ہے اور ابھی۔ تم میرا راستہ نہیں روک سکتے ہو۔ اس کو گرفتار کر لو۔" وکیل احمد نے ایک دم طیش میں آتے ہوئے کہا۔ "یہ سرکاری کام میں مداخلت کر رہا ہے۔" بات بہت زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا

جیسے نبی احمد کا اُس خاتون سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے ورنہ وہ یوں مزاحمت نہ کرتا۔ وہ ایک دم وکیل احمد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کہو ان سے کہ جب مجھے گرفتار کریں۔ بیں تم میں سے کسی کو کبھی یہاں سے زندہ نہیں جانے دُوں گا۔"

"اِس کو وارنٹ دکھاؤ کمال دین! تاکہ اسے پتا چلے کہ ہم بلا اجازت یہاں نہیں آئے ہیں۔ ویسے اِس کا طیش دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

کمال دین کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ اسے کھول کر اس نے ایک فائل نکال کر نبی احمد کے سامنے کر دی۔ بولا "اِس کو دیکھ لو میاں جی! کسی دھوکے میں نہ رہنا۔ ویسے تم ہمیں یاد رہو گے۔ کسی دن تم سے بھر ملاقات ضرور ہو گی۔" کمال دین کا لب و لہجہ وکیل احمد سے کہیں زیادہ تُرش تھا۔ نبی احمد نے وارنٹ کو گہری نظر سے دیکھا اور بھیگے مُرغ کی طرح گردن جھکا کر الگ ہو گیا گویا وہ انھیں راستہ دے رہا تھا جسے اُس نے اپنے وجود سے روک رکھا تھا۔

"تسلی ہو گئی تمھاری! یہ ہوٹل شوٹل میں سب خانے میں ڈال دُوں گا۔ سمجھے! مت اترانا کہ تم بڑے دولت مند ہو۔ ہم منٹوں میں بندے کو خاک شاہ کر دیتے ہیں نبی احمد! مجھے یاد رکھنا۔ پرے ہٹ جاؤ اب۔ چلو مرزا صاحب! دکھاؤ مجھے وہ کون سا کمرہ ہے اور اگر مطلوبہ شخص ہمیں نہیں ملا تو یہ وقت جو ضائع ہو گیا اِس کی قیمت نبی احمد دے گا۔" یہ کہہ کر وہ کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا سیڑھیوں کے دائیں سمت چلنے لگا۔ وہاں گیارہ سے تیس تک کمرے کا نمبر چلتا تھا اور پچیسواں کمرہ آخری کونے میں تھا اور وہ بند تھا۔ مقفل، دلِ عاشق کی طرح تاریک اور سنسان۔

"اوہ تو یہ بات ہے، اسے کھولو مرزا صاحب! اِس کی چابی کہاں ہے؟"

"وہ... وہ تو اُس خاتون کے پاس ہے۔" مرزا منوّر منمنایا۔

"ہوں۔ دوسری چابی تو آپ کے پاس ہو گی؟"

"جی نہیں۔ ہمارے تالوں کی صرف ایک ہی چابی ہوتی ہے۔"

"کیا خیال ہے نبی احمد! جب تک تم ہم سے جھگڑتے رہے اس وقت تک کسی آدمی نے اس عورت کو خبردار کر دیا تھا کہ نہیں، تمھارا ذاتی خیال کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں اِس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کسی نے اُسے فون کر دیا ہو گا۔"

"وہ کوئی چھپکلی نہیں تھی۔ اگر کمرے میں ہوتی تو آپ کے سامنے ہوتی۔ یہاں سے کوئی راستہ دوسری طرف نہیں نکلتا ہے۔ صرف سیڑھیاں ہی آدمی کو نیچے اتار سکتی ہیں۔"

"مگر تم اتنے طیش میں کیوں ہو اُستاد! کوئی ہم نے تمھاری کھوتی کو تو ہاتھ نہیں لگا دیا۔ تمھارا رویّہ میری سمجھ میں نہیں آیا نبی احمد!"

"مجھ سے بہت سوچ سمجھ کر بات کریں انسپکٹر صاحب! اپنی عزّت آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" نبی احمد بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اُن کو اُٹھا کر باہر پھینک دیتا۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی۔ وہ کسی بھی طرح اُن کا وجود برداشت نہیں کر رہا تھا۔ وکیل احمد نے پھر دروازے کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ کمال دین نے ایک لمبی سی چابی بیگ سے نکال کر تالے میں پھنسا دی۔ اب وہ زور دے رہا تھا۔ کلک کر کے وہ تالا کھل گیا۔ وکیل احمد دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر اندر گھس گیا۔ دو سپاہی دروازے میں جم کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے سامنے مس آرمینیا کا کمرہ تھا جس کے فرش پر سرمئی رنگ کا قالین بچھا تھا۔ پلنگ اُس میں ایک ہی تھا۔ سامنے سنگار میز دھری تھی۔ اس کے ساتھ میز پر ٹیلیفون رکھا تھا۔ فون کے ساتھ ایک ٹیلیویژن بھی پڑا تھا۔ ضرورت کی ساری ہی چیزیں وہاں موجود تھیں۔ پلنگ کی پائنتی کی طرف ایک میز پر ایک بڑا سا اٹیچی کیس رکھا تھا۔ عقبی دیوار کے بائیں کونے میں غسل خانہ تھا۔

وکیل احمد نے کمرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "کمال دین! وہ غسل خانہ کھول دو۔" کمال دین نے اِس کے حکم کی تعمیل کی معلوم یہ ہوا کہ غسل خانے کی پچھلی دیوار میں ایک روشن دان تھا جس کی کوئی کیل تک نہیں ہلی تھی۔ کسی کا وہاں سے فرار ہو جانا ناممکن تھا۔ کمال دین واپس آیا تو اُس نے اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کیا "اسے کھولو، کیا ہے اِس میں؟"

خود وہ دوسرے سپاہی کے ساتھ کمرے کے کونے کھدرے دیکھنے لگا۔ مگر وہاں مس آرمینیا ہوتی تو نظر آتی۔ وہ تو وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے بروقت اطلاع مل گئی تھی کہ وہاں چھاپا پڑنے والا ہے۔ کسی مخبر نے اسے متنبہ کر دیا ہو گا جب ہی وہ کمرے سے نکلتے ہی میری طرف دوڑی اور اپنا بریف کیس میرے کمرے میں پھینک کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نکل گئی۔ وہ کھا وکیل احمد کے ہاتھ کیسے آ جاتی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بریف کیس میں تھا کیا؟ جسے وہ امانت کے طور پر میرے حوالے کر گئی تھی۔ ہم ابھی تک مس آرمینیا کے دروازے پر احمقوں کی طرح پولیس کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ نبی احمد کا اضطراب البتّہ دیدنی تھا۔ وہ کھڑا کھڑا ہاتھ ملتا تھا۔ کمال دین نے بالآخر وہ اٹیچی کیس کھول دیا۔ ہم ابھی تک دروازے میں کھڑے تھے۔ دونوں سپاہیوں کا رُخ بھی کمرے کی طرف تھا اور نبی احمد

مرزا منثور اور میں اُن کے پاس ہی کھڑے تھے اٹیچی کیس کھلا، تو معلوم یہ ہوا کہ اس میں مہاتما بدھ کے پانچ مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ جن پر تازہ تازہ رنگ پھرا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی دکان سے خریدے گئے ہیں۔ اُن کے سوا اس میں اور کچھ نہ تھا۔ وکیل احمد نے اٹیچی کیس میز پر سے اٹھوا کر نیچے رکھوا دیا۔ اس کے اندر کے تمام خانے اس نے دیکھ لیے مگر وہاں سے اسے کوئی چیز نہیں ملی۔ اِن پانچ مجسموں کو اٹھا کر اس نے بڑی احتیاط سے دیکھا۔ کسی کے اندر کوئی خلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سارے مجسمے ٹھوس پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ وہ اُن کو باری باری ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاصے وزنی ہیں۔ اندازہ میرا یہ تھا کہ ٹیکسلا کے کسی پرانے کاریگر نے حال ہی میں وہ مجسمے بنا کر مس آرمینیا کو دیے ہیں۔ وہ نوادرات کی تلاش میں کسی نہ کسی طرح اس کاریگر تک جا پہنچی ہوگی۔ وہ سیاحت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خدا معلوم وہ کہاں کہاں گھوم چکی تھی۔ بالآخر اس نے اپنے لیے کوئی چیز پسند کی تو مہاتما بدھ کے مجسمے تھے۔ اُن میں سے تین تو سینے تک ڈھلے تھے اور دوسرے پاؤں تک کی خبر دیتے تھے، اس حال میں کہ مہاتما اُن مجسموں میں سیدھے گیان دھیان کی منزلوں میں نظر آتے تھے، مگر اُن پانچوں کا رنگ سرمئی اور سیاہی مائل تھا اور احساس یہ ہوتا تھا کہ ابھی ابھی کاریگر کے ہاتھ سے نکل کر وہاں پہنچے ہیں۔

وکیل احمد نے انھیں پھر سے اٹیچی کیس میں ڈال دیا۔ اب وہ کمرے کے دوسرے حصوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ سنگار میز پر زنانہ استعمال کی بہت سی چیزیں پڑی تھیں۔ لپ اسٹک، نیل پالش، ناخن تراش اور اس طرح کی کئی الابلا چیزیں۔ وہ انھیں کھول کھول کر دیکھتا رہا۔ ہر شے میں مس آرمینیا کا عکس جھلکتا نظر آتا تھا۔ پاؤڈر کے تین چار ڈبے تو ایسے تھے کہ اُن کی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ وکیل احمد نے سنگار میز کی تمام درازیں دیکھیں مگر ان میں سے اسے کام کی کوئی چیز نہیں ملی۔ اسے قطعًا یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ آخر وہ خاتون تھی کون اور اس قدر چالاکی کا مظاہرہ وہ کیسے کر گئی؟ کوئی شے اس کے پاس بہت ہی زیادہ مشکوک تھی۔ اس کی خبر تھانے والوں کو بھی مل گئی تھی جب ہی تو وہ صبح سویرے وہاں پر آ دھمکے تھے مگر وہ چیز وکیل احمد کو نہیں مل رہی تھی۔ اس سے جان چھڑا کر آرمینیا وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔ وہ چیز میرے کمرے میں پڑی تھی۔ اس طرح کہ مجھے بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں بھی تو بڑی افراتفری میں اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور اب مجھے واپس جانے کی جلدی تھی مگر میرا تجسس مجھے وہاں رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اچانک نبی احمد سپاہیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے کمرے میں جا گھسا اور بڑے طنطنے سے بولا۔ "کیوں جناب! کچھ ملا آپ کو؟ کیا چیز ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟ صرف یہ چند مجسمے جو راولپنڈی کی کئی دکانوں پر مل جاتے ہیں۔ آپ کو ہمارے مہمانوں سے یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے انسپکٹر! یہ بڑے ہی عزت دار لوگ ہوتے ہیں۔ کسی چوہڑے چمار کو ہم یہاں نہیں ٹھہراتے۔"

"تم چپ رہو نبی احمد! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے بتاؤ وہ عورت کون ہے؟"

"وہ ایک سیاح ہے۔ تین دن سے وہ اس کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کا پورا نام ڈاکٹر آرمینیا فراہیم ہے۔ وہ نیویارک میں پریکٹس کرتی ہے۔ کچھ اور بتاؤں میں آپ کو۔ اس کے پاس امریکی نائب صدر کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ہے۔ ایک تعریفی سرٹیفکیٹ۔ امریکی کانگریس کے کئی لوگ اسے جانتے ہیں۔ آپ کو کیا پتا کہ یہاں کیسے کیسے لوگ آتے ہیں۔" نبی احمد کہتے ہوئے دم پھولنے لگا۔

"اور اسی لیے وہ ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی یہاں سے فرار ہو گئی ہے۔ یہی بات ہے نا، کہ اور کچھ؟ اسے پیدا کرو نبی احمد! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمھیں پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا۔ ہماری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔"

"کیسی اطلاع؟ کیا بتایا گیا ہے آپ کو؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا استاد! ابھی تو تم اسے پیدا کرو۔ وہ جہاں بھی ہے، اسے اطلاع دو کہ اس سے وکیل احمد ملنا چاہتا ہے، پولیس اس کی تلاش میں ہے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چند لمحے پہلے تک تماشائیوں میں شامل تھا اور ہم سے بہت پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا۔ وہ سیدھا وکیل احمد کے پاس جا پہنچا، بولا۔ "سر!..... آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کون ہو تم؟" وکیل احمد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"یہ بڑے راز کی بات ہے اور آپ کے مطلب کی ہے۔ ذرا الگ ہو کر سُن لیں۔"

"آؤ ادھر غسل خانے میں چلو۔" یہ کہہ کر وہ اس آدمی کو ساتھ لے کر غسل خانے میں جا گھسا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ دونوں باہر نکلے تو وکیل احمد بڑے غضبناک انداز میں نبی احمد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتاؤ نبی احمد! کہ وہ عورت کہاں گئی ہے؟ تمھیں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ محض اس بنا پر کہ مہمان ہر لحاظ سے ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں اور ... کوئی زیادتی ان سے کی تو میں ابھی ایس پی صاحب سے ... کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا اور نیچے اُتر گیا۔

"کیا کہا تھا تم نے انوار میاں! عورت کس طرف نکل تھی پہلے؟"

"جی وہ اس طرف نکلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس ..." اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں یاد نہیں کہ وہ کس کمرے میں گئی تھی؟"

"میں اس وقت سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ وہ میرے پاس سے ... گزری تھی جب میں نیچے اُترا تو وہ بھی چند لمحوں بعد ہال ... سے گزر کر باہر نکل گئی۔ وہ بہت جلدی میں تھی۔"

"ہوں۔ ایک اٹیچی کیس تھا اس کے پاس۔ کیا رنگ تھا اس کا؟"

"جی... میرا خیال ہے سیاہ رنگ تھا اُس کا اور اسے وہ دونوں ہاتھوں سے اٹھائے ہوئے تھی وہ خاصا وزنی معلوم ہوتا تھا۔"

"اب جاؤ تم لوگ! ہٹو یہاں سے، کوئی تماشا نہیں لگا ہے یہاں، جاؤ۔" وکیل احمد ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ہم سب دروازے کو گھیر کر کھڑے تھے۔ اس کی یہ للکار سن کر لوگ دائیں بائیں کھسکنے لگے۔ اُن کے ساتھ میں بھی وہاں سے ہٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیڑھیوں کے قریب جا ٹھہرا۔ مجھے اپنے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں حالات کیا ... کیا ہو جائیں۔ تھانیدار دو سپاہیوں کو کمرے میں ٹھہرا کر ... کمروں کی طرف لپکا۔ انوار بھی اس کے ساتھ تھا مگر وہ اُن ... سامنے بیس کمروں میں سے کسی بھی کمرے کا پتا نہیں بتا ... سکتا تھا جہاں وہ عورت گئی ہو گی۔ اس کی یہی مشکل اس کی بے ... بسی کا سبب بن گئی۔ تھانیدار کو سامنے دیکھ کر وہ خواہ مخواہ ... دیکھتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ اس کا آقا ہو۔ اس کی کیفیت ایسی ... تھی۔ پتا نہیں اس کا رویہ کیوں اتنا جیران کُن تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پولیس سے کتنی کھاتا تھا۔ شاید وہ کوئی عادی ... تھا جب ہی تو پولیس کی خوشامد میں مصروف تھا۔ ... بظاہر وہ بڑا معقول آدمی دکھائی دیتا تھا۔ یہ محض اتفاق کی ... تھی کہ کئی کمرے اس وقت مقفل پڑے تھے اُن کے مکین ... کسی کام سے باہر جا چکے تھے اور تھانیدار کے لیے بہت ... مشکل تھا کہ وہ کسی کمرے کو کھول دینے کا حکم دے۔ ایک ایک کر ... کے کھلے دروازے کو دھکا دے کر کھلوا لیا۔ کسی میں کوئی ... موجود تھی اور کسی میں کوئی آدمی۔ دروازوں کے اندر ایسے ہی ... نظر ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ پوچھا اس نے کسی ... نہیں۔

تھانیدار میرے کمرے کی طرف بڑھا تو میں ایک دم سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ بڑا ہی خوفناک لمحہ تھا۔ اچھا ہوا کہ میں کمرے کو مقفل کر آیا تھا مگر... مگر کیا پتا تھا کہ وہ تھانیدار لمبی سی چابی لگوا کر اسے بھی کھلوا لیتا، اسے کون روک سکتا تھا۔ ساری بات تو اختیار کی تھی۔ وہ ذرا سا تھانیدار اس وقت خدا بن بیٹھا تھا۔ کسی میں دم مارنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ نبی احمد بھی وہاں سے ذلیل ہو کر نیچے اُتر گیا تھا۔

ابھی میں نے ہال کے فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ خاتون مجھے دروازے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے لفافے اُٹھائے ہوئے تھی جن میں پھل بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق لبوں پر ایک نیم خوابیدہ مسکراہٹ لیے ہوئے تھی۔ جیسے وہ کسی گہرے خیال میں ہو۔ کسی پرانی یاد، کسی عمدہ بات کو یاد کر رہی ہو۔ اب کی بار میں نے اسے بھرپور نظر سے دیکھا کہ کچھ اندازہ کر سکوں۔ وہ خالصتًا یورپی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی آنکھیں البتہ سیاہ تھیں۔ کسی طرف نگاہ اٹھائے بغیر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دیوار گیر آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر اچانک نبی احمد اس کی طرف لپکا۔

"میڈم!"

"اوہ آپ! کیا بات ہے، خیر تو ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔" اس نے اپنے قدم پھیر لیے۔ اب وہ نبی احمد کے

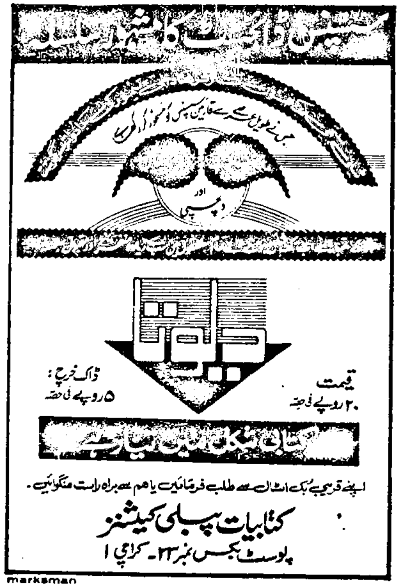

سامنے جا کھڑی تھی۔

"یہ اتنے سارے پھل آپ کہاں سے لے آئی ہیں؟"

"اتنے عمدہ پھل ہوتے ہیں آپ کے ملک میں کہ میں تو حیران رہ گئی ہوں۔ ان کو نہ کھانا کیا کہتے ہیں کفران۔۔۔" وہ لفظ ڈھونڈتی رہ گئی اور مسکرانے لگی۔

"کفرانِ نعمت۔ ہاں، کفرانِ نعمت ہوتا ہے مگر آپ کو پتا ہے کہ آپ کے کمرے کی تلاشی لی گئی ہے؟"

"کیا؟ اوہ نو۔۔۔ جو دی ہیل ہی از؟ کس نے تلاشی لی ہے میرے کمرے کی؟" اُس نے سیڑھیوں کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھا۔

"پولیس آئی ہے۔ اچھا ہوا آپ واپس آ گئیں۔ اُن سے بات کریں۔ وہ ابھی اُوپر ہی ہیں۔ انسپکٹر وکیل احمد آئے ہیں۔"

"اوہ ہیل ود ہِم! یہ کیا بکواس ہے، کیسی پولیس ہے آپ کی، آئیں میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سیڑھیاں عبور کر گئی۔ نبی احمد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ میں بھی خود کو روک نہ سکا اور اُن کے پیچھے میں بھی سیڑھیاں طے کر گیا۔ میری جان تو زیادہ ہی شکنجے میں آ گئی تھی۔ آرمینیا کا اصل مدعا تو میرے کمرے میں پڑا تھا۔ اور میں پاگلوں کی طرح وہاں اِدھر اُدھر ناچتا پھر رہا تھا اور اس سوچ میں گم تھا کہ اگر بات زیادہ ہی بڑھ گئی تو میں کیا جواب دُوں گا۔ میرے اپنے بریف کیس میں ایک خطیر رقم پڑی تھی ۔۔۔ اس کو میں پولیس کی زد سے کیسے بچا سکوں گا۔ وہ وقت میرے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ کاش میں اپنا اور اُس کا بریف کیس اٹھا کر ہی مجھے وہاں سے باہر نکل جانا مگر۔۔۔۔۔ وقت بھلا کس کے ہاتھ آیا ہے۔ میرا اپنا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ میں ایک خواہ مخواہ کی پریشانی میں پھنس رہا تھا۔

"ہے انسپکٹر! واٹ دی ہیل یُو آر ڈوئنگ ہیر؟ میرا کمرہ کس نے کھولا ہے؟ آپ کو۔۔۔ آپ کو جرأت کیسے ہوئی؟" اس نے انسپکٹر وکیل احمد کو للکارتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت تک اس کے کمرے کے دروازے تک واپس جا چکا تھا۔ مس آرمینیا کا اندازِ گفتگو حیران کن تھا۔ وہ بہت اچھی اُردو بولتی تھی۔ وکیل احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک دو لمحے تو وہ اسے بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی بھی وہی کیفیت ہو گئی تھی جس کا میں تجربہ کر چکا تھا۔ وہ بھی جواب کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ آرمینیا اس کے پاس سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ دو سپاہی ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔

"مجھے یہ حکم ہے میڈم! کہ میں آپ کو گرفتار کر لوں، وارنٹ میرے پاس ہے، یہ دیکھ لیں۔" وکیل احمد نے اپنی خیرہ نگاہوں کو اُس سے چھپاتے ہوئے ایک کاغذ مس آرمینیا کے سامنے کر دیا۔

"مگر کیوں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے آخر؟ یہ سراسر زیادتی ہے، یہ حکم کس نے لکھا ہے؟"

"باقی باتیں تھانے میں چل کر ہوں گی۔ آپ پر ہیروئن کے کاروبار کا الزام ہے میڈم!"

آرمینیا تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ کسی بھی قیمت پر گرفتار نہیں ہونا چاہتی تھی مگر دونوں سپاہی اس کے دائیں بائیں ہو گئے تھے اور وہ زبردستی اسے ہتھکڑی پہنا رہے تھے۔

"اوہ ڈیم اِٹ۔ یہ کیسا ملک ہے، تم چاہتے کیا ہو مجھ سے آخر؟ کیا ملا ہے تمہیں میرے کمرے سے؟ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"مجھے افسوس ہے میڈم! ثبوت بھی ہم آپ کو دے دیں گے۔ لے چلو تھانے۔ آپ کا کوئی ضمانتی ہو تو اسے اطلاع دے دینا۔ یہ نبی احمد بہت بڑا ہمدرد ہے آپ کا۔ اس سے تو میں بعد میں نمٹوں گا۔"

یہ کہہ کر وکیل احمد نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر پڑا اٹیچی کیس ساتھ رکھ لے اور خود وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ سپاہیوں نے مس آرمینیا کو ہتھکڑی لگا کر زبردستی نیچے اتارا اور وہ فوراً ہی بڑے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مس آرمینیا نے سیڑھیاں اُترتے وقت ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر اُس نے منہ پھیر لیا۔ انداز اُس کا ایسا تھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ کیا مخبری تم نے کی ہے؟ وہ بریف کیس میں نے تمہارے ہی کمرے میں رکھا تھا، تم نے پولیس بُلا لی۔ یہ کیسا اندھیر مچایا تم نے۔ وہ یہی کہہ رہی تھی مگر۔۔۔ مگر شاید وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ اُس نے رُخ دوسری طرف پھیرا تو میرا خیال ہے، وہ زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ دوبارہ اس نے کسی طرف دیکھا ہی نہیں دیا مگر عین ممکن ہے وہ مجھے پہچان ہی نہ سکی ہو۔ وکیل احمد اسے ہتھکڑی لگا کر لے گیا تھا۔ اور نبی احمد بس ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہوٹل کو سنبھالتا کہ آرمینیا کے مقدمے کی پیروی کرتا۔

"میں دیکھ لوں گا، ان سب کو دیکھ لوں گا۔ یہ میرے ہوٹل کو ذلیل کر دینا چاہتے ہیں۔ کسی کی عزت ہی یہاں محفوظ نہیں تو پھر وہ کیوں ٹھہرے گا یہاں۔۔۔" بڑے غصے میں یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں جا گھسا۔

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ آرمینیا کے اس بریف کیس سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کس کسی نے دیکھا تھا۔ پھر بھی میں جی کڑا کر کے دروازے کی طرف چل دیا۔ خواہ مخواہ ہی اس احساس نے مجھے پریشان کر دیا تھا کہ اس بریف کیس کو ہاتھ لگانا میرے لیے عذاب بن جائے گا۔ دروازہ میں نے بڑی احتیاط سے کھولا جیسے میں وہاں نقب زنی کے لیے داخل ہو رہا ہوں۔ اس عورت نے مجھے ایسی افراتفری میں مبتلا کر دیا تھا کہ کسی بھی بات پر میرا یقین نہیں جم رہا تھا۔ دروازے کو اندر سے مقفل کر کے میں نے بستر پر نظر ڈالی۔ بریف کیس سامنے ہی رکھا تھا۔ میں اس کی طرف یوں بڑھ رہا تھا جیسے اس کے اندر۔۔۔۔۔۔۔ کسی نے دستی بم رکھ دیے ہوں جو ہاتھ لگاتے ہی مجھے پرزہ پرزہ کر دیں گے۔ کمرے کی عقبی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ان پر گرل لگی ہوئی تھی اور وہ خاصی گھنی گرل تھی جس کو کاٹ لینا آسان نہیں تھا اور پھر وہ کمرہ دُوسری منزل پر تھا۔ کوئی آدمی پچھلی طرف سے اوپر نہیں آ سکتا تھا۔ اگر آتا بھی تو اُسے کمرے کے اندر آنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی۔

بریف کیس بالآخر میں نے اُٹھا لیا۔ وہ خاصا وزنی تھا اور اُس میں تالے لگے ہوئے تھے۔ اُسے ضرب لگائے بغیر کھول لینا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اس وقت صرف اپنے ہی بریف کیس کی چابی تھی۔ دُوسری چابی کمرے کے قفل کی تھی۔ ابھی میں وہ چابی لگا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"کون ہے بھئی!" میں نے بستر سے اچھل کر بریف کیس ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ میں اسے کسی جگہ چھپا دینا چاہتا تھا۔ مگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"میں جمعدار ہوں جی! صفائی کے لیے آیا ہوں۔"

"لُٹ جائے تیرا بیڑا غرق۔ یہ کوئی صفائی کا وقت ہے۔۔۔ کھوتے کے پتر! اسے بھی ابھی وہاں پہنچنا تھا۔ حد ہو گئی۔" میں نے بریف کیس پھر بستر پر ڈال دیا۔

"ذرا ٹھہر کے آنا جمعدار! میں خود اندر جا رہا ہوں۔"

"جی بہت اچھا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ گیا۔ حد ہو گئی بھئی! اب جمعدار بھی مجھے ڈرانے لگا ہے اور حالت یہ تھی کہ بریف کیس میں مجھ سے چابی نہیں لگ رہی تھی پھر بھی میں اس کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ چوتھے جھٹکے پر کلک ایسی آواز پیدا ہوئی اور بریف کیس کھل گیا۔ اس کے اندر پلاسٹک کے لفافوں میں سنہری پنّی میں لپٹے ہوئے تہ در تہ لفافے پڑے تھے اور بس۔ کوئی نوٹ شوٹ اس میں نہیں تھا۔ وہ ہیروئن تھا کہ میں نے ہیروئن کو اتنی صاف ستھری حالت میں دیکھا۔ لفافہ ذرا سا کھول کر میں نے اس میں موجود سفوف انگلی پر ڈال کر دیکھا۔ صُورت اس کی دوا ایسی تھی ۔۔۔ گویا میں

آرمینیا اس بریف کیس کو پولیس سے بچانے کے لیے میرے کمرے میں گھس آئی تھی اور اپنی شدید ذہنی افراتفری میں اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کس دروازے میں داخل ہو رہی ہے اس کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد تھے مگر جس گرفتاری سے وہ بچ رہی تھی وہ تو بہرحال ہو کر رہی۔ وہ اس اعتماد پر ہوٹل میں آ گئی تھی کہ پولیس اب اُسے کچھ نہیں کہہ سکے گی کیونکہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جا سکے مگر پھر بھی وکیل احمد اسے باندھ کر لے گیا تھا۔ حالاں کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آرمینیا کا اعتماد اس نے واقعی مجروح کر دیا تھا۔ ورنہ وہ جس طنطنے اور طمطراق سے بات کر رہی تھی، وکیل احمد کو اس پر تو کھلا جانا چاہیے تھا۔ وکیل احمد نے نبی احمد کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بے چارہ چیختا ہی رہ گیا کہ اس کے مہمانوں کو ذلیل نہ کرو مگر۔۔۔ مگر جب ہوٹل میں ایسے مہمان آئیں گے تو پھر ان کو بچا لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اُن لفافوں کو نکال کر میں نے بستر پر ڈال دیا تو معلوم ہوا کہ اس کے نیچے ایک اور تہہ موجود ہے جس پر موٹے پلاسٹک کا پردہ چڑھا دیا گیا تھا۔ اُسے جب میں نے کھولا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر امریکی ڈالر موجود ہیں۔ تو یہ قصہ ہے۔ بریف کیس بہت زیادہ قیمتی ہو گیا تھا۔ اُن نوٹوں کو میں نے گنا تو معلوم ہوا کہ وہاں سو سو ڈالر کی بیس گڈیاں رکھی تھیں اور اُن دنوں ایک ڈالر شاید دس روپے میں ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک اور بڑی رقم میرے ہاتھ آ گئی تھی مگر اس کی مجھے ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھ سے وہ ایک کروڑ روپیہ ہی کہیں ٹھکانے لگ جاتا تو وہی بہت کافی تھا۔

بریف کیس میں نے بند کر دیا۔ میرے کمرے میں اس کی موجودگی میرے لیے عذاب بن سکتی تھی مگر حالات ایسے تھے کہ میں کسی بھی طرح اسے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ اس ہیروئن کی قیمت خدا جانے کیا تھی، اتنا مجھے معلوم تھا کہ اس کا ایک ایک پیکٹ لاکھوں روپوں میں بک جاتا ہے اور یہ قیمت سمندر پار کے ملکوں میں لگتی تھی۔ ابھی تو وہ اپنے ہی ملک میں تھی اور یہاں سے وہ چند ہزار میں مل جاتی ہو گی۔ بریف کیس میں سولہ لفافے تھے۔ ہر لفافے کا وزن کم از کم چار چھٹانک تو ضرور ہی ہو گا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارہ حاصل کروں۔ عین ممکن تھا پولیس کے آدمی باہر موجود ہوں۔ اگر میں یہ بریف کیس اسی حالت میں لے کر باہر نکلا تو وہ اسے ضرور پہچان لیں گے۔ باہر میری کار تو موجود ہے مگر اس تک پہنچنا بھی آسان نہ ہو گا۔ میں اگر اس بریف کیس کے مال کو کسی گٹھڑی میں باندھنا

ہُوں تو بھی معاملہ مشکوک ہو جائے گا اور میرے اپنے بریف کیس میں ہے ہی نہیں تھی۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ کئی سگریٹ میں نے اس عرصے میں پھونک ڈالے مگر بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ رات سے میں وہاں ٹھہرا ہُوا تھا مگر ابھی تک کسی نے بھی مجھے فون نہیں کیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے بڑی احتیاط سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی آدمی بول رہا تھا۔

"ہیلو!"

"کیا یہ رُوم نمبر پینتالیس ہے؟"

"جی ہاں۔ کون صاحب؟"

"کیا سردار کریم نواز بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں میں بول رہا ہوں۔"

"دیکھیں، میرا نام آبادشاہ ہے۔ آپ کے پاس ہماری ایک امانت پڑی ہے۔ یہ اچھا ہے کہ وہ آپ کے پاس ہے۔ آپ براہِ کرم اسے اپنے ساتھ لے کر ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔ آپ کو ایک اور بریف کیس دے دیا جائے گا، اُسے آپ اس میں رکھ لیں۔ ایئرپورٹ پر اُسے آپ ایئرہوسٹس مس شمیم کو دے دیں۔ وہ آپ کو وی آئی پی رُوم کے سامنے ملیں گی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں آپ کے باپ کا غلام جو ٹھہرا۔ سُن اوئے آبادشاہ! اوّل تو تم لوگوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے جس سے میں پریشان ہو گیا ہُوں۔ میں تمھاری یہ امانت سیدھی پولیس کے حوالے کر رہا ہوں، سمجھے! دُوسرا فون میں پولیس اسٹیشن ہی کروں گا۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے میرے بادشاہ! ہمارے حکم کی تعمیل ہونی چاہیے، ہر حال میں، سمجھے! کہ نہیں؟ دوسرا بریف کیس ابھی آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک دم فون بند کر دیا۔ اور میں ریسیور کو گھورتا ہی رہ گیا۔ حد ہو گئی یعنی مجھے ان لوگوں نے گدھا ہی سمجھ لیا تھا۔ ایک آسان آسامی۔ کبھی کچھ تو سوچا ہوتا تم نے۔ کس سے پنجہ لڑا رہے ہو! تمھارا خیال ہوگا کہ میں گویا واقعی کوئی سردار کریم نواز قسم کی چیز ہوں، کمال ہے! یعنی وہ غلام جیلانی ایک دم پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ تو بہرحال مجھے نہیں جانتے تھے۔ مگر انھیں اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ کسی مہاجال میں تو نہیں پھنس رہے ہیں۔ انھیں کسی نہ کسی طرح مس آرمینیا نے بتا دیا ہوگا کہ وہ بریف کیس کس کے پاس ہے یعنی کوئی آدمی بہت قریب سے حالات کا مشاہدہ کر رہا تھا مگر وہ ابھی تک میرے سامنے نہیں آیا تھا اور میں وہاں اُلّوؤں کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آبادشاہ کو بھی معلوم تھا کہ بریف کیس کا رنگ بدل جانا چاہیے کیونکہ باہر سفید کپڑوں میں پولیس کھڑی ہوگی اور وہ ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھ رہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ٹیلی فون ابھی تک محفوظ تھا۔ اس پر اُن لوگوں نے کوئی آدمی نہیں بٹھایا تھا ورنہ آبادشاہ مجھ سے ایسی بات ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آواز بڑی گونجدار تھی۔ آدمی وہ بہت ہی جی دار معلوم ہوتا تھا۔ بڑی کراری، چٹختی آواز میں بات کرتا تھا جس میں ایک عجیب قسم کا تحکم پایا جاتا تھا اور وہ مجھے دہلا دینا چاہتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں فون پر اُس کی آواز سن کر لرز جاؤں گا۔ مگر۔۔۔ مگر ایسے تو میں نے بہت دیکھے تھے۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے؟

ابھی میں پلٹ کر بستر تک پہنچا ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میری سانسیں رُکنے لگیں۔ پتا نہیں حالات کیسے کیا ہو جائیں۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس پر سائلنسر چڑھا تھا۔ بلجیئم کا بنا ہوا وہ پستول بہت ہی ہلکا اور بے آواز تھا۔ میرے پہلے "چپ شاہ" کی طرح کام کرتا تھا۔ گولیاں اس میں نو آتی تھیں اور اس گھڑی وہ لبالب بھرا تھا۔

"کون ہے؟"

"جمعدار ہوں صاب جی!"

"بہت تیرے کی۔" یہ سالا پہلے بھی آیا تھا۔ پتا نہیں ان لوگوں سے کیسے چھٹکارہ مل سکے گا۔ بریف کیس کو میں نے کمبل کے نیچے دبا دیا اور پھر اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ واقعی جمعدار ہی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دُوسرے میں ایک بڑی سی پلاسٹک کی بالٹی پکڑ رکھی تھی جس پر ڈھکنا لگا ہوا تھا۔

"میں پہلے بھی آیا تھا جی، آپ اس وقت غسل خانے میں رہے تھے صاب جی۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے پتا ہے چلو اپنا کام کرو۔" میں نے اسے اندر گزار کر دروازہ مقفّل کر دیا۔ میں شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ شاید میری قوتِ فیصلہ مفلوج ہو گئی تھی۔ میں وہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا مگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جمعدار غسل خانے میں جانے کے بجائے کمرے کے وسط میں ٹھہر گیا۔ بولا "صاب جی! آپ کے لیے میرے پاس ایک چیز ہے جی! یہ۔۔۔ یہ دیکھیں۔" اس نے بالٹی کا بڑا سا ڈھکنا اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُدھر جو نظر ڈالی تو اُس وقت بالٹی میں سے ایک سلیٹی رنگ کا بڑا سا بریف کیس نکال رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تجھے کس نے دیا ہے؟"

"یہ دراصل صاب جی! ایک آدمی مجھے دے گیا ہے انعام کے طور پر اس نے مجھے پانچ سو روپے بھی دیے تھے جی! پانچ منٹ پہلے وہ مجھ سے ملا تھا۔"

"تو یہ بات ہے۔ تم یہ کام بھی کر لیتے ہو؟"

"نہیں جی۔ میں تو نوکر ہوں۔ جو کام کوئی کہتا ہے کر دیتا ہوں جناب!"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"جی میرا نام ڈیلوڈ ہے۔"

"یہ بالٹی کہاں سے لی تھیں؟"

"جی یہ ہوٹل والوں کی ہے۔ سارا گند میں اسی میں بھر لیتا ہوں۔"

"مگر آج تو یہ بہت صاف ستھری ہے۔"

"میں اسے دھو دھلا کر نکلا تھا جی! ابھی تک اس میں میں نے کوئی چیز نہیں ڈالی۔"

"ہوں۔ یہ بریف کیس تمھیں کس نے دیا ہے؟"

"ایک آدمی تھا جی وہ۔ مجھے ہوٹل کے باہر کوڑے کے ڈھیر کے قریب ملا تھا، اس نے یہ بریف کیس مجھے دے دیا۔ وہ اسے کپڑے میں لپیٹ کر لایا تھا۔ بولا، اسے پینتالیس نمبر کمرے میں پہنچا دو، اس بالٹی میں رکھ کر۔"

"اس کا نام نہیں جانتے ہو تم؟"

"جی نہیں۔ نام تو اس نے نہیں بتایا ہے۔"

"حلیہ کیا تھا اس کا؟"

"جی وہ۔۔۔ وہ تو بہت سوٹڈ بوٹڈ آدمی تھا جی! فرفر بات کرتا تھا۔ آواز اس کی بڑی تیز تھی اور مونچھیں اس کی بہت گھنی تھیں۔ میں بس یہی دیکھ سکا جی بس۔"

"اور تم نے اس سے پانچ سو روپے لے لیے۔"

"میں کیا کہوں جی! میں نوکر جو ٹھہرا۔ اس نے بڑی مختصر بات کی۔ کہا کہ یہ پینتالیس نمبر کمرے میں دے دوں، انعام پانچ سو روپے اور بس۔ عجیب ہی آدمی تھا جی وہ۔ پتا نہیں وہ مجھے کب سے تاڑ رہا تھا۔"

"تم ایک کام کرو ڈیلوڈ! میں تمھیں یہ دوسرا بریف کیس دیتا ہوں، اسے تم اسی بالٹی میں رکھ کر سیدھے اپنے گھر لے جاؤ۔ کہاں رہتے ہو تم؟"

"ہوٹل کے پیچھے جمعداروں کے کچھ کوارٹر ہیں، میں تین نمبر میں رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اسے تم اپنے کوارٹر میں لے جاؤ، بیوی ہے تمھاری؟"

"جی نہیں۔ میری ماں رہتی ہے وہاں۔ وہ آج کل بیمار ہے۔ اس کی دوا دارو میں لگا رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بریف کیس تم اسی طرح چھپا کے لے جاؤ۔ میں کسی وقت تم سے آ کر لے لوں گا۔ سمجھے! اور یہ لو، ایک ہزار روپیہ۔ یہ تمھارا انعام ہے، اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"پر جی وہ۔۔۔ کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ اس میں؟"

"نہیں کوئی خطرہ نہیں ہے ـــــ جلدی کرو۔" میں نے کمبل کے نیچے سے وہ بریف کیس نکال کر اس کی بالٹی میں رکھ دیا اور اس سے سلیٹی رنگ کا بریف کیس لے کر الگ ڈال دیا۔

"اب جاؤ تم۔ سمجھو صفائی ہو گئی۔ اسے تم سیدھا اپنے کوارٹر میں لے جاؤ۔ کہیں رُکنا نہیں ہے۔ کوئی پُوچھے تو کہہ دینا کہ تم بالٹی اندر لینے جا رہے ہو۔ اس کے بعد تم یہ کپڑے تبدیل کر کے بریف کیس لے کر سیدھے اسلام آباد ہوٹل جا پہنچو گے۔ میں تمھیں وہیں ملوں گا۔ پُوری ٹیکسی لے لینا کرایہ میں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! پر لگتا ہے اس میں بڑا خطرہ ہے، چار سو چالیس یاد رکھنا۔"

"نہیں ڈیلوڈ! گھبراؤ نہیں۔ میں بہرحال تم سے وہیں ملوں گا، اسلام آباد ہوٹل کے گیٹ پر۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! میں پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے بالٹی پر ڈھکنا رکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہُوا وہ باہر نکل گیا۔ میں راہداری میں نکل کر اسے سیڑھیوں میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ جب وہ نیچے چلا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔ میں ہر حال میں پولیس سے بچ جانا چاہتا تھا۔ خدا معلوم کون کس وقت مجھے پہچان لے اور میری جان مزید عذاب میں پھنسا دے۔ میں تو پہلے ہی داغی آدمی تھا۔ مجھے تو ہر قدم پر زبردست احتیاط کی ضرورت تھی۔ میرے نقشِ کفِ پا تو بڑی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کون جانے کس وقت کسی کی نظر کام کر جائے۔ اور میں پہچان لیا جاؤں۔ ایسے میں کون یقین کرے گا کہ میں غلام جیلانی نہیں، سردار کریم نواز ہُوں۔ مرحوم ستنا جالہ نے مجھے نیا نام تو دے دیا تھا مگر میری صُورت تو وہ نہیں بدل سکا تھا۔ میں تو وہی تھا، جن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ؎

کس طرف جائیں، کہاں نکلیں کہ تم رسوا نہ ہو
ہم تو دیوانے ہیں، دیوانوں سے دنیا آشنا

حالت میری ایسی ہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد میں اپنا اور اُن کا دیا ہوا بریف کیس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تبھی احمد کے آدمی کو کمرے میں بلا کر میں نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا تھا اور اب میں ہر طرح سے آزاد تھا۔ دونوں بریف کیس میرے ہاتھوں میں تھے۔ اُن کو لے کر میں بڑے اطمینان سے ہوٹل سے باہر نکلا اور سیدھا اپنی گاڑی تک جا پہنچا۔ ہوٹل کے باہر پولیس کے آدمی سفید

کپڑوں میں کھڑے تھے۔ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے مگر جس بریف کیس کی ان کے سامنے نشاندہی کی گئی تھی، وہ میرے پاس نہیں تھا اور یہی بات میری بچت کا سبب بن رہی تھی۔ وہ بڑے کائیاں لوگ تھے، ہر بات پر نظر رکھتے تھے بالخصوص اُس جیسے ہوٹل کے سامنے ٹھہر کر انھیں کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ پولیس میں بالعموم گاؤں کے لوگ ملازم رکھے جاتے ہیں اُن میں بیشتر ان پڑھ ہوتے ہیں۔ انھیں بسا اوقات شہروں میں آ کر حالات کو سمجھنے میں بڑی دیر لگ جاتی ہے — زیادہ تر مجرموں کی کامیابی کی وجہ یہی ہے کہ وہ سیدھے سادے نیم خواندہ سپاہی ہماری عیّاریوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور جب سمجھتے ہیں تو اس وقت تک کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے، جرائم پیشہ لوگ بہت آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ان کی تکنیک بدل جاتی ہے، رویّہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ پولیس اگر شاخ شاخ چھپتی ہے تو مجرم پتّہ پتّہ چل کر دُور نکل جاتا ہے۔

دونوں بریف کیس میں نے دوسری سیٹ پر ڈالے اور گاڑی لے کر میں ایئرپورٹ جانے کے بجائے سیدھا اسلام آباد کی طرف چل دیا۔ پتا نہیں مجھے کیوں یہ یقین تھا کہ ڈیوڈ وہاں ضرور پہنچے گا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ، اس کی مسکراہٹ اور اس کا انداز مجھے یہی بتاتے تھے کہ وہ ہر حال میں مجھے وہاں مل جائے گا۔ اپنا قیمتی بریف کیس میں اُسے دے آیا تھا جس میں سو سو ڈالر کی بیس گڈیاں موجود تھیں۔ یہ بہت بڑی رقم تھی جسے میرا خیال ہے کہ مس آرمینیا نے مزید سودے کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ وہ ابھی مال خرید رہی تھی، کہ کسی نے اس کے بارے میں مخبری کر دی۔ عین ممکن ہے، کچھ مال پولیس کے ہاتھ آ چکا ہو، شاید وہ ایئرپورٹ سے اطلاع ملنے پر یہاں آئے تھے کیونکہ ابھی مس آرمینیا شہر سے کچھ اور مال خریدنے کی کوشش کر رہی ہوگی، میرا یہی اندازہ تھا۔ اگر وہ اپنے پورے ڈالر خرچ کر چکی ہوتی تو اب تک وہ وہاں سے چلی گئی ہوتی۔ مگر بریف کیس ابھی تک نوٹوں سے لبالب بھرا ہُوا تھا اور اس کے گروہ کے لوگ اس کے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کسی آبادشاہ کو اطلاع مل گئی تھی کہ ہُوا اکیلا ہے، جب ہی تو اس نے مجھے فون کیا تھا۔ انداز اس کا بڑا ہی دھمکی آمیز تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ہوٹل کے اردگرد موجود ہوں گے۔ کوئی تو ایسا تھا جس نے ڈیوڈ کو وہ بریف کیس دے کر اندر بھیجا تھا۔ اس کے ساتھی بھی وہیں ہوں گے۔ یہی سوچ کر میں نے گاڑی کو جب مال روڈ پر دوڑایا تو دونوں عقب نما آئینوں پر میری نگاہ جمی رہی، میرے پیچھے بڑی ٹریفک آ رہی تھی۔ اُن میں کاریں بھی تھیں اور ویگنیں بھی۔ بسیں بھی تھیں اور اسکوٹر بھی۔ کوشش کے باوجود میں صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہ کر سکا۔ مجھ پر بہت سی نگاہیں جمی تھیں۔ ہر کوئی دوسرے کو دیکھ کر گزرتا ہے۔ کبھی کبھار تو یہی دیکھنے کے لیے لوگ نظریں نہیں ہٹاتے کہ یہ گاڑی کس ماڈل کی ہے اور اس میں سوار کون ہے۔ کوئی چوہڑا ہے کہ کھنگی، کوئی معزز آدمی ہے کہ گھسیارا۔ ہاں، کبھی کیا اکثر اوقات یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں تو پھر بھی خاصا معقول آدمی نظر آتا تھا۔ اور بہت سے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے لیکن اُن میں مس آرمینیا کے ساتھی کون تھے اس کا میں تعیّن نہ کر سکا۔ اور میرے آگے پیچھے ٹریفک چلتی رہی۔

مگر جیسے ہی میں ریلوے پُل کے نیچے سے گزرا تو مجھے محسوس ہوا کہ ایک ٹویوٹا کرولا میں دو آدمی مجھے بہت گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ وہ گاڑی مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی تو میں نے لہانک بائیں سڑک کا رُخ کیا، وہاں چھوٹی سی ملٹری بیرکس بنی ہیں، اُن کے پاس سے گزر کر گوالمنڈی کی طرف جا نکلا اور گاڑی میں نے ایک گلی میں ڈال دی۔ وہ خاصی چوڑی گلی ہے، گاڑی آرام سے گزر سکتی تھی۔ میں اُسے کر آگے نکلا تو گلی ایک دم ختم ہو گئی۔ سامنے لی تھی اور بائیں ہاتھ ایک مکان کا عقبی حصہ جس کے گرد چھوٹی سی دیوار بنا دی گئی تھی مگر دروازہ اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گاڑی اس حصے میں لے جا کر کھڑی کر دی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اُن دونوں آدمیوں کو ٹھیک پہچانا تھا۔ وہی میرے پیچھے لگے تھے بظاہر وہ بھی بہت معقول آدمی دکھائی دیتے تھے مگر ایک کے کوٹ کے نیچے مجھے پستول کی پیٹی صاف نظر آ گئی تھی۔ دُوسرا بھی مسلح ہی ہوگا اور اُن سے میرے لیے بچ جانا بہت ضروری تھا۔ انھیں معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ ڈیوڈ کی زندگی کو میں خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ خود میری زندگی بھی اُن کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھی۔ میں تو خواہ مخواہ ہی اُن کے فساد میں پھنس گیا تھا مگر اُس رقم کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکا اور میری نیّت بدل گئی۔ ایسوں کا مال ہضم کر جانا تو بہت ہی عمدہ بات ہے۔ پھر میں کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس رقم کو روپوں میں بدلوا کر بینک میں ڈال دوں گا۔ اتنی رقم آ گئی تھی میرے پاس کہ ہم بڑے آرام سے دو پشتوں تک زندگی یوں گزار سکتے تھے جیسے کوئی رئیس ابن رئیس گزارتا ہے اور یہ اچھی بات تھی، ایسے موقعے بار بار کہاں ملتے ہیں اور پھر میری قسمت میں شاید ایسی ہی رقمیں لکھی تھیں۔ کم از کم پہلی بڑی رقم جو مجھے ملی وہ تو ایسے ہی لوگوں کی تھی اور وہ میرے بہت کام آئی تھی۔

گاڑی بند کر کے میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو وہاں ایک بڑھیا دیوار کے پاس بیٹھی دکھائی دی، وہ احاطہ اسی کا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اُس کے سامنے ایک چنگیر میں ماش اور چنے کی دال پڑی تھی جسے وہ چُن رہی تھی۔ وہ چنگیر چھوڑ کر چارپائی سے اُٹھ گئی۔ اس کی کوٹھری اس کے عقب میں فرا رہی تھی۔ اس اثنا میں میں نے گاڑی کی ڈِکی میں سے ایک بڑے رنگ کا بڑا سا کارکور نکال لیا۔ اس کا مجھے علم تھا کہ وہ گاڑی میں موجود ہے۔ بڑھیا تیزی سے لپکتی ہُوئی میری طرف آئی تو میں نے اس کو وہیں روکتے ہوئے ”سلام ماں جی! میں یہ گاڑی یہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میں شیخ اسلم صاحب کا بھانجا ہوں، لاہور سے آیا ہوں۔“ میں نے گلی میں ایک مکان پر لکھے شیخ محمد اسلم کا نام پڑھ رکھا تھا۔ وہ شیخ صاحب کا نام سُن کر ایک دم کھِل اٹھی۔

”اچھا اچھا! اُدھر کوئی جگہ نہ ہوگی نا؟“

”ہاں۔ بات یہی ہے ماں جی! میں کچھ دیر بعد اسے لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے گاڑی کو پوری طرح ڈھانپ دیا، یہاں تک کہ اس کے پہیّے بھی چھُپ گئے۔

”میں بھی کہوں، یہ کار والا کون آ گیا ہے میرے گھر؟ فکر نہ کر بیٹا! میں اس کا خیال رکھوں گی۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ماں جی! مجھے ذرا کام ہے، میں پھر آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں اپنا بریف کیس اٹھا کر وہاں سے نکلا اور عقبی گلی میں جا گھسا۔ میرا تعاقب کرنے والے دونوں آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے مگر جیسے ہی میں اگلی گلی میں سے گزر کر پھر بڑی سڑک پر پہنچا تو وہ ٹویوٹا مجھے دوبارہ نظر آئی۔ وہ دونوں آدمی اس میں موجود تھے اور بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں ایک دکان کی اوٹ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے نکلتے چلے گئے۔ لگتا تھا وہ سیدھے گوالمنڈی کا پل عبور کر کے ڈی اے وی کالج روڈ پر جا پڑیں گے۔

”خس کم جہاں پاک۔ ان بدبختوں کو تو اُدھر ہی رہ جانا چاہیے ورنہ یہ مجھے مال ہضم نہیں کرنے دیں گے۔ ایک دفعہ میں قندیا پہنچ جاؤں پھر خیر ہے۔ یہ کبھی میری ہوا تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔“

نہیں کیا علوم کہ اُن کا واسطہ کس سے پڑا ہے ـــــــ اگر یہ تلنگے ہیں تو میں بھی تلنگا تھا۔ پھر یہ کبھی کسی اجنبی پر یوں اندھا دھند اعتبار نہیں کریں گے مگر وہی غلطی مجھ سے بھی شاید سرزد ہو چکی تھی جس کے وہ مرتکب ہُوئے، وہ خاتون مرتکب ہوئی۔ میں نے بھی اُس ڈیوڈ پر اندھا دھند اعتبار کر لیا تھا۔ کوئی پوچھے ”میاں! تم نے وہ بریف کیس اُسے کیوں دے دیا؟ وہ اگر اسلام آباد ہوٹل نہ پہنچا، کہیں راستے میں ہی اُن کے ہتّے چڑھ گیا۔ یا اس کی اپنی ہی نیّت خراب ہو گئی تو پھر۔۔۔۔ تجھے کتنے نفلوں کا ثواب ہوگا؟ تُو کیسے اُس کو اتنا ایماندار سمجھ رہا ہے؟ کیا ثبوت ہے تیرے پاس؟ ایک اس کی آنکھوں میں ذرا سی جھلملسی دیکھ کر تُو نے بریف کیس اس کو دے دیا۔ آنکھوں سے کیا ہوتا ہے، اور یہ جمعدار اور اس قماش کے لوگ تو زمانے کی ٹھوکروں میں رہ کر ویسے ہی بھلے مانس بن جاتے ہیں یا نظر آتے ہیں۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ وہ ایماندار اور نیک بھی ہوں گے، اگر اُس کی نیّت میں فتور آ گیا یا اُن لوگوں نے اس کو کوارٹر ہی میں چھاپ لیا تو تیرے ہاتھ کیا آئے گا غلام جیلانی؟“ مجھے گجرات کے کالے بابا کی اُس چھوکری کا دیا ہُوا نام یاد آ گیا۔ عجیب لڑکی تھی وہ بھی اور مجھے وہ یاد بھی آتی تو کہاں آئی؟ وہ اتنی تیز تھی کہ مجھے ساتھ لے کر وہ لحد میں اُتر گئی۔ اس کی یاد نے میرے ذہن کو عجیب طرح کی پُراسرار خوشی سے سرشار کر دیا اور میں ایک نئے عزم کے ساتھ دکان کی اوٹ سے نکل کر سڑک پر جا ٹھہرا۔ ٹیکسی سامنے ہی کھڑی تھی۔ میں کچھ پُوچھے بغیر اس میں جا بیٹھا۔

”چلو، اسلام آباد چلو مگر مجھے بہت جلدی ہے، اتنی بات یاد رکھنا۔“

گاڑی کا انجن چل ہی رہا تھا، اس نے فوراً ہی اُسے آگے بڑھا دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کو ٹاپ گیئر میں ڈال کر بولا ”اُدھر کوئی آگ تو نہیں لگ گئی ہے صاحب؟“

”اوئے۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ آدمی وہ بہت ہی کانٹا معلوم ہوتا تھا۔ لہجہ اس کا بڑا ہی تمسخر آمیز تھا۔ بات وہ یُوں کرتا تھا جیسے کوئی دُکھوں کا مارا بابو اس کی گاڑی میں آ بیٹھا ہو۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا ”تیرا کیا خیال ہے، کوئی آگ سے زیادہ بڑی مصیبت اس شہر پر نہیں آ سکتی، جس میں ایک چھوٹا سا پلاٹ بھی دو لاکھ سے

کم میں نہیں ملتا ہے جس میں آدمی صرف مزدوری کے لیے آسکتا ہے رہ نہیں سکتا، ویسے تیرا مقام اصلی کون سا ہے؟ میرا مطلب ہے تم کہاں رہتے ہو؟"

وہ میرے لہجے کی تلخی کو سمجھ گیا۔ بولا۔ "میرا کیا ہے بابو جی! ڈیڑھ دو گز کے مکان میں چھ بچوں کے ساتھ رہتا ہوں اور چھ سو روپے کرایہ ادا کرتا ہوں میرا کیا پوچھتے ہو آپ۔ آپ کی جلدی کی بات سن کر مجھے خیال آیا تھا کہ ہوسکتا ہے آپ کی جائداد جل رہی ہو۔" اب بھی اس کا لہجہ ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ تلخی، دوراں کا مارا ہوا آدمی سواری سے اُلجھ کر خوش ہوتا تھا۔ اُسے یہ حیرت ہوتی تھی کہ لوگ اسلام آباد کے لیے ٹیکسی کیسے لے لیتے ہیں؟ جب کہ پنڈی سے وہاں تک کا کرایہ پچاس سے کم نہیں بنتا تھا۔ یا کوئی ڈرائیور اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا تھا۔

اُس کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ "بات تو تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے میاں! مگر میں ابھی صاحبِ جائداد نہیں ہوا۔ کوئی اور ہی آگ ہے جسے میں بجھانے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی شیروانی اُتار کر زانوؤں پر ڈال لی اور سر پر قراقلی پہن لی تاکہ کوئی راستے میں مجھے پہچان نہ سکے۔ میں ہر حال میں ان بدمعاشوں سے بچ جانا چاہتا تھا۔ اُن کی نیت نیک نہیں تھی اور پھر نیت کا کیا پوچھتے ہو یارو! نیت تو میری بھی نیک نہیں رہی تھی۔ ہاتھ آیا مال میں کیسے چھوڑ دیتا۔ اور پھر ایسے لوگوں کا مال۔۔۔

"ایک بات پوچھوں باؤ جی! آخر یہ دُنیا جا کہاں رہی ہے، دیکھیں نا، میں آپ کے کپڑے اتارتا ہوں، آپ کسی اور کے کپڑے اتارنے میں لگے ہیں۔ ایک بات کرتا ہوں۔ آخر یہ سلسلہ رکے گا کہاں؟ کوئی حل ہے اس مہنگائی کا؟ اس ذلت کا جو آدمی کو دو وقت کی روٹی کے لیے سہنی پڑ رہی ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا، کبھی نہیں۔۔۔"

اب ہم ڈی اے وی کالج روڈ سے گزر کر مری روڈ پر جا پہنچے تھے مگر وہ دونوں آدمی مجھے ابھی تک نظر نہیں آئے تھے۔ مگر جیسے ہی ہم پوٹھوہار ہوٹل کے سامنے سے گزرے، وہ دونوں تلنگے مجھے حیران پریشان حالت میں ہر گاڑی کو خورد بینی نگاہ سے دیکھتے نظر آئے۔ یہ اچھا تھا کہ میں نے اپنی شیروانی بدل لی تھی اور سر پر ٹوپی رکھ لی تھی اور وہاں دو تین گاڑیاں ایک ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں بڑے اطمینان سے آگے نکل گیا وہ مجھے پہچان نہیں سکے تھے۔

"کیا کہا تم نے، میں سن نہیں سکا بھائی! ذرا پھر سے کہنا؟"

"دفع کرو جی! وہ ایسی خاص بات نہیں تھی، ویسے آپ کا شغل کیا ہے میرا مطلب ہے کاروبار؟"

"میری چھوٹی سی زمینداری ہے بھائی! اِدھر سرگودھا میں، بس۔"

"تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کہ آپ بھی کوئی بابو شابو ہی ہیں، لالا سفید پوش قسم کے۔"

"ذرا تیز چلو میاں! اور چھوڑو یہ باتیں، بس کام سے کام دکھا کرو۔" یہ کہہ کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اب ہم فیض آباد سے آگے نکل چکے تھے اور کوئی دم جاتا تھا کہ ہم زیرو پوائنٹ سے بھی گزر چکے ہوں گے۔ ڈرائیور بالآخر میری بات سمجھ گیا اور پھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی ورنہ وہ تو خواہ مخواہ ہی مجھ سے اُلجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آب پارہ سے گزر کر جب ہم اسلام آباد ہوٹل کی طرف بڑھے تو میرا دھیان اس وقت بھی مختلف کاروں کی طرف لگا تھا مگر اُن میں سے وہ خاص ٹویوٹا کوئی نہیں تھی جسے میں راولپنڈی چھوڑ آیا تھا۔ اُن کو غچہ دینا بہت ضروری تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ جمعدار وہاں پہنچ چکا ہوگا؟

اسلام آباد ہوٹل پر پہنچتے ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور دونوں بریف کیس اٹھا کر میں چاروں طرف کا جائزہ لے کر اندر جا پہنچا۔ اور یہ دیکھ کر میرا مغز الٹنے لگا کہ ڈیوڈ وہاں موجود نہیں تھا۔ سارے ہی ہال میں نے دیکھ لیے۔ پاگلوں کی طرح میں نے ہوٹل کی سیڑھیاں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک گھوم کر دیکھ لیں، جمعدار وہاں موجود نہیں تھا۔ تھک ہار کر میں اُن کے سامنے والے ہال میں جا بیٹھا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ کسی بھی طرح مجھے اُس پر اس قدر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُس نے بریف کیس کھول کر دیکھ لیا ہوگا۔ وہ اتنی بڑی رقم اور وہ بھی ڈالروں میں کیسے چھوڑ دیتا اور اس میں ہیروئن بھری تھی جو لفافوں میں بند تھی۔ اس نے وہ بھی محفوظ کر لی ہوگی۔ اس کی قیمت کا بھی اسے احساس ہوگا وہ لاکھوں روپوؤں میں بک سکتی تھی۔ کچھ بھی نہ ہوتا تو ایسے لوگ محض بریف کیس کو ہی کافی سمجھتے ہیں کہ وہ بھی پانچ چھ سو روپے میں آتا تھا۔ مجھ سے کیسی زبردست غلطی ہو گئی تھی۔ اور وہ لٹیرے میرے پیچھے گھوم رہے تھے۔ ابھی وہ راولپنڈی ہی میں تھے مگر یہ بھی ممکن ہے اُن کا سارا گروہ میرے پیچھے لگ گیا ہو۔ وہ کوئی ایک دو تو نہیں ہوتے ہیں۔ اس جھٹکے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسی غلطی تو مجھ سے زندگی بھر نہ ہوئی ہوگی۔

میں نے بیرے کو اپنی طرف اشارے سے بلایا۔ وہ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر بولا۔ "خیر تو ہے صاحب! آپ کو تو پسینہ آ رہا ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں بھائی! تھوڑی چائے لے آؤ۔ کچھ کھانے کو

...ابھی لا دو۔" میں اس سے نظریں نہیں ملا سکا تھا۔ وہ کچھ ہی ...ے آیا۔ اس عرصے میں سگریٹ سے دل بہلاتا رہا۔ مگر ...زا نہیں دے رہا تھا۔ آدھا میں نے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ہر ...بے مزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ آدمی اپنی ہی غلطی کے سبب یوں مارا جائے ...چھتاوا اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ...تھا۔ ایک تو اس فساد میں میں خواہ مخواہ ہی پھنسا دیا گیا تھا۔ مگر ...جب میں نے اس کا تعاقب شروع کیا تو دولت ہی میرے ہاتھ سے ...چھوٹ گئی تھی، اور اُن کی نظروں میں مجرم میں الگ بن گیا۔ وہ کیا ...سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔ پتا نہیں وہ آبادشاہ کیا چیز تھا۔ ...جواب سن کر تو اُسے بھی پسینہ آ گیا ہوگا۔ اُس نے حیرت انگیز تیزی ...جمعدار کے ہاتھ دوسرا بریف کیس میرے پاس بھیج دیا۔ جس کا ...طلب یہ تھا کہ پولیس کو پہلے بریف کیس کا رنگ تک یاد تھا۔ ...درمیان میں اگر ایک کڑی غائب نہ ہوتی اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ ...مس آرمینیا اپنے کمرے سے نکل کر کس کمرے میں گئی ہے تو ان کا کام ...حد آسان ہو جاتا۔ وہ اسی وقت اس قصے کو ختم کر دیتے۔ مگر اب ...بس ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ گئے تھے۔ ناممکن تھا کہ وہ مس آرمینیا سے اعتراف ...کرا لیتے۔ وہ بڑی ہی زمانہ ساز عورت تھی، پتا نہیں اسے جرائم کی ...دنیا میں آئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا، کیسے کیسے پاپڑ وہ بیل چکی ہوگی ...کس کٹھالی میں اُسے ان لوگوں نے ڈالا ہوگا جہاں سے وہ ...دن بن کر نکلی تھی، وہ پولیس کے پلّے کچھ نہیں ڈالے گی۔

اُن کے پاس ثبوت بھی تو کوئی نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے، اس ...خود رقم ہضم کر لی ہے یا وہ لوگ جو ہیں اس سے بریف کیس ...لینے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر اس بات میں کوئی وزن نہیں ...تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دونوں آدمی ہوٹل سے نکلتے ہی میرے پیچھے ...لگتے۔ نہیں اس وقت تک ڈیوڈ نہیں مل سکا تھا۔ ڈیوڈ نے تو ...ریا کر بریف کیس دیکھا ہوگا۔ اس کے تالے بھی آسانی سے کھل ...نے تھے۔ اُس کی نیت کوارٹر پر جا کر ہی بدلی ہوگی۔

دن کا ایک بج گیا اور میں ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ بڑی دیر ...ئی تھی مگر اس جمعدار کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ وقت تھا کہ ...رے نہیں گزرتا تھا۔ کار بھی میرے پاس موجود نہیں تھی۔ وہ میں ...نڈی میں چھوڑ آیا تھا، اور اب مجھے اپنی رقم کی فکر لگی تھی۔ ...ناسب یہ تھا کہ میں اُسے کسی جگہ رکھ دیتا کسی محفوظ جگہ پر ڈھیر ...ہا مگر ایسی کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ راولپنڈی میں میرا کوئی ...نہیں تھا۔ کسی بینک میں اُس وقت میں جا ہی نہیں سکتا تھا، ...دیر ہو چکی تھی۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا اور پھر کسی تعارف کے بغیر ...بڑی رقم جمع کروانا ناممکن تھا۔ لازم تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ ...رکھتا۔ میں ایسے مخمصے میں پھنس گیا تھا کہ خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

دو بجے میں نے کھانا منگوا لیا۔ بھوک تیز ہوئی تھی۔ تین بجے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ٹیکسی لے کر سیدھا نیفڈیک میں جا گھسا۔ وقت گزارنے کے لیے فلم ہی سب سے اچھا ذریعہ تھی۔ دوسرا خالی بریف کیس میں نے جان بوجھ کر ہوٹل میں چھوڑ دیا۔ میں اسے لے کر کیا کرتا۔ وہ میرے لیے بوجھ بن گیا تھا۔ انگریزی فلم تھی، وہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ ایک تو اُن گوروں کے مکالمے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ پتا نہیں کیا بکواس کرتے رہتے ہیں۔ میں سارا وقت بس جماہیاں ہی لیتا رہا۔ کبھی کبھی ہیرو جب غضبناک ہو کر گھونسا چلاتا تھا تو وہ ساری بات میری سمجھ میں آ جاتی تھی۔ اور میں سوچتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی بڑی زیادتی کی ہوگی جب ہی وہ اس قدر ناراض ہو رہا ہے۔ بالآخر فلم ختم ہو گئی۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ سینما سے نکلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔ اور میں اس میں بیٹھ کر سیدھا گولمنڈی جا پہنچا۔ رات بڑے دکھوں کا مداوا ہے۔ اندھیرا آدمی کے سو عیب چھپا لیتا ہے اور ٹیکسی کے اندر بھی اندھیرا ہی تھا مگر جب میں گولمنڈی کے بازار میں پہنچا تو میں نے وہاں رکنے کا ارادہ بدل دیا۔ اور میں سیدھا ہوٹل کی طرف چل دیا۔ مجھے ہر حال میں ڈیوڈ کے پاس پہنچنا تھا۔ پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے۔

ہوٹل کی طرف جانے کے بجائے میں ٹیکسی سے اُتر کر عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ جمعداروں کے کوارٹر وہاں سے کوئی دو سو گز دور تھے۔ اس وقت تک لوگ کام دھندے سے فارغ ہو کر گھروں میں بیٹھ چکے تھے۔ کوارٹروں کی طرف ایک پتلی سی گلی نکلتی تھی۔ اور اس میں روشنی بالکل نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ کس مکان میں رہتا ہے مگر جیسے ہی میں نے وہ گلی عبور کی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک کھلی جگہ پر جا پہنچا ہوں۔ وہاں دیواروں کے ساتھ ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس کے پاس سے گزر کر میں ذرا آگے بڑھا تو ایک کھاؤں کھاؤں کھانستا بڈھا مجھے نظر آیا۔ وہ حقہ ہاتھ میں لیے سامنے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"بابا جی! وہ ڈیوڈ کہاں رہتا ہے؟"

"وہ سامنے کے تین نمبر کوارٹر میں رہتا ہے۔ وہ شہتوت کے سامنے والا کوارٹر ہے، اُس کا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"بڑی مہربانی بابا جی!"

میں اس کے بتلائے ہوئے پتے کی طرف بڑھا تو اچانک مجھے شہتوت کے قریب سے ایک آدمی تیزی سے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ بلاخیز رفتار سے موٹر سائیکل تک جا پہنچا مگر معلوم یہ ہوا وہ کچھ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے

معلوم نہیں ہو سکا کہ اُسے تکلیف کیا ہے۔ فاصلہ بھی کوئی تین گز کا ہو گا۔ میں ابھی اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے موٹر سائیکل کو ایڑ لگائی اور اُسی لمحے وہ پتلی سی گلی میں جا گھسا۔ اس کا رویّہ میری سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کو روک لینے کا کوئی جواز میرے پاس موجود نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی بہت ہی جلدی کا کام ہو۔ اُس پر مزید غور کرنے کے بجائے میں شہتوت کے قریب جا پہنچا ڈیوڈ کے کوارٹر کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ تین نمبر اس کے ماتھے پر صاف لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوارٹر ہوٹل کی طرف سے اپنے ملازمین کو بنا دیے گئے تھے۔ دروازہ شہتوت کے عقب میں تھا۔ میں اس درخت کے قریب سے گزر کر دروازے تک جا پہنچا۔ صحن میں بتی نہیں جل رہی تھی البتہ دائیں ہاتھ کے کمرے کی ایک کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

"ڈیوڈ صاحب!" میں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اُسے آواز دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے صحن میں قدم ڈال دیا۔ کوارٹر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی آدمی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ میں جان بوجھ کر جوتوں کی آواز بڑھاتے ہوئے کمرے تک جا پہنچا۔ اُس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر پھر دستک دی۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات تھی۔ مجبور ہو کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرا وہم حقیقت بن رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں کوئی بہت ہی خطرناک بات مجھے پیش آ سکتی ہے۔ سامنے چارپائی پر ڈیوڈ پڑا تھا۔ اس حال میں کہ ایک خنجر اس کی ہنسلی کے اندر دھنسا تھا اور وہ الٹ کر چارپائی پر گر گیا تھا۔ اُسے اپنا منہ سیدھا کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا کہ اُسے موت نے آ لیا۔ خون سے اس کا سفید قمیص تر ہو رہا تھا۔ اُس کا قاتل شاید وہی آدمی تھا جو میرے سامنے موٹر سائیکل لے کر گلی میں نکل گیا تھا۔

"اوہ میرے خدا!" میرے کلیجے سے ہُوک اٹھنے لگی۔ اس کے پاس سے گزر کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کی ماں چارپائی پر لیٹی تھی۔ دوا کی شیشی اس کے بستر پر پڑی تھی۔ اور اس کا منہ اس طرح کھلا تھا کہ اسے شاید مرض کی شدّت نے دوسرا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بیچاری بیمار تھی اور اسی حالت میں اس نے بستر پر پڑے پڑے جان دیدی تھی۔ ڈیوڈ اُس کی تیمارداری میں ہی لگا رہتا تھا جب ہی وہ میری طرف نہیں آ سکا۔ پانی کا گلاس تپائی پر دھرا تھا۔ کچھ اور دوائیں بھی پڑی تھیں وہاں۔ کچھ پیٹنٹ اور کچھ دوسری ——— ڈاکٹر کی بنی ہوئی دوائیں۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو پتا چلا کہ وہ کب کی ٹھنڈی برف ہو چکی ہے۔ اُس کے چہرے کی جھریاں بتاتی تھیں کہ اُس نے بہت جی لیا ہے اور اب اُسے مر ہی جانا چاہیے تھا مگر وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ ہی لے گئی تھی لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ ڈیوڈ کس راہ سے آگے نکلا ہے۔ اُس کے گلے میں خنجر کس نے بھونک دیا ہے۔ میں اس کمرے سے نکل کر پھر ڈیوڈ کے پاس جا پہنچا۔ اس کے بستر پر بھی دو دوا کی شیشیاں پڑی تھیں۔ وہ شاید اُسی وقت دوا لے کر واپس آیا تھا کہ اس کا قاتل بھی اس کے پیچھے گھُس آیا۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی وہاں موجود ہو اور ڈیوڈ سے بات کرتے ہی اُس پر ٹوٹ پڑا ہو۔ اس آدمی کو میں نے اندھیرے میں دیکھا تھا۔ اس کا قد درمیانے درجے کا تھا وہ گٹھے ہُوئے جسم کا آدمی تھا اور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ عین ممکن ہے ڈیوڈ نے اُسے زخمی کر دیا ہو۔ کیونکہ فرش پر ایک خنجر پڑا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے چند منٹ بعد معلوم ہوئی۔ وہ دروازے کے قریب پڑا تھا اور اُس پر خون لگا ہُوا تھا۔

قاتل بالآخر اسے مار دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے، اس کی نیت یہ نہ ہو جب بات زیادہ بڑھ گئی تو دونوں نے خنجر نکال لیے۔ میں نے ڈیوڈ کو چارپائی پر لٹا دیا۔ ایک زخم اس کی پسلی پر بھی موجود تھا۔ اور وہ ایسی حالت میں ختم ہوا تھا کہ اس کی ماں دوسرے کمرے میں خراب و خستہ صورت میں پڑی تھی۔ وہ اُٹھنے سے بھی لاچار تھی۔ اسے بھی معلوم ہو گا کہ دوسرے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے ڈیوڈ کی موت کا تصوّر ہی کیا ہو گا کہ اس کی جان نکل گئی ہو گی۔ ڈیوڈ کے کمرے کا حلیہ بھی بگڑا ہُوا تھا۔ قاتل نے اس کو مار دینے کے بعد وہاں کی تلاشی لی تھی۔ اُن کے دونوں ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ بڑی پیٹی بھی دوسرے کمرے میں کھلی تھی۔ جہاں جہاں اُسے شک ہو سکتا تھا وہاں وہاں اس نے ناخن مارے تھے مگر اُسے کچھ نہ مل سکا تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ گیا تھا۔ مجھے بھی اسی چیز کی تلاش تھی جو قاتل کے ہاتھ نہ آ سکی تھی۔ میں نے صحن میں نکل کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ مجھے زیادہ اطمینان سے اس گھر کی تلاشی لینی ہو گی۔ بریف کیس مجھے ضرور مل جانا چاہیے تھا۔ ڈیوڈ نے اسی کے لیے جان دی تھی ——— اس کا مطلب یہ تھا وہ ابھی تک اس کے پاس موجود تھا مگر کہاں؟ یہ بات سوچنے کی تھی۔

میں نے ایک بار پھر سارے کمرے کو بغور دیکھا۔ وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں قاتل کی نظر نہ گئی ہو۔ اُن کے دونوں ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ نئے پرانے کپڑے سب اُلٹا دیے گئے تھے۔ ایک الماری بھی وہاں موجود تھی۔ وہ بھی میں نے دیکھ لی۔ برتن بھانڈے ہی وہاں رکھے تھے۔ چینی کے برتن ہوٹل سے چرائی ہوئی چائے دانیاں کپ، پلیٹیں اور چمچے۔ بستر بھی شاید وہیں سے آیا تھا۔ ممکن ہے

…نے برسوں دے دیا گیا ہو۔ اس کی ماں کے نیچے بھی …بچھا تھا چارپائیاں دیسی تھیں لیکن تکیے فوم کے تھے ڈیوڈ …ہوٹل سے مل گئی تھی، اٹھا لاتا تھا۔ تین بہت عمدہ قسم …جو وہاں سے … کیس بھی الماری میں دھرے تھے۔ اُن کے ساتھ دو لائیٹر … ایک گیس کا، ایک پٹرول کا۔ ڈیوڈ اگلے کمرے میں سوتا …تھا۔ اس کی ماں دوسرے کمرے میں پڑی رہتی ہو گی۔ کوارٹر تنگ …تھا بے حد تنگ پھر بھی اس میں دو کمرے موجود تھے اور باورچی خانہ …نے میں بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی غسل خانہ تھا، چھوٹا سا غسل خانہ …نا ہی بڑا سوئی خانہ تھا۔ جب اس قسم کے دوگوں کی ضرورت ہی …تنی ہوتی ہے اور ڈیوڈ نے تو ابھی شادی ہی نہیں کی تھی کہ اسے …رتے نے آ لیا۔ کیا میں ہی اس کے قتل کا سبب نہیں بن گیا تھا۔ …صبح تو وہ اچھا بھلا میرے پاس آیا تھا۔ ایک لالچ اُسے …ٹی میں بریف کیس رکھ کر میرے پاس لے آیا تھا۔ وہ اسے صرف …پانچ سو روپے دے کر اندر بھیج سکتے تھے۔ میں نے اسے ہزار روپیہ …دیا تھا۔ اسے اور زیادہ انعام کی اُمید بھی دلائی تھی۔ اسے میرے …پاس ضرور پہنچنا چاہیے تھا مگر وہ رُک گیا، نہ آ سکا کہ اس کی ماں …بہت زیادہ بیمار ہو گئی تھی۔ وہ اس کی تیمارداری میں لگا رہا۔ اُسے …بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ ایسے میں وہ بھول ہی گیا کہ اسے …پہنچنا بھی ہے۔ کوئی انتظار میں کھڑے کھڑے سوکھ گیا …اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اور اب… اب اس پر ایسی مرن …چڑھی تھی کہ وہ آلے سے نہ اُترتی تھی۔ خنجر اس کی شہ رگ …لگ گیا تھا۔ قاتل کوئی بہت ہی ماہر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ …جانتا تھا، آدمی کو کہاں سے چھیلتے ہیں۔ خدا جانے اُس نے کمر …زخم کیوں لگایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ڈیوڈ کو روک دینا …چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس پر مزید حملہ نہ کر سکے اور بتا دے کہ …بریف کیس کہاں رکھا ہے مگر بات زیادہ ہی بڑھ گئی ہو گی۔

میں اندازہ لگاتا رہا۔ اور اس کے گھر کا چپہ چپہ چھانتا رہا۔ مجھے بالآخر یقین ہونے لگا کہ وہ بریف کیس ان دو کمروں …میں نہیں ہے۔ مُردے کے ساتھ بیٹھنا بڑا ہی سوہان روح …ہے اور وہاں تو دو مُردے تھے۔ ایک عورت ایک مرد۔ اُن کی موجودگی …ہلائے دیتی تھی مگر میں پھر بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ہر شے …ٹٹولتا رہا ——— وہ کمرہ کھنگال کر میں باورچی خانے میں جا گھُسا۔ …بڑی ویران ہی تھا۔ ایسے لوگوں کے چولھوں کے گرد ہوتا ہی کیا ہے۔ …چند برتن اور ایک چولھا اور بیٹھنے کے لیے ایک چوکی۔ برات …اور ہنڈیا خالی۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ میں اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہوتا …تو اُن کے دُکھوں کا علاج نہیں کر سکتا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ …مگر کچھ لوگوں کو تو یہ کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ نہ اُن میں علم کی خوشبو پیدا ہو سکتی ہے نہ ہنر کی جستجو۔ وہ دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور انہی ہاتھوں سے کلہاڑے کا کام لیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ انھیں موت آ لیتی ہے۔ ڈیوڈ تو اچھا۔ ہاں کہ اسے ایک قاتل کا خنجر نصیب ہو گیا ورنہ لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں اور کوئی اُن کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ڈیوڈ بھی اسی طبقے کی پیداوار تھا مگر اب وہ بے موت مارا جا چکا تھا اور میں اس کے ویران باورچی خانے میں کھڑا تھا۔ وہاں بھی دیکھنے دکھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مایوس ہو کر میں وہاں سے نکل کر غسل خانے میں جا گھُسا۔ ایک لائف بوائے کی ٹکیا وہاں صابن دانی میں رکھی تھی۔ اور ایک چھوٹی سی چوکی جو نل کے سامنے تھی۔ نل کے نیچے ہی ایک بالٹی دھری تھی، اور بس۔ یہ تھا اس کا غسل خانہ ——— وہ شکر کرتے ہوں گے کہ نلکے میں پانی موجود رہتا ہے۔ غسل خانہ چھوڑ کر میں پھر صحن میں جا نکلا۔ وہاں ایک تار پر ایک چھدرا سا تولیہ لٹک رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کونے میں اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ کسی دن اس کا بان، اس کی لکڑی بھی چولھے کی نذر ہو جاتی کہ وہاں سوئی گیس موجود نہیں تھی۔ بائیں ہاتھ مرغیوں کا ایک ڈربہ بنا ہوا تھا۔ مٹی کا وہ ڈربہ خاصا لپا پُتا نظر آتا تھا۔ ڈیوڈ کی ماں شاید اُدھر زیادہ توجہ

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

- کیا آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔
- کیا آپ کی آنکھیں بھینگی ہیں۔
- کیا آپ چشمہ لگاتے ہیں۔
- یا آنکھوں کے کسی مرض کا شکار ہیں؟

تو کتاب ———

کم نظری اور اُس کا سدِ باب

قیمت دس روپے۔ ڈاک خرچ روپے

آپ کو بتائے گی کہ ———

عینک سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بغیر دوائوں کے اپنی آنکھیں کس طرح صحت مند بنائی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں صحت مند ہیں تو انہیں ہمیشہ کس طرح صحت مند رکھا جا سکتا ہے

ہر شخص کے لئے یکساں طور پر مفید کتاب

دیتی تھی مگر اُس وقت وہاں صرف دو مرغیاں موجود تھیں۔ میں نے اس کے سوراخوں میں سے اندر جھانک لیا تھا۔ صرف دو مرغیاں تھیں وہاں جو مجھے دیکھ کر ایک دم کُڑکُڑانے لگیں اُن کی نیند خراب ہو گئی تھی مگر نہیں، وہاں کچھ اور بھی تھا۔ سوراخوں میں سے مجھے ڈربہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر صحن کی بتی جلا دی اور ڈربے کا دروازہ کھول دیا۔ مرغیاں شور مچاتی ہوئی اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں مگر میں نے اُن کی طرف توجہ نہیں دی۔ ڈربے کی عقبی دیوار کے ساتھ بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ وہ بریف کیس جو ڈیوڈ کو بہت مہنگا پڑا تھا۔ اسے میں نے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ وہ مٹی سے اَٹا ہوا تھا۔ ڈربے کا دروازہ میں نے فوراً ہی بند کر دیا۔ اور بریف کیس اُٹھا کر میں کمرے میں جا گھسا۔ جس چیز کی مجھے تلاش تھی، وہ بالآخر مجھے مل گئی تھی۔ میں نے ایک چادر لے کر بریف کیس کی دُھول صاف کی اور پھر اُسی چادر میں اسے لپیٹ کر میں باہر نکل آیا۔ اس کا وزن برابر نظر آتا تھا جس میں کمی بیشی کوئی نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے ڈیوڈ نے اسے کھولا ہی نہیں تھا۔ اندازہ میرا یہی تھا۔ محض اس لیے وہ اسے اتنا سنبھال کر رکھ رہا تھا کہ اسے بڑے انعام کی امید تھی۔ میرا خیال ٹھیک نکلا ڈیوڈ کی آنکھ سے شرافت جھلکتی تھی۔ میں نے اس پر اعتماد کر کے غلطی نہیں کی تھی۔ کچھ آنکھیں ہوتی ہی ایسی ہیں، اُن پر بلاخوف و خطر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور ڈیوڈ کی آنکھیں ایسی ہی تھیں؛ وہ مر چکا تھا۔ اُن کے کفن دفن کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور میرا خیال ہے اس کی جیب میں ڈیڑھ ہزار روپیہ تو موجود ہی ہوگا۔ وہ بہت کافی تھا۔ مرنے کے بعد اب کسی چیز کی ضرورت انھیں کہاں رہ گئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں اپنا بریف کیس اور بائیں میں دُوسرا پکڑ کر میں نے تمام بتیاں بجھائیں اور بڑے اطمینان سے میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ رات زیادہ ہی بھیگ چکی تھی۔

جب میں پتلی سی بے چراغ گلی میں سے گزرا تو میں اس قاتل کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا خنجر ڈیوڈ کو لے ڈوبا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ وہ کوارٹر سے بہت مایوس ہو کر نکلا تھا اور اب خدا جانے اس کے گروہ کے لوگوں نے اُس کا کیا حشر کر دیا ہو۔ شکر ہے وہ پھر لوٹ کر اس کوارٹر میں نہیں آتے تھے، ورنہ شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ کوئی اُن میں سے میرے ہاتھوں مارا جاتا۔

گلی میں سے نکل کر میں جان بوجھ کر ہوٹل کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ بائیں طرف مُڑ کر میں ایک اور عمارت کے سامنے سے گزر کر آگے نکلا تو پتا چلا کہ میں ٹیکسی اسٹینڈ تک جا پہنچا ہوں یہ اچھی بات تھی۔ میں فوراً ہی ایک ٹیکسی میں جا گھسا۔

ڈرائیور کچھ دُور کھڑا تھا، وہ تیزی سے میری طرف لپکا، بولا "آپ کو کہاں جانا ہے جناب؟"

"مجھے ذرا گوالمنڈی تک جانا ہے پیارے! چلے گا؟"

"کیوں نہیں چلیں گے جناب!" ادھر جھک مارنے کے لیے کھڑا ہے کیا! پر دس روپے لگیں گے۔"

"وہ میں نے دُوں گا بھائی! بیٹھ اندر بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

صدر سے گوالمنڈی کچھ زیادہ دور نہیں تھا چند منٹوں میں ہم وہاں جا پہنچے۔ ٹیکسی کو فارغ کر کے میں نے دونوں بریف کیس اٹھائے اور شیخ محمد اسلم کی گلی سے گزرنے کے بجائے دوسری گلی عبور کر کے اس کچے احاطے کے عقب میں جا پہنچا جہاں میری کار کھڑی تھی۔ میں نے گلی کے مکان کے سائے میں رُک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا اچانک مجھے اپنی حماقت پر طیش آنے لگا۔ میں بلا سوچے سمجھے ہی خود کو اسلم صاحب کا بھانجا ظاہر کر کے گاڑی وہاں کھڑی کر گیا تھا۔ یہ میری زبردست حماقت تھی جس کا خمیازہ میں اب بھگت رہا تھا۔ کار کے قریب تین آدمی کھڑے تھے اور اُن میں دو پولیس والے معلوم ہوتے تھے۔ میں گھنے سائے میں کھڑا تھا۔ کچھ میری شیروانی بھی سیاہ رنگ کی تھی۔ میں انھیں نظر نہیں آیا۔ فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس گز کا ہوگا۔ ڈرائیور نے اچھا کیا تھا کہ مجھے ٹیکسی روکتے روکتے بھی دوسری گلی کے سامنے جا اتارا تھا۔ اگر میں پہلی گلی سے جاتا تو صورتِ حال ایک دم بگڑ سکتی تھی کیونکہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کار کے مسئلے پر ہی گفتگو کر رہے تھے۔ اور وہاں کوئی شیخ اسلم بھی موجود تھا جس سے مخاطب ہو کر دوسرا آدمی کہہ رہا تھا۔

"دیکھیں صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ چوری کی کار ہے، ورنہ کوئی آپ کا بھانجا ہوتا تو وہ سیدھا آپ کے گھر جاتا، آپ سے ملتا۔ گیراج بھی آپ کے پاس ہے۔ گاڑی وہاں کھڑی ہو سکتی تھی۔"

"آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے تھانیدار صاحب! واللہ میرا اس سے کوئی تعلق ہوتا تو وہ سیدھا میرے پاس آتا۔ یہاں کار کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر میرا کوئی بھانجا ہے کہاں۔ میری کوئی بہن ہی نہیں ہے جناب!"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں، اس لیے میں نے گلی کے موڑ پر سپاہی کھڑے کر دیے ہیں۔ وہ جیسے ہی واپس آیا، سپاہی اسے روک لیں گے اس پر کور بھی چڑھا ہے اور خود وہ بیٹھا پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے کیوں اماں! کیا حلیہ تھا اس کا؟"

وہ بڑھیا بھی کہیں قریب ہی کھڑی تھی مگر مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

"وہ جی جوان آدمی تھا۔ جی صدقے میرے صادق جیسا تھا اونچا لمبا جوان۔ اور گلے میں اُس کے وہ کیا ہوتا ہے لمبا سا [...]ٹ پہن رکھا تھا۔ بال گھنے اور گھنگھریالے تھے جی! مجھے اُس نے [...]بیے ایسے ماں جی کہہ کر بُلایا تھا۔ پتا نہیں صادق کے ابا کو کیا [...] جی آپ کو بُلا لایا۔ وہ تو لگتا ہی کار سوار تھا، چور کہاں تھا وہ۔"

"چوروں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے ہیں شیدے! کوئی [...]ن کے منہ پر نہیں لکھا ہوتا کہ میں چور ہوں اور تو نے کار یہاں رکھوالی، اب دے جواب ان کو۔" بوڑھے نے مچل کر کہا۔ [...]وہ بھی تھانیدار کے سامنے جا ٹھہرا تھا مگر بڑھیا ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔

"کوئی سامان بھی تھا اس کے پاس؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"وہ جی کیا کہتے ہیں، ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا اس کے پاس، جو بابو لوگ اٹھائے پھرتے ہیں، بس وہی تھا جی، پر دُہائی خدا [...] وہ چور نہیں تھا۔ میرا دل نہیں مانتا ہے جی!"

"تو چُپ رہ شیدے! خدا کو مان! تو خواہ مخواہ ہی شہ دے [ر]ہا ہے پولیس کو۔ جب اسلم صاحب کہتے رہیں کہ ان کا کوئی بھانجا نہیں ہے۔ تو تو کیسے کہہ رہی ہے۔"

"شکل تو جی ان سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا۔ ان کا بھانجا ہی لگتا تھا، آگے اللہ جانے۔"

"بکواس بند کر، شکل ان سے ملتی تھی! ارے میں کہتا ہوں [...] شکل چڑیلوں جیسی تھی تو کیا میں تجھ سے شادی ہی نہ کرتا۔ [...]ں جی خود گل کر دو تھانے دار صاحب؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو بابا جی! شکلوں سے کیا ہوتا ہے بہرحال [...] اس کار کی نگرانی کرنی ہوگی۔ آپ اب گھر جائیں شیخ صاحب! [ضر]ورت ہوئی تو میں آپ کو بُلا لوں گا۔ کار تو بالکل نئی دکھائی [دے ر]ہی ہے۔"

"وہ نئے ماڈل پر ہی ہاتھ مارتے ہیں تھانیدار صاحب! [...] دو سال پہلے میری مزدا بھی وہ لے اُڑے تھے۔ وہ بھی [...] نئی تھی، رات گزر جاتی تو گئی تھی وہ سیدھی کسی کارخانے [...] آپ نے ناکہ بندی کروا دی اور وہ لوگ پکڑے گئے۔ [...] تین بجے اسے لے کر باہر نکلے تھے وہ۔" شیخ اسلم نے کہا۔

"چھوڑو جی! ڈی آئی جی صاحب کا حکم تھا ہمیں وہ بھی عجیب [...] تھا۔ کوئی چائے شائے ہو سکے تو بھجوا دیں ہمارے لیے، [...] بہت ہو گئی ہے۔"

"جی جی ٹھیک ہے میں ہوٹل والے سے کہہ دیتا ہوں وہ [...]ے آئے گا۔"

"بس چائے کہہ دیں۔ کچھ کھانے کے لیے مل جائے تو اور [...] بھلی ہے۔" تھانیدار نے گاڑی کے مڈگارڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی وہ اونچا ہوا اس کی نگاہ مجھ پر آ پڑی۔ وہ ایک دم اُچھل سا گیا۔ "اوئے! اِدھر دیکھو۔ اس دیوار کے ساتھ کون کھڑا ہے۔ ٹھہر جا تیری ایسی تیسی ...." یہ کہہ کر اس نے پستول پر ہاتھ مارا۔ میں تو اس کی یہ للکار سن کر پاگل ہی ہو گیا اور وہاں سے بلاخیز رفتار سے گلی میں بھاگ نکلا۔ صورتِ حال ایک دم خراب ہو گئی تھی۔ وہ مجھے صاف سیدھا کار چور سمجھ رہے تھے۔ کار کا نمبر، نام، ماڈل شاڈل سب انھیں معلوم ہو چکا تھا۔ شیخ اسلم صاف کہہ چکا تھا کہ اُن کا کوئی بھانجا ہے ہی نہیں۔ کسی نے جان بوجھ کر اُن کا نام لے دیا تھا۔ ظاہر ہے، اِتنے سارے شکوک جب پیدا کر دیے جائیں تو پھر اُن کو صاف کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ میں اگر وہاں رُک کر اُن سے اکڑ کر بات کرتا تو بھی وہ کبھی نہیں مانتے محض شبہے میں ہی مجھے اندر کر دیتے اور یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوتی۔ اگلی صبح کوئی بھی پولیس والا مجھے پہچان سکتا تھا۔ پہلی غلطی ہی بڑی خوفناک تھی کہ میں اب دوسری کا بھی مرتکب ہو جاتا، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اب وہ سب لوگ احاطے کی دیوار پھلانگ کر میرے پیچھے بھاگ رہے تھے میرے اور اُن کے درمیان فاصلہ یہی کوئی تین مکانوں کا ہوگا۔ صرف اتنی ہی مہلت مجھے مل سکی تھی کہ میں دائیں ہاتھ کی ایک گلی میں گھوم گیا اور بلا سوچے سمجھے میں ایک مکان کے اَدھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کس کا مکان ہے۔ میں نے اندر پہنچتے ہی فوراً دروازہ بند کر لیا۔ وہ کوئی تین منزلہ مکان تھا اور پتا نہیں اُس میں کون کون لوگ رہتے تھے۔ بس ایک لمحے کی مہلت مجھے چاہیے تھی اور وہ مجھے مل گئی تھی۔ گلی اتنی سی تھی کہ کوئی دوڑ کر اسے دو تین منٹ میں عبور کر کے آگے نکل سکتا ہے اور میں اسی جھانسے سے کام لے رہا تھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ وہ جب اُس گلی میں داخل ہوئے تو وہ یہی سمجھے کہ اس ذرا سی مدّت میں میں گلی عبور کر گیا ہوں۔"

"شیر محمد تم اس گلی میں کھڑے رہو اور دھیان رکھو۔"

تھانیدار نے کسی سپاہی کو پکار کر کہا، اور خود وہ دُوسرے سپاہیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی آواز میں بے پناہ جوش اور غضب شامل تھا جیسے کوئی شکاری کُتا۔ بھاگتے ہوئے خرگوش پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ آگے نکلے اور اُن کی آوازیں معدوم ہو گئیں تو میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ اس مکان کی ڈیوڑھی تھی جس کے اندر اُوپر جانے کے لیے سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ پہلے حصے کا بڑا دروازہ سامنے ہی تھا۔ سیڑھی اس کے بائیں جانب تھی۔ میں تیلی سُلگا کر یہ سوچ رہا تھا کہ

اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تھانیدار اپنے سپاہی کو موڑ پر کھڑا کر گیا تھا۔ میرا باہر نکلنا کسی بھی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ میں بہت بھاگا تو دس بیس قدم بھاگ لوں گا پھر وہ مجھے فرش کر دیں گے۔ وہ مسلح تھے اور تھانیدار کے پاس پستول تھا۔ یہ تو کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کہ گلی کے لوگوں کو آدھی رات کے وقت اٹھا دیں، اور کہیں کہ اپنے مکانوں کی تلاشی دو۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ وہ ساری رات گلی کے موڑ پر کھڑے رہیں۔ شکار انہیں نہ ملے تو بھی وہ اِدھر اُدھر پہرہ دیتے رہیں لیکن اگر وہ گلی چھوڑ کر بازار کی طرف چلے گئے یا پھر کار کی طرف متوجہ ہو گئے تو موقع غنیمت جان کر میں باہر نکل جاؤں گا۔ مگر یہ سب کچھ حالات پر منحصر تھا۔ تیلی بجھ گئی تو میں نے سیڑھیوں پر قدم دھر دیا۔ مجھے کسی محفوظ جگہ کی ضرورت تھی، مجھے ہر حال میں پولیس سے بچ جانا چاہیے تھا۔ ایک تو اتنی بڑی رقم میرے پاس موجود تھی پھر میرے سر کی قیمت بھی انھوں نے مقرر کر رکھی تھی۔ ہر جگہ کی پولیس کو معلوم تھا کہ ایک شخص ہے غلام جیلانی — اسے ضرور پکڑنا ہے۔ میں بھلا کیسے خود سے غافل ہو سکتا تھا۔ اگرچہ میرے طور اطوار نہیں بدلے تھے، میں ابھی تک کھلا پھر رہا تھا حالانکہ مجھے ناپید ہو جانا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ آ جانے کے بعد میں آنے کے ساتھ کسی بھی طرف نکل سکتا تھا مگر جانے ایسا کیوں تھا۔ میرے پاؤں ابھی تک بندھے تھے۔ پتا نہیں تقدیر کو کیا منظور تھا اور وہ مجھے کہاں مارنا چاہتی تھی۔ نہ مجھے بھوک کا احساس رہتا تھا نہ پیاس کا۔ بس اپنی جان ہتھیلی پر لیے میں سرِ بازار رقص میں مصروف تھا، اور ہر حال میں اپنے کاسۂ سر کو بچا لینا چاہتا تھا مگر اسے تو کسی نہ کسی روز گرنا ہی تھا، پتا نہیں کہاں ؟

سیڑھیاں گھوم کر اوپر اٹھتی تھیں۔ اب میں دوسری منزل پر جا پہنچا تھا اور میرے سامنے ایک دروازے پر رئیس نذیر احمد اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر لکھا ہوا تھا........ میں چند منٹ تک اُن حرفوں پر غور کرتا رہا۔ اور پھر میں نے اللہ کا نام لے کر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ کچھ بھی ہو اس آدمی کے ہاتھوں مر جانا زیادہ بہتر ہو گا بجائے اس کے کہ میرے پیچھے اتنے سارے آدمی لپکتے رہیں۔ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں کسی اچھے آدمی کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔ جو مجھ سے بہت ہی تپاک سے ملے گا۔ اور ٹھہرنے کے لیے جگہ بھی دے دے گا۔

دوسری دستک پر کسی نے اندر سے پوچھا "کون ہے ؟"

"جی میں سید رضا ترمذی ہوں جناب! کراچی سے آیا ہوں۔"

میری آواز سن کر کسی نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ اب میرے سامنے ایک ہونق قسم کا آدمی کھڑا تھا جس کی آنکھوں پر خاصے وزنی شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ بنیان پاجامے میں ملبوس تھا، اور سلیٹی رنگ کی چادر سے بدن ڈھانپ رہا تھا۔ گال اس کے اندر کو پچکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے نیند کو ترس رہا ہو۔ بال اس کے اکھڑے ہوئے تھے مگر لبوں پر ایک رسیلی مسکراہٹ موجود تھی۔

"جی فرمائیے! مجھ سے ملنا ہے آپ کو ؟"

"جی ہاں۔ در اصل میری پوسٹنگ یہاں ہو گئی ہے آپ کے دفتر میں۔ میں بھی اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر ہوں۔ آج ہی آیا ہوں۔ وقار علی طوسی ہیں نا کراچی میں، انھوں نے آپ کا پتا دیا تھا، سو میں اِدھر چلا آیا۔" میں نے اپنی زبان اور لب و لہجے میں خالص کراچی والوں کا انداز اپناتے ہوئے کہا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آئیے اندر تشریف لے آئیے۔ میرا خیال ہے بارش ہونے والی ہے۔ بڑی سرد ہوا آ رہی ہے۔" اس نے سلیٹی رنگ کی چادر کی بکل بالآخر مار ہی لی۔ وہ در اصل اس کے مہین سے جسم کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بڑا ہی کثیر الاولاد آدمی ہے اور اسے بیوی بچوں کا غم ہی لے ڈوبا ہے۔ یہ میرا احساس تھا۔ پتا نہیں کچھ دنوں سے مجھے قیافہ شناسی کا چسکا کیوں پڑ گیا تھا۔ میں یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کسی آدمی کے بارے میں میں نے کیا رائے قائم کی اور پھر وہ نکلا کیسا۔ یہ بات میں کسی کو بتاتا تو نہیں تھا۔ مگر اندر ہی اندر میں اندازہ لگاتا رہتا تھا کہ میری رائے صحیح تھی یا نہیں۔ ایسا ہوتا تھا کہ بالعموم میرا قیافہ درست ثابت ہوتا تھا۔ اور رئیس نذیر احمد کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ اس بندے کو کثرتِ اولاد نے مار دیا ہے۔ ایسا کہ وہ اپنی ساری اچھل کود ہی بھول بیٹھا تھا۔

مجھے لے کر وہ ایک تنگ سے کمرے میں جا گھسا۔ پہلے ہی منظر سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ اس نے زمین پر پڑے بچوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہلا کر اٹھا دیا، بولا "اے چلو! اُدھر نکل جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس، ہمارے مہمان آئے ہیں۔ اے اٹھ جا پپّو! اوئے شمو! تو بھی اٹھ۔ کاکا تو بھی بھاگ۔ خالی کرو یہ پنجرا، کیا مذاق بنا رکھا ہے تم نے۔"

بچے گہری نیند میں تھے، چاؤں چاؤں کرنے لگے۔ تعداد میں چھ تھے۔ چار کے نام تو رئیس صاحب نے لیے مگر دو سے میرا تعارف نہ ہو سکا۔ وہ بادلِ ناخواستہ اٹھے تو سہی مگر اپنے لحاف اٹھا کر دوسرے کمرے میں جا گھسے۔

"اے یہ تیرا لحاف تو اِدھر ہے دو ... دو اسے ... بہت ذلیل کا بچہ ہے، بھاگ جا اپنی ماں کے پاس۔" رئیس صاحب نے ایک لحاف دونوں ہاتھوں سے پیٹتے ہوئے کہا اور اُسے کھینچ کر اپنے پاؤں میں ڈال لیا۔

"بیٹھیں جناب! تشریف رکھیں۔ رات کو گھر کا سامان ہم برآمدے میں رکھ دیتے ہیں جگہ کم ہے ناجی! کراچی میں تھے تو اپنا مکان تھا، اب کیا رہ گیا ہے باقی۔ بیٹھیں، یہ تکیہ نیچے رکھ لیں۔" رئیس صاحب نے ایک ٹھُنگنا سا تکیہ مجھے بیٹھنے کے لیے دے دیا۔

"اری او بالے کی ماں! کچھ ہوش کر۔ کراچی سے سید رضا ترمذی آئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی چائے ہی بنا دے۔"

"آتے رہیں، مجھے کیا ہے، خود ہی نمٹو ان سے — میں سارے دن کی تھکی ماندی پڑی ہوں — یہ کوئی وقت ہے چائے کا؟" ان کی اہلیہ زیادہ دور نہیں تھی۔ آواز دروازے کے قریب سے ہی آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے بھئی! میں خود بنا دیتا ہوں۔"

"رہنے دیں رئیس صاحب! ضرورت نہیں ہے۔ میں کھانا کھا کر اور چائے پی کر آ رہا ہوں۔ آپ کی بڑی نوازش! اچھا ہوا آپ مل گئے ورنہ بہت پریشانی اٹھانا پڑتی۔"

"بہت اچھا ہوا آپ.... یہاں آ گئے ورنہ کہاں مارے مارے پھرتے۔ اور ہوٹل تو یہاں ایک بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ یہ سامان اُدھر پیچھے رکھ دیں، بڑی جگہ ہے وہاں۔" میں نے ان کے کہنے کے مطابق دونوں بریف کیس کونے میں الماری کے نیچے رکھ دیے۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے، بولے "میں نے آپ کو پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ کسی اور جگہ تھے آپ۔ کراچی تو دیکھیں نا اپنا بہت دیکھا بھالا ہے۔"

"میں نے در اصل حال ہی میں یہ ملازمت کی ہے بلکہ پہلی دفعہ یہاں ہی میری پوسٹنگ ہوئی ہے مجھے پبلک سروس کمیشن والوں نے سلیکٹ کر لیا تھا۔"

"اوہ! اب سمجھا۔ یعنی یہ آپ کی پہلی پوسٹنگ ہے۔ جب ہی تو کہوں کہ آپ کہیں نظر نہیں آئے۔ خیر خیر کوئی بات نہیں۔ آخر ہم کس لیے ہیں، کب کام آئیں گے، ویسے آپ رہنے والے کہاں کے ہیں۔"

"کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو۔ رہتک کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ ہم رہنے والے ہیں اسی رہتک حصار کے۔ میرا خیال ہے کہ شعر کچھ غلط ہو گیا ہے بہر حال میں حصار کا رہنے والا ہوں۔ پھر میں ٹم کراچی ہوا۔ بعد میں ٹم لاہوری بن گیا۔"

"تو یہ بات ہے۔ آج کل آپ لاہور میں رہتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ وہاں ہمارے چند عزیز و اقارب ہیں — پر آپ جانیں کہ العقرب کل عقرب۔ آج کل کے عزیزوں سے تو اللہ کی پناہ۔"

"ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ دیکھیں اُدھر تکیے کے نیچے میرے سگریٹ پڑے ہوں گے، ذرا عنایت کر دیں۔"

میں نے ہاتھ ڈالا تو وہاں سے مجھے کنگ اسٹارک کا پیکٹ اور ایک ماچس ملی۔ وہ سگریٹ نکال کر مجھے دینے لگے تو میں نے کہا — "نہیں رہنے دیں، یہ پئیں۔ آپ جانیں مجھے تو آج کل ٹی اے ملا ہوا ہے نا، اس لیے۔"

"ہاں صاحب! اس ٹی اے کا مزہ ہم بھی اٹھا چکے ہیں مگر پتا ہے کیا ہوا؟ سب کچھ ان پر خرچ ہو گیا۔ کسی کا کرتہ بنا دیا، کسی کی شلوار۔ اسے کہتے ہیں خود کردہ را علاج نیست۔"

میرا دھیان اس عرصے میں گلی کی طرف لگا ہوا تھا۔ تھانیدار مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا اور بلند آواز سے مجھے گالیاں دے رہا تھا کہ میں اس کے ہاتھ کیوں نہیں آیا؟ رئیس صاحب بہت دیر تک اپنی ہانکتے رہے۔ بچوں کا رونا روتے رہے۔ انھیں بس یہی غم کھائے جا رہا تھا۔

"خدا کی قسم، میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اسے چیر دیتا۔ مگر بہت تیز آدمی نکلا۔ اُدھر چائے پی لو چل کر۔" وہ سپاہیوں سے کہہ رہا تھا کہ اُن کی دعوت تو بہر حال قائم تھی۔

"آپ نے ٹھیک کہا ہے رئیس صاحب! ویسے میرا خیال ہے، کثیر العیال ہونا آپ کے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔"

"کیا کروں ترمذی صاحب! اللہ کی یہی مرضی ہے اور پھر اپنی اپنی قسمت ہے صاحب! اب آپ سے کیا عرض کروں کچھ کہنے کی بات نہیں ہے شادی کو تیرہ سال بمشکل ہوئے ہوں گے اور اس عرصۂ قلیل میں سترہ بچے۔ کچھ جڑواں بھی تھے۔"

"سترہ! اور وہ سب بقیدِ حیات ہیں ؟"

"جی نہیں۔ چھ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ورنہ مجھے تو گلی میں بستر لگانا پڑتا۔ چھ تو یہاں لیٹے ہیں اور سات اُدھر ہیں۔ اُن میں سے تین کو برآمدے میں ٹاٹ کے پیچھے ڈالا ہے۔" رئیس صاحب بہت ہی غمزدہ آواز میں بولے۔ لگتا تھا ان کی گھگی بندھ جائے گی۔ روہانسے ہو گئے تھے بے چارے اپنا دکھ کہتے کہتے۔

"چلیں دفع کریں رئیس صاحب! کل کو جب یہ کمانے کے لیے باہر نکلیں گے تو ایک دو نہیں چھبیس ہاتھ ہوں گے، آپ کی دنیا بدل کر رکھ دیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اُن کی کچھ ڈھارس بندھی اور وہ زیادہ دلجمعی سے گولڈ لیف کے سگریٹ پر ہاتھ مارنے لگے پھر بولے "ٹھہریں، میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں میرا بھی اب چلنے کا وقت ہو گیا ہے کیا بجا ہے آپ کی گھڑی میں ؟"

"پونے نو بج رہا ہے، بیٹھے بیٹھے ہمیں بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

"حد ہوگئی۔ یعنی وقت اتنی تیزی سے گزر گیا ہے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ کمال ہے! بس اب میں چائے بنا کر دیتا ہوں گا۔"

"چلیں میں بھی باورچی خانے میں چلتا ہوں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے تھے کہ آپ کو بھی اب چلنا ہی ہے، کیا مطلب تھا آپ کا؟"

"آپ کو نہیں پتا؟ کوئی بات نہیں پتا لگ جائے گا صاحب! اس نوکری کی یہی مصیبت ہے۔ رات کو دو بجے دفتر جانا پڑتا ہے گاڑی آتی ہے اور وہ باندھ کر لے جاتے ہیں۔"

"واللہ نہیں۔ ایسا کہیں، یہ کوئی ریلوے کی نوکری ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ بُری۔ ہاں، کبھی رات کو گیارہ بجے تک دفتر میں رہنا پڑتا ہے۔ کوئی ٹھیک نہیں ہے صاحب اس نوکری کا۔"

"مگر کرتے کیا ہیں وہ لوگ؟"

"تو گویا آپ کو اس کا کوئی تجربہ نہیں؟"

"اللہ معاف کرے، ابھی تک تو میں اس عذاب سے نہیں گزرا ہوں۔ آپ سے ہی سن رہا ہوں میں۔" یہ کہہ کر میں اُن کے ساتھ باورچی خانے کی طرف نکل گیا۔ اُن دو کمروں کے پہلو میں ایک پنجرہ سا بنا تھا جسے وہ باورچی خانہ کہتے تھے۔ وہاں صرف دو آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی اور بس۔ سامنے سوئی گیس کا چولھا دیوار کے ساتھ لگا تھا جس پر اُن کی بیگم کھانا پکاتی تھیں۔ آنے کو تو ہوا گلی میں سے آجاتی تھی مگر اس کا نکاس نہیں ہوتا تھا۔

ترمذی صاحب نے چولھا کھول کر اُس پر چائے چڑھا دی، بولے۔ "چائے پکانا بھی ایک عجیب فن ہے صاحب! کنفیوشش نے تو اس بارے میں ایک پورا باب لکھ مارا ہے۔"

"اس پر لعنت بھیجیں، یہ بتائیں کہ آپ کی نوکری کیسی ہے؟"

"آپ نے اخبار میں بھی کبھی کام نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ اس کا بھی مجھے تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ کو وقار علی طوسی نے میرا پتا دیا تھا؟"

"جی ہاں۔ وہ آپ کے اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں۔"

دراصل اس آدمی کا نام میں نے بہت دن پہلے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔ وہ مجھے یاد رہ گیا۔ اور اس گھڑی وہی میرے کام آرہا تھا اور رئیس نذیر احمد خوش ہو رہے تھے کہ طوسی صاحب نے انھیں ایسا ہی معتبر جانا کہ مجھے ان کا پتا دے دیا، بولے "اُن سے میری بہت پرانی یاد اللہ ہے، وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں دراصل یہ کہہ رہا تھا کہ انھوں نے بھی آپ کو اس دفتر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"جی نہیں۔ وہ تو کچھ نہیں بولے بلکہ یہ کہہ رہے تھے کہ چلیں آپ کو کلاس ٹو کی گزیٹڈ نوکری مل گئی ہے محنت کریں گے، تو ترقی بھی ہو جائے گی۔"

"بالکل غلط کہا ہے انھوں نے جناب! مجھے دیکھیں، میں نو سال سے یہاں ملازم ہوں۔ تنخواہ میری سیدھی قرض خواہوں کے پاس چلی جاتی ہے، کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔ یہ میرے ایک عزیز کا مکان ہے، انھوں نے از راہِ کرم یہ جگہ مجھے دے رکھی ہے، ورنہ یہاں کرایوں کا حال نہ پوچھیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے مگر سُنا ہے کہ حالات بدل رہے ہیں شاید کچھ بہتری کی صورت نکل آئے۔"

"سُنا تو میں نے بھی یہی ہے مگر ہمارے ہاتھ میں پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ یہ بہرحال آپ سوچ لیں۔ اب بھی وقت ہے، یہ نوکری نہ ہی کریں ورنہ آپ کی حالت مجھ سے بھی ابتر ہو جائے گی۔ ہاں۔ آپ کی یہ تندرستی ایک سال میں ختم سمجھیں۔"

"اچھا! تو یہ حال ہے اس ملازمت کا۔ آپ نے اچھا کیا مجھے بتا دیا۔ میرے پاس ابھی ایک اور آفر بھی ہے لیکچرر شپ کی۔"

"تو بس اُدھر ہی چلے جائیں، اس پیشے پر لعنت بھیجیں۔ بڑے بڑے پھنے خاں یہاں ذلیل ہو کر رہ گئے۔ میرا حال دیکھیں، میں ڈبل ایم اے ہوں۔ جرنلزم میں بھی ایم اے کیا ہے، ایل ایل بی بھی ہوں مگر یہاں میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔"

"بڑی دردناک کہانی ہے آپ کی۔ آپ نے اچھا کیا۔ ابھی مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ گاڑی کس وقت آتی ہے آپ کو لینے کے لیے؟"

"بس دو سوا دو بجے آجاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ ہی نکل چلوں گا۔ میرے ایک عزیز ہیں اُدھر اسلام آباد میں۔ میں اُن کے پاس جا رہا ہوں گا پھر کل آپ سے دفتر میں ملاقات ہوگی۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"نہیں۔ یہ بہت ضروری کام ہے رئیس صاحب! آپ کے ہاں ویسے ہی جگہ کم ہے، بچے پریشان ہوگئے ہیں، وہ ابھی تک نہیں سو سکے، یہی بہتر ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میرے خلوص پر آپ شک نہ کریں۔ میں آپ کا اور طوسی صاحب کا خادم ہوں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی محبت دکھائی۔ میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔"

اس وقت تک پولیس کے آدمی گلی سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ کہیں بھی گئے ہوں، بہرحال وہ اب آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ کاربر تو میں لعنت بھیج ہی چکا تھا۔ اس کی واپسی ناممکن تھی۔ میں اُسے لینے جاتا تو اس کے اردگرد موجود سپاہی مجھے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ یا پھر گرفتار کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے۔

ایک نہیں، درجنوں کاروں کی چوری وہ میرے ذمے ڈال دیتے۔ پھر مجھے جگہ جگہ گھماتے اور رقمیں وصول کرتے رہتے۔ زیورات کے چور کو بھی وہ اسی طرح دکان دکان گھماتے ہیں۔ صرافوں سے کھلے بل سے رقمیں وصول کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چور جس کا بھی نام لے دے، وہ وہیں جا ٹھہرتے ہیں۔ وہ جتنے زیادہ صرافوں کا نام لے، پولیس والے اتنے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اس کا ریمانڈ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اُن کے لیے سونے کی کان بن جاتا ہے۔ کار چوروں کے ساتھ بھی وہ یہی کرتے ہیں۔ جب اُن کا پیٹ بھر جاتا ہے اور کچھ اور اس کے ذریعے سے برآمد نہیں ہو سکتا تو اُسے بالآخر جیل بھجوا دیتے ہیں۔ اللہ اللہ اور خیر سلا۔ میں بھلا کیسے اُن کے ہتھے چڑھ جاتا۔ رئیس صاحب نے اچھی بات بتائی تھی۔ سرکاری گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ گاڑی اسلام آباد بھی جاتی تھی۔ میں اسی میں بیٹھ کر کسی جگہ اُتر جانا چاہتا تھا تاکہ میں ٹیکسی لے کر کسی طرف نکل سکوں۔

رئیس صاحب نے چائے بہت اچھی بنائی تھی۔ وہ واقعی اس فن سے کماحقہ آگاہ تھے مگر مجھے اس وقت بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا۔ چائے وہ لطف نہ دے سکی تھی جس کی وہ ہر لحاظ سے حقدار تھی۔

گلی اس وقت تک بالکل پُرسکون ہو چکی تھی، کتے بھی مطمئن ہو کر گہری نیند میں کھو چکے تھے۔ رئیس نذیر احمد میرے گولڈ لیف کے سگریٹوں سے لپٹا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے وہ گیارہ سگریٹ پی گیا تھا اُن دو ڈھائی گھنٹوں میں۔ پتا نہیں وہ اُسے اتنے کیوں بھا گئے تھے۔ بہت ترسا ہوا آدمی تھا وہ۔ افلاس نے اسے برباد کر رکھا تھا۔ اس محنت کا، اس کاوش کا کیا فائدہ، جو آدمی کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ کر سکے۔ میں بھی ملازمت کر کے دیکھ چکا تھا۔ سب کچھ نون تیل کے چکر میں ہی ختم ہو جاتا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچتا تھا۔ اور جو کچھ میں اماں کو بچا کر دیتا تھا، وہ اپنی ہزار ضرورتیں روک لینے کا ثمر تھا۔ آسیہ کے بیاہ کے لیے جو کچھ اماں نے جمع کیا تھا وہ اس کے لیے بیٹی کی پیدائش کے دن سے ہی جُزرسی کرنے کی وجہ سے مل سکا تھا۔ ورنہ وہ بھی نڈھال ہی رہتی تھیں۔ اُن کے چہرے پر بھی خوشی مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

رئیس نذیر احمد جیسے لوگ ایک دو نہیں، لاکھوں کی تعداد میں ہوں گے۔ ان کو تو کثرتِ اولاد نے نہیں مار دیا ہوگا، مگر وہ بھی یہی دُکھ جھیل رہے تھے اور کوئی اُن کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اس عذاب سے بچنے کے لیے لوگوں نے جُزوقتی کام تلاش کر رکھے ہیں مگر اس میں تو انھیں دُہری مار سہنا پڑتی ہے۔ معاوضہ انھیں دونوں طرف سے اتنا کم ملتا ہے کہ وہ بس بلکتے ہی رہ جاتے ہیں۔

دو بجے تک رئیس نذیر احمد تیار ہو گئے۔ لنڈے سے کوٹ انھوں نے البتہ بہت عمدہ خرید رکھا تھا اور باہر بارش برسنے لگی تھی۔ سوا دو بجے اُن کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا، بولے "چلیں صاحب! یہ اچھا موقع ہے، آپ جانا ہی چاہتے ہیں تو پھر چلیں۔ ارے بچّو! تم اِدھر آکر لیٹ جاؤ۔ تمھیں ہم نے خواہ مخواہ بے آرام کیا۔"

میں نے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو دو سپاہی اس وقت بھی گلی کے دونوں نکڑوں پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میرا خیال ہے انھیں اس کار کی وجہ سے خاص طور پر وہاں کھڑا کیا گیا تھا ورنہ شاید اس سے پہلے وہاں کسی ایسے پہرے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہوگی جسے ہم ٹھیکری پہرہ کہتے ہیں۔

"ذرا یہ بریف کیس آپ اُٹھائیں، دُوسرا میں پکڑ لیتا ہوں۔ اندھیرے میں چلنا مشکل ہو رہا ہے۔" میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے رئیس صاحب کو روک کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں اُٹھا لیتا ہوں اسے۔" وہ بڑی محبت سے میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولے۔

گاڑی کا دروازہ مکان کے دروازے کے سامنے ہی کھول کر رکھا گیا تھا کیونکہ ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ رئیس صاحب اندر پہنچے تو بولے "او بھائی! یہ ہمارے نئے ایڈیٹر صاحب ہیں، ترمذی صاحب۔ یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔"

"ضرور بٹھاؤ صاحب! ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" ڈرائیور نے بڑے تپاک سے کہا اور میں دروازے سے نکل کر فوراً ہی رئیس صاحب کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ایک بڑی سی اسٹیشن ویگن تھی اور اس میں ابھی اور کئی لوگوں کو سفر کرنا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس رات ویگن کے اندر کی بتی کوشش کے باوجود روشن نہ ہو سکی۔ ڈرائیور بٹن دبا کر رہ گیا۔ ورنہ وہ بتی روشن کر کے میرا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ میں نے جان بوجھ کر اپنی اچکن اُتار کر بازو پر ڈال لی تھی۔ اس کے نیچے میں محض ایک سوئیٹر پہنے ہوئے تھا اور ٹوپی میں نے سر پر یوں رکھ لی تھی کہ میری پہچان نہ ہو سکے ورنہ یونہی راستے کے پہرے پر اس حلیے میں کسی پولیس والے کے ہاتھ لگنا جس نے مجھے بھاگتے دیکھا تھا کسی بھی طرح موت کو دعوت دینے سے کم نہ تھا۔ وہ میری جان کبھی نہ چھوڑتا۔

گاڑی چلی اور سپاہی کے قریب سے ہو کر بازار کی طرف مُڑ گئی اور پھر اس کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ جو سینئر لوگ ہیں اُن کو وہ سب سے پہلے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو وہ بعد میں جگاتے تھے۔ پتا نہیں وہاں وہ کون سے چاول چھڑتے تھے، کیسا بان بٹتے تھے۔ رئیس نذیر احمد تو سخت بدک

ہوا تھا۔اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاتا۔مگر اس کے پاؤں میں بیوی نے اولاد کی ایسی زنجیر باندھ دی تھی۔اور وہ اتنے سال اس ملازمت کی نذر کرچکا تھا کہ اب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔گاڑی مری روڈ پر نکلی اور سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف چل دی۔مجھے تو ان کے ساتھ نہیں جانا تھا میں تو کسی ٹیکسی اسٹینڈ کی تلاش میں تھا مگر بات نہیں بن رہی تھی۔راستے میں کہیں بھی کوئی ایسا اڈہ نظر نہیں آیا۔

"کیا خیال ہے رئیس صاحب! مجھے کہاں اترنا چاہیے؟" دوسرا بریف کیس میں نے ان سے لے کر ٹانگوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"یہ گاڑی ہمیں چھوڑ کر صدر بھی جائے گی۔آپ اسی میں بیٹھ کر وہاں چلے جائیں۔وہاں سے آپ کو ٹیکسی بھی مل جائے گی۔اسلام آباد میں کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"میں دراصل جی نائن کتھری میں جانا چاہتا ہوں۔" ایسے ہی میں نے ایک اجاڑ سی بستی کا نام لے دیا۔میں کہاں اتنا واقف تھا اس شہر سے۔قدم قدم پر میرے لیے مشکلیں پیدا ہو رہی تھیں۔کوئی گھڑی چین کی نہیں آتی تھی اور اب نیند الگ مجھ پر غالب آتی جا رہی تھی۔کوئی کب تک رت جگا کرسکتا ہے۔آنکھ تو بالآخر مُندنی ہی ہے پلکوں کے نیچے کوئی کتنے انگارے رکھ سکتا ہے۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

یہ اچھی بات تھی کہ گاڑی میں رئیس صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ڈرائیور کے ساتھ ایک چپراسی تھا اور بس۔

گاڑی بالآخر سیٹلائٹ ٹاؤن کی ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔

"بھئی! ان کو ساتھ ہی رکھنا یہ جہاں بھی کہیں ان کو اتار دینا سمجھے۔" رئیس صاحب نے ڈرائیور کو تاکید کی اور مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر عمارت کے اندر چلے گئے۔میں تو اپنے ہی دکھوں میں الجھا ہوا آدمی تھا کسی اور طرف توجہ ہی نہیں دے سکتا تھا۔ورنہ میں ضرور دیکھتا کہ رئیس صاحب کیوں اس قدر پریشان ہیں۔یہ تو سچ ہے کہ آدمی خدا کے حضور سجدے سے بچنے کے لیے صبح کی نیند کا بہانہ بنا لیتا ہے۔وہ سجدہ اسے بڑا گراں گزرتا ہے جو اسے تمام سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے مگر ایک معمولی سی نوکری کے لیے وہ اُف تک نہیں کرتا۔اور اس وقت اٹھ کر بھاگتا ہے جب ساری دنیا اطمینان کی نیند سوتی ہے یہاں تک کہ ماں بچے سے غافل ہو جاتی ہے۔ایسے میں رئیس نذیر احمد کے لیے بستر چھوڑ کر برستی بارش میں گاڑی کے اندر جا بیٹھنا عذاب سے کم نہ تھا۔

گاڑی پھر مری روڈ پر جا چڑھی۔ڈرائیور نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔نیند نے اسے بھی پاگل کر رکھا تھا۔پتا نہیں وہ اسٹیئرنگ کیسے سنبھالے ہوئے تھا۔میرا خیال ہے محض عادتاً وہ ایسا کر رہا تھا ورنہ اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار نہیں تھا۔یہی حال چپراسی کا تھا۔وہ پچھلی سیٹ پر سر ڈال کر بیٹھا رہا۔

گاڑی بالآخر لیاقت باغ کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ڈرائیور نے وہاں کھڑی ٹیکسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ترمذی صاحب! میرا خیال ہے آپ یہاں سے کوئی ٹیکسی لے لیں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔میں یہیں اتر جاتا ہوں تمھاری بڑی مہربانی ہے بھئی! انشاءاللہ کل دفتر میں تم سے ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر میں ویگن سے اتر گیا۔دونوں بریف کیس میرے ہاتھوں میں تھے۔مگر اس طرح کہ دونوں کو میں نے چادر میں کس کر باندھ لیا تھا یوں کہ وہ دیکھنے والے کو نظر نہیں آتے تھے۔میں ویگن کے اندر تھا تو مجھے بارش کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا مگر اب جو باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔اور اس کے ساتھ ہوا بھی تھی۔اس طوفانِ باد و باراں میں مجھے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی، جہاں میں دو گھڑی کسی تکیے پر سر رکھ کر آرام سے سو سکتا اور جہاں پولیس کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہوتا۔میرا مال محفوظ رہتا اور میں صبح اٹھتے ہی وہاں سے نکل سکتا۔

ویگنوں کے اڈے کے عقب میں ہوٹل ہیں۔ان کے نیون سائن چمک رہے تھے۔بارش سے بچنے کے لیے جو لوگ وہاں موجود تھے، وہ برآمدوں اور دکانوں میں دبک گئے تھے۔میں گاڑی سے نکل کر سیدھا ہوٹل میں جا گھسا۔پولیس کے تین چار سپاہی باہر دکان کے اندر بیٹھے مجھے نظر آئے تھے۔مگر ان کے بیٹھنے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھا ایک آدمی اونگھ رہا تھا۔اسے میں نے جگا دیا۔

"میاں! کوئی کمرہ مل سکے گا یہاں؟"

"جی۔۔۔جی کیوں نہیں۔کیسا کمرہ چاہیے آپ کو؟" وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سامنے رکھے رجسٹروں پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کمرہ انہی کے اندر موجود ہو۔۔۔

"سنگل روم۔۔۔کوئی بھی ہو۔" میں نے بارش کے قطرے بازوؤں پر سے جھاڑتے ہوئے کہا۔اس بھلے آدمی نے دوسری منزل پر میرے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔اور خود اس کی چابی لے کر میرے ساتھ چل دیا۔کمرہ نمبر سولہ اس نے کھول دیا تھا۔اس میں میری ضرورت کی ساری ہی چیزیں موجود تھیں۔نام میں نے اپنا سید رضا ترمذی لکھوایا تھا۔اور کہہ دیا کہ میں ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوں۔فی الحال ہوٹل میں ٹھہروں گا۔کرایہ بھی اس کا

معقول ہی تھا۔ صرف نوّے روپے نقد۔ اور اس وقت میں ایسی حالت میں تھا کہ وہ مجھ سے تین سو بھی مانگتا تو میں اسے دے دیتا۔ وہ جب مجھے کمرے میں اتار کر واپس چلا گیا تو میں نے دونوں بریف کیس پلنگ پر ڈال کر شیروانی اتاری اور ہاتھ منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں جا گھسا۔ نیند نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا مگر مجھے اپنا سارا بدن بہت ہی غلیظ معلوم ہو رہا تھا۔ بریف کیس میں میری ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ میں نے اس میں سے ایک قمیص پاجامہ نکال لیا۔ جب میں نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ابھی زندگی باقی ہے اور اسے بہرحال سلیقے سے گزار لینا چاہیے۔ رئیس نذیر احمد کی چائے نے میری بھوک اڑا دی تھی مگر اب پھر پیٹ کھانے کو مانگتا تھا جس کے لیے میں ہوٹل والوں کو اس وقت پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مس آرمینیا کا بریف کیس دوبارہ کھول کر دیکھا۔ اس میں موجود رقم اور پلاسٹک کے لفافے جوں کے توں پڑے تھے۔ لفافے کچھ الٹے سیدھے رکھے تھے اور رقم کی گڈیاں جس حالت میں تھیں، ان میں بھی تبدیلی نظر آتی تھی۔ وہ بھی پلاسٹک میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ڈیوڈ نے اسے کھول کر ضرور دیکھا تھا۔ عین ممکن تھا وہ جان بوجھ کر اسلام آباد نہ گیا ہو۔ اس کی والدہ کی بیماری بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی نیت کا بدلنا بھی خارج از امکان نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اس نے بریف کیس کھول کر دیکھ لیا ہو گا۔ میرا پہلا اندازہ شاید بالکل ہی غلط تھا۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی اپنی ہی مجبوری کی وجہ سے اسلام آباد نہیں پہنچ سکا تھا۔

دونوں بریف کیس کمرے میں پلنگ کے نیچے محفوظ کر کے میں نے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح ٹھونک بجا کر بند کر دیں۔ اور پھر میں اللہ کا نام لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ بھوک پر نیند غالب آ رہی تھی۔ بالآخر میں سب کچھ بھول بھال کر گہری نیند میں کھو گیا۔

وہ خطرہ جو پچھلے بیس گھنٹے سے میرے سر پر منڈلا رہا تھا اب بڑی حد تک دُور ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں انھیں براہِ راست کہیں بھی نہیں مل سکا تھا۔ آباد شاہ کی میں نے آواز ہی سنی تھی۔ اور ڈیوڈ کے قاتل کو میں نے بے خبری میں گلی عبور کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر ابھی براہِ راست اُن سے میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اور میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اپنے گمشدہ مال کو ڈھونڈنے کے لیے وہ کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اب تک تو میں اُن سے بچ بچا کر نکل آیا تھا۔ مگر جب میں دن کی روشنی میں باہر نکلا تو پھر خدا معلوم وہ لوگ کیا کریں۔ اتنے سادہ تو وہ ہرگز نہیں ہوں گے کہ انھیں میری شکل ہی یاد نہ رہی ہو۔ میں بہرحال ایک بہت بڑے فساد میں پھنس چکا تھا۔ جس سے بچ نکلنا محال معلوم ہوتا تھا۔ میری گاڑی بھی گوالمنڈی میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ پولیس نے اسے قبضے میں لے لیا تھا اور وہ اس کی سخت نگرانی کر رہے تھے۔ اگر رئیس نذیر احمد کی ویگن نہیں آتی تو میں اس مکان سے شاید کبھی باہر نہ نکل سکتا۔

دل بڑے وسوسوں میں مبتلا تھا مگر پھر بھی میں ذہن سے سب کچھ جھٹک کر گہری نیند میں کھو گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت تک آٹھ بج چکے تھے۔ میں نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔ میرے دونوں بریف کیس پلنگ کے نیچے محفوظ تھے۔ نہا دھو کر میں پھر سے تازہ دم ہو گیا۔ ناشتہ میں نے کمرے ہی میں منگوا لیا۔ بھوک نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ پتا نہیں سارا دن مجھے کسی جگہ سے کھانے کو بھی مل سکے گا کہ نہیں۔ میں تو چیتے کی کمر پر بیٹھا تھا، اب اُترنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی خیال سے میں نے ناشتے ہی کو کھانا سمجھ کر کھایا۔ اور اپنی کوہان میں نے اچھی طرح بھر لی اور پھر میں نے وہ بریف کیس چادر میں بندھے بندھائے اپنے سامنے رکھ لیے۔ ساری مصیبت انھی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اُن سے دستکش ہونا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ میرے سامنے کم و بیش دو کروڑ روپے پڑے تھے، اور وہ بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی کہ میں کبھی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میری ضرورتیں کچھ بھی نہیں تھیں۔ ہاں ذاتی طور پر مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ غلام جیلانی تو اپنے اوپر کیا خرچ کر سکتا ہے؟ اب تک تُو نے زندگی سے کیا حاصل کیا ہے؟ تجھے تو ایک عرصے سے دو وقت کی روٹی بھی نہیں مل رہی ہے، تیرے پاس کوئی ڈھنگ کا لباس بھی نہیں ہے۔ پھر تُو۔۔۔ تُو کس لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ آدمی کی بے بسی دیدنی ہے، اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ وہ ایسے سراب کے پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے؟ یہ رقم کس کی ضرورت ہے، آسیہ کی؟ ہاں — اس کی ضرورت ہو سکتی ہے، پتا نہیں وہ اسے کہاں خرچ کرے گی؟ مگر وہ اس کی حقدار کہاں ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

بیرا برتن لینے کے لیے واپس آیا تو میں نے کہا "یہاں کوئی کار کرائے پر مل سکتی ہے؟ مجھے سوات جانا ہے۔"

"جی مل سکتی ہے، بالکل مل سکتی ہے۔ نیچے کئی کاریں کھڑی ہیں، میں اُن سے بات کروا دوں آپ کی؟"

"ہاں، بات کرو۔ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر جناب! میں ابھی کسی سے کہہ دیتا ہوں۔"

"کار نئی ہونی چاہیے، چھکڑا نہیں۔"

"ایسی ہی ہو گی جی!" یہ کہہ کر اس نے برتن اٹھائے، اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد میں ہوٹل سے باہر آ چکا تھا اور میرے دونوں بریف کیس ڈرائیور نے اٹھا رکھے تھے۔ کار نئی تھی۔ ٹویوٹا کرولا۔ سوات کے لیے ڈرائیور نے پانچ سو روپے طلب کیے تھے۔ واپسی وہ اسی روز چاہتا تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ مجھے بھلا سوات کہاں جانا تھا۔ میں تو انھیں غلط سمت اس لیے بتا رہا تھا کہ شہر سے نکلنے کے بعد میں ڈرائیور کو کسی بھی طرف موڑ سکتا تھا اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی آدمی کو یہ معلوم ہو سکے کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہوٹل تک رسائی حاصل کر لیتے۔ اُن کے مخبر بھی تو بہت کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتے تھے۔ رقم اور مال ہر حال میں محفوظ رکھنا اُن کے لیے ضروری تھا۔ ہاں اگر پولیس بالمقابل آ جائے تو پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے کہ پولیس سے وہ دشمنی مول نہیں لے سکتے تھے۔

گاڑی اڈے سے نکلی تو میں ہر آدمی کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا مگر مجھے اُن میں سے کوئی خاص شخص نظر نہیں آیا کہ اُن کے چہروں پر عجیب سی وحشت ہوتی ہے بظاہر وہ پُرسکون نظر آتے ہیں۔ مگر اندر سے بہت مضطرب اور ایسے میں جب اُن کی اتنی بڑی رقم اُن کے ہاتھ سے چھن چکی ہو تو پھر وہ کسی کو بھی معاف نہیں کرتے۔ مگر اس ہجوم میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے معاملوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔

"دیکھو میاں! مجھے اچانک یاد آیا ہے کہ ایک کام کے سلسلے میں مجھے میانوالی پہنچنا ہے۔ تم یوں کرو کہ گاڑی اُدھر لے چلو۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"مگر جی، وہ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سوات جائیں گے۔"

"کہا تھا بھئی! مگر سوات ہم کل چلے جائیں گے۔ تمھیں تو فُرصت ہی ہے نا۔ میانوالی سے ہو کر ہم اُدھر نکل جائیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی مگر کرایہ پہلے طے کر لیں جناب!"

"کہو تو میں تمھیں گاڑی کی قیمت پہلے ادا کر دوں یا پھر یہ دو ہزار روپیہ رکھ لو ضمانت کے طور پر۔ کیا خیال ہے تمھارا؟" میں نے نوٹوں کی ایک گڈی اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ جھینپ سا گیا۔ میری قراقلی ٹوپی اور میری شیروانی مجھ پر اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔ مگر پھر بھی وہ کرائے کے بارے میں بات کر لینا چاہتا تھا۔

"یہ لو یہ دو ہزار روپے رکھ لو، ٹھیک رہیں گے۔" میں نے سو سو کے بیس نوٹ پھاڑ کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"نہیں جی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ پر کوئی بے اعتباری نہیں ہے مجھے۔ میں ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ کہیں بعد میں فضیحتا نہ ہو۔"

"میں اسی لیے تمھیں یہ رقم دے رہا ہوں میاں! رکھ لو۔ جتنے پیسے چاہو کاٹ لینا۔"

مگر اس نے رقم نہیں پکڑی۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔ "آپ بہت اچھے آدمی نظر آتے ہیں مجھے۔ میں تو گاڑی کا نوکر ہوں۔ مالک کا پیٹ بھرتا ہوں پھر جو کچھ بچے لے لیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اتنا اوچھا نہیں ہوں۔"

"تمھاری مہربانی ہے یہ، پھر بھی یہ رقم رکھ ہی لو۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیے زبردستی۔

وہ اور زیادہ خوش ہو گیا۔ اب وہ زیادہ اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم شہر سے نکل کر تلہ گنگ روڈ کی طرف چل دیے۔ مگر میری نگاہ بار بار آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں اُن کی دست بُرد سے بچ نکلا ہوں۔ وہ بہت خبیث لوگ تھے۔ پتا نہیں اُن کا جال کہاں کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ مس آرمینیا ابھی تک تھانے والوں کی تحویل میں ہے یا کسی بڑے آدمی کی ضمانت پر رہا ہو گئی ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا مگر اس بات کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا ورنہ فون پر تو میں کسی بھی وقت تھانے سے بات کر سکتا تھا مگر اب بڑی دیر ہو چکی تھی اور مجھے ہر حال میں قندیار پہنچنا تھا۔

کبھی کبھار کوئی بس، کوئی کار وہاں سے گزرتی تھی تو اس کے مسافروں کو میں نگاہ میں رکھتا تھا۔ آدمی اندر سے کسی خلفشار میں مبتلا ہو تو اسے گرد و پیش سے ہر لمحہ شدید خطرے کا احساس ہوتا رہتا ہے، میرا بھی یہی حال تھا۔ ہر آدمی مجھے مشکوک نظر آتا تھا۔ چند میل آگے چلنے کے بعد ہم سڑک پر تنہا رہ گئے۔ میرے ڈرائیور نے رفتار ایک جیسی رکھی تھی۔ میرا خیال ہے اسے میری سہولت کا زیادہ احساس تھا۔ سڑک بڑی ہی ناہموار تھی جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بڑی احتیاط سے سنبھل کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے ٹریفک کہیں رُکی ہوئی ہے، پتا نہیں کیا بات تھی، سامنے سے کوئی بھی گاڑی آگے نہیں آ رہی تھی۔ شاید ٹریفک والوں نے گاڑیاں روک لی تھیں۔ میرے عقب میں البتہ دو کاریں دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ اچانک ہی عقب نما میں نمودار ہو گئی تھیں۔ شاید وہ کسی درمیانی راستے سے نکلی تھیں، ورنہ اس سے پہلے تو وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ ہماری رفتار بس معمول کے مطابق تھی۔ ڈرائیور نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا مگر پھر بھی وہ بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں تو کسی خطرے کا احساس نہیں تھا۔ ہم اب کالے چٹے

پہاڑ کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اردگرد گھنا جنگل تھا۔ ایسا کہ آدمی کو راستہ نہیں دیتا تھا۔

وہ دونوں کاریں ایک دم ہمارے اوپر آ چڑھیں۔ اس طرح کہ ہمارے اور اُن کے درمیان کچھ بھی فاصلہ باقی نہ بچا۔ تب... مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوفناک لمحہ سر پر آ پہنچا تھا جس سے بچنے کے لیے میں نے بہت کوشش کی تھی۔ اگلی کار میں تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو آدمی اور... وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے ہٹ کر۔ پچھلے دونوں دروازے اُن کے ہاتھ تلے تھے۔ پچھلی کار میں دو آدمی سوار تھے۔ اگلی کار ہمارے قریب سے گزری اور پھر ایک دم ہمارے سامنے جا کر رک گئی۔ اس کے ڈرائیور نے یوں بریک لگائے کہ اگر ہماری رفتار تیز ہوتی تو دونوں گاڑیاں آگے پیچھے سے ٹوٹ جاتیں میرے ڈرائیور نے جس کا نام فرید احمد تھا ایک دم بڑی مہارت سے گاڑی روکی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولا ”نظر نہیں آتا کیا؟ یہ بریک لگانے کا طریقہ ہے؟ ابھی میری گاڑی کا ستیاناس ہو جاتا۔“ مگر میں نے اس کی بات نہیں سنی۔ اپنا چپ شاہ میں نے سیدھے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ دونوں بریف کیس میرے قریب ہی رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کا علم ڈرائیور کو بھی تھا۔ اچانک پچھلی کار سے ایک دم گرجتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”گاڑی جنگل کی طرف موڑ لو ڈرائیور صاحب! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

فرید احمد مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کی گاڑی پر کوئی یوں حملہ بھی کر سکتا ہے۔ آواز وہ آبادشاہ کی تھی۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔ فون پر اس کی آواز میں اچھی طرح سُن چکا تھا۔ سامنے کی گاڑی میں بیٹھے دو آدمی ہم پر پستول تان چکے تھے۔ اگرچہ وہ ابھی تک باہر نہیں نکلے تھے مگر انداز اُن کا بڑا ہی جارحانہ تھا۔

”جلدی کرو۔ سُنا نہیں تم نے۔“ آبادشاہ پھر چیخا۔ وہ اس تاخیر کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

”گاڑی جنگل کی طرف لے چلو فرید احمد! مجبوری ہے۔“ میں نے ڈرائیور سے دبی آواز میں کہا۔

اُس نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔ شاید میرے چہرے کا رنگ زیادہ ہی اُڑ گیا تھا یا کیا بات تھی۔ وہ بس چپ ہی رہ گیا اور گاڑی اس نے بائیں طرف موڑ لی۔ چاروں طرف گمبھیر سناٹا طاری تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں طرف سے ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ کوئی گاڑی آگے نہیں آ رہی تھی۔

فرید احمد نے گاڑی جنگل میں ڈال دی تو وہ دونوں کاریں بھی ہمارے پیچھے آنے لگیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے صاحب!“ فرید احمد نے عقب نما میں انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں۔ تم یوں کرو کہ ایک دم بائیں سیٹ پر بیٹھ جاؤ، گاڑی میں سنبھال رہا ہوں۔“ میں نے درمیانی جگہ پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

فرید احمد میری بات سمجھ کر ایک دم دوسری نشست پر جا بیٹھا۔ مگر اسٹیئرنگ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کی جگہ لے لی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ لوگ شاید سمجھ ہی نہیں سکے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اسٹیئرنگ ہاتھ میں لیتے ہی میں نے گاڑی کی رفتار ایک دم تیز کر دی اور گھنی جھاڑیوں سے الجھتا ہوا میں ایک دم آگے بڑھ گیا۔ دونوں کاریں بھی میرے پیچھے تھیں مگر اس ذرا سے عرصے میں میں نے کوئی آدھے فرلانگ کا فاصلہ پیدا کر لیا۔ اُن کے ڈرائیور یا تو اناڑی تھے یا انھیں جنگل نے پریشان کر دیا تھا۔ اتنا سا فاصلہ میرے لیے بہت کافی تھا۔

”تم نیچے اُتر جاؤ فرید احمد! اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میں زندہ بچ گیا تو اس کی میں تمھیں قیمت دے دوں گا۔“ وہ میرے لہجے کی یخ بستگی پر حیران رہ گیا۔ میں نے بایاں دروازہ کھول دیا تھا۔

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا ہے صاحب! میں ہر حال میں گاڑی کے اندر رہوں گا۔“

”وہ بدمعاش مجھے مار دیں گے اور تیری بھی لاش کا پتا نہیں چلنے دیں گے۔“

”کچھ بھی ہو، میں نہیں اُتروں گا۔“ اُس نے چیخ کر کہا۔ وہ نوجوان سا آدمی تھا۔ عمر اُس کی یہی کوئی بائیس تیئیس سال ہوگی۔ اُس کے لیے وہ ایک انوکھا تجربہ تھا اور وہ ہر حال میں گاڑی کے اندر رہنا چاہتا تھا۔

مگر اُدھر جیسے ہی اُن لوگوں نے دیکھا کہ میں گاڑی کو آگے لے جا رہا ہوں تو انھوں نے پھر اپنی رفتار تیز کر دی اور ایسے زاویے پر آ پہنچے کہ مجھ پر گولی چلا سکتے تھے مگر میں سامنے کے گھنے درختوں تک جا پہنچا تھا۔ فوراً ہی گاڑی کو اُن کی اوٹ میں لے گیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اُن کے پاس پستول ہی نہیں رائفلیں بھی ہیں۔ جن سے وہ دُور دُور تک مار کر سکتے تھے۔ جیسے ہی گاڑی میں نے درختوں کی اوٹ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی، ایک گولی سنسناتی ہوئی ہماری طرف لپکی، اُس کا رُخ ٹائر کی طرف تھا۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات ہوتی۔ وہ ذرا سا فاصلہ میرے بہرحال بہت کام آیا۔ ان کی گولی ناکام ہوئی تو دوسری کار سے کسی نے رائفل سیدھی کر

کے ہم پر تڑاتڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ گاڑی کے شیشے اور اس کی باڈی چھلنی ہونے لگے۔ فرید احمد کا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ وہ گاڑی میں سے تڑپ کر بڑی بے جگری سے باہر نکل گیا۔

”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میری گاڑی تباہ ہو رہی ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔“ اُس نے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ اب وہ درختوں کی اوٹ سے باہر جا رہا تھا کہ میں نے اُس ذرا سے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی کی رفتار ایک دم تیز کر دی اور اُس کا رخ میں نے مزید اندر کی طرف پھیر دیا۔ میرا چپ شاہ میرے دائیں ہاتھ میں تھا مگر ابھی اس سے کام لینے کا موقع نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی گاڑی کی رفتار تیز ہوئی، فرید احمد پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا مگر میں تو اسے پہلے ہی کار چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہا تھا، دوبارہ اسے کیسے اندر آنے دیتا۔ گاڑی درختوں کی اوٹ سے نکلی تو اُن لوگوں نے پھر اس کے ٹائر پھاڑ دینے کی کوشش کی۔ مگر ٹائر پر اُن کی کوئی گولی بھی نہ لگ سکی البتہ پچھلا شیشہ ان لوگوں نے کرچی کرچی کر دیا۔ اُف میرے خدا! میں اس لمحے کی خون منجمد کر دینے والی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔

انھوں نے فرید احمد کو اپنی کار میں بٹھا لیا اور اب وہ دُگنی رفتار سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ جنگل کی گھنی جھاڑیاں اب اُن کے لیے رکاوٹ نہیں بن رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آئے میں نے ایک دم گاڑی کو پیچھے کی طرف دوڑا دیا۔ اس طرح کہ انھیں کہیں رُکنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ساتھ ہی میں نے چپ شاہ اُن پر داغ دیا۔ گولی شیشے میں سے گزرتی ہوئی ڈرائیور کے سینے میں جا دھنسی۔ اور پھر میری گاڑی کا عقب اُن کی کار سے جا ٹکرایا۔ زوردار دھماکے کی آواز پیدا ہوئی تو میں نے دوسری گولی چلا دی۔ اس کے جواب میں آبادشاہ نے مجھے [illegible]ک کر رائفل کا راؤنڈ چلا دیا۔ میں تو بچ گیا مگر وہ گولی میری کار کے اگلے شیشے کو تباہ کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی کو آگے کی طرف بھگا دیا۔ پتا نہیں میری رفتار کتنی تھی۔ وہ میرے اُس حملے سے [illegible] سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ میں جنگل کے اندر [illegible] پانی سے لبالب بھری ندی تک جا پہنچا۔ وہ [illegible] میرے پیچھے لپکتے [illegible] رہے تھے اور وہ مجھے کوئی موقع نہیں دینا چ[illegible]ک کار کو اب آبادشاہ خود ڈرائیو کر[illegible] اس جیسا جی دار آدمی میں نے خال خال ہی دیکھا [illegible]ے کار کے ڈرائیور کو اُچھال کر باہر پھینک دیا تھا۔ جیسے اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی ہو۔ میرا خیال [illegible] وہ شدید زخمی تو تھا مگر ابھی مر[illegible]ں تھا۔

ندی پر [illegible] ہی میں نے بریف کیس چادر سمیت اُٹھائے اور کار چھوڑ کر پانی [illegible] کود گیا۔ اُن کے جال سے میں بہرحال بچ جانا چاہتا تھا۔ میرے لیے اوٹ کا رہی کی تھی جسے تاک کر وہ مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ پتا نہیں فرید احمد کا کیا حال ہو گیا ہوگا؟ میں ندی کے عین بیچ میں پہنچا تھا کہ وہ کنارے پر آ رُکے اب وہ زیادہ اطمینان سے مجھ پر گولی چلا سکتے تھے میرے لیے اس گٹھری کی وجہ سے تیز تیز تیرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے گلے سے باندھ لیا تھا۔ اور جوں توں کر کے میں کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک گولی میرے سر سے مس ہو کر نکل گئی۔ وہ خونخوار لوگ مجھے مار ہی دینا چاہتے تھے۔ میں ایک دم پانی کے اندر چھپ گیا مگر اس کے ساتھ ہی وہ گٹھری بھی میری گردن سے چھوٹ کر نیچے چلی گئی۔ اس کے پیچھے میں بھی ندی کے پانی میں اور گہرا غوطہ لگانے پر مجبور ہو گیا مگر گٹھری ایک دم ندی کی تہہ سے جا لگی تھی۔ جس کو پانی کے اندر ہی اندر اٹھا کر میں کوئی آدھ منٹ تک آگے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا اور میں پھر پانی کے اُوپر آنے پر مجبور ہو گیا۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ لوگ خاصے پیچھے رہ گئے ہیں اور میں ایسی جگہ پر سر اٹھا سکا ہوں جہاں پانی کے اوپر کئی قسم کے پھول اور پودے اُگے ہوئے ہیں۔ اور وہاں سرو ایسے کئی درخت بھی استادہ تھے۔ اُن درختوں کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں نے اُن درختوں کو نشان سمجھ کر گٹھری ایک درخت کی تہہ میں رکھ دی۔ دُوسرا غوطہ زیادہ آسان معلوم ہوا پھر جیسے ہی میں اوپر اٹھا، وہ لوگ دوبارہ مجھ پر گولیاں برسانے لگے مگر اب رائفل صرف ایک کے ہی ہاتھ میں تھی۔ باقی تین آدمی پانی میں کود چکے تھے اور تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ رائفل بردار آدمی آبادشاہ ہی تھا۔ اور فرید احمد اس کے پاس ہی زمین پر لیٹ رہا تھا۔ شاید اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ گاڑی کی بربادی نے اسے تباہ کر دیا تھا۔

میں نے بالآخر ندی کے پانی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بلاخیز رفتار سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنی امانت میں نے اللہ کے سپرد کر کے ندی کے حوالے کر دی تھی اور اب اُن کی طرح میں بھی خالی ہاتھ ہی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ میرا لباس بُری طرح بھیگ چکا تھا اور پھر شیروانی کا بھیگنا تو عذاب بن جاتا ہے۔ اُن لوگوں کی رفتار خاصی تیز تھی، اور آبادشاہ انھیں چیخ چیخ کر آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنے بوجھ سے پریشان ہو کر شیروانی اتارنی چاہی مگر آبادشاہ کی گولیاں مجھے چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ اگر وہ پانی میں اُگے درخت میری اوٹ نہ بنتے تو وہ مجھے اسی لمحے مار چکا تھا۔ نشانہ اس کا بہت اچھا تھا مگر درخت اس کی پیش نہیں چلنے دیتے تھے۔ میں نے

شیروانی کو گلے ہی میں لپٹنے دیا اور درختوں کی اوٹ میں میں کنارے کی طرف بڑھنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک گولی میرے بازو کو چاٹتی ہوئی گزر گئی ہے۔ یہ میرا بایاں بازو تھا۔ درد کا ہلکا سا احساس مجھے ہوا تو میں رُک گیا۔ وہ تینوں آدمی مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ اُن میں سے ایک نے مجھ پر گولی داغ دی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں پاگل ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں کھڑا تھا۔ پانی سے خاصا اُوپر اٹھ آیا تھا۔ میں نے غضبناک ہو کر چیپ شاہ اُس پر داغ دیا۔ دو گولیاں چلیں اور وہ پستول سمیت نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ وہ پھر دوبارہ مجھے نظر نہیں آیا۔ دُوسرے دو آدمی اس اثناء میں پانی کے اندر غوطہ لگا کر آگے بڑھ رہے تھے مگر مجھے اس کا اندازہ جب ہی ہوا جب میں درخت کے ساتھ پیٹا ہوا ایکدم کسی کی آہنی گرفت میں اُلجھ کر رہ گیا۔ کسی نے مجھے پانی میں کھینچ لینے کی کوشش کی تھی۔ پھر اُس کا چہرہ مجھے نظر آیا۔ اوہ میرے خدا! وہ وہی آدمی تھا جسے میں نے رات ڈیوڈ کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں اب تک اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھا جس سے وہ میری ٹانگ چھیل دینے کی فکر میں تھا۔ اس نے بڑے جھنجلاتے ہوئے غضبناک انداز سے مجھے نیچے کھینچا تو میں درخت کو ایک ہاتھ سے تھام نہ سکا اور پانی میں گرنے لگا۔ مگر ابھی اس نے خنجر اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے چیپ شاہ سے اس پر گولی داغ دی۔ وہ میرے سامنے ہی تو تھا۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں لگی اور خنجر پر سے اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اُوپر اُٹھایا اور پھر پانی میں گرا دیا۔ اس کا خنجر بھی اس کے ساتھ ہی نیچے چلا گیا۔ اب صرف دو آدمی باقی رہ گئے تھے اور مجھے انہی سے نمٹنا تھا۔ ایک آبادشاہ اور دُوسرا کوئی اور جس نے پانی میں غوطہ لگا رکھا تھا۔ وہ سمت کا تعین کیے بغیر مجھ سے کئی ہاتھ آگے نکل گیا۔ اور نظر مجھے جب ہی آیا جب وہ مجھ سے کوئی سو گز دور تھا۔ میں نے اس کو چیپ شاہ کی زد میں لے تو لیا مگر میرا وہ پستول جواب دے گیا۔ اس میں سے گولیاں ختم ہو گئی تھیں یا وہ جام ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہُوا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس آدمی کی عمر دراز ہو۔ ابھی اجل کا فرشتہ اس کی طرف نہ لپک سکا ہو۔ بہر حال کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ ورنہ وہ میری گولی سے بچ نہیں سکتا تھا۔

اُس نے جب مجھے یوں نہتا ہوتے دیکھا تو پکار کر بولا۔

"شاہ جی! اسے جانے مت دینا یہ نہتا ہو چکا ہے، اِسے پکڑ لو شاہ جی!" یہ کہتے ہوئے وہ خنجر لے کر میری طرف لپکا۔ پتا نہیں اس کا پستول کہاں رہ گیا تھا میرا خیال ہے وہ کہیں پانی میں گر گیا تھا۔ میں واقعی نہتا ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر درخت سے چمٹ گیا تھا۔ کیونکہ کنارہ وہاں سے کوئی پچاس گز دور تھا۔ اور ندی خاصی گہری تھی۔ کنارے پر اترتے ہی پانی آدمی کو نگلنے لگتا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ آدمی اس پانی کا مقابلہ کرتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آبادشاہ بھی شاید اپنے سارے راؤنڈ ختم کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کی طرف سے بھی کوئی گولی اب میری طرف نہیں آ رہی تھی اور اُس نے رائفل لاٹھی کی طرح ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

جیسے ہی وہ آدمی میرے پاس پہنچا، اس نے پانی سے اُبھر کر خنجر اُوپر اٹھایا ہی تھا کہ میں اُلٹ کر اس کے اوپر جا گرا۔ اور اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے کر اسے پانی میں ڈبو دیا۔ وہ تیراکی کا ماہر تھا۔ خنجر تو اس نے چھوڑ دیا مگر فوراً وہ پانی میں بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی کلائی میرے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔ دراصل اس پر گھڑی بندھی تھی جو اس کی کوئی رگ سامنے نہیں آنے دیتی تھی۔ وہ پانی میں گھرا اُترنے لگا تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے اوپر کھینچا اور تیزی سے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے نرخرے سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور پھر اس نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ بے سُدھ ہو چکا تھا — ہمارا محور اور مرکز وہ درخت ہی تھے۔ میں انہی کے سہارے وہاں پانی میں کھڑا تھا۔ اسے بے بس کر کے میں نے کنارے پر نظر ڈالی۔ آبادشاہ سخت حیران تھا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ اس کے چار آدمی ضائع ہو چکے تھے اور اب وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ میں نے ایک بار اس آدمی کو سنبھالا اور اُسے پانی میں کھینچتا ہُوا آبادشاہ کی طرف چل دیا۔ وہ بڑا ہی مشکل کام تھا مگر مجھے اس آدمی کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُسے میں نے پانی سے بچانے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ جیسے بھی ہو سکا، میں اُسے ندی کے پانی میں گھسیٹتا ہُوا کنارے کی طرف بڑھا۔ صرف اس کا سر میں نے ڈوبنے سے بچا لیا تھا کہ موت کا سارا فساد وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور پانی کی موت اسی راہ سے آدمی پر غالب آتی ہے۔

آبادشاہ بھاگا نہیں، وہ بڑے آہنی عزم کے ساتھ کنارے پر کھڑا رہا۔ فرید احمد اس کے پاس ہی مفلوج سی حالت میں دوزانو ہو کر بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بُری طرح بلک رہا تھا۔ میں نے اس آدمی کو لے جا کر کنارے پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ پانی بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکا تھا۔ آبادشاہ کی رائفل بے کار ہو گئی تھی ورنہ وہ مجھے یوں آگے نہ آنے دیتا۔ پھر بھی وہ گھبرایا ہُوا نہیں تھا۔ مجھ پر اس نے کوئی حملہ بھی نہیں کیا۔ میری

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھُورتا رہا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ میں پانی میں شرابور ہو رہا تھا۔

"تو تم ہو آبادشاہ! میں نے فون پر تمہاری آواز سنی تھی۔ یہ قصّہ کیا ہے آخر؟ کیوں تم نے میرا راستہ روکا؟ کیوں مروا دیا اِن آدمیوں کو تم نے؟ تمہیں پتا نہیں تھا کہ تم کس کا راستہ روک رہے ہو؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟" میں نے پستول کا میگزین کھولتے ہوئے کہا۔ وہ خواہ مخواہ ہی جام ہو رہا تھا، شاید اس کے اندر کوئی چیز پھنس گئی تھی دھیان میرا آبادشاہ کی طرف ہی تھا اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پتھر کا ہو چکا ہو سو وہ مسلسل مجھے گھُورے جا رہا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ مت بھولو کہ میں تمہیں یہیں ختم کر سکتا ہوں۔ بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے؟ کس لیے تم نے اس غریب کی کار تباہ کر دی؟ تم چاہتے کیا تھے آخر؟"

میں نے میگزین بند کر کے پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ اس میں اب بھی تین گولیاں موجود تھیں جن سے میں اُس کا مغز پاش پاش کر سکتا تھا۔

اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر تینوں گاڑیاں کھڑی تھیں دو کے آمنے سامنے کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ فرید کی کار میں جگہ جگہ سُوراخ ہو گئے تھے۔ صرف ایک گاڑی سلامت تھی۔ اس پر میں کوئی گولی نہیں چلا سکا تھا۔ اس وقت ہم اس جنگل میں کوئی چھ سات میل اندر کھڑے تھے۔ کئی پگڈنڈیاں اور راستے ندی پر آ کر ختم ہو جاتے تھے۔ پتا نہیں اس میں اتنا زیادہ پانی کہاں سے آ گیا تھا اور وہ جگہ جہاں سے میں اس میں اُترا تھا کچھ زیادہ ہی گہری تھی اور اب وہ آبادشاہ کے آدمیوں کو نگل چکی تھی۔ ایک بے ہوش تھا، ایک کی لاش گاڑی میں ہی پڑی رہ گئی تھی اور اب شاید آبادشاہ کی باری تھی۔

میں ایک دم غضبناک ہو کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر رائفل نیچے پھینک دی۔ اور مجھ سے بچنے کے لیے وہ سرپٹ بھاگنے لگا۔

میں اگر چاہتا تو اس کو وہیں ڈھیر کر سکتا تھا مگر میں نے گولی نہیں چلائی۔ بلکہ میں بھی اس کے پیچھے بھاگ نکلا۔ میں اُسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ اس سے میں بہت سی باتیں معلوم کر سکتا تھا مگر وہ میرے خبردار کرنے کے باوجود رُکا نہیں اور اچھل کر گھنی جھاڑیوں میں جا چھپا۔

فرید احمد تو کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ اصل بات تو آبادشاہ کی تھی۔ میں پوری قوت سے اس کی طرف لپکا۔ وہ اس وقت پتھروں کے ایک ڈھیر پر جا ٹھہرا تھا اور اس کے اردگرد سرکنڈے نے دیوار کھڑی کر دی تھی۔ میں اس کو زخمی کیے بغیر فرار ہونے سے روک نہیں سکتا تھا۔ ابھی میں اُس کا نشانہ لے ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پوری قوت سے میرے سر میں کوئی چیز دے ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اسے برداشت ہی نہ کر سکا اور وہیں اوندھے مُنہ نیچے گر گیا۔ مجھے پلٹ کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور میرے حواس معطل ہو گئے۔ پتا نہیں اُس حالت میں مجھ پر کیا گزری۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ اپنے پیچھے میں نے کسی گاڑی کی آواز سنی تھی۔ ٹھیک سے یاد نہیں کہ فاصلہ کتنا تھا۔ اس کی طرف دھیان دیے بغیر میں اپنے ہی جوش میں آبادشاہ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میرے دشمن کو ضرب لگانے کا موقع مل گیا اور اس خانہ برانداز نے مجھے پاؤں سے اکھاڑ دیا۔

جب میرا مغز ٹھکانے لگا اور مجھے ہوش آیا تو میں اس وقت بھی وہیں کہیں اسی جنگل میں پڑا تھا، اس حال میں کہ میرے ہاتھ پاؤں بڑی مضبوطی سے جکڑ دیے گئے تھے۔ شیروانی میرے جسم پر نہیں تھی۔ سوئیٹر بھی اتار لیا گیا تھا اور میں گھاس پر اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ میرے دونوں بازو کمر پر بندھے تھے۔

"اوئے جوان! اٹھ جانا ذرا۔ تجھے اب ہوش آ رہا ہے۔"

کسی نے مجھے پاؤں کی ٹھوکر مار کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی چھابھی نظر آ رہا تھا۔ اور رائفل لے کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ بڑی بڑی کالی تلوار ایسی مونچھیں تھیں اس کی اور آنکھیں خون آلود ہو رہی تھیں۔ سر پر اُس نے پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور اس کی قمیص شلوار کا رنگ نیلا تھا۔ پاؤں میں اُس نے سیاہ رنگ کے بہت عمدہ جُوتے پہن رکھے تھے۔ انداز اس کا بڑا ہی جارحانہ تھا۔

میں پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا جب اس نے مجھے پلٹ کر سیدھا کیا تو میرے دونوں بازو کمر کے نیچے دبنے لگے۔ مگر میں نے اپنے چہرے سے اس اذیت کا اظہار نہیں کیا۔ وقت شاید زیادہ نہیں گزرا تھا۔ سُورج سر پر آ چکا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی تو میری نظریں آبادشاہ سے چار ہونے لگیں۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بڑے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور فرید احمد اس کے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک اور آدمی بھی وہاں تھا مگر اسے میں نہیں دیکھ سکا۔ وہ میرے سرہانے کی طرف کھڑا تھا، اور میرے پاؤں کی طرف ایک بڑی ٹرائمف موٹر سائیکل پڑی تھی۔ تو گویا وہ دو آدمی اس وقت ہی جنگل میں پہنچے تھے اور مجھے

انہی میں سے کسی نے سر پر ضرب لگا کر نیچے گرا لیا تھا۔

"اٹھ جا بچے! تجھ سے تو بڑا حساب لینا ہے ہمیں۔" وہ آدمی پھر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا پاؤں میرے گھٹنے پر یوں رکھا کہ اگر وہ ذرا سا دباؤ دیتا تو میں ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو جاتا۔ کیونکہ میری پنڈلیوں کے نیچے ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ وہ انھوں نے میرا خیال ہے جان بوجھ کر وہاں رکھ دیا تھا۔ یا پھر مجھے ڈالا ہی ایسی جگہ تھا کہ گھاس تو میری کمر کے نیچے تھی مگر باقی جسم پتھروں پر پڑا تھا۔

"تو چیز کیا ہے بھئی! ہمارا بریف کیس ہاتھ میں آتے ہی تو بلا بن گیا۔ تیرا دھندا بھی چوری چکاری کا تو نہیں ہے کہیں؟" اس آدمی نے پھر میرے زانو پر بوجھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اس کے دباؤ سے اپنی ٹانگ بچانے کے لیے میں ایک دم دُہرا ہو گیا اور بندھی ہوئی ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگا دیں۔ مجھے واقعی اپنی حالت پر اس وقت بہت ترس آ رہا تھا۔ وہ مجھے باندھ کر مار دینا چاہتے تھے۔ ارادہ ان کا یہی نظر آتا تھا۔

"اس سے پوچھ یار محمد! کہ اس نے اپنا نام بھی مجھے صحیح بتایا تھا کہ نہیں۔ یہ کہتا تھا کہ یہ سردار کریم نواز ہے مگر یہ ہے کوئی اٹھائی گیرا۔ سردار ایسے تو نہیں ہوتے۔"

اچانک مجھے اپنے سر پر شدید چوٹ لگنے کا احساس ہوا۔ وہ آدمی جو میرے سرہانے کھڑا تھا، اپنے بوٹ کی ٹھوکر مار کر میرے سامنے آ گیا۔ میرا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

"بول اوئے پھنّے خاں! کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں آبادشاہ کو بتا چکا ہوں کہ میرا نام سردار کریم نواز ہے۔"

"سردار کہاں کا ہے تو! کام تو تیرا اُچکوں جیسا ہے۔ اس بریف کیس پر تیرا کیا حق تھا؟ کسی نے اُسے تیرے پاس امانت رکھوایا تھا؟"

"وہ میں اسے ہی واپس کرنا چاہتا تھا مگر اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔" میں نے بڑی دھیرج سے جواب دیا۔ اُن کے ارادوں کا مجھے علم تھا۔ پھر اُن سے نپٹنے ڈرنے کی یا اُن کے سامنے ہکلانے کی کیا ضرورت تھی۔

"تو مس آرمینیا کی بات کرتا ہے۔ اس سے پوچھ اٹک جان کہ جب میں نے اسے بتا دیا تھا تو پھر یہ بریف کیس لے کر بھاگا کیوں؟"

"یہ غلط ہے، میں نے وہ بریف کیس ڈلیوڈ کے حوالے کر دیا تھا۔"

"بالکل جھوٹ۔ ڈلیوڈ کے پاس کچھ نہیں تھا۔"

"اور اسی لیے تم نے اُسے قتل کروا دیا۔"

"وہ ہماری مجبوری تھی اور پھر اس نے اپنی موت کا خود انتظام کیا تھا۔ خود اس نے ہمارے آدمی پر حملہ کیا۔"

"اب کیا چاہتے ہو تم؟"

"وہ بریف کیس ہمارے حوالے کر دو، اور ہمارا 'کھیڑا' چھوڑ دو تو ہم تمھیں بخش سکتے ہیں۔" اٹک جان نے پستول مجھ پر تانتے ہوئے کہا۔

"اس کا مجھے کچھ علم نہیں ہے، وہ میں نے ڈلیوڈ کو دے دیا تھا۔"

اس بات پر آبادشاہ ایک دم طیش میں آ گیا۔ اس نے اوپر مجھے بالوں سے پکڑا اور چار پانچ طمانچے میرے منہ پر مار کر بولا۔ "تو سچ بولے گا بچے! تجھے سچ بولنا پڑے گا۔ فرید احمد بتا رہا تھا کہ تمھارے پاس ایک گٹھری تھی۔"

"وہ کہیں راستے میں گر گئی ہے مجھے نہیں پتا وہ کہاں رہ گئی ہے۔"

"کیا تھا اس گٹھری میں؟"

"میرا کچھ ذاتی سامان تھا اس میں۔ کپڑے اور کچھ اور چیزیں۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے۔ اٹک جان! اس کو بتا دو، ہم اس کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔ وہ بریف کیس ہمیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ ہمارے تین آدمی اس نے مار دیے ہیں۔ اتنا نقصان تو ہمیں کبھی بھی نہیں اٹھانا پڑا۔ میں کہتا ہوں سچ سچ بتا دے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

"میرے ہاتھ اگر کھول دو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ پھر میں تم سے زیادہ بہتر بات کر سکوں گا۔" وہ ایک بار پھر مجھے مارنے کے لیے بڑھا مگر پھر اس نے کسی خیال سے ہاتھ روک دیا۔

"بہتر ہے ہمیں اس بریف کیس کا پتا بتا دو۔"

"تم یہ بتاؤ آبادشاہ! اس مس آرمینیا سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"یہ مت پوچھو ہم سے۔ اس سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں ہے، سمجھے! اپنی رہائی چاہتے ہو تو اس بریف کیس کا پتا بتا دو۔"

"میں نے کہا تو ہے کہ وہ میں نے ڈلیوڈ کو دے دیا تھا۔"

اس پر اٹک جان نے میری ٹانگوں کی رسّی پکڑی، اور بڑے ہی وحشیانہ انداز سے وہ مجھے گھسیٹنے لگا۔ وہ بڑا ہی اذیت ناک مرحلہ تھا۔ وہ مجھے پتھروں پر، گھاس پر اور کانٹوں پر گھسیٹتا چلا گیا اور وہ تینوں میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ یار محمد کھلکھلا کر ہنس رہا تھا اور یہی حال آبادشاہ کا تھا — اٹک جان مجھے کوئی سو گز تک گھسیٹتا ہی چلا گیا۔ میری کمر اور میرے بندھے ہاتھ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ وہ میری زندگی کا بڑا ہی خوفناک لمحہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

مگر میں نے اُف تک نہیں کی۔ وہ سزا مجھے میرے ایک جرم کے بدلے میں مل رہی تھی جو امانت میں خیانت کی وجہ سے دی جا رہی تھی، مگر وہ عورت خود خائن تھی۔ خود وہ بددیانت لوگ تھے۔ اور اُن کا تعلق غیر ممالک میں موجود لوگوں سے تھا اور مس آرمینیا اُن کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ مجھے وہ سب کچھ جھیلنا ہی تھا کہ اُن سے کوئی بھی بات بعید نہیں تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ جب تک ان کو بریف کیس کا پتا نہیں بتاؤں گا وہ مجھے زندہ رکھیں گے۔ اس وقت تک مجھے گولی نہیں ماریں گے جب تک ان کا مال انھیں واپس نہیں مل جاتا۔ اب جب کہ میں اُن سے جھوٹ بول ہی چکا تھا تو مجھے اس بات پر پہرہ دینا چاہیے تھا کیونکہ صرف اُن کے بریف کیس کی ہی بات نہیں تھا، میرا اپنا ایک کروڑ روپیہ دوسرے بریف کیس میں بند تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ چادر میں بندھے ہوتے تھے اور ندی اُن کی امین بن گئی تھی۔ تب اپنی رقم سے ہاتھ دھو لینا تو انھیں بتا دیتا کہ وہ بریف کیس کہاں ہے۔ مگر یہ ناممکن تھا۔

جب اٹک جان رُکا تو اس وقت تک میرا بُرا حال ہو چکا تھا۔ میرے سر میں کانٹے چبھ گئے جو مجھے سخت تکلیف دے رہے تھے۔ ہم اس وقت گھنے جنگل میں تھے، ایسے جنگل میں جہاں لکڑیاں چننے والے بھی نہیں جاتے۔ اور کالا چٹا پہاڑ میری قبر بنتا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ میرے چہرے پر شاید اذیت اور کرب کا بے پناہ احساس ابھر آیا تھا جسے دیکھ کر اٹک جان نے میری رسّی چھوڑ دی۔

"اب بھی تمھاری سمجھ میں آیا ہے کہ نہیں۔ اس بریف کیس کا پتا بتا دو۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ تمھارے ہی پاس ہے۔"

میں نے اس کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ میرے حواس پھر کھٹکنے لگے تھے کہ آبادشاہ میرے قریب آ کر بولا۔ "سردار جی! بریف کیس کا پتا بتا دو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔ بریف کیس ہمیں دے دو اور آرام سے گھر چلے جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو ہم تمھارے گھر والوں کو بھی اٹھا لیں گے۔ ہاں تمھارے بارے میں معلومات حاصل کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔"

"یہ تمھارا وہم ہے آبادشاہ! تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے۔ میں سارے رشتے ناتے توڑ چکا ہوں۔ کچھ حاصل نہیں ہو گا تمھیں۔ بہتر ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بریف کیس میں ڈیوڈ کو دے آیا تھا اور یہی میرا جواب ہے۔"

"پھر تم کل ہوٹل سے نکل کر کہاں گئے تھے؟"

"میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔"

"تم رات ویگنوں کے اڈے پر کیسے پہنچے؟ اور ہوٹل میں کیوں رہے؟"

"میں دوست کے گھر نہیں ٹھہرا۔ وہی مجھے رات کو ہوٹل پہنچا گیا تھا۔"

"ہوں۔ تم رات عشا کے قریب ڈلیوڈ کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں میں گیا تھا۔ وہاں ڈلیوڈ اور اس کی ماں مرے پڑے تھے۔ ڈلیوڈ کو قتل کر دیا گیا اور اس کی ماں بیماری سے مر گئی۔"

"اور پھر تم وہاں سے خالی ہاتھ نکل آئے۔"

"میں بریف کیس تلاش کرتا رہا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔"

"ہوں۔ اور یہ گٹھری جو تمھارے پاس تھی اس کو تم نے کہاں پھینکا؟"

"وہ کہیں راستے میں گر گئی تھی۔ تم نے تو مجھے پاگل کر رکھا تھا، میں کیا کرتا۔"

میری کمر میں بھی کئی کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ ہاتھ اور پیٹھ بُری طرح چھل چکے تھے مگر اُن کا کوئی علاج میرے پاس نہیں تھا۔ اور آبادشاہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تو بہت ہی ڈھیٹ آدمی ہے اُستاد! مگر تیرا تو ہم لٹو گھما دیں گے، تو سمجھتا کیا ہے آخر خود کو؟" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی کی طرف چل دیا۔

میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ جان ضیق میں پڑ گئی تھی۔ یار محمد اور اٹک جان پستول تان کر میرے سامنے آ ٹھہرے تھے۔ دونوں سگریٹ کے رسیا معلوم ہوتے تھے اور لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ دونوں شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ آبادشاہ کا بھی یہی حال تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اسی وقت مجھے گولی مار دیتے۔

آبادشاہ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لمبا سا رسّا تھا۔ "یہ لو اٹک جان! اسے درخت پر باندھ کر اس کا لٹو گھماؤ، پھر یہ خود ہی بولے گا۔ ایسا ذلیل آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔"

اٹک جان نے سگریٹ ہاتھ میں مسل کر دور پھینکا اور پستول جیب میں رکھ کر رسّا اس نے آبادشاہ سے لے لیا۔

کچھ ہی دیر بعد اٹک جان نے وہ رسّا ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر یار محمد اور آبادشاہ نے مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس رسّے کے ساتھ اُلٹا لٹکا دیا۔ اس طرح کہ میرے دونوں پاؤں انھوں نے رسّے میں جکڑ دیے۔ وہاں پہلی رسّی بھی موجود تھی۔ وہ بھی انھوں نے وہیں رہنے دی۔

جب وہ مجھے اُلٹا لٹکا چکے تو آبادشاہ بولا۔ "اب بھی

بنا دے تجھے! ورنہ تیرا لٹو پوری طرح گھوم جائے گا۔ تو یہ عذاب سہ نہیں سکے گا۔ اب بھی وقت ہے۔"

حالت میری یہ تھی کہ میرے بازو کمر پر بندھے تھے اور میری قمیص سرک کر میرے منہ پر آ پڑی تھی۔ وہ مجھے واقعی مار دینا چاہتے تھے۔ میری رسوائی اس سے زیادہ اور کیا ہو گی مگر میں اُن کے سامنے سچ کیسے بول دیتا۔ وہ اپنی ضد پر اَڑے تھے تو میں کیسے اُن کے سامنے دست بردار ہو جاتا؟ میں اپنا ایک کروڑ اُن کے حوالے کیسے کر دیتا؟ اور ابھی مجھے گولی مار دینے کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ میری بچت اسی میں تھی کہ میں مسلسل انکار کرتا رہوں۔ مجھے صورتِ حال کے کسی نہ کسی طرح اچانک بدل جانے کی توقع تھی۔ وہ کوئی بھی غلطی کر سکتے تھے جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

یار محمد نے مجھ سے کوئی جواب نہ پا کر آبادشاہ کے اشارے پر رسّے کو پوری قوت سے گھما دیا۔ اف میرے پروردگار! اب میں واقعی لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ ہر شے مجھے اپنے اردگرد محوِ رقص نظر آتی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ میرے حواس ختم ہونے لگے۔ اور میں خود پر ضبط نہ کر سکنے کی وجہ سے قے کرنے لگا۔ میرے معدے میں جو کچھ تھا وہ میں نے الٹ دیا۔ میری حالت بد سے بدتر ہو گئی تو وہ مجھ سے ذرا دور ہٹ گئے۔ اور الگ جا کر اطمینان سے فرید احمد کے پاس بیٹھ گئے۔ کوئی دس منٹ تک میری یہی حالت رہی۔ بالآخر رسّا ایک جگہ تھم گیا۔ میں ابھی تک الٹا لٹک رہا تھا۔ قے البتہ رُک چکی تھی کہ اچانک میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں نے ان دونوں پر نظر دوڑائی۔ تو میں نے دیکھا کہ فرید احمد پستول سے اُن پر گولیاں چلا رہا تھا اور پہلی گولی اس نے یار محمد کو ماری تھی۔

"بدمعاشو! میری سواری کو اتنا ذلیل کر دیا ہے تم نے اور میں تمھارا لحاظ کرتا رہا۔" وہ انھیں گندی گالیاں دے رہا تھا۔ دوسری گولی اس نے آبادشاہ پر چلائی۔ اس عرصے میں اٹک جان سنبھل چکا تھا مگر فرید احمد نے اس کو کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس پر گولی چلا دی۔ اس طرح کہ اس کا دایاں بازو بری طرح زخمی ہو گیا۔ آبادشاہ کی گردن میں گولی دھنس گئی تھی۔ اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ یار محمد کو اس نے پہلے ہی ہلّے میں شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس کی دونوں رانوں سے خون اُبل رہا تھا۔

فرید احمد نے گرے ہوئے اٹک جان کے قریب پڑا پستول اٹھایا اور اسے بائیں ہاتھ میں لے کر بولا۔ "تمھارا لٹو میں اب خود گھماؤں گا کتو! بولو اب — ایک شریف آدمی کو ذلیل کر رہے ہو تم — اس پر الزام لگاتے ہو۔ کیا گناہ کیا ہے اس نے تمھارا؟ میری گاڑی بالکل تباہ کر دی ہے تم نے۔ یہ نقصان کون پورا کرے گا؟ تمھارا باپ؟ بولو۔" یہ کہہ کر اس نے پستول کے دستے سے انھیں مزید زخمی کر دیا۔ شاید وہ انھیں بے ہوش کر دینا چاہتا تھا۔ ضرب وہ اُن کے سروں پر لگا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ بے ہوش بھی ہوئے تھے کہ نہیں مگر فرید احمد بہت جلدی میں تھا۔ اس نے فوراً ہی میری طرف رُخ کیا اور مجھے اُس رسّے کی گرفت سے بڑی مشکلوں سے رہائی دلائی۔ دراصل میں زمین سے کئی فٹ اونچا اٹھا ہوا تھا اور رسّے تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس مشکل کے حل کے لیے وہ پھر اٹک جان کے پاس گیا اور اس کا خنجر لے کر وہ درخت پر جا چڑھا اور وہاں سے رسّے کو کاٹ دیا۔ میں دھڑام سے نیچے گرا تو اس نے میری رسّیاں کھول دیں۔

"خدا کا شکر کریں صاحب! یہ تو بڑے موذی لوگ ہیں۔ آپ کہاں ان کے ہتھے چڑھ گئے؟"

"تمھارا میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں فرید احمد! تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟"

"مجھے بہت غصہ آ رہا تھا صاحب! ان کی حرکتیں میں دیکھ رہا تھا مگر بات بن نہیں رہی تھی۔ یہ سب کے سب مسلح تھے۔ ابھی جب یہ میرے پاس آپ کو اوپر لٹکا کر واپس گئے تو میں نے موقع ملتے ہی یار محمد سے اس کا پستول چھین لیا۔ وہ ذرا دیر کے لیے اس سے غافل ہوا تھا۔ نیا سگریٹ سلگانے کے لیے اس نے پستول جیب میں ڈال لیا تو وہ میں نے فوراً ہی کھینچ کر اس پر گولی چلا دی اور پھر کام آسان ہو گیا۔ ایسے خبیث کے بچے ہیں یہ — اُن کا وہ آدمی جو کنارے پر بے ہوش پڑا ہے، وہ بھی ہوش میں آ رہا ہے۔ آپ نے جسے ندی میں گولی ماری تھی، وہ بھی زخمی ہے مگر اب خوفزدہ ہو کر وہ اندر ہی اندر چلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اسے۔"

"اچھا! اور وہ جو گاڑی میں پڑا ہے؟"

"اس کا پتا نہیں کیا حال ہے۔ میرا خیال ہے اس کی ہنسلی کے پاس گولی لگی تھی۔"

"تم نے کمال کر دیا ہے فرید احمد! میں کبھی تمھارا یہ احسان نہیں بھول سکوں گا۔ میں تمھیں نئی گاڑی لے دوں گا اور جو گاڑی تباہ ہو گئی ہے اس کی قیمت دے دوں گا، ہاں — بالکل بے فکر رہو۔ ان سب کو گاڑی میں ڈالو، ان کا علاج بہت ضروری ہے۔"

"دفع کریں جی! پڑا رہنے دیں ان کو ادھر۔ چیل کوّے کھا جائیں گے انھیں۔ کیا ضرورت ہے ان کتوں کے علاج کی۔"

"نہیں فرید احمد! یہ بہت ضروری ہے۔ شکر ہے کہ ان میں سے مرا کوئی بھی نہیں۔ تم میرے ساتھ لگو ذرا۔"

میں نے ان سب کو فرید احمد کی مدد سے کھینچ کھانچ کر گاڑی میں ڈالا۔ وہ آدمی جو گاڑی میں زخمی ہوا تھا ابھی زندہ تھا مگر اس کا خون زیادہ بہہ نکلا تھا پھر بھی اس کے بچ جانے کی امید تھی۔ وہ تعداد میں چھ تھے۔ ان کو گاڑی میں بٹھا کر میں فرید احمد کے ساتھ دوبارہ ندی کی طرف نکل گیا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں اپنی گٹھڑی واپس لے آؤں — وہ بہت ضروری ہے۔ سارا مال اسی میں ہے۔"

"کیسا مال؟ آپ کا مطلب ہے کہ وہ بریف کیس آپ کے پاس ہے؟"

"ہاں — میں تمھیں ابھی واپس آ کر بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں پھر ندی میں کود گیا۔ اور سیدھا اُن درختوں کے پاس جا پہنچا جہاں گٹھڑی میں نے تہ میں اتاری تھی۔ پہلے ہی غوطے میں مجھے وہ گٹھڑی مل گئی۔ چادر میں بندھی ہونے کی وجہ سے اس کا اٹھا لینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ اسے ساتھ لے کر میں پانی کی سطح پر آیا اور … درخت کے ساتھ ٹک کر میں نے اسے گردن اور شانے پر لٹکا لیا۔ اب واپسی میں تیرنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ جب میں دوبارہ کنارے پر پہنچا تو فرید احمد کنارے سے کوئی بیس قدم دُور تھا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو اُس کی نظریں بدلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک دم مجھ پر پستول تان لیا اور بڑے سخت لہجے میں بولا۔ "یہ گٹھڑی ادھر رکھ دو اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمھاری جان ان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بلا سوچے سمجھے مجھ پر گولی چلا دی۔

پہلی گولی میری ران میں لگی۔ میں تڑپ کر اچھلا تو گٹھڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دوسری گولی چلائی وہ میرے بائیں بازو پر لگی۔ تو میں پاگلوں کی طرح ندی کی طرف بھاگا۔ فرید احمد مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا۔ وہ میری طرف لپکا اور جب اس نے تیسری گولی چلائی تو میں اس وقت تک ندی میں کود چکا تھا۔ مجھے اپنی جان بچا لینا ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ کنارے پر پہنچ کر رک گیا۔ میں نے پانی میں کودتے ہی غوطہ لگا دیا تھا۔ اور میں پانی کے اندر ہی اندر دوسری طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مجھے سانس لینے میں شدید تکلیف محسوس ہونے لگی تو میں اچھل کر پانی کی سطح پر آ گیا۔ اس وقت تک میں ندی کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ فرید احمد نے وہیں کھڑے کھڑے مجھ پر دو گولیاں چلائیں۔ مگر میں فوراً ہی غوطہ لگا گیا۔ جب میں دوسری بار اوپر ابھرا تو اس وقت تک فرید احمد اپنی گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور میرے دونوں بریف کیس اُس کے پاس تھے۔

میں پاگلوں کی طرح پیچھے لوٹا مگر ندی کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ وہ فاصلہ اتنی جلدی طے کر لینا مجھے ناممکن نظر آتا تھا۔ میرا بازو اور میری ٹانگ بری طرح زخمی تھے اور مجھے کنارے کی شدید مزاحمت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں فرید احمد کو وہاں سے فرار ہوتے دیکھ کر صبر نہ کر سکا اور جس قدر جلد ممکن ہو سکا ندی عبور کرنے لگا۔

میں کنارے پر پہنچا تو فرید احمد اس وقت تک وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ میری ساری محنت برباد ہو گئی تھی۔ بالآخر وہ سب کچھ فرید احمد اٹھا کر لے گیا تھا۔ جسے میں نے سنبھالنے کے لیے کئی زندگیاں برباد کر دی تھیں۔ میں نے اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے آبادشاہ کی دوسری گاڑی سنبھالی۔ اس کی جیب سے کچھ نوٹ جھانک رہے تھے۔ وہ میں نے کھینچ کر باہر نکالے اور انھیں جیب میں ڈال کر میں اندھا دھند گاڑی کو بھگاتا ہوا تیز رفتاری سے فرید احمد کے پیچھے چل دیا۔ اس کی گاڑی اپنے پیچھے راستہ بناتی چلی گئی تھی۔ میں اُسی راستے پر طوفانی رفتار سے بڑھتا چلا گیا۔ میرے ذہن میں پھوڑا اُگ آیا تھا۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم اپنے مال کی حفاظت کرتے تھے، کر سکتے تھے مگر یہ بنا بنایا کھیل کیسے بگڑ گیا؟ کیا فرید احمد اسی لیے اُن کے سامنے سارا عرصہ یوں بھیگی بلی بنا رہا کہ وہ موقع ملتے ہی ہم سب کو غچہ دے دے گا۔ اس نے تو واقعی کمال کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سی چال کس وقت چلنی چاہیے مگر ایسی چال جو دوسروں کا بھٹہ ہی بٹھا دے یہ کہاں لکھا تھا آخر؟ اور اب وہ دو کروڑ روپوں کا مالک بن بیٹھا تھا۔ وہ نمک حرام تو سیدھا یورپ کا ٹکٹ کٹائے گا۔ کیا لے گا وہ پاکستان میں رہ کر — ایک لمبی رقم اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس کے تو وارے نیارے ہو گئے تھے اور کوئی اسے روکنے والا بھی نہیں تھا اور عمر اُس کی کیا تھی؟ یہی کوئی بیس بائیس سال۔ ایسے میں کروڑوں کی رقم مل جائے تو آدمی کی تو واقعی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا ہے۔ مجھے سخت طیش آ رہا تھا۔ کیسی کیسی حماقتیں مجھ سے سرزد ہو چکی تھیں۔ اس فرید احمد پر اتنا زیادہ اعتماد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اُن کا سارا مال ندی میں پڑا ہے۔ اور میں اسے اندھوں کی طرح ہاتھ میں پکڑ کر اس کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے کچھ تو سوچا ہوتا۔ مجھے معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ ایسے میں کسی بھی آدمی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر میرا برا ہو۔ یہ باتیں تو اب میرے ذہن میں آ رہی تھیں جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اور …… وہ پستول سے مسلح تھا۔ وہ تو شکر ہے مجھے صرف دو ہی زخم لگے تھے۔ کوئی کاری گھاؤ وہ نہیں لگا سکا تھا۔

اور میں بھاگ کر ندی میں کود گیا تھا۔ ورنہ وہ تو ہر حال میں مجھے قتل کر دیتا۔ سوچتا ہوگا کہ اصل بانس تو یہی ہے جس پر رقم لٹک رہی ہے اسی کو کاٹ دو۔ پھر بانسری بجنا بند ہو جائے گی۔ یہی سوچا ہوگا اس نے اور اب وہ مزے سے پنڈی کی طرف جا رہا ہوگا۔ خدا غارت کرے اسے، مجھے تو اس نے اپنی مونچھیں منڈوا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک ذرا سا چھوکرا اور یہ حال۔ اُف میرے خدایا! یہ شکست بھی میرے مقدر میں لکھی تھی۔

میں نے جوں توں کر کے جنگل عبور کیا۔ ران میں گولی نے گھٹنے سے ذرا اوپر زخم ڈالا تھا۔ بازو میں ایک ہلکا سا زخم تو پہلے ہی مجھے لگ چکا تھا مگر فرید احمد نے وہاں گھاؤ ڈال دیا تھا اور وہ دونوں ہی زخم رسنے لگے تھے۔ پھر بھی میں برداشت کر رہا تھا۔ میں نے چلتے چلتے اپنا کپڑا پھاڑ کر زخم سے ذرا پیچھے ران پر کس کر پٹی سی باندھ لی۔ جس سے یہ فرق پڑا کہ میرا خون رسنا کم ہو گیا۔ جب میں جنگل کے آخری حصے میں تھا تو میں نے سوچا کہ میں بازو کو بھی باندھ لوں مگر مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ چھوکرا کا بچہ پتا نہیں کتنی دور جا چکا تھا۔ اس زخم کو میں نے یوں ہی چھوڑ دیا۔ اور گاڑی کو سڑک پر لاتے ہی میں نے ٹاپ گیئر میں ڈال دیا۔ اس بلا خیز رفتار سے میں بڑھتا چلا گیا کہ اچانک ایک جگہ فرید احمد کی گاڑی مجھے کھڈے میں گری نظر آئی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ کوئی آدمی اس گاڑی کے قریب نہیں تھا اور گاڑی الٹی پڑی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ آگ سے محفوظ تھی۔

میں نے کار روکی اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے کھڈ میں اُتر گیا۔ آثار یہ بتاتے تھے کہ وہ حادثہ عمداً کیا گیا تھا۔ کیونکہ گاڑی کے اندر فرید احمد نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی وہ گٹھری جس میں اتنے سارے لوگوں کی زندگی بندھی تھی۔ فرید احمد کو میں نے چاروں طرف دیکھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے گاڑی کو جان بوجھ کر وہاں گرا دیا اور خود وہ چلتی گاڑی سے کود گیا ہے۔

یہ میری بہت بڑی بدنصیبی تھی۔ ایسی بدنصیبی جس کا کوئی بھی علاج میرے پاس نہیں تھا۔ فرید احمد کو فوراً ہی پنڈی جا کر ڈھونڈ لینا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ اس جیسا چالاک آدمی دوبارہ گھر لوٹ کر نہیں گیا ہوگا۔ وہ سیدھا کسی اور شہر چلا گیا ہوگا۔ اب وہ اتفاقاً ہی میرے ہاتھ آ جائے تو اور بات ہے ورنہ اس کو ڈھونڈ لینا ناممکن تھا اور میرے زخم مجھے دم بدم کمزور کیے جاتے تھے شاید ران میں گولی اندر دھنس کر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں، مجھے علاج کی شدید ضرورت تھی۔ مگر میں کہاں جا سکتا تھا۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ اسپتال جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ضرور پوچھتے ہیں، میاں! تم کون ہو؟ اور زخم کیسے لگے؟ کس قبیلے سے تعلق ہے تمہارا؟ خیر خیریت سے آئے ہو؟ خود مرنے سے بچے ہو تو دوسروں کا کیا کر آئے ہو؟ اس جیسے سیکڑوں سوال وہ پوچھتے ہیں اور پولیس کو وہ الگ خبردار کر دیتے ہیں، یہ خطرہ میں مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔ کسی مجرم۔۔۔ کسی مجھ ایسے اشتہاری مجرم کی زندگی موت سے کم اذیت ناک نہیں ہوتی اور پھر میں جو تازہ تازہ لُٹا تھا، میرا تو ذہن ہی کام نہیں کرتا تھا۔

میں ایک بار پھر گاڑی میں جا بیٹھا اور اس کا رُخ میں نے کھوڑ کی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ مجھے وہاں طبی امداد مل سکتی تھی اور یہ اچھا تھا کہ میں آباد شاہ کی جیب سے نوٹ نکال لایا تھا ورنہ میں تو اس روز دانے دانے کو ترس جاتا۔ کوئی مجھے روٹی کا ایک لقمہ دینے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ چہ جائیکہ کوئی ڈاکٹر میرا علاج کرتا۔

میں نے نوٹ نکال کر گنے۔ سو سو کے نوٹوں کی تین گڈیاں تھیں جو میں اٹھا کر لے آیا تھا۔ وہ تیس ہزار روپیہ میرے ہزار کام سنوار سکتا تھا۔ مگر۔۔۔ یارو۔۔۔! جس ذلت آمیز شکست سے میں دوچار ہو چکا تھا اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بڑی ہی اذیت ناک اور عبرت انگیز شکست تھی جس کے لیے میں ہزار بار خود پر نفرین بھیج چکا تھا اور اب بھی میری طبیعت مطمئن نہیں ہوتی تھی میرا دل چاہتا تھا کہ میں کسی کھمبے سے ٹکرا کر خود کو فنا کر دوں۔ گاڑی سمیت کسی دائیں بائیں کھڈ میں جا گروں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا کہ آپ نے خون کا دریا عبور کر کے ایک چیز حاصل کی ہو اور کوئی اسے یوں ہی لے اُڑے یہ کہاں لکھا ہے؟ میں خود کو کسی بھی طرح معاف نہیں کر سکتا تھا مگر۔۔۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ ویسے میرا یہ ارادہ ضرور تھا کہ میں جیسے بھی ہو سکا، اس فرید احمد کو ہر حال میں تلاش کروں گا۔ آج نہیں تو کل وہ مجھے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ مگر یہ محض میری خام خیالی ہی تھی۔ حقائق سے اس کا تعلق کچھ بھی نہیں تھا۔ اور ابھی تو مجھے اپنے زخم رفو کروانے تھے۔

میں جب کھوڑ کے بازار میں سے گزر رہا تھا تو مجھے اچانک ایک جگہ ڈاکٹر ابدال بیگ کا بورڈ لکھا نظر آیا۔ وہ کوئی میڈیکل پریکٹیشنر تھا کسی قلعہ دیدار سنگھ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا۔ نہ وہ ایم بی بی ایس تھا نہ کچھ اور۔ خدا جانے وہ کیسی ڈگریاں تھیں جو اس نے بورڈ پر لگا رکھی تھیں۔ انہیں پڑھ کر میں نے کار وہاں روک دی اور سیدھا اس کی دکان میں جا گھسا۔ خواتین کے لیے اس نے الگ حصہ بنا رکھا تھا۔ مردوں کو باہر بڑی میز پر ہی دیکھ لیتا تھا اور اس وقت وہ دکان میں موجود تھا۔ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ اس وقت تنہا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے دو گولڈ لیف کے پیکٹ اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ شکل صورت سے وہ خاصا مفلوک الحال آدمی معلوم ہوتا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی پچاس کے قریب ہو گی۔ چہرے سے ذہانت اور تجربہ جھلکتا تھا۔

مجھے یوں اس قدر نڈھال دیکھ کر وہ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا "کیا بات ہے بھائی! خیر تو ہے؟ تم تو شدید زخمی معلوم ہوتے ہو؟"

"ہاں ڈاکٹر! مجھے راستے میں ڈاکوؤں نے زخمی کر دیا۔ میں بس جان بچا کر یہاں تک آ گیا ہوں میرے زخم دیکھیں پہلے۔"

"کیوں نہیں۔ مگر وہ کون لوگ تھے؟ یہ تو کوئی پولیس کا کیس معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آدمی کی زندگی ان سوالوں سے زیادہ ضروری ہے جسے میں بچا کر آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ میرا زخم دیکھیں ڈاکٹر صاحب! گولی شاید اندر ہی رہ گئی ہے۔" میں نے ران اس کے سامنے کھولتے ہوئے کہا۔

وہ کرسی کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گیا، بولا "بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ تمہارے کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں یہ قصہ کیا ہے آخر؟"

"جلدی کریں ڈاکٹر صاحب! میری جان نکلی جا رہی ہے اور آپ کو باتیں سوجھ رہی ہیں۔ کتنی فیس ہے آپ کی؟"

"ایسے معاملے میں تو میں سو روپے سے کم نہیں لیتا۔"

"صرف سو روپے! آدمی کی جان کی قیمت! لوگ تو ایک ٹیلیویژن کی خرابی دیکھنے کے سو روپے لے لیتے ہیں۔ میں آپ کو پانچ سو روپے دوں گا مگر جلدی کریں۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹوں کی گڈی میں سے سو سو کے پانچ نوٹ اس کے سامنے میز پر ڈال دیے۔ وہ کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ کرسی سے اٹھا اور میز پر سے تمام ضروری اوزار اٹھا کر میری طرف بڑھا، بولا۔

"میں آپ کو پہلے ٹیکہ لگا دوں، گولی پھر ہی نکل سکے گی ورنہ آپ کو درد بہت ہوگا۔"

"جو مرضی آئے کریں۔ میرا بازو بھی شدید زخمی ہے مگر گولی آگے نکل گئی تھی۔"

اس نے بڑی احتیاط سے مجھے ٹیکہ لگا کر میری ران سن کر دی اور پھر نہایت چابکدستی سے اس نے زخم میں سے گولی نکال دی لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے میرا زخم کچھ اور گہرا کر دیا۔ درد سے تو میں بچ گیا مگر جب وہ فارغ ہوا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جب ٹیکے کا اثر ختم ہوگا تو درد پھر جاگ اٹھے گا اور مجھے بڑی تکلیف دے گا مگر وہ تو مجھے سب کچھ سہنا ہی تھا کہ میری تقدیر ہی یہی تھی میں اس سے کسی بھی طرح بچ نہیں سکتا تھا۔ جب وہ میرے بازو پر پٹی باندھ چکا تو بولا "اب بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ اُدھر کالے چٹے پہاڑ کے قریب۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ وہ میرا تمام سامان لوٹ کر لے گئے، صرف یہی رقم بچ سکی ہے۔"

"آپ تھانے کیوں نہیں گئے؟"

"کیا فائدہ ہوگا؟ کیا وہ کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ کسی کی مدد کی ہے انہوں نے، بہت بھولے آدمی ہیں آپ ڈاکٹر صاحب!"

"ٹھیک ہے، آپ یہ چار سو روپے رکھ لیں۔ میرے لیے یہ سو روپیہ ہی کافی ہے۔"

اس نے میری توقع کے برعکس صرف ایک سو روپیہ اپنے پاس رکھ کر باقی رقم مجھے واپس کر دی۔

"کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں میرے کپڑے بُری طرح بھیگ گئے ہیں۔ مجھے یہاں سے کوئی ریڈی میڈ کپڑے لا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ہاں، یہ تو کچھ مشکل نہ ہوگا۔ قمیص شلوار لا دوں، پاس ہی میں ایک دکان یہاں کھلی ہے۔ وہاں سے یہ سب کچھ مل سکتا ہے۔"

"بس وہی لا دیں۔ میں شاید ابھی چل نہیں سکوں گا۔"

"ہاں، آپ کو بہت آرام کی ضرورت ہے۔ زیادہ چلنے پھرنے سے یہ زخم خراب ہو سکتا ہے۔"

"میں یہی کروں گا۔ یہ لیں یہ دو نوٹ لے جائیں۔" میں نے اسے دو سو روپے دے دیے۔ وہ کچھ سوچتا ہوا دکان سے اترا اور باہر چلا گیا۔ وہ کوئی بہت ہی ہمدرد اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی بات پہ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ رقم کا بھی لالچ نہیں رکھتا تھا۔ ورنہ میں اسے پانچ سو روپے دے رہا تھا۔ ایسے بھی لوگ ابھی اس دنیا میں موجود ہیں۔

وہ باہر نکلا تو میں ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ میری ٹانگ جس طرح سُن ہو کر رہ گئی تھی، کاش میرا ذہن بھی اس طرح مفلوج ہو جاتا۔ تاکہ میں آگے پیچھے کی کوئی بات نہ سوچ سکتا۔ مجھ پہ آباد شاہ اور اس کے ساتھیوں نے جس طرح عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، وہ میرے لیے ایک للکار کی حیثیت رکھتا تھا۔ کوئی اتنی بڑی رقم زندگی میں پہلی بار مجھ سے چھین کر آگے نکل گیا تھا اور وہ بھی ایک نوعمر سا ڈرائیور جس کی جرأت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ آباد شاہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ جب میں ان سے پیچھا چھڑا کر رقم کی طرف بڑھا تو فرید احمد کے ہاتھوں میں ان کا پستول آ چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ فرید احمد کی یہ نیت نہیں تھی۔ وہ آخری وقت تک بڑے خلوص سے میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر جب اس نے آباد شاہ کو زیر کر لیا تو پھر اس نے محسوس کیا کہ اب تو صرف میں ہی وہاں رہ گیا ہوں۔ اذیت

کا مارا ہوا نڈھال پریشان غلام جیلانی ہی اس کے اور رقم کے درمیان باقی ہے۔ تو اس وقت اس کی نیت بدل گئی اور مجھے بھی اس نے مار دینے کا تہیہ کرلیا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ بڑے کاری زخم لگائے تھے اس نے۔ اگر ندی مجھے تحفظ نہیں دیتی اور میں اس میں نہ کود گیا ہوتا تو پھر کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ مجھے اپنے طور پر دریا برد کرکے وہ رقم لے کر اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کی کون سی گاڑی صحیح سلامت رہ گئی ہے۔ وہ سیدھا اسی میں جا بیٹھا تھا اور اب میرے سامنے صرف ایک ہی مقصد باقی رہ گیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے، میں اُسے ختم کردوں اور اس سے وہ رقم واپس لے لوں۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس وقت تک قندیار واپس نہیں جاؤں گا جب تک وہ رقم مجھے مل نہیں جاتی۔ میں نکو بن کر وہاں سے لوٹ گیا تو پھر ایسے لوگوں کا راستہ کون روک سکے گا۔ وہ تو کسی کو بھی للکار کر اس سے سب کچھ چھین لیں گے اور وہ فرید احمد تو ڈرائیور تھا۔ ہزار سواریوں سے روز اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ آ گئے تھے اور ہمت اس کی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنی حماقت کی وجہ سے ایک ناکارہ گدھے کو شیر بنا دیا تھا جو کسی بھی گردن پر منہ رکھ کر اس کا خون چوس سکتا تھا اور آباد شاہ تو ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی وہ شدید زخمی کر چکا تھا اور وہ لاشوں کی صورت میں گاڑی کے اندر کٹی ہوئی لکڑیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ پتا نہیں ان کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ جنگل تو آخر جنگل ہی ہوتا ہے اور وہاں میں نے سُن رکھا تھا کہ راتوں کو خونخوار جانور بھوک بھوک پکارتے پھرتے تھے۔ انہوں نے اتنی ساری زندہ بدست مُردہ لاشیں وہاں دیکھیں تو اُن کو کون بچا سکے گا، ان کی تو بعد میں صرف ہڈیاں ہی مل سکیں گی اور یہ اچھا ہی تھا۔ آباد شاہ ایسے لوگوں میں سے تھا جن کا زمین کے اوپر رہنے کے بجائے زمین کے اندر دھنس جانا ہی بہتر تھا۔ پتا نہیں وہ اب تک کتنے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی قبر کھود چکا تھا۔ اس ہیروئن کی بھینٹ چڑھا کر وہ کتنے لوگوں کو بیکار کر چکا تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا تھا؟ اس کا تو مر جانا ہی بہتر تھا۔ اچھا تھا کہ موت نے انہیں جنگل میں آ لیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت شدید زخمی تھے۔ وہ جنگل سے کہاں اٹھ سکیں گے۔ کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔ وہ گھنے جنگل میں پھنسے تھے۔ ایسی جگہ جہاں شکاری بھی نہیں پہنچ سکتے تھے مگر...... مگر سوال یہ تھا کہ آخر میں یہ سب کچھ کس لیے کر رہا ہوں اور کیوں میں اپنا راستہ بدل نہیں لیتا، بڑی رحمت تھی خدا کی میرے اوپر۔ کہ اس نے ابھی تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر قدم پر میری حفاظت کرتا چلا آیا تھا۔ پھر.... پھر.... کیا یہ لازم تھا مجھ پر کہ میں اپنی اس جہالت کی راہ پر بڑھتا ہی چلا جاتا، مجھے لوٹ جانا چاہیے تھا۔ اس رقم پر لعنت بھیج کر مجھے پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا مگر میں ایسا نہ کرسکا۔ بھٹر بھٹر کر فرید احمد کا چہرہ میرے تصور میں اُبھرتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ میرے پاس ہتھیار بھی کوئی نہیں رہ گیا تھا اور میں ہارے ہوئے جواریوں کی طرح وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اس کا مقابلہ کیسے کرسکوں گا؟ وہ تو مجھے دُور سے ہی مَسل کر رکھ دے گا۔ بڑا دلیر آدمی تھا وہ، موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانا جانتا تھا پھر بھی میں اپنے ارادے کو ترک نہ کرسکا۔ رقم کوئی چھوٹی موٹی نہیں تھی۔ کل کا بچّہ دو کروڑ روپیہ مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔ میں اُسے کیسے معاف کر دیتا۔

کل کلاں کو جب آبی کو پتا چلے گا تو وہ پھر مجھ پر ہنسے گا اور ایسے موقعوں پر اس کی ہنسی میرے لیے گالی بن جاتی تھی۔ کچھ ایسی ہی بات تھی اس کے طنز میں کہ آدمی کا جگر کٹنے لگتا تھا۔ وہ صاف ہی کہے گا کہ تو بس وہی کھوتے کا کھوتا ہی رہا غلام جیلانی! کل کا بچّہ تجھ سے رقم چھین کر لے گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر واپس آ گیا۔ اُس بھلے آدمی نے بڑی صدق دِلی سے میری خدمت کی تھی۔ میرے لیے وہ جو سوٹ لایا وہ میرے ناپ کے عین مطابق تھا۔ بنیان اور انڈر ویئر بھی وہ لے آیا تھا۔

"یہ لو بھائی! اب اسے پہن لو۔ یہ رنگ ٹھیک رہے گا؟"

"ہاں۔ جو کچھ بھی آپ لے آئے ہیں ٹھیک ہے، ورنہ میں کہاں خراب ہوتا پھرتا!"

"اندر جا کر کپڑے بدل لو۔ اب دَرد کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ ٹانگ تو ابھی تک سُن ہے۔"

"یہ دوا ضرور کھاتے رہنا۔ یہ کیپسول، ہر چھ گھنٹے بعد کھاتے رہو۔ ہو سکے تو مجھے کل پھر دکھا لینا۔ ویسے اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لو یہ چودہ روپے باقی بچے ہیں۔"

میں نے دکان کے عقبی حصے میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ سُوٹ گہرے سُرمئی رنگ کا تھا، مجھے بہت پسند آیا۔ اسے پہن کر میں جب ڈاکٹر کے سامنے پہنچا تو وہ خوش ہو گیا۔

"اب آپ کی طبیعت بہتر نظر آتی ہے۔"

"آپ کی مہربانی ہے ڈاکٹر! یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دو دن یہاں رہ کر آپ سے علاج کروالوں۔"

"نہیں بھائی! ہوٹل یہاں کوئی نہیں ہے۔ کم از کم آپ کے شایانِ شان تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت پڑنے پر آپ شہر سے علاج کروا سکتے ہیں۔ آپ کا فوری مسئلہ تو میں نے حل کر دیا ہے۔"

"آپ جیسا ہمدرد اور مخلص آدمی تو مجھے کوئی بھی نہیں ملے گا۔

کوئی ایسی صورت بنائیں کہ میں دو چار دن یہاں رہ سکوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کے گھر پر رہ سکوں۔ میں بہت پریشان ہوں ڈاکٹر! میں اس کا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے مسٹر! معاملہ یہ ہے کہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کو یہ زخم کیسے آئے ہیں؟ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ آپ کا علاج ہو گیا، آپ کا لباس بدل گیا، بس یہی بہت کافی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ نو، یہ نہیں ہو سکتا۔ آئی ایم سوری۔"

"اوہ! تو یہ بات تھی۔ میں سمجھا نہیں تھا۔ بہرحال آپ کا شکریہ ڈاکٹر! آپ کی یہ مہربانی مجھے یاد رہے گی۔" یہ کہہ کر میں ایک ٹانگ پر بوجھ ڈال کر بڑی مشکلوں سے اٹھا اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کی گٹھری اٹھا کر... کار میں جا بیٹھا۔ مجھے ڈاکٹر سے اس کی بے مہری کی شکایت کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر کیوں ٹھہراتا؟ یہ کسی طرح بھی جائز اور ممکن نہیں تھا۔ وہ مجھ سے میرا اتا پتا پوچھ رہا تھا مگر میں اسے کیا بتاتا۔ میرے پاس تو اپنی شناخت کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور اگر اسے پتا چل جاتا کہ میں غلام جیلانی ہوں اور میرے سر کی ایک قیمت مقرر ہے۔ میں ایک اشتہاری ملزم ہوں تو پھر شاید وہ اسی وقت پولیس سے رابطہ قائم کر لیتا۔ آدمی کی نیّت بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ فرید احمد کا حال میرے سامنے تھا۔ ڈاکٹر نے اچھا ہی کیا کہ مجھے دھتکار دیا۔ میں تھا بھی اسی قابل۔

میں کار میں سوار ہوا تو وہ اس وقت سگریٹ سلگا کر کرسی پر جم کر بیٹھ چکا تھا اور بڑے غور سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پر مزید توجّہ دیے بغیر میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور بازار سے باہر آ گیا۔ کھوڑ سے نکل کر میں کچھ ہی دیر بعد پھر بڑی سڑک پر جا چڑھا۔

میرا رُخ اب راولپنڈی کی طرف تھا۔ مجھے ہر حال میں فرید احمد تک پہنچنا تھا مگر میری ٹانگ میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ زخم میں پھر سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ ایدال بیگ نے خدا معلوم میرا علاج کیا بھی تھا کہ نہیں۔ گولی تو میں نے نکلتے دیکھی تھی۔ ٹانگ اب تک تو سُن تھی۔ مگر جیسے ہی ٹیکے کا اثر ختم ہوا، میری جان عذاب میں آ گئی۔ پھر بھی میں جوں توں کرکے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں خدا خدا کرکے راولپنڈی جا پہنچا۔ کسی سرکاری اسپتال میں جانے کے بجائے میں صدر میں رُکا اور سیدھا ایک پرائیویٹ کلینک تک جا پہنچا۔ اس وقت تک دَرد نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ پتا نہیں میں کار کیسے وہاں تک لے آیا تھا۔

کلینک میں ڈاکٹر موجود تھا۔ اس کو میں نے اپنا زخم دکھایا تو وہ پٹّی کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہ پٹّی میں نے راستے میں ایک ڈاکٹر سے کروائی تھی مگر دَرد نے اب پھر مجھے پاگل کر رکھا ہے!"

"مگر یہ زخم آیا کیسے؟"

"او جی لعنت بھیجیں اس بات پر۔ صرف یہ دیکھیں کہ میری فوری ضرورت کیا ہے۔ کوئی کمرہ ہے آپ کے پاس؟"

"کیوں نہیں۔ آپ یہاں داخل ہو جائیں مگر زخم کے ٹھیک ہونے تک آپ کو یہاں رہنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں ڈاکٹر صاحب!"

ضروری کارروائی کے بعد اس نے مجھے کلینک میں داخل کر لیا۔

ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے دے دیا گیا اور جب میں بستر پہ لیٹا تو ڈاکٹر نے میری پٹی کھول دی۔ میں نے کہا ہے نا کہ اقبال بیگ نے میرے زخم کو اور گہرا کر دیا تھا۔ جس کے علاج کے لیے مجھے پتا نہیں وہاں کتنے دن خراب ہونا پڑتا۔ کلینک کا نام صوفی نرسنگ ہوم تھا۔ اس کے مالک کا نام ڈاکٹر شکیل احمد صوفی تھا اور اس نے ہی مجھے وہاں داخل کیا تھا۔ ڈاکٹروں کی ایک اچھی ٹیم اس کے پاس موجود تھی اور وہ دل و جان سے مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔ مجھے وہاں آٹھ دن رہنا پڑا۔ میرا زخم مجھے ہلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ پورے آٹھ دن گزر گئے۔ اس دوران میں اخبار بھی باقاعدگی سے پڑھتا رہا مگر حیرت ہے کہ اس میں آباد شاہ کی اس واردات کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ کسی نے اس معاملے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ شاید پولیس کو اس کی اطلاع ہی نہیں دی گئی تھی، یا پھر وہ جان بوجھ کر اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ کوئی بات تھی ضرور۔ مگر مجھے اس کا علم نہ ہو سکا اور میں بندھے جانور کی طرح وہاں بستر پہ لیٹا رہا۔ ڈاکٹر نے آٹھویں دن مجھے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ جب میں نے حساب کروایا تو معلوم ہوا کہ ان کا بل گیارہ ہزار پانچ سو روپے تک جا پہنچا تھا۔ شکر ہے کہ وہ رقم میرے پاس موجود تھی ورنہ تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا مہنگا کلینک تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہاں ان آٹھ دنوں کے عرصے میں کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ مریضوں کا وہ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور یہی ان کی خوبی تھی۔ پیسے تو وہ خوب کماتے تھے مگر علاج بھی ٹھیک ہی کرتے تھے۔

آٹھ بڑے ہی قیمتی دن ضائع ہو گئے۔ اس دوران باہر خدا معلوم کیسے کیسے واقعات پیش آ چکے تھے۔ مجھے ایک بار پھر فرید احمد کا تعاقب کرنا تھا مگر ان آٹھ دنوں کا نقصان میں کیسے پورا کر سکتا تھا۔ پھر بھی ایک امید تھی، ایک آس تھی کہ فرید احمد سے میری ملاقات ضرور ہو گی۔ اس نے پتا نہیں اس رقم کو کہاں کہاں استعمال کیا ہو گا اور ان ڈبوں کو اس نے کہاں پھینکا ہو گا۔ وہ ہیروئن بھی اس کے بہت کام آ سکتی تھی۔ چند لوگوں کو شدید زخمی کر کے اس نے جس طرح میدان مار لیا تھا، وہ ساری باتیں برابر میرے ذہن میں کھلبلی مچاتی رہتی تھیں۔ اسپتال میں گزرے ہوئے ایک ایک دن کا حساب مجھے یاد تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ کلینک سے نکلتے ہی میں بازار جا پہنچا اور اپنے لیے میں نے کچھ جوڑے کپڑوں کے خریدے۔ میرے بوٹ بھی اس افراتفری میں بے رنگ ہو چکے تھے۔ وہ بھی میں نے بدل لیے اور نئی وضع قطع اوڑھ کر میں فرید احمد کی تلاش میں چل نکلا مگر اس طرح کہ آباد شاہ کی کار میں نے ایک بار پھر صوفی نرسنگ ہوم کے احاطے میں لے جا کر بند کر دی۔ وہاں اور بھی کئی کاریں صبح و شام کھڑی رہتی تھیں۔ چوکیدار کو میں نے تاکید کر دی کہ وہ میری کار پہ نگاہ رکھے۔ بیس روپے میں نے اسے انعام کے طور پر دے دیے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں سیدھا ٹیکسی اسٹینڈ تک جا پہنچا۔ کسی ڈرائیور کو تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہوتا۔ تین چار ڈرائیور اس وقت ایک عارضی سے چائے خانے کی بینچ پہ بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔

"برادر! مجھے ایک ڈرائیور فرید احمد سے ملنا ہے۔ اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "لڑکے! ایک چائے مجھے بھی دینا۔"

"فرید احمد؟ وہ جوان سا لڑکا جو ہے؟ ہلکی ہلکی سی مونچھیں ہیں اس کی؟"

"ہاں ہاں، وہی۔ ایک کام تھا مجھے اس سے۔ میں آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔ کہتا تھا کہ وہ اس اڈے پر مل جائے گا۔"

"کیا کام ہے آپ کو اس سے؟"

"دراصل وہ مجھے ایک ڈاٹسن کار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ کہتا تھا سستی دلا دوں گا۔"

"بات یہ ہے بھائی جی! کہ وہ کچھ بیمار سا تھا۔ دراصل اس کے پیٹ میں درد سا رہنے لگا تھا۔ گھر پہ علاج کروا رہا تھا مگر پتا یہ چلا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ پرسوں سے اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔ کوئی آدمی اس کے گھر آیا اور اسے بلا کر لے گیا مگر پھر وہ واپس نہیں آیا۔ اس کے گھر والے بھی سخت پریشان ہیں۔ میں کل شام اس کے گھر گیا تھا۔ اس کی ماں کو غش پہ غش آ رہے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عین ممکن ہے وہ کسی سواری کے ساتھ گیا ہو۔"

"جی نہیں۔ گاڑی بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ کہتا تھا وہ حادثے میں تباہ ہو گئی ہے۔"

"مگر وہ تو شاید کسی اور کی تھی۔ اس کی اپنی ملکیت تو نہیں تھی وہ؟"

"جی ہاں۔ مالک الگ پریشان ہے۔ وہ تلہ گنگ روڈ پہ کئی دن پہلے تباہ ہو گئی تھی۔ فرید احمد کسی سواری کو چھوڑ کر آ رہا تھا کہ ڈاکو اس سے کار چھین کر بھاگ گئے۔"

"ہوں۔ یہ تو بہت بری خبر سنائی ہے تم نے۔ مگر..... مگر کون اس کا دشمن ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے وہ کہیں خود ہی چلا گیا ہو گا۔"

"جی نہیں۔ ہے تو وہ نوجوان سا مگر بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ اپنے والدین کی جی جان سے خدمت کرتا ہے۔ وہ خود کہیں نہیں جا سکتا اور پھر وہ بیمار تھا۔ اسے علاج کی ضرورت تھی۔ ویسے آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا نام سردار کریم نواز ہے اور آپ کا اسم گرامی؟"

"میرا نام سلیم احمد ہے۔ لوگ مجھے چھیما کہتے ہیں۔ ایسے ہی نام بگاڑ دیا ہے ان بے ہودہ لوگوں نے۔"

"کیا آپ مجھے اس کے گھر والوں سے ملوا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ وہ ادھر صدر میں ہی رہتا ہے، ہاتھی چوک کے قریب جائیں گے نا آپ؟"

"ہاں۔ مجھے ذرا ان سے ملوا دیں۔ پتا تو چلے کہ اسے ہوا کیا ہے؟"

"تو ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آئیں ٹیکسی میں چلتے ہیں۔" اس عرصے میں لڑکے نے چائے ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ اسے ختم کر کے ہم اٹھے اور ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

چھیما گاڑی میں میرے ساتھ تو بیٹھ گیا مگر وہ میری شناخت کے بارے میں کچھ مطمئن نہیں تھا، بولا۔ "آپ کا شغل کیا ہے؟ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہ ضروری تو نہیں ہے چھیما صاحب! شہر میں ہزاروں لوگ پھرتے ہیں۔ ان کو آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔"

"پھر بھی، میرا مطلب ہے کہ فرید آپ سے کہاں ملا تھا؟"

"یہ کوئی دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میں نے اس کی ٹیکسی میں سفر کیا تھا۔ راستے میں اس سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ وہ مجھے ڈاٹسن کار سستی دلا سکتا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ شاید کوئی کار اس کی نظر میں ہو۔ خدا کرے وہ اب تک گھر آ چکا ہو۔"

کچھ ہی دیر بعد اس نے گاڑی ایک تنگ سی گلی کے سامنے بازار کے موڑ پہ کھڑی کر دی۔ ہم گلی سے گزر کر جب فرید احمد کے مکان پر پہنچے تو اس وقت کئی آدمی اس کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے چھیما صاحب؟" میں نے اس بھیڑ سے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے وہاں ان کی موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"لگتا ہے پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے چھیما بھیڑ کے اندر گھس گیا۔ "کیا بات ہے خیر تو ہے، یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"او جی چھیما صاحب! ادھر تو خیر دین کا گھر ہی اجڑ گیا ہے۔ دروازے کھلے پڑے ہیں، ہر شے الٹی پڑی ہے اور نہ خیر دین اندر ہے نہ اس کی بیوی اور بیٹی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" چھیما مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"او جی یہ ہو گیا ہے۔ اندر کوئی بھی نہیں ہے اور کسی کو پتا نہیں ہے کہ وہ لوگ کہاں گئے۔ وہ خود جاتے تو گھر کو یوں کھلا کیسے چھوڑ جاتے۔ پہلے اس کا بیٹا اغوا ہوا اور اب باقی سارا ٹبر بھی اغوا ہو گیا۔" اس نے بہت ہی بری خبر سنائی تھی۔ میرے تصور میں فرید احمد کوئی بڑی ہی خوش حال زندگی گزارتا نظر آتا تھا مگر اس کے اغوا نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اب اس کا پورا خاندان گھر سے غائب تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ آباد شاہ کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ اس نے فرید احمد کے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے تھے۔ کسی جگہ وہ ڈرائیور ان کی قید میں تھا مگر اس نے اعتراف نہیں کیا ہو گا۔ ان کو اس نے نہیں بتایا ہو گا کہ روپیہ اس نے کہاں رکھا ہے۔ وہ تو گھر میں پیٹ کے درد کا بہانہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈھیر ساری دوائیں اس نے منگوالی ہوں گی مگر آباد شاہ اس پہ غالب آنے کے باوجود اس رقم تک نہیں پہنچ سکا ہو گا اور اب اس نے فرید احمد کو مکمل طور پہ بے بس کرنے کے لیے اس کے خاندان کو اغوا کر لیا تھا۔

میں چھیما صاحب کے ساتھ اس کے مکان میں داخل ہو گیا۔ دو چار آدمی اور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ٹھیک کہتے تھے، گھر کی ہر شے اوندھی پڑی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا جیسے وہ ہر جگہ کسی چیز کو تلاش کرتے رہے ہیں مگر مطلوبہ شے انہیں مل نہیں سکی تھی۔ کرسیاں، میز، پلنگ، الماریاں ہر شے اوندھی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بھوتوں کا گھر ہو۔ نیچے اوپر پانچ کمرے بنے تھے۔ پرانی طرز کا مکان تھا۔ چھیما اس وقت دوسرے لوگوں سے کوئی بات کر رہا تھا کہ میں اس کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ صورتِ حال بہت ہی پریشان کن ہو گئی تھی۔ مجھے آباد شاہ کو تلاش کرنا ہو گا۔ تاکہ میری رقم تو مجھے واپس مل سکے۔ اسے میں چھوڑ کر فندیار نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لیے تو میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ میں کیسے اپنی ہار تسلیم کر لیتا۔

میں ابھی گلی میں نکلا ہی تھا کہ چھیما صاحب میرے پیچھے لپکے چلے آئے۔ دور سے آواز دے کر بولے "سردار صاحب!" میں نے قدم روک لیے۔ وہ بھاگ کر میرے پاس پہنچا اور کہنے لگا "آپ بھول ہی گئے کہ میں بھی آپ کے ساتھ آیا تھا۔"

"میں پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ کسی کو وہاں پتا ہی نہیں ہے کہ ہوا کیا ہے؟ ان لوگوں کو کس نے اغوا کر لیا ہے؟ کوئی بتاتا ہی نہیں۔"

"لوگوں کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ واردات تو کہیں آدھی رات کو ہوئی ہو گی۔ پتا نہیں وہ کتنے آدمی تھے، کیسے انہیں مجبور کر کے لے گئے۔ ویسے جمال صاحب نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ وہ آ ہی رہے ہوں گے۔"

"چلیں اچھا ہے، پولیس خود دیکھ لے گی کہ معاملہ کیا ہے۔ ویسے ان لوگوں کی کسی کے ساتھ دشمنی ضرور ہو گی۔"

"دشمنی کے بغیر یہ کام کوئی کیسے کر سکتا ہے مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، فرید احمد ایسا آدمی نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو بہت ہی بھلا لوک ہے۔ نہ کسی کے لینے میں' نہ دینے میں۔ ہر ایک سے صاب سلامت' ہر ایک سے جی حضوری۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"بس جی، اب تو میں اڈے پر چلوں گا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ مجھے آپ صوفی نرسنگ ہوم پر چھوڑ دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا راستہ بھی وہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کا دَروازہ کھول دیا۔

میں نے اپنی کار نرسنگ ہوم سے نکالی اور اسے لے کر شہر کی آوارہ گردی کرنے لگا۔ ارادہ میرا یہی تھا کہ میں سارا دن راولپنڈی اور اسلام آباد میں کار بھگاتا پھروں۔ کسی نہ کسی جگہ تو آبادشاہ کے آدمی اپنی گاڑی پہچان کر میرے سامنے ضرور آئیں گے۔ وہ مجھ سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اب تک فرید احمد سے کچھ نہیں مل سکا تھا۔ ورنہ وہ اس کے خاندان کو اغوا نہ کرتے۔ اس آدمی نے رقم ہاتھ آ جانے کے بعد اسے فوراً خرچ کرنا کچھ ضروری نہیں سمجھا۔ اسے لے کر وہ گھر جا بیٹھا تھا۔ پیٹ میں درد کا بہانہ بنا کر اس نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کسی کو اس کے گھر کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ کسی کے سامنے جائے گا ہی نہیں تو اس سے کوئی رقم کیسے واپس مانگے گا۔ کچھ ایسا ہی سوچ رکھا تھا اس نے۔ وہ کسی زبردست تبدیلی کی آرزو کرتا ہوگا۔ گھر والوں کو بھی اس نے رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا ورنہ شاید اس کے گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہاں کی کوئی بھی چیز نئی نہ تھی۔ ہر شے پر وقت کی گرد جمی نظر آتی تھی۔ نہ کوئی وی سی آر' نہ ٹی وی' نہ کچھ اور۔ گھر کا خرچ ویسے کا ویسے ہی رہا۔ فرید احمد نے سب کچھ دبا کر رکھ لیا تھا۔ سوچتا ہوگا کہ باہر کچھ ٹھنڈ ٹھنڈا ہو جائے' کچھ وقت گزر جائے تو وہ رقم کو سلیقے سے استعمال کرے گا اور ایسا کاروبار کرے گا جس سے اس کی زندگی بدل سکتی ہو۔ وہ بڑی سوچ بچار کا حامل آدمی تھا۔ ایک ایک قدم بہت ہی سنبھل سنبھل کر اٹھاتا تھا۔ اس کا رویّہ میں برابر دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ جنگل کے سارے خون خرابے کو بڑے اطمینان سے دُور بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ اب دونوں طرف سے معاملہ انجام کو پہنچ رہا ہے تو وہ اس منطقی نتیجے پر پہنچا کہ اسے آخری آدمی کو بھی ختم کر دینا چاہیے۔ مجھ پر اس نے گولی اسی لیے چلائی تھی اور وہ اپنے منصوبے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

مگر اسے کیا معلوم کہ کسی جرم کو جرم کے راستے ختم کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ وہ اندازہ نہ کر سکا کہ آبادشاہ کے آدمی مرتے مرتے بھی اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ان میں سے اگر ایک بھی آدمی بچ گیا تھا تو وہ اس کو ختم کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔

چھیما مجھے بتا گیا تھا کہ اس کی بہن جوان ہے اور خاصی قبول صُورت بھی ہے۔ اس کا اغوا فرید احمد کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کے والدین بھی آبادشاہ کے ہاتھ آ گئے تھے۔ اتنی ساری مجبوریوں کے علی الرغم وہ اس رقم کو کیسے ہضم کر سکتا تھا مگر یہ اس کی بدنصیبی ہی تھی کہ وہ راولپنڈی میں بیٹھا رہا، گھر کو قلعہ سمجھ کر۔ اس نے یہ سوچ لیا کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکے گا مگر وہ تو ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کے گھر کا پتا معلوم کرنا تو کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ اس کے دوست ہی اس کے لیے مصیبت بن سکتے تھے۔ فرید احمد یہیں مات کھا گیا اور سیدھا اُن کی سُولی پر لٹک گیا۔

کار کو میں مری روڈ سے گزار کر فیض آباد کی طرف نکل گیا. اس سے آگے کئی راستے نکلتے تھے۔ میں اسلام آباد جا پہنچا۔ وہ شہر ابھی بن رہا تھا۔ اس کے خدوخال تو واضح ہونے لگے تھے مگر ابھی اس میں وہ گہما گہمی پیدا نہیں ہوئی تھی جو زندگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ سڑکیں ابھی تک گھنے جنگل کے بیچوں بیچ سے گزر کر کسی ویران جگہ پر جُپ ہو جاتی تھیں، اُداس اور سنسان جیسے اس سے آگے کچھ بھی نہ ہو۔ وہ آخری اُفق بن جاتی تھیں۔ جہاں سے آگے نگاہ کام نہیں کرتی تھی۔

وہ پورا دِن میں نے اُن دونوں شہروں کی سڑکیں ناپنے میں گزار دیا۔ بہت سے ہوٹل بھی دیکھ لیے مگر آبادشاہ کا کوئی آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میری کار کے پیچھے کوئی نہیں لپکا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ پتا نہیں وہ لوگ کہاں جا چھپے تھے؟ فرید احمد اور اس کے خاندان کو اغوا کر کے انہوں نے کہاں چھپا دیا تھا؟ ایک میری جان ہی تھی جو میں ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرا راستہ کاٹیں، مجھے للکاریں۔ میرا بس چلتا تو میں گلے میں گھنٹہ باندھ کر چلتا۔ تا کہ وہ اس صدائے جرس سے ہی مجھے پہچان لیتے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ مجبور ہو کر میں نے رات اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ڈیرا جمالیا۔ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ دل میں امّید کی لَو بجھتی نظر آتی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟ مجھے ٹھہر ٹھہر کر آسیہ یاد آتی تھی' احساس مجھے یہی ہو رہا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں گھِر گئی ہے۔ خدا جانے ایسا کیوں تھا اور کوئی آدمی مجھے یاد نہیں آیا۔ نہ آبی' نہ کوئی اور۔ ایک صرف آسیہ ہی میرے تصوّر میں اُبھر رہی تھی۔ جیسے وہ فریاد کر رہی ہو۔ اس کا کربناک چہرہ بار بار میرے حافظے میں ابھرتا تھا۔ میں نے سوچا. جیسے بھی ہو سکا، میں کل شام قندیار چلا جاؤں گا۔ میں اس رقم پہ

لعنت بھیج دوں گا۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ دو بھیڑیوں کے درمیان کسی جگہ معرکہ ہو رہا تھا۔ وہ خود ہی فیصلہ کر لیں گے۔ یا فرید احمد غالب آ جائے گا یا آبادشاہ۔ مجھے بہرحال وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کل دوپہر تک میں دونوں شہروں میں گھوم پھر کر دیکھوں گا اور پھر وہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ وہ رقم تھی ہی منحوس۔ اس کے لیے مجھے بڑے مرحلے طے کرنے پڑے تھے مگر پھر بھی وہ میری نہ ہو سکی۔ پھر اس دوڑ دھوپ کا فائدہ ہی کیا تھا؟

مری روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے دو تیز دھار چھُریاں خرید لی تھیں۔ وہ میرے نئے بریف کیس میں موجود تھیں اور بس۔ چند کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی مجھے نئے سرے سے خریدنی پڑی تھیں۔ ان کے بغیر میرا گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے کھانا منگوایا، دن کے اخبار بھی منگوا لیے اور کھانا کھا کر میں ان کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ چھُریاں میں نے بستر کے نیچے رکھ لی تھیں۔ مگر جیسے ہی میں نے فوم کا گدّا ہٹایا مجھے محسوس ہوا کہ بستر کے تکیے کی طرف بیڈ کے اندر ایک سوراخ ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ میں نے پورا فوم اوپر کھینچ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ سوراخ ایسے ہی پیدا نہیں ہو گیا تھا کہ لکڑی ٹوٹ گئی ہو، بلکہ اسے کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ آری اس میں سے صاف پھِری ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس میں سے ایک رُومال برآمد ہوا۔ رُومال کے ساتھ ایک خنجر بھی تھا، کھُلا خنجر۔ یہی کوئی نو انچ لمبا اور اس کا پھَل سُرخ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ خون ملا اترا ہوا ہو، جو اَب خشک ہو چکا تھا اور اس میں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ میں اس ہوٹل کا نام نہیں بتاؤں گا مگر وہ خنجر بتاتا تھا کہ وہ کسی کے جسم میں سے گزر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر دونوں چیزیں پھر اس سوراخ میں ڈال دیں۔ پتا نہیں وہ کس کا خنجر تھا اور اسے کس نے استعمال کیا تھا؟

بستر پر میں لیٹ تو گیا مگر نیند مجھ سے رُوٹھ گئی۔ میرا ذہن اس خنجر پر مرتکز ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ میں اس کے بارے میں انتظامیہ کو اطلاع کر دیتا ہوں مگر وہ اطلاع ایک لمبے فساد کا عنوان بن سکتی تھی۔ اس لیے میں نے چُپ رہنے میں ہی مصلحت سمجھی مگر کمرے کی فضا سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ بستر کے عین سامنے پاؤں کی طرف دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی لوہے کی الماری پڑی تھی جس کو وارڈ روب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اپنے کپڑے میں نے وہیں رکھ دیے تھے۔ بائیں ہاتھ بستر کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا ٹی وی رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تپائی پر ٹیلی فون پڑا تھا۔ ضرورت کی ساری ہی چیزیں وہاں موجود تھیں مگر اس خون آلود خنجر کی موجودگی سارا مزہ کِرکِرا کر رہی تھی۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک یونہی عاجز سا ہو کر بستر پر لیٹا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون آدمی ہو گا جو اس خنجر کی نذر ہو گیا ہو گا اور قاتل کون تھا؟ خنجر کو رومال میں لپیٹ کر چلا گیا تھا اور اسی حالت میں اسے سوراخ کے اندر ڈال دیا گیا تھا۔ پتا نہیں لاش کا کیا بنا ہو گا؟ کیا ہوٹل کے لوگوں کو معلوم تھا کہ وہاں کیا ہو چکا ہے؟ کئی سوال میرے ذہن میں اُبھر رہے تھے مگر ان کا کوئی حل میرے پاس نہیں تھا۔

میں ایک بار پھر بستر سے اٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ فرش پر سُرمئی رنگ کا قالین بچھا تھا اور تمام چیزیں اس کے اوپر تھیں۔ قالین کو اٹھا لینا آسان نہیں تھا۔ ہر چیز کو اس کی جگہ سے ہٹانا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ بیڈ کو بھی اور یہ خاصا مشکل کام تھا۔ پھر بھی میں قالین کو جگہ جگہ سے دبا دبا کر دیکھتا رہا مگر وہاں سے مجھے کوئی چیز نہیں ملی۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی زبردست واردات ہو چکی ہے۔ جس کا ہوٹل والوں کو بھی علم نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ قاتل نے لاش کو کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال لیا ہو۔

میں ایک بار پھر الماری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے نچلے حصّے میں خانے بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی میں نے سب کے سب دیکھ لیے۔ وہاں سے مجھے کوئی چیز نہ مل سکی۔ البتہ ایک خانہ ایسا تھا، جس کا پیندا پھٹا ہوا تھا۔ وہ آخری اور سب سے نچلا خانہ تھا۔ اُسے میں نے باہر کھینچ لیا تو پتا چلا کہ اس کے نیچے قالین پر کچھ زنانہ کپڑے پڑے ہیں۔ ان کو میں نے ہاتھ میں لیا تو مجھے کسی ٹھوس چیز کا احساس ہوا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک چھوٹا سا پستول ہے۔ یہی کوئی ہتھیلی جتنا لمبا۔ اس میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ صرف ایک خانہ خالی تھا۔ کل پانچ گولیاں موجود تھیں۔ چھٹی استعمال ہو چکی تھی۔ وہ پستول اس پر چلا تھا جس کے یہ کپڑے تھے کہ اس نے کسی پر چلایا تھا؟ وہ خنجر بھی اسی بات کا پتا دیتا تھا مگر...... سب کچھ تاریکی میں تھا۔ اُن کپڑوں کو میں نے الماری کے نچلے خانے میں سنبھال کر رکھ دیا اور پستول لے کر میں بستر پر جا لیٹا۔ ٹی وی پر اس گھڑی کوئی بڑی ہی دَرد بھری آواز میں غزل گا رہا تھا۔ تھا تو وہ کوئی غیر معروف سا آدمی مگر اس کی آواز بہت ہی پُرسوز تھی۔ میں کچھ دیر تک غزل کے بولوں میں اُلجھا رہا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہوٹلوں کے یہ کمرے پتا نہیں اپنے اندر کیسے کیسے فسانے چھپائے بیٹھے تھے۔ کون جانے بند کواڑوں کے پیچھے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے؟ گناہ کے وہ دَر بند کمرے، ان کے بارے میں صرف تصوّر ہی کیا جا سکتا ہے۔ خدا جانے کیسے کیسے لوگ وہاں رات کی رات رُک کر کیا کچھ کر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہاں قتل بھی ہو جاتے تھے اور ہوٹل کی انتظامیہ کو علم تک نہ ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی دن کوئی لاش بھی

وہاں پڑی رہ جائے۔ ایسے کاریگر تو بہت کم ہوتے ہیں جو مُدّعا ہی غائب کردیں۔ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں ابھرتے رہے۔ یہاں تک کہ بتی جلتی رہی، ٹی وی پر پروگرام بھی ہوتے رہے اور میں پستول ہاتھ میں لیے یونہی پڑے پڑے گہری نیند میں کھو گیا۔ تھکن نے بالآخر مجھے نڈھال کر کے گہری نیند سُلا دیا تھا۔

اچانک میری آنکھ کُھل گئی۔ پتا نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا۔ جیسے ہی آنکھ کُھلی تو معلوم ہوا کہ میرے دروازے پر کوئی بہت سنبھل کر دستک دے رہا ہے۔ دیوار گیر گھڑی اس وقت ایک بجا رہی تھی۔ ٹی وی خاموش ہو کر صرف فضا کی تصویر دکھا رہا تھا۔ ہر شے جوں کی توں پڑی تھی اور بتی جل رہی تھی۔ دروازے کی دستک نے ہی مجھے جگا دیا تھا۔ میں اسی حالت میں بستر سے اٹھا تو پستول بستر پر لڑھک گیا۔ اُسے سنبھال کر میں نے سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ حالت یہ تھی کہ میں بُوٹ بھی نہیں اتار سکا تھا۔ بیٹھے بٹھائے میں یوں اُونگھ گیا کہ پھر کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ دستک تیسری بار اُبھری تو میں دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔

"کون ہے بھئی؟"

"جناب! میں استقبالیہ سے آیا ہوں۔ آپ کا فون آیا ہے مگر آپ نے شاید ریسیور الگ کر رکھا ہے۔"

"نہیں تو، ریسیور تو فون پر رکھا ہے۔ کس کا فون ہے؟"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پستول میں نے قمیص کی پہلو والی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میرے سامنے استقبالیہ کلرک کھڑا تھا۔

"ذرا دیکھیں، میرا خیال ہے آپ کا فون صحیح نہیں رکھا ہے۔ فون تیسری بار آیا ہے۔"

میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ریسیور واقعی غلط پڑا تھا۔ اپنی جگہ سے ذرا اُوپر اٹھا ہوا تھا۔ کلرک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے ریسیور اٹھایا، وہ ٹیون دینے لگا۔

"اب ٹھیک ہے۔ واقعی ریسیور غلط رکھا تھا۔ اب اس سے میری بات کرا دیں۔"

"جی بہت بہتر۔ ذرا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔ کوئی دو منٹ بعد وہ فون پر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"لیں جناب! بات کریں کوئی فردوسی صاحب آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی بھائی جی! کون صاحب ہیں آپ؟"

"تو گویا آپ بیدار ہو ہی گئے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو نیند نہیں آئی ہو گی۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے اندر ابھی یہ خُدائی صفت پیدا نہیں ہوئی۔ کہ نیند تو صرف اُسے ہی نہیں آتی۔"

"آپ کو بھی نہیں آنی چاہیے جناب سردار کریم نواز صاحب قبلہ! سُنا نہیں آپ نے کسی نے کہا ہے کہ

نیند نہ آوندی چور رلوں تے نہ عاشق لگے جُھکو
عِشق لَتاڑے آدمی تے برف لَتاڑے دُکھ!"

"بڑی عمدہ شاعری کرتے ہیں آپ! تخلص کیا کرتے ہیں حضرتِ داغ صاحب! رات کا ایک بج رہا ہے اور آپ کو شعر سُوجھ رہے ہیں۔"

"کوئی سخن فہم مل جائے تو پھر شاعری سُوجھنے لگتی ہے جناب! ویسے میرا نام فردوسی ہے۔"

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ بے شک ہم سب مراجعت کر جائیں گے ایک دن مگر آپ کو یہ خارش اس وقت کیوں ہو رہی ہے اور میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟" وہ ہنسنے لگا۔

"بات یہ ہے حکیم صاحب کہ ہم آپ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کچھ دیر کے لیے ہمارے پاس آسکتے ہیں؟"

"وہ کس لیے؟ کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"دراصل ہمیں یہ خارش پریشان کر رہی ہے کہ آپ سارا دن ہماری تلاش میں پھرتے رہے مگر ہم آپ کو نہ مل سکے۔"

"یہ کس نے کہا ہے آپ سے؟"

"ظاہر ہے ہماری گاڑی آپ کے قدموں تلے تھی اور سنا ہے، آپ بہت پریشان تھے۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ گڈ! اپنے شاہ جی کا کیا حال ہے؟"

"انہیں بھی خارش نے بہت پریشان کر رکھا ہے اور علاج اس کا آپ کے پاس ہے۔"

"ہوں۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ میری رقم مجھے واپس کر دیں۔"

"حضور! ہم اس کی تلاش میں ہیں اور آپ سے اسی لیے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اور وہ آدمی؟ اس کا کیا کیا ہے آپ نے؟"

"اسے بھی آپ سے ملوا دیں گے۔ اب تو اس کے تین اور آدمی ہمارے پاس آ گئے ہیں۔"

"مجھے اپنا پتا بتائیں۔ میں ابھی آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

"گڈ! مجھے امید تو نہیں تھی کہ آپ ایسا کر سکیں گے۔ پھر بھی یہ بات ہماری مرضی کے عین مطابق ہے۔ کیا آپ ابھی آئی نائن پہنچ سکتے ہیں؟"

"بالکل پہنچ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ہماری رقم بھی ساتھ لیتے آیئے گا۔"

"ضرور ضرور، کیوں نہیں لاؤں گا میں وہ رقم۔ آپ کو تو میں اسی لیے تلاش کر رہا تھا۔ وہاں کون کون ہو گا؟"

"ہم آپ کے استقبال کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔ بڑا شاہانہ ویلکم دیا جائے گا آپ کو۔ اے رائل وارم ویلکم۔ ہم چوک میں کھڑے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور میں ریسیور کو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے بتی بجھائی اور اپنی دونوں خنجر نما چُھریاں ساتھ لے کر میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔ اُس میں بیٹھ کر جب میں سڑک پر پہنچا تو رات مجھے کچھ زیادہ ہی اُداس اور ویران نظر آئی۔ سڑکوں پر دُور دُور تک سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ ایسے میں ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے کوئی عقل مندی نہیں دکھائی تھی مگر پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ میں ہر حال میں ان سے ٹکرا جانا چاہتا تھا۔ صرف رقم کی بات نہیں تھی۔ اب تو چار زندگیاں بھی اُن کے رحم و کرم پر تھیں۔ جن سے مجھے زبردست ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ اگرچہ فرید احمد کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں تھا مگر اس کے والدین کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کو تو ہر حال میں رہائی ملنی چاہیے تھی۔ لیکن جن لوگوں سے میں نبرد آزما تھا، ان سے کسی قسم کی ہمدردی کی توقع رکھنا بالکل عبث تھا۔ وہ اس لفظ سے ہی ناواقف تھے اور اب وہ آئی نائن چوک میں میرے منتظر تھے۔

معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ فرید احمد سے اپنی رقم ابھی تک نہیں اگلوا سکے تھے اور میں پانچواں آدمی تھا جس پر وہ ہاتھ ڈال رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان سے میرے ٹکرا جانے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہی بات تھی کہ مجھے اچانک ہی ایک چھوٹا سا پستول مل گیا تھا۔ جس نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ اگرچہ وہ کسی مجرم کا پستول تھا۔ اس کی بدگمشدہ گولی کسی جسم میں دھنس چکی تھی اور ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کمرے میں مجھ سے پہلے کون لوگ ٹھہر چکے تھے مگر یہ زیادہ ضروری بات نہیں تھی۔ ہاں یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ واردات کہیں میری مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔ پولیس کو تو کارروائی کے لیے کسی آدمی کی ضرورت ہوتی ہے اور میں وہاں موجود تھا۔ اگرچہ میرا سامان وہاں زیادہ نہیں تھا۔ محض ایک سستا سا بریف کیس پڑا تھا۔ جس سے میرا پتا انہیں معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں اگر میں واپس جا کر کمرے میں ٹھہر گیا اور کسی نہ کسی طرح پولیس کو اس واردات کا علم ہو گیا تو پھر وہ اس کمرے میں ضرور آ سکتے تھے۔ ایک خون آلود خنجر بستر کے اندر دبا پڑا تھا اور وہ میرے لیے گلے کی پھانسی بن سکتا تھا۔

میں لال کوارٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ گھنا جنگل تھا۔ سڑک بہت آگے جا کر ظفر چوک سے گزرتی ہوئی گھوم کر آئی نائن تک جا پہنچتی تھی اور میں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا تھا کہ اچانک میری گدّی پر کوئی ہتھوڑا سا لگا۔ ایک دم ٹھک کی سی آواز پیدا ہوئی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے حواسِ خمسہ سارے کے سارے مسلوج ہو گئے ہیں۔ میرے ہاتھ سے اسٹیئرنگ چھوٹنے لگا۔ کسی نے ایک دم اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ مجھے ایک جھنجھنی سی آئی۔ ذرا دیر کے لیے میرے حواس معطل ہوئے مگر پھر ایک دم میں اس کیفیت پر غالب آ گیا۔ چوٹ کا اثر میرے وجود کے دفاعی حصار سے ٹکرا کر ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا آدمی یہ سمجھ کر کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں، اسٹیئرنگ سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اس کی آگے بڑھی ہوئی گردن پر میں نے بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ اسے امید ہی نہیں تھی کہ میری طرف سے کوئی مزاحمت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالتے ہی اس کی رگِ احساس کچھ اس طرح مَسل دی کہ وہ اسٹیئرنگ کے اوپر ہی ڈھیر ہو گیا۔ گاڑی میں بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ سامنے چوک تھا۔ اس سے ذرا اُدھر بائیں ہاتھ ایک پگڈنڈی سی نکلتی تھی جو جنگل کے اندر ہی اندر چلتی تھی۔ میں نے گاڑی اس پگڈنڈی پر ڈال دی۔ اب میں سڑک کی روشنیوں کی زد سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ آدمی بائیں نشست پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کوئی نوجوان سا آدمی تھا۔ جس پر تجربے کی لکیر ابھی نہیں کھنچی تھی۔ اس کی ضرب بھی اسی لیے کمزور رہ گئی۔ ورنہ گدّی پر مارے گئے ہاتھ تو بڑے بڑے سروں کو بدحواس کر دیتے ہیں۔ پتا نہیں میری کار اس نے کہاں دیکھی تھی یا دکھا دی گئی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کار کی چابیاں بھی اس کے پاس تھیں۔ جب ہی تو وہ اُن کی مدد سے کار کھول کر اس کے پچھلے حصّے میں سیٹوں کے درمیان دبک کر رہ گیا تھا۔ قد اس کا زیادہ نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی اسکول کا طالب علم تھا۔ چہرے سے بھی یہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس ہو گیا تھا۔ جب ہی تو مجھ سے ہار گیا۔ کوئی تجربہ کار شخص ہوتا تو شاید وہ مجھے وہیں بے ہوش کر دیتا اور پھر جہاں چاہتا کھینچ کر لے جاتا۔ اس کے پاس بہت عمدہ قسم کا سائلنسر لگا پستول تھا، وہ میں نے سنبھال لیا۔ مجھے پہلے پستول کی بہ نسبت زیادہ عمدہ ہتھیار مل گیا تھا۔

پگڈنڈی پر کچھ دُور جانے کے بعد میں نے کار کی اندر کی بتّی بجھا دی اور اسے اپنے ساتھ لے کر پھر بڑی سڑک پر آ گیا۔ ان کا پہلا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ آئی نائن کے چوک میں مجھے شاید ہی مل سکیں۔ چاہتے وہ یہ تھے کہ اُن کا آدمی مجھے بے ہوش کر کے کار خود اُن کے ٹھکانے پر لے جائے گا مگر صورتِ حال بالکل ہی بدل گئی تھی۔ کار کو اس ویران سڑک پر

دوڑاتے ہوئے میں کچھ ہی دیر بعد آئی نائن کے چوک میں جا پہنچا۔ وہاں دُور دُور تک کوئی بندہ موجود نہیں تھا۔ چند لمحوں تک میں گرد و پیش کا گہری نظر سے جائزہ لیتا رہا مگر کسی نے میرا راستہ نہیں روکا۔ کار میں نے سامنے کی سڑک پر ڈال دی۔ کسی ایک جگہ پر رُک کر ان کا انتظار کرنا بے کار نظر آتا تھا۔ جیسے ہی میں سامنے کی سڑک کے آخری حصے تک پہنچا، مجھے درمیانی گلی میں سے ایک اور کار سڑک پر نکلتی دکھائی دی۔ ان کا رُخ میری طرف تھا۔ میں نے گاڑی روک لی۔ انداز ان کا بڑا ہی جارحانہ معلوم ہوتا تھا۔ کار کو وہ ساٹھ ستّر کی رفتار سے چلاتے ہوئے میرے سامنے آ ٹھہرے۔ دائیں بائیں جو لوگ بیٹھے تھے، ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی اسٹین گنیں تھیں۔ جن کا رُخ میری طرف تھا۔

"تو بالآخر تم آ ہی گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ تم بالکل تنہا ہو" ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"میں تنہا نہیں ہوں۔ یہ لڑکا بھی میرے ساتھ ہے لیکن یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔"

"ہمیں اس سے یہی امید تھی۔ اسے باہر نکال دو۔"

"کیا ضرورت ہے اس کی؟ اب مجھے کہاں چلنا ہوگا؟"

"کار اِدھر گلی میں لے چلو۔ ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔" ڈرائیور نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ فردوسی وہی ہے۔ اس کی آواز مجھے فون پر سُنی ہوئی آواز سے ملتی جلتی لگی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم آ جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی ان کی کار کے پاس سے گزاری۔ وہ تعداد میں تین تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔ تینوں نے بہت عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی دُھل دُھلا کر وہاں آئے ہوں۔ پتا نہیں آباد شاہ نے کتنے آدمی اپنے ساتھ ملا رکھے تھے اور اب تو ایک بہت بڑی رقم کا معاملہ تھا۔ اس لیے مختلف جگہوں پر موجود تمام لوگوں کو اس نے اپنے گرد جمع کر لیا ہوگا۔ اس رقم نے مجھے بھی ذلیل کر دیا تھا۔ میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا مگر اسے میں چھوڑ بھی کیسے سکتا تھا۔ تھی وہ بہت ہی منحوس رقم! وہ بھی اس کے لیے بہت خراب ہو رہے تھے۔ نہ انہیں دن کو چین تھا نہ رات کو۔ وہ میرے پیچھے لگے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کہاں کہاں پھرتا رہا ہوں؟ میرے ہوٹل کا بھی انہیں علم تھا۔ وہ میرے کمرے میں بھی آ سکتے تھے مگر پتا نہیں ایسا کیوں نہیں کر سکے۔ البتہ آدھی رات کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا تھا اور میری سادگی دیکھیں کہ میں انہی کے ٹھکانے پر انہیں زک پہنچانے کے ارادے سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ جو آدمی کے اندر حوصلے کی اَتی ہوتی ہے وہ اسے چین نہیں لینے دیتی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہت ہوا تو وہ مجھے مار ہی تو دیں گے مگر اس سے پہلے میں اُن کے بہت سے آدمی ختم کر سکتا تھا۔ اتنا مجھے بھی یقین تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہو سکا۔ میں کسی بھی صورتِ حال سے کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔

گلی خاصی کُھلی تھی۔ ان کی کار میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ سانویں کوٹھی پر پہنچ کر انہوں نے مجھے رُک جانے کا اشارہ کیا۔ کوٹھی کا گیٹ کُھلا پڑا تھا۔

"اس کے اندر چلے جاؤ۔ ہم بھی آ رہے ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

میں نے گاڑی گیٹ کے اندر پہنچا دی۔ میں جب دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس وقت وہ تینوں بھی کار سے نکل رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے۔ ڈرائیور نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے۔ تم اپنا یہ پستول پھینک دو۔" کوٹھی کوئی دو کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی عمارت پلاٹ کے پچھلے حصے میں بنی تھی۔

"ڈرتے ہو؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم اپنے ہتھیار الگ رکھ دو۔ یہ میرا حکم ہے۔" میں نے کار کے کھلے دروازے کے عقب میں رک کر کہا۔

"آپ ہماری بات نہیں سمجھے سردار صاحب! اس پستول پر سائیلنسر لگا ہے۔ یہ اس لڑکے کا پستول ہے۔"

"ہاں۔۔ اس نے مجھ پر اسی سے حملہ کیا تھا۔ ورنہ میں خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں مطلب کی بات کر لینی چاہیے۔ آئیں اندر بیٹھتے ہیں۔" میں نے اپنی دھمکی بے اثر جاتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ چلیں اندر چلتے ہیں۔ بات وہیں ہوگی۔"

مگر ابھی میں دروازے کے عقب میں کھڑا ہی تھا کہ مجھے اپنی کمر پر کسی سخت چیز کا احساس ہوا۔

"بہتر ہے یہ پستول پھینک دو۔" کسی نے بڑے ہی دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ وہ آواز آباد شاہ کی تھی اور وہ مجھے اپنے نرغے میں لے چکا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے پستول پکڑنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے پلٹ کر اس کی اسٹین گن کا رُخ بدل دیا۔ ایک ثانیے کی تو ضرورت تھی۔ اب اس اسٹین گن کی نال میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور میرے پستول کی نال اس کے پہلو سے لگی تھی۔ آباد شاہ منجمد ہو کر جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

"بہتر ہے کہ تم یہ چالاکیاں چھوڑ دو آباد شاہ! میرا نام غلام جیلانی ہے استاد! شاید تم نے یہ نام سُن رکھا ہو۔"

"کیا! کیا کہا تم نے؟ غلام جیلانی!" برآمدے کی بتیوں کی روشنی میں اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی اس صورتِ حال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔

"ہاں۔ میں غلام جیلانی ہوں۔ جس کے لیے پولیس نے بڑا انعام مقرر کر رکھا ہے فردوسی! کیا چاہتے ہو تم، میں اسے ختم کر دوں؟" میں نے ان تینوں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ کوٹھی میں ان چاروں کے سوا اور کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ ورنہ وہ

اب تک سامنے آ چکا ہوتا۔

"نہیں بابا لوگ! ایسا نہ کرنا۔ ہم اپنی ہار تسلیم کرتے ہیں۔ کہو تو ہم اپنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔"

"اگرچہ یہ مردانگی نہیں ہے فردوسی! پھر بھی تم اپنے ہتھیار الگ رکھ دو اور اندر چلو۔"

میرے کہنے کے مطابق ان تینوں نے اپنے ہتھیار گاڑی کی چھت پر ڈال دیے، تو میں نے آباد شاہ کے ہاتھ سے اسٹین گن چھین لی۔ وہ چاروں بے بس ہو چکے تھے۔ ان کو ہانک کر میں برآمدے میں لے گیا۔ کوٹھی کا دروازہ ابھی تک کُھلا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اس کوٹھی کے سامنے ابھی کوئی اور مکان نہیں بنا تھا۔ بلکہ جگہ جگہ پلاٹ خالی پڑے تھے۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ کوئی اس صحن میں ہونے والے ڈرامے کا عینی شاہد بن جاتا۔ وہ چاروں بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ آباد شاہ کا رنگ تو ابھی تک نہیں پلٹا تھا۔

"اندر چلیں شاہ جی! اور مجھے بتائیں کہ یہ قصّہ کیا ہے؟"

وہ نڈھال ہو کر سامنے کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹے سے قالین کے اِرد گرد صوفے بچھے تھے۔ وہ ان کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔

"بیٹھ جائیں! اور مت سمجھیں کہ میں آپ کا دشمن ہوں۔ میں تو خواہ مخواہ ہی اس مِس آرمینیا کی وجہ سے آپ سے اُلجھ گیا ہوں۔ ورنہ جھگڑے فساد کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بیٹھ جائیں۔" میں نے پستول اور اسٹین گن صوفے پر ڈال دیے۔ وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے اور ایک ہی صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا واقعی آپ غلام جیلانی ہیں؟" یہ بات فردوسی نے پوچھی۔

"ہاں۔ تمہیں شک نہیں کرنا چاہیے۔ میں وہی غلام جیلانی ہوں جن کا نام تم سن چکے ہو۔"

"پھر تو ہم سے بڑی بھُول ہوئی بابا لوگ! کیوں شاہ جی؟ خواہ مخواہ ہم نے ایک بَلا اپنے پیچھے لگا لی۔"

"مجھے خود بڑی حیرت ہے بھئی! اندازہ میرا یہی تھا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں، جو آدمی ہماری تلاش میں سارا دن گھومتا رہا۔ جس نے اُس جنگل میں ہمیں شہ مات دے دی، وہ کوئی عام نہیں ہو سکتا تھا۔"

"آپ کے زخم ٹھیک ہو گئے؟"

"ہاں۔ میرے زخم تو ٹھیک ہو گئے ہیں مگر میرے دوسرے ساتھی ابھی اسپتال میں ہیں اور ان کا علاج ہو رہا ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ زخم فرید احمد نے لگایا ہے۔ اس نے آپ کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر آپ اس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ فرید احمد نے گاڑی کو جان بُوجھ کر کھڈّے میں گرا دیا ہے۔ خود وہ بس میں بیٹھ کر شہر آ گیا تھا۔ دراصل ہم بھی کوئی آدھ گھنٹے بعد اس کے تعاقب میں نکل گئے تھے۔ شہر پہنچ کر ہم سیدھے اسپتال جا پہنچے۔ ہم میں سے کوئی بھی صحیح حالت میں نہیں تھا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو میں نے فرید احمد کے گھر کا پتا معلوم کیا اور پھر ہم اسے اٹھا کر یہاں لے آئے مگر وہ منہ سے کچھ پھُوٹتا ہی نہیں ہے۔ مجبور ہو کر ہم اس کی بہن اور اس کے ماں باپ کو بھی یہاں لے آئے ہیں لیکن ابھی تک ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے والدین کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ وہ رقم کہاں ہے۔ فرید احمد دو دن سے بے ہوش پڑا ہے۔ فردوسی نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ مار دیا تھا۔ ویسے تو وہ ٹھیک ہی ہے، اس کی بے ہوشی ہمیں پریشان کر رہی ہے۔"

"اس کا کیا پتا، اس مِس آرمینیا کا؟"

"وہ ابھی تک پولیس کی تحویل میں ہے مگر آرام سے ہے۔ دراصل اس کے پاس جو بُت تھے ان میں بھی ہیروئن تھی، ان کی دیواروں کے اندر جمائی گئی تھی۔ پولیس نے وہ بھی برآمد کر لی، بُت توڑ کر نکال لی۔ اب ان کا کام اور زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ مِس آرمینیا کو وہ کسی طرح بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔"

"پھر تو بہت ہی بُری ہوئی آپ کے ساتھ۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے شاہ جی! آپ بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیں نا، کتنی آسانی سے آپ نے میری بات مان لی۔ یہ لیں سگریٹ پئیں۔"

میں نے پیکٹ سے اپنے لیے سگریٹ نکال کر باقی ان کے سامنے ڈال دیے۔ وہ چاروں مسکرا دیے۔ پہلی بار ان کے چہرے پر بشاشت نظر آئی۔

"یہ گوگی کہاں گئی ہے؟ اُسے بلاؤ فردوسی! ان کے لیے چائے بنائے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے یہ بتائیں مجھے کہ وہ رقم ہے کتنی؟"

"کچھ نہ پوچھیں بابا لوگ! صرف وہ ڈالر ہی ڈیڑھ کروڑ کے ہیں اور وہ جو ہیروئن ہے وہ کم سے کم چار کروڑ کی ہوگی۔ وہ بریف کیس بہت قیمتی ہے جیلانی صاحب!" فردوسی نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے اب پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"فرید احمد نے نہیں بتایا کہ اس نے بریف کیس کہاں رکھے ہیں۔ میرے بریف کیس میں اسّی لاکھ روپیہ ہے۔ وہ مجھے ملنا چاہیے۔ کیوں شاہ جی! ملنا چاہیے کہ نہیں؟"

"بالکل جی! آپ تو اپنے ہی بھائی بند نکلے جیلانی صاحب!

ورنہ ہم سمجھے تھے کہ کوئی وڈیرا ہم سے ٹکرا گیا ہے سردار کریم نواز۔ اب اس فرید احمد کو ہوش آئے تو پتا چلے۔ اس فردوسی نے اسے زیادہ ہی گہری ضرب لگا دی ہے۔"

"کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اب صبح ہم کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ ورنہ ہمارا خیال تھا کہ خود ہی ہوش میں آ جائے گا۔ سانس اس کا بالکل ٹھیک ہے۔ دل بھی دھڑک رہا ہے۔ بس دماغ ہی سُن ہو گیا ہے اس کا۔"

"کہیں وہ مکر تو نہیں کر رہا؟"

"نہیں جی! ایسی بات نہیں ہے۔ اس کی بہن کو ہم اس کے سامنے لے جا چکے ہیں۔ بڑی دھمکیاں دی ہیں ہم نے اسے مگر وہ ایسا پکّا آدمی ہے کہ اس نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

اتنے میں ان کا آدمی ملازمہ کے ہاتھ پر چائے رکھوا کر اندر آ گیا۔

"اوئے لشکر خان! جاؤ اس لڑکے کو دیکھو، وہ تو ہمیں یاد ہی نہیں رہا۔ دیکھو اس کا کیا حال ہے۔" آباد شاہ نے گوگی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے بڑے قرینے سے چائے ہمارے سامنے رکھی اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ مالکوں کے ساتھ وہ خود بھی جاگ رہی تھی اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد لشکر خان واپس آ گیا۔ اس نے لڑکے کو دونوں بانہوں پر اٹھا رکھا تھا۔

"خیر تو ہے؟ اسے کیا ہو گیا تھا جیلانی صاحب؟"

"یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے الگ کمرے میں ڈال دو لشکر خان! دراصل اس کے سر پہ چوٹ لگی ہے۔ میں نے اسے دروازے میں دے مارا تھا۔ اس نے میری گدّی پہ ضرب لگائی تھی۔"

"گدّی پر ضرب لگائی تھی! تو پھر بھی آپ بچ گئے؟"

"جی ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہوئی تھی۔ اس کی ناتجربے کاری میرے کام آ گئی۔"

"نہیں جی! یہ تو بہت کاری آدمی ہے بھئی! بڑے داؤ پیچ جانتا ہے۔ پر خیر آج اس کو سمجھ آ گئی ہو گی۔ اس کو بستر پر لٹا دو۔" آباد شاہ نے اس کی نبض ٹٹولنے کے بعد کہا۔ لشکر خان دوسرے کمرے کی طرف نکلا تو آباد شاہ بولا: "آپ بھی ذرا فرید احمد کو دیکھ لیں۔ پتا تو چلے کہ اسے ہوا کیا ہے؟"

"ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔ چلیں۔" میں نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر بائیں کمرے میں جا گھسا۔ فردوسی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ تیسرے آدمی کا نام فضل احمد تھا۔ وہ کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔ ان کے ہتھیار البتہ وہیں پڑے رہے۔

فرید احمد عقبی کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ اس حال میں کہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لباس بے ترتیب سا تھا۔ قمیص شلوار جو وہ پہنے ہوئے تھا، اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے، جگہ جگہ خون کے داغ نظر آتے تھے مگر وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کی نبضیں میں نے ٹٹول کر دیکھیں، دونوں آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیا وہ دو دن سے بے ہوش تھا۔ ضروری تھا کہ وہ لوگ اس کا علاج کرواتے مگر اس کے لیے وہ ایسا ڈاکٹر کہاں سے لاتے جو ان کا راز کسی پر ظاہر نہ کرتا۔ اس بات سے ڈرتے ہوئے وہ لوگ چُپ ہی رہے ہوں گے۔

"کوئی فون ہے یہاں؟"

"ہاں۔ فون تو موجود ہے۔ دراصل یہ کوٹھی فردوسی کی ہے۔ ٹیلی فون پر اسی نے آپ سے بات کی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔ اسے ڈاکٹر کی شدید ضرورت ہے۔"

آباد شاہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ فون پر میں نے اسی وقت صوفی نرسنگ ہوم کے نمبر گھما دیے۔ ڈاکٹر قریشی کے اسسٹنٹ ڈاکٹر عظیم رات کو وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان سے میری علیک سلیک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

وہ مجھے فون پہ مل گئے۔ کلینک میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے وہ رات بھر بڑی دل جمعی سے کام کرتے تھے۔ وہاں سے نکلنے پر میں ان کی توجہ، ہمدردی اور محبت کی وجہ سے ایک ہزار روپے الگ دے آیا تھا۔ جس کے لیے وہ میرے بہت زیادہ شکر گزار تھے۔ جب انہوں نے میرا نام سنا تو وہ کھِل اٹھے۔

"کیا حال ہے سردار صاحب! خیر تو ہے نا؟"

"جی، میں تو آپ کی دُعا سے بالکل ٹھیک ہوں مگر میرے ایک عزیز کا ہے۔ وہ بے ہوش پڑے ہیں۔ اگر آپ آ جائیں تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔ فیس کی پروا نہ کریں۔"

"میں آ جاؤں مگر...... کیا آپ انہیں یہاں نہیں لا سکتے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے مگر وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں۔ براہِ کرم آپ خود یہاں آ جائیں۔ ضروری سامان لے کر آ جائیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آ نہیں سکوں گا۔ آپ اسے یہاں بھیج دیں، میں دیکھ لوں گا۔ دو مریضوں کی حالت یہاں بہت خراب ہے اور میرا یہاں ٹھہرنا بہت ضروری ہے۔"

"بہتر ہے۔ میں مریض کو بھیج دیتا ہوں۔ یٰسین نام ہے اس کا۔ خدا حافظ!" فون بند کر کے میں آباد شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "اس کو صوفی نرسنگ ہوم میں پہنچا دیں۔ ان سے کہیں کہ یہ محمد یٰسین ہے، اس کا اصل نام انہیں مت بتائیں۔ علاج اس کا بہت ضروری ہے شاہ جی! ورنہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ سب کچھ اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ فردوسی تم اسے فضل احمد کے ساتھ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔ اس کل کے لونڈے نے تو ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"اس کے کپڑے تبدیل کروا دیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ اوئے فضل احمد! اس کو نیا جوڑا پہنا دو۔ بڑا ذلیل آدمی ہے یہ۔ دونوں بریف کیس اس نے کسی ایسی جگہ سنبھال کر رکھے ہیں کہ اس کے والدین کو بھی علم نہیں ہے۔ ہم نے اس کا سارا گھر الٹ کر رکھ دیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کی کارروائی دیکھ آیا ہوں۔"

"چھوڑو جی! اصل مصیبت تو تم ہو۔ وہ جمعدار خواہ مخواہ مارا گیا۔ اس رقم نے تو ہم سب کو تباہ کر دیا ہے۔"

"اور اگر یہ پولیس کے ہاتھ آ جاتی؟"

"پھر تو بولو ہی رام تھا۔ ہم تو بالکل ہی برباد ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کس دشمن نے مخبری کی تھی۔ وہ مل جائے تو میں اس کا گردن کاٹ دوں۔" شاہ جی ایک دم طیش میں آ گئے۔

فضل احمد اور فردوسی کچھ ہی دیر بعد فرید احمد کو کار میں ڈال کر کلینک کی طرف چل دیے۔ اب صرف لشکر خان وہاں رہ گیا تھا اور اسے سخت نیند آ رہی تھی۔

"جا اوئے، اُدھر جا کے سو جا۔ خواہ مخواہ جمائیاں لے رہا ہے تُو۔ کوئی کام ہوا تو تجھے جگا لیں گے۔" وہ بھی یہ بات سن کر ہمارے سامنے سے اٹھ گیا۔

"فرید احمد کے والدین کہاں ہیں؟"

"وہ سو چکے ہیں۔ ان کو ہم نے بلاوجہ پریشان کیا مگر اب وہ مطمئن ہیں۔ کمرہ ہم باہر سے بند رکھتے ہیں۔ رقم مل جائے تو ہم انہیں باعزت بری کر دیں گے۔ یہ مکّار لڑکا پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے گھر میں پڑا رہا۔ سوچتا ہو گا کہ بات دب جائے تو پھر یہ باہر نکلے مزے کی بات یہ ہے کہ گاڑی لے کر پھر مالک کے پاس نہیں گیا۔ اسے کہہ دیا ہو گا اس نے کہ نقصان پورا کر دے گا۔ کچھ دن وہ انتظار کرے۔"

"ہاں، یہ تو وہ کر ہی سکتا تھا۔ ویسے آپ یہ دھندا کب سے کر رہے ہیں؟"

"مدّت ہو گئی ہے جی! مگر اب اس سے میری گلو خلاصی نہیں ہو رہی ہے۔ پہلے ایک عورت تھی مس ٹیرف، وہ ہم سے مال لیتی تھی۔ وہ ترکی میں گرفتار ہو گئی۔ پھر مسز ولیم سامنے آئی۔ وہ بہت ہی تیز طرّار عورت تھی۔ بڑا مال ہم نے اس کے ذریعے بھیجا ہے باہر۔ پھر ایک اور عورت آئی، مس شکلا۔ تھی تو وہ ہندوستانی مگر دیکھنے میں انگریز معلوم ہوتی تھی۔ وہ باہر سے ہمارے لیے ڈالر اور سونا لاتی تھی اور یہاں سے ہیروئن لے جاتی تھی۔ اب یہ مس آرمینیا آئی ہے مگر اس کی بھی قسمت خراب ہی لگتی ہے۔ یہ تیسرا پھیرا ہے اس کا اور فسادی میں پھنس گئی ہے۔ یار لوگ اب ایسی عورتوں کو لمبی سزا دیتے ہیں۔ یہ فیشن ہو گیا ہے حالانکہ یہ دھندا ہمیشہ سے چل رہا ہے۔ مگر اب ہماری باری آئی ہے اور ہم یورپ کے ملکوں میں یہ مال بھیجتے ہیں تو وہ لوگ تلملا اٹھتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ وہ ہمیں سرحدی علاقوں کے لیے لمبی امداد دینے پر آمادہ ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کی کاشت روکی جا سکے۔ کیوں بھئی! آپ ملامے لگتے ہیں؟ کیوں یہ مال نہ بھیجیں ہم؟ ذرا تمہاری بھی اولادیں خراب ہوں تو پھر تمہیں پتا چلے کہ دوسری قوموں کو کیسے خراب کرتے ہیں مگر ہماری حکومت....... نئے نئے قانون بنا رہی ہے، ایسے سخت کہ یہ دھندا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بھئی تم راستے سے ہٹ جاؤ، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ یورپ والے تمہارے سگے تو نہیں ہیں؟ یہ زہر اُن تک پہنچنے دو، تمہارا کیا جاتا ہے مگر یہ باز ہی نہیں آتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟" وہ اپنی ہی ترنگ میں مست مجرمانہ ذہنیت کے زیرِ اثر اپنے نظریات بیان کر رہا تھا، اپنی کاروباری دشواریوں کا رونا رو رہا تھا۔

"مگر اس میں اپنا بھی تو نقصان ہے شاہ جی! ہماری اپنی نسل خراب ہو رہی ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں جی، یہ لوگ بکواس کرتے ہیں۔ اعداد و شمار غلط ہوتے ہیں ان کے۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے لوگ اس سے بہت دُور رہتے ہیں۔"

"ہمارے تو بادشاہ تک اس مصیبت میں گرفتار رہے ہیں شاہ جی! پتا ہے آپ کو کہ جہانگیر بھی شوق فرماتا تھا اور ہمایوں بھی۔ الاماشاءاللہ سب کے سب اس کے رسیا تھے۔ محاورے بنے ہوئے ہیں اس کے لیے، الگ الفاظ بنا لیے گئے تھے۔ تکیوں اور مزاروں پر اس کا راج رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اس کو تو ہر حال میں روک دینا چاہیے۔"

"یہ بات نہیں ہے جیلانی صاحب! مزار اور تکیے تو ہمیشہ سے نکمّے لوگوں کا اڈّا رہے ہیں۔ وہ زندگی سے بیزار، ہارے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جن کا نشے کے بغیر گزارا ہی نہیں ہوتا۔"

"خدا کرے ہماری رقم واپس مل جائے اور بس۔ آپ کے بریف کیس سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ مجھے تو بس میرے وہ اسّی لاکھ واپس دلا دیں۔"

"وہ فرید احمد ٹھیک تو ہو لے۔ پتا نہیں وہ کس مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ رقم ہے کہاں؟ ورنہ میں اسے گولی سے اُڑا دوں گا۔ ایسا چکّر تو ہمیں کبھی نہیں پڑا تھا۔"

"یہ تو ہے۔ کیا خیال ہے، کچھ دیر سو نہ لیا جائے؟"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ میں تو اکڑ کر رہ گیا ہوں۔ بس اتنی بات یاد رکھیں کہ آپ نے جس عقل مندی سے یہ فساد ختم کیا ہے۔ اس پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ورنہ پتا نہیں یہاں کیا ہو جاتا ۔۔۔ بخدا میں نے آپ ایسا حوصلہ مند آدمی کوئی نہیں دیکھا ہے۔ آپ فردوسی کے فون پر تنِ تنہا باہر نکل آئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آپ اتنے سارے لوگوں پر کیسے غالب آسکتے ہیں۔ آپ کو کسی بھی بات کا اندازہ نہیں تھا پھر بھی آپ چلے آئے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔" وہ ابھی تک میری اس جرأت پہ حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا: "ویسے یہ بتائیں کہ پولیس نے آپ کے سر کی قیمت کیوں لگا رکھی تھی؟ بڑا چرچا ہے آپ کا۔ میرا ایک دوست رہتا ہے لاہور میں، وہ آپ کے بارے میں بہت باتیں بتاتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"راشدی نام ہے اس کا۔ پولیس افسر ہے۔"

"راشدی، میں جانتا ہوں اُسے۔ مگر اس سے کیا کام رہتا ہے آپ کو؟"

"بس دوست ہے میرا وہ اور کچھ نہیں ہے۔ ہمارے دھندے میں وہ شامل نہیں ہے، ایسا نہ سمجھیں۔"

"دفع کریں اس ذکر کو، بستر کہاں ہے؟"

"آئیں اس کمرے میں سو جائیں۔ میں تو اُدھر دُوسرے ہی کمرے میں سوؤں گا۔"

"تو یہ بات ہے گویا۔" میں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ایسے ہی فردوسی نے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ دُوسری طرف نکل گیا۔ اُسے باہر کا گیٹ بھی بند کرنا تھا اور کمرے بھی مقفل کرنے تھے۔

بستر نرم تھا اور فوم آرام دہ تھا۔ میں چاروں طرف سے کمرہ مقفل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ بات زیادہ نہیں بڑھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ میرے خلاف کوئی سازش نہیں کریں گے۔ وہ خود داغی لوگ تھے اور ان کا جو نقصان میں کر چکا تھا اسے وہ معاف کر چکے تھے۔ اب اس بات کو غنیمت سمجھتے تھے کہ میں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ وہ مار دھاڑ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ بہ امرِ مجبوری انہیں گولی چلانی پڑے تو الگ بات ہے ورنہ یہ ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو کام صُلح صفائی سے ہو جائے اسے وہ جنگ سے ختم کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی، جہاں ان کا ہاتھ رُک سکتا تھا، وہ روک لیتے تھے۔ ورنہ وہ اگر چاہتے تو مجھے بہت پہلے ختم کر سکتے تھے۔

جانے کیا بات تھی، آسیہ اس رات بھی مجھے بہت یاد آئی۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی ایسا ہی لاسلکی رابطہ قائم تھا کہ وہ اگر کسی اذیت میں مبتلا ہوتی تھی تو میرا چین اڑ جاتا تھا۔ اس رات بھی بستر پر لیٹنے کے بعد میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ میں اس عذاب سے فراغت پاتے ہی اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کی گریاں آنکھیں ٹھہر ٹھہر کر میرے تصوّر میں ابھرتی تھیں۔ پھر بھی میں دل کو تسلی دے کر سو ہی گیا کہ نیند نے نڈھال کر رکھا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ کوٹھی میں ابھی تک سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید گوگی بھی سوئی ہوئی تھی۔ ورنہ باورچی خانے میں کچھ تو شور ہوتا۔ فرید احمد کے گھر والے بھی شاید نہیں جاگے تھے۔ اگر جاگے بھی تھے تو عین ممکن ہے انہیں بہت دُور کے کمرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ آوازیں ان کی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں اور ڈرائنگ روم میں فون بھی خاموش تھا مگر جب میں اس کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا ریسیور کسی نے الگ ڈال دیا تھا شاید اس لیے کہ کوئی گھر پہ فون نہ کر سکے تاکہ کسی کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

میں منہ دھو کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ اخبار صبح سے وہاں پڑا تھا اور ابھی تک کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد آباد شاہ بھی برآمدے میں نکل آیا۔ بھرپور نیند نے اس کی بشاشت لوٹا دی تھی اور وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ سگریٹ سلگا کر وہ لمبے کش لیتا ہوا میرے پاس آبیٹھا۔ وہ بھی غسل کر آیا تھا اور اس کے لباس میں کوئی بہت ہی عمدہ خوشبو مہک رہی تھی۔

"کیا حال ہیں سردار صاحب؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ جی! کچھ پتا چلا فرید احمد کا؟"

"نہیں۔ ارے میں نے شاید ریسیور ہی الگ کر دیا تھا۔ ابھی پتا کرتے ہیں۔ ویسے خبریں کیا ہیں؟"

"بس وہی پُرانی گھسی پٹی خبریں ہیں اور کیا ہو گا ان اخباروں میں۔ آپ نے ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے؟"

"ہاں۔ گوگی تیار کر رہی ہے۔ بہت اچھی عورت ہے بے چاری۔ ہماری بہت خدمت کرتی ہے۔ کاش ہم اس کو کوئی صلہ بھی دے سکتے۔ ٹھہریں، میں اُن کو فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اخبار دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو بولا: "یار جی! ڈاکٹر نے تو کمال کر دیا ہے۔ فرید احمد کو ہوش آگیا ہے۔ حد ہو گئی! وہ فردوسی ہمیں صبح سے فون کر رہا تھا مگر ہم نے اٹھایا ہی نہیں۔"

"چلیں، مبارک ہو آپ کو۔ ایک مرحلہ تو بخوبی طے ہو گیا ہے۔ وہ گھر کب آ رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے شام تک اسے وہ لوگ فارغ کر دیں گے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ اُسے آپ میرے حوالے کر دیں۔ میں دیکھوں گا وہ کیا کہتا ہے استاد تیس مار خاں۔"

"میں یہی کروں گا۔ بس ہماری رقم اور مال واپس دلا دیں اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔"

"فکر نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ سب کچھ ابھی تک محفوظ ہو گا۔"

"دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ آج مجھے مس آرمینیا کے وکیل کے پاس بھی جانا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، ضرور جائیں۔ اتنے میں بھی ذرا باہر گھوم آتا ہوں۔ مگر ابھی تک آپ نے مجھے فرید احمد کے والدین سے نہیں ملوایا۔"

"مل لیں۔ فرید احمد آجائے تو اس کے سامنے ملیں۔ ویسے ہم نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ وہ بالکل محفوظ ہیں۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ان کا قصور بھی تو کوئی نہیں ہے نہ یاؤ خیال اس کی بہن کا رکھنا ہو گا۔ آپ کے ساتھ کئی بدنیّت آدمی ہیں۔ ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں ان کی کھال نہ کھینچ لوں گا۔ یہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کوٹھی کے ڈائننگ رُوم کی طرف چل دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد اس نے گاڑی نکالی تو میں بھی دوسری گاڑی کی طرف چل دیا۔

"آپ کس وقت واپس آئیں گے؟"

"دو تین بجے تک آجاؤں گا شاہ جی! فکر نہ کریں۔" وہ مسکراتا ہوا کار میں بیٹھا اور باہر نکل گیا۔ لشکر خان نے میرے پیچھے گیٹ بند کیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص تو کوٹھی میں تنہا ہو گا۔ پتا نہیں آباد شاہ کو ان لوگوں پر اتنا اعتبار کیوں ہے؟

اسلام آباد ان دنوں دیکھنے دکھلانے کی کوئی چیز نہیں تھا۔ بس ایسے ہی سڑکوں کا ایک جال بچھ گیا تھا۔ جس پر سرکاری ملازموں کے لیے اِدھر اُدھر بستیاں بسا دی گئی تھیں اور وہ بھی ان کے گریڈوں کے حساب سے۔ کچھ ایسے تھے جو شکل سے ہی درجہ چہارم کے لوگ نظر آتے تھے اور وہ ایسے کوارٹروں میں رہتے تھے جو ہندو معاشرے کی تصویر پیش کرتے تھے کہ وہاں بھی اچھوتوں کے لیے سراسر الگ بستیاں بنائی جاتی ہیں مگر مجھے اس سے کیا لینا تھا۔ میں اس شہر کی کھلی سڑکوں پر کار دوڑاتا ہوا سیدھا راولپنڈی جا پہنچا۔ صدر سے میں نے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں اور پھر مال روڈ پر سے گزرتا ہوا جیل کی طرف چل دیا۔ کئی یادیں اس جیل سے وابستہ تھیں جس کے دروازے کسی درندے کے منہ کی طرح کھلتے تھے اور کئی جوانوں کو نگل کر بند ہو جاتے تھے۔ ایسے ایسے جوانوں کو جن کے شباب پر دیکھنے والوں کو بھی فخر محسوس ہوتا تھا مگر پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ جو کوئی ان میں سے باہر آتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عمر کے ڈھیر سارے سال وہ کہیں دن رات کی چند گردشوں میں گنوا آیا ہے۔ اسے دیکھ کر ترس آنے لگتا تھا۔ اسی جیل کے کسی ایک خانے میں آسیہ بھی رہ آئی تھی۔ میں اسے وہاں سے نکال تو لایا تھا مگر..... اس کے ذہن سے اس عقوبت خانے کی یادیں کیسے کھرچ دیتا۔ یہ بات میرے بس میں نہیں تھی۔

کار میں نے جیل کے دروازے کے سامنے ریلوے لائن کے قریب کھڑی کر دی۔ درمیان میں سڑک رواں دواں تھی اور جیل کے دروازے کے دائیں بائیں قیدیوں سے ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان کو دیکھنا، ان کے سُتے ہوئے چہروں کو دیکھنا، ان کی ترسی ہوئی آنکھوں پر نگاہ کرنا بذاتِ خود ایک بہت بڑا عبرتناک مرحلہ تھا۔ حسرتیں ان کے چہروں پر لکھی دکھائی دیتی تھیں۔ میں ان کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک پولیس کا ایک ٹرک میرے قریب سے گزرا۔ میں سمجھا، میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن نہیں، میں ہوش میں تھا۔ میں کار کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا مگر اس ٹرک کو دیکھتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس ٹرک میں پولیس کے مسلح سپاہیوں میں گھری ہوئی آسیہ بیٹھی تھی۔ ہاں، ہاں، وہ آسیہ ہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرہ سُتا ہوا اداس اور پریشان۔ اور..... اور اس کے ساتھ آپی بھی تھا۔ میرا دوست آپی اور..... اس کے ساتھ تجمل حسین اور طاہر بیگ بیٹھے تھے۔ اُف میرے پروردگار! کیا سب کچھ ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹرک جیل کے دروازے پر جا ٹھہرا۔ ایک انسپکٹر نے نیچے اتر کر کچھ کاغذات سپاہیوں کو دکھلائے تو انھوں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگ کر اس طرف نکلا مگر سڑک پر اچانک تین کاریں آگئیں۔ ان کے بیچ میں سے گزرنا ممکن نہ رہا۔ کوئی دس سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ اتنے میں وہ ٹرک اندر چلا گیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ تو گویا سب کچھ ہی تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ میری نظر تو آپی اور آسیہ کے چہروں پر جم کر رہ گئی تھی۔ کتنے حیران چہرے تھے وہ۔ ان کی مایوسیوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ وقت نے میرے کلیجے پر بھالا دے مارا تھا۔ یہی وہ جیل تھی جہاں سے میں نے آسیہ کو جان ہتھیلی پر رکھ کر نکالا تھا۔ اب وہ پھر اس عقوبت خانے میں جا پھنسی تھی۔ کون مجھے اس وقت جیل کی طرف دھکیل رہا تھا؟ کیا میں یہی کچھ دیکھنے کے لیے وہاں گیا تھا؟ یہ کیسی بے بسی تھی۔ میری تقدیر نے مجھے یہ دن بھی دکھانا تھا۔ اسی دن کے لیے اس نے وہ سارے راستے مجھ سے طے کروائے تھے جن سے میں کبھی آشنا بھی نہیں تھا۔

میں نے دروازے کی جالی سے آنکھیں لگا دیں۔ سپاہی قیدیوں کو باری باری نکال رہے تھے۔ سب سے پہلے طاہر بیگ اترا۔ اس کے بعد غوث محمد، پھر آپی اور اس کے بعد تجمل حسین۔ آخر میں آسیہ اتری۔ وہ لُٹے بجھے چکے تھے، اتنے مایوس تھے کہ ان کی نگاہ کسی طرف نہیں اُٹھتی

تھی اور سامنے سپاہیوں نے قطار لگا رکھی تھی۔ آسیہ کا سیاہ لبادہ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اسے کسی بھی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ذرا دیر کے لیے ایک سپاہی دائیں طرف ہوا تو اس وقت آسیہ نے ٹرک کے اڈے پر پیر رکھا۔ میں ایک دم بڑے زور سے کھنکارا۔ آسیہ نے شاید میری کھنکار کو سمجھ لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"بہن جی!" میں نے اسے آواز دے دی۔ تب اس نے نگاہ اٹھا کر جالی میں سے مجھے دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پہچان گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر دروازے کی طرف بڑھی مگر سپاہی نے ایک دم اُسے دھکا دے کر روکا اور ٹرک کی دیوار سے لگا دیا۔ آسیہ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس وقت تک ٹرک کے دوسرے قیدی آگے جا چکے تھے۔ وہ انسپکٹر جو انہیں لے کر آیا تھا، سامنے ہی کھڑا تھا۔ آسیہ ذرا دیر کے لیے دروازے کی جالیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سر جھکا دیا۔ وہ انسپکٹر اسے کہہ رہا تھا۔

"چل اندر، یہ کیا ڈراما لگا رکھا ہے تُو نے۔ کون ہے باہر جس سے ملنے جا رہی ہے؟"

اس وقت ملاقاتی کسی نام کے سلسلے میں میرے قریب جالی کے سامنے آ ٹھہرے تھے۔ انسپکٹر نے ہمیں بڑے غضبناک انداز سے گھور کر دیکھا اور پھر آسیہ کو دھکیلتا ہوا وہ جیل کے اگلے دروازے کی طرف لے چلا۔ آسیہ نے صرف ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ٹرک کے لیے چند لمحوں بعد بڑا دروازہ پھر کھل گیا۔ سپاہی اس میں بیٹھ کر باہر نکل آئے، تب مجھے ہوش آیا۔ ورنہ میں تو سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ ٹرک آگے نکلا تو میں بھاگ کر کار کے اندر جا بیٹھا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اُن پر کیا بیت گئی ہے۔ کس نے انہیں اس حال کو پہنچا دیا تھا۔ آسیہ کے خلاف کوئی زبردست سازش کی گئی تھی ورنہ وہ یوں گرفتار نہ ہوتی۔ کیا وہ کوئی پولیس کا خاص دستہ تھا جو راولپنڈی سے بھیجا گیا تھا اور اُن کو گرفتار کر کے میانوالی لے جانے کے بجائے اس شہر میں لے آیا تھا۔ جہاں سے آسیہ کو میں نے رہائی دلائی تھی۔ میرے سینے پر منوں بوجھ پڑ گیا تھا۔ میرے سارے خواب ایک ایک کر کے بکھرتے چلے گئے تھے۔ کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگے تھے۔ یہ..... یہ..... کیا ہو گیا ہے میرے پروردگار! میری تقدیر کے ترکش نے میرے لیے کیسے کیسے تیر چھپا رکھے ہیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پولیس پھر آسیہ کو گرفتار کر لے گی مگر یہ سب کچھ ہو چکا تھا اور اب کی بار اس کے ساتھ آپی بھی تھا، تجمل حسین بھی تھا اور غوث محمد بھی۔ جو بھی آدمی انہیں ہاتھ لگا وہ قندیار سے پکڑ کر لے آئے تھے۔ آسیہ پر ایک مقدمہ تو پہلے ہی تھا۔ جیل سے فرار ہونے کی بات بھی انہیں یاد تھی۔ کئی اور لوگ بھی تھے جو آسیہ کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ بڑے الزامات تھے اس پر۔ میں اسی لیے اس کو اس راہ پر

چلنے سے منع کرتا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ وہ زوال کی اس راہ پر بڑھتی چلی گئی۔ اسے گورائیے کی حویلی نے باندھ لیا تھا۔ اس پر راج کرنے کی ہوس نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ خدا جانے اس کے ذہن میں کیسے منصوبے تھے۔ وہ جاگیر کے ہر گاؤں میں تبدیلیاں لانا چاہتی تھی۔ ایسی تبدیلیاں جن سے لوگوں کی زندگی کا معیار بہتر ہو سکے۔ اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور میں اسی کے لیے ہی یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ مگر وہ سب کچھ غارت ہو کر رہ گیا۔ وہ رقم بھی میرے ہاتھ سے نکلتی نظر آتی تھی۔ فرید احمد کی صحت اور نیت کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ اس سے روپیہ تو جب مل سکتا تھا جب وہ اس پر آمادہ ہوتا۔ اگر اس نے مرنے کی ٹھان رکھی تھی تو پھر اس کو روک لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ سب باتوں کا انحصار اس کی نیت پر تھا۔ یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ رقم اس کے پاس موجود بھی ہے کہ نہیں۔ رقم پر تو لعنت بھیجی جا سکتی تھی۔ اصل مسئلہ تو کچھ اور ہی رُخ اختیار کر گیا تھا اور..... اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب کی بار وہ آسیہ کو مختلف الزامات کی بنیاد پر پھانسی چڑھا دیں گے۔ یہی حال وہ آپی کا کریں گے۔ اس کے گناہ بھی کچھ کم نہیں تھے۔ الزامات کی ایک لمبی فہرست تھی جو وہ اس کے خلاف تیار کر سکتے تھے۔ میں کیا کروں باری تعالیٰ؟ میری رہنمائی فرما۔ میں..... میری تدبیریں ناکام ہو گئی ہیں۔ میں تنہا ہوں اور اُن کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ میری بہن پھر اُن کے نرغے میں پھنس گئی ہے۔ وہ جاگیردارنی بننے کے بعد پھر یہ اسیری کی زندگی کیسے برداشت کرے گی؟ یہ اس سے نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔ وہ میری بہن، اس سے یہ اذیتیں کیسے سہی جائیں گی؟ اور پھانسی کے تصور سے ہی میری روح فنا ہوئی جاتی تھی۔

ٹرک کچھ دیر کے لیے جیل کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ ان کا کوئی سپاہی ابھی تک جیل کی عمارت کے اندر تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو کاغذوں کا ایک پلندہ انسپکٹر کے حوالے کر کے وہ بھی ٹرک میں بیٹھ گیا پھر ٹرک واپس مُڑ گیا۔ جیسے ہی وہ بڑی سڑک کی طرف نکلا، میں نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ میں اس انسپکٹر سے ملنا چاہتا تھا، جس نے یہ کارروائی کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ قیدیوں کو اس کے حوالے نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ ان کے ہمراہ قندیار سے آیا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

ٹرک صدر تھانے تک جا پہنچا اور سیدھا احاطے میں جا ٹھہرا۔ سپاہی اور انسپکٹر اس میں سے اتر کر اندر چلے گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے مگر یہ تو حقیقت تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں وہاں کھڑا اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا مگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ میں تھانے کے سامنے سڑک کے دوسری طرف کھڑا اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک سگریٹ ہی کچھ

سکون دے رہا تھا، جسے میں نے بجھنے نہیں دیا۔ اچانک مجھے تھانے کے کھلے دروازے سے وہی انسپکٹر اسکوٹر پر باہر نکلتا دکھائی دیا۔ وہ اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد شاید اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ جیسے ہی وہ سڑک پر آیا، میں نے کار اس کے پیچھے لگا دی اسے یہ احساس دلائے بغیر کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں۔ وہ سیدھا لال کرتی کی طرف نکلا اور پھر لالہ زار کالونی کی طرف بڑھنے لگا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہو گی مگر صحت اس کی بہت عمدہ تھی اور قد کاٹھ کا بھی وہ بہت مضبوط دکھائی دیتا تھا۔

ہمارے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ میں اس کے اسکوٹر کے عقب نما میں نظر نہیں آ رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ پیچھے مُڑ کر دیکھنے کا عادی بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ کسی نہ کسی مرحلے پر اسکوٹر ضرور روک لیتا۔ کیونکہ کار تو بہرحال اس کے آئینے میں نظر آتی ہو گی۔ کوئی ڈیڑھ میل آگے جا کر وہ لبِ سڑک بنی ایک چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ میں نے گاڑی بہت پیچھے روک لی۔ میں ابھی تک اس کے سامنے جانے سے گریزاں تھا۔

کوئی بیس منٹ بعد میں نے اس کے دروازے پر دستک دے دی، جہاں راجہ ممتاز احمد کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ جب وہ دروازے پر نمودار ہوا تو اس وقت بھی اپنی وردی میں ملبوس تھا۔ شاید وہ دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آیا تھا۔ ہاتھ میں اس نے تولیہ پکڑ رکھا تھا۔ شاید وہ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ کچھ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"جی میں آپ سے ہی ملنا چاہتا ہوں راجہ صاحب! ایک بہت ضروری کام ہے مجھے۔"

"کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"جی میرا نام سردار کریم نواز ہے اور میں سرگودھا سے آیا ہوں۔"

"ہوں، آئیے، اندر چلیے۔ یہ گاڑی آپ ہی کی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"میرا خیال ہے آپ تھانے کے سامنے کھڑے تھے۔"

"جی ہاں۔ دراصل میں علیحدگی میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں وہاں کافی دیر کھڑا رہا پھر سوچا، آپ سے گھر پر مل لوں تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دراصل کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ بازار کا کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آئیے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔

جب میں صوفے پر بیٹھ چکا تو اس نے تولیہ پھیلا کر ہینگر پر ڈال دیا۔ "کیا خیال ہے کھانا نہ کھا لیں پہلے؟"

"آپ منگوائیں اور شروع کر دیں۔ مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔"

"نہیں سردار صاحب! کھانا تو کھا ہی لینا چاہیے۔ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ کھانے میں اصل بات یہ ہے کہ وہ گرم ہونا چاہیے۔" اس کی وہ بڑی بڑی غلافی آنکھیں برمے کی طرح میرے وجود میں دھنسی جاتی تھیں۔ وہ دراصل مجھ سے کچھ کہلوائے بغیر یہ معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ میرا وہاں پہنچنے کا مدعا کیا ہے؟ اور میں کس قماش کا آدمی ہوں؟ مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔

"بڑی بی! کھانا اِدھر ہی لے آؤ، ڈرائنگ روم میں۔" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ہاں، اب بتائیں کہ بات کیا ہے؟"

"راجہ صاحب! میں آپ سے یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ وہ قیدی جنہیں آج آپ جیل پہنچا کر آئے ہیں، انہیں آپ نے کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"آپ کا کیا تعلق ہے اُن سے؟" اس نے بھوئیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"وہ مکرّم علی گورایا ہیں نا، وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ ان کو پولیس کے ٹرک میں دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی ہے۔"

"مکرّم علی گورایا؟ ہمارے ٹرک میں اس نام کا تو کوئی آدمی نہیں تھا۔ البتہ ایک شخص تجمل حسین ضرور پکڑا گیا ہے۔"

"میں نے خود دیکھا ہے انہیں، وہ آپ کے ٹرک میں سوار تھے۔ ایک عورت بھی تھی ان کے ساتھ اور کچھ اور آدمی بھی تھے۔"

"اوہ! آپ یقیناً تجمل حسین گورایا کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل اس کی شکل صورت اپنے بھائی مکرّم علی گورایا سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ کوئی بھی اسے مکرّم علی سمجھ سکتا ہے۔"

"تو گویا وہ مکرّم علی نہیں تھے؟"

"نہیں۔"

"آپ نے انہیں کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے جناب! دراصل وہ عورت جس کا نام آسیہ ہے، جیل سے بھاگی ہوئی عورت ہے۔ وہ ادھر پنڈی جیل میں تھی کہ اس کے بھائی نے اُسے وہاں سے نکال لیا۔ اس کا نام غلام جیلانی ہے اور وہ بھی مفرور ہے۔ اسے بہت عرصہ پہلے پھانسی کی سزا ہوئی تھی مگر وہ بھی جیل سے بھاگ نکلا اور اب تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ جیل سے آسیہ بھاگی تو کسی نہ کسی طرح قندیار جا پہنچی اور مکرّم علی گورایا کی حویلی میں رہنے لگی۔ پھر یوں ہوا کہ اس نے مکرّم علی کو گولی مروا دی اور اس کی جگہ اس نے تجمل حسین کو حویلی میں لا کر مکرّم علی گورایا بنا دیا۔ اس دوران غلام جیلانی بھی اس سے جا ملا اور انہوں نے اُدھر بہاڑپور کے قریب نہر کی کھدائی کے کام میں مداخلت کر کے وہاں کے تمام مزدور اغوا کر لیے اور ٹھیکیدار صاحب کو بھی وہ لے اُڑے۔ اُن میں ملک اشرف

بھی تھے، ملک اصغر علی اور قیصر علی بھی شامل تھے۔ اُدھر کیرل میں بہت خون خرابہ ہوا کیونکہ آسیہ نے ڈاکوؤں کا ایک زبردست گروہ بنا لیا تھا اور وہ تمام ڈاکو اس نے وہاں جھونک دیے۔ کئی آدمی وہاں انہوں نے مار ڈالے۔ ان کے اپنے آدمی بھی وہاں کٹ گئے۔ اُن میں گل خان اور مسولینی نامی دو ڈاکو بھی شامل تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس واردات کا سرغنہ بھی غلام جیلانی ہی تھا۔ ہمیں تو اس کا پتا بھی نہیں چل سکتا تھا۔ یہ سارا معاملہ دراصل لندن سے مکرّم علی گورایا کی بہن سکینہ کے خط سے ظاہر ہوا۔ اس نے پنڈی پہنچ کے ڈی آئی جی کو خط لکھا تھا کہ قندیار میں اس کے بھائی مکرّم علی گورایا کے بارے میں اسے بتایا جائے کہ وہ کس حال میں ہے؟ کسی نے اُسے لندن میں اطلاع دی ہوگی کہ یہاں حالات کیا ہیں۔ اس خط کی بنا پر جب تفتیش کی گئی تو ساری بات سامنے آگئی۔ اس کا سہرا کلیم احمد کنجاہی کے سر ہے۔ وہ ہمارا بہت قابل افسر ہے۔ اس کی سفارش پر ہی تمام لوگوں کو جو حویلی میں موجود تھے، گرفتار کر لیا گیا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں مگر وہ ابھی نہیں پکڑے گئے۔ کچھ کا ریمانڈ لینا باقی ہے۔ تفتیش ابھی مکمل نہیں ہو سکی۔"

"کیا اُن لوگوں نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ مکرّم علی گورایا کو مار دیا گیا ہے؟"

"جی نہیں۔ ان میں سے اعتراف تو کسی نے بھی نہیں کیا اور ایک آدمی پاگل بن بیٹھا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"خود کو گردیزی کہلاتا ہے، حسن علی گردیزی مگر شاید یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ سنا ہے کہ وہ غلام جیلانی کا گہرا دوست ہے۔"

"ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ مکرّم علی گورایا کو قید میں ڈال آئے ہیں۔ اسے میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ گورایا ہی تھا۔"

"جی نہیں۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ اگرچہ اس کی شکل مکرّم علی سے بہت ملتی ہے مگر وہ دراصل تجمل حسین ہے۔ مکرّم علی کا سوتیلا بھائی۔"

اتنے میں اس کی ملازمہ کھانا لے کر اندر آگئی۔ "آیئے! کھانا کھالیں پہلے۔"

اس کی نظریں برابر میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اپنے ہر فقرے کا تاثر وہ میرے ردِّ عمل سے اخذ کرنے کی کوشش میں تھا۔ میز پر اس نے بھنا ہوا مُرغ رکھ دیا۔ روٹیاں روغنی تھیں۔ ساتھ ہی دو بوتلیں سیون اپ کی بھی اس نے سامنے رکھ دیں۔ دہی بھی وہاں موجود تھا۔ دوسرے پھیرے میں وہ بھنے گوشت کی ٹرے لے کر آئی ——— راجہ صاحب خاصے خوشحال آدمی معلوم ہوتے تھے اور کیوں نہ ہوتے، بڑے اہم تھانے میں مامور تھے اور کوئی ان کی آمدنی کا حساب نہیں لگا سکتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ہر دیوار پہ ایک وال کلاک آویزاں تھا۔ دو ٹی وی موجود تھے۔ ایک رنگین اور ایک بلیک اینڈ وائٹ۔ مگر چیزوں کی ترتیب ایسی تھی جیسے کسی نے وہاں دکان لگا رکھی ہو۔ ان میں سلیقہ کوئی نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے انہیں جلدی سے یونہی لا کر ڈال دیا ہو۔ کوئی ایک چیز دوسرے سے ملتی نہیں تھی اور میں سمجھتا تھا کہ جو چوری کا مال اِدھر اُدھر سے برآمد ہوتا ہوگا، اس میں سے قیمتی اشیاء ان کے گھر میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ کون مالکوں کو ڈھونڈتا پھرتا۔ بہت سا مال لاوارث پڑا رہ جاتا تھا۔ وہاں دو فریزر بھی رکھے تھے۔ وہ بھی شاید اسی راستے سے وہاں پہنچے تھے مگر کیا فائدہ اُن چیزوں کو گننے کا، ان پر مغز کھپانے کا۔

ہم کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران وہ بالکل خاموش رہے۔ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ پھر بھی میری طرف سے اُن کی توجہ کم نہیں ہوئی۔ وہ مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر میری پلیٹ میں ڈالتے رہے اور یہاں کی مہربانی تھی، وہ مجھے اس قابل سمجھتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خود انہوں نے میرے ہاتھ دُھلائے۔ میرے سامنے عمدہ قسم کے سگریٹ رکھے اور بولے "سردار صاحب! میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ ان لوگوں سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ مجھے صحیح صورتِ حال کا علم ہو جائے تو شاید میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔"

"میں نے عرض تو کیا ہے، مکرّم علی گورایا میرا دوست ہے۔"

"مگر وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ اس نہر کے اسکینڈل کے سلسلے میں ایف آئی اے حرکت میں آگئی تھی۔ انہوں نے ہی معلوم کیا کہ وہاں ملک اشرف جیسے سرکاری آدمی بھی اُن کی قید میں ہیں۔ یہ باتیں کلیم احمد صاحب کے ذریعے معلوم ہوئیں۔ وہ قیصر علی اور اصغر علی کے ساتھ ملک اشرف صاحب کو گھنے جنگلوں میں لے گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے وہ انہیں برآمد کر سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ تینوں محفوظ رہے ورنہ ان کے بچ جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔"

"مجھے حیرت ہے۔ مکرّم علی گورایا تو ایسا آدمی ہرگز نہیں تھا۔"

"مگر اس نے تو یہ کام نہیں کیا۔ اس کا سہرا تو آسیہ کے سر ہے۔ اُسے وہ لوگ بہن جی کہتے ہیں۔ سب کے سب آدمی اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ گروہ کے تمام لوگ تو گرفتار نہیں ہو سکے مگر جو ہمیں مل گئے ہیں، وہ بھی بہت کافی ہیں۔ ان کی گرفتاری میں سکینہ کے خط نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سوڈے کی دو بوتلیں کھول دیں اور لا کر میرے سامنے میز پہ رکھ دیں۔

"یہ پیئیں سردار صاحب! کھانا اس سے جلدی ہضم ہو جاتا ہے۔"

"مگر اس کو اتنی جلدی ہضم کرنے کی کیا ضرورت ہے راجہ صاحب! میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ راجہ صاحب اب کوئی کارروائی کرنے پر آمادہ ہیں۔ انہوں نے ابھی تک تو صرف مجھے تولنے کا ہی کام کیا تھا وہ میری ہر بات پر غور کر رہے تھے مگر اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ان سے جو آدمی مخاطب ہے، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ شاید وہ مجھے اس معاملے کی کوئی گمشدہ کڑی سمجھ رہے تھے اور وہ بوتل جو انہوں نے میرے سامنے رکھی، خالی از علت نہیں تھی۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ میں اسے پی لوں۔ ضرور پی لوں کہ معدے کی گرانی ختم کرنے میں یہ سوڈا بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

میں نے وہ بوتل اٹھائی مگر اس کا پہلا ہی گھونٹ مجھے خبردار کر گیا کہ راجہ صاحب نے اپنی کارروائی شروع کر دی ہے اور اب وہ مجھے بھی پھانس لینا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کا دوست غلام جیلانی ان کے سامنے بیٹھا ہے۔ میں نے ایک گھونٹ پی کر بوتل میز پر رکھی پھر دوسری بار اٹھانے لگا تو اُسے میں نے جان بوجھ کر میز سے نیچے گرا دیا، یوں جیسے وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔ وہ بوتل گری تو سوڈا قالین پر بہہ نکلا۔ راجہ صاحب اپنی جگہ سے تڑپ

کر اٹھ گئے۔

"یہ کیا کر دیا ہے آپ نے ؟ قالین خراب ہو گیا ہے۔ رحمتے! اِدھر آ ذرا، یہ بوتل اٹھا لے۔" اس نے ملازمہ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ فریج کی طرف بڑھ گئے اور انہوں نے دوسری بوتل باہر نکال لی۔ میری نظریں ان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اب بوتل کھولنے والی چابی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ حالانکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بوتل کھول چکے ہیں مگر ظاہر وہ یہی کر رہے تھے پھر ان کا رُخ فریج کی طرف ہو گیا۔ ایک لحظے کے لیے وہ وہاں رُکے اور پھر بوتل لا کر انھوں نے مجھے دے دی۔ چابی انہیں مل گئی تھی اور بوتل پر وہ اُسے آزما چکے تھے۔ اب اس بوتل سے انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

"لیں یہ دُوسری بوتل لے لیں سردار صاحب!"

"آپ بلا وجہ تکلف فرماتے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی بھلا؟" یہ کہہ کر میں خواہ مخواہ بلند آواز سے کھانسنے لگا۔ اس قدر کھانسا کہ مجھے اپنا دم الٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے یوں ظاہر کیا، جیسے میں دمے کا بہت پرانا مریض ہوں۔ حالت میری ویسی ہی ہو گئی تھی۔ میں نے بوتل کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کوئی دس منٹ یونہی گزر گئے اس عرصے میں راجہ صاحب گھر میں رکھی کھانسی کی گولیاں لانے کے لیے باہر نکل گئے۔ میں نے اس دَوران وہ بوتل پانی کے جگ میں انڈیل دی۔ رنگ اس کا پانی ایسا ہی تھا۔ جب راجہ صاحب واپس آئے تو بوتل کو خالی دیکھ کر خوش ہو گئے۔

"اچھا کیا آپ نے یہ بوتل پی لی۔ یہ گولی بھی کھالیں۔ اس سے ضرور فرق پڑے گا۔"

"نہیں اس کی اب ضرورت نہیں رہی، میں نے گولی کھالی ہے میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ گیا۔ مجھے بے ہوش کرنے کی ساری ہی تدبیریں رائیگاں ہو رہی تھیں۔ دراصل پولیس کے لوگ کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ جس سے زیادہ دوستی کا دم بھریں، سمجھو اسی کا بھٹہ بٹھا دیں گے اور مجھے انہوں نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا تھا۔ بڑے مشکوک سوال میں نے ان سے پوچھے تھے۔ وہ مجھے کیسے بچ کر نکل جانے دیتے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ میں بھی اس ڈرامے کا ایک کردار ہوں جس کے تمام دوسرے لوگ ان کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔ وہ بہت رُکتے رہے کہ ابھی کچھ دیر میں اور وہاں رکوں مگر میں فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں اگلا حربہ وہ کیا استعمال کریں کہ مجھے بے بس کر کے رکھ دیں۔

مجبور ہو کر وہ میرے ساتھ ہی باہر آ گئے مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری کار کا اگلا دایاں ٹائر بیٹھ چکا تھا۔ کسی نے اس کی ہوا نکال دی تھی۔ یہ بہت پریشان کن بات تھی۔

"یہ..... اس کی تو کسی نے ہوا نکال دی ہے راجہ صاحب!"

"پتا نہیں، یہ ہوا کیسے نکل گئی۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں میرے ساتھ چلیں۔ میں اسکوٹر پر آپ کو لے چلتا ہوں یا پھر ٹائر الگ کر لیں۔"

"ہاں، ٹائر ہی الگ کرنا پڑے گا مگر یہ کام میں نے کبھی کیا نہیں ہے۔ بہرحال کوشش کرتا ہوں۔"

"ہاں۔ آپ یہی کریں۔ میں تو اب بہرحال جا رہا ہوں۔ بڑا کام ہے مجھے۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھے اور فوراً ہی وہاں سے چل دیے۔

معلوم یہ ہو رہا تھا جیسے وہ فوراً ہی لال کُرتی سے سپاہیوں کو میری طرف بھیج دیں گے۔ وہ کسی بھی بہانے مجھے گرفتار کر سکتے تھے۔ حالات بہت ہی پریشان کن ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ میری نظروں سے غائب ہوئے میں نے تیزی سے ٹائر بدلنا شروع کر دیا۔ مجھے ہر حال میں اپنی کھال بچا لینا چاہیے تھی۔ کار کو میں وہاں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ جس قدر جلدی ہو سکا، میں نے پہلا ٹائر نکالا۔ ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ دوسرا ٹائر میں کار میں چڑھا چکا تھا کہ ایک جیپ مجھے اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ پولیس کی جیپ ہے۔ میں تیزی سے کار میں بیٹھا اور اس کو موڑنے کی کوشش کی مگر سڑک اتنی تنگ تھی کہ مجھے بہت آگے جا کر اس کو واپس لانا پڑتا۔ اتنے میں وہ جیپ میرے قریب سے گزر گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ فارسٹ والوں کی جیپ تھی۔ ذہن میں خدشے بھر جائیں تو سُوئی بھی بھالا نظر آتی ہے اور میری کار کے لیے جگہ اتنی بھی تنگ نہیں تھی کہ میں اسے موڑ نہ سکتا۔ اس کا رُخ بدل کر میں جس قدر جلدی ہو سکا لال کُرتی کی طرف بڑھا۔ خطرہ مجھے یہی تھا کہ راجہ ممتاز میرے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دے گا۔ اس کا رویّہ مجھے یہی بتا رہا تھا۔

ابھی میں دائیں ہاتھ کی سڑک پر چڑھا ہی تھا اور لال کُرتی کی سڑک میں نے چھوڑی ہی تھی کہ میرے خدشے درست ثابت ہونے لگے۔ پولیس کی ایک جیپ انتہائی تیز رفتاری سے مجھے اپنی طرف آتی نظر آئی۔ اس کو راجہ صاحب کے گھر کی طرف مُڑتے ہوئے میں نے عقب نما میں دیکھا۔ اس میں راجہ ممتاز نہیں بیٹھے تھے بلکہ کچھ اور ہی لوگ تھے اور انہیں راجہ صاحب نے ہی بھیجا تھا۔ تاکہ وہ مجھے جس طرح بھی ہو سکے پُوچھ گچھ کے لیے سیدھے تھانے لے جا سکیں۔ بڑا ہی خطرناک لمحہ میرے قریب سے ہو کر گزر گیا تھا۔ میں لالہ زار کالونی سے نکلا اور سیدھا ایوب پارک کے قریب جا پہنچا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ گاڑی میں مری روڈ سے نکال کر آئی ٹاؤن کی طرف چل دیا۔ ایک ٹھکانہ میرے پاس موجود تھا۔ اس مرحلے پر آباد شاہ میرے سو کام آ سکتا تھا۔ مجھے اس راجہ ممتاز کے پاس ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا مگر مُعاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں صبر نہ کر سکا جو کچھ ہو چکا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میرا جگری دوست آبی بھی ان کی گرفت میں آ چکا تھا۔ ویسے تو مجھے معلوم ہی تھا کہ ایک دن ایسا ہونا ہی ہے۔ اس گھڑی کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا مگر وہ گھڑی میرے اندازے کے بالکل ہی برعکس ایسی حالت میں آئی کہ وہ سب کے سب بندھ کر رہ گئے۔ ایسے حال میں کہ کوئی ان کا پُرسانِ حال بھی نہیں تھا۔ میں نے چاہا کہ وہاں سے سیدھا قندھار چلا جاؤں مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اب وہاں کون باقی رہ گیا تھا۔ حویلی تو سنسان پڑی ہو گی۔ ایک بڑی رقم آبی کے پاس موجود تھی، وہ خدا معلوم کس کے ہاتھ آئی ہو گی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ملک اشرف بھی اُن کے چُنگل سے بچ نکلا تھا۔ بڑے صاحب اس کا انتظام کر سکتے تھے مگر اس بات کا کیا بھروسہ تھا کہ ملک اشرف پھر کسی نہ کسی طرح ان کی گرفت سے بچ نکلے۔ وہ سو بہانے بنا سکتا تھا، اپنی وفاداریوں کا انہیں یقین دلا سکتا تھا۔ اب اس کے سارے دشمن جیل جا چکے تھے تو کچھ پولیس ریمانڈ پر تھے۔ اسے کسی بھی بات کی فکر نہیں رہ گئی ہو گی مگر یارو میں کیا کرتا؟ کدھر جاتا۔ فلاح کی کوئی راہ میرے لیے کھُلی نہیں رہ گئی تھی۔ میں اس چومکھی لڑائی میں کیسے پورا اتر سکتا تھا۔ میرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا۔

جب میں آئی ٹاؤن پہنچا تو اس وقت تک آباد شاہ واپس آ چکا تھا۔ میری گاڑی دیکھ کر وہ گیٹ پر آ گیا، بولا "اچھا ہوا آپ واپس آ گئے۔ میں اکیلا یہاں بور ہو رہا تھا۔" اس نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ میرا چہرہ کچھ زیادہ ہی مُرجھایا ہوا تھا۔ وہ بڑی حیرت سے میرا منہ دیکھتا رہا۔ میں نے گاڑی اندر لے جا کر کھڑی کی تو وہ گیٹ بند کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے پاس آ پہنچا "کیا بات ہے خیر تو ہے۔ آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں؟"

"کیا کہوں شاہ جی! ذلّت آدمی کا مقدر ہو جائے تو پھر عزت اسے کہیں نہیں مل سکتی۔ آج میرے تمام ساتھی جیل جا پہنچے ہیں۔ میں انہیں خود دیکھ کر آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کون سے ساتھی؟"

"میری بہن آسیہ، میرا دوست آبی اور دوسرے لوگ۔ اُدھر قندھار میں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ وہ حویلی سے سب کو گرفتار کر کے راولپنڈی لے آئے۔"

"چلیں اندر، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ آپ کی بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ مجھے کھینچ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

میں نے اسے وہ تمام باتیں جو میں ضروری سمجھتا تھا، بتا دیں۔ وہ بڑی حیرت سے میرا منہ تکتا رہا اور سگریٹ سے کھیلتا رہا۔ پتا نہیں وہ تمام باتیں اسے میں نے کیوں اور کیسے بتا دیں۔ میرا دل بھرا ہوا تھا۔ چھالا سا نکل آیا تھا میرے سینے پر۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے سردار صاحب! آپ کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہو تو مجھے بتائیں۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

"کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی ہے شاہ جی! وہ بڑے لمبے فساد میں پھنس گئے ہیں۔ ان کو چھُڑا لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے فردوسی اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ بڑے پولیس افسر اس کے دوست ہیں۔ شاید جیل تک بھی اس کی رسائی ہو۔"

"وہ آ جائے تو پھر اس سے بات کر لیں گے۔ مگر اس سارے ابتلا کا انجام اچھا نہیں ہوا ہے۔ ذرا گوگی سے کہیں کہ وہ چائے بنا دے۔"

"وہ بنا رہی ہو گی۔ میں نے لشکر خان کو ایک کام سے مظفر آباد بھیجا ہے۔ وہ خواہ مخواہ ہی اس پر ریشہ خطمی ہو رہا تھا۔ ایک دم لفنگا آدمی ہے وہ۔"

"مجھے بھی یہی ڈر تھا۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں جلدی واپس آ گیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ بس آج غلطی ہو گئی۔"

"اس فرید احمد کا کیا حال ہے اب؟"

"میں نے ابھی فون کیا تھا انہیں۔ وہ اب بہت بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ چار بجے گھر آ جائیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ورنہ ہماری وہ رقمیں تو شاید کبھی ہمیں واپس نہ مل سکیتں۔"

"اب بھی کیا بھروسہ ہے سردار صاحب! ہو سکتا ہے فرید احمد بھی چُپ سادھ لے۔ وہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اس کی تو پُشتیں سنور سکتی ہیں۔"

"نہیں اب وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ مجھے یقین ہے۔"

فردوسی ٹھیک چار بجے فرید احمد کو لے کر واپس آ گیا مگر اس حال میں کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور فردوسی نے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا رکھی تھی۔ وہ اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا اور اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی۔

"اس مکّار نے راستے میں پولیس کو پکارنا چاہا تھا۔ اس کا نخرہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔"

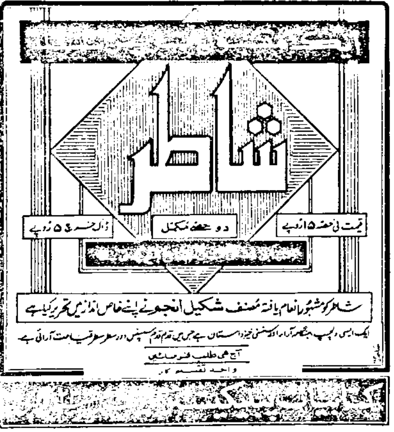

"نہیں بھائی! یہ تو بہت اچھا آدمی ہے۔ اک ذرا اس کی نیت خراب ہوگئی تھی مگر اب تک تو یہ ساری بات سمجھ چکا ہوگا۔ کیوں فرید احمد؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ایک دم بلکنے لگا۔

"مجھے معاف کردیں بھا جی! خدا کے لیے مجھے معاف کردیں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی ہے۔" وہ میرے سینے سے لگ گیا۔

"مجھے معلوم ہے فرید احمد! مجھے معلوم ہے، انسان خطا کا پتلا ہے۔ تمہاری وجہ سے تمہارے والدین اور تمہاری ہمشیرہ بھی پریشان ہوگئی ہیں۔ یہ لوگ انہیں باندھ کر لے آئے تھے۔"

"مجھے پتا چل گیا ہے، میں جانتا ہوں بھا جی! خدا کے لیے انہیں چھوڑ دیں۔ میں..... میں آپ کی رقم واپس کردیتا ہوں۔"

"تمہیں یہی کرنا چاہیے۔ ساری گولیاں ہم تمہیں معاف کرتے ہیں، پریشان نہ ہو۔ اب بتاؤ کہ وہ رقم کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس محفوظ ہے بھا جی! دونوں بریف کیس ویسے ہی بندھے پڑے ہیں۔ ان کو میں نے پانی کی پرانی ٹنکی میں ڈال دیا تھا۔ وہاں پانی بالکل نہیں ہے۔ اس کے اوپر میں نے فرش ڈال دیا تھا۔ میں خود مستری ہوں نا جی! یہ کام بھی میں نے سیکھ رکھا ہے۔"

"مگر کس مکان میں؟"

"ہمارا ایک اور مکان ہے، چھوٹا سا کوارٹر، اسی گلی میں ہے۔ اس میں ایک ٹنکی بنی ہوئی ہے۔ کوئی ایک مہینہ ہوا وہ مکان ہم نے کرائے داروں سے خالی کروایا تھا۔ بریف کیس وہیں رکھے ہیں۔ پانی کا کنکشن عرصہ ہوا کٹ چکا ہے۔"

"گڈ! بہت سمجھ دار آدمی ہو تم۔ ویسے وہ تمہارے پیٹ میں درد اٹھا بھی تھا کہ ایک بہانہ تھا۔"

"وہ تو میں نے ایسے ہی بہانہ کر رکھا تھا بھا جی! میں چاہتا تھا کہ سارا فساد گزر جائے تو پھر میں اطمینان سے ساری رقم نکال کر کاروبار میں لگا دوں گا مگر آباد شاہ صاحب نے مجھے چین نہیں لینے دیا۔ پھر یہ میرے والدین کو بھی پکڑ لائے۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا فرید احمد! یہ تو ہونا ہی تھا۔ ان لوگوں نے اپنی جان لڑا رکھی ہے، یہ کیسے اس رقم کو چھوڑ دیتے؟ بہرحال اب بتاؤ کہ وہ رقم تم کب واپس کرو گے؟"

"وہ رقم میں آپ کو دے دوں گا مگر میری ایک شرط ہے۔"

"بکواس نہ کر اوئے! ہم تیری کوئی شرط ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ کوئی نیا تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو؟ تیرے نخرے ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔" فردوسی نے اس پر پھر پستول تان لیا۔

"نہیں یار! ایسا نہ کہو۔ اسے بات کہنے دو۔ ہاں فرید احمد! کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھیں بھا جی! وہ رقم کروڑوں میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا بریف کیس تو چار کروڑ روپے کا ہوگا۔ یہی حال آپ کے بریف کیس کا ہے۔ اس میں اسی لاکھ روپیہ موجود ہے۔"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے۔"

"آپ اس میں سے مجھے دس لاکھ روپے دے دیں۔ یہ میری آپ سے درخواست ہے۔ میرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ پھر کبھی یہ موقع میرے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"ہوں..... دس لاکھ... کیا خیال ہے شاہ جی؟"

"بکتا ہے یہ لفنگا! بھنگ پی گیا ہے۔ ذات کی کوڑھ کرلی اور شتہیروں کو جپھے۔ حد ہوگئی! مارو اس بدمعاش کو، ادھر ہی ختم کردو اس کا مکان ہم خود ڈھونڈ لیں گے۔" آباد شاہ نے بڑے ہی غضبناک انداز میں کہا۔ فرید احمد بجھ کر رہ گیا۔

"میں صرف آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ یہ کوئی شرط نہیں ہے میری شاہ صاحب! سمجھیں کہ آپ میری روزی بحال کر رہے ہیں میری تباہ شدہ کار کا معاوضہ دے رہے ہیں۔"

"فرید احمد! تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں وہ رقم دے دوں گا، دس لاکھ دے دوں گا۔ میرا یہ وعدہ رہا۔ تم نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے مگر وہ سب کچھ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو پھر کبھی ایسے لوگ تمہیں نہیں مل سکیں گے۔ جاؤ اب فردوسی کے ساتھ، فضل بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ رقم ہم تمہیں دے دیں گے، یہ میرا وعدہ رہا۔"

"خدا آپ کو خوش رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے والدین اور بہن پر آپ نے ہاتھ نہیں اٹھایا ہوگا۔"

"نہیں، وہ بالکل محفوظ ہیں۔ تم رقم ہمیں لا دو تو ہم ان کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔" آباد شاہ نے کہا۔ فرید احمد مطمئن ہوگیا اور بڑی آسودگی سے مسکرانے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد فردوسی اور فضل اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شہر چلے گئے تو آباد شاہ بولا "آپ نے اچھا کیا ہے، اسے دس لاکھ کا لالچ دے کر رقم اگلوائی ہے۔"

"یہ لالچ نہیں ہے شاہ جی! میں یہ رقم اسے واقعی دے دوں گا۔ اس کا کچھ بھلا ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! یعنی دس لاکھ کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"بڑی اہمیت ہے شاہ جی! مگر جن مرحلوں سے وہ گزر گیا ہے جیسی ذلت اسے اپنے والدین اور بہن کے اغوا کی وجہ سے سہنی پڑی، اس کے مقابلے میں تو یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں آپ! اس لڑکی کو ہم نے اپنی بیٹی ایسا تصور کیا ہے۔ میں نے حکم دے رکھا تھا کہ ان سے کوئی کچھ نہ کہے اور یہ لوگ میرا حکم مانتے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے آباد شاہ جی! تو پھر میں آپ کو سلام کرتا ہوں کہ آپ نے انہیں اتنی عزت دی۔ ویسے وہ لوگ ہیں کہاں؟"

"وہ ادھر ہی ہیں۔ رقم واپس مل جائے تو پھر ہم انہیں فرید احمد کے ساتھ بھیج دیں گے۔" وہ مجھ سے بات کر رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ ان لوگوں کی اس قدر ذلت و رسوائی کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں آباد شاہ کے پاس سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر بستر پہ لیٹ گیا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ان پابجولاں اسیروں کے اس نئے عذاب نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ کوئی تو صورت ایسی نکلنی چاہیے جس سے میں ان کی مدد کرسکوں۔ ان کی مصیبت کے دن آگئے تھے۔ آپی نے تو آج تک جیل نہیں دیکھی تھی۔ ہمارے ساتھ وہ بھی پس گیا۔ پتا نہیں اصل حالات کیا تھے۔ راجہ ممتاز سے جو باتیں میں نے سنی تھیں، ان سے میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بہت الجھا ہوا تھا۔ بار بار بیٹی سے لگے پستول پر ہاتھ ڈالتا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میرے پاس بھی پستول موجود ہے۔ وہ میری جیب کی طرف بار بار دیکھتا تھا مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال پوچھتا۔ سوچتا ہوگا کہ وہ آدمی جو اتنی دیدہ دلیری سے سیدھا اس کے گھر پہنچ سکتا ہے تو وہ خالی ہاتھ نہیں ہوگا اور محض گفتگو تک خود کو محدود نہیں رکھے گا۔ دوسرے کمروں سے جو آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ خاصا قبیل دار آدمی ہے۔ اس کی بیٹیاں اسی وقت اسکول سے واپس آئی تھیں اور کم از کم چار ضرور تھیں۔ اس کا بیٹا بھی وہیں تھا۔ وہ بھی زیادہ عمر کا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی بیگم کوئی بہت ہی محتاط اور فرماں بردار عورت تھی۔ بچوں کو اس نے ایک بار بھی ڈرائنگ روم کی طرف نہیں آنے دیا اور راجہ ممتاز کو ان سے جو محبت تھی وہ اسے گھر کی چار دیواری میں کسی قسم کے حزن خرابے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ورنہ وہ شاید مجھے وہاں سے ہلنے نہ دیتا۔ پھر بھی اس نے مجھے بے بس کردینے کی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ نکلتا تو شاید میں بھی اس وقت جیل میں ہوتا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ راجہ ممتاز کوئی بہت ہی محتاط اور ڈرپوک قسم کا آدمی تھا، بڑھ کر میرا گریبان نہ پکڑ سکا اور یہ بات میرے لیے اچھی ثابت ہوئی مگر سوال یہ تھا کہ میں کیا کروں؟ ایسا کون ہوگا جو مجھے ان سے ایک بار ملوا دے، میری ان سے بات کروا دے۔ اپنی رہائی کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی تجویز تو ضرور ہوگی۔ مشکل یہ تھی کہ آسیہ اسی جیل میں جا ٹھہری تھی جس کے سپرنٹنڈنٹ کو وہ قتل کر چکی تھی۔ پولیس کو کئی ذرائع سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ وہ ڈرائیور بھی ابھی زندہ ہوگا اور اس کا بیان بھی موجود ہوگا، جس نے اسے کوٹھی تک پہنچایا تھا۔ وہ آسیہ کی شناخت کرسکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ لوگ تجمل حسین سے مکرم علی گورا یا کے قتل کی واردات کا بھی احوال دریافت کرلیں..... کسی بھی آدمی کا جیل میں پہنچنے کے بعد ارادہ کمزور ہوسکتا ہے۔ اس اسیری نے بڑے بڑوں کے دل دہلا دیے تھے۔ آدمی کا وجود پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ زنجیریں پاؤں سے لپٹی ہوں تو پھر سارا جسم انہی کو تکتا رہتا ہے۔

میں بڑی دیر تک اس نئی صورتِ حال پر کڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی مگر فرید احمد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی؟ اس دوران آباد شاہ دو تین بار میرے کمرے میں آکر لوٹ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں سویا ہوا ہوں۔ آخر تھک ہار کر میں بستر سے اٹھ گیا۔ عین اس وقت باہر صحن میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ فرید احمد واپس آگیا تھا۔ فردوسی کار سے نکل رہا تھا۔ صحن کی بتی جل رہی تھی۔ آباد شاہ تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ فردوسی کامیاب لوٹا تھا۔ دونوں بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھے۔

"آپ کو مبارک ہو شاہ صاحب! رقم بالآخر واپس مل گئی ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو فردوسی! آج ہم سرخرو ہوگئے۔ ورنہ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کرامت صاحب ہمیں کبھی معاف نہ کرتے۔" ایسے ہی یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی مگر اسے احساس ہوگیا کہ اس نے شاید بہت ہی غلط بات کہہ دی ہے جو اسے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ وہ فرید احمد کو ساتھ لے کر تیزی سے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔

فردوسی نے سب سے پہلے اپنا بریف کیس کھولا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ پانی سے بالکل محفوظ رہا تھا۔ شاید اس کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں جا سکا۔ ان کا تمام مال اس میں جوں کا توں رکھا تھا۔ ہیروئن بھی اور ڈالر بھی، وہ انہوں نے نکال کر گنے اور پھر بریف کیس میں رکھ دیے پھر انہوں نے میرا بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ آباد شاہ بولا "اسے کھولیں سردار صاحب! یہ اپنے خاص نمبر سے کھلتا ہے۔"

"وہ نمبر میں نے معلوم کرلیا تھا۔ سات سات اور سات نمبر، ہیں نا اس کے؟" فرید احمد نے کہا، وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہاں۔ تم بہت تیز آدمی ہو فرید احمد! نمبر تو اس کے یہی ہیں۔" میں نے وہ نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ بریف کیس کھلا تو میری جان میں جان آئی۔ اس میں بھی تمام رقم ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ فرید احمد نے نوٹوں کی ترتیب شاید بدل دی تھی۔ وہ انہیں گنتا رہا تھا۔ ورنہ وہ جیسا تھا ویسا ہی مجھے واپس مل گیا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ اتنا ہوا بند بریف کیس تھا کہ اس میں بھی پانی داخل نہیں ہوسکا تھا اور اس

بات کا مجھے علم نہیں تھا۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس دوران وہ نوٹ گل سڑ گئے ہوں گے۔ فرید احمد بڑی حریصانہ نظروں سے اُن نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے فرید احمد! تمہیں دس لاکھ روپیہ چاہیے؟" میں نے نوٹ گننے کے بعد کہا۔ وہ پورے ہی تھے۔ ایک نوٹ بھی ان میں سے اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔

"میں کیا کہوں سردار صاحب! یہ میری ضرورت ہے۔ آگے آپ مالک ہیں۔ رقم میں نے آپ کو واپس کردی ہے۔" فرید احمد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ رہنے دیں سردار صاحب! یہ رقم میں دے دیتا ہوں یہ اس کا انعام ہے۔ ہم تو ایک پیکٹ بیچ کر اس سے دُگنی رقم کما لیں گے۔ کیا خیال ہے فرید احمد! ڈالر لینا پسند کرو گے؟"

"انہیں میں کہاں سے تڑواتا پھروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ فردوسی! تم اسے دس لاکھ روپیہ تجوری میں سے نکال دو۔"

"میرا خیال ہے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ پانچ لاکھ اسے میں دے دیتا ہوں اور پانچ آپ دے دیں۔"

"چلیں یونہی سہی۔ آپ کو بھی اسّی لاکھ واپس مل رہا ہے۔ جاؤ فردوسی! تم پانچ لاکھ اسے اپنی طرف سے لادو۔"

میں نے فرید احمد کے سامنے پانچ لاکھ روپے گِن کر رکھ دیے۔ اس پر تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ نوٹ اس نے بڑی محبت سے جھولی میں ڈال لیے۔ اس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے بہہ نکلی تھیں، بولا۔ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ حالانکہ میں اس رقم کا اہل بالکل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی ہے۔ خدا کی قسم میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ پتا نہیں آپ نے میری یہ بات کیسے مان لی ہے۔" اس کے رخسار بھیگنے لگے تھے۔

"کبھی کبھی آدمی کو اپنا دشمن بھی عزیز ہونے لگتا ہے۔"

اس عرصے میں فردوسی دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔ وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو لفافے تھے۔ وہ اس نے آباد شاہ کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے لفافوں میں رکھی رقم گِن کر فرید احمد کے سامنے رکھ دی۔ وہ بھی بالآخر اس پر مہربان ہوگیا تھا اور اس کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا احساس نہیں اُبھر رہا تھا۔ اس نے فراخدلی سے وہ رقم اس ڈرائیور کو دے دی تھی جس نے ہم سب کو ختم کردینے کی کوشش کی تھی۔ کسی ایک کو بھی اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ اس گھڑی لشکر خان اور فضل باہر برآمدے میں کھڑے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دونوں ان سے کوئی صلاح مشورہ نہیں کرتے تھے۔ تمام کام آباد شاہ کے حکم پر ہوتے تھے اور فردوسی اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ فرید احمد کو رقم مل گئی تو فردوسی نے اسے ایک تھیلا دے دیا تاکہ وہ نوٹ اس میں ڈال لے۔

"میرا خیال ہے کہ اب آپ میرے گھر والوں کو میرے ساتھ کردیں اور مجھے اجازت دیں۔"

"اجازت تو ہم دے دیں گے مگر کیا ہم امید رکھیں کہ تم ہمارے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے؟" آباد شاہ کے ذہن میں شک کا ناگ اُبھر رہا تھا۔ وہ ایک دم بہت سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں میکر شاہ صاحب! آپ تو میرے محسن ہیں۔ میں کیسے کسی کے سامنے آپ کا نام غلط طور پہ لے سکتا ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا، کبھی بھی نہیں ہوگا۔ کہیں تو میں اپنا بازو کاٹ کر آپ کے پاس ڈال جاؤں۔ کوئی بھی ضمانت میں دینے کو تیار ہوں۔ فرید احمد نے ایک دم پریشان ہوکر اپنا بایاں بازو ننگا کرکے میز پہ رکھ دیا۔" اسے جہاں سے چاہیں کاٹ لیں۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ فردوسی! ان لوگوں سے انہیں ملاؤ اور وہیں سے انہیں کار میں بٹھا کر گھر بھیج دو مگر اس طرح کہ ان سب کی آنکھوں پر پٹی ہونی چاہیے۔ جیسے تم ان کے گھر کے قریب پہنچ کر کھول دو گے۔"

"جی بہت بہتر! میں ان کو صدر کے علاقے میں کسی جگہ اتار دوں گا۔ آگے یہ خود مالک ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا فرید احمد! خدا حافظ۔ خدا کرے تم پھر کبھی ہمارے راستے میں نہ آؤ۔" اس نے ہاتھ فرید احمد کی طرف بڑھا دیا۔ مجھ سے بھی اس نے بڑے خلوص سے مصافحہ کیا اور فردوسی کے ساتھ کوٹھی کے عقب کی طرف چل دیا۔ وہ لوگ وہیں کسی کمرے میں بند تھے۔

وہ باہر نکلے تو میں نے کہا۔ "شاہ جی! آپ نے کہا تھا کہ شاید فردوسی میری کچھ مدد کرسکے۔"

"ارے ہاں! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ ان لوگوں کو میں لشکر خان کے ساتھ بھی بھیج سکتا ہوں۔ ٹھہریں! میں اس سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے فردوسی کے پیچھے لپکا اور کوئی پندرہ منٹ بعد وہ اس کو ساتھ لے کر واپس آگیا، بولا۔ "اب آپ بات کرلیں فردوسی سے۔ ان کو میں نے لشکر خان کے ساتھ بھیج دیا۔ فرید احمد ویسے خوش ہوگیا تھا۔ وہ تینوں بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔"

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ ویسے شاہ صاحب نے مجھے کچھ بتایا تو ہے مگر میں بھلا اس سلسلے میں کیا کرسکوں گا۔"

میں نے مختصر الفاظ میں آسیہ اور دوسرے لوگوں کے بارے میں اس سے بات کی۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہا، پھر بولا۔

"یہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے حضور! کوئی اور جھگڑا ہوتا تو میں شاید کچھ کرسکتا۔ اُن پر تو آپ نے بتایا ہے کہ بہت سنگین الزامات عائد ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں فردوسی بھائی! مگر..... کوئی دُکھ ایسا نہیں

ہے جس کا علاج نہ ہو۔"

"ویسے آپ ان کی رہائی کے لیے یا اُن سے ملنے کے لیے کتنی رقم خرچ کرسکتے ہیں؟" اس نے مجھے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

"میں خود کو بیچ سکتا ہوں فردوسی! ان کے لیے میں سارے جہان کو آگ لگانے کو تیار ہوں۔ یہ پوچھو کہ میں کیا نہیں کرسکتا۔"

"ہوں..... ٹھیک ہے۔ کبھی کوئی دیوار بھی پھاندی ہے تم نے؟ کسی گھر میں ڈاکا بھی ڈالا ہے تم نے؟"

"اس کی مت پوچھو بھائی! پتا نہیں میں کیا کچھ کرسکتا ہوں۔"

"پھر تم یوں کرو کہ دو دن انتظار کرو۔ کرامت صاحب دو دن بعد راولپنڈی آئیں گے۔ میں تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔ بڑے ہمدرد آدمی ہیں وہ۔ تمہاری ضرور مدد کریں گے۔"

"نہیں یار! میں انتظار نہیں کرسکتا۔ میرا خیال ہے اب تم مجھے اجازت دو۔ کیا یہ کار میں چند دن اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، کوئی ہرج نہیں۔ جب یہ فارغ ہوجائے تو اسے اِدھر ہی چھوڑ دیں سردار صاحب!" آباد شاہ نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے کھانا تو کھالیں بھئی! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" فردوسی نے تیزی سے کہا۔

"نہیں۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ایسا بدنصیب ہوں کہ ایک عرصے سے دو وقت کی روٹی چین سے نہیں کھا سکا ہوں۔ آپ کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا شاہ جی! مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کردیں۔"

"نہیں سردار صاحب! آپ بہت حوصلہ مند آدمی ہیں۔ آپ ایسا تو میں نے آج تک کوئی نہیں دیکھا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے گلے سے لگا کر بولا۔ "آپ کے پاس ایک پستول ہے۔ اس کے لیے یہ کچھ اور گولیاں لے جائیں۔ وہ میرا خاص ہتھیار ہے، آپ کو میری یاد دلاتا رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے کوئی بیس گولیاں نکال کر مجھے دے دیں۔

"آپ کی مہربانی ہے شاہ جی! یہ گولیاں میرے بہت کام آئیں گی۔" میں نے فردوسی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر بریف کیس اٹھا کر میں باہر نکل آیا۔ کار سامنے ہی کھڑی تھی۔ اسے لے کر میں جب کوٹھی سے نکلا تو وہ دونوں دیر تک مجھے گیٹ سے باہر نکل کر دیکھتے رہے۔

میرے ذہن کے ایوانوں میں عجیب سی لہو رنگ دُھول اڑ رہی تھی۔ ہر شے مجھے سُرخ ہی سُرخ نظر آتی تھی۔ ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔ پتا نہیں میں کیا چاہتا تھا۔ ہر چیز سے مجھے نفرت سی ہوگئی تھی۔ میں کیا کروں میرے پروردگار! جن کی آزادی کے لیے میں نے پہاڑ الٹ دیے، وہ پھر اسیر ہوگئے تھے۔ ان کو میں کیسے رہائی دلا سکوں گا۔ بار بار وہ پہاڑ میں کیسے الٹ سکوں گا جو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوطی سے اپنی جگہ ڈٹ گئے تھے۔ پہلے تو میں یوں کامیاب ہوگیا کہ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ کسی کو میرا نام معلوم نہیں تھا مگر اب..... اب تو کوئی ایسا نہ تھا جو مجھے نہ جانتا ہو۔ سرکار دربار میں تو میں شیطان کی طرح مشہور ہوچکا تھا۔ پولیس میرے نام سے تھراتی تھی اور میری تکّا بوٹی کرنے کے لیے بے چین پھرتی تھی۔ میں تو اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہ گیا تھا۔ پھر..... میں ایسے میں ان کی کیا مدد کرسکوں گا۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ سب کچھ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ کیا ہم سب اپنے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے تھے جو بہت ہی اندوہناک تھا۔ زندگی خرچ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تیلی جو ہمارے وجود کو باندھتی ہے، آہستہ آہستہ کٹتی جا رہی تھی۔ قانون کی ایک چھوٹی سی دفعہ ہمارے خلاف ان کے ہاتھ میں ٹیک بن گئی تھی جو بہت گہرا شگاف ڈالتی تھی۔ اتنا بڑا کہ مضبوط سے مضبوط قلعے اس سے سر ہوجاتے تھے۔ ایک مسلسل اور پیہم کوشش کے باوجود ہم قانون کی بالادستی سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے اور اب سب کچھ پیوندِ خاک ہوا جاتا تھا۔ پتا نہیں آسیہ اور آپی سے وہ کیا کچھ چھین چکے ہیں۔ وہ دونوں ہی بہت نڈھال دکھائی دیتے تھے۔ یوں جیسے ان میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔ آسیہ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ وہ انسپکٹر کو ڈانٹ دیتی اور کہتی کہ مجھے دروازے کے باہر کھڑے آدمی سے بات کرنی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے حوصلے کی بالا بلند دیوار ڈھے چکی تھی۔ یہی حال آپی کا تھا۔ وہ بھی اس قدر پژمُردہ اور نڈھال تھا کہ کسی طرف دیکھے بغیر جیل کے اگلے دروازے تک جا پہنچا۔ جیسے وہ موم کی ناک بن چکا ہو۔ ورنہ ایسے جھٹکے تو آدمی کو لگا ہی کرتے ہیں۔ وہ جو بہت کُھل کھیلتے ہیں، جو سروں کا سودا کرتے ہیں، جن کی راتیں کھلی آنکھوں گزر جاتی ہیں، جن کی صبحیں انہیں بے کل اور بے قرار کردیتی ہیں۔ ان کو ایسے مرحلوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے مگر آپی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی ڈھال بن جاؤں گا، وہ میرے عقب میں رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا حالانکہ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ آدمی کا میمنہ میسرہ محفوظ بھی ہو تو بھی غنیم اس کے عقب سے حملہ آور ہو سکتا ہے مگر اس راز کو وہ سمجھ ہی نہ سکا۔ اب وہ زنجیریں پہن کر جیل جا بیٹھا تھا اور میں پھُولوں کی چادر لیے اس کے مزار کو تلاش کر رہا تھا۔ مگر..... میں اس تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ سارے ہی راستے بند نظر آتے تھے۔ اسے پھولوں نے بے ہوش کردیا تھا۔ وہ آسیہ کے بہت قریب رہنا چاہتا تھا اسی لیے اس روز میرے ساتھ لاہور نہیں گیا۔ ورنہ شاید وہ بچ جاتا مگر اب وہ جس دیوار کے زیرِ سایہ جا لیٹا تھا، وہ جب گرتی ہے تو پھر گرتی ہی جاتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے اوپر گر رہی ہے۔

کار کو میں بھگاتا ہوا بے سوچے سمجھے آگے نکل رہا تھا۔ میری سمجھ میں

کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں سانپ کے اس پھن پر کیسا جال ڈالوں کہ اسے بے بس کردوں۔ وہ ایسے ہی چکر میں اُلجھ گئے تھے کہ ان تک پہنچنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں لاشعوری طور پر پھر جیل تک جا پہنچا ہوں۔ وہ اسی دروازے کے پیچھے بند تھے اور قانون کی گرفت نے انہیں بے بس کر رکھا تھا۔ ان کی بے بسی تو دیدنی تھی ہی، میں بھی کچھ کم بے بس نہیں تھا۔

پتا نہیں کیا ہوا، میں کافی دیر تک وہاں کھڑا سوچتا رہا اور پھر میں نے جیل کے سُپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ وہ ان دنوں اس عقوبت خانے کے بائیں ہاتھ جھنڈا چیچی کی طرف جانے والی سڑک پر رہا کرتا تھا۔ اس کے ٹھکانے کا مجھے علم تھا مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ اب وہاں کون آدمی رہتا ہے۔ کئی لوگ تبدیل ہو چکے تھے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر میں نے کار سڑک پر کھڑی کرکے مقفل کردی۔ وہ اس کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ باہر گیٹ پر اکبر علی قریشی کے نام کا بورڈ آویزاں تھا۔ سامنے ایک وسیع لان تھا۔ برطانوی دَور کی بنی ہوئی وہ کوٹھی اگرچہ پُرانے طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتی تھی، پھر بھی اس کا اپنا ایک حسُن تھا۔

وہ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ سامنے کے دو کمروں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ گیٹ کچھ اس طرح کا تھا کہ اسے باہر سے ہاتھ ڈال کر کھولا جا سکتا تھا۔ اس پر گھنٹی کوئی نہیں لگی تھی۔ کچھ ہی دور سڑک کے دوسرے کنارے پر جیل کے قریب پولیس کا بڑا دفتر تھا اور میں اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہاں ہر وقت سپاہی موجود رہتے تھے۔ پتا نہیں وہ کس چیز کا پہرہ دیتے تھے۔ کوئی شے انہوں نے وہاں سنبھال کر رکھی تھی۔

کوٹھی کا گیٹ کھول کر میں اندر جا گھسا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی پہرے دار وہاں بھی موجود ہوگا مگر کسی نے میرا راستہ نہیں روکا تھا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور پستول ٹھہر ٹھہر کر مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ میں سیدھا برآمدے تک جا پہنچا۔ وہاں مجھے ایک گھنٹی نظر آئی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ فریادی پہلے برآمدے تک بلا روک ٹوک پہنچ جاتے اور پھر زنجیرِ عدل ہلاتے۔

سامنے کے کمرے میں بتی زیادہ روشن تھی۔ میں نے چند سیکنڈ وہاں رُک کر گھنٹی بجادی۔ اس کی آواز زیادہ دُور تک نہیں گئی۔ سامنے کے کمرے میں ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ چند لمحے بعد کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اب میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ جس نے بڑے شاہانہ قسم کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی اور دوسرے میں اس نے سگار تھام رکھا تھا۔ ایک مخصوص قسم کی رعونت اس کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہی برآمدے کی بتی جلادی۔

"جناب! میں ...... قریشی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"قریشی تو میرا ہی نام ہے۔ کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"اگر آپ کہیں بیٹھ کر میری بات سُن لیں تو یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"سردار کریم نواز۔"

"آیئے!" یہ کہہ کر اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں بڑے سلیقے سے چاروں طرف صوفے لگے تھے۔ درمیان میں قالین تھا جس پر چاندنی بچھی تھی۔ گاؤ تکیے بڑی بہار دکھا رہے تھے۔ قریشی صاحب شاید وہیں تکیے کا سہارا لے کر بیٹھے تھے۔ تکیے کے قریب کئی کتابیں اور رسالے رکھے تھے۔ راکھ دان خاصا نمایاں نظر آ رہا تھا۔

"بیٹھیں! میں بس ایسے ہی جاگ رہا تھا۔ ایک فون کا انتظار ہے مجھے۔ ورنہ دیر تو بہت ہو چکی ہے۔" اس نے دیوار کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت سوا گیارہ ہو چکے تھے۔ قریشی کی آنکھیں پتھرے کھولنے والی آنکھیں تھیں۔ لگتا تھا کوئی راز اس کے سامنے راز نہیں رہ سکتا۔ کچھ آنکھیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو بس دیکھتے رہیے .... اور بچتے رہیے۔

"وقت واقعی بہت ہو چکا ہے۔ میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں حاضر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔"

"کسی قیدی کا معاملہ ہے؟"

"جی ہاں۔ آج دوپہر کو جیل میں کچھ قیدی آئے ہیں۔ ان میں میری ہمشیرہ بھی شامل ہے، میری سگی ہمشیرہ۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"آسیہ۔ اس کے ساتھ میرے ایک بھائی ہیں حسن علی گردیزی۔ میں آپ سے ان کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

"جی! فرمایئے، میں سن رہا ہوں۔"

میں صوفے سے اٹھ کر قالین پر ان کے قریب جا بیٹھا مگر میری یہ بات انہیں پسند نہیں آئی پھر بھی انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔ "بات یہ ہے قریشی صاحب! یہ بتایئے کہ ایک آدمی یعنی آپ ایسا ایک افسر ساری زندگی میں کتنے پیسے کما لیتا ہے؟"

"کیا؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی کُل تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے ہوگی؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" اس نے بجھا ہوا سگار پھر سے سُلگا لیا۔ وہ میری باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا مگر بہت محتاط انداز میں۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ زیادہ سے زیادہ سال میں چوبیس ہزار کما لیتے ہوں گے۔ کوٹھی کا کرایہ پندرہ سو لگا لیں۔ سب مل ملا کر بھی بیالیس ہزار روپیہ ہوگا، پچاس لگا لیں۔" وہ بڑے ہی عجیب انداز سے مسکرائے جیسے کسی نے انہیں برہنہ کر دیا ہو۔

"آپ میری تنخواہ کا حساب کرنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں، یہ بات نہیں۔ میں دراصل یہ کہہ رہا تھا کہ اس طرح آپ تیس سال میں زیادہ سے زیادہ پندرہ لاکھ روپے کما لیں گے۔ ہے نا یہی بات؟ کوئی بہت چلتا پرزہ... آدمی ہوگا تو وہ بیس لاکھ کما لے گا، حد پچیس لاکھ۔ کیا خیال ہے؟"

"میں ابھی تک آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔ آپ تو کسی قیدی کی بات کر رہے تھے؟"

"میں اُدھر ہی آ رہا ہوں۔" میں نے جیب سے پانچ سو پچپن کا پیکٹ نکال کر کھول لیا اور سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ دراصل وہ بات کہتے ہوئے میرا دم پھُولنے لگا تھا۔ وہ کوئی پالکی نشین قسم کا آدمی تھا۔ جھٹکے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ اس سے جب بھی بات کرتے ہوں گے تو ہں کو سر، جی حضور اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہوں گے، اس کے ماتھے کی ذرا سی شکن ساری جیل میں کپکپی پیدا کر دیتی ہوگی۔ اس کے تو ٹھاٹھ ہی عجیب تھے اور میں اس سے یہ کہہ رہا تھا کہ زندگی بھر میں کیا کما لے گا؟ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی اپنا اصلی وزن بتانے پر تیار نہیں ہوتا اور پولیس افسر تو اس معاملے میں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ان سے ان کی تنخواہ کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سگائیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ نکاح ٹوٹ جاتے ہیں اور میں اکبر علی قریشی سے وہی بات کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میں نے آئینہ رکھ دیا تھا۔ میرا دم بھلا کیوں نہ پھولتا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا قریشی صاحب کہ کوئی ایسی تدبیر کریں کہ ان قیدیوں کو چھوڑ دیں اور مجھ سے آپ پچاس لاکھ روپیہ لے لیں اور نوکری سے استعفیٰ دے کر آرام کریں۔ کیا رکھا ہے اِس ملازمت میں، یہ میری آفر ہے۔"

"وِری گڈ! کیا بات ہے آپ کی یعنی آپ نے میری قیمت بھی لگا دی۔ اور وہ بھی رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب کوئی جانور بھی اپنے اڈے سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وِری گڈ! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"یہ بات نہیں ہے قریشی صاحب! میں ... میرا مقصد خدانخواستہ آپ کی تضحیک نہیں ہے۔ میں بڑی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں ان کو رہا کر دینا آپ کے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا جب کہ ہم عمر بھر آپ کو دُعا دیتے رہیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے، ناممکن! کیا نام بتایا ہے آپ نے اپنا؟"

"سردار کریم نواز۔"

"آپ واقعی سردار معلوم ہوتے ہیں، آپ کے ضرور بارہ بج گئے ہیں یا بجنے کو ہیں۔ میں جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہوں، اس شہر کا محافظ۔ سارے شہر کا گندہ مال اور کچرا میرے پاس جمع ہوتا ہے تاکہ شہر کے لوگ اس سے محفوظ رہیں کیونکہ وہ کچرا سارے معاشرے کو خراب کر دیتا ہے۔ میں یہ کام اپنا فرض سمجھ کر کرتا ہوں صرف تنخواہ تو کوئی چیز نہیں ہے، میں اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کرتا ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم مجھے تنہا چھوڑ دیں، ایسا نہ ہو کہ مجھے آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرنا پڑے۔ آپ ایک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ بڑے غضبناک انداز سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اسے طیش کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا۔ بجھتا ہوا سگار اس نے راکھ دان میں ڈال دیا اور میز پر سے سگریٹ اٹھا کر سُلگانے لگا۔ وہ اس وقت ٹیلی فون کے قریب جا پہنچا تھا۔ میں ڈرا کہ وہ کہیں پولیس کو اطلاع نہ دے دے، صرف چند نمبر گھمانے کی ضرورت تھی اور پولیس اس کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھی۔

"آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں سردار صاحب! یہی بہتر ہے۔"

مگر میں وہاں سے ناکام لوٹنے کے لیے تو نہیں گیا تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے قریب جا ٹھہرا۔ وہ دراز کے سامنے کھڑا تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ اُس میں ہاتھ ڈال کر وہ کوئی ہتھیار باہر نکال لیتا۔ اندازہ میرا یہی تھا کہ اس کے گھر والے سو چکے ہیں۔ ذرا سا کھٹکا انہیں نیند سے چونکا سکتا تھا۔ مگر اپنا ہتھیار نکالنے سے پہلے میں اتمامِ حجت کر لینا چاہتا تھا۔ اس آدمی کے سامنے میں نے اپنے پتّرے جب کھول ہی دیے تھے تو پھر واپسی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اپنے اس اقدام کے پان پھُولنے کے بارے میں تو مجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا اور شاید میں سوچ بھی چکا تھا۔

"نہیں قریشی صاحب! ایسا نہ کہیں، آپ کو میری بات پر غور کرنا ہوگا۔ مجھے یہ کام ہر حال میں کرنا ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے بڑے بھائی! تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اگر میرے جیسے لوگ مجرموں کو رہا کرنے لگے تو پھر کیا ضرورت ہے ان کچہریوں کی، ان عدالتوں کی۔ اس قانون کی۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہتر ہے تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں پولیس کو بُلوا لوں گا۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔" اُس کا لہجہ اب خاصا درشت ہو گیا تھا اور میرے پاس اسے رام کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔

"یہ دیکھیں قریشی صاحب! میں رقم ساتھ لایا ہوں۔ بخدا میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔" میں نے اس کی ہر حرکت پر

نگاہ رکھتے ہوئے بریف کیس اس کے سامنے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ میرا دایاں ہاتھ پستول کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ ایسی ہی حالت اس کی بھی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اس دراز پر تھا جس میں اس نے شاید کوئی آتشیں اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ مگر ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آیا پولیس کو بلانا بہتر ہوگا کہ اسے خود اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہیے؟ دونوں باتیں اس کے ذہن میں اُلٹ پلٹ ہو رہی تھیں۔

اس نے ایک نظر نوٹوں پر ڈالی اور بولا۔ "یہ کتنے روپے ہیں؟"

"یہ پچھتر لاکھ ہے قریشی صاحب! بولی بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔ میں یہ ساری رقم آپ کو دے سکتا ہوں۔" وہ ایک لحظے کے لیے سُن ہو کر رہ گیا۔ چند لمحوں تک وہ رقم کو تکتا رہا پھر پہلی بار اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بڑے ہی غضبناک انداز میں بولا۔ "یو بلڈی فول! تم یہاں سے جاتے ہو کہ نہیں۔ تم میری دنیا بھی خراب کرنا چاہتے ہو اور عاقبت بھی۔ وہ ستر سو روپے میرے لیے زیادہ قیمتی ہیں جو مجھے مل رہے ہیں۔ یہ بریف کیس اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

اصل بات کا سرا میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی آواز اندر تک پہنچ رہی تھی۔ کسی بھی وقت وہاں ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی شخص اندر آ کر مجھے اچانک ہی بے بس کر سکتا تھا۔ کچھ اور نہ ہوتا تو اس کے بیوی بچے ہی میرے لیے مصیبت بن سکتے تھے۔ اس بحث مباحثے کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا۔

میں نے بریف کیس بند کر دیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اگر۔۔۔ اگر میں اس آدمی کو اغوا کر لوں تو کیسا رہے؟ حالات کچھ ایسے ہی تھے کہ میں اس پر بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال سکتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے قریشی صاحب! کہ آپ ناراض ہو گئے۔ مجھے درحقیقت بات ہی نہیں کرنی آئی۔ لیکن سودا بالکل سیدھا تھا، آپ کی مرضی۔ مجھے اجازت دیں۔"

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور جان بوجھ کر میں مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہو گیا۔ وہ سمجھا اس کی دھمکی اثر کر گئی ہے۔ بڑے گریزاں انداز میں اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ پریشان نہ ہوں قریشی صاحب! بات سمجھیں ادھر ہی ختم ہو گئی ہے، مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا جیسے میں اس کو دلاسہ دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، میرا بایاں ہاتھ اس کی گردن تک جا پہنچا اور جیسے ہی اس کی رگِ احساس دبی، وہ تڑپ کر پیچھے ہٹنے لگا مگر میری انگلیاں اس وقت تک اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ وہ میز کے قریب ہی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ یوں جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا مگر عین اسی وقت کسی نے مجھے ایک دم چونکا دیا۔ وہ کوئی زنانہ آواز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پہلو کے کمرے کے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت مجھے اندر آتی دکھائی دی۔

اس دلچسپ داستان کے باقی واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ کیجیے

گمراہ

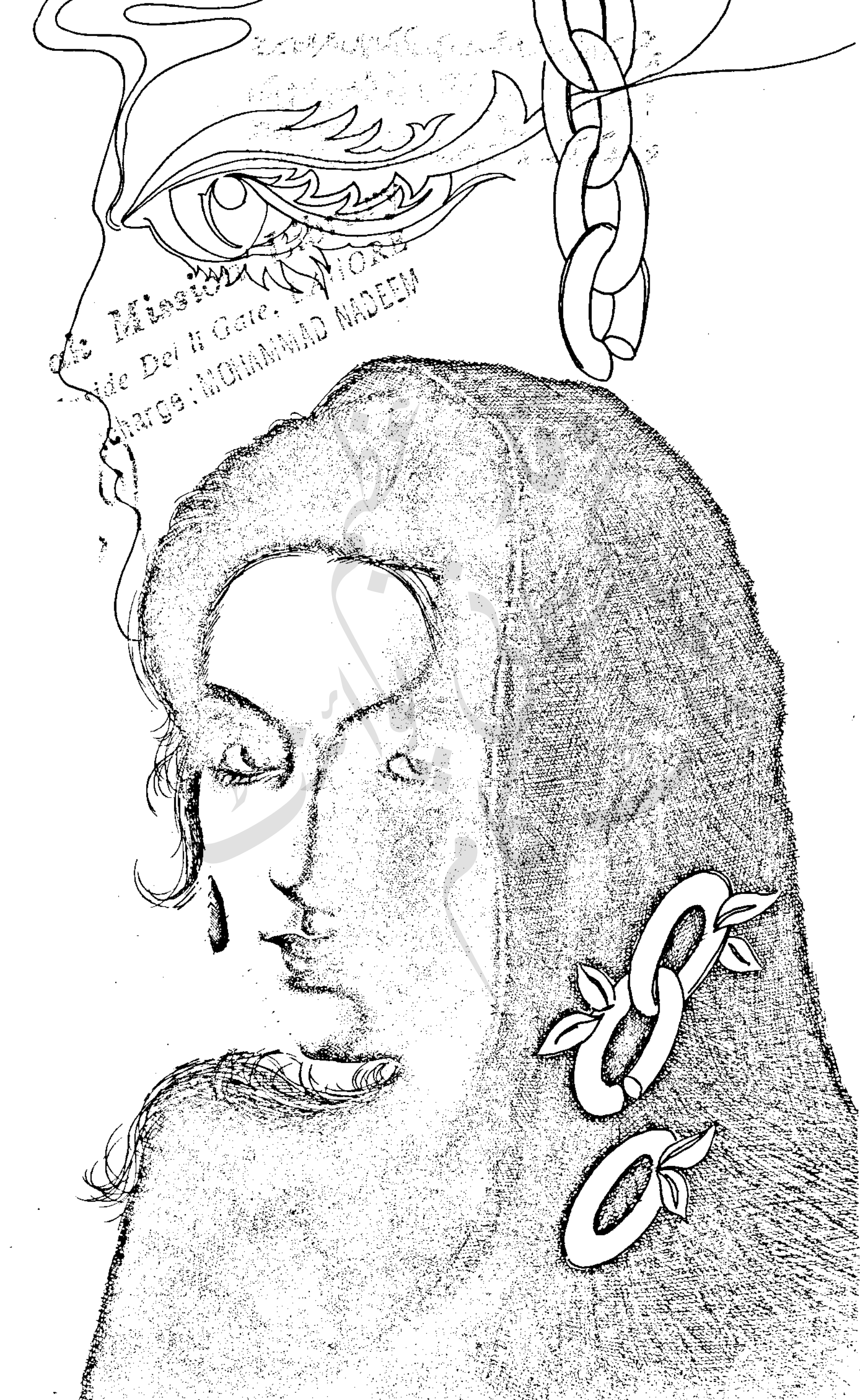

"آپ یہ کس سے باتیں کر رہے ہیں قریشی صاحب!؟" وہ ابھی یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ قریشی صاحب کی بتی گُل ہو چکی ہے۔ اپنے شوہر کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر وہ متوحش سی ہوکر مجھے دیکھنے لگی۔

"انھیں دیکھیں بھابی! یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم چُپ ہو گئے۔" اس عورت نے وہ چار قدم جس قیامت خیز عجلت میں طے کیے، وہ میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ قریشی تک یوں پہنچی جیسے وہ اُس بَلا کو اپنی گردن میں ڈال لے گی جو اس کے شوہر کو ختم کر رہی تھی مگر قریشی کی کھُلی آنکھیں اور کھُلے منہ کو دیکھ کر بلکنے لگی۔ اُن کی نبضیں تو ابھی چل رہی تھیں۔ وہاں سے پلٹ کر وہ تیزی سے دروازے کے قریب دیوار میں لگی گھنٹی کی طرف پلٹی۔

"یہ تو بے ہوش ہو گئے ہیں، میں ڈرائیور کو جگاتی ہوں،" وہ سرونٹ کوارٹر میں سویا ہوا ہے۔" مگر میں اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھی، میں نے بڑی خاموشی سے اس کے پاس پہنچ کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ یوں بدک کر میری طرف پلٹی جیسے مجھے کھا ہی لے گی۔ شاید وہ سمجھ چکی تھی کہ قریشی کی مصیبت کی اصل وجہ میں ہی ہوں مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکتی۔ میں نے اس کے دل اور دماغ کا رشتہ منقطع کر دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ڈھے سی گئی۔ جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ کوئی بہت پرانی دیہاتی قسم کی عورت تھی جس نے شہر میں آکر فیشن پرستی میں شہریوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اس کے اُن دو فقروں کا لب و لہجہ ہی بتاتا تھا کہ وہ گنوارپن سے ابھی تک نجات نہیں پا سکی۔ وہ بے ہوش ہوئی تو میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ روشنی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور اس کی قوتِ گویائی اثر دکھاتی ہے۔ اندھیری راتوں کا سناٹا اتنا گمبھیر جب ہی ہوتا ہے کہ اس میں نہ سورج نظر آتا ہے نہ چاند۔ اور بتی بھی کوئی روشن نہیں ہوتی۔ سارا ہنگامہ تو روشنی کا پیدا کردہ ہے۔

میں نے برآمدے میں نکل کر باہر کی بتیاں بھی بجھا دیں۔ اب ساری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی تھی اور یہ اچھی بات تھی ورنہ میں قریشی کو اٹھا کر باہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اپنی کار میں باہر سڑک پر چھوڑ آیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر بھی میں مایوس نہیں ہوا۔ اکبر قریشی کو میں نے کندھے پر ڈالا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ زیادہ وزنی نہیں تھا۔ یہی کوئی من ڈیڑھ من بوجھ تھا اس کا جسے میں آسانی سے کندھے پر اٹھا کر بھاگ سکتا تھا۔ بائیں ہاتھ میں بریف کیس لے کر میں برآمدے میں نکلا اور بے تحاشا گیٹ کی طرف بھاگا۔ صحن میں گھُپ اندھیرا طاری تھا۔ میرے پیچھے کوٹھی سناٹوں سے بھر گئی تھی۔ اسے کندھے پر اٹھا کر مجھے وہ پینگری یاد آئی، جو آسیہ کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔ اس بدنصیب کو یہ دن بھی دیکھنا تھا۔

گیٹ سے نکلتے ہی میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ سڑک بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ قریشی کو کار کی پچھلی نشست پر لٹا کر میں نے گرد و پیش کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے کار جھنڈے چیچی کی طرف موڑ دی۔ میں اسے جیل کے سامنے سے نہیں گزارنا چاہتا تھا کہ راستے میں پولیس ہیڈ کوارٹر تھا جہاں سپاہی ہر وقت گیٹ پر موجود رہتے تھے۔ پتا نہیں میرا وہ اقدام صحیح بھی تھا کہ نہیں اور وہ اُن اسیروں کی رہائی میں میری مدد بھی کر سکتا تھا کہ نہیں۔ اکبر قریشی کو اٹھا لینے کے بعد وہ آگ جو میرے کلیجے میں لگی تھی، کسی حد تک سرد ہو گئی تھی اس نے دوپہر سے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ اب میں زیادہ اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ گاڑی نئی تھی اور بے آواز چلتی تھی۔ لئی کے پُل کی طرف مڑنے کے بجائے میں سیدھا نکل گیا۔ سامنے ورکشاپ تھی۔ اس کے آگے سے گزر کر میں ایئرپورٹ کی طرف نکلا اور وہاں سے گھوم کر میں چکلالہ روڈ پر جا چڑھا۔ سڑکیں اس وقت بالکل سنسان ہو چکی تھیں۔

کوئی پچیس منٹ بعد میں دوبارہ آئی ٹاؤن جا پہنچا۔ مجھے آبادشاہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی۔ سارے شہر میں ایک صرف وہی آدمی تھا جو میرے کام آ سکتا تھا۔ اس سے تصادم کا راستہ ختم ہو گیا تھا اور ایک عجیب طرح کی مفاہمت ہمارے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

گیٹ پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجا دی۔ اکبر قریشی ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ اسے ایسی حالت میں، میں کہیں بھی پھینک سکتا تھا مگر اس کا مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اسے تو میں نے اسی لیے کھُرچ کر باہر نکال لیا تھا تاکہ وہ میرے کام آ سکے۔ اُسے میں کھرے سکّے کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔

دوسری گھنٹی کی ضرورت نہیں پڑی۔ فردوسی برآمدے میں نکل آیا تھا۔ اس نے میری گاڑی دیکھی تو تیزی سے گیٹ کھول کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔ اس کی نظر سیدھی پچھلے حصے پر پڑی۔

"یہ کون ہے سردار صاحب قبلہ؟"

"اندر چلو پہلے، پھر بتاتا ہوں۔ یہ بہت اہم آدمی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے کار گیٹ کے اندر ڈال دی۔ وہ دروازہ بند کر کے جب میرے پاس پہنچا تو میں نے کہا۔ "پہلے سامنے کی بتی بجھا دو

فردوسی بھائی! یہ بہت ضروری ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے؟ یہ کوئی پردہ نشین ہے؟"

"بس ایسی ہی بات ہے۔ بتی بجھا دو پہلے۔"

جیسے ہی اس نے بلب بجھایا، میں نے قریشی کو کھینچ کر سیٹ سے باہر نکال لیا۔

"اسے پکڑو یار! تماشا تو نہ دیکھو۔" فردوسی نے میری بات مانتے ہوئے قریشی کو پاؤں سے پکڑا اور ہم اسے ڈنڈا ڈولی کر کے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ اس وقت تک آبادشاہ بھی جاگ اٹھا تھا اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا تھا۔ قریشی کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا، بولا۔ "یہ... یہ کیا کر دیا ہے آپ نے؟ یہ تو جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہے اکبر قریشی۔ اسے کیوں لے آئے ہیں آپ؟ اور یہ بے ہوش ہے کہ آپ نے اسے مار دیا ہے؟"

"آہستہ بولیں شاہ جی! خدا کے لیے۔ دیکھیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، آپ کیسے جانتے ہیں اسے؟"

"بھائی ہمارے کئی آدمی جیل جا پہنچتے ہیں، اُن کی ملاقات کے لیے جاتا ہوں تو اس سے مل کر کام جلدی ہو جاتا ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا آدمی ہے، میری بہت عزت کرتا ہے۔ کبھی کبھار میں اُسے کوئی چھوٹی موٹی رشوت بھی دے دیتا ہوں۔ کبھی کوئی ٹی وی، کوئی وی سی آر، کوئی ریڈیو، کبھی گھڑی، کبھی کیمرہ۔"

"تو گویا یہ رشوت بھی لے لیتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آخر آدمی ہے اور بڑے اختیار والا آدمی ہے۔"

"شاید آپ کی یہ بات میں تسلیم نہ کروں۔ شاہ جی اس نے آج مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ میں اسے پچھتر لاکھ روپے دے رہا تھا تاکہ یہ اُن دو قیدیوں کو رہا کر دے مگر یہ مانا ہی نہیں۔"

"تو یہ بات ہے۔ لیکن میں کیسے مان لوں سردار صاحب! چیزیں تو یہ مجھ سے لے لیتا رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لیے آپ سے وہ چیزیں لے کر انھیں پہنچا دیتا ہو۔ اُدھر دوسرے افسروں کا منہ بھی تو پھیلا رہتا ہوگا جو اُس کے اوپر ہیں۔" فردوسی نے کہا۔

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔ آپ اسے کیوں لے آئے ہیں؟"

"میں اسے یرغمال بنا کر رکھوں گا شاہ جی! اور اس کوٹھی میں کئی اور لوگوں کو بھی لا کر باندھ دوں گا۔ جب تک آسیہ اور آبی رہا نہیں ہوتے، میں ان کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"مگر یہ آپ کی خام خیالی ہے سردار صاحب! وہ آپ کی بات کبھی نہیں مانیں گے بلکہ اس طرح آپ اُن دونوں کے عذاب میں اضافہ کر دیں گے۔ آپ نے بہت غلط کام کیا ہے یہ جناب!" فردوسی نے پہلی بار صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک میرے اس اقدام کی اصل اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ ہاں، اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بات معمولی نہیں ہے۔

اکبر قریشی قالین پر پڑا بظاہر مُردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اگر اس کی نبض متحرک نہ ہوتی تو شاید میں بھی اُسے مُردہ ہی تصور کرتا۔ آبادشاہ کا منشا سمجھتے ہوئے فردوسی پھر گویا ہوا، بولا۔ "آپ ہمیں کسی لمبی مصیبت میں پھنسا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا کیا تعلق ہے آپ سے؟ ہے کوئی؟ رقم آپ کو واپس مل گئی۔ دس لاکھ اُس کتّے ڈرائیور کو بھی آپ نے دلوا دیے، اب اور کیا چاہتے ہیں آپ! ہمارا ٹھکانا بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں؟"

میں اُس کی یہ بات سن کر بڑے اطمینان سے آبادشاہ کے پاس صوفے پر جا بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ وہ اپنی جگہ درست ہی کہہ رہے تھے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ انھیں کسی مصیبت میں پھنسا دوں۔ مگر... مگر اب تو میں وہاں پہنچ ہی گیا تھا، اپنے مالِ غنیمت کے ساتھ۔ میں واپس کیسے چلا جاتا؟

"میری مدد کریں شاہ صاحب! میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ صبح تک تو یہ بات سب جگہ پھیل جائے گی کہ قریشی اغوا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو ہوگا ہی۔ میری مانیں تو اسے یہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ ہم بہرحال یہ ذمّے داری نہیں لیں گے، یہ بات آپ طے سمجھیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ کوٹھی مجھے دے دیں اور خود کہیں اور چلے جائیں۔"

"جی ہاں۔ کیا بات ہے آپ کی۔ ہر جگہ آپ سودا ہی کرتے پھرتے ہیں۔ یہی بات آپ نے قریشی سے کہی کہ نوکری چھوڑ کر روپیہ لے لو اور قیدیوں کو رہا کر دو۔" فردوسی نے بڑے طنز سے کہا۔

"اوئے بیٹھ جا اوئے! اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمھیں۔ میں اسے کہیں اور لے جاؤں گا۔ خواہ مخواہ چڑچڑ کر رہے ہو تم۔ اسے سمجھاؤ شاہ جی کہ یہ میرے ساتھ تمیز سے بات کرے۔"

"کیا کرنا چاہیے اسے آپ کے خیال میں؟ کوئی کمشنر لگے ہیں آپ یہاں۔ اسے اٹھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ۔" آبادشاہ کا ہاتھ اس کے پہلو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صورتِ حال بہت ہی نازک ہو گئی تھی۔

"تمھیں معلوم ہے شاید کہ مِس آرمینیا اسی جیل میں ہے اور اس کی ہر ضرورت ہمیں ہی پوری کرنی ہے۔ ہم اسے کسی بھی طرح یہاں سے باہر نہیں لے جانے دیں گے۔ اس پر احسان کر کے ہم اپنے اوپر احسان کریں گے۔ تم اسے باہر نہیں لے جا سکو گے۔"

فردوسی نے ایک دم اپنا پستول مجھ پر تان لیا۔ وہ غضبناک ہو گیا تھا اور یہی حال آبادشاہ کا تھا۔ دونوں اپنے آپے میں نہیں تھے۔

"بہتر ہے تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ ہم تمھیں بس اتنی ہی رعایت دے سکتے ہیں کہ تمھیں یہاں سے زندہ جانے دیں۔" میں ان کے درمیان پھنس کے رہ گیا تھا۔ قریشی وہاں سے واپس چلا گیا تو وہ آسیہ اور آبی کی جان عذاب میں ڈال دے گا۔ اُن کو ایسی اذیت میں مُبتلا کر دے گا کہ وہ مر جانا بہتر سمجھیں، لہٰذا میں اسے وہاں چھوڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن جب کسی آدمی پر پستول تان لیا جاتا ہے تو پھر پہل اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اس کے لیے شکست تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ وہ اچانک اکبر قریشی کے ہمدرد بن بیٹھے تھے اور اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ ان کی اپنی اصل مالک اُن دنوں جیل میں تھی اور اس کے لیے وہ قریشی سے مل کر سہولتیں حاصل کر سکتے تھے۔ عین ممکن ہے اُس نے اُن سے یہ وعدہ بھی کر رکھا ہو کہ وہ کسی دن موقع ملتے ہی اسے جیل سے فرار ہونے میں مدد دے گا۔ ایسے لوگوں کو چھوڑ دینے سے کوئی بڑی مصیبت نہیں آتی ہے۔ یہ سب کچھ ممکن تھا۔ وہ پتہ جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جسے میں نے قریشی سے اپنی لایعنی گفتگو میں بے تحاشا تیزی دکھا کر ضائع کر دیا تھا، وہ ابھی اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اُن کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ قریشی کو واقعی وہاں سے اٹھنے نہیں دیں گے۔ آبادشاہ نے بھی پستول نکال لیا تھا اور وہ صوفے سے اٹھ کر میز کے پاس جا ٹھہرا تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ میرا بریف کیس ابھی کار ہی میں رکھا ہوا تھا۔ اور میرے ہاتھ کی ہر ہر حرکت پر وہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ اُن سے بچ نکلنا محال ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی! میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں صوفے سے اٹھ گیا۔

"یوں نہیں! تمھیں اپنے ہتھیار یہاں رکھنے ہوں گے۔ ہاتھ اُوپر اُٹھا لو، میں تمھاری تلاشی لوں گا۔" فردوسی کا لہجہ اور زیادہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک خاص نتیجے پر پہنچے تھے۔ جب میں قریشی کو لے کر وہاں گیا تو اس وقت ان کا رویہ کچھ اور طرح کا تھا۔ یہ بات انھیں بہت بعد میں سُوجھی کہ وہ قریشی پر احسان کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ آبادشاہ پہلے ہی مجھے ٹوک دیتا۔ اور اب وہ جس نتیجے پر پہنچے تھے اس کے لیے وہ مجھے وہاں سے اُٹھا دینا چاہتے تھے۔ قریشی کو انھوں نے مجھ سے گولی کے زور پر الگ کر دیا تھا۔ پہل وہ کر چکے تھے اور میں وہاں سے اٹھ جانے پر مجبور تھا مگر میں تلاشی نہیں دے سکتا تھا، وہ مجھے غیر مسلح کر دینا چاہتے تھے۔

"زیادتی نہ کرو فردوسی! یہی کافی ہے کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں تلاشی میں بہرحال نہیں دُوں گا۔" میں نے اپنے بدن کو پاؤں پر تولتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ میں تمھیں خبردار کر رہا ہوں۔" اس کی یہ بات سُنتے ہی میں نے زمین سے کئی ہاتھ اوپر اچھل کر پُوری قوت سے اس کے سینے پر ٹھوکر ماری۔ ضرب اُسے بہت کاری لگی تھی۔ وہ جیسے ہی قالین پر گرا میں اس کے عقب میں جا رکا۔ مگر ابھی میرے ہاتھ پاؤں سیدھے نہیں ہوئے تھے کہ آبادشاہ نے گولی چلا دی۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔ گولی سیدھی فردوسی کے دائیں پہلو میں لگی۔ میں نے فوراً ہی اسے اپنی ڈھال بنا لیا اور اپنا پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ گولی کی آواز سے کوٹھی میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ لشکر خان اور افضل بھی تیزی سے ڈرائنگ رُوم میں آ گئے۔ افضل خالی ہاتھ تھا البتہ لشکر خان کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے مجھ پر تان لیا تھا۔ انھیں فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ ہوا کیا ہے۔ فردوسی شدید زخمی ہو چکا تھا اور وہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ میں اسے کھینچتا ہوا دیوار کے قریب لے گیا۔

"آبادشاہ! تم مجھے ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہو۔ پستول پھینک دو اور مجھے نکل جانے دو۔ قریشی میرے ساتھ جائے گا۔ تم نے فردوسی کو خواہ مخواہ زخمی کر دیا ہے۔"

"میں پھر کہتا ہوں قریشی یہاں سے نہیں جائے گا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے۔" لشکر خان اور افضل ابھی تک دروازے کے اندر آ کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور وہ ایسے رُخ پر تھے کہ وہ مجھے زیادہ آسانی سے مغلوب کر سکتے تھے۔ اس بات کا آبادشاہ کو بھی احساس ہو چکا تھا۔ اس نے پستول نیچا نہیں کیا۔ فردوسی کی چیخیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اس کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا شاید گردہ ہی پھٹ گیا تھا۔ درد نے اسے بہت ہی نڈھال کر دیا تھا۔

"تم مجھ سے بچ جاؤ آبادشاہ! میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ روک رکھا ہے ورنہ فردوسی کو تو میں ابھی ختم کر سکتا ہوں۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔"

عین اس وقت لشکر خان نے دروازے کی اوٹ میں جانے کی کوشش کی۔

"رُک جا اوئے لشکر خان! میں تیری چال سمجھ رہا ہوں۔" میں نے فردوسی کو اوپر اپنے اُوپر پھیلاتے ہوئے کہا مگر اُس کا نہ سر اپنی جگہ رکتا تھا نہ ہاتھ پاؤں۔ اس کا وجود اس کے بس میں نہیں رہ گیا تھا اور خون اس کے زخم سے بَھل بَھل بہہ رہا تھا۔ میری بات پر

غور کیے بغیر لشکر خان تیزی سے باہر نکل گیا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ کمرے میں کئی کھڑکیاں موجود تھیں جن کے شیشوں میں سے وہ مجھے کسی بھی وقت تاک کر شکار کر سکتا تھا۔ کوئی وقت ضائع کیے بغیر میں فردوسی کی اوٹ میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سارا جھگڑا تو اس قریشی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور وہ میرے سامنے قالین پر بے سُدھ پڑا تھا۔ فردوسی ابھی ہوش میں تھا اور اب بھی وہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ میں نے ایک لحظے کے لیے صورتِ حال پر غور کیا۔ اس وقت آبادشاہ قریشی کے سر کی طرف کھڑا تھا۔ میں نے قریشی کو تاک کر اس کے سینے پر گولی چلا دی۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ گولی آبادشاہ کو بُری طرح متزلزل کر گئی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا اور دیوار کے ساتھ جا لگا۔ مجھے یقین تھا قریشی ختم ہو چکا ہے۔ بے ہوشی کی حالت میں ہی اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ اس میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں اس سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا لیکن اس کو مار کر میں نے آبی اور آسیہ کو جیل کے مصائب سے بچا لیا تھا اور یہی بہتر تھا۔ آبادشاہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ اِتنا پریشان تو وہ کبھی بھی نہیں ہوا ہو گا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تمھیں سمجھ آ گئی ہو گی۔ اب تم پولیس کو بڑے اطمینان سے بتا سکو گے کہ اکبر قریشی یہاں کیسے ہلاک ہو گیا؟"

یہ کہہ کر میں فردوسی کو پھر اپنی ڈھال بنا کر دروازے کی طرف بڑھا مگر مجھے یہ ڈر تھا کہ لشکر خان باہر نکل کر میرے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے فردوسی کو چھوڑ دیا اور تیزی سے برآمدے میں نکل گیا۔ لشکر خان شاید اُس وقت کسی اندرونی کھڑکی کے سامنے کھڑا نشانہ لے رہا تھا مگر حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ ایک ہی جست میں مَیں گاڑی کے اندر جا بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے میں دروازہ توڑتے ہوئے باہر نکل گیا۔ زبردست دھماکا پیدا ہُوا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ اس کو اُتر کر مجھے کھولنے کی مہلت ہی کہاں تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ افضل تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ آبادشاہ کے جس تارِ عنکبوت میں مَیں اُلجھ کر رہ گیا تھا وہ بالآخر کٹ تو گیا تھا مگر اب بھی اُس کے تار مجھے اپنے وجود سے اُلجھے نظر آتے تھے۔ وہ اس قتل کا عینی شاہد تھا۔ خدا معلوم وہ پولیس کو کیا بیان دے مگر وہ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا۔ لاش اگر اس نے پولیس کے سامنے پیش کر دی تو اس کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس سے سو ہزار سوال پوچھیں گے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ قریشی کو وہاں

سے اٹھوا کر کسی اور جگہ پھینکوا دے۔ وہ یہی کر سکتا تھا اور تو کوئی راستہ اس کے سامنے کھلا نہیں رہے گا۔ وہ شکر کرے گا کہ اس کی اپنی جان بچ گئی تھی۔ مجھ پر وہ کوئی موثر حملہ نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ کتنا چاہتا ہو گا کہ مجھے وہیں ختم کر دے۔

پتا نہیں میں کس طرف نکلا اور کیسے نکلا، میرا مغز کام نہیں کر رہا تھا۔ ایک صرف اسٹیئرنگ ہی میرے ہاتھ میں تھا ورنہ راہ رستے کا مجھے قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ ہوش مجھے جب ہی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں پہاڑ کے دامن میں جا پہنچا ہوں۔

کار آگے بڑھا کر میں نے گھنے درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کر دی۔ ایسی جگہ پر جہاں وہ کسی کو نظر نہ آ سکتی تھی۔ تب مجھے سگریٹ یاد آیا اور میں نے پیکٹ نکال لیا۔ اس وقت تک مجھے بھوک نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں ایسا بدنصیب تھا کہ میری جیب میں لاکھوں روپے موجود ہوتے تھے مگر مجھے دو وقت کی روٹی نصیب نہ تھی اور اب درمیان میں یہ نیا پیچ آ پڑا تھا۔ آبی اور آسیہ پھر ایسی ابتلا میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی طرح بھی میں اُن کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا اور اب میں اس جھنڈ تلے کار کھڑی کر کے مکھیاں جھل رہا تھا۔ میری مرادوں کے دن تو بہت پیچھے رہ گئے تھے مگر ابھی تک میری ریاضتیں ختم نہیں ہو سکی تھیں۔ وہ پارہ سا دھڑکتا دل جو سینے میں طوفان مچاتا تھا اب کبھی کبھی یونہی بیٹھے بٹھائے ساکن ہوتا نظر آتا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے اور زیادہ پُرسکون کرنے کے لیے اور کیا کرنا چاہیے۔ حال یہ تھا کہ میرا ہاتھ رکتا ہی نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی بھینٹ چڑھ جاتا تھا اور اب قریشی کی باری آ گئی تھی۔ نیاز اس کی بیوی کیا سوچتی ہو گی؟ وہ گھنٹی کی طرف بڑھی اور پھر بے بس ہو کر گر پڑی — اس کو پتا بھی نہ چل سکا ہو گا کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے اور اب وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ کاش قریشی نے میری بات مان لی ہوتی تو ہم اُسے نہال کر دیتے مگر وہ . . . اصولوں کی بات کرتا تھا، اسے نوکری عزیز تھی۔ وہ بھی بقولِ غالب گشتۂ خمارِ قیود و رسوم تھا۔ مرنے کے لیے اسے بھی ملازمت ہی درکار تھی۔ ورنہ میں اُس کے سامنے اتنی رقم رکھ رہا تھا جتنی اس کے آباؤ اجداد نے بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ اس کی پشتیں سنور جاتیں لیکن وہ رقم کی طرف نہیں بڑھا، اب گولی کھا کے اسے صبر آیا تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ میں بعد میں اسے کہاں سنبھالتا پھرتا۔ اس کی منت سماجت کرتا کہ وہ اسیروں کے لیے رحم کا جذبہ اپنے دل میں پیدا کرے اور خدا سے ڈرے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ورنہ کسی صاحبِ اختیار کو خدا سے ڈرانا

ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیر سے کہے کہ اس بکری پر رحم کر، جو تیرے سامنے تیری زد میں آگئی ہے۔ ایسا کوئی نہیں کرتا ہے۔

سگریٹ مزہ دے رہا تھا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے مگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آسیہ سے میں بار بار یہی کہتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ جائے۔ اس چکر کو ختم کر دے، اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کسی بھی دن پولیس اس تک پہنچ سکتی ہے۔ دو بار تو خود میرے سامنے وہاں سپاہی آ چکے تھے۔ پتا نہیں انھوں نے آگے جا کر کیا رپورٹ دی ہو۔ آسیہ خود قانون کی نظر میں مجرم تھی، اسے وہ کیسے چھوڑ دیتے؟ ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا اور ہو گیا۔ اب کی بار آبی بھی پھنس گیا تھا اور کوئی ان دونوں کا پرسان حال نہیں تھا کسی اور سے تو مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

میرے بھانویں وہ تجمل حسین اور دوسرے لوگوں کی کل ہی گردن مار دیتے، مجھے کیا تھا! اصل مسئلہ تو آبی اور آسیہ کا تھا۔ ان کی جان چھوٹ جاتی تو میں اب کی بار انھیں لے کر کہیں دور نکل جاتا۔ پہاڑوں کا رخ کرتا کہ سمندر کا یا کسی ریگستان میں خیمہ لگا لیتا۔ کچھ بھی کر لیتا مگر اس عذاب مسلسل سے میری جان چھوٹ جاتی لیکن اس حال میں تو میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا اور اب تو میں مرت لوک میں پھر رہا تھا۔ کوئی مدھم مدھم آواز بھی مجھے زندگی کا پتا نہیں دیتی تھی۔ اب کی بار میں اُن تک کیسے پہنچ سکوں گا۔

بھوک نے مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا مگر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ راستے محفوظ نہیں تھے سب سے بڑا مرحلہ وہ زیرو پوائنٹ تھا۔ وہ پولیس کا گڑھ بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے ایک مائی کی بات یاد آئی۔ وہ اس زیرو پوائنٹ کو حیران پوائنٹ کہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہی بات آتی تھی کہ یہ راستہ شاید کسی حیراں نے بنایا ہے اور وہ حیراں پوائنٹ ہم ایسوں کے لیے پل صراط بن گیا تھا۔ وہ راتوں کو پیچھے لپک کر گاڑیاں پکڑ لیتے تھے۔ بڑے تیز رفتار موٹر سائیکل تھے اُن کے پاس اور ان مخصوص آدمیوں کو کسی بھی بھاگتے آدمی کو مار دینے کی اجازت تھی۔

ایسے میں بسا اوقات انھیں انعام بھی دیے جاتے تھے اور اس وقت رات کا ایک بج گیا تھا۔ اس جھنڈ سے باہر نکلتے وقت مجھے ہول آتا تھا پھر بھی میں وہاں سے باہر نکل آیا اور زیرو پوائنٹ کی طرف جانے کے بجائے کراچی کمپنی کی طرف چل نکلا۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ اُن لوگوں کی اسیری کیسے میرے علم میں آ گئی کہ میں راولپنڈی میں بندھ کر رہ گیا تھا۔ میں تو محض جیل کی صورت دیکھنے کے لیے پھرتا پھرتا اُدھر نکل گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے پولیس کی گاڑی میں آسیہ اور آبی نظر آ جائیں گے۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ میری تقدیر مجھے پھر باندھ کر اسی راستے پر لے آئی تھی جسے عبور کرنے کے لیے مجھے اپنی زندگی داؤ پر لگا دینی پڑی تھی۔ کسی مجرم کا دوبارہ گرفتار ہو جانا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اس کو تو بہر حال گرفتار ہونا ہی ہوتا ہے کہ وہ ہر پھر کر اسی زمین پر واپس آ جاتا ہے جس کے قانون کی وہ خلاف ورزی کرتا ہے مگر... میری مٹی پھر سے خراب ہونے لگی تھی مجھے اُن کی اسیری نے پہلے سے زیادہ حیران کر دیا تھا۔ میری نظر میں وہ مٹیا پھوس سپاہی جن کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا پھر سے بالا بلند ہو گئے تھے اور اب میں اُن سے بچنے کے لیے کار ایسے راستے پر چلا رہا تھا جہاں سے ان کا گزر کم ہوتا تھا۔

بالآخر میں پنڈوڑے کے راستے سیٹلائٹ ٹاؤن سے گزرتا ہوا مری روڈ پر جا چڑھا اور کچھ ہی دیر بعد میں ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ بھوک نے مجھے اس گھڑی کچھ زیادہ ہی پاگل کر دیا تھا۔

گاڑی ایک الگ تھلگ جگہ پر روک کر میں سیدھا ریلوے اسٹیشن کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچا۔ وہاں کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ کھانے کے لیے میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مل سکے گا۔ ویٹر بہت سمجھ دار آدمی تھا وہ بڑے تپاک سے پیش آیا۔ دن کو شاید وہ اپنی نیند پوری کر لیتے تھے، اسی لیے وہ رات کو بہت ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ وہ دو تھے اور دونوں بہت چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ میرے بائیں ہاتھ کی میز پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ وضع قطع کے اعتبار سے وہ کوئی بہت ہی جدید قسم کے لوگ تھے۔ وہ ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے راولپنڈی پہنچے ہوں گے، بڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے، یوں جیسے وہ کسی اور کو اس میں شریک نہ کرنا چاہتے ہوں۔ دونوں کے ہاتھ میں بڑے خوبصورت بریف کیس اور کندھے پر لٹکانے والے بیگ تھے جو میز پر بڑی ترتیب سے رکھے تھے۔ ہال میں سناٹا اتنا زیادہ تھا اور جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ کچھ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ...... سب کے سب سرگوشیوں میں باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ ویٹر بھی بہت خاموش طبع آدمی تھے اور وہی تمام گاہکوں کو بھگتا رہے تھے۔ میرا خیال ہے میری سماعت کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی یا پھر وہ خاموشی فضا میں تیرتی سرگوشیوں کو زیادہ موثر طریقے سے پھیلا رہی تھی۔ میں نے سنا ایک نوجوان کہہ رہا تھا۔

"دیکھو جلیس! جلسہ کل شام چار بجے ہو رہا ہے چک کھرانہ میں۔"

"یہ کہاں ہے؟" دوسرے نے پوچھا جسے جلیس کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

"یہ جگہ راولپنڈی سے دس میل دور ہے۔ کہوٹہ سے ذرا آگے۔" اس نے بتایا۔

"ہوں۔ ٹھیک! گویا ہمیں وہیں پہنچنا ہے۔"

"ہاں۔ اور ہمیں اُن صاحب کا جھٹکا وہیں کرنا ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کو میں عرفان صاحب سے ملوا دوں گا۔ سارا انتظام وہ آپ کو سمجھا دیں گے۔" جلیس نے کہا۔

"کھانا تو ہم کھا چکے ہیں، کیا خیال ہے وہیں نہ چلیں؟"

"عرفان صاحب کے پاس؟"

"ہاں۔" اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"بس چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔ بیرا لا ہی رہا ہوگا۔"

"یہ بتاؤ وقاص! کہ تم نے رقم کتنی لی ہے اُن سے؟" جلیس نے پوچھا۔

"بس یہ سمجھ لو کہ ایک لاکھ تمھارا ہو چکا ہے اور ایک گاڑی بھی، برانڈ نیو۔ ایک دم اپ ٹو ڈیٹ۔ سمجھو اب رخشی تمھیں ملے ہی ملے۔ وہ خود تمھارے پیچھے بھاگے گی۔"

"ہائے! وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر! جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ۔"

"مگر تم اپنے بارے میں بتاؤ تمھارا حصہ کتنا ہے؟"

"بھئی آدھی رقم میری ہو گی۔ ایک لاکھ سمجھو مجھے مل جائے گا۔"

"لیکن کب؟"

"کل رات۔ اس کی تم فکر نہ کرو، کام پہلے ہو جانا چاہیے۔ لو، وہ چائے آ گئی۔" بیرا اُن کی میز پر چائے کے برتن رکھنے لگا۔ وہ واپسی کے لیے مڑا تو میں نے اسے اشارہ کر کے اپنی طرف بلا لیا۔

"یار! میرے لیے بھی کھانا جلدی لے آؤ۔ بڑی بھوک لگی ہے۔"

"ابھی لایا صاحب! کیا کھائیں گے آپ؟" وہ دوسری میز پر سے مینو اٹھا کر لے آیا۔

"جو بھی ملے لے آؤ بھئی صرف پیٹ بھرنا چاہیے۔"

مجھے بس تھوڑے سے سالن اور روٹی کی ضرورت تھی رات کی اس گھڑی کوئی اور دل پسند چیز کہاں سے مل سکتی تھی۔ بیرا جلدی ہی لوٹ آیا۔ وہ میرے سامنے ابھی برتن رکھ رہا تھا کہ وہ دونوں آدمی جلدی جلدی چائے پینے لگے۔ دونوں نے پرچوں میں چائے انڈیل لی تھی۔ اُن کا انداز بہت افراتفری کا تھا جیسے انھیں کسی جگہ پہنچنے کی جلدی ہو۔ میں نے بھی روٹیاں پیٹ میں اتارنی شروع کر دیں مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ زیادہ ہی جلدی میں تھے۔

"اوئے میاں نوردین! یار میرا وہ بریف کیس ادھر دے دو۔" میں نے بیرے کو آواز دے کر کہا۔ اس کا نام میں اس وقت سن چکا تھا جب کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے اسے کسی کام کے لیے آواز دی تھی۔

وہ تیزی سے میری طرف آیا اور بولا۔ "جی کون سا بریف کیس؟"

"ارے وہ نظر نہیں آتا تجھے۔ میں نے ایسے ہی اُدھر ڈال دیا تھا۔" میں نے اُن نوجوانوں کی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت زدہ ہو کر اُن کی طرف بڑھا اور میز کی دائیں نکڑ پر رکھا بریف کیس اٹھانے لگا۔ وقاص اور جلیس دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ وقاص نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ کیا کرتے ہو بھئی! یہ ہمارا بریف کیس ہے۔ کس نے کہا ہے کہ اسے یہاں سے اٹھاؤ؟"

"جی! وہ صاحب کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اُن کا ہے۔"

"بکواس کرتے ہیں وہ۔ اُن کا دماغ پھر گیا ہے۔ یہ ہمارا بریف کیس ہے۔" اس نے بیرے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ چائے پینا بھول گئے۔ دونوں کے چہرے دیکھنے کے لائق تھے۔

"یہ میرا بریف کیس ہے بھائیو! میں ابھی تو لے کر آیا ہوں۔ غلطی سے وہاں رکھ دیا ہے۔ اسے اپنی ملکیت تو نہ بنا لو۔" میں نے تیزی سے لقمہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا اور دوسری روٹی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ سالن مزے دار تھا مگر اس سے زیادہ مزے دار میری بھوک تھی۔ پر ان سب سے مزے دار وہ لوگ تھے جن کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا اور اُن کو روک لینا ہی اس وقت میرے لیے سب سے بڑا کام تھا۔

"آپ جیسے گھن چکر تو ہم نے بہت دیکھے ہیں مگر یہ نہیں دیکھا کہ آپ آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی جانتے ہیں۔" جلیس نے بڑے ہی خشمگیں لہجے میں کہا۔

"کیا کرتے ہو یارو! یہ میرا بریف کیس ہے اس میں میری چیزیں رکھی ہیں، میں ابھی بتا سکتا ہوں، حد ہو گئی۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے آپ مالک ہیں۔" اس وقت دوسری روٹی آدھی سے زیادہ میں کھا چکا تھا اور ابھی مجھے کم سے کم ڈیڑھ روٹی اور کھانی تھی۔

"بل لاؤ یار! یہ شخص تو پاگل ہو گیا ہے اس سے خواہ مخواہ کی بحث کا کیا فائدہ۔" وقاص نے ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکا کر بریف کیس ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دوسرے نے بھی اپنی چیزیں سنبھال لیں۔ وہ چائے ختم کر چکے تھے اور بیرا پریشان تھا کہ وہ کیا کرے؟

"یہ بریف کیس ادھر رکھ دو میاں! اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اسے جلدی میں وہاں رکھ دیا۔

"تم اس کے مالک تو نہ بن جاؤ۔" میں نے اب کی بار زیادہ دبنگ لہجے میں کہا تاکہ دوسرے گاہک بھی سن لیں۔ ہال کے کاؤنٹر پر کھڑا آدمی بھی ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ بات کچھ زیادہ ہی بڑھتی نظر آ رہی تھی۔ بیرا ابھی تک بل نہیں لایا تھا اور وہ دونوں سخت کشمکش و پنج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تھے وہ بہت ہی نوعمر اور پرجوش بھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ دونوں تھپڑ مار مار کر میرا حلیہ بگاڑ دیتے۔

"بکواس نہ کر اوئے جاہل آدمی! جانتا ہے تو کس سے بات کر رہا ہے! تو ہے کون آخر؟ تیرے باپ نے خریدا تھا یہ بریف کیس؟" وقاص ایک دم غضبناک ہو کر میری طرف بڑھ آیا۔ بولا "ہاتھ لگا اسے، میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔"

اس وقت تک میں کھانا ختم کر کے بیرے کے ہاتھ میں پکڑے تولیے سے منہ پونچھ رہا تھا۔ وقاص واقعی بہت طیش میں آ چکا تھا۔ میں اس کی توقع کے بالکل برعکس بڑی فراخ دلی سے مسکرا دیا۔ "یار! میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ بہت بھولے آدمی ہو تم۔ ایک دم غضبناک ہو گئے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے نوٹوں کی آدھی گڈی نکال کر بیرے کو سو کا نوٹ دے دیا۔

"جاؤ یار عیش کرو۔ ان کا بل بھی اسی میں سے کاٹ لینا اور باقی تم رکھ لینا۔ جاؤ شاباش۔ ہاتھ ملاؤ بھئی! تم تو دشمن ہی بن گئے ہو۔ اب غصہ تھوک دو۔"

"یہ مذاق اچھا نہیں ہے صاحب! کسی کو خواہ مخواہ تنگ کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔" جلیس نے میرے قریب آ کر کہا۔ وہ اپنا بل ادا کرنے کے لیے دس دس کے کچھ نوٹ نکال رہا تھا۔

"بل میں نے ادا کر دیا ہے۔ آپ کہیں آگے جائیں گے کہ شہر جانا ہے؟"

"ہم شہر ہی جا رہے ہیں، لال کرتی کی طرف۔ مگر آپ نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔"

"لعنت بھیجو جی اس بات پر۔ کیا نام ہے آپ کا؟ میرا مطلب ہے آپ کا اسم گرامی؟"

"میرا نام وقاص ہے۔ یہ میرے دوست ہیں جلیس احمد۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آئیے چلتے ہیں اب۔ باہر میری گاڑی کھڑی ہے۔ کہیں کالج میں پڑھتے ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ ہم تعلیم ختم کر چکے ہیں۔ گلبرگ میں ان کی دکان ہے کاسمیٹکس کی اور میں شادمان کالونی میں دکان کرتا ہوں الیکٹرانکس کی۔" وقاص نے جواب دیا۔ چہرہ اس کا ابھی تک صحیح حالت پر نہیں آیا تھا۔ بشاشت لوٹ نہیں رہی تھی۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے بھئی! میں تو ایسے ہی

آپ سے مذاق کر رہا تھا۔ دراصل مجھے آپ بہت ہی بھولے بھالے سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کہا ذرا ان کو چھیڑ کر دیکھتے ہیں۔ اب آپ غصہ تھوک ہی دیں تو اچھا ہے۔"

اس وقت تک ہم پلیٹ فارم کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے ٹکٹ ایگزامنر کو پلیٹ فارم ٹکٹ واپس کیا، تو وہ بہت حیران ہوئے۔ جلیس رہ نہ سکا۔ بولا "آپ گویا ادھر ہی کہیں پھر رہے تھے؟"

"ہاں۔ مجھے دراصل بھوک بہت لگ رہی تھی، سوچا اسٹیشن پر جا کر کچھ کھا لیتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ سکتا ہوں، وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے۔ کہاں جائیں گے آپ؟"

"جانا تو ہمیں کھوڑہ ہے۔ آپ کو بلاوجہ زحمت ہوگی۔"

"نہیں۔ زحمت کی کیا بات ہے۔ میں خود بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ میرا گھر کھوڑہ ہی میں ہے۔"

"اچھا! کھوڑہ میں رہتے ہیں آپ۔ پھر ٹھیک ہے کیوں وقاص! ہم ان کے ساتھ ہی بیٹھ چلتے ہیں۔"

"یار مجھے ان پر اعتماد نہیں رہا۔ ایسا نہ ہو کہیں یہ واقعی ہمارے بریف کیس چھین لیں۔ ہاں بھائی بات ایسی ہی ہے۔ آپ نے ہم سے سلوک بھی تو یہی کیا ہے نا!"

"ارے نہیں جانِ من! وہ تو محض ایک مذاق تھا۔ ویسے آپ نہیں جانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔" میں نے اصرار ترک کر دیا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو اہمیت دینے لگے تھے۔

"چلو یار! یہ کوئی ایسے ویسے نظر نہیں آتے ہیں، وہم نہ کرو۔" جلیس نے وقاص کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر وہ میرے ساتھ گاڑی کی طرف چل دیے۔

میرا اپنا بریف کیس اندر ہی پڑا تھا۔ اور بالکل محفوظ تھا۔ انھیں کار میں پچھلی سیٹ پر بٹھا کر میں لال کرتی کی طرف چل دیا۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں کسی بڑی واردات کے لیے راولپنڈی آئے ہیں مگر ابھی تک میں اس کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ بات وہ کسی جلسے کی کر رہے تھے جو کسی چک کھرانہ میں ہو رہا تھا اس میں کون کون لوگ شامل ہوں گے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا اور براہِ راست ان سے کوئی بات پوچھ لینا ممکن نہیں تھا۔ ورنہ ان کے بدک جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی ان سے مزید معلومات حاصل کر لینا بہت ضروری تھا مگر مجھ سے وہ کھل نہیں رہے تھے۔ ویسے میں نے انھیں ابتدا ہی میں خوفزدہ کر دیا تھا۔ پھر بھی میں یہ چاہتا تھا کہ ان کی حقیقت معلوم کر لوں، ورنہ ان کے تعاقب کا تو مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

"آپ کھوڑہ میں ہی رہتے ہیں؟" وقاص نے پوچھا۔ حالاں کہ میں پہلے ہی انھیں بتا چکا تھا۔

"جی ہاں۔ میرا گھر وہیں ہے۔"

"آپ مہاجر ہیں یا مقامی؟"

"میں دراصل جالندھر کا مہاجر ہوں۔ مکان ادھر لے لیا تھا۔ اب میں لکڑی کا کاروبار کرتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کل چک کھرانہ میں کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں کون آ رہا ہے وہاں۔ کل مجھے بھی وہاں جانا پڑے گا۔" میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

چند لمحوں تک انھوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، پھر وقاص بولا "جلسے تو ہوتے ہی رہتے ہیں جہاں سے ووٹ ملنے کی امید ہو، یہ وہاں جلسہ کر ڈالتے ہیں۔ یہ چک کھرانہ کہاں ہے؟"

"کھوڑہ کے پاس ہی ہے۔ خاصا بڑا نگر ہے۔" اس وقت ہم لال کرتی جا پہنچے تھے۔ فاصلہ ہی کتنا تھا۔

"بس یہاں روک دیں۔ سامنے کی گلی میں ہمیں جانا ہے۔"

"چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں راستہ بتا دیں۔" مگر وہ نہیں مانے۔ وقاص نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے مجبوراً گاڑی روکنا پڑی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ جناب! ہماری کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو ہمیں معاف کر دیں۔" وقاص نے اگلے دروازے کے پاس پہنچ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے آپ سے۔ اچھا بائی بائی۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سامنے کی گلی میں جا گھسے۔ میں ان کا گھر دیکھنا چاہتا تھا جہاں وہ کسی عرفان صاحب سے بات کرنا چاہتے تھے مگر میرا تعاقب انھیں اور زیادہ پریشان کر دیتا۔ پھر بھی میں نے گاڑی بائیں ہاتھ پوسٹ آفس کے سامنے کھڑی کر دی اور خود پیدل ان کے پیچھے چلنے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ گلی میں سیدھے چلتے ہوئے آٹھویں یا نویں مکان کے سامنے جا کر رک گئے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں صبح واپس آ کر عرفان کو ڈھونڈ سکتا تھا۔ وہ دروازے پر دستک دے رہے تھے اور انھیں قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ میں ان کے تعاقب میں ہوں۔ اب مجھے گلی میں جانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ان کا ٹھکانا مجھے معلوم ہو گیا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد وہ مکان کے اندر چلے گئے تو گلی بالکل سنسان ہو گئی۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ان لوگوں کی گفتگو نے مجھے الجھا دیا تھا اور میں ڈرتا تھا کہ جس جلسے میں وہ شریک ہونے کے لیے آئے ہیں وہاں پتا نہیں کون آدمی ان کے لیے لقمۂ تر بن جائے۔ وہ بے وجہ پنڈی نہیں آئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کس لیے آئے ہیں اور کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بڑے صاحب کو شکار کرنے آئے ہوں جن کو بچا لینا میرا فرض تھا۔ ان کے لیے پہلے بھی میں نے مقدور بھر کوشش کی تھی اور وہ بچ بھی گئے تھے۔ اب ان

دونوں کی گفتگو جو اتفاقاً میرے کان میں پڑ گئی تھی، کسی کی جان بچانے میں میری بہت معاون ثابت ہو سکتی تھی مگر میرا اصل مسئلہ یہ تو تھا ہی نہیں، میں تو ان لوگوں کی اسیری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو وہ جھوٹے سچے گواہ بھگتا کر انھیں سزا دے دیں گے۔ ایسے میں آسیہ سیدھی پھانسی کے تختے پر لٹک سکتی تھی۔ اور اب تو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا قتل بھی اسی کے حساب میں لکھا جا چکا تھا۔ یہ مجھے کسی طرح بھی منظور نہیں تھا مجھے قانون کے اس شکنجے کو روک دینا ہو گا۔ اگرچہ میری نظر میں آسیہ اب ایک مجرم کی حیثیت سے ابھرتی تھی جس نے میری کسی بات پر دھیان نہیں دیا تھا مگر اس کے باوجود میں اسے یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خدا کو پتا نہیں کیا منظور تھا، اسے میں نے دیکھا بھی تو کہاں دیکھا۔ اس کے لیے پھر سے درِ زنداں کھل رہا تھا اور وہ خود کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔

میں لال کرتی سے پریشان ہو کر کچہری کے قریب جیل کے دائیں ہاتھ بنے ایک موٹیل میں جا ٹھہرا۔ مجھے نیند نے پریشان کر رکھا تھا۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ کرایہ تو بہت مانگتے ہیں، مگر مسافر کی ساری تھکن اتار دیتے ہیں اور کوئی سوال بھی نہیں پوچھتے ہیں اور سب سے اہم بات یہی تھی۔ کمرہ مجھے عمارت کے عقبی حصے میں ملا۔ گاڑی میں نے مقفل کر کے ان کے اندرونی گیراج میں کھڑی کر دی۔ اور خود میں کمرے کو تمام اطراف سے بند کر کے بستر میں جا لیٹا۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس رات کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اکبر قریشی کا میں جان بوجھ کر جھٹکا کر آیا تھا محض اس لیے کہ اس کی واپسی آبی اور آسیہ کے لیے زبردست عذاب بن سکتی تھی۔ اب مجھے اس بات کا افسوس بھی ہو رہا تھا۔ کسی کو یوں جان سے گزار دینا بہت بڑا گناہ ہے اور وہ بھی بے اشتعال۔ قریشی نے میری بات نہیں مانی تھی، تو یہ اس کی اپنی اصول پسندی تھی۔ اس نے اتنی بڑی رشوت پر تھوک کر منہ پھیر لیا تھا تو لازم تھا کہ میں اسے شاباش دیتا اور آفرین کہتا مگر میرے اندر جو ایک کمینہ آدمی بیٹھا ہے وہ مجھے کچھ بھی نہیں کرنے دیتا۔ ایسے لوگ تو خال خال ہی ملتے ہیں جو کسی لوبھ، کسی لالچ کے بغیر اپنے فرائض انجام دیے جاتے ہیں ورنہ اتنی بڑی رقم کو سامنے دیکھ کر کون ہو گا جس کا دل نہیں مچلے گا مگر اکبر قریشی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک طرح سے میری شکست تھی۔ ایسی شکست جس پر جتنا بھی ماتم کرتا کم تھا۔ وہ رقم مجھے بڑی ہی بے وقعت نظر آئی جس کے پیچھے میں دیوانوں کی طرح گھومتا پھرا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے آدمی کو نہیں خرید سکی تھی۔ تو پھر اس کا

فائدہ ہی کیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ مجھے اپنی تدبیر کے ناکارہ ہو جانے کا افسوس اتنا زیادہ تھا کہ اس کا اظہار مشکل ہے۔ اب کی بار آسیہ بہن! شاید میں تم تک نہ پہنچ سکوں۔ میری پہلی ہی تدبیر ناکام ہو گئی تھی اور ایک آدمی خواہ مخواہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

چند منٹ میں اسی ذہنی انتشار میں مبتلا رہا، پھر نیند نے تھپکنا شروع کر دیا اور میں ہر شے سے غافل ہو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت نو بج رہے تھے۔ میری تمام کسلمندی دور ہو چکی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور پھر میں اخبار دیکھنے لگا۔ اس میں اور تو سب کچھ تھا مگر آپی اور آسیہ کی گرفتاری کی خبر نہیں دی گئی تھی۔ کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور شاید یہ سب کچھ پولیس کی مداخلت کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ مصلحتاً بعض خبریں شائع نہیں ہونے دیتے۔ انہیں یقین تھا کہ مجرموں کا سرغنہ غلام جیلانی کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اُن کے پیچھے ضرور آئے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب میری تلاش میں زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ لازم تھا کہ میں اور زیادہ محتاط ہو جاتا مگر میں اتنی احتیاط کہاں سے لاتا۔ مجھے تو جیل کی دیواروں سے سر پھوڑ کے مر جانا تھا۔ آسیہ اچھی تھی یا بُری تھی، اس سے بحث نہیں ہے، وہ میری بہن تھی اور اب ایسے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی جس کو روک دینا ہی میری سب سے بڑی کامیابی تھی مگر مجھے اپنے اُوپر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ آپی بھی اب کی بار میرے لیے آزمائش بن گیا تھا۔ اس کی خاطر مجھے اپنی جان لڑا دینی چاہیے تھی۔ مگر میں کیا کروں! اس درِ زنداں کو کھولنے کی چابی میرے پاس نہیں تھی۔ میری پہلی ہی کوشش ناکام ہو گئی تھی اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں سے آغاز کروں؟ دیوار کے کس حصے میں نقب لگاؤں کہ میں ان دونوں کو باہر لا سکوں۔

اخبار وہیں پھینک کر میں تیزی سے ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچا اور بل ادا کر کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے وقاص اور جلیس کا پتا کرنا چاہیے تھا۔ شاید میں کسی کی زندگی بچا سکوں۔ کوئی میری وجہ سے اگر موت کے منہ سے بچ جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔

اچانک میرے ذہن میں پنجاب ہاؤس کا خیال آیا۔ وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ ابھی میں نے گاڑی باہر نہیں نکالی تھی کہ میں اس کے پاس پہنچ کر لوٹ گیا اور استقبالیہ کلرک کے پاس جا ٹھہرا۔

"برادر! مجھے یہاں سے ایک فون کرنا ہے۔"

"جی ضرور کریں۔ نمبر کیا ہے؟"

"دراصل مجھے پنجاب ہاؤس فون کرنا ہے۔"

"کس سے ملیں گے آپ؟"

"کسی سے بھی ملا دیں، کوئی بھی آدمی جو ڈیوٹی پر موجود ہو۔"

اُسے نمبر یاد تھا، وہ اس نے گھما دیا۔ فون کسی سپاہی نے اٹھایا تو اس نے ریسیور مجھے دے دیا۔

"ہیلو! کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی میں ہیڈ کانسٹیبل نور محمد بول رہا ہوں۔"

"مجھے یہ بتائیں نور محمد صاحب کہ آج یا کل رات آپ کے ہاں لاہور سے کون کون صاحب آئے ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"میں سردار کریم نواز آف گلشیر پور بول رہا ہوں۔"

"جی سردار صاحب! یہاں بڑے صاحب آج صبح پہنچے ہیں۔"

"وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"اسلام آباد گئے ہیں۔"

"میں یہ پوچھ رہا تھا انسپکٹر صاحب کہ کیا وہ آج چک کھرانہ کے جلسے میں جائیں گے؟"

"جی ہاں۔ وہ اسی لیے آئے ہیں۔ پارٹی کا بہت بڑا جلسہ ہے وہاں۔ راجہ ریاض قدیر اُن کے میزبان ہوں گے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا، دراصل میں بھی وہیں جا رہا ہوں، شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ نور محمد نے مجھے بہت عمدہ معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ وقاص اور جلیس بھی وہیں جا رہے تھے۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے اُن کی سرگوشیاں سن لی تھیں اور ایک بڑا راز میرے ہاتھ آ گیا تھا۔

آدمی سے بعض اوقات ایسی ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جن کا اندمال ناممکن ہوتا ہے۔ میں جیسے ہی فون بند کر کے استقبالیہ سے باہر نکلا تو مجھے ایک آدمی تیزی سے اپنے پیچھے لپکتا نظر آیا۔ میں اس وقت گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔

"میاں صاحب!" میں نے قدم آہستہ کر لیے۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی "چیٹ کپڑیا" ہے اور وردی اتار کر ادھر اُدھر کی بُو سونگھتا پھرتا ہے۔ اُن کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُن کو پہچان لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ کا ایک احمق پن اُن کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے حالاں کہ وہ ایسے نہیں ہوتے، اندر سے بہت کائیاں ہوتے ہیں۔ سفید قمیص شلوار میں ملبوس وہ آدمی بظاہر یہ دکھانے پر مصر تھا کہ بہت پریشان حال اور اندر سے ٹوٹا پھوٹا آدمی ہے۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"جی ہاں۔ کہیں جا رہے ہیں آپ؟"

"کیا مطلب؟ یعنی میرے جانے سے مراد کیا ہے آپ کی؟"

"آپ پنجاب ہاؤس جا رہے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"مجھے دراصل ریاض قدیر صاحب سے ایک کام ہے۔ میرا خیال ہے وہ آپ کے دوست ہیں۔"

"یہ کس نے کہا ہے آپ سے؟"

"دراصل میں نے آپ کی فون پر باتیں سُنی ہیں، اگر آپ مہربانی کریں تو کسی جگہ بیٹھ کر میری بات سُن لیں۔ میں بہت دکھی آدمی ہوں جناب۔ ہو سکے تو بڑے صاحب سے میری سفارش کروا دیں۔"

"اوئے جا یار! مجھے تو معاف ہی رکھ۔ میں تیرے کس کام آ سکتا ہوں۔ میرے اپنے سو کام پھنسے ہیں کوئی میرے کام نہیں آتا۔ میں تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" میں نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ اور زیادہ آزردہ خاطر ہو کر بولا۔ "ایسا نہ کہیں سردار صاحب! میں بڑی آس لے کر آپ کے پیچھے آیا ہوں۔"

"کام کیا ہے تمھارا؟"

"میں آپ کے ساتھ ہی پنجاب ہاؤس چلتا ہوں۔ راستے میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے آؤ۔ اندر بیٹھو۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تو یہ گاڑی ہے آپ کی۔ ماشاء اللہ بالکل نئی نظر آتی ہے۔"

"کام کی بات کرو میاں! مجھے بتاؤ تمھیں بڑے صاحب سے کیا کام ہے؟" یہ کہہ کر میں گاڑی باہر سڑک پر لے آیا۔ مگر اس کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ ذرا سا اونچا کیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے پستول نکال لیا تھا۔ غالباً اس نے وہ قمیص کے نیچے دبا رکھا تھا۔

"بہتر ہے کہ گاڑی تم سیدھی طرح تھانے لے چلو۔ بائیں ہاتھ ایس پی آفس میں۔" اس کی آنکھیں ایک دم خون آلود ہو گئی تھیں۔

"وہ کس لیے میاں؟" میں نے گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ "اور تم ہو کون بڑے بھائی؟ ذرا اپنا تعارف تو کرواؤ۔"

"میں انسپکٹر جان عالم ہوں، سی آئی ڈی انسپکٹر۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم بڑے صاحب کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ جان عالم صاحب کیا بات ہے آپ کی — چلیں کون سے تھانے چلیں گے آپ؟"

"سیدھے ایس پی آفس چلو۔ کچہری کی طرف۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی کا رُخ موڑ لیا۔ اس کے سامنے ذرا سا بھی میں... تردّد دکھاتا یا کسی بھی طرح میں دبنے لگتا تو پھر وہ بہت ہی اونچا اُٹھ جاتا۔ پستول کا رُخ اس نے میری طرف کر رکھا تھا مگر اس طرح کہ باہر سے کسی آدمی کو وہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ موٹیل میں بیٹھ کر لوگوں کی بغلیں سونگھتا پھرتا تھا۔ فون پر اُس نے میری گفتگو سن کر فوراً ہی مجھے دبا لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس نے کسی بہت بڑے سازشی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ شاید اپنی جگہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اندازہ اس کا بہت ہی صحیح تھا مگر مجھ سے وہ اس وقت کچھ بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ گاڑی جیسے ہی کچہری کے قریب پہنچی میں نے اس کا اسٹیئرنگ پوری طرح پھیر کر اُسے پل پر سے گزارنا چاہا اور اس کے ساتھ ہی میں گھوم کر اس کی طرف جھک گیا۔ اس طرح کہ اب میرا بایاں ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑا تھا۔

باہر بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ چلنا مشکل ہو رہا تھا——

اس بھیڑ کو دیکھ کر اس نے پستول چھپا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں سیدھی راہ پر آ گیا ہوں — اور یہی اس کی خام خیالی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کی رگِ احساس مسل دی۔ اس طرح کہ وہ اپنا بایاں ہاتھ قمیص کے نیچے پستول پر پوری طرح جما نہ سکا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ اس پر کوئی ایسی بھی آفت آ سکتی ہے جو اسے یُوں بے دم کر دے گی۔ اس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں اور منہ یُوں کھل گیا جیسے وہ پانی کو ترستا مر گیا ہو۔ گاڑی کا رُخ سیدھا ہوا تو میں پھر اپنی نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔ وہ سیٹ پر یوں لیٹ گیا تھا جیسے بہت زیادہ تھک گیا ہو اور اب آرام کر رہا ہو۔ کار میں نے لوگوں کی بھیڑ میں سے گزار کر آگے نکالی تو وہ لڑھکتا ہوا ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اس کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔

میں سڑک پر آگے جانے کے بجائے کار کو انکم ٹیکس کمشنر کے دفتر میں لے گیا۔ کاروں کی ایک لمبی قطار عمارت کے احاطے میں کھڑی تھی۔ دولت مند لوگ انکم ٹیکس بچانے کے لیے وہاں بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ کچھ کاریں دفتری لوگوں کی تھیں۔ میں یُونہی افراتفری میں وہاں جا پہنچا تھا مگر میرا مطلب پُورا نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس جانِ عالم کو کسی جگہ فارغ کر دینا چاہتا تھا لیکن جگہ کوئی نہیں مل رہی تھی۔ چار و ناچار میں نے کار کو ایک بڑے سے ٹرک کے قریب لے جا کر روکا۔ اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کا پستول میں نے الگ کر لیا۔ گولیاں پیٹی کے ساتھ ہی لگی رہ گئی تھیں۔ پھر میں نے اس کا بٹوہ بھی نکال لیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر جان عالم کو بڑی ہی آہستگی سے دھکیل کر ٹرک کے نیچے گرا دیا، اس کے اگلے پہیوں کے قریب۔ یہ محض اتفاق تھا کہ کوئی اور آدمی اس وقت ہمیں نہیں دیکھ رہا تھا۔

ورنہ وہ میری کوئی دانش مندی نہیں تھی۔

ابھی میں کار کو وہاں سے ہٹا ہی رہا تھا کہ کسی نے عمارت کی تیسری منزل سے شور مچا دیا۔ کوئی آدمی وہاں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ بلند آواز سے لوگوں کو پکارتا ہوا سیڑھی کی طرف بڑھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ احاطے میں کھڑے کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ بیشتر اس کے کہ وہ لوگ مجھ تک آ پہنچتے میں نے کار اسٹارٹ کی اور فوراً ہی احاطے سے نکل کر بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ پنجاب ہاؤس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا مگر میں اس طرف نہیں گیا۔ کار کو بھگاتا ہوا میں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل تک جا پہنچا۔ اور وہاں سے سیدھا لال کرتی کی طرف نکل گیا۔

اس جانِ عالم نے مجھے نئی مصیبتوں میں پھنسا دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ میرا وہ عام سا لباس ہی تھا۔ میں محض کرتا شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس لباس میں مجھے اتنے بڑے ہوٹل میں دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا ہوگا یا عین ممکن ہے اسے میری کار کے بارے میں کوئی شبہ ہوا ہو۔۔ کچھ نہ کچھ تھا ضرور، ورنہ محض پنجاب ہاؤس میں فون کر لینے سے تو وہ کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ممکن ہے آبادشاہ نے اپنی کار کی چوری کی رپورٹ پولیس کو دے دی ہو۔ جان عالم بلاوجہ میرے پیچھے نہیں لپکا تھا۔ بہرحال میں اصل بات کو سمجھ نہیں سکا اور اسے ڈھیر کر کے آگے نکل آیا۔ اب وہ لوگ طرح طرح کے اندازے لگا رہے ہوں گے۔ ممکن ہے میرے پیچھے آ رہے ہوں۔

مجھے اس کار نے بھی نئے خدشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر آبادشاہ نے واقعی کار کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں دے دی تھی تو مجھے ہر لمحے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ بلکہ اس کو چھوڑ ہی دینا چاہیے تھا۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ وہ کسی بھی جگہ مجھے روک سکتے تھے جانِ عالم نے خاص طور پر گاڑی کی بات کی تھی۔ کہا تھا کہ یہ بالکل نئی گاڑی ہے اور یہ کچھ انوکھی چیز نہیں تھی۔ گاڑی بلاشبہ نئی تھی۔ میں کسی اور طرف نکلنے کے بجائے سیدھا بنک جا پہنچا۔ اس اتنی بڑی رقم سے میں بہرحال جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ میرے پیچھے کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔ کسے پتا تھا کہ جان عالم ہے کون؟ وہ اس وقت وہیں بیٹھے یہ اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ اسے ہوا کیا ہے۔ جس آدمی نے مجھے تیسری منزل سے جان عالم کو ٹرک کے نیچے پھینکتے دیکھا تھا اسے یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ اسے ہوا کیا ہے اور جان عالم کا جغرافیہ کیا ہے۔ اس نے میرا سارا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھے کسی اور ہی رستے پر ڈال دیا۔

مصیبت یہ تھی کہ بنک میں بغیر کسی تعارف کے میں اپنا حساب کھول نہیں سکتا تھا۔ ابھی میں وہاں کھڑا ہی تھا کہ ایک بی بی میری طرف بڑھی۔ بولی ”بیٹے! ذرا یہ چیک تو لکھ دو مجھے۔ میں دستخط تو کر سکتی ہوں مگر انگریزی نہیں لکھ سکتی۔“

”تو اردو میں دو حرف لکھ لو نا!“

”نہیں۔ اس میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چیک کی رقم کچھ کی کچھ کی جا سکتی ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ لائیں میں لکھ دیتا ہوں۔ کتنی رقم چاہیے آپ کو؟“

”آٹھ ہزار روپے۔ بس صرف آٹھ ہزار کا چیک لکھ دو۔“

میں نے اس سے چیک بک لے کر ایک چیک لکھ دیا۔ اس نے رقم کو سمجھتے ہوئے اس پر دستخط کر دیے۔

”آپ میرا بھی ایک کام کر دیں بی بی! میں یہاں اپنا حساب کھلوانا چاہتا ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے نا، کاغذ لاؤ میں دستخط کر دیتی ہوں۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہے بی بی! میں ابھی فارم لے آتا ہوں۔“

اسے ایک طرف کرسی پر بٹھا کر میں نے فارم لیے اور ان کو بھر کر میں نے دستخطوں کے لیے وہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیے۔ کوئی پینتالیس پچاس کے پیٹے میں تھی وہ خاتون اور خاصی معقول دکھائی دیتی تھی۔ آنکھوں پر اس نے بہت عمدہ قسم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس نے فارموں پر دستخط کر دیے تو بولی ”تم کتنی رقم کا حساب کھلواؤ گے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں چوہتر لاکھ روپے جمع کروا رہا ہوں۔“

”کیا کہا تم نے؟ چوہتر لاکھ؟ اور تمہیں انٹروڈکشن کے لیے کوئی آدمی نہیں ملا؟“

”میں آج ہی یہاں آیا ہوں کاروبار کے سلسلے میں۔ اگر یہ رقم میں بنک میں جمع کروا دوں تو پھر آسانی سے کراچی منتقل ہو سکتی ہے۔ میں اسے کہاں ساتھ رکھ سکتا ہوں۔“

”کیا کاروبار ہے تمہارا؟“ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا اور دل اس کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ میرے ہاتھ سے فارم چھین کر پھاڑ ڈالے۔ اسے مجھ پر اعتبار ہی نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی، اس رقم نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

”میرا گاڑیوں کا کاروبار ہے بی بی! یہ رقم کئی فرموں سے وصول کی ہے میں نے۔“

”گھر کہاں ہے تمہارا؟“

”گھر تو کراچی میں ہے، کاروبار بھی وہیں ہے۔“

”مجھے حیرت ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اپنا کوئی کارڈ ہو تو مجھے دے دو۔۔ میں ادھر حیدر روڈ پر رہتی ہوں۔ پینتالیس نمبر کوٹھی میں۔ اگر ہو سکے تو کسی وقت وہاں ضرور آنا۔۔ تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔“

”جی میں کوشش کروں گا بلکہ آپ ابھی رک جائیں تو میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔ گاڑی ہے میرے پاس۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ فارغ ہو کر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی پر زیادہ جم کر بیٹھ گئی اور اپنے پرس میں سے تسبیح نکال کر منہ ہی منہ میں کوئی دعا پڑھنے لگی۔

وہ فارم لے کر میں سیدھا مینجر کے کمرے میں جا گھسا دروازے پر اس کے نام کی تختی لگی تھی جس پر فراست احمد۔۔۔ لکھا ہوا تھا۔

”جناب فراست صاحب! میں یہاں ایک اکاؤنٹ کھولنا چاہتا ہوں۔ میں دراصل کراچی سے آیا ہوں مختلف فرموں سے میں نے رقم اکٹھی کی ہے اور یہ چوہتر لاکھ روپیہ ہے میرے پاس۔“ بغیر کسی تمہید کے میں نے اپنا مقصد اسے بتا دیا۔

”ارے آپ تشریف تو رکھیں۔ حد ہو گئی۔ اتنی بڑی رقم آپ ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ زمانہ نازک ہے!“

”اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کے بنک کے ذریعے میں اسے ضرورت پڑنے پر کسی بھی وقت منتقل کر سکتا ہوں۔“

”ضرور۔ ضرور! آخر ہم بیٹھے کس لیے ہیں!“ یہ کہہ کر اس نے چپراسی کو اندر بلوایا، اس سے چائے کا کہہ کر بولا ”فقیر محمد کو میرے پاس بھیج دو۔ مگر جلدی۔“ اس نے فارم مجھ سے لے کر غور سے پڑھا اور بولا ”یہ خاتون کون ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ بیگم تصور علی ہیں، یہ دستخط انہی کے ہیں۔“

”جی ہاں۔ وہ میری عزیزہ ہیں۔“

”آج وہ میرے پاس نہیں آئیں۔ ورنہ وہ انگریزی میں چیک لکھوانے کے لیے ہمیشہ اندر آ جاتی ہیں۔ وہ آئی ہوئی ہیں؟“

”جی ہاں، باہر بیٹھی ہیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ آج پتا چلا کہ ان کے عزیز واقارب کتنے بڑے بڑے لوگ ہیں۔“ اتنے میں فقیر محمد اندر آ گئے۔ فارموں کو مختلف مراحل سے گزارنے کے بعد انھوں نے رقم طلب کی تو میں نے بریف کیس ان کے سامنے رکھ دیا۔ صرف ایک لاکھ روپیہ میں نے اپنی جیب میں رہنے دیا اور چوہتر لاکھ ان کو دے دیا۔ یہ اس کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی کہ ایسا کوئی گاہک ان کے پاس کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں یہ لکھ دیتا ہوں کہ میں نے آپ کو یہ اکاؤنٹ کھولنے کی ترغیب دی ہے۔“ وہ بولا۔

”ضرور ضرور! یہ کیا بات ہوئی! یہ آپ کا اپنا اکاؤنٹ ہے صاحب اور میں آپ کا خادم۔“

وہ خوش ہو گیا۔ اس کا اسکور ایک دم اونچا ہو گیا تھا۔ شاید اسے اس خدمت کے صلے میں ترقی بھی مل سکتی تھی اور یہ بہت اچھی بات تھی۔ میرا بھلا کیا جاتا تھا۔

تمام مراحل سے فارغ ہو کر جب میں فراست احمد کے کمرے سے نکلا تو وہ میرا دوست بن چکا تھا۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا، بولا ”آپ کو جب بھی موقع ملے میرے ہاں تشریف لائیے، کوئی بھی کام ہو مجھے بتائیں میں حاضر ہوں۔“

”آپ کی بڑی مہربانی! میں کسی وقت ضرور حاضر ہوں گا۔ اب نہیں تو پھر کبھی سہی۔ ویسے فون پر آپ سے رابطہ رہے گا۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے باہر نکلا تو بیگم تصور علی میری منتظر تھیں اور تسبیح انھوں نے پھر سے پرس میں بند کر لی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعا یہی مانگ رہی تھیں کہ اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو خدا انھیں معاف کر دے۔ اپنی ہر پریشانی میں وہ یہی دعا مانگتی ہوں گی۔ وہ اتنی بڑی رقم کی بات سن کر اندر سے بکھر کر رہ گئی تھیں۔

”آئیں بی بی! میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“

”چل بھائی! کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟“

”جی نہیں۔ بلکہ آپ کا نام تو مینجر کو معلوم تھا۔ وہ آپ کے دستخط بھی پہچانتا تھا۔ بیگم تصور علی نام ہے آپ کا؟“

”ہاں۔ میں اکثر یہاں آتی رہتی ہوں، فراست صاحب مجھے جانتے ہیں۔ آج تم مل گئے تو میں نے تم سے ہی چیک لکھوا لیا۔ بات یہ ہے بھائی۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ میرے ساتھ ہی باہر نکل آئیں اور گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

”جی میرا نام سردار کریم نواز ہے۔“

”اچھا! تو تم کوئی سردار ہو؟“

”جی ہاں۔ یہی میرا نام ہے۔“

”بات یہ ہے کہ چیک کسی بھروسے کے آدمی سے لکھواتے ہیں نا اور پھر سچی بات یہ ہے کہ میری لکھائی بہت خراب ہے۔“

”کوئی بات نہیں بی بی! زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود آپ بہت مہذب اور معقول نظر آتی ہیں۔ آپ کی شخصیت بھی دوسروں کو متاثر کرتی ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ کسی بہت اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

”ہاں۔ کبھی ایسا ہی تھا۔ میرے شوہر جنگلات کے ٹھیکے لیتے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں زیادہ ہی بڑے تھے۔ سمجھیں کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ساٹھ سال کے ہوتے۔ میں ابھی بیالیس سال کی ہوں۔“

”تو کیا وہ۔۔۔۔“

”ہاں وہ فوت ہو چکے ہیں۔ تین سال پہلے وہ ایک حادثے میں مر گئے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بھتیا! بس میری بدنصیبی کہ میں

پیچھے رہ گئی ہے۔ پھر وہ مجھے راستہ بتانے لگیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک گیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ کوٹھی کئی کنال پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف عمارت کو ڈھانپتے ہوئے برآمدے بنے تھے جن پر پرانی طرز کی سرخ ٹائیلوں کی چھت پڑی تھی اور اس کے چاروں .... طرف گھاس کے قطعات دکھائی دیتے تھے۔ برآمدوں کو بڑی بڑی چِقوں سے زیادہ آرام دہ بنا دیا گیا تھا۔ روشنی وہاں تک کم کم جاتی تھی۔ برآمدوں کی چھتوں کے اوپر بڑے بڑے روشن دان تھے جو عمارت کو اندر سے منور کرتے تھے۔ بیگم تصوّر علی کا ملازم برآمدے میں کھڑا تھا، وہ گاڑی دیکھ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ گیراج بائیں دیوار کے ساتھ تھا مگر میں نے کار برآمدے کے سامنے جا روکی۔

"گام حُو! یہ ہمارے مہمان ہیں سردار کریم نواز۔ انھیں اندر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ امتل آ گئی ہے کہ نہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ تو بارہ بجے کے بعد آئیں گی۔ کالج میں چھٹی بارہ بجے ہوتی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ آئیں سردار صاحب!" وہ مجھے پہلی بار سردار صاحب کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ورنہ ساری گفتگو کے دوران وہ مجھے تُو اور تم کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔

"جی نہیں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے بی بی! آپ کا گھر میں نے دیکھ لیا ہے، جیسے ہی فرصت ملی میں آ جاؤں گا۔ اب اجازت دیں۔"

"نہیں سردار صاحب! چائے تو پیتے جائیں۔"

"جی نہیں۔ میں اس وقت معذرت چاہتا ہوں۔ ویسے میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلدی واپس آ جاؤں گا۔" اتنے میں میں نے جان بوجھ کر گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ اُسے میں نے دوبارہ اسٹارٹ کرنا چاہا مگر چابی میں پوری نہیں چلا رہا تھا۔ دراصل میں اسے وہیں چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ باہر اس کی وجہ سے مجھ پر کوئی بھی آفت آ سکتی تھی۔ اور بیگم تصوّر علی کی کوٹھی میں اسے چھوڑ کر میں خود کو زیادہ محفوظ کر سکتا تھا۔

کوئی دس منٹ تک میں گاڑی سے اُلجھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر باہر نکل آیا۔

"میرا خیال ہے اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ کام میرا بہت ضروری ہے۔"

"تو پھر کسی مستری کو بُلوا لیں؟"

"نہیں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں اسے اِدھر ہی چھوڑ دیتا ہوں، بعد میں مستری کو بلوا کر اسے درست کروا لوں گا۔"

"ہاں۔ یہ بہتر رہے گا۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے سردار صاحب! اور اسی بہانے آپ پھر یہاں آ سکیں گے۔ اگر دُور نہیں جانا ہے تو کوئی ٹیکسی لے لیں۔"

"ہاں۔ یہی کروں گا۔ میں ابھی ٹیکسی پر چلا جاتا ہوں، اسے بھی اِدھر ہی خراب ہونا تھا۔" میں نے بریف کیس باہر نکال کر کار کو مقفل کیا، اپنے پاس میں نے ضرورت کے لیے پانچ ہزار روپے رکھ لیے۔ بنک کی چیک بک اور وہ روپیہ جو میں ساتھ لے آیا تھا وہ سب کا سب میں نے ڈیش بورڈ میں رکھ کر مقفل کر دیا۔

"اچھا اب اجازت دیں۔ میں انشاءاللہ جلد ہی واپس آؤں گا۔"

وہ گیٹ تک میرے ساتھ آئی اور پھر بڑی شفقت اور محبّت سے بولی "خدا حافظ۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ اب تو کار لینے کے لیے آپ کو واپس آنا ہی پڑے گا۔"

کوٹھی سے باہر سڑک پر نکل کر میں ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔ دراصل میں دوبارہ لال کُرتی پہنچنا چاہتا تھا۔ جلیس اور وقاص کی باتوں نے مجھے رات سے پریشان کر رکھا تھا اور میں انھیں ہر قیمت پر اس واردات سے روک دینا چاہتا تھا جس کے لیے وہ راولپنڈی آئے تھے۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی؟ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس جلسے میں کوئی بہت ہی المناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے یہی احساس دلا رہی تھی۔ ایسا واقعہ جس کا میری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے مگر اس کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

تب مجھے جانِ عالم کا بٹوہ یاد آیا۔ اس کا پستول میرے نیفے میں بندھا تھا۔ میں نے جیب سے بٹوہ نکال کر کھول لیا۔ بیگم تصوّر علی کی کوٹھی کافی پیچھے رہ گئی تھی اور میں دوسری سڑک پر جا چڑھا تھا۔ گرمی سے بچنے کے لیے میں درخت کے سائے میں جا ٹھہرا اور بریف کیس زمین پر رکھ کر میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور اس کا بٹوہ دیکھنے لگا۔ اس میں سے مجھے پندرہ سو روپے ملے۔ وہ میں نے الگ رکھ لیے۔ پھر اس میں بھرے کاغذات دیکھنے لگا۔ وہاں اس کا شناختی کارڈ موجود تھا۔ وہ واقعی پولیس انسپکٹر تھا اور نام اس کا جانِ عالم ہی تھا۔ وہ کارڈ کوئی چار سال پرانا تھا اور ابھی تک چل رہا تھا۔ کارڈ کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی ڈائری رکھی تھی، اسے کھول کر تو میں حیرت میں ڈوب گیا۔ اس میں دوسرے بہت سے لوگوں کے پتوں کے علاوہ وہ ولسن ڈارمن کا پتا بھی لکھا تھا، اس کا فون نمبر اور گھر کا پتا دونوں درج تھے اور وہ شخص گلبرگ لاہور ہی میں رہتا تھا۔ گھر کا نمبر صاف صاف لکھا تھا۔ بٹوے کے دوسرے خانے میں بھی کچھ کاغذات موجود تھے۔ وہ میں نے کھولے تو وہاں سے مجھے جان عالم کے نام کا ایک اور

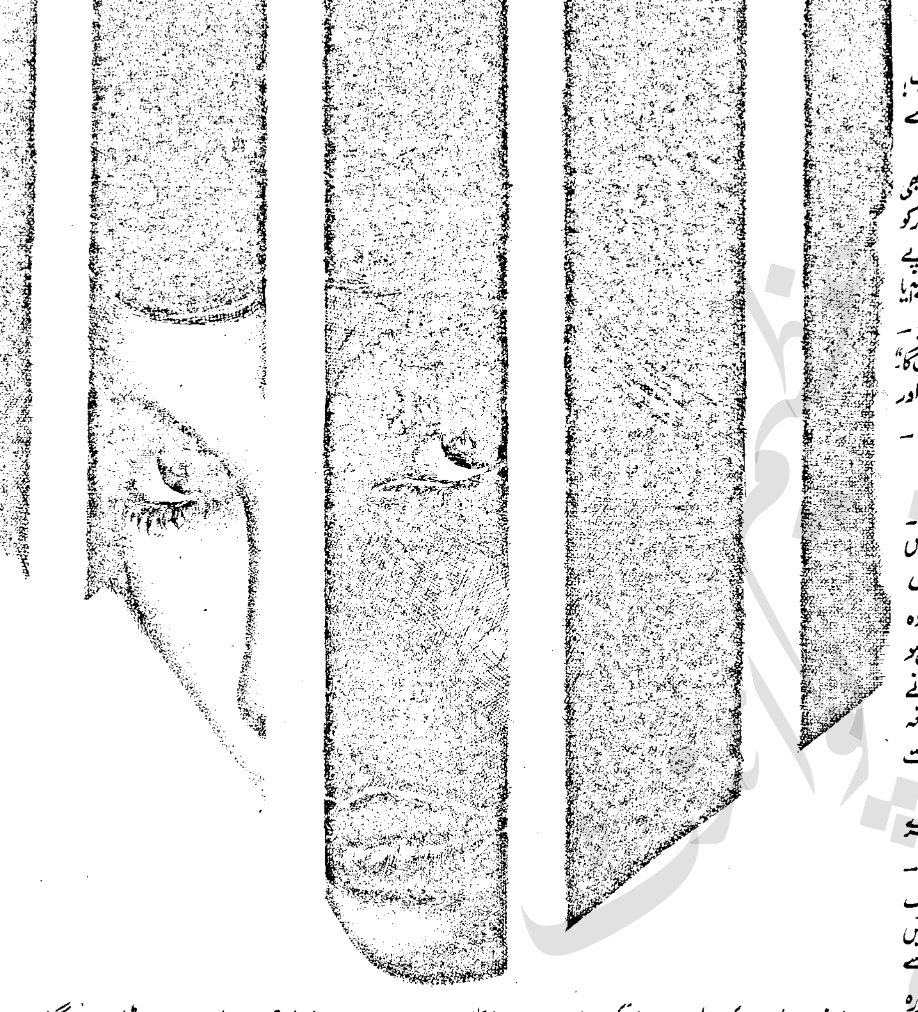

شناختی کارڈ ملا۔ وہ کسی ولسن اینڈ ساؤتھ کمپنی کے نام کا تھا جہاں جانِ عالم اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کے اجراء کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ وہ شخص کس کے ایما پر میرے پیچھے پڑا تھا۔ یہ ولسن ہی تھا جس نے مجھے اس روز جانِ عالم کے توسط سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں اس کا پتّہ صاف نہ کر دیتا تو پتا نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ لیکن یہ ولسن ہے کیا بلا؟ مجھ سے لاہور میں مل لینے کے لیے وہ میرے گھر آیا۔ پھر میں اس کی کوٹھی جا پہنچا جہاں وہ مجھ سے عمداً نہیں ملا تھا۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ وہ اس روز گھر ہی میں موجود تھا۔ اب اس نے کسی پرانے سی آئی ڈی کے آدمی کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں اسے موٹیل میں مل گیا اور مجھے اس نے پہچانتے ہی یہ کوشش کی کہ وہ مجھے وہیں سے اُڑا دے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گاڑی کے بارے میں میری تشویش بے جا ہی تھی۔ آبادشاہ نے کار کی گمشدگی کا قصّہ پولیس کو نہیں بتایا تھا۔

میں نے بٹوے کا تیسرا خانہ کھول لیا۔ اس میں دراصل تہ در تہ کئی خانے موجود تھے اور ابھی میں دو ہی کو دیکھ سکا تھا۔ تیسرے خانے کو دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس میں میرے تازہ فوٹو موجود تھے اور اُن کا پس منظر مسٹر ولسن کا وہ برآمدہ تھا جہاں مجھے مسز ولسن نے بتایا تھا کہ میرا فوٹو کسی نے نہیں اُتارا ہے بلکہ باہر بجلی چمک رہی ہے۔

جس کی بنا پر میں یہ سمجھا کہ میری تصویریں لی جا رہی ہیں تو یہ سلسلہ تھا وہ گو، با جیلانی کے پیچھے وہ کتا بلا وجہ نہیں لگا تھا۔ اس کا کوئی خاص مقصد تھا جس کو میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس ولسن نے وہ جال میرے پیچھے یونہی نہیں پھینکا تھا مگر اُسے مجھ سے کیا ضد ہو سکتی ہے، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے جانِ عالم کو وہیں رگید دیا تھا ورنہ وہ تو پتا نہیں میرا کیا حشر کرتا۔ بار بار وہ مجھے ایس پی آفس لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کیا وہاں اس نے میرے لیے کوئی پھندا تیار کر رکھا تھا؟ موٹیل میں وہ شاید اسی صبح پہنچا تھا۔ کیا اسے وہاں میری موجودگی کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ یا وہ یُونہی کسی کی تلاش میں وہاں جا پہنچا تھا کہ میں اس کے سامنے آ گیا۔ صُورتِ حال قطعًا واضح نہیں تھی معلوم یہ ہوتا تھا کہ ولسن مجھ سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ وہ بھی راولپنڈی پہنچ چکا تھا اور غالباً جان عالم کی طرح میری تلاش میں ہو گا۔ اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ رات میں نے موٹیل میں گزاری ہے تو شاید وہ مجھے وہیں آ لیتے۔ پتا نہیں اس خبیث نے کتنے آدمی میرے پیچھے لگا رکھے تھے۔ حالات کچھ زیادہ ہی اُلجھ کر رہ گئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ پیشتر اس کے کہ وہ لوگ مجھ پر حملہ آور ہوں اور مجھے بے خبری میں آ لیں، میں خود کیوں نہ انھیں تلاش کر کے ان کے ٹھکانے پر ہی... تباہ کر دوں۔ بعد میں کوئی بھلا کیا کر سکتا ہے۔ مگر سمتیں غیر متعین ہو گئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اور کس راستے سے مجھ پر حملہ آور ہو گا۔ میرے ذہن میں اس گھڑی صرف اس جلسے تک پہنچنے کا بھوت سوار تھا۔ میں ایک بار پھر بڑے صاحب سے امداد کا خواستگار ہونا چاہتا تھا۔ وہ میری سو طرح سے مدد کر سکتے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ میں اُن کا کتنا خیر خواہ ہوں۔ اُن کو اگر میں اپنی ابتلا کے بارے میں بتا سکا تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ پر مہربان ہو جائیں گے۔ میرے لیے اُن کے دل میں بڑی ہمدردی تھی اور شاید یہ انھی کی وجہ سے تھا کہ میں اب تک پولیس کی دستبرد سے بچا ہوا تھا۔ ورنہ وہ لوگ کیا نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے اپنا بریف کیس اُٹھایا اور آگے چل دیا ——

اب جو میں سامنے دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ میں ڈی۔ آئی۔ جی کے دفتر کے بالمقابل کھڑا ہوں۔ اللہ میری توبہ! کوئی بہت بڑا غیبی ہاتھ ہی مجھے بچاتا چلا جا رہا تھا۔ ورنہ غلام جیلانی اسیری کے پھندے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس عمارت کے احاطے میں بڑے بڑے پولیس افسر مونچھوں پر تاؤ دیتے پھر رہے تھے۔ انھیں اگر معلوم ہو جاتا کہ ان کے سامنے کون کھڑا ہے تو وہ مجھے کچا چبا جاتے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دور مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی تو میں نے اُسے ہاتھ دے دیا۔ وہ رُکی تو میں غڑاپ سے اس کے اندر جا بیٹھا۔

"چل یار! مجھے ذرا لال کُرتی میں رُک کر واپس آنا ہے۔ وقت ہے نا تیرے پاس؟" میں نے ڈرائیور کو دیکھے بغیر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں صاحب! وقت ہی وقت ہے آپ کے لیے گھر سے نکلا کس لیے ہوں" وہ کچھ زیادہ مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اُس گلی میں جا پہنچا جہاں میں نے جلیس اور وقاص کو رات اُتارا تھا۔

بریف کیس ہاتھ میں لے کر میں نے ٹیکسی کو رُکنے کے لیے کہا اور اس مکان تک جا پہنچا جہاں وہ دونوں اُترے تھے۔ دستک دینے پر ایک بچہ باہر نکلا۔ بولا "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"میں عرفان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ گھر پر ہیں"

"وہ میرے ابّو ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام کریم نواز ہے، انھیں بتا دو"

لڑکا فوراً ہی واپس چلا گیا۔ مکان دو منزلہ تھا، کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ اُن لوگوں کی رہائش نچلی منزل میں ہے۔ کوئی دو منٹ بعد ایک صاحب ولایتی سوٹ میں ملبوس بڑے طمطراق سے باہر آئے۔ عمر اُن کی یہی کوئی پینتیس سال ہو گی۔ صحت ان کی بہت عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس وقت کوٹ کے نیچے پستول لگا کر باہر آئے تھے۔ شاید وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سوٹ ہلکے سرمئی رنگ کا تھا۔ ٹائی بھی ویسی ہی تھی۔ وہ اُس لباس میں خاصے وضعدار دکھائی دیتے تھے۔ گرمیوں میں لوگ کبھی کبھار ایسے لباس بھی پہن لیتے ہیں۔

"جی فرمایئے! میرا ہی نام عرفان ہے؟"

"اوہ! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے صاحب! دراصل رات ایک صاحب میرے ساتھ یہاں تک آئے تھے۔ اُن کا نام وقاص تھا۔ ان کی عینک میری گاڑی میں رہ گئی تھی۔ میں وہ دینے آیا ہوں"

"وقاص؟ اس نام کا تو کوئی آدمی یہاں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"

"جی نہیں۔ وہ آپ کا ہی نام لے رہے تھے اور میرے سامنے اس دروازے میں داخل ہوئے تھے"

"رات میرے ہاں دو مہمان آئے تھے۔ کوئی دو بجے مگر... اُن کا حلیہ کیا تھا؟"

میں نے تفصیل سے اُسے اُن کا حلیہ بتا دیا۔

"حیرت ہے! اُن میں سے ایک کا نام صفدر تھا اور دوسرے کا نام سیف حسین۔ مگر وہ تو صبح نو بجے یہاں سے واپس چلے گئے تھے۔ اُنھیں کھوڑ جانا تھا"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے مجھے اپنا نام صحیح نہیں بتایا۔ آپ کے دوست تھے وہ؟"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے وہ آپ کا بھی ذکر کر رہے تھے۔ آپ کا نام سردار کریم نواز ہے نا"

"جی ہاں۔ یہی میرا نام ہے"

"تو اندر تشریف لے آیئے نا، باہر کیوں کھڑے ہیں۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ آپ غالباً اُنھیں اسٹیشن پر ملے تھے اور شاید اُن کے بریف کیس پر بھی آپ نے اپنا دعویٰ جتایا تھا"

"جی ہاں۔ ایسے ہی مذاق کیا تھا میں نے اُن سے مگر مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے اپنا نام کیوں مجھے غلط بتایا ہے" میں نے اس کے دروازے میں قدم ڈال دیا۔

وہ مسکرانے لگا، بولا "آپ دلچسپ آدمی ہیں، آئیں بیٹھیں"

اُس نے میرے لیے اپنی بیٹھک کھول دی۔

"ٹھنڈا پئیں گے کہ گرم؟ ویسے موسم تو ٹھنڈے کا آ گیا ہے"

"تکلیف نہ کریں، میں بس ابھی چلا جاؤں گا۔ یہ رہی اُن کی عینک"

میں نے اپنی عینک نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"میرا خیال ہے اب شاید وہ وہاں سے سیدھے لاہور چلے جائیں۔ آپ عینک بہرحال دے جائیں۔ میں اُن تک پہنچا دوں گا"

"آپ کہیں جا رہے تھے؟"

"جی ہاں۔ میں دراصل کھڑنہ جا رہا ہوں۔ وہاں آج ایک جلسہ ہو رہا ہے اور میں اُس میں شرکت کروں گا"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کون کون آ رہا ہے وہاں؟"

"اُس میں بڑے بڑے لوگ آئیں گے" اُس نے عینک کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا "میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں سردار صاحب کہ اُن دونوں کی عینکیں اُن کے پاس تھیں۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھے تو دونوں نے عینکیں پہن رکھی تھیں۔ پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُن کی عینک ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"

"یہ میری گاڑی میں پڑی تھی اور اُنھی کی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اور کوئی آدمی اس میں نہیں بیٹھا" اتنے میں اس کا بیٹا برف میں لگی دو سوڈے کی بوتلیں لے کر اندر آ گیا۔

"لیں یہ پئیں۔ بوتلیں خاصی ٹھنڈی ہیں"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ ویسے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ دونوں آدمی کام کیا کرتے ہیں؟"

"دونوں الیکٹرانک انجینئر ہیں۔ ایک کی دکان شادمان میں ہے اور دوسرے کی گلبرگ میں مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"مجھ سے شاید جلیس نے کہا تھا کہ وہ کاسمیٹکس کا کام کرتا ہے"

"اس کی دکان میں کاسمیٹکس کی چیزیں بھی رکھی ہیں۔ ویسے زیادہ کام وہ ریڈیو اور ٹی وی ریپئر کا کرتا ہے"

"وہ اتنی دور سے یہ جلسہ دیکھنے کے لیے کیسے آ گئے؟ ایسے جلسے تو لاہور میں بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں؟"

"بس جی! شوق کی بات ہے اور پھر پارٹی سے اُن کے تعلق کا بھی معاملہ ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ آپ اُن کے بارے میں ایسے سوال کیوں پوچھ رہے ہیں! کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟"

"وجہ تو کوئی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے، اجازت دیں" مگر جیسے ہی میں کُرسی سے اُٹھا، جان عالم کا پستول میرے نیفے سے کھسک کر میرے پاؤں میں جا پڑا۔ البتہ ابھی وہ شلوار کے اندر ہی تھا۔ میں فوراً ہی دوبارہ کُرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری اس کیفیت کو سمجھ گیا۔ جب میں پستول کو شلوار کے پائنچے کے اندر ہی اندر ہاتھ ڈال کر اوپر کھینچنے لگا تو وہ میری اس حرکت کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ البتہ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

"آپ ذرا دیر کے لیے بیٹھیں۔ میں فون پر معلوم کرتا ہوں کہ وہ لوگ اگر پنڈی میں ہیں تو آپ سے ملنے کے لیے فوراً واپس آ جائیں۔ میرا خیال ہے وہ ابھی صدر میں ہوں گے"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ معلوم کر لیں۔ میں انتظار کر سکتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ اُسی وقت صحن کی طرف نکل گیا۔ کوئی بہت بڑی سازش تھی جس کے راستے میں، میں رکاوٹ بن رہا تھا کہ چک کھُرانہ کے اس جلسے میں وہ کسی بدنصیب کو تباہ کر دینا چاہتے تھے اور عرفان اس سازش کی ایک اہم کڑی تھا۔ اس کے دوسرے مُہرے بھی موجود تھے مگر وہ ابھی تک پسِ پردہ تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ سب کے سب بے نقاب ہو جاتے، وہ بڑے ہی محتاط لوگ تھے۔ ایک ایک بات بہت سوچ سوچ کر کرتے تھے اور وقت میرے پاس بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میں کروں تو کیا کروں۔ میں محض ایک مفروضے کی بنا پر اُن کے پیچھے لگ گیا تھا اور ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ بظاہر وہ بہت ہی بے خبر لوگ دکھائی دیتے تھے۔ مگر وہ سازش کسی بہت اونچے درجے پر اس طرح سوچی گئی تھی کہ اس پر عمل درآمد کا سارا کام اُن جیسے چھوٹے لوگوں پر ڈال دیا گیا تھا اور وہ اتنے محتاط تھے کہ کسی کے سامنے منہ نہیں کھولتے تھے۔ انھیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر... میں اُن کے اندر کیسے جھانک سکوں گا۔ ابھی تک تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

فون کسی دوسرے کمرے میں پڑا تھا۔ بظاہر وہ گھر بہت معمولی

سا دکھائی دیتا تھا لیکن وہاں فون کی سہولت مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ عرفان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ میں نے نیفے میں اُڑسا پستول نکال کر بریف کیس میں بند کر لیا اور اپنا خاص پستول دیکھ بھال کر اس طرح ہاتھ کے نیچے رکھ لیا کہ میں اُسے کسی بھی لمحے بروئے کار لا سکتا تھا۔ اگلے لمحے کا مجھے قطعاً کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ عرفان اپنے اصلی رنگ روپ میں ظاہر ہو جائے۔ اُسے یقین آنے لگے کہ میں کسی خاص مقصد کے لیے اُس کے پاس پہنچا ہوں اور وہ مقصد تھا بھی بہت اہم۔ مجھے اُس جلسے میں شریک ہونے والے ایک بہت بڑے آدمی کی زندگی بچانی تھی، ایک ایسے شخص کی زندگی جو مہربان ہو کر میری مشکل آسان کر دے۔ میں اس سے یہی بھیک مانگ سکتا تھا مگر بات اتنی آسان نہیں تھی۔ اس کے لیے مجھے پتا نہیں کیسی تگ و دو کرنی پڑے، کیسے کیسے خون کے دریا عبور کرنے پڑیں۔ یار لوگوں نے اپنا جال بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا تھا۔ اگر وہ سازش کامیاب ہو گئی تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ اس میں عرفان ایسا آدمی بھی شامل تھا اور لاہور سے دو الیکٹرانک انجینئر بھی اس کے لیے بلوائے گئے تھے۔ ہاں! ایک صرف میں ہی ایسا آدمی تھا جسے اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا مگر اُن کے اصلی شکار کو میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ میں ایسے میں آبی اور آسیہ کو بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن کا مقدمہ وہ لوگ یونہی کسی عدالت میں نہیں ڈال دیں گے۔ انھیں ملزم اور پھر مجرم ثابت کرنا اُن کے لیے اتنا آسان نہ ہوگا۔ ہاں! وہ آسیہ کو جیل سے بھاگ جانے کی سزا فوراً دے سکتے تھے مگر آبی جو علی حسن گردیزی بن بیٹھا تھا، اس کے خلاف وہ فوری طور پر کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اگر میں اس کے ساتھ ہوتا تو بات دوسری تھی۔ مجھے وہ کئی معاملات میں ملوّث ثابت کر سکتے تھے مگر... میں تو ابھی اُس منزل سے بہت دور تھا اور شاید اور زیادہ دور نکل جاؤں لیکن اُن لوگوں کی اسیری نے مجھے وہیں باندھ کر ڈال دیا تھا اور میں کہیں بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔

عرفان کوئی پندرہ منٹ بعد واپس آیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بولا۔ ”وہ ابھی واپس آ رہے ہیں۔ اُن سے میری فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ صدر میں تھے، آ ہی رہے ہوں گے۔“

”چلیں اچھا ہے کہ اُن سے یہیں ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے اُنھیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی۔“

”ہاں۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ اُن کی عینکیں تو اُن کے پاس ہیں۔ پھر آپ کے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے۔ وہ آپ سے خود ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ لیں، یہ سگریٹ پئیں۔“ میں نے پیکٹ اس کے سامنے ڈال دیا۔ سوچ ہم دونوں کی ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی مگر وہ اپنے پتّے دکھا رہا تھا اور نہ میں۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنا آپ چھپا رہے تھے اور وقت بہت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔

ابھی کوئی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر کوئی آدمی تیزی سے ڈیوڑھی عبور کر کے صحن میں آ پہنچا۔ وہ کوئی خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ جس نے سفید قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔ گلے میں اُس نے سونے کی زنجیر ڈالی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ مجھے کسی خبیث کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور سر کے بال گھنے اور گھنگریالے۔ رنگ اس کا سرخ و سفید تھا۔ پاؤں میں اس نے سفید رنگ کے بوٹ پہن رکھے تھے اور اس کی کلائی میں گھڑی سنہرے ڈائل کی تھی اور... اور میرا خیال ہے کہ وہ اپنی قمیص کے نیچے ریوالور باندھے ہوئے تھا۔ جیسے ہی اس نے بیٹھک کے دروازے کی جالی پیچھے ہٹائی۔ اُس کا بایاں پہلو زیادہ وزنی معلوم ہوا۔ اس کے پستول کا اُبھار نمایاں ہو گیا تھا۔

”عرفان صاحب!“

”آؤ۔ آؤ۔ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا مُرشد! ان سے ملو۔ یہ سردار کریم نواز صاحب ہیں، ہمارے نئے مہربان۔“ عرفان کے لہجے کا طنز میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

وہ آدمی تیزی سے اندر آ گیا مگر وہ مسکرایا نہیں۔ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ عرفان کی طرف گھوم گیا۔ بولا۔ ”آپ ابھی تک یہاں ہیں عرفان صاحب! گئے نہیں؟“

”ان کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی۔ یہ ایک عینک لائے ہیں۔“

”اوئے تُو کیا مصیبت ہے بھئی! مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ ہماری کوئی عینک شینک گم نہیں ہوئی۔ شاید تیری ہی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ آخر تیرا یہاں آنے کا مطلب کیا ہے یار! تُو چاہتا کیا ہے میاں؟“ اس آدمی نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ہاتھ اس کا پہلو کے ساتھ لگ گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں اپنا پستول باہر نکال سکتا تھا۔

”یہی بات میں عرفان صاحب سے پوچھنا چاہتا تھا پہلوان! اچھا ہوا تم نے یہ سوال خود ہی پوچھ لیا۔ آخر اُس جلسے میں اتنے دُھوم دھڑکے سے جانے کا مطلب کیا ہے؟ میں بھی یہی بات پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اپنی ٹانگیں سامنے رکھی تپائی پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

بات اب زیادہ واضح ہونے کے قریب آ گئی تھی۔

”اوئے! یہ تُو ہوتا کون ہے آخر! تیرا کیا واسطہ ہے اس معاملے سے؟ تجھے کس سالے نے یہاں بھیجا ہے؟“

”بات یہ ہے پہلوان! تم ذرا میرا یہ کارڈ دیکھ لو۔ میرا نام جان عالم ہے۔ یہ دیکھو یہ کارڈ۔“ میں نے جان عالم کا کارڈ اس کے سامنے کر دیا۔ ”میں سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر ہوں، سمجھتے ہو نا؟ اور میرا خیال ہے کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس کا اقرار

کر لو۔ ورنہ میں تم دونوں کو تھانے لے چلنے پر مجبور ہوں۔ اُن دونوں کا بندوبست تو میں کر آیا ہوں۔“

وہ دونوں اس کارڈ کو دیکھ کر پریشان سے ہو گئے۔ وہ اس مرحلے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے مگر اُس آدمی کے چہرے پر تحیّر نہیں تھا۔ وہ بڑی تن چھن سے بولا۔ ”تم بکواس کرتے ہو۔ جان عالم کو تو ڈسمس ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم کوئی ڈبل کراس قسم کے لفنگے ہو۔“ یہ کہتے ہی اُس نے جیب سے ایک دم پستول نکال لیا۔ مگر میرا ہاتھ زیادہ تیزی سے چلا اور میں نے اپنا چپ شاہ نکال کر اس کے پستول والے ہاتھ پر اس طرح مارا کہ اس کا ہاتھ ایک دم اپنی گرفت کھو بیٹھا اور اس کا پستول نیچے جا گرا لیکن اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر عرفان نے مجھ پر پستول تان لیا۔

”ہاتھ اوپر مت اُٹھانا۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ اس کی غضبناک آواز سنتے ہی مُرشد نے تیزی سے پاؤں کی ٹھوکر میرے ہاتھ پر ماری اور وہ خود پورے قد سے اچھل کر مجھ پر آ پڑا۔ اس طرح کہ اُس نے میری بغل میں سر دے کر دونوں ہاتھوں سے میری دائیں کلائی پھیر کر دیوار کی طرف کر دی۔ میں نے چاہا کہ بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبا دوں مگر عرفان نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اُس نے میرا بایاں کندھا پکڑ کر میرا بازو بیکار کر دیا۔ مُرشد اپنے پورے وزن سے مجھ پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ پستول دونوں کے ہاتھ میں نہیں تھے۔ عرفان نے اُسے شاید پھر جیب میں ڈال لیا۔ ایک زبردست جھٹکے سے مُرشد نے میرا پستول ہاتھ سے چھڑا دیا مگر اُسے اٹھایا نہیں، دری پر ہی پڑا رہنے دیا۔ یہاں تک کہ اس کے اور میرے وزن سے کرسی اُلٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگی پھر وہ دونوں مجھے کرسی سے کھینچ کر آگے لے آئے۔ اب ہم تینوں ہی غیر مسلح تھے اور وہ دونوں میرے بازوؤں کو شل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مُرشد نے یوں کیا کہ وہ ایک دم میری چھاتی پر بیٹھ گیا۔ اب میرے دونوں بازو فرش پر لگے ہوئے تھے اور ان پر عرفان نے پاؤں رکھ دیے تھے۔ جیسے ہی مُرشد میرے سینے پر بیٹھا، میں نے پاؤں زمین پر جما کر اسے کچھ اس طرح سر کے اوپر سے اُچھالا کہ وہ گری ہوئی کُرسی پر سر کے بل جا پڑا۔ میرے بازو عرفان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ مجھے یوں آزاد ہوتے دیکھ کر عرفان نے پھر پستول نکال لیا۔ ابھی میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ وہ غرّایا۔

”تیری موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔ اسے چھیل دے مُرشد! مار خنجر اس کے سینے میں۔ گولی چلی تو گھر میں کہرام مچ جائے گا۔“ اس نے پستول مجھ پر تان رکھا تھا اور وہ مُرشد کے اُٹھ جانے کا انتظار کر رہا تھا مگر جیسے ہی مُرشد اُٹھنے لگا، میں نے پوری قوت سے پاؤں کی ضرب اس کے کولھے پر دے ماری۔ پتا نہیں کیا ہوا، وہ بلبلا کر دُہرا ہونے لگا۔ عرفان کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے جان بوجھ کر میری ٹانگوں پر گولی چلا دی مگر اس کا نشانہ خطا گیا۔ میں ایک دم اچھل کر اس پر جا پڑا۔ اس طرح کہ اُسے دوسرا نشانہ لینے کا موقع ہی نہیں ملا مگر یہ میری زبردست غلطی تھی۔ کیونکہ وہ مُرشد کے عقب میں کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں آگے بڑھا، مجھے مُرشد نے ٹانگوں کی قینچی مار کر اس طرح جکڑا کہ میں عرفان کو نیچے گرانے کے بجائے خود اس کے شکنجے میں پھنس کر رہ گیا۔ اُس نے قینچی کا داؤ اس طرح لگایا تھا کہ میں خود کو کھڑا نہ رکھ سکا اور اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر عرفان نے پستول کا دستہ میرے سر کی پشت پر اتنی قوت سے مارا کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ میرے حواس معطّل ہو گئے پھر مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ اس نے بہت کاری ضرب لگائی تھی۔ گولی کی آواز سن کر اس کے گھر والے دروازے تک آ پہنچے تھے مگر میں انھیں پوری طرح دیکھ نہیں سکا

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گرانقدر معاوضے پر چراتا ہے

نک ویلوٹ کی چوریاں

ان چوریوں کی دلچسپ کہانیاں

وہ تمام کہانیاں جو آج تک لکھی گئی ہیں

قیمت ۱۵/ روپے

ڈاک خرچ ۵/ روپے

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۱

تھا کہ میرے ہوش ہی جلتے رہے۔

میری بے ہوشی کچھ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہی۔ کیونکہ جب میں اپنے حواسوں میں آیا تو اس وقت دھوپ کا رُخ یہ بتاتا تھا کہ دن کا ایک بج رہا ہے۔ میری گھڑی میری کلائی پر بندھی تھی مگر میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میرے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس وقت میں ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ جس کا فرش ننگا تھا اور جس میں گھر کا کاٹھ کباڑ بھر دیا گیا تھا۔ اُن لوگوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں مضبوط رسّی سے جکڑ دیے تھے۔ کمرے کا دروازہ میری توقع کے عین مطابق باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ میں اگر کوشش کرتا تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ روشنی اس کمرے میں ضرورت سے زیادہ ہی آ رہی تھی تب مجھے محسوس ہوا کہ میں گھر کی دوسری منزل پر قید کیا گیا ہوں۔ پتا نہیں انھوں نے مجھے سیڑھیوں پر سے کس طرح گزارا ہوگا۔ گھر شاید اُس گھڑی بالکل خالی تھا، کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بازو میرے کمر کے پیچھے باندھے گئے تھے۔ جن کے جکڑ بند میں کسی طرح بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ خود وہ لوگ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ دروازے کے باہر کسی طرح کی کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی کمرے میں ایک پرانی طرز کی الماری رکھی تھی جو کسی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ سامنے کے دروازے پر بھی ایک... روشن دان موجود تھا مگر وہ دونوں اتنے چھوٹے تھے کہ ان میں سے میرا گزر جانا ممکن نہیں تھا۔ خدا جانے انھوں نے مجھے جان سے کیوں نہیں گزار دیا تھا، کس لیے وہ مجھے زندہ چھوڑ گئے تھے؟ سوچتے ہوں گے کہ اس سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ میری دونوں جیبیں خالی تھیں وہ میرے پستول بھی لے گئے تھے اور بریف کیس بھی جس میں میری ضرورت کی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ مجھے صحیح معنوں میں قلاش اور مفلس کر گئے تھے۔

میں کھڑا تو ہو گیا مگر اُس رسّی کی وجہ سے قدم اٹھانا مشکل نظر آتا تھا۔ پھر بھی میں اُچھل اُچھل کر دیوار کے پاس جا پہنچا۔ دروازے کے باہر کوئی آدمی موجود نہیں تھا، صحن خالی پڑا تھا۔ اس دروازے کی درزیں مجھے یہی بتاتی تھیں۔ گھڑی وہ خدا جانے کیوں میرے ہاتھ پر چھوڑ گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ انھیں یاد ہی نہیں رہی ہوگی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن میرے مسئلے کا کوئی حل وہاں موجود نہیں تھا۔ کوئی چاقو، کوئی چھری مجھے مل بھی جاتی تو میں اُس سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ تو کمر کے پیچھے بندھے تھے اور اُدھر کسی کی موت اس کے تعاقب میں چلتی ہوئی اس کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ ڈیڑھ بج گیا تھا مگر میں ابھی تک اس مشکل کا

کوئی حل تلاش نہیں کر سکا تھا۔ لازم تھا کہ میں بڑے صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیتا لیکن میری رہائی کی کوئی راہ کُھلی نہیں تھی۔ دروازہ میں نے بار بار پیٹ کر دیکھ لیا۔ کبھی میں تختے سے اپنا سر پٹختا تھا، کبھی سینہ ہاتھ تو میرے کمر سے بندھے تھے۔ وہ اسیری مجھے لے ڈوبی تھی۔ میری بے چینی حد سے بڑھ گئی تھی اور میرا دھیان بار بار کمرے کی مختلف چیزوں کی طرف لوٹ رہا تھا۔

سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک پرانا ٹرنک پڑا تھا میں نے آگے بڑھ کر اُسے کھولنا چاہا مگر نہ میرے ہاتھ کام کرتے تھے نہ پاؤں۔ بڑی مشکلوں سے میں عقبی حصے میں بندھے ہاتھ اس تک لے گیا۔ اس حال میں کہ میرا منہ دوسری طرف تھا اور میں جھک کر ٹرنک کا ڈھکنا کھول رہا تھا۔ اس میں تالا تو کوئی نہیں تھا۔ بالآخر میں اس کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں مختلف قسم کے اوزار پڑے تھے۔ جیسے کسی لوہار ترکھان کے پاس ہوتے ہیں۔ ان اوزاروں کو میں نے لیٹ کر فرش پر اُلٹ دیا۔ میری بے بسی کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ایک اچھا بھلا آدمی اُن لوگوں نے جانور کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ اُن اوزاروں میں ایک آری بھی موجود تھی۔ اس کو میں نے لیٹ کر دونوں پاؤں سے اُٹھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی آدمی کے جب ہاتھ کٹ جاتے ہیں تو اس کی ساری قوت پاؤں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس آری کو میں نے دونوں پاؤں کے اندر سمیٹ کر اس طرح سیدھا کیا کہ اس کا ایک سرا دیوار میں جا لگا تھا اور اس کے دندانے اب میرے کام آ سکتے تھے مگر اس میں حرکت تو جب ہی پیدا ہو سکتی تھی جب میں رسّی اُن دندانوں پر رکھ کر اسے آگے پیچھے پھیرتا۔ ایسی بے بسی کے دن بھی میرے مقدر میں تھے۔ چند چوہوں نے مجھے وہاں یوں باندھ لیا تھا کہ میں اپنا وزن بھی نہیں سنبھال سکتا تھا۔ کسی چیز سے کام لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر اُس آری کو رسّی پر رکھ کر جب میں اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا تو تب مجھے یاد آیا کہ یہ کام میں اپنے دانتوں سے بھی تو لے سکتا ہوں۔ میں نے نیچے جھک کر اُس آری کا دستہ منہ میں لیا۔ اب کام زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ رسّی بالآخر کٹ گئی۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اُن ظالموں نے گرہیں ایسی سخت باندھی تھیں کہ شاید میں انھیں ہاتھوں سے کاٹ ہی نہیں سکتا تھا۔

میرے پاؤں آزاد ہوئے تو اب مجھے حرکت کرنے میں آسانی ہو گئی۔ مگر کمر سے بندھی رسّی تک پہنچنا اب بھی ناممکن تھا۔ دونوں بازو انھوں نے اس طرح جکڑ دیے تھے کہ اُس رسّی کو کاٹ لینا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں آری کو اب کی بار دونوں پاؤں میں پھنسا کر کمر تک لے گیا۔ یوں کہ اس کے دندانے رسّی کو کاٹ سکتے تھے۔ یہ تجربہ زیادہ آسان رہا۔ میں پاؤں کو بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا جس سے وہ رسّی کٹ گئی۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ اپنے دونوں ہاتھ آزاد دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔

اس وقت تک دو بج چکے تھے۔ اور ابھی مجھے اُس کمرے سے نکلنے کے لیے پتا نہیں کتنی تگ و دو کی ضرورت تھی۔ میں نے فرش پر بکھرے اوزار پھر سے ٹرنک میں ڈالے اور سامنے کی الماری کو پیچھے ہٹا کر کھڑکی کے پاس جا پہنچا، اس کھڑکی سے میں بڑی آسانی سے باہر کود سکتا تھا۔ اس کے دونوں تختے میں نے کھول دیے۔ سامنے ہی کوئی آٹھ فٹ نیچے ایک چھت تھی۔ جس سے ذرا آگے سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ پتا نہیں وہ کن لوگوں کا مکان تھا۔ وہ کوئی بہت ہی غریب لوگ تھے اور محض اس لیے وہاں رہ رہے تھے کہ اُن کے باپ دادا نے اُن کے لیے مکان بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ کچھ رہائشیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

اردگرد کا نقشہ ذہن میں جمائے ہوئے میں نے کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی، بڑے زور کا دھماکا ہوا، میں سمجھا میرا کوئی گٹا گوڈا ٹوٹ گیا ہے لیکن نہیں، میں تو بہر حال بچ ہی گیا تھا۔ ہاں مکان کے اندر طوفان آ گیا تھا۔ گھر کی کوئی بڑھیا دُہائی دیتی ہوئی صحن میں نکل آئی۔

”وے چھورے! وے تیرا بیڑا غرق، دیکھ تو اوپر کیا مصیبت آئی ہے۔ اپنا تو کوٹھا ہی ڈھے گیا ہے شینت۔“

میں پلٹ کر دوسری چھت پر جا چڑھا۔ میں بڑھیا کو رُک کر دیکھ لینے کی جرأت ہی کہاں رکھتا تھا۔ اُس مکان کی سیڑھی میرے سامنے ہی تھی۔ بڑھیا شاید دَھپ دَھپ کرتی چھت پر آ رہی تھی کہ میں اس کے ہمسائے کی سیڑھی میں جا دبکا۔ اس کے کچھ قدم دوسری منزل پر پہنچے تھے مگر میں وہاں سے نیچے کھسک آیا۔ اُن کی سیڑھی سامنے بنے غسل خانے کے قریب کھلتی تھی۔ خدا جانے وہ کن لوگوں کا مکان تھا۔

میں پاؤں کی چاپ کو دباتا ہوا مکان کے صحن میں نکلا اور دروازہ کھول کر گلی میں جا پہنچا۔ اگر کوئی آدمی وہاں ہوتا تو مجھے یوں نکلنے نہ دیتا۔ میں سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اب میں لال کرتی کے بڑے بازار تک جا پہنچا تھا اور وہ چھوٹا سا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا جس کی عقبی گلی میں میں عرفان سے ملا تھا مگر میں اس گلی میں جانے کے بجائے بیگم تصور علی کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ اس عورت کا دم میرے لیے اُس گھڑی غنیمت تھا۔ میں تو سچی بات یہ ہے کہ عرفان کے گھر سے کُھکھ ہو کر نکلا تھا۔ کچھ بھی میرے پاس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میرے پاس کرائے کے بھی پیسے نہیں رہ گئے تھے، سب کچھ انھوں نے لپیٹ لیا تھا۔

حیدر روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اُس وقت گامُو جو ایک جمعدارنی سے برآمدوں کے باہر فرش پر جھاڑو دلوا رہا تھا۔ مجھے گیٹ پر دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکا اور میرے کچھ کہے بغیر ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میری کار سامنے ہی کھڑی تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ میرے پاس کار کی چابی ہی موجود نہیں تھی اور یہ بڑے سیاپے کی بات تھی۔

”گامُو جُو! تو ایک کام کر۔ بازار سے کسی ایسے آدمی کو بُلا لا جو تالے چابیاں بناتا ہو۔ میری کار کی ساری چابیاں گم ہو گئی ہیں، تیری بڑی مہربانی ہوگی۔“

”جی بہت بہتر۔ ایک آدمی اُدھر چوک میں بیٹھتا ہے۔ میرا یار ہے وہ، میں اُسے ابھی لے آتا ہوں۔“

”ہاں۔ یہ تیری خاص مہربانی ہوگی۔ بیگم صاحبہ اندر ہیں؟“

”جی ہاں، میرا خیال ہے وہ سو گئی ہیں۔ بٹیا کالج سے واپس آ چکی ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے، میں تمھارا انتظار کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دائیں ہاتھ عمارت کے برآمدے کے قریب جا ٹھہرا۔ میں بیگم تصور علی کو جگانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ جمعدارنی فرش پر جھاڑو دیتی رہی اور میں وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ بھوک نے الگ کلیجہ کُھرچنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی کب تک ایسی ذلتیں اور ایسی اذیتیں سہہ سکتا ہے، آخر کب تک؟ اور دنیا برابر اپنے دھندے میں مصروف چلی جا رہی تھی۔ وہ جو بدی کو ہی اپنا حق اور فرض سمجھتے تھے مسلسل اس پر عمل بھی کر رہے تھے۔ ورنہ یہ عرفان، یہ مُرشد، یہ جلیس اور یہ قاص کون لوگ تھے؟ کس نے انھیں اس راہ پر لگا دیا تھا؟ کوئی بہت بڑا لالچ اُن کے پیشِ نظر تھا۔ جس نے اُنھیں ہر قدم پر قیامت مچانے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ بظاہر تو وہ بہت ہی بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ شہروں میں رہتے تھے، گلیوں کے معزز لوگ نظر آتے تھے۔ ان کی دیگر مصروفیات بھی ہوں گی، اُن کے بال بچے بھی تھے۔ وہ سب کچھ ہی کرتے تھے مگر نہیں، ان کی اصل راہ بدی کی راہ تھی اور وہ اس سے زیادہ آرام پاتے تھے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ کیا کر رہے تھے؟ مجھے باندھ کر وہ اپنے شکار پر بلا خوف و خطر جھپٹ رہے تھے اور کوئی ان کے راز سے واقف نہیں تھا۔ یہ راز جب منظرِ عام پر آتا جب وہ کسی کو نیست و نابود کر چکے ہوتے، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دیتے اور وہاں بھرے جلسے میں کسی کی لاش پڑی ہوتی۔ مگر اس راز کی آگ سُلگ ملنے کی جو سزا میں نے بھگت لی تھی، میرا خیال ہے وہی بہت کافی تھی۔ اگر میں بندے کا پُتر ہوتا تو وہیں سے لوٹ جاتا لیکن میرے اپنے مسائل تھے، مجھے کسی کی ہمدردیوں کی ضرورت تھی، کسی بہت بڑے صاحبِ اختیار آدمی کو میں اسی طرح اپنے اوپر مہربان کر سکتا تھا کہ میں اس کی جان بچا لیتا اور وہ مہربانی یہ کرتا کہ مجھے میرے ایروالیس دلا دیتا۔ یہ کام اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ کئی حربے استعمال کر سکتا تھا۔ جبکہ میں محض بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ خدا جانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ اُن کا شکار بڑے صاحب ہی تھے اور کوئی نہیں تھا۔

ایک دھڑا ایسا تھا کہ وہ اُن کا وجود ہی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اُن کی جان لینے کی پہلے بھی کئی بار کوشش کی گئی تھی اور اب کی بار انھوں نے اس جلسے کو تاڑ رکھا تھا جو چک گھرانہ میں ہو رہا تھا اور جس کا آغاز آج پانچ بجے ہونا تھا مگر انجام کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا ہوگا، کس کس کی لاش وہاں تڑپتی رہ جائے، کتنے آدمی قتل ہو جائیں۔ کوئی ایسے جلسے میں یونہی تو نہیں جا گھستا ہے باقاعدہ منصوبہ بنایا جاتا ہے اور اس منصوبے کے مہرے پتا نہیں کون کون تھے؟ کس کس کے ہاتھ میں انھوں نے اپنے جال کی ڈوریاں تھما رکھی تھیں اور کون انھیں یہ اذن دے گا کہ کب انھیں بزن بزن کرنا ہوگا؟

مجھے تو صرف آسیہ اور آپی کی فکر تھی۔ وہ کسی طرح رہا ہو جاتے تو میں انھیں ساتھ لے کر کہیں دور نکل جاتا۔ انھیں پھر ان دنیاوی آلائشوں کی طرف لوٹنے نہ دیتا مگر ابھی تک تو میں بے بس ہی چلا آ رہا تھا۔ انھیں گرفتار بھی ہونا تھا تو اس وقت ہی! کوئی وقت، کوئی گھڑی۔ کوئی شبھ گھڑی دیکھو پھر وہ چوڑیاں پہنو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ پولیس آئی اور تم نے ہاتھ باندھ لیے۔ کچھ تو سوچا ہوتا اور کچھ نہیں تو میرا ہی انتظار کر لیتے۔ میں تمھیں شاید اس ابتلا سے بچا ہی لیتا مگر وہ بہت ہی نکمے نکلے۔ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ انھیں شاید پولیس نے سوتے میں بے بس کر دیا تھا۔ ورنہ جاگتے میں وہ یوں آسان اور تر لقمہ ثابت نہ ہوتے۔

میں ابھی وہاں کھڑا ہی تھا کہ گام جو واپس آ گیا۔ اس کا دوست واقعی زیادہ فاصلے پر نہیں رہتا تھا۔ جب ہی وہ ایک تھیلا لے کر اس کے پیچھے پیچھے گیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ میں تو خوش ہو گیا۔ گام جو میرے بہت کام آیا تھا۔ ورنہ اُن تلنگوں نے تو مجھے پوری طرح نہتا کر دیا تھا۔ ٹنڈ منڈ اور بے شاخ! اُن کے گھر سے میں کوئی کم خوار ہو کر تو نہیں نکلا تھا۔

”لیئو صاب جی! بندہ میں لے آیا ہوں۔ اب آپ اسے کام بتا دیں۔ ویسے میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ کار کی چابی بنوانی ہے۔“

”چلو یار! اس کار کو دیکھو۔ اس کی چابیاں مجھ سے گم ہو گئی ہیں۔“

”کوئی بات نئیں چوہدری صاب! میں تو اسی لیے سارے اوزار لے آیا ہوں۔ کار کیا ہے میں تو بڑے بڑے سیف کھول لیتا ہوں کسی کی چابی گم ہو جائے تو وہ فوراً میرے پاس آتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر بندے کی چابی گم ہو جائے تو تو وہ بھی بنا سکتا ہے۔ ہے کہ نہیں لال محمد! کیا بات ہے تیرے کارخانے کی۔“ گام جو نے اس کے کندھے پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔

”اونہ یار! میرا کندھا پہلے ہی زخمی ہے۔ پتا نہیں وہ کون کھوتے کا پتر تھا۔ ایک دم آج اُس نے اسکوٹر میرے اوپر چڑھا دیا۔ ہاں یہ صبح سویرے کا واقعہ ہے۔“

”مارنا تھا اُس خبیث کو، یعنی وہ تیری ہی چابی گم کر رہا تھا۔ تو اگر مر مرا جاتا نا تو آج یہ کار کیسے کھلتی۔“

”خیر، ایسا بھی کچو چا نہیں ہوں میں کہ خواہ مخواہ ہی مر جاتا۔ موت اپنے آنے کی خبر دیتی ہے۔ کوئی بیماری شیماری، کوئی تپ شپ کوئی اور خیر خبر۔“ پھر وہ کار کی طرف متوجہ ہو گیا بولا ”یہ گاڑی تو ماشاء نئی ہے باؤ جی؟ چابی کیسے گم ہو گئی اس کی؟“

”بس یار! اس کے ساتھ میرا بریف کیس بھی کسی جگہ رہ گیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں۔ تو ذرا جلدی کر دے بھائی۔“

”اس نے گاڑی کو دیکھ بھال کر بڑا پکا منہ بناتے ہوئے کہا۔ صاب جی! اس کے پچاس روپے لگیں گے۔ کتنی چابیاں بنا دوں؟“

”دیکھ! تو اس کے دروازے کی پھر اگنیشن کی، ڈیش بورڈ کی اور ڈکی کی دو دو چابیاں بنا دے۔ میں... چل میں تجھے سو روپے دے دوں گا۔ اب تو خوش ہے نا تو؟“

”سو روپے دے دیں گے آپ! کمال ہے پھر تو مزے ہی آ گئے۔ بس آپ اُدھر جا کر بیٹھ جائیں۔ دس منٹ میں چابیاں مل جائیں گی۔“

”آئیں سردار صاب! آپ اندر بیٹھیں ڈرائنگ روم میں۔ میرا خیال ہے کھانا تو آپ کھا چکے ہوں گے؟“

”نہیں یار! کھانا بھی نہیں کھا سکا ہوں، فرصت ہی نہیں ملی اگر ہو سکے تو لے ہی آؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کچھ نہ کچھ رسوئی خانے میں رکھا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اُس نے ڈرائنگ روم کھول کر مجھے اندر بٹھا دیا۔ وہ خاتون خاصی خوشحال دکھائی دیتی تھی۔ کمرے کا سامان اس بات کی گواہی دیتا تھا۔ صوفے اور کرسیاں اگرچہ پرانی طرز کے تھے مگر اُن کو بہت سنبھال کر استعمال کیا گیا تھا۔ بالخصوص ایرانی قالین لہو رنگ تھا اور بہت قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ پتا نہیں یہ شبہ میرے دل میں کیسے اُبھرا کہ اُس عورت نے بنک میں مجھ سے جان بوجھ کر چیک لکھوایا تھا۔ ورنہ ایسی بھی کیا بات تھی کہ وہ اردو ہی نہ لکھ سکتی ہو۔ خواہ وہ کتنی ہی بدخط کیوں نہ ہوتی۔ وہ کسی دوسرے کے سامنے چیک کبھی نہ رکھتی یا تو وہ کوئی بہت ہی قیافہ شناس عورت تھی جسے معلوم ہو جاتا تھا کہ دوسروں کی جیب میں کیا ہے یا کوئی اور بات تھی۔ مینیجر نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ اُس سے بھی اکثر اوقات چیک لکھوا لیا کرتی ہے اور وہ اُسے جانتا ہے مگر اس کے بارے میں اُس نے کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ ورنہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے عیب کا ذکر ضرور کر دیتا مگر اس بارے میں وہ بالکل خاموش رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُسے کوئی زیادہ الجھی ہوئی عورت نہیں سمجھتا تھا، خوش دلی سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔

اُس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات تھی ضرور ورنہ وہ تنہا عورت تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی کی مالک۔ اپنی گفتگو سے بھی وہ خاصی پڑھی لکھی دکھائی دیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کے سوا شاید اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایسی خاتون کو ایک چھوٹے سے کام کے لیے کسی سہارے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

بالآخر میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اس سے تو میں پھر بھی بات کر سکتا تھا۔ ویسے وہ اس رقم کا سن کر ایک دم چونک اٹھی تھی، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم وہاں جمع کروانے آیا ہوں مگر میرے فارموں کو دیکھ کر اُسے یقین آ گیا اور پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے گھر ضرور آؤں، یہ اچھی بات تھی۔ مجھے تو کسی ایسے ہی ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں میں دو گھڑی رُک کر سوچ سکتا، آرام کر سکتا۔ اس کی دعوت کو میں نے بڑی خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔ مگر اس سے آگے کیا ہوگا؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ مگر ابھی تو وہ سوئی ہوئی تھی کسی بہت ہی عقبی کمرے میں جہاں کوئی آواز اس کی نیند خراب نہ کر سکے۔

کوئی پندرہ ہی منٹ گزرے تھے کہ گام جو اندر آ گیا۔ بولا۔ ”چابیاں تیار ہو گئی ہیں صاب جی!“

”یہ تو بہت اچھا ہوا بھئی... مگر ادھے ٹھہر جا! وہ ڈیش بورڈ اس نے کھول کر دیکھا تھا؟“ میں بھاگ کر گاڑی کے پاس جا پہنچا۔

”صاب جی! اللہ معافی دے۔ آپ نے تو مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔“ غلام محمد بولا۔

”کیا مطلب؟ خیر تو ہے؟“

”او جی ادھر اس خانہ خراب میں آپ نے اتنی بڑی رقم ڈال رکھی ہے! توبہ توبہ! میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ بندہ بشر ہوں، ایمان بھی بندے کا ایسا ہی ہے جیسے بندے کی چابی۔ وہ ایک دم گم ہو جاتی ہے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں غلام محمد! مجھے تم پر اعتبار ہے بھئی! لاؤ وہ چابیاں دے دو مجھے۔“

اُس نے آٹھ چابیاں میرے حوالے کر دیں۔ وہ سب نئی معلوم ہوتی تھیں۔ صرف اُن کے دندانے کسی کسی جگہ سے گھس دینے سے وہ کسی بھی کار میں لگ سکتی تھیں۔

”رقم آپ گن لیں جناب! بعد میں ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔ ہاں! کیوں بھئی گام جو!“

”ہاں ہاں... یہ بہت ضروری ہے جناب! ہم ٹھہرے غریب آدمی۔“

”نہیں یار! تم کیسے غریب ہو گئے، اتنی بڑی کوٹھی کے مالک ہو۔“ میں نے ڈیش بورڈ سے رقم کی تمام گڈیاں نکال کر گن لیں۔ نوٹ پورے تھے۔ میں نے سو روپے غلام محمد کو دیے تو وہ خوش ہو گیا اور مجھے دعائیں دیتا ہوا اُسی وقت باہر چلا گیا۔ گام جو بڑی حسرت سے نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

”لے یار! تو بھی کیا یاد کرے گا... لے یہ دو سو روپے تو بھی رکھ لے مگر تو تو کھانا لینے گیا تھا؟“

”وہ میں نے میز پر لگا دیا ہے جی۔ میں آپ کو ہی بلانے آیا تھا۔“

”تو چل پھر! پہلے پیٹ پوجا کر لیں۔“

”پر جی یہ روپے! میں کیسے رکھ لوں؟“

”کیوں، ان میں کیا بات ہے۔ یہ جیب میں نہیں آتے کیا؟“

”آتے تو ہیں، پر دیکھیں نا جی، وہ بیگم صاحبہ سنیں گی تو ناراض ہوں گی۔“

”چھوڑ و یار! اُن کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تیرے کام آئیں گے، چل اب کھانا کھلا دے۔“ اس نے نوٹ جیب میں ڈال لیے اور مجھے وہ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں کی ہر شے سے بہت سلیقہ جھلکتا تھا۔ بیگم تصور علی امورِ خانہ داری کی ماہر معلوم ہوتی تھی کراکری تو اس نے بے مثال جمع کر رکھی تھی۔ ہر شے سے ایک نفاست ٹپکتی تھی۔ گام جو نے میرے لیے انڈے تل دیے تھے۔ وہ میں نے دو روٹیوں کے ساتھ کھا لیے۔ کچھ دہی بھی اُس نے رکھ دیا تھا، وہ بھی میں نے پیٹ میں اُتار لیا۔ بھوک چیز ہی ایسی ہے کہ جب وہ آ دھمکتی ہے تو پھر ہر شے اچھی لگنے لگتی ہے۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آیا۔ اب میرا وہاں ٹھہرنا کسی بھی طرح مفید نہیں تھا۔ دیر بہت ہو چکی تھی اور وہ لوگ پتا نہیں کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ جن کا میں گھر ناپ رہا تھا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو گام جو حیران رہ گیا۔ بولا ”یہ... یہ تو آپ کہتے تھے خراب ہو گئی ہے۔“

”اب تو چل ہی پڑی ہے۔ اچھا بھئی! خدا حافظ! میں جیسے ہی موقع ملا پھر آؤں گا۔ بیگم صاحبہ سے میرا اسلام کہہ دینا۔“ یہ کہہ کر میں کار کو باہر سڑک پہ لے آیا۔ دیکھنا مجھے یہ تھا کہ عرفان کا گھر جو مجھے اُس وقت بالکل ہی خالی نظر آتا تھا، کیا واقعی خالی تھا۔ میں نے کار کا رُخ پھر لال کرتی کی طرف موڑ دیا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا جب میں اُس مکان تک پہنچا تو وہاں مجھے دروازے پر ایک بڑا سا تالا نظر آیا۔ وہ لوگ واقعی وہاں سے جا چکے تھے میں نے اس کے ساتھ والے مکان پر دستک دی تو وہی بڑھیا باہر نکلی جس کی آواز میں چھت پر سن چکا تھا۔ میں اس وقت گاڑی کے اندر جا بیٹھا تھا۔

وہ دروازے میں نہیں رُکی بلکہ گلی میں اُتر آئی۔ بولی ”کیا ہے ویرا! تو نے دروازہ کھڑکایا ہے؟“

”ہاں ہاں جی! میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عرفان صاحب

کہاں چلے گئے؟ باہر تالا لگا ہے۔"

"ہائے ویرا! میں تو خود 'حریان' ہوں وہ سارا 'سمیان' ٹرنک پر لاد کر دو گھنٹے پہلے یہاں سے چلے گئے۔ کرائے دار تھے بچارے۔"

"مگر کہاں چلے گئے؟ مجھے تو ایک بہت ضروری کام تھا اُس عرفان سے۔"

"کوئی مینے شینے کی بات ہوگی ویرا! پر تُو اُسے بھول ہی جا۔ پتا نہیں ایتھے کتنے آئے اور چلے گئے۔ روتے ہوئے۔"

"اچھا! ایسا آدمی تھا وہ؟"

"ہاں تے ہور کی! آیاں غریب لوک ہاں پر کسی کا دینا تو نہیں ہے نا۔ پر اس کا دَر وَجّا لوگوں نے توڑ مارا۔ پتا نہیں کیا دھندا کرتا تھا وہ۔"

"یہ بہت بُری خبر سنائی ہے تم نے بے بے! مروا دیا تم نے بس۔" میں نے کار آگے بڑھادی اور وہ دوپٹے سے اپنی ناک پونچھتی ہوئی سامنے کے مکان پر جا پہنچی۔ میرا خیال ہے وہ انھیں یہی خبر سنانے گئی ہوگی کہ عرفان بھاگ گیا ہے۔ لوگ اس کو پوچھنے کے لیے آ رہے ہیں اور ایک گاڑی والا ابھی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔

میں نے کار حقبی بازار سے گزار کر قلعے کی طرف پھیر دی۔ وہاں سے راستہ جہلم روڈ کو نکلتا تھا۔ یہاں سے میں سیدھا جلسے کا رُخ کر سکتا تھا مگر وہاں جانے سے پہلے میں صدر جا پہنچا اور اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے میں نے عمدہ قسم کی ریڈی میڈ شیروانی اور کئی جوڑے خرید لیے۔ انھیں وہیں پہن کر میں چل دیا۔ دیر بہت ہوگئی تھی۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ مجھے فوراً ہی چک کھرانہ پہنچنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں وہاں حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ذہن میرا ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔ کسی نہ کسی طرح خدا کرے بڑے صاحب وہاں نہ پہنچے ہوں! اگر وہ وہاں جا ہی پہنچے ہیں تو خدا کرے کوئی ایسی بات ہو جائے کہ وہ جلسہ منعقد نہ کرسکیں مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ پروگرام اُن کا بالکل واضح تھا اور اُس کے مطابق ہی ان تلنگوں نے بھی منصوبہ بنالیا تھا اور میں اُسے ہر حال میں ناکام بنا دینا چاہتا تھا۔ مگر مجھے ابھی حالات کا اندازہ ہی نہیں تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ کیا کریں گے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ وہ کوئی ماہر نشانہ باز اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ وہ کوئی اور ہی پھڈا تیار کر رہے تھے۔ ورنہ مجھے معلوم ہو جاتا۔ اُن کے چار آدمیوں کو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ تو مجھے کوئی اہم لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ واردات کے لیے اُن کا طریقِ کار بالکل ہی مختلف ہوگا اور ابھی مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں؟

گاڑی میں میں نے روات پہنچ کر پٹرول ڈلوایا اور پھر میں سیدھا کہوٹہ جا پہنچا مگر وہ میری منزل تو نہیں تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چک کھرانہ وہاں سے کوئی چھ میل دور ہے۔ لوگ اس گاؤں کی طرف بڑی تعداد میں جا رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہاں آج جلسہ ہو رہا ہے۔ میں بھی اُسی راہ پر ہولیا۔

وہ گاؤں ایک بڑے سے ٹیلے کے عقب میں آباد تھا۔ دور سے ہی مجھے جلسے کے انتظامات دکھائی دینے لگے۔ شامیانے لگ چکے تھے اور ان کے اندر کرسیاں بچھا دی گئی تھیں جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے۔ جلسہ پانچ بجے شروع ہونا تھا، پروگرام یہی تھا۔ میں نے گاڑی جلسہ گاہ سے کافی دور پوری طرح مقفل کر کے کھڑی کر دی۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس ہتھیار کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے دونوں پستول اُن لوگوں نے ہتھیا لیے تھے۔ یہاں تک کہ میرے پاس ایک خنجر تک نہیں تھا اور یہ بڑے خسارے کی بات تھی۔

میں جیسے ہی شامیانوں کے اندر پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ جلیس اور وقاص وہاں موجود نہیں ہیں۔ کچھ اور لوگ تھے جو لاؤڈ اسپیکر کے تار درست کر رہے تھے۔ ریڈیو کے کچھ لوگ اپنا ساز و سامان لگا رہے تھے۔ وہ جلسے کی کارروائی ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ ڈائس پر بڑی سی میز کے پیچھے تین کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ ایک اُن میں شہ نشین تھی۔ دوسری دونوں کم تر نظر آتی تھیں۔ لوگ جلسہ گاہ میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اُن کے بیٹھنے کے لیے فرش پر دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ نہ وہاں جلیس نظر آ رہا تھا نہ وقاص۔ مرشد اور عرفان کا بھی وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا آخر؟ انھیں تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ مجھ پر اُن لوگوں نے بلاوجہ تو کمند نہیں پھینکی تھی، انھوں نے یونہی تو مجھے باندھ کر نہیں ڈال دیا تھا۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور تھی۔ ورنہ وہ اتنے پریشان نہ ہوتے۔ مجھ پر یوں پستول نہ تان لیتے۔ میں بلاوجہ تو اتنا خوار نہیں ہوا تھا۔ پورا دن میں نے اُن پر ضائع کر دیا تھا تو کوئی وجہ بھی تو تھی۔ جلسہ گاہ میں پولیس بھی موجود تھی۔ ایک سے ایک قدآور سپاہی وہاں آیا ہوا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اُن میں سے کون کون مجھے جانتا ہے۔ ایک آدمی لوگوں کو قطاروں میں بیٹھنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا کہ میں اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ جلسے کے منتظمین میں سے تھا اور سپاہیوں سے اس کی بن نہیں رہی تھی۔

"بھائی صاحب!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔

"جی فرمایئے؟" وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے جیب سے سگریٹ نکالنے لگا۔

"اس جلسے میں کون کون لوگ آ رہے ہیں؟"

"وہ جی اپنے بڑے صاحب ہیں پھر صدرِ پارٹی بھی ہیں اور بھی کئی لوگ آ رہے ہیں —— ریاض قدیر کی تقریر ہوگی، بڑا جشن میلہ رہے گا اپنے

چک کھرانہ میں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی جلسے کا ہی سن کر یہاں آیا ہوں۔ کیا بڑے صاحب آ چکے ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ سیدھے ریاض قدیر کی حویلی چلے گئے تھے۔ لوگوں کی شکائتیں سن رہے ہیں۔"

"جلسہ پانچ بجے شروع ہوگا؟"

"جی ہاں۔ وقت تو یہی ہے، پر دیر بھی ہو سکتی ہے۔ دربار ختم کر کے ہی وہ یہاں آئیں گے۔" آپ تشریف رکھیں، میرا خیال ہے کارروائی پانچ بجے شروع ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا قدیر صاحب سے مل لوں۔ کچھ کام ہے.... مجھے ان سے۔" یہ کہہ کر میں شامیانوں سے باہر نکل آیا اور گاؤں کی طرف چل دیا۔ گاڑی میں نے وہیں رہنے دی اور بھی کئی لوگوں کی کاریں وہاں موجود تھیں۔ جو میرے بعد وہاں آ ٹھہری تھیں اور اُن کے ڈرائیور اُن کے پاس ہی کھڑے تھے۔

ریاض قدیر کی حویلی دور سے ہی پہچانی جاتی تھی۔ میں کسی سے پوچھے بغیر وہاں جا پہنچا۔ دروازے کے اندر باہر سپاہی موجود تھے اور وہ ہر ایک پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ایسے موقعوں پر پولیس کچھ زیادہ ہی چوکس ہو جاتی ہے۔ اُن میں کئی انسپکٹر بھی تھے اور سب انسپکٹر بھی مگر شاید اُن میں کوئی بھی براہِ راست مجھے نہیں جانتا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ میں نے اس روز لباس تبدیل کر لیا تھا اور وہ ہلکی موتیے رنگ کی شیروانی دوسروں کو متاثر کرتی تھی۔ جوتے بھی میں نے بدل لیے تھے۔ اگر میں اُس لباس میں وہاں جا پہنچتا جس میں عرفان کی اسیری میں تھا تو نتیجہ اچھا نہ نکلتا۔ وہ مجھے وہیں روک لیتے مگر اب مجھے دیکھ کر وہ مؤدب سے ہوگئے تھے۔ ویسے تو وہ کسی کے لیے بھی دل میں کوئی ادب احترام نہیں رکھتے، سب کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ صرف ڈنڈے کی زبان پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی کوئی چوہدریوں ایسا لباس پہن کر اُن کے سامنے چلا جائے جو اُسے سجتا بھی بہت ہو تو وہ چونک اٹھتے ہیں۔

انسپکٹر نے مجھے ذرا دیر کے لیے دروازے پر روکا بولا "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں راجہ ریاض قدیر صاحب سے بات کروں گا —— میرا نام سردار کریم نواز ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ سامنے کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔" اُس نے راستہ چھوڑ دیا۔ تو میں خود کو سنبھال کر صحن میں داخل ہو گیا۔ وہ لوگ حویلی کے بڑے ہال جیسے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں بے دھڑک اندر جا گھسا۔ کوئی چالیس پچاس آدمی وہاں پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بڑے صاحب تشریف فرما تھے۔ راجہ ریاض قدیر اُن کے بائیں ہاتھ تھا اور رئیسِ اعلیٰ دائیں ہاتھ۔

میں جیسے ہی دروازے میں داخل ہوا میری نظریں بڑے صاحب پر جا پڑیں۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فوراً ہی مجھے پہچان گئے۔ اُن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری مگر وہ مسکراہٹ فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ کمرے میں اِدھر اُدھر کئی سپاہی کھڑے تھے اور ہر حرکت پر وہ نگاہ رکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے اپنی نظریں چُھڑائیں اور کرسیوں کی اگلی قطار تک جا پہنچا۔ وہاں بائیں ہاتھ دو کرسیاں خالی تھیں۔ ایک پر میں جا بیٹھا۔ اس وقت رئیسِ اعلیٰ صاحب ایک آدمی سے مخاطب تھے۔ اُس نے کوئی درخواست اُن کے ہاتھ میں دے رکھی تھی اور رئیسِ اعلیٰ اپنے سیکرٹری کو کچھ سمجھا رہے تھے۔

میں جب بیٹھ چکا تو بڑے صاحب نے پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہے ہوں کہ میاں تم اِدھر کیسے آ گئے؟ اُن کو یوں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا تو انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ انھوں نے اپنے قریب کھڑے ایک انسپکٹر کو اپنے پاس بلایا، وہ فوراً ہی بہت زیادہ مؤدب ہو کر اُن کے قریب جا ٹھہرا اور جھک کر اُن کی بات سننے لگا۔ چند ثانیوں تک وہ اُس سے کچھ کہتے رہے اور پھر رئیسِ اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے۔

ابھی کوئی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ وہ انسپکٹر گھوم کر میری طرف لپکا اور اگلی قطار تک آ پہنچا۔ دربار کی کارروائی جاری تھی۔ ایک اور آدمی اپنی درخواست لے کر اُن کے سامنے جا ٹھہرا تھا۔

انسپکٹر نے میری طرف جھک کر کہا "آپ سردار کریم نواز صاحب ہیں نا؟"

"جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔"

"آپ ذرا دیر کے لیے دوسرے کمرے میں آ جائیں۔ بڑے صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

میں نے فوراً ہی کرسی چھوڑ دی اور انسپکٹر کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے پہلو کے کمرے میں پہنچ کر مجھے بڑے ہی احترام سے صوفے پر بٹھا دیا۔

"آپ تشریف رکھیں، بڑے صاحب ابھی آپ سے بات کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر جا ٹھہرا۔ میرا دل بلّیوں اوپر اچھل رہا تھا۔ ایک عجیب سا جوش میرے اوپر غالب آ رہا تھا۔ میری یہ قسمت کہ بڑے صاحب مجھ سے خود بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس پر جتنا بھی فخر کرتا کم تھا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا یا رو! میں بالا بلند ہو گیا تھا۔ میری بات بن رہی تھی۔ کوئی مجھ پر واقعی بہت زیادہ مہربان ہو گیا تھا، اتنا مہربان کہ وہ بھری مجلس میں مجھے پہچان لیتا تھا اور اب وہ مجھ سے بات بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ فخر کی بات

اور کیا ہو سکتی تھی کہ میرے ایسا راندۂ درگاہ ایسے اونچے مقام پر جا پہنچا تھا۔ میں واقعی اُس گھڑی اپنے آپ میں نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اُس کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا تو باہر کے دروازے پر کھڑا انسپکٹر ایک دم مؤدّب ہو کر اندر آ گیا۔ دوسری طرف سے بڑے صاحب داخل ہو رہے تھے۔ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور اُن کے سامنے یوں سر جھکا لیا جیسے وہ میرے ماتا پتا ہوں، میرے محسن ہوں جن کے بے پناہ احسانوں تلے میرا وجود پوری طرح دب گیا ہو۔

بڑے صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے اور مسکراتے ہوئے بولے ”کیا حال ہیں سردار صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں؟ انسپکٹر! یہ دروازہ بند کرو اور دھیان رکھو کوئی آدمی اندر نہ آئے۔“

”جی بہت بہتر سر! ایسا ہی ہوگا۔“ اُس نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ اب ہم کمرے میں تنہا ہو گئے تھے۔

میرے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور بڑے صاحب میری ذہنی کیفیت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”آپ خیریت سے ہیں نا؟ بیٹھیں۔“

”میں… میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں جناب! کہ آپ نے مجھے یہ عزت دی۔ میری بات سننے کے لیے آپ یہاں تشریف لائے۔ خدا آپ کو اور زیادہ عزت دے، آپ نے میرا مان بڑھایا ہے۔“

”ارے بیٹھیں تو سہی سردار صاحب! خیر تو ہے، آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔“ وہ میرے قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اُن کی چھٹی حس کچھ زیادہ ہی بیدار تھی اور مردم شناسی میں اُن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ میرے چہرے پر لکھے پیغام کو شاید پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ سرگوشی میں بولے ”آخر ایسی کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے آپ کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔“

میں اُن کے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ تاکہ میں اُن کے کان میں بات کہہ سکوں ”میری اطلاع یہ ہے جناب کہ آپ کے دشمن اس جلسے میں آپ پر کاری وار کریں گے اور میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں۔ آپ…. آپ…. براہِ کرم اس جلسے میں شریک نہ ہوں۔“

”ہوں مگر…. آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”یہ لمبی بات ہے، پہلے آپ اپنے تحفظ کا انتظام کریں۔“

”مگر وہ کون لوگ ہیں، مجھے تفصیل سے بتائیں۔“

”میں ابھی ابھی اُن کی قید سے نکل کر آیا ہوں۔ اُن میں سے ایک کا نام عرفان ہے، دوسرے کا مُرشد، تیسرا آدمی وقاص ہے اور چوتھا جلیس۔ میرا خیال ہے وہ اس جلسے میں شامل ہوں گے البتہ وہ ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ میری اطلاع یہی ہے کہ سارا کام وہی کر رہے ہیں۔“

”مگر وہ ہیں کون؟“

”بالکل گمنام لوگ ہیں لیکن کسی نے سارا کام اُنھی کے سُپرد کر رکھا ہے اور اصل آدمی کا نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔“

”لیکن میں یہ جلسہ چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ لوگ میری تقریر سننے کے لیے دور دور سے یہاں آئے ہیں۔“

”آپ یوں کریں کہ کسی نہ کسی طرح خود کو اس جلسے سے الگ کر لیں، رئیسِ اعلیٰ تقریر کر لیں گے۔“

”ہوں، ٹھیک ہے۔ اُن لوگوں کو آپ پہچانتے ہیں مگر وہ جلسے میں موجود نہیں ہیں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”جی ہاں، وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔“

”بہت بہتر، آپ بے فکر رہیں۔ آپ مجھ سے دوسری ملاقات رات آٹھ بجے کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ اُسی وقت اُٹھ گئے مگر اُن کے چہرے سے کسی قسم کا تردّد نمایاں نہیں ہو رہا تھا۔ بولے ”آپ جلسہ گاہ میں چلیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ کسی بھی جگہ نظر آ جائیں تو پولیس کو بتا دیں۔“ یہ کہہ کر وہ عقبی دروازے سے دوسری طرف نکل گئے اور میں سامنے کا دروازہ کھول کر صحن میں جا پہنچا۔ انسپکٹر ابھی تک وہاں کھڑا تھا مگر ذرا ہٹ کر، مجھے باہر جاتے دیکھ کر وہ تیزی سے کمرے میں جا گھسا اور میں باہر نکل آیا۔

میں جب دوبارہ جلسہ گاہ میں پہنچا تو اس وقت بھی مجھے اُن لوگوں میں سے کوئی آدمی سامنے نظر نہیں آیا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔

ٹھیک پانچ بجے جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ جلسہ گاہ میں بنے ڈائس پر رئیسِ اعلیٰ شہ نشین پر جا بیٹھے۔ ریاض قدیر ان کے بائیں ہاتھ تھے اور دائیں ہاتھ مسعود احمد ہاشمی۔ سیکرٹری کے فرائض ندیم احمد کے سُپرد کیے گئے تھے۔ میں اس وقت جلسہ گاہ کی پچھلی قطاروں میں دری پر جا بیٹھا تھا۔ بڑے صاحب وہاں نہیں آئے تھے اور ندیم احمد نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا کہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ جلسے میں تشریف نہیں لا سکیں گے۔ جلسہ گاہ کے دائیں بائیں علاقے کے بڑے بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ مگر میں جان بوجھ کر وہاں نہیں بیٹھا تھا۔

جلسے کا آغاز کلامِ پاک کی تلاوت سے ہوا۔ پھر ریاض قدیر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا بلاشبہ وہ بہت اچھا مقرر تھا۔ سامعین دم بخود بیٹھے رہے۔ روسٹرم کچھ اس قسم کا تھا کہ اس کی دراز خاصی وزنی معلوم ہوتی تھی اور آدمی اس کے پیچھے چُھپ جاتا تھا مگر ریاض قدیر خاصے لمبے قد کا آدمی تھا اور وہ مجھے دور سے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ روسٹرم اُس کو چُھپانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ ابھی تقریر کر ہی رہا تھا اور اپنے کسی دعوے کو ثابت کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک زبردست دھماکا ہوا، روسٹرم ایک دم پاش پاش ہو گیا اور اُس کے ساتھ ریاض قدیر بھی فضا میں اُڑ گیا۔ اردگرد بیٹھے تمام لوگ اس دھماکے کی زد میں تھے۔ وہ ایسا خوفناک دھماکا تھا کہ کسی کو کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیسے گیا۔ کیونکہ پولیس نے ہر شے کو بہت دیکھ بھال کر وہاں رکھا تھا۔ جب میں نے بڑے صاحب کو وہ اطلاع دی تھی تو اس کے بعد وہ اور زیادہ مستعدی سے جلسہ گاہ کا جائزہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ دشمنوں نے وہاں کوئی بم بھی دھر رکھا ہے۔ وہ شاید ٹائم بم تھا جب ریاض قدیر نیچے گرے تو اُن کے پُرزے اُڑ چکے تھے اور ساری فضا دُھواں دُھواں ہو گئی تھی۔ چاروں طرف زبردست افراتفری مچ گئی۔ ریاض قدیر موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے تھے کسی اور کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ سب بھی شاید زخمی ہو گئے تھے۔ سیکرٹری ندیم احمد بھی بچ نہیں سکا ہوگا۔ سامنے بیٹھے ہوئے کچھ اور لوگ بھی زخمی ہوئے تھے مگر اُن کے زخم دیکھنے کی مجھے مہلت ہی کہاں تھی۔ لوگ پاگلوں کی طرح جلسہ گاہ سے نکل کر بھاگ اٹھے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہاں دھماکا بھی ہو جائے گا۔ میں سامنے پھیلے گرد و غبار میں پھنسے لوگوں کی طرف توجہ دیے بغیر تیزی سے اپنی کار کی طرف لپکا۔ اب مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ بڑے صاحب غضبناک ہو کر کہیں میری ہی گرفتاری کا حکم نہ جاری کر دیں۔ کیونکہ اطلاع تو میں نے ہی اُن تک پہنچائی تھی۔ وہ کسی وقت بھی مشتعل ہو کر مجھے قید کر سکتے تھے۔ کئی اور لوگ بھی بدحواس ہو کر کاروں کی طرف بھاگے۔

جیسے ہی میں گاڑی کے قریب پہنچا تب مجھے محسوس ہوا کہ دو آدمی اُس وقت تک اپنی گاڑی لے کر بھاگ نکلے ہیں اور وہ وقاص اور عرفان کے سوا اور کوئی نہیں تھے۔ مُرشد بھی اُن کے ساتھ تھا اور وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اُن پر میری نظر پڑی تو میں نے کار ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کی اور اُن کے پیچھے لپکا کوئی تین چار فرلانگ کا فاصلہ کچی پگڈنڈی پر طے کرنا پڑتا تھا۔ اُسے میں بلاخیز رفتار سے لپیٹتا ہوا آگے بڑھا تو ان کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی اور وہ ایک دم پختہ سڑک پر جا چڑھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میرے پاس ہتھیار کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اُن کا تعاقب ترک نہیں کیا۔ وہ غارت گر اُدھر کہیں گاڑی میں ہی بیٹھے رہے تھے۔ اپنا کام ختم کر کے وہ اس کا انجام بھی دیکھنا چاہتے تھے مگر اصل آدمی اُن کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور ریاض قدیر خواہ مخواہ ہی مارا گیا تھا۔ پتا نہیں مجھے اُنھوں نے جلسہ گاہ میں دیکھا تھا کہ نہیں۔ اگر دیکھا ہوتا تو شاید وہ پہلے ہی بھاگ لیتے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ پکّی سڑک پر چڑھتے ہی اُن کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ مگر اُن کا رُخ راولپنڈی کی طرف نہیں تھا، وہ سیدھے پنجاڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میری کار کو پیچھے لپکتا دیکھ کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے مگر اپنی رفتار اُنھوں نے کم نہیں کی۔ ابھی سورج چھپنے میں خاصا وقت تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ کسی اور راستے سے راولپنڈی ضرور جائیں گے۔ اُن کا اگلے کسی گاؤں سے کوئی تعلق مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دائیں بائیں کسی بھی طرف مڑ نہیں سکتے تھے۔ فاصلہ بالآخر کم ہونے لگا مُرشد کوئی اچھا ڈرائیور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ موڑ کاٹتے وقت شاید اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ اس کی یہ کمزوری بھانپ کر میں نے اُنھیں اگلے ہی موڑ پر جا لیا مگر حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ مجھ پر گولی نہیں چلا رہے تھے۔ گاڑی آگے بڑھا کر میں عین سڑک کے بیچ میں ہو کر چلنے لگا۔ اس وقت تک ہم چک کھُرانہ سے کوئی سات میل دور نکل چکے تھے۔ اب وہ میرے پیچھے ہو گئے تھے۔ اُن سے کچھ آگے نکل کر میں نے گاڑی کو بریک لگا کر ایک دم ریورس کیا تو وہ چونکے مگر بڑی دیر ہو چکی تھی مجھ سے بچنے کے لیے وہ بائیں ہاتھ مڑے اور سیدھے درخت سے ٹکرا گئے۔ ٹکر بہت شدید تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔ کار کی بائیں بتّی ٹوٹ گئی۔ مگر یہ کوئی بڑا نقصان نہیں تھا۔ اُن کی گاڑی کے دروازے آپ ہی آپ کھل گئے۔ رفتار اُن کی بہت تیز تھی اور اُنھیں اُمید ہی نہیں تھی کہ میں گاڑی کو پیچھے بھی لا سکتا ہوں۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو اس وقت تک مُرشد اور وقاص بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ اُن کے انجن کا بھُرکس نکل گیا تھا اور اسٹیرنگ مُرشد کے سینے میں دھنس چُکا تھا۔ یہی حال وقاص کا تھا۔ وہ بھی خود کو بچا نہیں سکا تھا، شیشہ ٹوٹ کر اس کے چہرے کو بُری طرح زخمی کر گیا تھا اور اس کا ایک ٹکڑا اُس کی گردن میں دھنس چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکے تھے۔ عرفان پچھلی نشست پر بیٹھا تھا مگر اس کے بھی ہوش ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ میں نے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اُسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ چوٹیں اُسے کچھ ایسی لگی تھیں کہ وہ نیم جاں ہو رہا تھا۔ اُس کو گاڑی سے کھینچ کر میں اپنی کار کی طرف لے گیا۔ سیٹ پر ڈال کر میں نے عرفان کی جب تلاشی لی تو اس کی جیب سے میرا پستول برآمد ہو گیا۔ کچھ رقم بھی اس کے پاس تھی مگر میں نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔

اسے پچھلی سیٹ پر ڈال کر میں نے وقاص کو باہر کھینچا مگر اس کا دم برابر ہو چکا تھا۔ گلے میں لگے شیشے کے ٹکڑے نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا اور مُرشد تو کسی بھی طرح وہاں سے اُٹھا لینے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اُن کو وہیں چھوڑ کر میں اپنی کار میں جا بیٹھا۔ سورج کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا۔ میں نے عرفان پر ایک نظر ڈالی اور گاڑی کو ٹاپ گیئر میں ڈال کر راولپنڈی کی طرف چل دیا۔ پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ وہ لوگ سڑک کی ناکہ بندی کر چکے ہوں گے۔ پتا نہیں اس فساد نے کیا صورت اختیار کر لی ہو۔ میں کس کس سے کہتا پھروں گا کہ میں بڑے صاحب کا دوست ہوں اور اُنھی کے دشمنوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔

میں نے کچھ آگے نکل کر کار کو پنجاڑ کی طرف موڑ دیا۔ وہ رات مجھے کسی اور جگہ گزار لینی چاہیے تھی۔ اُن لوگوں کے سامنے جانے میں سراسر نقصان تھا۔ وہ بہت بھڑکے ہوئے ہوں گے، اُن سے مجھے کوئی فائدہ پہنچنے کے بجائے زبردست خسارے کی صورت دیکھنی پڑے گی۔ سب سے پہلا تنک تو وہ مجھ پر ہی کریں گے کہ میاں سردار کریم نواز! یہ بتاؤ کہ تم نے بڑے صاحب کو یہ خبر جب دی تو ہمیں کیوں نہیں بتایا اور پھر تمھیں وہ اطلاع کیسے ملی؟ اُن کے دشمنوں کا تمھیں اگر سراغ ملا تھا تو تم نے ہمیں پہلے خبردار کیوں نہیں کیا اور پھر آخر تم ہو کون؟ کیسے تم ان لوگوں کا کھرا ناپتے پھرتے ہو؟ تمھارا اصلی نام کیا ہے؟ وہ تو سو سوال پوچھتے ہیں اور میں کس کس بات کا انھیں جواب دے سکوں گا۔ میری خاموشی تو انھیں اور زیادہ شک میں مبتلا کر دے گی۔ اُن کے سامنے اس رات تو بالکل ہی نہیں جانا چاہیے کہ اس میں نقصان ہی نقصان تھا، میری ترکی تو وہیں تمام ہو جاتی۔

شام گہری ہو چلی تھی اور میں عرفان کو ساتھ لے کر راولپنڈی سے اور زیادہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا ہی بہت تھا کہ بڑے صاحب کو میں نے ہلاکت سے محفوظ کر لیا تھا۔ اُن کے حاکم اعلیٰ ابھی میرا خیال ہے بچ ہی گئے ہوں گے۔ وہ بڑی رسوائی کا دور تھا۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اتنی زیادہ تھی کہ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ باہمی رقابتیں اتنی زیادہ بڑھ چکی تھیں کہ بھائی بھائی کا گلا کاٹتا تھا۔ ایسے میں وہ شہدے بڑے صاحب کو یونہی رواروی میں مار کر پھینک دیتے تو دوسرے ہی دن کوئی اور آدمی الحمدللہ کہتا ہوا اُن کی گدّی سنبھال لیتا اور اُن کا نام صرف اس لوح پر محفوظ رہ جاتا جس پر گزرے ہوئے وقت کا نام لکھا جاتا ہے اور بس۔ اگر وہ لوگ اس روز کامیاب ہو جاتے، اپنی سازش کو بروئے کار لے آتے تو پھر میں بھی شاید ہمیشہ کے لیے اپنی نگاہ میں شرمندہ اور ذلیل ہو کر رہ جاتا۔ میرا وہ دن ضائع نہیں گیا تھا مگر... مگر اُس کا کوئی انعام مجھے شاید ہی مل سکے کہ میں اپنی بے تدبیری سے بڑے صاحب کو اپنے بارے میں بھی اشتباہ میں ڈال آیا تھا اور انھیں بعد کے واقعات دیکھ کر یہی سُوجھا ہو گا کہ غلام جیلانی بھی اس سازش میں باقاعدہ شریک تھا۔ پھر کسی اپنے ہی مقصد کے لیے وہ وعدہ معاف گواہ بن کر سامنے آ گیا۔ اندازہ میرا یہی تھا اور میں اسی سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر سوچ رہا تھا مگر صورتِ حال میرے حق میں نہیں تھی، ہرگز بھی نہیں تھی۔

عرفان کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ حادثے نے اُسے بھی چُرمُر کر کے ڈال دیا تھا۔ اُسے طبّی امداد کی شدید ضرورت تھی مگر وہ میں اُسے کیسے مہیا کر سکتا تھا۔ پھر بھی میرا خیال یہ تھا کہ شاید میں کلر سیداں یا پھر پنجاڑ سے اُس کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر سکوں گا۔ کیونکہ وہ پچھلی سیٹ پر بہت ہی نڈھال ہو کر بیٹھا تھا۔ اتنا کہ اس کی مُندی آنکھیں کھُل نہیں رہی تھیں۔

راستے میں بائیں ہاتھ جو گاؤں میری راہ میں آیا وہ سبھراؤں تھا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے ایک راہگیر سے پوچھا تو اس نے یہی بتایا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرا محکم ہو رہا تھا۔ وہ چاندرات نہیں تھی۔ چاروں طرف تاریکی نے شام ہوتے ہی ڈیرے جما لیے تھے۔ ایک صرف تاروں کی روشنی تھی جو راستہ دکھاتی تھی۔ اُس گاؤں میں داخل ہو تو سب سے پہلے اسکول دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کار کی روشنی اس پر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکیوں کا مڈل اسکول ہے۔

میں سیدھا اُس کے دروازے تک جا پہنچا۔ ہارن کی آواز سن کر اسکول کا چپراسی باہر نکل آیا۔ وہ کوئی بہت ہی سادہ سا دیہاتی تھا۔ ہاں، اتنی تمیز اُسے ضرور تھی کہ جب کوئی گاڑی والا دستک دے تو آدمی کو اپنی کلغی تھوڑی سی جھکا لینی چاہیے۔ اس کے منہ میں لقمہ تھا جسے نگل کر وہ کار کے پاس آ گیا اور مجھے سلام کرنے لگا۔

اس کے سلام کا جواب دے کر میں نے کہا: ”تم کیا کرتے ہو بھئی یہاں؟ کیا نام ہے تمھارا؟“

”جی میرا نام محمد صادق ہے اور میں چپراسی ہوں، اس اسکول کا چپراسی۔“

”کوئی محکمۂ جنگلات کا یا کوئی اور ریسٹ ہاؤس ہے یہاں؟“

”ہے جناب! بالکل ہے مگر آپ کو دوسرے راستے سے جانا ہوگا۔“

”کیا تم میرے ساتھ آ سکتے ہو؟ مجھے راستہ معلوم نہیں ہے۔“

”جی کیوں نہیں، بس ذرا ٹھہریں، میں لالٹین لے لوں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، لالٹین لے لو ورنہ واپسی پر تمھیں پریشانی ہوگی۔“ میں نے اپنا سر پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ اتنا کہ اب آگے چلنے کی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ کوئی کہاں تک ایسی کلفتیں سہہ سکتا ہے یارو! کوئی حد بھی تو ہوتی ہو گی مگر میری اذیتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ میں ڈھیر ساری رقم لے کر اُن لوگوں کی طرف جا رہا تھا کہ اُنھوں نے سر پھر اسی اوکھلی میں دے دیا تھا۔ یہاں سے میں نے اُنھیں بڑی مشکلوں سے نکالا تھا اور اب کی بار آسیہ آپی کو بھی لے ڈوبی تھی۔ کتنا اصرار کیا تھا میں نے کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلے مگر وہ مانا ہی نہیں اور اب نتیجہ اس کے سامنے تھا ورنہ وہ بھی آج آزاد ہوتا، گرفتار ہوتی تو صرف آسیہ ہوتی یا اس کے سنگی ساتھی۔ وہ تو اس عذاب میں نہ پڑتا۔ مگر... میں کہوں کہ یہ بھی اس کی تقدیر تھی تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ وہ شاید اسی طرح اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا اور میں شاید دُور کھڑا اُسے دیکھتا ہی رہ جاؤں اور اس کی کچھ بھی مدد نہ کر سکوں۔ آخر کو آدمی ہوں میں، میری تدبیریں اگر ناکام ہوتی ہیں تو یہ کوئی بعید از قیاس بات نہ ہو گی کہ حالات مجھے کسی بھی طرح اس نتیجے پر پہنچانے میں مددگار ثابت نہیں ہو رہے تھے جس کے لیے میں کوشش کر رہا تھا۔ کیا پتا بڑے صاحب میری کوئی مدد کرتے بھی ہیں کہ نہیں۔ میں نے بس اندھا دُھند اس کنویں میں ایک ڈول ڈال دیا تھا۔ اب اس میں سے کوئی میری آرزو کا یوسف باہر آتا تھا کہ کوئی پتھر، یہ تو میں نہیں جانتا تھا مگر ابھی جو کچھ میں وہاں جلسے میں دیکھ آیا تھا اس سے تو مجھے کسی بھلائی کی امید نظر نہیں آتی تھی۔

اتنے میں محمد صادق، لالٹین اور لاٹھی اٹھائے باہر آ گیا۔ اس کا کُتّا بھی اس کے پیچھے تھا۔

”یار! اس کُتّے کو ہم کہاں رکھیں گے؟ اس کو کار میں ڈال کر سنبھال سکو گے؟“

”جی ہاں، یہ تو میں کر سکتا ہوں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ دوسری طرف سے اندر بیٹھ جاؤ۔“

اس نے کُتّے کو پُچکار کر گود میں اُٹھایا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا مگر صحت اس کی بہت اچھی تھی۔

”میرا خیال ہے میں نے تمھیں کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔“

”کوئی بات نہیں جی! میں واپس آ کر کھاؤں گا۔ گھر والی سے میں کہہ آیا ہوں کہ وہ روٹی لپیٹ دے۔ آپ کی خدمت تو میرا فرض ہے نا جی۔“ پھر وہ عرفان کی طرف دیکھنے لگا جو سیٹ پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔

”کدھر سے چلنا ہے؟ یہ میرے ساتھی ہیں۔ راستے میں حادثہ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی حالت ٹھیک نہیں رہی۔“

”اللہ رحم کرے۔ ویسے راستہ زیادہ دور نہیں ہے۔ ذرا بائیں ہاتھ چلیں۔ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس گاؤں کے پیچھے ہے۔ پہاڑی کی طرف آپ نے انھیں کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔“

”ڈاکٹر یہاں کہاں ملتا ہے۔ پریشان ہو کر میں ادھر آ گیا ہوں۔“

اس کے کہنے کے مطابق میں نے کار دوسری سمت موڑی اور پھر ہم اس راستے پر جا چڑھے جو ریسٹ ہاؤس کو جاتا تھا۔

جتنا راستہ اُوپر جاتا تھا، اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ڈرائیور کو کسی جگہ کوئی دِقت پیش نہ آئے۔ کئی مقامات پر راستے میں پتھروں کی سڑک ڈال دی گئی تھی۔ تاکہ راستہ ہموار رہے۔ دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور وہ پگڈنڈی یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ کسی بڑی ہی پُرفضا جگہ تک آدمی کی رہنمائی کرتی ہے۔ محمد صادق کا کُتّا سہما سہما سا بیٹھا تھا۔ شاید اُسے کار کی سواری نے پریشان کر دیا تھا۔ کوئی دو ڈھائی میل چلنے کے بعد مجھے ایک عمارت دکھائی دی۔ جس کے گیٹ کے دائیں ہاتھ ایک لالٹین روشن تھی۔

”یہ ریسٹ ہاؤس ہے جناب! آپ بے فکر ہو کر چلیں۔ اس کا چوکیدار گلاب خان میرا واقف ہے۔“ محمد صادق نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور آدمی بھی ریسٹ ہاؤس میں موجود ہو، کوئی جنگلات کا افسر۔“

”ہاں جی، یہ تو اُن کا گھر ہے۔ وہ جب بھی چاہیں آ سکتے ہیں۔ بڑے عیش کرتے ہیں وہ یہاں! مُرغے شُرغے تو عام ہی چلتے ہیں یہاں! بھلے لوگ ہوتے ہیں یہ جنگلات والے۔“

”کسی سے ملے ہو کبھی؟“

”کئی ایک سے ملا ہوں جناب جی! بڑے سخی لوگ ہوتے ہیں۔ دو چار روپے مجھے بھی دے ہی جاتے ہیں۔ کوئی آتا ہے تو گلاب خان سیدھا میرے پاس چلا آتا ہے۔ راشن پانی اُنھیں میں ہی سپلائی کرتا ہوں۔“ وہ اشارہ کر رہا تھا کہ مجھ پر بھی اس کا حق بنتا ہے۔

ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار گلاب خان بوڑھا آدمی تھا۔ وہ اُس وقت صحن میں کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔

”اوئے گلاب خان! صاب جی کے لیے کمرہ کھول دو بھئی! ان کے ساتھی بیمار ہیں، راستے میں حادثہ ہو گیا تھا۔“

”اللہ خیر کرے۔ کیا یہ محکمۂ جنگلات میں کام کرتے ہیں؟“

”نہیں بھئی! یہ بات نہیں ہے، ہم آپ کو کرایہ دے دیں گے جتنا کہو۔ میرے ساتھی بہت بیمار ہیں گلاب خان! ہمارے لیے تمھیں کھانا بھی تیار کرنا ہو گا۔ ابھی تو زیادہ رات نہیں گزری ہے۔“ میں نے کار سے نکلتے ہوئے کہا۔ صادق پہلے ہی کُتّے کو لے کر گاڑی سے اُتر گیا تھا۔

گلاب خان نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور بولا: ”صاب جی! یہاں رہنے کے آپ کو پچاس روپے دینے ہوں گے۔ کھانے کے پیسے الگ سے۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو گلاب خان! یہ لو، یہ سو روپے رکھ لو۔ ایک کمرہ کھول دو اور ہمارے لیے بہترین قسم کا کھانا تیار کرو۔“

اس نے وہ نوٹ بڑے حریصانہ انداز میں پکڑا۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی غیر سرکاری آدمی کے رہنے کا کرایہ اتنا زیادہ ہرگز نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس روپے ہو گا یا حد سے حد بیس روپے مگر وہ پچاس مانگ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ پھر بھی رعایت کر رہا ہے۔ مجھے اس کی بات مان لینے میں ہی عافیت نظر آتی تھی۔

اُنھوں نے عرفان کو اُٹھانے میں میری مدد کی اور ہم اُسے لے کر کمرے میں چلے گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ ریسٹ ہاؤس کا ماحول بہت ہی شاہانہ تھا۔ کمروں میں بڑے بڑے دو دو پلنگ بچھے تھے جن پر فوم کے بستر لگا دیے گئے تھے۔ صوفے، کرسیاں، قالین اور عمدہ قسم کی سنگھار میزیں ہر کمرے میں موجود تھیں اور بڑے قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ زیادہ زور غسل خانوں میں لگے قدِ آدم آئینوں پر تھا۔ پتا نہیں وہاں کون لوگ آتے تھے اور کیا کرتے تھے۔ گلاب خان کی حالت مجھے ٹھیک ہی لگتی تھی۔ اس کا لباس اُجلا تھا اور انداز بہت ہی

کاروباری۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ٹھیک ہے بچے! تیری ہر فرمائش میں پوری کروں گا۔ مجھے تو وہاں دو چار دن گزارنے ہی تھے۔ میں اتنی جلدی لوٹ کر راولپنڈی نہیں جانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں بڑے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ مجھے اپنی سلامتی مخدوش نظر آتی تھی۔ میرے بھلائی کے کام میں بھی انھیں سو خرابیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایسے میں، میں کس کس کو یقین دلاتا، میری نیت نیک تھی۔ میں کسی سازش میں ملوث نہیں تھا مگر وہ سارے ہی مرحلے گزر چکے تھے۔

عرفان ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اس کو میں نے بہت ٹھونک بجا کر دیکھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُسے چوٹ کہاں لگی ہے۔ میرا یہ خیال تھا کہ وہ صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ وہ ابھی تک نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ کوئی اتنے سخت کینڈے کا آدمی نہیں تھا۔ کوئی بڑے صدمے اُس نے شاید اٹھائے ہی نہیں تھے۔ ورنہ وہ اب تک ہوش میں آ چکا ہوتا۔

رات کو دس بجے کے قریب اُن دونوں نے میرے لیے کھانا تیار کر دیا۔ کچھ بھی نہیں تھا ان کے پاس ایک مرغ ہی تھے جن کو وہ بڑی فراخدلی سے روسٹ کر لائے تھے اور کچھ روٹیاں اور تو کوئی بھی چیز اُن کو میسّر نہیں تھی اور وہ اسے ہی بہت بڑی عیاشی سمجھتے تھے کہ صاحب لوگوں کو وہ بہت مرغ کھلاتے ہیں۔ عرفان تو کچھ کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں تنہا بیٹھ کر ہی سب کچھ چٹ کر گیا۔ بھوک نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ میں اچھی طرح اپنی کوہان بھر لینا چاہتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اگلا کھانا مجھے کس وقت اور کہاں ملے۔

کھانے کے برتن اُٹھانے کے لیے وہ دونوں میرے کمرے میں آئے تو میں نے انھیں پچاس پچاس روپے اور دے دیے۔

”یہ رکھ لو گلاب خان! پچاس صادق کے ہیں۔ تم دونوں نے بہت کام کیا ہے، یہ اس کا انعام ہے۔“

وہ دعائیں دینے لگے۔ دونوں ہی بہت خوش ہو گئے تھے۔ صادق تو اُسی وقت اپنی لالٹین اٹھا کر گاڑی کی طرف چل دیا۔ اُسے نیچے اُتار کر گلاب خان پھر میرے پاس آ گیا۔ بولا ”صاب جی! کوئی اور خدمت ہو تو بتا دیں، میں حاضر ہوں۔“

”اور کیا کر سکتے ہو تم گلاب خان؟ کھانا مل گیا، تم نے بستر بھی دے دیے اور کیا چاہیے مجھے اس جنگل میں۔“

وہ میرا یہ جواب سُن کر فوراً ہی لوٹ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خجالت اُبھر آئی تھی۔ میں اپنے ہی دکھوں کا مارا آدمی کسی عیش کا کہاں متحمل ہو سکتا تھا۔ بہت سے وہاں ایسے آئے ہوں گے جن کی جیبیں جنگلات کی دولت بیچ دینے کی وجہ سے رشوت سے بھری ہوتی ہیں۔ وہ اُس روپے کو خوب لُٹاتے ہوں گے۔ روپیہ تو میرے پاس بھی بہت تھا مگر..... میں اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

میرے ہاتھ میں وہ مٹی کا ڈھیر تھا۔ ابھی دوپہر کو ہی اُن لوگوں نے مجھ سے ساڑھے چھ ہزار روپے چھین لیے تھے۔ اُن میں وہ پندرہ سو بھی موجود تھے جو میں نے جانِ عالم کی جیب سے نکالے تھے۔ اس کا بھی مجھے بہت افسوس تھا۔

گاڑی کے ڈیش بورڈ سے میں احتیاطاً ساری رقم نکال کر میں لے آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس رقم کی مجھے زیادہ حفاظت کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ تو گلاب خان پر ہی میرا اعتماد جما تھا، نہ محمد صادق پر اور گاڑی باہر تنہا کھڑی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتے تھے ـــــ ڈیش بورڈ تک پہنچنا اور اس کا تالا کھول لینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

اُن نوٹوں کو میں نے الماری میں دھرے کسی کے پُرانے تھیلے میں ڈال لیا۔ وہ شاید گلاب خان کے بھی کسی کام کا نہیں تھا۔ کوئی شکاری اُسے وہاں ڈال گیا تھا۔ شاید گلاب خان کی بھی نظر وہاں نہیں پڑی تھی۔ ورنہ وہ وہاں شاید نہ ہوتا۔ اُس کی خوبی یہ تھی کہ اس کو میں بڑے اطمینان سے گلے میں لٹکا سکتا تھا۔ اس میں تسمے ایسے ہی لگے تھے اور پھر اس میں زِپ ایسی لگی تھی کہ وہ بڑے اطمینان سے بند ہو جاتی تھی۔

ان نوٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے کمرہ پوری طرح بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ عرفان ابھی تک بے ہوش تھا۔ بلکہ میرا خیال ہے اس کی نیم جاں حالت کچھ اور ہی خراب ہو گئی تھی حالانکہ زخم اس کے جسم پر قطعاً کوئی نہیں لگا تھا اور یہی بات میرے لیے حیران کن تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں لالٹین کی بتی نیچی کر کے نیند میں کھو گیا۔

میرا خیال ہے کہ میں زیادہ دیر نہیں سو سکا تھا کہ اچانک مجھے باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ اس کے پیچھے ایک اور انجن چیخ رہا تھا اور وہ شاید کسی جیپ کا انجن تھا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ رہا۔ کوئی بہت ہی خوفناک لمحہ میرے سر پر آ پہنچا تھا یا شاید وہ کوئی مسافر تھے جو رات گزارنے کے لیے وہاں آ گئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

گلاب خان نے بھی وہ آوازیں سُن لی تھیں۔ وہ برآمدے میں سویا ہوا تھا، فوراً ہی اُٹھ کر دروازے تک جا پہنچا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے دیکھا کہ پولیس کے کئی سپاہی اس وقت تک دیوار پھاند کر اندر آ چکے تھے۔ میرے سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی پاؤں بوٹوں میں پھنسلائے اور ریسٹ ہاؤس کا سیاہ کمبل اوپر ڈال کر میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لیا اور تھیلا کندھے پر لٹکا کر لالٹین کی بتی بجھا دی۔ ابھی میں دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ مجھے برآمدے میں بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔

”پکڑ لو اس کتے کو، میں آج اس کو ختم کر کے دم لوں گا۔“ کوئی انسپکٹر

بڑے غضبناک انداز سے بھونکا۔

برآمدہ تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے آواز سنتے ہی عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ اس وقت تک چاروں طرف پھیل چکے تھے۔ میرا وہ کمبل مجھے اندھیرے کا حصہ بنا رہا تھا۔ وہ سیدھے میرے کمرے کے سامنے جا ٹھہرے اور انھوں نے دروازہ اپنی ٹھوکر سے توڑ ڈالا۔ وہاں بھی بتی جل رہی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے بعد وہاں کوئی مسافر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس روشنی کا ایک ہالا مجھے اُن کے سامنے بے نقاب کر گیا مگر جیسے ہی روشنی نے میرا پردہ فاش کیا، میں اچھل کر عقبی لان میں جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں چلیں مگر اُن کی سمت کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ میں لڑھکتا ہوا دیوار تک جا پہنچا اور پیشتر اس کے کہ وہ دوبارہ نشانہ لے سکتے، میں احاطے کی پچھلی دیوار پر سے کود کر آگے نکل گیا۔

صورتِ حال بہت ہی اندوہناک ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

”رُک جا اوئے تیس مار خاں کی اولاد! غلام جیلانی! ہم تیرا سر چاہتے ہیں آج۔“ یہ اُس انسپکٹر کی آواز تھی جس نے قسم کھائی تھی کہ وہ مجھ کتے کو ختم کر کے دم لے گا۔ وہ نہ معلوم کیا کیا خرافات بکتا ہوا سپاہیوں سمیت دیوار پھلانگ کر عقبی حصے میں نکل آیا تھا۔ سامنے گھنا جنگل تھا، گھنا اور تاریک۔ تاروں کی روشنی بھی نیچے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میرے اوپر گھنے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے میں اُلجھی ہوئی نظر آتی تھیں اور راستہ جھاڑیوں سے یوں اٹا تھا کہ قدم اُٹھانا مشکل نظر آتا تھا۔ وہ جو عقبی دیوار پھاند کر آگے نکلے تھے، مسلسل میرا تعاقب کر رہے تھے اور وہ انسپکٹر برابر مجھے گالیاں دیتا چلا آ رہا تھا۔ غلام جیلانی، اتنے سارے شکاری کتوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے اُن سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اُنھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ بھی راتوں کی نیند برباد کر کے کسی کے حکم پر میرے پیچھے لگے تھے۔ اُنھوں نے بستر کا آرام تج رکھا تھا مگر..... وہ انسپکٹر اس روز مجھے یہ جتلا رہا تھا کہ اُسے یہ حکم ہے کہ مجھے زندہ یا مُردہ جس حال میں بھی ہو سکے پکڑ کر کسی کے سامنے لایا جائے۔ میں اس کی مجبوری سمجھتا تھا۔ بہت طعنے سُنے ہوں گے اُس نے۔ ساری پولیس کو کسی نے ذلیل کر دیا ہو گا کہ اُن سے ایک چھ فٹ کا آدمی گرفتار نہیں ہو سکتا ہے تو پھر وہ کس مرض کی دوا ہیں کروڑوں روپیہ اُن پر خرچ ہو رہا ہے۔ تو وہ کس لیے۔

ایک درخت کی اوٹ میں چھُپ کر میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی دس آدمی تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ انسپکٹر کے پاس پستول تھا۔ ان کی آواز بھی مجھے یہی احساس دلاتی تھی اور وہ دو دو کی صورت میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔ کسی سپاہی نے ریسٹ ہاؤس کی لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ وہ گدھا خود ہی میری گولی کا نشانہ بننے کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو اسے وہیں ڈھیر کر سکتا تھا مگر میرا ہاتھ نہیں اُٹھا۔ وہ بھی کسی گھر کا فرد تھا، کسی ماں کے ماتھے کا بَل تھا۔ کسی بیوی کا شوہر، کسی بہن کا بھائی تھا۔ میں اُسے کیوں مار دوں۔ وہ محض حکم کا پابند تھا اور بس۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھ پر پہلی باڑھ مارنے کے بعد اُن کے ہاتھ رک گئے تھے۔ شاید وہ بلاوجہ گولیاں ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

پھر اچانک ہی اُن کی آوازیں بند ہو گئیں۔ میرا خیال ہے کہ انسپکٹر نے اُنھیں کوئی اشارہ کر دیا تھا۔ اُن کی خاموشی نے مجھے پریشان کر دیا۔ سپاہی نے لالٹین کی بتی ایک دم نیچے گرا دی۔ میرا خیال ہے اُس نے لالٹین زمین پر ڈال دی تھی اور اب روشنی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ دم سادھ کر بیٹھ گئے تھے اور آوازوں پر دھیان دے رہے تھے۔ جنگل کے اُڑتے ہوئے پرندے جن کی نیند خراب ہو گئی تھی پھر درختوں پر بیٹھ رہے تھے۔ گولیوں نے اُنھیں رات کے اُس پہر بہت بے آرام کیا تھا ـــ وہ بہت ہی عجیب سی آوازیں تھیں۔ پرندوں کے پاؤں تلے جھولتی شاخیں اور پھر اُن کا اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹنا۔ جنگل کا سناٹا ذرا ذرا دیر بعد ٹوٹتا تھا اور یہی حال میرے دل کا تھا۔

سپاہیوں کو یقین تھا کہ میں ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوں اور وہ اس بنا پر میرے اردگرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مگر میں اُنھیں اتنی گھنی تاریکی میں قطعاً دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر آواز پر دھیان دے رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ میں درخت پر چڑھ جاؤں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایسے میں تو میں اُن کے لیے بہت آسان ہو جاتا۔ ان سب کی رائفلیں ایک ہی بار سیدھی اُٹھ کر مجھے چھید ڈالتیں۔

آخر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا اور جھاڑیوں سے اُلجھتا بچتا میں پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دراصل جیسے کھڑے تھے ویسے ہی میرے پیچھے بھاگ نکلے تھے۔ ورنہ وہ اپنے ساتھ ٹارچ لاتے، کوئی روشنی کا انتظام کرتے، مجھے پکڑنے کے لیے کوئی لمبا جال لے کر آتے اور اُنھیں مجھ سے یہ آنکھ مچولی نہ کرنا پڑتی جو کئی دنوں سے بلکہ کئی سالوں سے جاری تھی۔ میرا اُن سے بار بار مقابلہ ہوا تھا اور ہر بار میں جُھکائی دے کر آگے نکل جاتا تھا مگر اس رات صورتِ حال قطعاً پُرامید نہیں تھی۔ میرے بچ جانے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ کیونکہ سامنے ایک پہاڑی تھی اور ساری کی ساری جنگل سے ڈھکی ہوئی جس پر چڑھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کیونکہ اُس کا ارتفاع بڑھتا چلا جاتا تھا اور پولیس والے تو بالکل ہی نہیں جانتے تھے کہ ایسے علاقوں میں اُنھیں کرنا کیا ہے۔ یہ بات میرے حق میں جاتی تھی مگر وہ مجھے وہاں سے نکلنے تو دیتے۔

میں ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ میرے پاؤں تلے

دیتے خشک پتّوں نے انھیں چوکس کر دیا۔ ان آوازوں کو سنتے ہی انھوں نے ایک دم مجھ پر گولی چلادی۔ ایک نہیں کوئی چار رائفلیں چلی تھیں۔ میں اگر زمین پر نہ لیٹ جاتا تو شاید میں پھر کبھی نہ اُٹھ سکتا۔ میں اُسی حالت میں لیٹ کر فاصلہ طے کرنے لگا مگر پھر اچانک ہی ایک پتھر میرے ہاتھ آگیا اُسے اُٹھا کر میں نے تیزی سے بائیں ہاتھ پھینکا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس آواز کی طرف لپکے جو اس پتھر نے پیدا کی تھی۔ یہ ذرا سا وقفہ میرے بہت کام آیا اور میں اُٹھ کر بھاگنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں بلا خیز رفتار سے جھاڑیوں اور کانٹوں کو پھلانگتا ہوا میں کوئی دو سو گز دور نکل گیا مگر وہ اندھیرا میری راہ روکتا تھا۔ یہاں تک کہ میں تاریکی میں آگے بڑھتے بڑھتے ایک درخت سے بُری طرح ٹکرا گیا۔ میں شاید اندھا ہو گیا تھا۔ ٹکر ماتھے پر لگی تھی اور بڑی ہی شدید تھی۔ چند لمحوں تک تو مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں سکا۔ جیسے ہی میں سنبھلا، میں نے پھر آگے دوڑ لگادی مگر وہ اتنے پاگل نہیں تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں کس طرف بھاگ رہا ہوں میرے قدموں کی آواز نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور وہ اب پھر میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

اچانک ہی مجھے اپنے قدم روک دینے پڑے۔ ایک ہیولا سا مجھے دائیں ہاتھ چلتا نظر آیا۔ وہ کوئی سپاہی تھا۔ اُس نے مجھے دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فاصلہ یہی کوئی پانچ چھ گز کا ہو گا۔ درمیان میں دو درخت تھے، وہ اُن کی اوٹ میں رُک کر مجھ پر رائفل سیدھی کر رہا تھا کہ میں ایک دم زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ بکواس کرتے ہوئے گولی میری طرف چلادی مگر میں اسی لمحے درخت کی اوٹ میں جا پہنچا تھا۔ دوسری گولی چلانے کے لیے اس نے رائفل پھر لوڈ کرنا چاہی تو اس عرصے میں میں اُس پر جا پڑا۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح گھمانا چاہا مگر اس کا ہاتھ میں نے روک لیا اور فوراً ہی اپنا دوسرا ہاتھ... اس کی گردن پر ڈال دیا۔ اس کی رگِ احساس کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ ایک چھ فٹ کا جوان کیسے بے سُدھ ہو جاتا ہے۔ وہ جیسے کھڑا تھا ویسے ہی نیچے گر گیا۔ مگر اس کی گولی تمام سپاہیوں کو اپنی طرف متوجہ کر گئی۔ وہ تیزی سے اُدھر لپکے اور میرا جو ارادہ تھا وہ میں پورا نہ کر سکا۔ صرف اس کی رائفل اور گولیوں کی پیٹی لے کر ہی میں وہاں سے بھاگ سکا۔ اب میں زیادہ بہتر طور پر اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ میں دو چار کو مار کر ہی مرتا۔ پستول سے وہ رائفل کہیں زیادہ بہتر تھی۔ مگر میری تقدیر اس رات میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ سپاہی جس کے پاس لالٹین تھی، بتّی اونچی کر کے میرے پیچھے لپک رہا تھا اور میں اُسے نظر بھی آ رہا تھا۔ دوسرے بھی اس روشنی میں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن لوگوں نے پھر مجھ پر باڑھ ماردی۔ مگر اُن گولیوں میں سے کوئی بھی میرے حصے کی نہیں تھی۔ وہ شاید تھک گئے تھے یا پھر اُن کی نظر کام نہیں کرتی تھی۔ کوئی بھی گولی نشانے پر نہ بیٹھ سکی۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ گھنے درختوں کی اوٹ مجھے بچا رہی تھی اور اب راستہ زیادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جھاڑیاں جنگل کے اس حصے میں بہت کم ہو گئی تھیں۔

اچانک مجھے سامنے ایک گڑھا سا نظر آیا۔ اس کے ارد گرد گھنی جھاڑیاں اُگی تھیں۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اُس کے اندر جانا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ وہ ایک دم مجھ پر چڑھ آتے تو مجھے وہیں کونے میں گھیر کر ختم کر دیتے مگر وہ لوگ کچھ اتنی تیزی سے میرے پیچھے آ رہے تھے کہ میں اس گڑھے کے اندر جانے پر مجبور ہو گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک کھوہ ہے جس کا منہ بہت تنگ تھا اور اُس کے دائیں بائیں بڑی بڑی چٹانیں پڑی تھیں۔ میں نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے پھر ایک پتھر اُٹھا کر دائیں ہاتھ پھینکا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ پتھر کہیں بہت دور جا گرا ہے اس کے گرنے کی آواز مجھے سنائی نہیں دی مگر پولیس فوراً اس طرف متوجہ ہو گئی اور میں تیزی سے اس کھوہ میں داخل ہو گیا۔

اندر کی ہوا گرم تھی۔ رات کے پچھلے پہر جنگل میں جس سردی کا احساس ہو رہا تھا وہ اچانک کم ہو گیا۔ میں نے اس میں پہنچتے ہی ماچس جلائی۔ وہ اندر سے خاصا کھلا غار تھا جس کے پہلے حصے میں مجھے کوئی چرند پرند نظر نہیں آیا۔ رائفل میں نے لوڈ کر لی تھی اور پستول بھی میرے ہاتھ تلے تھا مگر مجھے اُن کو چلانے کی ضرورت ابھی تک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کوئی موقع ہی ایسا نہیں آیا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اُن سپاہیوں پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ گدڑ ریانما انسپکٹر ہی انھیں مسلسل آگے ہانک رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اتنی دور تک میرے پیچھے نہ آتے۔ غار میں جا کر مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ میں سمجھا میں بُدھ ہوں اور گیان دھیان کے لیے وہاں جا بیٹھا ہوں۔ سپاہی دوڑتے ہوئے میرے پیچھے لپک رہے تھے اور اب وہ اُن چٹانوں تک آ پہنچے تھے۔ انسپکٹر مسلسل مجھے بُرا بھلا کہہ رہا تھا اور سپاہیوں کو اُکسا رہا تھا کہ وہ میرا تعاقب جاری رکھیں۔ پتھر کی آواز نے اُن کو پہاڑی کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کھوہ کا منہ اتنا تنگ نہ ہوتا تو شاید وہ سیدھے اندر چلے آتے مگر وہ انھیں نظر ہی نہیں آئی اور وہ اوپر چڑھتے چلے گئے۔ یہ ذرا سی مہلت میرے لیے بہت کافی تھی اور میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ مجھے اُن سے چھپنے کا موقع مل رہا تھا۔

ابھی میں دوسری تیلی جلا کر سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا میں اُس کھوہ میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھ سے کوئی دو گز پرے کمبل میں لپٹا ایک آدمی مجھے بڑے غور سے تیلی کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت انگیز چمک تھی۔ میں نے تیلی سامنے پڑی گھاس کے ڈھیر پر پھینک دی۔ اُس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی تو میں پستول تان کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی موجودگی میرے لیے بڑی حیران کن تھی۔

"تو کون ہے بھئی اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"وہ.... وہ باہر گولی چل رہی ہے شاید، وہ تیرے پیچھے لگے ہیں"

"پر تو کون ہے بھئی! اس کھوہ میں کیا کر رہا ہے تو؟"

"میں مسافر ہوں"

"یہ کوئی ہوٹل ہے تیرے لیے! اور تو یہاں آرام کر رہا ہے نا؟ بڑا کرایہ دیتا ہو گا تو! انٹرکانٹینینٹل کا"

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بولا۔ "ایک سگرٹ مجھے دے دے"

"وہ تو میں دے ہی دوں گا، پر یار! تو میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ یہ لے، اندر کوئی اور جگہ بھی ہے؟"

"بڑی جگہ ہے اندر، اس سے آگے یہ کھوہ دریا تک پہنچ جاتی ہے۔ اس پہاڑی کے پیچھے دریا ہے"

"واقعی؟"

"ہاں، بڑی لمبی کھوہ ہے یہ۔ شاید اندر کوئی جانور بھی ہوں۔ میں آگے نہیں گیا۔ رات کو یہ جگہ بڑی خوفناک ہو جاتی ہے"

"پر تو یہاں کیا کر رہا ہے بھئی! کوئی ولی اللہ ہے تو؟" تب میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک لمبا کرتا پہنے ہوئے تھا اور اُس کے تن پر کچھ نہیں تھا۔ صرف وہ کرتا ہی اس کا ننگ ڈھک رہا تھا۔

"تجھے کیا! تو اپنا کام کر"

"عجیب آدمی ہے تو! میری جان پر بنی ہے، پولیس میرے پیچھے لگی ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ میں اپنا کام کروں! کیا کام کروں میں؟ کوئی کام ہے تو بتادے"

"تو میرا کھیڑا چھوڑ! اپنی فکر کر۔ وہ اندر آگئے تو تو مارا جائے گا۔ کسی کو مار کر بھاگا ہے تو؟" اس نے اپنی ٹانگیں پسارتے ہوئے غار کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ "یہ آگ بجھا دے یہ انھیں تیرا پتا بتادے گی"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی پاؤں سے وہ آگ بجھا دی۔ اب اُس کی راکھ ہی باقی رہ گئی تھی۔ جس میں چند جگنو اب بھی چمک رہے تھے۔ کھوہ میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔

"اگر ضرورت پڑے تو یہ لکڑی سلگا لینا۔ اس کی آگ بجھتی نہیں ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے پر.... میں کیا کروں دوست! میں بہت تھک گیا ہوں، تو اچھا ہے کہ شہروں اور بستیوں سے دُور اس جنگل میں وقت گزارتا ہے۔ پر.... تیرا گزارا کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے ایک اور سگرٹ اسے دے دیا۔ پولیس کے سپاہی پھر لوٹ رہے تھے۔ انسپکٹر بہت برہم تھا۔ اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس کھوہ کے اوپر ہی پھر رہے تھے اور وہ سپاہیوں کو بار بار ڈانٹ رہا تھا۔ وہ بڑا فاصلہ طے کر آئے تھے مگر ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچ سکے تھے۔

"تیرا نام کیا ہے یار؟ تجھے یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔ تیرا سگریٹ پھر بجھ گیا ہے، لا میں سُلگا دوں۔ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے تیرے پاس؟"

"ہے، ایک ہتھیار ہے میرے پاس۔ بہت زبردست ہتھیار"

"مذاق کرتا ہے تو، میں تیرا سگریٹ سُلگا دوں"

"نہیں، روشنی باہر جاتی ہے۔ تجھے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے"

سپاہی واقعی اس وقت کھوہ کے سامنے پھر رہے تھے۔ اگر گھنی جھاڑیاں اُن دو چٹانوں کے بیچ نہ اُگی ہوتیں تو وہ بھی اس غار میں اُتر آتے۔ میرے اور اُن کے درمیان فاصلہ کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

"چل مجھے غار کا پچھلا حصہ دکھا! مجھے بہت جلدی ہے"

"نہیں، بیٹھا رہ! ابھی وقت نہیں آیا۔ چُپکا بیٹھا رہ!"

"کمال کرتا ہے تو! وہ اب بالکل سامنے آگئے ہیں"

"نہیں، وہ شاید اِدھر نہ آئیں۔ یہ جھاڑیاں بڑی زبردست اوٹ ہیں۔ تجھے کیسے نظر آگئی یہ کھوہ؟"

"میں بہت جُھک کر چل رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ نظر آگئی۔ کیا تو یہاں تنہا رہتا ہے؟"

"کوئی اور نظر آتا ہے تجھے یہاں؟"

"باہر پولیس کے سپاہیوں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ شاید وہ مایوس ہو گئے تھے یا انھوں نے اپنا طریقِ کار بدل دیا تھا۔ کچھ ہوا ضرور تھا مگر مجھے اُس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ غار کے اس چھوٹے سے منہ پر پہنچے بغیر باہر کی صورتِ حال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہ کھوہ اپنے محلِ وقوع کی وجہ سے اب تک اُن کی نظر میں نہ آسکی تھی۔

"تو نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میرا نام گولاٹی ہے مگر فقیروں کا بھی کوئی نام ہوتا ہے بھلا"

"تو بکواس نہ کر، فقیر تو تو بالکل نہیں ہے۔ کوئی اور ہی چیز ہے تو۔ بتادے مجھے کہ تیرا پیشہ کیا ہے؟"

"پہلے تو بتا کہ تیرا کیا پیشہ ہے؟"

"میرا پیشہ قزاقی ہے یہ ہتھیار دیکھ رہا ہے نا تو، یہ رائفل پولیس والوں کی ہے" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر رائفل پر پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ بہت ہی نرم اور گداز تھا جیسے وہ کسی عورت کا ہاتھ ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی محنت کا کام نہیں کرتا تھا۔ ایسے ہاتھ یا فقیروں کے ہوتے ہیں جو مانگ کر کھاتے ہیں اور ایک تنکا دُہرا نہیں کرتے ہیں یا پھر پشتینی امیروں کے۔ کہ وہ بھی حکم

چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

اُس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بولا۔ "تو اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تھیلا کیسا ہے تیرے گلے میں؟"

"یہ شکاریوں کا تھیلا ہے۔ میں اس میں سر کاٹ کاٹ کر رکھتا جاتا ہوں۔"

"تو بکواس کرتا ہے، بالکل بکواس کرتا ہے تو۔ سروں کی فصل اتنی زیادہ نہیں ہو گئی ہے۔"

"ہو گئی ہے پیارے! اب تو ہر طرف سر ہی سر نظر آتے ہیں، بے مغز سر۔ جن کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ چل مجھے غار کا پچھلا حصّہ دکھا۔"

"نہیں، ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ تو چپکا بیٹھا رہ! تجھے بھوک تو نہیں لگی ہے؟"

"بھوک تو لگی ہے، پر تو کیا کر سکے گا؟" میں نے اُسے آزمانے کے لیے کہا۔ اُس نے فوراً ہی کسی جگہ ہاتھ مارا اور جب اندھیرے میں میرا ہاتھ ٹٹول کر اس نے مٹھی کھولی تو اس میں بھنے ہوئے چنے موجود تھے۔

"یہ اس ہوٹل کا ناشتا ہے۔ اس انٹرکنانٹل کا۔ یہی کھانا تھا نا تو نے؟"

"تو اچھا آدمی ہے یار! میں تجھے پسند کرنے لگا ہوں ــــ پر تیرا یہ بن باس میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"ٹھہر! میرا خیال ہے وہ پھر لوٹ رہے ہیں۔ یہ آوازیں سن رہا ہے تو؟"

"ہاں۔ اوئے وہ تو شاید ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

"اس جنگل کا چپّہ چپّہ چھان مارو! وہ ابھی باہر نہیں نکلا ہے۔ ادھر ہی ہے وہ نیچ ذات۔"

اُس انسپکٹر کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ پھر مجھے گالی دے رہا تھا۔

"دیکھ! یہ گھاس ہے نا، میں اسے دروازے پر ڈال دیتا ہوں، تو ادھر ہی بیٹھ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اندر بچھی گھاس اکٹھی کر کے دبے پاؤں دروازے کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے غار کا منہ پوری طرح بند کر دیا۔ گھاس اس نے ڈھیر ساری اکٹھی کر رکھی تھی اور وہ اس سے نیا کام لے رہا تھا۔ غار کا منہ بند کر کے وہ واپس آیا تو بولا۔ "اب تو بے فکر ہو جا، یہ گھاس انھیں اندر نہیں آنے دے گی۔ اس کا رنگ جھاڑیوں ایسا ہے۔"

وہ انسپکٹر تو پاگل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد اُس چٹان کے پاس آ ٹھہرا جو غار کے دہانے پر کھڑی تھی۔ سپاہی بھی اس کے پاس آ پہنچے تھے۔

"خان صاحب! اس جیلانی نے تو ہمیں ذلیل کر دیا ہے۔ آپ پہچانتے ہیں اُسے؟" یہ کسی سپاہی کی آواز تھی اور وہ بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

"کہاں یار! اُس کتے کو میں نے پہلے دیکھا ہوتا تو اُدھر چک گھڑانہ میں ہی نہ دبوچ لیتا اور بڑے صاحب کا یہ حکم ہے کہ اسے ہر حال میں گرفتار کرنا ہے۔"

"بڑے ظلم کی بات ہے خان صاحب! آج تو بڑے صاحب مارے ہی گئے تھے۔ کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔"

"ہاں۔ وہ تو اُن کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئے ــــ اُس کو دیکھو یار! ورنہ ہماری نوکری ختم ہو جائے گی۔" انسپکٹر پر مایوسی طاری ہو رہی تھی اور ہم نیچے بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں یہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس آدمی نے غار کے دہانے پر گھاس پھیلا کر بہت اچھا کیا تھا۔ ورنہ کوئی پتا نہیں وہ کیا کرتے۔ ہم اُن سے چند ہاتھ ہی تو دور بیٹھے تھے۔

اُس کے دیے ہوئے چنے میں بڑے شوق سے کھا رہا تھا۔ بھوک تو مجھے نہیں تھی۔ پھر بھی وہ چنے اتنے اچھے اور خستہ تھے کہ اُن کو کھا کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔

"یہ چنے اچھے ہیں نا؟"

"ہاں، تازہ بھنے ہوئے لگتے ہیں، بہت عمدہ ہیں۔"

"لے اب میں سونے لگا ہوں، مجھے نیند آ رہی ہے۔ تو بھی سو جا اور بھول جا کہ وہ تجھ تک پہنچ بھی سکتے ہیں۔ ابھی میرے اللہ کو یہ منظور نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمبل کو اور زیادہ کھول کر گھاس پر لیٹ گیا۔ وہ مجھے نظر بالکل نہیں آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بھائی۔ میں تو سو نہیں سکتا ہوں۔ ایسے میں بھلا کس کو نیند آ سکتی ہے۔"

"اللہ سے بہتری کی اُمید رکھ! وہ بڑا کارساز ہے۔" اس کی آواز دبنے لگی۔ اُسے واقعی نیند آ گئی تھی اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔

"تیرے پاس پانی ہے؟"

"ہاں، ٹھہر میں تجھے پانی پلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر اُٹھ گیا اور کچھ دور پڑے گھڑے میں سے پانی نکال لایا اور مجھے ٹٹول کر مٹی کا پیالہ میری طرف بڑھا کر بولا۔ "پتا نہیں وقت کیا ہو گیا ہو گا۔"

"ڈھائی یا تین بج گئے ہوں گے۔ جب میں ڈاک بنگلے سے نکلا تھا تو اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں تیلی جلاؤں؟ گھڑی میرے پاس ہے۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہ کرنا۔ تو کہتا ہے کہ تین بج گئے ہیں، حد ہو گئی۔ اور وہ....."

"تجھے کس کا انتظار ہے؟"

"ہاں۔ شنواری کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

وہ دوبارہ نہیں لیٹا۔ بلکہ غار کے منہ کی طرف چل دیا اور کچھ دیر تک وہاں گھاس کے گٹھے کے پیچھے بیٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا پھر

وہ میرے قریب آ گیا۔ بولا۔ "تو نے ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ شنواری اور رستم کا راستہ یہ لوگ کاٹ دیں گے۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔"

"کون لوگ ہیں یہ، غار میں ان کا کیا کام ہے؟"

"بہت منحوس آدمی ہے تو! وہ کسی طرح ٹل ہی نہیں رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھ سے سگریٹ اور ماچس طلب کیے۔ وہ میں نے اُسے دے دیے تو وہ غار کے اگلے حصّے کی طرف چلا گیا اور سگریٹ سلگا کر واپس آ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گیا تھا اور تیلی کی روشنی سے بہت ڈر رہا تھا۔

"اگر وہ آ جاتے تو میں اس غار کو پتھروں سے بند کر دیتا مگر پتا نہیں کیا بات ہے وہ ابھی تک نہیں آئے آخر تجھ سے کیا دشمنی ہے انھیں؟" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے سگریٹ لے کر میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ اچانک باہر مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی زبردست جنگ چھڑ گئی ہو۔ گولیاں کچھ اتنے تواتر سے چلیں کہ ہم دنگ رہ گئے۔ پولیس کے لوگ غار سے دور چلے گئے تھے ــــ گولیوں کی آوازیں فاصلے سے آ رہی تھیں جیسے کوئی بھاگتے ہوئے نشانے پر حملہ کر رہا ہو۔

گولاٹی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ "یہ..... یہ وہی ہیں، شنواری اور رستم۔ انھیں اسی وقت ادھر آنا تھا۔ تو نے اچھا نہیں کیا ہے استاد! اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا ــــ تیری بلا اُن پر جا پڑی ہے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ اگر اُن میں کوئی جان ہوئی تو وہ اُن سے بچ جائیں گے۔"

"مشکل ہے۔ وہ اتنے سارے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ دس بارہ تو ضرور ہی ہوں گے۔"

"ہاں، اتنے تو ہیں وہ مگر..... باہر اندھیرا ابھی تو بہت ہے ــــ اُنھیں شنواری اور رستم پاس نہیں پھٹکنے دیں گے۔"

باہر دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔

"اُن کے پاس پستول ہیں کیا؟"

"نہیں اسٹین گنیں ہیں۔ دونوں مسلّح ہیں۔ بڑی گولیاں ہیں اُن کے پاس مگر بندے کا کیا بھروسہ ہے۔" وہ ابھی تک میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی ہتھیلی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔ گولیوں کی آوازیں اب دور ہٹتی جا رہی تھیں۔ "اللہ معاف دے۔ تو نے ہمیں برباد کر دیا ہے استاد! آخر تو کیا کہہ کے نکلا تھا۔ اِدھر تو کبھی پولیس نہیں آئی تھی۔ یہ جنگل بہت محفوظ تھا۔" گولاٹی نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"اوئے پرے ہٹ کر بیٹھ! تو کیا زنانیوں کی طرح شور مچا رہا ہے۔ کچھ نہیں ہو گا انھیں، تو کہے تو میں خود اُن سے جا بھڑتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، میں نے یہ تو نہیں کہا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے تو تو خود پناہ گزیں ہے، میرے پاس جان بچانے کے لیے آ گیا ہے۔ تو ناراض ہو گیا ہے کیا؟ موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں دیکھو کیسے بچ کر نکل آیا ہوں۔"

"وہ... وہ رستم کو اگر پکڑ لیں تو سمجھیں گے کہ تو ان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اُس کی شکل صورت تجھ سے بہت ملتی ہے۔ خدا اُسے محفوظ رکھے۔" گولاٹی بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ لکڑی جلا دی جس کی روشنی نہیں بجھتی تھی۔ غار میں چاروں طرف اجالا سا پھیل گیا تھا۔ اُس لکڑی کو اُس نے دیوار کے ساتھ ایک چھوٹے سے پتھر کی اوٹ میں رکھ دیا۔ کمبل اُس نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور مونچھیں شاید اُس نے کبھی تراشی ہی نہیں تھیں۔ سر کے بال البتہ منڈے ہوئے تھے۔ وہ گلے میں ایک تعویذ باندھے ہوئے تھا۔ غار اس کے برابر اونچا تھا اور وہ اس میں بڑی آسانی سے چل سکتا تھا صرف اس کھوہ کا دروازہ ہی تنگ تھا۔ شاید وہ جان بوجھ کر تنگ کر دیا گیا تھا۔ اُس نے گھڑے سے پانی پیا اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر اُس نے کسی جگہ رکھی اسٹین گن اٹھالی اور اس کو لوڈ کرنے لگا۔

گولیوں کی آواز اب بہت مدھم ہو گئی تھی۔ بلکہ میں کہوں کہ معدوم ہو چکی تھی تو یہ زیادہ قرینِ قیاس بات تھی۔ کیونکہ وہ شاید بہت دور جا چکے تھے کسی کسی وقت گولی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ شنواری اور رستم اگر لوٹ کر آئے تھے تو وہی اُن کو اُلجھا چکے تھے۔ انجام کا نہ مجھے علم تھا نہ گولاٹی کو۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ لمبے سے کرتے کے نیچے کمر پر جانگیہ باندھے ہوئے تھا اور ایسا بھی کوئی چُست اور ننگ دھڑنگ آدمی نہیں تھا۔ وہ اسٹین گن اُس نے بڑی مضبوطی سے تھام لی تھی، انداز اس کا ایسا تھا جیسے وہ ساری عمر اسی کے ساتھ رہتا رہا ہو۔ وہ اس کے ہاتھ میں ناچ رہی تھی۔ ہتھیاروں کی اُسے سمجھ تھی مگر اس کے چہرے کا تردد ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"ہمیں اُن کا ادھر ہی انتظار کرنا ہو گا۔ یہی بہتر ہے۔ میرا خیال ہے میں باہر نہ ہی نکلوں تو اچھا ہے۔"

"تو تمھارا کیا ارادہ تھا۔ تم خود باہر جانا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ خدا کرے وہ دونوں اُن کے ہاتھوں سے بچ نکلے ہوں۔ ویسے وہ بہت ماہر نشانہ باز ہیں۔ اُن کی کوئی گولی خطا نہیں جاتی۔ پتا نہیں وہ کس کس کو مار چکے ہوں گے۔"

"نہیں، میرا خیال ہے وہ پسپائی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ پولیس اچانک ہی اُن کے سامنے آ گئی ہو گی۔"

"انھیں یہ بھی ڈر ہو گا کہ پولیس نے اُن کا ٹھکانہ بھی دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں! تھے تو وہ اِدھر ہی۔ ہوسکتا ہے وہ یہی سوچیں۔"

"میں سالا اندر ہی چوہے کی طرح دبک کر رہ گیا۔ پہلی گولی پر ہی مجھے اُن پر سوار ہو جانا چاہیے تھا۔ بہت بُرا ہوا۔ پر تیرا نام کیا ہے منحوس آدمی! آخر تو ہے کیا چیز؟" وہ جھنجلا گیا۔ اسے میں نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا تھا۔

"دیکھ میرا نام سردار کریم نواز ہے۔ میں دُکھوں کا مارا آدمی بہت خوار ہوا ہوں ان کے آگے۔ میری کہانی نہ ہی پوچھ گولاٹی! تو نہیں سمجھ سکے گا۔"

"کوئی سردار شردار ہے تو! ہُوں... پر تیری ان سے کیا دشمنی ہے؟"

"بس ایسا ہی چکر ہے۔ میں کسی وقت تجھے بتا دوں گا۔ فکر نہ کر اور اُن کی واپسی کی دُعا مانگ۔" مگر گولاٹی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ غار میں اسٹین گن لے کر اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اس نے ٹخنوں تک اونچے جوتے پہن لیے تھے۔ گولیوں کی بڑی پیٹی اس نے کُرتے کے نیچے کمر سے باندھ لی تھی اور پتلون بھی اس نے وہیں کھڑے کھڑے چڑھا لی تھی۔ وہ گویا کسی مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مایوس ہو کر وہ پھر غار کے اندر رکھے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

ہمارے دائیں ہاتھ سے تازہ ہوا غار میں آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گولاٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ کسی فراخ جگہ پر کھلتا تھا۔ اس ہوا میں ہلکی سی نمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ اُن لوگوں نے اپنے لیے بہت محفوظ جگہ کا انتخاب کیا تھا مگر یہ مجھے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ آخر ان کا پیشہ کیا ہے اور اس کے لیے انھیں چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُن کا نام تو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ورنہ کوئی نہ کوئی تو مجھ سے اُن کا ذکر ضرور ہی کرتا لیکن ایسے لوگوں سے میرا تعلق بھی کہاں رہا تھا۔ آسیہ کے گروہ کے آدمی تو مجھ سے ملتے تھے مگر وہ اتنا کہاں کھلتے تھے اور جو کھلے تھے وہ تو ایسے کسی آدمی کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ پتا نہیں یہ کون لوگ تھے۔ ان کا پیر طریقت کون تھا۔ اور کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں براہِ راست گولاٹی سے یہ بات پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

میں تو خود ہی اتنا دل شکستہ، خوار اور رسوا ہو رہا تھا کہ میں کسی اور کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ بڑے صاحب نے بالآخر میری گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔ انھیں یہی شک گزرا ہوگا کہ وہ سازش شاید میں نے ہی تیار کی تھی اور محض اُن پر احسان دھرنے اور انھیں اپنا ممنون بنانے کے لیے وقت سے پہلے اُن تک جا پہنچا تھا تاکہ میں اپنے لیے اُن سے کچھ اور رعایتیں حاصل کر سکوں۔ انھیں یہی خیال آیا ہوگا۔ ورنہ اس سازش کا اُن پر کسی بھی طرح انکشاف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ محض اتفاق تھا کہ میں نے اسٹیشن کے ڈائننگ ہال میں اُن کی سرگوشی سُن لی تھی۔ ورنہ مجھے کوئی اِلہام تو نہیں ہوتا تھا مگر اب میں خود کو اس سازش سے الگ ثابت کرنے میں ناکام ہوا جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ کب تک صبر کرتے، اُنھیں بالآخر یہ حکم دینا ہی تھا۔ وہ کسی ایسے مجرم کو کہاں تک ڈھیل دے سکتے تھے۔ خواہ وہ اُن کا کتنا ہی بڑا محسن کیوں نہ ہو اور اب تک تو یہ بات بڑی پھیل چکی تھی کہ غلام جیلانی کو کچھ اعلیٰ افراد کی زبردست حمایت حاصل ہے اور وہ اس الزام سے ہر حال میں بچنا چاہتے تھے۔ نتیجہ ظاہر و باہر تھا۔ مجھ پر زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ بڑا ہتھیار اُن کے پاس پولیس ہی کا تھا۔ وہ اُسے کسی بھی وقت میرے پیچھے ڈال سکتے تھے۔ میں تنہا آدمی اُن کا کہاں تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں پر تو میں اپنا سر اُن کے آگے ڈال دیتا۔ یہ تو میری تقدیر تھی جو اَب تک مجھے بچاتی چلی آئی تھی ورنہ میری گرفتاری میں اُن کی طرف سے کوئی کسر تو نہیں رہ گئی تھی مگر اب جو معاملہ میرے سامنے تھا، اس کو سلجھا لینا مجھے مشکل نظر آرہا تھا۔ میرا پہلا ہی تیر خطا چلا گیا تھا۔ بڑے صاحب میرے ممنون ہونے کے بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھے تھے اور یہ بالکل قدرتی امر تھا۔ وہ جو کچھ بھی میرے خلاف کرتے کم تھا کہ میں نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے تھے۔ ورنہ عرفان، جلیس، وقاص اور مُرشد کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ بالکل ہی بے وقعت لوگ تھے۔ جن کا شاید نہ کوئی ساتھی تھا نہ مستقبل۔ وہ بہت غیر معروف قسم کا گروہ تھا۔ البتہ اتنا انھیں ضرور معلوم تھا کہ اگر وہ سامنے ہے اور ان کا گھر بھی لوگوں کی نظر میں رہا تو پھر مجھ جیسا کوئی بھی آدمی ان کا ناطقہ بند کر سکتا ہے۔

گولاٹی ابھی تک سامنے کے پتھر پر بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ غار کے اندر مجھے اپنے اردگرد تو اور کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال ہے ان کی ضرورت کی چیزیں کہیں بہت آگے پڑی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے آدمی ایسی چیزوں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ہے۔ اس کی روزمرہ کی ضرورتیں تو ہر حال میں پوری ہونی چاہئیں۔ پتا نہیں وہ غار کہاں تک طویل تھا اور اس کے اندر انھوں نے کتنے خانے بنا رکھے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی دور میں دریا کا پانی اس راہ سے گزرتا ہوگا۔ پھر وہ پانی پیچھے ہٹ گیا یا اپنی اصل سطح سے نیچے گر گیا۔ کچھ ہوا ضرور تھا کہ وہ غار بن گیا اور اب وہ ان کے ہاتھ آگیا۔ بلاشرکتِ غیرے وہ اس کے مالک بن بیٹھے تھے۔

کبھی کبھی گولاٹی کے چہرے پر میرے لیے شدید نفرت اُبھرنے لگتی تھی۔ خدا جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اُسے میرا وجود ناقابلِ برداشت دکھائی دینے لگتا تھا مگر صرف چند ثانیوں کے لیے پھر اُس کے چہرے پر خوشگوار تاثر اُبھرنے لگتا شاید وہ اپنے آپ سے اُلجھ رہا تھا۔ اسے اپنے ہی خیالات سے ندامت ہونے لگتی تھی۔

رات کے ساڑھے چار بج گئے۔ اس وقت تک چاروں طرف مکمل سناٹا چھا چکا تھا۔ پولیس وہاں سے جا چکی تھی یا پھر اُن کا مرکز بدل گیا تھا۔ کچھ ہوا ضرور تھا کہ اچانک گولاٹی اپنی جگہ سے اُچھل کر غار کے منہ کی طرف لپکا۔ وہاں گھاس کا گٹھا کوئی شخص پیچھے ہٹا رہا تھا۔ جلتی لکڑی کی ہلکی سی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ ایک گرانڈیل جوان غار کے اندر آرہا تھا۔ اُس نے گھاس ٹھوکر مار کر پرے ہٹا دی۔ اس کے بال شانوں تک بڑھے ہوئے تھے اور وہ کُرتے کے اوپر کالی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں اُس نے اسٹین گن سنبھال رکھی تھی۔ اُس کے پیچھے ایک اور آدمی آرہا تھا۔ وہ بھی دُہرا ہو کر غار کے اندر آگیا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل تھا اور وہ قمیص شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس کا انداز بہت ہی کرخت نظر آتا تھا۔

"خیر کہ تو اِدھر زندہ ہی ہے نا ماڑا!" وہ آدمی اپنے سامنے گولاٹی کو دیکھ کر بولا اور اس کے گلے سے لگ گیا۔ "آج تو مارے ہی گئے تھے ہم۔ یہ رشوت خور پولیس والے اِدھر کیا کر رہے تھے؟"

"شنواری! میں تیرے لیے دعا مانگ رہا تھا، قسم سے دل میرا دھکا دھک بول رہا تھا۔ تو ٹھیک ہے نا رستم!"

"بہت خوار ہوئے آج تو۔ آخر یہ پلیسے یہاں کیا کر رہے تھے؟ ہم اوپر پہاڑی پر پہنچے تو دغادغ شروع ہو گئے وہ۔ اوئے یہ کون ہے! کسے بٹھا رکھا ہے تم نے اندر؟" رستم ایک دم اُن کو بھول کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اسٹین گن اُس نے سیدھی کر لی تھی اور وہ یوں آگے آرہا تھا، جیسے کسی دشمن پر دھاوا بول رہا ہو۔ شنواری بھی حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک حیران کن تھی اور اس معاملے میں وہ گولاٹی کو بھی مات کر رہا تھا۔

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"یہ... یہی وہ آدمی ہے جس کے پیچھے پولیس لگی تھی۔ یہ اُن سے بچتا بچاتا یہاں تک آ پہنچا۔ اللہ نے ہی اس کا پردہ رکھا آج۔" گولاٹی نے رستم کے پاس پہنچ کر کہا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹا سیدھا ہاتھ ہی نہ جھاڑ دے۔ گولاٹی کی آواز سن کر وہ کچھ مدھم پڑنے لگا اور میرے قریب آ کر اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے تم کوئی لمبا ہی ہاتھ مار کر نکلے ہو گے۔ وہ خواہ مخواہ کسی کا یوں پیچھا نہیں کرتے۔ ویسے وہ ہمارا ایک آدمی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کس کا ذکر کر رہے ہو تم؟"

"میں وارثی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ آج اِدھر ہی آرہا تھا کہ پولیس کی گولی سے شدید زخمی ہو گیا۔ ہم اُس کی مدد نہ کر سکے۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔"

"خیر کہ ماڑا، وہ وارثی خود کو شریف آدمی ثابت کر سکتی ہے بھئی! چاہے وہ اس کا علاج بھی کرے گا اور چھوڑ بھی دے گا۔ کہے گا کہ اُن کو غلطی لگ گیا۔" شنواری نے میرے پاس آ کر کہا اور وہ بھی مجھ سے ہاتھ ملانے لگا۔ اس کا پنجہ واقعی بہت مضبوط تھا۔ وہ میرے قریب پڑے پستول اور رائفل دیکھ کر بولا۔ "تو تم اِدھر ہتھیار بھی لایا ہے۔ یہ پُلس کا پکا تین سو تین رائفل ہے۔"

"ہاں۔ یہ میں نے ایک سپاہی سے چھینا تھا۔ مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ گولاٹی نے میرا بہت خیال رکھا مگر یہ کہہ رہا تھا کہ میں بہت منحوس آدمی ہوں۔"

"ماڑا اس کا بھی خیال ٹھیک ہی تھا۔ اِدھر تمھارے آنے کا خوشی میں پولیس نے دَنادَن شروع کر دیا۔ کوئی گولی ہمیں لگ جاتا تو پھر کیا ہوتی۔ بہت ذلیل کیا اُن لوگوں نے۔ وہ تو جاتے ہی نہیں تھے۔ اَچھا ہُوا وارثی اُن کے ہتّے چڑھ گیا اور وہ اُسے لے کر اطمینان پا گیا۔"

"پر تُو ہے کون؟ بھئی اس غار کا تمھیں کیسے پتا چلا؟" رستم نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُس نے سگریٹ سلگا لیا تھا اور اب وہ گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔

"بس ایسے ہی میں یہاں تک آ پہنچا تھا۔ اِس کے منہ پر پہنچا تو سیدھا اندر آگیا۔"

"بیٹھ جا پیارے! بیٹھ جا اور یہ بتا کہ تیرے ساتھ ہوا کیا ہے اور تُو کیا کر رہا ہے؟" رستم نے اپنا سر پتھر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت لمبی بات ہے میرے بھائی! میرا اصل نام غلام جیلانی ہے اور میرے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے۔"

"غلام جیلانی؟ یار گھپلا نہ کر، کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ تُو غلام جیلانی ہے؟" رستم ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے تحیّر نے مجھے بھی حیران کر دیا۔

"ثبوت تو میرے پاس کوئی بھی نہیں ہے۔ یہی کافی نہیں ہے کہ میں غلام جیلانی ہوں اور میرا دوسرا نام سردار کریم نواز ہے۔ اب تم سے کیا پردہ یارو!"

"تم... تم وہی تو نہیں ہو جو لاہور جیل سے بھاگ نکلے تھے؟"

"ہاں۔ تم نے ٹھیک پہچانا ہے مجھے۔ میں وہی ہوں مگر... مگر تم کہاں تھے وہاں؟"

"میں بھی انھی دنوں وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ مجھے چودہ سال کی سزا ہوئی تھی۔ جس میں سے میں نے تین سال گزار لیے تھے کہ اُدھر زبردست

لوٹا ہوگیا۔ اُس فساد میں میں بھی باہر آگیا۔"

"حد ہوگئی! خوب ملے ہو بھئی! کمال ہے! اسی خوشی میں ایک بار پھر مجھ سے گلے مل لو رستم! کیسے کیسے لوگ پڑے ہیں یہاں!"

میں نے فرطِ مسرت سے آگے بڑھ کر اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ میرا خیال ہے کہ مقدمے کے دوران ہی اس نے مجھے وہاں دیکھا ہوگا۔ بعد میں سب کو پتا چل گیا تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہوگئی ہے بہت سے لوگ میرے زبردست مدّاح تھے۔ شاید رستم کو یہ بھی معلوم تھا کہ میرے ہاتھوں میں کیسا جادو ہے۔ وہ میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولا "میں ان انگلیوں کے صدقے! یہ اب بھی اپنا کام دکھاتی ہیں کہ نہیں؟"

"ہاں! ان سے میں نے بڑے بڑے تنے ہوئے سر جھکا دیے تھے رستم! یہ انگلیاں میرے بہت کام آئی ہیں۔"

"اُدھر تم کہیں پاکٹ ماری تو نہیں کرتی تھی؟"

"نہیں بابا لوگ! یہ بات نہیں ہے میں ایک فن کی بات کر رہا ہوں۔"

"اسے سمجھنے کی کوشش کرو شنواری! یہ ایک آدمی نہیں بلکہ پورا گروہ ہے۔ اب تُو فکر نہ کر، سمجھ لے کہ ہمارے دن پھر گئے ہیں۔" رستم نے خوش ہو کر کہا۔

"اوئے گولاٹی! اِس کی کوئی خدمت خاطر بھی کی ہے تُو نے کہ نہیں؟ یہ تو دُولھا آدمی ہے یارو!" رستم نے اس لکڑی کی روشنی میں مجھے بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ چنے اور ایک پیالہ پانی ہی میں اسے دے سکا ہوں اور یہ وقت کوئی کھانے کھلانے کا تو نہیں تھا۔" شنواری بھی گھاس پر ہمارے پاس ہی آبیٹھا۔ وہ بھی گہری دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔

"مگر تم آئے کہاں سے ہو رستم اور اس گولاٹی کو کیوں یہاں چھوڑ گئے تھے؟"

"اسے کئی دنوں سے بخار آرہا تھا۔ گلے میں درد بتا تا تھا اپنے، اس لیے اسے چھوڑ گئے ہم۔ اب کیا حال ہے تیرا گولاٹی؟"

"آج تو ٹھیک ہی رہا ہوں۔ وہ گولیاں کام دکھا گئی ہیں، اچھی تھیں وہ۔"

"تجھے ملیریا ہوگیا تھا اور وہ گولیاں اسی لیے تھیں۔"

"مگر تم آئے کہاں سے ہو؟ دھندا کیا کرتے ہو آج کل؟"

"یار! کیا پوچھتے ہو، مزہ نہیں آرہا ہے۔ دھندا کوئی خاص نہیں ہے۔ بڑی سڑک پر نکل کر کوئی نہ کوئی بس لُوٹ لیتے ہیں۔ کبھی دس بیس ہزار مل جاتے ہیں، کبھی کچھ بھی نہیں۔ مزہ بالکل نہیں آرہا ہے۔"

"یہ تو کوئی دھندا نہ ہوا۔ نہیں یار! کچھ شرم کرو، مسافروں پر ہاتھ اٹھانا کوئی شرافت نہیں ہے۔"

"تو اور کیا کریں ہم؟ پولیس نے اتنا پریشان کر دیا تھا ہمیں کہ مجبوراً ہم کئی مہینوں سے یہاں پڑے ہیں۔ میں نے ایک جتھا بنایا تھا پچھلے سال مگر وہ سب کے سب اندر ہوگئے۔ ایک واردات کے لیے اجالہ گئے تھے کہ موقعے پر ہی پکڑے گئے۔ پھر میں کچھ بھی نہ سوچ سکا اور ادھر آگیا۔ پھر یہ شنواری اور گولاٹی مل گئے اور ہم نے اس غار میں پناہ لے لی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ ابھی تک تو پولیس سے بچے ہوئے ہیں مگر کب تک؟ آج تو میں سمجھا تھا کہ وہ ہمارے ٹھکانے تک پہنچ چکے ہیں مگر شکر ہے کہ وہ کسی اور چکر میں تھے۔"

"کچھ جمع جتھا بھی ہوگا تمھارے پاس؟"

"کچھ بھی نہیں بھائی۔ کوئی دو چار ہزار ملتا ہے تو اُدھر ہم تماشبینی میں صرف کر آتے ہیں۔ کچھ جُوئے میں ہار دیتے ہیں۔"

"اور رہتے تم یہاں ہو؟"

"جب بہت تنگ آتے ہیں تو پھر ہم تینوں شہر جا پہنچتے ہیں کچھ کھیل تماشا کر کے لوٹ آتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو کچھ "کماتے" تھے وہ سارے کا سارا عیاشی میں خرچ کر دیتے تھے۔

"پر تم بتاؤ، تمھارا کیا دھندا ہے آج کل؟ اور یہ تھیلا کیسا لٹکا رکھا ہے تم نے گلے سے؟"

"یہ.... دیکھ لو، خود ہی دیکھ لو۔" میں نے وہ تھیلا کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اتنے سارے نوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"یہ.... نوٹ تمھیں کہاں سے مل گئے! بالکل نئے لگتے ہیں۔ کوئی بنک لوٹا ہے تم نے؟"

"بس ایسے ہی ہاتھ لگے تھے یہ۔ رکھ لو، جتنی ضرورت ہو رکھ لو۔"

"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

"مجھے لگتا ہے تم آج بالکل ہی خالی ہاتھ واپس آئے ہو۔" گولاٹی نے کہا۔ وہ بھی اُن نوٹوں کو دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہوگیا تھا۔

"لے لو ماڑا! کیا ہرج ہے۔ کچھ رقم لے لو۔" شنواری بولا۔

"لے لیں گے بھئی! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ضرورت ہوگی تو لے لیں گے۔ اوئے گولاٹی! اب تو شاید صبح ہوگئی، کوئی چائے شائے بنا دے۔"

"ہاں! میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غار کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔

رستم نے تھیلے کو بند کر کے مجھے واپس کر دیا۔ بولا "یہ خاصی بڑی رقم ہے، کم از کم ایک لاکھ تو ضرور ہی ہوگی۔"

"ہاں! تمھارا اندازہ صحیح ہے مگر یہ بتاؤ وہ آدمی جس کا تم ذکر کرتے ہو، وارثی نام ہے نا اس کا؟"

"ہاں! کرم وارثی نام ہے اس کا۔"

"اس نے اگر پولیس کو اس جگہ کا پتا بتا دیا تو کیا ہوگا؟"

"نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ اُسے معلوم نہیں ہے کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور پھر ہم تو اُس کو یونہی ساتھ لے آئے تھے، بچارا بہت بھوکا تھا اور ہم اُسے کچھ کھلانا چاہتے تھے۔"

"مگر وہ تمھارے ہاتھ کہاں سے آیا؟"

"اس کے بازو پر گولی لگی تھی اور وہ راستے میں بے آسرا پڑا تھا۔ ہم اُسے ساتھ لے آئے۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کا نام کرم وارثی ہے اپنے گاؤں کا نام بھی وہ بتا رہا تھا۔ وہاں وہ اسکول ماسٹر ہے مگر اس کی فکر نہ کرو، شنواری ٹھیک کہتا ہے۔ وہ خود کو بچا لے گا۔ لو یہ سگریٹ پیو۔" اس نے پیکٹ میرے آگے رکھ دیا۔ وہ سگریٹ اس نے شاید بس کی کسی سواری سے چھینے تھے۔

"اُس خانہ خراب کی بات نہ کرو بھئی! یہ بتاؤ کہ پولیس تمھارا پیچھا کیوں کرتی ہے؟ وہ پولیس والی کیوں ادھر بمباری کرتی ہے؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے شنواری! اُنھیں میری خبر مل گئی تھی اور وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگئے۔ یہ غار نہ ملتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ مجھے بہرحال یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ماڑا وہ اپنے کچھ آدمی اِدھر کھڑی کر گئی ہوگی۔ وہ پولیس والی اتنا چوکس ہوتی ہے.... مگر خیر ہے، اُم اس غار کو بند کر دے گا۔"

"وہ کیسے۔ کیا کرو گے تم؟"

"اِدھر پتھر ایسی ایسی ہے کہ وہ بالکل قدرتی لگتی ہے۔ ہم اس سے غار کا منہ بند کر دے گا۔ یہی ہوگا ماڑا، ہاں۔"

"کیوں رستم تمھارا کیا خیال ہے؟"

"یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ سب تو ہو سکتا ہے۔ ہم بہت دنوں سے یہاں پڑے ہیں۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے رستم! میں سمجھ نہیں سکا ہوں آخر یہاں پڑے رہنے کی کیا تُک ہے؟ کس لیے تم یہاں بیٹھے ہو؟ کوئی خاص ہی بات ہے استاد! اور بس لوٹنے والا معاملہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

میری یہ بات سن کر اُن دونوں نے بڑے معنی خیز انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے مگر پھر فوراً ہی رستم سنجیدہ سا ہو کر بولا۔

"تمھارا یہ شک بے معنی ہے جیلانی! ہم نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ کوئی ایسی بات ہوتی تو ہم خود تمھیں بتا دیتے۔ بہرحال اب تمھارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں تو موقع ملتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ شاید صبح ہونے تک حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

"مشکل ہے۔ میرا خیال ہے اُن کے آدمی ابھی تک جنگل میں موجود ہیں۔ اتنے بڑے معرکے کے بعد وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتے۔"

"چلو دیکھ لیں گے۔ یہ غار تو بہرحال محفوظ ہے۔"

"اتنا بھی محفوظ نہیں ہے۔ تمھارے آنے سے یہ اور بھی غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ ہم پر کسی کو کوئی شک نہیں تھا مگر اب وہ چپّے چپّے کی تلاشی لیں گے۔ گولاٹی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تمھارا آنا کوئی نیک فال نہیں ہے۔"

رستم نے یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیسی سوچ اُبھر آئی تھی۔ شنواری بھی اس کا ہم نوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بھی منہ پکا کر کے بیٹھ گیا تھا۔ میرے اس سوال نے اُنھیں شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ وہ شاید واقعی مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے اور اپنی اصلیت چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ کوئی بات تھی ضرور مگر میں اسے ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔

غار کے پچھلے حصّے سے مجھے مٹی کے تیل کی بُو محسوس ہوئی شاید انھوں نے وہاں کیروسین کا چولھا جلا لیا تھا۔ چائے آگ کے بغیر تو نہیں پک سکتی تھی۔

"یہ اسٹوو کی آواز ہے۔ ہم نے دھوئیں سے بچنے کے لیے یہ کام کر لیا تھا۔" رستم نے مجھے متوجہ دیکھ کر کہا۔

"ہاں! غار سے دھواں نہیں نکلنا چاہیے مگر روٹی کیسے پکاتے ہو تم؟"

"وہ بھی اِسی چولھے پر پک جاتی ہے۔ گولاٹی سارے کام کر لیتا ہے۔"

"ٹھہرو۔ مجھے ذرا غار کا پچھلا حصّہ تو دکھاؤ۔ گولاٹی کہہ رہا تھا، دوسری طرف دریا ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ دوسری طرف سے یہ غار بند ہے۔"

"مگر یہ تازہ ہوا کہاں سے آ رہی ہے؟"

"درمیان میں سے ایک جگہ یہ غار ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ ہوا اُدھر سے آ رہی ہے۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہے۔ تازہ ہوا تو ملتی ہے نا تمھیں۔" مگر میں نے دیکھا کہ رستم کچھ اور اُلجھ گیا تھا۔ یہی حال شنواری کا تھا۔ دراصل وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُنھیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا تھا، یہی بات تھی۔ وہ پہلے تو وہاں میری موجودگی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے تھے مگر اب اچانک ہی اُنھیں کوئی ایسی بات سُوجھ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ میں وہاں سے نکل جاؤں۔ اس کا سبب مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے بہرحال اپنا پستول سیدھے ہاتھ کی جیب میں رکھا اور رائفل میں گولیاں ٹھونس کر کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے مگر میری کسی بات پر انھوں نے اعتراض نہیں کیا۔ مجھے اطمینان سے بیٹھنے دیا۔ خود بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ وہ مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے اور اُن کے چہروں سے عجیب اضطراب جھلکنے لگا تھا۔

اتنے میں گولاٹی چائے کی کیتلی اٹھائے سامنے آ گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں پیالیاں پکڑ رکھی تھیں۔

"لو بھئی چائے تو تیار ہو گئی ہے۔"

"اوئے گولاٹی! تُو کیا گپ مار رہا ہے اس سے کہ غار دوسری طرف کھلتا ہے۔ تیرے باوا نے اُدھر کوئی دروازہ لگا رکھا ہے؟"

"میں نے کیا کہا ہے جو تم اتنے گرم ہو رہے ہو! وہ تو میں ایسے بات کر رہا تھا۔ اُدھر تو ہم کبھی گئے ہی نہیں ہیں۔" گولاٹی نے بات کی گہرائی تک پہنچتے ہوئے کہا۔

"اوئے تو اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔ لعنت بھیجو اِس پر۔ میں کون سا یہاں بیٹھا رہوں گا۔ ابھی چائے پی کر میں نکل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے گولاٹی کے ہاتھ سے پیالیاں لے لیں اور کیتلی لے کر اُن میں چائے انڈیلنے لگا۔ وہ دونوں کچھ مطمئن سے ہو گئے اور میرے ساتھ وہ بھی چائے پینے لگے۔

عین اسی وقت غار کے پچھلے حصّے میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہلکا سا دھماکا تھا مگر تھا وہ گولی دغنے کا جیسے کسی نے غار کے اندر پہنچ کر وہ گولی چلائی ہو۔ وہ تینوں ایک دم سنبھل گئے۔

"میرا خیال ہے۔ گل زری آ گیا ہے۔" گولاٹی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا تو یہی ہے مگر یہ گولی اُس نے کس پر چلائی ہے؟" یہ کہہ کر رستم تیزی سے اُٹھا اور اپنی رائفل سنبھالتا ہوا آگے کی طرف چل دیا۔ شنواری اس کے پیچھے تھا مگر ابھی وہ دو قدم ہی نکلے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی سر سے پاؤں تک خاکی کپڑوں میں ملبوس اُن کے سامنے آ گیا۔

"اوئے گل زری! تُو نے تو ہمیں حیران ہی کر دیا ہے۔ یہ گولی کس پر چلائی ہے تم نے؟"

"راستے میں ایک سانپ بیٹھا تھا، کنڈلی مار کر۔ شکر ہے میرا اُس پر پاؤں نہیں جا پڑا۔ اُسے میں نے گولی سے اُڑا دیا۔ پر یہ کون ہے؟"

"یہ اپنا دوست ہی ہے۔ تم کہو کیا کر آئے ہو؟"

"وہ سارا سامان میں نے شہر پہنچا دیا۔ نواز کے ڈیرے پر اب وہ جانے اور اس کا کام۔"

"چلو یہ اچھا ہوا۔ آؤ چائے پیو۔ ایک دم گرم گرم چائے ہے۔" رستم نے اُسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کھڑا ہوا مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو یہ تمھارا مہمان ہے؟"

"ہاں۔ غلام جیلانی نام ہے اس کا۔ اس کے پیچھے پولیس لگی تھی۔ بچ بچا کر یہ اِدھر آ گیا۔ بس اب جانے ہی والا ہے یہ۔ صبح ہوتے ہی نکل جائے گا۔ یہ اپنا گل زری ہے جیلانی! بڑا جی دار آدمی ہے۔"

گل زری نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ اس کا پنجہ بہت مضبوط تھا۔ مجھے اُس نے یہی احساس دلایا کہ وہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ آدمی ہے۔ عمر اس کی یہی کوئی پینتیس کے قریب ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک حیران کن تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پہلی ہی نظر میں آدمی کا دُروں بُروں دیکھ لیتا تھا۔ میرے سامنے گھاس پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ تمھارا کب کا دوست ہے رستم؟ آدمی تو مجھے بہت سمجھ دار نظر آتا ہے۔"

"یہ کسی زمانے میں میرے ساتھ جیل میں تھا۔ اُدھر جب قیدیوں نے واویلا مچایا اور میں بھاگ نکلا تو یہ اس وقت پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا۔ یہ بھی کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آیا۔ اب ہم دونوں آزاد تو ہیں مگر قانون کا سامنا نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ہے۔ آدمی کی ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ گھر کا رہتا ہے نا گھاٹ کا۔ قانون چیز ہی ایسی ہے۔ پولیس کیوں اس کے پیچھے لگی تھی؟"

"اس نے بتایا تو نہیں ہے مگر ظاہر ہے پولیس یونہی تو پیچھا نہیں کرتی۔"

"اس خانہ برباد سے پُوچھ بھئی! مارا یہ بھی کوئی بات ہے۔ یہ بتائے تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔" شنواری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بڑی دیر بعد اس کے چہرے پر بشاشت آئی تھی۔

"کیا بات ہے، تم تو یوں لگتا تھا جیسے مر ہی جاؤ گے۔ بہت بجھے ہوئے تھے تم! اب یہ مسکراہٹ کیسے آ گئی تمھارے رخِ مبارک پر شنواری صاحب!" میں نے اُسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے طنز کو سمجھ گیا بولا۔ "مارا! ایک ایسی ہی بات تھی بھئی! پر تم بُرا نہ مانو! اُم تمھارا یار ہے، بالکل پکا یار۔"

" دیکھو گل زری! اُدھر چک گھرانہ میں کل رات ایک جلسہ تھا۔ اُس میں بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے تھے۔ کسی طرح مجھے پتا چلا کہ وہ لوگ صدرِ جلسہ کی جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی کہ میں نے صدرِ جلسہ کو اطلاع دے دی۔ وہ بچ تو گئے مگر انھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ میری گرفتاری کا بھی حکم جاری کر دیا جس کے نتیجے میں پولیس اس جنگل تک میرے پیچھے چلی آئی، یہ ہے میرا گناہ۔" میں نے گل زری کو ساری بات بتا دی۔ وہ مجھ سے مزید تفصیل پوچھتا رہا، جب میں چپ ہوا تو وہ بولا۔

"دیکھو! جن آدمیوں کے تم نے نام لیے ہیں اُنھیں تو میں نہیں جانتا مگر جس عرفان کو تم باندھ کر سہراؤں چھوڑ آئے ہو اُس سے میں البتہ واقف ہوں اور یہ بات یاد رکھو کہ اس سازش کا تعلق جن لوگوں سے ہے وہ ملک کے اندر نہیں باہر ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"میں تمھیں یہ بتا رہا ہوں کہ پچھلے ہفتے اُن لوگوں نے لاہور کے قریب ایک گاؤں کے چوہدری مختار ڈھلوں کو قتل کر دیا تھا۔ اُن میں سے ایک آدمی پکڑا گیا تھا۔ اس نے پولیس کو یہ بتایا ہے کہ وہ انڈیا سے آیا ہے اور اس کا تعلق جموں سے ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم! یعنی مختار ڈھلوں کو وہ مار چکے ہیں؟"

"بالکل! میں اس وقت لاہور میں تھا۔ بڑا چرچا ہوا اخباروں میں اس واردات کا اور اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔ جیسے چپ رہنے میں ہی مصلحت تھی۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "تم مختار ڈھلوں کو جانتے ہو؟"

"وہ۔۔۔ وہ میرا دوست تھا بھئی۔ میرا صبح شام اس کے ہاں آنا جانا تھا۔"

"کہیں تم تو وہ آدمی نہیں ہو جس نے ڈھلوں صاحب کو امرتسر سے اُن کی قید سے نکالا تھا۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"یہ غلام جیلانی ہے بھئی! میں نے تمھیں اس کا نام ابھی بتایا تو تھا۔"

"تو تُو ہے غلام جیلانی! اوئے میرے خدایا! یہ میں کیا سن رہا ہوں!" وہ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور میری طرف دونوں ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "یہ ہماری قسمت ہے کہ آپ ہمارے درمیان بیٹھے ہیں جیلانی صاحب! ہزار سلام اس ماں کو جس نے آپ کو جنم دیا۔ مجھے آپ کے بارے میں لاہور میں معلوم ہوا تھا۔"

"آپ کی مہربانی ہے کہ آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں مگر ڈھلوں صاحب پر کیا گزری؟ وہ کون لوگ تھے؟"

"ڈھلوں صاحب اُس وقت ساہیوال میں اپنے کسی دوست سے ملنے گئے تھے کہ اُن کی جیپ پر قاتلوں نے حملہ کر دیا۔ اُن کا ڈرائیور

بھڑکی اور وہ خود گولیوں کا نشانہ بن گئے۔"

"مگر قاتل کون تھے؟"

"اُن میں سے ایک آدمی پکڑا گیا۔ وہ دراصل اُس کار میں سوار تھا جس میں سے ڈھلوں صاحب پر گولیاں چلائی گئیں تھیں۔ اپنے دو ساتھیوں کو اُس نے کسی جگہ اُتارا اور خود اکیلا ہی آگے نکل گیا مگر بڑی سڑک پر وہ ابھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کی کار خراب ہو گئی۔ اتنے میں پولیس کو خبر ہو گئی اور انھوں نے اس کار کے حوالے سے اُسے پکڑ لیا۔ اُس کا نام چندر موہن ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے دو ساتھی پارتھی اور شلنگا اس کے ہمراہ تھے مگر وہ راستے میں اُتر گئے۔"

"پارتھی اور شلنگا۔ اچھا پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"اس چندر موہن نے بتایا ہے کہ انھیں پاکستان میں کئی لوگوں کو ہلاک کرنے کا مشن دیا گیا ہے۔ مگر وہ اُس روز صرف ڈھلوں کو ختم کر سکے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے گل زری! اب تو میں کسی طرح بھی یہاں نہیں رُک سکتا۔"

"ابھی صبر کرو، ڈھلوں صاحب تو ختم ہو ہی چکے ہیں، وہ تو واپس نہیں آ سکتے۔ میں نے سنا ہے کہ اُن کی بیوی بھی اُن کے خلاف ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اُسے طلاق دے دی۔"

"اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

"سنا ہے کہ ڈھلوں صاحب کو بہت پہلے بتا دیا گیا تھا کہ وہ بھی اس فہرست میں شامل ہیں جن کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

"یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔ وہ فہرست میں نے ہی انھیں مہیا کی تھی۔"

"ہوں۔ بہرحال میں اس عرفان کی بات کر رہا تھا۔ اگر یہ وہی آدمی ہے تو سمجھو کہ اس سازش کا ایک بہت بڑا مہرہ اُن کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اس سے سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہ سب کچھ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میرا ایک دوست ہے لاہور میں، یہ ساری باتیں مجھے اُسی سے معلوم ہوئی ہیں۔"

"کیا وہ کوئی سرکاری افسر ہے؟"

"نہیں بھئی! سرکاری افسر ہمیں کہاں گھاس ڈالتے ہیں۔ اس نے بہرحال یہ ساری باتیں کہیں سے سن لی تھیں۔"

"اور وہ عرفان کا نام لے رہا تھا۔"

"ہاں۔ ہو سکتا ہے وہ بھیس بدل کر پاکستان میں رہ رہا ہو۔"

"خدا ہی رحم کرے۔ یہ ہندو ہمارے خلاف سازشوں سے باز نہیں آئے گا۔ بہرحال مجھے یہ بتائیں گل زری کہ اگر میں آئندہ آپ سے ملنا چاہوں تو کہاں مل سکتا ہوں۔"

"میرا تو کوئی پتا نہیں ہے۔ اب اس غار سے ہمارا تعلق ختم ہونے کو ہے۔ آپ اگر کوئی جگہ بتا دیں تو میں وہاں پہنچ سکتا ہوں۔"

"دیکھیں، حیدر روڈ راولپنڈی پر ایک خاتون رہتی ہیں بیگم
آپ وہاں سے میرا پتا معلوم کر سکتے ہیں۔ وہ مجھے سردار کریم نواز
نام سے جانتی ہیں۔"

"مجھے یاد رہے گا۔" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مگر مجھے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس غار میں آپ کیوں رہ رہے

"یہ ایک بڑے ہی راز کی بات ہے جو ہم آپ کو نہیں بتا سکتے۔ سمجھ
کہ یہ ہماری آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے، نہ بتائیں مگر میرا خیال ہے کہ آپ مجھ پر
کر سکتے ہیں۔"

"اعتماد تو مجھے پورا ہے، ایسا نہ کہیں۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ
پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ بس چپ ہی بھلی سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ باہر میرا خیال ہے صبح ہو چکی ہے۔"

"ہاں، روشنی پھیل رہی ہے۔ گولاٹی! دوسری طرف سے باہر
معلوم کرو کہ کیا حالات ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا لباس بدلا
عام سے دیہاتی لباس میں وہ غار کے پچھلے حصے کی طرف نکل گیا۔
ہی دیر بعد رستم اور شنواری کو ساتھ لے کر گل زری بھی وہاں سے
گیا۔ اُن سے وہ کوئی بہت اہم مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

میں ذرا تنہا ہوا تو پھر حالات کے تانے بانے میں اُلجھ کر
میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکے آسیہ اور
کو اُن لوگوں کی اسیری سے رہائی دلا سکوں مگر ابھی تک مجھے کوئی
نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت بھروسہ تھا مجھے مختار ڈھلوں پر مگر گل زری
کہتا تھا کہ وہ کب کے ختم ہو چکے۔ اب میں کس پر تکیہ کر سکتا تھا۔
بڑے صاحب نے تو میری گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اُن کی
فہمی کیسے دور کر سکتا تھا۔ اب کی بار تو وہ مجھے دیکھتے ہی بھڑک
اور فوراً ہی مجھے گرفتار کروا دیتے۔ اُن کا ذہن میں کیسے صاف کر سکتا
پتا نہیں گل زری نے وہ ساری باتیں کہاں سے معلوم کر لی تھیں۔
اس کا بہت ہی قریبی ساتھی ہو گا جس نے یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔
عام حالات میں تو یہ اندر خانے کی باتیں باہر نہیں آ سکتی تھیں۔ افسوس مجھے یہ
اب وہ اتنی بڑی جاگیر کسی وارث کے بغیر ہی رہ گئی تھی۔ ڈھلوں
کے دور نزدیک کے رشتے دار ہی اب اس جاگیر پر چڑھ دوڑیں گے۔
آدمی کس قدر بے بس ہے۔ ڈھلوں صاحب نے اس پر کبھی غور
نہیں کیا تھا اور کرتے بھی تو کیا کر لیتے۔ کتنی ہی بیویاں ان کے گھر
رہ چکی تھیں مگر کوئی بھی اُن کے لیے وارث پیدا نہ کر سکی اور وہ
دشمنوں کی نذر ہو گئے۔ ایسے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ خود میں
اس حال میں پھر رہا تھا مگر... میرا کیا تھا، کوئی وارث نہ بھی

توکیا تھا۔ میں کون سی جاگیر کا مالک تھا۔ ایک شادی آدمی کے لیے فوری
ہے مگر میں اُس مرحلے سے بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ ایک میری پسند تھی مگر
نہیں اُسے بھی خود سے متنفر کر چکا تھا۔ وہ مندآرا میرا نام سننا بھی گوارا
نہیں کرتی تھی۔ ایسے میں بھلا میں کیا کر سکتا تھا اور میری الجھنیں تھیں کہ
بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی ایسے گہرے زخموں کا علاج کہاں...
ڈھونڈے؟ کس ماندری کے پاس جائے کہ اس کے دُکھ دور ہو جائیں۔
ایسا تو کوئی نہیں ملتا تھا اور حالت میری یہ تھی کہ میں اس وقت بھی سیخ
میں پروئے کباب کی طرح کبھی اس پہلو سے جلایا جا رہا تھا اور کبھی اُس
پہلو سے۔

گل زری کوئی پندرہ منٹ بعد واپس آ گیا۔ شنواری اور رستم اس کے پیچھے تھے۔ وہ تینوں بہت ہی سنجیدہ نظر آتے تھے۔ گل زری بولا۔

"ابھی گولاٹی اگر اچھی خبر لائے تو آپ اسی راستے سے باہر نکل جائیں ورنہ عقبی راستہ تو بہرحال کھلا ہے۔ فکر نہ کریں، میں .... موقع ملا تو راولپنڈی میں آپ سے ضرور ملاقات کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے پیارے! میں تمھارا انتظار کروں گا مگر تم نے ابھی بہ نہیں سنائی ہے گل زری! ڈھلوں صاحب میرا بہت پیارا دوست تھا۔ یاروں کے کام آنے والا آدمی تھا۔ بڑا مخلص، بڑا جی دار۔"

"اس کی موت کا مجھے بھی افسوس ہے۔ میں تو اس سے کبھی نہیں ملا ہوں مگر کہتے ہیں کہ وہ بڑی قدآور سماجی شخصیت کا مالک تھا۔ اخباروں میں بہت دنوں اس کا چرچا رہا مگر مجھے یہ حیرت ہے کہ کسی اخبار نے اس معاملے میں غیر ملکی مداخلت کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اصل مجرم نے اپنا جو نام بتایا، وہی اخبار میں آ گیا۔ حالانکہ میرا وہ دوست بتاتا تھا کہ اس کا اصل نام چندر موہن ہے۔"

"یہ کون آدمی ہے جو تمھیں اتنی پتے کی بات بتا رہا ہے؟"

"اُس کا بھائی کوئی بہت بڑا افسر ہے۔ جس کا پولیس سے گہرا تعلق ہے بہرحال یہ میں آپ کو بتا دوں کہ وہ لوگ اس فہرست پر ہاتھ صاف کر چکے ہیں اور اُن کا پہلا شکار ڈھلوں تھا۔"

"پولیس نے اُس مجرم کا نام کیوں چھپایا ہے؟"

"اس کا سبب تو وہی بتا سکتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ اس کی کوئی سیاسی وجہ ہو گی اور پھر دوسرے ملزموں کو پکڑنے کے لیے بھی اُن کی کوئی حکمت ہو گی۔"

اتنے میں گولاٹی واپس آ گیا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ وہ کسی آدمی کو گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔

"اوئے رستم! یہ دیکھ اُس کو شاید مرگی کا دورہ پڑا ہے۔ کوئی مسافر ہے، اُدھر جنگل میں پڑا تھا۔ میں اسے لے آیا ہوں۔"

ہم تینوں تیزی سے اس کے پاس جا پہنچے۔ ہمارے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا بوڑھا گولاٹی کے ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ اُسے واقعی مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ اُس کی پگڑی کھل کر گلے میں آ پڑی تھی اور اس کے حلق سے عجیب طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہاتھ پیر اس کے مڑ گئے تھے۔ چہرہ اس کا تنا ہوا تھا، بہت ہی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ میں تو لرز کر رہ گیا۔ آدمی پر موت یوں بھی وارد ہوتی ہے؟

"اس کا کچھ کرو یار! آخر کو یہ انسان ہے، اس کی جان بچانا ہمارا فرض ہے۔"

"لاؤ اسے ادھر گھاس پر لٹا دو گولاٹی! اور اس کو چائے دو۔" رستم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

گولاٹی نے اُسے کھینچ کر گھاس پر لٹا دیا اور اس کے لیے چائے پیالے میں انڈیلنے لگا۔

"تم خواہ مخواہ ہی اس مصیبت کو یہاں لے آئے ہو۔ ہم بھلا اس کا کیا کر سکتے ہیں۔ کوئی علاج ہے ہمارے پاس اس کا؟"

"نہیں یار! ایسا نہ کہو گل زری! کوئی مصیبت کا مارا آدمی ہے۔ دیکھو تو اس کے منہ سے جھاگ کیسے نکل رہا ہے۔" رستم نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی چادر سے اُس کا منہ پونچھتے ہوئے کہا اور اس کو سہارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔

"میاں جی! لو یہ چائے پی لو۔" گولاٹی نے اس کے پاس جا کر کہا۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ چائے ابھی تک گرم تھی۔ وہ اُس نے میاں جی کے منہ سے لگا دی مگر اس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ چائے کا گھونٹ دائیں بائیں بہ نکلا۔ گولاٹی نے پھر چادر لے کر اس کا منہ صاف کیا اور پھر چمچے سے اس کے حلق میں چائے انڈیلنے لگا۔

گل زری بھی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم بھلا اس کی کیا مدد کر سکتے تھے مگر پھر بھی انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی تھا کہ اس کو جو بھی آرام پہنچا سکتے، پہنچاتے اور اُس کو موت کے منہ میں نہ جانے دیتے۔ چمچہ چمچہ کر کے گولاٹی نے چائے اس کے پیٹ میں اُتاری مگر اس کی حالت پھر بھی نہ سنبھلی۔

"اسے چھوڑ دو گولاٹی! یہ خود ہی کچھ دیر بعد ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس دیہاتی کے دل کی دھڑکن حیران کن حد تک ٹھیک تھی اور بڑی ہی عجیب بات تھی۔ میں سمجھا شاید میں غلطی پر ہوں، اس لیے ایک بار پھر میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ ٹھیک ٹھیک چل رہی تھی۔ جھاگ کا ایک اور ریلا اس کے منہ پر آ گیا جسے گولاٹی دوبارہ صاف کرنے لگا تو میں نے اُسے پیچھے کھینچ لیا اور خود چادر سے اس کا منہ صاف کرنے لگا۔ وہ اپنے بدن کو بُری طرح توڑ مروڑ رہا تھا۔ کوئی سمجھے، وہ نزع کے عالم میں ہے مگر میں سمجھ چکا تھا کہ وہ مکر کر رہا ہے، اس پر کوئی مرگی کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ گولاٹی کو فریب دے کر وہ ہمارے اڈے تک آ پہنچا تھا۔

"گولاٹی! یہ تمھیں کہاں ملا تھا؟"

"یہ اُدھر جنگل میں پڑا تھا۔ بہت نڈھال ہو رہا تھا۔"
"میں پوچھتا ہوں کوئی اور آدمی بھی اس کے پاس تھا؟"
"نہیں بھئی! نہ بندہ نہ بندے کی ذات، کوئی بھی آدمی وہاں نہیں تھا۔"
"تو یہ بالکل تنہا تھا؟"
"ہاں! اکیلا پڑا تھا وہاں، کوئی راہی ہے۔ گھر سے نکل کر وہاں بیہوش ہو گیا ہے۔"
"گل زری! اس غار کو جس طرح بھی ممکن ہو چھوڑ دو یا پھر اسے بند کر دو۔ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"
"کیا مطلب! کیا خطرہ ہے ہمیں؟"
"یہ پولیس کا آدمی ہے گل زری اور گولاٹی کو دیکھ کر یہ جان بوجھ کر مریض بن گیا ہے۔"
"کیا! یہ پولیس کا بندہ ہے۔ اوئے بیڑہ غرق! اسے تو ادھر ہی ختم کر دینا چاہیے۔" اُس نے تیزی سے پستول نکال لیا — وہ تینوں ایک دم گالیوں پر اتر آئے۔
"اوئے تیری ماں مر جائے۔ تو کیا مصیبت ہے اوئے۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" گولاٹی نے پاگلوں کی طرح اس بڈھے کو گلے سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اس طرح ہمارا ٹھکانہ تلاش کر رہا تھا۔ تیرا تو میں ستیاناس کر دوں گا بے۔ تو نے سمجھا کیا ہے۔" مگر وہ آدمی تو جیسے ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ اس چوٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے تڑاخ تڑاخ تین چار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔
"اور کون ہے تیرے ساتھ؟ یہ ڈراما بند کر دے ذلیل آدمی۔ بتا تیرے پیچھے کون ہے؟" مگر میری ضربوں نے بھی اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ خدا جانے وہ کس چیز کا بنا ہوا تھا۔
"تیری نبضیں میں دیکھ چکا ہوں۔ تو مریض نہیں ہے۔ کمینے بتا تو یہاں کس لیے آیا ہے، یہ ناٹک ختم کر دے اب۔" میں نے ایک بار پھر اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔
دوبارہ زمین پر گرتے ہی اس نے اپنا منہ گھاس میں چھپا لیا۔ حالت اس کی اب بھی وہی تھی۔ گل زری ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ پولیس کہیں آس پاس ہی تھی۔ بولا۔
"اوئے گولاٹی! سامان سمیٹو اور یہاں سے نکل چلو، جلدی کرو۔ تم اسے باندھ کر ڈال دو رستم!"
"سامان تو اب یہاں کوئی نہیں ہے گل زری! میں کس مصیبت کو اندر لے آیا ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی ہے بھائی! مجھے معاف کر دو۔"
"تم ہو ہی گدھے! ہمیشہ سے پاگل پن کی باتیں کرتے چلے آئے ہو۔ یہ ساری چیزیں بوری میں ڈالو اور نکل چلو۔"

اتنے میں رستم نے رسی لے کر اس آدمی کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔ مگر ابھی ہم سامان سمیٹ ہی رہے تھے کہ ہمیں کچھ فاصلے پر بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ رستم نے اچانک ہمیں خبردار کرتے ہوئے کہا: "اوئے گل زری! یہ دیکھ! اس کی جیب سے یہ دانے نکلے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ ذلیل آدمی انہیں راستے میں بکھیرتا آیا ہے.... تاکہ وہ لوگ اسے ڈھونڈ سکیں۔"
"پھر تو مارے ہی گئے ہم۔ اسے گولی میں پرو دو، اس کو ..." گل زری نے غضبناک ہو کر کہا۔ مگر ان بوٹوں کی آواز اب قریب ہو گئی تھی اور وہ غار کے عقبی حصے سے اندر آ گئے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنے آدمی ہیں۔ مگر ان سے نمٹ لینا آسان ابھی میرے ... تھا۔ ہم چاروں بہت افراتفری کے عالم میں دوسری طرف بھاگے ... سے میں غار میں داخل ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس راستے کا انہیں ... نہیں ہو گا۔ گل زری بھی یہی سمجھ رہا تھا مگر صورتِ حال بہ پہلا اندازہ ... مختلف تھی۔ ہم اسی خیال میں غار کے منہ تک جا پہنچے مگر عین ... پیچھے سے کسی نے اندھیرے میں ہم پر گولی چلا دی۔ معلوم یہ ہوتا تھا ... میں ایک دو نہیں کوئی آٹھ دس ہیں۔ غار کا عقبی حصہ ان کے ... بھر گیا تھا اور پھر ایک بڑی ہی غضبناک آواز غار میں گونجی۔ ... انسپکٹر تھا جس کی باتیں میں سن چکا تھا۔ وہ ہمیں للکار کر ... جاؤ اوئے کتے کے بچو! ورنہ میں ایک ایک کو یہاں ختم کر ... دوسری طرف بھی پولیس موجود ہے۔ یہ تمہارا آخری دن ہے ... تمہاری آخری صبح۔ بہتر ہے اپنے ہتھیار پھینک دو۔"
اس نے پہلی باڑھ مارنے کے بعد ہاتھ ذرا دیر کے ... لیا تھا۔ اچانک غار تیز روشنی سے بھر گیا۔ اب کی بار وہ ... ٹارچ بھی لے آئے تھے۔ ہم چاروں اس روشنی کی زد میں ... ہم ایک دم دیواروں کے ساتھ لگ گئے۔ مگر گل زری اندر ... پتھر کے پیچھے لیٹ گیا۔ وہ پتھر غار کا منہ بند کرنے کے لیے رکھا ... لیٹتے ہی اس نے اپنی اسٹین گن کا منہ کھول دیا۔ غار اس کی گو... آوازوں سے لرزنے لگا۔ سپاہی اس کے وار سے بچنے کے لیے دا... ہو گئے۔ ٹارچ بجھ چکی تھی اور اب ہم سب اندھیرے کی لپیٹ ... کہ اچانک ایک بھیانک چیخ ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی آدمی ... زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ کے ساتھ ہی دوسری طرف سے پھر ... باڑھ ماری گئی مگر اس عرصے میں گولاٹی اور شنواری غار کے ... باہر نکل گئے اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ جیسے ہی ... نکلے، سامنے کھڑے سپاہیوں نے ان کو دیکھتے ہی گولی چلا دی۔ ... تڑپنے لگا۔ اس وقت تک صبح نمودار ہو چکی تھی اور اُجالا چار ... گیا تھا مگر ہم دونوں طرف سے گھر کر رہ گئے تھے۔ شنواری ... کی آواز ہمیں دوبارہ سنائی نہیں دی۔ ... جنگل کا حصہ بن کر ...

وہ غار سرنگ کی طرح آگے نکلتی تھی۔ سپاہیوں نے جب دیکھا کہ دوسری طرف سے ان پہ حملہ ہو رہا ہے، شاید ان کا کوئی سپاہی ہلاک ہو چکا تھا تو وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ تب میں نے اس انسپکٹر کی درد میں لپٹی آواز سنی۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا اور کہہ رہا تھا۔
"اوئے روشن علی! یہ زندہ بچ کر نہ جائیں۔ ان کو ادھر ہی بھون دو۔ پیچھے مت ہٹو۔" یہ کہہ کر اس نے اندھیرے میں ہم پر پستول داغ دیا مگر وہ گولی پتھر سے ٹکرا کر رہ گئی۔ دراصل ہم اس وقت تک پتھر کی اوٹ میں لیٹ چکے تھے اور ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں پوری طرح دیکھ چکے ہیں۔ میں نے ابھی تک ان کی رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ پستول لینا آسان ابھی میرے کام نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری نظر میں آتے تو میں کچھ کرتا۔ گل زری البتہ بہت غضبناک ہو رہا تھا، یہ اسی کی گولی تھی جو انسپکٹر کو لگ گئی تھی اور وہ دُور اندھیرے میں کسی جگہ اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ شاید میرا ... حال بہ پہلا اندازہ صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تعداد میں دس بارہ نہیں تھے، آوازیں مگر عین ... مجھے یہی احساس دلاتی تھیں۔ وہ تعداد میں یہی کوئی چار یا پانچ تھے۔
اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص غار میں داخل ہو رہا تھا۔ اس ... کو دیکھنے کے لیے میں نے اپنا سر گھمایا تو معلوم ہوا کہ وہ گولاٹی تھا اور اس کے پیچھے رستم کسی کو گھسیٹ کر اندر لا رہا تھا۔ وہ شنواری کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ گولی پتا نہیں اسے کہاں کہاں ... اس کا کرتہ خون سے بھیگ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر ... انہیں خبردار بھی کیا مگر وہ روشنی کی وجہ سے سامنے ڈٹے ہوئے سپاہیوں کو نظر آ گئے۔ ایک لحظے کی دیر ہو جاتی تو وہ ان دونوں کو ختم کر چکے ہوتے۔ گولاٹی اور رستم فوراً ہی پتھر کی اوٹ میں چھپ گئے۔ ... ان کی تیزی طراری انہیں بچا گئی تھی۔
جیسے ہی سامنے سے گولی چلی، گل زری نے پھر اپنی اسٹین گن کا منہ کھول دیا۔ مگر اب کی بار کوئی بھی اس کی زد میں نہیں آیا۔ وہ زیادہ محفوظ ہو کر ہم پر نظر رکھ رہے تھے۔
"باہر کتنے لوگ ہیں؟" میں نے گولاٹی سے پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی لیٹ گیا تھا۔
"ان کی تعداد کا پتا نہیں چل رہا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلے انہوں نے شنواری کو پرو دیا۔ مگر میرا خیال ہے ہم بھی دو تین کو ختم کر کے آئے ہیں۔"
اچانک سامنے سے گولیوں کی زبردست بوچھاڑ آئی مگر پھر ... لگا جیسے وہاں زلزلہ آ گیا ہے۔ غار کے اندر ہر شے لرزنے لگی۔
"اوئے بیڑا غرق گل زری! ہمارا اسلحہ خانہ تباہ ہو گیا ہے۔" رستم نے بلند آواز سے کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں آتش فشاں پھٹ ... جو ٹھہر ٹھہر کر دھماکے ہو رہے تھے۔ پھر ان کا سلسلہ لامتناہی ہو گیا تھا۔
"وہی دو صندوق باقی رہ گئے تھے۔ میرا خیال ہے گولیاں ان کے اندر جا گھسی ہیں۔ یہ تو بہت بُرا ہوا رستم!"
"میں نے کہا بھی تھا کہ ان کو بھی وہاں سے اٹھا لو مگر تم مانتے ہی نہیں۔"
"میں کیا کرتا، میں اتنا بوجھ کیسے اٹھا لیتا۔"
کوئی دس منٹ تک وہ دھماکے ہوتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی ڈائنا میٹ رکھا تھا، جسے انہوں نے انجانے میں فلیتہ دکھا دیا تھا۔
"مگر اچھا ہی ہوا ہے گل زری! وہ خود ہی ختم ہو گئے ہیں مجھے یہی لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے رستم آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔
"ذرا صبر کرو رستم! رُک جاؤ۔" گل زری نے اس کو وہیں دبا دیا۔ کوئی پانچ منٹ اور گزر گئے۔ اب غار میں مکمل سناٹا طاری تھا۔ گولاٹی کا دھیان غار کے منہ کی طرف لگا تھا۔ ایک اسٹین گن اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ پتا نہیں وہ ہتھیار انہیں کہاں سے مل گئے تھے۔ وہ رائفل اور پستول استعمال نہیں کر رہے تھے۔ اسٹین گنیں یہی کوئی ہاتھ سوا ہاتھ لمبی تھیں۔ ان کی ساخت دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ دھماکے ختم ہوئے تو ہم تینوں اس پتھر کی اوٹ سے نکلے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ ہو کر آگے بڑھے۔
رستم نے سامنے سناٹے کی حکمرانی دیکھی تو اندھیرے میں کسی جگہ دیوار میں لگی وہ لکڑی اٹھائی اور اسے جلا کر بولا: "اب اس کو جلا لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"
"یار! ایسا نہ کر۔ دشمن کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔" گل زری نے ایک دم زمین پہ لیٹتے ہوئے کہا مگر اس کے خدشے بے بنیاد تھے۔ چند قدم پہ انسپکٹر کی اُدھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ خون میں تر بتر اور ان دھماکوں کا سب سے پہلا شکار وہی تھا۔ اس سے کوئی دو قدم دور دو سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کوئی اور آدمی وہاں اگر تھا تو وہ باہر جا چکا تھا۔ وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ دھماکا خیز مواد دو صندوقوں میں بند تھا۔ جن کا اب وہاں نام و نشان تک موجود نہیں تھا۔ صرف ان کے خول ہی اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔
"اس کا کیا مطلب ہے گل زری! یہ دھماکے کیسے ہو رہے تھے یہاں؟"
"ہم نے اپنی حفاظت کے لیے یہ چیزیں رکھی تھیں مگر وہ تباہ ہو گئیں۔"
"میرا خیال ہے تم سچ نہیں بول رہے ہو۔ کچھ اور سامان کی بھی تم بات کرتے ہو۔ کچھ اور چیزیں بھی تمہارے پاس ہوں گی، یہ سب کیا ہے آخر؟ کس کے خلاف تم اتنا سارا اسلحہ یہاں جمع کر رہے تھے؟"
"کچھ نہیں یار! تم اپنے کام سے کام رکھو اور یہاں سے باہر نکل چلو۔ اوئے گولاٹی! جلدی ادھر آ۔ چلو اس وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔"

"پھر اس شنوازی کا کیا کروں؟"
"اُسے اٹھا لاؤ رستم! جاؤ۔ جیلانی! ہم آگے چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے رستم سے وہ لکڑی لی جو غار کو منوّر کر رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ غار کچھ ہی دُور جا کر تنگ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس میں سے صرف ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ اس جگہ دونوں طرف چٹانیں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہاں اس غار کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں ہو سکا تھا مگر جیسے ہی ہم اُن دو چٹانوں میں سے گزرے، مجھے کھُلی جگہ کا احساس ہونے لگا اور یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہاں بھی تین ٹرنک موجود تھے مگر وہ بالکل خالی پڑے تھے۔ ان میں جو سامان تھا، وہ نکالا جا چکا تھا۔
"یہ قصّہ کیا ہے گل زری! مجھے تم بتلاتے کیوں نہیں ہو؟"
"کچھ بھی نہیں ہے بھئی! ہمیں اپنی حفاظت کے لیے تو یہ سب کچھ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ان ٹرنکوں کا سامان خرچ ہو چکا ہے۔"
"میں اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ فوجی قسم کا سامان ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ کون دیتا ہے اور یہ کس کے خلاف تم استعمال کرتے ہو؟"
"تمہارے اِن سوالوں کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا ہوں۔"
اچانک ہم ایسی جگہ جا پہنچے جہاں سے سُرنگ کی زمین ننگی ہو چکی تھی۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے گولاٹی باہر نکلا تھا اور وہ سپاہی بھی اسی راہ سے اندر آئے تھے مگر گل زری وہاں نہیں رُکا۔ سرنگ آگے بڑھ رہی تھی۔ ہمارے پیچھے رستم اور گولاٹی آ رہے تھے۔ شنوازی کو انہوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھا رکھا تھا۔
"گل زری! اسے دیکھو ذرا! یہ تو شاید ختم ہو چکا ہے۔" گولاٹی نے بلند آواز سے کہا۔
"تو اس کو اِدھر ہی پھینک دو۔ ختم کرو یہ قصّہ!" گل زری نے قدم روک لیے اور ان دونوں نے شنوازی کو زمین پر لٹا دیا۔ غار کے اس دہانے میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ شنوازی کے سینے پر گولی لگی تھی اور وہی اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ اس کا رنگ پیلا ہو چکا تھا اور اب وہ ہر دُکھ سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی لاش دیکھ کر زندگی کی بے ثباتی پر رونا آتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت جوان تھا مگر ان راہوں پر چل کر وہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔ کوئی اس کی میّت پر رونے والا موجود نہیں تھا اور وہ تینوں ایسے سنگدل تھے کہ اس کے لیے قبر کا اہتمام بھی بے کار سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔
اُسے یوں ہی زمین پر لٹا کر وہ دونوں اُٹھے تو میں نے انہیں شرم دلاتے ہوئے کہا "یارو! اس کو دفن تو کر دو۔"
"جلدی کرو بھئی! اتنی فرصت کہاں ہے ہمیں۔ پتا نہیں دشمن کہاں تک آ پہنچا ہے۔ آگے نکلو۔" گل زری نے رستم کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا اور وہ شنوازی کی لاش الانگ کر آگے نکل گیا۔
"تم وہ پتھر دیوار میں پھنسا آئے تھے؟" گل زری نے پوچھا۔

"ہاں! اسی لیے دیر ہو گئی۔ پہلے ہم نے گھاس کا گٹھا وہاں رکھا اس کے پیچھے سارے پتھر چٹانوں میں پھنسا کر رکھ دیے۔ اب ادھر کوئی اندر نہیں آسکتا ہے۔"
"مگر یہ سُرنگ ان کے کام آسکتا ہے۔ اب کی بار ہم اِدھر آئے اس کو بند کر دیں گے۔"
"لعنت بھیجو اس قصّے پر۔ اب ہم کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔"
"ہاں، اب کوئی اور ہی ٹھکانہ ڈھونڈنا پڑے گا۔"
ہم کوئی سو قدم آگے نکلے ہوں گے کہ غار کا منہ کھُلنے لگا۔ ایک جھیل کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کا پانی اس جگہ سے بہت اور اس کے پاس پہنچنے کے لیے پہاڑ کے عقبی حصّے میں خاصا فاصلہ طے کر تھا۔ گل زری اس راستے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ مختلف کترا ہوتا ہوا آگے نکلا اور کوئی دس منٹ بعد ہمیں ساتھ لے کر وہ جھیل جا پہنچا۔ ایک کشتی اس نے کنارے پر ڈال کر الٹا رکھی تھی۔ اسے ہم نے کیا اور کھینچ کر جھیل کے پانی تک لے گئے۔ میرے لیے وہ سارا سلسلہ ہی حیران کن تھا۔ پولیس مجھے دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھی۔ میرا ہے کہ وہ جتنے بھی تھے کام آچکے تھے یا پھر انہیں اندازہ ہی نہیں وہ غار کتنا لمبا ہے اور اس میں داخلے کے لیے کون کون سے راستے ہو سکتے ہیں۔ وہ جھیل کسی زمانے میں بہت اونچی چڑھ آتی ہوگی اور کا پانی اس غار کو اور وسیع اور گہرا کرتا ہوا آگے نکل گیا ہوگا۔ مگر اس سرنگ میں سے پانی نہیں گزرتا تھا۔ کیونکہ جھیل کی سطح بہت چلی گئی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ غار کے اندر مجھے کوئی جانور نظر آیا۔ ورنہ ایسی ہی جگہوں پر جانور رات گزارتے ہیں۔ مگر شاید کی بود و باش نے انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کہتے کہ وہ کئی مہینوں سے وہاں پڑے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک مجھے بتا رہے تھے کہ ان کے وہاں ٹھہرنے کا مقصد کیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہ میں ان کی وجہ سے اس رات پولیس کی دست بُرد سے محفوظ تھا ورنہ میرے بچ جانے کی امید بہت کم تھی۔ خدا ہی جانتا ہے انسپکٹر کا نام کیا تھا مگر تھا وہ بہت ہی فرض شناس افسر! میری گرفتاری کے لیے کسی بھی خطرے کی پروا نہیں کی اور یہ جانتے بھی کہ وہ جگہ اس کے لیے بالکل اجنبی اور غیر محفوظ ہے، وہ غار بے خطر داخل ہو گیا تھا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں ابھی تک کہیں موجود ہوں کہ نہیں، اس نے اپنے کسی ساتھی کو جان بوجھ کے راستے میں ڈال دیا تھا۔ اگر وہ احتیاط کرتا اور یوں اندھا دھند غار میں نہ گھس آتا تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اسے کا انتظار کرنا چاہیے تھا مگر یہ بھی تو ممکن تھا کہ ہم وہاں سے پہنچنے سے پہلے ہی رفو چکر ہو جاتے۔ گل زری تو یہی کہہ رہا تھا کہ حملے نے ہمیں رُکنے پر مجبور کر دیا اور اب وہ سب کے سب

تھے اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہ گئے ہیں اور موت نے انہیں کیسے اجاڑ دیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ گل زری آخر تھا کون؟ اور وہ سارا دھندا کس کے لیے کر رہا تھا؟ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور میں اتنی بار اپنا سوال ان کے سامنے دُہرا چکا تھا کہ اب میں ان سے دوبارہ پوچھنے سے کترا رہا تھا۔ گل زری نے چپّو سنبھال لیے تھے۔ غار سے وہ صرف اسٹین گنیں ہی باہر لا سکے تھے۔ میں نے بھی سپاہی کی رائفل وہیں پھینک دی تھی۔ وہ مجھے اس گھڑی بوجھ دکھائی دیتی تھی۔ ایک صرف پستول ہی میرے پاس تھا جسے میں نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ رستم اور گولاٹی کچھ اس انداز سے کشتی میں بیٹھے تھے کہ وہ اپنی.... اسٹین گن کو کسی بھی وقت دائیں بائیں طرف کھڑے کسی بھی دشمن پر استعمال کر سکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ابھی تک خطرے کی زد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ جھیل کوئی زیادہ وسیع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ کئی ندیاں وہاں پہنچ کر پانی کے بڑے ذخائر میں بدل جاتی تھیں۔ کیونکہ وہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا تھا اور وہ پھر ایک بڑی ندی کی صورت میں آگے چلتا تھا۔ پانی ٹھنڈا تھا اور یہ احساس دلاتا تھا کہ ابھی موسم گرما کا سورج اس میں تپش پیدا نہیں کر سکا ہے۔ اپریل کا آخر آخر تھا۔ دن بہت بدل گئے تھے۔ مگر وہ جو ایک عذاب میری جان کو لگا تھا اس سے میں چھٹکارا نہیں پا سکا تھا۔ میرے قاتل ابھی تک مجھے نہیں بھولے تھے۔ ایک بار پھر میں نے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا تھا۔ اب وہ زیادہ سرگرمی سے میرا پیچھا کرنے لگے تھے۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ میں کیسے کیسے صدمے جھیل رہا ہوں۔ آسیہ نے پھر میرے لیے زبردست مشکل پیدا کر دی تھی۔ کاش! اس نے میری بات مان لی ہوتی تو مجھے یہ دن دیکھنا نہ پڑتا مگر وہ ضد کی بہت پکّی تھی۔ اپنے ذہن میں اس نے زندگی کا جو نقشہ بنا لیا تھا، وہی اس کی بربادی کا سبب بن گیا اور اب آپی بھی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ دوبارہ اس راستے پر کیسے جا چڑھے۔ آپی سے تو مجھے یہ اُمید تھی کہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکے گا اور بے موت مارا جائے گا۔
اِدھر میرا یہ حال تھا کہ میری پہلی ہی تدبیر الٹ گئی تھی۔ میں اُن کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اور اب ایسے اجنبیوں کے درمیان گھِر کر رہ گیا تھا جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں ان حوادث کو کیا کہوں، وہ آدمی کو ایسے ایسے سنگی ساتھی دے جاتے ہیں، ایسے ایسے لوگوں سے ملاقات کروا دیتے ہیں کہ آدمی ان سے لرزتا بھی رہتا ہے اور ان کا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتا ہے اور یہ عجیب بات تھی کہ میری ملاقات مسلسل ایسے لوگوں سے ہو رہی تھی جو خود زندگی کے عقب میں بندھے گھوڑے کی سی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ کسی کا سہارا نہیں بنتے تھے، خود قانون سے بچتے پھرتے تھے۔ نہ وہ میری کچھ مدد کر سکتے تھے، نہ میں ان کے کام آسکتا تھا۔

گل زری کشتی کو جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف لے جا رہا تھا کہ اچانک رستم نے ہمیں سنبھلنے کا اشارہ کیا، بولا "وہ اُدھر پہاڑی پر کھڑے ہیں۔ بچ جاؤ گل زری!" یہ کہتے ہوئے اس نے اسٹین گن کا منہ کھول دیا مگر اس کی گولی سے پہلے ہی انہوں نے ہم پر باڑھ مار دی۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور پہاڑی کے آخری کنارے تک آپہنچے تھے۔ فاصلہ اتنا تھا کہ ہم کسی بھی طرح ان کی گولیوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اُن کی گولیاں کشتی سے بہت پیچھے برس رہی تھیں۔ وہ کوئی نیا دستہ تھا جو اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے وہاں آ گیا تھا جب اُنہوں نے دیکھا کہ ان کی گولیاں بے کار جا رہی ہیں تو وہ آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے مگر وہ جھیل میں نہیں اُتر سکتے تھے۔ کیونکہ کشتی وہاں کوئی بھی نہیں تھی۔ گل زری نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی تھی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پولیس کے آدمی ایکدم پانی میں کُود گئے۔ وہ بڑے ماہر تیراک دکھائی دیتے تھے۔ چار آدمی اس طرح جھیل میں اتر گئے کہ میں خود ان کی جوانمردی کو دیکھ کر آش آش کر اٹھا۔ کچھ سپاہی پیچھے رہ گئے تھے اور وہ انہیں ہدایتیں دے رہے تھے۔ ان کی آوازیں ہمیں کچھ کچھ سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ سپاہی جھیل میں اترے اور ہتھیار پانی سے اوپر رکھ کر آگے بڑھنے لگے تو رستم نے ایک بار پھر اسٹین گن سیدھی کر لی۔ وہ انہیں وہیں ختم کر دینا چاہتا تھا مگر میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ ایسے دلیروں پر یوں وار کرنا کوئی بہادری کی بات نہیں تھی۔ پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب گل زری نے ہاتھ مار کر رستم کی اسٹین گن نیچے کر دی۔
"اُن پر فائر مت کرو۔ یہ غلط ہے رستم! ایسے جوانوں کو مار دینا کوئی بہادری نہیں ہے۔"
"تو کیا چاہتے ہو تم! اُن کی گولیوں کا نشانہ بنو گے؟"
"ہم جلد ہی دوسرے کنارے پر پہنچ رہے ہیں، سامنے دیکھو۔"
ہم اس وقت واقعی کنارے سے صرف چند گز دُور رہ گئے تھے اور وہ چاروں سپاہی مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہتھیار پانی سے اُوپر اٹھے ہوئے تھے مگر ہم پر انہیں گولی چلانے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ پانی انہیں کسی جگہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں اگر ہم چاہتے تو انہیں وہیں ختم کر سکتے تھے مگر نہ تو گل زری یہ چاہتا تھا اور نہ میں۔ رستم کی آرزو بس دل میں ہی رہ گئی۔ وہ دوبارہ ان پر گولی نہ چلا سکا۔
کنارے پر پہنچتے ہی گل زری نے کشتی اُلٹ کر پانی میں ڈبو دی، اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت سپاہی جھیل کے وسط میں پہنچ چکے تھے مگر اب بھی وہ اتنی دُور تھے کہ ہم پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ یہ اُن کی مجبوری تھی۔ وقت اور فاصلے نے اُن کے لیے رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ ورنہ وہ ہمیں یوں بچ کر نہ نکلنے دیتے۔
کنارے پر پہنچتے ہی گل زری نے کہا "رستم! تم گولاٹی کے ساتھ دوسری طرف نکل جاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم میں سے کسی نہ کسی کو تو زندہ رہنا ہو گا۔

جیسے ہی موقع ملے میرے پاس راولپنڈی پہنچ جانا۔ بس اب نکل جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کی ایک گڈی جیب سے نکال کر اس کو دے دی۔ "یہ نوٹ رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے۔"

رستم نے وہ نوٹ لے کر جیب میں ڈالے اور پھر ان دونوں نے ہم سے بڑی محبت سے مصافحہ کیا اور اسی وقت مشرقی سمت میں نکل گئے سامنے گھنا جنگل ان کا منتظر تھا اور وہ اسی کی اوٹ میں چل کر اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک وہ چاروں سپاہی خاصے آگے آ چکے تھے اور اگر ہم چاہتے تو ان پر بڑی آسانی سے غالب آ سکتے تھے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔

گل زری ان کو دیکھ کر مسکرایا اور انھیں بڑی گندی گالی دے کر بولا۔ "دیکھو تو، کیسے چلے آتے ہیں، جیسے باوا کی بارات پر جا رہے ہوں۔ آؤ، جلدی نکل چلو۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک اسٹین گن میرے حوالے کر دی۔ وہ اس نے دائیں کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ اس کی اپنی اسٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہم نے اپنی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ بلکہ میرا خیال ہے ہم بھاگ نکلے تھے۔ جنگل کا مغربی حصّہ زیادہ گھنا تھا اور ہم اسی راہ سے کسی طرف نکل جانا چاہتے تھے۔

وہ پولیس والے اس وقت تک بہت آگے آ چکے تھے مگر پانی نے انھیں اس قدر تھکا دیا تھا کہ وہ جب کنارے لگے تو کتنی ہی دیر تک انھیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں۔ ہم پلٹ پلٹ کر مفرور گیدڑ کی طرح انھیں دیکھ رہے تھے۔ جھیل کے کنارے اور جنگل کے درمیان کوئی ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ وہ جتنی تیزی سے ہم نے طے کیا، اسے کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ آدمی بھوکا بھی ہو اور اسے سرپٹ دوڑنا بھی پڑے تو پھر باقی کچھ بھی نہیں رہتا ہے۔ میرا وہ شکاری تھیلا میرے کندھے سے لٹک رہا تھا اور میں پاگلوں کی طرح گل زری کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ پولیس کے سپاہی اس وقت کنارے لگے جب ہم جنگل سے کوئی بیس قدم دور رہ گئے تھے۔

بالآخر ہم جنگل میں جا گھسے۔ ہم انھیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ میری اور گل زری کی تقدیر اس گھڑی متوازی چل رہی تھی۔ نہ اسے کوئی پناہ مل رہی تھی اور نہ مجھے۔ پتا نہیں وہ کیا کر چکا تھا اور کیا کرنے جا رہا تھا۔ اسے راولپنڈی پہنچنے کی جلدی تھی اور میری منزل بھی وہی تھی۔ مجھے البتہ معلوم تھا کہ میرا ٹھکانہ کیا ہے میں بہرحال ان اسیروں کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا جن سے میری زندگی وابستہ تھی مگر گل زری کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ابھی تک اس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی ہمارے جوڑ کچھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ ان کو الگ الگ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ جنگل گھنا تھا۔ اتنا گھنا کہ اونچے اونچے درختوں کے نیچے دھوپ بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ راہ راستے کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا مگر پھر بھی ہم اندھا دھند آگے بڑھ رہے تھے۔ گل زری کوئی بہت ہی کبیر سینہ آدمی تھا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا ہوگا کہ نہتے آدمی پر وار کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا دیا تھا۔ خود اس نے ایک طرح سے اپنے دشمن کو وار کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ سپاہی ایک دوسرے سے الگ ہو کر دو دو کی صورت میں ہمارے پیچھے آ رہے تھے اور اس یونہی بغیر کسی نشانے کے ادھر ادھر گولیاں برسا رہے تھے۔ محض خیال سے کہ شاید ہم وہیں کہیں جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں مگر جلد ہی ان کی بندوقیں خاموش ہو گئیں۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا اس طرح تو وہ ہمیں برابر خبردار کرتے آ رہے تھے اور یہ بات ہمیں محتاط بناتی چلی گئی تھی۔ گل زری ان کی اس حرکت پر ہنس رہا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ ہمیں بھاگ جانے کا موقع دے رہے ہیں۔ ورنہ ان گولیوں کا کیا فائدہ ہے؟"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تم نے بھی تو ان پر گولی نہ چلائی تھی!"

"مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے جیلانی! وہ فرض کے بوجھ دب کر مارے جاتے ہیں، ان کا انسپکٹر پیچھے ہی رہ گیا تھا۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"میرا خیال یہی ہے۔ اس نے سپاہیوں کو آگے بھیج دیا تھا جاؤ تم لڑو، میں ذرا سگریٹ پی لیتا ہوں۔" گل زری نے بھاگتے ہوئے کہا۔ اس کا سانس مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ بھاگنے میں اسے کوئی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہ بات میرے لیے بڑی حیرت کی تھی۔ کیونکہ میرا دم پھول گیا تھا اور میری رفتار بھی کم ہوتی جا رہی مگر اس سے ہار نہ ماننے کے خیال سے میں اپنے جسم پر جبر کا کوڑا برساتا چلا جا رہا تھا۔ میں خود کو اس سے کم تر ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہمارے اور پولیس کے سپاہیوں کے درمیان فاصلہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا اور ہم ابھی تک جنگل میں ہی تھے۔ پولیس کے سپاہی ہمیں دوبارہ نہیں آئے۔ وہ شاید بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اچانک درختوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے لگا اور ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں کندھوں تک اونچی گھنی کانٹے دار جھاڑیاں ایک دوسرے میں پھنسی نظر آتی تھیں۔ وہ اتنی گنجان تھیں کہ ان کے درمیان سے گزرنا محال نظر آتا تھا۔ ہم نے دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن سنبھال کر ان کو راستے سے ہٹانا شروع کیا اور بڑی مشکلوں سے ان میں سے گزرنے لگے مگر گل زری نے جگہ مجھے روک لیے بولا۔ "واپس چلو یار! یہ راستہ صحیح نہیں ہے۔" مگر ابھی اس نے قدم پیچھے ہٹایا ہی تھا کہ اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ وہ سے نیچے جھکا مگر بڑی دیر ہو چکی تھی۔ ایک سانپ اس کی پنڈلی کو ڈس گیا تھا اور اب وہ تیزی سے جھاڑیوں کے اندر چھپ رہا تھا۔ میں نے ایک دم اسے تاک کر گولی چلا دی۔ وہ درمیان سے کٹ کر رہ گیا۔

گل زری بھی زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ ایک دم بدلنے لگا۔ اسے میں نے کھینچ کر جھاڑیوں سے باہر نکالا۔ اس حال میں کہ اس کی اسٹین گن اس نے کندھے پر لٹکالی تھی اور اس کو میں نے کندھوں سے پکڑ رکھا تھا اسے درختوں کے پاس لا کر میں نے زمین پر لٹا دیا۔ اس کی حالت دم بدم خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اس کی جیب سے رومال نکال کر فوراً ہی اس کی پنڈلی سے اوپر کس کر باندھ دیا اور اس کے زخم پر منہ رکھ کر میں اس کے جسم سے زہر نکالنے لگا مگر میری یہ تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ درحقیقت تک اتنے الٹے بہت سا زہر اس کے خون میں سرایت کر چکا تھا۔ تین چار بار میں نے اس کی پنڈلی کا خون چوس کر پھینک دیا مگر گل زری کی حالت نہیں سنبھلی۔ زہر کا اثر میرے منہ میں بھی گھلنے لگا تھا۔ اسے میں نے جوں توں کر کے بار بار تھوکنے سے باہر تو نکال دیا لیکن گل زری کا بدن اپنا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ رومال اگرچہ میں نے بہت کس کر باندھا تھا مگر پھر بھی وہ سانپ اتنا زہریلا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے گل زری کو میرے ہاتھ سے چھین کر لے گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات بھی نہ کہہ سکا۔ مجھے یہ بھی نہ بتا سکا کہ وہ ہے کون اور اس کے مقاصد کیا تھے۔ اپنی سی تمام تدبیریں میں نے کر ڈالی تھیں۔

مگر نہیں، کافی دیر تک بالکل ساکت رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ وہ پھر سے ہوش میں آ رہا تھا۔ بڑی ہی کمزور آواز میں بولا۔ "جیلانی! مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میں۔۔۔۔ میں بچ گیا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ میں تمھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں برادر! ایسا نہ سوچو۔ میں تمھارے پاس ہوں، اب کیا حال ہے تمھارا؟"

"میں ٹھیک ہوں، میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔ تم نے۔۔۔ تم نے بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا زہر چوس لیا ہے۔ میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکوں گا برادر! کبھی نہیں۔" اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر سینے پر ڈال لیا۔ جیسے وہ اطمینان کرنا چاہتا ہو کہ میں ابھی تک وہیں ہوں۔

"ایسا نہ سوچو گل زری! میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میرے ہاں دوست ہو تم۔"

"مجھے پانی پلاؤ۔۔۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔" اس نے بڑی ہی مری سی آواز میں کہا۔ ایسی آواز میں جیسے وہ کسی گہرے کنویں سے بول رہا ہو مگر پانی میں کہاں سے لا سکتا تھا۔ راستے میں تو کسی بھی جگہ مجھے پانی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میں وہاں سے اٹھ گیا۔

"میں تمھارے لیے پانی لاتا ہوں۔"

"ادھر ان درختوں کے نیچے بائیں ہاتھ۔ برسات کا پانی جمع رہتا ہے۔ وہاں سے لے آؤ۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا درختوں کے نیچے سے چلتا ہوا بائیں ہاتھ بڑھا، تب مجھے معلوم ہوا کہ گل زری اس علاقے سے کچھ زیادہ ہی واقف تھا۔ وہاں ایک تالاب سا بنا ہوا تھا اور پانی وہاں جمع تھا۔ ایسا پانی جو اتنا صاف شفاف تھا کہ اس کے اندر موجود مچھلیاں بھی صاف نظر آتی تھیں، اسے دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ کسی جھرنے نے وہاں گر کر وہ تالاب سا بنا دیا تھا۔ جس میں پانی جمع ہونے کے بعد آگے نکل جاتا تھا۔ برتن تو میرے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ میں پانی لے جاتا تو کیسے لے جاتا۔ میں نے اردگرد نگاہ ڈالی تو مجھے کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹا ہوا گھڑا دکھائی دیا جس کا پیندا ابھی سلامت تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس جھرنے کا پانی لوگ اپنی ضرورت کے لیے گھروں تک لے جاتے تھے۔ مگر اس وقت وہاں کوئی بھی آدمی موجود نہیں تھا۔ وہ پیندا اٹھا کر پہلے تو میں نے اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا، زہریلے خون کا اثر اپنے منہ سے صاف کیا اور پھر پیندے کو پانی سے لبالب بھر لیا۔ اچانک مجھے دائیں ہاتھ کی جھاڑیوں میں سے دو نیل گائیں سر نکالتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں، ان کو دیکھتے ہی میں نے پانی زمین پر رکھا اور ایک پتھر کی اوٹ میں چھپ کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ آئیں اور سیدھی پانی تک جا پہنچیں۔ وہ پیاسی تھیں اور دن بھر کے لیے پانی کی ضرورت سے بے نیاز ہونے کے لیے تالاب پر جھک رہی تھیں۔ میں نے اسٹین گن سیدھی کر لی۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت ان میں سے کسی ایک کو مار کر میں اپنی اور گل زری کی بھوک مٹا سکتا تھا۔ مگر جب وہ میرے نشانے کی زد میں آئیں تو پتا نہیں کیا ہوا میرے دل نے مجھے لبلبی دبانے سے روک دیا۔ میں انھیں ہلاک نہیں کر سکتا تھا، مجھے اس کا کوئی حق نہیں تھا وہ فطرت کا بڑا ہی حسین شہکار نظر آتی تھیں۔ ان کے بدن بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ وہ اس جنگل کا حصہ نظر آتی تھیں۔ میری اٹھی ہوئی اسٹین گن وہیں جم کر رہ گئی۔ ان کو مار دینے کا حق مجھے حاصل نہیں تھا۔ میں نے ان کو پانی پینے دیا اور اسٹین گن کندھے سے لٹکا کر میں نے گھڑے کا پیندا اٹھایا اور پھر گل زری کی طرف چل دیا۔ مگر ابھی میں وہاں سے چار ہی قدم آگے نکلا ہوں گا کہ ان دونوں نے مجھے دیکھ لیا اور پھر کچھ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگیں کہ جھاڑیوں میں غائب ہوتے وقت وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ ان کو اس طرح بدحواس ہوتے دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ ان پر ہاتھ نہ اٹھا کر میں نے اچھا ہی کیا تھا ورنہ ان کو مار لینا تو کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر مجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملتا وہ بہت کرتیں تو ہماری دو وقت کی بھوک مٹا دیتیں۔ باقی کا گوشت ہم وہیں پھینک کر نکل جاتے۔ وہ ہمارے کس کام کا تھا۔ ہاں قدرت نے ان کو پالنے پوسنے کا جو کام کیا تھا وہ بے بدل تھا۔ اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا

سکتا تھا۔ میر نے کہا تھا کہ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں۔ اچانک مجھے اس فکر مند کا ایک مصرع یاد آ گیا۔ اور میں اُسے منہ ہی منہ میں گنگناتا ہوا واپس گل زری کے پاس جا پہنچا۔ وہ میری راہ دیکھ رہا تھا، پانی دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اور اُسے منہ سے لگا کر غٹا غٹ پی گیا۔ یہاں تک کہ وہ پینڈا آدھا رہ گیا۔ سیر ہونے کے بعد وہ بولا "تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے جیلانی؛ ورنہ یہ سانپ تو مجھے مار ہی گیا تھا۔"

"ایسا نہ کہو گل زری! تم میرے دوست ہو اور انسان دوست بھی ہو تمھیں پا لینے کی مجھے خوشی ہے اب کیا حال ہے تمھارا؟"

"ٹھیک ہی ہوں۔ یہ زہر تم نے نکال دیا' طریقہ تمھیں معلوم تھا ورنہ تو وہ بہت ہی خطرناک تھا۔"

"ہاں میں نے اُسے مار دیا تھا مگر... تم چل سکتے ہو کہ نہیں؟"

"مجھے کچھ دیر آرام کر لینے دو۔ لگتا ہے جیسے میں بہت پرانا روگی ہوں۔ بدن میں جان ہی نہیں رہ گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم آرام کر لو۔ میں پہرہ دیتا ہوں۔ مجھے اُن پولیس والوں کا ڈر ہے وہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔"

"ہاں مگر ہم خاصے آگے نکل آئے تھے۔ رستم اور گولالی کو میں نے اسی لیے دوسری طرف بھیج دیا تھا تاکہ ان کی توجہ بٹ جائے۔ ہو سکتا ہے وہ اُن کے پیچھے نکل گئے ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے تم اس جنگل سے خاصے واقف ہو۔"

"ہاں میں کئی بار یہاں سے گزرا ہوں۔"

"مگر کس لیے؟ اور تمھارا دھندا کیا ہے بھئی! میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔" وہ بڑی بے دلی سے مسکرایا اور پنڈلی سے اُوپر بندھے رومال کو اور زیادہ کسنے لگا۔

"یہ بات نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔"

"پھر بھی۔ پتا تو چلے۔ وہ رستم اور شنواری بتا رہے تھے کہ تم لوگ بسیں لوٹتے ہو مگر مجھے یقین نہیں آتا۔"

وہ درخت کے نیچے لیٹا تھا، اُٹھ کر اس کے تنے کی ٹیک لے کر بیٹھ گیا۔ رنگ اس کا ابھی تک زرد تھا۔ اس نے گھڑے کا پینڈا اٹھا کر پھر منہ سے لگا لیا اور سارا پانی پی کر اسے الگ رکھ دیا۔ بولا۔

"میں ایک تنظیم کے لیے کام کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری تنظیم حق بجانب ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، آخر ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے تمھیں اتنی رازداری کی ضرورت ہے؟"

"اپنے ساتھیوں کو ہم لیس کر رہے ہیں۔ مختلف ذریعوں سے میں ان کو اسلحہ فراہم کر رہا ہوں۔ جہاں جہاں سے یہ اسلحہ اور دھماکا خیز مواد ملتا ہے وہ میں لے کر انھیں پہنچاتا ہوں۔ تم جس عرفان کی اور مرشد کی بات کر رہے ہو' وہ بھی ہماری ہی تنظیم کے رکن ہیں۔ عرفان جس کو تم بے ہوش کر کے ڈاک بنگلے میں چھوڑ آئے تھے، اُسے میں نے ختم کر دیا ہے۔ وہ اُن کے ہاتھ آ جاتا تو سب کچھ وہ اُگلوا لیتے۔ اُف! میری پنڈلی میں درد بڑھنے لگا ہے۔" وہ ٹانگ پھیلا کر بولا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بھی میری نظر میں ہے اور میں تمھیں اسی لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں' تم ہمارا ساتھ دو، ہم میں شامل ہو جاؤ۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم۔ اور اس سارے کے لیے ہمیں اسلحے کی ضرورت ہے جس سے ہم جا بجا رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔ میں تمھیں اسی لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں ورنہ مجھے معلوم ہو گیا تھا تم کون ہو۔ میں تمھیں وہیں ختم کر سکتا تھا مگر میں ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔"

"اور ابھی تمھیں اللہ نے صرف سانپ سے بچوایا ہے۔ میں یہ اسٹین گن سیدھی کر لوں تو تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ گویا یہ تم ہی تھے جس نے جلسے میں وہ دھماکا کرایا تھا؟"

"اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا ہوں مگر ساری بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی نہ کسی نے اُن کو اس کام پر لگایا ہو گا۔"

"تم خود کہتے ہو کہ عرفان کو تم نے خود ختم کر دیا ہے۔"

"ہاں۔ میں بھی جلسے میں موجود تھا مگر میں تمھیں جانتا تھا۔ جب پولیس تمھارے پیچھے لگی تو تب بھی میں نہ سمجھا بات کیا ہے۔ عرفان، مرشد اور جلیس جب وہاں سے بھاگے، اُس وقت بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اچانک پولیس کے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تب مجھے معلوم ہوا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں گاڑی لے کر تم لوگوں کے پیچھے چل دیا مگر مجھے بہت دیر ہو گئی۔ اور جلیس کو میں نے گاڑی کے اندر مردہ حالت میں دیکھا۔ تب تمھارے پیچھے بھاگا مگر پولیس پہلے ہی تمھارے تعاقب میں آ چکی تھی۔ میں جب ڈاک بنگلے پہنچا تو اُس وقت پولیس وہاں داخل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ڈاک بنگلے میں آ کر عرفان کو خنجر مار کر ختم کر دیا مگر ابھی میں تمھاری تلاش میں ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑیاں وہاں آ پہنچیں۔ میں اُن سے بچنے کے لیے وہاں سے بھاگ نکلا۔ میری گاڑی ڈاک بنگلے کے باہر رہ گئی۔ اس تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا اور میں مختلف راستوں پر چلتا ہوا غار تک جا پہنچا۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کوئی سامان تھا تمھارے پاس؟"

"وہ میں نے کل صبح وہاں سے نکالا تھا۔ اُسے ٹھکانے پہنچا کر میں رات کو سبھراؤں چلا گیا تھا۔"

"تو یوں کہو کہ ملک کے اصل دشمن تو تم لوگ ہو۔ گھر کے بھیدی ہو کر لنکا ڈھا رہے ہو' ذلیل آدمی! میں تمھیں کبھی

نہیں کروں گا۔ یہ سانپ تمھیں مار ہی دیتا تو اچھا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ڈھلوں کو ختم کرنے میں بھی تمھارا ہی ہاتھ تھا۔ گل زری! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک دشمن کو زہر سے بچا رہا ہوں۔" میں نے اسٹین گن سیدھی کر لی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس کا مغز پاش پاش کر دوں۔ "بہتر ہے تم مجھے اپنا اصلی نام بتا دو۔ تم گل زری ہرگز نہیں ہو۔ بتاؤ تم کون ہو اور تمھاری تنظیم کا کیا نام ہے؟ میں سب کچھ اگلوائے بغیر تمھیں نہیں چھوڑوں گا' بتاؤ تم کون ہو؟"

"دیکھو زیادہ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے مجھے دوست کہا ہے، میرے عیب اور میرے ہنر پر نظر نہ ڈالو۔ یہ دیکھو کہ میں تمھیں ختم کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تم مجھ پر کیسے گولی چلا سکتے ہو۔"

"وہ تمھاری غلطی تھی مگر میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔ دشمن کو اتنا قریب دیکھ کر تو میں چپ نہیں رہ سکتا۔ تمھیں پتا ہے میں نے ڈھلوں کو بھڑکتی آگ میں سے نکالا تھا اور تم نے اسے مار دیا۔ بتاؤ تم ہو کون؟ تم گل زری نہیں ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمھیں اصل بات بتا کر غلطی کی ہے مگر میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ جاگیردار تھا۔ اس کی گردن پر کئی لوگوں کا خون تھا' اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ وہ ملک کا دوست تھا، ہمدرد تھا۔ وہ اس ملک کا سچا شہری تھا۔ اس کی ذات پر لوگوں کو فخر تھا۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ تمھارا دشمن تھا؟"

"دیکھو! ڈھلوں کو نہ میں نے مارا ہے نہ میری تنظیم نے۔ وہ کسی اور کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور اب تم ملک صاحب کو بھی مار دینا چاہتے تھے۔"

"ہاں۔ اس کی ذمے داری میں لینے کو تیار ہوں۔ ریاض قدیر تو بے چارہ خواہ مخواہ ہی مارا گیا ہے۔"

"اور ابھی تمھارا منصوبہ ختم نہیں ہوا ہے' ہے نا یہی بات؟"

میری بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بولا "میں ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔"

لیکن اس کی چال میں وہ پہلی سی مضبوطی اور ثابت قدمی نہیں رہی تھی بلکہ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اپنی اسٹین گن وہ میرے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ تب میں نے اطمینان سے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ وہ میرے سامنے تھا تو میرے لیے مسلسل اشتعال کا سبب بن رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے اوٹ میں ہوا تو میں نے اس معاملے کے ہر پہلو کا جائزہ لیا۔ ابھی تو میں صرف ایک ہی آدمی سے مل سکا تھا۔ اگر میں اس کی دوستی کا دم بھرنے لگوں تو مجھے یقین تھا کہ ایسی صورت میں یہ بات میرے لیے زیادہ آسان ہو جائے گی کہ میں اُن کے اندر رہ کر ان کو ختم کر دوں۔ یہ زیادہ بہتر تھا اور مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ ڈھلوں کو مار چکے تھے اور گل زری کو اس سلسلے میں سب کچھ معلوم تھا۔ اب وہ جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔ کل رات انھوں نے بڑے صاحب کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہ گئے تھے۔ مگر پھر بھی اُن کا نام تو ان کی فہرست میں شامل تھا۔ نام وہ کسی غیر ملکی تنظیم کا لے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ اُن کے آلۂ کار ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُن کے اندر ہی کچھ ایسے لوگ ہوں جو اس سازش کے سرغنہ ہوں۔ مجھے اُن کے اندر گھس کر ہی ساری صورتِ حال معلوم ہو سکتی تھی۔ باہر رہ کر یا گل زری کو یہیں مار کر میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لازم تھا کہ میں اس شخص سے الجھنے کے بجائے اس سے دوستی کا دم بھروں کیونکہ وہ ہر حال میں میرا بہت احترام کرتا تھا اور اُسے یقین تھا کہ اگر میں اُن کی تنظیم میں شامل ہو جاؤں تو اُن کا کام اور زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔ مجھے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ باہر رہ کر تو میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں سے نکل کر یا اس جنگل میں رہ کر اگر میں گل زری کو چھوڑ دیتا ہوں اور اسے میری نیت پر ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا ہے تو وہ میری دوستی کا دم بھرنے کے باوجود اسی شبہے کی بنا پر مجھے کسی بھی وقت ختم کر سکتا تھا۔ مجھے ہر حال میں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

عین ممکن تھا کہ آسیہ اور آپی کو جیل سے رہائی دلانے میں وہ میری کوئی بڑی ہی موثر مدد کر سکیں۔ اُن کے لیے شاید یہ زیادہ آسان ہو۔ معاملے کا یہ پہلو بھی اس گھڑی میری نظر میں تھا۔ میں منافق تو نہیں تھا مگر اس وقت مجھے منافقت ہی اختیار کر لینی چاہیے تھی ورنہ صورتِ حال بہت ہی دگرگوں ہو سکتی تھی۔ خدا جانے اُن کی فہرست میں اور کس کس بدنصیب کا نام شامل تھا' مجھے یہ تمام باتیں معلوم ہونی چاہییں۔ گل زری اُن کا بہت ہی اہم رکن تھا۔ وہ شکل صورت ہی سے پڑھا لکھا دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ اس کی گفتگو بھی لکھے پڑھے لوگوں ایسی تھی۔ پتا نہیں اس کی تعلیم کیا تھی مگر جس بے دردی اور سنگدلی سے اس نے شنواری کو غار میں پھینک دیا تھا اس سے تو میں یہی نتیجہ نکال سکا تھا کہ اُن کے دل میں کسی کے لیے کوئی ہمدردی اور غمگساری نہیں تھی، بلکہ وہ آدمی کو اس وقت تک اپنے تصرف میں رکھتے تھے جب تک وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے چوسی ہوئی گٹھلی کی طرح پھینک دیتے تھے۔ شنواری کا حال میرے سامنے تھا۔ گل زری نے اسے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اُن کے لیے وہ بے کار ہو چکا تھا۔ وہ ارادے کے اتنے مضبوط لوگ تھے کہ اس گل زری نے خود جا کر ڈاک بنگلے میں عرفان کا جگر چیر ڈالا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے خنجر استعمال کیا تھا مگر وہ ۔۔۔ وہ

تو اس وقت میرے پہلو کے کمرے میں تھا۔ یہ بات وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اُس نے خود اس کا کام تمام کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے اُسے پہلے میرا پتّہ صاف کرنا چاہیے تھا اور میں اس وقت گہری نیند میں تھا۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

کچھ ہی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کی طبیعت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی تھی۔ آتے ہی اس نے مجھ سے سگریٹ طلب کیا اور اُسے سلگا کر بولا۔ "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ مت سمجھو کہ میں تمھارا دشمن ہوں۔ یہ اسٹین گن میں اسی لیے ادھر رکھ گیا تھا تاکہ تم مجھ پر اعتماد کرنا سیکھو۔"

"تم کہتے ہو کہ عرفان کو تم نے ڈاک بنگلے میں ختم کر دیا۔ مگر وہ تو میرے نزدیک ہی موجود تھا۔ پہلو والے کمرے میں۔"

"میں کھڑکی کے راستے اس کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُسے تم ساتھ لے آتے ہو کیونکہ سڑک پر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس وقت ڈاک بنگلے کا چوکیدار گہری نیند میں تھا اور اتفاقاً وہ کھڑکی کُھلی تھی جس میں سے گزر کر میں اُس تک پہنچ گیا۔"

"تمھیں میرا خیال نہیں آیا۔ میں بھی تو وہیں تھا۔"

"میں اُدھر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر گاڑیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اُن سے بچنے کے لیے میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ پھر وہ باقی رات تمھاری تلاش میں پھرتے رہے۔ اُن سے بچتے ہوئے میں دُوسرے راستے سے غار تک جا پہنچا۔"

"ہُوں ۔ ۔ ۔ دیکھو میں تم سے یہی کہوں گا کہ یہ راستہ چھوڑ دو اور پولیس کو اطلاع دے دو کہ تمھاری تنظیم کیا کر رہی ہے تب ہی تم میرے دوست ہو سکتے ہو ورنہ میں تمھارا راستہ روکوں گا۔ مجھ سے کسی بھلے کی توقع مت رکھو۔"

"وہ راستہ تو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ جس مقصد کے لیے ہم کام کر رہے ہیں وہ بہت اعلیٰ و ارفع مقصد ہے۔ اس پر ہزاروں جانیں قربان کی جا سکتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں خواہ مخواہ ہی اُن کے پیچھے امرتسر گیا۔ بلاوجہ ہی اتنی ساری تکلیفیں اٹھائیں۔ اصل لوگ تو اب میری سمجھ میں آئے ہیں مگر تمھارے اور اُن کے پروگرام میں ایک بات تو بالکل مشترک ہے۔ ایسی ہی ایک فہرست اُن لوگوں نے تیار کر رکھی ہے جس میں یہاں کے بڑے بڑے لوگ شامل ہیں۔ وہ فہرست میں نے ڈھلوں صاحب کو دے دی تھی۔ اس کے لیے میں نے بڑی محنت کی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اصل سانپ تو تم ہو۔"

"یہ تمھارا وہم ہے جیلانی! ہمارا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور اگر میں یہ بات ثابت کر دوں تو؟"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو گا۔"

"اگر میں ثابت کر دوں کہ تمھاری تنظیم کے سب سے اُونچے عہدے پر فائز آدمی اُن لوگوں کا آلۂ کار بنا ہُوا ہے تو پھر!"

"اس کا نام بتا سکتے ہو تم؟"

"یہ تو تم ہی مجھے بتاؤ گے۔"

"ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔ بہرحال تم سوچ لو۔ جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اطمینان سے دو چار دن بعد اپنی مرضی بتا سکتے ہو۔ یار! اِس نے کہیں زیادہ ہی اثر نہ ڈال دیا ہو میرے بدن میں جان ہی نہیں رہی ہے۔"

"ٹھیک ہو جاؤ گے تم۔ کہیں سے دُودھ تمھیں مل جائے تو بہتر ہے۔"

"تو پھر چلو۔ پہاڑ سے نیچے اُتر کر ایک گاؤں آتا ہے شلکاری۔ وہاں سے دُودھ مل سکتا ہے۔"

"تم چل سکتے ہو؟"

"ابھی نہیں، مجھے کچھ آرام کر لینے دو۔ تم نے زہر پُورا نکال دیا تھا نا؟"

"ہاں۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی جب ہی تو تم بچ گئے ہو۔"

"یہ تمھاری مہربانی ہے جیلانی! ورنہ کون کسی کا زہر اپنے منہ میں ڈالتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ رنگ اس کا ابھی تک اصلی حالت میں نہیں آیا تھا۔ زخم سے اب خون بہنے لگا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کے بدن نے زہر کو پوری طرح رد کر دیا تھا۔ وہ خون اس بات کی علامت تھا۔

اچانک مجھے کہیں قریب ہی سے اُن اونچی اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے گاڑی کی گھڑگھڑ سنائی دی۔ گل زری نے بھی آواز سُن لی تھی۔

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ تو کسی گاڑی کی آواز ہے بھئی! اس کو دیکھو کہیں ہم بے موت ہی نہ مارے جائیں۔" گل زری نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور اسٹین گن اس نے سیدھی ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں خود بھی گاڑی کی آواز سے پریشان ہو گیا۔ وہاں سے نکلنا ہی مشکل تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ پولیس کی جیپ ہے۔ کار کی آواز قدرے مختلف ہوتی ہے۔ میں درخت کے پاس پہنچ کر دو قدم اُٹھا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی پولیس کی جیپ تھی اور اب وہ جھاڑیوں کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ جیپ پر کئی جوان سوار تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔

"یہ تو پولیس کی جیپ ہے بھن جی! اور اُن میں سے ایک کے پاس وائرلیس بھی ہے۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کو اس جنگل کے اندر کوئی اطلاع دے رہے ہیں۔"

"کوئی راستہ ہے؟ میں تو اس جگہ سے بالکل ناواقف ہوں۔"

"اب تو جھیل کی طرف لوٹنا بھی ممکن نہیں رہا۔ چلو، تم اُدھر اس جھرنے کی طرف چلو۔"

"تم چل سکو گے؟"

"کوشش کرتا ہوں جہاں تک جا سکا میں چلوں گا۔ مجھے چلنا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ہم دوبارہ گھنے جنگل کی طرف مڑ گئے۔

"شاید ہم دونوں کا وقت قریب آ گیا ہے۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا ہے جیلانی!"

"ایسا نہ کہو۔ ذرا ہمت سے کام لو۔" میں نے اُسے تیز چلاتے ہوئے کہا۔ اس کا حوصلہ تو بہت بلند تھا مگر جسم اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے کچھ دُور جا کر میرا کندھا چھوڑ دیا۔

"تم کب تک مجھے سہارا دو گے، یہ سفر مجھے خود ہی طے کرنا ہو گا۔" جیپ اُس وقت تک جھاڑیوں کے آخری حصے میں آ پہنچی تھی اور ہم وہاں سے زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ دُور گئے ہوں گے۔ اچانک ہمیں محسوس ہُوا کہ جنگل مختلف اطراف میں سیٹیوں سے گونجنے لگا ہے۔ وہ سپاہی جو جھیل میں سے گزر کر جنگل میں آئے تھے، اُن سیٹیوں کا جواب دے رہے تھے ۔ وہ ہماری تلاش میں پھر رہے تھے۔ ایک ایک قدم بہت پھونک پھونک کر اُٹھانے کی ضرورت تھی۔

"اگر تو بچ گیا نا جیلانی! تو میری ایک بیوی ہے جو کرسیاں میں رہتی ہے، کالج کے بالکل ساتھ والی گلی میں۔ تم اس کو سہارا دو گے۔ وہ بہت پڑھی لکھی عورت ہے، ڈبل ایم۔اے ہے مگر میں نے اسے نوکری نہیں کرنے دی۔ میری موت کی صورت میں اس کا خیال رکھنا۔ اس حال میں مجھے بچ جانے کی امید نہیں ہے جیلانی!"

"بکواس کرتے ہو تم۔ ہم زندہ رہیں گے۔ پلٹ کر ہم اُن جھاڑیوں میں جا بیٹھتے ہیں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ اُدھر نکلو پھر۔" اُس نے جنگل کے کنارے کا رُخ کیا۔

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دیکھو وہ شنواری بھی تو بے موت مارا گیا ہے۔ ہم اس کی لاش بھی دفن نہ کر سکا۔ آدمی کتنا بے حس ہے حالانکہ ہمارے لیے ہی اس نے جان دی تھی۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اس کی موت ایسے ہی لکھی تھی کہ اسے کفن بھی نصیب نہ ہوتا۔ تیز چلو۔" میں نے نیچے جھک کر اس کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے کہا۔ جھاڑیاں اب ہمیں زیادہ دُور نہیں لگتی تھیں۔ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ وہ ہمیں دیکھ سکیں۔

اچانک ہمیں کچھ ہی فاصلے پر وہ جیپ کھڑی نظر آئی۔ ہم ایک دم نیچے بیٹھ گئے۔ جنگل ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا۔ "دو دو کی صورت میں چاروں طرف پھیل جاؤ۔ جیسے ہی وہ نظر آئیں، سیٹی بجا کر سب کو خبردار کر دو۔ گولی چلاؤ تو صرف ٹانگوں پر یا بازو پر، سمجھے! اُن کو زندہ پکڑنے کا حکم ہے۔" وہ کوئی انسپکٹر قسم کی چیز تھا۔ اُس نے دوبارہ وائرلیس ہاتھ میں لیا اور بولا۔ "اُن کی تعداد چار ہے، انھیں ہر حال میں گرفتار کرنا ہے سمجھے! اور زندہ حالت میں۔"

ہم تو سکڑ سمٹ کر رہ گئے۔ جیپ زیادہ سے زیادہ کوئی سو قدم دُور ہو گی۔ اگر بیچ میں جنگل اور وہ گھنی جھاڑیاں نہ ہوتیں تو ہم سیدھے اُن کی زد میں جا پھنسے تھے۔ ابھی تک قدرت ہمیں اُن سے بچا رہی تھی۔ لیٹے لیٹے ہم آگے بڑھنے لگے، اس حالت میں گل زری کا ہاتھ زیادہ تیزی سے نہیں چلتا تھا مگر اُس پر ٹھہر ٹھہر کر ایسی غنودگی طاری ہوتی تھی کہ وہ بے بس ہو جاتا تھا اور پولیس ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ انھیں یہ حکم تھا کہ ہم جس حال میں بھی دستیاب ہوں گرفتار کر لیے جاویں۔ آہستہ آہستہ ہم اُن جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے جو آدمی کے کندھے کندھے تک اونچی تھیں اور جن کی جڑوں میں سانپ رینگتے پھرتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اُن جھاڑیوں میں جا پہنچے۔ وہ لوگ ابھی تک ہمیں نہیں دیکھ سکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم ابھی دُور کہیں گھنے جنگل میں ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جیپ کو جنگل کے کنارے چھوڑ کر آگے نکل گئے تھے جب کہ ہم جھاڑیوں میں جا لیٹے تھے۔

وہاں پہنچ کر ہمیں ذرا دَم لینے کی مہلت ملی تو گل زری کے کہنے کے مطابق میں نے اس کا رُومال اس کے زخم پر اس طرح باندھ دیا کہ پہلے میں نے زخم پر مٹی ڈال دی، اسے رُومال کی پٹی نے بہت سکون پہنچایا۔ بولا۔ "تنہا آدمی بھی کتنا بے بس ہوتا ہے ۔ میں سوچتا ہوں یہ حادثہ اگر مجھے کہیں اکیلے میں پیش آتا تو کیا ہوتا؟"

"بندہ بندے کا دارو ہوتا ہے گل زری! میں بہرحال تمھیں مرنے نہیں دیتا۔ میرا خدا اب بھی میری دعا سُن لیتا ہے۔ اگرچہ میں بڑا ہی گنہگار ہوں مگر مجھے اب بھی اس کی رحمت پر بھروسہ ہے۔"

"کیا ہم یہاں سے بچ نکلیں گے؟"

"آثار تو ایسے ہی ہیں، وہ لوگ جنگل کی طرف نکل گئے ہیں۔"

"یار! کہیں وہ رستم اور گولائی کو ہی نہ پکڑ لیں۔"

"نہیں، وہ بہت دُور نکل چکے ہوں گے اور پھر اُن کا راستہ بھی تو اور تھا۔ وہ مشرق کی طرف گئے تھے۔"

"ہو سکتا ہے وہ لستراڑ کی طرف نکل گئے ہوں۔ وہ راستہ

انھیں معلوم تھا۔"

"چپ رہو اور جھاڑیوں کو مت چھیڑو۔ وہ دو متلاشی ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔" میں نے دو سپاہیوں کو درخت پر چڑھے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑے غور سے ان جھاڑیوں کو دیکھ رہے تھے جن میں سے وہ جیپ چلا کر آگے نکلے تھے۔ سارے علاقے پر اُن کی نظر تھی۔ انھوں نے یہ اچھا طریقہ نکالا تھا کہ وہ درخت پر جا چڑھے تھے تاکہ چاروں طرف نگاہ ڈال سکیں اور ہم ایسے یتیم اور لسیر لوگوں کی گرفتاری پر انعام حاصل کریں — وہ یہی چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ گل زری کی گرفتاری پر بھی اُن لوگوں نے کوئی انعام ضرور ہی مقرر کر رکھا ہوگا۔ کیونکہ ایسا آدمی اُن کی نظر میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور وہ اتنا نڈھال ہو رہا تھا کہ صرف ایک کنکر مار کر بھی اسے نیچے گرایا جا سکتا تھا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اُن سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ ابھی تک زہر کے اثرات سے محفوظ نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ اُس سانپ کی دہشت ایسی اس کے حواس پر چھا گئی تھی کہ بدن کا سارا زہر ختم ہونے کے باوجود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ابھی تک تندرست نہیں ہو سکا ہے۔ بلشتر سانپ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ ڈستے بھی ہیں مگر زہر نہیں اُگلتے۔ اِن کا شکار صرف اپنے خوف کی وجہ سے ہی مر جاتا ہے اور گل زری کی یہی کیفیت ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں اُسے بار بار تسلی دیتا چلا آ رہا تھا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے اور اُسے اب زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے مگر وہ میری اس بات پر اعتبار ہی نہیں کرتا تھا۔

تھا تو وہ اسی قابل کہ میں اسے وہیں ختم کر دیتا تو یہ زیادہ اچھی بات ہوتی مگر مجھے اس سے کچھ اور ہی کام لینے کی سوجھ رہی تھی۔ اسی لیے میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ مجھ پر مکمل اعتماد کا اظہار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ہتھیار بھی میرے سامنے ڈال دیے تھے۔ اُن کی طرف سے اسے قطعاً بے اختیاری نہیں تھی۔ اُسے یقین تھا کہ میں اس کی تنظیم میں شامل ہو جاؤں گا۔ وہ جھاڑیوں کے بیچ میں اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اس کا دم پھولنے لگا تھا۔ پتا نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سپاہی درخت سے نیچے اتر گئے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکے تھے۔

"وہ کہیں ادھر تو نہیں آ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ وہ درخت سے اتر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ پھر جنگل کی طرف نکل گئے ہیں۔"

"مجھے بہت بھوک لگی ہے جیلانی! میں کیا کروں؟"

"یہاں تمھاری پھوپھی بیٹھی ہے جو تمھیں پراٹھے پکا د

بھوک کا خیال چھوڑو میاں! یہ دیکھو کہ ہم یہاں سے کیسے سکتے ہیں۔ وہ کھوتے کے پتر سیدھے ہم پر چڑھے آتے ہیں۔"

"ہم لیٹ کر آگے بڑھ سکتے ہیں مگر بہت احتیاط کی ہوگی۔ کوئی جھاڑی ہلنی نہیں چاہیے۔"

"تو چلو پھر! نکل چلو۔ جو کرے کرتار۔"

میں بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر لیٹ گیا۔ راستے پتھریلی زمین ہمارا استقبال کر رہی تھی۔ کوئی بیس قدم آگے کر وہ رُک گیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ جانور جسم اس کے ارادوں میں حائل ہونے لگا تھا۔

اچانک بکریوں کا ایک غول اُن جھاڑیوں میں نمودار ان کی تعداد کوئی سو کے قریب تو ضرور ہی ہوگی۔ وہ دائیں آگے پیچھے جو کچھ سامنے آتا اس پر منہ مارتی چلی آ رہی تھیں۔ اور ان رکھوالے کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اُن آوازیں ہمیں سنائی دینے لگیں۔ وہ تعداد میں دو تھے۔ ایک آواز یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ کوئی جوان آدمی ہے، دوسرا بہت بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ بکریوں نے ہمیں یوں جھاڑ میں لیٹے دیکھا تو وہ عجیب انداز میں ممیانے لگیں، یوں جیسے انھیں سانپ نظر آ گئے ہوں۔

"اِن میں سے کسی کو پکڑ یار! میں اس کا دودھ پیوں" گل زری نے بڑی حسرت سے کہا۔ حالت میری بھی بری ہو رہی تھی۔

"کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو مگر کوئی فساد ہی نہ پڑ جا

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ جو سامنے ہے اسے پکڑ لے

اس وقت تک سورج نصف النہار تک جا پہنچا تھا۔ اس جنگل نے ہمیں باندھ کر ڈال دیا تھا۔ بڑا وقت گزر چلا تھا۔ ہم ابھی تک وہاں سے نکل نہیں سکے تھے اور یہ ہماری بہت بدنصیبی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا مگر گل زری نے مجھے ذلیل تھا۔ اُس سانپ نے تو اسے چھوڑ دیا تھا مگر اس کی دہشت پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک بکری کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی دہشت دیدنی تھی۔ ٹانگ چھڑانے کے لیے اس نے بہت زور لگایا مگر وہ میری گرفت سے نہ نکل سکی۔ ایسے میں جھاڑیاں زور زور سے ہلنے لگیں مگر سب طرف پھیلی ہوئی تھیں اور ساری جھاڑیاں ہلا رہی تھیں۔ وہ جو تعاقب میں تھے، کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ میں نے اس کے دو لوٹے نچوڑ کر گل زری کے حلق میں اتار دیے اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ دودھ نے گل زری پر حیرت انگیز اثر کیا۔ وہ کوئی دس منٹ

بہت مطمئن نظر آنے لگا۔

"یہ اچھا کیا ہے تم نے جیلانی! اس دودھ نے میری بھوک بھی مٹا دی ہے اور میرا دورانِ خون بھی صحیح کر دیا ہے۔ اب ذرا میری نبض دیکھو۔" اُس نے اپنی کلائی میری طرف بڑھا دی۔ نبض اُس کی واقعی اب ٹھیک چل رہی تھی اور اُس کے چہرے پر پھیلی پیلاہٹ پر سُرخی غالب آنے لگی تھی اور یہ اچھی علامت تھی۔

"چلو اب نکل چلو۔ ہم کب تک اس مصیبت میں پھنسے رہیں گے؟"

"تم بھی دودھ پی لو۔"

"مگر بکریاں تو دور چلی گئی ہیں۔"

"راستے میں کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گی۔ چلو اب۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی اسٹین گن کندھے پر ڈالی اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔ کچھ ہی دُور جا کر جھاڑیاں چھدری ہو گئی تھیں۔ ایک یہاں اور ایک دس فٹ دور۔ اب ہم چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسے میں کوئی بھی آدمی دُور سے ہمیں دیکھ سکتا تھا اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔

گل زری رُک گیا۔ بولا "اُن کو دیکھو یار! وہ جان کے لاگو دفع ہوئے ہیں کہ نہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کوئی نظر تو نہیں آ رہا ہے۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ جنگل گولی کی آواز سے گونج اٹھا۔ کوئی تڑاتڑ فائر کر رہا تھا۔ وہ کسی ایک طرف یا کسی ایک بندوق کی گولی نہیں تھی۔ جواب میں کسی نے اسٹین گن چلا دی۔ کوئی پانچ منٹ تک جنگل میں فائرنگ ہوتی رہی۔ ہم دم بخود ہو کر لیٹے رہے۔ گولی کی آواز جنگل کے مشرقی حصے سے آ رہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ رستم اور گولاٹی اُن کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ وہ ابھی تک جنگل میں ہی پھنسے تھے۔ کوئی ایسی ہی وجہ تھی کہ وہ اس حصے سے آگے نہ نکل سکے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

"میرا خیال ہے کہ رستم اور گولاٹی پر گولیاں برسائی جا رہی ہیں۔"

"بہت بدنصیب لوگ ہیں وہ! کیا ضرورت تھی اتنی دیر تک وہاں رُکنے کی؟"

"وہ خود نہیں رُکے، اُن کا راستہ روک دیا گیا ہوگا۔"

"لعنت ہے اُن دونوں پر۔" جنگل پھر سے خاموش ہو گیا تھا اور میرا خیال ہے کہ تمام سپاہی ایک ہی طرف بڑھ گئے تھے۔

میں اس وقت بکریوں کا رکھوالا اچانک ہمارے سر پر آ پہنچا۔ وہ بڑی حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہمارا جو حال تھا وہ خدا دشمن کا بھی نہ کرے۔ ہماری داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ لباس میلا چیکٹ ہو رہا تھا۔ سر کے بال بھی الجھے ہوئے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ ہم کوئی بہت ہی مفلوک الحال لوگ ہیں۔

"اوئے تم کون ہو بھئی! اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ہم دونوں اس کی آواز سُن کر ایک دم سناٹے میں آ گئے۔ وہ سر پہ بڑی سی لُنگی قسم کی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ گلے میں واسکٹ، اُس کے نیچے کُرتہ اور کمر میں شلوار۔ جُوتے اس کے دیسی قسم کے تھے۔ لمبی نوک دار جُوتی جو جنگلوں میں بہت کام دیتی ہے۔ ہم سے وہ صرف چار قدم دُور کھڑا تھا۔ ہاتھ میں اس نے لمبا سا نگہ پکڑ رکھا تھا جس سے وہ درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر نیچے گراتا تھا تاکہ بکریاں کھا سکیں۔ وہ ہمارے عقب میں کھڑا تھا مگر ہم اُسے دیکھ چکے تھے۔ اس کا سوال سن کر ہم دونوں نے یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے ہم بے ہوش ہو چکے ہوں۔

"ہے چاچا ممدو! اِدھر آ ذرا۔ یہ دیکھ کون لوگ ہیں یہ۔" اس نے اپنے چاچا کو آواز دی جو شاید کہیں قریب ہی کھڑا تھا۔

"کیا نظر آتا ہے تجھے؟"

"اِدھر تو آ۔ یہ دو بندے ادھر بے ہوش پڑے ہیں۔" اس کی یہ بات سُن کر چاچا ممدو فوراً ہی آگے بڑھا۔

"اوئے یہ کیا قصہ ہے بھئی! ان کے پاس تو ہتھیار بھی ہیں پر یہ بے ہوش کیسے ہو گئے؟"

"مجھے کیا پتا! ذرا دیکھ، شاید ہوش میں آ جائیں۔"

"نا بھائیا نا! تم خود ہی دیکھو۔ پر ٹھہرو، اُدھر گولیاں بھی تو چل رہی تھیں۔ پولیس کی گڈی بھی جنگل میں گئی تھی۔ یہ معاملہ کیا ہے یار؟"

"چاچا میرا خیال ہے یہ بالکل بے ہوش ہو چکے ہیں۔" اس کی یہ بات سُن کر چاچا بھی ہمارے قریب آ گیا اور وہ ہماری آنکھیں پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے مگر ہم یوں بنے رہے جیسے اب کبھی ہوش میں نہیں آئیں گے۔

"یار، اِن کی جیبیں دیکھ! اور یہ گھڑی تو اتار اس کی۔" چاچا نے میری گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "پر ٹھہر، پہلے ان کے یہ ہتھیار الگ کر لے۔ یہ تو بڑی قیمتی بندوقیں ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے میری اسٹین گن کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کا بھتیجا میری بائیں کلائی سے گھڑی اتارنے لگا۔ وہ دونوں بہت نیچے جُھک آئے تھے اور اُن کی گردنیں میری زد میں تھیں۔ میں نے ایک دم اُن کے گلے پکڑ لیے۔ وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ میں نے ایک دم اُن کی رگیں مسل دیں۔ وہ ٹوٹی شاخوں کی طرح زمین پر گر گئے۔ ممدو چاچا کے چہرے پر خاصی لمبی داڑھی تھی اور اس نے بھی سر پہ پشاوری طرز کی لُنگی باندھ رکھی تھی اور وہ بھی کُرتہ شلوار میں ملبوس تھا۔ وہ دونوں نیچے گرے تو گل زری حیران و پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ..... یہ کیا کر دیا ہے تم نے انھیں! یہ تو بالکل بے ہوش ہو گئے ہیں!"

"بیمار تھے بے چارے۔ ہماری بُو سونگھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔"

"نہیں یار! یہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور ہی چکر ہے۔ پر یہ سب ہوا کیسے؟"

"یہ بات رہنے دے تو! کپڑے تبدیل کر لے۔" جلدی کر۔

دیکھتے ہی دیکھتے میں نے اس کے کپڑے پہن لیے اور جب میں سر پہ پگڑی باندھ چکا تو گل زری مجھے دیکھ کر بولا۔

"تیرا جواب نہیں ہے بھئی! پہلے تو تُو نے انہیں بے ہوش کیا اور اب اُن کے کپڑے بھی پہن لیے ہیں۔"

"تُو بھی جلدی کر اُستاد! باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

میں نے اس جوان کی واسکٹ اور قمیص اتارتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد گل زری بھی گڈریا بن چکا تھا۔ ہم نے اپنے کپڑے ان کو پہنا دیے اور انہیں گھسیٹ کر گھنی جھاڑیوں کے اندر ڈال دیا۔ اب انہیں سانپ کاٹے یا بچھو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی اور پھر میں نے ان دونوں کی جیبوں میں جان بوجھ کر دو دو ہزار روپے ڈال دیے۔ اسٹین گنیں گل زری نے کھول کر میرے تھیلے میں رکھوا دیں اور یہ زیادہ بہتر جگہ تھی اُن کے لیے۔

اپنا حلیہ بدل کر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب سارا علاقہ ہماری نگاہ میں تھا۔ پولیس کی جیپ خاصے فاصلے پر جنگل کے اندر کھڑی تھی۔ دو سپاہی اس سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ باقی سب لوگ کسی اور طرف جا چکے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ رستم اور گولا ئی انہیں اپنے پیچھے بھگا رہے تھے یا پھر وہ کوئی اور آدمی تھے جو مشتبہ حالت میں وہاں پھر رہے تھے۔ سانگہ ہاتھ میں لے کر میں بکریوں کو یکجا کرنے لگا۔ گل زری نے بھی چھڑی ہاتھ میں لے لی تھی اور اب ہم دونوں گڈریے بن کر اس ویرانے میں پھر رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ دُور کھڑے سپاہیوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا مگر اب وہ ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ساری بکریاں یکجا کر کے ہم انہیں بڑے اطمینان سے ہانکتے ہوئے شلکاری کی طرف چل دیے۔ وہ گاؤں پہاڑ کی تلہٹی میں واقع تھا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں یہ بکریاں چھوڑ دینی چاہئیں۔" گل زری نے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"نہیں بھئی! ان کو ساتھ لے کر چلو مگر تم جا کدھر رہے ہو؟"

"جنگل کے قریب سے ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ راستہ زیادہ قریب ہے نیچے اُترنے کے لیے یہی ٹھیک رہے گا۔"

"مگر وہ پولیس والے......؟"

"وہ اپنے دھندے میں پھنسے ہیں اور پھر ہم جنگل میں تو نہیں جائیں گے۔"

"ہاں! ان کا دھیان رکھو۔" میں نے بکریوں کو ہانکتے ہوئے کہا۔ مگر وہ بہت ہی شیطان قسم کی بکریاں تھیں۔ ہم سے بھلا وہ کہاں سنبھلتی تھیں۔ میرے باپ دادا نے بھی کبھی یہ کام نہیں کیا تھا۔ ان جھاڑیوں میں بکریاں بار بار بکھر جاتی تھیں مگر پھر بھی وہ ایک دُوسرے کو یاد رکھتی تھیں ان میں سے کوئی جنگل کی طرف نہیں بھاگی۔ کچھ بکریاں گل زری نے اپنے آگے لگا لیں اور کچھ میں نے مگر ابھی ہم جنگل سے کوئی آدھا فرلانگ دُور تھے کہ سامنے سے ہمیں دو سپاہی اور ایک فاریسٹ گارڈ آتے دکھائی د[یے] وہ اتنے اچانک ہمارے سامنے آ گئے کہ ہم دونوں پریشان ہو گئے۔ [میرا] ہاتھ ایک دم پگڑی پہ چلا گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سر پہ موجود ہے [یا] نہیں۔ وہ تینوں ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔

"اوئے جوان! ٹھہر جا ذرا۔" گارڈ نے ہمیں آواز دے کر [روک] لیا۔ ایک سپاہی نے اپنے ہاتھ میں ڈول پکڑ رکھا تھا۔ ہم دونوں [رک] گئے۔ چادریں ہم نے کندھوں پر اس طرح ڈال رکھی تھیں کہ کسی کو یہ مع[لوم] نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود ہے۔ ایک [بکری] ہم دونوں نے پکڑ رکھی تھی۔

"یارا! کوئی دُودھ مل سکے گا تم سے؟"

"بڑا دُودھ جی! یہ مال ہے کس کا۔ پر آپ کو دُودھ کی ضرورت پڑ گئی جناب؟"

"ادھر پولیس آئی ہے جنگل میں۔ تھانیدار کو چائے کی ضرورت [تھی] کوئی بکری دو کو بھائی۔"

"یہ بکری حاضر ہے جناب!"

میں نے بکری ان کے سامنے کر دی۔ گارڈ نے ڈول لے کر اس کا دُ[ودھ] دوہنا شروع کر دیا۔ سپاہی بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے مگر [ان کے] وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ہم بکریوں کے اصل رکھ[والے] نہیں ہیں۔

"یہ پولیس کیوں آئی ہے سنتری جی! خیر تو ہے۔" گل زر[ی نے] ایک سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بدمعاش اس جنگل میں چھپا ہے۔ اس کو تلاش کر[رہے] ہیں ہم لوگ۔"

"اچھا! کمال ہے، میں بھی کہوں کہ یہ پوری جیپ بھر کر کہاں جا[رہی] ہے۔ ادھر شاید گولی بھی چلی تھی۔ آوازیں آ رہی تھیں۔"

"وہ سُوروں کا اِجڑ تھا۔ سپاہیوں نے ان پر گولی چ[لائی] تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں سے نکل آئے۔ ایک دم سامنے آ گئے۔ ان[سے] جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔"

"بدمعاش کون ہے جو اِدھر آ نکلا ہے؟" گل زری کا لہجہ...

محتاط تھا۔

"ایک جلیانہ بدمعاش ہے۔ اس کی گرفتاری پر انعام بھی [ہے] پچاس ہزار روپے۔ چک کھرانہ میں واردات کر کے نکلا ہے۔ [ہمیں] تھانے میں صبح پیغام ملا تھا کہ ہم اس جنگل کا محاصرہ کر لیں مگر و[ہ] ہی نہیں آیا۔" میں اپنا یہ نیا نام سن کر پریشان ہو گیا۔ ان سالو[ں نے] میرا نام ہی بگاڑ دیا تھا۔

"جلیانہ بدمعاش؟ اسے تم میں سے کسی نے دیکھا بھی ہے؟"

"کہا تو ہے کہ ہم نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ البتہ تھانیدار [صاحب] کہہ رہا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ کیوں بھئی! بکری فارغ ہو گئی؟"

"یہ تو مشکل سے آدھ سیر دُودھ ہو گا بھئی۔"

"تو کوئی اور بکری پکڑ لے بھائی۔ وہ لے آ۔ وہ جو چتکبری کھڑی ہے نا، اُسے لے آ اِدھر۔" گل زری نے فاریسٹ گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے اس بکری کو آگے لے آیا اور ڈول لے کر اس کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس بکری کو دوہنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ ڈول میں اب کوئی ڈیڑھ سیر دودھ بھر گیا تھا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے بھئی! کچھ پیسے دے دوں تمہیں؟"

"جی نہیں۔ پیسوں کی فکر نہ کریں جی! کوئی اور خدمت ہو تو ہمیں بتائیں۔"

"نہیں یارا! یہی بہت کافی ہے۔ چلو دینداد صاحب! اب تھانیدار کے پاس چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر فاریسٹ گارڈ سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیا اور ہم بکریاں اکٹھی کر کے آگے نکل گئے۔ فکر کی اب کوئی بات نہیں تھی۔ وہ لوگ ہمیں اتنا قریب دیکھنے کے باوجود نہیں پہچان سکے تھے اور یہ اچھی بات تھی۔ حلیہ بدلنے کا ہمیں یہی فائدہ ہو رہا تھا کہ ہم ہر قسم کے شک و شبے سے بالا بلند ہو کر بے فکری سے نیچے اترتے چلے گئے۔ گل زری بہت خوش تھا۔ بار بار میرے کندھے پر ہاتھ مار مار کر مجھے تھپتھپا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نے بکریوں کا خیال چھوڑ دیا اور کسی گاؤں میں رُکنے کے بجائے ہم سیدھے آگے نکل گئے۔ راہ راستے کا تو نہ گل زری کو علم تھا نہ مجھے۔ کوئی پگڈنڈی بھی سامنے نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی ہم اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر جتنی جلدی ہو سکا، پولیس کی دست بُرد سے نکل کر کوئی دو گھنٹے تک پیدل چلتے رہے۔ گل زری بھی اس عرصے میں بالکل خاموش رہا اور میں کوشش کے باوجود اس کی چپ کا قفل نہ کھول سکا۔ میں کوئی بات پوچھتا تو وہ بس آں ہاں شاں کر کے رہ جاتا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے ذہن میں کلبلا رہی تھیں جو کچھ اس نے کہا تھا وہ میرے لیے اچنبھے کا باعث تو نہیں تھا۔ ڈھکوں کے قتل کی بات جب اس نے مجھے سنائی تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے اور کن لوگوں سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے مگر اب تک اس نے مجھے اپنے پتے پوری طرح نہیں دکھائے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنا ہاتھ روک رکھا تھا۔ ورنہ میں اسے غار میں ہی ختم کر دیتا مگر میں اسے ڈھیل دیتا جا رہا تھا تاکہ میں اس کو پوری طرح سمجھ سکوں۔ اس کا دُروں بُردں میرے سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ وہ اسلحے کا بہت بڑا اسمگلر تھا۔ اس اسلحے کو خدا جانے وہ کہاں کہاں پہنچاتا تھا اور اس کے خریدار کون تھے۔ مجھے اُن کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سارا رستہ بالکل ہی خاموش رہا۔

بالآخر ہم ایک پختہ سڑک پر جا پہنچے۔ پتا یہ چلا کہ ہم ایک بار پھر چک کھرانہ کے قریب جا پہنچے ہیں۔ وہ قصبہ ہمارے عقب میں رہ گیا تھا کچھ ہی دیر بعد ایک بس ہمیں نظر آ گئی اور ہم اس میں بیٹھ کر پھر راولپنڈی چل دیے۔ بس میں بیٹھتے ہی گل زری چہکنے لگا، بولا۔

"بھائی! اب نکال سگریٹ! شکر کر کہ ہم ایک بڑے فساد سے بچ گئے ہیں۔" میں نے اسے سگریٹ نکال کر دے دیا مگر اس کی بشاشت مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اتنا عرصہ خاموش رہنے کے بعد میں خود اندر سے الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے بڑے شدید وسوسوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کسی بہت بڑی سازش کا حصہ تھا۔ کسی ایسے گروہ کا رُکن تھا جو کسی بھی بات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے نہ دوستی کا احساس تھا نہ دشمنی کا۔ وہ شاید ملک کے ان لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا جو افراتفری کو ہی سب سے بڑا تماشا سمجھتے ہیں۔ وہ بات تو یہی کر رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ذہن میرا بار بار آسیہ کی طرف پلٹ رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسے سیدھا تختۂ دار کی طرف لے جا رہے ہیں اور آپی اس کے پیچھے پیچھے ہے۔ وہ اس پر تو کوئی الزام ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ابھی تک مجھے گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ اگر میں اُن کی گرفت میں آ جاتا تو پھر میرے بیان کی روشنی میں ہی وہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے تھے مگر میں ایسا بیان کیسے دے سکتا تھا۔ اور پھر مجھ سے وہ ایسی باتیں تو جب ہی اگلوا سکتے تھے جب وہ مجھے گرفتار کر لیتے مگر میں ابھی تک ان کی زنجیروں سے بہت دُور تھا اور میں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر کبھی میں گھر گیا، اُن کے نرغے میں آ گیا تو میں اپنے پستول کو خود ہی گلے پہ رکھ کر لبلبی دبا دوں گا۔ مجھے اور نہیں جینا تھا۔ ایسی حالت میں تو ہرگز نہیں جینا تھا جس میں مجھے ان کی بے تحاشا مار اور بے پناہ تشدد کا شکار ہونا پڑتا۔ خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ مجھے وہ خود پر وار کرنے سے نہیں روک سکیں گے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ جس رفتار سے وہ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے اور جس تیزی کا وہ مظاہرہ کر رہے تھے، وہ اس سے مجھے کسی بھی وقت بے بس کر سکتے تھے۔ کہیں بھی وہ میرے لیے زمین تنگ کر سکتے تھے اور ایسے میں مجھے یہی کرنا چاہیے تھا کہ میں وہ مٹی اوڑھ کر لیٹ رہوں جس پر وہ مجھے گرا دینا چاہتے تھے۔ کوئی میری مایوسی کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا، وہ کبھی کسی کو سلامتی کی منزل پر نہیں پہنچاتا اور میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ ایک تہ در تہ یاسیت تھی جو میرے وجود پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ اب نہ میرے بدن میں وہ پہلی سی توانائی باقی تھی۔ میں جلدی ہی ہانپنے لگتا تھا۔ میرے ہاتھوں کی رگیں نظر آنے لگی تھیں۔ بدن کی ساری تازگی اور لہلہاہٹ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میرا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا اور لوہے کی چھاتی کر لینے کی امنگ ختم ہو گئی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں شاید اس امکان پر بھی غور کرنے لگا تھا کہ کسی جگہ میں خود ہی سر میں تیشہ مار کر مر جاؤں۔ مایوسیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں، جب آدمی کی کوئی تدبیر

کارگر نہیں ہوتی تو وہ ایسے ہی خواب دیکھنے لگتا ہے جس میں اس کا وجود آہستہ آہستہ نفی کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ اثبات پر سے اس کا یقین اٹھنے لگتا ہے۔ موت کا تصور آدمی کے جسم میں لہو بھرنا شروع کر دیتا ہے اور ایسے میں کوئی دم جاتا ہے کہ آدمی تنگ آ کر خود پہ کاری وار کر دیتا ہے۔ میں بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ خدا خبر وہ ساعت بد کب میرے سامنے آ جائے اور کب موت مجھے بہت ہی سہانی دکھائی دینے لگے۔ حالات تو بہرحال ایسے ہی تھے۔ وہ بجلی میرے وجود میں لوکنے لگی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

بس راولپنڈی پہنچی تو میں نے گل زری کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کنڈکٹر سے کہا کہ وہ بس روک دے۔

"کیا کرتے ہو بھئی! یہاں اترنے کا کیا فائدہ ہوگا؟"

"یہی بہتر ہے۔ ہم یہاں سے کوئی ٹیکسی لے لیں گے۔ اٹھو۔ دیر نہ کرو۔"

ڈرائیور نے بس روکی تو ہمارے ساتھ کئی اور لوگ کچہری کے قریب اتر گئے۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادل گھر آئے تھے اور لگتا تھا کہ بارش ضرور ہو گی۔ دونوں اسٹین گنیں میں نے پہلے ہی اپنے تھیلے میں بند کر لی تھیں جس میں میں نے نوٹ ٹھونس رکھے تھے۔ پستول البتہ ہماری جیب میں تھے اور ہم نے چادریں بازو کے نیچے سے نکال کر یوں اوڑھ رکھی تھیں، جیسے ہم ان سے پردے کا کام لے رہے ہوں۔ ورنہ چادروں کا موسم نہیں تھا۔ پھر بھی اکثر دیہاتی لوگ ایسی چادریں اوڑھے پھرتے تھے کہ موسم کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔

"جانا کہاں ہے اب؟"

"اس جیل میں میری بہن قید ہو کر آئی ہے۔ گل زری! میں ان دیواروں کو تو دیکھ لوں جو اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔"

"کس کا ذکر کرتے ہو تم! وہ قید کس طرح ہو گئی؟"

"یہ اللہ کے بھید ہیں۔ کون جانے کس کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ آؤ، میں اس دروازے کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں سے میں نے اسے آخری بار اندر جاتے دیکھا تھا۔"

"کسی اور چکر میں نہ پھنس جانا۔ چلو پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے اپنے ساتھ لے کر کچہری کے ایک ہوٹل میں جا گھسا۔ حلیہ ہمارا اس وقت گڈریوں ایسا ہی تھا۔ بیرے کو میں نے کھانا لانے کو کہا اور خود منہ ہاتھ دھونے کے لیے نلکے پہ جا ٹھہرا۔ گل زری نے بھی میری دیکھا دیکھی منہ پہ دو چھینٹے مار لیے اور پھر ہم چادروں سے منہ خشک کرتے ہوئے میز پر جا بیٹھے۔ بیرا ہمارے لیے مرغ کا گوشت لے آیا۔ میں نے اسے یہی کہا تھا مگر وہ کچھ حیران ہو رہا تھا کیونکہ اس کے سامنے وہ زردہ، فرنی اور پلاؤ بھی لایا تھا اور وہ ایسا کھانا تھا جو ہمارے حلیے کے کسی آدمی کو زیب نہیں دیتا تھا۔

اس کا خیال یہ ہوگا کہ ہم دال روٹی پر ہی گزارا کر لیں گے۔ آدمی کی پہچان اس صدی میں بھی اس کے لباس سے ہی کی جاتی ہے۔ حالانکہ کئی صدیاں پہلے شیخ سعدی کو بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تو وہ بچارے پریشان ہو کر رہ گئے تھے مگر یہ جب کی بات ہے جب ہم لوگ مہذب نہیں ہوئے تھے لیکن صورتِ حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم آج بھی ذہنی اعتبار سے وہیں کھڑے تھے جہاں شیخ سعدی کے دور کے لوگ کئی صدیاں پہلے کھڑے تھے۔

بہرحال کھانا ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر اس کے بعد چائے پی۔ گل زری نے ڈھیر سارے سگریٹ خرید لیے اور چار پیکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے بولا "یہ رکھ لو میاں! اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ تو کر رکھا ہے مگر سگریٹ اس میں شامل نہیں ہوتے ہیں۔"

"اوئے مذاق نہ کرا وئے" میں نے سر کو دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

چائے پی کر ہم ہوٹل سے نکلے مگر جیسے ہی ہم نے سڑک پر قدم رکھا میرے پاؤں برف ہونے لگے۔ میں لڑکھڑا سا گیا۔ گل زری مجھے نہ سنبھالتا تو میں گر ہی گیا تھا۔ کسی نے میرے سر پر بم رکھ کر فلیتہ سلگا دیا تھا۔ سامنے ماموں ارشد میری ماں کو ساتھ لیے ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اف میرے پروردگار! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ماں کی حالت بڑی ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے تھیں۔ سر پر دوپٹے کی بکل۔ لباس بھی ان کا سفید ہی تھا۔ ان کی نظر سڑک پر تھی جیسے وہ پتھروں سے بہت ڈر رہی ہوں یا موں ارشد انہیں سہارا دیے ہوئے تھے۔ ان کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں بھاگ کر ان کے پاس جا پہنچا۔ "ماں جی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ماں! آپ یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے ماں کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے ان کے رخساروں پہ آنکھیں رکھ دیں۔ میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ میری آواز پہچان گئیں۔ ان کی ممتا اُبلنے لگی تھی۔

"یہ..... تو ہے جیلانی! میرا بیٹا، میرا لال..... میرا چاند! یہاں کیا کر رہا ہے بیٹے! میں تو تیری صورت کو ترس گئی۔" وہ کہنے لگیں اور میرا منہ سر چومتے ہوئے بولیں "دیکھا ارشد تم نے! میں کہتی تھی میرا بیٹا ضرور ملے گا مجھے۔ میرا آنا بے کار تو نہیں گیا۔"

"اوئے کاکا! تو خوب ملا ہے! میں بھی کہوں ہماری آپا کو کس نے پکڑ لیا ہے۔ پر یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے تم نے؟"

"بس ایسے ہی ماموں! آدمی کے حلیے میں ہوں۔ تم لوگ کب آئے ہو گاؤں سے؟"

"کل آئے تھے ہم۔ سُنا ہے کہ آسیہ کو پولیس نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا ہے۔ ہم تو اس کو دیکھنے آئے تھے مگر اس سے ملاقات نہیں ہوئی کسی نے ہماری بات ہی نہیں سنی۔"

"بیٹے! یہ کیا اندھیر مچ گیا ہے۔ آسیہ مجھے پچھلے ہفتے ملنے آئی تھی۔ دو دن ہمارے پاس رہی پھر واپس چلی گئی۔ مگر پرسوں اس کا ملازم باوا اجمل میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ آسیہ گرفتار ہو گئی ہے۔ میں پاگل ہو کر اِدھر بھاگی مگر وہ ملی ہی نہیں۔ آخر ہوا کیا ہے؟ وہ کیوں گرفتار ہو گئی ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ کیسے کیسے صدمے دے رہے ہو تم مجھے۔ نہ میں نے کوئی تمہارا سکھ دیکھا، نہ آسیہ کا۔ کیسی تقدیر لے کر پیدا ہوئے ہو تم۔ میں تو جیتے جی مر گئی ہوں بیٹے! یہ کیا ہو گیا ہے آخر! اس کا جرم کیا ہے؟" وہ میرے کندھے پر سر ڈال کر رو رہی تھیں۔ ماموں ارشد کا چہرہ بھی آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اس نے بہت غم کھینچا ہے۔ یہی حال میری ماں کا تھا۔ ان کے چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی تھیں اور آنسو ان کو کچھ دیکھنے نہیں دیتے تھے۔

"فکر نہ کریں ماں جی! سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" میں نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ اجمل کہاں ہے؟"

"وہ کسی کام سے گیا ہے۔ کہتا تھا میں کسی وکیل سے مشورہ کرتا ہوں۔ شام کو وہ ہمیں ہوٹل میں ملے گا۔"

"کس ہوٹل میں؟"

"کیا نام بتایا تھا اس نے بھائی جی؟"

"فرحان ہوٹل۔ وہ اُدھر صدر بازار میں ہے۔ رات ہم وہیں رہے تھے۔"

"ہوں! آپ پریشان نہ ہوں ماں جی! اچھا ہے آپ مجھے مل گئی ہیں۔ اب میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ میں بھی اس کے لیے ہی اِدھر آیا تھا مگر خیر اب صبح اس سے مل لیں گے۔ آپ پہلے کھانا کھا لیں۔ آئیں، یہ میرے دوست ہیں گل زری۔ یہ میری والدہ ہیں اور یہ میرے ماموں ارشد علی ہیں۔" میں نے ان کو گل زری سے ملوایا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ کی ملاقات ہو گئی۔ آپ فکر نہ کریں ماں جی! آپ کی بیٹی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگی۔ آخر کو آدمی ہی جیل جاتے ہیں۔ ان کو کھانا کھلا کر ہوٹل لے چلو میاں! یہ بہت ضروری ہے۔" وہ بھی ماں جی کے آنسوؤں سے بہت متاثر دکھائی دیتا تھا۔

ان دونوں کو ہم ہوٹل میں لے گئے۔ ماں جی وہاں کرسی پر بیٹھ کر بین کرنے لگیں مگر مجھے وہ سلسلہ اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے ہمارے لیے بہت صدمے اٹھائے تھے۔ بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں مگر اس ہوٹل میں بیٹھ کر ان کا بلکنا کسی بھی طرح درست نہیں تھا۔ لوگ متوجہ ہو سکتے تھے میں نے ان کے قریب بیٹھ کر انہیں تسلی دی۔

"ماں جی! یہ ہوٹل ہے۔ آپ کو بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ میں کوئی کم دکھی نہیں ہوں مگر صبر بہرحال بہتر ہے۔ آپ ہمت نہ ہاریں.....؟"

"تم دونوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ بیٹی میں نے اس لیے جنی تھی کہ وہ جیل میں سڑتی رہے اور تم ایسے آوارہ ہو کہ تمہیں گھر کی روٹی راس نہیں آتی۔ پردیس میں تم کیا جھک مارتے پھرتے ہو؟ کیا کرتے رہتے ہو تم؟"

"بہن جی ٹھیک کہتی ہیں کاکا! تم نے تو حد ہی مکا دی ہے تمہاری کوئی بات میلی سمجھ میں نہیں آتی۔ کوئی کالو بال کلتے ہو کہ زمین لے لکھی ہے تم نے۔ کوئی کوٹھا کلہ، کوئی گھل بال۔ کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس۔ تم آخل کونسے خصوصی کام کلتے ہو؟ میلا بیٹا ایسا کلے تو میں اسے گولی مال دوں۔ آخل کو اس بڑھیا کا بھی حق ہے تم پل کہ نہیں؟"

میں شرمسار سا ہو کر ماموں کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ طیش میں آ گئے تھے اور ایک دم مجھ پر برسنے لگے تھے۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ ان کی کسی بات کا میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔

"یہ تھیلا کیا لٹکا رکھا ہے تم نے؟ مُرغیاں چھولے بیچنے والوں کی طرح۔ انڈے بیچتے ہو تم۔ یہ کوئی شریفوں کا حلیہ ہے جو تم نے بنا رکھا ہے۔ آخر تم کرتے کیا ہو؟ کس لیے یوں در بدر پھرتے ہو۔ کوئی نوکری، کوئی ملازمت کوئی کاروبار ہو تو ایک بات ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ اور وہ تمہاری بہن! وہ جب ہمارے پاس گاؤں آئی تو اتنی لمبی موٹر کار تھی اس کے پاس۔ اس کے ٹھاٹھ ہی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ پھر پتا چلا کہ وہ قید ہو گئی ہے۔ دُر پھٹے منہ تم دونوں کا۔ خوب عزت بنائی ہے خاندان کی تم نے۔" ان کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ مگر گاہکوں کی بھیڑ کا خیال کرتے ہوئے وہ دبی آواز میں بول رہے تھے اور یہی بہت غنیمت تھا مگر ان کا غصہ ابھی تک نہیں ڈھل رہا تھا۔

"میں آپ سے بہت شرمسار ہوں ماموں! مگر میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ قسم خدا کی میں بے بس تھا۔ سمجھیں کہ میں حالات کا مارا ہوا اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا مگر میں جلدی گھر لوٹ آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ مجھے ماں جی کا بہت احساس ہے بابا مگر میں بہت مجبور تھا۔ میں یہ حلیہ آج ہی بدل دوں گا۔ میں آسیہ سے اس حال میں تو نہیں ملوں گا۔ ماموں غصہ تھوک دیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

انہوں نے دو چار لقمے بڑی مشکل سے زہر مار کیے۔ ان کی شاید بھوک ہی مر گئی تھی۔ بل ادا کر کے میں نے انہیں وہاں سے اٹھایا اور ٹیکسی میں بٹھا کر سیدھا فرحان ہوٹل جا پہنچا۔ ہاتھی چوک کے عقب میں اسٹیشن کی طرف جو سڑک جاتی ہے وہ ہوٹل اسی سڑک پہ تھا اور وہ کمرہ ابھی تک ان کے پاس موجود تھا جس میں وہ گزشتہ رات مقیم تھے۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے ماں جی کو ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ نہ میرے آنسو تھمتے تھے نہ اُن کے۔ افسوس انہیں بھی تھا اور ندامت نے مجھے بھی نڈھال کر دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں انہیں کیسے راضی کروں۔ گل زری بھی اس صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ ارشد ماموں صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئے تھے۔ ماں جی بھی خوشحال

دکھائی دیتی تھیں مگر جس غم نے انہیں ڈس لیا تھا اس کا کوئی علاج نہ میرے پاس تھا نہ کسی اور کے پاس۔ تقدیر کا چکر ہمارے لیے ایسے ایسے خنجر تیار کر چکا تھا کہ وہ جب دل میں اترتے تھے تو گہرے زخم ڈال دیتے تھے۔ آر پار سوراخ ہو جاتے تھے اور میری تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں اپنے وجود کے سرہانے رقص کرتا رہتا۔ ایسا رقص جو مجھے لہو رُلاتا تھا۔ میں ہر وقت بازار کے محاذ پر پِٹتا رہتا تھا۔ کسی پہلو مجھے قرار نہیں ملتا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ کسی نے میری گردن پر خنجر رکھ دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بہت عاجز آ چکا تھا۔ مجھ سے ماں جی کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کی وہ بیٹی اسیر ہو گئی تھی۔ جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ جس کی خاطر وہ صبح شام پریشان رہتی تھی۔ جس کے بیاہ کے لیے اس نے پائی پائی جوڑ کر الگ رکھ دی تھی۔ وہ حنا اس کے ہاتھ پر پھول نہ بن سکی۔ وہ گھر سے نکلی اور سیدھی محبس جا پہنچی۔ حالانکہ ماں نے اُسے کبھی گھر میں تنکا دُہرا نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ یہی کہتی تھی کہ آسیہ تو یہ کام چھوڑ دے۔ میں کر لوں گی۔ ساری زندگی کام ہی کرنا ہے۔ دو گھڑی میری چھت تلے آرام کر لے بیٹی! پھر زندگی کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ تیرا گھر بار ہو گا۔ بچے تجھے گھیر لیں گے۔ پھر تو تو پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھ سکے گی۔ تجھے آرام کرنا چاہیے۔ پتا نہیں کیسی کیسی باتیں وہ آسیہ کے لیے سوچا کرتی تھی مگر پھر سب کچھ ہی تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ کچھ بھی باقی نہ بچا۔ نہ گھر نہ گلی، نہ محلّہ نہ شہر۔ آسیہ ایسی ڈولی میں بیٹھی جس کے چاروں طرف خنجر ہی خنجر لگے تھے۔ اس کے کہار سپاہی بن گئے۔ وہی اسے ویران راستوں پر چلاتے ہوئے کہاں سے کہاں چھوڑ آئے۔ نہ بارات نہ باڑی اور اب ماں میرے گلے لگ کر مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ آسیہ اس درِ زنداں تک کیسے پہنچی ہے۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اس پر کیا بیت گئی ہے؟

"یہ بتا کاکا کہ آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پولیس نے اسے کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"مجھے بھی کچھ پتا نہیں ہے ماما جی! وہ اُدھر قندیا میں رہتی تھی۔ سمجھو وہ جاگیر دارنی بن چکی تھی۔ بڑے ٹھاٹھ تھے اس کے۔ پتا نہیں اُسے کس کی نظر کھا گئی۔"

"جب وہ گرفتار ہوئی تو اس وقت تم کہاں تھے؟"

"میں یہاں پنڈی میں تھا۔ میں نے دراصل وہ ٹرک دیکھ لیا تھا جس میں وہ لوگ بیٹھ کر جیل جا رہے تھے، پولیس نے انہیں گھیر رکھا تھا۔"

"تم غلط کہتے ہو۔ ساری بات کا تمہیں علم ہے مگر تم بتلاتے نہیں ہو۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ زمینیں ویران ہو جاتی ہیں۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو بہن جی! کوئی وکیل کرنا ہے تو کر لو۔" وہ بہت اُلجھے ہوئے تھے۔ انہیں یہ راستے قطعاً پسند نہیں تھے۔ تھانے کچہری کا تصوّر ان کے نزدیک بہت ہی غلط تھا۔ وہ کسی بھی معاملے میں پولیس سے رجوع نہیں کرتے تھے۔ ساری زندگی انہوں نے امن چین سے گزار دی تھی۔ نہ خود کسی کا حق مارتے تھے، نہ کسی کو ایسا کرنے دیتے تھے۔ اگر انہیں کوئی ایسا نقصان پہنچ بھی جاتا تھا تو وہ چُپ رہ جاتے تھے۔ اندھیرے پر بکتی بھینسوں کا سودا وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ گھر سے باہر وہ کبھی رکے ہی نہیں تھے اور اب یہ سب کچھ دیکھ کر انہیں وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ جس قدر جلدی ممکن ہوتا گاؤں واپس چلے جانا چاہتے تھے۔ مگر ایسی کوئی تدبیر میرے سامنے نہیں تھی۔ جس کو بروئے کار لا کر میں ماں جی کو مطمئن کر سکتا۔ اب تو بات چل نکلی تھی۔ جانے کہاں تک پہنچے۔ ہمیں کیسے کیسے کنوئیں کھودنے پڑیں۔ کیا کچھ کرنا پڑے۔ ہم دونوں ہی بازی ہار چکے تھے۔ ہم پر تو تقدیر بھی بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ وہ بھی تیروں کی بوچھاڑ میں ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ وقت کی اس دھاندلی اور بار بار کی چوٹ نے ہمیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور ماموں ارشد کو گھر جانے کی بہت جلدی تھی۔

"تمہارا ماما ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یوں کرو ارشد بھائی! کہ تم آج ہی واپس چلے جاؤ۔ ہم بھگت لیں گے جو ہمارے نصیب میں ہو گا۔" ماں نے بالآخر اپنے آنسو پونچھ لیے۔ ایک عجیب طرح کی طمانیت سی اُن کے چہرے پر ابھر آئی۔ جیسے وہ زندگی کو اس نئے رُخ سے دیکھنے کے لیے خود کو تیار کر چکی ہوں۔ وہ ذہنی تبدیلی اسی وقت ہی وقوع پذیر ہوئی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے غسل خانے میں جا کر...... وضو کیا۔ پھر وہ نماز پڑھنے لگیں۔ اس عرصے میں ہم تینوں کمرے میں خاموش بیٹھے رہے۔ گل زری تو کوئی بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ماموں بھی چپ ہو گئے۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا تھا۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی۔ میں کوشش کے باوجود اُن کے سامنے سگریٹ نہ پی سکا۔ شاید میں اپنے بارے میں انھیں کوئی غلط تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔ یا پھر یہ اُن کا احترام تھا اُن دونوں بزرگوں کا جو مجھے یہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ماں نے نماز پڑھ کر تسبیح ہاتھ میں لی۔ شاید وہ خدا سے دعا کر رہی تھی کہ ہمیں ان پریشانیوں سے نجات دے۔ یقیناً کچھ ایسی ہی بات تھی۔ تسبیح پھیر کر وہ اٹھ گئیں۔ فرش پر بچھی چادر انھوں نے سنبھال کر الگ رکھ دی اور بڑے تحمل سے ماموں ارشد کو مخاطب کر کے بولیں۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھائی! میرا خیال ہے تم آج ہی واپس چلے جاؤ۔ تمہارے ڈھور ڈنگر ویران ہو جائیں گے۔ اُن کو تو کوئی چارہ دینے والا بھی نہیں ہے۔ فضیلت بیچاری کیا کر سکے گی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بہن جی! میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں جلد ہی کچھ کر لینا چاہیے۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ اس کا جرم کیا ہے؟"

"جرم جو بھی ہو گا، وکیل دیکھ لے گا۔ تم بہرحال اب گھر چلے جاؤ۔ یہ لو یہ سو روپے رکھ لو۔ واپسی کے کرائے کی بھی تمہیں ضرورت ہو گی۔" یہ کہہ کر ماں جی نے اپنے تھیلے سے ایک بٹوا نکال کر سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے آگے ڈال دیا۔ بٹوے میں خاصی رقم موجود تھی۔

"تیرے پاس تو میرا خیال ہے، کچھ بھی نہیں ہو گا جیلانی! تیرا حال بہت پتلا نظر آتا ہے مجھے۔" ماں جی نے مجھے ٹٹولتے ہوئے کہا مگر ان کی بات کا جواب میں نے نہیں دیا۔ میں ماموں کو دیکھ رہا تھا۔

اُس نے نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ماں جی کے خرچ پر ہی راولپنڈی پہنچا تھا اور اپنی جیب سے وہ ایک پائی بھی خرچنے پر تیار نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کام تو اس کی بہن کا ہے، سارا خرچ اسے ہی برداشت کرنا چاہیے۔ وہ ایسا ہی بھائی تھا جس کو بیوی کے مکتب میں ڈال کر ایسا بنا دیا گیا تھا کہ اس کا خون ہی سفید ہو گیا تھا۔ اُسے اس بات میں ذرا بھی عار محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اس سفر کا سارا خرچ بہن کے ذمّے ڈال دے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں انھیں مل گیا تو وہ اپنی جان چھڑانے لگا۔ وہ اس بارہ باٹ رشتے پر دو قدم بھی اپنی بہن کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ماں جی ٹھیک کہتی ہیں ماما جی! اب آپ جائیں، میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

ماں جی نے بٹوے میں سے سو سو کے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ میرا خیال ہے وہ کوئی دس بارہ ہزار روپے تو ضرور ہی ہوں گے۔ "بیٹے! یہ رکھ لو تم! کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے، وکیل کا بھی بندوبست کرو۔ تمہاری رقم میرے بہت کام آئی۔ اب تک میں اسی سے کام چلا رہی ہوں۔"

"ماں جی یہ کیا کرتی ہو تم! یہ نوٹ رکھ لو، بٹوے میں ڈال لو، اللہ نے بہت پیسے دیے ہیں مجھے۔ میں 'انڈے' نہیں بیچتا ہوں۔ یہ دیکھو!" میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ڈھیر سارے نوٹ اس کے سامنے ڈال دیے۔ ماموں کی آنکھوں میں ایسا تحیّر ابھرا کہ باید و شاید۔ یہ انھی کی بات کا جواب تھا جو میں اب دے رہا تھا۔ وہ ذات برادری کے شریکوں ایسا سلوک اپنی بہن سے کر رہے تھے۔ اور مجھے وہ اس لیے ڈانٹ رہے تھے کہ میں اُن کے بیٹوں کی طرح نوکری نہیں کر رہا تھا۔

"یار! تیرے پاس اتنے نوٹ ہیں اور تُو اب تک اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں کر سکا ہے۔"

"میں کیا کروں ماما جی! مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں تو اس کے بدلے خود جیل جانے کو تیار ہوں۔"

ماں جی کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا، بولیں۔ "ٹھیک ہے، میں سمجھتی تھی تیرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ حلیہ تم نے ایسا ہی بنا رکھا ہے۔ یہ نوٹ اندر رکھ لو اور اپنا لباس درست کرو۔ یہ تمہارا دوست بھی اسی حال میں پھر رہا ہے۔" اس نے پہلی بار گل زری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے ماں جی کہ ہم بڑی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارا کاروبار ایسا ہی ہے۔ ہمارا زیادہ وقت گاؤں میں گزرتا ہے، اس وجہ سے یہ حلیہ بنا رکھا ہے ہم نے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو ہم آج ہی یہ لباس بدل لیں گے۔" وہ مسکرانے لگا تھا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کی طرف بھی دھیان دے رہی ہیں۔

"اچھا بھئی! میں اب چلتا ہوں۔ بس میں نکل جاؤں گا۔ مجھے اطلاع ضرور کرتے رہنا۔ فکر لگی رہے گی مجھے۔" ماموں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے ماما جی! ہم آپ کو خط لکھتے رہیں گے۔ آپ دُعا کریں، اللہ یہ مشکل آسان کر دے۔"

"وہ تو میں کرتا ہی رہتا ہوں، اب بھی کروں گا، بس اب مجھے اجازت دیں۔"

اور پھر اُس نے باری باری ہم سے ہاتھ ملایا۔ اور ماں جی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ حالانکہ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی نہیں رُکا۔ بازار میں نکلا تو ہم اسے ہوٹل کی دوسری منزل سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ کر اُسی وقت آگے نکل گیا۔

"تو یہ حال ہے ہمارے ماما جی کا۔ انھیں اپنے ڈھور ڈنگروں کی فکر لگی ہے، حد ہو گئی! یہ کیسا ماما ہے ہمارا ماں جی! آپ کا وقت کیسے گزرتا ہو گا وہاں؟"

"دفع کر اسے۔" یہ آسیہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اللہ رکھے میری بیٹی شہزادی لگتی تھی۔ کار میں ہمارے گاؤں چیک سوالن گئی تھی۔ اسے اس حاسد کی نظر کھا گئی ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آسیہ پر کوئی مصیبت آ گئی ہے تو یہ بڑی مشکلوں سے میرے ساتھ آنے کو تیار ہوا۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔"

"مگر آپ کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟"

"اچھا ہی ہے۔ فضیلت البتہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ رہتی ہی میرے پاس ہے وہ۔ پر مجھے کیا لینا ہے اس سے۔ میرا کوئی بوجھ نہیں ہے اس پر۔ تمہاری دی ہوئی رقم ہی میرے لیے بہت کافی ہے، اب بھی میرے اس کی طرف نو سو روپے نکلتے ہیں۔ ضرورت پڑتی ہے تو سیدھا میرے پاس آ جاتا ہے۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ وہ پیسے آپ اس سے واپس نہ مانگیں پھر بھی ہمارا ماما ہے یہ۔ آپ آسیہ کے بارے میں فکرمند نہ ہوں، میں

سب سنبھال لوں گا، یہ ایسی کوئی بڑی مشکل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! اب تو مجھے یقین ہے کہ تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی کر لے گا۔ میری اس یتیم بچی کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"آپ اب آرام کریں، بہت تھک گئی ہوں گی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کل آپ کی آسیہ سے ملاقات کروا دوں۔ چائے پئیں گی آپ؟"

"نہیں، چائے کی ضرورت نہیں ہے، میں ذرا دو گھڑی سو لینا چاہتی ہوں۔"

"آؤ گل زری! ہم باہر بیٹھتے ہیں، یہ کرسیاں لے آؤ۔ برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔"

کمرے کے باہر ایک برآمدہ سا بنا تھا، کرسیاں ہم نے وہاں ڈال لیں۔ گل زری نے بیرے کو آواز دی اور چائے لانے کا کہہ دیا۔

"اب بتاؤ گل زری! ساری بات تو تم سمجھ گئے ہو۔ تم اس معاملے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں کیا کہوں بھئی! یہ بہت ٹیڑھا معاملہ ہے اور جن لوگوں سے میرا واسطہ رہتا ہے وہ بااثر لوگ نہیں ہیں — خدا خبر وہ کچھ کر بھی سکتے ہیں کہ نہیں۔"

"پھر بھی کچھ بتاؤ تو سہی، اُن کے نام تو لو۔"

"ایک تو پیر بارک اللہ ہیں، اُن کے مرید تو بہت ہیں۔ اور وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر اُن کا بارُود سلگانا بہت مشکل ہے۔"

"تم اُن کے لیے کیا کرتے ہو؟"

"یہ سارا اسلحہ اور سونا میں انھی کے حکم سے آگے پیچھے کرتا رہتا ہوں۔ اس غار میں دو دن پہلے میرے پاس ڈیڑھ من سونا تھا، ڈلیوں اور اینٹوں کی شکل میں اور اسلحہ بھی خاصا تھا۔ وہ میں نے اُن کی مطلوبہ جگہ پہنچا دیا تھا۔"

"مگر یہ اسلحہ، یہ سونا تمھیں ملتا کہاں سے ہے؟"

"اس کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے مگر مجھے یہ مردان سے ملتا ہے۔ پیر صاحب کے دو مرید ہیں وہاں، اوّل خان اور جہانگیر صاحب۔ وہ مجھے یہ سب کچھ دے دیتے ہیں اور میں انھیں مختلف دیہاتوں کے رستے کار میں رکھ کر لے آتا ہوں۔ اٹک پل سے میں نہیں گزرتا، وہاں پڑتال زیادہ ہوتی ہے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تم سرکار کے خلاف کام کر رہے ہو؟"

"تو ٹھیک ہی کہتا ہوں نا! اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالتا۔"

"سونے کا کیا کرتے ہو تم؟"

"وہ ہمارے لیے سرمائے کا ذریعہ ہے۔"

"اس کی رقم کس کی تجوری میں جاتی ہے؟"

"سیٹھ رجب علی کے پاس۔ یہ اسی کا سرمایہ ہے اور اسی کی تجوری میں جاتا ہے۔"

"ہوں! مگر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تو پارٹی کے کرتا دھرتا ہی جانتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد جو دھماکے اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں جو گولیاں چلتی ہیں، اچانک ہی چلنے لگتی ہیں، وہ سب پارٹی کے لوگ کرتے ہیں۔ حکومت کو ہم یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ ہر جگہ خیریت نہیں ہے۔"

"مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"بہت سے لوگ پارٹی سے ملتے جاتے ہیں۔ ہماری تعداد بڑھتی جا رہی ہے، ایک مضبوط محاذ ہم نے بنا لیا ہے۔"

"سیٹھ رجب علی کہاں رہتا ہے؟"

"وہ اُدھر صدر ہی میں رہتا ہے مگر اس سے کوئی مل نہیں سکتا، یہ ناممکن ہے۔"

"اور وہ پیر بارک اللہ؟"

"اُسے بھی کسی نے آج تک نہیں دیکھا ہے، میں نے سنا ہے کہ وہ کوہ مری میں رہتا ہے مگر اس سے ملنا بھی اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سیٹھ رجب علی سے۔"

"اور وجہ کیا ہے؟ کیوں نہیں ملتے وہ کسی سے؟"

"میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں۔ اگر کبھی تفتیش ہوتی تو ان کا وجود ثابت کرنا ناممکن ہوگا۔ کوئی انھیں جانتا ہی نہیں۔"

"حیرت ہے! مگر اس سونے اور اسلحے کے لیے روپے لین دین کون کرتا ہے؟"

"جہانگیر اور اوّل خان رقم بینک میں جمع کروا دیتے ہیں۔ وہاں سے وہ آگے نکل جاتی ہے۔"

"عرفان اور مُرشد کے ذمّے کیا کام لگایا گیا تھا؟"

وہ ذرا دیر کے لیے چونک سا گیا، بڑی حیرت سے بولا۔ "یہ بات تم سے کس نے کہی ہے؟"

"ارے تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ عرفان کو تم نے خود ختم کیا تھا، یاد نہیں رہا تمھیں؟"

"میں شاید اُس وقت پاگل ہو گیا تھا اور شاید اب بھی پاگل پنے کی باتیں کر رہا ہوں۔"

"تک نہیں اوئے! میرا خیال ہے تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے مگر ایسا نہ سمجھو۔ میں تمھارے ساتھ جہنم تک جانے کو تیار ہوں، سوال صرف آسیہ اور آپی کی رہائی کا ہے، اس کے بعد تم جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"سوچ لو، یہ راستہ بہت کٹھن ہے۔ تم مر بھی سکتے ہو۔ یہ بانات کی پگڈنڈی نہیں ہے۔"

"مجھے منظور ہے گل زری! میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر صرف اُن کی رہائی میرا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

"دیکھ جیلانی! وقت کا یہ راستہ تو میں بند کر سکتا ہوں۔ تمھاری بہن اور تمھارے دوست کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ انھیں پھانسی نہیں ہوگی، اس بات کی ضمانت میں دے سکتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں اُن کی رہائی چاہتا ہوں۔ میری ماں یہاں آ گئی ہے، کل میری اُن سے ملاقات ہونی چاہیے۔"

"سمجھو ہو گئی ملاقات! کل دس بجے تیار رہنا۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اگلی بات میں تمھیں کل بتاؤں گا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم ہماری تنظیم میں شامل ہو جاؤ۔ اس کے لیے تمھیں بارہ ٹوپی سے ملنا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟ بارہ ٹوپی سے کیا مراد ہے تمھاری؟"

"یہ ہماری تنظیم کی مجلسِ عاملہ کا نام ہے۔ وہ بارہ آدمیوں پر مشتمل ہے۔ اُن کے سامنے تمھیں حاضر ہو کر ایک عہد نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"اور یہ مجلس ہے کہاں؟"

"یہ کراچی میں ہے۔ ہم دونوں ہوائی جہاز پر وہاں جائیں گے اور اسی شام واپس آ جائیں گے۔"

"ارادے تو تمھارے بہت نیک ہیں۔ ٹھیک ہے بھائی! میں بہرحال تیار ہوں۔ کل کا سورج نکلنے کے بعد اگلی بات ہوگی۔ مگر مجھے بتاؤ کہ عرفان، وقاص اور مُرشد جو ختم ہو گئے ہیں، اُن کے بارے میں پولیس تفتیش تو کرے گی۔"

"ضرور کرے گی مگر کسی کو اُن کا اتا پتا نہیں مل سکے گا۔ اُن کے پاس اُن کی شناخت کی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"مگر اُن کے چہرے تو موجود ہیں؟"

"ہوتے رہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کوئی اُن کو شناخت نہیں کر سکے گا۔"

"کیوں نہیں! اُن کے والدین، اُن کے عزیز و اقارب، انھیں تم کیسے مطمئن کر سکو گے؟"

"وہ ایسے ہی لوگ تھے، اب مجھے ہی دیکھ لو، نہ میرے والدین ہیں نہ کوئی بہن بھائی۔"

"میرا خیال ہے عرفان کی شادی ہو چکی تھی۔"

"نہیں۔ جو بچے تم نے لال کُرتی میں دیکھے تھے، وہ اس کے بچے نہیں تھے، انھیں عرفان نے یُوں ہی وہاں ٹھہرا رکھا تھا۔ اسی لیے تو وہ اسی وقت مکان سے چلے گئے۔ عرفان کے پاس وہ مکان کئی مہینوں سے تھا، وہ کرائے دار تھا وہاں۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ تمھیں ہر معاملے کا علم ہے اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ گل زری! تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو، میں تو بالکل پاگل ہوں، خواہ مخواہ دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم پاگل نہیں ہو بلکہ تمھاری صحیح راہنمائی نہیں کی گئی ہے ورنہ تم بہت بڑے آدمی بن سکتے تھے مگر خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم یُوں کرو کہ آج رات اپنے یہ بال کٹوا لو اور یہ مونچھیں بھی صاف کروا دو۔ البتہ داڑھی تم اتنی بڑھا لو کہ اس پر باقاعدہ ہاتھ پھیرا جا سکے۔"

"وہ کس لیے؟"

"میں تمھیں نئے حلیے میں دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بہت ضروری ہے۔ اپنے لیے ایک سیاہ عبا سلوا لو۔ آج سے تمھارا نام علی آشتی ہوگا۔ کیسا رہے گا یہ نام؟"

"نہیں یار! ایسا مذاق نہ کرو میرے ساتھ۔"

"یہ مذاق نہیں ہے آشتی صاحب! یہ بہت ضروری ہے۔"

اتنے میں بیرا چائے لے کر آ گیا۔ اور ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بیرا جب واپس چلا گیا تو وہ بولا۔ "تو پھر یہ بات طے رہی کہ آج سے تمھارا نام علی آشتی ہوگا۔ نہ غلام جیلانی، نہ سردار کریم نواز۔ اور یہ اچھی بات ہے، پریشان نہ ہو۔ اس سے بہت جگہ تمھاری جان بچی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے گل زری! اب تو مجھے ہر جگہ تمھاری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔"

"ہاں! مگر ہم تمھیں تخریب کار نہیں بنائیں گے، اس کی فکر نہ کرو۔ یہ کام کوئی اور لوگ کریں گے۔ سمجھو آج سے تمھاری زندگی کا رُخ بالکل ہی بدل جائے گا۔ ہم تمھیں تحفّظ دیں گے مکمل تحفّظ۔ اگر صبح تم کراچی میں ہو گے تو اسی شام پشاور جا رہے ہو گے — فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمھیں۔"

"مجھے منظور ہے گل زری! مگر کیا یہ تمھارا اصلی نام ہے؟"

"میرا نام گل زرین ہے۔ گل زری تو خواہ مخواہ ہی لوگوں نے بنا لیا ہے مگر یہ میرا اصلی نام نہیں ہے اور وہ نام بتلانے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" چائے پینے کے بعد وہ بولا۔ "آؤ بازار چلتے ہیں، ہمارا حلیہ اب تبدیل ہو جانا چاہیے۔"

بازار جا کر ہم نے اپنے لیے سیاہ عبائیں خریدیں۔ اور عمدہ قسم کی قمیصیں، شلواریں، بنیانیں، جرابیں اور بوٹ بھی خرید لیے۔ اسی

شام ہم دونوں نے سر کے بال منڈوا دیے۔ مونچھیں بھی اُسترے کی نذر کر دیں۔ اور یہ بات بہت ضروری تھی۔ پولیس کسی بھی وقت ہمیں پہچان کر ہم پر ہاتھ ڈال سکتی تھی۔ داڑھیاں ہماری خاصی بڑھ آئی تھیں، اُن پر ہم نے ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ گل زری کا یہ خیال تھا کہ ہمیں اب بارِیش نظر آنا چاہیے۔

رات کو دس بجے وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ ایک سوٹ کیس اس نے خرید لیا تھا اور ایک میں نے۔ اپنے کپڑے اور اسٹین گن وہ اس میں باندھ کر نکل گیا اور مجھ سے کہہ گیا کہ وہ صبح آٹھ بجے میرے پاس پہنچ جائے گا۔ کھانا ہم دونوں نے ماں جی کے ساتھ ہی کھایا۔ وہ بہت خوش تھیں کہ انھیں اُن کا بچھڑا ہوا بیٹا مل گیا تھا، اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ اب وہ اپنی بیٹی کے کام آ سکیں گی۔

”دیکھیں ماں جی! کچھ ایسی مصلحت ہے جس کی بنا پر میں نے عارضی طور پر اپنا نام علی آشتی رکھ لیا ہے، امید ہے آپ بُرا نہیں منائیں گی۔“

”کیوں؟ ایسا کیوں کر رہا ہے تو؟ کیا تجھے میرا دیا ہوا نام پسند نہیں ہے؟“

”بہت پسند ہے ماں جی! میرے لیے یہ بہت ہی متبرک نام ہے مگر ایک خاص کام کی وجہ سے میں اسے بدل رہا ہوں ویسے تو میں آپ کا وہی غلام جیلانی ہوں ماں جی۔“

”ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر خیر ہی ہے نا، کوئی پولیس شولیس کا چکر تو نہیں ہے نا؟“

”وہ تو ایک وجہ ہے ماں جی! میں جیل سے بھاگا ہوا آدمی ہوں، آپ سمجھتی ہیں نا!“

”ہاں! یہ تو ہے بس ٹھیک ہے، میں تو تمھیں بیٹا ہی کہوں گی۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔“

”بس اب آپ آرام کریں ساڑھے دس بج گئے ہیں۔ کل ہم آپ سے ملیں گے اور پھر میں آپ کے لیے کوئی مکان بھی تلاش کر لوں گا۔ ابھی آپ واپس نہیں جائیں گی ماں جی! لائیں میں آپ کے پیر دبا دوں۔“

”نہیں وے پُتر! اس کی ضرورت نہیں ہے میرا خیال ہے ابھی میری صحت کافی اچھی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے ماں جی! نماز میں آپ کی صحت کا راز ہے۔ اللہ کو آدمی یاد کرتا رہے تو وہ اُسے کبھی نہیں بھلاتا ہے، رحمتیں نازل کرتا رہتا ہے۔“

”تو بھی نماز پڑھا کر بیٹے! یہ دو دن کی زندگی ہے پھر یہ وقت ہاتھ نہیں آتا ہے۔ نماز پڑھا کر اللہ تیری مشکلیں آسان کرے گا۔“

”ہاں ہاں جی! میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا، فکر نہ کریں۔“ وہ عشاء کی نماز پڑھ چکی تھیں۔ میں نے اُن کے لیے عمدہ قسم کا خالص دودھ منگوا لیا تھا۔ وہ میں نے انھیں پلایا اور جب وہ لیٹ گئیں تو میں اُن کی پائینتی بیٹھ کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ پاؤں، وہ سارے جہاں سے اُجلے اور پاؤں ایک عرصے بعد میرے سامنے آئے تھے۔ میرا دل بلیوں لگا تھا۔ میں انھیں بے ساختہ چومنے لگا۔ یہ انھی قدموں کی تھی کہ میں ابھی تک زندہ تھا ورنہ میرے مرنے میں تو کوئی شبہ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ موت بار بار میری طرف لپکتی چلی آ ایسے تو ان گنت واقعات میرے سامنے تھے جن میں خود لینا میرے لیے ناممکن تھا مگر شاید یہ ان کی پابوسی کا نتیجہ میں ہر مرحلے سے سُرخرو ہو کر نکل آتا تھا اور میرے دشمن ہاتھ ہی ملتے رہ جاتے تھے۔

ماں جی جلدی ہی گہری نیند میں کھو گئیں تو میں بھی اپنے پر جا لیٹا مگر خواب میرے لیے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے ذہن عجیب سی آندھی چل رہی تھی۔ آرزوؤں کی دھکم پیل ہو رہی تھی کا تسلسل ایک دوسرے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس غار کا خیال آتا تھا رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ موت میرے سر پر سے ہو کر گزر تھی۔ پچھلی رات ہمیں جس قیامت کا سامنا کرنا پڑا تھا اُس سے مرضی کے سوا کسی بھی طرح بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ صبح میری زندگی کی باغ باڑی اجاڑنے کے لیے میرے پیچھے تھے۔ وہ زیادہ دُور تو نہیں تھے۔ کشتی پر انھیں باڑ مارنے کا ہی گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس کی دعا کی برکت تھی کہ میں اور گل وہاں سے بچ کر نکل آئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ماں کی دعاؤں نتیجہ تھا ورنہ میں آہنی زرہ پوش تو نہیں تھا۔

وہ گدڑ لیے ہمیں نہ ملتے تو صورتِ حال اور بھی پریشان جاتی۔ وہ کوئی ایک دو تو نہیں تھے۔ اُن سے نمٹ لینا کسی بھی ممکن نہیں تھا مگر ایک صبر و استقلال جو مجھے ملا تھا، وہی میرے آیا۔ ورنہ حوصلہ ہار دینا تو کچھ مشکل نہ تھا۔ میں ہاتھ اُٹھا کر سامنے جا پہنچتا کہ لو میاں میں حاضر ہوں، مجھے مار دو جتنا مار سکو ورنہ میرے مار لو یا مجھے قتل کر دو، میں حاضر ہوں۔ بہت گناہ کیے ہیں! یہ ظالم ایسا کھرا بڑے لوگوں کا خون میری گردن پر ہے، یہ گردن کاٹ لو یہ خم اونچے گدھوں کا سا رویہ انھیں بہت راس آتا ہے۔ مجرم بالآخر اُن کے سامنے سر ڈال دیتا ہے اور وہ جس طرح چاہتے ہیں لے ہیں۔ میرے ساتھ بھی وہ یہی کرتے — مجرم سمجھتا ہے کہ ستیاناس ہو گیا ہے وہاں سوا ستیاناس بھی سہی۔ وہ ہر بات سے کر لیتا ہے یہاں تک کہ پھانسی کی کوٹھری تک جا پہنچتا ہے اور اسے بھی تقدیر کا جبر سمجھ کر سب کچھ سہہ جاتا ہے۔ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب وہ اس دارالفغاں سے باہر نکلتا ہے تو اس کی گردن ڈیڑھ ہاتھ لمبی ہو چکی ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس کی لاش وصول کرنے والا اس کا عزیز وہاں موجود ہو تو وہ سب سے پہلے اس کی گردن پر چادر ڈالتا ہے تاکہ وہ باعثِ عبرت چیز نظر نہ آئے جس کی وجہ سے وہ شے سے لاشے میں تبدیل ہو گیا تھا اور مجھے وہ ایسے ہی دینے کی توقع رکھتے تھے مگر میں بچ گیا تھا، بچتا چلا آیا تھا۔ محض اس لیے کہ مجھے وہ سب کچھ ناقابلِ برداشت نظر آتا تھا۔ میں نے اسی لیے تو یہ کہا ہے کہ وہ حکیم حضوری اگر کہیں مجھے مل گیا، کوئی ایسی گھڑی آ پہنچی تو پھر میں اپنے پستول کی نال اپنے حلق پر رکھ کر لبلبی دبا دوں گا۔ انسانی جنگل کے اس حصار میں ایسے مرحلے پر پہنچ کر آدمی کو خود پر وار کر لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ وہ اُن کی زنجیریں پہن کر اُن کی تجویز کردہ اور اُن کی پسندیدہ موت مرے۔ یہ مجھ سے شاید کبھی نہ ہو سکے گا اور وہ اسی مار پر تھے۔ میرے پیچھے ہتھکڑیاں لے کر وہ اسی لیے بھاگے پھرتے تھے مگر میں ابھی تک وادیٔ امن کی طرف کھڑا تھا جہاں امن ہی امن تھا، سکون ہی سکون تھا اور میری ماں مجھ سے آ ملی تھی۔ کچھ دن مجھے اُن کی خدمت کا موقع مل رہا تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ میں جی جان سے اُن کی خدمت کروں گا اور اُن کی دعائیں لوں گا۔ شاید یہ امن انھی کی وجہ سے تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے میرے لیے خدا سے گریہ زاری کرتی رہتی تھیں۔ کوئی بات تھی ضرور کہ میں اب تک موت کے نرغے میں بار بار آ جانے کے باوجود بچ جاتا تھا۔ یہ انھی کی آہِ سحر گاہی کا نتیجہ ہی تو تھا کہ میں اب تک زندہ تھا۔ ورنہ کون سا ایسا حادثہ تھا جو مجھ پر نہیں گزر گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ فوت ہوئیں تو پھر انھیں بھی خبردار کر دیا گیا تھا کہ وہ کس نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ شاید میں بھی اب تک خدا کی گرفت سے اسی لیے بچا ہوا تھا۔ ورنہ تو میرے گناہ کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔ اُن کا تو کوئی انت حساب ہی نہیں تھا۔ پسِ پردہ تو شاید میری ماں ہی تھی جس کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج خدا نے ہر بار رکھ لی تھی، ورنہ میرے بازار تو کب کے بند ہو چکے ہوتے۔ میں بیچارا بانگڑو آخر تھا کس شمار قطار میں۔ میرے حوصلے کے اُونچے اونچے مینار تو کبھی کے زمیں بوس ہو چکے تھے۔ اب تو آخری وار مجھے اپنے ہی اوپر کرنا تھا، جینا بیکار ہوتا جا رہا تھا۔

گل زری کے بول بچن مجھے یاد آتے تھے تو میں سمجھتا تھا کہ شاید وہ کچھ کر سکے۔ کوئی بڑی سفارش، کوئی بڑا سہارا اُس کے پاس ہوگا جب ہی تو اُس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا ورنہ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ یہ تو بہت آسان بات تھی مگر اب تک اس نے میری تمام تر کوشش کے باوجود اپنے پتے پوری طرح مجھے نہیں دکھائے تھے۔ وہ بہت اُونچا اُڑ رہا تھا بہت اونچی اونچی باتیں کرتا تھا جیسے ملک کا سارا اونچا نیچا سلسلہ اسی کی کاوش کا مرہونِ منت ہے۔ پتا نہیں اس نے کس کے تخت پکڑ لیے تھے۔ اُس کا ایک ایک لفظ مجھے حیران کرتا تھا۔ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور وہ صحیح بھی تھا۔ پھر اُس نے ڈھلوں کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس پر بھی اعتبار کرنا ہی پڑا تھا۔ اُسے میرے اور آئی کے امرتسر کے ڈیرے کا بھی سارا قصہ یاد تھا۔ خدا جانے وہ کیا تھا اور کس کے لیے کام کر رہا تھا؟ مجھ سے اس نے ایک پائی نہیں لی۔ بازار سے جو کچھ خریدا اُس کے پیسے اُس نے خود ادا کیے۔ اپنے حصے کا تمام حساب اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اُس نے ایسا بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی رقم اس نے مجھ پر خرچ کی ہو۔ معاملے کے اس پہلو نے مجھے اور زیادہ حیران کیا۔ چیزیں تو کوئی اتنی زیادہ ہم نے نہیں خریدی تھیں۔ مگر جو کچھ بھی تھا، اس کا حساب اس نے یوں کیا تھا کہ اُس نے میرا کوئی احسان لینا پسند نہیں کیا۔ حالاں کہ میرے پاس خاصی رقم موجود تھی اور اُسے معلوم بھی تھا مگر ہر بار اُس نے اپنی ہی جیب پر انحصار کیا۔

خاصی رات تک میں شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا رہا۔ آخر وہ دافعِ بلیات نیند میری طرف لوٹ ہی آئی۔ اور میں دماغ سے سب وسوسے، سارے اندیشے ہٹائے دُور دراز جھٹک کر گہری نیند میں کھو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو ماں جی اس وقت حمائل شریف پڑھ رہی تھیں، وہ اُسے اپنے ساتھ ہی لے آئی تھیں۔ بستر سے اُٹھتے ہی میں غسل خانے میں جا گھسا۔ بہت دنوں کی میل کا حساب مجھے چکانا تھا۔ میرے دن رات یوں گزرے تھے کہ کسی بات کا مجھے ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ پولیس کے خوف نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ ہر وقت مجھے یہی فکر رہتی تھی کہ وہ سہروں والے مجھے کسی بھی جگہ روک لیں گے اور اپنی بارات کا دُولہا بنا کر جیل پہنچا دیں گے، خدا انھیں غارت کرے۔ خدا جانے انھوں نے کتنے لوگوں کا خون خشک کر رکھا تھا مگر میری یہ فکر دم بہ دم بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور اب مجھے گل زری نے علی آشتی بنا دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ بھول جاؤ، تم کبھی غلام جیلانی بھی تھے یا سردار کریم نواز بھی تمھارا نام ہوا کرتا تھا۔ اب یہ نیا نام خدا جانے مجھے راس بھی آتا تھا کہ نہیں مگر پھر بھی اُس نے جو نام مجھے دیا تھا، وہ مجھے اپنانا ہی پڑ رہا تھا۔

ساڑھے سات بجے تک میں باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ماں جی سے بھی میں نے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار رہیں، ٹھیک آٹھ بجے گل زری ہوٹل آپہنچا۔ اسے سامنے دیکھ کر میرا دل خوش ہوگیا، اُسے وقت کا احساس تھا اور وعدے کا پاس بھی ۔ وہ اچھے موڈ میں تھا۔ علیک سلیک کے بعد بولا "میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے، ماں جی تیار ہیں ؟"

"ہاں! وہ بھی تیار ہیں، تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ یہ حُلیہ کیسا رہے گا ؟"

"ایک دم فسٹ کلاس۔ اس میں تم کوئی بہت ہی عالم فاضل آدمی نظر آتے ہو۔ چلیں ماں جی! اس کو پہچانتی ہیں آپ ؟"

"پتا نہیں تمھیں کیا سُوجھی ہے، تم نے بھی سیاہ چغہ پہن لیا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"ہم نے بھیس نہیں بدلا بلکہ ہمارا اصل لباس ہی یہ ہے۔ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کے بیٹے کا نام آج سے علی آشتی ہے۔ وہاں جا کر اسے جیلانی کے نام سے نہ پکاریں، یہ بہت ضروری ہے۔"

"اس کا نام لینے کی مجھے کیا ضرورت ہے بیٹے! اس کا کوئی نام نہ بھی ہو تو بھی یہ میرا اشارہ سمجھ لیتا ہے۔"

"میرے پاس گاڑی ہے آئیں! آج ٹیکسی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ مگر تم تھے کہاں ؟ رات کہاں گزاری ہے تم نے ؟"

"میں کلرسیداں چلا گیا تھا، وہ بہت پریشان رہنے لگی ہے۔"

وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ پہلے بھی اس نے جب بیوی کی بات کی تھی تو اُس کا رویّہ ایسا ہی تھا۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اُس پر اب تک مجھے اعتبار نہیں آیا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کی کونسی رگ دباؤں کہ وہ سچ اُگل دے۔ اب تک تو میرا اُس کا نباہ اِس لیے ہو رہا تھا کہ جنگل سے نکلنے اور پولیس سے بچ جانے کی اُسے بھی اتنی ہی ضرورت تھی، جتنی مجھے۔ وہ بھی بہت ہی غیر معمولی جرائم میں ملوّث تھا۔ اگرچہ پولیس اُس کے پیچھے نہیں بھاگی تھی۔ وہ اس وقت اُن کی فہرست میں شامل نہیں تھا مگر وہ اُن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس پر لازم تھا کہ وہ میرا ساتھ چھوڑ دیتا۔ گولائی اور رستم کے ساتھ کسی طرف نکل جاتا۔ وہ بہت اچھا موقع تھا اور اُسے یقیناً کوئی دقّت پیش نہ آتی۔ لیکن اُس نے میرا ساتھ دینا زیادہ بہتر سمجھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں۔ پھر بھی وہ اندھا دُھند مجھ پر اعتبار کرتا چلا گیا میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا ماہرِ نفسیات تھا۔ آدمی کی سرشت سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں اُس پر وار نہیں کر سکوں گا۔ اس نے مجھے جھانسا ہی ایسا دیا تھا۔ حالانکہ جو واقعات اس نے بیان کیے تھے اُن سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اُن میں ملوّث رہا مگر پھر بھی وہ میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اُس صبح جب اُس نے بیوی کی بات کی تو پھر میرے ذہن میں یہ شبہ ابھرا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ کوئی ایسی ہی بات تھی جو اس کے مُنہ پر نہیں آتی تھی۔

وہ میرے سامنے ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے سگریٹ سلگا کر اس کا دُھواں سینے میں دبا کر جان بوجھ کر کھانسنا شروع کر دیا۔ چند لمحے اُس کی یہی کیفیت رہی پھر اس نے سگریٹ ایش ٹرے پر ڈال کر مسل دی اور بولا "علی آشتی ان اسٹین گنوں کا کیا کریں؟"

"میں یہ تھیلا ادھر ہی رکھ رہا ہوں پستول کافی رہیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں ان کی حفاظت کون کرے گا؟"

"ہم اس وقت جیل ہی جا رہے ہیں نا ؟"

"ہاں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے وہاں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟"

"نہیں، کوئی ایسا موقع تو نہیں ہے۔"

"کس کے ذریعے تم وہاں جاؤ گے ؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہم شریفانہ طور سے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے مِل کر اُن سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"کیسی بات کرتے ہو بھئی! جیل کا سپرنٹنڈنٹ تو قتل ہو چکا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ اکبر قریشی مر چکا ہے ؟"

"ہاں! میری اطلاع یہی ہے۔ آج کے اخبار میں اُس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر ضرور ہوگی۔"

"کمال کرتے ہو تم! یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" اُس نے برآمدے سے گزرتے ہوئے بیرے کو آواز دی۔ "اوئے کاکا! ذرا آج کا اخبار تو اِدھر لا۔"

"جی بہت بہتر! ابھی لاتا ہوں۔"

جیسے ہی بیرا دروازے سے ہٹا، گل زری نے کرسی میری طرف کھینچ لی، بولا "اُسے کس نے مار دیا ہے اور تمھیں کیسے پتا چلا ؟"

"رات کوئی آدمی باہر برآمدے میں کھڑا کسی کو بتا رہا تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے۔"

"حیرت ہے۔ پھر تو وہاں جو [illegible] بیکار ہے۔ ایک وہی آدمی کام آسکتا تھا۔ وہ بے چارہ لوگوں کی مدد کر کے بہت خوش ہوتا تھا میرا خیال تھا کہ ہم اس لباس میں اُسے متاثر کر سکتے ہیں۔"

"تو یہ محض تمھارا خیال تھا! کوئی ٹھوس تجویز تمھارے سامنے نہیں تھی؟"

"نہیں اِسی لیے تو میں نے یہ لباس تجویز کیا تھا۔"

"بالکل گھامڑ ہو تم، اوّل درجے کے احمق ہو۔ خواہ مخواہ میں بھی تم نے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایسا بے تدبیرا آدمی تو میں نے آج تک نہیں دیکھا ہوگا۔ میں سمجھا تم بہت کاری آدمی ہو۔"

"مگر تم میری بات تو سنو!"

"اوئے چھڈ یار! ماں جی! آپ ابھی ادھر ہی رہیں، آج آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں خیر تو ہے پُتّر! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو ؟"

"یہ ہمارا یار تیر تُکّے سے کام لے رہا تھا۔" وہ کمرے کے دوسرے کونے میں ابھی تک پلنگ پر بیٹھی تھیں، وہاں سے اُٹھ کر ہمارے پاس آ گئیں۔ عین اس وقت بیرا اخبار لے کر آ گیا۔ ہمارے لیے اُس میں دو خبریں اہم تھیں ایک تو چک کھرانہ کے جلسے میں دھماکے کی خبر اور دوسری اکبر قریشی کے بارے میں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اکبر قریشی کی گمشدگی کا معمّا ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے اور پولیس اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا سکی ہے کہ وہ کون آدمی تھا جو آدھی رات کو اُن کی کوٹھی پر جا پہنچا اور جس نے اکبر قریشی کی بیوی کو بے ہوش کرنے کے بعد انھیں کوٹھی سے اغوا کر لیا۔ اُن کا ڈرائیور اُن کی کوٹھی پر ہی رہتا ہے۔ وہ بھی کچھ نہیں بتا سکا حالاں کہ وہ بھی اس وقت اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا۔ اکبر قریشی کے بچّوں کو بھی کچھ معلوم نہیں کیونکہ وہ اس وقت سو رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پولیس کا دفتر بھی قریب ہی ہے مگر ان میں سے بھی کسی کو اس واقعے کی خبر نہیں ہو سکی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اغوا کنندہ کوئی ایک آدمی نہیں ہے بلکہ ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ کاروں میں وہاں پہنچے ہوں گے۔ کمرے میں کسی قسم کے تشدد کا نشان نہیں ملا ہے، وہاں کی ہر شے معمول کے مطابق رکھی ہوئی تھی۔ اغوا کے وقت اکبر قریشی اپنے کمرے میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے اور انھیں کسی کے فون کا بھی انتظار تھا۔ اُن کی بیوی کا بیان یہی تھا۔

"کیا لکھا ہے اخبار میں ؟"

"کوئی خاص خبر نہیں ہے ماں جی! آپ آرام کریں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اُن کو لے جا کر پھر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور وہ تسبیح رولنے لگیں۔ اِس عرصے میں گل زری بڑے غور سے اخبار دیکھتا رہا۔

"یار! یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ تم تو کہتے تھے کہ وہ قتل ہو چکا ہے۔"

"مجھے کیا پتا۔ دو آدمی رات یہی بات کر رہے تھے، مجھے کوئی الہام تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ پھر اخبار پڑھنے لگا۔ صفحہ میرے سامنے ہی تھا۔ اس میں چک کھرانہ کے بارے میں اخبار نے لکھا تھا۔

"پولیس ابھی تک اس واردات کے اصل ملزموں کو گرفتار نہیں کر سکی ہے۔ سہراؤں اور اس کے اردگرد کے سارے جنگل کا پولیس نے محاصرہ کر رکھا ہے مگر وہ ابھی تک کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکے ہیں۔ آئی جی صاحب نے حکم دیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے، پولیس اصل مجرم کو گرفتار کرے۔ اس سلسلے میں اردگرد کے تھانوں کو بھی خبردار کر دیا گیا ہے اور پولیس کی ایک خاص ٹیم مقرر کی گئی ہے جو اس معاملے کی تفتیش کرے گی۔ اس ٹیم کے سربراہ قربان علی شاہ ڈی ایس پی ہوں گے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس میں ہمارے بارے میں کوئی خبر نہیں چھپی ہے۔" گل زری نے اخبار مجھے تھما دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا خیال ہوگا کہ غار کے اندر جو کچھ ہُوا، وہ سب اخبار میں درج ہوگا مگر پولیس نے شاید جان بوجھ کر وہ بات چھپالی تھی۔ اس کا کوئی ذکر وہاں موجود نہیں تھا اور یہ بڑی ہی حیرت کی بات تھی۔ تصادم تو اُن لوگوں سے وہاں ہوا تھا مگر وہ انھیں بھی غلام جیلانی کے بھائی بند ہی سمجھ رہے تھے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایک باقاعدہ گروہ بنا لیا ہے جس نے سہراؤں کے عقبی پہاڑ پر ڈیرا جما لیا ہے مگر انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ وہاں تخریب کار جمع تھے اور وہ اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ کوئی بہت بڑا فساد وہ ملک میں ڈالنے والے تھے۔ پولیس کی بے خبری نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ انھیں اٹھتے بیٹھتے اِن دنوں صرف غلام جیلانی ہی یاد رہتا تھا۔

"گل زری! مجھے یہ بتاؤ کہ تمھیں کیسے شبہ بلکہ یقین تھا کہ اکبر قریشی تمھارے کام آسکے گا ؟"

"بھئی! وہ سیاسی قیدی تو نہیں ہیں۔ ہم اُن سے یوں نہیں مِل سکتے کہ ہم خود "داگی" آدمی ہیں، وہ ہمیں پہچان لیں گے ٹھیک ہے نا ؟ اکبر قریشی اِس معاملے میں ہماری مدد کر سکتا تھا۔"

"ہاں! یہ بات تو صحیح کہتے ہو تم۔"

"مگر ماں جی تو انھیں مِل سکتی ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ کوئی ہمدرد آدمی اُن کو وہاں مِل جائے یا پھر ہم کسی وکیل کے ذریعے انھیں مِل سکتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم اپنا منہ چھپانے پر مجبور ہیں۔"

"کیا وہ تمھیں جانتا تھا ؟"

"نہیں، وہ مجھے نہیں جانتا تھا مگر اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمارے کام آسکتا تھا۔ میرا ایک ساتھی جیل میں ہے، اسی جیل میں۔ اس سے میں دو بار مِل چکا ہوں اور صرف اکبر قریشی کی وجہ سے۔ میں کسی کا رقعہ لے کر اس کے پاس گیا تھا۔"

عین اُس وقت ہوٹل کا بیرا ہمارے کمرے میں آ گیا، بولا۔

"صاب جی! آپ کا فون ہے نیچے، گل زرین صاحب کا۔"

"ہاں۔ میرا نام گل زرین ہے کون ہے فون پر ؟"

"پتا نہیں جی! یہی کہا ہے کہ آپ کو بلوا دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں بھئی! خدا خیر ہی کرے۔" یہ کہہ کر وہ بیرے کے ساتھ ہی نیچے اُتر گیا۔ اور میں ماں جی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ تسبیح اچھی تھی کہ اُن کے سکونِ قلب کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت اُن دانوں پر خدا کا نام لیتی رہتی تھیں۔

"ماں جی آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا دیکھیں تو کتنا پریشان ہو رہی ہیں آپ۔"

"کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میری بیٹی اتنی بڑی مصیبت میں پھنسی ہے، میں کیوں نہ آتی؟"

"وہ پہلے بھی تو جیل کاٹ رہی تھی۔"

"وہ الگ بات تھی اور مجھے اس کا صحیح علم بھی نہیں تھا مگر اب تو وہ باؤ اجمل مجھے خود بتا کر گیا ہے، میں کیسے نہ آتی۔ میں اس سے مل کر جاؤں گی۔ پتا نہیں تم کیوں ڈرتے ہو مجھے لے چلو اس کے پاس، دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے پلنگ سے اتر کر جوتے پہن لیے اور چادر اوڑھ کر ایک نئے عزم کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پتا نہیں تم کس بات سے ڈرتے ہو! وہ کیا کہہ رہا تھا گل زری؟ میں سن رہی تھی۔ کیوں منہ چھپائے پھرتے ہو تم؟ کس بات کا ڈر ہے تمھیں؟"

"ایسے ہی کہہ رہا تھا وہ۔ تو بھلا میں کیوں منہ چھپاؤں گا کسی سے! پہلے کہہ رہا تھا کہ میں تمھیں آسیہ سے ملوا دوں گا، اب آں باں شاں کر رہا ہے، پاگل آدمی ہے وہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم خود وہاں جا سکتے ہیں، یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔" میں نے اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میری تمام چیزیں اور نوٹ اسی میں تھے۔ تھیلا میں نے الماری میں بند کر دیا تھا۔

گل زری کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا، بولا "لو بھئی کام بن گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہاں ایک آڈٹ پارٹی آئی ہوئی ہے، شیخ عبدالرحمن کی سربراہی میں۔"

"اچھا پھر؟ ان سے کیا لینا ہے ہمیں؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ جیل کا آڈٹ کر رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اندر چلے جائیں گے اور جس سے چاہیں گے ملاقات کر لیں گے۔"

"مگر ان سے ہم کیسے مل سکیں گے؟ وہ تمھارے واقف ہیں؟"

"میرے تو نہیں البتہ اصغر صاحب کے واقف ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں اور اس وقت وہ جیل کے سامنے کھڑے ہیں۔"

"تو پھر چلو، سوچتے کیا ہو شیخ صاحب کہاں ہوں گے؟"

"وہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آئیں ماں جی! سمجھیں کام بن گیا۔" یہ کہہ کر وہ برآمدے میں نکل گیا۔ ہم نے کمرہ بند کیا اور اس کے ساتھ نیچے اتر گئے۔ گاڑی اس کے پاس خاصی پرانی تھی مگر پھر بھی آرام دہ تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور سیدھے جیل کے دروازے پر جا پہنچے۔ حلیہ ہمارا بڑا ہی نستعلیق قسم کا تھا۔ سر پر ہم نے سیاہ عمامے باندھ رکھے تھے اور وہ عبائیں ہماری علمی فضیلت کی گواہی دیتی تھیں، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ کوئی ادنیٰ قسم کے مجرم ہیں۔ بلاشبہ آدمی لباس ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

جیسے ہی ہم گاڑی سے اترے، لوگوں کی بھیڑ کاٹتے ہوئے ایک آدمی تیزی سے ہماری طرف لپکا۔

"السلام علیکم حاجی صاحب!"

"وعلیکم السلام! کیا حال ہے بھائی اصغر علی! اکڑے تو ہو؟"

"جی آپ کی دعا ہے۔ ان سے ملیں، یہ شیخ عبدالرحمن ہیں، آڈٹ آفیسر اور یہ ہیں حاجی گل زرین صاحب۔" اس نے اپنے پاس کھڑے ایک ولایتی وضع قطع کے آدمی سے گل زری کا تعارف کروایا۔ مصافحے کے بعد گل زری ہماری طرف متوجہ ہوا۔ "یہ میرے دوست علی آشتی نقشبندی صاحب اور یہ ہیں ہمارے اصغر صاحب یہ سنیئر آڈیٹر ہیں جیل کا آڈٹ کرنے آئے ہیں۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جناب! یہ میری والدہ ہیں۔" میں نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ماشاءاللہ! ہمارے اصغر صاحب آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے جیسا سنا ویسا ہی پایا۔ دراصل ہم نے جیل کا آڈٹ شروع کر رکھا ہے۔"

"تو پھر چلیں حاجی صاحب! ہمارے ساتھ ہی چلیں۔"

"وہ روکیں گے نہیں؟"

"نہیں جی! آپ ہمارے ساتھ ہوں گے جناب! تو ان کی کیا مجال ہے جو آپ کو روک سکیں۔" اصغر صاحب نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا۔ "آپ یہ گاڑی ادھر کھڑی کر دیں سپاہی کے سامنے۔ یہ خیال رکھے گا۔"

حاجی گل زرین صاحب نے گاڑی دائیں ہاتھ کھڑی کر کے لاک کر دی اور پھر ہم جیل کے دروازے کی طرف بڑھے۔ پتا نہیں ان کے پاس ایسی کون سی گیدڑ سنگھی تھی کہ اصغر صاحب کو دیکھتے ہی سپاہی نے دروازے کی کھڑکی کھول دی اور ہم اندر چلے گئے۔

"سنتری جی! یہ لوگ میرے ساتھ ہیں۔ آئیے جناب ہم اوپر جا رہے ہیں، ہمارا دفتر وہیں ہے۔" اصغر صاحب نے کہا اور کسی پوچھ گچھ کے بغیر ہی ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچے۔ انھیں وہاں ایک الگ کمرہ دے دیا گیا تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھے تو جیل کا اکاؤنٹنٹ تیزی سے ہمارے قریب آ گیا۔

"کیا حال ہیں جناب شیخ صاحب! اوپر نمبردار نے کمرہ صاف کر دیا تھا کہ نہیں؟"

"بالکل صاف جی! کمرہ بالکل صاف کروا دیا تھا۔ کوئی اور حکم؟ مجھے بتائیں؟"

"بس ٹھیک ہے۔ ان کے لیے چائے لے آؤ اور کھانے کے لیے بھی کچھ لے آنا۔ چلیں شیخ صاحب۔"

اس نے کمرے کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا جب ہم کرسیوں پر بیٹھ چکے تو شیخ صاحب بولے "اکرم بھٹی صاحب! کام ہم پھر شروع کریں گے، پہلے تم ان حاجی صاحب کو دو آدمیوں سے ملوا دو۔ ایک حسن علی گردیزی ہیں اور ایک آسیہ بانو ہیں وہ لوگ قندیا سے گرفتار ہوئے ہیں آپ کو بتایا تھا میں نے۔" یہ بات شیخ عبدالرحمن نے کہی اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ قیدیوں کا نام جانتا ہے مگر جس یقین کے ساتھ وہ بات کر رہا تھا اس سے مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب، میں ابھی انھیں بلوا لیتا ہوں میرا خیال ہے وہ پچھلی سیڑھی سے آ جائیں تو بہتر رہے گا۔"

"ہاں! اور ان کی ملاقات بھی پچھلے کمرے میں کروا دیں۔ کل ان کا وکیل یہاں آئے گا۔ خیر وہ تو خود ہی ان سے مل سکتا ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"میں بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر بھٹی صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔

میری حیرت سہ چند ہوتی جاتی تھی۔ وہ کام جسے میں بہت ہی مشکل سمجھ رہا تھا، ایک دم اتنا آسان ہو جائے گا، اس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گل زری میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ماں جی دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ وہ کچھ نہیں بول رہی تھیں، ایک صرف تسبیح تھی جس پر وہ خدا جانے کیسی کیسی دعائیں منہ ہی منہ میں پڑھتی رہتی تھیں۔ گل زری نے ہنسی میری کرسی پر ٹکا دی اور دبی آواز میں بولا۔ "کہو کیسی رہی؟"

"تم مجھے پاگل کر دو گے آخر یہ سب ہو کیسے گیا؟"

"یہ سارا کرشمہ اپنے شیخ صاحب کا ہے آشتی صاحب! میرا خیال ہے اصغر صاحب نے آپ کو رقم دے دی ہوگی؟" اس نے شیخ صاحب سے پوچھا۔

"جی ہاں، اس کی فکر نہ کریں۔"

"آپ اس سے آگے کی بات بھی سوچیں۔"

"آگے کی بات کا میں ذمہ نہ لے سکوں گا۔ کل ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"مگر آپ سے تو رات میں نے ساری بات کہہ دی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ دیکھیں نا اتنے پیسوں میں تو یہ کام نہ ہو سکے گا۔"

"تو یہ رقم کی بات ہے۔ بتائیں کتنی رقم چاہیے آپ کو؟"

"کم از کم چار لاکھ اور اتنی ہی رقم اکاؤنٹنٹ اور دو سپاہیوں کو دینی ہوگی۔"

"میں سمجھا نہیں ہوں حاجی صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں شیخ صاحب؟" میں نے مداخلت کرتے ہوئے گل زری سے کہا۔

"بات یہ ہے آشتی صاحب! مگر کیا آپ نے ان لوگوں سے بات کر لی ہے؟" وہ پھر شیخ صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ میں کر لوں گا۔ اس کی فکر نہ کریں۔"

"کچھ مجھے بھی بتائیں جناب! کہ یہ قصہ کیا ہے؟" میں نے مزید جھجکتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"کیا آپ آٹھ لاکھ کا بندوبست کر سکتے ہیں؟" گل زری نے میرے قریب ہو کر کہا۔

"یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔ ہم رقم آپ کو دے دیں گے شیخ صاحب!" وہ بولا۔

"کب؟"

"آدمی رہا ہو جائیں تو اس کے بعد۔"

"جی نہیں! رقم آپ کو پہلے دینی ہوگی۔"

"طریقہ کیا ہوگا؟"

"طریقہ وہ خود سوچ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے شیخ صاحب! ہمیں منظور ہے۔"

"ابھی تو آپ نے صرف چھ ہزار ہی دیا ہے۔ وہ میں نے ان میں تقسیم کر دیا ہے آپ یہ رقم کب دے دیں گے؟"

"میں کل یہ کام کر سکوں گا مگر مجھے بتائیں تو سہی کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟" میں نے ان کی باتوں سے الجھتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے علی آشتی صاحب کہ۔۔۔" وہ سرگوشی کے لہجے میں بات کرنے لگا۔ بولا "ہم آپ کے آدمیوں کو رہا کروا دیں گے۔ آپ کل رقم کا بندوبست کر لیں۔"

"یعنی آسیہ اور آپی دونوں رہا ہو جائیں گے؟"

"ہاں! میں کوئی ترکی تو نہیں بول رہا ہوں۔" اس نے اور زیادہ سرگوشی میں کہا۔

"مگر میں کیسے یقین کر لوں حاجی صاحب!" میرے وجود میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ جیل میں گویا سیندھ بھی لگ سکتی تھی اور میں نے اکبر قریشی کو خواہ مخواہ ہی مار دیا تھا۔ کتنا پارسا بنتا تھا وہ، اپنے اصولوں پر قربان ہو گیا اور ادھر اس کے چھوٹے چھوٹے کارندے بیٹھے بٹھائے لاکھوں کا دھندا کر لیتے تھے۔ کرنا کیا تھا، آدمی کو ادھر سے ادھر پہنچا دینا تھا اور بس۔ کیا۔۔۔ کیا یہ شیخ عبدالرحمن کوئی بہت بڑا بہروپیا تو نہیں ہے؟ اس کی اصلیت یہ نہیں تھی۔ میری حیرت کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وہ بات جسے میں ناممکن سمجھ رہا تھا، وہ ممکن ہو گئی تھی۔

گل زری میری اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا، اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش کرا دیا اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ وہ دونوں آدمی سامنے رکھے رجسٹروں کی ورق گردانی کرنے لگے۔

ماں جی مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ کیا یہ اس تسبیح کا کرشمہ تھا کہ میرا کام بن رہا تھا۔

"میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا، فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے بریف کیس میں سے نکال کر ایک کیمرا مجھے دے دیا اور بولا۔ "آپ اُن دونوں کی تصویریں اتار لیں، فاصلے سے بھی اور قریب سے بھی۔ میرا خیال ہے شیخ صاحب کہ آپ ہمیں دو تین دن تو ضرور ہی دیں گے۔"

"میں نے آپ کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ کل تک یہ کام ختم ہو جانا چاہیے ورنہ پھر ہم کبھی کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

"کوشش تو ہم کریں گے، بہرحال آپ دو چار دن تک اُن کا آڈٹ کرتے رہیں۔"

"بڑی مصیبت ہے بھئی! کچھ بھی گھپلا ہو سکتا ہے۔ خیر میں دو دن اور بڑھا لوں گا۔"

اتنے میں نمبردار چائے لے کر آ گیا اور پیالیاں ہمارے سامنے رکھ کر وہ بسکٹ کی پلیٹ بھی چاروں طرف گھمانے لگا۔

"اب تم جاؤ بھئی! کوئی ضرورت ہوئی تو میں تمھیں گھنٹی دے کر بلا لوں گا۔"

نمبردار فوراً ہی باہر نکل گیا۔ حفظِ ماتقدم کے لیے دروازہ ہم نے کھلا ہی رکھا تھا تاکہ کوئی ہماری باتیں نہ سنے۔ کمرہ ایسے حصے میں بنا تھا جہاں سے ہم کھڑکی میں سے جیل کا لان اور دوسرے حصے بڑی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

کوئی بیس منٹ بعد اکاؤنٹنٹ اکرم بھٹی صاحب واپس آ گئے اور سرگوشی میں بولے۔ "اب آپ پچھلے کمرے میں چلے جائیں مگر یاد رکھیں، آپ کی آواز باہر نہیں آنی چاہیے۔ آپ اور ماں جی ہی جائیں گے نا؟"

"ہاں۔ آئیں ماں جی!" میں کیمرا کندھے پر لٹکا کر ماں جی کے ساتھ عقبی کمرے کی طرف بڑھا اور اس طرف رکھی کرسیاں سرکا کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ ماں جی میرے ساتھ ہی تھیں۔ وہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ ہم دونوں وہاں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے کا دروازہ بند تھا مگر اس کے اندر کی کُنڈیاں کھلی ہوئی تھیں۔

"کہاں ہیں وہ؟" ماں جی نے کمرے کو خالی دیکھ کر کہا۔

"وہ آ رہے ہوں گے۔ اپنا دل مضبوط رکھیں ماں جی! آپ کی آواز اونچی نہیں ہونی چاہیے۔ آسیہ کو رُلانے کی کوشش نہ کریں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں بیٹے! میں محتاط رہوں گی۔"

کوئی پانچ ہی منٹ بعد سامنے کا دروازہ بے آواز کھلا اور سب سے پہلے اس میں مجھے آبی کی صورت نظر آئی۔ وہ بہت مرجھایا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ سالوں سے بیمار ہے۔ اُس کی وہ تازگی، وہ شوخی، وہ خود نمائی ساری کی ساری ختم ہو چکی تھی۔ لباس اس کا میلا ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو اس کے چہرے پر ایسا تحیر ابھرا کہ میں سمجھا وہ کوئی عجوبہ چیز دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے بتایا نہیں گیا تھا کہ انھیں کس لیے وہاں بلوایا گیا ہے۔ رنگ ہلدی ہو رہا تھا مگر مجھے دیکھتے ہی اس کی تمام حسیات جاگ اٹھیں اور وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

"اوئے یار جانی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! میری آنکھیں... یہ تُو ہی ہے جیلانی؟" وہ باہیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"یہ میں ہی ہوں بیٹے! یہ کیا حال ہو گیا ہے تیرا؟"

"میں... میں سمجھا وہ مجھے پھر پولیس کے حوالے کر رہے ہیں بابا لوگ۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک آیا ہوں جیلانی۔ مجھے... نے بتایا تھا کہ تو نے ہمیں یہاں آتے دیکھ لیا تھا پر میں سوچتا تھا یہ اس کا وہم ہے، تُو بھلا کیسے یہاں آ سکتا تھا۔" وہ بلکنے لگا۔ اس کی گرفت میرے جسم پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی جیسے اسے اپنا کوئی کھویا ہوا حصہ دوبارہ مل گیا ہو۔ "یہ تُو ہی ہے جیلانی؟"

"ہاں! یہ میں ہی ہوں بھائی! تُو فکر نہ کر۔ میں آ گیا ہوں، کوئی تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ تُو بے فکر ہو جا۔" مگر عین اسی وقت دروازے میں آسیہ نمودار ہوئی۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور ماں جی کی نظر دروازے پر ہی لگی تھی۔ وہ جیسے ہی آگے آئی، ماں جی نے اسے بڑھ کے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُن دونوں کی چیخیں نکل گئیں مگر انھیں شاید احساس تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ بلکل میں چوری چوری رو رہی تھیں۔ ان کے منہ سے لفظ نہیں نکلتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے آسیہ نے صرف اتنی بات کی۔

"ماں جی! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آپ کو دیکھ رہی ہوں پر میں جیل میں ہوں ماں جی! میری بدنصیبی پھر مجھے یہاں لے آئی۔" ماں جی نے اسے آگے لا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ بولیں۔ "نہ کر بیٹی! تیرا بھائی ابھی زندہ ہے، ابھی میں زندہ ہوں۔ اب وہ تجھے یوں نہیں مرنے دیں گے۔" وہ پھر اس کے گلے لگ گئیں۔ آبی نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے اور وہ مجھے یوں تکنے لگا تھا جیسے خود کو یقین دلا رہا ہو کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔

"میں نے سنا تھا تُو پاگل ہو گیا ہے؟"

"ڈراما تو میں نے کیا تھا پر وہ ملنے ہی نہیں دیا۔ بہت انھوں نے مجھے جلادوں نے ذرا خیال نہیں کیا کہ میں اُن کے آدمی ہوں، اُن کی نوکری کا ذریعہ ہوں۔ اگر ہم نہ ہوں تو پھر کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟" وہ میری جیب میں سگریٹ تھا، خود ہی پیکٹ نکالنے لگا۔ پتا نہیں کب سے اُس نے سگریٹ نہیں پیا تھا۔

"چھوڑ دے بابا! خدا اس مصیبت میں دشمن کو بھی نہ پھنسائے۔" اس کے دانت میلے ہو رہے تھے، منہ سے بدبو آ رہی تھی، بال بھی اس کے بہت الجھے ہوئے تھے۔ حال اس کا بہت ہی پتلا ہو رہا تھا، البتہ آسیہ مجھے بہتر نظر آتی تھی۔ وہ ماں جی سے ابھی تک لپٹی ہوئی تھی اور وہ دونوں دُکھ سُکھ رونے میں مصروف تھیں۔

"مجھے معلوم ہے آبی! پر فکر نہ کر، میں تجھے جلد ہی یہاں سے نکال لوں گا۔ لگتا ہے تجھے کھانے کو بھی یہاں کچھ نہیں ملتا۔"

"کچھ نہ پوچھ جیلانی! بڑے بڑوں کی مونچھیں اکھاڑ دی ہیں ان لوگوں نے۔ بڑے بڑے پھنے خان جھک کر چلتے ہیں یہاں۔ کھانے کا تو ذکر ہی نہ کر۔ اسی لیے تو میں اس عذاب میں پھنسا تھا۔ پر تُو یہاں آیا کس لیے ہے ـــــ اِدھر تو صرف جالی میں سے بات ہو سکتی ہے۔" اُس کا رنگ اب نکھرنے لگا تھا جیسے زندگی بھر اس کا اعتماد بحال ہو گیا ہو۔

"دیکھ میں تم دونوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں جو بھی پیغام ملے اس پر عمل کرنا، سمجھے۔ شاید وہ گھڑی کل ہی آ جائے۔ کسی بھی وقت معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں تیرے لیے ساری چیزیں لے آتا مگر خیر کل تک گزارا کر۔"

"میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا جیلانی!"

"نہیں ایسا نہیں سوچتے۔ ٹھہر میں آسیہ سے تو بات کر لوں۔" یہ کہہ کر میں اُس کی طرف بڑھا تو تب اُسے یاد آیا کہ میں بھی وہاں پر موجود ہوں، ورنہ وہ ماں جی کے سینے سے ایسی لگی تھی کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بلکتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

"میں نے آپ کو بہت دُکھ دیے ہیں ویر جی! میری وجہ سے کوئی گھڑی آپ کی چین سے نہیں گزری۔ مجھے مُعاف کر دیں، میں بڑی

بدنصیب ہوں پر خوش قسمت بھی ہوں کہ مجھے آپ جیسا بھائی ملا ہے۔"

"ایسا نہیں سوچتے۔ تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے آسیہ۔ میں نے اُس روز تمھیں آواز بھی دی تھی مگر وہ تمھیں دھکیل کر لے گئے۔ میں جب سے پریشان ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اللہ نے میری کتنی جلدی سن لی۔ میرا خیال ہے میں کل تک تمھیں یہاں سے نکال لوں گا فکر نہ کرنا، سارا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔"

"واقعی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو مجھ پر بڑے سنگین الزام لگا رہے ہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ ابھی تم اِدھر ہی رہو، زندگی کی سرحد سے اِدھر۔ اور یہی بہت کافی ہے۔ یہ بے بس ہو جائیں گے البتہ تم اگر دوبارہ اس راستے پر چلیں تو پھر شاید ہم کچھ نہ کر سکیں۔"

"میری توبہ بھائی جان! اگر میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی تو اس حال کو نہ جا پہنچتی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ حالات ایسے ہو جائیں گے"

"مگر ہوا کیا تھا وہاں؟ کیوں آبی! تم گرفتار کیسے ہو گئے؟"

ابھی وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ دروازہ کھلا اور بھٹی صاحب اندر آ گئے، بولے "میرا خیال ہے اب آپ ان کو جانے دیں۔ وقت بہت کم ہے۔"

میں نے آسیہ اور آبی کو دیکھا، دونوں کے رنگ فق ہو گئے تھے۔ انھیں امید نہیں تھی کہ ہماری ملاقات اتنی مختصر ہو جائے گی۔

"ٹھیک ہے بھٹی صاحب! یہی بہت کافی ہے۔ ہم ان سے مل تو لیے۔" میں نے اپنے پسینے پر کُرتے ہوئے کہا۔ ہم اس ملاقات کو طول نہیں دے سکتے تھے۔ سب کچھ اُنھی لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہی بہت تھا کہ ہم وہاں جا پہنچے تھے۔ اُن سے مل لیے تھے۔ اُن کے دکھ میں شریک ہوئے تھے۔ ورنہ تو ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں تھا اور اس کام کا سہرا تو گل زری کے سر تھا۔ وہی اس کا انتظام کر سکا تھا مگر... مگر ابھی تک میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ میرے دکھ کے لیے اتنی زیادہ ہمدردی کیوں کرتا تھا اور اس نے جیل تک کیسے رسائی حاصل کر لی تھی۔ کیا وہ ساری رات یہی کچھ کرتا رہا ہے۔ میرے لیے ہی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اگر یہی بات تھی تو مجھے اس کے مقاصد کا علم ہونا چاہیے۔ وہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں لاچار ہو کر کرسی سے اُٹھ گیا۔ وہ دونوں اسیر بھی نوشتۂ دیوار کو پڑھ چکے تھے۔ آسیہ نے ایک بار پھر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "وہ... وہ مجھے مار دیں گے ماں جی! مجھ پر وہ کسی کے قتل کا الزام دیتے ہیں۔ وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"کچھ نہیں ہو گا بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھ۔ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا نہیں ہل سکتا۔ میں تیرے لیے دُعا کروں گی۔ تجھے کچھ نہیں ہو گا۔" مگر اُن کی آواز کی لرزش یہ بتا رہی تھی کہ اُسے خود اپنی بات پر اعتبار نہیں تھا۔

آبی کا حال اور بھی ابتر تھا۔ وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر تک رہا تھا۔ بولا "مجھے معاف کر دینا سردار صاب! کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ واپسی کے شاید سارے ہی راستے بند ہو چکے ہیں۔"

"اوئے بک نئیں اوئے تو، مایوس نہیں ہوتے۔ یہ گناہ ہے۔ کل تک کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ بے فکر رہ! اور یہ لے، یہ کچھ روپے رکھ لے۔ یہاں بلیک میں ہر شے مل جاتی ہے۔" میں نے ہزار روپے اس کے ہاتھ میں دے دیے۔

وہ اُس نے فوراً ہی نیفے میں اڑس لیے۔ بولا "یہ چوہڑے فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ کس مرغے میں کتنا گوشت ہے۔ بہرحال خدا تمھاری مہربانیاں مجھے یاد رہیں گی۔" وہ بہت آزردہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایسا تو اُسے عمر بھر نہیں دیکھا تھا اور وہ میرا جگری یار تھا۔ بھلا دینا کسی بھی طرح میرے بس میں نہیں تھا۔ سچ کہوں تو اب بار میں آبی کے لیے زیادہ پریشان تھا کہ وہ حادثہ، وہ المیہ جس کا نزول مجھ پر ہونا چاہیے تھا، اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ ہم دونوں کی وجہ سے خواہ مخواہ ہی مارا گیا تھا۔ ورنہ اس کا قصور تو کوئی بھی نہ تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد تو اس نے سب کچھ میری ہی رضا جوئی کے لیے کیا تھا۔ اپنے ماضی کو تو وہ سرتاسر بھلا چکا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے ماں بھی یاد نہیں رہی تھی۔ جو ابھی تک اپنی دہلیز پر کھڑی اس کا انتظار کرتی ہو گی۔

بھٹی ذرا دیر کے لیے پیچھے ہٹا تو میں نے اُن دونوں کی چار تصویریں لے لیں۔ قریب کی بھی اور دور کی بھی مگر ان کا فائدہ گل زری کو معلوم تھا۔

انھیں وہاں سے بادلِ ناخواستہ سیڑھیوں میں اُتار کر ہم کمرے میں آ گئے۔ شیخ صاحب نے اب باقاعدہ رجسٹر کھول لیے تھے۔ یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ بہت زیادہ مصروف ہو گئے ہوں۔ بھٹی صاحب نے ہمیں دوسرے راستے سے گزار کر گیٹ تک پہنچایا اور ہم تینوں وہاں سے نکل کر پھر گاڑی تک جا پہنچے۔ ایک مرحلہ، بہت ہی سنگین مرحلہ طے ہو گیا تھا اور میرا اعتماد کچھ بحال ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار میں پھر اُن کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

جب ہم دوبارہ ہوٹل پہنچے تو ماں جی نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گئیں۔ وہ بہت زیادہ تھک گئی تھیں اور اتنے زیادہ آنسو وہاں بہا چکی تھیں کہ اب اُن کی آنکھوں میں پانی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ لیٹ گئیں تو ہم دروازہ بند کر کے باہر برآمدے میں جا بیٹھے۔ وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ دوپہر میں زیادہ شوریدہ سر ہو گئی تھی۔ دنوں کا کچھ حساب ہی نہیں رہ گیا تھا مجھے۔ بس وہ آتے تھے، ٹکیوں پہ میرا سر دیکھتے تھے اور قریب سے گزر جاتے تھے۔ کسی کسی روز وہ مجھے بھی اپنے ساتھ اُٹھا لیتے تھے مگر اپنا کوئی نشان وہ میرے پاس نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ بڑے ہی بے رنگ و نور دن تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اُن میں رنگ کیسے بھروں کس کو اس آئینہ خانے میں لا کر رکھ دوں کہ دن زیادہ بہتر طریقے سے گزر سکیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ابتلا میرے تعاقب میں رہتی تھی۔ کتنے ہی سجیلے موسم اسی طرح گزر گئے تھے کہ نہ مجھے اپنا ہوش تھا نہ کسی کو میرے بارے میں کوئی پریشانی تھی۔ گل زری نے مجھے یوں گہری سوچ میں دیکھا تو بولا "یہ عبائیں اب اُتار دینی چاہئیں۔ میرا خیال ہے، یہ ہمارے بدن پر اچھی لگتی تھیں۔"

"دفع کر یار۔ یہ سب ظاہری باتیں ہیں جو دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے کی جاتی ہیں۔ مجھے تو اپنے اندر کی بات بتا اور یہ بتا کہ کل کیا ہو گا؟"

"ہاں! مجھے یاد آیا، وہ تصویریں لے لی تھیں نا تم نے؟"

"ہاں۔ وہ میں نے بنائی تھیں۔ اب کیا کرو گے تم ان کا؟"

"یہ کیمرا مجھے دے دو اور ہاں ہمیں اب ایک ایسے آدمی اور ایک عورت کی ضرورت ہے جو آسیہ اور آبی سے قد کے لحاظ سے پوری مشابہت رکھتے ہوں۔"

"کیا مطلب! وہ کیا کریں گے؟ انھیں کس نسخے میں ڈالو گے بھئی؟"

"بات یہ ہے آشتی صاحب کہ ہم بندے کے بدلے بندہ انھیں دے دیں گے۔ ایسے بہت سے مل جاتے ہیں۔ تم نہ لا سکو تو میں تلاش کر لوں گا۔ ہم آسیہ اور آبی کو جب ہی وہاں سے نکال سکتے ہیں جب اُن کی گنتی پوری کر دیں۔ اس کے لیے ہم ان دونوں کا حلیہ آسیہ اور آبی جیسا بنا دیں گے۔ وہ اُن کی جگہ جیل میں رہیں گے اور پھر اپنا حلیہ اصلی حالت میں لے آئیں گے۔ بھٹی صاحب اُن کو ملاقاتیوں میں شامل کروا کر باہر نکال دیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہ ہو گا۔ اس کے لیے ہمیں اُن دو آدمیوں کو پانچ دس ہزار دینے ہوں گے۔ وہ ہم دے لیں گے۔"

"کمال کرتے ہو یار جی! یہ خوب تدبیر سوچی ہے تم نے مگر تم یہ دھندا کب سے کر رہے ہو؟"

"مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ بس ایسے ہی یاد آ گیا مجھے وہ شیخ عبدالرحمٰن۔ وہ بہت بڑا جعلساز ہے۔ آڈٹ افسر ہرگز نہیں ہے مگر بن بیٹھا ہے وہ۔ کسی اپنے ہی کام سے وہاں جا بیٹھا ہے۔ پہلے اس نے انھیں یہ اطلاع دی سرکاری دفتر کی مہر کے ساتھ کہ وہ آڈٹ کے لیے آ رہا ہے اور اس کے ساتھ تین آدمی اور ہوں گے۔ جب وہ اطلاع انھیں مل گئی تو انھوں نے اس کے لیے کمرہ الگ کر دیا۔ اکاؤنٹنٹ سے کہہ دیا کہ وہ حساب کتاب تیار رکھے۔ وہ جو بھٹی صاحب ہے نا، وہ دراصل اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ پتا نہیں وہ اور کس قسم کی وارداتیں کرتے رہتے ہیں۔ دونوں نے بڑی جائدادیں بنائی ہیں۔ ویسے وہ شیخ عبدالرحمٰن کوئی کام نہیں کرتا ہے پھر بھی بڑے ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ وہ برسوں سے اس جیل کا آڈٹ کر رہا ہے۔ رات مجھے یاد آیا تو میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ یہ ساری تدبیر اُس کی ہے مگر رقم وہ بہت زیادہ مانگ رہا ہے۔"

"نہیں، یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے گل زری! وہ دو زندگیاں بچا رہا ہے۔"

"خیر تم دے سکتے ہو تو ضرور دو۔ ویسے بھی میں اُن سے کسی رعایت کے لیے نہ کہتا۔ اب مجھے اپنے آدمی کے لیے اُن سے ملنا پڑے گا۔ وہ سات سال کی سزا بھگت رہا ہے۔"

"مگر یہ بتاؤ کہ تم وہ دو آدمی کہاں سے لاؤ گے؟ کوئی بازار میں تو نہیں بکتے ہیں ایسے لوگ۔"

"اُن کا بندوبست میں کر لوں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کسی کو بھی دس بیس ہزار روپے دے کر اس کام پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ میں کوئی فالتو قسم کی عورت ڈھونڈ لوں گا۔ کرنا ہی کیا ہے آخر کسی چہرے کو آسیہ کے چہرے کے مطابق بنانا ہے، کوئی بھی میک اپ کا ماہر یہ کام کر سکتا ہے۔ مرد بھی کوئی مل جائے گا۔"

"تو پھر یہ کام ضرور کرو۔ کتنے پیسوں کی ضرورت ہو گی تمھیں؟"

"میرا خیال ہے تم اگر کر سکو تو پچاس ہزار کا انتظام کر دو۔ کل میں نے شیخ صاحب کو چھ ہزار روپے دیے تھے، وہ میرے پاس موجود تھے مگر اب نہیں ہیں۔ جیب خالی ہو گئی ہے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمھیں رقم دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے سوٹ کیس میں سے نکال کر اُسے پچاس ہزار روپے دے دیے۔

وہ مطمئن ہو گیا، بولا "اب میں چلتا ہوں۔ شام کو تم سے ملاقات ہو گی۔ میں دو آدمی ڈھونڈتا ہوں۔ پہلے مجھے یہ تصویریں دُھلوانی ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھائی! تیرا علم تو ہی بہتر جانتا ہے، مجھے تو تم نے حیران کر دیا ہے۔"

"ابھی کہاں آشتی صاحب! ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ ابھی تو بڑے مرحلے باقی ہیں زندگی کے۔ آدمی کو پتا نہیں کیا کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مصافحہ کر کے نیچے اُتر گیا۔

وہ اب بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ ایسا اجنبی جس کے بارے میں مجھے قطعاً کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک گولی کی دشمنی میرے اور اُس کے درمیان ابھی تک موجود تھی۔ پتا نہیں وہ میں اس پر دانستہ یا وہ مجھ پر چلاتا۔ کچھ نہ کچھ ہونا ضرور تھا مگر ابھی تک وہ موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کا خلوص دیکھ کر میں ہاتھ روک لیتا تھا مگر جو کہانی اُس نے مجھے سنائی، وہ بار بار مجھے طیش دلاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں کن مراحل سے گزر رہا ہوں۔ وہ سب کچھ اُس کے علم میں تھا۔ اُس نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ آبی اور آسیہ جیل

کیسے جا پہنچے۔ وہ رات بھر اس سلسلے میں شاید جاگتا رہا تھا۔ اس نے شیخ عبدالرحمٰن کو جا پکڑا تھا۔ اس سے سودا بھی کرلیا تھا۔ اُن کی رہائی کے لیے جو کچھ بھی ضروری تھا، وہ فراہم کررہا تھا۔ اس نے کہا تھا عورت بھی مل سکتی ہے اور مرد بھی مگر مجھے یہ حیرت ہورہی تھی کہ اس سے آگے وہ کیا کرے گا۔ اُن دونوں کو وہ آسیہ اور آبی کے بدلے میں کیسے بھیج دے گا اور وہ دونوں بدنصیب وہاں سے کیسے باہر آسکیں گے؟ یہ سارا سلسلہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ چار بجے جب ہم اُٹھے تو معلوم ہوا کہ ساتھ والا کمرہ خالی ہوچکا تھا۔ وہ میں نے اپنے لیے رکھ لیا اور کرایہ میں نے پیشگی ادا کردیا۔ مجھے دراصل اس سارے سلسلے کے لیے ایک الگ کمرے کی شدید ضرورت تھی۔ ماں جی کے سامنے میں گل زری سے کوئی بھی بات نہیں کرسکتا تھا اور یہ دیکھ کر میں سٹپٹا اٹھتا تھا کہ ماں جی ہماری تمام باتیں سن لیتی تھیں بعد میں وہ ایسے ایسے سوال پوچھتی تھیں جیسے وہ سارے مشورے ہم اُن کے سامنے کرتے رہے ہوں۔ یہ اُن کی ذہنی توانائی کی ایک ادنیٰ سی جھلک تھی۔ وہ اپنے گردو پیش کو بہت گہری نظر سے دیکھتی تھیں۔

کمرہ مجھے مل گیا تو میں اپنا تسکاری تھیلا اور سوٹ کیس لے کر اُس میں منتقل ہوگیا۔ ماں جی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔ اُن کی عبادت میں فرق آرہا تھا۔ گل زری کوئی پانچ بجے میرے پاس پہنچا۔ ایک عورت اور ایک مرد بھی اس کے ساتھ تھے۔ عورت کا قد کاٹھ ہُو بہُو آسیہ ایسا تھا۔ گل زری نے بہت سوچ سمجھ کر انھیں اپنے منصوبے میں شامل کیا ہوگا۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو وہ بولا "لے بھائی! میں انھیں ساتھ لے آیا ہوں اور یہ ہمارے ساتھ مکمل تعاون کے لیے تیار ہیں۔ اس خاتون کا نام شمشاد ہے اور بھائی صاحب کا نام خورشید ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمھیں یہ مل گئے ہیں۔ ویسے ان کی فیس کیا ہوگی؟"

"دیکھ، یہ شخص بہروپیا ہے۔ کام ہی یہی کرتا ہے۔ اس سے میں نے دس ہزار کا وعدہ کیا ہے۔ وہ میں اسے پہلے دے دوں گا۔ خاتون کو بھی ہم دس ہزار دے دیں گے۔ سارا سلسلہ یہ خود ہی کرلیں گے۔ تصویریں میں نے انھیں دے دی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی! مگر ان کو معلوم بھی ہے کہ انھیں کرنا کیا ہے؟" شمشاد نے پہلی بار مجھے بڑی بھرپور نظر سے دیکھا۔ اس کی عمر بھی کوئی پچیس سال ہوگی۔ اس کا رنگ حیرت انگیز حد تک آسیہ سے ملتا تھا۔ گل زری کا انتخاب بہت ہی صحیح تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی لے آئے تھے۔ شاید اس میں انھوں نے سامان رکھا تھا جو کسی میک اپ والے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

"تم ان سے خود ہی پوچھ لو۔" گل زری سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ ہم آپ کو کس نسخے میں استعمال کررہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ گل زری صاحب نے بتایا ہے مجھے مگر مجھے ڈر ہے پھر ہمارا کوئی والی وارث نہیں بنے گا۔" خورشید نے کہا۔ وہ خاصا ۔۔۔ تھا اور میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ آبی کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔

"یہی سوال تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ فرض کرتے ہیں کہ ہم ۔۔۔ کو آسیہ اور آبی کی صورت میں جیل پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوگا، آپ کیسے باہر آسکیں گے؟"

"صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ ہم انھیں یہ کہہ دیں کہ کسی نے بے ہوش کرکے جیل بھیج دیا ہے اور اس میں ہمارا کوئی ۔۔۔ نہیں ہے۔"

"بات اتنی آسان نہ ہوگی۔ تم آپس میں رشتے دار ہو؟"

"جی ہاں، ہم میاں بیوی ہیں۔"

"ہوں۔ مگر اُن سے بچ جانا آسان نہ ہوگا۔ وہ تمھاری بات کا کیسے یقین کریں گے اور روپے تم نے صرف دس ہزار مانگے ہیں۔ اتنے بڑے کام کی یہ فیس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"گل زری صاحب رعایت کا کہہ رہے تھے۔"

"تم کچھ اور بڑھا سکتے ہو۔ میرا کیا ہے جو مناسب سمجھتے ہو۔" گل زری نے لقمہ دیا۔

"دیکھو، میں تمھیں اس کام کے ایک لاکھ روپے دوں گا۔ بس میں نہیں معلوم کہ وہاں تم پر کیا بیتے گی۔ وہ سختی کے دن تمھیں خود ہی ۔۔۔ ہوں گے۔ یہ روپیہ تم بینک میں رکھ سکتے ہو۔ بعد میں کام آئے گا۔ وہ یہ بتاؤ گل زری کہ انھیں تم جیل کیسے پہنچاؤ گے؟"

"شمشاد برقع پہن کر ہمارے ساتھ وہاں جائے گی۔ چہرہ وہ پہلے سے آسیہ ایسا بنائے گی۔ خورشید بھی یہی کرے گا۔ جب ہم ۔۔۔ کے ساتھ وہاں جائیں گے تو ان کے بدلے ہم بڑی آسانی سے ۔۔۔ اور آبی کو لے کر باہر آجائیں گے۔"

"پاگل پنے کی بات نہ کرو۔ وہ کیسے اُن کو باہر آنے دیں۔"

"اس کا حل یہ ہوگا کہ وہ دونوں اپنا حلیہ ان کی اُس صورت ۔۔۔ ایسا بنالیں گے جس میں یہ ہمارے ساتھ جیل جائیں گے۔"

"ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے ۔۔۔ یہ ساتھ لے کر جائیں گے جو اُن کی صورت سے ملتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ اس کا بندوبست ہم کرلیں گے۔" خورشید نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ یہ تمھارا علم ہے۔ اس جنتر منتر کو تم ۔۔۔ سکتے ہو۔ ذرا تم ہمیں اپنی صورت بدل کر دکھاؤ۔"

"بہت بہتر۔ آپ ذرا باہر چلے جائیں۔ تاکہ ہم آرام سے یہ کام کرسکیں۔" خورشید نے اپنا سوٹ کیس سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر ماں جی کے کمرے میں چلے گئے۔ چھ بج رہے تھے۔ ہم نے چائے منگوالی اور گپ شپ میں لگ گئے۔ اچانک ماں جی کو کوئی بات یاد آگئی۔ بولیں "تمھیں معلوم ہے، تمھارے تایا جی اور اختر کو کسی نے قتل کردیا تھا۔ تمھارے ماموں راشد نے مجھے بتایا تھا، وہ عبدالغنی کے گھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمھاری تائی بہت خوشحال ہوگئی ہے۔"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے ماں جی! اُن کے دن پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا مکان بھی بنوا لیا ہے مگر اس وقت جب عبدالغنی اور اختر ختم ہوچکے تھے۔"

"اپنی اپنی قسمت ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انھیں اتنا سارا روپیہ کس نے دے دیا۔ اختر کی پنشن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ملازمت تو کچھ بھی نہیں تھی۔"

"ہاں! وہ تو ابھی بالکل ہی نیا نیا تھا۔ خدا جانے انھیں وہ رقم کس نے دے دی۔ پر لعنت بھیجیں اُن پر، ہمیں کیا لینا دینا ہے ان سے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے، ہماری مصیبتوں کی اصل وجہ تو وہی لوگ تھے۔ خدا نے بہت انصاف کیا ہے۔"

"کوئی جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔"

"پر سوال یہ ہے بیٹے کہ آخر انھیں کس نے مار دیا؟ سنا ہے وہ بس میں قتل ہوگئے تھے۔"

"مار دیا ہوگا کسی نے۔ تھوڑے ڈاکے پڑتے ہیں آج کل۔ سنا ہے وہ کوئی ڈاکو ہی تھے۔"

"مگر جو خبر مجھے ملی ہے اس کی تم تصدیق نہیں کررہے ہو۔ کیا واقعی وہ ڈاکو تھے یا کوئی اور؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاکو نہیں تھے۔ کوئی پرانی دشمنی ہم پر کام کرگئی ہوگی۔"

"ہوسکتا ہے یہی بات ہو۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"میں اس لیے پوچھ رہی ہوں بیٹے کہ اس سلسلے میں کچھ لوگ تمھارا نام لے رہے ہیں۔ تمھارے ماموں ارشد کا خیال ہے کہ اُس روز اچک سوالن گئے تھے اور یہ بے کبھی سچ۔ مگر میں نے بہت لتاڑا تھا اسے۔ اُس کے بعد تو اُس نے کوئی بات نہیں کی مگر اس کی سوچ یہی تھی۔"

"مار کھائے گا وہ مجھ سے خواہ مخواہ۔ ابھی تو وہ بچ کر چلا گیا ہے ماں، مگر پھر کبھی اُس نے یہ بات کہی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ رشتے داریاں میں سب تہ کرکے رکھ دوں گا۔ اُسے بتا دیں آپ۔ میں برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ میرے خلاف ایسی باتیں کرتا پھرے۔ ماں! سب کو تہ تیغ کردوں گا۔" گل زری یہ تمام باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا مگر بولا وہ کچھ نہیں۔ ماں جی نے بڑی زیادتی کی تھی کہ اس کے سامنے ہی انھوں نے وہ بات چھیڑ دی۔ انھیں کیا پتا کہ گل زری سے میرے تعلقات کس قسم کے ہیں۔ میں اُس پر کسی طرح بھی اعتبار نہیں کرسکتا تھا اگرچہ وہ میرے بہت کام آرہا تھا۔ دامے، درمے، سخنے وہ میری مدد کررہا تھا مگر خدا جانے اس کے مقاصد کیا تھے اور وہ کیا چاہتا تھا۔ اب تک تو اس کی مہربانیاں مجھے پاگل کیے ہوئے تھیں۔

کوئی بیس منٹ بعد خورشید نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ ہم دونوں اُٹھ کر اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں گئے تو اُن دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے چہروں پر ایسا غلاف چڑھا لیا تھا کہ خورشید ہُو بہُو آبی اور شمشاد آسیہ دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے واقعی اپنے چہرے بدل لیے تھے اور اس طرح بدلے تھے کہ اُنھیں پہچاننا ناممکن ہوگیا تھا۔ آسیہ اور آبی کی تصویریں سامنے رکھی تھیں۔

"کیوں گل زری صاحب! کیا خیال ہے؟"

"مجھے حیرت ہے بھئی! بہت حیرت ہے۔ کیوں بھائی! دیکھا تم نے ان کا کمال۔ میرا انتخاب درست تھا نا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو گل زری! میرا خیال ہے اب یہ کام ہوسکتا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ آج رات تم دونوں اِدھر ہی رہو۔ میں صبح آٹھ بجے یہاں پہنچ جاؤں گا مگر کل تم اور ماں جی ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔"

"کیوں! مجھے کیوں نہیں لے جاؤ گے؟"

علمِ رُوحیت پر ایک بے حد کارآمد کتاب

ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی

اپنا پیغام دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے اور اُن کے دلوں کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ

قیمت ۱۲/- روپے

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تم اگر جانا چاہو تو صرف کچہری تک جاسکو گے، اس سے آگے نہیں۔"

"جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔ میں بہرحال صبح تیار رہوں گا۔"

"یہ لو بھائی! یہ پچاس ہزار روپے ہیں۔ جو تم نے مجھے دیے تھے یہ میں اِن کو دے رہا ہوں۔ دے دوں؟"

"ہاں ہاں، کوئی ہرج نہیں ہے۔"

"مگر تم وہ رقم کب دے سکو گے؟"

"اس کا انتظام میں صبح کردوں گا۔ بینک نو بجے کھل جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ نو بجے ہم سیدھے بینک جائیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ کمرہ ان کے لیے چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے میں دوسرے کمرے میں سو جاتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد گل زری وہاں سے نکل گیا۔ میں نے چاہا کہ میں اس کا تعاقب کرکے دیکھوں کہ وہ جاتا کہاں ہے مگر پھر میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ مجھے اس کے عیب و ہنر سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس کا خلوص ہی میرے لیے بہت کافی تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ میری مدد کے سوا اور کوئی مقصد اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ مجھ پر احسان کرنا چاہتا تھا اور میں ممنون ہونے کے لیے بے تاب تھا کہ میری بہن ایسے حصار میں جا پھنسی تھی کہ میں تنہا اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کسی نہ کسی کی مدد کی ضرورت تھی اور گل زری میرے کام آ رہا تھا مگر وہ گھڑی دو گھڑی کا اطمینان ہوتا تھا جو ذرا دیر کے لیے میرے سامنے بے کراں ہو کر سمٹنے لگتا تھا۔ پھر مجھے وہ شخص انتہائی عیار اور مکار دکھائی دینے لگتا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ جب اس نے کہا کہ میں کل اس کے ساتھ جیل نہیں جاؤں گا تو میرا معز آلٹنے لگا تھا مگر پھر بھی میں چُپ ہی رہا۔ ابھی اس کو للکارنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ بہرحال میں نے طے کر رکھا تھا کہ میں اس کے ساتھ جیل ضرور جاؤں گا۔ اب تو یہ بات اور بھی ضروری ہو گئی تھی۔ کیونکہ آسیہ کی رہائی کا وقت قریب آ رہا تھا۔

کھانا کھا کر میں خورشید کے کمرے میں جا بیٹھا۔ اس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں۔ وہ بھی اس وقت کھانا کھا کر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گئے۔ نئے چہرے انھوں نے اتار کر سوٹ کیس میں بند کر دیے تھے۔

"آئیے آشتی صاحب! کھانا کھا لیا آپ نے؟"

"ہاں۔ کھانا میں کھا آیا ہوں۔ آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"ہم اُدھر ڈھوک کھبہ میں رہتے ہیں۔ سولہ نمبر گلی میں۔"

"آپ تنہا ہیں؟ کوئی اور آدمی نہیں ہے آپ کے ساتھ؟"

"جی نہیں۔ دراصل ہم کوئی چھ مہینے پہلے لاہور سے پنڈی آگئے تھے، کاروبار کے سلسلے میں۔"

"کیا کاروبار کرتے ہیں آپ؟"

"میں ایک ناٹک کمپنی میں کام کرتا تھا مگر وہ لوگ بھی کچھ یہاں سے کراچی چلے گئے۔ آج کل تو میں بیکار ہی پھر رہا تھا۔"

"آپ کی شادی کب ہوئی؟"

"شادی بھی کوئی چار مہینے پہلے ہوئی تھی۔"

"گل زری آپ سے کیسے واقف ہے؟"

"یہ ہمارا ڈراما دیکھنے آتے تھے۔ مجھ سے یہ وہیں ملے تھے۔ کام میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ کئی بار میں نے ان کا حلیہ تبدیل کیا۔ پتا نہیں ایسا کیوں کرتے ہیں یہ۔ ویسے آدمی بہت بھلے ہیں۔ کے کھرے اور بات کے دھنی۔"

"ہوں۔ حیرت ہے! انھیں بھلا حلیہ تبدیل کروانے کی کیا"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جناب! میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں!"

"آپ کو معلوم ہے کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے ان کا گھر نہیں دیکھا۔"

"آپ صرف دس ہزار میں مان گئے! کیا یہ رقم اس خطرے سے میں کم نہیں تھی جو آپ کو مول لینا پڑ رہا ہے؟"

"پتا نہیں۔ یہ البتہ کہہ رہے تھے کہ ان کے کوئی واقف ہیں، وہ ہمیں ملاقاتیوں میں شامل کرواکر باہر نکال دیں گے۔"

"شاید ایسا نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں آپ کو جیل میں اُن کی جگہ قید رہنا پڑتا۔ ایسے میں آپ کیا کرتے؟"

"پھر تو بیڑہ ہی غرق تھا۔ ایسے میں تو کروڑ روپیہ بھی کم اپنی جان کو قاتل کی جگہ کون پھنساتا ہے بھلا۔"

"تو گویا آپ کو معلوم ہے کہ وہ قاتل ہیں؟"

"نہیں۔ میں یونہی کہہ رہا ہوں۔ اُن کے جرم کا تو مجھے پتا نہیں۔"

"بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو ہم جلد ہی باہر نکلوالیں گے۔ نے یہ بندوبست کر رکھا ہوگا۔"

میں کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھا رہا اور واپس آکر ماں جی کے میں لیٹ گیا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر پہلے ہی سو چکی تھیں۔ شمشاد خورشید نے مجھے مایوس ہی کیا تھا۔ وہ گل زری کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیا اور اُن سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اُن کے حالات شاید اُن دونوں ہی ابتر تھے۔ جب ہی تو وہ دس دس ہزار روپے کر اس کام کے تیار ہو گئے تھے۔ ورنہ وہ ایسا کبھی نہ کرتے۔ کون کسی کی خاطر کے لیے تیار ہوتا ہے مگر گل زری نے انھیں ایسا اطمینان دلایا یہ کام کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے۔ یا تو وہ دونوں بہت لوگ تھے جو اس ہم رنگِ زمیں دام میں پھنس رہے تھے یا کوئی ہی چھٹے ہوئے لوگ تھے جنھیں معلوم تھا کہ کس جگہ انھیں کیا کرنا ہوگا۔ وہ جیل کے اندر کے حالات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ مجھے تو بہرحال میں آسیہ اور آپی کی سلامتی درکار تھی۔ اس لیے مجھے ہر حیلہ ایک بہت بڑی تدبیر دکھائی دیتا تھا۔ میں ہر اس آدمی کا بال بندھا غلام بننے کو تیار تھا جو میری اس گرہ کو کھول سکتا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے کسی گل زری کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل چکا تھا۔ اب تک اس کی ساری ہی تدبیریں کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ جبکہ میں اس کے سامنے کندۂ ناتراش ثابت ہو رہا تھا۔ جیسے کسی بات کا مجھے علم ہی نہ ہو اور یہ تھا بھی سچ ہی۔ میں کہاں کا صاحبِ کمال تھا۔ دیوار کی اینٹ پکڑ کر میں اوپر اٹھتا تھا اور پھر کوئی لہر سی آتی تھی کہ میری ساری سربلندی پر پانی پھیر دیتی تھی۔ میں پھر تحت الثریٰ میں جا گرتا تھا۔ میرا جینا بھی کوئی جینا تھا۔ میری ساری زندگی کا ماحصل یہ تھا کہ میں جیل سے گھر اور گھر سے جیل تک کا چکر کاٹ کر پھر وہیں آپہنچا تھا، جہاں میری زندگی اپنی چمک دمک کھو بیٹھی تھی۔

کئی رات تک میں اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا اور پھر صبح پر تکیہ کرتے ہوئے میں گہری نیند میں کھو گیا۔

اگلے دن ماں جی اپنے بستر سے اٹھیں تو میری بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ وضو کرکے مصلے پر جا بیٹھیں تو جانے مجھے کیا سوجھی میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا مسجد میں جا پہنچا۔ اُس صبح نے مجھے اداس کر دیا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں فرش پر سر ڈال کر خدا کے سامنے اتنی گریہ زاری کروں کہ اس کا دل پگھلا کر رکھ دوں۔ مجھے اس کی مدد کی ہمیشہ ہی بہت ضرورت رہی ہے مگر اس صبح تو میں کچھ اور زیادہ ضرورت مند ہو گیا تھا۔ اس کی رحمت کے سوا مجھے اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

گل زری ٹھیک آٹھ بجے ہمارے پاس آگیا۔ اب کی بار وہ بوشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا اور سر پر اُس نے ہلکا سا فلیٹ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ لباس کی وضع قطع سے وہ کوئی انگریز افسر معلوم ہو رہا تھا اور وہ کار میں آیا تھا۔ اُس کار میں جو کل بھی پرانی تھی اور آج بھی پرانی تھی۔ شمشاد اور خورشید پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ ماں جی کو ہم ہوٹل میں چھوڑ کر اُسی وقت کار میں بیٹھے اور سیدھے لال کُرتی جا پہنچے۔ مجھے بینک سے روپے نکلوانے تھے اور گمشدہ چیک بک کے بدلے میں نئی چیک بک نکلوانی تھی۔ کیونکہ وہ تو عرفان نے مجھ سے چھین لی تھی، جان عالم کے تمام کاغذات سمیت۔ وہ سب کچھ وہیں رہ گیا تھا اور اب اس کی واپسی ناممکن نظر آتی تھی۔

بینک پہنچ کر میں نے سب سے پہلے تو ان کو یہ اطلاع دی کہ میری چیک بک گم ہو چکی ہے اور مجھے اپنے دستخط بھی تبدیل کرنے ہیں۔ منیجر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑھ چڑھ کر اس کارِ خیر میں میری مدد کی اور کوئی آدھ گھنٹے میں اس نے مجھے دس لاکھ روپے دے دیے جنھیں چھوٹے سے سوٹ کیس میں بند کرکے میں دوبارہ کار میں جا بیٹھا۔

"رقم لے آئے ہو آشتی صاحب؟"

"ہاں۔ اب سیدھے جیل چلو۔ رقم کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔"

"پہلے ان کو رقم دے دو۔ یہ بینک جانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔" میں نے اوٹ میں رکھ کر سوٹ کیس کھولا اور انھیں دس دس ہزار کی کئی گڈیاں دے دیں جنھیں اٹھا کر خورشید سیدھا بینک میں جا گھسا۔

"کیا اُس کا اکاؤنٹ یہاں ہے؟"

"جی ہاں۔ پانچ دس روپے تو ضرور ہی ہوں گے۔ اپنا حساب اُنھوں نے یہاں ہی کھولا تھا۔ ان کے کوئی دوست انھیں یہاں لے آئے تھے۔ یہ کئی مہینے پہلے کی بات ہے۔" شمشاد نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

خورشید کوئی بیس منٹ بعد واپس آگیا اور پھر ہم سیدھے جیل کی طرف چل دیے۔ رقم اس نے بینک میں جمع کروا دی تھی۔ غالباً وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے حساب میں ایک لاکھ روپیہ جمع کروایا تھا اور وہ بہت خوش تھا مگر۔۔۔ وہ دونوں میاں بیوی ایسے مقام کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے اُن کی واپسی بہت ہی مخدوش تھی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اطمینان آخر کس وجہ سے تھا۔ میں بہرحال اپنی جگہ بہت شرمسار ہو رہا تھا کیونکہ میں اُنھیں ایسی جگہ مار رہا تھا جہاں اُن کے منہ میں کوئی پانی ٹپکانے والا بھی نہیں ہوگا۔ جیل کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ لوگ خود کو اُن کے کرکے کیسے خوفناک مجرموں کی رہائی کا سبب بن گئے ہیں تو وہ تو اُن کی چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔ کئی لوگ نوکری سے برخاست ہو جائیں گے۔ کئی ایک کو وہ معطل کر دیں گے اور جو بھی آئے گا وہ اپنا سارا غم و غصہ انہی پر اتار دے گا۔ وہ بار بار اُن سے یہی پوچھیں گے کہ میاں تم کہاں سے بیچ میں آ ٹپکے ہو اور وہ آسیہ اور آپی کیسے شمشاد اور خورشید بن گئے؟ اب تم آئے ہو تو پھر ٹھیک ہے اُن کی جگہ اب تم ہمارے دھوکے سہو۔ خود ہی پھانسی چڑھ جاؤ۔ ہم تو یہی کر سکتے ہیں۔ وہاں اُن کی بات بھلا کون سُن سکے گا۔ ہاں البتہ اُن کے لیے اگر ہم کوئی اچھا سا وکیل پیروی کے لیے کھڑا کر سکیں تو وہ شاید کچھ کر سکے مگر گل زری نے معاملے کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں اُن دونوں کے مستقبل کا کیا نقشہ اس کے سامنے تھا۔

جیل کے سامنے اُس روز بڑی بھیڑ تھی۔ لوگ ملاقاتوں کے لیے دور دور سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ جالیوں کے سامنے اُن لوگوں نے اژدہام کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جیل کے بڑے دروازے کے سامنے بھی جمگھٹا لگا تھا۔

شمشاد برقع پہنے ہوئے تھی اور وہ کوئی بہت ہی معزز

دکھائی دیتی تھی۔ جس لباس میں وہ وہاں پہنچی تھی، وہ اُسے کئی دوسروں سے منفرد بنا رہا تھا اور اُس نے نقاب کے نیچے ابھی آسیہ کا چہرہ نہیں پہنا تھا۔ خورشید بھی اپنے ہی حلیے میں تھا۔ وہ شاید یہ سارا کام اندر پہنچ کر کرنا چاہتا تھا۔ ایک چھوٹا سا بریف کیس اس کے پاس موجود تھا۔ جو اُس کی بہت مدد کر سکتا تھا۔

ہم ابھی کار میں ہی بیٹھے تھے کہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے اصغر صاحب ہماری طرف لپکے اور علیک سلیک کے بعد بولے "آئیں جناب! آپ چار آدمی ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ ابھی تو چار ہی ہیں" گل زری نے شمشاد اور خورشید کو کار سے اُتارتے ہوئے کہا۔ اس نے جان بوجھ کر شمشاد کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ حالانکہ کل سے میں اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے تک اُن کے درمیان میں نے ایسی کوئی خاص بات نہیں دیکھی تھی۔ یہ بات شاید خورشید کو بھی اچھی نہیں لگی تھی مگر وہ چُپ ہی رہا۔ میں بھی سوٹ کیس لے کر کار سے اتر گیا۔ حیرانی مجھے یہ تھی کہ شمشاد نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی جیل کی طرف بڑھ گئی۔ خورشید اس کے پیچھے تھا۔

میں اور اصغر بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھے تو دروازے کی جالی میں سے ہمیں ایک بالا بلند پولیس افسر نظر آیا۔ طے یہ تھا کہ میں اس روز جیل کے اندر نہیں جاؤں گا۔ گل زری نے کار کی چابی مجھے دیتے ہوئے کہا "آتشی صاحب! آپ کار میں جا بیٹھیں، ہم فارغ ہوتے ہی باہر آجائیں گے"

"ٹھیک ہے بھئی! میں آپ لوگوں کا انتظار کرتا ہوں" یہ کہہ کر میں نے چابی اس کے ہاتھ سے لے لی اور دروازے سے چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔ لباس میرا اب بھی وہی تھا۔ عبا اور عمامہ مجھے لوگوں سے بہت منفرد ثابت کرتا تھا۔

وہ پولیس افسر ابھی تک جالی کے سامنے کھڑا تھا۔ حالانکہ ہر روز وہاں سپاہی کھڑے ہوتے تھے۔ اصغر صاحب کو سامنے دیکھ کر اُس نے کھڑکی کھول دی۔ بھیڑ اگرچہ خاصی تھی۔ بہت سے لوگ جو جیل حکام سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے، اندر جانے کے لیے ہاتھوں میں درخواستیں پکڑے ہوئے تھے۔ کئی ایسے تھے جو باہر کھڑے سپاہیوں کی منت سماجت کر رہے تھے۔ وہ چاروں کھڑکی سے باہر جا رُکے۔ میں دروازے کے بائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ اس پولیس افسر نے اصغر کو روکتے ہوئے کہا "اپنا کارڈ دکھایئے"

"او جی میں آڈیٹر ہوں۔ شیخ عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ آیا ہوں اور یہ میرے ساتھ ہیں اکرم علی" اس نے گل زری کا تعارف کروایا۔

"اوہ تو یہ بات ہے"

"اور یہ لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ کسی قیدی سے ملاقات کریں گے یہ۔ میں انھیں ساتھ لایا ہوں" اس نے وضاحت کی۔

"گڈ! تو پھر آپ اندر آجائیں جناب اصغر صاحب! اور ... بھی لے آئیں" اس نے کھڑکی میں سے اُن چاروں کو لیا اور کھڑکی بند کر دی ۔۔۔ تب مجھے یاد آیا کہ رقم تو سوٹ کیس میں میرے ہی پاس رہ گئی مگر اس وقت تک انھیں اندر گئے ... منٹ گزر چکے تھے۔ نہ گل زری کو یاد رہا نہ اصغر صاحب کو۔ رقم کے بغیر تو وہ لوگ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے سوچا کہ اُن میں سے کوئی بھی آدمی کسی وقت باہر آکر مجھ سے رقم لے سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ تلوار نیام میں رکھی تھی، کسی بھی وقت کھینچی جا سکتی تھی۔ قید خانے میں ایسا بھی اندھیر نہیں مچا تھا کہ اُن میں سے کوئی باہر نہ آسکے۔ میں وہاں سے ہٹ کر کار میں جا بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر ... کا جائزہ لینے لگا۔

لامتناہی دکھوں کے مارے لوگ جیل کے سامنے ... لوگوں کی ملاقاتیں آسان نہیں ہوتی تھیں۔ دور دراز سے لوگ ... جیل کے دروازے پر آرہے تھے کہ صبح دم وہ اپنے پیاروں کے چہرے ... سکیں گے۔ کسی کا شوہر قید میں تھا۔ کسی کا بھائی۔ کسی کا بیٹا ... اور وہ اُن سے ملنے کی آرزو دل میں چھپائے ہر طرف سے اُمڈ آجاتے تھے مگر اُن سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ وہ اُنھیں دھتکار ... تھے۔ کئی ایک ایسے تھے جو ہاتھوں میں نوٹ لیے پھرتے تھے ... ان کے صدقے میں وہ اپنے عزیزوں سے مل سکیں۔ وہ نوٹ ... طریقے سے باہر بنے ہوٹل کے کارندوں کے ذریعے مختلف ... اپنے مالکوں کے نام سے جا پہنچتے تھے۔ پھر اُنھی کے صدقے میں ... کی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ وہ سارا منظر میرے سامنے تھا مگر ... نہیں کر سکتا تھا۔ میرا اپنا بازو جیل کے اندر تھا۔ میں کسی کے لیے ... کچھ ایسے تھے جو پھلوں کے ٹوکرے اور قیدیوں کی ضرورت کی چیزیں لے کر وہاں آتے تھے اور نوٹوں کے پہیوں پر چڑھا کر پہنچاتے تھے مگر اُن میں سے آدھی چیزیں راستے میں ہی رہ جاتیں ... کم کم ہی اندر پہنچتی تھیں۔ سب کچھ سپاہی لے لیتے تھے ... اس ساری دھاندلی کا کوئی علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔

کوئی بیس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اچانک پولیس ... جیپ تیزی سے چوک میں سے گزر کر جیل کی طرف بڑھی ... کئی سپاہی اور انسپکٹر موجود تھے۔ اندر پہنچتے ہی وہ کود کر اُترے اور تمام لوگوں کو وہاں سے زبردستی ہٹا کر انھوں نے ... کا بڑا دروازہ بند کر دیا۔ میں سڑک کی دوسری طرف کھڑا تھا ... سلسلہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جیل کا دروازہ ایک د...

اور وہ سب کے سب اندر چلے گئے۔ شاید اُس قید خانے میں کوئی فساد ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے مگر میں بہت زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی بہت ہی بُری خبر آسکتی تھی۔ عین اُسی وقت مجھے اکرم بھٹی کار کے قریب پہنچتا دکھائی دیا۔ وہ کسی اور ہی دروازے سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے تیزی سے کار کا دروازہ کھولا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا "یہاں سے نکل چلو بھائی! وہ..... وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں۔ جلدی کرو"

"کیا کہتے ہو تم! کون گرفتار ہو گئے ہیں؟"

"شیخ صاحب، اصغر اور حاجی صاحب۔ دو آدمی اور بھی اُن کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ یہاں سے نکل چلو"

"مگر ہوا کیا ہے؟ کچھ پتا تو چلے؟"

"کسی نے مخبری کر دی ہے۔ جلدی چلو یار!" مجبور ہو کر میں نے کار اسٹارٹ کر دی جب میں اُسے ساتھ لے کر ایوب پارک کی طرف بڑھا تو اُس نے کہا "کسی نے لاہور سے صبح جیل میں فون کیا تھا..... ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو کہ اُن کے آڈیٹر آرہے ہیں۔ بس اس بات پر ڈپٹی صاحب کو شک پڑ گیا۔ اُس نے جب انھیں بتایا کہ آپ کے ایک آڈٹ افسر شیخ عبدالرحمٰن تو پہلے ہی آڈٹ کر رہے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ اس نام کا کوئی آدمی اُنھوں نے نہیں بھیجا۔ یہ کوئی زبردست فراڈ معلوم ہوتا ہے۔ بس سارا قصہ یہاں سے ہی خراب ہوا۔ اُنھوں نے کچھ دیر پہلے شیخ صاحب کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں اصغر صاحب اندر گئے تو اُن کو تمام ساتھیوں سمیت انھوں نے پکڑ لیا۔ یہ پولیس جو ابھی اندر گئی ہے، وہ اسی سلسلے میں بلائی گئی تھی۔ فساد بہت لمبا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بھی گرفتار کر لیں گے۔ مجھے یہی ڈر ہے آتشی صاحب! بہت برا ہوا۔ پتا نہیں میرا کیا بنے گا؟"

"تمھارا اپنا رول کیا ہے اس ڈرامے میں؟ تم کیا کرتے رہے ہو؟"

"شیخ صاحب نے اب تک چار تخریب کاروں کو یہاں سے رہا کروایا ہے اور اس کام کے اُنھیں دس لاکھ روپے دیے گئے ہیں۔ اب حاجی گل زری صاحب اس گروہ کے سردار سید علی کو چھڑوانا چاہتے تھے۔ وہ اسی لیے جیل کا آڈٹ کرنے کے بہانے اندر گئے تھے۔ آج سید علی کی رہائی کا دن تھا۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے کہ معاملہ خراب ہو گیا اور وہ پکڑے گئے"

"حاجی گل زری کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"اُنھی کا تو تعلق ہے۔ سید علی کی رہائی کے لیے وہی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ سے جو دس لاکھ روپیہ لیا گیا ہے وہ دراصل سید علی کے سلسلے میں ہے۔ آپ کی بہن اور دوست کی رہائی تو سمجھیں جھونکے میں تھی مگر وہ بھی نہ ہو سکی اور اب گل زری خود پھنس گئے ہیں"

"مگر تم کیوں جیل سے بھاگ نکلے ہو؟"

"مجھے اپنا ڈر ہے بھائی! دو لاکھ میں نے بھی لیے تھے اُس سودے میں سے۔ جب میں نے اُن چار تخریب کاروں کو یہاں سے رہا کروایا تھا تو مجھے اس دس لاکھ میں سے دو لاکھ ملا تھا"

"ہوں۔ کیا نام تھے ان کے؟"

"فرمان علی، گوہر حسین، ہیرا لالا اور نوازش۔ انھیں دس دس سال کی سزا ہوئی تھی اور انھوں نے ابھی ایک سال اور چھ مہینے ہی گزارے تھے جیل میں مگر اُن کا سارا گروہ کمزور ہو گیا تھا۔ اسی لیے گل زری نے پہلے بھی شیخ عبدالرحمٰن کے ذریعے یہ کام کروایا تھا"

"یہ کب کا واقعہ ہے اور اُس وقت وہ کس روپ میں آئے تھے؟"

"وہ اُس وقت بھی آڈٹ افسر بن کر ہی آئے تھے مگر کسی نے اُن کی نشاندہی نہیں کی تھی ۔۔۔ کیونکہ اے جی آفس سے کسی نے پوچھا نہیں تھا۔ دوسرا آڈٹ اب ہو رہا ہے مگر اصلی آڈٹ کی تاریخ انھوں نے اب طے کی ہے"

"پہلا آڈٹ کب ہوا تھا؟"

"گیارہ مہینے ہو چکے ہیں اُسے"

"اور اب یہ دوسرا آڈٹ ہے؟"

"ہاں۔ اسی لیے تو کسی کو شک نہیں پڑا مگر آج جو فون یہاں آیا اس سے سارا معاملہ خراب ہو گیا"

"کیا آسیہ اور آپی آج باہر آئے تھے؟"

"نہیں! اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ نمبردار بھی میرے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ہزار کھنڈ میں نے اُسے بھی دے دیا تھا۔ یہ جب کی بات ہے جب مجھے دو لاکھ ملا تھا۔ باقی رقم تو شیخ عبدالرحمٰن ہی ہڑپ کر گیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کُل رقم کتنی طے ہوئی ہے"

"اب تو میرا خیال ہے ساری بات تمھارے علم میں تھی"

"ہاں۔ کُل آٹھ لاکھ کا سودا ہوا تھا اور اُنھوں نے مجھے چار لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب کی بار وہ مجھ سے انصاف کرنا چاہتے تھے"

"اور تم یہاں اکاؤنٹنٹ ہو؟"

"ہاں۔ مگر اب تو سب کچھ ہی تباہ ہو گیا ہے۔ وہ رقم شیخ صاحب کے پاس رہ گئی"

"اُس کا ذکر ہوا تھا کہیں؟"

"اصغر صاحب نے مجھے یہی بتایا تھا کہ آج وہ رقم آپ سے لیں گے۔ میرا خیال ہے گل زری صاحب نے اُسے دے دی ہو گی۔ اس کے بغیر تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے"

"تو گویا ابھی آسیہ اور آپی کو اطلاع نہیں دی گئی ہو گی کہ وہ اوپر آجائیں"

"نہیں بھئی! اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ پولیس نے جاتے ہی اصغر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا"

"مگر وہ رقم تو ابھی میرے پاس موجود ہے۔ اس سوٹ کیس میں رکھی ہے۔ میں اسے صبح ہی بینک سے لایا ہوں۔ وہ اُسے ساتھ لے جانا بھول گئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انھیں یاد آئے گا تو ... منگوا لیں گے۔"

"ہوں! تو وہ رقم ابھی آپ کے پاس پڑی ہے۔"

"ہاں بھئی! اچھا ہوا میں نے یہ انھیں دے نہیں دی۔ ورنہ تو یہ بھی برباد ہو گئی تھی۔"

"اچھا تو یہ آپ کے پاس ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا آشتی صاحب! ورنہ یہ واقعی ختم ہو چکی تھی! اسے وہ بحق سرکار ضبط کر لیتے یا آپس میں حصے بخرے کر لیتے۔" اس کی آنکھوں میں ایسی حرص اُبھر آئی کہ میں حیران رہ گیا۔ ایسی حریص آنکھیں تو میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ جن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اُس رقم کے لیے آدمی کو مار دینے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ تب میں نے اس کے جسم کا جائزہ لیا — وہ خاصا لمبا تڑنگا آدمی تھا جس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے رخسار پچکے ہوئے تھے۔ جیسے کسی بھیڑیے کے ہوتے ہیں جسے مسلسل شکار کے پیچھے بھاگنے کا چسکا ہو۔ اس پر بھی گوشت نہیں چڑھتا ہے۔ یہی حال اُس بھٹی صاحب کا تھا۔ جسم اس کا بہت ورزشی معلوم ہوتا تھا۔ ہونٹ آگے کو نکلے ہوئے۔ ماتھا بھی منحوس سا تھا۔ بال اُس پر خاصے آگے تک اُگے ہوئے تھے۔ میں کہوں کہ وہ تنگ پیشانی تھی تو یہ زیادہ قرینِ قیاس بات ہو گی اور وہ عمدہ قسم کی بوسکی کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسے اُس نے کسی بہت اعلیٰ درزی سے سلوایا تھا کہ اُس پر بہت سج رہا تھا۔ کلائی پر اُس نے سُنہرے ڈائل کی گھڑی لگا رکھی تھی۔ جب ہی میں کہوں کہ اتنا خوشحال آدمی جیل میں کیا کر رہا ہے اس کو تو اپنے مربعوں پر ہونا چاہیے۔ وہ اور زیادہ جھک کر میرے قریب ہو گیا۔ اس وقت ہم ایوب پارک کی دیوار سے آگے گولف روڈ کے میدان کے سامنے جا پہنچے تھے۔

صورتِ حال بڑی ہی غیر واضح اور پریشان کن نظر آتی تھی۔ اکرم بھٹی گرفتاری سے بچنے کے لیے جیل کے کسی خفیہ دروازے سے باہر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ میرے ذہن پر سوار ہو رہا تھا۔ کار وہاں روکنے کے بجائے میں ایوب پارک میں سیدھا آگے نکلتا چلا گیا۔ بھٹی میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ انداز اس کا ایسا تھا کہ وہ مستقبل کے خوف سے لرز بھی رہا تھا اور اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم محفوظ ہے کہ اسے لے کر وہ کسی بھی طرف نکل سکتا تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے مجھ سے چھین بھی سکتا ہے۔

"کہاں چلنا ہے اب؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"میں کیا بتاؤں بھائی۔ حالات ایک دم بدل گئے ہیں۔ تم یوں کرو کہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ تمھارا پیچھا کر رہے ہوں گے؟"

"میرا اندازہ یہی ہے۔ وہ اُن لوگوں سے سب کچھ اُگلوا لیں گے۔"

"تمھارے گھر کا بھی اُنھیں علم ہو گا؟"

"کیوں نہیں! سب سے پہلے تو وہ میرے ہی گھر جائیں گے۔"

"مگر پہلے تم صحیح بات تو معلوم کر لو۔ وہ دو لاکھ روپیہ تمھیں ملا تھا؟"

"یہ کوئی دس گیارہ مہینے پہلے کی بات ہے۔ آڈٹ جب ہی ہ..."

"اس وقت تم سے کسی نے کچھ نہیں کہا؟"

"وہ بات رفع دفع ہو گئی تھی اور وہ چاروں آدمی ملک سے باہر نکل گئے تھے۔ شاید انڈیا چلے گئے تھے۔" غیر ارادی طور پر اس کی نظر بار بار میرے سوٹ کیس کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ خدا جانے دل میں کیسے کیسے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

"کوئی ایسا آدمی تم بتا سکتے ہو جو ہمیں جیل کے بارے میں اطلاع دے سکے۔ میرا مطلب ہے کہ میں آسیہ اور آپی کے بارے میں اُس سے مدد لینا چاہتا ہوں۔"

"یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ جیل کے چار ڈپٹی ہیں۔ اُن میں سے نیازی سب سے زیادہ بہتر رہے گا۔"

"پورا نام کیا ہے اُس کا؟"

"محمد سالم نیازی۔"

"کہاں رہتا ہے وہ؟"

"اُس کا مکان لیاقت روڈ پر ہے۔ گارڈن کالج کے سامنے۔"

"اُس سے تم بات کر سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے اُسے ہم اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ یہ کچھ کر سکتی ہے۔"

"ہوں... یہ بتاؤ کہ پہلے دو لاکھ تم نے کہاں خرچ کیے؟"

"میں نے اسلام آباد میں ایک مکان خرید لیا تھا۔"

"کون رہتا ہے اُس میں؟"

"وہ میں نے اپنی بیوی کے نام سے خریدا تھا اور آج کل ... پر دے رکھا ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، نیازی اس وقت کہاں ہو گا؟"

"آج کل اس کی ڈیوٹی شام کو ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت گھر پر ہو گا۔"

"ہوں... کیا خیال ہے ہم سیدھے اس کے گھر نہ چلیں؟"

"ہاں! یہ ہو سکتا ہے تم گاڑی موڑ لو۔ ہم ابھی اس کے ہاں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بات اس سے بہر حال تم ہی کرو گے!"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اگر وہ ہتھے چڑھ گیا تو تمھارا کام آسان..."

تمھیں پتا ہے، جیل کے سپرنٹنڈنٹ اکبر قریشی اسپتال میں شدید زخمی پڑے ہیں۔ کسی نے انھیں پیٹ میں گولی مار کر اسپتال کے دروازے پر ڈال دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"یہ ہو چکا ہے بھئی! اور آج کل وہ اسپتال میں پڑے ہیں۔ بیان انھوں نے کوئی نہیں دیا۔ میں کل اُن کو دیکھنے گیا تھا۔ گولیاں اُنھیں پیٹ میں لگی تھیں۔ اُن کی جان بچ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے گولیاں نکال لی ہیں اور اب وہ بات کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟ کس نے گولی مار دی اُنھیں؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پہلے بھی ایک سپرنٹنڈنٹ کو کسی عورت نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم کہ اُسے کسی عورت نے گولی ماری تھی۔ عورتوں کی گولی پر کوئی اُن کا نام تو نہیں لکھا ہوتا—" میں نے کار ایوب پارک کے عقب میں پہنچا دی تھی اور اب ہم مری بروری کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ایک بار پھر ہمیں شاید جیل کے قریب سے گزرنا تھا۔ راستے میں قصرِ صدارت بھی تھا اور پولیس وہاں جا بجا کھڑی تھی مگر میں کسی طرف توجہ دیے بغیر سیدھا آگے نکلتا جا رہا تھا۔

"وہ عورت جس ٹیکسی میں وہاں گئی تھی اس کے ڈرائیور کا بیان ہے کہ وہ سیدھی سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی میں چلی گئی تھی اور اُسے انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو اُس کے آنے سے پہلے ڈرائیور نے گولی کی آواز سنی تھی۔ وہ گولی اُس نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ پر چلائی تھی۔ میں نے ڈرائیور کا بیان اخبار میں پڑھا تھا۔"

"ہوں... اور تو سمجھ گیا کہ وہ کوئی عورت ہی تھی جس نے اُسے گولی ماری۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

"اور تیرا خیال ہے کہ اکبر قریشی صحت یاب ہو جائے گا۔"

"وہ صحت یاب ہو چکا ہے بھئی! کل اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ واپس جا کر اُن لوگوں سے نمٹ لے گا ... یہ کام ... اُسے سب کچھ معلوم ہے مگر شاید اُس نے ابھی ... بیان ... دیا ہے۔ ہو سکتا ہے دے بھی دیا ہو اور پولیس کو اس معاملے میں جان بوجھ کر خاموش کرا دیا گیا ہو۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ آسیہ اور آپی پر کسی نے کوئی اور پابندی تو عائد نہیں کی ہے؟"

اُس وقت تک ہم دوبارہ جہلم روڈ پر جا چڑھے تھے اور جیل ہمارے دائیں ہاتھ رہ گئی تھی۔ ہم ادھر کا رُخ نہیں کر سکتے تھے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہاں ہم پر کیا بیت جائے۔ بھٹی نے میرا سوال تو سُن لیا تھا مگر وہ اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

"کیا کہتے ہو، تم بول نہیں رہے ہو؟"

"میں کیا کہوں بھئی! تم کیسی پابندیوں کا ذکر کر رہے ہو اور اکبر قریشی کے زخمی ہونے سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"اوہ میں سمجھا! دراصل مجھے یہ ڈر تھا کہ کوئی اور سپرنٹنڈنٹ آ گیا تو اُن کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"

"نہیں! کوئی اور آدمی یہاں نہیں آیا اور اکبر قریشی تو ابھی زندہ ہے، دوسرا کیسے آ سکتا ہے بھلا۔ مگر میرا خیال ہے کہ بات کچھ اور ہے پیارے! بہتر ہے تم مجھے سب کچھ بتا دو۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، میں کوئی بات چھپا رہا ہوں؟ تمھارا وہم ہے یہ۔ بہر حال جیسے بھی ہو سکے گل زری کو وہاں سے نکال لینا چاہیے۔ وہ بچارہ خواہ مخواہ ہی پھنس گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ اس وقت تک وہاں سے نکل چکا ہو۔ بڑے حربے ہیں اس کے پاس بہت ہوا تو وہ اُسے شام تک چھوڑ دیں گے کیونکہ اس کے خلاف ثبوت کوئی نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک قیدی سے ملنے گیا تھا اور بس۔"

"ہاں! یہ ہو تو سکتا ہے۔ بہر حال نیازی سے مل کر ہی پتا چل سکتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم لیاقت روڈ پر جا پہنچے، گاڑی ہم نے لیاقت باغ کے کونے کی سڑک سے گزاری تو بھٹی نے مجھے رک جانے کا اشارہ کیا۔

"یہ مکان ہے نیازی کا۔ ٹھہرو، میں معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کار سے اتر گیا۔

سامنے کے دو منزلہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے گھنٹی بجائی تو کچھ ہی دیر بعد دوسری منزل کی بالکونی سے کسی نے نیچے جھانکا۔

"کون ہے بھئی؟"

"میں ہوں نیازی صاحب! اچھا ہوا آپ گھر پر مل گئے ہیں۔ آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ ذرا دروازہ کھولیں۔" بھٹی نے دروازے سے پیچھے ہٹ کر نیازی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی ہی دیر بعد نیچے آ گیا تو میں بھی کار کو مقفل کر کے ان کے پاس جا پہنچا۔

"اوئے بھٹی صاحب! کیا حال ہے آپ کا۔ آج ڈیوٹی پر نہیں گئے ہیں آپ؟"

"میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ ان سے ملیے، یہ میرے دوست ہیں علی آشتی صاحب۔ یہ ہیں سالم نیازی صاحب جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ بولا، "لگتا ہے آپ کوئی بہت ہی عالم فاضل آدمی ہیں۔ آپ کا لباس تو یہی بتاتا ہے۔" وہ کوئی بہت ہی بانکا سجیلا اور خوبصورت جوان تھا جسے ... یہ

محض اُس کے مردانہ حسن کی وجہ سے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ سفید کھدر کے شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں یہ احساس دلاتی تھیں کہ وہ کوئی بہت ہی حساس اور نبض شناس آدمی ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔ میری ڈیوٹی شام کو شروع ہوتی ہے۔ کام کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی افسر کو رات کے وقت بھی وہاں رہنا پڑتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا خوشحال آدمی ہے۔ بیٹھک میں اُس نے جو سامان سجا رکھا تھا، وہ آدمی کو بہت متاثر کرتا تھا۔ سبز رنگ کا قالین تھا اور اُسی رنگ کا کپڑا صوفوں پر چڑھا تھا۔ کمرے کا رنگ بھی سبز تھا۔

"اوئے کاکا! ان کے لیے فریج میں سے بوتلیں نکال دے۔ گرمی کچھ بڑھ گئی ہے۔ کیوں بھٹی صاحب! خیر سے تو آئے ہیں نا؟" اُس نے ملازم کو آواز دینے کے بعد کہا۔ ملازم دروازے میں آ ٹھہرا تھا۔

"خیر ہی ہے جی، بالکل خیر ہے۔ ویسے یہ مکان آپ کو بہت اچھا مل گیا ہے اور باغ اس میں بالکل مفت کا ہے۔"

"کیا مطلب؟ ایک چھوٹا سا لان ہے اور بس۔"

"لان تو ہے ہی مگر یہ لیاقت باغ بھی تو دیکھیں، یہاں سے آپ کُلی کریں تو پانی سیدھا باغ میں جاتا ہے۔"

"اچھا! یعنی اسے آپ میرے گھر کا پائیں باغ سمجھ رہے ہیں۔" اُس نے ملازم سے بوتلیں لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا۔ بولا۔ "کون ہے بھئی؟"........ "نہیں بھائی! تم اِدھر کہاں آ گئے۔ بہت ہی رانگ نمبر ہے۔" ریسیور رکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا ـــ "یہ لیں بھٹی صاحب! کوکا کولا پئیں۔ آپ بھی لیں جناب! اِن سے آپ نے مکمل تعارف نہیں کروایا ہے بھٹی صاحب! خیر تو ہے نا؟"

"خیر ہی ہے نیازی صاحب! میرا فرض ہے کہ آپ کی اچھے اچھے لوگوں سے ملاقات کراتا رہوں۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ آپ مجھے ممنون فرما رہے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے ان سے میری ملاقات کروا دی۔ مگر معاملہ کیا ہے بھٹی صاحب، میرا خیال ہے آپ کھانا تو ضرور کھا کر جائیں گے۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کا ایک بہت اہم کام جیل سے متعلق ہے۔ اگر آپ کچھ مدد کر سکیں تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

"کام بھی تو بتائیں۔ اگر میں کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔"

"صاب! آپ کو بیگم صاحب نے بلایا ہے۔" اس کے ملازم نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔ سگریٹ پیتے ہوں تو حاضر ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کے دو پیکٹ ہمارے سامنے رکھ دیے اور خود اندر میں چلا گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس سارے سلسلے سے نفرت تھی اور میں خود سے سخت متنفر ہو گیا تھا۔ آسیہ نے پھر مجھے اُس راستے پر ڈال دیا تھا جس پر چل کر میں نے ایک عمر ضائع کر دی تھی اور مجھے پھر چھوٹے چھوٹے لوگوں کی منتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ مجھے نیا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن میں سے کوئی خان، کوئی افغان۔ کوئی نیازی، کوئی بھٹی، کوئی مُغل اور وہ سب لوگ اتنے غیر اہم تھے کہ اُن کے سامنے اپنا راز کھولنا ہی اب عذاب نظر آتا تھا مگر مجھے وہ راستہ پھر سے طے کرنا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ میں آسیہ اور آبی کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آسیہ کے سلسلے میں تو یہ بات تھی کہ میرا اس کا خون کا رشتہ تھا۔ اُسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچتی تھی تو میرا وجود لرزنے لگتا۔ اس کے لیے میرا درد ناقابلِ برداشت تھا۔ احساس مجھے یہی تھا کہ وہ پور بھر ڈوبی تو پھر سارے جہان کے سمندر اُس پر جا پڑیں گے اور وہ کبھی نہ اُبھر سکے گی مگر بات اب اتنی سی نہیں تھی۔ میرا آبی بھی اس بندی خانے میں جا پھنسا تھا اور اُسے نہیں معلوم میں اس کے لیے دل میں کیسا درد محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے بار بار مہربانیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں گویا اس پر مہربانی کر رہا ہوں کہ اس سے ملنے کے لیے جیل جا پہنچا تھا مگر یہ بات صحیح نہیں تھی۔ اُس کے لیے بھی میں دل میں ایسا ہی دکھ محسوس کرتا تھا جیسا آسیہ کے لیے تھا۔ میں اُن دونوں کے بغیر نہتا ہو کر رہ گیا تھا اور اُنھیں جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا وہاں سے رہائی دلانے کی کوشش میں تھا مگر ابھی تک اس اُلجھن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اب ہم سالم نیازی کے دروازے پر جا چڑھے تھے۔ پتا نہیں وہ کس قماش کا آدمی تھا۔ تنخواہ تو اس کی اتنی نہیں تھی کہ وہ اس میں عمدہ اور شاندار قسم کا دو منزلہ مکان خرید سکتا۔ اس کے ذرائع کچھ اور بھی تھے۔ اس کے سامنے قیدیوں کا ہجوم لگا رہتا تھا جن میں سے بیشتر ایسے تھے جو مالی فائدے کے لیے جیل جا پہنچے تھے۔ اُن قیدیوں میں ایسے بھی تھے جو لاکھوں کروڑوں کما کر گھر چھوڑ آئے تھے۔ اُن کے لواحقین کو آسانی سے پھانسا جا سکتا تھا۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ اُن کے آدمیوں پر جیل میں تشدد ہو۔ اُنھیں جیل میں سہولتوں کی بھی ضرورت تھی۔ آدمی کی سب سے بڑی ضرورت کھانا ہے۔ جو جیل میں ملتی تھی اُس پر آدمی زندہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے لواحقین کی کوشش ہوتی تھی کہ اُنھیں اچھے سے اچھا کھانا ملے۔ اسی طرح اگر میں گننے لگوں تو بے شمار ایسی باتیں تھیں جن کو بنیاد بنا کر قیدیوں کی اذیت میں بے پناہ اضافہ کیا جا سکتا تھا، اور وہ

کے سارے اُن کے رحم و کرم پر تھے۔ ایسے میں جیل کے حکام خواہ وہ کسی بھی درجے میں ہوں اُن کی پریشانیوں میں بلاجواز اضافہ کر کے اُن کے لواحقین سے جتنا فائدہ چاہتے اُٹھا سکتے تھے اور یہی وہ بات تھی جس نے نیازی جیسے لوگوں کو بے پناہ اختیار دے رکھا تھا۔ ایسا اختیار جسے بروئے کار لا کر وہ مکان تو کیا کوٹھیاں خرید سکتے تھے۔ اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جس نے اپنی ذاتی جائداد نہ بنا رکھی ہو۔ حیرت تھی کہ اکبر قریشی نے کیوں میری وہ پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھا گیا تھا ورنہ وہ شاید آمادہ ہو جاتا۔

میں اُنھی خیالوں میں غرق تھا۔ سگریٹ میرے ہاتھ میں سُلگ کر بجھنے لگا تو میں نے اُسے راکھ دان میں مسل دیا۔ بھٹی بہت غور سے میرے چہرے کو تک رہا تھا۔ بولا۔ "خیر تو ہے مولانا آشتی صاحب! کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم کوئی نقب کے منہ پر تو نہیں بیٹھے ہیں۔"

"اس سے زیادہ بڑی نقب اور کون سی ہو گی بھٹی صاحب! کہ ہم اس قلعے ایسی اُونچی دیوار کی ایک اینٹ کھسکا رہے ہیں ــ یہ نیازی کوئی کم اہمیت کا آدمی تو نہیں ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ اس سے ہم پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مگر بات تم خود ہی کرو۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی موقعے اپنی حماقت کی وجہ سے کھو دیے ہیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ایسا مسکا لگاؤں گا کہ دیکھتا رہ جائے گا۔ میرا خیال ہے میں جیل فون کر کے معلوم نہ کر دوں کہ قصہ کیا ہے؟"

"ہاں یہی بہتر رہے گا۔ نیازی کسی لمبے ہی کام میں لگ گیا ہے شاید۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے مگر تم نے اپنا سوٹ کیس کہاں رکھا ہے؟"

"وہ کار میں پڑا ہے اور کار میں نے مقفل کر دی ہے۔ وہ بہت محفوظ ہے وہاں۔"

"کمال کرتے ہو یار! اتنی بڑی رقم ہے وہ۔"

"کہیں نہیں جاتی ہے بھائی! تم اپنا رانجھا راضی کرو، بات کرو جیل کے کسی آدمی سے۔" میں بھی اس وسوسے میں مبتلا تھا کہ خدا جانے وہاں حالات کیسے کیا ہو گئے ہوں۔ بھٹی نے اُٹھ کر فون کے نمبر گھما دیے۔

"کون صاحب ہیں؟"...... "ذرا مجھے سب اکاؤنٹنٹ جمیل سے ملا دیں۔" پھر وہ ریسیور پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ سپاہی تھا جیل کے دروازے پر موجود رہتا ہے۔ میری آواز نہیں پہچان سکا ہے۔"

چند ہی لمحوں بعد مطلوبہ آدمی فون پر آ گیا۔ "ہیلو جمیل بھائی! میں اکرم بھٹی بول رہا ہوں۔"

"آپ کہاں چلے گئے ہیں بھٹی صاحب! اِدھر......" آگے میں بات نہیں سُن سکا تھا۔

میں تیزی سے بھٹی کے پاس جا پہنچا۔ آواز بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔

"کیوں! کیا ہوا ہے؟"

"وہ شیخ عبدالرحمٰن تھے نا، وہ آڈٹ افسر۔ پولیس نے انھیں گرفتار کر لیا ہے۔ اُن کا ساتھی بھی اُن کے ساتھ ہے۔"

"وہ کس لیے بھائی! کیا کیا ہے اُس نے؟"

"وہ کوئی جعل ساز تھا۔ پچھلے سال بھی وہ یہاں آیا تھا، ٹیسٹ آڈٹ کے لیے تین دن رہ کر گیا تھا۔"

"ہاں ہاں پھر؟ اب کیا ہوا ہے؟"

"دراصل لاہور سے صبح صبح فون آیا تھا کہ اے جی آفس سے آڈٹ پارٹی آ رہی ہے، اُن کی رہائش کا بندوبست کر دیں۔ فون انھوں نے یوسفی صاحب کو کیا تھا۔ وہ بہت وہمی آدمی ہیں۔ انھوں نے اسی وقت مجھے بلوا لیا۔ آپ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔"

"اچھا پھر؟ میں ذرا ایک کام سے باہر نکل گیا تھا۔"

"بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے شیخ عبدالرحمٰن اور اصغر صاحب کے کمرے کا دروازہ بند کروا دیا۔ پولیس کوئی آدھے گھنٹے بعد آ گئی۔ اس دوران حاجی گل زرین صاحب بھی آ گئے۔"

"اچھا پھر؟"

"پھر کیا تھا، یوسفی صاحب نے اُن دونوں کو گرفتار کروا دیا۔ وہ حاجی گل زرین کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا، انھیں وہ کوئی آدھے گھنٹے بعد وہیں چھوڑ گئے۔"

"عبدالرحمٰن نے بیان کیا دیا ہے؟"

"وہ بالکل چپ ہے اور اصغر صاحب بھی کوئی بیان نہیں دے رہے ہیں مگر پولیس اُن سے سب کچھ پوچھ لے گی۔ اتنا اندھیر تو کہیں نہیں مچا ہے۔" جمیل کی آواز مجھے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ میں نے بھی ریسیور کے ساتھ کان لگا دیے تھے۔

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ یار، میں ایک کام میں ایسا پھنسا اِدھر کچہری میں کہ واپس نہ آ سکا۔ دیکھو میں اب صبح ہی حاضر ہوں گا۔ خدا ہی خیر کرے۔ وہ شیخ صاحب ایسا اونچا فراڈ کر رہے تھے مگر انھیں اس کی ضرورت کیا تھی؟"

"مجھے کیا پتا۔ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جمیل بھائی! شاید میں ابھی واپس آ جاؤں ورنہ صبح ملاقات ہو گی۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"تم نے اُس کی باتیں سُن لی ہیں نا؟"

"ہاں، چلو اچھا ہوا کہ شیخ صاحب نے کوئی بیان نہیں دیا ہے تمھاری جان بچ گئی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ہو سکتا ہے پولیس اس سے اصل بات اگلوا لے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم یوں کرو کہ یہاں سے فارغ ہوتے ہی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤ۔"

"ہاں میں یہی کرتا ہوں میرا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔"

اتنے میں نیازی صاحب دوبارہ کمرے میں واپس آ گئے "مجھے افسوس ہے بھٹی صاحب! دیر کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ ایک مہمان آ گیا تھا گھر میں۔"

"مسئلہ یہ ہے نیازی صاحب کہ ہماری جیل میں دو قیدی آئے ہیں۔ ایک عورت اور ایک مرد اور وہ اپنے آشتی صاحب کے بہت قریبی عزیز ہیں۔"

"اچھا! وہ ان کے بہت قریبی عزیز ہیں۔"

"اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کی رہائی میں ان کی مدد کریں۔"

"کتنی سزا ہوئی ہے انھیں؟"

"ان کا تو ابھی مقدمہ بھی شروع نہیں ہوا۔ پولیس نے اپنا ریمانڈ ختم کر کے انھیں جیل بھجوا دیا ہے، ویسے وہ عورت پہلے کی سزا یافتہ ہے مگر ابھی اس کی سزا ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ جیل سے بھاگ نکلی اور پھر سنا ہے کہ اس نے کسی آدمی کو قتل کر دیا تھا مگر اس کا ثبوت پولیس کے پاس نہیں ہے۔"

"ان کا مقدمہ ابھی شروع نہیں ہوا ہے... ویسے وہ ہیں کون؟ ان کے نام تو مجھے معلوم ہونے چاہئیں۔"

"یہ بھی ہم بتا دیں گے نیازی صاحب!" بھٹی بہت محتاط انداز میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ ان دونوں کے نام اسے جب ہی بتائے گا جب وہ اس کام پر پوری طرح آمادہ ہو جائے گا۔ "پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟"

"دیکھیں کسی قیدی کو رہا کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کسی کو پتا چل گیا تو ان کی مدد کرنے والے بھی جیل میں بند ہو جائیں گے۔ یہ کام میں نے پہلے کبھی نہیں کیا ہے، ویسے آپ مجھے کوئی اور خدمت بتاتے تو میں انکار نہ کرتا۔"

"پھر بھی، سوچیں تو سہی۔ کام تو یہ ہر حال میں ہو جانا چاہیے۔"

"یہ بتائیں کہ دوسرا آدمی کیوں پکڑا گیا ہے؟"

"وہ اسے عورت کا ساتھی سمجھ کر لے آئے ہیں۔ تین چار آدمی اور بھی ہیں مگر ان کی ہمیں کوئی فکر نہیں ہے۔"

"میرا یہ خیال ہے بھٹی صاحب کہ آپ کسی وکیل سے ملیں۔ وہ ان کے مقدمے کی پیروی کرے جب وہ لوگ عدالت میں ہوں تو اس وقت انھیں بڑی آسانی سے رہا کروا لیا جائے۔"

بھٹی نے بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور "آپ کا کیا خیال ہے آشتی صاحب! پہلے یہ کام نہ کر لیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی مگر مجھے تو ان کی مدد کی ضرورت ہے اور یہ سودا نقد بہ نقد ہو سکتا ہے۔ ہم ان کو منہ مانگی رقم دے رہے ہیں۔" میں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ میں نیازی سے مخاطب ہو رہا تھا۔

"مجھے جب تک صحیح صورتِ حال آپ نہیں بتائیں گے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ ان قیدیوں کے نام کیا ہیں؟"

"دیکھیں آپ جو طریقہ ہمیں بتا رہے ہیں وہ تو بہت اچھا ہے مگر خطرناک بھی ہے۔ ایسے میں پولیس کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ قیدی کو گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے مولانا! کیا وہ سیاسی قیدی ہیں؟ الزام تو ان پر کوئی بھی لگ سکتا ہے۔"

"جی نہیں، وہ سیاسی قیدی نہیں ہیں۔"

"پھر آپ ان کا نام مجھے کیوں نہیں بتا رہے ہیں؟ آپ کو جب مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے تو پھر یہاں آنے کا فائدہ؟ آپ کو یاد ہوگا کہ چند دن پہلے کسی نے اکبر قریشی سے ان کی کوٹھی میں کی تھی، رات کے بارہ بجے اور پھر انھیں وہ لوگ اغوا کر کے لے گئے۔ میں ان کو گولی مار دی اور پھر شدید زخمی حالت میں اسپتال کے پر چھوڑ گئے۔ اب ان کا علاج ہو رہا ہے، ان کی جان بچ گئی ہے۔ میں کل صبح ان سے مل کر آیا ہوں۔ جو باتیں انھوں نے بتائی ہیں حیران کن ہیں۔ اگرچہ قریشی صاحب نے پولیس کو ابھی کوئی بیان نہیں دیا ہے، یہ ان کی مصلحت ہے مگر ان قیدیوں کی ہم نے نگرانی شروع کر دی ہے۔ اب آپ مجھے بھی ویسی ہی صورت میں پھنسانا چاہتے ہیں بھٹی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ بھی جیل کے ملازم ہیں آخر اس مذاق کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا تو ہمیں علم نہیں ہے نیازی صاحب! بہر حال ہم تو مسئلہ آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔" میں نے اس کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے سگریٹ سلگا لیا۔ اس نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ آباد شاہ نے قریشی کو اسپتال پہنچا کر میرے لیے بڑی مشکل پیدا کر دی تھی۔ نیازی غلط کہہ رہا تھا۔ آسیہ اور علی حسن پر ان لوگوں نے بہت تشدد کیا ہوگا اور اب وہ لوگ شاید جیل میں ہوں گے۔ بلکہ انھیں وہاں سے نکال کر انھوں نے کسی صعوبت خانے میں بند کر دیا ہوگا۔ حالات ایسے ہی تھے۔ قریشی بھلا پولیس کو کیا بیان نہ دیتا؟ اسے کیا ہمدردی تھی ہم سے؟

"دیکھیں، اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اکبر قریشی کا مسئلہ ہے آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلے آپ مجھ سے معاوضے کی بات طے کر لیں پھر شاید میں کچھ سوچ سکوں۔"

"ہم... ہم آپ کو ایک لاکھ روپیہ دے دیں گے۔" بھٹی نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لوگ ابھی تک جیل میں ہیں اور پولیس نے دوبارہ انھیں تفتیش کے سلسلے میں وہاں سے نکال نہیں لیا؟"

میرے اس سوال نے اسے بہت زیادہ چونکا دیا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرتا دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے ذہن میں اکبر قریشی کی ابتلا پھر سے ابھر آئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک بڑے غور سے مجھے گھورتا رہا پھر اس نے سگریٹ سلگا لیا، اپنے فراخ ہاتھوں کو کھول کر لکیروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے..... تو میں کہوں گا کہ آپ وہی آدمی ہیں جس نے اکبر قریشی کو اغوا کیا تھا، تو آپ کیا کہیں گے؟ اور ان دونوں قیدیوں کے نام آسیہ اور گردیزی ہیں علی حسن گردیزی۔" تب بھٹی نے بھی مجھے یوں دیکھا جیسے وہ مجھے پہلی بار ایک نئے روپ میں دیکھ رہا ہو۔

"کیا یہ سچ ہے آشتی صاحب! اکبر قریشی کو آپ....؟"

"نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا مگر ان دونوں قیدیوں کو تو بھٹی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی ملاقات اکبر قریشی سے بھی کل شام کو ہوئی تھی اور اس نے بھٹی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس قصے کے اصل کردار کون لوگ ہیں مگر اب اکبر قریشی کے نام کے ساتھ ہی ان دونوں کا نام سن کر وہ لرز اٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نیازی سے کیا کہے۔

"اس کا مطلب یہ ہے آشتی صاحب کہ آپ نے مجھ سے اصل بات چھپا رکھی تھی آپ نے اکبر قریشی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ میں آپ کا اصل منشا سمجھ ہی نہ سکا، حد ہو گئی۔ مجھے افسوس ہے نیازی صاحب! کہ حالات ایسے ہو گئے ہیں۔ پولیس کو فون کریں، ہم اس آدمی کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔" مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بالکل نہتا ہے نیازی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ بھی بے بس تھا کیونکہ میری جیب میں میرا پستول دم سادھے لیٹا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے بلاشبہ میرے آدمیوں کا نام یہی ہے مگر میں نے اکبر قریشی کو اغوا نہیں کیا۔ یہ غلط ہے۔"

"بکواس نہ کر مولانا! یہ دروازہ بند کر دیں بھٹی صاحب اور اسے ادھر ہی باندھ کر ڈال دیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا پستول نکال لیا۔

"ہاتھ پیچھے رکھو نیازی صاحب! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں ساتھ چلو؟ کوئی مذاق سمجھ رکھا ہے تم نے۔ چلاؤ یہ پستول، دیکھتا ہوں تم کیا کر سکتے ہو۔" نیازی نے ایک دم کرسی سے اچھل کر میری دائیں کلائی پر ہاتھ ڈال کر پستول کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اس کی جسمانی قوت میرے لیے بڑی حیران کن تھی۔ مگر جیسے ہی وہ میرے قریب ہوا تو میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔ وہ میرے دام میں خود ہی الجھ گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کی رگِ احساس پوری قوت سے مسل دی۔ وہ اسی وقت فرش پر جا گرا۔ اس عرصے میں بھٹی میری کمر پر دو تین مکے مار چکا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح مجھے زیر کرے گا۔ جیسے ہی نیازی بے ہوش ہوا، میں نے الٹ کر پستول اس کے سینے پر لگا دیا۔

"کیا خیال ہے بھٹی! گولی چلا دوں، آواز بالکل پیدا نہیں ہوگی۔ یہ بے آواز اپنا کام کرتا ہے۔" حالاں کہ یہ بات غلط تھی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دیں آشتی صاحب! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اسے اٹھاؤ اور کار میں ڈال دو، چلو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔ جلدی کرو۔"

"مگر......"

"بکواس بند کر کتے! تیرے ایک ایک گھونسے کا میں تجھ سے بدلہ لوں گا، چل اٹھا اسے۔"

وہ پریشان ہو کر آگے بڑھا اور نیازی کو کمر پر لاد کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ اس وقت گھر کا کوئی آدمی اندر نہ آ جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ان دونوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ کوئی دس ہاتھ کا صحن ہمارے سامنے تھا۔ اسے عبور کر کے ہم بڑے دروازے سے آگے نکلے اور تیزی سے کار تک جا پہنچے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ نیازی کے گھر والے اس وقت اندر کے کسی کمرے میں مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے اور میرے لیے میدان بالکل صاف تھا۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا تو بھٹی نے اپنا بوجھ اس کے اندر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

"چل اب تو اگلی سیٹ پر بیٹھ جا۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا بھٹی! تو نے بہت غلط حرکت کی ہے، چل آگے لگ۔" میں نے پستول پھر اس کی کمر سے لگا دیا تھا۔

وہ لرزتا ہوا اگلی سیٹ پر جا بیٹھا، بولا "مجھے معاف کر دیں آشتی صاحب! میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے مگر اب تم مجھے اکبر قریشی کا قاتل سمجھ رہے ہو

یہی بات ہے، تاہ تیری تنظ پڑی کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" میں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے اُڑاتا ہُوا میں پھر لیاقت روڈ پر جا پہنچا۔

مگر سوال یہ تھا کہ میں اُن دونوں کو ساتھ رکھ کر کیا کرتا؟ اُن کے ایک وار سے تو میں بچ گیا تھا اور یہ بہت ضروری تھا۔ فون اُن کے سامنے رکھا تھا۔ اِک ذرا نمبر گھمانے کی دیر تھی۔ اور وہ دو سکھے مجھ پر غالب بھی آسکتے تھے مگر انھیں کیا معلوم کہ وہ کس سے بات کر رہے ہیں۔ نیازی کا داؤ بہت عمدہ تھا۔ اُس نے میرے تنے ہوئے پستول کا رُخ موڑ دیا تھا۔ اگلا مرحلہ کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مگر میرے دونوں ہاتھ بہت کاری تھے۔ وہ ایک جیسا کام کرتے تھے اور کسی کی رگِ احساس کو مسل دینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کب تک ان لوگوں کی منتیں کرتا رہوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ آبی اور آسیہ جیل میں نہیں ہیں۔ اکبر قریشی کا بیان اُن کے لیے نئی مشکلات پیدا کر چکا ہو گا۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ میں کیا کچھ کر چکا ہوں۔ مجھے اِس سارے فساد سے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ ان کے لیے میں نے اور زیادہ اذیتوں کا سامان کر دیا تھا جس کا کوئی جواز میرے پاس موجود نہیں تھا۔ اِتنا مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ میرے بہت کام آسکتے تھے سب کچھ ان کے اختیار میں تھا مگر اب سب کچھ ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ایسی کس چیز کا بلیدان دُوں آسیہ اور آبی کو کس چیز میں تولوں کہ اُن کی وہ مصیبتیں ختم ہو جائیں۔

"بھٹی! اگر تم نے کوئی آواز نکالی تو اچھا نہ ہو گا۔ میں تھیں اِدھر ہی مار دوں گا۔" میں نے بھٹی کو خوفزدہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ مری روڈ کے چوک پر چند سپاہی کھڑے تھے مگر بھٹی نے انھیں مخاطب نہیں کیا۔ میری دھمکی اُس پر اثر کر گئی تھی۔

میں نے کار کو وقار النسا کالج کی طرف موڑ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چکلالہ روڈ پر جا چڑھے۔ سڑک ویران تھی، اُس پر سے گزر کر ہم سیدھے آگے نکل گئے۔ میں چاہتا تھا کہ اُن دونوں کو باندھ کر کسی جگہ ڈال دوں۔ اُن کو مار دینے سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ واپس جا کر وہ اپنی زندگی پھر سے شروع کر سکتے تھے۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آسیہ اور آبی، اکبر قریشی کے بیان کی وجہ سے جس اذیت سے دوچار ہو چکے تھے، میں اُسے کم تو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اُن دونوں کو مار کر مجھے کیا ملتا۔ حالاں کہ وہ دونوں اس وقت میرے اختیار میں تھے۔ اور بھٹی جان چکا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں مگر پھر بھی میرے دل میں اُن کے لیے ہمدردی تھی۔ مجھے پہچان لینے کے بعد اُن کا اضطراب اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دینے پر آمادہ تھے مگر جب وہ آگے نکلے تو میں ... اُن کی راہ میں دیوار بن گیا اور یہ اچھی بات تھی ورنہ ہو سکتا تھا، وہ میرے ساتھ اور زیادتی کرتے تو میں انھیں وہیں جان سے مار دیتا۔

جب ہم چکلالہ سے آگے نکلے تو اچانک بھٹی نے میرے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے معاف کر دیں آتشی صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس بات کا کسی سے کوئی ذکر نہیں کروں گا۔"

"مگر یہ نیازی تو اِس بات کو کبھی نہیں بھول سکے گا۔"

"میں اِسے بھی سمجھا دوں گا۔ ہم اِس کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔"

"اِس سے مجھے بہر حال کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ تم جو چاہے کرو۔ اگر تم چُپ رہو گے تو اِس میں تمھاری بھلائی ہے ورنہ میں کسی دن تمھیں نتھ ڈال دوں گا۔ میں تمھارے خاندان کو ختم کر سکتا ہوں۔ اِتنی بات یاد رکھو کہ آسیہ اور گردیزی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ سمجھے! نیازی کو بھی سمجھا دینا۔ اب گاڑی سے اُترو اور اِسے لے کر کسی ٹیکسی میں جا بیٹھو۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ سمجھ لو میں نے تمھیں معاف کیا۔" یہ کہہ کر میں نے کار سڑک سے اُتاری اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ "یہ لو، یہ کچھ روپے رکھ لو۔ یہ تمھارے کام آئیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے سو روپے کا ایک نوٹ بھٹی کے حوالے کیا۔ اُس نے نیازی کو اُٹھا کر گاڑی سے باہر نکالا اور گھاس پر ڈال دیا۔ دھوپ اُس گھڑی زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔

میں اُن دونوں پر لعنت بھیجتا ہُوا اُسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں اُن کو شہر لے جا کر بھی چھوڑ سکتا تھا مگر میں اُن سے جلدی ہی جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ میری ساری تدبیریں خاک میں مل گئی تھیں۔ اب تک میرا کوئی تیر نشانے پر نہیں بیٹھ سکا تھا۔ قسمت نے نتھنوں میں تیر دے رکھا تھا۔ کوئی گھڑی سکون کی نہیں آتی تھی۔ کاش آسیہ نے میری بات مان لی ہوتی تو وہ آج یوں اُس بندی خانے میں رُسوا نہ ہوتی۔ بہت روپیہ تھا میرے پاس، وہ میں سارا اُسے دے سکتا تھا۔ وہ قندھار میں نہ ٹھہرتی کسی اور جگہ نکل جاتی۔ اُسے زمین کا شوق تھا، وہ زمیندارنی بننا چاہتی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ میں اُس کا یہ شوق بھی پورا کر سکتا تھا۔ وہ کسی بھی جگہ زمین خرید کر بیٹھ سکتی تھی۔ ماں کو بھی اپنے پاس بُلا سکتی تھی۔ وہ چاہتی تو میں اس کا نکاح بھی کروا سکتا تھا۔ آبی بھی اس کے لیے تیار تھا۔ اُسے آسیہ سے بہت محبت تھی۔ وہ اُسے پسند بھی کرتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو میں لاکھوں روپے اُس کی مناکحت میں اُسے دے سکتا تھا۔ اِس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور بندھی بندھائی ماری گئی۔ اُسے کیا مل سکا؟ زندگی نے اُسے سارے ہی مواقع مہیا کیے، اُس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ روپیہ جس کی اُسے ضرورت تھی، ہمارے پاس موجود تھا۔ مگر... مگر وہ اپنے ارادوں کی اُڑان میں ہی ماری گئی اور اب وہ گھائل مُرغابی کی طرح جیل کے صحن میں جا گری تھی۔ ٹھنڈی برفیلی ہوائیں راس نہیں آتی تھیں۔ اب وہ اُن تپتی بلکتی دیواروں کے پیچھے جا گری تھی جہاں سے اُسے نکال لینا میرے بس میں نہیں تھا، کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اِس ذرا سی دیر میں اس کا رنگ کتنا بدل گیا تھا۔ آبی کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ جیل کے دن رات اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں بُجھ سی گئی تھیں۔ یہی حال آسیہ کا تھا جسے دیکھ کر سورج چمکنے لگتا تھا... مگر اب انھیں بھی اپنا رنگ رُوپ کھو بیٹھی تھیں۔ کوئی ایسے مریضوں کے لیے دوا دارو کا بندوبست کہاں سے کر سکتا تھا جو اپنی ہی بداعمالیوں کی وجہ سے بسترِ علالت پر جا گرے ہوں۔ اکبر قریشی کا تعاون حاصل کرتے کرتے میں نے جیل میں اُن کے لیے ایک اور دشمن پیدا کر دیا تھا، اب وہ جو کچھ بھی کرے کم تھا۔ اس آبادشاہ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی۔ کیا ضرورت تھی اُس قریشی کے بچّے کو اسپتال کے دروازے پر پھینکنے کی۔ اُسے صحتیابی کی منزل پر اُس نے کیوں لے جا پھینکا؟ محض اس لیے کہ وہ اُن کے کام آتا تھا مگر میرا کام تو اس نے پوری طرح بگاڑ دیا تھا۔ اب وہ صحتیاب ہو رہا تھا۔ لوگوں کو سمجھا رہا تھا کہ اس کے مجرم اُس کے سامنے ہی ہیں۔ میرا بُرا ہو میں اُسے آسیہ اور گردیزی کی بات بتا آیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کام بن جائے گا۔ مگر میں تو اُسے اور بگاڑ آیا تھا۔ اب وہ جیل اسپتال سے نکل کر سیدھا اُن دونوں پر عذاب بن کر نازل ہو گا۔ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ نیازی کو یہ بات بتا سکتا تھا کہ اِس پر حملہ کس نے کیا ہے اور کس وجہ سے کیا ہے تو پولیس کو اُس نے کیا کچھ نہیں بتایا ہو گا۔

میں حالات کے اس دھارے پر بہتا ہُوا لرزاں ترساں حالت میں کار لے کر ایک بار پھر صدر کی طرف چل نکلا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ اب میں اپنا سارا کام کسی وکیل کے سپرد کر دوں گا۔ دیکھتا ہوں کہ قانون میری اور اُن کی کیا مدد کر سکتا ہے۔

ماں کے خیال نے بھی مجھے بہت آزردہ کر رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خُدا جانے ہمارے لیے کیسی کیسی دُعائیں مانگتی رہتی تھی۔ مگر وہ سب کی سب اُلٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ ہمارے لیے امن و آشتی چاہتی تھی، دعا مانگتی تھی کہ خُدا ہمیں خوشیاں اور مسرتیں عطا کرے۔ مگر ہمارا ہر گزرنے والا لمحہ ہمارے لیے نئی اذیتیں لے کر آتا تھا۔ آسیہ کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں چاہا تھا۔ مگر... آسیہ کو ملا کیا؟ صرف لامتناہی دُکھ اور مصائب کا گورکھ دھندا؟

میں سیدھا ہوٹل جا پہنچا۔ ماں مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اور زیادہ دُکھی ہو گئی، بولی "کیا بنا بیٹے! کوئی سبیل نکلی آسیہ کی رہائی کی؟"

صنعیہ جاوداں دوزنامہ بچی کہانیوں کے مُصنف
الیاس سیتاپوری
کی دو نئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں

آشنا آشنا
قیمت: ۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے

زرِ زم زم
قیمت: ۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے

دونوں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر صرف ایک کتاب کی قیمت ادا کریں۔ دُوسری کتاب مُفت
ڈاک خرچ -/۵ روپے ملا کر کل وی پی -/۲۵ روپے کا کیا جائے گا

● یہ پیشکش صرف محدُود مدّت تک کے لئے ہے!

ملنے کا پتہ

"نہیں ماں جی! کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ آسیہ لمبے چکر میں پھنس گئی ہے۔ میں۔۔۔ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔"

"صبح تو تم بہت دلاسا دے رہے تھے مجھے۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

"ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا ہے ماں جی! میں۔۔۔۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ جس طرح آپ نے پہلے صبر کیا تھا، اب بھی ویسا ہی پتھر سینے پر رکھ لیں اور بھول جائیں کہ آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے۔ میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے کسی کے لیے کُڑھنے کا۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو! اس کے لیے یہ ساری مصیبتیں تمھاری پیدا کردہ ہیں اور اب تم ہی مجھے صبر کرنے کا کہہ رہے ہو۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی بیٹے! تم نے ہم پر بہت ظلم کیا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے ماں جی! میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے تو اُس کے لیے ایک صاف ستھری زندگی کا تصوّر باندھ رکھا تھا اور اب تو میں تُو بنی ہاتھ میں لے کر اس کے لیے رہائی اور آزادی کی دُہائی دے رہا ہوں مگر اس جنگل میں میری کون سنتا ہے۔ زوری، زر اور زاری بھی کسی کام نہیں آتے۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا ہوں۔"

"یہ بات نہ کہو! اس کے لیے کسی وکیل سے ملو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ تم غلط طریقے سے اُس کی مدد کر رہے ہو۔ یہ صحیح راستہ نہیں ہے۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔"

"تم جیل میں نقب لگانا چاہتے ہو۔ جہاں نقب زن جمع ہیں۔ اُن سے تم مدد کی توقع رکھتے ہو!"

"ایسا نہیں ہے ماں جی! ایسا نہیں ہے۔ میں کیا کروں، میری کوئی پیش نہیں چلتی ہے۔ میں بہت دُکھی ہو رہا ہوں ماں جی! مجھے آپ کی محبت اور شفقت کی ضرورت ہے۔ میں بہت بے آسرا ہو گیا ہوں۔"

میں نے اپنا سر اُن کے بازوؤں سے لگا دیا۔ میں رونا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں جھرنا بن گئی تھیں۔ پتا نہیں میں کب سے نہیں رویا تھا۔ مگر اُس دن ماں کو سامنے دیکھ کر میں ضبط نہ کر سکا۔۔۔۔۔۔۔

وہ پلنگ پر بیٹھی تھیں، مجھے یوں نڈھال اور اتنا بے بس دیکھ کر اُن کی بھی آنکھیں بہہ نکلیں اور وہ اتنا روئیں کہ میرے سر کے بال اُن کے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ وہ بھی خدا جانے کب سے وہ بارش آنکھوں میں سمیٹ کر بیٹھی تھیں۔ ایک عمر کے بعد وہ پہلا دن تھا کہ وہ مجھ پر اور میری بے بسی پر رو رہی تھیں اور میں جو بڑا مُنہ زور تھا۔ جس کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں تھا، ہوٹل کے اُن بند دروازوں میں اُن کے پیروں پر سر رکھ کر گریہ وزاری کر رہا تھا۔

بالآخر انھوں نے میری آنکھیں پونچھ ڈالیں اور مجھے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر کے بولیں۔ "یوں ہمت نہ ہارو بیٹے! دنیا ختم نہیں ہو گئی ہے، پھر سے کوشش کرو، مجھے بہرحال تم بھیج دو۔ مجھ سے بیٹی کا یہ دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ تم جس طرح بھی ہو چک سوالن بھیج دو۔ میرا دل بہل جائے گا۔ میں اسے تقدیر کا لکھا چپ ہو جاؤں گی۔ میرے لیے یہی بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! کل میں آپ کو یہاں سے چک سوالن دوں گا۔ کیا آپ تنہا سفر کر سکیں گی؟ میں آپ کے ساتھ نہیں سکوں گا، یہ میری مجبوری ہے۔"

"تیری کیا مجبوری ہے؟ تیرا کیا کام یہاں رُکا ہے؟ تو میرے ساتھ چل بیٹے! یہ بہت بُری بات ہے، ماں کو آخری کندھا بھی نہ دے گا؟"

"ایسا نہ کہیں ماں جی! ایسا نہ کہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ کو میں ایک نئی گاڑی لے دیتا ہوں۔ ایک ڈرائیور بھی آپ کے ساتھ رہے گا، وہ آپ کی خدمت بھی کرے گا۔"

"اِتنے پیسے ہیں تیرے پاس؟ نئی گاڑی لے دے تو!"

"ہاں، اس کی فکر نہ کریں، پیسے بہت ہیں میرے پاس۔ سے کیا چیز اچھی ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور ہاتھ مُنہ دھو کر پھر سے تازہ دم ہو گیا۔ عمامہ مجھے بہت سجتا تھا اور میں نے رکھا تھا کہ جب تک اس سے کام چلا میں اسے سر پر ہی رکھوں گا۔ عبا بھی میرے لیے نئی چیز تھی۔ میں اُسے پسند کرنے لگا تھا۔ کا خواہ مخواہ دُوسروں پر رعب پڑتا تھا اور لوگ سمجھتے تھے کوئی بڑا عالم چلا آ رہا ہے۔ نیازی نے تو مجھے دیکھتے ہی مولانا کا لقب دے دیا تھا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے، مجھے ایسا نہیں چاہیے تھا۔ کہاں وہ اللہ والے نیک لوگ اور کہاں میں سارے جہان کا چھٹا ہوا بدمعاش۔ میں بھلا اُن کا مقابلہ کیسے کر سکتا مگر اپنی ضرورت کے لیے میں نے وہ حلیہ اپنا لیا تھا۔

دوپہر کا کھانا میں نے ماں جی کے ساتھ کھایا۔ نیند اُن کی اُڑ گئی تھی۔ وہ بھی قیلولہ نہ کر سکی تھیں اور مجھے تو اُن دنوں فکریں لاحق ہو گئی تھیں کہ رات کو بھی مجھے نیند نہیں آتی تھی۔

دوپہر دو بجے کے قریب میں بازار میں نکل آیا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ماں جی کو نئی گاڑی دے کر گاؤں بھیجوں گا۔ ماموں جی بھی یاد کریں گے کہ ماں جی کے بیٹے نے انھیں کیسے رخصت کیا ہے۔ اب کی بار اُن کے پاس ڈرائیور بھی ہوگا اور ایک نوکر بھی اور وہ گاؤں میں زیادہ ٹھاٹھ سے زندگی گزار سکیں گی۔ مکان انھوں نے اپنے لیے الگ بنوا رکھا تھا اور یہ بہت اچھی بات تھی۔

صدر کی ایک دکان سے میں نے سنی ڈاٹسن کی قیمت پوچھی۔ معلوم ہوا کہ وہ کُل چھیانوے ہزار میں آتی ہے اور یہ قیمت زیادہ نہیں تھی۔ فرم کا مالک کوئی بہت ہی بھلا آدمی تھا۔ بولا: "آپ میں نوّے ہزار کی دے دُوں گا۔ پہلی بار آپ میری دکان پر آئے ہیں۔ میں آپ کو اپنا گاہک بنانا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے صاحب! کیا اسمِ گرامی ہے آپ کا؟"

"مجھے خواجہ نوازش علی کہتے ہیں۔"

"بات یہ ہے خواجہ صاحب کہ مجھے ایک ڈرائیور کی بھی ضرورت ہے، اس کا بندوبست کر سکیں گے آپ؟"

"کیسا ڈرائیور چاہیے آپ کو؟"

"کوئی ایسا ہو جو میری والدہ کے ساتھ گاؤں میں رہ سکے۔ وہ وہاں تنہا رہتی ہیں اور میں کاروبار کے سلسلے میں اکثر باہر ہی رہتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ایسا آدمی مل سکتا ہے مگر اس کے بال بچوں کو بھی وہاں رہنا ہوگا۔ اُن کا بندوبست ہو سکتا ہے؟"

"جی ہاں! میرا خیال ہے ہو سکتا ہے۔ نہ ہُوا تو ہم اُسے الگ مکان بنوا دیں گے، کوئی مشکل بات نہیں ہو گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ابھی فون پر کہہ دیتا ہوں۔ آپ چار چھ آدمیوں میں سے کسی کو منتخب کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ سات بجے یہاں آ جائیں۔ گاڑی بھی لے لیں اور ڈرائیور بھی۔"

"بس یہ ٹھیک رہے گا۔ میں سات بجے آ جاؤں گا۔ یہ آسمانی رنگ کی گاڑی ٹھیک رہے گی، اس میں تمام ضروری سامان لگوا دیں۔ اے سی کا بھی بندوبست کر دیں۔"

"بس ٹھیک ہے یہی لے لیں۔ یہ ساری گاڑیاں نئی آئی ہیں۔ میں اس میں آپ کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی رکھوا دیتا ہوں۔"

میں نے اُسی وقت رقم اُسے گن دی۔ نوٹ میں ساتھ لے کر گیا تھا۔ رسید لے کر میں وہاں سے نکلا اور سیدھا ایک سینما ہال میں جا بیٹھا۔ وہاں کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ انگریزی فلموں کے نام مجھے اکثر یاد نہیں رہتے۔ وہ بھی کوئی مار دھاڑ کی فلم تھی مجھے پسند آئی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے بڑی خلقت آئی ہوئی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ سینما کے تمام حصے بھر گئے تھے۔ یہاں تک کہ سب سے عمدہ جگہ میں بھی اُس روز تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ میں چونکہ زیادہ ہی پہلے پہنچ گیا تھا، اس لیے مجھے تو اپنی پسند کی نشست مل گئی تھی مگر دوسروں کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ حیرت ہے کہ لوگ اتنی تعداد میں انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں اور فلموں پر بے تحاشا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم کوئی غریب مُلک کے باشندے ہیں۔ لوگوں کے پاس ایسی نمائش بینی کے لیے بہت روپیہ تھا اور وقت بھی۔ زیادہ تر لوگ اپنی بیگمات کے ساتھ آئے ہوئے تھے یعنی وہ طبقہ جس کی امارت اُن کے حلیے سے ظاہر ہوتی ہے۔ نمود و نمائش نے بہت زیادہ خراب کر رکھا ہے۔ اُن کو یوں اپنی بنی سنوری بیگمات کے ساتھ سینما ہال میں دیکھ کر مجھے یقین ہونے لگا کہ بیگمات نے شوہروں کو اس حد تک بہجا رکھا ہے کہ وہ اُن کے بغیر فلم بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ابھی وی سی آر کی بات نہیں پھیلی تھی اور لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ گھروں پر بھی فلمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

فلم شروع ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اور ابھی بتیاں گُل نہیں ہوئی تھیں کہ میرے قریب کی نشست پر ایک صاحب اپنی بیگم کے ساتھ آ بیٹھے۔ دونوں نشستیں خالی تھیں اور غالباً انھوں نے پہلے سے مخصوص کروا رکھی تھیں۔ وہ آئے اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس آدمی نے کوئی بہت ہی عمدہ قسم کی خوشبو لگا رکھی تھی۔ ایسی خوشبو جس نے ماحول کو معطر کر دیا۔ خوشبو مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے اور ایسی عمدہ خوشبو تو مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ اُن کے ساتھ جو خاتون تھیں، وہ بھی مہک رہی تھیں۔ اور شاید وہ بھی وہی خوشبو استعمال کرتی تھیں جو اُن کے شوہر نے لگا رکھی تھی۔ ایک عمدہ قسم کے برقعے میں وہ ملبوس تھیں۔

فلم جلد ہی شروع ہو گئی۔ میرا دھیان مگر ابھی تک انھی کی طرف تھا لیکن اُن کی گفتگو کا سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، البتہ ایک جیل کا لفظ بار بار مجھے چونکا رہا تھا۔ فلم کے مکالمے اتنی بلند آواز میں ادا ہو رہے تھے کہ اُن دونوں کی باتوں میں سے کوئی فقرہ مکمل طور پر سُن لینا میرے بس میں نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے کان اُدھر ہی لگائے رکھے اور سر کو بائیں طرف جھکا کر اُن کی طرف متوجہ رہا۔ تب مجھے محسوس ہُوا کہ وہ آدمی جیل کی سزا بھگت رہا ہے اور کوئی وحید احمد ہے جس کی وجہ سے وہ ہر مہینے جیل سے باہر نکل آتا ہے اور ایک دن یا ایک رات باہر گزار کر واپس چلا جاتا ہے۔ گفتگو وہ دونوں انگریزی میں کر رہے تھے۔ دونوں کا لہجہ بہت ہی شُستہ تھا۔ وہ خاتون بھی بہت عمدہ انگریزی بول رہی تھی جسے سُن کر مجھے حیرت ہو رہی تھی اور آج انھوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی مغز ماری کے بعد میں اُن کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا سکا ورنہ وہ بڑی بے ربط گفتگو تھی۔ وہ خاتون اس آدمی کی منگیتر تھی۔ اس شخص کو کسی غبن کے معاملے میں سات سال کی سزا ہوئی تھی لیکن اس کے محکمے کا مجھے کوئی علم نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ اتنی بات ظاہر تھی کہ وہ روپیہ اُس شخص کے پاس ابھی تک محفوظ پڑا تھا۔ نام اس کا عبدالمتین تھا۔ خاتون کو وہ بُشریٰ کے نام سے پکار رہا تھا۔

آدمی اگر کوشش کرے، صدقِ دل سے کوشش کرے تو کسی راز کی حقیقت معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ مجھے اُن کی بات چیت سُننے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی وقت صرف کرنا پڑا۔ بالآخر انٹرول ہو گیا۔ بتیاں پھر روشن ہو گئیں اور مختلف چیزیں بیچنے

والوں نے شور مچا دیا۔ ہمارے بائیں ہاتھ ایک بیرا کھڑا تھا۔ خاتون نے اپنا جھلملاتا ہوا ہاتھ اُٹھا کر اسے اپنے قریب بلا لیا، بولی۔ "ہمارے لیے چلتے لے آؤ مگر بسپر یٹ اور کچھ کھانے کو بھی۔"

"جی بہت بہتر۔" بیرا فوراً ہی بغلی سیڑھی کی طرف بھاگا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ تب میں نے پہلی بار اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ خاصا وجیہ آدمی تھا، ستواں ناک، تنگ دہن، فراخ ماتھا، ٹھوڑی ذرا سی اندر کو دبی ہوئی، سامنے کے دانت ذرا سے اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور وہ ٹو شرٹ پینٹ میں ملبوس تھا۔ خوشبو جو انھوں نے لگا رکھی تھی وہ خواہ مخواہ دوسروں کو اُن کی طرف متوجہ کراتی تھی اور یہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا، وہ تھے بھی اس قابل کہ لوگ اُن کی طرف توجہ دیں۔ خاتون کا جہاں تک سوال تھا، وہ سرتاسر برقعے میں تھی۔

کچھ ہی دیر بعد بیرا واپس آ گیا اور اس نے چائے کے سامان سے بھری ٹرے اس خاتون کے سامنے کر دی۔ اس نے وہ ٹرے لے کر زمین پر ڈالی اور برقعے کے اندر ہی اندر چائے بنانے لگی۔ اتنے میں بتیاں پھر بجھنے لگیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فلم پھر شروع ہو رہی تھی مگر ابھی اشتہارات ہی دکھائے جا رہے تھے اور ہال کے وسط کا ایک قمقمہ ابھی روشن تھا۔

خاتون نے چائے بنا کر متین صاحب کو پیش کی اور پھر وہ دونوں فلم دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ قمقمہ بھی بجھ گیا اور اصل فلم پردۂ اسکرین پر دکھائی جانے لگی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ خاتون اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ "میں ذرا باتھ رُوم تک جاؤں گی۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" بات وہ اب بھی انگریزی زبان میں کر رہے تھے۔ مگر وہ خاتون نہیں مانی۔

"آپ تکلف نہ کریں، میں چلی جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کرسیوں کی رَو میں سے گزر کر دیوار تک جا پہنچی اور سیدھی ہال کے دروازے سے باہر چلی گئی۔ متین صاحب وہیں بیٹھے رہ گئے۔ میں نے چاہا کہ میں ان سے کوئی بات کروں مگر وہ اپنے خیالوں میں اتنے مگن تھے کہ مجھے ہمت ہی نہ ہوئی اور میں بھی فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔

بُشریٰ کو وہاں سے ہٹے کوئی دس منٹ ہو گئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے عبدالمتین صاحب کا سر ڈھلکنے لگا ہے۔ وہ بہت بے چینی محسوس کر رہے تھے مگر اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ وہ اپنا سر نشست پر بڑی مشکل سے سنبھال رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے صاحب آپ کو، خیر تو ہے؟" مگر میری اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پتا نہیں کیا ہوا، میں ایک دم تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سیدھا باتھ رُوم کی طرف نکل گیا۔ یہ میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے وہاں سے ایک دم باہر نکال دیا تھا۔ باتھ روم کے دونوں حصے سینما کے دائیں ہاتھ بنے تھے اور وہ دونوں تھے۔ عورتوں کا باتھ روم بھی خالی تھا اور مردوں کا بھی، اس وقت کسی کا وہاں ہونا قرینِ قیاس نہیں تھا۔ بشریٰ وہاں نہیں تھی۔ میں تیزی سے باہر نکلا تو مجھے سینما کے گیٹ سے بشریٰ ایک ٹیکسی کو روکتی نظر آئی مگر جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی اور ڈرائیور نے اس کی رفتار دی تھی۔ میں صرف اس کے نمبر ہی پڑھ سکا تھا۔ وہ آر آئی ڈی چھتیس نمبر کی کار تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر آس پاس کوئی ٹیکسی نہ مل سکی تو میں پریشان ہو کر پھر سینما ہال کی طرف آیا اور سیدھا اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ متین صاحب کے ہاتھ ٹھنڈے برف ہو چکے ہیں، اُن کا سر نشست کے پچھلے حصے پر یوں ٹکا ہوا تھا جیسے وہ فلم نہیں دیکھ رہے بلکہ چھت کو گھور رہے ہوں۔ جو ہاتھ نشست کے دائیں ہاتھ پر تھا، میں صرف وہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹخ ہو رہا تھا اور ان کی جان قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ انھیں مرے ہوئے پانچ منٹ گزر چکے تھے اور میں پندرہ منٹ گزار آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں زہر دیا گیا ہے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ میں اس صورتِ حال کا کسی بھی طرح سامنا کر سکتا تھا، میری کچھ اپنی مجبوریاں تھیں۔ میں سینما کے مالکوں کو اطلاع دیتا، فلم رُکواتا، وہ پولیس کو بُلا لیتے اور تفتیش ہوتی تو معاملہ وہیں آ ٹھہرتا کہ مقتول کے آس پاس اور کون کون براجمان تھا۔ ایسا گنہگار تھا کہ پولیس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میرے لیے سب سے بہتر یہی تھا کہ میں وہاں سے ٹل جاتا۔ کسی کو تک یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ عبدالمتین پر کیا گزر چکی ہے۔ میرا وہاں سے اُٹھ جانا بھی غلط تھا مگر میں وہاں ٹھہر کر مزید پریشانیاں پیدا کر سکتا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط سے اِرد گرد کا جائزہ لیا اور پھر آخری نظر عبدالمتین پر ڈال کر میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں سے باہر جا چکا تھا مگر میرے ذہن پر عجیب سا اضطراب تھا۔ کوئی بات نہ ہوئی! ایک خوبصورت عورت کے ساتھ اتنی امنگ سے آپ فلم دیکھنے جائیں اور برقعے کی اوٹ سے چائے کی زہر بھری پیالی آپ کو پیش کر دی جائے تاکہ آپ کا خاتمہ بالخیر ہو سکے اور وہ آدمی یہ نہ سمجھ سکے کہ ہوا کیا ہے۔ عبدالمتین جیل سے کچھ وقت کے لیے اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے باہر آیا تھا۔ پتا نہیں یہ اجازت اسے کس نے دی تھی، وہ کسی وحید احمد کا نام لے رہا تھا اور اس بات پر بہت مطمئن تھا کہ وہ اُس کا دوست ہے۔ وحید احمد نے اتنا خطرہ مول لے رکھا تھا کہ عبدالمتین کچھ دیر کے لیے باہر گھوم سکے۔ اسے جیل میں اور بھی کئی مراعات حاصل ہوں گی۔ ایسے بھی لوگ تھے جو اس محبس کو بھی اپنا گھر سمجھتے

تھے۔ انھیں وہاں ایسی ایسی سہولتیں حاصل ہو جاتی تھیں! اُس عبدالمتین نے بھی یہ سہولت حاصل کرنے کے لیے بہت رشوت دی ہو گی۔ جب ہی تو وہ ہر مہینے گھر لوٹ آتا تھا۔ یہ بات میں نے سُن تو رکھی تھی مگر اس کا تجزیہ مجھے اس روز ہو رہا تھا۔

سینما سے نکل کر میں سیدھا ایک ہوٹل میں جا بیٹھا اور ایک الگ تھلگ نشست سنبھال لی۔ زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا اور میز پر رکھا اخبار دیکھنے لگا مگر ذہن میں یکسوئی ہی نہیں تھی۔ سوچیں گڈمڈ ہوئی جاتی تھیں، ایسے میں ایک صرف سگریٹ ہی میرا مونس و غمخوار تھا جسے سلگا کر مجھے سکون کا احساس ہونے لگتا تھا۔ بشریٰ ٹیکسی میں فرار ہوئی تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے اس کی آخری جھلک دیکھ لی مگر اس کو روک لینا تو کسی بھی طرح میرے بس میں نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ بہت کام کی عورت ثابت ہو سکتی تھی۔ عین ممکن ہے عبدالمتین کے لیے جیل کا دروازہ اسی نے کھلوا رکھا ہو۔ یہ اس کی ہی کرشمہ ساز نگاہ کا اشارہ ہو کہ اس نے عبدالمتین کے لیے یہ رعایت حاصل کر لی ہو مگر اس نے عبدالمتین کو زہر کیوں دیا؟ یہ بڑا اہم سوال تھا اور میں اسے حل کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرا مفاد بھی جیل سے وابستہ تھا۔ وہ دونوں وہاں سے کسی طرح رہا ہو جاتے تو میری ساری پریشانیاں ختم ہو جاتیں۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی کُنجِ تنہائی میں جا بیٹھتا۔ بہت اُلجھ چکا تھا میں زندگی سے مگر وہ راستہ نہیں دیتی تھی۔ اگر آسیہ جیل میں نہ پہنچتی تو پھر شاید کرنے کے لیے مجھے کوئی کام نہ تھا۔ میں واقعی یہ دُنیا تیاگ دیتا، مگر اب مجھے جم کر، ٹھہر کر اس چومکھی لڑائی میں اپنا کردار ادا کرنا تھا اور ایسے میں بشریٰ میرے بہت کام آ سکتی تھی مگر اس کو ڈھونڈ لینا بھی تو آسان نہیں تھا۔ صرف اس ٹیکسی کا نمبر ہی مجھے یاد رہ گیا تھا لیکن اس کا کیا ثبوت تھا کہ ٹیکسی والے اسے اپنے گھر کے سامنے اُتارا ہو گا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس کی سمت کا اندازہ اس ٹیکسی ڈرائیور سے کیا جا سکتا تھا مگر اس کو تلاش کر لینا بھی بہت مشکل تھا۔ اگر وہ اچانک ہی مجھے کہیں نظر آ گیا تو اور بات ہے، ورنہ میں اس کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

میں کافی دیر ہوٹل کے وسیع لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ چھ بج گئے۔ وہاں سے اٹھ کر میں سیدھا خواجہ نوازش علی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے گاڑی بہ طرح ہادی تھی اور اس میں پٹرول بھی اس نے بھروا دیا تھا۔ سارے کاغذات تیار تھے، وہ میں نے اس سے لے لیے۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس روز اس نے ایک گاڑی بیچ لی تھی۔

گاڑی کو اچھی طرح دیکھ پرکھ کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے وہ چار آدمی بلوائے جو اس نے میرے کہنے پر وہاں جمع کر لیے تھے اور اُن میں سے مجھے [illegible] کا انتخاب کرنا تھا تاکہ وہ ڈرائیور کی خدمات انجام دے سکے۔ میں سمجھ گیا آدمی تھا، اُن کا انٹرویو کیا لیتا۔ ایک ادھیڑ عمر کا ڈرائیور بہرحال مجھے اچھا لگا۔ نام اس کا نظام دین تھا اور وہ اُن دنوں بہت ہی پتلے حال میں تھا۔

اُس کو جب میں نے دیکھا تو خواجہ صاحب بولے۔ "جناب میرا خیال ہے آپ میری ذمے داری پر اسے ملازم رکھ لیں۔ یہ کہیں بھی رہ سکتا ہے، اکیلا دم ہے اس کا۔ ہر خدمت کے لیے تیار ہو گا۔ یہ کھانا بھی پکا سکتا ہے، گھر کا کام کاج بھی کر سکتا ہے اور پھر ڈرائیور کا ڈرائیور۔"

نظام دین مسکرایا تو مجھے محسوس ہوا کہ اسے اپنے دانتوں کی صحت کا بہت خیال رہتا ہے۔ اتنے صاف ستھرے چمکیلے دانت میں نے خال خال ہی دیکھے تھے، وہ بولا۔ "صاب جی! آجما کر دیکھ لیں۔ ہوں تو چٹا اَن پڑھ، پر کام میں بہت ستھرا کرتا ہوں، سب کھدمت کر سکتا ہوں۔ روٹی کپڑا اور تھوڑی سی تنکھاہ۔ میرا کھرچا بھی زیادہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے چند کاغذات مجھے دکھائے جن میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا اور ڈاکٹر فیروز کی تعریفی اسناد بھی۔

"کتنے پیسے لو گے تم؟"

"بس جی آپ چھ سو دے دیں۔ وہ میں اپنی گھر والی کو بھیج دیا کروں گا۔ وہ اِدھر آٹھ مقام رہتی ہے، چار بچیاں ہیں میری اور ایک بیوی۔ آپ کو دعا دیں گے۔"

"تم کوئی ٹیکسی کیوں نہیں لے لیتے؟"

"کہاں جی! یہ دھندا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اُدھر پھر وج صاب تھے نا جی، ڈاکدار۔ وہ گُجر گئے اللہ بخشے بہت اچھے آدمی تھے۔ اُن کے پاس میں نے سولہ سال کام کیا۔ اب تو کسی چیج کا مجا ہی نہیں رہا۔ وہ مجھے پانچ سو دیتے تھے۔ آکھری تنکھاہ یہی تھی میری۔ آپ چھ سو دے دیں اور روٹی کپڑا مل جائے تو یہی بہت ہے۔"

"ٹھیک ہے یار جی! آج سے تم ہمارے 'مُلاجم' اور ہم تمھارے نوکر۔ کیوں کھاجا صاب! کیسی رہی؟"

"ایک دم فسٹ کلاس۔ ذمے داری اس کی میں لیتا ہوں۔ کوئی بات ہو، آپ مجھے پکڑ لیں، یہ بہت کھرا بندہ ہے، نہ چوری میں نہ چکاری میں۔ ڈاکٹر فیروز کے پاس اس کا بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ اسے عادت پڑ گئی ہے لگی بندھی تنخواہ کی۔"

"تو ٹھیک ہے پھر، تم گاڑی نکالو اور میرے ساتھ چلو۔ تمھیں آج ہی لاہور جانا ہو گا۔"

"میں تیار ہوں صاب جی! مگر آپ کے پاس بھی تو ایک گاڑی ہے۔" اس نے مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھ لیا تھا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں اسے یہاں خواجہ صاحب کے پاس چھوڑ دیتا ہوں، کل کسی وقت لے لوں گا۔"

"کوئی بات نہیں، گاڑی آپ میرے گیراج میں رکھوا دیں۔ چلو نظام دین! یہ گاڑی باہر نکالو۔"

کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنی کار خواجہ صاحب کے گیراج کے اندر چھوڑی اور نئی گاڑی لے کر باہر نکل آیا۔

نظام دین بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ اس نے گاڑی سڑک پر ڈالی تو بولا "آپ نے بہت اچھا سودا کیا ہے صاب جی! یہ بہت وڈیا گاڑی ہے۔ پیٹرول بھی کم کھرچ کرتی ہے مجا آتا ہے اسے چلانے میں، واہ واہ۔"

اس نے ایک ایک کر کے اس کے سارے ہی پرزوں کو آزما کر دیکھ لیا۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔

"اس کے کاغذات اور نمبر وغیرہ کا کام تم لاہور جا کر کروا سکتے ہو۔ وہاں ہمارا ایک ملازم حیدر ہو گا۔ وہ بھی سمجھ دار آدمی ہے۔ مجھے امید ہے تمھاری اس سے اچھی نبھ جائے گی۔"

"جو میرے مولا کو منظور۔ میں تو جی پیدا ہی کھدمت کے لیے ہوا ہوں۔ کل پرسوں آپ پھر پنڈی آجائیں گے۔"

"ہاں مجھے کچھ کام ہے یہاں۔ بہرحال ایک میری ماں جی ہیں، تم ان کے ساتھ ہو گے۔"

کچھ ہی دیر بعد میں نے وہ گاڑی ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرائی۔ نظام دین اندر ہی بیٹھا رہا اور میں ماں جی کے پاس جا پہنچا۔ وہ مغرب کی نماز کی تیاریاں کر رہی تھیں، مجھے دیکھ کر بولیں "پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ میں چک سوالن چلی جاؤں؟"

"آپ لاہور جائیں گی ماں جی! ادھر گلبرگ میں میں نے ایک کوٹھی خرید رکھی ہے۔ آپ اس میں مالک کی حیثیت سے رہیں گی۔ دو ملازم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ایک ڈرائیور ہے نظام دین... وہ آپ کو یہاں سے گاڑی میں بٹھا کر لاہور لے جائے گا۔ کوٹھی میں میرا ایک ملازم حیدر رہ رہا ہے، وہ آپ کی بہت خدمت کرے گا۔ بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ آسیہ کو میں کسی نہ کسی طرح جیل سے رہا کروا لوں گا۔"

"تمھارے پاس وہاں کوٹھی بھی ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔ گلبرگ میں ہے نا؟"

"ہاں ماں جی! آپ اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔"

"تم میرے ساتھ چلو گے نا؟"

"ہاں ہاں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ کو وہاں ساری سہولتیں مہیا ہوں گی۔ آپ کا بیٹا کوئی ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہے۔"

"تو چلو پھر تیاری کرو۔ ہوٹل کا بل ادا کر کے ہم آج ہی لاہور چلتے ہیں۔ مجھے کیا لینا ہے اُدھر چک سوالن میں۔ تیرے اس لعنتی ماموں کے پاس ہے کیا سوائے حسد کے؟" یہ کہہ کر وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

کچھ ہی دیر بعد مغرب کی اذان ہو گئی۔ انھوں نے نماز ادا کی اور کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد بولیں۔

"بس ٹھیک ہے، اب نکل چلو۔ میں وہاں اطمینان سے اب تیرے بیاہ کا بھی بندوبست کر سکوں گی۔ بہت آوارہ گردی کر لی ہے تم نے۔ وہ بھی گھر آ جائے تو میں اس کا بھی اچھی طرح بندوبست کر دوں گی، اس چھوکری کا۔ نام آسیہ اور کام دیکھو بھلا... ایسی نکلے گی وہ! مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔"

"ایسے کچھ نہ کہیں ماں جی! وہ بے قصور ہے۔ اس کی آ... سے نہیں دیکھی جاتی۔ بہرحال نکلیں یہاں سے۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ ہوٹل سے باہر آ گئیں۔

"یہ کار دیکھ رہی ہیں آپ! یہ میں نے آج ہی خریدی ہے، نوّے ہزار میں ملی ہے۔"

"ہائے! تُو نے اتنے پیسے خرچ کر دیے بیٹے! میرے لیے... خرید لی۔ یہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں اور کوٹھی بھی تیری..."

"ہاں ہاں ماں جی! آپ کے لیے تو میں ابھی کچھ بھی نہیں کر... اس سال میں آپ کو ہوائی جہاز میں حج کراؤں گا۔ آپ جاتے ہی... دے دیں، حیدر آپ کو سب کچھ سمجھا دے گا۔" گاڑی ہوٹل کے سڑک کے پار کھڑی تھی۔ نظام دین نے ہمیں سڑک عبور کرتے دیکھا تو ایک دم باہر نکل آیا اور دوڑ کر ہمارے پاس آ پہنچا۔

"سلام علیکم ماں جی! صاب جی یہ آپ کی بالدہ ہیں؟"

"ہاں ہاں! بالدہ نہیں، والدہ کہو بھئی۔ ان کو اندر بٹھاؤ۔"

نظام دین ہماری راہنمائی کرنے لگا اور سڑک کی ٹریفک سے بچا کر ماں جی کو کار میں بٹھا دیا۔ میرا سوٹ کیس جس میں اب نوٹ... موجود تھے، اگلی دو سیٹوں کے سامنے رکھا تھا۔ ماں جی کار میں بیٹھ... شے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میرے کہنے کے مطابق خواجہ... نے اس کو ایئر کنڈیشن بھی کر دیا تھا۔ مگر وہ ابھی نظام دین نے... تھا۔

"یہ تو بہت اچھی گاڑی ہے بیٹے! تو نے کیسے خرید لی ہے؟"

"مت پوچھیں ماں جی! یہ سمجھیں کہ جس چیز پر آپ ہاتھ... وہ آپ کی ہو جائے گی۔ سارا راستہ آپ کو ٹھنڈی ہوا لے... اس میں اے سی بھی لگوا دیا ہے میں نے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے، مجھے یہ دن بھی دکھا دیا ہے تو نے۔ وہ تیرا تایا عبدالغنی تو ہمیں بہت ہی فقیر سمجھتا تھا، خدا اس کو غرق کرے۔"

"وہ تو ہو ہی جیجک ہے ماں جی! اس کے بارے میں کیا سوچیں۔ چل بھئی نظام دین! اب اس کالے ہی بھی چلا... خواجہ صاحب نے دو گھنٹے میں اس کے اندر بڑا کام کرا دیا..."

"وہ تو جی بہت بھلے لوگ ہیں، میں انھیں جانتا ہوں۔ ایسا بجنس مین کم ہی ہو گا بجار میں۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ نئی سواری کچھ عجب ہی مزہ دیتی ہے۔ میں تو نہال ہو گیا۔ اگلی نشست پر بیٹھ کر میں نے کیسٹ ریکارڈر چلا دیا۔ ماں جی اور زیادہ حیران ہوئیں۔ ان کے لیے یہ سب کچھ بالکل ہی نیا اور حیرت انگیز تھا۔ روات سے آگے نکل کر انھوں نے زیادہ جم کر پچھلی نشست پر قبضہ جما لیا۔ ورنہ شاید وہ سمجھ رہی تھیں کہ اس میں انھیں ایک طرف ہو کر ہی بیٹھنا ہو گا۔

سفر بڑے مزے سے کٹا اور ہم رات کو کوئی ساڑھے بارہ بجے لاہور جا پہنچے۔ جہلم میں گاڑی روک کر نظام دین نے ہمارے لیے ڈھیر سارے پھل خرید لیے۔ ماں جی سارا راستہ ان سے دل بہلاتی رہیں۔ حیرت ہے کہ انھوں نے مجھ سے راستے میں آسیہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ شاید وہ نظام دین کی وجہ سے ایسا کر رہی تھیں۔ بہرحال انھیں یہ احساس تھا کہ کسی اور کے سامنے انھیں کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس سے ان کی یا ان کے بیٹے کی سبکی ہو۔

❁

حیدر لمبی تان کر سویا ہوا تھا۔ مجھے کئی بار گھنٹی بجانا پڑی۔ تب کہیں اس کی آنکھ کھلی اور وہ ہاتھ میں پستول لے کر باہر کی طرف لپکا۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا حلیہ کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہا تھا۔ بال الجھے ہوئے، گلے میں ایک لمبی سی بنیان اور کمر پر تہمد۔ اسے جوتے پہننے کا بھی خیال نہیں آیا۔ پستول اس نے یوں پکڑ رکھا تھا جیسے اس نے کبوتر مار کر پنجے سے پکڑ رکھا ہو۔

"اوئے حیدر! تیری نیند کا قفل ہی نہیں کھلتا اور یہ پستول کس لیے اٹھائے ہو؟" میں نے اس کو لتاڑا تب اس کو ہوش آیا۔

"سردار صاحب آپ! اللہ! میں سمجھا کسی نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے، پولیس آ گئی ہے، حد ہو گئی۔ اور یہ... یہ گاڑی میں کون ہے؟"

"یہ میری والدہ ہیں بھئی! اب یہ ادھر ہی رہیں گی اور یہ نظام دین ہے، ہمارا نیا ڈرائیور۔" اتنے میں ماں جی گاڑی سے باہر نکل آئیں مگر حیدر نے انھیں دوبارہ اندر بٹھا دیا۔

"یہ گاڑی اندر تک جا سکتی ہے ماں جی! آپ فکر نہ کریں۔ آپ بھی بیٹھ جائیں۔ چل اوئے چلا اس کو، حد ہو گئی۔ آپ نے مجھے فون ہی کر دیا ہوتا۔"

کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو وہ اس کا قفل چڑھانے لگا۔ اتنے میں نظام دین نے کار کی رفتار تیز کر کے اسے پورچ تک پہنچا دیا۔ حیدر کو سخت طیش آیا۔ وہ بھاگتا ہوا ہمارے پیچھے آیا اور نظام دین سے بولا "اوئے تُو روک نہیں سکتا تھا اپنی اس مامی کو دو گھڑی۔ میں تالا لگا رہا تھا، حد ہو گئی ہے۔"

"چل دفع کر حیدر! غصہ تھوک دے۔ ابھی بیچارا نیا نیا ہے نا، سمجھ جائے گا۔"

نظام دین پریشان سا ہو کر باہر نکلا اور حیدر کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "تو اس چوہے کا نام ہے حیدر۔ اوئے دیکھ! آگے سے مجھ سے بڑی تمیز سے بات کرنا، سمجھا کہ نئیں۔ میں بُوتھا توڑ دیتا ہوں اگلے کا۔ بڑا آیا حد ہو گئی کا پُتر۔"

"جانے دے یار نظام دین! یہ اچھا تعارف ہو رہا ہے تمھارا، ہائیں! ایسے کیسے نبھے گی تمھاری۔ چلو اب غصہ تھوک دو، ماں جی کیا سوچیں گی تمھارے متعلق۔"

"میرا خیال ہے پہلے میں نماز پڑھ لوں، عشا کی نماز تو بالکل ہی نکل گئی راستے میں۔" ماں جی کو ایک دم یاد آیا۔

"ہاں ہاں ماں جی! اوئے حیدر، ان کے لیے جانماز بچھا۔ چل اُدھر آئیں ماں جی! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔"

"میں ابھی بندوبست کر دیتا ہوں ماں جی! ادھر آ جائیں۔"

یہ کہہ کر حیدر ماں جی کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ میں اور نظام دین پورچ ہی میں کھڑے تھے کہ عمارت کے اندر سے مجھے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

* کیا آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔
* کیا آپ کی آنکھیں بھینگی ہیں۔
* کیا آپ چشمہ لگاتے ہیں۔
* یا آنکھوں کے کسی مرض کا شکار ہیں؟

تو کتاب

کم نظری اور اس کا سدِباب

قیمت دس روپے۔ ڈاک خرچ روپے

آپ کو بتائے گی کہ

عینک سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بغیر دواؤں کے اپنی آنکھیں کس طرح صحت مند بنائی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں صحت مند ہیں تو انہیں ہمیشہ کس طرح صحت مند رکھا جا سکتا ہے

ہر شخص کے لئے یکساں طور پر مفید کتاب

پنچے کے رونے کی آواز ابھی تک آرہی تھی' اسے حیدر بھی سُن رہا تھا۔ بولا "وہ جی وہ ---- بالی کی ہمشیرہ ہے نا، وہ آئی ہوئی ہے۔ نکاح تو ہوگیا تھا جی' اگلے ہی دن ہوگیا تھا۔"

"اوئے تیرا بیڑا غرق! یعنی تیرا نکاح بھی ہوچکا ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ یہ ہمشیرہ اس کی کہاں سے نکل آئی؟"

"وہ جی دراصل اس کی خالہ زاد ہے۔ اُدھر وہ محمود کوٹ ہے نا وہاں سے آئی ہے بہن کو دیکھنے کے لیے۔" حیدر اس کی آواز سے پریشان ہوگیا تھا۔

ماں جی نے مجھے بڑے غور سے دیکھا، بولیں "جا کا کا! شاید وہ سمجھ رہے کہ اس کا ابا آگیا ہے۔" ماں جی نے مجھ پر زبردست چوٹ کی۔ لمبی باتیں وہ اس ایک فقرے میں کہہ گئی تھیں۔

"ایسی بات نہیں ہے ماں جی! اس ذلیل نے میری کوٹھی کو یتیم خانہ بنا دیا ہے۔ مگر خیر' وہ اس کی مہمان ہے' اس کی عزت ہمارا فرض ہے۔ چل اوئے! دکھلا مجھے کون لوگ ہیں وہ۔" یہ کہہ کر میں حیدر کو ساتھ لے کر کوٹھی کے عقب میں جا پہنچا۔ حیدر نے ان لوگوں کو باقاعدہ سرونٹ کوارٹر میں جگہ دے رکھی تھی۔ کوٹھی کی عمارت میں انھیں نہیں لایا تھا۔ حیدر نے بڑی عجلت میں دروازہ کھولا، تو میں نے دیکھا کہ وہ لوگ صحن میں ہی سوئے ہوئے تھے اور گھنٹی کی آواز سن کر جاگ اٹھے تھے۔

حیدر نے صحن کی بتی جلائی تو مجھے ایک پلنگ پر بالی بیٹھی نظر آئی۔ اُس نے ہمیں دیکھ کر گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ اس کی خالہ زاد بہن اپنے دو بچوں کے ساتھ صحن کے دُوسرے حصے میں لیٹی تھی اور اب وہ بھی اُٹھ بیٹھی تھی۔

"انھیں سلام کرو بالی! سردار صاحب آئے ہیں۔"

بالی نے پلنگ چھوڑ دیا اور آداب کہہ کر چپ ہوگئی۔ دُوسری عورت بھی اس کی دیکھا دیکھی پلنگ سے اُتر آئی اور بڑے دلیر لہجے میں بولی "سلام علیکم بھاجی!" گھونگھٹ اُس نے بھی مُنہ پر ڈال لیا تھا۔ شکل میں اُن میں سے کسی کی بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ "اوئے حیدر! یہ کیا چیز ہے بھئی؟" میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

"اس کا نام روبینہ ہے۔ میں اُسے دُور بینا کہتا ہوں۔ اس کا شوہر کمال دین کہیں چپراسی ہے۔ بالی کے نکاح کے تیسرے ہی دن یہ یہاں آگئی تھی' کل چلی جائے گی۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے میاں! کچھ ان لوگوں کی خاطر داری کرو۔ آخر کو یہ تمھاری سالی ہیں۔ اِن کا بھی کچھ حق ہے آخر۔ مگر کام تم نے بہت لفنگوں ایسا کیا ہے یعنی بالی سے تم نے نکاح بھی پڑھوا لیا ہے' حد ہوگئی تمھاری بھی۔" میں نے دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آگیا۔

"میں کیا کرتا سردار صاحب! اس سے مجھے کچھ وہ... عشق سا ہوگیا تھا، پر اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے غلطی... عورت تو آدمی کو پاگل کر دیتی ہے' ایک ایک پیسہ چھین... بالی کے تو عیش ہوگئے مگر میں غریب خواہ مخواہ میں مار... وہ پچھتا رہا تھا۔ پتا نہیں اُس نے کبری کے سامنے بالی کو... سبز باغ دکھائے تھے۔

"حق مہر کیا لکھا ہے تم نے؟"

"پچاس ہزار۔ ہاں! اس سے کم پر وہ راضی ہی نہیں...

"اور تم مان گئے۔"

"میں کیا کرتا جی! بس بے موت مارا گیا ہوں۔ زیور کا... بیس ہزار کا مانگا' وہ بھی میں نے دے دیا۔ کیا کرتا میں؟" حیدر...

"تمھیں اُس سے عشق ہوگیا تھا۔ ہے نا یہی بات!" ... گھامڑ آدمی ہے۔ ایک ذرا سی عورت کے لیے تو نے اپنی ز... خراب کر لی ہے۔ تو اب ہماری خدمت کرے گا کہ اُس کے نخرے... میں تو ماں جی کو تمھاری وجہ سے لے آیا تھا، پر لگتا ہے اب گز... سے ہوگا۔"

"ایسا نہ کہیں جی! میں آپ کا غلام ہوں سردار صاحب... بھی ماں جی کی جی جان سے خدمت کرے گی ورنہ میں اس کو... دُوں گا، ہاں! مگر وہ ایسی نہیں ہے' اُسے سب کام آتے ہیں...

"خیر۔ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ ابھی تو تم ڈھنگ سے... پہنو اور ماں جی کے لیے الگ کمرے میں بستر لگا دو۔ اور ان کی... ضرورتوں کا خیال رکھو۔ بالی کو بھی بلوا لو بہت دن آرام کر... اُس نے۔"

"جی ٹھیک ہے، میں اُسے بھی بلوا لیتا ہوں۔ کپڑے ... لیتا ہوں آپ چلیں' میں بس ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ کوارٹر... لوٹ گیا۔ میں کوٹھی کی بڑی عمارت میں جا پہنچا۔ اُس وقت نظام دین کار کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ... وہ کیا کرے؟ کسی نے اُسے اندر بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اُ... لے کر میں اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔

"تمھارے رہنے کے لیے میں سرونٹ کوارٹر میں بندو... کر دیتا ہوں' وہ بہت اچھی جگہ ہے۔ گاڑی اُدھر گیراج میں... کرنی ہوگی۔"

"آپ کی مہربانی ہے جی! کوٹھی تو بہت وڈی ہے' ا... خوبصورت کسی نے بڑی لگن سے بنوائی ہے۔"

"ہاں! بڑی جگہ ہے اس میں اور باہر لان بھی بہت بڑے... تمھیں صرف ماں جی کی خدمت کرنی ہوگی۔ انھیں کسی بات کی... نہیں ہونی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں اُن کے دن بہت آرام سے...

"ایسا ہی ہوگا جی! اُن کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھے گی جی' ویسے آپ بُرا نہ مانیں جی تو کچھ کھرچ پیٹھے کے لیے مجھے پیشگی دے دیں تو گھر بھیج دُوں۔"

"اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا' فکر نہ کرو۔ صبح لے لینا۔"

اتنے میں حیدر' بالی کو ساتھ لے کر میرے کمرے میں آگیا۔ اب کی بار اس نے گھونگھٹ اٹھا رکھا تھا اور وہ واقعی گھر بار والی لگتی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر مجھے بڑے سلیقے سے آداب کہا۔

"مجھے افسوس ہے سردار صاحب! میں ٹھیک طرح سے آپکی تعظیم نہ کرسکی' یہ میری نالائقی تھی۔"

"نہیں نہیں! ایسا نہیں سوچتے۔ جاؤ حیدر! تم اپنے نظام دین کے لیے دوسرے کوارٹر میں جگہ بنا دو۔ جو کچھ اسے چاہیے' دے دو۔ یہ تمھارا بھائی ہے' اس کا ہر طرح سے خیال رکھو' جاؤ۔" وہ اب کی بار قمیص شلوار پہن کر آیا تھا اور شاید اُس نے منہ پر دو چھینٹے بھی مار لیے تھے۔ بال بھی اس نے سنوار رکھے تھے۔ بالی بھی تازہ دم نظر آتی تھی۔

حیدر نے نظام دین کو بڑی روکھی نظر سے دیکھا اور بولا۔ "چل بھائی! میں دُوسرا کوارٹر تیرے لیے کھول دیتا ہوں۔ منجی بستر بھی لگا دیتا ہوں۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولا "پر ابھی تو آپ نے کھانا بھی کھانا ہوگا؟"

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے راستے میں کھا لیا تھا۔ جاؤ اور مجھے اطلاع دو کہ اسے تم نے مناسب جگہ دیدی ہے۔"

وہ دونوں باہر نکلے تو بالی وہیں مؤدب کھڑی رہی۔

"بیٹھ جاؤ بالی! ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" مگر وہ میرے سامنے ہی قالین کے کونے پر لباس کو بڑے قرینے سے سنبھالتی

ہوئی آہستہ سے بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اس میں بھلی لگ رہی تھی۔

"تو پھر تم نے حیدر کے ساتھ نکاح کر ہی لیا؟"

"جی ہاں۔ وہ تو ریٹائر ہو گئے تھے۔ ویسے بڑی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"تم نے حق مہر پچاس ہزار لکھوا لیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے؟"

"وہ تو جی میرے بھائی کی ضد تھی، انہوں نے ضد کی تھی۔ اور حیدر بھی مان ہی گئے، کچھ بول نہیں سکے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ شادی نبھ جائے گی؟"

"کیا کہتے ہیں آپ! اب تو حیدر بڑی محبت کرنے لگے ہیں۔ میرا مرنا جینا انہی کے لیے ہے۔ ایسا کیوں پوچھتے ہیں آپ؟"

"میرا مطلب ہے کہ دیکھیں... وہ پھٹا افیون کا عادی ہے نا!"

"اس سے کیا ہوتا ہے جی! آدمی دل کا اچھا ہونا چاہیے۔ عورتوں کی قدر کرنے والا ہو۔ پھر تو بس ہرا بھرا خوش۔ وہ ٹی کا بھی ہو تو میں ان کی پرواہ نہ کروں گی۔ آپ نے اچھا ہی کیا جو میری ان سے ملاقات کروا دی۔ اب میرا بھائی بھی خوش ہے کہ چلو بہن کے ہاتھ پیلے ہو گئے۔ ہم کو بھی بڑی خوشی ہے اب جو کچھ بچتا ہے، وہ بہت ... کرتا ہے۔ کل آیا تھا، کہہ رہا تھا کہ مہینے بعد وہ مجھے پانچ سو روپے دے جائے گا۔"

"وہ کیسے کے واسطے ہیں گے؟"

"یہ تو ہی بات کی! پر اس کا خلوص تو دیکھیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو بالی! دعا کرو خدا ہماری پریشانیاں بھی دور کر دے۔ تم بے فکر ہو کر رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ماں جی آ گئی ہیں، ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ ان کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ وہ میری بھی ماں جیسی ہیں اور مالکن ہیں۔ میں دن رات ان کی خدمت میں ایک کر دوں گی۔"

"بالی، میں یہی سوچتا ہوں ایسی اچھی گفتگو تم کہاں سے سیکھ گئی ہو۔ کسی بڑے گھر کی بیٹی لگتی ہو مجھے۔"

"جی نہیں۔ گھر تو ہمارا بہت چھوٹا ہے مگر میں نے بھائی کی ... ابتدائی سال کی پڑھائی نہیں سیکھی۔ کچھ پڑھ لینے کے بعد آدمی خود کو دوسروں سے جدا رکھتا ہے۔ میری یہی کوشش رہی تھی کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ آ جائے۔ میں نے ڈھیر ساری کتابیں پڑھی ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آدمی کی ذہانت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ الگ ہے کہ مجھے ایسا آدمی ملا ہے جو بہت ادنیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو آدمی کی تقدیر ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ بہرحال تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس روبینہ کو تو کل گھر بھیج دو۔ ... نہ جانے کیسی ہو گئی ہے، اس کا لباس بھی مجھے پسند نہیں آیا۔ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھو گی۔"

"جی ایسا ہی ہوگا۔ میں اسے صبح ہی رخصت کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم ماں جی کے پاس جاؤ۔ انہیں تمہاری ضرورت ہو گی۔" میں نے اپنی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو کر کہا۔ وہ اٹھی اور مجھے آداب کہہ کر باہر نکل گئی۔

اب میں پھر چھت کو گھورنے لگا تھا۔ یہ ... تھا جس میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مجھ سے تو اچھی تھی جسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس کے لیے کرنا ہے۔ ... مجھ سے زیادہ دور تو نہیں تھیں مگر ... ابھی تک ان کا ... نہیں آیا تھا میں پھر وہاں سے نکل جاتا۔ پھر میرے ذہن ... نذر ہو جاتے۔ پھر مجھے اس مصروفیت خانے سے ٹکرانا پڑتا۔ یہ ایسی ویران راہوں میں ابھرتی ہیں ... بن جاتے ہیں کیا کروں پروردگار! تجھ تو ہی میری مشکل ... اور آپی کو کسی طرح وہاں سے نکال ... دوسرا ... ہی تباہ کر دے گا۔ اب ایک بار شاید ہی وہ خود کو بچا سکیں ... لوگوں کی عادتیں بدل جاتی ہیں، ان کی فطرت میں ایسی ... آتی ہے کہ وہ کسی بھی طرح سنبھل نہیں سکتے۔ آپی تو بہت آسان آدمی تھا۔ کوئی اسے ایسا مل گیا جو اس کی نبض کی ... کو سمجھ کر اسے کچھ کا کچھ بنا دیتا تو میں کیا کر لیتا۔ اس کے لیے ماحول بالکل ہی انوکھا اور نرالا ہوگا۔ وہ بھی خود کو ذرا سی ... اور سہولت کے لیے... پوری طرح بیچ دے گا۔ وہاں سودے ہوتے ہیں۔ گڑ کی ایک ڈھیلی کے لیے آدمی بیچ سے بیچ کام کرنے آمادہ ہو جاتا ہے۔ چرس اور افیون بھی اس کی راہ نہیں ... اگر اسے یہ لت پڑ گئی تو پھر... پھر کیا ہوگا؟ ... دوہری دھار کی تلوار پر جا ٹھہری تھی۔ اس کو بھی بچا لینا ضروری تھا۔ جیل ویسے بھی اچھی جگہ نہیں مگر جو عادتیں آدمی سے ملتی ہیں وہ اسے دین کا رہنے دیتی ہیں نہ دنیا کا۔ کنج عزلت تو آدمی کو کچھ نہیں کہتا۔ ابھی ان کا مقدمہ ... ابھی کوئی راستہ نکل آتا تو یہ زیادہ بہتر تھا۔ انہیں بچا لینا ... بہت ضروری تھا مگر میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں ... ہی کوشش میں نے کر دیکھی تھی مگر ابھی تک ڈور کا سرا نہیں آیا تھا۔ اور اب میں نے سوچا تھا کہ کل یہ سارا معاملہ وکیل کے سامنے رکھ دوں گا تاکہ ان کے بارے میں کوئی چارہ جوئی تو ہو سکے۔ وکیلوں کا اعجاز بھی دیکھنے کی چیز ہے ... بے گناہوں کو قاتل ثابت کر سکتے ہیں۔ ... اگر یونہی تو وکیلوں کے پیچھے ... مارے مارے نہیں پھرتے!

جانے کب ہم گہری نیند میں کھو گئے۔ صبح میں کوئی سات بجے بیدار ہوا تو اس وقت تک ماں جی نماز سے فارغ ہو کر بالی کے ہمراہ کوٹھی کے لان میں پھر رہی تھیں اور حیدر باورچی خانے میں گھسا ہوا تھا۔ میں سیدھا ان کی طرف بڑھ گیا۔ ماں جی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بالی کو جو کچھ معلوم تھا وہ بتاتی جا رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے ماں جی! سیر کے لیے تو یہ باغ بہت اچھا ہے۔"

"تو نے کمال کر دیا ہے بیٹے! ایسی عمدہ کوٹھی خریدی ہے تو نے۔ رات تو میں بہت تھکی ہوئی تھی جلدی سو گئی مگر اب میں نے کوٹھی کے تمام حصے دیکھ لیے ہیں۔ بہت پیاری جگہ ہے۔ تم نے کتنے میں خریدی ہے؟"

"کئی سال تک آپ کی جدائی کا یہ انعام ہے ماں جی! آپ میرے لیے اور آپی کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں نا۔ بس اسی لیے خدا نے یہ جگہ مجھے دے دی ہے۔"

"میری دعا کہاں اثر کرتی ہے بیٹے! سب جھوٹ ہے۔ سبھی ذات صرف خدا کی ہے۔ یہ بالی تو بہت اچھی لڑکی ہے، ہر بات میں سچ بولتی ہے۔ اسے سمجھاؤ کاکا! کہ یہ اتنا سچ نہ بولا کرے۔ اس نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے۔" بالی نے شرما کر منہ پر پلو ڈال لیا۔ وہ موتیے کے رنگ کی قمیص شلوار پہنے ہوئے تھی اور پاؤں میں سینڈل بھی اس نے اسی رنگ کے پہن رکھے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس تبدیلی پر بہت زیادہ فرحت محسوس کرتی ہے۔

"سچ بولنا تو بہت اچھی بات ہے ماں جی! کیا یہ جھوٹ بولا کرے؟ میں تھوڑا ہوں یہ کام کرنے کے لیے۔ دنیا بھری پڑی ہے جھوٹوں سے، کسی ایک کو تو سچ ضرور بولنا چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کاکا! پر یہ دیکھ، صاف کہہ دیا ہے اس نے مجھ سے کہ اس کا بھائی اندھا ہے اور بھیک مانگتا ہے۔ ہائے! یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ لڑکیاں تو گھروں کی عزت ہوتی ہیں، اپنی بری بات کو بھی سو پردوں میں چھپاتی ہیں مگر یہ بالی......"

"یہ ایسی ہی ہے ماں جی! اور اسی لیے میں نے حیدر سے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے، سکھی رہے گا۔ اچھا ہے یہ بے چاری مان گئی ورنہ حیدر لنڈورا ہی رہ جاتا۔" بالی نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اس روبینہ کا کیا بنا؟ میں نے کہا تھا اسے یہاں سے رخصت کر دو۔"

"وہ تو چلی بھی گئی۔ میں نے اسے دو سو روپے دے دیا تھا، بے چاری بہت غریب ہے۔ وہ بھی کوئی آدھا گھنٹہ پہلے یہاں سے نکلی ہے۔" ماں جی نے کہا۔

"میں نے بھی اسے پیسے دیے تھے۔ بہت ترس آتا ہے مجھے اس پر۔ اسے کوارٹر مل رہا ہے سرکاری کوارٹر۔ وہاں گیا تو پھر اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔" بالی نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"چلو، یہ اچھا ہوا۔ اس کی مدد کسی طرح ہو ہی گئی۔ ... کی چاؤں چاؤں مجھے اچھی نہیں لگتی۔ موقع ملے تو آپ پھر اسے کچھ مالی امداد دے دیں ماں جی! یہ بہت ضروری ہے۔ یہ پیاری کوٹھی اب آپ کی ملکیت ہے، اسے پھر سے آباد کریں گے ہم۔ اب میں ذرا نہا لوں، پھر ہم اکٹھے ناشتا کریں گے۔"

"میں تو ناشتا کر چکی ہوں۔ بالی نے صبح ہی صبح مجھے پراٹھا کھلا دیا تھا۔ بے چاری بہت خدمت گزار ہے۔ اس کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرے گا۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ سیر کریں، میں نہا لوں پہلے۔" یہ کہہ کر میں دوبارہ کوٹھی کی طرف چل دیا۔ موسم بہت بدل گیا تھا۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ پنکھے بھی کام نہیں دیتے تھے۔ میں نے سوچا میں ان تمام کمروں میں اے سی لگوا دیتا ہوں جن میں ماں جی رہا کریں گی۔ یہ بہت ضروری تھا۔ انہیں کچھ تو سکھ ملنا چاہیے تھا۔ اس بے چاری نے زندگی میں دکھ ہی دکھ دیکھے تھے۔ کوئی گھڑی اس کی چین سے نہیں گزری تھی۔ اب بھی اگر اس کا یہی حال رہا تو پھر لعنت ہے میری زندگی پر۔

ناشتا جب میں کر چکا تو حیدر اس وقت میرے سامنے ہی تھا۔

"دیکھو حیدر! تو آج مستری کو بلوا کر کوٹھی کے چار کمروں میں اے سی لگوا دے گا۔ سمجھا کہ نہیں۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میری ماں جی آئی ہوئی ہیں، انہیں گرمی لگتی ہو گی۔ ایک دم فرسٹ کلاس اے سی لے آؤ۔"

"بہت اچھا سردار صاحب! میں بس ابھی جاتا ہوں۔ مستری میرا واقف ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر اے سی خرید لوں گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں کپڑے بدل لوں، اتنے میں تو بھی تیار ہو جا اور مجھ سے پیسے لے جانا۔"

اس کو اے سی کے لیے کہہ کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ وہ جبہ وہ عبا قبا میں نے اتار ڈالی۔ خواہ مخواہ ہی میں لوگوں کی نظروں میں نمایاں ہو جاتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ میں نے سر کے بال استرے سے منڈوا دیے تھے اور مونچھیں بھی کتروا دی تھیں۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں تھی مگر ضرورت یہی تھی۔ میں اسی لیے مان بھی گیا تھا مگر فائدہ اس کا بھی کچھ نہ ہوا۔ الٹا میں گل زری کو ہاتھ سے کھو بیٹھا۔ پتا نہیں اب وہ کس حال میں تھا۔ بوسکی کی قمیص شلوار پہن کر میں ٹیلیفون کے پاس جا بیٹھا۔ مجھے کئی جگہ فون کرنا تھے۔ کسی کے سامنے جانے کی تو مجھ میں ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ فون ایک محفوظ ذریعہ تھا جس سے میں کئی معاملات کی چھان بین کر سکتا تھا۔

حیدر کو میں نے پچاس ہزار روپے دے دیے تاکہ وہ اے سی

رو نہ وہاں لے ہی لگوا سکے۔ ماں جی کو بالی نے سنبھال لیا تھا اور وہ اُن سے ایک منٹ کے لیے اِدھر اُدھر نہیں ہوتی تھی ــــ یہ اچھی بات تھی۔ ماں جی کا دِل بہل گیا تھا۔ اچھا ہوا وہ چیک سوالن نہیں گئیں ورنہ وہاں وہ بلا وجہ پریشان ہوتی رہتیں۔ ماموں کے مزاج کو میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ یہی بہت تھا کہ ماں جی نے بہت ہی بُرے دِن اس کے گاؤں میں گزار لیے تھے مگر اس سے آگے نہیں۔ اب وہ میری ذمّہ داری میں تھیں اور میرا فرض تھا کہ میں اُن کے ہر آرام کا خیال کرتا۔

حیدر باہر چلا گیا تھا۔ وہ نظام دین کی کار میں بازار گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ راستے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ وہ گھل مِل جائیں گے ورنہ وہ تو بہت ہی تپے ہوئے نظر آتے تھے۔ حیدر نے نظام دین کو اپنا دُشمن سمجھ لیا تھا حالاں کہ بات بالکل غلط تھی۔ میں اُن دونوں کو اُن کے صحیح خانے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے تو حیدر سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اخبار خرید لیا کرے اور اس کا ناغہ بالکل نہ کرے، وہ اخبار کیا ہوئے؟ میں فوراً ہی ماں جی کے کمرے میں جا پہنچا۔ بالی بھی وہیں تھی۔

"وہ… وہ بالی تمھیں پتا ہے میں نے حیدر سے اخبار کے لیے کہہ رکھا تھا۔ آج کا اخبار کہاں ہے؟"

"میں ابھی لاتی ہُوں سردار صاحب! دراصل صبح سویرے حیدر نے باورچی خانے میں رکھ دیا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلی، جب وہ لوٹی تو اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔

"باقی دِنوں کے اخبار کہاں ہیں؟"

"وہ بھی لا دُوں؟"

"ہاں بھئی! یہ بہت ضروری ہے۔"

"وہ تو سب کے سب کوارٹر میں پڑے ہوں گے۔"

"تو جاؤ پھر وہ سب کے سب مجھے لا دو۔ میں تمھاری ماں جی کے پاس بیٹھتا ہُوں۔ اس بالی نے تو آپ کا جی بہلا دیا ہے ماں جی! ہے کہ نہیں؟"

"ہاں! پتا نہیں ایسا کیوں ہے، مجھے یہ گھر اپنا معلوم ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ میرا اپنا ہو اور میں صدیوں سے اس میں رہ رہی ہوں۔"

"یہ آپ ہی کا ہے ماں جی اور کس کا ہوگا۔ آپ اس میں خوش رہیں میری اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہوگی۔ میں نے آج چاروں کمروں میں اے۔ سی کے لیے کہہ دیا ہے۔ وہ آ گئے تو تمام کمرے ٹھنڈے رہا کریں گے۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا ہے تُو نے۔ ورنہ اس گرمی میں تو بہت بُرا حال ہوتا مگر اس پر تو سُنا ہے بڑے پیسے خرچ ہوں۔"

"ہوا کریں نا، پیسے ہوتے کس لیے ہیں۔ ارے آپ پر… نہیں کہ آپ کے پاس کوئی رقم بھی ہے کہ نہیں۔"

"ہیں بس چار ہزار روپے لائی تھی، وہی خرچ کر رہی ہُوں مگر جب سے تم ملے ہو تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔"

"دیکھیں یہ الماری ہے نا لوہے کی، اس کی چابیاں… لیں۔ میں اس میں ڈھیر سارے نوٹ رکھ دیتا ہُوں جتنے… خرچ کریں۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف دوڑا اور سوٹ کیس میں سے دو لاکھ کی رقم لا کر میں نے ماں جی کے سامنے الماری… دی۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر اُن نوٹوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ اتنے سارے نوٹ! میں کیا کروں گی۔ ان کا او… کاروبار کیا ہے بیٹے! مجھے بتا تو سہی آخر؟" وہ کمرے کا… بند کر کے میرے قریب آ گئیں۔

"آپ اِن نوٹوں کو گنیں گی نہیں، بلکہ صرف خرچ کر… سمجھیں آپ! میری ماں کو کسی چیز کی پریشانی نہیں ہونی چا… آپ نہیں جانتی ہیں، آپ کو پا کر میں کتنا خوش ہوں میں… کھوئی ہوئی جنّت مجھے واپس مِل گئی ہے۔ آسیہ کے نام پر… میں جتنی چاہیں رقم خرچ کریں۔ اِن کے ختم ہونے کی پروا نہ… کریں ماں جی!"

"خدا تمھیں خوش رکھے، پر تُو یہ بتا کہ تیرا کاروبار کیا ہے کیسے اتنے سارے نوٹ کما لیتا ہے؟ پتا ہے ہم تو ایک ایک… بہت سینت سینت کر رکھا کرتے تھے۔ میرا اب بھی یہی حال ہے… بینک سے جو منافع ملتا ہے وہ میں ہر مہینے بہت سوچ سمجھ کر خرچ… کرتی ہوں۔"

"اب آپ بس حج پر جانے کے لیے تیار رہیں۔ میں… سمجھا دُوں گا، وہ سارا بندوبست کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! میں حج ضرور کروں گی، پر کیا… ہو گا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو؟"

"میں… دیکھیں نا ماں جی! میں ابھی وہاں نہیں… چاہتا، کچھ کام ہی اتنے زیادہ ہیں۔ بہر حال، اگلے سال ضرور چلا جاؤں… آپ اگلے سال دُوسرا حج کر لیں، ٹھیک ہے کہ نہیں؟"

"جیسے تیری مرضی بیٹے! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"یہ چابیاں سنبھال کر رکھ لیں اور اِن نوکروں کے… الماری کبھی نہ کھولیں، بس اتنی احتیاط ضرور رکھیں۔"

"میں سمجھتی ہوں بیٹے! تُو فکر نہ کر۔" یہ کہہ کر انھوں… چابیاں میرے ہاتھ سے لے کر اپنے تھیلے میں رکھ لیں۔

"یہ تھیلا بھی بدل لیں ماں جی! اس کی جگہ میں…

خوبصورت پرس لا کر دوں گا، اُس میں اپنی چیزیں رکھا کریں۔ میں آج ہی آپ کے لیے ساری چیزیں خرید لاؤں گا، اس میں نئے کپڑے بھی شامل ہوں گے۔"

اتنے میں بالی ڈھیر سارے اخبار لے کر اندر آ گئی۔ وہ میں نے اُس سے لیے اور سیدھا اپنے کمرے میں جا بیٹھا، اُن سب کو تاریخ وار کر لینے کے بعد میں اُن میں سے اپنے بارے میں خبریں پڑھنے لگا۔ وہ خبریں جن کا محرّک میں تھا۔

سب سے زیادہ واضح خبر اکبر قریشی کے بارے میں تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اُس نے ابھی تک پولیس کو گھر سے اپنے اغوا اور زخمی ہونے کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ اس نے صرف یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ ایک اجنبی اس کے کمرے میں آیا اور اُس نے آتے ہی اُسے گلے سے دبوچ کر بے ہوش کر دیا۔ جب اُسے ہوش آیا تو وہ اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ پولیس ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکال سکی تھی کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا۔ اور اُس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ آسیہ اور آپی ابھی تک محفوظ تھے، انھیں پولیس نے اس سلسلے میں تفتیش کرنے کے لیے باہر نہیں بلایا تھا۔ ہاں اتنی بات ظاہر تھی کہ اُن قیدیوں پر ان لوگوں نے کڑی نگرانی شروع کر دی تھی۔ نیازی نے بھی مجھے یہی بتایا تھا۔ یہ ممکن ہے وہ اُن سے تشدّد کے ذریعے میرا اصلی نام معلوم کر لیں مگر اس معاملے میں انھیں وہ کوئی ددھش نہیں دے سکتے تھے۔ قریشی نے یہی سوچ رکھا تھا کہ وہ صحت یاب ہو کر خود اُن سے بات کرے گا مگر ابھی اس کو اسپتال سے نکلنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔

دوسری خبر اس سینما کے متعلق تھی جہاں عبدالمتین کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ پولیس اس عورت کی تلاش میں ہے جو اس کے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں اس آدمی کی بھی تلاش ہے جو عبدالمتین کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ اس نے عربی طرز کا عمامہ اور عبا پہن رکھے تھے معلوم یہ ہوا ہے کہ وہ بھی اسی وقت سینما سے اُٹھ کر باہر نکل گیا تھا اور دوبارہ اندر نہیں آیا۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

سنسنی خیز انکشافات! بے معنی بات۔ یہ اخبار والے ہمیشہ ہی سنسنی خیزی پیدا کرنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ میں نے اخبار تہ کر کے رکھ دیے۔ اُن کا فائدہ ہی کیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، کس طرف نکلوں کہ میں تو دیوانہ تھا اور دیوانوں سے دُنیا آشنا، پولیس والے بانہیں پھیلا پھیلا کر میری طرف بڑھتے تھے۔ بات کچھ ایسی ہی تھی۔ کاش ستنا جا زندہ ہوتے تو وہ میری مدد کر سکتے تھے مگر وہ راستہ بھی میں نے اپنے لیے بند کر لیا تھا۔ مختار ڈھلوں زندہ ہوتے تو وہ میرے بہت کام آتے ــــ گل زدی نے جو اطلاع مجھے دی تھی وہ میرے لیے بہت کافی تھی مگر اُن کو مارنے والے کون تھے، یہ بڑا اہم سوال تھا مگر اس کا کوئی حل میرے پاس نہیں تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک وہاں بیٹھا اس صورت حال پر غور کرتا رہا مگر آسیہ اور آپی تک پہنچنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا، میرے لیے باہر نکلنا بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جُبّہ اور عمامہ میرے اب کام نہیں آ رہا تھا۔ سر تو میں نے منڈوا لیا تھا۔ داڑھی مونچھ بھی صاف کر لی تھی۔ پھر بھی میں اپنی شناخت کو چھپا نہیں سکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب بہت سارے لوگ میری صورت کو پہچانتے تھے۔ ماں جی اور بالی بھی میری راہ میں آ ٹھہری تھیں۔ میں اُن کے سامنے کوئی بہروپ بدلتا تو وہ بھی حیران ہوتیں۔ وہ ابھی مجھے نہیں جانتی تھیں۔ اُن کو یہاں لا کر میں نے ایک گھر تو آباد کر لیا تھا مگر اُن سے مجھے خود کو چھپا لینا چاہیے تھا۔

میں نے ایک پشاوری لُنگی لے کر سر پر باندھ لی اور گلے میں ایک ریشمی مفلر ڈال لیا۔ اس سے اتنا ہو گیا کہ کوئی مجھے دیکھتا تو سمجھتا کہ کوئی پشاوری جا رہا ہے۔ گلے میں میں نے ایک واسکٹ پہن لی۔ اتنے میں نظام دین کار لے کر واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک سوزوکی وین بھی لائے تھے جس میں حیدر بیٹھا تھا۔ چار دن اے سی انھوں نے وین پر لاد رکھے تھے۔

حیدر فوراً ہی میرے پاس آ پہنچا بولا۔ "سردار صاحب میں اے۔ سی لے آیا ہوں۔ چوالیس ہزار کے ملے ہیں، رسید دیکھ لیں۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں ہے بھائی! تم بس انھیں لگوا دو مستری ساتھ آیا ہے کہ نہیں؟"

"اسے میں ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اب سارے کمرے ٹھنڈے یخ ہو جائیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم اِدھر ہی بیٹھو، میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو آؤں گا۔ ماں جی سے کہہ دینا۔" یہ کہہ کر میں پورچ کی طرف نکل گیا۔

"چل بھئی نظام دین! مجھے ذرا پتوکی جانا ہے۔ جلدی واپس آ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب جی! بیٹھیں۔"

"مجھ سے تم نے کچھ پیسوں کے لیے کہا تھا۔ یہ لو یہ ہزار روپیہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے اس کو ہزار روپے کے نوٹ گن کر دے دیے۔

وہ خوش ہو گیا۔ ایک دم خوش ہو گیا۔ بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہے صاب جی! میں یہ آج ہی گاؤں بھیج دوں گا۔ آپ

غریبوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔"

"پیسوں کی فکر نہ کیا کرو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، چلو اب۔"

نظام دین نے کار پیچھے ہٹائی اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ میں دراصل اس روز ڈھلوں صاحب کی حویلی جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ گل زری کی اطلاع کہاں تک درست ہے۔ یہ بڑی اہم بات تھی۔ میں کسی اور سے یہ بات معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس کو فون کرتا تو شاید وہ مجھے پوری بات نہ بتاتے۔

ابھی میں گلبرگ سے نکلا ہی تھا کہ اچانک مجھے الماس اپنے قریب سے گزرتی نظر آئی۔ وہ اپنی کار میں جا رہی تھی اور اُسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہمیں اُس نے یوں اوورٹیک کیا تھا جیسے وہ ہماری گاڑی کو، اس کی رفتار کو، اس کے ڈرائیور اور اس کے مالک کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتی ہو۔ شاید وہ بہت جلدی میں تھی۔ رنگ اس کا اب بھی بے مثال تھا۔ وہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہمارے پاس سے گزر کر آگے نکلی تو میں نے نظام دین سے کہا "ذرا اس کار کا پیچھا کرو نظام دین۔ میں اس عورت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"او چھڈو جی! یہ زنانیاں جو ہوتی ہیں نا آدمی کو کہیں کا نئیں رہنے دیتیں۔ دیکھا نہیں کیسی بانکی شوکی بنی ہے یہ۔"

"نہیں بھئی! مجھے اس سے واقعی ایک کام ہے۔ یہ فلمی اداکارہ الماس ہے۔ گاڑی تیز چلاؤ۔"

"پھر تو ٹھیک ہے جی۔ ابھی لو۔ اچھا ہے اس کے درشن ہو گئے۔" مگر وہ کوشش کے باوجود گاڑی آگے نہ بڑھا سکا۔ راستے میں ٹریفک زیادہ تھی۔ اس نے یوں کیا کہ گاڑی الماس کی کار سے تیسرے نمبر پر رکھی۔ وہ اس وقت اُدھر شادمان کالونی کی طرف جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ بائیں ہاتھ مڑی، نظام دین کو موقع مل گیا اور اس نے گاڑی اس کے قریب سے گزار دی۔

"ذرا آگے لے جا کر گاڑی روک لو۔" میں نے اُسے حکم دیا اور خود کھڑکی میں سے سر نکال کر میں الماس کو دیکھنے لگا۔

نظام دین نے گاڑی آہستہ کی تو الماس نے بڑے غضب سے کار کو جھٹکا دے کر آگے بڑھایا اور غصے سے بولی "یو بلڈی فول! یہ کیا طریقہ ہے، دیکھتے نہیں کہ میں بھی جا رہی ہوں۔ ہٹاؤ گاڑی آگے سے۔" اس نے نظام دین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ بیچارا ہکا بکا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ "اور تم کیا بندروں کی طرح منہ نکال کر دیکھ رہے ہو۔ تمیز سے گاڑی چلاؤ۔" اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں آبی کا دوست جیلانی ہوں، میڈم!"

"اوہ نو! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔" یہ کہہ کر وہ کار سے باہر نکل آئی اور اس کا دروازہ ٹھک سے بند کرتی ہوئی بولی "آپ کیسے ہیں جیلانی صاحب! مجھے معاف کر دیں، میں آپ کو پہچان نہیں سکی۔ میں نے بہت مس کیا ہے آپ کو۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو سڑک پر سے گزرتے دیکھا تو اِدھر آ گیا۔ کہاں جا رہی ہیں؟"

"میں آپا مہتاب کے ہاں جا رہی ہوں۔ وہ کچھ بیمار ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ آبی اس وقت کہاں ہے؟"

"انھوں نے تو مجھے بھلا ہی دیا ہے۔ عرصہ ہی ہو گیا، ملاقات نہیں ہوئی۔ کہاں ہیں وہ آج کل؟"

"کہیں بیٹھ کر بات کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"ہاں، میری کوٹھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چلتے ہیں۔ مہتاب کو میں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں راستہ بتاتی چلیں۔ چل بھئی، گاڑی ان کے پیچھے لگا دے۔"

الماس پلٹ کر اپنی کار میں جا بیٹھی اور ہمارے آگے چلنے لگی۔

"اچھا ہوا صاب جی! میں نے منہ آئی گالی اُس کو نہیں دی ورنہ جی اُس نے تو میری بے عزتی کر دی تھی۔"

"اوئے پاگل آدمی! عورتوں سے کوئی اس طرح بات کرتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی! پر کوئی اپنی عزت تو خراب نہیں کرتا ہے نا۔" اس کا لہجہ اس کے دل کی غمازی کر رہا تھا۔

"کیا خیال ہے نظام دین! تیری اس کے ساتھ میں شادی کروا دوں۔"

"توبہ توبہ۔ استغفار پڑھیں صاب جی! میرا تو سارا [illegible] اس کا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ اللہ معاف کرے۔ یہ تو ہاتھی ہے۔ سنا ہے جب پرانے بادشاہ کسی پر ناراض ہوتے تھے کسی پر تو اس کے گھر ہاتھی بھیج دیتے تھے کہ لے میاں، اس کی [illegible] کیا کر اور وہ بیچارا پاگل ہو جاتا تھا۔ سارا راشن پانی ہاتھی کا ہوتا تھا۔ میرا بھی آپ وہی حال کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے، شادی۔" نظام دین دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے [illegible] کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ خاصا مسخرا آدمی تھا۔ [illegible] کا ڈھنگ اُسے آتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد الماس کی گاڑی ایک وسیع و عریض [illegible] کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی [illegible] ہے اور وہ اس میں مالک کی حیثیت سے داخل ہو رہی [illegible] اُس کے دو ملازم گیٹ پر کھڑے رہتے تھے۔ گیٹ ہارن کی آواز سن کر ہی کھولا تھا۔

ہم جب صحن میں پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور [illegible] مجھے کار سے اُتارا اور ملازموں سے کہنے لگی "اس کے لیے چائے بناؤ اور دلی خان! یہ ان کا ڈرائیور ہے۔ خاص خیال رکھو اس کا۔"

"وہ میرا اتنا بھی عزیز نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ بس کام چلا لیتا ہے۔" وہ میری بات کا مفہوم سمجھ کر مسکرانے لگی۔

"آپ سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کی باتیں مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ آیئے۔"

وہ مجھے برآمدے میں سے گزار کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہاں کی ہر شے ایک اپنی ہی چکا چوند لیے ہوئے تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ دن بہ دن زیادہ امیر ہوتی چلی گئی تھی۔ گھر کا سارا ساز و سامان بیرونی ممالک سے منگوایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"ذرا اجازت دیں تو میں باتھ روم تک جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ دروازہ بائیں ہاتھ ہے۔"

اس کو وہاں چھوڑ کر میں باتھ روم میں جا گھسا۔ کوٹھی میں ہر چیز ایک نرالی شان رکھتی تھی۔ بڑا روپیہ صرف کیا گیا تھا آرائش پر۔ میں جب واپس آیا تو چپ نہ رہ سکا۔

"آپ کی کوٹھی میں ساز و سامان بہت خوبصورت ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی "میرا خیال ہے کہ یہ سب آپ کا حسنِ نظر ہے۔ آپ بیٹھیں، ملازم آپ کے لیے کھانے کا سامان لا رہا

ہے یہ سگریٹ ہیں اور تو آپ کچھ نہیں پیتے ہوں گے۔"

"اور بھی کچھ ہے؟"

"سب کچھ ہے، ہمہ اقسام مشروبات۔ کیا چاہیے آپ کو مگر میرا خیال ہے آپ ٹی ٹوٹلر ہیں۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ میرے لیے یہ سگریٹ ہی کافی ہیں۔"

"ویسے یہ ٹنگی جو آپ نے سر پر باندھ رکھی ہے، اس کی وجہ سے میں آپ کو نہیں پہچان سکی تھی۔ شکر ہے میں نے کوئی غلط بات منہ سے نہیں کہہ دی۔ ورنہ میں غصے کی بہت بری ہوں۔ آپ کا ڈرائیور بھی سوچتا ہو گا کہ میں کیسی عورت ہوں۔" اتنے میں اس کا ملازم اردلی خان چیزوں سے لدی پھندی ٹرالی لے کر اندر آ گیا۔ ٹرالی سامنے دیکھ کر اُس نے ملازم کو واپس بھیج دیا۔ بولی "میں جب تک آواز نہ دوں ادھر مت آنا۔ میں ان سے ایک ضروری بات کر رہی ہوں۔" وہ بچارا اُنہی قدموں لوٹ گیا۔ اس نے مجھے شربت کا ایک گلاس بنا کر دیا۔

"نظام دین آپ سے مرعوب ہو گیا تھا ورنہ بندہ وہ بھی اُلٹے مغز کا ہے۔"

"آمدم برسرِ مطلب! مجھے یہ بتائیں کہ حضرت آبی صاحب ہیں کہاں؟ وہ اِدھر کیوں نہیں آئے؟ بڑے دعوے کرتے تھے میری محبت کے، اب کہاں گئی اُن کی محبت؟"

"یہ بات نہیں ہے میڈم!"

"آپ زیادتی کر رہے ہیں جیلانی صاحب! آئی ایم ناٹ یور میڈم۔ میرا نام الماس ہے۔"

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا مگر دیکھیں نا، میں آپ کو میڈم نہ کہوں تو کیا کہوں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ میرا آپ سے ایک رشتہ بھی ہے۔ آپ میرے جیٹھ لگتے ہیں مگر ابھی تک وہ دن نہیں آیا ہے۔ پھر بھی مجھے آپ الماس کہہ سکتے ہیں؟"

"چلیں یونہی سہی! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آبی.... اس کی پریشانیوں کا حال معلوم ہے آپ کو؟"

"نہیں تو! کیا ہوا ہے انھیں؟ مجھے تو انھوں نے کبھی کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔"

"وہ آج کل راولپنڈی جیل میں بند ہے۔ اس پر کوئی قتل کا مقدمہ بن گیا ہے۔"

"اوہ نو! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ غلط کہتے ہیں۔"

"جی نہیں، میں سچ ہی کہہ رہا ہوں۔"

"کیا واقعی انھوں نے جان بوجھ کر کسی کو قتل کر دیا ہے۔ اُس تھل نیں تو خیر جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری اُن پر نہیں جاتی تھی مگر اب کیا ہوا ہے؟ اُس وقت تو انھوں نے میری ہمدردی میں گولیاں چلائی تھیں۔"

"پولیس انھیں کسی اور کے ساتھ شبہے میں پکڑ کر لے [illegible] میں آپ سے شرمندہ ہوں مگر بات یہی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ خاصا خراب ہے [illegible] آج تک یہ سمجھ نہیں آ سکی ہے کہ آخر آپ دونوں کرتے کیا [illegible] آپ کا کاروبار کیا ہے؟ میں تو بخدا آپ کو بہت شریف آ[illegible] تھی۔"

"اس میں شک بھی کیا ہے۔ ایسا کبھی بھی نہ سوچیں [illegible] کا کردار یہ دنیا اور اس کی اُلجھنیں تشکیل دیتی ہیں۔ ہم بھی [illegible] ہیں مگر یار کی یاری دیکھنی چاہیے۔ اس کے لعل پر ہم نظر نہیں [illegible]

"مجھے معلوم ہے لیکن جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس [illegible] بندوبست کیا جائے۔"

"میرا خیال تھا، شاید آپ اس کی کچھ مدد کر سکیں۔"

"کوئی وکیل نہیں کیا ہے آپ نے؟"

"وکیل کا بھی میں نے سوچا تھا مگر بات بہت لمبی ہو [illegible] اور شاید حاصل کبھی کچھ نہ ہو۔" یہ کہہ کر میں نے معاملے کی کچھ [illegible] اسے بتا دی مگر آسیہ کا نام نہیں لیا۔ کہ وہ کہیں بدک ہی نہ جا[illegible]

"ہوں....!" وہ ایک لمبی سی 'ہوں' کہہ کر گہری سوچ [illegible] گئی۔ شربت کا گلاس اس نے بھی ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا مگر [illegible] پی نہیں سکی تھی۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ اب وہ گانے بھی [illegible] اور اُن گانوں کی شہرت دور دور تک پھیل رہی تھی۔ یہی [illegible] فلمی دنیا میں اب اُس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ یہ محض اللہ [illegible] کہ وہ مجھے مل گئی تھی اور میں توقع رکھتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی [illegible] سوچ لے گی۔ آبی کے لیے اس کے دل میں لبسی محبت ابھی [illegible] نہیں ہوئی تھی اور یہ بڑی بات تھی۔ وہ اس کا نام حسن کر[illegible] ہو گئی تھی۔ بالآخر اس نے شربت کا گلاس ختم کر کے میز پر ڈال[illegible]

"آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟"

"وقت ہی وقت ہے میڈم! مجھے اب کیا کرنا ہے [illegible] جیل میں بند ہے۔ میں تو اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کر [illegible]

"ہوں.... ٹھیک ہے۔ آپ بڑے صاحب کو جا[illegible]

"جی میں.... میرا خیال ہے کوئی بھی اُن سے ناوا[illegible] ہو گا۔ وہ جو اُونچی اُونچی فصیلوں کے پیچھے رہتے ہیں۔"

"ہاں وہی۔ آج صبح ہی اُن کے پرائیوٹ سیکرٹری [illegible] آیا تھا۔ وہ مجھے باریابی کی اجازت مرحمت فرما رہے [illegible]

"کیا مطلب! یعنی آپ کو بُلایا ہے انھوں نے؟"

"ہاں! وہ دراصل میرا گانا سُننا چاہتے ہیں۔"

"جی! میں سمجھ رہا ہوں۔ اُن کی جولانی طبع کا بھی مجھے اندازہ ہے۔"

"اور سیکرٹری نے مجھے آج رات وہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ رات دس بجے۔ دعوت کسی کوٹھی میں ہو گی۔ معدودے چند لوگ وہاں آئیں گے۔ شاید وہ جگہ کہیں شاہدرہ کے پاس ہے، دریا کے کنارے۔"

"جی! میں سمجھ رہا ہوں۔ ایسی موج میلے کی دعوتیں ایسی ہی جگہ ہوا کرتی ہیں۔"

"مجھے یہ اجازت ہے کہ میں اپنے ساتھ ایک آدمی کو وہاں لے جا سکتی ہوں، ایک محافظ کو۔"

"پھر! کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"میرا خیال ہے اُن سے بات ہو سکتی ہے۔ وہ بڑے اثر رسوخ کے آدمی ہیں۔ اُن کا کیا جائے گا مگر ہمارا کام ہو جائے گا۔"

"کیا خیال ہے آپ کس کو ساتھ لے جائیں گی؟"

"آپ کو۔ میرا یہی خیال ہے۔ آپ سے زیادہ بہتر محافظ مجھے اور کون مل سکتا ہے۔"

"میں تیار ہوں، بالکل تیار ہوں۔"

"میرا خیال ہے آپ کی کمر پر اس وقت بھی پستول موجود ہے۔" وہ بڑے دلربا انداز میں مسکرائی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر اس کا آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"میری نگاہ آدمی کا ایکسرے کر لیتی ہے۔ تو پھر طے رہا کہ آج رات دس بجے ہم سفید پور جائیں گے۔ یہ اس جگہ کا نام ہے۔ وہاں کسی نے دریا کے کنارے ایک محل آباد کر رکھا ہے اور اس قسم کی ساری محفلیں آج کل وہیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔"

"میں نے پہلے تو انکار ہی کر دیا تھا مگر خیر اب میں ضرور جاؤں گی۔ میں انھیں فون کر دیتی ہوں۔ اُن سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر وہ ناراض ہو گئے تو.... کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں وہ۔" یہ کہہ وہ اطمینان سے ٹیلیفون کی طرف بڑھی اور نمبر گھما کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں ہاں کہہ دوں۔ میں بھی جواب میں مسکرا دیا۔ میری اس مسکراہٹ سے اُسے بڑی استقامت ملی۔ کسی نے دوسری طرف سے فون اٹھا لیا تھا۔

"کون صاحب ہیں؟" وہ بولی...... "جی! مراد صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟"...... "آپ نے صبح فون کیا تھا"...... "ہاں۔ کیا واقعی؟ بہت ناراض ہیں وہ؟"...... "نہیں مراد صاحب! میں تو اُن کی داسی ہوں۔ وہ حکم کریں اور میں حاضر نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا اُن سے بات ہو سکتی ہے۔ ناچیز انھیں سلام عرض کرنا چاہتی ہے۔"...... "ٹھیک ہے مراد صاحب۔ اچھا سُنیں! اُن سے کہہ دیں کہ میں آج رات دس بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ سفید محل۔ یہ جگہ میں نے دیکھ رکھی ہے۔ ایک فلم کی شوٹنگ بھی ہم وہاں کر چکے ہیں؟"...... "تو بس ٹھیک ہے، میں شاید نو بجے ہی وہاں پہنچ جاؤں۔ میرے ساتھ میرا ڈرائیور ہو گا اور بس۔ ویسے مجھے چھٹی کس وقت ملے گی؟"...... "ہاں! یہی بہتر ہے۔ اُن کو آرام بھی تو کرنا ہے۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ میری طرف لوٹ آئی۔

وہ کچھ افسردہ سی نظر آنے لگی تھی۔ میرے لیے بھی یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ وہ کام جسے میں نہ کر سکا، ایک عورت کے ذمے ڈال رہا تھا اور وہ بھی ایسی عورت جس کو اپنی شہرت اور عزت بنانے کے لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی لیکن وہ سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں پال سکتی تھی۔ وہ آئی اور بھی بھی نظروں سے میرے سامنے بیٹھ کر شربت کا گلاس بھرنے لگی۔ ملازم نے تمام چیزوں کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔

"کاش آپ مجھے آج نہ ملے ہوتے۔ تو میں اُن کی دعوت کبھی قبول نہ کرتی۔ وہ بہت دنوں سے اصرار کر رہے ہیں مگر میں ہر بار مصروفیت کا بہانہ کر کے بات ٹال دیتی ہوں، شہر سے باہر چلی جاتی ہوں، شوٹنگ کے بہانے۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مگر اب پتا نہیں ایسی کیا بات ہے۔ آبی کے لیے میں.... ہاں ٹھیک ہے۔ اس کے لیے مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ یہی سہی مگر پتا نہیں وہاں حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"دیکھیں نا، میں نے وہ سفید محل دیکھ رکھا ہے۔ ہم نے وہاں شوٹنگ کی ہے۔ خاصا بڑا محل ہے۔ اس کی دیواریں بہت اُونچی ہیں۔ تنہائی وہاں ایسی ہے کہ آدمی کا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ چند ملازم بھی وہاں رہتے ہیں ـــــ کبھی کبھار وہ محل سجنے لگتا ہے ـــــ وہ بھی ایسے لوگوں کی وجہ سے۔ ایسے میں اچانک وہاں بہار آ جاتی ہے۔ یہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ مجھے وہاں ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا۔ مگر اب میں ضرور جاؤں گی۔ میرا خیال ہے کہ... کیا کہتے ہیں آپ؟ میں وہاں محفوظ رہوں گی نا؟ بات بھی تو دیکھیں بہت بڑی ہے۔ آبی کی رہائی کوئی معمولی معاملہ نہیں ہے اگر میں اُن کے سامنے گا کر انھیں خوش کر دوں تو میرا خیال ہے میں اُن سے آبی کی رہائی کا وعدہ لے سکتی ہوں۔ آبی تو اس بات کو نہیں سمجھتے، وہ مجھ سے بہت ناراض ہو کر گئے تھے مگر مجھے اُن سے محبت ہے جیلانی صاحب۔ وہ مجھے اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں۔"

وہ مسلسل بولتی چلی جا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ میں

خاموش بیٹھا اسے بولتے دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ میرا اپنا دل اس معاملے میں مطمئن نہ تھا۔

"کیا بات ہے، میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے؟"

"میں کیا کہوں الماس! فون پر اس آدمی نے کیا کہا ہے آپ سے؟"

"وہ تو خوش ہو گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ وہ اپنی گاڑی بھیج دیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیا..... کوئی خطرہ تو محسوس نہیں کرتے آپ اس معاملے میں؟"

"بہت بھولی ہیں آپ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خطرہ نہ ہو۔ آبی [illegible] کا آسان کام نہیں۔ میرا خیال ہے آپ اس قصے کو رہنے ہی دیں۔ اس کی قسمت میں جو ہوگا وہ بھگت لے گا۔ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا ہوتا کہ میں آپ سے اس کا ذکر نہ کرتا۔ فائدہ ہی کیا ہے۔"

"نہیں نہیں! ایسا نہ سوچیں۔ جب وہ آخری بار مجھ سے ملے تو انھوں نے مجھ پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ وہ ہاتھ کے بہت سخی آدمی ہیں۔ ان کی شاید کچھ زیادہ ہی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اُن کی وجہ سے میں نے ایک فلم شروع کر دی۔ اس کے لیے بھی انھوں نے مجھے ڈھیر ساری رقم دے دی۔ کم از کم پندرہ لاکھ تو دے ہی دیے تھے۔ وہ فلم آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی ہے۔ 'دل نگار' نام ہے اُس کا۔ میں خود اس میں ہیروئن ہوں۔ اُس میں کام کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے آدمی کو یوں جیل کی نذر کر دینا ناممکن ہے جیلانی صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وکیل تو ہماری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ ہمیں کوئی اور ہی راستہ تلاش کرنا ہوگا اور وہ میں کروں گی۔ آبی کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں انھیں کیسے بھول سکتی ہوں۔"

"وہ آپ کے منگیتر بھی ہیں۔"

"کاش ہم اُنہی دنوں شادی کر لیتے مگر پتا نہیں وہ کیوں پیچھے ہٹ گئے۔ اس بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔"

"پھر بھی میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ سفید محل جانے کا خیال چھوڑ دیں۔ آبی کو اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔"

"آپ اس کا ذکر آبی سے نہیں کریں گے۔ میں ایک فیصلہ کر چکی ہوں اور وعدہ کر لیا ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی۔ وہ کہا نہیں [illegible] مجھے۔" یہ کہہ کر اس نے شربت کا پورا گلاس حلق میں اُتار لیا اور پھر دوسرا گلاس بھرنے لگی۔ پتا نہیں اُسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ کس جذبے میں مبتلا تھی؟ اُسے معلوم تھا کہ یہ راستہ کس قدر کٹھن ہے۔ اُسے کن مراحل سے گزرنا ہوگا۔ جیل کی بالا بلند دیواریں پھلانگنا بچوں کا کھیل تو نہ تھا۔ وہ فلمی دنیا کی مشہور و معروف شخصیت تھی۔ اپنا تشخص اُسے بہت عزیز تھا۔ وہ کبھی بھی خود کو [illegible] نہیں گراتی تھی۔ اپنے حلقے میں وہ بڑی ہی معزز سمجھی جاتی تھی۔ اخبار میں بھی اس کے بارے میں کبھی کوئی اسکینڈل شائع نہ ہوا تھا۔ آبی کو بھی اس کا احساس تھا مگر پتا نہیں وہ کس بات سے ناراض ہو گیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اب صورتِ حال بہت ہی پُرپیچ ہو گئی تھی۔ الماس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اُس پر عمل بھی کر گزرے گی مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب بھی ہو جائے گی؟ اس پر وار خالی بھی جا سکتا تھا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کو سمجھا لینا میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ ارادے کی بہت پکی عورت تھی۔ اس کو روک لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ وہ [illegible] سامنے سے اُٹھ کر ٹہلنے لگی تھی۔ اس کا ذہنی اضطراب اُسے [illegible] نہیں لینے دیتا تھا۔ کوئی بات اس کے دل میں کھب کر رہ گئی تھی۔ تب میں نے جانا کہ وہ آبی سے کتنی محبت و عقیدت رکھتی ہے۔ وہ اُس کے نام کی مالا جپتی تھی۔ آبی نے اُسے مسحور کر رکھا تھا۔ ایسی اداکارائیں کب کسی کو اہمیت دیتی ہیں۔ میں اسے خوش قسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔ ورنہ وہ اس قابل کہاں تھا کہ اُس کے نام پر سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جائے۔

شدید ذہنی اضطراب میں گھر کر میں وہاں سے اُٹھ کر باہر آیا۔ نظام دین برآمدے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم اُٹھ گیا "اب کیا حکم ہے صاب جی؟"

"دیکھو، تم اس گاڑی کے کاغذات تیار کراؤ۔ خواہ تمھیں اپیلائیڈ فار سے کام نہیں چلے گا۔"

"جی بہت بہتر۔ میں واپسی پر ادھر ہی آ جاؤں گا۔"

"ہاں! اگر میں یہاں نہ ہوا تو گھر پر ملوں گا۔ یہ لو [illegible] ساتھ لے جاؤ۔ میرا خیال ہے تم سیدھے وہاں سے گھر پہنچ جانا۔ شاید مجھے کچھ دیر ہو جائے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک ہزار [illegible] دے دیا تاکہ وہ اطمینان سے یہ کام کروا سکے۔ وہ گاڑی میں والدہ کو دے دینا چاہتا تھا۔ انھیں زندگی کے اس حصے میں تو آرام ملنا چاہیے تھا۔ ورنہ اب تک انھوں نے ہمارا کیا [illegible] تھا۔ اچھا ہوا میں نے انھیں جیک سوالن نہیں جانے دیا۔ [illegible] میں انھیں بھلا کیا آرام ملتا ہوگا۔

نظام دین جلد ہی گاڑی لے کر باہر نکل گیا تو میں [illegible] ہوا دوبارہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ الماس اس وقت میں آ ٹھہری تھی۔ اس کا رنگ اور زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔ [illegible] آ ٹھہرتی تھی وہاں کا سارا ماحول منور ہو جاتا تھا مگر اس [illegible] بہت افسردہ لگ رہی تھی۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ جس آدمی [illegible]

اتنی محبت کرتی ہے، اُسے کسی دن جیل بھی جانا پڑے گا۔

"آپ نے گاڑی کہاں بھیجی ہے؟"

"یہ میں نے نئی خریدی ہے۔ اس کے کاغذات بنوانے کے لیے میں نے نظام دین کو دفتر بھیجا ہے۔"

"تو پھر طے رہا کہ آپ شام کو چھ بجے میرے ساتھ چلیں گے۔"

"جانا تو کچھ مشکل نہیں ہے الماس بیگم! مگر یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔"

"ایسا نہ سوچیں۔ کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"خدانخواستہ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو..... یہ ناممکن نہیں ہے۔ وہ بڑے معزز لوگ ہیں، اُس کوٹھی کی دیواریں بہت اُونچی ہیں۔"

"لیکن آپ جو میرے ساتھ ہوں گے۔"

"اور پھر وہ مجھے پہچانتے بھی ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے جانتے ہیں۔ انھیں میری موجودگی اچھی نہیں لگے گی۔ وہ مجھے اندر نہیں جانے دیں گے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ میرے ساتھ ہوں گے اور آپ کا حلیہ بھی بدلا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں آپ کو روک نہیں سکتا ہوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"تو پھر یوں کریں کہ آپ ادھر ہی آرام کریں۔ دوپہر کا کھانا بھی یہاں ہی کھا لیں۔"

"بہت بہتر! میں ذرا سو لیتا ہوں۔"

"ہاں یہ اچھا رہے گا۔ آپ کے لیے میں بیڈروم کھول دیتی ہوں۔ اتنے میں کچھ دوسرے انتظامات کر لوں گی۔ کچھ اور لوگ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔"

"مگر اس کی اجازت کہاں ہے! وہ تو صرف ایک آدمی کو اندر جانے دیں گے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ میوزک کے بغیر کام کیسے چل سکے گا۔ انھیں اتنی سمجھ ہونی چاہیے۔"

"جو مرضی ہے کریں..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" الماس نے میرے لیے بیڈروم کھول دیا اور میں [illegible] بستر پر جا لیٹا۔ اس نے اے سی بھی کھول دیا تھا۔

کچھ [illegible] مجھے کمبل کی ضرورت محسوس [illegible] اُس نے پائنتی ڈال دیا تھا۔ [illegible] گر گئی [illegible] ڈر سا گیا۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ [illegible] آنکھوں [illegible] کئی تھیں۔ [illegible] تو [illegible] مجھے سونا بھی [illegible]

جب میں بیدار ہوا تو اُس وقت دو بج رہے تھے۔ وہ بڑی افسردہ دوپہر تھی۔ مجھے الماس نے جگا دیا تھا اور وہ ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ میں باہر نکلا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ شاید روتی رہی ہے۔ خدا جانے اُسے کس خیال نے رُلا دیا تھا۔ وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی "کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"کیا بات ہے، آپ روتی رہی ہیں؟"

"نہیں تو، [illegible] کوئی خیال آ گیا تھا کہ میرے آنسو نکلے۔ اور پھر....."

"پھر کیا؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ابھی اس آدمی کا فون آیا تھا۔ [illegible]"

[illegible]

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آپ ایک [illegible] الماس! [illegible] خوشی ہوئی ہے۔ [illegible] ایسے [illegible]"

[illegible]

"[illegible] آبی کی [illegible] ہم اُن کی کوئی مدد [illegible] کر سکے۔"

"اللہ بہتر کرے [illegible] اور راستہ نکل آئے گا۔ [illegible] رہنا چاہیے۔"

میں اس کے ساتھ [illegible] میز پر جا پہنچا۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کھانا اُس نے بہت [illegible] تیار کروایا تھا اور وہ اصرار کر رہی تھی کہ [illegible] کھاؤں۔ [illegible] مجھے اُن کے ساتھ کھانے میں شریک ہو کر بہت مزہ آیا۔ [illegible]

"میں نے ابھی راولپنڈی فون کیا تھا۔ [illegible] اپنی افسردگی پر وہ اب تک قابو نہیں پا سکی تھی۔

"کسے فون کیا تھا آپ نے؟"

"وہ بہت [illegible] سیاسی لیڈر ہیں [illegible] صاحب۔"

"اچھا! پھر! پھر کیا ہوا؟"

"اب مجھے اُن کے فون کا انتظار ہے۔"

"کیا کہا تھا آپ نے [illegible]؟"

"میں نے [illegible] صاحب [illegible] میں اُن سے بات کی تھی کہ وہ مجھے [illegible] کا کیا حال ہے۔"

"گڈ! بہت اچھا کیا آپ نے۔ کیا کہا انھوں نے؟"

"کہہ [illegible] معلوم کروا تے ہیں۔ وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ [illegible] شاعر بھی ہیں، بہت اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ اُن کا

کلام بھی چھپ چکا ہے۔ اس کی رونمائی کے وقت انھوں نے مجھے بھی بلایا تھا۔ اُن کی کتاب کا نام 'لب و عارض' ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"وہ دراصل .... آپ کو تو شاید پتا نہیں ہے۔ آج سے کوئی چار سال پہلے وہ مجھے پسند کر چکے تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ میں اُن سے شادی کر لوں اور خاتونِ خانہ بن کر بیٹھ جاؤں مگر یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ اداکاری میری گھٹی میں پڑی ہے۔ میں بھلا یہ کام کیسے چھوڑ دیتی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ کاش آپ نے اُن کی بات مان لی ہوتی۔"

"جی نہیں۔ ہر انسان، ہر کام کے لیے نہیں ہوتا ہے مگر لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بات بن جائے گی۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ میرے بہت مداح ہیں۔ اُن کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر اُن کی کوئی اڑتیس سال ہوگی۔ پھر بھی وہ بڑے دیدہ زیب آدمی ہیں ——"

"جی جی، میں سمجھ رہا ہوں۔"

"اور آج میں نے بہت دنوں بعد انھیں فون کیا ہے۔ وہ مجھ سے آبی صاحب سے میرے تعلق کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں بھلا اُن سے کیا کہتی۔"

"جی، جی۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" میں نے شدید ذہنی تذبذب میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔ الماس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس عورت کو کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ دراصل کسی کو بھی مسترد نہیں کرتی تھی۔ آبی کا نام وہ اپنی گرہ میں باندھ رکھتی تھی اور رفیق خاور صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ الماس اب تک اُسے نہیں بھلا سکی تھی۔ کوئی بھی عورت ماضی کو فراموش نہیں کرتی ہے اور پھر کوئی ایسا آدمی جس کا اختیار بے حد و حساب ہو، جس کے قلم کی ایک حرکت بڑے بڑوں کی قسمت کا فیصلہ کر دے وہ اُسے کیسے بھول سکتی ہے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ ہم وہاں سے اُٹھ کر پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ کمرے کی ہوا یخ بستہ تھی۔ اس نے کوٹھی کے ہر کمرے میں اے سی لگوا لیا تھا اور یہ بڑی خوشحالی کی علامت تھی۔ الماس اپنی زندگی کا بہترین دور گزار رہی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ تیزی سے دوسری طرف لپکی۔ معلوم ہوا کہ وہ رفیق خاور صاحب ہیں۔ پنڈی سے بول رہے ہیں۔ الماس نے مجھے کونے میں رکھا دوسرا فون اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو وہ کہہ رہے تھے۔

"کیا حال ہیں آپ کے، میں نے اُن کا پتا کروا لیا ہے۔"

"اچھا پھر؟ کیا معلوم ہوا آپ کو؟"

"وہ تو کوئی بہت ہی گھٹیا آدمی ہے وہ آبی! اسے چوری، ڈاکا زنی اور قتل کے مقدموں میں پکڑا گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کوئی عورت ہے آسیہ، وہ بھی اس کے ساتھ گرفتار ہوئی ہے۔ آبی نے اپنا نام علی حسن گردیزی رکھا ہوا ہے۔ ہاں اُس کے ساتھ کئی اور آدمی بھی ہیں۔ وہ میانوالی کے علاقے قندیار کی حویلی سے گرفتار ہوئے ہیں۔ انھوں نے اصل ملک کو قتل کرنے کے بعد اس کی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ پولیس نے اُن کے ریمانڈ کا وقت پورا ہونے پر جیل بھیج دیا ہے مگر ابھی اُن کا مقدمہ عدالت میں نہیں لگا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ البتہ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ اسلم آبی اندھا ہو چکا ہے اور وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔"

"کیا کہا آپ نے! وہ اندھے ہو چکے ہیں؟" وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

"جی ہاں! یہ بڑی اہم بات ہے اور جیل سے وہ اپنا علاج کرانے کہیں منتقل نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں! ایسی کیا بات ہے؟"

"وجہ یہ ہے کہ اس آدمی پر کسی اور کے ذریعے جیل سپرنٹنڈنٹ اکبر قریشی کو اغوا کرنے اور پھر اقدام قتل کا مقدمہ بھی اس سے درج ہوا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے خاور صاحب!"

"یہ ہو چکا ہے الماس۔ پتا نہیں تمھیں اس آدمی سے ہمدردی کیوں ہے۔ اکبر قریشی بچ گیا ہے اور اُس نے ہی یہ مقدمہ درج کروایا ہے۔ کل وہ دونوں پولیس کی تحویل میں چلے جائیں گے۔"

"یہ تو بہت ہی افسوس ناک بات ہے خاور صاحب! کچھ ہو سکے تو ان لوگوں کی مدد کریں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ اگر چاہیں تو آجائیں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ویسے بائی دی وے، وہ آپ کا ہے کون ہے؟"

"وہ میرے بہت قریبی عزیز ہیں خاور صاحب! مجھے تو یہ سب کچھ جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔ علی حسن گردیزی ایسا نہیں کر سکتے۔"

"یہ اُس کا اصل نام نہیں ہے بانو! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ریکارڈ تو بہت ہی گندہ ہے۔ کوئی شریف آدمی تو اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ امپاسبل۔ میں بہرحال اس معاملے میں شاید آپ کی کوئی مدد نہ کر سکوں۔ آئی ایم سوری بانو! تھینک یو۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔"

"اوہ ڈیم اٹ! کر دو بند۔ تمھیں کسی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں۔"

"بانو! سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ بات نہیں ہے۔"

"حل کیا بتلاتے ہیں آپ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔"

"اور اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہو تو پھر؟"

"جھوٹ نہیں ہے یہ، آبی کے ساتھ ایک اور آدمی کی بھی پولیس کو تلاش ہے اور اس کا نام ہے غلام جیلانی۔ پولیس نے اُس کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے، پچاس ہزار روپے۔ وہ ایک نہیں کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب ہے اور آج سے نہیں بہت عرصے سے وہ اس کی تلاش میں ہیں۔ پتا نہیں آپ کیا سمجھ رہی ہیں اس معاملے کو۔ بہتر ہے آپ اُن کا خیال چھوڑ دیں ڈیئر! یہ اچھی بات نہیں ہے ——"

الماس نے فون پٹخ دیا۔

الماس کے چہرے پر ایک غضبناک کیفیت ابھر آئی تھی — اس پر ایسے ایسے انکشافات ہوئے تھے کہ وہ اندر سے بہت دکھی ہو گئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ آبی اس قسم کا آدمی ہے۔ میرے بارے میں بھی اس کا تصور بہت ہی عمدہ تھا مگر حالات کے اس رُخ کا تو اُسے قطعاً علم نہیں تھا۔

ریسیور رکھ کر وہ دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگی۔ میں اپنی جگہ شرمندہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھ میں سکت ہی نہیں رہی تھی کہ میں اُس کو مخاطب کر سکوں۔

کتنی ہی دیر تک وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ میں بھی اپنی جگہ سے ایک قدم نہ ہل سکا۔ میں تو واقعی سُن ہو کر رہ گیا تھا۔

"آپ .... آپ یہاں سے چلے جائیں جیلانی صاحب! آپ کے لیے یہی بہتر ہے اور سمجھیں کہ میں آبی کے لیے اور آبی میرے لیے مر گیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"یہ غلط ہے الماس بیگم! یہ جھوٹ ہے۔ رفیق خاور کو جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔"

"اور صحیح کیا ہے۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ اس سے زیادہ میری بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ میں .... میرا منگیتر ایک ڈاکو ہے، ایک قاتل ہے، ایک ذلیل آدمی ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ کو بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے میڈم! میں تو اس سے زیادہ میں کچھ نہیں سن سکوں گا۔ وہ میرا دوست ہے، میرا بھائی ہے۔ اس کی تذلیل میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"اور .... اور آپ اس کے دوست ہیں، استاد ہیں اور اس راہ پر لگانے والے آپ ہی ہیں۔ کیا بات ہے آپ کی۔ آپ دس بیس لاکھ روپیہ ایک لمحے میں خرچ کر سکتے ہیں۔ کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں آپ۔ پھر بھی آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ بہتر ہے آپ یہاں سے ابھی چلے جائیں اور بس۔ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتی ہوں۔"

"مگر میری بات تو سنیں۔ میں کہتا ہوں یہ ساری باتیں غلط ہیں!"

"میں ہی آپ کو نہ سمجھ سکی۔ ورنہ آپ کا اُس ریگستان میں جو انداز تھا، مجھے اُس سے عبرت پکڑ لینا چاہیے تھی۔ کتنے بے دریغ ہو کر آپ نے وہاں گولی چلائی تھی۔ میں بھی سوچتی تھی کہ کوئی عام آدمی اس طرح تو کبھی نہیں کرتا ہے۔ کتنے ہی آدمی آپ نے وہاں مار دیے اور آپ کے چہرے پر ملال تک نہیں آیا۔ مجھے اُسی وقت ہی سمجھ جانا چاہیے تھا مگر میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے آبی صاحب سے اپنی منگنی کروا لی۔ کوئی مجھ ایسا پاگل بھی دیکھا ہے آپ نے اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری ابھی تک آبی صاحب سے شادی کیوں نہیں ہو سکی۔ اُس خونی، اُس بھیڑیے سے۔ وہ اب جیل میں بیٹھا ہے اور اندھا ہو چکا ہے۔ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے جو اُسے مل رہی ہے۔ وہ اُسے علاج کی مہلت بھی نہیں دے رہے ہیں۔ اچھا ہے، وہ اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ اُف میرے پروردگار! یہ میرے کس گناہ کی سزا تھی۔ میں .... اگر میری اس سے شادی ہو گئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ بتائیے جیلانی صاحب! پھر کیا ہوتا؟ میری شہرت، میری عزت، میرا وجود سب کچھ تباہ ہو گیا ہوتا۔"

وہ اُس وقت صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور یوں باتیں کر رہی تھی جیسے وہ خود سے مخاطب ہو۔ میرے پاس اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اُس سے کہتا تو کیا کہتا۔

"ٹھیک ہے میڈم۔ میں جا رہا ہوں، خدا حافظ۔"

"میری کیفیت کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں جیلانی صاحب! آپ نے سُن لیا ہے رفیق خاور صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ آپ کے بارے میں بھی اُنھوں نے جو کچھ کہا، وہ میرے لیے حیران کن ہے۔"

"مجھے کسی کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ آبی پر کیا بیت گئی ہے۔"

"پھر .... وہ .... کیا وہ تشدد سے اندھے ہوئے ہیں؟ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔" اُس کی غزالی آنکھیں اشک بار تھیں۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں! میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ کل ایک کام سے اِدھر آیا تھا۔ اب میں پھر راولپنڈی جا رہا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے، میں تو اُسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچا۔ نہ اُسے کچھ سوجھ رہا تھا، نہ مجھے۔ وہ بہت دل شکستہ نظر آتی تھی۔ اس کے آنسو بے وجہ نہیں تھے۔ کسی کی آس اُمیدیں یوں ٹوٹ جائے، کوئی اپنے ساتھی کے بارے میں ایسا کچھ سُنے جو اُسے خاور صاحب نے بتایا تھا تو وہ تو زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس کیا باقی بچتا ہے، کچھ بھی نہیں اور وہ دلوں میں آگ لگا دینے والی عورت اپنے اس محبوب سے مایوس ہوئی تھی جس کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اُس تک ضرور لوٹ آئے گا۔ جس کے متعلق وہ اب تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ

ایک بہت بڑا راز چھپا رہا ہے۔ جس کے پاس بے تحاشا روپیہ موجود ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ اُس نے فلم کے لیے اُسے پندرہ بیس لاکھ بغیر کسی جھجک کے دے دیے۔ کون دے سکتا تھا اور پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اُس نے وہ رقم کہاں خرچ کی ہے۔ اس شخص کے بارے میں جب اُسے پتا لگا کہ وہ ڈاکو ہے، قاتل ہے، خونی ہے تو اُس کے محسوسات کا کوئی بھی شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ مجھے بھی اب وہ اُسی کوڑے سے دو چار ہی تھی۔ مجھے جب اُس نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا تو وہ اپنی جگہ بالکل حق بجانب تھی۔ میں اُس کو یہ سب کچھ محسوس کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اس وقت اس کی دل شکستگی دیدنی تھی اور مجھے اُس سے ہمدردی تھی لیکن اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں نادم سا ہو کر اُس کی کوٹھی سے نکلا اور سڑک پر جا پہنچا۔

ٹیکسی مجھے جلدی ہی مل گئی اور میں اُس میں بیٹھ کر سیدھا اپنی کوٹھی جا پہنچا۔ نظام دین مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا اور مجھ سے وہ مختلف کاغذات پر دستخط کروانا چاہتا تھا مگر گاڑی تو میں نے ماں جی کے نام سے خریدی تھی۔ اُن سے میں نے مختلف فارموں پر دستخط کروا کر اُسے دے دیے تاکہ وہ اگلے روز اس معاملے کو طے کروا دے۔

میرا دل اتنا بجھا ہوا تھا کہ میرا گھر میں کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اذیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس نے مجھے بے بس کر رکھا تھا۔ کمروں میں اس وقت تک اے۔ سی لگ چکے تھے اور ان کی ہوا خنک تھی۔ جی چاہتا تھا آدمی اس خنکی میں مست ہو کر گہری نیند میں کھو جائے مگر نیند نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا۔ چھ بجے تک میں یونہی بستر میں پڑا سوچتا رہا مگر کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میرا خیال ہے اُس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے کہ میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کوئی صاحب مسز سفیر احمد صاحبہ کا پوچھ رہے ہیں۔

"کون مسز سفیر احمد؟ یہاں تو اس نام کی کوئی عورت نہیں رہتی۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی رانگ نمبر تھا مگر وہ صاحب کچھ زیادہ ہی نشے میں تھے۔

"جناب نمبر تو یہی ہے۔ یہ میرے پاس لکھا ہوا ہے اور اتنا پاگل میں ابھی نہیں ہوا کہ نمبر ہی غلط لکھ لوں۔ براہ کرم مجھے اُن سے ملوا دیں، ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"تو پھر آ جاؤ۔ مجھ سے ہی مل لو۔ میں اس وقت بالکل تنہا ہوں۔"

"آپ کا نام؟"

"تمھیں میرے نام سے کیا مطلب ہے بھائی؟"

"پھر بھی صاحب جی والا۔ کوئی تو نام ہوگا آپ کا؟"

"میرا نام سفیر احمد ہے۔"

"ہاں اب ہوئی نا بات۔ آپ خواہ مخواہ ہی مجھے زچ ... دیکھیں آپ کی بیگم نے ہم سے کچھ سامان خریدا تھا۔ ایک کرا ... کچھ وی۔ سی۔ آر کے کیسٹ۔ کچھ رقم وہ دے گئی تھیں ... باقی ہیں۔ وہ مجھے اُن سے لینے ہیں۔ اس لیے آپ کو زحمت ... آپ کی کوٹھی کا نمبر بھی میرے پاس لکھا ہے۔ اگر آپ نے ... تو میرے آدمی آپ کے گھر آ جائیں گے اور یہ اچھی بات نہ ہو ..."

وہ مجھے باتوں میں گھسیٹ رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہو سکتا ہے کسی بہت بڑی سازش کا حصہ ہو۔ کوئی آدمی پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے ایک دم فون الگ ... میں خواہ مخواہ ہی بے وقوف بن رہا تھا۔ کوئی پانچ سیکنڈ ... پھر فون اٹھایا تو وہ ابھی تک بول رہا تھا۔

"آپ بولتے کیوں نہیں ہیں سفیر احمد صاحب! اگر ... ہیں تو بتا دیں۔ میں انتظار بھی کر سکتا ہوں۔" اُس کے قریب کہیں کئی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں مگر میں اُن میں سے کسی کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ نمایاں آواز صرف اُسی آدمی کی تھی ... فون بند کر دیا۔ احساس مجھے یہی ہو رہا تھا کہ کسی نے ... نہیں کیا ہے۔

نظام دین اس وقت تک واپس آ چکا تھا ... بند ہوتے تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کارروائی ... میں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور اُمّی کپڑے ... ایک سوٹ کیس لیا اور اُس میں ضروری سامان ڈال ... کے لیے تیار ہو گیا۔ کوئی پچاس ہزار کی رقم میں نے اُس کی جیب ... بھر لی۔ میری اسٹین گن بھی اُسی میں تھی اور گولیاں بھی۔ ... میں نے قمیص کے نیچے کمر پر باندھ لی۔ میں اُس فون سے خوف ... نہیں چاہتا تھا کہ میرا کوئی دشمن میرے گھر پر شب خون مار ... والدہ کو پریشان کرے۔ میں گھر کو اُن کے لیے امن کا گہوارہ ... تھا۔ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں وہاں نہ رکھ کر میں نے ... کیا۔ میں تنہا ہوتا تو بات ہی اور تھی۔ میں کسی بھی صورت ... عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ بہت ہوتا تو وہ مجھے مار ہی دیتے نا ... زیادہ وہ کیا کر سکتے تھے مگر ماں جی کے سامنے میں ذلیل ... لیے تیار نہیں تھا اور ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ... ہیں جو فون پر یہ جاننا چاہتے تھے کہ غلام جیلانی گھر پر ... اب انھیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں گھر پر موجود ہوں۔ وہ ... ٹکوے تیز کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آج رات ... ضرور آئیں گے۔ پر وہ تھے کون؟ اس کا مجھے اندازہ نہیں ...

تیار ہو کر میں ماں جی کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ مغرب کی نماز کے لیے وضو کر چکی تھیں۔ بولیں: "آؤ بیٹے! تم نے تو آج شکل ہی نہیں دکھائی ہے۔ خیر تو ہے نا؟"

"بالکل خیر ہے ماں جی! بس ذرا سی تھکن ہے۔ کمرہ تو اب ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے بیٹے! خدا تمھیں ... کتنا خیال ہے تمھیں میرا۔ نظام دین نے کوئی ایک گھنٹہ پہلے مجھے ... سیر کرائی ہے۔ ہائے کتنا پھیل گیا ہے یہ شہر۔ کوئی ایک گھنٹے تک ہم باہر رہے ہیں۔"

"پھر تو بہت اچھی بات ہے ... ابھی اپنے مکان تک بھی نہیں گئیں۔ اُس پر تو تالا چڑھا ہوا ہے۔"

"ہاں بیٹے! آسیہ آ جائے تو پھر میں اُدھر جاؤں گی۔"

"میں دراصل آسیہ ہی کا پتا کرنے جا رہا ہوں۔ یہ کار آپ کے پاس رہے گی۔ میں ٹرین سے چلا جاؤں گا۔ آپ سے میں اجازت لینے آیا تھا۔"

"تمھارا اللہ نگہبان بیٹے! اپنا بہت دھیان رکھنا اور فون کرتے رہنا۔ میں انتظار کروں گی۔ ابھی جاؤ گے؟"

"جی ماں جی! میرا یہی خیال ہے۔ کل صبح میں کسی وکیل سے بات کروں گا۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ اطلاع مجھے ضرور دیتے رہنا۔ میرا دل یہاں ... گھبرایا تو میں چک سوالن چلی جاؤں گی۔ آخر کو وہ میرا بھائی ہے۔ بڑا خیال رکھتا ہے میرا۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نظام دین آپ کے ساتھ رہے گا۔ بہت وضعدار آدمی ہے۔ یہ رقم آپ اپنے حساب میں جمع کروا دیں۔ جتنی چاہے خرچ کریں مگر بینک کے ذریعے ... ویسے میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

"تم اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟"

"کیوں؟ آپ کے پاس بری لگتی ہے یہ؟ اسے آپ اپنے پاس ... آپ کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگر آپ چک سوالن جائیں تو کسی ... بینک میں جمع کروا دیں۔"

"مجھے دھڑکا لگا رہے گا۔ بہرحال ٹھیک ہے۔ تمھارا کوئی حساب ... ہے یہاں؟"

"حساب تو ہے مگر وہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں رہے گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ نظام دین کے ساتھ بینک جا کر یہ روپیہ اپنے نام سے وہاں جمع کروا دیں۔ حیدر کو ساتھ لے جائیں۔ اس نے بھی وہاں حساب کھلوا لیا ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ایسا ہی کروں گی۔"

"تو پھر اجازت دیں ماں جی۔ میں بس ابھی جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! اللہ حافظ۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگیں۔

حیدر اور بالی اُس وقت باورچی خانے میں تھے۔ میں نظام دین کو ساتھ لے کر اُن کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم چپ ہو گئے۔ بالی نے بالآخر حیدر کو باندھ لیا تھا۔ وہ اس کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ میں نے حیدر کو باہر بلا کر کہا: "اوئے حیدر! دیکھ میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ کسی شخص کا فون آئے تو میرا نام کسی کو نہیں بتانا ہے۔ کہنا کہ میں یہاں رہتا ہی نہیں ہوں۔ سمجھے! کوئی آئے تو اسے گیٹ سے ہی ٹرخا دینا۔ گھر میں تو بہرحال کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں سردار صاحب! بالکل سمجھ گیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"میں کسی وقت تمھیں فون کروں گا۔ ماں جی کا بہت خیال رکھنا ہو گا۔ کل بینک جا کر ان کا حساب کھلوا دینا۔ کچھ رقم وہ وہاں جمع کروا دیں گی۔"

"ایسے ہی ہو گا۔ آپ کے کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں سردار صاحب! وہ ہماری مالکن ہیں۔"

"اچھا خدا حافظ! یہ بالی کیسی جا رہی ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ وہ مجھے اب واقعی اپنا شوہر تسلیم کرتی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے، خوش رہو اور کبری کے منہ میں کچھ راتب ڈال دیا کر۔ پھر تو نہیں آیا وہ اِدھر؟"

"آیا تھا جی! مجھ سے بیس روپے لے گیا۔ کہتا تھا گولی ختم ہو گئی ہے۔"

"بس یہی کمزوری ہے اُس کی۔ ویسے وہ اچھا آدمی ہے۔ اُس سے دوستی رکھو گے تو مزے میں رہو گے۔ چل بھئی نظام دین! مجھے اسٹیشن چھوڑ آ پیارے۔" یہ کہہ کر میں کار کی طرف بڑھ گیا۔ "کاغذات کا کیا ہوا نظام دین؟"

"جی وہ کل تک تیار ہو جائیں گے۔ میں دوپہر کو وہاں جا کر اُنھیں دے آیا تھا۔"

"اس میں عمدہ قسم کی نمبر پلیٹ لگوا لینا۔ پتا چلنا چاہیے کہ یہ کسی معتبر آدمی کی کار ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا صاحب جی۔"

"یہ بتا کہ یہاں سے نکلتے وقت کسی نے تیرا تعاقب تو نہیں کیا؟"

"جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ بہت بچ

بچا کے رہنا۔ یہ لاہور شہر ہے پیارے۔" میں نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھ لیا۔ کوٹھی کے ارد گرد کوئی آدمی موجود نہیں تھا جسے میں مشکوک سمجھ سکتا۔ گاڑی آرام دہ تھی، ہر قسم کے ساز و سامان سے مزین تھی اور نظام دین بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ اُس کو یہ ملازمت دے کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ضرورت مند تھا اور میں بھی ایک طرح سے ایسا ضرورت مند تھا جس کو کوئی بہت ہی وفادار آدمی ہی بھگتا سکتا تھا اور نظام دین میرے اس معیار پر پورا اُترتا تھا۔

اسٹیشن جلدی ہی آگیا۔ میں نے اُترتے وقت پھر پانچ سو روپے اُسے دے دیے۔ وہ کچھ حیران سا ہو گیا۔ بولا "صاب جی! آپ نے ایک ہزار تو پہلے بھی دیا تھا۔"

"اوئے یہ بھی رکھ لے۔ بھیج دینا گھر والی کو۔ وہ انتظار کرتی رہتی ہو گی۔ کسی دن دو روز کی چھٹی لے کر گھر بھی ہو آنا۔ سمجھا! تو کمائے گا نہیں تو وہ کھائیں گے کیسے۔"

"آپ کی مہربانی ہے جی! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں.... ایسا.... ایسا تو مجھے کوئی بھی نہیں ملا تھا جی، آپ لکھ لُٹ ہیں صاب جی! خدا آپ کو اتنا دے کہ آپ سورج جیسے مہربان ہو جائیں۔" نوٹ ہاتھ میں لے کر اُس کی آنکھیں بہ نکلی تھیں۔ یہ اُس کے تشکر کا انداز تھا۔ آدمی کی ضرورتیں ہی اُسے ذلیل کرتی ہیں اور پیمانہ ایک ہی ہے۔ روپیہ روپیہ اور صرف روپیہ۔

"ایسا نہیں سوچتے نظام دین! تمھاری ضرورت اب ہماری ضرورت ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" میں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور پھر میں اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میں جب تک اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا، وہ وہیں کھڑا رہا۔ دل میں سوچتا ہو گا کہ اُس کی قسمت کتنی یاور ہو گئی ہے۔ اس کی ضرورتیں آپ ہی آپ پوری ہونے لگی تھیں۔ اگر یہی حال رہا تو وہ تھوڑے دنوں میں ہی اپنے گاؤں کا مُعتبر ترین آدمی بن جائے گا۔ چار چھ کنال زمین بھی خرید لے گا۔ تقدیر کبھی اس پر اتنی مہربان نہ رہی ہو گی۔ میں نے سوچا، میں واپسی پر پھر اُسے ایک ہزار دے دوں گا۔ پانچ دس روز کی تو بات ہے اب کی بار میں راولپنڈی سے خالی ہاتھ واپس نہیں آؤں گا۔ آسیہ اور آپی میرے ساتھ ہوں گے۔

گاڑی ساڑھے نو بجے نکلتی تھی۔ میں نے اسٹیشن کے ڈائننگ ہال سے کھانا کھایا اور ٹھیک پونے نو بجے میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ میرے ساتھ سفر کرنے والا ایک نو بیاہتا جوڑا تھا۔ اُن کا انداز مجھے یہی بتاتا تھا۔ ایسے جوڑوں کے لباسوں سے ایک مہک سی اُٹھتی ہے جو ماحول کو معطر کر جاتی ہے۔ اُن کی طرف توجہ دیے بغیر میں یکسو ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال ہے انھیں میری آمد پر کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی ـــ میں

ٹھہرا سدا کا چھڑا آدمی۔ جتنے وہ دونوں کوئی نیم خواندہ ... مگر اُن کا تموّل اُن کے لباسوں سے ظاہر تھا۔ شاید دولہا ... بڑے کاروباری لوگوں سے تعلق تھا۔ بہر حال میں نے اُن کو توجہ نہیں دی اور وہ اپنے حال میں مست ایک دوسرے ... سے بیٹھے پیتے رہے۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ آپی اندھا کیسے ہو گیا۔ کہیں ... کہ اُس نے اپنے عدسے سے ہی کھو دیے ہوں مگر ایسے ... اسے ارد گرد کی چیزیں تو نظر آ جانی چاہئیں تھیں۔ اگرچہ ... ہوتی تھیں۔ ایسی صورت میں آدمی یہ تو پہچان سکتا ہے ... پر ہے کہ آسمان پر۔ اُس کے سامنے روشنی کی جائے تو ... کہ روشنی ہو چکی ہے۔ پھر وہ کیسے کہتا تھا کہ آپی نابینا ہو گیا ... اُن لوگوں نے اس پر تشدد کیا تھا تو پھر یہ بات تسلیم کی جا ... وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا ہو۔ ایسی صورت میں تو اس کی ... ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اُس سے پوچھتے ہوں گے کہ بتا ... تھا ہے کس نے اکبر قریشی پر وار کیا؟ کیا چاہتا تھا وہ؟ مگر ... آپی بچارا کیا بتا سکتا تھا۔ اُسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ یہی ... کا تھا۔ اس پر بھی ضرور تشدد کیا گیا ہو گا اور کسی سے انھوں ... پوچھا ہو گا۔ اُن کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا ... کو صرف آسیہ اور آپی کا نام معلوم تھا۔

اور وہ کہہ رہا تھا کہ کل انھیں پولیس بھی جسمانی ... سے نکال لے گی۔ اُن کے خلاف ایک اور مقدمہ درج ہو گیا ... سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ جیل کے اندر رہ کر اپنی تار ... ہلا رہے ہیں کہ باہر کسی بھی آدمی پر حملہ ہو سکتا ہے۔ وہ ... لوگوں کا اتا پتا پوچھ رہے ہوں گے۔ اُن کا خیال ہو گا کہ ... بڑا گروہ ہے۔ جس کا سربراہ غلام جیلانی ہے۔ میرا نام بھی ... ہو گیا ہو گا۔ صورتِ حال بہت ہی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اُن ... تباہی کی تمام تر ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ مگر میں ... جگہ بے بس تھا۔ اُن کے میں کسی بھی کام نہیں آ رہا تھا۔

گاڑی گوجرانوالہ پہنچ کر ذرا دیر کے لیے رُکی تو ... آدمی ہمارے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ وہ شاید کوئی موسیقار ... نے اپنے ساتھ ایک لمبا سا ڈبا اُٹھا رکھا تھا جس میں بالعموم ... موسیقی کے آلات رکھ لیتے ہیں۔ اس کی شکل بھی اُنھی لوگوں ... بال کندھوں تک پھیلے ہوئے، مونچھیں بڑی بڑی خان ... منہ میں پان، سگریٹ الگ اس کے لیے وبالِ جان بنا ہو ... فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ لباس اس کا سفید اور ... کُرتا پاجامہ وہ پہنے ہوئے تھا اور پاؤں میں ملتانی کھسّہ ... نے بڑی نزاکت سے ہلکی سی طلائی زنجیر پہن رکھی تھی اور ...

... مُریاں تھیں۔ آتے ہی اس نے بڑی زوردار قسم کی السلام علیکم کی۔ وہ ... چوتھی نشست کا مسافر تھا۔ ڈبا صرف چار آدمیوں کے لیے تھا۔ اپنا وہ لمبا سا ڈبا اس نے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ہم سب کی وعلیکم السلام کے بعد وہ بڑے اطمینان سے جم کر نشست پر بیٹھ گیا۔ بولا "گاڑی یہاں بہت کم عرصے کے لیے رُکی ہے۔ بہت بھاگنا پڑا مجھے۔"

"ہاں یہ تو ہے حالانکہ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ آپ اس میں سوار ہو رہے ہیں اور آپ کے لیے بھاگ دوڑ نقصان دہ ہے۔"

اُس نے بہت اچھنبے سے میری طرف دیکھا۔ بولا "تو گویا آپ مجھ پر طنز فرما رہے ہیں؟"

"نہیں جناب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہاں میں کہاں آپ۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک۔"

"گویا یہ مزید طنز فرمایا ہے آپ نے۔"

"میرا خیال ہے تعارف کا یہ طریقہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ دیکھیں میرا نام سردار کریم نواز ہے۔ یہ سونٹی دیکھ رہے نا آپ؟ یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اب آپ اپنا نام عنایت فرما دیں تو مہربانی ہو گی۔"

"میرا نام اُستاد اللہ نواز خان جمبول والا ہے اور میں سارنگی نواز ہوں۔ راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن جا رہا ہوں۔" اُس کی آواز بہت متوازن اور متحمل تھی۔ بدن اس کا ورزشی معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سارے ہی گائک قسم کے لوگ کسرت ضرور کرتے ہیں۔ سارا دن بیٹھے رہتے اور صرف گلا پھاڑنے یا انگلیاں فگار کر لینے سے تو صحت نہیں بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن میں سے اکثر و بیشتر پہلوانی کا فن جانتے ہیں۔ سادھو سنت، فقیر اور مُلا لوگ بالعموم بے فکر، خوش خوراک اور بہت عمدہ بُنت کے آدمی ہوتے ہیں اور یہی حال اُس اللہ نواز خان کا تھا۔ لگتا تھا کوئی فکر اُسے دامنگیر تھی ہی نہیں۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی خان صاحب! اگر ہو سکے تو اس سفر میں ہمیں بھی کوئی مدھر گیت سنا دیں۔ آخر کو آپ اُستاد ہیں۔"

"نہیں بابا! یہ نہیں ہو گا۔ یہ وقت گانے کا تو نہیں ہے۔ سارنگی کی آواز دب جاتی ہے۔ ایسے میں کوئی تان میں کیسے چھیڑ سکتا ہوں۔"

"اب آپ نے بھی طنز فرمانا شروع کر دیا، کچھ سنا دیں۔ ریڈیو پر سارنگی کی آواز اتنی مدھر کہاں ہوتی ہو گی۔ سنا ہی دیں بس۔"

وہ میری یہ بات سن کر مسکرا دیا۔ بولا "کیوں ستاتے ہو میاں جی! یہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہمیں گورنمنٹ نے دیا ہے۔ ہمیں آرام سے سفر کرنے دیں۔"

"سنا دیں بابا جی! کیا ہرج ہے آخر، میں بھی آپ سے یہی عرض کروں گا۔" ہمارے سامنے بیٹھے دولھا نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اس کی دلھن برقعے میں لپٹی ہوئی تھی اور اب تک میں اس کا ناخن بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بہت محتاط خاتون تھی اور پردے کا حق ادا کرتی تھی۔ البتہ وہ دولھا میاں سے باتیں مسلسل کرتی آ رہی تھی مگر وہ ایسی سرگوشیاں تھیں جن کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔" خان صاحب نے اب اپنی توجہ اس پر مرکوز کر دی۔

"جی ہاں! اور ہم ذرا سیر کے لیے جا رہے ہیں کوہِ مری۔"

"آپ کا اسمِ مبارک؟"

"میرا نام محمد جان ہے۔ شاہ عالمی مارکیٹ میں میری ہوزری کی دکان ہے۔ میں ٹھوک کا کام کرتا ہوں۔"

"اب آپ کہتے ہیں تو میں سارنگی کھول لیتا ہوں۔ اُمید ہے آپ کا سفر اچھا گزر جائے گا۔"

چند لمحے بعد خان صاحب نے اپنا ڈبا کھول لیا۔ اُس میں سے انھوں نے سارنگی نکالی اور وہ سرک کر میرے قریب ہو گئے۔ اُن کی انگلیاں پھڑکنے لگی تھیں۔ سارنگی کچھ عجیب قسم کی تھی۔ چند لمحوں تک وہ تاروں سے کھیلتے رہے۔ اُن کو کبھی وہ کستے تھے، کبھی ڈھیلا چھوڑ دیتے تھے۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ہم اس وقت گجرات اسٹیشن سے ذرا اِدھر ہی تھے کہ اُنھوں نے سارنگی کو پوری طرح بھڑکا دیا۔ خان صاحب واقعی اپنے فن کے اُستاد تھے ـــ وہ ہمیں ماہیا سنا رہے تھے۔ گجرات اسٹیشن یونہی بے خیالی میں گزر گیا۔ اُستاد کے ہاتھ میں سارنگی ہو تو وہ جو بول چاہے اُس میں بول سکتا ہے۔

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

قیمت: =/15 روپے ○ ڈاک خرچ: =/5 روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مرگیا تھا لیکن اس کی لاش مندر کے تہہ خانے میں اصل حالت میں موجود تھی۔
- سونا گھاٹ کے علاقے پر اس رُدر پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ ہر جگہ زندہ نظر آتا تھا
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آکر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کر لیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟
ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

انکا (مکمل، دو حصے)	اقابلا (مکمل، دو حصے)	غلام روحیں (مکمل)
قیمت فی حصہ ... روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت فی حصہ ۱۵ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت ۱۰ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے

جان محمد بھی سمجھنے لگا تھا۔ میں بھی اسے ایک بالکل ہی نئی چیز سمجھ رہا تھا۔ دُلھن البتہ بالکل گم صم بیٹھی تھی اور خان صاحب کا یہ حال تھا کہ کن انکھیوں سے ہم سب کو دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس سارنگی کے سُر سے ایک عجیب قسم کی گیس نکلنے لگی اور دو دیکھتے ہی دیکھتے میرے وجود پر حاوی ہونے لگی۔ میں تیزی سے اُچھل کر وہاں سے ہٹا۔ اس کی زد سے بچنے کے لیے میں دروازے تک جا پہنچا مگر میری ہمت اچانک ہی پست ہونے لگی۔ گیس اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ محمد جان اور اُس کی دُلھن بھی ایک دم بے چین ہو کر اُٹھ گئے اور پھر اس کے ساتھ ہی میں نڈھال ہو کر فرش پر جا گرا۔ اس گیس نے میرے شاید پھیپھڑے بند کر دیے تھے۔ میں دوسرا سانس لے ہی نہیں سکا تھا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہاتھ ہلا سکوں۔ خان صاحب نے فوراً ہی سارنگی بند کر دی۔ اب وہ گیس اس میں سے نہیں نکل رہی تھی۔ خود انھوں نے منہ پر ایک سلیٹی رنگ کا نقاب اوڑھ لیا تھا جس میں اُن کی ناک اور منہ چھپ گئے تھے۔ سارنگی انھوں نے فوراً ہی ڈبے میں رکھی اور ارد گرد کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے فرش سے اُٹھا کر سیٹ پر ڈال دیا۔ میرا سوٹ کیس برتھ پر پڑا تھا۔ وہ اُنھوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر وہ دُولھا جان محمد کی طرف بڑھے۔ اُس کی بھی آنکھیں کھلی تھیں۔ خان صاحب نے اُس کی جیبوں سے جو کچھ برآمد ہوا اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر وہ دُلھن کی طرف بڑھے اور اس کے تمام زیورات انھوں نے نوچ نوچ کر اتار لیے۔ وہ خاصی خوش شکل لڑکی تھی اور حیرت ہے کہ اس کی بھی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ بھی ایک اُنگلی تک حرکت میں نہیں لا سکتی تھی۔

وہ کوئی عجوبۂ روزگار قسم کی گیس تھی۔ جیسا استاد اللہ نواز خان جموں والے نے سارنگی کے خول میں بھر رکھی تھی۔ ایسے بے آسرا مسافروں کو لوٹنے کے لیے استعمال کرنے کا گُر سمجھ لیا تھا۔ کوئی پانچ منٹ تک تو میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خان صاحب نے پہلی اچھی طرح خالی کرنے گاڑی کی زنجیر کھینچ دی۔ جیسے ہی گاڑی آہستہ ہوئی دو آدمی ریلوے کی وردیوں میں ملبوس کہیں سے ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ انھوں نے بائیں ہاتھ کا دروازہ کھولا اور مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے وہ اسی وقت گاڑی سے نیچے اُتر گئے۔ کسی اور آدمی سے اُنھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ خان صاحب بھی اُن کے ساتھ ہی ڈبے سے باہر آ گئے اور ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ مجھے اُٹھا کر سامنے کی جرنیلی سڑک پہ جا پڑے۔ میرا خیال ہے کہ ریلوے کے .... آدمی اُن کے بعد ہی ہمارے ڈبے میں پہنچے تھے۔ کیونکہ گاڑی کی بتیاں یہ بتا رہی تھیں کہ بہت سے لوگ ہمارے ڈبے کے سامنے جمع ہو چکے تھے مگر وہ لوگ گاڑی کے آہستہ ہوتے ہی اپنا کام کر کے فارغ ہو گئے۔ اب وہ سڑک پر جا کھڑے تھے۔

یہی کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک کار ہمارے قریب پہنچ گئی۔ جیسے ہی وہ رکی خان صاحب اور دوسرے دو آدمیوں نے مجھے اُٹھا کر کار کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹا دیا کہ اُن میں سے خان صاحب میرے دائیں ہاتھ پر اور ایک آدمی بائیں ہاتھ۔ تیسرا آدمی گاڑی کی اگلی نشست پر ڈرائیور بہت مستعد نظر آتا تھا۔ اُن کے بیٹھتے ہی اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ اب اس کار کا رُخ لاہور کی طرف تھا۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن برابر کام کر رہا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میں مسحور ہو چکا ہوں۔ مجھے انھوں نے مسخر کر لیا تھا۔ اُن کی کسی حرکت کے خلاف میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا تھا۔ شاید میرے اعصاب پر فالج گر گیا تھا۔ میری ساری طاقت ختم ہو گئی تھی۔ صرف دماغ سوچ سکتا تھا مگر وہ بھی اس طرح کہ اس کے احکامات پر میرے اعضا کام نہیں کرتے تھے۔

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا اُن میں سے تیسری سواری تھا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ کان بھی کام کر رہے تھے۔ آوازیں بھی مجھے سنائی دے رہی تھیں مگر میرا ردِ عمل کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی اس بات کو سمجھ رہے تھے۔ اُن میں سے وہ آدمی جو میرے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ بولا "آپریشن کیسا رہا خان صاحب!"

"بہت آسان! یہ خود ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے سارنگی سنائیں۔ میں نے کہا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے سارنگی بجائی اور اس کی گیس کی نالی میں نے سیدھی کر لی اور بس صرف ایک گھمانے کی دیر تھی کہ اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔"

"اچھا کیا آپ نے، مجھے یقین تھا کہ صاحب نے یہ گیس اس میں نہیں بھر دی ہے۔"

"عابدی میاں! اب کہاں ہوں گے ولسن صاحب؟"

"وہ لاہور میں ہیں۔ آپ کو ویسے بڑی زحمت دی۔ گوجرانوالہ تک کار بھگانا پڑی۔"

"ہاں۔ یہ پٹھا تو نکل ہی چلا تھا۔ اگر آپ بہت جلدی نہ کرتے تو ہم آج بھی ناکام ہی رہتے۔"

"نہیں! ولسن صاحب اسے کسی نہ کسی صورت میں اٹھا لیتے مگر حیرت ہے خان صاحب کہ اس خبیث نے دو بار اٹھایا۔ ولسن صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے کہ یہ آواز غائب ہے۔ اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟"

"لاہور جا کر دیکھ لیں گے۔"

"اس کی جیبیں بھی دیکھی ہیں آپ نے؟"

"ارے یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اُس نے مجھے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ میری جیب میں اس وقت کوئی ڈیڑھ ہزار روپیہ موجود تھا۔ وہ انھوں نے نکال لیا اور پھر میری کمر سے بندھا پستول بھی اُتار لیا اور گولیاں بھی نکال لیں۔

"تو گویا یہ ہر وقت مسلح رہتا ہے۔ یہ شیطان! یہ بھلا کب کسی کو بخشتا ہوگا" اُستاد اللہ نواز نے کہا۔ رقم اُس نے پوری کی پوری اپنی جیب میں ڈال لی اور پستول اُس نے عابدی صاحب کو دے دیا۔ اپنے چہرے سے نقاب اُنھوں نے کار میں بیٹھتے ہی اُتار دیا تھا۔

عابدی نے پستول کو اچھی طرح سے دیکھ بھال کر اگلی نشست پر بیٹھے آدمی کو تھما دیا۔ بولے "فرزند علی اسے سنبھال کر رکھنا۔ یہ تمھارے بہت کام آئے گا۔ بڑے شیر دلیر آدمی کا پستول ہے یہ۔ مگر یہ بیچارا چوہے کی موت مارا گیا۔ ہت تیری ایسی تیسی ــــ مارو خان صاحب خوب مارو اس خبیث کو" یہ کہہ کر اُس نے میرے سر پہ ایک دھول جما کر میری ٹھوڑی سینے سے لگا دی۔

"ارے کیا ماریں بابا لوگ! یہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔ اب ولسن صاحب اس کی کھال کی جوتیاں بنائیں گے ہو سکتا ہے مسز ولسن اس سے وتلنے بھی بنوا لیں۔"

"مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے اسے کس لیے پکڑا ہے۔ کچھ پتا ہے آپ کو خان صاحب؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ پر خیر، اس کا معاوضہ تو ہمیں مل ہی جائے گا۔ یاد ہے نا، انھوں نے کبیر صاحب کو پکڑنے پر ہمیں کتنا نہال کیا تھا۔ تیس تیس ہزار تو مل ہی گئے تھے ہمیں۔"

"اس سوٹ کیس کو کھولو خان صاحب! میرا خیال ہے اس میں نمبر والا تالا لگا ہے۔"

"تو پھر کون اس کا نمبر جانتا ہے؟ یہ ہوش میں آئے تو بات ہوگی۔"

"یہ سوٹ کیس بہرحال ولسن صاحب کو نہیں دینا ہے، یہ ہم چاروں کا حصہ ہے۔"

"ٹھیک ہے عابدی بھائی! ارے ڈرائیور صاحب! ذرا دھیان سے چلایا۔ ایسا نہ ہو کوئی ایکسیڈنٹ ہی ہو جائے۔"

"اور ہماری قبر ادھر ہی بن جائے خان صاحب! یہ کہیں ہوش میں ہی نہ آ جائے۔ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے یہ۔"

"کچھ اور گیس نہ چڑھا دوں اِسے؟"

"یوں کرو اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ پھر کوئی فکر نہیں رہے گی۔ زیادہ گیس چڑھنے سے یہ مر بھی سکتا ہے۔"

"ہاں! یہ بہتر رہے گا۔"

"ہتھکڑی تو میں دے سکتا ہوں" فرزند علی نے کہا۔

"ہاں ہاں خوب یاد دلایا تم نے۔ لاؤ وہ مجھے دے دو میں اسے ابھی جکڑ دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے کار کے ڈیش بورڈ میں رکھی ایک ہتھکڑی فرزند علی سے لے کر میرے دونوں ہاتھوں پر کس دی۔ اس کی ہاتھ بھر لمبی زنجیر برابر جھنجھنا رہی تھی مگر اس پر کنڈا نہیں لگا تھا۔ شاید وہ انھوں نے کسی سپاہی سے چھینی تھی یا اُس کا قیدی زنجیر سمیت بھاگ نکلا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد انھوں نے میرے پاؤں ایک بجلی کے تار سے کس کر باندھ لیے اور میری یہ حالت تھی کہ میں کوشش کے باوجود اُن کا ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔ میں مجہول سا ہو کر اُن کے سامنے بیٹھا رہا۔ خدا جانے وہ گیس کس قسم کی تھی جسے اس نے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہتھکڑی میرے ہاتھوں پر لگی تھی۔ میں اسے دیکھ تو سکتا تھا مگر اس کا احساس مجھے ہرگز نہیں تھا۔ ایسے میں وہ میرا بازو کاٹ بھی دیتے تو مجھے محسوس نہ ہوتا۔ سارا بدن شل ہو گیا تھا۔ وہ ایسی ہی جان لیوا گیس تھی۔ جس کی شیشی اُس ابلیس نے سارنگی کے اندر لگا رکھی تھی اور میں اُسے سارنگی بجانے کے لیے کہتا رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اُس کے نغموں میں ایسا زہر بھرا ہے۔ کوئی بھی آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اُستاد اللہ نواز خان جموں والا لومڑی کا بچہ سارنگی میں ایسی مہلک گیس لیے پھرتا ہے۔ یہ کوئی مان لینے والی بات تو نہیں تھی سائیں جان محمد کا بھی اس نے بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ اس کی جیبوں کی صفائی کے بعد اس نے دُلھن کے زیورات بھی نوچ لیے تھے۔ میری رقم پہ بھی وہ ہاتھ صاف کر چکا تھا اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی وہ اس میں سے کوئی دھیلا پائی دینے پر تیار نہیں تھا۔

کار بالآخر لاہور شہر میں داخل ہو گئی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ بازار بند ہو چکے تھے۔ اسٹیشن کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے گھڑی دیکھ کر معلوم ہوا کہ ڈیڑھ بج چکا ہے۔ میری گھڑی اس لومڑی کے بچے نے پہلے ہی اُتار کر اپنے ہاتھ پر باندھ لی تھی اور میں ٹھن ٹھن گوپال ہو کر اُن کے سامنے یوں بیٹھا تھا جیسے میں غلام جیلانی نہیں اُن کے باپ کا غلام پشتینی ہوں۔

کار کو لے کر وہ سیدھے ولسن کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ اللہ نواز اُترا تو عابدی اور فرزند علی نے مجھے جکڑ لیا۔ وہ دونوں اس وقت پستول لے کر میرے دائیں بائیں آ بیٹھے تھے۔ شاید اُنھیں یہ شبہ تھا کہ کہیں گیس کا اثر ختم نہ ہو چکا ہو۔ اللہ نواز نے گیٹ کی گھنٹی بجا دی۔ چند منٹ میں ولسن کا حبشی نوکر باہر آ گیا، اس نے کار سامنے دیکھی تو اس کے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔

"دروازہ کھولو میاں! سیٹیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ولسن صاحب کو بھی جگا دو۔"

اس نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے کار عمارت کے سامنے روک دی اور اس کے ساتھ ہی مجھے فرزند علی اور عابدی نے

گھسیٹ کر کار سے نکالا اور ہاتھ پیر سے پکڑ کر برآمدے میں لے گئے۔

اس اثنا میں ولسن جاگ چکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ مجھے فرش پر بے سدھ لیٹے دیکھ کر بڑے طمطراق سے بولا "سوا یٹ لاسٹ یو ھیو ڈن اَیٹ! شاباش خان جی! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔"

"مجھے یہی کرنا چاہیے تھا ولسن صاحب! میرا آپ سے یہ وعدہ تھا۔ اس کو سنبھالیں اب اور ہمیں اجازت دیں۔ ویسے ولسن صاحب اتنی بات یاد رکھیں کہ اسے سارنگی سننے کا بہت شوق ہے۔ یہ خود ہی کہہ رہا تھا کہ سارنگی بجاؤ۔ سو میں نے بجا دی۔"

"اچھا کیا تم نے۔ اب میں نمٹ لوں گا اس سے۔ ذرا ٹھہرو، رقم لیتے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو بولا "یہ لو لفافے میں دس ہزار روپیہ ہے آپس میں بانٹ لینا۔"

"صرف دس ہزار؟" اللہ نواز نے کہا۔

"یہی بہت کافی ہیں۔ اب تم جاؤ۔ اور آرام کرو... اور کچھ؟"

"جی کچھ نہیں! اب ہم چلتے ہیں۔" اُس نے بہت ہی بے دلی سے کہا۔ اس کا اندازہ تو کہیں زیادہ کا تھا مگر رقم اُسے بہت ہی کم ملی تھی۔ ولسن کا انداز بہت ہی نپا تلا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا افسر ماتحتوں کو حکم دے رہا ہو۔

"مزدور خان! اسے اٹھاؤ اور اندر لے چلو۔ تم اس کے ساتھ لگو فرزند علی۔ یہ وردیاں تو بہت سج رہی ہیں تمھیں۔"

"بس جی ایسے ہی ہمارے ہاتھ آگئی تھیں۔ بہت کام دیا ان وردیوں نے۔ بھری گاڑی سے ہم اسے نکال کر باہر لے آئے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑا تو مزدور خان نے پیروں کی طرف سے اٹھا لیا اور عمارت کے اندر لے جا کر راہداری سے گزرتے ہوئے آخری کمرے میں ڈال دیا۔ ولسن باہر ہی کھڑا رہا۔ جب وہ انھیں رخصت کر کے اندر آیا تو صرف مزدور خان ہی اس کے ساتھ تھا۔

"صاحب! میرا خیال ہے یہ آدمی ہماری تمام باتیں سنتا آیا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"اس حالت میں بھی؟"

"جی ہاں۔ لگتا تو مجھے یہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہی نہیں ہوئیں۔ اس کے حواس ابھی سلامت ہیں۔"

"کوئی بات نہیں! میں اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ بس یہی کافی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے میرے اوپر ایک ہلکا سا کمبل ڈال دیا اور تمام کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر کے وہ دونوں باہر نکل گئے۔

میرے نیچے قالین بچھا تھا۔ کمرے میں قالین کے دائیں ہاتھ صوفے اور بائیں ہاتھ کرسیاں لگی تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک میز رکھی تھی۔ جس پر کتابیں اور رجسٹر پڑے تھے۔ جاتے ہوئے وہ چھت کا پنکھا چلا گئے تھے۔ جس کی ہوا ٹھنڈی محسوس ہوتی تھی۔ میں بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے تھے اور ہتھکڑی کی زنجیر دائیں ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ پاؤں بجلی کے تار سے بندھے تھے۔ ذہن میرا بگولوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ کسی کو گالی دینے کا اب کیا فائدہ تھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ میں اپنے پیچھے ایک لکیر چھوڑ آیا تھا اور اُس لکیر کے دائیں بائیں بہت سے لوگوں کی لاشیں بکھری تھیں۔ انھیں میں نے ڈس لیا تھا۔ وہ پکار پکار کر انتقام کی رٹ لگا رہے تھے۔ اُن کے لواحقین راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر میرے لیے بد دُعا کرتے رہے تھے۔ تھا کہ کوئی اُن میں سے ایسا نہ ہوتا جو میرا راستہ نہ روکتا اور میرے سامنے آگیا مگر ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ولسن کو میں نے کیا تکلیف پہنچائی ہے۔ کسی بھی وقت وہ میرے راستے میں نہیں آیا تھا۔ اور حیرت مجھے یہ تھی کہ اب تک اس نے کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے مجھے پکڑنے کے لیے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لے لیا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ فون پر وہی لوگ تھے جو یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں گھر پر ہوں کہ نہیں جب یقین ہو گیا کہ میں اپنی کوٹھی میں موجود ہوں تو انھوں نے بڑی ہوشیاری سے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ میں ہی اندھا تھا جو نہیں دیکھ سکا کہ کوئی بڑی ہی غیر مرئی صورت میں میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

وہ گاڑی نہیں پکڑ سکے تو کار میں سیدھا میرے پیچھے آگئے۔ یہاں سے صرف ایک آدمی انھوں نے اندر بھیجا اور وہ اُستاد اللہ نواز خان جموں والا تھا۔ اس کا طریقۂ واردات بڑا عجیب تھا۔ بظاہر وہ کوئی میراثی کا پُتر نظر آتا تھا، ایک سارنگی اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اپنے مخالف کو وہ دوسرا سانس نہیں لینے دیتا تھا۔ کیا میں سمجھوں کہ وہ کرائے کے قاتل تھے۔ اُجرت پر کام کرتے تھے۔ ولسن کو وہ کہاں سے مل گئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اُن سے بہت سے کام لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ واردات پر نکلنے سے پہلے وہ اُسی کے ہاں بیٹھے تھے۔ اُن کی چیت سے یہی معلوم ہوتا تھا مگر وہ جانِ عالم کہاں تھا؟ وہ تو ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ میں اگر اُسے راولپنڈی میں گاڑی سے نہ پھینک دیتا تو وہ شاید بہت دن پہلے ہی اپنا کام کر چکا ہوتا۔ اس کی ناکامی کے بعد ولسن نے اِس اُستادوں کے اُستاد کو میرے پیچھے لگا دیا لیکن وہ میرا کریں گے کیا؟ کس شکنجے میں ڈالنا چاہتے ہیں مجھے؟ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ کیا وہ اُس رقم کے متلاشی تھے جو میں نے سناجا کے بھائی سے حاصل کی تھی یا کوئی اور قرض تھا جو وہ چکانا چاہتے تھے۔

سب کچھ ہی بھسم ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ میں آسیہ تک پہنچا نہ آبی تک۔ میری ہرجائی تقدیر مجھے کسی اور ہی راستے پر لے آئی تھی۔ میں زندہ تھا، موجود تھا مگر میرے اعضا میرے بس میں نہیں رہ گئے تھے۔ پتا نہیں وہ گیس کتنی مہلک تھی اور ولسن نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ گاڑی تک پہنچتے ہی اُس نے سب سے پہلے وہ سارنگی اُستاد کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ وہ ایسی گیس تھی جو غالباً میدانِ جنگ میں دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ وہ مرتے نہیں ہوں گے۔ ہتھیار اُن کے ہاتھ میں ہی رہتے ہوں گے۔ وہ دیکھ بھی سکتے ہوں گے۔ اور سمجھ بھی سکتے ہوں گے۔ اُن کی سماعتیں بھی برقرار رہتی ہوں گی لیکن وہ ایسے شل ہو جاتے ہوں گے کہ اُن سے کچھ نہ ہو سکتا ہوگا۔ میں نے کوئی ایسا معرکہ تو نہیں دیکھا تھا مگر معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ گیس کسی ایسے ہی کام میں استعمال ہوتی ہوگی کہ اُس ..... کے بل بوتے پر وہ لاکھوں کی فوج کو چیونٹیوں میں بدل دیتے ہوں گے اور اب میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ میں تو ایک فرد تھا مگر میری بے بسی بھی دیدنی تھی۔ اس گیس کی وجہ سے تو اُستاد کسی بھی جگہ پہنچ کر تباہی مچا سکتا تھا۔ کسی کو بھی ننتا کر سکتا تھا۔ ولسن نے اچھا کیا جو اُس سے ایسا خطرناک ہتھیار واپس لے لیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اُستاد کو اُس گیس کی غرض و غایت کا صحیح علم نہیں تھا ورنہ وہ شاید اُسے واپس نہ کرتا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ صرف ایک بار ہی ولسن نے اُسے اُن لوگوں کے سامنے استعمال کیا ہوگا مگر یاروا میرے تو اُس نے جندرے ڈھیلے کر دیے تھے۔

میں دیر تک قالین پر پڑا اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا مگر کوئی نتیجہ نکال لینا میرے بس میں نہیں تھا۔ میرے غور و فکر کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ بالآخر مجھے نیند آگئی۔ وہ مہربان نیند جو سارے دکھوں کا بڑا اور موثر علاج ہے۔ قالین آرام دہ محسوس ہوتا تھا اور پنکھا چل رہا تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو چار سُو سویرا ہو رہا تھا۔ سورج شاید ابھی نہیں نکلا تھا کہ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اس وقت تک شاید میں اُس گیس کے اثر سے محفوظ ہو چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ میں بول سکتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں کو اپنی مرضی کے مطابق ہلا سکتا ہوں۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، میرے سامنے جانِ عالم آ ٹھہرا۔ وہ مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر بتی جلا دی۔ میں اُسے دیکھ کر بھی ادھ مؤا سا ہو کر لیٹا رہا۔ وہ بڑی نخوت سے بولا "غلام جیلانی عرف سردار کریم نواز! ہوں! آخر کار تم پھنس ہی گئے اور وہ بھی ایک سارنگی نواز کے ہاتھوں سے۔" یہ کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے میرے اردگرد گھوم گیا۔ اس گھڑی دروازہ کھلا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ میں ابھی تک گیس کے اثر میں مبتلا ہوں۔ میری آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ لہٰذا جیسے ہی وہ میرے سر کی طرف آیا، میں نے بلاخیز تیزی سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اس کی ٹانگوں میں پھنسا دیے۔ اس طرح کہ اس کی ایک ٹانگ میرے بندھے ہاتھوں کے حلقے میں پھنس گئی۔ وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ تیورا کر صوفے پر گر گیا تو میں نے ایک دم اُٹھ کر اس کی پھنسی ٹانگ کو کندھے پر چڑھا کر دونوں زانو اُس کی ٹانگوں سے گزار کر پیٹ پر رکھ دیے۔ وہ ایک دم چیخنے لگا مگر اس ذرا سی مدت میں میں نے ہاتھ اس کی گردن میں دھنسا دیے۔ ہتھکڑی اتنی مہلت تو دیتی ہے کہ آدمی کی انگلیاں کام کر سکیں۔ جیسے ہی اس کی گردن دبی اُس کا سر ڈھلک گیا۔ آواز اس کی زیادہ بلند نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں پلٹ گئیں۔ سفیدی زیادہ نمایاں نظر آنے لگی۔ اس کو یوں بے بس کرنے کے بعد میں نے اُس کی تلاشی لی۔ وہ اپنے ساتھ پستول تو رکھتا ہی تھا۔ وہ میں نے نکال لیا مگر اُس کے ساتھ تیز دھار خنجر بھی اس کی پتلون کی دائیں جیب میں موجود تھا۔ وہ بھی میں نے الگ کر لیا اور اُسے صوفے سے گھسیٹ کر اس طرح اُچھالا کہ وہ صوفے کے عقبی حصے میں جا گرا۔ اب وہ سامنے سے دیکھنے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔

پستول کو میں نے نیفے میں پھنسایا اور خنجر سے میں اپنے پاؤں کی تار کاٹنے لگا۔ ہتھکڑی کو تو میں چابی کے بغیر ہاتھ سے اُتار نہیں سکتا تھا مگر ابھی تار کاٹ رہا تھا کہ ولسن اور مسز ولسن بڑے اطمینان سے دروازے میں آ ٹھہرے۔ میں نے خنجر الگ رکھا اور نیفے میں سے پستول نکالنے لگا مگر وہ میری اس حرکت کو فوراً ہی سمجھ کر پیچھے ہٹے اور دروازہ اُنھوں نے دھڑ سے بند کر دیا۔ کاش میں نے پستول نیفے میں نہ پھنسایا ہوتا۔ میں سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ وہ باہر سے کنڈی لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ میں اُن دونوں کا جلوس نکال دیتا۔ مجھ سے یہی غلطی ہو گئی۔

راہداری میں نکلتے ہی انھوں نے باہر سے تالا لگا دیا۔ دروازہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کوئی شیشہ اُس میں موجود نہیں تھا۔ ورنہ میں اُنھیں وہیں چھید دیتا۔ میرے غصّے کی کوئی انتہا نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر تیزی سے وہ تار کاٹ ڈالے اور دروازے کے پاس جا کر اندر کی دونوں کنڈیاں بند کر لیں۔ کم از کم اُن کے اگلے حملے سے تو میں محفوظ ہو گیا تھا۔ بیچ کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس کی چٹخنی بھی میں نے اندر سے بند کر لی اور پھر اُس جانِ عالم کو صوفے کے پیچھے سے نکال کر قالین پر ڈال دیا۔ اب میری کوشش یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے، جانِ عالم ہوش میں آجائے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی گردن کی مالش کرنے لگا۔ پھر میں نے اس کی پنڈلیوں کی رگوں کو حرکت دی۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں کے تلوے رگڑے۔ کوئی دس منٹ مجھے اس کام میں لگ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے شکار کو دوبارہ کس طرح ہوش میں لایا جاتا ہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ یوں جیسے وہ دوبارہ

زندہ ہو رہا ہو۔ یہ میرے ہاتھوں کا کرشمہ تھا کہ میں اچھے بھلے آدمی کو سُلا بھی سکتا تھا اور ہوش میں بھی لا سکتا تھا۔ میں چاہتا تو اس کے ہاتھ باندھ سکتا تھا مگر میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ بہت اہم آدمی تھا۔ اس سے میں بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ اس کو باندھ دینا درست نہیں تھا۔ ایسے میں وہ بدک جاتا۔ مجھ پر کوئی راز ظاہر نہ کرتا۔

"کیا حال ہے جانِ عالم! خیر تو ہے؟ آنکھیں تو کھولو بڑے بھائی!"

"تم.... اوہ میری یہ گردن.... اف! یہ کیا مصیبت ہے۔" وہ بڑی مشکلوں سے قالین پر اُٹھ بیٹھا مگر پستول میرے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ وہ سُن ہو کر رہ گیا۔

"طبیعت کیسی ہے تمھاری؟" اس کی جیب سے میں نے سگریٹ اور ماچس نکال لیے تھے۔ وہ میں نے اس کی طرف اچھال دیے۔

"پیو جانِ عالم۔ اس سے تمھیں آرام ملے گا۔ دھواں تو گلے میں اُتار ہی سکو گے۔" مگر اس نے اُن کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ رنگ اس کا اور زیادہ پیلا ہو گیا تھا۔

"یہ قصہ کیا ہے جانِ عالم؟ مجھے بتاؤ۔ تم مجھے راولپنڈی میں ملے تھے۔ وہاں تم سے میری جان چھوٹ گئی تھی مگر یہ ولسن کیا چاہتا ہے؟ تم اس کے کہنے پر میرے پیچھے لگے تھے؟ تم چاہتے کیا ہو آخر؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا اور ایک سگریٹ جلا کر اس کی طرف پھینک دیا۔ وہ اس کی قمیص پر گرا۔ اُس سے بچنے کے لیے اُس نے سگریٹ فوراً ہی اُٹھا کر انگلیوں میں پھنسا لیا مگر بولا کچھ نہیں۔ شرمندہ شرمندہ سا دکھائی دیتا تھا وہ۔ جیسے وہ سب کچھ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

"میرے ہاتھ بندھے ہیں جانِ عالم! ہتھکڑی کھل نہیں سکتی۔ میں سگریٹ بھی بڑی مشکل سے پی رہا ہوں۔ یہ کیسی معذوری ہے؟ آخر کیوں تم لوگوں نے مجھے یہاں لا ڈالا ہے؟ کچھ مقصد بھی تو ہو گا اور وہ میں جاننا چاہتا ہوں جانِ عالم! مت سمجھو کہ میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ میرے ساتھ تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ میں اتنا قید اور اتنا بندھا ہوا ہونے کے باوجود تمھارے اس پستول کی لبلبی دبا سکتا ہوں۔ بولو تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم ڈاکٹر دھمن کو نہیں بھولے ہو گے۔ یہ سب کچھ اُنھی کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔"

"کیا! کیا کہا تم نے؟ اُس دھمن کی.... ایسی تیسی! میں تمھیں اور ولسن کو اِدھر ہی ختم کر دوں گا۔ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔" میں نے پوری قوت سے لات اس کے سینے پر جما دی۔ وہ پلٹ کر دوبارہ قالین پر گر گیا۔ "شیطان کی اولاد! میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اُس نے کیا کہا ہے تم سے؟" مگر جانِ عالم میری ضرب سے کچھ زیادہ ہی نڈھال ہو گیا تھا۔ اسے دوبارہ اٹھنے میں خاصی دیر لگی۔

"بتاؤ مجھے، وہ کہاں ہے اس وقت؟"

"وہ امریکہ میں ہے اور ولسن کو اُس نے ہی تمھارے [illegible] ہے۔ مگر.... مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ولسن کا [illegible] ہوں۔ جو حکم وہ دیتا ہے، میں اُسے ماننے پر مجبور ہوں۔" وہ کہتے ہوئے بولا۔

"راولپنڈی تم کس لیے گئے تھے؟"

"میں وہاں تمھاری ہی تلاش میں گیا تھا۔ تم مجھے اتفاقاً [illegible] گئے تھے مگر پھر تم نے بازی جیت لی۔ مجھے بہت نقصان اُٹھانا [illegible] میرے پاس کچھ رقم بھی تھی۔ تم نے وہ بھی چھین لی۔"

"ہوں! تو گویا دھمن کی وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے بیٹے! میں بھی اُس کی تلاش میں تھا۔ اچھا ہے کہ وہ [illegible] ہی سامنے آ رہا ہے۔ بڑی رقم دی ہو گی اُس نے ولسن کو؟"

"ہاں۔ اُس نے یقیناً ولسن کو بہت روپیہ دیا ہو گا مگر مجھے [illegible] نہیں ہے۔"

"یہ کام کیا کرتا ہے؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں نے اسے کوئی کام کرتے نہیں [illegible] ہے۔ البتہ ایک کیمیکلز کی فیکٹری میں اُس کا حصہ ہے، مرید کے [illegible] وہاں کئی قسم کی گیسیں بنتی ہیں۔"

"اور یہ لوگ کون تھے؟ یہ اللہ نواز، فرزند علی اور مزدور خان [illegible] کون ہیں یہ چمچے؟"

"یہ ولسن کے ملازم ہیں۔ بہت چھان پھٹک کے بعد لوگوں کو وہاں ملازمت دی جاتی ہے۔"

"اور وہ عالیہ کہاں ہے؟"

"اس کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ میں صرف [illegible] کو جانتا ہوں اور میں نے سنا ہے کہ جس کوٹھی میں تم رہ رہے ہو [illegible] اُس کی ملکیت ہے۔"

"ملکیت ہے نہیں، بلکہ کبھی تھی۔ میں نے اسے سات لاکھ میں [illegible] ہے۔ کیا کہا تھا اُس نے؟"

"وہ تو یہی کہتا ہے۔ وہ کچھ دن پہلے یہاں سے ہو کر گیا ہے [illegible] بہت غضبناک ہو رہا تھا۔"

"ہوں.... اور وہ سارنگی کا فراڈ؟ وہ گیس اُسے کہاں سے ملی ہے؟"

"شاید وہ اُس نے خود تیار کی ہے۔ میرا اندازہ یہی ہے [illegible] سے وہ کوئی بھی کام لے سکتا ہے۔"

"اُس کی تو میں انتڑیاں باہر نکال دوں گا۔ سمجھا کیا ہے [illegible] نے مجھے۔ مجھ سے ابھی تو بچ گیا ہے مگر کب تک؟ اُسے نہیں [illegible] کہ وہ کس آگ سے کھیل رہا ہے۔ تم اُس کے چکر میں کیسے آ گئے؟ پُرانے پولیس کے ملازم ہو۔"

"ہاں۔ مجھے اُنھوں نے نوکری سے نکال دیا تھا۔ مجبوراً مجھے ولسن کی ملازمت اختیار کرنی پڑی مگر میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ میں ولسن کا نوکر ہوں۔ کام وہ مجھ سے اسی قسم کے کرواتا ہے۔"

"اب کیا ارادے ہیں اس کے؟"

"وہ تمھیں آج کسی وقت کراچی بھیج دے گا۔ ہوائی جہاز میں سوار کر کے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ کراچی سے تمھیں امریکہ پہنچا دے گا۔"

"میں نے تو سُنا تھا کہ وہ قید ہو گیا ہے؟"

"وہ خبر غلط تھی۔ آپ کو حیدر نے بتائی ہو گی۔ وہ جان بوجھ کر اُڑائی گئی تھی تاکہ تمھیں کوئی شک نہ پڑے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے، میں تو اس کے پیچھے نہیں گھوم رہا تھا۔"

"وہ یہی سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم بہت بدطینت اور شیطان صفت آدمی ہو۔ تم سے وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔ اسی لیے وہ یہاں سے امریکہ چلا گیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ تم اسے کاروبار بھی نہیں کرنے دو گے۔ وہ یہی کہتا ہے۔ میں نے خود اس کی باتیں سُنی تھیں۔ ورنہ ولسن تو تمھیں جانتا بھی نہیں تھا۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ تمھیں معلوم ہے دھمن کا کاروبار کیا ہے؟"

"وہ ڈاکٹر ہے اور بس۔ میں تو یہی جانتا ہوں۔"

"نہیں، وہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ انسانی اعضا کا کاروبار کرتا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کو اُن کے گُردوں سے محروم کر دیا ہے۔ یہ دیکھو، یہ میرا پیٹ دیکھو۔ اس نے دھوکے سے میرا بھی گردہ نکال کر بیچ دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ امریکہ میں بھی یہی کام کرتا ہو گا۔ پتا نہیں وہاں کون کون بدنصیب اس کے ہاتھ لگتے ہوں گے۔"

جانِ عالم میرا پیٹ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ بولا۔ "یہ تم کیا کہتے ہو۔ میں.... میں کیسے مان لوں اس بات کو۔ وہ.... وہ تو بہت مشہور ڈاکٹر ہے۔ اگرچہ وہ گردوں کا ہی اسپیشلسٹ ہے مگر گردہ فروش...! نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"وہ یہی کچھ کرتا ہے۔ وہ کسی یونیورسٹی کا پاس کیا ہوا ڈاکٹر نہیں ہے۔ عالیہ بھی محض ایک نرس ہے مگر وہ بھی ڈاکٹر بن بیٹھی ہے۔ میں.... میں ان سے انتقام ضرور لوں گا۔ کسی قیمت پر بھی انھیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے عہد کر رکھا ہے جانِ عالم! تم تو یونہی ہزار دو ہزار میں ولسن کے ہاتھوں بک گئے ہو۔ یہ راستہ چھوڑ دو۔ اس میں سراسر نقصان ہے۔" مگر ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کمرے میں ایک دم دھواں بھرنے لگا۔ وہی سلیٹی رنگ کی گیس اُس میں آ ترنے لگی۔ اس کی بو بھی [illegible] تھی کہ وہ سانس میں شامل ہوتے ہی آدمی کو تہس نہس کر [illegible] [illegible] کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ جانِ عالم بھی خود کو محفوظ نہیں [illegible] تھا۔ وہ بلند آواز سے چیخا۔

"خدا کے لیے اسے بند کرو۔ میں بھی اندر ہوں۔ اسے روکو۔"

مگر اُس کی آواز چند ہی لمحوں بعد دبنے لگی۔ کمرہ گیس سے بھرتا چلا گیا۔ اُس میں چھپنے کی کوئی بھی جگہ نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنی قمیص کا دامن ناک سے لگا لیا۔ مگر اس گیس سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ سانس کی ضرورت تو آخری دم تک رہتی ہے۔ کوئی ہوا سے کیسے بچ سکتا ہے۔ وہ گیس روشن دان کے شیشے میں سوراخ کر کے اندر ڈالی جا رہی تھی۔ باہر کسی جگہ انھوں نے سیڑھی لگا رکھی تھی اور سوراخ میں سے نالی ڈال کر وہ گیس کو اندر بھر رہے تھے۔ کوئی بیس سیکنڈ میں وہاں سانس لینا مشکل ہو گیا۔ اب نہ میں بول سکتا تھا نہ جانِ عالم اور دروازے اُن لوگوں نے باہر سے مقفل کر رکھے تھے۔ سارا ڈراما دو منٹ میں ختم ہو گیا اور ہم دونوں قالین پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ آدمی کے قوی کو معطل کر دینے کے لیے تو صرف تھوڑی سی گیس ہی بہت کافی تھی۔ وہاں تو ولسن نے پورا کمرہ اس سے بھر دیا تھا اور گیس کے خارج ہونے کے امکانات بالکل ہی نہیں تھے۔ جانِ عالم بھی بے ہوش ہو گیا اور میں بھی۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ حالانکہ رات ولسن یہ کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا مگر اب اُس نے جب دیکھا کہ میں زندہ سلامت ہوں اور اُس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہوں تو اُس نے میرے خلاف ایسا حربہ استعمال کیا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ میرے ساتھ جانِ عالم بھی اُسی حال کو جا پہنچا تھا۔

خدا خبر میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا اور درمیان میں کتنے.... جان لیوا لمحے بِن کہے بِن بتائے گزر گئے۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ابھی تک اپنے ہاتھ پاؤں حرکت میں نہیں لا سکتا ہوں اور میں کسی گاڑی میں سوار ہوں۔ کوئی ڈرائیور میرے سامنے بیٹھا تھا اور میرے پہلو میں جانِ عالم موجود تھا اور وہ پستول کی نال میرے پہلو سے لگائے ہوئے تھا۔ میری دونوں ٹانگوں پر انھوں نے سفید پلستر چڑھا رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے میری ٹانگیں اگلی دو سیٹوں کے درمیان میں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹانگوں کا وزن اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ میں انھیں ہلا نہیں سکتا تھا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ کیا میں کہیں زخمی ہو گیا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ میرے سامنے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر ولسن بیٹھا تھا۔ کار کی بتی روشن تھی۔

میں نے جب آنکھیں کھولیں تو جانِ عالم ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ بولا۔ "ولسن صاحب! یہ شخص ہوش میں آ رہا ہے۔"

"بہت بُرا ہوا جانِ عالم! گاڑی روک دے خان!"

اُس کے حکم پر ڈرائیور نے گاڑی سڑک سے اُتار کر ایک کھمبے کے پاس روک دی۔ میرے ہاتھ کُھلے تھے۔ اُن کو باندھنے کی انھوں نے شاید کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی مگر وہ میرے ہاتھ نہیں تھے۔ میں اُن سے کوئی کام ہی نہیں لے سکتا تھا۔ ولسن تیزی سے

میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبا تھا۔ اس میں سے اُس نے ایک سوئی لگی سرنج نکالی اور اُسے ایک شیشی میں ڈبو کر نکال لیا۔ پھر وہ میرے بائیں بازو کو ننگا کر کے بولا "اس کو ذرا سنبھال کر رکھ جانِ عالم! میں اسے ٹیکہ لگا رہا ہوں۔" جانِ عالم تو پہلے ہی تیرے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ اُس نے پستول سمیت دونوں ہاتھوں سے مجھے جکڑ لیا۔ ولسن نے میری کلائی پر کس کر ایک رومال باندھا اور جیسے ہی میری خون کی رگ اُبھری اُس نے وہ ٹیکہ میرے جسم میں لگا دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے قویٰ اور زیادہ مضمحل ہو گئے مگر حیرت ہے کہ اب بھی میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں، اب بھی میرا ذہن سوچ سکتا تھا۔ یہ بڑے ہی کمال کی بات تھی۔ ایسے میں وہ چاہتے تو میرا گلا بھی کاٹ سکتے تھے۔ میں اُف بھی نہیں کر سکتا تھا مگر اُن کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہ زیادہ بے فکری سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ مجھے چند منٹ تک ولسن بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ میری نبضوں پر بھی اس کا دھیان لگا تھا۔ جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تو بولا۔۔۔ "ٹھیک ہے، اب چلو۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ہوائی اڈے پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

"جی ہاں! فلائٹ تو چار بجے جاتی ہے۔ اب ساڑھے تین ہو رہے ہیں۔ صبح زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ہاں! تیز چلاؤ ذرا، کاش یہ فلائٹ لاہور سے چلا کرتی۔ ہمیں خواہ مخواہ اتنی مصیبت جھیلنی پڑی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اگلی نشست پر جا بیٹھا اور مزدور خان نے گاڑی چلا دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ہوائی اڈے جا پہنچے۔ ان کی باتوں سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ کراچی کا ہوائی اڈہ ہے۔ اُنھوں نے مجھے گاڑی سے نکال کر فوراً ہی ایک اسٹریچر پر ڈال کر آگے بڑھا دیا۔ وہ اسٹریچر انھوں نے ایک پورٹر سے منگوایا تھا۔ میرے ساتھ اب جو عورت چل رہی تھی اور مجھے سنبھال رہی تھی، وہ کوئی انگریز نرس تھی جو پہلے سے وہاں کھڑی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ ولسن اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ بولا "میرا خیال ہے اب آپ مجھے اجازت دیں۔۔۔ میں چلتا ہوں۔"

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب کچھ میرے پاس موجود ہے۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ مسٹر ولسن! بائی دی وے، آپ کب پہنچ رہے ہیں؟"

"میرے آنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ آپ مجھے بس فون کر دینا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں فون کر دوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔"

ولسن نے نرس کو وہیں سے خدا حافظ کہا اور کار کی طرف واپس چلا گیا۔ نرس نے پورٹر کو دائیں ہاتھ چلنے کے لیے کہا اور کچھ ہی دیر بعد ہم ہوائی اڈے کے اندر جا پہنچے، معلوم یہ ہوتا تھا کہ انھوں نے میرا پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ پہلے سے تیار رکھا تھا اور مجھے وہ "شدید" ظاہر کر کے اُسی وقت ملک سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔ میری بے دیکھیں کہ یہ سب کچھ میرے سامنے میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ دشمنوں نے مجھے باندھ کر ڈال دیا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ بھی رہا تھا اشارے کنائے سے بھی کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے ان سے بچا لو۔ یہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ مجھے علاج کے لیے نہیں بلکہ زندگی سے محروم کر دینے کے لیے ملک سے باہر لے جا رہے ہیں تاکہ کوئی ان کا ہاتھ نہ روک سکے۔ یہ مجھے پُرزہ پُرزہ کر دیں گے لوگو! مجھے بچا لو مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے تو انھوں نے اُس گیس اور ٹیکے کی وجہ سے پوری طرح مفلوج کر رکھا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد نرس نے مجھے اسی طرح اسٹریچر پر ڈال کر جہاز تک پہنچا دیا۔ ایئر ہوسٹس کمال مہربانی دکھا رہی تھیں۔ وہ بھی ساتھ ساتھ میری نشست تک چلتی رہیں۔ ان میں سے ایک بولی "ہائے کتنا ہینڈسم جوان ہے۔ پریر ایکسیڈنٹ!"

"ذرا سنبھال کے بے بی! شاید اس کا وہاں علاج ہو سکے۔ ہیں اس کے دونوں گردے بھی آخری مرحلے میں ہیں۔" دوسری نے کہا۔

جو نرس میرے ساتھ ساتھ آ رہی تھی، بولی "انشاء اللہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے اسی لیے ساتھ بھیجا جا رہا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں غیاث صاحب! آپ وہاں سے تندرست ہو کر آئیں گے۔" ایئر ہوسٹس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں بول بھی سکتا ہوں، سُن بھی سکتا ہوں مگر میں تو آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا تھا۔ اس کی بات کا جواب دینا تو ایک طرف رہا۔

نرس کی نشست میری نشست کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے میری نشست کو پھیلا کر اس طرح کر دیا کہ میں اُس میں بخوبی لیٹ سکتا تھا۔ ٹھیک چار بجے جہاز کراچی سے پرواز کر گیا۔ سچی بات ہے کہ میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ میں بے طرح رو دیا۔ میری بے بسی دیدنی تھی۔ میں وطن سے ہی نکالا جا رہا تھا اور اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے زندہ بھی رہنے دیں گے کہ نہیں۔ اس وقت میں نے اس قدر آنسو بہائے کہ میرے رخسار تر ہو گئے۔ نرس اِس کیفیت کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے دو رومال میرے آنسوؤں سے تر کر لیے۔

جیسے ہی ہوائی جہاز اُڑا، نرس نے ایئر ہوسٹس سے پانی منگوایا اور اپنے بریف کیس سے ایک شیشی نکال کر اُس نے دو گولیاں زبردستی میرے حلق میں اُتار دیں۔ شاید اُسے یہ حیرت تھی کہ یہ آنکھیں اب تک بند کیوں نہیں ہوئی ہیں۔ اُن گولیوں کا اثر تو بہت تیز ہوا کہ میں جلد ہی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا اور میرا دماغ مکمل طور پر ماؤف ہو گیا۔

پتا نہیں وہ راستہ کس طرح کٹا۔ کس کس جگہ وہ جہاز رُکا۔ کون کون سا جہاز اُسے بدلنا پڑا۔ مجھے وہ شدید مریض کی فہرست میں ڈال کر اسٹریچروں کے ذریعے راستے بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ اُسی حالت میں شاید ڈیڑھ دن گزر گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اس وقت ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے نیچے فوم کا بستر بچھا تھا۔ مسہری کے نیچے بہت عمدہ قالین فرش پر ڈال دیا گیا تھا۔ کرسیاں جو وہاں چار ہی تھیں، دیوار کے ساتھ لگی تھیں مگر وہ سب کی سب کسی بہت ہی عمدہ لکڑی سے بنائی گئی تھیں۔ کمرے میں رکھی تمام چیزوں کی نفاست کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ ہوا کا خرام یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ بہت خنک اور نم آلود ہے۔ میں کمرے میں بالکل تنہا تھا مگر نہیں، میں اُن کے لیے اس قابل کہاں تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ سکتے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری دونوں ٹانگوں سے پلستر اُتر چکا تھا ورنہ پاؤں سے لے کر میری ناف تک کا تمام حصّہ اُس میں چھپا ہوا تھا۔ جب میں بے ہوش ہوا تو اس وقت میرے لیے ٹانگیں ایک بوجھ بن چکی تھیں۔ لباس میرا بہت صاف ستھرا تھا۔ سفید قمیص اور پتلون کی طرز کا سفید پاجامہ انھوں نے مجھے پہنا دیا تھا۔ شاید نیچے بنیان بھی تھی۔

آہستہ آہستہ میں بستر سے یوں اٹھا جیسے میں بہت بیمار رہا ہوں اور میری ہمت ہی جواب دے چکی ہو۔ میں اُن کے ٹیکوں، گولیوں اور گیس کی وجہ سے واقعی بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا مگر جیسے ہی میں بستر سے اُٹھا، ایک بہت تگڑے جُثّے کا حبشی کسی طرف سے ایک دم میرے سامنے آ گیا۔ وہ بھی سفید قمیص پتلون میں ملبوس تھا۔ اُسے دیکھ کر میں پریشان سا ہو گیا۔ وہ تو میرے اس ڈرامے کا حصّہ ہی نہیں تھا۔ مجھے تو وہاں تک کوئی اور ہی لوگ لے کر آئے تھے اور مجھے نرس نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے بڑے بڑے کسرتی بازو ہوا میں جھول رہے تھے۔

"گڈ آفٹرنون مسٹر گیاث! ہاؤ آر یو ناؤ؟" وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا اور وہ بھی کالی انگریزی جسے میں بمشکل سمجھ رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی مصیبت تھی۔ میں اتنی انگریزی کہاں جانتا تھا کہ اُس سے گفتگو بھی کر سکتا۔ پھر بھی میں نے اُسے بتایا کہ میں ٹھیک ہی ہوں۔ میری مشکل کو سمجھتے ہوئے وہ کُرسی کھینچ کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بولا "آپ کے لیے حکم یہ ہے کہ میں آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں مگر آپ کو کسی طرح بھی کمرے سے باہر نہ جانے دوں۔ امید ہے آپ اس کا خیال رکھیں گے۔"

"پر بھائی تُو ہے کون؟ تو کیسے میرا مانیٹر بن گیا ہے؟ کس نے مقرر کیا ہے تجھے؟"

"یہ ڈاکٹر ڈومن کا حکم ہے۔ یہ اُنھی کا اسپتال ہے۔"

"پر میں ہوں کہاں؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔ یہ قصہ کیا ہے آخر؟" میری زبان زیادہ رواں ہونے لگی تھی۔ جتنی انگریزی میں جانتا تھا وہ میرے پوری طرح کام آ رہی تھی۔

"آپ کو یہ معلوم نہیں ہے؟"

"نہیں بھائی! مجھے تو باندھ کر ٹیکے پر ٹیکہ لگا کر یہاں لایا گیا ہے۔ مجھے کیا پتا وہ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔"

"اوہ، یہ تو عجیب بات بتائی ہے آپ نے! آپ سان فرانسسکو میں ہیں جناب! اور آپ کو کراچی سے یہاں لایا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کے گردوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ کا دماغ بھی صحیح نہیں ہے۔ آپ لوگوں پر خواہ مخواہ حملہ کر دیتے ہیں مگر آپ فکر نہ کریں۔ یہ لوگ آپ کا صحیح علاج کر دیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو تم سمجھتے ہو میرا دماغ بھی خراب ہے اور گردے بھی۔ یہ کہا ہے نا انھوں نے؟ بلاؤ ذرا اُس ڈاکٹر دھمن کو۔"

"وہ شام کو آئیں گے۔"

"پر وہ میری ٹانگوں کا پلستر کہاں گیا؟ وہ تو کہتے تھے کہ کسی ایکسیڈنٹ میں میری ٹانگیں کچلی گئی ہیں۔ یہ کیسے ٹھیک ہو گئیں؟"

"نہیں نہیں، آپ کی ٹانگیں تو بالکل درست ہیں۔ یہ دیکھیں، ذرا سی خراش تک نہیں ہے کہیں پر۔" اُس نے میرے پاجامے کا پائنچہ اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا اور مجھے حیرت تھی کہ میری ٹانگوں کے تمام بال انھوں نے اُسترے سے صاف کر دیے تھے۔ کسی ایک جگہ بھی بال نہیں رہنے دیا تھا۔

"دیکھو، خدا کے لیے میری بات سنو! تم عیسائی ہو کہ مسلمان؟"

"میں عیسائی ہوں جناب اور میرا نام سیزر ہے۔"

"خدا تمھارے حال پر رحم کرے۔ میری بات غور سے سنو! میں نہ تو بیمار ہوں اور نہ زخمی۔ یہ لوگ مجھے لاہور سے زبردستی یہاں لے آئے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ انھوں نے میری ٹانگوں پر پلستر کیوں چڑھا رکھا تھا۔ ڈاکٹر دھمن میرا دشمن ہے، جان کا دشمن۔ وہ مجھے قتل کر دے گا۔ خدا کے لیے میری کچھ مدد کرو۔ ورنہ میں ان سب کو ختم کر دوں گا، ان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوہ، اوہ! ویری ساری مسٹر گیاث! بُری بات! آپ خود کو سنبھالیں۔ ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتے تھے۔ براہِ کرم آپ لیٹ جائیں۔ ورنہ آپ کو پھر یہ دورہ پڑ سکتا ہے۔" اُس نے مجھے دوبارہ بستر پر لٹانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے۔

"ہٹ جاؤ تم! مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ میں بالکل تندرست آدمی ہوں۔ دفع ہو جا پرے۔" یہ بات میں نے اپنی زبان میں کہی۔ اس کے سامنے انگریزی بول بول کر میرا منہ تھک گیا تھا مگر وہ کوئی

زیادہ ڈھیٹ قسم کا آدمی تھا۔ برابر مجھ سے الجھتا رہا۔

"آپ لیٹ جائیں مسٹر گیاث! یہ اچھی بات نہیں۔"

"اوئے توں یہاں دفع ہو۔ پتا نہیں کہاں کی جوٹھ ہے تو۔ ڈیم اٹ۔ میں نہیں لیٹوں گا۔" یہ کہہ کر میں بستر سے اتر گیا اور بھاگ کر کھڑکی کے سامنے جا ٹھہرا۔ اس میں یہاں سے وہاں تک شیشہ لگا تھا۔

تو یہ بات ہے۔ ان آدم خوروں نے مجھے بیٹھے بٹھائے سان فرانسسکو پہنچا دیا تھا۔ اس گتے کے بچے دشمن کا خدا بیڑا غرق کرے۔ وہ پتا نہیں کیا کرے گا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے ذہن کی پھرکی گھوم گئی تھی۔ میرے سامنے ایک وسیع باغ تھا۔ اس سے آگے کوئی سڑک تھی۔ جس پر ٹریفک نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اس سے آگے پھر عمارتیں ہی عمارتیں تھیں۔ باغ میں اس وقت کوئی اکا دکا آدمی نظر آتا تھا۔ تو میں اب امریکہ کی سیر کر رہا تھا۔ خدا ان کو تباہ کرے۔ مجھے اس دشمن نے پاگل مشہور کر دیا تھا۔ جب ہی وہ سیزر بہت سنبھل سنبھل کر مجھ سے بات کر رہا تھا۔

وہ اب مجھ سے چند ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اسے میں نے گھور کر دیکھا تو اس نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے وہ میرا سامنا کرنے سے گھبرا رہا ہو۔ پھر میں نے جھنجلا کر پردہ دائیں سے بائیں چلا دیا۔ شیشہ میری نگاہ سے اوجھل ہوا تو کمرے میں روشنی کم ہو گئی۔ جس کی کمی دو ٹیوب لائٹیں پوری کر رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھا تو پتا چلا کہ وہ پوری طرح مقفل ہے۔

"اسے کھولو مسٹر سیزر! میں باہر جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں نہیں جناب! آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔" وہ ایک دم قریب آ ٹھہرا۔ "آپ لیٹ جائیں۔ آرام آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ کے گردے خراب ہیں۔ آپ بے ہوش بھی ہو سکتے ہیں۔ آئیں آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں آپ کو ناشتا کراتا ہوں۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ناشتا لے آؤ۔ کوئی سگریٹ ہے تمہارے پاس۔"

"جی ہاں! سگریٹ بھی موجود ہیں۔ میں ابھی دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے الماری کھول کر اس میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر مجھے دے دیا۔

"زیادہ نہ پئیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں جناب۔"

"اوئے توں بکواس نہ کر۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جی کیا کہا آپ نے؟ میں سمجھا نہیں۔"

"تو کیا سمجھے گا گھامڑ آدمی! میرا مطلب یہ ہے مسٹر سیزر کہ ناشتا لے ہی آؤ۔" میں نے دوسرا فقرہ انگریزی میں کہا۔

وہ مسکرانے لگا۔ بولا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں مسٹر گیاث! آپ ناشتے میں کیا پسند کرتے ہیں؟"

"جو کچھ ہے لے آؤ۔" میں نے وہاں سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ میرے لیے کئی قسم کی الا بلا چیزیں نکال کر لے آیا۔ صرف ایک چیز کی سمجھ مجھے آئی اور وہ تھی دودھ ملی کافی۔ دوسری شے سینڈوچ تھے مگر اس کھانے میں نہ روٹی تھی، نہ ڈبل روٹی۔

"تم پر ہزار لعنت ہے بھئی! یہ ناشتا دیتے ہو تم اپنے مہمانوں کو؟"

"جی! کیا کہا آپ نے؟ میں سمجھا نہیں!"

"دفع کر یار! تو عجیب ہے۔ میں کہاں تک تجھ سے تکی بولتا رہوں۔ بات یہ ہے سیزر بھائی کہ ادھر کوئی ڈبل روٹی نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"وہ بھی لا رہا ہوں جناب! آپ شروع تو کریں۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ برگر لے آیا۔ اپنے ہوٹلوں میں اس کا بھی عام رواج تھا۔ مجھے یاد ہے، راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک آدمی ڈیا نا بند کباب قسم کی چیز بیچا کرتا تھا۔ وہ بھی اسی قسم کی چیز تھی۔ ڈبل روٹی کاٹ کر اس کے دو پرتوں میں وہ قیمہ ٹھونس کر بھر دیتا تھا۔ بعد میں سنا ہے کسی نے اس کو دھمکی دی تھی کہ سالے یہ ڈیا نا بند کباب کا کیا مطلب ہے۔ اندر کروا دوں گا تجھے۔ یہ مذاق بند کر دے۔ بعد میں اس نے وہ بورڈ ہی بدل لیا جس پر اس نے عبارت کو تبدیل کروا کے لکھ لیا تھا۔ "شیریں برگر کھائیے اور لطف اٹھائیے۔"

جوں توں کر کے میں نے وہ ناشتا زہر مار کیا۔ کافی البتہ بہت لذیذ تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے پھر سگریٹ سلگا لیا مگر اس صورت حال کو دیکھ کر مجھ سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

"اوئے پاگل آدمی!" میں نے سیزر کو آواز دی مگر وہ پھر میرا منہ تکنے لگا۔ وہ میری بات کیسے سمجھ سکتا تھا۔ برتنوں کو بیسن میں رکھ کر میری طرف پلٹا۔

"کچھ مجھ سے کہا ہے آپ نے؟"

"لک مسٹر سیزر!"

"یس آئی ایم لکنگ۔"

"تو ذرا ڈاکٹر دشمن کو بلا دے۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ وہ شام کو آئیں گے۔"

"کسی اور ڈاکٹر کو بلا دے۔ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، یہاں۔" میں نے بہانے سے کام لیا۔

"پین؟ یو مین ویری سیویر پین؟"

"ہاں ہاں یہی بات ہے۔ یہاں درد ہے مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر ہارون کو بلوا لیتا ہوں۔ ابھی فون کرتا ہوں اسے۔" یہ کہہ کر وہ الماری کے قریب رکھے فون کی طرف لپکا۔ میں سمجھتا تھا، وہ کوئی ریڈیو ہے مگر وہ اُن کا انٹرکام تھا۔

"مجھے ڈاکٹر ہارون سے ملا دیں، پلیز!"

چند لمحوں بعد ڈاکٹر فون پر آ گیا۔

"ہیلو ڈاکٹر ہارون!......" "یس سر! ایک ہی بات ہے سر! وہ مسٹر گیاث ہے نا۔ اس کے پیٹ میں شدید درد ہے۔ آپ اس کو دیکھ لیں۔"......" "بس ابھی آ جائیں، وہ بہت پریشان ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور اپنے ہاتھ یونہی جھلاتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ وہ کچھ شرمسار سا تھا۔

"مجھے کیا پتا، میں سمجھا وہ ہارون ہے۔ سب اسے یہی کہتے تھے مگر وہ کہتا ہے میں ہارون ہوں، ڈاکٹر ہارون۔ چلو یہی سہی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہارون! کیا یہ پاکستانی آدمی ہے؟"

"جی ہاں۔ بالکل پاکستانی ہے۔ ڈاکٹر ڈومن نے کچھ ہی دن پہلے اسے ملازم رکھا ہے۔"

"اس اسپتال کا کیا نام ہے؟"

"اس کا نام پام روز ہاسپٹل ہے۔"

"کیا۔ پرائیویٹ؟"

"جی ہاں، پرائیویٹ کلینک ہے۔ بالعموم یہاں گردے کے مریض آتے ہیں۔"

"کتنے ڈاکٹر ہیں یہاں؟"

"چھ ڈاکٹر ہیں۔"

"کیا وہ سب کے سب پاکستانی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ہوں... ٹھیک ہے سیزر! میرا درد کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔" میں کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ سیزر میرے سامنے ہی کرسی پر بیٹھا رہا۔ بدن اس کا بہت ہی کسرتی معلوم ہوتا تھا۔

"تم باڈی بلڈنگ کرتے ہو؟"

"جی ہاں، میں باکسر بھی تھا۔ میں نے اب یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ میری عمر تیس سال ہو گئی تو میں نے رنگ چھوڑ دیا۔ اب یہاں کام کرتا ہوں۔"

"کچھ فائدہ بھی ہوا تمھیں باکسنگ کا؟"

"فائدہ تو بہت ہوا۔ بہت رقم ملی مجھے مگر وہ ختم بھی ہو گئی۔ شراب، عورتیں، جوا۔ کئی بلائیں چمٹ گئی تھیں مجھے۔"

"ابھی شادی نہیں کی ہے تم نے؟"

”نہیں! اس کے بارے میں مَیں نے کبھی نہیں سوچا۔ فائدہ بھی کیا ہے؟“

وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار اچھی طرح کر سکتا تھا مگر اس کی آنکھوں کو قرار نہیں تھا۔ چاروں طرف اس کی نظریں گھومتی تھیں۔ دراصل اُسے کبھی کبھی یہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ کہیں میں درندگی پر نہ اتر آؤں۔ اُسے شاید یہی سمجھایا گیا تھا کہ اس سے بچ کر رہنا۔ یہ کاٹ لیتا ہے۔ اُس دھمّن کا خدا ستیاناس کرے۔ اس نے میرے لیے زبردست مصیبت پیدا کر دی تھی اور اب بھی وہ باز نہیں آ رہا تھا اور ابھی میں سان فرانسسکو کا ایک کمرہ ہی دیکھ سکا تھا۔ جہاں اُس نے سیزر کو مجھ پر مسلط کر رکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اُسے تنخواہ کیا دیتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ سیزر اپنی ذمے داری کو پوری طرح سمجھتا تھا۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ بجنے لگا۔ کسی نے باہر سے اُسے مقفل کر رکھا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا لباس ہی بتاتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ چہرے مُہرے سے وہ قطعی پاکستانی نظر آتا تھا۔ اُس نے اندر آتے ہی دروازے میں کُنجی گھما دی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اُسے پھر سے مقفل کر رہا تھا۔ جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو مسکرا رہا تھا۔ سیزر اُسے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی بڑے دوستانہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔

”آپ کا مریض پیٹ میں درد کی شکایت کر رہا ہے۔“ اُس نے اپنی افریقی انگریزی میں کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس سالے کو گرامر کا کچھ خیال نہیں تھا۔ بس اپنا مطلب وہ سمجھا لیتا تھا مگر بڑی روانی کے ساتھ۔

ڈاکٹر نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، بولا ـــ ”السلام علیکم۔“ وہ بڑے خلوص سے مسکرا رہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی پینتیس سال ہوگی۔ رنگ اس کا سانولا سا تھا اور سفید کوٹ اُسے اچھا لگتا تھا۔

”وعلیکم السلام ڈاکٹر! میں... میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ آ گئے۔ دراصل... میرے پیٹ میں درد نہیں ہے، میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں صبح سے یہاں پڑا ہوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے یہاں کون لایا ہے، کیسے لایا ہے اور کیوں لایا ہے؟ میں کوئی مشین کا پُرزہ تو نہیں ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“

ڈاکٹر ہارون نے مسکراتے ہوئے کرسی میرے پلنگ کے قریب کھسکا لی، بولا ”اگرچہ یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب صرف ڈاکٹر دھمّن ہی دے سکتے ہیں مگر پھر بھی میں آپ کو بتا دوں مسٹر غیاث کہ یہ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ آپ امریکہ آنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے آپ کا پاسپورٹ بنوایا گیا۔ عارضی ویزا آپ کے لیے حاصل کیا گیا۔ پھر آپ کو شدید بیمار ظاہر کر کے وہ یہاں علاج کے لیے

لے آئے۔ آپ کی ٹانگوں پر پلستر چڑھایا گیا، کسی اور کے ایکسرے رکھے گئے تاکہ راستے میں کسی کو شک نہ ہو سکے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا۔ مس ہیریسن آپ کو لے ہی آئیں، وہ جو آپ کی نرس تھیں۔“

میں حیرت زدہ ہو کر اس کی باتیں سنتا رہا۔ مگر اس میں مطلب کی بات کوئی نہیں تھی۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا یا اُسے کچھ بتایا گیا تھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ میں نے خود یہاں آنے کی آرزو

”میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ بلکہ مجھے بتایا ہی یہ گیا ہے۔ عارضی ویزے کو بعد میں تبدیل کروایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نہیں کر سکتے؟“

”جی ہاں! وہ گورنر لگے ہیں یہاں کے۔ کیا بات ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عالیہ کہاں ہوتی ہیں؟“

”وہ بھی اِدھر ہی ہیں مگر ان کا زیادہ وقت گھر پر گزرتا ہے۔ وہ اسپتال نہیں آتی ہیں۔ یہ پرائیویٹ کلینک ہے، پام اس کے تمام اخراجات دھمّن صاحب برداشت کرتے ہیں۔ یہ چیرٹی اسپتال ہے۔“

”ہوں! کیا آپ کو یقین ہے کہ میری ٹانگوں پر پلستر اس لیے چڑھایا گیا تھا تاکہ وہ زخمی نظر آئیں یا کوئی اور بات تھی؟“ میرے سوال پر اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں ”پلستر میری ناف تک مجھے بیٹھنا مشکل نظر آتا تھا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی اور بات بھی شامل ایسا نہیں ہے مسٹر غیاث!“

”تم غلط کہتے ہو۔ میرا نام غیاث نہیں ہے۔ میں غلام ہوں۔ میرا دوسرا نام سردار کریم نواز ہے۔ پھر کسی نے مجھے کہنا شروع کر دیا۔ اب تم نے میرا نام غیاث احمد رکھ دیا۔ آخر مذاق ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“

”دیکھیں آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اطمینان سے میں وقت گزاریں۔ سیزر آپ کی خدمت کرے گا۔ آپ کے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے سمجھے آپ... ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ سان فرانسسکو ہے۔ باہر نکلیں گے پر مصیبتوں کے پہاڑ آ گریں گے۔ پھر کوئی آپ کی مدد نہیں کرے گا کو سنبھال کر رکھو سیزر! دوبارہ ہم میں سے کسی کو بلانے کی کو کرنا۔“ یہ کہہ کر ہارون ایک دم کرسی سے اٹھ گیا اور دروازے مڑنے لگا۔ سیزر اُس کے دائیں ہاتھ کھڑا تھا اور میں یہ د تھا کہ اس نے ہارون کی آخری بات سنتے ہی ایک ہلکا پھلکا بائیں ہاتھ میں تھام لیا تھا اور اس پر سائلنسر لگا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں سر! اب آپ کو زحمت نہیں دی جائے گی۔“ سیزر بولا۔ ڈاکٹر اس وقت تک دروازے میں چابی لگا رہا تھا مگر سیزر کی نگاہ میری ہر حرکت کا اندازہ کر رہی تھی اور میری ہمت اُن ٹیکوں نے ختم کر دی تھی۔ میرے بدن میں وہ پہلی سی توانائی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ میں نے اپنے ارادے پر خود ہی برف ڈال دی اور اُسے نکل جانے دیا۔ وہ میرے لیے صحیح وقت نہیں تھا اور نہ وہ ہارون میرا مخاطب تھا۔ اس کو باندھ کر مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

ڈاکٹر باہر نکلا تو سیزر نے دروازہ مقفل کر دیا۔ پھر اس نے پستول پتلون کے اندر پھنسا لیا اور مجھ سے مخاطب ہوا ”مسٹر گیاث! بہتر ہے کہ آپ اب آرام کریں۔ آپ بہت تھک گئے ہیں۔ میں بھی دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ عقبی دیوار تک جا پہنچا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مجھے اس نے دوسری بات کرنے ہی نہیں دی۔ میں بھی اس کے رویے کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ صرف حکم کا غلام تھا۔ اُسے کسی اور بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں تھی۔

کمرے میں کھڑکی صرف ایک ہی تھی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ صرف اُسی کھڑکی سے ممکن تھا مگر اُس سے مجھے کیا مل سکتا تھا۔

میرے شب و روز کی اذیتیں اور بڑھ گئی تھیں۔ میرے پیپل کی چھتر چھاؤں اور زیادہ چھدری ہو گئی تھی۔ تقدیر میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ میرا کوئی بھی پھول امید کے مزار پر نہیں چڑھ رہا تھا ـــ مجھے یقین تھا کہ اُس پلستر میں رکھ کر وہ کوئی ایسی چیز امریکہ لے آئے ہیں جو عام حالات میں ہرگز نہیں لا سکتے تھے۔ مجھے احساس تک نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے میری ٹانگوں کے بال اس حد تک مونڈ دیے ہیں۔ خدا جانے وہ میرے بھٹکے ہوئے وجود سے کیا کرتے رہے تھے ـــ آدمی بے ہوش ہو جائے تو پھر چاہے اُسے سمندر میں گرا دو اسے کیا پتا چلے گا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ اُس پلستر میں دبا کر پاکستان سے ہیروئن لے آئے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں ایک دم بستر سے اٹھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے بدترین قسم کے جرم میں پھنسا کر خود الگ ہو جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر دھمّن نے سوچا ہوگا کہ میں اگر کہیں پھنس گیا تو وہ خود ہی مجھ سے بھگت لیں گے، اس کا نام تو کہیں نہیں آئے گا۔ وہ تو کاغذات میں کسی بھی جگہ مذکور نہیں تھا، نہ کوئی اور۔ یہاں تک کہ وِلسن بھی اس سے اپنا دامن چھڑا سکتا تھا اور مس ہیریسن کہہ سکتی تھی کہ وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ صرف انسانی ہمدردی کی بنا پر وہ میرا خیال رکھ رہی تھی۔ کئی بہانے بنائے جا سکتے تھے لیکن ایک بات ظاہر تھی کہ وہ میری ٹانگوں پر کوئی اس قسم کی چیز باندھ لائے تھے اور مجھے انھوں نے شدید بیمار ظاہر کر رکھا تھا۔

اور اب میرا یہ حال تھا کہ میرے پاس اپنی شناخت کے لیے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ نہ ویزا، نہ پاسپورٹ، نہ کوئی اور کاغذ۔ وہ سب کچھ اُن کے پاس تھا اور وہ اُس تک مجھے کبھی نہ پہنچنے دیتے۔ اب انھیں بیٹھے بٹھائے ایک بڑا معتبر اور بہت ہی بیمار کیریئر مل گیا تھا اور مال انھوں نے میری ٹانگوں سے بڑے آرام سے الگ کر لیا تھا۔ خدا جانے وہ چیز امریکہ میں کتنے کروڑ میں بکی ہوگی۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ میں تو اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا۔

یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے تو میرے اپنے ہی دُکھ چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ایک وہ غم نصیب آسیہ تھی۔ جس نے ایسا لباسِ سوگواراں پہن لیا تھا کہ خوشی اُس کے لیے اجنبی بن گئی تھی۔ میں اس کی رہائی کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے دن رات برباد ہو کر رہ گئے تھے۔ پتا نہیں اُسے کتنی اذیتیں دی گئی ہوں گی۔ یہی حال آبی کا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ اندھا تو وہ پہلے ہی سے تھا۔ ورنہ وہ میرے پیچھے نہ لپکتا۔ میرا ساتھ نہ دیتا۔ وہ مجھے پیرِ کامل سمجھتا تھا۔ بالآخر تباہ ہو گیا۔ میں اس کے کسی بھی کام نہ آ سکا اور اب اگر اس کی بصارت ضائع ہو گئی تھی تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ عشق میں یہی کچھ ہوتا ہے اور وہ میری محبت میں مبتلا تھا۔ وہ راندۂ درگاہ آبی، اُسے میرے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ مجھ سے بچھڑا تو وہ آسیہ کا دامن پکڑ بیٹھا مگر اس کی محبت بھی اُسے راس نہ آئی۔ وہ بالآخر اس کے پیچھے چلتا ہوا جیل جا پہنچا اور اب وہ اپنے حصے کے دُکھ جھیل رہا تھا۔ کتنا کمزور دکھائی دے رہا تھا وہ اُس روز۔ کہتا تھا، یہ تمھاری مہربانی ہے جیلانی کہ تم مجھے پیسے دے رہے ہو، پگلا کہیں کا۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے اور تجھ سے میں کیا کہوں آبی! پتا نہیں تو کیا سوچ رہا تھا اس وقت۔ تو سمجھتا تھا، میں نے تجھ سے مل کر مہربانی کی ہے مگر تجھے کیا پتا کہ جیل میں تو نہیں، غلام جیلانی جا پھنسا۔

بُکھیا اُسیں مرنا ناھیں ـــ تے قبر پیا کوئی ہور

مگر تو اس رمز کو نہیں سمجھ سکے گا آبی! تیرے جسم پر پڑنے والے ہر کوڑے کی ضرب میرے جسم پر داغ چھوڑ رہی ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں اور اب میں کس جال میں جا پھنسا ہوں ـــ یہ سان فرانسسکو ہے آبی! ہم نے صرف اس کے بارے میں پڑھ رکھا تھا کہ یہ کوئی امریکہ کا شہر ہے۔ تجھیں تو معلوم نہ ہوگا مگر میں نے ایک ٹوٹی اسٹیونسن کی کہانی بوتل کا جن پڑھی تھی۔ اس نے ان جگہوں کا ذکر کیا تھا۔ اُسے ہوائی بہت پسند تھا۔ وہ شاید انھی جگہوں کا رہنے والا تھا۔ یہ ایسی سرزمین ہے جو شاید بحر الکاہل اور امریکہ کے درمیان میں کہیں واقع ہے مگر سان فرانسسکو اس سے آگے ہے۔ مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا آبی کہ میں تیرے بغیر، بن دیکھے، بن سنے اس عظیم سمندر پر سے گزرتا چلا آیا تھا اور مجھے معلوم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ میں سفر میں ہوں اور اب ریاست کیلیفورنیا کے صدر مقام پر آ بیٹھا ہوں۔ ابھی مجھے اسے اندر سے دیکھنا ہے۔ کہتے ہیں

یہاں سے امریکہ ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی عورت سر کے بل کھڑی ہو۔ نہ اس کی سمجھ میں آتا ہو گا کہ چیزیں یوں الٹ کیسے ہو گئیں، نہ وہ سمجھتی ہو گی کہ وہ کیسی نظر آ رہی ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے... مجھے سان فرانسسکو دیکھنا ہے مگر ابھی تو یہ شہر ہی میرے لیے پورا امریکہ بن گیا ہے۔ میں تصور کر سکتا ہوں آپی کہ یہ شہر کیسا ہو گا، لوگ کیسے ہوں گے، ان کی سوچ کیسی ہو گی۔ یہ ہوٹلوں، کلبوں اور تھیٹروں کا شہر ہے۔ یہی سنا ہے میں نے مگر ابھی میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ ایک تیری اذیتوں کا خیال آتا ہے، اپنے مرنے اور جینے کے دن یاد آتے ہیں، جو میرے سامنے کھڑے ہیں تو مجھے جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ پتا نہیں رحمٰن نے میرے بارے میں کیا کچھ سوچ رکھا ہے۔ میرے لیے کیسی کیسی وحشتناک سزائیں اس نے تجویز کر رکھی ہوں گی۔ ابھی تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں آپی۔

میرے دن بہت ہو گئے جینے کے ہیں۔ مجھے یہی نظر آتا ہے وہ مجھے یہاں سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ مجھے یہی لگتا ہے مگر شاید غلام جیلانی اس بحران سے بھی نکل جائے کہ ابھی اس کی ہمت نہیں ٹوٹی ہے۔ ابھی موت کی آرزو وہ نہیں کرتا ہے کہ ابھی باہر دھوپ نکلی ہے اور آسمان پر کہیں کسی جگہ بادل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بادل نچڑنے لگے تو زمین پر پھر سے بہار آ جائے گی۔ ابھی میرے مرنے کے دن تو نہیں ہیں آپی۔ ابھی مجھے زندہ رہنا ہے مگر کیسے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ میرے اور تیرے درمیان اب ہزاروں میل کا فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ یہ فاصلہ عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور وہ ڈاکٹر ہارون کہہ گیا ہے کہ باہر نکلو گے تو تم پر مصیبتوں کے پہاڑ آ گریں گے اور کوئی تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ کیا ہو گیا ہے دوست! کچھ سمجھ سکا ہے تو! مگر نہیں، ہم سب تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ سان فرانسسکو!

دن کا پتا نہیں یہ کون سا وقت تھا۔ سگریٹ کا سارا پیکٹ میں تقریباً ختم کر چکا تھا۔ دھوپ ڈھلنے لگی تھی کہ اچانک مجھے اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں ایک بار پھر بستر سے اٹھ گیا۔ کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جمائی پر جمائی آنے لگی تھی۔ میرا برا ہوا میں اس سیزر سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ آج تاریخ کیا ہے اور یہی سب سے بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھا تو اس روز مئی کی تین تاریخ تھی۔ ان لوگوں کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا اور آج پتا نہیں کیا تاریخ تھی۔ میرا بدن ٹھہر ٹھہر کر سن ہونے لگا تھا۔ سر پر بال تو کوئی نہیں رہ گیا تھا شاید دوبارہ اگ رہے تھے مگر پھر بھی سر کی جلد کٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بدن شل ہونے لگا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ یہ حالت تو میری کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں بدترین حالات میں بھی خود کو بہت سنبھال کر رکھتا تھا مگر اب کیا ہو گیا تھا مجھے۔ میں نے پیکٹ میں رکھے آخری تین سگریٹوں میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ بدن ٹوٹنے کا سبب اس کی وجہ سے رہتا ہے۔ اسے پی کر آرام آ جائے گا مگر اٹھ کر میں نے پانی کا گلاس بھر کر پیا۔ مگر میری کسلمندی نہ گئی۔ لگتا تھا میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہوں گا۔ بدن کسی چیز کا طالب تھا مگر وہ کیا چیز تھی، اس کا مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہ تھا۔

میں کمرے میں شدید اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر پھرتا رہا مگر قرار مجھے نہیں آ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی چیز ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ ایسی چیز جس میں میری روح بندھی تھی۔ میں منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لے رہا تھا۔ سگریٹ بھی ... دیتا تھا۔ اس کا سوال بھی معلوم ہوتا تھا۔ ... میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔

تنگ آ کر میں نے سیزر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ کچھ دیر بعد دروازہ کھول کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔ وہ شاید سو گیا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں میں ابل رہی تھی۔

"یس پلیز! کیا بات ہے؟ میں ذرا دیر کے لیے سو گیا تھا۔"

"آج کیا تاریخ ہے سیزر؟" میں نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ سارا بدن لرز رہا تھا۔ جسم میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ گویا میں ایک لق و دق صحرا طے کر کے وہاں پہنچا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ جسم کسی چیز کی طلب میں بڑی اذیتیں اٹھا رہا تھا اور سیزر دروازے میں کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"بتاؤ سیزر آج کیا تاریخ ہے۔ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میری مدد کرو سیزر! مجھے سمجھاؤ کہ میں کہاں ہوں۔" میرے آنسو بہہ نکلے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ ایسی آزردگی اور ایسی بے بسی تو زندگی بھر غالب نہ آ سکی تھی۔

"آج... آج گیارہ تاریخ ہے مسٹر گیاث! پر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

گیارہ کا لفظ سن کر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دماغ کا فیوز اڑا دیا ہے۔ "تم... تم بکواس کرتے ہو۔ آج گیارہ کیسے؟ جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا تو اس روز تین تاریخ تھی۔ میرے آٹھ دن کہاں چلے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے آٹھ دن تک بے ہوش رکھا۔"

"اوہ نو۔ ایسا نہ سوچیں مسٹر گیاث! آپ بیمار ہو گئے تھے۔ مجھے کیوں جگا دیا ہے آپ نے؟"

"میں... میں شاید مر رہا ہوں سیزر! مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔" میں نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا مگر وہ بھی بیکار ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دم فرش پر بیٹھ گیا۔ جیلانی کو وہ پوری طرح برباد کر چکے تھے۔ نہ جانے وہ مجھے کیسی کیسی دوائیں دیتے رہے تھے۔ جس کی وجہ سے میں پتا نہیں کیا ہو کر رہ گیا تھا۔ ورنہ میں ایسا تو نہیں تھا یارو! میں تو ایک دنیا تسخیر کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ میرے حوصلے کی انی کبھی اس قدر کند نہیں رہی تھی۔ کیا یہ سب کچھ ڈاکٹر رحمٰن کی وجہ سے کیا گیا تھا؟ اس نے تو مجھے ناکارہ کر ہی دیا تھا مگر اس سے آگے کیا ہوا؟ وہ مجھے سان فرانسسکو تک لے آئے؟

سیزر نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ میری نبضیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے کچھ خیال آیا اور وہ مجھے سہارا دے کر پلنگ تک لے گیا۔ بولا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی آپ کو دوا دیتا ہوں۔ پریشان نہ ہوں۔" یہ کہہ کر وہ الماری کی طرف بڑھا اور اس کا تالا کھول کر اس نے ایک ڈبے میں سے ایک کیپسول نکالا اور پانی کا گلاس لے کر وہ میرے پاس آ گیا۔

"یہ... یہ کیپسول کھا لیں مسٹر گیاث! آپ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے ڈاکٹر نے یہی دوا تجویز کی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے کیپسول میرے منہ میں ڈال دیا اور پانی کا گلاس مجھے دے کر بولا۔ "یہ کھا لینے کے بعد ابھی کوئی آدھ گھنٹے میں آپ کو کھانا بھی کھلا دوں گا۔ آپ نے دوپہر کا کھانا بھی تو نہیں کھایا۔"

میں نے پانی کا گلاس خالی کر کے اسے دے دیا۔ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی پانچ منٹ بعد میرے دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی اور وہ تشنج کی کیفیت آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔ اب مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شاید سارے ہی مرحلوں سے آگاہ تھا۔ اس نے مجھے سگریٹ سلگا کر دے دیا۔

"آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانا لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے چادر اوڑھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کیپسول نے معجز نما اثر دکھایا تھا۔ میری طبیعت پھر سے بحال ہو گئی تھی اور اب سگریٹ مزہ دے رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ اس کیپسول میں آخر ایسی کیا چیز تھی۔ بدن ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ بہت اچھی دوا تھی مگر اس کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ آخر مجھے کیا مرض لگ گیا تھا۔ کچھ تو میری سمجھ میں آتا۔ نہ مجھے کھانسی تھی، نہ ... میرا دل اتنا کمزور تھا کہ میں بات بے بات ڈھے جاتا۔ کوئی مرض مجھے ہوتا تو اس کا مجھے علم ہو جاتا۔ میری ذہنی حالت بھی ٹھیک ہی تھی۔ کیپسول نہ ملنے کی وجہ سے میرا دماغ جو کیفیت محسوس کر رہا تھا، وہ اب ختم ہو چکی تھی مگر... مگر میرے یہ آٹھ دن کہاں گزرے؟ وہ سارے کے سارے بے ہوشی کی نذر ہو گئے۔ آخر ہوا کیا تھا؟ مجھے وہ لوگ مس ہیریلین کے حوالے کر کے چلے آئے تھے۔ مجھے وہ ٹیکہ بھی لگاتی رہی ہو گی۔ ایک ٹیکہ تو مجھے یاد تھا اور اس کی وجہ سے میرا دماغ بھی ماؤف ہو گیا تھا۔ پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں آسمان پر ہوں کہ زمین پر۔ ایسے میں وہ میری بے خبری سے فائدہ اٹھا کر خدا جانے مجھے کہاں سے کہاں لے گئے اور پھر سان فرانسسکو میں لا اتارا۔ یہ بھی مجھے سیزر نے ہی بتایا تھا مگر اس کا کیا بھروسہ کہ یہ جگہ سان فرانسسکو ہی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا تو ایک وسیع باغ نظر آتا تھا۔ اس سے آگے ایک سڑک اور بس۔ کسی بات سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ماحول البتہ بہت بدلا بدلا سا نظر آتا تھا۔ چیزوں کی حالت یہ احساس دلاتی تھی کہ میں اپنے وطن سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ اس حبشی کی موجودگی بھی یہی بتاتی تھی اور اب وہ میرے لیے کھانا لینے کے لیے گیا تھا۔

میں نے اچھا کیا، ماں جی کو اپنی کوٹھی میں ٹھہرا آیا تھا۔ قابلِ اعتبار ملازم بھی انھیں دے آیا تھا۔ روپیہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ انھیں کسی بات کی فکر نہیں ہو گی۔ ایک آسیہ کے بارے میں سوچ کر ان کا دل آزردہ ہو جاتا ہو گا مگر وہ تو اپنی تقدیر بھگت رہی تھی۔ ایک دیوارِ گریہ ہر وقت اس کے سامنے رہتی تھی۔ وہ اس صورتِ حال کو بدل نہیں سکتی تھی۔ اس کے بارے میں ماں جی کو زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپی بھی آسیہ کے ساتھ ہی بند تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ آسیہ اس پر بہت بھروسہ کر سکتی تھی مگر... مگر سوال یہ تھا کہ میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں، اس ڈاکٹر رحمٰن اور عالیہ نے تو مجھ سے ایسا انتقام لیا تھا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور ابھی پتا نہیں ان کا منصوبہ کیا تھا۔ مجھ سے وہ اور کیا چاہتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے جان سے نہیں ماریں گے۔ ابھی وہ میرے بہت سے اعضا پر اپنا حقِ ملکیت استوار رکھتے تھے۔ وہ میری آنکھیں نکال کر بیچ سکتے تھے۔ میرے پھیپھڑے بھی ان کے کام آ سکتے تھے مگر وہ مجھے مار دینے کے حق میں نہیں ہوں گے۔ ہاں جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ اب اس آدمی کو مار دینا ہی بہتر ہے تو پھر شاید وہ مجھے کوئی ٹھنڈی پڑیا دے کر ختم کر دیں۔ ایک کیپسول ہی بہت کافی تھا، ایک سائنائڈ کا کیپسول۔ اور ان کی ساری فکریں دور ہو سکتی تھیں پھر انھیں مجھ سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو گا۔ مجھ سے وہ بھرپور فائدہ اٹھا کر مجھے ختم کر دیں گے مگر ابھی نہیں اور اس ذرا سی مہلت سے ہی مجھے فائدہ اٹھا لینا چاہیے تھا۔ ورنہ... ورنہ پھر بہت دیر ہو چکی ہو گی مگر مصیبت یہ تھی کہ میرا بدن اپنی اصلی حالت پر نہیں آ رہا تھا۔ میری ہمت جواب دے جاتی تھی۔ میں تو سیزر سے بھی نہیں نمٹ سکتا تھا اور اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد سیزر میرے لیے کھانا لے آیا۔ اب کی

بار وہ ڈھیر سارا گوشت ساتھ لایا تھا۔ چمچے کانٹے، پلیٹیں، ٹرے کھانے کا سامان۔ سب کا سب اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ امریکی کھانا ہے۔ میری بھوک اچانک ہی عود کر آئی اور میں کھانے میں جت گیا۔

”کہیں یہ سور تو نہیں ہے مسٹر سیزر؟“

”میں سمجھا نہیں؟“

”میں پوچھتا ہوں کہیں یہ خنزیر کا گوشت تو نہیں ہے؟“

”او نو۔ یہ بھیڑ کا گوشت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ سور کا گوشت نہیں کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈومن بھی نہیں کھاتے ہیں۔ مجھے پتا ہے۔ وہ بکری اور بھیڑ کے گوشت کو ترجیح دیتے ہیں۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ مجھے کیا مرض تھا۔ میرے یہ آٹھ دن کہاں گزرے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ ڈاکٹر ڈومن یہی کہتا تھا کہ آپ بیمار تھے۔“

”اُن سے تم میری ملاقات نہیں کروا سکتے؟“

”ہو جائے گی، ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟“

”اب میں ٹھیک ہوں، اس کیپسول نے اچھا اثر کیا ہے۔“

”ویسے مسٹر گے ایث! ڈاکٹر عالیہ بھی آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ وہ آپ کے بارے میں بہت پریشان تھی۔“

اس نے اب کی بار غیاث کو اس طرح کہا جیسے وہ کہہ رہا ہو... GAY - ASS یعنی میں کوئی خوش باش گدھا ہوں۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا اور وہ عالیہ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں سیزر کہ تم میری اُن سے ملاقات کروا دو۔ عالیہ اچھی عورت ہے۔ میں اُس کی وجہ سے یہاں آیا ہوں ورنہ مجھے بیماری کوئی نہیں ہے۔“

”شاید وہ شام کو ادھر آ جائیں۔ انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کمرے میں جا گھسا۔ دروازہ اُس نے اپنی طرف سے بند کر لیا اور میں پھر سوچ کے گرداب میں پھنس گیا۔ میرے پروردگار! یہ میں کس مصیبت میں گھر گیا ہوں یہاں کوئی ایسا نہیں جو میری بات سمجھ سکے۔ کسی کو میرے نفع نقصان سے کوئی غرض نہیں۔ پتا نہیں وہ مجھے کس لیے یہاں لے آئے ہیں۔ وہ سامنے بھی نہیں آ رہے ہیں، آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟“

سیزر کے دیے ہوئے کیپسول نے میرے بدن میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا مگر اُس کے باوجود میں شدید کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ بہت دنوں بعد مجھے کھینچ کھانچ کر زندگی کی سرحد پر واپس لے آئے تھے اور اب تک پچھلے دس بارہ دنوں سے وہ مجھے ٹیکوں کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھتے چلے آئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مجھے شدید نقاہت کا احساس ہو رہا تھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

اگلے دو دن میرے اس حال میں بسر ہوئے کہ گیارہ بجے میری حالت غیر ہونے لگتی مجھے پھر کسی شے کی طلب ہوتی تھی۔ یوں جیسے میرے اندر سے کوئی چیز نوچی جا رہی ہو۔ کلیجہ جلنے لگتا تھا۔ ناشتہ تو میں ٹھیک سے کر لیتا تھا مگر کوئی دو گھنٹے بعد میرے جسم میں شدید تشنج ایسی کیفیت ہونے لگتی۔ سیزر میری اس حالت کو اب سمجھنے لگا تھا۔ اس نے میں مجھے پھر کیپسول کے زیرِ اثر رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ پھر ہلکورے لینے لگتا اور میں ایک عجیب سے بے کیف سرور میں لگتا۔ وہ ایسا سرور تھا جس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا سے میرے لیے کوئی مفر بھی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں سے کئی بار پوچھا بھی مگر وہ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے یونہی ہاں ہاں کر کے رہ جاتا تھا۔ اس کے لفظوں سے کہاں ہوتی تھی۔ تیسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ وہ صبح شام میری میں مصروف رہتا تھا۔ شاید اُسے کوئی اور کام تھا ہی نہیں صرف میری حفاظت کے لیے وہاں متعین کیا گیا تھا۔ اندازہ وہ ڈاکٹر بھی پھر نہیں آیا اور میں نے بھی اس کے بارے میں سے نہیں پوچھا۔ شاید وہ مجھے کوئی صحیح بات بتلانے پر آمادہ تھا اور اس کے خلاف میرے دل میں نفرت بھرتی چلی جا رہی اس نے شاید یہی سمجھ لیا تھا کہ میں بڑا ہی گھامڑ قسم کا آدمی جسے وہ جس طرح چاہے نچا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ڈمن نے جسے کہتا تھا۔ شاید اُسے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

چوتھے روز تو حد ہی ہو گئی۔ مجھے ناشتے کے بعد ہی کی طلب محسوس ہونے لگی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ شاید بہت ہی گھٹیا نشے کا عادی بنا رہے ہیں۔ ورنہ تو کوئی کہ میں یوں ٹھیک وقت پر آپے سے باہر ہو جاتا۔ میرا جسم چٹخنے لگتا، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ ایک گھٹی گھٹی تھی کہ اپنے اردگرد کی ہر شے سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ اس کیا تھا آخر؟

میری طبیعت جب زیادہ ہی بگڑنے لگی تو میں ایک اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا تب مجھے محسوس ہوا کہ سیزر کسی سے مسلسل میری حالت کو نگاہ میں رکھتا تھا کیونکہ ابھی میں کھٹکھٹایا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک دم پٹ کھول کر میرے

”ہیلو فرینڈ! کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے“

میں میز کا سہارا لے کر راستے میں ہی رک گیا۔

”تمھیں معلوم ہے سیزر، میں کون ہوں؟“ میں نے اپنا ہوئے کہا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی آنکھوں کے اُس رنگ کو سمجھ نہ سکا۔

”معلوم ہوتا ہے پھر تمھاری طبیعت خراب ہو گئی ہے، لو کیپسول کھالو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”میرے سوال کا جواب دو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟“

”اوہ ویل ویل۔ پتا نہیں تم کس نالی کے کیڑے ہو۔ کھاؤ کیپسول، یہ لو پانی۔“ اس نے کیپسول میرے منہ تک لاتے ہوئے کہا۔ گلاس اس کے بائیں ہاتھ میں تھا اور ٹھکا اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

”میں یہ کیپسول نہیں کھاؤں گا کمینے! تم مجھے نشے کا عادی بنا رہے ہو۔ کتے! کیا سمجھتے ہو مجھے تم۔ جانتے ہو میں کون ہوں۔ گندے چوہے نیگرو!“

میری آواز ایک دم بلند ہو گئی۔ وہ میری یہ کیفیت دیکھ کر مسکرانے لگا، بولا۔ ”تم ہوش میں نہیں ہو۔ یہ کیپسول کھالو۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لو شاباش!“

مگر جیسے ہی وہ کیپسول میرے منہ میں ڈالنے لگا، میں نے بدن کی ساری قوت ہاتھوں میں مجتمع کر کے اس کی گردن پر انگلیاں رکھ دیں۔ وہ معجز نما انگلیاں حرکت میں آئیں تو سیزر ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹا مگر اس کے عقب میں وارڈ روب تھا۔ جگہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس کی گردن کے اندر گہری دھنس چکی تھیں۔ دوسرا سانس اُسے لینا نصیب نہیں ہوا اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا پڑا۔ اس کی صرف آنکھیں ہی کھلی رہ گئی تھیں اور اُن میں ایسا تحیر اُبھر آیا تھا کہ باید و شاید۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا ہوگا کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ کیپسول فرش پر گر چکا تھا، گلاس کرچی کرچی ہو گیا تھا اور کسی کو علم نہیں تھا کہ میرا محافظ کس راہ سے کس طرف نکل گیا تھا۔ اس کو بے بس کر کے میں چند لمحوں تک یونہی میز کے ساتھ کھڑا اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ لگتا تھا جیسے میں کوئی پہاڑی عبور کر رہا ہوں۔ چڑھائی ہی چڑھائی تھی میرے سامنے۔ جس پر قدم دھرنا میرے لیے ناممکن نظر آتا تھا۔ میرا کلیجہ اُلٹنے لگا تھا۔ ابھی تک میرا جسم لرز رہا تھا۔ کسی شے کی طلب نے مجھے پاگل کر رکھا تھا مگر میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے، میں اُس کیپسول کا زہر حلق سے نیچے نہیں اُتاروں گا۔ یہ میرا عہد تھا جو میں نے اپنے بے جان دل سے کر رکھا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ ہیروئن کا کیپسول ہے، اُس کا رنگ ہی بتا رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ میں اُسے اپنے لیے زہر ہلاہل سمجھ رہا تھا اور وہ مجھے اُس کا عادی بنا رہے تھے۔ اب تو پندرہ دن گزر چکے تھے اور وہ شاید اب تک اپنے اس منصوبے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ میری واپسی ناممکن تھی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ایک بار اس راہ پر لگ گیا تو پھر میری واپسی نہ ہو سکے گی۔ میں خود نشے کی تلاش میں مارا مارا پھروں گا، بھیک مانگوں گا۔ سڑکوں پر آوارہ پھر کر ایک کیپسول کے لیے اپنا سب کچھ بار دوں گا مگر وہ جیلانی کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ میرے ارادے کی پختگی کو نہیں جانتے تھے۔ حالانکہ نشہ جس پہلی چیز کو تباہ کرتا ہے وہ آدمی کا ارادہ ہی ہے۔ اس دیوار کو وہ سب سے پہلے گرا دیتا ہے مگر اُس روز میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں وہ کیپسول نہیں کھاؤں گا۔ مگر کوئی چیز ایسی تھی جو مجھے مسلسل اُس کیپسول کی طرف دھکیل رہی تھی اور وہ بڑی پاگل قوت تھی۔ اُس کے سامنے ہمالہ ایسا پہاڑ بھی ہوتا تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ وہ بڑی میٹھی چھری تھی جس سے انھوں نے مجھے ذبح کر دینا چاہا تھا۔ میں نے وہ کیپسول فرش پر سے اٹھایا اور اُسے میز پر رکھ کر کھول دیا۔ اس کی دوا اب میرے سامنے تھی۔ وہ نسواری رنگ کی دوا جو جسم میں اُتر کر آدمی کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ آدمی کو ایسا سرور دیتی ہے جو نہ شراب میں مل سکتا ہے نہ کسی اور چیز میں۔ شراب تو آدمی کو بہت اُونچا اُٹھا دیتی تھی۔ اگر کوئی بہت حوصلہ مند ہے تو شراب اس کے حوصلے کی انی کو آسمان اتنا اونچا کر دیتی ہے اگر کوئی بہت ہی بدطینت ہے تو اس کی بدطینتی کو وہ اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔ شراب میں یہ صفت موجود ہے مگر جس نشے کا وہ مجھے عادی بنا رہے تھے وہ تو آدمی کو ذلت اور رسوائی کی انتہا تک پہنچا دیتا تھا۔ وہ کسی بھی کام کا نہیں رہتا تھا۔ اس کے سارے عیب و ہنر دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے اور یہی وہ بات تھی، جس سے میں ہر حال میں بچ جانا چاہتا تھا — میں غلام جیلانی کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہی میری ڈھال تھا، وہی میرا محافظ تھا، وہی مجھے بلندیوں سے ہمکنار کرتا تھا۔ میں اُسے کیسے مر جانے دیتا، یہ ناممکن تھا اور یہ اچھا تھا کہ بالآخر میں نے سیزر کو رگید ڈالا تھا کہ میرے لیے ہم رنگ زمیں دام اُسی کے ذریعے پھیلایا جا رہا تھا اور میں غلام جیلانی کو ہر حال میں اُس سے بچا لینا چاہتا تھا۔

میں نے کیپسول کی راکھ فرش پر گرا کر پاؤں سے مسل ڈالی اور سیزر کو کھینچ کر میں نے پلنگ کے نیچے ڈال دیا مگر مجھے چین نہیں آ رہا تھا۔ گھبرا کر میں پھر پلنگ پر لیٹ گیا لیکن نہ میرا ذہن ٹھکانے تھا، نہ دل۔ کتنی ہی دیر تک میں بے سدھ ہو کر پلنگ پر لیٹا رہا۔ جب میں پھر سے عاجز آنے لگا تو میں نے اُٹھ کر ایک اور گلاس لیا اور اُس میں پانی بھر کر میں نے حلق سے نیچے اُتار لیا مگر پانی سے بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ پریشان ہو کر میں سیزر کے کمرے میں جا گھسا۔

اُس پٹھے نے اپنے لیے خوبصورت پلنگ بچھا رکھا تھا۔ اُسے بھی قالین میسر تھا۔ پلنگ کے قریب ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر مجھے دو جوتے نظر آئے۔ اُن میں سے ایک مردانہ جوتا تھا اور دوسرا زنانہ۔ کیونکہ دوسرے جوتے کی ایڑی خاصی اونچی تھی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ادھر کوئی عورت بھی سیزر کی مہمان تھی اور وہ اس کے کمرے میں کسی نہ کسی وقت ضرور آتی تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں بھی ایک وارڈ روب موجود تھا۔ اس کو جب میں نے کھولا تو

اس کے دائیں ہاتھ سینزر کے کپڑے تھے اور بائیں ہاتھ کسی خاتون کے۔ کچھ دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ ایک سلیٹی۔ بگ کا بیٹ بھی دھرا تھا۔ میں نے سینزر کے کپڑے اپنی جگہ سے ہٹا کر دیکھے تو وہاں مجھے پستول کا خول نظر آیا۔ اس کے ساتھ کچھ گولیاں بھی تھیں۔ گویا سینزر نے وہ سامان کسی خاص مقصد کے تحت جمع کر رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پستول اس کی پتلون کے نیفے میں پھنسا ہوگا۔ وہ میرے سامنے اس کی نمائش بھی کر چکا تھا۔ کمرے میں پلنگ کے سامنے ہلکی پھلکی کرسیاں رکھی تھیں جن کی پالش حیران کن تھی۔ وہ چاندی کی بنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ سینزر کو رہائش کے لیے عمدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ میں نے وارڈروب کے دائیں ہاتھ رکھی میز کی درازیں کھول دیں۔ مگر اس میں سینزر کے ذاتی استعمال کی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچھ سگریٹ، کچھ تمباکو، دو پائپ۔ کاغذ وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ نچلی دراز میں دو شیشیاں پڑی تھیں اور ان میں وہی کیپسول موجود تھے جن کا مزہ میں چکھ چکا تھا۔

وہ کمرہ دوسری طرف سے پوری طرح بند تھا وہاں سے باہر نکلنے کا دروازہ دوسری طرف سے مقفل تھا۔ کھڑکی پر پردہ کھنچا تھا، گہرے نیلے رنگ کا پردہ۔ وہ میں نے کھینچ کر دیکھا تو میرے سامنے وہی منظر تھا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ سامنے ایک بڑا سا لان تھا اور اس سے آگے ایک سڑک اور بھی اور بس۔ وہ سڑک اُس گھڑی خاصی آباد نظر آتی تھی۔ ٹریفک دونوں سمتوں میں جا رہی تھی۔

مصیبت یہ تھی کہ ابھی تک میری وہ کیفیت زائل نہیں ہوئی تھی۔ میرا بدن میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بائیں ہاتھ ایک بڑا سا چولہا رکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اُسے کیا کہتے تھے۔ تھا وہ گیس کا چولہا۔ سینزر اُسی پر ساری چیزیں پکاتا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ ایک فریج رکھا تھا اور اُس میں سینزر نے کھانے پینے کی کئی چیزیں بھر رکھی تھیں۔ ایک بوتل میں مجھے سیب کا رس نظر آیا۔ وہ میرے خیال میں سب سے زیادہ خوش ذائقہ چیز تھی۔ وہ نکال کر میں نے منہ سے لگالی، سیب کا رس تازہ تھا اور دل کو سکون دیتا تھا۔ اُسے پی کر مجھے آرام محسوس ہوا۔ ایک خانہ گوشت سے بھرا ہوا تھا اور وہ یخ ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ نچلے خانوں میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ انڈے مجھے زیادہ بہتر نظر آئے۔ انھیں نکال کر میں نے تلنے کے لیے چولھے پر رکھ دیا۔ کچھ تازہ روٹی وہاں رکھی تھی۔ وہی میرے کام آئی۔ گوشت بھوننے کا میں عادی نہیں تھا۔ اس کا مجھے طریقہ ہی نہیں آتا تھا۔ میں ٹھہرا جیتی ستی آدمی مجھے باورچی خانے کا علم کیسے آسکتا تھا۔ جوں توں کر کے میں نے انڈے تلے اور بغیر نمک مرچ ڈالے وہ میں نے ڈبل روٹی قسم کی چیز سے زہر مار کیے۔

دوپہر ہو چکی تھی اور ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ بالآخر میں نے سینزر کے کمرے سے شراب کی بوتل نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ وہ کوئی بہت ہی عمدہ قسم کی وسکی تھی اور میں اپنے ... کو شراب کی نذر کر دینا چاہتا تھا۔ شاید اُس سے مجھے ... وہاں سوڈا بھی موجود تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ خالی ... کرتو میں شاید کہیں کا بھی نہ رہتا۔ میں بیٹھے بٹھائے ... گیا اور پھر میں اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے ... اُسے قبول بھی کرتا ہے کہ نہیں؟

مگر میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ بات بن نہیں رہی ... جس چیز کی طلب میں مر رہا تھا، شراب اُس کا نعم البدل نہیں ... اور مجھے اُس عذاب سے جس قدر جلد ممکن ہو نجات حاصل ... تھی۔ میں نے شراب کی بوتل الگ رکھ دی اور ایک بار پھر ... میں... اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ سگریٹ کچھ مزہ تو دیتا تھا مگر ... نہیں بن رہی تھی جی چاہتا تھا میں اُسے سارے کا سارا ... خبیثوں نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسا نشہ مجھ پر سوار کر ... اب اُس کے مقابلے میں کسی اور چیز میں کوئی مزہ ہی نہیں ... اس نشے کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔

سینزر کے ہوش میں آجانے کا بھی مجھے ڈر تھا اور اس کو ... بے حد ضروری تھا۔ اسی خیال سے میں نے اُٹھ کر اُسے پلنگ ... نکالا اور اس کے ہاتھ پاؤں کس کر باندھنے کے بعد اُسے بڑی مشکل ... میں نے پلنگ پر لٹا دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں کرتے ... سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ میں نے ڈھلوں صاحب ... میں قیدیوں کو بھنگ کا پیالہ پیتے دیکھا تھا۔ وہ بہت چیختے چلاتے ... اُن کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ انھیں جب بھی پیاس لگتی تھی، پینے ... انھیں تیز بھنگ دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ پھر وہ خود ... عادی ہو جاتے تھے۔ اتنے عادی کہ وہ اس کا خود مطالبہ کرتے ... بھی شاید وہ لوگ وہی حال کر دینا چاہتے تھے مگر میں نے طے کر ... کہ یہ ظلم خود پر نہیں ہونے دوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ میرا جسم کب تک ... پر قائم رہتا ہے۔ میں دنیا کی ہر شے اُسے فراہم کر سکتا تھا مگر ... بھنگ، ہیروئن، ایل۔ ایس۔ ڈی یا کوئی اور ایسی چیز اس کو نہ ... خواہ میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر سینزر کے کمرے میں جا گھسا ... پستول میں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ چھوٹا سا پستول میرے ... کام آسکتا تھا۔ اس کے چیمبر میں نو گولیاں رکھی تھیں اور ان ... وہ کوئی بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں ... بٹوا اور کمرے کی چابیاں بھی مل گئی تھیں۔ بٹوے میں کرنسی ... تھے۔ وہ میں نے الگ کر لیے۔ بٹوے کی دوسری چیزیں میرے ... نہیں آسکتی تھیں۔ البتہ ایک چھوٹی سی ڈائری ایسی تھی جس ... کے نام اور فون نمبر لکھے تھے اور اس میں سینزر نے ڈاکٹر دھمن اور ... پتے بھی لکھے تھے اور فون نمبر بھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں۔ کیونکہ فون نمبر دونوں ناموں کے سامنے ایک ہی تھا۔

سینزر نے الماری میں اپنے کپڑے ٹانگ رکھے تھے۔ اُن کو نکال کر میں نے اپنے لیے ایک پتلون پسند کی پھر ایک سفید قمیص اور سوئٹر پہن کر میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو وہ لباس مجھے ٹھیک ہی تھا۔ ٹائی گردن سے لٹکا کر میں نے کوٹ پہنا تو وہ مجھے پورا دکھائی دیا۔ اس کا قد کاٹھ میرے برابر ہی تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ مجھے وہاں سے نکل جانے کے لیے ایک عمدہ لباس کی اشد ضرورت تھی ورنہ میں تو وہاں مریضوں کے سے کپڑے پہن کر لیٹا تھا۔ جو میری بے ہوشی کے عالم میں مجھے پہنا دیے گئے تھے اور جن کو پھینک دینا ہی میرے لیے بہتر تھا۔

میں اس وقت عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ دونوں کمروں میں ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے عقبی دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک وسیع و عریض غلام گردش تھی۔ جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ احساس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر دھمن وہاں زیادہ سے زیادہ چار چھ کمرے کرائے پر لے کر بیٹھا ہوگا۔ وہ ساری عمارت نہ تو خرید سکتا تھا، نہ اُسے کرائے پر لے سکتا تھا، ماحول قطعاً اسپتال ایسا تھا۔ میں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا، ہوا کی ایک تیز باڑھ نے مجھے روک لیا۔ باہر ہوا بہت سرد تھی۔ میں کسی طرف دھیان دیے بغیر راہداری عبور کر کے لفٹ تک جا پہنچا۔ جس نے مجھے کچھ ہی لمحوں بعد عمارت کے باہر پہنچا دیا۔

ایک عظیم الشان شہر میرے سامنے تھا۔ جس کے آگے پیچھے کی کوئی بات میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک دن مجھے کوئی باندھ کر امریکہ بھی پہنچا دے گا۔ اُس شہر سے میرا واسطہ صرف اتنا سا تھا کہ اس میں دھمن اور عالیہ رہتے تھے اور انھوں نے کسی جگہ ایک خیراتی اسپتال بھی کھول رکھا تھا اور میں نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہوں، میں انھیں تباہ کر دوں گا۔ وہ اسی قابل تھے مگر اس گھڑی میرے دل میں ان کے لیے انتقام کے بجائے رحم کی، ہمدردی کی اور محبت کی رمق پیدا ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی وہاں پردیسی تھے اور میں بھی اس شہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن میری سوچ کے یہ زاویے درست نہیں تھے۔ مجھے انھوں نے ایک خاص مقصد کے لیے وہاں بلوایا تھا۔ میری ٹانگوں پر پلستر چڑھا کر وہ خدا جانے کیا چیز وہاں سے امریکہ لے گئے تھے۔ ابھی تک مجھے اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ شہر میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

میں کوئی ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ معلوم یہ ہوا کہ میں براڈ اسٹریٹ میں کھڑا ہوں۔ وہ اسپتال کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا جس سے میں ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ میں چاہتا بھی تو دوبارہ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت شام بہت آگے جا چکی تھی۔ مجھے بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا اور میری جیب میں صرف پچیس ڈالر تھے۔ بدن کا تکدر ابھی تک دور نہیں ہو رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں اس شاہراہ پر گھومتا رہا۔ میرے خدا! رات ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی۔ دُھند لکے نے ہر شے کو نیم دُروں نیم بُروں کر رکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں، کدھر نکلوں؟ وہاں ہوٹلوں، کلبوں اور تھیٹروں کی ایک وسیع دُنیا آباد تھی۔ اسپتال سے نکلے ہوئے مجھے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ دولت جو پاکستان میں رہ گئی تھی میرے ساتھ ہوتی تو میں جی بھر کر اُس شہر کے نہاں خانے دیکھ سکتا تھا۔ ایک ہوٹل کے سامنے بالآخر میں جا ٹھہرا۔ وہ کوئی اچھا ہی ہوٹل تھا۔ میں تیزی سے دروازہ کھول کر ہال میں جا گھسا۔ ماحول نیم تاریک سا تھا۔ بتیاں بہت مدھم جل رہی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ لوگ موم بتیوں سے کام چلا رہے تھے اور خواہ مخواہ ایک خوابناک سی کیفیت اُن لوگوں نے وہاں پیدا کر رکھی تھی جس کی وجہ سے مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنی اپنی ترنگ میں جھوم رہے تھے۔

ایک ویٹر فوراً ہی میری طرف لپکا۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ میں سمجھا شاید میرے ہی وطن سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ بنگالی نکلا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ میں اُسے کھانے کا آرڈر دے کر میز پر رکھے اخبار دیکھنے لگا مگر ذہن میرا بُری طرح منتشر تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے چھٹکارا پا سکوں گا۔ میرے پاس اپنی شناخت کے لیے کوئی کاغذ موجود نہ تھا اور میرا پاسپورٹ بھی اُن لوگوں نے غصب کر رکھا تھا۔ سینزر کے کمروں میں ایسی کوئی چیز نہیں مل سکی تھی جو میری مدد کر سکتی۔ اگر میں وہاں سے واپس بھی جانا چاہوں تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور پھر اتنا کرایہ میرے پاس کہاں سے آئے گا۔ اس ماحول سے مجھے شدید وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ خدا جانے میں اس اسپتال سے باہر کیسے نکل آیا تھا اور کسی نے میرا پیچھا کیوں نہیں کیا تھا۔ انھیں تو میرے بارے میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ کیسے مجھ پر اعتبار کر گئے اور سینزر کے سلسلے میں وہ اتنے بے پروا کیسے ہو گئے۔ اخبار کی عبارتوں پر میری نظر نہیں ٹک رہی تھی۔ ایسا لاوارث اور بے سہارا تو کوئی نہ ہوگا جیسا تو ہو گیا ہے جیلانی!

ابھی میں کھانا شروع کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک خاتون کسی طرف سے اُٹھ کر میری میز تک آ پہنچی۔ وہ کوئی بہت ہی عمدہ قسم کی خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ ایک گہرے سُرخ رنگ کا کوٹ اس نے پہن رکھا تھا۔ جب وہ میز کے بالکل قریب پہنچی تو میں نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور لقمہ میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

وہ گہری نیلی آنکھوں میں عجیب سی معصومیت لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔ بولی: "اِف یو ڈونٹ مائنڈ...."

"اوہ نو۔ پلیز بی سیٹڈ" میں نے لقمہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا اور

اس کے احترام میں کرسی سے اُٹھ گیا۔
"میرا نام سَاف نرہے، سافنر"۔
"مجھے غیاث کہتے ہیں، میں پاکستان سے آیا ہوں"۔
"میرا اندازہ درست نکلا۔ میں پچھلے سال اسلام آباد گئی تھی۔ تبادلے کی وجہ سے ہمیں واپس آنا پڑا۔ میرے شوہر ولیم وہاں ایک فرم میں کام کرتے تھے۔ پھر اُن کا تبادلہ ہوگیا"۔
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شکر ہے کسی کو یہاں اسلام آباد کے بارے میں معلوم تو ہے"۔
"بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ پاکستان تو امریکہ کا بہت اچھا دوست ہے"۔
"جی ہاں یہ تو ہے۔ ہم بھی امریکہ کے بہت شکر گزار ہیں۔ وہ ہمارے خیرات زکوٰۃ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ کیا پینا پسند کریں گی؟"
"میں نے کافی کے لیے کہہ دیا ہے"۔
"اور کھانا؟"
"جی نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے"۔
"آپ کے شوہر نہیں آئے؟"
"جی نہیں۔ وہ نیویارک میں ہیں۔ اُنھوں نے یو۔ این۔ او کی ملازمت کرلی ہے۔ میرے والدین یہاں ہیں، میں اُن کے پاس آئی ہوئی ہوں"۔
"کہاں رہتی ہیں آپ؟"
"میں اسی سڑک کے آخر میں رہتی ہوں۔ دراصل مجھے پاس...ن لوگ بہت پسند ہیں۔ بڑے ہمدرد اور بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ میں بھی ان کی میزبانی کر کے بہت خوش ہوتی ہوں۔ دراصل.... ایسا ہے کہ ولیم سے میری کچھ اَن بَن ہوگئی ہے۔ وہ مجھے دھوکا دیتا رہا ہے۔ میں اسی لیے اُسے چھوڑ آئی ہوں۔ یہ کچھ وقت ہوگا آپ کے پاس؟"
"وقت ہی وقت ہے اور ہے کیا میرے پاس۔ کوئی خدمت ہو تو مجھے بتائیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ میری بات پر خود بھی مسکرانے لگی۔ بولی "آپ بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ آج میری ملاقات ایک اچھے پاکستانی سے ہوگئی۔ میں نے کہا نا کہ مجھے اسلام آباد بہت پسند ہے۔ اسلام آباد میں میں نے بہت اچھے دن گزارے ہیں۔ اب واپس کب جائیں گے؟"
"پتا نہیں۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کوئی کام ہے وہاں آپ کو؟"
"میں ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ دراصل میری وہاں دو سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ایک کالج کی وائس پرنسپل تھیں مس سائرہ بانو اور دوسری آپ کے وومنز ڈویژن میں ایک خاتون تھیں مس تشکید خلجی۔ اُن کو میں نے خط بھی لکھے مگر اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ آپ واپس جائیں تو اُنھیں میرا سلام کہہ دیں"۔
"یہ تو ہو ہی جائے گا۔ کیا آپ کو میں مس کہہ سکتا ہوں؟"

"کیا ہرج ہے۔ اب ولیم تو میری زندگی سے خارج... وہ کسی کیتھرائن کے پیچھے لگا ہے۔ اوّل نمبر کا بدمعاش نکلا... عورت کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے"۔
"ہر پہلی عورت کے پیچھے کیوں نہیں؟" میں نے... اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک بہت ہی ا... اس کے لبوں پر اُبھری اس کے دانت بہت ہی صاف شفاف... چہرہ اس کا بیضوی تھا۔ بال اس کے قدرے سرخ تھے۔
میں نے کھانا ختم کیا تو اتنے میں بیرا کافی لے کر گیا... سلیقے سے ایک پیالی میرے سامنے رکھی اور بولی "ویسے آپ... کس لیے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی ملازمت کرلی ہے آپ..."
"جی نہیں کچھ اور ہی قصہ ہے مس سافنر! پھر کسی وقت... گا میں آپ کو"۔
"میرا خیال ہے کہ...." وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور... پُچسکی لے کر خلا میں گھورنے لگی۔
"آپ کچھ کہہ رہی تھیں مس سافنر؟"
"اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو میرے ساتھ چلیں کچھ وقت... گزاریں۔ میں..... دراصل میں بہت زیادہ تنہائی محسوس کر...
"کوئی ہرج نہیں۔ مجھے کوئی خاص کام نہیں ہے" میں... کرتے ہوئے کہا اور بل دینے کے لیے ویٹر کو بلایا تو میں یہ دیکھ... گیا کہ سارا بل اُس نے خود ادا کر دیا ہے۔ رقم کُل سات ڈالر بنی تھی... زیادہ بڑی رقم نہیں تھی۔
"آئیے! میرا خیال ہے ہم پیدل چلتے ہیں۔ باہر موسم بہت...
"ہاں؟ یہ بہتر رہے گا" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ اُٹھنے لگ... نے دیکھا کہ میز کے پاس ایک چھوٹا سا بریف کیس رکھا تھا اور... یہ تھا کہ اُسے میں اُٹھاؤں۔ یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی... بڑے اطمینان سے وہ بریف کیس اُٹھالیا تو اس کے قدم بڑھ... کی طرف اُٹھ گئے۔ میں اس سے کوئی دو قدم پیچھے تھا۔
دروازے سے نکل کر اُس نے چاروں طرف بڑے غو... بائیں ہاتھ کے راستے پر چل دی۔ اب میں اس کے قریب ہو کر... وہ کچھ گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ پتا نہیں ایسی کیا بات تھی... میں مجھ سے بولی "ولیم نے میرے پیچھے سُراغرساں لگا رکھے ہیں... سے دس قدم دور رہ کر چلیں، تو زیادہ بہتر ہوگا" اس کا اند... مربیانہ تھا جیسے کوئی بڑی ہی وفا شعار خاتون بڑے اعتماد... اپنے شوہر سے کہہ رہی ہو۔
"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں" یہ کہہ کر میں... دس قدم آگے نکل گیا۔ میرا دھیان البتہ پیچھے ہی تھا۔ بریف کیس... ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اس سے...

چلنے لگا۔ ٹھہر ٹھہر کر رُک رُک کر میں اُسے دیکھ لیتا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ولیم نے اس کی زندگی میں ایک اور گہری نقب لگا رکھی تھی اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سافنر کے دن رات کیسے گزرتے ہیں۔ خود وہ نیویارک میں مزے سے رہ رہا تھا۔ سافنر بھی شاید اس کے اعتماد پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے پیچھے سُراغرساں لگانے پر مجبور ہوگیا تھا۔ یہ بہت عام سا اور بڑا ہی گھٹیا طریقہ تھا دوسروں کو ذلیل کرنے کا۔ میاں نہیں بیوی پسند نہیں ہے تو طلاق دے دو۔ ایک دو تین کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دو۔ کیا ضرورت ہے ایک دوسرے کی جاسوسی کرنے کی جس گاؤں نہیں جانا اس کا راستہ کیوں پوچھتے ہو؟ مگر یورپ اور امریکہ میں شاید یہ سب کچھ جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب ولیم صاحب طلاق کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسا ہی اگر سافنر بھی کرنے لگے تو کیا ہو۔ وہ بھی تو یہی کہتی تھی کہ ولیم نے کسی کیتھرائن کو ڈھونڈ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ خود اتنی محتاط تھی کہ ہوٹل سے مجھے اٹھا کر ساتھ تو لے جا رہی تھی مگر میرے ساتھ نہیں چل رہی تھی۔ اُسے سراغرساں کا خوف تھا۔ یہ تھی اُن لوگوں کی زندگی اور میں ایسا پاگل تھا کہ خواہ مخواہ ہی وہ اٹیچی کیس لے کر اُس کے ساتھ چل دیا تھا۔
اچانک سافنر کے قدموں کی چاپ مجھے اپنے قریب آتی محسوس ہوئی۔ اُسے دیکھنے کے لیے میں راستے کے ایک طرف ہو کر رُک گیا تو وہ میرے پاس سے گزرتی ہوئی سرگوشی کے انداز میں بولی "میرے پیچھے چلے آئیں۔ میں دس قدم آگے چلتی ہوں"۔
یہ کہہ کر وہ آگے نکل گئی۔ پہلی بار میں نے اس کے سراپا پر غور نظر ڈالی۔ اُسے اپنا کر یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ..... جہان کی دولت مل گئی ہے۔ یہ اس کے شوہر کی بدنصیبی تھی کہ وہ سافنر سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کی آواز میں ایسی غنائیت تھی کہ میں انگریزی لب و لہجے کا عادی نہ ہونے کے باوجود یہ چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔ ایسی ہی آواز میں نے لاہور میں بھی سُنی تھی مگر وہ آواز مجھے لے ڈوبی تھی اور اُن لوگوں نے بالآخر مجھے اغوا کر کے سان فرانسسکو پہنچا دیا تھا مگر سافنر کا تو اُن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو کسی اور ہی خمیر سے بنی ہوئی تھی۔
سافنر کوئی آدھ فرلانگ چلی ہوگی کہ وہ بائیں ہاتھ ایک گلی میں

مڑ گئی۔ میں اُس سے بھی کوئی دس قدم پیچھے تھا۔ دو عمارتوں کے سامنے سے گزر کر وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ اُس وقت رات کے دس ساڑھے دس بج چکے تھے۔ جیسے ہی میں اُس کے قریب پہنچا اُس نے اشارے سے مجھے ایک عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے کے لیے کہا اور خود ایسی بن گئی جیسے وہ مجھ سے قطعاً ناواقف ہو۔

سیڑھیاں زیادہ دور نہیں تھیں مگر جیسے ہی میں پہلے قدم پر پہنچا، ایک آدمی اچانک ہی میرے سامنے آ گیا۔

"ہے مسٹر! یہ بریف کیس مجھے دے دو، جلدی۔"

اس کی آواز میں عجیب طرح کا تحکم اور شتابی تھی۔ سافنر اس دیوار کے ساتھ کھڑی تھی اور میں اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس آدمی نے بائیں ہاتھ میں ایک خنجر تھام رکھا تھا۔ لگتا تھا وہ اس کو چلانے کا فن جانتا ہے۔ اس نے ایک دم مجھ سے بریف کیس جھپٹ لینے کی کوشش کی مگر اس کا اندازہ بالکل ہی غلط تھا۔ جیسے ہی اس نے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے اُس کی ٹانگ پر زبردست ٹھوکر لگائی۔ وہ الٹ کر سیڑھیوں پر لڑھک گیا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔ "بریف کیس اِدھر دے دو۔ ورنہ میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔"

مگر اس عرصے میں مَیں خود کو سنبھال چکا تھا۔ جیسے ہی وہ غرّاتا ہوا اٹھا میں نے پوری قوت سے بریف کیس اُس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ شاید اس حملے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر خنجر دائیں ہاتھ میں لے کر اس طرح میرے پہلو میں دھنسانا چاہا کہ میں دوسرا سانس نہیں لے سکتا تھا مگر میں ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ خنجر سمیت دیوار میں جا لگا۔ اس کی نیت کو سمجھ کر میں نے اس کی کلائی دائیں ہاتھ میں پکڑی اور اُسے پوری طرح بے بس کر دینے کے لیے میں نے اُس کی گردن پر بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ بریف کیس اس وقت سیڑھیوں پر پڑا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹا تو اُس کے ساتھ ہی اس کا وجود سنسان ہو گیا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ بے جان ہو کر سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا۔

اسی وقت سافنر سامنے آ گئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے سیڑھیاں چڑھی اور میرے قریب سے گزر کر آگے نکل گئی۔ ایک ہلکی سی سرگوشی مجھے سیڑھیوں میں سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میرے پیچھے آؤ۔ مگر فاصلہ دے کر۔"

وہ عجیب عورت تھی۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور وہ بھی محض اس بریف کیس کی وجہ سے مگر وہ اسے میرے ہاتھ سے لے لینے کے بجائے مسلسل مجھے ہدایات دیتی چلی جا رہی تھی اور میں اس بریف کیس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا یا وہ وقت ہی ایسا تھا کہ سیڑھیوں میں مجھے کوئی اور آدمی نہیں ملا۔ لوگ شاید ایسی ہی وارداتوں سے بچنے کے لیے

جلدی دروازے بند کر لیتے تھے۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا کی تیسری منزل پر جا پہنچا۔ وہ بائیں ہاتھ مڑی اور تیسرے پر رک کر قفل کھولنے لگی۔ میں اب بھی اس سے فاصلے پر کھڑا تھا نے مجھے مسحور کر رکھا تھا۔ میں کوئی اور بات سوچ ہی نہ سکا وہ بریف کیس اس کے حوالے کر کے مجھے راستے میں ہی الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ڈرتی تھی تو ڈرتی رہے مجھے کیا لینا تھا اُس سے مگر جس مجھ سے مخاطب ہوئی تھی اور جس اپنائیت کا اظہار وہ کر رہی اس شہر میں اتنا بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے میرے غیر متوقع تھا اور میں اسی لیے اس کے ساتھ چلا آیا تھا مگر اب بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک آدمی تو میرے ہاتھوں ابھی ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کی وجہ سے اور کیسے کیسے حادثے میری ہوں گے۔

دروازہ جلد ہی کُھل گیا اور اُس نے راہداری کے دونوں غور سے دیکھتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ غائب ہو گئی۔

چند لمحوں کی تاخیر کے بعد میں آگے بڑھا تو دروازہ دیا اور میں سیدھا اندر جا پہنچا۔ میرے سامنے ایک بہت کمرہ تھا۔ جس میں سے گزر کر اگلے حصے تک پہنچا جا سکتا تھا بائیں ہاتھ فرش پر نیلے رنگ کا قالین بچھا تھا۔ دروازے ہی آدمی چار فٹ کے ننگے فرش پر چل کر دوسرے کمروں تک سافنر مجھے اس کمرے میں نظر نہیں آئی مگر جیسے ہی طرف بڑھا، وہ سامنے کے دروازے میں سے پھر نمودار ہوئی

"آپ کا بہت بہت شکریہ مسٹر غیاث! آپ نہ ہوتے تو یہ بریف سے چھن گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب آ گئی اور بریف کیس لینے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

"نہیں مس سافنر! پہلے یہ بتائیں کہ یہ آدمی کون تھا مجھ پر حملہ کیا؟"

"وہ کوئی بدمعاش ہو گا۔ ایسے بہت سے لوگ یہاں آپ نے تو شاید اُسے مار ہی دیا ہے۔"

"اور اُسے مار دینے کا نتیجہ جانتی ہیں آپ؟"

"میں خود پریشان ہو گئی ہوں۔ آپ فوراً یہاں سے کارڈ ہے میرا، کل آپ سے کہیں بھی مل سکتی ہوں۔ کر لیں۔"

"مگر اس قتل کا کیا ہو گا؟"

"ہمیں کسی نے دیکھا نہیں ہے، یہ اچھی بات ہے۔ تو وہ خود دیکھ لے گی۔ آپ بہرحال ابھی چلے جائیں۔"

"جی نہیں مس سافنر! مجھے اس ڈرامے کا اگلا حصہ دیکھنا ہے۔ اس کی چابی ہو گی آپ کے پاس؟"

"کیا مطلب! کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں اسے کھول کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتا تو چلے کہ اس میں ہے کیا۔"

"نہیں نہیں! آپ اسے نہیں کھولیں گے۔ یہ غیر ضروری بات ہے۔ بریف کیس مجھے دے دیں۔"

اچانک مجھے اپنے عقب میں دروازہ کُھلنے کی آواز سنائی دی۔ دو آدمی تیزی سے اندر آ رہے تھے۔ میں دروازہ بھیڑ کر آ گیا تھا۔ اگر میں اندر آ کر کُنڈی لگا دیتا تو اُن کی دستک مجھے سنبھلنے کا موقع دے سکتی تھی مگر اُن کا انداز بڑا ہی جارحانہ تھا۔

"سافنر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بریف کیس ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہمیں دے دو اور یہاں سے نکل جاؤ۔" ایک آدمی نے اچانک پستول تانتے ہوئے کہا۔ میں نے بریف کیس کو اپنی ڈھال بنا لیا اب میرا رُخ اُن دونوں کی طرف تھا۔ وہ کوئی بہت ہی شُہدے قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں چیونگ گم کھا رہے تھے اور ایک کی ٹھوڑی پر مصنوعی تل عجیب انداز سے ہل رہا تھا۔ پستول اُس نے تان رکھا تھا۔ دوسرا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیسے وہ کسی چیونٹی کو دیکھ رہا ہو۔

"لاؤ، یہ بریف کیس اِدھر دے دو۔" اس نے بایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا اور آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "تمھارا بہت بہت شکریہ کہ تم اسے یہاں تک لے آئے۔ لاؤ۔"

"اگر میں انکار کر دوں تو؟" میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ میرا اپنا ہاتھ جیب تک جا پہنچا تھا۔ ینزر کا پستول مجھے سہارا دے رہا تھا۔

"تو گویا تم انکار بھی کر سکتے ہو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے سافنر؟" اس کی نظریں ابھی تک مجھ پر جمی تھیں۔

"میں خود حیران ہوں کفلر! اس نے ہیرل کو مار دیا ہے۔"

"اسے ہم دیکھ آئے ہیں۔ وہ مرا نہیں، بے ہوش ہوا ہے۔ اس کی فکر نہ کرو مگر یہ آدمی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم ہو کون بھئی! اگر اسے لے کر جا سکتے ہو تو دروازے سے نکل جاؤ۔ سیدھا جیل پہنچا دیں گے وہ تمھیں۔" یہ کہہ کر وہ میرا راستہ چھوڑ کر صوفے پر بڑے اطمینان سے جا بیٹھا۔ دوسرا آدمی بھی اس کے پیچھے تھا۔

"تم بھی بیٹھو سافنر! اس کا خیال ہے اس بریف کیس کو لے کر یہ بھاگ بھی سکتا ہے۔ شکر کرو، کسی پولیس والے کی تم پر نظر نہیں پڑ گئی۔ آؤ ادھر بیٹھو میرے سامنے۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"میں پاکستان سے آیا ہوں مگر میں خود نہیں آیا، لایا گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ لایا گیا ہوں! اس کے کیا معنی ہوئے؟" اُس نے یہ کہہ کر پائپ سلگا لیا۔ بریف کیس ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور اب وہ اس کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھے۔

"یہ خاصی لمبی بات ہے جنابِ کفلر! آپ ابھی اس بریف کیس کی بات کریں۔"

"کھول سکتے ہو تو کھول لو، باہر لے جا سکتے ہو تو لے جاؤ۔ ویسے ہم اس کے مالک ہیں۔ ہم نے ہوٹل میں اسے سافنر کے لیے میز کے پاس رکھ دیا تھا مگر اس کو یہ خود نہیں اُٹھا سکتی تھی کیونکہ اس پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے تمھیں یہ کام سونپ دیا۔ ہیرل تو احمق تھا۔ اس نے بہت جلدی کی۔ شاید اس کی اپنی نیت خراب ہو۔ کیوں سافنر یہی بات ہے نا؟"

"لگتا تو مجھے یہی ہے۔ ورنہ وہ اتنی تیزی نہ دکھاتا۔" اب سافنر بھی سامنے کے صوفے پر جا بیٹھی تھی اور بائیں ہاتھ لگے آئینے میں اپنی سُرخی کو اُجاگر کرنے لگی تھی۔ فلیٹ میں ہمارے سوا شاید کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا ورنہ وہ اب تک باہر آ چکا ہوتا۔ میں بھی اُن کے سامنے تیسرے صوفے پر جا بیٹھا مگر ابھی تک میں اس عذاب سے نجات نہیں پا سکا تھا جس کی وجہ سے میرا سارا بدن ٹھہر ٹھہر کر لرز تا تھا۔ کفلر نے پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔ پتا نہیں اس کی وجہ کیا تھی۔

"تم یوں کرو، اسے کچھ مزدوری دے دو تاکہ یہ چلتا بنے۔" کفلر نے کہا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"مگر یہ تو بریف کیس کھولنے کا کہہ رہا ہے۔"

"ہوں۔ آخر قصہ کیا ہے ماسٹر؟ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس بریف کیس میں ہے کیا جس کی وجہ سے سافنر نے مجھ سے جھوٹ بولا اور....."

"جھوٹ اس نے کچھ نہیں بولا۔ اس میں ہیرے ہیں اور یہ ایک صرّاف کی دُکان سے چُرائے گئے ہیں۔ لاؤ میں اسے کھولتا ہوں۔" اس نے جیب سے چابی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

"لاؤ میں اسے خود کھولتا ہوں۔ یہ چابی مجھے دے دو۔" میں اب بھی اُس پر اعتبار نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بریف کیس ہاتھ لگتے ہی وہ نو دو گیارہ ہو جائیں گے اور میں بس ٹاپتا ہی رہ جاؤں گا مگر حیران کن بات یہ ہوئی کہ اس نے چابی میری طرف پھینک دی۔

"لو اسے تم ہی کھول لو۔" یہ کہہ کر اس نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ چیونگ گم پر اُس کے دانت ابھی تک چل رہے تھے۔ وہ تینوں بہت زیادہ چوکنے نظر آ رہے تھے۔ سافنر کا تو شاید کلیجہ ہی حلق تک آ گیا تھا۔ اس کی وہ بڑی بڑی گہری نیلی آنکھیں اور زیادہ کُھل گئی تھیں۔ میں نے چابی بریف کیس میں گھمائی تو اس کا ایک تالا کُھل گیا۔ اس پر سافنر ایک دم میرے قریب آ گئی۔

اُس کی طرف کوئی دھیان دیے بغیر میں نے بریف کیس کا دُہرا تالا

کھول کر اُسے قالین پر رکھ دیا۔ اس اثنا میں کفلر بھی سافنر کے پاس آ بیٹھا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے اپنا پستول پھر نکال لیا تھا۔ میں نے بریف کیس کا ڈھکنا کھول دیا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ بریف کیس میں بہار آئی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی چکا چوند سی میری نگاہوں میں بھر گئی۔ وہ ہیرے تھے، سچّے اور کھرے، ہیرے جو بڑی احتیاط سے ایک شیشے کے پیکٹ میں رکھے تھے۔ اُس کے ساتھ شیشے کا ایک اور پیکٹ بھی تھا۔ اس میں بہت ہی خوبصورت زیورات موجود تھے۔ دونوں پیکٹ الگ الگ کسے تھے اور اُن پر سان فرانسسکو کے ویلکم جیولرز، کا نام لکھا تھا اور وہ بھی کسی بہت ہی چمکیلی دھات سے۔

کفلر نے دونوں پیکٹ اٹھا لیے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک پیدا ہو گئی تھی۔ سافنر بھی خوشی سے نڈھال ہو گئی تھی۔

"دیکھ لیا تم نے، یہ صرف ہیرے ہیں۔ تمھارا کیا خیال تھا؟"

"میں یہ سمجھتا تھا کہ اس میں ہیروئن ہو گی۔"

"تمھارا خیال غلط تھا۔ ہم ایسے سودے نہیں کرتے ہیں۔ یہ لو، یہ دو سو ڈالر ہیں۔ یہ تمھاری مزدوری ہے۔"

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مال تمھیں مبارک ہو۔ میں جا رہا ہوں۔"

"یُوں نہیں بیٹے! ایسے کیسے جا سکتے ہو تم۔ ہمیں پاگل سمجھا ہے تم نے۔ یہاں سے تم سیدھے کسی پولیس اسٹیشن فون کر سکتے ہو۔" کفلر نے پستول کا رُخ میری طرف پھیر دیا۔

"بے فکر رہو، ایسا نہیں ہو گا۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ پاکستان میں شاید میرا دھندا یہی تھا مگر اس سے ذرا مختلف۔ اچھا مس سافنر! آپ سے شاید اب تو کبھی ملاقات نہ ہو سکے۔" اس اثنا میں سافنر نے بریف کیس بند کر دیا تھا اور وہ اُسے ہاتھ میں لے کر اٹھ گئی تھی۔

"ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے ہیں بیٹے! ادھر بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم نے ہیرل کو کیا دیا ہے۔ وہ بالکل بے ہوش ہو گیا تھا اور اب اسپتال جا چکا ہو گا۔"

"کچھ نہ کچھ کیا ضرور ہے تم نے۔ کہاں رہتے ہو؟"

"مجھے خود پتا نہیں! مجھے ایک شخص نے شدید بیمار ظاہر کر کے پاکستان سے یہاں پہنچا دیا ہے اور میں کسی چیرٹی اسپتال میں پڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے یہ دن کیسے گزرے ہیں۔ انھوں نے مجھے مسلسل بے ہوش رکھا پھر مجھے انھوں نے ہیروئن کا عادی بنا دیا۔ اب بھی میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ جو کپکپی سی دیکھتے ہو نا یہ اسی وجہ سے ہے۔" میں نے اُس کے پستول کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ یہ بات اس کے لیے بہت ہی حیران کن تھی۔ اس ہتھیار کے سامنے تو بڑے بڑوں کے پتّے پانی ہو جاتے تھے مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ نہ میرے چہرے کا رنگ بدلا اور نہ میری زبان میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی

"کس نے تمھیں یہاں پہنچایا ہے؟"

"اس کا نام ڈاکٹر دھمن ہے، ڈاکٹر دھمن۔ مجھے اُس کے گرگے ... پہنچایا گیا ہے۔ اس نے یہاں کوئی اسپتال کھول رکھا ہے۔"

"ڈومن! یہ کون ہو سکتا ہے سافنر؟ کبھی نام سنا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے اس کا۔"

"چیرٹی اسپتال کھول رکھا ہے اس نے اور وہ پاکستان ... ہوں! یہ قصہ کیا ہے سافنر! ہم تمھاری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ ... آدمی نظر آتے ہو۔"

"میں کیا کہوں کفلر! مجھے بھی تم ایسے لوگ بہت پسند ہیں ... میرے دوست بن سکتے۔"

"تم مجھے اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔ ایک بڑی مشکل سے ... نکال لیا ہے ورنہ ہم ان ہیروں کے مالک نہیں بن سکتے تھے۔ ... بڑی مشکلات حائل تھیں۔ دو بار سافنر کو روکا گیا مگر یہ بریف ... لے کر ہوٹل جا پہنچی اور پھر تم نے ہماری مشکل آسان کر دی۔ ... دوست ہی سمجھو۔ اب یہ پستول تم پر کبھی نہیں اُٹھے گا۔ تم سے یہ ..." یہ کہہ کر اس نے پستول جیب میں ڈال لیا۔

"ویسے میں بہت حیران ہوں، تم اس سے قطعاً خوفزدہ نہیں ... یہ کیسے ممکن ہے! اسے دیکھ کر تو لوگ راستہ بھول جاتے ہیں۔ کفلر ... ہی تو مشہور ہے۔ میں شارپ شوٹروں کا باپ ہوں۔" یہ کہہ کر ... الماری میں سے شراب کی بوتل نکال لی۔ بولا "مجھے اطمینان ... بات بتاؤ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیا دشمنی تھی ... ساتھ؟" گلاس میں اُس نے سوڈا ملایا اور اُسے سافنر کے سامنے ... دوسرا گلاس اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے بڑے اختصار کے ساتھ اُسے اپنے بارے میں ... بتائیں۔ جن سے یہ ظاہر ہو سکے کہ دشمن میرا بہت پرانا ...

"ہوں! میرا خیال ہے تم کچھ دن ادھر ہی رہو۔ ہم ڈومن ... میں معلوم کریں گے۔ پھر شاید تمھارے لیے ہم کچھ کر سکیں۔ ... ہے سافنر؟"

"جیسے تمھاری مرضی! پہلے تم ان ہیروں کو ٹھکانے لگا ... کی نیت نیک نہیں تھی۔ ورنہ وہ راستے میں اس سے بریف کیس ..."

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں مگر وہ پولیس کو کچھ نہیں بتائے ... ہنری کی گاڑی میں اُسے اسپتال بھیج دیا ہے۔"

"وہ آئے گا تو پھر فساد ڈالے گا۔"

"اُس کی نیت کو میں سمجھ گیا ہوں مگر اُسے صرف ... ملے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کل صبح ہم یہ ہیرے بیچ دیں گے ... کر لیں گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ یہ دونوں پیکٹ اب ہیرے ... گے۔ کل میں بارہ بجے یہاں آؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سافنر ...

لیا اور دونوں پیکٹ نکال کر جیب میں ڈال لیے پھر وہ دونوں ہمیں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل گئے۔ سافنر نے بھی اُسے نکل جانے دیا۔ میرا خیال ہے اُسے اُن دونوں پر بہت اعتماد تھا۔ ورنہ وہ اُن کے قدم روکتی۔ وہ باہر نکلے تو سافنر بولی: "کفلر کہہ گیا ہے کہ تم ادھر ہی رہو گے مگر یہ بتاؤ تمھیں پسند بھی ہے کہ نہیں؟"

"میں کیا کہوں۔ یہ بات تو آپ ہی سمجھ سکتی ہیں کہ مجھے یہاں ٹھہرنا چاہیے کہ نہیں۔ ویسے میرا ٹھکانہ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم ادھر پہلو کے کمرے میں لیٹ جاؤ۔ ضرورت کی ساری چیزیں وہاں موجود ہیں۔ آؤ میں تمھیں کمرہ دکھا دوں۔" یہ کہہ کر وہ بڑی متانت سے میرے ساتھ دوسرے کمرے میں گئی۔ پلنگ پر صاف ستھری چادر بچھی تھی اور کمبل پائنتی رکھا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ کمرہ میری ضرورت کے لیے بہت کافی تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ مس سافنر! آپ کی یہ مہربانی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔"

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو ابھی بتا دو۔ میں دوبارہ نہیں آ سکوں گی۔"

"اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو بیٹھ جائیں۔ آپ سے بات کر کے مجھے خوشی ہو گی مس سافنر!"

"کام تو کوئی نہیں ہے مجھے! کھانا بھی میں کھا آئی تھی۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور میز پر رکھے ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔

"اس کمرے میں کون سوتا ہے؟"

"یہ کفلر وغیرہ آ جاتے ہیں تو یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ ورنہ تو یہ کمرہ خالی ہی رہتا ہے۔"

"آپ نے مجھے اپنے شوہر کی بات بتائی تھی، کیا وہ سچ تھی؟"

"ہاں! بالکل سچ تھی۔ تمھیں شبہ ہے کوئی؟"

"پھر یہ ہیروں کی چوری اور یہ کفلر؟"

"ہاں۔ مجھے یہاں آئے چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ کام میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ ایک دن میری ملاقات کفلر سے ہو گئی۔ اس نے مجھے کچھ ایسا سبق پڑھایا کہ میں اس کے اشاروں پر چلنے لگی۔ مجبوری تھی۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ میری ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ اب تک تو اس نے مجھ سے کئی کام کروا لیے ہیں۔"

"آپ ان لوگوں کے ساتھ کیسے شامل ہو گئیں؟"

"بس ایسے ہی۔ ایک جگہ سے میں نے تھوڑی سی شاپ لفٹنگ کی تھی۔ ایک میوزیم ہے یہاں، ریڈ میوزیم۔ وہاں ایک چھوٹا سا بدھ کا مجسمہ مجھے بہت پسند تھا۔ وہ سونے کا بنا ہوا تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر میں نے اُسے اُڑا لیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ کفلر نے میری یہ حرکت دیکھ لی۔ جب میں میوزیم سے باہر نکلی تو یہ بھی میرے تعاقب میں تھا۔ میں ریستوران میں گھسی تو یہ بھی وہاں آ گیا اور اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ بس وہ دن گیا اور یہ آیا، میں اس سے اپنی جان نہیں چھڑا سکی۔"

"اور وہ بُت؟"

"وہ ہم نے پگھلا کر بیچ ڈالا۔ ہمیں دس ہزار ڈالر ملے۔ وہ ہم نے آدھے آدھے بانٹ لیے۔"

"اور یہ ہیرے؟"

"یہ دراصل براڈوے کے قریب ایک جیولر ہے اس کی دکان سے میں نے چرائے ہیں۔ یہ تینوں آدمی نگرانی پر مامور تھے۔ یہ ہیرل، کفلر اور گیٹار۔ وہ آدمی جو بے ہوش ہو گیا تھا، اس پر کفلر بہت اعتماد کرتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔"

"آپ نے یہ ہیرے کیسے چرا لیے؟ وہ تو بڑی زبردست نگرانی کرتے ہیں۔"

"نگرانی تو ہوتی ہی ہے، بس یہ میرے ہاتھ کا کمال ہے۔ دراصل مسٹر غیاث! بات یہ ہے کہ ہم نے ان ہیروں کے بدلے میں مصنوعی ہیرے خرید لیے تھے۔ اُن کا وہاں شوکیس میں رکھنا ہی اصل کام تھا۔ سو وہ میں نے آج شام بڑی چابکدستی سے کر دیا اور یہ ہیرے ہمارے ہو گئے۔"

"مگر وہاں سے نکلنے کے بعد آپ ہوٹل کیسے پہنچیں؟"

"اس کی الگ کہانی ہے۔ راستے میں دو بار ہمارے حریفوں نے ہمارا راستہ روکا۔ ایک جگہ وہ زنانہ پولیس کے روپ میں تھے۔ دوسری جگہ وہ براہِ راست اس معاملے میں کود گئے مگر کفلر نے دونوں دفعہ مجھے بچا لیا۔ جب بریف کیس میں نے آپ کو دیا تو اس وقت بھی کفلر اور گیٹار آپ کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہیرل اُن میں سب سے آگے تھا۔"

"گویا کسی اور کو بھی ان ہیروں کا علم تھا؟"

"جی ہاں۔ اُس کا نام انتھونی ہے اور وہ کفلر کا کاروباری حریف ہے۔ ان ہیروں پر اس کی بھی نظر تھی مگر ہم انھیں لے اُڑے۔ اسی لیے وہ بہت زیادہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شاید وہ پھر کوئی حرکت کرے۔ ان ہیروں کی قیمت کم از کم چالیس ہزار ڈالر تو ضرور ہی ہو گی۔ وہ زیور بھی بیس ہزار ڈالر میں بک جائے گا۔" اب مجھے نیند آنے لگی تھی اور وہ محسوس کر کے باہر نکل گئی۔

پتا نہیں وہ کون سا وقت تھا۔ نیند بہرحال میں خاصی لے چکا تھا کہ اچانک مجھے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں اس وقت سینر کے زیر جاموں میں ملبوس تھا اور وہ ایسے تھے کہ گرم بنیان اور ٹانگوں پر چڑھا ایک گرم غلاف۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی میں نے جوتوں میں پیر پھنسائے اور پستول ہاتھ میں لے کر میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت تک سافنر بھی جاگ چکی تھی اور اپنا شب خوابی

کا گاؤن درست کرتی ہوئی وہ عقبی دروازے میں آ ٹھہری تھی۔

گھنٹی چند لمحوں بعد پھر بجی۔ سافنز کا رنگ اڑنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھی اور سرگوشی میں بولی ”دروازہ مت کھولنا پتا نہیں باہر کون ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے اس وقت! رات کے تین بج رہے ہیں۔“ میں نے میز کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ کمرے کی فضا میں سبز رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سافنز کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی تھی۔ اُس کے وسوسے شاید حقیقت کا روپ اختیار کر گئے تھے۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ باہر انتھونی کھڑا ہے اور وہ اُن ہیروں کی تلاش میں آیا ہے جو اب کفلر کے پاس تھے۔ سافنز اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”سافنز دروازہ کھولو میں روزالی ہوں۔“

” یہ آواز سنتے ہی سافنز دروازے کی طرف لپکی اور اُس نے تڑپ کر چٹخنی کھول دی۔ سامنے ایک معمر عورت کھڑی تھی۔ وہ بُری طرح کھانس رہی تھی۔ ایک کمبل اُس نے اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ مگر ابھی سافنز نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے عزالی کو زوردار دھکا دے کر کمرے کے اندر گرا دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبا تڑنگا آدمی ایک دم سافنز کو دھکیل کر آگے بڑھ آیا۔ میں اس وقت دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔

اس آدمی نے سافنز کو پستول کی زد میں لے کر پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کیا اور غضب ناک آواز میں بولا ”خبردار! اگر تم نے شور مچایا تو جان سے مار دوں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے قالین پر گری بڑھیا کی کمر پر ٹھوکر مار کر اُسے اور آگے دھکیل دیا۔ ابھی تک وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے ایک دم سافنز کو بالوں سے پکڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا اور بڑے ہی قہر آلود انداز سے اس نے پستول مجھ پر تان لیا، بولا ”اچھا! تو وہ مال تمھارے پاس تھا۔ کمال ہے میں ہی نہ سمجھ سکا۔“ اُس کی یہ بات سنتے ہی سافنز نے سر کو جھٹکا دے کر گردن کے پچھلے حصے سے کچھ اس طرح اس کی ناک پر ضرب لگائی کہ اُس کی ایک دم نکسیر پھوٹ نکلی۔ اس پر اُس آدمی نے اندھے بھینسے کی طرح بائیں ہاتھ سے سافنز کو ہوا میں اُچھال کر میری طرف پھینک دیا اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے دو ہاتھ اوپر اُچھل کر پوری قوت سے میرے پیٹ پر پاؤں کی ضرب لگائی۔ میرا یہ حال تھا کہ میں پستول کا سیفٹی کیچ ہی نہ کھول سکا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں بے کار کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ آدمی کا اعتماد اُسے کبھی کبھی بالکل ہی لے ڈوبتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں اُس کی ضرب سے دُہرا ہو کر قالین پر گر گیا۔ اس نے اسی پر ہی بس نہیں کی، میں نیچے گرا تو اُس نے میری گردن پر اپنا بوٹ رکھ کر مجھے رگیدنا شروع کر دیا۔

میرے جسم میں ابھی تک وہ پہلی سی توانائی پیدا نہیں ہوئی مجھے بہت ناز تھا۔ اُس نے اپنا دوسرا پاؤں میرے پیٹ دیا۔ اب وہ مجھے بالکل ہی بے دم کر دینا چاہتا تھا۔ مگر جیسے نے میرے پیٹ پر دباؤ ڈالا، اُس کا پہلا پاؤں جو میری گردن نرم ہونے لگا۔ میں نے فوراً ہی اُس کا پاؤں ہاتھ میں ایک دم گھما دیا۔ اُس کی ٹانگ دُہری ہوئی تو اُس کا دوسرا پیٹ سے اُتر گیا مگر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دیوار سے جا لگا۔ مگر اب اُس کا پستول میرے سینے کے گیا تھا اور لبلبی پر اس کی انگلی سکڑنے لگی تھی۔

وہ بڑے ہی غضب ناک لہجے میں بولا ”میرا پاؤں چھو کتے! ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔“ مگر ابھی یہ لفظ اُس میں ہی تھے کہ کسی طرف سے سافنز نے بلا اٹھا کر اس کی دے مارا۔ یہ ضرب اس کے لیے بہت کافی تھی۔ اس کا کے ساتھ لگا اور وہ نیچے چلا گیا۔ اُسی حالت میں اس نے سے گولی داغ دی۔ اُس کے پستول میں سائلنسر لگا ہوا ایسی آواز پیدا ہوئی مگر اُسی لمحے میں نے ایک دم اس کی دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیوار کی طرف موڑ دی۔ وہ تڑپ کر ہٹا۔ اب وہ سیدھا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر وہ اپنی کلائی سکا۔ میں نے پیر کالے خاں کی دعا کا اثر دیکھا۔ اُس کی کلائی جو دیا تو اس کا جوڑ اُکھڑ گیا اور پستول اُس کے ہاتھ سے نیچے وہ ایک زبردست چیخ مار کر کلائی کو زانوؤں میں دے کر دہرا ساتھ ڈھے گیا۔ اب وہ بار بار ہاتھ کو زانوؤں سے نکال کر تھا جو اَب کلائی پر جھولنے لگا تھا۔ درد نے اُسے نڈھال کر اس کا پستول دروازے کے پاس جا پڑا تھا۔ جسے میں نے اٹھا لیا۔ اس پر واقعی سائلنسر لگا ہوا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں ایسا تھا مگر جسم کے لحاظ سے وہ کوئی چھوٹا سا کھلونا نظر آتا اس سے وہ شخص بڑے کام لے رہا تھا۔ راتوں کو دوسروں کے کھلوا کر بے دریغ نقب لگاتا تھا اور رہتے لوگوں کو بد سے گزار دیتا تھا۔ اس کا چہرہ یہی بتاتا تھا۔ اس کے والد سے کوئی غالباً نیگرو رہا ہو گا۔ اس کا رنگ گورا ہرگز نہیں بڑی اور موٹی، سر کے بال بہت گھنے اور سیاہ دہانہ تنگ گوریلے کی عکاسی کرتا تھا۔

”ہاں ماسٹر اب بتا، کیا کام ہے تمھیں سافنز سے! اور بڑھیا کو کیوں پریشان کیا ہے تم نے؟“

”اوہ میرا ہاتھ، یہ کیا کر دیا تم نے۔ تم نے میرا جوڑ ہے بدبخت۔“ وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔

”ہاتھ کا خیال چھوڑ دے اُستاد اور یہ بتا کہ تو آیا

نیرا نام انتھونی ہے؟“

”نہیں نہیں، مَیں انتھونی نہیں ہوں۔ میں لانسر ہوں۔ گریگ لانسر۔ کوئی پٹی دے دو مجھے۔ اوہ، میں پاگل ہو جاؤں گا اس درد سے۔“ وہ پھر چیخا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے آنسو بہ نکلے تھے۔ شاید درد حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ سافنز اب تک بلا ہاتھ میں لیے اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ سامنے قالین پر بڑھیا کھاؤں کھاؤں کھانس رہی تھی۔

”یہ معاملہ کیا ہے بی بی۔ تمھیں یہ سافنز کے دروازے پر کیسے لے آیا؟“

”یہ.... یہ کتے کا پلا تھوڑی دیر پہلے ... کھاؤں، کھاؤں میرے دروازے پر آیا اور اس نے مجھے جھپٹ لیا اور کہنے لگا ’ذرا سافنز کو جگا دو۔ میں اس کے سامنے گیا تو وہ ناراض ہو گی‘ اور یہ کہہ کر اس نے پستول مجھ پر تان لیا۔ میں خوف زدہ ہو کر اس کے ساتھ آ گئی۔ اس نے مجھے دھمکایا کہ اگر میں نے سافنز کو آواز نہ دی تو یہ مجھے جان سے مار دے گا۔ مجھے افسوس ہے بیٹی کہ میری وجہ سے یہ چوہا اندر آ گیا۔ مجھے بہت افسوس ہے سافنز... کھاؤں کھاؤں کھس۔“ بڑھیا برابر کھانستی جا رہی تھی۔

میرے پستول کا رُخ اب تک لانسر کی طرف تھا اور اُسے معلوم تھا کہ وہ آدمی جس نے اُس کی کلائی توڑ ڈالی تھی، اگر کچھ کرنے پر آ گیا تو وہ کیا نہیں کر سکتا ہے۔ وہ باوجود اتنے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے اندر سے بہت ہی بزدل آدمی نکلا۔ یہاں تک کہ درد سے گھبرا کر اس کے آنسو بہ نکلے تھے۔ شاید اس نے درد کبھی سہا ہی نہیں تھا۔

”اُٹھیں بی بی! ان کو آپ ان کے دروازے تک پہنچا دیں مس سافنز! یہ خواہ مخواہ پریشان ہو گئی ہیں۔“ میں نے روزالی کو نہایت ادب سے قالین پر سے اٹھا کر کھڑا کیا اور اس کا کمبل میں نے اس کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا مگر میرے پستول کا اور میری نظر کا رُخ اب بھی لانسر کی طرف تھا۔ میں اُسے کوئی اور حرکت کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے وہ کوئی اور بدتمیزی کر سکتا۔ ”جائیں مس سافنز! ان کی مدد کریں۔“

”ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آئیں مدر، آئیں۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع کر دوں گی۔ آپ ابھی اس کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ ورنہ آپ کہاں شہادتیں دیتی پھریں گی۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ روزالی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”اٹھو لانسر! اُدھر کرسی پر بیٹھو میرے یار! تم تو خواہ مخواہ ڈر گئے ہو، وہ انتھونی سُنے گا تو کیا کہے گا تمھارے بارے میں۔“ میں نے بائیں ہاتھ سے لانسر کو کندھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم میری کلائی کے بارے میں کچھ کرو۔ خدا کے لیے مجھے اسپتال لے چلو۔“ وہ ابھی تک اپنے جھولتے ہوئے ہاتھ کے سلسلے میں پریشان تھا جسے اس نے بائیں ہاتھ سے اس طرح پکڑ لیا تھا جیسے کوئی نیم جاں مچھلی کو پکڑ کر رکھتا ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے صوفے کی طرف بڑھا اور دھم سے وہاں جا گرا۔ دھیان اس کا اب بھی ہاتھ کی طرف تھا۔

”کوئی پانی شانی، کوئی شراب شروب؟ میں کیا پیش کروں تمھیں اس وقت؟ رات کے ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ تم اس وقت کیا کیا کرتے ہو مسٹر لانسر؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس کی حالت پر مجھے ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ ذلیل آدمی نے ایسے وقت میں ہمیں پریشان کیا تھا کہ پرندے بھی اس لمحے نیند سے بیدار ہونا پسند نہیں کرتے۔

”اب کیا حال ہے تمھارا مسٹر لانسر؟“ میں نے اس کے اُکھڑے ہوئے ہاتھ کو ذرا سا ہلا کر پوچھا۔ وہ درد سے بے حال ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا اور کس گدھے نے اُسے کہا تھا کہ وہ اس پیشے میں قدم ڈال دے جس میں چاقو، خنجر، برچھی، گولی کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ پیشہ کم حوصلے کے لوگوں کے لیے تو ہے ہی نہیں۔ مگر گریگ لانسر اس پیشے میں قدم رکھ کر اب کچھ کر دکھانے کی آرزو میں مرا جا رہا تھا اور اس رات اُس نے سافنز کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ مجھے بھی پہچانتا تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل سے نکلتے دیکھ لیا تھا مگر وہ سمجھا تھا کہ میں کوئی یونہی سا اجنبی ہوں۔ ایک بریف کیس میرے ہاتھ میں جھول رہا تھا اور وہ اسی کی تلاش میں تھا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ وہی بریف کیس ہے جس کا وہ متلاشی ہے۔ جب اُس نے مجھے سافنز کے کمرے میں دیکھا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا اور اُس نے کہہ ہی دیا کہ ”اچھا تو یہ تم تھے، میں ہی تمھیں نہ سمجھ سکا۔“ اور وہ شخص اب لٹکتے ہوئے ہاتھ کے بارے میں اتنا فکرمند تھا کہ جب میں نے پوچھا کہ اب اس کا کیا حال ہے تو وہ درد سے نڈھال ہو کر بولا ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے گولی مار دو۔ اس درد سے تو مر جانا اچھا ہے۔“

”فکر نہ کرو، یہ درد جلدی ختم ہو جائے گا۔ جوڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے اسے لٹکائے رکھو گے تو یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا، یوں۔“ میں نے بایاں ہاتھ ہوا میں ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ اور لٹک گیا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس بتیس سال ہو گی۔ اس نے سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔

”کیا وہ انتھونی تمھارے ساتھ ہے؟“

”نہیں وہ بنگال لانسر میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“

"یہ ایک ریستوران ہے۔ دن رات کھلا رہتا ہے۔ اُف! یہ درد مجھے مار ڈالے گا۔ کوئی دوا ہی دے دو۔"

اتنے میں فلیٹ کا دروازہ پھر کھلا اور سافز واپس آ گئی۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے کوئی چادر بھی نہ اوڑھ سکی تھی۔ آتے ہی اُس نے میرے کمرے میں جا کر ایک گاؤن زیب تن کیا اور پھر میرے قریب آ ٹھہری۔ بولی "میں رونالی کو اس کے فلیٹ میں چھوڑ آئی ہوں۔ بے چاری نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ اس ظالم انسان نے اسے بہت مارا ہے۔ مارو اس کتے کے بچے کو۔ اس کی آنکھیں نکال لو۔" سافز نے بلّا پھر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اگر اس کے سر میں دے مارتی تو اس کا مغز پھٹ جاتا۔ اس بلّے کو دیکھ کر لانسر خوف زدہ ہو کر اور زیادہ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ سافز اس پر پھر ہاتھ اٹھائے گی۔

"مس سافز! آپ اس کے ہاتھ پر کوئی دوا لگا دیں۔ بے چارہ بہت تڑپ رہا ہے۔"

"مرنے دو اسے! کوئی دوا نہیں ہے میرے پاس۔ پولیس کو فون کرو، وہ اسے لے جائیں گے۔ پوچھو اس سے کہ یہ آیا کس لیے ہے۔"

"مجھے انتھونی نے بھیجا ہے۔ اُسے ہیروں کی تلاش ہے۔ جنھیں تم لے آئی ہو۔"

"اُس کا کیا زور ہے ان پر؟ کیا حق ہے اس کا ان ہیروں پر؟ میں نے وہ ہیرے کفلر کو دے دیے ہیں۔ جاؤ کہہ دو اس سے کہ وہ کفلر کے پاس ہیں اور انتھونی سے کہہ دینا کہ اپنا سر بچا کر رکھے ورنہ اس میں سے کوئی گولی گزار دے گا۔"

"تو پھر میں جاؤں مس سافز؟"

"ہاں جاؤ۔ اور اُسے اپنا یہ ہاتھ بھی دکھا دینا۔ کہہ دینا کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر چلے۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ مسٹر گے ایث اب میری حفاظت کر رہے ہیں۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔" یہ کہہ کر اس نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ اور جیسے ہی لانسر اس کے پاس سے گزرا، سافز نے تیے سے اُسے دھکیل کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر کے وہ میری طرف بڑھی۔

"اوہ گے ایث، تم نے کمال کر دیا ہے۔ ایسے بے مثل آدمی ہو تم۔ مجھے تم پر فخر ہے، ناز ہے۔" اس کا یہ انداز وارفتگی دیکھ کر میں شرمندہ سا ہو گیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر میں نے کمبل اوڑھ لیا۔

وہ فوراً ہی میرے پیچھے لپکی اور کمرے میں قدم رکھ کر بولی۔ "میں ... مجھے تم پر فخر ہے گے ایث! تم نے مجھے ایک بہت بڑے عذاب سے بچا لیا ہے۔ میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"سمجھیں شکریہ ادا ہو گیا ہے۔ اب آپ آرام کریں۔ ہے اب وہ دوبارہ ادھر نہیں آئیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی! کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے تمہاری آواز کی منتظر رہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف ...

یہ عجیب اتفاق تھا کہ امریکہ میں میری پہلی مڈبھیڑ جرائم پیشہ لوگوں سے ہو رہی تھی جن کا کام ہی دوسروں پر عیش اُڑانا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ نہ دن دیکھتے نہ رات۔

سیزر کا پستول میں نے کھول کر دیکھا۔ معلوم ہوا کا کٹھکا کچھ ایسی فن کاری مانگتا تھا کہ میں اس دار و گیر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ تھا وہ پستول بالکل کھرا، کا سیفٹی کیچ کھولنے کے لیے ایک بٹن دبانا پڑتا تھا۔ وہ میں نہیں آیا تھا۔ اس وقت گریگ لانسر کی گولی مجھے لگ ہوتی۔ پھر بھی بڑی بچت ہو گئی اور اس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا کم تھا مگر سوال یہ تھا کہ آخر میں کس فساد میں گھر ہوں؟ سیزر کے چکر سے نکل کر میں سافز کے ہتھے چڑھ گیا۔ اگرچہ یہ میری بہت پرانی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر دھمن کو کسی طرح نیست و نابود کر دوں۔ یہ شاید اس خواہش کا اثر تھا کہ میں امریکہ جا پہنچا تھا مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ میں ... ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گیا تھا اور اب مجھے کچھ اور ہی ... لگے تھے اور وہ بھی ایسے لوگ جن کا کام ہی چوری چکاری ... پتا نہیں وہ کس جیولر کا بیڑا غرق کر آئے تھے۔ ہیرے کفلر کے پاس تھے مگر انتھونی اور لانسر خواہ مخواہ ہی اس میں ... رہے تھے۔ اور میں پاکستان میں بھی اپنے پیچھے ایک عذاب ... تھا۔ اُن کے لیے جو میری وجہ سے جیل کی سختیاں سہہ ... میں اُن کے لیے بالکل ہی بے کار ہو کر رہ گیا تھا۔ اُن کی ... مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اور حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ ... ہوا میں معلق کر دیا تھا۔ نہ میں زمین کا رہ گیا تھا، نہ آسمان ...

میں بستر پر پڑا صبح تک اس صورتِ حال پر غور کر ... مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرا بدن اُس آزمائش سے نکل ... جو مجھے وہ کیپسول نہ ملنے کی وجہ سے جھیلنا پڑ رہی تھی ... زیادہ بہتر طور پر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا ... اب اتنی زیادہ کھنچی ہوئی نہیں تھیں۔ سر کا درد بھی ختم ہو چکا ... اپنے وجود پر اعتبار آنے لگا تھا۔ وہ نقاہت جو مجھے ... سے پہلے محسوس ہو رہی تھی، اس پر میں غالب آتا جا رہا ... اچھی علامت تھی۔

اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے کہ میں بستر سے اُٹھ گیا اور سیدھا غسل خانے میں جا گھسا۔ سافز نے ہر شے وہاں بہت قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں نہانے کا ایک ٹب بھی موجود تھا۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک اس ٹب میں بیٹھ کر مَل مَل کر نہاتا رہا۔ میری صحت عود کر آئی تھی اور میں دل میں اب پہلی سی ترنگ اور امنگ محسوس کر رہا تھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یوں میں حالات کا غلام بنا رہا، یوں لوگ میرے ساتھ کھیلتے رہے تو ایک نہ ایک دن وہ مجھے تباہ کر دیں گے۔ مجھے سارے معاملات کو خود اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ ایک نئے ارادے سے ... کار بھی نہیں تھا۔ ورنہ یہ شہر مجھے خرابی کے سوا کچھ بھی نہ دے سکے گا۔

نہا کر جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو اس وقت تک سافز بھی بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے چائے تیار کر لی تھی اور بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ جب میں سیزر کا لباس پہن کر اور خوشبو کی ایک شیشی اپنے اوپر انڈیل کر اس کے سامنے پہنچا تو وہ چہکنے لگی۔

"ہے! آپ کی تو کایا پلٹ گئی ہے مسٹر گے ایث! کیا پی لیا ہے آپ نے صبح صبح؟"

"کیا مطلب! ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کھا پی سکا ہوں۔"

"مجھے حیرت ہے۔ آپ کا رنگ نکھر آیا ہے۔ بیٹھیں چائے پئیں، یہ لیں۔" اس نے ایک کپ میری طرف بڑھا دیا اور خود اُٹھ کر صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپ کے ہاں ٹیلی فون ہے؟"

"جی ہاں! کیا کریں گے ٹیلی فون کا؟"

"میں ڈاکٹر دھمن کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کفلر ابھی آ جائے گا۔ میرا خیال ہے وہ اس کا پتا معلوم کر کے ہی آئے گا۔ لیں یہ اخبار پڑھیں۔ اس میں یہ خبر بڑی اہم ہے۔" اس نے اخبار میرے سامنے رکھ دیا۔

وہ خبر اسی چوری کے بارے میں تھی جس کا صراف کو علم ہو چکا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اُن ہیروں میں ایک ایسا ہیرا بھی موجود ہے جس کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔ چوروں نے شیشے کے ویسے ہی دو ڈبے جیولر کی دکان پر رکھ دیے تھے جس کی وجہ سے اُسے یہ فوراً معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو چکی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ کوئی عورت تھی جو ذرا سی دیر کے لیے وہاں آئی تھی۔ اُس نے ہوشیاری سے ہی نقلی ہیرے وہاں رکھ کر اصلی چرا لیے۔ اُس کی وضع قطع جو بیان کی گئی تھی وہ سافز سے بالکل مختلف تھی اور وہ اس بات پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"میں خبر پڑھ چکا تو وہ بولی۔ "میں نے دراصل اس وقت وِگ لگا رکھی تھی اور یہ تجویز کفلر کی تھی کہ میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے روپ میں وہاں جاؤں ---- اب اس حلیے کی عورت انھیں کہاں ملے گی؟"

"مگر وہ انتھونی اگر آپ کی مخبری کر دے تو؟"

"وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا؟ پولیس پہلے ہی اس کی تلاش میں ہے۔"

"مگر وہ اُن کے سامنے آئے بغیر بھی اُنھیں اطلاع دے سکتا ہے۔"

"نہیں! میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ اتنا کمینہ نہیں ہو سکتا۔ کفلر کے ساتھ وہ کئی وارداتیں کر چکا ہے۔ ایک عورت کے معاملے میں اُن کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہیرل کو اُس نے ہی گمراہ کیا ہوگا۔ یہ خبر پڑھ کر ہم تک ضرور پہنچے گا وہ۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ہیرے اتنی قیمت کے نہیں ہیں مگر اب وہ حیران ہو رہا ہوگا۔"

ابھی ہم چائے پی کر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی نے سافز کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ وہ کفلر ہے۔ سافز نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا اور اپنا اوور کوٹ اتار کر زور سے صوفے پر پھینک کر بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جاگ رہے تھے۔"

"صبح ہو چکی ہے کفلر! تمہارا کیا خیال ہے، ہم سوتے ہی رہتے۔"

"ویسے تمھیں مبارک ہو سافز! وہ گریگ لانسر یہاں سے نکل کر انتھونی کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے انھیں پانچ ہزار ڈالر دے کر اپنی جان چھڑا لی ہے اور اب وہ دونوں لاس اینجلس جا چکے ہوں گے۔ انتھونی کو اپنی گرفتاری کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور رقم اس کے پاس کوئی نہیں تھی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اُس سے ہماری جان چھوٹ گئی۔"

"ہاں ڈارلنگ! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ ہیرے تو بہت قیمتی نکلے۔ صبح کا اخبار پڑھا ہے تم نے؟"

"ہاں، میں پڑھ چکی ہوں اور یہ بہت اچھی خبر ہے۔"

"اب ہم اطمینان سے اُن ہیروں کو بیچ لیں گے۔ تم سناؤ مسٹر گے ایث! رات کیسی گزری؟"

"بہت اچھی، مجھے گہری نیند آئی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔"

"تمھیں نیند آ گئی تھی! لانسر کے یہاں آنے کے باوجود۔" اس نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں! نیند آ ہی گئی تھی۔ میں نے تمھیں بتایا ہے ناکہ یہ سب کچھ میرے روزمرّہ کے معمولات میں سے ہے۔ مجھے ہر حال میں نیند آجاتی ہے۔"

"ہوں! میں تمھارے دھمن کا پتا معلوم کر آیا ہوں۔ اس کا مکان شہر کے نواح میں ہے۔ کارن ایونیو میں۔ اور ابھی وہ گھر پر ہوگا۔ تم اس سے بات کرنا چاہو گے۔"

"چاہتا تو میں یہی تھا مگر اب تم خود میرے ساتھ چلو۔ یہ قصّہ میں تمھارے سامنے ختم کروں گا۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"میں اُن دونوں کو ختم کر دوں گا۔ اس مصیبت کا صرف یہی ایک حل ہے۔"

"نہیں نہیں بھئی! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم پکڑے جاؤ گے۔ ایسی حماقت نہیں کرنا ہے۔"

"میں یہی کروں گا کفلر! شاید خدا نے مجھے اسی لیے یہاں پہنچا دیا ہے۔ اُن کی موت کا فیصلہ آج ہی ہوگا اور میرے ہاتھوں ہوگا۔ میں اپنا ارادہ بدل نہیں سکتا ہوں۔ اُن لوگوں نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔ میں بہرحال تمھیں اس کے دروازے تک پہنچا دوں گا۔ آگے تم جانو اور تمھارا کام۔" کفلر نے اس سے آگے کوئی بات نہیں کی اور چائے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

سافنر نے اس کی پیالی میں چینی گھولتے ہوئے کہا۔ "اس ملک کے قانون کو سمجھنے کی کوشش کرو مسٹر گے ایث! تم بچ نہیں سکو گے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں مس سافنر! کیا یہاں قتل نہیں ہوتے، ڈاکے نہیں پڑتے، سب کچھ ہوتا ہے یہاں۔ اور وہ لوگ تو میرے نزدیک کب کے واجب القتل ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اُنھیں ڈاکٹر دھمن کے وہ جرائم بتائے جو وہ پاکستان میں کرتا رہا تھا۔ وہ دونوں بڑی حیرت سے میری باتیں سُنتے رہے۔ اُنھیں میں نے اپنا پیٹ بھی کھول کر دکھایا تو وہ اور زیادہ چونک گئے۔ "یہ زخم بھی اُسی کا لگایا ہوا ہے کفلر! اس نے مجھے ایک گُردے سے محروم کر دیا۔ میری بہن پر بھی اُس نے یہی حربہ آزمایا۔ ایک نہیں، اس کے زخم خوردہ تو بے شمار ہیں اور اب وہ امریکہ میں آچکا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ یہاں وہ کیا کچھ کر چکا ہے۔ میں اُنھیں کیسے معاف کر دوں۔"

"حیرت ہے کہ وہ اب تک بچا ہوا ہے۔ سنا تم نے سافنر! وہ ایک عادی مجرم ہے اور یہاں ڈاکٹر بن کر بیٹھا ہے۔ ایک چیریٹی اسپتال اس نے کھول رکھا ہے۔ اس کا ہاتھ تو ضرور روکنا چاہیے۔"

"مگر تم کیا کر سکو گے کفلر! تم سے تو آج تک ایک مرسکا ہے، تم کیا کر سکو گے؟" سافنر نے پریشان ہو کر ...

"وہ تو ٹھیک ہے ... مگر ... اس کی بات غور کرو۔ گُردوں کا یہاں باقاعدہ کاروبار ہو رہا ہے۔ دھڑا دھڑ لوگوں کے اعضاء بدلے جا رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ہوگا جو براہِ راست اس کاروبار سے روپیہ کما رہا ہوگا۔"

"بہرحال تم اُس مکان کے اندر نہیں جاؤ گے۔ تم کو ... کرنا ہوگا۔ ورنہ اسے پتا دے دو، یہ خود دیکھ لے گا کہ کیا کرنا ہے۔"

کفلر مسکرا دیا۔ بولا۔ "نہیں۔ یہ اچھی بات نہ ہوگی۔ میں خود وہاں نہیں جاؤں گا۔ اس کو دروازے تک پہنچا دوں گا۔ چلو بھئی! دیر ہو رہی ہے۔"

"بس میں جانا ہوگا؟"

"نہیں میرے پاس کار ہے۔ اچھا سافنر! میں جلد آجاؤں گا۔ اپنا دھیان رکھنا۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت میرے ساتھ عمارت سے باہر نکل آیا۔

باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سُورج آہستہ آہستہ اوپر ...

ہم کار میں بیٹھے تو مجھے محسوس ہوا کہ کفلر بہت منجھا ہوا ڈرائیور ہے۔ سڑکوں کا یہ حال تھا کہ وہ نیچے اُترتی تھیں تو اُترتی ہی چلی جاتی تھیں۔ وہ شہر ایسے سنگم پر واقع ہے کہ سمندر سے نکلتے ہی اس کی اوپر اُٹھنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شہر سطحِ مرتفع پر واقع ہے۔ پہاڑیوں پر آبادیاں قائم کی گئی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس راستے سے کہاں لے جا رہا ہے اور مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں تو وہاں کی ٹریفک اور کاروں کا ہجوم دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ لوگ بہت خوش باش دکھائی دیتے تھے۔ ستھرے راستے، گرد کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ ایک بہت ہی مہذب معاشرے کا امین شہر تھا جس کی ارضی جنّت کا پتا دیتی تھیں اور اس بھیڑ میں ہر شخص اپنے راستے پر چلتا تھا۔ کاش میں اس شہر میں زیادہ عرصہ گزار کر اُن لوگوں میں گھُل مل کر رہ سکتا۔ ہَوا، کراچی ایسی ہوا تھی مگر موسم ایسا تھا کہ وہ ہَوا سینے پر بوجھ نہیں بنتی تھی۔

کفلر کوئی آدھ گھنٹے تک آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک بنگلے کے سامنے کار ٹھہرا دی۔ بولا۔ "یہ ہے وہ بنگلا جس میں ڈاکٹر دھمن رہتا ہے۔"

"مگر یہ جگہ کون سی ہے؟"

"یہ نئی آبادی ہے، سان فرانسسکو کا نواحی علاقہ۔ اس سڑک کا نام کارن ایونیو ہے۔ سامنے دروازے پر گھنٹی کا بٹن ...

ڈاکٹر ابھی اندر ہی ہوگا۔" اُس نے سڑک پر کار سے نکلے بغیر مجھے راستہ بتایا۔

"تم واپس جاؤ گے اب؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے مجھے یہی کرنا ہوگا۔ میں یہاں نہیں رُکوں گا۔"

"ٹھیک ہے کفلر! خدا حافظ! ویسے میں یہاں سے فارغ ہو کر تمھارے پاس آؤں گا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"ہم شاید آج یہاں سے نکل جائیں۔ مجھے اُن ہیروں کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

"ٹھیک ہے! میں فون پر معلوم کروں گا۔ ویسے تم اپنا وہ پتا تو دیتے جاؤ جہاں میں تم سے مل سکوں۔" اُس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دے دیا۔

"تم چاہو تو اگلے اتوار کو مجھ سے اس پتے پر مل سکتے ہو۔"

"بہت بہتر، اچھا خدا حافظ!"

"وِش یُو گُڈ لَک مَین۔ مگر یاد رکھو، کام تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔" میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ میں ابھی تک کار میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ سوال میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا جو کل سے مجھے پریشان کر رہا تھا۔ "اُتر جاؤ نا اب۔"

"ایک بات بتاؤ کفلر! سافنر سے تمھارا کیا تعلق ہے؟ یہ بڑی ذاتی سی بات ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ تم بُرا نہیں مناؤ گے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی رسائی سے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگا۔ بولا۔ "سافنر نے ولیم کے بارے میں تمھیں جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے۔ وہ اسلام آباد میں رہی ہے۔ پھر ولیم سے وہ الگ ہوگئی۔ سان فرانسسکو جب وہ آئی تو مجھے مل گئی۔ اب ہمارے درمیان صرف ایک سمجھوتا ہے کہ وہ میرے سوا کسی اور کے ساتھ مل کر کام نہیں کرے گی۔ اور بس۔ یہی بہت کافی ہے۔ میں اُس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہوں اور وہ میرا خیال رکھتی ہے۔"

"شکریہ کفلر! میں بس یہی پوچھنا چاہتا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے اس وعدے پر قائم ہے اور اچھی عورت ہے۔" یہ کہہ کر میں کار سے نیچے اُتر گیا۔ وہ اب تک میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا مگر کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔

میرے سامنے کارن ایونیو کی وسیع و عریض سڑک پھیلی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف تا حدِ نظر اُونچے اُونچے درخت دکھائی دے رہے تھے اور اُن کے عقب میں ایک ایک دو دو منزلہ بنگلے بنے ہوئے تھے۔ میں اُس علاقے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ... مجھے یہی ہونے لگا تھا جیسے میں اسلام آباد میں پھر رہا ہوں۔

منظر بالکل ویسا ہی تھا۔ البتہ بنگلوں کی عمارتوں کے عین سامنے ہر جگہ قدرتی حُسن کو برقرار رکھنے کے لیے درختوں کو یونہی بے محابا پھیلنے دیا گیا تھا اور بڑے گیٹ کے اندر پہنچ کر اُنھی درختوں کے نیچے بنے راستوں اور پگڈنڈیوں پر چل کر عمارتوں تک پہنچنا پڑتا تھا۔ ڈرائیو وے بھی وہاں موجود تھے۔ کبھی کبھار کوئی کار بہت تیزی سے گزرتی نظر آتی تھی۔

میں ایک طویل عرصے کے بعد ڈاکٹر دھمن کے سامنے جا رہا تھا۔ وہاں عالیہ بھی ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اس سے الگ رہ رہی ہو۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میری اطلاعات غلط تھیں کہ اُن میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے تھے۔ اُن کی طبیعتیں بھی ایک جیسی تھیں۔ جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہوں اور یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک اپنے منصوبوں میں بہت کامیاب تھے۔ اُن کی تجویزیں بے مثال تھیں۔ ایسی کہ اُن میں کوئی جھول نہیں تھا۔ کسی بھی جگہ اُنھیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔

میں ابھی گیٹ سے ذرا دور ہی کھڑا تھا کہ مجھے ایک شخص موٹر سائیکل پر اس طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ کوئی ڈاکیہ تھا۔ حلیہ اس کا ڈاکیوں ایسا ہی تھا۔ اُس نے ذرا دیر کے لیے موٹر سائیکل اُس گیٹ کے پاس روکی۔ اپنے بڑے سے چرمی بیگ سے اُس نے دو خط نکالے اور گیٹ کے ستون میں بنے چھوٹے سے شگاف میں ڈال دیے۔ وہ شگاف اندر کی طرف کھلتا تھا۔ ڈاک تقسیم کر کے وہ آگے نکلنے لگا تو میں اس کے سامنے جا ٹھہرا۔

"پلیز! مجھے یہ بتائیں کہ ڈاکٹر دھمن کا گھر یہی ہے۔" میری انگریزی چند ہی دنوں میں خاصی نکھر گئی تھی۔

"ہاں۔ بالکل یہی ہے۔ ڈاکٹر ڈومن وہ ادھر ہی رہتا ہے۔"

"شکریہ بھائی! بہت بہت شکریہ۔" وہ مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ میں نے گیٹ پر پہنچ کر گھنٹی بجا دی۔ آواز کی بازگشت مجھے سنائی نہیں دی۔ پتا نہیں اطلاع ہوگئی تھی کہ نہیں۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد میں نے پھر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ بٹن یہ احساس دلاتا تھا کہ گھنٹی بج رہی ہے اور اطلاع ہوگئی ہے۔ اپنے اندرونی اضطراب سے بچنے کے لیے میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ کوئی چار یا پانچ منٹ بعد گیٹ کی کھڑکی کھل گئی۔ اب میرے سامنے ایک بانکا سجیلا جوان کھڑا تھا۔ جو شکل سے ہی پاکستانی نظر آتا تھا۔ وہ بہت عمدہ قسم کا گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں اس نے پائپ پکڑ رکھا تھا۔

"یس پلیز! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی نہیں ہے بلکہ کوئی ایرانی ہے جو اردو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس کا لہجہ یہی بتاتا تھا۔

"مجھے ڈاکٹر دھمن سے ملنا ہے۔"

"آپ کا نام؟"

"مجھے علی آشتی کہتے ہیں۔ میں لاہور سے آیا ہوں۔"

"کیا کام ہے آپ کو ڈاکٹر صاحب سے؟ آپ نے اُن سے ملنے کے لیے وقت لیا ہے؟"

"اوہ نو! مجھے وقت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ انھیں اطلاع دیں اور زیادہ دماغ نہ کھپائیں۔ اس طرح آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے گیٹ کی کھڑکی کے اندر قدم رکھ دیا۔

وہ قدِ آدم کھڑکی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ میں آگے ہوا تو وہ... بادلِ ناخواستہ پیچھے ہٹ گیا۔ بولا "آپ اِدھر ہی ٹھہریں میں انھیں اطلاع دیتا ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ آپ کو آنے جانے میں خواہ مخواہ پریشانی ہوگی۔ ویسے وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ کو آداب نہیں آتے ہیں .... میں کہتا ہوں آپ یہاں رُکیں اور انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی آپ سے نہ مل سکیں۔"

"تو میں واپس آجاؤں گا۔ ویسے بائی دی وے آپ کا اسمِ گرامی کیا ہے؟" میں نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونس کر اس کے سامنے اکڑتے ہوئے کہا۔ سگریٹ میرے لبوں میں پھنسا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری طبیعت کل کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ اپنے دورانِ خون کا اندازہ میں اپنے ہاتھ کے ناخنوں سے لگا لیتا تھا۔ اُن کا رنگ سُرخ ہو رہا تھا۔ شاید یہ صبح کی سردی کا اثر تھا۔ میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ پتلون کی بیلٹ کے نیچے دبے پستول کو ٹٹول رہا تھا۔ جسے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں باہر نکال سکتا تھا۔ مجھے وہاں بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میرے ہاتھ تلے اب میزر کا پستول نہیں تھا۔ جسے میں کھول ہی نہیں سکا تھا اور لانسر پھل کر گیا تھا۔ اب کی بار صورتِ حال قطعاً مختلف تھی۔

وہ چند لمحے مجھے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا سُرخ و سفید رنگ اس کی قابلِ رشک صحت کا پتا دیتا تھا۔ قد اس کا میرے برابر ہی تھا۔ "مجھے عارف مغربی کہتے ہیں۔"

"عارف مغربی! گڈ! یہ اچھا نام ہے۔ مجھے آپ علی آشتی مشرقی کہہ سکتے ہیں۔ چلیں۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پائپ کا گہرا کش لگا کر اس نے ذرا دیر کے لیے رُکتے ہوئے کہا "کوئی خاص چیز لائے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب کے لیے؟ آئی مین۔ انداز آپ کا ایسا ہی ہے اور پھر آپ لاہور سے آئے ہیں۔"

"ہے تو سہی مگر میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

ہم اس وقت اونچے اونچے درختوں کے نیچے بنی سِلوں کی پگڈنڈی پر چل رہے تھے جو بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ درزوں میں سے کہاں ہمیں جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ ابھی خاصی دور تھی کہ اس کا اندازہ ایک دم پر بینہ نہ سا ہو گیا۔

"میں آپ کو زیادہ دام دے سکتا ہوں اور ...... نہیں ہوگا۔ ایک کلو کے دو لاکھ ڈالر مجھ سے ... کر لیں۔"

اُس کی بات کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا ... بنا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات زیادہ واضح طور پر ... کا نام لے دے جس کے ایک کلو کی وہ اتنی بڑی ... کاش وہ چیز میرے پاس ہوتی۔

"دو لاکھ ڈالر ایک کلو کے! مجھے آپ اپنے کمرے ... میں نے ایک لمحے کے لیے رُکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ بہتر رہے گا۔ اِدھر آجائیں۔" یہ کہہ کر اس نے ... کا راستہ پکڑا اور دوسری پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اب اس کا ... کے بائیں ہاتھ کی طرف تھا۔ میں نے سگریٹ ... پائپ ایک دم بجھا دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر ایک میری طرف بڑھا دیا اور دوسرا اپنے لبوں سے لگا کر سلگانے لگا ... پاکستان سے کب آئے ہیں؟"

"رات ہی یہاں پہنچا ہوں۔ ڈاکٹر دُھمّن نے مجھے اپنا ... تھا مگر میں رات کو یہاں نہیں آیا۔ سیدھا ہوٹل جا ٹھہرا ... کیا خوبصورت جگہ ہے۔ بڑی عظیم عمارت ہے اس کی ... گیا رات گزار کر میں صبح اُٹھتے ہی اِدھر آگیا۔ میرا سامان ابھی ... ہے۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"وہ کھِل اُٹھا۔ بولا "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے ... یہاں نہیں لائے۔ ڈاکٹر سے آپ کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہیں ... سے سارا مال خرید لوں گا۔ نرخ یہی ہوگا۔"

"خیر وہ بھی دیکھ لیں گے مگر میں ڈرتا ہوں کہیں ... ہمیں دیکھ نہ لے۔"

"اُس سے کیا فرق پڑتا ہے آپ ایسے مہمانوں کو تو ... خوش آمدید کہتا ہوں۔ آئیں ذرا تیز چلیں۔" یہ کہہ کر وہ تیز ... ہو لیا۔ کوئی پانچ منٹ میں ہم عمارت کے بائیں ہاتھ کے ... جا پہنچے۔ ایک کارپورچ وہاں بھی بنا ہوا تھا اور وہاں ... تھیں۔ عمارت کے وسطی حصے میں بھی کارپورچ تھا ... سیاہ رنگ کی کیڈلاک کھڑی تھی مگر آدمی وہاں کوئی نظر ... عمارت پر اُس گھڑی مکمل خاموشی طاری تھی۔ یوں ... وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ دونوں طرف سنگلے کی ...

ہم ایک بڑے سے برآمدے میں سے ہو کر ...

ہوا کہ ہم ایک ہال کمرے میں جا پہنچے ہیں ــــ جس کی ... دیواروں میں دروازے بنے تھے۔ بائیں ہاتھ ایک بہت ہی خوبصورت سیڑھی اوپر چڑھتی تھی۔ جو دوسری منزل کا راستہ بتاتی تھی۔ اس ہال کے بین وسط میں صوفوں کا ایک دائرہ سا بنا تھا جن تک پہنچنے کے لیے صوفوں کے درمیان میں جگہ بنی ہوئی تھیں۔ ان صوفوں کے سامنے شیشے سے مزین گول میزیں رکھی تھیں۔ کمرے کے فرش پر گھاس کے رنگ کا اونچے اونچے ریشے والا قالین بچھا تھا۔

"تشریف رکھیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے میری ملاقات ہو گئی۔ ورنہ آپ کو اپنے دُھمّن صاحب کا ملازم بھی جا سکتا تھا۔ اس کا نام گلفام ہے۔"

مجھے اس نے صوفے پر بٹھا کر میز پر رکھی گھنٹی بجا دی۔ چند ہی لمحوں بعد عقبی دروازہ کھلا۔ میں نے سر گھما کر اِدھر دیکھا تو میں یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ میرے سامنے مس ہیرلیبن کھڑی تھی۔ وہی عورت جو مجھے ہوائی جہاز میں لاد کر سان فرانسسکو لائی تھی۔

پہلی نظر میں تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکی مگر جب وہ سامنے آئی تو اس کا حافظہ جاگنے لگا اور وہ مغربی کو دیکھ کر بولی "یہ... انھیں آپ کہاں سے لے آئے ہیں؟" وہ بڑی سلیس فارسی بول رہی تھی۔ تب میں نے جانا کہ وہ امریکی نہیں تھی۔ بلکہ وہ عارف مغربی کی طرح ایرانی تھی اور اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں فارسی بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ کسی زمانے میں وہ میرا بہت مرغوب موضوع رہی تھی۔

"کیا مطلب! تم جانتی ہو انھیں؟" مغربی نے پوچھا۔ وہ خود ہیرلیبن کے غیر متوقع تاثر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ وہی تو ہیں جن کو میں کراچی سے یہاں لائی تھی۔ خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کا نام تو علی آشتی ہے۔"

"یہی ہوگا مگر ہم ان کو غیاث احمد کے نام سے یہاں لائے تھے۔ غیاث احمد ولد نبی احمد اور یہ کل شام اسپتال سے غائب ہو گئے تھے۔"

"اوہ! تو یہ وہی آدمی ہے جو اسپتال سے فرار ہو گیا تھا ــــ گاڈ ڈیم۔ ڈاکٹر دُھمّن کو اطلاع دو۔ بھاگو، جلدی کرو۔" مغربی ایک دم پریشان ہو گیا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ مجھے وہیں کھڑے کھڑے گولی مار دیتا۔ ہیرلیبن تیزی سے عقبی دروازے کی طرف بڑھی۔

"رُک جاؤ ہیرلیبن ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ رُک جاؤ۔" میں نے ایک دم پستول نکال کر مغربی اور ہیرلیبن کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں میری گولی کی زد میں تھے۔ رُخ ان کا ایسا ہی تھا مگر اس ... وہ تڑپ کر دروازے تک جا پہنچی۔ پیشتر اس کے کہ وہ میری نگاہوں سے غائب ہو جاتی، میں نے اس کے بازو کو تاک کر گولی چلا دی۔ شوں شک ایسی آواز پیدا ہوئی اور ہیرلیبن تھرا کر گھوم گئی۔ سہارا لینے کے لیے وہ دیوار سے ٹیک لگانے لگی مگر وہ یہ صدمہ نہ سہہ سکی اور قالین پر گر گئی۔ اس کا ایک بازو خون میں تر ہو گیا تھا۔ مغربی ایک دم اٹھ کر اس کی طرف بڑھا مگر میں نے اُسے لپک کر بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

"ذرا اتنی تیزی نہ دکھاؤ عارف! تم اتنے مغربی نہیں ہو جتنا ظاہر کر رہے ہو۔ بیٹھ جاؤ اور کوئی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

مگر وہ بہت ہی بے خبر ہو رہا تھا۔ چیخ کر بولا "وہ شدید زخمی ہو گئی ہے۔ مجھے چھوڑ دو، اُسے دیکھنے دو۔" اس نے پلٹ کر میرے سینے میں گھونسا مارنا چاہا مگر میں نے اس کے بال چھوڑ کر اُسے صوفے کے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے پاس ہتھیار کوئی نہیں تھا اور یہی بات میرے حق میں جاتی تھی۔ وہ صوفے کے پیچھے سے اُٹھ کر پھر ہیرلیبن کی طرف بڑھا۔ وہ اس وقت بوکھلائی ہوئی اپنے زخم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے تھے۔

"اِسے اُٹھا کر اِدھر لاؤ۔ کوئی دوا ہو تو اس کے زخم پر لگا دو۔" یہ کہہ کر میں اُن کے پاس جا پہنچا۔ مغربی اس وقت ہیرلیبن کے بازو کا معائنہ کر رہا تھا۔ گولی اسے زخمی کر کے جِلد پھاڑ کر آگے نکل گئی تھی اور اس کا نشان میں دیوار پر صاف دیکھ سکتا تھا۔

"اِسے اُٹھا کر صوفے پر ڈال دو۔ گولی آگے نکل گئی ہے مگر مجھے افسوس ہے اس حادثے پر۔"

میں بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ جیسے وہ میری مادری زبان ہو۔ پتا نہیں اتنی انگریزی میرے اندر کہاں چھپی ہوئی تھی۔

مغربی نے ہیرلیبن کو بڑی اپنائیت سے اُٹھا کر صوفے پر لٹا دیا اور اس کے بازو کا خون رومال میں جذب کرنے لگا۔

"تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ اس کا کیا قصور ہے؟" وہ بڑی درد بھری آواز میں بولا۔ پھر الماری کی طرف دیکھنے لگا۔ "اس کا خیال رکھو۔ میں الماری سے دوا نکالتا ہوں۔"

اس نے رومال وہیں رہنے دیا اور سامنے کی الماری کی طرف بڑھا مگر یہ اچھی بات نہیں تھی۔ وہاں سے وہ کوئی بھی ہتھیار نکال سکتا تھا۔

"رُکو! میں خود الماری سے دوا نکالتا ہوں۔ میز کے قریب مت جانا۔ اگر تم نے پھر گھنٹی بجائی تو اچھا نہ ہوگا۔"

وہ میری بات سمجھ کر وہیں رُک گیا اور دوبارہ ہیرلیبن کے پاس جا ٹھہرا۔ رومال ہاتھ میں لے کر بولا۔ "بہت وحشی آدمی ہو تم۔ کیا قصور تھا اس بے چاری کا؟"

میں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور پستول کا رُخ اس

کی طرف رکھ کر میں نے الماری کھول دی۔ اس کی کچھ درازوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ ایک الماری میں البتہ کچھ شیشیاں موجود تھیں اور مرہم پٹی کا سامان بھی۔ وہ میں نے نکال کر چھوٹی سی ٹرے میں رکھا مگر نظر میری اُنھی پر جمی تھی۔ میں اُن پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ہیرلین عام عورتوں کی طرح واویلا نہیں مچا رہی تھی۔ بلکہ اب وہ بڑے صبر سے زخم کا درد سہہ رہی تھی۔ وہ ٹرے لے جا کر میں نے مغربی کے پاس رکھ دی۔

"اب اس کی مرہم پٹی کر دو۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں" مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ میری آواز میں عجیب طرح کی لکنت پیدا ہونے لگی تھی پھر وہی وقت آرہا تھا جب مجھے اس "دوا" کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی جس پر اُنھوں نے مجھے ڈال رکھا تھا۔ بدن میں پھر وہی کسلمندی پیدا ہو رہی تھی جسے کل میں بڑی مشکل سے دبا سکا تھا مگر میں نے ضبط کا کوڑا بدن پر اس طرح برسایا۔ خود کو اس طرح کھینچ کر رکھا کہ چند لمحوں بعد میں اُس تشنج پر قابو پا چکا تھا جو مجھے نڈھال کر رہا تھا مگر وہ قوت میرے ارادے سے کہیں زیادہ طاقتور تھی جو مجھے اندر ہی اندر رگید تی تھی۔ جب تک مغربی نے اس کی مرہم پٹی ختم کی اس وقت تک میں نڈھال ہو کر صوفے پر جا بیٹھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری اس کیفیت سے آگاہ ہو سکیں۔

ہیرلین اس صدمے سے جانبر ہو چکی تھی۔ وہ پٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ مغربی اس کے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور اب بھی اس کا ہاتھ ہیرلین کے کندھے پر تھا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو کہ گھبراؤ نہیں، ایسے حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پاتے ہوئے پھر خود کو تیکھا کیا مگر جسم پر میرا اختیار قائم نہیں ہو سکا تھا۔ بند بند میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ دُھمن نے مجھے موت سے پہلے ہی زندگی سے محروم کر دینے کی کوشش کی تھی۔ ایسی بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی تھی جو مجھے اٹھنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اس نشے نے بڑے بڑے پیل تن جوانوں کو کھا لیا تھا۔ اب میری باری تھی اور یہ دوسرا دن تھا کہ میرا رُواں رُواں مجھ سے اُس نشے کا طلب گار تھا۔ جو مجھے انھوں نے دو ہفتے تک دیا اور جس کے بغیر میں اب رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ دُھمن نے مجھ سے بہت ہی خطرناک انتقام لیا تھا۔ ایسا انتقام جس کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں جھولنے لگا تھا اور میری نظروں سے وہ دونوں معدوم ہو رہے تھے۔

میرا خیال ہے عارف مغربی نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے ہیرلین کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا اور بولا "اب کیا چاہتے ہو تم؟"

"اوہ میں.....؛" میں نے بدن کو جھٹکا دے کر سیدھا کیا "کیا کہہ رہا تھا میں....." مگر پھر فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا

مجھے اس کیفیت سے چھٹکارا پانا ہوگا۔ جو مجھے اُن کے سامنے بھی... جا رہی تھی" ہیرلین! تم دُھمن سے کیا کہنے جا رہی تھیں؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ خاموش رہی ... کے توقف کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر بولی "تمھاری آواز لرز... تمھیں تو گولی نہیں لگی" اس کے لہجے میں استہزا تھا۔ جو مجھے ناگوار گزرا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری بات کا جواب دو ..."

"میں اُنھیں بتلانے جا رہی تھی کہ تم واپس آ گئے ہو"

"اور..... کیا کہتیں تم اُس سے؟"

"اور یہ کہ تمھارے پاس پستول بھی ہے اور تم نشے میں ہو..." کی اپنی آواز لرز رہی تھی۔ وہ ابھی تک گولی لگنے کے صدمے ... نہیں کر سکی تھی۔

مغربی اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں ... وہ کیا کرے۔ ایسی صورت میں کہ اس کے مقابل ایک ایسا ... ہو جو پستول سے مسلح بھی ہو اور نشے میں بھی مبتلا ہو۔ وہ چند ... صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ پھر اچانک ہیرلین نے اس سے کچھ ... کہا تو وہ ایک دم میری طرف بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر بولا "یہ لیتے ... تم نشے میں ہو۔ نشے کی شکستگی میں تم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ... پستول مجھے دے دو۔"

"بڑے حسین ہو تم، کیا بات ہے تمھاری۔ وہیں بیٹھو ... سوراخ ڈال دوں گا۔ بیٹھ جاؤ۔ مجھے بٹ گریں نشے میں نہیں ... عارف مغربی! بلکہ تم سب خود نشے میں ہو۔ وہ میرا پاسپورٹ کہاں ... مِس ہیرلین؟"

"وہ..... وہ تو ڈومین صاحب کے پاس ہے۔ وہ انھوں ... سے لے لیا تھا۔"

"ہوں۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ میں ابھی اس سے ... ہوں۔" میں نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ ... نشہ تھا۔ جس کی طلب بار بار دماغ کو شل کر دیتی تھی۔ یہ ... کہ میں اس شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دُھمن نے ... ذلت و رسوائی کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ مجھ سے اپنا آپ سنبھالنا ... مشکل ہو گیا تھا۔

"چلو اُٹھو! دونوں میرے آگے ہو جاؤ، چلو۔" میں نے ... کا رُخ اب مغربی کی طرف پھیر دیا۔ میں اُسے پوری طرح ... چاہتا تھا۔

وہ دونوں اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے اور عقبی دروا... طرف چلنے لگے۔ ہیرلین کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ مغربی ... سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ وہیں گر جاتی۔ پھر بھی وہ بڑی حوصلہ...

تھی۔ اس نے آگے جا کر دائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک کمرہ تھا۔ وہ شاید اُن میں سے کسی کی خوابگاہ تھی۔ وہ دونوں اس میں سے گزر کر آگے نکلے تو میں نے مغربی کی کمر سے پستول لگا دیا۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ سیدھے دُھمن کے کمرے میں چلو۔"

خوابگاہ کے ساتھ ایک اور عقبی کمرہ تھا۔ اس میں سے گزر کر ہم نکلے تو ایک بار پھر ہم بڑے سے ہال میں جا پہنچے اس میں یہاں سے وہاں تک کرسیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں کوئی بارہ ہاتھ لمبی میز تھی اور اس پر جا بجا تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ ایسا ماحول تھا جیسے وہاں اس وقت کوئی دعوت ہونے والی ہو۔ وہ کوئی بہت ہی شاہانہ بہت تھی پتا نہیں دُھمن اس کا کرایہ کیا دیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی ملکیت ہو۔ اس ہال میں سے گزر کر ہم دوسرے عقبی دروازے تک جا پہنچے۔ وہ دائیں ہاتھ کھلتا تھا مغربی نے اسے بڑی تیزی سے کھول دیا اور ہم اس حال میں اس کمرے میں پہنچے کہ وہ دونوں میرے پستول کی زد میں تھے۔

تب میں نے اس ابلیس کو دیکھا جس کا نام دُھمن تھا۔ وہ ایک بڑی سی میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہیرلین ایک دم چیخنے لگی۔ دُھمن فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ قلم اس نے الگ رکھ دیا۔ آنکھیں اس کے اندرونی تحیر کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ چند لمحات تک تو وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ ہو کیا رہا ہے مگر جب میں ان دونوں کے ساتھ روشنی کے حلقے میں پہنچا تو اسے یاد آیا کہ کون اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ خاصا معمر لگ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ پچاس سال کا ہو چکا ہو۔ اس نے ہاتھوں میں دائیں بائیں دو چمکتی ہوئی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ اس کی ٹائی پر کوئی بہت ہی خوبصورت ہیرا لگا تھا۔ کلائی میں اس کی گھڑی بڑی چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ وہ بہت عمدہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ سر کے بال کچھ اور پیچھے ہٹ گئے تھے۔ پھر بھی وہ بہت صحت مند نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے ہیرلین! یہ تمھیں کہاں سے مل گیا ہے؟ اس کو تو ہم کل سے تلاش کر رہے ہیں۔ بہت دنوں بعد ملے ہو تم غلام جیلانی! کیسے ہو؟ میرا خیال ہے تم ابھی تک اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے ہو۔ انداز تمھارا یہی لگتا ہے۔"

میں نے مغربی کی کمر سے پستول ہٹا لیا اور ذرا پیچھے ہو کر میں نے خود کو دُھمن پر نمایاں کر دیا۔ اب میری گولی کا رُخ اس کی طرف تھا مگر وہ اسے دیکھ کر قطعاً خوفزدہ نہیں ہوا۔

ہنستے ہوئے بولا "بیٹھو غلام جیلانی! میں تمھارے بارے میں بہت پریشان تھا۔" وہ مجھ سے پنجابی میں بات کر رہا تھا۔ "بیٹھو مت ہیرلین، یہ تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ یہ تمھارے بازو پہ پٹی کیسی ہے؟"

دُھمن نے مجھے نگاہ میں رکھ کر ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اس نے ہیرلین کو زخمی کر دیا ہے۔ گولی بازو پر لگی ہے۔" مغربی نے کہا۔

"اور تم نے مرہم پٹی بھی کر لی۔ بیٹھو غلام جیلانی! میرا خیال ہے تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمھاری پرانی عادت ہے۔ یہ امریکہ ہے میرے بچے! تمھیں اپنے طور اطوار بدل لینے چاہئیں۔ تم دونوں جاؤ۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

"یہ نہیں جائیں گے دُھمن اور تم بھی یہاں سے زندہ باہر نہ جا سکو گے۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھے یہاں کس لیے منگوایا؟ کوئی رشتے داری جوڑنی ہے؟ کیوں بلوایا ہے تم نے یہاں؟"

"تمھاری بھی تو خواہش تھی غلام جیلانی! تم خود میرے پیچھے آنا چاہتے تھے حیدر سے تم نے بھی کہا تھا، سو تم یہاں آ گئے۔"

"بکواس بند کر دُھمن! میں تیری موت بن کر آیا ہوں۔ کہاں ہے وہ عالیہ؟ میں اسے تمھارے سامنے عبرت ناک سبق دوں گا۔ تم مجھ سے بچ نہیں سکتے ہو اب۔"

"بکواس مت کرو غلام جیلانی! بیٹھ جاؤ۔ میں تمھارے لیے ناشتا منگواتا ہوں۔ تم دونوں جاؤ اب یہاں سے۔" اس نے مغربی اور ہیرلین سے کہا۔

"میں کہتا ہوں یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے بائیں ہاتھ سے ہیرلین کے منہ پر تھپیڑ مارا۔ وہ بلبلا کر ایک دم نیچے بیٹھ گئی۔ مغربی نے فوراً ہی اسے سہارا دیا۔ وہ بڑی آزردگی سے دُھمن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہیرلین بری طرح سسکیاں لینے لگی۔

"عالیہ کا بھی میں یہی حال کروں گا۔ تم مجھ سے بچ نہیں سکو گے دُھمن! میرے اور میری بہن کے گُردے کی تمھیں بڑی قیمت دینی ہوگی۔ کیوں بلوایا ہے تم نے مجھے یہاں؟ بولو، جواب دو؟"

"یار تم زیادہ ہی گرم ہوتے جا رہے ہو۔ آخر فائدہ کیا ہے اس طرح بات کرنے کا۔ میں نوکر کو اندر بلاتا ہوں۔" اس نے ہاتھ میز کی دراز کی طرف بڑھایا مگر میں نے فوراً ہی اس کی کلائی کو تاک کر گولی چلا دی مگر نہیں! گولی تو وہیں رُکی رہ گئی۔ پستول کی لبلبی نہ آگے حرکت کرتی تھی نہ پیچھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جام ہو گئی ہو۔ حالانکہ اس میں ابھی سات گولیاں موجود تھیں۔ میں حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔

دُھمن برابر مسکرا رہا تھا۔ اس نے میز کی دراز کے اوپر لگی گھنٹی بجا دی اور پھر بڑے اطمینان سے وہ کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی بڑی فراخدلی سے مسکرا رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیاں برابر کمرے میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں اور ان دونوں کا رُخ میری طرف تھا۔

چند ہی لمحوں بعد سامنے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک حبشی گزر کر دُھمن کے سامنے آ ٹھہرا۔

"فیدر! مس ہیرلیبن اور مغربی کو باہر لے جاؤ۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تم دونوں جاؤ، اب آرام کرو۔ فیدر تمھارا خیال رکھے گا۔" اب کی بار اس نے رواں دواں انگریزی میں بات کی۔

فیدر فوراً ہی ان کی طرف بڑھا اور کرسیاں آگے کھسکا کر اس نے ان دونوں کے لیے جگہ پیدا کی پھر ہیرلیبن اور مغربی کو ساتھ لے کر وہ عقبی دروازے سے دوسری طرف نکل گیا۔ میں اپنی جگہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ دھمن نے دراز سے خاصی لمبی نال کا پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیا تھا جیسے وہ اس کے استعمال کی ضرورت محسوس نہ کر رہا ہو۔

"بیٹھیں غلام جیلانی صاحب! تشریف رکھیں اور بھول جائیں کہ آپ کا ایک وار خالی جا چکا ہے۔ پستول میز پر رکھ دیں۔ یہ آپ کے کام نہیں آسکے گا۔" اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیاں اب بھی چمک رہی تھیں۔ ان کے نگینوں کا رخ میری طرف تھا اور میرا پستول ناکارہ ہو گیا تھا یا اسے ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ اس کا مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا ورنہ لبلبی کے نیچے دبی گولی نے میرا حکم کبھی نہیں ٹالا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کہاں لگنا ہے اور کیا کرنا ہے مگر اس کمرے میں سب کچھ ہی گڑبڑ ہو گیا تھا۔ کیا وہ دھمن کا رعب تھا؟ جس نے مجھے رگید ڈالا تھا۔ اس کی شخصیت کا سحر تھا جس کے سامنے میں بے بس ہو گیا تھا؟ آخر وہ کیا چیز تھی جو میرے دماغ ہی کو نہیں، لوہے کی گولیوں کو بھی عاجز کر دیتی تھی؟ یہ راز میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور دھمن کا وہ لہجہ مجھے بہت ہی استہزا آمیز لگ رہا تھا جیسے وہ میرا تمسخر اڑا رہا ہو۔

"بیٹھو یار! تم کیا الٹی سیدھی باتیں سوچ رہے ہو۔ میں تمھارے لیے ناشتا منگوا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بائیں ہاتھ کی گھنٹی بجا دی۔ فوراً ہی ایک خاتون دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک پُروقار کشش تھی۔

"سلور! یہ ہمارے دوست ہیں غلام جیلانی۔ انہیں سلام کرو اور ان کے لیے ناشتا لاؤ۔" یہ سنتے ہی وہ سرو قد کچھ ایسے خادمانہ و وارفتہ انداز میں میری طرف بڑھی کہ اس کی مسکراہٹ پر مجھے پھولوں کا تبسم یاد آیا مگر میں نے جھینپ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"آپ کیا پسند فرمائیں گے جناب؟"

"ایس مصیبت نوں پَراں ہٹاؤ دھمن صاحب! نئیں تے مَیں اینوں تھپیڑ مار دیاں گا۔" میں نے خالص پنجابی میں کہا۔

دھمن بے تحاشا ہنسنے لگا پھر بولا "سلور! اب جاؤ تم اور ناشتا لے آؤ مگر جلدی آنا۔"

وہ دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹی اور جب اس کے سفید جوتے مجھے دروازے میں غائب ہوتے نظر آئے تو میں نے سینے میں رکتا ہوا سانس بڑی مشکل سے باہر نکالا۔

میں سمجھا میں ابھی تک نشے کی طلب سے باہر نہیں آیا۔ وہ بھی ہنس رہا تھا اور میری وہ طرفہ تماشا حالت دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ بولا "کیا خیال ہے امریکہ کے بارے میں آپ کا؟ کیسا لگا؟" مگر اس کی آواز کی کھنک مجھے حیران کرتی تھی۔ وہ برابر ہنس رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا غصہ ڈھلنے لگا ہے۔ "بات دراصل یہ ہے صاحب کہ یہاں ہر قسم کی آزادی ہے، مادر پدر آزاد قسم کا معاشرہ ہے کہ نہیں؟ مگر خیر! ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ سلگا لیے اور ایک مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ غلطی نہ کر بیٹھیں۔ غصے میں آدمی کیا نہیں کر سکتا ہے۔" اس کی نظریں میرے پستول پر گڑ گئیں۔ "میرا خیال ہے یہ پستول مجھے دے دیں۔ یہ آپ کے کسی کام نہیں آسکے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے ایک دم پستول اٹھا لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر میں نے چاہا کہ گولی سیدھی اس کے دل میں اتار دوں مگر ایک بار پھر میری انگلی لبلبی تک پہنچ کر رک گئی۔ وہ دبی ہوئی تھی مگر گولی آگے نہیں نکل رہی تھی۔ جیسے وہ ایک دم اپنی جگہ جام ہو گئی ہو۔ اس کی ٹائی پن میں لگا ہیرا اور اس کی انگوٹھیوں کے نگینے میری نگاہیں خیرہ کر رہے تھے۔

"اسی لیے کہتا ہوں کہ یہ آپ مجھے دے دیں۔ یہی بہتر ہے۔ دراصل ایٹمی دور سے بھی آگے نکل چکے ہیں اور یہ امریکہ ہے میرے بھائی! یہاں آدمی کی نظر میں ایسی قوت آ گئی ہے کہ یہ پستول، یہ ریوالور بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ لائیں یہ مجھے دے دیں۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر مسکراتا جا رہا تھا۔

"تم نے مجھے حیران کر دیا ہے دھمن! میں کوئی اور ہی ارادہ لے کر یہاں آیا تھا...." ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ وہ دشمنِ ایمان پھر اندر آ گئی اور ناشتا میرے سامنے رکھنے لگی۔ کمرہ ایسی خوشبو سے بھر گیا تھا جس میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو زیادہ نمایاں تھی۔ نہیں وہ لوگ اس قدر خوشبویات کیوں استعمال کرتے تھے۔ کمرے میں کہیں کوئی بہت ہی قوی برقی ہیٹر لگا تھا جس کی وجہ سے عمارت مکمل طور پر گرم رہتی تھی۔ میں اپنے پورے لباس میں بیٹھا تھا اور وہ رکھنے کے لیے میرے دائیں بائیں یوں پھر رہی تھی جیسے اپنے جلوے آج ہی دکھا دینے ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگا اس ماحول میں۔ دھمن میرے اس اندرونی اضطراب کو دیکھ رہا تھا اور دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اچھا بندوبست کیا ہے میں نے اس کا۔ نہ یہ ہنس سکتا ہے اور نہ رو سکتا ہے۔ دھمن کا انتخاب بے مثل تھا کہ اس نے ایسی خاتون وہاں رکھی تھی جو آدمی کی اگلوا لیتی تھی۔ اس کی ساری اچھائی اور اس کی ساری برائی چہرے پر لکھی نظر آنے لگتی تھی۔ اگر اس کے اندر دھوپ

تھی تو وہ اسے اور تاریک کر دیتی تھی۔ سلور کو دیکھ کر آدمی اپنے آپ میں نہیں رہتا تھا اور یہی اس کی خوبی تھی۔

وہ ناشتا میرے سامنے رکھ کر فوراً ہی واپس چلی گئی۔ میرے سامنے انڈے، توس، مکھن، کچھ سوڈا، کچھ لسّی قسم کی چیز اور چند پھل رکھے تھے۔

"کھائیں غلام جیلانی صاحب! جان بنائیں۔ لگتا ہے آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔"

میں نے پستول اب بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ دھمن کے تحمل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اسے غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ اشتعال نام کی کوئی چیز مجھے اس میں نظر نہ آتی تھی اور یہ بڑی ہی حیرت کی بات تھی۔ اس معاملے میں میں اس کا کسی بھی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی ایسے آدمی سے کیا کہے جس کا پتّہ ہی مر چکا ہو، جو کسی بھی بات پر مزاحمت نہ کرنا چاہتا ہو، جس نے طے کر رکھا ہو کہ دوسروں کو بھونکنے دو مگر خود ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔

میں نے ناشتے میں ہاتھ ڈال دیا مگر مجھے یہ ڈر تھا کہ اس ابلیس نے کہیں اس میں کوئی خواب آور دوا نہ ملا دی ہو۔ میرے پاس اسے دیکھنے، چکھنے اور اس سے محفوظ رہنے کا کوئی گُر نہیں تھا، پھر بھی میں نے لقمہ منہ میں ڈال لیا۔ میرا خیال ہے اس نے سلور کو کوئی خاص اشارہ نہیں کیا تھا۔

"سیزر کو ہم بڑی مشکل سے ہوش میں لا سکے ہیں۔ آخر ہوا کیا تھا؟ اسے کیا چیز کھلائی تھی آپ نے؟"

"شاید اس کے سر پہ چوٹ آ گئی ہو۔ وہ مجھ سے بھڑ گیا تھا۔" میں نے گلاس میں سوڈا بھرتے ہوئے کہا۔ ناشتا مزے دار تھا اور اس ذات بھوک نے مجھے پریشان کر رکھا تھا مگر اس سے زیادہ پریشانی مجھے اس بات پر تھی کہ وہ آخر ایسی کیا چیز تھی جس نے میرے پستول کو یوں جام کر دیا تھا کہ اس کی گولی میرے کہے میں نہیں رہی تھی۔ یہ کیا اندھیر مچ رہا تھا میرے اردگرد کہ انھوں نے مجھے یوں بے بس کر کے انگلیوں پر لپیٹ لیا تھا۔ مجھے وہ راز معلوم ہونا چاہیے تھا مگر میرا ذہن کام ہی نہیں کرتا تھا۔

"سیزر یہ کہتا ہے کہ آپ نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا تھا۔"

"وہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ گلے پر کوئی بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

"مگر وہ اس سے بے ہوش ہو گیا تھا اور آپ جانتے ہیں میں ڈاکٹر ہوں۔ اس کے گلے کی ایک اندرونی رگ پھول کر باہر آ گئی تھی اور اس کے بے ہوش ہونے کی یہی وجہ تھی۔ یہ سب کچھ آپ نے کیسے کر لیا؟"

"یہ تم مجھے آپ کہہ کر کیوں مخاطب کر رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ میں تمھارا دشمن ہوں، جان کا دشمن۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہیں یہ امریکہ ہے بڑے بھائی۔ یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ سلور کو نہیں دیکھا آپ نے؟ میں اسے آج رات تمھارے ساتھ بھیجوں گا۔ پورے شہر کی سیر کرا دے گی آپ کو۔"

"بات کو ٹالیں نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا ہوں۔"

"نہیں، اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمھارا گُردہ بیچ کر کھا لیا۔ تمھاری بہن کا گُردہ بھی ہمارے کام آ گیا اور تم ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟ دیکھو اب میں تمہیں آپ سے نہیں، تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔"

"ہاں یہ زیادہ بہتر ہے۔ مجھے تم سے یہی امید رکھنی چاہیے۔ آپ سے یہی محسوس ہوتا ہے جیسے تم مجھ سے تکلف برت رہے ہو حالانکہ میں تمھارا دشمن ہوں۔"

"چھوڑ یار! یہ دیکھ کہ تُو اب امریکہ پہنچ چکا ہے — تیرا نام غیاث احمد ہے، ولد نبی احمد اور یہ ایک نئی دنیا ہے جسے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ ہم بھی دریافت کر رہے ہیں۔ تم بھی دریافت کرو۔ کئی چیزیں ابھی تک تم نے نہیں دیکھیں، سلور کے ساتھ جاؤ گے تو وہ دکھا دے گی۔"

"اس پر لعنت بھیجو، مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"ہو گی، ضرور ہو گی۔ کیوں کہ تم اس معاشرے سے تعلق رکھتے ہو جہاں ایک حنائی ناخن بھی دکھانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خیر دفع کرو اس ذکر کو، میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے سیزر کو بے ہوش کیسے کر دیا؟ وہ بہت گالیاں دے رہا تھا تمھیں۔ کہہ رہا تھا تم اس کا پستول بھی لے گئے اور اس کی جیب سے رقم بھی نکال لی۔ بہت طیش میں تھا وہ۔ اگر تم مجھے وہ طریقہ بتا دو تو مہربانی ہو گی۔"

"کوئی طریقہ ورِیقہ نہیں ہے۔ بس ہو گیا بے ہوش وہ، اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اور مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی ورنہ تو میں تھوکتا نہ"

"اچھا کیا تم نے کہ یہاں آ گئے ہو۔ میں نے تمھارے پیچھے آدمی لگائے تھے مگر وہ تمھیں ڈھونڈ ہی نہ سکے۔ آخر تم گئے کہاں تھے؟"

مگر میں نے کفلرا اور سافنر کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔

"میں نے رات ایک عمارت کے برآمدے میں بسر کی ہے۔ پتا نہیں وہ کونسی جگہ تھی۔ صبح میں ٹیکسی لے کر ادھر آ گیا۔"

"اس گھر کا پتا تمھیں کس نے بتایا؟"

"ٹیلیفون آپریٹر نے۔ اسے تمھارا نام یاد تھا اور وہ کوئی پاکستانی ہے جو یہاں کئی سال سے رہ رہا ہے۔"

"ہوں۔ ہو سکتا ہے یہی بات ہو مگر مجھے یقین نہیں آیا۔ اگر تم ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق یہ بتا دو کہ تم سے کوئی غلطی ہو چکی

ہے تو اس کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔ بعد میں ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

"نہیں، مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ ویسے وہ چیریٹی اسپتال تم نے کس لیے کھول رکھا ہے؟"

"ہم نے پرانا دھندا چھوڑا تو نہیں ہے، اب بھی چلا رہے ہیں مگر اس میں آمدنی اب بہت کم ہو گئی ہے۔ اسی لیے ہم نے..."

"ہاں ہاں، بتاؤ نا۔ اب کیا کر رہے ہو؟" مجھے اپنی ٹانگوں سے اترے ہوئے بال یاد آئے۔ ان پر چڑھا ہوا پلستر ذہن میں ابھرنے لگا۔ "میری ٹانگوں پر تم نے پلستر کیوں چڑھوایا تھا؟"

"یہی ایک راستہ تھا تمھیں یہاں منگوانے کا اور اس کے لیے میں نے دلسن کو بڑی رقم دی تھی۔ بالآخر وہ تمھیں پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"مگر اس پلستر میں ایسی کیا خاص بات تھی؟"

"کوئی تو بات تھی جو تمھیں پلستر میں دبایا گیا تھا۔ اب ہم سے تم معاملے کی بات کرو جیلانی! ہم نے اپنا دھندا بدل لیا ہے۔"

"کیا کرتے ہو اب تم؟"

"ہم پاکستان سے ہیروئن، حشیش اور افیون منگواتے ہیں۔ تمھاری ٹانگوں پر بھی ہم نے افیون ہی بندھوائی تھی۔ وہ کوئی دس کلو تو ضرور ہی ہو گی اور اب ہم تمھیں اس کے منافع میں سے تمھارا حصہ دینا چاہتے ہیں۔ کتنی رقم لو گے تم؟"

"تو یہ بات ہے، تم نے مجھے کیریئر بنا لیا ہے میرے نہ چاہنے کے باوجود۔ ہے نا یہی بات؟"

"تم ٹھیک سمجھے ہو مگر اس سے تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ یا جی! تم پاکستان میں رہتے تو جیل میں سڑتے یا تمھیں وہ پھانسی چڑھا دیتے۔ ساری عمر تم نے کیا ہی کیا ہے؟ قتل و غارت گری مگر یہ کام اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ پکڑے جانے پر اس کی سزا پھانسی ہرگز نہیں ہے۔ یہی دو چار سال اِدھر یا اُدھر، مگر ہم نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ ہم اپنے آدمی کو چھڑانے کے لیے لاکھوں روپے رشوت میں جھونک سکتے ہیں۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے ہمارے لیے۔"

"تم ایسا کرو دھمن، تم نے مجھے تو بے بس کر ہی دیا ہے۔ میرے پستول کو بھی تم جام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سودے سے جو میرے ذریعے ہوا، تم نے بڑی رقم کمائی ہو گی۔ تم یوں کرو، مجھے وہ پاسپورٹ دے دو جس پر تم مجھے یہاں لائے ہو اور واپسی کا کرایہ۔ میں فوراً واپس پاکستان پہنچنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔"

"ایسی کیا بات ہے وہاں؟ کوئی اپنی محبوبہ چھوڑ آئے ہو وہاں؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ میری بہن آسیہ پھر جیل جا پہنچی ہے میرا ایک دوست ہے آبی، وہ بھی گرفتار ہو گیا ہے۔ ان دونوں پر قتل کے الزامات ہیں۔ میں انھیں ہر حال میں جیل سے رہا کر[...] ہوں اور اس کے بعد میری توبہ، میں باز آیا اس سارے دھند[...]"

"کونسی جیل میں ہیں وہ؟"

"راولپنڈی جیل میں۔"

"یہ تو بہت بُری خبر سنائی ہے تم نے مگر خیر اس کا حل بھ[...] سوچ لیں گے۔ بس یوں سمجھو کہ انھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا[...] ذمہ ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں سارے طریقے آزما آیا ہوں[...] مجھے جیل میں نقب لگانی ہو گی۔"

"ایسا نہیں سوچتے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تم [...] بے وقوفی اور ناتجربہ کاری کی باتیں کر رہے ہو ورنہ اگر ذرا سلیقے[...] لیا جائے تو اس دنیا میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ جب کسی کمر[...] آکسیجن ختم ہو جائے تو وہاں شمع نہیں جل سکتی مگر اس دنیا م[...] کمرے بھی تو ہیں، وہاں شمع جلائی جا سکتی ہے۔ مجھے ہی دیکھ[...] اور عالیہ پاکستان میں بہت پریشان ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ہمارا س[...] تم جیسا اناڑی اور ناتجربہ کار آدمی لگ گیا تھا۔ تم کوئی بھی حماقت[...] تھے جس سے ہم بچ جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ہم نے اپنی کرنٹی[...] دی اور سنا ہے کہ وہ تم نے خریدی ہے۔ کتنی بڑی حماقت کی تم[...] وہاں رہتے تھے۔ اس کے ایک ایک چپّے سے واقف تھے۔ ہم[...] تو اسے بلاسٹ کر سکتے تھے۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تمھیں کس[...] طرح تباہ کروا سکتے تھے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ ہر آدمی ک[...] افادیت ہوتی ہے۔ اسے ختم کر دینے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں[...] ہم نے تمھیں کچھ نہیں کہا اور اب دیکھو تم کیسے ہمارے کام آ[...] اور تمھارا مستقبل بھی بن رہا ہے۔ جانتے ہو ہم تمھیں اس سود[...] میں سے ایک لاکھ ڈالر دینا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ تم[...] کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو دھمن! مگر پیسہ میری ضرورت نہیں[...] میں اس قتل و غارت کو بھی کبھی پسند نہیں کرتا۔ تم ہی تھے جس[...] اس غلط راہ پر ڈال دیا جس کی وجہ سے لوگ میرے دشمن بن گ[...] ایسے لوگ تھے کہ انھیں ختم کر کے ہی میں زندہ رہ سکتا تھا۔ اب کوئی نہیں تو پولیس ہی میری دشمن بن چکی ہے ورنہ... ورنہ[...] آدمی تو ہرگز نہیں تھا۔ دھمن...... پہلی چوری پر میری[...] شادی نے مجھے مجبور کیا۔ کیوں کہ ہم سے کوئی شخص جہیز میں[...] روپے طلب کر رہا تھا ورنہ تو میں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ مگر اب تم[...] راستہ اور سنگلاخ بنا دیا ہے۔ میں ہر حال میں پاکستان واپس[...] چاہتا ہوں۔"

وہ بڑے اطمینان سے میری باتیں سنتا رہا مگر میں دیک[...]

[...]تی کہ اندر سے وہ بالکل ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے پھر شاید کچھ مذاق سوجھا۔ اس نے بائیں ہاتھ کی گھنٹی پھر بجا دی۔ اس پر وہ سلور [...]چہرہ دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔ میں ایک بار پھر پسینے میں نہا گیا۔ اس کو نظر بھر کر دیکھنا خود کو زبردست آزمائش میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

دھمن پھر زیر لب مسکرانے لگا۔ بولا۔ "یہ برتن اٹھاؤ سلور ادھ[...] ہمارے لیے کافی لاؤ۔ پھر صاحب کو ادھر آ کر گانا سُناؤ۔"

وہ خاتون برتن سمیٹ کر واپس گئی تو میں نے کہا۔ "کچھ شرم کرو دھمن۔ کیوں ذلیل کرتے ہو مجھے۔"

"دراصل یہ قوم ہی بے حیائی کو زیادہ پسند کرتی ہے اور میں ان کو انھی کی لاٹھی سے مارتا ہوں۔ دیکھا نہیں تم نے یہ کتنی خوش ہے۔"

"میرے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

"سوچنا کیا ہے۔ تم آئے ہو، اطمینان سے بیٹھو۔ سیر و تفریح کرو۔ پھر کام کے بارے میں بھی سوچ لیں گے۔"

پتا نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ دھمن ایک بالکل ہی بدلا ہوا انسان نظر آتا تھا۔ اس کا وہ رویّہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب بھی میرا پستول میرے ہاتھ تلے میز پر دھرا تھا مگر وہ میرے لیے بے کار ہو چکا تھا۔ کوئی بات ایسی تھی جس نے دھمن کے دل سے سارا خوف ختم کر دیا تھا اور وہی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کے سامنے مٹی کا مادھو بن کر بیٹھ گیا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ پستول کیوں کام نہیں کر رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی ورنہ وہ صبح تو بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ ہم پر اس لانسر نے گولی چلائی تھی۔ اس کا نشان بھی میں نے دیوار پر دیکھا تھا۔ اب بھی اس میں سات گولیاں موجود تھیں مگر وہ مونگ پھلی کے دانے بن گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی کام نہیں آ رہی تھی۔

"تمھیں معلوم ہے دھمن کہ یہ عارف مغربی مجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کوئی خاص بات کی ہے اس نے؟"

"ہاں، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کوئی ہیروئن کا اسمگلر ہوں۔ وہ مجھے ایک کلو کے دو لاکھ ڈالر دینے پر آمادہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم سے بالا بالا میں اس سے سودا کر لوں۔ آخر مطلب کیا تھا اس کا؟"

"پاگل ہے سالا۔ سمجھتا ہو گا کہ اس طرح وہ اپنے طور پر کما لے گا۔"

"مگر اسے تم پر اعتماد نہیں ہے۔"

"یہ بات میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کیا تم پاکستان جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں، میں یہاں نہیں رُک سکتا۔"

"تو یوں کرو کہ ابھی تو تم چلے جاؤ مگر ہمارا مال لے کر تمھیں دوبارہ یہاں آنا ہو گا۔"

"یہ میں نہیں کر سکوں گا، ناممکن۔ مجھے اس دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے غلام جیلانی! بھول جاؤ کہ تم اپنی مرضی بھی رکھتے ہو۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں غلام جیلانی اس لیے ہوں کہ میری ایک اپنی مرضی ہے، ایک اپنا وجود ہے، ایک اپنے حالات ہیں، نہیں، میں نہیں بدل سکتا۔"

"بھول جاؤ اس قصے کو۔ میں تمھیں ایک لاکھ ڈالر دے رہا ہوں۔ یہ تمھارے ہوں گے۔"

"مگر مجھے کرنا کیا ہو گا؟" میں نے انکار کو اپنی حماقت سمجھتے ہوئے کہا۔ اس کو مار دینے کا خیال بھی میرے دل سے ختم ہو گیا تھا۔ میں اس

کے سامنے تابعِ مہمل بن کر رہ گیا تھا۔

"ایک شخص ہے کشمیر خان، یہ کابل کا رہنے والا ہے مگر رہائش اس کی پشاور میں ہے۔ وہ تمھیں لاہور میں مال پہنچا دے گا اور وہ طریقہ بھی سمجھا دے گا جس سے تم وہ مال یہاں لے آؤ گے۔"

"جانتے ہیں آپ کہ پابندیاں کتنی سخت ہیں۔ امریکہ تو اس ہیروئن سے بچنے کے لیے ایٹمی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہے۔"

"مجھے معلوم ہے مگر ہم بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہیں۔ بڑے بھائی! تمھیں ساری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔"

اتنے میں ایک بار پھر دروازہ کھل گیا اور وہ دشمنِ تمکین و آگہی پھر ایک بار اندر آ گئی۔ وہ ہمارے لیے کافی لائی تھی اور گلے میں وائلن لٹکائے ہوئے تھی۔ دھمن نے اسے گانے کا حکم دے رکھا تھا۔ اب کی بار میں نے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے ہمارے سامنے کافی رکھی اور پھر دیوار کے ساتھ لگ کر وائلن بجانے لگی۔ دھمن نے واقعی وہاں الف لیلوی ماحول پیدا کر رکھا تھا اور وہ اس پر ذرّہ بھر بھی شرمندہ نہیں تھا۔

وائلن کے وجود سے کچھ ایسی اداس دُھن اُبھری کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی انگلیاں جادو جگانے لگی تھیں۔ دھمن بھی سب کچھ بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی گردن سائبیریا کی کونج جیسی تھی۔ اس نے جب وائلن کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر منہ کھولا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ دل کے تاروں کو چھیڑ سکتی ہے۔

"بڑے اداس دن آ گئے ہیں
موسمِ فراق مجھے ڈس لے گا
خزاں نے درخت اُجاڑ دیے ہیں
پت جھڑ چاروں طرف چھا گئی ہے
ہرے بھرے گلستانوں کا رنگ بدلنے لگا ہے
میں کب تک تمھارا انتظار کروں؟
میرے پیچھے بھی موت لگی ہے
ایک دن مجھے بھی مر جانا ہے۔"

یہ گیت اس نے کچھ اتنی پُرسوز لَے میں گایا کہ میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ بھی اندر سے بہت دُکھی معلوم ہوتی تھی۔ جب اس نے وائلن سے ہاتھ کھینچا اور اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوئی تو دھمن نے جیب سے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی تہ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ وہ کوئی ہزار ڈالر تو ضرور ہی ہوں گے۔

"خدا تمھیں خوش رکھے سلور! تم نے ہمارے مہمان کو خوش کر دیا ہے اور مجھے بھی۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے جناب۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نوٹ دانتوں میں پھنسا کر دائیں کندھے پر وائلن لٹکایا اور کافی کے برتن سمیٹ کر واپس چلی گئی۔

"اپنا یہ پستول مجھے دے دو۔" اس کے جانے کے بعد دھ
"اور بھول جاؤ کہ تم مجھ پر بھی گولی چلا سکتے ہو۔ آج شام جب میں سوار ہو گے تو میں تمھیں ایک تحفہ دوں گا جسے تم کبھی فرا نہیں کر سکو گے۔ ابھی اسے مجھے دے دو۔"

میں نے کہا ہے نا کہ میں اس کے سامنے بالکل ہی اگو رہ گیا تھا۔ پستول میں نے فوراً ہی اٹھا کر اسے دے دیا۔ مگر کو میں اب بھی سمجھ نہیں سکا تھا جس نے مجھے دھمن کے آگے بے بس کر دیا تھا۔

"تمھارا پاسپورٹ شام کو تمھیں مل جائے گا۔ یہاں سے تم پاکستان جاؤ گے۔ تمھارا پتا ہمیں معلوم ہے۔ کشمیر خان تم سے رابطہ کر لے گا۔ تمھیں ایک ہفتے بعد پھر یہاں آنا ہوگا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ تمھاری والدہ بھی اب تمھارے ساتھ میں اور بہن تمھاری جیل میں ہے۔ اگر اس کی رہائی چاہتے ہو تو ہم سے تعاون کرو۔ ہم اسے وہاں سے نکال سکتے ہیں۔ کبھی اپنا بھلا بھی سوچ لیا کرو۔ گولی کی سیاست ہر وقت کام نہیں آتی۔"

اس نے مجھے بالکل ہی طفلِ مکتب سمجھ لیا تھا۔ اب وہ مجھے میری والدہ کے بارے میں بھی ایک ڈھکی چھپی دھمکی دے رہا تھا مگر میں چپ رہا۔ اس کو مشتعل کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس حال میں کہ میں ابھی تک اس شہر میں قیدی کی حیثیت سے پھر رہا تھا اور اس کے سوا میرا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

"مجھے یہ بتاؤ دھمن کہ اتنے دن تم نے مجھے کس طرح بے ہوش رکھا۔ اب مجھے رہ رہ کر کسی چیز کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ آخر قصہ کیا ہے؟"

"کیا محسوس ہوتا ہے تمھیں؟"

"ایک عجیب سا تشنج جسم میں محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سر میں شدید درد اُٹھنے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جان ہی نہیں کل صبح سے میری یہ حالت ہے۔"

"اس سے بچ کر رہنا۔ تمھیں اس سیزر نے ہیروئن کی ڈال دی ہے۔ اسے میں نے ہی یہ حکم دیا تھا مگر اب جس طرح بھی اپنے آپ کو سنبھالو۔ جتنی بھی تکلیف سہہ سکتے ہو سہہ لو مگر پھر کیپسول کو ہاتھ نہ لگانا۔ چار آٹھ دن اور گزر جاتے تو تم کبھی واپس سکتے تھے۔ ہیروئن پوری طرح تمھارا حلیہ خراب کر دیتی۔ مجھے افسوس ہے مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تم ہوش میں آتے ہی شور دیتے۔ فائدے کے بجائے ہمیں نقصان کا اندیشہ تھا۔"

"ٹھیک ہے دھمن صاحب! تم واقعی بہت کاری گر

میں ہی پاگل تھا جو خواہ مخواہ تمھاری دشمنی مول لے بیٹھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ یہ چیریٹی اسپتال تم نے یہاں کیسے کھول لیا؟"

"یہ بہت ضروری تھا۔ میرا کام ہی یہی ہے۔ میں غریبوں کا علاج مفت کرتا ہوں۔ ہیروئن کی اسمگلنگ سے جو فائدہ مجھے ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ اسپتال پر خرچ کر دیتا ہوں۔"

"اور وہ گُردے؟"

"وہ دھندا ابھی شروع ہے پیارے۔ اب تم سے کیا پردہ... کوئی نہ کوئی بندہ مل ہی جاتا ہے اور گردوں کی یہاں بڑی مانگ ہے۔ اب تم جاؤ اور عالیہ سے مل لو۔ وہ تمھیں اچھے لفظوں سے یاد کرتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ لگی گھنٹی بجا دی۔ چند ہی لمحوں بعد فیدر کمرے میں داخل ہوا۔ دھمن پھر سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ ایک اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ فیدر کو دیکھے بغیر وہ بولا۔ "اب کیا حال ہے مغربی کا اور وہ ہیرلین کیسی ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں سر! ہیرلین بستر پر لیٹ گئی ہیں۔ اُن کا بازو زخمی ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔ اب تم ان صاحب کو ڈاکٹر عالیہ تک پہنچا دو۔ وہ اپنے کمرے میں ہی ہیں نا؟"

"جی سر! وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔ میں شاذلی سے پوچھتا ہوں۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم انھیں ساتھ لے جاؤ۔ میں کوئی آدھے گھنٹے بعد یہاں سے اٹھوں گا۔ ڈاکٹر عالیہ کو بتا دینا کہ ہم گیارہ بجے اسپتال جائیں گے۔" یہ کہہ کر ایک فائل اس نے اپنے سامنے رکھ لی اور پھر بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ بولا۔ "ناراض نہیں ہونا جیلانی صاحب! یہ دُنیا ایسی ہی ہے۔ بہرحال آج شام کو ہم آپ کو ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ بنوا دیں گے۔ خدا حافظ۔"

"ٹھیک ہے بھائی! تو وقت کا بادشاہ ہے۔ میری بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ خدا حافظ۔" میں نے بڑی ہی بے دلی سے اس سے ہاتھ ملایا اور فیدر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ حیرت ہے کہ میں اسے جان سے مارنے کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ کفلر سے بھی میں نے یہی کہا تھا مگر میں کچھ نہیں کر سکا۔ اُلٹا اس کا بندۂ بے دام بن کر باہر نکل آیا۔ اس کی بے پناہ خود اعتمادی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ نہ اس پر کوئی گولی اثر کرتی تھی نہ زبان سے کوئی اُسے مات دے سکتا تھا۔ وہ ایسا ابلیس تھا جس نے مجھے پروں پر ڈال رکھا تھا۔ ایسی حالت میں کہ میری ذرا سی حرکت مجھے تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی اور میں اس کا تابعِ مہمل بن کر رہ گیا تھا۔ بڑی دولت تھی اس کے پاس اور خدا خبر اس نے کہاں کہاں سے اکٹھی کی تھی۔ ہم تو اس سے کراچی میں صرف ستر لاکھ ہی بٹور سکتے تھے مگر اس کا بھی اس نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوا اور اب وہ مجھے ایک لاکھ ڈالر کے ڈرافٹ کی خوشخبری دے رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے مزید کام کروں۔ پتا نہیں وہ مجھے اب کس نسخے میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں بالکل ہی نہتا ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے دھمن نے ہر طرف سے پسپا کر دیا تھا۔

سامنے راہداری تھی اور فیدر میری رہنمائی کر رہا تھا۔ چوتھے کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گیا۔

"ڈاکٹر عالیہ اس کمرے میں ہیں۔"

"میں اندر چلا جاؤں؟"

"آپ ٹھہریں۔ میں انھیں اطلاع دیتا ہوں۔ کیا کہوں اُن سے؟"

"مجھے کیا پتا ہے۔ کہو دھمن صاحب کا ایک مہمان ان سے ملنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گیا اور پھر چند لمحوں بعد وہ باہر نکل آیا۔

"جائیں سر! ڈاکٹر عالیہ اندر ہی ہیں۔"

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس وقت عالیہ اپنے قد سے کہیں اونچے صوفے پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے قدموں کی پہلی چاپ پر اس نے کتاب الگ رکھ دی۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھی اور اس پر اس نے سرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ پوری بیر بہوٹی نظر آ رہی تھی۔ رنگ اس کا اور شہابی ہو گیا تھا۔ پہلے سے وہ کہیں زیادہ صحت مند دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک دم صوفے سے اٹھ گئی۔ اس نے بھی ہاتھ میں ویسی ہی انگوٹھی پہن رکھی تھی جیسی میں دھمن کی انگلیوں میں دیکھ چکا تھا۔ کلائیوں پر اس نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ سبز رنگ کے قالین پر میں ابھی دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ وہ خود کو روک نہ سکی اور تیزی سے میری طرف بڑھی۔

"اوہ جیلانی آپ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ یہاں کیسے آ گئے آپ؟" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کا بچھڑا ہوا محبوب سامنے آ گیا ہو۔ اس نے کوئی بہت ہی عمدہ قسم کی خوشبو لگا رکھی تھی اور کمرہ اس خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔

"مجھے فیدر نے آپ کا نام نہیں بتایا تھا۔ بیٹھیں، ادھر اس صوفے پر بیٹھیں۔ اوہ کتنی مدت کے بعد ملے ہیں آپ۔ کچھ کمزور لگ رہے ہیں مجھے۔ آپ کی پریشانی کا احساس ہے مجھے۔ شاید سیزر نے آپ کو نشے پر ڈال دیا تھا۔ آپ بولتے کیوں نہیں ہیں؟ ہمارا قصور معاف کر دیں اب۔" اس نے بڑی ہی بے چارگی سے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ "بخدا میں یہ نہیں چاہتی تھی جیلانی! میں نے اس بات کی مخالفت کی تھی مگر دھمن صاحب نہیں مانے۔ آپ کو یہاں آنے میں کوئی دِقت تو نہیں ہوئی؟ ہیرلین آپ کا بہت خیال رکھ

رہی تھی اور آپ سارا راستہ بے ہوش ہی رہے۔ کچھ پولیس نائیں پاگلوں کی طرح اس کا منہ تک رہا تھا۔ کہنے کے لیے میرے پاس کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ اس کی وہ آئینہ سی عکاس آنکھیں اور زیادہ حسین ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا کھاتی تھی۔ اسے امریکہ کی آب و ہوا ابھی کچھ زیادہ ہی راس آگئی تھی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ دھمن کی منکوحہ ہے وہ۔ اور اسے دیکھ کر میں مسحور ہوا جاتا تھا اور وہ مجھ سے میرا حال پوچھ رہی تھی۔ وہ جسے میں نے بڑی اذیتیں دی تھیں جس نے مجھے بھی زندگی کی سرحد سے باہر پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ وہ ایسی ہو گئی تھی جیسے میرے اور اس کے درمیان کوئی اختلاف ہی نہ ہو، جیسے وہ ماضی کے سارے ورق جلا کر گنگا کی لہروں میں نہا دھو کر ابھری ہو۔ اس کے سارے گناہ دھل چکے ہوں اور دلوں سے اس نے ساری میل دھو ڈالی ہو۔ میں بھی شاید ساری باتیں بھلا چکا تھا۔

"میری طرف دیکھیں جیلانی! مجھ سے ناراض ہیں آپ! مجھ سے بات تو کریں۔" اس کے لہجے میں بڑی مٹھاس پر چ گئی تھی۔

"میں کیا بات کروں عالیہ! میں... میں بہت دکھی ہو گیا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ آپ ایسی ہی ڈانس ماسٹر بن بیٹھی ہیں کہ جس طرح چاہیں مجھے نچاتی رہتی ہیں۔" میرے آنسو بہ نکلے۔ انھیں میں کوشش کے باوجود نہیں روک سکا۔ وہ کچھ آزردہ سی ہو کر میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ایسا نہ سوچیں جیلانی! مجھے معلوم ہے آپ کیا محسوس کر رہے ہیں مگر ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب کچھ آپ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے مگر ہم آپ کو اس کا معاوضہ بھی دیں گے اور یہ صرف معاوضے کی بات نہیں ہے۔ ڈیپ ڈاؤن ان مائی ہارٹ۔ میں آپ سے ملنا چاہتی تھی جیلانی! آپ شاید یقین نہ کریں، یہ دیکھیں! میں نے الماری میں آپ کی تصویر سجا رکھی ہے، یہ دیکھیں۔" اس نے دائیں ہاتھ پر ایک بڑے سے وارڈروب کا دروازہ کھول دیا اور اپنے کپڑوں کو پیچھے ہٹا کر بولی "یہ دیکھیں! یہ آپ ہی کی تصویر ہے نا! میں آپ کو بہت یاد کرتی رہی ہوں جیلانی! آپ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی آپ کو فراموش کر سکے۔"

اس کا وارڈروب دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ کوئی ننھا سا کومل پودا اس کے دل میں اُگا تھا جسے اس نے آہستہ آہستہ ثمر بار محبت کے شجر کی صورت میں پرورش کر لیا تھا۔ میں تو یہی کہوں گا حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے سخت نفرت کرتی ہو گی لیکن اس کا وہ انداز دیکھ کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ وہ مہر ہی مہر تھی اور اب وہ یاس اور آس کے درمیان ڈولتی پھر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کوک پینا پسند کریں گے؟" اس نے الماری میں سے کوک کا ڈبا نکال کر گلاسوں میں بھر دیا اور میرے ساتھ صوفے

پر بیٹھ گئی۔ بولی "بیئیں! یہ آپ کی صحت کے نام ہے۔ دھمن سے کیا باتیں ہوئیں؟ ارے اپنے آنسو تو پونچھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے پھرتی سے رومال نکال کر میرے چہرے پر پھیر دیا۔ "مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے ہیں اور کہیے کیا حال ہے آپ کا؟"

"بس ٹھیک ہوں عالیہ۔ یہ میری تصویر آپ نے وارڈروب میں کیوں لگا رکھی ہے؟"

"نہیں بتائیں گے ہم۔ کوئی کسی کی تصویر کیوں گلے سے لگا کر رکھتا ہے۔ اتنی بھی سمجھ نہیں آپ کو؟"

مجھے اس کی باتوں میں خلوص نظر آرہا تھا۔ وہ بلا وجہ مہربان نہیں ہو گئی تھی۔ کوئی بات اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ "دھمن مجھے آج شام لاہور بھیج رہا ہے۔ کہتا ہے مجھے بار بار پھر وہاں سے یہاں آنا ہو گا۔"

"میں اس سے متفق نہیں ہوں جیلانی! یہ بہت ہی خطرناک راستہ ہے۔ آپ کسی بھی ملک کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں، پھر کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکے گا۔ آپ کو چودہ سال جیل بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں ویسے ہی جیل سے بھاگا ہوا آدمی ہوں۔ مجھے ... کی سزا دی گئی تھی۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں، آپ کا پانی کی سطح پر آنا بہت خطرناک بات ہے۔ دھمن صاحب آپ سے نیکی نہیں کر رہے ہیں۔ وہ ... آدمی کو خرید سکتے ہیں، کسی بھی آدمی کو۔"

"مگر اس بہانے واپس تو جا سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے ... انکار نہیں کر سکتا۔"

"واپس تو آپ ضرور چلے جائیں مگر دوبارہ اس کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔"

"تو پھر کیا کروں میں؟ وہاں تو کشمیر خان ہے جس کی ... میں مجھے کام کرنا ہو گا۔"

"اُف میری توبہ! میں اس دھمن کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ بہرحال اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ابھی آپ کا کچھ نہیں بگڑا ... آپ بین الاقوامی قانون کے مجرم بن جائیں گے۔ سوچ لیں۔"

"مجبوری ہے عالیہ! آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ ... واپس تو بہرحال جانا ہے۔"

"آپ کی بہن کہاں ہے آج کل؟"

"وہ بیچاری پھر جیل جا پہنچی ہے۔ میں نے اس کو رہا تو کرا دیا تھا مگر وہ اپنی حماقت سے پھر قید ہو گئی ہے۔"

"مجھے ہمدردی ہے اس سے۔ کاش میں اس کی کچھ مدد کر سکتی۔ البتہ دھمن اس سلسلے میں آپ کی بڑی مؤثر مدد کر سکتا ہے۔"

"وہ کہہ تو رہا ہے مگر مجھے اعتبار نہیں آیا۔ وہ بھلا یہاں ... کیا کر سکتا ہے؟"

"وہ بہت کام کا آدمی ہے جیلانی! دیکھا نہیں آپ نے کہ کس طرح اس نے ولسن کے ذریعے آپ کو یہاں باندھ کر بلوالیا۔ اس کے ذہن کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ... یہ سیزر کے کپڑے پہن رکھے ہیں آپ نے؟" اس نے اچانک میرے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور کیا کرتا؟ اس کو بے ہوش پا کر میں نے اس کے کپڑے پہن لیے۔ ایسے تو میں باہر نہیں آسکتا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ بولی "آپ فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کے لیے تین چار جوڑے خرید لیے تھے اور وہ ابھی ادھر ہی ہیں۔ پچھلے اسٹور روم میں صندوق کے اندر پڑے ہیں وہ۔ میں آپ کو نکال دیتی ہوں۔ آپ نہا دھو کر انھیں پہن لیں۔ اتاریں اس حبشی کا لباس۔"

"تو گویا آپ کو معلوم تھا کہ میں ایک دن یہاں ضرور آؤں گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر آپ جب اچانک ہی غائب ہو گئے تو پھر ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ اچھا ہوا کہ آپ واپس آگئے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید پولیس اسٹیشن جا پہنچتا۔ سیزر بہت ہی نکما آدمی نکلا۔" پھر وہ عقبی دروازہ کھول کر اسٹور روم میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو وہ دو سوٹ... اٹھائے ہوئے تھی جن کے ساتھ ایک اوور کوٹ بھی تھا۔ جوتے میرے پاس موجود تھے۔ قمیصیں، بنیانیں اور زیر جامے بھی ساتھ تھے۔

میں اٹھ کر غسل خانے میں جا گھسا اور خوب مل مل کر نہایا پھر سوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔

وہ بڑی ناقدانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی "اللہ! کتنا سجتا ہے یہ آپ کو۔ آپ کے ناپ کا مجھے صرف اندازہ ہی تھا مگر وہ ٹھیک ہی نکلا۔" وہ میرے چاروں طرف بڑی تیزی سے گھوم گئی اور پھر مجھے اس نے دھکیل کر آئینے کے سامنے کر دیا۔ اس ایک گھنٹے کے دوران میں کیلے ہوئے سانپ کی طرح ذہنی طور پر ایک ہی طرف جھکتا چلا گیا تھا۔ مجھے ہر طرف عالیہ ہی عالیہ دکھائی دے رہی تھی۔ کمرہ اس کے وجود سے بھر گیا تھا اور میرا دل بھی۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ عالیہ اس طرح بھی مجھ پر مہربان ہو سکتی ہے۔ میرے ذہن میں تو اس کا خاکہ ایک زہریلی ناگن کا سا تھا۔ پھر اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی بات بھی مجھے قابل اعتراض نہ لگی تھی اور میں منہ بندھا شیر ہو کر اس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ شاید میں خود بھی ناچنے کے موڈ میں تھا۔

دن کے گیارہ بج گئے تھے اور اسے یاد آیا کہ دھمن کے ساتھ بھی جانا ہے۔ وہ اٹھی اور اس نے انٹرکام پر دھمن سے کہہ دیا کہ وہ گھر پر آرام کرنا چاہتی ہے، باہر نہیں جا سکے گی۔ کیوں کہ اس کی طبیعت بوجھل ہے۔ دھمن اس کا ایسا مطیع اور فرمانبردار تھا کہ اس نے کوئی اعتراض ہی نہیں کیا، نہ وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں آیا۔

اس دوران میں اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں اور میری بپتا بھی بڑی توجہ سے سُنی۔ دوپہر ہوئی تو عالیہ نے انٹرکام پر کسی رد تھیمن سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، میں ساحل پر جاؤں گی۔ پھر اس نے کھانا منگوالیا۔ وہ تمام عمدہ قسم کا تھا۔ کچھ امریکی ٹیٹروں کا گوشت تھا اور اسے وہ گوشت بہت پسند تھا۔ میرے لیے اس نے خاص طور پر توے کی روٹی پکوائی اور حد یہ ہے اس نے ایسا مکھن منگوایا جو خالصتاً پاکستانی معلوم ہوتا تھا کہ اس میں سے ابھی تک لسی کی باس آرہی تھی اور وہ خوش تھی، بہت خوش۔ جیسے کوئی لمبی جُدائی کا مارا ہوا آدمی اچانک اس پہاڑ کو گرانے میں کامیاب ہو جائے جو اُس کی راہ روکے ہوئے تھا۔ — پتا نہیں اتنی ساری چاہت میرے لیے اس کے دل میں کیسے اُمڈ آئی تھی۔ وہ شاید ماضی کے ہر ہر لمحے میں اس بات پر پچھتاتی رہی تھی کہ اس نے مجھے کیوں کھو دیا۔ میری کس بات نے اس کے دل میں پیار کا وہ پودا پیدا کر دیا تھا جو اَب تناور درخت بن چکا تھا؟ کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ جس جیلانی کو وہ جانتی تھی، وہ ان کے لیے آندھی طوفان بن کر آتا تھا۔ اس نے کبھی انھیں چین نہیں لینے دیا تھا۔ پھر بھی وہ میری اسیر تھی .... مجھے بڑی حیرت تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ شاید وہ دھمن کے نئے کاروبار میں میری شراکت کے لیے ایسا کر رہی ہے مگر اس خیال میں کوئی جان نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ تو خود مجھے اس کام سے بچ جانے کی نصیحت کر رہی تھی۔ وہ مجھے دوبارہ کسی قانونی شکنجے میں پھنستا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ عجیب سی پُراسرار ہمدردی اس کے دل میں میرے لیے اُبھر آئی تھی۔ اس کے بارے میں شاید میں اب تک شدید بدگمانی میں مبتلا رہا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ عورت کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور ادھر امریکہ میں تو یہ بات زیادہ ہی صحیح تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ امریکی طرز کا لباس زیب تن کر کے میرے ساتھ دوسرے پورچ میں نکلی جہاں اب ایک کار کھڑی تھی اور اس کا حبشی ڈرائیور رد تھیمن دروازے کھولے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ عالیہ کو دیکھ کر ایک دم باہر نکلا اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بولا۔

"کہاں چلنا ہے میڈم؟"

"ذرا ساحل تک چلو۔ ہمارے یہ مہمان سیر کرنا چاہتے ہیں۔"

میں کار کے دوسرے دروازے سے پچھلی سیٹ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ مجھے سیر کے لیے لے جا رہی تھی۔ اپنی عنایتوں سے اس نے میرا تو دامن بھر دیا تھا۔ وہ میرے دشمنوں کی سدھائی ہوئی عالیہ۔ وہ میرے خون کی پیاسی عالیہ مگر وہ مہربان ہوئی تو اس نے ساری دشمنیاں بھلا دیں۔ کوئی ایسا کہاں کر سکتا ہو گا پھر بھی میرے ساتھ

ایسا ہو چکا تھا اور میں تہ دل سے اس کا شکر گزار تھا۔

وہ اپنے بنگلے سے نکل کر سیدھی فشرمینز وہارف کی طرف نکلی اور وہاں سے ساحل کی طرف چل دی۔ روتھمین اس کا اشارہ سمجھتا تھا۔ پوچھے بغیر وہ آگے نکلتا چلا گیا مگر اچانک راستے میں عالیہ کو کوئی نکتہ یاد آیا تو اس نے گاڑی پیچھے موڑنے کو کہا اور کچھ دیر تک ہم ہلٹن ہوٹل اور اس کے گرد و نواح کی سیر کرتے رہے۔ یہ وہ ہوٹل ہے جس میں کم و بیش دو ہزار کمرے تو ضرور ہی ہوں گے۔ اس کی عمارت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہاں سے ہم آگے نکلے تو عالیہ نے گاڑی کا رخ گولڈن گیٹ برج کی طرف کر دیا۔ یہ دنیا کے طویل ترین پلوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے جس کی لمبائی کوئی ایک میل تو ضرور ہی ہوگی۔ دو منزلہ پل ہے اور آدمی کی صنعت کا کمال۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر اسے دیکھتا چلا گیا۔

عالیہ میری اس حیرانی پر خوش ہو رہی تھی۔ بولی "آپ یہاں آئے ہیں تو اس شہر کو دیکھ تو لیں۔ آج شام کو آپ واپس جا رہے ہیں یہ ہے نا یہی بات؟"

"ہاں عالیہ! اور اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ہامی کیوں بھر لی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ میرے بارے میں یوں سوچا کرتی ہیں اور وہ تصویر جو آپ کے وارڈروب میں ٹنگی ہے، اس نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی آدمی کو واقعی اچنبھا ہونے لگتا ہے ورنہ میں سوچتی تھی کہ میں جیسے ہی آپ کے سامنے آئی آپ مجھے گولی مار دیں گے۔ تھا نا یہی ارادہ آپ کا؟"

"ہاں۔ میں شاید پاگل ہو گیا تھا۔ نفرت پاگل پن کی دلیل ہی تو ہے ورنہ لوگ ایسے نہیں ہوتے جیسا دوسرے انھیں سمجھتے ہیں اور پھر عورت کے دل کا بھید کسی نے پایا ہی نہیں۔"

"مرد بھی ایسے ہی ہوتے ہیں انھیں عورتوں نے ہی جنا ہوتا ہے جیلانی صاحب! ویسے میں یہاں بہت خوش تھی مگر اب شاید خوش رہنا ممکن نہ رہے۔ آپ مجھے پہلے سے زیادہ یاد آئیں گے۔"

پل کی سیر کے بعد اس نے پھر گاڑی کا رخ ساحل کی طرف موڑ دیا اور ہم کسی جگہ رکے بغیر بہت آگے جا نکلے۔ ایسی جگہ جہاں آبادی نہیں تھی۔ گاڑی میں روتھمین بیٹھا رہا اور ہم کھاڑی کا نظارہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ساحل کی ریت تک جا پہنچے اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔

میں نے سگریٹ سلگایا تو اس کی بو سونگھ کر عالیہ بولی "آپ نے کبھی کنگ اسٹارک کا سگریٹ پیا ہے؟"

"نہیں تو۔ کوئی خاص بات ہے اس میں؟"

"ہاں۔ میرا بڑا بھائی وہی سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے تو وہ دن مجھے خواب سے لگتے ہیں۔ ہم ایک بہت ہی تنگ سی گلی میں رہتے تھے۔ گھروں کا پانی یوں ہی گلیوں میں کھلا پھرتا تھا۔ نہیں تھی وہاں اور پتا نہیں میری ماں نے وہاں کتنا عرصہ گزارا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں جب آٹھویں میں پہنچی تو میرے والد فوت ہو گئے۔ ہائے کتنا شوق تھا انھیں کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر بن جائے۔ میرے یوسف کو تو پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔ کچھ گھر کے حالات بھی نہیں تھے جس سے بددل ہو کر اس نے سریے کی مل میں نوکری تھی۔ ہم ان دنوں شالامار ٹاؤن میں رہتے تھے۔ وہ جو لاہور سامنے ہے۔ میرے والد فوت ہوئے تو گھر کا سارا بوجھ یوسف پر آ پڑا۔ اسے دن رات سریے کی مل میں کام کرنے کی وجہ سے وہ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں پسینے میں نہا جاتا تھا۔ میں جب مل کے سامنے سے اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد گزرتی تھی تو دیکھ کر مجھے بہت ترس آتا تھا مگر چھوڑیں جیلانی صاحب! میں بھی باتیں لے بیٹھی ہوں کوئی اور بات کریں۔"

"نہیں نہیں۔ بتائیں مجھے کہ پھر کیا ہوا؟"

"میں نے جب دسویں کا امتحان دیا تو میرا بھائی ٹی بی کا مریض ہو چکا تھا۔ اس سے مل کی محنت برداشت نہیں ہوئی۔ وہ دن رات کھاؤں کھاؤں کرتا رہتا تھا۔ پھر وہ ایک دن عاجز آ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ دوا اسے دے ہی نہیں سکتے تھے۔ دوائیں اس دور میں بھی بہت تھیں اور آپ جانیں حکیم بے چارہ اس کا کیا علاج کرتے۔ وہ آنے کی دوا کا مرض تو نہیں ہوتا نا اور جب یوسف بھائی فوت ہوئے روز میرا نتیجہ نکل رہا تھا۔ میں اپنا نتیجہ سن کر خوشی خوشی گھر آئی۔ ماں کی بالیں بیٹھا دیکھ کر وہیں دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے لیے کر سکی اور وہ بے چارہ دم دے گیا۔ ہمارے گھر میں ایک کھیل تک نہ وہ دن بڑا ہی منحوس تھا جیلانی صاحب! بہت ہی منحوس دن تھا۔ ہمارے ماموں باغبانپورہ میں رہتے ہیں۔ اچھا کاروبار ہے ان کا۔ تجہیز و تکفین انھی کے خرچ پر ہوئی اور پھر ہمارے تمام اخراجات کی ذمے داری انھوں نے اپنے سر لے لی۔ تھے تو وہ چٹے ان پڑھ تعلیم کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نرسنگ میں داخلہ لے رہی ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اللہ رکھا نام تھا بیچارے بے اولاد ہی مر گئے۔ نرسنگ میں داخلہ ملنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کا خرچ چلانے کے قابل ہو گئی۔ وظیفہ ان دنوں مجھے خاصا مل جاتا تھا مگر میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ہم اتنے غریب تھے عید شبرات کے دن نئی چوڑیوں کو ترستی رہتی تھی مگر صاحب کہ مجھے پتا بھی نہیں ہے کہ میرے پاس کتنا روپیہ ہے۔ حلال کی کمائی کا نہیں ہے مگر ہے تو میرا اور یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے نے مجھے اتنی دولت دے کر کس آزمائش میں ڈالا ہے۔ بالآخر وہی کرے گا نا۔ مگر اس دولت تک میرا

نے اپنی روح کا سودا دھمن سے کر لیا اور اس کی قسمت میں بہت ہے۔ سیدھے طریقے سے خدا اسے کبھی کچھ دیتا ہی نہیں اور جو دیتا ہے اس سے دھمن کا گزارا نہیں ہوتا۔ وہ پھر خدا سے منہ موڑ کر پرانے راستے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے عالیہ کہ آپ دھمن سے خوش نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے جیلانی صاحب۔ مگر میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں۔ ایسے میں میں کہاں جا سکتی ہوں۔ کوشش کے باوجود میں اس سے منہ نہیں پھیر سکتی۔"

"آخر آپ کو اس پر اعتراض کیا ہے؟"

"کوئی ایک اعتراض ہو تو بتاؤں۔ وہ ڈاکٹر نہیں ہے مگر ڈاکٹر بنا ہوا ہے۔ اس نے انسانی اعضا کو کاروبار کی شکل دی۔ ڈھیروں روپیہ کمایا ہے۔ کسی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کوئی اس کے پاس گردے کی تکلیف کا مریض آتا ہے تو وہ اس کا گردہ ہی نکال لیتا ہے اور پھر بیچ دیتا ہے۔ وہ دھندا ذرا ٹھنڈا ہوا تو اب اس نے ہیروئن کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ مختلف لوگوں کو وہ پاکستان سے مریض کی صورت میں یہاں اپنے چیریٹی اسپتال میں منگوا چکا ہے اور ہر مریض کے ساتھ کم از کم دس کلو ہیروئن اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ آپ کی بھی تو ٹانگوں پر پلستر چڑھایا گیا تھا۔ کئی ایسے ہیں جن کے پیٹ چاک کر کے ان میں ہیروئن اس طرح بھر دی جاتی ہے کہ کوئی شک ہی نہیں کر سکتا۔ مریض کے کاغذات پر اورینٹل چیریٹی اسپتال کی مہر ہوتی ہے، جسے بہت سے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔ چندہ مل جاتا ہے۔ حکومت امداد دیتی ہے۔ کوئی ایک پاکھنڈ تو نہیں پھیلا رکھا ہے اس نے مگر یہ سب کچھ ہیروئن کے لیے کیا جا رہا ہے۔"

"سان فرانسسکو میں اس آدمی کا نام بتا سکتی ہیں آپ، جو دھمن سے مال خریدتا ہے؟"

"نہیں، اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مریض کو کراچی میں تیار کیا جاتا ہے۔"

"کیا ولسن بھی کچھ نہیں جانتا؟"

"اسے سب کچھ معلوم ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ ایسی باتیں نہ سوچیں۔ جن لوگوں سے امریکہ میں دھمن کا واسطہ ہے وہ آپ کو ایک منٹ میں ختم کر سکتے ہیں۔ ایسی بات خواب میں بھی نہ سوچیں۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو یہاں تک پہنچایا ہے وہ بھی لگ ہوں گے۔ ان سے بچ کر رہیں۔ کوئی سافنر بھی ملی تھی

اچانک عالیہ نے مجھ سے ایسا سوال پوچھا جس کے بارے کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ میں نے ان کا ذکر ان کے سامنے نہ عالیہ کے سامنے، پھر وہ کیسے جان کی بھی تھی۔

"آپ کو اس کا نام کس نے بتایا ہے؟" میں نے خود کو ایک دم سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اس نے فون کیا تھا مجھے۔ کہہ رہی تھی کہ کوئی غیاث صاحب ہیں جو آج رات میرے فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہ آپ کا نام لے رہے ہیں۔"

"اوہ، تو یہ کون عورت ہے؟"

"یہ بھی اسی گروہ کی فرد ہے اور وہ کفلر بھی۔ میرا خیال ہے کفلر آپ کو یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"دراصل ان لوگوں نے آپ کو جلدی ڈھونڈ لیا تھا اور پھر وہ سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگے رہے۔"

"مگر وہاں سافنر کے فلیٹ پر گولی بھی چلی تھی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"دراصل وہ انتھونی اور لانسر کوئی بہت ہی گھٹیا قسم کے چور ہیں۔ انھوں نے سافنر کو اور کفلر کو وہ ہیرے چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سافنر کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ اس گروہ میں شامل ہونے اور اتنی مالدار ہونے کے باوجود شاپ لفٹنگ سے باز نہیں رہتی ہے۔ یہ اس کی ایک ہابی ہے، ایک شغل ہے جس میں وہ بازار جاتے ہی مصروف ہو جاتی ہے مگر وہ اب تک پکڑی نہیں گئی ہے، ہر بار کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کے فلیٹ پر انتھونی اور لانسر نے اس بریف کیس کے لیے حملہ کیا تھا۔ سنا ہے وہاں کوئی ہیرل بھی تھا جسے آپ نے بے ہوش کر دیا تھا۔"

"ہاں، یہ درست ہے مگر یہ ساری باتیں آپ کو کیسے معلوم ہو گئیں؟ یہ کوئی بہت ہی لمبا چکر نظر آتا ہے۔"

"چکر تو کوئی نہیں ہے جیلانی صاحب! دراصل ہم سب چور ہیں۔ جس کو جو کچھ ملتا ہے وہ اٹھا کر بھاگ نکلتا ہے۔ بہرحال میں آپ سے یہ کہہ رہی تھی کہ حالات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ جو جہاں ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ جن حالات کا آپ کو سامنا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ آپ چپ چاپ دھمن کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں۔"

"مگر آپ تو پہلے کہہ رہی تھیں..."

"وہ میرا ذاتی خیال تھا۔ مجھے آپ سے گہری ہمدردی ہے جیلانی صاحب! میں... شاید آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"وہ تو میں سمجھ ہی رہا ہوں عالیہ۔ اس میں شک و شبے کی بات ہی نہیں رہی۔" میں نے ایک اونچی اٹھتی ہوئی لہر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ لہر پلٹ رہی تھی۔ نچلی چٹانوں سے سر پھوڑ کر وہ سمندر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ شاید میرا بھی یہی حال تھا۔ میں بھی شاید پیچھے

ہٹ رہا تھا مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں نے ان سانپوں کی بامبی دیکھ لی تھی۔ اس ڈرامے کے بہت سے کردار میرے سامنے آ چکے تھے اور ایک کردار کو میں گھیر گھار کر ایسے مقام پر لے آیا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر سچ بولنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ میں اس کے کمرے میں آ رہا ہوں۔ اس نے وارڈروب کے خانے میں میری تصویر کپڑوں کے پیچھے کچھ ہی دیر پہلے لٹکائی تھی۔ تاکہ وہ کہہ سکے کہ وہ تو ایک عرصے سے میرے عشق میں گرفتار ہے۔ وہ مجھے پھر ایک نئے فریب میں مبتلا کر رہی تھی۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ میں ان کے لیے نیک فال ثابت ہوا ہوں۔ لاکھوں ڈالر کا فائدہ میں انھیں ...... پہنچا چکا تھا اور اس میں سے وہ مجھے صرف ایک لاکھ ڈالر دینے پر آمادہ تھے مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی تھی کہ مجھے پھر سان فرانسسکو آنا ہوگا۔"

یہ بڑی زیادتی کی بات تھی یارو! وہ حرام خور مجھے استعمال کرنے سے اب بھی باز نہیں آ رہے تھے۔ ان کے رویّے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ دھمن سراپا مٹھاس بن گیا تھا جیسے اس کے منہ میں کوئی دانت ہی نہیں تھا۔ اس کے پوٹے میں کوئی زہر ہی نہیں تھا۔ وہ ایسا بن گیا تھا جیسے وہ کاٹ ہی نہ سکتا ہو اور اب عالیہ بھی یہی ثابت کر رہی تھی کہ وہ بالکل معصوم اور میری بڑی ہمدرد ہے لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ غلاظت کی کتنی بڑی پوٹ ہے۔

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب تو مجھے ہر حال میں دھمن کا ساتھ دینا ہوگا۔ میری کوئی اپنی مرضی کہاں رہ گئی ہے پھر عالیہ یہ دیکھیں کہ اس میں نفع کتنا ہے۔ ایک لاکھ ڈالر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"خیر ستّر لاکھ روپیہ تو آپ نے کراچی میں ہم سے دھروا لیا تھا جیلانی صاحب! کیوں جھوٹ بول رہے ہیں آپ؟ اس کا کیا کیا آپ نے؟ وہ روپیہ کہاں ہے اب؟"

"وہ ... وہ میں نے یوں ہی دوستوں میں بانٹ دیا۔ کچھ آ بی لے گیا۔ کچھ میں نے یوں ہی خیرات کر دیا۔ چھوٹی سی رقم تھی وہ۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ وہ چھوٹی سی رقم تھی! گویا دس زندگیاں ختم ہو جائیں تو بھی وہ اتنی رقم کما کر نہیں دے سکتے۔ آپ ہیں کس خیال میں؟ ویسے دھمن کو بہت طیش آ رہا تھا مگر آپ کچھ زیادہ ہی تیز نکلے۔ وہ اب تک اس رقم کو نہیں بھول سکے ہیں۔ جب کبھی اسے یاد کرتے ہیں تو ایک ہوک سی اٹھتی ہے ان کے دل میں۔ پتا ہے وہ بہت کنجوس آدمی ہیں۔"

"ہاں، بات تو یہی لگتی ہے مجھے۔ عالیہ آپ اس لباس میں بہت ہی خوب صورت نظر آ رہی ہیں۔ بخدا آپ کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ مجھے کبھی نہ بھول سکے گا۔"

"چھوڑیں بھی! آپ کہاں ہم جیسوں کو گھاس ڈالتے ہیں۔"

وہ ایک ادائے ناز سے بولی "چلیں دیر ہو رہی ہے۔" وہ ... ہوئے اٹھ گئی۔

اچانک مجھے اپنے قریب ہی ایک پتھر لڑھکنے کی آواز ... دی۔ میں ایک دم تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اب عالیہ ... کی طرف دیکھ رہی تھی اور میں بھی۔ ہمارے بائیں ہاتھ تین ... ہمیں گھور رہے تھے، یوں جیسے ہم کوئی واقعی ہنسنے ہنسانے ... ہوں۔ پتھر انھوں نے ہی ہماری طرف پھینکا تھا۔ ان پر ہماری ... تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"ہیلو انڈین! مزے ہو رہے ہیں؟" ان میں سے ایک ... سفید دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ ان کے لباس ایسے تھے جیسے ... ہاں ریلوے کے خلاصی پہنتے ہیں۔ بلیو جینز اور جیکٹ۔ پاؤں ... انھوں نے بڑے سفید جوتے پہن رکھے تھے اور وہ ہمارے ... اس طرح کھڑے تھے کہ اگر وہ چھلانگ لگاتے تو سیدھے ہمارے ... آ گرتے۔

"کیا ہے بھئی، کیا دیکھ رہے ہو؟ کوئی خاص بات ہے؟"

"یہاں سے بھاگ چلو جیلانی! یہ بہت خبیث لوگ ... راہ چلتے لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں اور ہم بالکل نہتے ہیں۔" عالیہ ... ان سے خوفزدہ ہو کر کہا۔ کار ہماری اس وقت بہت پیچھے سڑک ... کھڑی تھی۔

"مشورے ہو رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔ اور یہ ہار ... یہ لاکٹ، یہ گھڑی اور نقدی ادھر کر دو۔ سمجھے تم۔ نکالو باہر جو کچھ ..." ان میں سے ایک نے پتلون میں دبا لمبا خنجر باہر نکالتے ہوئے ... "یہ دیکھو! یہ نو انچ تک اندر چلا جاتا ہے۔ اس سے ہم ہر قسم کا ... مار لیتے ہیں۔ کیوں نیوٹن؟" اس نے اپنے ایک دوست کو ... مار کر پوچھا۔

وہ دونوں اور زیادہ وحشیانہ انداز میں ہنسنے لگے۔ ان میں ... ایک نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو فرانسس۔ یہ کام تو اپنا یہ ننھا ایڈ... بھی کر سکتا ہے۔" ایڈورڈ ان سے قد میں سب سے کم دکھائی ... میرا خیال ہے وہ تینوں پیے ہوئے تھے ورنہ اتنی دیدہ دلیری ... حرکتیں نہ کرتے۔"

میں نے اپنی گھڑی کلائی سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی ... طرح عالیہ بھی اپنی طلائی چوڑیاں اتارنے لگی۔ چار اس نے ... میں دے دیں۔ اب وہ باقی چوڑیاں اتار رہی تھی کہ فرا... دم اوپر سے نیچے چھلانگ لگا دی مگر وہ ابھی خود کو سنبھا... سیدھا نہیں ہوا تھا کہ میں نے گھڑی اور چوڑیاں بہتر جانتے ... بڑھتے ہوئے اس کی دائیں کلائی پکڑ لی جس میں ... وہ اس سے میری ہنسلی کی ہڈی کاٹ دینا چاہتا تھا، جب ہی ...

"تمھاری یہ ہمت! یو ڈرٹی سوائن۔" اس نے پورے زور سے ... کر اپنی کلائی چھڑانی چاہی مگر میں اس وقت تک اس پر آسنا دباؤ ... ڈال چکا تھا کہ اس کا جوڑ کھل گیا۔ وہ چیختا چلاتا ہوا خنجر چھوڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ یوں جیسے میں نے اسے ذبح کر دیا ہو۔ میں نے اس کا خنجر اٹھایا اور تڑپ کر چٹان سے خاصا پرے ہٹ گیا۔ عالیہ بھی دہشت زدہ ہو کر پانی کی طرف نکل گئی۔ فرانسس کا یہ حال دیکھ کر نیوٹن اور ایڈورڈ نے چٹان پر سے یوں چھلانگ لگائی کہ اگر میں پیچھے نہ ہٹتا تو وہ میرے اوپر آ پڑتے۔ اب خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں بھی خنجروں سے مسلح تھے۔ جن کی ساخت ایسی تھی کہ اندر جاتے ہوئے بھی گوشت کاٹتے تھے اور باہر آتے ہوئے بھی بوٹیاں ساتھ لے آتے تھے۔ ان کا خم اور چمک دمک دیکھ کر آدمی کا دل دہل جاتا تھا۔ ویسا ہی ایک خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ غالباً ایسے خمدار خنجر ملایا میں بنائے جاتے ہیں۔ ان کو میں نے ایک پرانے فوجی کے پاس دیکھا تھا جس نے دوسری جنگِ عظیم میں خدمات انجام دی تھیں۔

اب وہ دونوں دائیں بائیں سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ شاید مجھے مار دینا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی ہی خونخوار درندگی اور چمک ابھر رہی تھی۔

"یو ڈرٹی انڈین ..... کم آن! وی ول کل یو۔" مجھے ان کے یہ الفاظ اب بھی حرف بہ حرف یاد ہیں۔ دونوں یک زبان ہو کر یہ بات کہہ رہے تھے۔

"بکواس بند کرو۔ میں انڈین نہیں، پاکستانی ہوں اور تمھیں آج سبق سکھا کر رہوں گا۔ آؤ، آگے آؤ۔" میں نے خنجر کو دائیں سے بائیں ہاتھ اور بائیں سے دائیں ہاتھ میں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں بڑے ہی غنڈے اور لچر قسم کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے رنگ افریقی حبشیوں جیسے تھے۔ ہمیں اس چٹان کی اوٹ میں تنہا دیکھ کر ہم پر پل پڑے تھے۔ ایک کو تو میں نے رگید ڈالا تھا مگر دو سامنے تھے اور بہت بری طرح ہنکار رہے تھے۔

وہ نیوٹن تھا جس نے سب سے پہلے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی۔ فاصلہ میرے اور ان کے درمیان یہی کوئی پانچ فٹ کا ہوگا کہ اس نے بدن کو تول کر اوپر اٹھایا اور تیر جیسی تیزی سے خنجر سیدھے ہاتھ میں لے کر کئی ہاتھ اوپر اچھل کر وہ مجھ پر اس طرح گرا کہ اس کے دونوں پاؤں میرے سینے پر پڑے اور سیدھا ہاتھ میری بائیں پسلی کی طرف لپکا۔ چھلانگ اس کی بہت ہی کاری تھی مگر اس کے داؤ کو سمجھ کر میں نے اس کے نیچے گرتے ہی بایاں ہاتھ اس طرح کھول لیا کہ اس کی خنجر والی کلائی کو میں نے نیچے نہیں آنے دیا، راستے میں ہی پکڑ لیا۔ ... تنومند اور طاقتور جوان تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو ... اس کی کلائی ہاتھ میں لے کر میں پہلو کے بل اٹھا اور اپنا خنجر میں نے اس کی شہ رگ میں گھونپ دیا۔ سارا معاملہ ایک ہی لمحے میں ختم ہو گیا۔ وہ گردن کٹے ہوئے بکرے کی طرح چیخا اور الٹ کر منہ کے بل گر گیا۔ اس کا خون ایک دھار کی صورت میں بہ نکلا تھا۔ میں نے فوراً ہی خنجر کھینچ لیا۔ ایڈورڈ ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا تھا مگر جیسے ہی نیوٹن کا خون اس نے دیکھا، وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹا اور تیزی سے چٹان کی طرف بڑھا مگر وہ ابھی چار ہاتھ ہی اوپر اٹھا ہوگا کہ میں نے پیچھے سے جا کر اس کی ٹانگ کو جھٹکا دے کر کچھ اس طرح کھینچا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پہلو کے بل نیچے گر گیا۔ خنجر اس نے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ نیچے گرا میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر سر کے بل کھڑا کر دیا مگر وہ جان کے خوف سے سخت مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر کچھ اس طرح مجھے جھٹکا دے کر اپنی ٹانگیں چھڑائیں کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کے دونوں ٹخنے میرے ہاتھ سے چھوٹے تو اس نے فوراً ہی اپنا خنجر دانتوں سے نکال لیا۔ اب وہ گٹھری سی بنا مجھے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا میں نے پوری قوت سے اس کے سینے پر لات جمائی۔ وہ الٹ کر پھر چٹان سے جا ٹکرایا مگر اس ذرا سی مہلت سے اس نے فائدہ اٹھایا اور پلٹ کر خنجر اس طرح مجھ پر چلایا کہ بس ایک انگلی برابر فرق رہ گیا ورنہ خنجر نے میری پسلی چھید ڈالی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس کے تیور دیکھ کر میں نے اپنا خنجر نوک سے پکڑ کر اس طرح اس کی طرف پھینکا کہ اگر وہ فوراً ہی پہلو نہ بدل لیتا تو میرا خنجر سیدھا اس کے سینے میں جا دھنستا اور مجھ سے یہی سب سے بڑی غلطی ہوئی۔ خنجر چٹان سے ٹکرا کر اس کے پاؤں میں جا پڑا تھا۔ ایڈورڈ نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے ذرا سا نیچے جھک کر وہ خنجر اٹھا لیا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے پوری تیزی سے عالیہ کی طرف لپکا۔ یوں لپکا کہ چند لمحوں تک تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کر کیا رہا ہے؟ عالیہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر پہلے تو پانی کی طرف بھاگی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ پلٹ کر سامنے کی چٹانوں کی طرف لپکی مگر ایڈورڈ کی رفتار کا وہ کہاں مقابلہ کر سکتی تھی۔

وہ ابھی اس تک پہنچ نہیں پایا تھا کہ میں اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ اتنا فاصلہ پیدا کر گیا تھا کہ پیشتر اس کے کہ میں اس تک پہنچ سکتا، اس نے عالیہ کو جا لیا اور ایک خنجر دانتوں میں دبا کر بائیں ہاتھ سے عالیہ کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اب اس کا دایاں ہاتھ آزاد تھا اور اس میں وہ خنجر لیے ہوئے تھا۔ وہ چیخ کر بولا۔

"تم اگر آگے آئے تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ واپس چلے جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" مگر میں نے سُنی اَن سُنی کر دی، بلاخیز رفتار سے میں اس تک جا پہنچا اور ذرا سا فاصلہ دے کر میں اچھل کر ان دونوں پر جا پڑا، اس

طرح کہ ایڈورڈ عالیہ کو سنبھال نہ سکا اور اسے بالوں سے پکڑے پکڑے وہ زمین پر گر گیا۔ وہ اتنا سخت جان تھا کہ منہ میں پھنسا خنجر ابھی تک اس نے دانتوں تلے دبا رکھا تھا اور اپنا دوسرا خنجر وہ عالیہ کے پیٹ پہ چلا ہی رہا تھا کہ میں نے درمیان میں اپنی ٹانگ پھنسا دی۔ ہاتھ اس کا نیچے تو گرا مگر وہ ریت میں گڑ کر رہ گیا۔ یہ ذرا سی مہلت میرے لیے بہت کافی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا اور اس کی رگِ احساس پوری قوت سے مسل دی۔ اس نے فوراً ہی سر ڈال دیا اور بھول ہی گیا کہ اس کے ساتھ دو جوان اور بھی تھے اور اس نے ایک خاتون کو پکڑ رکھا تھا جس کا پیٹ وہ پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ ایڈورڈ کا منہ کھلا تھا اور وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

عالیہ اس کی گرفت سے چھوٹ کر ایک دم اٹھ گئی۔ اس کا لباس ریت میں لتھڑ گیا تھا مگر اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ڈری سہمی ہوئی میرے ساتھ کھڑی ہو گئی اور یوں ایڈورڈ کو دیکھنے لگی جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

"اوہ، جیلانی! یہ کیا ہو گیا ہے؟ آپ نہ ہوتے تو میں آج ختم ہو گئی تھی۔" اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ وہ بُری طرح رونے لگی تھی۔

"وہ چوڑیاں کہاں ہیں؟"

"وہ ... وہ تو میں نے جیب میں ڈال لی تھیں اور آپ کی گھڑی بھی۔ پر وہ ... وہ آدمی تو شاید مر چکا ہے۔" اس نے روتے روتے جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکال لیا۔ چوڑیاں اور گھڑی میرے سامنے تھیں اور وہ نیوٹن کو دیکھ رہی تھی۔

"آؤ، اسے دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں عالیہ کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ نیوٹن کی طرف بڑھا۔ خنجر نے اس کی ہنسلی کے اندر کا حصہ کاٹ دیا تھا البتہ شہ رگ بچ گئی تھی۔ وہ شدید زخمی تھا مگر اس کا علاج ہو سکتا تھا لیکن میں اس کو ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ "آؤ عالیہ، یہاں سے اب نکل چلو۔" میں نے فرانسس کو دیکھنے کے لیے چٹان کے آس پاس دیکھا مگر وہ وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ابھی اس کے ہاتھ پیر سلامت تھے۔ وہ فرار ہو سکتا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف نکلا ہے۔ اس نے مجھے نئی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں عالیہ کو ہمراہ لے کر وہاں سے نکلا اور چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اوپر جا چڑھا۔ ہماری گاڑی وہاں سے کوئی دو فرلانگ دور تھی۔ عالیہ کا دم پھولنے لگا تھا۔ وہ کپڑوں سے ریت جھاڑتے ہوئے میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔

"وہ شخص جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا بچ جائے گا نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، بچ جائے گا۔ میں نے اس پر نسخہ نمبر تیرہ استعمال کیا ہے۔ مگر آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟" میں نے عالیہ کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے آنسو اب خشک ہونے لگے پھر بھی وہ کبھی ہنستی تھی اور کبھی رونی صورت بنا لیتی تھی صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

"بہت ہی درندہ قسم کا آدمی تھا وہ بیگرد۔ ایسا ہوتا اس نے میرے بالوں پہ کر میرا سر حل کر رہ گیا۔ جیلانی اگر تو کیا ہوتا؟ میں تو اس خیال سے ہی لرز رہی ہوں۔" اب حوصلہ عود کر آیا تھا اور وہ زیادہ دل جمعی سے پاؤں اٹھانے لگی۔

"میرا خیال ہے آپ کو چلنے میں کچھ دشواری ہو رہی ہے۔"

"جی نہیں، اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ [illegible] نے تو ہمیں ذلیل کر دیا ہے۔ یہ اسی طرح اکیلے دُکیلے آدمی کو [illegible] سے سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ اُف میری توبہ! امریکیوں [illegible] یہ نیگرو کینسر بن گئے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے نا، ان کی جڑیں اب بھی افریقہ ہیں جہاں پر آنے والے ہر اجنبی کا گوشت پکا کر کھا جاتے تھے۔ اس ظلم کا بدلہ لے رہے ہیں جو گوروں نے ان کے ساتھ کیا۔"

"مگر ہم نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟"

"ہم بھی ان کے لیے گوروں کے ساتھی ہیں۔ یہ ان [illegible] انتقام لینے میں اب کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ شکر کریں کہ نکل آئے ہیں۔" اب ہم گاڑی تک پہنچ چکے تھے اور شکر ہے جسم پر نیوٹن کے خون کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ روتھین [illegible] رہا تھا۔ اسے جگا کر ہم کار میں جا بیٹھے۔

"جلدی چلو روتھین! بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ بولی [illegible] شاید ساحل پر دو گھنٹے گزارے تھے۔ اس میں وہ لڑائی بھی شامل جس کو عالیہ شاید زندگی بھر نہ بھلا سکے۔ "مجھے ڈر ہے کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔"

"ڈر تو مجھے بھی ہے مگر خیر، فکر کی کوئی بات نہیں [illegible] کا ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ اس کا بندوبست [illegible] گا۔ بہرحال ہوئی ہمارے ساتھ بہت بُری ہے۔" روتھین اردو سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے ہم آزادی سے بات کر سکتے تھے۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کا پستول کہاں ہے، وہ جو آپ نے لانسر سے چھینا تھا؟" عالیہ نے ایسی بات [illegible] جس کا مجھے وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اسے معلوم کر چکی ہے۔

"بڑی ہی عجیب باتیں کرتی ہیں آپ۔ کس نے بتایا [illegible] میرے پاس پستول بھی تھا؟"

"وہ ... وہ سافنر ... میں نے آپ کو ...... بتایا تو تھا [illegible] نے مجھے فون کیا تھا۔"

میں شرمندہ سا ہو کر بھاگتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگا۔

نے بٹیائے ہوئے لہجے میں کہا: "وہ پستول مجھ سے دھمن صاحب نے رکھوا لیا تھا۔ میں نے ان پر گولی چلانا چاہی مگر وہ چلی ہی نہیں۔ پتا نہیں ایسی کون سی قوت ہے ان کے پاس۔" میں نے اب کی بار اس [illegible] بڑے احترام سے لیا تھا۔ یہ عزت اس نے خوامخواہ ہی پیدا کر دی تھی ورنہ میں قطعی اسے قابلِ احترام نہیں سمجھتا تھا اس کتے کو جس کی طمع بے حد و حساب بڑھ چکی تھی اور وہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کے کلیے کا پابند نہیں تھا۔ اسے صرف پیسہ اور پیسہ چاہیے تھا۔ خواہ اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ گولی کیوں نہیں چلی؟"

"میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں حالانکہ چند منٹ پہلے وہ پستول ٹھیک کام کرتا تھا۔ میں نے ہیرلین پر گولی چلائی تھی۔"

"اوہ میرے اللہ! تم کیسے سنگدل ہو۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا؟" عالیہ نے مجھے تعجب سے دیکھا۔

"وہ ... وہ میرا کہنا نہیں مان رہی تھی، بہرحال وہ زیادہ زخمی نہیں ہوئی۔ بازو کی کھال ذرا ادھڑ گئی تھی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہو گی۔"

"تو گویا دھمن کو آپ پھر بھی زیر نہیں کر سکے۔" اس نے اپنی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے کہا۔ اس میں بھی ایسا نگینہ لگا تھا جو بڑی چکاچوند پیدا کر دیتا تھا، ہاتھ کی طرف متوجہ کرتا تھا۔

"بات تو یہی ہے۔ میرا خیال ہے میرا پستول اس وقت بھی ٹھیک تھا۔ بعد میں اس نے اپنا پستول نکال لیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنا پستول اسے دے دوں۔ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی مگر یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ آخر ایسی کیا بات ہے دھمن میں کہ پستول اسے دیکھ کر گنگ ہو جاتا ہے؟"

"یہ آپ نے اس سے پوچھا ہوتا۔ میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"وہ کہہ رہا تھا کہ آج شام مجھے ایک ایسا تحفہ دے گا جسے میں کبھی بھی خود سے جدا نہ کر سکوں گا۔"

"ایسے ہی کہہ رہا ہو گا۔ کیا تحفہ ہو سکتا ہے وہ؟ زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ ہو گا، ہنڈی کی شکل کا۔"

"خیر دیکھیں گے کہ کیا تحفہ دیتا ہے۔ ان حبشیوں نے تو ہماری سیر بالکل ہی خراب کر دی۔"

"میں خود پریشان ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ فرانسس کہیں کوئی اور ... مصیبت نہ کھڑی کر دے۔"

"مگر اسے ہماری کار کا نمبر معلوم نہیں ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہے وہ کہ دونوں کوئی پاکستانی تھے مگر اس سے کیا ہوتا ہے بھلا۔ پاکستانی تو یہاں بہت سے ہوں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"چھوڑیں، خدا کے لیے آج کے واقعے کے بارے میں معافی مانگیں۔ کیا [illegible] تھا ہم اگر اپنی چوڑیاں اور یہ گھڑی انھیں دے دیتے۔ بیچارے شہدے سے لگتے تھے اور یہ گھڑی بھی تو آپ نے سیزر سے چھینی تھی۔ بہت گالیاں دے رہا تھا وہ آپ کو۔ کہتا تھا کہ میں گلا گھونٹ دوں گا ... اس کا میں نے دل میں کہا، پہلے تم اپنے گلے کی خیر مناؤ۔ وہ تو گردنوں کا بادشاہ ہے۔ چھوتے ہی بندے کا منکا توڑ دیتا ہے۔ یہی کیا تھا آپ نے اس کے ساتھ؟"

"لعنت بھیجیں اس پر۔ بہت دکھی کر رکھا تھا اس نے مجھے .... سمجھتا ہی نہیں تھا کہ کسی معزز آدمی کو یوں ذلیل نہیں کرتے ہیں۔ اُلٹا مجھے اس نے کیپسول پر ڈال دیا تھا۔"

عالیہ ہنسنے لگی، بے تحاشا ہنسنے لگی۔ روتھین بھی اس کی ہنسی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"وہ ... وہ سیزر بار بار اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ کہتا تھا، دیکھو جی میری رگ پھول گئی ہے۔ اس سؤر کو تو میں گولی مار دوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں! مجھے کھڑے کھڑے اس نے بے ہوش کر دیا۔ یہ کیسے کر لیتے ہیں آپ؟" اس نے اپنا پرس بند کر دیا اور گھڑی میری طرف بڑھا دی۔ اس کا سارا غصہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ساحل کے واقعے نے اسے جو صدمہ پہنچایا تھا وہ اس سے جانبر ہو چکی تھی۔

"کسی دن میں آپ کو تجربہ کروا دوں گا۔ بے فکر رہیں۔"

وہ چپ ہو گئی اور باہر خلا میں گھورنے لگی۔ اس کے ذہن میں نجانے کون سی سوچیں آباد ہونے لگیں تھیں۔ پھر وہ اس وقت ہی چونکی جب روتھین گاڑی کو اندر لے جا رہا تھا۔ اس وقت دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ عالیہ کے ساتھ جب میں اندر پہنچا تو اس نے جاتے ہی انٹرکام پر معلوم کر لیا کہ دھمن اس وقت تک واپس نہیں آیا تھا۔

"چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ضرور منگوا لیں اور یہ کپڑے بدل لیں۔ مجھے بھی یہ لباس تبدیل کرنا ہو گا۔ ان حبشیوں نے ہمیں اس لباس میں دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔ آپ کو بائی دی وے کونسا رنگ پسند ہے؟"

"وہ سلور ہے نا، اس نے جس رنگ کا لباس پہنا تھا، وہ رنگ زیادہ پسند ہے۔" میری یہ بات سن کر عالیہ کے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ وہ بھنویں سکیڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ "آپ نے سلور کو دیکھا ہے؟"

"ہاں ہاں، میری صبح اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ گانا بھی وہ بہت اچھا گا لیتی ہے۔ صبح اس نے خزاں اور جدائی کا گیت گایا تھا اور دھمن کی موجودگی میں۔"

"اوہ، ڈیم اِٹ۔ میں کسی دن اسے گولی مار دوں گی۔ دھمن کو اس نے بالکل ہی بگاڑ دیا ہے۔ خیر دیکھ لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے میں جا گھسی۔ غصے میں وہ اور زیادہ حسین دکھائی دیتی تھی۔

جب میں بھی لباس تبدیل کر چکا تو اس نے قہوہ منگوا لیا اور پھر

شام پانچ بجے تک ہم یونہی بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ڈر ہمیں یہی تھا کہ وہ حبشی کہیں پولیس کو اطلاع نہ کر دیں۔ فرانسس نے وہاں سے بھاگ کر ہمارے ذہن میں کئی خدشے پیدا کر دیے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح پولیس کو اطلاع کر سکتا تھا مگر خیر ہوئی، وہ پولیس تک نہیں پہنچا اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے ساتھی کا علاج ہو سکا کہ نہیں اور یہ اچھی بات تھی۔ مجھے تو بہر حال اسی شام کراچی کے ہوائی جہاز پر سوار ہو جانا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے دھمن واپس آ گیا اور سیدھا عالیہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ہیلو مسٹر غیاث احمد! کیا حال ہے آپ کا؟" اس وقت عالیہ دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی اور وہ بہت ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں دھمن صاحب! کیا پروگرام ہے پھر؟"

"پروگرام بالکل ٹھیک ہے۔ یہ لیں، یہ ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ۔ یہ غلام جیلانی کے نام کا ہے۔ کوئی اُسے رد نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر ڈرافٹ اس نے مجھے دے دیا۔ "اور یہ لیں آپ کا ٹکٹ، یہ رہا آپ کا پاسپورٹ۔ یہ غیاث احمد کے نام کا ہے۔ آج سات بجے کی پرواز سے آپ واپس جا سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ فوراً ہی کشمیر خان سے رابطہ قائم کریں گے۔ وہ خود آپ کو فون کرے گا۔ اسے میں نے اطلاع دے دی ہے۔ باقی باتیں وہ آپ کو خود ہی سمجھا دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بہر حال تیار ہوں۔"

"اتنی بات یاد رکھیں کہ ہمیں آپ کے مکمل تعاون کی ضرورت ہے، آدھے پونے تعاون کی نہیں۔ اپنے سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کر آپ کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا ورنہ شاید میں آپ کی حفاظت نہ کر سکوں۔۔ ایک بہت بڑا راز آپ کے ہاتھ آ گیا ہے اور اس کی قیمت جان ہے۔" یہ بات اس نے بہت سنجیدگی سے کہی۔ اتنی سنجیدگی سے کہ میں اپنی جگہ لرز کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت انگیز چمک اُبھر آئی تھی۔

"میں سمجھ رہا ہوں دھمن صاحب! کام آپ نے واقعی بہت ہی خطرناک شروع کر رکھا ہے۔ ایک طرح سے آپ نے قانون کو للکار رکھا ہے مگر میں ہر حال میں آپ سے تعاون کروں گا۔ آپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہوں گا۔"

"میرا کوئی نقشِ قدم نہیں ہے۔ یہ کاروبار ہی ایسا ہے۔ اس میں اصل چیز احتیاط ہے۔ ہمیں اپنے راز کی ہر حال میں حفاظت کرنی ہوگی۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آسیہ اور آپی کے بارے میں آپ کچھ کر سکیں گے؟"

"ہاں، میں نے کہا تھا اور اس کا بھی میں کوئی بندوبست کر لوں گا۔ جلد ہی آپ کو کوئی اچھی خبر ملے گی۔ میں نے پاکستان میں اپنے آدمی سے کہہ دیا ہے۔ وہ دھیان رکھے گا۔"

"اس سلسلے میں مجھے کس سے بات کرنی ہوگی؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ وہ آدمی خود ہی آپ سے مل لے گا۔ بہر حال میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ عین ممکن ہے آسیہ رہا ہو کر سسر... کے گھر پہنچ جائے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ آپ نے کسی تحفے کا مجھ سے ذکر..."

"وہ تحفہ یہی تھا، یہ ڈرافٹ۔ روپے کا کوئی بدل نہیں... بہت بڑی رقم ہے۔ کیوں عالیہ؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں بھلا کیسے آپ سے اختلا... سکتی ہوں۔ میں کوئی سلور تو نہیں ہوں۔" عالیہ نے جان بوجھ... کی دُکھتی رگ پکڑ لی۔ وہ جھنجلا گیا بولا۔ "شٹ اپ۔ تم ایسے وہم میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ سلور از سلور، ناٹ گولڈ۔ اینڈ عالیہ... میری ملازمہ ہے اور بس۔ میرا خیال ہے ان حضرت نے... کیا ہے۔ کیوں جیلانی صاحب؟"

"جی نہیں، میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا۔ یہ خود ہی... بیٹھی ہیں۔ بہر حال اب چھ بج رہے ہیں۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"ہاں کوئی سامان ہو تو باندھ لیں۔"

"نہیں، یہ ڈرافٹ ہی بہت کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی عالیہ آپ ہی انھیں ہوائی جہاز... کرا دیں۔"

"نہیں آپ خود ہی انھیں ہوائی اڈے لے جائیں، میری... ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بہانہ بنا رہی تھی۔ دھمن نے بھی اصرار نہ...

"اور سنو دھمن! آج ایک بڑا خوفناک واقعہ ہو گیا ہے۔ ہم سیر... لیے ساحل پہ گئے تھے۔" عالیہ نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ...

"اچھا، پھر کیا ہوا وہاں؟" دھمن نے عالیہ کی سنجیدگی... دیکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا۔ اس نے میری... بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ورنہ میں عالیہ کو منع کر دیتا۔

"ہم پر تین نیگرو جوانوں نے حملہ کر دیا۔ وہ خنجروں سے مسلح تھے۔"

"حملہ کر دیا! کمال کرتی ہو تم۔ کیا چاہتے تھے وہ؟"

"وہ ہم سے نقدی، گھڑیاں اور زیورات مانگ رہے تھے۔"

"اوہ، ڈیم اِٹ! کون لوگ تھے وہ؟ پھر کیا ہوا؟ جلدی... میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔" اس نے سلگتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

"جیلانی صاحب کو ان کا یہ انداز ناگوار گزرا۔ بڑی لڑائی ہوئی جس میں ان کا ایک آدمی شدید زخمی ہوا۔ اس کی گردن میں خنجر لگ... تھا۔ دوسرے کی کلائی ٹوٹ گئی اور تیسرے کو انھوں نے بے... جس کی کلائی ٹوٹی تھی وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اوہ، مائی گاڈ! تو یہ گُل کھلایا ہے تم نے۔ کیا ضرورت... جانے کی؟ جانتی بھی ہو کہ شہر کے لُچے لفنگے وہاں پھرتے...

...ہی شتر بے مہار ہیں۔ پھر کیا ہوا؟" دھمن شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"پھر کیا ہوتا، ہم سیدھے گھر واپس آ گئے مگر مجھے ڈر ہے کہ بات پولیس تک جا پہنچے گی۔"

"یہ تو ہوگا ہی۔ ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا۔ دوسرے کا بازو ٹوٹ... تیسرا بے ہوش ہو گیا تو بات ڈھکی چھپی کیسے رہ سکتی ہے۔ آپ... نہیں آتے جیلانی صاحب! کیا ضرورت تھی ان سے اُلجھنے کی۔ کچھ دے دلا کر جان چھڑا لی ہوتی۔"

"پھر تمھاری بیوی تمھیں صحیح سلامت واپس نہیں مل سکتی تھی۔ پھر میں بھی ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا اور کبھی سر اٹھا کر نہ چل سکتا۔ تم بھی مجھے طعنے دے دے کر زچ کر دیتے۔" میں نے اس کے طنز سے پریشان ہو کر کہا۔

"ٹھہرو، میں معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فون کی طرف بڑھا اور نمبر گھما کر اس نے سامئن کا نام لیا۔

"ہے سامئن! تم ابھی تک ساحل پہ بیٹھے ہو؟... کوئی خاص خبر؟... کیا کیا! کوئی نیگرو زخمی ہو گیا ہے... مگر ہوا کیا تھا؟... پولیس کا کیا خیال ہے؟" اس نے کوئی بات کی تو دھمن نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

"یہ سامئن تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"اس نے کہا ہے کہ وہ کوئی پاکستانی جوڑا تھا، جس کا اتا پتا نہیں مل رہا۔ اس پاکستانی نے اسے زخمی کیا ہے۔ ایک آدمی وہاں بالکل بے ہوش حالت میں ملا ہے۔ پولیس ان دونوں کو اسپتال لے گئی ہے مگر وہ ابھی تک کچھ نہیں کر سکے ہوں گے۔"

"تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے دھمن؟ لعنت بھیجو ان پر۔ میں تو اب واپس جا ہی رہا ہوں۔"

"ہاں اور یہ اچھی بات ہے۔ عالیہ تو خیر اب گھر پہ رہتی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس اُس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے گی۔ اچھا تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ عالیہ بھی اٹھ کر باہر چلی گئی تو میں نے اِدھر اُدھر کمرے میں ٹٹولنا شروع کیا۔ مجھے دھمن نے بالکل ہی نہتا کر دیا تھا اور یہ بات کسی بھی طرح میرے حق میں نہیں جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ عالیہ کے کمرے سے مجھے کوئی ایسی چیز مل جائے جو میں ہتھیار کے طور پر اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ کوئی خنجر، کوئی چاقو میرے پاس ضرور ہونا چاہیے تھا۔ میرا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ میں خود یہ سوچتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو امریکہ جا کر اپنے ان دشمنوں کو نیست و نابود کر دوں۔ میری ساری پریشانیوں کا اصل سبب وہی تھے مگر میں ان کے سامنے پہنچتے ہی ایسا مٹی کا مادھو بن گیا تھا کہ مسلسل ان کی ہاں میں ہاں ملاتا جا رہا تھا۔ میرا پستول بھی اس شخص نے بیکار کر دیا تھا۔ اندازہ میرا یہی تھا کہ عالیہ بھی اسی طرح پستول کی گولی کو بیکار کر سکتی ہے جس طرح دھمن نے کی تھی۔ اسی لیے میں نے اس پر پھر کوئی وار کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اب یہ موقع مجھے پھر کہاں مل سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے ہی تھے مگر میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک تدبیر میرے ذہن میں یہ بھی تھی کہ میں انھیں ان کے مال سمیت کسی جگہ ... پولیس کے حوالے کر دوں۔ یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی۔ لاہور میں کشمیر خان موجود تھا۔ اس کو وہاں پھنسایا جا سکتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ دھمن کا کوئی ایسا مال میرے سامنے نہیں تھا اور نہ مجھے وہ جگہ معلوم تھی جس کی میں پولیس کو اطلاع دے سکتا۔ سارے ہی پتے ان کے ہاتھ میں تھے اور میرا غیظ و غضب بتاشے کی طرح گھل گیا تھا۔ میں ان کے خلاف اب تک کچھ بھی نہیں کر سکا تھا مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ عالیہ نے الگ میرے دل پر ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اس نے کچھ اس طرح سے مجھے نرم کر دیا تھا کہ اتنا سارا موقع ملنے کے باوجود میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکا تھا مگر منصوبہ ان کا وہی تھا۔ وہ مجھے اب نئے کاروبار میں ڈال رہے تھے تاکہ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ عالیہ نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کفلر اور سافنر ان کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے مجھے اسپتال سے غائب ہونے کے چند ہی منٹ بعد تلاش کر لیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ایک بریف کیس کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے ورنہ شاید وہ خود ہی مجھے ساتھ لے کر رات کو ہی دھمن کے پاس پہنچ جاتے۔ سب کچھ ہی الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں تیزی سے کمرے کی تلاشی لے رہا تھا۔ جگہ جگہ میرے ہاتھ پڑ رہے تھے۔

اچانک میں نے بیڈ کی نچلی دراز کھول لی۔ اس میں عالیہ کے دو پستول پڑے تھے اور دونوں کے ساتھ ان کے سائلنسر بھی تھے۔ میں نے فوراً ہی ایک پستول اٹھا لیا۔ کچھ گولیاں الگ رکھی تھیں۔ وہ بھی میں نے جیب میں ڈال لیں۔ عالیہ ابھی تک باہر تھی ——

میں نے پستول کھول کر دیکھا۔ اس میں چھ گولیاں موجود تھیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ عالیہ کسی ہتھیار کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

پستول مل جانے پر مجھے دلی اطمینان حاصل ہو گیا اور میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ میں عالیہ کو اب بالکل ہی ختم کر دینا چاہتا تھا مگر اس کے لیے مجھے کوئی موقع مل جانا چاہیے تھا کہ میں وہاں سے بغیر کسی دقت کے نکل سکوں۔ پاسپورٹ مجھے واپس مل چکا تھا اور کراچی کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی میرے پاس موجود تھا۔ میں ان دونوں کو ختم کر کے کسی بھی ہوائی اڈے پر پہنچ سکتا تھا۔ سب سے زیادہ فکر تو مجھے پاسپورٹ ہی کی تھی جو مجھے مل چکا تھا۔

میرا ذہن کسی بھی طرح یہ بات تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وہ دونوں

گولی کے سامنے ناقابلِ شکست ہو چکے ہیں اور کوئی انھیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ساحل پر عالیہ جس طرح خوفزدہ ہو کر بھاگی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے بھی زخم آسکتا ہے۔ گولی یا خنجر اس پر بھی اثر کرسکتی ہے مگر میں نے وہ موقع کھو دیا اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ مجھے اس خوفزدہ اور ڈری سہمی عورت کو قتل کر کے کو … نی ہوتی۔ پھر اچانک میرا ذہن آسیہ اور آبی کی طرف پلٹنے لگا۔ کون ان اذیتوں کا تو شمار ہی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ میری وجہ سے خواہ مخواہ اس عذاب میں پھنس گئے تھے اور دھمن یہ کہتا تھا کہ وہ ان کو رہائی دلا سکتا ہے عین ممکن ہے کہ وہ انھیں رہائی دلوا سکتا ہو۔ آبی اندھا ہو چکا ہے۔ اسے علاج کے بہانے جیل کا ڈاکٹر یا کوئی ایسا ہی اور آدمی اسپتال منتقل کروا سکتا تھا۔ آسیہ کو بھی اسی بہانے جیل سے نکال کر کسی ڈاکٹر کے حوالے کیا جاسکتا تھا۔ ان دونوں کی موت کا تصدیق نامہ بھی لیا جاسکتا تھا۔ انھیں قطعی طور پر بے ہوش کر کے کوئی بھی ڈاکٹر یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں مر چکے ہیں اور اس طرح ان کی "میتوں" کو اسپتال سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر دھمن اپنی جگہ ایک بہت ہی بااختیار آدمی تھا۔ اگر وہ امریکہ میں ایک چیریٹی اسپتال کھول کر لوگوں سے بے شمار چندے اور دوسری مراعات حاصل کرسکتا تھا اور اتنی زیادہ تعداد میں افراد کو اور محکموں کو بے وقوف بنا سکتا تھا تو کیا اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان دونوں بدنصیبوں کو جیل سے رہائی دلوا دے۔ امکان یہی غالب تھا اور مجھے اس کی بات میں بڑا وزن دکھائی دیتا تھا۔ میں انھیں قتل کر کے کیا حاصل کرسکوں گا؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک آدمی کو مار دینے سے تو کسی پرانے زخم کا بدلہ نہیں لیا جاسکتا ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ انھیں کسی لمبے پچھتاوے میں مبتلا کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اگر وہ میرے کسی کام نہ آسکا تو پھر مجھے اس کو ختم ہی کر دینا ہوگا مگر ابھی نہیں۔ مجھے اپنا ہاتھ روک لینا چاہیے۔ میں ان پر یہی ظاہر کروں تو اچھا ہے کہ میں ان کے ساتھ مکمل تعاون کر رہا ہوں۔ یہی بہتر ہے ورنہ وہ چونک کر، بدک کر مجھ پر کوئی ایسا وار کرسکتے تھے کہ میں وہیں چت ہو کر رہ جاتا۔ میری کوئی داد فریاد بھی نہیں سن سکتا تھا وہاں۔ کون تھا وہاں جو مجھے پناہ دیتا یا میری میت کو نہلا دھلا کر زمین میں اتار دیتا۔ مجھے کوئی ایسی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

عالیہ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو میں حیران رہ گیا۔ وہ ایسی بن سنور کر آئی تھی کہ اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟ وہ مردود تو ختم ہو گئے جیلانی! ویسے یہ بات کہوں گی غیاث احمد کہ تم ہو دلیر آدمی۔"

"جی، بہت شکریہ۔ اب بس آپ مجھے اچھی اچھی دعاؤں سے رخصت کر دیں۔" اس کو قتل کرنے کے جو منصوبے میں بنا رہا تھا، وہ سب … کے دھرے رہ گئے۔ وہ ایسی ہی تھی کہ اس کو مار دینا

کوئی بہادری کی بات نہیں تھی مگر اس کے اندر جو لالچ بھ… آدمی کو پریشان کر دیتا تھا۔ دولت کا لالچ جس کے لیے اس … پاپڑ بیلے تھے۔ پتا نہیں کس کس کے گردے وہ نکال کر … علین اسی وقت دھمن واپس آگیا۔ بولا "چلو بھئی … وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب اسے اجازت دو عالیہ! خدا … کہو اسے۔"

"ہاں، میری طرف سے اجازت ہے انھیں۔ آپ … گاڑی نکلوائیں۔ یہ ابھی آتے ہیں، میں ان سے ایک خاص … چاہتی ہوں۔"

"جیسے تمھاری مرضی بھئی۔ دیکھو اپنے ساتھ کوئی ہتھیار … ہوائی جہاز میں سوار مت ہونا۔ وہ گرفتار کرلیں گے تمھیں … کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ کوئی چیز تو نہیں ہے تمھارے پاس؟"

"وہ تو تم نے صبح ہی — مجھ سے الگ رکھوالی تھی … کوئی ہتھیار میرے پاس کہاں سے آسکتا ہے۔"

"ہاں اس بات کا بہت دھیان رکھنا۔ اچھا میں … انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی آجاؤ۔ چھ دس ہو چکے ہیں۔"

وہ اسی وقت باہر نکل گیا تو عالیہ آہستہ آہستہ میری … بڑھی اور میرے سامنے قالین پر دوزانو ہو کر بولی "جیلانی … آپ کے ذہن کو پڑھ رہی ہوں۔ آپ ہم دونوں کو ہلاک کر… ہیں۔ میں کمرے کے باہر سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں چھو… عدسہ دروازے میں ایسا لگا ہے کہ اس میں سے کمرے کا منظ… صاف نظر آجاتا ہے۔ تم نے میرا پستول نکال لیا ہے۔ گولیاں … اس کے ساتھ تھیں۔ کیا واقعی تم مجھے قتل کرسکتے ہو؟"

اوہ میرے پروردگار! اس نے مجھ پر ایسا وار کیا تھا کہ … پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ اتنا اچانک اور ایسا بے ساختہ سوال تھ… میں اس کا کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس نے نقش… لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے چپ چاپ اس کا پستول نکا… اس کے سامنے قالین پر رکھ دیا مگر میری نگاہیں اوپر نہیں اٹھ…

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں عالیہ! اس کے سو… اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں واقعی یہی سوچ رہا تھا…"

"یوں نہیں سوچتے ہیں جیلانی! کبھی کبھی کسی کو معاف … میں آدمی کو وہ لذت ملتی ہے جو خون بہانے میں بھی نہیں ملتی … آپ سے ہماری یہ نئی دوستی بھی قطعی طور پر کاروباری نوعیت … مگر اب کی بار اس میں محبت بھی شامل ہے۔ اسے یاد رکھیں اور … سمجھیں کہ اگر آپ کا کوئی نقصان ہو گیا تو مجھے خوشی بھی ہو سکتی ہے … بات کہہ رہی ہوں۔ ہم دونوں کو آپ تہ دل سے معاف کر دیں۔"

"ٹھیک ہے عالیہ! میں نے آپ کو معاف کیا۔ بالکل معاف…

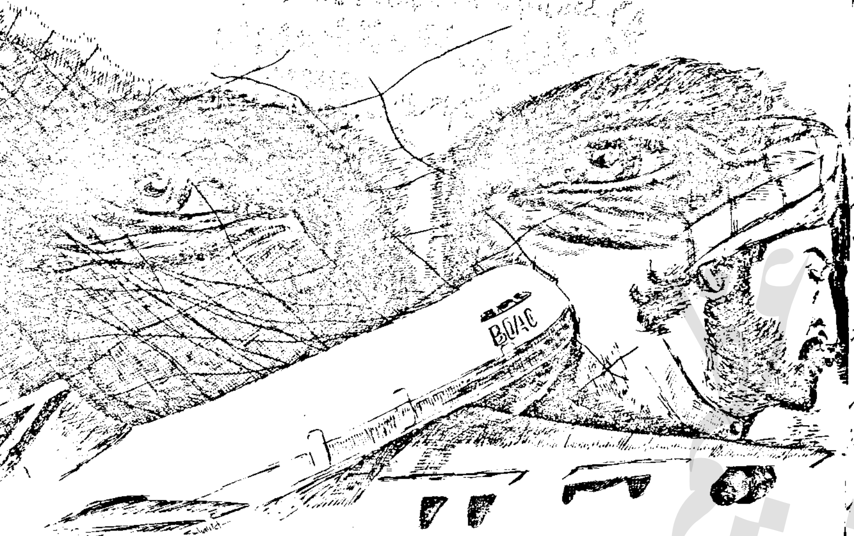

اب پھر کبھی میں انتقام کی بات نہیں سوچوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا آپ سے۔"

"آپ کی آنکھیں بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ یہ لیں، یہ انگوٹھی میری طرف سے آپ کے لیے بیش بہا تحفہ ہے" تا اس نے اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی اتار کر میرے سامنے رکھ دی۔

"یہ ایسی دھاتوں سے بنی ہے جیلانی اور یہ ایسی ایجاد ہے جس پر امریکی لوگ فخر کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اس میں کوئی ایسی چیز رکھی ہے اس کے نگینے میں کہ اس کی موجودگی میں آدمی پر گولی اثر نہیں کرسکتی۔ یہ پستول اور رائفل کی گولی کو اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتی۔ صبح تم نے دھمن پر پستول تان لیا تھا مگر تمھاری گولی اپنی جگہ جام ہو کر رہ گئی۔ یہ سب اسی نگینے کا کرشمہ تھا کہ تم دھمن کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ ویسی ہی انگوٹھی ہے جو میں نے پہن رکھی ہے۔ میں بھی گولی کو بے کار کر دیتی ہوں، چاہو تو آزمالو یہی وہ تحفہ ہے جو دھمن تمھیں دینا چاہتا تھا مگر اس کی نیت بدل گئی۔ اب میں یہ تمھارے تحفظ کے لیے پیش کرتی ہوں۔"

"اوہ، تو یہ بات تھی۔ عالیہ آپ کا میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ میں اسے واقعی خود سے کبھی جدا نہ کرسکوں گا۔"

اس نے وہ انگوٹھی میری انگلی میں اپنے ہاتھ سے پہنائی اور بولی: "یہ آپ کو گولی کی موت سے بہرحال بچاتی رہے گی۔ یہ امریکی پولیس کے اعلیٰ افسروں کو فراہم کی گئی ہے۔ شاید فوجیوں کو بھی دے دی گئی ہو۔ اسے بہت سنبھال کر رکھیں۔ یہ آپ کو میری یاد دلاتی رہے گی اور اسے دھمن کو مت دکھائیں۔" وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی اور میرا یہ حال تھا کہ مجھے اپنی ساری پچھلی زندگی بے کار نظر آنے لگی تھی۔ آدمی کی بدگمانی اسے کیا سے کیا بنا دیتی ہے، کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اسے معاف کر دوں، دھمن کو بھی معاف کر دوں۔ حالانکہ … حالانکہ اسے میری زندگی پر پورا اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ دھمن بھی مجھے صبح ختم کرسکتا تھا مگر اس نے بھی مجھ سے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی اور عالیہ تو مجھ پر بہت ہی مہربان ہو گئی تھی، اتنی مہربان کہ اس نے بلا تاخیر وہ انگوٹھی مجھے پہنا دی جس کی وجہ سے وہ خطرے سے محفوظ ہو جاتی تھی۔

میں کوئی دو منٹ اور وہاں رکا اور اس سے رخصت ہو کر باہر نکل گیا۔ پورچ میں دھمن میرا انتظار کر رہا تھا۔

"یار بڑی دیر لگا دی تم نے۔ کیا کرتے رہے ہو تم اتنی دیر؟"

میں نے اپنا رومال بائیں ہاتھ میں اس طرح لے رکھا تھا کہ انگوٹھی پر اس کی نظر نہ پڑے۔

دھمن خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اپنے شوفر کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ گاڑی اس بنگلے سے باہر نکلی تو اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ بولا "یہ لو سگریٹ پیو۔ امریکہ کا بہترین برانڈ ہے۔"

"مجھے تو پاکستانی برانڈ ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ سگریٹ پتا نہیں کب کے بنے ہوتے ہیں، بالکل مزہ نہیں دیتے۔"

"کیوں، کوئی خاص بات ہے ان میں؟"

"یہی لگتا ہے مجھے تو۔ ایک دم گلا بند کر دیتے ہیں۔ کھانسی آنے لگتی ہے۔"

"ہاں، یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔ کروڑوں کے حساب سے سگریٹ بناتی ہیں یہ کمپنیاں اور ساری دنیا کو مال سپلائی کرتی

ہیں ۔ سگریٹ تازہ کیسے رہ سکتے ہیں ۔ ویسے ایک بات بتاؤ جیلانی ! عالیہ سے تمھارے مراسم کچھ زیادہ ہی بہتر نہیں ہوگئے ہیں ؟ ٹھیک ہے کہ نہیں ؟ "

" میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں دھمن جی ۔ تم لوگوں نے اپنا وطیرہ ایک دم بدل لیا ہے ورنہ میں شاید تمھیں زندہ نہ چھوڑتا ۔ میں تمھیں ختم کر دینا چاہتا تھا مگر تمھارے رویّے نے مجھے حیران کر دیا ہے ۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ "

" وجہ کوئی بھی نہیں ہے ۔ میرا خیال ہے تم بھی مرنا پسند نہیں کرو گے پھر تو ساری بات ہی ختم ہو جاتی ہے ۔"

" مگر ... مگر میں تمھارے دیے ہوئے زخموں کو کیسے بھول سکتا ہوں ۔ مجھے اپنے رویّے پر بھی سخت حیرت ہے ۔"

" عالیہ نے کیا کہا ہے تم سے ؟ "

" کچھ بھی نہیں ۔ اس میں وہ پہلا سا غیظ و غضب رہا ہی نہیں ۔ جانو میں کسی نئی عورت سے مل رہا تھا ۔ وہ سراپا التفات تھی ۔ مروّت ہی مروّت ۔ تم نے آخر یہ بینترا بدلا کس طرح ؟ "

" میں نے تمھیں یہاں اسی لیے بلوایا تھا کہ یہاں آتے ہی میں تمھیں گولی مار دوں گا ۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی ۔ تم ہمارے بس میں تھے ، بے ہوش پڑے تھے ۔ گیارہ دن بے ہوش پڑے رہے تم ۔ تمھیں مار دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ۔ مجھے تم پر ترس آنے لگا تھا ۔ عالیہ خود یہی کہہ رہی تھی ۔ اسے بھی تم پر بہت ترس آتا تھا ۔ آخر اس نے کہہ دیا کہ جیلانی کو کوئی کچھ نہ کہے ۔ تم نے ہمیں فائدہ بھی تو بہت پہنچایا ہے ۔ اپنی طرف سے میں بہت مطمئن تھا ۔ دیکھا نہیں تم نے کہ تمھاری گولی اپنی جگہ سے سرک نہیں سکی ۔"

" اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ عالیہ نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا ۔"

" اس کی ایک خاص وجہ ہے مگر وہ میں تمھیں نہیں بتا سکوں گا ۔ مجھے یہ بتاؤ جیلانی کہ عالیہ کا رویّہ کیسا رہا تم سے ؟ وہ کچھ زیادہ ہی پُراسرار ہو گئی ہے ۔ کئی باتیں مجھ سے چھپا لیتی ہے ، حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے ۔"

" تمھیں اس پر کوئی شبہ نہیں کرنا چاہیے ۔ یہ بڑی غلط بات ہو گی ۔"

" اچھا تمھیں جب ساحل پر وہ حبشی ملے تو اس وقت تم کیا باتیں کر رہے تھے ؟ "

" بس ہم بیٹھے تھے ۔ بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے ۔ لہروں کا نظارہ کر رہے تھے ۔"

" نہیں ۔ میرا خیال ہے بات اتنی سی نہیں ہے ۔ وہ نیگرو کسی پر یوں ہی حملہ نہیں کرتے ۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہو گی کہ انہیں تمھیں للکارنے کا موقع ملا ۔"

" میں تمھاری بات نہیں سمجھ سکا ہوں دھمن ! میرا خیال ہے ... پر اِدھر اُدھر کئی جوڑے بیٹھے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی آگے نکل ... انھوں نے ہمیں تنہا پا کر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا ۔ وہ عالیہ کی ... گھڑی اور دوسری چیزیں چھین لینا چاہتے تھے اور یہ میں کسی ... برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ شاید عالیہ کو بھی اٹھا کر لے جاتے ۔"

" ہوں ، ٹھیک ہے ۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے ۔ میرا ... قیمت پر ساتھ دیتی ہے اور یہی بہت ہے ۔ پھر میں نے ... کاروبار میں برابر کا شریک بنا رکھا ہے اور اس کا اپنا ایک الگ ... ہے ۔ جس کے بارے میں میں نے کبھی اس سے کچھ نہیں پوچھا ۔ بہر حال تم سے یہ کہوں گا جیلانی کہ ... عورت کو سمجھ لینا بہت ...

عین اس وقت ہمارے عقب سے دو موٹر سائیکل ... تیزی سے آگے نکلے اور ان میں سے ایک نے کچھ ایسے انداز ... موٹر سائیکل کار کے سامنے سے گزاری کہ دھمن اگر گاڑی کو ... موڑ لیتا تو وہاں بڑا شدید حادثہ ہو جاتا ۔ سڑک پر اس وقت ... نہیں تھی ۔ کبھی کبھار کوئی موٹر گزرتی نظر آ جاتی تھی ورنہ سڑک ... سنسان پڑی ہوئی تھی اور ابھی ہم اس صورتِ حال سے سنبھلنے ... نہیں پائے تھے اور دھمن اسے زبردست گالیاں دے ہی ... اس حبشی نے موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ جان بوجھ کر کار کے نیچے ڈال ... دھمن اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا ۔ گاڑی ایک دم اچھلی اور ... پھر بائیں ہاتھ کی طرف نکل گئی ۔ دھمن نے ایک دم بریک لگائے ... رک گئی مگر اسی وقت اس حبشی نے پستول نکال کر کار کا اگلا پہیہ ... زوردار دھماکا ہوا اور ہم وہاں شل ہو کر رہ گئے ۔ پہیہ زمین سے ... دھمن نے پنجابی میں بڑی چکردار قسم کی گالی دیتے ہوئے دروازہ ... دیا مگر جیسے ہی اس نے سر باہر نکالا دوسرے موٹر سائیکل سوار ... ہاتھ سے آگے نکل کر اس پر پستول تان لیا مگر میں یہ دیکھ کر ... کہ اس کا پستول جام ہو کر رہ گیا ۔ لبلبی پر اس کی انگلی بار بار ... تھی مگر گولی برآمد نہیں ہو رہی تھی ۔ وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹا ... کی طرف لپکا مگر دھمن نے اسے بھاگ کر گریبان سے پکڑ کر ... لیا ۔ دوسرا موٹر سائیکل سوار اسے للکارتا ہوا آگے بڑھا تو ... سے نکل کر اسے تیزی سے آگے بڑھ کر بالوں سے پکڑ لیا ۔ اس کا ... اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ کوشش کے باوجود اس میں سے گولی ... سکا ۔ پستول کی لبلبی ٹس سے مس نہ ہوئی ۔ اس کی آنکھیں حیرت ... پھیلنے لگیں اور پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا ۔

ان دونوں کو ساتھ لے کر ہم کار کے پاس جا پہنچے ... حالت دیدنی تھی ۔ ان کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی ۔

" کیا چاہتے ہو تم ؟ " دھمن نے بڑے غضب ناک ...

پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اس حبشی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا ۔ " بتاؤ ، کیوں ہمارا راستہ روکا ہے تم نے ؟ "

" وہ ... ہم اس شخص سے بدلا لینا چاہتے تھے ۔ اس نے ہمارے ساتھیوں کو اُدھر ساحل پر زخمی کر دیا ہے ۔"

" اوہ تو یہ بات ہے ۔ گڈ ۔ سنبھالو بھئی انھیں ۔" اچانک دھمن کی نگاہ میرے ہاتھ پر جا پڑی ۔ میری انگلی میں عالیہ کی دی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا ۔ بولا ۔ " تو یہ بات ہے ۔ میں بھی کہوں کہ تم پر گولی کیوں اثر نہیں کر رہی ہے ! کمال ہے یار ، اس نے یہ انگوٹھی تمھیں دے دی ! "

اب وہ خالص پنجابی میں بات کر رہا تھا ۔

" ہے ! چلو اِدھر ہماری گاڑی میں نیا پہیہ لگاؤ ۔ یہ لو ، یہ جیک پکڑو اور جلدی کرو ۔" اس نے ان دونوں حبشیوں کو کار کی ڈگی سے جیک نکال کر نیا کام سمجھایا ۔ " تمھاری یہی سزا ہے ۔ جلدی کرو ، ہمیں ایئرپورٹ جانا ہے ۔"

وہ دونوں حیرت زدہ ہو کر چپ چاپ گاڑی کا پہیہ بدلنے لگے ۔ دھمن نے دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دے دیا تھا ۔

" تو بالآخر تم نے عالیہ کو اپنے حق میں اتنا ہموار کر لیا کہ اس نے اپنی انگوٹھی تمھیں دے دی ۔"

" میرا خیال تھا کہ اس کا تمھیں علم ہو گا ۔"

" مجھے کیسے علم ہو سکتا تھا ؟ "

" وہ بتا رہی تھی مجھے کہ جس بیش بہا تحفے کا دھمن نے تم سے ذکر کیا تھا وہ یہی تھا ۔ میں سمجھا کہ اس نے تمھیں بتا دیا ہو گا ۔"

" تم نے ہاتھ پر رومال اسی لیے لپیٹ رکھا تھا ۔ ٹھیک ہے جیلانی ! ویسے تم ہو بہت کاریگر آدمی ۔ سمجھو عالیہ نے تمھیں اپنے نورتن سے بیش قیمت تحفہ دیا ہے ۔ یہ انگوٹھی امریکہ میں صرف دس بیس آدمیوں کے پاس ہو گی ۔" اس نے بڑی پھیکی مسکراہٹ میں لپیٹی بات کہی مگر اس کی آنکھیں سڑک پر جمی تھیں ۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا ۔ کوئی چیز اس کے سینے میں ٹوٹ کر رہ گئی تھی ۔ شام کے سائے بہت گہرے ہو چلے تھے ۔ ان حبشیوں نے کار کا پہیہ بدل دیا تھا اور دھمن اب ان کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا ۔ اس نے بڑی آہستگی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر حبشیوں کی طرف بڑھا دی ۔

" یہ لو ، یہ پانچ سو ڈالر ہیں ۔ اِن سے اُس آدمی کا علاج کرواؤ اور پھر کبھی ہمارے راستے میں مت آنا ورنہ اچھا نہ ہو گا ۔ میں تمھیں جان سے بھی مار سکتا ہوں ۔ لو ، پکڑو یہ نوٹ ۔"

دونوں نیگرو اس کے رویّے پر حیران ہو رہے تھے ۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں مگر دھمن نے وہ نوٹ زبردستی حبشی کی جیب میں ڈال دیے ۔

" یہ لو ، یہ سو ڈالر اور رکھ لو ۔ موٹر سائیکل کی مرمت کروا لینا ۔ سمجھے ! جاؤ ، اب دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ۔" یہ کہہ کر اس نے وہ نوٹ بھی دوسرے حبشی کی جیب میں زبردستی ڈال دیے اور پھر اس نے اپنا پستول نکال لیا اور کڑک کر بولا ۔ " جاؤ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں واقعی تمھیں جان سے مار دوں گا ۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں کے پستول اٹھا کر کار کے اندر ڈال دیے ۔ پھر مجھے ساتھ لے کر اس نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور گھڑی دیکھ کر بولا ۔ " ان کالوں نے دیر کرا دی ہے ۔ سات بج گئے ہیں ۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی ۔ وہ دونوں حبشی سڑک کے ایک طرف ہو کر ہمیں یوں تک رہے تھے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں ۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ایسا بھی ہو گا جس پر انھوں نے قاتلانہ حملہ کیا ہو اور وہ انھیں انعام کے طور پر یوں ہی چھ سو ڈالر نکال کر دے دے مگر دھمن شاید یہی چاہتا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہیں اس بات کو یاد رکھیں کہ ... سان فرانسسکو میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جس نے انھیں اتنی بڑی رقم محض اس لیے دی تھی کہ انھوں نے اس کے خلاف پستول نکال لیے تھے ۔

" ہمیں اس سڑک پر نہیں آنا چاہیے تھا ۔ یہاں اکثر اوقات لوگوں کو لوٹ لیا جاتا ہے ۔"

" آخر وجہ کیا ہے دھمن ! تم جیسے نیک لوگ بھی یہاں آ چکے ہیں پھر بھی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ؟ "

" نیکی تو تم پر ختم ہے جیلانی ! میں بیچارہ تمھارا مقابلہ کہاں کر سکتا ہوں ۔"

" اگر تم یہ کار نہ لاتے تو شاید یہ لوگ ہمیں نہ پہچان سکتے ۔"

" میرا خیال ہے انھوں نے تمھیں پہچان لیا تھا ۔ وہ باہر تمھارا انتظار کرتے رہے ۔ جس کا ہاتھ ٹوٹا تھا اس نے تمھاری نشاندہی کر دی ہو گی ۔"

" ویسے یہ معاملہ کیا ہے ؟ یہ نیگرو کیوں اتنے بھڑکے رہتے ہیں ؟ گورے تو اپنے آپ میں ہی رہتے ہیں ۔"

" ان لوگوں نے فتور مچا رکھا ہے ۔ سارے امریکہ کا یہی حال ہے ۔ ان کی بستیاں بھی الگ ہیں ۔ سارا طور طریقہ بھی جُداگانہ ہے ۔ امریکیوں سے مل جل کر نہیں رہتے ۔ پتا نہیں یہ کیا چاہتے ہیں ۔ دھندا ان کا یہی ہے ۔ اپنی آبادیوں میں تو یہ کسی کو پھٹکنے بھی نہیں دیتے ۔"

" کیا خیال ہے ، ہم وقت پر پہنچ جائیں گے ؟ "

" ہاں ۔ دعا کرو جہاز کی روانگی میں کچھ تاخیر ہو جائے ۔ ویسے بات مشکل ہی نظر آتی ہے ۔"

اس نے گاڑی کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی اور ایک قریبی راستے سے ہو کر ہوائی اڈے کی طرف بڑھا ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ دھمن

عالیہ کے اس رویے سے اداس ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ عالیہ نے اس سے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی تھی، ورنہ اسے کیا ضرورت تھی، مجھے ایسی نادر و نایاب انگوٹھی دینے کی لیکن مجھے دھمن کو یقین دلانے کی فرصت ہی کہاں تھی کہ عالیہ بے قصور ہے۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی کوئی گہری خلیج میرے اپنے مفاد میں تھی۔ اس سے میں بھرپور فائدہ اٹھا سکتا تھا مگر ابھی اس کا کوئی موقع نہیں آیا تھا۔ ابھی مجھے اپنے پتے سیدھے کرنے تھے۔ ان دونوں نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور میں تہ دل سے انھیں معاف بھی کر چکا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں ان کی جان لینے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن اس سے آگے کی بات کے بارے میں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر وہ مجھے اسی قسم کا فائدہ پہنچاتے رہے تو پھر مجھے کیا ضرورت تھی ان کو ہلاک کرنے کی مگر سوال یہ تھا کہ کیا میں واقعی اس معاملے میں ان سے تعاون کر سکتا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں ان کا کسی ایک ہی ہلّے میں بیڑہ غرق کر دوں۔ امریکہ میں وہ دونوں اور ان کے ساتھی جیل پہنچائے جا سکتے تھے اور پاکستان میں ولسن اور کشمیر خان۔ ان کو بھی میں جیل بھجوا سکتا تھا مگر ابھی میں نے معاملے کے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ پھر بھی امکانات تو موجود ہی تھے اور وہ لوگ آہستہ آہستہ میری گرفت میں آنے جا رہے تھے۔

دھمن کی تیزی بالآخر کام آگئی۔ ہم سات بج کر دس منٹ پر ہوائی اڈے جا پہنچے۔ پی۔ آئی۔ اے۔ سی کا طیارہ سات بج کر پچیس منٹ پر روانہ ہو رہا تھا۔ میں عنایت احمد کے نام سے سفر کر رہا تھا۔ پاسپورٹ میرے پاس تھا اور ٹکٹ بھی۔ دھمن نے مجھے جیب خرچ کے لیے ایک ہزار ڈالر دے دیے۔ بولا "یہ رکھ لو، تمھارے کام آئیں گے۔ لاہور میں تم میرے فون کا انتظار کرنا۔ میں جلد ہی تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

"ٹھیک ہے دھمن! یہ سفر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"مجھے امید ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو گے۔ اچھا خدا حافظ!"

دھمن نے مجھے آخری دروازے سے گزرنے سے پہلے بڑی محبت سے گلے لگا لیا۔ پتا نہیں اچانک کیا ہوا، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بولا "اگرچہ آدمی اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا ہے مگر میں بہرحال تم سے کوئی شکایت نہیں رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی ہمیں معاف کر چکے ہو گے۔"

"ہاں، بات تو ایسی ہی ہے۔ اگر تم آئندہ کے لیے محتاط رہو تو میرا خیال ہے یہ نئی دوستی نبھ سکتی ہے۔"

"بے فکر رہو۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور بھیڑ میں شامل ہوگیا۔

پی۔ آئی۔ اے۔ سی کا طیارہ اس وقت مسافروں کو نگل رہا تھا۔ میرے لیے دھمن نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ طیارہ سیدھا پیرس جا رہا تھا۔ امریکہ کے کسی اور شہر میں اسے کوئی کام نہیں تھا۔

ہوائی جہاز کے اندر جب میں پہنچا تو مجھے ایئر ہوسٹس نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور فرسٹ کلاس کے حصے میں ساتویں نشست پر بٹھا دیا۔ وہ کچھ بہت ہی زیادہ مہمان نوازی کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں کی چمک، اس کے ہونٹوں کا تبسم آدمی کو متاثر کر دیتا تھا۔ کے آدھے پیسے تو میرا خیال ہے جہاز میں مہمان نوازی سے ہو جاتے تھے۔ وہ ساتویں نشست تھی جو مجھے دی گئی۔ آٹھویں کا مسافر ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر اپنی جیبیں ڈرافٹ بہت محفوظ جگہ پر تھا۔ ہتھیار میرے پاس کوئی نہیں ایک صرف ٹکٹ تھا، کراچی تک کا۔ جیب میں دھمن کے دیے ایک ہزار ڈالر اور اس کے علاوہ کچھ رقم مجھے سہارا دیتی تھی کہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے لیے وہ بالکل ہی ایک انوکھی ایئر ہوسٹس بار بار ہماری طرف لپکی چلی آتی تھیں۔ دو سگریٹ پیکٹ میرے پاس موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو کھول کر سگریٹ سلگا لیا۔ لائٹر مجھے ایئر ہوسٹس نے لا دیا تھا۔ سگریٹ سلگا کر میں نے وہ لائٹر اسے واپس دینا چاہا تو اس نے مسکرا کر تپاک سے کہا "یہ ہماری طرف سے ہے آپ کے لیے۔ اسے اپنے پاس رکھیں اور ہماری خدمات کو یاد رکھیں۔" وہ بڑی صاف اور سمجھ آنے والی شستہ انگریزی بول رہی تھی جس کا ہر لفظ پتے پر پڑتا

"وہ تو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی مس... کیا نام ہے آپ کا"

"ورجینیا ہاپکن نام ہے میرا۔"

"ورجینیا... یہ لفظ شاید نکلا ہے..." میں نے دانائی کا رعب جھاڑنا چاہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بات کاٹ

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں سر! مگر ایک اور چیز بھی ہوتی یہاں، ورجینیا ٹوبیکو۔ آپ کراچی جا رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ کراچی، پاکستان۔"

"پھر یہ ٹوبیکو ضرور ساتھ لے جائیں۔ یہ ترکی کے تمباکو سے بہتر ہوتا ہے۔"

"جی شکریہ! ہمارے اپنے ملک میں مردان کا تمباکو

اتنے میں خالی نشست کا مسافر وہاں آگیا۔ معلوم کوئی خاتون ہے۔ عمر اس کی یہی کوئی بیس بائیس سال تنہا سفر کر رہی تھی۔ اسے پیرس جانا تھا اور نشست اس کی قریب تھی۔ اسے میرے پاس سے گزر کر آگے جانا پڑا تھا۔ وہ اپنا پرس اور ایک چھوٹا سا بریف کیس لیے ہوئے تھی ٹوکری میں اس نے کچھ پھل رکھے ہوئے تھے۔

ورجینیا اسے اپنے ساتھ لے کر آگے آئی اور بولی "ان کو آگے جانے دیں۔ مجھے یقین ہے آپ کا سفر بہت خوشگوار رہے گا۔"

میں اپنی جگہ سے ایک دم اٹھ گیا۔ اس خاتون کے ساتھ ساتھ درحقیقت ایک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو چل رہی تھی۔ اس نے اپنی تینوں چیزیں سنبھال کر رکھیں اور پھر میرا شکریہ ادا کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

وہ خاتون جب اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تو لبوں ہی اداسی کا معیار بہت بہتر ہے۔ امریکی طیارے تو بیل گاڑیاں دکھائی دیتے ہیں"

"جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ دراصل بات یہ ہے کہ امریکہ میں بیل زیادہ ہوتے ہیں نا اور گائیں انھیں آسٹریلیا سے منگوانی پڑتی ہیں۔ کیا یہی وجہ نہیں ہے اس بے ہنری کی؟" میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش مار کر دھواں جان بوجھ کر اس کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ دھوئیں کے پیچھے میرا خالی سانس ابھی تک لرز رہا تھا۔

وہ کچھ زچ سی ہو کر اپنا رومال منہ کے گرد گھمانے لگی۔ بولی "میرا یہ مطلب تو نہیں تھا جناب! آپ کوئی مسخرے تو نہیں ہیں۔ کہاں گائیں اور کہاں طیارے۔ کہاں کی بات آپ نے کہاں پہنچا دی اور یہ سگریٹ کا دھواں تو آپ ذرا مجھ سے دور ہی رکھیں۔"

"نہیں نہیں! آپ یہ بات نہیں کہہ سکتی ہیں مس... آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟"

"مس پیسیفک جیفرسن۔ یہ میرے والد ہیں مسٹر جیفرسن۔"

"گڈ! بہت خوبصورت نام ہے آپ کا۔ پیسیفک! یعنی امن پسند۔ صلح جو۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

وہ میرے اتنے سارے الفاظ جن میں اس کے نام کی تعریف ہی تعریف تھی، سن کر خوش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر پھیلا ناگواری کا تاثر ختم ہونے لگا۔ اس نے ذرا سا میری طرف مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ میرا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں مس! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ میرے الفاظ کی سچائی پر غور کریں۔" پتا نہیں اتنی ساری انگریزی مجھے کہاں سے آگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں کالج کے زمانے میں اور دفتر میں ملازم ہونے کے بعد اکثر اوقات لوگوں سے جان بوجھ کر انگریزی میں بات کیا کرتا تھا اور اس کا اثر بھی اچھا ہی ہوتا تھا۔ انھی دنوں میں نے اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر اپنے ذخیرۂ الفاظ کو بہت بڑھا لیا تھا اور اب وہ ایک ایک کر کے میرے کام آ رہے تھے۔ میں دوسروں کو اب بھی اپنی انگریزی سے متاثر کر سکتا تھا۔

وہ بڑی فراخدلی سے مسکرائی اور بولی "میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ بہت فراخدل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی بخیل کسی کی تعریف میں اتنے الفاظ ضائع نہیں کرتا ہے۔"

"نہیں نہیں آپ ایسا نہ سوچیں۔ آپ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں۔"

"میں سوشیالوجی میں ایم ایس سی کر کے اب پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ پیرس میں اسی لیے جا رہی ہوں کہ اپنا ایک تھیسس وہاں مکمل کروں گی۔"

"موضوع کیا ہوگا آپ کے تھیسس کا؟"

"بڑا نازک موضوع ہے جناب! مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ عورت کو تلاشِ معاش کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ نازک موضوع ہے نا؟ بڑی باتیں بنائی جائیں گی مگر میں تنقید سے نہیں ڈرتی۔ ویسے ایم ایس سی میں، میں نے نرگسیت پر ایک مقالہ لکھا تھا اور اس کی بہت تعریف کی گئی تھی۔"

اللہ اللہ! یہ خاتون، یہ بیس بائیس سال کی خاتون کیسے کیسے خوفناک موضوعات پر سر کھپاتی ہے! میں سوچ رہا تھا۔

"آپ کی عمر کیا ہوگی خاتون؟"

"میں... دراصل اس اگست میں اٹھائیس سال کی ہو جاؤں گی۔ ویسے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو میری بات پر امریکی بیل کیسے یاد آگئے؟ میں ابھی تک حیران ہوں۔"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ موسم کی مطابقت سے اس نے لباس پہن رکھا تھا۔ بوٹ اس نے بہت ہی نازک اور نفیس پہن رکھے تھے۔ ناخنوں پر کیوٹیکس اور ہونٹوں پر سرخی اسے زیب دیتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ شاید وہ پوری کی پوری امریکی یا یورپی نسل سے نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں کوئی مشرقی پیوند اس کے نسب میں ضرور لگا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ان ہسپانوی لوگوں کی اولاد تھی جنھیں عربوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ پھر عرب آہستہ آہستہ ان کے افق سے غائب ہوگئے اور وہ لوگ چلتے چلتے دور تک پھیل گئے۔ کچھ لاطینی امریکہ میں جا بسے، کچھ اس سے آگے وسطی امریکہ میں چلے گئے۔ تب ہی اس پیسیفک نے جنم لیا اور وہ تعلیم حاصل کرتے کرتے ایسے موضوع پر جا پہنچی جس کی نزاکت کا اسے بھی شدید احساس تھا۔

"دراصل مس پیسیفک! آپ نے جب بیل گاڑی کا نام لیا تو مجھے امریکی بیل یاد آگئے۔ حالانکہ ان سے اب یہاں کوئی کام نہیں لیا جاتا مگر ہمارے پاکستان میں اب بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ بیل وہاں کے کسان کے لیے بہت کام کرتا ہے۔"

"تو آپ پاکستانی ہیں گویا!" اس نے عجیب سا منہ بنایا۔ شاید اسے میری بات پسند نہیں آئی تھی۔

"جی ہاں۔ میں پاکستانی ہوں اور اس بات پر فخر کرتا ہوں۔"

اچانک یہ اعلان چاروں طرف گونج گیا کہ طیارہ روانگی کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ میں نے سگریٹ بجھا دیا اور ارد گرد بیٹھے مسافروں پر ایک

اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ بی۔او۔اے۔سی میں زیادہ تر یورپی اور امریکی سفر کرتے ہیں اور میں تو ایسی جگہ پر تھا جہاں سے وہی لوگ جہاز میں بیٹھتے ہوں گے۔ ان میں کوئی مجھے پاکستانی یا بھارتی نظر نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ میں فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوں اور ہوسکتا ہے دوسرے حصے میں کوئی ایسا آدمی موجود ہو جو میرے علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔

ہوائی جہاز نے بالآخر زمین چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ بلندیوں کی طرف محوِ پرواز ہوگیا۔ ہوسٹس نے کئی رسالے، اخبار اور کچھ میٹھی چیزیں ہمارے سامنے لارکھیں۔ اس کا بار بار ہماری طرف آنا ہی میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ بی۔او۔اے۔سی نے اسے منتخب کر کے مسافروں پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ میرے قریب پیسیفک بھی موجود تھی لیکن اس نے جس طرح میرے پاکستانی ہونے پر بُرا سا منہ بنایا تھا، میں اس سے چڑ سا گیا تھا۔ پتا نہیں اسے پاکستان سے کیا پرخاش تھی۔

جہاز جب متوازن ہوگیا اور اس کی رفتار اپنے عروج پر جا پہنچی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پیسیفک ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ اب مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی سی نظر آرہی تھی۔ اس نے پھر کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب مجھے بھی اس کے رویّے سے ضد سی ہوگئی۔

"یہ پھل آپ نے کہاں سے لیے ہیں؟"

"میری ہمشیرہ کا ایک باغ ہے یہاں سان فرانسسکو میں۔ یہ اس باغ کے پھل ہیں۔ آپ کھانا پسند کریں گے؟ میں دراصل انھیں اپنے ساتھ پیرس لے جا رہی ہوں۔"

"ہوں۔ آپ کبھی پاکستان گئی ہیں؟"

"نہیں تو۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہاں دہلی، آگرہ، بمبئی اور نینی تال میں نے ضرور دیکھا ہے۔"

"ہوں۔ کچھ پاکستان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلیں۔ بہت اچھا ملک ہے۔"

"اوہ! مجھے معلوم ہے۔ مگر... ملک تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں لوگ رہتے ہیں۔ آپ نے اپنا نام نہیں بتایا مجھے۔" اس نے شکایت کی۔

"میرا نام غیاث احمد ہے۔" میں نے اپنی سہولت کے مطابق سیٹ کو پھیلاتے ہوئے کہا مگر ابھی میں اسے کوئی اور جواب نہیں دے پایا تھا کہ اچانک ایک مسافر پائلٹ کے کیبن کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کیبن کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جہاز میں کسی کی گونج دار آواز ہر طرف سناٹے بکھیرتی چلی گئی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"خواتین و حضرات! توجہ دیں۔ اس جہاز کو ہم نے اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے۔ یہ اب پیرس نہیں جائے گا بلکہ ہم اسے سیدھا ہوانا لے جارہے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی زندگی عزیز ہے تو ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ امریکی حکومت اگر ہمارے چار ساتھیوں کو چھوڑ دے تو ہم جہاز کو واگزار کردیں گے۔ ورنہ یاد رکھیں، میں اور میرے چار ساتھی طرح مسلح ہیں اور وہ جہاز کو کسی بھی وقت تباہ کرسکتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا انحصار آپ کے رویّے پر ہے۔ جہاز کے دونوں پائلٹ حکم کے پابند ہیں۔ ان کو ہم نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔" یہ بند ہوگئی۔

ایک آدمی نشستوں کے درمیان سے گزر کر ہمارے سامنے وہ ہاتھ میں پستول لیے ہوئے تھا۔ شکل و صورت سے وہ قطعی طور نظر آتا تھا۔ بال اس کے سفیدی مائل تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی، مونچھ لمبی لمبی، ایک ہاتھ میں اس نے گھڑی کے ساتھ کوئی کڑا پہن رکھا تھا میں منکے لٹک رہے تھے۔ سوئیٹر کے نیچے اس نے گریبان کھول رکھا اس کی آنکھیں، ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے تھیں۔ وہ جدھر نظر اٹھاتا تھا مسافروں کے چہرے لٹک جاتے تھے کی نظریں چند چہروں پہ بار بار اٹھتی تھیں اور ان میں وہ خاتون پیسیفک بھی تھی۔ شاید وہ اس کو کچھ زیادہ ہی ترجیح دے رہا تھا۔ اس کی وجہ کی خوبصورتی بھی ہوسکتی تھی مگر بات اتنی سی نہیں تھی بلکہ اس کی کسی اور پس منظر کے سبب زیادہ متوجہ تھا۔

"براہ کرم آپ پُرسکون رہیں۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کی چیزیں رہیں گی لیکن میں کسی قسم کی کوئی شرارت برداشت نہیں کروں گا۔" کے ساتھ ہی وہ لپکتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ میں سمجھا وہ میری سمت ہے مگر وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا بلکہ اس کا رخ پیسیفک کی تھا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس سے وہ... ٹوکری اچک لی جس میں اس نے پھل رکھے ہوئے تھے۔ میں وہ پھل سیب جیسے تھے۔ ان کی رنگت بالکل سیبوں جیسی تھی۔ اٹھا کر وہ آدمی تیزی سے نشستوں کے سامنے جا ٹھہرا مگر وہ ایسے سے چل رہا تھا کہ ہر آدمی اس کی نگاہ میں تھا۔

"حضرات! یہ... یہ تین سیب نہیں ہیں بلکہ تین بڑے ہی بم ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی پھٹ گیا تو جہاز کے پرخچے اڑ سکتے ہیں اس لیے ہم سے تعاون کریں۔ جہاز کا رخ ہم نے ہوانا کی طرف موڑ لیا ہے۔"

"یہ... یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب میں نے اپنے باغ سے اتارے ہیں۔ پلیز آپ بات پر یقین کریں۔" مس پیسیفک نے خوف سے نڈھال ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ میں بمشکل اس کا مفہوم سمجھ سکا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ صحیح بات کہہ رہی ہیں؟"

"میں یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سراسر بکواس کر رہا ہے، جھوٹ بول رہا ہے، لوگوں کو خواہ مخواہ خوفزدہ کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ خدا اس کا بیڑا غرق کرے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کی اپنی جان بھی سخت خطرے میں ہے۔"

"اوہ، یہ باسٹرڈ، یہ ہمارے جہاز کو اغوا کرکے کیوبا لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ... وہ کاسترو! وہ تو بہت ہی... وہ ہمارا سخت دشمن ہے اُسے ہم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"

"گھبراتی کیوں ہو مس پیسیفک! آپ تو بڑی بہادر قوم کی فرد ہیں۔ آپ کے پاس ایٹم بم ہے، ہائیڈروجن بم ہے۔ ایک دو آپ نے جاپان پر بھی گرائے تھے۔ آپ کو کیا غم ہے؟ آپ کا یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ لوگ تو چاند پر بھی جا چکے ہیں۔ یہ لفنگا آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ساری دنیا آپ سے تھراتی ہے۔ اس کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"اوہ، آپ سمجھنے کی کوشش کریں مسٹر اگیاس! یہ چار آدمی ہمیں تباہ کرسکتے ہیں۔ ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان کی بات مان لے مگر... مگر مسٹر اگیاس! ہوسکتا ہے ان لوگوں نے میری ٹوکری سے سیب اڑا کر اس میں سیبوں کی شکل کے بم رکھ دیے ہوں۔ ان سے تو کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ میں جب ٹکٹ لینے گئی تھی تو اپنی یہ تینوں چیزیں ایک خاتون کے پاس رکھ گئی تھی۔ ہوسکتا ہے اسی وقت گڑبڑ ہوئی ہو۔ ورنہ وہ اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ ٹوکری میں بم ہیں، مہلک بم؟"

اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور وہ شدید اضطرابی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھنے کو ہی تھی کہ میں نے اسے بیٹھا رہنے کے لیے کہا۔ مگر وہ آدمی اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ رہا تھا۔ وہیں سے بڑے کڑک دار لہجے میں بولا۔ "او مس! بھول جاؤ اپنی ٹوکری کو۔ ہم نے اس میں اپنے پھل ڈال دیے تھے اور تمہارے پھل ہم کھا گئے تھے۔ جہاں بیٹھی ہو وہیں بیٹھی رہو، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" عین اسی وقت اس کا ایک ساتھی عقبی دروازے سے آگے نکلا اور سیدھا اُس کے پاس جا پہنچا۔ ذرا دیر کے لیے وہ ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ وہ بھی پستول سے مسلح تھا مگر حلیہ اُس کا زیادہ مہذب اور شائستہ معلوم ہوتا تھا۔ چند لمحوں تک وہ مسافروں کو گہری نظر سے دیکھتا رہا اور پھر اُس نے عقبی حصے کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اب وہ پستول تان کر ہمارے پیچھے ٹھہرا تھا۔ درمیان کی دیوار سے آگے تمام مسافر بیٹھے تھے اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ابھی تک تو ہمیں یہی معلوم تھا کہ وہ تعداد میں چار ہیں۔ ایک آدمی پائلٹ کیبن میں جا گھسا تھا اور اسی کے اشارے پر ہوائی جہاز کا رُخ کیوبا کی طرف پھیر دیا گیا تھا۔

پتا نہیں وہ کون لوگ تھے۔ امریکہ سے انھیں اور امریکہ کو اُن سے کیا ضد تھی۔ کوئی بات ایسی ہی وجہ نزع بنی تھی کہ وہ ہوائی جہاز اغوا کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ مگر وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ میں نے سن رکھا تھا کہ کیوبا روس کا ہمنوا بن چکا ہے اور اپنے گنے کا رس بیچ کر روس سے ہر شے حاصل کرلیتا ہے اور یہی بات اُس کے ہمسائے امریکہ کو پسند نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے کہ میاں کاسترو! یہ تم نے اتنی دور روس میں اپنی رشتے داریاں کیوں جوڑ لیں۔ آخر ہم کس لیے بیٹھے ہیں یہاں۔ روس والے کون ہوتے ہیں آخر، اس بحرالکاہل تک کمند پھینکنے والے۔ ہم جو سُپر طاقت بن چکے ہیں۔ چاند تک رسائی حاصل کرچکے ہیں۔ فضائے بسیط پر ہمارا قبضہ ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو ہمیں آنکھ دکھا سکے تو تمھیں کیا سوجھی کہ تم نے روس سے اپنا رشتہ قائم کرلیا، شرم نہ آئی تمھیں۔ ہم مر گئے ہیں۔ اپنے لیے تیر و تفنگ، توپ، بندوق روس سے منگواتے ہو۔ میاں ہم تمھیں دے دیتے۔ اتنا ہی شوق ہے تمھیں تیر اندازی کا تو ہمارے اسلحہ خانے کھلے ہیں۔ تمھیں روس سے پینگیں بڑھانے کی آخر ضرورت کیا تھی۔ اب اس یاری کی قیمت بھی دو۔ ہم تو تمھیں دو قدم نہیں چلنے دیں گے۔ امریکہ پر صرف امریکہ ہی حکومت کرسکتا ہے۔ اور یہی بات تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ میرا خیال ہے سارا جھگڑا یہیں سے شروع ہوا اور اب کاسترو کے کچھ حمایتی امریکہ میں بھی پیدا ہوچکے ہیں۔ اُنہی کے یار دوست کوئی چار گوریلے ہوں گے، چار تخریب کار جن کی رہائی کے لیے وہ لوگ کوشش کر رہے تھے اور جہاز کا اغوا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہوگا۔ انھیں یقین ہوگا کہ وہ ایسی حرکت کرکے امریکی حکومت

دُنیا کے حیرت انگیز فنِ تحریر شناسی کی مدد سے دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں۔
تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر و رہنما کتاب
تحریر اور شخصیت
قیمت ۱۰/ روپے ڈاک خرچ روپے
○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کرسکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے اپنی کمزوریاں اور خامیاں کیسے دُور کی جاسکتی ہیں؟
ملنے کا پتہ مکتبہ نفسیات ○ پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

کو جھکنے پہ مجبور کر سکتے ہیں مگر گدھے یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ جہاز تو بی۔او۔اے۔سی والوں کا ہے برطانوی حکومت کی ملکیت۔ اُسے اپنے قبضے میں لے کر وہ امریکہ کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ لندن والوں کو البتہ جھرجھری سی آجائے گی مگر معلوم یہ ہو رہا تھا کہ انھوں نے خواہ مخواہ اُسے اغوا نہیں کیا تھا۔ طیارے میں زیادہ تعداد امریکیوں ہی کی تھی اور پتا نہیں اُن میں کون کس پائے کا آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی اُن میں ایسا بھی ہو جس کو دبا کر یہ لوگ اپنا مطلب پورا کر سکتے ہوں۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے، مجھے تو بہر حال وہ سب کے سب عام سے لوگ دکھائی دیتے تھے مگر خواص کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی شاید انہی میں شامل ہوں۔ جن کو بے بس کر کے وہ امریکی حکومت کو مجبور کر سکتے تھے۔ صورتِ حال بہت ہی تشویشناک ہو گئی تھی۔

میرا کراچی کا عزم تو وہیں کا وہیں دھرا رہ گیا تھا۔ اب خدا جانے وہ جہاز کب تک اُن کے قبضے میں رہتا ہے اور وہ اُسے چھوڑتے بھی ہیں یا تباہ کر دیتے ہیں اور مس پیسیفک الگ بلک رہی تھی کہ اس کو بھی انھوں نے اس معاملے میں گھسیٹ لیا تھا۔ میں نے اُسے بہتیرا سمجھایا کہ وہ صبر کرے مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔ برابر سسکتی جا رہی تھی۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ کہیں بعد میں اُسے بھی اغوا کنندگان کی فہرست میں شامل نہ کر لیا جائے اور وہ کہیں کہ چلو تم قطار میں لگ جاؤ، تم اُن کی ساتھی ہو۔ اُسے بس یہی غم کھائے جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیا ہوگا؟ مجھے تو جس قدر جلد ممکن ہو سکتا پاکستان پہنچنا تھا۔ کوئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ جیل کی سنگین دیواروں کے پیچھے آسیہ اور آپی میری راہ دیکھتے ہوں گے۔ میں اُن سے وعدہ کر آیا تھا کہ میں اُن کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا مگر میں ادھر امریکہ میں خوار ہو رہا تھا اور وہ بھی خواہ مخواہ۔ اس دشمن نے مجھے اور زیادہ ذلیل کروا دیا تھا۔ کیا وقعت تھی اس ایک لاکھ ڈالر کی جو میری جیب میں ڈرافٹ کی صورت میں پڑا تھا مگر اُسے تو بس یہی ضد تھی کہ کوئی ایسا مل جائے جس کو نچوڑ کر وہ روپیہ پیدا کر سکے اور وہ اس نے ڈھونڈ بھی لیا تھا مگر میرے لیے تو اس نے زبردست مشکلیں پیدا کر دی تھیں۔ حد ہو گئی تھی ذلالت کی اور وہ خوش فہم عالیہ! خدا اُس سے سمجھے! وہ رونا بھی جانتی تھی اور ہنسنا بھی اور اُس نے مجھے آہستہ آہستہ نرم کر ہی لیا تھا اور میں بھی ایسا بدھو نکلا کہ اس کی انگلی پر زلفِ یار کی طرح لپٹتا چلا گیا۔ خدا غارت کرے ان دونوں کو۔ مجھے اُن لوگوں نے ایک نئے عذاب میں پھنسا دیا تھا اور اب میرا رُخ ہوانا کی طرف پھیر دیا گیا تھا۔

پیسیفک زیادہ ہی پریشان ہو گئی تھی۔ میری طرف جھک کر بولی۔

"اگر انھوں نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو.... تو کیا ہوگا مسٹر اگیاس؟"

"میرا نام غیاث احمد ہے، اگیاس نہیں۔ حوصلہ رکھیں، کچھ نہیں ہوگا۔

ساری میزبان خواتین دوسرے حصے میں رہ گئی تھیں، وہ ہمارے پاس نہیں آئی۔ مسافروں میں کئی بوڑھی عورتیں اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ وہ ایسے تھے جنھیں زندگی سے اب اور کچھ نہیں دینا تھا مگر جوانوں کو تو ایسی موت پسند نہیں آتی۔ وہ بہت بے بس ہوئے لگتے تھے مگر کسی کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ دونوں موت کے فرشتے آمنے سامنے کھڑے اُن کا خون خشک کر رہے تھے۔ اُن کی لبلبی پر اُن کی انگلیاں بے قرار بیٹھی تھیں۔ جہاز کو چونکہ چند روز اس لیے ایندھن تو اس میں وافر مقدار میں موجود تھا اور اب وہ رُکے بغیر سیدھے ہوانا پہنچ سکتے تھے۔ اچانک مجھے کھڑکی کے میں سے جہاز کے دائیں بائیں تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ فوجی طیاروں نے ہمارے ہوائی جہاز کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ کبھی اُس کے اوپر اڑتے تھے، کبھی نیچے، کبھی دائیں اور کبھی جاتے تھے اور کبھی بائیں طرف مگر کر وہ کچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ جہاز میں کم و بیش ساڑھے تین سو آدمی سوار تھے۔ اُن کی زندگیاں اغوا خطرے میں ڈال سکتے تھے۔ اُنھیں بہت ہی محتاط رویہ اختیار چاہیے تھے۔ ورنہ اگر جنگ کا زمانہ ہوتا تو اب تک وہ ہمارے کے پرخچے اُڑا چکے ہوتے۔

میرے دائیں ہاتھ کی قطار میں بیٹھا ایک نوجوان صورتِ حال کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں پھل کاٹنے والی چھری تھام رکھی تھی۔ اٹھتے ہی اس نے بلا خیز رفتار سے چھری کو دستے سے ماہرانہ انداز سے سامنے کھڑے آدمی پہ دے مارا۔ وہ اس وقت سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اگر وہ پہلو نہ بدل لیتا تو وہ چھری سیدھی اس کے سینے میں جا دھنستی مگر وہ ایک دم دوسری طرف مڑ گیا۔ چھری سیدھی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اس پر اس نوجوان نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف دوڑا جیسے وہ اُسے غیر مسلح حالت میں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دے گا۔ دوسرے لوگوں نے ایک دم شور مچا دیا مگر ابھی وہ چند قدم بھی کہ دونوں طرف سے دو گولیاں چلیں۔ ایک عقب سے اور ایک سامنے سے۔ لڑکھڑا کر جہاز کے فرش پر گر گیا۔ اس کے جسم سے خون کا فوارہ بہ نکلا۔ وہ دونوں آدمی اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے پر جم کر کھڑے رہے۔ اُن میں سے ایک نے بڑے ہی قہرناک انداز کہا، "کسی اور نے یہ حرکت کی تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔ ہم بھی معاف نہیں کریں گے۔ سُن رہے ہو تم لوگ! ہمیں یقین ہے ہم سے مکمل تعاون کرو گے۔"

پتا نہیں وہ عورت مقتول کی کیا لگتی تھی۔ البتہ اس کے سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھی مگر

سنسناتی ہوئی گولی اِس کے پاؤں کو چھوتی ہوئی کرسی سے جا لگی۔ وہ سامنے کھڑے آدمی نے چلائی تھی۔ وہ عورت دبک کر میری سیٹ کے پیچھے آ لگی۔ اس کا رنگ پیلا ہو چکا تھا اور آنکھیں ویران ہو گئی تھیں۔ اُس کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازو پر رکھے رہ گئے اور پھر ہوا میں جھول گئے۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔

اس وقت تک جہاز کو روانہ ہوئے پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔

میں نے اس خاتون کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ آدمی جو سامنے کھڑا تھا کڑک کر بولا، "ہے مسٹر! اس کو فرش پر پڑا رہنے دو۔ خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ مغز پھاڑ دوں گا۔" اس نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا ساتھی اسی دوران میں اپنی جگہ سے ہل کر کوئی چار قدم آگے آ چکا تھا اور اب وہ مجھ سے اتنی ہی دور تھا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی گرفت میں لے سکتا تھا اور اس کا پستول مجھے برابر للکار رہا تھا۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔

"اوئے کتے کے بچو! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔" میں ایک دم کڑکتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور پہلے ہاتھ میں ہی میں نے اپنے عقب میں کھڑے آدمی کو ٹائی سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اس عرصے میں دو گولیاں چلانے کی کوشش کی گئی مگر مجھے معلوم تھا کہ اُن کی گولیاں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکیں گی۔ اس آدمی کا پستول میرے پیٹ سے آ لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پکڑ کر اسے چند ہی لمحوں میں بے ہوش کر دیا۔ اب اس کا پستول میرے ہاتھ میں آ چکا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا ساتھی تڑپ کر میری طرف لپکا۔ وہ بار بار پستول کی لبلبی دبا رہا تھا مگر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا، میں نے پوری قوت سے اس کا گلا بائیں ہاتھ میں پکڑا اور بلا خیز رفتار سے میں نے اس کی بھی رگِ احساس مسل دی۔ وہ یوں گھوم کر گرا جیسے اس میں زندگی کی رمق کبھی تھی ہی نہیں۔ اس کا پستول سامنے بیٹھے ایک بوڑھے آدمی نے اُٹھا لیا اور ابھی وہ ہاتھ اُٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے اُسے روک دیا۔

"او نو پلیز! آپ گولی نہیں چلائیں گے۔ صرف میں ہی ان سے نمٹ سکتا ہوں۔ یہ پستول مجھے دے دیں۔" میں نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر جیب میں ڈال لیا۔ کسی کو دوسرے حصے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ ہوا کیا ہے۔

"دیکھیں آپ ان دونوں کو سنبھالیں۔ میں اُن کی خبر لیتا ہوں۔"

"مگر.... مگر وہ آپ کو گولی مار دیں گے صاحب! آپ نے کمال کر دیا ہے مگر آپ کا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" اس بوڑھے شخص نے اور کئی اور آدمیوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس اطمینان سے بیٹھ جائیں۔"

یہ کہہ کر میں جہاز کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے کھولا........ اُن کا تیسرا ساتھی فوراً ہی پستول کا رُخ میری طرف کر کے بولا، "خبردار! کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو تم؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بلند کر کے مجھ پر گولی چلانا چاہی مگر وہ وہیں جام ہو کر رہ گئی۔ میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں بوٹ کی ضرب لگائی۔ اس کی گردن مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ الٹ کر بائیں ہاتھ گرا تو میں نے سب سے پہلے اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ دوسرا لمحہ اُسے نصیب نہ ہو سکا۔ میں نے اس کی رگ پوری طرح کچل ڈالی۔ اس کا پستول میں جیب میں ڈال ہی رہا تھا کہ اچانک اُن کا چوتھا آدمی دو گز کے فاصلے سے مجھ پر اسٹین گن سے حملہ کرنے لگا مگر لبلبی اس کا حکم نہیں مانتی تھی۔ وہ دبتی تو تھی مگر گولی اپنی جگہ سے سرک نہیں سکتی تھی۔ میری وہ انگوٹھی اس کے سارے سسٹم کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ دو سکھوں نے اچانک اس کے پیچھے پہنچ کر اس کے بازو پکڑ کر زوردار جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے اسٹین گن چھین لی۔ وہ اسی حصے میں سفر کر رہے تھے، پہلے میری نظر ان پر اسی لیے نہیں پڑی تھی۔ اُن کی پگڑیاں بتا رہی تھیں کہ وہ سکھ ہیں۔ جیسے ہی وہ آدمی اُن کی گرفت میں آیا میں نے پوری قوت سے اس کی کلائی ہاتھ میں لے کر جھٹکا جو دیا تو اس کا جوڑ کھل گیا اور وہ درد سے بلبلاتا ہوا فرش پر پٹخنیاں کھانے لگا۔

"اے اسٹین گن مینوں دے دیو سردار جی! ہُن سارا ڈراما ختم سمجھو۔"

"نئیں جی! اِک ہنجواں وِی ہے گا جے۔ اوہ پائلٹ دے کول بیٹھا اے۔" ایک سکھ نے خالص جالندھری انداز میں کہا۔

"اچھا! او نو وِی دیکھ لینے آں۔ ٹھہرو ذرا۔ تسیں ایتھے ای ٹھہرو۔" یہ کہہ کر میں دوڑتا ہوا پائلٹ کے کیبن کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، کسی نے پوری قوت سے پستول کا دستہ میرے جبڑے پر دے مارا۔ میں ذرا دیر کے لیے تو سُن سا ہو کر رہ گیا مگر ابھی وہ پستول کی نال میرے سینے تک لایا ہی تھا اور اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ پستول جام ہو چکا ہے، میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ میرے ہاتھ میں ابھی مسلا ہی جا رہا تھا کہ ایک پائلٹ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"اس کو چھوڑ دیں مسٹر پائلٹ! اب یہ کچھ نہیں کر سکے گا۔" میں نے اس کی رگِ احساس مسل دینے کے بعد کہا۔ وہ مٹی کا ڈھیر ثابت ہو رہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے فرش پر ڈھے گیا۔

"مسافروں کو یہ خوش خبری سنائیں کہ ہم نے جہاز اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اب اُن سب کی زندگیاں بالکل محفوظ ہیں۔"

"کیا واقعی! یہ کیسے ہو گیا؟"

"یہ ہو چکا ہے۔ ان کے چاروں ساتھی دونوں حصوں میں... بے ہوش پڑے ہیں۔ جلدی سے یہ خوش خبری مسافروں کو سنا دیں۔"

اُس نے فوراً ہی کہنا شروع کیا۔ "اٹینشن پلیز! جہاز اغوا کرنے والوں پر پوری طرح قابو پا یا جا چکا ہے۔ ایک مسافر نے جان کی بازی لگا کر پانسہ پلٹ دیا ہے۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جہاز کو ہم واپس سان فرانسسکو لے جا رہے ہیں۔ آپ کو مبارک ہو۔ سفر ملتوی کرنے کا ہمیں افسوس ہے مگر یہ بہت ضروری ہے۔"

ابھی میں اُن کے کیبن سے نکلا ہی تھا کہ وہ دونوں سکھ اور کچھ اور مسافر میری طرف بڑھے۔ ورجینیا بھی ان کے ساتھ تھی۔

"تُساں تے کمال کر دِتا اے بھاجی! اینی بہادری کدی وی نئیں ویکھی۔ کیہ ناں اے تہاڈا؟" ایک سکھ نے مجھے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔

"تہاڈا کیہ ناں اے سردار جی! پہلے تُسیں اپنا شبھ ناں دسو مینوں؟"

"میرا ناں امریک سنگھ اے۔ تے انہاں دا ناں شیر سنگھ —— پر تُساں تے حد مکا دتی اے۔ ایسا ٹنگیا اے تُساں اونہاں نوں۔ تن تے بے ہوش نیں، تے چوتھا ماں نوں روندا پیا اے۔ او دا تے تُساں گٹ ای کھول دِتا اے۔"

کئی امریکی اور برطانوی مسافر مرد اور عورتیں بھی میرے گرد جمع تھیں۔ وہ بھی حیرت اور مسرت بھری نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیتے، سب کے سب میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے اور بے حد خوش تھے۔

میرے اپنے حصّے سے مس پیسفک بھی باہر آگئیں۔ بولیں۔ "یو آر گریٹ مسٹر اگیاس! یو آر ریئلی گریٹ! یہ ساری مصیبت انھوں نے ہی کھڑی کی تھی —— وہ پھل ابھی تک وہیں پڑے ہیں۔ وہ بم نہیں تھے، میرے اپنے باغ کے سیب تھے۔ آپ کو پتا ہے نا، وہ مجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔"

"او چھڈو جی! ایناں دِیاں گلاں۔ آؤ تُسیں ساڈے کول بیٹھو۔ پہلے تے ایناں وِچوں کسے دی ہمت وی نئیں ہو سکی —— آؤ ساڈے کول بیٹھو۔" امریک سنگھ نے پھر مجھے جپھا ڈال لیا اور بڑی محبت سے ساتھ لے کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ شیر سنگھ کھڑا رہا۔ دوسرے مسافر بھی اس اثنا میں اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے مگر اُن کی حیرت دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے کوئی آسمانی مخلوق سمجھ رہے ہیں۔ جہاز اب واپس سان فرانسسکو جا رہا تھا۔ پائلٹ بار بار لوگوں کو اطمینان سے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"تسیں کِتھے جا رہے سو؟"

"میں کراچی جا رہیا سی جی! پر ایناں تے ہور ای چکر وِچ پا دِتا۔ بہت ہی شہدے لوک نے اے، حد ہو گئی۔" میں نے دونوں پستول اور اسٹین گن کھول کر دیکھے، وہ گولیوں سے لبالب بھرے تھے مگر اُن کی لبلبی کام نہیں کرتی تھیں اور یہ سارا کرشمہ اس [انگوٹھی کا تھا] جسے اُن لوگوں نے خدا معلوم کس قدر زرِ کثیر صرف کر کے کسی سائنسدان سے بنوایا تھا۔ عالیہ نے کہا تھا کہ ایسی انگوٹھیاں چند اعلیٰ پولیس افسروں یا اونچے فوجی عہدوں پر مامور لوگوں کے پاس ہیں مگر میرا یہ خیال تھا کہ وہ انگوٹھی ابھی شاید اُن چند ہی لوگوں کو ہی مل سکی تھیں جنھوں نے اس کی تیاری پر کروڑوں خرچ کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ بھید کیا تھا۔ میں نے مگر اُس انگوٹھی کو انگلی سے اتار کر جیب میں ڈال لیا اور ایسے کہ کسی کو بھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ ہُوا کیا ہے۔

امریک سنگھ ہنس رہا تھا۔ بولا۔ "اچھا اچھا! تُسیں جا رہے سو۔ میں وِی آکھاں جے ایڈا دلیر کون ہو سکدا اے، جیہڑا ہوائی جہاز چھڑا لیندا۔ ایہہ کم تُسیں ہی کر سکدے سو۔ کوئی ہور نئیں کر سکدا سی۔"

"او چھڈو جی، تُسیں کہڑیاں گلاں وِچ پے گئے او۔ ایہہ چنگی طرحاں بنھو، ایناں دِیاں مُشکاں کس دیو۔" میں نے دیکھا اسٹیورڈ اُن پانچوں کو یکجا کر کے اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا۔ پانچواں آدمی برابر چیخ رہا تھا۔ اس کی کلائی کا کھلا جوڑ اُسے سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ بہت بُری طرح بلبلا رہا تھا مگر پھر بھی انھوں نے اُسے باندھ کر ڈال دیا اور میزبان خواتین مسافروں میں کھانے کی چیزیں تقسیم کرنے لگیں۔

جب طیارے میں ذرا ٹھنڈ ٹھنڈا ہُوا تو امریک سنگھ بولا۔ "پر ایہہ دَسو بھائی جی! ایناں کول تے پستولاں تے بندوقاں سن۔ تُسیں ایناں دا مکو کس طراں ٹھپ دِتا، ایہہ گل سمجھ نئیں آئی۔ ایہہ تے بڑے بائیانک قسم دے لوک سن۔ جہاج کوئی عام گل تے نئیں ہو جاندے نیں۔ تُسیں ایناں دا کس طراں مقابلہ کر لیا؟"

"او ئے تکیا نئیں توں! اونہاں کولوں اک دی گولی نئیں چل سکی۔ ہاں! ایہہ بڑی حیرانگی دی گل اے۔ حالانکہ پستول تے بندوقاں دے بالکل ٹھیک ٹھاک سن۔" شیر سنگھ نے بڑے بیٹے کی طرح وہ معاملے کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کرتا رہا تھا۔

"دسو نا جی! ایہہ ہویا کس طراں؟" امریک سنگھ نے بڑے ہی پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں جوان آدمی تھے۔ کوئی پچیس، اٹھائیس سال کے مگر مذہب کے بہت پابند دِسنے تھے۔ داڑھی کو امریکہ میں بھی نہیں بھول سکے تھے۔

"او بس جی، میری مت ماری گئی سی جی! میں وی آ گیا۔ میں کیا ویکھی جائے گی، مرنا تے اِکو واری اے۔"

"او ئے ٹھیک اے جی! پر ویکھو ناں، تساڈے کول سُوئی وی نئیں سی۔ ایہہ وڈی ہریانی دی گل اے۔"

"ہاں! ایہہ تے اسیں بچھڑنے آں۔ پر خیر، جہاز بچ گیا جے —— رب دا شکر ادا کرو۔ نئیں تے ہُن اسیں ہوانا وِچ ہوانے ہو[ندے]۔" یہ کہہ کر شیر سنگھ بڑی فراخدلی سے مسکرایا۔ دوسرے مسافر بھی جاری باتیں بڑے غور سے سُن رہے تھے مگر ان کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا اور مس پیسفک ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"تھینک یو مسٹر اگیاس! اپنی سیٹ پر چلیں۔ انھیں آرام کرنے دیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ چلیں اب تو جلد ہی سان فرانسسکو پہنچ جائیں گے۔ اچھا یار جی! فیر سہی۔ اسیں فیر ملاں گے —— سان فرانسسکو جا کے۔" میں نے اُن دونوں سے ہاتھ ملایا اور مس پیسفک کے ساتھ جہاز کے دوسرے حصّے میں جا بیٹھا۔ وہاں بھی اس وقت سکون اور امن و امان قائم ہو چکا تھا مگر اُس آدمی کی موت نے مجھے پریشان کر دیا تھا جس کے جسم میں دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ اُسی وقت مر گیا تھا۔ اس کی لاش وہاں سے اٹھا کر اُنھوں نے دیوار کے ساتھ لگا دی تھی اور اُس پر چادر ڈال دی تھی۔ پتا نہیں وہ کون آدمی تھا اور کس کے لیے کہاں جا رہا تھا؟

"یہ آدمی کون تھا مس؟"

"یہ بتا رہے ہیں کہ اس کا نام فریڈرک تھا۔ پیرس میں کسی سرکاری کام سے جا رہا تھا۔"

"اس کی موت کا مجھے بہت افسوس ہے مس! وہ خاتون کون تھیں جو اس کے پیچھے اٹھی تھیں؟"

"وہ اس کی ہمشیرہ تھی۔ سیر کے لیے پیرس جا رہی تھی۔"

"اوہ! ویری سیڈ۔ کاش میں اُسے بچا سکتا۔ مجھے ہوش ہی بہت دیر میں آیا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی آپ اس کو بچا بھی سکتے تھے؟"

"ہاں۔ کاش میں نے انھیں پہلے ہی روک دیا ہوتا۔ دیکھا نہیں آپ نے، اُن کی کوئی گولی کام نہیں کر سکی۔"

"مگر.... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا! اُن کی گولی کیوں نہ چلی؟ مجھے ہی نہیں سب لوگوں کو سخت حیرت ہے۔ وہ یہی باتیں کر رہے ہیں۔"

"پتا نہیں گولی کیوں نہیں چل سکی۔ وہ گھبرا گئے ہوں گے۔"

"مگر وہ فریڈرک! اس پر گولی کیسے چل گئی؟" وہ ہر بات کی وضاحت چاہتی تھی اور تحیّر اس کی آنکھوں میں ایسا اُبھر آیا تھا کہ... ہیرو شاید۔

"رہنے دیں مس! بس ہو گئی جو بات ہونی تھی۔ فریڈرک کی موت آئی تھی، اُسے ساتھ لے گئی۔ مجھے ابھی زندہ رہنا ہے تو میں زندہ ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں آدمی کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے کہ اتنے لوگوں کی جان بچ گئی۔ ورنہ ہم سب ذلیل ہو جاتے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ اینڈ اسے ٹروکر سیکن، میرا اعتقاد بھی یہی ہے مگر.... دیکھیں نا، یہ سب کچھ ناممکن تھا۔"

"مگر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ نہیں! کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"بڑے شوق سے۔ آپ یقیناً ایک مہذب آدمی ہیں۔" اس نے لائٹر میرے ہاتھ سے لے کر سگریٹ کو خود آگ دکھائی۔ اس کی مسکراہٹ زیادہ دلفریب اور زیادہ قاتل ہو گئی تھی۔ وہ بھی روایتی عورتوں میں سے تھی۔ اُسے بھی دلیر آدمی بہت پسند تھے۔ اب اُسے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ وہ کسی گوری نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ جو بزعم خویش خود کو سب سے اعلیٰ تصوّر کرتی ہے۔

جب ہم سان فرانسسکو واپس پہنچے تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے اور شہر میں ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ وہ لوگ جن کے عزیز و اقارب اس طیارے میں سوار تھے، ہوائی اڈے پر پہنچے ہوئے تھے۔ انھیں پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ پائلٹ نے انھیں ساری صورتِ حال کی راستے میں ہی اطلاع دے دی تھی —— وہ ہوائی اڈے کے لوگوں سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے تھا اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی مجھے ایک لمبے امتحان سے گزرنا ہو گا۔ وہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھیں گے مگر میں اُنھیں کیا جواب دے سکوں گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی بھی ذی ہوش آدمی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ میں تنِ تنہا، نہتا اور غیر مسلح ہوتے ہوئے اور اپنے جسم کو کوئی اوٹ مہیا کیے بغیر اُن سے جا ٹکرایا۔ اُن کی گولیاں جام کر دیں اور انھیں اس حد تک بے ہوش کر دیا کہ اُن کی حالت مُردوں سے بدتر ہو گئی۔ اس بات کو کوئی بھی شخص تسلیم نہیں کرے گا مگر یہ سب کچھ تو اُن کے سامنے تھا اور سیکڑوں آدمی اس کے گواہ تھے۔ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی۔ سب نے دیکھا تھا، سب ہی گواہی دیں گے کہ یہی کچھ ہوا تھا۔ اُن کو میں نے دیکھتے دیکھتے لاشوں میں بدل دیا تھا۔ نہ اُن کے جسم کام آئے نہ اُن کی گولیاں۔ وہ کوئی کم حیثیت کے لوگ نہیں ہوں گے۔ انھیں بہت ٹھوک بجا کر اس مہم پر بھیجا گیا ہو گا۔ وہ عام آدمی نہیں تھے۔ اپنے اندر ہزار خوبیاں رکھتے تھے۔ اُن کے وہ ورزشی اور بہت سے تُلے بدن کوئی ایک دن میں تیار نہیں ہوئے ہوں گے۔ اُن پر اور اس مہم پر بہت روپیہ صرف ہوا ہو گا۔ وہ دو حکومتوں کا معاملہ تھا۔ ایسے میں وہ اپنے سب سے زیادہ منتخب لوگوں کو ہی کسی ایسے کام پر بھیجتے ہوں گے کہ وہ ناکامی کا سامنا نہیں کر سکتے، ناکام ہو کر اختلافات اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اب وہ پانچوں وہاں موجود تھے۔ انھیں جلد ہی ہوش میں لایا جائے گا۔ اُن سے اتا پتا پوچھا جائے گا کہ وہ ہیں کون؟

کس کے ایما پر کام کر رہے ہیں؟ کیا کچھ نہیں پوچھیں گے وہ اُن سے اور وہ مجبور ہوں گے، انھیں سب کچھ اُگلنا ہوگا۔ پھر اختلافات کا جھگڑا اور تیز ہو جائے گا مگر مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔ اصل سوال تو میری اپنی ذات کا ہے۔ میں نامی گرامی غلام جیلانی۔ قسمت کا مارا، ایک سیلانی آدمی۔ نہ میں پڑھا لکھا نہ میں کوئی ہنر جانوں۔ میں تو دھاندلی کی پیداوار تھا۔ میں کسی کو کیا بتاتا کہ میں کون ہوں اور وہ سوال پوچھنے والے بڑے مہذب، بڑے زیرک، بڑے دانا لوگ ہوں گے۔ میں اُن کے سامنے کیا کہہ سکوں گا؟ کیا یہ کہ سارا کرشمہ اس انگوٹھی کا ہے جو مجھے عالیہ نے دی تھی اور جسے میں انگلی میں پہن کر پہاڑ سے بھی ٹکرا سکتا تھا۔ میری اس بات پر کون یقین کرے گا مگر معاملہ تو یہی تھا۔ وہ اس کا تجربہ بھی کر سکتے تھے۔ بات درست ثابت ہو سکتی تھی مگر پھر یہ سوال ہوگا کہ وہ انگوٹھی بنائی کس نے؟ وہ کون سا سائنسدان تھا جس نے ایسی انگوٹھی بنا لی مگر ابھی تک وہ صرف چند جرائم پیشہ لوگوں تک ہی محدود تھی؟ میرا یہی اندازہ تھا اور وہ پوچھیں گے کہ میاں یہ کیا ہوا کہ اُن کے صدر تو اس نعمت سے محروم رہیں اور ایک کے بعد ایک گولیوں سے بھنتے رہیں اور چند لوگ، چند نہایت ہی گندے اور جرائم پیشہ لوگ اس سے مستفید ہوتے رہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — میں کہہ دوں گا.... میں نے یہی سوچ رکھا تھا، میں کہہ دوں گا کہ یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے اور پیر مرشد کی دعا برکت! یہ اس وجہ سے ہوا ہے ورنہ میرے اندر، میرے جسم میں، میری باہنوں میں، میری انگلیوں میں ایسا کوئی کمال نہیں ہے مگر.... یہ تو بیسویں صدی کا آخر ہے یارو! وہ کیسے یقین کر لیں گے۔ خدا تو اُن لوگوں نے سائنس کو سمجھ رکھا ہے، انسانی عقل کو یہ مقام دے دیا ہے کہ وہ ایسی باتوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ وہ بظاہر بہت سچے سیدھے عیسائی ہیں۔ دوسری طرف وہ روس والے ہیں اور کیوبا والے بھی اُن جیسے ہی ہیں۔ جہاں ایک ہی مذہب جاری و ساری ہے اور وہ ہے خدا کی مکمل نفی۔ وہ کب تسلیم کرتے ہیں کہ خدا بھی ہے اور جب میں ایسے لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے کرم کا، احسان کا نام لوں گا تو وہ سمجھیں گے میں پکا پاگل ہوں، گھاس کھا گیا ہوں۔ بھلا اغوا شدہ طیارے کبھی یوں بھی واپس آتے ہیں کہ سارے مسافر صحیح سلامت ہوں اور اُن کے اندر اغوا کنندگان لاشوں کی مانند پڑے ہوں۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے؟ مگر میں اس بات پر اصرار کروں گا کہ بات یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے یہی کرنا ہوگا۔ ورنہ تو وہ میری جان نہیں چھوڑیں گے مگر مصیبت کوئی ایک نہیں تھی۔ وہ سالے تو میری قدِ آدم تصویریں اُتار لیں گے، اس خبر کو خوب خوب اچھالیں گے۔ کہیں گے، پاکستان تیرا شکریہ! کہ تو نے ایک ایسا جوان پیدا کیا جو برستی گولیوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ تصویریں پاکستان کے اخباروں میں بھی چھپیں گی یا... زیادہ ذلیل ہو جاؤں گا۔ وہ تو فوراً ہی مجھے پہچان لیں گے... کس مصیبت کو گلے لگا لیا ہے۔ میں جو کسی اور نام سے... یوں فاش ہو کر رہ جاؤں گا۔ میرے پروردگار! اس... مجھے ہرگز قبول نہیں ہے کہ وہ میری بات کو یوں بانس... مگر یہ سارے مرحلے تو اب میرا مقدر بن چکے تھے۔

آپ نے کبھی بادامی باغ کا اڈہ دیکھا ہوگا۔ وہاں ہر وقت لاریاں ہی لاریاں دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ جا رہی ہیں۔ مسافروں کی بھیڑ اتنی کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی... کے اڈے کا اس سے بھی زیادہ بُرا حال ہے۔ جدھر دیکھو... ہوائی جہاز نظر آتے ہیں۔ طیاروں کو نیچے اُترنے سے پہلے... ہوائی اڈے کے چکر لگانے پڑتے ہیں مگر ہمارے لیے... رَن وے پہلے سے صاف کر دیا تھا۔ جیسے ہی ہمارا طیارہ... ایمبولینس اور دوسری گاڑیاں ہماری طرف لپکیں۔ پولیس... بڑی تعداد نے طیارے کو گھیر لیا۔ لگتا تھا، ہمارے چاروں... ایک افراتفری مچ گئی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے... کرنے والوں پر توجہ دی اور انھیں فوراً ہی ایمبولینسوں میں... لے گئے۔ فریڈرک کی لاش بھی انھوں نے قبضے میں لے... انھوں نے ہمیں بڑی حفاظت سے طیارے سے اُتارا... زندہ سلامت دیکھنے کے لیے ہوائی اڈے پر ایک جم غفیر... ان کے انتظامات دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ تمام مسافروں کو... انھوں نے ایک بڑے سے کمرے میں جمع کر دیا۔ اُن کے... اُن سے ملنے کے لیے اُمڈے پڑتے تھے۔ مجھے اور طیارے کے تمام لوگوں کو انھوں نے الگ بس میں بٹھا کر ہوائی ا... کسی اور حصے میں پہنچا دیا۔ ہمارے پیچھے فوٹو گرافر اور اخبار... رہے تھے۔ میں نے یوں کیا کہ رومال سے اپنا منہ ڈھانپ... بال ابھی زیادہ نہیں بڑھے تھے۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے... کوئی اَن پڑھ سا آدمی سمجھ رہے تھے۔ وہ اُن کا کوئی... تھا جس کا نام ہڈسن تھا۔ وہ میرے بارے میں بہت... تھا۔ اس نے مجھے ایک بار بھی منہ پر سے رومال ہٹا لینے... کہا اور یہ اچھی بات تھی۔

جب ہم کمرے میں پہنچے تو اس وقت وہاں... کئی اور افسر بھی موجود تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پائلٹ کا بیان لیا۔ وہ اس سارے معاملے کا اصل ہیرو مجھے قرار... بار بار اس کی انگشتِ شہادت میری طرف اُٹھتی تھی۔ دوسروں نے اس کے بیان کی تصدیق کی۔ پھر باری آئی دوشیزہ...

...اُسے شاید تقریر کرنے کا شوق تھا۔ اُس نے پہلے بڑی لمبی... اور پھر ہڈسن کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ...جن کا نام بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھیں غیاث احمد صاحب... ہماری مدد نہ کرتے تو شاید آج ہم ہوانا میں ہوتے اور کم و بیش... آدمیوں کو وہ مار چکے ہوتے۔ کیونکہ وہ پانچ آدمی تھے... پستولوں میں نو نو گولیاں بھری تھیں۔ اس کے سوا اُن کے... کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ فریڈرک اپنے جوش میں اُن سے ٹکرا... گولی کا نشانہ بننا پڑا اور پھر غیاث احمد صاحب نے انھیں... کہ اُن سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ یہ بات تو صرف غیاث صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ سارا معرکہ انھوں نے کیسے سر کیا اور اُن کی ...گولیاں کیوں جام ہو کر رہ گئیں۔ یہ محیر العقول واقعہ ایسا نہیں کہ اسے... بھلایا جا سکے۔ مسٹر غیاث کی بہادری اور دلیری کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ یہ ایسے بے مثال آدمی ہیں کہ اتنے ...خطرات کے باوجود انھوں نے کسی کو جان سے مارے بغیر مسافروں کی جانیں بچا لیں۔ ہم سب ان کے اس قدر احسان مند ہیں... بیان نہیں کر سکتی اور یہ پاکستان جا رہے تھے، ٹکٹ ان کے پاس کراچی کا ہے....“

وہ اپنی تقریر میں کچھ زیادہ ہی پُرجوش ہوتی جا رہی تھی کہ ہڈسن نے اُسے روک دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”کچھ اس معاملے پر آپ بھی روشنی ڈالیں گے کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟“

میں نے اپنا رومال منہ پر سے نہیں ہٹایا۔ میرے ارد گرد بہت سے فوٹو گرافر اور اخبار نویس کھڑے تھے۔ وہ بار بار مجھ سے رومال ہٹا لینے کا تقاضا کر رہے تھے مگر میں نے اُن کی کسی بات پر توجہ نہیں دی۔ ”مسٹر ہڈسن! مجھے کوئی بیان نہیں دینا ہے ان سے کہیں کہ یہ مجھے تنہا چھوڑ دیں اور ان میں سے کوئی شخص میری تصویر نہ لے۔ مجھے اس قسم کی پبلسٹی سے سخت نفرت ہے۔“

وہ شاید پہلے سے ہی میری بات سمجھ رہا تھا۔ بولا ”ٹھیک ہے۔ چلیں میں آپ کو ہوٹل پہنچا دیتا ہوں۔ اب یہ طیارہ صبح روانہ ہوگا۔ صحیح وقت ہم آپ کو بعد میں بتا دیں گے ——“ پھر وہ اُن لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا ”براہِ کرم آپ تشریف لے جائیں۔ مسٹر غیاث آرام کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ دوسرا آدمی تھا جس نے مجھے میرے صحیح نام سے پکارا تھا۔ پہلی ورجینیا تھی، وہ بھی مجھے غیاث ہی کہہ رہی تھی۔ ورنہ دوسرے لوگوں میں سے کسی نے بھی مجھے میرے نام سے نہیں پکارا تھا، شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے ...کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ہڈسن نے مجھے کار میں بٹھایا اور خود بھی میرے ساتھ سوار ہو گیا۔ وہ کوئی ہوائی اڈے کی کار تھی۔ جس میں ڈرائیور بھی نہیں تھا

تھا۔ وہ سیدھا مجھے ہلٹن ہوٹل لے گیا اور ایک بڑے ہی آرام دہ اور آراستہ، پیراستہ کمرے میں اُتار دیا۔ میری ضرورت کی ساری ہی چیزیں وہاں موجود تھیں۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اتنا بڑا حادثہ ہو چکا تھا مگر دھمن مجھے دیکھنے کے لیے ہوائی اڈے پر نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے وہ بھیڑ میں کسی جگہ مجھے نظر نہ آیا ہو مگر اُسے تو مجھ سے براہِ راست بات کر لینی چاہیے تھی۔ میں تو اس بارات کا دولھا بنا ہوا تھا۔ مجھ سے ملنے والے کسی آدمی کو وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔ وہ مجھے فوراً ہی اس سے ملوا دیتے مگر وہ کہیں نظر ہی نہیں آیا تھا۔

ہڈسن کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ میرے تمام کوائف اس نے اپنی ڈائری میں لکھ لیے۔ میں نے پاسپورٹ کے اندراجات کے مطابق اُسے ساری باتیں لکھوا دیں۔ آخر میں وہ بولا ”اب یہ بتائیں مجھے مسٹر غیاث.... اور یہ بڑا اہم سوال ہے کہ اُن کے پاس پستول موجود تھے، اُن میں گولیاں بھی بھری ہوئی تھیں، وہ انھوں نے چلا کر دیکھ لیں مگر کوئی گولی پستول سے باہر نہیں نکل سکی۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ یہاں تک کہ اُن کی اسٹین گن بھی کام نہ کر سکی۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”یہ سب میرے اللہ کا کرم تھا مسٹر ہڈسن! ورنہ میں کوئی زرہ بکتر نہیں پہنے ہوئے تھا۔ اگر آپ بھی خدا پہ یقین رکھتے ہیں تو پھر سمجھ لیں کہ یہ اس کا احسان تھا۔ ورنہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے وہ گھبرا گئے ہوں اور اُن کی انگلیاں بے جان ہو گئی ہوں مگر.... یہ سب کچھ بہت ہی حیران کُن ہے۔ بہر حال آپ کھانا کھا لیں اور پھر اطمینان سے سو جائیں۔ طیارے کی روانگی کی اطلاع آپ کو پہنچ جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا مگر ناقابلِ یقین تحیر اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔

میں نے انٹر کام پہ کھانے کے لیے کہہ دیا اور پھر میں نے دھمن کا فون نمبر ملایا۔ اس کا نام میں نے ہڈسن کو بتا دیا تھا اور اُن سے کہہ دیا تھا کہ میں صرف سیر کے لیے یہاں آیا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔ وہ مطمئن بھی ہو گئے تھے یا شاید جان بوجھ کر اپنا اطمینان ظاہر کر رہے ہوں۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

فون میریلین نے اٹھایا۔ بولی ”ہیلو!“ اس کی آواز میں نے پہچان لی۔

”میں ڈاکٹر دھمن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔“

”ان کی بیگم؟“

”وہ بھی اُن کے ساتھ گئی ہیں۔ آپ کون صاحب ہیں؟“

میں نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ مجھے اپنا نام اُسے نہیں بتانا چاہیے

تھا۔یہی بہتر تھا۔کوئی میرے فون کو سنتا تو بھی شاید کچھ نہ سمجھ سکتا اور میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ میرا فون کہیں نہ کہیں پر ٹیپ ضرور ہو رہا ہوگا۔ ہڈسن معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سان فرانسسکو میں میں کن کن لوگوں سے ملا ہوں۔کوئی عزیز، کوئی رشتے دار تو ضرور ہی ہوگا میں نے دھمن کا نام تو لیا تھا مگر یونہی سرسری طور پر کہ میں اس سے واقف ہوں اور اس سے ملا بھی ہوں اور بس۔ پتا نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا، کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ بہت کُریدتے رہے تھے۔ اخبار نویسوں کے سوال زیادہ ہی پریشان کن تھے مگر میں نے چُپ سادھ لی۔ کچھ کہا ہی نہیں اور منہ پر رومال رکھ کر وہاں سے اُٹھ گیا۔یہی بہتر تھا۔ بات نہایت مختصر ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد کھانا آگیا۔اُن سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے سُؤر کا گوشت نہ دیں۔میرے لیسے انھیں کئی اور لوگ بھی ملتے ہوں گے۔ وہ کسی خانے میں لکھ لیتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے۔ اس "نعمت" سے محروم رہتا ہے۔خانے کے آگے جلیبیائی نشان لگا دیتے ہیں۔خس کم جہاں پاک۔جو نہیں چاہتا اُسے کیوں دیا جائے۔کھانا کچھ چینی طرز کا تھا۔مچھلی بھی اُسی انداز سے پکائی گئی تھی اور گوشت بھی۔مجھے بھوک نے کچھ زیادہ ہی پریشان کر رکھا تھا

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے انگوٹھی کو زیادہ محفوظ رکھنے کے لیے پتلون کے نیفے میں خاصا اندر پہنچا دیا۔اس کے اوپر بیلٹ آسکتی تھی اور اب وہ کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔سگریٹ سلگانے کے بعد میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھا بیرا اپنے برتن سمیٹنے کے لیے واپس آیا ہوگا۔یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھول دیا مگر وہاں بیرا نہیں تھا۔میرے سامنے دھمن اور عالیہ کھڑے تھے۔اُن کو دیکھ میرے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔

"ادئے دھمن! یہاں کیسے آگئے تم؟ آؤ اندر آجاؤ۔"

"پتا چلا کہ تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ہم تمھیں دیکھنے کے لیے ایئرپورٹ گئے تھے مگر وہاں بھیڑ اتنی تھی کہ تم سے ملنا بہت مشکل تھا۔بعد میں معلوم ہوا کہ تم یہاں پہنچ گئے —— سو تم سے ملنے یہاں آگئے۔خیریت سے تو ہو نا؟"

"بالکل خیریت سے ہوں۔آپ سے رخصت ہو جانے کے باوجود یہاں ہوں۔یہ ناحیرت کی بات۔" انھیں ساتھ لے کر میں نے اندر آتے ہوئے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ وہ صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

"سو تم نے بالآخر اس انگوٹھی کا راز فاش کر ہی دیا۔"

نہیں بھئی! کچھ خدا کا خوف کرو۔ایسی بات ہرگز نہیں ہوئی اور میں نے اس کا کسی سے ذکر نہیں کیا مگر اس بات کا مجھے بہت افسوس ہے کہ کسی نے جہاز کے اندر اس دھینگا مشتی کے دوران میری

انگلی سے وہ انگوٹھی اتار لی۔ اس کا مجھے بے حد صدمہ ہے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کا منہ کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔

"یہی ہوا ہے دھمن! جہاز کے اندر بڑا ہنگامہ ہوا۔ مرحلے تک وہ میرے پاس موجود تھی مگر پھر پتا نہیں اڑالی۔میری انگلی میں وہ کچھ بڑی بھی تو تھی۔پتا ہی نہیں ہوا کیا ہے۔" میں نے اس سے سراسر جھوٹ بولتے ہوئے

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے جیلانی! کس کو پڑی تھی کہ اس وقت میں تمھاری انگوٹھی پر دھیان دیتا؟"

"میں کیا کہوں۔کسی کو پسند آگئی ہوگی۔ سامان تو کوئی نہیں تھا۔شکر ہے کہ وہ ڈرافٹ محفوظ رہ گیا۔صرف انگوٹھی نہیں گئی، کسی نے میری اس جیب سے دو سو ڈالر بھی نکال وہ میں نے کسی فوری ضرورت کے لیے ادھر رکھے ہوئے

"تم نے کسی سے ذکر نہیں کیا اس کا؟"

"میں کسی سے کیا کہتا! خاموش ہی رہ گیا ہوں۔ وہ کون شخص تھا۔میں تو خود پریشان ہو رہا ہوں۔اب کہ مجھے اس بات کا ذکر ہڈسن سے ضرور کر دینا چاہیے تھا مگر کیا کر سکتا ہے۔" میں نے چہرے سے شدید پریشانی ظاہر ہوئے کہا۔اُس وقت دھمن اپنی انگوٹھی نہیں پہنے ہوئے وہ اُسے ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔

"کیا تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔اس انگوٹھی سے میں ہوائی جہاز کو بچا کر لے آیا ہوں۔ وہ میری ڈھال دھمن! میں کیوں اس کے بارے میں تم سے جھوٹ بولوں گا فائدہ ہوگا مجھے ایسا کرنے سے؟" ایک جھوٹ میں بول چکا اب اس کو نبھانے کے لیے مجھے سو جھوٹ بولنے پڑیں گے مجھے نہیں معلوم کہ میں نے انگوٹھی کے گم ہونے کی بات ان کیوں کہی۔ بعض اوقات آدمی سے غیر اضطراری طور پر ایسا سرزد ہو جاتی ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔بس آپ ہی آدمی کسی بات کی نفی کرنے لگتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔یہی میرے ساتھ ہوا تھا اور وہ دونوں بہت پریشان ہو گئے تھے۔

"دیکھو جیلانی! ہم اپنے طور پر اس انگوٹھی کا کسی سے نہیں کر سکتے۔تم نے بھی شاید ٹھیک ہی کیا ہے کہ اس کے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا کیونکہ... کیونکہ وہ بہت ہی تھی۔اس کی دھات خاص اجزا سے تیار کی گئی تھی۔"

"مگر تم تو کہتے تھے... میرا مطلب ہے عالیہ نے مجھے بتایا

چند بڑے پولیس اور فوج کے افسروں کے پاس ہوگی —— تو کیا یہ غلط تھی؟

"میرا اندازہ یہی تھا مگر تمھیں شاید پتا نہیں ہے کہ اس کام کے نے ایک سائنس داں کو دس لاکھ ڈالر دیے ہیں اور صرف دو انگوٹھیاں بنائے ہیں۔خدا کے لیے سوچو، تم کیا کر بیٹھے ہو۔"

"میں کیا کہوں۔میری اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے انگوٹھی ہوائی جہاز میں گر گئی ہو۔کئی لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ وہ جہاز میں میرے پاس ہی تھی اور پھر میری انگلی میں نہیں رہی۔"

"تم نے کسی سے ہمارا بھی ذکر کیا تھا؟"

"ہاں، میں نے ہڈسن کو بتا دیا تھا کہ یہاں اس شہر میں ایک ڈاکٹر دھمن ہیں، وہی میرے واقف ہیں۔"

"اور کیا کہا تم نے اس سے؟ یہاں آنے کا مقصد کیا بتایا اسے؟"

"میں نے کہہ دیا کہ میں سیر کے لیے آیا تھا اور میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔اب واپس جا رہا ہوں۔"

"یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ ورنہ پتا نہیں وہ کیا سوچتے اور کیا کچھ بتایا ہے تم نے انھیں؟"

"کچھ بھی نہیں! آپ کا ذکر بھی میں نے بس سرسری طور پر کیا تھا اُس نے بھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ کیا مجھے کچھ اور بھی کہنا چاہیے تھا؟"

"نہیں۔بات بڑی مختصر ہونی چاہیے۔تم نے بہت اچھا کیا کہ زیادہ بات کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اخبار نویسوں سے کیا کہا تم نے؟"

"میں نے رومال سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا اسی وجہ سے وہ میری پوری تصویر نہیں لے سکے۔ویسے اُن سے میں نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اتنی بات کہی کہ یہ سب میرے اللہ کا احسان اور کرم ہے۔بس یہی بات کہی تھی میں نے۔"

"یہ بھی اچھا ہی کیا ہے تم نے۔خواہ مخواہ تمھاری تصویریں چھپ جاتیں۔پاکستان تک تمھاری شہرت پھیل جاتی اور تم خواہ مخواہ ہی دھر لیے جاتے۔ وہاں کی پولیس اب بھی تمھاری تلاش میں ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔اسی لیے میں نے اُن سے زیادہ بات نہیں کی۔ خطرہ یہی تھا۔"

"میرا خیال ہے تم اپنا سفر ملتوی کر دو۔چار چھ دن اور یہاں رہ لو۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ کسی دن تم بغیر اطلاع کے یہاں سے جا سکو گے اس جہاز میں تم گئے تو یہ کہانی بھی تمھارے ساتھ ہی جائے گی۔"

"تمھاری یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے دھمن مگر مجھے جانے دو۔ پیرس پہنچ کر میں کوئی دوسرا جہاز لے لوں گا۔ دو دن وہاں ٹھہر کر چلا جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔اب ان کو روکنا اچھا نہ ہوگا۔" عالیہ نے کہا۔ وہ بہت بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔

"بہتر ہے۔بہرحال تم پیرس یا لندن پہنچ کر دو چار دن کے لیے رک جانا۔تاکہ یہ معاملہ تمھارے ساتھ نہ چلے۔ویسے اخبار نویس تمھاری تاک میں ہوں گے۔انھیں تو ایسی باتیں خدا دے۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میرا خیال ہے اگلی دفعہ تمھیں ادھر ہی ٹھہر جانا چاہیے—ہم تمھارا انتظام کر سکتے ہیں۔یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔" دھمن نے مجھے مشورہ دیا۔

"میں بھی اس بات کی تائید کرتی ہوں۔ پاکستان میں آپ نہ رہیں تو بہتر ہے۔کیا ہے آپ کا وہاں؟ آسیہ کو چھڑا سکیں تو پھر سیدھے یہاں آجائیں۔آپ کی والدہ بھی آسکتی ہیں۔کیا ہرج ہے۔کون سی بڑی جائداد ہے آپ کی وہاں۔" عالیہ نے خوش ہو کر کہا۔ پتا نہیں اُسے میرے اس ترکِ وطن میں کیا خوبی نظر آ رہی تھی۔

"میں انھی کے لیے واپس جا رہا ہوں۔ خدا کرے میں اُن کی مشکل آسان کر سکوں۔پھر میں واقعی یہاں آجاؤں گا۔یہ شہر مجھے بہت پسند آیا ہے۔"

"بہرحال اتنی بات یاد رکھو جیلانی کہ تم نے اپنا بہت بڑا نقصان کر لیا ہے۔ وہ انگوٹھی اب تمھیں کہیں نہیں مل سکے گی۔میں بہرصورت اس سائنس داں سے پھر ملوں گا۔شاید وہ ایک آدھ اور بنا دے۔"

"یہ اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا —— البتہ میں ہڈسن سے ضرور ذکر کروں گا کہ جہاز میں میری انگوٹھی گر پڑی تھی۔اس کے خواص کا میں اس سے ذکر نہیں کروں گا۔"

"ہاں! یہ بات اُسے بتا دینا اور دو سو ڈالر کا بھی اور ہاں! ہمارا اس سے جس قدر کم ذکر ہو سکے، بہتر ہے۔کہہ دینا کہ وہ میرے پُرانے واقف ہیں لاہور سے۔اور بس۔اور ایک آدھ گھنٹے کے لیے تمھارے پاس رہے تھے۔بس! اس سے زیادہ نہیں۔کہیں کفلر کا ذکر تو نہیں چھیڑا؟"

"نہیں، اس کا کوئی موقع ہی نہیں آیا۔ویسے وہ پوچھ ضرور رہے تھے مگر میں نے انھیں اُن لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، اب ہم چلتے ہیں۔میرا خیال ہے جہاز صبح سات بجے یہاں سے روانہ ہوگا۔لاہور پہنچ کر ہمیں اطلاع ضرور کر دینا۔ فون نمبر تو تمھارے پاس موجود ہے۔"

"ہاں۔اس کی فکر نہ کرو۔میں خود فون کر دوں گا۔" وہ اُٹھے اور بڑے تپاک سے مجھ سے مصافحہ کر کے باہر نکل گئے۔

اُن کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے انگوٹھی کے گم ہو جانے کی بات کیوں کی۔ اس کا مجھے کیا فائدہ تھا۔ وہ تو انھوں نے مجھے اپنے تحفظ کے لیے دی تھی۔تاکہ میں مختلف النوع خطرات سے

خود کو محفوظ رکھ سکوں۔ وہ اور تو کچھ نہیں چاہتے تھے مجھ سے۔ عالیہ کی یہی مرضی تھی۔ ورنہ وہ مجھے کیوں ایسی قیمتی انگوٹھی دیتے۔ جو الٰہ دین کے چراغ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی اور اب میں اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ تیر تو ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ عالیہ کو میں نے بہرحال بہت مایوس کیا تھا۔ وہ مجھ سے ایسی توقع نہیں رکھتی تھی۔ اس نے دشمن کی مرضی کے خلاف وہ انگوٹھی مجھے دی تھی اور میں نے اُسے ہی کھو دیا۔ یہ بات اُسے کھا گئی ہوگی۔ جب ہی تو وہ بہت زیادہ...... پریشان ہو گئی تھی۔ ورنہ جب وہ دروازے پر آئی تھی تو بہت تر و تازہ نظر آتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بجھتی چلی گئیں۔ اُس کا وہ رنگ، وہ چمک دمک ایک دم ماند پڑ گئی تھی اور مجھے اس بات کا سخت افسوس ہو رہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کسی بہانے سے اُسے بتا دوں گا کہ انگوٹھی مل گئی ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ ہڈسن نے اسے ہوائی جہاز کی تلاشی کے دوران ڈھونڈ لیا تھا۔ کوئی بھی بہانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اُن دونوں کا اعتماد تو بہرحال مجھے بحال کر دینا چاہیے۔ ورنہ وہ پھر مجھ پر کسی بھی قسم کا بھروسہ نہیں کریں گے۔ عالیہ کی رائے تو میرے متعلق بالکل ہی بدل گئی ہوگی اور میں یہی نہیں چاہتا تھا۔ آدمی سو رنگ بدلے مگر کسی خاتون کے دل سے اپنی عزت ختم نہ ہونے دے۔ ورنہ آدمی دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ دوست جن سے اب ہم کبھی نہیں مل سکتے جو ہم سے دور جا چکے ہیں، اُن کے دلوں میں قائم کردہ وہ پرانے جذبے وہ پرانی اچھی رائے، وہ اُن کی محبت کا کھرا پن صرف اسی طرح ہی قائم رہ سکتا ہے اور رہا ہے کہ آپ نے اُن سے اچھا سلوک کیا، انھیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ جب ہی وہ آپ کو ہمیشہ اچھے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اُن کی رائے کو کسی بھی طرح تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔ یہی راحت ہے، یہی زندگی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ جلد ہی میں اُن دونوں کو یہ بتا دوں گا کہ انگوٹھی مجھے واپس مل چکی ہے مگر جو صدمہ جو دھچکا میں انھیں پہنچا چکا تھا وہ ان کے لیے شاید زیادہ ہی سخت اور صبر آزما تھا۔

اپنا لباس اُتار کر میں نے بڑے قرینے سے سجائی ہوئی وارڈروب میں رکھا۔ ڈرافٹ اور دوسری تمام چیزیں میں نے پتلون کی جیبوں میں ڈال دیں اور دونوں زیرِ جاموں میں ہی کمبل لپیٹ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ زندگی عجیب سی چکپھیری بن کر رہ گئی تھی۔ میں بگولوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ایک سُوکھا ہوا تنہا پتہ۔ میں پڑا اور سوچتا تھا، میری تقدیر کچھ اور ہی رنگ دکھاتی تھی۔ کہاں میں، کہاں لاہور اور راولپنڈی کی گلیاں اور کہاں سان فرانسسکو بہت دور کہیں امریکہ کے بہت مغرب میں بحرالکاہل کے پاس۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میرے پروردگار! میری خاک کہاں کہاں اُڑتی پھرے گی؟ میں ایسا تو نہ تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ میں راہ کا پتھر بن جاؤں کوئی جس طرف چاہے پھینک دے۔ آخر یہ راز کیا ہے میرے خدا؟ کوئی حد تو ہوگی اس اذیت کی۔ جب میں تیرے سامنے آؤں گا تو پتا نہیں تو میرے بارے میں کیا فیصلہ دے مگر میری یہ چار دن کی زندگی تو اس قدر زہریلا بنا دی گئی ہے۔

ذہن بہت ہی پراگندہ ہونے لگا تھا۔ سامنے ٹی وی رکھا تھا۔ نیند نہیں آئی تو میں نے ٹی۔ وی لگا لیا۔ کوئی بہت ہی گھٹیا قسم کا آدمی مجھ سے پہلے اس کمرے میں رہ کر گیا تھا۔ کیونکہ جو چینل اس نے لگا رکھا تھا وہ کسی شریف آدمی کے دیکھنے کی چیز تو نہیں تھی۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ ہم کس آزادی کے بارے میں سنتے تھے اور کہتے تھے کہ اس مادر پدر آزادی کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے جو یورپ اور امریکہ کا خاصہ ہے۔ میری تو آنکھیں پتھرانے لگیں۔ میں نے ٹی وی بند کر دیا۔ یا باری تعالیٰ! تیرے بھید نرالے ہیں۔ تو وہ ہے جس نے کسی قوم کو محض اس لیے تباہ کر دیا کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ کسی کو اس لیے غارت کر دیا کہ وہ بُت پوجتے تھے۔ کیسی کیسی قومیں اپنے گناہوں کی وجہ سے تیرے عذاب میں مبتلا ہوئیں مگر ان لوگوں کی رسّی کب تک دراز رہے گی جو ساری ہی حدیں اور سرحدیں پار کر گئے ہیں اور اُلٹا رعب دیتے ہیں کہ اپنے کام سے کام رکھو ورنہ ایٹم بم مار دیں گے؟ ہاں! رعب یہی دیتے ہیں کہ ہمارے پھٹے میں ٹانگ مت اڑاؤ ورنہ تمھاری امداد ختم، قرضے ختم، تمھاری سیاسی آزادی بھی ختم۔ ایٹم بم۔ ہے نا دھاندلی کی بات؟ اور ان کو اب تک کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ اب ایسی کوئی حد باقی نہیں رہی جو یہ پار کریں۔ ان کا اگلا قدم اب چاند سے آگے کسی اور سیارے پر ہے۔ سُنا ہے چاند اُس روز ہی سیاہ ہو گیا تھا جب ان لوگوں نے اُس پر پہلا قدم رکھا۔ پھر ہمارے کسی شاعر کو اس میں کوئی کشش نہ رہی۔ پتا نہیں اب کون سا سیارہ یہ مزید سیاہ کریں گے۔ ہاں! ان کے ہاتھ اب بہت لمبے ہو گئے ہیں، ان کے ہتھیار بے پناہ ہیں، ان کی یلغار بھی بے پناہ ہے۔ ہم تو ان سے تیری ہی پناہ طلب کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں اور یہاں ایک شہدا، لُچا، لفنگا، بدمعاش، پاجی غلام جیلانی جو جگہ جگہ گندگی کھاتا پھر رہا ہے۔ اس کو بھی تو اسی قوم میں اُٹھانا۔ کہ یہ اسی دوزخ کے لائق ہے جو تو نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے سر میں گومڑا سا اُبھر آیا ہو۔ نیند کسی صورت آ ہی نہیں رہی تھی۔

پتا نہیں وہ کون بدمعاش تھے؟ اور اُن کے چار ساتھی کون تھے جنھیں وہ لوگ امریکی قید سے چھڑانا چاہتے تھے، اُن کے لیے انھوں نے پورا ہوائی جہاز ہی اغوا کر لیا تھا۔ مجھے اس ہڈسن سے یہ بات معلوم کر لینی چاہیے تھی مگر میرا خیال ہے وہ بھی اس وقت بالکل بے خبر تھا۔ اُسے آرام و آسائش کی پڑی تھی۔ آخری دم تک وہ میرے ساتھ رہا۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ اب میں صحیح ٹھکانے پر پہنچ گیا ہوں تو وہ مجھ سے مصافحہ کر کے الگ ہو گیا۔

میرا خیال ہے اُس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا کہ اچانک باہر راہداری میں مجھے عجیب سے ہنگامے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی آدمی دوڑ رہے ہوں۔ پھر اچانک مجھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں تڑپ کر بستر سے اُٹھ گیا اور کمبل لپیٹ کر دروازے سے جا لگا۔ دبڑ دبڑ اب بھی جاری تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قصہ کیا ہے۔ پیچھے ہٹ کر میں نے سردی سے بچنے کے لیے کوٹ پہن لیا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ بوٹ میں نے پاؤں میں پھنسا لیے تھے کہ سلیپر میرے پاس کوئی بھی نہیں تھے مگر ابھی میں کوٹ پہن ہی رہا تھا کہ مجھے کمرے کی عقبی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ راہداری میں جو گڑبڑ ہو رہی تھی، وہ تو میں بھول ہی گیا۔ شیشہ ٹوٹا تو میں نے ایک دم کونے میں ہٹ جانے کی کوشش کی مگر شیشے کی کھڑکی کھل چکی تھی اور اُس میں سے دو بہت ہی قوی ہیکل حبشی جوان کمرے میں کود آئے تھے اُن کے ہاتھ میں لمبے لمبے چھُرے تھے۔ ایک کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ تو یہ بات تھی۔ کسی نے مجھے بہت پہلے سے تاڑ رکھا تھا۔ اُن سے بچنے کے لیے میں نے تیزی سے کمبل گھما کر اس طرح مارا کہ وہ دونوں اُس کی لپیٹ میں آئے تو سہی مگر ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ بلکہ اُس کمبل میں چھپ کر اتنی تیزی سے آگے بڑھے کہ مجھے اپنا بچاؤ کرنا محال نظر آنے لگا۔ میں بائیں طرف ہٹا، کمبل کا ایک سرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا اور میں بالکل نہتا تھا۔ باہر ابھی تک بہت ہنگامہ مچا تھا۔

باہر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں، آواز اُن دونوں نے بھی سُن لی ہوگی مگر کمبل کو انھوں نے الگ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے عقب میں چھپ کر وہ دائیں بائیں پھیل گئے۔ میں ابھی بائیں ہاتھ کے آدمی کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کا گلا دبوچ کر اُسے بے بس کر دوں کہ دوسرے آدمی نے ایک دم میرے عقب میں آ کر میرے گلے میں ایسا پھندا ڈالا کہ میرے لیے ہلنا ناممکن ہو گیا۔ پھندا ایسی رسّی کا تھا جس کے دونوں سرے اس کے ہاتھ میں تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس آدمی نے مجھے بے جان کر دیا اور میں ایسا بے ہوش ہوا کہ پھر مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ کیسے مجھے وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور کس راستے سے لے گئے، یہ سب کچھ میرے لیے پردۂ راز ہی رہا۔ وہ پھندا اتنا سخت اور اتنا ناقابلِ شکست تھا کہ مجھے دوسرا سانس لینا نصیب ہی نہ ہو سکا۔ اُس روز مجھے محسوس ہوا کہ وہ لوگ جن کی رگِ احساس میں مسل دیتا تھا، کیسے عذاب سے گزر جاتے ہوں گے۔

اُن لوگوں نے مجھے زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہنے دیا۔ میری آنکھ کھلی تو اس وقت سامنے دیوار گیر گھڑی سوا دو بجا رہی تھی۔ میرے پلنگ کے گرد تین آدمی یوں کھڑے تھے کہ میری ذرا سی حرکت پر وہ مجھے موت کی گہری نیند سُلا سکتے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں عجیب سی ساخت کے ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ لمبے پستول تھے اور اُن کے پوز دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ گولیاں اُن میں بہت تھیں۔ میرے لیے وہ کوئی مقامِ شکر نہیں تھا۔

جیسے ہی میں نے آنکھیں کھولیں، اُن میں سے ایک آدمی نے کوئی پاؤڈر کا بڑے ہی خوشبودار پاؤڈر کا ڈبا پیچھے ہٹا لیا۔ اُسی نے میری گردن میں پھندا ڈالا تھا، اب وہی میرے لیے مسیحا بن رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ انھوں نے کھینچ کر الگ الگ پلنگ کی پٹیوں سے باندھ رکھے تھے۔

کمرہ خاصا صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا کسی بہت بڑی عمارت کے فلیٹ کا حصہ ہے۔ میں نے سر گھما کر انھیں بڑے غور سے دیکھا۔ حبشی اُن میں صرف وہی تھا جس نے مجھے وہ لخلخہ سُنگھا کر پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ دوسرا آدمی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ دوسرے دو آدمی خالصتاً امریکی تھے مگر اُن کی اصل سے میں واقف نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ برطانوی نژاد تھے کہ فرانسیسی، ہسپانوی تھے کہ کوئی اور۔ امریکہ کی تاریخ پر بہت سی قوموں نے یلغار کر رکھی تھی اور وہ اب بھی جاری ہے۔ کوئی کسی بھیس میں، کوئی کسی بھیس میں وہاں پہنچتا ہی رہتا ہے۔

”کیا حال ہیں پٹھے! ادھر دیکھو۔ طبیعت کیسی ہے تمھاری؟“ ایک گورے نے میری ٹھوڑی کا رُخ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ اُن رذیلوں نے پھندا ڈال کر مُرغے کو پھانسا تھا اور پانی تک کو نہیں پوچھ رہے تھے۔ ”پانی مل سکتا ہے کیا؟“ میں نے صاف ستھری انگریزی میں کہا۔ میرا خیال ہے اُسے معلوم تھا کہ میں اُن کی زبان بول سکتا ہوں۔

”ساورن پانی لاؤ صاحب کے لیے۔ بہت تھکے ہوئے لگتے ہیں۔“ اس نے دوسرے آدمی سے کہا۔

وہ ذرا دیر کے لیے میرے سر کے عقب میں غائب ہوا تو حبشی بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ہماری زبان سمجھتا ہے۔“ یہ بات اس نے انگریزی میں کہی مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ گوروں نے اصل انگریزی اس کے پلّے ہی نہیں پڑنے دی۔ وہ ایسے ہی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات کرتے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں آئی تو ٹھیک ورنہ جاؤ موج کرو۔

ساورن میرے لیے بہت نفیس گلاس میں پانی لے آیا۔ اس نے میرا سر اوپر اٹھا کر وہ پانی سارے کا سارا مجھے پلا دیا اور پھر مسکراتے

ہوئے بولا۔ "بیٹے، ہم تمھیں اس لیے یہاں لائے ہیں تاکہ تم سے معلوم کر سکیں کہ آخر وہ کونسی چیز ہے تمھارے پاس جس کی وجہ سے تم نے جہاز میں ہمارے اُن پانچوں ساتھیوں کو برباد کر دیا۔ نہ گولی تم پر اثر کرتی ہے نہ کوئی اور چیز۔ صرف تمھاری وجہ سے وہ لوگ جیل جا پہنچے ہیں۔ ورنہ جانتے ہو، ہم اپنے چاروں ساتھیوں کو اب تک چھڑا چکے ہوتے۔ تمھیں آخر اتنی مزاحمت کی کیا ضرورت تھی، تمھیں پتا نہیں تھا کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ کئی حکومتیں ہمارے ساتھ ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایک مقصد ہے، ایک نصب العین ہے جس کیلیے ہم بڑی بڑی قربانیاں دے سکتے ہیں مگر تم نے انھیں یوں چٹکی بجاتے میں مسل دیا۔ آخر کیا چیز ہے تمھارے پاس؟ ہمیں بھی تو بتاؤ؟"

"کیا تم میرے ہاتھ کھول نہیں سکتے ہو۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اگر تم سچے ہو، حق پر ہو تو شاید میں تمھارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاؤں۔ دنیا میں اَن گنت لوگوں پر چند لوگ بے انتہا ظلم کر رہے ہوں تو میرا خیال ہے میں تمھارا ساتھ دے سکتا ہوں مگر یوں بندھ کر، یوں بے بس ہو کر نہیں۔ بہتر ہے میرے ہاتھ کھول دو اور مجھ سے اطمینان سے بات کرو۔" میں نے ساورن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ یوں کہ وہ میری نظروں کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر دوسرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں" اس کے جھانسے میں مت آنا۔ اسی طرح پڑا رہنے دو اسے۔ وہ پانچ تھے اور ہار گئے اور ہم صرف تین ہیں۔ مطلب کی بات کرو۔ ان رسیوں سے یہ مر نہیں جائے گا۔ بتاؤ بیٹے! وہ کیا چیز تھی تمھارے پاس؟"

"مجھے تم یہ بتاؤ کہ اس ہوٹل کی راہداری میں گولیاں کون چلا رہا تھا۔ اس دوران تم عقبی کھڑکی سے اندر آ گئے۔ اُس ہنگامے کا کیا مطلب تھا؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"ہوں۔ اُدھر پولیس کے سپاہی تمھاری حفاظت پر مامور تھے۔ وہ سارا ہنگامہ اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے تھا، سمجھے تم۔ پولیس نے اُن پر گولیاں بھی چلائیں۔ اس دوران ہم کھڑکی توڑ کر تمھارے کمرے میں کود گئے۔"

"تو یہ بات تھی۔ گڈ۔ دیکھو، میں دراصل خود نہیں جانتا ہوں کہ وہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں نہتا تھا، بالکل غیر مسلح تھا۔ میرے پاس تو ایک چھری بھی نہیں تھی۔ یہ سب میرے اللہ کا کرم اور احسان تھا کہ مسافروں کی جانیں بچ گئیں ورنہ وہ فریڈرک تو وہیں مر گیا تھا۔"

"او ڈیم اِٹ! او لٹ اللہ؟ یو مین گاڈ۔ نو! نو! نو! آئی ڈونٹ بیلیو اِن اِٹ....."

"ذرا ٹھہرو ملارڈو! ذرا ایک منٹ۔" ساورن نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ مسٹر گیاس! کہ کیا یہ بات درست ہے کہ تم طیارے میں بیٹھے ہی اس لیے تھے کہ اس کی حفاظت کر سکو؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم پاکستان سے بڑی سخت کمانڈو قسم کی ٹریننگ لے کر آئے ہو۔ پھر امریکہ میں بھی تم نے ٹریننگ لی اور تمھیں انھوں نے اس دستے میں شامل کر لیا ہے جو جہازوں کے اغوا کو روکنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟" ساورن نے کہا۔

"ہوں۔ یہ بات تمھیں کس نے بتائی ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سب جگہ یہی بات مشہور ہے۔ پولیس کے لوگ بھی یہی بتا رہے ہیں۔ اخبار نویسوں نے بھی یہی کہا ہے۔ ہم اس کی تم سے تصدیق چاہتے ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں اسی لیے اس طیارے میں سوار تھا۔ میرے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک امریک سنگھ تھا اور ایک شیر سنگھ، وہ بھی اس خاص دستے میں شامل ہیں۔ میں نے اس وقت ایک خاص ہتھیار سینے پر لگا رکھا تھا۔ وہ ایک عام سا لاکٹ ہے۔ جس کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں مگر اس کا اثر یہ ہے کہ وہ ہر ہتھیار کو بے اثر کر سکتا ہے۔ وہ میرے پاس تھا مگر وہ میں نے بعد میں اُن کو دے دیا تھا کیونکہ اس کا میرے پاس رہنا خطرے کا باعث بن سکتا تھا اور امریک سنگھ مجھ سے بہت سینئر ہے، وہی ہمارا انچارج ہے۔ اس کے حکم پر میں فرسٹ کلاس میں جا بیٹھا تھا۔" میں نے اُن کے خیال کی تصدیق کر دی۔ وہ دنگ رہ گئے تھے۔

چند لمحوں تک وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے رہے پھر ملارڈو نے میرے کوٹ کا گریبان بڑے زور سے کھینچتے ہوئے کہا۔ "تو تم اُسی اسپیشل اسکواڈ کے آدمی ہو۔ ہماری اطلاع درست نکلی مگر تم نے وہ چیز اُنھیں کیوں دے دی۔ اُس کی کیا ضرورت تھی اُنھیں؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ وہ میرا باس ہے۔ وہ لاکٹ صرف ایک ہی تھا اور کسی ایک کے پاس ہی رہ سکتا تھا۔"

"اس کا سائز کیا ہے؟" ساورن نے پوچھا۔

"یہی کوئی ایک انچ مربع ہو گا۔ ایک زنجیر سے اُسے گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔"

"کیا وہ اب امریک سنگھ کے پاس ہے؟"

"ہاں، یا پھر وہ شیر سنگھ کے پاس ہو گا۔ کوئی بھی اُسے رکھ سکتا ہے۔"

"اور وہ دونوں اب کہاں ہیں؟"

"وہ مسافروں میں شامل تھے۔ اسی طیارے میں وہ لندن تک سفر کریں گے۔"

"ہوں، تو یہ بات ہوئی نا۔ جیکی تم اس کا خیال رکھو۔ نیت بند کر کے چلے جائیں گے۔ ہم امریک سنگھ اور شیر سنگھ کو یہاں لائیں گے۔" ساورن نے حبشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ پستول لے کر میرے دائیں ہاتھ کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، ہم اس کو دیکھے گا۔ ضرورت پڑی تو اسے گولی مار دے گا۔" انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسا ہمارے سرحدی لوگ اردو زبان بولنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ ویسی ہی دقت وہ محسوس کر رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اُن حبشیوں کو امریکہ میں آج بھی مساوی مواقع حاصل نہیں ہیں۔ وہ تعصب کا شکار ہیں۔ انھیں جان بوجھ کر تعلیمی پسماندگی میں مبتلا رکھا گیا ہے۔ نہ انھیں ملازمت کے مساوی مواقع دیے جاتے ہیں نہ کاروبار کے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی صاف ستھری زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے اور جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ وہ جیکی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا اور اب وہ ایسے لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا جن کی امریکی حکومت سے ٹھن چکی تھی اور مجھے اب بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کس گروہ یا کس حکومت کے ایما پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

میں نے جان بوجھ کر اُن سکھوں کا نام لیا تھا تاکہ وہ لوگ اُن پر ہاتھ ڈالیں اور کسی نہ کسی طرح وہ لوگ میرے پاس پہنچ جائیں کہ وہ اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی نشان تو ضرور ہی چھوڑیں گے جس کی وجہ سے میری رہائی آسان ہو جائے گی۔ یہ میرا مفروضہ تھا اور انھوں نے اُسی پر عمل شروع کر دیا اور یہ بہت اچھی بات تھی۔ میں نے امریک سنگھ کے گلے میں ایسا ہی ایک تعویز دیکھ لیا تھا۔ اس کا حجم بھی یہی کوئی ڈیڑھ مربع انچ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی زیور تھا۔ جیسے کوئی لاکٹ ہوتا ہے اور مجھے یقین تھا کہ ساورن اور ملارڈو یا تو اس لاکٹ کے لیے اُس کا گلا کاٹ لیں گے یا اُسے اٹھا کر میرے پاس لے آئیں گے۔ دونوں باتوں میں سے ایک تو ضرور ہی ہو گی۔

میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ ہلٹن ہوٹل سے میری گمشدگی کا پولیس کو اُسی وقت علم ہو گیا ہو گا جب ذرا راہداری کا ہنگامہ ختم ہوا ہو گا۔ انھوں نے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہو گا اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے کن لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اب جیسے ہی ان لوگوں نے اُن سکھوں پر ہاتھ ڈالا تو پولیس چوکس ہو کر یا تو اُن کو اغوا ہونے دے گی یا پھر انھیں وہیں پکڑ لے گی۔ دونوں صورتوں میں وہ صحیح صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں گے۔

جب ساورن اور ملارڈو باہر نکل کر فلیٹ کا دروازہ بند کر گئے تو جیکی نے کرسی گھسیٹ کر میرے قریب کر لی۔ بولا۔ "تم سگریٹ پیتے ہو؟"

وہ گدھا سگریٹ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لفظ کی ریکھیں تالو سے چپکا لیتا تھا۔

"ہاں ہاں! سگریٹ تو میں بہت پیتا ہوں۔ پر یہ میرے ہاتھ... ایک ہی کھول دو تاکہ میں سگریٹ تو پی سکوں۔"

"نو! اس کا آرڈر نہیں ہے۔ ہونٹوں میں پھنسا لو۔ یہ لو۔" اس نے سگریٹ میرے ہونٹوں میں رکھ کر لائٹر سے سلگا دیا۔

"کیا تنخواہ ملتی ہے تمھیں ان خدمات کی؟"

"اچھی خاصی ہے۔ سمجھو دو ہزار ڈالر۔ تم بھی یہ نوکری کر لو۔ تم کو وہ چار ہزار ڈالر دے دے گا۔ تم کمانڈو ہے نا، ٹرینڈ کمانڈو۔ تمھاری زیادہ ہو گا۔"

"مجھے کون نوکر رکھے گا بھئی!"

"کیوں نہیں! اس نے آفر کیا ہے، اُس ملارڈو نے۔ میرا کیا ہے ذرا اپنا ریکارڈ خراب ہے۔ اس لیے ان کی نوکری میں آ گیا۔ یہ اچھا ہے، ظلم نہیں کرتا۔ پر کبھی کبھی ظالم ہو جاتا ہے۔ جیسا آج فریڈرک کو مار دیا۔ جیسے تم کو پکڑ کر لے آیا۔ یہ..... یہ ذرا سا زیادتی کی بات لگتا ہے۔"

رسیاں میرے ہاتھوں پر اتنی کس کر اور ایسی سختی سے بندھی تھیں کہ میرے ہاتھ جنبش نہیں کھا تے تھے۔ میں زور لگا لگا کر تھک گیا تھا اور اب میں نے اس بات کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ ہاتھ میں رسیوں سے آزاد بھی کروا سکتا ہوں۔ جیکی اچھا آدمی تھا۔ بڑا خوبصورت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اک ذرا اس کے ہونٹ اس کے آبا و اجداد پر نہ جاتے تو میں اُسے خوبرو آدمی کہہ سکتا کیونکہ اس کے دانت بہت ہی چمکیلے، ہموار اور صاف شفاف تھے اور اس کا سارا بدن سانچے میں ڈھلا ہوا لگتا تھا۔

"تم ورزش بھی کرتے ہو؟"

"ہاں! ورزش میں تو ہماری جان ہے۔ یہ بدن نہیں دیکھتے، کیسا ہے۔"

"اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔ بہت ہی خوبصورت اور سڈول بدن ہے تمھارا۔"

وہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ پستول اُس نے اپنی ران پر رکھا اور اپنا بازو کھول کر مجھے ڈنڈ دکھانے لگا۔ حالانکہ وہ پوری آستین کا سوئیٹر پہنے ہوئے تھا مگر پھر بھی اس کے بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر مجھے دلی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا بدن بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

"واقعی تم بہت ورزشی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ باکسنگ کرتے ہو؟"

"نہیں، زیادہ نہیں۔ البتہ ہم ریسلنگ کرتا ہے۔ جب موقع ملتا ہے، ہم یہ کام ضرور کرتا ہے۔ میکسیکو، گوئٹے مالا، گی

ور یا نامہ میں ہم نے کئی کشتیاں لڑیں۔ ہارا بھی اور جیتا بھی پر ب نہیں، اس نوکری میں وقت نہیں ملتا۔" کوئی ایک گھنٹہ اسی ح گزر گیا۔ جیکی پہلے پہل تو مجھ سے باتیں کرتا رہا مگر پھر اسے اپنا رض یاد آیا تو اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور عقبی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہر دیکھنے لگا۔ پھر وہ پلٹ کر کمرے کا چکر لگانے لگا۔ اس وقت اس ا موڈ بہت خطرناک ہو گیا تھا جب میں نے کہا کہ میرا ایک ہاتھ و کھول دو۔ اس نے مجھے ایک دم ڈانٹ دیا۔ پتا نہیں یہ بات اُسے یسے سوجھ گئی کہ میں شور بھی مچا سکتا ہوں اور ہم ایسے فلیٹ میں ہیں س کے آگے پیچھے اوپر نیچے کئی لوگ آباد ہیں۔ جیسے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، اُس نے ایک رومال لے کر میرے منہ میں ٹھونس دیا یہ اس کی سراسر زیادتی تھی مگر میں اُسے روک نہیں سکتا تھا۔ یونکہ مجھے اُس نے پاؤں سے بھی باندھ دیا تھا۔ جس کا خیال ملارڈو ساورن کو نہیں آیا تھا۔ اس طرف سے فارغ ہو کر وہ پھر میرے لنگ کے گرد گھومنے لگا۔ ایسی حالت میں کہ اُس نے میری طرف یکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے دل میں شاید میرے لیے رحم ا جذبہ ابھرنے لگتا تھا۔ وہ کسی کو قتل کرنا گناہِ کبیرہ سمجھتا تھا مگر یہ س کی مجبوری تھی کہ اس ملازمت کی وجہ سے اُسے یہ بھی کر گزرنا ڑتا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں برابر حرکت کر رہی تھیں۔ اُن لوگوں کو ہاں سے گئے ہوئے کوئی سوا گھنٹہ ہو گیا تھا کہ اچانک ہمارے کمرے ا دروازہ کسی نے کھول دیا۔ وہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ اس ال میں کہ اُنھوں نے امریک سنگھ اور شیر سنگھ کو الگ الگ سنبھال کھا تھا۔ یوں جیسے وہ دونوں نشے میں ہوں اور اُنھیں اُن کے ہارے کی سخت ضرورت ہو۔ دونوں سکھوں کی پگڑیاں کھل کر گلے یں لٹک رہی تھیں اور اُن کے بال بکھر کر چاروں طرف پھیل گئے تھے۔

اُنھیں لا کر انھوں نے کرسیوں پر ڈال دیا۔ پتا نہیں وہ اُنھیں ہاں سے کس حال میں پکڑ لائے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اُسی لباس یں تھے جس میں میں نے اُنھیں چھوڑا تھا۔

دروازہ بند کر کے ساورن بولا "بکواس کرتے تھے تم۔ اس کے پاس تو کوئی لاکٹ نہیں ہے۔ نہ اس کے پاس۔ ہم نے ان کی پوری لاشی لی ہے۔"

"تو پھر ان کو یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

"صرف تمھیں دکھانے اور ان کی مزید تلاشی لینے کے لیے۔ ہم نے ان کے بال بھی کھول کر دیکھ لیے ہیں۔ اب صرف ان کا جسمی معائنہ ہی باقی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا کرو گے تم ان کا؟"

"ان کا ہم ایکسرے لیں گے۔ مجھے شک ہے کہ وہ لاکٹ ان میں سے کسی نے نگل لیا ہے۔ ورنہ وہ ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔"

مگر ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کسی نے باہر سے فلیٹ کا دروازہ زوردار دھماکے سے یوں کھول دیا جیسے کسی چٹخنی کا وجود ہی نہ تھا اور اُس کے ساتھ ہی چار پولیس مین ریفلیں لیے اندر گھس آئے۔

"خبردار کوئی ہلنے کی کوشش نہ کرے۔ تم تینوں ہماری زد میں ہو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو۔" جیکی نے سارجنٹ کے یہ الفاظ سنتے ہی اپنا پستول پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ ساورن اور ملارڈو ابھی اپنا سانس ہی درست کر رہے تھے اور اُنھیں اپنے پستول یاد ہی نہیں آئے تھے کہ پولیس اندر آ گئی تھی۔ وہ بے بس ہو کر رہ گئے اور انھوں نے نہایت ہی اضطراب کی حالت میں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

اُنھیں سپاہیوں کے حوالے کر کے سارجنٹ میری طرف بڑھا اور بولا "ہمیں افسوس ہے سر! بہت ہی افسوس ہے کہ آپ کو اتنی پریشانی اُٹھانی پڑی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے شکاری چاقو سے وہ نائیلون کی رسیاں کاٹ دیں جو میرے ہاتھوں اور پیروں کو جکڑے ہوئے تھیں۔ میں بڑی مشکل سے پلنگ سے اُٹھا تو اُس نے مجھے سہارا دیتے ہوئے میرے بوٹ میرے سامنے کر دیے۔

"یہ بہت ہی گھٹیا لوگ ہیں مگر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ آپ کو کوئی ضرب تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں! ابھی تک تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان کی طرف دھیان دیں۔ یہ بھی اسی بی۔ او۔ اے سی کے مسافر ہیں جس میں میں سوار تھا۔"

"پتا نہیں اِن کو یہ کیوں لے آئے ہیں۔ خیر معلوم ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ سکھوں کی طرف متوجہ ہوا۔ معلوم یہ ہوا کہ اُن کے سر دل پہ کوئی وزنی شے مار کر انھیں بے ہوش کیا گیا ہے۔

"ہم انھیں بچا لینا چاہتے تھے مگر جب یہ بے ہوش ہوئے تو ہم نے اس خیال سے انھیں وہاں نہیں چھیڑا تا کہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ رہتے کہاں ہیں۔ ہم نے جیپ میں ان کا پیچھا کیا اور یہاں آ پہنچے۔ ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی ہے سر!" وہ مجھے بار بار سر کہہ کر شرمندہ کر رہا تھا۔

"آپ کو پتا ہے یہ مجھے ہوٹل سے اٹھا لائے تھے؟"

"جی ہاں! لائٹ مین کو آپ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ان لوگوں نے چالاکی یہ کی کہ ایک آدمی کو ہوٹل کی راہداری کی طرف بھیج دیا۔ وہ طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگا جس سے لائٹ مین کو اس پہ شک پڑ گیا۔ اُسے تین بار وہاں گولی چلانا پڑی مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ اس عرصے میں یہ لوگ عقبی کھڑکی میں سے اپنا کام کر گئے۔ خدا جانے آپ سے یہ کیا چاہتے تھے۔"

"مجھے بھی انھوں نے کچھ نہیں بتایا، ابھی تو اصل بات کی طرف یہ آئے ہی نہیں تھے۔ صرف شکار کو یکجا کرنے میں لگے تھے۔"

سارجنٹ اُن سکھوں کی طرف متوجہ تھا۔ جب وہ نہیں سنبھلے تو اُس نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اُنھیں فوراً اسپتال لے جائیں۔ انھیں جب سپاہی اٹھا کر باہر لے گئے تو سارجنٹ بولا "میرا نام ہارٹن ہے۔ سارجنٹ ہارٹن۔ آئیں میرے ساتھ۔ ہم ان کتوں کی موٹر میں واپس چلتے ہیں۔ سان کو آگے بڑھاؤ بھئی۔" یہ کہہ کر وہ اُن سب کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکلا۔

ہم اُس عمارت کی دوسری منزل میں تھے، لفٹ بند تھی۔ سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر ہم ملارڈو کی کار میں بیٹھ گئے۔ ایک سپاہی اُن کے دائیں ہاتھ تھا۔ سارجنٹ ہارٹن نے مجھے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھا لیا اور گاڑی خود ڈرائیو کرنے لگا۔

"میرے کپڑے تو ابھی تک ہلٹن ہوٹل میں ہیں۔"

"ہم وہیں جا رہے ہیں۔ آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے اور میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ لائٹ مین آپ کی حفاظت نہ کر سکا۔" اسے واقعی میری حالت دیکھ کر سخت افسوس ہو رہا تھا۔ اُن تینوں کے ہاتھ میں انھوں نے ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں اور اُن کا ایک سپاہی انھیں بندوق کی زد میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ اُن کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں حالات کے اس دھارے کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ امریک سنگھ اور شیر سنگھ کو انھوں نے پتا نہیں کیسے اغوا کیا تھا۔ بہرحال ہارٹن نے بہت عقلمندی سے کام لیا تھا کہ اُنھیں اغوا ہونے دیا۔ وہ لوگ اُنھیں بے ہوش کر کے لے اُڑے مگر اُس نے اُن کا راستہ نہیں روکا۔ بلکہ اُن کے پیچھے چل نکلا۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ ورنہ وہ مجھ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے بھی یہی کچھ سوچ کر اُن دونوں سکھوں کا نام لے دیا تھا اور وہ ایسے تیز نکلے کہ سیدھے اُن سے جا بھڑے۔ نتیجہ بہرحال میری توقع کے مطابق نکلا اور اب ہم ہلٹن ہوٹل جا رہے تھے۔

"جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ وہاں کچھ ایسی افراتفری نہیں مچی تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ ایک دنیا اس ہوٹل میں آباد تھی۔ میں شاید بتا چکا ہوں کہ اس میں کم و بیش دو ہزار کمرے تھے۔ ایک پورا شہر اس کے اندر ڈیرا ڈالے پڑا تھا۔ شاید کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ دوسرے حصے میں کیا ہو چکا ہے۔ ہوٹل کا ایک چھوٹا سا اہلکار دو اور ملازموں کے ساتھ ہمارے کمرے میں پہنچا۔ اس جگہ کا وہ پہلے ہی معائنہ کر چکے تھے۔ پولیس کے چند لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ جن میں ہارٹن بھی موجود تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے وہ کھڑکی پوری کی پوری نکال کر اُسی وقت نئی کھڑکی لگا دی تھی اور شیشے کی کرچیں جو کمرے کے قالین پہ بکھری ہوئی تھیں وہاں سے اُٹھا لی گئی تھیں۔ پولیس اپنی کارروائی مکمل کر چکی تھی اور رپورٹ وہ بہت پہلے سے تیار کر کے

لے گئے تھے۔ اس واقعے کے سارے ہی شواہد وہاں سے مٹا دیے گئے تھے۔ اگر ایسی بات کہیں میرے وطن میں ہوتی تو میرا خیال ہے یار لوگ سارا ہوٹل ہی مقفل کر دیتے اور... کئی دن تک واقعے کے سارے شواہد یونہی موجود رہنے دیتے مگر وہ اتنے منظم اور اتنے تیز لوگ تھے کہ ہر حال میں اپنے معمولات کو جاری رکھنا جانتے تھے اور یہی ان کے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل تھی۔ وہ لکیر پیٹنے کے عادی نہیں ہیں، فوراً ہی اگلا ورق الٹ لیتے ہیں۔

مجھے کچھ ہی دیر بعد انھوں نے تنہا چھوڑ دیا۔ میری پتلون اور قمیص وارڈ روب میں جوں کی توں رکھی تھی اور اس میں تمام چیزیں موجود تھیں۔ مجھے زیادہ فکر اس انگوٹھی کی تھی، وہ پتلون کے نیفے میں دبی تھی۔ اُسے میں نے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا تھا۔ نوٹ بھی سارے کے سارے وہیں دھرے تھے۔ ایک لحاظ سے مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی واقعہ وہاں ہوا ہی نہیں۔

میں بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ ہارٹن نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا ”کیا آپ اسی طیارے سے جانا چاہیں گے؟“

”میرا تو یہی خیال ہے۔ دو گھڑی سو لیتا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ طیارہ صبح سات بجے روانہ ہوگا۔“

”میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ اگر کوئی اور رکاوٹ نہ ہوئی تو صبح آپ روانہ ہو سکیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا تھا اور میں تمام کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح مقفل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ اُس نشے کی طلب نے دوبارہ میرا جسم شل نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی قوتِ ارادی سے اس پر قابو پا چکا ہوں۔ بستر میں لیٹتے ہی میں سارے خیالات ذہن سے جھٹک کر گہری نیند میں کھو گیا۔

دوبارہ جب میں بیدار ہوا تو بہت کوفت ہوئی۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے اور مجھے اب تک کسی نے اطلاع ہی نہیں دی تھی کہ جہاز کا کیا ہوا۔ میں نے جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتے کے لیے کہہ دیا اور فون پر ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کیا۔ معلوم یہ ہوا کہ مجھے جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی گئی کیونکہ جہاز صبح سات بجے روانہ ہو گیا تھا۔ اُن سے میں نے کہا کہ سیکیورٹی افسر سے میری بات کروا دیں۔

یہ تو کوئی تک نہ ہوئی کہ مجھے جان کر جہاز میں سوار ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ اس کارروائی کو میں بھلا کیا نام دے سکتا تھا۔۔۔ ہارٹن ایئرپورٹ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے وہاں سے مایوس ہو کر دھمن کو فون کیا۔ اس بار ریسیور ریسلو نے اُٹھایا اور اپنی جلترنگ ایسی آواز میں بڑے خوبصورت لہجے میں بولی ”مے آئی نو یور نیم پلیز؟“

”اوہ ڈیم اٹ! میں غیاث بول رہا ہوں۔“

”غیاث دی لیڈی کلر! ہیر لیسن کو آپ نے ہی زخمی کیا تھا۔“

”ہاں وہ میری غلطی تھی۔ اب ذرا دھمن سے بات کروا دیں۔“

اس نے ذرا دیر کے لیے آواز روکی اور پھر بولی ”یس بات کریں۔“

”ہیلو! تم ابھی تک یہاں ہی ہو؟“

”میں کیا کرتا، انھوں نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تمھیں اطلاع ضرور دیں گے۔“

”مگر کب! مجھے تو بہت دیر ہو رہی ہے۔“

”ایسا کون سا کام پڑا ہے اُدھر۔ چلے ہی جاؤ گے۔ یہ بیگار نہ لیتے تو شاید تمھاری جان جلدی چھوٹ جاتی۔ اس انگوٹھی کا پتا چلا ہے کچھ؟“

”نہیں! مگر تمھیں پتا ہے میرے ساتھ کیا ہوا۔ مجھے رات انھوں نے ہوٹل سے اغوا کر لیا تھا۔“

”کیا مطلب!“ دھمن نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہاں بھئی! وہ دو آدمی تھے اور طیارہ اغوا کرنے والوں کے ساتھی تھے۔ انھوں نے ہوٹل کی عقبی کھڑکی توڑ کر مجھے بے بس کر دیا۔“

میں نے اُسے رات کے تمام واقعات کی تفصیل بتا دی تو وہ بہت زیادہ حیران ہوا۔ بولا ”ابھی تم واپسی کا پروگرام ملتوی کر دو۔ میں جلد ہی ہوٹل پہنچ رہا ہوں، محتاط رہنا۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔ بہت زیادہ چوکس رہو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میرے لیے ناشتا آ گیا۔ بیرا گو بہت ہی گم صُم سا آدمی تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس سے رات کے واقعے کے بارے میں بات کروں مگر پھر میں چپ ہی رہ گیا۔ اس سے میں کیا کہہ سکتا تھا۔ مگر طبیعت میری سخت مکدر ہو رہی تھی۔ کوئی چیز مزہ ہی نہیں دے رہی تھی۔

ناشتا کر کے میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ہارٹن کا فون آ گیا۔ بولا ”مجھے افسوس ہے جناب! کہ ہم آپ کو صبح کے طیارے میں نہ بھیج سکے۔ دراصل آپ کا تفصیلی بیان بہت ضروری ہے۔ میں ابھی آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

”آپ مجھ سے وعدہ کر کے گئے تھے۔“

”درست ہے مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس سارے معاملے میں آپ کی گواہی بے حد ضروری تھی۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ پولیس اسٹیشن جا کر آپ کو بیان دینا ہے اور بس۔“

”کس وقت آ رہے ہیں آپ؟“

”بس کوئی آدھ گھنٹے میں۔ میرا انتظار کریں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

میں اس مخمصے میں خواہ مخواہ ہی پھنس گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کارروائی اتنی لمبی ہو جائے گی اور مجھے تھانے میں بیان دینے کے لیے بھی جانا پڑے گا۔ میں نے تو ان کے ساتھ نیکی کی تھی۔ اُن کا طیارہ اغوا ہونے سے ہر قیمت پر بچا لیا تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ رات بھر مجھے اس کی سزا بھی سہنی پڑے گی۔ نہ مجھے سونا نصیب ہوا نہ میرا سفر کم ہو سکا الٹا مجھے اُن تین بدمعاشوں کی بھینٹ چڑھ جانا پڑا تھا اور ابھی پتا نہیں کن مرحلوں سے مجھے گزرنا پڑے۔

کوئی بیس منٹ بعد عالیہ میرے پاس آ پہنچی، وہ تنہا آئی تھی۔ دھمن اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اس وقت ساری میں ملبوس تھی۔ ماتھے پر اس نے بندیا سجا رکھی تھی۔ رنگ روپ اس کا بالکل ہندو عورتوں کا سا دکھائی دیتا تھا۔ کاجل کی دھار کو اس نے بہت تیز کر رکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے دیوار کے قریب رکھ کے وہ سیدھی صوفے پہ اپنا پرس پھینک کر وہیں دھم سے بیٹھ گئی۔ میں دروازہ اندر سے بند کر کے پیچھے ہٹا تو وہ بولی ”کیا میں سمجھوں کہ آپ نے دھمن سے انگوٹھی کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ میرا اندازہ یہی ہے جیلانی۔ میں تمھارا دروں بروں بہت اچھی طرح پڑھ سکتی ہوں۔ دیکھیں جھوٹ نہیں بولنا ہے۔“ ابھی میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ وہ پھر بولی ”تھوڑا سا کوک نکالیں فریج سے، پیاس لگ رہی ہے۔“

میں نے فریج میں سے کوک نکال کر دو گلاسوں میں انڈیل دیا۔

”بتایا نہیں آپ نے، آخر قصہ کیا ہے؟ اس سے جھوٹ بولنے کا مقصد کیا تھا؟“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں عالیہ! انگوٹھی میرے پاس ہے اگرچہ اب اس کے بہت سے گاہک پیدا ہو چکے ہیں مگر پھر بھی وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ دراصل میں نے دھمن سے اس لیے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کہیں واپس نہ مانگ لے۔“

”ٹھیک کیا ہے آپ نے۔ وہ بہت ناراض ہو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اتنا بڑا راز تم نے اُسے کیوں بتا دیا۔ بڑی غلط بات ہو گئی ہے۔“

”مگر وہ کس تحفے کا ذکر کر رہا تھا؟ آپ کو بھی اس کا علم ہے؟“

”شاید وہ اس ڈرافٹ کی بات کر رہا ہو۔ یا عین ممکن ہے اس کا اشارہ اس انگوٹھی کی طرف ہی ہو مگر بعد میں اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہو مگر مجھ پہ وہ بہت ناراض ہوا۔ ویسے تم نے بہت عقلمندی کی ہے۔ ورنہ وہ شاید تم سے زبردستی انگوٹھی چھین لیتا۔ وہ اُسے بہت عزیز ہے۔“

”میرا خیال ہے میں اُسے واپس نہ کر دوں۔ اس کے اعتماد کو میں کھونا نہیں چاہتا۔“

”ایسی غلطی ہرگز نہ کریں جیلانی! آپ کی زندگی ویسے ہی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے اور... میں نہیں چاہتی کہ آپ کے دشمن کامیاب ہو جائیں... ہاں بس اتنی بات یاد رکھیں۔ باقی سب بے معنی ہے۔ کہاں ہے وہ انگوٹھی؟“ اس نے بڑے ادائی لہجے میں کہا اور کوک پینے لگی۔ میں نے انگوٹھی نکال کر اُسے دے دی۔۔۔ وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی ”یہ آپ کے بہت کام آئے گی۔ جیلانی! اسے بہت سنبھال کر رکھیں۔“ یہ کہہ کر اس نے انگوٹھی مجھے دے دی۔

”میں آپ کا شکرگزار ہوں عالیہ! ورنہ میں آپ سے کسی ایسی نوازش کی قطعاً توقع نہیں رکھتا تھا۔ اس انگوٹھی کو تو میں جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“ مگر وہ کسی اور ہی خیال میں کھو چکی تھی۔

”دل دریا سمندروں ڈونگے، تے کون دلاں دیاں جانے ہو... یہ نا یہی بات؟ دھمن اسپتال چلا گیا ہے۔ کسی مریض کو اس کی بہت سخت ضرورت تھی۔ مجھے آپ یہ بتائیں جیلانی! کبھی آپ نے محبت کی ہے؟ کسی کو ٹوٹ کر چاہا ہو گا۔ کیا نام ہے اس کا؟“

میں کوک کا گلاس اٹھا کر چوتھی کرسی پر جا بیٹھا۔ میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے تو زندگی نے فرصت ہی نہیں دی تھی کہ میں اپنی کتاب کا یہ ورق اُلٹ سکوں۔ میں اُسے کیا بتاتا۔ ایک وہ مندآ سا تھی۔ وہ خوابوں میں ہی مجھے ملی اور خوابوں میں ہی بچھڑ گئی۔ میں نہ اس کے کسی کام آ سکا نہ وہ میری طرف توجہ دے سکی اور جب میں نے اُسے آخری بار دیکھا تو وہ امرانی کا تنور بن چکی تھی۔ اس کا سارا حسن و جمال ماضی کی داستان بن چکا تھا۔ صرف ایک زخم رہ گیا تھا اس کے دل میں اور وہ تھا اس کے باپ کے قاتل کا دیا ہوا زخم جو اس کی محبت کا اسیر تھا مگر وہ..... بھلا اپنے باپ کے قاتل کو کیسے معاف کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ میرے ذہن اور میرے قلب سے نکلتی چلی گئی۔ اب تو ایک عرصے سے میں اُسے خواب میں بھی نہیں مل سکا تھا حالانکہ ہمارے ملنے کی جگہ ہی وہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں اب کچھ نہیں سوچا تھا اور عالیہ پوچھ رہی تھی کہ اس خوش خصال کا نام کیا ہے جس نے مجھے یوں آتش زادہ بنا رکھا تھا۔ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ اس نے دوسرا گلاس بھرا اور صوفے سے اُٹھ کر میرے پاس آ ٹھہری۔

”بتائیں نا! وہ کون ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟“

”بیٹھ جائیں عالیہ اور یہ بتائیں کہ مجھ ایسے لچے لفنگے آدمی سے کون محبت کرے گا۔ میرے عمل نہیں دیکھتی ہیں آپ؟ اور پھر یہ دیکھیں کہ میری زندگی کن حالات میں گزر رہی ہے۔ ایسی تو مجھے کوئی کبھی نہ مل سکی جو صرف اور صرف میرے لیے خود کو بھول سکتی۔ عورت ایک تحفظ کی طلب گار ہوتی ہے اور وہ میں کسی کو بھی فراہم نہیں کر سکتا۔“

" غلط! بالکل غلط! محبت کسی تقاضے کے بغیر کی جاتی ہے۔ تحفظ تو بہت دور کی بات ہے۔ میں ..... میرا حال دیکھیں، مجھے آپ کہاں کھینچ لائے ہیں۔ حالانکہ ہمارے درمیان کیسی کیسی نفرتیں پل رہی تھیں۔ میں آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی مگر... شاید دل کے نہاں خانوں میں اصل بات یہ نہیں تھی۔ پہلے ہی دن سے میری یہی کیفیت تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ بتائیں نا؟ اس سارے سلسلے کی کوئی وجہ سمجھ آئی ہے آپ کو؟"

" شاید یہ امریکہ کی آب و ہوا کا اثر ہے، اس بے وطنی نے آپ کے محسوسات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ورنہ میں ..... میں تو محض ایک مجرم ہوں اور مجرم کو لوگ جس نظر سے دیکھتے ہیں، وہ مجھے معلوم ہے۔"

" اب کیا سوچا ہے آپ نے؟" اس نے موضوع ایک دم بدل دیا۔ وہ اچانک ہی اداس ہو گئی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

" کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟"

" کب واپس جا رہے ہیں آپ؟"

" میرا بس چلے تو میں ابھی نکل جاؤں۔"

" اُن سے بات کی ہے آپ نے؟"

" ہاں۔ اُن کا سکیورٹی افسر سارجنٹ ہارٹن یہاں پہنچ رہا ہے۔ میں نے اس سے بات کی ہے۔"

" آپ دس پندرہ دن یہاں رُک نہیں سکتے ہیں۔ میں آپ کو امریکہ کی سیر کراؤں گی۔ لاس اینجلس چلیں گے۔ ہالی ووڈ بھی آپ کو دکھاؤں گی۔ بڑی رونقیں ہیں یہاں۔"

" نہیں چاہیے مجھے یہ سب کچھ عالیہ! میں..... میں دراصل آسیہ کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں آپ کیسے کہہ رہی تھیں کہ اُن کو دھمن رہا کروا سکتا ہے۔"

" وہ چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے مگر اس کام کے لیے اُسے پاکستان جانا ہوگا اور یہی وہ نہیں چاہتا ہے۔ تمھیں یاد ہے کراچی کا وہ ہیلتھ ڈائریکٹر ڈاکٹر ترمذی جسے تم نے ہمارے ساتھ اغوا کر لیا تھا؟"

" ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔ کیا کیا ہے اس نے؟"

" ترمذی نے ڈاکٹر دھمن کے خلاف زبردست واویلا مچا دیا۔ باقاعدہ تفتیش کروائی۔ پتا یہ چلا کہ دھمن ڈاکٹری کی سند نہیں لے سکا تھا۔ اس کا لائسنس جعلی تھا۔ اس پر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے اُسے بلیک لسٹ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب دھمن پاکستان نہیں جانا چاہتا۔ ویسے اس کا اثر و رسوخ اب بھی بہت ہے۔"

" اگر آپ کچھ کر سکیں تو ضرور کریں۔ کسی کے نام کوئی چھٹی، کوئی سفارش، کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ میرا پتا آپ کے پاس موجود ہی ہے۔"

" ہاں ہاں، پتا تو موجود ہی ہے۔ کمال کیا آپ نے کہ ہماری ہی کوٹھی خرید لی۔"

" اس کا علم مجھے بعد میں ہوا مگر خیر آپ کو نقصان تو نہیں ہوا۔ میں نے رقم پوری ادا کر دی تھی۔"

" رقم تو مجھے مل ہی گئی تھی۔ ان دنوں ہمیں واقعی بہت ضرورت تھی۔ پھر تو دھمن نے ایسا چکر چلایا کہ ہمارے وارے نیارے ہو گئے۔ بہرحال طے یہ ہوا کہ آپ اب کسی بھی وقت واپس جا سکتی ہیں، یہاں ٹھہریں گے نہیں۔"

" جی نہیں۔ ہو سکتا ہے میں آسیہ اور آپی کو رہا کروا کر یہاں بھیج دوں۔ بہت دکھ اُٹھائے ہیں اُن لوگوں نے۔"

" ٹھیک ہے، میں اُن کا بہت خیال رکھوں گی۔ آسیہ کو اپنی سگی بہن تصور کروں گی۔ اُسے یہاں بھیج دیں۔"

" میں یہی کروں گا۔ میرا خیال ہے اب ہارٹن آنے ہی والا ہوگا۔"

" اچھا تو بس ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں۔ آپ کے لیے میں یہ کچھ چیزیں لائی ہوں۔ اس سوٹ کیس میں کچھ جوڑے ہیں، پرفیوم، سامان، کچھ رومال اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ہیں۔ ان کو سنبھال لیں اور مجھے اجازت دیں۔"

جب وہ میرے کمرے سے رخصت ہوئی تو واقعی بہت زیادہ اُداس تھی مگر میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ آگ دونوں طرف برابر نہیں تھی۔ میرے دل میں وہ خاص شعلہ بھڑک ہی نہیں سکی تھی جو آدمی کو زندگی بھر کے لیے جہنم آسا بنا دیتا ہے۔ وہ اس منزل سے بہت دور تھی یا پھر میں ہی اس لائق نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی اور حیرت کی بات یہ کہ دھمن بھی اس بات کو سمجھ گیا تھا مگر ذکر تک نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی گھر سے نکلا تھا۔ دونوں ایک ہی کار میں سفر کر رہے تھے۔ اُن کا ارادہ مجھ تک پہنچنے کا تھا مگر پھر جانے دھمن کو کیا سوجھی، وہ ہوٹل آنے کے بجائے اسپتال چلا گیا اور عالیہ کار لے کر سیدھی میرے پاس [illegible]۔ کوئی اس کی کیا توجیہ کر سکتا ہے۔ اُن کو سمجھنا میرے بس کی بات تو ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے عالیہ کو اپنی کسی بات سے [illegible] نہیں کیا تھا اور وہ جب وہاں سے رخصت ہوئی تو اسے [illegible] بے توجہی کی شکایت تو ہرگز نہیں تھی۔

ہارٹن کوئی بیس منٹ بعد وہاں آ پہنچا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بولا "جیکی نے سارا راز اگل دیا ہے اور ہم نے اُن کے [illegible] آدمی اور بھی گرفتار کر لیے ہیں۔ وہ کیوبا کی شہ پر یہ کام کر رہے تھے۔ کرائے کے غنڈے۔"

" اچھا! یہ تو بہت اچھی بات سنائی ہے آپ نے مگر [illegible] لوگوں کو رہا کروانا چاہتے تھے؟"

" وہ چی گویرا کے ساتھی ہیں۔ بہت دنوں سے جیل میں ہیں۔ انھوں نے کئی لوگوں کو قتل کیا ہے، ہم انھیں کیسے معاف کر سکتے ہیں؟"

" اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

" آپ کو بس دس منٹ کی زحمت دیں گے ہم۔ آپ سفر میں ہیں۔ بس آپ کا بیان لے کر ہم کسی اگلی پرواز سے آپ کو بھیج دیں گے۔ امریکی حکومت آپ کو انعام بھی دینا چاہتی ہے مگر اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا اور حکومت پاکستان کے ذریعے وہ انعام آپ کو دیا جائے گا۔"

" وہ، خدا کے لیے ایسا مت کریں ہارٹن صاحب! یہ لمبا دھندا کون کرتا رہے گا۔ میں ویسے بھی وہاں حکومت کی مخالف پارٹی کا رکن ہوں، ہماری حکومت کو اس بارے میں آپ کبھی کچھ نہ بتائیں۔ ہاں، مجھے انعام نہیں چاہیے ہے بھائی!"

" مجال ہے کسی کی، کوئی آپ کو وہاں پریشان کر سکے۔ کمال کرتے ہیں آپ! ہم کس لیے یہاں بیٹھے ہیں۔ وی آر سپر پاور، ڈونٹ یو نو اٹ؟"

" یار ہارٹن! خدا کے لیے یہ سلسلہ بند کر دو۔ میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی بہانے سیدھا جیل میں ڈال دیں گے، نہیں جانتے ہو تم انھیں۔"

" اچھا خیر، دیکھا جائے گا۔ ابھی تو آپ اپنا بیان لکھوا دیں۔ چلیں، کوئی اور کام تو نہیں ہے اب؟"

" نہیں، کوئی کام نہیں ہے۔ یہ سوٹ کیس اُٹھا کر میں سیدھا آپ کے ساتھ چل دوں گا۔"

" ٹھیک ہے۔ یہ سوٹ کیس اِدھر ہی رہنے دیں۔ بعد میں لے لیں گے۔ آپ کو شاید ابھی یہ کمرہ اپنے پاس رکھنا پڑے۔ اگلے جہاز کا آپ کو انتظار بھی تو کرنا ہوگا۔"

" ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سوٹ کیس کو الماری میں بند کر کے چابی جیب میں رکھی اور اس کے ساتھ سیدھا تھانے چل دیا۔

ان مراحل کا ذکر میں آپ سے اس لیے کر رہا ہوں یارو تاکہ آپ کو بتا سکوں کہ کوئی مجرم خواہ کیسا ہی کام کیوں نہ کر دے، کوئی وکٹوریہ کراس کے لائق معجزہ ہی کیوں نہ دکھا دے۔ دوزخ ایسی آگ میں جھلستے بے شمار لوگوں کو [illegible]ے۔ وہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو جائے مگر کبھی بھی اچھے لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ سے نادم رہے گا، خود کو ہر جگہ بچانے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا تاکہ کوئی اس کا ماضی بے نقاب نہ کر دے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے ماضی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میرے تمام افعال میرے لیے مصیبت بن گئے تھے۔ میں کوئی اچھا کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں مجبور تھا کہ دیوار کے تاریک رُخ پر رہوں۔ میں اُجالوں سے خوفزدہ تھا۔ میرا دل ہر وقت اسی پریشانی میں مبتلا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسا میرے سامنے نہ آ جائے جو بھری محفل میں مجھے ذلیل کر سکے کہ تم تو یہ تھے! تم شریف کب سے بن گئے؟ یہی غم مجھے کھاتا رہتا تھا اور اس وقت ہارٹن سے بھی میں یہی بات کہہ رہا تھا مگر وہ شریف اور سادہ لوح آدمی نہیں سمجھ سکا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میں محض اپنی معصومیت کی وجہ سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ورنہ جسے امریکی حکومت کوئی انعام دینا چاہے وہ بھلا اسے اپنی خوش نصیبی کیوں نہ سمجھے، وہ امریکی حکومت جس کے سامنے بڑے بڑے قومی رہنما سربسجود رہتے ہیں۔ اُنھیں امریکہ کی ہر لحظہ خوشنودی کی طلب رہتی ہے کہ اُن کا طوطی جب تک ہی بول سکتا ہے جب تک امریکی رہنما اُسے اس قابل سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظروں سے گر کر تو بڑے بڑے جابر اور قاہر رہنما ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر کوئی ایسی حکومت کے دیے ہوئے انعام سے کیسے بدظن یا بدگمان ہو سکتا ہے کہ ان کا دیا ہوا انعام کسی آدمی کو یک بیک ساری دُنیا سے ممتاز کر دیتا ہے مگر..... مگر میں تو اپنی جگہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں ہارٹن سے اور کیا کہتا۔ پاکستان میں تو میں بار بار اپنا نام، اپنی ذات، اپنی شخصیت یہاں تک کہ اپنے والدین کے خانے میں کسی اور کا نام لکھوانے پر مجبور تھا۔ وہ جب کسی خاص پتے کے حوالے سے میرا نام لیں گے تو کیسے نہیں سمجھ سکیں گے کہ میں ہوں کون اور میرا حدودِ اربعہ کیا ہے۔ جیل کی کال کوٹھری کا دروازہ تو انھوں نے پہلے ہی میرے لیے وا کر رکھا ہے اور میری گرفتاری پر ایک گراں قدر انعام کا اعلان وہ بہت پہلے کر چکے ہیں۔ مجھے کوئی انعام امریکی حکومت دے گی تو وہ کیسے برداشت کر لیں گے۔ بڑی مشکل میں جان پھنس گئی تھی میری اور میں چاہتا تھا کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے میں اُن کی نظروں سے روپوش ہو جاؤں۔ ایسا روپوش ہو جاؤں کہ وہ چاہیں بھی تو میں اُنھیں نہ مل سکوں۔ حالت میری یہی ہو گئی تھی۔

پتا نہیں وہاں کون کون سے لوگ موجود تھے مگر جیسے ہی ہارٹن نے میری آمد کا اعلان کیا، وہاں ہر طرف افراتفری سی مچ گئی یوں جیسے کوئی بہت بڑا آدمی وہاں پہنچ گیا ہو۔ تھانہ وہ کوئی ایسا تھا جو ہوائی اڈے کے علاقے سے متعلق تھا۔ تھانے کی عمارت بلاشبہ دیکھنے کے لائق تھی۔ مجھے اپنے ہاں کے تھانے اس جگہ بہت یاد آئے۔ اُن کی حوالات بھی اپنے ہاں کے کسی بہت اچھے بنگلے کے کسی کمرے سے زیادہ بہتر تھی۔ اُس میں بھی حوالاتی موجود تھے مگر اُن کے لیے اُٹھنے بیٹھنے کی مناسب سہولتیں موجود تھیں۔ ہر شے اُنھیں مہیا کی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے اُن کے غسل خانے بھی اُن کے شایانِ شان تھے۔ میں اُن حوالاتیوں کو دائیں ہاتھ بنے صاف ستھرے کشادہ کمرے وال

میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا، عمارت کے برآمدے میں بہت سے افسر آ ٹھہرے تھے۔ ہارٹن نے میرا اُن سے تعارف کروایا تو وہ اس قدر جھک کر اتنے عقیدت اور احترام کے جذبے سے مجھے ملے کہ میں اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ یا پروردگار! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ میں اس مذاق کا متحمل نہیں ہو سکتا ہوں۔ یہ اتنے سارے لوگ، ان کی یہ وردیاں، یہ تمغے، یہ بِلّے، یہ ٹوپیاں سب کے سب میرے لیے جھک گئی ہیں اور میں..... میں ایک پاپی غلام جیلانی! ان کی مت تو نہیں ماری گئی۔

میں اُن سے باری باری ہاتھ ملاتا ہوا آگے بڑھا تو اُن کے سب سے بڑے افسر نے بڑے تپاک سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اندر تشریف لے چلیں جناب! آپ سے ملنے کی بہت آرزو تھی ہمیں۔ آیئے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا اور میز کے سامنے مہمانوں کے لیے رکھی ایک بہت ہی آرام دہ کرسی پر بٹھا کر بولا: "ہارٹن! ان کے لیے کچھ منگواؤ بھئی! یہ تو ہمارے محسن ہیں اور محسنوں کے لیے تو ہم ترستے ہی رہتے ہیں۔ دراصل خدا نے ہمیں اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ ہم پر بھلا کوئی کیا احسان کر سکتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ مگر آپ نے تین سو پچاس آدمیوں کی جان بچا کر ہمیں خرید لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر میرا کندھا تھپتھپاتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ کوئی چالیس پینتالیس سال کا آدمی تھا۔ خالص امریکی۔ اس کا لب و لہجہ یہی بتا رہا تھا کہ وہ بہت ہی پڑھا لکھا اور اپنے کام کا ماہر آدمی ہے۔ مونچھیں اس کی منڈی ہوئی تھیں اور داڑھی بھی بہت کلین شیو کر رکھا تھا اس نے۔ فراخ ماتھا، گہری نیلی آنکھیں، رنگ سرخ، بال سیاہ جن کی وجہ سے اس کے چہرے کی جاذبیت اور بڑھ گئی تھی۔ وردی اس پر سجتی تھی۔ ساڑھے چھ فٹ اونچا وہ جوان کرسی پر بیٹھا مجھے بہت ہی عظیم دکھائی دیا۔ افسری ایسے ہی لوگوں کو ملنی چاہیے۔ اس کی مسکراہٹ بڑی ہی دلفریب تھی۔ جب وہ بات کرتا تھا تو اس کی ٹھوڑی میں گڑھا سا پڑ جاتا تھا۔ کیا چاہِ ذقن اسی کو کہتے ہیں کہ اس کے ہونے سے چہرے اور زیادہ پُرکشش ہو جاتے ہیں۔

کسی نے اُس کی بات سُن لی تھی۔ اس کا ایک چینی ملازم چند ہی لمحوں بعد کافی لے کر اندر آ گیا۔ شاید وہ تیار ہی بیٹھا تھا۔

"لیں کافی پئیں! بیٹھ جاؤ ہارٹن۔ ان سے ملنے کا تو مجھے بہت ہی اشتیاق تھا۔ یہ دیکھیں سارے اخبار میں نے منگوا رکھے ہیں مگر کیا بات ہے آپ نے اپنی تصویر کیوں نہیں آنے دی؟ ہر جگہ آپ نے منہ پر رومال رکھ لیا ہے۔"

" دراصل یہ..... یہ پبلسٹی سے بہت گھبراتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا۔"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں صاحب کہ آپ نے مجھے عزت بخشی۔ میں ممنون ہوں آپ کا مگر وہ کام تو میرا فرض تھا اور ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر کہیں وہ جہاز میں کوئی خرابی پیدا کر دیتے، ان کی گولیاں کام کر جاتیں تو میں شاید سارے ہی مسافروں کو... معاملے کے اس پہلو پر بھی دھیان دیں۔ میں کہتا ہوں وہ... میری بے وقوفی ہی تھی۔ جسے آپ ازراہِ کرم بہادری اور... اور جرأتِ رندانہ کا نام دیتے ہیں۔" مجھے رندانہ کا کوئی صحیح انگریزی لفظ نہیں سُوجھا تھا۔

میری یہ بات سُن کر وہ ہنسا اور اپنے سامنے رکھے بلکے... بید کو ہوا میں لہرا کر بولا: "بات یہ ہے مسٹر غیاث! کہ جنگ میں... آدمی کو نتیجے پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور وہ نتیجہ حیرت انگیز حد تک آپ کے حق میں رہا۔ وہ پانچوں آدمی آپ نے کھڑے کھڑے بے ہوش کر دیے۔ اُن کی گولیاں بے اثر ہو گئیں۔ وہ ایسی جام ہو... کہ نالوں میں ہی پھنس گئیں۔ ایسے میں اگر کوئی ایسی قدرت ر... ہے تو اچھی طرح یہ بات جانتا ہے کہ نتیجہ اس کے حق میں رہے گا یا نہ... ہے کہ نہیں اور اسی وجہ سے آج ساری امریکی قوم آپ کی شکر گزار ہے... ذرا پڑھیں تو سہی اخباروں نے کیا لکھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چاہا... میں اخبار کی خبریں پڑھوں مگر میں نے انھیں پرے ہٹا دیا اور کافی پینے لگا۔

"میں بہت حیران ہوں۔ جو بھی سنتا ہے حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ اُن کے تمام ہتھیار کام کرتے تھے۔ بعد میں ہم نے انھیں چیک... دیکھا۔ وہ بہت عمدہ حالت میں تھے۔ وہ گولیاں... ذرا اڑ ز چلانے... ہیں مگر آپ مجھے یہ بتائیں کہ وہ گولیاں جام کیسے ہو گئیں۔ بس اتنی سی بات آپ مجھے بتا دیں۔"

"میں نے ان کو بتایا تھا مسٹر ہارٹن کو کہ وہ اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ اُن سے کوئی بھی گولی داغی نہ جا سکی۔ ورنہ وہ مجھے وہیں ختم کر دیتے۔"

" اچھا یہ بتائیں، ان کی گردنوں پر، سب کی گردنوں پر ایک ہی قسم کے نشان تھے۔ میں نے کئی ماہروں سے پوچھا ہے مگر وہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ سب نے یہی کہا کہ کوئی رگ ہے جو دماغ تک جاتی ہے۔ وہ رگ دبا دینے سے آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں آپ کیسے کر لیتے ہیں؟ وہ سب لوگ اُسی رگ کے مل دینے سے بے ہوش ہوئے تھے۔"

" ہاں! یہ بات میں آپ کو وضاحت کے ساتھ بتا سکتا ہوں۔ کوئی آدمی ہے یہاں جو عملی طور پر اس مشق کو برداشت کر سکے۔ یعنی وہ بے ہوش ہونے کے لیے تیار ہو۔ پھر اُسے ہوش میں لایا جا سکتا ہے۔" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کا نام پیٹر ہاک تھا، اس آدمی کا جو مجھ سے مخاطب تھا۔ تھانے کا سب سے بڑا افسر د...

...تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ ہارٹن کو دیکھا۔ پھر میز کے دائیں طرف بیٹھے دو اور افسروں کو ٹٹولا۔ وہ سب کے سب مسکرا رہے تھے مگر اس کام کے لیے وہ قطعاً تیار نہیں تھے۔

پیٹر ہاک بلند آواز سے قہقہہ لگا کر بولا: "یہ شرط آپ نے بہت کڑی رکھی ہے مگر ٹھہریں۔ ہارٹن! اُس شائر کو بلائیں ذرا۔ وہ حوالات میں ہے۔ بڑا مان ہے اُسے اپنے جسم پر۔ لائیں ذرا اُسے۔"

ہارٹن مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

"لیں یہ سگریٹ پئیں۔" اس نے اپنے سامنے رکھا ایک ڈبا میرے آگے کر دیا اور لائٹر اٹھا کر میرا سگریٹ خود سلگانے لگا۔

"پاکستان میں آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں لاہور میں رہتا ہوں جناب! اُدھر گلبرگ میں۔"

"آپ اپنا پاسپورٹ دکھا سکتے ہیں مجھے۔"

"جی کیوں نہیں! یہ ہے میرا پاسپورٹ۔" میں نے جیب سے پاسپورٹ نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ اُسے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اُس کے مندرجات اس نے سامنے رکھے کاغذ پر لکھ لیے۔ بولا: "کوئی فون نمبر ہے آپ کا؟"

"جی ہاں۔" میں نے اپنی کوٹھی کا فون نمبر اُسے لکھوا دیا۔

"آپ کام کیا کرتے ہیں وہاں؟"

"میں تجارت کرتا ہوں۔"

"امریکہ آپ کس سلسلے میں آئے تھے؟"

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں یوں کھانسنے لگا، جیسے سگریٹ کے دھوئیں نے مجھے نڈھال کر دیا ہو۔ میں چند لمحوں تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔

"ہوشنگ! ان کے لیے پانی لاؤ۔" اس نے ملازم کو آواز دی۔ "یہ سگریٹ مت پئیں۔ مجھے بھی اسی قسم کا چھُو آتا ہے۔ یہ سگریٹ آدمی کو بہت خراب کرتے ہیں۔" اس نے پیکٹ میرے سامنے سے اٹھا کر الگ رکھ لیا۔ میں نے بھی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ دراصل میں چند لمحے اس سوچ میں گزار رہا تھا کہ اُسے میں کیا جواب دوں۔ وہ میرے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کر رہا تھا اور لکھتا بھی جا رہا تھا۔ وہاں سے وہ کسی بھی لمحے لاہور فون کر کے کوئی بھی بات معلوم کر سکتا تھا۔ پھر اُسے معلوم ہو جاتا کہ میں تو کوئی جعلی آدمی ہوں۔ میرا نام غیاث احمد نہیں ہے۔ نہ میں سردار کریم نواز ہوں۔ علی آشتی بھی نہیں ہوں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ وہ بہت آگے میرے نام کی اصلیت سے واقف ہو جائے گا۔ اُسے یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ دراصل میں غلام جیلانی ہوں اور میرے گھر میں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اس صورتِ حال کو سمجھ سکتا اور کہہ دیتا کہ ہاں غیاث احمد کا گھر یہی ہے۔ اُنھیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ انھیں کون بتائے گا کہ میں کسی کی مہربانی سے بے ہوش کر کے امریکہ پہنچا دیا گیا ہوں۔ کاش میں نے عقل سے کام لیا ہوتا اور صبح ہی اُن کو فون کر دیا ہوتا۔ کال تو مل ہی سکتی تھی۔ مجھ سے بہت ہی زبردست غلطی ہو گئی تھی جس کا اس وقت تو کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال میں نے طے کر لیا کہ وہاں سے نکلتے ہی ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔ اب تو اس جھوٹ کو بہرحال نبھا ہی دینا چاہیے کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار میرے سامنے نہیں تھا۔

ہوشنگ پانی لے آیا تو میں نے ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی لیا۔

"میرا خیال ہے اب آپ کی طبیعت بہتر ہے۔"

"جی ہاں! ایسے ہی دم اُلٹ گیا تھا میرا۔"

اتنے میں ہارٹن اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں ایک اور آدمی تھا۔ بہت ہی پلا ہوا۔ جیسے کوئی پہلوان ہو۔ بلا کی گردن تھی اس کی جسے وہ بڑی مشکل سے گھماتا تھا۔ سینہ اس کا چالیس پینتالیس کے درمیان ہو گا۔ پیٹ اندر کو دبا ہوا۔ وہ چیونگم کھا رہا تھا۔ اس کے بال میری ہی طرح کے تھے۔ ابھی اُگ رہے تھے۔ رنگ اس کا تانبے ایسا تھا۔ دونوں کلائیوں پر اُس نے کڑے پہن رکھے تھے۔

وہ آگے آ کر ہارٹن کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ کسی کو اُس نے سلام نہیں کیا۔ البتہ ایک ایک کر کے وہ سب کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے کھوتے کے پترو۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ ہارٹن کے عقب سے ہٹ کر وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا اور کافی کا مگ جو ہارٹن کے لیے بنایا گیا تھا اور ابھی اس نے نہیں پیا تھا، اٹھا کر اس نے بڑی بے تکلفی سے منہ سے لگا لیا۔ پیٹر ہاک اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مگر ہارٹن بہت سنجیدہ تھا۔ مگ اس نے ختم کر کے میز پر رکھ دیا۔ پھر اپنی کلائی سے منہ پونچھ کر اُس نے یونہی کھڑے کھڑے بائیں بازو کو اس طرح اوپر اٹھا دیا کہ اس کے ڈنڈ نظر آنے لگے۔

"ہیلو شائر! کیا حال ہے تمھارا؟"

"فائن! ایک دم فائن۔ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ تم میری جان کیوں نہیں چھوڑتے ہو۔"

"چھوڑ دیں گے۔ جان بھی چھوڑ دیں گے۔ ابھی اٹلی گرفتار نہیں ہوا۔ اس کا پتا تم بتا دو تو ہمارا کام زیادہ آسان ہو جائے۔"

" میں کسی اٹلی کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں وہ کون کتا ہے۔ مطلب کی بات کرو۔ اُدھر ہماری شطرنج کی بازی چل رہی ہے۔"

" اوہ تو یہ بات ہے۔ دیکھو! یہ غیاث احمد ہیں۔ تم سے کچھ پنجہ آزمائی کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہیں مجھ سے مسٹر پیٹر! ان کو خواہ مخواہ پٹوانا ہے مجھ سے۔ ان کا جثہ دیکھا ہے آپ نے۔"

"اِس کی فکر نہ کرو۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں غیاث صاحب مگر تھوڑی ہل چل تو ہونی ہی چاہیے نا۔"

"یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں ان سے لڑنا چاہتا ہوں ـــ آئی ایم ساری مسٹر پیٹر! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا اور نہ میں ایسے کسی مظاہرے کے لیے تیار ہوں۔"

"اوہ آپ تو ناراض ہی ہو گئے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ نو.... نو.... آپ ایسا نہ سوچیں۔ آپ نے چونکہ کشتی کا ہی داؤ پیچ استعمال کیا تھا، اس لیے میں نے یہ بات کہی ہے اور شائر بھی پہلوان ہے۔"

"ہوگا! ضرور ہوگا۔ ان کا انداز ہی کہہ رہا ہے مگر مجھے تو آپ معاف رکھیں۔" میں ایک دم کرسی سے اُٹھ گیا اور ہارٹن کی طرف مڑ کر میں نے کہا "آئی ایم ساری مسٹر ہارٹن! آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیے اور کرسی کی گرفت سے باہر نکل آیا۔ اُن سے میں مصافحہ کرنے کے حق میں بھی نہیں تھا۔ وہ بہت ہی گھٹیا لوگ معلوم ہوتے تھے۔ اُنھیں تماشا دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ مجھے شائر سے بھڑا دینا چاہتے تھے۔ محض اس لیے کہ وہ اصل تماشا پھر سے دیکھ سکیں جو میں ہوائی جہاز میں دکھا چکا تھا۔ اُن میں سے کوئی آدمی ایسا ضرور تھا جو اُن اغوا کنندگان کا ہمدرد تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اوہ! آپ تو واقعی ناراض ہو گئے۔ ذرا سنیں تو۔ ہم آپ کو اس طرح نہیں جانے دیں گے۔" پیٹر ہاک نے بلند آواز سے کہا مگر میں نے سُنی اَن سُنی کر دی لیکن جیسے ہی میں ہارٹن کے پاس سے گزرا شائر نے ایک دم اپنا بایاں بازو پھیلا کر میرے آگے کر دیا۔ میرا خیال ہے پیٹر ہاک نے اُسے آنکھ مار دی تھی۔ ورنہ وہ ایسی بدتمیزی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی ایسی حرکت پر اس کے خلاف کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتے تھے۔ اس پر پستول تان سکتے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے موٹی موٹھ والے خاص ڈنڈے اس کے سر میں مار سکتے تھے کہ وہ ڈنڈے ایسے ہی موقعوں کے لیے وہاں رکھے ہوئے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ شائر کے پھیلے ہوئے بازو نے مجھے روکا ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا استہزا ابھر آیا تھا۔

"ہیے! یو ڈرٹی انڈین! ہم سے لڑنا چاہتا ہے! تیری یہ جرأت!"

"مسٹر شائر! میں ہندوستان سے نہیں، پاکستان سے آیا ہوں اور میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا ہوں۔ یہ لوگ مذاق کر رہے ہیں، انھیں سمجھائیں مسٹر ہارٹن! میں باہر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے پھر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ شائر کا بازو... پیچھے نہیں ہٹا تھا اور اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ خون آلود ہو... لگی تھیں۔

"نہیں نہیں نہیں شائر! تم جاؤ، شطرنج کھیلو۔ آپ بیٹھیے مسٹر... ابھی تو آپ کا بیان بھی ہم نے نہیں لکھا، تشریف رکھیں..." میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا مگر شائر اس کی بات... سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پیٹر کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں... اُسے کوئی اور اشارہ مل رہا تھا۔ پیٹر کی معنی خیز ہنسی کا مفہوم... طرح سمجھ رہا تھا۔

"اوہ نو مسٹر ہارٹن! مجھے کوئی بیان نہیں دینا ہے۔ میں... ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی... اس وقت تک شائر نے بازو نیچے کر لیا تھا۔ کیونکہ میں اُس... ہارٹن کے پاس سے گزر رہا تھا مگر ابھی میں نے تیسرا قدم اُٹھایا... تھا کہ اچانک شائر نے پاؤں آگے کر کے کچھ اس طرح گھمایا کہ م... فرش پر گرتے گرتے بچا۔ یہ بڑی زیادتی کی بات تھی۔

"تم مجھ سے لڑنا چاہتے تھے۔ اب بھاگ کیوں رہے ہو..." میں بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ میں نے خود کو... سے سنبھالا۔ "اسے سمجھاؤ مسٹر پیٹر! یہ پولیس اسٹیشن ہے اور یہاں... ہر حال میں امن قائم رہنا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں نے کسی طرف دیکھے... بغیر جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لگا لیا مگر ابھی میں لائٹر... نہیں نکال سکا تھا کہ شائر نے بائیں ہاتھ سے میرے منہ پر ایسا... مارنا چاہا کہ وہ اگر مجھے لگ جاتا تو میں شاید دوبارہ نہ اُٹھ سکتا... میں واقعی پلے ہوئے سانڈ ایسی طاقت تھی مگر میرا دھیان اُس... طرف تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ میرے قریب آیا، میں نے ایک د... نیچے جھک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اس کی کلائی...

"اب بھی وقت ہے پیٹر صاحب! اسے سمجھا لو۔ ورنہ اچھا... نہیں ہوگا۔" میں نے شائر کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ شائر... کبھی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس کا ہاتھ روک بھی سکتا... وہ اُس کا بایاں ہاتھ تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بے پناہ قوت... سامنے میں محض ایک چیونٹی ہوں۔ چند لمحوں تک وہ مجھے دیکھتا... اس نے اپنا جسم ہلائے بغیر کلائی میرے ہاتھ سے چھڑانا چاہی... اچانک میں نے اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ میرا ارادہ سمجھتے ہو... اُس نے پوری قوت سے دائیں لات کی ٹھوکر ماری اور میرے پاؤں... سے اُکھاڑ دیے۔ میری بائیں ٹانگ پر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی... آ گرا ہو۔ اُس کی کلائی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ تب ہارٹن کو احساس... ہوا کہ صورتِ حال بہت خراب ہو گئی ہے۔

"مسٹر پیٹر! شائر سے کہیں کہ یہاں سے چلا جائے۔ یہ ہمارے... مہمان ہیں، ہمارے محسن ہیں۔" مگر پیٹر نے اس کی بات سُنی اَن سُنی... وہ ابھی تک میز کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ہارٹن کی بات... جلدی سے سگریٹ سلگا لیا۔ میں اُس وقت فرش پر جا گرا تھا۔ ...شائر نے پہلا جھٹکا دے دیا تھا۔

"...اُٹھو! گندے کیڑے۔ مجھ سے لڑنے کا مزہ چکھو، ادھر اس... میں کوئی ایسا نہیں جو میری آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات... اُٹھو!" اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے فرش سے اُٹھنے کا اشارہ... اس کا ایسا تھا جیسے وہ کسی مدِمقابل پہلوان کو دوبارہ حملہ کی دعوت دے رہا ہو اور وہ کسی ایسے رنگ میں کھڑا ہو جہاں ...غفیر اس کی لڑائی دیکھنے کے لیے جمع ہو۔

میرا دایاں ہاتھ زمین پر تھا اور ابھی میں پوری طرح فرش ...نہیں ہوا تھا مگر جیسے ہی اس نے بکواس کی میں جھنجلا کر فرش ...بڑھ گیا۔ اس نے اپنی اس ترنگ میں دونوں ہاتھ آگے بڑھا ...رکھے تھے اور اس کی انگلیاں ناچنے لگی تھیں۔ جیسے وہ کسی معمول ...کو اُٹھنے کا حکم دے رہا ہو۔ میں کچھ زیادہ ہی تپ گیا تھا۔ میرے ...اندر کا وحشی اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں نیم دائرے میں ...اس کے گرد گھوما اور پھر میں نے اُس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا پیر سائیں ...زدہ ہو گیا تھا۔ اپنی کلائی میرے ہاتھوں میں دیکھ کر وہ مسکرایا اور ...جھٹکا دے کر اس نے مجھے پھر اپنے زور میں نیچے گرا دینے کی کوشش ...کی مگر میں اس وقت تک اس کی کلائی کو اس قدر دبا چکا تھا کہ ...دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ کا جوڑ کھل گیا اور وہ درد سے بلبلا کر ...قدِ سا اچھل کر زمین پر گر گیا۔ اپنا ہاتھ اس نے کراہتے ہوئے ...دونوں ٹانگوں میں دبا لیا تھا مگر درد کچھ ایسا شدید تھا کہ اس سے ...برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فرش پر پٹخنیاں کھانے لگا۔ میں نے ...اسے اس حال میں ہاں ہاں کرتے دیکھا تو اس کو سکون پہنچانے کے ...لیے میں نے ایک دم اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس جیسی تنی ...ہوئی گردنیں تو میں نے بہت دیکھی تھیں۔ میری پشت پیٹر کی طرف ...تھی۔ جیسے ہی شائر کی گردن میرے ہاتھ میں آئی، میں نے اس کی ...کھال کے نیچے گوشت کی تہ میں دبی رگِ احساس مسل دی اور یوں مسل ...دی کہ وہ دوسرے لمحے بالکل ساکت و جامد ہو گیا۔ میں نے جب ...اسے چھوڑا تو وہ فرش پر ادھ مُوا ہو کر لمبا لیٹ چکا تھا۔ اصلی شائر ...تو اسے گویا رخصت ہو گیا تھا۔

"...لیجیے دیکھ لیں پیٹر صاحب! میرا خیال ہے اب آپ کی تسلی ...ہو گئی ہوگی۔" پھر میں آہستہ آہستہ میز کی طرف پلٹا اور کرسی پر بیٹھ کر ...میں نے سگریٹ سلگا لیا۔

...سب کے سب اپنی اپنی جگہ بُت بنے کھڑے ...تھے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ شائر بہر حال بے ہوش ہو چکا تھا۔ تب پیٹر نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا "اِسے دیکھو ہارٹن! یہ کہیں مر تو نہیں گیا۔ اوہ مائی گاڈ! ایسا منظر تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے شائر کی طرف بڑھا۔ اب اس کے ایک ہاتھ کی نبض پیٹر دیکھ رہا تھا اور دوسرا جھولتا ہوا ہاتھ ہارٹن نے تھام رکھا تھا۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے کہیں اُسے مار تو نہیں دیا تھا مگر وہ بے ہوش تھا اور سانس اس کا ٹھیک ہی چل رہا تھا۔ دونوں نے بیک وقت اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"کوئی اور مظاہرہ بھی چاہتے ہیں آپ؟ کیا خیال ہے مارٹن! میں مسٹر پیٹر کو بھی تختۂ مشق بناؤں؟ ایک مظاہرہ اور بھی ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔"

"او نو! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ شرٹن! اسے اُدھر فرسٹ ایڈ کے کمرے میں پہنچا دو۔ جلدی کرو۔ پتا نہیں پیٹر صاحب کو کیا سوجھی! یہ بہت برا ہوا ہے سر! ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" ہارٹن نے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

پیٹر کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور اس کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے اس نے کوئی بہت بھیانک خواب دیکھا ہو۔ شرٹن نے دوسرے افسر کے ساتھ مل کر شائر کو ڈنڈا ڈولی کر کے کمرے سے فوراً ہی باہر نکال دیا۔

پیٹر بڑی مُرجھائی ہوئی آواز میں بولا "واقعی ہارٹن! ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر.... مگر کیا یہ جلدی ہوش میں آ جائے گا مسٹر غیاث احمد؟" اس نے دوسرا سگریٹ بھی ایش ٹرے میں مسل دیا اور پھر تیسرا ہونٹوں میں دبا لیا۔ یقیناً وہ اندرونی طور پر کسی اضطراب کا شکار تھا۔

"جی ہاں! اُمید تو یہی ہے بشرطیکہ اُسے صحیح علاج مل سکے۔ براہِ کرم میرا بیان لکھیں، مجھے جلدی واپس جانا ہے۔" مگر وہ اتنا اُلجھ چکا تھا کہ لائٹر کا شعلہ بھی اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اور وہ سگریٹ تک نہیں پہنچ رہا تھا، اس کا سر جھک گیا تھا۔ اس نے شائر کو خواہ مخواہ ذبح کروا دیا تھا اور شاید اب اس سوچ میں تھا کہ یہ اکیلا آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک شک کا ناگ اُس وقت اس کے ذہن میں پھن پھیلانے لگا تھا۔

"اِن کا بیان لکھ لیں مسٹر ہارٹن! میں ذرا دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں شائر کا کیا حال ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سر پر ٹوپی رکھی اور عقبی دروازے سے دوسرے کمرے کی طرف نکل گیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ میں آخر کیا کروں گا۔ شائر کو کسی معاملے میں ملوث کر کے انھوں نے حوالات میں بند کر رکھا تھا۔ ہارٹن اُسے دبئی سے اُٹھا کر لے آیا تھا مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ اُسے کس عذاب میں

پھنسا رہا ہے۔ خود شائر کو بھی یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کسے للکار رہا ہے۔ آخر تک اُسے یہی یقین تھا کہ وہ مجھے کسی بھی وقت ختم کر سکتا ہے۔ اسی لیے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں عجیب انداز سے ناچ رہی تھیں۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ کوئی اس کی کلائی توڑ بھی سکتا ہے۔ جب اس نے مجھے "گندے کیڑے" کہا تو میں اُسی وقت ہی اندر سے جھنجھنے لگا تھا۔ اُس نے مجھے ایسی گالی دی تھی جس کا معاوضہ یہی ہو سکتا تھا کہ میں اُسے ختم کر دیتا۔ گردن میں انگلی زیادہ گہری ڈال دیتا تو اس کا وہیں قصہ تمام ہو جاتا مگر میں نے اُسے صرف بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا تھا اور یہی بہتر تھا۔ اب پھر کبھی پیٹر کسی سے ایسے مظاہرے کا تقاضا نہیں کرے گا مگر جو کچھ میں کر چکا تھا، اس سے میرا اپنا ہی ریکارڈ خراب ہو رہا تھا اور میرے بارے میں اُن لوگوں نے جان بوجھ کر اپنی تفتیش کا سلسلہ لمبا کر دیا تھا۔ ہارٹن نے مجھ سے کچھ ذاتی سوال کیے۔ پھر امریکہ میں آنے کا مقصد پوچھا پھر میری واپسی کے بارے میں لکھا اور آخر میں طیارے کے اندر جو کچھ ہوا وہ اس کی تفصیل لکھتا رہا۔ آخر میں اس بیان پر اس نے میرے دستخط کروا لیے۔ اس کام کے لیے اُس نے پیٹر کے اسٹینو گرافر کو بلوا لیا تھا۔ اس نے میرے بیان کی چار نقلیں تیار کیں۔ جب میں اُن پر دستخط کر چکا تو ایک نقل اُس نے مجھے دے دی۔ اس کا اسٹینو بہت سمجھدار آدمی تھا۔ اُس نے میرے بیان کو صحیح صحیح طریقے سے کاغذ پر قلمبند کیا تھا۔ اُس میں کوئی غلطی نہیں تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہارٹن بولا: "آپ ابھی آرام کریں۔ میں آپ کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیتا ہوں۔ چیف آ جائے تو پھر آپ چلے جائیں۔"

"مگر میں جلدی واپس جانا چاہتا ہوں۔ ایک ایک منٹ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔" میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! آپ کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مجھے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ اُن کے آرام کا کمرہ تھا۔ پیٹر ہاک کام سے جب بہت زیادہ تھک جاتا تھا تو اُسی کمرے میں آ بیٹھتا تھا۔ دائیں ہاتھ کھڑکی کے قریب آرام دہ پلنگ پڑا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے رکھے تھے۔ درمیان میں ایک گول شیشے کی خوبصورت میز دھری تھی۔ فرش پر اُنھوں نے گہرے نیلے رنگ کا مصنوعی ریشے کا بنا ہوا قالین بچھا رکھا تھا۔ کمرے میں فریج بھی تھا۔ ٹی وی بھی موجود تھا۔ آدمی کے آرام کی گویا ساری ہی چیزیں وہاں رکھی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسا پُر آسائش کمرہ میرے ہاں کے کسی پولیس افسر کو خواب میں بھی نہ ملا ہوگا۔

میں صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا تو ہارٹن فوراً ہی باہر نکل گیا۔ دروازہ اُس نے باہر سے بند کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ا... عادتاً نہیں کیا تھا بلکہ یہ اشارہ کر دیا گیا تھا کہ وہ مجھے باہر... میرا بُرا ہو، میں نے اپنے لیے بہت گہرا گڑھا کھو... اپنی موت کا سامان میں نے خود پیدا کر لیا تھا اور یہ میری... وہ کتنا بھی مجھے اشتعال دلا دیتا، مجھے خاموش رہنا چاہیے تھا... یہ کہ میں نے کیوں اُن کو اپنے سارے ہی داؤ پیچ عملی مظاہرے... سمجھا دیے۔ یہ کوئی نیک فال نہیں تھی۔ شائر کو اس پیٹر نے... لیے اندر بلایا تھا اور وہ خبیث کا بچہ مجھے نہایت ہی کمزور... گرانے لگا تھا۔ پیٹر کا اشارہ بھی مجھے یاد تھا۔ وہ دراصل یہ... چاہتا تھا کہ آخر ہوائی جہاز کو میں بچا کر کیسے لے آیا۔ وہ کہ... میرے پاس جس کی وجہ سے میں نے اتنے سارے مسلح آدمیوں... کر دیا اور اب اس نے عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بات... میں وہ بڑی حد تک حق بجانب تھا کہ یہ شخص جو امریکہ میں... کسی وجہ سے آ پہنچا ہے تو اس کا منشا کیا ہے؟ اس وحشی جان... مالک کا نام کیا ہے اور وہ مجھ سے کیا کام لیتا ہے؟ وہ اسی فکر... ہلکان ہو رہا تھا۔

مگر یہ سب میرے اندازے ہی تھے۔ مجھے کوئی حتمی... ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی تھی جس سے میں کسی خاص نتیجے پر پہنچ... دشمن نے مجھے ایک نئے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ ایسے جہنم... جہاں ہر طرف سے اجنبی چہرے بھیانک روپ میں میرے... آ رہے تھے۔ اُن کے لیے میرا اچھا کام بھی شک و شبے کا باعث... رہا تھا۔ اُس تھانے میں اب تک جو کچھ ہوا تھا، وہ کسی کی سو... فکر کا نتیجہ نہیں تھا۔ پیٹر ہاک نے تو مجھے صرف میرا بیان لینے... وہاں بلایا تھا مگر اچانک ہی اُسے عملی مظاہرے کی بات سوجھ... وہ اس کے کسی اعلیٰ افسر کا حکم نہیں تھا جس کی پابندی اُس پر لازم... یونہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اُس نے مجھے پھانس... اس طرح کہ میں اپنی نادانی کی وجہ سے خود ہی اس کے جال... پھنس گیا۔ ورنہ کیا ضرورت تھی مجھے اس عملی مظاہرے کے لیے... ہونے کی۔ میں طرح دے جاتا۔ شائر آیا بھی تھا تو میں اس کا... نہ کرتا۔ دب جاتا، جھک جاتا۔ مجھے اس سے بھڑنے کی کیا ضرو... مگر اب میں ایسا کرنے کے بعد ایک طوفان کو جگا بیٹھا تھا۔

پیٹر ہاک کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک واپس نہیں آیا۔ میں فر... رکھے کوک سے دل بہلاتا رہا۔ ڈھیر سارے سگریٹ میں نے پ... مگر وہ نہیں آیا۔ البتہ کمرے کے عقبی دروازے سے اچانک... آدمی اندر گھس آئے۔ دیکھنے میں تو وہ بظاہر بہت مہذب... ہوتے تھے۔ کوٹ پتلون میں ملبوس، ٹائیاں لگی ہوئی، مہر... پاؤں میں چمکتے ہوئے بوٹ مگر وہ پولیس والے ہرگز دکھائی...

...تھے۔ امریکی پولیس کا بھی ایک انداز اور اسلوب ہے۔ اُن کی ...اُن کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتی ہے۔ بیشتر اُن میں سے ایسے ...وہ خاص طرز کے بال کٹواتے ہیں، مونچھوں کو زیادہ بڑھنے ...دیتے۔ اُن میں سے بیشتر بغیر مونچھوں کے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ ...مونچھیں ہی بتاتی ہیں کہ وہ پولیس کے لوگ ہیں مگر اُن دونوں ...چہروں سے ایک خاص قسم کی خشونت اور بے زاری ٹپکتی تھی ...اپنے آپ سے بھی برہم ہوں۔ دونوں چیونگم کھا رہے تھے۔ ...ایسا کیوں تھا۔ اُن کے بدمعاش صفت لوگ ہر وقت چیونگم ...ہوتے تھے اور وہ دونوں بھی اس طرح جگالی کر رہے تھے۔ رنگ ...کے تانبا جیسے سُرخ تھے۔ جیسے وہ کڑی دھوپ میں وقت گزارتے ...ہوں۔ اندر آتے ہی انھوں نے ہیٹ اتار کر مجھے سر کو ذرا سا جھکا کر ...سلام کیا۔

"...مجھے ہنری پاور کہتے ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں آئرن گاف۔ ...ڈومن صاحب نے بھیجا ہے۔"

"اوہ، آئی سی! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اُنھیں معلوم ...میں یہاں ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ خود یہاں پہنچ ...میری انگریزی اِن چند دنوں میں زیادہ عمدہ ہو گئی تھی ...میں خوش تھا کہ میرے حافظے میں وہ سارے الفاظ پھر سے اُجاگر ...ہونے لگے تھے جنھیں میں بھولتا جا رہا تھا۔

ہنری نے ہیٹ پلنگ پر ڈال دیا۔ بولا: "کیا پوچھا ہے انھوں ...نے آپ سے؟" وہ صوفے پر میرے بہت قریب ہو کر بولا تھا۔ اس ...لہجہ سرگوشی کی غمازی کرتا تھا۔ جیسے وہ اپنی آواز کو بہت دبا دینا چاہتا ہو۔

"بس ایسے ہی ذاتی سے سوال تھے۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ ...میں میرا گھر کہاں ہے۔ یہاں میں کس کے پاس ٹھہرا تھا۔ بس ...اسی قسم کی باتیں۔" یہ کہہ کر میں نے بیان کی نقل اس کے سامنے رکھ دی۔

"اوہ تو یہ نقل بھی انھوں نے آپ کو دے دی ہے، گڈ!" اُس نے ...اشتیاق سے وہ کاغذ پڑھنا شروع کر دیا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ تھانے کا کوئی اور آدمی اُن کے پیچھے ...نہیں آیا۔ کسی نے انھیں راستے میں روکا نہیں۔ وہ عقبی دروازے ...سے اندر آئے تھے۔ ایک بڑی راہداری اس طرف بھی تھی۔ کسی ...نہ کسی کو تو اُن کی آمد کا اعلان کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں وہاں قطعاً ...مشتبہ آدمی کی حیثیت سے بیٹھا تھا مگر پولیس نے اس بارے ...میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی اور یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ میں ...سمجھتا ہوں کہ اُن کا طریق کار بالکل ہی جداگانہ ہوگا۔ وہ بڑا جمہوری ...ملک ہے۔ ہر شخص کے شہری حقوق کا وہاں سب سے زیادہ تحفظ ...کیا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ لوگ جہاں چاہتے ہیں، پہنچ جاتے ہیں ...میرے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔

"گاف! ذرا یہ تم بھی پڑھ لو۔" اس نے کاغذ اپنے دوست کی طرف بڑھا دیا۔ خود پائپ سلگانے لگا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مونچھوں پر وہ بڑی آہستگی سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جیسے کسی پرانی چوٹ کو سہلاتے ہیں۔

"اس میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے ہنری!" گاف نے کاغذ کو تہ کر کے مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مگر... مگر... بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے گاف! کیا آپ سے انھوں نے کسی کی ضمانت کے لیے بھی کہا ہے؟"

"نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں؟ آپ کو یہ شبہ کیسے ہوا؟"

"میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں مگر اصل بات یہ ہے مسٹر گیس! کہ... پتا ہے آپ کو کہ آپ ہوائی جہاز میں شدید بیمار کی حیثیت سے لائے گئے تھے۔ آپ کے دونوں گردے کام نہیں کر رہے تھے اور آپ کی ٹانگیں بھی زخمی تھیں۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہیے تھی۔ ڈومن صاحب نے بھی آپ کو بتا دیا تھا۔ مادام عالیہ نے بھی آپ سے یہی کہا تھا۔ آپ کو کیسے معلوم نہیں! اس بات کا ذکر اس بیان میں سب سے پہلے آنا چاہیے تھا۔ آپ کیسے کہتے ہیں کہ آپ یہاں محض سیر سپاٹے کے لیے آئے تھے۔"

"اوہ ڈیم اِٹ! میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا اور پھر صورتِ حال ایسی تھی کہ میں کسی طرح بھی دھمن یا عالیہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اپنی بیماری کا ذکر میں نے اسی لیے نہیں کیا۔ میں تو کراچی واپس جا رہا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ میں پہلے جو کچھ کہہ چکا تھا، اُس سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مسٹر گیس! مگر پولیس کی تفتیش کا رُخ یہی ہوگا۔ اُنھوں نے آپ کو اسی لیے یہاں روک لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بارے میں انھیں سب کچھ معلوم ہو جائے۔ آپ نے اُنھیں یہ کیوں نہیں کہا کہ آپ بیمار تھے۔ علاج کے لیے یہاں آئے تھے۔ اب واپس جا رہے ہیں۔ اور بس۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے بیان سے منحرف نہیں ہو سکتا۔"

"آپ نے ہمیں زبردست مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ ڈاکٹر ڈومن اور مادام عالیہ بھی پریشان ہو گئی ہیں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔"

"اوہ! مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا مسٹر ہنری! اور پتا ہے اُس پیٹر ہاک نے مجھے یہاں ایک شخص ہے شائر، اس سے بھڑا دیا تھا۔ میری اس سے باقاعدہ لڑائی کروا دی۔ وہ سانڈ ایسا پلا ہوا شرابی آدمی ایک دم مجھ پر پل پڑا۔"

"اسے سُن رہے ہیں مسٹر گاف! یعنی اس نے اپنے آپ کو...

سے پٹوا دیا۔"

"میں پٹا تو خیر ہرگز نہیں، اُسے میں نے بے ہوش کر دیا تھا مگر اس لڑائی سے پیٹر ہاک کا اصل مقصد یہ جاننا تھا کہ میں نے ہوائی جہاز میں اتنے سارے مسلح آدمیوں کو کیسے بے بس کر دیا۔ وہ ایک عملی مظاہرے کا تقاضا کر رہا تھا۔"

"اوہ! سیل وِد اِٹ! آپ بہت ہی احمق آدمی ہیں۔ ہم دونوں اس جہاز میں موجود تھے۔ سارا معاملہ ہم نے خود دیکھا ہے مگر آپ کو یہاں عملی مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ خواہ مخواہ 'ایکسپوز' ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں وہ آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ یہ تو بہت ہی بُرا ہوا ہے گاف! کسی طرح اس آدمی کو یہاں سے نکالو ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی۔ ہم تفتیش کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" اس کا لہجہ اب بھی بہت دبا ہوا تھا۔ وہ گاف سے بھی سرگوشی میں ہی بات کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ہاک سے مل لینا چاہیے۔"

"نہیں، وہ اور زیادہ بدظن ہو جائے گا۔ کچھ اور سوچو مسٹر آئرن گاف۔"

"تو پھر اس کے بارے میں ہمیں فوراً ڈاکٹر ڈومن سے ملنا چاہیے، وہی بتا سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ حالات واقعی بہت خراب ہیں۔"

"مگر آپ کو اتنی فکر کیوں لاحق ہے مسٹر ہنری؟"

"آپ نہیں سمجھ سکتے ہیں مسٹر گیٹس! اُن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ آپ نے انھیں اپنا فون نمبر کیوں بتا دیا ہے۔ وہ فوراً وہاں فون کر کے معلوم کر لیں گے کہ کیا آپ کے گھر والوں کو اس بات کا علم ہے کہ آپ اس وقت امریکہ میں ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے بھائی! وہ کہہ دیں گے کہ انھیں تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ آپ اُن سے رخصت ہو کر راولپنڈی گئے تھے، یہی بات تھی نا؟"

"ہاں بالکل یہی بات تھی۔ تو گویا آپ بھی اس سارے معاملے کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اور آپ کو علم تھا کہ میں کس لیے یہاں لایا گیا ہوں اور کس کی وساطت سے؟" میں نے ہنری کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے مسٹر گیٹس! یہ سب کچھ ہمیں ڈاکٹر ڈومن نے بتایا ہے۔ مسٹر آئرن گاف ان کے وکیل ہیں۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حقائق جو ہمیں معلوم ہیں، اُن کو آپ اس بیان میں جھٹلا چکے ہیں۔ ڈاکٹر ڈومن تو صاف کہہ دیں گے کہ میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے ۔۔۔ کہ ہے؟ اس صورت میں سارا بوجھ آپ پر پڑے گا۔ آپ کیسے بچ سکتے ہیں؟ یہی ہم سوچ رہے ہیں۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ گویا ڈاکٹر دھمن مجھے اس مقدمے میں پھنسا کر الگ ہو جانا چاہتا ہے اور یہ مقدمہ ہو گا۔۔۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور پیٹر ہاک سگریٹ کا گہرا کش لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی فائل تھی۔ ہارٹن اس کے پیچھے تھا۔ ہنری اور گاف کو یوں میرے قریب بیٹھے دیکھا تو بھویں ...

"ہیلو مسٹر غیاث! یہ کون صاحب ہیں؟ کوئی دوست ہیں؟"

"مجھے ہنری پادر کہتے ہیں۔ یہ آئرن گاف ہیں۔ ہم دونوں دراصل اس جہاز میں سوار تھے جسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہمیں ... یہ صاحب یہاں ہیں تو ہم ان سے ملنے کے لیے چلے آئے۔"

"اوہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کہاں جا رہے تھے جہاز میں؟"

"ہم پیرس جا رہے تھے کہ یہ واقعہ ہو گیا۔"

"یہ تو بہت بہادر آدمی ہیں جناب! ان کا تو کوئی جواب نہیں ہے۔ بیٹھیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک کرسی کھینچ کر ہمارے ... کے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ہارٹن نے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ہاک کے عقب میں کھڑا رہا مگر میں دیکھ رہا تھا وہ اُن دونوں کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو اب آپ تشریف لے جائیں۔ وہ فائل پر ہاتھ مار کر کچھ اس طرح کرسی پر جم کر بیٹھ گیا جیسے وہ ہماری طرف سے کسی بات کا ... کر رہا ہو مگر اُن دونوں کی باتیں تو ختم ہو گئی تھیں، انھیں ہاک کی موجودگی میں مجھ سے کچھ نہیں کہنا تھا۔

وہ صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے فوراً ہی اٹھ گئے۔ ہنری ...

"مسٹر گیٹس! ہم دوسرے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں ... فارغ ہو کر آئیں تو ہم آپ کو اپنے گھر لے جائیں گے۔ میرے ... بچے آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اخباروں میں آپ کا ... پڑھ کر وہ آپ سے ملنے کی آرزو رکھتے ہیں۔"

"جی بہت بہتر! میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گا مسٹر ..." میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ... وقت میری انگوٹھی میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔ وہ دونوں ... مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے تو ہاک نے ہارٹن کو اشارہ کیا ... بیٹھ جائے۔

"ہاں تو مسٹر غیاث! میں نے آپ کے بارے میں ساری ... مکمل کر لی ہے مگر مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اتنی غلط بیانی ... کیوں لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں ہوں مسٹر ہاک! آپ میرے ... کا یہ صلہ دے رہے ہیں مجھے! میں نے آپ کا جہاز اغوا ہونے ... لیا اور آپ میرے بارے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے ... کیا ہے میرا قصور کیا ہے آخر؟" میں نے ایک دم اپنی آواز میں ... گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بولا "ناراض ... مسٹر غیاث احمد! دراصل ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آپ ... کن حالات میں آئے اور اتنی جلدی واپس کیوں جا رہے ہیں۔ ... آپ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ آپ نے ایک جہاز کو اغوا ... نے سے بچایا ہے۔ آپ کے بارے میں ہماری دلچسپی بالکل فطری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"میں قطعاً کوئی غیر معمولی آدمی نہیں ہوں، میں ایک عام سا ... ان ہوں۔ اپنے ذاتی تحفظ کے لیے میں اگر کوئی گُر جانتا ہوں تو ... کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ مجھے تھانے میں روک لیں۔ میرے ... میں تفتیش کرنے لگیں۔ مجھے آپ یہاں سے نکلنے کیوں نہیں ... دے۔ یہ قصہ کیا ہے مسٹر ہارٹن! آپ مجھے اسی لیے یہاں لائے تھے؟"

"میرا خیال ہے میں اپنا فرض ہی ادا کر رہا ہوں اور خلافِ قاعدہ ... میں کوئی بات نہیں ہے ۔۔۔ کہ ہے؟ ہمارے لیے آپ نہایت ہی ... قابلِ احترام آدمی ہیں۔"

"اچھا احترام کر رہے ہیں آپ میرا۔ میں تین گھنٹے سے یہاں بیٹھا ... خوار ہو رہا ہوں۔ کوئی حد ہے اس زیادتی کی۔"

"ویسے ایک بات ہے مسٹر غیاث! آپ انگریزی بہت اچھی بول لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ آپ کی مادری زبان نہیں ہے۔ بہت ذہین آدمی ہیں آپ۔" ہاک نے بڑی فراخدلی سے میری زباندانی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا مگر مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اُن دونوں کو کوئی زبردست موٹی اور قسم کی پُر پیچ گالی دوں۔ اُن فتنہ پردازوں نے پتا نہیں اس فائل میں میرے خلاف کیا کچھ جمع کر لیا تھا۔

"آپ یہ بتائیں کہ یہاں سیر کرنے آئے تھے یا کوئی اور کام تھا؟ ... سچ بتائیں آپ، جھوٹ ایک بہادر آدمی کو زیب نہیں دیتا۔"

اس سوال میں بڑے راز پنہاں تھے۔ وہ بالواسطہ طور پر ... ہنری اور دھمن کی گردن پر اپنا رَسّا مضبوط کر رہے تھے۔ میں اگر اس ... ابلیس کا نام لے دیتا تو پھر ساری بات ہی کُھل کر سامنے آ جاتی اور ... نہ میں اپنا دفاع کر سکتا نہ دھمن مگر جو ثبوت اس کے پاس موجود تھے ان کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا اور فائل ابھی تک ... بند پڑی تھی۔

"بتائیں نا کہ آپ امریکہ کس لیے آئے تھے؟"

"میں نے اپنے بیان میں یہ سب کچھ آپ کو بتا دیا ہے۔"

"اور وہ سب کا سب جھوٹ ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لیے کہ آپ جب یہاں اُترے چار مئی کو تو اس وقت ... بحیثیت 'شدید بیمار' کی حیثیت سے اُترے۔ کوئی نرس یا لیڈی ڈاکٹر ... کر ہیریسن آپ کے ساتھ تھیں۔ وہی آپ کو ہوائی اڈے سے اسٹریچر پر ڈال کر گاڑی تک لے گئیں۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایمبولینس کس اسپتال کی تھی اور آپ کا علاج کہاں ہوا اور آپ کو بیماری کیا تھی۔ اس بارے میں آپ کچھ بتا سکیں گے۔"

بات کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی تھی۔ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ میرا اس حال میں امریکہ آنا خالی از علت نہیں تھا۔ ایسی صورت میں کہ میں محض پندرہ سولہ دن وہاں گزار کر بڑی صحت مند حالت میں بقائمی ہوش و حواس واپس جا رہا تھا کہ یہ واقعہ ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے وہاں رُکنا پڑا ورنہ میں اب تک کراچی پہنچ چکا ہوتا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اُس سے کیا کہتا، اپنا بیان میں کیسے بدل لیتا مگر وہ سوال اتنا بے ڈھب تھا کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔

"براہ کرم آپ یہ بتائیں کہ آپ کو تکلیف کیا تھی؟"

"دیکھیں، میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور وکیل کون ہے آپ کا؟"

"ابھی تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"پھر... کیا سوچا ہے آپ نے؟" ہاک کا لہجہ اب بھی بہت نرم اور مہذب تھا۔ وہ قطعاً طیش میں نہیں آیا۔ ورنہ کوئی میرے علاقے کا تھانیدار ہوتا تو اب تک میری لمبی "چھترول" کر چکا ہوتا اور میری تمام نسلوں کو اپنی گالیوں میں لپیٹ چکا ہوتا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ صاحب جو ابھی یہاں موجود تھے ..... آئرن گاف، یہ وکیل ہیں۔ میں اِن سے مشورہ کر سکتا ہوں۔"

"ہاں، میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ ضرور مشورہ کریں۔ اگر آپ ان کے ساتھ جانا چاہیں تو انھیں آپ کی ضمانت دینا ہو گی۔ تاکہ ہم دوبارہ ضرورت پڑنے پر آپ سے مل سکیں۔ ٹھیک ہے نا! یہ بہت ضروری ہے۔" پھر اس نے فائل کھول لی اور بولا "آپ نے شاید اپنے گھر کا فون نمبر ہمیں صحیح نہیں بتایا ہے۔ میں وہاں دوبار فون کر چکا ہوں مگر وہ گھر کسی سردار کریم نواز کا ہے۔"

"اوہ! کیا نمبر لکھوایا تھا میں نے؟"

وہ میرے بیان کو پڑھتے ہوئے میرے گھر کا نمبر بتانے لگا۔

"میرا نمبر تو یہی ہے مسٹر ہاک! آپ کو کوئی اور نمبر مل رہا ہو گا۔ غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔ میں دوبارہ چیک کر لوں گا۔ ویسے آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کی ٹانگیں زخمی تھیں؟ کیونکہ جب آپ یہاں آئے تو مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کی ٹانگوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔"

"میں آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔ پہلے میں اپنے وکیل

سے مشورہ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، جائیں مسٹر ہارٹن! اُن دونوں آدمیوں کو بلالیں۔ میں اس وکیل سے خود بات کروں گا۔"

ہارٹن اُسی وقت باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ دونوں آدمی اس کے ساتھ تھے۔

"آپ ان سے بات کرلیں چیف! یہ ہنری پاور ہیں اور یہ آئرن گاف۔"

"میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔ سنا ہے آپ وکالت کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ محض اتفاق ہے ورنہ میں اس سلسلے میں یہاں نہیں آیا ہوں۔ ہم تو محض ان کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔"

"اوہ! مگر یہ تو کہتے ہیں کہ یہ آپ سے کوئی قانونی مشورہ لینا چاہتے ہیں؟"

"اگر یہ بات ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی مسٹر ہاک! اور میرے لیے باعثِ افتخار بھی۔"

"ٹھیک ہے، آپ ان سے بات کریں۔ ویسے مسٹر غیاث احمد! میں معذرت چاہتا ہوں۔ ذرا دیر کے لیے آپ اپنی پتلون کے پائنچے اوپر چڑھالیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی ٹانگوں پر پٹی کیوں بندھی تھی۔ ظاہر ہے آپ کی ٹانگیں شدید زخمی تھیں۔"

"جی نہیں۔ میری ٹانگیں کیوں زخمی ہونے لگیں۔ میں نے کہا ہے کہ میں صحیح سالم حالت میں یہاں آیا تھا، یہ دیکھیں۔" میں نے اپنی دونوں ٹانگوں پر سے پتلون اوپر چڑھالی، گھٹنوں سے اُوپر تک ــــ

"ہوں، ٹھیک ہے۔ آپ کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اب آپ ان سے بات کریں۔" یہ کہہ کر وہ ہارٹن کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ہنری اور گاف میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئے۔ اپنے ہیٹ انھوں نے اب کی بار میز پر ڈال دیے تھے۔

"دیکھا آپ نے، یہ شخص کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے میں آپ کو پھانس لے۔"

ہنری نے اب کی بار سگار سلگا لیا۔ وہ کوئی بہت ہی عمدہ قسم کا سگار تھا جس کا تمبا کو بھینی بھینی خوشبو دیتا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں مسٹر گاف؟ یہ ہاک تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا ہے۔"

"بس آپ اپنے اس بیان پر ڈٹے رہیں اور کہہ دیں کہ باقی سب جھوٹ ہے۔ ہم اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔" گاف نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"میں اُس بیان پر ڈٹا ہوا ہوں مگر وہ مان ہی نہیں رہا۔"

"کیا وہ آپ کو یہاں روکنے پر اصرار کرتا ہے؟"

"نہیں، اُس نے کہا ہے کہ اگر میں یہاں سے جانا چ[اہوں] تو کسی کو میری ضمانت دینا ہوگی۔"

"کس قسم کی ضمانت؟"

"شخصی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی تک کوئی با[ت] اُس نے نہیں کی ہے۔"

"تو چلیں پھر، آپ میرے گھر چلیں۔ میں آپ کی ضما[نت] دے دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اُٹھیں پھر، یہ بہت ضروری ہے۔ میں [...] آگیا ہوں یہاں بیٹھ بیٹھ کر۔" میں نے صوفے سے اُٹھتے ہو[ئے ...]

ہم تینوں ہاک کے کمرے میں جا پہنچے۔ ابتدا گاف نے [...] کی۔ بولا "جناب یہ ہمارے محسن ہیں، ایک نہیں سارے [...] آدمی اِن کے ممنونِ احسان ہیں مسٹر ہاک! اگر آپ انھیں [...] دیں تو ہم ان کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔"

"میں نے اِن سے کہا تو تھا مگر صورتِ حال بہت [...] گئی ہے اور میں انھیں حوالات میں بند کرنے پر مجبور ہوں۔" پیٹر ہاک نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میرا گناہ کیا ہے آخر؟"

"یہ ہیروئن کی اسمگلنگ کا معاملہ ہے مسٹر غیاث احمد! آپ کو کچھ لوگوں نے کیریئر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ جب تک ہمیں نہیں ملتے، آپ کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں [کر] سکتے۔ آئی ایم ساری! ہارٹن ان کو اُدھر حوالات میں بند [کر دو] اینڈ نو آرگومنٹس پلیز۔" یہ کہہ کر وہ جان بوجھ کر غسل خانے [میں] جا گھسا۔

گاف اور ہنری ہکا بکا رہ گئے۔ میرا اب دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ ہاک نے مجھے ایک نئی مصیبت میں پھنسا دیا تھا جو نتیجہ اس نے اخذ کیا تھا، اُس تک اُسے پہنچانے میں [...] میری اپنی غلطیاں بھی شامل تھیں مگر میں کیسے مان لیتا کہ [...] کسی نے استعمال کیا تھا۔ میری جیب میں ایک لاکھ ڈالر کا [...] موجود تھا اور وہ بھی غیاث احمد کے نام۔ میں تو بالواسطہ [...] خود اُن کے جرم میں شامل ہو چکا تھا۔ دشمن کو میں نے اس [...] سے نکال ہی دیا تھا۔ وہ واقعی کہہ سکتا تھا کہ اس کا مجھ سے [...] تعلق نہیں ہے۔

حوالات میں رہنا مجھے کسی بھی طرح منظور نہیں تھ[ا ...] ہاک نے حکم دے دیا تھا اور وہ خود وہاں سے اُٹھ گیا تھا [...] ایک دم بگڑ گئی تھی۔ اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں وہاں [سے ...] جاتا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ میرا کچھ [...] سکتے تھے۔ اُن کی گولیاں اس انگوٹھی کی وجہ سے اپنی [...]

[...] ہو کر رہ جائیں۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔

"کیا خیال ہے مسٹر گاف! ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں خود حیران ہوں، ہم آپ کی ضمانت دینے کو تیار ہیں [...] مانتے ہی نہیں۔" پھر وہ ہارٹن کی طرف بڑھا اور بولا ــ [...] مسٹر ہارٹن! آپ کے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ [...] کے باوجود آپ ان کو روک رہے ہیں۔ جانتے ہیں اس کا [...] کیا ہوگا؟"

ابھی ہارٹن کوئی جواب نہ دے سکا تھا کہ ہاک تیزی سے [غس]ل خانے سے باہر نکل آیا، وہ ہمارے تیور دیکھ کر میز کی طرف [...] بولا "آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر گاف! یہ شخص اپنا نام [...] بھیس بدل کر امریکہ آیا ہے۔ اس کا اصل نام سردار کریم نواز [...]ہے۔ اس سے پوچھیں کہ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے اس کے [گھر] والوں سے بات کی ہے۔ اس نام کی تختی اس کے دروازے [پر] لگی ہے، گلبرگ تھانے سے بھی میں نے معلوم کیا ہے۔ اس کی [ٹا]نگوں پر اتنا پلستر کیوں چڑھا ہوا تھا؟ حالانکہ اس کی دونوں [ٹا]نگیں بالکل صاف ہیں، کوئی زخم نہیں ہے وہاں۔ میں نے ڈاکٹر [...] کو یہاں بلایا ہے مگر وہ ابھی تک مل نہیں سکا ہے۔ جب [تک] ان سب باتوں کا فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں اسے نہیں جانے [...]دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ پلستر کے نیچے ہیروئن بند کی گئی تھی مگر اس کے بارے میں یہ کچھ نہیں بتاتا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس کی [ت]لاشی لو ہارٹن۔ تم نے ابھی تک یہ کام نہیں کیا ہے۔"

ہارٹن نے یہ بات سنتے ہی مجھے سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ میں اُس کے ہاتھ روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے میرے پاس سے سگریٹ، ماچس، پاسپورٹ، ٹکٹ، کچھ نوٹ، گھڑی، انگوٹھی اور وہ ڈرافٹ برآمد کر کے میز پر رکھ دیا جو دشمن نے مجھے دیا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے! یہ ڈرافٹ دیکھ رہے ہیں آپ مسٹر گاف! یہ ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ ہے۔ یہ اس کے پاس کہاں سے آیا؟ کس بات کا انعام دیا گیا ہے اسے؟ بتاؤ مجھے یہ کس خدمت کا معاوضہ ملا ہے تمھیں؟ ہمیں فریب دے رہے ہو! مسلسل جھوٹ [بو]لتے ہو۔ اس بی۔ او۔ اے۔ سی کے طیارے کی بات چھوڑیں، وہ [...] الگ مسئلہ ہے۔ بتاؤ یہ ڈرافٹ کس نے دیا ہے تمھیں؟ یہ [...] تمھارے نام ہے۔"

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہنری اور گاف بھی چُپ سادھ کر کھڑے تھے۔

"بتاؤ مجھے! یہ قصہ کیا ہے؟ کوئی نیا جھوٹ گھڑ لو، کوئی نئی [کہانی] سنا دو۔ یہ ڈرافٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے کسی کی کوئی [...] خدمت سرانجام دی ہے جس کا معاوضہ تمھیں اس ڈرافٹ کی صورت میں ملا ہے۔"

"دیکھیں! یہ میرا قطعاً ذاتی معاملہ ہے۔ یہ ڈرافٹ یہاں موجود ہے، آپ ثابت کریں کہ اسے میرے پاس کیوں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔"

"مگر کیسے؟ کیا کام کیا ہے تم نے جس کا یہ معاوضہ ہے؟ کہاں سے آیا ہے یہ روپیہ تمھارے پاس؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا، جو کچھ آپ کر سکتے ہیں، کرلیں۔"

"ہمیں افسوس ہے مسٹر ہاک! کہ ہم نے بلاوجہ آپ کے کام میں مداخلت کی۔ ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو ــ ہمیں اجازت دیں۔ ہم تو محض انھیں دیکھنے آگئے تھے۔"

"آپ کا پتا میرے پاس موجود ہے مسٹر گاف! کوئی خاص بات ہوئی تو میں آپ کو بلوا لوں گا، خدا حافظ۔"

گاف مجھ سے نظریں ملائے بغیر تیزی سے ہنری کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صورتِ حال بالکل ہی بدل گئی تھی۔ ہاک کو مجھ سے جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ ورنہ اس کا رویہ میرے ساتھ بہت ہی شریفانہ تھا۔ بات بات پر وہ مجھے 'آپ آپ' کہہ کر بلاتا تھا مگر اب وہ ایک دم 'تو' اور 'تم' پر آگیا تھا۔ ہارٹن کا بھی یہی حال تھا۔

"بیٹھ جاؤ اور مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جن کو تم چھپا رہے ہو۔ اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا ہے۔ آپ جو جی چاہتا ہے کریں مگر یہ انگوٹھی مجھے دے دیں، یہ میرے پیر صاحب نے مجھے دی تھی، اس کو میں ہر حال میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔"

"پیر! واٹ پیر؟ میں سمجھ نہیں سکا ہوں!"

"میرے سپرچیوئل گائیڈ، میرے پیر صاحب۔"

"اوہ ڈیم اِٹ! میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا ــ ہارٹن ذرا چائے کے لیے کہو۔ آپ کی یہ تمام چیزیں میرے پاس امانت ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اُنکی تفصیل فائل میں لکھ لی۔ سگریٹ اور ماچس اس نے مجھے لوٹا دیے۔ پھر وہ میز پر میری طرف جھک کر بولا "اُن سے تم نے ڈرافٹ کیوں لے لیا، یہ ادائیگی پاکستان میں بھی ہو سکتی تھی ــــ" وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے میرے سارے راز کو اچھی طرح سمجھ رہا ہو۔ ابھی تک اس نے قطعاً کسی قسم کا اضطراب ظاہر نہیں کیا تھا، نہ گالی گلوچ پر اُترا تھا۔ یہ اس کی تربیت کا حصہ تھا۔ وہ کسی بھی حالت میں حوصلہ نہیں ہارتا تھا اور اُسے غصہ

بھی بہت کم آتا تھا۔ مجھے تو بہر حال اُس نے گھڑے کی مچھلی سمجھ لیا تھا اور وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کسی بھی وقت مجھ سے سب کچھ معلوم کر سکتا ہے۔ اگر میں اُس حال میں کسی اپنے ہاں کے تھانے میں ہوتا تو پتا نہیں کیا ہوتا۔

"میں نے نقد رقم ادا کر کے یہ ڈرافٹ بنوایا تھا اور وہ میری اپنی رقم تھی۔ راستے کے کسی بکھیڑے میں پڑنے سے بچنے کے لیے میں نے ڈرافٹ کو مناسب جانا تھا۔"

"بینک آپ خود گئے تھے یہ ڈرافٹ بنوانے کے لیے یا آپ کا کوئی دوست؟"

یہ ایک اور بہت ہی کٹھن سوال تھا۔ میں نے کسی امریکی بینک کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور کسی کا نام میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ دھمن نے میرے لیے زبردست مشکل پیدا کر دی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے مسٹر غیاث احمد! بہر حال میں تمھارے بارے میں مزید تفتیش کروں گا۔ پھر سارے ثبوت تمھارے سامنے رکھ کر تم سے بات ہوگی جب تک کے لیے خدا حافظ!"

اتنے میں ہارٹن واپس آ گیا۔

"اسے اُدھر حوالات میں بند کر دیں مسٹر ہارٹن اور پھر میرے پاس آئیں۔"

انگوٹھی اور میری دوسری تمام چیزیں اس نے بڑی احتیاط سے دراز میں رکھ لی تھیں۔

"پھر کیا خیال ہے، یہ انگوٹھی نہیں دیں گے آپ؟"

"نہیں۔ اگر آپ بے قصور نکلے تو یہ میں بڑی معذرت کے ساتھ آپ کو دے دوں گا۔ ورنہ سزا کاٹنے کے بعد لے لیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو آٹھ دس سال اِدھر ہی رہنا پڑے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حالات بہر حال ایسے ہی ہیں۔"

ہارٹن کو قطعاً یہ توقع نہیں تھی کہ صورتِ حال اتنی سنگین ہو جائے گی۔ وہ تو مجھے بڑے شوق سے دیکھنے دکھانے کے لیے تھانے لایا تھا مگر ہاک نے سارا معاملہ ہی خراب کر دیا۔ اگرچہ وہ اپنا فرضِ منصبی ادا کر رہا تھا، کسی بھی پولیس افسر کو ایسا ہی کرنا چاہیے مگر میرا تو اس نے بیڑہ ہی غرق کر دیا تھا اور مجھے اپنی رہائی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ ہاں، اگر میں اُسے سب سچ بتا دیتا تو پھر شاید وہ مجھے رہا کر کے دھمن کو گرفتار کر لیتا مگر اس کے لیے ثبوت میرے پاس کوئی نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ نرس جو میرے ساتھ تھی اور جسے میں نے زخمی کر دیا تھا، اُسے دھمن نے کسی اور طرف ٹھلا دیا ہوگا۔ اس کا نام اس نے پہلے ہی بدل دیا ہوگا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا، پتا نہیں میری زبان پر دھمن کا نام کیوں نہیں

آ رہا تھا حالانکہ یہ بڑی آسان بات تھی مگر اب تک جو کچھ کہہ چکا تھا جو بیان میں لکھوا چکا تھا، وہ سارے کا سارا ایسا تھا کہ میں اب اس کی نفی نہیں کر سکتا تھا اور پھر وہ ڈرافٹ بھی مجھے پھنسانے کے لیے بہت کافی تھا۔ ہاک ٹھیک ہی پوچھ رہا تھا کہ آخر وہ کس خدمت کا معاوضہ ہے اور یہی وہ بات تھی جس کا جواب میں دے نہیں سکتا تھا۔ میں خود دھمن کے جرم میں شریک بن چکا تھا۔ کیونکہ اس نے منافع کا دسواں حصہ مجھے دے دیا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ہاک نے ابھی تک براہِ راست دھمن کا نام نہیں لیا تھا۔ بس ایسے ہی سرسری طور پر اس کا ذکر کرتا تھا۔ پتا نہیں اس کی وجہ کیا تھی۔ اس نے دھمن کو پکڑنا چاہا تھا مگر وہ ابھی تک اُسے مل نہیں سکا تھا۔ ہنری اور گارڈن دھمن کے بھیجے ہوئے آدمی تھے۔ وہ یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ میں آخر تھانے میں کیا کر رہا ہوں۔ میرے بارے میں اُسے پریشانی لاحق تھی، اس کا تقاضہ یہی تھا۔

ہارٹن نے حوالات کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا۔ میں اُس روز ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ ہارٹن جیسے ہی واپس گیا، میں نے بڑی بے دلی سے قدم آگے بڑھایا۔ سامنے ایک میز کے گرد بیٹھے چار آدمی شطرنج کھیل رہے تھے۔ سامنے کی دیوار کے پاس دو آدمی بڑے اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان سے ذرا آگے آخری کونے میں پلنگ بچھے تھے۔ جیسے کسی اسپتال کے وارڈ میں ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ اُن میں سے دو پلنگوں پر دو آدمی کمبل اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں مکمل سناٹا طاری تھا۔ شطرنج کھیلنے والے بھی اتنے انہماک سے کھیل رہے تھے کہ انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کس کس جرم میں وہاں بٹھائے گئے تھے مگر ان کی شکل و صورت سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی منجھے ہوئے عیار قسم کے لوگ ہیں۔ البتہ وہ دو آدمی جو اخبار پڑھ رہے تھے، بڑے نستعلیق سے دکھائی دیتے تھے۔

میں جب اُن کی طرف بڑھا تو ایک آدمی مجھے دیکھ کر ایک دم کرسی سے اُٹھ گیا۔ میں شطرنج پر بیٹھے آدمیوں کی طرف جان بوجھ کر نہیں گیا تھا۔ مجھے اُن کی شکلوں سے ہی گھن آتی تھی۔

"تم.... تم وہی ہو نا جس کی شائر سے لڑائی ہوئی تھی؟"

"ہاں، میں وہی ہوں۔ تم سے مطلب؟"

اس کی آواز سن کر میز کے گرد بیٹھے آدمی چونکے اور شطرنج بھول کر وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے۔ میں نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"میرا نام کرسٹل ہے، یہ فراؤن ہے۔ تم پاکستان سے آئے ہو؟"

"ہاں میں پاکستانی ہوں۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"غیاث احمد۔"

"اس سے ملو، یہ کارل ہے، اس کا نام ہاؤسٹن ہے، یہ ڈینی ہے اور یہ بیلرز ہے۔"

میں اُن چاروں کو دیکھ کر کرسی سے اُٹھ گیا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" اُن کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے بغیر میں نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔

"سنا ہے ماسٹر! تو نے اُدھر شائر کو تباہ کر دیا، وہ ہاک کے کمرے سے بے ہوش ہو کر نکلا ہے کیا ہوا تھا اُسے؟" فراؤن نے بڑے ہی استہزا آمیز لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز قدرے غنغنی تھی۔ اس وقت آدھے بازوؤں کا سوئیٹر اور تنگ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رنگ اس کا تانبے ایسا تھا۔ اگلے دو دانتوں میں کھڑکی سی بنی ہوئی تھی۔

"تمھاری لڑائی ہوئی تھی اس سے؟"

"ہاں۔ ایک مکا مار دیا تھا میں نے اُسے، وہیں گر گیا، ناک سے خون بہنے لگا، شاید فٹ ہو گیا۔"

"تم نے مکا مار دیا تھا! جا یار! کیوں مذاق کرتا ہے تو۔ ہم بھی دیکھتے ہیں۔ تو بھلا شائر سے کیا بھڑ سکتا ہے۔ اُسے ضرور پولیس نے مارا ہوگا۔ میرا تو وہ بھلکا اُڑا دیتا۔ کیوں فراؤن؟" کرسٹل نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے، تو کیوں پوچھتے ہو۔ جاؤ موج کرو، شطرنج کھیلو۔"

"تم پکستان سے آئے ہو؟" ہاؤسٹن نے پوچھا۔

"پکستان نہیں، پاکستان کہو، یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

ڈینی کے منہ سے سیٹی نکل گئی۔ وہ چٹکیاں بجانے کا عادی تھا۔ بولا "بڑے نخرے ہیں تمھارے، پنجہ لڑاؤ گے؟ دیکھتا ہوں کیا کر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور میز اس نے بڑے طنطنے سے سامنے کھینچ لی۔ دوسرے لوگ بھی کرسیاں گھسیٹ کر میز کے پاس لے آئے۔ ڈینی کا قد کاٹھ بالکل شائر ایسا تھا۔ سر اس کا زیادہ بڑا تھا۔ شاید مغز سے بالکل خالی تھا۔ کان اس کے خاصے کھڑے نظر آتے تھے اور کچھ موٹے بھی تھے۔ حالانکہ ہمارے ہاں پہلوان قسم کے لوگوں کے کان بالعموم ایسے نہیں ہوتے۔ وہ پہلوان تو نہیں تھا مگر بدن اس کا بہت ورزشی معلوم ہوتا تھا۔ جسمانی قوت صرف ہمارے ہاں ہی اہمیت نہیں رکھتی لوگ اس سے یہاں ہی دہشت نہیں کھاتے بلکہ امریکہ اور دوسرے ممالک میں بھی یہی کیفیت ہے۔ حالانکہ ہم بیسویں صدی کے آخر میں جی رہے ہیں جب آدمی کو مارنے کے لیے صرف ایک آٹھ آنے کی گولی ہی بہت سمجھی جاتی ہے اور یہ ایٹمی دور ہے جس میں یار لوگوں نے شہروں کے شہر چشم زدن میں تباہ کر دینے کے سامان پیدا کر لیے ہیں۔

وہ چھ کے چھ میرے ارد گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ڈینی نے دائیں ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکا دی۔

"کیا خیال ہے کرسٹل، شرط لگے گی؟"

"ہاں، کیوں نہیں.... میں پانچ ڈالر رکھتا ہوں۔"

"چلو پانچ ہی سہی۔ کوئی اور؟" ڈینی نے پوچھا۔ کرسٹل نے پانچ ڈالر میز کے کونے پر رکھ دیے۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی پانچ پانچ ڈالر نکال دیے۔ اُن کی جیبوں میں زیادہ بڑی رقم نہیں تھی۔ ایسے ہی وقت گزاری کے لیے وہ ایسی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ شاید وہ شطرنج بھی شرط لگا کر کھیلتے تھے مگر اس کا مجھے کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔

"کیوں مذاق کرتے ہو یار، وہ اپنی کلائی تڑوا بیٹھے گا کرسٹل صاحب! اسے سمجھاؤ۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری بات کے جواب میں بیلرز نے خالص پاکستانی انداز سے کھڑے ہو کر ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم ہاتھ تو باہر نکالو۔ نیچے سگریٹ رکھ دو ہاؤسٹن! سلگتے ہوئے سگریٹ۔ دیکھتے ہیں یہ کیسے کلائی توڑ دے گا ڈینی کی۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھو بھائی! میں پنجہ نہیں لڑاتا۔ یہی کافی نہیں ہے کہ مجھے یہاں کی پولیس نے حوالات میں بند کر دیا ہے۔"

"گولی مارو پولیس کو۔ کام کی بات کرو۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم نے شائر کے ساتھ کیا کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر نکلا تھا۔ اسپتال جا پہنچا، نکالو ہاتھ۔"

"تم بھی اسپتال جانا چاہتے ہو؟" میں نے اب کی بار ڈینی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا جب ہاتھ میں ہاتھ پڑے گا۔ لاؤ پنجہ دو مجھے، وزن کتنا ہے تمھارا؟"

"ایک سو اسی پاؤنڈ۔"

"صرف اتنا ہی! میرا وزن دو سو تیس پاؤنڈ ہے، کیا سمجھے! لاؤ پنجہ لاؤ اِدھر۔" یہ کہہ کر اُس نے زبردستی میرا دایاں ہاتھ تھام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میرا پنجہ پکڑ لیا۔ نیچے اُن لوگوں نے جلتے ہوئے سگریٹ ڈال دیے تھے اور وہ پوری طرح سُلگ رہے تھے۔ دراصل وہ سب کے سب میری قوت آزمانا چاہتے تھے۔ شائر کے بارے میں انھیں کسی نے بتا دیا تھا کہ اس کا حال کس نے بگاڑ دیا ہے اور کس طرح۔ اب وہ چھ کے چھ میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ میں ڈینی کو کسی بھی طرح شکست نہیں دے سکوں گا اور عین ممکن ہے میرا پنجہ ہی ٹوٹ جائے۔

ڈینی کی اشتعال انگیزی حد سے بڑھ گئی تھی مجبوراً مجھے اپنا پنجہ کھولنا پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دنگل میں بدن کو کیسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ساری کی ساری قوت انگلیوں پر مرتکز کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کے چہرے پر خون کا ارتکاز نظر نہیں آنا چاہیے۔ خواہ اُسے کتنا ہی زور کیوں نہ صرف کرنا پڑے۔ مدِمقابل چہرے کی رنگت سے معلوم کرلیتا ہے کہ آدمی کا منکا کہاں ٹوٹتا ہے اور کہاں وہ اُسے بے بس کرسکتا ہے۔

وہ پانچوں تماشبیں کی حیثیت رکھتے تھے اور چھٹا آدمی مجھ سے اُلجھ رہا تھا۔ ڈینی کا ہاتھ غیر معمولی طور پر سرد تھا اور اُس کی ہتھیلی بالکل خشک تھی۔ لگتا تھا، میں نے کسی لوہے کے پرنے میں اپنا ہاتھ دے دیا ہے۔ اس کا بایاں ہاتھ خاصا اوپر اُٹھ گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دائیں پنجے میں اپنی تمام قوت منتقل کرچکا ہے۔ میرا پنجہ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ مسکرایا۔ فراؤن کی طرح اُس کے دانتوں میں بھی ایک کھڑکی نظر آتی تھی اور وہ اُس وقت بھی چیونگم چبا رہا تھا۔

بات صرف چند لمحوں میں ختم ہوسکتی تھی۔ اس نے مجھ سے زور آزمائی شروع کردی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے بدن کو ہاتھ کی سیدھ میں لاتا جارہا تھا۔ میرا پنجہ اُس نے اس طرح پکڑا کہ اس کی ہتھیلی میری ہتھیلی سے مس ہورہی تھی۔ وہ انگلیوں پر دباؤ نہیں ڈالتا تھا بلکہ مجھے ہتھیلی کی قوت سے زیر کرنا چاہتا تھا۔ پہلی زور آزمائی میں اس نے میرا ہاتھ اتنا پیچھے گرادیا کہ سگریٹ سے وہ صرف چند انچ دور رہ گیا۔ شرط یہ تھی کہ وہ ہاتھ کو اتنا نیچے جھکادے کہ وہ سگریٹ سے چھو جائے مگر اُسے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ اس کے ساتھی برابر شور مچا رہے تھے۔ اُس کا حوصلہ بڑھانے میں وہ بہت پیش پیش تھے۔ کسی بھی مقابلے میں کسی فریق کے لیے واہ واہ کرنے والے موجود ہوں تو اس کے مدِمقابل کا حوصلہ خواہ مخواہ ہی پست ہونے لگتا ہے۔ شاید میرا بھی یہی حال ہوتا کہ ڈینی کی جسمانی قوت بلاشبہ حیرت انگیز تھی لیکن جب دوسری زور آزمائی شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی دائیں ٹانگ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سالا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی، میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ میں اب تک اپنی جگہ پر جم کر بیٹھا تھا۔ وہ ہتھیلی پر انحصار کررہا تھا۔ میں نے اپنا انگوٹھا جان بوجھ کر اس کی انگلیوں میں پھنسا دیا اور پھر میں نے پوری قوت سے اس کی کلائی کو جھٹکا جو دیا تو اس کے ہاتھ کی پُشت سگریٹوں پر جالگی۔

مقابلہ ختم ہوچکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہا گیا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اسے اپنی توہین [illegible] تھا۔ اُس نے غضبناک ہوکر میز ایک دم میری طرف اُلٹ[illegible] جس کی وجہ سے میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ کرسی سمیت پیچھے گر گیا مگر وہ وہیں نہیں رکا۔ بلکہ میز کے دونوں پائے پکڑ کر وہ میری طرف بڑھا اور میز سیدھی میرے اوپر دے مارا [illegible] وہ کرسی سے ٹکرائی۔ میرے دونوں گھٹنے اُس کی زد میں آگئے [illegible] کو بچانے کے لیے میں نے دونوں ہاتھ فرش پر لگائے اور [illegible] ایک دم اُٹھ گیا۔ اس نے میز کو پھینک دیا اور مجھے گالیاں [illegible] مجھ پر پل پڑا اور دائیں ہاتھ سے اُس نے میرے منہ پر [illegible] مارا۔ ابھی وہ بایاں ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے اُس کے [illegible] میں بوٹ کی ٹھوکر لگائی۔ فاصلہ اتنا تھا کہ میں کاری ضرب [illegible] سکتا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے حملوں میں [illegible] زیادہ شدت پیدا ہوگئی اور اس نے مجھے گریبان سے پکڑنے [illegible] کی۔ اس کے پانچوں ساتھی ہمارے اردگرد کھڑے تھے مگر [illegible] اس نے میرا گریبان پکڑا نہیں تھا کہ کمرے کی سلاخوں کے سا[illegible] کئی سپاہی اور خود پیٹر ہاک آٹھہرے۔ ایک سپاہی نے در[illegible] کھولا اور اس کے ساتھ ہی ہارٹن اندر آگیا۔ اُس نے پستو[ل] نکال لیا تھا۔

"ڈینی!" وہ چیختے ہوئے بولا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ مغز پھاڑ دوں گا۔"

اس کی آواز سنتے ہی ڈینی کو ہوش آگیا اور اس کے [illegible] ہوئے ہاتھ وہیں رُک گئے کئی سپاہی موٹھ والے ڈنڈے [illegible] اس کے گرد آٹھہرے تھے۔ اگر ڈینی کا حملہ جاری رہتا تو [illegible] اس کا سر پاش پاش کردیتے۔ ہارٹن واقعی غضبناک ہوچکا تھا [illegible] میں دیوار کے ساتھ جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

ہارٹن نے بڑے ہی طیش سے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ [illegible] جھانپڑ ڈینی کے رسید کیا۔ "کتے کی نسل! یہ کیا کررہا ہے تو [illegible] جانتا ہے یہ کون شخص ہے۔ اس نے پی۔ او۔ اے۔ سی کا [illegible] اغوا ہونے سے بچایا ہے۔"

"جب ہی تم نے اسے حوالات میں بند کردیا ہے۔ [illegible] بڑی ہمدردی ہے تمھیں اس سے۔ شاید یہ اسی نے حملہ کیا [illegible] تم دیکھتے رہ گئے اور اب بھی اس کی طرف داری کررہے ہو" [illegible] نے ویسے ہی غضبناک لہجے میں کہا۔ جس کا مظاہرہ ہارٹن کر[illegible]

"میں کچھ نہیں جانتا۔ پلیز آپ یہاں سے اٹھیں۔ میں [illegible] کو دوسرے کمرے میں بٹھاتا ہوں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

اس اثنا میں ہاک بھی اندر آگیا تھا۔ بولا۔ "ہوا کیا تھا [illegible]

"جناب یہ دونوں پنجہ آزمائی کررہے تھے، شرط لگ گئی [illegible] پانچ پانچ ڈالر دیے ہیں۔ یہ صاحب شرط جیت گئے ہیں مگر [اِ]یک دم غصہ آگیا اور یہ ان پر پل پڑا۔" ہاؤسٹن نے اُسے [بت]ائی۔

[ٹ]ھیک ہے۔ ہارٹن انھیں دوسرے کمرے میں بٹھا دو اور [illegible] کو میرے کمرے میں بھیجو۔ تم بھی آؤ ہاؤسٹن۔" یہ کہہ کر [illegible] آگے آگے چل دیا۔

ہارٹن نے مجھے وہاں سے نکال کر دوسرے کمرے میں پہنچا [illegible] نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ اس میں ایک پلنگ رکھا تھا۔ درمیان [illegible] فٹ جگہ خالی تھی۔ اس سے آگے دو کرسیاں دھری تھیں [illegible] کے آخری حصے میں نکڑ کے ساتھ غسل خانہ بنا ہوا تھا۔

میں نڈھال سا ہوکر پلنگ پر جالیٹا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا [illegible] میرے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ میں نے تو نیکی سمجھ کر [illegible] اغوا ہونے سے بچایا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا سفر یوں [illegible] ہوجائے گا اور کوئی بھی شخص میری مدد کو نہیں آسکے گا۔ ہاک [illegible] نے اختیار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہاتھ [illegible] مارنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ ہیروئن کے کسی بڑے اسکینڈل [کو بے] نقاب کرسکے گا مگر ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت اُسے نہیں ملا [illegible] محض ایسے شواہد اس کے ہاتھ لگے تھے جن سے وہ واردات [illegible] کا سا نقشہ ذہن میں استوار کرسکتا تھا۔ اگر دھمن نے سپر ڈال [دی] اور پولیس کے لوگ اُسے بھی اعتراف کرنے پر مجبور کرگئے تو [illegible] میرے، دھمن اور عالیہ کے لیے دس بارہ سال جیل میں پڑے [رہ]نے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ہمیں جان سے تو نہیں [مار]یں گے مگر اُن کی سزا اتنی طویل ہوگی کہ ہم وہاں سے شاید [ہی] زندہ سلامت باہر آسکیں۔ اب سوال یہ تھا کہ میرا رویّہ کیا ہونا [چاہ]یے۔ ایک بیان جو میں دے چکا تھا، اُس سے میں منحرف بھی [ہو] سکتا تھا۔ میرے ساتھ دھمن نے بلاشبہ بہت زیادتی کی تھی [مجھے] اس کے خلاف بیان دے دینا چاہیے تھا مگر پتا نہیں میں ایسا [کیوں] نہیں کررہا تھا۔ وجہ شاید یہی تھی کہ وہ مجھے ایک کیریئر کی [حیث]یت سے استعمال کرچکے تھے اور کوئی آدمی اس بات کا یقین [نہیں] کرے گا کہ وہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ ہزاروں [illegible] کیریئر اسی لیے جیل میں ڈال دیے گئے تھے کہ مال اُن کی تحویل سے [برآمد] ہوا تھا۔ یا وہ اس مال کو لے جانے میں وسیلہ بن گئے تھے [illegible] ہی وہ کسی فہرست میں ڈال دیں گے اور میں کسی بھی طرح [illegible] نہیں سکوں گا مگر یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ [illegible] مجھ سے یا کسی اور سے کوئی مال برآمد نہیں کرسکا تھا۔ محض [illegible] تھا جس میں وہ رنگ بھرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ابھی [illegible] مجھے یقین تھا کہ میرا نام انھوں نے کسی رجسٹر میں یا کسی اور سرکاری کھاتے میں درج نہیں کیا تھا۔ ایک بیان تھا جو انھوں نے مجھ سے لکھوالیا تھا اور بس۔ ابھی تک میری ٹانگوں کے ایکسرے انھیں دستیاب نہیں ہوسکے تھے۔ ہوسکتا ہے ہاک نے اس کام پر کچھ لوگوں کو مامور کردیا ہو لیکن میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ عین ممکن ہے دھمن نے میرے بارے میں سارا ریکارڈ جلا ڈالا ہو۔ کسی جگہ میرے علاج کے بارے میں بھی اس نے کچھ درج کررکھا ہو۔ مجھے بہرحال انتظار کرنا ہوگا۔ جلد بازی میرے لیے کسی بھی طرح مفید نہیں تھی۔

دن کا ایک بج گیا تو ہارٹن نے ایک سپاہی کے ہاتھ میرے لیے کھانا بھجوادیا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اُسے میں ابھی تک یاد تھا۔ ابھی میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہارٹن کھڑا تھا۔ اُس نے اندر سے دروازے پر چٹخنی چڑھائی اور میرے پاس آکر بولا۔ "کھانا پسند آیا آپ کو؟"

"ہاں! مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ بیٹھیں۔ میں اس توجہ کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"مجھے بہت افسوس ہے غیاث صاحب! ہاک نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، میں اُس سے متفق نہیں ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھیں، اس نے مجھ سے میرا پاسپورٹ، ٹکٹ اور ڈرافٹ بھی چھین لیا ہے اور میری انگوٹھی اور گھڑی بھی۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"وہ بھی اس کی زیادتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ ایک خیالی تصویر کو مکمل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ آپ بہرحال پریشان نہ ہوں۔ اگر رات تک اس نے آپ کو رہا نہ کیا تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ کو ساتھ لے کر میں ہی یہاں آیا تھا مگر ہاک اپنی چالاکیاں دکھانے لگا۔"

"آپ بھلا کیا کرسکیں گے مسٹر ہارٹن!"

"میں کیا نہیں کرسکتا ہوں بھلا! فکر نہ کریں۔ میں کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور نکال لوں گا۔ ویسے آپ مجھے صحیح صحیح بات بتادیں۔ کیا واقعی ڈاکٹر دھمن اس کاروبار میں ملوث ہے۔ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔" اس کی سرگوشی اور زیادہ ناقابلِ فہم ہوگئی۔ وہ میرے اس قدر قریب ہوگیا تھا کہ میں اس کے سانس کی بو محسوس کرسکتا تھا۔ مجھے کسی نے فضیلت بتایا تھا کہ کسی پولیس والے کا کبھی اعتبار نہ کرنا خواہ وہ آپ کا بھائی ہی کیوں نہ ہو اور ہارٹن میرا رازدار بننے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہاک غلط سمجھ رہا ہے۔ دھمن ایسا آدمی نہیں ہے۔ وہ محض ایک ڈاکٹر ہے اور بس۔"

"پھر... پھر یہ ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ آپ کو کس نے دیا

ہے۔" وہ سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ "یہ بڑی اہم بات ہے۔"

"یہ میرے اپنے ڈالر تھے جن کو میں نے ڈرافٹ میں تبدیل کروالیا ہے۔"

"کوئی ثبوت ہے اس کا آپ کے پاس؟"

"ثبوت کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ رقم اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور اس کو میں نے لندن اور ہانگ کانگ میں کمایا تھا۔ میں یونہی تو سیر کرنے نہیں نکل آیا۔ میرے پاس کچھ قالین تھے، کچھ پاکستانی زیورات تھے اور کچھ پرانے زمانے کی چیزیں۔ انٹیکس سمجھتے ہیں نا آپ۔ وہ میں نے بیچ کر نقد کر لیے اور سیر کیلیے امریکہ چلا آیا۔"

"مگر آپ کے پاسپورٹ پر تو یہ بات درج نہیں ہے کہ آپ لندن اور ہانگ کانگ گئے تھے، میں نے خود دیکھا ہے اسے۔"

"وہ میرے پہلے پھیرے کی بات ہے۔ اس کے بعد میں سیدھا یہاں چلا آیا اور رقم مجھے یہاں مل گئی۔ بینک کے پتے پر۔ میرا پہلا پاسپورٹ گم ہو چکا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاک کی سوچ بالکل غلط ہے۔ بہرحال آپ شام تک انتظار کریں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کیا.... ہو سکتا ہے۔"

"آپ کی مہربانی ہے مسٹر ہارٹن! ورنہ تو میں خواہ مخواہ ہی اس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیں کوئی چپراسی یا سپاہی آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کمرے میں ہم خاص خاص آدمیوں کو بٹھاتے ہیں۔ مثلاً کوئی سیاسی قیدی یا کوئی اور اہم شخص۔"

"اس لحاظ سے تو میں بھی خاص آدمی ہوں آپ کے لیے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ آپ اُس کمرے میں ہوتے تو وہ لوگ آپ کو چین نہ لینے دیتے۔ وہ ڈپٹی دراصل آپ سے شائر کی بے عزتی کا بدلہ لے رہا تھا۔ وہ اس کا گہرا دوست ہے۔"

"اُنھیں کس لیے یہاں رکھا گیا ہے؟"

"اُن پر ایک قتل کا الزام ہے مگر وہ قاتل ہرگز نہیں ہیں، کسی قاتل کو وہ تحفظ فراہم کر رہے تھے۔ اس لیے اُنھیں یہاں رکھا گیا ہے۔ ویسے ہیں وہ بہت بدنام لوگ۔"

"مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے دھمن کو اطلاع دی ہے۔ میرے متعلق کچھ اُسے بتایا ہے کہ نہیں؟"

"آپ پام روز اسپتال کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ دھمن کا چیریٹی ہوسپٹل ہے۔"

"ہاں، مگر وہ ہمیں نہ گھر پر مل سکا ہے نہ اسپتال... اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔ وہ کل رات... پہنچا ہے۔"

"کسی کام سے چلا گیا ہوگا مگر میری اس سے کوئی... شناسائی نہیں ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ لاہور کا رہنے... اور یہاں میری اس سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔"

"خیر! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں... کی تھیوری سے متفق ہی نہیں ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور... دروازہ مقفل کر کے دوسری طرف نکل گیا۔

میں جب بستر پر لیٹا تو میرے ذہن میں پرانی یادوں... پرانی اذیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اُمڈا چلا آرہا تھا... میں بہت بچتا تھا، ہر حال میں بچ جانا چاہتا تھا کیونکہ... یادیں مجھے لہو رلاتی تھیں۔ اُن سے میرے گھنگھرو بولنے... کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ میں کسی کا کچھ بھی سنوار نہیں... کسی کے کام نہیں آسکتا تھا۔ میری اُٹھان تو ٹھیک ہی تھی... جب میں پھل پھول لایا تو پھر ایسا بکھرا کہ اب تک سنبھل... سکا تھا اور اب میں سان فرانسسکو میں ایک حوالاتی کی... سی زندگی بسر کر رہا تھا اور مجھ سے ہارٹن اصل بات پوچھ... تھا۔ وہ ٹھگ، ہاک کا بھیجا ہوا تھا۔ وہ میرا ہمدرد بن رہا... میں اس کے جھانسے میں کیسے آجاتا۔ یہ ناممکن تھا کیونکہ... کو اصل بات بتا دیتا تو نہ میں جیل سے بچ سکتا تھا نہ دھمن... اس شخص سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں تو اسے... چاہتا تھا مگر اس نے مجھے ایسے چکر میں پھنسا دیا تھا کہ... پیچھے ہٹ سکتا تھا نہ آگے جا سکتا تھا۔ سانپ کے منہ میں... آگئی تھی، نہ اُگلے بنتی تھی نہ نگلے۔ میری جان ضیق میں... تھی۔ آبی اور آسیہ بچارے کیا سوچتے ہوں گے۔ کوئی اُن کا... حال نہ ہوگا۔ میرے بارے میں اُنھیں کوئی اطلاع نہ... گا۔ کس کو معلوم تھا کہ میں یوں بے ارادہ امریکہ جا پہنچوں گا۔

بہت ہی تھک گیا تھا سوچ سوچ کر۔ بالآخر میں گہری نیند... گیا۔ فائدہ اسی میں تھا۔ میری سوچ، بچار میرے کسی کام نہیں... تھی۔ حال میرا یہ تھا کہ میں مسلسل جھوٹ بولتا چلا آرہا تھا۔ آخر کس لیے؟ شاید مجھے عالیہ سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس... روایت سے ہٹ کر مجھے ایک نادر الوجود تحفہ دیا تھا۔ ایسا... مجھے اَمر کر سکتا تھا۔ بندوق اور پستول کی گولی سے بچا سکتا تھا... اس کا ممنونِ احسان تھا مگر اب وہ تحفہ مجھ سے چھن چکا... پتا نہیں اب وہ مجھے کب واپس مل سکے اور ملے گا بھی کہ نہیں...

جب میں سو کر اٹھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ کمرے کی بڑی گھڑی یہی بتا رہی تھی۔ میں نے بستر سے اٹھ کر غسل خانے... غسل سے فارغ ہو کر آئینے میں اپنی صورت دیکھنے... گیا اور... پرانا غلام جیلانی تھا۔ وقت نے میری صورت بہت... بدل دی تھی مگر پھر بھی کوئی بھی شخص مجھے دور سے ہی... سکتا تھا۔ غسل خانے سے نکل کر میں نے بٹن دبا دیا۔ کچھ دیر بعد تھانے کا چپراسی اندر آگیا۔ انھوں نے میرے دروازے... سپاہی کھڑا کر دیا تھا۔

"برادر! چائے اگر مل سکے تو لے آؤ۔ ذرا تازہ دم ہو جاؤں گا۔"

"کافی نہ لے آؤں جناب! چائے تو شاید نہ مل سکے۔"

"تو کافی لے آؤ اور اگر مسٹر ہارٹن ملیں تو اُنھیں میرے پاس بھیج دو۔"

"جی بہت بہتر۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ چپراسی کوئی دس... بعد واپس آگیا۔ وہ میرے لیے کافی بنا لایا تھا۔ چپراسی کسی... دو نسل میں سے تھا گورے اور کالے کا امتزاج۔ رنگ اس کا نہ... تھا نہ کالا۔ بس عجیب سی مٹیالی مٹیالی صورت تھی اس کی۔

"جناب مسٹر ہارٹن تو ابھی یہاں نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو... آپ کا پیغام دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ باہر نکلا تو میں کافی سے دل بہلانے لگا۔ وہاں دیوارگیر... الماری میں چند کتابیں اور رسالے پڑے تھے۔ میں اُن کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وقت کسی طرح گزرتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی... اسے دھکا دیتا رہا۔ یہاں تک کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ میرے... کا قفل ایک بار پھر بجنے لگا۔ میرے سامنے پھر ہارٹن آ ٹھہرا... اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا اور سرگوشی کے لہجے... مسٹر غیاث! یہ رہیں آپ کی چیزیں، آپ کا اٹیچی کیس بھی... لے آیا ہوں یہ لیں۔ اس میں آپ کی تمام چیزیں محفوظ ہیں... لفافے میں۔"

"ارے! یہ آپ کیسے لے آئے۔ یہ تو ہاک کے پاس تھیں۔"

"بس میرا داؤ چل گیا۔ میں نے اس کی دراز کھول لی تھی۔ وہ... وقت کسی کلب میں بیٹھا شراب پی رہا ہوگا۔"

میں نے بڑی بے تابی سے لفافہ پلنگ پر الٹ دیا۔ اس... میری انگوٹھی، گھڑی، ڈرافٹ اور پاسپورٹ سب کی سب... جوں کی توں موجود تھیں۔

"فرینڈ! میں تمھارا کیسے شکریہ ادا کروں۔ تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔"

"نہیں نہیں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا فرض تھا۔ کیونکہ میں ہی آپ کو ساتھ لے کر یہاں آیا تھا کہ آپ سے بیان لکھوانا ہے مگر وہ بیان کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔" اس کا لہجہ اب بھی سرگوشی کا پتا دیتا تھا۔ اُسے باہر کھڑے سپاہی کا بھی دھڑکا لگا تھا۔

"پھر اب کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"دیکھیں آپ یہاں سے نکل جائیں، یہی بہتر ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اِس اٹیچی کیس کو کھولیں ذرا۔"

"اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ میرے چند کپڑے ہی تو ہیں۔" میں نے انگوٹھی انگلی میں پہنتے ہوئے کہا۔

"نہیں، اسے کھولیں، میں آپ کے لیے امریکی پولیس کے سپاہی کی وردی لے کر آیا ہوں۔ اسے پہن کر آپ جیسے ہی موقع ملے یہاں سے نکل جائیں۔"

میں نے اٹیچی کیس کھول کر دیکھا۔ ایک وردی وہاں اوپر ہی رکھی ہوئی تھی۔ "مسٹر ہارٹن! کیا آپ کو یقین ہے کہ میری اس قدر مدد کر کے آپ محفوظ رہیں گے؟"

"اس کی فکر نہ کریں۔ میں بھگت لوں گا۔ آپ کی رہائی بہت ضروری ہے ورنہ یہ لوگ آپ کو تباہ کر دیں گے۔ آپ کو لمبی سزا ہو جائے گی۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے بیان پر اڑے رہے اور کوئی غلط بات نہیں کہہ دی جس سے ہاک کی خیالی تصویر مکمل ہو سکتی ورنہ بات بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ ڈاکٹر دھمن کو بھی یہ لوگ پکڑ لیتے۔"

"کیا یہ اس سے مل چکے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ گھر پہنچ چکا ہے اور ہاک خود اس سے ملا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ آپ کو بالکل نہیں جانتا ہے۔ ہاں، کچھ دن پہلے آپ اس سے ملنے آئے تھے مگر اُس نے کہا ہے کہ وہ کسی غیاث احمد کو پہلے سے نہیں جانتا تھا۔"

"اور کیا کہا اُس نے؟"

"یہی کہ وہ کسی رقم کو ڈرافٹ میں تبدیل کروانا چاہتا تھا۔ اس نے آپ کو بینک کا پتا دے دیا۔ اس کے علاوہ وہ آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے۔"

"ٹھیک کہا ہے اس نے۔ میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بہرحال اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"دیکھیں! آپ اس الماری کو دیکھ رہے ہیں نا، اس کو ذرا کھینچیں... اس طرح۔" اس نے دیوار میں لگی الماری کو ذرا سا باہر کھینچ لیا۔ "یہ اور زیادہ باہر آسکتی ہے۔ اس کی دوسری طرف بھی ایک ایسی ہی الماری ہے۔ اُسے آپ دوسری طرف دھکیل سکتے ہیں۔ دراصل یہ ایک دروازہ سا بناتی ہے۔ یہ الماری اِدھر نکل

سکتی ہے اور دوسری اگلے کمرے میں دھکیلی جا سکتی ہے۔ رات کو ایک دو بجے آپ ان الماریوں کو ہٹا کر دوسری طرف جا سکتے ہیں۔"

"اچھا پھر؟ آگے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"دوسرا کمرہ پولیس کے پرانے سامان سے بھرا ہے۔ اس میں تین دروازے لگے ہیں۔ کونے کا دروازہ ایسے غسل خانے میں کھلتا ہے جس کا ایک دروازہ باہر برآمدے میں کھلتا ہے۔"

"ونڈرفل! یہ تو بہت اچھی بات بتائی ہے آپ نے۔"

"آپ اُس دروازے سے باہر جا سکتے ہیں۔ میں اس کی باہر کی چٹخنی رات کو کسی وقت کھول دوں گا۔ اس سے آپ بڑے اطمینان سے باہر نکل سکتے ہیں۔ وہ اس عمارت کا عقبی حصہ ہے۔ برآمدے سے نکل کر آپ دروازے کی طرف بڑھیں۔ آپ پولیس کی وردی میں ہوں گے۔ سر پر ہیٹ بھی جما لیں۔ وہ بھی اسی میں رکھا ہے۔ اپنا چہرہ اس جیسٹر کے کالروں میں چھپا لیں جو میں... غسل خانے میں رکھ دوں گا۔ سمجھے آپ! یہ بہت ضروری ہے۔ اس کی جیب میں گہرے نیلے شیشوں کی عینک بھی ہوگی۔ وہ آنکھوں پر لگا لیں۔ یہ بریف کیس آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ گیٹ پر کسی سے کوئی بات نہ کریں بلکہ غسل خانے کے باہر ایک موٹر سائیکل کھڑی ہوگی، اس پر بیٹھیں اور دندناتے ہوئے باہر نکل جائیں۔"

"وہ موٹر سائیکل کس کی ہوگی؟"

"وہ فیلکن کی ہے۔ اُس وقت وہ دوسری منزل پر ہوگا۔ وہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور موٹر سائیکل میں چابی موجود ہوگی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ہارٹن! مجھے آپ ایسا ہمدرد کہاں مل سکے گا۔ میں تو آخری سانس تک آپ کا یہ احسان فراموش نہیں کر سکتا ہوں۔"

"نہیں نہیں! احسان کی بات نہیں ہے۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے مسٹر غیاث! آپ بہت جی دار آدمی ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"اگر کسی نے شبہے کی بنا پر مجھے روک لیا تو.....؟"

"تو پھر سمجھیں کہ یہ آپ کی تقدیر ہے۔ میں اس سے آگے کچھ نہ کر سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اپنا دفاع کرنا آتا ہے مسٹر ہارٹن!"

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ وِش یو آل دی گڈ لک۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی واپس چلا گیا۔

بلاشبہ مجھ پر ہارٹن کا یہ بہت بڑا احسان تھا کہ وہ میری رہائی کے لیے اتنا کچھ کر رہا تھا، اتنا کچھ کہ شاید میرا کوئی اپنا بھائی بھی ایسا نہ کر سکتا۔ پتا نہیں وہ مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو گیا تھا۔ وہ ہاک کا نائب تھا اور اس پر تھانے والے بہت زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ اُسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ جو چاہتا کرے۔ اس کے لیے اُسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ بھی تھانے میں ہاک کے بعد اُسی کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کوئی روک رکاوٹ ہرگز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ... پاس آ چکا تھا۔ مجھ سے وہ اتنی ساری ہمدردی کر رہا تھا ... کی اپنی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی مگر مجھے یقین ... نے اپنا بچاؤ پہلے سے کر رکھا ہوگا ورنہ وہ اتنا بڑا خطرہ ... طرح مول نہ لے سکتا تھا۔ کسی امریکی پولیس والے کو ... تھی کہ وہ کسی میرے ایسے کے لیے اپنی جان کھپاتا اور ... چھوڑنے بھی جاتا۔ یہ ناممکن تھا مگر وہ ایسا کر رہا تھا ... ثبوت بھی میرے سامنے تھا پھر میں اس پر اعتبار کیوں ... مجھے ہر حال میں اس کے کہنے کے مطابق عمل کرنا چاہیے تھا۔ بقول اس کے وہ ہاک میری ساری زندگی تباہ کر دیتا۔ کسی ... پر بھی مجھے نہ چھوڑتا تاکہ اُسے اپنی ایک خیالی تصویر کو مکمل ... وہ کسی کو باندھ کر ہیروئن کے چکر میں جیل پہنچا دینا چاہتا تھا ... میں اس کا ہاتھ کیسے روک لیتا۔ ہارٹن نے میرے لیے ... خطرہ مول لیا تھا اور وجہ اس کی میری سمجھ میں نہیں آ رہی ... اس کی ہمدردی کا میرے لیے کوئی جواز بظاہر تو نظر نہیں ... پھر بھی وہ مجھے فرار ہونے کے سارے راستے سمجھا گیا تھا ... اُس پر اعتبار کرنا ہی پڑ رہا تھا کیونکہ میں اور زیادہ اُن کے ... میں پھنس جاتا تو پھر میری رہائی ناممکن ہو جاتی۔

کھانا میں نے آٹھ بجے کھا لیا۔ مسلح سپاہی باہر ... وہ خاصا چوکس نظر آتا تھا۔ فرار ہونے سے پہلے مجھے تھوڑی ... لے لینی چاہیے تھی مگر میرا اضطراب کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ... نیند نہیں آئی۔ سگریٹ ہی ایک کام کی چیز تھے، میں ان ... بہلاتا رہا۔ وہ انگوٹھی میری انگلی پر موجود تھی۔ اس کی ... میں کسی قسم کا خطرہ تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس طرف ... میں بالکل مطمئن تھا مگر سوال یہ تھا کہ میں فرار ہو کر کس ... گا۔ امریکہ سے باہر کیسے جا سکوں گا۔ سان فرانسسکو کا ... تو میرے کام نہ آ سکے گا۔ پولیس کو معلوم ہو جائے گا تو وہ فوراً ... طرف تمام لوگوں کو چوکس کر دیں گے۔ میرے لیے طرح طرح ... کھڑی کر دی جائیں گی۔ ٹکٹ تو اب بھی میرے پاس موجود ... وہ کسی اور طیارے کے لیے تو نہیں تھا۔ اُس میں مجھے ... کروانی پڑے گی۔ ایسے میں میں کس دفتر جا سکوں گا ... کوئی علم نہیں تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ میں سیدھا کفلر ... سافنر میری مدد کر کے خوش ہوگی۔ میں سیدھا اُن لوگوں کے ... جا پہنچوں گا۔ میری مشکل کا حل وہ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

پولیس والے مجھے چوہے کی موت مار دیں گے۔ کسی نہ کسی جگہ ضرور گرفتار کر لیں گے۔ ہاک کو دھوکا دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی میں مطمئن تھا کہ کوئی آدمی مجھے جان سے نہیں مار سکے گا۔ وہ انگوٹھی جو میرے پاس موجود تھی۔

رات کے بارہ بجے تو میں بستر سے اُٹھ گیا۔ اب مجھے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی تمام ... بریف کیس ہاتھ میں لیا، آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ ... زیادہ پریشان نہیں تھا۔ پھر بھی میرے چہرے پر اضطراب ... تنی ہوئی تھیں۔

باہر مکمل سناٹا طاری تھا۔ شاید سپاہی نے بھی کسی جگہ بیٹھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کی طرف سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر وہ الماری اپنی جگہ سے کھسکا کر اُسے کوئی دو فٹ آگے کھینچ لیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ الماری کو کھینچ لینے سے جو آواز پیدا ہوئی، اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اپنے اطمینان کے لیے میں نے الماری کو چھوڑ کر دروازے کے ساتھ کان لگا دیے۔ باہر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے دوسری الماری دھکیل کر آگے کیا تو معلوم ہوا کہ ہارٹن ٹھیک ہی کہتا تھا، دیوار کے اندر کوئی دو ہاتھ کا راستہ پیدا ہو چکا تھا جس میں سے میں بریف کیس لے کر بڑی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ دوسرے کمرے میں گھپ اندھیرا طاری تھا۔ میں نے الماری سے آگے نکل کر... ماچس جلائی تو اس کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں پولیس کا بہت سا پرانا سامان پڑا تھا۔ ان کی وردیاں، ناکارہ اسلحہ، گھاس کاٹنے کی مشین، بستروں کی اونچی اونچی تہیں جو پلنگ پر رکھی تھیں، موٹھ والے ڈنڈے، ہیلمٹ اور اسی قسم کی بہت سی دوسری چیزیں وہاں قرینے سے رکھی تھیں۔ ایسے قرینے سے کہ اُن میں ایک ترتیب جھلکتی تھی۔

میں ماچس کی روشنی میں چلتا ہوا چیزوں سے بچتا بچاتا ہوا غسل خانے میں جا گھسا۔ ہارٹن ٹھیک کہتا تھا، وہاں ایک کھونٹی پر ایک نیا جیسٹر ٹانگ رکھا تھا اور ایک نیلے رنگ کا ہیلمٹ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے جیسٹر پہنا، پھر اس کی جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگا لی اور ہیلمٹ پہن کر میں اگلے دروازے میں سے گزر کر باہر نکل گیا۔ ہارٹن نے تمام انتظامات مکمل کر رکھے تھے۔ یہ عمارت کا بایاں حصہ تھا، جہاں کوئی دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ کیاریاں سی بنی تھیں جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شاہ بلوط کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ایک موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کی گئی تھی۔ میں جب اُس کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ چابی اس میں موجود تھی۔ میں نے بریف کیس موٹر سائیکل کے کیریئر پر رکھا اور پھر جیسٹر کے کالر اونچے کر کے میں اس پر بیٹھ گیا۔ وہ پہلی ہی ضرب پر اسٹارٹ ہو گئی۔ موٹر سائیکل اگرچہ خاصی بھاری بھرکم تھی پھر بھی اس کی رفتار پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن قابو میں نہیں تھا اور دل میرا بلیوں اوپر اچھل رہا تھا۔ موٹر سائیکل میں نے موڑ تو لی مگر گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے سیکڑوں وسوسوں نے نرغے میں لے لیا تھا۔ ابھی میں نے گیئر لگایا ہی تھا کہ اوپر کی کسی منزل سے مجھے کسی نے للکارتے ہوئے کہا۔ "اسٹاپ مین! ہُو دی ہیل آر یو، دِس ازمائی ......"

وہ شاید فیلکن تھا۔ مجھے اس نے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آواز خاصے فاصلے سے آ رہی تھی۔ شاید وہ کسی عقبی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی میں نے دوسرا گیئر لگا دیا اور پھر برق رفتاری سے گیٹ کی طرف بھاگا۔ عمارت کا چھوٹا سا لان عبور کر کے میں آگے نکلا تو اس وقت تک فیلکن شاید اپنی جگہ سے دوڑتا ہوا نیچے آ گیا تھا مگر اب اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ شو... نے بہت مچایا ہوگا مجھے دیکھتے ہی گیٹ پر کھڑا سپاہی ایک طرف ہٹ گیا اور میں اُس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گیا.........

وہ سمجھا ہوگا میں کسی بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ امریکی پولیس کی تیزی اور شتابی اُن کی اپنی عمارت سے ہی شروع ہو جاتی تھی۔ وہ کام بڑی عجلت میں کرنے کے عادی ہیں اور گیٹ پر کھڑے سپاہی کا یہی خیال تھا۔ میں ایسا جیسٹر پہنے ہوئے تھا جو اُنہی کی وردی کا حصہ تھا۔ سر پر ہیلمٹ بھی ویسا ہی تھا۔ سپاہی کو کسی طرح بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کوئی غیر ہوں اور وہاں سے فرار ہو رہا ہوں اور یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میں اُن کی نسل میں سے نہیں ہوں۔ میں اسی بات سے فائدہ اُٹھا کر باہر نکل گیا مگر راہ رستے کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ صورتِ حال ایسی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ وائرلیس پر فیلکن تمام پولیس والوں کو مطلع کر سکتا تھا۔ اس کے پاس میری سب سے بڑی نشانی تو اس کی اپنی موٹر سائیکل تھی۔ کسی بھی سپاہی سے وہ کہہ سکتا تھا کہ فلاں حلیے کے آدمی کو جہاں بھی ملے پکڑ لو۔ وہ فلاں نمبر کی موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔

لازم تھا کہ میں اس موٹر سائیکل سے جس قدر جلد ہو سکتا جان چھڑا لیتا مگر فوری طور پر اس پر عمل کرنا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی سڑک تھی اور کس طرف نکلتی تھی مگر ابھی میں کوئی تین کلومیٹر ہی آگے نکلا تھا کہ مجھے ...

عقب میں سائرن کی آواز سنائی دی۔ وہ کوئی پولیس کار تھی جو برابر شور مچاتی چلی آ رہی تھی۔ پتا نہیں انھیں سائرن بجا کر چلنے کی ہدایت کس نے کر رکھی ہے۔ وہ جب بھی کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے باہر نکلتے ہیں، ہارن پورے زور شور سے بجاتے چلے جاتے ہیں تاکہ لوگ متوجہ ہو جائیں، راستے سے ہٹ جائیں مگر اس کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو ہوتا ہے کہ وہ افراتفری میں ہونے کے باوجود اُن کی آوازیں سن کر کسی قریب ترین جگہ پر منہ چھپا کر بیٹھ رہتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی وہاں روز ہی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں تو خیر پولیس کا رویہ بہت ہی انوکھا ہے۔ اُن کے پاس ایسے وسائل بھی نہیں ہیں۔ بہت ہوا تو وہ کہیں گھات لگا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن میں اتنی جرأت بھی نہیں ہوتی ہے کہ وہ کسی خوفناک مجرم کو یوں سرِ عام پکڑ سکیں۔ شرفا کی بات الگ ہے کہ وہ قانون کا احترام کرتے ہیں اور اُن کی ٹانگیں پہلے ہی مرحلے میں جواب دے جاتی ہیں۔

وہ سائرن اب زیادہ واضح طور پر سنائی دینے لگے تھے اور موٹر سائیکل کا میٹر بتا رہا تھا کہ فاصلہ اب ساتویں کلومیٹر تک جا پہنچا ہے۔ سڑک اس گھڑی بالکل سنسان پڑی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں کہیں رُک جاؤں مگر ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک بائیں ہاتھ مجھے ایک ریستوران کھلا نظر آیا۔ اس کے بڑے ہال کی بتیاں روشن تھیں اور لوگ وہاں اس وقت بھی کھانے پینے میں مصروف تھے۔ میں نے گھما کر موٹر سائیکل اس ریستوران کے عقب میں لے جا کر روک دی۔ ایک پارکنگ لاٹ وہاں موجود تھی۔ جس میں بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ کئی موٹر سائیکلیں بھی وہاں موجود تھیں اُن کے قریب لے جا کر میں نے فیلکن کی موٹر سائیکل کھڑی کر دی اور اُسے مقفل کر کے میں نے چابی جیب میں ڈال لی۔

جب میں بریف کیس اٹھا کر ریستوران کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا تو اس وقت تک پولیس کار شاید واپس آ رہی تھی۔ چاروں طرف گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ ریستوران کے اندر کی آوازیں باہر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک دیوار کے ساتھ رُک کر اندھیرے میں اپنا جیسٹر اُتار کر بازو پر ڈال لیا اور ہیلمٹ سر سے اتار کر... ہاتھ میں پھنسا لیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اگر مجھے راستوں کا علم ہوتا تو میں کسی بھی طرف بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا تھا مگر شہر سے میری عدم واقفیت مجھے مارے ڈالتی تھی۔

پریشان ہو کر میں ایک بار پھر کاروں کے ہجوم کی طرف بڑھا میرے سامنے ایک دو نہیں کم سے کم ڈیڑھ دو سو کاریں موجود تھیں۔ کئی لوگ فارغ ہو کر اُن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انھیں کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ اُن کے درمیان کون کون آدمی موجود ہے۔ اچانک مجھے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس حال میں اپنی کار کی طرف بڑھتا نظر آیا کہ وہ خود بھی بُری طرح جھوم[...] اس کے ساتھ جو خاتون تھی، وہ بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ [...] ہو رہے تھے۔ اچانک وہ آدمی فرش پر گر گیا۔ اس خاتون [...] دیکھا کہ وہ اس کو اٹھا نہیں سکے گی تو اس نے بڑی بے [...] چاروں طرف دیکھا۔ میں اُس سے چند ہی قدم دور تھا [...] تک وہ اُس آدمی کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کی نظریں [...]

اپنی بے بسی پر تلملا کر وہ میری طرف بڑھی اور دونوں [...] پھیلا کر بولی۔ "پلیز! آپ اگر میری کچھ مدد کر سکیں۔ میرے [...] بے ہوش ہو گئے ہیں۔"

"اوہ، کیا ہوا ہے انھیں؟"

"پتا نہیں، ایک دم گر گئے ہیں۔ آپ کار ڈرائیو کر لیتے [...]"

"جی ہاں۔ چلیں میں ان کو کار میں ڈال دیتا ہوں۔" [...]

ہم دونوں نے اس آدمی کو فرش سے اٹھا کر کار کے اندر [...] پر ڈال دیا۔ وہ دُھت ہو رہا تھا، شراب اپنا اثر دکھا رہی [...]

"یہ لیں چابی۔ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی ورنہ میں آپ کو [...] نہ دیتی۔" اس نے بڑی ہی لجاجت سے کہا۔

"بے فکر رہیں، میں آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔ بیٹھیں۔" یہ کہ[...] نے اپنا جیسٹر، بریف کیس اور ہیلمٹ پچھلی سیٹ کے نیچے ڈا[...] ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار میں چابی لگا دی۔ وہ اپنے [...] پاس پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو[...] شوہر پر بار بار جھک کر اس کا حال دیکھتی تھی اور وہ ایسا [...] احمق تھا کہ بیوی کو یوں منجدھار میں چھوڑ کر خود شراب کے میں پورے کا پورا ڈوب گیا تھا اور ابھی تک ہوش میں آ رہا تھا۔

"مجھے راستہ معلوم نہیں ہے میڈم! میری رہنمائی کر[...] جانا ہے آپ کو؟"

"ہمارا گھر ویسٹ وہارف کے پاس ہے۔ میں آپ کو بتاتی چلوں گی۔" کار کی اندر کی بتی شاید خراب تھی۔ میں کو[...] کے باوجود اس خاتون کو روشنی میں نہیں دیکھ سکا۔ اب تک [...] نے اس کے سراپا پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اگرچہ وہ مجھ سے [...] تھی مگر میں کچھ اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس کو صحیح طور پر دیکھ [...] سکا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں کاریں اس طرح کھڑی تھیں کہ [...] کار بڑی آسانی سے بائیں ہاتھ نکالنے کے بعد آگے کی جا[...] تھوڑا سا راستہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے کارگزاری [...] اُن لوگوں کی تمدنی زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ وہ کس[...] سلیقے اور شعور کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ کہیں وہ کار میر[...] ہوتی اور کوئی کراچی ایسا بڑا شہر ہوتا تو مجھے وہاں سے نکلنے [...]

[...]خوار ہونا پڑتا۔

[...] اُس وقت تک پولیس کے کئی لوگ ریستوران کے عقب میں [...] تھے اور یہ بہت خطرناک بات تھی۔ فیلکن نے میرے پیچھے ایسے [...] تھے جو کسی بھی طرح اپنے سراغ سے ہٹنے پر آمادہ نہیں [...] کا لیے [...] پتا نہیں کیسے وہ لوگ موٹر سائیکلوں کی قطار تک جا پہنچے۔ جلد [...] نھیں فیلکن کی موٹر سائیکل مل گئی۔ اب وہ عجیب طرح سے چاروں [...] پھیل گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تعداد میں چھ تو ضرور ہی [...] میں نے کچھ اور لوگوں کو وہاں سے کاریں نکالتے دیکھا تو اُن [...]ٹ میں ہو کر میں پارکنگ لاٹ سے نکلنے لگا۔ ایک ایک لمحہ [...]ت لیتی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ میرے پاس پستول کوئی نہیں تھا اور [...] طرح سے یہ اچھا ہی تھا۔ ورنہ میں اُن پر گولی ضرور داغ دیتا۔ [...]یں یہ خیال نہیں آیا کہ میں کسی کار میں بیٹھ کر باہر نکل سکتا ہوں۔ [...] نہیں یہ بات اُن کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ وہ اگرچہ مجھے اپنی [...] ساتھیوں سمیت چاروں طرف پھیلے دکھائی دیتے تھے مگر اب تک [...]ن میں سے کسی نے کاروں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا اور میں [...] کار کے اندر مکمل تاریکی میں بیٹھا تھا اور دونوں بتیاں میں نے [...] روشن کر رکھی تھیں۔

میں جیسے ہی ریستوران کے احاطے سے باہر نکلا، وہ خاتون [...] بولی "چوک کے بائیں ہاتھ چلیں۔ وہ سڑک سیدھی ساحل کی طرف [...] جاتی ہے۔"

[...] گاڑی چوک سے گزار کر جیسے ہی میں آگے نکلا، ایک تیز رفتار کار میرے عقب سے گزرتی ہوئی میری کار کے سامنے چلنے لگی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اپنی رفتار سست کرتا جا رہا ہے۔ اس کا ڈرائیور بڑے معنی خیز انداز میں پچھلی بتی کبھی جلا دیتا تھا، کبھی اُس کی روشنی بالکل ہی کم کر دیتا تھا۔ کوئی آدھ فرلانگ تک اُس نے مجھے آگے نہیں نکلنے دیا اور پھر جیسے ہی بڑا چوک فاصلے پیچھے رہ گیا تو اس کے ڈرائیور نے کار میرے بائیں ہاتھ کر دی اس طرح جیسے وہ مجھے سڑک کے کنارے پہنچا کر میری گاڑی روک دینا چاہتا ہو۔ وہ خاتون بھی اس صورتِ حال سے سخت بدحواس ہو گئی۔ کسی اور گاڑی کا دُور دُور تک کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر میں زرغے میں پھنس کر رہ گیا۔ دوسری کار ذرا سی ترچھی ہوئی اور اس نے میرا راستہ بند کر دیا۔ میں نے مجبور ہو کر بریک لگا دیے۔

"ارے! یہ کیا حرکت ہے بھائی؟" میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر ڈرائیور کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی حرکت پر سخت غصہ آ رہا تھا مگر ابھی وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ اس کی عقبی سیٹ [...] ایک آدمی اُٹھا اور تیزی سے میرے قریب آ ٹھہرا [...] بولا "مسٹر گے ایس! تم سخت خطرے میں ہو۔ میرے ساتھ چلے آؤ اور یہ گاڑی اِدھر ہی چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ بہت بھاری بھرکم تھا۔ "جلدی کرو۔"

"مگر یہ خاتون کیا کریں گی؟ انھیں ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں یہ صاحب؟" خاتون نے سر آگے نکال کر کہا۔ اس کے بالوں سے عجیب طرح کی مہک اُٹھ رہی تھی جس کا پہلی بار مجھے احساس ہوا۔

"اُٹھ جاؤ۔ یہ خود دیکھ لیں گی۔ کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے تم نے۔ آؤ۔" میں اس کے لہجے کی تُندی اور تیزی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ایک ہلکا سا پستول تھام رکھا تھا جسے وہ مجھ سے اور اُس خاتون کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آؤ، جلدی کرو۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے بائیں بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

"مگر میرا بریف کیس۔"

"وہ بھی لے لو مگر جلدی کرو۔ عجیب پاگل آدمی ہو تم۔ وقت بالکل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور میں ابھی اپنی چیزیں اُٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا اُس نے خاتون کی گدی پر پستول کا دستہ دے مارا اور وہ بیچاری میرے دیکھتے ہی دیکھتے عین غین ہو گئی۔ اُس آدمی نے اُسے جان بوجھ کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں اس کا ہاتھ روک نہیں سکتا تھا۔ کسی نے کسی خاص مقصد کے تحت اُن کو میرے پیچھے بھیجا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے دوست ہیں کہ دشمن۔ پھر بھی مجھے اُن پر اعتبار کرنا ہی پڑ رہا تھا کہ وہ صورتِ حال بہت ہی غیر واضح تھی۔ میں تھانے کی حوالات سے بھاگ نکلا تھا۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی، وہ اس خاتون نے بلا ارادہ فراہم بھی کر دیا تھا کہ میں اسکی گاڑی لے کر اسکے گھر جا رہا تھا مگر وہ دونوں اچانک ہی میری راہ میں آ گئے تھے اور مجھے اُن کی بات مان لینے میں ہی عافیت نظر آتی تھی۔

وہ خاتون پستول کی ضرب نہ سہہ سکی اور اپنے شوہر کی طرف لڑھک گئی۔ اس آدمی نے کار کے دونوں دروازے بند کیے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی گاڑی کے پچھلے حصے میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی کی رفتار ساٹھ ستر تک پہنچا دی۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ ہیں کون مگر اتنا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بہت ہی اُونچے لوگ ہیں۔ اتنے طاقت ور اور اتنے تیز رفتار کہ ہمہ وقت اُن کی نگاہیں ہر اس بات پر جا پڑتی ہیں جو اُن کے حوالے سے شہر میں کہیں بھی ہو رہی ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ میں تھانے سے نکل آیا ہوں۔ انھیں یہ بھی پتا تھا کہ میں کس گاڑی میں کس روپ میں جا بیٹھا ہوں اور وہ اس قابل بھی تھے کہ آناً فاناً میرے تعاقب میں لپک سکتے۔ اُن سے کچھ بھی پوشیدہ

نہیں تھا اور ان کی برق رفتاری نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں نے کار کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ اس کے اندر کی آرائش یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ کسی بہت ہی صاحبِ حیثیت آدمی کی کار ہے اور اس کی نشستیں ایسی تھیں کہ وہ خالصتاً پولیس کا رنگ ظاہر کرتی تھیں اور یہ میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم میں! دیکھتے نہیں ہو، پولیس تمہارے تعاقب میں آ رہی تھی۔ انھوں نے وہ موٹر سائیکل بھی قبضے میں لے لی ہے جس پر تم سوار تھے۔"

"مگر میں پوچھتا ہوں، تم ہو کون اور یہ معاملہ کیا ہے۔ میں صرف تھانے سے بھاگا ہوں، چور تو نہیں ہوں میں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔"

"یہ.... یہ کار تو مجھے کسی پولیس افسر کی معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ آئی لائیک یو فار اِٹ — لو سگریٹ پیو۔" اس نے ایک سگریٹ سیدھا میرے لبوں میں پھنسا دیا۔

"یہ کار تمھیں کہاں سے ملی؟"

"زیادہ مغز مت کھپاؤ۔ تمہاری حفاظت بہت ضروری ہے۔ چیف نے کہا تھا کہ اسے ہر حال میں پولیس کے نرغے سے نکالنا ہے۔"

"مگر... کون چیف؟ میں کسی چیف شیف کو نہیں جانتا۔"

"تم بہت اُلجھے ہوئے ہو۔ اطمینان سے بیٹھو۔ ہم تمہاری چربی نہیں نکال لیں گے برخوردار!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"آلیور۔"

"آلیور کرامویل؟" میں نے ایسے ہی ایک تاریخی نام لے دیا۔

وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ "آدمی تم بہت سمجھ دار ہو۔ تمھیں بچا کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

"تم نے اب تک میرے مطلب کی کوئی بات نہیں کی۔ اُس خاتون کو تم نے کیوں بے ہوش کر دیا؟"

"وہ.... ذلیل اسی قابل تھی، وہ ڈرائیونگ جانتی ہے۔ صرف تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے ڈراما کر رہی تھی۔"

"میں کوئی اتنا حسین آدمی نہیں ہوں۔"

"یہ تو کوئی اُس سے پوچھے جو تمھیں لے جا رہی تھی۔ وہ ہر روز یہی کرتی ہے اور پھر اس مرد کی انگوٹھی یادگار کے طور اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔"

"مگر اس کا نام کیا ہے؟"

"جیفنر تھروٹ۔ بہت مشہور ہستی ہے وہ۔ اُس کا شوہر بہت بڑا صنعتکار ہے مگر اُسے شراب نے بالکل ہی نکما کر رکھا ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔"

"ہاں۔ اور یہ اچھا ہی ہے۔ میرا خیال ہے اب تک وہ کوئی پانچ سو ستر آدمیوں کی انگوٹھیاں جمع کر لی ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم پانچ سو اکہترویں آدمی ہوتے۔"

"تمہارے ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"اسے نہیں جانتے ہو تم! یہ اپنا پیارا سیزر ہے۔"

میرے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ سیزر نے اپنا ہیٹ ہلکا کیا۔ وہ ہنس رہا تھا، بولا۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر گیاث!" اس ... کی آواز میں افراتفری میں نہیں پہچان سکا تھا۔

"اچھا تو یہ تم ہو! اور شاید تم ڈاکٹر دھمن کے اشارے پر ... کر رہے ہو۔"

"نہیں، یہ ہمارے چیف کا حکم ہے۔"

"اور وہ کہاں ہے اس وقت؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ تمھیں بہر حال ہم نے بچا لیا ہے۔"

"ہوں — کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے یونہی بے خیالی میں اپنا دایاں ہاتھ سیزر کی نشست کے دائیں پہلو میں محض سہارا لینے کے لیے پھنسا دیا مگر میرا ہاتھ کسی گیلی چیز پر آ گیا جب میں نے اُسے باہر کھینچا تو معلوم ہوا کہ وہ خون ... ہو چکا ہے۔ سیٹ کے دائیں طرف کسی کا خون لگا ہوا تھا۔

"یہ.... یہ کیا ہے مسٹر آلیور؟"

"اوہ! سیزر! ڈیم اِٹ۔ تم سے گاڑی بھی صاف نہیں ہو سکی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ کس کا خون ہے آلیور؟"

"بتا دوں تمھیں! یہ.... یہ.... ہم نے ہیڈر ہاک کو ہلاک کیا ہے اور اس کی لاش پیچھے ڈکی میں رکھی ہے۔"

"نہیں آلیور! یہ نہ کہو، اسے کیوں مار دیا ہے تم نے؟ یہ زیادتی کی بات ہے۔"

"وہ.... وہ ہمارے راز سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ ان جن لوگوں کی فہرست بنائی گئی تھی، اس میں ڈاکٹر دھمن کا نام ... تھا۔ دوسرا نام کفلر کا تھا۔ تیسرا سافنر کا اور وہ اپنی تفتیش ... بڑھاتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کل تک شاید مجھ سے ... سے بھی متعارف ہو جاتا۔ اس معاملے میں ابھی تک اس کا ... راز دار نہیں تھا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ تھانے ... سے کس کس آدمی پر شبہ کر رہا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ یہ بہت ... اسمگل کرنے والوں کا گروہ ہے جسے وہ گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔ ... ہمیں آج شام ہی معلوم ہوئی اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے ... چھٹکارا بہت ضروری ہے۔"

... ہارٹن بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔"

"تو کیا وہ ہارٹن ...؟"

"نہیں۔ وہ اپنا ہی آدمی ہے اور ہر مہینے اس کا حصہ اُسے ... پہنچتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے بلا وجہ وہاں سے ... بنا دیا۔ ... مگر وہ کب تک اپنی خیر منا سکے گا۔"

"... اس کی فکر مت کرو۔ گاڑی تیز چلاؤ سیزر! ہمیں شہر سے باہر ... اسے دفن کر دینا ہے۔"

سیزر سنبھل کر بیٹھ گیا اور گاڑی کی رفتار اس نے نوّے میل ... بڑھا دی۔ بالآخر لمبا چوڑا شہر پیچھے رہ گیا، اس کی کسی بھی سڑک ... مجھے معلوم نہیں تھا مگر اُس سڑک کا رُخ مجھے سمندر کی طرف ... رہا تھا کیونکہ سڑک مسلسل ڈھلان بنتی جا رہی تھی۔

"یہ کام تم کب سے کر رہے ہو آلیور؟"

"زیادہ باتیں مت کرو مسٹر گیاث۔ بس اتنی بات یاد رکھو کہ ہم سب ہمیشہ خطرے میں گھرے رہتے ہیں اور ہر حال میں ہمیں اپنی جان بچانی ہے۔"

اُس وقت تک رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ سیزر نے کار ایک چھوٹی سی پہاڑی کے عقب میں کھڑی کر دی۔

"کیا خیال ہے، یہ جگہ بہتر رہے گی کہ نہیں؟"

"ہاں! ٹھیک ہی ہے آؤ اُسے ہم ڈکی سے نکالتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کار سے باہر نکل گیا۔

سیزر نے جب ڈکی کھولی تو اس کی ہوا سرکنے لگی۔ ڈکی میں سے ہیڈر ہاک غائب ہو چکا تھا۔

"اُف! یہ.... کیا ہو گیا ہے سیزر! وہ کہاں چلا گیا ہے؟" آلیور نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ڈکی کا ڈھکنا سیزر کے ہاتھ میں جھول کر رہ گیا۔

"وہ.... میرا خیال ہے سر.... کہ وہ ابھی زندہ تھا۔ ڈکی بھی کھلی پڑی تھی۔ وہ.... وہ کسی جگہ اُتر گیا ہوگا۔"

"مگر... مگر تم نے تو اُسے گولی مار دی تھی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر وہ بچ گیا ہوگا ورنہ ڈکی میں بند ہوتا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔" سیزر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہاک جسے ... اپنے طور پر مار چکے تھے، ڈکی سے کیسے غائب ہو سکتا تھا۔ اُن دونوں کے رنگ فق ہو گئے تھے۔ چاندنی نے آنکھیں اور زیادہ سراسیمہ کر رکھا تھا۔ وہ اندھیرے کے عادی تھے۔ اندھیروں میں ہی زندگی بسر کرتے تھے۔ روشنی کا سامنا وہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چاندنی سے بھی خوفزدہ ہو چکے تھے۔

"ہمیں یہ گاڑی چھوڑ دینی چاہیے۔ یہ تو بہت ہی بُرا ہوا ہے سیزر!"

"گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ میں نے خود اُسے لڑھکتے دیکھا تھا۔ جب میں نے اُسے اُٹھایا تو اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا جسے میں نے رومال سے ڈھانپ دیا تھا۔ ڈکی میں بھی خون موجود ہے۔ اس کے لیے ایک گولی کافی نہیں تھی۔ وہ زخمی تو ضرور ہوا مگر موقع ملتے ہی فرار ہو گیا۔"

"میرا خیال ہے جب ہم نے مسٹر گیاث کو روکا تو وہ اُسی وقت ڈکی سے نکل بھاگا۔ یہ تو بہت ہی بُرا ہوا ہے سیزر!"

"کوئی بات نہیں، اس سے نمٹ لیں گے ہم۔ تم گاڑی کو سیدھا میرے گھر لے چلو۔"

"ٹھیک ہے آلیور! یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی پھر سے سڑک پر چڑھا دی۔ وہاں کی تمام گاڑیاں ایسی تھیں کہ اُن کے اسٹیرنگ بائیں ہاتھ لگے تھے اور ٹریفک اُن کے دائیں ہاتھ چلتی تھی۔ سیزر بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ واپسی پر اُس کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ ہم پھر اُسی بستی میں جا پہنچے ہیں جہاں ڈاکٹر دھمن کی رہائش گاہ تھی مگر سیزر نے اس کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔ گاڑی کو مختلف راستوں سے گزارتا ہوا وہ ایک بنگلے کے سامنے جا ٹھہرا۔ اس نے باہر نکل کر دروازہ کھولا اور پھر گاڑی اندر لے جا کر گیراج کے سامنے کھڑی کر دی۔

"تم گاڑی اپنے ساتھ لے جاؤ اور اچھی طرح اس کو دھلوا دو۔ ایک مہینے کے لیے یہ تمہارے گیراج میں بند رہے گی۔ بعد میں اس پر نیا رنگ کروا دیں گے۔"

"مگر ہاک تو اسے پہچان لے گا۔ اُسے ہماری صورتیں بھی شاید یاد ہوں۔"

"نہیں۔ گولی اس پر ہم نے فاصلے سے چلائی تھی اور جب ہم نے اُسے کار میں ڈالا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اُسے ہمارا حلیہ یاد نہیں ہوگا۔ بے فکر رہو۔" آلیور نے اُسے تسلی دی اور مجھے ساتھ لے کر وہ کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ حیرت ہے کہ اس نے کسی کو اُٹھانے جگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عقبی حصے کا ایک دروازہ کھول کر وہ اندر جا پہنچا۔

"میرے پاس یہ تین کمرے ہیں۔ مالک دوسرے حصے میں رہتا ہے۔ ایک گیراج اس نے مجھے دے رکھا ہے اور یہ کمرے میری ساری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔"

"تم شہر میں کیوں نہیں رہتے؟"

"اس کی وجہ تو تم جانتے ہی ہو۔ ویسے بھی مجھے دیہات کا ماحول زیادہ پسند ہے۔ دیکھا نہیں کتنا سرسبز علاقہ ہے یہ۔"

"میرا خیال ہے ڈاکٹر دھمن بھی اِدھر ہی کسی جگہ رہتا ہے۔"

"نہیں بھئی! یہ خیال تمھیں کیسے آیا؟ اوہ! دراصل یہ علاقہ بالکل اُس جیسا ہے جس میں ڈاکٹر دھمن رہتا ہے۔ تم یوں کرو کہ

اس کمرے میں سو جاؤ۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی ہے؟"

"نہیں۔ میں بس اب سو جانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ ادھر، مجھے بھی بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ میں اپنے کمرے میں سو جاتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم الگ الگ کمروں میں بند ہو کر لیٹ گئے۔ یادوں کا ایک طوفان تھا جو میرے ذہن میں افراتفری مچا رہا تھا مگر مجھے اب کچھ نہیں سوچنا تھا۔ کسی کی قبر پر مجھے آنسو نہیں بہانے تھے۔ بہت رو لیا تھا میں اُن لوگوں کی میتوں پر جن کے میں کسی کام نہ آسکا اور جو میری کوئی مدد نہ کر سکے۔ میں کس کس کے سرہانے بیٹھ کر روتا، کس کس چہرے کو یاد کرتا۔ سب کچھ ہی بھسم ہو کر رہ گیا تھا۔ حالات نے مجھے اچانک ہی وطن سے بے وطن کر دیا تھا اور ایسی جگہ لا پھینکا تھا کہ میں کوشش کے باوجود اس جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔ بڑا کس بل تھا میرے بازوؤں میں مگر وہ سب کا سب بیکار ہو گیا تھا۔ میرے کسی اچھے کام کو بھی یار لوگ شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور وہ ہاک تو مجھے لے ہی ڈوبا تھا۔ اگر اس کے شکوک کسی طرح صحیح ثابت ہو جاتے اور اُسے یقین ہو جاتا کہ جو کچھ اس نے سوچ رکھا ہے وہ بالکل درست اور جائز تھا تو مجھے وہ اس معاملے میں اس طرح رگید دیتا کہ وہ لوگ مجھے چودہ سال کے لیے جیل بھیج دیتے۔ وہ اتنی لمبی قید ہوتی کہ جب میں وہاں سے باہر نکلتا تو ساری دنیا ہی بدل چکی ہوتی۔

نیند کا غلبہ ایسا تھا کہ میں زیادہ دور تک کسی بھی خیال کا پیچھا نہ کر سکا اور جلد ہی نیند کے سمندر کی تہ میں بیٹھتا چلا گیا۔

صبح جب میں سو کر اُٹھا تو سورج اس وقت تک خاصا اونچا اُٹھ چکا تھا۔ گھڑی دس بجا رہی تھی اور آلیور ابھی تک اپنے کمرے میں ہی تھا۔ کنڈی اس نے اندر سے چڑھا رکھی تھی۔ اُسے جگائے بغیر میں غسل خانے میں جا گھسا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں باہر برآمدے میں جا بیٹھا۔ وہاں بھی آلیور نے اپنے آرام کے لیے کرسیاں بچھا رکھی تھیں۔ برآمدے کے سامنے ہرا بھرا لان تھا۔ ویسا ہی ایک لان کوٹھی کے دوسرے حصے میں بھی تھا۔ سامنے کے حصے میں ایک دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ جس میں سے گزرنے کے لیے ایک دروازہ رکھا گیا تھا۔ ہاکر اخبار پھینک چکا تھا۔ اس کو گیٹ کے قریب سے اُٹھا کر میں نے سگریٹ سلگایا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ میرے مطلب کی اس میں کوئی خبر نہیں تھی اور امریکیوں کے مسائل سے مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اخبار قریب رکھی چھوٹی میز پر ڈال دیا۔

اگرچہ مجھے تھانے سے رہائی مل چکی تھی مگر اس کے باوجود میں آزاد نہیں تھا۔ کچھ غیر مرئی زنجیریں اب بھی میرے تعاقب میں تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اُنہیں بچا کر میں عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا ورنہ اب تک ... ہوتا۔ مجھے ہر حال میں آسیہ اور آبی کو رہائی دلوانا تھی۔ خواہ مخواہ ہی قید کی صعوبت میں مبتلا ہو گئے تھے اور ... لینے کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

اچانک لان کے بیچ میں بنی دیوار میں لگا چھوٹا سا دروازہ کھلنے کی آواز مجھے سنائی دی۔ دروازے پر سبز رنگ پھیرا ... تاکہ وہ گھاس کے رنگ کے مطابق نظر آئے اور دلفریب ... دے۔ اس دروازے کے کھلتے ہی لان میں بہار آگئی۔ سرخ ... میں ملبوس ایک لڑکی اس میں سے نکلی اور ادھر اُدھر دیکھتی ... آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی میری طرف بڑھتی۔ اس ... پر میری نظریں گڑ کر رہ گئیں۔ اس کے تراشیدہ بال بہت ... انداز سے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایسے کہ اس کی پیشانی ان میں چھپ گئی تھی۔ رنگ بھی اس کا سُرخ تھا۔ پاؤں میں سُبک سی سفید سینڈل پہن رکھی تھی۔

وہ میرے سامنے آٹھہری اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "آلیور کہاں ہے اور آپ کون ہیں جناب عالی؟" اس کی آواز ... نغمگی تھی۔

اس کی آواز سن کر میں کرسی سے اُٹھ گیا اور چند قدم بڑھ کر اس کے نزدیک جا ٹھہرا۔ منسلآرا کے بعد وہ دوسری ... تھی جس سے میں مرعوب سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں ... عجیب سے بلب جل رہے تھے۔ میں تو اُسے بس دیکھتا ... مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے پوچھا کیا ہے۔ حالت میری ... زدہ آدمی کی سی ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا آپ خیریت سے تو ہیں جناب عالی!" ... میری آنکھوں کے سامنے دونوں ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ... کوئی یہ دیکھ رہا ہو کہ اس کا مخاطب اندھا تو نہیں ہے۔

"اوہ! میرا نام غیاث احمد ہے ... اور ... اور میں ٹھیک ہوں۔ ہاں ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔"

وہ بے ساختہ ہنس دی اور میرے پاس سے گزر ... اُس کرسی پر جا بیٹھی جہاں سے میں اٹھا تھا۔

"کیا ... کیا آپ نے پہلے کبھی کسی عورت کو نہیں دیکھا جناب عالی؟" وہ بائیں ہاتھ سے میز پر پڑا اخبار اٹھاتے ہوئے ...

"میں ... پتا نہیں شاید دیکھا ہو میڈم! مگر ... جیسی تو آج تک نہیں دیکھی۔" خدا جانے وہ مجھے جناب ... کیوں پکار رہی تھی۔ بار بار فقرے کے آخر میں ... تھی۔ میرا خیال ہے اس کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا ...

کو ظاہر نہیں کر رہی تھی یا میں ہی اُسے سمجھ نہیں سکا تھا۔
"آپ.... آپ کس ملک سے آئے ہیں جنابِ عالی؟"
"میں.... وہ دراصل میں امریکہ کا باشندہ نہیں ہوں۔"
"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں جنابِ عالی!"
"پاکستان سے آیا ہوں جی میں۔ دراصل لاہور کا رہنے والا ہوں۔"
"پاکستان! نام سُنا ہے میں نے۔ وہ جو انڈیا کے ساتھ والا ملک ہے؟"
"جی جی! میں وہیں سے آیا ہوں۔" میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑا تھا اور مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا تھا کہ دوسری نشست پر بیٹھ جاتا۔
"وہ ملک جس نے تین بار انڈیا پر حملہ کیا ہے، وہی ملک ہے نا جنابِ عالی؟"
"یہ بات آپ سے کس نے کہی ہے جنابِ عالی؟" پہلی بار مجھے اُس کے الفاظ اُسی کو واپس کرنے پڑے۔
وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی۔ "آپ میری نقل اُتار رہے ہیں؟"
"نہیں نہیں جنابِ عالی! بلکہ میں سوچتا ہوں شاید ایسا نہ کہ کے مجھ سے غلطی سرزد ہو رہی تھی۔"
"میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔"
"آپ نے غلط پڑھا تھا جنابِ عالی! انڈیا تو بہت بڑا ملک ہے۔ ہم اس پر کیسے حملہ کر سکتے ہیں جنابِ عالی! دراصل انڈیا نے ہم پر تین بار حملہ کیا ہے۔"
"وہ کیوں بھلا! کیا ضد ہے اُسے آپ سے جنابِ عالی! حالانکہ وہ سبزی خور لوگ ہیں، گوشت نہیں کھاتے۔ کسی کو مارنا اُن کے مذہب میں گناہ ہے۔ آپ تشریف تو رکھیں۔"
"بالکل ایسے ہی جیسے امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرا دیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی برباد کر دیے تھے جنابِ عالی!"
"وہ.... وہ تو دیکھیں نا جنابِ عالی! انسانیت کو بچانے کے لیے ہمیں ایٹم بم استعمال کرنا پڑا تھا۔ ورنہ جاپانی تو ہندوستان پر قبضہ کر لیتے۔ ہاں! میں نے پڑھا ہے کہ وہ بہت خطرناک ہو چکے تھے۔ یہ.... یہ آئیور کہاں ہے؟"
"وہ ابھی تک سویا ہوا ہے۔"
"آپ یہاں کس لیے آئے ہیں جنابِ عالی؟"
"وہ میرا دوست ہے اور بس۔"
"کس کمرے میں سویا ہوا ہے وہ سر غیاث احمد؟"
"اپنے کمرے میں جنابِ عالی!" اس کے منہ سے اپنا نام سُن کر میرا سر فخر سے تن گیا۔ اس نے میرا نام یاد رکھا تھا۔ حالانکہ میں نے یونہی سرسری طور پر اُسے بتایا تھا۔ وہ اُسے گفتگو کے دوران بھول بھی سکتی تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔

"آپ نے ناشتا کر لیا ہے سر غیاث احمد؟"
"جی نہیں! ابھی تک تو نہیں کیا ہے۔"
وہ فوراً ہی کرسی سے اُٹھ گئی۔ بولی۔ "آئیں سر غیاث! آپ کو ناشتا کرواتی ہوں۔ سمجھیں میں بہت اچھی کک ہوں۔"
وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ سیدھی آئیور کے باورچی خانے تک بلا جھجک گئی جیسے وہاں کے گوشے گوشے سے خوب واقف ہو۔
"آپ اِدھر بیٹھ جائیں سر غیاث احمد! میں آپ کے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔" اس نے ایک کرسی میرے سامنے کر دی جو باورچی خانے کے کونے میں رکھی تھی۔
"کیا واقعی! آپ ناشتا تیار کریں گی؟"
"ہاں! کیا حرج ہے۔ آپ آئیور کے دوست ہیں اور..."
فریج سے اُس نے دو انڈے نکالے۔ وہیں ڈبل روٹی بھی موجود تھی۔ سارا سامان چولھے کے قریب رکھ کر اس نے انڈے تلے اور اُنھیں بڑی نفاست سے دو پلیٹوں میں رکھ کر وہ میرے پاس لے آئی۔ اس دوران وہ کچھ نہیں بولی، بدستور مسکراتی رہی۔ محویت سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ ڈبل روٹی کے ساتھ اس نے کچھ کباب بھی بنا لیے تھے — اس نے ایک اسٹول بھی قریب کھینچ کر رکھ لیا اور اس پر خود بیٹھ گئی۔
"اب شروع کریں۔ کیا میں بھی اس میں شامل ہو سکتی ہوں؟"
"کیوں نہیں ریسپیکٹڈ لیڈی! آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"میرا نام الزبتھ ہے۔ ویسے مجھے عام طور پر لزی کہتے ہیں۔ میرے والد کو یہی نام پسند ہے جنابِ عالی!"
"اگر آپ مجھے صرف غیاث کہہ کر پکاریں تو مجھے خوشی ہوگی۔"
وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی۔ "میں ایسا پسند نہیں کرتی ہوں جنابِ عالی! ٹھہریں میں آئیور کو جگا..." یہ کہہ کر اس نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا پھر سے پلیٹ میں رکھا اور باورچی خانے سے نکل کر برآمدے کی طرف لپکی۔ جاتے ہی دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی کے سوئچ پر انگلی رکھ دی اور بجاتی ہی چلی گئی۔ کوئی ڈیڑھ منٹ تک اس کی انگلی بٹن پر رہی اور پھر وہ ہنستی ہوئی کمرے میں واپس آ گئی۔ آئیور جاگ اُٹھا تھا۔ وہ اپنا گاؤن درست کرتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔
"کیا مصیبت ہے، کون ہے باہر؟" وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولا۔
ہم دونوں پھر ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ باورچی خانے کے کمرے میں پہنچا تو اس وقت ہم دونوں بالکل خاموش...

...اس کی نظر لزی پر پڑ گئی کیونکہ وہ کچن کے دروازے کے سامنے تھی۔
"اوہ تو یہ تم تھیں۔ کیا ضرورت تھی اتنی زور سے گھنٹی بجانے کی۔ کوئی مر تو نہیں گیا تھا۔ ارے گے ایٹ تم کیا کر رہے ہو بھئی!" وہ باورچی خانے کے دروازے تک آ گیا اور مجھے لزی کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر حیران سا ہو گیا۔
"مجھے انھوں نے ناشتا بنا کر دیا ہے آئیور! یہ تو کوئی ماورائی ہستی معلوم ہوتی ہیں۔"
"اس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی رہتی ہے۔ تم کالج نہیں گئیں آج؟"
"بس نہیں گئی! کوئی رعب ہے تمھارا۔"
"دیکھ تو مجھے تنگ نہ کیا کر لزی! بہت بُری بات ہے، تو ہر روز میری نیند خراب کر دیتی ہے۔"
"رات کو ڈاکے مارتے رہتے ہو تم! کیا کرتے رہتے ہو آخر؟ جلدی سو جاؤ تو وقت پر اُٹھ جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم کاہل تو ہرگز نہیں ہو۔"
اچانک ایک بوڑھی حبشی عورت کسی طرف سے وہاں آ گئی اور آئیور کے کندھوں کے اوپر سے باورچی خانے میں جھانک کر بولی۔ "مس لزی! اُدھر مسز فنیلی سخت ناراض ہو رہی ہیں۔ گھر چلیں، اُٹھ جائیں مس لزی! وہ بُری طرح گرج رہی ہیں۔"
"کیا مصیبت ہے، چلو۔" لزی کے چہرے سے پہلی بار مسکراہٹ غائب ہوئی اور وہ مجھے بغور دیکھتی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی کرسی چھوڑ دی۔ آئیور ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ جب وہ دونوں برآمدے میں پہنچے تو لزی نے ایک بار پھر مڑ کر مجھے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔ پھر وہ تیز تیز چلتی ہوئی لان میں سے گزر گئی۔ دروازہ اس نے اپنی طرف سے بند کر لیا۔ میں اُس گہرے سبز رنگ کے دروازے کو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔
آئیور نے لزی کے جانے کے بعد کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بولا۔ "آؤ ناشتا کریں۔ انڈے تو یہ بہت خوب تلتی ہے۔"
"مگر تم نے تو ابھی منہ بھی نہیں دھویا۔"
"اسے لعنت بھیجو، میرا منہ آخر ہے کس قابل۔ دو چار کام میں ایسے ضرور نمٹا دیتا ہوں۔ آؤ۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ باورچی خانے میں جا گھسا اور کُلی کر کے ناشتے کے لیے میز پر بیٹھ گیا۔
"یہ لزی کون ہے آئیور! بڑی بے تکلف ہے تم سے؟"
"یہ فنیلی کی بیٹی ہے، سب سے بڑی بیٹی۔ اس کی ماں مر گئی ہے اور اب یہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں بہت پریشان ہے۔"
"کوئی اور بہن بھائی بھی ہے اس کا؟"
"نہیں۔ اس کے سگے تو کوئی نہیں ہیں۔ سوتیلے ضرور ہیں۔ دو بہن بھائی ہیں۔ ایک فریڈرک اور دوسری ورونا۔ دونوں بہت چھوٹے ہیں ابھی۔ فنیلی نے کوئی دو سال پہلے دوسری شادی کی ہے۔"
"فنیلی کیا کرتا ہے؟"
"ایک دواؤں کی فیکٹری میں حصہ ڈال رکھا ہے اس نے۔ اس کے علاوہ اس کی کچھ ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ خاصا مالدار آدمی ہے۔"
"ہوں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔"
"ہاں، بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے مگر سوتیلی ماں اس کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے۔"
"تمھارے پاس کس لیے آتی ہے؟"
"اِسے ہر روز کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی ہے، مجھے تنگ کرنے کے لیے آ جاتی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی ایسی نظر آتی ہے یہ۔ سونیا اگر زندہ ہوتی تو آج اس کی عمر کی ہوتی۔"
"تو کیا ہوا اُسے! وہ زندہ نہیں ہے؟"
"نہیں۔ وہ چھ سال کی ہو کر مر گئی۔ ایک سال بعد اس کی ماں بھی فوت ہو گئی۔"
"تو کیا تم جب سے تنہا رہ رہے ہو؟"
"ہاں۔ پھر میں دوبارہ گھر نہ بسا سکا۔ سب بیکار ہے مسٹر گے ایٹ!"
"پھر تم اس دھندے میں کیوں پڑے ہو؟"
"کیا کروں، گزارا نہیں ہوتا۔ آج اس سینر نے ہاک پر گولی چلا کر مجھے بھی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ورنہ میں کسی کو جان سے مار دینے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں مگر ہاک کے لیے چیف کا یہی حکم تھا۔"
"لیکن وہ تو بچ گیا ہے۔"
"یہی خوف میری جان لے رہا ہے۔ پتا نہیں وہ ڈِکی سے کیسے فرار ہو گیا۔ وہ تندرست ہو کر ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ ہم اُسی کی کار میں فرار ہوئے تھے۔ یہی کار جس میں سینر ہمیں یہاں لایا ہے۔"
"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم یہ جگہ چھوڑ دو؟"
"نہیں۔ یہ بہت محفوظ مقام ہے پیارے! اور کسی کو پتا نہیں ہے کہ میرا دھندا کیا ہے۔"
"کیا میں لزی سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟"
"خیر تو ہے! میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا؟"
"کوئی خاص بات نہیں ہے آئیور! وہ بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی ہے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو مگر اس کی ماں اُسے جینے نہیں دیتی۔

باپ اس کا بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ سمجھو پینسٹھ کے قریب ہو گا وہ اور بیوی نے اُسے بندۂ بے دام بنا رکھا ہے۔ وہ لزی کو سوتیلی ماں کے ظلم سے نہیں بچا سکتا۔"

"میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ لزی کو یہ ماحول چھوڑ دینا چاہیے۔"

"اپنا بُرا بھلا وہ خود سمجھ سکتی ہے، اب اتنا بھی بھولا نہ سمجھو اُسے! مسز فنیلی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ویسے اس کے باپ نے جو وصیت کر رکھی ہے اس کے مطابق یہ بنگلا لزی کا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی والدہ کی ملکیت تھا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ آئیور نے لقمہ وہیں چھوڑا اور ریسیور کی طرف لپکا۔ فون اس کے اپنے کمرے میں تھا۔

جب وہ واپس آیا تو بڑے فکر مند لہجے میں بولا "یہ ہمارے چیف کا فون تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"اس نے اشاروں میں بتایا ہے کہ ہاک مُردہ حالت میں سڑک پر پڑا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں گولی لگی تھی۔ پتا نہیں اُسے کسی نے اٹھایا کیوں نہیں، وہ رات بھر وہیں پڑا رہا۔"

"اور کیا کہا ہے اس نے؟"

"مجھے بُلایا ہے۔"

"ہُوں۔ کیا خیال ہے پھر؟"

"میں ابھی چلا جاؤں گا۔ تم بہرحال اِدھر ہی رہو۔ عین ممکن ہے میں کچھ دن کے لیے باہر چلا جاؤں، چیف نے مجھے کوئی کام سونپا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ دن اِدھر ہی رہوں گا۔" لزی کے تصور نے میرے دل میں انجانی خوشیاں بھر دی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ اسکے ساتھ میرا وقت خوش گوار گزرے گا۔ وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے گی۔

"بہت احتیاط کی ضرورت ہے مسٹر گے ایٹ! ایسا نہ ہو، یہاں رہ کر تم کوئی اور ہی مصیبت مول لے لو۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ تم اطمینان رکھو مطلع صاف ہو جائے تو میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"ہاں! میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ تمھاری جان سخت خطرے میں ہے۔ اگر ہمارے چیف کو یہ یقین ہو گیا کہ تمھاری وجہ سے اُن کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے تو وہ کسی بھی وقت تمھیں ختم کروا دے گا۔ ہم سب کی جان اس کے پاس گروی رکھی ہے۔ ہاں، ہماری زندگی کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ہم اس کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔"

"کیا واقعی؟ یہ تو بڑی عجیب بات بتائی ہے تم نے!"

"ہاں، حقیقت یہی ہے۔ اس لیے تمھیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ چیف کو تمھارے بارے میں بہت زیادہ تردد ہے۔ ہمہ وقت تمھاری نگرانی ہو رہی ہے۔ اُسے اب تک [...] ہے کہ تم نے کسی کے سامنے کوئی غلط بات نہیں کہی [...] کی خبر اُسے پہنچا تا رہا ہے اور اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ [...] کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ تمھارے منہ سے نکلی ہوئی ذرا [...] تمھاری موت کا سبب بن سکتی ہے۔"

"یہ تو بہت ہی خطرناک بات بتائی ہے تم نے [...] کو میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے اس کا راز کسی [...]"

"وہ خود ہی اس بات کا اندازہ کر لے گا۔ اسے [...] سے نمٹنے کا فن آتا ہے۔ اس کے آدمی فوراً ہی اُسے اطلاع [...]"

"اُس کا نام کیا ہے آئیور؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ صحیح پوچھو تو میں نے آج تک [...] شکل بھی نہیں دیکھی۔ یہ اس کے فن کا کمال ہے کہ اس [...] کی نیت کو دور بیٹھے بیٹھے سمجھ لیا۔ ہم لوگ لاکھوں ڈالر [...] دیتے ہیں مگر نہ اس کا نام جانتے ہیں، نہ صورت آشنا ہیں۔"

"کیا وہ.... وہ کوئی مافیا قسم کی تنظیم چلا رہا ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم تو صرف ہیروئن کی ٹا[...] میں شامل ہیں۔ اب مجھے دیکھو، وہ مجھے تین ہزار ڈالر ہر [...] ہے اور اس مکان کا کرایہ پانچ سو ڈالر الگ ہے اور کام [...] بھی نہیں۔ بس ہفتے دس دن کیلیے مجھے اِدھر اُدھر جانا [...] آج بھی میرا خیال ہے کوئی مال آیا ہے جسے لے کر مجھے کسی [...] شہر جانا ہو گا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے آئیور! میں تمھارا شکر گزار ہوں [...] مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ میں بہت محتاط رہوں [...]"

"عین ممکن ہے یہ لڑکی لزی بھی اس کی تنخواہ دار [...] میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا جال بہت لمبا اور بے حد [...]"

"یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بس سمجھ لو کہ تمھیں اپنے سائے سے بھی بچنا ہو گا [...] نہیں ہے مسٹر گے ایٹ کہ تم جو مال لائے تھے وہ یہاں [...] میں ایک کروڑ ڈالر میں بِکا ہے۔"

"کیا کہا؟ ایک کروڑ ڈالر میں!"

"ہاں۔ اور یہ بات تم سے چھپالی گئی تھی۔ ڈالر [...] میں سے آدھا حصہ دے دیا گیا۔ باقی چیف نے اپنے پاس [...] جو ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ تمھارے پاس ہے، یہ تو [...] ہے.... سمجھوں گا۔"

"یار تم مجھے برباد کر دو گے۔ کس الف لیلیٰ کی بات کر [...] اتنا مال میں کیسے لا سکتا تھا!"

"وہ اسٹریچر جس پر تم لد کر آئے تھے اس میں کسی مال ہی بندھا [...] کے پائپ بھرے ہوئے تھے مال سے۔ تمھاری ٹانگوں پر [...] بندھی تھی اور تمھارے پیٹ پر بھی۔ یہاں تک کہ تمھاری [...] جو پٹی باندھی گئی تھی اس میں بھی ہیروئن تھی۔"

"خدا بیڑہ غرق کرے اس دشمن کا۔ مجھے تو اس نے پاگل کر دیا ہے۔"

"تمھاری تیاری پر بڑی محنت کی گئی تھی۔ پیارے! مجھے سب معلوم ہے اور اسی لیے مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمھاری بہت نگہداشت [...] تم یہاں رہو اور آرام سے وقت گزارو۔ یہ گھر تمھارا ہے، یہاں ہر چیز تمھاری ہے۔ وہ تم سے اب ایک اور چکر لگوائیں گے۔ [...] پھر تمھیں شدید بیمار ظاہر کیا جائے گا۔ چیف کا خیال ہے کہ [...] سے زیادہ بہتر شخص اُسے اور کوئی نہیں مل سکے گا۔"

"تو گویا میری واپسی ناممکن ہو گئی ہے؟"

"ہاں! ابھی تک تو شاید صورتِ حال ایسی ہی ہے۔ شاید تم سے زیادہ بہتر کوئی آدمی انھیں مل جائے۔"

"مگر آئیور! میں جلدی وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں، میری کچھ مدد کرو میرے بھائی! میں تو خواہ مخواہ ہی مارا گیا ہوں۔"

"اس کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ [...] دیکھو، میرا ٹیلیفون ہر وقت ٹیپ ہوتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ چیف کے حکم پر ہوتا ہے۔ میں کسی سے کوئی انٹ شنٹ بات بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ تم بھی بہت محتاط رہو گے۔ کیونکہ تمھاری گفتگو کا ایک ایک لفظ چیف تک پہنچ جائے گا۔"

"میں اردو میں بات کروں گا تو پھر وہ کیا کریں گے؟"

"اس کی بھی دوا اُن کے پاس موجود ہے۔ تمھارے پاکستان کے باشندے چیف کے ملازم ہیں اور وہ سندھی، پنجابی، اردو اور پشتو بلکہ کشمیری بھی خوب سمجھتے ہیں۔ تمھیں تو وہ ایک قدم نہیں چلنے دیں گے مگر ہاں! ایک بات بتاؤ، کچھ لوگ کہتے ہیں، گولی تم پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ یہ کیا چکر ہے؟ ہوائی جہاز میں تم پر بھی گولی چلائی گئی تھی، ایک آدمی کے جسم میں آرپار سوراخ ہو گیا تھا، تم کیسے بچ گئے؟ جہاز اغوا کرنے والے سب کے سب مسلح تھے۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

"یہ سب میرے مولا کا کرم ہے۔ ورنہ تو میرے مرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔"

"تم بہت حضرت آدمی ہو مسٹر گے ایٹ! یہ مولا کیا ہوتا ہے؟ ملا رہتا ہے یہ؟"

"یہ ہر جگہ ہر مقام پر موجود ہے اور ہماری ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ میں اسے گاڈ کے مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں۔"

"نہیں پیارے! یہ بات نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے۔ تم کہیں کوئی زرہ تو نہیں پہنتے ہو؟"

"نہیں، زرہ تو میرے پاس کوئی نہیں ہے۔" میں نے اُسے قمیص کا دامن اٹھا کر چھاتی تک اپنا جسم دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمھارے پیٹ پر نشان کیسا ہے؟ کوئی زخم لگا تھا تمھیں؟"

"میرے گردے کا آپریشن ہوا تھا، یہ اُسی کا نشان ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم بہرحال بہت محتاط رہو گے اور دیکھو اُس آدمی کا نام تھامسن ہے جو تمھاری نگرانی پر مامور ہے۔ ذات کا حبشی ہے اور بہت بڑا پہلوان اور باکسر رہ چکا ہے وہ اپنے وقت کا۔ کم سے کم اس شہر میں کوئی اُسے ہرا نہیں سکا تھا۔ پتا نہیں وہ خود تمھارے پاس آئے یا کسی اور کو بھیجے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان ہے اور ناک اس کی پچکی ہوئی ہے۔ وہ نہ صرف پستول چلا سکتا ہے بلکہ خنجر زنی میں بھی ماہر ہے اور ہاتھ اس کے جوڈو کراٹے کی بجلیاں لہراتے ہیں۔"

"گویا تم مجھے اس سے خوفزدہ کر رہے ہو۔ ایسے تو میں نے بہت دیکھے ہیں آئیور! تم لوگ ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکے ہو۔ بہرحال تمھارے ان مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔ اب تم تیار ہو کر نکل جاؤ۔" یہ کہہ کر میں پھر برآمدے میں جا بیٹھا۔

آئیور کچھ ہی دیر بعد تیار ہو کر باہر آیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر، مجھے بہت محتاط رہنے کا مشورہ دے کر گیراج کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اُس نے ایک چمچاتی کار بند کر رکھی تھی۔ چھوٹے سائز کی شیورلیٹ۔ وہ اس نے باہر نکالی اور مجھے گیراج کے دروازے بند کر لینے کا کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے گیراج کے دروازے بند کیے اور پھر ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر میں اس سبز رنگ کے دروازے کے پاس جا ٹھہرا جس میں سے لزی دوسرے مکان میں گئی تھی۔

پتا نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا جب سے لزی مجھ سے ملی تھی اور جب سے وہ مجھ سے رخصت ہو کر دوسری طرف گئی تھی، میرا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کوئی سحر تھی، کوئی جادو تھی یا کیا تھی؟

میں نے دروازے کی جھریوں میں سے دوسری طرف نظر ڈالی، میرے سامنے بھی ایک سرسبز لان تھا۔ جس کے گرد سرو و صنوبر کے بالا بلند درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس لان کے سامنے عمارت کا جو حصہ مجھے نظر آتا تھا وہ آئیور کے حصے سے زیادہ کشادہ اور حسین تھا مگر وہاں لزی تھی نہ مسز فنیلی اور بچے بھی کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ میں کوئی دو گھنٹے تک وہاں گھاس پر بیٹھا اُن جھریوں سے دوسری طرف دیکھتا رہا مگر اُن لوگوں میں سے مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس صبح جو آگ میرے دل میں لزی نے لگائی ہے اس کا نتیجہ آخر کیا نکلے گا۔ وہ غلام جیلانی جسے کوئی شکست نہ دے سکا تھا،

جسے ناز تھا اپنے زورِ بازو پر، اس غلام جیلانی کا دماغ لزی نے ایسا بند کر دیا تھا کہ اب اس کے وجود پر دل ہی کی حکمرانی تھی اور اُسے کچھ سُوجھتا ہی نہیں تھا۔

یہ کیسا ستم ہے یارو! کہ آدمی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو پھر اُسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُسے آگے پیچھے کی کوئی بات یاد نہیں رہتی ہے میں کہ آسیہ اور آبی کے غم میں بہت روتا تھا، اُن کی فکر نے مجھے پاگل کر رکھا تھا مگر اس دن اُن کو بھی یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ لزی نے ایسا پردہ میرے دماغ پر ڈال دیا تھا کہ میں اس روز کئی گھنٹے وہاں بیکار بیٹھا رہا اور دروازے کی جھریوں کو تکتا رہا۔ محض اس آس پر کہ شاید وہ پھر مجھے نظر آجائے مگر وہ نہیں آئی اور سورج لڑھکتا ہوا آگے نکل گیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ میرے سگریٹ بھی سب کے سب ختم ہوگئے، دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہوگئے مگر وہ نہیں آئی۔

دن کا ایک بج چکا تھا کہ میری مُراد پوری ہوگئی۔ لزی اپنے گھر کے اونچے برآمدے میں نظر آئی۔ وہ ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائے ہوئے تھی۔ لان پر سے اس کی نظر پھیلتی ہوئی دروازے تک آئی اور وہ مسکراتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی۔ اب وہ گھاس پامال کر رہی تھی۔

وہ تیز تیز چلتی دروازے تک آئی اور پھر اس نے کُنڈی کھول دی اور میں نہال ہوگیا۔

مجھے اس نے یوں دروازے کے بالکل سامنے بیٹھے دیکھا تو حیران رہ گئی ”ریسپیکٹڈ سر! آپ یہاں!“

میں ایک دم اٹھ کر دیوار کے ساتھ جا لگا ”مجھے یہاں بیٹھے چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔“

”مگر کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے جنابِ عالی؟“

”ٹرے میں کیا ہے ریسپیکٹڈ لیڈی؟“

”یہ..... میں آپ کے لیے کھانا لائی ہوں۔ مجھے خیال تھا کہ آپ ابھی تک بھوکے ہوں گے۔ وہ آلیور اندر ہی ہے؟“

”نہیں، وہ باہر جا چکا ہے۔“

”میں نے اس کی گاڑی کی آواز سُنی تھی۔ اچھا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ آیئے کھانا کھائیں۔ مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔“

وہ میرے آگے آگے چل دی برآمدے سے گزر کر ہم کمرے میں جا پہنچے۔ وہ سیدھی بڑی میز تک گئی۔

”میں آپ کے لیے خود پکا کر لائی ہوں۔ آنٹی سے میں نے کہہ دیا کہ آلیور بھوکا ہوگا۔ اس لیے اس نے زیادہ اعتراض نہیں کیا مگر غصہ اُسے بہت زیادہ آرہا تھا۔ میں بھلا کب پروا کرتی ہوں... جنابِ عالی۔“

”آپ اپنی ماں کو آنٹی کہتی ہیں؟“

”ہاں، وہ میری سوتیلی ماں ہے نا۔ بہت پریشان کر رکھا ہے وہ مجھے۔ خدا اُسے غارت کرے۔ صبح سے اُس نے مجھے ... رکھا تھا۔ میری کتابیں اُٹھا کر جلا دیتی ہے، نہیں چاہتی کہ میں کالج جاؤں۔ کیا مجھے اس کی پروا کرنی چاہیے جنابِ عالی؟“

”آپ مجھے جنابِ عالی کیوں کہتی ہیں؟“

وہ میری بات کو نظر انداز کر گئی۔ بولی ”یہ لیں، مجھے ... کہ یہ روٹی آپ بہت پسند کریں گے۔“

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے توے کی ... روٹیاں رکھی تھیں ”یہ آپ نے کیسے پکا لیں! آپ نے تو ... کر دیا ہے!“

”میں آئی ہی اس لیے ہوں جنابِ عالی کہ آپ اور ... حیران ہوں۔ میرے کالج میں ایک پاکستانی لڑکی پڑھتی ہے ... اس کا نام جمیلہ طوسی ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ اس نے ... چیزیں سکھا دی ہیں۔ وہ اکثر مجھے ملا بھیجتی ہے۔“

”کمال ہے بھئی! آپ تو..... مجھے بڑی حیرت ہے لزی ... آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ یہ سالن آپ نے کیسے ...“

”ان باتوں کو چھوڑیں اور کھانا شروع کریں۔ ویسے ... مجھے لزی کیوں کہا ہے، میں نے تو اس کی آپ کو اجازت نہیں ...“

”مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں، مجھے لگتا ہے جیسے ... سے آپ کو جانتا ہوں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔“

”ویسے یہ بتائیں کہ آپ نے اتنی انگریزی کہاں سے سیکھی جنابِ عالی!“ وہ اب بھی اپنی شوخی اور شرارت سے باز نہیں ...

”کیوں کوئی نئی بات ہوگئی ہے؟“

”نہیں۔ پھر بھی لوگ جب انگریزی بولتے ہیں تو ... نہیں دیتے۔ ویسے آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اُردو بھی آتی ہے ... نہیں جیسی آپ بول سکتے ہیں۔“

”کوئی بات اُردو میں کریں۔“

”آپ پہلے کھانا تو کھالیں۔“ اس نے اُردو میں نہایت ... سے کہا۔

”ارے! یا میرے خدا! یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ لگتا ... امریکہ میں پاکستان بن گیا ہے۔ آپ مجھے پاگل کر دیں گی جنا... میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ ایسی ثابت ہوں گی ... وہ پاکستانی طریقے سے پکا کر لائی تھی۔ جمیلہ طوسی نے اسے ... پاکستانی بنا دیا تھا۔ یا پروردگار! یہ کیسی عجوبہ روزگار لڑکی ... اس نے واقعی مجھے حیران کر دیا تھا ”آپ کی اُستاد جمیلہ طوسی ... کمال کر دیا ہے جنابِ عالی! آپ کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے ... آپ مجھے اس سے ملوا سکتی ہیں؟“

... ہاں کیوں نہیں۔ ویسے آپ سے بات میں نے جان بوجھ ... تاکہ میں دیکھ سکوں کہ میں کسی اور کے سامنے اُردو یا ... سکتی ہوں کہ نہیں۔ جمیلہ کے سامنے تو میں روز ہی بولتی ... وہ میری بہت مدّاح ہو چکی ہے۔ میں اُسے کسی روز یہاں ... گی، شاید کل ہی جنابِ عالی!“ وہ پھر ہنس دی۔

... مجھے کچھ آلیور کے بارے میں بتا سکیں گی آپ ریسپیکٹڈ لیڈی؟ ... لزی کہنے کی مجھے اجازت نہیں ہے نا۔“

... مٹی پاؤ جی ایس گل اُتے۔ کیہہ جنابِ عالی، جنابِ عالی ... اوے“ اس نے یہ فقرہ ایسی میٹھی پنجابی میں ادا کیا کہ میں ... کر اٹھا۔ وہ میرے وطن میں جا کر تو لوگوں کو حیران کر دیتی، ... بلکہ خالص پنجابی میں بات کر سکتی تھی۔ میں اس کے بارے ... میں کیا کیا سوچ رہا تھا۔

اچانک ایک معمّر امریکی کمرے میں داخل ہوا۔ اپنے اندر آنے ... کی اطلاع اس نے کھانس کر دے دی تھی۔ جسے سُن کر لزی ایک دم اس ... کی طرف لپکی۔

”اوہ پاپا! آپ بہت اچھے وقت پر آگئے۔ ان سے ملیں، یہ ... غیاث احمد صاحب، پاکستان سے آئے ہیں۔ بہت ہی نفیس آدمی ہیں۔ یہ میرے پاپا ہیں آرتھر فنیلی۔“ اس نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

مگر وہ شاید ہماری بات ہی نہیں سن رہا تھا اس کے چہرے کے نقوش سیدھے نہیں ہو رہے تھے۔ میرا بڑھا ہوا ہاتھ اس نے جھٹک دیا اور اپنے غصّے پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا ”لزی! وہ..... وہ..... تمھیں پتا ہے، تمھاری ماں کا کیا حال ہو رہا ہے؟“

”نہیں تو.... کیا ہوا اُسے؟“

”وہ... وہ میرا پھندا.... وہ جانور شکار کرنے کا پھندا کس نے جھاڑیوں میں کھول کر رکھا تھا؟“

”مجھے کیا پتا.... میں تو یہاں بیٹھی ہوں۔“

”تمھاری ماں کا دایاں ہاتھ اس شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ میں گھر نہ آتا تو شاید وہ ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ شدید زخمی ہوگئی ہے۔ شاید اُس کا ہاتھ کاٹنا پڑے۔ ڈاکٹر یہی کہہ رہا ہے۔ چلو اُسے دیکھو۔ چلو بدبخت لڑکی! وہ سب تمھاری شرارت ہے۔“

”مجھے کچھ پتا نہیں ہے پاپا۔ میں نے تو وہ پھندا دیکھا بھی نہیں ہے، ایک عرصے سے نہیں دیکھا۔“ مگر آرتھر اس کی کسی بات پر

اعتبار نہیں کر رہا تھا۔ اُسے گھسیٹتا ہوا وہ باہر لے گیا۔

میں بھی اپنے قدم روک نہ سکا اور اُن کے پیچھے پیچھے لان تک جا پہنچا۔ جب وہ دروازہ عبور کرنے لگے تو آرتھر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بڑے ہی نفرت بھرے انداز میں بولا۔ "تم کیوں چلے آرہے ہو منہ اٹھائے، کوئی ڈاکٹر ہو تم؟ جاؤ اندر بیٹھو۔"

"آپ کی بیوی زخمی ہوگئی ہے۔ شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔"

"نہیں۔ تمھاری مدد کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے بڑے زور سے دروازہ دوسری طرف سے بند کر لیا اور لزی کو اُسی طرح ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا مکان کے اندر لے گیا۔

چند ہی منٹ بعد مجھے اُن کی گاڑی گیٹ کی طرف جاتی دکھائی دی۔ پیچھے ایک ڈاکٹر اور ایک جوان عورت بیٹھی تھی اور آرتھر فنیلی گاڑی چلا رہا تھا۔ بچوں کو شاید وہ لزی کے حوالے کر گئے تھے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، میں نے لان کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا مگر لزی باہر نہیں آئی۔ کوئی دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے دروازے کی درمیانی لکڑی پر پاؤں رکھ دیا اور اوپر سے کود کر لان کے دوسرے حصّے میں جا پہنچا۔ عمارت کے سامنے بنے لمبے سے ٹیرس کے نیچے سے گزر کر میں اُن کے بڑے دروازے تک جا پہنچا اور جاتے ہی میں نے اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ کوئی دو منٹ بعد لزی نے دروازہ کھولا۔ وہ بُری طرح سسک رہی تھی۔ شاید آرتھر فنیلی نے اُسے زدوکوب کیا تھا۔

"کیا ہوا لزی! آپ تو رو رہی ہیں؟" میں اُسے دیکھ کر بے ساختہ اُس کی طرف بڑھا مگر وہ ایک دم دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ "ہوا کیا ہے آخر، مجھے نہیں بتائیں گی؟"

"وہ.... وہ.... مجھے پاپا نے مارا ہے، بہت مارا ہے۔ صرف اُس کی وجہ سے، اس حرافہ کی وجہ سے۔"

"کیا اس کا ہاتھ بہت زیادہ زخمی ہوگیا ہے؟"

"ہاں۔ آئیں اِدھر، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔"

"یہ کہہ کر وہ مجھے راہداری میں سے گزار کر عقبی لان میں لے گئی۔ پھندا اس وقت گھاس پر پڑا تھا۔ اس کا شکنجہ بہت ہی خوفناک تھا۔ اس سے شیر کو بھی پکڑا جا سکتا تھا۔

"یہ ہے وہ پھندا جس سے پاپا جنگل سے جانور پکڑتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں پھنس کر کوئی جانور اپنی ٹانگ چھڑا نہیں سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ٹانگ کٹوا کر ہی فرار ہو سکتا ہے۔ اب اس جوزفین کو پتا نہیں کیا سوجھی، اس نے اس میں ہاتھ دے دیا۔"

"کیا یہ اِدھر ہی پڑا تھا؟"

"یہ دیکھیں اس پر تازہ تازہ خون لگا ہے اور یہ ادھر ہی... جھاڑیوں کے اندر پڑا تھا۔"

"وہاں کس نے رکھ دیا اسے؟"

"مجھے کیا پتا، پاپا نے رکھا ہوگا یا پھر بچے لے گئے ہوں..."

"مگر اس کو لگانے اور کھولنے کے لیے قوت درکار ہے... یہ بچوں کا کام نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے روزی وہاں رکھ گئی ہو۔ کوئی کیا کہہ سکتا... وہ نیگرو جو یہاں کام کرتی ہے۔ وہ دراصل دو بلّوں سے بہت... ہے، روز باورچی خانے میں گھس آتے ہیں۔"

"وہ کہاں ہے اس وقت؟"

"وہ گھر چلی گئی ہے۔ صبح شام یہاں آتی ہے۔"

"آپ کے پاپا کو یقین ہے کہ یہ پھندا آپ نے ہی وہاں..."

"جب ہی تو انھوں نے مجھے مارا ہے۔ خدا کرے جوزفین کا ہاتھ ہی کٹ جائے، میری یہی دُعا ہے۔"

"بچے کہاں ہیں اس وقت؟"

"انھیں میں نے کمرے میں سُلا دیا ہے۔ ایک مصیبت ہوئے ہیں میرے لیے۔"

"کیا یہ آپ کے پاپا کی دوسری شادی ہے؟"

"نہیں، یہ اُن کی پانچویں شادی ہے۔ میری ماما تو فوت... تھیں۔ پھر تین اور آئیں مگر نبھ نہ سکی۔ اب یہ پانچویں ہے۔"

"اور یہ بچے کس کے ہیں؟"

"یہ اس کے پچھلے شوہر سے ہیں۔"

"ہوں... اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کچھ بھی نہیں، میں یہ گھر چھوڑ دوں گی، آج ہی یہاں سے... جاؤں گی۔ کوئی تُک ہے بھلا! میں پاپا سے مار نہیں کھا سکتی... جوزفین نے ہمارے درمیان خلیج حائل کر دی ہے۔ میں یہاں... جاؤں گی۔"

"کہاں جائیں گی آپ؟ میرا مطلب ہے کوئی ٹھکانہ... کے پاس؟"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔ آئیں اندر بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں، میرا خیال ہے اُن کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں..." ...خیال سے سخت وحشت ہو رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ... وہ بڑی باوقار لڑکی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر بات کرتی تھی... اطوار سے وہ یہی تاثر دیتی تھی کہ وہ عام امریکی لڑکیوں سے مختلف ہے۔ اپنے طور پر میں اس کے بارے میں کئی اندازے...

"ٹھیک ہے، چلیں۔ وہیں بیٹھتے ہیں۔"

وہ فاصلے پر رکھی کرسیوں کی طرف بڑھی۔ جب ہم... سے بیٹھ چکے تو میں نے سگریٹ سلگا لیا۔

"...کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ شادی شدہ ہیں یا......؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے جناب عالی۔ ...بالکل خالی ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔

"...ٹھیک ہے۔ کیا آپ جمیلہ طوسی سے ملنا پسند کریں گے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اُسے فون کر دوں گی۔ وہ شام کو پانچ بجے آجائے گی۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ وہ یہاں آجائے اور دیکھیں منہ دھو کر لباس تبدیل کر لیں۔ آخر کو وہ آپ کے والد ہیں مسٹر آرتھر۔ ...انھیں بھی تو کوئی حق ہے آپ پر ریسپکٹڈ لیڈی!"

"اسی لیے تو میں آہستہ آہستہ غصّہ پینے کی کوشش کر رہی ہوں... اُن کا یہ رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں مارا۔ میں فورتھ ایئر کی طالبہ ہوں، کیسے ان کی مار برداشت کر سکتی ہوں۔ آخر کو میں بالغ ہوں، اپنا بُرا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہوں جناب عالی!"

"بس بھول جائیں اس بات کو۔ خدا کرے جوزفین ٹھیک ٹھاک واپس آجائے۔ ایسی باتیں تو گھروں میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بہرحال، آپ امید رکھیں کہ جمیلہ طوسی شام پانچ بجے یہاں آجائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں مگر میں آپ سے یہ کہہ دوں جناب عالی کہ......" میں نے سگریٹ کو گھاس پر رکھ کر مسل دیا۔

"آپ نے فقرہ مکمل نہیں کیا ہے جناب عالی!" وہ مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں کیا کہوں ریسپکٹڈ لیڈی۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں مگر...... پھر بھی میں کہہ ہی دوں کہ آپ کے بغیر میں اب کسی منزل کا تصور نہیں کر سکتا ہوں۔"

"میں بھی نہیں ہوں...... سر عنایت احمد؟" حیرت ہے میرا نام بہت ہی صحیح انداز میں لے رہی تھی۔ نہ اس نے مجھے عنایت کہا تھا، نہ گیس اور یہ بڑی اچنبھے کی بات تھی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ روشن ہوگئیں۔ ان میں جلتے ہوئے بلب اور ...ابھرنے لگے۔

"اس بات کا مفہوم میں آپ کو شام کو بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں اُس کی طرف دیکھے بغیر اپنے لان کی طرف پلٹ آیا۔ وہ دروازے تک میرے ساتھ آئی۔ چٹخنی اس نے ہی کھولی مگر میں کچھ ایسا مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا نے مجھے کچھ اس طرح مسحور کر دیا تھا کہ میں پھر کچھ کہہ نہ سکا اور وہ بھی دروازے تک چُپ چاپ میرے سامنے چلتی رہی۔ البتہ ایک مخصوص مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ مچلتی رہی۔

آلیور کے کمرے میں واپس آکر میں مدہوش سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ مجھے اس گھرانے کو سمجھنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ سارا قصّہ اتنا سا تھا کہ جوزفین اس لڑکی کو اب برداشت نہیں کر رہی تھی۔ چاہتی وہ یہ تھی کہ وہ گھر میں یا تو نوکرانی بن کر رہے یا وہاں سے نکل جائے۔ دوسرا کوئی راستہ وہ اُسے نہیں دیتی تھی۔ وہ اس کا کالج جانا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور اُس نے آرتھر کو اس کے خلاف اتنا بھڑکا دیا تھا کہ وہ اب بات بات پر اُسے روکتا، ٹوکتا تھا اور اب اسے مارنے بھی لگا تھا جس کی وجہ سے لزی کا بغاوت پر اُتر آنا مجھے بالکل فطری نظر آتا تھا مگر مجھے خدا جانے کیا ہوتا جا رہا تھا کہ میری وہ کمزوری بن گئی تھی۔ اُس کے بغیر میں واقعی کسی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حسین تھی، بے حد حسین مگر اس سے کہیں زیادہ اس کے اندازِ گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اُس کی شوخیوں نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی اور میں ہر قیمت پر اسے اپنانا چاہتا تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس پر آمادہ بھی ہو جائے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ دُنیا میں اگر کوئی عورت میرا ساتھ دے سکتی تو وہ صرف لزی ہی ہوگی۔ مسند آرا بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھی اور میں اس کے باپ کا قاتل تھا۔ مجھ سے مسند آرا کا بیر تو بالکل فطری بات تھی۔ وہ کیسے میری بیوی بن سکتی تھی۔ کاش میں نے اسے یتیمی کی گود میں نہ پھینکا ہوتا۔ تو پھر شاید وہ مصوّر، وہ فطری رنگوں کو اُجاگر کر دینے والے قلم سے آراستہ اس کی حنائی انگلیاں کسی اور سمت نہ بڑھ سکتیں۔ میں ان کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اب میری ساری تگ و دو کے باوجود وہ کسی بھی طرح میری نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے خود ہی اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے تھا کہ ہم دونوں کے لیے یہی بہتر تھا اور وہ خانہ جو میرے دل کے نہاں خانوں میں ابھی تک بے آباد پڑا تھا، لزی سے مکمل طور پر پُر ہو سکتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے جمیلہ طوسی کو وہاں آنے کی دعوت دینے کے لیے لزی کو مجبور کیا تھا تاکہ میں اس کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل کر سکوں اور اُس کے ذریعے اُسے پیغام بھی دے دوں۔

افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ سالا آلیور خواہ مخواہ ہی بکواس کر گیا تھا کہ آرتھر فنیلی بہت بوڑھا ہے اور اسے شراب نے بالکل نکما کر دیا ہے۔ وہ تو اچھا خاصا چاق و چوبند آدمی تھا، وہ کسی طرح بھی بوڑھا نظر نہیں آتا تھا۔ آلیور کا مقصد پتا نہیں

کیا تھا۔ مجھے اس نے پوری طرح خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس احمق کو کیا معلوم کہ اب گولی مجھ پر اثر کر ہی نہیں سکتی ہے۔ عالیہ نے مجھے غیر معمولی زرہ فراہم کردی تھی۔

شام کے سوا پانچ بجے تو میں اُٹھ کر لان میں جا بیٹھا۔ ایک کرسی میں نے وہاں ڈال دی تھی مگر ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ لان کی دیوار میں لگے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ پٹ کھلا تو لزی میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہی تر و تازہ لزی جس کی آنکھوں میں شرارت ہمہ وقت ناچتی رہتی تھی۔ اس کا چہرا گل و گلزار دکھائی دیتا تھا۔

وہ آگے آئی اور میرے سامنے بڑی نیاز مندی سے سر جھکا کر بولی: "بندی کو اجازت ہے جنابِ عالی؟" یہ فقرہ اس نے اردو میں کہا اور ایسی اردو میں کہ میں اس کے لب و لہجے پر حیران رہ گیا۔ اُسے دیکھ کر میں ایک دم کرسی سے اٹھ گیا تھا مگر وہ دروازے پر ہی رُک گئی تھی۔

"آئیے، آئیے، تشریف لائیے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"جمیلہ طوسی بھی آئی ہیں سر غیاث احمد!" یہ کہہ کر اس نے پلٹ کر دروازے کی دوسری طرف دیکھا تو دوسری خاتون نے دروازے میں قدم رکھا۔ وہ خاصی گوری چِٹی لڑکی تھی۔ اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ پاکستانی ہے۔ شلوار قمیص میں ملبوس وہ مجھے کوئی ایتھلیٹ نظر آرہی تھی۔ چہرے پر مَردانگی کے آثار تھے۔ مُردہ سی آنکھیں تھیں اس کی جن میں کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا لباس بالکل سادہ تھا۔

وہ آگے بڑھی اور مسکراتی ہوئی بولی: "السلام علیکم جنابِ عالی!"

"وعلیکم السلام جنابِ عالی! کیا یہ جنابِ عالی میری چِڑ بنالی ہے آپ نے بھی؟"

"جی نہیں، بلکہ لزی نے بتایا ہے کہ آپ کو میں بھی جنابِ عالی کہوں۔ کیونکہ آپ اس سے خوش ہوتے ہیں۔"

"اوئے لعنت پاؤ جی ایسیں گل اُتے۔ میں آپ کے لیے کرسیاں نکلواتا ہوں۔"

"نہیں، ہم کمرے میں بیٹھیں گے۔ روزی نے بچوں کو سنبھال لیا ہے سر غیاث احمد۔" لزی نے کہا۔

"آپ کی ماں کا کیا حال ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔ پاپا نے فون بھی نہیں کیا۔ وہ ابھی تک اسپتال میں ہوں گے۔ آؤ جمیلہ! آپ بھی تشریف لے آئیں جنابِ عالی!" وہ اب بھی زیرِ لب تبسم فرما رہی تھی۔

جب ہم کمرے میں پہنچے تو ان کی تواضع کے لیے تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ فریج میں سے آلبور کے کیکھے [illegible] نکال کر میں نے اُن کے سامنے رکھ دیے۔

"سر غیاث احمد، تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین [illegible]"

"یہ اِن کی نوازش ہے۔ ویسے غیاث احمد صاحب [illegible] کس شہر سے آئے ہیں؟"

"میں لاہور سے آیا ہوں بی بی! بس ذرا سیر و تفریح [illegible] نکلا تھا کہ ان سے ملاقات ہوگئی اور ان کی وساطت سے [illegible] نیاز بھی حاصل ہوگئے۔"

"میں وزیر آباد سے یہاں میٹرک کرنے کے بعد آئی تھی، تو مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ سال ہوگئے۔ میرے ابا یہاں [illegible] دفتر میں کام کرتے تھے۔ اب انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا [illegible] کھول لیا ہے اور ہم اِدھر ہی رہ گئے ہیں۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ویسے آپ نے [illegible] اُردو اور پنجابی کیسے سکھائی؟ دونوں زبانیں یہ فر فر بولتی ہیں۔"

"یہ بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہے۔ ہر کام میں گہری دلچسپی لیتی ہے۔ یہ زبانیں تو اس نے چھ مہینے میں سیکھ لی تھیں۔ [illegible] مطالعے سے یہ اور بھی نکھر گئی، اب تو یہ پوری پاکستانی ہے اور میں کہوں کہ اسے پاکستان سے بہت دلچسپی ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ شاید اس نے ہندی بھی سیکھ لی ہے۔ کبھی [illegible] لڑکی ہے، کیوں لزی؟"

"ہاں۔ وہ پردیپ سے سیکھی تھی۔"

میں نے صوفے پر جمیلہ کی طرف جھک کر کہا: "[illegible] کے لیے علیحدگی میں میری بات سن لیں۔"

یہ کہہ کر میں پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جمیلہ ڈری سہمی سی اس کمرے میں آگئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اتنی ایتھلیٹ نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ آنکھیں اس کی اب بجھی بجھی سی لگتی تھیں۔

"مجھے بتائیں جمیلہ بی بی کہ لزی کیسی لڑکی ہے؟"

"بہت ہی اچھی لڑکی ہے غیاث صاحب! میں نے اِس میں کوئی عیب نہیں دیکھا۔ عام امریکی لڑکیوں سے مختلف ہے۔"

"آپ کو پتا ہے میں یہ بات کیوں پوچھ رہا ہوں؟"

"جی نہیں! یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"میں دراصل اس سے شادی کے بارے میں [illegible] رہا ہوں۔"

"ہوں۔ کیا آپ کنوارے ہیں؟"

"جی ہاں! یہی بات ہے اور میں آپ سے غلط بیانی [illegible] سوچ لیں، ویسے لزی بے مثال لڑکی ہے۔ بہت ذہین، [illegible] حاضر جواب اور......"

"اس کا مذہب کیا ہے؟"

"اس نے عیسائی گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ آرتھر بھی [illegible] ہے اور کیتھولک ہے۔"

"کیا یہ میری تجویز مان لے گی؟"

"میرا خیال ہے شاید مان لے۔ آپ کا ذکر وہ بہت ہی اچھے طریقے سے کر رہی تھی۔ ویسے آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"میری کچھ زمینداری ہے، پھر کچھ کاروبار بھی کرلیتا ہوں۔ [illegible] خیال ہے کہ میں اس کو بہت خوش رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے غیاث صاحب! یہ بدترین حالات میں بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ شوہر کے بارے میں اس کے خیالات کیا ہیں بلکہ میں کہتی ہوں کہ یہ بالکل مشرقی ذہن کی لڑکی ہے۔"

"اس کے شغل کیا کیا ہیں؟"

"پڑھنا، پڑھنا اور صرف پڑھنا۔ تھوڑی سی ٹیبل ٹینس کھیل لیتی ہے اور بس۔ یہ تو بنی بنائی پاکستانی لڑکی ہے۔ آپ کو اس پر کوئی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔"

"اس کے والدین مان جائیں گے؟"

"اس سلسلے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ شاید ہی مانیں، بڑے نسل پرست ہیں۔"

"ہوں۔ کیا آپ میرا پیغام لزی کو دے سکتی ہیں؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں اس سے ابھی بات کرلیتی ہوں۔" جمیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پاؤں تپائی پر پھیلا لیے اور سگریٹ سُلگا لیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ میں لزی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ دو ہی دن میں میرے حواس پر اس قدر غالب آگئی تھی کہ لوگ برسوں میں اس منزل تک نہ پہنچ سکے ہوں گے جو ایک دم میرے سامنے آگئی تھی۔ حیرت ہے کہ مجھے اس روز کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ نہ ماں، نہ آسیہ، نہ آپی، نہ میری پہلی زندگی، نہ اس کا کچھ بھی میری نگاہ میں تُل نہیں سکا۔ میں بس اس کی طرف تیز رفتار سے بڑھتا ہی چلا گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے نہ ملی تو پھر کچھ بھی نہ مل سکے گا۔ میرے لیے وہی [illegible] آخر ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے جس کا شعلہ آدمی کے ذہن سے اٹھتا ہے اور دل کو بھسم کرکے رکھ دیتا ہے۔ کیا یہ پہلی نظر کی محبت تھی جس نے مجھے باندھ لیا تھا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے حالات کیا ہیں۔ میں امریکہ میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ خود اس وقت ایک قیدی اور بے بس کی حیثیت سے آلبور کے مکان میں رہ رہا تھا اور اس شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جو میری ضمانت ہی دے سکے اور پیٹرک نے لاہور سے بھی میرے بارے میں معلوم کرلیا تھا۔ اس نے میرے گھر فون کیا تھا مگر وہ تو کسی غیاث احمد کو نہیں جانتے تھے، پتا نہیں فون کس نے اٹھایا تھا۔ پیٹرک کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس پتے پر کوئی سردار کریم نواز رہ رہا ہے اور وہ اپنے ذہن میں مجھے وہی تصور کر رہا تھا۔ اگر اس کا داؤ چل جاتا تو وہ مجھے کبھی تھانے سے نکلنے نہیں دیتا بلکہ وہاں سے سیدھا جیل پہنچا دیتا اور شاید میرے پیچھے وہ دھمن، عالیہ، آلبور، کفلر اور ان کے تمام حواریوں کو بھی وہیں ڈال دیتا۔ وہ کیا نہیں کرسکتا تھا۔ بہت اختیار تھا اس کے پاس۔ امریکی حکومت تو ہیروئن کے اسمگلروں کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی مگر ان سب باتوں کے باوجود میں نے لزی پر جال پھینک دیا۔ مجھے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ میں اپنے ساتھ اس کی بھی زندگی تباہ کردوں گا۔ وہ کہاں میرے پیچھے ماری ماری پھرتی رہے گی، کس کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گی، کہاں کہاں میری ضمانتیں کراتی پھرے گی۔ اسے کیا معلوم کہ عدالتیں کیا ہوتی ہیں، پاکستان میں وکیل کیا کرتے ہیں اور تھانے آدمی کو کس کس ذلت سے آشنا کرتے ہیں۔ یہ سارے مراحل وہ کیسے طے کرسکے گی۔ ان میں سے کوئی بھی بات مجھے نہیں سوجھی۔ مجھ پر تو بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ اسے اپنا لوں۔ وہ لزی کا عشق بلا خیز مجھے لے ڈوبا تھا۔

میرا انداز خالصتاً مشرقی تھا۔ میں نے براہِ راست لزی سے بات نہیں کی تھی۔ یہ فریضہ میں نے جمیلہ طوسی کے سپرد کردیا تھا اور اب وہی میری آس امید بن گئی تھی۔ پتا نہیں لزی کیا جواب دے۔ اس نے تو کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک دن کسی پاکستانی کی بیوی بن جائے گی۔ اگرچہ اس نے پاکستانی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ وہاں تقریباً ہر جگہ پنجابی سمجھی جاتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ سات کروڑ لوگ یہ زبان بولتے تھے۔ مشرقی پنجاب اس میں الگ تھا۔ یہی حال اُردو کا تھا، وہ تو سارے ہی جنوبی ایشیا میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ رابطے کی بہت بڑی زبان بن گئی تھی اور لزی اس میں مہارت حاصل کرچکی تھی مگر کیا قدرت نے اُسے یہ سب کچھ اسی لیے مہیا کردیا تھا، اُسے ایک خاص رجحان دے دیا تھا۔ کیونکہ اسے ایک دن پاکستان کا شہری بننا تھا۔ یہ بڑی ہی عجیب بات تھی۔ فطرت بعض اوقات اِنسان کو عجیب سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور میں بڑے دُکھوں کا مارا، بڑی مصیبتوں کے بوجھ تلے دبا غلام جیلانی، برق رفتاری سے

اس کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے میں اگر اسے نہ پا سکا تو وہ مجھ سے انھی چند دلوں میں ہمیشہ کے لیے چھن جائے گی، کوئی اسے اُچک لے گا۔ پتا نہیں یہ احساس کیوں اتنا گہرا اور اتنا واضح تھا۔

کچھ ہی دیر بعد جمیلہ طوسی میرے کمرے میں واپس آ گئی۔ اس کے عقب میں لزی بھی۔ پیشتر اس کے کہ جمیلہ مجھ سے کوئی بات کر سکے، لزی بے دھڑک ہو کر بولی "سر غیاث احمد! یہ..... یہ زحمت آپ نے جمیلہ کو کیوں دی؟ آپ مجھ سے بھی یہ بات کر سکتے تھے۔"

"مجھے آپ کا جواب چاہیے ریسپیکٹڈ لیڈی! مجھے براہ راست آپ سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔" وہ میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ میرے پاپا سے بات کریں جنابِ عالی!"

"دراصل غیاث صاحب، آپ کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے نا، لزی یہی کہتی ہے۔ ویسے اس کو اعتراض کوئی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ کو دیکھتے ہی پسند کرنے لگی تھی۔"

"جمیلہ ٹھیک کہتی ہے۔ میں اس کے سامنے اعتراف کرتی ہوں جنابِ عالی کہ میں آپ کو پسند کرنے کی گنہ گار ضرور ہوں مگر آپ کی تجویز کے بارے میں، میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔"

"مگر مجھے بہت جلدی ہے جنابِ عالی! میں بس چند دلوں میں پاکستان واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے سر غیاث احمد کہ میں بہت غریب لڑکی ہوں۔ ایک صرف یہ کوٹھی ہی میری ہے مگر اس پر بھی میرے پاپا اور جوزفین دانت تیز کر رہے ہیں۔"

"اس کی پروا مت کریں! مجھے کسی جائداد وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت روپیہ ہے میرے پاس، اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو سونے سے لاد دوں گا، پلاٹینم میں تول دوں گا جنابِ عالی! روپیہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

"ہوں! بہرحال مجھے کچھ وقت عنایت کریں اور اس دوران میرے پاپا سے بات کر لیں۔ عین ممکن ہے اس کی ضرورت نہ پڑے، کیونکہ اگر ان کا رویّہ یہی رہا اور وہ جوزفین کی حمایت کرتے رہے تو مجھے یہ گھر کل ہی چھوڑ دینا ہو گا۔ میں ہوسٹل میں رہ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے جنابِ عالی! میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا لیکن آپ نے اگر میرے حق میں فیصلہ نہ کیا تو بھی میں اپنے فیصلے سے دستبردار نہیں ہوں گا ہاں، اتنی بات آپ یاد رکھیں۔"

وہ دونوں میری اس بات پر ہنسنے لگیں۔

اچانک کوٹھی کے دوسرے دروازے پر کسی موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"اوہ! میرا خیال ہے پاپا آ گئے ہیں۔ آؤ جمیلہ! ... ہیں سر غیاث احمد۔"

"چلیں، میں آپ کو دروازے تک چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُن کے ساتھ صحن میں اتر آیا۔ اس ... آ گئے تھے۔ لزی تیزی سے دوسری طرف نکل گئی۔

جمیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دروازے سے ... بولی "یہ لیں، یہ میرا اور لزی کا فون نمبر ہے۔ آپ کی ... دے رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کاغذ کا ایک پُرزہ مجھے تھ...

"یہ لزی کے گھر کا نمبر ہے؟"

"جی ہاں۔ اچھا خدا حافظ، آپ سے پھر ملاقات ہو ..." وہ بھی دوسری طرف چلی گئی۔ لزی کی ملازمہ روزی نے اس ... تک گیٹ کھول دیا تھا اور دروازے کی جھری میں سے مجھے کار اندر آتی دکھائی دے رہی تھی۔ جوزفین اس کے ساتھ ... اور آرتھر کا چہرا بہت ہی بگڑا ہوا تھا۔

میں دروازے سے ہٹ کر اپنے کمرے میں واپس ... مجھے اُن کے ذاتی جھگڑے میں ملوّث ہونے کی ضرورت ... ہاں اگر آرتھر نے پھر لزی پہ ہاتھ اٹھایا تو شاید میں اُسے ... توہین تصوّر کروں۔

ابھی کوئی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ میں نے لزی ... گھما دیا۔ چند لمحوں تک گھنٹی بجتی رہی پھر کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

"آرتھر اسپیکنگ۔"

"ہیلو آرتھر فنیلی! آپ کی مسز کا کیا حال ہے اب ..."

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں، کون صاحب بول ..."

"میں آپ کا ہمسایہ غیاث احمد بول رہا ہوں۔ آپ سے ... سُنا ہے آپ کی مسز کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا؟"

"اوہ! تو یہ تم ہو۔ تمھیں میری بیوی سے کیا دلچ... سکتی ہے مسٹر؟"

"میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔"

"میرے ہمسائے کے مہمان ہو تم۔"

"یہی سمجھ لیں۔"

"تمھیں میرے گھر کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں ..."

"عجیب آدمی ہیں آپ! آپ سے اظہارِ ہمدردی ... بھی جرم ہے۔"

"جرم تو نہیں ہے خیر! اُس کا ہاتھ شاید کاٹنا پڑ... کی کلائی کے صرف چند تسمے باقی رہ گئے ہیں اور میں دوبارہ ... ہوں۔"

... میں یہ کہہ رہا تھا مسٹر آرتھر کہ آپ براہِ کرم اپنی بیٹی ... ہوں! ... سمجھیں اور اُسے قصور وار نہ ٹھہرائیں۔"

"... کیوں قصور وار نہ ٹھہراؤں۔ اس مصیبت کا اصل سبب ... ہے۔ تمھیں کیا پتا ہے مسٹر کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"آپ کا خیال ہے اس نے جان بوجھ کر وہ پھندا ڈالا تھا؟"

"مجھے سو فیصد یقین ہے۔ تم بہرحال اس معاملے سے ... میرے گھر کے معاملے میں دخل مت دو۔"

"میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں مسٹر آرتھر کہ آپ نے لزی ... زدوکوب کیا تھا۔ دوبارہ آپ کا ہاتھ اس پر نہیں اٹھنا ... چاہیے آپ! میں لزی کے بارے میں بہت جذباتی ہوں۔ وہ میری منگیتر ہے اور ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔"

"اوہ ڈیم اِٹ! میں تمھارا منہ نوچ لوں گا۔ سمجھا کیا ہے ... نے مجھے۔ وہ تمھاری منگیتر کیسے ہو گئی؟"

"بس کوئی ایسی ہی بات ہوئی ہے۔ بہرحال آپ براہِ کرم ... احتیاط سے کام لیں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

... اسے میں نے بہت زیادہ ناراض کر دیا تھا۔ خدا جانے میں نے ... کیا تھا کہ بُرا۔ بہرحال اسے میں نے اپنی موجودگی اور حیثیت کا احساس دلا دیا تھا تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ میں لزی کے ... میں کیا سوچ رہا ہوں مگر تمہید بہت ہی غلط ہو گئی تھی۔ وہ ... مغلوب الغضب آدمی تھا۔ سارا غصہ وہ لزی پر اتار رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ لزی پر پھر ہاتھ اٹھائے تاکہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے اور گھر سے نکل کر ہوسٹل میں جا ٹھہرے۔ میرا فائدہ اسی میں تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ رات آہستہ آہستہ نیچے اُتر آئی تھی۔ وہ سان فرانسسکو کی رات میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ ساحلِ سمندر سے آتی ہوئی ہوا نے سارے شہر کو معطر کر رکھا تھا۔ اس ہوا میں اجنبی جزیروں کی خوشبو بسی تھی۔ میں نے آلیور کے فریج سے چیزیں نکال کر رات کا کھانا خود ہی تیار کیا اور اسے کھا کر میں ایک بار پھر برآمدے سے اتر کر لان میں جا بیٹھا۔ چاند آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا اور چاروں طرف چاندنی نے نیلی ردا بچھانی شروع کر دی تھی۔ لان میں لگے سرو اور صنوبر کے درخت بہت ہی پُراسرار دکھائی دیتے تھے۔ میرا دھیان لزی کے گھر کی طرف تھا۔ ابھی تک آرتھر نے میرے گھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میں اُسے فون پر خاصی بے نقط سُنا چکا تھا۔ کسی کی بیٹی کو خواہ مخواہ اپنی منگیتر ظاہر کر دینا کسی بھی غیرت مند باپ کے منہ پر طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ امریکی یا یورپی لوگ اتنے ہی بے غیرت ہو چکے ہیں۔ کچھ قدریں اُن میں ابھی تک باقی ہیں۔ اگرچہ ان کی اخلاقی باختگی ضرب المثل بن چکی ہے مگر پھر بھی خاندان کے تصور سے وہ ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ اسی سے کسی معاشرے کا شیرازہ بنتا اور بگڑتا ہے۔

میں لزی کے انتظار میں دیر تک وہاں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ آلیور واپس نہیں آیا۔ وہ شاید کسی کام سے شہر سے باہر نکل گیا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ دھمن اور عالیہ نے میری بات میں کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ دبک کر بیٹھ گئے تھے کہ اُن کا نام ظاہر نہ ہونے پائے۔ رات کے گیارہ بج گئے تو میں وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گیا اور سیدھا آلیور کے بیڈ روم میں پہنچا۔ اس کے کمرے میں بڑی نفاست سے دو الماریوں میں ڈھیر ساری کتابیں بند تھیں اور اُن سب کی بڑی باقاعدگی سے جھاڑ پونچھ ہوتی تھی۔ آلیور کے کمرے کی ساری ہی چیزیں بہت عمدہ تھیں اور اُن پر کوئی گرد نہیں تھی۔ وہ اُن کی صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔

اُن کتابوں کے عنوان خاصے دلچسپ تھے۔ یونہی وقت گزاری کے لیے میں نے ایک الماری کھول لی۔ معلوم یہ ہوا کہ آلیور کے مطالعے کا ذوق بہت ہی عمدہ تھا۔ نامور ادیبوں کی نگارشات سے مزین کتابیں اتنی زیادہ تعداد میں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی بے مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے میں نے اُن کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ زیادہ تر کتابیں اسرائیل کے بارے میں تھیں۔ مجھے اُن کے بارے میں اب تک کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ وہ فلسطینیوں کو اُن کے ملک سے زبردستی نکال کر مشرقِ وسطیٰ میں ایک ملک بنا کر بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے عربوں کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا تھا۔ ابھی میں وہ کتابیں دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے وہاں ایک ایسی کتاب ملی جس کے مطالعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ وہ کسی ہنری فاسٹر کی لکھی ہوئی کتاب تھی اور اُس کا عنوان تھا—"یہودی مملکت اور اس کے مالی وسائل"۔ اس چھوٹی سی کتاب کے چند ہی اوراق میرے لیے حیران کن ثابت ہوئے۔ آلیور اس کتاب کو غور سے پڑھ چکا تھا اور جا بجا اس نے عبارتوں کو خط کشیدہ کر رکھا تھا۔ ایک جگہ اُس نے اپنی ڈائری کا حوالہ دیا تھا۔ پتا نہیں اُس سے وہ کیا مراد لیتا تھا مگر اتنی بات عیاں تھی کہ اس کتاب کو پڑھ کر میں یہ سمجھا تھا کہ اسرائیل کی امداد بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ اس میں نہ صرف امریکی عوام بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے بلکہ اس امداد کے ذرائع کچھ اور بھی تھے۔ جس کی وجہ سے ...

روز بروز اتنا طاقت ور ہوتا جا رہا تھا کہ اس نے اِردگرد کے بہت سے عرب ممالک کو تنگ کر رکھا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں اس کتاب کو پڑھتا رہا۔ میرا مغز مسلسل خراب ہوتا رہا، بلاشبہ میری ہمدردیاں اُن مسلمان ملکوں سے تھیں جن کی سرزمین پر اسرائیل نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ میں کسی طرح بھی اُسے حق بجانب نہیں سمجھتا تھا مگر میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے آلیور کی اس ڈائری کی تلاش شروع کر دی۔

اِس دَوران میں اس کے دو صندوقوں تک جا پہنچا جو دائیں ہاتھ کے چھوٹے سے کمرے میں رکھے تھے۔ ان میں آلیور کے کپڑے وغیرہ رکھے تھے۔ کچھ اس کی ضرورت کی دُوسری چیزیں بھی تھیں اور تالے اُن میں بالکل نہیں لگے تھے۔ موٹے ریگزین کے وہ صندوق آسانی سے اِدھر اُدھر لے جائے جا سکتے تھے کہ اُن کے نیچے پہیّے لگے تھے۔ اُن کو کھینچ کر میں بڑے کمرے میں لے آیا۔ وہاں روشنی زیادہ تھی۔ بالآخر مجھے ایک صندوق میں سے آلیور کی ڈائری مل گئی۔ اس کو جب مَیں نے کھولا تو معلوم ہوا کہ آلیور اس میں اپنی تمام آمدنی اور اخراجات کا باقاعدہ حساب رکھتا تھا اور وہ آمدنی کئی سالوں پر مبنی تھی۔ وہ پچھلے چھ سال سے ہیروئن کا دھندا چلا رہا تھا جس سے اس نے کروڑوں ڈالر کمائے تھے۔ بہت سے لوگوں کے نام اس میں درج تھے جو اس دھندے میں اس کا ساتھ دیتے تھے اور ایک الگ حساب اُس نے اُن رقوم کا لگا رکھا تھا جو کسی فرینلو نامی آدمی کو دیے گئے تھے۔ اس شخص کا نام پتا اور فون نمبر بھی وہاں درج تھا۔ اسے پچھلے چھ سال میں آلیور نے پچاس کروڑ ڈالرز فراہم کیے تھے اور پھر میں ان صفحات کو آخر تک دیکھتا چلا گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک اسرائیلی وزیر جیکسن باقاعدگی سے امریکہ آتا رہا ہے اس کا ذکر آلیور نے زیادہ تفصیل سے کیا تھا۔ وہ اس کا گہرا دوست تھا۔ آلیور نے اسی ذکر میں بتایا تھا کہ اس نے جیکسن کو اسرائیل کی امداد کے طور پر چالیس کروڑ ڈالرز فراہم کیے اور وہ سب کے سب صرف ہیروئن کی درآمد سے حاصل کیے گئے۔ جو مختلف ممالک سے امریکہ لائی جاتی تھی اور پھر وہاں سے نہ صرف امریکہ بلکہ اِردگرد کے ممالک میں بھی فراہم کر دی جاتی تھی۔ ہیروئن کو اُس نے دنیا میں اسرائیلی امداد کا سب سے بڑا ذریعہ اور وسیلہ بتایا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ فرینلو ہے کون۔ ساری رقمیں اسی کے ذریعے جیکسن، موشے دایان اور مس روزالی کو فراہم کی گئی تھیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ہیروئن کی اسمگلنگ کا سب سے زیادہ فائدہ تو اسرائیل کو پہنچ رہا تھا کہ وہ ساری رقوم جنگی تیاریوں پر خرچ ہوتی تھیں اور میں صرف ایک ہی آدمی، ایک ہی ذریعے اور ایک ہی وسیلے کو سمجھ سکا تھا۔ ورنہ دوسرے ممالک میں بھی اسرائیل کے کارندے کام کرتے ہوں گے اور وہ بھی اسرائیل کو ایسے ہی طریقوں سے سرمایہ فراہم کرتے ہوں گے۔ کیا فرینلو وہی آدمی تو نہیں جسے آلیور بار بار چیف کہہ کر پکارتا ہے۔ اچانک ہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تو میں نے اس کے دونوں ٹرنک اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ دیے اور ڈائری کا وہ صفحہ سامنے رکھ کر میں نے فون پر [illegible] کے نمبر گھمائے۔ کوئی پانچ سیکنڈ بعد کسی نے فون اٹھا لیا اور [illegible] بھاری بھر کم آواز میں بولا۔ "ہیلو!"

"دیکھیں، میں وِلسن بول رہا ہوں لاہور سے۔ مجھے مسٹر [illegible] سے بات کرنی ہے، اُن سے ملوا دیں۔"

"فرینلو! گاڈ ڈیم اِٹ۔ اس نام کا کوئی آدمی یہاں [illegible]"

"مجھے آلیور نے ان کا یہی نام بتایا تھا۔"

"تم بھاڑ میں جاؤ۔ یہاں کوئی فرینلو نہیں رہتا ہے اور تم آلیور کو بھی نہیں جانتے ہو اور تم...... سن آف اے ڈنکی، [illegible] ہو گئے۔ وہ تمہارے جیسی گدھے کی آواز میں انگریزی نہیں بولتا [illegible] وہ خالص امریکی ہے، سمجھے! اینڈ شٹ اپ۔" یہ کہہ کر اس نے دھڑ سے فون کریڈل پر دے مارا۔ ٹھک کی سی آواز پیدا ہوئی [illegible] گفت گو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میں ریسیور کو بس گھورتا ہی رہ گیا۔ [illegible] آدمی نے غصے میں آ کر اپنی اصلیت ظاہر کر دی تھی۔ وہ تھا کوئی امریکی۔ اس کا لب و لہجہ یہی بتا رہا تھا اور انگریزی اس کی [illegible] لوگوں ایسی تھی مگر اتنی بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ لوگ ولسن [illegible] واقف تھے، اس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے لب و لہجے [illegible] آشنا تھے۔ اسی لیے اس شخص نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ تو خواہ مخواہ ہی بدنام ہو رہے تھے جتنی بھی رقم ہیروئن کی اسمگلنگ سے حاصل ہوتی تھی وہ سیدھی اسرائیل پہنچا دی جاتی تھی۔ یا اُن بینکوں میں ڈال دی جاتی تھی جہاں اسرائیل نے امریکہ میں حساب کھلوا رکھے تھے۔ برآمد کنندگان کو صرف ایک معمولی حصہ ملتا تھا اور وہ اسی میں خوش رہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بین الاقوامی منڈی میں ہیروئن کی قیمت کروڑوں ڈالر تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ لوگ برباد ہو رہے تھے، ہزاروں لاکھوں گھر تباہ ہو چکے تھے مگر اصل فائدہ اِسرائیل اٹھا رہا تھا۔

اِدھر کوئی فرینلو تھا جس کے لیے دھمن، عالیہ، ولسن اور [illegible] اور لوگ مسلسل کام کر رہے تھے اور میں بھی ان کی لپیٹ میں آ گیا [illegible] زیادہ کہ اب میری واپسی ناممکن ہو گئی تھی۔ ایک بات تو [illegible] تھی کہ انھوں نے اس شخص کا پتہ کاٹ دیا تھا، اس پیٹر ہاک [illegible] اُن کا سراغ لگانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن انھوں [illegible] اپنا راز بڑی صفائی سے چھپا لیا تھا۔ فون پر جو آدمی بھی موجود [illegible] اُسے وِلسن کی آواز کا بھی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن کے کارندے [illegible]

[illegible] کہاں کام کرتے ہیں اور کس جگہ، کس کو کون سا کام تفویض کیا [illegible] سازش بہت ہی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ [illegible] فرینلو کے حکم سے ہی مجھے وہاں ڈال دیا گیا ہو۔ صورتِ حال کا صحیح اندازہ مجھے نہیں ہو رہا تھا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح فرینلو سے ضرور ملوں گا۔ جب ہی حالات کا میں مکمل جائزہ لے سکوں گا مگر میں تنہا آدمی اتنے بڑے بین الاقوامی گروہ کو کیسے شکست سے دوچار کر سکوں گا۔ وہ تو کسی بھی وقت مجھ پر غالب آ سکتے تھے۔ عین ممکن ہے فرینلو کے پاس بھی کوئی ایسی ہی انگوٹھی موجود ہو جو اُسے تحفظ فراہم کرتی ہو۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے پاس جو انگوٹھی ہے، میں اس کو آزما کر دیکھوں۔ وہ انگوٹھی مجھ سے عالیہ نے ذرا دیر کے لیے لی تھی اور مجھے ابھی تک اُسے دوبارہ آزمانے کا موقع نہیں ملا۔ میرے بریف کیس میں ہارٹن نے پستول رکھ دیا تھا اور اس کی ڈھیر ساری گولیاں بھی۔ میں نے انگوٹھی اتار کر بستر پر نمایاں جگہ پر رکھی اور پستول نکال کر میں نے اُس پر گولی چلانا چاہی اور یہ دیکھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا کہ پستول [illegible] ہونے کے باوجود اُس کی گولی نلکی کے سرے سے آگے نہیں نکلی، نال میں جام ہو کر رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگوٹھی دیسی ہی تھی اور اپنا کام دکھا رہی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے کمرے بند کیے اور بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں یونہی آنکھیں میچ کر ادھ موا سا پڑا رہا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ مجھے چین نہیں آ رہا تھا۔ لزی پھر میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔

اس کا تصوّر ذہن میں لے کر میں پھر کرسی پر جا بیٹھا مگر ایک اُس کا خیال ہی مجھے مضطرب نہیں کر رہا تھا بلکہ اس جگہ پر میری اپنی حیثیت بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میری روشنیٔ طبع میرے کسی کام نہیں آ رہی تھی۔ ابھی میں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ مجھے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے گیٹ تک آتی ہوئی لگی۔ میں سمجھا کوئی راہگیر ہوں گے مگر ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کسی نے اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ میرا یہ خیال تھا کہ آلیور واپس آ گیا ہے۔ میں نے دوسرے کمرے کی بتی جلا کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے تین آدمی کھڑے تھے جن کو میں قطعاً نہیں پہچانتا تھا۔ اُن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ تینوں مسلح ہیں۔ ایک عجیب سی گُربہ صفت [illegible] اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ تینوں ہی داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز تھے۔

اُن میں سے ایک آدمی نے دروازے کے اندر بڑے تحکم سے قدم رکھتے ہوئے کہا "آلیور کہاں ہے؟" آواز اُس کی پھٹے ڈھول کی سی تھی۔ گردن کی رگیں آواز نکالتے وقت پھول جاتی تھیں۔

"مگر تم کون ہو اور بے وقت یہاں آنے کا مطلب؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"زیادہ سوالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارا نام گایاس ہے؟"

"ہاں۔ گایاس نہیں، غیاث۔"

"پیچھے ہٹو، ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ چلو اندر۔"

"مگر تم ہو کون مسٹر! کس نے بھیجا ہے تمھیں؟" مگر اس نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

"فرینلو کو فون تم نے کیا تھا؟"

"اوہ میں سمجھا! گُڈ! آؤ اندر آ جاؤ۔" میں دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ تینوں پہلے ہی کمرے میں صوفے پر جم کر بیٹھ گئے۔ اُن کی نظریں مسلسل میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔

"تمھیں یہ کیا سُوجھی مسٹر! وِلسن بن کر فون کرنے کا مطلب کیا تھا؟ تم کیا کہنا چاہتے تھے فرینلو سے؟ اور یہ نام تمھیں کس نے بتایا ہے؟"

"مجھے یہ نام وِلسن نے بتایا تھا۔"

"بالکل جھُوٹ! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے فرینلو کا نام کہاں سے معلوم کیا ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مسٹر...... کیا نام ہے تمھارا؟"

"بڑی اکڑ فوں سے بات کرتے ہو۔ جانتے ہو ہم کس لیے آئے ہیں۔ تمھیں ابھی ٹھنڈا کر سکتے ہیں ہم اور ہمیں حکم بھی یہی دیا گیا ہے۔ بتاؤ تم نے فرینلو کو فون کیوں کیا تھا؟ کیا کہنا چاہتے تھے تم اُس سے؟"

"میرا خیال ہے تمھیں بات کرنے کی تمیز کسی نے نہیں سکھائی ہے۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں کوئی دھونس دھاندلی نہیں چلے گی۔ تم یہاں سے اٹھو اور فوراً باہر چلے جاؤ۔" میں نے ہارٹن کا دیا ہوا پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا مگر وہ مجھ سے کہیں زیادہ تیز نکلا اور اُس سے پیشتر اس کے کہ میں ہاتھ سیدھا کرتا، مجھ پر گولی چلانی چاہی مگر یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا کہ اس کا پستول کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ کھلونے کی طرح اندر ہی اندر کلِک کلِک کر کے رہ گیا۔

"یہ پستول جیب میں رکھ لو۔ یہ تمھارے کام نہیں آئے گا مسٹر......" مگر میری یہ بات سنتے ہی دوسرے دونوں آدمیوں نے اپنے اپنے پستول نکال لیے اور ایک دم میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

"بتاؤ تم نے فرینلو کو فون کیوں کیا تھا؟"

"یہ تو میں جب ہی بتا سکتا ہوں جب تم مجھے اپنا حدودِ اربع بتا دو۔ کہاں سے آئے ہو تم؟"

"تمھارے کسی سوال کا جواب دینے کے ہم پابند نہیں ہیں۔ اِس کو اِدھر ہی ختم کر دو۔"

گوشش کردیکھو: میں نے چاہا کہ اُن کو وہیں ختم کردوں مگر میں آلیور کا فرش ان کے خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُن دونوں نے اپنی اپنی جگہ گولیاں چلانا چاہیں مگر وہ بھی ناکام رہے۔ انگوٹھی میرے بہت کام آرہی تھی۔ میں نے اپنا پستول بائیں ہاتھ میں لے کر اُن میں سے ایک کے منہ پر زبردست قسم کا گھونسا دے مارا۔ وہ اُلٹ کر صوفے پر جا پڑا۔

"اب بتاؤ برادر کہ تمھارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے؟"

مگر میرے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے صوفے پر گرے آدمی نے ایک دم خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کردیا۔ اس طرح کہ اگر میں پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کا خنجر سیدھا دستے تک میرے دل میں اُتر جاتا۔ مجھے پکڑنے کے لیے دوسرے آدمی نے اچانک اُچھل کر میرے پیٹ پر لات جمائی۔ میں بُری طرح چوٹ کھا کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اتنے میں خنجر بدست آدمی نے پھر مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اس کا نیچے اُترتا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی کلائی ہاتھ میں آتے ہی میں نے کچھ اس طرح مروڑی کہ اس کا خنجر فرش پر جا گرا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی گردن پکڑ لی اور اس کی رگ بُری طرح مسل دی۔ اُسے دوبارہ اُٹھنے کی مُہلت ہی نصیب نہیں ہوئی مگر اس ذرا سے وقفے سے فائدہ اٹھا کر اُس آدمی نے جو میرے پیٹ پر لات مار چکا تھا، سنبھل کر ایک کڑکڑاتا ہوا گراری دار چاقو نکال لیا۔ اس کی کڑکڑاہٹ نے مجھے ایک دم اُٹھنے پر مجبور کردیا۔ تیسرا آدمی ابھی تک صوفے پر بیٹھا تھا۔ میں نے اُٹھتے ہی بائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ اُس آدمی کے منہ پر دے مارا۔ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے جھانپڑ کا اس نے قطعاً کوئی اثر نہیں لیا۔ مجھے گندی گندی گالیاں دیتا ہوا وہ بڑے منجھے ہوئے انداز میں چاقو لہراتا میری طرف بڑھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ انگوٹھی مجھے کسی خنجر چاقو یا کسی اور ہتھیار سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اپنا تحفظ مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔

جیسے ہی جھکائی دے کر وہ میرے دائیں حصّے کو نشانہ بنانے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے انتہائی برق رفتاری سے پستول نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ فاصلہ میرے اور اس کے درمیان صرف دو ہاتھ کا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ درد سے کراہتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ فرش سے جا لگا۔ تب اس تیسرے آدمی کو ہوش آیا کہ بازی بالکل ہی پلٹ گئی ہے۔ وہ ایک دم وہاں سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا مگر میں نے اُسے لپک کر بالوں سے پکڑ لیا اور اُسے کھینچتا ہوا صوفے کی طرف واپس لے آیا۔ گھبرا کر اس نے پستول فرش پر پھینک دیا۔ اس کے پاس خنجر نہیں تھا اور دُوسرے دونوں آدمیوں کے پستول پہلے ہی اُن کے ہاتھوں سے چھُوٹ چکے تھے۔

"ہاں برادر! اب بتاؤ کہ یہاں آنے کا مقصد کیا تھا؟" [illegible] صُورتِ حال سے مطمئن ہو کر اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ کر [illegible] سُلگا لیا۔ پستول میں نے بائیں طرف رکھ دیا تھا۔

"میں چیف کی طرف سے آیا ہوں اور مجھے یہ حکم تھا کہ [illegible] ساتھ لے کر اس کے پاس پہنچوں۔ ایسا نہ ہو سکے تو تمھیں ختم کردوں"

"اُس اُلّو کے پٹھے کا نام کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں اُس سے آج تک نہیں ملا ہوں"

"اور یہ فرینلو کون ہے؟"

"یہ اس کا نائب ہے"

"فون کس نے اٹھایا تھا؟"

"فرینلو نے"

"ہوں۔ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟"

"انھیں یقین ہو چلا ہے کہ تم ان کے لیے مُصیبت بن گئے ہو۔ تمھارے فون سے وہ یہی سمجھے تھے"

"اور آلیور کہاں ہے؟"

"وہ گریک ٹاؤن گیا ہے"

"یہ کہاں ہے؟"

"یہاں سے کوئی دو سو میل دُور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"ہاں، یہ لو" میں نے پیکٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"جانتے ہو، یہ آدمی مر چکا ہے"

"یہ مرا نہیں، بے ہوش ہو گیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام لوور ہے"

"اور تمھارا نام؟"

"فرینک"

"اور یہ تیسرا آدمی؟"

"اس کا نام فراسٹ ہے مگر اس کو کیا ہوا ہے؟"

"اس کی ذرا سی گل ہوئی ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے مار دینے کا حکم تمھیں چیف نے دیا ہے؟"

"ہاں۔ وہ اب تم سے مزید کوئی کام لینا نہیں چاہتا"

"تم یوں کرو فرینک کہ مجھے اپنے چیف کے پاس لے چلو"

"نہیں، میں اب ایسا نہیں کرسکتا۔ تم اُس کے لیے خطرہ بن سکتے ہو، یہ نہیں ہو گا"

"یہ کام تو تمھیں کرنا ہو گا۔ ویسے اُس کا پتا مجھے معلوم ہے۔ میں صبح اس کے پاس خود جانا چاہتا تھا"

"تم اُس سے نہیں مل سکو گے۔ وہ اپنی جگہیں بدلتا رہتا ہے۔ بکواس کرتے ہو تم۔ کیا وہ گارڈن ایونیو میں نہیں رہتا، [illegible] سڑک پر ہے جس پر پہلے میوزیم بنا ہے"

"کبھی اُس کا دفتر وہاں تھا مگر اب نہیں ہے"

"فون نمبر تو وہیں کا ہے"

"وہ اس نے تبدیل کروالیا تھا"

"اٹھو اور اِن دونوں کو اسپتال پہنچاؤ۔ پھر ہم تمھارے چیف کے پاس چلیں گے"

"نہیں نہیں، یہ زیادتی نہ کرو۔ میں تمھیں وہاں نہیں لے جا سکتا"

"تمھارا باپ بھی جائے گا، اٹھو" میں نے اس کے بال پکڑ کر اسے صوفے سے اٹھا لیا "چلو میرے ساتھ"

"مگر مجھے گاڑی چلانا نہیں آتی"

"یہ کام میں کرلوں گا"

"نہیں نہیں! میں ایسا نہیں کرسکتا۔ چیف کو تو میں نے آج تک خود نہیں دیکھا، کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے"

"تو پھر تم مجھے فرینلو کے پاس لے چلو"

"ہاں، یہ میں کرسکتا ہوں۔ چلو"

یہ کہہ کر وہ اپنے بال درست کرتا ہوا لوور کی طرف بڑھا۔ [illegible] ران پر لگی گولی اسے بُری طرح نڈھال کر گئی تھی مگر وہ ابھی زندہ تھا البتہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا، وہ کیا راز تھا جسے وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا یا اُس نے فرینلو سے کوئی عہد کر رکھا تھا یا وہ کوئی بہت ہی بُزدل آدمی تھا۔ لوور کو اٹھانے کی بجائے اس نے پستول اٹھایا۔ میں ابھی اس کا مقصد سمجھ ہی نہ سکا تھا کہ اس نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندہ سلامت آدمی ایک دم بے جان ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی وحشت اُبھر آئی تھی کہ بایدو شاید۔ میں اس کی مَوت کو کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ اس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ کنپٹی سے خون بہہ کر اس کا دایاں رُخسار تر کرنے لگا۔ اس کی صُورت بہت ہی بھیانک ہو گئی تھی۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا اور مجھ سے سوال کرنے کا حق بھی اُس نے چھین لیا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کا خون اب قالین کو تر کرنے لگا تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ گولی کی آواز کمرے میں گھُٹ کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ انتہائی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کی خودکشی کی وجہ یہی میری سمجھ میں آتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے دونوں آدمی بھی مجھے فرینلو کے پاس نہیں لے جائیں گے، وہ بھی انکار کردیں گے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اپنا فون فرینلو نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ جو پتا میرے پاس موجود تھا وہ مجھے قطعاً ناکافی اور غیر تسلّی بخش معلوم ہوتا تھا۔ فرینک کا یہ اقدام میرے لیے لاینحل معمّا بن گیا تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُن گدھوں کو وہاں سے اٹھانا اور ٹھکانے لگانا بھی مجھے مشکل دکھائی دیتا تھا۔ میں کہاں ان کی لاشوں کو اٹھائے پھرتا۔ ایک تو بے ہوش تھا اور دوسرے کی ران زخمی تھی اور تیسرا کسی اور دُنیا میں پہنچ چکا تھا۔ ایک نئی مُصیبت میرے لیے پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے پریشان ہو کر ایک بار پھر فرینلو کے نمبر گھما دیے۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہاں سے اُٹھ گیا ہو گا مگر نہیں۔ وہ ابھی تک فون پر موجود تھا۔

"ہیلو!" اس کی بہت ہی دبنگ آواز مجھے سنائی دی۔

"میری آواز پہچانتے ہو؟"

"ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔ تم آرتھر کے بڑوس سے بول رہے ہو"

"بڑے خبردار معلوم ہوتے ہو۔ تم نے تین آدمی میری طرف بھیجے تھے"

"ہاں۔ مگر تم ابھی تک وہیں ہو! گاڈ ڈیم اِٹ۔ وہ آدمی کہاں ہیں؟"

"اُن کی لاشیں یہاں سے اٹھوا لو"

"کیا بکواس کرتے ہو تم۔ میں تمھارا مغز توڑ دوں گا۔ کیا ہوا ہے انھیں؟" وہ ایک دم بوکھلا سا گیا۔ اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یا پھر اپنا پتا بتا دو، میں انھیں لئے وہاں آجاتا ہوں"

"او شٹ اَپ! تم انھیں آؤٹ نہیں کرسکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"مگر یہ سب کچھ ہو گیا ہے مائی ڈیئر فرینلو اور میں نے تمھیں اِسی لیے فون کیا ہے میرے پیارے بچّے! بہتر ہے کہ تم ابھی وہاں سے چل دو یا کوئی کُوڑا گاڑی بھیج دو، میں انھیں لدوا دوں گا۔ اگر تم نے ان کا بندوبست نہیں کیا تو میں خود تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا، سمجھے اور پھر تمھاری زندگی کی ضمانت میں نہیں دے سکوں گا فرینلو بیٹے"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا اور پھر سگریٹ سُلگا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کسی لاش کے ساتھ اور وہ بھی مسخ شدہ چہرے والی لاش کے ساتھ بیٹھنا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اُس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ فرینلو کا فون دوبارہ نہیں آیا۔ پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ لے دے کر ایک وہی سہارا رہ گیا تھا جس سے میں دل بہلاتا رہتا تھا۔ اچانک دروازے پر کسی نے بہت ہی ہلکے انداز میں دستک دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ پتا نہیں دروازے پر کون آیا تھا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا

اور دبے پاؤں آگے بڑھا۔ دستک پھر ہوئی۔ اب کی بار ذرا زیادہ بلند تھی۔

"کون ہے؟"

"اوہ سر غیاث احمد! دروازہ کھولیں، آپ خیریت سے تو ہیں؟" یہ لزی کی آواز تھی۔ میں اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ اپنی زندگی کا یہ رُخ میں اُسے دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ اچانک ہی آگئی تھی اور اُن تینوں کو میں نے تو یہاں آنے کی دعوت نہیں دی تھی، میں لزی کو سمجھا سکتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"آئیں لزی! مجھے افسوس ہے یہ کمرہ کچھ اچھا منظر پیش نہیں کر رہا ہے۔ وہ ابھی تک میری اوٹ میں کھڑی تھی اور کمرے میں اس کی نظر نہیں پھری تھی۔

"کیا ہوا، خیر تو ہے نا؟ آپ کے دروازے پہ کار کھڑی ہے، میں باہر لان میں آپ کا انتظار کر رہی تھی مگر آپ باہر ہی نہیں آئے سر غیاث احمد! وہ کار کس کی ہے؟"

"وہ اِن لوگوں کی ہے لزی، دیکھیں ذرا انھیں۔ کیا یہ آلیور کے دوست ہیں؟" میں ایک طرف ہٹ گیا۔

"اوہ مائی گڈنیس! یہ کیسے مر گئے؟"

"سب نہیں مرے ہیں۔ یہ آدمی بے ہوش ہے، اِس کی ران میں گولی لگی ہے، البتہ اس آدمی نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر خود کو گولی مارلی۔ میں بہرحال بالکل بے قصور ہوں۔" میں نے اس کو دکھلائے بغیر پستول جیب میں رکھ لیا۔

وہ چیخنا چاہتی تھی مگر اس نے اپنا منہ بند کر لیا۔ دونوں ہاتھ سختی سے منہ پہ رکھ لیے۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اُتر آئی تھی۔ ایسا منظر اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس سے وہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ رنگ اس کا دیکھتے ہی دیکھتے پیلا ہونے لگا۔

"میں نے گولی کی آواز تو سُنی تھی مگر یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ آپ کے کمرے سے آئی ہے۔ یہ کون لوگ ہیں آخر؟"

"میں اِنھیں بالکل نہیں جانتا۔ یہ اچانک ہی آئے اور جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، انھوں نے مجھ پر پستول تان لیے۔"

"اوہ! اور آپ بچ کیسے گئے؟ یہ تو کوئی بہت ہی خطرناک لوگ ہیں۔"

"ہاں۔ اِن کے چہرے تو یہی بتا رہے ہیں۔ بس ان کا داؤ نہ چل سکا۔ اس آدمی کو میں نے زخمی کیا ہے اور اس شخص کو ایسی ٹکر لگی کہ یہ بے ہوش ہوگیا مگر اس کی سمجھ مجھے نہیں آئی کہ اس نے خود کو کیوں گولی مارلی۔"

"اب کیا کریں گے ان کا سر غیاث احمد؟ آپ تو یہاں بالکل ہی اجنبی ہیں۔ پولیس کو کیا جواب دیں گے؟"

"میں خود حیران ہوں لزی کہ کیا کروں۔ کوئی بات سمجھ نہیں آرہی ہے۔"

"ان کے نام کیا ہیں؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے لزی۔ مجھے کیا پتا یہ لوگ کون ہیں" میں نے جھوٹ بول دیا۔

"آپ یوں کریں کہ ابھی یہاں سے نکل جائیں اور کسی بھی ہوٹل میں جا ٹھہریں۔"

"نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے لزی! آپ کو، آرتھر کو، اُس کی بیوی جوزفین کو، آلیور کو اور پتا نہیں کس کس کو معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں۔ میں کسی الزام سے کیسے بچ سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے میں پولیس کو اطلاع کر دوں۔"

"ایسا ہرگز نہ کریں۔ وہ آپ کو کسی اور چکر میں پھنسا دیں گے۔ ایک بات بتائیں سر غیاث احمد! اخباروں میں وہ تصویر آپ ہی کی چھپی تھی نا، اغوا شدہ ہوائی جہاز کو چھڑانے کے حوالے سے؟" اب وہ زیادہ اطمینان سے بات کرنے لگی تھی۔ اس کا اضطراب بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

"ہاں، وہ میں ہی تھا اور وہ تصویر آپ کے اس ادنیٰ خادم کی ہی تھی۔"

"اوہ! یہ بات میرے لیے باعثِ فخر ہے جنابِ عالی! اب دیکھیں نا، اگر یہ بات پولیس کے علم میں آگئی تو وہ کیا سوچیں گے۔"

"میں کہہ دوں گا کہ یہ لوگ مجھ پر حملہ کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ یہ میرا کمرہ ہے، میں یہاں رہ رہا ہوں۔ ان کا اس طرح اور مجھ پر حملہ کرنا قطعاً غیر قانونی ہے۔"

"مگر پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں مانتا ہے۔ میں آپ کو کسی مصیبت میں پھنستا نہیں دیکھنا چاہتی۔ بخدا میں بڑی دیر سے لان میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ روزی نے بچے سنبھال لیے تھے۔ پاپا ابھی تک اسپتال سے واپس نہیں آئے۔ اُن کا فون آیا تھا، کہتے تھے کہ مدر کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔"

"چلیے آپ کی دعا قبول ہوئی۔"

"پتا نہیں کیوں میں خود کو مجرم سمجھ رہی ہوں۔ دراصل وہ پھندا جھاڑیوں میں، میں نے ہی کھول کر رکھ دیا تھا کہ دونوں بلّے اس میں پھنس جائیں مگر مجھے کیا پتا تھا کہ جوزفین اس میں ہاتھ مار دے گی۔ اُسے لان میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ بیچاری میری وجہ سے اپنے ہاتھ سے محروم ہوگئی، ساری عمر مجھے کوستی رہے گی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ آرتھر ٹھیک ہی کہتا تھا کہ یہ سارا قصور کا ہی ہے۔ بس نے آپ کو بے وجہ تو نہیں مارا۔ ہے کہ نہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے سر غیاث احمد! مگر میری یہ نیت نہیں تھی۔ میں جوزفین کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ اسے محض ایک حادثہ سمجھیں اور یہ بھول جائیں۔ ویسے آپ کے پاپا نے میرے بارے میں کچھ کہا ہے یا نہیں؟"

"جی نہیں! مگر وہ بہت زیادہ غصے میں تھے۔ دیکھیں صبح کیا کہتے ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا، آپ بے فکر رہیں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ مسئلہ اب یہ ہے کہ ان لوگوں کا کیا کروں؟" ابھی میں بات کہہ ہی رہا تھا کہ کھلے دروازے میں سے اچانک ہی دو آدمی کسی طوفان کی طرح اندر آگئے۔ اس وقت لزی میرے عقب میں کھڑی تھی۔ اُسے میں نے فوراً ہی اپنی اوٹ میں لے لیا۔

"اوہ! تو یہ تینوں ختم ہو چکے ہیں۔ بائی گاڈ! میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمھیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھ پر گولی چلادی۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے مگر وہ گولی اندر ہی دب کر رہ گئی، دوسرے کا پستول بھی جام ہوگیا۔ میں لزی کو اوٹ میں لے کر عقبی کمرے کی طرف بڑھا اور ان کی گولی کے جواب میں میں نے بھی گولی چلادی۔ گولی چلی تو سہی اور وہ پہلے آدمی کے سینے میں لگ بھی گئی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دوسری گولی میں نے اس کے ساتھی کی طرف چلائی مگر اس پر بھی قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس وقت تک میں لزی کو عقبی کمرے میں دھکیل چکا تھا۔ اُس نے جاتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اب میں اُن سے نمٹنے کے لیے بالکل آزاد تھا۔ میں نے اپنا نشانہ بدلا۔ میری تیسری گولی پہلے آدمی کے سینے میں ہنسلی سے ذرا نیچے لگی مگر وہ سامنے کھڑا بڑے طنز سے مسکراتا رہا۔ اِس اثنا میں دوسرے آدمی نے نیچے جھک کر ایک عجیب سا گولہ جیب سے نکالا اور جب وہ گولہ اس نے میری طرف پھینکا تو میں پاگل ہو گیا۔ وہ کوئی آہنی جال تھا۔ جو اس نے میری طرف اس طرح پھینکا کہ جب وہ کھلا تو میں اس میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ کاش میں نے عقبی کمرے کی دیوار نہ چھوڑی ہوتی تو پھر شاید میں اس کو ہاتھوں پہ روک لیتا مگر اب اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اس آہنی جال سے لگی ڈوری کو اس شخص نے ایک دم کھینچ لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اس میں قطعی طور پر بند ہو کر رہ گیا۔ دوسرا کام اُن لوگوں نے یہ کیا کہ وہ ایک دم میرے اوپر آچڑھے اور ایک جھٹکے سے پہلے آدمی نے پستول میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اب میں بالکل ہی نہتا ہو چکا تھا۔

"ہوں۔ تو تمھارا نام گارنس ہے۔ لومڑی کے بچے۔ بہت ہوشیار بنتے تھے تم۔ کیا کر دیا ہے تم نے انھیں، بتاؤ؟" پہلے آدمی نے میری پسلیوں میں بوٹ کی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"یہ جو فرینک ہے نا، اس نے خودکشی کر لی، کنپٹی پر پستول رکھ کر خود کو گولی مارلی۔ یہ آدمی بے ہوش ہے اور یہ تیسرا آدمی زخمی ہے۔ اس کی ران میں گولی لگی ہے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟" میں نے بڑے پُراعتماد اور جمے ہوئے لہجے میں کہا۔ مجھے انھوں نے جال کے اندر بالکل ہی مُرغا بنا لیا تھا اور میں اُن کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا تھا۔ اس حال میں کہ جال کے تار میرے ہاتھ پاؤں کاٹ رہے تھے۔ پتا نہیں ایسا کھُردرا جال انھوں نے کس لیے بنایا تھا۔ اتنا انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے وہ پستول سے شکست نہیں دے سکیں گے۔ اس کا تجربہ انھیں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اخبار اس کے گواہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ آہنی جال بھی لیتے آئے تھے اور اس کی وجہ سے وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے مگر میری اصلی زرہ کا راز وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میری انگوٹھی پر ہاتھ نہ مار دیں۔ میں ایسی حالت میں تھا کہ اپنا دفاع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میری تلاشی کے دوران شاید وہ یہی کریں مگر اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو روکنا میرے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

انھوں نے سب سے پہلے فرینک کو دیکھا۔ پھر وہ فراسٹ کی طرف بڑھے اور یہ دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ پھر وہ لوور کی نبض دیکھنے لگے، وہ ابھی تک بے ہوش تھا مگر اس کے سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔

"ہے کاٹن! اس لڑکی کو دیکھو۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔ دیکھا نہیں تم نے کیسی ہے۔"

"ہاں ہاں، اُسے تو ضرور ساتھ لے جانا چاہیے شاور! وہ تو لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔ ہالی ووڈ کی ایکٹریس لگتی ہے۔" یہ کہہ کر کاٹن عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"لگتا ہے اِن دونوں میں گہری دوستی ہے۔ کیوں بے! یہ تجھے کہاں سے مل گئی؟" شاور نے پھر میری پسلی میں بوٹ کی ٹھوکر ماری۔

میں نے بہت زور لگایا مگر وہ جال مجھ سے کسی بھی طرح نہ کھُل سکا۔ ورنہ میں اُس کی باچھیں چیر دیتا۔ وہ اسی قابل تھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ جیسے ہی اس نے بوٹ کی ٹھوکر مجھے لگائی، میں نے بازو پھیلا کر اس کی دونوں ٹانگیں جکڑ لیں۔ میرے بازو کھُل کر تاروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ تیورا کر نیچے گرا تو میں نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر ڈال دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ اس نے لزی کے بارے میں ایسی شُہدی بات کی تھی کہ میں برداشت ہی نہ کر سکا۔ لزی کے لیے

تو میں ساری دنیا سے لڑ سکتا تھا۔ کوئی اس کے خلاف ایسی بات کہہ کر کیسے بچ سکتا تھا مگر میرے ہاتھ صرف دو خانوں سے باہر نکلے تھے اور جس ڈوری سے جال کستا چلا جاتا تھا، وہ انھوں نے مقفل کر دی تھی۔

کاٹن نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا اور جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر میری طرف آیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پستول کا دستہ سیدھا میری گُدّی پر دے مارا۔ وہ بہت ہی کاری ضرب تھی جسے میں برداشت نہ کر سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں بے ہوش ہو گیا پھر مجھے قطعاً پتا نہیں چلا کہ کمرے میں ہوا کیا ہے، لڑکی پر کیا بیتی، میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اس وقت ایک صاف ستھرے فوم کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ بہت ہی صاف ستھرا تھا۔ فرش پر نیلے رنگ کا مصنوعی ریشے کا قالین بچھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک میز کے گرد چار کرسیاں بچھی تھیں اور میز پر کچھ لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سرکاری افسر کی میز ہے۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں تین دروازے لگے تھے۔ ایک باہر کو کسی طرف کھلتا تھا اور دو عقبی دیوار میں تھے۔

میرے سر میں اس وقت شدید درد ہو رہا تھا۔ سر دبانے کے لیے میں نے ہاتھ اوپر اُٹھائے تو معلوم ہوا کہ میری انگوٹھی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں تو مجھے احساس ہوا کہ ان میں وہ سب چیزیں موجود تھیں جو مجھے یاد تھیں۔ یہاں تک کہ سگریٹ بھی وہیں رکھے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں پوری طرح کھلے تھے اور میرے اوپر کسی نے نرم ملائم کمبل ڈال رکھا تھا۔ اُسے پرے ہٹا کر میں بستر سے اُٹھ گیا۔ سامنے کے دروازے پر پردے تنے تھے۔ میں نے وہ پردے ہٹائے تو مجھے کمرے کے سامنے برآمدہ دکھائی دیا۔ اس سے آگے کھلا صحن تھا جس میں گھاس کے قطعات بنا دیے گئے تھے۔ عمارت اس چوکور صحن کے چاروں طرف اُمڈتی چلی گئی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی اونچی عمارت ہے کیونکہ کمروں کا اور منزلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اوپر کو اٹھتا چلا گیا تھا۔

میرے کمرے کے باہر پولیس کا باوردی امریکی سپاہی بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں چونکا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے پولیس پکڑ کے آئی تھی۔ پہلا سوال میرے ذہن میں یہی ابھرا کہ ان سالوں کو کس نے بتا دیا کہ آئیور کے گھر میں کیا کچھ ہو چکا ہے، وہ لوگ تو پولیس کو کوئی بات بتلانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے خواہ اُن کے کتنے ہی آدمی خرچ ہو جائیں۔ وہ چُپ کا روزہ رکھ لینے والے لوگ تھے۔ پھر یہ کیسے ہو گیا۔ پولیس کو کس نے خبردار کر دیا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بہت محتاط رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ صورتِ حال بہت ہی خراب اور اندوھناک معلوم ہوتی تھی۔ میں ایک بار پھر پولیس کے پھندے میں جا پھنسا اور اب کی بار میری رہائی شاید ناممکن ہو گی۔ کیونکہ کوئی بھی آدمی بات پر اعتبار نہیں کرے گا کہ اتنے سارے آدمیوں کو میں نے دیا کہ میں تو پہلے ہی تھانے سے بھاگا ہوا آدمی تھا۔ میں پلٹ کر پر جا کر بیٹھ گیا۔ سر کا درد کچھ اور ہی بڑھ گیا تھا۔ پستول کی ضرب سے گُدّی پر گومڑا سا اُبھر آیا تھا۔ اس ابلیس نے ذرا لحاظ نہیں کیا تھا۔ آخر کو یہ بھی انسان ہے اور پھر غیر ملکی ہے۔ اس آدمی نے اس کا نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا۔ کیونکہ میرا سر تو بہت ہی نازک تھا۔ کوئی ایسی ضرب اُسے ہرگز نہیں لگانی چاہیے تھی جس سے کوئی اُبھر آئے اور امریکی پاکستانی تعلقات میں رخنہ پڑ جائے مگر اُس کو ان رموز کی کیا خبر تھی۔ گدھا کہیں کا۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ میں اس باہر بیٹھے سپاہی کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں جاگ چکا ہوں۔ میں وہاں سے پھر نکل بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔ بستر سے اُٹھ کر میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ وہ غسل خانہ ہے اور بہت ہی عمدہ جس میں شیمپو، تولیہ اور صابن کے علاوہ شاور بھی لگا تھا اور باتھ ٹب بھی اور فرش اس کا نہایت نفیس اور عمدہ تھا۔

میں نے سگریٹ میز پر رکھی ایش ٹرے میں مسلا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں جا گھسا مگر جب میں نے نلکا کھولا اس میں سے گرم پانی برآمد ہوا۔ میں نے کپڑے اُتار دیے۔ اب نہا لینا ہی زیادہ بہتر تھا کہ بدن پر جمی میل کا یہی تقاضا تھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں خوب مل مل کر نہایا۔ یاروں نے کنگھی شیشہ بھی سجا رکھا تھا اور یہ بہت ہی اچھی بات تھی۔ قوم بڑی ہی سلیقہ شعار قوم ہے۔ چہرے کی آرائش و زیبائش کا بہت ہی خیال رکھتی ہے۔ اگرچہ اس معاملے میں اُن کی عورتیں زیادہ آگے بڑھ گئی ہیں بلکہ یہاں تک کہ وہ کنگھی اور شیشے بلکہ لپ اسٹک تک ساتھ رکھتی ہیں۔ جہاں کہیں چہرے کا رنگ اُڑا دیکھا بیٹھ کر آئینہ سامنے رکھا اور بن سنور کر پھر آگے چل دیں۔ اگرچہ پاکستان میں بھی یہ رواج چل نکلا ہے اور عام عورتیں گھر میں اگرچہ ہی بنی رہیں مگر جب باہر نکلتی ہیں تو چھوٹا سا آئینہ اور کنگھی ساتھ رکھتی ہیں۔ پرس شاید اسی لیے ایجاد کیے گئے تھے کہ ہر شیڈ کی لپ اسٹک رکھی جا سکتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ترقی کے زینے طے کرنے لگے ہیں۔ گو ہمارے ہاں کے مرد سڑے بھسے ہی دکھائی دیتے ہیں جس کو سونگھو منہ سے بدبو اُمڈتی دکھائی دیتی ہے۔ بھنگ، چرس، حقہ اور سگریٹ کے مرد ذرا نہیں سوچتے کہ راہ میں اگر کوئی اُن کا منہ سونگھ لے تو سو پشتوں کو گالیاں دیتا گزر جائے گا مگر اُنھیں کون سمجھائے

کا کتنا خیال رکھتا ہے اور اپنے چہرے کو ہر دم تر و تازہ بنانے کے لیے وہ کتنا اہتمام کرتا ہے کہ وہ اس آرزو جاتا ہے اور یہی سوچ کر گھر سے نکلتا ہے کہ شاید اسے کوئی منہ یہ اپنے اپنے معاشروں کا رواج ہے۔

میں نے بھی اس روز یہی سوچا تھا کہ یہ عاشق کا جنازہ ہے، میری تجہیز و تکفین کرے گی تو یہ جنازہ دھوم سے نکلنا چاہیے۔ اتنا تو کر لینا چاہیے کہ اُن کے سامنے تازہ دم ہو کر جاؤں کہ یہ میری کا سوال تھا۔ ورنہ وہ سوچتے کہ کیسی سڑی بھسی صورت لے کر آ گیا ہے جو پہلے بھی تھانے سے بھاگ نکلا تھا اور اب پھر ہمارے آ گیا ہے یارو! کچھ نہ کچھ خیال تو مجھے کرنا ہی چاہیے تھا کہ میں بھی کے ایک خاص گروہ کی نمائندگی کرتا تھا جس کے لیے پولیس ترین قسم کی حوالاتیں بنا رکھی تھیں اور غلیظ ترین جیلیں جن کا مقدر ان کی لاج تو مجھے امریکہ میں رکھ ہی لینی چاہیے تھی۔ ورنہ وہ سوچتے کہ کوئی غلام جیلانی پلس سردار کریم نواز پلس عنایت احمد نہیں ملا تھا۔

دفتر کے اوقات کار خدا معلوم کیا تھے۔ جب میں نہا دھو کر ایک دم تازہ ہو کر غسل خانے سے نکلا تو میں سمجھا پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔ ذہن میں دراصل تری نے بڑی لطافتیں بھر دی تھیں۔ اس کا مجھے بہت اونچا اڑانے لگا تھا مگر میں اُسے آئیور کے گھر عقبی میں بند کرنے کے بعد کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ پتا نہیں اُسے ان نے کہاں رکھا تھا۔ کس حال میں تھی وہ مظلوم لڑکی جس نے زندگی کا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال ذہن میں آتے ہی الجھنے لگا اور سگریٹ نکال کر میز کے سامنے رکھی کرسی پر جا بیٹھا اس کی مقفل تھیں۔ وہاں سے اٹھ کر میں پھر دروازے کے جا ٹھہرا۔ سپاہی ابھی تک وہیں بیٹھا تھا، اسٹول کے اوپر۔ ایسا کیوں تھا۔ یعنی امریکہ میں بھی اسٹول پائے جاتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اسٹول کی تعمیر و بدبخت پابندی لگا دیتا کہ جس کو ذلیل کرنا ہوتا ہے، یار لوگ اُسے بٹھا دیتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے چپراسی کہ وہ بیچارے ایسے اسٹول بیٹھتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے وہ اسٹول اُن کی کمر پر اُگ آیا ہے۔ اگر کی بیٹھ پر درخت اُگ آئے تو وہ کہتا ہے چلو اسکی چھاؤں میں گے۔ چپراسی بھی یہی سمجھ لیتا ہے کہ چلو اللہ نے یہ اسٹول اور وہ خوش رہتا ہے۔ اتنا ہی خوش جتنا اس کی جیب اجازت ہے۔

اسٹول بردار سپاہی بھی غالباً اس خیال میں مگن تھا کہ اس ایک پاکستانی پرندہ بند کر رکھا ہے جس کی رکھوالی اُسے سونپی مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہاں سے کوئی راستہ ایسا دیکھوں جو مجھے اُن کی قید سے رہائی دلا دے۔ خدا جانے اُن سالوں کو کیسے خبر ہو گئی تھی اور وہ کس حال میں وہاں پہنچے تھے۔ اُس کاٹن کے یار شاور نے وہاں سے اُن تباہ حال لوگوں کو اُٹھا لیا تھا کہ وہ بھی پولیس نے دھر لیے تھے، اُسی کٹی پھٹی حالت میں اور اُس لڑکی کا کیا بنا ہوگا وہ درندے تھے، ایسے درندے جو بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ انھوں نے لڑکی سے خدا جانے کیا سلوک کیا ہوگا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اُسے ان لوگوں نے کوئی گزند پہنچائی ہو گی تو میں ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں اپنے دل سے وعدہ کر رہا تھا۔ وہ دوسری لڑکی تھی جس نے زندگی کی بیش بہا نعمتوں پر میرا اعتماد پھر سے بحال کیا تھا۔ اس سے پہلے مند آرا میری راہ میں آئی مگر وہ بھی حالات کے نرغے میں پھنس کر پُرزہ پُرزہ ہو گئی۔ اُسے وہ کتے کا بچہ آہُو لے ڈوبا تھا اور بالآخر وہ مجھ سے ایسی متنفر ہوئی کہ اس سے رسم و راہ استوار کرنے کی کوئی بھی صورت باقی نہ رہی۔ اب یہ لڑکی میرے سامنے آئی تھی، شعلہ جوالہ بن کر، برق و رعد کی طرح تڑپتی، بل کھاتی ہوئی میرے دل و دماغ پر اچانک ہی آ گری تھی اور میں اس حال کو جا پہنچا تھا کہ اس کے سوا مجھے کچھ اور سوجھ ہی نہیں رہا تھا لیکن اس پر بھی اگر ان لوگوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا، اس کو بھی انھوں نے پُرزہ پُرزہ کر کے رکھ دیا تو پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہو گا۔ میں ان میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ اس بات کی مجھے کوئی فکر نہیں رہی تھی کہ میں امریکہ میں ہوں۔ ان کے بدن بھی گولی کو راہ دیتے تھے اور میں اُن میں درجنوں سوراخ ڈال سکتا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ لڑکی کو ان کی طرف سے کوئی گزند پہنچی ہو۔ میں اُن میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کر سکتا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ اُس کی بے بسی سے اُنھوں نے ضرور فائدہ اٹھایا ہو گا۔ وہ بیچاری اُن کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔ اس کی مزاحمت تو پہلے ہی لمحے میں ختم ہو گئی ہو گی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکی ہو گی۔ اس کی آہ و فریاد سننے والا کون ہو گا۔ کسی کو احساس بھی نہ ہو سکا ہو گا، ایسی حالت میں کہ اس کا باپ آرتھر اسپتال میں رُکا ہوا تھا اور اس کی سوتیلی ماں اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کا ماتم کر رہی ہو گی۔ میرے پروردگار! یہ کیا ہو گیا ہے۔ کیا میرا نصیب ایسا ہی خفتہ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی اُسے بجلیوں نے بھسم کر ڈالا۔ یہ کیسا انصاف ہے میرے اللہ! اس لڑکی کا آخر قصور کیا تھا، کیوں وہ میرے کمرے میں آئی، کیوں اس کے دل میں میرے لیے اتنی چاہت پیدا ہوئی کہ وہ آرام کی نیند چھوڑ کر میری طرف چلی آئی جہاں میں نے کمرے میں اُسے ایسے ایسے منظر دکھائے کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے اور وہ بھی میری وجہ سے، میرے اعتبار پر، میرے سہارے سب کچھ برداشت کر گئی کیونکہ میں اس کے ساتھ تھا مگر اس سے آگے جو کچھ ہوا، وہ تو نہ میرے وہم و گمان میں تھا نہ اس کے

خیال وخواب میں بھی ایسی بات آئی ہوگی۔

ابھی میں اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا تھا کہ اچانک دروازے کے شیشوں میں سے مجھے ایک قدآور آدمی کی صورت دکھائی دی۔ سپاہی اُسے دیکھ کر اسٹول سے اُٹھ گیا۔ اس آدمی نے امریکی پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ وہ کوئی افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے دروازے پر پہنچتے ہی اپنی ٹوپی اتار دی۔ اس کا پستول، وردی کے ساتھ بہت سجتا تھا۔ بڑے ہی سڈول جسم کا آدمی تھا وہ۔ سپاہی نے فوراً ہی دروازے میں چابی لگائی اور وہ آدمی ایک عجیب سے دلفریب انداز سے پردہ ہٹا کر اندر آگیا۔

مجھے سامنے پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ بولا۔ ”تو تمھیں ہوش آگیا ہے؟“

”جی ہاں۔ کیا مجھے بے ہوش رہنا چاہیے تھا؟“

”نہیں! یہ تو بہت اچھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر فیرس دو بجے تک تمھارے پاس رہا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر چلا گیا تھا۔ تم وہی آدمی ہو نا جو پیٹر ہاک کے تھانے سے فرار ہو گیا تھا؟“

”جی ہاں۔ میں وہی ہوں اور میرا نام غیاث احمد ہے۔“

”ہوں۔ بیٹھو، اطمینان سے بیٹھو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور جاتے ہی اس نے گھنٹی بجا دی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور افسر اس کمرے میں آگیا اور بولا۔ ”ہیلو گریگری کیسے ہو؟“

”بالکل ٹھیک۔ یہ آدمی بالآخر ہوش میں آ ہی گیا۔“

”ہاں۔ گریگری! اور اب ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ کیوں مسٹر، تم ہم سے تعاون کرو گے کہ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یاد رکھو، تم یہاں سے بھاگ نہیں سکو گے۔ اس وقت تم پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہو۔“

”میں سمجھ رہا ہوں جناب! پوری طرح آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ ہمفرے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اُسے اپنی نوٹ بک میں لکھتے جاؤ۔ مجھے یہ بتاؤ مسٹر غیاث کہ تم اس مکان میں کیسے پہنچے؟“

”میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں پہلے مجھے یہ بتائیں کہ وہاں جو کچھ ہوا اس کی اطلاع آپ کو کیسے ملی؟“

”ہاں، یہ بہت اہم سوال ہے۔ دراصل ہمیں آدھی رات کو ایک لڑکی کا فون ملا۔ اس کا نام لزی ہے اور وہ ساتھ والے مکان میں رہتی ہے۔“

”کیا وہ بچ گئی تھی؟“

”ہاں۔ دراصل جب تم نے اُسے عقبی کمرے میں دھکیلا تو اس نے کوئی بیس منٹ بعد وہاں سے اسٹور روم میں پناہ لے لی۔ اس اسٹور روم میں الماری کے پیچھے ایک دروازہ ہے۔ اس نے وہ دروازہ کسی نہ کسی طرح کھلوا لیا۔ اس کی ملازمہ روزی نے اس کی چیخ سُن لی تھی۔ دراصل وہ ایک ہی مکان ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اپنے گھر میں پہنچتے ہی اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کر دیا۔ اطلاع ملتے ہی ہم فوراً اس مکان تک جا پہنچے۔ اس وقت تم جال کے اندر بالکل بے ہوش پڑے تھے اور وہ آدمی لوگوں کو اٹھا کر باری باری گاڑی میں لاد رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے فرینک کو لادا تھا، ابھی وہ فراسٹ کو اٹھا ہی رہا تھا کہ ہم اندر جا پہنچے۔ فراسٹ، لوور اور شادر بے ہوش تھے۔ انھیں ہم نے طبی امداد فراہم کی۔ اب وہ دوسرے کمرے میں بند ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم سے انھیں کیا دشمنی ہے؟ کیا چاہتے تھے وہ تم سے؟“ یہ کہہ کر اس نے سگار کا ڈبا سامنے رکھا اور ایک سگار ہمفرے کو اور مجھے پیش کیا پھر بولا۔ ”بے فکر ہو کر بات کرو۔ اگر تم صحیح بات بتا دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم تمھارے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ ہمیں بتاؤ یہ قصہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ انھی لوگوں میں سے کسی نے پیٹر ہاک کو قتل کیا ہے مگر ابھی تک ہم اس راز کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ہمارے پاس کسی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

تب میں نے محسوس کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں ان کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ مجھے اب کسی سے کوئی ہمدردی نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ دھمن اور عالیہ کا نام کسی جگہ نہ لوں کہ اُس عالیہ نے مجھے ایک ایسی بیش بہا چیز عطا کی تھی جو مجھے بار بار موت کے منہ سے بچا لیتی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دونوں میرے مجرم تھے، اُن سے مجھے اپنا پرانا حساب کتاب کرنا تھا۔ وہی تو تھے جنھوں نے میری زندگی کو اس ڈگر پر ڈالا تھا، اس خاردار راہ پر جس پر چلتے چلتے میری روح تک لہولہان ہو گئی تھی۔ میرے ہر بُنِ مُو سے سرخ سیال رِس رہا تھا اور میں دربدر بھٹک کر، اپنوں سے ٹوٹ کر یوں دربدر پھر رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اُن کا نام لیے بغیر میری کہانی کیسے مکمل ہوگی اور کون اس پر اعتبار کرے گا۔

”دیکھیں جناب، میرا اصل نام سردار کریم نواز ہے۔ میں لاہور کا رہنے والا ہوں اور ایک پُرامن شہری ہوں۔ وہاں ایک شخص ہے جس کا نام دلسن ہے۔ اس نے مجھے اغوا کر لیا۔ اس کے بعد میری ٹانگوں پر پلستر چڑھا کر اور مجھے شدید بیمار ظاہر کر کے مجھے ہوائی جہاز میں سوار کرایا اور سان فرانسسکو بھیج دیا۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ میں علاج کے لیے امریکہ جا رہا ہوں۔ میری ناف تک پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اور مجھے انھوں نے ٹیکے لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں جب مجھے مکمل ہوش آیا تو میں کسی اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کوئی چیریٹی اسپتال ہے۔ غالباً اس کا نام اوریئنٹل چیریٹی تھا۔ وہاں اُن لوگوں نے مجھے کوئی پندرہ بیس دن رکھا جس دوران وہ مجھے ہیروئن کا عادی بناتے رہے۔ وہاں ایک نیگرو تھا، ہارٹن، وہ میری نگرانی کرتا رہا۔ ایک دن موقع پا کر میں وہاں سے فرار ہو گیا۔“

”بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ تم نوٹ کر رہے ہو نا ہمفرے؟“

”ہاں، میں سب کچھ لکھ رہا ہوں۔“

پھر میں نے اُن کو بعد کے تمام واقعات بلا کم و کاست سُنا دیے مگر میں نے کہیں بھی عالیہ اور دھمن کا ذکر نہیں کیا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ ہارٹن نے کیوں میری مدد کی۔ راستہ مجھے اس نے دکھایا تھا اور میں اُس کی ہدایت پر نیلکن کی موٹر سائیکل لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ جب میں ایک شرابی شوہر کی بیوی کے ساتھ ایک کار میں سوار ہو کر سڑک پر نکلا تو مجھے آیور اور سینرز نے کار سے نکال لیا اور اس عورت کو بے ہوش کر دیا۔“

”ہوں۔ تو وہ عورت ٹھیک کہتی تھی ہمفرے! اُسے واقعی بے ہوش کر دیا گیا تھا۔“

”جی ہاں۔ جب میں آیور کی کار میں سوار ہوا تو پتا یہ چلا کہ وہ پیٹر ہاک کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے مگر معلوم یہ ہوا کہ پیٹر ہاک اُن کی ڈکی سے نکل کر فرار ہو چکا ہے۔ اُن لوگوں نے کسی جگہ گولی مار کر ڈکی میں ڈال لیا تھا۔ سینرز اور آیور بہت پریشان ہوئے۔ کار کی خون آلود سیٹ نے انھیں اور زیادہ سراسیمہ کر رکھا تھا۔ بالآخر وہ مڑے اور آیور کے مکان پر جا پہنچے۔“

”ہوں۔ گڈ! یہ اچھا ہے کہ تم ہم سے تعاون کر رہے ہو۔ میں تمھاری باعزت رہائی کی پوری کوشش کروں گا۔ پھر کیا ہوا؟“ گریگری نے میری باتوں پر مکمل طور پر اعتبار کرتے ہوئے کہا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میں سچ بول رہا ہوں اور اس بات پر وہ بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بعد کے تمام واقعات بھی اُسے سنا دیے اور کہا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس شخص فرینلو کے حکم سے کیا گیا ہے جس کا فون نمبر آیور کی ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔“

”وہ ڈائری ہم نے اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ وہ نمبر ہمیں معلوم ہے مگر حیرت ہے کہ اب اس نمبر پر کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ بلکہ پتا چلا ہے کہ وہ نمبر اس کی صحیح جگہ سے اٹھا کر کسی اور جگہ رکھ دیا گیا ہے اور وہ کسی فرانسس کے نام جاری ہوا تھا۔ اب نہ فرانسس نظر آتا ہے نہ فرینلو۔ بلکہ فرینلو نام کا کوئی آدمی شاید ہے ہی نہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم سے انھیں کیا دشمنی ہے؟“

”دراصل یہ ایک بہت بڑا ریکٹ ہے مسٹر گریگری! ہیروئن اسمگل کرنے والوں کا۔ وہ کروڑوں ڈالر کا کاروبار کرتے ہیں۔ بھارت، نیپال، پاکستان، افغانستان اور خدا جانے کہاں کہاں سے مال اُن کے پاس پہنچتا ہے۔ فرینلو کو یہ ڈر تھا کہ کہیں میں اصل بات پولیس کے گوش گزار نہ کر دوں۔ اسی لیے اس نے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا کہ خدا کو ابھی یہ بات منظور نہیں تھی۔“

”ہاں۔ ورنہ تمھارے قتل میں تو کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے پانچ بہترین اور معتمد آدمی تمھاری طرف بھیجے مگر وہ خود کٹ کر رہ گئے۔ تمھیں بہرحال لزی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ورنہ تم شاید زندہ نہ بچ سکتے۔ بہرحال ہمارا کام اب بہت آسان ہو گیا ہے لیکن کوشش کے باوجود ہم کسی تھامسن کو گرفتار نہیں کر سکے جسے آیور کے کہنے کے مطابق تمھاری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ البتہ کفلر کو ہم نے پکڑ لیا ہے مگر وہ ایسا گھنّا ہے کہ کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں فوراً اپنے وطن جانا چاہتا ہوں مگر اس سے پہلے میں لزی سے شادی کروں گا۔ وہ اس کے لیے آمادہ ہے۔“

”خیر یہ تمھارا اپنا مسئلہ ہے۔ ہم اس میں کچھ نہیں کر سکتے۔ البتہ تمھیں ہم ابھی کوئی ایک مہینے تک یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ تم آیور کے مکان میں ٹھہر سکتے ہو۔ تمھاری حفاظت کا انتظام ہم کر دیں گے لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ تم ان لوگوں کی گرفتاری میں ہماری مدد کرو اور جب یہ معاملہ عدالت میں چلے تو وہاں ہماری مدد کرو۔“

”میں اس کے لیے تیار ہوں جناب!“

”ایک سوال اس ڈرافٹ کا ہے جو تمھارے بریف کیس سے برآمد ہوا ہے۔ یہ تمھیں کس نے دیا تھا؟“

”یہ غالباً فرینلو نے تیار کروایا تھا۔ مجھے آیور نے دیا ہے۔“

”مگر..... آیور تو تم سے بہت بعد میں ملا ہے؟“ ہمفرے نے پوچھا۔

”اس سے پہلے تو میں نے ڈرافٹ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔“

”مگر اس کی تاریخ تو کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ یعنی ڈرافٹ تمھارے ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے پہلے کی تاریخ بتاتا ہے۔ اگر یہ تمھیں ہی دینا تھا تو تمھارے سفر سے پہلے ہی دے دیا ہوتا۔ بعد میں اس کا کیا فائدہ تھا؟“

”عین ممکن ہے وہ لوگ اسے میرے لاہور کے پتے پر بھیج دیتے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال ابھی بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ہمیں نہیں مل رہا ہے۔ ہم اس اسپتال بھی جائیں گے اور دوسرے شواہد بھی اکٹھے کریں گے۔“ ہمفرے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایسا شخص ہے جو تمھاری ضمانت دے سکے؟“ گریگری نے پوچھا۔ اس کا سگار پھر بجھ گیا تھا۔

”جی نہیں، میں تو یہاں بالکل ہی اجنبی ہوں۔“

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آئیور کو تو ہم آج ہی گرفتار کریں گے۔ ہم نے گریک ٹاؤن فون کر دیا ہے۔ بہرحال تم اب گھر جاؤ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو ہم تمھیں بلوالیں گے مگر اپنا پتا چھوڑے بغیر گھر سے کبھی غیر حاضر نہ رہنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ پولیس تمھاری حفاظت کا ذمہ لے رہی ہے اس لیے ہم سے تمھارا تعاون بہت ضروری ہے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر گریگری!"

"تمھارے بیان کے مطابق ہم آج سیزر کو بھی پکڑ لیں گے۔ اُن دونوں پر پیٹرہاک کے قتل کا مقدمہ چلے گا۔ ویسے تمھیں یقین ہے کہ فرینک نے خودکشی کی تھی؟"

"جی ہاں! میں نے آپ سے غلط نہیں کہا ہے۔ میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ بات میرے بس میں تھی۔ میرے پاس آئیور کا پستول موجود تھا مگر میں نے فراسٹ کو زخمی کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے یقیناً مار دیتا۔"

"مگر سوال یہ ہے مسٹر گاٹس کہ آخر ان کی گولیاں کیوں نہیں چلیں؟ کیسے آپ ہر بار اُن کے پستولوں سے بچتے رہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ ذرا اس کی تو وضاحت کر دیں۔" یہ ہمسفر کی آواز تھی وہ مجھے بہت ہی حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ہاں یہ واقعی بہت اہم سوال ہے مسٹر غیاث احمد! اس سے پہلے طیارے کے اندر بھی یہی کچھ ہو چکا ہے۔ کوئی زرہ پہن رکھی تھی آپ نے؟" گریگری نے اس بات میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا اور سگار اس نے دوبارہ سلگا لیا۔

"کیا تم صبح اٹھ کر نہائے تھے؟ بہت تازہ دم لگ رہے ہو۔" ہمسفر نے ایک دم میرے حلیے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ میرا خیال ہے یہ سوال اُسے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھا مگر وہ اُسے اب یاد آ رہا تھا۔

"ہاں، یہ غلطی مجھ سے ہو چکی ہے۔ میں نے آپ کا غسل خانہ استعمال کیا تھا مسٹر گریگری!"

دونوں ہنس دیے۔ گریگری بولا "کوئی بات نہیں تم نے غسل کر لیا یہ بہت اچھا کیا۔ اتنے سارے خون خرابے کے بعد نہا لینا ہی اچھا ہوتا ہے۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا "میرا خیال ہے تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ یہاں کون مجھے ناشتا دیتا۔"

"میں ابھی منگواتا ہوں۔ بہرحال اب یہ راز ہمیں بتا ہی دو کہ تم گولیوں سے کیسے محفوظ رہ جاتے ہو۔ یہ بات کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔" گریگری نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

اس کی مرعوب کن مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ نتھنے اس کے بہت ہی حساس تھے۔ حالانکہ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا، پھر بھی جانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر نسائیت ضرور پائی جاتی ہے جو اُسے اور زیادہ دلفریب بنا[ئے] شاید وہ کسی دن اعلان کر دے کہ وہ عورت بن رہا ہے۔ شاید [اس لیے] بھی وہ پولیس کے بہت اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور ہمفری جو [اسے] بلاتا تھا اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ گریگری کا بہت زیادہ [احترام] کرتا ہے۔

"ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہ یہ قصہ کیا ہے۔ ہمیں تو یہ راز بتا دو تو اچھا ہے۔ ہمارا کاروبار ہی ایسا ہے۔ تمھیں دُعا دیں گے۔ [بار بار] تم پر گولیاں چلائی گئیں مگر ہر دفعہ تم بچ گئے سامنے ہوتے ہوئے [بھی] بچ گئے۔ ہے نا یہ حیران کن بات!"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں مسٹر گریگری! شاید اللہ کو ابھی میری [موت] منظور نہیں ہے۔ ورنہ میں ایک عام سا آدمی ہوں جو محبت کر سکتا ہے اور نفرت بھی اور جسے شدید بیمار ظاہر کر کے ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے پٹیوں میں باندھ کر اغوا بھی کیا جا سکتا [ہے]۔ میں خود اس راز کو نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ میری والدہ [کی دعاؤں] کی وجہ سے ہو کہ میں ہر بار گولی کی زد سے بچ جاتا ہوں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، ہماری مائیں ہمارے لیے دعائیں نہ مانگتی ہوں گی اور کیا عیسائیوں کی ماؤں کی دعا قبول نہیں ہوتی؟ صحیح بات بتاؤ مسٹر گاٹس! ہم تمھارے شکر گزار ہوں گے۔" ہمفری [نے] پھر میرا نام غلط طور پر ادا کیا تھا۔ اکثر لوگ وہاں یہی کر رہے تھے۔ [وہ] مجھے گیٹ کہتا کوئی گاٹس اور کئی ایک تو سیدھا سیدھا مجھے [گیس] ہی کہہ دیتے تھے۔ جیسے میں بھی کوئی ٹوئی گیس قسم کی چیز ہوں۔ [میں] اس کا تدارک نہیں کر سکتا تھا۔

"میں اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا ہوں برادر۔ کوئی گولی جو میری موت کا سبب بننے کے لیے ہو، میرے جسم پر [اثر] کر جائے مگر ابھی تک تو میں خود یہ راز نہیں سمجھ سکا ہوں۔ آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، ہم یہ راز معلوم کر لیں گے مسٹر غیاث! کسی نہ کسی دن تو یہ بات ہمارے علم میں آ ہی جائے گی۔ ابھی تو تم دو مہینے ادھر ہی ہو۔" گریگری نے یہ کہہ کر گھنٹی بجا دی۔ عقبی [دروازے] سے ایک نیگرو قسم کا آدمی نمودار ہوا تو اُس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "مسٹر غیاث کے لیے ناشتا لاؤ۔ یہ صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں مسٹر پال!"

"جی بہت بہتر، میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔"

"ہاں تو مسٹر گاٹس! مجھے یہ بتائیں کہ کراچی سے آپ نے [طیارے] میں تنہا سفر کیا کہ کوئی آپ کے ساتھ بھی تھا؟" ہمفرے نے پوچھا۔ وہ اپنی نوٹ بک کے صفحے مسلسل اُلٹ رہا تھا۔

[می]را خیال ہے کہ میں تنہا نہیں تھا۔ ایک نرس میرے ساتھ [تھی۔ م]یں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون تھی۔" حالانکہ مجھے اس [بار]ے میں سب کچھ معلوم تھا مگر میں نے عالیہ اور دھمن کو اس [مصیبت س]ے بچا لینے کے لیے جھوٹ بول دیا۔

"[ا]س کی وجہ کیا تھی، آپ کو یاد کیوں نہیں ہے؟"

"[و]جہ صاف اور سیدھی ہے، میں ٹیکے کے زیرِ اثر سفر کر رہا [تھا۔ اس] کی وجہ سے میں کبھی نیم بے ہوش اور کبھی بالکل بے ہوش [رہت]ا۔"

"[مجھے] یہ بتائیں مسٹر غیاث! کہ ولسن نے اس کام کے لیے صرف آپ [کا انتخا]ب کیوں کیا؟ بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں کیونکہ یہ بہت [اہم سوا]ل ہے۔"

[ج]واب دینے سے پہلے میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ [و]ہ بہت ہی اہم سوال تھا۔ اگر میں انھیں صحیح بات بتا دیتا تو [مشک]ل میں پھنس جاتا۔ مجھے عالیہ اور دھمن کا نام لینا پڑتا۔

"دیکھیں، یہ خاصی لمبی کہانی ہے۔ لاہور میں ایک ڈاکٹر تھا۔ [عبدالغن]ی۔ وہ کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھا مگر مشہور اس نے یہی کر رکھا [تھا۔ اس] نے باقاعدہ ایک کلینک کھول رکھا تھا مال روڈ پر۔ ایک [بار] پیٹ میں شدید درد کے علاج کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔ [اس] نے چند دن تک تو مجھے مختلف دوائیں دیں مگر میرا درد کم نہ ہوا [تو اس] نے ایک روز یہ بتا کر مجھے پریشان کر دیا کہ میرا بایاں گردہ [خراب] ہو چکا ہے اور اسے نکلوا دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ [مجھ سے پہلے یہ]اں میں کئی اور دوست بھی اس کے زیرِ علاج رہ چکے تھے۔

بڑی اچھی شہرت تھی اس کی۔ جب اس نے کہا کہ میرا گردہ نکال دینا پڑے گا تو میں اپنی جہالت کی وجہ سے اس کے لیے تیار ہو گیا۔ جب [اُ]س نے میرا آپریشن کر دیا تو مجھے اس کی ایک نرس ریٹا سے معلوم ہوا کہ میرا گردہ خراب نہیں تھا۔ بلکہ ڈاکٹر عبدالغنی نے اُسے جان بوجھ کر نکالا ہے اور ایک اور شخص کو ایک لاکھ روپے میں فروخت کر دیا ہے۔ کیونکہ اس شخص کے دونوں گردے خراب ہو چکے تھے۔ اس شخص کی جان بچ گئی مگر میں تباہ ہو کر رہ گیا۔ یہ دیکھیں آپ میرا پیٹ دیکھ سکتے ہیں۔" میں نے قمیص اُٹھا کر اُنھیں آپریشن کے زخم کا نشان دکھاتے ہوئے کہا۔

وہ اُسے بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ گریگری اپنی کرسی سے اُٹھ کر معائنے کے لیے آگے آ گیا۔

"جب مجھے اس فریب کا علم ہوا تو میں نے اس کے خلاف مقدمہ کرنے کی دھمکی دی۔ مختلف ذرائع سے میں اس سے ٹکرانے لگا۔ میرا پروپیگنڈا بڑھا تو اُس نے مجھے ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا اور اپنے دوست ولسن کو میرا پتا بتا دیا اور کہا کہ اسے ہیروئن کے ساتھ باندھ کر کہیں بھی بھیج دو۔ اسے لاہور میں نہیں رہنا چاہیے۔ بس یہ تھی وہ اصل وجہ جس سے میں ولسن کا شکار بنا اور اُس نے مجھے بے ہوش کر کے سان فرانسسکو پہنچا دیا۔ میں چونکہ کوئی پندرہ بیس دن بے ہوش رہا تھا، اس لیے میں نہیں بتا سکتا کہ اس نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کیا جن کے نام مجھے یاد رہ سکے وہ میں نے آپ کو بتا دیے ہیں۔"

"گڈ۔ میرا خیال ہے ہمیں اس کی یہ بات تسلیم کر لینا چاہیے۔" گریگری نے دوسرا سگار سلگا لیا۔ اسی وقت اس کے نیگرو نے ناشتا

میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ انڈے توس، مکھن اور کچھ مشروبات اس میں موجود تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مشروب کچھ ہمارے ہاں کی لسی ایسا تھا جسے پی کر مجھے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ شاید وہ دہی کو بلو کر بنایا گیا تھا، اس دوران وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے باہر کے کمرے میں چلے گئے۔

جب میں ناشتا کر چکا تو وہ اندر آ گئے۔ ہمفرے بولا "چلیں ہم تمہاری یہ بات مان لیتے ہیں کہ تمہارا گردہ فروخت کر دیا گیا۔ مگر کیا وہ ڈاکٹر ابھی تک لاہور میں موجود ہے؟"

"نہیں، اُس نے کچھ ہی دن بعد کلینک کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ شفا بار کلینک نام تھا اس جگہ کا۔ اب شاید وہ وہاں نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے وہ شہر چھوڑ دیا تھا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تھانے سے فرار ہونے میں تمہیں واقعی ہارٹن نے مدد دی تھی یا وہ کوئی اور آدمی تھا۔ ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ ہارٹن ہی تھا۔ کیونکہ وہ بہت پرانا اور بڑا ہی بھروسے کا آدمی ہے اور بڑا عہدہ ہے اس کا۔ وہ کسی طرح بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتا تھا۔"

ہمفرے کا ذہن زیادہ تیز چلتا تھا۔ وہ معاملات میں مین میخ زیادہ نکالتا تھا۔ جبکہ گریگری کبھی کبھی کوئی سوال کرتا تھا۔ میز پر آگے کو جھک کر اس نے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کہ جس آدمی نے تمہاری مدد کی تھی اس کا قد تمہارے اندازے کے مطابق کیا ہوگا؟ بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیا تم نے ہارٹن کو اسی روز دیکھا تھا؟ اس سے پہلے تو تم نے پیٹرک کے معاملے میں اس کا ذکر نہیں کیا۔"

ہارٹن نے تو میرے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ مجھے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ اس کا ذکر کر کے میں نے بلا وجہ اس کو معتوب بنا دیا تھا اور ابھی وقت تھا کہ میں اس کو کسی لمبے فساد سے بچا لیتا ورنہ اس کا عہدہ بھی چھن جاتا اور وہ اُسے جیل میں بھی سڑا دیتے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا اور اس سوال نے ایک اچھا موقع پیدا کر دیا تھا جس سے میں اُسے بچا سکتا تھا۔

"اُس کا قد میرا خیال ہے ساڑھے پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا اور وہ قدرے لنگڑا کر چلتا تھا۔ شاید اُسے کوئی چوٹ لگی تھی۔"

"چہرے کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اس کی داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور اس کے بائیں رخسار پر یہاں ایک تل تھا، خاصا بڑا تل، اس جگہ۔" میں نے اپنے بائیں رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ تمہیں یقین ہے کہ اس کا حلیہ یہی تھا؟"

"جی ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"وہ تمہیں کس وقت ملا تھا؟"

"رات کو، یہی کوئی نو بجے۔"

"دیکھا تم نے ہمفرے! مجھے یقین تھا کہ ہارٹن ایسا کر ... وہ کوئی اور آدمی تھا۔ پولیس کی وردی میں اندر چلا گیا ہوگا ... نے خوش ہو کر کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہارٹن کیونکر ایسا کر سکتا ... ہم ایک مدت سے جانتے ہیں۔" ہمفرے نے کہا پھر وہ ... پر ہاتھ رکھ کر بولا "ٹھیک ہے مسٹر گائس! اب تم گھر جاؤ ... گاڑی تمہیں آئیور کے مکان پر چھوڑ آئے گی تمہیں ہر حال میں ... ہوگا۔ فون پر ہم سے تم رابطہ قائم رکھو گے۔ میرا خیال ہے ہم ... ہی وطن واپس بھجوا سکیں گے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ مسٹر ہمفرے! اور آپ کا بھی ... جیسے بھی ہو سکے آپ فوراً وطن واپس بھجوا دیں۔ میرے لیے یہ ... کا سفر بن گیا ہے۔ کسی دوسرے ملک میں آنے کا یہ میرا پہلا ... ہے۔ شکر ہے کہ مجھے کچھ انگریزی آتی تھی ورنہ تو میں مارا ہی گیا ...

"انگریزی تم واقعی بہت اچھی بول لیتے ہو۔ مجھے خود حیرت ... یہ کہہ کر گریگری اور ہمفرے نے مجھ سے ہاتھ ملایا مگر اچانک ... کوئی بات یاد آ گئی اور گریگری نے مجھے روکتے ہوئے کہا "ٹھہرو ... تم ذرا دیر کے لیے بیٹھو۔ میرے ایک فائل میں کچھ تصویریں ہیں ... کو دیکھ کر شاید تم اس آدمی کو پہچان سکو جس نے تمہیں تھانے ... ہونے میں مدد دی تھی۔"

"میرا خیال ہے ہم ہارٹن کو یہاں بلوا لیتے ہیں۔" ہمفرے ... مجھے دوبارہ کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ زیادہ بہتر رہے گا۔ تم اُسے فون کر دو مگر ایک ... کا خیال رکھنا مسٹر کہ اُسے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم کس سلسلے ... سے مل رہے ہو۔ کیا خیال ہے ہمفری! ہم اس سے ہارٹن کو ... ملوائیں یا اُسے دور سے پہچاننے دیں؟"

"یہ کوئی زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ ہم ہارٹن کو دوسرے کمرے ... بٹھا دیں گے اور یہ شیشے میں سے دیکھ کر بتا سکے گا کہ وہ ہارٹن ... یا کوئی اور۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اُسے فون کرو۔ اُدھر اسٹینو کے کمرے ... جاؤ۔ ہم اِدھر ہی رہتے ہیں۔" گریگری نے کہا اور ہمفرے دوسرے ... میں چلا گیا۔ گریگری نے ایک بار پھر سگار سلگا لیا اور کرسی کی ... پر سر رکھ کر بولا "یہ بتاؤ مسٹر غیاث! کہ فرینک نے واقعی خود ... تھی یا تم نے اُسے ہلاک کر دیا تھا۔ آثار تو یہی بتاتے ہیں کہ ... پر گولی چلائی تھی۔"

"نہیں جناب! یہ بات نہیں ہے اگر ثبوت ضائع نہ ... تو مجھے یقین ہے کہ اس کا پستول سب کچھ بتا سکے گا اس پر ...

... کے نشان ہوں گے۔ نال پر شاید کچھ خون بھی لگا ہو۔ ... پر قطعاً گولی نہیں چلائی۔ اس کے بارے میں میں قسم ... ہوں۔ میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ مجھے اُلجھانے ... کی کوشش نہ کریں۔"

"نہیں نہیں، میں تمہیں اُلجھا نہیں رہا ہوں۔ تفتیش کرنا تو ہمارا ... ہے اور ہم تم پر کوئی سختی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ ... وقت لزی تمہارے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟"

"جب وہ تینوں ختم ہو گئے لزی اس وقت میرے کمرے میں ... وہاں کا منظر دیکھ کر بہت پریشان ہوئی مگر وہ کیا کر سکتی ... میرا خیال ہے کہ اُسے صرف یہی اطمینان تھا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔"

"... محبت ہے اُسے تم سے؟"

"محبت تو میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ انسانی ہمدردی کی بات ... ہے۔"

"وہ جو مر گیا، وہ بھی تو انسان ہی تھا۔ تم یہ بتاؤ مسٹر غیاث! فرینک نے خودکشی کیوں کی ہے؟ اسے کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ ... کر لیتا؟"

"اُس نے ہی مجھے فرینلو کے بارے میں بتایا تھا اور جب ... نے کہا کہ وہ مجھے اپنے چیف اور فرینلو سے ملوا دے تو پہلے تو وہ ... ہو گیا مگر پھر اس کے چہرے پر بڑا ہی کربناک تاثر پیدا ہوا جیسے ... خیال سے ہی کانپ اُٹھا ہو کہ وہ مجھے اُن لوگوں سے ملانے کے ... لے جا رہا ہے۔ اس قدر خوفزدہ کر رکھا تھا اُن لوگوں نے اُسے ... نے دیکھتے ہی دیکھتے خودکشی کر لی۔"

"تم بہت دلچسپ آدمی ہو مسٹر! ہر بات کا تمہارے پاس ایک جواب موجود ہے مگر حالات بتلاتے ہیں کہ تم شاید بچ نہ سکو۔ بہر حال ... پوری کوشش کروں گا۔" وہ مجھے وہیں بیٹھا رہنے کے لیے کہہ کر ... کمرے میں جا گھسا۔

میں اگر کوشش کرتا تو وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ باہر کے ... پر بیٹھے سپاہی کو اُڑنگا دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر میں ... ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اس سے حاصل کچھ بھی نہ ہوتا، البتہ ... نگاہ میں اور زیادہ مشکوک ہو جاتا اور وہ یہی سمجھتے کہ سارا قصور ... ہے۔ اس لیے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔

کوئی بیس پچیس منٹ بعد ہمفرے کمرے میں آیا اور بولا۔ "... مسٹر! ہارٹن آ چکا ہے اور وہ میرے کمرے میں بیٹھا ہے اُسے ... تم ہمیں بتاؤ گے کہ کیا وہ وہی آدمی ہے جس نے تمہیں فرار ... میں مدد دی تھی۔ غلط بات نہیں کرو گے۔ خواہ مخواہ تم کہیں ... پھنسوا دو۔ تمہیں صحیح بات بتانا ہوگی۔"

"کیا آپ کو شک ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"نہیں، پھر بھی میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ ورنہ ہم تمہیں مشین کے سامنے لے جائیں گے جو بتا دیتی ہے کہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ آؤ۔"

اس نے مجھے اسٹینو کے کمرے میں پہنچا دیا۔ گریگری اس سے اگلے کمرے میں تھا اور سامنے کے دروازے پر شیشے لگے تھے جس سے آر پار کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہارٹن اس وقت گریگری سے کسی معاملے پر محوِ گفتگو تھا۔ میں نے تو طے ہی کر رکھا تھا کہ اُسے دیکھ کر بھی انکار کر دوں گا۔ میں کسی طرح بھی تسلیم نہیں کروں گا کہ وہ وہی آدمی ہے جس نے مجھے تھانے سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ پردہ ذرا سا کھنچا ہوا تھا اور ہارٹن کا رُخ گریگری کی طرف تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک میز رکھی تھی۔

ہمفرے نے پردے کچھ اور کھینچ دیے اور بولا "ذرا دیکھ کر بتاؤ کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے تمہاری مدد کی تھی۔" میں نے دونوں پردوں کے درمیان میں جھری سے ہارٹن کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔

"یہ وہ آدمی نہیں ہے مسٹر ہمفرے! یہ ہرگز وہ آدمی نہیں ہے۔ اس کا قد اور حلیہ تو بالکل مختلف ہے۔"

"تم یقین کے ساتھ کہتے ہو؟"

"بالکل! میں قسم کھا سکتا ہوں۔ یہ قطعاً وہ آدمی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم آگے چلو۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پٹ کھول دیا اور مجھے ساتھ لے کر وہ اُن کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ یہ بہت ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ساری صورتِ حال کو بدل سکتا تھا۔ مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی مگر مجھ سے کہیں زیادہ احتیاط ہارٹن کو برتنا چاہیے تھی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے سامنے دیکھ کر اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ ہمفرے اور گریگری نے ہم دونوں کو زبردست مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ سارے معاملے کا فیصلہ وہاں ہی ہو سکتا تھا۔

"ہیلو ہارٹن! اس سے ملو یہ گائس احمد ہے۔ تمہارے تھانے سے بھاگنے والا۔"

ہارٹن نے سر کو ذرا سا گھما کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم یوں کھڑا ہو گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا مگر میں نے گریگری اور ہمفرے کی طرف سے منہ پھیر کر اُسے خاص انداز سے آنکھ ماری۔ وہ میرے اس اشارے کو سمجھ گیا۔ بہت تیز اور ذہین آدمی تھا۔ ایکدم مجھ پر برستے ہوئے بہت ہی تحکم آمیز لہجے میں بولا "تو بالآخر تم پکڑے ہی گئے۔ یہ کہاں سے ملا ہے تمہیں مسٹر ہمفرے؟ اس نے تو ہمیں ذلیل

کروا دیا ہے۔ تھانے سے تم کیسے بھاگ نکلے تھے استاد؟" اس نے اپنا پستول تھپتھپاتے ہوئے کہا، یوں جیسے وہ اسی وقت مجھے گولی مار دے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ "ہم اس پر کتنا اعتبار کر رہے تھے۔ وہ کون تھا جس نے تمھیں وہاں سے بھاگنے میں مدد دی۔ کون تھا وہ؟ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہیں اور تم فیلکن کی موٹر سائیکل لے کر بھاگ نکلے۔ اس بیچارے نے بہت تلاش کیا تمھیں مگر تم بہت ہی اوّل درجے کے بدمعاش ثابت ہوئے۔ یہ کہاں سے ملا ہے تمھیں ہمفرے؟" اس کی اداکاری بہت ہی بے مثال تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ ایک صرف آلیور اور سینزر کو ہی معلوم تھا کہ مجھے تھانے سے کس نے بھاگنے میں مدد دی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اُن کے ہاتھ کبھی نہیں آئیں گے اور یہ بہت اچھی بات تھی۔

"تم بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"وہ.... جی.... دراصل مجھے ایک شخص ہارٹن نے وہاں سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ اس کا قد تو آپ سے بہت چھوٹا تھا۔ یہی کوئی سوا پانچ ساڑھے پانچ فٹ مگر وہ نام اپنا ہارٹن ہی بتا رہا تھا۔ اُس نے مجھے پچھلے دروازے کا پتا بتایا۔ اوورکوٹ بھی اُس نے مہیا کیا اور فیلکن کی موٹر سائیکل کے بارے میں بھی اس نے بتایا کہ چابی گاڑی میں لگی ہوگی۔"

"مگر وہ تھا کون؟ ہارٹن تو میرا نام ہے۔ اُستاد! کس نے میرا نام لے کر تمھاری مدد کی تھی؟ میں تو اس کو گولی مار دوں گا۔ میری ملازمت پر یہ ایک دھبّہ ہے۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا۔ حالا[...] ہی تمھیں پکڑ کر تھانے لے گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے جناب! مگر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں [...] سے واقف نہیں ہوں اور وہ کہتا تھا کہ اس کا نام ہارٹن ہے۔"

وہ ابھی تک کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ [...] تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھے وہیں زندہ زمین میں گاڑ [...] اس کا غصہ کسی بھی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

"بکواس کرتا تھا وہ۔ میں ہی تمھیں قانون کے سامنے [...] اور میں نے ہی تمھیں رہائی دلا دی! سُن رہے ہو گریگری! یا [...] بولتے ہو۔ خواہ مخواہ میرا نام لے رہے ہو۔ یا اُس آدمی کو [...] کوشش کر رہے ہو۔ کون تھا آخر وہ؟ کوئی تھانے کا ہی آدمی [...]"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! اس کا رول تو بہت [...] سا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا اور ضروری ہدایات دے کر [...] جن کی وجہ سے میں وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"دیکھ لوں گا میں۔ وہ مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ اس کو [...] میں بند کر دو گریگری! یہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔"

"زیادہ ناراض نہ ہو ہارٹن! مجرموں کے کئی رنگ ہو[...] ہم اس کے بارے میں جلدی ہی کوئی فیصلہ کر لیں گے۔"

[...]بارہ آلیور کے مکان پر پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں اس سے بڑی [...]یات حاصل ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پھر اس کو [...] کوشش کریں اور کچھ آدمی ہمارے ہاتھ آجائیں۔"

"[...]ٹھیک ہے جو مرضی آئے کرو۔ بہت ہی گھٹیا آدمی ہے یہ۔ [...]بھی خیال نہیں آیا کہ میں اور پیٹر ہاک اس سے کتنی رعایت [...] تھے۔" یہ کہہ کر وہ بالآخر کرسی پر بیٹھ گیا۔ گریگری اور ہمفرے [...]مطمئن ہو چکے تھے اور یہ بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ ورنہ معاملہ [...]اُلجھ جاتا۔ ہارٹن کی ملازمت پر حرف آتا تو وہ مجھے جا بجا [...]ت کرنے کی کوشش کرتا اور یہ اچھی بات نہ ہوتی۔ میں اس [...]ں بھی پھنس جاتا اور کوئی میرا پُرسان حال نہ ہوتا۔

[...]کچھ ہی دیر بعد ہمفرے نے برآمدے کے باہر کھڑی ایک [...]گاڑی میں مجھے سوار کروا دیا۔ میری حفاظت کے لیے چار [...]سپاہی میرے ساتھ کر دیے گئے۔ مجھے انھوں نے حوالات میں [...]بند نہیں کیا تھا۔ یہ اُن کی اپنی مصلحت تھی۔ دراصل وہ مجھے [...]کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور مقصد اُن کا یہ تھا کہ [...]یہ طور پر میری نگرانی کرتے رہیں گے جس کی وجہ سے وہ اس [...]کے باقی لوگوں کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ اُن کا منصوبہ یہی تھا۔ [...]یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے آلیور کے گھر میں ضرور ملنے آئیں گے [...]ہر حال میں مجھے ختم کر دینا چاہتے تھے کیونکہ اُنھیں پل پل کی خبر [...]ہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کے مخبر کون تھے۔ [...]ذریعے سے اُنھیں معلومات حاصل ہوتی تھیں اور وہ اتنی [...]ہوتی تھیں کہ اُن کا کوئی بھی منصوبہ ناکام نہیں رہتا تھا۔ [...]اپنے آدمیوں کی یہ ہزیمت قطعاً گوارا نہیں تھی۔ رات بھر جو [...]تار رہا اس کی وجہ سے وہ میری تکّہ بوٹی اُڑا دینا چاہتے تھے۔ [...]اس وقت خدا جانے کہاں جا بیٹھا تھا مگر اس کا حکم چلتا [...]ور جو کچھ وہ کہتا تھا اُسے اس کے آدمی پتھر کی لکیر سمجھ کر اس پر [...]تے تھے اور میں اب سان فرانسسکو کا قیدی بن کر اُن سپاہیوں [...]ساتھ کسی زنجیر سے بندھے بغیر اُن کے حکم کی پابندی پر مجبور تھا۔ [...]دوبارہ آلیور کے مکان پر بھیج رہے تھے تاکہ وہ اپنے منصوبے [...]جامہ پہنا سکیں۔ اُن کے لیے میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ [...]ٹن ایک کیریئر تھا جس نے ایک بڑے گروہ کی نشاندہی کر دی [...] مگر اُن میں سے ابھی تک کوئی سرغنہ اُن کے ہاتھ نہیں آیا تھا [...]یہی بات اُن سے برداشت نہیں ہو رہی تھی جو لوگ پکڑے [...]تے وہ محض کمّی کمین تھے، اُن کے حکم کے پابند۔ اُنھیں اپنے گروہ [...]غداری کرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی اور فرینک کی [...]زندگی اس کی ایک مثال تھی۔

آلیور کے مکان پر اُنھوں نے نئے تالے چڑھا دیے تھے جن کی چابیاں سپاہیوں کے پاس تھیں۔ اُنھوں نے گیٹ پر گاڑی روکی اور مختلف تالے کھولتے ہوئے مجھے آلیور کے کمرے میں پہنچا دیا۔ مجھ سے وہ کچھ نہیں بولے قطعاً خاموش رہے۔ میں جب کمرے میں پہنچ گیا تو اُنھوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ چاروں طرف ڈالی اور پھر مجھ سے کچھ کہے بغیر واپس لوٹ گئے مگر مجھے معلوم تھا کہ گریگری نے مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے کوئی خاص بندوبست کر دیا تھا۔ اس کا میں اندازہ ہی کر سکتا تھا مگر کون میری نگرانی پر مامور تھا، یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ حیرت ہے کہ اُنھوں نے وہ قالین بھی وہاں سے اُٹھوا لیا تھا جس پر فرینک کا خون لگا ہوا تھا۔

وہ سپاہی جیسے ہی بڑے گیٹ سے باہر نکلے میں نے تمام دروازے یکے بعد دیگرے بند کیے اور آلیور کے عقبی کمرے میں جا گھسا۔ وہ بڑے سلیقے سے تمام کمروں کی تلاشی لے چکے تھے اور جس چیز کی اُنھیں ضرورت تھی وہ وہاں سے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ چیزوں کی ترتیب ذرا نہیں بدلی تھی۔ یہ اُن کا کمالِ فن تھا کہ جس چیز کو جہاں سے اُٹھایا گیا تھا وہ وہیں ٹھیک طریقے سے رکھ دی گئی تھی۔ میں قطعاً اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شے اپنی اصل جگہ سے ہٹی ہوئی ہے۔ ورنہ اپنے ہاں کی پولیس اگر کسی گھر کی تلاشی لیتی ہے تو پتا یہ چلتا ہے جیسے وہاں سے کوئی طوفان گزر گیا ہے۔ ہر شے اوندھی سیدھی پڑی ہوتی ہے اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کیا جاتا کہ چیزوں کی ایک اپنی ترتیب ہوتی ہے جس کو بدل دینے سے ہر شے بدل جاتی ہے۔ بالعموم وہ بڑے بڑے شواہد خود اپنے ہاتھوں ہی ضائع کر دیتے ہیں اور پھر سارا زور وہ ملزم کو ڈرانے دھمکانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

آلیور کے عقبی کمرے سے نکل کر میں اسٹور میں جا گھسا۔ لزی اُس طرف سے نکلی ہوگی۔ اسٹور روم میں پہنچ کر میں نے پچھلی دیوار کے ساتھ لگی الماری دیکھی، وہ بھی میرا خیال ہے ٹھیک طرح سے اپنی جگہ پر رکھ دی گئی تھی۔ میں کچھ صحیح نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس بات پر میں نے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس الماری کو کھسکا کر میں نے پرے ہٹایا تو اس کے پیچھے واقعی ایک دروازہ موجود تھا۔ یہی کوئی ڈھائی فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا دروازہ، تو گویا لزی اس راستے سے اپنے مکان میں گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ اس راستے سے تو میں کسی بھی وقت لزی کو بلا سکتا تھا۔ خود اس کے مکان تک جا سکتا تھا۔ راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کے پاپا سوئے ہوئے ہوں گے۔ اس کی سوتیلی ماں بھی گہری نیند میں ہوگی اور میں چپکے سے لزی کے دربار میں حاضر ہو سکوں گا ـــــ کوئی مجھے روک نہیں سکے گا۔ لزی سے بے روک ٹوک ملنے کے خیال نے میرے دل میں مسرتوں کے

سارے پیمانے چھلکا دیے۔ وہ ایسی تھی کہ اس کے لیے مجھے ہزار بند دروازے کھولنے پڑتے تو میں کھول دیتا۔ اس کی آنکھوں کا تصور ہی آدمی کو کافر بنانے کے لیے بہت کافی تھا وہ رات کو اسی دروازے سے خوفزدہ ہو کر آگے نکلی ہوگی۔ ابھی تو میں نے اس سے کوئی دل کی بات کہی ہی نہیں تھی۔ ابھی تو میں اسے حال دل سنانے کو ہی تھا کہ وہ وہاں آ پہنچے ، باوجود یہ کہ وہاں کمرے کا منظر بہت ہی دلخراش تھا وہ بڑے حوصلے اور عزم سے میرے پاس بیٹھی رہی ، ذرا نہیں گھبرائی۔ اس کا وہ ابتدائی اضطراب جلد ہی ختم ہو گیا تھا کیونکہ میں اس کے پاس موجود تھا۔ میں اس پر اپنی جان قربان کر سکتا تھا۔ اُسے پا لینے کی آرزو نے مجھے پاگل کر رکھا تھا اور خوشی مجھے یہ تھی کہ گریگری اور ہمفرے نے مجھے دوبارہ آیو کے مکان پر بھیج دیا تھا۔ ورنہ میں اس سے دور رہ کر شاید نیم جاں ہو جاتا۔ محض اس کے تصور سے ہی دن رات دل بہلاتا۔ اس سے مل لینے کی تمنا کبھی پوری نہ ہوتی۔ اب تو مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازے کے اس پار موجود ہوگی۔ اس سے مل لینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

حیرت مجھے یہ ہو رہی تھی کہ اس کو دیکھ لینے کے بعد میرا ماضی مجھ سے چھُٹتا جا رہا تھا۔ مجھے اس کے سوا کسی اور بات کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ نہ بہن نہ ماں، نہ آپی نہ کوئی اور۔ میرے ذہن کے پردوں پر اس کی تصویر رقص کناں رہتی تھی۔ میں گریگری اور ہمفرے کے سامنے بیٹھا تھا تو بھی میرے دھیان کی سیڑھیوں پر لزی ہی کھڑی تھی۔ وہ اتنی بے کراں بھی ہو سکتی تھی ! میں اس کا کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دروازے سے پلٹ کر میں پھر آیو کے کمرے میں آ گیا۔ مجھے نیند آنے لگی تھی۔ یہی بہتر تھا کہ میں رات کی بے خوابی کا علاج بستر میں ڈھونڈتا۔ ناشتا میں نے کر ہی لیا تھا۔ میں آنکھیں موند کر بستر پر جا لیٹا۔ نیند سو دکھوں کا علاج ہے۔ آنکھیں بند ہوئیں تو میں جلد ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ آپی میرے ساتھ ہوتا تو میرا دل بہلاتا رہتا، سو طرح سے میرا خیال رکھتا مگر وہ تو بہت پیچھے رہ گیا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نیا جنم لے چکا ہوں جس میں لزی کے سوا میرا کسی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی مگر پتا نہیں مجھے قدرت نے ایسے اتفاقات کی نذر کیوں کر دیا تھا کہ میں سمجھ رہا تھا، میں اگر زندہ بھی ہوں تو ایک دم دنیا کے کچھواڑے میں ڈال دیا گیا ہوں۔ جہاں ایک نئی زندگی میری ہم رکاب ہو گئی تھی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے اپنے ماضی سے کٹ جانے کا افسوس نہیں تھا۔ بہت دکھ تھا مجھے اس بات کا۔ میرے راستے روکے جا رہے تھے۔ میری واپسی کم و بیش ناممکن بنا دی گئی

تھی۔ میں وطن کی طرف مراجعت چاہتا تھا مگر وہ لڑکی ... نہیں آ رہا تھا۔ مجھے نئی الجھنوں میں پھنسا دیا گیا تھا ... کہاں اور ہیروئن کی اسمگلنگ کہاں۔ میں لعنت بھیجتا تھا ... کاروبار پر مگر اب میں اس کاروبار میں باقاعدہ حصے دار ... تھا۔ حیرت مجھے یہ بھی تھی کہ اُن لوگوں نے مجھ سے وہ ایک لاکھ ... کا ڈرافٹ کیوں نہیں چھینا۔ وہ ابھی تک میری جیب میں ... نہیں وہ چاہتے کیا تھے۔ حالانکہ وہ ڈرافٹ اُنھیں مجھ سے ... چاہیے تھا۔ وہ ایک ثبوت تھا جس کے پس منظر سے وہ ... ہونا چاہتے تھے۔ یہاں تک رعایت اُنھوں نے برتی کہ ... بھی انھوں نے مجھے واپس دے دیا۔ میں جانتا تھا، یہ سب وہ جان بوجھ کر کر رہے تھے۔ وہ مجھے کسی لمبے ہی چکر میں ... رہے تھے مگر ابھی تک وہ پوری صورت حال سے آگاہ نہیں ... تھے جیسے ہی کوئی اہم کڑی اُن کے ہاتھ لگ گئی وہ مجھ سے کوئی ... رعایت کیے بغیر مجھے جیل بھیج دیں گے اور مجھے کم از کم چودہ ... سزا تو ضرور ہی دلوا دیں گے مگر میں نے بھی خود کو اب ... تھا۔ وہ جو چاہیں کر لیں۔ میں نے آدھا سچ تو اُن کے سامنے ... ہی دیا تھا۔ اب وہ جانیں اور اُن کا کام۔ مجھے تو اس گھڑی ... اور صرف لزی کے قریب رہنے کی آرزو تھی۔ اس کے سوا میں ... نہیں چاہتا تھا، پتا نہیں میں ماضی کے بارے میں اتنا سنگدل ... ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی میں کوئی دو گھنٹے ہی سویا ہوؤں گا کہ اطلاعی گھنٹی ... نے بڑے زور سے بجا دی۔ یہ بیماری امریکہ میں کچھ زیادہ ... جو بھی آتا ہے گھنٹی پر ہاتھ رکھا اور اُسے بجاتا ہی چلا گیا ... انھیں کیا مزہ ملتا تھا۔ شکر ہے پاکستان میں اوّل تو اللہ نے ... لوگوں کو اطلاعی گھنٹی کی سہولت ہی نہیں دی اور جنھیں یہ ... ہے وہ بس برداشت کیے چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ایسا ... کہیں نہیں مچتا کہ آدمی کسی بھی حالت میں ہو گھنٹی کے دبانے ... فوراً باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی کمبل الگ ... اور تیزی سے باہر نکلا مگر جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ... قتالہ کھڑی تھی جس کا نام لزی تھا۔

" اچھا ، یہ آپ ہیں تو آپ پر قربان جائیے۔ آپ ... لزی! خدا کا شکر ہے میں آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں ... اندر آ جائیے۔"

اس کی آنکھوں کی روشنی ایک دم تیز ہو گئی یعنی ... معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ... ہونے لگتی ہے رنگ اس کا اور زیادہ شہابی ہو جاتا ... آنکھیں تارہ سی ہو جاتی ہیں۔ وہ کچھ بولے بغیر کمرے میں ...

... ہوئی اور پٹ بھیڑ کر میرے سامنے یوں کھڑی ہو گئی ... بار دیکھ رہی ہو۔
... دیکھ رہی ہو لزی ؟
... ابھی کالج سے واپس آئی ہوں۔ ڈیڑھ بج رہا ہے ... آپ کب واپس آئے ؟"
... کوئی تین چار گھنٹے پہلے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ کالج ...
..."
... رات کی بات یاد آتی ہے تو میرے پسینے چھوٹ جاتے ... انھوں نے کیسے چھوڑ دیا۔ مجھے امید نہیں تھی جناب عالی! ... علاوہ آپ پر کئی مقدمے چلا دیں گے۔ ہائے، میں نے کتنی ... مانگی ہیں آپ کے لیے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا ؟"
... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھیں نا لزی! حملہ تو اُن لوگوں ... یہ میرا کمرہ ہے۔ وہ مسلح ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ اس ... تصور تھا ؟" وہ مستجاب دعا کی طرح میرے سامنے کھڑی ... کا وجود دہک رہا تھا۔ ہمیشہ ہی دہکتا رہتا تھا اور اب ... وجود میں اُمڈتا کوئی جذبہ مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اُسے ... بھار رہوں مگر پھر خیال آتا تھا، پتا نہیں وہ کیا سمجھے۔ کیا کہے ... ردِّعمل کیا ہو کہ یہ لڑکیاں تو بادشاہوں ایسی ہوتی ہیں۔ کبھی ... سے چڑ جاتی ہیں اور کبھی گالیاں کھا کر انعام دیتی ہیں۔
... آئیں کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"
... آپ نے کھانا کھا لیا ؟"
... نہیں تو، مجھے پکانا ہی نہیں آتا۔"
... تو ٹھیک ہے آپ اُدھر باورچی خانے میں کرسی لے آئیں۔ میں ... کے لیے کھانا تیار کرتی ہوں سر غیاث احمد! آپ کی خدمت ... مجھے خوشی ہوتی ہے۔"
... مجھے آپ واقعی پاگل کر دیں گی۔ لزی! کیا میں واقعی اتنا ... قسمت ہوں ؟" میں نے کرسی لے جا کر باورچی خانے میں دروازے ... رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے فریج میں سے مختلف چیزیں نکالیں۔ آیو رنے ... خاصا جمع کر رکھا تھا۔ میری بات سُن کر وہ مسلسل مسکراتی جا رہی ... مجھے جمیلہ نے ایک مصرعے کا مطلب سمجھایا تھا۔ وہ فارسی ... میں کسی شاعر نے کہا ہے کہ عشق اوّل در دلِ معشوق ... شود۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے ؟"
... اب مجھ سے باقاعدہ اردو میں بات کر رہی تھی۔
... یہ آپ کی جمیلہ طوسی تو کوئی بہت ہی ہرفن مولا قسم کی چیز ... ہے۔ بھلا آپ کو یہ مصرع سنانے کی اُسے کیا ضرورت تھی ؟ ... لگتا ہے کہ اُسے بھی آپ سے عشق ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی " یہ عشق کیا ہوتا ہے ---- سر غیاث احمد ؟"

" یہ .... یہ عشق دراصل اپنی جان کسی پر فدا کرنے کا جذبہ ہوتا ہے جو آپ ہی آپ دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا محرک کوئی نہیں ہوتا۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ معشوق کو خوش دیکھنے کے لیے اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دے۔"

" کیا یہ امریکہ میں بھی پایا جاتا ہے ؟"

" میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں تو یہاں نیا نیا آیا ہوں آپ ہی بتا سکتی ہیں کہ یہاں کے لوگ دل میں وہ گداز رکھتے ہیں کہ نہیں جو انھیں آگ میں کود جانے پر مجبور کر دے ؟"

" میرا خیال ہے کہ یہ خالص پاکستانی چیز ہے۔ کیونکہ .... کیونکہ یہاں تو روز لوگ آتے بہانے بیویاں بدلنے کے حامی ہیں۔ کوئی کسی کے لیے نہیں روتا۔ سب اپنے حال میں مست ہیں سر غیاث احمد! یہ خود پرست لوگ ہیں۔"

" ہو سکتا ہے۔ آپ کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، ان لوگوں کے بارے میں۔ کیا آپ نے کبھی رومیو جولیٹ کی کہانی پڑھی ہے ؟"

" ہاں، مگر .... مگر وہ تو اٹلی کے لوگ تھے سر غیاث احمد! اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ اُن مسلمانوں کی اولاد تھے جو سسلی میں جمع ہو گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا اور اٹلی چلے گئے۔" اس نے مجھے ایک بالکل ہی نئی بات بتائی تھی۔

" اور اُن کا جذبہ خالصتاً عرب کے بادیہ نشینوں کا جذبہ تھا —— ایک دوسرے کے لیے اُن کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی تھی۔ وہ عشق کے لیے قربانی دے سکتے تھے۔"

" خدا خیر کرے لزی! آپ کی معلومات مجھے مار دیں گی۔ میرا علم بہت محدود ہے، بخدا اب تو زیادہ ہی محدود نظر آنے لگا ہے۔ پتا نہیں آپ کیا کچھ پڑھتی ہیں۔"

" میرا کام یہی ہے سر غیاث احمد! میرا سارا وقت لائبریریوں میں گزرتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، علم الاصنام، عمرانیات اور خدا جانے کس کس موضوع کی کتابیں میں پڑھتی رہتی ہوں۔ میں کالج میں ہمیشہ اوّل رہی ہوں مگر اب شاید ایسا نہ کر سکوں۔"

اُس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے دیکھا جیسے وہ کوئی بہت ہی انوکھی بات کر رہی ہو۔

" کیوں، اب کیا ہو گیا ہے لزی! مائی ریسپکٹڈ لیڈی ؟"

" اب آپ جو بیچ میں آ گئے ہیں، میں آپ کو پڑھوں کہ کتابیں دیکھوں ؟"

" ہائے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔
تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو

تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

سمجھ رہی ہیں نا اس شعر کو لزی! شاعر ایسے ہی کسی تجربے سے گزرا تھا۔" میں نے اس کی بات سے بہت زیادہ متاثر ہو کر کہا

"میرا خیال ہے کہ کوئی امریکی شاعر ایسی بات شاید زندگی بھر نہ کہہ سکے ان کے جذبے بہت سطحی اور ہیچ ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ظاہر کی بات کرتے ہیں۔ ان کی نظر صرف نمود و نمائش پر رہتی ہے۔ جب ہی تو ہر روز طلاقیں ہوتی ہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جسم کے اندر ایک روح بھی ہوتی ہے جانوروں میں روح نہیں ہوتی۔ ان کی طرز فکر بالکل جانوروں ایسی ہے اور مجھے اسی بات سے چڑ ہے۔"

"آپ کی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لزی! مجھے خوشی ہے کہ آپ اتنے عمدہ خیالات کی مالک ہیں۔ بخدا یہ میری خوش نصیبی ہے۔" میں نے کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر میرے قدم رک گئے۔ مجھے وہ اس گھڑی کوئی بہت ہی مرصع غزل دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس وقت گوشت تل رہی تھی۔ میں سمجھا اس نے میرا دل فرائی پین میں ڈال دیا ہے۔ اس کے ذہنی عروج نے مجھے حیران کر دیا تھا اور میں سوچنے لگا تھا زندگی اس کے ساتھ گزرے گی تو کتنی حسین ہو جائے گی۔ مگر کیا میں اس قابل تھا؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اٹھتا تھا۔ میں اسے کیا دے سکوں گا، سوائے غم اور پریشانی کے میرے پاس اور تھا کیا؟ اور میری بیوی بن کر ان سارے غموں کو ان آلام کو ان مصائب کو کیسے گھر کے آنگن میں بند ہو کر جھیل سکے گی جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ..... وہ غلط آدمی کو منتخب کر بیٹھی تھی۔ کاش میرا ماضی مجھے چھوڑ دیتا۔ کاش میں اس سے الگ ہو سکتا مگر یہ کیسے ممکن تھا غلام جیلانی تو ایسا کبھی بھی نہیں کر سکے گا۔ اور اس طرح تو اس لزی کے لیے بھی مصیبت بن جائے گا۔ اس کا خیال ذہن سے نکال دے کہ تو وہ کوڑھی ہے جو ایک دن لزی کو بھی اپنے کوڑھ میں مبتلا کر دے گا۔ بری سوچ کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ پھر تو اس لڑکی کو کیوں مسلسل فریب دے رہا ہے تو اس نیک طینت، پاک باطن لڑکی کو کیوں برباد کرنے پر تل گیا ہے؟ کاش تو سمجھ سکتا غلام جیلانی کہ تو اس کے قابل ہرگز نہیں ہے مگر..... میرا دل مسلسل ذہن کے اس عذاب کی تکذیب کیے جاتا تھا اور مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اس کی طرف بڑھتا ہی چلا جاؤں اور میرے اس کے درمیان کوئی شے رکاوٹ نہ بن سکے۔

"کیا سوچ رہے ہیں سر غیاث احمد؟"

ایک بھی موقع ایسا نہیں آیا تھا کہ اس نے مجھے سر اور جناب کے الفاظ کے سوا مخاطب کیا ہو۔ وہ میرا بہت ہی زیادہ احترام کرتی تھی اور سر غیاث احمد کا لفظ وہ جب کہتی تھی تو اس کے لہجے میں استہزا یا طنز قطعاً نہیں ہوتا تھا۔

"کچھ نہیں آپ کی والدہ کا کیا حال ہے؟"

"میں نے بتایا تھا نا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ابھی تک اسپتال میں ہیں اور بچے روزی کے پاس ہیں۔"

"ہوں، یہ بہت برا ہوا ہے لزی! بہرحال یہ ... حادثہ تھا۔"

"... تو میں بھی یہی ہوں مگر..... میرا ذہن ... اب میں نے سوچا ہے کہ یہ مکان میں جوزفین کو ... کے حوالے کر دوں۔" وہ یہی چاہتی تھی۔ میری مخالفت ... لیے کرتی تھی۔ بہت ہی غریب والدین کی بیٹی ہے اب ... کا ہاتھ بھی کٹ گیا ہے، میں اس کے ساتھ یہی نیکی کر ... اور کیا ہے میرے پاس جو میں اسے دے سکوں۔ کیوں ...

"آپ اس کی مدد کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں، مجھے اس پر بہت ترس آتا ہے۔"

"تو اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے آپ کو؟ ... ڈھیر سارا روپیہ دے سکتا ہوں۔ آپ اتنی بھی غریب نہیں ..."

"کیا مطلب! یعنی.....؟"

"ہاں! آپ کہیں تو میں اسے آٹھ دس لاکھ روپیہ ... ہوں۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"اتنا سرمایہ آپ کے پاس ہے؟"

"کیوں نہیں، میں کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔"

"جی نہیں، میں آپ کو یہ تکلیف نہیں دوں گی ... میں جوزفین کو یہ مکان دینے کا تہیہ کر چکی ہوں۔"

"پھر میرے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"وہی بات جو جمیلہ طوسی نے آپ سے کہی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ پہلے میرے پاپا سے بات کر ... نہ مانے تو پھر میں کچھ اور سوچوں گی۔ ویسے بھی میرا دل کہتا ... میرا یہاں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ جوزفین مجھے کبھی معاف نہیں ... گی اور شاید پاپا بھی معاف نہ کر سکیں۔ بہت طرف دار کی ... وہ جوزفین کی۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے لزی! ہم فوراً شادی کر لیتے ..."

"جی نہیں، ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ ... ملنا چاہیے۔ میں اتنی عجلت کی قائل نہیں ہوں۔ البتہ ... منگنی کر لیتے ہیں۔ شادی چار چھ مہینے بعد کر لیں گے۔"

"چار چھ مہینے! نہیں لزی! میں تو پاگل ہو جاؤں گا ... نہیں ہونا چاہیے۔ میں آرتھر سے خود بات کروں گا ...

... ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ زندگی بھر اپنا ہاتھ بندھا ... میں گی لزی! میں اندر سے بہت بڑا ہوں اور بہت مضبوط ... میں آپ کو دھوکا دوں تو سمجھیں میں اپنی ماں کا بیٹا ... نہیں ہوں۔"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں کرتے ہیں۔ سر غیاث احمد! مجھے ... مکمل اعتماد ہے۔ پھر بھی آپ پاپا سے بات ضرور کر لیں۔ یہ ... ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ان سے مل لوں گا۔" کچھ ہی دیر بعد ... میز پر لگا دیا اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ... ابھی تک بھوکی تھی اور سیدھی میری طرف چلی آئی تھی۔ کھانے ... وہ بڑی نزاکت سے انگلیاں چلاتی تھی اور لقمے کو ہونٹ بند ... چباتی تھی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کو بڑے غور سے ... رہا تھا۔ واقعی وہ ساری کی ساری بے حد حسین تھی۔ اپنی ... عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی اور اپنی شکل و صورت کے حسن ... اعتبار سے بھی اور باتیں اس کی مجھے بار بار حیران کرتی تھیں۔ ... علم جو اس نے کتابوں سے حاصل کیا تھا، ایک دریا تھا جو اس ... کوزے میں بند تھا۔ اس کی رفاقت میں زندگی گزارنا ہی اصل ... زندگی تھی۔ میں اسے ہر حال میں اپنا لینا چاہتا تھا۔

کھانا ختم کر کے وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی مگر ... تکلف جو ہم دونوں میں ابتدا سے اب تک موجود تھا برابر قائم ... رہا۔ اس کو پولیس والوں نے اس ڈرامے میں اس لیے نہیں گھسیٹا ... تھا کہ اس نے انھیں ساری حقیقت بتا دی تھی۔ شاید اس نے ... بھی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اگر یہ بات ... ہوتی تو گر یگری مجھ سے اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تفصیل ... سے گفتگو کرتا۔ اسے بھی یقین تھا کہ اس نے ان سے سچی بات کہہ دی ... ہے۔ اس کا فون ہی ان کے لیے بہت غنیمت تھا۔ ورنہ تو وہ لوگ ... مجھے جال میں باندھ کر سیدھا کسی پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتے ... اور سمندر میں دھکا دے دیتے۔ میری اپنی زندگی بھی اس گھڑی ... لزی کی مرہون منت تھی۔ وہ اگر اس آزمائش کے لمحے میں ... ہاتھ سے بچ کر نہ نکل جاتی تو شاید خود بھی تباہ ہو جاتی اور میرے ... بچ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ان کے لیے بہت ... آسان شکار بن گیا تھا۔ میرے لیے وہ کھردرا جال لائے تھے۔ ... ابھی تک سمجھ نہیں رہے تھے کہ وہ مقابلہ کس سے کر رہے ... تھے۔ یوں تو مجرموں کے پاس پاکستان میں پستول اور بندوقیں ... بڑی تعداد میں موجود تھے مگر امریکہ میں تو ان کی کھلی چھٹی تھی ... کوئی جو چاہتا تھا جہاں سے مرضی ہو خرید سکتا تھا۔ کوئی ناکہ ... یا روک ٹوک نہیں تھی اور پولیس کبھی نہیں پوچھتی تھی کہ میاں تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ ہاں جب کوئی آدمی قتل ہو جاتا تھا تو پھر اس کی تفتیش بڑی گہرائی سے کی جاتی تھی اور قاتل کو وہ بڑے گھر پہنچا کر ہی دم لیتے تھے مگر ہر بات میں تو یار ہمیں امریکہ کی نقل نہیں کرنا چاہیے۔ چلو گولہ بارود میزائل اور طیاروں کی بات تو الگ رہی۔ اگر ہماری سرحدوں پر بھارت حملہ ... تو پھر امریکی ہتھیاروں کی ضرورت ہمیں کہاں رہ جاتی ... ہوں۔ لگی تمام عظمت انھی ہتھیاروں کی صنعت میں پوشیدہ ہے گویا ... رکھ کر وہ دو چار ملکوں کو بارہ مہینے لڑاتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں کبھی عرب اسرائیل جنگ جگا دیتے ہیں کبھی عراق ایران کو بھڑا دیتے ہیں۔ زیادہ مندا ہوا تو لاطینی امریکہ میں ہی کوئی چھیڑ خانی کر دی اور انھیں لڑوا دیا۔ وہاں سے نکلے تو کسی اور ملک کو تاڑ لیا کہ یہ سالے ابھی تک آرام سے کیوں بیٹھے ہیں ان کو تگنی کا ناچ نچاؤ اور ہتھیار بیچو کہ اس کے بغیر ان کے عوام بھوکوں مر جائیں گے۔

میں نے کوئی چار بجے لزی کو برآمدے میں اتار دیا۔ جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور بولی۔ "آپ آج پاپا سے بات نہ کریں۔ وہ اچھے موڈ میں ہوں گے تو میں آپ کو بتاؤں گی اور پہلے اس پولیس کی مصیبت سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گئی ہوں جناب عالی!"

"ہاں، اس کا بھی میں بندوبست کر لوں گا۔ آپ بے فکر رہیں، اچھا خدا حافظ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا مگر وہ بس ایک دلفریب مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے چلی گئی۔

اس کی 'جناب عالی' نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ خدا جانے وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ یہ اس کا تکیہ کلام بھی نہیں تھا صرف مجھے ہی اس نے اس لفظ کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اپنے ہر فقرے کے آخر میں وہ جناب عالی کا پتھر میرے ٹخنے میں دے مارتی تھی۔ ایسے میں وہ بلاشبہ بہت خوبصورت اور دلفریب نظر آتی تھی۔ اگر وہ طنز تھا تو بھی مجھے منظور تھا۔ استہزا تھا تو بھی ٹھیک تھا۔ اس سے میرا تعلق اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر ذہن میں بھی یہ سوال ابھرتا تھا کہ آخر میں اتنا ناقابل شکست کیسے بن گیا

یہی سوال گریگری اور ہمفرے کو پریشان کر رہا تھا۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے کہ باہر گیٹ پر کسی گاڑی کا ہارن چیخنے لگا۔ میں نے باہر نکل کر گیٹ کھولا تو مجھے پولیس جیپ میں گریگری، ہمفرے اور دو اور آدمی بیٹھے نظر آئے۔ وہ نیچے اترے تو گریگری نے سلام دعا کے بعد کہا۔

"یہ ڈاکٹر اسوالڈ ہیں اور یہ ان کے اسسٹنٹ کاپ مین۔ دراصل ہم آپ کا طبی معائنہ کروانا چاہتے ہیں مسٹر غیاث۔ کیا آپ

ہمیں اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟"

"کیوں نہیں! آیئے مگر میں بیمار تو نہیں ہوں۔" میں نے اُنھیں اپنے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، بیمار تو ہم ہیں۔ ایک سوال ہمیں بار بار پریشان کر رہا ہے کہ آخر آپ پر گولی کیوں اثر نہیں کرتی؟"

"کیا آپ مجھے گولی مار کر دیکھیں گے؟"

"ارے نہیں نہیں، ہمارا یہ مطلب نہیں ہے مسٹر غیاث! ویسے آپ تو سیل کہتے ہیں، تجربہ تو ہمیں یہی کرنا چاہیے مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیوں ڈاکٹر اسوالڈ! کیا آپ انھیں گولی مار کر دیکھیں گے؟" ڈاکٹر اور اس کا اسسٹنٹ ہنسنے لگے۔

"کرنا تو ہمیں یہی چاہیے مسٹر گریگری! اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے مگر اس کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔" کاپ مین نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ اس دوران میں نے اپنی انگوٹھی اُتار کر صوفے کے گدّے کے نیچے رکھ دی۔ میں انھیں اپنے راز سے قطعاً آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر ڈاکٹر اسوالڈ نے کہا۔

"مسٹر جی ایس! آپ براہِ کرم اپنے تمام کپڑے اُتار دیں۔"

"جی بہت بہتر۔" یہ کہہ کر میں غسل خانے کی طرف بڑھا تو اس نے مجھے روک لیا۔

"نہیں، غسل خانے میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے یہ کپڑے آپ یہیں اُتاریں۔" وہ بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر، نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"آپ زیرِ جامہ رہنے دیں مگر جلدی کریں۔ وقت بہت کم ہے۔" ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

جب میں نے کپڑے اُتار دیے تو اُس نے چاروں طرف گھوم کر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میرے پیٹ پر زخم کے بارے میں اُس نے کوئی بات نہیں کی۔

"ٹھیک ہے۔ کاپ مین تم ذرا اِدھر آؤ اور وہ شیلڈ لے آؤ۔" کاپ مین اسکے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اپنے بڑے سے بریف کیس میں سے لوہے کی ایک موٹی چادر نکالی اور اُسے میرے سینے کے ساتھ لگا کر بولا "یہاں ٹھیک رہے گی؟" اس نے چادر کے ساتھ لگے لکڑی کے دستے کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مسٹر گریگری اِدھر آئیں اور دیکھ لیں اس چادر میں سے گولی نہیں گزر سکتی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مسٹر غیاث! میں اس چادر پر گولی چلا رہا ہوں۔ یہ بلٹ پروف چادر ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ میری گولی جام ہوتی ہے کہ نہیں۔" اس نے اپنا پستول نکال لیا۔

"اور اگر آپ کا نشانہ چوک گیا تو؟" میں پریشان ہو گیا۔ کوئی بھی حادثہ ممکن تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ صرف آپ کے حوصلے کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ گولی چلائیں۔ کاپ مین ذرا دھیان سے یہ دستہ پکڑ کر رکھنا مگر ٹھہریں۔ یہ دستہ مجھے دے دیں، میں خود پکڑوں گا۔"

عین اس وقت برآمدے میں مجھے لزی آتی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے اس کے پاپا آرتھر تھے۔ وہ اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حالت یہ تھی کہ گریگری نے پستول تان لیا تھا اور دستہ میں ابھی کاپ مین کے ہاتھ سے لے نہیں سکا تھا۔ مجھے وہ اس حالت میں دیکھ کر اور بھی زیادہ سراسیمہ ہو گئی اور تڑپ کر اندر آ گئی۔

"یہ.... یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ آپ کو شوٹ کرنا چاہتے ہیں۔ سر! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟" آرتھر دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔

"ہم اُن پر ایک تجربہ کر رہے ہیں مس! اس شخص پر گولی اثر نہیں کرتی اور ہم یہی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔"

"آپ نے انھیں بھی تجربے کا کوئی جانور سمجھ لیا ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں آپ کے خلاف پولیس کو اطلاع کر دوں گی۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ آپ اس حرکت سے باز آ جائیں۔ آپ نے ان کو اس کی اجازت کیوں دی؟ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔" وہ میری طرف پلٹ پڑی۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کام ہو ہی جانے دیں۔"

"نہیں نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ ہذیانی کیفیت میں بولی۔

"دیکھیں، یہ چادر بلٹ پروف ہے۔ گولی میں چلاؤں گا۔ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ یہ میری ذمّے داری ہے۔ مس! آپ ذرا دیر کے لیے سامنے سے ہٹ جائیں۔ کاپ مین دستہ پکڑے رہو۔"

"اور اگر کاپ مین کی نیت بدل گئی تو؟" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"تو میں اسے اپنے ہاتھ سے اِدھر ہی گولی مار دوں گا۔ کوئی مذاق سمجھ رکھا ہے اس نے۔"

"یہ دستہ مجھے دے دو اور پہلے آپ اس چادر پر الگ سے چلا کر دکھائیں۔" میں نے وہ چادر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے اپنے جسم سے کچھ فاصلے پر کر دیا۔ میرا پورا ہاتھ اب کھل گیا تھا۔ گریگری نے یوں کیا کہ فوراً ہی چادر پر گولی چلا دی۔ معلوم یہ ہوا کہ واقعی وہ چادر تھی اور گولی اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ لزی اور آرتھر حیرت زدہ ہو کر وہ تماشا دیکھ رہے تھے اور انھیں یہ کوفت ہو رہی تھی کہ میں اس کے لیے راضی کیسے ہو گیا۔ وہ میری ذہنی حالت کو بھی مشتبہ سمجھنے لگے تھے مگر میں نے دل میں سوچا کہ یہ تجربہ ہو گیا ہے۔ میں کہاں روز روز اُنھیں سمجھاتا پھروں گا کہ مجھ پر گولی اثر نہیں کرتی۔ میں اُن کے لیے طرفہ تماشا چیز بن گیا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد میں نے وہ چادر اپنے سینے کے سامنے رکھ دی۔ گریگری نے ایک بار پھر ہاتھ بلند کیا۔ گولی چلی اور چادر پر لگ گئی۔ تجربہ کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی چادر پھینک دی مگر گریگری کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں ان دو آدمیوں کی زبانی کچھ معلوم ہو چکا تھا جنھوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ ایک تعویذ میرے پاس چھوٹے سے لاکٹ کی صورت میں جو دو سکھوں کے پاس رہ گیا تھا۔ شاید یہی بات گریگری کو کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور میرے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا مگر اسے کچھ بھی نہ مل سکا۔ ایک ایک جیب کی تلاشی لینے کے بعد مجھے کپڑے پہننے کی اجازت دے دی پھر مجھے گھورتے ہوئے مخصوص انداز میں بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ...."

"میں نے کہا ہے کہ میرے خدا کا خاص فضل ہے مجھ پر کہ گولی میرے جسم پر اثر نہیں کرتی اور آپ نے تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے چلیں ڈاکٹر اسوالڈ! میرا خیال ہے ہم ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ آپ کی پریشانی بے جا تھی مس! آپ نے دیکھا کہ ہم انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر اسوالڈ اور کاپ مین کو ساتھ لیا اور اُسی وقت کمرے سے باہر نکل گیا۔

آرتھر اور لزی ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے اس صورتِ حال سے سمجھوتا کر سکے۔

"آپ تشریف رکھیں مسٹر آرتھر! اِدھر بیٹھ جائیں۔ آپ بھی بیٹھیں نا مس لزی! کیسے آئے ہیں آپ اور آپ کی مسز کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے مسٹر غیاث! اُن کا ہاتھ کٹ گیا۔ وہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکیں گے۔ زخم ہی کچھ ایسا لگ گیا تھا۔"

"آپ نے ایسا خوفناک پھندا گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے.... بہرحال اس حادثے کا مجھے خود بہت افسوس ہے۔"

"بہرحال جو ہو چکا وہ بدلا تو نہیں جا سکتا مسٹر غیاث! آپ سے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بڑے شوق سے۔ آپ بیٹھیں نا مس لزی ان کے لیے کوک وغیرہ نکالیں۔" میں نے سگریٹ نکال کر آرتھر کو پیش کیا مگر اس نے نہیں لیا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا ہوں۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے مسٹر آرتھر! کاش میں بھی اس سے جان چھڑا سکتا۔ آپ کچھ کہنا چاہتے تھے؟"

"آپ نے اس روز فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ مجھے آپ کا انداز پسند نہیں آیا مگر چونکہ آپ میری بیٹی سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے، اس لیے میں نے گوارا کر لیا۔ ویسے آپ یہ بتائیں کہ لزی کے بارے میں آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

بات یہ ہے مسٹر آرتھر! میں سیدھا اور کھرا آدمی ہوں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ میں لزی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میری اُن سے بات ہو چکی ہے، میرا خیال ہے وہ بھی تیار ہیں۔"

"مگر یہ بتاؤ بھائی! کہ تم ہو کون؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی اجنبی لوگوں پر یوں ہی تو اعتبار نہیں کر لیتا۔"

"میری پاکستان میں چھوٹی سی زمینداری ہے۔ کچھ میرا اپنا کاروبار ہے۔ میں بی اے پاس ہوں اور ڈھیر سارا سرمایہ میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور میرا خیال ہے، میری عمر اب ستائیس سال ہو چکی ہے اور اب مجھے شادی کر لینا چاہیے۔"

"مگر لزی میں اچانک آپ کی اتنی دلچسپی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"دیکھیں! لزی میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی بیوی میں ہونا چاہئیں۔ وہ حسین ہے بے حد حسین۔ ایسی کہ شاید ہی اس شہر میں کوئی اس جیسی موجود ہو۔ اللہ نے اُسے بڑی ذہانت عطا کی ہے۔ وہ اُردو اور پنجابی بول لیتی ہے، سمجھ لیتی ہے۔ اس زیادہ مجھے اور کیا چاہیے؟"

"ہوں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ کے پاس ڈھیر سارا سرمایہ ہے؟"

"یہ تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ ایک لاکھ ڈالر تو ابھی میرے پاس موجود ہیں۔ یہ دیکھیں، یہ ڈرافٹ ہے۔ کچھ چیزیں یہاں بیچی ہیں میں نے، یہ رقم اُسی سلسلے کی کڑی ہے اور ابھی مجھے کئی رقمیں یہاں سے وصول کرنا ہیں۔" میں نے ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔

ڈرافٹ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ اُسے اٹھا کر وہ روشنی کے رُخ پر رکھ کر اس کے مندرجات پڑھنے لگا؟

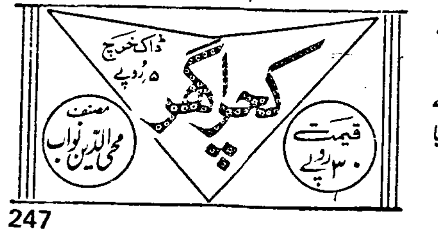

مگر پھر اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر ڈرافٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ مجھے حیران کر رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"یہ ڈرافٹ آپ کو کس نے دیا ہے؟"

"میں نے یہاں قالینوں کی ایک کھیپ بھیجی تھی۔ یہ رقم اسی سلسلے میں ملی ہے مجھے۔"

"ٹھیک ہے مسٹر غیاث! آپ اپنی بات تو کہہ ہی چکے ہیں۔ اگرچہ لزی کے لیے ایک سے ایک اچھا رشتہ مجھے مل رہا ہے مگر میں اس کی ذاتی پسند کو ترجیح دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

"تو پھر میں کیا سمجھوں؟"

"مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا ابھی۔"

"چائے تو پیتے جائیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ لزی! چائے ان کے سامنے رکھ دو، یہ خود پی لیں گے۔"

"مگر یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے انکل آرتھر! لگتا ہے آپ ناراض ہو گئے ہیں۔"

"دیکھیں جب تک پولیس آپ کو کلیئر نہیں کر دیتی۔ میں کوئی بات نہیں کر سکتا اور اب مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ پولیس آپ کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے زبردستی لزی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا اور وہ بھی ایسی مٹی کی مادھو نکلی کہ اس کے ساتھ فوراً ہی باہر نکل گئی۔ آرتھر نے اُسے چائے کے برتن بھی اٹھانے نہیں دیے۔

میں شرمندہ سا ہو کر ان کے پیچھے برآمدے کی طرف لپکا مگر وہ لان کا دروازہ کھول کر تیزی سے دوسری طرف چلے گئے۔ میرے کلیجے میں بل سا پڑنے لگا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، وہ لزی جو بار بار میری طرف آتی تھی اس سے اپنے والد کا ہاتھ بھی نہ جھٹکا گیا۔ کچھ تو اُسے میرا خیال کرنا چاہیے تھا اور یہ آرتھر کیا سمجھتا ہے مجھے۔ پولیس میرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ ساری بات میں نے انھیں بتا دی تھی مگر..... مگر اس کے باوجود میں تسلیم کر چکا تھا کہ میں ہیروئن کی اسمگلنگ کا ذریعہ بن چکا ہوں۔ آرتھر ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے شاید ہی چھٹکارا مل سکے۔ وہ میرے خلاف مقدمہ ضرور درج کر چکے ہوں گے۔ میری قانونی حیثیت تو بہت ہی مشکوک ہو چکی تھی۔ اپنے پاؤں پر میں خود کلہاڑا مار چکا تھا۔ اگرچہ اب کی بار انھوں نے میرے بیان پر دستخط نہیں لیے تھے۔ اس کی ابھی انھیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو گی مگر وہ کسی بھی وقت ایسا کر سکتے تھے۔ آرتھر ٹھیک کہتا تھا۔ وہ مجھے کبھی بھی "کلیئر" نہیں کریں گے۔ مرکزی کردار تو میں ہی تھا۔ انھوں نے ایک بہت بڑا برج گرا لیا تھا اور اب وہ خفیہ طریقے سے میری نگرانی کر رہے تھے۔ اس خیال سے کہ کچھ اور پرندے بھی شاید انھیں مل جائیں۔ اُنھیں موقعے پر پکڑ سکیں۔ کیونکہ تھا تو میں آئیور کے مکان ... آئیور کی حیثیت کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔ میری سادگی ... پولیس سے ہمدردی، مروت اور محبت کی توقع رکھتا تھا ... مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ پولیس خواہ کہیں کی بھی ہو وہ کبھی ... دوست نہیں ہوتی۔ پاکستان میں بار بار اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی میں نے ان پر اعتبار کر لیا۔

یہ میں نے کیا کیا باری تعالیٰ! آرتھر ٹھیک ہی سوچتا ... میں پولیس کے حربے سمجھ ہی نہ سکا۔ میں نے سوچا تھا ... انھیں بتا دیتا ہوں۔ مجھے اُن لوگوں نے زبردستی یہ ... پہنچا دیا تھا اور میں اس کا اعتراف کر چکا تھا۔ آرتھر ٹھیک ... رہا تھا اور اُسے مجھ سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں تھی ... کسی نے اُسے میری ساری کہانی سنا بھی دی ہو اور اس ... کے سامنے مجھے اس طرح پیش کیا ہو کہ میرا چہرہ بہت ہی ... دکھائی دیتا ہو۔

مگر وہ ڈرافٹ دیکھ کر اس قدر پریشان کیوں ہو گیا ... آرتھر کا اس سے کیا تعلق تھا۔ کیا اُسے معلوم تھا کہ وہ ڈرافٹ ... گیا ہے اور میرے لیے بنایا گیا ہے مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ... تو اس معاملے سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا مگر..... کیا آئیور کو ... مکان اس نے یونہی دے رکھا تھا۔ یا اس کا آئیور سے کوئی تعلق ... یہ بڑا اہم سوال تھا مگر اس کا جواب مجھے کوئی بھی نہیں دے سکتا ... ہر شخص نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ پتا نہیں ... تعلق کس شعبے سے تھا۔ اس نے عمدہ قسم کی گاڑی بھی رکھی ... وہ ایک ایسی نوجوان عورت تھی جس کے اخراجات بے حد ... تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے دو بچے بھی ساتھ لے کر آئی تھی ... تمام ضروریات پوری کرنا آرتھر کی ذمے داری تھی اور آئیور ... تھا کہ اس کی شہر میں ٹیکسیاں چلتی ہیں اور دواؤں کی ایک ... میں اس کا حصّہ بھی ہے میرا خیال ہے آئیور غلط کہہ رہا تھا ... اصل حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ مجھے معلوم کرنا ہو گا کہ وہ کس ... آدمی ہے مگر میرے ذرائع تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ میرے ... آرتھر کی طرف سے ایک پھانس سی چبھ گئی تھی اور اب ... آفتِ جاں لزی بھی مجھے مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ یہ بات ... شکوک کو اور بھی پختہ کرتی تھی کہ ایک امریکی لڑکی اپنے لیے ... جیون ساتھی کا انتخاب کرنے کے بعد باپ سے شادی کی ... مانگ رہی تھی اور باپ اسے اجازت دینے میں نہ صرف ... حجت کر رہا تھا بلکہ مجھے اپنے زیرِ احسان رکھنا چاہتا تھا۔

کی طرف سے دل میں غبار آیا تو میری روح

لزی لرز کر رہ گئی۔ اس کی معصوم صورت میری آنکھوں ... بھرنے لگی۔ میں ایک عرصے سے بھانت بھانت کے لوگوں ... بہت سہا تھا۔ طرح طرح کی شخصیتوں کو سمجھ اور پرکھ رہا تھا۔ ... بڑے فتنہ گر ملے تھے مجھے اس راہ میں۔ اور مجھے اس ... کا بھی بڑا تجربہ تھا۔ پھر وہ گربہ صفت ماجدہ میرے ذہن ... دریچے میں در آئی۔ کیسی بھولی اور معصوم نظر آتی تھی وہ میرے دل میں اس کے لیے کیسی ہمدردیاں سما گئی تھیں اور کیا کچھ نہ کیا تھا میں نے اس کی زندگی سے زہر نکالنے کے لیے۔ مگر وہ کیا نکلی تھی۔ اس نے کیسے کیسے چلتر دکھائے تھے مجھے اور کون سا حربہ نہ استعمال کیا تھا مجھے زیرِ دام لانے کے لیے۔ ایک وہ سروری خانم تھی۔ وہ آہو چشم، کیسی طرح دار تھی وہ بیگم آہو، کیا طنطنا دکھاتی تھی اور کیسے گن چھپے تھے اس حسین صورت کے پیچھے اور ایک وہ مسند آرا تھی۔ وہ صورت گر جس نے تصویروں میں رنگ بھرتے

بھرتے میری زندگی میں اپنا رنگ بھر دیا تھا مگر وقت کی دھوپ میں وہ رنگ بھی مدھم پڑتے پڑتے آخر ایسا گم ہوا تھا کہ بڑی دیدہ ریزی بڑی جستجو کے بعد کہیں کوئی ہلکا سا نشان نظر آتا تھا۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب اس پیکرِ جمال کا نام کانوں میں رس گھولتا محسوس ہوتا تھا اور اس سراپا ناز و انداز کے تصور سے دل کی دھڑکنیں یوں بے قابو ہو جاتی تھیں کہ باید و شاید۔ اس کے بعد اگر کسی بُتِ طناز نے میرے دل میں جل ترنگ بجائے تھے، میرے خرمنِ دل میں ہلچل پیدا کی تھی اور میری خزاں رسیدہ زندگی کو بہار آشنا کیا تھا تو وہ لزی تھی۔ معصوم اور مظلوم لزی۔ جس کا باپ کسی کے نازنین جلووں میں گم ہو کر اپنی پدرانہ شفقت کہیں گم کر بیٹھا تھا۔ یہ کوئی ایسی اچنبھے والی بات بھی نہیں تھی جس سے میں متاثر ہو گیا تھا۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ جب بھی کوئی گم کردہ جوانی کسی جواں سال بیوی کا روگ پالتا ہے تو اسے اپنی عمر کی طرف سے غافل رکھنے کے لیے بیوی کے لبوں پر مسکراہٹیں سجائے رکھنے کے سوا کسی کا ہوش نہیں رہتا۔ اسے اتنی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے کہ وہ کسی مرحوم و مغفور کی چھوڑی ہوئی اولاد کی جانب دھیان دے اسے تو ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کم عمر بیوی کو شوہرِ نامدار کی عمر کا حساب کرنے کا خیال نہ آ جائے، کہیں فرصت کا کوئی لمحہ کوئی خالی ساعت اسے اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ لہٰذا وہ اس طرف سے اس کا دھیان بٹائے رکھنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔

لزی کا باپ آرتھر بھی یہی کچھ کر رہا تھا۔ اگر لزی واقعی سچ بول رہی تھی، اگر اس کا دل ایسا ہی شفاف آئینہ تھا جیسا وہ مجھ پر ظاہر کر رہی تھی تو یہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو اس کے گھر میں اس کے ساتھ ہو رہا تھا لیکن وہ جس طرح اپنے باپ کے ساتھ میرے پاس سے رخصت ہوئی تھی، اس کے پیشِ نظر تو میرے دل میں بے شمار شکوک و شبہات کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ آرتھر کا ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ دیکھ کر حیران و پریشان ہونا میرے سینے میں بری طرح چبھ رہا تھا۔ اور یہی ایک بات لزی کو بھی مشکوک بنا رہی تھی۔ میں جس راہ کا مسافر تھا، وہاں جا بجا خندقیں کھدی ہوئی تھیں اور قدم قدم پر شکاری ہم رنگِ زمیں جال لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ایسے میں ذرا سی بھی غفلت اس کارخانۂ حیات سے میرا رشتہ منقطع کر سکتی تھی۔ میں کسی پر بھی آنکھ بند کر کے اعتماد کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ تصدیق اور تفتیش کے بغیر کسی کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں دے سکتا تھا۔ بیشک میں نے لزی کو اپنی نصف زندگی سونپنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اب میں خود اپنے اس عاجلانہ فیصلے پر حیران ہو رہا تھا اور اس بات پر اپنے رب کا شکر بجا لا رہا تھا کہ اس نے وقت کے ہاتھ سے نکلنے سے پہلے ہی مجھے اس سے نواز دیا تھا۔ اگر یہ وقت میرا ساتھ چھوڑ کر آگے نکل جاتا تو نہ جانے میں کس دلدل میں پھنسا اپنی بے بسی پر اشکبار ہوتا۔ میں ابھی بڑا ناپختہ تھا۔ مجھ میں دور اندیشی جیسی کوئی چیز ابھی تک پیدا نہ ہو سکی تھی۔ میں دھمن اور عالیہ جیسے موذی دشمنوں کا تو ہر طرح مقابلہ کر سکتا تھا۔ ان کی شاطرانہ چالوں کو ہو کر ایسی چالیں بھی چل سکتا تھا جن میں مات کا خوف نہ ہو مگر پسِ دیوار بیٹھے دشمن کو آہٹ سے پہچان لینے کا گر ابھی میں نہیں سیکھ سکا تھا۔

گو دھمن اور عالیہ اس بار ایک بالکل ہی مختلف روپ میں میرے سامنے آئے تھے۔ انھوں نے مجھ پر یہی ظاہر کیا تھا کہ جیسے انھوں نے میری دشمنی کھرچ کھرچ کر اپنے دلوں سے نکال دی ہے اور اب وہاں میرے لیے ہمدردی اور پُرخلوص محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ قطعی نہیں رہا ہے مگر میں ان کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ انھوں نے انھیں کہاں کہاں اور کیسے کیسے چرکے دیے ہیں اور یہ کہ جیسے شیطان کی لغت میں معافی یا درگزر جیسا کوئی لفظ نہیں ہے اس بار اس نے مجھ پر گل و گلزار عالیہ کا پھندا پھینکا تھا کی قینچی سے میرے بال و پر کتر کے مجھے قوتِ پرواز سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ جواب میں میں نے بھی اپنے پر سمیٹ کر خود کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ مقصد میرا صرف یہ تھا کہ میں کسی طرح پاکستان واپس پہنچ جاؤں پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے اپنے طرزِ عمل سے عالیہ کو اس حد تک ہموار کر لیا تھا کہ اسے میری حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی تھی اور اس نے پُرخلوص محبت کا اظہار اس طرح کیا تھا کہ اپنی وہ نہایت قیمتی اور عجوبہ قسم کی انگوٹھی مجھے دے دی تھی۔ مگر میں جانتا تھا وہ لوگ میرے ذریعے جو کچھ حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے، وہ اس انگوٹھی کی قیمت سے کہیں زیادہ تھا۔ اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خلوص اور محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس وقت اگر ان سے میں آرتھر اور لزی کے بارے میں حقیقتِ حال جاننے کی کوشش کرتا تو وہ لوگ ان کے بارے میں ذرا ذرا سی تفصیل بھی بتا دیتے۔ بشرطیکہ وہی کچھ ہوتے جو میں انھیں سمجھ رہا تھا۔ مگر اس وقت میں ان سے بھی کچھ نہیں معلوم کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے خود اپنے لیے انھیں اجنبی بنا لیا تھا۔ اوّل تو مجھے یقینِ کامل تھا کہ اگر میں انھیں فون کروں گا تو دوسری طرف سے یہی جواب ملے گا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ دوسرے میں نے گریگری اور ڈاکٹر کو جو کچھ بتایا تھا، اس میں سے دھمن اور عالیہ کے نام نکل اڑا گیا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں انھیں یہاں کسی معاملے میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر میں منشیات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں ان کے بھی نام لے دیتا تو گریگری انھیں زمین کے نیچے سے بھی کھود نکالتا اور جرم ثابت ہونے کے بعد عدالت انھیں لمبی سزا میں دیتی۔ ان کے ختم ہونے کا انتظار کرتے کرتے میرا انتقام خود ہی ختم ہو جاتا۔ میرے دل میں پیوست کانٹے کے تیوں رہ جاتے اور میں بے بسی سے ہاتھ ملتا ہی رہ جاتا یہ بھی ممکن تھا کہ میں ان کے جیل سے باہر آنے تک اپنی طبعی عمر تمام کر چکا ہوتا تو ان کا سارا حساب کتاب، تمام کا تمام بہی کھاتہ میرے ساتھ ہی چلا جاتا اور میدانِ حشر میں تو مجھے اپنے اعمال کا حساب دینے سے ہی فرصت نہ ملتی پھر میں ان سے کب اور کہاں حساب کتاب کرتا۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ انھیں امریکا کی پولیس سے بچائے رکھوں۔ انھیں میں اپنے لیے محفوظ کر لوں۔ تاکہ سارا مول تول یہیں اسی جہان میں چکتا ہو جائے اور دوسرے جہان کے لیے بس اپنا اعمال نامہ ہی باقی رہے۔ میں نے انھیں بڑی مہارت اور بڑی خوبی سے شیشے میں اتارا تھا اور اسی اعتبار کی بوتل میں بند کر کے انھیں دوبارہ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ دھمن نے کہا تھا کہ وہ محض میرے لیے اپنا لاہور کا مکان بیچ کے اور سارا کاروبار سمیٹ کر سان فرانسسکو میں آ بسا ہے۔ میں اس کے دل سے یہ کانٹا دھو کر اسے ایک بار پھر پاکستان لے جا کر اور ان کی بوٹیاں کاٹ کر انھیں اپنی مظلوم بہن آسیہ کے آگے ڈال دینا چاہتا تھا۔ میری اس معصوم اور پاک باطن بہن کو انسانی لہو کا چسکا انھی لوگوں نے لگایا تھا اور میری خواہش تھی کہ وہ اپنی پیاس انھی کے خون سے بجھائے اور پھر ان کی بوٹیاں بنا کے کتوں اور مردار خور جانوروں کی دعوت کا اہتمام کر ڈالے۔ یہ سب تو بعد کی باتیں تھیں، ابھی میں لزی کے مسئلے پر سوچ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی زلف کی زنجیر سے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ میں اس کے حضور پابہ جولاں کھڑا تھا اور یہ فکر دامن گیر تھی کہ کسی طرح اس کی جانب سے میرے دل کا غبار صاف ہو جائے۔ کاش اس کے دل کا شیشہ ایسا ہی شفاف ہو جیسا وہ ظاہر کرتی ہے۔ مگر میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جو مجھے اس سرو سمن کی صحیح شکل و صورت دکھا سکتا۔ میری دلی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ لزی کا دامن کسی خاردار جھاڑی میں الجھا ہوا نہیں ہے۔ وہ کسی کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب سے میں نے اس دھرتی پر پاؤں ٹکائے تھے، میرا واسطہ ایسے ہی لوگوں سے پڑتا رہا تھا جو میری چاہت کا دم بھی بھرتے تھے اور میرے بارے میں دوسروں کو اطلاعات بھی پہنچاتے تھے۔ اس ذلیل سافنر اور کفلر ہی کو لے لیجیے۔ میں نے ان کتوں کی کتنی مدد کی تھی۔ اس سافنر کو انتھونی کے بھیجے ہوئے غنڈے لانسر سے بچایا تھا اور ان کے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے ان کی دسترس سے نکلنے نہیں دیے تھے اور اس کا صلہ ان لوگوں نے مجھے یہ دیا تھا کہ وہ ذلیل سافنر میرے بارے میں عالیہ کو خبریں پہنچاتی رہی تھی۔ میرے ایک ایک لمحے، ایک ایک ساعت سے اسے باخبر رکھے ہوئے تھی اور وہ کھوتے دا پُتّر کفلر، کمینہ کس معصومیت سے انجان بن کر مجھے ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچا گیا تھا۔ وہ تو عالیہ پر میرا کچھ ایسا جادو چل گیا تھا کہ اس نے مجھ پر ان کی حقیقت واضح کر دی۔ ورنہ میں تو ہمیشہ انھیں اپنا ہمدرد ہی سمجھتا رہتا اور جب بھی کبھی دھمن وغیرہ سے بگاڑ ہوتا اور مجھے ان سے بچنے کے لیے کسی جائے پناہ کی ضرورت ہوتی تو سیدھا ان بھیڑیوں کی بھٹ میں جا گھستا اور انجانے میں دشمن کے لیے لقمۂ تر بن جاتا۔

میں لزی سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بالمشافہ گفتگو کر کے اس کے بارے میں اپنی خلش کو دور کرنا چاہتا تھا مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک اس کا باپ آرتھر گھر میں موجود تھا۔ وہ مجھے لزی تک کبھی نہیں پہنچنے دیتا۔ بہت ہی شوریدہ سر اور شورہ پشت قسم کا آدمی تھا وہ آرتھر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے مجھے زبردست ٹکر لینا پڑے گی لیکن مشکل یہ تھی کہ ابھی تک میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ میرے اور آرتھر کے ٹکراؤ کی صورت میں لزی میرا ساتھ دے گی یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میرے مقابلے میں اپنے باپ کو ترجیح دے...... اگر ایسا ہوا تو میں آرتھر پر کبھی فتح نہیں پا سکوں گا۔

میں ابھی اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ کمرے کے باہر سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب کون آ گیا ہے؟ میں نے سوچا اور پھر دروازے پر نمودار ہونے والے شخص کو دیکھ کر بوکھلا کے

کھڑا ہوگیا۔ وہ آرتھر تھا۔ لزی کا باپ آرتھر جو کچھ ہی دیر قبل لزی کو تقریباً گھسیٹتا ہوا میرے پاس سے لے گیا تھا۔

وہ اندر آکر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بیٹھو، میں لزی کے سامنے تم سے کھل کر گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اسے گھر چھوڑ آیا ہوں۔"

میں حیران حیران نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چند لمحے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میز پر رکھی ہوئی چائے کو جو لزی ہمارے لیے بنا کر لائی تھی اور ان کے جانے کے بعد جسے میں نے بھی ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا تھا، دیکھتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "مسٹر غلام جیلانی! حیران بعد کو ہو لینا پہلے اپنے اور میرے لیے ایک ایک کپ چائے بناؤ۔ کمال ہے بھئی تم نے تو ابھی تک اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

میں نے اسے اس طرح مسکرا کر باتیں کرتے دیکھا تو میری حیرانی دوچند ہوگئی۔ واپس آنے کے بعد تو اس کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری اس سے بہت پرانی شناسائی رہی ہو۔ میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ وہ مجھے میرے اصل نام غلام جیلانی سے مخاطب کر رہا تھا۔ جبکہ میں نے اسے اپنے بارے میں کوئی بھی صحیح بات نہیں بتائی تھی۔ یہاں تمام ہی لوگ مجھے غیاث احمد کے نام سے جانتے تھے اور اسی نام سے مجھے مخاطب کرتے تھے۔ آرتھر سے بھی میرا تعارف غیاث احمد کی حیثیت سے ہی ہوا تھا۔ پھر اسے میرا اصل نام کیونکر معلوم ہوا۔ اگر اسے میرا نام معلوم ہوگیا تھا تو یقیناً میرے بارے میں اور بھی نہ جانے کیا کیا کچھ جان گیا ہوگا وہ۔

میں نے بمشکل اپنی دلی کیفیت پر قابو پا کر پیالے کی ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر آرتھر! میں حیران ہوں کہ آپ مجھے میرے اصل نام غیاث احمد کے بجائے ایک بالکل ہی نئے نام غلام جیلانی سے کیوں مخاطب کر رہے ہیں؟"

"اس لیے مسٹر غلام جیلانی کہ تم نے مجھ سے خود کو اسی نام سے متعارف کرایا ہے۔" آرتھر نے شوخ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے!" میں چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے ایسا کب کیا مسٹر آرتھر! مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کبھی خود کو غلام جیلانی کہا ہو۔"

ہاں، تم نے کہا تو نہیں لیکن تم نے جو ڈرافٹ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے دکھایا تھا، وہ غلام جیلانی ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈرافٹ تمہارے نام کا ہے اور اس میں درج رقم تمہاری ہی ملکیت ہے۔ اگر تمہاری وہ بات پ[...] تو اس کا مطلب صاف ہے کہ تمہارا اصل نام غلام جیلانی [...] اور تم بعض مصلحتوں کی بنا پر غیاث احمد کے نام سے امریکا میں [...] ہوئے ہو۔ کیوں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ مجھے قدم قدم پر حیرتوں کے سمندر میں غوطے دینے پر تلا بیٹھا تھا، وہ سچ کہہ رہا تھا اور یہ سچ اس تک کیسے پہنچا تھا، یہ بات میرے لیے باعث تشویش بھی تھی اور باعث حیرت بھی۔ وہ ڈرافٹ تو دھمن نے مجھے دیا تھا اور اس پر میرا نام غیاث ہی تھا پھر یہ کون تھا جو ڈرافٹ دیکھتے ہی میری اصلیت سے واقفیت کا اعلان کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ میرے بارے میں اور کیا کیا جانتا تھا۔ اب میں ایک نئی الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔ [...] میری حقیقت سے وہ پوری طرح باخبر تھا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا اور لزی جس کی چاہت میں اندھا ہو کر عقل و ہوش سے بے گانہ ہو کر میں اسے ڈرافٹ دکھانے کی غلطی کر بیٹھا تھا، میری دسترس سے بہت دور چلی جاتی۔ اس میں تو شک شبہے کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ میرے بارے میں سب کچھ جان[...] کے بعد آرتھر کبھی لزی کو مجھ سے شادی کرنے کی اجازت نہ دے[...] بلکہ وہ تو مجھے کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھنے دے گا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے مسٹر غلام جیلانی؟" آرتھر مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"جی کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں دراصل..."

"تم یہ سوچ رہے تھے کہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے کیا [...] سنائی جائے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ [...] اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر جیلانی! [...] نہ ہی میں تم سے کچھ پوچھوں گا کیونکہ میں اس غلام جیلانی کو [...] اچھی طرح جانتا ہوں جس کی جستجو میں پاکستان بھر کی پولیس پریشان ہے۔ جس نے ڈاکٹر دھمن کی دشمنی میں جرائم کی ایسی پرد[...] ہے کہ اب وہ کسی طرح اس سے اتاری نہیں جاتی۔ تم دھمن سے [...] لینے کی دھن میں مصائب کی دلدل میں اتر گئے ہو۔ جرائم [...] کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس میں تم بری طرح [...] گئے ہو اور وہی ڈاکٹر دھمن تمہاری یہاں آمد کا سبب بنا[...] اس نے تمہارے ذریعے کروڑوں ڈالر کی افیون امریکا اسمگل [...] اور یہ ڈرافٹ تمہیں اسی خدمت کے صلے کے طور پر دیا گیا [...] کیا خیال ہے، میں نے کوئی بات غلط تو نہیں کہی؟"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا۔ [...] زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ الفاظ میرے حلق میں اس بر[...] پھنس کر رہ گئے تھے کہ کسی طرح اگلے ہی نہیں جا رہے تھے۔

[...]ی بڑا ہی پرانا پاپی معلوم ہوتا تھا۔ ہزاروں سال پرانا، زمانے کا [...]د سرد چشیدہ۔ جس کی آنکھیں یا تو آدمی کے اندر اتر کر اس کے [...]ی کی ساکت و سامت جھیل کو اتھل پتھل کر کے رکھ دینے کی [...]حیت سے مالا مال تھیں یا پھر اس کے ذرائع لامحدود تھے۔ [...]نے وسیع ذرائع کا مالک تھا وہ کہ پاکستان جیسے چھوٹے اور ترقی پذیر [...]ہاں میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھی ہر دم [...]خبر رہتا تھا۔ آخر وہ تھا کیا شے؟ اس کی باتوں سے یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ نظر آتا ہے، وہ ہے نہیں۔ اس کی اصلیت [...]کچھ اور ہی ہے۔ کوئی بڑا سمندر قسم کا آدمی ہے وہ۔ میرے سامنے وہ جس طرح آہستہ آہستہ اپنا ایک ایک بل کھولتا جا رہا تھا، اس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا اور جلد ہی میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ وہ جس قدر آہستگی اور غیر محسوس طریقے سے اپنے بل کھولتا جا رہا ہے، اسی قدر ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ میرے گرد جال بنتا جا رہا ہے۔ ابھی اس نے مجھ پر اپنی باخبری کا پھندا ڈالا تھا اور اس مہارت سے ڈالا تھا کہ میرے لیے اس نے بچ کر نکل جانے کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

میں حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے اور دیدے نچانے کے سوا کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا اور وہ اپنی کامرانی پر شاداں و فرحاں مضحکہ اڑانے والی شوخی آنکھوں میں سمیٹے میرے تڑپنے کا نظارہ کر رہا تھا۔

میری خاموشی نے اسے میرے گرد جال بننے کا موقع فراہم کیا۔ "تمہاری خاموشی اور حیرانی دلیل ہیں اس بات کی کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے تمہیں اس سے اختلاف نہیں ہے۔ تم تسلیم کر رہے ہو کہ میری معلومات غلط نہیں ہیں۔"

میں نے کمزور سا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ "میں حیران ہوں مسٹر آرتھر! کہ آخر ان باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ آپ اس طرح کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں، میں سمجھ نہیں سکا؟"

"بہت خوب۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم آخر دم تک دفاع کرنے پر یقین رکھتے ہو۔ آدمی کو امید کا دامن کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور اپنے بچنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ دشمن کے مضبوط ترین حصار میں بھی کسی ایسے روزن کی تلاش جاری رکھنا چاہیے جہاں سے تازہ ہوا اور روشنی حاصل کی جا سکے۔ بہرحال اس وقت تمہارے لیے یہی مناسب ہے کہ تم

ہتھیار پھینک کر خود کو میرے حوالے کر دو اور یہ یقین کر لو کہ مجھ سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس وقت تک جب تک تم مجھ سے تعاون کرتے اور میری ہدایات پر عمل کرتے رہو گے۔" اس نے بڑے شفیق لہجے میں کہا۔

"کس طرح کا تعاون؟ کون سی ہدایات؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہدایات جو تمھیں میری طرف سے وقتاً فوقتاً ملتی رہیں گی سب سے پہلے تو تمھیں پاکستان جا کر دھمن سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟ یعنی تم... تم بھی... دھمن اور عالیہ کے ساتھی ہو؟"

"ایک اعتبار سے تم یہ کہہ سکتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ اب جبکہ ہمارے درمیان سے تمام پردے اٹھ رہے ہیں، تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے، پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟" میں زچ ہو کر بولا۔

"نہیں مسٹر غلام جیلانی! ابھی نہیں۔ ہمارے درمیان سے ابھی کوئی پردہ نہیں اٹھا ہے۔ صرف تم بے نقاب ہوئے ہو، میرے بارے میں تم اب بھی کچھ نہیں جانتے اور اندازے لگانے کے سوا کوئی بات اتنے یقین سے نہیں کہہ سکتے جتنے پُراعتماد طور پر میں نے تمھاری روداد بیان کی ہے۔" اس نے تضحیک آمیز انداز میں اس طرح کہا کہ میرا سر جھک گیا۔

میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر پوچھا۔ "تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

"ابھی تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمھیں دھمن نے جو کام بتایا ہے، اسے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرو۔" اس نے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ تم دھمن کے ساتھی ہونے کا اعتراف بھی نہیں کر رہے ہو اور مجھے اس کا ساتھ دینے پر مجبور بھی کر رہے ہو۔ کیا اس کی وجہ بتانا پسند کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ میں دھمن کا ساتھی نہیں ہوں۔ میرا یا ان لوگوں کا جن کے لیے میں کام کر رہا ہوں، دھمن یا اس کے کسی بھی کارندے سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر بھی ہم لوگ نہ صرف ان کی حمایت کرتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر سامنے آئے بغیر ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے بے حد مفید، بہت کارآمد ہے۔"

"اور تمھارے مقاصد کیا ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمارے مقاصد۔" وہ ایک بار پھر شرارت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ "ہمارے مقاصد بہت عظیم ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

بڑا عجیب معمّا آدمی تھا وہ۔ صاف چھپتا بھی نہیں تھا اور سامنے آنے سے بھی کتراتا تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان شیش ناگ قسم کے لوگوں سے الجھنا کبھی فائدہ مند نہیں ہوتا۔ ان سے جس قدر دور رہا جائے اتنا بہتر ہے ورنہ کبھی نادانستگی میں ان کی دُم پر پیر پڑ جائے تو یہ پلٹ کر ڈس لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔ مجھے بھی اس وقت کیسے کیسے لوگوں کے درمیان اچھالتا پھر رہا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ سیدھی سادی اپنوں کی ستائی ہوئی لزی کو بیوی بنا کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا اور اپنی گلبرگ والی کوٹھی میں لے جا کر سجا دوں گا تو اس عالی شان کوٹھی کی آب و تاب دو چند ہو جائے گی۔ لزی جیسے حسن و جمال کے مجسمے اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے عالی شان محلوں کی زیب و زینت میں اضافہ کیا جا سکے۔ مگر یہ آرتھر تو کچھ شے ہی عجیب ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "مسٹر آرتھر! جب کہ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، ایسی صورت میں کیا میں یہ سمجھ لوں کہ لزی میرے لیے شجرِ ممنوعہ ہے؟"

"تمھارا کیا خیال ہے؟ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" اس نے الٹا مجھ سے ہی سوال کر ڈالا۔

"اگر ایمانداری سے پوچھیں تو میرا جواب نفی میں ہوتا۔ میں ایسے شخص کو اپنی بیٹی سے شادی کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن میرا جواب نفی میں نہیں ہے۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو میں لزی کو تم سے شادی کرنے کی اجازت دے دوں گا۔ مگر تم جلد بازی سے کام نہیں لو گے۔ لزی ایک باشعور لڑکی ہے۔ پہلے وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے۔ اس دوران تم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ بھی لو گے۔ اس کے بعد اگر تم دونوں اپنے موجودہ فیصلے پر قائم رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن شرط یہی ہے کہ شادی سے پہلے اور بعد میں تم ہمیشہ ہمارے کام آتے رہو گے۔" آرتھر نے کہا۔

میرا دل بے پناہ مسرتوں سے لبریز ہو گیا۔ میرے سارے شکوک و شبہات مٹی کے گھروندے کی طرح مسمار ہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لزی میری ملکیت قرار دے دی گئی ہے

احساس مجھے سرشار کیے دے رہا تھا۔ آرتھر نے مجھے ...ی قوت، ایک نیا ولولہ عطا کیا تھا اور میں خود میں ساری ...رنگوں کر دینے کا حوصلہ بیدار ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ میرے ...ے یہ خیال بھی محو ہو گیا تھا کہ آرتھر مجھ سے کیا کام لینا ...ہے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود ...ی کو میری زوجیت میں دینے کے لیے آمادہ کیوں ہے؟ ...ہی اب یہ خیال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ اسے میرے ...میں اتنی ڈھیر ساری معلومات کہاں سے دستیاب ہو ...وہ کون سا ذریعہ تھا جس نے اسے سات سمندروں سے ...رے ایک نہایت دور دراز برِاعظم میں میرے روز و شب ...ک ٹھیک اطلاعات بہم پہنچائی تھیں۔ میرے دل کا سارا ...غبار چھٹ گیا تھا اور لزی کو پا لینے کے مسرت افزا احساس ...ا کوئی دوسری بات میرے دل و دماغ میں سما ہی نہیں ...تھی۔

شاید میرے چہرے پر میرے دلی جذبات رقم ہوتے ...ہے تھے اور آرتھر میری اندرونی کیفیات کو پڑھ رہا تھا۔ ...اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آ کر میرا شانہ تھپتھپاتے ...ہوئے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تمھارے چہرے کی یہ شادمانی ہمیشہ ...رہے اور اگر تم میرے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے ...میں اس کی ضمانت دینے کو تیار ہوں کہ تمھارا دل ہمیشہ مسرتوں ...سے بھرا رہے گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔"

میں نے اسے رخصت کرنے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مسٹر آرتھر! وہ پولیس... کیا وہ لوگ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے؟"

"تم اس کی فکر مت کرو، اب یہ ہمارا کام ہے کہ جتنی جلدی ...ہو سکے، ہم تمھیں پاکستان پہنچا دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ ...پولیس افسر تمھیں زیادہ پریشان نہ کرے اور جلد ہی قانونی طور ...پر تمھیں واپس جانے کی اجازت مل جائے۔" اس نے مجھے ...اطمینان دلایا۔

"لیکن اگر انھوں نے پھر بھی مجھے جانے کی اجازت نہ ...دی تو؟" میں نے شبہ ظاہر کیا۔

"تمھیں یہ شبہ کیوں ہے کہ وہ تمھیں جانے نہیں دیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"شبہ ہی نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجھے منشیات ...کی اسمگلنگ کے معاملے میں پھانس کر کوئی لمبی سزا دلوانا چاہتا ...ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر بھی تمھیں خوف زدہ یا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے تمھیں کسی چکّر میں پھانسنے کی کوشش کی تو ہم کوئی اور راستہ پیدا کریں گے۔ بہرحال اب تمھیں یہاں سے بحفاظت پاکستان پہنچانے کی ذمّے داری ہماری ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بڑی دیر تک صوفے میں دھنسا مستقبل کے سہانے خواب بُنتا رہا۔ میرا تصور مجھے آسمانوں میں اڑائے پھر رہا تھا۔ زمین پر میرے قدم ٹکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ لزی کا تصور ایسا حسین، ایسا پُرکیف تھا تو اس کا قرب کتنا سحر انگیز ہوتا۔ فون کی گھنٹی نے مجھے زیادہ دیر پرواز نہیں کرنے دی۔ اس کی کرخت آواز نے لمحوں میں مجھے زمین پر لا پھینکا تھا۔ میں نے بڑی خونخوار نظروں سے فون کو گھورا جو وقفے وقفے سے دم لے لے کر مجھے اپنی جانب بلا رہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا لیکن دوسری جانب سے جو چہکتی لہکتی رس بھری آواز میری سماعت میں جرعہ جرعہ امرت انڈیل رہی تھی، اس نے میری رگوں میں حرارت سی دوڑا دی تھی۔ میرے کانوں کے ذریعے جو امرت رس میری روح میں اتر رہا تھا، اس نے میری حالت ہی کچھ سے کچھ کر دی تھی۔ وہ سیمیں بدن شیریں سخن مجھے پکار رہی تھی۔ میں نے فوراً اس کی آواز پر لبیک کہا تو وہ ہزار ناز و انداز سے اپنی آواز میں رس بھر کر اٹھلائی۔ "کیا بات ہے جنابِ عالی! کیا پاپا نے آپ کا منہ شہد سے بھر دیا ہے کہ آواز ہی نہیں نکل رہی ہے؟"

میں نے ہزار جان سے قربان ہو جانے والا انداز اختیار کیا۔ "اوہ لزی! تمھارے پاپا بڑے عظیم انسان ہیں۔ بہت گریٹ آدمی ہیں وہ۔ انھوں نے آج کمال ہی کر دیا۔ تم خواہ مخواہ ہی ان کی طرف سے بدظن رہتی ہو۔ حالانکہ وہ تو بڑے ہی مہربان انسان ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے انھوں نے آپ کو کچھ گھول کر پلا دیا ہے کہ یوں ایک دم ان کی شان میں رطب اللسان ہو گئے ہیں۔"

"ہاں، لزی! تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ انھوں نے مجھے ایسا مفرحِ قلب اور راحتِ روح شربت پلایا ہے جس نے میری کایا ہی پلٹ دی ہے۔" میری چہکار جاری تھی۔

"واہ بھئی واہ، کمال ہو گیا آج تو جنابِ عالی! معلوم ہوتا ہے ہفت افلاک کی سیر کر رہے ہیں اس وقت آپ۔" اس نے بڑی نستعلیق اردو میں کہا تھا۔

"تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ اس وقت تو میں ساتویں آسمان سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔"

"اچھا تو اب زمین پر واپس آجائیے رانجھا جی! اور میںنوں وی دسو کہ گل کی اے؟" اس نے اردو اور پنجابی کا ملغوبہ تیار کر دیا۔

جواب میں میں نے آرتھر سے اپنی گفتگو کے وہ خاص خاص حصے اسے سنا دیے جو میرے اور اس کے متعلق تھے۔ درمیان سے وہ تمام باتیں غائب کر دیں جن کا تعلق آرتھر اور میری زیرِ زمین سرگرمیوں سے تھا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے اپنی سرگرمیاں اس پر ظاہر نہیں ہونے دی تھیں۔ آرتھر کے بارے میں تو میں بھی ہنوز نابینا تھا۔ اتنی طویل اور مفصل گفتگو کے بعد بھی میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ کسی خفیہ تنظیم کا رکن ہے جو اپنے کسی خاص مقصد کے لیے یہاں جرائم کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ وہ کون ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خود مجھے نہیں معلوم تھا تو میں اسے کیا بتاتا؟

خود آرتھر نے میرے پاس سے جانے کے بعد لزی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری زبانی اپنے باپ کا فیصلہ سن کر ایک دم خاموش ہوگئی تھی۔ میں سمجھا کہ شاید اسے اس فیصلے سے اتفاق نہیں ہے۔ شاید وہ مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی اور اب اپنے باپ کا فیصلہ سن کر حیرانی سے گنگ ہوگئی ہے۔ میں نے بے تابانہ اسے پکارنا شروع کر دیا۔

"ہیلو لزی! ہیلو... بولو نا، تم اچانک خاموش کیوں ہوگئی ہو، کیا تمھیں میری باتوں سے دکھ پہنچا ہے؟"

"اوہ نہیں، ایسے مت سوچیں جنابِ عالی! مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے آپ کی بات سے۔ اتنی خوشی کہ اس پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاپا اتنی آسانی سے مان جائیں گے۔ یہ سب آپ کی شخصیت کا کمال ہے جنابِ عالی! آپ کے سامنے نہ جانے کیوں آدمی کا سارا تن بھن جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا جاتا ہے۔" اس نے لرزتی کانپتی آواز میں میرا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"دیکھیں، اب آپ مجھے بنائیں نہیں، آج تو میرے لیے جشنِ مسرت کا دن ہے اور ایسے خوشی کے موقع پر بس خوشیاں ہی سمیٹنے دیں مجھے۔" میں نے اسے قصیدہ گوئی سے روک دیا۔

"چلیے، اگر آپ کہتے ہیں تو میں کچھ نہیں کہتی۔ آپ کے حکم سے زبان بند کیے لیتی ہوں جنابِ عالی!" اس نے خالص مشرقی بیویوں والے انداز میں کہا۔ میرا دل اس کے اس انداز پر باغ باغ ہوگیا۔

میں نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ "عالی! ... کیا آپ اس وقت میرے ساتھ کہیں باہر چل سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں سر غیاث احمد! آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے اس وقت۔" اس نے بھی جواب میں میرا ہی انداز اختیار کیا تھا۔

"تو پھر میری درخواست ہے کہ آپ ان سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میرے ہاں تشریف لے آئیں جن کے ذریعے کسی عاشقِ نامراد کو رقصِ بسمل پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے جنابِ عالی! اگر آپ اپنی نثری شاعری سنانے کے لیے مجھے کہیں لے جانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ فون پر ہی اپنا یہ شوق پورا کریں۔ کیوں مجھے شارعِ عام پر تماشا بنانا چاہتے ہیں۔" وہ شاید شرم سے گلنار ہوگئی تھی۔

مجھے بڑی کوفت ہوئی کہ میں نے ایسے گل دگلزار قسم کے الفاظ فون پر استعمال کر کے ضائع کر دیے تھے۔ اگر وہ میرے سامنے ہوتی تو میں اسے یوں بیر بہوٹی بنتے دیکھ کر خاصا محظوظ ہوتا اور اب وہ مجھ سے اس کی ضمانت طلب کر رہی تھی کہ میں اس کے سامنے اسے گلگوں بنا دینے والے الفاظ کا استعمال نہ کروں۔ میرے پاس اب یہ ضمانت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

میں نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ سوچا تھا لزی کے ساتھ باہر نکلوں گا تو کسی چھوٹے سے پُرسکون ریسٹورنٹ میں جا بیٹھوں گا جہاں رومان پرور نیم تاریک ماحول میں لزی کی آواز میرے کانوں میں چاندی کی پُرکیف گھنٹیاں بجاتی رہے گی تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا لیکن میں جیسے ہی اس بُتِ طناز کی ہمراہی میں مکان کے بیرونی گیٹ سے باہر آیا، دائیں بائیں دونوں جانب سے دو قوی ہیکل جوان لپکتے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ گو دونوں کی کمر سے بندھے ہولسٹروں میں ریوالور موجود تھے مگر انھوں نے انھیں ہاتھ لگانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اور لزی نے ایک ساتھ چونک کر انھیں دیکھا۔ ان میں سے ایک نے نہایت نرم و مہذب انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں جناب؟"

مجھے ان کا اس طرح راہ روک کر کھڑے ہو جانا ہی ناگوار گزرا تھا، اس کے سوال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے تلخی سے اردو میں کہا۔ "تیرے ماموں کی فاتحہ میں جا رہے ہیں۔ اوئے تو کون ہے بھئی ہمیں پوچھنے والا؟"

میرا جواب سن کر لزی کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ "جنابِ عالی! یہ پولیس کے آدمی ہیں، ان سے اس طرح نہ بولیں۔"

سوال کرنے والا جوان میری بات تو نہیں سمجھ سکا تھا لیکن انداز دیکھ کر وہ بری طرح ٹپٹا گیا تھا۔ اس نے بوکھلائے انداز میں کہا۔ "جی، کیا کہا آپ نے جناب؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی لزی بول پڑی۔ "ہم ذرا باہر جا رہے ہیں۔ یہ غیاث احمد کچھ دیر تفریح کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ سوری، جناب! غالباً مسٹر گریگری آپ کو بتا چکے ہیں کہ اطلاع دیے بغیر آپ کہیں نہ جائیں۔ کیا آپ انھیں مطلع کر چکے ہیں؟" اس کا اندازِ گفتگو اب بھی شائستہ تھا۔

"تو کیا میں ان کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل بھی نہیں سکتا؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"جناب! آپ سے میری بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔" اس کے لہجے میں انکسار ہنوز موجود تھا۔ "میں نے اطلاع دینے کے لیے کہا ہے، اجازت لینے کے لیے نہیں۔ کہیں جانے سے پہلے آپ کو مسٹر گریگری یا مسٹر ہمفرے کو مطلع کرنا ضروری ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ تم امریکی لوگ مارتے بھی ہو تو اس طرح کہ پٹنے والے کو اس کا احساس نہ ہو سکے۔ کیا تم مجھے مہذب اندازِ گفتگو سے یہ نہیں سمجھا رہے ہو کہ میں یہاں قید ہوں، مجھے باہر نکلنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ تمھارے افسران نے مجھے تھانے کی حوالات میں بند کرنے کے بجائے اس مکان میں محصور کر دیا ہے۔" میں نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

"اوہ نہیں جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہم نے تو ایسا آپ کی حفاظت کے خیال سے کیا ہے۔ آپ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو کسی وجہ سے آپ کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔"

اس کی بات سُن کر مجھے بھی احساس ہوا کہ مجھے اس طرح لزی کو ساتھ لے کر گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ وہ سچ کہہ رہا تھا، اس وقت باہر نکل کر میں خود کو خطرات کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ وہ لوگ جو ایک بار مجھے چوہے کی طرح جال میں پھنسا کر بے بس کر چکے تھے، انھوں نے لزی کے بارے میں کچھ خیالات کا اظہار تو نہیں کیا تھا۔ کیا ہوا اگر وہ اب دوبارہ مجھ پر جال ڈالنے نہیں آسکتے تھے۔ ان کے دوسرے ساتھی تو ایسے تھے جن تک ابھی پولیس کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ ان کا وہ پسِ دیوار بیٹھا چیف ابھی محفوظ تھا اور اس نے میرے لیے نہ جانے کتنے کتے اِدھر اُدھر چھوڑ رکھے تھے۔ جو نہ جانے کہاں کہاں کن کن گوشوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے اور موقع ملتے ہی میری کوچیں کاٹ کر میرے سارے کے سارے بل نکال دینا چاہتے تھے اور اگر میرے ساتھ لزی بھی ان کے ہاتھ لگ جاتی تو یہ تو ان کے لیے بونس ہوتا، وہ اس کے ساتھ جو سلوک کرتے، اس کے تصوّر ہی سے میں لرز کر رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت تو عالیہ کی دی ہوئی وہ محافظ انگوٹھی بھی میرے ہاتھ میں نہیں تھی جو دور مار ہتھیاروں کے منہ بند کر دیتی ہے اور کسی انجان اور تاریک گوشے سے میری طرف روانہ کی جانے والی گولیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ وہ انگوٹھی میں نے گریگری اور ہمفرے کی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے بستر میں گدّے کے نیچے چھپا دی تھی اور بعد میں اسے وہاں سے نکال کر انگلی میں ڈالنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس جوان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "شکریہ دوست! شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مجھے اس طرح گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ اس اجنبی شہر کے ناآشنا گلی کوچے مجھے کہیں بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔"

پھر میں نے لزی کو واپس چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ لزی! ہم واپس چلیں۔ پوشیدہ اور انجانے دشمنوں کے درمیان مجھے اس طرح تمھارے ساتھ باہر نہیں پھرنا چاہیے۔"

میں لزی کا بازو تھام کر واپس مڑ گیا تو وہ دونوں جوان میرے اس تعاون کا شکریہ ادا کر کے اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے لزی سے کہا۔ "یہ تو بڑی مشکل ہوگئی۔ اب میں رات کا کھانا کہاں سے کھاؤں گا؟"

"اوہ، اتنی سی بات کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سر غیاث احمد! کھانا میں ابھی آپ کے لیے تیار کر دیتی ہوں۔" لزی نے شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے چٹکی بجائی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چل رہا ہوں۔ کچن میں تمھارا ہاتھ بٹاؤں گا۔"

"نہیں نہیں، سر غیاث احمد! آپ ایسا نہ کریں۔ میں جانتی ہوں، آپ کے ملک میں مرد کچن کا کام نہیں کیا کرتے۔ آپ بھی یہ کام مجھے تنہا ہی کرنے دیں۔ میں بس یوں کھانا تیار کر لیتی ہوں۔" اس نے ایک بار پھر انگوٹھے اور درمیانی انگلی کی مدد سے چٹکی بجائی اور مجھے واپس جانے کا اشارہ کر کے بولی۔ "آپ جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں، میں بس چند منٹ میں

آپ کو کھانے کی میز پر بلالوں گی۔"

میں نے ہنس کر کہا: "آپ تو مکمل طور پر خاتونِ مشرق بننے پر آمادہ نظر آتی ہیں لزی بیگم! یعنی میرا مطلب ہے کہ محترمہ بیگم الزبتھ غیاث احمد!"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی: "آپ آدمی خاصے زندہ دل ہیں سر غیاث احمد! میرا خیال ہے کہ آپ کی بیگم بن کر میں کچھ زیادہ نقصان میں نہیں رہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا: "تو کیا آپ کا خیال ہے، آپ کوئی نقصان کا سودا کر بیٹھی ہیں؟"

"ابھی قطعی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا کہ سودا منافع کا ہے یا نقصان کا۔ ابھی تو محض اندازے ہی لگائے جاسکتے ہیں۔" وہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"پھر آپ نے یہ کیوں کہا کہ زیادہ نقصان میں نہیں رہوں گی۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ کچھ نہ کچھ نقصان ہوگا ضرور؟" میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں جاکر ایک اسٹول پر براجمان ہوگیا۔

وہ فریج کھول کر کھانے کا سامان نکالتے نکالتے چونک کر میری طرف مڑی اور چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد بولی: "دیکھیے جنابِ عالی! زبان پکڑ کر باتوں کو غلط رنگ دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں نے یہ بات سنجیدگی سے نہیں کہی تھی اور یہ آپ نے مجھے آپ آپ کرکے کیوں مخاطب کرنا شروع کردیا۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے آپ کے منہ سے یہ آپ جناب، سمجھے، جنابِ عالی!"

"دیکھیے لزی بیگم! اس سلسلے میں آپ کوئی اعتراض نہیں کرسکتیں۔ جب آپ مجھے سر غیاث احمد اور جنابِ عالی جیسے القاب سے نوازتی ہیں اور مجھ سے گفتگو میں ادب آداب کو ہر لمحہ ملحوظ رکھتی ہیں تو میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔" میں نے اس کا اعتراض مسترد کرنا چاہا۔

وہ بولی: "نہیں جنابِ عالی! آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ جمیلہ طوسی نے مجھے بتایا ہے کہ مشرق میں اور خاص طور پر آپ کے برِصغیر میں عورتیں مردوں کو ادب و احترام سے مخاطب کرتی ہیں اور مرد صرف غیر عورتوں کے معاملے میں ادب آداب کا خیال رکھتے ہیں اور جب وہ اپنی بیویوں سے آپ جناب کرنے لگیں تو سمجھ لو وہ ان سے ناراض ہیں اور انھیں اپنے دل سے دور رکھنے کے لیے تکلف کی دیوار حائل کررہے ہیں۔"

میں نے ذرا حیران ہوکر اسے دیکھا اور بولا: "اچھا تو یہ سبق پڑھاتی رہتی ہے تمھیں وہ تمھاری جمیلہ طوسی بھلا انکہ

ایسا ہے نہیں۔ بے تکلفی سے پکارنے میں تو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے، قربتیں بڑھتی ہیں اس طرح تو۔ اب آئندہ اگر اس کا خیال رکھیں گے اور کوئی کسی کا بے جا اور بے ضرورت ادب احترام نہیں کرے گا۔"

"نہیں جنابِ عالی! میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرسکتی۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کو اس طرح مخاطب کرکے مجھے کیسا قلبی سکون ملتا ہے۔ اس کا تو آپ اندازہ بھی نہیں لگاسکتے جنابِ عالی! یہ تو میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے آپ مجھے اس اعزاز سے محروم نہ کریں سر غیاث احمد! آپ اپنا یہی بے تکلفانہ انداز برقرار رکھیں اور مجھے اپنے انداز پر قائم رہنے دیں۔ پلیز، دیکھیے مجھے مجبور نہ کریں۔"

اس نے ایسے التجا آمیز فیصلہ کن انداز میں کہا کہ میرے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ یوں بھی میں اس سے کسی بحث مباحثے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایسی کہاں تھی کہ اس سے بحث و تکرار کرکے اپنی کوئی بات ماننے پر مجبور کیا جائے۔ وہ تو حکم دینے اور تعمیل کرانے کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ وہ پریوں کے دیس کی شہزادی، وہ روپ نگر کی رانی اسی لیے دنیا میں آئی تھی کہ اس کے سامنے سرنگوں رہا جائے، اس کی اطاعت میں کوتاہی نہ کی جائے، اس کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیا جائے، اس سے سرکشی اختیار نہ کی جائے۔ لہٰذا میں نے بھی اپنی زبان کو لگام دے کر سرکشی سے روک دیا تھا۔ ایسے معاملات میں مباحثے اور مناظرے دلوں میں گرہیں ڈال دیتے ہیں، ایک دوسرے کو زیر کرنے کی آرزوئیں جگاتے ہیں۔ دل کے معاملات میں تو افہام و تفہیم ہی وجۂ نجات ہے۔ چنانچہ میں نے بھی افہام و تفہیم کی راہ اختیار کرکے اپنے خوابوں کے محل مسمار ہونے سے بچالیے تھے۔ میں اس سے بحث کرکے اسے قائل کرنے کی کوشش میں اپنے مستقبل پر سیاہی نہیں پھیرنا چاہتا تھا۔ میں نے جب سے اسے دیکھا تھا، میرے سینے میں خواب انگڑائیاں لینے لگے تھے، موسمِ گل نے میرے دل میں بسیرا کرلیا تھا۔ میں نے آرزوؤں کے سمندر سے موتی چن چن کر ایک حسین و دلکش مالا تیار کی تھی اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں تھا کہ الفاظ کے خنجر سے اس مالا کو کاٹ کر سارے موتی منتشر کردیے جائیں۔ وہ خوش ادا، خوش بیاں ایسی ہی تھی کہ اسے کھو دینے کا تصور بھی بڑا اذیت ناک تھا۔ اس نے میرے دل کا ایک ایک گوشہ، ایک ایک روزن منور کردیا تھا اور اب اس کی روشنی ذرا بھی ماند پڑتی تو گھٹن کا احساس ہونے لگتا، زندگی ایک روگ بن جاتی، حیات کا سارا تانا بانا الجھ کر رہ جاتا۔ حال میرا تو یہ تھا کہ اس سے سرتابی کی ہمت کہاں سے لاتا۔ چنانچہ میں جیالا ایک شورہ پشت شخص، جس کا اعمال نامہ چٹانوں پر رقم تھا، جس کے سینے میں پتھر دھڑکتا تھا، سر جھکا دینے ہی میں عافیت جان کر اس کے سامنے سرنگوں ہوگیا تھا۔

میں خیالات کا تانا بانا بننے میں مصروف تھا کہ لزی نے کھانا تیار ہونے کا اعلان کرکے میرے تصورات کی ڈور کاٹ دی۔ کھانا اس کے ہاتھوں نے بڑا عمدہ اور لذیذ تیار کیا تھا۔ میں اس کی بنائی ہوئی ایک ایک چیز اسے داد دیتے ہوئے مزے لے کر کھائی۔ خوب سیر ہوکر کھانے کے بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں واپس آگئے۔ وہ دیر تک میرے ساتھ بیٹھی میرے کانوں میں اپنی مدبھری آواز سے شہد گھولتی رہی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے لوریاں سنا رہی ہو۔ میں وہ لوریاں سنتے سنتے اونگھنے لگا تو وہ مجھے خواب گاہ کی طرف لے گئی۔ خواب گاہ میں جاکر اس نے مجھے لباس تبدیل کرکے سونے کی ہدایت کی اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک دروازے کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے مجھے اس کے واپس آنے کا انتظار ہو اور جب اس کی واپسی سے ناامید ہوگیا تو اس کی ہدایت کے مطابق لباس تبدیل کرکے بستر پر دراز ہوگیا۔

صبح جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ سورج کو طلوع ہوئے اتنا وقت گزر چکا تھا کہ دھوپ میں اچھی خاصی حدت پیدا ہوچکی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا، وہ دن کے ساڑھے دس بجنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا۔ مجھے لزی کا خیال آیا جو یقیناً صبح سے اب تک کئی بار آکے واپس جاچکی ہوگی۔ اس نے مجھے بیدار کرکے میرے آرام میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ پندرہ منٹ کے بعد باتھ روم سے نکل کر کچن میں پہنچا تو فریج کے ہینڈل میں ایک رول کیا ہوا کاغذ پھنسا دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ کاغذ ضرور لزی نے وہاں پھنسایا ہوگا اور اس میں اس نے میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہوگا۔ میں نے جھپٹنے کے سے انداز میں کاغذ کو ہینڈل سے کھینچ کر کھولا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا... وہ تحریر لزی ہی نے وہاں لگایا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"ڈیئر سر غیاث احمد!

میں نے آپ کے لیے ناشتا تیار کرکے میز پر لگا دیا ہے۔ پاپا رات سے جوزفین کے پاس اسپتال میں ہیں، شاید دوپہر کے بعد وہ گھر آئیں۔ میں کالج جارہی ہوں، ایک بجے کے بعد واپسی پر ملاقات ہوگی۔ آپ ناشتا کرلیں لنچ میں آکر تیار کردوں گی۔

آپ کی الزبتھ فیلی"

بے اختیار میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا اور سینہ میرا فرطِ انبساط سے پھول گیا۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ ایک عرصے کے بعد اس دیارِ غیر میں کسی کو میری ضروریات اور میرے آرام سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی کے دل میں میرا خیال سمایا تھا۔ اس اجنبی ملک کی ہرجائی سرزمین پر ایک باوفا نے مجھ سے پیمانِ وفا باندھا تھا اور اسے نباہنے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ میں شاداں شاداں کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ بیرونی گیٹ کی اطلاعی گھنٹی میٹھے سُروں میں گنگنا اٹھی۔ میں نے باہر آکر گیٹ کھولا تو وہاں پولیس کی کار میں گریگری اور اس کا اسسٹنٹ ہمفرے موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کار سے باہر آگئے۔ انھوں نے کار وہیں چھوڑ دی اور میری ہمراہی میں اندر ڈرائنگ روم میں آگئے تو میں نے پوچھا: "کیا حال ہے مسٹر گریگری؟ معلوم ہوتا ہے گزشتہ رات تم لوگ خاصے مصروف رہے ہو۔ تمھارے چہرے تھکے ہوئے اور آنکھیں بے خوابی کے سبب سُرخ ہورہی ہیں۔ کیا رات بھر چھاپے مارتے رہے ہو؟"

گریگری نے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور پھر ایک طویل کش لے کر مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "باتیں بعد میں ہوں گی مسٹر غیاث! پہلے یہ بتاؤ یہاں کافی مل سکتی ہے؟"

میں نے کہا: "مل تو سکتی ہے مگر خود کچن میں جاکر بنانا پڑے گی۔"

ہمفرے نے اٹھتے ہوئے کہا: "میں بنالوں گا، تم لوگ بیٹھو۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے گریگری سے پوچھا: "کیا تم نے آلیور کو پکڑ لیا ہے؟"

"ہاں۔" گریگری نے جواب دیا: "آلیور ہی نہیں فرنیلو اور اس کے چند گرگوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے ہاتھ آئے ہیں جن کے بارے میں ہم میں سے کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اعلیٰ نسب لوگ منشیات جیسے گندے کاروبار سے منسلک ہوں گے۔ بڑی اعلیٰ نسل کے مجرم پکڑے ہیں رات کو ہم نے۔"

"شاید تم امریکنوں کے لیے یہ کوئی نرالی بات ہوگی۔ ہمارے

ہاں تو ایسے ہی لوگ اس کاروبار میں ہاتھ ڈالتے ہیں جو یا تو خود باعزت اور بااختیار ہوں یا پھر انھیں کسی لمبے ہاتھوں والے شخص کی پشت پناہی حاصل ہو۔ کوئی عام سا چھوٹا موٹا مجرم تو اس کاروبار کی طرف دیکھنے کی بھی ہمّت نہیں کر سکتا۔" میں نے اس کی بات سُن کر حیران ہوئے بغیر کہا۔

گریگری نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔ "بے شک یہ کاروبار ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی شکل و صورت اور سج دھج سے مہذب اور بااعتبار نظر آتے ہوں۔ جن پر ہم لوگ کبھی شک بھی نہ کر سکیں۔ دنیا میں ہر جگہ یہ مارِ آستین لوگ موجود ہیں۔ یہ دوہری زندگی بسر کرنے والے لوگ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔"

"کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم نے کن کن لوگوں کو کہاں کہاں سے گرفتار کر کے ان کے قبضے سے کیا کچھ برآمد کیا ہے؟" میں نے یہ سوال یہ معلوم کرنے کے لیے کیا تھا کہ دھمن اور عالیہ بھی ان کے ہاتھ لگ گئے ہیں یا نہیں۔

"آلیور اور فرنیلو کے گرگوں کے علاوہ انھی کی نشاندہی پر ہم نے کروڑوں ڈالرز کی منشیات برآمد کی ہیں۔ اور ان کے بیانات کی روشنی میں ہم جن معزز لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکے ہیں ان سے تمھاری ملاقات عدالت میں ہو سکے گی۔ فی الحال میں تمھیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔" گریگری نے جواب دیا۔

"عدالت میں۔" میں بڑبڑایا۔ "تو کیا تم اپنے وعدے سے پھر رہے ہو؟"

"کون سا وعدہ مسٹر غیاث احمد؟" گریگری نے پوچھا۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں کوئی وعدہ خلافی کر رہا ہوں۔ کیا میں نے آپ سے کوئی وعدہ کیا ہے؟"

میں تلملا کے رہ گیا۔ "کیا اب تم اس سے بھی انکار کرو گے کہ تم نے مجھے پاکستان واپس بھیجنے کا وعدہ کیا ہے؟"

"اوہ، مگر میں نے ایسا کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ میں نے تو آپ کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر آپ کا بیان درست ثابت ہوا اور آپ بے قصور ثابت ہوئے تو ہم آپ کو پاکستان جانے سے نہیں روکیں گے۔" وہ بولا۔

"تم نے جو گرفتاریاں کی ہیں کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا؟" میں جرح کرنے پر اتر آیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بھی شکنجے میں کسنے کی فکر میں تھا۔

"ہمیں یہ تو یقین آ گیا ہے کہ تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو، ان لوگوں نے پہلی بار تمھیں استعمال کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں انھیں آج یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن ابھی تمھارے بارے میں کچھ باتیں ہمارے ذہن میں کھٹک رہی ہیں۔ تم نے جہاز کو اغوا ہونے سے بچا کر ہم پر ایک احسان کیا ہے اور ہم تمھیں سزا دلوا کر احسان فراموش کہلوانا پسند نہیں کریں گے۔ ہم تمھیں واپس جانے سے نہیں روکیں گے لیکن ابھی ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تم کچھ روز اور یہاں سے نہ جاؤ۔"

"اور اس عرصے میں تم میرے لیے کوئی ایسا پھندا تیار کر لو گے جو میرے گلے میں فٹ ہو سکے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں، مسٹر غیاث! بات یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے تم سے کہا نا کہ ہم تمھارے احسان کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا عوض دینے کو بھی تیار ہیں۔ اگر اس کیس میں تم کسی طرح ملوث بھی ہوئے تو ہماری ریاستی انتظامیہ تمھیں رعایت دے دے گی۔ تم نے یہاں منشیات کا کاروبار کرنے والوں کی نشاندہی بھی کی ہے جس کے نتیجے میں ہم نے بڑا کامیاب آپریشن کیا ہے۔ اب ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تمھیں عدالت میں ان کے خلاف ایک مضبوط گواہ کے طور پر پیش کریں۔ تمھاری گواہی کے بعد ان کا بچنا ناممکن ہو جائے گا اور تمھاری بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔ تمھیں ہم باعزّت طور پر بری کر دیں گے۔ پھر تم آزادی کے ساتھ اپنے ملک واپس جا سکو گے۔"

"اس طرح کے مقدمات برسوں نہیں تو مہینوں ضرور چلتے ہیں۔ مقدمات کا فیصلہ ہونے تک تو پاکستان میں میرا سب کچھ لٹ چکا ہو گا۔ نہ جانے پھر میں واپس جانے کے قابل بھی رہوں گا یا نہیں۔" میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مطمئن رہو ہم کوشش کریں گے، تمھیں کسی طویل مدت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں منشیات کی اسمگلنگ کے مقدمے جلدی فیصل کر دیے جاتے ہیں۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔

اسی وقت ہمفرے دونوں ہاتھوں میں کافی کے دو مگ پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے گریگری سے کہا۔ "تمھاری بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ انھوں نے منشیات کی اسمگلنگ میں مجھے کیریئر کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یہ بات جب عدالت کو معلوم ہو گی تو وہ مجھے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑیں گے جس طرح تم مجھے بتا رہے ہو، عدالت کے سامنے بری ہونے کے لیے تو پہلے مجھے خود اپنے جرم کا اعتراف کرنا ہو گا۔ ایک اقبالی مجرم کو عدالت کیسے معاف کر دے گی، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی؟"

"اوہو، تم اس سلسلے میں اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ یہ ذمہ داری ہماری ہے۔ ہم پر اعتبار کرو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہماری مدد کرو اور ہم تمھیں قید و بند کے عذاب میں مبتلا کر دیں۔" گریگری نے مجھے سمجھایا۔

عدالت میں پیش ہونے کا خیال میرے ہوش اڑائے دے رہا تھا۔ اگر یہ لاہور، پنڈی یا پاکستان کا کوئی شہر ہوتا تو میں اُن سے بچا کر کسی طرف بھی نکل جاتا، بے شمار راستے مجھے معلوم تھے اپنے دیس کے۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایک جگہ پڑا پتھر بھاری کس طرح ہوتا ہے۔ یہاں اس اجنبی ملک میں تو میں بالکل ان کے رحم و کرم پر تھا۔ میرے ہاتھ پیر اور آنکھیں سب وہی لوگ بن کر رہ گئے تھے، یہ مجھے اندھے کنویں میں بھی دھکا دے دیتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ایسا بے دست و پا تو میں نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کیسے کیسے خوفناک مرحلے آئے تھے میری زندگی میں۔ کیسے کیسے پھندے مجھ پر پھینکے گئے تھے لیکن ہر بار جب وہ میری شہ رگ تک پہنچنے والے ہوتے تھے، میں کوئی نہ کوئی راہ اپنے بچنے کے لیے نکال ہی لیتا تھا۔ ایسی صورتِ حال سے تو میں کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف پولیس تھی جو بظاہر بڑی مہربان، بڑی ہمدرد نظر آتی تھی اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو میری یہاں موجودگی کا سبب بنے تھے۔ نہ جانے ان میں سے کتنے لوگ ابھی آزاد تھے اور کون جانے کہاں کہاں میری گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ایک وہ تھا نیگرو باکسر فلپس۔ آلیور نے بتایا تھا کہ وہ مستقل اس کے مکان کی نگرانی پر مامور تھا۔ بڑا زبردست تھا وہ۔ رنگ میں تو اس نے بڑے بڑے ہیوی ویٹ چیمپئن ناک آؤٹ کر دیے تھے۔ اور رنگ کے باہر بھی اس کے ہاتھ بجلیاں گراتے تھے۔ بڑے دراز دست اور ابلیس صفت تھے وہ لوگ جو منشیات کے ڈالرز کی افیون کے ساتھ مجھے ناشتے دان بنا کر اسمگل کر رہے تھے اور اب چاہتے تھے کہ میں مستقل طور پر ان کے لیے کیریئر کا کام دیتا رہوں۔ انھوں نے مجھ سے آسیہ اور آبی کی رہائی کا وعدہ کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر میں نے پاکستان میں ان کے ایجنٹ شمیر خان سے مال وصول کر کے ان تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی تو وہ آسیہ اور آبی کی آزادی کے لیے کوئی نقب لگا دیں گے۔ چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ وہ دونوں آزاد ہو جاتے تو ہم مل کر آئندہ زندگی کے لیے کوئی منصوبہ بندی کرتے۔ دولت کی میرے پاس اب کوئی کمی نہیں تھی، ہم کہیں بھی جا کر نئے سرے سے ایک شریفانہ زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں سے آسیہ اور آبی کی رہائی کے لیے مدد لینے کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ میں ہمیشہ کے لیے ان کا کیریئر بن جاؤں۔ وہ ایک آدھ بار اپنا کام نکال کر میرا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ وہ کبھی بھی مجھے کسی اور طرف نہیں جانے دیتے اور اگر میں ان کے کھونٹے سے رسّی تڑانے کی کوشش کرتا تو وہ آسیہ اور آبی کو پھر کسی خوف ناک دلدل میں اتار دیتے۔

"کیا سوچنے لگے مسٹر گیاس؟" مجھے سوچتے دیکھ کر ہمفرے نے کہا۔ "ہم تم سے وعدہ کر رہے ہیں، تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ تمھیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مسٹر گریگری! میرے پاس تمھارے وعدوں پر بھروسہ کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ اس وقت چونکہ تم سے اختلاف کر کے میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا تمھاری بات مان لینے ہی میں بھلائی نظر آتی ہے۔ البتہ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے مجھے یہاں قید کیوں کر رکھا ہے۔ میں تنہا یہاں پڑے پڑے اکتا گیا ہوں، باہر نکل کر سیر و تفریح کرنا چاہتا ہوں۔"

گریگری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اٹھ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا کیپٹن گریگری یا ان کے اسسٹنٹ ہمفرے میں سے کوئی موجود ہے؟"

"جی ہاں، دونوں ہی موجود ہیں۔ آپ کون صاحب ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں پولیس کمشنر بول رہا ہوں۔ ان دونوں سے کہو جتنی جلدی ممکن ہو میرے آفس پہنچیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"جی بہتر ہے۔ میں آپ کا پیغام ان تک پہنچائے دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "پولیس کمشنر کا فون تھا۔ انھوں نے فوراً تم دونوں کو اپنے آفس میں طلب کیا ہے۔"

262

"کیوں خیریت تو ہے؟" گریگری اور ہمفرے دونوں کی زبان سے بیک وقت ایک ہی جملہ نکلا اور وہ دونوں تیزی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ انھوں نے وجہ نہیں بتائی مجھے، صرف اتنا ہی کہا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ان کے آفس

پہنچ جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم جا رہے ہیں۔ اگر وہاں کوئی اہم معاملہ نہیں ہوا تو ہمیں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" گریگری نے کہا اور وہ دونوں نہایت سرعت کے ساتھ باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد مجھے طرح طرح کے خیالات نے آ گھیرا۔ نہ جانے کس کس کو باندھ لائے تھے وہ امریکی قانون کے محافظ اور چاہتے یہ تھے کہ میں ان کے خلاف عدالت میں گواہی دوں۔ وہ سلطانی گواہ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے عدالت کے سامنے مجھے۔ اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کس کو کہاں کہاں سے پکڑ کر لے آئے ہیں اور ان کے قبضے سے کیا کیا کچھ برآمد کیا ہے انھوں نے۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ انھوں نے جن لوگوں کو منشیات کا گھناؤنا کاروبار کرنے کے جرم میں گرفتار کیا تھا ان میں حقیقی مجرم کتنے تھے۔ جب میں ان کے بارے میں کوئی بھی صحیح بات نہیں جانتا تھا تو ان کے کالے کرتوتوں کی عدالت کو کیا تفصیل بتاتا۔ پتا نہیں ان میں کتنے ایسے ہوں گے جن کی میں نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس سلسلے میں گریگری اور ہمفرے کو میری رہنمائی ضرور کرنا چاہیے، ورنہ عدالت میں جا کر ان کا کیس کمزور ہو جائے گا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ میری گواہی ان کے کیس کو مضبوط کر دے گی۔ یہ بات میری سمجھ میں تو آتی نہیں تھی کہ ایسا کیسے ہو جائے گا۔

میں انھی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک دم چونک کر اٹھا اور کھڑکی سے جھانک کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ گولی کس نے کس پر چلائی تھی۔ لیکن باہر کا منظر دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گریگری اور ہمفرے اس قدر جلدی میں گئے تھے کہ انھوں نے جاتے ہوئے عمارت کا بیرونی دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ اب اس کھلے ہوئے دروازے سے ایک نہایت صحت مند اور توانا قوی الجثہ نیگرو اندر داخل ہو رہا تھا۔ ہیبت اس کی کچھ ایسی تھی کہ خواہ مخواہ ہی دل پر دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں باہر نگرانی کرنے والے دونوں پولیس کے جوانوں کی گردنیں دبوچ رکھی تھیں۔ اس کا ڈیل ڈول اور تن و توش ایسا زبردست تھا کہ وہ جوان اس کے پنجوں میں پھنسے بے بس پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ نیگرو کے دائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان جوانوں نے اس فیل تن نیگرو کو عمارت میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اور جب وہ ان کے روکنے سے نہیں رکا ہوگا تو انھوں نے دھمکانے کے لیے پستول نکال لیے ہوں گے، اس پر بھی وہ باز نہ آیا تو ان میں سے کسی ایک نے فائر کر کے اس کا بازو زخمی کر دیا ہوگا۔ چونکہ میں نے ایک ہی فائر کی آواز سنی تھی لہٰذا میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ مگر پستول کی گولی بھی اس سیاہ فام گینڈے کو روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ وہ دایاں بازو زخمی ہونے کے باوجود ان دونوں کی گردنیں دبوچ کر انھیں بھی اپنے ساتھ اندر کھینچ لایا تھا۔ دروازے میں داخل ہو کر اس نے دونوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر زور زور سے دو تین جھٹکے دیے اور پھر مردہ چھپکلیوں کی طرح لان میں اِدھر اُدھر اچھال دیا۔ وہ دونوں جہاں گرے تھے وہیں بے سدھ پڑے رہ گئے۔ ان میں یا تو سچ مچ ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی تھی یا پھر شاید انھوں نے بے جان بن کر پڑے رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ انھیں پھینک کر وہ فیل مست جھومتا ہوا سیدھا اسی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا جہاں میں موجود تھا۔ وہ اس عمارت کے گوشے گوشے سے واقف معلوم ہوتا تھا اسی لیے تو گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس بات میں تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ میرے لیے وہاں آیا تھا اور جن لوگوں کو گریگری اور ہمفرے سرکاری مہمان بنا لائے تھے وہ شترِ بے مہار انھی میں سے کسی کا پالتو معلوم ہوتا تھا۔ اور انھی کے اشارے پر وہاں گھس آیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے میں اس ہاتھی کے مقابلے پر اپنا دفاع کر سکتا۔ مگر وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور ہتھیاروں کی قسم کی کوئی شے گریگری اور ہمفرے نے وہاں چھوڑی نہیں تھی۔ وہ دونوں جب لزی کی اطلاع پر فرنیلو کے بھیجے ہوئے غنڈوں سے مجھے نجات دلانے کے لیے آئے تھے، اس کے بعد انھوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا اور اس تلاشی کے دوران میں ایک ایک ہتھیار دریافت کر کے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ پھر جب میں دوبارہ یہاں وارد ہوا تو مجھے اپنے مطلب کی چیز سمجھ کر انھوں نے میری حفاظت اور نگہداشت کے لیے اپنی پولیس فورس کے دو جوان مکان کے باہر متعین کر دیے تھے جو اب بے جان مجسموں کی طرح لان میں بے ترتیب پڑے تھے۔ ورنہ تو میں کہاں کا وزیر سفیر قسم کی چیز تھا جو وہ میری حفاظت پر اپنے دو تربیت یافتہ آدمی برباد کرتے۔ وہ غریب تو خود اپنا دفاع بھی نہ کر سکے تھے تو میرا دفاع کس طرح کرتے۔ انھیں تو اندازہ بھی نہیں تھا میرے دشمنوں میں کیسے دیو قامت، فولاد صفت لوگوں کے نام شامل ہیں۔ انھیں للکارنا یا ان کی راہ مسدود کرنا ہر کسی

بس کی بات تو نہیں تھی۔ وہ میرے قریب سے قریب تر آتا تھا اور میرے پاس اپنے ہنرمند ہاتھوں اور تجربے کے ئی ہتھیار نہیں تھا۔ ایک اس عالیہ خانم کی دی ہوئی انگوٹھی جو پستول، بندوق، اور اسٹین گن جیسے دور مار ہتھیاروں زباں اگلنے سے روک سکتی تھی۔ مگر کسی خنجر بدست کو یا بگرد جیسے مکھنا ہاتھی کو مجھ تک پہنچنے سے روکنا اس کے یار میں بھی نہیں تھا۔ وہ سیاہ رو کوئی بہت ہی خطرناک دہ لیے کر میری طرف آ رہا تھا اور مجھے اس کا مقابلہ اپنے وں اور تجربے سے ہی کرنا تھا۔ اس سے بچنے کی ایک ہی ب میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ میں اندرونی کمرے میں جا کر اس راستے سے آرتھر کے گھر میں چلا جاؤں، جہاں سے فرار ہو نے گریگری کو فون کر کے میری مدد کے لیے بلایا تھا اور لے فرنیلو کے آدمیوں سے نجات دلائی تھی۔ لیکن اب تو مجھے ترکیب پر عمل کرنے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔ وقت کا آخری بھی میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں فرار راستے کی طرف قدم بڑھاتا ڈرائنگ روم کا دروازہ زوردار کے سے کھلا اور وہ کالی آندھی اندر داخل ہو گئی۔ اب میرے پاس اس سے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی راہ نہیں رہی تھی۔ میرے پاس اپنے ہاتھوں کا ہنر استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کسی دیو کی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ بھی اسے اپنے سامنے دیکھ کر اپنی جگہ ہی کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سختی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ کون ہو تم اور یہاں اس طرح کیوں گھس آئے ہو؟"

اس نے بھنویں سکیڑ کر تحقیر آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "یو فول! تمھارا کیا خیال تھا کہ پولیس کو انفارم کرنے کے بعد تم ہم سے بچ کر واپس بھی جا سکو گے؟"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ پولیس فارم کرنے اور واپس جانے کا کیا قصہ ہے؟ تم آخر ہو کون؟ صاف صاف بات کرو نا؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"صاف صاف بات یہ ہے کہ مجھے تمھاری بوٹیاں کر کے کھلا دینے اور بچی کھچی ہڈیاں تمھاری ماں کو تحفے کے طور بھیجنے کا حکم ملا ہے۔ بے وقوف کے بچے! تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد تو اب روئے زمین پر تمھارے لیے قبر کی جگہ بھی نہیں ہے۔" وہ حقارت سے بولا۔

"شاید تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمھیں کسی اور کے لیے حکم دیا ہوگا۔ میں تو ایسے کسی آدمی کو جانتا تک نہیں جو ایسے خوفناک احکامات دیتا ہو۔" میں ہنوز انجان بنا رہا۔

"کیا تمھارا نام گے یاس احمد نہیں ہے؟" اب اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی تھی۔ شاید وہ شک و شبہے میں مبتلا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ غلط آدمی سے تو مخاطب نہیں ہے۔

میں نے اسے مزید الجھانے کے لیے کہا "دیکھا نا! میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم غلط جگہ آ گئے ہو۔ میرا نام گے یاس احمد نہیں غلام جیلانی ہے۔ اور میں یہاں آلیور کا مہمان ہوں۔"

وہ غصے سے سر جھٹک کر بولا "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ میں کسی غلط جگہ پر نہیں آیا ہوں۔ مجھے یہیں بھیجا گیا ہے۔ آلیور کے مہمان گے یاس احمد کے پاس۔ میں جانتا ہوں تمھارا نام گلام جیلانی ہے مگر تم یہاں فرانسسکو میں گے یاس احمد ہی ہو۔"

"اچھا اچھا!" میں نے کہا "چلو میں نے مان لیا، تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرا جرم کیا ہے آخر؟"

"چیف کا کہنا ہے، تم نے پولیس کو اطلاع دے کر تنظیم کے کئی لوگوں کو پکڑوا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"مگر میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ تمھارے چیف کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔"

"غلط ہو یا صحیح، میں نہیں جانتا۔ تمھیں میرے ساتھ چیف کے پاس چلنا ہوگا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ جسے چیف طلب کرتا ہے، اسے آسمان دوبارہ نہیں دیکھ پاتا۔ وہاں تمھارے گوشت سے چیف کے کتوں کی دعوت ہوگی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ آسانی سے میری جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کی نظروں میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے زبردستی ہاتھ پیر باندھ کر اٹھا لے جائے گا۔ یہی اس کی خام خیالی تھی اور اسی فریب میں مبتلا رکھ کر میں اسے شکست دے سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے غصہ دلا کر اس کی کھوپڑی ناکارہ کر دینے کی نیت سے کہا "ہاں اگر تم مجھے یہاں سے لے جا سکو تو ضرور۔۔۔ اپنے چیف کے خاندان والوں کی دعوت میں میرا گوشت استعمال کر لینا۔"

میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ میرے اس توہین آمیز انداز نے اس کی بھوسہ بھری کھوپڑی میں آگ لگا دی تھی۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا اور بندر کی طرح دانت نکالتا ہوا آگے بڑھتے ہوئے غرایا "او فول! تم نے کیا سمجھا ہے اپنے آپ کو بندر کی اولاد؟"

میں نے اسے مزید طیش دلانے کے لیے ہنس کر کہا "شکل سے بھی تم افریقی بندر کی اولاد ہی نظر آتے ہو۔ پھر بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اوہ کمینے، بدمعاش! تھامسن سے آج تک کسی نے اس انداز میں بات کرنے کی ہمت نہیں کی۔ میں تمھیں اس بکواس کا تو ابھی مزہ چکھا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے غضب ناک انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی۔

میری زندگی بھی انھی کھیل تماشوں میں گزر رہی تھی۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ وہ آسانی سے مجھے زیر کر لیتا۔ بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے میں نے اور بڑے بڑے طوفانوں، سیلابوں کا سینہ چیرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اگر ایسا ہی لقمۂ تر ہوتا تو اب تک میری ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوتیں۔ اس کے زمین چھوڑتے ہی میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور جھکائی دے کر اس کے دائیں جانب دیوار سے جا لگا۔ وہ اس صوفے پر جا گرا جس کے آگے میں کھڑا تھا اور صوفے سمیت دوسری طرف اُلٹ گیا۔ میں دور کھڑا اس کے تن من میں آگ لگا دینے والی شریر مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھا۔ تو یہ ہے وہ باکسر تھامسن جس کے بارے میں آلیور نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں بجلیاں کڑکتی ہیں اور زلزلے اس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شہ زور اس سے پناہ مانگتے اور اس کے سامنے سے کترا کے نکلتے ہیں۔ اس کا ایک ہی ہاتھ اچھے بھلے آدمی کو دن میں تارے دکھا دیتا ہے۔ اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تھا بھی کچھ ایسا ہی مگر بے چارہ کیا کرتا، آج اس کا مقابلہ ایک ایسے شخص سے پڑ گیا تھا جو جانتا تھا کہ ایسے بے مہار جانور کو کس طرح قابو کیا جا سکتا ہے۔ میں اسے طیش دلا دلا کر اندھا کر دینا چاہتا تھا تاکہ موقع ملتے ہی اس کی رگِ احساس پر ہاتھ ڈال سکوں اور جب تک اس کا موقع نہیں ملتا مجھے اس کے ہاتھوں کی پہنچ سے دور دور رہنا تھا۔

اس نے اٹھنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا اور اُٹھتے ہی تیر کی طرح اڑتا ہوا میری طرف آیا مگر میں بھی کچھ کم پھرتیلا نہ تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں ایک لمحہ پہلے میں کھڑا تھا، تو میرے بجائے مضبوط دیوار نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے ہی زور میں پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا اور اس تصادم سے جو دھماکا ہوا تھا، اس سے دیواریں لرز گئی تھیں، کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنا اُٹھے تھے۔ اگر میں بھی وہاں موجود ہوتا تو میرا تو حشر نشر ہو جانا تھا۔ میں تو پہچاننے کے قابل بھی نہ رہتا۔ اس شدید ٹکر نے شاید خود اس کے بھی ہوش اُڑا دیے تھے اور یقیناً اس کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا ہوگا۔ جبھی تو وہ اپنا سر دائیں بائیں زور زور سے جھٹک رہا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی مگر بس ایک پل کے لیے ہی وہ گردن میرے ہاتھوں میں رہ سکی تھی جیسے ہی میرے ہاتھوں نے اُس کی گردن کو چھوا تھا، اس نے زور سے اپنا دایاں کندھا جھٹکا تھا۔ میں اس جھٹکے سے اُچھل کر پیچھے جا گرا۔ اس کی رگِ احساس مسلنے کی خواہش میرے دل ہی میں رہ گئی تھی اور ساگر گرتے ہی میں کروٹیں لے کر لوٹتا ہوا وہاں سے ہٹ نہ گیا ہوتا تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو کسی بھاری رولر کے نیچے آجانے والے پتھر کا ہوتا ہے۔ میرا سُرمہ بن جانے میں بس ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ تھامسن کسی بھاری چٹان کی طرح وہاں آکر گرا جہاں میں لمحہ بھر پہلے موجود تھا۔ میں پھرتی سے اچھل کر کھڑا ہوا تو دیکھا وہ فرش پر دونوں ہاتھ ٹکا کر دوبارہ اٹھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس میں وہ تیزی اور طراری نہیں رہی تھی۔ میں نے اس مرتبہ اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے چیتے کی سی تیزی سے جھپٹ کر اُس کا دایاں ہاتھ پکڑا اور اس کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر نہایت پھرتی کے ساتھ اُسے بل دے کر اپنے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ ہی تھامسن کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں جس تیزی سے اس پر جھپٹا تھا، اسی تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ اسے ایسے ہی لگا ہوگا جیسے اس کے ہاتھ پر بجلی گری ہو۔ وہ دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اور اپنا ہاتھ رانوں میں دبا کر مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر میں سمجھا تھا، اس کے سارے کس بل نکل گئے ہیں۔ تمام کے تمام پُرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں جیسے آج سے قبل جتنے بھی لوگوں کے بازو اس طرح اکھاڑے گئے وہ دوبارہ اُٹھ کر میرے مقابل قدم جمانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ تھامسن بڑے ہی سخت، فولادی اعصاب کا مالک تھا۔ چند سیکنڈ لوٹ پوٹ ہو کر دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ ناکارہ ہو چکا تھا۔ چہرہ خون میں ڈوبا ہوا۔ اس کے باوجود وہ کھڑا ہوا مجھے للکار رہا تھا۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے! میں ایک ہاتھ سے بھی تیری گردن توڑ سکتا ہوں۔"

اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر کے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

شاید اُس کی عقل کچھ ٹھکانے آگئی تھی۔ اس نے یہ یقین سمجھ لیا تھا کہ میں اُسے طیش میں لا کر اندھا دھند اقدام پر مجبور کرنے کی حکمتِ عملی سے کام لے رہا ہوں، چنانچہ اب وہ سوچ سمجھ کر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں بھی اب اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ میں نے اُس کا نصف زور توڑ دیا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ ناکارہ ہو چکا ہے اور پیشانی سے بہنے والا لہو بار بار اس کی آنکھوں پر آجاتا ہے جس کی وجہ سے اُسے آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی اور وقفے وقفے سے آنکھیں صاف کرنا پڑ رہی تھیں۔

میں خاموش کھڑا اُس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ میری نظریں اُس کے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم رہ گیا کہ میں ایک ہی جست میں اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے سکوں تو میں نپے تلے انداز میں اس کے ہاتھ پر جھپٹا۔ اس بار وہ خاصا چوکنا تھا۔ اس نے تیزی سے ایک طرف ہو کر اپنے ہاتھ کو میری زد سے بچاتے ہوئے اُسے ہتھوڑے کی طرح گھما کر میری پشت پر دے مارا۔ اس کا ہاتھ پوری قوت سے میرے نہیں لگا تھا، اس کے باوجود مجھے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا اور میں اُس کے قریب سے گزر کر اوندھے منہ ایک صوفے پر جا گرا۔ صوفہ میرے ساتھ ہی اُلٹ گیا۔ میں صوفے کی دوسری جانب پڑا تھا اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تھامسن نے لات مار کر صوفے کو میرے اوپر پلٹ دیا۔ میں صوفے کے نیچے چت پڑا تھا۔ اس طرح کہ صوفے کی پشت والا حصہ میرے پیٹ پر ٹکا ہوا تھا۔ اس حالت میں اگر میں ذرا سی سُستی کا مظاہرہ کرتا تو مجھے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ میں نے فوراً ہی صوفے کو دونوں ہاتھوں پر سنبھالا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اُسے پوری قوت سے اوپر اچھال کر خود اس کے نیچے سے مچھلی کی طرح پھسل کر دیوار سے جا لگا۔ میرا یہ عمل بڑا بروقت اور کارگر ثابت ہوا تھا۔ تھامسن صوفے کو میرے اوپر اُلٹ کر اپنے پورے وزن سے اُس کے اوپر گرا تھا لیکن میں نے صوفہ اچھالنے میں جلدی کی تھی کہ تھامسن کو موقع ہی نہ مل سکا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی صوفہ اس کے منہ پر جا لگا تھا جس کی وجہ سے تھامسن کی زخمی پیشانی اور رُخسار کی جلد پھٹ گئی تھی اور وہ اپنا توازن بھی کھو بیٹھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوفہ اس سے ٹکرا کر واپس نیچے گرا تو اس کے ساتھ ہی تھامسن بھی اوندھے منہ اس کے اوپر آ رہا۔ ایک ہاتھ تو اُس کا پہلے ہی ناکارہ تھا جس کی وجہ سے اسے دوبارہ سنبھل کر اُٹھنے میں قدرے دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور ایک زوردار ٹھوکر اُس کی زخمی پیشانی پر رسید کر دی۔ وہ اس ضرب سے بلبلا اٹھا اور پلٹا کھا کر صوفے سے الگ لڑھک جانا چاہا مگر میں نے اُسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کے پلٹتے ہی تیزی سے اس کا صحیح سلامت ہاتھ پکڑ لیا اور پھر مجھے وہ دوسرا بازو بھی اکھاڑ دینے میں بس پلک جھپکنے کی دیر لگی تھی۔ اس بار تھامسن کی چیخ کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ الٹے ہوئے صوفے پر چت پڑا زمین پر پیر رگڑ رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو نیچے جھول رہے تھے اور اوپری نصف دھڑ صوفے کی پشت کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اب وہ اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ لڑھک کر یا پھسل کر صوفے سے نیچے آجاتا۔ میں نے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور اُسے کھینچ کر فرش پر ڈال دیا۔ تکلیف کی شدت سے اُس کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔ بُری طرح کراہتے ہوئے وہ اپنے دونوں پیر فرش پر مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے بسی اور بے چارگی جھلکنے لگی تھی اور سارا تن بدن، تمام کا تمام غرور خاک میں مل گیا تھا۔ اس پر بڑا بُرا وقت آپڑا تھا جو وہ بغیر سوچے سمجھے اپنی گزشتہ کامیابیوں اور بے پناہ طاقت کے زعم میں مجھ سے آٹکرایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں ایک تیرہ بخت شخص ایک عرصے سے سنگی چٹانوں سے سر پھوڑ رہا ہوں۔ میرے مقدر کی تاریکی مجھے کہاں کہاں لیے پھرتی رہی ہے اور کیسے کیسے طوفانوں سے میں نبرد آزما رہا ہوں۔ میں نے خوف ناک ترین آندھیوں کے رُخ موڑ کر جینے کا قرینہ سیکھا ہے پھر میں اس سیاہ رو سے کس طرح شکست کھا جاتا۔ میں ایک فاتح کی طرح سینہ تانے کھڑا اس کی شکستگی کا نظارہ کر رہا تھا۔ اچانک مجھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں سرعت کے ساتھ دروازے کی طرف مُڑ گیا۔

دروازے پر ایک اور سیاہ فام نیگرو ایک سفید فام شخص کے ساتھ ایستادہ تھا۔ وہ دونوں نہ جانے کس وقت وہاں آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ میری چھٹی حس نے بروقت مجھے ہوشیار کیا تھا۔ اگر ایک ثانیے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ مجھے باندھ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے مڑتے ہی سیاہ فام کو ایک ایسا ہی جال اپنی طرف پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس میں وہ ایک بار پہلے بھی مجھے پھانس چکے تھے۔ جال کے ہوا میں پرواز کرتے ہی میں نے چیتے کی طرح جست لگائی اور ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے تک دوڑتا چلا گیا۔ دیوار کے قریب جا کر میں پلٹا اور دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں جھنجلائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ ان کا یہ داؤ بھی بے کار ہو گیا تھا۔

نیگرو قہر و غضب کی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے جال کو واپس اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ سفید فام نے غصے سے دانت بھینچتے ہوئے پستول نکال کر میری طرف سیدھا کر لیا اور دروازے سے ہٹ کر چند قدم اندر آ گیا۔

اس نے پستول سے میرا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "سیدھی طرح خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ میں تمھارا بھیجہ اُڑانے میں ذرا بھی رعایت نہیں کروں گا۔ تم نے ہمارے بہت قیمتی آدمی کو ناکارہ کر دیا ہے۔ اب تم کسی اور رعایت کے مستحق نہیں رہے ہو۔"

"میں تمھارے آدمی سے لڑنے نہیں گیا تھا۔ اس نے خود ہی یہاں آ کر مجھے چیلنج کیا تھا۔ پھر اس کے انجام کا ذمے دار میں کیسے ہو سکتا ہوں؟" میں نے بھی تند لہجہ اختیار کیا تھا۔

"ایک یہی کیا تم تو بہت سی باتوں کے ذمے دار ہو۔ کس کس سے انکار کرو گے۔ بہتر یہی ہے کہ اب خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے چلو۔" اس نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟" میں نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر ہم تمھیں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہیں چھوڑیں گے اور جب تم مفلوج ہو جاؤ گے تو باندھ کر تمھاری گٹھری بنا کر ساتھ لے جائیں گے۔" اس نے حقارت سے کہا۔

"اس کالے ہاتھی کی طرح؟" میں نے تھامسن کی طرف اشارہ کر کے طنزاً کہا۔ "یہ بھی تو مجھے اپنے چیف کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔"

"یہ سیاہ فیل تو بے وقوف تھا۔ طاقت کے زعم میں مار کھا گیا تم سے۔ میں ایسی حماقت نہیں کروں گا۔ اگر تم نے مجھ سے بھڑنے کی کوشش کی تو اس پستول کی گولی تمھارا استقبال کرے گی۔" اس نے اپنا پستول لہراتے ہوئے مجھے دھمکانے کی کوشش کی۔

"اچھا۔" میں نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں پوچھا۔ "بہت زعم ہے تمھیں اس چند انچ کے کھلونے پر۔ کیا تم اسے استعمال کرنا بھی جانتے ہو یا صرف دھمکیاں دینے کے لیے ساتھ لیے پھرتے ہو۔"

وہ ایک دم مسکرانے لگا۔ "بے کار ہے، میں تھامسن نہیں ہوں جو تمھاری ان باتوں سے طیش میں آ کر ہوش گنوا دوں گا اور نہ ہی میں اُس کی طرح ہاتھوں پیروں سے مقابلہ کرنے کا قائل ہوں۔"

"پھر تم کس طرح مقابلہ کرنے کے قائل ہو؟" میں نے اپنا انداز برقرار رکھا۔

"میری صرف ایک انگلی اشارہ کرے گی اور مقابلہ یہ پستول کرے گا۔ کیا تم اس سے مقابلہ کر سکو گے؟" اس نے بھی تحقیر آمیز لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

"تم بھی میرے بارے میں پوری معلومات حاصل کیے بغیر ہی چلے آئے ہو۔ اور تمھیں میری طرف بھیجنے والوں نے بتایا نہیں کہ یہ پستول، ریوالور جیسے ہتھیار میرے سامنے آتے ہی اپنی کارکردگی بھول جاتے ہیں؟" میں نے اُسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تھامسن جیسے فیل کو میں نے زیر کر لیا تھا تو ان دونوں کو میں کیا اہمیت دیتا۔ کتنی دیر ٹک سکتے تھے میرے آگے چڑی کے یہ غلام۔ اگر وہ جال میں نے ان کے پاس دیکھ نہیں لیا ہوتا تو اب تک میں ان کے ہاتھ پیر توڑ کر انھیں تھامسن کے پاس لٹا چکا ہوتا۔ وہ اُن کا عجیب و غریب گورکھ دھندا جیسے اُنھوں نے نہ جانے کس طرح انسانوں کا شکار کرنے کے لیے تیار کیا تھا مجھے آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھا اور وہ سفید کھوتا یہ سمجھ رہا تھا کہ اُس نے اپنے بالشت بھر کے پستول سے مجھے بے بس کر رکھا ہے۔ جب تک عالیہ نے مجھے وہ کرشمہ ساز انگوٹھی نہیں دی تھی یہ پستولیں بندوقیں میری راہ روک لیا کرتی تھیں مگر اب تو ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی تھی میرے لیے۔ کیسی لاجواب شے میری تحویل میں دے دی تھی اس عالیہ بیگم نے۔ کیسا عجب بدلا تھا اس دُشمن کی زوجہ محترمہ نے کہ میری تو عقل ہی خبط ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ بھورا بندر کہہ رہا تھا۔ "میں نے بھی سُنا ہے کہ تمھارے سامنے ہتھیار ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تمھارے پاس کوئی ایسی پوشیدہ طاقت ہے جو ہتھیاروں کو بے کار کر دیتی ہے لیکن میں ایسی احمقانہ باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کسی وقت اتفاقاً ایسا ہو گیا ہو کہ عین وقت پر کسی پستول یا رائفل کی گولی نہ چل سکی ہو، ورنہ یہ ہتھیار کسی کے دوست تو نہیں ہوتے کہ کسی کو پہچان کے گولیاں نہیں اُگلتے۔ انھیں بنانے والوں نے ان میں پہچاننے یا رحم کھانے کی خصلت ہی نہیں رکھی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں بس اسی کی انگلی کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اگر تمھیں اس بالشت بھر کے اوزار پہ

[...]اعتماد ہے تو اپنے ساتھ یہ تیتر پکڑنے کا جال کیوں لیے [...]پھرتے ہو؟"

"اوہ، یہ جال؟ یہ تو اس نیگرو ولسن کا ہتھیار ہے۔ مجھے [...]اس کے استعمال کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ ویسے تم مطمئن رہو میں [...]یہ جال استعمال نہیں کرنے دوں گا۔ اس بالشت بھر کے کھلونے [...]سے ہی تمھیں باندھ کر لے جاؤں گا۔" اس نے اپنے ساتھی نیگرو [...]سے کہا۔ "ولسن! تم یہ جال باہر پھینک دو۔ میں دیکھتا ہوں یہ میرے [...]پستول کے مقابل کتنی دیر کھڑا رہ سکتا ہے۔"

بس یہیں وہ مجھ سے مات کھا گیا تھا۔ یہی اس سے زبردست [...]غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا کہ [...]میرے لیے سب سے زیادہ خوف ناک چیز وہ جال ہی تھا، [...]جسے وہ باہر پھنکوائے دے رہا تھا۔ تھا تو وہ اوّل درجے کا [...]احمق مگر خود کو بہت چالاک ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور [...]یہی کوشش اُسے لے ڈوبی۔ نیگرو جسے اس نے ولسن کہہ کر [...]مخاطب کیا تھا جال کو باہر پھینکتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، مگر شاید [...]وہ اس سفید فام بے وقوف کا ماتحت تھا۔ اور اس کے حکم کی [...]تعمیل کے سوا کوئی اختیار نہیں رکھتا تھا۔ اس نے خاموشی کے [...]ساتھ جال دروازے سے باہر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ [...]سینے پر باندھ کر سعادت مندی سے کھڑا ہو گیا۔

اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی چنانچہ [...]میں مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور اُس سفیدے کے قریب [...]جا کر اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے، تیرا [...]یہ کھلونا مجھے دے دے۔ یہ تیرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا ہے؟" [...]میں نے اپنا طلسمی انگوٹھی والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لا دے [...]میرے پتر!" میں انگریزی میں پنجابی کی پیوند کاری بھی کرنا چاہ [...]رہا تھا۔

میری بے خوفی اور پُراعتماد انداز دیکھ کر وہ کچھ الجھن کا شکار ہوا تھا مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مجھے جھڑکی دی۔ "رک جاؤ، زیادہ بہادر بننے کی کوشش مت کرو۔ تمھارے یہ نفسیاتی حربے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو گا اور تم خواہ مخواہ اپنے جسم کا کوئی حصہ ضائع کر دو گے۔"

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تم سے یہی کہہ [...]رہا ہوں اپنے اس گینڈے کے انجام سے عبرت حاصل کرو۔"

میں باتیں کرتے ہوئے اس کے بہت قریب چلا گیا [...]تھا۔ اس کا احساس ہوتے ہی وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور میرے [...]گردوں کا نشانہ لے کر پستول کی لبلبی دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن اس کے پستول کی لبلبی نے اس کا ساتھ دینے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ اس کی انگلی کا دباؤ تسلیم کرنے کے لیے ہی تیار نہیں تھی تو پستول کی نال سے کیا برآمد ہوتا۔ اس نے گھبرا کے پستول کو دیکھا اور لبلبی پر پورا زور صرف کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کی راہ میں کوئی سنگ گراں حائل ہو گیا تھا جو اسے ذرا بھی جنبش نہیں کرنے دے رہا تھا۔ پستول اُس کے لیے کوئی خدمت انجام نہ دے سکا تو میں نے اُسے چڑانے کے لیے کہا۔ "اوئے یار، ذرا کھول کے تو دیکھ، کہیں اس کے پگ میں کچرا تو نہیں آ گیا ہے۔ کوئی گیئر شیئر تو نہیں پھنس گیا اس کا۔ تو خالی خولی اپنی انگلی کو تکلیف کیوں دے رہا ہے۔"

میرے کہنے پر اُس نے جلدی سے پستول کا چیمبر کھول کر دیکھا اور اُسے اُلٹا کر کے اپنے دوسرے ہاتھ پر جھٹک دیا۔ چیمبر سے نکل کر چھ گولیاں اس کی ہتھیلی پر آ گریں تو اس نے حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ کبھی وہ مجھے دیکھتا تھا اور کبھی اپنی ہتھیلی پر پڑی ہوئی پستول کی گولیوں کو تکنے لگتا تھا۔ پھر اس نے جھنجلا کر وہ گولیاں مجھ پر کھینچ ماریں۔ اس سے پہلے کہ وہ خالی پستول بھی میرے سر پر دے مارتا، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اس نے پستول میرے ہاتھ سے چھیننے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ کر زور آزمائی شروع کر دی۔ مگر یہ تو اس کی خام خیالی ہی تھی کہ وہ طاقت کا مظاہرہ کر کے مجھے زیر کر لے گا۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی آواز نکلی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوتا چلا گیا۔ شاید گھٹنا کچھ زیادہ ہی زور سے لگ گیا تھا یا پھر وہ لڑنے بھڑنے والوں کے قبیلے کا آدمی نہیں تھا مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا، وہ جن لوگوں کے ساتھ تھا اور جن کی خاطر مجھے باندھ کر لے جانے کے لیے یہاں آیا تھا، ان کے ساتھ کوئی نازک اندام شخص تو چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اب جو بھی کچھ ہو، چوٹ اُسے ایسی ہی آئی تھی کہ وہ پیٹ پکڑے جدھر کے تے انداز میں دوہرا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے نمٹنے کے لعد میں نے اس نیگرو نما ولسن کو دیکھا۔ وہ اپنے سفید فام افسر اعلیٰ کو زمین بوس ہوتے دیکھ کر تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا لیکن ابھی دروازے سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُلٹ کر واپس کمرے میں آ پڑا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے باہر سے اسے ٹھوکر مار کر اندر اچھال دیا ہو۔ اس کے ساتھ

ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے اندر گرتے ہی گریگری پستول ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے ہمفرے بھی تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر دروازے ہی میں رُک گئے۔ اندر کا منظر اُن کے لیے ایسا ہی چونکا دینے والا تھا۔

میں نے گریگری اور ہمفرے کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولا "لو مسٹر گریگری! میں نے تمھاری گنتی میں تین کا اور اضافہ کر دیا ہے۔"

گریگری اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ہوں، کون ہیں یہ لوگ؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ انھوں نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے کہ ان کے چیف نے مجھے اپنے رو برو پیش کرنے کی ذمے داری سونپ کر انھیں میری طرف روانہ کیا تھا اور بقول اس سیاہ ہاتھی کے۔" میں نے نیم جان پڑے ہوئے تھامسن کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کا چیف آج میرا گوشت اپنے کتوں کی ضیافت میں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہڈیاں میری ماں کو تحفے میں روانہ کر دینے کا خواہش مند ہے مگر آج تو اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ اس نے جن لوگوں کو یہ خدمات تفویض کی تھیں، وہ تو بڑے ہی نااہل اور نکمے ثابت ہوئے ہیں۔"

گریگری نے ہمفرے کی طرف دیکھ کر کہا "ہمفرے! اُن لوگوں سے کہو، انھیں یہاں سے اٹھا لیں اور اس نیگرو کے بچے کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کے حوالے کر دو۔"

ہمفرے نے پستول نکال کر اس کالیے کو کور کیا اور اُسے اپنے آگے لگا کر باہر لے گیا۔

ان کے جانے کے بعد گریگری نے مجھ سے پوچھا "ہمارے جانے کے کتنی دیر بعد آئے تھے یہ یہاں؟"

"میں ٹھیک سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ تمھارے جانے کے بعد میں اپنے حالات پر غور کرنے بیٹھ گیا تھا اور اس میں ایسا مستغرق ہوا تھا کہ وقت کے گزرنے کا مجھے احساس ہی نہ رہا۔ نجانے کتنی دیر بعد باہر گولی چلنے کی آواز سن کر میں چونکا تھا۔" میں نے اُسے سب کچھ تفصیل سے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔

پوری کتھا سُن کر وہ بولا "تم نے جو فون ریسیو کیا تھا، وہ پولیس کمشنر کا نہیں تھا۔ انھی میں سے کسی نے ہمیں یہاں سے ہٹانے کے لیے پولیس کمشنر بن کر تمھیں فون کیا تھا۔ میں کمشنر کے آفس پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمارے لیے کوئی فون نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا، شاید کسی نے مذاق کیا ہو گا۔ اکثر شریر قسم کے نوجوان ہمیں تنگ کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں وہاں سے کچھ ضروری کاموں کے سلسلے میں اپنے دفتر چلا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی یہاں آس پاس کے کئی مکانوں سے فون کر کے بتایا گیا کہ ایکر کے مکان کے سامنے ایک دیو ہیکل نیگرو پر دو نوجوانوں نے گولی چلائی ہے اور وہ نیگرو زخمی ہونے کے باوجود اُن دونوں کی گردنیں پکڑ کر انھیں گھسیٹتا ہوا آئیور کے مکان میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں پولیس فورس کے ساتھ یہاں دوڑا چلا آیا اور باہر لان میں اپنے دونوں آدمیوں کو بے جان پڑے دیکھ کر یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کسی نے ہمیں یہاں سے ہٹانے کے لیے فون کیا تھا اور ہمارے جاتے ہی وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے تم پر چڑھ دوڑے تھے۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ کیا تمھارے دونوں آدمی اب تک بے ہوش ہیں؟"

"بے ہوش؟" اس نے کہا "وہ دونوں مر چکے ہیں۔ اس سانڈ نے ان دونوں کی گردنیں توڑ دی تھیں۔ مجھے حیرت ہے ایسی بے پناہ قوت کا مالک شخص تمھارے ہاتھوں اس بری طرح مار کھا گیا کہ اس میں کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ مسٹر غیاث! آخر تم ہو کیا چیز؟"

"بس جی! کرم ہی تھا مولا کا، ورنہ بندہ کس قابل ہے۔ سچ پوچھو تو اگر اس کا ایک بھی ہاتھ بھرپور طریقے سے میرے لگ جاتا تو اس کی جگہ میں پڑا ہوتا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

گریگری میرے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوا مگر خاموشی سے اُسے تسلیم کر لینے ہی میں اُسے کوئی مصلحت نظر آئی تھی۔ پھر بھی اس نے اتنا ضرور کہا "مسٹر غیاث! آدمی تم بھی کچھ کم نہیں معلوم ہوتے۔ جو کچھ نظر آتے ہو وہ ہو نہیں تم۔"

"او نہیں جی، غلط فہمی ہو گئی ہے تمھیں ورنہ میں بھی ہوں آدمی کا بچہ ہی۔"

"ہاں، مگر آدمی کے بچے بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔" اس نے کہا پھر بولا "میرا خیال ہے اب تمھارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں تمھارے لیے کوئی اور انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے چونک کر کہا "میرا یہاں رہنا مناسب کیوں نہیں ہے؟"

"اس لیے کہ جب تک تم یہاں رہو گے، یہ لوگ تمھیں چین نہیں لینے دیں گے۔ کل بھی انھوں نے تمھیں پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ لڑکی الزبتھ تمھارے ساتھ نہ ہوتی تو وہ تمھیں باندھ کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کل کی ناکامی کے بعد خاموش نہیں بیٹھے، آج کل سے زیادہ خطرناک صورت ران تھی انھوں نے تمھارے لیے۔ شاید ابھی تمھارے ستارے گردش میں نہیں آئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"جب تم جانتے ہو کہ ستارے میرا ساتھ دے رہے ہیں تو یہ جگہ چھوڑ دینے کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟ جب تک جان میں جان ہے، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن وقت ہمیشہ ساتھ نہیں دیا کرتا۔ پتا نہیں کب ساتھ چھوڑ دے اور تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔"

وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں اس کی بات کیسے مان لیتا۔ وہ میری روح نکال لینے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے مشورے پر عمل کر کے یہاں سے کہیں اور چلا جاتا تو میری حیات کی ڈور ٹوٹ جاتی، زندگی مجھ سے بے وفائی پر آمادہ ہو جاتی۔ میں وہ جگہ کیسے چھوڑ دیتا جہاں میری زندگی، میری روح لرزی موجود تھی۔ ابھی ایک بجے کے بعد اسے واپس آنا تھا۔ اگر میں گریگری کے کہنے پر عمل کرتا تو وہ مجھے کہاں ڈھونڈتی پھرتی۔ اس کا تو میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ سوتیلی ماں نے اس کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی، ایک باپ تھا سو وہ اپنی جوان بیوی کی نازبرداریوں میں اسے بھول بیٹھا تھا اور پھر میں بھی اس کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس کی قربت نے ہی میرے پیروں میں زنجیر ڈال کر مجھے یہاں باندھ رکھا تھا۔ اس سے دور ہو کر میرے لیے اس سرزمین پر قدم جمائے رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ مجھے اپنی ماں کی یاد ستانے لگتی جو وہاں پاکستان میں میری منتظر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں اس عالی شان کوٹھی کے دروازے پر لگی رہتی ہوں گی، جو میں اس کے سلسلے میں بڑے اہتمام کر آیا تھا۔ وہ سوچتی ہو گی، اس کا بیٹا اس دروازے سے گزر کر اس کے پاس پہنچنے ہی والا ہو گا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کس ارضی مصیبت میں گرفتار ہوں اور دنیا کے کس گوشے میں اپنے نصیبوں سے برسرِ پیکار ہوں جہاں اس کا تصور ہی نہیں پہنچ سکتا ہو گا۔ اسے تو ہر گھڑی یہ آس لگی ہو گی کہ بس اب تب میں اس کا سوہنا پتّر اس دروازے پر نمودار ہو گا اور ماں جی کہہ کر ہنستا ہوا اس کی ممتا بھری آغوش سے لپٹے گا۔ میں نے کوٹھی میں اس کے آرام و آسائش کا مناسب اور معقول انتظام کر دیا تھا مگر میں جانتا تھا، ماں کی نظروں سے اس کا بیٹا دور ہو جائے تو اس کی آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ ٹھنڈے ٹھار اور یخ بستہ ائیر کنڈیشنڈ کمرے بھی اسے دوزخ کی طرح تپتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ان برف جیسے کمروں میں بھی آگ پر لوٹتی ہو گی اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد دامن پھیلا کر اپنے سوہنے رب سے پتّر کی خیر سے واپسی کی دعائیں مانگا کرتی ہو گی۔ یار دوست دشمنیاں پالنا بھی کسی عذاب سے کم تو نہیں ہوتا۔ ہر دم جان ہتھیلی پر رکھی رہتی ہے۔ آدمی اپنے اختیار ہی میں نہیں رہتا۔ میری زندگی کا کتنا بڑا حصہ آنکھ مچولی کے اس کھیل کی نذر ہو گیا تھا۔ کبھی میں فرشتۂ اجل کی طرح کسی کے تعاقب میں دوڑتا پھرتا تھا اور کبھی اپنا آپ چھپائے کسی کو اپنے تعاقب میں دوڑاتا ایسے پیچ در پیچ راستوں پر پڑ جاتا تھا کہ پھر واپسی کا راستہ یاد نہیں رہتا تھا اور ماں جی میری راہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ پھر مہینوں برسوں میں کہیں اس کی کوئی دُعا عرش کو چھو لیتی تھی تو میں اس کے پاس جا پہنچتا تھا۔ مگر اس بار تو یار لوگوں نے حد ہی مُکا دی تھی۔ میرے سارے پرپُرزے کاٹ کے مجھ سیماب صفت شخص کو پورا کا پورا ایکمشت اسمگل کر لائے تھے اور ایک حیرت ناک کام یہ کیا تھا کہ میرے اندر افیون کا وہ خوفناک سفوف بھی بھر رکھا تھا۔ پھر ایک بالکل ہی اجنبی جگہ بٹھا کر مجھ سے دوستی کے رشتے استوار کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ شیطان صفت دھمن اور اس کی وہ نصف بہتر عالیہ جنھوں نے میرے اندر دشمنی کی تخم ریزی کی تھی، اس بار ایک بالکل ہی انوکھے روپ میں میرے سامنے آئے تھے۔ ایسا چولا بدلا تھا انھوں نے کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ مجھے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ دراز کرنے کے سوا کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اور اس عالیہ نے پوری طرح میری نکیل اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ میں نے کچھ ایسی سعادت مندی دکھائی تھی اسے، ایسے کمالات کا مظاہرہ کیا تھا اس کے سامنے کہ اسے میری زندگی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو اس نے مجھے وہ زندہ طلسماتی انگوٹھی دی تھی جس کی وجہ سے امریکا بھر کے اخبارات میرے وجود سے بھر گئے تھے۔ خوب اچھالا تھا انھوں نے مجھے، ایسی مقبولیت دی تھی کہ ہالی ووڈ کے کسی اداکار کو بھی کبھی نہیں دی ہو گی۔ یہ ساری نیک نامی، ساری شہرت عالیہ کی دی ہوئی اس زندہ طلسماتی انگوٹھی کی ہی مرہونِ منت تھی۔ ورنہ تو میں ایک بے نشان شخص غلام جیلانی، جسے امریکا میں چند سیاہ قلب خوش پوشوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا جس طرح غیاث احمد کے فرضی نام سے اسمگل کر کے لایا گیا تھا اسی طرح گمنامی کے عالم میں واپس بھی چلا جاتا۔ امریکی قانون کے ان چاق و چوبند محافظوں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی بدنامِ زمانہ ہسٹری شیٹر، اپنے وطن میں جس کے سر کی قیمت پچاس ہزار روپے مقرر ہے کب ان کی حدود میں داخل ہوا، اور کب ایک لاکھ ڈالر کا ڈرافٹ کما کر واپس چلا گیا۔

گمنامی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ آدمی آزادی کے ساتھ

جب اور جہاں چاہتا ہے، چلا جاتا ہے۔ زمانے بھر میں مارا مارا پھرتا ہے اور کوئی اس سے نہیں پوچھتا کہ یار! یہ جو تو شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا ہے، تو اس کی کوئی غرض و غایت بھی ہے یا بس یوں ہی اپنے پاسپورٹ کی خانہ پُری کرتا اور زمین کی پیمائش کرتا پھر رہا ہے۔ میں جب تک ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا کسی نے مجھ سے بھی یہ نہیں پوچھا تھا کہ اے میاں! تو کس گاؤں کا باشندہ ہے اور کونسی فصل کا مول چکانے یہاں آیا ہوا ہے مگر جب سے میری گمنامی نے میرا ساتھ چھوڑا تھا میں کہیں کا نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح کے سوالات کر کر کے مجھے عاجز کیا ہوا تھا کسی طرح میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے وہ، حالانکہ میں نے اس گرگیری کی ترقی اور نیک نامی کا اچھا خاصا بندوبست کر دیا تھا اور اب میری راہ میں ایک اور سنگِ گراں آگیا تھا مجھے دل کا روگ لگ گیا تھا۔ ایک آفتِ جاں کہ نام جس کا الزبتھ فیلی تھا، میرے خرمنِ ہوش پر برق بن کے آگری تھی۔ اس نے تو میری قوتِ پرواز بالکل ہی سلب کر لی تھی۔ اب میں اس در کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ وہ معاملاتِ دل سے ناآشنا شخص جو صرف قانون کا بندہ تھا، مجھے اس کے در سے اکھاڑ لے جانا چاہتا تھا۔ کہنا اس کا یہ تھا کہ وہ مجھے دشمنوں کی دسترس سے دور لے جانا چاہتا ہے۔ اسے کیا پتا تھا وہ خود مجھ سے کتنی بڑی دشمنی کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے صاف کہہ دیا۔

"دیکھو یار گرگیری! میں اب تک تمھاری ہر بات مانتا رہا ہوں۔ تمھارے فائدے کے لیے میں نے اپنے گرد خوفناک دشمنوں کا انبار لگا لیا ہے۔ وہ لوگ میری جان کے دشمن بن گئے ہیں مگر اب مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو کہ میں یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ میں نے تو تم سے نہیں کہا تھا کہ میری حفاظت یا نگرانی کیلیے اپنے آدمیوں کو مامور کر کے ضائع کرا دو۔ میں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت رکھتا ہوں، تم اس کے لیے فکرمند مت ہو۔ میں چاہتا ہوں جب تک یہاں سان فرانسسکو میں ہوں، اسی مکان میں رہوں۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا "خیر، یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا مگر اس کی وجہ جاننا ضرور چاہوں گا۔ آلیور کی گرفتاری کے بعد بھی تمھاری اس مکان سے دلچسپی کچھ سمجھ میں نہیں آئی میری۔ آخر تم یہ جگہ چھوڑ کر کہیں جانا کیوں نہیں چاہتے؟"

"ہے کوئی وجہ مگر اس میں تمھاری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک دم چونک کر بولا "کہیں اس کی وجہ وہ لڑکی الزبتھ تو نہیں ہے جس نے کل مجھے فون کر کے تمھاری تھی؟ اور جس سے تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا میرے سامنے شاید تم اس سے شادی کا ارادہ بھی رکھتے ہو؟"

"تمھارا خیال کچھ ٹھیک ہی ہے۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے" میں نے جواب دیا۔

"تم نے جب اس کا ذکر کیا تھا اس وقت مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ میں تمھیں بتا دوں کہ تم نے بہت غلط سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ کیا تم اس کے سلسلے میں بہت زیادہ سنجیدہ ہو؟" اس نے سوال کیا تو اس کی آنکھوں سے فکرمندی جھلکنے لگی تھی۔

"ہاں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ چند ہی دنوں میں اس نے مجھے کتنا متاثر کیا ہے۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے باپ آرتھر نے ہمیں شادی کی اجازت بھی دے دی ہے۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے آخر تم یہ جان کر اس قدر فکرمند کیوں نظر آنے لگے ہو؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

وہ کچھ دیر پیشانی پر سلوٹیں ڈالے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے چہرے پر الجھن تیر رہی تھی اور آنکھیں اس کی میرے چہرے پر یوں ٹکی ہوئی تھیں جیسے وہاں لکھی کوئی دھندلی سی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کوئی ایک منٹ اس نے اسی طرح گزار دیا۔ پھر بے یقینی سے نفی میں سر ہلا کر بولا "یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کس بات پر۔ تمھیں کس بات پر یقین نہیں آرہا ہے" میں نے قدرے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"میں کس طرح سمجھ لوں کہ تم ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتے۔ نہیں یہ غلط ہے" اس نے اس طرح سر جھٹکا جیسے وہ کسی ایسے خیال کو سر سے جھٹک دینا چاہتا ہو جو اس کی مرضی کے خلاف اس کے دماغ میں در آیا ہے۔

میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ میں نے جھنجلا کر کہا "اوئے گرگیری بیٹھے! کچھ منہ سے تو بول۔ کچھ تو کھل کے بات کر۔ میرے یار! کیوں قطرہ قطرہ میرا لہو نچوڑنے میں مصروف ہو گیا ہے تو؟"

اس نے ایک بار پھر بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"کیا واقعی تم کچھ نہیں جانتے ان کے بارے میں؟"

"ایسی کیا بات ہے ان لوگوں میں۔ کیا ان میں کچھ اسرار پوشیدہ نظر آئے ہیں تمھیں؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"طنز مت کرو۔ تم میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آرہے، تم نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھ نہیں آتی تمھیں کیا سمجھوں اور کس خانے میں اندراج کروں میں تمھارے نامِ نامی اسمِ گرامی کو۔ کس خانے میں بٹھاؤں تمھیں؟ کبھی تو تم ایک نہایت ہوشیار آدمی دکھائی دیتے ہو اور کبھی بالکل گربہ مسکین نظر آتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنے بارے میں ایک بار سب کچھ بتا دو، سب کچھ صاف صاف، تاکہ ہم تمھارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں۔"

"میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ سب کچھ تو بتا چکا ہوں میں اپنے بارے میں۔ کیا عجیب لوگ ہو یار تم آدمی کی زبان پر اعتبار کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ عجیب شکی لوگ ہو۔ اب اور کیا جاننا چاہتے ہو مجھ سے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ہم زبانوں پر بہت کم اعتبار کرتے ہیں۔ بس خال خال، خاص خاص معاملات میں ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس میں ہمارا قصور بھی کیا ہے۔ جن لوگوں سے بہت ہمارا واسطہ رہتا ہے، وہ ایسے کہاں ہوتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا جائے۔ شک تو ہمیں کرنا ہی پڑتا ہے اور یہ شک ہی ہمیں صحیح سمت میں لے جاتا ہے۔ ہماری کامیابی کا راز ہی یہ ہے۔"

"تو تم میری طرف سے مطمئن نہیں ہو۔ پھر میری حفاظت کے لیے کیوں دوڑے چلے آتے ہو؟"

"نہیں تحفظ فراہم کرنا تو ہمارا فرض ہے۔ اور یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ تمھارے بارے میں صحیح معلومات جمع کریں۔ تم نے اغوا ہونے والے طیارے کو بچا کر ہم پر احسان کیا ہے مگر جس طرح تم نے طیارے کو اغوا ہونے سے بچایا ہے اور جس خوبی سے ہائی جیکروں کو قابو کیا ہے، یہ کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ تم باقاعدہ گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کیے ہوئے ہو۔ ہم نے تمھیں یہاں روکا بھی اسی لیے تھا۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔ تمھارے بیان اور واقعات کی تحقیق کے دوران جو راز ہائے سربستہ منکشف ہوئے ہیں انھوں نے ہمیں ایک دوسری ہی راہ پر ڈال دیا۔ تمھاری بہت سی باتیں درست ثابت ہوئیں لیکن جو بات میرے ذہن میں صاف نہ ہو سکی اور جس نے مجھے الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے وہ ان ہتھیاروں کا بیکار ہو جانا ہے جنھیں تمھارے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ گُر میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے جس سے تم ہتھیاروں کو بے کار کر دیتے ہو۔ آج بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ہمارا آدمی اپنا پستول استعمال نہ کر سکا۔ تم کہتے ہو تم نے اسے مہلت ہی نہیں دی کہ وہ پستول سے گولی چلا سکتا۔ حالانکہ اگر پستول اس کا ساتھ دے رہا ہوتا تو وہ تمھیں اس وقت بھی گولی مار سکتا تھا جب تم اس کالے بن مانس سے برسرِ پیکار تھے اور جیسے ہی تم نے اسے زیر کیا تھا، اسے بے دریغ تم پر گولی چلا دینا چاہیے تھی۔ اس نے تمھیں سنبھلنے کا موقع ہی کیوں دیا؟"

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو، یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے مجھے مہلت کیوں دی؟" میں نے کہا۔

"اس سے پوچھے بغیر میں کہہ سکتا ہوں، اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا۔ وہ مجبور تھا، اس کا پستول ساتھ نہیں دے رہا تھا" اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"اوئے یارا! ایک تو مجھے تیری سمجھ نہیں آتی۔ تو ہے کی شے بھئی؟" میں نے اردو میں کہا۔

وہ ہنس کر بولا "جو کچھ کہنا ہے اس زبان میں کہو جسے میں بھی سمجھ سکوں۔"

میں نے کہا "اوئے یار! تو نے تو کل میری موت کا سامان کر کے بھی دیکھ لیا تھا پھر بھی تیری حالت میں فرق کوئی نہیں آیا۔ میں کس طرح یقین دلاؤں کہ وہ بس ایک اتفاق تھا ورنہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے کوئی طلسم خانہ نہیں چھپا رکھا ہے اپنے اندر۔ بس مرضی ہے مالک کی۔ میری موت ابھی نہیں آئی تھی میری پرچی نہیں کٹی تھی ابھی ورنہ میری موت کا بندوبست تو پورا پورا تھا ان لوگوں کے پاس۔"

"اور یہ دلیو۔ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو تم، اگر تمھارے پاس کوئی خاص قوت نہیں ہے تو یہ کیسے چت ہو گیا تم سے؟ جانتے ہو اس نے میرے جن دو جوانوں کی گردنیں ایک ایک ہاتھ میں دبوچ کر توڑ ڈالی ہیں وہ اچھے خاصے صحت مند اور بہترین تربیت یافتہ تھے۔ مگر تم سے یا اپنے

ہاتھ تڑوا کر ناک آؤٹ پڑا ہے، اس میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں رہی ہے۔" اس نے تھامسن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں یہ فن ضرور مجھے ودیعت ہوا ہے۔ اس سے تو میں انکاری ہو ہی نہیں سکتا۔ تم اپنے یہاں کے کسی بھی بیل تن کو میرے مقابل کر کے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اللہ نے چاہا تو اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ یہ کسی پوشیدہ قوت کا کرشمہ نہیں ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنی اس خصوصیت کا اظہار کر دیا۔

"ہوں۔ تو تم جن لوگوں کے درمیان قیام پذیر ہو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے حالانکہ وہ تمھیں پھانسنے کے لیے اپنے تمام ڈھکے چھپے حربے استعمال کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"ڈھکے چھپے حربوں سے تمھاری مراد کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میری مراد الزبتھ سے ہے۔ تم اس سے شادی کر کے اسے اپنی زندگی میں نصف کا حصے دار بنانے جا رہے ہو اور جانتے اس کے یا اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں ہو۔ یہ میں کیسے مان لوں؟" وہ بولا۔

"اس کا ساتھی تم کسے کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آرتھر فینلی، آلیور اور جوزفین کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" اس نے مجھ سے ہی سوال کر ڈالا۔

"آرتھر لزی کا باپ ہے اور جوزفین اس کی سوتیلی ماں، جبکہ آلیور ایک اسمگلر ہے، اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے بارے میں جو کچھ میں جانتا تھا تمھیں بتا چکا ہوں۔ آرتھر کے بارے میں آلیور ہی نے مجھے بتایا تھا۔ اس کی ٹیکسیاں چلتی ہیں اور ایک دواساز فیکٹری کے کچھ شیئرز لے رکھے ہیں اس نے۔ اس کے علاوہ اور کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

اسی وقت ہمفرے چار پولیس کے سپاہیوں کو ساتھ لیے وہاں آ گیا۔ گرنگری اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ہمفرے سے پوچھا "کیا بات ہے ہمفرے! خیریت تو ہے؟ اتنی دیر کیوں لگ گئی تمھیں واپس آنے میں۔ کوئی مسئلہ تو نہیں پیدا ہو گیا تھا؟"

"وہ مسٹر گرنگری! وہ کالیا پکا شیطان ہے۔ اس نے مجھے ڈاج دے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ عین اس وقت جب میں اسے لے کر پولیس وین کے قریب پہنچا، اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی تھی۔ باہر مجمع اتنا ہو گیا ہے کہ اگر اسے گولی چلا کر روکنے کی کوشش کی جاتی تو مجمع میں سے کسی کے گولی لگ جانے کا اندیشہ تھا۔" وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔

اوئے یار غلام جیلانی، کن لوگوں میں آ پھنسا ہے تو، کس کھائی میں اتار دیا ہے تجھے اس رذیل دشمن نے۔ کیسے گرگٹ کی نسل کے ہیں یہ، ان کی تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتی، پل پل میں تو رنگ بدل لیتے ہیں یہ، ایک لمحے سجن نظر آتے ہیں تو دوسری ہی گھڑی میں دشمن کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اب یہ سالا انگریزی نسل کا گورا، جس کے پرکھوں میں سے کسی نے یہاں آباد ہو کر اسے امریکی ہونے کا شرف بخش دیا ہے، مجھ پر کیسا وقت ڈالے دے رہا ہے۔ یہ تجھے تیری الزبتھ بیگم سے دور کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ نہ جانے اس کے بارے میں کون کون سے راز اپنے سینے میں بھرے بیٹھا ہے۔ ٹھیک ہے وہ آرتھر فینلی کوئی بڑا ہی کیکر قسم کا بندہ ہے۔ اس نے میرے بارے میں بڑی چھان پھٹک کر رکھی ہے۔ اس کا دروں بروں یکساں نہیں ہے۔ کرتا وہ بھی کچھ الٹے سیدھے دھندے ہی ہے۔ ممکن ہے آلیور کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ مگر مجھے تو یہاں اب تک جتنے بھی لوگ ملے تھے دروں بروں کسی کا بھی ایک جیسا نہیں تھا۔ اس ہارٹن ہی کو لے لو۔ ہے تو وہ پولیس کا بڑا ہی سینئر موسٹ اور با اعتبار آدمی مگر کالے دھندے کرنے والوں سے ملا ہوا ہے۔ انھی کے حکم پر اس نے مجھے بیٹرک جیسے ذہین اور فطین افسر کی قید سے رہائی دلائی تھی۔ اس طرح نکالا تھا مجھے اس نے کہ بے چارہ بیٹرک ہاک جان سے ہی گزر گیا تھا۔ اور پھر جب وہ ہمفرے مجھے لے کر اس کے سامنے گیا تو کیسا لال پیلا ہو رہا تھا وہ جیسے سچ مچ میرے فرار میں اس کا کوئی حصہ ہی نہ رہا ہو۔ اب یہ گرنگری ہے جو دو روز سے میرے ساتھ چلتر بازیاں کر رہا ہے۔ اصلیت جاننا چاہتا ہے میری۔ اب میں اسے کیا بتاؤں اپنی اصلیت؟ اگر ہوتا یہ میرے ملک کے کسی علاقے کا تھانیدار، یا کوئی ایس پی، ڈی ایس پی قسم کی چیز تو بتاتا میں اسے کہ میں کون ہوں اور کیا اصلیت ہے میری۔ اس کی ساری تیزی طراری، سارا دم خم نکال کے ڈال دیتا اس کے سامنے اور کہتا، لے پتر یہ ہیں وہ ساری چیزیں جن پر تو اس قدر اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ مگر وہ جو کہا ہے سیانوں نے، اپنے گھر کے سامنے کتا بھی شیر ہوتا ہے تو وہ کچھ زیادہ بھی غلط نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے گھر کے سامنے کتا ہی شیر ہوتا ہے ورنہ شیر تو بس شیر ہی ہوتا ہے کہیں بھی چلا جائے اسے کوئی کتا نہیں کہہ سکتا۔ یہ گرنگری بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا مجھے۔ عیاری اور مکاری میں تو یہ پوری قوم ہی لاثانی ہے۔ ایسے ہی تو انھوں نے آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنے زیرنگیں نہیں کیا ہوا ہے۔ کچھ تو ہے نا ان کے

...ہے ایسے خونخوار ہتھیاروں کی سپلائی کے ٹھیکیدار یہ لوگ ...بن گئے ہیں۔ کچھ تو خصوصی صفات ہیں ان میں جو تیسری ...ممالک کا سہ گدائی لیے ان کے در پہ آوازیں لگاتے ...ہیں۔ مجھے تو انھوں نے فٹ بال بنا رکھا ہے۔ کبھی ...میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی اس گول سے ...کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ یہ فیصلہ وہ کسی طرح کر ہی ...رہے ہیں کہ میرا آخر بنائیں کیا؟ کس دوا میں استعمال کریں ...ہیں کس کس مرض میں کام آ سکتا ہوں ان کے؟

دل تو میرا چاہتا تھا کہ کچھ دستی ہنر پیش کر دوں ان کے ...اور نکل جاؤں کسی بھی سمت۔ چار سمتیں ہیں۔ مشرق، مغرب ...ل جنوب میں سے کہیں تو کوئی ایسا راستہ ہوگا جو یہاں سے ...لے جاتا ہوگا۔ کوئی پگڈنڈی تو میرے سوہنے دیس کو جاتی ...آدمی کو غریب الوطنی میں وطن کی یادیں کیسا بے چین رکھتی ...اس کا تجربہ تو مجھے اب ہوا تھا۔ مجھے تو وطن میرا اس لیے بھی ...یاد آ رہا تھا کہ وہاں میری آسیہ، میری ماں جائی قید و بند کی ...دنوں میں مبتلا تھی۔ میرے جگری یار اسلم آبی کو راولپنڈی جیل ...بلند دیواروں نے اپنے احاطے میں لے رکھا تھا۔ نہ جانے ...مراحل سے گزارا جا رہا ہوگا انھیں وہاں۔ ان کے جسموں ...کو کتنے نشانوں سے سجا دیا ہوگا ظالموں نے۔ اور وہ ...امید پر ہر ظلم سہہ رہے ہوں گے کہ میں کسی وقت بھی انھیں ...کا مژدہ سنا دوں گا۔ ہر ضرب کو وہ آخری سمجھتے ہوں گے۔ ...کس نے بتایا ہوگا کہ میں کس رانددن میں پھنس گیا ہوں اور اس ...کی حالتِ زار تو بہت ہی دگرگوں ہو گی۔ اس کی تو بینائی بھی ...چھوڑ گئی ہے اس کا۔ ان کا خیال آتا تو سینہ سلگ اٹھتا تھا ...بس یہی کرتا تھا، گرد میں ناپ دوں ان سب کی جو میرے ...دیوار بن گئے ہیں۔ مگر میں دل مسوس کے رہ رہ جاتا تھا۔ ...بہت بڑی مشکل تھی اس راہ میں جس نے مجھے باندھ کے ...رکھا تھا۔ کولمبس کی دریافت کردہ اس سرزمین میں میں جدھر ...بھی گزرتا، دور ہی سے پہچان لیا جاتا۔ میں ان میں کسی ...گھل مل ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا رنگ روپ، ان کے ...رنگا رنگ میرے فریم میں فٹ ہی نہیں ہوتے تھے۔ جس راہ ...سے میرا گزر ہوتا لوگ مڑ مڑ کے مجھے دیکھتے جاتے۔ میری ...پر اجنبیت کی مہر لگی تھی۔ دنیا میں ہر جگہ غیر ملک کا باشندہ ...سمجھا جاتا ہے۔ راہ گیر اسے پلٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے ...آنکھ اسے اندر باہر سے اچھی طرح ٹٹولتی رہتی ہے۔ ...آوارہ ویران کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی ...ہوئے کبوتر کی طرح کبھی اس منڈیر پر جا بیٹھتا اور کبھی اس منڈیر پر جا ٹکتا۔ آخر کار کسی ایسی چھتری پر جا اترتا جہاں سے دوبارہ اڑنا نصیب نہ ہوتا۔ پھر ان کی میری ذات سے ساری ہمدردیاں ختم ہو جاتیں۔ وہ مجھے کسی رعایت کے قابل نہ جان کر کوئی ایسا گوشہ فراہم کر دیتے جہاں انتظار کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

میری نجات اسی میں تھی کہ میں اُن لوگوں کا اعتماد حاصل کر لوں تاکہ وہ قانون کی حفاظت میں مجھے اپنے وطن واپس بھیج دیں۔ اگر میں اس میں ناکام ہو جاتا تو ایک صورت اور بھی میرے پیشِ نظر تھی۔ میں انھیں اپنے ماضی کی ایک ایک داستان سنا دیتا۔ انھیں بتا دیتا کہ میں وہ غلام جیلانی ہوں جس کی شہ زوری کے چرچے گلی گلی، قریہ قریہ ہوتے رہے ہیں۔ اپنے وطن کے اخبارات میں میرے کارناموں کی شہ سرخیاں لگتی رہی ہیں۔ قتل و غارت گری کی بے شمار وارداتوں میں میں اپنے وطن کی پولیس کو مطلوب ہوں۔ اور انھوں نے میرے سر کی قیمت پچاس ہزار روپے مقرر کر رکھی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد وہ مجھے اپنے ملک کے سفارت کاروں کے حوالے کر دیتے۔ اور وہ مجھے اپنی تحویل میں لے کر سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ واپس بھیج دیتے۔ اپنے وطن کی مٹی میرے پیروں سے لگتی تو کوئی نہ کوئی راہ نجات کی بھی نکل ہی آتی۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا مسٹر غیاث!" میں گرنگری کی آواز سن کر چونکا اور اسے دیکھنے لگا۔ "تم آرتھر فینلی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے؟"

"ہاں، میں تمھیں بتا چکا ہوں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔ اگر کچھ جانتا ہوتا تو یقین کرو بتانے میں مجھے کوئی عار نہ تھا۔" میں نے ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو گرانڈیل تھامسن کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس چٹی چمڑی والے کو وہ کہیں پہنچا آئے تھے اور تھامسن کے لیے کسی قریبی اسپتال سے اسٹریچر اٹھا لائے تھے لیکن اسے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالنا بھی ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے گرنگری سے کہا "او یار! کیوں ان بے چاروں کو ہلکان کر رہے ہو۔ کوئی بندے کا پتر ہوتا تو یہ اسے اٹھا بھی لیتے۔ اس ہاتھی کو یہ کیسے اٹھا سکیں گے اس کے لیے تو کرین شرین کا بندوبست کرو۔"

گرنگری ہنس کر بولا "بے فکر رہو۔ تم جب اس ہاتھی کو بے دست کر سکتے ہو تو یہ اسے اٹھا بھی نہیں سکیں گے کیا؟ اب ایسے بھی بودے نہیں ہیں یہ۔" پھر وہ بولا "میں تمھیں ان لوگوں کے بارے میں وہ سب کچھ بتائے دیتا ہوں جس سے

تم لاعلمی کا اظہار کر رہے ہو۔ اس کے بعد تم شاید صحیح فیصلہ کر سکو کہ تمھیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے یا نہیں۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم کن لوگوں میں گھرے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم اپنا دروں کھول کے رکھ دو میرے آگے، میں بھی اپنی زنبیل تمھارے سامنے اُلٹ دوں گا۔ ایک ایک بات بتا دوں گا اپنے بارے میں۔"

"اچھا تو سنو۔" اس نے کہنا شروع کیا "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ آلیور عیسائی ہونے کے باوجود یہودیوں کے مفادات کے لیے کام کرتا رہا ہے۔"

"ہاں، یہ میں نے اس کی ڈائری میں پڑھا تھا۔ اس نے لکھا تھا اپنے اعتراف نامے میں وہ منشیات کی اسمگلنگ سے حاصل ہونے والے کروڑوں ڈالر زاب تک اسرائیلی لیڈروں کو ان کی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے دے چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ امریکی عیسائی ہونے کے باوجود ان یہودیوں سے اس قدر ہمدردی کیوں رکھتا ہے۔ کون سے مفادات وابستہ ہیں اس کے ان سے؟"

"وہ ایک ہی امریکی نہیں ہے جو یہودیوں سے دلی ہمدردی رکھتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے علاوہ دنیا کے بے شمار ممالک میں جہاں یہودی آباد ہیں، ان گنت لوگ ایسے ہیں جو ان سے نہ صرف ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ ان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آلیور بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ یہودیوں سے ہمدردی رکھتا تھا اور ان کے کام آنا چاہتا تھا۔ یہودیوں کو تو ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ آرتھر کو معلوم ہوا کہ وہ یہودیوں کا دوست ہے تو اس نے اسے یہودیوں کے لیے فنڈ جمع کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے اس پر بھی تیار کر لیا کہ اسرائیل کے دفاعی اخراجات پورے کرنے کے لیے منشیات کی اسمگلنگ میں ان کا ساتھ دے۔"

"آرتھر نے اسے اس کے لیے آمادہ کیا تھا! اس کا مطلب یہ ہوا کہ آرتھر پہلے ہی سے اسرائیل کے لیے یہ کام کر رہا تھا۔ وہ بھی ان کے دوستوں میں سے ہی ہے؟" میں نے کہا۔

"دوست نہیں، مسٹر غیاث! وہ یہودیوں کا صرف دوست نہیں ہے۔ وہ ایک کٹر یہودی ہے۔ انتہائی متعصب یہودی، جو یہودیوں کے اس نعرے پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ بنی اسرائیل دنیا کی سب سے افضل اور برتر قوم ہیں۔ دنیا کا ہر یہودی خواہ وہ کہیں بھی آباد ہو خود کو اسرائیل کا باشندہ ہی سمجھتا ہے اور صیہونیت کے لیے ہر قسم کی خدمت بے دریغ انجام دیتا ہے۔"

"کیا... کیا کہا تم نے! آرتھر یہودی ہے؟" میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا دل کسی نے بری طرح مسوس کر رکھ دیا ہو۔ "پھر تو... الزبتھ بھی... یہودی ہے؟" مجھ سے بولا نہیں گیا۔

گریگری میرے چہرے پر نظریں جمائے بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری حیرت سے پھٹی... ہوئی آنکھیں اور ابتر حالت کہیں اداکاری تو نہیں ہے لیکن مجھے اس وقت کسی اداکاری کا ہوش ہی کہاں تھا۔ میرا تو دل و دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ دل سینے میں تڑپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور دماغ کی رگیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ میرے تو وہم و گمان میں کہیں دور دور یہ بات نہیں تھی کہ میں جس کے تصور سے اپنے اجاڑ دل کو گلستان بنائے ہوئے ہوں، جس کی موہنی صورت کو قابلِ پرستش سمجھ بیٹھا ہوں وہ ایک ایسی قوم کی فرد ہے جس کا نام بھی میرے لیے گالی ہے۔

گریگری نے میری حالت دیکھ کر کہا "مسٹر غیاث! اب اچھا، میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ تم واقعی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ہاں، آرتھر بھی یہودی ہے اور تم بھی۔ یہ دونوں، جامعہ یہودا، کی ذیلی تنظیم جیوش ایجنسی کے سرگرم کارکن ہیں۔ تمھارے لیے یہ اطلاع بھی بڑی دھماکا خیز ہوگی کہ وہ دونوں باپ بیٹی نہیں ہیں۔"

"کیا... کیا! وہ باپ بیٹی نہیں تو پھر کون ہیں؟" مجھے تو اس نے حیرتوں کے سمندر میں غوطے دینا شروع کر دیے تھے۔ کیسے عجیب عجیب انکشافات کر رہا تھا وہ اس وقت۔

"ہاں، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ باپ بیٹی نہیں ہیں اور نہ ہی جوزفین آرتھر کی بیوی ہے لیکن ظاہر وہ لوگ یہی کرتے ہیں سب کے سامنے۔" گریگری نے بتایا۔

"پھر کون ہیں وہ، کیا رشتہ ہے ان کے درمیان؟ کس رشتے سے وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے درمیان یہودیت ہی سب سے بڑا اور قابلِ رشتہ ہے۔ وہ دونوں، الزبتھ اور جوزفین، آرتھر کی دست راست ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے آرتھر تک پہنچاتی ہیں جو یہودیوں کے ہمدرد ہیں اور بعض اوقات تم جیسے لوگوں کو بھی اپنے جال میں پھانس کر ان کے ذریعے اپنے قومی مقاصد پورے کرتی ہیں۔"

"تو وہ میرے گرد پھندے کس رہی تھی، وہ ذلیل یہودن مجھے آلۂ کار بنا کر اسرائیل کے لیے دولت حاصل کرنا چاہتی تھی۔"

"...پیتے؟" میں نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔

"تمھاری قسمت اچھی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہو گئی تمھاری۔ ...ی میں کسر نہیں رہ گئی تھی۔ تم اس کی معصوم صورت پر مر مٹے ...کے لیے ہنسی خوشی سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے اور تمھارے ...بھی یہ نہیں جان سکتے کہ تم اصل میں کام کس کے لیے کر ...۔" گریگری بولا۔

"میں تمھارا شکر گزار ہوں گریگری! تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ ورنہ میں تو انجانے میں اپنی قوم کے لیے شرمندگی کا ...بیٹھا تھا اور پھر وہ تم نے کیا نام لیا تھا اس کا وہ جامعہ ... اور اس کی وہ ذیلی تنظیم۔ کیا ہے وہ، کیا نام ہے اس کا؟" ...نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"جیوش ایجنسی۔" وہ بولا۔

"ہاں، ہاں۔ یہی جیوش ایجنسی۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟" میں...

"جامعہ یہودا، یہودیوں کی ایک بہت بڑی تنظیم ہے۔ ...یارک میں اس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اسرائیل اور دنیا بھر میں جہاں ...یہودی آباد ہیں ان کے مستقبل کے لیے یہی منصوبہ بندی ...کرتا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے یورپی قوموں پر محنت کر رہے ... ابتدا میں جامعہ یہودا کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا۔ انیس سو ...کی جنگ سے قبل انھوں نے لندن کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ...برسوں کی پُرزور، کامیاب پروپیگنڈہ مہم کے بعد یہ ...کی طرف رجوع ہوئے اور نیویارک کو مرکز بنا لیا۔ اب دنیا ...کے یہودیوں اور یہودی تنظیموں کو نیویارک ہی سے ہدایات ...کی جاتی ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں جامعہ یہودا کی دو ذیلی تنظیمیں قائم ...ہوئیں جن میں سے ایک کا ہال، اور دوسری جیوش ایجنسی ہے۔ ...دونوں تنظیمیں الگ الگ جامعہ یہودا کے مقاصد کی تکمیل کے ...کام کرتی ہیں۔ امریکا کے تقریباً تمام ذرائع ابلاغ پر جامعہ ...کا قبضہ ہے۔ یورپ اور امریکا میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور ...کے ذریعے برسوں سے زبردست پروپیگنڈہ مہم جاری ...عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہودیوں کی بے ...سامانی اور مظلومیت کی داستانیں خوب بڑھا چڑھا کر پیش کی ...تم امریکہ اور یورپ کے عوام میں یہودیوں کے لیے جو ...جذبات دیکھتے ہو، یہ اسی پروپیگنڈے کا نتیجہ ہیں۔ ...یہودا دنیا بھر کے یہودیوں کو یہ درس دیتی رہتی ہے کہ وہ ...سب سے افضل ہیں۔ وہ جہاں بھی ہیں صرف اور صرف ...یہ انھیں صیہونیت کے مقاصد کو ہر حال میں پیش نظر ...اور ان کے لیے کام کرنا ہے۔ جامعہ یہودا کے تین بڑے مقاصد ہیں جن کی تکمیل کے لیے ہر یہودی شب و روز کوشاں رہتا ہے۔ ہر جگہ ان کے پیش نظر یہی تین مقاصد ہیں۔

اوّل یہ کہ دنیا کی ساری دولت پر یہودیوں کا قبضہ ہو۔ اس کے لیے وہ مشرق سے مغرب تک ہر ملک کی معیشت پر اپنا تسلط قائم کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ امریکا، یورپ افریقہ اور ایشیا کے بیشتر ممالک کی معیشت پر وہ بری طرح چھاتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ امریکا جیسے ممالک کو بھی اسرائیل کی امداد و اعانت پر مجبور کر دیتے ہیں۔

دوئم یہ کہ ابلاغ کے تمام ذرائع اپنے قبضے میں رکھو اور ان کے ذریعے نہ صرف عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرو بلکہ مختلف اقوام کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے ان کا سکون درہم برہم کرتے رہو۔ کسی کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ وہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔

تیسرا اور سب سے خوفناک کام یہ ہے کہ یہودیت کے سوا دنیا کے ہر مذہب اور نظریے کو باطل کرنے کے لیے انتشار اور افتراق کے بیج بوتے رہو۔ چنانچہ اس کے لیے ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ جہاں بادشاہت ہوتی ہے، وہاں کے عوام میں یہ جمہوریت کی تبلیغ کرتے ہیں اور جمہوری تحریکوں کو جنم دیتے ہیں۔ جہاں مذہب کا چرچا ہو وہاں لادینیت (سیکولرازم) کے نعرے لگواتے ہیں۔ جہاں جمہوریت ہوتی ہے وہاں سوشلزم کا پرچار شروع کر دیتے ہیں اور جہاں سوشلزم ہوتا ہے وہاں انتہا پسندانہ خالص مارکسی کمیونزم لانے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ غرض دنیا کو کسی نہ کسی طرح انتشار میں مبتلا رکھنا ان کا مقصدِ حیات ہے۔

صیہونیت کا بانی یہودیوں کا لیڈر تھیوڈر ہرزل کہا کرتا تھا۔

"ہمارا مسئلہ معاشرتی نہیں ہے۔ یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ اسے عالمی سیاسی مسئلے کی شکل دے دی جائے تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم دنیا بھر کے یہودی ایک قوم ہیں۔ ایک واحد اور منظم قوم، اگر ہم نے یہ بات بھلا دی اور ہم نظریات کی بنیاد پر منتشر ہو گئے تو ہم مزدور بن جائیں گے۔ دوسری قومیں ہمیں غلام بنا لیں گی۔ ہم جبھی سربلند ہوں گے جب دنیا بھر کے سرمائے پر ہمارا خوفناک حد تک تسلط ہو جائے گا۔ ان تمام حکومتوں کو تلپٹ کر دو جو قومیت کی بنیاد پر

قائم ہیں۔ کیونکہ یہ حق صرف یہودی قوم کا ہے۔ دوسروں کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں کمیونزم یا صیہونیت!"

چنانچہ جرمن اشتراکیت ہو یا روس کا کمیونسٹ انقلاب ہر جگہ یہودی ہی سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ یورپ میں سیکولرازم، لبرلزم، سوشلزم اور کمیونزم ان سب کے بانی یہودی ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد جو پہلی پولٹ بیورو بنی اس کے سات ارکان یہودی تھے۔ کیوں کہ روسی انقلاب کی ساری منصوبہ بندی یہودیوں نے کی تھی۔ اس کے علاوہ لیون ٹراٹسکی برونشتاین جسے لینن نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا مشرقی نیویارک کا رہنے والا یہودی تھا۔ امریکی معیشت اور ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کے قبضے نے امریکی عوام کو ان کا ہمنوا بنا دیا ہے۔ حکومت اور انتظامیہ مجبور ہو کر رہ گئی ہے لیکن اب جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اس نے امریکا کے سنجیدہ حلقوں اور حکومت کو ایک قومی مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ جس طرح امریکا میں منشیات پھیلا رہے ہیں اسے روکا نہیں گیا تو مستقبل میں صحت مند قیادت اور دانشوروں سے امریکا خالی ہو جائے گا۔

آرتھر فینلی، سان فرانسسکو میں یہ زہر پھیلا رہا ہے۔ الزبتھ اور جوزفین اس کی کارکن ساتھی ہیں۔ ابتدا میں الزبتھ خود بھی اسمگلنگ کرتی رہی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کئی بار انڈیا، پاکستان، ایران اور افغانستان جا چکی ہے۔ اس پر کبھی کسی کو شک بھی نہ ہو سکا کہ وہ کس لیے بار بار ان ممالک کے چکر لگاتی ہے۔ وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے مشاہدات کی غرض سے وہاں جاتی تھی۔ اس کا حسنِ معصوم اس کی بہترین ڈھال بنا رہا۔ وہ اتنی کم سن، معصوم اور بھولی بھالی نظر آتی ہے کہ کوئی اس کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہو گی۔ اداکارہ وہ اس درجے کی ہے کہ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کبھی اسے دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بار ایران کے راستے وہ افغانستان جا رہی تھی تب ہمارے ایک آدمی کو اس پر شبہ ہو گیا۔ وہ اس سے قبل ایک بار اسے انڈیا سے افغانستان جاتے دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ وہیں رُک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس سے یہی غلطی ہوئی۔ اگر وہ اس کے پیچھے لگا رہتا تو اسے اسمگلنگ کے سامان سمیت آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ واپس آئے گی تو اس کا پیچھا کر کے اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا مگر اس نے واپسی کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔

اس کی رپورٹ پر یہاں پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی جس کے نتیجے میں اسے باہر بھیجنا بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد الزبتھ اور جوزفین، آرتھر کی دواساز کمپنی کے نمونے لے کر جانے لگیں۔ وہ بھی نظر میں آ گئے تو انھوں نے اب تمھیں تاکا ہے۔ غالباً اب انھوں نے اسی علاقے سے کیریئر تلاش کرنا شروع کر دیے ہیں، جہاں سے وہ منشیات لے کر آتے ہیں۔ تم ان کا پہلا شکار ہو۔ مگر تم بھی کم نہیں ہو استاد! تم نے پہلے ہی تجربے میں ان پر وقت ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا "اب میں ایسا بھی مٹی کا مادھو نہیں ہوں کہ کوئی میری مرضی کے خلاف مجھے کیریئر بنا ڈالے اور میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکوں کہ اے بھائی تیرا حدود اربع کیا ہے۔ کیا سمجھ کے تو نے مجھے اپنا توشے دان بنا ڈالا ہے۔ مگر یار یہ یہودی بھی ہیں بڑی کتی شے... کہاں کہاں ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے ہیں انھوں نے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا دھندے دریافت کر رکھے ہیں۔ کیسے کیسے خوفناک منصوبے ڈالے پھرتے ہیں یہ اپنی جیبوں میں۔ اور حیرت یہ ہے کہ تم لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ پیروں کی مالش ہی کرتے رہتے ہو۔ اب اپنے اوپر وقت پڑا ہے تو ان کے عیب نظر آئے ہیں تمھیں!"

"یہی تو ہماری مجبوری ہے، انھوں نے ہمیں بھی بری طرح اپنے شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے" وہ بولا "ان کے کام کرنے کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ کوئی ثبوت ہی نہیں چھوڑتے ہیں کہیں۔ اب دیکھو تمھیں انھوں نے وہیں پاکستان میں کہیں تاکا ہوگا۔ پھر یہ تمھیں یہاں لائے اور اس طرح لائے کہ تمھیں کیریئر بھی بنا ڈالا۔ پھر الزبتھ کے ذریعے تمھاری کو جیبیں کاٹنے کا بھی انتظام کر ڈالا۔ اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم اپنے وطن میں کوئی نیک نام آدمی نہیں ہو۔ انھوں نے وہاں تمھارے متعلق سنا ہوگا۔ پھر تمھیں دیکھ کر یہ اندازہ کیا ہوگا کہ تم ان کے کس قدر کام آ سکتے ہو۔ کچھ بہت ہی سنگین قسم کے جرائم درج ہوں گے وہاں تمھارے حساب میں، ایسے سنگین جرائم جن کے سرزد ہونے کے بعد آدمی کو کسی محفوظ ترین پناہ گاہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تمھیں بھی کوئی ایسی ہی جائے پناہ درکار ہو گی تبھی وہ تمھیں یہاں لے آئے۔ انھوں نے کوئی بہت ہی محفوظ و مامون پناہ گاہ فراہم کر دینے کا وعدہ کر کے ہی تمھیں کیریئر بننے پر راضی کیا ہوگا۔ اور یہ جو ڈرافٹ تم ساتھ لیے پھر رہے ہو یہ اسی خدمت کے صلے میں تمھارے پاس پہنچا ہوگا..."

"بس بس، زیادہ اندازے نہ لگا میرے یار! اب تجھ سے غلطیاں سرزد ہونے لگی ہیں۔ ویسے استاد! آج تو نے

میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہے۔ کھڑے رہنے کی جگہ نہیں چھوڑی ہے تو نے میرے لیے۔ یہ اتنے بہت سارے اعداد و شمار اور یہ ڈھیروں معلومات کس خانے سے نکالی ہیں تو نے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

وہ آہستہ سے مسکرایا "یہ مذاق میں اُڑا دینے والی بات نہیں ہے میرے دوست! یہ ایک بڑا ہی سنگین مسئلہ ہے جس سے آج امریکی قوم دوچار ہے۔"

"نہیں نہیں، میرے یار گرگری! تو نے یہ کیسے جان لیا کہ میں مذاق میں اڑا دینا چاہتا ہوں اسے؟ غلط فہمی ہو گئی ہے تجھے۔ ایسے سنجیدہ اور خوفناک مسئلے میں مذاق کی گنجائش ہی کہاں نکلتی ہے؟ میری تو عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ میں نے کسی پولیس کے آدمی کو پہلی بار ایسی دقیق گفتگو کرتے سنا ہے۔ اور سوچ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں۔ کیا پولیس کے محکمے میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اتنی گہرائی تک جا کر دیکھتے اور اتنے اہم موضوعات پر مغز کھپاتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمھارے خیال میں پولیس کا محکمہ کوئی ایسی مخلوق چلاتی ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہے؟"

"کم از کم ہمارے یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید امریکا میں سبھی پولیس والے تم جیسے ہوں۔ مگر میرے لیے تو یہ ایک بالکل ہی نیا، بالکل انوکھا تجربہ ہے" میں نے اسے بتایا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو غیاث احمد! پولیس اگر اہم قومی معاملات سے بے خبر ہو جائے اور ملکی امور کی جانب سے آنکھیں پھیر لے تو اپنے ملک کے خلاف ہونے والی سازشوں اور تخریب کاریوں سے کس طرح نمٹے گی۔ یہ تو ہمارا فرضِ اوّلین ہے۔ ہمارے محکمے کی ذمّے داری ہے۔ ہم اپنے ملک میں رونما ہونے والے چھوٹے بڑے واقعات سے بے خبر رہ کر اپنی ذمّے داری فریضے سے غفلت برتنے کا جرم کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم اگر حالات پر گہری نظر نہیں رکھیں گے تو ہمیں یہ کیسے پتا چل سکے گا کہ ہمارے ملّی مفادات پر کہاں سے ضرب لگائی جا رہی ہے؟" وہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"شاوا بھئی، گل ای مُکا دی تُو نے تو" میں نے کہا "دنیا تو یہی جانتی ہے، یہودی تمھارے بہترین دوست ہیں اور تمھاری حکومت اسی دوستی کا وقتاً فوقتاً ثبوت بھی فراہم کرتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود تمھارا محکمہ ان کے اعمالوں پر بھی نظر رکھتا ہے، ان کا بھی محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ ایسی سخت دیکھ ریکھ تو بیشتر ممالک میں دشمنوں کی بھی نہیں کی جاتی۔ انھیں اسی وقت دیکھا جاتا ہے جب وہ کچھ کر گزرتے ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں؟ بہر حال یہ موقع اس بحث میں الجھنے کا نہیں ہے غیاث احمد! میں نے تمھیں وہ سب کچھ بتا دیا ہے جس کا جاننا اب تمھارے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ" وہ جو تمھارے بظاہر بے حد ہمدرد دوست ہیں، جنھوں نے تم سے بے شمار وعدے کیے ہیں اور ایک لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم تمھاری جھولی میں ڈال کر اپنی دوستی کا اعتبار قائم کیا ہے' ان کی اصلیت جاننے کے بعد بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھولو گے؟"

"گرگری میرے یار! مجھ پر یقین کرو، میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ہے اور جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے اگر یہ سب درست ہے تو میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے بروقت چوکنا کر دیا" میں نے کہا۔

"شکر گزاری کی کوئی بات نہیں ہے مسٹر غیاث احمد! یہ میری ذمّے داری تھی، تمھیں اس سے آگاہ کر دینا کہ تم کن لوگوں سے دوستی کے رشتے استوار کر رہے ہو اور انجانے میں کس راہ پر نکل آئے ہو، میرا فرض تھا۔ لیکن شاید تمھیں میری باتوں پر اعتبار نہیں ہے۔ تمھارا خیال ہے کہ میں نے تمھاری زبان کھلوانے کے لیے کوئی داستان گھڑ لی ہے۔"

"او نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"پھر تم مجھے کچھ بتانے سے ہچکچا کیوں رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"او بھائی گرگری! تو میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتا یار! مانتا کیوں نہیں کہ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہے جو میں تجھے بتا چکا ہوں" میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا "اچھا اپنے بارے میں ہی سچ بول دو"

تھا وہ بڑا ہی سیانا۔ کیسا سیاپا دکھا رہا تھا مجھے۔ مجھ سے میری اصلیت اگلوا کے اپنے طور پر اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا، اس تفتیش کے دوران اسے وہ باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی جو میں نہیں بتا رہا ہوں۔ حالاں کہ میں نے اس سے دھمن اور عالیہ کے ناموں کے سوا کچھ نہیں چھپایا تھا۔ ان کی طرف تو میں اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے مجرم تھے۔ ان دونوں سے تو مجھے اپنے گم شدہ برسوں کا بہت سا حساب کتاب کرنا تھا۔ انھیں میں کیسے اس کے حوالے کر دیتا۔ اپنے بارے میں اسے ساری حقیقت سے آگاہ کر دینے کا میں خود ہی فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔ خیال میرا یہی تھا" اگر میں نے صاف گوئی سے کام لے

کر اس کی ہمدردی حاصل کر لی تو وہ ضرور میری واپسی کا کوئی راستہ نکال لے گا۔ ورنہ وہ مجھے پاکستانی سفارت خانے کے حوالے کر دے گا اور ان سے کہے گا کہ لو میاں سنبھالو اپنے اشتہاری مجرم کو۔ تم تو اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ دیکھو ہم نے اسے کس طرح باندھ کے تمھارے حوالے کر دیا ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ "گریگری یار! تو میرے بارے میں جان کے کیا کرے گا؟ میں بڑا تیرہ بخت گم کردہ راہ شخص ہوں۔ میرا اصل نام غلام جیلانی ہے۔ میری نیک نامی کا اندازہ یوں کر لے کہ میرے وطنِ عزیز میں میرے سر کی قیمت پچاس ہزار روپے مقرر ہے۔ تیرا یہ اندازہ غلط ہے کہ جو لوگ میری یہاں موجودگی کا سبب بنے ہیں انھوں نے مجھ سے کوئی وعدہ بھی کیا ہے۔" میں نے اپنی پوری داستانِ حیات من و عن بیان کر ڈالی۔ پھر کہا۔ "حیرت مجھے یہ ہے تم آرتھر وغیرہ کے بارے میں اتنی ساری معلومات رکھتے ہوئے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو۔ ابھی تک انھیں آزاد چھوڑ رکھا ہے؟"

"اس میں ہماری کچھ مصلحت ہے۔ ہم انھیں اس وقت تک چھیڑنا نہیں چاہتے جب تک ان کے ایک ایک کارندے کا ایک ایک ٹھکانے کا ہمیں علم نہیں ہو جاتا۔ تمھیں انھوں نے جس کلینک میں رکھا تھا وہ بھی ہماری نظر میں ہے۔ اس کا مالک تمھارے ہی وطن کا ایک شخص ڈاکٹر دھمن ہے۔ اور وہاں کا زیادہ تر اسٹاف بھی پاکستانی ہے۔ کیا تم جانتے ہو اس ڈاکٹر دھمن کو؟"

"ایسی کوئی خاص واقفیت تو نہیں ہے میری اس سے۔ البتہ جانتا ضرور ہوں۔ کلینک میں قیام کے دوران ہی دو ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اس نے تو تمھاری ضمانت بھی لینے کی کوشش کی تھی۔ دو وکیلوں کا انتظام کیا تھا اس نے تمھارے لیے۔ وہ اتنا مہربان کیوں ہو گیا تھا تم پر؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میں نے ہی بیٹرہاک سے کہا تھا، وہ ڈاکٹر دھمن کو اطلاع کر دے۔ شاید وہ میری ضمانت لے لے۔ بیٹرہاک نے مجھ سے یہی کہا تھا، اگر کوئی تمھاری ضمانت لے لے تو میں تمھیں حوالات سے نکال دوں گا۔ میرا تو خیال ہے وہ کوئی بڑا ہی انسان دوست قسم کا آدمی ہے، وہ ڈاکٹر دھمن ورنہ کسے پڑی ہے دو دن کی شناسائی پر ضمانتیں لیتا پھرے۔" میں ڈاکٹر دھمن کی طرف سے اس کے شبہات مٹا دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے اس کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ بھی کوئی طفلِ مکتب قسم کا بندہ تو نہیں تھا۔ نہ جانے کن کن مراحل سے گزرتا رہتا تھا وہ۔ بھانت بھانت کے آدمیوں سے واسطہ رہتا تھا اس کا۔ میری باتیں اس پر اثر انداز کہاں ہو سکتی

تھیں۔ اس نے موضوع ہی تبدیل کر دیا تھا۔ بولا۔ "ہمیں تمھارے تعاون کی ضرورت ہے غلام جیلانی! ہم چاہتے ہیں تم ہمارا ساتھ دو۔"

"میں نے تم سے کہہ تو دیا ہے، میں عدالت میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ لیکن تم بھی میری وطن واپسی کا وعدہ یاد رکھنا۔ میں جلد سے جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "مگر اب شاید تمھیں عدالت میں پیش کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اگر تم ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو ہم دو ایک روز میں ہی تمھیں یہاں سے نکال دیں گے۔"

"دو ایک روز میں!" میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "کیا وہ مقدمہ ختم ہو جائے گا؟"

"مقدمہ تو ختم نہیں ہو گا۔ کریں گے ہم یہ کہ تمھارے جانے کے بعد عدالت کو بتائیں گے کہ ملزمان کے ساتھیوں نے تمھیں اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔ پھر ہم تمھیں برآمد کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے۔ اس طرح مقدمہ طول پکڑ جائے گا۔ اس عرصے میں تمھارے ذریعے ہم ایسے لوگوں کو بھی پکڑ لیں گے جو اب تک ہماری نظروں میں نہیں آسکے ہیں۔ تم وطن واپس جا کر ہر ایک کو یہی بتانا کہ ہمیں ڈاج دے کر نکل آئے ہو۔"

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے دریافت کیا۔ "اور وطن واپس جا کر میں تمھارے کس کام آؤں گا؟"

"یہ ہم تمھیں طیارے میں سوار کراتے وقت بتا دیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا کون سا کام تھا جو وہ مجھ سے میرے ہی ملک میں لینا چاہتا تھا۔ امریکی سی آئی اے کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہیں یہ لوگ مجھے اپنا آلۂ کار بنا کر میرے وطن کو کسی مشکل سے دوچار کرنا تو نہیں چاہتے۔ کہیں یہ میرے دیس کی سرزمین پر میرے ذریعے سازشوں کی کاشت تو نہیں کرنا چاہتے۔ میرے ہاتھوں میں اپنے کسی خوفناک منصوبے کی باگ ڈور تو تھمانا نہیں چاہتے۔ یہودی تو ہمارے کھلے دشمن تھے ہی مگر یہ امریکن بھی کچھ زیادہ نیک نام تو نہیں تھے کہ میں آنکھ بند کر کے ان سے کوئی وعدہ کر لیتا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "اب کون سا کام لینا چاہتے ہو میاں صاحب مجھ سے تم جس کے عوض میرے سارے گناہ معاف کیے دے رہے ہو؟"

"اس کی فکر مت کرو۔ ہم تم سے تمھارے ملک کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں لیں گے۔ ہم جو کام تمھارے سپرد کریں گے اس سے تو تمھارے ملک کو فائدہ ہی پہنچے گا۔" اس نے مجھے سمجھایا۔

"ہاں، اگر ایسا ہے تو میں تم سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔" میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

میرا جواب سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور نہایت گرم جوشی سے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے بولا۔ "اوہ تھینکس مائی ڈیئر فرینڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم فکر مت کرو۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھا تو تم دیکھو گے، ہم تمھارے کس کس طرح کام آتے ہیں۔ بڑے وسائل ہمیں دے رکھے ہیں خدا نے۔ تمھاری ساری الجھی گتھیاں سلجھا دیں گے ہم۔"

لگ کچھ ایسا تھا جیسے میں نے اسے کوئی بہت بڑی خوشی دے دی ہو۔ مسرت سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اپنے اس بے پناہ انبساط کو سمیٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "اچھا مائی ڈیئر! اب میں چلوں گا۔ ابھی پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان تینوں گدھوں سے بھی نمٹنا ہے۔ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا میں ان سے کہ وہ کون ہے جسے ان کی زندگی سے اتنی نفرت ہو گئی ہے۔ کس نے انھیں تمھاری طرف دھکیل کر ان کی جان لینا چاہی تھی۔ شاید وہ کچھ اگل ہی دیں۔"

میں اسے رخصت کرنے کے لیے باہر تک آیا تھا۔ اس کے عملے کے تمام افراد ان تینوں جیالوں کو اپنی وین میں ڈال کے لے جا چکے تھے۔ صرف ہمفرے ان کے استعمال میں رہنے والی پولیس کار کے دروازے سے ٹکا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ گریگری نے باہر آ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا۔ تمھارے کسی بھی عمل سے الزبتھ یا آرتھر پر یہ ظاہر نہ ہو کہ تم ان کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر چکے ہو۔ ان سے بالکل اسی طرح ملتے رہو جیسے اب تک ملتے رہے ہو۔ میں اپنے چار آدمی یہاں بھیج دوں گا۔ جو آئندہ کسی اچانک حملے کی صورت میں تمھاری مدد کریں گے۔"

"نہیں، اب تم مزید اپنے کسی آدمی کو ضائع مت کرو۔ مجھے ان لوگوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔" میں نے اس سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے جیسی تمھاری مرضی۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بیرونی دروازہ بند کر دیا اور واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے اندر آگ لگا گیا تھا۔ اپنا سارا وجود جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مجھے۔ ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات کیے تھے اس نے، پل پل چونکا تا رہا تھا وہ مجھے۔ آہ۔ کیسے کیسے حسین سپنے دیکھے تھے میں نے، اس یہودن بچی کو اپنے سامنے... بٹھا کر کیا کیا منصوبے بنائے تھے کیسی چاہت

سے دل کے آئینہ خانے میں اتارا تھا اس اسرائیل زادی کو۔ کیا سمجھتا رہا تھا میں اسے اور کیا نکلی تھی وہ۔ صورت سے تو وہ بالکل ایک بھولی بھالی معصوم اور مسکین بچی معلوم ہوتی تھی۔ ایسی معصوم کہ جس نے ابھی پوری طرح آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد کا ماحول بھی نہ دیکھا ہو۔ اور گن لومڑیوں جیسے بھر رکھے تھے اس نے اپنے اندر۔ اب اس کی نستعلیق اردو اور فارسی دانی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اسے خصوصی طور پر ان علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں سکھائی گئیں تھیں جن علاقوں میں اسے کام کرنا تھا۔ اس کے سرپرستوں نے اسے ہر فن میں طاق کر کے اور ہر قسم کے اسلحے سے لیس کر کے ہی اتارا ہو گا میدان میں۔ اب مجھ پر اس کا یوں ایک دم میرے گرد پھیل کر میرا احاطہ کر لینے اور عشقِ پیچاں کی طرح چھاتے چلے جانے کا مقصد بھی منکشف ہو گیا تھا۔ میں بھی بالکل الو ہی بن گیا اس کے سامنے۔ بس اس کے جمال کی رعنائیاں ہی دیکھتا رہا تھا۔ یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ آخر مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو وہ یوں والہ و شیدا ہوئی جا رہی ہے۔ آنکھوں پر اس نے میری ناز و انداز کے ایسے پردے ڈال دیے تھے کہ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا مجھے اس کے سوا۔ ہوش اس نے میرے ایسے گم کیے تھے کہ میں اس کے کسی فعل کو قابلِ گرفت سمجھتا ہی نہیں تھا ورنہ مجھے یہ تو سوچنا ہی چاہیے تھا وہ ایک مادر پدر آزاد معاشرے کی پروردہ امریکی لڑکی، شادی کے معاملے میں اپنے باپ سے رجوع کرنے کا مشورہ کیوں دے رہی تھی مجھے اور وہ اس کا نام نہاد سوتیلا باپ، وہ ابلیس زادہ آرتھر فیلڈنگ۔ پتا نہیں اس کا یہ نام بھی اس کے رشتے کی طرح نقلی ہی تھا یا اصلی۔ الزبتھ سے شادی کی اجازت دینے کے لیے مجھ سے اپنی شرائط تسلیم کروا رہا تھا۔ کہتا تھا، میں اس کے لیے کام کرتا رہوں، کیریئر بنا رہوں اس دھمن کے پیچھے کا۔ پاکستان واپس پہنچ کر کسی ضمیر فروش کشمیر خان سے ملوں اور ان کے لیے افیون کا وہ سفوف فراہم کرتا رہوں جس سے حاصل ہونے والے ڈھیروں ڈالر اسرائیل کو مسلح کرنے پر صرف کیے جاتے رہیں اور میں ایسا الو کا فرزند ہوں کہ محض ایک دوشیزۂ جمال کی نگاہِ التفات کی خاطر اپنے وطن، اپنے پاکستان اس شجرِ سایہ دار کی جڑیں کاٹنے پر آمادہ ہو گیا تھا جس کے سائے میں آٹھ کروڑ میرے بھائی، میرے ہم وطن آزادی کا سانس لے رہے تھے۔ تف ہے مجھ پر کیسا رذیل کام کرنے جا رہا تھا نادانستگی میں۔ اور اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ مردار خور گدھ دھمن اور اس کی پالتو کتیا عالیہ دونوں نے یہودیوں کی غلامی قبول

کرلی تھی۔اس ننگِ انسانیت نے انسانی گردے فروخت کرتے کرتے اپنا قومی تشخص، اپنی آزادی بھی بیچ ڈالی تھی۔ دولت کی ہوس نے اسے بالکل ہی تحت الثریٰ میں اتار دیا تھا۔ حد سی مکادی تھی رذالت کی ان کمینوں نے تو۔ اور یہ باتیں ایسی تھیں کہ اب تو ان کے میرے ہاتھوں زندہ درگور ہونے سے بچنے کے سارے امکانات بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔ اور ان دونوں بنی یہود کے عیاروں کے تو میں نے ایسی چھتر ڈالنی تھی کہ یاد رکھیں زندگی بھر۔ حشر نشر نہ کر دیا میں نے ان کا تو غلام جیلانی نام نہیں میرا۔

میرا سینہ پھنکا جا رہا تھا اور دماغ میرا کسی تنور کی مانند گرم تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف نظر کی۔ ایک بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا، کسی بھی لمحے وہ قیامت بائی، آفت بیگم لنزی نازل ہونے ہی والی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے مجھے اپنے دل و دماغ کو سرد خانے میں رکھ کر ٹھنڈا کر لینا چاہیے تھا۔ میں اس کے آنے سے قبل خود کو نارمل کر لینا چاہتا تھا۔ اس حالت میں اگر وہ میرے سامنے پڑ جاتی تو میرے لیے خود کو سنبھالے رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر غسل خانے کا رُخ کیا۔ ٹھنڈے پانی کا شاور کھول کر اس کے نیچے بیٹھا تو ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سے اندر جلتی ہوئی گرم ہوائیں تھمنے لگیں۔

میرے رب کے کام بھی خوب ہوتے ہیں۔ اپنے عاصی بندوں کی دیکھ ریکھ سے بھی کبھی غافل نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم بندے ہی ہیں جو کسی کے ساتھ سلوک کرتے بھی ہیں تو پہلے جاننا چاہتے ہیں، یہ شخص آخر ہے کون؟ کس زمین سے ناتا ہے اس کا؟ قومیت کیا رکھتا ہے اور پہچان کیا ہے اس کی؟ وہ رب سارے جہانوں کا، ان جھمیلوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں اور وہ سب کا نگہبان ہے۔ جلد یا بدیر رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے جسے محفوظ رکھنا چاہتا ہے، اس کے لیے ایسی پیش بندیاں کر دیتا ہے کہ انسانی عقل اس تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ اب اگر میں اس جہاز سے صحیح سلامت نکل گیا ہوتا تو آج یہ میری داستانِ حیات کچھ اور ہی ہوتی۔ میرا سر ندامت سے جھکا ہوا ہوتا اور منہ چھپاتا پھر رہا ہوتا میں کہیں۔ میرے تار و پود ایسے الجھے ہوتے کہ انھیں سلجھانا میرے بس میں نہ ہوتا۔ اس وقت تو مجھے بڑا غصہ تھا ان طیارہ اغوا کرنے والوں پر۔ اسی غصے اور جھنجلاہٹ میں بغیر سوچے سمجھے میں ان پر پل پڑا تھا۔ کچھ عالیہ کی دی ہوئی انگوٹھی کی شہ بھی حاصل تھی مجھے۔ غصہ مجھے اسی بات پر تھا کہ وہ خواہ مخواہ میری راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ میں جلد از جلد وطن پہنچنا چاہتا تھا اور وہ طیارے کو نہ جانے کن کن مقامات پر کب تک لیے پھرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور جب اس سارے ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد ان لوگوں نے دوسری صبح کی فلائیٹ سے میرا جانا منسوخ کر دیا اور مجھے کچھ روز کے لیے روک لیا تو میں کیسا چراغ پا ہوا تھا۔ میرا سر گھوم گیا تھا یہ سن کر۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا، میرے اس طرح رک جانے میں اس دونوں جہانوں کے مالک کی کیا مصلحت تھی۔ یہ عقدہ تو آج کھلا تھا کہ یہ سب کچھ میرے رب نے میری بہتری کے لیے ہی کیا تھا اور اب میری زبان اس کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہی تھی۔ کیسی راندن میں گرنے سے بچایا تھا اس نے مجھے ورنہ تو میرے اس رذالت کی دلدل میں اترنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ بڑا کارساز ہے وہ اپنے بندوں کو تمام آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کے لیے پہلے ہی سے انتظامات کر دیتا ہے۔ ایسا ماحول بنا دیتا ہے کہ انسان تو اسے سمجھنے سے ہی قاصر رہتا ہے۔

میں ابھی غسل خانے ہی میں تھا کہ لنزی کی آواز سنائی دی۔ وہ اسرائیل زادی مجھے ہی پکار رہی تھی۔ "کہاں ہیں بھئی آپ جنابِ عالی! کچھ بتائیں تو۔ آواز تو دیں۔"

اس کی آواز سن کر میرے سینے میں پھر حرارت بڑھنے لگی تھی مگر میں نے جلد ہی اسے روک دیا، زیادہ بڑھنے نہیں دیا۔ میں نے آواز دے کر اسے بتایا۔ "میں ادھر ہوں۔ غسل کر رہا ہوں، بس ابھی آیا تم بیٹھو۔"

وہ اب قریب ہی آ گئی تھی۔ بولی "میں آپ کے لیے کھانا لے آئی ہوں۔ آپ جلدی سے نکلیں، میں اتنی دیر میں کھانا لگا دیتی ہوں میز پر۔"

"اچھا۔ میں بس دو منٹ میں آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ پھر جلدی جلدی باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔

دو منٹ سے زیادہ نہیں لگائے تھے میں نے اس کے پاس پہنچنے میں۔ اس کی حقیقت جاننے سے پہلے میں شاید ایسا نہیں کرتا لیکن اب تو اس کے دل میں اپنی تابعداری کا سکہ جما دینا چاہتا تھا۔ اسے اس کا یقین دلا دینا چاہتا تھا کہ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری کے سوا میں کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ میں اس کے سامنے سر اٹھانے کا حوصلہ ہی کھو چکا ہوں۔ غلام جیلانی کی ساری اکڑفوں، تمام کی تمام شہ زوری دوسروں کے لیے ہے، اس کے لیے تو میں صرف غلام ہوں، بے دام کا غلام۔

وہ میز پر انواع و اقسام کے کھانے سجانے میں منہمک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے میرے اعزاز میں کوئی موٹی موٹی ضیافت کر ڈالی ہو۔ بڑے اہتمام کر لائی تھی وہ۔ میں نے شوخ لہجے میں پوچھا "مائی ریسپیکٹڈ لیڈی! کس کی ضیافت کا اہتمام ہو رہا ہے آج؟"

اس نے مڑ کر ہزار جان سے فریفتہ ہو جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اپنے گلاب کی پنکھڑی جیسے لبوں کو یوں حرکت دی کہ ان سے جلترنگ کی سی آواز پیدا ہو کر کانوں میں رس گھولنے لگی "آپ کے سوا اور کون ہے ایسا جنابِ عالی! جس کی ضیافت کا میں اہتمام کروں گی؟"

قورمہ، بریانی، اور شامی کباب کے ساتھ تر تراتے پراٹھوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے پیٹ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک شامی کباب توڑ کے منہ میں رکھا اور منہ چلاتے ہوئے بولا "اوئے شاوا بھئی شاوا، مزہ ہی آ جائے گا آج تو۔ تم نے امریکا میں بھی پاکستانی دستر خوان سجا دیا ہے۔"

وہ شوخی سے اٹھلائی "جب ایک پاکستانی کو جیون ساتھی مان لیا جائے تو پاکستانی دستر خوان بھی سجانا ہی ہوگا۔ ذرا دیکھیں۔ یہ کھانے کھا کر بتائیں میں پاکستانی کھانے پکا سکتی ہوں یا نہیں؟"

میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور باری باری ایک ایک چیز کھانا شروع کر دی اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے وطن کے کھانے پکانا بھی اس نے اسی محنت سے سیکھا تھا جس محنت سے اس نے ہماری زبان سیکھی تھی۔ میں نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ "واہ میرے مولا! کتنا مہربان ہے تو مجھے امریکا میں لا کر ایک پاکستانی خانم سے نواز دیا ہے۔ یہاں چھپا رکھی تھی تو نے میری یہ نصف بہتر اور میں اسے وہاں پاکستان میں تلاش کرتا پھرتا تھا۔"

"آپ باتیں بڑے مزے کی کرتے ہیں جنابِ عالی!"

"حالانکہ آدمی میں بہت کڑوا ہوں۔ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا دیکھنے میں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اس میں سے آدھی بات غلط ہے۔" وہ شوخ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"کون سی آدھی بات؟" میں نے بھی اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ اچھا نہ لگنے والی۔ آدمی تو بے شک آپ کڑوے ہیں مگر برے ذرا نہیں لگتے۔ اور باتیں تو آپ کی جنابِ عالی سیدھی دل میں اترتی جاتی ہیں۔" وہ بالکل کسی دوشیزۂ مشرق کی طرح شرما شرما کر بول رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں اس کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کمال کی اداکارہ تھی وہ بنتِ یہود۔ واقعی اس کے حربوں سے بچ کے نکل جانا ایک مشکل ترین کام تھا۔ انجان آدمی تو کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا تھا اس کے جال سے۔ مگر بگری مجھے اتنا کچھ بتا گیا تھا کہ اب اس کی کوئی ادا، نظر کا کوئی تیر میرے دل تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور میں بھی اپنی اداکاری کی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا اس کے سامنے۔ میں نے اپنی آنکھوں میں اس کے لیے پیار کا پورا سمندر سمیٹ لیا تھا اور اس کی بنائی ہوئی ایک ایک چیز کی دل کھول کر تعریف کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ پاکستانی کھانے پکانا بھی تمھیں جمیلہ طوسی ہی نے سکھایا ہوگا؟"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے میرے کھانے کا انداز دیکھ کر بولی "آپ تو جنابِ عالی! اپنے وطن کے کھانے دیکھ کر ان پر بری طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ ذرا صبر سے کام لیں، اطمینان سے کھائیں۔ آپ ہی کے لیے تو ہے یہ سب کچھ کوئی دوسرا نہیں ہے یہاں۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی یہ خوش ذائقہ کھانے دیکھ کر بے اختیار ہوا جا رہا تھا۔ چنانچہ اپنے ہاتھوں کو کنٹرول کر کے میں نے کہا "میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے؟"

"کون سی بات کا جواب؟ کیا معلوم کیا تھا آپ نے جنابِ عالی؟" اس نے اس طرح کہا جیسے پہلے اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

"میں یہ معلوم کر رہا تھا مائی ریسپیکٹڈ لیڈی! کیا یہ کھانے پکانا تم نے جمیلہ طوسی سے ہی سیکھا ہے؟"

"ہاں، بالکل بالکل جنابِ عالی! یہ چٹخارے دار کھانے پکانا میں نے جمیلہ طوسی سے ہی سیکھا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے جنابِ عالی! میں انھیں کھا بالکل نہیں سکتی۔ صرف آپ کو کھلا سکتی ہوں۔" وہ بولی "یہ جو آپ ہماری مقامی ڈش دیکھ رہے ہیں نا، یہ اسی لیے میں اپنے ساتھ لائی ہوں۔"

"تو کیا تم آج کالج نہیں گئی تھیں؟ تم نے تو لکھا تھا تم کالج جا رہی ہو؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

میرے اس سوال پر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے ڈیلے ماند پڑے تھے۔ صرف اتنی دیر کے لیے کہ اگر میں اس کی آنکھوں میں نہیں جھانک رہا ہوتا تو مجھے پتا بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ایسی ہی اپنے فن میں طاق تھی وہ یہودن۔ نہایت ہی پختہ کار۔ آدمی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتی تھی کہ اس کا کون سا وار کاری لگا ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل چکی تھی "وہ بات یہ ہوئی تھی سر غیاث احمد! میں گئی تو کالج ہی تھی مگر پاتے مجھے کالج

فون کر کے بتایا کہ جوزفین کو ابھی ان کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے انھیں ابھی اسپتال ہی میں رہنا ہوگا۔ میں گھر واپس چلی جاؤں کیونکہ آپ یہاں تنہائی میں بور ہو رہے ہوں گے۔ میرے پاپا کے سوا کون آتا ہے آپ کے پاس جس سے آپ کا دل بہلا رہے۔"

ہاں، بڑا خیال کرنے لگے ہیں اب وہ میرا۔ یہ بھی میرے لیے قدرت ہی کی طرف سے انتظام کیا گیا ہے۔ ورنہ تو اس تنہائی میں میرا دم گھٹ جاتا۔" میں نے احسان مندی سے کہا۔

"اوہو، میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ کھانا بالکل ہی بند کر دیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں، میں کھا تو رہا ہوں؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کہاں کھا رہے ہیں آپ تو بس باتیں کیے جا رہے ہیں؟ کھانا کھائیں جنابِ عالی!" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں ہاں، کھانا بھی کھا رہا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے مائی ریسپیکٹڈ لیڈی! کہ میں خاموش بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا اور جب تم سامنے ہوتی ہو تب تو زبان بند رکھنا میرے لیے ممکن ہی نہیں رہتا۔ بس یہی جی کرتا ہے، کان تمھاری آواز سنتے رہیں آنکھیں تمھاری تصویر کشی کرتی رہیں اور زبان تمھاری توصیف میں نغمہ سرا رہے۔"

اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر مجھے دیکھا اور ایک ادائے خاص سے شرما کر بولی۔ "ایک تو آپ کی یہ نثری شاعری وقت بے وقت شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کوئی موقع ہے ان باتوں کا جنابِ عالی!"

"عشق و محبت، وقت، موقع یا مقام کے پابند نہیں ہوتے لزی بیگم! آپ ان پر پہرہ بٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ زبان کو اگر دلی کیفیت کے اظہار سے روکا گیا تو یقین کریں میرا کلیجہ چھلنی ہو جائے گا۔ دل پاش پاش ہو جائے گا۔ پھر آپ کے کیا ہاتھ آسکے گا ایک بے جان لاشے کے سوا؟" میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ متفکر نظر آنے لگی۔ سنجیدگی سے بولی۔ "یہ کیسی باتیں شروع کر دیں آپ نے جنابِ عالی! ایسی دل ہلا دینے والی باتیں تو نہ کریں آپ۔"

"پھر آپ بھی ایسی کلیجہ شق کر دینے والی باتیں نہ کریں مجھ سے۔" میں ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔

"اوہ، نہیں جنابِ عالی! آئندہ میں کبھی کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالوں گی۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ کانوں سے لگا کر بولی۔ "آپ تو مذاق ہی مذاق میں سنجیدہ ہو گئے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں لزی بیگم! ایسا خوفناک مذاق بھی نہ کرنا کبھی مجھ سے۔ ورنہ تو جان ہی لے لے گا کسی دن یہ مذاق آپ کا۔"

"اوہ، نہیں جنابِ عالی! کبھی نہیں، کان پکڑ لیے میں نے آئندہ کے لیے۔" اس نے فوراً کہا، پھر بولی۔ "یہ آپ نے پھر مجھے آپ جناب سے مخاطب کر کے تکلفات کی دیوار حائل کرنے کی کوشش کیوں شروع کر دی ہے؟"

"ہاں، وہ مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ تم معاف کر دو، درگزر سے کام لو اس سلسلے میں۔ چھوڑو جی مٹی پاؤ اس گل اُتے اور کھاؤ رج رج کے۔" میں نے ہنستے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

میری بات سن کر وہ بے اختیار قہقہے لگانے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "اوہ جنابِ عالی! آپ تو بے حد دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ کا یہ روپ تو میں نے آج پہلی بار ہی دیکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے ساتھ رہو گی تو ایسے ایسے روپ دیکھو گی جن کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ بڑا صاحبِ فن ہے یہ تمھارا سر غیاث احمد، بڑے بڑے کمالات پوشیدہ ہیں اس میں۔"

"وہ تو میں سمجھتی ہوں جنابِ عالی! آپ کے جیسے جیسے کمالات دیکھے، پڑھے اور سُنے ہیں میں نے، اس کے بعد یہ تو میں جان ہی گئی ہوں، کسی معمولی آدمی سے واسطہ نہیں ہے میرا۔"

"تم نے کہاں سے پڑھا اور سن لیا ہے میرے بارے میں؟" میں نے قدرے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ طیارے والا واقعہ، کیا بھول گئے آپ؟ امریکا بھر کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن نے آپ کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ کیا کیا کچھ نہیں لکھا اور کہا گیا تھا آپ کے بارے میں۔ ایک قومی ہیرو کا سا درجہ دے دیا تھا انھوں نے آپ کو۔"

"ہاں، یہ تو میں کبھی فراموش ہی نہیں کر سکوں گا۔ اس واقعے نے تو میری زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعہ نہیں ہوتا تو میں اس طیارے سے پاکستان واپس چلا گیا ہوتا۔ پھر مجھے تم جیسی پیکرِ جمال و کمال شریکِ حیات کہاں ملتی۔ میری زندگی میں بہار کہاں آتی؟ پوری زندگی یوں ہی تنہا کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہوا کے رُخ پر اِدھر اُدھر اڑتے اور بھٹکتے ہوئے گزر جاتی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلتا کہ کوئی پری وش نازنین، کوئی الزبتھ بیگم بنت آرتھر فینلی یہاں اپنے جلو میں بہاریں لیے میری منتظر بیٹھی ہوگی۔ یہ خبر کون دیتا مجھے؟ کہاں سے پاتا میں تمھیں لزی بیگم؟"

"اور میں بھی آپ کے نیاز سے محروم رہ جاتی سر غیاث احمد! خزاں کے زرد اور مرجھائے ہوئے پتوں کے سوا میرے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ اس اعتبار سے تو وہ ہائی جیکرز ہمارے لیے رحمت ہی ثابت ہوئے ہیں۔ ان کا شکر گزار ہونا چاہیے ہمیں۔" لزی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ اب تو میں ان کا ہر دم شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔ حالانکہ اس وقت جب وہ طیارہ اغوا کرنے لگے تھے بڑا غصہ آیا تھا مجھے ان کے اوپر۔" میں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے اسیر رکھنے کے لیے شیریں گفتاری اور ناز و ادا کے وہ سارے ہی ٹرمپ کارڈ ایک ایک کر کے استعمال کرتی رہی جو اس کے پاس تھے۔ میں بھی ایک عاشقِ صادق کی طرح اس کی شان میں قصیدہ خوانی کرتا رہا۔ وہ اپنی صورت کی جادوگری پر اس حد تک اعتماد رکھتی تھی کہ اسے گمان بھی نہیں گزرا ہوگا کہ میں اس کے دام سے آزاد بھی ہو سکتا ہوں۔ اس روز اس نے بہت سا وقت میرے ساتھ گزارا تھا اور تمام وقت وہ اپنے تیر تفنگ مجھ پر چلاتی رہی تھی۔ پھر وہ اس کا بناسپتی باپ آرتھر فینلی آگیا۔ اس نے آتے ہی لزی کو اپنے گھر بھیج دیا۔ اور میرے بالکل قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

"مسٹر جیلانی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے تو اپنے دوستوں کو عجیب مشکلوں میں گرفتار کر دیا ہے۔ ہمیں آپ سے ایسی توامید نہیں تھی۔"

"کن دوستوں کی بات کر رہے ہیں آپ مسٹر آرتھر؟" میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

"وہی لوگ جو آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں۔ کیا کیا کہہ دیا آپ نے پولیس سے ان کے متعلق۔ انھوں نے ان کے بہت سارے آدمی پکڑ لیے ہیں۔" آرتھر نے رازداری سے کہا۔

"آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں نے پولیس کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سب کا یہی خیال ہے۔ آپ کے سوا اور کون بتا سکتا ہے انھیں کچھ؟" اس نے کہا۔

"غلط فہمی ہوئی ہے انھیں بھی اور آپ کو بھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ان کے بارے میں جانتا ہی کیا ہوں جو کسی کو بتاؤں گا۔ میں یہاں عالیہ اور دھمن کے سوا جانتا ہی کسے ہوں؟ یا پھر اس آلیور سے واقف ہوں جو کل سے نہ جانے کہاں غائب ہے۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے، پولیس نے کن کن لوگوں کو پکڑا ہے۔ کیا ان میں دھمن اور عالیہ بھی شامل ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں وہ دونوں تو آزاد ہی ہیں۔ ان کے کلینک کی طرف ابھی پولیس نے رُخ نہیں کیا۔ البتہ آلیور اور دوسرے کئی افراد کو گرفتار کر لے گئے ہیں۔" آرتھر نے جواب دیا۔

"اب آپ خود انصاف کریں۔ کیا یہ مجھ پر بہتان نہیں ہے۔ میں اگر پولیس کو کچھ بتاتا تو سب سے پہلے دھمن اور عالیہ کے پاس پہنچتی پولیس۔" میں نے اسے بتایا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پھر یہ پولیس افسر گریگری اور اس کا اسسٹنٹ ہمفرے تمھارے گرد کیوں منڈلا رہے ہیں آخر؟" وہ آپ سے تم پر آگیا تھا۔

"انھیں بھی آپ کی ہی طرح کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں آلیور کے ساتھ اس کے مکان میں یوں ہی بے مقصد نہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھ سے آلیور اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے میری طرف متوجہ کرنے والے بھی تو وہی لوگ ہیں جنھیں آپ میرا دوست کہتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ وہ کیوں پولیس کو تمھاری طرف متوجہ کریں گے؟" آرتھر بولا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن اگر وہ کل اپنے آدمی یہاں نہیں بھیجتے اور وہ لوگ مجھے جال میں باندھ کر لے جانے کی کوشش نہ کرتے تو گریگری کے فرشتے بھی نہیں جان سکتے تھے کہ میں کہاں ہوں۔ انھوں نے نہ صرف مجھے باندھ لیا تھا بلکہ وہ لزی کے ساتھ بھی زیادتی کرنے پر اُتر آئے تھے جس کی وجہ سے لزی نے ہی فون کر کے گریگری اور ہمفرے کو یہاں بلایا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"اوہ، اوہ، تم غلط سمجھے ہو۔ وہ ان کے بھیجے ہوئے آدمی نہیں تھے۔ وہ ان کے ساتھی تھے جنھیں تم نے طیارہ اغوا کرنے سے روک دیا تھا۔ کیا تم دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اگر وہ دھمن کے آدمی ہوتے تو لزی کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔" آرتھر نے کہا۔

میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ واقعی وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے اس طرح تو سوچا ہی نہیں تھا۔ دھمن وغیرہ تو آرتھر ہی کے لیے کام کر رہے تھے۔ پھر اس کے آدمی لزی کو بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کیسے کر سکتے تھے۔ مجھ سے اندازہ لگانے میں زبردست غلطی ہوئی تھی۔ وہ لوگ مجھے اپنے چیف کے پاس لے جانا چاہتے تھے اور میں سمجھا تھا وہ اس چیف کا ذکر کر رہے ہیں جس کے بارے میں آلیور نے مجھے بتایا تھا۔ میں نے آرتھر سے کہا۔ "یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ مجھے تو بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ پھر وہ لوگ بھی جو آج یہاں آئے تھے اور میرے ہاتھوں زخم کھا کے گریگری کے شکنجے میں جا پھنسے ہیں انھی کے آدمی ہیں۔ ان طیارہ اغوا کرنے والوں کے۔"

"آج! کیا آج بھی کچھ گڑبڑ ہوئی ہے یہاں؟" آرتھر نے

چونک کر کہا۔

"ہاں جی، زبردست معرکہ آرائی ہوئی ہے آج تو۔" پھر میں نے اسے آج کے واقعے کی پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔ "آلیور نے مجھے بتایا تھا، چیف کی طرف سے تھامسن نامی ایک نیگرو باکسر اس کے مکان کی نگرانی پر مامور ہے۔ اس نے مجھے اس کا حلیہ بھی بتایا تھا۔ لہٰذا جب وہ گرانڈیل نیگرو یہاں آیا تو میں۔۔۔ اسے تھامسن ہی سمجھا تھا۔ اس نے خود بھی اپنا نام تھامسن ہی بتایا تھا۔"

"تھامسن نام بتایا تھا اس نے اپنا؟" آرتھر ایک بار پھر چونک پڑا۔ "یہ کیسے ممکن ہے تھامسن کو کسی معاملے میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ صرف نگراں ہے۔ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں اسے اوپر والوں کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ پھر وہاں سے جو ہدایت ملتی ہے اس پر عمل کرتا ہے۔"

"تو پھر وہ کوئی اور تھامسن تھا۔ مگر اس کا حلیہ۔ ضروری تو نہیں ہے کہ ایک ہی نام رکھنے والے دو آدمیوں کا حلیہ، ڈیل ڈول اور قد قامت بھی ایک جیسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہی بات میرے لیے بھی باعثِ تشویش ہے۔" وہ بولا۔ "ٹھیرو میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر اس جگہ پہنچا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے۔ دوسری جانب سے سلسلہ جلد ہی مل گیا تھا۔ وہ کچھ دیر فون پر بات کرتا رہا۔ مگر آواز اس کی اتنی دھیمی تھی کہ میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکا تھا۔ بات کر کے اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور آہستہ آہستہ میری طرف واپس آنے لگا۔ اس کے چہرے سے فکر و تردّد عیاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دوسری جانب سے اسے کوئی غیر متوقع خبر سنائی گئی ہو۔ کسی انہونی کی خبر دی گئی ہو اسے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا، فکرمند سا آ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا مسٹر آرتھر؟ کوئی بری خبر ملی ہے کیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آں، ہاں، یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی مسٹر جیلانی! تھامسن کل سے لاپتا ہے۔ اس نے کل یہاں ہونے والے کسی واقعے کی بھی انھیں اطلاع نہیں دی تھی اور نہ ہی وہاں آج کے واقعے کی خبر پہنچی ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ جو تھامسن یہاں آیا تھا وہ وہی تھامسن تھا لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں تھا اور تمھیں اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ اس سے تو کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ تمھیں چیف کے پاس لے جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں، وہ ان لوگوں کے ساتھ مل گیا ہو۔ مگر ایسا کیسے ہو گیا؟ یہ تو بہت

عجیب بات ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے۔ مگر مسٹر آرتھر! آپ فکر نہ کریں۔ اس نے اگر غداری کی ہے تو اسے اس کی خاصی معقول سزا بھی مل گئی ہے۔" میں نے آرتھر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فکر کی بات تو پھر بھی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اسے سزا ملی یا نہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ اس نے غداری کیوں کی۔ وہ کیا وجوہ ہیں جنھوں نے اسے ایسا کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ معلوم ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر اس کا سدِّباب نہ کیا گیا تو یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے گا۔" آرتھر نے کہا۔

"ہاں یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ یہ ضرور معلوم کریں آپ۔" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"خیر، یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ ایک مسئلہ سامنے آیا ہے تو اس کا حل بھی نکل ہی آئے گا کوئی نہ کوئی۔ تم یہ بتاؤ وہ گڑبڑی کیا کہتا ہے اب۔ وہ تمھاری جان چھوڑنے کو تیار ہوا نہیں؟"

"میں نے اسے اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش تو بہت کی ہے اور میرا خیال ہے میں اس میں کامیاب بھی رہا ہوں۔ آج اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دو ایک روز میں مجھے جانے کی اجازت مل جائے گی لیکن مسٹر آرتھر! میں ایک بات آپ کے گوش گزار کر دوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں، کہو کیا بات ہے؟" اس نے مشفقانہ انداز میں پوچھا۔

"میں لزی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ جانے سے پہلے اسے میری دلھن بنا دیں۔" میں نے کہا۔

"ایسی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو تم دونوں نے اچھی طرح ایک دوسرے کو سمجھا بھی نہیں ہے۔ ابھی تو تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔ آئندہ جب آؤ گے تو تمھاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں جناب! ایسا نہیں ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ لیا ہے اور ہمارے لیے جدائی ایک عذاب سے کسی طرح کم نہیں ہو گی۔ آپ اس مسئلے کو آئندہ پر نہ ڈالیں مسٹر آرتھر!" میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا کہ تم نے لزی کو سمجھ لیا ہے۔ خود لزی نے ابھی تمھارے بارے میں کوئی بات نہیں کہی ہے۔ میں نے کہا نا تم دونوں جب تک ایک دوسرے کے مزاج آشنا نہ ہو جاؤ، جب تک دونوں ہی مطمئن ہو کر یہ فیصلہ نہ کر لو کہ تم لوگ ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار سکو گے، شادی کے بارے میں سوچو بھی مت۔ مسٹر جیلانی! شادی کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہوتا۔"

وہ اپنی مکارانہ باتوں سے مجھے ٹال رہا تھا۔

میں اس سے اتنی آسانی سے ہار ماننے والا تو نہیں تھا۔ شادی تو اب مجھے اس بنت یہودا سے نہیں کرنا تھی۔ میں کتنا ہی برا انسان تھا، کتنے قتل اور ڈاکا زنی کے واقعات میرے حساب میں درج تھے اور اب بھی میں اس سے تائب ہو کر کوئی پیر فقیر تو نہیں بن گیا تھا مگر اب اتنا ابلیس زادہ نہیں تھا کہ ایک یہودن کو اپنا ہم سفر بنا لیتا۔ میں تو کسی طرح اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ وہاں جا کر میں اس کی ساری یہودیت نکال دیتا۔ اس کے ذریعے مجھے اپنے ملک کے ان سیاہ رو ضمیر فروشوں کی نقاب کشائی کرنے میں آسانی ہو جاتی جن کی زر پرستی نے ان کے دلوں سے وطن کی محبت اور قوم کا درد کھرچ کھرچ کر نکال ڈالا تھا۔ وہ دولت کے پجاری یہ بھی بھول بیٹھے تھے کہ جس دولت کی خاطر وہ اپنے وطن، اپنے ملک، اپنی زمین سے بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہیں، یہ ملک، یہ آزاد خطۂ زمین نہ رہا تو ان کی دولت ان کے کس کام آئے گی۔ جن لوگوں کا وہ ساتھ دے رہے ہیں، وہ تو اپنے درمیان کسی ننگِ ملت کا وجود برداشت کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اپنا کام نکالنے کے بعد وہ سب سے پہلے ان غداروں کی گردنیں ہی ناپیں گے۔ یہ وہ کیسے فراموش کر دیں گے کہ انھوں نے اپنوں سے بے وفائی کی ہے۔ جو اپنوں کی جڑیں کاٹ سکتا ہے، سونے چاندی کی چمک جسے اپنے ملک کی بنیادیں کھودنے پر آمادہ کر سکتی ہے، وہ کہیں بھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔ جن کے لیے وہ اس بھیانک جرم کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اپنے درمیان جینے کا حق کبھی نہیں دیتے۔ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد فوراً اس کی گردن مار دیتے ہیں۔ اور وہ سب کچھ اس سے چھین لیتے ہیں جو غداری کے انعام کے طور پر اسے دیا ہوتا ہے۔ اے کاش یہ ملک و قوم کے دشمن، زر کے پجاری اپنی اور اپنی قوم کی آزادی کا سودا کرتے وقت ان کے انجام پر بھی نگاہ ڈال لیا کریں جن کی تقلید میں وہ ایسا کر رہے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر یہ دیکھ لیا کریں کہ ان سے قبل ان جیسے لوگوں کو ان کے آقاؤں نے کس سلوک کا مستحق سمجھا تھا۔ مگر ان کی بدقسمتی انھیں یہ جاننے کی مہلت کہاں دیتی ہے۔ جان بھی لیں تو ان کی عقل انھیں طرح طرح کے سبز باغ دکھاتی ہے۔ وہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کے آقا ایسے احسان فراموش نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو گا جو دوسروں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ یہی خوش فہمی ہر غدار کو موت کی دہلیز پر لے جاتی ہے۔ اور پھر اسے انجام پر افسوس کرنے کی بھی مہلت میسر نہیں آتی۔

میں نے بڑے سنگین جرائم کیے ہیں۔ کون سا جرم ہے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا مگر ننگِ وطن بن کر وطن فروشی جیسا گھناؤنا کام نہ ہو سکا مجھ سے۔ اپنے گھر کی بنیادیں کھودنے کا کام میں کبھی نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں میرے ملک کے آٹھ کروڑ باشندے۔۔۔ ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح ہیں۔ جو باہم دست و گریباں بھی ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو برا بھلا بھی کہتے ہیں لیکن اپنے خاندان کی تباہی کے سامان نہیں کرتے۔ اس چھت کو کبھی نیلام پر نہیں چڑھاتے جو ان کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ آزادی کی قدر و قیمت وہ خوب جانتے ہیں۔ انھوں نے اس آزادی کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں۔ نسلیں کٹوا دی ہیں اپنی جب کہیں جا کر یہ نعمت ملی ہے انھیں، اور یہ صیہونیت کے علمبردار، اللہ کی معتوب قوم کے سازشی لوگ میرے ملک میں مختلف نعرے لگا لگا کے میری قوم کے سیدھے سچے لوگوں کو گمراہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے اندر ہی سے کچھ ضمیر فروشوں کو تلاش کر کے ہم سے آزادی اور خود مختاری جیسی نعمتیں چھین لینا چاہتے تھے۔ میں یہ جاننے کے بعد بھی ان کی راہ نہ روکتا، ان کی رسی نہ کھینچتا، انھیں اپنے سوہنے وطن میں من مانی کرنے دیتا۔ اب ایسا سیاہ کار تو نہیں تھا میں۔ گناہوں کی کالک میرے چہرے تک ہی پہنچ سکی تھی، دل میرا۔۔۔ بالکل بے داغ تھا۔ اس پر میں نے کوئی داغ دھبّہ نہیں آنے دیا تھا۔ اسی لیے میں اس بنت الیہود لزی کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا وہاں جتنے کتّے انھوں نے پال رکھے ہوں گے ان کا علم لزی ضرور رکھتی ہو گی۔ وہ میرے ساتھ پاکستان چلی جاتی تو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں سے رابطہ ضرور قائم کرتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان سب کو یا ان میں سے کچھ کو مجھ سے ملوا بھی دیتی۔ پھر میں اسے اور اس کی قوم کے پالے ہوئے تمام خنزیروں کو پوری طرح بھگت لیتا۔ چنانچہ میں نے آرتھر سے کہا۔ "مسٹر آرتھر! آپ نے تو بڑی کڑی شرط رکھ دی ہے۔ بڑا سخت پرچہ رکھ دیا ہے میرے سامنے۔ اس کا حل کرنا میرے لیے بڑا مشکل ہو جائے گا۔ ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے کے لیے تو اچھا خاصا وقت درکار ہو گا ہمیں اور اتنے عرصے اگر میں یہاں رہ گیا تو وہاں پاکستان میں میری بہن آسیہ اور میرے یار آئی پر نہ جانے کیا کچھ بیت جائے۔ کن قیامتوں سے گزار دیے جائیں وہ دونوں اور جب میں اپنے لیے شادمانیاں سمیٹ کر واپس پہنچوں تو وہاں کچھ بھی نہ بچا ہو۔ کچھ ایسا ہی بندوبست کر رہے ہیں یار لوگ ان کے لیے۔ وہ کسی قیمت پر انھیں معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ بے چارہ آئی تو پہلے ہی بے نور ہو چکا ہے۔ بینائی سے محروم کر دیا ہے انھوں نے اسے۔ نصف زندگی تو انھوں نے چھین ہی لی ہے اس کی۔ اب اگر میں بروقت کچھ نہ کر سکا اس کے لیے

تو بقیہ نصف بھی وہ اس کے پاس نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں تمھاری اس مجبوری کو۔ اس کا حل بھی سوچ لیا ہے میں نے۔" آرتھر نے ہمدردی سے کہا۔

"کیا حل سوچا ہے آپ نے اس کا؟" میں نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا حل یہ ہے مسٹر غلام جیلانی کہ تم جب یہاں سے واپس جاؤ گے تو لزی بھی تمھارے ساتھ جائے گی۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ اس کا ساتھ تمھارے لیے بڑا سود مند ثابت ہو گا۔" آرتھر نے کہا۔

"اوہ، مسٹر آرتھر! کتنے اچھے ہیں آپ۔ کتنے مہربان اور ہمدرد۔ آپ نے میری ساری الجھنیں دور کر دی ہیں۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا ہے میرے لیے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "مگر یہ آپ نے اسے سمجھانے والی کیا بات کہی۔ کیا وہ میرے ساتھ جانے کے لیے راضی نہیں ہوگی؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمھارے ملک میں ہمارے بہت سے دوست ہیں جو ہمارے لیے جان کی بازی لگانے کو بھی ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ہم بھی ان کا بہت خیال رکھتے ہیں، بڑے کام آتے ہیں ہم ان کے۔ لزی ان سب سے واقف ہے۔ وہ تمھیں ان لوگوں سے ملا دے گی اور وہ سب مل کر تمھاری بہن اور دوست کی رہائی کے سلسلے میں کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے وہ ان لوگوں کو رہا کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بڑے اثر رسوخ کے مالک ہیں ان میں سے کئی تو۔" اس نے مجھے بہت بھاری رشوت پیش کی تھی۔

"اگر ایسا ہو گیا مسٹر آرتھر! تو یہ سمجھ لیں، میں آپ کا زندگی بھر کے لیے غلام ہو جاؤں گا۔" میں نے بھی اپنی جانب سے اس کے سامنے اتنی ہی بھاری پیش کش کی تھی۔

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بس تو پھر یہ طے ہو گیا، جب تم واپس جاؤ گے تو ایک دوست کی حیثیت سے لزی بھی تمھارے ساتھ جائے گی۔"

اس نے بالکل وہی بات کہہ دی تھی جو میں چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ میرے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکا تھا۔ اس نے مجھ پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری طرف سے اس کے دل پر جمی شکوک و شبہات کی ساری گرد دھل گئی تھی۔ یوں بھی میرے بارے میں وہ ہر قسم کی تحقیق و جستجو کر چکا تھا۔ ایک ایک بات معلوم کر چکا تھا وہ اپنے غلاموں کے ذریعے مجھ سے متعلق۔ وہ جانتا تھا میں جرائم کی جس ہولناک دلدل میں اتر چکا ہوں اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ غلام جیلانی کے راستے میں کبھی کوئی دیوار زیادہ دیر حائل نہیں ہو سکی۔ بڑی سے بڑی دلدل اسے نگل نہیں سکی تھی۔ وہ نادان چوہا اونٹ کو اپنے بل میں داخل کر لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے یہی خواب میرے عزائم کی کامیابی کی دلیل تھے۔ میری فتحیابی کے لیے بہترین ذریعہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں بڑی دیر تک اس مسئلے پر ہی غور کرتا رہا۔ مجھے پہلی بار اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع ملا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ میں نے ایسے زبردست فنکاروں کو اس فن میں مات دے دی تھی جو نہ جانے کب سے دوہری زندگی گزار رہے تھے۔ پھر میرا خیال ان ہائی جیکروں کی طرف بھٹک گیا جو مجھے اس مقام تک پہنچانے کا سبب بنے تھے۔ نہ جانے کون تھے وہ لوگ اور کس تنظیم سے تعلق تھا ان کا؟ تھے کسی بہت ہی منظم گروہ کے — ان کے عزائم بڑے ہی خوف ناک قسم کے رہے ہوں گے۔ جبھی اپنی ناکامی پر اس قدر مشتعل تھے وہ کہ انھوں نے گزشتہ دو تین دن میں مجھے تین بار اٹھا لے جانے کی کوشش کی تھی۔ پہلی بار تو وہ میری شکلیں کس کے لے بھی گئے تھے اور اگر میں نے انھیں ان سکھوں کی طرف نہ بھیج دیا ہوتا تو میں اب تک ان کی قید میں ہی پڑا سڑ رہا ہوتا۔ نہ جانے کیا حالت بنا دی ہوتی انھوں نے میری اب تک۔ کن کن مراحل سے گزار دیا ہوتا مجھے۔ وہ تو بھلا ہو ہارٹن کا کہ اس نے میرے اندازے کے عین مطابق کارروائی کر کے مجھے ان سے نجات دلا دی تھی۔

ہارٹن کا خیال آتے ہی مجھے یاد آیا۔ وہ تو بڑا ہی خطرناک قسم کا آدمی ہے۔ آستین کا سانپ ہے وہ۔ بالکل کتے کی سی خصلت ہے اس کی۔ اپنے ہم نسلوں کو دیکھ کر غرانا، دانت نکال کر ان پر جھپٹ پڑنا اور روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دینے والے انسانوں کے پیچھے پیچھے دم ہلاتے پھرنا، جان بھی دے دینا ان کے لیے، اسی خصلت کا مالک تھا وہ۔ نہ جانے کیسے انسان بن گیا تھا وہ، ہونا تو اسے کتا ہی چاہیے تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میرے جسم میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھ سے بڑی زبردست غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ میں گریگری کو اپنی اصلیت بتانا بھول گیا تھا۔ جس وقت ہمفرے اور گریگری نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا تھا اس وقت میں نے جو کچھ کیا تھا وہ اس وقت کے حالات کے تحت تھا۔ مگر اب تو وہ بات نہیں رہی تھی۔ گریگری سے اب میرے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ میں نے آئندہ کے لیے کچھ مشترکہ منصوبوں پر کام کرنا منظور کر لیا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ دشمن ہماری چالوں سے بے خبر رہے۔ اسے کسی طرح بھی یہ معلوم

ہونا چاہیے تھا کہ میں گریگری کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کسی کارروائی کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔ انھیں اس کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ کسی حالت میں مجھے واپس نہیں جانے دیتے۔ یہیں بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتے اور میری ماں جیسے دروازے پر آنکھیں جمائے بیٹھی ہی رہ جاتی۔ آسیہ اور آپی کے سارے سپنے بکھر کے رہ جاتے۔ وہ لوگ یہی سمجھتے رہتے کہ میں نے ان کے اس انتہائی نازک وقت میں ان کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے۔ ساتھ چھوڑ گیا ہوں میں ان کا اور یہی بدگمانی ساتھ لیے وہ دنیا سے گزر جاتے۔ انھیں یہ کون بتاتا کہ میں کس جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ کس رن میں اتار دیا ہے مجھے تقدیر نے۔

گریگری اگر ہارٹن کو بتا دیتا تو ساری بازی ہی الٹ جاتی۔ وہ پولیس کا ایک سینیئر ترین نہایت ہی قابل اعتماد افسر تھا۔ وہ اگر گریگری سے کچھ معلوم کرنا چاہتا یا یہی پوچھ بیٹھتا کہ وہ میرے بارے میں کس نتیجے پر پہنچا ہے تو گریگری اسے سب کچھ بتا دیتا۔ اسے یہ تو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ہارٹن کسی بدنیتی سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو یہی سمجھتا کہ چونکہ وہ بھی میرے معاملات سے متعلق رہا ہے، طیارے سے اترنے کے بعد میں اسی پولیس اسٹیشن کا مہمان بنا تھا جہاں ہارٹن تعینات تھا، اسی لیے وہ میرے معاملات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میرے لیے یہ بے حد ضروری ہو گیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو گریگری کو اس کی اصلیت سے آگاہ کر دوں۔ ہارٹن بھی یقیناً میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوگا۔ اس کے آقاؤں نے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی کہ مجھے پولیس سے کب تک نجات حاصل ہوگی اور اگر وہ یہی جاننے کے لیے گریگری کے پاس پہنچ گیا تب بھی اسے صحیح صورت حال کا علم ہو جائے گا۔ میں اٹھ کر تیزی سے ٹیلی فون کی طرف جھپٹا۔ اور ریسیور اٹھا کر ڈائل کی طرف انگلی بڑھائی۔ مگر میری انگلی ڈائل کو چھو کر ہی رہ گئی۔ میں اس سے فون پر رابطہ کس طرح کر سکتا تھا، مجھے اس کا نمبر تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اور یہ بھی میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا، اگر مجھے اس کا نمبر معلوم ہوتا تو جلد بازی میں خود ہی میں نے اپنے گلے میں پھندا ڈال لیا ہوتا اس وقت۔ یہ بات میں بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا کہ آلیور کا فون ٹیپ کیا جاتا ہے۔ آلیور نے خود مجھے بتایا تھا۔ میں اس فون پر ایسی کوئی بات کسی سے نہ کروں جو میرے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔ اس کا فون ٹیپ کیا جاتا ہے اور اس کے مکان کی بھی نگرانی کی جاتی ہے۔

میں فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ گریگری سے کس طرح رابطہ قائم ہو سکے گا؟ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم، یہ علاقہ کون سا ہے اور اس کا پولیس اسٹیشن کہاں واقع ہے؟ میرا دماغ بہت پریشان تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس الجھن اور پریشانی میں مجھے لزی کے آنے کا علم بھی نہ ہو سکا۔ اس کی موجودگی کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب اس نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز سن کر میں نے اسے دیکھا۔ وہ میرے قریب کھڑی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کسے فون کر رہے ہیں جناب عالی! کس سوچ میں گم ہیں آپ؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "اوہ کچھ نہیں، کچھ نہیں... وہ میں دراصل اس پولیس افسر گریگری سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا وہ لوگ مجھے کب یہاں سے جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔"

"پھر کیا اب ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ کیا اب معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی؟" اس نے کہا۔

"نہیں، وہ بات یہ ہے، یہ خیال ہی نہیں رہا تھا مجھے کہ گریگری کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"ارے تو یہ بات ہے۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے جناب عالی! لائیے میں ملاتی ہوں نمبر۔"

اس نے میرے ہاتھ سے ریسیور لے کر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے سلسلہ ملنے پر اس نے گریگری سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر ریسیور میری طرف بڑھا کر بولی۔ "لیجیے جناب عالی! بات کریں مسٹر گریگری سے۔"

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب گریگری ہی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "مسٹر گریگری! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ میں کب تک روانہ ہو سکوں گا یہاں سے؟"

آدمی وہ بڑا ہی صاحب فہم تھا۔ میرے بات کرنے کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا وہ کہ کسی خاص وجہ سے میں فون پر کھل کے بات نہیں کر پا رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی کہا۔ "مسٹر غیاث احمد! آپ یوں کریں کہ یہاں پولیس اسٹیشن آ جائیں میرے پاس۔ کچھ ضروری کارروائی کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ کو ہم ٹھیک سے بتا سکیں گے کہ آپ کب جا سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں ابھی حاضر ہو جاتا ہوں لیکن ذرا سی مشکل ہوگی مجھے آنے میں۔"

"کیسی مشکل؟ میں سمجھا نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"وہ اب دیکھیے ناجی، آپ کا یہ شہر میرے لیے تو بالکل اجنبی ہی ہے نا۔ آپ لوگوں نے مجھے یہاں گھومنے پھرنے یا کچھ دیکھنے بھالنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ پھر میں کیسے پہنچ سکوں گا آپ

تک ہے؟" میں نے کہا۔

"اوہ، یہ بات ہے، اچھا ٹھہریں میں ہمفرے کو بھیج رہا ہوں آپ کے پاس۔" اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

میں نے بھی ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے لزی سے کہا۔" وہ اپنے اسسٹنٹ کو بھیج رہا ہے مجھے لینے کے لیے۔ اس کا کہنا ہے وہ کچھ ضروری کارروائی کرنا چاہتا ہے، اس کے بعد یہ بتا سکے گا کہ کب مجھے جانے کی اجازت ملے گی۔ کیا تم بھی چلو گی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن؟"

"میں کیا کروں گی جنابِ عالی! آپ تنہا ہی جائیں تو بہتر ہے۔ ممکن ہے اسے میرا آپ کے ساتھ جانا پسند نہ آئے۔ وہ کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتا ہو جو میری موجودگی میں نہ کر سکے۔" لزی نے کہا۔

اس کی مصلحت پسندی نے مجھے تنہا ہی گریگری کے پاس جانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں نے تو اس سے بس یوں ہی رسماً پوچھ لیا تھا۔ مگر دل میں ڈر بھی تھا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہی نہ ہو جائے۔ وہ بڑی موقع شناس تھی، خاصی فراست رکھتی تھی وہ، اس نے جان لیا تھا کہ گریگری مجھے یوں ہی اپنے پاس آنے کو نہیں کہہ رہا ہوگا۔ کوئی اہم بات ہی ہوگی جو اس کی موجودگی میں نہیں ہو سکے گی۔ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ میں پوری طرح اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہوں۔ اس پر اس درجہ فریفتہ ہوں کہ کوئی بات اس سے چھپا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ میری واپسی پر وہ مجھ سے سب کچھ اگلوا لے گی۔

میں نے اس سے کہا۔" ہاں، یہ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ جانا تو مجھے اکیلے ہی چاہیے وہاں۔"

وہ بولی۔" آپ جب تک وہاں ہو کر آئیں جنابِ عالی! میں ذرا مارکیٹ تک ہو آؤں گی۔ ضرورت کی کچھ چیزیں لاؤں گی۔ پاپا کہہ رہے تھے آپ دو ایک روز میں پاکستان روانہ ہو جائیں گے اور مجھے بھی آپ کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے جنابِ عالی! بہت حیران ہو رہی ہوں میں۔"

"کون سی بات لزی بیگم! کس وجہ سے حیران ہو رہی ہو تم؟" میں نے معلوم کیا۔

"حیرت مجھے اس بات پر ہے جنابِ عالی! وہ پاپا تو بڑے ہی سخت گیر آدمی ہیں لیکن پتا نہیں کیا بات ہے، آپ کے سامنے ان کی ساری سختی ہوا ہو گئی ہے۔ آپ کی ہر بات بلا چون و چرا مان لیتے ہیں وہ۔"

میں نے کہا۔" اس میں حیرانی کی کیا بات ہے لزی بیگم! میں ان سے کوئی ایسی بات ہی نہیں کہتا جو ماننے والی نہ ہو۔"

"واہ جنابِ عالی! کیا خوب ہیں آپ بھی۔ آپ نے مجھے

اپنے ساتھ لے جانے کو کہا، یہ بات ان کے لیے ماننے والی تھی کیا؟"

"کیا برائی تھی اس میں؟" میں نے پوچھا۔" کیوں ملنے والی نہیں تھی ذرا بتانا تو؟"

"دیکھیں نا، ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے آپ نے ہمارے ساتھ۔ اتنی جلدی وہ آپ پر اتنا اعتماد کرنے لگے ہیں۔ ایسا پہلے تو انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ مجھے تو آپ کوئی ساحر لگتے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ نے مجھے اسیر کر لیا ہے اپنا اور اب پاپا بھی دم بھرنے لگے ہیں آپ کا۔ بڑی تعریفیں کرتے ہیں وہ آپ کی۔"

"اچھا، اور ان کی تعریفیں سن کر تم نے مجھے جادوگر سمجھ لیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور کیا سمجھوں میں آپ کو جنابِ عالی! آپ نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ میں نے پاپا کو اتنا مہربان کبھی نہیں پایا جتنے وہ آج کل ہو رہے ہیں مجھ پر۔"

اسی وقت بیرونی دروازے پر کسی کار کا ہارن بج اٹھا۔ لزی نے مسکرا کر کہا۔" لیں جنابِ عالی! وہ آ گئے آپ کو لینے کے لیے۔ اب آپ جائیں لیکن ذرا جلدی واپس آنے کی کوشش کریں اور ہاں یہ ضرور پوچھ لیں آپ اس گریگری سے کہ اب تو آپ کے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کیا ہم آج شام کو کہیں تفریح وغیرہ کے لیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟"

"ٹھیک ہے، میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

بیرونی دروازے پر پولیس موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہمفرے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ والی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے ادھر کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے خاموشی سے اس کے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ کار ریورس کر کے پیچھے لے آیا اور اسے سڑک پر دوڑاتے ہوئے بولا۔" کیا وہ آفت کی پڑیا اس وقت بھی تمھارے ساتھ ہی تھی؟"

"ہاں، وہ لوگ کم ہی مجھے اکیلا چھوڑتے ہیں۔ آرتھر یا لزی میں سے کوئی ایک کسی نہ کسی بہانے میرے پاس موجود رہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔" لزی کو اب کسی بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اب ساری زندگی تمھارے ساتھ ہی لگی رہے گی۔ ویسے یار! تم ہو آدمی کمال کے۔ ایک ہی دن میں اسے شیشے میں اتار لیا۔"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔" میں نے تو شیشے میں ہی اتارا تھا مجھے تو بوتل میں اتار کر بند کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہی تو کر رہی ہے وہ۔ تمھیں تو بوتل میں ہی بند کیا جا سکتا ہے۔ کسی جن سے کم نہیں ہو تم بھی۔ اس ہاتھی جیسے ہارٹن کو تم نے جس طرح ناک آؤٹ کیا ہے وہ کوئی جن ہی کر سکتا تھا۔" وہ بولا۔

"ارے کس کا ذکرِ خیر شروع کر دیا یار تو نے۔ آدمی کا بچہ تو وہ لگتا ہی نہیں ہے کہیں سے۔ کیسے اٹھا کے لے گئے تھے تم لوگ اُسے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس لے ہی گئے تھے کسی نہ کسی طرح۔" اس نے کہا اور کار ایک عمارت کے گیٹ میں داخل کر دی۔

میں نے پوچھا۔" یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے؟ یہ تو کسی کی رہائش گاہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ گریگری نے مجھے پولیس اسٹیشن آنے کو کہا تھا۔"

"گھبراؤ مت۔ یہ گریگری ہی کی رہائش گاہ ہے۔ وہ تم سے یہیں ملنا چاہتا ہے۔" ہمفرے نے کہا۔

میں نے حیرت سے اس عالی شان عمارت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہوئے کہا۔" کمال ہے یار! وہ اتنا بڑا آفیسر تو معلوم نہیں ہوتا مجھے جس کے لیے اتنی عظیم الشان رہائش گاہ فراہم کی جائے۔"

"یہ عمارت سرکاری نہیں اس کی ذاتی ملکیت ہے۔" ہمفرے نے پورچ میں کھڑی ہوئی ایک لمبی سی جہازی سائز کی کار کے پیچھے اپنی کار روکتے ہوئے کہا۔" گریگری ایک دولتمند خاندان کا فرد ہے۔"

"پھر بھی پولیس کی نوکری کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ اس کا ذاتی شوق ہے۔ ورنہ نوکری کی اسے ضرورت نہیں ہے۔" ہمفرے نے بتایا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک سجے سجائے نہایت خوبصورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو گریگری نے بڑے تپاک سے استقبال کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔" مسٹر جیلانی! میں نے اس لیے تمھیں اپنے گھر بلایا ہے کہ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہو سکیں گی۔" اس نے مجھے ساتھ لے جا کر ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔" ہاں، اب بتاؤ وہ کیا اہم بات تھی جس کے لیے تم نے مجھے فون کیا تھا؟"

میں نے کہا۔" تمھارے آنے کے بعد میں آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ ابتدا میں تم سے میں نے ایک جھوٹ بولا تھا۔ اگر اب میں نے اس کی تصحیح نہیں کی تو ہمارا سارا منصوبہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ ہم غفلت میں مارے جائیں گے۔"

"اوہ، کون سا جھوٹ بولا تھا تم نے مسٹر جیلانی؟" گریگری نے کہا۔" کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"میں نے تمھیں ہارٹن کے بارے میں سچی بات نہیں بتائی تھی گریگری! تم نے جب اسے شناخت کے لیے میرے سامنے کیا تھا تو میں نے جھوٹ بول دیا تھا کہ مجھے پیٹر ہاک کی قید سے فرار میں مدد دینے والا وہ ہارٹن نہیں تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

گریگری اور ہمفرے دونوں حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ہمفرے بولا۔" پھر اب تمھیں یہ خیال کیوں آیا کہ تم ہمیں اس کے بارے میں صحیح بات بتا دو؟"

میں نے گریگری سے مخاطب ہو کر کہا۔" اس وقت میرے جھوٹ بولنے کی وجہ یہ تھی گریگری کہ مجھے تم سے کسی بھلائی کی امید بالکل نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا تم مجھے کسی چکر میں پھانس کر سزا دلوائے بغیر نہیں رہو گے۔ لہٰذا میں ہارٹن کو بچانا چاہتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کر سکوں۔"

"اوہ، جیلانی! یہ بہت برا کیا تم نے۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" گریگری لمبی سانس لے کر بولا۔

"میں مجبور تھا دوست! مجھے اس کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیا تھا اس وقت۔ یقین کرو اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ میری مدد کر کے دراصل یہودیوں کے عزائم کی تکمیل میں ان کی مدد کر رہا ہے تو میں بجلی کی کرسی پر بیٹھ کر جان دے دینا پسند کر لیتا مگر اسے بچانے کی کوشش نہ کرتا۔ اب ان کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد تمھیں اس کی اصلیت سے بے خبر رکھنا میرے لیے خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ تمھارے آنے کے بعد الزبتھ اور آرتھر نے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ ورنہ شاید میں بہت پہلے تمھیں اس کی اطلاع دے دیتا۔" میں نے اسے بتایا۔

گریگری بولا۔" تم نے یہ بہت اچھا کیا جیلانی! مجھے اس سے آگاہ کر دیا۔ ورنہ میں اس سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔ اسے بتا دیتا کہ ہم نے تمھیں کس لیے اپنے وطن جانے کی اجازت دی ہے۔ اف میرے خدا! اگر اسے ہمارے عزائم کا علم ہو جاتا تو تمھارا کیا حشر ہوتا جیلانی؟"

"میرے یہاں سے جانے کے بعد اگر اسے علم ہو بھی جاتا تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اپنے وطن میں میں ان سے اچھی طرح نمٹ لیتا۔ ایسی چھترول کرتا میں ان کی کہ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کرتے وہ۔ البتہ ہم اپنے پروگرام کو عملی جامہ

نہیں پہنا سکتے تھے۔ وہ ہوشیار ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔" میں نے کہا۔ "میں نے آرتھر فینلی اور لزی کا جو اعتماد حاصل کیا ہے، وہ میرے بہت کام آئے گا وہاں۔ میں ایک ایک کو چن چن کے ..... ٹھکانے لگا دوں گا۔ ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں ہونے دوں گا۔"

"کیا آرتھر نے پاکستان میں اپنے کچھ ایجنٹوں کی نشاندہی کی ہے؟" گریگری نے پوچھا۔

"نہیں، نشاندہی تو اس نے ابھی تک کسی کی نہیں کی ہے، مگر وہ میرے ہمراہ الزبتھ کو بھیجنے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ الزبتھ پاکستان پہنچ کر مجھے ان تمام لوگوں سے ملا دے گی جو وہاں ان کے لیے کام کر رہے ہیں۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"یہ بہت ہی اچھا ہوا ہے جیلانی یار! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میری توقع سے زیادہ تیز جا رہے ہو تم۔"

"او نہیں یار! اب ایسی بات نہیں ہے۔ بس کچھ خدا کو ہی شاید میرے ہاتھوں ان کی بربادی منظور ہے ورنہ تو بڑے کیکر ہیں وہ لوگ۔ کسی کو ذرا ہاتھ نہیں رکھنے دیتے اپنے اوپر۔"

"ہاں یہ تو ہے، تمھیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ان سے۔ اگر انھیں شبہ بھی ہو گیا کہ تم ہم سے ملے ہوئے ہو تو یہ تمھاری بنیادیں تک کھود کے پھینک دیں گے، نسلیں تک مٹا ڈالیں گے یہ تمھاری۔"

"اوئے اس کی فکر ہی نہ کرو۔ بس ایک بار وطن واپس پہنچ جاؤں پھر دیکھنا تم تماشا۔ بنیادیں کس کی کھودی جاتی ہیں اور نسل کشی کس کی ہوتی ہے۔" میں بولا۔

"گریگری مسکرا کر بولا۔" دیکھو دوست! وطن جا کر بدل نہ جانا۔ اگر کبھی یہ خیال آئے بھی تمھارے دل میں تو یہ سوچ لیا کرنا کہ ہاتھ ہمارے بھی کچھ کم لمبے نہیں ہیں۔ پاتال میں سے بھی نکال لاتے ہیں آدمی کو ہم۔ ہاں، کچھ ایسا ہی بندوبست کر رکھا ہے ہم نے دنیا بھر میں۔"

"تو کیسی باتیں کرتا ہے یار گریگری! میں نے کوئی خرید و فروخت تو نہیں کی ہے تیرے ساتھ۔ کوئی سوداگری تو نہیں کر رہا ہوں میں، اپنے ضمیر، اپنے ایمان اور اپنی حب الوطنی کا مول تو نہیں چکایا ہے میں نے۔ میں تو اپنے وطن کے دشمنوں کی قبروں کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"غصہ مت دکھاؤ، برا مت مانو دوست! ہم جو کچھ کرنے جا رہے ہیں اس میں شکوک و شبہات تو پیدا ہوتے ہی ہیں۔ بڑا نازک معاملہ ہے یہ جیلانی! جدھر سے مطمئن ہو کر بیٹھو گے، وہیں سے مار کھا جاؤ گے۔ مطمئن تو ہونا ہی نہیں چاہیے اس معاملے میں۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہی ہے مگر یوں بر ملا کسی کی نیت پر شک بھی نہیں کرنا چاہیے، آدمی بددل ہو کر بے ایمانی پر اتر سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا۔" ہمفرے جو اب تک خاموش بیٹھا تھا بول پڑا۔

میں نے کہا۔ "تو اس ہارٹن کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے۔ اس مار آستین کا کوئی بندوبست ضرور کرنا، اس کی طرف سے ہر دم خطرہ ہی رہے گا، نہ جانے کب کوئی بات اس کے کان میں جا پڑے۔"

"اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو، ہم اس کی کوچیں کاٹ کے ایک طرف ڈال دیں گے اسے۔ اب وہ تمھاری راہ میں حائل ہونے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔" گریگری بولا۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے اجازت دو۔"

"ہاں، تم اب جاؤ۔ تمھارا زیادہ دیر ہمارے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" گریگری بولا۔ "اور تم جب چاہو اپنے وطن واپس جا سکتے ہو۔ ہماری طرف سے اجازت ہے تمھیں۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ میں بے حد ممنون ہوں تمھارا۔ کیا آج ہی رات یا کل صبح کی کسی فلائٹ سے چلا جاؤں؟"

"میں نے کہا نا، جب چاہو چلے جاؤ۔" وہ میرے ساتھ ہی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"بہت بہت شکریہ دوست! تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی ہے یہ کہہ کر۔" میں نے کہا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں ہے، یہ تو ہمیں کرنا ہی تھا۔ کام بھی تو لے رہے ہیں ہم تم سے۔" وہ بولا۔

وہ مجھے چھوڑنے کار تک آیا تھا۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ الزبتھ آج شام مجھے کہیں باہر لے جانا چاہتی تھی کیا خیال ہے چلا جاؤں میں اس کے ساتھ؟"

"ہاں ہاں، ضرور جاؤ، کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔" اس نے کہا۔

میری واپسی بھی ہمفرے کے ساتھ اس کی کار میں ہی ہوئی تھی۔ ہمفرے نے گریگری کے مکان سے نکل کر کار سڑک پر دوڑاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "یار جیلانی! اب تو تم جا ہی رہے ہو اور ہم سے تمھاری دوستی بھی ہو گئی ہے۔ اب تو مجھے بتا دو تمھارے

نے ہتھیار کیوں ناکارہ ہو جاتے ہیں؟"

"اوئے یار! کمال آدمی ہو، تم یہ بات بھول نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے؟ یہ تو مجھے زندگی بھر جبین رکھے گی۔ ایک خلش سی رہے گی ہمیشہ مجھے۔" وہ بولا۔

مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے کہا۔ "یہ ایک خاص قسم کا وظیفہ دتا ہے۔ جسے پڑھنے سے ایسا ہو جاتا ہے۔"

"وظیفہ!" وہ بولا۔ "یہ وظیفہ کیا ہوتا ہے؟"

میں ابھی اسے جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ اچانک ایں جانب کی گلی سے نکل کر ایک سیاہ وین ہمفرے کی کار کے سامنے آگئی۔ ہمفرے بریک لگانے میں ذرا بھی دیر کرتا تو اس کی اور وین سے بری طرح ٹکرا جاتی۔ اس کے پوری قوت سے ریک لگانے کے باوجود کار گھسٹتی ہوئی وین کے ساتھ جا لگی تھی۔ ہمفرے نے جھنجلا کر سر باہر نکالا۔ وہ وین کے ڈرائیور سے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ وین کا دروازہ کھلا اور چار تن و مند زان ہاتھوں میں ریوالور لیے کود کود کر نیچے آگئے۔ انھوں نے ہمفرے کی کار کو گھیرنے میں اس قدر عجلت کا مظاہرہ کیا تھا کہ ہم دونوں کو صورتِ حال سمجھنے کا موقع تک نہیں مل سکا۔

اور

جب صورتِ حال ہماری سمجھ میں آئی تو بازی ان کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ ان میں سے دو آدمی کار کی عقبی نشست کے دونوں دروازے کھول کر اندر داخل ہو چکے تھے ....

انھوں نے عقبی نشست پر قبضہ کرتے ہی میری اور ہمفرے کی گردنوں پر اپنے اپنے پستول کی نال رکھ دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ہماری گردنوں سے پستول لگا کر ہمیں بے بس کر دیا ہے اور اب ہم ان کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کا یہ خیال ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ موت کو ہنسی خوشی گلے لگانے کے لیے کون تیار ہوتا ہے، اس یقین کے باوجود کہ موت برحق ہے۔ اس سے کسی کو رستگاری نہیں جو آج زمین کا سینہ روندتا پھر رہا ہے، اپنی عیاریوں اور چالاکیوں پر نازاں گردن اکڑائے، سینہ تانے پھر رہا ہے، جو شب و روز دنیا بھر کی آسائشیں اپنے گرد جمع کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے اور اپنے جسم کو آرام پہنچانے کی کوششوں میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں صرف کیے ڈال رہا ہے۔ اسے اس ساری جدوجہد، ساری تگ و دو کے باوجود بالآخر پیوندِ زمیں ہو جانا ہے۔ سارے عیش و آرام، مال اور محل اور نام و نمود زمین کے اوپر ہی رہ جائیں گے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے

اعمالوں کا حساب ساتھ لے کر یہاں سے چلا جائے گا۔ اس حقیقت سے کوئی انکاری نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ان منصوبوں کی تکمیل تک جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ جب بھی موت سر پہ کھڑی نظر آتی ہے، کچھ روز اور جینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ پستول کی نال گردن پہ رکھی ہو تو جینے کی کچھ اور مہلت حاصل کر لینے کی آرزو میں ہر آدمی اس کے اشاروں پر ناچنے کو تیار ہو جاتا ہے جس کی انگلی گردن سے لگے پستول کی لبلبی پہ جمی ہو۔ اب اگر وہ چاروں مسلح افراد ہمیں بے بس اور مجبور سمجھ رہے تھے تو کیا غلط کر رہے تھے وہ۔ انھوں نے یا ان کے سرپرستوں نے ہمیں زیر کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا، اب تک انھوں نے اس کے ہر مرحلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام سے ہمکنار کیا تھا۔ اس میں کہیں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی ان سے۔ اب اگر میرے ہاتھ میں کوئی طلسماتی انگوٹھی تھی تو اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ ان منصوبہ سازوں نے اپنے منصوبے میں اس کا تو ذکر نہیں کیا ہوگا۔ وہ بھی اس بات سے بے خبر ہی تھے۔

دو آدمی باہر ہی کھڑے رہے تھے۔ ایک ہمفرے کی طرف اور دوسرا میری طرف۔ پستول اپنے اپنے انھوں نے بھی ہم پہ سیدھے کر رکھے تھے۔ ہمفرے کی طرف جو شخص کھڑا تھا، اس نے بڑے ہی خونخوار انداز میں غراتے ہوئے کہا "مسٹر ہمفرے اپنی حیثیت سے کوئی غلط فائدہ حاصل کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ خاموشی سے جو کہا جائے اس پر عمل کرتے رہو ورنہ زندگی زیادہ وفا نہیں ہوتی۔"

پھر اس نے ہمارے پیچھے عقبی نشست پر بیٹھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "تم دونوں نہایت ہوشیاری کے ساتھ انھیں لے کر پیچھے آؤ۔"

وہ دونوں تیزی سے ہٹے اور واپس وین میں جا بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آگئی۔ اس نے ہمارا راستہ چھوڑ دیا اور سیدھی ہو کر آگے سڑک پر چلنے لگی۔ عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے اشخاص میں سے جس نے ہمفرے کی گردن سے پستول لگا رکھا تھا، بولا "تم بھی اپنی گاڑی وین کے پیچھے لگا لو۔ خبردار! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں نے کن انکھیوں سے ہمفرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ دونوں ہونٹ اس کے بھینچے ہوئے تھے۔ حالت سے اس کی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اس کی گردن سے پستول نہ لگا ہوا ہوتا تو وہ اس حکم دینے والے کا حشر نشر کر کے رکھ دیتا۔ مگر اس وقت تو وہ بے بس تھا، مجبورِ محض۔ اس کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا چنانچہ اس نے خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی جاتی ہوئی وین کے پیچھے لگا لی۔ وہ دو تھے۔ اگر

میں چاہتا تو پیچھے مڑ کر ان لوگوں کی گردنیں ڈھیلی کر سکتا تھا۔ ماہر کا دیا ہوا طلسمی تحفہ میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے ان دونوں کے پستول ہمارے لیے بے ضرر تھے لیکن میں نے ان پر اپنا کوئی ہنر آزمانا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہمفرے مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آخر مجھ پر یہ دور مار ہتھیار، گولیاں کیوں نہیں اگلتے؟ میں اب تک انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ یہ محض اتفاق تھا جو جہاز میں ان لوگوں کے ہتھیار ناکارہ ہو گئے تھے ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خصوصی صلاحیت نہیں ہے جو ہتھیاروں کو ناکارہ بنا دے۔ انھیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ گرہ اب تک موجود تھی اور وہ اسے کھولنے کی کوشش بھی کرتے رہے تھے۔ وہ میری ایسی بے سروپا باتوں پر یقین کر بھی کیسے سکتے تھے۔ ان کا تعلق امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کی ریاست سان فرانسسکو کی پولیس سے تھا۔ دنیا کے جدید ترین آلات انکے زیر استعمال تھے۔ کوئی ایسا آلہ انھیں آج تک نہیں ملا تھا جو ہتھیاروں کی زبان بند کر سکے، ان کے دہانے پاٹ سکے۔ نہ ہی انھوں نے کسی ایسی ایجاد کے بارے میں اب تک سنا ہوگا۔ چنانچہ یہ گتھی ان کے ذہنوں میں الجھ کر رہ گئی تھی اور کسی طرح سلجھائی نہیں جا رہی تھی۔ وہ یہ تو تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ایسا محض اتفاقاً ہو جاتا ہے۔ ایک جیسا اتفاق بار بار تو نہیں ہوا کرتا۔ جہاز اغوا کرنے والا کوئی ایک آدمی تو نہیں تھا۔ وہ کئی تھے اور یہ کوئی بے وقوف انسان بھی تسلیم نہیں کرے گا کہ بیک وقت ان سب کے ہتھیار کسی وجہ کے بغیر محض اتفاقاً ناکارہ ہو گئے تھے اور اس کے بعد مجھ پر ان لوگوں نے جتنے بھی حملے کیے، ان میں بھی۔۔۔ کوئی پستول یا ریوالور ان کا ساتھ نہ دے سکا تھا اور حملہ آوروں کو میرے ہاتھوں ہر بار زک اٹھانا پڑی تھی۔ اگر وہ جہاز کا واقعہ میرے بیان کی روشنی میں اتفاق سمجھ لیتے تو پھر ان بعد کے واقعات کو کس خانے میں فٹ کرتے؟ یہ بات میں خوب جانتا تھا کہ وہ میری کسی دلیل کسی حجت کو تسلیم نہیں کریں گے مگر میں انھیں اصل بات بھی تو نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر وہ میری انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کی حقیقت جان جاتے تو مجھے اس طلسمی انگوٹھی سے ہاتھ دھو لینا پڑتے۔ میں نے تو اس کے سلسلے میں دشمن کو بھی گمراہ کر دیا تھا۔ اسے بھی میں اس فریب میں مبتلا کر چکا تھا کہ وہ انگوٹھی کہیں میں گم کر بیٹھا ہوں۔ فی الحال میں نے یہی مناسب جانا تھا کہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں، ممکن ہے گریگری کے آدمی ہماری نگرانی کرتے رہے ہوں اور انھوں نے دشمن کو ہمارا راستہ کاٹتے دیکھ لیا ہو۔ ممکن ہے گریگری ہماری مدد کے لیے حرکت میں آگیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب ایک ڈرامے کا حصہ ہو۔ مجھے اور ہمفرے کو گریگری کے آدمیوں نے

پھیرا ہو، وہ میری سان فرانسسکو روانگی سے پہلے یہ معمّا حل کر لینا چاہتا ہو کہ میرے سامنے ہتھیار زنگ آلود کیوں ہو جاتے ہیں؟ اگر میں جوش میں آکر ان لوگوں سے بھڑ جاؤں تو انھیں میرا اپنے پستول آزمانے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا اور جب وہ پستول اپنی نااہلی کا اعلان کریں گے تو پھر میرے پاس کوئی بہانہ نہیں رہے گا۔ مجھے اصلیت اگلنا ہی پڑے گی۔ ایسے میں میرے لیے یہی بہتر تھا کہ خاموش بیٹھا حالات کا مشاہدہ کرتا رہوں اور موقع ملنے پر اس نئی افتاد سے نمٹنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ استعمال کروں جس میں ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت نہ آئے۔

وہ ہمیں شہر کی بھری پری سڑکوں اور گلیوں سے گزارتے کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں مسلح افراد بڑے ہی چوکنّا اور اپنے فن میں یکتا معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے ہمیں اس بات کا کوئی موقع نہیں دیا کہ میں یا ہمفرے ان کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے اور نہ ہی انھوں نے شارعِ عام پہ گزرنے والے کسی پیدل یا سوار کو ذرا بھی یہ شبہ ہونے دیا تھا کہ وہ ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ آگے جاتے والی وین ہماری رہنمائی کرتی ہوئی ہمیں شہری آبادی سے باہر لے آئی۔ میں نے آگے شاہراہ پر نظریں جماتے ہوئے عقبی نشست پہ براجمان اغوا کنندگان سے پوچھا "اوئے یارو! یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے، تم ہمیں کسی لمبے ہی سفر پہ لے چلے ہو؟"

ان دونوں میں سے کسی نے بھی میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے ایک لمحے ان کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا "اوئے کچھ بولو تو یارو! کیا منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے ہو؟"

وہ اب بھی خاموش ہی رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے ہمفرے سے کہا "یار ہمفرے! یہ لوگ شاید میری زبان نہیں سمجھتے۔ پتا نہیں کونسی زبان جانتے ہیں یہ؟ تو ہی ان سے پتا کر یار، کہاں لے جا رہے ہیں یہ ہمیں؟"

ہمفرے نے کہا "ہمیں یہ نہیں وہ آگے والی وین میں سوار لوگ لے جا رہے ہیں۔ یہ تو بس حکم کے غلام ہی ہوتے ہیں۔ یہ کیا بتائیں گے تمھیں؟"

"ہاں یار! بات تو تیری ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے مگر انھیں بھی تو آخر کچھ نہ کچھ بولنا چاہیے۔ ذرا پتا تو کرو ان کے منہ میں زبانیں بھی ہیں یا نہیں؟"

ہمفرے نے ہنس کر کہا "یہ تو تم ہی معلوم کر سکتے ہو ان سے۔ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔"

"اتنی سی بات کرنے میں بھی ہمت کی ضرورت ہے یار! کیسا پلپلیا ہے تو؟"

"گردن سے پستول کی نال لگی ہو تو پولیس کی وردی کسی کام نہیں آتی دوست!" وہ بولا۔

"اوئے یار! کیسی باتیں کرتا ہے تو؟ کیسا ملک ہے یہ تیرا؟ میرے یہاں تو ہزار آفات سے محفوظ کر دیتی ہے یہ وردی آدمی کو۔ بڑے بڑے پھنّے خاں صبح و شام سلام کرتے ہیں اس وردی کو۔ یوں سمجھ لو، جس کے تن پر سج جاتی ہے بادشاہ بنا دیتی ہے۔ یہ سات کیا، سات سو خون بھی معاف ہو جاتے ہیں اس پر۔ بڑے سے بڑا جرم حلال ہو جاتا ہے اس ذاتِ شریف پر۔"

"ہاں، سنا ہے میں نے بھی بہت کچھ مشرقی ممالک کی پولیس کے بارے میں مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے، تم ایسی خطرناک سچویشن میں بھی ایسی باتیں کر لیتے ہو؟"

"پھر کیا کروں بھائی! ہاتھ پیر میں ہلا نہیں سکتا کہ زندگی اپنی مجھے بھی عزیز ہے۔ ان سے کچھ پوچھتا ہوں تو یہ جواب نہیں دیتے، ایسے میں خاموش رہ کر ہولتے رہنے سے تو کچھ نہ کچھ بولتے رہنا بہتر ہے۔"

ہمفرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ دونوں میری اتنی بکواس کے بعد بھی ایک لفظ نہیں بولے تھے اور نہ ہی انھوں نے کوئی حرکت کی تھی۔ ان کی اس خاموشی اور بے پروائی نے مجھے جھنجلا دیا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا تھا کہ وہ دونوں میری باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سوچا، میں ایک دم پیچھے پلٹ کر ان کے پستول چھین لوں۔ اسی وقت آگے جاتی ہوئی وین پختہ شاہراہ چھوڑ کر گھنے درختوں کے درمیان ایک کچّے راستے پر مڑ گئی۔ ہمفرے نے بھی اپنی کار اسی سمت موڑ لی۔ بڑے بڑے گھنے اور تناور درختوں کے درمیان ناہموار راستے پہ کار یوں اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے جم کر بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ ایسے میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں رہا تھا۔ کچھ دُور چل کر وہ وین رُک گئی۔ ہمفرے نے بھی اپنی کار روک دی۔ وین کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہی دونوں جو ہمیں اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے وین میں جا بیٹھے تھے، گاڑی سے اُتر کر ہماری کار کے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے۔ ایک نے میری طرف کا دروازہ کھول کر مجھے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور خاموشی کے ساتھ کار سے باہر نکل آیا۔ دوسرے نے ہمفرے کو بھی کار سے اُتار لیا تھا۔ اس نے ہمفرے کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آگے چلنے کا حکم دیا مگر جیسے ہی ہمفرے نے اپنی پشت اس کی طرف کی، اس نے پھرتی سے پستول کی نال پکڑ کر اس کے دستے سے پوری قوت کے ساتھ ہمفرے کی کنپٹی بجا دی۔ ضرب اتنی بھرپور اور ایسی تلی تھی کہ اسے دوسری چوٹ لگانے کی ضرورت ہی

محسوس نہ ہوئی۔ ہمفرے کسی بلانوش شرابی کی طرح لہرا کر زمین بوس ہو گیا تھا۔

بے ہوش ہمفرے کو اُٹھا کر دوبارہ اس کی کار میں ڈالنے اور کار کو اسٹارٹ کر کے ایک طرف کرنے میں انھوں نے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگایا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی وین میں آ بیٹھے اور ہمفرے اور اس کی کار کو وہیں چھوڑ کر وین کو بیک کر کے دوبارہ سڑک پر لے آئے۔ میں نے انھیں شہر کی طرف واپس جاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ "یارو! آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم لوگ اور مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟"

ہمفرے کو ضرب لگا کر بے ہوش کرنے والے نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تمھیں کہاں لیے جا رہے ہیں، یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ویسے تم نے ہم سے تعاون کر کے ہمارا کام آسان کر دیا ہے جیلانی! ہمیں بس یہی خدشہ تھا کہ کہیں تم مزاحمت پر نہ اُتر آؤ۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے لیے تمھیں ان لوگوں کے شکنجے سے آزاد کرانا مشکل ہو جاتا۔"

"اوہ! تو تم لوگ مجھے پولیس کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے بھیجے گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں، اور شکر ہے کہ تمھیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر تم نے اس کام کے لیے ایک غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟ کونسی غلط جگہ کا انتخاب کیا ہے ہم نے؟"

"میرا مطلب اس جگہ سے ہے، جہاں تم نے ہماری کار روکی تھی۔ اس پولیس افسر گریگری کا مکان وہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ ممکن ہے اس نے یا اس کے کسی آدمی نے تم لوگوں کو ہماری راہ روکتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔" میں نے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ ہم کوئی کام بے سوچے سمجھے نہیں کیا کرتے۔ تم جب ہمفرے کے ساتھ آلیور کے گھر سے روانہ ہوئے تھے، اس کے بعد سے ہم نے تم پر پوری نظر رکھی ہے۔ یہ وین جو ہم نے اس کام کے لیے استعمال کی ہے، یہ بھی پولیس ہی کی ہے، قیدیوں کو اِدھر اُدھر لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور پولیس کی دو گاڑیوں کا ایک جگہ دیکھا جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ کسی نے دھیان بھی نہیں دیا ہو گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

اوہ، تو یہ بات تھی۔ میں نے سوچا۔ اسی لیے ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ مگر ہمفرے نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ وین پولیس کی ہے؟ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ اسے گریگری ہی کی... کوئی چال سمجھ رہا تھا، ورنہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ مار کھا جانے والا آدمی تو نہیں تھا۔ اسے یہ یقین ہی مار گیا تھا کہ یوں شارع عام پر اس کی کار روکنے والے اس کے محکمے کے ہی لوگ ہو سکتے ہیں، جنھیں کسی خاص منصوبے کے تحت گریگری نے ہی اس کام پر مامور کیا ہو گا اور منزل پر پہنچ کر اسے اس منصوبے کا علم ہو ہی جائے گا۔ جو کچھ اس پر اچانک گزر گئی تھی، اس کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ "بے چارہ،" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ نہ جانے کب تک اس ویرانے میں بے ہوش پڑا رہے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس پر کیا بیتے گی۔ کیا بتائے گا وہ گریگری کو؟

میں اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ مجھے منزل پر پہنچنے کا پتا ہی نہ چل سکا۔ گاڑی رُکنے پر ہلکا سا جھٹکا لگا تو میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ کوئی گودام تھا جہاں وین جا کر رُک گئی تھی۔ جس دروازے سے گاڑی اندر داخل ہوئی تھی، وہ اب بند ہو رہا تھا۔ انھوں نے وین کا دروازہ کھول کر مجھے نیچے اُتارا تو سب سے پہلے میری نظر اس قاتلِ عالم پر پڑی۔ میں اسے دیکھ کر بُری طرح چونکا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے دوبارہ ملاقات ہو سکے گی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ وہی تھی، وہی دشمنِ دین و ایمان، عالیہ خانم۔ اس کے یاقوتی لبوں پر وہی سحر انگیز مسکراہٹ رقصاں تھی، وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ دھمن بھی موجود تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے عالیہ کی دی ہوئی طلسمی انگوٹھی کا خیال آ گیا جس کے بارے میں دھمن سے میں کہہ چکا تھا کہ وہ میرے پاس سے کہیں گم ہو گئی ہے۔ وہ انگوٹھی اس وقت میرے ہاتھ میں موجود تھی۔ میں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور انگوٹھی انگلی سے اُتار کر اندر ہی اندر جیب میں گرا دی۔

دھمن فاتحانہ انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آؤ جیلانی یار! تم نے تو یہاں آتے ہی پوری ریاست سان فرانسسکو کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ یار عجیب شے ہے بھئی تُو بھی، جہاں جاتا ہے، ہنگامے تیرے ہمرکاب ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کے کہا۔ "ہاں بھئی، اپنی تو کچھ حالت ہی عجیب ہو گئی ہے۔ سکون نام کی کوئی شے تو ہے ہی نہیں اپنے مقدر میں۔ پر دھمن یار! آدمی تُو بھی کمال کا ہی ہے۔ بڑے پرپُرزے ہیں تیرے بھی۔ بڑی عیّار لومڑی کے بھٹ سے کھوج لایا ہے تُو مجھے۔"

اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ اپنے سینے سے بھینچ لیا مجھے۔ بولا۔ "یہ تو چیز ہی کچھ نہیں ہے یار! تُو نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ جن لوگوں کے لیے میں کام کر رہا ہوں اُن کی دراز دستی ابھی تُو نے دیکھی کہاں ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اُن کے۔ ان لوگوں کے ساتھ مل کر چلے گا تُو تو تیرے بھی سارے دلدر دُور ہو جائیں گے۔ سارے کانٹے چُن لیں گے یہ تیرے پیروں کے۔ میں جانتا ہوں بڑے زخم ہیں تیرے سینے میں۔ بڑا ستایا ہے تجھے

ں بے وفا زمانے نے، قدم قدم پر کانٹے بچھائے ہیں تیری راہ میں پنوں اور بیگانوں سبھی نے۔ بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے تیرے لیے سینے میں میرے۔ ایسے ہی تو نہیں بُلا لیا تھا میں نے... تجھے یہاں۔"

کیسے درد بھرے بول اُگل رہی تھی زبان اس کی، کیسا غمگسار نا ہوا تھا اس وقت وہ مگرمچھ کی اولاد۔ سمجھ وہ یہی رہا تھا کہ میں نے س کی ساری خطائیں معاف کر دی ہیں، اس کے لگائے ہوئے سارے لھاؤ بھر چکے ہیں اور میں انھیں بھول چکا ہوں۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ معافی اور درگزر جیسے خانے ہی نہیں رکھے گئے تھے میرے سینے میں، اس میں تو بس ایک ہی خانہ تھا اور اس میں انتقام کے انگارں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا اور اب جب کہ مجھے اس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے ملک و ملّت کی سوداگری کر رہا ہے، بنی اسرائیل کی غلامی کا جُوا ڈال لیا ہے اس نے اپنی گردن میں پھر میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ کہاں باقی رہ سکتا تھا۔

اس کے دل میں میرے لیے اب کیا جذبات تھے، یہ تو میں نہیں جان سکتا تھا مگر خود میرے دل میں اس کے لیے منافقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے اسی منافقت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یار دھمن! کیسا دردمند دل ہے سینے میں تیرے، مجھے کیا پتا تھا کہ تُو اپنے سینے میں ایسا حُسن بھرے پھر رہا ہے۔ وہ جو کہا ہے نا کسی شاعر نے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

پر یار! تُو تو کچھ دوسرے ہی قسم کے دھوکے دیتا ہے، بدگمان کرتا پھرتا ہے دنیا بھر کو اپنی طرف سے۔ اپنے اندر کا حُسن چھپا کے ایسی بگڑی ہوئی شکل دکھاتا ہے دوسروں کو کہ کوئی اچھی بات سُوجھتی ہی نہیں کسی کو تیرے بارے میں۔ جب تک تجھے قریب سے نہ دیکھا جائے، کسوٹی پر کسا نہ جائے، بڑا بدشکل نظر آتا ہے تُو۔"

وہ بڑی محبت سے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "چھوڑ یار! ان باتوں کو۔ کیا دھرا ہے اس نام و نمود میں۔ آدمی کو بھلائی اسی طرح کرنا چاہیے، نیکی کسی کو نظر نہیں آنی چاہیے، نظر آ جائے تو وہ نیکی نہیں رہتی، نمائش کی چیز بن جاتی ہے۔ جس کا کوئی صلہ، کوئی اجر نہیں ملتا۔ آؤ چلو اب چلیں۔" وہ مجھے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

وہ گودام کے عقبی حصّے کی طرف مُڑ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ عالیہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ وہ بار بار مسرور نگاہوں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ فرطِ انبساط سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور شہابی رخساروں پر شفق پھول رہی تھی۔ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا جو لوگ مجھے یہاں تک لے کر آئے تھے وہ وہیں وین کے پاس کھڑے رہ گئے تھے۔ دھمن ہم سے چند قدم آگے نکل گیا تھا۔ میں نے عالیہ سے اردو میں کہا۔ "کیا بات ہے عالیہ بیگم! بڑی خوش و خرّم نظر آ رہی ہیں آپ۔"

وہ مسرت سے لبریز مگر دھیمی آواز میں بولی۔ "کیا یہ میرے لیے خوشی کی بات نہیں ہے جیلانی کہ آج میں ایک بار پھر آپ کو صحیح سلامت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہوں۔"

میں نے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر تو مجھے اپنی نظروں پر رشک کرنا چاہیے۔ آپ جیسی گل گلزار ہستی کی ایسی والہانہ محبت میرا مقدر تو نہیں ہو سکتی تھی۔"

"ایسی باتیں نہ کریں جیلانی! میں آپ کو بتا چکی ہوں، آپ کی محبت تو پہلے ہی دن سے میرے دل میں بسی ہوئی ہے اور اب جبکہ آپ نے مجھے سمجھ لیا ہے تو آپ کے دکھ سُکھ کا مجھ پر اثر کیوں نہیں ہو گا؟"

"تم ابھی میری سلامتی کی بات کر رہی تھیں۔ تو کیا تمھیں میری سلامتی کی امید نہیں تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دھمن کی طرف دیکھا، وہ ہم سے دس بارہ قدم آگے چل رہا تھا۔ عالیہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "اس وقت یہ بات نہ چھیڑیں جیلانی! میں رات کو کلینک آؤں گی۔ مجھے آپ سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"کلینک میں!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "مگر میں وہاں کیسے پہنچ سکوں گا؟ پولیس کو میری تلاش ہو گی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گھیر لیں گے۔ میرے لیے گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ ویسے تمھارے اس دھمن نے مجھے پولیس کی تحویل سے نکال کر اچھا نہیں کیا ہے۔ میں انھیں اپنی طرف سے مطمئن کر چکا تھا، وہ لوگ مجھے ایک آدھ دن میں ہی وطن واپس بھیج دیتے مگر اب میرا یہاں سے نکلنا ناممکن نظر آتا ہے۔"

"اچھا! ایسا ہو گیا تھا۔ پھر تو واقعی دھمن سے یہ بڑی غلطی ہوئی ہے لیکن آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے بھی آپ کو

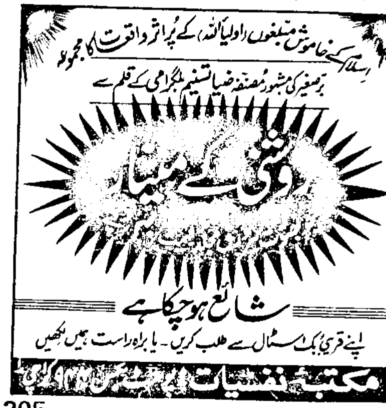

واپس بھیجنے کا مناسب اور معقول انتظام کر لیا ہے۔ پولیس کو پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ آپ کب یہاں سے روانہ ہو گئے۔"

"اچھا، ایسا انتظام کر لیا ہے اس دھمن نے میرے لیے مگر پھر بھی میں کلینک تک جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکوں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے ان کی نظروں سے بچ کر ہی رہنا چاہیے۔ بڑے دوُر بین لوگ ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔"

"کہیں آنے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ہم آپ کو یہاں سے سیدھے کلینک ہی لے جا رہے ہیں۔ وہاں آپ کی کچھ مرہم پٹی کی جائے گی۔ آج کی رات اور کل کا دن آپ وہیں گزاریں گے۔ کل آدھی رات کے بعد ایک خصوصی طیارہ آپ کو لے کر روانہ ہو جائے گا۔" عالیہ نے مجھے بتایا۔

"ہوں۔" میں نے اس کی بات سن کر سوچتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مجھے پارسل بنا کر یہاں لایا گیا تھا، اسی طرح بھیجنا بھی چاہتے ہیں یہ لوگ۔"

عالیہ نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے ایک دم پٹڑی ہی بدل ڈالی۔ بولی۔ "اوہ، جیلانی صاحب! آپ اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ آپ نے دھمن سے دوستی کی ہے تو وہ آپ کو یوں منجدھار میں تو نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ ضرور کسی نہ کسی طرح پاکستان بھیج کر ہی دم لے گا۔"

میں نے اسے بات بدلتے دیکھ کر دھمن کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کھڑکی نما دروازے کے قریب کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم اس کے نزدیک پہنچے تو وہ بولا۔ "کیا بات ہے بھئی جیلانی؟ کیا پریشانی لاحق ہے تمھیں؟"

عالیہ جلدی سے بولی۔ "یہ کہہ رہے ہیں، تم نے انھیں یہاں بلا کر اچھا نہیں کیا۔ پولیس انھیں پاکستان واپس بھیجنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔ انھیں فکر ہے کہ اب یہ واپس نہیں جا سکیں گے۔"

دھمن نے ہنس کر کہا۔ "اسے ابھی اندازہ نہیں ہوا ہے کہ یہ کن لوگوں کے درمیان آ گیا ہے ورنہ کبھی ایسی بات نہ کرتا۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "تم دیکھنا ہم تمھیں کیسی آسانی سے واپس بھیج دیں گے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے آگے جھکا اور اس چھوٹے سے دروازے کے دوسری جانب نکل گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے عالیہ بھی آ گئی۔ اس کے ادھر آتے ہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جس دروازے سے گزر کر ہم لوگ آئے تھے، زمین سے ایک دیوار ابھر کر اسے بند کر رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ اس طرح بند ہو گیا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو وہاں! پوری دیوار ایک جیسی ہی نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس جگہ کوئی دروازہ بھی ہو سکتا ہے۔

دھمن نے مجھے آگے کھینچتے ہوئے کہا۔ "آؤ نا یار! کیا دیکھ رہے ہو۔ چلے آؤ۔ اب اس جگہ کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکے گا۔"

یہ ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ تھا۔ جس میں ہر طرف لکڑی کی چھوٹی بڑی پیٹیاں چھت تک چنی ہوئی تھیں۔ ان پیٹیوں میں کیا تھا، یہ تو میں نہیں جانتا مگر اندازہ یہی ہے کہ منشیات کے سوا ان میں اور کچھ نہ ہوگا۔ کمرے کے درمیان چھت میں ایک تیز روشنی کا بلب لگا ہوا تھا جس کی روشنی میں کمرے کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر اوپر جانے کے لیے لکڑی کا ایک زینہ تھا۔ جس کا آخری سرا چھت سے لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ زینے کے اختتام پر کوئی ایسا راستہ بظاہر تو نہیں تھا جس کے ذریعے اوپر اس کمرے سے باہر جایا جا سکتا لیکن مجھے یقین تھا کہ جس طرح اس کمرے میں آنے کے بعد گودام میں کھلنے والا وہ چھوٹا سا دروازہ معدوم ہو گیا تھا جس سے گزر کر ہم اس چھوٹے سے گودام میں آئے تھے، اسی طرح زینے کے اختتام پر بھی کوئی دروازہ یا کھڑکی ضرور موجود ہوگی، ورنہ یہاں زینے کی موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔

دھمن نے زینے کے پاس پہنچ کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میرے آگے آگے زینے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھنے لگا۔ دھمن آخری سیڑھی پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سامنے کی دیوار کو ہلکا سا دھکا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بھڑے ہوئے دروازے کو دھکا دے کر کھولا جاتا ہے۔ اس کے دھکا دیتے ہی دیوار کا کوئی تین فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا حصہ کسی دروازے ہی کی طرح کھل گیا۔ دھمن کے پیچھے پیچھے میں اور عالیہ بھی اس کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئے تھے۔ ہمارے دوسری طرف پہنچتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا اور اب ہم لوگ دھمن کے کلینک میں کھڑے تھے۔ جس کمرے میں ہم تینوں کھڑے تھے، وہ دھمن کا مخصوص کمرہ تھا۔ وہ جب کلینک آتا تھا تو اسی کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ یہاں دیواروں میں تین طرف بڑی بڑی الماریاں نصب تھیں جن میں بے شمار چھوٹے بڑے جار، شیشیاں اور جراحی کے آلات رکھے نظر آ رہے تھے۔ جس راستے سے ہم اندر داخل ہوئے تھے، اس جگہ بھی دیوار میں ایسی ایک الماری موجود تھی جس نے تہ خانے کے اس راستے کو چھپا رکھا تھا۔ کمرے کے درمیان دھمن کی بڑی سی میز تھی جس کے سامنے اور دائیں بائیں آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔

دھمن نے میز کے پیچھے اپنی مخصوص ریوالونگ چیئر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو جیلانی! اب یہاں ہم اطمینان سے گفتگو کر سکیں گے۔"

میں اس کے دائیں جانب کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عالیہ، دھمن کی کرسی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔

دھمن نے اس سے کہا۔ "تم چاہو تو گھر واپس جا سکتی ہو۔ میرا ل ہے، تمھارا کوئی کام تو نہیں رہا ہے یہاں اب۔"

"ہاں، تم لوگ باتیں کرو، میں جا رہی ہوں۔ ضرورت پڑے تو کبھے فون کر دینا۔ میں گھر پر ہی ہوں گی۔" عالیہ نے فوراً کہا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "میں استقبالیہ والوں سے کہہ جاتی ہوں اگر کوئی تم سے ملنے آئے تو کہہ دیں، تم یہاں نہیں ہو۔"

"ہاں، یہ ضرور کہتی جانا ان سے اور کسی سے دو کپ کافی کے ہے بھی کہہ دینا۔" وہ اپنی کرسی پر جھولتے ہوئے بولا۔

اس کے جانے کے بعد دھمن مجھ سے بولا۔ "تمھیں پولیس والوں نے زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟"

"اونہیں، یار! یہاں کے پولیس والے تو بڑے شریف ہوتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں اس دنیا میں ایسی پولیس بھی موجود ہے جو نہ مار پیٹ کرتی ہے نہ گالیاں دیتی ہے۔ یہ اگر ہمارے ملک میں پہنچ جائیں تو لوگ ان کے مرید ہونے کے لیے آنے لگیں۔"

"دو یہاں کی پولیس دراصل قانون کی محافظ ہے۔ نہ خود قانون شکنی کرتی ہے نہ دوسروں کو کرنے دیتی ہے۔ معاشرے کی درستی اور قانون کی بالادستی کے لیے پولیس کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے، اگر پولیس راشی اور مجرموں کی پشت پناہ ہو جائے تو اس معاشرے کا تو بس اللہ ہی حافظ ہے۔ برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں مگر اتنے کہیں نہیں ملیں گے جتنے ہمارے ہاں پولیس کے محکمے میں پلے جاتے ہیں۔"

"اوئے، ہماری پولیس کا تو ذکر ہی نہ کر دیار! وہاں تو شریف آدمی پولیس کا نام سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگتا ہے۔ لوگ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتے ہیں مگر پولیس کے پاس جانا پسند نہیں کرتے۔ جنھیں اپنی عزت پیاری ہوتی ہے وہ پولیس کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر چھوڑو اس قصے کو۔ دو دن پہلے یہاں پولیس نے بڑی گرفتاریاں کی ہیں۔ کچھ بڑے لوگ بھی جو بظاہر بڑے معزز تھے، بے نقاب ہو کر پولیس کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ تم نے... پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ چنانچہ میں اور عالیہ بھی محتاط ہو گئے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ پولیس کسی وقت بھی میرے کلینک پر دھاوا بول دے گی مگر جب ایسا نہیں ہوا تو... تمھاری طرف سے ہماری بدگمانی دور ہو گئی۔ پھر مارٹن نے بھی ہمیں بتایا کہ پولیس کو ملنے والی اطلاعات کا ذریعہ تم نہیں ہو۔ تم نے ان کے افسران کے سامنے اس بات سے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس نے تمھیں تھانے کی حوالات سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ پولیس کی اطلاعات کا ذریعہ کیا تھا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا لیکن تمھاری پوزیشن بہرحال صاف ہو گئی اور اس طرح تم پر ہمارا اعتماد بھی پختہ ہو گیا۔ مجھے تو پہلے ہی یقین نہیں تھا۔

میں تمھیں اتنے کمزور اعصاب کا آدمی نہیں سمجھتا کہ تم پولیس کے تشدد یا اس کے نفسیاتی حربوں کا مقابلہ نہ کر سکو۔ میں ایک عرصے سے تمھیں جانتا ہوں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی کمزوری دیکھتا تو کبھی تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ نہ بڑھاتا۔ مجھے خوشی ہے، تم نے مجھے اپنوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔"

میں بھی دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ میرے عزائم کی انھیں ہوا بھی نہیں لگ سکی تھی۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے اس سرکش گھوڑے غلام جیلانی کو لگام لگا کر اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی بدگمانی کو اپنے دل میں جڑ نہ پکڑنے دیں۔ میں نے کہا۔ "ان بیچاروں کی تو بات ہی کیا ہے۔ اگر میرے ملک کی پولیس ہوتی تو وہ بھی میری مرضی کے خلاف مجھے کچھ بولنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔"

"ہاں، ہاں، مجھے یہی امید تھی تم سے۔ اسی لیے تمھاری قدر کرتا ہوں اور چونکہ میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ آج ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا تمھاری خاطر اور تمھیں پولیس کے ہاتھوں سے چھین لایا لیکن وہ تم نے کیا کہا تھا عالیہ سے کہ پولیس تمھیں پاکستان واپس بھیج رہی تھی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، میں انھیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں ایک شریف اور بے ضرر آدمی ہوں۔ میرا کسی غیر اخلاقی یا غیر قانونی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں، وہ محض اتفاق ہیں۔ حالانکہ بعض باتیں میری ان کی سمجھ میں نہ آسکی تھیں، اس کے باوجود وہ میرے ساتھ رعایت برت رہے تھے۔ میں نے ان کا طیارہ اغوا ہونے سے بچا لیا تھا جس کی وجہ سے وہ مجھے واپس بھیج کر میرے احسان کا کچھ عوض دینا چاہتے تھے۔ اگر تم درمیان میں نہ آ جاتے تو کل تک میری روانگی متوقع تھی۔"

"مجھے یہ نہیں معلوم تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ تمھاری زبان کھلوانے کے لیے تم پر اپنے حربے آزما رہے ہیں۔ آج مجھے جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ تم ایک پولیس افسر کے ساتھ آلیور کے گھر سے نکلے ہو، میں نے راستے ہی سے تمھیں اغوا کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ میرے آدمی اس کار پر نظر رکھے ہوئے تھے جس میں تم باہر گئے تھے۔ مجھے اطلاع ملی کہ وہ تمھیں ایک اور پولیس افسر کے گھر لے گیا ہے تو میں نے اپنے آدمیوں کو کسی نسبتاً ویران جگہ پر اپنی کارروائی کرنے کا حکم دے دیا۔ نتیجہ تم خود دیکھ رہے ہو۔" دھمن نے فخریہ انداز میں کہا۔

"نتیجہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ تمھارے آدمیوں نے ہمیں پولیس افسر گریگری کے مکان کے قریب ہی روک لیا تھا۔ اگر وہ اپنے مکان کے باہر ہوتا یا اس نے کسی کو ہماری نگرانی پر مقرر کیا ہوتا تو بازی پلٹ بھی سکتی تھی۔" میں بولا۔

”وہ بعد کی بات تھی۔ ایسے معاملات میں خطرات تو مول لینا ہی پڑتے ہیں۔ ہمارا تو کام ہی خطرات سے کھیلنا ہے۔ اگر وہ لوگ تمھیں اپنے طور پر پاکستان بھیج دیتے تو ہمیں اپنے کام کے لیے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا پڑتا۔“ دھمن نے کہا۔

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرنے سے کسی قسم کی معذوری تو ظاہر نہیں کی ہے میں نے۔ میں کسی ذریعے سے بھی واپس جاتا، وہ کام تو مجھے کرنا ہی تھا نا؟“

”تم غلط سمجھے ہو۔“ وہ بولا۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”اور پھر کیا مطلب تھا تمھارا؟“ میں نے سوال کیا۔

”مسئلہ پاکستان جاکر وہاں سے کچھ لانے کا ہی نہیں ہے، ہمیں یہاں سے کچھ بھیجنا بھی ہے وہاں۔ جو ظاہر ہے تمھارے ساتھ ہی بھیجا جائے گا۔ اب اگر تم کسی اور ذریعے سے چلے جاتے تو ہمیں اس کام کے لیے کسی اور کو بھیجنا پڑتا۔ یہی کہنا چاہ رہا تھا میں۔“ دھمن نے کہا۔

”اوہ، یہ بات ہے۔ یہاں سے کیا لے جانا ہوگا مجھے؟“ میں نے پوچھا۔

”جو کچھ تم وہاں سے لے کر آئے تھے اس کی قیمت۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔ میں لے جاؤں گا مگر کس کو دینا ہوگا وہ ڈرافٹ مجھے؟“ میں نے کہا

”ڈرافٹ! کون سا ڈرافٹ؟“ وہ حیران ہو کے بولا۔

”تم جو رقم میرے ذریعے بھیجنا چاہتے ہو کیا وہ ڈرافٹ کی شکل میں نہیں ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی حد کر دی یار تم نے بھی جیلانی! ارے ایسے معاملات میں چیک یا ڈرافٹ قسم کی چیزیں چلتی ہیں کہیں۔ یہ سودے اس طرح نہیں ہوا کرتے۔ تمھیں یہاں سے قیمتی ہیرے لے جانے ہوں گے۔“ وہ بولا۔

”ہیرے!“ میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ میں کیسے لے جاؤں گا۔ اس قسم کے کاموں کا مجھے تجربہ تو ہے نہیں۔“

”وہ بھی ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کام کرنے ہی سے تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کرو گے نہیں، ناتجربہ کار ہی رہو گے۔ بس ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے۔ تم دیکھو گے یہ کچھ مشکل کام نہیں ہے۔“

”مگر وہ...“ میں نے کہنا چاہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ بولا۔ ”اگر مگر چھوڑو یار! مجھے حیرت ہے، تم جیسا باحوصلہ آدمی ہمت ہارے دے رہا ہے۔ او بھئی! جب ہم موجود ہیں تو تمھیں فکر کس بات کی ہے۔ ہم کوئی یونہی آنکھیں بند کر کے تو تمھیں کنویں میں نہیں دھکیل دیں گے۔ ایسے انتظ... سے بھیجیں گے کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکے گا۔“

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ دھمن نے اونچی آواز میں کہا۔ ”آجاؤ۔“

دروازہ کھلا اور نرسوں کے سفید بے داغ یونیفارم میں ملبوس ایک شعلہ جوالا، ٹرے میں دو مگ رکھے ایک ہاتھ سے ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے تو پلک جھپکانا بھول گیا۔ کیسی کیسی حور پریاں جمع کر رکھی تھیں اس دھمن بے دین نے اپنے اردگرد۔ ایک وہ شعلہ بداماں سلور تھی جسے پہلے روز میں نے دھمن کے مکان پر دیکھا تھا۔ جس سے اس نے مجھے گانا بھی سنوایا تھا اور وہ لوگ جب مجھے اسمگل کر کے یہاں لائے تھے تب بھی میں اس کلینک میں رہا تھا گویا یہاں حسن و جمال کی فراوانی اس وقت بھی دیکھی تھی میں نے مگر ایسی سنگِ مرمر کی تراشیدہ مورت پہلی بار ہی دیکھ رہا تھا میں یہاں۔ شاید دھمن نے چُن چُن کر نادر نمونے اپنی خدمت کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ غالباً اسی لیے وہ عالیہ بیگم اس سے کچھ اکھڑی اکھڑی رہتی تھی آج کل۔ مجھ پر اس کی نظرِ التفات کی وجہ بھی شاید یہی تھی ورنہ وہ ابلہ کہاں کام آنے والی تھی میرے۔ اس نے میرے قریب آکر کافی کا مگ میرے سامنے رکھا تو میری نظریں اس کے حسین چہرے سے اُلجھ کر رہ گئیں۔ دھمن نے میری وارفتگی دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب واپس بھی آجا میرے یارا کہاں گم ہو گیا ہے تو؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور اردو میں بولا۔ ”گم کہاں ہو سکتا ہوں یار! میں تو تیرے ذوقِ جمال کی داد دے رہا تھا... کیا حال ہوتا ہوگا تیری اس عالیہ بیگم کا ان گل رُخوں کو تیرے گرد دیکھ کر؟“

”تو بہت غلط انداز میں سوچ رہا ہے جیلانی! ان کا اور عالیہ کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ تو نہیں جانتا عالیہ کا کیا مقام ہے میرے دل میں۔ یہ تو میری ضرورت ہیں، صرف ضرورت۔ انھیں میں نے آنے جانے والوں کو متاثر کرنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے اپنے پاس اور کوئی کام نہیں ہے ان کا یہاں جب کہ عالیہ میری زندگی ہے، میری روح ہے وہ۔ ذرا غور تو کر، زندگی اور ضرورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت تو حالات کے مطابق نظرانداز بھی کی جا سکتی ہے مگر زندگی سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں رہا جا سکتا۔ ایسی بے رحمی کی باتیں نہ کیا کر مجھ سے۔“ وہ اداس ہو گیا تھا۔

نرس ہماری باتیں نہ سمجھ سکی تھی۔ وہ کافی رکھ کر چلی گئی تھی۔ میں حیران حیران دھمن کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا سنگ دل ...ان بھی کسی کے لیے اپنے سینے میں کوئی نرم گوشہ رکھتا ہوگا۔ اس ...پتھر دل پر بھی کسی کی محبت نقش ہوگی۔ وہ عالیہ کے سلسلے میں بے حد ...س تھا اور میں نے عالیہ کو بھی اس کے لیے ایسا ہی بے چین ...پاتا تھا۔ میں نے اب سے پہلے اسے جب بھی دیکھا تھا، ...سے پیر تک دھمن ہی کے رنگ میں رنگا پایا تھا مگر اس بار وہ خاصی ...بدلی نظر آتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ جس وارفتگی کا اظہار ...تھا اس میں دھمن کا وجود کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی اب تک سمجھ نہیں سکا تھا میں۔ ابتدا میں تو یہی سمجھتا رہا ...کہ یہ دونوں زن و شوہر مجھے اپنے دام میں لانے کے لیے اپنے ...تمام ہنر، سارے کے سارے حربے آزما رہے ہیں مجھ پر۔ مگر ...نے اپنی زندگی کے سارے رموز مجھ پر آشکارا کر دیے اور ...ی حفاظت کے لیے وہ عجیب طلسمی انگوٹھی مجھے دے دی تو میرے ...اس کی محبت پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا مگر اب ...دھمن کی باتیں سن کر میں پھر الجھن میں مبتلا ہونے لگا تھا۔

مجھے سوچتے دیکھ کر دھمن نے کہا۔ ”او، یار! ہم بھی کیا باتیں لے بیٹھے۔ کافی پیو، پھر میں تمھیں سارا پروگرام سمجھائے دیتا ہوں... تفصیل سن کر تم بھی تسلیم کر لو گے کہ ہیروں کی اسمگلنگ اتنا مشکل کام نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ہیروئن کی قیمت ہم ہیروں کی شکل میں اسی لیے ادا کرتے ہیں۔“

”جو لوگ یہ اسمگل شدہ ہیرے وصول کرتے ہیں، کیا انھیں اس کی پوری قیمت مل جاتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً۔ اگر یہ نقصان کا سودا ہوتا تو وہ لوگ کوئی اور طریقہ اختیار کرتے۔ ہم انھیں ان کی مطلوبہ چیز پہنچا دیتے ہیں۔ وہ ان کا ...کیا کرتے ہیں، کس طرح ان کے ذریعے رقم حاصل کرتے ہیں، یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔ تم بھی ان فضول باتوں میں سر کھپانے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔“ دھمن نے مجھے سمجھایا۔

”یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ ہیروں کا کیا کرتے ہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی یہ بات پوچھ لی تھی۔ مجھے یہ ہیرے کس کو پہنچانے ہوں گے؟“

”اس سلسلے میں بھی تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کراچی پہنچو گے تو وہ خود تم سے رابطہ قائم کر لیں گے۔“ دھمن بولا۔ ”بلکہ ایئرپورٹ سے وہی تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کراچی میں تم ان کے مہمان ہو گے۔“

میں کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوچنے لگا۔ یار جیلانی! یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہوئی۔ سارا معاملہ ہی اُلٹا ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر میں اس طرح یہاں سے چلا گیا تو گریگری کو کیسے پتا چلے گا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ مجھے اسی شہر میں تلاش کرتا رہ جائے گا۔ اس سے رابطے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میں اسے کیسے اطلاع دوں گا اپنے وطن پہنچنے کی۔ اگر کراچی پہنچ کر میں اسے خط لکھوں تو مجھے اس کے مکان کا پتا معلوم نہیں ہے اور اگر پولیس اسٹیشن کے پتے پر خط بھیجا جائے تو ممکن ہے وہاں بھی کوئی ہارٹن موجود ہو اور خط کھول کر دیکھ لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہماری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ ویسے تو سُنا ہے کہ امریکی سی آئی اے دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے پاس ذرائع اور وسائل بھی لامحدود ہیں لیکن انھیں کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوگی تو وہ کریں گے کیا۔ مجھے روانگی سے پہلے کسی نہ کسی طرح گریگری کو اطلاع ضرور دے دینا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کہیں میری طرف سے بدگمان نہ ہو جائے۔ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اس کے ساتھ تعاون کا میرا وعدہ محض فریب تھا۔ یہاں سے نکلنے کے لیے میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اگر یہ بدگمانی اس کے دل میں بیٹھ گئی تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ میرا دشمن بن جائے گا تو میں ان اسرائیل زادوں کے مقابلے میں تنہا رہ جاؤں گا اور میں اکیلا دو اتنے بڑے بڑے محاذوں پر کس طرح لڑ سکوں گا، میرا تو جھٹکا کر کے رکھ دیں گے یہ لوگ۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک میں بڑا مطمئن تھا۔ ہر کام مجھے بے حد آسان معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی خدشہ ہی نہیں رہا تھا میرے دل میں کہ اچانک اس ذلیل دھمن نے درمیان میں آکر مجھے اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟

میں نے کافی کا مگ خالی کر کے رکھتے ہوئے دھمن کی طرف دیکھا۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بولا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی فکرمند نظر آ رہے ہو مجھے جیلانی! آخر ایسی کیا بات ہے؟ تم یقین کرو، ہم کسی مصیبت میں پھنسنے نہیں دیں گے تمھیں۔“

میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ”نہیں یار! مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بس ذرا اماں جی کا خیال آگیا تھا۔ وہ میرے یوں اچانک غائب ہو جانے سے بڑی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ حالانکہ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب تو یہ میرا معمول سا بن گیا ہے۔ کبھی اچانک اس کے سامنے پہنچ کر اسے حیران کر دیتا ہوں اور کبھی ایک دم یوں غائب ہو جاتا ہوں جیسے کبھی کوئی سپنا رہا ہوں اس کے لیے۔ وہ عادی ہو چکی ہے اس کی، مگر پھر بھی آخر ماں ہے۔ ہر دم یہ آس لگائے رہتی ہے کہ بس اب میرا پُتر آنے ہی والا ہے۔ مجھے اس کی بڑی فکر رہتی ہے۔ ڈرتا رہتا ہوں میں دل ہی دل میں کہ کہیں وہ میری راہ دیکھتے دیکھتے مٹی نہ ہو جائے۔ بے چاری کتنی بدنصیب

ماں ہے۔ اولاد کا سکھ دیکھنا اسے نصیب ہی نہ ہو سکا کبھی۔۔۔ ہم دونوں بہن بھائی کی سیاہ بختی خون رُلاتی رہتی ہے اسے ہر دم۔"

"اب تو تم اس کے پاس ہی جا رہے ہو، پھر اس کے لیے رنجیدہ کیوں ہوتے ہو؟" وہ بولا۔

"ہاں، میں اس کے پاس جا رہا ہوں، اسی لیے تو وہ مجھے اور زیادہ یاد آ رہی ہے۔ آدمی جب اپنے کسی پیارے کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ بس یہی جی کرتا ہے کہ اُڑ کے اس کے سامنے جا پہنچے۔"

"تو خوش قسمت ہے یار جیلانی! تیری ماں بھی موجود ہے اور بہن بھی، جن کے سینوں میں تیرے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ بڑا دولت مند ہے تو۔ ایسی دولت کا مالک ہے تو جسے نہ کوئی چرا سکتا ہے اور نہ ہی چھین سکتا ہے تجھ سے۔ رشک آنے لگا ہے مجھے تجھ پر۔ بس، ایک دن اور صبر کر لے، ذرا سنبھالے رکھ اپنے دل کو۔ دو تین دن کے بعد تو اپنی ماں جی کے پاس بیٹھا اپنی اچانک گمشدگی پر بہانے تراش رہا ہو گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "تم نے میرے جانے کے لیے کیا پروگرام بنایا ہے؟ کس طرح روانہ کرو گے مجھے یہاں سے تم؟"

وہ بولا "بہترین منصوبہ بنایا ہے ہم نے۔ گزشتہ ہفتے، یعنی آج سے تین دن قبل ہمارے کلینک میں ایک ایکسیڈنٹ کا کیس آیا تھا۔ وہ ایک تمھاری ہی عمر کا پاکستانی تھا۔ کراچی کے ایک صنعتکار کا بیٹا تھا۔ اس کا سر شدید زخمی تھا اور دونوں ٹانگیں بری طرح کچلی گئی تھیں۔ اس کے بچنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی مجھے۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں تمھاری واپسی کا بہترین منصوبہ اُبھرنے لگا۔ چنانچہ میں نے وہ تمام چیزیں جو اس کی جیبوں اور سفری بیگ سے برآمد ہوئی تھیں اور اس کی شناخت میں مدد دے سکتی تھیں، اپنے قبضے میں کر لیں۔ وہ یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آیا تھا۔ نیو یارک کے لنکن ہوٹل میں اس کا قیام تھا جہاں سے اپنے دو امریکی دوستوں کے ہمراہ اسی روز یہاں پہنچا تھا اور سڑک عبور کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یہاں لانے والے غالباً وہی دونوں امریکی تھے جو اسے نیو یارک سے لے کر آئے تھے مگر وہ اسے یہاں پہنچا کر ایسے غائب ہوئے کہ دوبارہ ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں نے اس کے تمام کاغذات اور پاسپورٹ وغیرہ اپنے پاس محفوظ کر لیے۔ وہ شخص اسی روز مر گیا تھا۔ ہم نے پولیس کو اس کے زخمی حالت میں لائے جانے کی اطلاع دے دی تھی لیکن پولیس اس سے کچھ معلوم نہ کر سکی تھی کیونکہ انھیں اس کی لاش ہی مل سکی تھی۔ پولیس نے اپنے طور پر اس کے بارے میں تفتیش کی تھی۔ اس نے ان دونوں امریکیوں کو بھی بہت تلاش کیا جو اسے ہمارے کلینک پہنچا کر غائب ہو گئے تھے مگر وہ نہ ان دونوں کو پکڑ سکی اور نہ ہی متوفی کے بارے میں کچھ جان سکی۔ اسے کسی ایسے حادثے کے بارے میں بھی کچھ پتا نہ چل سکا جس میں ایک شخص اتنا شدید زخمی ہوا ہو۔ لہٰذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ دراصل ڈکیتی کی واردات ہے۔ انھوں نے اس کے پاس کوئی بڑی رقم دیکھ کر اسے لوٹنے کے لیے اس حال کو پہنچا دیا اور پھر شدید زخمی حالت میں یہاں ڈال کر روپوش ہو گئے۔ انھوں نے پاکستانی سفارت خانے سے بھی رابطہ قائم کیا مگر وہ بھی کسی قسم کی شناخت کے بغیر اس کے بارے میں کیا بتا سکتے تھے۔ چنانچہ پولیس نے اسے لاوارث قرار دے کر اس کی تدفین کر دی۔ اس کے تمام کاغذات میرے پاس موجود ہیں۔ اب تم ان کاغذات کے ساتھ اس کے نام سے پاکستان واپس جاؤ گے۔ ہمیں صرف پاسپورٹ میں اس کی تصویر کی جگہ تمھاری تصویر لگانا ہو گی اور یہ کام ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ البتہ تم پر ہمیں تھوڑی سی محنت ضرور کرنا ہو گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا "جب کاغذات مکمل ہیں تو مجھ پر کیا محنت کرو گے؟"

"ہم تمہیں ایک ایسے زخمی کی حیثیت سے جہاز میں سوار کرائیں گے جس کی دونوں ٹانگیں ایک حادثے میں ٹوٹ چکی ہیں۔ تمھاری دونوں ٹانگوں پر گھٹنوں سے اوپر تک پلاستر چڑھا ہو گا۔ ایک نرس دیکھ بھال کے لیے تمھارے ساتھ ہو گی۔ کراچی پہنچتے ہی وہ پلاستر کاٹ دیا جائے گا اور تم ہر جگہ جانے کے لیے آزاد ہو گے۔ یہ ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ کوئی تمھارے کاغذات پر توجہ نہ دے اور تم بخیر منزل پر پہنچ جاؤ ورنہ اگر کسی نے پاسپورٹ پر لگی تمھاری تصویر پر غور کیا تو ممکن ہے ہماری جعلسازی اس کی نگاہوں میں آ جائے۔۔ ایک معذور شخص پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دے گا۔"

"اور اس پلاستر میں ہی تم وہ ہیرے بھی چھپا دو گے جو مجھے لے کر جانا ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا منصوبہ ہے؟ کہیں کوئی جھول نظر آتا ہے تمھیں اس میں؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"تم مجھے اسی طرح پارسل بنا کر لائے بھی تھے یہاں۔ کیا اسی طرح واپس جانے پر کسی کو شک نہیں ہو گا مجھ پر؟"

"تمھارے ساتھ جو نرس ہو گی اس کے پاس پام روز اسپتال کے شناختی کاغذات ہوں گے اور تمھارے لیے ایک ایسا سرٹیفکیٹ بھی ہو گا جو تمھیں شدید زخمی اور کلینک کے زیرِ علاج ثابت کرے گا۔ پھر تمھاری ٹانگوں کی ایکسرے رپورٹ ہو گی جس میں دونوں پنڈلیوں کی ہڈیاں کچلی ہوئی نظر آئیں گی۔" وہ بولا "ایک چیریٹی اسپتال سے جانے والے مریض پر کون شک کرے گا بھلا؟"

"اور میرے ساتھ جانے والی نرس وہ میرلین ہی ہو گی جو یہاں لانے کی ذمے دار تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں دوست! اس بار جو نرس تمھارے ساتھ ہو گی اسے دیکھ کر ہی تمھارا دل باغ باغ ہو جائے گا۔"

"اچھا! کون ہے وہ؟ کیا وہی تو نہیں جو ابھی کچھ دیر پہلے چائے لے کر آئی تھی؟"

"وہ جو کوئی بھی ہے، میں ابھی تمھیں اس کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔" وہ شرارت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کسی سے کہا "ڈاکٹر ہارون کو بھیجو میرے پاس۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمھارے اس اسپتال میں تمام ڈاکٹرز ہیں۔"

"ہاں، اور یہ سب میرے ہی جیسے ڈاکٹر ہیں۔ اس لیے میرے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہیں۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک چیریٹی اسپتال کی آڑ میں جرائم کا جو اڈا قائم کر رکھا ہے اس کے بارے میں وہاں کی انتظامیہ نے کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ وہ امریکہ جیسے ملک کی ایک ریاست میں جعلی ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ ایک جعلی اسپتال کھولے بیٹھا تھا اور اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا وہاں، لیکن ڈاکٹر ہارون کی آمد نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

اس ڈاکٹر ہارون سے میں ایک بار پہلے بھی مل چکا تھا یہاں۔ اس نے آتے ہی دھمن کو سلام کرنے کے بعد مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا "آپ آ گئے جناب جیلانی صاحب! کیسے ہیں آپ؟ سنا ہے بڑی زیادتیاں کی ہیں یہاں کی پولیس نے آپ کے ساتھ؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی دھمن بول پڑا "نہیں بھئی! ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے ان کے ساتھ۔ ہمیں ملنے والی اطلاعات درست نہیں تھیں۔ یہ غلام جیلانی بڑے اچھے، بڑے جاں نثار دوست ثابت ہوئے ہیں۔ بڑا پردہ رکھا ہے انھوں نے ہمارا۔ اب ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ جی جان سے ہم ان کی مدد کریں۔ آپ انھیں لے کر چلیں۔ ان کی ٹانگوں پر ایک بار پھر پلاستر چڑھانا ہے ہمیں۔"

"جی بہتر۔ آیئے جیلانی صاحب! چلیں میرے ساتھ۔" وہ باہر جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔

دھمن نے مجھ سے کہا "تم ان کے ساتھ چلو جیلانی! میں بھی آ رہا ہوں۔"

"اچھا، ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر ہارون کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ڈاکٹر ہارون نے میرے ساتھ چلتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"میں نے سنا ہے یہ ڈاکٹر دھمن آپ کے ذریعے مزید مال منگوا رہا ہے اور یہاں سے بھی کچھ مال بھیج رہا ہے آپ کے ساتھ؟"

"ہاں یار! اب میں اس دلدل میں اُتر ہی گیا ہوں تو جو کچھ وہ کہے گا کرنا ہی پڑے گا نا مجھے۔"

"آپ مجبور تو نہیں ہیں اس کے لیے؟ سنا ہے وہاں پاکستان میں تو بڑا ڈنکا بجتا ہے آپ کے نام کا۔ وہاں آپ کو کون مجبور کر سکتا ہے ایسے کام کے لیے؟" اس نے کہا۔

"ارے نہیں یار! اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے بڑی بے پر کی اُڑا رکھی ہے میرے بارے میں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو آج میں یہاں ذلیل و خوار نہ ہو رہا ہوتا۔ کیا تمھیں پتا نہیں ہے کہ کس طرح کیریئر بنا کے لایا گیا ہوں میں کولمبس کی اس دریافت میں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، وہ تو میں جانتا ہوں جناب! مگر خود ڈاکٹر دھمن نے مجھے بتایا ہے کہ انھیں بڑا کھڑاگ کرنا پڑا تھا آپ کو قابو کرنے کے لیے۔ وہ تو بس ان کی قسمت اچھی تھی جو آپ دھوکا کھا گئے۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا ہے مگر یار جی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میری قسمت پھر کبھی میرا ساتھ چھوڑ جائے۔ عیار دشمن سے تو آدمی کو بچنا ہی چاہیے ڈاکٹر صاحب! اگر وقت نے اسے دوست بنا دیا ہے تو پھر اسے دوبارہ دشمنی پر آمادہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ نہیں یار! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

میں حیران تھا کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ وہ دھمن کے در کا نگہبان کتا اس سے بے وفائی پر کیوں کمربستہ ہے۔ اس کی باتیں میری رگوں میں سنسناتی پھر رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دھمن کے اشارے پر ایسی باتیں کر کے میرا اندروں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ یہودیوں کا زرخرید کتا دھمن میری طرف سے مطمئن نہیں تھا اور میرے گرد ہمدردی کا جال بن کر ان کے ذریعے میرے اندر اُتر کر مجھے ٹٹول کھنگال ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر میں اسے جانتا نہ ہوتا تو شاید اس کے فریب میں آ جاتا۔ میں نے دوستی اور دشمنی کے ایسے ایسے رنگ دیکھ رکھے تھے کہ دشمن کی طرف سے آنے والی ہواؤں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ پھر میں اس ڈاکٹر فراڈ کی باتوں میں کیسے آ جاتا۔

وہ کہہ رہا تھا "کہاں ہے صاحب! میں نے تو اب تک آپ کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس کے بالکل برعکس پا رہا ہوں میں آپ کو۔ یقین نہیں آتا کہ آپ وہی غلام جیلانی ہیں جس کے خوف سے ڈاکٹر دھمن نے لاہور چھوڑ دیا تھا۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا "اوئے تو میرے کان کیوں کھائے جا رہا ہے بھئی؟ تیرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے میری حیثیت میں کیا فرق

آجائے گا اور تُو میرا اتنا ہمدرد کیوں بن گیا ہے؟ کہاں سے بھر گئی ہے تیرے دل میں میرے لیے اتنی چاہت، ایسی ہمدردی؟"

وہ ایک دم گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بوکھلا کے بولا۔ "اوہ جناب! اتنی زور سے تو نہ بولیں۔ کسی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ کیوں میری جان لینا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے محسوس کیا، اس کی گھبراہٹ میں تصنع بالکل نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر جو زردی کھنڈ گئی تھی اس میں کھوٹ ذرا بھی نہیں تھا۔ مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں نے مسکرا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے افسوس ہے دوست، میں نے تمھارے خلوص پر شک کیا۔ یقین کرو، مجھے تمھاری نیت کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔"

میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھے ایک راہداری کے موڑ پر جیسے ہی گھوما، میری نظر سامنے سے آتے ہوئے سیزر پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بُری طرح چونکا اور ٹھیک کرو ہیں ساکت کھڑا ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر ہارون سے کہا۔ "سُنا ہے یہ کالیا مجھے بڑی گالیاں دیتا رہتا ہے۔ اس نے میری گردن توڑنے کی قسم بھی کھا رکھی ہے؟ حالانکہ جب میں پولیس اسٹیشن سے فرار ہوا تھا تو اس نے آلیور کے ساتھ میری مدد کی تھی۔"

"آپ نے بھی تو بڑی زیادتی کی تھی اس کے ساتھ، بیچارہ گھنٹوں گردن سیدھی نہ کر سکا تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر دھمن کے حکم پر آپ کی مدد کو دوڑ گیا تھا۔ پھر کسی نے اسے یہ باور کرا دیا کہ آلیور کی گرفتاری آپ کے اشارے پر ہوئی تھی۔ تب ہی سے دشمن ہو رہا ہے آپ کا۔"

اس اثنا میں ہم سیزر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔ "ہیلو کالیے! کیا حال ہے تیری گردن کا؟ یہ ڈاکٹر صاحب بتا رہے ہیں، بڑی تکلیف ہو گئی تھی تجھے؟"

وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "کتّے کے بچّے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ دانت پیستے ہوئے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ دیوار سے لگ کے مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دیوار کے ساتھ دباتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرے منہ پر پوری قوت سے مکّا مارنے کی کوشش کی لیکن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔ سیزر کا مکّا دیوار پر لگا تھا۔ اس کے منہ سے کراہ خارج ہو گئی۔ وہ تکلیف سے منہ بنا کے پیچھے ہٹا اور اپنے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تیور اس کے یہی بتا رہے تھے کہ دوبارہ پھر وہ مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "سیزر ہوش میں رہو، غصّہ آدمی کو ذلیل کرا دیتا ہے... لڑائی جھگڑے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمھیں۔"

"ہوش تو میں ابھی ٹھکانے لگا دوں گا تیرے۔ تُو نے سمجھا کیا ہے مجھے۔" وہ پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر ہارون جو اس صورتِ حال پر بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا، سنبھل کر سیزر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "سیزر! پاگل ہو گئے ہو تم۔ یہ مہمان ہیں ڈاکٹر صاحب اور میڈم کے۔ انھیں اگر کوئی نقصان پہنچا تو تمھیں پچھتانے کا بھی موقع نہ مل سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب زندہ نہیں چھوڑیں گے تمھیں؟"

سیزر نے بے یقینی کے انداز میں ڈاکٹر ہارون کو دیکھا۔ پھر بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر! یہ تو یہاں ان کا قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ پھر اب یہ اچانک مہمان کیسے ہو گیا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ تمھیں اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب اپنے آفس میں موجود ہیں۔ ان سے پوچھ لو جا کے۔ وہ تمھیں یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ اچانک مہمان کیسے ہو گئے۔" ڈاکٹر ہارون نے کہا۔

"اوہ، ڈاکٹر!" وہ مٹھیاں بھینچ کر قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں... میں معلوم کرتا ہوں ڈاکٹر سے۔" وہ تیزی سے مُڑ کر دھمن کے آفس کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم یہ مت سمجھ لینا کہ میں نے تمھاری جان چھوڑ دی ہے۔ سیزر کو کبھی کوئی چوٹ نہیں دے سکا ہے۔ تم فریبی، مکّار، تم نے دھوکے سے مجھے بے ہوش نہ کر دیا ہوتا تو تم بھی اپنے پیروں سے چلنے کے قابل نہ ہوتے آج۔ میں چھوڑوں گا تمھیں اب بھی نہیں۔"

وہ غصّے سے پیچ و تاب کھاتا، چیخ چیخ کر مجھے بُرا بھلا کہتا دھمن کے آفس کی طرف چلا گیا۔

ہارون نے میرا بازو تھام کر کہا۔ "آئیں چلیں جناب! آپ نے کس مصیبت کو چھیڑ لیا ہے اپنے ساتھ۔ بالکل جنگلی ہو جاتا ہے غصّے میں یہ اور معاف کرنا تو کسی کو جانتا ہی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بے کار درمیان میں آکر اسے روکا۔ مجھے ان جنگلیوں کو سیدھا کرنا آتا ہے ڈاکٹر! آج اگر میں اس کے دماغ کی گرد جھاڑ دیتا تو آئندہ یہ کبھی اس طرح بے قابو نہ ہوتا۔"

"اجی چھوڑیں جناب! مٹّی ڈالیں اس کمینے پر۔ آپ نے کونسا یہاں رہنا ہے جو بار بار اس سے واسطہ پڑتا رہے گا آپ کا۔ ایک آدھ دن کے لیے کیوں جنجال لیتے ہیں اپنے سر۔" ڈاکٹر ہارون نے مجھے سمجھایا۔

"کہتے تو ٹھیک ہو تم یار!" میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے اسی راہداری کے دونوں طرف بنے ہوئے کمروں میں سے بائیں جانب کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک بیڈ نما لمبی سی میز پڑی تھی۔ ایسے بیڈ عموماً ڈاکٹروں کے ہاں ہوتے ہیں۔ ان پر مریضوں کو لٹا کر وہ ان کا معائنہ کیا کرتے ہیں۔ دیواروں میں شیشے کی الماریاں تھیں۔ جن میں جراحی کے آلات اور دواؤں کی بوتلیں چُنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ہارون نے بیڈ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آپ وہاں لیٹیں جناب! میں کچھ ضروری انتظامات کر لوں۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر صاحب بھی آجائیں گے۔"

میں جا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ آدمی حالات کی غلامی سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ وقت کے سامنے قدم جمائے رکھنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وقت کا سیلاب انسان کو بہانے لیے پھرتا ہے۔ اس کی ساری چُستی، چالاکی اور شہ زوری اسی وقت تک اس کا ساتھ دیتی ہے جب تک ہوائیں اس کے موافق چل رہی ہوں۔ ہوا کا رُخ بدلتا ہے تو بڑے سورما، جنگجو اور فاتح لمحوں میں زمین پر آرہتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ابھی چند روز پہلے وہ میرے ہوش و حواس چھین کر مجھے لپیٹ کے یہاں لے آئے تھے تو میں کیسا چراغ پا ہوا تھا۔ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو میں اس پورے اسپتال کو بم سے اُڑا دیتا یا آگ لگا کے اسے نیست و نابود کر ڈالتا اور آج میں خود چل کر اس میز پہ آبیٹھا تھا۔ میں نے انھیں اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں میرا پارسل تیار کر دیں اور مجھے وطن... واپس بھیج دیں، جہاں میری بدنصیب بہن آسیہ اپنے کرموں کو بھوگ رہی تھی۔ میرا جگری یار آپی بینائی جیسی نعمت سے محروم ہو کر کسی اندھیری کوٹھری میں پڑا سسک رہا تھا اور میری ماں جی اپنے ربّ کے حضور سربسجود میری واپسی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ آج مجھے ان لوگوں کی یاد بہت آرہی تھی۔ جی چاہتا تھا اُڑ کے ان کے پاس جا پہنچوں لیکن میرے چاہنے سے وقت کی رفتار نہیں بدل سکتی تھی۔ ہمارے درمیان حائل فاصلے سمٹ نہیں سکتے تھے۔

ابھی میں سنبھل کر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ دھمن بھی وہاں آگیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ "وہ یار جی! اسے سیزر کو کیا کر دیا ہے تم نے، بڑا الف ہو رہا تھا وہ۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا ہے میں نے اسے۔"

"میں کیا کرتا اس کے ساتھ۔ وہی کالی رات کی پیدائش اُلجھ پڑا تھا مجھے دیکھ کر۔ اس کے پچھلے زخم ہی نہیں بھرے ہیں۔ وہی رہ رہ کر سینہ پھونکے ڈال رہے ہیں اس کا۔ صورت کی طرح مجھے تو اس کا دل بھی سیاہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں، تم نے ٹھیک کہا۔ ہے تو وہ ایسا ہی کینہ پرور۔ بُغض بھرے پھر رہا ہے تمھاری طرف سے اپنے دل میں۔" دھمن نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ڈاکٹر ہارون بیچ میں آگئے ورنہ دال تو میں اس کا آئینے کی طرح شفاف کر دیتا آج۔" میں نے کہا۔

"چلو، اچھا ہی ہوا، بات آگے نہیں بڑھی۔ وہ آدمی ویسے بڑے کام کا ہے۔ وفا تو اس کی رگ رگ میں بھری ہوئی ہے۔ بالکل کتّے کی سی خصلت ہے اس کی۔ ذرا سا چُمکار دو تو پیروں میں لوٹنے لگتا ہے۔ ایسے جانور کو تو بس پیار کی چھڑی سے ہی ہانکنا چاہیے۔ بہرحال تم مطمئن رہو، اب وہ اِدھر نہیں آئے گا۔"

پھر انھوں نے مجھے میز پر لٹا دیا۔ پتلون کے پائینچے میری انھوں نے گھٹنوں سے اتنے اوپر تک کاٹ دیے کہ وہ پتلون کے بجائے نیکر بن کر رہ گئی۔ وہ میرے دونوں پیروں پر اپنی مہارت میں مصروف تھے اور میں اپنے ماضی، حال میں اُلجھا ہوا تھا۔ اچانک مجھے لزی کا خیال آگیا۔ اس بنتِ خنزیر کو ساتھ لے جانا تو میرے پروگرام میں شامل تھا۔ یہ لوگ مجھے جس طرح بھیج رہے تھے اس میں لزی کا تو کوئی کردار ہی نہیں تھا۔ اگر میں اسے ساتھ لیے بغیر چلا گیا تو اندھیرے میں ٹکریں مارنے کے سوا میں کوئی خاص کام تو نہیں کر سکوں گا۔ میں نے سوچا، اس کا میرے ساتھ ہونا بے حد ضروری تھا۔ وہی تو تھی جو مجھے اپنے وطن کی کالی بھیڑوں سے روشناس کراتی۔ میں نے دھمن سے کہا۔ "ارے یار دھمن! تم نے تو اچانک مجھ پر دھاوا بول کے میرے ہوش ہی گم کر دیے۔ مجھے تو یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میرے ساتھ ایک اور ہستی کو بھی پاکستان جانا ہے۔"

"اچھا۔ تم نے کسی کو اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیا ہے کیا؟"

"ہاں یار! ایسا ہی سمجھ لو۔ اب اگر میں اکیلا چلا گیا تو بڑا بے اعتبار ہو جاؤں گا۔ بڑی بھول ہو گئی ہے مجھ سے۔ وطن پہنچنے کی خوشی میں اسے بھول ہی بیٹھا تھا میں۔ میرے بھائی! کچھ کرو اس کے لیے۔" میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"مگر وہ ہے کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم، کچھ بتاؤ تو؟" دھمن نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"وہ یار! تم نہیں جانتے اسے؟ وہ آرتھر فنیلی کی نورِ نظر الزبتھ فنیلی کی بات کر رہا ہوں میں۔"

"اچھا اچھا، سمجھ گیا میں۔ اپنے ہی بنے ہیں وہ بھی۔ مجھے یاد آیا، وہ آرتھر بتا رہا تھا، تم اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ او بھئی! یہ کیا سوجھی ہے تمھیں؟ کیا پاکستان میں لڑکیوں کی کمی ہے... تمھارے لیے، جو یہاں اتنی دور سے مصیبت ساتھ لگا کے لے جانا چاہتے ہو؟" دھمن نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

"یار! مجھے تو میں نے کچھ دیر پہلے اپنی زوجہ محترمہ کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ تُو تو واقف ہے اس عشق خانہ خراب

کی کارستانیوں سے۔ پھر بھی ایسی باتیں کر رہا ہے تُو۔"

"اچھا تو عشق ہو گیا ہے آپ کو پیارے بھائی! وہ بھی آرتھر کی بیٹی سے۔" دھمن نے ہنس کر کہا۔

"مذاق نہیں اُڑاؤ میرا۔ تم نے بھی کوئی بزرگوں کے حکم پر نکاح نہیں پڑھوایا تھا عالیہ سے۔"

"میرا کوئی بزرگ تھا ہی نہیں جو میرے لیے دُلھن تلاش کرتا اور خرابی کیا دیکھی ہے تم نے عالیہ میں؟"

"تو تم نے آرتھر کی بیٹی میں دیکھی ہے کوئی خرابی جو تم ایسی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھی کبھی۔ میں کیا مدد کر سکتا ہوں اس کے بارے میں؟" وہ بولا۔

"پھر تم مجھے اس کے ساتھ شادی کرنے سے منع کیوں کر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے کب منع کیا ہے تمھیں؟ او بڑے بھائی! یہ تم مجھے الزام کیوں دے رہے ہو آخر؟" دھمن خوشدلی سے بولا۔

"میں الزام دے رہا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ابھی تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں لڑکیوں کی کیا کمی، جو میں یہاں سے مصیبت گلے لگا کے لے جا رہا ہوں۔" میں قدرے جھنجلا گیا تھا۔

"او بھائی میرے! میں نے تو ایک عام سی بات کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا نا کہ تم شادی نہ کرو اس سے۔ یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں منع کرنے یا روکنے والا کون ہوتا ہوں بھلا۔ کہو تو میں خود بات کروں آرتھر سے؟"

"نہیں یار! بس شکریہ تمھارا۔ میں بات وات سب کچھ کر چکا ہوں اس سے۔ میں تو تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جانا میرے پروگرام میں شامل تھا۔ اب تم جو کچھ کر رہے ہو، اس طرح وہ میرے ساتھ کیسے جا سکے گی؟ کوئی ایسا انتظام کرو کہ وہ بھی جا سکے اسی طیارے میں، جس میں تم مجھے بھیجو گے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اب اس مرتبہ تو اکیلے ہی چلے جاؤ تم، آئندہ جب آؤ گے تو اسے بھی لے جانا ساتھ۔ جس طرح تم جا رہے ہو، ایسے تم خود ہی پہنچ جاؤ تو کیا کم ہو گا۔ اس غریب کو کہاں پریشان کرو گے۔"

میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے بغیر نہیں جاؤں گا یہاں سے۔ ہٹو چھوڑ دو مجھے، میں اسے خود لے آؤں گا جا کر۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس نے آج کی رات میرے ساتھ سیر و تفریح کا بھی پروگرام بنا رکھا ہے۔"

وہ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "پاگل مت بنو جیلانی! باہر نکلتے ہی پولیس تمھیں گھیر لے گی۔ تم اس سے بچ نہیں سکو گے۔ ہر گلی کوچے میں تلاش ہو رہی ہے۔"

"اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ وہ مجھے پہلے ہی پاکستان جانے کی اجازت دے چکے ہیں۔ اگر دیکھ لیا انھوں نے مجھے تو کہہ دوں گا، اغوا کنندگان کو مرغا بنا کے نکل آیا ہوں ان کی قید سے۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"اور اگر انھوں نے تمھیں اس جگہ پہنچانے کو کہا جہاں سے تم نکل بھاگے ہو تب؟" دھمن نے پوچھا۔

"میں کہہ دوں گا، یہ شہر میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ میں اس کے کسی خاص مقام سے بھی واقف نہیں ہوں۔ نہ جانے کونسی جگہ تھی وہ۔ البتہ باہر کا نقشہ الٹا سیدھا سمجھا دوں گا انھیں۔"

"وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ تمھاری باتوں میں آ جائیں گے۔ وہ تمھیں اپنی کار میں بٹھا کے پورے شہر میں لیے پھریں گے۔ ایک ایک گلی، ایک ایک مکان دکھائیں گے وہ تمھیں۔" دھمن نے کہا۔

"اگر ایسا کیا انھوں نے تو میں اس گودام کی نشاندہی کر دوں گا جہاں سے تمھارے آدمی لے گئے تھے مجھے۔ کوئی حرج تو نہیں ہے نا اس میں۔ میرا خیال ہے وہ گودام کے ذریعے تمھارے اس اسپتال تک تو نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"ہاں، خطرہ تو نہیں ہے اس میں کوئی، مگر پھر بھی ایسا رِسک لیا ہی کیوں جائے۔" دھمن بولا۔

"پھر۔ پھر کیا بتاؤں میں انھیں۔ تم اپنے کسی حریف کا پتا بتا دو مجھے۔ پھنسوا دوں گا اس سالے خنزیر کی اولاد کو۔"

وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ "کھوپڑی تمھاری بھی بہت تیز کام کرتی ہے۔ بہر حال اس ساری تکلیف کی ضرورت نہیں ہے تمھیں۔ لیٹے رہو یہیں چُپ چاپ۔ میں کروں گا تمھارے لیے کچھ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کے لیے اس قدر سنجیدہ ہو رہے ہو۔ یار! یہ عشق ہے ہی بڑی پیڑی شئے۔ جہنم میں بھی کودنے پر مجبور کر دیتی ہے آدمی کو۔"

"کہتا تو تُو یار ٹھیک ہی ہے۔ کچھ ایسی ہی شئے ہے یہ... غلام جیلانی جیسے سیمابی کے پیروں کی زنجیر بن گیا ہے یہ عشق...! تو بچارے سیدھے سادے لوگوں کا کیا حشر کرتا ہو گا یہ؟" میں نے کہا۔ "تو کچھ کر لے میرے بھائی! کوئی ایسی سبیل نکال لے کہ وہ بھی چلی جائے میرے ساتھ۔ ورنہ میرا جانا تو بے کار ہی ہو جائے گا... آدھا تو میں یہیں رہ جاؤں گا اور وہ نصف غلام جیلانی جو پاکستان پہنچے گا وہ بھی کسی کام کا تو نہیں ہو گا۔"

"اچھا یار! ٹھیک ہے، کریں گے کچھ تیرے لیے۔ یاری کر کے یوں تو نہیں چھوڑ دوں گا میں تجھے۔" دھمن بولا۔

"ہاں یار! دیکھنا سستی بالکل نہ کرنا اس کام میں۔ وہ ساتھ

[illegible] نہیں ہو گی تو میں اڑتے ہوئے طیارے سے بھی کود جاؤں گا۔ اس کے بغیر یہ شہر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں۔" میں نے ایک عاشقِ صادق کے انداز میں کہا۔

اس ضمیر کے تاجر کو تو مجھے یہی تاثر دینا تھا کہ میں آرتھر اور الزبتھ کی حقیقت سے بے خبر ہوں اور میرا سینہ لزی کے عشق کی آگ میں پھنکا جا رہا ہے۔ جب تک اسے میرے عشق کی شدت اور سچائی کا یقین رہتا، وہ میرے بارے میں کسی شک کو جگہ نہ دیتا۔ وہ گرگِ باراں دیدہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ عشق آدمی کی آنکھیں اور کان بالکل بند کر دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں تصورِ جاناں کے سوا کوئی بات ہی نہیں سکتی۔ سوچنے اور سمجھنے کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں بس۔ دل کی ہر دھڑکن محبوب کے نام کی صدا دیتی سنائی دیتی ہے۔ حالت جس کی یہ ہو اس کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے کہ وہ محبوب کی جنبشِ ابرو کے سوا کوئی اور اشارہ بھی دیکھ اور سمجھ سکے گا، مزاجِ یار کے خلاف بھی کوئی کام کر سکے گا۔ اس بے ضمیر کا کوئی دین ایمان تو تھا نہیں جو وہ اس کے بارے میں کچھ سوچتا۔ اس کا تو سب کچھ وہ دولت تھی جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے اوپر سب کچھ حلال کر لیا تھا۔ حصولِ زر کے سوا اسے کوئی کام رہ ہی نہیں گیا تھا اس دُنیا میں۔ وہ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا جو زر کو خدا مان کر اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اپنے گرد دولت کا انبار لگانے کے لیے ساری حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ انتہا یہ کہ انھیں ان لوگوں کی بھی کوئی پروا نہیں رہتی جو اُن کی دولت میں اضافے کے لیے شب و روز محنت کرتے ہیں۔ وہ غریب اپنی محنت کا پھل بھی زر پرست کی جھولی میں ڈال کر نانِ شبینہ کے لیے اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ یہ دُنیا ہے اچھے بُرے، امیر غریب، مہرباں نامہرباں، ظالم اور مظلوم ہر طرح کے انسان پائے جاتے ہیں یہاں۔ ازل سے یہی دستور چلا آ رہا ہے۔ چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کی خوراک پہلے بھی بنتی رہی اور اب بھی بن رہی ہے۔ تہذیب اور تمدن کے ارتقا نے بہت کچھ بدلا ہے مگر انسانی جبلت کو ابھی مکمل طور پر بدلا نہیں جا سکا ہے۔ یہ جاننے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود ایک دن اسے سب کچھ یہیں چھوڑ کر اپنے خالق کے پاس لوٹ جانا ہے۔ وہاں نہ زر و جواہر کے انبار اس کے ساتھ جائیں گے نہ محل دو محلے۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی میں سے صرف نامۂ اعمال کی پوٹلی ہی اس کے ساتھ جائے گی۔ انسان نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ساری دُنیا کو اپنے پیچھے سمیٹ کر بیٹھ جانا چاہتا ہے۔ ایسا ہی عاقبت نا اندیش تھا وہ دھمن بھی۔

انھوں نے مجھے پلاستر میں لپیٹ کر ایک علیحدہ کمرے میں آرام دہ بستر پر ڈال دیا۔ ضرورت کی ہر چیز اس کمرے میں حاضر کر دی تھی، اس ابنِ غلام دھمن نے اور ایک نہایت ہی چہکتی لہکتی بلبلِ خوش الحان کو میری پاسبانی کا فرض سونپ دیا تھا۔ نام تو اس کا میری تھا مگر وہ مریم کی سی پاکیزگی اس میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ شانوں پر منتشر سیاہ ریشم جیسے نرم اور چمکدار بال جو سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف سے بادلوں کی طرح چہرے کی چاندنی کو اپنی اوٹ میں لے لیتے تھے اور ایک ادائے ناز سے گردن جھٹک کر انھیں وہ یوں پرے پھینک دیتی تھی جیسے ان کی یہ حرکت اسے ایک آنکھ نہ بھا رہی ہو۔ حالانکہ اس نے انھیں آزاد اسی لیے چھوڑ رکھا تھا کہ جب کوئی گستاخ نظر اس کے چہرے کے گلاب پر ٹک کر رہ جائے تو درمیان میں حائل ہو کر اسے نظرِ بد سے محفوظ کر لیں۔ صورت اس کی ایسی ہی من موہنی تھی کہ جو ایک بار دیکھتا ہو گا نظر ہٹانا بھول جاتا ہو گا مگر میں تو اب پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا تھا۔ مجھے اب دھمن سے تعلق رکھنے والے ہر شخص پر یہودی ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی مسلسل بولے جا رہی تھی اور میں بس ہوں ہاں کرتے ہوئے سُنے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ترکش کے سارے تیر مجھ پر چلا ڈالے مگر میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوا تو وہ عاجز آ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میری یہاں موجودگی پسند نہیں آئی ہے جناب! میں چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گی کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیں یہاں پر۔"

"ارے نہیں نہیں، اب اتنی بھی بُری نہیں ہیں آپ۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو آپ کی باتیں بہت غور سے سُن رہا ہوں۔ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں آپ مس میری! بڑی شیرینی ہے آپ کی آواز میں۔"

وہ خوش ہو گئی۔ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیوں بنا رہے ہیں آپ مجھے؟"

"بنانے والی ذات تو اس ربِ کریم کی ہے مس میری! جس نے مجھے، آپ کو اور اس ساری کائنات کو بنایا ہے اور جسے اس خالق نے تخلیق کر دیا ہو، اسے میں اور کیا بناؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اتنی دیر میں، میں نے آپ سے کوئی دو ہزار باتیں تو ضرور کہی ہوں گی اور ہوں ہاں کرنے کے سوا جواب آپ نے ان میں سے کسی ایک کا بھی نہیں دیا۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید آپ کو بس یہی دو الفاظ یاد کرائے گئے ہیں۔ اس کے سوا آپ کو کچھ بولنا نہیں آتا۔ لیکن اب جو آپ کی زبان کا تالا ٹوٹا ہے تو میں سوچ رہی ہوں کہ میں نے آپ کو بولنے کے لیے مجبور کر کے کچھ اچھا نہیں کیا ہے اپنے حق میں۔" وہ شوخی سے اِٹھلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں مس میری! اب ایسی بات بھی نہ کریں آپ۔ دیکھیں، اسی لیے میں بول نہیں رہا تھا اتنی دیر سے۔ میری حیثیت ہی کیا

ہے۔ کون سی خوبی ہے مجھ میں کہ میں زبان کھولنے کی جرأت کرتا، آپ جیسی بلبلِ خوش نوا کے سامنے۔"

اس کے انگاروں کی طرح دہکتے رخساروں پر شعلے رقص کرنے لگے تھے۔ بالکل بیر بہوٹی نظر آنے لگی تھی وہ۔ زبان تو اس کے منہ میں ساکت ہو کر رہ گئی تھی مگر آنکھیں اس کی "مثنوی زہرِ عشق" پڑھتی معلوم ہونے لگی تھیں۔ شاید آج سے قبل کسی نے اس کی تعریف میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ تعریف تو میں نے بھی کچھ ایسی خاص نہیں کی تھی اس کی، مگر شاید میرا اندازِ بیاں اس کے دل میں اُتر گیا تھا یا شاید وہ بھی کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میرے سامنے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس ابلیس زادے دھمن نے کس ارادے سے اسے مجھ پر مسلط کیا تھا اور وہ سامنے بیٹھی صدقے واری ہو جانے والی نگاہوں سے مجھے تکے جا رہی تھی تو اس کا دروں کیسا تھا؟ کیا کیا ارادے باندھ رکھے تھے اس نے اپنے دل میں؟... میں کوئی تارک الدّنیا، زاہدِ خشک تو نہیں تھا کہ اس بُتِ کافر کی کوئی ادا میرے دل کو چھو نہ سکتی۔ دل میرا بار بار ڈانواں ڈول ہونے لگتا تھا مگر یہ موقع اسے تنہا چھوڑنے کا نہیں تھا لہٰذا میں نے ذہن رسا کو اس کے ساتھ لگائے رکھا تھا کہ اس وقت میں اس کی کسی معمولی سی غلطی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ کچھ دیر آنکھوں کے راستے میرے دل میں اُترنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی "آپ شاعر تو نہیں ہیں جناب!"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ مس میری! یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے؟ کیا میں صورت سے شاعر نظر آتا ہوں آپ کو؟"

"صورت سے تو آپ مجھے کوئی کاؤبوائے لگتے ہیں مگر حیرت ہے، باتیں آپ بالکل شاعروں جیسی کرتے ہیں، سیدھی دل میں اُتر جانے والی۔ میرا تو دل جھوم اُٹھا ہے آپ کی باتیں سُن کر۔" وہ آنکھیں بند کر کے مسرت آمیز لہجے میں بولی۔

تاثر وہ یہی دے رہی تھی مجھے، جیسے میری باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہی ہو۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے ایک دم بات ہی بدل ڈالی۔ پوچھا "وہ ڈاکٹر دھمن کہاں ہیں مس میری؟"

"وہ تو گھر چلے گئے اپنے۔ کیوں؟ آپ انھیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ یوں بات بدلنے پر کچھ حیران ہو گئی تھی۔

"اور ڈاکٹر ہارون؟ وہ ہوں گے نا یہاں؟"

"پتا نہیں، وہ بھی ہیں یا نہیں۔ دیکھنا پڑے گا جا کر مجھے۔"

"تو ذرا تکلیف کریں۔ دیکھ لیں جا کر انھیں۔ کچھ بات کرنی ہے مجھے ان سے۔" میں نے کہا۔

وہ حیران حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ حیرانی اسے یہ ہو گی کہ آخر میں آدمی کس مزاج کا ہوں... کیسی عجیب طبیعت پائی ہے میں نے۔ اس جیسی بانکی، کٹیلی آنکھوں والی نار کو یوں مہرباں دیکھ کر بھی مجھے اوروں کا خیال رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ملنے والا پیغام موصول ہونے کے بعد بھی میں کتابِ محبت کی ورق گردانی کرنے کے بجائے ان حسین لمحات کو ڈاکٹر ہارون پر ضائع کیے دے رہا ہوں۔ شاید وہ یقین کر چکی تھی کہ اس نے مجھے پوری طرح مسخر کر لیا ہے۔ اب میں اس کی موجودگی میں کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکوں گا۔ تھی وہ شکاری قسم کی۔ گھات لگانے اور پھندا ڈالنے میں اچھی خاصی مہارت حاصل تھی اسے۔ اس کے لیے یہ شاید پہلا موقع تھا جب کسی نے اس کے تیرِ نظر سے گھائل ہو کر مسیحائی کے لیے اس کے سوا کسی اور کو آواز دی تھی۔

دو ہی منٹ کے بعد ڈاکٹر ہارون کمرے میں داخل ہوا، اس کے پیچھے پیچھے وہ دشمنِ ایمان بھی تھی۔ میں نے ڈاکٹر ہارون سے اردو میں کہا "اوئے یار ڈاکٹر صاحب! یہ کیا چیز مسلط کر دی ہے تم لوگوں نے میرے اوپر؟"

"کون سی چیز، کس چیز کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" وہ کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

"میں اس کا ذکر کر رہا ہوں پیارے بھائی!" میں نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کا جسے تم پھر اپنے ساتھ لگا کے لے آئے ہو۔"

"کیوں جناب! کیا کیا ہے اس نے؟ کوئی گستاخی کر بیٹھی ہے یہ آپ کی شان میں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"گستاخی یہ بیچاری کیا کرے گی۔ البتہ ادائیں اس کی بڑی بازاری قسم کی ہیں۔ مجھے اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے یہ بنتِ امریکا۔ کیا کوئی شریف زادی دستیاب نہیں ہے تمھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اوہ، تو یہ بات ہے، اس لیے اس قدر چراغ پا ہیں آپ، لیکن جناب! اسے تو ڈاکٹر دھمن نے خاص طور پر منتخب کیا ہے آپ کے لیے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آپ بڑے شوقین مزاج آدمی ہیں۔ لہٰذا آپ کی خدمت کے لیے کوئی ایسی ہی لڑکی ہونی چاہیے جو آپ کے معیار پر پوری اُتر سکے۔"

"اچھا تو یہ معیار ہے میرا، اس کی نظر میں۔ ایسا سمجھتا ہے وہ مجھے۔ لاؤ اسے ذرا میرے پاس، میں پوچھوں گا اس سے کہ اس نے کب مجھے ایسی پستی میں گرتے دیکھا ہے۔ جاؤ بلا کے لاؤ اسے۔" میں غصے سے چیخا۔

وہ بیچارہ بُری طرح گھبرا گیا۔ بولا "آپ ناراض نہ ہوں

جناب! میں ابھی اسے واپس بھیج دیتا ہوں۔" پھر وہ میری کی طرف مڑ کر انگریزی میں بولا "مس میری! آپ جائیں یہاں سے۔ ہمیں ضرورت ہو گی تو پھر بلا لیں گے۔"

اس نے ایک بار پھر حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر عجیب سی کشمکش و پیچ کی کیفیت میں مبتلا باہر چلی گئی۔ جی تو میرا بڑا چاہتا تھا اس بتِ طناز سے اٹھکیلیاں کرنے کو مگر ڈر یہی مانع تھا میرے ارادوں کے درمیان کہ کہیں وہ دھمن کی سکھائی پڑھائی ہوئی مینا نہ ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں کے چھلکتے ساغر سے پلا پلا کر اتنا مدہوش نہ کر دے کہ میرا دروں بروں سب کچھ اس پر عیاں ہو جائے۔ اگر اس کے ذریعے دھمن کو میرے اصل پروگرام کی ہوا بھی لگ جاتی تو اس عالمِ بے بسی میں جبکہ دونوں ٹانگیں میری انھوں نے پہلے ہی قابلِ استعمال نہیں چھوڑی تھیں، وہ نہ جانے مجھے کس خوفناک عذاب سے گزار دیتے۔ پتا نہیں کس گڑھے میں اتار دیتے۔ میرے ٹکڑے کر کے کسی جھیل، سمندر یا دریا میں مچھلیوں کی خوراک بنا دیتے مجھے۔ بڑی بُری گھڑی آ پڑی تھی مجھ پر۔ پھونک پھونک کے قدم بڑھانے کی ضرورت تھی اس وقت۔ وہ گھڑی ایسی بالکل نہیں تھی کہ میں اس دلِ ناہنجار کی باتوں پر کان دھرتا، اس شترِ بے مہار کو نکیل ڈال کر ہی رکھنے کی ضرورت تھی اس وقت۔ چنانچہ میں نے اسے اپنے کمرے سے نکلوا دیا تھا اور یہی بہتر بھی تھا میرے لیے۔ ورنہ نہ جانے کس کھین میں جا اترتا میں۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر ہارون نے مجھ سے پوچھا "لیجیے جناب! نکال دیا میں نے اسے یہاں سے۔ اب تو کوئی شکایت نہیں رہی نا آپ کو ہم سے؟"

میں نے ہنس کر کہا "شکایت تو مجھے پہلے بھی کچھ نہیں تھی پیارے بھائی! ناراضگی تو میری دھمن سے تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"بہر حال اب انھیں بلانے کی ضرورت تو نہیں رہی۔ مطمئن ہیں نا آپ اب؟" اس نے کہا۔

"ہاں یار! کہہ تو دیا میں نے اب ٹھیک ہے سب کچھ۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب میں کسی اور کو بھیج دیتا ہوں آپ کے پاس۔" وہ جانے کیلیے مڑ کر بولا۔

"اوئے نہیں بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اور کسی کو مت بھیجنا یہاں۔ مجھے ضرورت ہو گی تو خود بلا لیا کروں گا۔ کوئی گھنٹی شنٹی تو ہو گی ہی نا یہاں؟" میں نے کہا۔

وہ پھر میری طرف مڑ گیا۔ بولا "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ وہ دیکھیں، وہ آپ کے سرہانے دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ جو سوئچ بورڈ لگا ہے، اس میں کئی رنگ کے سوئچ لگے ہیں۔ وہ سُرخ سوئچ جو ہے اسے آپ کسی ایمرجنسی کے لیے استعمال کریں۔ اسے دباتے ہی اسپتال کے ہر ڈاکٹر کے آفس میں، اس کمرے کے نمبر والا سُرخ بلب روشن ہو جائے گا اور جو ڈاکٹر بھی اس وقت اپنی میز پر موجود ہو گا اُسے پتا چل جائے گا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ فوراً آپ کے پاس دوڑا چلا آئے گا۔ سبز بٹن دبانے سے سبز رنگ کا بلب روشن ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض کو اس ڈاکٹر کی ضرورت ہے جس کے وہ زیرِ علاج ہے۔ چنانچہ وہ ہر ڈاکٹر جو اس بلب کو روشن دیکھے اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مطلوبہ ڈاکٹر تک اس کی اطلاع پہنچا دے کہ اس کے مریض کو اس کی ضرورت ہے اور یہ پیلا سوئچ اس کمرے میں متعین نرس کو بلانے کے لیے ہے۔ اس کے دبانے سے کمرے کے باہر لگا ہوا زرد رنگ کا بلب روشن ہو جاتا ہے۔ انھیں آپ ذہن نشین کر لیں اور ضرورت کے مطابق انھیں استعمال کریں۔ آپ کے کمرے کے باہر ایک نرس کی ڈیوٹی لگا دی جائے گی۔ وہ آپ کے بلائے بغیر اندر قدم بھی نہیں رکھے گی۔"

انتظام انھوں نے بڑا معقول کر رکھا تھا۔ بظاہر کوئی اس اسپتال کی کارکردگی پر اُنگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں اسپتال کی آڑ میں کوئی غلط دھندا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ جسے بھی یہاں لگاؤ اسے یہ تاکید ضرور کر دینا کہ اندر بغیر بلائے قدم بھی نہ رکھے۔"

"اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ میں جا کر اس کا انتظام کر دوں۔" ڈاکٹر ہارون پھر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

"اوئے یار! تمھیں جانے کی اس قدر جلدی کیوں ہے؟ کیا کوئی ضروری کام کر رہے ہو وہاں؟"

"نہیں ایسا کوئی ضروری نہیں ہے۔" وہ جاتے جاتے پھر رک کر میری طرف پلٹ گیا "کچھ اور کہنا ہے آپ کو؟"

"یہاں بیٹھو ذرا میرے پاس۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں میں تم سے۔ میرے سینے میں ہلچل مچا دی ہے تم نے اس وقت وہ باتیں کر کے۔ تم دھمن کے ہر معاملے میں شریک معلوم ہوتے ہو۔ اس کا کوئی راز تم سے پوشیدہ نہیں ہے شاید۔ اس قدر با اعتبار آدمی ہو تم اس کے۔ پھر تم مجھے اس کے خلاف کیوں اُکسا رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"اس سلسلے میں آپ مجھ سے کوئی بات نہ کریں جناب! آج رات ڈاکٹر ڈھمن ایک ضروری کام سے نیویارک جا رہے ہیں۔ ان کی روانگی دس بج کر پندرہ منٹ پر ہوگی۔ ڈاکٹر عالیہ انھیں رخصت کر کے ایئرپورٹ سے سیدھی یہیں آئیں گی۔ وہ آپ کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیں گی۔ اس وقت تو آپ مجھے جانے ہی دیں۔"

مجھے خیال آیا، عالیہ نے بھی آج رات اسپتال میں مجھ سے کچھ اہم باتیں کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی، اس کا علم ہارون کو بھی تھا۔ مجھے ان کی باتوں میں بغاوت کی بو محسوس ہوئی تھی مگر اس وقت میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عالیہ، ڈھمن کی شریکِ حیات ہی نہیں، شریکِ کار بھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گلے گلے تک دلدل میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں یہ تصور بھی محال تھا کہ وہ ڈھمن سے باغی ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ اس کا بدلا ہوا طرزِ عمل بھی میری نظر میں ان دونوں کی ملی بھگت ہی تھی۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے ذریعے کوئی بڑا فائدہ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر جال ڈال رہے ہیں۔

"ڈھمن نیویارک جا رہا ہے۔ واپس کب آئے گا وہ؟ اس نے تو مجھے بتایا تھا کہ کل رات میں یہاں سے روانہ کر دیا جاؤں گا، پاکستان کے لیے۔ کسی خصوصی طیارے کا انتظام کیا ہے انھوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کل شام سے پہلے ہی واپس آجائیں گے۔ آپ کی روانگی کے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

"اچھا پھر تم جاؤ، میں آرام کروں گا اب۔"

"بہت بہتر جناب! اگر کوئی ضرورت ہو تو سوئچ دبا کر بلا لیجیے کسی کو۔" وہ مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت شام کے چھ بج چکے تھے عالیہ کے آنے میں ابھی چار گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت تھا۔ میں اتنی دیر سو لینا چاہتا تھا۔

دس بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے، جب ہارون نے مجھے بیدار کر کے عالیہ کی آمد کی خبر دی۔ اس نے بتایا، وہ بس اسپتال پہنچنے ہی والی ہے، میں منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤں۔ رات کا کھانا عالیہ بھی میرے ساتھ ہی کھائے گی۔ میں نے منہ ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بولا "آپ کے پیروں پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔ باتھ روم جانے میں آپ کو خاصی دشواری ہوگی۔ یہیں انتظام کیے دیتا ہوں میں۔"

میں نے کہا "اوئے چھڈ یار! خالی خولی پلاستر ہی تو چڑھا ہے کوئی خدانخواستہ میرے پیر بے کار تو نہیں ہو گئے ہیں۔ کوئی دشواری نہیں ہوگی مجھے۔" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ٹھہریں جناب! ذرا صبر تو کریں۔ میں یہ دروازہ تو بند کر دوں۔ کوئی آ نہ جائے اچانک۔"

اس نے دروازہ بند کر کے مجھے سہارا دے کر باتھ روم تک پہنچا دیا۔ میں باتھ روم سے واپس آ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ ڈاکٹر ہارون نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "لیجیے میڈم آگئیں شاید۔"

وہ عالیہ ہی تھی جو دروازہ کھلنے کے بعد اندر آئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھیں اس کی فرطِ انبساط سے چمک رہی تھیں "کیسے ہیں آپ جیلانی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟" میرے قریب آکر وہ جذبۂ محبت سے سرشار لہجے میں بولی۔

"اللہ کا شکر ہے جی! میری طبیعت کو کیا ہونا تھا بس ذرا باندھ کے ڈال رکھا ہے انھوں نے مجھے۔" میں نے سامنے کھڑے ڈاکٹر ہارون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ شرمندہ ہو کر بولا "اب ایسا تو الزام نہ دیں جناب آپ مجھے۔ یہ پلاستر تو آپ کی مرضی سے ہی چڑھایا گیا ہے آپ کی ٹانگوں پر۔"

"ہاں یار! کچھ ایسی بھی مجبوریاں آپڑتی ہیں آدمی پر کبھی کبھی جب وہ خود اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بڑے فائدے کے لیے چھوٹا موٹا نقصان تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے نا؟" میں نے کہا۔

عالیہ ہنس کر بولی "اوہو آپ لوگ تو بحث کرنے لگے ہیں ذرا سی بات پر۔ ہارون صاحب! مجھے بھوک لگ رہی ہے، بہت شدید قسم کی۔ کھانا منگوا لیں آپ جلدی سے اور چھوڑ دیں اس قصے کو یہیں۔"

"جی بس ابھی لیجیے۔ آپ ہی کا انتظار تھا ہمیں۔" ہارون یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"یہ گیارہ بجے رات تک آپ بھوکی کیوں پھر رہی ہیں عالیہ بیگم! مجھے ابھی ہارون نے بتایا تھا کہ آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گی تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ بھلا اتنی رات تک کون بھوکا رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس آج دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں۔ آج آخری رات ہے آپ کی ہمارے درمیان۔ کل تو آپ چلے ہی جائیں گے۔ پھر نہ جانے یہ سعادت کبھی حاصل بھی ہو سکے گی مجھے یا نہیں۔" وہ کچھ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"اوہ، تو اتنی محبت کرتی ہیں آپ مجھ تیرہ بخت سے! میرے ساتھ کھانا کھانے کی خاطر اب تک بھوکی پھر رہی ہیں آپ! ہٹکے بھئی ہٹکے۔ حد ہی مکا دی ہے آپ نے تو عالیہ بیگم۔"

"میرا خیال ہے، دل آپ کا ابھی تک صاف نہیں ہو سکا ہے میری طرف سے۔ میری محبت پر ابھی تک شک کر رہے ہیں آپ۔ دل سے قبول نہیں کیا ہے اب تک آپ نے مجھے۔" وہ افسردہ ہو کر بولی۔

"یہ بات نہیں ہے عالیہ! میری طرف سے کسی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دیں آپ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی "آپ کی محبت کا اندازہ تو مجھے اسی روز ہو گیا تھا جس دن آپ نے وہ طلسمی انگوٹھی دی تھی۔"

"آپ نے ڈھمن کو خوب بے وقوف بنایا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ واقعی وہ انگوٹھی آپ سے کہیں گم ہو گئی ہے۔ ویسے غلطی ہو گئی تھی ہم سے، اسے یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں نے آپ کو وہ انگوٹھی دے دی ہے۔ بڑا چراغ پا تھا وہ اس بات پر۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں! اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ ناراض تھا اس بات پر کہ تم نے مجھے وہ انگوٹھی کیوں دے دی۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ اس انگوٹھی کو میرے پاس سے اڑانے کی کوشش نہ کرنے لگے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہہ دیا کہ انگوٹھی کہیں گم ہو گئی ہے مجھ سے۔ مجھے اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ اسے یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہیے تھی کہ وہ انگوٹھی میرے پاس ہے۔ اس طرح وہ مجھے بالکل ہی ناقابلِ تسخیر مان کر ایسا انتظام کر دیتا میرے لیے کہ اسے مجھ سے نجات مل جاتی۔ حیرت مجھے اسی پر تھی کہ اس نے ابھی تک ایسا کیا کیوں نہیں تھا۔ وہ جتنے نقصان میرے ہاتھوں اٹھا چکا تھا، اس کے بعد تو میری زندگی بہت مختصر ہو جانا چاہیے تھی۔"

"اسے آپ کے خلاف کوئی بہت ہی سخت قدم اٹھانے سے میں روکتی رہی ہوں۔ آپ کی محبت مجھے آپ کی حفاظت اور حمایت کرنے پر اکساتی رہی ہے ہمیشہ۔" وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

میں نے گردن اوپر اٹھا کر چھت کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر کہا "واہ میرے مولا! کیا سبیلیں کرتا ہے تو اپنے نافرمان بندوں کے لیے۔ وقت سے پہلے تو کسی کو قدم آباد کی طرف جانے ہی نہیں دیتا۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ بولی "بڑے پکے اور سچے مسلمان لگ رہے ہیں آپ اس گھڑی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ عالیہ بیگم! کیا اس سے پہلے آپ کو میں مسلمان نظر نہیں آیا کبھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نظر آنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے جیلانی! اب دیکھیں نا، نظر تو وہ بنا سپتی ڈاکٹر ڈھمن بھی آتا ہے۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ مگر ہے وہ پکا یہودی۔" وہ بولی۔

میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے سینے میں دل ساکت ہو کر رہ گیا ہو۔ سانس گھٹنے لگا تھا میرا۔ بمشکل میں نے اپنی حالت پر قابو پا کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا کہا تم نے عالیہ! یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟" اس کے اس انکشاف نے عجیب حالت کر دی تھی میری۔ ایسا کیوں ہوا تھا۔ وجہ اس کی میں کبھی نہیں جان سکا تھا۔

وہ بوکھلا کر میرے پاس آئی اور تشویش ناک انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی "ارے ارے، یہ کیا ہونے لگا ہے آپ کو جیلانی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ کا تو چہرہ ہی سفید پڑ گیا ہے ایک دم۔"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "میرا سانس رکنے لگا تھا آپ کی بات سن کر۔ کیا سچ کہہ رہی ہیں آپ؟ سچ مچ ڈھمن یہودی ہے کیا؟"

وہ پریشان ہو کر بولی "میری اس بات سے اتنی تکلیف پہنچی ہے آپ کو۔ مجھے معلوم ہوتا تو کبھی ایسی بات نہیں کرتی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سچ مچ یہودی ہے۔ ویسے جو آدمی یہودیوں کے لیے کام کرے اسے کتنا یہودی ہی چاہیے۔"

"اوہ، یہ بات ہے۔ تو وہ فرزندِ ابلیس، یہودیوں سے بھی مل بیٹھا ہے؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"جی ہاں۔ اور اسی وجہ سے میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں۔" وہ بولی "اب دیکھیں نا جیلانی! آدمی کو دولت کی ہوس میں اتنا بھی تو اندھا نہیں ہو جانا چاہیے نا۔ اسے اپنی شناخت بھی باقی رکھنا چاہیے۔ برے دھندے کرنا اور بات ہے۔ مگر ملک اور قوم کی بقا سے تو نہیں کھیلنا چاہیے کسی کو۔ آخر وہ بھی تو لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی جیسی قیمتی شے ہتھیلی پر رکھے پھرتے ہیں، اپنے ملک کے تحفظ کی خاطر۔ سب کچھ قربان کر دیتے ہیں وہ مادرِ وطن پر۔"

"ہاں عالیہ! وہ بھی ہمارے ہی جیسے انسان ہوتے ہیں۔ ان کے سینے... حرص و ہوس سے خالی ہوتے ہیں۔ طمع انھیں

زیر نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی لوگ قربانیاں دینے والے ہوتے ہیں۔ ہر شخص نہیں کر سکتا یہ کام۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہا آپ نے۔ مگر جو شخص قربانی نہیں دے سکتا اُسے کیا ملت فروش بن جانا چاہیے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نہیں یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔ سر اتار لینا چاہیے ایسے آدمی کا۔ اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ حالات سے مجبور ہو کر غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں اور کچھ فطرتاً ہی بُرے ہوتے ہیں۔ مگر ننگِ ملت کہلوانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا خود کو۔ لیکن یہ دھمن کو آخر سوجھی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بس طمع کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے وہ۔ لالچ نے پردے ڈال دیے ہیں آنکھوں پر اس کی۔" وہ بولی۔

"یہ بہت بڑا کام لے لیا ہے اس نے اپنے ذمے....!" میں ہارون کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے دو وردی پوش بیرے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ ہارون نے میرے بیڈ کے ساتھ ایک میز لگا دی۔ اور ان دونوں نے اس پر کھانا چن دیا۔ ہارون نے ایک کرسی کھینچ کر میز کے دوسری طرف رکھتے ہوئے عالیہ سے کہا۔ "آپ ادھر آ جائیں میڈم!"

عالیہ میرے بیڈ سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھی۔ اس نے ہارون سے کہا۔ "آپ بھی آ جائیں ہارون صاحب!"

"شکریہ میڈم! آپ لوگ کھائیں، میں کھا چکا ہوں۔" ہارون نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

دونوں بیروں کو اس نے واپس بھیج دیا تھا اور خود ایک کرسی لے کر دروازے پر جا بیٹھا تھا۔ عالیہ نے اس سے پوچھا۔ "آپ کے علاوہ اور کون کون ہے اسپتال میں اس وقت؟"

"ڈاکٹر قیصر اور ڈاکٹر تنویر ہیں میڈم! انھیں میں نے سمجھا دیا ہے، ادھر کوئی نہیں آئے اس وقت۔" وہ بولا۔

"بہت اچھا کیا ہے یہ آپ نے۔" عالیہ نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولی۔ "کھانا شروع کریں نا جیلانی! باتیں بھی ہوتی رہیں گی کھانے کے دوران۔ سنا ہے اس طرح کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے۔"

"ہاں، سنا تو میں نے بھی ایسے ہی ہے۔" میں نے ہنس کر ہارون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میرے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے بولی۔ "یہ ڈاکٹر ہارون ہمارے شریکِ راز ہیں۔ آپ ان کی طرف سے بالکل مطمئن ہو کر باتیں کریں اور وہ دونوں ڈاکٹر قیصر اور ڈاکٹر تنویر بھی اپنے ہی آدمی ہیں۔ نرسیں یہاں سب مقامی ہیں، وہ اردو بالکل نہیں جانتیں پھر بھی ڈاکٹر ہارون نے ادھر آنے سے انھیں منع کر دیا ہے۔ ہم لوگ آزادانہ ہر موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ کوئی خارج نہیں ہوگا ہمارے درمیان۔ اور نہ کوئی بات باہر نکلے گی یہاں سے۔"

"اچھا تو یہ بات تھی ڈاکٹر ہارون!" میں نے ہارون سے کہا۔

"پھر تو آپ کو ایسی باتیں اس وقت بالکل نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ وہ دھمن سن سکتا تھا، کوئی بات بھی اس کے کان میں پڑ کر آپ کو مشکوک لوگوں کی فہرست میں شامل کر سکتی تھی۔ خود میں چوکنا ہو گیا تھا آپ کی طرف سے۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی تھی جناب! مجھے احساس ہو گیا تھا اس بات کا۔ اسی لیے دوسری بار آپ کے پوچھنے کے باوجود میں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میڈم پر ڈال دیا تھا اس ذمے داری کو۔"

میں نے عالیہ سے پوچھا۔ "مگر عالیہ بیگم! آپ نے یہ یقین کیوں کر لیا کہ میں اس معاملے میں آپ کا ہی ساتھ دوں گا؟ میں دھمن کا طرف دار بھی تو ہو سکتا ہوں۔ آپ نے کچھ خطرہ محسوس نہیں کیا مجھ سے؟"

"میں آپ کو ایک عرصے سے جانتی ہوں جیلانی! جو ہنگامہ خیز زندگی آپ گزار رہے ہیں اس میں بھی زیادہ قصور آپ کا نہیں ہے۔ آپ نے تو صرف ایک بار اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک قدم اٹھایا تھا۔ اگر اس رات آپ ہمارے گھر سے اپنی ضرورت پوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو شاید کبھی دوبارہ اس راہ پر قدم نہ دھرتے۔ مگر آپ کی ناکامی اور پھر میرے اور دھمن کے خوف ناک اقدام نے آپ کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ جس کے نتیجے میں آپ مجسم انتقام بن گئے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ آپ کی موجودہ پُرآرام زندگی کے ذمے دار ہم ہی دونوں ہیں، ہماری خود غرضی نے آپ کی زندگی زہر آلود کر دی ہے ورنہ آپ فطرتاً بُرے آدمی نہیں ہیں۔" اس نے مکمل طور پر میری زندگی کا تجزیہ کر کے رکھ دیا تھا میرے سامنے۔

"پھر بھی میں آخر انسان ہی ہوں، ایک خطاکار انسان۔ میری نیت بھی بدل سکتی ہے کسی وقت۔ ضروری تو نہیں ہے کہ وہی کچھ کروں جو تم چاہتی ہو۔"

"آدمی کو پہچاننے کا اتنا سلیقہ تو ہے مجھ میں جیلانی! جن لوگوں کے درمیان میں رہ رہی ہوں، وہاں کوئی کمتر درجے کی، کم عقل اور سیدھی سچی عورت ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ اپنے، ملک کی سلامتی اور نیک نامی کو ہر شے پر مقدم جانتے ہیں۔ اور پھر میں آپ سے کوئی خطرناک کام تو نہیں لے رہی ہوں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اس کارِ بد میں

جب دھمن کے ساتھ شریک نہ ہوں۔ یہاں سے جانے کے بعد دوبارہ کیریئر بن کر نہ آئیں اور اگر ہو سکے تو پاکستان میں جو لوگ ان کی معاونت کر رہے ہیں، انھیں بے نقاب کر کے پولیس کے حوالے کر دیں۔"

"اور تم خود اس کے ساتھ رہ کر اس کی معاونت کرتی رہو گی؟" میں نے عالیہ سے پوچھا۔

"میں مجبور ہوں جیلانی!" اس کی آواز میں ایک کرب سا بھر آیا۔ "میرا اس کے سوا نہ کوئی سہارا ہے، نہ کہیں ٹھکانہ۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ کون اپنی چھت کے نیچے برداشت کر سکے گا مجھے۔ بُرے لوگوں کے ساتھ رہ کر بہت سی بُری عادتیں چمٹ گئی ہیں میرے ساتھ، جنھیں چھوڑنا اب میرے اختیار میں نہیں رہا ہے۔ لہٰذا میری آپ فکر نہ کریں۔ میں یہاں رہ کر اسی طرح دوسروں کو بھی اس کے جال میں پھنسنے سے روکنے کی کوشش کرتی رہوں گی جس طرح آپ کو روکنے کے لیے کر رہی ہوں۔"

آدمی کا ضمیر اگر بالکل ہی مر نہ گیا ہو تو اس کی بداعمالیاں کبھی نہ کبھی اس کے سینے میں کسک ضرور دینے لگتی ہیں۔ عالیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ دھمن کو حد سے تجاوز کرتے دیکھ کر اس کے سینے میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ وہ کھلم کھلا اس کی مخالفت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی مگر اپنے طور پر اس نے دھمن کے خلاف ایک محاذ ضرور قائم کر لیا تھا اور دھمن کے ساتھیوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کی باتیں سن کر میرا جی چاہا میں اسے اپنی پناہ میں لے لوں۔ اسے ان سیاہ کاروں کی دنیا سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ مگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا میرے لیے۔ میں تو خود ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ دھمن مجھے پاکستان بھیجنے کے لیے اپنے وسائل استعمال کر رہا تھا۔ پھر میں اس کی نظروں سے بچا کر عالیہ کو اپنے ساتھ کیسے لے جا سکتا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "عالیہ! آپ کی باتوں نے میرے دل میں آپ کے لیے بڑی عزت و توقیر پیدا کر دی ہے۔ میں آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں، میں کیا کر سکتا ہوں آپ کو اس جنجال سے نکالنے کے لیے؟"

وہ بولی۔ "نہیں جیلانی! آپ میرے لیے بالکل پریشان نہ ہوں۔ میرے لیے فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے یہاں۔ اگر آپ نے میری بات مان کر دوبارہ ادھر کا رُخ نہ کیا تو میں اسے ہی بہت بڑی کامیابی سمجھوں گی اپنے لیے۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ مجھے اس ننگِ وطن کی اصلیت معلوم ہو چکی ہے۔ آپ بس دیکھیے اس کے حسین چہرے پر بہاریں اس کے ساتھ۔ واپس تو میں پہلے بھی آنے کا نزدیک فریب تھا ایک یہاں اور اب تو میں ایک ایک ٹانکا ادھیڑ کے رہوں گا مجھے۔ مگر آج وہ مجھ پر رذیلوں کا۔ کیا یاد کریں گے یہ بھی کہ کسی غلام جیلانی سے واسطہ پڑا تھا ان کا۔"

"مجھے یہی امید تھی جیلانی! آپ سے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "بس آپ وہاں کا محاذ سنبھال لیں اور یہاں کی تو فکر ہی نہ کریں آپ، یہاں میں موجود ہوں۔ کسی کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"

"میرا تو خیال تھا کہ تم بھی پاکستان چلی چلو کسی نہ کسی طرح۔ خاک ڈالو یہاں کے معاملات پر۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے سارے زمانے کو راہِ راست دکھانے کا۔"

"نہیں جیلانی! آپ سمجھیں میری بات کو، مجھے مجبور نہ کریں کہیں بھی جانے کے لیے۔ نہیں رہنے دیں اس موذی کے ساتھ، میں اسے بھی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں، شاید خدا کبھی اس کے دل میں بھی نیکی ڈال دے۔" وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

"معلوم یہ ہوتا ہے عالیہ! آپ کے دل میں اس کے لیے اب بھی کوئی نرم گوشہ موجود ہے۔ اس سے علیحدہ ہونے یا اُسے کوئی نقصان پہنچانے کے لیے آپ کا دل تیار نہیں ہو رہا ہے ابھی۔ کیوں ہے نا یہی بات؟" میں نے پوچھا۔

"شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب دیکھیں نا جیلانی! کتنا طویل ساتھ ہے میرا اور اس کا۔ اور جتنی یگانگت تھی ہم دونوں میں، اس کے بعد ایک دم اسے چھوڑ دینے کو کیسے جی چاہے گا۔ یوں ضرورت تو ہے نا مجھے اس کی۔ سہاگ ہے وہ میرا۔ ہمارے ہاں تو عورت کا سب کچھ اس کا سہاگ ہی ہوتا ہے۔ جیسا بھی بُرا بھلا ہے، ہے تو نا۔ کون سی مشرقی عورت ہنسی خوشی اپنا گھر برباد کرنا چاہے گی، کون سہاگ اجاڑنا چاہے گی اپنا؟" وہ اداسی سے بولی۔

"ہاں، کہتی تو تم بھی ٹھیک ہی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن جس زندگی کا اس نے انتخاب کر لیا ہے، اپنے اور تمھارے لیے، یہ زندگی زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ ذرا سی بھی غفلت یا کوئی بھی غلط فہمی عمریں تمام کر سکتی ہے تم دونوں کی۔ اس کھپ سے نکلنا تو اس کے لیے کسی طرح بھی ممکن ہی نہیں۔ جب بھی اس نے ایسا کرنا چاہا، وہ اس کے لیے زندگی عذاب بنا دیں گے۔ وہ یہ خطرہ کبھی مول نہیں لیں گے کہ دھمن ان کا ساتھ چھوڑ کر ان کے راز دوسروں کو منتقل کر دے۔ یہ بات تم نہیں جانتی ہو کیا کہ ایسے کاموں میں رازداری کی کیا اہمیت

زیر نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی لوگ ہر شخص نہیں کر سکتا بہ ن ہے اس کی راہ میں بھی۔ یہی مجبوری ظاہر

”ٹھیک کہ بی۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کا ساتھ چھوڑ مرتے دنیا کے کسی گوشے میں بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔ اس کی جان لے کر ہی وہ لوگ اسے چھوڑیں گے اب۔ بڑی خوف ناک دلدل میں پاؤں دھر دیا ہے اس نے۔ پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے اس میں۔“ وہ بولی۔

”جبھی تو کہہ رہا ہوں، ساتھ چھوڑ دو اس دشمن رذیل کا۔ ورنہ تم بھی کہیں اس کے ساتھ ماری ہی نہ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اب جو بھی ہو، بھگتنا تو پڑے گا ہی۔ ہر بُرے بھلے میں اس کا ساتھ دینے کی قسم کھا رکھی ہے میں نے۔ اب تو میرا مرنا جینا اسی کے ساتھ ہے جیلانی! یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا اس کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے۔ اس وقت بھی وہ شریفانہ زندگی نہیں گزار رہا تھا۔ اس کا کوئی راز مجھ سے چھپا ہوا تو نہیں تھا۔ کیا نہیں جانتی تھی میں اس کے بارے میں۔ آپ خود فیصلہ کریں جیلانی! جب میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر لیا ہے تو اب اس کا ساتھ چھوڑ دینا کس طرح ممکن ہے میرے لیے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے جیلانی! میں اسے اس جہنم میں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے ساتھ ہی رہ کر یہ کوشش کرتی رہوں گی کسی طرح اس کی جان چھوٹے ان لوگوں سے۔“

”آفرین ہے تمھاری ہمت کو عالیہ! میں نے اتنا حوصلہ، عورت ذات میں پہلے نہیں دیکھا تھا کبھی۔ اور نہ ہی میں آپ کو وعدوں کا اتنا پابند سمجھتا ہوں۔ آپ نے تو میرے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے ہیں، اپنے بارے میں۔“ میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتی رہی۔ آنکھوں سے شبنم کے دو قطرے کسی طرح پھسل کر اس کے رخساروں کے بیچ آ ٹھہرے تھے۔ اس نے انھیں رومال سے صاف کر کے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر نظریں جھکا لیں۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ کھانے میں مصروف رہے۔ حالت میری بھی خاصی دگرگوں ہو رہی تھی اس گھڑی۔ کوئی بات زبان سے نکل نہیں رہی تھی اور حلق میں ایسے پھندے سے پڑ رہے تھے کہ لقمے بھی آہستہ آہستہ اٹک اٹک کر حلق سے نیچے اُتر رہے تھے۔ بڑا سوگوار سا ماحول ہو گیا تھا۔ مجھ سے کھایا نہیں گیا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی بھی حالت مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ شاید میری وجہ سے وہ بہ جبر و اکراہ لقمے بنا بنا کر منہ میں رکھ رہی تھی۔ مجھے ہاتھ اٹھاتے دیکھ کر اس نے بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔ اور ہارون سے بولی۔ ”ہارون صاحب! یہ برتن اٹھوا دیں اور کافی کے لیے کہہ دیں ذرا۔“

”جی بہتر ہے میڈم!“ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

میں نے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ عالیہ بولی۔ ”ایک سگریٹ مجھے بھی دیں جیلانی!“

میں نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اس کی طرف بڑھا دیا اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ منتخب کر کے نکالا اور اسے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھا دیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک طویل کش لیا اور اس کا دھواں اوپر منہ کر کے چھت کی طرف چھوڑنے کے بعد بولی۔ ”آپ ان باتوں کو یوں دل پر نہ لیں جیلانی! ہمارے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ ہمیں صرف اسی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ منہ لٹکا کے بیٹھ جانے سے کام نہیں بنے گا۔ عمل کی ضرورت ہے اس وقت۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو عالیہ!“ میں نے تکلف کی دیوار گرا دی تھی اور اب اسے بار بار تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ بھی معترض نہیں تھی میرے اس اندازِ تخاطب پر۔ حالانکہ ہمارے درمیان تکلفات کی کوئی گنجائش تو پہلے ہی نہیں رہی تھی۔ مگر پھر بھی ہم کچھ فاصلہ رکھ کر باتیں کرتے رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے درمیان اعتماد کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ دلوں میں کچھ گرہیں ایسی باقی تھیں جو کسی طرح کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ آج کی ہماری گفتگو نے وہ گرہیں کھول دی تھیں اور اب ہم ایک دوسرے کے لیے راز نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے سینے میں وطن کی محبت جاگ اٹھی تھی اور دشمن کی بھی ضرورت تھی اسے، اس لیے وہ کوئی ایسا اقدام چاہتی تھی جس سے سانپ بھی مر جائے اور اس کی لاٹھی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے۔ اس کام کے لیے اس کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی تھی اور اس نے پہلے ہی دن سے میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں وہ جانتی تھی، حقیقت کا علم ہونے کے بعد میں اس سے اپنی دشمنی بھلا کر اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے مقصد میں اس لیے کامیاب ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے گرگجری نے مجھ پر وہ راز منکشف کر دیا تھا جس کا اظہار وہ مجھ پر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اگر گرگجری ایسا نہ کرتا تو مجھے اس کی باتوں پر اعتبار مشکل ہی سے آتا۔ میں اسے بھی اس کی کوئی چال ہی سمجھتا رہتا۔ انھوں نے مجھے ہمہ رنگ زمیں جال بچھا بچھا کر اتنی بار پھانسا تھا کہ اب میں اس کی کسی بات پر اعتبار کر ہی نہیں سکتا تھا حالانکہ اس نے اپنے خلوص کا یقین دلانے کے لیے وہ طلسمی انگوٹھی مجھے دے دی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس پر شک کرنے کی عادت ترک نہیں کی تھی۔ میں اسے بھی ان دونوں کی چال ہی سمجھتا رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اس طرح میری حفاظت کا سامان کر کے میرے ذریعے بے اندازہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے مستقل کیر نیر بنائے رکھنے کے لیے میری زندگی کو طول دینا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنے وارڈروب میں میری تصویر لگا رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے حسین چہرے پر بہاریں بسیرا کر لیتی تھیں اور یہ سب کچھ میرے نزدیک فریب تھا، ایک حسین دھوکا تھا جو وہ مجھے دینا چاہتے تھے۔ مگر آج وہ مجھ پر پوری طرح عیاں ہو گئی تھی۔ آج میں نے یہ جان لیا تھا کہ وہ مجسّم فریب ہی نہیں ہے، اس کے خمیر میں ریا کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں شامل کی گئیں تھیں۔ اس کے سینے میں اسی کی طرح کا ایک حسین دل حرکت کر رہا تھا جس میں روئی کے گالے

جیسا گداز بھی تھا اور چٹانوں جیسی سختی بھی تھی اور ضرورت کے وقت اس کے استعمال کا سلیقہ بھی تھا اسے۔

وہ بولی "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اب تک دشمن کے ایک گرگے آلیور کے مکان میں مقیم تھے۔"

"ہاں، صحیح سنا ہے تم نے۔ اس کے مکان میں قیام کے دوران ہی میں اس قابل ہو سکا ہوں کہ تم پر اعتبار کر سکوں۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"دیکھیں عالیہ!" میں نے کہا "ہمارے درمیان اب تک جس طرح کا تعلق رہا ہے، اس میں اعتبار اور اعتماد کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ نہ میں نے کبھی تم پر اور دشمن پر اعتبار کیا اور نہ ہی تم لوگوں نے مجھے کبھی قابل اعتبار جانا۔ ہمارا ہر فعل ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے تھا۔ ہماری دشمنی کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی تھیں دلوں میں۔ آلیور کے ہاں قیام کے دوران ہی مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ دشمن کے منشیات کی اسمگلنگ کے کاروبار کو یہاں کے یہودیوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وہیں مجھے یہودیوں کی تنظیم 'جامعۂ یہودا' اور اس کی ذیلی شاخوں کا حال، اور 'جیوش سوسائٹی' کے بارے میں معلوم ہوا۔ ان کے مقاصد سے باخبر ہونے کے بعد مجھے جلد از جلد پاکستان پہنچنے کی اور بھی فکر لاحق ہو گئی۔ پہلے تو مجھے صرف آسیہ اور اسلم آپی کی فکر تھی، اب اس میں یہودیوں کے ان آلۂ کاروں کی فکر بھی شامل ہو گئی جو میرے ملک میں سرگرم عمل ہیں۔ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر دولت حاصل کرنے کے لیے اپنے ملک کی بنیادیں کھودنے میں مصروف ہیں۔ جنھیں اس کی ذرا فکر نہیں ہے کہ یہ ملک خدانخواستہ نہ رہا تو وہ کیا کریں گے۔ کہاں لے جائیں گے وہ اس دولت کو، کون پناہ دے گا انھیں اور کس کام آ سکے گی وہ دولت ان کے؟ ان کی اولاد کو کیا مقام مل سکے گا اس دنیا میں، غداروں اور وطن فروشوں کے بچے بھی ہمیشہ مشکوک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی انھیں گلے لگانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اپنے سر کا سائبان جلا دینے والوں کو کوئی اپنے گھر میں پناہ دینا پسند نہیں کرتا۔ یہی قانون قدرت بھی ہے اور قانون فطرت بھی۔ ایسے لوگ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ نہ اپنوں میں نہ غیروں میں۔ آلیور جس مکان میں رہتا تھا وہ ایک یہودی آرتھر فینلی کا مکان ہے۔ جہاں وہ اپنی تنظیم کی لڑکیوں الزبتھ اور جوزلین کے ساتھ رہتا ہے۔ اس نے اس مکان کا ایک حصہ آلیور کو اس لیے دے رکھا تھا کہ آلیور اسرائیل کے محکمۂ دفاع کو اسمگلنگ سے ہونے والی تمام آمدنی دے دیتا ہے۔ وہ یہ کام کرتا ہی ان کی امداد و اعانت کے لیے ہے۔ آرتھر فینلی، جوزلین کو اپنی دوسری بیوی اور الزبتھ کو اپنی بیٹی بتاتا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں میں باہم کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میں نے عالیہ کو ان کے بارے میں ایک ایک تفصیل بتا دی۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سب کچھ سنتی رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ عالیہ اور ہارون کو بھی ان ساری باتوں کا علم تھا۔ وہ حیران صرف اس لیے تھے کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔

میرے خاموش ہونے کے بعد عالیہ نے پوچھا "آپ کو یہ ساری تفصیل کس نے بتائی؟"

"مجھے جن لوگوں نے یہ ساری باتیں بتائی ہیں، ظاہر ہے وہ لوگ یہودیوں یا ان کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہودیوں نے ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیخ کنی کر دیں۔ وہ خود کھل کر یہودیوں کے مقابل نہیں آنا چاہتے البتہ ایسے لوگوں کو ہر طرح کی امداد فراہم کرنے کو تیار ہیں جو ان کے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہوں۔ انھوں نے یہاں سے پاکستان تک مجھ سے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح تو بڑی آسانی ہو جائے گی ہمیں۔ مگر وہ ہیں کون لوگ۔ کیا مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے آپ؟ کیا اب بھی آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے جیلانی؟" عالیہ نے کہا۔

"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے عالیہ! تم نے تو اس گھڑی میری ایک یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ میں تو بہت پریشان تھا اس سلسلے میں ان سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا مجھے۔ دشمن نے جو پروگرام بنا رکھا ہے، اس میں مجھے کوئی ایسی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی اور جانے سے پہلے میرا ان سے رابطہ ہونا بے حد ضروری تھا۔ انھیں کم از کم یہ اطلاع ضرور ہونا چاہیے کہ میں کب یہاں سے جا رہا ہوں..."

عالیہ نے بے صبری سے میری بات کاٹ کے کہا "مگر وہ ہیں کون۔ یہ تو آپ بتا ہی نہیں رہے ہیں۔"

"وہ وہی دونوں پولیس افسر ہیں جن کی تحویل سے دشمن مجھے نکال لایا ہے۔ اگر وہ درمیان میں نہ آ جاتا تب بھی میں کل کسی وقت یہاں سے روانہ ہو جاتا اور میرے ساتھ وہ الزبتھ فینلی بھی جانے والی تھی، وہ آرتھر فینلی کی نام نہاد بیٹی۔ پتا نہیں الزبتھ ہی اس کا نام ہے یا یہ نام بھی اس کے رشتے کی طرح دکھاوا ہی ہے بس۔" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" وہ بولی "مگر وہ آپ کے ساتھ کیونکر جا سکتی تھی۔ جب کہ آپ کی پشت پر پولیس موجود ہوتی؟"

"آرتھر کو میں نے اس سلسلے میں مطمئن کر دیا تھا۔ اسے یہ

نہیں معلوم تھا کہ میں پولیس کے لیے کام کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اسے تو یہی بتایا تھا میں نے کہ پولیس نے میری طرف سے مطمئن ہو کر میری جان چھوڑ دی ہے اور مجھے واپس جانے کی اجازت بھی دے دی ہے۔ الزبتھ کو وہ اس لیے ساتھ بھیج رہا تھا میرے کہ وہ پاکستان میں ان تمام ضمیر فروشوں سے مجھے متعارف کراتی جو وہاں یہودی کتوں کے ہاتھوں اپنی آزادی کا سودا کر چکے ہیں۔" میں نے اسے بتایا "مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ جب آرتھر کو میرے پروگرام کا علم تھا تو اس نے دشمن کو کیوں نہیں بتایا اس بارے میں؟ مقصد تو یہی ہے نا دشمن کا بھی کہ میں کسی طرح پاکستان واپس پہنچ جاؤں اور جب میرے جانے میں کوئی دشواری نہیں رہی تھی تو آخر ضرورت کیا آ پڑی تھی، اس سارے بکھیڑے کو پھیلانے کی؟"

"وہ یہ ہیرے بھیجنا چاہتا تھا یہاں سے تمہارے ذریعے۔ ان کے وہاں کراچی میں اچھے دام لگ جائیں گے۔ دراصل یہ وہی ہیرے ہیں جو سافر وغیرہ نے اڑائے تھے اور جنھیں بچانے کے لیے تم نے سافر کے فلیٹ میں اس لانسر کے ہاتھ کا جوڑ اکھاڑ دیا تھا۔ اس نے یہ ہیرے تمہارے ساتھ بھیجنے کے لیے آرتھر کو بھی چکر دے دیا ہے۔ اسے ان کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔ ان لوگوں نے پہلے ہی سے تمھیں اس طیارے سے بھیجنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ وہ ایک خصوصی طیارہ ہے جس میں کچھ ماہرین ایک وفد کی شکل میں بنکاک بھیجے جا رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنھیں اس رذیل اسرائیلی آرتھر نے اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ وہ تمھیں دشمن کے اس چیریٹی اسپتال سے رخصت کیے جانے والے ایک مریض کی حیثیت سے اپنے جہاز میں لے جائیں گے۔ تمہارے ساتھ اسپتال کی ایک نرس بھی ہو گی جو تمہاری دیکھ بھال کی غرض سے ساتھ جائے گی تمہارے۔ جانتے ہو وہ نرس کون ہے جسے بھیج رہے ہیں یہ لوگ نرس بنا کر تمہارے ساتھ؟" اس نے مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔ ویسے میں نے دشمن سے کہا تھا، الزبتھ کو کسی طرح بھیج دے میرے ساتھ۔"

"ہاں، وہ الزبتھ ہی کو بھیج رہے ہیں تمہارے ہمراہ۔ بہت خوف ناک لڑکی ہے وہ، ذرا ہوشیار ہی رہنا اس سے۔ جتنی حسین نظر آتی ہے، اس سے کہیں زیادہ زہریلی ناگن ہے وہ، اسے تمہاری نگرانی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ اگر اسے تمہارے اصل ارادوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو دوسرا سانس نہیں لینے دے گی وہ تمھیں۔"

میں حیرانی سے عالیہ کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے پہلے ہی الزبتھ کو میرے ساتھ نتھی کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا اور تاثر مجھے یہ دے رہے تھے جیسے میرے اصرار پر بھیج رہے ہوں میرے ساتھ اسے۔ ان کا کوئی کام بھی مصلحت سے خالی نہیں تھا۔ ہر لفظ کے کئی کئی معنی رکھتے تھے وہ۔ قسم قسم کے تیر لیے پھرتے تھے وہ ترکش میں اپنے۔ میں نے کہا "عالیہ! ایک کام یہ میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اس پولیس افسر گریگری کو میرے بارے میں مطلع کر دو۔ اس سے کہو کہ جو کچھ وہ مجھے روانگی کے وقت بتانا چاہتا تھا، ایک کاغذ پر لکھ کر دے دے اور یہ بھی بتا دے کہ پاکستان میں مجھے اس کی مدد کی ضرورت پڑی تو میں کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی واپس جاتے ہوئے یہ کام بھی کرتی جاؤں گی۔" عالیہ نے کہا۔

"ایک بات میرے سینے میں اور چبھ رہی ہے۔ کیا تم کچھ بتا سکو گی اس بارے میں؟" میں نے عالیہ سے پوچھا۔

"کیا؟ کون سی بات؟" عالیہ نے سوال کیا۔

"وہ گریگری بیٹھا یہ کہہ رہا تھا مجھ سے کہ میں الزبتھ کے ساتھ باہر سیر کو جا سکتا ہوں، اگر کوئی گڑبڑ ہو گی تو اس کے آدمی فوراً میری مدد کو پہنچ جائیں گے۔ دشمن کے آدمیوں نے ہمیں اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں گھیرا تھا۔ اگر گریگری نے ہماری نگرانی پر کسی کو مقرر کیا تھا تو کیا وجہ ہے، دشمن کے آدمیوں کی راہ نہیں روکی کسی نے؟ اور نہ ہی اب تک کوئی...... یہاں پہنچ سکا ہے۔" میں نے عالیہ سے کہا۔

وہ بولی "میں کیا بتا سکتی ہوں اس بارے میں۔ ممکن ہے انھوں نے اغوا کرنے والوں کا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے مزاحمت نہ کی ہو۔ وہ گودام تک پیچھے آئے ہوں وین کے اور اب رات میں کسی وقت اس گودام پر دھاوا کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہوں وہ لوگ۔ لیکن اب وہاں ان کے ہاتھ کیا آ سکے گا؟"

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوا ہے۔ اگر انھوں نے ہمارا پیچھا کیا ہوتا تو جس ویرانے میں اغوا کنندگان نے ہمسفر کو بیہوش کر کے مجھے اپنی گاڑی میں منتقل کیا تھا، وہاں وہ ضرور ان کو روکتے۔ وہ محض ان کا ٹھکانا معلوم کرنے کی خاطر ہمسفر کو بے ہوشی کی حالت میں وہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے اس وقت انھوں نے آپ کی نگرانی ضروری نہیں سمجھی ہو گی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت پولیس کا ایک ذمے دار افسر آپ کے ساتھ تھا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہا تم نے عالیہ! ضرور یہی بات رہی ہو گی۔"

عالیہ نے کہا۔ "ایک درخواست میں کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

"دیکھیں عالیہ! اس طرح بات نہ کیا کریں مجھ سے۔ یوں کہیں کہ ایک حکم دے رہی ہوں میں۔" میں بولا۔

"او نہیں جیلانی! میں اس قابل کہاں ہوں کہ آپ کو حکم دے سکوں۔ میری اتنی گزارش ہے آپ سے کہ آپ دشمن کو کوئی بہت بڑی سزا نہیں دیں، کوئی ایسا نقصان نہ پہنچائیں کہ وہ جان سے ہی گزر جائے۔"

"مجھے حیرت ہے تم اس کے کالے کرتوتوں سے واقف ہونے کے بعد بھی اس کے لیے ایسے جذبات رکھتی ہو۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اسے تمھارے بارے میں علم ہو جائے تو وہ تمھارے ساتھ ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔ جان لے لے گا تمھاری اسی سمے۔" میں نے اس سے کہا۔

"وہ مرد ہے جیلانی! میرے بغیر بھی زندگی اسی طرح بسر کر سکتا ہے۔ کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی اسے میری۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں، مجھے ابھی اس کے سہارے کی ضرورت ہے۔ سہاگ ہے وہ میرا، چادر ہے میرے سر کی۔ اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں رہوں گی۔ کیا آپ میری خاطر اسے معاف نہیں کر سکیں گے؟"

مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کا سہاگ اجاڑنے کی کوشش نہیں کروں گا کبھی۔ اور جہاں تک ہو سکا اس کی حفاظت کروں گا۔ وہ خوش ہو گئی تھی یہ بات سن کر، اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مُردنی ختم ہو گئی تھی اور چہرہ اس کا تر و تازہ نظر آنے لگا تھا ایک دم۔

"بہت بہت شکریہ جیلانی آپ کا۔ میری بات مان کر آپ نے بڑا مان بڑھا دیا ہے میرا۔ بڑے وسیع القلب ہیں آپ، اپنے ایسے دشمن کو بھی معاف کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں جس نے قدم قدم پر آپ کو نقصان پہنچانے کے سوا کبھی اور کچھ نہ کیا ہو۔ اچھا، اب مجھے اجازت دیں۔ صبح پھر آؤں گی میں آپ کے پاس۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"جاتے ہوئے گریگری سے ملنا نہ بھولنا۔ اسے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ کب جا رہا ہوں میں یہاں سے۔" میں نے کہا۔

"اس طرف سے بالکل مطمئن رہیں آپ جیلانی! انھیں میں بتا دوں گی۔" اس نے کہا اور خدا حافظ کہتی باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس بار وہ ایک بالکل ہی نئی عالیہ نظر آ رہی تھی مجھے۔ اس سے قبل وہ مجھے جب بھی ملی تھی، اس کی آنکھیں آگ ہی اگلتی رہی تھیں میرے لیے۔ کیسے کیسے رنگ دیکھے تھے میں نے اس کے۔ ذہن اس کا ہر دم جال ہی بنتا رہتا تھا۔ کیا نہیں کیا تھا اس نے مجھے بے دست و پا کرنے کے لیے۔ پہلی بار مجھے اس میں ایک خوبی نظر آئی تھی۔ اسے بڑی محبت تھی اپنے ملک سے۔ جرائم کی دلدل میں رہتے ہوئے بھی اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ اس کے ملک سے کوئی بھی ایسی چیز گزار کر لائی جائے جس سے یہودیوں یا اسرائیل کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو۔ وہ جس دشمن کے لیے اب تک دنیا کی ہر برائی کو گلے لگاتی رہی تھی، جس کی خاطر وہ بڑے سے بڑا جُرم کرتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتی تھی، جس کے اشارے پر نہ جانے کیسے کیسے کھیپ میں اترتی رہی تھی وہ۔ آج وطن کی محبت میں اس سے بغاوت پر اتر آئی تھی۔ وہ اس کی راہ میں حائل ہو رہی تھی مگر چاہتی اب بھی وہ یہی تھی کہ نہ وطن کی پیشانی پر بدنامی کا داغ لگے اور نہ ہی دشمن کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ دونوں ہی کو محفوظ و مامون دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے دونوں کا خیال تھا۔ وہ دونوں کو چاہتی تھی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ ایسی عورت جس کی زندگی میں نیکی کا گزر ہی نہ ہو، جس کے دن رات انتہائی گھٹیا اور ذلیل کاموں میں صرف ہو رہے ہوں، جسے حصولِ زر کے سوا دوسری کسی بات سے دلچسپی ہی نہ ہو، وہ ایک دم ایسی ہو جائے گی۔ اس کے سینے میں وطن کی محبت جاگزیں ہو سکے گی۔ لیکن وہ رب سارے جہانوں کا بڑی طاقت والا ہے۔ وہ کیسے کیسے لوگوں سے کیسے کام لے لیتا ہے، یہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے سپرد کر دی تھی تو عالیہ جیسی عورت کے سینے میں میرے وطن کی محبت بھر دینا اس کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔

*

میں ناشتا کر رہا تھا کہ ہارون نے مجھے آرتھر اور لزی کے آنے کی اطلاع دی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے وہ دونوں بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ لزی مجھے دیکھتے ہی بولی "کیسے ہیں آپ جنابِ عالی! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بالکل ٹھیک ہوں لزی بیگم! آئیں ناشتا کریں آپ لوگ بھی۔"

"آپ کھائیں مسٹر جیلانی! ہم ناشتا کر کے نکلے تھے گھر سے۔" آرتھر نے مجھے جیلانی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے چونک کر لزی کو دیکھا۔ وہ ہنس کر بولی۔ "گھبرائیں مت جنابِ عالی! مجھے پاپا نے سب کچھ بتا دیا ہے آپ کے بارے میں۔ افسوس مجھے بس یہ ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔ اگر آپ بتا دیتے مجھے، تب بھی آپ کی توقیر میرے دل میں کم نہ ہوتی۔ خیر چھوڑیں اس قصے کو، یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کوئی شکایت نہیں کر رہی ہوں آپ سے۔"

آرتھر نے فوراً اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس لیے لزی کو اندھیرے میں نہیں رکھا ہے کہ اب اسے بھی تمھارے ساتھ جانا ہے۔ یہ ساتھ رہے گی تو اس سے کچھ چھپا نہیں رہ سکے گا۔ اچانک اسے حقیقت کا علم ہوتا تو نہ جانے اس کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ اسی لیے میں نے اسے ہر بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے اسے اپنے تمام دوستوں کے پتے وغیرہ دے دیے ہیں۔ وہ لوگ اکثر و بیشتر یہاں میرے پاس آتے رہتے ہیں اس لیے لزی انھیں اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ بھی لزی سے خوب واقف ہیں۔ ضرورت پڑنے پر تم ان سے ہر طرح کی مدد حاصل کر سکتے ہو۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا مسٹر آرتھر! لزی کو تمام باتوں کا علم ہونا چاہیے تھا۔ آخر یہ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ پتا نہیں راستے میں کیا حالات پیش آئیں۔ بے خبری میں ان کے لیے تو مشکل پیدا ہو جاتی نا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ یہی خیال تھا مجھے بھی۔ اچھا میں چلوں گا۔ یہ الزبتھ اب یہیں رہے گی اور یہیں سے تمھارے ساتھ چلی جائے گی۔ اپنی ضرورت کا سامان یہ ساتھ لے آئی ہے۔ وہ یہاں اسپتال میں ہی موجود ہے۔ روانگی کا تم لوگوں کی سارا انتظام ہو چکا ہے۔ اب ہماری ملاقات اسی وقت ہوگی جب تم واپس آؤ گے۔"

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر لزی کو خدا حافظ کہہ کے واپس چلا گیا۔ میں نے لزی سے کہا۔ "اس ڈاکٹر دشمن نے تو اچانک مجھے اپنے قبضے میں کر کے پریشان ہی کر دیا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ اب شاید مجھے اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ تمھیں پتا بھی نہ چل سکے گا کہ میں کب واپس چلا گیا۔ ایک فکر مجھے یہ بھی ستا رہی تھی کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ تمھیں کسی نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ مجھے راستے ہی سے ان لوگوں نے اٹھا لیا ہے۔"

"ایسا نہیں تھا جنابِ عالی! ہمیں ایک گھنٹے کے بعد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کو گریگری کے گھر سے آتے ہوئے راستے میں کچھ نامعلوم لوگ ہمفرے سے چھین کر لے گئے ہیں۔ البتہ یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔" وہ بولی۔

"کیا گریگری آیا تھا تمھارے پاس؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"گریگری اور ہمفرے دونوں ہی آئے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے تمھارے لیے۔ گریگری بار بار افسوس کر رہا تھا کہ اس نے تمھاری نگرانی کیوں نہیں کرائی اس وقت۔ ہمفرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ اکیلے کیوں جانے دیا تمھیں؟"

"اسے پریشان ہونا بھی چاہیے۔ بڑی خبر گیری کی ہے اس نے میری۔ اور اب جب کہ وہ مجھے واپس جانے کے لیے کہہ چکا تھا، میں اچانک یوں غائب کر دیا گیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے لے جانے والے میرے اپنے ہی ہیں۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہوگا کہ جو لوگ اب تک مجھ پر حملے کراتے رہے ہیں، انھوں نے ہی اغوا کر لیا ہے مجھے۔"

"اس کی پریشانی کی وجہ یہ ہے جنابِ عالی! کہ وہ خود کو اس کا ذمے دار سمجھ رہا ہے۔ وہ آپ کے اغوا کو اپنی غفلت اور کوتاہی کا سبب جان رہا ہے۔" لزی نے بتایا۔

"ویسے یہ ایک اعتبار سے اچھا ہی ہوا۔ اب اسے یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ تم بھی میرے ساتھ گئی ہو یہاں سے۔"

"کیا اچھا ہوا اور کیا نہیں، یہ تو آپ ہی بہتر جان سکتے ہیں جنابِ عالی! میں کیا کہہ سکتی ہوں اس سلسلے میں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

کیسی عیاری اور مکاری بھر رکھی تھی اس نے اپنے اندر۔ کیسی ردا ڈال رکھی تھی اس نے اپنے اوپر، کسی طرح کھل کے ہی نہیں دیتی تھی وہ۔ اسے یہی خوش فہمی تھی ابھی تک کہ میں اس کے دروں سے بے خبر ہوں، کچھ جانتا ہی نہیں ہوں اس دوموئی کے بارے میں۔ وہ اسرائیل زادی اب بھی مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ میری حقیقت سے بے خبر ایک سیدھی سچی لڑکی ہے جو میری محبت سے مجبور ہو کر صرف میری خاطر اپنا گھر، اپنے والدین اور اپنا وطن چھوڑ کر میرے ساتھ اتنی دور جا رہی ہے۔ اور اس ذلیل آرتھر نے بھی مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے گرگوں سے لزی کی واقفیت کا ایک معقول جواز پہلے ہی پیش کر دیا تھا تاکہ میں یہ خیال ہی دل میں نہ لاؤں کہ یہ معصوم صورت مظلوم لڑکی ان زمانے بھر کے چھٹے ہوئے غنڈوں، اسمگلروں اور سازشیوں کو کیسے جانتی ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے مہاتماؤں کی گپھا میں جا اتارا تھا میری ایک چھوٹی سی حماقت نے۔ ٹرین میں بیٹھ کر موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش نے اس حال کو پہنچا دیا تھا مجھے۔ بڑے ہشت پا قسم کے لوگ تھے یہ، ان کی ہر راہ گزر بیک وقت کئی کئی سمتوں میں جا کر نکلتی تھی اور بے حد زود اثر زہر بھرے پھرتے تھے یہ اپنے پوٹوں میں، ان شیش ناگ لوگوں کے درمیان آ کر مجھے پتا چلا کہ میرا اصل قد کاٹھ کیا ہے۔ میں تو بس یوں ہی چند لونڈوں کو مار کر اِترا تا پھرتا تھا اور محض اتنی سی بات پر بڑا قد آور سمجھ بیٹھا تھا اپنے آپ کو۔ وہ تو تقدیر میری اچھی تھی کہ اس پولیس افسر

گر بگڑی کے دل میں خدا نے ہمدردی ڈال دی میرے لیے اور اس نے ان کا دروں بروں سب کھول کے رکھ دیا میرے آگے اور مجھے بتا دیا کہ لے میاں غلام جیلانی یہ ہے اس ابلا پری لزی کی اصلیت۔ اگر اس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا نہ ہوتا تو کون جانے کس خندق میں جا ٹھہرتا میں، کسی وادیٔ پُرخطر میں مسکن ہوتا میرا۔ ایسا ہی چکر دیا تھا اس بنتِ یہود، اس ابلیس کی بڑ پوتی نے مجھے۔ میرے تو ہوش ہی گم ہو گئے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں اس کی آنکھوں کی جھیل میں اُتر کر گم ہو گئی تھیں کہیں، پرواز کی ساری قوت کھو بیٹھا تھا میں اس کی ریشمی زلفوں کے جال میں الجھ کر۔

مَیں نے جواب میں اسی جیسی مکاری کی ردا اوڑھ لی تھی۔ میں نے کہا ”اب ایسے بات نہیں بنے گی لزی بیگم! اب تم میرے معاملات سے علیحدہ نہیں رہ سکتیں۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے میرے سانچے میں ڈھلنا ہو گا تمھیں۔“

”میں نے اختلاف تو نہیں کیا جناب عالی! آپ سے کبھی۔ اب آپ کو زندگی کے سفر میں ہمراہی مان لیا ہے تو آپ کے ساتھ قدم سے قدم بھی ملا کر تو چلنا ہی ہو گا مجھے۔“ وہ سر تسلیم خم کر دینے کے انداز میں بولی۔

”شکے بھئی شکے، لزی بیگم! جی خوش کر دیا ہے اس گھڑی تو آپ نے۔“ میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

اس نے ایک ادائے خاص سے شرما کر مسکراتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں اپنی۔ اُس کی اس ادا پر تن، من، دھن سے قربان ہو جانا چاہیے تھا مجھے۔ مگر میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں ایک موٹی سی بھاری بھرکم گالی لڑھکا دی اس کی طرف اور شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا ”امریکی لڑکی، مشرقی لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے بڑی اچھی لگتی ہے۔ لزی بیگم آپ کی اس ادا نے تو گھائل کر کے ڈال دیا ہے مجھے۔“

”کس نے گھائل کر ڈالا ہے آپ کو جیلانی؟ آج تو آپ بالکل رانجھا یا مہینوال لگ رہے ہیں۔“ میری بات ختم ہوتے ہی اچانک عالیہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ وہ سیدھی میری طرف ہی آ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر لزی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ مگر دوسرے ہی پل مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھ گئی۔ بولی ”آ ہا، الزبتھ آئی ہوئی ہیں۔ بہت دن بعد ملی ہیں الزبتھ! کہاں ہیں آپ، نظر ہی نہیں آتیں کبھی؟“

الزبتھ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”میں تو اپنے گھر ہی ہوتی ہوں مسز دھمن! آپ نے کبھی زحمت ہی نہیں کی ادھر آنے کی۔ بہت مصروف رہتی ہیں غالباً۔ کلینک کیسا چل رہا ہے آپ کا؟“

”یہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں الزبتھ! مصروفیت تو واقعی بہت بڑھ گئی ہے آج کل۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے کلینک میں۔ دل تو بہت چاہتا ہے آپ لوگوں کی طرف آنے کو مگر وقت ہی نہیں ملتا۔“ عالیہ نے صفائی پیش کی۔

”اور مسٹر دھمن تو ٹھیک ہیں نا۔ کہاں ہیں وہ؟ نظر نہیں آ رہے ہیں آج؟“ لزی نے کہا۔

”وہ آج ہیں نہیں یہاں۔ نیویارک گئے ہوئے ہیں۔ شام تک واپس آئیں گے۔“ عالیہ نے اسے بتایا۔ پھر پوچھا ”آپ کب آئی ہیں یہاں؟“

”بس تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ یہی کوئی دس منٹ ہوئے ہوں گے۔“ الزبتھ نے جواب دیا۔

”اور وہ مسٹر آرتھر کہاں ہیں؟ وہ نہیں آئے آپ کے ساتھ؟“ عالیہ نے سوال کیا۔

”وہ بھی آئے تھے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے، پھر واپس چلے گئے مجھے یہاں چھوڑ کر۔“ الزبتھ نے بتایا۔

”جب دو عورتیں یکجا ہو جاتی ہیں تو بے چارہ اکیلا مرد لٹو کی طرح دیدے نچا نچا کر انھیں دیکھنے کے سوا کس کام کا رہ جاتا ہے۔ وہ یہ بھول ہی جاتی ہیں کہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود ہے ان کے درمیان۔“ میں بولا۔

”اوہ نہیں بھئی۔ اب ایسا تو نہیں ہے جیلانی! آپ ہی کی خاطر تو ہم اکٹھا ہوئی ہیں یہاں اور آپ کو ہی بھول جائیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی زیادہ دیر بھی تو نہیں ہوئی ہے شاید ہمیں گفتگو کرتے ہوئے۔“ عالیہ جلدی سے بولی۔

”یہ چاہتے ہیں مسز دھمن! کہ یہاں آنے والے ان کے سوا کسی سے بات چیت نہ کریں۔“ لزی مسکراتے ہوئے بولی۔

”اب ایسا خود غرض بھی نہیں ہوں میں لزی بیگم! مَیں نے تو آپ دونوں کی مزاج پُرسی کو طول پکڑتے دیکھ کر صرف اس خیال سے کہی تھی یہ بات کہ کہیں آپ لوگ مجھے فراموش ہی نہ کر بیٹھیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ایسے خیالات کو جگہ نہ دیا کریں دل میں جناب عالی! آپ بھی کوئی فراموش کرنے والی شے ہیں؟“ لزی بولی۔

میں نے مسکرا کر اس فتنۂ بنی اسرائیل کو دیکھا اور عالیہ سے بولا ”یہ ناشتے کے برتن اٹھوا دیں عالیہ اور چائے منگوا دیں میرے لیے اور وہ سگریٹ بھی ختم ہو چکے ہیں میرے پاس، وہ بھی منگوا دیں۔“

”جی اچھا۔ لائیں یہ برتن میں خود ہی لے جاتی ہوں۔ چائے

اور سگریٹ بھجوا دوں گی میں آپ کے لیے۔ مجھے ذرا دیر لگے گی آنے میں، وہ ڈاکٹر ہارون کو کچھ کام ہے مجھ سے، وہ انتظار کر رہے ہیں میرا اپنے آفس میں۔“ عالیہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ برتن لے جاتے ہوئے اس نے لزی سے پوچھا ”چائے آپ بھی پئیں گی الزبتھ! آپ کے لیے بھی بھیجوں نا؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں پئیں گی یہ چائے۔“ میں لزی سے پہلے ہی بول پڑا ”یہ نہیں پئیں گی تو میں کیسے پی سکوں گا اکیلے۔“

”اوہ، ہاں، یہ تو میں بھی بھول ہی گئی تھی۔ آپ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اب۔“ عالیہ ہنستے ہوئے بولی اور باہر نکل گئی۔ میں نے لزی کو دیکھا۔ میری آنکھوں میں شوخی دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”دیکھا لزی بیگم! کتنی سمجھ دار ہے یہ مسز دھمن! ہمیں تنہائی میں دل کی باتیں کرنے کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے چلی گئی ہے وہ اس گھڑی۔ اور بہانہ یہ کیا ہے اس نے کہ ڈاکٹر ہارون اس کا منتظر ہے۔“

”حالانکہ ضرورت نہیں تھی انھیں ایسا کرنے کی۔ وہ جانتی ہیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ وہ ہمارے درمیان زیادہ دیر نہیں رہ سکیں گی۔ مجھے تو ان کی آنکھوں میں کچھ اور ہی نظر آیا تھا اس وقت جناب عالی!“ وہ بولی۔

”کیا؟ تمھیں کیا نظر آیا تھا اس کی آنکھوں میں؟“ میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

”اگر میں دھوکا نہیں کھا رہی ہوں تو میرا خیال ہے کوئی اور ہی جذبہ انگڑائیاں لے رہا ہے آپ کے لیے ان کے سینے میں۔ وہ آپ سے بے حد متاثر معلوم ہوتی ہیں مسٹر غیاث احمد!“ وہ بولی۔

”متاثر تو ضرور ہو گی وہ مجھ سے۔ مگر اس طرح نہیں جیسے تم سمجھ رہی ہو۔ کوئی خوشگوار یادیں وابستہ نہیں ہیں میرے ساتھ اس عالیہ کی۔ بلکہ وہ تو میرے بارے میں جب ماضی کے حوالوں سے سوچتی ہو گی تو دل کانپ اٹھتا ہو گا اس کا۔ خوف سے زرد پڑ جاتی ہو گی وہ۔ ایسے میں کوئی حسین جذبہ کہاں سما سکتا ہو گا اس کے دل میں میرے لیے۔“ میں نے کہا۔

”یہ خیال ہے جناب عالی! ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ محبت کی آنکھیں بالکل نہیں ہوتیں۔ قطعی طور پر اندھی ہوتی ہے وہ۔ جب کسی کے دل میں سماتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کون ہے اور کیسا ہے۔ دشمن کو بھی سجن بناتے دیر نہیں لگتی اسے۔ آپ نے بے شمار ایسے واقعات پڑھے، سنے یا دیکھے ہوں گے کہ کوئی حسنِ مجسم کسی حبشی کے عشق میں گرفتار ہے یا کوئی الھڑ دوشیزہ کسی عمر رسیدہ شخص کے لیے آہیں بھرتی پھرتی ہے۔ ایسے نوجوان لڑکے یا لڑکیاں تو ہر جگہ ہر وقت مل جاتے ہیں جو اپنے سے کئی گنا زیادہ عمر کے مردوں یا عورتوں کے عشق میں مبتلا ہیں۔ آپ آنکھیں بند کر لیں کسی کی طرف سے یہ اور بات ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ محبت پر ملک، ملت، رنگ نسل یا عمر کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ میں نے مسز دھمن کی آنکھوں میں بڑی چاہ دیکھی ہے آپ کے لیے۔“

”اچھا۔ بڑی گہری نظر ہے تمھاری۔ جو چیز میں اتنے عرصے میں نہیں دیکھ سکا، وہ تم نے چند ساعتوں میں دیکھ لی۔“

”عورت بڑی حساس ہوتی ہے ان معاملات میں خصوصاً ان کے لیے جن کی محبت کا سمندر خود اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ وہ ان آنکھوں کو پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی جو اس کے محبوب پر جمی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارے منہ میں رقابت کی زبان بول رہی ہے اس گھڑی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

وہ سنجیدہ ہو کر بولی ”شکر یہ ہے جناب عالی! کہ ہم آج ہی شام کو روانہ ہو رہے ہیں یہاں سے۔ ورنہ اس مسز دھمن کی آنکھوں کو اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ دوبارہ ایسی نظریں ڈال سکے آپ پر۔“

”اچھا، کیا کرتیں تم اس کے ساتھ؟ بڑی زلزلہ قسم کی عورت ہے، چیتے پالتی رہی ہے وہ۔“ مَیں نے کہا۔

”اگر شیر ببر بھی پالتی رہی ہو تو میرے سامنے کتنی دیر ٹک سکتی ہے۔ مار دھاڑ میں اچھے اچھے باکسر اور ریسلر مقابلہ نہیں کر سکتے میرا۔ جوڈو کراٹے، مارشل آرٹ، بوکسنگ، ریسلنگ غرض لڑائی کا کون سا فن ہے جو میں نے سیکھ نہیں رکھا ہے۔ وقت پڑا کبھی تو دکھا بھی دوں گی آپ کو یہ کمالات۔“ وہ جذباتی انداز میں بولی۔

”اچھا! یہ سب کچھ کر لیتی ہو تم؟ کمال ہے! پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا تم نے اس کا؟“

”ضرورت بھی کیا تھی، خواہ مخواہ اپنی بڑائی جتانے کی۔ کوئی پیشہ تو نہیں ہے یہ میرا۔ بس یوں ہی سیکھ لیا ہے یہ میں نے، کبھی ضرورت پڑنے پر اپنا دفاع کرنے کے خیال سے۔ کسی پر رعب جمانا مقصود نہیں ہے مجھے۔“

”یہ بہت اچھی بات ہے لزی! بڑی اعلیٰ ظرف ہیں آپ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اس بات سے۔“ مَیں نے کہا ”لیکن کبھی مجھ پر نہیں آزمانے لگنا اپنے یہ سارے فن۔ دیکھیں، بڑی محبت ہے میرے دل میں آپ کے لیے۔“

"واہ جناب عالی! کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ ایسی عاقبت نااندیش تو نہیں ہوں میں کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی دنیا اندھیر کرلوں گی۔ یہ تو خودکشی کرنے کے برابر ہوگا میرے لیے۔" وہ اداسی سے بولی۔

میں عالیہ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے گریگری کو میرا پیغام پہنچا دیا یا نہیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ لزی کچھ دیر کے لیے میرے پاس سے ہٹ جائے۔ مگر وہ تو کمبل ہو رہی تھی کسی طرح ایک پل کے لیے بھی میرا پیچھا چھوڑتی نظر نہیں آتی تھی وہ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ صبح عالیہ کے آنے سے پہلے ہی وہ بنی اسرائیل کا فرزند آرتھر اسے مجھ پر مسلط کر جائے گا۔ ورنہ میں عالیہ سے جلدی آنے کو کہہ دیتا یا فون پر ہی بات کر لیتا اس سے۔ ایک گھنٹے کے بعد عالیہ میرے کمرے میں واپس آئی تب بھی وہ ایک پل کے لیے بھی اٹھ کر کہیں نہیں گئی۔ میرے بیڈ کے ساتھ کرسی پر بیٹھی باتیں بناتی رہی۔ عالیہ پھر کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ دوپہر تک تین مرتبہ عالیہ میرے کمرے میں آئی مگر اسے ایک بار بھی مجھ سے اکیلے میں کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ وہ خود بھی گریگری کا پیغام مجھ تک پہنچانے کے لیے بے چین تھی۔ سہ پہر تین بجے کے قریب ایک نرس نے آکر لزی کو یہ پیغام دیا کہ عالیہ، دشمن کے آفس میں اس کی منتظر ہے۔ لزی نے اٹھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "اجازت دیں جناب عالی! میں دیکھ لوں، مسز دشمن مجھے کیوں بلا رہی ہیں۔"

"ہاں، ہاں ضرور جاؤ۔ اس میں مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

لزی کے جاتے ہی ہارون میرے کمرے میں داخل ہوا، وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کس مصیبت کو گلے لگالیا ہے جناب! یہ آپ نے؟ یہ تو کسی کو آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی ہے۔"

"اسے یہی ذمے داری سونپی گئی ہے اس کے سرپرستوں کی طرف سے۔ اسے اپنا کام کرنے دیں آپ، اگر خلل اندازی کی گئی اس کے کام میں تو وہ لوگ ہوشیار ہوجائیں گے۔ اس صورت میں ممکن ہے نقصان بھی پہنچا دیں وہ ہمیں۔ انھیں ذرا سا شک بھی نہ ہونے دینا چاہیے، بڑی تابعداری ظاہر کرتا ہے ان کے سامنے تو ہم سب کو۔"

"جی ہاں، بہت احتیاط کی ضرورت ہے جیلانی صاحب! اسی لیے میڈم نے اسے اپنے پاس بلا کر مجھے یہاں بھیجا ہے۔ وہ صبح سے کئی بار آپ کے پاس آئیں مگر بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا انھیں۔"

میں نے اس کی تمہید لمبی ہوتے دیکھ کر بات کاٹ دی۔ بولا۔ "زیادہ لمبی گفتگو کا وقت نہیں ہے، جلدی سے بتایئے، گریگری سے ملیں تھیں وہ تمھاری میڈم؟"

"جی ہاں، وہی بتانے کے لیے بھیجا ہے انھوں نے مجھے۔ وہ مسٹر گریگری کو آپ کے بارے میں بتا چکی ہیں۔ انھوں نے پیغام بھیجا ہے کہ یہ لوگ اگر آپ کو واپس بھیج رہے ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ چلے جائیں ان کے ساتھ۔ کراچی پہنچتے ہی ہمارے آدمی آپ سے خود رابطہ قائم کرلیں گے۔ تحریر انھوں نے اس لیے کوئی نہیں دی ہے کہ وہ کسی غلط ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔" ہارون نے بتایا۔

میرے دل سے ایک بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ گریگری کو میرے بارے میں اطلاع مل چکی ہے، میری یہ فکر بھی دور ہو گئی تھی۔ ہارون پیغام پہنچا کر واپس چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد لزی دوبارہ میرے کمرے میں واپس آگئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیوں بلایا تھا اس مسز دشمن نے؟"

"وہ پاپا کا فون تھا۔ وہ بتا رہے تھے آپ کے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں۔ روانگی کی تیاری کرلینا چاہیے اب مجھے۔ میرا پاسپورٹ وغیرہ وہ شام کو پہنچا دیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

میں خاموش ہو گیا۔ نہ جانے وہ جھوٹ بول رہی تھی یا سچ مچ ہی فون کیا تھا آرتھر نے۔ میں اس سے جرح کر کے اسے سچ بولنے پر مجبور تو نہیں کر سکتا للہذا میرے لیے خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جال
ساتواں حصہ

ناآسودہ جذبوں کی تسکین اور آتشِ انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرائم اس کی
زندگی بن گئے۔ نادیدہ منزلیں، انجانے راستے اور غیر متوقع
حادثات اس کی تقدیر بن گئے۔ ایک مردم گزیدہ زمانے
ستم رسیدہ وقت سے ٹکراتے ہوئے انسان کی سرگزشت

طیارہ کراچی کی طرف محوِ پرواز تھا اور میرا دل دھڑک دھڑک کر اپنے رب سے خیریت کے ساتھ طیارے کے کراچی پہنچ جانے کی دعائیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی اس وقت میری، جسے میں کوئی نام دے سکتا ہوں نہ اسے الفاظ میں بیان ہی کر سکتا ہوں۔ یار لوگوں نے ایک اسٹریچر پر لاد کے طیارے کی ایک آرام دہ نشست پر لا رکھا تھا مجھے۔ لزی پام روز اسپتال کی نرس کی حیثیت سے میری دیکھ ریکھ کا فرض سنبھالے ہوئے تھی۔ کاغذات میں میرا نام شاہد حسین درج تھا۔ پتا کراچی کے ایک فیشن ایبل علاقے کا تھا۔ میں کراچی سے بغرضِ تفریح امریکا آیا تھا۔ سان فرانسسکو میں ایک حادثے کے سبب میری دونوں ٹانگیں تقریباً مفلوج ہو گئی تھیں۔ لزی کے پاس میری ایکسرے اور میڈیکل رپورٹ تھی۔ ایکسرے میں میرے دونوں پیروں کی ہڈیاں کئی کئی جگہ کچلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ میرے صحت یاب ہونے میں ابھی بہت وقت درکار تھا اور چونکہ میں اتنے عرصے امریکا میں رہ نہیں سکتا تھا اس لیے مجھے واپس بھیجا جا رہا تھا۔ جو طیارہ مجھے لے کر جا رہا تھا اس میں پانچ افراد تو سان فرانسسکو سے سوار ہوئے تھے اور بقیہ بارہ افراد کو نیویارک سے سوار ہونا تھا۔ طیارہ تھائی ائیر لائن کا تھا۔ تھائی لینڈ کی حکومت نے اپنے ایک بڑے پروجیکٹ کی تکمیل میں مدد حاصل کرنے کے لیے کچھ ماہرین کو امریکا سے بلایا تھا اور یہ طیارہ انھیں لینے کے لیے خصوصی طور پر بھیجا گیا تھا۔ آرتھر فیتلی نے اپنے اثر و رسوخ سے اس طیارے میں میرے لیے بھی جگہ حاصل کر لی تھی۔ طیارے کو نیویارک سے پیرس، استنبول اور کراچی کے روٹ سے بنکاک پہنچنا تھا۔ اس لیے اسے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ پاسپورٹ پر اصل شاہد حسین کی جگہ میری تصویر اتنی مہارت سے لگائی گئی تھی کہ بغور دیکھنے پر بھی اس کے جعلی ہونے کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی ایک ایسے دونوں ٹانگوں سے معذور شخص کے کاغذات پر زیادہ توجہ کون دیتا ہے جس کے ساتھ ایک چیریٹی اسپتال کی نرس ہو، تمام میڈیکل رپورٹیں بھی ہوں۔ امریکا جیسے چوکنا اور چاق و چوبند ملک کے نہایت فرض شناس اور دور بیں حکام اس جعلسازی کو نہیں پکڑ سکے تھے تو کراچی ائیر پورٹ پر متعین افراد کا مجھے کیا خوف ہوتا۔ اوّل تو لزی جیسی نازنین کا نظارۂ جمال انھیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتا کہ وہ کاغذات پر غور کر سکیں اور اگر پھر بھی کوئی بدذوق، زاہدِ خشک اتنا وقت نکال ہی لیتا کہ ان کی طرف توجہ دے سکے تو اس کے لیے اصل اور نقل میں تمیز کرنا آسان نہ ہوتا۔

پیرس کے بعد طیارے کو استنبول میں تیل لینے کے لیے رکنا تھا۔ لیکن استنبول ائیر پورٹ پر طیارے کے انجن میں کچھ ایسی خرابی ہو گئی کہ اسے دوبارہ پرواز کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ کوئی نئی افتاد نہ آ پڑے،

میرا یہ سفر جلد تمام ہو جائے، ہمیں استنبول میں رکنا نہ پڑے۔ وہ دلوں کے بھید جاننے اور سب کی سننے والا رب کُل جہانوں کا مالک بڑا کارساز ہے۔ اس نے میری دُعاؤں کو قبولیت بخش دی اور ہمارا جہاز استنبول سے اڑان بھر کے رات کے گیارہ بجے کے قریب کراچی آ ٹھہرا۔ روشنیوں کے اس جگ مگ کرتے شہر میں پہلے بھی میں آ چکا تھا۔ لیکن اس سمے یہ شہر مجھے اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا خوبصورت آج معلوم ہو رہا تھا۔ میرے وطن کی جان کراچی جس کے سائے میں پاکستان کے گوشے گوشے سے تھکے ماندے تباہ حال لوگ آکر پناہ لیتے ہیں، بڑا غریب پرور کشادہ دل اور سخی ہے۔ یہاں آنے والے خالی ہاتھ اور خالی پیٹ آتے ہیں اور سخی کے در سے جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔ کبھی مایوس نہیں لوٹاتا یہ کسی کو۔ آج مجھے اس شہر کی مٹی سے ممتا کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اس سوہنی دھرتی پر ماتھا ٹکا کے اس مٹی کو چوم لوں، پیشانی پر مل لوں اسے اور چیخ چیخ کر کہوں۔ اے دنیا والو! دیکھو یہ میری پاک سرزمین کی مٹی ہے۔ اس سرزمین کی جس کی آزادی کے لیے میرے بزرگوں نے اپنے گھر جلا دیے، اپنی نسلیں کٹوا دیں، سب کچھ قربان کر دیا اور اس کی آبیاری کے لیے ایک نئے عزم کے ساتھ یہاں آ بسے۔ یہ اِن غازیوں اور شہیدوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ لوگو! دیکھو کیسا شاداب ہے میرا وطن۔ اس کی شادابی ان شہیدوں کی مرہونِ منّت ہے جنھوں نے اپنے خون سے اس کھیتی کو سینچا اور اس کی آبیاری کی۔ میرے اس سوہنے دیس کی یہ آزادی خدا کی اس نافرمان اور راندۂ درگاہ قوم کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی ہے۔ وہ اس کی بربادی کے لیے اپنے زرخرید غلاموں کے ذریعے یہاں طرح طرح کے نعرے اسمگل کر رہے ہیں۔ وہ میری قوم کے سیدھے سادے لوگوں کو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ یہ کوئی نظریاتی ملک نہیں ہے۔ نظریہ کوئی چیز ہی نہیں ہوتی اسے ایک سیکولر اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ حالانکہ دوسری جانب وہ دنیا کو یہ بھی باور کرانے میں مصروف ہیں کہ اسرائیل ایک نظریاتی مملکت ہے۔ کیسا دلچسپ مذاق ہے یہ اور کیسے نابینا ہیں وہ عقل کے دشمن جو اُن کی آواز میں آواز ملا کر اس ملک کو ایک لادینی مملکت بنا دینے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

کسٹم وغیرہ کی کارروائی میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ طیارے سے اترنے والے صرف دو ہی مسافر تھے، ایک میں تیرہ بخت غلام جیلانی اور ایک وہ میری نگراں الزبتھ فیلی جو ایک نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ مجھے اسٹریچر پر ڈال کر جیسے ہی باہر لایا گیا دو خوش پوش نوجوان تیزی سے لپک کر میرے قریب آ گئے۔ دونوں کے قد چھ چھ فٹ کے قریب ضرور رہے ہوں گے۔ صحت ان کی قابلِ رشک حد تک اچھی تھی۔ دونوں نے نہایت قیمتی کپڑے کے تھری پیس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں ان کے ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مہذبانہ انداز میں کہا "مجھے ڈاکٹر فیروز بخت کہتے ہیں جناب! اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں تو آپ شاہد حسین صاحب ہیں اور سان فرانسسکو سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "آپ کو بالکل دھوکا نہیں ہوا ہے ڈاکٹر! میں شاہد حسین ہی ہوں۔ لیکن کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کو میرے آنے کی اطلاع کیسے ہوئی؟"

"وہ جناب! ہمیں ڈاکٹر دھمن نے فون پر بتایا تھا۔ انھوں نے حکم دیا تھا کہ آپ کے لیے کراچی ائیر پورٹ پر ایمبولنس کا انتظام ہونا چاہیے۔ تو جناب ہم لینے آئے ہیں آپ کو۔"

"شکریہ آپ لوگوں کا۔ اور ڈاکٹر دھمن کا تو میں بے حد مشکور ہوں بڑی مہربانی کی ہے انھوں نے میرے ساتھ۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ پھر اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا "ان کا تعارف نہیں کرایا آپ نے؟"

"یہ میرے ساتھی ڈاکٹر شجاعت خان ہیں۔ انھیں آپ ڈاکٹر خان کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں جناب!"

وہ میرے لیے ایک ایمبولنس لے کر آئے تھے جس پر ایک پرائیویٹ اسپتال کا نام بے حد جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ دو میل نرس بھی موجود تھے۔ جنھوں نے مجھے نہایت آہستگی اور آرام سے اٹھا کر اپنے ساتھ لائے ہوئے اسٹریچر پر منتقل کیا اور پھر اس اسٹریچر کو ایمبولنس کے اندر پہنچا دیا۔ دونوں میل نرس اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی آ بیٹھے تھے۔ لزی کو انھوں نے آگے ڈرائیور کے ساتھ بٹھا دیا۔

ائیر پورٹ سے روانہ ہو کر ایمبولنس کوئی نصف گھنٹے کے بعد ایک جگہ جا ٹھہری اور جب انھوں نے مجھے باہر نکالا تو پتا چلا کہ وہ جگہ جہاں انھوں نے مجھے لا اتارا تھا ایک جدید طرز کی عالی شان کوٹھی تھی۔ جس کے ہر در و دیوار سے اس میں رہنے والے کی امارت جھلک رہی تھی۔ وسیع لان میں سبز گھاس کا فرش تھا، جس کے چاروں طرف خوش نما پھولوں کے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں قسم قسم اور رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے اس حصے میں اتنی تیز روشنی کا بندوبست کر رکھا تھا انھوں نے کہ رات کے اس گمبھیر سمے میں ... زمین پر پڑی ہوئی سوئی بھی نظر آ سکتی تھی۔ انھوں نے میرا اسٹریچر ایمبولنس سے نیچے اتار کر زمین پر رکھا تو میں اٹھ کر اپنے پیروں پر سیدھا ہو گیا۔ ڈاکٹر خان نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور آگے ڈرائیونگ نشست کی جانب بڑھ گیا۔ ڈاکٹر فیروز نے میرے قریب آکر سرگوشی میں کہا "ابھی کھڑے نہ ہوں آپ۔ وہ نرس دیکھ لے گی تو کوئی مصیبت کھڑی کر دے گی۔"

اس کا اشارہ لزی کی طرف تھا۔ میں نے کہا "اس کی فکر نہ کریں آپ۔ وہ جانتی ہے کہ میری ٹانگیں صحیح سلامت ہیں البتہ کچھ اور نہیں جانتی ہے وہ۔"

لزی بھی ایمبولنس سے نیچے اُتر آئی تھی۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑے دیکھ کر وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولی "اوہ جناب عالی! چلنے میں یہ پلاستر پریشان کرے گا آپ کو، لیٹے ہی رہیں ابھی آپ۔"

میں نے کہا "نہیں لزی! میری تو پیٹھ تختہ ہو گئی ہے لیٹے لیٹے، اب مزید نہیں لیٹ سکوں گا میں۔ اور یہ پلاستر کوئی تکلیف نہیں دے گا مجھے۔ میں سہارا لے کر چل سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو اس کی۔"

"آئیے پھر میں سہارا دے کر لے چلوں آپ کو۔" وہ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"ارے ارے، نہیں مس! آپ ہٹیں ہم لے چلتے ہیں انھیں۔" ڈاکٹر فیروز نے جلدی سے میرا بازو تھام کر کہا۔

"ہاں لزی! تم اندر چلو میں آ جاؤں گا ان لوگوں کے ساتھ۔"

ڈاکٹر خان بولا "آئیے مس! آپ میرے ساتھ آئیں۔ ان کی فکر نہ کریں بالکل، یہ اب ہماری ذمے داری ہے۔ آپ نے انھیں یہاں پہنچا دیا، اس کے بعد آپ کی ذمے داری ختم ہو گئی۔"

لزی کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی تھی مگر اس نے اپنے کسی عمل سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ وہ خاموشی سے خان کے ساتھ عمارت کے اندر چلی گئی۔ دونوں میل نرس خالی اسٹریچر کو ایمبولنس میں رکھ کر خود بھی اندر بیٹھ چکے تھے۔ اس اثنا میں فیروز مجھے سہارا دے کر آگے بڑھانے لگا۔ ایمبولنس آگے بڑھ کر عمارت کے دوسرے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ میں نے فیروز سے کہا "ڈاکٹر خان نے لزی کو ناراض کر دیا ہے۔ اسے اس انداز سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی اس سے۔ وہ کوئی معمولی نرس نہیں ہے۔ دھمن بھی ادب سے بات کرتا ہے اس سے۔"

وہ ہنس پڑا۔ بولا "کس کی بات کر رہے ہیں جناب آپ؟ ان اسمگلروں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو مسٹر گریگری کے حکم کی تعمیل میں آپ کو لینے کے لیے پہنچے تھے وہاں۔"

میں چلتے چلتے چونک کر رک گیا۔ حیرت سے دیدے پھاڑ کر میں نے اسے دیکھا "کیا... کیا.... تو تمھیں گریگری نے ائیر پورٹ پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ مگر وہ دھمن... اس نے بھی تو یہاں کسی کو میرے پہنچنے کی اطلاع دی ہو گی؟"

"ہاں، ضرور دی ہے اطلاع اس نے۔ اس کے آدمی ہم سے دو گھنٹے پہلے ہی واپس آ گئے تھے ائیر پورٹ سے، انھیں بتایا گیا تھا کہ تمھارا طیارہ صبح سات آٹھ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا یہاں۔ اب وہ صبح پھر جائیں گے ائیر پورٹ۔"

"لیکن انھیں یہ غلط اطلاع دی کس نے تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انتظام بھی ہمیں ہی کرنا پڑا تھا۔ ہم ان سے ائیر پورٹ پر کوئی تصادم نہیں چاہتے تھے۔"

یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ اتنی جلدی ان لوگوں سے مل بیٹھنا میرے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ ابھی تو بہت سے کام نمٹانے تھے مجھے۔ اس لزی بیگم کے ذریعے مجھے ان لوگوں سے متعارف ہونا تھا جو میرے وطن کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں، دھمن کے ان گرگوں سے نمٹنا تھا جنھوں نے میرا پارسل تیار کر کے سان فرانسسکو بھیج دیا تھا۔ اور انھیں بھی دیکھنا تھا جن کے لیے دھمن نے ایک بار پھر مجھے توشے دان بنا ڈالا تھا اور ان سب سے پہلے تو مجھے اپنی زنداں میں پڑی بہن آسیہ اور اپنے یار اسلم آپی کی خبر گیری کرنا تھا۔ ماں جی کے سینے سے لگ کے ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرنا تھا۔ نہ جانے کس حال میں تھی وہ۔ یہ تو اس کے ایک گوشے میں بیٹھ کے حمد و ثنا کرتے رہنے کے دن تھے، مگر تقدیر اسے اس عمر میں بھی سکون کا سانس لینے نہیں دے رہی تھی۔

میں نے کہا "یہ اچھا نہیں کیا تم لوگوں نے۔ کیا گریگری نے تمھیں ایسا کرنے کو کہا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا آپ اس جہاز سے کراچی پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں آپ کا خیال رکھنا ہے اور ضرورت کے وقت آپ کی مدد بھی کرنا ہے۔ چنانچہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ ایسے لوگ جو پہلے ہی ہماری فہرست میں ہیں، ایمبولنس لے کر ائیر پورٹ پہنچے ہیں تاکہ آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں تو ہم نے آپ کو ان سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے۔"

"خیال رکھنے کا مطلب یہ تو نہیں تھا یار! جو تم نے کر ڈالا ہے۔ تمھیں تو صرف دور دور رہ کر نگرانی کرنا تھی میری۔ اور ضرورت کے وقت مدد بھی اس طرح کرنا تھی کہ کسی کو یہ پتا نہ چل سکے کہ میرا مددگار کون ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ جناب! پھر تو بڑی غلطی ہو گئی ہے ہم سے۔ بہر حال

ہم کوشش کریں گے اس کے تدارک کی۔"
"کیا کریں گے آپ؟ کس طرح کریں گے کوشش؟" میں نے پوچھا۔
"آپ اندر چلیں جناب! اطمینان سے بیٹھ کر ترتیب دیں گے کوئی پروگرام۔" وہ بولا۔
"چلو۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ خیال رکھنا لزی کو معلوم نہ ہو تمھاری اصلیت۔ نہ اس کے سامنے کوئی ایسی بات کرنا۔ دشمن کی بڑی خاص اور اہم شخصیت ہے وہ، بڑے گن بھرے ہیں اس کے اندر اور ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے ہنر آتے ہیں اسے۔ اس کی معصوم صورت سے دھوکا نہ کھا جانا۔"
"یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کے بارے میں بتا دیا۔ ورنہ جس طرح آپ اس کے سامنے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے، اس سے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی آپ کی شریکِ راز قسم کی ساتھی ہے۔ جسے آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔"
"معلوم تو اسے بہت کچھ ہے میرے بارے میں۔ وہ یہی جانتی ہے کہ میں ایک جرائم پیشہ آدمی ہوں اور دشمن کے لیے کام کرتا ہوں۔ اب میں نے خود کو اس تنظیم کی غلامی میں دے دیا ہے جس کا دشمن بھی غلام ہے۔ لیکن اسے میرے اور مسٹر گریگری کے تعلقات کا علم نہیں ہے۔ میں اس کی اس ناواقفیت سے ہی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری اس کوٹھی میں کتنے لوگ ہیں؟"
"میرے اور خان کے علاوہ اس وقت یہاں ایک چوکیدار، ایک مالی اور ایک بوڑھی ملازمہ ہے جو کوٹھی کی صفائی اور یہاں ایک آدھ رات گزارنے کو آنے والوں کے لیے کھانا وغیرہ پکانے پر مامور ہے۔"
"ایک آدھ رات گزارنے سے کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا یہاں کوئی مستقل نہیں رہتا؟"
"جی نہیں، یہ کوٹھی صرف مہمانوں کے لیے ہے۔ ہمارا جو بھی ممبر باہر سے یہاں آتا ہے، اسے ہم اس کوٹھی میں ٹھہرا دیتے ہیں۔ مہمانوں کی ضروریات، دیکھ بھال اور انھیں تحفظ فراہم کرنا ہی میری ذمے داری ہے۔" اس نے بتایا۔
"کیا اس وقت میرا یہ پلاستر اتارا جا سکتا ہے؟" میں نے اس سے معلوم کیا۔
"ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے جناب! ہم کوئی سچ مچ کے ڈاکٹر نہیں ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔
"کوئی تیز دھار خنجر یا لوہا کاٹنے والی آری تو ہوگی نا۔ اگر نہ ہو تو کہیں سے مہیا کر دو مجھے۔" میں نے کہا۔
"یہ دونوں ہی چیزیں یہاں مل جائیں گی آپ کو۔" اس نے جواب دیا۔ "میں پہنچا دوں گا آپ کو یہ دونوں چیزیں۔"
وہ باتیں کرتے ہوئے مجھے ایک نہایت آراستہ خواب گاہ میں لے آیا۔ یہاں آرام و آسائش کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کی خواب گاہ میں ضرورت ہو سکتی ہے۔ بڑا ہی خواب ناک ماحول تھا یہاں کا۔ اندر داخل ہوتے ہی بستر پر گر کے نیند کی وادیوں میں اتر جانے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ ایسی ہی جادو اثر تھی وہ خواب گاہ۔
"کھانے وغیرہ کا انتظام کر دوں آپ کے لیے؟" اس نے مجھے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔
"نہیں، کھانا ہم جہاز میں کھا چکے ہیں۔ البتہ ایک کپ کافی ضرور پیوں گا میں۔" میں نے کہا۔
"کافی میں ابھی بنوا دیتا ہوں آپ کے لیے۔" وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑ گیا۔
"وہ آری بھی لیتے آنا۔ بیٹھنے میں بڑی تکلیف دے رہا ہے یہ پلاستر اور اس لزی کو بھی دیکھ لینا۔ کیا کر رہی ہے وہ۔"
"جی بہتر جناب!" وہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔
تین منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ آری لے کر واپس آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے آری لے کر پوچھا۔ "الزبتھ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے وہ اس وقت؟"
"آپ کی خواب گاہ کے سامنے والی لائن میں تیسری خوابگاہ میں ہیں وہ۔ شاید سونے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ملازمہ سے میں نے کہہ دیا ہے، وہ کافی لا رہی ہے آپ کے لیے۔" وہ بولا۔
"یہ علاقہ کون سا ہے جہاں ہم ہیں اس وقت؟" میں نے پوچھا
"محمد علی سوسائٹی ہے یہ جناب!"
"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔
"کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دیں جناب! یہ آپ کی مسہری کے سرہانے بٹن ہے اس کا۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ وہ مڑ کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔
صبح ہونے سے پہلے میں اپنا ٹھکانہ تبدیل کر دینا چاہتا تھا کیوں کہ یہاں رہنا میرے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ لزی پر کسی وقت بھی یہ راز کھل سکتا تھا کہ میں ان لوگوں کو ڈبل کراس کر رہا ہوں، دُہری چالیں چل رہا ہوں میں ان کے ساتھ اور یہ بات میرے منصوبے کی راہ میں بے شمار مشکلات کھڑی کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں سوچ لیا تھا کہ اسے ان لوگوں کے بارے میں بتا دوں گا، اس سے کہہ دوں گا

کہ ہم غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں، یہ دشمن کے آدمی نہیں ہیں۔ یہ کون ہیں اور کس مقصد سے ہمیں یہاں گھیر لائے ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے دشمن کے ہاتھوں کبھی کوئی چوٹ کھا چکے ہوں اور اس کا کھاتا رکھتے ہوں اپنے ساتھ اور ہمیں نشانہ بنا کے وہ پرانا حساب چکانا چاہتے ہوں۔
فیروز کے جاتے ہی میں نے آری سنبھالی اور آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ پلاستر کاٹنا شروع کر دیا۔ آری بہت اچھی تھی، اس کا بلیڈ بالکل نیا معلوم ہوتا تھا، ابھی زیادہ استعمال نہیں کیا گیا تھا شاید۔ پلاستر بڑے آرام سے کٹتا چلا جا رہا تھا۔ پھر بھی میں بہت احتیاط سے سنبھال سنبھال کے آری چلا رہا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ کہیں وہ پلاستر کو کاٹتی میرے پاؤں میں نہ اتر جائے۔ اسی دوران مجھے خیال آیا، اس کوٹھی سے باہر جا کر مجھے پاکستانی کرنسی کی ضرورت پڑے گی جو اس گھڑی میرے پاس بالکل بھی نہیں تھی۔ میں لزی کو ساتھ لے کر ساری رات سڑکوں پر تو نہیں پھر سکتا تھا، ان روشن اور شفاف سڑکوں پر کسی چور اچکے کا تو ڈر نہیں تھا مجھے۔ خوف ان کا تھا جنھیں ان چور اچکوں کو پکڑنے کا کام سونپا گیا تھا۔ میں قانون کے ان محافظوں کو خوب جانتا تھا۔ راتوں کو جرائم کی نیت سے نکلنے والوں سے ان کی بڑی یاری تھی۔ ان سے تو بھتہ بندھا ہوتا تھا ان کا۔ چنانچہ انھیں تو یہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے البتہ شریفوں پر ان کی نظریں بہت گہری پڑتی تھیں۔ رات کے سنسان وقت میں کوئی جوڑا چہل قدمی کے لیے گھر سے نکل آئے، کوئی ضرورت مند اپنی کسی اہم ضرورت کے تحت اپنا آرام تج کے سڑک پر آ جائے، کوئی اپنے بسترِ مرگ پر پڑے عزیز کو اسپتال پہنچانے کی غرض سے کسی سواری کی تلاش میں نکل کھڑا ہو تو یہ فوراً جان لیتے ہیں کہ یہ کسی بُری نیت سے نکلا ہے گھر سے۔ پھر یہ اسے کبھی نہیں چھوڑتے۔ کوئی بڑا جرم ثابت نہ ہو تو دفعہ ۱۰۹ میں تو دھرا ہی جا سکتا ہے کسی کو بھی۔ ایسے موقعے پر بھی راہِ نجات پیسے سے ہی ملتی ہے۔ کسی جوڑے سے چہل قدمی کرتے وقت نکاح نامے دکھانے کی فرمائش کرنے کا حق انھیں ہر وقت حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر لوگ نکاح نامے ہر گھڑی ساتھ لیے نہیں پھرتے تو پیسے تو ہوتے ہی ہیں نا ان کی جیب میں۔ چور ڈاکو سے تو آدمی مقابلہ کر کے بھی اپنا مال بچا لیتا ہے، اگر اس میں جرأت اور حوصلہ ہو تو لیکن ان وردی پوشوں سے اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا۔ کوئی دلیل کوئی حجت کام نہیں آتی ان کے سامنے۔ اپنے ہاتھوں سے جیب خالی کیے بغیر نجات نہیں پا سکتا کوئی ان سے۔
فیروز نے بتایا تھا کہ یہ کوٹھی جس میں اس گھڑی میں موجود تھا، محمد علی سوسائٹی میں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ یہاں سے کچھ ہی دور زر سری پر لوٹانا ہاؤس نامی ایک درمیانہ درجے کا ہوٹل تھا. جہاں مجھ جیسے ضرورت مندوں کو ہر وقت کمرہ مل سکتا تھا۔ اس ہوٹل کی انتظامیہ بے حد نیک تھی۔ وہ اپنے ہاں آنے والوں سے کبھی یہ نہیں پوچھتے تھے کہ بھائی جی یہ جو تم آدھی رات کو یوں گھسے چلے آئے ہو یہاں تو اس کی کوئی معقول وجہ بھی ہے یا نہیں۔ تمھارے پاس گھر سے بھاگ آئے ہو، کسی دشمن سے پناہ ڈھونڈتے نکلے ہو، کوئی مسافر ہو یا کوئی واردات کر کے اپنی یہاں موجودگی ظاہر کرنے کے لیے اندراج کرا رہے ہو اپنے نام کا ہمارے رجسٹر میں۔ وہ ایسے سوالات کر کے اپنے معزز مہمانوں کو پریشان نہیں کیا کرتے تھے اور جب آنے والا ایک رات کے قیام کی منہ مانگی قیمت دے رہا ہو تو کسی کو اس سے غرض ہونا بھی نہیں چاہیے کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کب تک ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں بھی لزی کو لے کر وہاں جا سکتا تھا اور جب تک میری جیب اجازت دیتی، سکون سے رہ سکتا تھا وہاں۔
دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر میں نے جلدی سے آری کرسی کے نیچے اپنے پیروں کے پاس رکھ دی اور بستر سے چادر کھینچ کے اپنے پیروں پر پھیلاتے ہوئے آواز دی۔ "کون ہے؟ آ جاؤ اندر۔"
وہ چالیس سال سے اوپر کی ایک خاصی صحت مند عورت تھی۔ وضع قطع سے اپنی وہ ملازمہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی صاف ستھری ٹرے پکڑ رکھی تھی اپنے ہاتھ میں جس میں رکھے ہوئے کپ سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ کافی لے کر آئی تھی میرے لیے۔ قریب آ کر اس نے سمٹتے شرماتے ہوئے ٹرے میرے سامنے کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "یہ کافی لیں صاحب جی۔"
میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ تیر گئی۔ اس عمر میں بھی اسے اپنے عشوہ و غمزہ و ادا پر بڑا مان تھا۔ شاید اسے اپنی زندگی کی کتاب کے گرد آلود ہو جانے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا اب تک، اسے اپنی چکا چوند کے ماند پڑ جانے کا پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ میں نے کافی کا کپ ٹرے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "نام کیا ہے بی بی! تیرا؟"
"زلیخا نام ہے صاحب جی یوں تو میرا، پر آپ کو اچھا نہ لگے تو کوئی اور نام رکھ لیں آپ۔" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔
"نام تو زلیخا بھی بُرا نہیں۔ کیا برائی نظر آتی ہے بی بی تجھے اس میں؟" میں نے پوچھا۔
"وہ جی برائی تو مجھے بھی کوئی دکھائی نہیں دیتی، پر وہ دیکھیں نا

صاحب جی! پسند بھی تو ہوتی ہے آدمی کی اپنی کوئی۔" وہ بولی۔
"ہاں، یہ ٹھیک کہا تم نے۔ میں بھی کوئی اپنی پسند کا اچھا سا نام سوچوں گا تمھارا۔ جب تک تم ایک کام کر دو میرا۔"
"ہاں، ہاں صاحب جی! کیوں نہیں کروں گی میں آپ کا کام اسی لیے تو ہوں میں یہاں۔ آپ کی خدمت کے لیے۔" وہ جلدی سے بولی۔
"وہ فیروز کہاں ہے۔ کچھ پتا ہے تمھیں اس کا؟"
"اپنے کمرے میں ہی ہیں وہ۔ آپ نے بھی کمال کیا جی۔ اس میں پتا ہونے کی کیا بات ہے؟" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔
"تو ایسا کرو، اس سے جا کر کہہ دو، تمھیں جیلانی صاحب بلا رہے ہیں۔"
"ابھی لیں جی! یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی، پتا نہیں کیا کام لیں گے آپ مجھ سے۔" وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔
گلے ہی پڑ گئی تھی وہ میرے۔ نہ جانے کیسی کیسی خوش فہمیوں کو جگہ دے رکھی تھی اس نے اپنے دل میں، کیسے کیسے سپنے دیکھا کرتی تھی وہ عمر کے اس حصّے میں بھی۔ زبان تو اس کی رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اور زبان سے زیادہ آنکھیں بولتی تھیں اس کی۔ نہ جانے حالات کی کس چکّی میں پسی جا رہی تھی وہ۔ کیسے کیسے مرحلوں سے گزر کر آئی تھی وہاں اور کتنی ناتمام آرزوئیں ستاتی رہتی تھیں اسے۔ تھی وہ کوئی ایسی ہی زمانہ گزیدہ عورت، ورنہ اس منزل پر پہنچ کر غمزے دکھانے کا ہوش ہی کہاں رہتا ہے کسی کو۔ دو ہی باتیں سمجھ میں آتی تھیں میرے۔ یا تو وہ کوئی ناتراشیدہ ہیرا تھی یا پھر ایسی کلی تھی جسے تیز آندھیوں نے وقت سے بہت پہلے شاخ سے جدا کر دیا تھا۔
میں نے کافی کا کپ خالی کر کے رکھا ہی تھا کہ وہ فیروز کے ساتھ دوبارہ واپس آ گئی۔ میں نے کپ ٹرے میں رکھ کر اس سے کہا "یہ لے جا بی بی! اور اب جا کے آرام کر تُو۔ اور ہاں دیکھ زیادہ مت سوچا کر اپنے بارے میں اور زیادہ دیر خالی بھی نہ بیٹھا کر، کرتی رہا کر کچھ نہ کچھ۔ وہ سنا نہیں ہے تُو نے خالی ذہن شیطان کا مسکن ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اپنا ذہن خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کام لیتے رہنا چاہیے اس سے۔"
"بہت اچھا مولوی جی! آپ کی باتوں کو پلّو میں باندھ کے رکھوں گی میں۔" اس نے چڑ کے کہا اور ٹرے اٹھا کر تیزی سے باہر چلی گئی۔
"کیا بات ہے جیلانی صاحب! کیا کوئی گستاخی ہو گئی اس سے؟" اس کے جانے کے بعد فیروز نے پوچھا مجھ سے۔

"اوئے نہیں یار! بس ایسی ہی ایک بات کہہ دی تھی میں نے اس سے۔ کوئی بڑی ستم رسیدہ لگتی ہے یہ مجھے۔" میں نے کہا۔
"پتا نہیں جناب! میں نے تو کبھی توجہ ہی نہیں دی اس کی طرف۔ حالانکہ دس سال ہو گئے اسے اس کوٹھی میں رہتے ہوئے۔"
"اس سے پہلے کہاں تھی یہ؟" میں نے پوچھا۔
"یہ بھی کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی میں نے۔ نہ جانے کہاں سے گھومتی پھرتی آ گئی تھی۔ ہمیں ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے رکھ لیا اسے۔ یہاں کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ جس کی وجہ سے کسی کو ملازم رکھنے سے پہلے چھان بین کی ضرورت ہو اس کے بارے میں۔ اور دس سال میں شکایت کا کوئی موقع بھی نہیں دیا اس نے یہاں کسی کو۔" اس نے بتایا۔
میں نے اس قصّے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ کئی سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر میں اس میں وقت برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت میرے پاس تھا ہی کہاں، جسے برباد کرتا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ ابھی مجھے اس پلاستر سے بھی نجات حاصل کرنا تھی جس میں اس ابنِ رذیل دھمن نے مجھے گھٹنوں سے اوپر تک دفن کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے میں آزادی کے ساتھ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا اور اس میں سے ہیرے بھی تلاش کر کے نکالنا تھے مجھے۔ انھیں میں یہاں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ میری ہی ملکیت بن جاتے۔ دھمن نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ انھیں یہاں کس کے حوالے کرنا ہے۔ جسے یہ ہیرے مجھ سے حاصل کرنا تھے، اسے ائیرپورٹ ہی پر ریسیو کرنا تھا مجھے۔ وہ وہاں نہیں آ سکا تھا۔ اور اب اس سے سامنا بھی ہو جاتا تو میں یہ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ وہی شخص ہے۔
میں نے موضوع بدلتے ہوئے فیروز سے کہا "کچھ پیسوں کا انتظام ہو سکتا ہے اس وقت؟"
"ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے اس وقت آپ کو؟"
"میں دراصل صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ الزبتھ بہت چالاک اور عیّار لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے کسی وقت بھی وہ ہمارے تعلق کے بارے میں جان سکتی ہے۔ میں ابھی اسے چوکنا کرنا نہیں چاہتا۔ بڑے کام لینا ہیں ابھی اس سے مجھے۔ یہاں سے جانے کے بعد مجھے قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ اسی لیے میں نے تم سے اس بارے میں پوچھا ہے۔ اگر ہو سکے تو پو پھٹنے سے پہلے پہلے کچھ رقم کا انتظام کر دو۔" میں نے اسے سمجھایا۔
"یہ آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔ دس بیس ہزار تو یہاں بھی موجود رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کافی ہوں گے اتنے روپے آپ کے لیے۔ مزید کی ضرورت ہو تو فون نمبر لے لیں میرا۔ اس پر بتا دیا کریں، رقم پہنچ جایا کرے گی۔ جہاں بھی آپ منگوانا چاہیں گے۔" اس نے کہا۔
"بس ٹھیک ہے۔ روپے لا دو مجھے۔ اس پلاستر سے جان چھڑا کے میں کچھ دیر ہاتھ پیر سیدھے کروں گا۔ اس کے بعد نکل جاؤں گا یہاں سے۔ گیٹ پر تو چوکیدار ہوتا ہے نا؟"
"جی ہاں، لیکن آپ عقبی دروازے سے جائیں۔ اُدھر کوئی نہیں ہو گا۔ پیچھے گلی سے نکل کر آپ مین روڈ پر پہنچ جائیں گے وہاں کوئی ٹیکسی یا آٹو رکشا ضرور مل جائے گا۔" اس نے مجھے بتایا۔
"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہاں سے نرسری تک تو پیدل بھی جا سکتے ہیں ہم۔ وہاں ٹوانہ ہاؤس میں جا ٹھہروں گا میں۔ میرا خیال ہے وہ ایک بہترین جگہ ہے میرے لیے۔"
"یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ اور اچھا کیا مجھے بتا دیا کبھی ضرورت ہوئی تو میں وہاں رابطہ کر لوں گا آپ سے۔ ویسے ایک آدمی مستقل آپ کی نگرانی کرتا رہے گا۔ اس سے بھی پتا تو چلتا ہی رہے گا آپ کے بارے میں۔"
"ٹھیک ہے، اب تم جا کر روپے لے آؤ۔ میں یہ بیڑیاں کاٹ لوں اپنے پاؤں کی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
وہ چلا گیا اور پانچ ہی منٹ کے اندر اندر اس نے اٹھارہ ہزار روپے لا کر میری جھولی میں ڈال دیے۔ وہ اپنے ساتھ ایک اٹیچی بھی لایا تھا جس میں چند جوڑے کپڑے رکھے تھے اور جوتوں کا ایک جوڑا بھی ساتھ تھا اس کے۔ وہ یہ ساری چیزیں میرے حوالے کر کے چلا گیا۔
پلاستر کاٹنے میں مجھے کوئی دو گھنٹے لگ گئے۔ بڑی تکلیف دینے لگا تھا وہ مجھے۔ پیر اکڑ کے رہ گئے تھے سیدھے کیے کیے۔ اس سے نجات ملی تو چند منٹ تک تو مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میرے وجود میں پیر ہیں ہی نہیں۔ دیر تک میں دونوں ہاتھوں سے پنڈلیاں سہلاتا رہا تب کہیں اپنے پیروں کو ٹھیک سے حرکت دینے کے قابل ہو سکا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اٹیچی سے نکال کر ایک صاف ستھری شلوار اور قمیص پہنی۔ شلوار تو ٹھیک ہی تھی البتہ قمیص کچھ تنگ تھی میرے، مگر اتنی بھی نہیں کہ پہنی نہ جا سکے۔ لباس تبدیل کر کے میں نے پلاستر کے تمام ٹکڑوں کو سمیٹ کر ایک جگہ کیا اور تکیے کا غلاف اتار کے انھیں اس کے اندر بھر دیا۔ تین ہیرے جو کاٹنے کے دوران نکل آئے تھے۔ وہ اسی کے ساتھ رکھ کر غلاف کا تھیلا اٹیچی میں رکھ لیا۔ فیروز کے دیے ہوئے روپے بھی اٹیچی میں رکھ کے میں نے اٹیچی مسہری کے نیچے سرکا دی۔ تین بج رہے تھے۔ میں دو گھنٹے آرام کرنے کی نیّت سے بستر پر گر پڑا۔
مجھے سوئے ہوئے ایک گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ دھماکوں کی آوازوں نے دوبارہ بیدار کر دیا۔ چند لمحے تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں اور کہاں سے آ رہی ہیں۔ حواس درست ہونے پر معلوم ہوا تھا کہ کوٹھی کے اندر کہیں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اچانک مجھے عالیہ کی دی ہوئی کرشمہ کار انگوٹھی کا خیال آیا تھا۔ وہ اس پتلون کی جیب میں پڑی تھی جو پلاستر چڑھواتے وقت میں نے پہن رکھی تھی۔ پلاستر اتارنے کے بعد میں نے وہ نصف پائنچوں والی پتلون اتار کر ایسے ہی ایک طرف ڈال دی تھی۔ انگوٹھی نکالنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا مجھے۔ اس وقت اگر فائرنگ کی آواز نہ سنتا تو وہ انگوٹھی یہیں رہ جاتی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے مجھے اس انمول شے سے محروم نہیں ہونے دیا تھا۔ بس بال بال بچا لیا تھا اس کارساز نے۔ ورنہ تو کسر ہی کیا رہ گئی تھی اس کے ہاتھ سے نکل جانے میں۔
میں انگوٹھی انگلی میں ڈال کے خواب گاہ سے باہر نکل آیا راہداری میں اتنی روشنی تھی کہ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اس طرف چل دیا جدھر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ راہداری کے اختتام پر دونوں جانب اوپر جانے کے لئے زینے بنے تھے۔ میں بائیں جانب کے زینے سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر کی منزل میں بھی ایک راہداری کے دونوں طرف کمروں کی لمبی سی قطار تھی۔ زینے کے سامنے ایک چھوٹا سا ورانڈہ تھا۔ جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والی گرل لگی تھی۔ میں نے گرل کے پاس پہنچ کر نیچے جھانکا۔ یہ کوٹھی کے سامنے کا حصہ تھا۔ جب میں یہاں آیا تھا تو دونوں گیٹ اور پورا لان روشنی میں نہائے ہوئے تھے لیکن اس وقت وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی مدھم سی روشنی میں کچھ سائے لان میں حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے کی منزل سے ٹھہر ٹھہر کر اِکّا دُکّا فائر کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے اتنی رات کو کوٹھی پر یوں دھاوا بول دیا تھا۔ ان کا مقصد کیا تھا اور وہ کیا چاہتے تھے کوٹھی کے مکینوں سے۔ یہ جاننے کے لیے میں ایک بار پھر دوڑتا ہوا نیچے جا پہنچا۔ لیکن نیچے آتے ہی میرے قدم جیسے زمین سے چپک کر رہ گئے نیچے

کا منظر میرے لیے ایسا ہی حیران کن تھا۔ وہاں دو نہایت تنومند آدمی اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے قریب ہی دو زخمی پڑے بُری طرح تڑپ رہے تھے اور لزی دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن سنبھالے ان دونوں کو کور کیے کھڑی تھی، جن کے ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر لزی بولی "لیں جنابِ عالی! سنبھالیں انھیں۔ بڑی تباہی پھیلائی شاید انھوں نے یہاں۔"

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "مگر یہ ہیں کون؟ اور کیوں گھس آئے ہیں یہاں، یہ توپ تفنگ لے کر؟"

"یہ تو آپ ان سے ہی پوچھیں، میں کیا بتا سکتی ہوں!" لزی نے جواب دیا۔

"اوئے کون ہو بھئی تم لوگ۔ کیا ارادے باندھ کے آئے تھے تم یہاں؟" میں نے ان دونوں کے قریب پہنچ کر ان سے پوچھا۔

"یہی سوال کرنے ہم بھی آئے ہیں تم سے کہ تم لوگ کون ہو اور ہمارے مہمانوں کو کیوں اغوا کر لائے ہو؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"اوئے کن مہمانوں کی بات کر رہا ہے تو پٹھے؟ اور تجھے یہ کس نے بتایا ہے کہ ہم اٹھا لائے ہیں تیرے کسی پروہنے کو؟" میں نے کہا۔

میں باتیں کرتے ہوئے ان کے بہت قریب چلا گیا تھا اور ہاتھوں میں ہتھیار میرے کوئی تھا نہیں۔ انھوں نے یہ موقع ہاتھ سے کھو دینا مناسب نہ جانا، ان میں سے ایک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا، جس پر وہ نہتّا جان کر جا پڑا ہے، اس کی قربت کتنی مہنگی پڑتی ہے دشمنوں کو، اس کے ہاتھوں میں کتنے ہنر پوشیدہ ہیں اور کیسے کرشمے بھرے پھرتا ہے وہ اپنی انگلیوں میں۔ میں نے اسے ہاتھوں میں سنبھال کر سینے سے بھینچ لیا۔ پھر ایک ہاتھ میرا اس کی گردن پر پہنچا اور اس کی رگِ احساس مسلنے میں مجھے ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوئی۔ جب میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا تو وہ کسی مُردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر جا گرا۔ اس کام میں بس چند سیکنڈ ہی لگے تھے مجھے۔ اسے یوں بے جان ہو کر گرتے دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک لمحے کو جیسے اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اوئے یار! یہ تیرا ساتھی تو بالکل ہی بودا نکلا۔ ایک ذرا سینے سے ہی تو لگایا تھا میں نے، ذرا دیکھ تو یار جی۔ اسے کیا ہو گیا ہے یوں اچانک، دل کا دورہ تو نہیں پڑ گیا کہیں!"

وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا تھا لیکن ایک ہی قدم اٹھا کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ ایک دم چونک کر رکا اور خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے غرایا "کیا کر دیا ہے تم نے اسے؟"

"او یار! کیسی باتیں کرتا ہے تو؟ میں کیا کرتا، یہ خود ہی سینے سے آ لگا تھا میرے۔ تو نے دیکھا نہیں تھا کیا؟" میں نے کہا۔

"بکواس نہیں کرو۔ یہ اتنی آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ دس پر بھاری ہے اکیلا۔" اس نے غصے سے کہا۔

"ہو گا بڑے بھائی! تو کہتا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔ پر اب تو خود اپنے اوپر ہی بوجھ بن گیا ہے۔" میں بولا۔

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تجھے کتے کی اولاد! یہ دوست تھا میرا۔" اس کی جیسے کھوپڑی الٹ گئی تھی ایک دم۔

وہ اڑتا ہوا مجھ پر آ کر گرا تھا۔ اس سے اس کی توقع نہیں تھی مجھے۔ میں سمجھ رہا تھا، اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر وہ مجھ سے بھڑنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ کوئی رنگروٹ قسم کا آدمی نہیں تھا۔ ایسے معاملات کا خاصا تجربہ معلوم ہوتا تھا اسے۔ وہ جانتا تھا شاید کہ میں کیا سوچ رہا ہوں گا اس گھڑی اس کے بارے میں۔ جبھی اس نے یہ خلافِ توقع حرکت کر کے میری پشت زمین سے لگا دی تھی۔ مجھے ساتھ لیے اس طرح گرا تھا وہ کہ میں اس کے نیچے دب گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میری گردن دبا کے پوری طاقت سے گھونسا مار کے جبڑے ہلا دیے میرے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا بایاں رخسار جس پر اس نے گھونسا مارا تھا، پھٹ گیا ہے مگر یہ موقع ان باتوں پر توجہ دینے کا نہیں تھا۔ وہ گھونسا مارنے کے لیے تھوڑا سا اٹھ گیا تھا میرے سینے کے اوپر سے۔ میرے لیے یہ اس سے نجات پانے کا بہترین موقع تھا۔ جیسے ہی اس نے دوسرا گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جما کے اسے اوپر اچھال دیا۔ وہ جیسے ہی مجھ سے الگ ہوا، لزی نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اسٹین گن اس کی پشت سے لگا دی۔ بولی، "خبردار، اب حرکت کی تو چھلنی کر دوں گی!"

وہ اٹھتے اٹھتے پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے لزی سے کہا۔ "خواہ مخواہ تکلیف دے رہی ہو تم اس ہتھیار کو اپنے۔ میں تو کہتا ہوں اس بچارے کو حسرت نکال ہی لینے دو اپنے دل کی!"

"آپ ان پر وقت برباد نہ کریں۔ اُدھر جائیں، باہر دیکھیں جا کر کیا آفت ڈھا کر آئے ہیں یہ۔ اتنی دیر سے گولیاں چل رہی ہیں اور کوٹھی کے مکینوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا ہے اب تک۔ ذرا پتا تو کریں، کس حال میں ہیں وہ لوگ، کہیں کام تو نہیں آ گئے ہیں وہ۔ بچاروں نے ہمیں بچانے کی خاطر جان نہ گنوا دی ہو اپنی۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لزی۔ اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ تم اسے دیکھو۔ میں خبر لیتا ہوں ان کی جا کر۔"

میں باہر جانے کے لیے مڑا تو وہ نیچے پڑا ہوا شخص بولا۔ "تو کیا تم دونوں اس کوٹھی کے مکینوں میں سے نہیں ہو؟ پھر کون ہو تم لوگ؟"

"تمھیں اس سے کیا غرض ہے کہ ہم کون ہیں؟" میرے بجائے لزی نے کرخت آواز میں کہا۔

"غرض ہے جبھی تو پوچھ رہا ہوں۔ مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ ہم غلط فہمی کا شکار ہو کر آپس میں ہی لڑ پڑے ہیں۔ آپ کا پورا نام الزبتھ ملیلی تو نہیں ہے؟"

"اوہ، تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟" لزی نے چونک کر کہا۔ میں بھی جاتے جاتے ٹھٹک کر رک گیا اور مڑ کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے اطمینان سے لزی کی طرف مڑ گیا بولا "میرا شبہ درست ہی ثابت ہوا، ہمیں واقعی غلط فہمی ہو گئی تھی میڈم!" پھر اس نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟"

میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ آنکھیں میری حیرت سے وا تھیں۔ میں نے پوچھا "اوئے تو ہے کون میاں! ذرا کھل کے تو بات کر، کون سے شبہے، کس غلط فہمی کی بات کر رہا ہے تو؟"

وہ الزبتھ ہی سے مخاطب تھا۔ بولا "ہمیں سان فرانسسکو سے ڈاکٹر دھمن نے آپ کی کراچی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ہم ائیرپورٹ بھی گئے تھے آپ دونوں کو لینے کے لیے۔ میرا مطلب آپ سے اور غلام جیلانی سے ہے۔ مگر وہاں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ خصوصی طیارہ جس سے آپ لوگ آ رہے ہیں، صبح کراچی پہنچے گا۔ چنانچہ ہم واپس چلے گئے مگر سوا گیارہ بجے ہمیں اطلاع ملی کہ آپ دونوں کراچی پہنچ گئے ہیں اور کچھ اجنبی لوگ آپ کو ایمبولنس میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ غلام جیلانی کہاں ہیں میڈم؟"

الزبتھ نے الجھن آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کیا چکر ہے جنابِ عالی! کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

"میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے بھی شبہ تھا کہ ہم غلط لوگوں کے ساتھ آ گئے ہیں۔ یہ لوگ اگر نہ بھی آتے تو میں تمھیں ساتھ لے کر صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرتا۔ اسی لیے میں نے پلاستر بھی اتار دیا آتے ہی۔"

الزبتھ چونک کر بولی "ارے ہاں، یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔ وہ پلاستر اب نظر نہیں آ رہا ہے آپ کے پیروں پر۔"

میں نے اس شخص سے پوچھا "ہاں، تو بڑے بھائی! کیا نام نامی اسمِ گرامی ہے آپ کا؟ اور اس کوٹھی کے لوگوں کا کیا بنایا ہے آپ نے۔ کہیں باندھ کے ڈال دیا ہے انھیں یا حیات کے سمندر پار اتار آئے ہو؟"

"پہلے تو آپ مجھے معافی دے دیں جیلانی صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نادانستگی میں کس سے الجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ جو لوگ آپ دونوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ انھوں نے یوں آزاد تو نہیں چھوڑ رکھا ہو گا آپ کو۔ میرا تو یہ خیال تھا، کہیں قید ہوں گے آپ دونوں۔ چوکیدار اور مالی کے سوا ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہی مل سکی تھی ہمیں اس پوری کوٹھی میں۔ شاید کچھ اور لوگ بھی تھے جن سے گولیوں کا تبادلہ ہوا تھا کچھ دیر۔ یا وہ گولیاں بھی آپ ہی لوگوں نے چلائی تھیں؟ ویسے ابھی آپ کوٹھی کے مکینوں کا ذکر کر رہے تھے؟"

"ہاں، دو آدمی اور تھے یہاں۔ بڑے سوہنڈ لونڈ قسم کے۔ گولیاں انھوں نے ہی چلائی ہوں گی۔ میں تو فائرنگ کی آواز سن کر ہی بیدار ہوا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔ پھر لزی سے پوچھا "یہ اسٹین گن کہاں سے ملی تھی تمھیں؟"

"وہ فیروز دے کر گیا تھا۔ ابھی ابھی گولیوں کی آواز سُن کر میں کمرے سے نکلی تو وہ بھاگتا ہوا اُدھر جا رہا تھا۔" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کر کے کہا "مجھے دیکھ کر اسٹین گن میرے ہاتھ میں تھما دی اور بولا دشمن نے حملہ کر دیا ہے اِدھر آئے تو تم روکنا اسے۔ میں دوسری طرف دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ آگے چلا گیا۔ اِس کے جاتے ہی یہ لوگ اِدھر آ گئے۔ میں نے انھیں دیکھتے ہی فائر جھونک مارا ان پر۔ ان کے دو ساتھی جو آگے تھے، گولیاں کھا کر فوراً ہی گر پڑے تھے اور ان دونوں نے ہاتھ اٹھا کر امان طلب کر لی تھی۔ اسی وقت آپ آ گئے اوپر سے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ دونوں جان بچا کے نکل گئے یہاں سے اور ہمیں ٹکرا دیا آپس میں۔" میں نے کہا "چلو ان زخمیوں کو سنبھالو جلدی سے، کوئی مر تو نہیں گیا ان میں سے؟"

میرے ساتھ وہ شخص بھی آگے بڑھا۔ اس نے ان دونوں زخمیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ سیدھا اس شخص کی طرف گیا تھا جو میرے ہاتھوں بے ہوش ہوا تھا۔ اسے ٹٹولتے ہوئے وہ بولا "شکر ہے۔ یہ زندہ ہے ابھی۔"

میں نے کہا "اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ صرف بے ہوش ہوا

ہے۔ ہوش آجائے گا ابھی اسے۔ ان دونوں کو سنبھالو، انھیں فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔"

اس نے اُدھر آ کے باری باری ان دونوں کو ٹٹولا۔ ان کے زخموں کا معائنہ کیا۔ دونوں کے پیٹ میں گولیاں لگی ہوئی تھیں وہ انھیں چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔ بولا "یہ تو ختم ہی ہو گئے سمجھیں۔ ان کا بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔"

"اوہ، بہت افسوس ہوا مجھے۔ بچارے غلط فہمی میں اپنوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے۔" لزی نے افسوس سے کہا۔

"ان دھندوں میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس پر اتنا افسوس نہ کریں۔ شکر کی بات یہ ہے کہ آپ دونوں صحیح سلامت مل گئے ہمیں۔ یہ دو کیا اور دس آدمی بھی آپ پر قربان کیے جا سکتے تھے آپ دونوں پر۔ آئیں اب آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔" وہ انھیں چھوڑ کر باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے روکتے ہوئے کہا "ٹھہرو یار! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ مجھے اپنا سامان تو لے لینے دو کمرے سے اپنے۔"

"ہاں ہاں، سامان تو ضرور لے لیں آپ۔ اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں تھا۔" وہ جاتے جاتے رک کر پلٹ آیا۔

میں نے لزی سے کہا "لزی! تم بھی اپنی اٹیچی وغیرہ لے آؤ جا کر۔"

"وہ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ اسٹین گن اپنے شانے سے لٹکا کے کمرے کی طرف چل دی۔

میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس شخص سے پوچھا "تیرا نام کیا ہے بھائی؟ وہ تو بتا دے میرے یار!"

"شرافت علی نام ہے میرا۔ بہت پرانا خادم ہوں میں ڈاکٹر صاحب کا۔" وہ بولا۔

"بڑی غلطی کی ہے یار تیرے والدین نے۔ ایسا نام رکھا ہے جو کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتا تجھ پر۔"

"بس جی، ان بچاروں کو کیا معلوم ہو گا کہ ان کا یہ شرافت علی کتنا شریف نکلے گا آگے جا کے۔"

"ہاں یار! کہتا تو ٹھیک ہی ہے تو بھی۔ ماں باپ تو اپنی اولاد کو کسی اچھے سے اچھے خانے میں ہی فٹ کرنا چاہتے ہیں۔ بُرے سے بُرے آدمی کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا اچھا آدمی بنے۔ مگر آدمی کی ہر خواہش پوری کہاں ہوتی ہے میرے یار! وقت کی گردش آدمی کو کیسے کیسے چکر دیتی ہے اور کہاں لے جا کے پھینک دیتی ہے، اس کا پہلے سے تو کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ میرے والدین نے بھی میرے لیے بڑے سہانے سپنے سجا رکھے تھے آنکھوں میں اپنی۔ اور ماں جی تو میری اب بھی مجھے بہت بڑا آدمی ہی سمجھتی ہے۔ اسے تو خبر بھی نہیں ہے کہ اس کا یہ بیٹا جسے دعائیں دیتے اس کی زبان نہیں تھکتی۔ کہاں کہاں رُلتا پھرتا ہے، کس کس چکّی میں پیسا جاتا ہے۔"

"ہاں جی تقدیر سے کون جیتا ہے آج تک۔ سب اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"

میں نے کمرے میں جا کر وہ جوتے اپنے پیروں میں چڑھا لیے جو فیروز میرے لیے لایا تھا۔ وہ بالکل میرے ہی ناپ کے تھے۔ پھر مسہری کے نیچے سے اٹیچی نکال کر چلنے کے لیے تیار ہوا تو شرافت علی بولا "وہ پلاستر کیا کیا جیلانی آپ نے جو آپ کے پیروں پر چڑھا تھا؟"

"اس کا کیا کرو گے تم؟ وہ تو میں نے پھینک دیا تھا۔"

"کیا... کیا... کیا کہہ رہے ہو یہ تم؟ ایسا کیسے کر دیا تم نے؟" وہ ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔

اس کی حالت دیدنی تھی۔ منہ اس کا کھلا ہوا تھا اور حیرت سے وا آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے لیے اپنی سنجیدگی برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح ہنسی کو اندر ہی اندر گھونٹ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اتنی رات گئے اس کی یہاں آمد اور یوں ہنگامہ آرائی کے پس پردہ کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ اسے مجھ سے اتنی ہمدردی تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ محض میری خاطر خطرات کے سمندر میں کود پڑتا۔ اسے ان ہیروں کی کشش ہی وہاں تک کھینچ لائی تھی لیکن یہ سن کر اس کے دل پہ آرے چل گئے تھے کہ وہ بیش بہا ہیرے میری ناواقفیت کی بنا پر اس کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ میں نے اس کی حالت سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے بظاہر اچنبھے سے پوچھا "کیا ہو گیا بڑے بھائی! تم یہ اچانک اتنے پریشان اور سراسیمہ سے کیوں نظر آنے لگے ہو۔ آخر میں اس بے کار پلاستر کے ٹکڑوں کو پھینکتا نہیں تو اور کیا کرتا؟"

"بے کار پلاستر کے ٹکڑے۔" وہ بڑبڑایا "کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ پلاستر کے ٹکڑے بالکل بے کار ہی تھے؟"

"اس میں یقین اور بے یقینی کی کیا بات ہے؟ میں نے خود انھیں کاٹ کر اتارا تھا اپنے پیروں پر سے۔ مجھے تو ان میں کوئی ایسی بات نظر آئی نہیں تھی جس کی بنا پر میں انھیں کوئی کارآمد شے سمجھ سکتا۔"

وہ چند ثانیے ٹٹولنے والی گہری نظروں سے میری صورت تکتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے دل کی کتاب کا ایک ایک ورق کھول کر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ دیر وہ یونہی مجھے دیکھتا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا "سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا واقعی بے خبر ہو۔ حالانکہ"

"اور میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ تم ایک ناکارہ شے کے لیے اس قدر پریشان کیوں ہو؟ آخر تھا کیا اس میں؟"

"تو تمھیں واقعی کچھ پتا نہیں ہے مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر دھمن تو کہتے تھے تم جانتے ہو اس کے بارے میں۔"

"کس کے بارے جانتا ہوں میں؟ اوئے یار! کچھ بک بھی تو کہ ہوا کیا ہے۔ کیا کوئی زبردست غلطی کر بیٹھا ہوں؟ کیا اس بار بھی اس پلاستر کے نیچے کوئی خزانہ دبا رکھا تھا اس دھمن نے، کیا ایک بار پھر میں کیریئر بن گیا ہوں؟"

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے تک رہا تھا۔ بڑی الجھن میں گرفتار تھا وہ اور شاید یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میرے اس بیان کو وہ کس کسوٹی پر پرکھے، کس پیمانے سے ناپے اور کون سی میزان پر چڑھا کر اس کا وزن دیکھے۔ "جیلانی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم سے کیا کہوں؟ کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو مجھ سے؟"

"میرے یار! تو پہیلیاں کیوں بُجھوا رہا ہے مجھ سے۔ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتا؟ اور یہ تُو نے کیسے جان لیا کہ میں مذاق بھی کر سکتا ہوں تجھ سے؟ تیرا میرا مذاق کا بھی کوئی رشتہ بنتا ہے کیا؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں میں، کہہ ہی کیا سکتا ہوں۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

چہرہ اس کا ایسا ہو رہا تھا جیسے موت ہو گئی ہو اس کے کسی بہت ہی قریبی عزیز کی۔ آواز سے بھی اس کی ایسے ہی کسی اندوہناک حادثے کا گمان گزرتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آنے لگا تھا لیکن میرے سامنے بھی کچھ مصلحتیں تھیں۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگا "ایسا کبھی ہوا تو نہیں ہے۔ کاروبار میں وہ کبھی جھوٹا ثابت تو نہیں ہوا ہے۔ کبھی وہ چھوٹی سے چھوٹی بددیانتی کا مرتکب بھی نہیں ہوا۔ پھر ایسا کیوں ہوا مگر آدمی کی نیت بدلتے دیر کتنی لگتی ہے۔ بڑے بڑے عابد زاہد قسم کے لوگ منٹوں میں بہک کر عمر بھر کی عبادت، ریاضت خاک میں ملا دیتے ہیں۔ پیسہ ہے ہی بڑی ذلیل شے۔ آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ ہم بھی آدمی ہی ہیں نا، مگر کیا کیا نہیں کرتے اس ذلیل شے کی خاطر؟"

"لیکن میرے بھائی! اس سوکھے ہوئے پلاستر کا پیسے سے کیا تعلق ہے؟ کیا دولت بھر رکھی تھی اس میں تم نے؟"

"چھوڑو اس قصّے کو۔ جلدی سے نکل چلو یہاں سے۔ بڑی گولیاں چلی ہیں یہاں۔ پاس پڑوس والوں میں سے کسی نے پولیس کو اطلاع نہ کر دی ہو۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اب خیال آیا ہے تمھیں اس کا۔"

ہم باہر نکلے تو لزی بھی اپنی اٹیچی سنبھالے اُدھر ہی چلی آ رہی تھی۔ ہم تینوں ایک ساتھ باہر نکل آئے۔ دونوں مین گیٹ چوپٹ کھُلے ہوئے تھے۔ دو کاریں بھی موجود تھیں وہاں۔ شرافت علی نے آگے والی سیاہ مرسڈیز کی طرف بڑھتے ہوئے آواز دی "نادر خان! سب لوگ کہاں ہیں؟"

"کوٹھی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں باس! کیا کام ہو گیا؟" مرسڈیز کی آڑ سے نکل کر ایک شخص آگے آتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" شرافت علی نے کہا "سب کو بلا لو۔ اور دیکھو، اندر ہمارے دو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ وہیں غلامو بھی بے ہوش پڑا ہے۔ اسے اٹھا کر پیچھے والی گاڑی میں ڈال دو۔ دونوں لاشیں ڈکی میں ٹھونس دینا لیکن خیال رکھنا خون کا کوئی ہلکا سا نشان بھی گاڑی پر نہ لگنے پائے۔ میں چل رہا ہوں، تم سب کو لے کر آؤ میرے پیچھے۔"

وہ ہمیں ساتھ لے کر مرسڈیز میں بیٹھ گیا تو تاریکی سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے بولا "کیا چلیں باس؟"

"ہاں۔" شرافت علی نے بارعب آواز میں کہا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میں نے ہیروں کے بارے میں اسے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے لیے بالکل اجنبی شخص تھا۔ جس طرح دھمن کا نام لے کر فیروز مجھے ایئرپورٹ سے اٹھا لایا تھا، اسی طرح یہ شرافت علی بھی فراڈ ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اسے باس کہہ کر مخاطب کر رہے تھے جس سے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ان کا سربراہ ہے لیکن یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے گینگ کا مختارِ کُل وہی ہے یا اس کے اوپر بھی کوئی ہے۔ بہرحال میں اپنا اطمینان کیے بغیر اس کے سامنے ہیروں کا نام بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک بات تو بتاؤ میرے یار! تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ایئرپورٹ سے ہمیں کچھ غلط لوگ اٹھا لے گئے ہیں؟"

"ہم تمھاری طرف سے غافل تو نہیں رہ سکتے تھے جیلانی۔ ہم نو بجے سے کچھ پہلے ایک ایمبولنس کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ وہاں معلوم ہوا کہ تمھارا طیارہ صبح سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا تو ہم نے وہاں رات کالی کرنا مناسب نہیں سمجھا اور واپس چلے آئے لیکن وہاں ایک آدمی کو چھوڑ آئے تھے کہ اگر طیارہ رات ہی میں کسی وقت آ جائے تو وہ مجھے فون کر کے بتا دے اور میرے پہنچنے تک تمھارے ساتھ رہے۔ چنانچہ جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ طیارہ آ چکا ہے، اس نے مجھے فون پر اس کی اطلاع دی اور خود تمھاری طرف چل دیا لیکن اس نے تمھارے پاس دوسرے لوگوں کو دیکھا تو تمھارے قریب جانے کے بجائے دور ہی سے نگرانی کرنے لگا۔ وہ تمھیں ایمبولنس میں سوار کر کے لے آئے۔ وہ انھیں وہاں روک تو نہیں سکا تھا لیکن اس نے ایمبولنس کا نمبر اور اس پر لکھا ہوا اسپتال کا نام نوٹ کر لیا تھا۔ فون ملنے کے بعد مجھے ایئرپورٹ پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا تھا۔ وہاں پہنچنے

اس شخص نے مجھے بتایا کہ فلاں اسپتال کی اس نمبر کی ایمبولنس تمھیں لے گئی ہے تو میں ایئرپورٹ سے سیدھا اس اسپتال پہنچا جس کا نام ایمبولنس پر لکھا تھا۔ وہاں وہ گاڑی بھی موجود تھی اور اس کا ڈرائیور بھی۔ ان سے پوچھ گچھ کی تو انھوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ ایئرپورٹ سے لائے جانے والے مریض کو کہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ یہی نہیں، سو روپے کا ایک نوٹ اس کی جیب میں گیا تو وہ ہمارے ساتھ اس کوٹھی تک بھی چلنے کو راضی ہو گیا۔ اس طرح میں چند گھنٹے بعد ہی تم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"یہ معلوم ہونے کے بعد کہ طیارہ صبح سے پہلے نہیں پہنچے گا، تم نے اپنا آدمی وہاں چھوڑنا ضروری کیوں سمجھا تھا؟"

"اس لیے کہ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی تھی۔ ایک طیارہ جسے نو بجے پہنچنا تھا اگر کسی وجہ سے لیٹ ہو بھی گیا تھا تو ایک دو گھنٹے کی تاخیر ہو سکتی تھی۔ صبح پہنچنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر طیارے کے پہنچنے کا صحیح وقت نہیں بتایا گیا تھا مجھے۔"

لزی جو خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی، بولی "یہ کون لوگ تھے جو ہمیں اس طرح لے گئے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا میڈم! اگر ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو پکڑ لینے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ کون لوگ ہیں اور یہ بھی کہ ان کا مقصد کیا تھا اس طرح آپ لوگوں کو لے جانے سے۔"

"میں سمجھتا ہوں شاید انھوں نے تمھیں پریشان کرنے کے لیے ایسا کیا تھا یا پھر انھوں نے اس طرح وارننگ دی ہے تمھیں۔ یاد کرو، آج کل کسی سے اَن بَن تو نہیں چل رہی ہے تمھاری؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہمارا تو پیارے دھندا ہی ایسا ہے۔ دشمنیاں تو اس میں قدم قدم ساتھ چلتی ہیں۔ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ انھوں نے اس طرح وارننگ دی ہے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"بالکل سیدھی سی بات ہے یار۔ ایک تو انھوں نے ہمیں اغوا کیا لیکن کہیں قید کرنے یا تکلیف پہنچانے کے بجائے ہمارے آرام و آسائش کا خیال رکھتے رہے وہ اور جب تم وہاں پہنچے تو کوئی خاص مقابلہ نہیں کیا انھوں نے تمھارا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جان بوجھ کے ہمیں تمھارے حوالے کر گئے ہوں۔ ورنہ اگر مقابلے سے بھاگنا بھی تھا انھیں تو ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش تو ضرور کرتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب عالی۔ بالکل درست خیال ہے آپ کا۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" لزی بولی۔

"بات تو میرے بھی جی کو لگتی ہے جیلانی تمھاری مگر اس سے بھی یہ پتا تو نہیں چل سکتا کہ وہ ہیں کون لوگ۔"

"لیکن کچھ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سوچو جنھوں نے تم سے کوئی مطالبہ کیا ہو کبھی اور تم نے ان کی بات نہ مانی ہو یا کسی ایسے دشمن کو یاد کرو جسے حال ہی میں کوئی نقصان پہنچایا ہو تم نے۔"

اس نے کار کو ایک جدید طرز کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔ "لو اب تم لوگ آرام کرو یہاں۔ میں دوپہر کے قریب آؤں گا تمھارے پاس۔"

"کیوں، کیا تم کہیں جا رہے ہو ہمیں یہاں چھوڑ کر؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ یہ بنگلا تمھارے لیے ہے۔ جب تک کراچی میں ہو یہاں رہو کوئی تکلیف نہیں ہوگی تمھیں۔"

"یہاں ٹیلی فون تو ہوگا نا؟" میں نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں، ضرورت کی ہر چیز موجود ہے یہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں ڈاکٹر دھمن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نمبر دیتے جاؤ مجھے۔"

"کیا بات کرو گے اس سے۔ کیا یہ معلوم کرو گے کہ تم صحیح لوگوں کے پاس پہنچ سکے ہو یا نہیں؟" اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں، یہی سمجھ لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم مجھے بھی کوئی فراڈ ہی سمجھ رہے ہو۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، تم اطمینان کر لو اپنا۔ ان حالات میں تمھیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔" اس نے کہا اور اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کے مجھے دے دیا۔

لزی بولی۔ "اس کی کیا ضرورت ہے جناب عالی، ڈاکٹر کا نمبر تو مجھے بھی معلوم ہے اور پھر ہمارے پاس پام روز چیریٹی اسپتال کے جو سرٹیفکیٹ وغیرہ ہیں ان میں اسپتال کے ٹیلی فون نمبر بھی موجود ہیں۔"

"اوہ، ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ اس کا خیال نہیں تھا مجھے۔"

کار گیٹ سے اندر داخل ہو کر رک چکی تھی اور دربان نے لزی کی طرف کا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ لزی اور میں اپنے اپنے اٹیچی کیس اٹھا کر باری باری کار سے اتر آئے۔ شرافت علی نے دربان سے کہا۔ "خان! یہ مہمان ہیں۔ انھیں اندر پہنچا دو اور ماسی کو بولو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے انھیں۔"

"جی صاب! بول دے گا صاب ہم۔ کیا ابی اس کو اٹھا کے بول دے؟"

میں نے کہا۔" ابھی نہیں، ابھی سونے دو اسے۔ صبح بتا دینا۔"

شرافت علی ہمیں خداحافظ کہہ کر واپس چلا گیا تو دربان نے ہمیں اندر لے جا کر ایک کمرے میں ہماری اٹیچیاں رکھ دیں اور بولا۔" آپ لوگ اس کمرے میں آرام کریں جناب۔ کوئی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دیں، ہم حاضر ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔" ہمیں الگ الگ کمرے چاہئیں خان۔ ایک کمرے میں گزارا نہیں ہوگا ہمارا۔"

"ایسا بات ہے تو ایک آدمی اُدھر چلا جاؤ۔" اس نے سامنے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اس کمرے میں رہو لزی، میں سامنے والے میں چلا جاتا ہوں۔" میں نے اٹیچی اٹھائی اور ادھر بڑھ گیا۔

صبح ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ رات بھر کی بے آرامی اور بھاگ دوڑ نے تھکا دیا تھا مجھے۔ آرام دہ بستر دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بستر پر جا گرا۔

میں گہری نیند میں ڈوبا بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو معلوم ہوا کہ زمین تو جوں کی توں ساکت ہی تھی البتہ وہ زلزلہ خانم لزی میرے قریب کھڑی بری طرح مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ میں نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کے پوچھا۔" کیا ہوا مائی ریسپکٹڈ لیڈی! کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے آپ پر جو صبح صبح زلزلہ بن کے آئی ہیں آپ؟"

" واہ جناب عالی! آج تو کمال ہی کیے دے رہے ہیں آپ۔ یہ صبح صبح ہے۔ ذرا گھڑی تو دیکھیں ایک بج رہا ہے دن کا۔ اور ایک گھنٹے سے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہوں میں آپ کو۔"

" اوہ ہاں، یہ تو یاد ہی نہیں رہا مجھے۔ صبح ہوتے ہوتے تو لیٹا تھا میں بستر پر۔" میں نے کہا۔

" اب اٹھیں۔ وہ شرافت علی نے فون کیا تھا ابھی۔ کہہ رہا تھا میں آ رہا ہوں آپ لوگ تیار ہو جائیں۔"

" اچھا۔ یہ کھانے پینے کا بندوبست ہے یہاں؟ بڑی بھوک لگی ہے اس وقت تو۔" میں نے پوچھا۔

" سب کچھ ہے آپ چلیں ڈائننگ روم میں، میں نے بھی نہیں کھایا ہے ابھی تک کچھ۔" وہ بولی۔

" ٹھیک ہے تم چلو بیگم غیاث احمد۔ میں بھی آتا ہوں ابھی۔" میں نے شرارت سے کہا۔

" دیکھیں جناب عالی! اس نام سے نہ پکارا کریں اب آپ مجھے۔ میں نہیں جانتی کسی غیاث احمد کو۔"

میں نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا اور شوخی سے بولا۔" واہ بھئی! کمال کی شے ہو تم بھی لزی بیگم۔ وہاں سان فرانسسکو میں تو بڑی شناسائی تھی تمھاری اس غیاث احمد سے، اب پہچاننے سے بھی انکار ہے اسے۔"

" تب بات اور تھی۔ اس وقت تک میں آپ کو نہیں جانتی تھی۔ اب میں اسے برداشت نہیں کروں گی۔"

" بڑی بے وفا ہو بھئی لزی۔ تم نے تو اتنی جلدی آنکھیں پھیر لیں اس غریب سے۔ کیا سوچے گا وہ؟"

" سوچنے دیں اسے جو کچھ اس کا جی چاہے سوچتا رہے۔ مجھے اس کی فکر بالکل نہیں رہی ہے اب۔"

" ارے بھئی غلام جیلانی پٹھے! گیا اب تو تو بھی کام سے۔ یہ لزی بیگم تو تجھے بالکل ہی اُتار بیٹھی ہے دل سے اپنے، کیا کرے گا تو اب؟ کسے بنائے گا اپنی زندگی کا ہمسفر؟ یہ تو گئی ہاتھ سے تیرے۔" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

" ایسی باتیں نہ کریں جناب عالی! آپ تو میری زندگی ہیں، میں آپ کو دل سے کیسے اُتار سکتی ہوں۔ ایسا کر کے میں کہاں زندہ رہ سکوں گی۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا جو آپ اخذ کر رہے ہیں۔"

" اور کیا مطلب تھا پھر؟ تم نے صاف صاف تو کہا ہے کہ تمھیں اب بالکل فکر نہیں رہی ہے میری۔"

" دیکھیں جناب عالی! پریشان نہ کریں مجھے، آپ خوب جانتے ہیں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ غیاث احمد کے لیے تھا اور آپ غیاث احمد نہیں، غلام جیلانی ہیں۔ میں نے آپ کو چاہا ہے، آپ سے محبّت کی ہے، میرے دل میں صرف آپ کی تصویر نقش ہے، کسی غیاث احمد کی نہیں۔" وہ افسردہ سی نظر آنے لگی تھی۔

اداکاری کے فن میں بڑی طاق تھی وہ۔ اگر گرگری نے مجھے اس کے دروں بروں سے آگاہ نہ کر دیا ہوتا تو اس نے تو میری بینائی کو دھوکا دے ہی دیا تھا۔ اس کی چالیں مجھ پر عیاں نہ کر دی گئی ہوتیں تو لمحوں میں مات کھا چکا ہوتا میں اس بنی اسرائیل کی شاطرہ سے۔ مجھ سے اپنی محبّت کا اظہار تو وہ اس طرح کرتی تھی جیسے مجھ سے زیادہ عزیز دُنیا کی کوئی شے نہ ہو اسے۔ بس میں ہی اس کا مقصدِ حیات ہوں۔

میں نے ہنس کر کہا۔" صدقے بھئی صدقے۔ قربان جائیے آپ کی محبّت کے خانم! لیں جناب کان پکڑ لیے۔ معافی دے دیں حضور! اور افسردگی دُور کر دیں اپنے اس سوہنے مکھڑے سے۔ آپ کی یہ سوگواری دیکھی نہیں جاتی مجھ سے۔ دل خون ہونے لگتا ہے میرا۔ بس اب مسکرا دیں ذرا تا کہ قرار آ جائے میرے اس دلِ ناتواں کو۔"

وہ ایک ادا سے مجھے دیکھ کر مسکرائی اور شرما کر اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ اس گھڑی وہ ایک خالص مشرقی دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی۔ کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا اس لمحے کہ وہ امریکہ سے امپورٹ کی گئی ہے۔ آنکھوں میں اس کی میری محبّت کے چراغ روشن تھے۔ وہ بمشکل اپنے گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک لبوں کو حرکت دینے میں کامیاب ہو سکی، مدھم سُروں میں بس اتنا ہی کہہ پائی وہ۔" ستایا نہ کریں ہمیں آپ جنابِ عالی!"

" آپ بھی اپنی اداؤں پر قابو رکھا کریں مائی ریسپکٹڈ لیڈی! مجھے امتحان سے نہ گزارا کریں یوں آپ۔"

اس کے رخسار دمک اُٹھے۔ بولی۔" اُف اللہ، اب جائیے نا۔ تیار ہو کر آئیں جلدی سے، ہمیں بھُوک لگی ہے۔"

" اوہ، یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" میں نے چونک کر کہا اور تیزی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

کھانے کی میز پر بوڑھی ملازمہ نے مجھے شرافت علی کی آمد سے مطلع کیا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گیا... جہاں شرافت علی میرا منتظر تھا۔ لزی برتن وغیرہ سمیٹنے میں ملازمہ کی مدد کرنے لگی تھی۔ شرافت علی نے مجھے دیکھ کر میری خیریت دریافت کی۔ " کیا حال ہے جیلانی آپ کا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں آپ کو؟"

" جب سے آیا ہوں سوتا ہی رہا ہوں۔ اُٹھنے کے بعد کھانا کھا کر تمھارے پاس آ گیا ہوں، اتنی دیر میں کیا تکلیف ہو سکتی ہے مجھے میرے یار! ہاں، جو تکلیف پہلے سے تھی، وہ بدستور موجود ہے۔"

" اوہ، مجھے بتائیں کیا تکلیف ہے آپ کو؟ میں کوشش کروں گا اسے دُور کرنے کی۔"

" نہیں یار جی! وہ تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے تو مجھے ہی کرنا ہے کچھ نہ کچھ۔"

" غیریت برت رہے ہو، شاید اس لیے کہ تمھیں میرے اور دھمن کے تعلقات کا علم نہیں ہے۔ بہت پرانا ساتھ ہے میرا اور اس کا، مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے اس کی۔ تمھارے اور اس کے درمیان ہونے والی محاذ آرائی سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں۔ میرے ہی مشورے پر اس نے تم سے دوستی کرنا چاہی ہے۔"

" تم نے ایسا مشورہ کیوں دیا تھا اسے؟"

" اس لیے کہ میں تم جیسے جی دار اور باصلاحیت آدمی سے دشمنی کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میں ایسے لوگوں سے دشمنیاں بڑھانے کے

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لیے قیمت: -/۶ روپے
HOW TO WRITE AN ESSAY
مضمون نگاری کے لیے قیمت -/۶ روپے
HOW TO WRITE AN EXPLANATION
وضاحت و تشریح کے لیے قیمت: -/۶ روپے
HOW TO LEARN CORRECT SPELLING
صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت: -/۶ روپے
HOW TO DO COMPREHENSION
ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت: -/۶ روپے
CORRECT POSITIONS OF PREPOSITIONS
پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت -/۶ روپے
HOW TO PUNCTUATE
رموز اوقاف جاننے کے لیے قیمت: -/۶ روپے
10 DAYS TO TRANSLATION
اُردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت: -/۱۲ روپے

○ اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا ایک سے زائد کتابوں کا -/۵ روپے ہوگا۔ پورا سیٹ منگانے پر ڈاک خرچ معاف (صرف اندرون ملک کے لیے) ○ کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں ○ کسی قسم کی نقد رقم خط میں ڈال کر ہرگز نہ بھیجیں۔ منی آرڈر ارسال کرنے کا پتا: مکتبہ نفسیات، پوسٹ بکس ۹۴۴ سعید مینشن بلیمویا اسٹریٹ، کراچی ۱ ○ بیرون ملک پورے سیٹ کی قیمتیں مع ڈاک خرچ: مشرقِ وسطیٰ -/۱۰۰ پاکستانی روپے، یورپ اور مشرق بعید -/۱۵۰ پاکستانی روپے، آسٹریلیا، امریکہ، افریقہ -/۲۰۰ پاکستانی روپے ○ بیرون ملک کتابیں منگانے کے لیے رقم بذریعہ ڈرافٹ روانہ کریں۔ ڈرافٹ پر نام اس طرح لکھوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L.
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

Sales Office: ذاتی طور پر حاصل کرنے کے لیے:
MAKTABA NAFSIAT 404 HUSSAIN CENTRE.SHAHRAHE IRAQ SADDAR KARACHI - PHONE: 526689

بجائے دوستی کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ یوں بھی دشمنی میں نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"ہاں، بات تو کسی حد تک ٹھیک ہی ہے تمھاری، پر یہ کوئی اپنے اختیار کی بات تو نہیں ہوتی۔ آدمی حالات سے مجبور ہو کر ہی دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ خوشی سے کون آگ میں کودنا پسند کرتا ہے؟"

"لیکن ایسے حالات ہی کیوں پیدا ہونے دیے جائیں جو دشمنی پہ مجبور کر دیں۔"

"یہ کیا بات کہہ دی تم نے میرے یار! حالات پہ کیسے اختیار ہوتا ہے؟ ان کا رُخ کون موڑ سکتا ہے؟"

"سب نہیں مگر کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں جن کا رُخ موڑنا ممکن ہوتا ہے اور یہ دشمنیاں، یہ تو قطعی طور پر آدمی کے اختیار کی چیز ہیں۔ آدمی نہ چاہے تو یہ کبھی سر نہ اُبھار سکیں۔ بس ذرا جذبوں کو لگام دینے کی بات ہے۔"

"او یار! کیسی بُزدلی کی باتیں کرتا ہے تُو۔ کوئی تیرا گردہ نکال کے بیچ ڈالے تو تُو اس کے خلاف نفرت کے جذبے کو کیسے لگام دے گا؟"

"بہت آسانی سے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میں اپنے دل کو یہ... سمجھاؤں گا کہ گردہ تو میرا جا ہی چکا۔ ایک گردے کے بغیر بھی میں اپنی زندگی اچھی طرح گزار سکتا ہوں تو دشمنی کر کے جان خطرے میں کیوں ڈالوں؟ اس کے بجائے گردہ فروش سے دوستی کر کے گردے کی قیمت کیوں نہ وصول کر لوں جو زندگی کو سنوارنے میں میرے کام آ سکے۔"

"اور دُکھ نہیں ہو گا تجھے اپنا اچھا بھلا گردہ ضائع ہو جانے کا؟"

"دُکھ تو ہو گا لیکن جب وہ جا ہی چکا ہے تو واپس تو نہیں مل جائے گا نفرت اور غصّے کا اظہار کرنے سے۔ البتہ اگر دشمن کا وار کارگر ہو گیا تو جان بھی جا سکتی ہے گردے کے ساتھ۔ پھر یہ خطرہ کیوں مول لیا جائے؟ یہ دیکھو!" اس نے اپنی قمیص کا دامن اُٹھا کر اپنا پیٹ میرے سامنے کر دیا۔ "یہ میرا دایاں گردہ بھی اسی دھمن نے بیچ کھایا ہے۔ دیکھا تم نے؟ مگر میں نے اس سے دشمنی نہیں کی۔"

میں نے دیکھا سچ مچ اس کے پیٹ میں بھی دائیں جانب چیرے کا ایسا ہی نشان تھا جیسا میرے پیٹ پر تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمھاری اجازت سے نکالا تھا اس نے گردہ تمھارا؟"

"بالکل نہیں۔ میرا گردہ بھی اس نے میری لاعلمی میں نکالا تھا۔ مجھے تو بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کر چکا ہے۔ انھوں نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ میرا گردہ خراب ہو گیا ہے، اگر اسے نکالا نہیں گیا تو میں مر بھی سکتا ہوں۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے وہ اسی طرح لوگوں کے گردے نکالا کرتا ہے۔ اس کے کلینک میں علاج کے لیے آنے والے بہت کم لوگ اپنے دونوں گردے واپس لے جاتے تھے۔ زیادہ تر تو ایک گردہ اسے ہی سونپ جاتے تھے۔ مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا مطلب ہے تم تو اس کے دوست ہو پھر اس نے تمھارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟"

"اس وقت ہماری دوستی نہیں تھی۔ میں ایک دفتر میں کلرک ہوا کرتا تھا۔ ایک بار پیٹ میں سخت تکلیف ہو گئی۔ علاج کے لیے ایک دوست کے مشورے پر دھمن کے کلینک چلا گیا۔ اس نے مجھے داخل کر لیا اپنے ہاں۔ میں نے بہت کہا کہ میں داخل نہیں ہو سکتا، اس کے اسپتال کے اخراجات برداشت نہیں کر سکوں گا میں۔ مگر اس نے میری ایک نہیں مانی۔ کہنے لگا 'فکر مت کرو، تم میرے بھائی ہو، مجھے تمھاری غربت پر ترس آتا ہے۔ میں تمھارا مفت علاج... کروں گا، تمھارا گردہ خراب ہو گیا ہے۔ اس کا آپریشن بھی مفت کروں گا۔ کوئی پائی پیسہ خرچ نہیں ہو گا تمھارا۔ میں مجبوراً راضی ہو گیا۔ جان کسے عزیز نہیں ہوتی جیلانی بھائی! یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی اس خدا ترسی کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما تھا اور جب مجھے اصل بات کا علم ہوا تو میں نے کوئی انتقامی کارروائی کرنے کے بجائے اس سے سیدھی سیدھی بات کی کہ اس نے میرے گردے کی جو قیمت حاصل کی ہے، اس میں سے نصف رقم مجھے دے دے۔ پہلے تو اس نے مجھے دھونس دھاندلی سے ڈرا دھمکا کے بھگانا چاہا لیکن جب میں نے بھی جواباً دھمکی دی کہ اگر اس نے میرا مطالبہ نہ مانا تو میں اخبارات کے دفتروں میں جا کر اپنی بپتا سناؤں گا۔ اخبارات میں اس کے کلینک میں ہونے والے دھندوں کی روداد شائع ہو گئی تو مجھ جیسے اور بھی بہت سے لوگ میدان میں آ جائیں گے جن کے گردے وہ نکال کے بیچ چکا ہے۔ میری یہ دھمکی کام کر گئی۔ اس نے مجھے پچاس ہزار روپے ادا کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اپنے کاروبار میں شراکت کی دعوت بھی دی، جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا، اب میں ایک معزز اور دولت مند شخص ہوں۔ یہاں دھمن کے تمام معاملات اب میں ہی سنبھالتا ہوں۔"

"لیکن تمھیں کیسے پتا چلا کہ اس نے تمھارا گردہ نکال کر بیچ دیا ہے؟"

"چھوڑو اس قصّے کو، یہ بڑی طویل داستان ہے۔ پھر کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ فی الحال تو تم مجھے اس پلاستر کے بارے میں بتاؤ جو تم نے اپنے پیروں سے اُتارا تھا۔ وہ کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے پھر انجان بن کر کہا۔ "او ئے یار۔ آخر تم اس کے لیے اس قدر پریشان کیوں ہو؟ ایسی کیا چیز تھی اس کے اندر؟ میں نے تو اسے یوں ہی بے کار شے جان کر پھینک دیا تھا۔"

وہ گہری نظروں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولا۔

"جیلانی! میں ایک گھنٹہ پہلے فون پہ بات کر چکا ہوں دھمن سے۔

اس نے بتایا ہے کہ تمھیں سب کچھ معلوم ہے۔ اب مجھ سے زیادہ اُڑنے کی کوشش نہ کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے... معلوم تھا، پلاستر میں کیا تھا لیکن میں اس طرح تو تمھارے حوالے نہیں کر سکتا اسے۔"

"کیا؟" وہ چونک کر بولا۔ "کیوں نہیں دو گے تم مجھے وہ؟"

"اس لیے کہ میں تمھیں نہیں جانتا۔ میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ تم وہی آدمی ہو جسے یہ مال دینا ہے۔"

"ہوں، بات تمھاری بھی معقول ہے۔ یہاں آتے ہی جن حالات سے تمھارا سابقہ پڑا ہے، اس کی روشنی میں تمھیں ایسا ہی محتاط رویّہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔"

"یہ ماننے کے بعد بھی کہ میرا رویّہ درست ہے، تم اس کے لیے ضد کرو گے؟"

"نہیں، بالکل نہیں، میں نہ اس سلسلے میں کوئی ضد کروں گا نہ جبر۔ میں اپنی طرف سے مطمئن کیے بغیر تم سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا اور مطمئن... ہونے کے لیے مناسب یہی ہے کہ تم دھمن سے خود بات کر لو۔ رات جب تم نے اس پلاستر کی اہمیت سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا تو مجھے یہی خیال آیا تھا کہ شاید دھمن نے کسی وجہ سے پروگرام تبدیل کر دیا ہے لیکن اسے ایسا کرنا تھا تو مجھے اس کی اطلاع دینا چاہیے تھی چنانچہ میں نے اس سے بات کی اور جب معلوم ہوا کہ تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یا تو تم میری طرف سے مشکوک ہو یا پھر تمھاری نیت خراب ہو گئی ہے۔ میں نے دھمن سے کہا کہ وہ تمھیں فون کر کے میری طرف سے مطمئن کر دے۔ لہٰذا اب وہ فون کر کے تم سے بات کرے گا۔ اس وقت تک میں بھی یہیں موجود ہوں۔"

"یہ اچھا کیا ہے تم نے۔ ورنہ میرا تو خیال تھا کہ تم میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کرو گے۔"

"اب ایسا بھی گدھا نہیں ہوں میں یار جی! اور ہاں وہ الزبتھ سے تو ذکر نہیں کیا ہے نا تم نے ہیروں کا؟"

"او نہیں پیارے بھائی! میں جانتا ہوں اسے ایسی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ بڑی محبت کرنے والی لڑکی ہے وہ۔ بڑا پیار بھرا ہے میرے لیے اس کے دل میں۔ اب میں اسے اپنے کالے کرتوتوں سے باخبر کر کے اس کے دل کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا، تم بھی خیال رکھنا، کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا اس کے سامنے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "تم فکر نہ کرو اس کی تو۔ تمھیں یار کہا ہے تو یاری نبھانا بھی جانتا ہوں میں۔"

"میں ان جھگڑوں سے نمٹ کے جلد سے جلد لاہور پہنچنا چاہتا ہوں۔ ماں جی بڑی بے چین ہوں گی میرے لیے۔"

"فکر نہ کرو، دھمن سے بات کر کے ہیرے مجھے دے دو۔ اس کے بعد جب جانا چاہو گے سیٹ ریزرو کرا دوں گا جہاز میں۔"

"ہاں یار! یہ ٹھیک رہے گا۔ میں بھی بس اُڑ کے پہنچ جانا چاہتا ہوں اس کے پاس۔"

"میں نے سُنا ہے تمھاری بہن آج کل راولپنڈی جیل میں ہے۔ کچھ سنگین قسم کے الزامات ہیں اس پر۔"

"ٹھیک سُنا ہے تم نے۔ اس کی بھی فکر لگی ہوئی ہے مجھے۔ یہی وہ تکلیف ہے جس کا ابھی ذکر کیا ہے میں نے۔ اس کے ساتھ میرا یار اسلم آپی بھی ہے۔ سُنا ہے جیل کی سختیوں نے اس کی بینائی چھین لی ہے۔ ان دونوں کو بھی آزاد کرانا ہے مجھے۔ لیکن کوئی تدبیر نہیں بن رہی ہے۔"

"فکر مت کرو یار! کوئی بہت بڑا وکیل کھڑا کر دیں گے ان کی پیروی کے لیے۔ تم لاہور جا کر ماں جی سے مل آؤ اپنی، پھر دیکھیں گے اس مسئلے کو بھی۔"

فون کی گھنٹی نے ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ شرافت علی اُٹھتے ہوئے بولا۔ "شاید دھمن کا فون ہے۔"

"ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف دھمن ہی تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے سب کچھ سُننے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے جیلانی! اب تم صحیح لوگوں کے درمیان پہنچ چکے ہو۔ وہ امانت تم شرافت علی کو دے دو۔"

اُس نے مجھے ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے ریسیور رکھ کر شرافت علی کو دیکھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو آؤ میرے ساتھ۔ تمھاری امانت میری اٹیچی میں موجود ہے۔"

اس کا چہرہ خوشی سے کھِل گیا۔ وہ مسکراتا ہوا اُٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ میں اسے ساتھ لے کر اس کمرے میں آ گیا جہاں میں نے رات گزاری تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ جہاں میں سویا تھا۔ اٹیچی بیڈ کے نیچے رکھی تھی۔ میں نے نیچے جُھک کر اٹیچی اُٹھائی اور اسے بیڈ پر رکھ کر اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ ڈھکنا کُھلتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ رگوں میں خون کی گردش اتنی تیز ہو گئی کہ دونوں کنپٹیاں بری طرح جلنے لگیں۔ حالت بڑی عجیب ہو گئی تھی میری، بدن کا رُواں رُواں سنسناتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر شرافت علی کو دیکھا۔ وہ بھی... میری کیفیت کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ بولا۔ "کیا ہوا جیلانی! کیا بات ہے؟ یہ تم اچانک اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟"

میری زبان گنگ تھی، منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بمشکل اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا۔ "وہ... وہ تھیلا... شرافت علی... اس میں وہ تھیلا... نہیں... ہے۔ وہ... وہ...."

جس ہیں پلاسٹر کے ٹکڑے ... رکھے تھے ... مم ... مم ... میں نے"

؟ کیا کہہ رہے ہو تم ...؟" شرافت علی کی آنکھیں بھی حیرت کی زیادتی سے پھٹ گئیں۔

میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو جیسے میری رگوں میں لہو کی گردش تھم گئی تھی —— شاید خون رگوں میں حرکت کرنا بھول گیا تھا۔ ایسا ہی شدید اور اچانک جھٹکا پہنچا تھا دل و دماغ کو میرے اور اس شرافت علی کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی مجھ سے۔ دیدے اس کے بھی پھیل کر رہ گئے تھے اور منہ یوں کھلا ہوا تھا جیسے ہوا مار گئی ہو اسے، منہ بند کرنے کی اس میں سکت ہی نہ رہ گئی تھی یہ کیفیت میری بس چند لمحے رہی تھی اس کے بعد تو میری رگوں میں کھولتا ہوا لاوا دوڑنے لگا، آنکھیں بے طرح سلگ اٹھیں۔ میں نے اٹیچی بند کر کے الگ رکھی اور شرافت علی کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کر اس کے قریب جا ٹھہرا۔

"اوئے سیاپا دکھاتا ہے مجھے تو کھوتے دے پُتّر!"

وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ یوں اُچھل کے پیچھے ہٹا جیسے میں نے اسے بجلی کا ننگا تار چھوا دیا ہو۔ "کیا کہہ رہا ہے۔ جیلانی! ہوش کھو بیٹھا ہے کیا! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا، تیری نیت میں فتور آگیا ہے۔"

"اوئے بیّت کے بچے' الٹی چوری لگاتا ہے مجھ پر سوؑر کی اولاد۔" میں طیش میں آکر اس پر جھپٹا۔

وہ مجھے جھکائی دے کر دوسری طرف نکل گیا اور تیزی سے پستول نکال کر مجھ پر سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "رک جا جیلانی۔ یہ ڈراما میرے ساتھ نہیں چل سکے گا تیرا۔ سیدھی طرح ہیرے نکال دے ورنہ آج اپنی بدمعاشی کی عمر تمام سمجھ۔ تیرے جیسے کتوں کی دُمیں سیدھی کرنا آتا ہے مجھے۔"

اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس گھڑی وہ طلسماتی انگوٹھی میرے ذہن سے بالکل اتر گئی تھی۔ یہ یاد ہی نہیں رہا تھا مجھے کہ وہ اس پستول کو مجھ پر پتھر کی طرح پھینک کر مار تو سکتا تھا اس سے میرا سینہ چھید نہیں سکتا۔ اس کے اندر دھری وہ اجل کی پیامبر گولی جس پر اعتبار کر کے شرافت علی مجھ پر یوں بھونک رہا تھا، میرے سامنے اس سے وفا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آدمی کے پورے جسم میں ایک آنکھ ہی ایسا پُرزہ ہے جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں سچ ہی سچ رقم ہوتا ہے۔ آنکھوں کی تحریر کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتی، شرط یہ ہے کہ کسی کو وہ تحریر پڑھنے کا فن بھی آتا ہو۔ اور یہ فن کہیں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، یہ تو زمانے کی ٹھوکروں میں رُلتے رُلتے آدمی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ مجھے میری

خم پارہ تقدیر جس بھٹی میں پکاتی رہی تھی، وہاں تو بڑے تجربے سمو دیے گئے تھے میرے اندر۔ اس ذلالت خان کی آنکھیں جو لوگوں کو اپنا نام شرافت علی بتاتا تھا، مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ اس کی زبان بھی سچ ہی اگل رہی تھی اس سمے۔

میرے چہرے پر تردد کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ میں الجھن کا شکار ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے پیارے' یہ کام تیرا نہیں ہے۔ مجھے یوں ہی شبہات نے آگھیرا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہاں میرے اور تیرے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس پلاستر کی قیمت کیا ہے۔ اور پلاستر کے وہ بے حقیقت ٹکڑے خود اپنی قیمت بتا نہیں سکتے کسی کو۔"

میری بات سُن کر شرافت علی کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوا مگر پھر ایک دم اس کے رگ پٹھے دوبارہ اکڑ گئے۔ لہجے کا طنطنا کچھ اور بڑھ گیا۔ "تیری کوئی چالاکی مجھ پر اثر نہیں کرے گی جیلانی۔ بکواس میں بالکل نہیں سنوں گا۔ خیریت چاہتا ہے اپنی تو وہ سارے ہیرے اُگل دے یہاں میرے سامنے۔"

"روک کے استاد روک کے۔ زیادہ فوں فاں نہ کر پیارے بھائی! یقین کر لے، کسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہے اُن پر۔"

"کیسے یقین کروں میں؟ کیا ثبوت ہے اس کا تیرے پاس؟ ابھی تو تو مجھ پر ہی الزام لگا رہا تھا ان کی چوری کا۔ پستول دیکھ کر چال بدل رہا ہے۔"

"نہیں یار جی! بات یوں نہیں ہے۔ مجھے یہی گمان ہوا تھا اس گھڑی کہ تو کسی مشکل سے گزارنا چاہتا ہے مجھے، پر جب میں نے تیری تلاشی لی، تجھے اندر سے کھنگالا تو تو نردوش ہی نظر آیا مجھے۔"

"جھوٹ مت بول، صاف کیوں نہیں کہتا کہ اس پستول نے بازی پلٹ دی ہے تیری۔"

"او یار، بس کر اب، مان لے کہ میں کوئی چھل کپٹ نہیں کر رہا ہوں تیرے ساتھ۔" عین اسی لمحے میرا انگوٹھی والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا۔ میری نظر انگوٹھی پر پڑی تو میں مسکرا اٹھا۔ میں نے کہا۔ "اور تو یہ بار بار اپنے پستول کو کیوں بیچ میں لے آتا ہے؟ بہت خوش فہمی ہے تجھے اس کے بارے میں؟ حالانکہ سمجھ دار لوگ ایسے ہرجائی اوزاروں پر تکیہ نہیں کرتے کبھی۔"

"یہ اوزار نظر آرہا ہے تجھے' یہ پستول؟ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے۔ بڑے دھماکے سے گولی اگل دیتا ہے یہ جیلانی۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ کمزور دل آدمی تو اس کی آواز سے ہی عدم کو سدھار جاتا ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے۔ مگر اس کے لیے بھی کمزور دل ہونا شرط ہے اور میں کیا تجھے کوئی ایسا ہی پھولنس کا چھپر دکھائی دیتا ہوں نہیں

پیارے، اگر میں ایسا ہی بھسم ہو جانے والا ہوتا تو تُو جانتا ہے' تیرے اس دھمن اور اس کے گرگوں نے کیسے کیسے اوزار نہیں آزمائے ہیں مجھ پر مگر وہ میرا ایک نٹ بھی لُوز نہیں کر سکے۔"

"دیکھ جیلانی! جب تو نے ساری اگلی پچھلی باتیں بھلا کر ہمارے ساتھ یاری کا رشتہ قائم کر ہی لیا ہے تو اسے برقرار رکھ۔ ہمارے ساتھ دیانت داری سے چلے گا تو چند ہی برسوں میں کروڑوں کا مالک بن جائے گا۔ یہ ہیرے تیرا زیادہ دن ساتھ نہیں دے سکیں گے جبکہ ہم تیرے بُرے بھلے میں ہر وقت تیری پشت پر موجود رہیں گے۔"

"تو میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتا میرے یار۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، مان لے وہ ہیرے میرے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اب ہمیں مل کر ان کی بازیابی کی کوشش کرنا چاہیے، یوں لڑائی جھگڑے سے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا ہمارے۔"

میرے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ میرے چہرے نظریں جمائے چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پستول واپس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے جیلانی، میں یقین کیے لیتا ہوں تجھ پر۔ مگر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ ہیرے گئے کہاں؟ کون لے سکتا ہے انھیں؟"

"ہاں، اب صحیح بات کی ہے تو نے۔ اس سوال کا صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا، ان تمام حالات کا از سرِ نو جائزہ لینا ہو گا جو یہاں آتے ہی ہمیں پیش آئے۔ وہ لوگ جو ہمیں ایئر پورٹ سے اپنے ساتھ لے گئے تھے' ان کا بھی کوئی مقصد تو ہو گا نا۔ وہ کوئی اپنے ابے یا ماموں کا ولیمہ کھلانے تو نہیں لے گئے تھے نا؟"

"ہاں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایک بار پھر اس کوٹھی پر دھاوا کرنا ہو گا لیکن انھیں یہ کیسے پتا چلا کہ تم اپنے ساتھ کیا لے کر آئے ہو؟"

"یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ پہلے تو تم یہ سوال حل کرو کہ انھیں یہ کیسے پتا لگا۔ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ میں کسی عام فلائٹ سے تو آیا نہیں تھا کہ انھوں نے بس اتفاقاً مجھے ایئر پورٹ پر دیکھ کر پہچان لیا اور میرے اس سفر کی غرض و غایت جاننے کے لیے لے اڑے اپنے ساتھ۔ یقیناً انھیں پہلے سے علم تھا ہر بات کا، اسی لیے باقاعدہ منصوبے کے ساتھ وہاں پہنچے تھے وہ۔ اور اس خوبصورتی سے تمھیں ٹہلا دیا تھا انھوں نے ایئر پورٹ سے کہ اگر تم نے احتیاطاً اپنا ایک آدمی وہاں نہ چھوڑ دیا ہوتا تو تمھارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے تھے کہ سان فرانسسکو سے

ڈاکٹر دھمن نے جو پارسل تمھارے لیے بھیجا تھا وہ کہاں گم ہو گیا۔"

"ہاں یار، معاملے کے اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا اب تک۔ یہ تو واقعی حیران کُن بات ہے۔ انھیں تمھارے بارے میں کیسے علم ہوا اور وہ اتنے باخبر لوگ ہیں کون جنھیں ہم نہیں جانتے۔ حالانکہ وہ ہمارے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔"

"اور اب میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے ان ہیروں ہی کی خاطر یہ سارا ڈراما کیا تھا۔"

"وہ کیسے؟ یہ یقین تمھیں کیونکر ہوا ہے؟"

"بالکل صاف اور سامنے کی بات ہے یار جی۔ جسے ہم فراموش کیے بیٹھے ہیں۔"

"کچھ بتاؤ بھی تو یار۔ کون سی بات ہے وہ سامنے کی؟"

"تم نے جب کوٹھی پر چڑھائی کی تھی تو وہ کھل کر تمھارے مقابلے پر نہیں آئے تھے، انھوں نے بس یوں ہی سا برائے نام مقابلہ کیا تھا، ہلکی سی ٹھاں ٹھوں کر کے نکل بھاگے تھے وہ وہاں سے۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟"

"ہاں، ہوا تو ایسا ہی تھا۔ اس پر مجھے حیرانی بھی تھی۔ حالانکہ خیال میرا یہی تھا کہ بڑا زبردست قسم کا معرکہ ہو گا وہاں۔ اسی لیے پورے انتظام سے گیا تھا میں۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا ایسا کیوں ہوا؟ وہ جن کے ذرائع اتنے وسیع ہوں، جو سان فرانسسکو سے اڑنے والے ایک خصوصی طیارے کے مسافروں کے بارے میں بھی علم رکھتے ہوں، وہ اتنے بودے تو نہیں ہو سکتے کہ کچھ دیر بھی تمھارے مقابلے پر ٹک نہ سکتے ہوں۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے بس۔"

"وہ کیا؟ کیا سمجھے ہو تم اس بات سے؟"

"یہ کہ جس مقصد کے لیے انھوں نے یہ ساری تگ و دو کی تھی، وہ اسے حاصل کر چکے تھے، اسی لیے انھوں نے تمھیں ہم تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہیرے حاصل کرنے کے بعد تو ہم ان کی جان کا عذاب ہی تھے نا؟ اس عذاب سے انھیں چھٹکارا تو پانا ہی تھا کسی نہ کسی طرح اور تم نے ان کی یہ مشکل حل کر دی تھی۔"

"اوہ ... اوہ ... جیلانی، یہ تو بالکل سیدھی سچی بات ہے اور میں اتنی سیدھی سی بات سمجھ نہیں سکا، کیا ہو گیا تھا مجھے؟ وہ الّو کے پٹھے تو میری آنکھوں میں دھول جھونک گئے اور میں سمجھ ہی نہیں سکا کچھ۔"

"چلو اب تو سامنے آگئی ساری بات۔ اب ذرا دماغ ٹھنڈا رکھ کر سوچو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

وہ چند لمحے سر جھکا کے سوچتا رہا، پھر بولا "رات وہاں اچھا خاصا ہنگامہ کر آئے ہیں ہم، ابھی ایک دو روز تو اُدھر کا رُخ بھی کرنا

مناسب نہ ہوگا۔ فی الحال میں ایک دو آدمی اس کوٹھی کی نگرانی پر مامور کیے دیتا ہوں۔ حالات معمول پر آنے کے بعد ہم ایک بار پھر دھاوا بولیں گے وہاں۔"

"لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ لوگ اسی کوٹھی میں جمے بیٹھے رہیں۔ اگر اس اثنا میں انھوں اپنا ٹھکانا تبدیل کر لیا تو؟"

"اسی لیے میں وہاں کی نگرانی کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس ڈور کا سرا وہیں سے مل سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے، یہ ٹھیک فیصلہ کیا ہے تم نے۔"

"اچھا اب تم آرام کرو۔ میں شام کو آؤں گا تمھارے پاس۔ اگر دل گھبرائے یا کراچی کی سیر کرنا چاہو تو گاڑی گیرج میں کھڑی ہے نکال لینا اور کوئی اہم ضرورت ہو تو مجھے فون کر لینا۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے بڑی خوب صورتی سے اپنی جان چھڑا کر اس کا رخ دوسری سمت پھیر دیا تھا مگر خود میرا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ فیروز اور خان مجھ سے جس حوالے سے متعارف ہوئے تھے، اس کے پیش نظر میرا دل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا کہ ہیرے انھوں نے غائب کیے ہوں گے۔ ادھر شرافت علی بھی مجرم نظر نہیں آتا تھا مجھے۔ اس کا سارا کا سارا عمل اس کے حق میں گواہی دے رہا تھا۔ پھر وہ کون تھا جس نے ان پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا؟ ایک ہی بات رہ رہ کے ذہن میں چبھ رہی تھی یا تو فیروز کی کوٹھی میں میرے سونے کے بعد کسی ملازم نے یہ حرکت کی تھی یا پھر یہاں شرافت علی کے بنگلے میں کسی کی نیت ڈگمگا گئی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہیں جناب عالی؟ کیا کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے؟"

لزی کی بھید دں بھری جل ترنگ آواز نے میری سوچوں کے تار کاٹ دیے۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنے نازک لبوں کو نہایت دلنشیں مسکان سے آراستہ کیے میرے سامنے کھڑی، نیم خوابیدہ نگاہوں سے یوں دیکھ رہی تھی کہ مجھے اپنے خرمنِ ہوش کو خاکستر ہونے سے بچائے رکھنا مشکل معلوم ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کے رخِ تاباں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "آؤ لزی، بیٹھو۔ کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟"

وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس لیے ادھر آنا مناسب نہیں سمجھا کہ شاید آپ لوگ کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں تو میری موجودگی آپ کے لیے تکلیف دہ بن جائے گی۔"

"اوہ کیسی باتیں کرتی ہو تم، کیا کسی کو اپنی زندگی سے یوں بیزار ہوتے دیکھا ہے کبھی؟" میں نے اس کے مقابل بیٹھ کر کہا۔

"یہ تو آپ کی محبت ہے جناب عالی، جو آپ اس طرح سوچتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ دو آدمیوں کی گفتگو کے درمیان میں کسی تیسرے کو کباب کی ہڈی نہیں بننا چاہیے۔"

"لیکن اس کا اطلاق تم پر تو نہیں ہوتا۔ تم سے تو میں کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتا کبھی۔"

"آپ نہ چھپائیں کوئی بات، مگر دوسرا شخص تو چھپانا چاہے گا نا؟ اس کے نزدیک تو میری یہ حیثیت نہیں ہے۔"

"ہاں، یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ شرافت علی شاید تمھارے سامنے کھل کر نہیں بول سکتا۔"

"کوئی اہم ہی مسئلہ لے کر آیا تھا وہ۔ یہ تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب وہ آپ کو ساتھ لے کر ادھر آ رہا تھا۔"

میں نے اس وقت اچانک ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ لزی کو اس سارے معاملے سے باخبر کر دوں۔ اس طرح آرتھر کے دل میں دھمن کی طرف سے بدگمانی کا پودا لگایا جا سکتا تھا۔ مجھے ان دونوں ہی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میرے نزدیک تو وہ دونوں ہی خوفناک قسم کے زہریلے سانپ تھے جن کا سر کچلا جانا بے حد ضروری تھا۔ ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے مقابل کھڑا کر کے خود کو تماشائی بنا لینے کا اصول بھی ان یہودیوں ہی کا وضع کردہ تھا۔ میں نے بچپن میں ایک واقعہ پڑھا تھا کہیں۔ ایک یہودی دکاندار کی دکان میں سانپ نکل آیا۔ یہودی کا جواں سال بیٹا بندوق لے کر سانپ کو مارنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ یہودی نے اپنے ایک دشمن کو آتے دیکھا، اس نے جلدی سے بیٹے کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور بھاگ کر اپنے دشمن کے پاس جا کے گڑگڑانے لگا کہ اسے سانپ سے بچا لے۔ دشمن، یہودی سے بندوق لے کر اس کی دکان میں گیا اور سانپ کو مار دیا۔ پھر اس نے بندوق یہودی کو واپس کی اور اسے حقارت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد یہودی کے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا۔ "بابا! یہ تم نے کیا کیا؟ اس سانپ کو تو میں خود بھی مار سکتا تھا پھر تم نے ایک دشمن کا احسان کیوں لیا؟ کیسی حقارت سے دیکھتا ہوا گیا ہے وہ۔"

یہودی بولا۔ "بیٹے! جب دو دشمن موجود ہوں تو ہمیں کوئی خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اب دیکھو نا، وہ موذی سانپ بھی دشمن تھا ہمارا اور وہ شخص بھی دشمن ہی تھا۔ میں نے ان دونوں کو مقابل کر دیا۔ اب اس نے سانپ کو مار دیا یوں ہمارا ایک دشمن ختم ہو گیا، اگر وہ ناکام ہو جاتا اور سانپ اسے مار دیتا تب بھی ہمارا ایک دشمن ہی کم ہوتا۔ ہم دونوں تو محفوظ ہی رہتے نا پھر بھی۔"

میں نے بھی انھیں خود انھی کے داؤ سے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا۔ "ہاں لزی، ایک مسئلے سے دوچار ہو گئے ہیں ہم۔ کسی نے میری اٹیچی سے وہ ہیرے غائب کر دیے ہیں جو ڈاکٹر دھمن

نے میرے ذریعے یہاں بھیجے تھے۔ شرافت علی اس وقت وہ ہیرے ہی لینے آیا تھا لیکن میں نے اٹیچی کھولی تو ہیرے اس میں نہیں تھے۔"

"کیسے ہیرے جناب عالی، کب لائے تھے آپ وہ ہیرے؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں ہے ان کی۔"

میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا؟ تمھیں خبر نہیں ہے۔ کیا ڈاکٹر دھمن نے تمھیں یا مسٹر آرتھر کو ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تو سمجھتا تھا تمھیں معلوم ہوگا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب عالی۔ ڈاکٹر دھمن نے ڈیڈی کو ہیروں کے بارے میں بتایا ہوتا تو انھوں نے جب ہمارے روانہ سے پہلے مجھے آپ کے بارے میں ہر بات صاف صاف بتائی تھی، اسی وقت وہ ان ہیروں کا ذکر بھی ضرور کر دیتے۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ ڈاکٹر دھمن نے انھیں بھی بے خبر رکھا تھا اس سے۔"

"اوہو، یہ اچھا نہیں کیا اس نے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح آدمی بے اعتبار ٹھہرتا ہے۔ اپنوں کی نظروں میں بھرم جاتا رہتا ہے اس کا۔ میں جانتا ہوتا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو تمھیں ضرور آگاہ کر دیتا۔"

"وہ ہیرے تھے کہاں؟ آپ کے سامان میں تو تھے نہیں۔ سامان تو تھا ہی نہیں آپ کے ساتھ کچھ بھی، تن کے کپڑوں کے سوا۔ اور جیبوں میں رکھ کر لائے نہیں جا سکتے تھے وہ۔ پھر کہاں رکھا تھا آپ نے انھیں؟"

"میرے پیروں پر جو پلاسٹر چڑھایا گیا تھا، اسی میں رکھ دیے گئے تھے وہ ہیرے بھی۔"

"اُف میرے خدا! اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو جاتا تو ہم جیل میں ہوتے اس وقت۔"

اس نے خوف سے لرزتے ہوئے ایسے انداز میں کہا جیسے یہ کوئی بڑا ہی خوفناک کام تھا اس کے لیے۔ وہ مجھے یہی تاثر دینا چاہتی تھی اپنے بارے میں۔ اس طرح وہ یہ سمجھا رہی تھی مجھے کہ اس نے پہلے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ وہ اب بھی میرے سامنے کھلنے کو تیار نہیں تھی۔ شاید غیر محسوس طریقے سے آہستہ آہستہ ایک ایک بل کھولنا چاہتی تھی وہ اپنا تاکہ میں چوکنا نہ ہو جاؤں، کسی طرح کا شک اور شبہ سر نہ ابھارنے لگے میرے ذہن میں اس کی طرف سے۔

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ میں بھی اپنا سینہ مقفل ہی رکھنا چاہتا تھا اس کے سامنے۔ مجھے تو خود کو ہر دم پوری طرح پوشیدہ ہی رکھنا تھا اس سے۔ اس کے اور اس کی پوری قوم کے عزائم مجھ پر عیاں تھے اور میری جیت اسی میں تھی کہ میرے کسی ارادے کی ہوا بھی اسے نہ لگ سکے۔ میں نے پُر تاسف انداز میں کہا۔ "یہ بہت بُرا کیا ہے اس ڈاکٹر دھمن کمینے نے تمھارے ساتھ۔ دل میں تمھارے بدگمانی ڈالنے کی کوشش کی تھی اس نے۔ پورا سُؤر جن ہے وہ۔"

لزی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا ہوتا ہے یہ؟ بڑا عجیب نام دیا ہے آپ نے اُسے۔"

"کیسا نام؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟"

"یہ جو ابھی آپ نے کہا تھا ڈاکٹر دھمن کے بارے میں۔ یہی کہ پورا سُؤر جن ہے وہ؟"

"اوہ۔" میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "وہ اصل میں بات یہ ہے لزی کہ اس وقت غصے میں بے ساختہ نکل گیا میری زبان سے یہ۔ وہ میرا یار آبی کہا کرتا تھا اسے سُؤر جن۔ وہی یاد آ گیا تھا مجھے اس گھڑی۔"

"آبی۔ یہ کون ہے اور کہاں ہے اس وقت؟"

"اس کا پورا نام تو محمد اسلم آبی ہے۔ بڑا پکا یار ہے وہ میرا۔ میرے پسینے پر اپنا خون گرانے کو تیار رہتا ہے ہر گھڑی۔ اِن دنوں میری بہن آسیہ کے ساتھ راولپنڈی جیل میں اپنی تیرہ بختی کے دن گزار رہا ہے۔"

آبی اور آسیہ کے خیال نے مجھے افسردہ کر دیا تھا۔ کلیجہ کٹتا ہوا سا محسوس کر رہا تھا میں۔ سانس میرا سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر لزی نے افسردگی سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے جناب عالی۔ بے حد شرمندہ ہوں میں آپ سے۔ لیکن یقین کریں، میرا مقصد آپ کی دل آزاری ہرگز نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرا یہ سوال آپ کو اس قدر افسردہ اور ملول کر دے گا۔ ورنہ میں ہرگز نہ پوچھتی ان کے بارے میں۔ اف میرے خدا! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ کا دوست اور بہن ایسے اذیت ناک مرحلے سے گزر رہے ہیں۔"

"ہاں لزی، تمھیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس میں تمھارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اگر آبی کا ذکر نہ کرتا تو تم یہ سوال بھی نہ کرتیں، اس میں تمھاری خطا ہی کیا ہے۔ وہ تو میری خم پارہ تقدیر ہے جو مجھ پر نشتر زنی کرتی رہتی ہے اور اسی کے لگائے ہوئے زخم کبھی کبھی کسک دینے لگتے ہیں تو میں نڈھال ہو جاتا ہوں۔"

"آپ تو بہت سنجیدہ ہو گئے جناب عالی۔ ہمت سے کام لیں، حالات کا مردانہ وار مقابلہ کریں، بالکل اسی طرح جس طرح اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے مقابل آ جانے والے آدمی ہیں۔ کم از کم آپ

پر یہ افسردگی کی چھاپ بالکل نہیں اچھی لگتی ہے۔"

وہ ٹھیک کہتی تھی، میں اس وقت کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح مسائل حل نہیں ہوا کرتے، اس کے لیے تو آدمی کو حالات سے پنجہ لڑانا پڑتا ہے، وقت کی رفتار کو قابو میں کر کے اس کا رخ بدلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اس گھڑی اپنے دل پر پتھر رکھ کر جیسے تیسے خود کو سنبھالا۔

"آؤ لزی، چھوڑو اس قصے کو، چلو ہم باہر چلتے ہیں میں تمھیں اپنے ملک کے اس سب سے بڑے شہر کراچی سے متعارف کراؤں چل کر۔ ہم اسے روشنیوں کا شہر کہتے ہیں۔ یہ شہر بڑا غریب پرور ہے ملک کے گوشے گوشے سے لوگ اس کے دامن میں پناہ لینے آتے ہیں اور یہ کشادہ دل عظیم شہر اُن سب کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ یہ میرے ارضِ پاک کی عظمت کا نشاں ہے، یہ میرے قائد کا شہر ہے۔ اسی لیے ہر قسم کی طبقاتی منافرت اور تعصّب سے پاک رہ کر یہ میرے ملک کی معیشت کا تمام تر بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے شب و روز جاگتا رہتا ہے۔ یہاں زندگی ہر وقت رواں دواں رہتی ہے۔ آدمی کو رات اور دن کے آنے جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں بھی یہی کہنا چاہ رہی تھی آپ سے جنابِ عالی! رات ہمارا طیارہ یہاں پہنچا تھا تو میں نے فضا سے دیکھا تھا اس جگ مگ کرتے شہر کو۔ بڑا حسین اور دلکش منظر تھا وہ، زمین پر کہکشاں اتری نظر آتی تھی جا بجا۔ میرے دل میں اسی وقت سے اس شہر کو دیکھنے کی خواہش مچل رہی ہے۔"

میں اسے ساتھ لے کر باہر آیا تو بنگلے کے مین گیٹ پر بیٹھا ہوا دربان ہمیں دیکھتے ہی لپکتا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا۔ "کیا کہیں باہر جائیں گے صاحب جی؟" وہ ایک لاغر سا ادھیڑ عمر شخص تھا، شاید کسی نشے نے مار رکھا تھا اسے۔ مجھے حیرت تھی کہ شرافت علی نے اس بے ضرر مچھر کو اس بنگلے کی حفاظت کا کام سونپ رکھا تھا۔

"ہاں یار! ہم ذرا شہر دیکھنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔"

"بہت اچھا جناب! بس ذرا ایک منٹ ٹھہریں میں گاڑی لے کر یوں آیا ابھی۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ٹھیک ہے، تم گاڑی لے کر آؤ، ہم گیٹ پر کھڑے ہیں۔"

وہ گیرج کی طرف دوڑ گیا۔ میں اور لزی ٹہلتے ہوئے گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ اس نے ایک چم چم کرتی کرولا ہمارے پاس لا کر کھڑی کر دی۔ پھر جلدی سے نیچے اتر کر ہمارے لیے عقبی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "آئیں صاحب جی۔ تشریف رکھیں آپ لوگ اندر۔"

میں نے لزی کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ادھر کوئی ڈرائیور شرائیور نہیں ہے ایسا جو پورے شہر سے واقف ہو۔ میں پہلے دو بار آ چکا ہوں کراچی مگر یار، شہر کو دیکھنے کی مہلت نہ مل سکی کبھی۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر خادمانہ انداز سے آگے جھکا اور بولا۔ "خادم حاضر ہے جناب۔ آپ فکر ہی نہ کریں، شہر کا کونہ کونہ دکھلاؤں گا۔ ایسی ایسی جگہیں دکھاؤں گا کہ جی خوش ہو جائے گا آپ کی میم صاحب کا بھی۔"

"ٹھیک ہے چلو پھر، مگر یہاں کون بیٹھے گا؟ اس گیٹ پر؟"

"وہ جناب گل زمان ہے چوکیدار، آتا ہو گا ابھی سامنے دکان سے نسوار لینے گیا ہے مجھے بٹھا کر۔"

"اوہ، اچھا میں تو تمھیں ہی چوکیدار سمجھ بیٹھا تھا۔"

"نہیں جناب، میں تو ڈرائیور ہوں حضور۔ صاحب نے آپ کی خدمت کے لیے مجھے یہاں بھیجا ہوا ہے رات سے۔ میں تو یہاں بیٹھے بیٹھے سوکھا ہی جا رہا تھا جناب۔ شکر ہے آپ کو باہر جانے کا خیال آ گیا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "او ہو یار، مجھے نہیں پتا تھا کہ تیری یہ حالت یہاں بیٹھ کر سوکھنے سے ہوئی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کوئی دم شم لگاتا رہا ہے تو۔ کمال ہے بھئی، بڑی خشک ہوا ہے کراچی کی، آدمی بیٹھے بیٹھے خزاں رسیدہ شاخ بن جاتا ہے۔"

"اوہ جناب، یہ مطلب تو نہیں تھا میرا۔ آپ تو زبان پہ پاؤں دھر دیتے ہیں آدمی کی۔" وہ خجل ہو کر بولا۔

میں ہنستے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف کا دروازہ بند کیا اور سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ سے نکال دی۔ گلی کا موڑ کاٹتے ہی گاڑی ایک کھلی اور کشادہ شاہراہ پر دوڑنے لگی اور ایک چھوٹی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد مزارِ قائد کے سامنے جا پہنچی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "پہلوان جی۔ ذرا گاڑی ادھر لگا لو، بابا کے مزار کے ساتھ۔ دعا کرتے چلیں ہم بھی اپنے اس عظیم محسن کے لیے جس نے آزادی جیسی نعمت دلائی ہے ہمیں۔"

ڈرائیور نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر گاڑی مزار کے احاطے میں داخل کر کے ایسی جگہ روک دی جہاں سے ایک سیدھا راستہ مزار کو جاتا تھا۔ میں لزی کے ساتھ گاڑی سے اتر کر مزار کی طرف چل دیا۔ لزی بولی۔ "آپ نے ڈرائیور کو ناراض کر دیا جنابِ عالی۔ ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی آپ کو اس سے۔"

"ہاں، میں بھی محسوس کر رہا ہوں اس کی ناراضگی کو مگر اس

اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں اپنی زبان کو روک ہی نہیں سکا۔ خیر منا لیں گے اسے ابھی واپس آ کر۔ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکے گا وہ خود بھی۔ آدمی خاصا باتونی لگتا ہے، زبان میں کھجلی ہو رہی ہو گی خود اس کے بھی۔"

لزی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمارے بائیں جانب سے ایک آواز سنائی دی۔ کسی نے بڑے عامیانہ انداز میں آواز لگائی تھی۔ "اوئے صدقے بھئی میرے بادشاہ۔ قربان جائیں تیرے، یہ میمڑی کہاں سے اٹھا لایا ہے پیارے؟ بڑا رنگ روپ دیا ہے اسے دینے والے نے۔"

میں نے اور لزی نے ایک ساتھ گردن گھما کے اُدھر دیکھا۔ ایک جھاڑی کے ساتھ گھاس میں چار بے فکرے جوان بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک کپڑا بچھا تھا جس پر کھانے پینے کا سامان اور سگریٹوں کے کئی پیکٹ دھرے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی ہتھیلی پر رکھا چرس ملا تمباکو خالی سگریٹ میں بھر رہا تھا اور بقیہ تینوں ہمیں دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ اپنے لباس اور شکل و صورت سے وہ کسی کم تر درجے کے نہیں لگتے تھے۔ عمریں ان کی ابھی علم حاصل کرنے کی تھیں اور یقیناً وہ طالب علم ہی تھے ابھی مگر حصولِ علم کے بجائے انھیں اپنی معصوم جوانیوں کے لیے روگ حاصل کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ اپنے والدین کے خوابوں کو مسمار کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ شکایت انھیں اپنے والدین سے غالباً یہی رہی ہو گی کہ وہ ان کے اس دنیا میں ورود کا سبب کیوں بنے۔ انھیں عدم ہی میں کیوں نہیں رہنے دیا گیا۔ وہ اگر عدم میں رہتے تو یقیناً شاد رہتے، اس جہاں میں تو ان کی شادمانی کا کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ ہم نے انھیں طرح دے کر گزر جانا چاہا تو ان میں سے ایک نے آواز لگائی۔

"چلے کدھر میرے بادشاہ! ادھر لے آؤ نا اپنی اس پرنسس مارگریٹ کو۔ دو چار دم تم بھی لگا لو ہمارے ساتھ، تارے نظر آنے لگیں گے بھری دوپہر میں۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ الزبتھ نے میرا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ "چلیں جنابِ عالی! چھوڑیں انھیں۔ یہ بے چارے اپنے ہوش میں نہیں ہیں اس وقت۔"

الزبتھ کی بات ان لوگوں نے بھی سن لی تھی۔ وہ جو سگریٹ بھرنے میں مصروف تھا، ایک دم گردن اٹھا کر الزبتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابے یہ تیری پرنسس مارگریٹ تو فر فر اردو بول رہی ہے۔"

"ابے چپ کر الّو! ایسے بانکے نواب کے ساتھ رہ کر اردو نہیں بولے گی تو کیا انگریزی میں عشق کرے گی اس سے؟"

ہمیں دم لگانے کی دعوت دینے والے نے اپنے ساتھی کو ڈانٹا تو سب قہقہے لگانے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "مائی ڈیئر پرنسس! یہ دیکھیں مجھے، غور سے دیکھیں، میں پوری طرح ہوش میں ہوں اپنے۔ ان سالے گھاس بھرے سگریٹوں میں نشہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ آؤ آؤ آزما کے دیکھ لو تم اسے۔"

اس نے قریب آ کے الزبتھ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ لزی نے میرا بازو چھوڑ کر اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس سے وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا پھر پلک جھپکتے میں وہ قلابازی کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ میں سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی اس کے تینوں ساتھی اس پر قہقہے لگانے لگے۔ اپنے ساتھیوں کے قہقہے سن کر اس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ وہ چند لمحے قہر آلود نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر گھما کے لزی کو دیکھا۔ وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم تو کہتے تھے میں نشے میں نہیں ہوں۔ پھر یہ تمھارے قدم کیوں اکھڑ گئے؟ تم سے تو سیدھا کھڑا ابھی نہیں ہوا جا رہا ہے۔"

وہ دانت کچکچا کے تیزی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "سوّر کی بچی! میں بتاتا ہوں تجھے پیر کیسے اکھڑ گئے۔"

وہ لزی پر جھپٹ پڑا۔ لزی مجھ سے چند قدم دور چلی گئی تھی۔ اسے یوں دیوانوں کی طرح جھپٹتے دیکھ کر وہ ایک دم نیچے بیٹھ گئی اور بجلی کی سی تیزی سے دونوں ہاتھ آگے کر کے اسے اپنے ہاتھوں پر روک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی وہ اس کے اوپر سے اڑتا ہوا لزی کے پیچھے جا گرا۔ اس بار وہ کمر کے بل گرا تھا اور اب کمر پکڑے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ چوٹ کچھ ایسی آئی تھی اُسے کہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا اس سے۔ میں حیرت سے درد سے تڑپتے ہوئے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ مگر لزی اس کے ساتھیوں کی طرف مُڑ گئی تھی۔ وہ تینوں اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ غصے اور جوش سے ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ہمارے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔

میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہاں دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیور ہمیں اتار کر شاید گاڑی آگے لے گیا تھا۔ کچھ دور بڑی شاہراہ تھی جہاں چھوٹی بڑی گاڑیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتی نظر آ رہی تھیں، کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ہماری طرف توجہ بھی کرتا۔ لزی نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "بہتر یہ ہے دوستو،

کہ اب تم ہماری راہ میں حائل ہونے کی کوشش مت کرو۔ ہمیں جانے دو ہم تم سے ......"

ان میں سے ایک جو اُن سب سے زیادہ قوی اور دراز قامت تھا تیزی سے اپنی جیب سے پستول نکال کر ہمیں کوَر کر کے بولا۔ "بکواس مت کرو کُتیا! ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو بھیجا اڑا دوں گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اوئے لے یار! ہم ویسے ہی معافی مانگ لیتے ہیں تم سے۔ اس کھلونے کو کیوں تکلیف دیتا ہے۔"

"معافی تو میں ابھی دے دوں گا تم دونوں کو، فکر کیوں کرتے ہو اور یہ کھلونا نظر آتا ہے تجھے کھوتے۔ نام جانتا ہے تو اس کھلونے کا؟"

"اوہ نہیں جناب! سانوں تو کچھ پتا ای نئیں یہ ہے کی شے۔ کچھ آپ ای دس دو جی کی ناں ہے اِس دا۔"

"مذاق اُڑاتا ہے باس کا تو کنجر کی اولاد!" اس کے دوسرے ساتھی نے غضب ناک لہجے میں کہا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔

اس نے میرے قریب آکر اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے خالی ہاتھ جان کر اپنے اتنے قریب آنے کا موقع دے دیا تھا کہ اب میرے پاس اس کے خنجر سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ خنجر میرے جسم کے کسی حصے میں اترتا، لزی چیتے کی طرح اس پہ جھپٹی اور اسے رگیدتی ہوئی اپنے ساتھ لیتی چلی گئی۔ میں اس آفتِ ناگہانی سے سنبھلا تو اس پستول بردار نے میری کمر سے پستول کی نال لگا کر حکم دیا۔ "اس انگریز کی بچّی کو روکو ورنہ گولی مار دوں گا تمھیں۔"

میں نے آہستہ سے مڑ کر اس کا پستول والا ہاتھ الگ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لے یار! کیوں مذاق کر رہا ہے۔"

اسی وقت اس کا ایک ساتھی یوں اس پہ آکر گرا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر اس پہ پھینک دیا ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اُلجھ کر نیچے گرے تو لزی نے ایک بار پھر میرا بازو تھام کر مجھے کھینچنا شروع کر دیا۔ "یہاں سے بھاگ چلیں جنابِ عالی! کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دیں یہ ہمارے لیے۔"

"ہاں جی چلو، یہ تو کمیل ہی ہونے لگے ہیں۔"

ہم واپس جانے کے لیے مڑے تو وہ پستول بردار پھر ہماری راہ میں حائل ہو گیا۔ "خبردار! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ کمیل تمھیں اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے۔"

میں [illegible] زچ ہو کر کہا۔ "او بڑے بھائی! آخر تو چاہتا کیا ہے میرے"

"میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے اس کا حساب برابر کر کے جاؤ جس کی کمر توڑی ہے اس میمٹری نے۔"

"اور یہ حساب برابر کیسے ہو گا پیارے بھائی؟"

"ایسے کہ اب یہ میمٹری ہمارے ساتھ جائے گی اور اس وقت تک تیمارداری کرے گی اس کی جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ اس دوران ہم بھی کچھ خدمت لیتے رہیں گے اس سے۔"

میں نے پوری قوت سے الٹا ہاتھ گھما کے اس کے منہ پر مارا۔ "سؤر کی اولاد! میں کرتا ہوں خدمت تیری۔"

وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر الگ جا گرا تھا۔ اسے اس کے دوسرے ساتھی نے جھپٹ کر اٹھایا اور اس کا رخ میری طرف کر کے لبلبی دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کی لبلبی کو ذرا بھی جنبش دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اس نیچے گرنے والے کو گریبان سے پکڑ کے اٹھایا اور دونوں ہاتھوں پہ اٹھا کر اس پہ دے مارا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اسی وقت ایک کرخت آواز ابھری۔ "خبردار! اپنے اپنے ہاتھ اٹھا لو اور کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ دس بارہ رائفل بردار سپاہی ہمارے گرد بندوقیں تانے گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور ان کا ایک افسر ریوالور تانے ہمارے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یہ آنکھیں سنبھالیں چوہدری صاحب! یہ یہاں مزارِ قائد کے زیرِ سایہ لوگوں کو لُوٹنے کے لیے بیٹھے ہیں۔"

اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم کیا آئی جی لگے ہو یہاں کے، جو مجھے یوں حکم دے رہے ہو؟ یہ تو ہم دیکھیں گے کہ کون کسے لُوٹ رہا تھا یہاں۔"

"میں حکم تو نہیں دے رہا آپ کو جناب! میں نے تو مجرموں کی نشاندہی کی تھی۔"

"اوئے چپ کر جا بے! اٹر ٹر نہ کر زیادہ۔ اس اکیلی میم کو دیکھ کر لُوٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب الزام لگا رہا ہے ان بچوں پر۔ یہ تجھے لیٹرے دکھائی دیتے ہیں بدمعاش؟"

"جناب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بغیر کسی تحقیق یا تفتیش کے یہ الزام کیسے لگا رہے ہیں آپ مجھ پہ؟"

"اوئے تفتیش کے بچّے! اندھا سمجھتا ہے تو ہمیں۔ مجرم کو تو ہم اس کی خوشبو سے پہچان لیتے ہیں۔"

"ہاں جناب! میں جانتا ہوں، بڑا تجربہ ہے آپ کو اس کا مگر اس وقت آپ کی ناک کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ بہت غلط جگہ ہاتھ ڈال بیٹھے ہیں آپ۔ اتنی نرم غذا نہیں ہیں ہم جیسے آپ چبائے بغیر نگل سکیں۔"

اسی وقت لزی بھی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو غلط فہمی ہو گئی آفیسر! یہ مجرم نہیں ہیں، یہ تو میرے ساتھی ہیں، منگیتر ہیں یہ میرے۔ ہمیں ان چاروں نے گھیرنے کی کوشش کی تھی اور بے وجہ ہی بھڑ گئے تھے یہ ہم سے۔ بہرحال ہم نے انھیں اچھا سبق دے دیا ہے۔"

لزی کے بیان نے اس افسر نما ٹِلیے کا لہجہ ہی بدل دیا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "معاف کیجیے جناب! غلط فہمی ہو گئی تھی ہمیں۔ اب دیکھیں نا آج کل چور اُچکّے بھی شریفوں جیسی شکل بنائے پھرتے ہیں۔ ایسے میں دھوکا تو ہو ہی جاتا ہے نا۔ آخر ہم بھی انسان ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ میرا تو بڑا پرانا یارانہ تھا ان پولیس کے بہروپیوں سے۔ بڑے رنگ دیکھ رکھے تھے میں نے ان کے۔ گرگٹ تو بس یوں ہی مفت میں بدنام ہو گیا ہے کسی وجہ سے ورنہ رنگ بدلنے میں تو ان سے زیادہ ماہر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو میں اس کی نن پھن دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ لڑکے انھوں نے وہاں چارے کے طور بٹھائے ہوئے تھے اور اس گھڑی لزی کا غیر ملکی ہونا کام آگیا تھا میرے۔ اگر وہ کوئی مقامی عورت ہوتی تو اس کی بھی کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی اور کچھ نہیں تو شاہراہِ عام پہ نازیبا حرکات کی دفعہ تو لگا ہی دیتے وہ ہم پہ۔

انھوں نے ان چاروں کو گھیر کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ انسپکٹر نے انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اوئے شرم نہیں آتی تمھیں۔ ایسے اعلیٰ خاندان کے ہو کر اتنی گھٹیا حرکتیں کرتے ہو تم لوگ۔ نام ڈبوتے ہو والدین کا اپنے۔"

وہ چاروں اپنے اپنے ہاتھ جوڑ کر گھگھیانے لگے۔ "ہمیں معاف کر دیں انسپکٹر صاحب! غلطی ہو گئی جناب! آئندہ کبھی نہیں کریں گے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، اب کبھی دیکھیں آپ تو، جو چاہیں سزا دے دیں، بس اس بار معاف کر دیں۔"

"معافی ہم سے نہیں، ان سے مانگو جنھیں تم نے پریشان کیا ہے۔ یہ معاف کر دیں تو ٹھیک ہے، ورنہ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو تھانے لے جا کے پرچا کاٹ دوں گا تم چاروں کا۔"

"نہیں جناب! ایسا نہ کریں مر جائیں گے ہم تو بالکل۔" پھر وہ چاروں میری اور لزی کی خوشامد کرنے لگے۔ "آپ دونوں ہمیں بچا لیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں آئندہ کبھی ایسا مذاق نہیں کریں گے کسی سے۔"

"مذاق۔" لزی نے چونک کر انھیں دیکھا۔ "تو یہ مذاق کیا تھا تم لوگوں نے ہم سے؟"

"ہاں ہاں! بس یوں ہی ذرا سا مذاق کیا تھا ہم نے تو۔ کیا خبر تھی کہ بات یوں بڑھ جائے گی۔"

لزی نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔ "اوہ جنابِ عالی! اسنا آپ نے! یہ تو مذاق کر رہے تھے ہم سے۔ آپ خواہ مخواہ میں سنجیدہ ہو گئے ان کے ساتھ۔ چھوڑیں جانے دیں بے چاروں کو۔"

میں بھی بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بات آگے جاتی تو کسی موقع پر میرے بھی تار پود بکھر سکتے تھے اور پھر مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ پولیس افسر کسی نہ کسی طرح یہیں بات ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے ہچکچاتے دیکھ کر وہ میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ادھر آئیں چوہدری صاحب! ذرا ایک بات سن لیں میری۔"

میں اس کے ساتھ تمام لوگوں سے الگ ہو کر بولا۔ "ہاں جی، بولیں کیا بات ہے؟"

"وہ دیکھیں، میں آپ کو کسی مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتا۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں تو آپ یہاں کراچی کے باشندے نہیں ہیں۔ کچھ دن کے لیے سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں یہاں۔ اب اگر ہم ان لوگوں پہ مقدمہ بنا دیں تو آپ کو اس مقدمے کا فیصلہ ہونے تک کراچی میں رکنا پڑے گا۔ عدالت اور گواہی کے چکر میں پھنس کر رہ جائیں گے آپ۔ پھر یہ یقینی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں کو سزا بھی ہو ہی جائے۔ یہ یہاں کے بڑے بااثر لوگوں کے لڑکے ہیں۔ آپ کے لیے بڑی پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی۔ میری بات مانیں تو مٹی ڈالیں جی ان کمینوں پہ۔ ویسے بھی آپ لوگوں نے کم سزا تو نہیں دی ہے انھیں۔ میں اور تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کر دوں گا تو آئندہ کے لیے سبق ہو جائے گا انھیں۔"

"ٹھیک ہے یار، جو تمھارا جی چاہے کرو۔ مجھے کوئی واسطہ نہیں ہے ان سے۔"

"نہیں جناب! میں نے اپنی طرف سے کیا کرنا ہے، ہو گا تو وہی جو آپ چاہیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ دفع ہی کرو یار اس قصے کو، میں کہاں خوار ہوتا پھروں گا۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر میں ان کے ذرا کان کھینچ کر بھگا دیتا ہوں انھیں، آپ جائیں اپنی بیگم صاحبہ کو ساتھ لے کر۔ آپ کے سامنے میں انھیں سمجھا نہیں سکوں گا صحیح طور پہ۔"

"بہت اچھا، پھر مجھے اجازت دیں آپ۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور لزی کو ساتھ لے کر واپسی کے راستے پہ چل پڑا۔ ڈرائیور نے گاڑی خاصے فاصلے پہ باہر جانے والے راستے کے بالکل قریب کھڑی کی ہوئی تھی۔ ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ اگلی دونوں نشستوں پہ لیٹا۔۔ خراٹے لے رہا تھا۔

میں نے اسے پکڑ کر ہلایا تو وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب اٹھ جا میرے بھائی۔ ہمیں آگے بھی جانا ہے یہاں قیام کی غرض سے نہیں آئے ہیں ہم۔"

وہ سنبھل کر ڈرائیونگ نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بیٹھیں صاحب! یہ سالی نیند نہ وقت دیکھتی ہے نہ جگہ۔ بس جہاں اکیلا بیٹھا دیکھتی ہے آکر دبوچ لیتی ہے۔ بڑا پریشان کیا ہے جی اس نے۔"

"افیون کتنی کھاتا ہے بھائی تو دن میں؟"

"وہ کہاں صاحب جی! ملتی کہاں ہے آج کل۔ دس کی خوشامد کرو تو آدھا یا پاؤ تولہ مل جاتی ہے، اسی لیے تو بدن اور بھی ڈھیلا رہنے لگا ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال دی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم گاڑی میں پڑے اس کالی مائی کا سپنا دیکھ رہے تھے اور وہاں بدمعاشوں نے آ گھیرا تھا ہمیں۔ پولیس اگر بروقت نہ آجاتی تو پتا نہیں کیا حشر ہوتا آج ہمارا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارے صاحب کے تو نام سے بڑے بڑے بدمعاش کانپنے لگتے ہیں۔ ان کے مہمانوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کون کر سکتا ہے؟"

"ہمارے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہے کہ ہم کس کے مہمان ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب جی! پر آپ نے انھیں بتا کیوں نہیں دیا۔ ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاتے سالے۔"

"چلو اب آگے کبھی ایسا موقع آیا تو یہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔"

"بالکل بالکل، ایسا ہی کریں آپ۔ کوئی مائی کا لال انگلی نہیں لگا سکتا آپ کو۔"

وہ ہمیں مختلف گلیوں اور شاہراہوں سے گزارتا ہوا طارق روڈ پر جا نکلا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اچانک فردوسی بیگم یاد آگئی بڑی طرح دار عورت تھی وہ اور رکھ رکھاؤ کا بڑا سلیقہ تھا اسے۔ اس نے بُرے وقت میں بڑا ساتھ دیا تھا میرا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "یار! ذرا ادھر کیفے ابراہٹ کے ساتھ گاڑی لگا لے۔ یہاں میرے ایک بہت پرانے جاننے والے رہتے ہیں۔ ادھر آ ہی گئے ہیں تو میں ان سے ملتا چلوں کھڑے کھڑے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جناب! آدمی کو اپنے دوستوں اور ہمدردوں سے ملتے جلتے رہنا چاہیے۔ تعلقات کی تجدید ہوتی رہتی ہے اس طرح اور کوئی کسی کو بھول نہیں پاتا۔ آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے صاحب! جہاں کوئی چیز کام نہیں آتی وہاں آدمی ہی کام آتا ہے آدمی کے۔"

اس نے گاڑی ایک طرف سڑک کے کنارے لگالی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔ "بس دس منٹ لگیں گے مجھے۔ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، ضرور جائیں آپ لیکن یہ خیال رکھیں، پھر کسی کے پھڈے میں پیر نہ اڑا بیٹھیں۔"

میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "اردو تو تم ایسی بامحاورہ بولتی ہو لڑکی بیگم! جیسے ہمارے ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ خاصی اٹھک بیٹھک رہی ہو تمھاری۔"

"یہ سب اس جمیلہ طوسی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے جناب عالی! بڑی محنت کی ہے اس نے مجھ پر۔"

"یار! کمال شے ہے وہ تمھاری جمیلہ طوسی۔ مجھے افسوس ہے میں اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ اس کی صلاحیتوں کو جاننے اور پرکھنے کا موقع ہی نہ مل سکا مجھے۔"

میں اس گلی میں داخل ہو گیا جہاں فردوسی بیگم کا فلیٹ ہوا کرتا تھا۔ اچھی خاصی تبدیلی آچکی تھی اس عرصے میں اس پورے علاقے میں۔ دکانیں ہی دکانیں دکھائی دینے لگی تھیں وہاں اور ایسی ایسی اشیا بھری پڑی تھیں ان دکانوں میں جن پر نظر پڑتی تھی تو ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ خریداروں کا بھی بے پناہ ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تعداد جدید فیشن کی دلدادہ ایسی خواتین کی نظر آتی تھی جن کے سرپرستوں کو بغیر ہاتھ پیر چلائے فراوانی سے خرچ کرنے کے لیے پیسہ مل جاتا تھا۔ آدمی کے پاس پیسے کی ریل پیل ہو تو خرچ کرنے کے سو بہانے آجاتے ہیں۔ اسی لیے تو دولت مند طبقہ بھی اخراجات پورے نہ ہونے کا ماتم کرتا نظر آتا ہے۔

کافی جستجو کے بعد میں اس عمارت کا جائے وقوع تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکا جس میں اس فردِ دس کی باسی فردوسی بیگم کا فلیٹ تھا۔ میں نے اس کے فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بجایا اور انتظار کرنے لگا۔ کئی منٹ تک جب کوئی جواب نہیں ملا تو ذرا زور سے دستک دی۔ اس پُرشور دستک کے جواب میں بھی فردوسی بیگم کے فلیٹ کا دروازہ نہیں کھل سکا البتہ برابر والے فلیٹ کے دروازے سے ایک چاند سا چہرہ طلوع ہو گیا۔ سن اس کا یہی کوئی اٹھارہ بیس کا رہا ہوگا اور صورت اس کی بس دل پر نقش ہو جانے والی تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی روشن، سرمہ سا آنکھیں سوالیہ انداز میں میرے چہرے پر مرکوز کر کے پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

میں نے اس غزال چشم کے سراپا پر نگاہیں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ بی بی! میں آپ کی پڑوسن فردوسی بیگم سے ملنے آیا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ ایک ادا سے اپنی چشم غزالاں کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ آنٹی سے؟ کیا رشتہ ہے آپ کا ان سے؟"

اس کے اس سوال پر میرے دماغ کی رگیں تن جانا چاہیے تھیں مگر وہ ایسی کہاں تھی کہ اس کی کسی بات پہ پیشانی شکن آلود ہو سکتی۔ اسے تو سختی سہنے کے لیے تخلیق ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا سوال سُن کر میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "کیا کریں گی آپ یہ پوچھ کر؟"

"جب آنٹی آئیں گی تو انھیں بتا دوں گی میں۔" اس نے معصومیت سے کہا اور دھیرے سے ہنس دی۔ دانت اس کے شفاف موتیوں کی طرح ترتیب سے جمے ہوئے تھے۔ کسی ٹوتھ پیسٹ کا بہترین اشتہار بن سکتی تھی وہ۔

"مگر تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمھاری آنٹی گئی کہاں ہیں۔"

"ارے، یہ تو میں بھول ہی گئی۔" اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ چہرہ اس کا گلنار ہو گیا اور آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے تھے۔ گلے میں جھولتے ہوئے برائے نام دوپٹے کا ایک کونہ منہ میں ٹھونس کر اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اللہ! کیا سوچتے ہوں گے آپ کہ کیسی سڑی دیوانی ہوں میں؟"

اس کی ایک ایک ادا یہ سمجھا رہی تھی مجھے کہ میرا واسطہ عورت کی کس قسم سے پڑ گیا ہے۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا اس گھڑی کہ میں اسے منزلِ مراد کا پتا سمجھانے بیٹھ جاتا۔ لہٰذا میں نے اسی کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ جیسی پری چہرہ کے بارے میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں۔ چلیں اب بتا دیں۔"

"اف اللہ، آپ تو بڑی پیاری پیاری باتیں کرتے ہیں۔ آئیں ناں، ادھر بیٹھ جائیں ہمارے یہاں۔ آنٹی آئیں گی تو مل لیجیے ان سے بھی۔ آنٹی کے مہمان ہمارے لیے کوئی غیر تو نہیں ہیں نا۔"

"مگر بی بی! آپ نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کی آنٹی گئی کہاں ہیں؟ میرا خیال ہے ان کے آفس کا تو وقت نہیں ہے یہ۔ دفتر سے تو وہ تین بجے تک آجاتی ہیں۔"

"جی ہاں، دفتر سے وہ آجاتی ہیں اس وقت تک مگر آج ان کے آفس میں کوئی پارٹی ہے۔ لہٰذا رات تک ہی آئیں گی وہ۔ آپ یہاں آجائیں، غیریت نہ برتیں ہم سے، آخر پڑوسیوں کا بھی تو کچھ فرض ہوتا ہے نا۔"

"ہاں بی بی! یہ فرض آپ کسی اور وقت ادا کر لیجیے۔ ابھی تو اجازت دیں مجھے۔ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو نیچے سڑک پر گاڑی میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں میرا۔ آپ فردوسی بیگم کو پیغام دے دیں میرا کہ جیلانی آئے تھے آپ سے ملاقات کے لیے۔ میں پھر آؤں گا کسی روز ایسے وقت جب وہ گھر پر موجود ہوں گی۔"

"جی اچھا۔ کہہ دوں گی میں ان سے۔ اور جب آپ ان کے پاس آئیں تو ہمیں مت بھول جائیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہیں۔ آپ تو سپنوں میں بھی یاد رہیں گی مجھے۔"

"باتیں آپ بہت اچھی بنا لیتے ہیں۔ میں بھی یاد رکھوں گی آپ کو۔"

"اچھا اب مجھے اجازت دیں شگفتہ بیگم!"

"دیکھیں یہ غلط طریقہ ہے آپ کا۔ کسی کا نام معلوم نہ ہو تو پوچھ لیا کریں اس سے، غلط سلط نام سے نہ پکارا کریں کسی کو۔ میرا نام شگفتہ بیگم نہیں گلنار خانم ہے جناب!"

"اچھا جی گل، و گلنار خانم! آئندہ یاد رکھوں گا میں یہ نام بھی آپ کا۔"

میں جلدی سے وہاں سے نکل کے بھاگا۔ اگر اس کی اجازت حاصل کرنے کا انتظار کرتا تو وہ یوں ہی بات سے بات پیدا کرتی چلی جاتی۔ اس فن میں بڑا ملکہ حاصل تھا اسے۔ آدمی کی نکیل پکڑ کر اسے اپنی مرضی کے مطابق ہانکنا اسے خوب آتا تھا۔ تبھی تو وہ ایسی ہی گل و گلزار کہ آدمی کا خود بخود جی چاہنے لگتا تھا اپنی باگیں اس کے حوالے کر دینے کو۔ مگر میرے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں اس سے اس کی قصیدہ خوانی کرتے بیٹھ جاتا۔ ڈھلتی شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ شرافت علی شام کو ملنے کا کہہ کر گیا تھا چنانچہ مجھے اب جلد از جلد اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔

اس عمارت سے نکل کر میں گلی کے کونے پر پہنچا تو لڑکی سامنے سے آتی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا ہو گیا تھا؟ خیریت تو ہے نا جناب عالی؟"

اس کے اس طرح پوچھنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں خاصا وقت اس گل و گلزار خانم کی نذر کر آیا تھا۔ اس نے مجھے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی کہ میں وقت کی رفتار پر دھیان دیتا۔ میں نے لڑکی سے جھوٹ بول دیا۔ "وہ اصل میں بات یہ تھی کہ میں بہت دنوں کے بعد آیا تھا ادھر۔ اس عرصے میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اس علاقے میں جس کی وجہ سے مجھے وہ فلیٹ تلاش کرنے میں دیر ہو گئی۔"

"اوہ شکر ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہیں کسی وبال میں نہ جا پھنسے ہوں آپ۔"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر گلی، ہر موڑ پر لوگ میرے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں۔"

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے جناب عالی! اس دنیا کے سارے ہنگامے آپ ہی کے دم سے قائم نظر آتے ہیں مجھے۔"

"نہیں لڑکی بیگم! اس طرح نہیں سوچا کرو۔ قدرت کے اس اتنے بڑے کارخانے میں ایک غلام جیلانی کی حیثیت ہی کیا ہے۔ کاروبارِ عالم بند تو نہیں ہو سکتا میرے بغیر۔ پتا نہیں کتنے غلام جیلانی

مجھ سے زیادہ پُرہنگام زندگی گزار کے جا چکے ہوں گے یہاں سے مگر ان کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی ہوگی اس کائنات میں۔“

ہم اپنی کار کے پاس پہنچے تو وہ منحنی سا ڈرائیور پھر ڈھلکا پڑا تھا سیٹ پر۔ میں نے اسے سیدھا کر اسٹیرنگ کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے فوراً اسٹیرنگ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ ایک دم ایسا چاق و چوبند نظر آنے لگا تھا کہ اسے دیکھ کر اس کی لمحہ بھر پہلے کی کیفیت کا خیال تک نہیں لا سکتا تھا کوئی دل میں اپنے۔ یہ ایک بڑی خوبی تھی اس میں، ورنہ اس جیسے پنکی کو اپنی گاڑی میں جوت دینا موت کو دعوت دینے کے برابر ہی ہوتا۔

ہم واپس پہنچے تو شرافت علی میرا منتظر بیٹھا تھا۔ میں وہیں ڈرائنگ روم میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لڑکی ایک ہی گھاگ تھی ایسے معاملات میں۔ اس نے سمجھ لیا کہ شرافت علی کا آنا بے مقصد نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ تھکن کا بہانہ کر کے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے شرافت علی سے پوچھا۔ ”کیا خبر ہے؟ کچھ پتا چلا؟“

”نہیں، ابھی کوئی پتا نہیں چل سکا ہے۔ میں نے دو آدمی لگا دیے ہیں اس کوٹھی پر۔ ویسے ابھی تو پولیس نے قبضہ کر رکھا ہے وہاں۔ آج دن بھر بہت سرگرم رہے ہیں وہ لوگ۔ وہ ان کا مالی اور چوکیدار دونوں ہی مر گئے ہیں۔ ہمارے آنے کے بعد میرے آدمیوں نے ڈاکے جیسی صورتِ حال پیدا کرنا چاہی تھی وہاں۔ اس کے نتیجے میں وہ دونوں کام آ گئے۔ کوٹھی سے نکلتے ہوئے ان کی پولیس سے بھی مڈبھیڑ ہو گئی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل ہی آئے۔ ہمارا کوئی آدمی پولیس کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔“

”پھر تو اب ان کا اس کوٹھی میں واپس آنا ناممکن ہی سمجھو۔“

”ہاں، ان حالات میں احمق ہی ہوں گے وہ جو دوبارہ اُدھر کا رُخ کریں گے۔“

”پھر اب کیا سوچا تم نے؟ کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے انھیں، اس آدمیوں کے سمندر کراچی میں؟“

”ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے حالانکہ پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مل ہی جائیں گے۔“

”کون سا طریقہ ہے؟ مجھے بتاؤ شاید میں کوئی اور بہتر تدبیر سوچ سکوں۔“

”ہم دونوں آج کی رات کراچی کے ایسے تمام ہوٹلوں اور کلبوں میں انھیں ڈھونڈنے چلتے ہیں جہاں ہمارے ہم پیشہ لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ شاید وہ کہیں نظر آ جائیں۔ تم میرے ساتھ ہو گے تو انھیں دیکھتے ہی پہچان لو گے۔ اس میں ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے تمھیں کہیں دیکھ لیا تو ہوشیار ہو کر روپوش ہو جائیں گے۔“

”ہاں یہ خدشہ تو ہے مگر اس کے سوا کوئی اور اس سے بہتر طریقہ بھی نہیں ہے، یہی ٹھیک ہے۔ ہم رات کا کھانا کھا کے نکل چلتے ہیں۔ اگر وہ نہ بھی ملے تو ان کا کوئی سراغ تو مل ہی جائے گا کہیں۔“

”میں سمجھا نہیں، سراغ کیسے مل جائے گا ان کا؟ کیا ہم لوگوں سے پوچھتے پھریں گے ان کے بارے میں؟“

”او یار! تم کیسے آدمی ہو، اتنی سی بات سمجھ نہیں سکتے کہ رات اتنا زبردست ہنگامہ ہوا ہے، پولیس تمام دن سرگرم رہی ہے اور جرائم کی دنیا میں کسی کو خبر ہی نہیں ہوگی اس کی! آج تو ہر جگہ اسی کے چرچے ہوں گے اور سب ایک دوسرے سے یہی معلوم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں گے کہ وہ کوٹھی کون استعمال کر رہا تھا اور ان لوگوں کے جو اس کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے حریف کون کون ہیں۔“

”ہاں یار! یہ تو تم نے بہت پتے کی بات سمجھائی ہے۔ میرا تو دھیان ہی نہیں گیا تھا اس طرف۔“

”بس تو پھر یہ طے ہو گیا کہ آج کی رات ہمیں یہ مہم سر کرنا ہے۔“

”ہاں بالکل، اب مجھے کچھ امید ہو چلی ہے کامیابی کی۔ اگر وہ مل گئے تو آج ہی اس مسئلے کو نمٹا لیں گے ہم۔“

”ہاں بھائی شرافت علی! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس مصیبت سے جان چھڑا کے نکل جاؤں۔ وہاں میری ماں جی کا پتا نہیں کیا حال ہوگا۔ بڑی اذیت میں دن کاٹ رہی ہوگی وہ بے چاری۔“

”لاہور میں وہ اسی کوٹھی میں ہوں گی نا جو تم نے ڈاکٹر دھمن سے خریدی تھی؟“

”ہاں، وہیں ہیں وہ، اس کوٹھی میں ان کے آرام و آسائش کا تمام سامان مہیا کر دیا ہے میں نے۔ چار کمروں میں ایئرکنڈیشنز بھی لگوا دیے ہیں مگر بیٹے کی جدائی کی آگ ٹھنڈی کرنے کی صلاحیت تو ان میں نہیں ہے۔“

”ہاں، یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ماں کے لیے اولاد سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ اولاد اگر نظروں سے دور ہو تو ماں کا دل کسی آرام و آسائش کو قبول نہیں کرتا۔ اس کا تو سارا دکھ سکھ ہی اولاد سے ہے۔“

”اسی لیے میں جلد سے جلد اس کے سامنے پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ مجھے دیکھے بغیر اس کے دل کو قرار نہیں آ سکے گا۔“

”تمھاری اس کوٹھی میں ٹیلی فون تو ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، ہے تو۔“

”تو پھر تم فون پر ماں جی سے بات کر کے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیوں نہیں کر دیتے؟“

”ہاں یار! یہ اچھی بات سجھائی ہے تم نے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔“

میں نے اٹھ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آخری نمبر گھماتے ہی دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ چوتھی گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھایا، پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”فرماؤ جناب! کی گل اے۔ تساں لوکاں نوں کوئی کم نئیں۔ ٹرن ٹرن کر کے ساڈی نیندراں خراب کر دے او!“

”اوئے کی بک بک لائی اے۔ کون ہے بھئی تو؟“ میں نے گرج کر کہا۔ ”حیدر کتھوں مر گیا اے؟“

”اتنا اوکھا کیوں بولتے ہیں جی آپ ہیں کون؟ مرن حیدر دے دشمن، وہ کیوں مرے بھلا؟“

”تو بالی بول رہی ہے؟ پہچانا نئیں تو نے مجھے؟“

”حد ہے بھئی، تمھیں کیسے پتا چلا کہ میں بالی بول رہی ہوں؟ اور میں کوئی علم غیب تو نئیں جانتی کہ شکل دیکھے بغیر پہچان لوں تم کو۔“

اسی لمحے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً حیدر ہی تھا۔ اس نے بالی سے پوچھا تھا۔ ”او بالی! یہ کس سے بات کر رہی ہے تو ٹیلی فون پہ؟“

”پتا نئیں کون ہے۔ کہتا ہے حیدر کدھر مر گیا ہے اسے بلاؤ۔ میرا نام بھی جانتا ہے وہ۔“

”چل ہٹ پرے، میں دیکھتا ہوں کون ہے۔“ پھر اس نے ریسیور لے کر پوچھا۔ ”کون ہیں جی آپ؟“

”اوئے حیدر کے بچے! یہ تو نے بالی کو ابھی تک انسان نہیں بنایا ہے۔“

وہ میری آواز سن کر ایک دم چیخا۔ ”اوئے بالی! تیرا بیڑا غرق، یہ تو سردار صاحب سے بات کر رہی تھی اس طرح؟“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”معاف کر دیں جناب! اس نے پہچانا نہیں تھا آپ کو۔ اور یہ آپ ہیں کہاں صاحب جی! ادھر ماں جی کی تو حالت خراب ہے آپ کی وجہ سے، بڑا یاد کرتی ہیں وہ آپ کو۔ کتنی تو منتیں مان رکھی ہیں انھوں نے۔ ابھی شام کو ہی داتا دربار گئی تھیں میرے ساتھ۔ ٹھہریں میں بلا کر لاتا ہوں انھیں۔“

وہ رکے بغیر ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اوئے ٹھہر تو جا ذرا، میری بھی تو سن لے۔ اپنی ہی بکے چلا جا رہا ہے۔ ماں جی کہاں ہیں اس وقت؟“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بالی انھیں لٹا کے آئی ہے بستر میں۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں جی ان کی کل سے۔“

”بالی سے کہو وہ چپ چاپ جا کر دیکھے اگر وہ جاگ رہی ہوں تو ٹیلی فون ان کے پاس ہی لے جانا، انھیں یہاں آنے کی تکلیف مت دینا اور اگر سو گئی ہوں تو جگانا نہیں انھیں، میں صبح پھر فون کر لوں گا سمجھ گیا نا میری بات کو اچھی طرح؟“

”بالکل بالکل صاحب جی! میں بالکل تکلیف نہیں دوں گا انھیں۔“ اس نے بالی کو آواز دے کر میری بات اسے اچھی طرح سمجھا کے ماں جی کے پاس جانے کو کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ”آپ ہیں کہاں سردار صاحب! میں نے تو آپ کے لیے سارا لاہور چھان پھٹک کے رکھ دیا، پر آپ کا کوئی پتا ہی نہیں چلا کہیں۔“

”میں لاہور میں نہیں ہوں یار! ادھر کراچی سے فون کیا ہے میں نے۔“

”تو جناب سردار صاحب! اگر آپ کراچی میں تھے تو وہاں سے پہلے بھی فون کر سکتے تھے۔ تسلی تو دے دیتے نا ماں جی کو۔“

”کراچی میں آج ہی پہنچا ہوں یار! میں ادھر بھی کب تھا۔ بڑی راندن میں جا اترا تھا میں، بس پوچھ مت کچھ بھی۔“

”ٹھیک ہے جی! آپ کہتے ہیں تو نہیں پوچھتا میں کچھ، پر وہ ماں جی ایسے جان نہیں چھوڑیں گی آپ کی۔“

”انھیں سمجھا دوں گا میں۔ تو دیکھ جلدی سے بالی کیا کر رہی ہے، آئی کیوں نہیں ہے اب تک۔“

”بس وہ آ گئی صاحب جی! مگر ماں جی نہیں ہیں اس کے ساتھ۔“ کچھ دیر خاموشی رہی اس کے بعد دوبارہ اس کی آواز سنائی دی۔ ”وہ بالی کہتی ہے سردار صاحب! کہ ماں جی سو چکی ہیں اس گھڑی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، آرام کرنے دے انھیں۔ وہ اٹھیں تو بتا دینا کہ میں کراچی میں ہوں اور بالکل بھلا چنگا ہوں، ایک دو دن میں لاہور پہنچ جاؤں گا، وہ پریشان نہ ہوں میری طرف سے۔“

”جی اچھا، بہت اچھا سردار صاحب! میں ضرور کہہ دوں گا۔“

”اور ہاں، تُو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ماں جی کی طبیعت کیا خراب ہے؟“

”وہ بخار آ رہا ہے جی انھیں کل سے۔ آج ذرا ٹھیک ہوئی تھیں تو داتا دربار ہو آئیں میرے ساتھ۔ اب پھر بخار تیز ہو گیا ہے۔ مجھے نے ڈھے دیا جی اصل میں انھیں۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔“

”ہاں، یہ تو تُو ٹھیک کہتا ہے حیدر! اس عمر میں اولاد کی جدائی کا صدمہ سہنا معمولی بات تو نہیں ہوتی۔“

”بس یہی بات ہے جی! ادھر آسیہ بی بی کی بھی خیر خبریت نہیں ملتی اور آپ بھی ایک دم لاپتا ہو گئے۔“

”ڈاکٹر کو بھی دکھایا انھیں تو نے کہ یوں ہی ڈال رکھا ہے بستر پر؟“

”کیوں نہیں جناب! ڈاکٹر کو دوبار بلا چکا ہوں میں۔ دوا

وی ہے اس نے، ٹیکہ بھی لگایا تھا کل شام کو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ خیال رکھنا ان کا اور تسلی دے دینا۔ میں کل صبح پھر فون کروں گا۔" میں نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

شرافت جو بہت توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا، میرے ریسیور رکھتے ہی بولا۔ "کیا ہوا جیلانی؟ خیریت تو ہے؟ کسے ڈاکٹر کو دکھانے کی بات کر رہے تھے تم؟"

"وہ حیدر بتا رہا تھا کل سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے ماں جی کی۔ بخار آ رہا ہے انھیں۔"

"ایسے وقت تمھیں ان کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر ان کمینوں نے تمھارے ہیرے غائب کر کے پریشانی کھڑی کر دی ہے خواہ مخواہ کی۔ اب جب تک وہ دستیاب نہ ہو جائیں، تم جا بھی کیسے سکو گے۔"

"ہاں یار! میری پیدائش کسی سعد ساعت کی معلوم نہیں ہوتی مجھے۔ شاید کوئی بہت ہی منحوس سیّارہ گھس پڑا تھا اس سمے میرے طالع میں اور اب اسے وہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "فکر مت کر پیارے! ہم آج ہی رات کوشش کر کے اسے نکال باہر کریں گے۔"

"او نہیں یار! ایسے شریف کہاں ہوتے ہیں یہ فلکِ کج رفتار کے سیارگاں۔ کتّے کی دم کی طرح بارہ بارہ سال نلکی ڈال کے رکھنا پڑتا ہے انھیں۔ پھر بھی یہ ضمانت نہیں ہوتی کہ یہ سیدھے ہو بھی جائیں گے۔"

میں شرافت علی کے ساتھ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے زیرِ زمین عشرت کدے میں داخل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ بڑے ہی نظر فریب نظاروں سے معمور تھا وہ وسیع و عریض ہال۔ انتظامیہ نے وہاں آنے والوں کی تفریحِ طبع کا بہت مناسب اور معقول انتظام کر رکھا تھا۔ رنگ و نور کی ایسی فراوانی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی کہیں۔ میں تو کراچی کے بازاروں اور شاہراہوں کی جگمگاہٹ دیکھ دیکھ کر نہال ہوا جاتا تھا اور سینہ میرا فخر سے پھولا پڑتا تھا یہ سوچ سوچ کر کہ میرے ملک میں بھی ایک ایسا عظیم الشان شہر موجود ہے جس کی ہم مثال دے سکیں۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں جو کچھ دیکھتا رہا ہوں وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے جو یہ شہر اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ یہاں کے سحر انگیز ماحول پر مجھے کسی اور ہی دنیا کا گمان گزرنے لگا تھا۔ میرا سینہ خوشیوں سے بھر گیا تھا مگر دل کے کسی دور افتادہ گوشے میں ایک چبھن، ایک خلش سی محسوس ہو رہی تھی۔ دل نے بے اختیار صدا دی تھی۔ کاش! یہ سب کچھ زمین کے اوپر ہوتا۔ یہ احساس میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا کہ رنگ و نور کی اس دنیا کے باسی

میرے ملک، میری قوم کے وفادار نہیں ہیں۔ سونے اور چاندی کی چمک میں ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ وہ بینائی سے محروم لوگ اپنے ارد گرد دیکھنے کی صلاحیت اور کھوٹے کھرے کی پہچان سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے نوجوانوں ہی کی نہیں، کم سن اور معصوم بچّوں کی رگوں سے بھی لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینے کے درپے ہیں۔ یہ ہماری نئی نسل کو منشیات کا زہر دے کر اس ملک کا مستقبل تاریک کر دینا چاہتے ہیں تاکہ خدا کی اس نافرمان اور راندۂ درگاہ قوم بنی اسرائیل کو اپنے عزائم کی تکمیل میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ جو لوگ وہاں موجود تھے، میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ باہر سیدھے سادے عام شہریوں کے درمیان اپنے اپنے حلقوں میں انھیں بہت تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوگا۔ بڑی عزت کی جاتی ہوگی ان کی وہاں۔ اور حالت ان کی یہ تھی کہ ان شریف لوگوں کی رگوں سے حاصل کیے ہوئے لہو کو وہ ان عشرت کدوں کی شان دوبالا کرنے پر صرف کر رہے تھے۔

ہمارے بالکل سامنے ایک آراستہ اسٹیج پر دو یورپی لڑکیاں رقص کے نام پر اپنی نمائش کر رہی تھیں اور ان کے پیچھے ایک قطار میں بیٹھے سازندے تیز قسم کی کوئی مغربی دھن بجا رہے تھے۔ ہال کے انتہائی بائیں جانب ایک چھوٹا سا بار کاؤنٹر تھا وہاں بھی نام اقوام سے تعلق رکھنے والی دو مست خرام حسینائیں طلب گاروں کو جام بھر بھر کر پیش کر رہی تھیں۔ بار کے ساتھ ساتھ کوئی دس بارہ میزوں پر جواریوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور پورے ہال میں لوگ اسٹیج پر تھرکتی، اچھل کودتی رقاصاؤں کو تک رہے تھے یا ساتھ بیٹھی حور شمائل نازنینوں سے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں کچھ میزوں پر چار چار، چھ چھ افراد کی ٹولیاں باہم سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ لوگوں کے صرف سر ہلتے نظر آ رہے تھے۔ یوں بھی ان کی آواز ہال میں گونجتی تیز موسیقی کو شکست نہیں دے سکتی تھیں۔ یہ دنیا جہاں شرافت علی مجھے کھینچ لایا تھا، اس دنیا سے بالکل ہی مختلف تھی جہاں سے میں آیا تھا۔ اُس دنیا میں طرح طرح کے لوگ آتے تھے۔ ہنستے مسکراتے تر و تازہ چہروں کے درمیان روتے بسورتے، خزاں رسیدہ مرجھاتے ہوئے چہرے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ خوش شکلوں اور خوش پوشوں کے ہمراہ بدشکل، خوار اور مفلوک الحال لوگ بھی نظر آتے تھے۔ شادمانیوں کے ساتھ ماتم کا شور بھی سنائی دیتا تھا اور زندگی کے شانہ بہ شانہ موت بھی قدم بڑھاتی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس دنیا میں جا اجالا تھا تیرگی کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ ہر سو زندگی ہی زندگی تھی، خوشی ہی خوشی، شادمانی ہی شادمانی۔ خزاں کی الم ناکیوں کا یہاں گزر ہی نہیں تھا۔ مرجھائے ہوئے مدقوق چہروں اور ماتم کے شور سے یہاں کی فضا بالکل نا آشنا معلوم ہوتی تھی۔ مسرتوں اور شادمانیوں کے درمیان زندگی پوری آب و تاب سے رقصاں تھی یہاں۔ نہ جانے کس سیّارے کی مخلوق تھی یہ جس کے چہروں پر فکر کا ہلکا سا سایہ یا ماتھے پر کوئی ہلکی سی شکن تک نظر نہ آتی تھی۔

شرافت علی نے چند ثانیے رک کر ایک طائرانہ نظر پورے ہال پر ڈالی پھر ایک جانب نظریں جما کر بولا۔ "آؤ، ادھر ایک آدمی کام کا نظر آیا ہے مجھے۔"

وہ مختلف میزوں کے درمیان سے چکراتا ہوا ایک نسبتاً علیحدہ گوشے میں بیٹھے اس تنومند شخص کے سامنے جا ٹھہرا جس کی میز پر بوتل اور گلاس کے سوا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ گلاس ہاتھ میں پکڑے اس میں بھرا ہوا سیال جرعہ جرعہ اپنے معدے میں اتار رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی بوتل آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ قد اس کا ایسا تھا کہ بیٹھے ہونے کے باوجود وہ چھ فٹ سے کم کا ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا، شانے اور سینہ اتنا کشادہ تھا کہ کسی چٹان کا گمان ہوتا تھا اس پر۔ رنگ اس کا سیاہی مائل ضرور تھا مگر اتنا سیاہ نہیں تھا کہ شبِ تاریک کا شبہ ہونے لگے۔ آدھی آستین کی بشرٹ سے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی دکھائی دے رہی تھیں اور صورت سے وہ بالکل کوئی خونخوار گینڈا نظر آتا تھا۔

شرافت پر نظر پڑتے ہی اس نے خوش ہو کر دانت نکال دیے۔ بولا۔ "آؤ، آؤ سیٹھ! آج کیسے کھیال آ گیا سیرو کا؟"

"کوئی خاص بات نہیں بس ایسے ہی تمھیں اکیلے بیٹھے دیکھ کر آ گیا اِدھر۔" شرافت نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

وہ بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ "ہو ہو... ہو ہو... اپن کا کسی کو ایسے کھیال نئیں آتا سیٹھ! یہ کون ہے تمھارے ساتھ کوئی نیا جناور معلوم ہوتا ہے؟" اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

میرا تو خون کھول اٹھا تھا ایک دم۔ وہ بن مانس کا بچّہ مجھے جانور کہہ رہا تھا۔ میرے تیور بگڑتے دیکھ کر شرافت علی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "صبر سے کام لو جیلانی! آؤ ادھر بیٹھو میرے ساتھ۔" پھر وہ اس بن مانس سے بولا۔ "بُری بات ہے شیرو! مہمانوں کی یوں بے عزتی نہیں کرنا چاہیے تمھیں۔ یہ مہمان ہیں ہمارے، لاہور سے آئے ہیں۔ سردار کریم نواز نام ہے ان کا بہت کام کے آدمی ہیں یہ۔"

"اچھا اچھا۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنا کھوپڑی بالکل الٹا ہو گیا ہے سیٹھ! ابھی تم مابھی دے دو۔ اپن کھود سالا جناور ہو گیا ہے اس ٹیم۔"

"ٹھیک ہے، آئندہ خیال رکھنا ان کا۔ پہچان لو انھیں اچھی طرح سے۔"

"بالکل یاد رکھے گا سیٹھ! ابھی تو ہم کبھی بھول نئیں سکے گا اس کو۔ تم بولو ابھی کیا کھدمت کرے ہم تمھاری؟"

"میں نے کہا نا، ہم کسی کام سے نہیں آئے ہیں تمھارے پاس مگر یہ آج تم اکیلے کیسے نظر آ رہے ہو؟"

"اپن چھوڑ دیا ہے سیٹھ اب یہ چکّر۔ یہ چھوکری لوگ جو ہے نا سیٹھ! یہ ایک دم پھراڈ ہے، سارا کا سارا پھراڈ۔ مال ہوتا ہے پاکٹ میں تو ایسا آتا ہے جیسے مٹھائی پہ مکھی گرتی ہے، کھیسا کھالی ہو جائے تو پہچانتا تک نئیں ہے۔"

"ہاں ایسی ہی بے وفا ذات ہوتی ہے یہ شیرو! مگر تمھیں کیا کمی ہے پیسوں کی؟ تمھاری جیب کیسے خالی ہو گئی؟"

"تم بھی کیا بات بولتا ہے سیٹھ! اپن کوئی پھیکٹری تو نئیں لگایا ہے نوٹ بنانے کا۔ دھندے والا آدمی ہے، کبھی دھندا تیج ہو جاتا ہے کبھی مندی آ جاتی ہے۔ تیجی ہووے تو بادشاہ نئیں تو بھکیر ہے اپن سالا۔ تمھارے جیسا سیٹھ لوگ کام نئیں دیتا تو بھوکے مرنے لگتا ہے سیرو۔ ابھی کوئی کھدمت ودمت ہو تو بولو اپنے اس کھادم کو۔"

"ایسی باتیں نہیں کیا کرو شیرو! یہ خادم وادم کیا چیز ہوتی ہے۔ ایسا مت کہا کرو اپنے آپ کو کتنی بار منع کیا ہے میں نے تمھیں اس سے۔ بس دوست ہو تم ہمارے اور کچھ نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے تم جو بولتا ہے ہم سن لیتا ہے وہ۔ پر دیکھو نا بولنے کا بات اور ہوتا ہے کرنے کا اور ہوتا ہے۔"

"اچھا اچھا، چھوڑو اس قصے کو۔ اس وقت چڑھی ہوئی ہے تمھیں۔"

"نئیں سیٹھ! بے عجتی کھراب نئیں کرو ہماری، آدھی بوتل میں سیرو آؤٹ نئیں ہو سکتا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو ذرا ایک بات تو بتاؤ۔ میں ابھی پتا کر لیتا ہوں تم کتنے ہوش میں ہو۔"

"پوچھو، پوچھو! ایک نئیں سو بات پوچھو۔ کیا سمجھا ہے تم نے سیرو کو۔"

"تمھیں پتا ہے کل رات ادھر محمد علی سوسائٹی کی کسی کوٹھی میں بڑی گولیاں چلی ہیں۔ پولیس بھی پہنچ گئی تھی وہاں۔"

"ہاں سُنا تو اپن نے بھی تھا، پر بات کیا تھی یہ پتا نئیں چلا۔ تم کو معلوم ہے سیٹھ! کیا بات ہوئی تھی اُدھر؟"

”مجھے اگر معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں پوچھتا؟“

”ہوہوہو... ہوہو...“ وہ ایک بار پھر اپنے سینے کا پورا زور صرف کر کے ہنسا پھر بولا ”اپن بھی سالا بالکل اُلو کی دم ہے، ایک دم پاگل، اوپر والا کھانا بالکل کھالی ہو گیا ہے کیسا بات پوچھتا ہے تم سے۔“

اس نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی نظر اٹھا کے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا اسے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے کانوں تک اس خوفناک قہقہے کی آواز ہی نہ پہنچ سکی تھی۔ ایسے ہی اپنے اپنے حال میں مست بیٹھے تھے وہ سب کے سب، کسی کو پروا ہی نہیں تھی کسی کی۔ نہ ہی کوئی یہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا تھا کہ اس کے آگے پیچھے یا دائیں بائیں کون لوگ تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے میں آدمیوں کے کسی ایسے جنگل میں کبھی نہیں اترا تھا۔ دنیا میں ایسے ایک دوسرے سے بے نیاز لوگ بھی ہوتے ہیں! یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اگر ابتدا میں ایسے لوگوں سے میرا واسطہ رہتا تو میری یہ خم پارہ تقدیر مجھے یوں در بدر نہ بھٹکاتی پھرتی۔ میں بھی اوروں کی طرح اپنا گھر بار سنبھالے اپنے اہل و عیال کو سہہ رہا ہوتا کہیں۔

”یہ معلوم کرو شیرو! کون لوگ تھے وہ جنھوں نے وہاں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سنا یہ ہے کہ آج دن بھر پولیس وہاں سر مارتی پھری ہے مگر ہاتھ نہیں آسکا کچھ بھی اس کے۔ بڑے کاریگر لوگ تھے وہ۔ دو لاشوں کے سوا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا وہاں انھوں نے اور وہ لاشیں اس قابل نہیں تھیں کہ کسی کو کچھ بتا سکتیں ان کے بارے میں۔ حالانکہ بڑی زبردست فائرنگ ہوئی تھی وہاں، دو پارٹیاں ہی ہوں گی وہ جو کسی بات پر لڑ پڑی ہوں گی۔ پولیس تو بہت بعد میں پہنچی تھی۔“

”چھوڑو سیٹھ اگر کر و انھیں تم کیا کرے گا پتا کر کے ان کا؟ کوئی تمہارا آدمی تو نئیں مارا ہے انھوں نے؟ اس کالے دھندے میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ تم کائے کو اس چکر میں پڑتا ہے... کھالی پیلی۔“

”یہ کاروباری معاملات ہیں! تم نہیں سمجھ سکو گے انھیں۔ کیا پتا وہ کوئی ہماری ہی لائن کے آدمی رہے ہوں، مارکیٹ خراب کرنا چاہتے ہوں وہ ہماری۔ ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ یہاں اس دھندے میں جتنے لوگ ہیں ہمارے اپنے ہیں وہ سب۔ ان کے درمیان کوئی ایسی بات ہوتی ہے تو ہمیں فوراً اطلاع مل جاتی ہے۔ پھر یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا اور خبر تک نہ ہو سکی کسی کو۔“

”یہ تو تم ٹھیک بولتا ہے سیٹھ! کوئی باہر کا آدمی معلوم ہوتا ہے یہ۔ میں جرور پتا کروں گا اس کا۔“

شرافت علی نے جیب سے سو روپے والے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس میں سے بیس نوٹ الگ کر کے شیرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ لو، یہ رکھ لو، دو ہزار ہیں یہ، تم آج کل مندی کا شکار ہو رہے ہو، پیسوں کی ضرورت ہو گی تمھیں۔“

شیرو نے نوٹ جھپٹنے کے سے انداز میں شرافت علی کے ہاتھ سے لے لیے ”تم نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے، آج کل تو بالکل کڑکا پڑا ہے اِدھر۔ یہ بوتل بھی ادھار میں لیا تھا آج۔ تم فکر نئیں کرو، کام تمھارا اپن جرور کرے گا۔“

”اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“ شرافت علی مجھے اٹھنے کا اشارہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور ہال میں موجود لوگوں کے چہروں کو ذہن نشین کرتا ہوا شرافت علی کے ساتھ باہر نکل آیا اس شداد کی جنت سے۔ مجھے یقین ہے جس طرح شداد اپنی بنائی ہوئی جنت کو دیکھنے کی خواہش لیے عین اس جنت کے دروازے پر فرشتۂ اجل کا شکار ہو گیا تھا اسی طرح اس زمیں دوز جنت کا بانی بھی اسے نہ دیکھ سکا ہو گا۔

ہوٹل سے باہر آ کر ہم دونوں اس طرف بڑھنے لگے جہاں شرافت علی نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ میں نے پوچھا ”یہ کون شخص تھا شرافت علی! جسے تم نے دو ہزار روپے دے کر وہ کام سونپا ہے؟“

”بڑے کام کا آدمی ہے وہ جیلانی! بس ذرا زبان کڑوی ہے اس کی کبھی کبھی کھوپڑی سے نکلنے لگتا ہے وہ۔ ایسے موقعوں پر تھوڑی سی برداشت سے کام لے لیا جائے تو پھر اسے جدھر چاہو ہانک سکتے ہو تم۔ جب کبھی پسِ پردہ رہ کر کوئی کام کرنا ہو تو اس سے رابطہ قائم کرتے ہیں سب لوگ۔ یہ کسی خاص گروہ یا پارٹی کا آدمی نہیں ہے ہر کوئی ضرورت پڑنے پر اس کی خدمات حاصل کر سکتا ہے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے کار کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ہوٹل کا ایک بیرا بھاگتا ہوا ہمارے پاس آ کر بولا ”وہ جی، صاحب جی! آپ کو ایک صاحب بلا رہے ہیں اُدھر ڈائننگ ہال میں۔“

”کسے؟ مجھے!“ میں نے رک کر ذرا حیران ہو کے پوچھا۔

”آپ کو نہیں جی، انھیں، یہ جو آپ کے ساتھ ہیں۔“

”کون صاحب بلا رہے ہیں مجھے؟“ شرافت علی نے پوچھا۔

”نام تو میں نہیں جانتا جی ان کا۔ ابھی آپ اندر سے آ رہے تھے تو انھوں نے مجھے بلا کر آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جو دو آدمی جا رہے ہیں ان میں سے ان نیلے سوٹ والے صاحب کو بلا لاؤ۔ میں آپ کی طرف بھاگا مگر اتنی دیر میں آپ گیٹ سے

باہر نکل چکے تھے۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کیونکہ نیلا سوٹ ہم دونوں میں سے شرافت علی نے ہی پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”تم گاڑی کے پاس چلو جیلانی! میں دیکھ کے آتا ہوں کون بلا رہا ہے مجھے۔“

وہ بیرے کے ساتھ واپس ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ایک گھنی مونچھوں اور جھاڑ جھنکار داڑھی والا شخص میرے پاس آ ٹھہرا ”وہ جناب جیلانی صاحب! ذرا اُدھر تو تشریف لے چلیں آپ۔“

میں نے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لے ڈالا۔ اس نے کالے رنگ کی شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی، قد کاٹھ اس کا مجھ جیسا ہی تھا۔ میں نے اس کے لہجے کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے اسی کے انداز میں پوچھا ”کدھرے جانا چاہتے ہیں آپ جناب مجھے؟ کچھ حدودِ اربع تو بتائیں آپ اپنا؟“

”وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ چلیں تو سرکار! وہ اُدھر سامنے ایک لال گاڑی کھڑی دیکھ رہے ہیں نا آپ، بس وہیں چلنا ہے ہمیں۔ آپ کے ایک بہت دیرینہ دوست بیٹھے ہیں وہاں۔“

”اچھا۔ چلو بھئی دیکھیں کون ہے وہ میرا دیرینہ دوست۔“

میں اس کے ساتھ کاروں کی قطار سے ذرا فاصلے پر کھڑی اس سرخ رنگ کی کار کی طرف چل دیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، بڑی عجیب بات ہوئی ہے یہ بھی۔ اُدھر کسی شخص نے شرافت علی کو ہوٹل کے اندر بلوایا تھا اور اِدھر کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں اس سرخ کار کے پاس پہنچا تو کار کی عقبی نشست کا دروازہ میرے لیے وا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کار میں روشنی بھی ہو گئی تھی۔ اس روشنی میں مجھے عقبی نشست پر کوئی شخص بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا مگر چہرہ اس کا میری نظروں سے اوجھل ہی تھا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ظہیر احمد تھا! وہی ظہیر احمد جس نے ایکبار میرے یار اسلم آبی کو اپنی ضمانت پر پولیس کی تحویل سے نکال کر دھمن اور عالیہ کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اسے پُرزے پُرزے کر کے نیلامی پر چڑھا دیں۔ اور ان انسانی اعضا کے تاجروں نے اس غریب کی آنکھوں سے قرنیے نکال کر ان کے دام کھرے کر لیے تھے۔ اس بھیڑیے کے بھٹ سے اگر میں آبی کو نکال نہیں لایا ہوتا تو وہ لوگ آنکھوں کے بعد اس کے گردے بھی بیچ کھاتے۔ آبی کو اس قید سے رہائی دلانے کے بعد میں اس کی تیمارداری کرنے اور اس کی بینائی واپس دلانے کے چکر میں ایسا الجھا تھا کہ مجھے دوبارہ کبھی اس مددگار احمد کا خیال ہی نہیں آیا جو واقعی اپنے نام کی مناسبت سے دھمن اور عالیہ کا بہترین مددگار ثابت ہوا تھا۔ میں اسے اس عقوبت خانے میں بے ہوش کر کے ڈال آیا تھا جہاں اس نے آنکھوں سے محروم آبی کو ڈال رکھا تھا۔ پتا نہیں میرے آنے کے بعد اس پر کیا بیتی تھی۔ شاید اس کال کوٹھری سے نجات پانے کے بعد سے اب تک وہ ایک ایک راہ گزر کو بڑے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انسانوں کے ہجوم میں مجھے ڈھونڈتی ہی رہی تھیں۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور بالآخر آج مجھے کھوج ہی نکالا تھا۔ اسے میرے ہاتھوں اپنی شکست کا بہت ملال تھا اور بھلا نہیں سکا تھا وہ اب تک اس واقعے کو۔

”بہت حیرانی ہو رہی ہے مجھے اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر؟ تمھارا کیا خیال تھا مجھے چوٹ دے کر نکل جانے کے بعد پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکو گے میرے؟ اگر اس طرح سوچا تھا تم نے تو یہ تمھاری خام خیالی ہی تھی۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے، میں اپنے دشمن کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا ہوں۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں تو تمھیں بالکل بھول ہی چکا تھا۔“

میرا جملہ پورا ہوتے ہی، میرے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے اس زور سے مجھے آگے دھکا دیا کہ میرے لیے سنبھلنا ممکن ہی نہیں رہا اور میں کار کے کھلے دروازے سے اوندھے منہ اندر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر سیدھا ہوتا کسی نے میرے سر کے پچھلے حصے میں کسی ٹھوس چیز سے ایسی شدید ضرب لگائی کہ میں اٹھتے اٹھتے دوبارہ نیچے ڈھے گیا۔ اس کے بعد میں بس اتنا ہی جان سکا تھا کہ کئی ہاتھوں نے مجھے پکڑ کر کار کے اندر کھینچا اور ایک جھٹکے کے ساتھ کار چل پڑی تھی۔

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک کرسی سے بندھا پایا تھا۔ اس طرح کہ میں کرسی پر سیدھا بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھ دیے گئے تھے اور مجھے کرسی کی پشت کے ساتھ جکڑ دیا گیا تھا کہ میرے لیے ہلنا جلنا تک ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے سامنے ظہیر احمد کھڑا مضحکہ اڑانے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سیاہ پوش جھاڑ جھنکار داڑھی اور مونچھوں والا بھی موجود تھا جس نے دھکا دے کر مجھے کار کے اندر پھینکا تھا۔ اس کے علاوہ دو لحیم شحیم آدمی اور بھی تھے جن کے چہروں پر انھوں نے بھی خوب گھاس چڑھا رکھی تھی، جسم ان کے فولاد سے ڈھلے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں پانی کا جگ پکڑا ہوا تھا۔ انھوں نے میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر مجھے ہوش دلایا تھا۔ پتا نہیں کون سی جگہ تھی جہاں انھوں نے مجھے یوں بے بس کر کے لا ڈالا تھا۔

مجھے ہوش میں دیکھ کر ظہیر بولا ”کیا حال ہے جناب میرا خیال

جیلانی صاحب؟" اس کا لہجہ تضحیک اور تحقیر سے معمور تھا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو ظہیر احمد؟ میری تمھاری دشمنی تو نہیں تھی کوئی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟"

"دشمنی؟ ہاں دشمنی تو کوئی بھی نہیں ہے ہمارے درمیان مگر میرے کھاتے میں کچھ حساب کتاب لکھا ہوا ہے تمھارا۔ کچھ قرض نکلتا ہے میرا تمھاری طرف۔ وہ قرض ادا نہیں کرو گے کیا؟ کیا اس سے انکار کرو گے تم؟"

"میں نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی تم سے بس اپنا بندہ ہی وصول کر کے لے گیا تھا اور یہ تو فرض تھا میرا۔"

"ہاں، تم سچ کہتے ہو یقیناً وہ تمھارا فرض تھا اور اب مجھ پہ فرض ہو گیا ہے کہ میں تم سے اس روز کا حساب کروں۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اگر لڑنا چاہتے ہو مجھ سے تو پہلے مجھے آزاد کر دو۔ یوں بے بس کر کے مارنا مردوں کا شیوہ تو نہیں ہے۔"

"تمھاری یہ خواہش میں ضرور پوری کر دوں گا جیلانی! مگر تم بھی پہلے مجھے وہ ہنر سکھا دو جس سے اس روز تم نے مجھے پلک جھپکتے میں بے خبر کر دیا تھا، دنیا و مافیہا سے۔"

"وہ کوئی ہنر نہیں تھا، بس کوئی ہاتھ ہی کارگر پڑ گیا تھا میرا، شاید تمھاری گردن کی کوئی نازک رگ آ گئی تھی زد میں۔"

"ہاں میں اسی رگ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں تم سے۔ وہ اتفاقاً نہیں آئی تھی زد میں، یہ یقین ہے مجھے۔"

"یقین کرو یار! وہ میں نے جان بوجھ کے نہیں کیا تھا۔ مجھے تو خبر بھی نہیں تھی کہ میں کیا کر بیٹھا ہوں تمھارے ساتھ۔"

"اچھا۔ تمھیں کچھ پتا نہیں تھا کہ تمھارا انگوٹھا کیا حرکت کر رہا ہے میرے ساتھ؟"

"یقین کرو میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں تم سے۔ مجھے سچ مچ کچھ پتا نہیں تھا۔"

اس نے آگے بڑھ کے پورے زور سے اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا "کُتے کے بچے! الو نہیں بنائے گا تو۔" پھر وہ اس سیاہ پوش سے بولا "جانو! اس سالے کی کھال اتار دے بدن سے۔ میں دیکھوں گا آج یہ کُتا کیسے بچ کے جائے گا یہاں سے۔ بڑا رستم زماں کا سالا بنا پھرتا ہے۔"

سیاہ پوش جانو نے علیحدہ کھڑے ہوئے دونوں افراد میں سے ایک کو مخاطب کیا "اوے بادل! لا ذرا وہ رسی تو اٹھا کے لے آ جس سے لٹکا کے کھال اتار۔ تے ہیں ہم بکر دل کی۔"

بادل وہ شخص تھا جو جگ والے کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ مڑ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ابھی لایا ساب!"

"اور دیکھ، خوب مضبوط رسی لانا۔ ایسی کہ بوجھ سہار لے اس کا، بڑا پلا ہوا سانڈ ہے یہ۔"

میں نے ظہیر احمد سے کہا "ظہیر احمد! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ بچے! میری دشمنی کی کوئی وجہ نہیں تھی اب تک۔ تُو نے میرے یار آبی کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ میں نے اس لیے بھلا دیا تھا کہ اس کے پیچھے دھمن اور عالیہ موجود تھے۔ میری اصل دشمنی ان سے تھی۔ وہ اگر تجھے درمیان میں نہیں لاتے تو میں جانتا بھی نہیں تھا کہ ظہیر احمد نام کا بھی کوئی بندہ پیدا کیا ہے خدا نے۔"

"یہ بات تو نے ٹھیک کہی ہے جیلانی، سیلانی! ہمارے تعارف کا ذریعہ وہی دونوں بنے تھے اور اب میں چاہتا ہوں کہ جب ہمارے درمیان شناسائی کا رشتہ قائم ہو ہی گیا ہے تو ہمیں ایک دوسرے سے پوری طرح واقف ہو جانا چاہیے۔"

"اگر واقفیت ہی حاصل کرنا ہے تو میرے یہ جکڑ بند کھول دے۔ پھر میں زیادہ اچھی طرح تعارف پیش کر سکوں گا اپنا!"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا "اوئے پینڈو! ایسا ہی الو کا پٹھا دکھائی دیتا ہوں میں تجھے؟"

"مجھے تو تُو کسی مخنث کی اولاد دکھائی دیتا ہے۔ الو تو بہت ذہین پرندہ ہے تو اس کا پٹھا تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

میری بات نے ظہیر احمد کی کھوپڑی سُلگا دی تھی۔ اس نے ایک اور جھانپڑ پورے زور سے میرے منہ پر مارا "بکواس بند کر اپنی کُتے کی اولاد! نہیں تو زبان کھینچ لوں گا۔ تو جانتا نہیں ابھی مجھے ورنہ یہ زبان تالو سے چپک کر رہ جاتی تیری۔"

اس کا وہ ہاتھ اتنی زور سے پڑا تھا میرے منہ پر کہ میں کرسی سمیت الٹ کر پیچھے جا پڑا تھا۔ میرے اس طرح گرنے سے کرسی کی پشت ٹوٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ کرسی کے ٹوٹنے سے وہ رسی جس سے انھوں نے مجھے لپیٹ رکھا تھا ڈھیلی پڑ گئی اور جیسے ہی میں سنبھل کر سیدھا ہوا، مجھے اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ کسی علیحدہ رسی سے نہیں باندھے تھے بلکہ وہی رسی جس سے مجھے کرسی کے ساتھ باندھا گیا تھا میرے ہاتھوں کے گرد بھی لپیٹ دی گئی تھی۔ انھوں نے اپنی طاقت کے زعم میں اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا کہ کرسی ٹوٹنے کے بعد میرے ہاتھ بندشوں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ وہ میرے اس طرح گرنے پر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ان کے قہقہے کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہے تھے۔ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرا کے بدن کو یوں سمیٹا کہ رسی پھسل کر نیچے میری کمر پر آ گری۔ میں فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا، کرسی کی ٹوٹی ہوئی پشت پیچھے جا گری اور رسی میرے پیروں میں آ رہی۔

مجھے یوں آزاد دیکھ کر ان کے قہقہے ایک دم رک گئے۔ ظہیر احمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ تینوں کے تینوں سناٹے میں آ گئے۔ اور فرصت کا یہی ایک لمحہ مجھے درکار تھا۔ میں چیتے کی سی پھرتی سے جست بھر کے ظہیر احمد پر جا پڑا۔ میرا زبردست گھونسا اس کے منہ پر پڑا تو وہ پیچھے الٹ گیا۔ میں نے فوراً گھوم کے لات چلا دی، وہ اس شخص کے پیٹ پر لگی جو پانی کا جگ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سے جگ چھوٹ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کے دُہرا ہو گیا۔ دوسرا ہاتھ میرا اس جانو کی طرف چلا مگر وہ ہوشیار ہو کر اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔ میں جھونک میں دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے میری کمر پر جانو کی لات پڑی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا گرا تو ظہیر احمد جو سنبھل کر اٹھ رہا تھا میرے نیچے آ گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی گردن دبوچ کر لوٹ لگائی اور اسے اپنے اوپر لے لیا۔ ساتھ ہی ساتھ میرا انگوٹھا اس کی رگِ احساس پر جا ٹکا۔ وہ ہاتھ پیر چلائے بغیر ساکت ہو گیا۔ اس اثنا میں جانو میرے قریب آ چکا تھا، میں نے ظہیر احمد کو دونوں ہاتھوں اور پیروں پر رکھ کر اس پر اچھال دیا اور ان کا حشر دیکھے بغیر لوٹ لگا کے ان لوگوں سے دُور چلا گیا اور یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اگر میں ان کا حشر دیکھنے کے لیے ایک لمحہ بھی وہاں رکا رہتا تو ان کے تیسرے ساتھی کا پھینکا ہوا جگ میری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیتا۔ اس خبیث نے وہ اسٹیل کا جگ پوری قوت سے پھینکا تھا میرے سر پر۔ میں جلدی سے اُٹھ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ میری پہلی لات ہی اس کے پیٹ پر ایسی لگی تھی کہ اسے سیدھا نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑے پکڑے دوبارہ جگ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا مگر میں نے ایک ہی ہاتھ میں اسے زمین سے لگا دیا لیکن وہ جانو کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوا تھا۔ میرے اس کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ہی وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور اس بار اسے کچھ عقل آ گئی تھی۔ لہٰذا اس نے اندھا دھند مجھ پر جھپٹنے کے بجائے پستول نکال کر مجھ پر سیدھا کر دیا تھا۔

"بس کر اوئے بندر کے بچے! رک جا وہیں پر نہیں تو گولی اتار دوں گا سینے میں سالے کے۔"

پستول دیکھ کر میں ذرا ٹھٹکا۔ فوراً میرا دھیان اپنی انگلی میں پڑی اس طلسمی انگوٹھی کی طرف گیا تھا۔ وہ ہنوز میری انگلی میں موجود تھی۔ یہ انھوں نے مجھ پر بڑی مہربانی کی تھی کہ میری بے ہوشی کے دوران مجھے رسیوں میں لپیٹتے ہوئے ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس انگوٹھی کو میری انگلی سے اتار لیا جائے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور جانو کے پستول کو دیکھ کر حقارت سے ہنس دیا "اسے واپس رکھ لے بچے! ابھی ان اوزاروں کے لیے کوئی ایسی گولی ایجاد نہیں ہوئی ہے جو غلام جیلانی کا سینہ چھید سکے۔"

میں اس کے پستول کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھا تو وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ اس کے لیے یہ ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ اس نے آج سے پہلے کسی کو پستول کے سامنے یوں بے فکری سے آگے بڑھتے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ میرا اطمینان اسے پریشان کر گیا تھا۔ اسے فوراً ہی بلٹ پروف کا خیال آیا تھا شاید۔ اس نے جلدی سے سنبھل کر اپنے پستول کا رخ میرے سر کی طرف کر کے کہا "چالاکی دکھاتا ہے جانو کو۔ بلٹ پروف پہن کر رعب میں لینا چاہتا ہے۔ اگر تیرا سینہ نہیں چھید سکتی اس پستول کی گولی تو بھیجا تو باہر نکال سکتی ہے نا۔"

"اوئے بس کر یار! رکھ لے اس کھلونے کو واپس۔ یہ کوئی مدد نہیں کر سکے گا تیری۔"

"میں کہتا ہوں رک جا جیلانی! میں کوئی رعایت نہیں کروں گا اب، یہ ناریل کھول دوں گا تیرا۔"

"اچھا! تو اب تک تُو رعایت کر تا رہا ہے میرے ساتھ۔ ایسا کون سا نازک رشتہ ہے یار! تیرا میرے ساتھ؟"

"بک نئیں اوئے۔ یہ ظہیر صاحب اگر منع نہ کرتے مجھے تو میں تو تجھے ہوش ہی نہیں آنے دیتا کمینے!"

میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ میرے قدم رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں تو میرے سر کا نشانہ لے کر اس نے پستول کی لبلبی دبانا چاہی مگر وہ کسی طرح دب ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پوری طاقت صرف کیے دے رہا تھا اس پر لیکن اسے کامیابی کسی طرح نہیں ہو رہی تھی۔ جھنجلا کے اس نے پستول کو دیکھا۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی اسے۔ میں نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا "اوئے کبھی صفائی بھی کر لیا کر اس کی میرے یار! تیل شیل بھی دے لیا کر اسے کبھی۔ بڑی سیوا کرنا پڑتی ہے اس اوزار کی، ایسے ہی نہیں حکم مان لیا کرتا ہے یہ ہر کسی کا۔"

وہ حیرت اور خوف سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی مجھے اور کبھی اپنے پستول کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ وہ اچھا خاصا پستول آخر گولی کیوں نہیں اُگل رہا تھا۔ پھر اس نے اچانک وہ پستول مجھ پر کھینچ مارا۔ میں اس کے اتنے قریب آ گیا تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی پہنچ سے زیادہ دور نہیں رہا تھا اور حالت اس کی ایسی تھی کہ میں اس کی طرف سے کسی اچانک کارروائی

کی توقع ہی نہیں کر رہا تھا۔ بس یہی اعتماد چوٹ دے گیا مجھے۔ پستول اتنے زور سے میرے سینے پر آ کے لگا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے کے پنجر کی کوئی ہڈی دغا دے گئی مجھے۔ میرا دایاں ہاتھ بے اختیار سینے کے حصّے پر جا رُکا جہاں چوٹ لگی تھی۔ سینے سے اٹھنے والی درد کی ٹیس نے مجھے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ بس وقت کا وہی ایک لمحہ میرے ہاتھ سے پھسل کر جانو کی جھولی میں جا پڑا تھا اور اسی ایک لمحے سے اس نے فائدہ اٹھا لیا۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح مجھ پر آ پڑا۔ اس کے گھونسے کسی پہلوان کے مگدر سے کم نہیں تھے۔ دو ہی گھونسوں میں اس نے مجھے زمین پر لٹا دیا اور پھر اس کی ٹھوکروں نے میرا جوڑ جوڑ ہلا کے رکھ دیا۔ میرا ایک ایک پُرزہ آواز دینے لگا تھا۔

وہ میرا تکبر آمیز اعتماد ہی کھا گیا تھا مجھے، اسی لیے میرے اس رب نے جو مالک ہے کُل جہان کا، انسان کو تکبر سے باز رہنے کی ہدایت کر دی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر یہ سوال ذہن میں سر ابھارتا ہے کہ انسان آخر کس چیز پر اتنا تکبر کرتا ہے، کیا وہ اپنی پیدائش کے عمل کو بھول گیا؟ اور شاید اسی لیے یہ عمل ازل سے بار بار دہرایا جا رہا ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو یاد رکھ سکے کبھی اپنی اوقات سے باہر نہ نکلے۔ مگر پھر بھی اپنے کارناموں پر اس کا سینہ پھولنے لگتا ہے، پیر پھیل کے چلنے لگتا ہے یہ اپنے۔ اور بھول جاتا ہے کہ دوسرے انسان بھی اسی کی طرح تخلیق کیے گئے ہیں اور وہ بھی اس دنیا پر اور اس میں موجود تمام اشیاء پر اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا اسے حاصل ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے اختیار میں دیکھ کر، اپنی دسترس میں پا کر یہ فراموش کر بیٹھتا ہے کہ یہ اس کے رب کی طرف سے امتحان ہے، اس کی دیانت اور اس کی امانت داری کا۔ خدا اسے دوسروں کی امانتیں ان تک پہنچانے کی خدمت سونپتا ہے، دوسروں کے حصّے کا رزق اس کی جھولی میں ڈال کر انھیں اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مگر وہ اسے اپنی ملکیت قرار دے کر اپنے نیچے سمیٹ کے بیٹھ جاتا ہے اور اسے اپنی مہارت اور ذہانت کا صلہ تصور کر کے اپنے لیے آسائشیں خریدتا ہے اور دوسروں سے ممتاز نظر آنے کے لیے فخر سے سینہ تان کے گردن اکڑا کے چلنا سیکھ لیتا ہے اور اس وقت تک وہ آنکھیں ہی نہیں کھولتا جب تک قدرت اسے اپنے شکنجے میں کس کے بے بس نہیں کر دیتی۔

میں بھی اس ننھی سی طلسمی انگوٹھی کے بل پر اپنے آپ میں نہیں سما رہا تھا۔ میں جس انداز سے جانو اور اس کے پستول کو دیکھ رہا تھا، وہ انسانوں کے دیکھنے کا انداز تو نہیں تھا۔ میں خود کو برتر اور جانو کو حقیر سمجھ لینے کی غلطی کا مرتکب ہوا تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اب میں اس حقیر جانو کی ٹھوکروں میں پڑا تھا اور مجھے اتنی

مہلت بھی نہیں مل رہی تھی کہ میں اپنے بدن پر پڑنے والی چوٹوں کو سہلا بھی سکوں۔ اس نے مجھے روئی کی طرح دُھن کے رکھ دیا۔ اس طرح کہ میرے بدن کا کوئی حصّہ ایسا نہ رہا تھا جہاں سے ٹیسیں اٹھ اٹھ کر مجھے بے چین نہ کر رہی ہوں۔

اس دوران وہ بادل بھی رسّی لے کر واپس آ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا استاد! یہ ظہیر صاحب کیوں پڑے ہیں اس طرح؟ اور یہ قادر کو کیا ہوا ہے؟ یہ کیوں گٹھڑی بنا پڑا ہے؟“

”اوئے کچھ نہیں یار! وہ غلطی ہو گئی تھی ہم سے ذرا سی دیر کے لیے غافل ہو گئے تھے ہم۔ اور اسی غفلت میں یہ سانڈ آزاد ہو گیا تھا کسی طرح۔ اس نے یہ حال کیا ہے ان دونوں کا۔“

”اچھا!“ بادل حیرت سے بولا۔ ”بڑا زور ہے استاد اس میں تو۔ تمھارے سامنے اس نے لمبا کر دیا انھیں!“

”ہاں ایسا ہی پاگل کُتا ہے یہ۔ ذرا بھی موقع ملے تو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے آدمیوں کو۔ چلو اس کی ٹانگیں باندھو۔ سالے کو اُلٹا لٹکائیں گے چھت سے۔“

انھوں نے میری ٹانگیں سیدھی کر کے رسّی سے باندھ دیں۔ میں خاموش پڑا رہا۔ مجھ میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ ان کے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتا۔ پھر مجھے چھت کے نیچے اس جگہ لے جانے کے لیے جہاں لوہے کا کُنڈا لگا تھا، بادل نے اٹھانے کی کوشش کی مگر میں اس سے ہلایا تک نہ جا سکا۔ وہ بولا۔ ”یار استاد! ہاتھ لگاؤ ذرا تم بھی۔ بڑی بھاری لاش ہے یہ تو، سالا ہلایا بھی نہیں جاتا مجھ سے۔“

”یہ تیرے اکیلے کے بس کا نہیں ہے۔ چل سنبھال ایک طرف سے اسے، میں دوسری طرف سے اٹھاتا ہوں۔“

وہ دونوں میرے دائیں بائیں آ ٹھہرے۔ انھوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ میری کمر کے نیچے رکھا اور دوسرا ہاتھ میری بغلوں میں دے کر مجھے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ میرے لیے انھوں نے خود ہی ایک بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ جیسے ہی انھوں نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے، میں نے دونوں ہاتھ سہارا لینے کے انداز میں ان کی گردنوں پر رکھ دیے اور اس سے پہلے کہ وہ میرے ارادے کو سمجھ سکتے، میں ان کی رگِ احساس مسل چکا تھا۔ وہ دونوں کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ایک ساتھ زمین پر ڈھے گئے۔

یہ ایک موقع میری تیرہ و تار تقدیر نے مجھے عطا کر دیا تھا۔ ان چاروں میں سے تین میرے ہاتھوں کی کرشمہ کاری کا شکار ہو گئے تھے اور ایک کسی چوٹ کھائے ہوئے پتّے کی طرح گھٹنوں میں منہ دیے پڑا تھا۔ شاید اس کے زیادہ ہی چوٹ آ گئی تھی۔ کسی ایسی ضرب لگ گئی تھی کہ اس کے سارے ہی تار جھنجھنا اُٹھے تھے۔ میں بھی کچھ کم مضروب نہیں تھا۔ اس سُوّر کے بچے جانو نے اپنا سارا زور الٹ دیا تھا مجھ پر۔ یہ بات شاید کسی طرح اس کے ذہن میں سما گئی تھی کہ اگر ایک بار مجھے زمین سے اُٹھنے کا موقع مل گیا تو پھر اس کے قدموں کو اس کا بوجھ سہارنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اپنے پستول کی بے بسی کا تماشا بھی دیکھ چکا تھا اور میرے لڑنے کا انداز بھی دیکھا تھا اس نے، پھر وہ مجھے سنبھلنے کا موقع دے کر اپنی موت کا سامان کیسے کر لیتا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اپنی ذات میں مجھے اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی سنگین قسم کی کارروائی کر سکوں مگر پھر بھی وہ ابھی میرے بارے میں جانتا ہی کیا تھا۔ آج پہلی بار تو اس نے دیکھا تھا مجھے اور اس پہلی ملاقات میں ہی خاصے اندازے قائم کر لیے تھے میرے بارے میں۔ پھر بھی میرے سارے کے سارے عیب و ہنر تو اس پر آشکارا نہیں ہو سکے تھے ابھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے سر کرنے کے لیے یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کہ آدمی میرے ہاتھ کی پہنچ سے دُور رہے اور یہ عدم واقفیت ہی لے ڈوبی تھی اسے۔

ان چاروں کو اپنے سامنے یوں بے دم پڑے دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی مجھے۔ آدمی خطرے کی حدود پار کر آئے اور دشمن اس کے سامنے بے دم پڑا سسک رہا ہو تو اس کی کھوئی ہوئی توانائیاں دوبارہ لوٹنے لگتی ہیں۔ میرا حال تک ہر مُوئے بدن فریاد کر رہا تھا، جسم کو ذرا سی بھی حرکت دینے کی کوشش کرتا تھا تو ایک ایک عضو سے آہ و فغاں ابھرنے لگتی تھی لیکن جلد از جلد ان بھیڑیوں کے بھٹ سے نکل کر اپنی جان سلامت لے جانے کی آرزو مجھے حوصلہ بخش رہی تھی۔ میں چوٹوں سے اٹھنے والی تیز ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے سہارے بالآخر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے پیروں کو رسّی کی بندش سے آزاد کر کے باری باری ان چاروں خبیثوں کا جائزہ لیا کہ کہیں ان میں سے کوئی اٹھ کر میری راہ میں حائل تو نہیں ہو سکے گا۔ پھر آہستہ آہستہ بے سدھ پڑے ہوئے جانو کے قریب جا کر اس کا وہ پستول تلاش کرنے لگا مگر وہ اس کے پاس نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو وہ مجھے ذرا فاصلے پر پڑا ہوا نظر آ گیا۔ میں نے اپنی دوسری طرف پڑے ہوئے بادل کے لباس کو ٹٹولا، اس کے نیفے میں پستول موجود تھا۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا، وہ گولیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں وہ پستول ہاتھ میں لے کر اٹھنے لگا تو میری پنڈلیاں کپکپانے لگیں، کوئی اور ہوتا تو میں دوبارہ وہیں لیٹ جاتا لیکن اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ ایک دھڑکا مجھے یہ بھی لگا ہوا تھا کہ اس عقوبت خانے کی ویرانی، باہر موجود کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہ کر لے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ مجھے جس تل گھر میں لا ڈالا تھا ان ذلیلوں نے، وہ کسی ویرانے میں واقع ہو گا۔ یقیناً یہ جگہ کسی عمارت کا تہ خانہ یا کوئی ایسا حصّہ تھی جہاں سے اٹھنے والی چیخ و پکار کی آوازیں عمارت کے باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ایسی صورت میں اس کمرے کے باہر یا عمارت کے کسی اور حصّے میں کچھ اور لوگوں کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ جو لوگ اس عمارت میں موجود تھے وہ میری یہاں موجودگی سے بھی واقف رہے ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ظہیر احمد مجھے کس مقصد سے یہاں لایا ہے۔ چنانچہ میرا جلد از جلد باہر نکلنا بے حد ضروری تھا۔ میں نے ہمت کر کے اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر ڈالا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ نہ جانے اس میں کتنے شگاف ڈال دیے تھے اس ظہیر احمد کے بلڈاگ نے، جن میں سے لہو رِس رِس کر میرے چہرے اور گردن پر [illegible] کیا تھا۔ [illegible] کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی اور چہرے پر سوجن کی وجہ سے آنکھوں کو کھولے رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے قمیص کے دامن سے آنکھیں اور منہ صاف کر کے اپنے ڈگمگاتے قدموں کو مضبوطی سے زمین پر جمایا اور سنبھل سنبھل کے آگے بڑھنے لگا۔ جانو کے پستول کے پاس جا کر میں وہ پستول اٹھانے کے لیے جھکا تو میری کمر سے اٹھنے والی ٹیسوں نے مجھے دوبارہ سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ میرا جی چاہا کہ لات مار کے اس پستول کو دور پھینک دوں، مگر پھر اس خیال سے رک گیا کہ ممکن ہے باہر مجھے ایک سے زیادہ لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑے تو ایک پستول ناکافی ثابت ہو۔ چنانچہ سیدھا کھڑے کھڑے ہی میں آہستہ آہستہ گھٹنوں کو خم دیتے ہوئے نیچے بیٹھ گیا اور پستول اٹھا کر دوبارہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حالت میری ایسی ہو رہی تھی کہ رات کے اس سمے کوئی کمزور دل آدمی مجھے دیکھ لیتا تو چیخ مار کر گر پڑتا۔

دونوں ہاتھوں میں پستول تھامے، جما جما کے قدم رکھتا ہوا میں باہر نکلا تو پتا چلا کہ میں کسی تہ خانے ہی میں تھا۔ میں جہاں کھڑا تھا، وہ بھی ایک بڑا سا کمرہ ہی تھا۔ تیز روشنی کا ایک بلب وہاں روشن تھا۔ میرے دائیں بائیں دو دو کمروں کے دروازے اور بھی نظر آ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بے شمار لکڑی کی پیٹیاں چُنی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی اوپر جانے کے لیے زینہ تھا جس کے اوپر دیوار میں کوئی ایسا راستہ نظر آ رہا تھا جسے باہر جانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ دیوار بالکل سپاٹ تھی، اسے دیکھ کر وہاں کسی راستے کی موجودگی کا تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی جو مجھے اس تہ خانے سے باہر نکال سکے لیکن اور جتنے بھی دروازے نظر آئے ان سب میں تالے لٹک رہے تھے۔ میں نے زینے پر چڑھ کر اوپر کی

دیوار میں راستہ تلاش کرنے کے ارادے سے سیڑھیوں پر قدم دھر دیا۔ سیڑھیاں چڑھنے میں مجھے بہت دشواری پیش آ رہی تھی، میرے پیر بار بار لڑکھڑا جاتے تھے۔ کمر اور سر سے درد کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر پورے بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم اٹھاتا اوپر چڑھتا چلا گیا۔ شاید وہ اوپر سے پانچویں سیڑھی تھی جس پر پاؤں دھرتے ہی سیڑھی کپکپانے لگی تھی اور میرا توازن بگڑنے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کے اس پر سے پیر ہٹا لیا اور بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ بظاہر اس میں خرابی کوئی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ ایک پیر اٹھا کر ایک بار پھر اس سیڑھی پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس پر زور ڈالنے لگا۔ اس بار اس میں کوئی گڑبڑ محسوس نہیں ہوئی مجھے۔ پھر بھی بہت محتاط انداز میں پیر جما کر میں نے اس پر دوسرا پیر رکھا، میرا پورا وزن پڑتے ہی وہ سیڑھی تھوڑی نیچے دبی اس کے ساتھ ہی دیوار کی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی دینے لگی۔ ایسی جیسے بہت سی مکھیاں بھن بھنانے لگی ہوں۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ زینے کے اختتام پر نظر آنے والی دیوار کا تین فٹ چوڑا نچلا حصہ نیچے سرکتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورا ٹکڑا نیچے جا کر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ اوپر جانے کا راستہ دکھائی دینے لگا۔ میں حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ تین طرف پھلوں کی پیٹیاں چنی ہوئی تھیں۔ جس راستے سے میں اوپر آیا تھا وہ بھی میرے اس کمرے میں قدم رکھتے ہی بند ہونے لگا تھا۔ جیسے ہی وہ دیوار برابر ہوئی، پھلوں کی پیٹیوں کی ایک قطار دائیں جانب سے سرک کر اس خالی جگہ پر جا ٹھہری۔ میرے لیے یہ بڑی حیرانی کی چیز تھی۔ میں نے آج سے پہلے ... دیواروں اور فروٹ کی پیٹیوں کی قطاروں کو اس طرح اپنے آپ حرکت کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس رذیل ظہیر نے پتا نہیں کیسا مشینی نظام قائم کیا ہوا تھا وہاں۔ میرے جیسے آدمی کی عقل میں تو ایسی چیزیں سما ہی نہیں سکتی تھیں کبھی۔ قتل و غارت گری تو میں نے بھی بہت کی تھی اور روپیہ بھی خوب کمایا تھا مگر وہ میرے کسی کام نہ آتا تھا۔ اپنے دشمنوں اور قانون سے بچنے کے لیے چاروں ہی سمتیں دیکھ ڈالی تھیں میں نے۔ حتیٰ کہ امریکا تک کی خاک چھان آیا تھا مگر کوئی ایسی پناہ گاہ بنا کے بیٹھ جانے کا خیال کبھی میرے دماغ میں راہ نہیں پا سکا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی ہاتھ آ گیا تھا میرے جب میرا یار آبی اور اس کے ساتھی میرے شانے سے شانہ ملا کر چل پڑے تھے میرے ساتھ۔ مگر وہ سب آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو کر کے کام آتے چلے گئے۔ فرشتۂ اجل نے انھیں تاک تاک کے پکڑا تھا۔ اگر اس وقت میں نے یوں شہر شہر، گاؤں گاؤں مارے مارے پھرنے کے بجائے کوئی زمین کا کونہ داب لیا ہوتا اپنے نیچے اور وہاں ایسے ہی کل پرزے فٹ کر لیے ہوتے جیسے ظہیر احمد نے فٹ کر رکھے تھے تو آج میں اکیلا زخم نہیں کھاتا پھر رہا ہوتا، میرا وہ یار اسلم آبی جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون گرانے کو تیار رہتا تھا، جیل کی صعوبتیں نہ سہہ رہا ہوتا۔ ہم بھی کوئی معزز روپ دھار کے بیٹھے ہوتے کہیں۔ وہ وردی پوش جن سے ہر شریف آدمی اپنی پگڑی بچائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور جو میرے خون کے پیاسے ہوئے پھرتے ہیں، آہو اور ڈھلوں کی طرح میرے دروازے پر بھی میری اجازت کے بغیر قدم نہ دھرتے اور ایک اشارے پر میرے چہرے کی تمام سیاہی کسی اور چہرے پر مل دیا کرتے۔ میرے نامۂ اعمال کے سارے کے سارے گناہ کسی بے مایہ غریب اور شریف آدمی کے نامۂ اعمال میں منتقل کر دیا کرتے اور میری حفاظت، میری پاسبانی کی تمام ذمے داری خود قبول کر کے مجھے ہر آفت سے محفوظ و مامون کر دیتے۔

وہ کمرہ جہاں اس سرنگ کا دہانہ کھلتا تھا، جس میں سے برآمد ہو کر میں وہاں آیا، اب کسی فروٹ مرچنٹ کے گودام کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس گودام میں داخل ہونے والا کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس گودام کی کوئی دیوار سحر زدہ کر دینے والی بھی ہے، یہاں بھی کسی علی بابا نے کھل جا سم سم جیسا کوئی دروازہ چھپا رکھا ہے، جس کے پیچھے اس کے اعمال کا سارا کا سارا حساب محفوظ رکھا ہے۔ یقیناً اس ظہیر احمد نے وہاں پھلوں کے ذریعے منشیات کی ہیر پھیر کا بڑا منظم اور مامون سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اوپر پھلوں کی پیٹیاں اور نیچے تہ خانے میں منشیات کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اس نے خوبانی پھلوں کے ساتھ لائی جاتی تھی کہیں سے یا اس کے اس طرح کہیں روانہ کرنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

میں نے اس کمرے میں نظر آنے والے واحد دروازے کا رُخ کیا اور اس کے قریب جا کر بہت آہستہ سے اس میں معمولی سی جھری پیدا کر کے باہر جھانکنے لگا

وہ کسی کوٹھی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے ایک کشادہ سبزہ زار تھا جس کے چاروں طرف ڈم ڈم کی باڑ لگی تھی۔ سبزہ زار پر بچوں کے کھیلنے کے جھولے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ گودام کے دروازے کے بالکل سامنے وہ سُرخ کار کھڑی تھی جس میں ٹھونس کر وہ مجھے یہاں لائے تھے۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول کے کار کا پوری طرح جائزہ لیا تو ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آرام سے پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کو دھیرے دھیرے کھولا اور کسی طرح کی آہٹ پیدا کیے بغیر باہر نکل گیا، ایک لمحہ وہاں رک کر ماحول کا جائزہ لینے کے بعد گربہ قدم چلتا ہوا میں کار کے نزدیک جا پہنچا۔

کار کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا ہوا شخص گہری نیند میں تھا۔ وہ ہر خطرے سے بے نیاز سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر سکون کی نیند سو رہا تھا۔ میں کار کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور پیچھے دیکھے بغیر جلدی سے اسٹیئرنگ وھیل سنبھال کر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "کدھر چلیے باس؟ کیا کھتم ہو گیا ہو گیا وہ سالا جیرا اسی دیر بھی نہیں چل سکا۔ میں تو بولتا ہوں اِدھر ہی کسی کچرا گھر میں ڈال دو۔ سویرے تک کتے بلّیاں کھا پی کر برابر کر دیں گے سالے کو۔ بے کار میں سمندر تک جا کے اتنا پٹرول کاہے کو جلاتا ہے؟"

اس کی یہ بات سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ مجھے جان سے مار دینے کی نیت رکھتے تھے۔ وہ مجھے دھیرے دھیرے ٹھکانے لگانا چاہتے تھے، سسکا سسکا کر، اذیتیں دے دے کر، بڑی درندگی سے انتقام کی آگ بجھانا چاہتا تھا وُہ ظہیر احمد۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ سامنا ہونے پر میں اس بھیڑیے کا قصہ تمام کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اس کا مستحق ہی نہیں تھا کہ کسی طرح کی رعایت دی جاتی اسے۔ مجھے خاموش پا کر ڈرائیور نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت سے دیدے پھاڑ کر رہ گیا "تم... تت... تم...!"

میں نے پستول اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جا اُلو کے پٹھے! گاڑی نکال جلدی یہاں سے!"

پستول دیکھ کر اس نے جلدی سے اسٹیئرنگ دوبارہ سنبھال لیا "کدھر... کدھر جائے گا تم...؟"

"یہاں سے باہر نکلو پہلے پھر بتاؤں گا۔ یہ یاد رکھنا، پستول گردن پر رکھا ہے تیری۔ اگر حرکت کی کوئی تو گولی مار کے لاش کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ یہی چاہتا تھا نا تو بھی کہ میری لاش کتے بلّیاں کھا جائیں؟"

"نئیں مائی باپ! ہم کو نئیں بولتا تھا ہم۔" اس نے کار جلدی سے آگے بڑھا دی۔

لان کا چکر لگا کے کار کوٹھی کے سامنے آئی تو گیٹ پر دربان نظر آ گیا مجھے، وہ گیٹ بند کیے بیٹھا تھا۔ اگر گاڑی اس کے قریب جا کر رکتی تو وہ صورتِ حال جان کر کوئی گڑبڑ کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ڈرائیور سے کہا "ہارن بجا کے گیٹ کھولنے کا اشارہ دو اسے۔ خبردار کوئی اور حرکت نہ کرنا۔"

اس نے فوراً ہارن بجانا شروع کر دیا۔ دربان نے ہارن سنتے ہی تیزی سے اُٹھ کر گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور موجودہ صورتِ حال سے خاصا بدحواس ہو رہا تھا۔ گیٹ کھلتے ہی وہ پوری رفتار سے کار کو باہر نکال لے گیا۔ سڑک پر آنے کے بعد وہ بولا "صاحب! اگر آپ بولے تو ہم آپ کو شرافت سیٹھ کی کوٹھی پر چھوڑ دے؟"

"تم جانتے ہو شرافت علی کو؟" اس کی بات سن کر مجھے ساری مشکل آسان ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔

"اس کو کون نئیں جانتا صاحب! آپ کو اُدھر ہوٹل میں اس کے ساتھ ہی تو دیکھا تھا ہم لوگ نے۔"

"ٹھیک ہے، وہیں لے چلو مجھے۔ کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

"نئیں صاحب! آپ کو تو ہم نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ پر وہ باس جانتا ہے آپ کو۔ بولتا تھا آپ اس کو کبھی چوٹ دے گیا تھا۔ وہ بڑا کھطرناک آدمی ہے صاحب! اِدھر بڑا بڑا لوگ دب کے رہتا ہے اس سے۔ آپ بہت جی دار آدمی ہے، ہم ایسے آدمی کی بہت کدر کرتا ہوں۔ کیا آپ نے ان لوگ کو بالکل کھتم کر دیا ہے صاحب؟"

"نہیں یار! اب ایسا بھی آدمی نہیں ہوں میں کہ ذرا سی بات پر بندے مارتا پھروں۔"

"آپ اس کو جرا سی بات بولتا ہے، وہ تو آپ کو کھتم کر دینے کے واسطے لے گیا تھا اٹھا کے۔ ہم حیران ہوں، آپ بچ کیسے گیا ان سے۔ اُدھر وہ چار آدمی تھا، آپ اکیلا تھا۔ پھر بھی آپ نے مار دیا ان کو۔"

"مگر تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے میرے بھائی؟ آدمی تو تُو بھی اسی ظہیر احمد کا ہے نا۔ پھر تو اس کے خلاف زہر

کیوں اُگل رہا ہے؟ کیا مصلحت ہے تیری اس میں؟ کہیں اس پستول نے تو زبان نہیں بدل دی ہے تیری؟"

"ایسا بات نہیں بولو صاحب! ہم بولا ہوں آپ کو کہ ہم جی دار آدمی کا گلام ہوں اور جو آدمی اس سالا جانو کو کلٹی کر سکتا ہے، اس کو تو ہم سر پہ بٹھاتا ہوں اپنے۔ وہ جانو نے اِدھر باندھ کے رکھا ہوا ہے ہم کو۔ وہی لایا تھا ہم کو اِدھر نوکری کے واسطے۔ ابھی ہم کو ڈراتا ہے، دھمکی دیتا ہے کہ نوکری چھوڑے گا تو کتل کر دے گا۔"

میری حالت بہت ابتر تھی اور وہ مسلسل بولنے پر مجبور کر رہا تھا مجھے۔ آدمی وہ بھی کوئی دکھوں کا مارا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس ماحول میں خوش نہیں ہے۔ کسی بڑی مجبوری نے اسے ظہیر احمد کے کھونٹے سے باندھ رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جانو اسے وہاں گھیر لایا تھا۔ یہ بات کسی حد تک درست تھی۔ اسے پرکھنے کے لیے کوئی پیمانہ، کوئی کسوٹی تو تھی نہیں میرے پاس۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھے شرافت علی کی کوٹھی پر ہی لے جا رہا تھا یا کسی اور دلدل میں پھینکنے جا رہا تھا۔ کیا پتا اسے میری حالت کا بھی اندازہ تھا یا نہیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری باتوں، میری آواز سے یہی معلوم کرنا چاہتا ہو کہ مجھ میں وہ پستول بھی زیادہ دیر تک اس پر سیدھا کیے رہنے کی طاقت ہے یا نہیں۔ اس نے بس چند لمحے ہی مجھے دیکھا تھا۔ اور کسی اس جیسے آدمی کے لیے میرا چہرہ خون سے رنگین ہونے کے باوجود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی تھا کہ وہ خون میرے اپنے زخموں سے بہہ بہہ کر آیا تھا یا کسی اور کے لہو کی دھاریں مجھے غسل دے گئیں تھیں۔ وہ میری آواز کی نقاہت سے ہی کچھ اندازہ کر سکتا تھا، اس کے لیے یہی ایک ہی طریقہ تھا کہ مجھے مسلسل بولتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ ایسا ہی کر بھی رہا تھا۔ میں بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا اور اپنی تمام تر توانائی صرف کر کے اپنی آواز کی گھن گرج کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔

"نام کیا ہے یار تیرا؟ تو آدمی کوئی مجھے بہت ہی دکھوں کا مارا لگتا ہے۔ بڑا درد ہے تیرے لہجے میں۔"

"ہاں جی! بچپن سے اب تک سکھ کا کوئی سانس نئیں لے سکا ہوں۔ سلامو نام ہے میرا۔ ویسے میرے ماں باپ نے تو سلمان نام رکھا تھا جی! پر ہمارے اُدھر اصل نام سے کوئی کسی کو نئیں بلاتا۔ میرا نام بھی انھوں نے سلمان سے سلامو کر دیا۔ جیسے وہ جان محمد جانو ہو گیا ہے۔"

"یہ جانو تیرا رشتے دار ہے کوئی؟ کیا رشتہ ہے اس سے تیرا؟"

"اس کی بہن ہے جی میرے گھر میں۔ بڑی نیک بی بی ہے جی وہ، ماں باپ بھی اس کے بہت نیک ہیں۔ یہ پتا نئیں اِیہ کیسے نکل گیا ہے۔ گھر میں کوئی راجی نئیں ہے جی اس سے۔"

"مگر تم کیسے آ پھنسے اس کے ساتھ۔ جب کہ تم یہ بھی جانتے تھے کہ وہ آدمی ٹھیک نہیں ہے؟"

"بس جی کیا بتاؤں۔ کسمت کی کھرابی تھی میری۔ نوکری چھوٹ گئی صاحب! میں پہلے ٹرک چلایا کرتا تھا بجری کا۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا، مالک نے اس بات پر چھٹی کر دی میری۔ حالانکہ نُصکان اتنا نئیں ہوا تھا اس کا۔ پھر میں بے کار رہا بہت دن تک۔ میری بے کاری سے تنگ آ کر گھر والوں نے اس کو بولا کہ مجھے نوکری سے لگوا دے کسی جگہ۔ بس جی اس نے اِدھر ظہیر صاحب کے پاس ڈرائیور لگا دیا مجھے۔ ان کالے دھندوں کا پتا چلا تو میں نے نوکری چھوڑنے کا بولا۔ اس پر اس کتے جانو نے بالکل طوطے کی مانند آ... پھیر لیں۔ بولنے لگا نوکری چھوڑے گا تو جان سے مار دوں گا۔ بھلے اپنی بہن کو جندگی بھر بٹھا کے کھلانا پڑے۔"

"ایسا کیوں کرتا ہے وہ؟ تجھے زبردستی کیوں باندھ رکھا ہے اس نے؟ چھوڑنے کیوں نہیں دیتا یہ نوکری؟"

"وہ صاحب جی! پہلے تو بولتا تھا میری بات کھراب ہو جائے گی ایسا کرنے سے، میں نے بڑی مُشکلوں سے ... کیا تھا باس کو۔ میں پھر بھی نئیں مانا تو بولنے لگا۔ ابھی ... کے راج پتا چل گئے ہیں تجھ کو۔ تُو اِدھر سے نوکری چھوڑ ... جائے گا تو اِدھر کا سارا پول پٹی کھول دے گا۔ بس جی ... واسطے وہ جانے نئیں دیتے ہیں مجھے۔ ایک بار میں گھر بھاگ گیا تھا، تین دن تک تو یہ کتا جانو پکڑ کے لے آیا مجھے ... باندھ کے اتنا مارا تھا کہ مہینے بھر تک بستر میں پڑا روتا رہا میں۔ اس دن کے بعد میں نے کبھی نوکری چھوڑنے کو نئیں ... اس سے۔ آج میرا دل بہت کھوس ہے صاحب! آج کھ... بدلا لیا ہے آپ نے ان سے۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب تم مجھے چھوڑ کر واپس جاؤ گے تو وہ لوگ تم سے یہ نہیں پوچھیں گے مجھے کیوں لے گئے تھے؟ ممکن ہے وہ تمھارے ساتھ پھر کوئی زیادتی کریں۔"

"وہ جی، میں آپ کو کھود تو لے کے نئیں آیا ہوں، تو آپ پستول دکھا کے لے جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے یار! اب تو چُپ ہو جا اور مجھے جلدی سے پہنچا دے شرافت علی کی کوٹھی پر۔"

میرے لیے اب مزید بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ سر میں بُری طرح ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور میں اس پر اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، حالانکہ وہ خود کو ایک نہایت نیک طینت اور مظلوم آدمی ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا لیکن میں اس پر اعتبار کر کے اپنی باگیں اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا تھا۔ جن لوگوں کے درمیان سے میں نے اسے اٹھایا تھا، وہ میرے لیے کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے دھوکے سے قابو کر کے موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا لیکن ابھی اس دنیا میں میرے حصّے کے بہت سے دکھ باقی تھے۔ ابھی میرے نام کا پتہ نہیں گر سکا تھا۔ اسی لیے میں بے شمار زخموں کو اپنے تن پر سجا کے اس قبر سے نکل بھاگا تھا جو انھوں نے میرے لیے نہ جانے کب سے تیار کر رکھی تھی۔ میری یہ خم پارہ تقدیر میرے ساتھ خوب آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کیسے کیسے مرحلوں سے گزارتی آ رہی تھی وہ مجھے۔ اور اب بھی ثبات نہیں تھا اسے۔ میری حیات کے سارے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے اس نے۔ ایسی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیا تھا اس نے مجھے کہ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جس راہ پر قدم دھرتا تھا کوئی صیّاد ہم رنگِ زمین جال لیے بیٹھا مل جاتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے پاؤں زخمی کر لیے تھے میں نے اور یہ ستم ظریف تقدیر مسکرا مسکرا کر میرا تماشا کرتی رہی تھی۔

کار کے بریکوں کے چرچرانے کی آواز نے مجھے چونکایا۔ میری آنکھ کے سامنے ایک بالا بلند خوبصورت کوٹھی حائل تھی۔ سلامو نے کار اس کوٹھی کے گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔ گیٹ کے ساتھ پیتل کی ایک تختی نصب تھی۔ جس پر کار کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں جلی حروف میں شرافت علی کا نام نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں اس نے مجھے ٹھیرایا تھا۔ یہ اس کی اپنی اقامت گاہ تھی۔ میں نے سلامو سے کہا۔ "نیچے اُتر کے دربان سے معلوم کرو، شرافت علی گھر واپس پہنچ گیا ہے یا نہیں۔"

"بہت اچھا صاحب! ابھی پتا کرتا ہوں میں۔" وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گیا۔

اس اثنا میں شاید کار کی ہیڈلائٹس دیکھ کر دربان آنے والی کار کی شناخت کے لیے بغلی دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا تھا۔ سلامو کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ سلامو نے اس کے قریب جا کر اس سے کچھ پوچھا تھا۔ مگر اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ جواب میں دربان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا۔ میں نے اس کے انداز سے ہی سمجھ لیا کہ شرافت علی وہاں نہیں پہنچا ہے ابھی۔ سلامو نے واپس آ کر بھی یہی بتایا مجھے۔ "وہ گھر پر نئیں ہے صاحب!"

"اس سے پوچھو، اسے اس بنگلے کا فون نمبر معلوم ہے جہاں اس کے کچھ مہمان آ کر ٹھیرے ہوئے ہیں۔"

سلامو نے وہیں کھڑے کھڑے میرا سوال اونچی آواز میں دربان تک پہنچا دیا۔ دربان کوئی بہت ہی اطاعت گزار قسم کا آدمی تھا۔ وہ باہر نکل کر ہمارے قریب آتے ہوئے بولا۔ "وہ تو جی مس صاحب کو پتا ہوگا۔ آپ بولے تو ہم اس کو فون کر کر کے پتا کر لے؟"

میں نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلا کر کہا۔ "مس صاحب کو فون کر کے کہو، کوئی ایسا آدمی میرے ساتھ کر دے جو ہمیں اس بنگلے تک پہنچا دے۔"

اس نے قریب آ کر مجھے دیکھا تو ایک دم گھبرا گیا۔ "ارے صاحب! آپ تو بہت زخمی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں یار! میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں جلد از جلد پہنچنا چاہتا ہوں اس بنگلے پر۔"

"مگر آپ کو تو اسپتال جانا چاہیے صاحب! آپ اُدھر کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"اس لیے کہ شرافت علی مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا کہیں۔ دراصل میں..... میں اس کا وہی..... مہمان ہوں جسے..... جسے اس نے... اس... بنگلے... میں ٹھیرایا... ہوا ہے..." نقاہت کے سبب میری زبان لڑکھڑانے لگی تھی اور اب مجھے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا بہت ہی دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اب تک کس طرح خود کو سنبھالے رکھا تھا، یہ مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ شاید وہ انسانی فطرت تھی جو مجھے اب تک سہارا دیے ہوئے تھی۔ اپنے آپ کو خطرات میں گھرا دیکھ کر آدمی میں کچھ غیر معمولی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک اسے خطرے کی حدود سے نکل آنے کا احساس نہیں ہو جاتا وہ اسے سہارا دیے رہتی ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت ایسا ہی ہوا تھا۔ جب میں سلامو کے ساتھ تنہا تھا تو کسی نہ کسی طرح اپنا آپ سنبھالے بیٹھا رہا تھا۔ لیکن شرافت علی کے دربان کو سامنے پاتے ہی میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں اس سے بات کرتے کرتے ہی تاریکی میں

ڈوبتا چلا گیا۔ میرے ذہن پر اندھیرے کی چادر دبیز ہوتی چلی گئی۔

میں نے آنکھیں کھول کر پہلے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میرے چاروں طرف کچھ لوگ کھڑے تھے جن کی شکلیں اتنی دھندلی تھیں کہ میرے لیے انھیں پہچاننا تقریباً ناممکن تھا۔ میرے کانوں میں ان کے بولنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ لوگ کہہ کیا رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی افراد کہیں دور کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینا چاہا مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے ہوں۔ میں نے آنکھیں بار بار پٹپٹا کر آنکھوں کے آگے چھائی ہوئی دھند دور کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی مجھے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ البتہ میری اس حرکت سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک دم کئی چہرے میرے بہت قریب آگئے۔ میرے کانوں نے کسی کی دبی دبی آواز سنی "ہوش آرہا ہے اسے اب۔"

"ہاں، آپ لوگ سامنے سے ہٹ جائیں اور جب تک یہ پوری طرح ہوش میں نہ آجائے کوئی بات کرنے کی کوشش نہ کرے اور کوئی ایسا سوال نہ کیا جائے جس کے جواب کے لیے اسے دماغ پر زور ڈالنا پڑے۔"

ان کی باتیں دھیرے دھیرے میری سمجھ میں آتی جارہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دھند بھی چھٹنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ وہاں موجود چیزیں مجھے نظر آنے لگیں۔ میرا ذہن بیدار ہوکر اپنے اردگرد کے ماحول کو اچھی طرح سمجھنے لگا تو میں نے گردن کو آہستہ آہستہ دائیں جانب گھمایا۔ سب سے پہلے میں نے جسے پہچانا وہ لزی تھی۔ بنی اسرائیل کا وہ حسین و جمیل فتنہ جسے میں سان فرانسسکو سے اپنے ساتھ لگا کر لایا تھا اور جو مجھے اپنی زلفِ گرہ گیر میں اسیر رکھنے کے لیے اپنے ناز و انداز کا سارا کا سارا ذخیرہ مجھ پر نثار کیے دے رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ آگے بڑھ کے میرے قریب آگئی۔ میں اسے صرف دیکھتا ہی رہا۔ چند لمحے اس کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں اور سر اوپر اٹھا کے اپنے سرہانے دیکھنے لگا۔ وہاں شرافت علی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر ہی لگی ہوئی تھیں اور ہونٹ یوں کپکپا رہے تھے جیسے وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کوئی آواز اس کے حلق سے کسی طرح آزاد نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس طرح اوپر دیکھنے سے میرے سر میں دھمک ہونے لگی اور آنکھیں میری درد کر اٹھیں۔ چنانچہ میں نے نظریں جھکا لیں اور ایک بار پھر لزی کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے جھک کر بولی۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے جنابِ عالی! کیسا محسوس کر رہے ہیں اب آپ؟"

یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ آخر مجھے کیا ہے اور میں اس طرح کیوں پڑا ہوا ہوں۔ میرے ہاتھ پیر کو انھوں نے اس طرح کیوں جکڑ رکھا ہے کہ میں انھیں حرکت تک نہیں دے سکتا۔ لزی کے سوال کرنے پر میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے کیا ہوا ہے لزی؟"

سوال کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری آواز بہت کمزور ہے۔ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی گہرے کنویں کے اندر سے بول رہا ہوں۔ لزی نے مجھے تسلی دینے کے انداز میں

"کچھ نہیں جنابِ عالی! وہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہاں سڑک پر۔ بہت معمولی سی چوٹیں آئی ہیں آپ کو۔ ڈاکٹر نے دوا لگادی ہے اور آرام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اب آپ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کریں۔ دماغ پر زور نہ ڈالیں۔"

اس نے اپنے ہاتھ سے میری آنکھیں بند کردیں۔ میرے سر میں درد کی لہریں اٹھ اٹھ کر مجھے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ میں نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ لزی جس ایکسیڈنٹ کا ذکر کر رہی تھی، وہ کب اور کہاں ہوا تھا۔ لیکن دماغ پر ہلکا سا زور دیتے ہی مجھے اپنا سر پھٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ لزی نے میرے چہرے سے شاید میرے درد کا اندازہ کر لیا تھا۔ بولی۔ "کیا بات ہے جنابِ عالی! آپ تکلیف زیادہ محسوس کر رہے ہیں کیا؟"

"میرے سر میں بہت شدید درد ہے۔ سر پھٹا جارہا ہے میرا۔" میرے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

"آپ اپنے دماغ پر بالکل زور نہ دیں جناب۔ بس آرام سے لیٹے رہیں۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

"ٹھہریں، میں انھیں انجکشن دے دیتا ہوں۔ تاکہ یہ سکون سے سوتے رہیں۔" میرے بائیں طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ میں نے ادھر نظریں گھما کر دیکھا، وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھول کر سرنج نکالی اور اسے بھرنے لگا۔ میں نے نظریں گھما کر لزی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آہستگی سے بولی۔ "آپ کو آرام کی ضرورت ہے جنابِ عالی! آپ کے سر میں کچھ زیادہ چوٹیں آگئی ہیں جس کی وجہ سے آپ کو دماغ پر زور ڈالنے سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر کا خیال ہے انجکشن کے بعد آپ سکون سے سوتے رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے اسی دوران میرے بازو میں سوئی اتار دی۔ لزی نے ایک بار پھر اپنا نرم نازک ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔ "اب آپ سکون سے سو جائیں۔ آنکھیں بند رکھیں اور ذہن کو آرام سے رہنے دیں بالکل۔"

وہ اگر ایسا نہ بھی کرتی تب بھی میرے بس میں اب آنکھیں کھلی رکھنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ ڈاکٹر نے انھیں بند رکھنے کا مناسب بندوبست کر دیا تھا۔ جلد ہی مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا اور چند ساعت بعد ہی میں پھر اپنے گرد و پیش سے غافل ہوگیا۔

بڑا ہی درندہ صفت تھا وہ جانو جانور، اس بے دردی سے کوٹا تھا اس نے مجھے جیسے میں آدمی نہیں کوئی سرکشی پر اترا ہوا جانور ہوں۔ میرا سارا بدن اس طرح کچلا گیا تھا جیسے میرے اوپر سے روڈ رولر گزار دیا گیا ہو۔ دوسرے ہفتے میں اس قابل ہوسکا تھا کہ اپنی پشت کو آرام پہنچانے کے لیے اٹھ کر بیٹھ سکوں اور لوگوں سے بات چیت کر کے دل بہلا سکوں اپنا۔ شرافت علی نے میرے علاج اور میری ضروریات کا اس طرح خیال رکھا تھا جیسے میں اس کا بھائی ہوں۔ وہ ہر روز اپنا خاصا وقت میرے ساتھ گزارتا تھا۔ لزی نے بھی اس موقع پر میری دیکھ بھال اور تیمارداری میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اس نے صحیح معنوں میں ایک وفاشعار اور شوہر پرست پاکستانی بیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ اس کی یہ خدمت گزاری دیکھ کر کوئی شبہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ امریکہ جیسے مادر پدر آزاد معاشرے کی پروردہ کوئی یہودی لڑکی ہے اور بڑے ہی خوف ناک منصوبوں کے ساتھ مجھ سے نانک دی گئی ہے۔ مجھے خود بھی کبھی کبھی یہ خیال ستانے لگتا تھا کہ کہیں گریگری نے مجھ سے اس کے بارے میں جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ لیکن اس کے جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دوسری طرف آرتھر فینلی کا دہرا کردار بھی میرے دل و دماغ کو بھٹکنے سے باز رکھتا تھا۔ وہ مجھ سے جس انداز سے ملتا تھا اور جیسے انکشاف اس کے بارے میں ہوئے تھے مجھ پر ان کے پیشِ نظر گریگری کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

تیرھویں دن میری حالت بہت بہتر ہوچکی تھی۔ اس روز میں نے صبح ناشتا لزی کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر ہم ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ اسی وقت شرافت علی بھی وہاں آگیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ "خدا کا شکر ہے جیلانی! کہ آج میں تمھیں بہت بہتر حالت میں دیکھ رہا ہوں۔"

"میں تمھارا مشکور ہوں دوست! تم نے بھائیوں کی طرح میرا خیال رکھا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو اس اتنے بڑے شہر میں لزی کے علاوہ میرا تو کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں تھا جو مجھے اپنی چھت کا سایہ بھی دیا کرتا۔ اور یہ وفا پیشہ، خلوص و محبت کی مورت لزی تنہا اس اجنبی شہر میں میرے لیے کیا کرسکتی تھی۔"

"اوہ، نہیں یار! اس طرح نہیں سوچا کرتے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کرسکا۔ وہ کمینہ ظہیر احمد مجھے دھوکا دے کر تمھیں اپنے ساتھ باندھ لے گیا۔ مجھے ایسی غفلت نہیں برتنا چاہیے تھی۔ میں اگر تمھیں تنہا چھوڑ کر نہ جاتا تو وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔"

"کامیاب تو وہ یوں بھی نہیں ہوسکتا تھا اگر مجھے اس کے ارادے کی ذرا بھی بھنک مل جاتی۔ اب اتنا بھی بے جان مٹی کا مادھو نہیں تھا میں کہ وہ مجھے آسانی سے اٹھا کر لے جاتے۔ بس دھوکا ہی کھا گیا تھا میں بھی۔"

"مگر ہوا کیا تھا، کیا تمھاری اس سے کوئی پرانی دشمنی تھی؟"

"نہیں یار! دشمنی اس سے تو میری کیا ہوتی۔ وہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ ہی کا معاملہ تھا۔ ان لوگوں نے میرے یار اسلم آبی کو باندھ لیا تھا اس کے ذریعے۔" میں نے اسے وہ سارے واقعات تفصیل سے سنا دیے جو کراچی میں میرے اور آبی کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اور جس کے نتیجے میں آبی کو اپنی آنکھوں سے محروم ہونا پڑا تھا۔

"ہاں ہاں، یہ ساری باتیں تو مجھے بھی معلوم ہیں۔ تم نے اس کا انتقام بھی تو بے حد خوف ناک طریقے پر لیا تھا ان سے، مگر ان واقعات سے ظہیر احمد کا کیا تعلق تھا؟ اسے تو ڈاکٹر دھمن نے اس کی خدمات کا معاوضہ اس سے کہیں زیادہ دیا تھا جو ان کے درمیان طے ہوا تھا۔ اور پھر جب تمھاری ڈاکٹر سے دوستی ہوچکی ہے تو اب پرانی باتیں دُہرانے سے کیا فائدہ؟"

"مجھے بھی اسی بات پر حیرانی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ میں اس واقعے کو بھول چکا ہوں، وہ بھی اس کا ذکر نہ کرے لیکن اس کے سر پر تو انتقام کا بھوت سوار تھا۔ وہ کہتا تھا میں نے آبی کو اس کی قید سے رہائی دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دھوکے سے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے اس کا بدلا لینا چاہتا تھا۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اسے، ایسا ہی کمینہ ہے وہ کُتّے کا بچہ۔ اگر کسی وقت کسی سے انجانے میں بھی اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اسے بھولتا نہیں ہے وہ، اور موقع ملتے ہی اس کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا ہے میرے کہ اس روز مجھے بیرے کے ذریعے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بلانے والا اسی کا آدمی تھا۔ اس نے اس طرح مجھے وہاں سے ہٹا کے تم پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نکالا تھا۔"

"اچھا، تو کیا ہوٹل میں واپس جانے کے بعد، وہ تمھیں نہیں مل سکا تھا جس نے بیرے کے ذریعے تمھیں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بلایا تھا؟"

"نہیں، میں جب ڈائننگ ہال میں پہنچا تو بلانے والا

وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ بیرا بھی بیچارہ بہت پریشان ہوا تھا۔ اس نے ہوٹل کے مختلف حصوں میں اسے کافی دیر تک تلاش کیا تھا مگر وہ اسے کہیں نہ مل سکا۔ بیرا بے حد شرمندہ تھا اور بار بار مجھ سے معذرت کر رہا تھا۔ میں خود بھی الجھن کا شکار ہو گیا تھا کہ آخر وہ کون شخص تھا جس نے اس طرح بلایا مجھے اور پھر خود غائب ہو گیا۔

واپسی میں جب تم مجھے نہیں ملے تو میں نے کچھ دیر تمھارا انتظار کیا۔ خیال میرا یہی تھا کہ شاید تم کسی ضرورت سے اِدھر اُدھر کہیں چلے گئے ہو اور جلد ہی واپس آجاؤ گے لیکن جب تم کافی دیر تک واپس نہ آئے تو میں نے خود ہوٹل کے آس پاس تمھیں تلاش کیا۔ کچھ لوگوں سے تمھارا حلیہ بتا کر معلوم بھی کیا مگر کوئی تمھارے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ میں سمجھا شاید تمھیں وہ شخص ہوٹل سے باہر کہیں نظر آگیا تھا جسے تلاش کرنے ہم دونوں نکلے تھے اور تم اس کے پیچھے لگ گئے ہو۔ چنانچہ میں واپس آگیا اور یہاں بیٹھ کر تمھارا انتظار کرنے لگا۔ تمھاری واپسی جس طرح ہوئی تھی، اس نے تو مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رکھا تھا۔ اب تمھاری زبانی صحیح حالات کا علم ہوا تو یہ اندازہ ہوا کہ انھوں نے میرے ساتھ چال چلی تھی۔ وہ بُلاوا دراصل مجھے تم سے الگ کرنے کا بہانہ تھا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہو گا شاید۔ پھر بھی اگر وہ جانو مجھے پیچھے سے دھکا دے کر اچانک کار میں گرا نہ دیتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے کبھی بھی۔ بس کچھ وقت ہی ساتھ دے گیا تھا ان کا۔"

"وہ جنابِ عالی! میرے لیے بھی یہی بات حیرانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ میں نے اُدھر سان فرانسسکو میں آپ کو بڑے بڑے خوف ناک لوگوں سے مقابلہ کر کے انھیں زیر کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ آپ کو کیسے اپنے شکنجے میں جکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی میری۔"

"ہاں لزی! آدمی سامنے کھڑے دشمن سے آسانی کے ساتھ مار نہیں کھا سکتا۔ سامنے سے آکر گلے میں پھندا ڈالنا چاہے کوئی تو ایک بچہ بھی مزاحمت تو کرتا ہی نا، لیکن فریب کی آندھی آدمی کے پیروں سے زمین نکال دیتی ہے۔ مزاحمت یا مقابلے کی نوبت ہی نہیں آتی اور دشمن اپنی عیاری پر بغلیں بجانا شروع کر دیتا ہے۔"

"چلیں، اب خاک ڈالیں ان پر، آئندہ جب تک یہاں کراچی میں ہیں ہوشیار رہیں ان سے۔"

"خاک تو میں اب ان کی قبروں پر ڈالوں گا لزی بیگم! ساڈے نال متھا لا کے چنگا نئیں کیتا ان کھوتے دے پتّروں نے ستّاں چیر دیاں گا میں ایک ایک کی۔ بس جان پکڑ لینے دو مجھے ذرا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جنابِ عالی! مگر اس طرح تو آپ ا[illegible] قصے میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ بات بڑھ گئی تو پھر بڑھتی ہی [illegible] جائے گی۔ جبکہ آپ جلد سے جلد لاہور پہنچ کر اپنی ماں جی سے [illegible] ملنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تم نے بہت اچھی بات یاد دلا دی ہے اس گھڑی [illegible] نے تو اُدھر ماں جی سے فون پر بات کرنی تھی۔ اس رات میں [illegible] حیدر کو کہہ دیا تھا کہ وہ ماں جی کو بتا دے میں صبح ان سے بات کر[illegible] گا فون پر۔ اس سوُر کے پتّر ظہیر احمد نے مجھے اس کا بھی موقع نہ[illegible] دیا۔ کیا سوچتی ہو گی ماں جی کیسا جھوٹا پتّر پیدا کیا ہے اس نے [illegible] کے قول و فعل کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔ گھڑی میں کچھ کہتا [illegible] اور گھڑی میں کچھ۔ نہ اس کی زبان ٹکتی ہے ایک جگہ، نہ پاؤں ہی [illegible] ہیں کہیں۔"

"لیکن اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ حالات ہی آپ کو ایسے پیش آتے رہتے ہیں، چلیں اب بات کر لیں ان سے۔"

"ہاں، لاؤ فون ذرا میرے پاس لے آؤ۔ میں انھیں تسلی [illegible] تو دے ہی دوں کچھ۔ پتا نہیں کیا حال ہو گا ان کا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے، تم ماں جی سے بات کر کے انھ[illegible] سمجھا دو کہ فی الحال تمھارا لاہور آنا ممکن نہیں ہے۔ ایسا لگ [illegible] ہے مجھے جیسے ابھی کچھ دنوں تک تمھارا کراچی سے نکلنا نہیں [illegible] سکے گا۔ معاملات الجھتے ہی جا رہے ہیں۔" شرافت علی بولا۔

وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا، یہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھ[illegible] اسے ان ہیروں کی فکر لاحق تھی۔ وہ جب تک مل نہیں [illegible] وہ میری جان چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ جانے [illegible] نے کن کن لوگوں سے ان ہیروں کے سودے کی بات کر [illegible] تھی۔ وہ لوگ اب اس کی جان کھا رہے ہوں گے اور یہا[illegible] حال یہ تھا کہ ابھی تک یہی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ ہیرے [illegible] کہاں اور انہیں میرے پاس سے اڑا لے جانے والا [illegible] کون ہے! میرے بغیر یہ معمّا حل کرنا اس کے لیے آسان [illegible] تھا اور مجھے اس رذیل ظہیر احمد نے تیرہ دن سے بستر پر لٹا ر[illegible] اور ابھی مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے لیے کم از کم [illegible] ہفتہ اور درکار تھا۔

لزی نے فون لا کر میرے سامنے ایک اسٹول پر رکھ د[illegible] نے بے تابی سے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر دیے۔ دوسری ہی گھ[illegible] دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ اس بار خود ماں جی نے [illegible] اٹھایا تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی میرے دل کا عجیب حال ہو گیا تھا، ماتھے [illegible] پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھرنے لگے تھے اور دل میرا پنڈ[illegible] طرح ہلنے لگا تھا۔ میں نے اپنی آواز کو بھرانے سے روکنے کے لیے [illegible] کوشش کی تھی اس کے باوجود میں جب بولا تو یوں لگتا تھا جی[illegible] میں چیخ مار کے رو پڑوں گا۔ میں نے رو دینے کے انداز میں کہا تھا۔

"السلام علیکم ماں جی! کیسی ہیں آپ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟"

"وعلیکم السلام پتّر کون ہے تُو؟ میں تینوں پہچانی نئیں۔"

"یہ میں ہوں ماں جی! آپ کا خطا کار پتّر غلام جیلانی نالائق نافرمان، بدنصیب۔"

"نہ نہ، پتّر! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ بد فال نہ نکالا کر زبان سے بدنصیب ہوں تیرے دشمن۔ تُو کیوں ہو بدنصیب۔ رب تیرا نگہبان ہو، تیرے نصیب جاگتے رہیں ہمیشہ۔ تُو ٹھیک ہے نا بیٹے؟"

"ہاں، ماں جی! بالکل ٹھیک ہوں میں۔ آپ کی دعائیں جو ساتھ ہیں میرے۔ پھر مجھے کیا ہو سکتا ہے!"

"رب صحت دے، زندگی دے اور خوش رکھے تجھے ہمیشہ پتّر! کئی دن ہوئے جب اس حیدر نے بتایا تھا تُو نے فون کیا تھا کراچی سے اور سویرے پھر فون کرنے کو کہہ دیا تھا اس سے۔ اسی دن سے یہ ٹیلی فون میں نے اپنے سرہانے رکھوا لیا ہے اور تیری آواز پر کان دھرے بیٹھی رہتی ہوں۔ آج اتنے دن کے بعد تجھے خیال آیا ہے پھر فون کرنے کا؟"

"وہ ماں جی! بس کیا بتاؤں۔ اچانک ایسے ایسے کام نکل آتے ہیں کہ ایک پل بھی فرصت کا نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج ذرا سی فرصت ملتے ہی میں نے آپ کو فون کر دیا ہے۔ بڑی یاد آتی ہیں ماں جی آپ مجھے۔"

"ہاں، بیٹا! پتّر جو ہوا میرا۔ پر کا کا ایک بات سمجھ نہیں آئی تیری مجھے؟"

"وہ کیا ماں جی؟ کون سی بات کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟"

"پتّر! ابھی تیری ایک اکیلی تو جان ہے اور رب نے تجھے اتنا کچھ دے رکھا ہے، پھر تو کیوں مارا مارا پھرتا ہے پیسے کی خاطر؟ میری بات مان جیلانی پتّر! لالچ میں نہ پڑ۔ بس ادھر لاہور ہی میں چھوٹا موٹا کاروبار رہنے اور سکھ چین کے ساتھ گھر بسا کے بیٹھ جا اپنا۔ بڑی چاہ ہے مجھے تیرا گھر آباد دیکھنے کی۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں ہے بیٹا! پتا نہیں کب بُلاوا آجائے۔ تُو سامنے ہو گا تو جان آسانی سے نکل جائے گی نہیں تو تیری صورت کو ترستی ہی نہ رہ جاؤں میں۔"

"ایسی باتیں نہ کریں ماں جی آپ۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے ہمیشہ۔ آپ کی دعاؤں کی بڑی ضرورت رہتی ہے مجھے، بڑا حوصلہ رہتا ہے آپ کے دم سے۔ میں کوشش کر رہا ہوں ماں جی جلد سے جلد آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہونے کی مگر ایک مسئلہ الجھ کر رہ گیا ہے یہاں جس کی وجہ سے کچھ اور دن گزارنے پڑ جائیں گے مجھے کراچی میں۔ ورنہ تو میں اس حیدر سے بات کرنے کے دوسرے ہی دن لاہور آرہا تھا۔ دعا کریں اس جھنجٹ سے جلدی چھوٹ جاؤں۔"

"خدا تجھے اپنی امان میں رکھے کاکا! پر یہ بات تیری مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی ہے کہ جس رب نے تجھے اتنا سب کچھ دیا ہے تُو اسے کبھی دو سجدے تک نہیں کرتا۔ یہ ساری مصیبتیں جو تجھے گھیرے رہتی ہیں نا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اسے یاد کرتا رہا کر بیٹے! اگر وہ بھی تجھے بھول جائے تو بتا تیرا کیا حشر ہو اس دنیا میں۔ شکر کرتا رہا کر اس مالک کا جو انھیں بھی کبھی نہیں بھلاتا جو زندگی بھر اس کا نام تک نہیں لیتے اور بیٹا! اس آسیہ کی بھی کچھ خبر ہے تجھے؟ کس حال میں ہے وہ؟ تُو تو کہتا تھا بہت جلد اسے آزادی دلا دے گا لیکن اب تو ایسا لگتا ہے جیسے تجھے اس کی بھی کوئی فکر نہ رہی ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ماں جی؟ وہ ایک ہی تو بہن ہے میری، میں اسی کی فکر بھی نہیں کر سکوں گا تو میرے جینے کا فائدہ کیا ہے۔ اسی کی خاطر یوں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ بہت ہاتھ پیر مارے ہیں میں نے اس کے لیے مگر کوئی صورت بن نہیں پا رہی ہے۔ کوئی ذریعہ اب تک کام نہیں آسکا ہے میرے، پھر بھی میں ناامید نہیں ہوا ہوں ابھی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کاکا! میں جانتی ہوں اپنی بہن کو مصیبتوں کے حوالے کر کے تو سکون سے نہیں بیٹھ سکے گا کبھی۔ مگر دیکھ نا پتّر! ماں ہوں نا میں اس کی، دل میں پتا نہیں کیسے کیسے خیال آتے رہتے ہیں اس کی طرف سے۔ طرح طرح کے وسوسے سر ابھارتے رہتے ہیں۔ سوچتی یہ ہوں کہ خدا نے تجھے آج اس قابل کیا ہے کہ تُو اپنی بہن کے دامن میں خوشیاں بھر سکے تو وہ نصیبوں کی ماری اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹنے کے بجائے اس جہنم میں جا ٹھہری ہے۔"

ماں جی کی باتوں نے میرے سینے میں انگارے بھر دیے تھے۔ ان کے لہجے میں چھپا ممتا کا کرب مجھے بے حال کر گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ماں جی کے گرد آسائشوں کا انبار لگا دیا تھا، ہر طرح کا سکھ دینے کی کوشش کی تھی انھیں، لیکن اس آسیہ کے روگ سے انھیں نجات نہیں دلا سکا تھا۔ آسیہ کے بغیر ان کے سینے میں ہر آسائش خار بن کر کھٹکنے لگتی تھی۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا اس سلسلے میں۔ وہ اپنے سیاہ اعمال کے ہاتھوں ایسے شکنجے میں جا پھنسی تھی جہاں سے اسے آزاد کرانا مجھے کسی طرح ممکن نہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ ایسی دلدل میں جا اتری تھی جہاں سے نکلنے کی ہر کوشش اسے مزید تہہ میں لیے جا رہی تھی۔ یہ بات میں ماں جی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر انھیں آسیہ کی آزادی کی آس نہ رہی تو ان کی سانس بھی ساتھ چھوڑ دے گی ان کا۔ اور یہ مجھے کسی حال میں بھی منظور نہیں تھا۔

میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا "ناامید نہ ہوں ماں

جی! دعا کرتی رہیں خدا سے۔ سُنا ہے ماں کی دعائیں تو عرش ہلا دیتی ہیں۔ آپ کی دعائیں اور میری کوششیں ایک دن کارگر ضرور ہوں گی۔"

"ہاں بیٹا! وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں مایوس نہیں کرے گا۔"

"وہ حیدر کہاں ہے ماں جی؟ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا وہ آپ کے ساتھ؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں کرتا؟"

"نہ نہ بیٹے! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اور بالی دونوں بڑی جی جان سے خدمت کرتے ہیں میری۔ یہیں گھر میں ہی ہے وہ۔ بلاؤں کیا اسے؟"

"ہاں ذرا بلا دیں اسے بھی۔ دو باتیں اس سے بھی کر لوں۔"

"اچھا ٹھہر بلاتی ہوں ابھی۔"

چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ حیدر کی چہکار سنائی دی مجھے۔

"وہ جی سلام علیکم سردار صاحب!"

"اوئے حیدرا یہ تو ہی ہے نا؟"

"بالکل بالکل، میں آپ کا خادم حیدر ہی ہوں سردار صاحب! حکم کریں جی کون سی خدمت ہے میرے لیے؟"

"تو ٹھیک تو ہے نا حیدر بچے؟ اور وہ تیری بالی گھر والی، وہ کیسی جا رہی ہے تیرے ساتھ؟"

"کچھ نہ پوچھیں سردار صاحب! بڑی کمبل قسم کی شے ہے وہ۔ ایک دم چھاپ کے بیٹھ گئی ہے مجھے۔ مگر ہے بہت آفت جناب! جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے جی اس نے آپ کے اس خادم خاص کو۔"

"اس کا مطلب ہے تو بہت خوش ہے اس کے ساتھ۔ اچھی گزر رہی ہے تم دونوں کی۔ اور وہ جو ایک ڈرائیور چھوڑ آیا تھا میں وہاں۔ کیا نام تھا اس کا.....؟"

"وہ نظام دین صاحب، نظام دین نام ہے اس کا۔ موجود ہے جی وہ بھی۔"

"ماں جی کو سیر کرانے لے جاتا ہے وہ کار میں بٹھا کے یا دن بھر گھر میں ہی پڑا اینڈتا رہتا ہے؟"

"شروع میں تو روز ہی لے جاتا تھا وہ، مگر پھر ماں جی نے خود منع کر دیا اسے۔ ان کا تو جی، دل ہی نہیں کرتا باہر نکلنے کو۔ آپ کو اور آسیہ بی بی کو بہت یاد کرتی ہیں وہ سردار صاحب! آپ آجائیں اب جلدی سے۔"

"ہاں یار! چاہتا تو میں بھی یہی ہوں مگر بڑی زنجیریں ڈال رکھی ہیں حالات نے میرے پاؤں میں۔ اچھا وہ ماں جی کہاں ہیں، کیا یہیں موجود ہیں تیرے قریب ہی؟"

"نہیں جی، وہ تو مجھے ادھر بھیج کے خود باہر لان میں نکل گئی ہیں۔"

"یہ اچھا ہوا۔ کوئی فون تو نہیں آیا تھا میرے نام۔ یا کوئی پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا مجھے؟"

"وہ جی پوچھتا ہوا تو کوئی نہیں آیا تھا مگر فون ضرور آ چکا ہے تین بار۔ کوئی کشمیر خان ہے جی وہ کہتا تھا جیسے ہی آپ واپس آئیں اسے اطلاع کر دیں اپنے آنے کی۔ فون نمبر لکھوا دیا ہے اس نے اپنا۔"

"اچھا، تو نے کیا بتایا اسے میرے بارے میں؟"

"کچھ بھی نہیں بتایا جی میں نے اسے۔ وہ بہت پوچھتا تھا مگر میں نے کہہ دیا، مجھے بتا کر نہیں گئے ہیں آپ۔"

"ہوں، اچھا اب اس کا فون آئے تو کہہ دینا میں کراچی میں ہوں ابھی تک۔ یہاں ایک حادثہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کچھ دن اور لگ جائیں گے مجھے ابھی کراچی میں۔"

"ٹھیک ہے جی، اب آیا اس کا فون تو یہی کہہ دوں گا میں اس سے۔"

"اور کوئی خاص بات تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں جی، اور تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"اچھا تو پھر میں فون رکھ رہا ہوں اب۔ وقت ملا ایک دو دن بعد پھر فون کر لوں گا۔"

"اچھا جی اللہ بیلی۔"

"رب راکھا۔" میں نے جواباً کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اب آپ آرام کریں جناب عالی! بہت دیر باتیں کی ہیں آپ نے آج۔ یوں ایک دم اتنی زیادہ محنت نہیں چاہیے آپ کو ابھی۔ آپ کی صحت کے لیے مناسب نہیں ہے۔ دماغ کو آرام دیں ابھی آپ زیادہ سے زیادہ۔" میرے فون رکھتے ہی لزی محبت کرنے والی بیویوں کے انداز میں تیجے کرنے لگی تھی۔

میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ "اتنی زیادہ دیر تو بات نہیں کی ہے میں نے۔"

"لیکن جتنی دیر کی ہے وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اتنی بھی نہیں کرنا چاہیے آپ کو گفتگو۔"

وہ مجھے کھینچتی ہوئی میری خواب گاہ تک لے گئی اور بستر پر لٹا کے آرام سے سونے کی ہدایت کر کے واپس جاتے ہوئے خواب گاہ کا دروازہ باہر سے بند کر گئی۔

شرافت علی نے میری صحت واپس لانے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ غذا اور دواؤں پر کھل کے خرچ کرتا رہا تھا وہ۔ مزید ایک ہفتے کے بعد زخموں کے ہلکے ہلکے نشانات کے سوا کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی تھی جو کسی قسم کی جسمانی کمزوری کا احساس بھی ہونے دیتی۔ مکمل طور پر صحت یاب ہو جانے کے بعد میں نے شرافت علی سے کہا۔

"لے بھئی شرافت علی! میں نے تو موت کو اپنے در سے نامراد لوٹا دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ظہیر احمد بھی ایسا کر سکتا ہے کہ نہیں۔ آج میں ملک الموت کی ہمراہی میں اس کے دروازے پر دستک دوں گا جا کر۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا صحت مند ہوتے ہی تم پھر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو؟"

"صرف متوجہ ہی نہیں کرنا چاہتا ہوں پیارے بھائی! اسے یہ بتانا بھی چاہتا ہوں کہ غلام جیلانی پر ہاتھ ڈال کے اس نے دراصل اپنی زندگی مختصر کر لی ہے، نقصان میرا کم، اُس کا زیادہ ہوا ہے۔"

"جیلانی! میری بات مانو اور اس مسئلے کو طول مت دو زیادہ۔ تم انھیں جانتے نہیں ہو۔ بے حد خطرناک لوگ ہیں وہ۔ آدمی کی ان کی نظر میں پیر کے نیچے آکر کچلی جانے والی چیونٹی سے زیادہ حیثیت نہیں ہے۔"

"اور تم مجھے نہیں جانتے ہو شرافت علی! مجھ سے دشمنی کرنے والے کے لیے یہ زمین چھوٹی پڑ جاتی ہے بہت۔"

"میں جانتا ہوں۔ سُنا ہے میں نے بہت کچھ تمھارے بارے میں بھی۔ خود ڈاکٹر دھمن اور عالیہ زندہ مثالیں ہیں اس کی۔ وہ لوگ محض تمھاری وجہ سے یہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ حالانکہ کچھ کم دراز دست نہیں تھے وہ بھی۔"

"پھر بھی تم مجھے اس سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس ظہیر احمد سے! حیرت کی بات نہیں ہے یہ؟"

"بات ڈرانے دھمکانے کی نہیں ہے جیلانی! دراصل میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں کسی چکر میں الجھ کر رہ جاؤ۔ ابھی تو ان ہیروں کا مسئلہ بھی سلجھانا ہے ہمیں اور وہ کشمیر خان بھی ادھر لاہور میں منتظر بیٹھا ہے تمھارا۔"

"ہیرے! شاید تُو سمجھتا ہے کہ وہ ہیرے میں نے چھپا رکھے ہیں کہیں۔ کیوں یہی بات ہے نا تیرے دل میں؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو جیلانی! میں یہ نہیں سمجھتا۔ شبہ ہوا تھا پہلے مجھے، مگر تمھاری بیماری کے دوران میں، ہم نے تم سے متعلق ایک ایک چیز کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ تمھاری طرف سے تو ہم اطمینان کر چکے ہیں پورا پورا لیکن ہم ان پر صبر کر کے تو نہیں بیٹھ سکتے۔ تلاش تو کرنا ہی ہے انھیں، اور یہ کام تمھارے تعاون سے ہی ہو سکتا ہے۔"

"میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔ میں تو اس رات بھی اسی مہم پر نکلا تھا تمھارے ساتھ لیکن وہ کتے کے بچے درمیان میں ٹانگ اڑا بیٹھے اپنی۔ اب اس کا جواب دیے بغیر تو میں آگے نہیں جا سکتا نا۔ کیا سوچیں گے وہ دل میں اپنے؟"

"یہ بھی تو سوچو، ادھر لاہور میں بیٹھا کشمیر خان کیا سوچ رہا ہوگا۔ کہیں وہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ تم اپنے وعدے سے پھر گئے ہو اور انھیں دھوکا دینے کی غرض سے خود کو کراچی میں اُلجھا رکھا ہے۔ کیا وہ ایسا نہیں سوچ سکتے؟"

"کشمیر خان کے لیے میں نے حیدر سے کہہ دیا تھا۔ وہ فون کرے تو اس سے کہہ دینا میں کراچی میں ہوں ابھی۔"

"معلوم ہے یہ بات اسے۔ تین بار فون پر بات کر چکا ہے وہ مجھ سے، اسے ہمارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو، تم اس کا مال لے کر جلد از جلد سان فرانسسکو چلے جاؤ دوبارہ۔"

"اُلو کا پٹھا ہے وہ کشمیر خان! اگر اسے ہمارے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے تو ہمیں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے اس سے۔ کوئی خادم نہیں ہوں میں اس کے باپ کا۔ گڑبڑ کرے گا زیادہ تو مری خان بنا دوں گا میں اُسے۔"

"ایسی باتیں مت کرو جیلانی! میں اپنے آدمیوں کے بارے میں ایسی باتیں سُننا پسند نہیں کروں گا کبھی بھی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اوہ، یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تم بھی اس دھمن کے آدمی ہو۔ کان کھول کے سُن لو شرافت علی! میری مرضی کے خلاف تم کوئی کام لینے کی کوشش نہیں کرو گے مجھ سے۔ میں نے دھمن سے ایک بار اور مال پہنچانے کا وعدہ کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ میری یہ شرط بھی ہے کہ وہ راولپنڈی جیل سے میری بہن آسیہ اور میرے یار اسلم آپی کی رہائی کا بندوبست کرے گا اور آرتھر فینیل نے لزی کو اسی مقصد سے میرے ساتھ بھیجا ہے۔ جب تک یہ کام نہیں ہو جاتا میں اس ملک سے باہر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکوں گا۔"

"اوہ، یہ بات ہے۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ بہرحال یہ کام بھی تمھارا اسی وقت ہو سکے گا جب تم کراچی سے نکلو گے۔ اس کے لیے بھی ضروری یہی ہے کہ تم یہاں اپنے آپ کو زیادہ نہ الجھاؤ، دشمنیاں نہ بڑھاؤ۔"

"میں نے کسی سے دشمنی نہیں کی ہے یہاں۔ وہ ظہیر احمد خود دشمن بنا پھر رہا ہے میرا اور اب میں اس سے نمٹے بغیر کراچی چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم مجھے صرف اس کی کوٹھی تک پہنچا دو۔ اس سے زیادہ میں تم سے اور کوئی مدد نہیں چاہتا۔ میں اکیلا ہی کافی ہوں اس کتے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنی ضد سے باز نہیں آتے تو مجھ سے کسی قسم کا گلہ بھی نہ کرنا۔ مجھے یہیں کراچی میں رہنا ہے ابھی، میں تمھاری خاطر ظہیر احمد سے بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ بہت خطرناک درندہ ہے۔ یہاں کوئی بھی اس کی راہ میں آنا پسند نہیں کرے گا۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر آدمی جب کسی طرف سے خطرہ محسوس کرتا ہے تو منہ کے

لیے اسی کی طرف دوڑ تا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کراچی کے وہ معزز لوگ جو کالے کاروبار میں ملوث ہونے کے باوجود اوپر سے اُجلے نظر آتے ہیں، وہ اس ظہیر احمد کے کاندھوں پہ رکھ کر بندوق چلاتے ہیں۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔ ٹھیک سمجھا ہے تم نے۔ ہم لوگ اپنے مخالفین سے نمٹنے کے لیے اسی کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔"

"اسی لیے تم چاہتے ہو کہ اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسے بھول کر میں کراچی سے چلا جاؤں۔ معاف کر دوں میں اس کتے کو تاکہ وہ تمہارے کاروبار کی حفاظت کرتا رہے۔ تم نے بہت دیر کر دی میرے یار! اگر ایسا ہی تھا تو تمہیں میرے بجائے ظہیر احمد کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ غلام جیلانی سے پنجہ لڑانے سے احتراز کرے۔ اسے مجھ سے دُور رہنے کی تلقین کر دی ہوتی تم نے، وہ میری راہ میں نہ آتا تو میں اس کی طرف دھیان بھی نہ دیتا کبھی۔"

"تو تم اس قصّے کو ختم نہیں کرو گے۔ آخر اس سے فائدہ کیا... ہوگا تمہیں؟"

"قصّہ میں نے تو شروع نہیں کیا تھا میرے یار! اس نے میرے یار آبی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، میں اس کے ساتھ اس کا حساب کرنے بھی نہیں گیا کبھی۔ یہی سوچ کر درگزر کر گیا تھا کہ وہ ایک کرائے کا آدمی تھا۔ لیکن اب اس کی حیثیت کرائے کے قاتل کی نہیں رہی ہے شرافت علی! اب اس نے براہِ راست مجھ پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے للکارا ہے مجھے۔ اور اگر میرے حصّے کی سانسیں ابھی باقی نہ ہوتیں تو اس نے کسی تاریک قبر میں مجھے اُتارنے کا انتظام کر ہی دیا تھا۔"

شرافت علی نے غصّے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "وہ کمینہ نادانستگی میں کیا کر بیٹھا ہے۔ اسے احساس نہیں ہے جیلانی! یقین کر میرے یار! میں اسے بچانے کے لیے تجھے نہیں روک رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ہمارے کام آ رہتا ہے لیکن ہم اسے اس کی اجازت بھی نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے دوستوں سے زیادتیاں کرتا پھرے۔"

"عجیب آدمی ہے تو بھی شرافت علی! تو مجھے کہیں سے بھی نہیں لگتا ہے تو۔ تیری باتوں میں اتنی ٹیڑھ ہوتی ہے کہ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تو کیا چاہتا ہے؟ کبھی کہتا ہے قصّہ ختم کر دوں اور معاف کر دوں اس بھیڑیے کو، کبھی کہتا ہے وہ قابلِ گردن زدنی ہے۔ میرے یار! صاف صاف بات کیوں نہیں کرتا؟"

"صاف بات تو یہ ہے جیلانی! کہ تجھے سب کچھ بھول کر جلد از جلد کشمیر خان سے ملنا چاہیے۔ وہ بہت بے چین ہے تجھ سے ملنے کے لیے۔ بس اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں کسی سے اُلجھے۔ اگر ظہیر احمد سے انتقام لینا ہی مقصود ہے تجھے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی بار جب تو کراچی آئے گا تو ظہیر احمد عدم کو سدھار چکا ہوگا۔"

"نہ نہ نہ... جیلانی اپنا حساب دوسروں کے کھاتے میں منتقل کرنے کا عادی نہیں ہے یار جی! کشمیر خان میری راہ دیکھتے دیکھتے اگر مر بھی جائے تو مجھے پروا نہیں ہے اس کی۔ میں اپنا سینہ ٹھنڈا کیے بغیر نہیں جا سکتا کہیں بھی۔ تم اگر مجھے ظہیر کے مکان تک نہیں پہنچا سکتے تو تم بھی بیٹھو ادھر ہی۔ میں خود تلاش کر لوں گا اسے۔" مجھے غصّہ آ گیا تھا اس کی باتوں پر۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لزی نے مجھے یوں پا بہ رکاب دیکھا تو وہ تیزی سے اُٹھ کر میری طرف بڑھتے ہوئے بولی "آپ تنہا کہیں نہیں جائیں گے جنابِ عالی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔"

میں اس کی طرف دھیان دیے بغیر تیزی سے باہر کی طرف چل دیا۔ باہر شرافت علی کی کار موجود تھی۔ اس کا ڈرائیور بھی کار کے قریب ہی کھڑا تھا مگر اس سے کچھ کہے بغیر میں کار کی ڈرائیونگ نشست کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔ لزی بھی تیز تیز قدم اٹھاتی میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ جتنی دیر میں میں نے کار اسٹارٹ کی، وہ دوسری طرف سے میرے ساتھ والی نشست کا دروازہ کھول کر میرے برابر آ بیٹھی تھی۔ ڈرائیور حیران کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرانی یہ ہو گی کہ میں اس کے ہوتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ہوں اور اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہ میرے استعمال کے لیے وہاں دوسری کار گیراج میں موجود تھی، پھر میں اس کے مالک کی کار کیوں لیے جا رہا ہوں۔ میں نے یوں ہی حیران پریشان چھوڑ کر کار ریورس کر کے بنگلے سے باہر نکالی اور کچھ سوچے سمجھے یا منزل کا تعین کیے بغیر ایک جانب دوڑا دی۔ مجھے اس شرافت علی پر بہت غصّہ آ رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھائی تھی کہ مجھے ظہیر احمد سے اپنی ذلت کا بدلہ لینے سے روکنا چاہتا تھا۔ اسے میری عزتِ نفس سے زیادہ میرے دوبارہ فرانسسکو جانے سے دلچسپی تھی۔ اس کی خاطر وہ ان گمشدہ ہیروں کو وقتی طور پر بھول جانے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ احمق آدمی یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ میں نے سچ مچ دشمن سے دوستی کر لی ہے اور اب میں ان کے لیے کام کرنے پر رضا مند ہو چکا ہوں۔ وہ مجھے بھی اپنے دوسرے کارندوں کی طرح اپنے اشاروں پر ناچتے دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ امریکا میں دھمن اور عالیہ نے غلام جیلانی کی برین واشنگ کر دی، سارے بل نکال دیے ہیں انھوں نے میرے اور میری ناک میں نکیل ڈال کے اس کا سرا اس شرافت علی کو تھما دیا ہے۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اس عالم میں ہوش میرے بالکل ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ میں اندھا دھند کار کی رفتار بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر لزی نے مجھے ٹوکا۔ "کیا خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے آپ نے جنابِ عالی؟ یا ظہیر احمد کے بجائے کسی راہگیر کو کچل دینا چاہتے ہیں؟"

مجھے جیسے ایک دم ہوش آ گیا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور کار کی رفتار کم کرتے ہوئے بولا "تم نے دیکھا لزی! یہ کتنے

خود غرض لوگ ہیں۔ اس ذلیل کتے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں سب کچھ بھول کر بس ان کے اشاروں پہ ناچتا رہوں۔"

"دیکھیں جنابِ عالی! یہ آپ کا خالص کاروباری معاملہ ہے اور چونکہ میں اس کی اُونچ نیچ سے واقف نہیں ہوں اس لیے ممکن ہے میں آپ کو صحیح مشورہ نہ دے سکوں، لیکن پھر بھی اتنا کہوں گی کہ اس وقت آپ زیادتی کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔ اس نے گزشتہ تین ہفتوں میں بڑی خدمت کی ہے آپ کی۔ ہر طرح خیال کرتا رہا ہے وہ آپ کا، اگر کوئی بھائی ہوتا آپ کا تو وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا جتنا اس نے کیا ہے اور آپ ایک ذرا سی بات پر مشتعل ہو گئے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے؟ تم اسے ذرا سی بات کہتی ہو؟ میری جان لینے میں کیا کسر چھوڑی تھی اس سؤر کی اولاد نے؟ زندگی تھی جو دوبارہ دیکھ رہی ہو تم مجھے۔"

"میں جانتی ہوں، آپ کی بات غلط نہیں ہے اور یہ بات اسے نرمی کے ساتھ سمجھائی بھی جا سکتی تھی۔ وہ بھی اپنی طرف سے نہیں کہتا ہے کچھ۔ اوپر والوں نے مجبور کیا ہوگا اسے بھی۔ یہ کیوں نہیں سوچتے ہیں آپ؟ وہ کوئی اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے ان معاملات میں۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے، مگر وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے حکم کے تابع سمجھتا ہو۔ اسے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھ پر حکم چلائے۔"

"ایسی بات نہیں ہے جنابِ عالی! وہ غریب تو آپ سے ڈرتا ہی رہتا ہے ہمیشہ، وہ آپ پر حکم کیسے چلا سکتا ہے۔ اس کی تو ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ اس کی کسی بات سے ناراض نہ ہو جائیں۔ اب یہی دیکھ لیجیے، آپ طیش میں آ کر اسکی کار لے کر نکل آئے مگر اسے اتنی جرأت بھی نہ ہو سکی کہ وہ آپ کو روک سکتا۔"

لزی کی باتوں نے میرے دماغ کی ساری گرمی دُور کر دی۔ میں سوچنے لگا، واقعی یہ تو مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے اس کے ساتھ۔ مجھے ایک دم اس طرح طیش میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے ایسی بُری بات بھی نہیں کہی تھی مجھ سے۔ وہ تو مجھے مصائب کے جنگل میں اُترنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی میں ان خونخوار، درندہ صفت دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکا ہوں۔ پہلی بار انھوں نے مجھے جس حالت میں پہنچایا تھا اس کے پیشِ نظر میرا ہر ہمدرد مجھے ان سے دُور رہنے ہی کا مشورہ دیتا۔ اس نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ اتنی سی بات پر مشتعل ہو کر میں نے اس کی ساری خدمات پسِ پشت ڈال دی تھیں۔ یہ تو بڑی کم ظرفی کی بات کی تھی میں نے۔ کیسے خلوص کا اظہار کیا تھا اس نے میرے ساتھ۔ اگر وہ نہ ہوتا تو انسانوں کے اس سمندر کراچی میں میری لاش کو زمین میں اُتارنے والا بھی شاید کوئی نہ ملتا۔ اس نے تو مجھے دوبارہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل بنانے میں اپنے تمام وسائل استعمال کر ڈالے تھے اور میں اسے یہ صلہ دے رہا تھا اس کا۔ میرا سر آپ ہی آپ ندامت سے جُھک گیا۔ کیا عجیب شے ہے یہ انسان بھی۔ لمحوں میں آپے سے باہر ہو کر اپنی اوقات بھول جاتا ہے۔

"میں تمہارا شکرگزار ہوں لزی! تم نے بروقت مجھے ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔ سؤر کا بال پڑ گیا تھا آنکھ میں میری، احسان بھلا بیٹھا تھا میں اس کے۔ کیا سوچتا ہوگا وہ کہ کیسے کمینے شخص کے ساتھ بھلائی کی تھی اس نے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کو جلدی عقل آ گئی۔ چلیں اب واپس چلیں۔"

"ہاں، چلو چلتے ہیں واپس اور چل کر معافی مانگوں گا میں اس سے۔ بہت بُرا کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔"

میں نے اگلے چوراہے سے گاڑی واپس موڑ لی جہاں سے میں نے گاڑی موڑی تھی وہ علاقہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو معلوم ہوا کہ میں ناظم آباد چورنگی تک آ پہنچا تھا اور اب گولیمار کے علاقے سے گزرتا ہوا السبیلہ کے پُل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ علاقہ اس لیے مجھے یاد تھا کہ پچھلی بار میں جب کراچی آیا تھا تو یہاں پہ کچھ دیرینہ دوستوں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ آبی کی آنکھوں کی روشنی واپس لانے کے لیے میں نے دھمن کے ہی ایک خاص آدمی سوات خان کو اسی گولیمار سے اغوا کیا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ خوب اچھی طرح یاد تھے مجھے یہ کوچہ و بازار۔ یہاں کچھ تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی۔ کچھ عمارتیں نئی اُبھر آئی تھیں زمین سے اور رونق بھی یہاں پہلے سے زیادہ نظر آ رہی تھی مگر یہ کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہیں تھی کہ میں اس جگہ کو پہچان ہی نہ سکتا۔ گولیمار کے پُل پہ پہنچ کر لزی نے مجھ سے کہا۔

"جنابِ عالی! آپ کو کوئی خاص بات تو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟"

"کیسی خاص بات؟ میں سمجھا نہیں تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"بہت دیر سے ایک سفید کار کو میں اپنی کار کے پیچھے لگا دیکھ رہی ہوں۔ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی تھی کہ شاید اسے بھی اسی راستے سے کہیں جانا ہوگا لیکن جب آپ نے گاڑی واپسی کے لیے موڑی تو وہ کار بھی واپس مڑ گئی ہے اور دو گاڑیوں کے پیچھے اب بھی ہمارے تعاقب میں چلی آ رہی ہے۔"

میں نے بیک ویو مرر پہ نظر ڈالی تو جلد ہی مجھے وہ سفید کار نظر آ گئی۔ میں نے اپنی کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے لزی سے کہا "تم نظر رکھو اس پر۔ میں قائدِ اعظمؒ کے مزار کے قریب گاڑی روک کر انہیں قریب آنے کا موقع دوں گا۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس گاڑی میں کون ہمارا تعاقب کر رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے، آپ ڈرائیونگ کی طرف توجہ رکھیں اپنی۔ بڑی رف ڈرائیونگ ہوتی ہے یہاں تو۔"

"یہ کراچی ہے لزی بیگم! اسٹیئرنگ وہیل تھام کر یہاں کی سڑکوں پر قتلِ عام کرتے پھریں آپ، کوئی پوچھے گا نہیں آپ سے بشرطیکہ آپ کی جیب میں نوٹ بھی ہوں یا کوئی نوٹوں والا آپ کی پشت پر موجود ہو اور اگر کسی زیادہ ہی فرض شناس شخص کے ہتھے چڑھ گیا کوئی ڈرائیور تو، یہاں ٹرانسپورٹروں اور ڈرائیوروں کی یونین موجود ہے۔ کسی ڈرائیور کو سزا دینے کی کوشش کی تو یونین والے سارے شہر میں ٹرانسپورٹ کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیتے ہیں منٹوں کے اندر۔ اور اس نظام کو دوبارہ درست کرنے کے لیے یہاں کی انتظامیہ کے پاس ڈرائیوروں کو سڑکوں پر موت کا رقص جاری رکھنے کی اجازت دینے کے سوا کوئی اور حل ہے ہی نہیں۔"

"حیرت ہے، ایسی بے دست و پا ہے یہاں کی انتظامیہ کہ راہ گیروں کو زندگی کا تحفظ تک فراہم نہیں کر سکتی۔"

"چپ ہو جاؤ لزی بیگم۔ ان فضول باتوں پر وقت مت برباد کرو۔"

"کمال ہے، یہ فضول باتیں ہیں آپ کے نزدیک جنابِ عالی! انسانوں کی زندگی کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی؟"

"او نئے چھنڈ بی بی! کی بک بک لائی اے۔ کیوں لوگوں کی... روٹی کے پیچھے پڑی ہے تو۔ آدمی نوکری کرتا ہے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے، بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے۔ انسانوں کی... زندگیوں کو تحفظ دینے کے لیے تو نہیں کرتا نوکری حکومت کی۔ ایسا کرے گا تو اس کے بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیم، بہترین لباس، عالی شان رہائش گاہ اور چم چم کرتی کار کا انتظام کیا تو کرے گی؟ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں، تمھاری طرح قانون کے بندے نہیں ہیں کوئی پابندیاں ہم بالکل قبول نہیں کر سکتے۔ یہ کراچی ہے لزی بیگم! ہمارے ملک کا سب سے بڑا شہر، ملک کی اسّی فیصد دولت سمٹا ہے اسی شہر میں موجود ہے، لوگ دور دور سے پیسا کمانے آتے ہیں یہاں۔ تہذیب اور اخلاق کا درس لینے نہیں آتے کوئی۔"

"اچھا اچھا، ذرا آگے کا بھی خیال رکھیں۔ کہیں کوئی آپ کی اس آزادی کا شکار نہ ہو جائے اور دیکھیں وہ قاتد کا مزاد بھی آگیا ہے قریب ہی، وہ کار بھی اب تک ہمارے تعاقب میں موجود ہے۔ اب کیا کریں گے آپ؟"

"بس دیکھتی رہو۔" میں نے اسے جواب دیا اور مزار سے پہلے ہی جو سڑک الٹے ہاتھ کو مڑتی ہے، ادھر گاڑی موڑ کر سڑک کے کنارے لگا کر روک دی۔

تعاقب میں آنے والوں کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ میں موڑ کاٹتے ہی رک کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ انھیں فکر ہوگی کہ کہیں میں کسی گلی میں گھس کر ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے مجھ پر نظر رکھنے کے ارادے سے تیزی کے ساتھ موڑ کاٹا تھا۔ موڑ کاٹتے ہوئے ان کی کار کے ٹائر بہت زور سے چیخے تھے اور اس سے پہلے کہ ان کی نظر میری کار پر پڑتی، وہ میری کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں اس کار میں جالو کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا اٹھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنی کار تیزی سے آگے نکال لے گیا۔ میں نے بھی اپنی کار آگے بڑھا کر اس کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے وہ میری لاعلمی میں میرا تعاقب کر رہا تھا اب میں اس کے پیچھے تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں اس کے پیچھے لگ چکا ہوں۔

ہماری کاریں آگے پیچھے یکساں رفتار سے دوڑ رہی تھیں۔ جالو کو علم تھا کہ میں نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا رکھی ہے۔ وہ نہ جانے کب سے میرے تعاقب میں تھا، اگر لزی میرے ساتھ نہ ہوتی یا اس نے اردگرد نظر نہ رکھی ہوتی تو میں اس کے تعاقب سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں انھیں شہر بھر میں تلاش کرتا پھرتا اور وہ میری دُم کے ساتھ بندھا میرے پیچھے چلتا رہتا اور بے خبری میں کسی مناسب مقام پر مجھے اچانک چھاپ لیتا۔ شاید وہ لوگ مستقل طور پر اس بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے جہاں شرافت علی نے ہمیں ٹھہرا رکھا تھا۔ اس نگرانی کا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا تھا کہ جیسے ہی میں تندرست ہو کر گھر سے باہر نکلوں، وہ میرے پیچھے لگ جائیں اور موقع ملتے ہی مجھے ایک المناک انجام سے دوچار کر دیں۔ مکان کی نگرانی یقیناً جالو یا ظہیر احمد خود نہیں کرتے رہے ہوں گے کیونکہ وہ تو وہ مصروف آدمی تھے کسی ایک جگہ بندھ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے، دوسرے شرافت علی اور اس کے آدمی انھیں بخوبی پہچانتے تھے، وہ انھیں بنگلے کے آس پاس دیکھ کر چوکنا ہو جاتے اور پھر انھیں مجھ پر اکیلے میں ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں دیتے۔ انھوں نے اس کام پر دوسرے ہی لوگوں کو مقرر کیا ہوگا۔ میرے گھر سے نکلتے ہی نگرانی کرنے والوں میں سے کسی نے جالو کو اطلاع دے دی ہوگی اور وہ راستے میں سے کسی جگہ ہمارے ساتھ لگ گیا ہوگا۔

جو بھی کچھ ہوا ہو بہر حال اب تو بازی پلٹ ہی چکی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی تھی اور اسے نکل بھاگنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تو وہ ادھر ادھر کی سڑکوں اور گلیوں میں چکراتا اور ٹریفک کے ہجوم میں مجھے ڈاج دے کر نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ میں کسی طرح اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں تو اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک ہاتھ سے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ دیا اور کار ایک مصروف شاہراہ پر ڈال دی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں مجھے چکراتا پھرا تھا۔ وہ ساری ہی گلیاں اور سڑکیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ کوئی پندرہ منٹ بعد ہم ڈرگ روڈ پر جا چڑھے اور تیزی سے ایئرپورٹ کی طرف بڑھنے لگے پھر ایئرپورٹ بھی پیچھے رہ گیا لیکن جالو نے اپنی کار نہ کہیں موڑی اور نہ روکی۔ وہ آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لزی یوں اندھا دھند مجھے اس کا پیچھا کرتے دیکھ کر بولی۔

"یہ کہاں جا رہا ہے جنابِ عالی! کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ کہیں دھوکے میں مارے ہی نہ جائیں ہم۔"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ یہ جا کہاں رہا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو جس سڑک پر ہم ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ریلوے لائن بھی چل رہی ہے۔ اس سے میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ ہمیں شہر سے باہر کسی ویرانے میں لے جانا چاہتا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی منزل ان کی کوئی خفیہ کمین گاہ ہو، جہاں اس کے اور بھی ساتھی موجود ہوں، اگر ایسا ہوا تو کیا ہمارے لیے ان سب سے بیک وقت مقابلہ کرنا ممکن ہو سکے گا؟"

میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی میں پڑی ہوئی اس طلسمی انگوٹھی کو دیکھا جو مجھے عالیہ نے دی تھی اور جس کی کرشمہ سازی سے میرے دوست اور دشمن سبھی بے خبر تھے۔ اسے دیکھ کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ "اب جو بھی ہو لزی بیگم! اس کھوتے دے پتر ظہیر احمد کی دُم میرے ہاتھ آگئی ہے تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں کسی قیمت پر بھی۔ ہاں تمھیں اگر کوئی خدشہ ہو تو تم اتر جاؤ یہیں اور کسی ٹیکسی وغیرہ میں واپس چلی جاؤ۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ جنابِ عالی! میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ یہ کیسے سوچ لیا آپ نے کہ میں کسی مشکل گھڑی میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گی۔ ایسا ہی کرنا ہوتا تو میں آپ کے ساتھ شرافت علی کے بنگلے سے ہی نہ نکلتی۔"

"نہیں نہیں، مائی ریسپیکٹیڈ لیڈی! میں اپنا مطلب صحیح طرح بیان نہیں کر سکا شاید۔ کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ اگر یہ مجھے ساتھ لگا کر کسی اندھے کنویں میں اتارنے لے جا رہا ہے تو تمھارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ تمھاری موجودگی میں مجھے تمھاری حفاظت اور سلامتی کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ ممکن ہے یہ تمھیں میری کمزوری بنا کر میرے ہاتھ پیر باندھ لینے میں کامیاب ہو جائے اس لیے میں چاہتا تھا کہ تم میرے ساتھ جانے کے بجائے واپس چلی جاؤ۔"

"اوہ، نہیں جنابِ عالی! میری آپ بالکل فکر نہ کریں، میری وجہ سے آپ کو بالکل کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور نہ ہی دشمن میری وجہ سے آپ کو زیر کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ میں اپنی حفاظت خود کر لوں گی۔"

میں نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا، وہ آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے ڈھکے چھپے سارے ہنر ایک دم مجھ میں انڈیل کر میرے دل میں اپنی طرف سے بدگمانیاں پیدا کرنے کے بجائے ایک ایک کر کے بڑے ہی غیر محسوس انداز میں اپنے پرت الٹنا چاہتی تھی۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہ اپنے اصل روپ میں میرے سامنے آجائے، میں اس کے اندر پوشیدہ سارے علوم و فنون سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر اس کے عزائم کے آگے بند نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے ساتھ چلنے سے روکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

ایک خشک ندی پر بنے ہوئے پُل کو عبور کر کے ہم کچھ دور اور سیدھے چلے تھے، پھر دائیں ہاتھ مڑنے والی ایک سڑک پر جالو نے اپنی گاڑی موڑ لی۔ آگے ریلوے کراسنگ عبور کرتے ہوئے میں نے بائیں جانب ریلوے اسٹیشن کی طرف نظر ڈالی۔ ریلوے پلیٹ فارم وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور پلیٹ فارم کے سرے پر لانڈھی ریلوے اسٹیشن کے نام کا پتھر نصب تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جالو مجھے لانڈھی لے آیا تھا جس کے بارے میں، میں نے سنا تھا کہ وہ منگھوپیر روڈ کے بعد کراچی کا دوسرا صنعتی علاقہ ہے۔ میں حیران تھا کہ جالو اُدھر کیوں آیا ہے۔ کسی صنعتی علاقے میں لا کر وہ میرے ساتھ کیا کر سکے گا۔ میں نے لزی سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس صنعتی علاقے میں کیوں آیا ہے؟"

"ممکن ہے ان لوگوں نے یہاں کوئی فیکٹری وغیرہ لگا رکھی ہو جسے یہ لوگ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہوں۔"

مجھے خیال آیا لزی کے اس جعلی باپ آرتھر فنیلی نے بھی تو وہاں سان فرانسسکو میں کسی دوا ساز فیکٹری کے شیئرز خرید رکھے ہیں اور ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں اس کی وہاں۔ بظاہر وہ بڑا معزز اور سیدھا سادا بے ضرر سا شہری ہے مگر اپنے شریفانہ روپ میں وہ کیسا بھیانک کھیل کھیل رہا ہے۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں کیسے خوفناک ارادے لیے پھرتا ہے۔

ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں چھوٹی بڑی فیکٹریوں اور ٹیکسٹائل ملوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور چونکہ یہ کام کا وقت تھا اس لیے سڑکیں تقریباً ویران پڑی تھیں۔ ایک موڑ پر مڑتے ہی سامنے تاحدِ نظر وسیع و عریض میدان نظر آنے لگا جو خودرو جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ بہت دور کچھ پہاڑیاں اور ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ جالو نے کار سڑک سے اتار کر اس میدان نما جنگل کے کچے راستے پر ڈال دی۔ یہ ایک ناہموار راستہ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِدھر سے کاریں اور ٹرک گزرتے رہے ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ

اس راستے کا اختتام ان پہاڑیوں ہی میں ہوتا ہے جو بہت دُور ہمیں نظر آرہی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ میل اس کچے راستے پر ریت اور مٹی کے غبار کے درمیان سفر کرنے کے بعد ہماری کاریں ایک چھوٹے سے نالے میں اتر گئیں۔ نالا بالکل خشک تھا اور اس کی چوڑائی کوئی ڈھائی تین سو گز ضرور ہی ہوگی۔ نالے میں اترتے ہی جانو نے اپنی کار دائیں طرف موڑ لی اور نالے کے اندر ہی اندر دُور تک چلا گیا۔ آگے جاکر نالا دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ وہ موڑ کاٹتے ہی جانو نے اپنی گاڑی روک دی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں نے بھی اس کی کار کے قریب اپنی کار روک دی تھی۔ جانو نے مجھے للکارا۔ "لے بھئی جیلانی! آجا اب باہر۔ یہاں میرے اور تیرے سوا کوئی نہیں ہے لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تیری لاش کو یہاں کتوں اور گیدڑوں کی خوراک بننے کے لیے نہیں چھوڑ جاؤں گا۔ یہ.... زمین اتنی نرم ہے کہ تجھے زمین کے نیچے دبانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی مجھے۔"

میں نے اپنی کار سے باہر نکلتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "یہ فیصلہ تو ابھی ہمیں کرنا ہے بچّے کہ کس کی لاش زمین میں دبے گی اور کون اپنے پیروں پر چل کر واپس جائے گا۔ ایسی بات نہ کر میرے ویرا! پتا نہیں بعد میں پچھتانے کا بھی موقع ملے یا نہیں۔"

میں جیسے ہی باہر نکل کر اس کے مقابل کھڑا ہوا، اس نے تیزی سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر غالباً شلوار کے نیفے میں پھنسایا ہوا پستول نکال کے مجھ پر سیدھا کر لیا۔ "آج میں تجھے اپنے پاس آنے کا موقع نہیں دوں گا پتّھے! اس دن مجھ سے یہی غلطی ہوئی تھی، میں تجھے زخمی اور نڈھال سمجھ کے تیرے پاس چلا گیا تھا اور تجھے اپنی گردن میں ہاتھ ڈالنے کا موقع دے دیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تُو لومڑی کی اولاد ہے، مرتے مرتے بھی اگر آدمی کی گردن ہاتھ میں آجائے تو اس کا جھٹکا کر جاتا ہے تو۔ آج دیکھتا ہوں کیسے بچ سکتا ہے تُو میرے ہاتھ سے؟"

"اوئے چپ کر جا گیدڑ کی اولاد! یہ بالشت بھر کا کھلونا ہاتھ میں پکڑ کے تو اپنے آپ کو رستم زماں کا پتّر سمجھ بیٹھا ہے؟ اس تیرے باپ ظہیر احمد نے بتایا نہیں تجھے کچھ میرے بارے میں؟"

"بہت کچھ بتایا ہے اس نے مجھے، مگر تیرا واسطہ جانو سے نہیں پڑا تھا کبھی، جبھی تیری سانس چل رہی ہے اب تک۔"

"شکے بھئی شکے، بڑا مان ہے یار تجھے تو اپنے اوپر۔ چل پھر دیر کس بات کی ہے، مُکا دے آج میری سانسیں۔"

"اور تُو کیا یہ سمجھ رہا ہے کہ میں تیرے ساتھ کوئی رعایت کر جاؤں گا آج۔ کتّے کی موت مرے گا آج تو میرے ہاتھ سے، عبرت پکڑیں گے لوگ تیرے انجام سے۔ یہ میم جسے تو ساتھ لیے پھر رہا ہے اپنے، یہ واپس جاکر بتائے گی دنیا والوں کو کہ وہ غلام جیلانی جس کا پورے پنجاب کی پولیس کچھ نہ بگاڑ سکی تھی کراچی میں جانو کے ہاتھوں کیسی بے بسی کی موت مرا ہے۔"

اس نے میرا نشانہ لے کر پستول کی لبلبی دبانے کی کوشش کی مگر اس کا وہ پستول آج ایک بار پھر اسے دغا دے گیا، جانو کی انتہائی کوشش کے باوجود پستول کی لبلبی اپنی جگہ چھوڑنے کو بالکل تیار نہیں تھی۔ وہ بار بار اسے دباتا تھا اور الجھن آمیز نگاہوں سے کبھی پستول کو اور کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ میں اس کی اُلجھن سے لطف اندوز ہوتا آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر ایسی زہریلی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر اس کی کھوپڑی بُری طرح سلگ اٹھی تھی۔

"میں نہ کہتا تھا پتّر! اس کھلونے پہ نہ اترا۔ دیکھا تُو نے آج ساتھ چھوڑ دیا ہے اس نے تیرا۔ اب کیا کرے گا تو؟"

اس نے جھنجلا کے پستول مجھ پر کھینچ مارا۔ میں جانتا تھا وہ ایسا ہی کرے گا لہٰذا میں اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ جیسے ہی اس کے پستول والے ہاتھ نے حرکت کی، میں پھرتی سے ایک طرف ہوگیا۔ مگر وہ بھی کوئی اناڑی نہیں تھا، لڑنے کا فن خوب جانتا تھا وہ، یہ گُر کی بات اسے اچھی طرح یاد کرائی گئی تھی کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا خودکشی کی کوشش کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ پہلے بھی اس نے مجھے اسی طرح زیر کیا تھا، میں نے اسے ذراسی مہلت دے دی تھی جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ آج بھی اس نے وہی حربہ استعمال کیا تھا، پستول پھینکتے ہی خود بھی اڑتا ہوا مجھ پر آیا تھا۔ میں ایک ہی غلطی دوسری بار دہرانا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ میں نے اس کی ہر حرکت پر پوری طرح نظر رکھی تھی، ایک پل کے لیے بھی اس سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اسے اپنی طرف جست بھرتے دیکھ کر میں نے بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی، وہ اپنے ہی زور میں اوندھے مُنہ زمین پر آرہا، پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھتا، میں نے اسے اپنی تیز ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں اس کے ساتھ بالکل وہی سلوک کر رہا تھا جو اس سے پہلے وہ میرے ساتھ کر چکا تھا۔ میں نے اس کے سر اور سینے کو ہدف بنا کر ایک لمحے کا بھی وقفہ دیے بغیر اس پر ٹھوکریں برسانا شروع کردیں۔ وہ میری ہر ٹھوکر پر بلبلا کر دوسری طرف جاتا تھا۔ جلدی ہی اس کا سر اور چہرہ لہولہان ہوگیا، اس کی تندی اور تیزی ختم ہونے لگی تھی، وہ نڈھال ہونے لگا تھا لیکن مجھ پر جنون سوار تھا، میں اسے ٹھوکریں مار مار کر جہنم واصل کر دینا چاہتا تھا۔ جس قدر اس کی مدافعت کمزور ہوتی جاتی تھی، میری ضربیں اسی قدر شدت اختیار کرتی جاتی تھیں۔ اور اگر لزی مجھے آکر نہ روک لیتی تو میں اس کی کوئی ہڈی سلامت نہ چھوڑتا۔ لزی نے میرے قریب آکر میرا بازو تھام کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بس، بس کریں جناب عالی! کیا آپ اسے مار کر ہی دم لیں گے آپ؟"

"اور تو کیا اس کتّے کو زندہ چھوڑ دوں میں۔ اس نے کیا رعایت کی ہے میرے ساتھ؟ یہ بھی تو میری جان ہی نکالنے کے درپے تھا۔ ملک الموت سمجھ رہا تھا یہ اپنے آپ کو۔ سمجھتا تھا میری روح نکال کے ساتھ لے جائے گا اپنے۔"

"ملک الموت تو آپ بھی نہیں ہیں، پھر کیوں جان نکال لینا چاہتے ہیں اس کی؟"

"اس لیے کہ میں اسے زندہ رکھ کر یہاں کراچی میں اپنی ٹانگیں پھنسائے رکھنا نہیں چاہتا....."

میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ وہ نیم مُردہ جانو جسے بے جان سمجھ کر لزی نے مجھے الگ کھینچ لیا تھا، اچانک مجھ پر آپڑا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ میں اس کے سارے انجر پنجر ڈھیلے کر چکا ہوں، اور اب اس میں اتنی جان بھی نہیں رہی ہے کہ وہ خود سے کروٹ بھی لے سکے۔ اسے زخموں سے چُور اور نڈھال دیکھ کر میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا تھا۔ مگر وہ بڑا ہی سخت جان ثابت ہوا تھا، لومڑی جیسی مکاری دکھا گیا تھا وہ اس گھڑی۔ مجھے اپنے اوپر حاوی دیکھ کر اس نے ہاتھ پیر چھوڑ کر مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ اب اس میں بالکل جان نہیں رہی ہے اور میرے غافل ہوتے ہی اس نے چیتے کی طرح جست لگا کے مجھے چھاپ لیا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے نیچے گرا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے مزاحمت کے لیے ہاتھ بلند کیے تو اس کی گردن میرے قبضے میں آگئی۔ لیکن میرے ہاتھوں نے جیسے ہی اس کی گردن کو چھُوا، وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہوگیا، اس نے مجھے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ میں اس کی رگِ احساس پر گرفت کر سکتا۔ ایک بار وہ اپنی گردن میرے ہاتھوں میں دے کر اس کا نتیجہ دیکھ چکا تھا، چنانچہ اس بار اسے میرے ہاتھوں کی زد سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر اٹھا تو میں نے اٹھنے کے بجائے لیٹے ہی لیٹے دونوں ٹانگیں اٹھا کر پوری قوت سے اس کی کمر پر ماریں۔ "اوغ" کی آواز کے ساتھ وہ ایک بار پھر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اوندھے منہ گرا، میں تیزی کے ساتھ بائیں جانب لوٹ لگا کے اس جگہ سے ہٹ گیا۔ اگر میں ہٹنے میں ذراسی بھی دیر کرتا تو وہ میرے اوپر ہی گرتا اور پھر نہ جانے میں اس کے نیچے سے نکلنے کے قابل بھی رہتا یا نہیں۔ اس کے گرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھی دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

لزی اپنی جگہ خاموش کھڑی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اسے اسی بات پر ہوگی کہ ابھی چند سیکنڈ پہلے اس نے جس شخص کو زخموں سے چُور پڑے دیکھ کر مجھے اس کی مزید مرمت سے روکا تھا، وہ دوبارہ کس طرح میرے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے لڑنے کے انداز اور تیزی طراری کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی چند ہی لمحے قبل وہ اپنے سر، چہرے اور سینے پر بے شمار ضربیں کھا چکا ہے اور اس کے چہرے اور لباس پر نظر آنے والا لہو خود اس کا ہی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے خونخوار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے حملے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اچانک اس نے مجھ پر جھپٹنے کے انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میں تیزی سے خود کو بچانے کے لیے ایک جانب ہٹ گیا لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا تھا، انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا ہو لیکن میری طرف آنے کے بجائے اس نے لزی کو جا دبوچا تھا۔ شاید اس کا خیال ہوگا کہ وہ اس طرح مجھے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کردے گا یا لزی کو ڈھال بنا کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر اس کی یہ خواہش دل ہی.... میں رہ گئی تھی۔ اس نے جیسے ہی لزی کو اپنی گرفت میں لیا، لزی نے نہ جانے کیا کیا تھا کہ وہ اچھل کر دور جا پڑا تھا۔ بس یوں لگا تھا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ وہ نیچے پڑا حیرت سے لزی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ تو سوچا بھی نہ ہوگا کہ جس نازک اندام حسینہ کو ایک سیدھی سادی لڑکی جان کر اس نے ڈھال بنانے کی کوشش کی تھی، وہ ایسی ہنرمند ہوگی کہ اس جیسے جنگجو بھینسے کو کسی بے جان کھلونے کی طرح اچھال دے گی۔ جانو لزی کو استعجابیہ انداز میں دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا، میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا، مگر لزی ایک دم جست لگا کر میرے اور اس کے درمیان حائل ہوگئی۔

"نہیں جناب عالی! اب آپ اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے، یہ شکست تسلیم کر چکا ہے آپ سے۔ مجھ پر حملہ کر کے یہ ثابت کر دیا ہے اس نے کہ یہ اب آپ سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔"

"اس نے تم پر حملہ کیا تھا، میں اسے اس کی سزا ضرور دوں گا۔"

"اپنے اوپر حملے کی سزا میں خود دے لوں گی اسے۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والوں سے لڑنا مردوں کی توہین ہے جنابِ عالی! ایسے آدمی سے عورت ہی لڑتی اچھی لگتی ہے۔ آپ ہٹ جائیں درمیان سے اب۔"

لزی کی یہ بات مجھے پسند آئی تھی۔ جانو نے اس پر حملہ کرکے مردانگی کا ثبوت نہیں دیا تھا، چنانچہ اب لزی ہی کو اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملنا چاہیے تھا۔ جس طرح وہ ہماری لڑائی کا دور ہی دُور سے نظارہ کرتی رہی تھی، اسی طرح مجھے بھی ان سے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ اس طرح مجھے لزی کے وہ جوہر دیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا، جو اب تک مجھ پر منکشف نہیں ہوسکے تھے۔ لہٰذا میں ان کے درمیان سے ہٹ کر علیحدہ کھڑا ہوگیا۔ جانو اب اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ہماری گفتگو نے شاید اس کی غیرت کو جگا دیا تھا، اسی لیے اس نے لزی پر دوبارہ حملہ کرنے کے بجائے میری طرف رُخ کیا تھا لیکن لزی نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ مار کر نیچے گرا دیا اور بولی۔ "ادھر

کہاں جا رہے ہو رستم کی اولاد! ادھر آؤ میری طرف۔"

جانو خونخوار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے تیزی سے اٹھا اور ایک دم لزی پر جھپٹ پڑا۔ لیکن لزی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ لزی نے ہوا میں اچھل کر بھرپور انداز میں فلائنگ کک ماری تھی۔ اسے جانو کی پھرتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ الٹ کر گرتے ہی وہ دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا کر اچھلا اور جب اس کے پیر زمین سے لگے تو وہ اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ لزی نے ایک بار پھر اچھل کر اپنے دونوں پیر اس کے سینے پر مارنا چاہے، مگر اس بار جانو اسے جھکائی دے کر ایک طرف ہوگیا۔ لزی کا وار خالی گیا، وہ زمین پر گر پڑی۔ اس کے گرتے ہی جانو نے دانت بھینچ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی لیکن لزی نے سرعت کے ساتھ تھوڑا سا ایک طرف ہو کے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور جانو کے نیچے گرتے ہی اچھل کے کھڑی ہوگئی۔ اٹھتے ہوئے بھی اس نے جانو کی ٹانگ نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اس کی ٹانگ کو کھینچتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹی اور ایک جھٹکے کے ساتھ پوری گھوم گئی۔ پھر جو ہوا وہ میرے لیے بہت ہی حیران کن تھا۔ میں نے اس سے پہلے عورت تو کیا کسی مرد کو بھی اتنے لمبے چوڑے اور تنومند زندہ آدمی کو ایک ٹانگ پکڑ کر اس طرح چکر دیتے نہیں دیکھا تھا جس طرح لزی اسے چکر دے رہی تھی۔ ہر چکر پر وہ زمین سے اونچا ہوتا جاتا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے جانو چھ فٹ کا صحت مند اور توانا آدمی نہیں کوئی مردہ کتا ہے جس کی دم پکڑ کر لزی تیزی سے اسے چکر دے رہی تھی۔ کئی زوردار چکر دینے کے بعد ایک مرتبہ جب وہ اپنی کار کی سیدھ میں آیا تو لزی نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ کمان سے چھوٹے تیر کی طرح لزی کے ہاتھوں سے نکلا اور پورے زور سے سر کے بل اپنی کار سے جا ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا، اور جانو کسی مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گر پڑا، وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، اس کا نچلا دھڑ زمین سے دو دو فٹ اچھل اچھل کر گر رہا تھا، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی جان نکل رہی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی، وہ جتنا جاندار جوان تھا، اسی قدر مشکل اور تکلیف کے ساتھ اس کی جان نکل رہی تھی۔ کئی منٹ تک وہ کسی نیم بسمل کی طرح مچلتا اور تڑپتا رہا، پھر آہستہ آہستہ ساکت ہوگیا۔

اس کے ساکت ہونے کے بعد لزی میرے قریب آکر بولی۔

"چلیں جناب عالی! یہ کھیل تو اب ختم ہوگیا۔"

"ہاں چلو۔" میں نے چونک کر لزی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے تم نے اتنے بھاری بھرکم آدمی کو یوں چکر دے دیے تھے جیسے اس میں بالکل وزن ہی نہ ہو کچھ۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنا وزن اٹھانے کی طاقت رکھتی ہوگی؟"

"اس کے لیے طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی جناب عالی! تکنیک ہوتی ہے بس ذرا سی۔"

"کمال کی تکنیک ہے بھئی یہ تو۔ میں نے تمھیں ایسا نہیں سمجھا تھا کبھی بھی۔ میں ایک سیدھی سادی لڑکی ہی سمجھتا رہا تھا تمھیں۔"

"حیرت کی بات نہیں ہے یہ جناب عالی! آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آپ جیسے خطرناک اور پرہنگام شخص کا دامن تھام کر رہ حیا پر چلنے کی خواہش رکھنے والی لڑکی خود کس مزاج اور کن خصائل کی مالک ہوگی؟ کوئی سیدھی سادی، بے ضرر، بے خطر لڑکی آپ کے بارے میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد آپ کے ساتھ چلنے کی جرأت کرسکتی ہے کبھی؟"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن پہلے کبھی تم نے اپنی کم ایسی صلاحیت کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟"

"میں کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی قائل نہیں ہوں مائی ریسپیکٹڈ سر! جب تک کوئی مجھ سے نہیں ... میں بس تماشا ہی دیکھتی رہتی ہوں۔ اب اس کو میں کیا کروں کہ آج اس جا کی عمر ہی تمام ہوچکی تھی کہ وہ مجھے چھیڑ بیٹھا۔"

بڑے خوفناک قسم کے حربوں سے لیس کر رکھا تھا اس بنت کو اس کے سرپرستوں نے۔ یہ میرے حق میں بہت ہی اچھا تھا کہ میں نے اسے اپنے اصل عزائم کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اگر کھل کر سے یا اس کی قوم سے دشمنی پر اتر آتا تو میرا انجام بڑا ہی عبرت ناک مجھے تو میری خم پارہ تقدیر نے اس ڈگر پر لا ڈالا تھا اور ابھی میری میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی، اس لیے جیسے تیسے اس راہ قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں اب تک راہ گزر پر چلنے کے طور طریقوں سے بھی واقف نہیں ہو سکا تھا کے نشیب و فراز سے کس طرح آگاہ ہوتا۔ ابھی تک میرا سابقہ ایسے ہی لوگوں سے پڑ رہا تھا جو بس چلتے چلتے بھٹک کر ادھر نکلے تھے، انھیں باقاعدہ کسی منصوبے یا مقصد کی تکمیل کے لیے تیار کیا گیا تھا اور جب میں ایسے لوگوں کے ہاتھ پڑا تو انھوں نے پہلے ہلے میں مجھے توشے دان بنا کر امریکہ ایکسپورٹ کر دیا تھا اور اب واپسی بھی ہوئی تھی تو اس طرح کہ بنی اسرائیل کا ایک فتنہ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ میرے ہمراہ تھا۔

"مسٹر آرتھر نے مجھے بتایا تھا کہ تم یہاں ان کے کچھ دوستوں واقف ہو اور مجھے ان سے متعارف کرا دو گی تاکہ بوقت ضرورت میرے کام آسکیں۔ میں جاننا یہ چاہتا ہوں کہ کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو میری بہن آسیہ اور میرے یار اسلم آبی کی رہائی کے میں میری مدد کر سکے؟" میں نے کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے لیے آپ زیادہ پریشان نہ ہوں جناب عالی!

کا یہ کام بھی ہوجائے گا، نکل ہی آئے گی کوئی صورت اس کی بھی۔"

"یہ کوئی یقینی بات تو نہیں ہوئی، حالانکہ میں بتا چکا ہوں جب تک وہ دونوں آزاد نہیں ہو جاتے، میں دوبارہ سان فرانسسکو یا پاکستان سے باہر کہیں بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے ڈر ہے ہم نے انھیں جلد آزادی نہ دلائی تو وہ سزا پا جائیں گے، اور ان کے لیے موت کی سزا سے کم کوئی سزا تجویز کرنے پر کوئی بھی عدالت رضامند نہیں ہوگی۔"

میں کار اسٹارٹ کر کے اس تالے سے باہر نکل آیا تھا۔ جانو کو ہم نے اس کی کار سمیت وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا اگر کوئی جلد ہی اس کی لاش کو دریافت نہ کرسکا اور دو ایک دن وہ وہیں پڑی رہی تو کتے اور گیدڑ اسے شناخت کے قابل نہیں رہنے دیں گے۔ اپنے حلیے ہم نے بڑی حد تک اس قابل کر لیے تھے کہ اگر ہم گاڑی سے باہر نہ نکلتے تو کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ ہم کوئی ہنگامہ خیز معرکہ سر کر کے آرہے ہیں۔ میرے لباس پر جانو کے خون کے دھبے تھے مگر ان پر مٹی لگنے سے ان کا رنگ خاصا مٹیالا ہو گیا تھا اور قریب سے بغور دیکھے بغیر کوئی انھیں خون کے داغ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بے دھڑک کار واپسی کے راستے پر دوڑانا شروع کر دی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تو ہے، آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ کام آپ کا ہو جائے گا۔"

"لیکن تم نے کہا ہے کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ اس کا تو مطلب یہی ہوا کہ کامیابی کا صد فی صد یقین نہیں ہے۔"

"دیکھیں جناب عالی! مسئلہ ہے انھیں سرکاری جیل سے نکالنے کا، اگر کسی کی نجی قید میں ہوتے وہ لوگ تو قید کرنے والوں کو نیست و نابود کر کے بھی انھیں نکالا جا سکتا تھا لیکن جیل میں تو ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں تو دوسرے ذرائع ہی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو کوئی اور راستہ بھی تلاش کیا جائے گا مگر پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کامیابی ہو ہی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اس شرافت علی کو بھی سمجھا دو تم ہی کہ وہ کشمیر خاں سے ملنے کے لیے جلدی نہ کرے۔ ابھی اس سے ملنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ میں اپنے مسائل کو حل کیے بغیر تو یہاں سے نہیں جا سکوں گا کہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا جناب عالی! کہ آپ کشمیر خان سے مل کر امریکہ چلے جائیں اور میں یہاں رہ کر آپ کی بہن اور دوست کی رہائی کے لیے کوشش کرتی رہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کوشش میں کوئی کمی نہیں چھوڑوں گی۔"

"میں سوچوں گا اس سلسلے میں، ابھی تو وہ جو ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی ہے اس سے بھی نمٹنا ہے کسی نہ کسی طرح۔"

"کون سی نئی مصیبت؟ کس کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟ ظہیر احمد کی تو بات نہیں کر رہے ہیں کہیں؟"

"اوئے نہیں یارا! یہ ظہیر احمد بھی مسئلہ ہے کوئی؟ اس کا ایک بازو تو کاٹ کے پھینک ہی آئے ہیں ہم۔"

"تو پھر اور کون ہے؟ میرے خیال میں تو اس کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مصیبت کہا جا سکے؟"

"میں ان ہیروں کا ذکر کر رہا ہوں، جو دھمن نے میرے پلاستر میں دفن کر کے بھیجے تھے اور اب غائب ہو چکے ہیں۔"

"اس کی آپ کیوں فکر کر رہے ہیں، وہ دھمن کا ذاتی معاملہ ہے، اس کے لیے وہ آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کر سکے گا یہاں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے؟ لاکھوں روپے کے ہیروں کو بھول جائے گا آسانی کے ساتھ وہ؟ اور بالکل کوئی کوشش نہیں کرے گا انھیں دوبارہ حاصل کرنے کی؟ میں نہیں سمجھتا وہ زر کا بندہ اتنی بڑی دولت کو یوں نظر انداز کر جائے گا۔ بغیر کسی وجہ کے۔"

"میری اطلاع اگر غلط نہیں ہے تو یہ اس کے لیے پہلا موقع نہیں ہوگا ایسا کرنے کا۔ اس سے پہلے بھی وہ پچھتر لاکھ روپے گنوا کر بھول چکا ہے۔ وہ نقصان بھی اسے آپ ہی کے ہاتھ سے پہنچا تھا نا؟"

میں حیران رہ گیا، اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ پوری تفصیل سے ایک ایک بات گوش گزار کر دی گئی تھی اس کے۔

"اوہ، تم یہ بھی جانتی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دشمن تھے ایک دوسرے کے۔"

"اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں اس بارے میں جب اس نے دشمن ہو کر اتنی بڑی رقم پر صبر کر لیا تھا تو اب دوست بن جانے کے بعد وہ آپ سے بگاڑ کرے گا اتنی سی بات پر۔ آپ کی دوستی زیادہ قیمتی ہے اس کے لیے جناب عالی!"

"خیر ٹھیک ہے، اگر یہ مسئلہ زنجیر نہیں بنا میرے پیروں کی تو ہم جلد از جلد لاہور چلیں گے مگر اس سے پہلے آسیہ کی رہائی کے لیے کوئی کارروائی شروع کر دینا چاہیے۔ لاہور پہنچے تو ماں جی سب سے پہلے اسی کے بارے میں سوال کریں گی۔"

"اپنی بہن سے بہت محبت ہے آپ کو؟ وہاں سان فرانسسکو میں بھی آپ کو اسی کی فکر پریشان کیے رہتی تھی۔"

"ہاں لزی! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں اسے کس قدر چاہتا ہوں۔ ہے ہی کون میرا، اس دنیا میں اس کے اور ماں جی کے سوا۔ اسی کی زندگی کے لیے خوشیاں لینے ہی تو نکلا تھا گھر سے اور جا پھنسا اس دھمن اور عالیہ کی دلدل میں جس میں سے دوبارہ نکلنا آج تک نصیب نہیں ہو سکا ہے مجھے۔ میرے پیچھے پیچھے بدبخت آسیہ بھی اسی راندن میں جا اتری اور اب جیل میں پڑی اپنے نصیبوں پر ماتم کناں ہے۔ ہماری اس تیرہ بختی نے ماں جی کو بھی بے چین کر رکھا ہے۔ ایک دن بھی سکھ کا سانس نہیں لے سکیں وہ اس دن سے جب سے میری تیرہ و تار تقدیر نے مجھے بے راہ رو کیا ہے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ، کیسی اولاد ملی

ہے انھیں۔ مائیں اپنے بچوں کو اس لیے تو اپنا لہو پلا کر جوان نہیں کرتیں کہ وہ ان کے بڑھاپے کے لیے روگ بن جائیں"۔ میری آواز بھرّانے لگی۔

"بہت جذباتی ہو رہے ہیں آپ اس وقت۔ حوصلے سے کام لیں جنابِ عالی! ہم جلد ہی ماں جی کے سارے زخم بھر دیں گے بہت جلدی، اور ان کی جھولی میں اتنی خوشیاں ڈال دیں گے کہ پھر انھیں کبھی کوئی شکوہ نہیں رہے گا آپ سے۔"

"میں اب تک اپنے دل کو انھی طفل تسلیوں سے بہلاتا رہا ہوں لزی بیگم! ہر بار میں اپنے آپ سے یہی عہد کرتا رہا ہوں کہ اس مرتبہ میں اپنی ماں جی کی راہ کے سارے کانٹے صاف کر دوں گا، ان کے دل کے سارے زخم سی کر زندگی بھر کے دکھوں کا مداوا کر دوں گا، مگر میری خم پارہ تقدیر نے مجھے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنا یہ عہد پورا کر سکوں۔"

"ہر شخص اپنے سینے میں آتش فشاں دبائے بیٹھا ہے۔ دنیا بڑی بُری جگہ ہے جنابِ عالی! یہاں پھول کم اور کانٹے زیادہ ہیں۔ کس کے سینے میں گلزار کھلے ہیں یہاں؟ ہر شخص کے کاندھے پر دکھوں کی گٹھڑی رکھی ہے۔ وہ جو بے حد آسودہ نظر آتے ہیں اور عشرت کدے سجائے بیٹھے ہیں اور وہ جو نہایت شاداں و فرحاں، خوشی سے کھلے ہوئے تر و تازہ چہرے لیے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، کبھی ان کے اندر جھانک کے دیکھا جائے تو پتا چلے کہ کیسے کیسے عذابوں سے گزر رہے ہیں وہ۔ یہ دنیا عبرت سرا ہے جنابِ عالی! اپنے دکھوں کا حساب کرنے کے بجائے دوسروں کے الم شمار کریں تو عقدہ کھلے گا آپ پر کہ آپ دوسروں سے زیادہ فائدے میں ہیں۔ پھر آپ کو اپنی تقدیر سے شکوہ نہیں رہے گا۔"

کیسی عالمانہ اور فلسفیانہ باتیں کر رہی تھی وہ اس گھڑی۔ اور کتنی سچّی باتیں تھیں اس کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تجربات و مشاہدات کی بھٹّی سے پک کر نکلی تھی وہ، حالانکہ اس کی صورت دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے ایسی باتیں کبھی سنی بھی ہوں گی کسی سے۔ اس کا ہر روپ انوکھا اور چونکا دینے والا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے جانو کو جس طرح ٹھکانے لگایا تھا وہ کوئی کم حیران کن واقعہ تو نہیں تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایسی گل بدن، گل پیرہن، شاخِ گل کی طرح نازک حسینہ جس کی تخلیق اس گلستانِ دنیا کے حسن کو دو بالا کرنے کیلیے کی گئی تھی، اپنے سینے میں کسی درندے کا دل لیے پھر رہی ہے۔ اداؤں سے اس کی چمن کھلتے تھے اور باتوں سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے تھے مگر عمل کی دنیا میں کون سے شگوفے کھلا رہی تھی وہ، یہ تو وہی جان سکتا تھا جس کا اس سے سابقہ پڑتا۔

وہ جیسی باتیں کر رہی تھی، میرے کان اب ان باتوں کو سننے کے عادی نہیں رہے تھے۔ اور بحث مباحثے کی مجھے عادت نہیں رہی تھی۔

ایک عرصے سے میں جو زندگی گزار رہا تھا اس میں ایسی چیزوں کا گزر ہی کہاں تھا۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں قاعدے قانون اور دلائل میں پڑ کر کون وقت برباد کرتا ہے۔ یہاں تو زور اور زبردستی ہی واحد دلیل ہے کسی کو قائل کرتے یا اپنی بات منوانے کی۔ یہاں حکم دینے یا حکم کی تعمیل کرنے کے سوا درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ یہاں زندگی مانگی نہیں، چھینی جاتی ہے اور جنھیں چھیننے کی عادت پڑ جائے، ان پر زبان کی دھار اثر نہیں کرتی۔

میں خاموش تو ہو گیا مگر میرے دماغ میں لاوا پک رہا تھا۔ اندر سے کوئی نادیدہ قوت مجھے یہ باور کرا رہی تھی کہ غلام جیلانی! اس بنتِ حوّا پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھے رہنا۔ یہ تیری بہن کی آزادی کے سلسلے میں تجھے بس طفل تسلیاں ہی دیتی رہے گی۔ یہ تیری کوئی مدد نہیں کرے گی کیوں کہ اسے اور اس کے سرپرستوں کو یہ کبھی منظور نہیں ہو گا کہ تجھ جیسی سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ ہر وقت تیری نکیل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اگر آسیہ اور آپی کو آزادی مل گئی تو تجھے اپنے اشاروں چلنے کے لیے مجبور نہیں کر سکیں گے۔ ان کی آزادی کا لالچ دے کر ہی تو تجھ سے کام لے سکتے ہیں وہ، ورنہ ان کے پاس ایسا کون سا ہتھیار ہے جو تجھے ان کے سامنے جھکا سکے۔

ہم ڈرگ روڈ پہنچ چکے تھے۔ ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے نیشنل ہائی وے سے ایک ذیلی سڑک دائیں جانب مڑ رہی تھی۔ لزی نے مجھے سیدھا جاتے دیکھ کر انگلی سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اِدھر سے چلیں۔ اب ہمیں فوراً گھر پہنچ جانا چاہیے۔"

میں نے گاڑی اس ذیلی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ "کیوں، آخر گھر پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں ہے تمھیں؟"

"اس لیے کہ وہاں شرافت علی ہمارا منتظر ہو گا۔ یوں بھی یہ ضروری ہے کہ اس نئی صورتِ حال سے اُسے آگاہ کر دیا جائے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا اس سے لزی بیگم! وہ اب بھی مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ ظہیر احمد کو اس کے حال پر چھوڑ کر لاہور جاؤں اور جلد از جلد کشمیر خان سے ملاقات کروں۔"

"میرا خیال ہے وہ اب ایسا نہیں کرے گا۔ آج کے واقعے کے بعد وہ آپ سے اس کی سفارش نہیں کرے گا۔ یہ جاننے کے بعد کہ خود ظہیر احمد بھی آپ کو شکار کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے، وہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ کیوں کہ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ آپ جلد از جلد لاہور چلے جائیں تو اس کی یہی کوشش ہونا چاہیے کہ آپ یہاں کسی لمبے چکر میں نہ الجھیں، مجھے امید ہے وہ آپ کے ساتھ مل کر فوری طور پر ظہیر احمد کا جھگڑا نمٹانے کی کوشش کرے گا۔"

"تمھارے کہنے سے ایسا بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی اُمید نہیں ہے اس لئے وہ ظہیر احمد کو کھانا نہیں چاہتا ہے اپنے

ہاتھ سے۔ وہ ضمیر فروش بہت کام آتا ہے ان لوگوں کے۔ معاوضہ لے کر ہر خدمت بجا لاتا ہے وہ ان کی۔"

شرافت علی ہمیں وہیں ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا ہوا ملا تھا۔ شاید اسے یقین تھا میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ یوں بھی لزی میرے ساتھ لگ کر گئی تھی چنانچہ اس کا یقین بے وجہ نہیں تھا۔ لزی سے وہ واقف ہو گا۔ شکل آشنا نہیں تھا لیکن ہمارے ساتھ فرانسسکو سے روانہ ہونے سے پہلے جب اسے ہمارے کراچی پہنچنے کی اطلاع دی گئی ہو گی تو یہ بھی بتا دیا گیا ہو گا کہ میرے ساتھ آنے والی وہ حسین ناگن کون ہے اور کس کس قسم کا زہر بھرے پھرتی ہے وہ۔ لوٹنے میں اپنے میں تو طیش میں اُٹھ کر چل دیا تھا اور جاتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی پر بھی نظر تک نہیں ڈالی تھی لہٰذا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لزی اسے اشارے سے یہ سمجھا کر میرے پیچھے گئی ہو کہ جائے نہیں، انتظار کرے، وہ مجھے واپس لے آئے گی ابھی۔ میں نے شرافت علی کو بیٹھے دیکھا تو اس سے معذرت کرنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے شرافت علی یار! بس غصّہ آگیا تھا مجھے، بڑی احسان فراموشی کا ثبوت دیا ہے میں نے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "مجھے یقین تھا جیلانی! جلد ہی تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور تم واپس آجاؤ گے۔"

"ہاں یار! یہ تو اچھا ہوا لزی میرے ساتھ چلی گئی، اس نے اپنی غلطی کا احساس دلا دیا مجھے، ورنہ میرے دماغ میں جب آگ لگتی ہے تو کچھ نہ کچھ جلا کر ہی سرد ہوتی ہے یہ۔ بڑے نقصانات اٹھائے ہیں میں نے اپنی اس کیفیت کے ہاتھوں۔"

"لیکن آج تو آپ نے دشمن کا زبردست نقصان کیا ہے۔ آدھی جان نکال لی ہے اس کی آپ نے۔" لزی بولی۔

"اس میں بھی تمھارا تعاون ہی حاصل تھا مجھے، میں اکیلا تو شاید نقصان ہی اٹھا کر آتا آج بھی۔"

"یہ نہیں آپ جنابِ عالی! سارے کس بل تو آپ نے ہی نکال کے الگ کر دیے تھے اس کے۔ جبھی تو میری طرف آیا تھا وہ۔ آپ سے بچنے کے لیے ہی تو اس نے مجھے ڈھال کے طور پر استعمال کرنا چاہا تھا۔ بہت خوفزدہ ہو گیا تھا وہ آپ سے۔"

"کیا کسی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا باہر؟" شرافت علی نے ہماری باتیں سُن کر پریشانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟ کون تھا وہ؟"

لزی نے اسے پوری تفصیل سنا ڈالی اور بولی۔ "اس ظہیر احمد کی کمر توڑ آئے ہیں یہ باہر نکلتے ہی۔"

"اوہ! واقعی کمال ہی کر دیا ہے یار جیلانی! تو نے تو۔ ایسا تو نہیں سمجھا تھا میں تجھے۔ ظہیر تو اب کسی کام کا ہی نہیں رہا ہے۔"

"کیوں نہیں رہا ہے وہ کسی کام کا؟ بچا تو جیسا کوئی اور مل جائے گا اسے۔ اس کے علاوہ اور بھی لوگ ہوں گے اس کے ساتھ؟"

"نہیں میرے یار! اس جانو کا تو بدل ہی نہیں ہے کوئی پورے شہر میں۔ اس کی وجہ سے ظہیر احمد سے خوفزدہ رہتے تھے تمام لوگ۔ کوئی ٹکرانے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا اس سے۔ بڑا خونخوار درندہ تھا وہ، جیلانی تجھے پتا نہیں ہے کیا کر آیا ہے تو۔ ڈنکا بج جائے گا کراچی میں تیرے نام کا، جسے بھی تیرے اس کارنامے کی خبر ہو گی تیرے آگے سر جھکا دے گا وہ آکے۔"

شرافت علی نے اُٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا تھا اور باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے کوئی بہت ہی بڑا، بہت ہی اہم کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ آنکھوں سے اس کی بے پناہ محبت اور عقیدت چھلکنے لگی تھی میرے لیے۔ میں حیران تھا، یہ وہی شرافت علی تھا جو چند گھنٹے پہلے اپنا سارا زور اس پر صرف کر رہا تھا کہ میں ظہیر احمد سے انتقام لینے کا خیال نکال پھینکوں اپنے دل سے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے مجھے اس سے دُور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جانو کی موت کا علم ہوتے ہی اس کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر تیزی سے ٹیلی فون کی طرف گیا اور ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے سلسلہ ملتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔ "ایک بڑی اچھی خبر ہے سراج!"...... "او نہیں یار! تم سوچ بھی نہیں سکتے اسکے بارے میں۔ بس یوں سمجھو معجزہ ہو گیا ہے۔"...... "ہاں ہاں بتا رہا ہوں۔ تم لانڈھی پولیس اسٹیشن کے انچارج کو فون کر کے اسے کہو وہ ریڑی کی طرف اپنے آدمی بھیج کر اِدھر نالے سے جانو بدمعاش کی لاش اٹھوا لے..... ہاں بالکل..... بالکل نجات مل گئی ہے اس سے ہمیں..... لانڈھی تھانے کا انچارج جب وہاں سے لاش لائے گا تو یقین دلا دے گا تمھیں۔ میرے لیے اس خبر پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرے بہت قریبی آدمی نے یہ کام کیا ہے..... بس موت ہی آگئی تھی سالے کی۔ الجھنے میں کھڑ گیا تھا وہ اس سے ظہیر کے بھڑکانے پر..... مِل لینا تم بھی اس سے۔ کوئی گمنام آدمی نہیں ہے، وہ بھی بڑا نامی گرامی شخص ہے۔ پہلے تصدیق کر کے اطمینان کر لو۔"

وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر ہٹا تو میں نے پوچھا۔ "کسے اطلاع دی ہے تم نے؟ کون ہے سراج؟"

"اپنا ہی آدمی ہے۔ پریشان کر رکھا تھا اسے اس رذیل جانو نے۔ پانچ لاکھ روپے قیمت لگا رکھی تھی اس نے اس جانو کے سر کی، اتنا عاجز تھا وہ اس سے۔ تم چاہو تو اس سے پانچ لاکھ روپے وصول کر سکتے ہو۔ خوشی سے دے دے گا وہ۔"

"اوئے دفع کر یار! تجھے تو شاید عادت پڑ گئی ہے ہر کام میں منافع کمانے کی۔ پیسے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا ہے تو؟"

"سب پیسے ہی کا تو کھیل ہے یار جی! آدمی کے پاس پیسہ نہ ہو تو کُتّے بلّیاں اس سے زیادہ اہمیّت اختیار کر جاتی ہیں۔ بھولا نہیں ہوں میں ابھی وہ زمانہ جب تن ڈھانپنے کے لیے پیٹ کاٹنا پڑتا تھا مجھے۔ ایک آنے کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا کوئی۔ آسودہ حال عزیز رشتے دار

اپنے ملنے والوں کے سامنے مجھے اپنا عزیز کہتے شرماتے تھے۔ وہی لوگ اب فخر کرتے ہیں اس بات پر کہ وہ شرافت علی کے عزیز ہیں۔ دُور دُور کے رشتے دار بھی سگوں کی طرح ملتے ہیں، جدھر جاتا ہوں لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ یہ سب اس پیسے ہی کا تو کمال ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا، ہلاک کر دیا اپنے آپ کو، تب آدمی اور پیسے کی حیثیت کا علم ہو سکا ہے مجھے۔"

"ہاں یار! بات تو کسی حد تک ٹھیک ہی کہتا ہے تو، مگر یہ بھی تسلیم کرے کہ ہر آدمی پیسے سے عزت اور نیک نامی نہیں خرید سکتا۔ کچھ میرے جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دولت حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی پہچان چھپاتے پھرتے ہیں۔ اپنا ہر نقش پامٹاتے ہوئے چلتے ہیں کہ قانون ان نشانوں پر چلتا ہوا ان تک نہ پہنچ جائے۔"

"ہاں ہوتے ہیں ایسے بدنصیب بھی جو اپنی کم فہمی کی بدولت افہام و تفہیم کی راہ تلاش نہیں کر پاتے اور جرائم پیشہ کی حیثیت سے متعارف کرا دیتے ہیں خود کو معاشرے میں۔ تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ تم نے ابتدا ہی میں خود کو ایک مجرم بنا کر پیش کر دیا چنانچہ تمھارے لیے مشکلات پیدا ہوتی چلی گئیں۔ ورنہ نہ جانے کتنے خوفناک ترین مجرم ایسے ہیں جنھیں کوئی ان کی اصل حیثیت سے جانتا تک نہیں، وہ معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اتنے معزز ہوتے ہیں وہ کہ قانون کے محافظوں کو ان کے جرائم کا علم ہونے کے بعد بھی انھیں نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ جرأت نہیں ہوتی ان پر ہاتھ ڈالنے کی۔"

"ہاں یار! جانتا ہوں میں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے میں اب تک موجود ہوں اس دنیا میں، ان لوگوں نے اپنے بہت سے کام مجھ سے لیے ہیں اور ان کے عوض مجھے تحفظ فراہم کرتے رہے ہیں۔ لیکن وہ ڈھلوں صاحب کے بعد اب ایسا کوئی سایہ نہیں رہا ہے میرے سر پر، جبھی میں خوار پھر رہا ہوں اِدھر اُدھر۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ تم نے ڈاکٹر دھمن کو دوست بنا کر ساری مشکلات سے نجات حاصل کر لی ہے۔ ابھی تمھیں ان کی طاقت اور ان کے ہاتھوں کی لمبائی کا اندازہ نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہوتا تمھیں تو ایسی بات نہیں کہتے۔"

"جانتا ہوں اس دھمن کو میں خوب اچھی طرح۔ مجھ سے زیادہ کون واقف ہے اس سے یہاں، میری ہی وجہ سے اس نے پہلے لاہور چھوڑا تھا اور پھر یہ ملک چھوڑ کر بھاگا تھا وہ۔ تم کیا بتاؤ گے مجھے اس کے ہاتھوں کی لمبائی کے بارے میں۔" میں نے طنز کیا۔

"اس خیال میں نہ رہنا جیلانی! اب ڈاکٹر دھمن وہ نہیں ہیں جنھیں تم دوڑائے پھرتے تھے اپنے آگے پیچھے۔"

"کیوں؟ کیا اب سُرخاب کے پر لگ گئے ہیں اس میں؟ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔"

"تمھیں اس سے اندازہ نہیں ہوا کچھ کہ اس نے وہاں چھپے بیٹھے بیٹھے تمھیں لاہور سے پارسل بنا کر بلا لیا اپنے پاس اور پھر ساری دشمنیاں دھو کر دل سے تمھارے دوبارہ اسی طرح یہاں بھیج دیا جس طرح بلوایا تھا۔"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے میرے خوف سے یہودیوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا ہے اپنے آپ کو، اور انھی کے کاندھوں پر چڑھ کر اونچا نظر آنے لگا ہے وہ۔ میں اسے چھوڑوں گا وہاں بھی نہیں۔ میں نے بھی اس کے لیے وہی دام تیار کیا ہے جس میں وہ مجھے الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر میں اس سے کہہ نہیں سکا یہ بات۔ لزی وہاں موجود تھی اور اس کے سامنے ایسی کوئی بات میری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے تھی جو اسے میری طرف سے چوکنا کر دیتی۔ اسے تو یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا کہ میں اس کے سحر طراز حُسن کی سحر کاریوں سے آزاد ہو چکا ہوں، اس کی آنکھوں کی جھیل میں تیرتے ہوئے محبت کے کنول میرے لیے اپنی کشش کھو چکے ہیں اب، اور میں جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ کشت و خون کی فصل کاٹتے گزرا ہے، جس کے سینے میں اپنی بہن آسیہ کو شاد و آباد دیکھنے کے سوا کوئی خواہش ہی نہیں تھی کبھی، جس کے ہر عمل کے پیچھے بس یہی ایک جذبہ پوشیدہ تھا اب تک، اس کی زندگی ایک نیا رُخ اختیار کر چکی تھی۔ قسمت نے دھمن کے گماشتوں کے ذریعے مجھے امریکہ بھیج کر جو کچھ منکشف کیا تھا مجھ پر، اس نے مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک مقصد فراہم کر دیا تھا۔ اس مقصد پر میں سب کچھ قربان کر سکتا تھا۔ آسیہ اور آبی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ملک کی آزادی اور قوم کی بقا کی خاطر تو ایک ہزار آسیہ جیسی بہنیں اور آبی قربان کیے جا سکتے ہیں۔ ابھی کوئی صدیاں تو نہیں گزر گئیں ہمیں آزادی حاصل کیے، زمانے کی گردنے ہمارے بزرگوں کی اس جدوجہد کو چھپا تو نہیں دیا ہے ہماری نگاہوں سے جو انھوں نے اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے کی تھی ــــــ لاکھوں جانیں نذر کر دی تھیں انھوں نے اس آزادی کے لیے اور لاکھوں بیٹیوں اور بہنوں کی آبرو اس ملک کی آبرو پر قربان کر دی گئی تھی۔ اور ابھی ایک نسل ہی گزری تھی کہ کچھ ننگِ ملت، ننگِ وطن میرے ملک کی آزادی کا سودا کرنے پر تُل گئے تھے۔ اجداد کی ہڈیوں کے بیوپاری، بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو کے سوداگر زر و جواہر کی چمک دیکھ کر بینائی کھو بیٹھے تھے اپنی۔ یہ بھی نہیں سوچتے تھے وہ کہ یہ ملک نہ رہا تو خود وہ کس طرح پہچانے جائیں گے دنیا میں۔ اس دور میں جب دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسان غلامی کی زنجیریں توڑ کے پھینک چکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گمنام قومیں بھی یا تو آزادی حاصل کر چکی ہیں یا اس کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں، یہ عاقبت نااندیش لوگ اپنے اجداد کی شدید جدوجہد اور عظیم ترین قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی آزادی کے دام کھرے کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اور قدرت مجھے ایک موقع فراہم کر رہی تھی۔ اس طرح میں اگر سب کی نہیں تو کچھ دشمنانِ ملک و ملت کی بیخ کنی ضرور کر سکتا تھا۔ پھر میں اس موقعے کو ضائع کیسے کر دیتا۔ اگر میں کسی ایک غدار کو بھی ٹھکانے لگا سکتا تو یہ بھی بہت تھا مجھ بے وسیلہ اور حقیر شخص کے لیے۔ میں نے کون سا نیک عمل کیا تھا اب تک جو کبھی میرے کام آجاتا وہ۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا پھر بھی چھٹے ان پڑھ لوگوں کی طرح جذبات کے ریلے میں بہا بہا پھر رہا تھا اب تک۔ یہ زمین، یہ سوہنی دھرتی جو میرا اور میرے پیاروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھی، جو میرے لیے انواع و اقسام کے میوے اور اناج اگاتی تھی، اس کا بھی تو قرض واجب تھا میرے اوپر، اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کبھی۔ کیسا احسان فراموش اور ناشکر گزار بندہ تھا میں۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے مجھے، اس نے جلدی میری آنکھیں کھول دی تھیں، سارے پردے اٹھا دیے تھے میری آنکھوں کے سامنے سے اور ایک موقع بھی فراہم کر دیا تھا۔ اب میں اس دھرتی کا کچھ تو قرض ادا کر ہی سکتا تھا۔ مشکل میرے لیے یہ تھی کہ میں ایک گم کردہ راہ شخص، گمراہی کی دلدل میں اتر کر اپنا مقام کھو بیٹھا تھا، اعتبار گنوا چکا تھا اپنا۔ اب اگر میں اس کام کے لیے با اختیار اور با وسیلہ لوگوں سے مدد کی درخواست کرتا تو وہ کبھی میری بات پر کان نہیں دھرتے بلکہ میرے سامنے آتے ہی مجھے پکڑ کے موٹی موٹی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیتے اور میرے ایک ایک عمل کا حساب کرنے بیٹھ جاتے۔ لیکن اب وقت نہیں رہا تھا حساب کتاب کرنے کا۔ اگر میں اس چکر میں پڑ جاتا تو یہ وقت بھی میرے ہاتھوں سے پھسل جاتا اور میں بس منہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔

میں نے شرافت علی سے کہا۔ "ہاں میرے یار! یہ اس نے سچ مچ مجھ پہ بڑا احسان کیا ہے۔ آنکھیں وا کر دی ہیں اس نے میری، احساس دلا دیا ہے مجھے کہ میں اپنی اب تک کی زندگی یوں ہی بے مقصد، خواری میں بسر کرتا رہا ہوں۔ میں نگر نگر، ڈگر ڈگر آوارہ پھرتے پھرتے منزل کا نشان گم کر بیٹھا تھا۔ اس دھمن نے امریکہ بلا کر مجھے میری منزل کا پتا دے دیا ہے۔ اس کی دشمنی نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اپنے چہرے کے نقوش چھپائے پھرتے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہا تھا مجھے۔"

"اس دوستی کو قائم رکھو گے تو فائدے ہی میں رہو گے جیلانی! دشمنی میں نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا کسی کے۔"

"ہاں تو ٹھیک کہتا ہے یار جی! یہی تجربہ ہوا ہے مجھے بھی اس زندگی میں، بہت تھک گیا ہوں میں دشمنیاں پالتے پالتے۔"

"اچھا اب میں جا رہا ہوں، شام کو آؤں گا۔ کہیں جانا ہو تو گاڑی موجود ہے گیراج میں لیکن جہاں جاؤ مادام کو ضرور ساتھ لے جانا۔ اکیلے نہیں نکلنا گھر سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہنگامے تمھارے انتظار میں باہر لائن لگائے کھڑے ہوئے ہیں، نکلتے ہی ٹوٹ پڑتے ہیں تم پر۔"

ہاں یار! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ویسے اب میں باہر نکلنے میں احتیاط کروں گا۔ ایک بات تو بتا یار! وہ محمد علی سوسائٹی کی اس کوٹھی کی خبر لی تو نے دوبارہ، جہاں سے مجھے اور لزی کو نکالا تھا تو نے؟"

"ہاں، وہ کوٹھی اب دوبارہ آباد ہو گئی ہے۔ کچھ غیر ملکی لوگ نظر آتے ہیں وہاں۔ کون ہیں یہ معلوم نہیں کیا میں نے۔"

"معلوم کرنا چاہیے تھا میرے بھائی تجھے ان کے بارے میں، ان ہیروں کا سراغ وہیں سے مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس کوٹھی میں آنے جانے والوں اور وہاں کے مکینوں کے متعلق تو پوری معلومات حاصل ہونا چاہیے ہیں۔"

"میرا دھیان نہیں گیا تھا اس طرف۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہاں غیر ملکی آ گئے ہیں، میں نے نظر انداز کر دیا تھا اسے، اب چھان پھٹک کراؤں گا ان لوگوں کی۔ ہو سکتا ہے ان کا تعلق بھی انھی لوگوں سے ہو جو پہلے استعمال کرتے تھے اس کوٹھی کو۔"

"ہاں، یہی مطلب تھا میرا بھی۔ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو اس بات سے واقف تھے کہ میں کس طرح، کس نام سے اور کب یہاں پہنچ رہا ہوں، وہ میری آمد کا سبب بھی جانتے ہوں گے۔ وہ ہر وقت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں ہمارے لیے۔ کمال ہے یار! تو نے انھیں بالکل حقیر جان کر بھلا دیا ہے۔ مصیبت بن جائیں گے وہ کسی بھی گھڑی۔"

"اوہ، شرافت علی! یہ تو تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تمھیں۔ معلوم تو کرنا چاہیے تھا ان کے بارے میں، آخر وہ کون لوگ ہیں اور کیوں ہمیں اُچک لے گئے تھے درمیان سے۔ ان کے عزائم کیا تھے اور دشمنی کیا تھی انھیں ہم سے۔" لزی بھی خاموش نہ رہ سکی۔

"ویری سوری مادام! یہ بڑی غلطی ہو گئی ہے مجھ سے، بہرحال کل تک آپ کو ان کے بارے میں ساری معلومات مل جائیں گی۔"

شرافت علی جس قدر ادب و احترام کے ساتھ مخاطب ہوتا تھا لزی سے اس پر آج پہلی بار توجہ دی تھی میں نے۔ آج سے پہلے اس طرف خیال ہی نہیں کیا تھا میں نے۔ ان دونوں کے اندازِ گفتگو میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق صاف محسوس ہوتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شرافت علی اچھی طرح واقف تھا اس سے اور تنظیم میں اس کے مقام اور مرتبے سے بھی آگاہ تھا۔ لزی کے سامنے اس کی حیثیت ایک ماتحت کی سی تھی، وہ لزی کے حکم کا پابند تھا۔ وہ دونوں حاکم و محکوم کا یہ رشتہ مجھ سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے۔ مجھ پر ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس تعلقِ خاص کو۔

شرافت علی کے جانے کے بعد لزی نے دو جگہ فون کر کے کچھ بات کی۔ جس زبان میں اس نے بات کی تھی ان سے، وہ زبان میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ میں بس اس کا منہ ہی دیکھتا رہا تھا۔ فون رکھ کر وہ میرے پاس آ بیٹھی۔ میں نے پوچھا۔ "کس سے بات کی ہے تم نے؟"

"ڈیڈی کے ایک دوست کو بلایا ہے میں نے یہاں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ رہا ہے وہ۔ آپ کے بارے میں بتا دیا ہے اسے میں نے۔"

"مگر وہ ہے کون شخص؟ مقامی آدمی تو معلوم نہیں ہوتا کوئی؟"

"ہاں، درست کہہ رہے ہیں آپ، مگر آپ نے یہ کیسے اندازہ کر لیا کہ وہ مقامی نہیں ہے؟"

جس زبان میں تم نے اس سے بات کی تھی وہ ہمارے ملک کے کسی حصے میں نہیں بولی جاتی۔ اسی لیے میں نے کہا وہ مقامی نہیں ہے۔"

بیس منٹ بعد ہی دربان نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی جیرالڈ صاحب آئے ہیں۔

میں نے لزی سے کہا۔ "وہ جسے تم نے بلایا تھا یہاں کیا اس کا نام جیرالڈ ہے؟"

"ہاں ہاں۔ کیا آگیا ہے وہ؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اسی کی آمد کی اطلاع دی ہے دربان نے۔"

"اچھا اچھا۔ میں لے آتی ہوں اسے جاکر، آپ بیٹھیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

چند منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک دُبلا پتلا لاغر سا آدمی تھا۔ قد اس کا چھ فٹ سے کم نہیں تھا، اس کے جسم پر قیمتی کپڑے کا تھری پیس سوٹ تھا جو ایسا لگتا تھا جیسے بانس کا ڈھانچہ تیار کر کے اس پر لٹکا دیا گیا ہو، بال اس کے بالکل سنہرے تھے۔ چہرے پر خشخشی سی سنہری داڑھی تھی اور آنکھوں پر باریک کمانی کی عینک رکھی ہوئی تھی، عمر اس کی پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اسے دیکھ کر کسی طرح بھی یہ گمان تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی خطرناک قسم کی تنظیم سے متعلق بھی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو اپنے آگے سرنگوں دیکھنے کے لیے صدیوں سے کوشاں ہے اور اپنے خوفناک منصوبوں کی تکمیل کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو ہر دم تیار رہتی ہے۔

"یہ مسٹر غلام جیلانی ہیں۔" لزی نے اس تاڑ کے درخت کو مخاطب کر کے میری طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے بولی۔ "اور یہ ہیں مسٹر جیرالڈ، جنابِ عالی! ڈیڈی کے بہت اچھے اور نہایت قابلِ اعتماد دوست ہیں یہ۔"

اس نے آگے بڑھ کر گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کے جناب! بہت چرچے سنتا رہا ہوں آپ کے۔ بہت اشتیاق تھا آپ سے ملاقات کا مجھے۔ خوش قسمتی ہے ہماری یہ کہ آپ کا تعاون حاصل ہو رہا ہے ہمیں۔ بڑی تقویت کا باعث ہوگا آپ جیسے شخص کا ساتھ ہمارے لیے۔" وہ روانی سے اُردو بول رہا تھا۔

"یہ محبت ہے آپ کی مسٹر جیرالڈ! جو آپ سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں مجھے۔ ورنہ میں خوب جانتا ہوں اپنے آپ کو۔"

"نہیں مسٹر جیلانی! کوئی شخص اپنے بارے میں سب کچھ ٹھیک نہیں جانتا۔ بہت سی خوبیاں اور خامیاں اسے نظر نہیں آتیں اپنی۔ چنانچہ یا تو وہ خود کو بہت بلند قامت سمجھتا رہتا ہے یا پست قامت۔ کسی کے قد کاٹھ کا صحیح علم تو اسے دیکھنے والے ہی رکھتے ہیں۔ آپ کیا ہیں، یہ ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے لزی سے کہا۔ "کیا کچھ کہہ دیا ہے تم نے ان سے میرے بارے میں؟"

"میں نے کچھ نہیں کہا ہے جنابِ عالی! یہ پہلے ہی واقف ہیں آپ سے، اخبارات میں پڑھتے رہے ہیں کارنامے آپ کے۔"

"یہ اخبار والے بھی بڑی عجیب شے ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا الٹی سیدھی باتیں چھاپ ڈالی ہیں انھوں نے اور تعلق مجھ سے اس طرح جوڑ دیا ہے ہر بات کا، جیسے میرے سوا پورے ملک میں کوئی دوسرا ایسا کام کر ہی نہیں سکتا ہے۔"

"جناب! کچھ حقیقت ہوتی ہے تبھی اخبار والے نمک مرچ بھی لگاتے ہیں، ایسے ہی تو نہیں لکھ دیتے وہ سب کچھ۔"

"اچھا، اب چھوڑو اس قصے کو، میں نے تم سے کہا تھا، آئزک سے ملنے کے لیے چلنا ہے ہمیں۔ تم نے رابطہ قائم کیا تھا اس سے؟"

"یس مادام! میں نے بتا دیا ہے اسے آپ موجود ہیں یہاں اور ملنا چاہتی ہیں اس سے۔ چار سے پانچ بجے کا وقت بھی دے دیا ہے اسے میں نے۔ اس دوران بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی وہاں بالکل، آپ اطمینان سے بات چیت کر سکیں گی اس سے۔"

لزی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "تین بج کے چالیس منٹ ہوئے ہیں اس وقت، اس کا مطلب ہے کہ ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔ اٹھیں جنابِ عالی! جلدی سے تیار ہو جائیں باہر جانے کے لیے۔"

"کون ہے یہ آئزک؟ اور تم کیوں ملنا چاہتی ہو اس سے؟" میں نے اٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"جب آپ اس سے ملیں گے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا آپ کو۔ ویسے بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے بھئی، لے چلو جہاں جی چاہے، میں انکار کیسے کر سکتا ہوں، چلو دیکھ لیتے ہیں تمھارے اس بزرگ کامل کو بھی۔"

دس منٹ کے اندر ہم تیار ہو کر بنگلے سے باہر آگئے۔

جیرالڈ کی لمبی سی کار موجود تھی۔ لزی میرے ساتھ اس کی عقبی نشست پر جا بیٹھی اور جیرالڈ نے ڈرائیونگ نشست سنبھال لی تھی۔ کار تیز رفتاری سے منزل کی جانب رواں تھی اور میرا دماغ اس آئزک میں الجھا ہوا تھا جس کے پاس وہ جیرالڈ ہمیں لیے جا رہا تھا۔ آئزک ایک خالص یہودی نام تھا۔ یورپ اور امریکہ میں اسحاق کو آئزک کہا جاتا ہے۔ اسحاق یہودیوں کا پسندیدہ اور متبرک نام ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا، وہ کوئی ابنِ یہود تھا جو یہاں کسی گوشے میں بیٹھا اپنی قوم کے ناپاک مقاصد کی

تکمیل میں مصروف تھا۔ نہ جانے وہ کب سے یہاں بیٹھا تھا اور اب تک کیا کیا گل کھلا چکا تھا۔ پتا نہیں کون سا رُوپ دھار رکھا تھا اس نے اور کون کون سے ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ وہ میرے ملک میں اپنی قوم کی سربلندی کے لیے۔ پتا نہیں، میرے گھر کی دیواروں میں کہاں کہاں اور کتنے نقب لگا رکھے تھے، کتنے چور دروازے بنا رکھے تھے اس نے اور کہاں کہاں سے بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف تھا وہ ابنِ یہود اسرائیل کا کتا۔ ایک نعرے کی بازگشت تو میں کچھ عرصے سے سن رہا تھا اپنے ملک میں۔ پاکستان کے ناخواندہ اور سیدھے سادے عوام کو نئی نسل کے کچھ گمراہ جوان، جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لادینیت کی سوغات لے کر نکلے تھے اور جنھیں یہود نواز بوڑھوں نے ترقی پسندی کے نام پر کمیونزم اور سوشلزم کا زہر پلا کر اندھا کر دیا تھا، یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیمِ ہند کا عمل بالکل غلط تھا۔ ایسا ہر نظریہ جس کی بنیاد دین اور مذہب ہو فرسودہ اور باطل ہے۔ یہ عقل کے اندھے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑیاں چلا رہے تھے۔ انھیں یہ حقیقت نہ جانے کیوں نظر نہیں آتی تھی کہ اسرائیل کا قیام بھی انھی نظریاتی بنیادوں پر عمل میں آیا تھا۔ انھیں بھی اپنی مذہبی اور قومی شناخت کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا درکار تھا چنانچہ مغربی ملکوں نے اپنی اپنی زمینیں بچانے کے لیے انھیں ارضِ مقدس کا ناسور بنا دیا۔ ان کی تمام تر ترقی ان کے مذہبی جذبات کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنے مذہبی معاملات میں اس قدر سنجیدہ اور فعال ہیں کہ انھوں نے اپنی قومی شناخت قائم رکھنے کے لیے صدیوں کی..... مُردہ توریت کی زبان عبرانی کو دوبارہ زندہ کر کے اسرائیل کی قومی زبان کے طور پر رائج کر دیا۔ دنیا کا کوئی یہودی نہ تو اپنے یہودی ہونے پر شرمندہ اور شرمسار نظر آتا ہے اور نہ ہی اپنی قوم میں سیکولرازم، سوشلزم یا کمیونزم کا پرچار کرتا ملتا ہے۔ حالانکہ یہ نعرے انھی کی ایجاد ہیں، انھوں نے ہی اقوامِ عالم کو یہ نئی راہیں سجھائی ہیں اور دنیا کی دوسری اقوام کو بھی وہ ان راہوں میں بھٹکاتے پھرتے ہیں خود اپنی قوم کو ان خرابات سے دُور ہی رکھتے ہیں۔ کوئی کٹر سے کٹر کمیونسٹ یا سوشلسٹ یہودی بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہودیت یا توریت کا منکر ہو۔ جو صیہونیت کے لیے اپنے جان و مال کی قربانی دیتے ہوئے ذرا تامل کرے۔ البتہ انھوں نے ہمارے درمیان اپنے بے شمار ایسے گماشتے چھوڑ رکھے ہیں جو ہمیں دین و مذہب سے دُور لے جانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، وہ ہمارے مذہبی جذبات کا مذاق اُڑاتے اور ہمیں رجعت پسند اور جاہل قوم ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ مذہب کی بات کرنے والوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتے کہ اُن کے یہودی آقا دنیا بھر میں اپنے مذہب اور قوم کی سربلندی ہی کے لیے متحد ہو کر کام کر رہے ہیں۔ یہ نکتہ انھوں نے پا لیا ہے کہ قومیں صرف مذہب کی بنیادوں پر ہی متحد اور متفق ہو کر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ مادیت لاکھوں کروڑوں انسانوں میں اتحاد پیدا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ خود تو متحد ہیں مگر دوسری اقوام کو مذہب سے بیگانہ کر کے باہم دست و گریباں کیے ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اسرائیل قائم کیا اور اسی طرح سے اب تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا کی معیشت پر بھی قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ مادّہ پرست جن کی زبانیں یہودیوں کو بُرا کہتے کبھی نہیں تھکتیں، بڑے فخر کے ساتھ یہودیوں کی بنائی ہوئی اشیاء استعمال کرتے ہیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں جنابِ عالی!" لزی نے مجھے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں لزی بیگم، بس یوں ہی ذرا اپنے حالات پر غور کر رہا تھا، نہ جانے کتنی ٹھوکریں اور لکھی ہیں میرے مقدر میں۔"

"مقدر و قدر کچھ نہیں ہوتا جنابِ عالی! آدمی اپنی تقدیر خود بناتا ہے اپنے ہاتھوں سے۔ اپنی کوشش اور محنت سے۔"

"اگر تمھاری یہ بات درست ہوتی لزی بیگم! تو دنیا میں غربت و افلاس کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو دن رات شدید محنت کرتے ہیں لیکن نانِ شبینہ کو محتاج رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ایک بار محنت کر کے درخت لگا دیتے ہیں، پھر زندگی بھر اس کے پھل کھاتے رہتے ہیں۔ یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں آپ سے بحث نہیں کروں گی اس سلسلے میں۔"

اسی وقت ہماری کار ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ میں اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا وہ مجھے کن راستوں سے گزار کر کہاں لے آئے تھے۔ کار سے باہر نکل کے میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دُور دُور تک ویرانی ہی ویرانی تھی اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک قدرے بلند پہاڑی کے دامن میں جیرالڈ نے کار روکی تھی۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پہاڑی کے اُوپر جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ کسی اور راستے کا کوئی نشان نہیں تھا وہاں۔"

"یہ کون سی جگہ ہے بھائی جیرالڈ؟ اور اس ویرانے میں

گاڑی کیوں روک دی ہے تم نے؟" میں نے جبرالڈ سے پوچھا۔

"ارے مسٹر جیلانی! آپ کراچی کے اس مشہور علاقے کو نہیں پہچانتے؟ منگھو پیر کی پہاڑیاں ہیں یہ۔ ان کے گرد کراچی کا سب سے بڑا انڈسٹریل ایریا ہے۔ سائٹ کہلاتا ہے یہ علاقہ۔"

"اچھا۔ مگر مجھے تو یہاں دُور دُور کسی فیکٹری یا مل کے آثار نظر نہیں آتے۔"

"حیرت ہے آپ ایسے گم تھے اپنی سوچوں میں، آپ نے دیکھا ہی نہیں، ہم ابھی فیکٹریوں کے درمیان ہی سے گزر کر آئے ہیں۔"

لزی قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "کمال کیا ہے جنابِ عالی آپ نے اس وقت تو۔ اتنے بے خبر تھے آپ! ایسا نہیں کرنا چاہیے آپ کو کبھی۔ قدم قدم پہ دشمن کھڑے کر رکھے ہیں آپ نے اور یوں راہ چلتے گم ہو جاتے ہیں آپ!"

"ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے لزی بیگم! خطرات سے بے پروا اسی وقت ہوتا ہے آدمی جب اپنے تحفظ کا یقین ہو اسے۔"

"اور اس وقت یہ یقین حاصل تھا آپ کو؟ کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے تھے اس وقت آپ؟"

"ہاں، دوستوں کے درمیان رہ کر فکر نہیں رہتی مجھے اپنی سلامتی کی اور جاں نثار دوستوں کے ساتھ تو فکر سے بے نیاز ہو جاتا ہوں میں۔" میں یہ کہتے ہوئے شوخ نگاہوں سے لزی کو دیکھتا جا رہا تھا۔

میری بات سن کر لزی نے مجھے دیکھا اور میری نظروں میں محبت آمیز شوخی دیکھ کر اس کے رخسار پر شفق پھول گئی۔ اس نے فوراً نظریں چرا کے اس پہاڑی کی طرف جس کے دامن میں ہم کھڑے تھے، اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں اُوپر بابا اسحاق کا آستانہ ہے، ہم وہیں جا رہے ہیں۔ بڑی شہرت ہے ان کی یہاں، دُور دُور سے لوگ اپنے مسائل لے کر آتے ہیں ان کے پاس۔"

"اچھا! یہ تو میں جانتا ہی نہیں تھا، تم امریکی بھی پیروں فقیروں پر یقین رکھتے ہو۔"

"کیوں نہیں، مگر ہر ایک پر نہیں۔ انھی پر اعتماد کرتے ہیں جو ہمارے آزمائے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"تو کیا آزمایا ہوا ہے تم نے اس بابا اسحاق کو؟ لیکن کس طرح؟ تم تو شاید پہلی بار آئی ہو یہاں؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے جنابِ عالی! میں دو بار پہلے بھی آ چکی ہوں یہاں، اور صرف بابا سے ہی ملنے آئی تھی دونوں بار۔"

"ایسے کون سے سنگین مسائل کھڑے ہو گئے تھے جن کی خاطر تم نے دو بار اتنا طویل سفر کیا تھا؟"

"تھے کچھ ایسے ہی گمبھیر مسئلے جنھیں بابا نے یوں چٹکی بجاتے حل کر دیا تھا۔" ہم باتیں کرتے ہوئے اُوپر چڑھتے رہے۔

نصف پہاڑی پر چڑھنے کے بعد ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں کسی غار کا دہانہ سا نظر آیا۔ جبرالڈ اس دہانے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے ہمارے آنے سے پہلے ہی سب کو چلتا کر دیا ہے بابا نے۔"

اسی وقت ایک شخص غار کے دہانے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ کوئی چالیس بیالیس سالہ دراز قد، صحت مند شخص تھا۔ رنگ اس کا کھلتا ہوا گندمی تھا اور اس نے ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک لمبے کرتے کے ساتھ سر پر عمامہ سا باندھ رکھا تھا۔ گلے میں کئی پتھروں کی مالائیں جھول رہی تھیں۔ اس کی داڑھی بے حد گھنی اور لمبی تھی اس کی۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت شستہ انگریزی میں لزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بابا آئزک اندر انتظار کر رہے ہیں آپ لوگوں کا مادام!"

"ہوں، کوئی اور تو نہیں ہے اس کے پاس؟"

"غیروں میں سے کوئی نہیں ہے۔ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے چلو، ہمیں لے چلو اندر بابا کے پاس۔ خبر تو ہو گئی ہے نا اسے ہمارے پہنچنے کی؟"

"جی ہاں، میں نے آپ کی کار دیکھتے ہی انھیں اطلاع دے دی تھی۔" وہ غار کے دہانے میں داخل ہو کر بولا۔

ہم تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے اس غار میں داخل ہو گئے۔ مجھے اس شخص کو انگریزی بولتے دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی تھی۔ اپنے حلیے اور شکل و صورت سے بالکل چٹا ان پڑھ، پینڈو لگتا تھا وہ۔ مگر انگریزی اس طرح بول رہا تھا جیسے وہ اس کی مادری زبان ہو۔ غار کے اندر جا کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ باہر سے دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس چھوٹے سے غار کے دہانے میں جس کے اندر داخل ہونے کے لیے آدمی کو رکوع کے انداز میں جھکنا پڑتا تھا، ایک پورا گھر بنا ہو گا۔ غار میں داخل ہو کر کوئی سو گز یونہی جھکے جھکے چلنے کے بعد آہستہ آہستہ دہانہ وسیع ہوتا چلا گیا تھا۔ چند قدم کے بعد دائیں جانب مڑے تو...... ایک دم یوں لگا تھا جیسے ہم کسی چھوٹی سی خانقاہ میں داخل ہو گئے ہوں۔ یہ ایک خاصا کشادہ کمرہ تھا جس کی دیواریں اور چھت انسانی ہاتھوں سے تیار کی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان پر باقاعدہ سیمنٹ کا پلاستر کیا گیا تھا۔ فرش پختہ تھا جس پر دری کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ چاروں کونوں پر اگربتیاں سلگ رہی تھیں جن کی خوشبو پورے کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ کمرے میں چار تنو مند ملنگ سیاہ چغے پہنے، گلے میں مالائیں ڈالے ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے چرس کے بھرے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بڑی

بڑی گھنی اور سیاہ داڑھیاں تھیں اور سر کے بال زلفوں کی طرح ان کی پشت اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں ان کے لوہے کے موٹے موٹے کڑے پڑے تھے۔ ہمیں انھوں نے بس یوں ہی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا اور اپنے شغل میں مصروف رہے۔ کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی ان لوگوں نے ہم میں سے کسی کو بھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یا تو وہ پہلے ہی سے ہماری وہاں آمد کے بارے میں جانتے تھے یا پھر وہاں ہر طبقے اور ہر طرح کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی اور ہماری آمد کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی ان کے لیے۔ جس راستے سے ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تھے اس کے بالکل سامنے والی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ہمارا وہ رہبر ہمیں ساتھ لے کر سیدھا اس دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس دروازے سے ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ہم آگے پیچھے باری باری اس میں سے گزر کر جہاں پہنچے وہ بھی ایک مختصر سا کمرہ ہی تھا جس کی لمبائی چوڑائی دس بائی بارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کمرے کی دائیں اور بائیں جانب والی دونوں دیواروں میں دروازے تھے، البتہ سامنے کی دیوار بالکل سپاٹ تھی۔ اس دیوار سے کوئی ڈیڑھ یا دو فٹ آگے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر سیاہ رنگ کا فرش بچھا تھا اور اس پر ویسے ہی رنگ کا بڑا سا گاؤ تکیہ بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بھی کالا ہی رنگ کیا گیا تھا اور یہاں روشنی بھی بس اتنی ہی تھی کہ آدمی کمرے اور اس میں موجود چیزوں کو دیکھ کر پہچان لے۔ میں اس طلسمی ماحول کا جائزہ لینے میں منہمک تھا کہ اچانک کسی کی آواز ابھری۔

"گڈ مارننگ ایوری باڈی!"

میں نے چونک کر دیکھا۔ چبوترے کے پیچھے جسے میں سپاٹ دیوار سمجھ رہا تھا وہ دراصل بڑا سا سیاہ پردہ تھا جو ہمیں درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر دائیں بائیں دونوں سمتوں میں سمٹ رہا تھا اور اس کے عقب سے جدید طرز کے قیمتی فرنیچر اور نئے دور کے تقاضوں کے مطابق... دیگر ساز و سامان سے آراستہ ایک اور کمرہ نمودار ہو رہا تھا۔ سامنے ہی ایک سرخ و سفید رنگت والا دراز قد اور بھاری جثے کا ایک شخص کھڑا مسکراتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اس نے بھی گردن سے ٹخنوں تک کا ڈھیلا ڈھالا جبہ ہی زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ چہرے پر گھنی سفید داڑھی تھی اور سفید ہی زلفیں بھی تھیں اس کی جنھیں درمیان سے مانگ نکال کر سلیقے سے دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں شانوں سے گزار کر آگے سینے پر ڈالا ہوا تھا۔ جبرالڈ اور لزی نے آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی وہ بہروپیا آئزک ہے جو یہاں بابا اسحاق کے نام سے کسی برگزیدہ شخص کا روپ دھارے بیٹھا ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ اس کے اس پاکیزہ روپ کا شکار ہو رہے ہوں گے۔ غار میں داخل ہونے کے بعد جن ملنگوں کو میں نے چرس کے دم لگاتے دیکھا اس سے یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ منشیات کا استعمال یہاں عام ہے اور یہ بھی کوئی ایسی ہی جگہ ہے جہاں ہماری نسلیں تباہ کرنے کا انتظام کر رکھا ہے ان بدنسل یہودیوں نے۔ میرا خون کھول اٹھا تھا یہ سب دیکھ کر لیکن ابھی اپنے جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دینا تھا مجھے۔ یہ تو ابتدا تھی ابھی، اور مجھے ان کی ایک ایک کمین گاہ ایک ایک بل میں داخل ہو کر بیخ کنی کرنا تھی ان کی۔ اس پہلے ہی مرحلے پر بے قابو ہو جاتا میں تو ان کی جڑیں اکھاڑنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ میں نے بھی مصلحت کے تقاضوں ... اور کیا مطلب ہے یہ؟ پیروی کی۔ بڑھ کر نہایت تپاک

"میرے عزیز! ... کے ڈنر میں ضرور جانا چاہیے۔" لزی نے ... میں کہا۔ خوشی ہو رہی ہے تمھیں ... گرمجوشی کے ساتھ مجھ ... لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہاں آخر لیا۔" مجھے یقین تھا ... ٹھیک ہے اگر لزی کا بھی یہی مشورہ ہے تو چلو ہمارے ساتھ لیکن تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے ... راستے پر آؤ گے ... ہماری آ ہی گیا۔"

"یہ ... بالکل۔ مجھے اس میں بالکل اعتراض نہیں ہے" حضرت ... بولا۔ "اب جلدی کریں آپ لوگ۔"

"بس پانچ منٹ لگیں گے ہمیں تیار ہونے میں ... جنابِ عالی!" لزی نے کہا۔

"تم جو کچھ کرنا چاہو کر کے آ جاؤ، میں تو یوں ہی ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے شلوار قمیص کے سوٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص تیاری تو مجھے بھی نہیں کرنا ... منہ ہاتھ دھو لوں ذرا۔" لزی کہتی ہوئی دو ... طرف چلی گئی۔

"... ٹریٹمنٹ پر شرافت ... سی ڈاج ہمیں لیے ہوئے ... لوگ موجود ہوں ... رہی تھی۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے ... لے گیا اور مجھے اس پر بٹھا کے ... رکھے تھے ان میں ... حیثیت سیٹھ ... اس اثنا میں جبرالڈ اور لزی بھی دوسرے ... سے کیا گیا تھا۔ سیٹھ تاہم پھر ان کے درمیان گفتگو شروع ہوئی تو میں اپنے آپ کو بالکل ہی احمق سمجھنے لگا کیونکہ وہ تمام تر باتیں اُردو یا انگریزی میں ہی کر رہے تھے لیکن کسی ایک بات کا مفہوم بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ عجیب بے ربط اور بے مقصد سی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ کوئی ایک

گھنٹے وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اپنی بات چیت کے دوران وہ بار بار مجھے بھی مخاطب کرتے جاتے تھے اور میں بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا۔ ان کی کسی بات کا جواب دینا ممکن ہی نہیں تھا میرے لیے۔

جبیر اللہ اور لزی گفتگو ختم کر کے واپسی کے لیے اٹھے تو میں بھی خدا کا شکر ادا کر کے کھڑا ہو گیا۔ آنزک ہمیں رخصت کرنے اس کمرے کے دروازے تک آیا تھا جہاں ہم ان چار ملنگوں کو چرس نوشی کرتے چھوڑ گئے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح بیٹھے دم لگا رہے تھے۔ ان کی حالت البتہ پہلے سے خاصی مختلف ہو چکی تھی۔ آنکھیں ان کی انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں اور کھانسی چین نہیں لینے دیتی تھی انھیں۔ اس بار انھوں نے ہمیں نظر اٹھا کے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ہمارا وہ رہبر جو ہمیں اپنے ساتھ اندر ہتیا ہمیں دوسرے کمرے میں پہنچا کے واپس آ گیا تھا اور اسی وقت ہوتا ہے۔ رکے سامنے کھڑا جبیر اللہ کی کار کی نگرانی کر رہا تھا۔

"اور اس وقت یہ یقین حاصل ، اور آ کر کار میں بیٹھ گئے۔

محسوس نہیں کر رہے تھے اس وقت آ۔ سنبھالی تھی۔ مغرب کی

"ہاں، دوستوں کے درمیان رہ کر نہیے۔

اپنی سلامتی کی اور جاں نثار دوستوں کے ساتھ تھا ہمیں دیکھتے ہی ہو جاتا ہوں میں۔" میں یہ کہتے ہوئے شوخ نہے انتظار کرتے۔"

کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کے لیے چلے

میری بات سن کر لزی نے مجھے دیکھا اور میں محبت آمیز شوخی دیکھ کر اس کے رخسار پر شفق پھیل گئی۔ پولیس نے فوراً نظریں چرا کے اس پہاڑی کی طرف جس کے دیکھا۔ ہم کھڑے تھے، اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں اُوپر بابا اسحاق کا اُس کی ہے ہم وہیں جا رہے ہیں۔ بڑی شہرت ہے ان کی یہاں، دُور دُور سے لوگ اپنے مسائل لے کر آتے ہیں ان کے پاس۔"

"اچھا! یہ تو میں جانتا ہی نہیں تھا، تم امریکی بھی پیروں فقیروں پر یقین رکھتے ہو؟"

"کیوں نہیں مگر ہر ایک پر نہیں۔ انھی پر اعتماد کرتے ہیں جو ہمارے آزمائے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"تو کیا آزمایا ہوا ہے تم نے اس بابا اسحاق کو ۔ں تک طرح؟ تم تو شاید پہلی بار آئی ہو یہاں؟" جانے کہاں سے اتنی

"نہیں، ایسا نہیں ہے جناب عالی بھی کمزور نہیں تھا کوئی۔" آ چکی ہوں یہاں، اور صرف بابا نے ہے میرے لیے۔ بڑا شہ زور سانڈ "ایسے کوئی ہی دن پہلے اس نے تیری جو دُرگت بنائی تھی اس کے بعد میرے لیے یہ سوچنا بھی ممکن نہیں تھا کہ تُو زیر کر سکے گا اسے۔ اسی لیے میں نے اس سے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا تجھے۔"

"اس ظہیر احمد کی بھی خبر ہے کوئی؟ اس سے بھی نمٹ ہی لینا چاہتا ہوں میں جلد سے جلد۔"

"جانو کے بعد وہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں رہا ہے۔ کسی وقت بھی گھیرا جا سکتا ہے اسے اب۔ فی الحال تو وہ اس جانو کی آخری رسومات کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دو دن کی مہلت دے دو اسے۔ کم سے کم تیجہ تو کر لے وہ اس کا۔"

"او، یار! کیسی بات کرتا ہے تو؟ میں تو چاہتا ہوں کہ دونوں کا تیجہ ایک ہی وقت میں ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"نہیں یار! کیوں مسجد کے ملا کی ایک دن کی روٹی چھین لینا چاہتا ہے۔ بھلا ہونے دے اس غریب کا بھی کچھ۔"

"اگر یہ بات مان لی میں نے تیری تو پھر دسویں، بیسویں اور چہلم کے کھانے کی باتیں کرنے لگے گا تُو۔"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے تیرا جیلانی! کچھ غریب غربا کا بھلا ہی تو ہو گا نا اس طرح بھی۔"

"بس کر او ئے، زیادہ غریب پرور بننے کی کوشش نہ کر۔ ایسی ہی ہمدردی ہے ان سے تو اپنی جیب بھی خالی کر نا کچھ۔"

"میرا مال ہضم کہاں ہو گا ان بے چاروں سے اور یہ حرام مال ان کے پیٹوں میں ڈال کر کیوں خون خراب کرنا چاہتا ہے تُو اُن کا؟"

"بات تو ٹھیک ہی کہتا ہے تُو بھی یار شرافت علی! اگر عزیزِ من کا مال تو اس سوٗر کی اولاد کو بھی حلال نہیں ہے۔ کون نیک کام کیے ہیں اس نے؟ اور کتنے حلال ذرائع سے مال رہا ہے وہ۔ نہیں یار جی! اسے تو مہلت دی ہی نہیں جانی۔"

"چلو تو پھر کل اس کا بھی جھٹکا کر دینا۔ آج کی تو مہلت دے ہی دے اسے میرے بھائی۔"

"کیوں؟ آج کیا بات ہے؟ آج کیوں روک رہا ہے کے اند، کام سے تُو مجھے؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔ آج تاجپوشی کی جا رہی ہے تیری ہو کر کوئی" بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا کہہ رہا ہے بھائی تُو؟ ذرا صاف صاف بات کر سے۔ بات کو سمجھنے کے معاملے میں بڑا کُند ذہن واقع ہوا ہوں۔"

"جانتا ہوں میں خوب اچھی طرح تیری کُند ذہنی کو۔ کراچی کے ساحل سے دَرّہ خیبر تک واقف ہیں لوگ تجھ سے۔"

"اچھا اچھا، چُپ کر جا بس اب، اور یہ بتا تُو کیا کہہ رہا ہے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا میرے عزیز! ملک غلام جیلانی المعروف سردار کریم نواز صاحب قبلہ کہ آج رات آٹھ بجے آپ انٹر کانٹی نینٹل میں مدعو ہیں۔ کچھ معززین نے آپ کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا ہے۔ دراصل اس طرح وہ اس شخص سے متعارف ہونا چاہتے ہیں جس نے جانو جیسے ہاتھی کو چٹکی سے مسل دیا ہے۔"

"اوئے پھڈّے یار! میں نہیں پڑتا ان جھمیلوں میں۔ میرے جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتا یہ سب کچھ۔"

"زیب کیوں نہیں دیتا یار جیلانی! کیسی بات کر رہا ہے تُو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں، سمجھنے کی کوشش کر بھائی شرافت! میں عادی نہیں ہوں ان چیزوں کا۔ میرے لیے تو بڑی انوکھی، بہت ہی حیرت کی بات ہے یہ۔"

"اس میں کون سا انوکھا پن ہے اور کیا بات حیرت والی ہے، میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں؟"

"دیکھ نا یار! یہ حیرت کی بات نہیں ہے، میں نے ایک اچھا خاصا کڑیل جوان مار دیا ہے تمھارے شہر کا اور تم لوگ مجھ سے انتقام لینے کے بجائے خوش ہو رہے ہو اس بات پر، اور ڈنر دینا چاہتے ہو مجھے؟"

"میرے خیال میں تو اس میں حیران ہونے والی کوئی بات ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو اعزاز ہے تمھارے لیے۔"

"او بھائی میرے! یہی تو کہہ رہا ہوں میں بھی، آخر یہ اعزاز والا کام کیسے ہو گا؟ اس سے پہلے تو کبھی ہوا نہیں ایسا۔ بیشمار قیدی میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اور جب بھی ایسا ہوا پولیس نے اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے میرے پیچھے اور میں... ان سے بچنے کے لیے خستہ خوار ہوتا پھرا نہ جانے کہاں کہاں۔ کچھ سفید چہرے والے سیاہ دل والے لوگوں نے بھی میرے ہاتھوں اپنے دشمنوں کو نابود کرایا، مگر انھوں نے بھی میری پیٹھ تھپکنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اس سے زیادہ تو عزت نہیں دی کسی نے مجھے اور کسی نے ڈنر یا لنچ کا اہتمام بھی کیا میرے لیے تو وہ بھی اپنے محل کے کسی دور دراز گوشے میں جہاں میرے یا میرے کسی ساتھی کے سوا کوئی نہ تھا۔"

"یہ زیادتی کی ہے ان لوگوں نے تمھارے ساتھ۔ اہمیت ظاہر نہیں کی انھوں نے تمھارے کام کی تم پر محض اس لیے کہ تم کہیں ان سے کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھو۔ کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے انھوں نے، تمھیں تمھارے کام کا صلہ نہ دے کر۔"

"اوئے چھوڑ یار! کیا بات کی ہے تُو نے بھی۔ آج کے دور میں کون دیتا ہے کسی کو صلہ اس کے خلوص اور محنت کا۔ یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے وقت پڑنے پر پناہ گاہ فراہم کر دی مجھے اور میں اب تک اپنی جان سلامت لیے پھر رہا ہوں محض ان کی اس مہربانی کی وجہ سے۔"

"اچھا خیر چھوڑو اس فضول ذکر کو۔ تیار ہو کر آ جاؤ جلدی سے۔ آٹھ بجے ہمیں پہنچنا ہے وہاں اور صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں آٹھ بجنے میں۔"

"بھائی شرافت علی! تُو معاف نہیں کر سکتا مجھے؟"

لزی جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی بول لی: "آپ کا اس میں نقصان ہی کیا ہے جنابِ عالی؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا: "تو کیا تمھارا مطلب ہے مجھے قبول کر لینا چاہیے ان کی دعوت؟"

"حرج کیا ہے اس میں آخر؟ انکار کی کوئی مناسب وجہ نظر نہیں آتی مجھے۔ اگر ہے تو بتا دیں۔"

"وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ آج سے پہلے میں نے ایسی دعوتوں میں کبھی شرکت نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے آج سے پہلے کسی نے آپ کو اتنی عزت دی بھی نہیں ہو گی۔" شرافت علی نے کہا۔

"ہاں، میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں، اور کیا مطلب ہے میرا؟" میں نے کہا۔

"پھر تو آپ کو آج کے ڈنر میں ضرور جانا چاہیے۔" لزی نے فیصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ "ٹھیک ہے اگر لزی کا بھی یہی مشورہ ہے تو چلو، میں چل رہا ہوں تمھارے ساتھ لیکن تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی لزی بیگم!"

"بالکل بالکل۔ مجھے اس میں بالکل اعتراض نہیں ہے۔" شرافت علی بولا: "اب جلدی کریں آپ لوگ۔"

"بس پانچ منٹ لگیں گے ہمیں تیار ہونے میں جناب عالی!" لزی نے کہا۔

"تم جو کچھ کرنا چاہو کر کے آ جاؤ، میں تو یوں ہی ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے شلوار قمیص کے سوٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص تیاری تو مجھے بھی نہیں کرنا، صرف منہ ہاتھ دھو لوں ذرا سا۔" لزی کہتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔

چھٹے منٹ پر شرافت کی ... ڈاج ہمیں لیے ہوئے سڑک پر تیرتی جا رہی تھی۔

ڈنر میں جو لوگ شریک تھے ان میں نمایاں حیثیت سیٹھ قاسم کی تھی۔ ڈنر کا اہتمام اسی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ سیٹھ قاسم کی کئی فیکٹریاں تھیں جہاں کئی قسم کی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے کاروبار تھے۔ شہر کے مصروف ترین کاروباری مراکز میں دکانیں تھیں، تعمیراتی کمپنی تھی اور مختلف قسم کے ٹھیکے بھی تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اس کے پاس۔ اس بے اندازہ دولت کے باوجود ہوسِ زر کم نہیں ہوتی

تھی اس کی کسی طرح خواہش اس کی یہی تھی کہ ساری کی ساری دنیا سمیٹ کر بیٹھ جائے اپنے نیچے سب کچھ تھا اس کے پاس اپنی اس مختصر سی زندگی کے لیے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت سے کہیں زیادہ مال و دولت دبائے بیٹھا تھا وہ۔ مگر سکون کا ایک لمحہ اس کی بظاہر جگمگ کرتی تقدیر میں کہیں نہیں تھا وہ ساعت اس کے حصے میں آئی ہی نہیں تھی جب آدمی مطمئن اور سیر ہو کر خدا کا شکر ادا کرنے بیٹھ جاتا ہے چنانچہ اس کے روز و شب دولت کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس قدر دیوانہ تھا وہ مال و زر کا کہ جائز اور ناجائز کی تمیز بھی کھو بیٹھا تھا حصولِ زر کے لیے ہر کام کرنے کو تیار رہتا تھا۔ لہٰذا بلیک مارکیٹنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، اسمگلنگ غرض کون سا راستہ، کونسا ذریعہ کمائی کا ایسا تھا جو اس نے اختیار نہ کر رکھا ہو سیٹھ قاسم جیسے رنگے سیاروں کے دشمن بھی کم نہیں ہوتے۔ چنانچہ انھیں ظہیر احمد اور جانو جیسے لوگوں کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ جانو ایسا آدمی تھا جسے ایسے ضرورت مندوں کی ہمیشہ تلاش رہتی تھی۔ وہ ان کے سینے پر سوار ہو کر ان سے موٹی موٹی رقمیں اگلواتا رہتا تھا۔ ان بزدل زر پرستوں میں کبھی اتنی جرات پیدا نہیں ہو سکی کہ اس کا کوئی مطالبہ پورا کرنے میں ذراسی بھی دیر کر سکتے۔ میرے ہاتھوں جانو کے المناک انجام کی خبر ان کے لیے کسی مژدۂ جاں فزا سے کم نہیں تھی۔ ان کے مُردہ جسموں میں نئی رُوح پھونکنے والی بات تھی یہ۔ چنانچہ سیٹھ قاسم سمیت وہاں موجود تمام لوگ میرے ہی گن گاتے رہے۔ وہ مجھ سے عجیب عجیب سوال کر رہے تھے۔ کوئی یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کتنے انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اب تک۔ کوئی یہ جاننے کا خواہاں تھا کہ میں گروہ کی صورت میں کام کرتا ہوں یا تنہا ہی لوگوں کی زندگیاں اجیرن کیے ہوئے ہوں۔ کسی نے اخبارات میں میرے بارے میں کچھ پڑھ لیا تھا اور اب اس کے متعلق کرید کرید کر مزید جاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ان سب کو حیرت اس بات پر تھی کہ میں جو بظاہر ایک عام سا آدمی نظر آتا تھا، یہ سب کچھ کیسے کر لیتا تھا۔ جانو کے بارے میں یہ جاننے کی جستجو ہر شخص کو تھی کہ میں نے اس جیسے خوفناک آدمی کو کس طرح ختم کر دیا تھا؟

رات کے گیارہ بجنے والے تھے جب ان لوگوں سے مجھے نجات ملی۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے تمام لوگ چلے گئے تو سیٹھ قاسم نے مجھ سے کہا۔ "کیا تم میرا ایک کام کر دو گے مسٹر جیلانی؟"

"کون سا کام ہے سیٹھ؟ اگر میرے کرنے کا ہوا تو ضرور کر دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"کرنے کا تو ہے سیٹھ قاسم جب کسی کو کوئی کام بتاتا ہے تو پہلے وہ یہ اطمینان کر لیتا ہے کہ وہ کام کر سکے گا یا نہیں۔"

"اگر تمھیں یہ یقین ہے کہ میں وہ کام کر سکوں گا تو ضرور بتاؤ مجھے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔"

"تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں مالا مال کر دوں گا تمھیں اتنا دوں گا جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے سیٹھ! پہلے کام تو بتاؤ مجھے۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

اس نے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی لزی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "شرافت علی! بُرا نہ ماننا دوست! میں ذرا جیلانی سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، کیا تم ہمیں اس کا موقع دو گے یا میں....."

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "آئیں مادام ہم ذرا اِدھر اُدھر گھوم پھر لیں اتنی دیر۔"

لزی نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کے شرافت علی کے ساتھ چلی گئی۔ اس لڑکی کا کردار واقعی حیرت انگیز تھا۔ وہ بالکل ایسی بنی رہتی تھی جیسے سچ مچ سیدھی سادی معصوم سی نازک اندام دوشیزہ ہو اور اسے میری ذات کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ جیسے خاموشی سے لوگوں کی باتیں سننے اور مسکرانے کے سوا کچھ آتا ہی نہ ہو۔ اس کے اسی معصومانہ انداز نے ہی تو سان فرانسسکو میں مجھے شکار کر لیا تھا اور اگر قدرت کو منظور نہ ہوتا تو اب تک جس طرح وہ میرے ساتھ لگی پھر رہی تھی، میں کبھی اس کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکتا اور وہ اسی بے خبری کے عالم میں مجھے نہ جانے کس اندھے کنویں میں اتار دیتی۔ میں تو کبھی شک بھی نہیں کر سکتا تھا اس کی نیت پر۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی یہ بات کہ ایسے معصوم اور حسین چہرے فریب کار بھی ہو سکتے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد سیٹھ قاسم نے میری طرف جھک کر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "جیلانی! میں تمھیں جو کام سونپنا چاہتا ہوں اس کی تکمیل کے لیے تمھیں امریکہ جانا پڑے گا۔ بہت سوچ سمجھ کر جواب دو مجھے، کیا تم وہاں جانے کو تیار ہو؟"

"ہوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسمگلنگ۔"

"نہیں نہیں، تم غلط سمجھے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک بالکل سیدھا، سچا معاملہ ہے، دو اور دو چار جیسا۔"

"اچھا، چلو بتاؤ پھر۔ مسئلے کی نوعیت کو سمجھے بغیر میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے میرے اپنے کچھ الجھے ہوئے ہیں، جنھیں سلجھائے بغیر کسی لمبے سفر پر روانہ ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"اوہ۔" وہ بولا۔ "اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتاؤ کون سا مسئلہ ہے تمہارا! میں کچھ کر سکا اس سلسلے میں تو یقین کرو ذرا بھی تامل نہیں کروں گا مجھے تمھارے کام آ کر بے حد خوشی ہو گی۔"

"میرا مسئلہ بہت سنگین ہے سیٹھ جی! اس کے حل کے لیے ایسے آدمی کی ضرورت ہے مجھے جو اعلیٰ سطح پر ایسے مراسم رکھتا ہو کہ اس کی بات رد نہ کی جا سکے۔"

"اعلیٰ سطح سے تمھاری مراد اعلیٰ حکام تو نہیں ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں، یہی مطلب ہے میرا، کسی چھوٹے موٹے آدمی کے بس کا کام نہیں ہے وہ۔ معمولی کاموں کے لیے تو میں خود بھی کسی کو تکلیف دینے کا قائل نہیں ہوں، ایسے بہت لوگ ہیں میرے پاس جو انھیں نمٹا سکیں۔"

"ٹھیک ہے مجھے بتاؤ کیا کام ہے؟ شاید میں کام آ ہی جاؤں تمھارے لیکن اس کے بعد تم میرے کام سے انکار نہیں کرو گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے بعد تو تم اگر کہو گے تو جہنم میں بھی چھلانگ لگانے سے دریغ نہیں کروں گا میں۔"

"اچھا تو پھر اب بتا دو کیا کام ہے تمھارا؟"

"میری بہن آسیہ اور میرا جگری یار آبی ان دنوں قتل اور ڈکیتی کے الزام میں راولپنڈی جیل میں بند ہیں۔ انھیں وہاں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں میں۔ اور یہ کام اثر و رسوخ کے بغیر ممکن نہیں ہے کسی طرح۔"

"ہوں۔" سیٹھ قاسم نے کہا اور چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے دوست کوشش کرتا ہوں میں۔ کامیابی اور ناکامی مقدر کی بات ہے تمھارے۔ کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتا ہوں میں اس سلسلے میں۔"

"مسئلے کی سنگینی کے پیشِ نظر میں بھی اس کے لیے مجبور نہیں کروں گا تمھیں۔ البتہ یہ وعدہ ہے میرا، اگر تمھارے ذریعے یہ کام ہو گیا میرا تو تم مجھے اپنا بے دام غلام پاؤ گے۔ جیلانی کو احسان فراموش نہیں پاؤ گے کبھی بھی۔"

"اچھا تو پہلے یہ کام نمٹا لیں تمھارا، میں اپنا کام بعد میں بتاؤں گا تمھیں۔"

"نہیں سیٹھ! تم بھی آج ہی اپنے کام کے بارے میں بتا دو مجھے، اس عرصے میں میں اس کے لیے پلاننگ کر لوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے تمھارے کام کے لیے مجھے امریکہ جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں تم سے مدد کی درخواست کیوں کرتا خود ہی کر لیتا سب کچھ۔"

"میرے لیے یہ ناممکن نہیں ہے۔ وہاں میرے کچھ ایسے دوست ہیں جو میری خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ امریکہ میں تمھارے دوست ہیں؟ یقین نہیں آتا مجھے۔"

"یقین کیوں نہیں آتا تمھیں؟ کیا تم ہی تعلقات رکھ سکتے ہو اپنے ملک سے باہر، میں نہیں رکھ سکتا؟ تم میری اس دوست کو بھول گئے ہو جو ابھی ابھی شرافت علی کے ساتھ اٹھ کے گئی ہے یہاں سے۔ امریکہ ہی سے امپورٹ کر کے لایا ہوں میں اسے اپنے ساتھ۔ الزبتھ فنیلی نام ہے اس کا، اور بڑی آفت کی پرکالہ ہے وہ۔"

"اوہ، ہاں۔ وہ تو ذہن سے ہی اُتر گئی تھی میرے لیکن یہ نہیں معلوم تھا مجھے کہ وہ امریکی ہے۔ تو کیا تم پہلے بھی کبھی جا چکے ہو امریکہ؟" وہ قدرے حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید یقین نہیں آیا تھا اسے میری بات پر۔

"خیر چھوڑو، یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ مجھے امریکہ کیوں بھیجنا چاہتے ہو؟"

"چند ماہ قبل میرا بیٹا سیاحت کی غرض سے امریکہ گیا تھا وہاں جا کر وہ اچانک غائب ہو گیا ہے کہیں۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، اسے واپس لانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ہی بیٹا ہے میرا۔"

"ہوں، یہ تو ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ تم یہاں امریکی سفارت خانے کے ذریعے وہاں کی حکومت سے رابطہ قائم کر کے اسے تلاش کروا سکتے ہو۔ اگر وہ قانونی طور پر گیا ہے اور کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہے تو وہ ضرور تعاون کریں گے۔"

"یہ میں کر چکا ہوں۔ تمھارا خیال ہے کہ میں اتنے دن خاموش بیٹھا رہا ہوں؟ میں نے اپنے طور پر ہر سیدھا راستہ اختیار کر کے دیکھ لیا ہے لیکن کچھ پتا نہیں چلا اس کا۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ نیویارک کے لنکن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، پھر اس نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کہاں گیا وہ کچھ پتا نہیں چلتا۔" اس کی آواز بھرّانے لگی تھی۔

نیویارک کے لنکن ہوٹل کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "نام کیا ہے اس کا؟"

"شاہد....." وہ آہستہ سے سسکی لے کر بولا۔ "شاہد حسین۔"

میرے پورے بدن میں جیسے برقی رَو دوڑتی چلی گئی۔ ایک ایک رُواں کھڑا ہو گیا تھا میرے بدن کا۔ میں سکتے کے سے عالم میں آنکھیں پھاڑے اس کی شکل کو تکتا ہی رہ گیا۔ کیسی عجیب بات تھی یہ، یہ اس شاہد حسین کا باپ تھا جس کے نام سے اور جس

کے کاغذات [illegible] میں نے سان فرانسسکو سے واپسی کا سفر کیا تھا۔ وہ شاید [illegible] ذلیل [illegible] کے باعث غریب الوطن [illegible] کر دیا تھا اب اس کی [illegible] وہ شاید نہیں [illegible] نے پتا نہیں کن کن [illegible] اور کن [illegible] تھا اپنے پاس [illegible] کن مظلوموں کی آہیں لے کر دولت مندوں کی صف میں آ کھڑا ہوا تھا وہ۔ مگر یہ دولت کیا کام آ رہی تھی اس کے؟ اپنے نورِ نظر لختِ جگر سے اس طرح محروم ہو گیا تھا وہ کہ اسے ابھی تک اپنے کنگال ہو جانے کی خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔ پتا ہی نہیں تھا اسے کہ اس نے دولت کے بل پر اپنے جس جگر گوشے کو امریکہ کی سیاحت کے لیے بھیجا تھا اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے وہاں۔

مجھے حیرانی سے اپنی طرف تکتے پا کر اس نے پوچھا "کیا بات ہے؟ تم اس قدر حیرت سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

میں نے سوچا اسے سب کچھ صاف صاف بتا دوں کہ اس کے بیٹے کے ساتھ اس ظالم امریکہ میں کیا بیت چکی ہے لیکن میری زبان نے ساتھ نہیں دیا میرا۔ دل بھی میرا آمادہ نہیں ہوا اس پر کہ میں اس سوختہ دل شخص کو مزید اذیتوں سے دوچار کر دوں، وہ جو ابھی کچھ ہی دیر پہلے دوستوں کے درمیان بیٹھا اپنی بالا بلند شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے خوب دل کھول کے قہقہے لگا رہا تھا، اندر سے کتنا شکستہ، کیسا منتشر تھا اور اپنے سینے میں ناسور چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے یہ محفل سجائی ہی اس لیے تھی کہ یوں مجھ سے رابطہ استوار کر کے مجھے اپنے درد کا مداوا کرنے پر آمادہ کر سکے۔ اسے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بنی طے کے کسی حاتم کی تلاش تھی جو اس کے لیے ایک طویل طویل سفر کر کے سکونِ قلبی فراہم کر سکے اسے۔ اس کی وہ بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ کیسا نادان، ناسمجھ تھا وہ۔ اتنے بڑے بڑے کام کرتا تھا لیکن اس حقیقت سے نا واقف تھا کہ سکون کی دولت نہ کہیں نقب لگا کر حاصل کی جا سکتی ہے نہ ذخیرہ اندوزی [illegible] بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ سے [illegible] نہ ہی کسی کا حق [illegible] یا کسی کا خون نچوڑنے سے [illegible] کے لیے قلب [illegible] صاف کرنے اور سینے میں گداز پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سخت دلوں میں جو ہوسِ زر سے پہلے ہی لبالب بھرے ہوں، سکون کہاں سما سکتا ہے؟ اس کے لیے تو بڑی جگہ چاہیے دل کے اندر، تنگ دلوں میں داخل ہی نہیں ہو سکتا وہ۔

"حیرت کی بات ہے سیٹھ قاسم! تم جیسا باحیثیت، بااثر شخص ایٹم کے اس دور میں اپنے بیٹے کا پتا نہیں چلا سکا [illegible] جیسے ملک میں اتنے بڑے آدمی کا جوان سال بیٹا ننھی [illegible] کی طرح گم ہو کر رہ گیا!" میں نے کہا۔

"ہاں، پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں اپنے آپ کو بڑے [illegible] بہت باحیثیت آدمی سمجھا کرتا تھا۔ سمجھ یہ رکھا تھا میں نے [illegible] دنیا میں دولت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس سے ہر چیز حاصل ہو جاتی ہے، سب کچھ مل جاتا ہے اس کے زور پر مگر اب مجھے احساس ہو گیا ہے اپنی بے بضاعتی کا، اب مجھ پر اپنی حقیقت پوری طرح کھل گئی ہے جیلانی! میں بڑا گنہگار شخص ہوں، دولت کی خاطر میں نے انسانیت سے ناتا توڑ کر خود کو مکمل طور پر شیطان کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن بیٹے کی گمشدگی نے مجھے پہلی بار دل کے درد سے آشنا کیا ہے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو آدمی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں گزشتہ ایک ماہ سے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے رب سے خطاؤں کی معافی کے لیے توبہ استغفار کر رہا ہوں لیکن مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ جیلانی! میرے بھائی! مجھے میرا بیٹا لا دو۔ میں اس کے عوض تمھیں اپنی ساری دولت دینے کو تیار ہوں۔"

اس کی آواز بھاری ہو کر پھٹنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی بلک بلک کر رو پڑے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا تھا۔ میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ چند ثانیے مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ "معاف کرنا دوست! میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔ یہ مسئلہ ہی ایسا ہے۔ میرے درد کو تم خوب سمجھ سکتے ہو کیونکہ تم بھی اپنی بہن کے لیے پریشان ہو اور اس کی سلامتی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے ہو لیکن تمھیں یہ اطمینان بھی حاصل ہے کہ تم اس کے مصائب سے آگاہ ہو، گو اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے مگر یہ تو جانتے ہو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میری بدنصیبی یہ ہے کہ میں یہ تک نہیں جانتا کہ میرا بیٹا ہے کہاں؟ اس لیے میں تمھاری بہن کا معاملہ پہلے نمٹانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں زیادہ وقت نہیں لگے گا تمھیں، جبکہ میرا کام صبر طلب بھی ہے اور مشکل بھی۔ پہلے تو تمھیں یہ معلوم کرنا پڑے گا، شاہد ہے کہاں؟ وہ صحیح سلامت بھی ہے یا نہیں؟ یہاں لانے سے پہلے تو اس کا ڈھونڈ نکالنا ہی ایک سنگین مسئلہ ہے۔"

اس کے لہجے کی شکستگی بتا رہی تھی کہ اسے اپنے بیٹے کی سلامتی کا یقین نہیں ہے۔ وہ سمجھ چکا ہے اس کے بیٹے کو کوئی

سنگین حادثہ پیش آیا ہے اور یہ ساری تگ و دو جو وہ کرنا چاہتا ہے یا کر رہا ہے محض اپنے دل کو اطمینان دلانے کے لیے ہے۔ ایک موہوم سی امید ہے جو اسے سہارا دے کر اکسا رہی ہے۔ میں نے اس کا یہ سہارا چھین لینا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا چنانچہ اسے مطمئن کرنے کی خاطر یہ وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے میری بہن آسیہ اور اسلم آبی کی رہائی کا انتظام کر دیا تو میں اس کے لختِ جگر کو تلاش کرنے امریکہ ضرور جاؤں گا۔

میرے اس وعدے نے اس کی بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "سیٹھ! یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ پھر آخر یہ انسان... اس کے پیچھے اس قدر دیوانہ کیوں ہے؟ کس دن کے لیے اپنے آپ کو دولت کے انبار لگانے میں شب و روز مصروف رکھتا ہے؟ جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اپنی زندگی بھر کی ہیر پھیر، بے ایمانی اور بداعمالیوں کے ذریعے حاصل کی جانے والی اس دولت میں سے ایک پائی بھی وہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے گا اس دوسرے جہان میں۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے اسے کہ اس جہان میں اس سے یہاں گزارے گئے ایک ایک پل کا بھی حساب لیا جائے گا۔ اپنے ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنا پڑے گی اسے اور وہ تمام معاملات جن کا تعلق دو انسانوں کے باہمی ربط سے ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ جیسا سلوک روا رکھتا ہے، اس کا نتیجہ تو وہ خود اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا قانون تو قدرت نے اسی دنیا کے لیے بنایا ہے۔ جس طرح جَو کی کاشت کرنے والا گندم کی فصل کاٹنے کی امید نہیں رکھتا، اسی طرح آدمی کو اپنی بداعمالیوں کے صلے میں کسی نیک عمل کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ جو کچھ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اس کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ پھر شکوہ کیسا اور شکایت کیوں؟"

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے جیلانی! ہم یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کبھی تقدیر کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور کبھی زمانے کو دوش دینے لگتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کا حساب نہیں کرتے کبھی، اپنے احتساب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ لوگوں کے ساتھ خود ہمارا عمل خراب ہے۔ نہ لوگ خراب ہیں، نہ زمانہ۔"

"اور جسے چوٹ کھانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے وہ سیٹھ قاسم کی طرح راہِ راست اختیار کر لیتا ہے۔ وقت کا کوئی ظالم لمحہ آدمی کی آنکھیں کھول دے تو یہ بھی اس کی خوش نصیبی ہی ہے۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں سیٹھ؟"

"نہیں دوست! تم بہت اچھی باتیں کہتے ہو، میں نے تمھارے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس کی روشنی میں تم ایسے تو نظر نہیں آتے.... میرا تو خیال تھا کہ تم کوئی بہت خوفناک قسم کے بڑے ہی سفاک آدمی ہو گے لیکن تمھاری اس وقت کی باتوں نے یہ تاثر دیا ہے مجھے کہ تم ایک دردمند دل کے مالک، ایک مہربان شخص ہو جسے حالات نے سنگلاخ راہوں پر ڈال دیا ہے۔"

"ہاں سیٹھ! کبھی میں بھی بہت ہی شریف گھرانے کا سیدھا سادا سا فرد تھا لیکن ایک رات تقدیر نے مجھ سے ایسا مذاق کیا کہ میرے ہاتھوں سے شرافت کا دامن چھوٹ گیا۔ میرے سینے میں دہکتے ہوئے انگارے بھر دیے گئے جنھیں سرد کرنے کی کوشش میں میں اپنی راہ بھی گم کر بیٹھا اور جب سے اب تک بھٹکتا ہی پھر رہا ہوں، نہ جانے میری یہ تیرہ و تار تقدیر مجھے اور کب تک بھٹکاتی پھرے گی؟"

" ناامید نہ ہو، خدا پر بھروسا رکھو، وہ بہتری کی کوئی راہ ضرور پیدا کرے گا تمھارے لیے، اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔"

اس کی بات سن کر میرے دل کی عجیب حالت ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میری رگوں میں لہو کی گردش ایک دم تیز ہو گئی ہے۔ دل ایک انجانی سی مسرت سے بھر گیا ہے۔ میرے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی، غلام جیلانی! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تیری برسوں کی آوارگی بے مقصد نہیں تھی۔ مصائب کا یہ انبوہ جو تیری راہ میں حائل رہا ہے ہمیشہ، تو یہ بھی قدرت کی طرف سے ایک عطیہ تھا تیرے لیے۔ تجھے مصائب کی بھٹی میں پکا کر تیار کیا گیا ہے کسی اہم کام کے لیے اور شاید اب اس کام کی ابتدا ہو چکی ہے۔ قدرت نے تیرا انتخاب تیرے ملک اور قوم کی اہم خدمت کے لیے کیا ہے اور ہر طرح سے تیار کر کے تجھے اس راہ پر ڈالا ہے کہ تو اپنے پاک وطن میں یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کر سکے۔ بے اختیار میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں جدھر وہ بنتِ یہود الزی، شرافت علی کے ساتھ گئی تھی۔ وہ دونوں نہ جانے کس گوشے میں جا ٹھہرے تھے۔ میں انھیں دیکھ نہیں سکا لیکن پھر بھی لزی کا چہرہ میری آنکھوں میں تیرنے لگا تھا اور ذہن میں گریگری کی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی، دنیا پر یہودیوں کا تسلط قائم کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے یہودی قوم کو تین نعرے دیے گئے ہیں۔ یہودیت کے سوا دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظریے کو باطل قرار دینے پر اپنا پورا زور صرف کر دو، دنیا بھر کی معیشت پر اس طرح چھا جاؤ کہ دنیا کی ساری دولت یہودیوں کے قبضے میں آ جائے اور تمام ذرائع ابلاغ پر ایسا تسلط قائم کر دو کہ یہودیوں کی آواز کے ساتھ

کوئی اور آواز سنائی نہ دے سکے۔ ہماری مرضی کے خلاف کوئی نہ کسی کی بات پر یقین کر سکے نہ کسی کی تحریر پڑھ سکے۔"

بھلا ہو اس گرگیری کا جس نے میرے لیے ایک راہ متعین کر دی تھی اور میری بے مقصد زندگی کو ایک نصب العین عطا کر دیا تھا۔ دشمن نے ..... ایک بھیانک انجام سے دوچار کرنے کے لیے۔ ایک خوفناک دلدل میں اتارنے کے لیے امریکہ پہنچانے کا انتظام کیا تھا میرے لیے لیکن قدرت نے کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس میرے رب نے اسی دلدل میں میرے لیے ایک نئی زندگی کی راہ پوشیدہ کر رکھی تھی۔

سیٹھ قاسم کچھ دیر خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ شاید اسے میرے بولنے کا انتظار تھا مگر جب میری خاموشی طول کھینچتی چلی گئی تو وہ میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔ "فکر مت کرو کسی بات کی۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا تمھارے دوست اور بہن کو آزادی دلانے کی۔ اگر تعلقات اور پیسہ کام نہ آسکا تو بڑے سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کریں گے ہم ان کے کیس کی پیروی کے لیے۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا میں۔"

"یہ ایک بے حد مشکل کام ہے سیٹھ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، اگر تم اس میں کامیاب نہ بھی ہو سکے تب بھی میں تمھارا کام ضرور کر دوں گا۔ میں اپنے کام کی تکمیل کی شرط واپس لیتا ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر وفورِ جذبات سے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور مسرت سے لبریز آواز میں بولا۔ "تم بہت عظیم انسان ہو غلام جیلانی! مجھے افسوس ہے، دنیا نے تمھیں سمجھا ہی نہیں آج تک۔"

"بس کرو سیٹھ! اتنا اونچا نہ اٹھاؤ مجھے کہ میں اپنے قد کی پیمائش ہی بھول جاؤں، زمین پر ہی رہنے دو مجھے۔"

"ایسی بات نہیں ہے جیلانی! یقین کرو، میں دل سے تمھاری قدر کرنے لگا ہوں۔ بہت متاثر کیا ہے تم نے مجھے۔"

"میرا خیال ہے اب کوئی خاص بات نہیں رہی ہے کرنے کو۔ لہٰذا کیوں نہ اٹھ جائیں اب ہم یہاں سے۔"

"ہاں، چلو۔ وہ لوگ باہر کہیں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے باہر کی طرف بڑھنے لگے۔ سیٹھ قاسم میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر جیسے ہی میں نے باہر قدم رکھنا چاہا، ایک بیرا تیزی سے میرے قریب آکر بولا۔ "جناب! وہ آپ کے ساتھی سوئمنگ پول کے قریب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" یہ بتاتے ہوئے اس نے چپکے سے کوئی تہ کیا ہوا کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

ایک لمحے کے لیے میں ذرا سا جھجکا مگر فوراً ہی سنبھل کر وہ ہاتھ جس میں اس نے کاغذ پکڑایا تھا، پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل آیا۔ سیٹھ قاسم باہر کھڑا اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر شرافت علی اور لزی کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے قریب جاکر کہا۔ "وہ بیرا بتا رہا تھا، وہ دونوں سوئمنگ پول کے قریب ہمارے منتظر ہیں۔"

"اچھا، آؤ پھر۔" سیٹھ قاسم نے کہا اور ایک جانب بڑھ گیا۔

میں نے چلتے چلتے کہا۔ "میں ذرا باتھ روم جانا چاہتا ہوں کیا میری رہنمائی کر دو گے سیٹھ؟"

"اوہ، کیوں نہیں۔ یہ اس طرف بائیں ہاتھ جو تپلی سی گلی ہے اسی میں چلے جاؤ۔ یہیں باتھ روم ہے۔"

میں اس کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھتے ہوئے بولا۔ "بس دو منٹ لگیں گے۔ ابھی آیا میں۔"

سفید ٹائلوں والے فرش اور دیواروں والا صاف شفاف باتھ روم اس گھڑی بالکل خالی تھا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی جیب سے کاغذ نکال کر دیکھا۔ وہ کوئی رقعہ تھا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"ایک درمیانے قد کا گہرے نیلے شلوار سوٹ میں ملبوس شخص، بہت دیر سے تمھارے گرد منڈلا رہا ہے۔ اس کا تعلق ایک نامی گرامی بدمعاش سے ہے۔ اس کے دو ساتھی ہوٹل کے باہر پیلے رنگ کی مزدا کار میں موجود ہیں۔ واپس جاتے ہوئے ان کا خیال رکھنا اور چوکنا رہنا ان کی طرف سے۔ کل دوپہر کے وقت ہل پارک پہنچ جاؤ تمھیں وہاں سے میرا آدمی میرے پاس لے آئے گا۔ یہ ملاقات بے حد ضروری ہے۔ یاد رکھنا کل دوپہر ٹھیک بارہ بجے، اس وقت ہل پارک ویران ہوتا ہے میرا آدمی خود ہی تمھارے پاس پہنچے گا اور اپنی شناخت کے لیے اپنا نام گرگیری بتائے گا۔ تم اس کے ساتھ بے دھڑک چلے آنا۔

تمھارا دوست گرگیری۔"

رقعہ پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گرگیری خود بھی پاکستان آگیا تھا۔ اگر یہ درست تھا تو اس کے آنے سے میری پشت مضبوط ہو گئی تھی لیکن اس کی یہاں موجودگی ان لوگوں کو چوکنا بھی کر سکتی تھی جن کے خلاف ہم دونوں کا اتحاد عمل میں آیا تھا۔ لزی اسے خوب اچھی طرح پہچانتی تھی اور اس کی حیثیت سے واقف تھی۔ اگر وہ گرگیری کو کہیں دیکھ لیتی تو اپنے لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع دے کر ہوشیار رہنے یا وقتی طور پر

اسکرین آؤٹ ہو جانے کی ہدایت دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مستقل طور پر اس کی نگرانی کرتے ہوئے کسی وقت وہ لوگ میرے اور اس کے گٹھ جوڑ سے بھی آگاہ ہو سکتے تھے لہٰذا میں یہ فیصلہ کر کے باتھ روم سے نکل آیا کہ کل ملاقات کے بعد اسے ان خطرات کی طرف متوجہ کروں گا اور اسے واپس جانے کے لیے کہوں گا۔ اگر وہ نہ مانا تو پھر دوسرا راستہ یہ ہوگا، وہ کراچی سے چلا جائے اور آئندہ میں لزی کے ساتھ جس شہر میں پہنچوں، وہ اُدھر کا رُخ نہ کرے۔ میں اسے ہر قیمت پر لزی کی نظروں میں آنے سے بچانا چاہتا تھا۔

سیٹھ قاسم ہمیں رخصت کرنے کے لیے شرافت علی کی کار تک آیا تھا۔ اس سے رخصتی مصافحہ کر کے میں کار میں جا بیٹھا، اندر بیٹھنے کے بعد میں نے کھڑکی سے سر نکال کر وہاں کھڑی ہوئی کاروں کی طرف نظریں دوڑائیں۔ ہم سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر وہ پیلی مزدا موجود تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اور دو آدمی اگلی اور پچھلی نشستوں کے دروازے کھولے یوں کھڑے تھے جیسے اندر داخل ہونا چاہ رہے ہوں، اگلی نشست کا دروازہ جس شخص نے کھولا ہوا تھا اس کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ تھا۔ اس کی نظریں ہماری کار پر ہی جمی ہوئی تھیں مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ فوراً مزدا کے اندر داخل ہو گیا میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر یوں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا جیسے میں اس جگہ اور اس کے اِردگرد کے ماحول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا ہوں۔

شرافت علی کا ڈرائیور کار ہوٹل کے پارکنگ پلاٹ سے نکال کر سڑک پر لے آیا تو وہ مزدا کار بھی حرکت میں آگئی۔ ہماری کار کراچی کی روشن، کشادہ اور شفاف سڑکوں پر تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور وہ پیلی مزدا کار برابر ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "شرافت علی! ایک پیلی مزدا کار بہت دیر سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کہیں تم نے باڈی گارڈ تو نہیں رکھ چھوڑے ہیں اپنے ساتھ؟"

"نہیں یار! یہ تجھے باڈی گارڈز کا خیال کیسے آگیا، اس کار کو پیچھے لگے دیکھ کر؟"

"جب ہم ہوٹل آنے کے لیے گھر سے نکلے تھے، اسی وقت تھوڑی دیر بعد ہی دیکھا تھا میں نے اس کار کو۔ ہوٹل تک یہ ہمارے ساتھ ساتھ لگی آئی تھی اور اب واپسی میں بھی موجود ہے یہ ہمارے پیچھے۔ میں نے سوچا شاید باڈی گارڈز ہیں یہ تیرے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اصل بات میں چھپا گیا تھا اس سے۔ گرگیری کے پیغام کا ذکر میں کر ہی نہیں سکتا تھا اس کے سامنے۔

اس نے شیشے میں عقبی منظر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جو دو کاروں کے پیچھے پیلے رنگ کی مزدا کار ہے اس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"ہاں وہی۔ تعجب ہے تم جیسے ہوشیار آدمی کو احساس نہیں ہو سکا اس تعاقب کا۔"

"اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا میرے ساتھ۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی میری گاڑی کا تعاقب بھی کر سکتا ہے۔"

"اوہ۔ اگر ایسا ہے تو یہ تمھارے نہیں، میرے تعاقب کا فرض انجام دے رہے ہیں کسی نے میرے پیچھے بھیجا ہے انھیں۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اس ظہیر احمد نے ہی یہ خدمت سپرد کی ہے ان کے۔"

"یار شرافت علی! تو نے خواہ مخواہ ہی مہلت دلوا دی ہے اس ظہیر احمد کو، حالانکہ خود اسے جان کے بغیر یہ دنیا اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔ خودکشی پر آمادہ نظر آرہا ہے مجھے وہ۔ کیوں نہ اس کا بھی قصہ تمام کرتے چلیں اسی وقت؟"

"اونہیں یار! تو تو ہر وقت ادھار کھائے ہی بیٹھا رہتا ہے خون خرابے کے لیے۔ خون سوار رہتا ہے ہر وقت تیرے سر پر۔"

"معلوم ہوتا ہے تیرے اُوپر اپنے نام کا کچھ نہ کچھ اثر موجود ہے۔ بالکل ہی شرافت کی ضد نہیں ہوا ہے ابھی تو۔ میرے بھائی! جو کام کرنا ہے اسے آج کر دیا کل فرق تو کچھ نہیں پڑتا نا؟ چنانچہ اچھا یہی ہے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑا جائے۔"

"لیکن میں تجھ سے مختلف انداز میں سوچتا ہوں جیلانی! میرا خیال یہ ہے کہ بُرا کام کرنے میں جتنی دیر کی جائے بہتر ہے اس طرح اس کا امکان رہتا ہے کہ شاید آدمی ایک بُرائی سے بچ جائے۔ ممکن ہے دیر ہونے کے بعد اس کی ضرورت نہ رہے یا ارادہ تبدیل ہو جائے اور آدمی ایک بُرائی کرنے سے بچ جائے۔ انسان کو کوشش یہی کرنا چاہیے۔"

"اوئے چپ کر جا بگلا بھگت! جانتا ہوں میں کتنا نیکوکار ہے تو، بڑے چرچے ہیں اس شہر میں تیری پارسائی کے۔"

"طنز نہیں کر جیلانی مجھ پر۔ تجھ جیسے آدمی کو حق نہیں پہنچتا مجھ پر انگلی اٹھانے کا۔ زبان بند ہی رکھ تو تو اپنی۔"

"اب آپ لوگ آپس میں تو نہ لڑیں، ختم کریں اس قصے کو اور ان کا کچھ بندوبست کریں جو پیچھے آرہے ہیں ہمارے۔" لزی بولی۔

"ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرو ڈرائیور!" شرافت علی نے لزی کی بات سن کر اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

"کیسے جان چھڑائے گا ان سے بیچارہ؟" میں نے شرافت علی سے پوچھا۔ "کیا مقابلہ کرے گا یہ ان سے؟"

"نہیں بھئی، یہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے ڈاج

دے کر نکلنے کی کوشش کرے گا یہ انھیں۔"

"اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے ہماری رہائش گاہ بھی دیکھی ہوئی ہے۔ راستے میں اگر گنوا بھی دیا انھوں نے ہمیں تو سیدھے ہماری رہائش گاہ پر پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کسی سعد ساعت کے انتظار میں مورچہ بنائے بیٹھے ہوں یہ وہاں۔"

"ہوں، بات تو تیری جی کو لگتی ہے جیلانی! پھر تو نے کچھ سوچا ہے ان کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"رات آدھی گزر چکی ہے۔ ایک بجنے والا ہے۔ اس وقت سڑکیں زیادہ تر ویران ہی پڑی ہوں گی۔ انھیں اپنے پیچھے لگائے ہوئے کسی ایسی سڑک پر لے چلو جہاں آبادی قریب نہ ہو۔ وہاں اس گاڑی کو روک کر نمٹ لیں گے ہم ان سے۔" لزی نے تجویز پیش کی۔

"یہ بہت مناسب بات کہی ہے لزی نے۔ اس کے سوا راستہ بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ بالکل ہی جان چھوٹ جائے گی ہماری۔"

"اور اگر وہ لوگ مسلح ہوئے تو؟ یوں خالی ہاتھ تو تعاقب میں نہیں آرہے ہوں گے وہ ہمارے۔ پستول تو ضرور ہی ہوں گے ان کے پاس، جبکہ ہمارے پاس کوئی چاقو یا خنجر تک نہیں ہے۔ پھر کیسے نمٹ سکیں گے ہم ان تینوں سے؟"

"ادئے چھڈ اوئے بزدلا! کی اگر مگر لائی ہے؟ یہ بھی تو سوچ میرے یار! ان حالات میں اگر انھوں نے راستے ہی میں ہمیں روک کر للکارا تو کیا کریں گے ہم؟ یوں خالی ہاتھوں مقابلہ کرلیں گے ہم ان کا؟"

"ٹھیک ہے جو تیرا جی چاہے کر یار!" شرافت علی نے کہا اور پھر ڈرائیور سے بولا "اسٹیڈیم روڈ نکل چل بھائی!"

"اچھا صاحب!" ڈرائیور نے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

اس اثنا میں ہم کیپری سنیما کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ایک ہی منٹ بعد مزارِ قائد پر جا پہنچے۔ مزار کی حد ختم ہوتے ہی دائیں ہاتھ والی سڑک پر ڈرائیور نے گاڑی ڈال دی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہاں قریب ہی وہ بنگلہ تھا جہاں شرافت علی نے ہمیں ٹھہرایا ہوا تھا لیکن ڈرائیور اُدھر جانے کے بجائے گاڑی سیدھی نکال لے گیا۔ جلد ہی ہماری گاڑی جیل کے برابر سے گزرتی ہوئی سبزی منڈی والی سڑک پر جا چڑھی۔ پیلے رنگ کی مزدا جو برابر ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھی، اب نظر نہیں آرہی تھی۔ سبزی منڈی میں اچھی خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی اس سمے۔ پھر اچانک ڈرائیور نے رفتار کم کیے بغیر گاڑی کو دائیں جانب موڑ دیا۔ یہ سڑک بالکل ویران نظر آرہی تھی۔ یہاں آبادی بھی نہیں تھی۔ ہمارے بائیں ہاتھ نیشنل اسٹیڈیم تھا۔ عین اسٹیڈیم کے سامنے پہنچ کر شرافت علی نے گاڑی ڈرائیور کو روکنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ہم سب نے ایک ساتھ گردنیں موڑ کر پیچھے آنیوالی کار کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے عقب میں سڑک بالکل ویران پڑی تھی۔ تعاقب میں آنے والی کار کا دُور دور پتا نہیں تھا۔ چند ثانیے ہم اسی طرح عقب میں نیم تاریک سڑک پر نظریں جمائے رہے۔ پھر لزی نے کہا "وہ لوگ بہت پیچھے رہ گئے شاید۔"

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کی کار ہماری کار کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکی ہو، وہ لوگ کہیں اور نکل گئے ہوں گے۔"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں ادھر اُدھر مڑتے ہوئے سکے ہوں اور سیدھے یونیورسٹی کی طرف نکلے چلے گئے ہوں صورت میں تو ہمارا ادھر آنا بے کار ہی ہوگیا۔"

"اگر وہ ہمیں کھو بیٹھے ہیں تو اب ہمارا بھٹکتے پھرنا ہی ہے، اچھا ہے اب ہم واپس گھر چلیں۔" شرافت علی نے

"ہاں، کیا کیا جائے مجبوری ہے، اب تو تیری بات پڑے گی۔ ٹھیک ہے یار۔ ڈرائیور بھائی! چل اب گھر ہی چل"

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے اسے آگے جاتے دیکھ کر کہا "یہ اب کدھر جا رہا ہے بھائی؟"

"گھر واپس چل رہے ہیں نا؟" ڈرائیور کے بجائے شرافت علی نے کہا۔

"مگر یہ تو سیدھا جا رہا ہے۔ گھر جانے کے لیے واپس تھا گاڑی کو اسے۔" میں نے متذبذب انداز میں کہا۔

"اوہ، تم کراچی کے راستوں سے واقف نہیں ہو اور سڑک ہے جو ہمیں واپس لے جائے گی، پیچھے مڑنا ضروری"

ہماری گاڑی ابھی زیادہ دُور نہیں گئی تھی کہ اچانک نظر عقب کا منظر پیش کرنے والے آئینے پر پڑی۔ ایک کار تمام روشنیاں بجھائے پوری رفتار سے ہماری طرف بڑھ وہ ہمارے بہت قریب آچکی تھی اور اس سے پہلے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا، وہ ہماری کار کے مقابلے برابر آگئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کار کے ڈرائیور نے اپنی کو ہماری گاڑی کے ساتھ رگڑتے ہوئے اسے دبانا شروع کار کے ڈرائیور نے پوری قوت کے ساتھ بریک لگا کر روک دی۔ دوسری کار بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ لوگ بہت تیزی سے دوسری جانب کے دروازے سے باہر نکلے اور کار کے پیچھے سے گھوم کر اس دوسری بڑھے۔ اس کار سے بھی چار افراد نکل کر ہماری طرف

میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور بقیہ تین ریوالوروں سے مسلح تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ کار وہ نہیں تھی جو اب تک ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ بہرحال یہ موقع ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اسٹین گن والا سب سے آگے تھا، میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے لپک کر اس کی اسٹین گن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اسے مجھ سے کسی ایسی احمقانہ حرکت کی توقع ہی نہیں رہی ہوگی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بوکھلا سا گیا۔ اس کی یہ بوکھلاہٹ اس کے ساتھ دوسرے ساتھیوں کو بھی لے ڈوبی۔ میں نے اسے سنبھلنے سے پہلے ہی پوری قوت سے اس کے پیچھے آنے والے ایک شخص پر دھکیل دیا۔ وہ دونوں الجھ کر پیچھے الٹ گئے۔ میں اس کے بقیہ دو ساتھیوں کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر مجھ سے پہلے ہی لزی ان پر جا پڑی۔ اس نے جھپٹ کے ایک کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچی اور بجلی کی سی تیزی سے اچھل کر دوسرے کی گردن پیروں میں دبا کر ایک جھٹکے سے ان دونوں کو الٹ دیا۔ ایک جھٹکے میں وہ دونوں سر کے بل زمین پر گرے تھے اور لزی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں حیرت سے لزی کو دیکھتا رہ گیا اور میری یہ حیرانی میرے دونوں حریفوں کو سنبھلنے کا موقع فراہم کر گئی۔ اسٹین گن والے نے کھڑے ہو کر اپنی اسٹین گن مجھ پر سیدھی کر کے مجھے للکارا "خبردار، اگر ذرا بھی حرکت کی تو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اس کے ساتھ پستول تانے کھڑا شرافت علی اور اس کے ڈرائیور کو کور کیے کہہ رہا تھا "شرافت علی! خیریت چاہتے ہو تو دور کھڑے ہو کر صرف تماشا دیکھنے کے سوا کوئی اور حرکت نہ کرنا، تم سے ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم صرف اس غلام جیلانی کو لے جا رہے ہیں اپنے ساتھ۔"

اس کی بات ختم ہوئی تھی کہ پیچھے سے لزی نے لات چلائی۔ میرے اور ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا، وہ اوندھے منہ زمین کی طرف جاتے ہوئے میرے قریب ہوا تو میں نے اس کے گرنے سے پہلے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے مُنہ پر مارا۔ گرتے گرتے ایک دم اچھل کر اسٹین گن والے پر جا پڑا۔ اسٹین گن والے نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔ وہ سنبھل کر سیدھا ہوا تھا کہ میں نے اس کے پیٹ میں لات مار کر اسے پھر زمین بوس کر دیا۔ اس مرتبہ اسٹین گن اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ شاید اس کے پیٹ میں میری لات کارگر ہی لگی تھی۔ نیچے گرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے گٹھڑی بن گیا تھا۔ مگر وہ جس کے مُنہ پر میں نے گھٹنا مارا تھا، بہت تیزی کے ساتھ وہ اٹھا تھا۔ اس نے اٹھتے ہی پستول مجھ پر سیدھا کر کے بے دریغ مجھے گولی مار دینے کے ارادے سے لبلبی دبا دی مگر پستول کی لبلبی جام ہو چکی تھی۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کی۔ اس کے دل میں مجھے گولی مار دینے کی حسرت ہی رہ گئی۔ وہ پستول سے ہی الجھا ہوا تھا، میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی تھام لی اور اپنے مخصوص انداز میں اس پر دباؤ ڈال کر جو جھٹکا دیا تو اس کی کہنی کا جوڑ اکھڑ گیا۔ ہلکی سی چٹ کی آواز ہوئی اور اس کے مُنہ سے زور کی کراہ نکل گئی۔ میں اسے چھوڑ کر اسٹین گن والے کی طرف متوجہ ہو گیا اور وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی اکھڑی ہوئی کہنی پکڑ کر درد سے بلبلاتے ہوئے ناچنے لگا۔ وہ اسٹین گن والا اب سنبھل چکا تھا اور اسٹین گن اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ میں نے اسکی بغل کے نیچے پسلیوں پر زور سے ٹھوکر مار دی۔ اس کا اسٹین گن کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے گر گیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چوٹ والی جگہ کو سہلاتے ہوئے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ٹھوکر کمر میں لگا کے کہا "اُٹھ اوئے کھوتے دے پُتّر! اٹھا اپنی یہ اسٹین گن۔ میں بھی تو دیکھوں یہ تجھے چلانا بھی آتی ہے یا بس یوں ہی لوگوں پر رُعب شعب ڈالنے اور کمزور دل آدمیوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہاتھ میں اٹھائے پھرتا ہے اسے تو۔"

وہ میری توقع کے بالکل خلاف اسٹین گن اٹھانے کی کوشش کرنے کے بجائے ایک دم میری طرف پلٹ پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اس نے لیٹے ہی لیٹے میرے دونوں پیروں کے درمیان اپنے پیر ڈال کر انھیں پورے زور سے دائیں بائیں کھول دیا۔ میرے دونوں پیروں کو اچانک اور اتنا شدید جھٹکا لگا کہ میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا اور میں الٹ کر پیچھے جا گرا لیکن فوراً ہی لوٹ لگا کے اس سے دور چلا گیا۔ میں دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی اسٹین گن سنبھال کے میری طرف سیدھی کر چکا تھا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر اس نے غراتے ہوئے کہا "اپنی زندگی چاہتا ہے جیلانی! تو ہاتھ اٹھا کے خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ اب میں گولی چلانے میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گا۔"

"چپ کر اوئے برادرِ عزیز! تُو جانتا نہیں ہے ابھی غلام جیلانی کو۔ معلوم ہوتا ہے تجھے میری طرف بھیجنے والے نے میرے نام کے سوا اور کچھ نہیں بتایا ہے ... پورا تعارف تو حاصل کر لے پہلے۔" یہ کہہ کر میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس کے تو وہم و گمان میں دور دور تک کہیں یہ بات نہ ہوگی کہ کوئی شخص اسٹین گن جیسے خطرناک ہتھیار کو نظر انداز کر

کے بھی حملہ کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر تو بڑے سے بڑے سُورما کے قدم اُٹھنے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے مُکّا مارا۔ وہ اس اچانک حملے سے پہلے ہی بوکھلایا ہوا تھا۔ مُکّا کھا کر اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ میں نفو راً اسٹین گن اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اسے اس کی طرف سیدھا کر کے کرخت لہجے میں للکارا۔ "خبردار او کُتّے کے بچّو! اب اگر حرکت کی کوئی کسی نے تو بھون کے رکھ دوں گا۔ ختم کر دیا یہ تماشا، تمھاری باری ختم ہوگئی ہے۔ چلو ہاتھ اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ سیدھے۔"

میرے مقابل نے بازی پلٹتے دیکھ کر فوراً ہی ہاتھ بلند کر دیے تھے۔ وہ دونوں جنھیں لزی نے سنبھال رکھا تھا، ہم سے خاصے دُور ہو گئے تھے، انھیں لزی رگیدتے ہوئے دُور تک لے گئی تھی۔ پستول ان کے، لڑائی کے دوران ہاتھوں سے نکل چکے تھے اور دست بدست جنگ میں لزی ان پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے مقابل ہی سیدھے کھڑے نہیں ہو پا رہے تھے، تو اسٹین گن کے سامنے کیسے ٹھہر جاتے۔ میری آواز سن کر لزی نے پلٹ کے میری طرف دیکھا تو فرصت کا یہ لمحہ انھیں بہت غنیمت معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اٹھ کر پوری رفتار سے سبزی منڈی کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ بلا خیز رفتار سے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر دوڑتے چلے گئے۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر آدمی میں جان بچانے کے لیے جو غیر معمولی قوت اچانک عود کر آتی ہے، وہ اس سے ایسے بھی کام کرا لیتی ہے جو عام حالات میں اس شخص کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتے۔ ایسا ہی ان دونوں کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ وہ اس تیزی سے بھاگے تھے کہ ہم میں سے کسی کا ان تک پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ میں اسٹین گن سے فائر کر کے انھیں گرا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کر کے خطرات کو دعوت دینا مناسب نہیں جانا۔ رات کے اس گمبھیر سناٹے میں اسٹین گن سے گولیاں چلنے کی آواز نہ جانے کہاں کہاں سے کس کس کو ہماری طرف کھینچ لاتی۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "گاڑی الگ کر وان ذلیلوں کی گاڑی سے۔ میں اسے انھی کی گاڑی میں ڈال کے لے چلوں گا۔"

شرافت علی بولا۔ "کیا کرو گے تم اسے اپنے ساتھ لے جا کر۔ دفع کر دو یار! اِدھر کہیں ٹھنڈا کر کے لٹا دو سالے کو۔ خواہ مخواہ کی مصیبت کھڑی نہ کر لینا اسے ساتھ لے جا کر۔ پتا نہیں کس کا پالتو جانور ہے یہ۔"

"یہی تو پتا کرنا ہے اسے اپنے ساتھ لے جا کر۔ معلوم تو ہونا چاہیے کہ کس کے اشارے پر دوڑ آیا ہے یہ ہمارے پیچھے۔"

"اس کے لیے ساتھ لیے پھرنے کی کیا ضرورت ہے... یہیں پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔"

"کہتا تو تو ٹھیک ہی ہے میرے یار! اگر یہ یہیں... سے بتا دے اپنے مالک کا نام اور پتا تو بہت سی اذیتوں... نجات مل جائے گی اسے اور ہم بھی مشقت اٹھانے سے... رہیں گے۔ کیوں بھئی کیا خیال ہے تیرا؟" میں نے اس بد... سے مخاطب ہو کر کہا۔ جو اسٹین گن کے دہانے پر ہاتھ رکھے...

"جانو کا خون رائیگاں نہیں جائے گا تجھے جیلانی! آج اگر... بچ گیا ہے ہمارے ہاتھوں سے تو اس مہلت کو غنیمت... اپنے لیے لیکن ایک بات میں تجھے بتا دوں کہ اس بار تو... جاتی سانسوں کے ساتھ واپس نہیں جا سکے گا۔"

"اوہ، تو تو بھی اس ظہیر احمد ہی کا پالتو کتا ہے۔ مگر... ہے مجھے تیرے اس آقا پر، نام تو اس کا بڑا ہے اس شہر... اس نے سارے ہی بھونکنے والے کتے پال رکھے ہیں... والا ایک بھی نہیں ملا اسے؟"

"بک بک نہ کر او نکھٹو! زبان کو لگام دے... تو جلد ہی پتا چل جائے گا تجھے کہ بھونکنے والا کون ہے اور... والا کون ہے۔"

"او ئے بھونکنا بند نہیں کرے گا تو؟" میں نے آگے... اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ لگایا اس کے مُنہ پر۔

میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑا تھا اس کے... کر پیچھے جا پڑا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اس کی گردن پر... دیا اور پھر اسے دنیا سے غافل ہونے میں بس ایک لمحہ ہی... اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے، وہ میرے ہاتھ میں جھول... گیا۔ شرافت علی نے لپک کر میرے قریب آتے ہوئے... یار! کیا بالکل ہی ختم کر دیا اسے؟"

"اتنا غیرت مند کہاں ہے یہ گیدڑ کی اولاد کہ ایک... ہاتھ میں جان سے چلا جائے۔ ابھی تو اسے بہت کچھ بھگ... اپنے بھاگ کے لکھے ہوئے کو تو نہیں مٹا سکتا یہ۔ اور... لکھنے والے نے کیا کیا لکھ دیا ہے اس کے لیے۔"

میں نے اسے نیچے ڈال دیا۔ شرافت علی نے اسے... دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے ہوش ہو گیا ہے یہ۔ کمال ہے یار، جلد... ہی ہاتھ میں نشے سے بے سدھ ہو گیا یہ تو۔ تیرا ہاتھ ہے یا...

وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے جھانپڑ مارنے سے... ہو گیا ہے۔ اسی لیے وہ اس قدر حیرانی کا اظہار کر رہا تھا... کیا معلوم تھا کہ کمال میرے مارنے کا نہیں تھا بلکہ یہ سا... میری اس انگلی کا تھا جو آدمی کی گردن پر پہنچتے ہی اس... رگِ احساس تلاش کر لیتی تھی اور اب تو اس فن میں...

طاق ہو چکی تھی وہ کہ غلطی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں رہا تھا۔ گردن پر پہنچتے ہی وہ ٹھیک اس جگہ جا ٹکتی تھی جہاں آدمی کی وہ کل فٹ کی ہوئی تھی اس کے خالق نے جسے دباتے ہی اچھے بھلے انسان کے سارے کل پرزے ڈھیلے ہو جاتے تھے اور وہ کھڑے کھڑے کسی بے بنیاد ستون کی طرح ڈھے جاتا تھا۔

میں نے شرافت علی کی بات کا کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اس کی طرف مڑ گیا جس کا ایک ہاتھ میں نے کہنی سے اکھاڑ کر ناکارہ کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جگہ پڑا، جھولتے ہوئے ہاتھ کو رانوں میں دبائے تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ لزی نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ "کیا تلاش کر رہے ہیں جنابِ عالی؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر نگاہیں چاروں طرف دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس دوسرے دشمن کو دیکھ رہا ہوں جس کا ہاتھ اُکھڑ گیا تھا۔ تعجب ہے وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

"میں نے اسے اپنی کار میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ابھی چند لمحے پیشتر۔ میرا خیال ہے وہ وہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔"

اسی وقت میں نے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور اس سے پہلے کہ میں یہ اندازہ کرتا کون سی کار اسٹارٹ ہوئی ہے، دشمنوں کی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شرافت علی کی کار سے رگڑ کھاتی ہوئی تیزی سے آگے نکل کر سڑک پر سیدھی دوڑنے لگی۔ شرافت علی اور اس کا ڈرائیور بوکھلائے سے "ارے ارے" کہتے کچھ دُور اس کے پیچھے دوڑے تھے مگر جب میں نے انھیں آواز دے کر بتایا کہ اب اس کا تعاقب کرنا بے کار ہے تو وہ دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے شرافت علی کھڑا دور ہوتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا پھر میری طرف مڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "بھاگ گیا بزدل!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں یار ایسا نہیں کہو اسے، وہ جس حالت میں کار چلا رہا ہے اسے بزدلی نہیں کہا جا سکتا۔"

"نہیں، میرا خیال ہے اسے ہوا کچھ نہیں تھا، یوں ہی مکر کر رہا تھا وہ، بھاگنے کا موقع حاصل کرنے کی خاطر۔"

"یہ کیسے سمجھ لیا تم نے؟ کیا اس کی حالت دیکھ نہیں سکے تھے تم؟ کیسا بلبلا رہا تھا وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر؟"

"اسی سے تو اندازہ ہوتا ہے، وہ ہاتھ کی تکلیف کا بہانہ کر رہا تھا ورنہ اس طرح گاڑی کیسے دوڑا سکتا تھا؟"

"آج تک ایسا نہیں ہوا شرافت علی! غلام جیلانی کے ہاتھ میں جس شخص کی کلائی ایک بار آ جاتی ہے اس کا ہاتھ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کے ایک ہاتھ کی کہنی اکھڑی ہوئی ہے۔ یہ اس کی جی داری ہے کہ اس کے باوجود وہ اس تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا لے گیا ہے۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالنا آسان کام نہیں ہے جبکہ دوسرے ہاتھ میں شدید تکلیف بھی ہو رہی ہو۔ اسے اپنے اکھڑے ہوئے ہاتھ کو بھی سنبھالنا پڑ رہا ہوگا۔"

"چلو خیر ہوگا خاک ڈالو اب اس پر۔ چلو واپس چلیں ہم لوگ بھی۔ مگر اس کا کیا کرو گے؟" اس نے بے ہوش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی ڈال لو گاڑی میں اپنی۔ گھر چل کر معلوم کریں گے اس سے حدودِ اربعہ اس کا۔"

"یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ انھیں ظہیر احمد نے تمھارے پیچھے چھوڑا ہوا ہے۔ پھر اور کیا معلوم کرو گے تم اس سے؟"

لزی بولی۔ "ہاں جنابِ عالی! شرافت علی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ جب یہ معلوم ہو ہی چکا ہے ہمیں کہ یہ لوگ کس کے اشارے پر ہمارے پیچھے آئے تھے تو پھر اس مصیبت کو ساتھ لیے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں پڑا رہنے دیں اسے، ہوش میں آنے کے بعد خود ہی چلا جائے گا جہاں جانا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "وہ ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو سوچو اگر اپنی بے ہوشی کے دوران گشت پر نکلی ہوئی کسی پولیس پارٹی کے ہاتھ لگ گیا یہ تو ہمارے لیے پریشانیاں نہیں کھڑی کر دے گا؟"

"میں سمجھا نہیں۔" شرافت علی بولا۔ "کیسی پریشانیاں کھڑی کر سکے گا یہ ہمارے لیے؟"

"تعجب ہے یار! یہ سیدھی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تمھارے۔ کیا ہوش میں آنے کے بعد پولیس کو یہ نہیں بتائے گا کہ اسے کون لوگ اس حالت میں پہنچا کر یہاں ڈال گئے ہیں؟ اور اس کے بیان پر پولیس ہمارے پیچھے نہیں آئے گی؟"

"کیسی باتیں کرتا ہے یار جیلانی تو بھی۔ یہ ایسا کوئی بیان دے کر خود کیسے بچ سکے گا پھر؟ اسے یہ بھی تو بتانا پڑے گا پولیس کو کہ آخر ہم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا ہے۔ اس سے ہماری کیا دشمنی ہے اور یہ اتنی رات گئے یہاں پہنچا کس طرح؟ کیوں آیا تھا یہ یہاں؟ پولیس سب سے پہلے تو خود اسی کے بخیے اُدھیڑنا شروع کرے گی۔ ایسے بھولے بادشاہ تو نہیں ہوتے پولیس والے کہ کسی کا بیان سنتے ہی اس پر یقین کر لیں اور اس کے بتائے ہوئے آدمیوں کے پیچھے دوڑ پڑیں۔ تیرا تو بڑا یارانہ رہا ہے پولیس سے۔ تو جانتا نہیں ہے انھیں کیا؟ جو ایسی باتیں کر رہا ہے؟"

بات اس کی بھی بڑی حد تک معقول اور مناسب تھی

چنانچہ ہم نے اسے وہیں چھوڑا اور دوبارہ کار میں سوار ہو کر شرافت علی کے اس مہمان خانے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں اس نے ہمیں ٹھہرا رکھا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لزی سے کہا۔ "آج میں اکیلا ہی ان لوگوں کی تلاش میں نکلوں گا جو ہمیں ائیرپورٹ سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہیرے ان ہی دونوں میں سے کسی ایک نے اُڑائے ہیں۔"

"یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا کوئی خاص بات یاد آئی ہے آپ کو؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے جس سے اُن کے مجرم ہونے کا ثبوت مل سکے لیکن اس معاملے میں ان کے سوا کسی اور کو مجرم ٹھہرایا بھی نہیں جا سکتا۔ میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گردش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ ہیرے ہتھیانا نہیں چاہتے تھے یا انھیں ہمارے پاس ان کی موجودگی کا علم نہیں تھا تو پھر وہ ہمیں دھوکا دے کر اپنے ہمراہ کیوں لے گئے تھے؟ کون لوگ تھے وہ اور انھیں ہم سے کیا دلچسپی تھی جو انھوں نے یہ سب بکھیڑا کیا تھا؟"

"ہاں، یہ بات غور طلب ہے۔ میں بھی اس مسئلے پر اکثر غور کرتی رہی ہوں مگر یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی کہ انھوں نے محض ہیروں کی خاطر یہ سب کچھ کیا تھا۔ اگر ہیرے ہی حاصل کرنا ہوتے انھیں تو وہ اتنی خاطر داری نہیں کرتے ہماری۔"

یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ہیرے حاصل کرنا ان کا مقصد نہیں تھا اور یہ بات بھی کسی طرح میرے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی کہ ہیرے ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک نے بھی اڑائے ہیں۔ وہ ایک سپر پاور کے لیے کام کر رہے تھے چنانچہ وہ ایسے کنگال یا اچکے نہیں ہو سکتے تھے کہ چند لاکھ کے ہیرے دیکھ کر ان کی نیت بدل جاتی۔ انھیں شاید گر یگری نے میرے بارے میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انھیں کب اور کس طرح خود کو مجھ سے متعارف کرانا ہے چنانچہ ان سے ایک غلطی ہو گئی، وہ وقت سے بہت پہلے میرے سامنے آ گئے تھے۔ انھوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ انھیں یہاں پہنچنے کے بعد میری حفاظت کرنا ہے اور ان لوگوں سے دور رکھنا ہے جو کسی جرائم پیشہ تنظیم سے متعلق ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ائیرپورٹ پر ہی میرے استقبال کی تیاری کر ڈالی۔ مجھے امید تھی وہ لوگ اگر دوبارہ مجھے مل گئے تو ان ہیروں کا کوئی سراغ ان سے ضرور مل جائے گا لیکن اس وقت میں ان کی تلاش میں نہیں نکل رہا تھا۔ یہ تو صرف ایک بہانہ ہی تھا۔ اصل میں تو مجھے لزی اور شرافت علی سے فی الحال اپنی جان چھڑانا تھی تاکہ دوپہر بارہ بجے ہل پارک میں گر یگری سے مل سکوں۔ مجھے حیرت تھی آخر حالات نے اچانک ایسا کون سا رُخ اختیار کر لیا کہ گر یگری کو بذاتِ خود یہاں آنا پڑ گیا اور اس نے مجھے ہل پارک میں ملنے کے لیے کیوں بلایا ہے؟

میں نے لزی سے کہا "تم ان کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان نہ کرو۔ میں انھیں جلد ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ لندن کے اس سمندر میں انھیں تلاش کر لینا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں اور جس دن وہ مجھے مل گئے اُن کے تمام اغراض و مقاصد معلوم ہو جائیں گے ہمیں۔ میرے سامنے زیادہ دیر پوشیدہ نہیں رکھ سکیں گے وہ اپنے دروں بروں کو۔ فر فر بولتے چلے جائیں گے۔"

"مجھے یقین ہے جنابِ عالی کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کے درست ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ آپ کے کمالات سے تو اب میں اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔ جس کے مقابل آ کر ہتھیار بے بس ہو جاتے ہوں اس کے آگے انسان کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک بار ہتھے چڑھ جائیں وہ آپ کے پھر ان کی زبانیں سارا کا سارا سچ اُگل دیں گی آپ کے سامنے۔"

"ویسے ایک بات ہے لزی بیگم! فنکارہ تو تم بھی چھوٹی موٹی نہیں ہو۔ بڑے ہُنر چھپا رکھے ہیں تم نے اپنے اندر۔"

"ارے نہیں جنابِ عالی! آپ سے بھلا میرا کیا مقابلہ۔ آپ ایک مضبوط سنگین چٹان ہیں اور میں ایک معمولی سا پتھر جسے کوئی بھی راہ گیر چلتے چلتے ٹھوکر مار کر ادھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ بڑا فرق ہے میرے اور آپ کے مقام اور مرتبے میں۔"

"تم کتنی معمولی ہو، یہ تو مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب تم نے جانو کو مُردہ چوہے کی طرح گھما کر کار پر دے مارا تھا۔ ایک ہی ضرب میں اس پھنّے خاں کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ دوبارہ سانس لینا بھول گیا تھا وہ سانڈ۔"

"اوہ!" وہ ہنس کر بولی۔ "وہ تو بس اتفاق تھا، اس کی ٹانگیں ہاتھ میں آ گئی تھیں میرے۔ اسے کوئی اہمیت نہ دیں۔"

"اور وہ گینڈے جیسا ڈھائی من کا آدمی جس طرح چلا گیا تھا زمین سے وہ بھی اتفاق ہی ہو گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسی، بولی "ارے آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے ہیں جنابِ عالی! آپ کی شہ پر تو گیدڑ بھی شیر بن سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ تم بھی میری ہی شہ پر شیر کی بیٹی بن گئی تھیں اس وقت۔ میں نے کوئی سحر پھونک دیا تھا تم پر۔"

"اب چھوڑیں جنابِ عالی! اس قصے کو۔ کیوں ان بے کار باتوں میں وقت برباد کر رہے ہیں اپنا۔ میں نے تو کبھی آپ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کیں۔ آپ کی صلاحیتوں پر اور نت نئے واقعات پر کبھی نہ تعجب کا اظہار کیا نہ آپ سے سوالات کیے۔ پھر آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ بھول جائیں سب کچھ اور صرف اتنا یاد رکھیں کہ ہم دونوں جو کچھ بھی ہیں، جیسے بھی ہیں ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ قہرِ خداوندی اگر ہیں تو دشمنوں کے لیے ہیں، ایک دوسرے کے لیے تو رحمتِ خداوندی ہیں، مجسّم خلوص و محبت ہیں اور بس۔ میری تمام صلاحیتیں ساری شہ زوری آپ کے نام ہے۔"

وہ خلوص و وفا کی تصویر نظر آنے لگی تھی۔ اس کے رونئیں رونئیں سے محبت کے سوتے پھوٹتے دکھائی دینے لگے تھے اس گھڑی اسے دیکھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ فریب اور ریا کے نام سے آشنا ہو گی۔ اس کی آواز میں جو شیرینی تھی، جو شہد بھرا ہوا تھا اس کے لہجے میں، وہ تو پتھر دلوں کو بھی موم کر سکتا تھا۔ میرا دل بھی اس کی اس وقت کی کیفیت کے فریب میں آنے لگا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ اس کی حقیقت کو فراموش کر کے اس کی جانب کھنچنے لگا تھا لیکن عقل نے اسے بروقت سنبھال لیا۔ اس فریب کار کے لیے میرے ہونٹوں پر بھی ایک پُرفریب مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو لزی بیگم! ہماری محبت کے درمیان ان معمولی معمولی باتوں کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں یہی مطلب تھا میرا بھی۔ اگر آدمی اپنوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھ لے تو خود اس کے لیے بھی مفید ہوتا ہے یہ۔ بہت سی الجھنوں سے بچا رہتا ہے وہ اور کسی سے تعلقات بھی نہیں بگڑتے۔ پُرسکون اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے آدمی کے مزاج میں لچک ہونا بہت ضروری ہے۔"

"ہاں، یہ بات جی کو لگتی ہے تمھاری۔ آئندہ میں خیال رکھوں گا اس بات کا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔ شرافت علی اگر پوچھے تو اسے بتا دینا میں ان ہیرے اُڑانے والوں کی تلاش میں گیا ہوں۔"

"واپسی کب تک ہو گی آپ کی؟ اگر دیر تک باہر رہنے کا پروگرام ہو تو میں بھی نکل جاتی ہوں کہیں۔"

"کہاں جانے کا ارادہ ہے تمھارا؟ کوئی خاص کام ہے کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"کام تو کوئی خاص نہیں ہے۔ اکیلے گھر میں بور ہونے سے بچنے کے لیے شہر گھومنے پھرنے نکل جاؤں گی اور کہاں جانا ہے مجھے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ میں شرافت علی کو فون کر کے بتا دیتا ہوں، ہم دونوں آج دن بھر گھر سے غائب رہیں گے۔"

"ہاں، اسے ضرور بتا دیں آپ اور باہر نکلتے ہوئے یہ اطمینان بھی کر لیں کہ کوئی آپ کی گھات میں... تو نہیں بیٹھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر نکلنے کے بعد کسی اور جھمیلے میں الجھ جائیں اور اصل کام رہ ہی جائے۔"

"ہاں، یہ معلوم کر لینا چاہیے ویسے امید تو نہیں ہے مجھے۔ جانو کے عبرت ناک انجام اور رات کے واقعے کے بعد اب کوئی اندھا دھند اقدام کرنے سے گریز ہی کرے گا وہ ظہیر احمد۔ پھر بھی ہمیں اپنی طرف سے احتیاط ہی کرنا چاہیے۔ تم ایسا کرو گاڑی لے کر باہر نکل جاؤ اور یہ دیکھو کوئی تمھارا تعاقب کرتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی گاڑی تمھارے پیچھے آئے تو اسے اپنے ساتھ لگا کر لے جانا۔ میں پانچ منٹ بعد گھر سے نکلوں گا اور کوئی ٹیکسی پکڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم دس منٹ اسے ادھر اُدھر چکر دے کر واپس آ جانا۔ اس طرح مجھے اُن سے بچ کر نکل جانے کا موقع مل جائے گا۔ گھر آ کے تم شرافت علی کو تعاقب کرنے والے کے بارے میں فون کر کے بتا دینا پھر وہ کوئی بندوبست کر دے گا اس کا۔"

"یہ تجویز اچھی ہے آپ کی۔ میں جا رہی ہوں پھر۔ آپ شرافت علی کو یہ بھی بتا دیں کہ وہ گھر میں موجود رہ کر پندرہ، بیس منٹ انتظار کرے۔ شاید مجھے اس کی ضرورت پیش آ ہی جائے۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور میں شرافت علی سے بات کرنے کے لیے فون اٹھا کر..... نمبر ڈائل کرنے لگا۔

لزی کے جانے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد میں گھر سے نکل آیا۔ شرافت علی نے میرے لیے دوسری کار بھیجنے کو کہا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے ٹیکسی میں ہل پارک پہنچنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ایک تو مجھے ہل پارک کا راستہ نہیں معلوم تھا، دوسرے میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ شرافت علی کو میرے ہل پارک جا کر گر یگری سے ملنے کی خبر ہو۔ اگر میں اس کی کار استعمال کرتا تو اس کے یا اس کے کسی کارندے کی نظر میں آ سکتا تھا۔ وہ لوگ جن کا شرافت علی سے تعلق تھا، اس کی کار پہچان کے اسے یہ بتا سکتے تھے کہ انھوں نے اس کار کو کہاں دیکھا تھا۔ بات اگر دیکھنے کی حد تک ہوتی تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں جن لوگوں کی تلاش میں گھر سے نکل رہا تھا انھیں ڈھونڈتا ہوا شہر کے کسی بھی تفریحی مقام پر پہنچ سکتا تھا۔ ڈر صرف یہ تھا کہ گر یگری سے ملاقات کے دوران کوئی مجھے یا میری گاڑی کو نہ پہچان لے۔

مین روڈ پر آ کے میں دیر تک کسی خالی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا لیکن مجھے کوئی ایسی ٹیکسی نظر نہ آ سکی جسے میں اپنے لیے روک سکتا۔ اسی وقت ایک بس آ کر مجھ سے ذرا فاصلے پر رُک گئی۔ اس میں آدمی بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بس کنڈیکٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر

آواز لگا رہا تھا: "صدر، ٹاور، کیماڑی، کیماڑی کیماڑی۔" اس اسٹاپ پر بس سے تین آدمی اترے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی ابھی صرف دس بجے تھے اور مجھے بارہ بجے ہل پارک پہنچنا تھا لہٰذا وقت گزاری کے خیال سے میں دوڑ کر اس بس پر چڑھ گیا۔ میرے چڑھتے ہی بس چل پڑی، بیٹھنے کے لیے جگہ ملنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، پَیر ٹکا کر کھڑے ہونے کو جگہ مل گئی تھی یہی غنیمت تھا۔

میرا خیال ہے کہ جس رات میں اپنی بہن آسیہ کی زندگی کے لیے شادمانیاں حاصل کرنے گھر سے نکلا تھا، اس رات میرے بخت کا ستارہ کسی بہت ہی نحس گھر میں داخل ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو میں ان بُردہ فروشوں کے گھر میں جا گھسا تھا۔ اس گھر سے حاصل ہونے والی نحوستیں کسی طرح میری جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ عافیت اسی رات میری زندگی سے رخصت ہوگئی تھی، سکون کے لمحات مُنہ موڑ کر کہیں اتنی دور چلے گئے تھے کہ اب مجھ تک پہنچنے کا راستہ ہی گم کر بیٹھے تھے.... میری زندگی میں خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ جدھر سے گزرتا تھا، جو راہ اختیار کرتا تھا یہ پُرخار جھاڑیاں میری راہ میں حائل ہوجاتی تھیں یا میرا دامن اس طرح الجھا لیتی تھیں کہ میں آگے بڑھنے کے بجائے ان سے اپنا دامن چھڑانے کی جستجو میں مصروف ہوجاتا تھا۔ ارادہ کہیں کا کر کے چلتا تھا اور جا کہیں پہنچتا تھا۔ ایک بار گھر سے نکلا تھا آسیہ کے نصیبوں کو سنوارنے کی نیّت سے تو جرائم کی دلدل میں جا اترا۔ اس روز بھی اس کے لیے آزادی خریدنے نکلا تھا مگر میری خم یارہ تقدیر نے مجھے امریکا کی ریاست سان فرانسسکو میں جا اتارا تھا۔ وہاں سے بمشکل واپسی کی راہ ملی تو یہاں کراچی پہنچتے ہی نت نئی آفات نے آن گھیرا تھا۔ میں جلد از جلد لاہور جانا چاہتا تھا مگر یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ ہی سجھائی نہیں دے رہی تھی مجھے۔ لاکھوں روپے کے ہیرے کسی رذیل نے اڑا لیے تھے میری تحویل سے اور اب ان کا سُراغ لگا کر انھیں دوبارہ حاصل کرنا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ حالانکہ شرافت علی کا رویّہ اب بڑی حد تک تبدیل ہوچکا تھا، وہ ہیروں کے سلسلے میں اب اتنا فکرمند یا پریشان نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ لوگ جن سے میرا واسطہ تھا، جو اُن ہیروں کے اصل مالک تھے، اتنے کشادہ دل کے مالک نہیں تھے کہ مجھ سے ان کا حساب لینا بھول جاتے۔ یوں تو میری زندگی کا مقصد ہی اب انھیں زِک پہنچانا اور ان کی جڑیں اکھاڑ کر ان کو نیست و نابود کر دینا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں کُھل کر ان کے سامنے نہ آؤں۔ جس طرح وہ دوستی کے لبادے میں چھپ کر اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کر دوسروں کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں، میں بھی اسی طرح ان کی جڑوں میں جا اتروں اور ایک دَم انھیں اکھاڑ کر پھینک دوں۔

کنڈیکٹر نے بس کے صدر پہنچنے کا اعلان کیا تو مجھے اچانک خیال آیا، میں نے اس سے ابھی تک ٹکٹ نہیں لیا تھا۔ لوگ مجھے دھکّے دیتے ہوئے بس سے نیچے اترنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے ٹکٹ خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالنا چاہے لیکن جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کوئی ہاتھ پہلے ہی میری جیب میں موجود تھا۔ وہ فنکار میری جیب خالی کرچکا تھا، اگر ایک لمحے اور میں اُدھر ہاتھ نہ لے جاتا تو مجھے اپنے لٹنے کی خبر ہوتی، نہ لوٹنے والے کا پتا چلتا۔ میں نے اپنی جیب سے نکلتے ہوئے ہاتھ کو تیزی سے اپنی گرفت میں لے کر اس فنکار کو دیکھا جس نے چور کے گھر میں داخل ہونا چاہا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی خوش پوش مگر مریل سا جوان تھا۔ یہ تھا وہ بہت دیدہ دلیر قسم کا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا، اس نے چلّا کر کہا: "اوئے شرم نہیں آتی تجھے۔ اتنا ہٹا کٹا آدمی ہے اور جیبیں کاٹتا ہے لوگوں کی۔"

"واہ بھئی واہ! صدقے جاؤں تیری اس ادا کے۔ چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

آس پاس کھڑے اور بیٹھے کئی لوگ ہماری طرف متوجّہ ہوگئے تھے۔ میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک آدمی نے پیچھے سے میری گردن پکڑ کر کہا: "کیا بات ہے پہلوان؟ اس بچے کیوں تڑی لگاتا ہے تم؟ بدمعاش لگتا ہے کیا تم اِدھر کا؟"

"دیکھیں جی! میری جیب سے پیسے نکال لینے لگا تھا یہ۔ میں نے دیکھ لیا تو میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے ہی گرہ کٹ بنانے لگا۔"

میں نے دیکھا کہ لوگ اس گرہ کٹ کی بات پر یقین کر کے مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ دو ایک نے تو مجھے مجرم تسلیم کر کے آوازیں بھی لگا دیں: "مارو سالے کو، پولیس کے حوالے کر دو بدمعاش کو....."

اس کے ساتھ ہی میری گردن پکڑنے والے نے میرے سر پر ایک ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا: "مارو سالے کو.... مار..."

میرے لیے یہ صورتِ حال بہت پریشان کُن تھی۔ اس اچکّے نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کا میں ایک ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اور بس کے اندر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں اُن سے دور ہو کر بیک وقت ان سب کو اپنے اُوپر حملہ آور ہونے سے روک سکتا۔ وہاں کوئی میری بات سننے یا مجھے صفائی کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حالات بگڑتے دیکھ کر میں نے پوری قوت سے اس شخص کے پیٹ میں کہنی ماری، جو پیچھے سے میری گردن تھامے لوگوں کو مجھے زد و کوب کرنے پر اکسا رہا تھا۔ اسے شاید مجھ سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ کُہنی لگتے ہی میری گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ الٹ کر پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں پر جا گرا۔ میں اس کمینے گرہ کٹ کا ہاتھ پکڑے پکڑے پیچھے مڑا اور ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے کھینچ کر اس کے مُنہ پر زوردار تھپّڑ رسید کرتے ہوئے کہا: "سُؤر کی اولاد! معصوم بن کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہے ...... بتا گرہ کٹ کون ہے؟" میں نے ایک اور تھپڑ مارا اسے۔

اس بار اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا میرے تھپڑ سے اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ اس اثنا میں جو میری کہنی سے چوٹ کھا کر گرا تھا، سنبھل کے دوبارہ کھڑا ہوگیا تھا اور مجھے گالیاں دیتے ہوئے لوگوں سے کہہ رہا تھا: "دیکھو کیسا اندھیر ہے۔ اس غریب کے پیسے نکال رہا تھا، پکڑا گیا تو الٹا اسی کو مار رہا ہے اور......"

میں نے ایک قدم بڑھ کر اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ "اوئے ذلیل دے پتّر! تو بھی مجھے اس کا ساتھی ہی لگتا ہے۔ چلو سالے! تھانے چلو میرے ساتھ۔ وہاں پوچھوں گا میں تم سے جیب کون کاٹ رہا تھا۔"

تھانے کے نام اور میرے کرخت لہجے نے سب کو چونکا دیا تھا۔ اس کی گالیاں نکالتی ہوئی زبان ایک دم رک گئی۔ اس نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر فوراً ہی بولا: "کیسا زمانہ آگیا ہے یارو! کچھ ہی نہیں چلتا کون چور ہے کون ساہوکار۔" پھر مجھ سے بولا: "معاف کرنا بھائی جی! اس کمینے نے گمراہ کر دیا تھا مجھے۔ سالا کیسا معصوم بنا ہوا ہے۔" اس نے بڑھ کر اس گرہ کٹ کو مارنا چاہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور اس کی کلائی تھام کر بولا: "یہ نہ سمجھ لینا بچو کہ تو مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اور کون کون ہے تمھارے ساتھ؟ سچ سچ بتا دو نہیں تو کھال اتار لوں گا تم دونوں کی۔"

"وہ غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو جناب! میں ساتھی نہیں ہوں اس کا۔ آپ قسم لے لیں جی مجھ سے۔"

"بک نہیں اوئے۔" میں نے اسے ڈانٹ کر اس دوسرے کو مخاطب کیا جس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ "ہاں بھئی! بتائے گا تو سچ سچ یا تھانے میں چھتر کھا کے بولے گا؟"

اسے شاید دو ہی تھپڑ کھا کے اندازہ ہوگیا تھا کہ آج کسی غلط ہاتھ میں جا پڑا ہے وہ۔ لہٰذا اس نے بولنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ "وہ جی! یہ میدا ہی ہے بس۔ یہی کاٹتا ہے جی جیبیں ان بسوں میں۔ کیتا ہے، پیر کالونی سے صدر تک اس کا علاقہ ہے۔ کوئی اور جیب کترا نہیں کرسکتا کوئی واردات اِدھر۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس میدے کے ایک تھپڑ لگایا۔ "کیوں اوئے وارداتیے۔ کیا کہتا ہے یہ باپ تیرا؟ ایں، ٹریننگ دینے کو ساتھ لایا ہے نا تو اسے؟"

میں اسے کھینچتا ہوا بس سے نیچے لے آیا۔ میرے نیچے اترتے ہی بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر جو اب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے، بس کو دوڑا کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے بھی کون سا ان دونوں کو تھانے ہی لے جانا تھا۔ پولیس تھانے کے چکر میں پڑ کر میرا وقت ہی برباد ہوتا تھا۔ پتا نہیں کب جان چھوٹتی میری ان سے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جان چھوٹتی بھی یا نہیں۔ ملک بھر کی پولیس کے پاس میری تصویریں اور میرے اعمال کی مکمل فہرست موجود تھی۔ میری گرفتاری پہ پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر تھا۔ یہ پچاس ہزار روپے کا لالچ ایسا تھا کہ پولیس کا ہر چھوٹا بڑا اہلکار میری تصویر آنکھوں میں بسائے پھرتا ہوگا۔ اگر کسی کو بھی یاد آجاتا میں تو پھر میرے لیے تھانے سے باہر آنے والا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

کچھ لوگ بس میں ہنگامہ ہوتے دیکھ کر تماشا دیکھنے یا اس کی وجہ جاننے کے لیے چلتے چلتے رک کر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگے مگر میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور میدے کو کھینچتا ہوا یوں ایک طرف چل دیا جیسے واقعی میں اسے تھانے لے جا رہا ہوں۔ بھیڑ بھاڑ سے آگے نکل آنے کے بعد میدے نے آہستہ سے کہا: "اس علاقے میں نئے آئے ہو چودھری جی؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا: "وہ تیرا پٹھا کدھر رہ گیا ہے میدے پہلوان؟ ٹریننگ تو خوب دی ہے تو نے اسے، پر ابھی کچا ہے بہت۔ کچھ دن بھٹی میں رکھ اسے۔"

"ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جی اسے۔ مہینہ بھر میں جیسا بن گیا ہے وہ، میں تو چھ مہینے میں بھی ایسا نہیں بن سکا تھا۔ سچی بات یہ ہے چودھری! ایک دن مجھے الگ بٹھا دے گا وہ۔"

"پر وہ گیا کدھر؟ یوں لگتا ہے جیسے وہ بس میں ہی رہ گیا ہو۔"

"ہوسکتا ہے وہ بس میں رہ گیا ہو۔ وہ بس کا کنڈیکٹر بھی اپنا ہی بندہ ہے جی۔ وہ اسے بچا کر لے گیا ہوگا۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا: "جا پھر تو بھی دوڑ جا اِدھر سے۔ آئندہ خیال رکھنا، اُستادوں سے داؤ نہ کرنا کبھی۔"

وہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگا۔ "اوئے کیا تو بھی اپنی ہی لائن کا بندہ تو نہیں ہے یار جی، کچھ سمجھ نہیں آئی مجھے تیری؟"

"او جا یار! کام کر اپنا، جان چھوڑ میری۔ بہت کام کرنا ہیں ابھی مجھے۔ چل دوڑ جا اب جلدی سے۔"

اس نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اپنے دونوں شانے اُچکائے اور پھر تیزی سے مُڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میں چند ثانیے کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جلد ہی وہ لوگوں کے ہجوم میں کہیں گم ہو گیا۔ میں نے اس سے جلدی جان چھوٹ جانے پر اطمینان کا سانس لیا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑ گئی تھی میرے۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہ علاقہ ایمپریس مارکیٹ کا تھا اور میرے سامنے ہی ایمپریس مارکیٹ کے بالا بلند گیٹ کے بالکل اوپر ٹاور بنا ہوا تھا۔ اس ٹاور میں لگی ہوئی گھڑی سوا گیارہ بجنے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ میں نے سوچا اب مجھے ہل پارک کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔ نہ جانے وہ یہاں سے کتنی دور ہے اور کتنی دیر لگے گی مجھے وہاں تک پہنچنے میں۔

قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر میں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی خالی ہی تھی، میرا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے اسے میرے بالکل سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ ”کدھر جانا ہے باؤ؟“

”وہ بھائی جی! ہل پارک لے چل ذرا مجھے۔ کتنی دیر لگے گی ہمیں وہاں پہنچنے میں؟“

”دیر شیر کی فکر ہی نہ کرو باؤ جی! پنج منٹ میں پُچا دوں گا۔ پر میٹر سے پنج روپیہ جیادہ ہوں گے۔“

”اوئے وہ کیوں بھئی؟ کوئی جاگیردار تو نئیں لگدا میں شکل سے تینوں؟“

”نئیں جناب! تُسی تو سمجھدار بندے ہو۔ پتا ہے تہانوں اس ویلے سواری نئیں لبدی کوئی اُدھر۔“

”چل ٹھیک ہے ویر میرے۔ لے لینا تو پانچ روپے زیادہ۔ پر ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے بارہ بجے ہل پارک پہنچنا ہے۔ اس سے نہ پہلے اور نہ بعد۔ بول منظور ہے تجھے؟“ میں نے اس سے کہا۔

”بالکل بالکل جناب! کھادم ہیں سرکار ہم تو۔ جب بھی حکم کرو گے پُچا دیں گے ہل پارک۔“ اس نے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے ٹیکسی کے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کتنی دور ہے ہل پارک یہاں سے؟“

اس نے پیچھے مڑ کر بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کراچی پہلی واری آئے ہو لگتا ہے۔ کس پنڈ سے آتے ہو چودھری؟“

”اوئے میں پینڈو لگتا ہوں تجھے شکل سے؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تیرا؟“

وہ گھبرا کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”تسی تاں ایویں ای بُرا مان گئے جناب عالی! یہ مطلب تو نئیں تھا میرا۔“

”اور پھر کیا مطلب تھا تیرا؟ کسی پنڈ کا چودھری نہیں سمجھا تھا تو نے مجھے؟“

”نئیں جناب! غلط فہمی لگ گئی ہے آپ کو۔ آپ نے پوچھا تھا ہل پارک کتنی دور ہے۔ تو میں سمجھا آپ پہلی بار آئے ہیں کراچی۔ اِدھر کراچی کا تو ہر بندہ جانتا ہے صدر سے ہل پارک کتنی دور ہے۔“ اس نے گاڑی آگے بڑھا کر کہا۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی نیا ہوں کراچی میں۔ کون سی جگہ کدھر ہے زیادہ نہیں جانتا میں۔ پر اس ناواقفیت سے آدمی پینڈو تو نہیں ہو جاتا نا؟ تُو کس پنڈ سے آیا ہے اِدھر؟“ میں نے اس کا سوال اسی کو لوٹا دیا۔

”میں تو جناب عالی! اُدھر کچا کھوہ سے آیا ہوں۔ چار سال ہو گئے ہیں کراچی میں مجھے۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ تُو خود پنڈ سے آیا ہے اسی لیے تجھے یہاں آنے والا ہر بندہ پنڈ سے آیا ہوا لگتا ہے۔“

”ہاں جی کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔ ویسے تُسی کتھوں آئے ہو؟“

”لاہور سے آیا ہوں میں۔ داتا کی نگری لاہور کا شہری ہوں۔ آئی کچھ سمجھ؟“

”ہاں جی آگئی سمجھ۔ کیا بات ہے جی لاہور کی۔ بڑا سوہنا شہر ہے۔ دیکھا ہے میں نے۔ ایک ماہ گزارا تھا اُدھر بھی۔ پر جی دھندا نئیں ہے اُدھر۔ بڑی جان مارنی پڑتی ہے۔ اِدھر کمائی بہت ہے۔ بھوکا مر ہی نئیں سکتا کوئی۔ آپ بھی کوئی نوکری شوکری کے چکر میں آئے ہیں نا؟ یا کاروبار کرنا چاہتے ہیں کوئی؟“

”نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں ہی سیر کرنے چلا آیا ہوں۔ بڑی تعریفیں سنتا تھا میں اس شہر کراچی کی۔ بہت جی کرتا تھا روشنیوں کا یہ شہر دیکھنے کو۔ بڑا غریب پرور شہر ہے یہ ہمارے ملک کا۔“

”یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے جی، دیس دیس نگر کا بندہ سمایا ہوا ہے اس شہر میں۔ غریب پرور تو ہے یہ۔“

”تو نے بتایا نہیں مجھے، ہل پارک ہے کتنی دور؟“ میں نے اپنا سوال ایک بار پھر دُہرایا۔

”بہت دور تو نئیں ہے جی! بس کوئی پنج ست منٹ لگیں گے ہمیں۔ پر تُسی تو بارہ بجے سے پہلے نئیں پہنچنا چاہتے نا وہاں۔ اور بارہ بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی ہیں۔“

”ہاں یار! اتنی دیر تو کراچی کی سڑکوں پہ پھرا تا رہ گاڑی۔ کچھ سیر ہو جائے گی یوں بھی۔“

”بہت اچھا جناب!“ اس نے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

وہ مختلف سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا رہا، میرا ذہن بھی رفتار سے حالات کے تانے بانے بُنتا رہا۔ کبھی میں گرگیری کے کراچی آنے کی وجہ جاننے کے لیے یہاں سے سان فرانسسکو تک جن حالات سے گزرتا رہا تھا، ان کی ایک ایک کڑی ملا ملا کر دیکھتا اور غور کرتا، کبھی ماں جی کے بارے میں سوچتا اور کبھی اپنی تیرہ بخت بہن آسیہ اور آپی کی آزادی کے لیے منصوبے بناتا بگاڑتا رہا۔ اسی اُدھیڑ بُن کے دوران فرصت کے چالیس منٹ بھی میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ ڈرائیور کی آواز نے مجھے خیالوں کے ہجوم سے باہر کھینچ لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لیں جناب دیکھ لیں پورے بارہ بجے ہیں۔ بالکل ٹھیک ٹائم پر پہنچا دیا ہے میں نے آپ کو ہل پارک۔“

میں نے چونک کر دیکھا، ایک سرسبز پہاڑی کے درمیان صاف ستھری شاہراہ پر اس نے ٹیکسی کھڑی کی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبزہ تھا۔ ایک جانب چھوٹی سی جھیل بھی تھی۔ میں نے گاڑی سے نیچے اتر کر ڈرائیور کو پیسے دیے۔ وہ مسکراتے ہوئے میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ماحول کا پوری طرح جائزہ لیا۔ اس وقت وہاں ہر سمت ویرانی کا راج تھا۔ کچھ دُور ایک چھوٹی سی چڑھائی پر نیلے رنگ کی ٹویوٹا کار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کار پر نظریں جما دیں اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ گرگیری اسی کار میں یا اس کے آس پاس کہیں موجود ہو گا۔ کیوں کہ اس کار کے سوا وہاں اور کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس پر میں توجہ دیتا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ اپنے پیچھے کسی کار کی آواز سُن کر ادھر دیکھا۔ وہ ایک سفید کرولا تھی اور سیدھی میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں رک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ سفید کرولا میرے قریب پہنچی تو اس کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی۔ کار میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو میرے رگ و پے میں [illegible] نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”جلدی سے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

میں نے اس سے کوئی سوال کیے بغیر تیزی سے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور کار کے اندر گھس گیا۔ میرے بیٹھتے ہی کار کی رفتار تیز ہو گئی۔

وہ مجھے ہل پارک کے قریب ہی ایک عالی شان کوٹھی میں لے گئے۔ میں نے راستے میں فیروز سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اُس نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ کار سے اُتر کر وہ مجھے ساتھ لیے کوٹھی کے کشادہ اور خوب صورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ یہاں کی ایک ایک چیز سے کوٹھی کے مکینوں کی اَمارت کا اندازہ ہوتا تھا۔ پورے فرش پر نرم اور دبیز قالین بچھا تھا جس پر چلتے ہوئے پیر اندر دھنستے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر سبز رنگ کے ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ دیواریں مصوری کے بیش قیمت شاہکاروں سے آراستہ کی گئی تھیں، اور دیواروں کے ساتھ ساتھ جدید طرز کے آرام دہ صوفے پڑے تھے۔ دائیں جانب ایک لمبے سے صوفے پر تین اشخاص پہلے سے موجود تھے۔ ان کے جسموں پر قیمتی کپڑے کے تھری پیس سوٹ تھے۔ جسمانی اعتبار سے وہ خاصے صحت مند اور دراز قامت لگتے تھے۔ عمر اُن میں سے کسی کی بھی تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تینوں بھی مقامی ہی تھے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سب ایک ساتھ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے جس طرح کِھل اٹھے تھے۔ اس سے ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے ملنے کے خواہش مند رہے ہوں۔ اُن کے قریب پہنچ کر فیروز نے باری باری ان تینوں سے میرا تعارف کرایا۔

”ان سے ملو غلام جیلانی! یہ ہمارے بہترین دوست اور ساتھی ہیں۔ ان لوگوں نے وطنِ عزیز کی سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ یہ علی احمد بالاری ہیں۔ سندھ کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دوست محمد بروہی ہیں، ان کا تعلق بھی ایک خوش حال اور بااثر خاندان سے ہے اور یہ اللہ بخش جو کھیو ہیں۔ غریب آدمی ہیں لیکن وطن کی محبت کا بے بہا خزانہ سینے میں چھپا رکھا ہے انہوں نے۔ ایک فقط جان ہے ان کے پاس جسے وطن پر قربان کرنے کو ہر دم تیار رہتے ہیں۔“

میں نے باری باری ان تینوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوچا۔ ”کیسے عظیم لوگ ہیں یہ۔ زندگی کے لیے کتنا عظیم مقصد رکھتے ہیں یہ۔ اور جیلانی تُو کتنا بدنصیب ہے۔ ایک بہن کو شاد و آباد دیکھنے کی خاطر تو نے کتنا کھڑاک کیا۔ کیسے کیسے طوفان سے نبرد آزما رہا ہے۔ زمانے بھر کو دُشمن بنا لیا اپنا۔ عافیت کی زندگی گنوا بیٹھا تو۔ پھر بھی وہ بہن جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا، سُکھ کا ایک سانس بھی نہ لے سکی ہے اب تک۔ یہ اتنی طول طویل زندگی اپنے لیے بھی عذاب بنا لی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اس سب کے بدلے میں حاصل کیا ہوا ہے تجھے؟ کیا پایا غلام جیلانی تُو نے۔ رُسوائیاں، ذلتیں اور خوف۔ اس کے سوا کیا ملا ہے تجھے؟ لہو کے وہ دھبے جنھوں نے تیرا دامن داغ داغ کر کے تجھے کھلی فضا میں آزادی سے پھرنے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ یہی سب کچھ اگر تو نے اپنے ملک اپنے وطن کی خاطر کیا ہوتا۔ اپنی لاکھوں کروڑوں بہنوں کی عافیت کے لیے یہ دھبے اپنے دامن پر سجائے ہوتے تو آج تیرا مقام ہی اور

ہوتا۔ تیرے سر کی قیمت لگانے کے بجائے تیرے سینے پر تمغے سجائے ہوتے۔ تجھے مجرم نہیں ہیرو کہا جاتا۔"

"کیا سوچنے لگے ہو جیلانی؟ کن خیالوں نے آگھیرا ہے تمھیں؟ کیا پسند نہیں آئے ہیں یہ لوگ؟"

"نہیں یار، بس یوں ہی ذرا موازنہ کرنے لگا تھا ان عظیم لوگوں سے اپنا۔"

"خوب، واقعی یہ بہت عظیم لوگ ہیں لیکن تمھاری طرح نامور نہیں ہیں اور تم سے متاثر بھی بہت ہیں۔"

"نہیں بھائی! کیوں شرمندہ کرتا ہے مجھے۔ مجھ میں کون سی خوبی ہے جس سے یہ لوگ متاثر ہو سکتے ہیں۔ ناموری بھی میری ایسی تو نہیں ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔ گردن ہی جھک جاتی ہے مجھ سے نا تار کھنے والوں کی۔"

"نہیں بھائی غلام جیلانی! ایسی بات تو نہ کریں آپ۔ ہم جانتے ہیں سائیں آپ کو۔ بڑا ظلم ہوا ہے آپ کے ساتھ۔ حالات کی ستم ظریفی ہے یہ کہ آپ جیسا با حوصلہ آدمی یوں رُلتا پھرتا ہے۔ آپ کا تو زیادہ قصور نہیں ہے نا اس میں۔ جن حالات سے آپ گزرے ہیں، کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا ان حالات میں جو آپ نے کیا ہے۔" دوست محمد بڑی جلدی سے بولا۔

"ہاں اڑا سائیں! دوست محمد ٹھیک کہتا ہے۔ آپ کا قصور تو نہیں ہے اس میں۔" علی احمد نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔

"یہ تو تم لوگوں کی محبت ہے یارو! جو تم ایسا سوچتے ہو۔ ورنہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا، خوشی سے کیا جائے یا مجبوری سے، وہ ہوتا تو گناہ ہی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی عدالت تمھاری اس دلیل کو تسلیم نہیں کرے گی۔ میں جب کل عدالت میں پیش کیا جاؤں گا، اپنے تمام اعمال کی جواب دہی تو کرنا ہی ہو گی مجھے۔ اور سزا بھی وہی ملے گی جو ان جرائم کے لیے مقرر کر دی گئی ہے۔"

"لیکن جب کوئی بدی کی راہ ترک کر کے توبہ کر لیتا ہے اور نیکی کی راہ پر آجاتا ہے تو خدا بھی اسے معاف کر دیتا ہے۔ سائیں! ہمارے ساتھ ملک و قوم کے دشمنوں کے خلاف صف بستہ ہو کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ اپنی گزشتہ زندگی سے تائب ہو چکے ہیں اور اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو آپ کے پچھلے سارے جرائم معاف ہو جائیں گے۔ یہ یقین رکھیں آپ۔" علی احمد بولا۔

"خیر خیر، دیکھا جائے گا۔ کسے خبر ہے کس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور یہ اچھا ہی ہے کہ آدمی اپنے آنے والے کل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بے خبری جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے انسان کو۔ بہتری کی امید اُسے تھک کر بیٹھنے نہیں دیتی۔"

"بالکل درست کہا ہے آپ نے جیلانی! اختلاف نہیں کیا جا سکتا آپ کی اس بات سے۔" فیروز نے کہا۔

میں نے ان لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بو...

"وہ میرا یار! میرا رہبر، گریگری کدھر ہے؟ اسے بلاؤ نا؟"

"گریگری؟" فیروز نے قدرے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

"مسٹر گریگری یہاں کہاں ہیں؟ یہ کس نے بتایا آپ کو؟"

میں بھی اس کی بات سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ گریگری یہاں نہیں ہے مگر مجھے تو...."

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سائیں! یہ بھائی فیروز کو خبر نہیں ہے۔ آپ کو یہاں بلانے کے لیے جو پیغام بھیجا گیا تھا، وہ مسٹر گریگری ہی کی طرف سے تھا۔ ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ آپ آنے میں ہچکچاہٹ نہ محسوس کریں۔ ہمارا ابھی آپ سے براہِ راست تعلق تو قائم نہیں ہوا ہے نا۔ پھر اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو آپ ہمارے پاس کیوں آتے!" دوست محمد بولا۔

"اوہ، تو یہ بات تھی۔ مجھے بھی یہی حیرانی تھی کہ یہ گریگری میرے پیچھے ہی پیچھے یہاں کیوں آگیا ہے؟ ایسے کیا حالات پیدا ہو گئے ہیں جو اسے خود آنا پڑ گیا ہے یہاں۔ خیر اب آپ لوگ بتائیں مجھے کیوں بلایا ہے آپ نے؟"

"سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ آپ سے باقاعدہ تعارف نہیں ہو سکا تھا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کون لوگ آپ کے دوست ہیں۔ ہمارے آدمی مستقل طور پر آپ کے ساتھ رہتے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر مدد کر سکیں آپ کی۔ ہمیں معلوم ہے گزشتہ رات ہوٹل سے روانگی کے بعد نیشنل اسٹیڈیم کے قریب آپ کو گھیر لیا گیا تھا مگر آپ نے انھیں اچھا سبق دیا ہے۔ اس سے پہلے ظہیر احمد نامی بدمعاش نے اپنے دستِ راست کی مدد سے آپ کو اغوا کیا تھا۔ وہاں سے بھی آپ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی نکل آئے تھے اور کل جالو کے ساتھ جو معرکہ لانڈھی کے صنعتی علاقے سے آگے ہوا تھا، ہمیں اس کی بھی خبر ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت دشمن سمجھ کر آپ اپنے ہی آدمیوں سے اُلجھ بیٹھیں۔"

"ہاں، یہ بہت اچھا کیا ہے آپ لوگوں نے۔ ورنہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کسی وقت۔ میرے پیچھے چلنے والا کوئی شخص نظر آجاتا میری، تو میں اُسے دوبارہ اپنے تعاقب میں آنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔"

"یہی خوف پیدا ہو گیا تھا ہمیں بھی۔ اسی لیے ہم نے آج کی اس میٹنگ کا بندوبست کیا ہے۔ ہمارے آدمی پیلے رنگ کی مزدا کار استعمال کرتے ہیں ہمیشہ، یہ خیال رکھیں آپ۔ اگر کبھی مدد کی ضرورت پیش آجائے تو اپنے آس پاس پیلی مزدا کار کو تلاش کریں اور اپنے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیریں۔ وہ سامنے آئے بغیر کسی نہ کسی طرح آپ کی مدد کریں گے۔ کوئی پیغام دینا ہو تو ایک فون نمبر نوٹ کر لیں۔ اس نمبر پر یہ بردہی صاحب ملیں گے انھیں بتا دیں جو بتانا ہو۔"

"تو وہ پیلے رنگ کی مزدا کار جسے میں نے کل رات ہوٹل سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ وہی تھی، جو آپ بتا رہے ہیں؟"

"تو آپ نے دیکھا ہے اُسے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بہت بروقت آپ سے ملاقات کر لی ہے۔"

"ہاں، یہ بہت ہی اچھا کام کیا ہے آپ لوگوں نے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم رات کو اسٹیڈیم کی طرف گئے ہی اس لیے تھے کہ کسی مناسب جگہ پر اس پیلی کار والوں سے نمٹ لیں، لیکن یہ خوش قسمتی تھی ان کی کہ وہاں اصل دشمن ٹکرا گئے ہم سے۔"

"اوہ، دیکھا آپ لوگوں نے۔ رات اگر وہ لوگ اس دوسری کار کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہ ہو جاتے تو کیسا زبردست تصادم ہو جاتا نادانستگی میں۔ سنا ہے وہ ظہیر احمد کے غنڈے اسٹین گن اور پستولوں سے مسلح تھے۔" علی احمد نے کہا۔

"ہاں، ایسی ہی تیاریوں سے آئے تھے وہ۔ وہ تو خیر یہ ہوئی، نہیں ہتھیاروں کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا۔"

"ایسی جرأت ہم نے کسی میں نہیں دیکھی کبھی۔ یہ تو کمال ہی کر دیتے ہیں جیلانی آپ۔ ایسے خوفناک ہتھیاروں سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوتے۔ انھیں نظر انداز کر کے ٹوٹ پڑتے ہیں دشمن پر۔ بڑے حوصلے کی بات ہے یہ۔" دوست محمد نے کہا۔

"ہاں بھئی، یہ تو سچ مچ بڑی دلیری کی بات ہے۔ موت کے منہ میں جا گھسنا معمولی بات تو نہیں ہے۔" علی احمد نے کہا۔

"ایسی کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں ہے یہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا سی حاضر دماغی کی ضرورت ہے۔ دشمن کے ہتھیار پر گرفت مضبوط کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ پڑو اس پر تو پھر اسے صرف اپنے بچاؤ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور اس کوشش میں اس کا دھیان ہتھیار کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے ہتھیار اس کے ہاتھ سے نکال دینے کا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی تیرے، مگر اس کے لیے بھی چیتے کی سی پھرتی اور بے خوفی درکار ہوتی ہے جو ہر آدمی میں نہیں ہوتی۔ اکثر لوگ تو آتشیں اسلحہ دیکھتے ہی شکست قبول کر لیتے ہیں۔" اللہ بخش جوکھیو نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "یارو! تعریفیں کر کر کے میرا دماغ ہی خراب کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے؟"

فیروز نے کہا۔ "دراصل یہ لوگ اخبارات میں تو تمھارے بارے پڑھتے ہی رہتے تھے مگر گزشتہ دنوں یہاں کراچی میں تمھارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی جو رپورٹیں ان تک پہنچی ہیں انھوں نے انھیں تمھارا گرویدہ کر دیا ہے۔ لہٰذا تم سے ملنے کے بعد انھیں اب تمھارے سوا کچھ یاد نہیں رہا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ، ان لوگوں کا مکمل اعتماد حاصل ہے تمھیں؟"

"کن لوگوں کی بات کر رہے ہو تم؟ کن کا اعتماد حاصل ہونے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تم؟"

"اور کن لوگوں کی بات کروں گا۔ شرافت اور الزبتھ وغیرہ کا ذکر کر رہا ہوں میں۔"

"اچھا۔ اچھا، مگر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تمھیں؟ کیا تمھیں کوئی ایسی بات معلوم ہوئی ہے جس سے ان کی عدم اعتمادی کا پتا چلتا ہو؟ ویسے میں نے تو ایسا کبھی محسوس نہیں کیا۔"

"نہیں، ہمیں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اسی لیے میں نے معلوم کیا ہے کیونکہ تم ہی زیادہ بہتر جانتے ہو اس سلسلے میں۔ ہمیں شبہ یوں ہوا تھا کہ گزشتہ دنوں تین ہفتے کے قریب ان لوگوں کی سرگرمیاں موقوف رہیں۔"

"ہو سکتا ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہو۔ مجھے علم نہیں ہے اس سلسلے میں کچھ بھی۔ ویسے ابھی میں ان کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہوا ہوں۔ لڑکی کے ذریعے دو ہی آدمیوں سے صرف ملنے کی حد تک تعلق قائم ہوا ہے۔"

"ایک بیرن صنعت کار الیگزنڈر کے بارے میں تو علوم ہوا تھا ہمیں۔ وہ تم دونوں کو اپنے ساتھ منگھوپیر کی پہاڑیوں میں بابا اسحاق کے آستانے پر لے گیا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ وہاں کیوں لے گیا تھا تمھیں۔ کیا تم نے خود خواہش کی تھی بابا صاحب کے آستانے پر حاضری دینے کی؟ بہت مشہور بزرگ ہیں وہ۔ بڑی دور دور سے لوگ ان کے دیدار کے لیے آتے اور دعائیں حاصل کرتے ہیں ان کی۔ بہت عقیدت ہے یہاں کے لوگوں کو ان سے؟"

"کیا غیر ملکی بھی آتے ہیں اس آستانے پر۔ کبھی یہ معلوم کیا تم نے، زیادہ تعداد کس علاقے یا ملک کے لوگوں کی ہوتی ہے؟"

"اس پر تو کبھی توجہ نہیں دی ہم نے۔ ویسے اکثر غیر ملکی بھی آتے ہیں وہاں۔ مگر یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کا طریقۂ کار کیا ہے۔ کیسے کیسے لوگوں پہ نظر رکھتے ہو تم؟"

"بابا صاحب کے آستانے پر آنے والے حاجت مند ہوتے ہیں۔ ان پر نظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے ہمیں۔"

"ہم لوگوں کا واسطہ جن لوگوں سے ہے، وہ شیطان کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں، مکاری اور عیاری میں۔ جہاں وہ ابلیس لعین داخل نہیں ہو سکتا، وہاں بھی گھس جاتے ہیں یہ لوگ۔ کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے ان سے۔ یہ بات نہیں بتائی ہے تمھیں کسی نے۔ ان کی خباثتوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہو اپنے ملک کو تو ہر اس جگہ اور ہر اس شخص پہ نگاہ رکھو جس پہ تم بھی شبہ نہیں کر سکتے ہو۔ یہ ایسی ہی جگہوں پہ چھپے ہوتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر بابا صاحب جیسے پہنچے ہوئے شخص کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ ان کی نظروں سے بچ نہیں ... سکتا کوئی۔"

"اور اگر وہ تمھارا بابا صاحب خود ہی ابلیس زادہ ہو تو؟ یہ بھی سوچا ہے کبھی تم نے؟"

"ایسی بات نہیں کرو سائیں! بابا صاحب ولی آدمی ہیں۔ ان کے بارے میں غلط الفاظ نہیں نکالو زبان سے اپنی۔" علی احمد نے کہا۔

"ہاں، بہت پہنچا ہوا، ولی کامل ہے وہ۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ لزی نے مجھے یہاں اب تک دو ایسے یہودیوں سے ملایا ہے جو ہمارے ملک میں صیہونیوں کے عزائم کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں اور بہت خاص لوگ ہیں وہ۔ تم جانتے ہو انہیں؟"

"اس جرمن صنعت کار کو جانتے ہیں ہم، اور اس کی نگرانی بھی کرتے رہتے ہیں مگر دوسرا کون ہے؟ اسے نہیں جانتے ہم۔"

"وہ دوسرا یہی تمھارا ولی کامل ہے۔ آئزک نام ہے اس کا۔ کسی نے بتایا تو نہیں ہے مجھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہی سرغنہ ہے یہاں ان سب کا۔ اسی لیے وہ لوگ مجھے اس سے ملوانے لے گئے تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو غلام جیلانی! اس آستانے کے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات تو سوچی بھی نہیں جا سکتی۔" فیروز حیرانی سے بولا۔

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں تم سے۔ یہ اسرائیل زادے ایسی ہی جگہ پر ہوتے ہیں، جہاں ان کے بارے میں شبہ بھی نہ ہو کسی کو۔"

"یہ تو سائیں بڑی عجیب بات بتائی ہے آپ نے۔ یقین نہیں آتا۔ ایسا ولی اللہ... نہ بابا نہ، ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔"

"میں نے اچھا خاصا وقت گزارا ہے وہاں اس کے ڈرائنگ روم میں، اور بہت سی باتیں بھی کی ہیں اس سے، پھر بھی غلط فہمی ہے مجھے؟"

"ڈرائنگ روم میں! تو کیا کسی مکان میں ملے تھے تم ان سے؟ پھر تو ضرور کسی اور آدمی سے ملے ہو گے تم۔"

"او یار! کیسا عجیب آدمی ہے تو۔ یقین ہی نہیں کرتا میری بات کا۔ میرے بھائی! میں اس سے اسی پہاڑی غار میں ملا تھا، کسی مکان میں نہیں ملا ہوں۔ وہیں اسی آستانے میں، اس کے اپنے ڈرائنگ روم میں۔ آئی کچھ سمجھ؟"

میری بات سن کر وہ چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر دوست محمد بولا "کچھ سمجھ میں نہیں آیا سائیں! ہم بھی وہاں جاتے رہتے ہیں اکثر۔ ایک چھوٹا سا غار ہے وہ بس۔ اس کے ایک حصے میں حاجت مند اور آستانے کے ملنگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ دوسرے حصے میں بابا صاحب عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ بالکل چھوٹا سا حجرہ ہے، جس میں ہر دم تاریکی رہتی ہے۔ کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا ہے وہاں اور آپ کہتے ہو ادھر ڈرائنگ روم بھی ہے۔"

مجھے ہنسی آگئی، میں نے کہا "اس چھوٹے سے حجرے کی دیواروں پہ سیاہ رنگ کیا ہوا ہے اور جس چبوترے پہ بابا اسحاق بیٹھا ہوتا ہے، اس کے بالکل پیچھے دیواروں ہی کے رنگ کا سیاہ دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس پردے کے پیچھے نہایت آراستہ، جدید طرز کا خوبصورت ڈرائنگ روم ہے۔ جس میں انسانی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ کبھی تم نے اپنے بابا صاحب کے چبوترے کے پیچھے جا کر دیکھا ہے؟"

"نہیں، چبوترے کے پیچھے جانا تو بہت بڑی بات ہے، اس کے قریب نہیں جا سکتا کوئی۔ حجرے میں جا کر تو بابا صاحب کے رعب سے پاؤں اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے آدمی کے لیے نظر نہیں اٹھائی جاتی اور پھر اندھیرا اتنا ہوتا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا وہاں۔"

"لیکن جب میں لزی اور الیگزینڈر کے ساتھ گیا تھا، وہاں تو اس وقت اتنی تاریکی نہیں تھی اس حجرے میں۔ ایک بلب روشن تھا وہاں، جس کی روشنی میں حجرے کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ وہ درمیانی پردہ ہٹا کر اس آراستہ کمرے میں ہی ہم سے ملاقات کی تھی اس بہروپیے یہودی نے۔ اس کے پاس جانے سے پہلے لزی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمیں آج شام پانچ بجے بابا آئزک سے ملنا ہے۔ پھر الیگزینڈر نے کہا تھا کہ اس نے فون کر کے مسٹر آئزک سے پانچ بجے کا وقت لے لیا ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہاں ٹیلیفون بھی موجود ہے۔"

"یہ تو بہت اہم انکشاف کیا ہے تم نے جیلانی! یہاں ان کے تقریباً تمام ہی گرگے نظر میں ہیں ہماری۔ بس ایک سرغنہ ہی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا تھا ہمیں۔ ایک ایک آدمی کی دن رات نگرانی کی ہے ہم نے، مگر کسی بھی طرح سرغنہ تک نہیں پہنچ سکے تھے ہم۔"

"اگر آپ کے کہنے کے مطابق وہی سرغنہ ہے تو اب ان میں سے کوئی بچ نہیں سکے گا ہم سے، یہ تو بڑا زبردست کام کیا ہے آپ نے سائیں غلام جیلانی! آپ تو بہت کام کے آدمی ثابت ہوئے ہیں۔" علی احمد مجھے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیسا بگلا بھگت ہے وہ بابا اسحاق۔ ایک خلقت کو اُلّو بنا رکھا ہے اس نے اتنے برسوں سے۔ سچے سائیں نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا اسے، باقاعدہ دستار بندی کی تھی اس کی۔ مجھے یاد ہے اچھی طرح۔" اللہ بخش جو کھیو نے بتایا۔ "کتنے عرصے خدمت کی ہو گی اس نے سچے سائیں کی، عبادت و ریاضت کے ذریعے دل میں جگہ بنائی ہو گی ان کے، تب کہیں یہ مقام عطا ہوا ہو گا اس ابن یہود کو۔ اور اب یہ اس آستانے کو اسرائیل کا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے ہے پاکستان میں۔"

"ہاں ایسی ہی لمبی پلاننگ کرتے ہیں یہ لوگ۔ برسوں بلکہ بعض اوقات تو صدیوں صبر و سکون کے ساتھ اپنے منصوبے پر خاموشی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمت نہیں ہارتے کبھی اور نہ ہی تھک ہار کے بیٹھتے ہیں کبھی۔ کامیابی کا راز یہی ہے ان کی۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ بھائی غلام جیلانی! انتھک محنت اور جاں فشانی کے بغیر قوموں کے لیے ترقی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ محنت اور لگن کو بہت اہمیت حاصل ہے اور سب سے زیادہ اہم چیز اتحاد ہے۔ متحد قوموں کو کبھی طاقتور ترین دشمن بھی شکست نہیں دے سکا۔ ہماری بدنصیبی یہی ہے کہ دشمن نے ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایسے نعرے لگوانا شروع کر دیے ہیں جنھیں اگر ابھی سے روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ ملت کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیں گے۔ آج کی نوجوان نسل اپنی ناتجربہ کاری اور کم فہمی کی بنا پر ان نعروں سے متاثر ہو رہی ہے۔ اب وہ کھلم کھلا چار قومیتوں، چار صوبوں، مقامی اور غیر مقامی کی باتیں کرتے پھرتے ہیں اور کوئی انھیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ صوبائی خود مختاری کے نام پر مرکز کو کمزور کر دینے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ مرکزیت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں یہ لوگ۔ تاریخ شاہد ہے، جب بھی کسی قوم نے مرکز سے رشتہ کمزور کیا یا ناتا توڑا، وہ برباد کر دی گئی ہے۔ دشمن یہی چاہتے ہیں کہ ہم صوبائیت اور علاقائیت کا شکار ہو کر اپنے مرکز سے دور ہو جائیں۔ صوبوں میں بٹ کر اپنی متحدہ قوت کو ختم کر دیں تاکہ وہ ایک ایک کر کے ہمیں بہ آسانی ہڑپ کر سکیں، جو کچھ وہ جنگ کے ذریعے حاصل نہیں کر سکے، اسے یہ عقل کے دشمن خود اپنے ہاتھوں سے انھیں پیش کر دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ دنیا کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے یہودی تو ایک قوم ہیں اور متحد ہو کر اسرائیل کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں لیکن ہمیں جو ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم کے افراد ہیں، صوبوں میں تقسیم کر کے چار قومیں ہونے کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ ان کی پروپیگنڈہ مشنری اسلام کے خلاف جو زہر اگلتی ہے، ہم اس کا جواب دینے کے بجائے اسلام سے بے زاری اور اپنے مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہمارے زعما جنھیں اس پروپیگنڈے کا جواب دینا چاہیے، انھیں اقتدار و اختیار اور محراب و ممبر کے جھگڑوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ وہ اقتدار حاصل کیے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور جب اقتدار ہاتھ آجاتا ہے تو اپنی تمام توجہ اسے محفوظ رکھنے اور طول دینے پر صرف کر دیتے ہیں۔ انھیں یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے کہ جب یہ آزادی نہیں رہے گی، یہ ملک نہیں رہے گا تو وہ اپنا حکومت کرنے کا شوق پورا کرنے کہاں جائیں گے۔" دوست محمد جذبات کی رو میں بہا چلا جا رہا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے بھائی! باتیں تو تمھاری جی کو لگتی ہیں مگر ایک ٹریجڈی یہ بھی تو ہے ہمارے ساتھ کہ ہم گزشتہ برسوں میں باتیں کرنے کا فن ہی سیکھ سکے ہیں، انھیں عملی جامہ پہنانا نہیں سکھایا کسی نے ہمیں۔"

"ہاں سائیں غلام جیلانی! تمھاری اس بات کو بھی جھٹلاؤں گا نہیں میں۔ میں تسلیم کرتا ہوں اسے۔ بالکل درست کہتے ہو تم۔ یہ بھی ہماری قوم کا مزاج بن گیا ہے۔ حقائق سے نظریں چرا کر، اپنی زبان سے ساری دنیا کو سرنگوں کر لیتے ہیں لوگ خیالوں ہی خیالوں میں۔ ہاکی یا کرکٹ کی ٹیم ہار جائے حریف ملک سے تو قومی غیرت جوش کھانے لگتی ہے۔ ٹیم کے ہر ممبر کو سولی چڑھا دینے کے مطالبے ہونے لگتے ہیں۔ اخبارات سیاہ ہو جاتے ہیں انکی کوتاہیوں کی فہرست سے، لیکن جب کوئی من پسند مداری نت نئے کرتب دکھا کر انھیں فریب دینے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اسے قومی ہیرو بنا لیتے ہیں۔ اس کا ہر عیب ہنر لگنے لگتا ہے اور وہ کھلا دشمن بھی جو اس کی حمایت کرے سجن لگنے لگتا ہے۔ ہم نے اسی لعنت کو مٹانے کا عزم کیا ہے۔ ہم ان چند قوم فروشوں کو اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہماری آزادی کا سودا کر لیں، مول چکا لیں ان شہیدوں کے لہو کا جنھوں نے آزادی کی راہ میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا، جنھوں نے خود مٹ کر ہمیں زندگی عطا کی۔ ہم ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔"

"میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں میرے بھائی! ہر محب وطن کے یہی جذبات ہوتے ہیں۔ مجھے بھی جب گزری کی

زبانی یہودیوں کے عزائم کا علم ہوا تھا تو اسی طرح میرا سینہ بھی جل اٹھا تھا۔ آگ لگ گئی تھی تن بدن میں میرے اور محض ان رذیلوں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کی خاطر ہی گریگری کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ تم لوگوں سے مل کر مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اور میرا حوصلہ بھی بڑھا ہے۔ یہ اطمینان بھی حاصل ہوا ہے مجھے کہ ابھی میرے ملک میں زندہ لوگ موجود ہیں لیکن میرے عزیز! جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ نہ ہی ہم چار پانچ آدمی اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں۔ حکومت کو بھی اس طرف توجہ دینا چاہیے۔"

"ہاں، بیشک حکومت کو توجہ دینا چاہیے اس طرف لیکن ہمیں بھی اپنا فرض یاد رکھنا چاہیے۔ ہر کام صرف حکومت کے لیے ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے اور پھر جب مسئلہ قومی سلامتی کا ہو تب تو ہماری ذمے داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ بھائی غلام جیلانی! یہ مت دیکھو کون کیا کر رہا ہے نہ یہ حساب کرو کس نے کیا کیا ہے۔ صرف اور صرف اپنے اعمال پر نظر رکھو۔ صرف اس کا حساب کرو کہ ہم نے اپنے حصّے کا کتنا کام کیا ہے؟" علی احمد نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"یارو! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس راہِ پُرخطر میں جس کا میں مسافر ہوں، تم جیسے وطن دوست ہم سفر بن جائیں گے۔ میں غلام جیلانی! ایک بے راہ رو شخص جسے اپنی بہن کے سوا کچھ یاد نہیں تھا، کبھی اتنے عظیم مقصد کی طرف بھی قدم اٹھا سکوں گا!" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔ کلیجہ منہ کو آتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر میں بے اختیار دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسک پڑا۔ میرا سینہ شق ہوا جا رہا تھا، آنکھوں میں آنسو سیلِ رواں کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ شہ زور، شورہ پشت غلام جیلانی طوفانوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جس کی پیشانی کبھی شکن آلود نہیں ہوئی تھی، چاروں طرف سے یلغار کرتے ہوئے مصائب کے ہجوم میں جس کی آنکھ کبھی نم نہیں ہوئی تھی، اس کی آنکھوں سے آج چشمے اُبل پڑے تھے۔ اور وہ کسی طفلِ شیرخوار کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

وہ چاروں میری اس کیفیت کو دیکھ کر پریشان ہو گئے اور مجھے چاروں طرف سے گھیر کر تسلّیاں اور دلاسے دینے لگے۔ کچھ دیر رو لینے سے دل کا غبار صاف ہو گیا تو میں اُٹھ کر فیروز کی رہنمائی میں باتھ روم پہنچا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس ان کے پاس آ بیٹھا۔ یارو! انسان بھی عجیب مخلوق ہے خدا کی۔ اسے کسی طرح ثبات نہیں ہے۔ یکساں حالت میں تو زیادہ دن رہ ہی نہیں سکتا وہ۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو خود پر مکمل اختیار حاصل ہی نہیں ہوتا ہے کبھی۔ حالات کے ریلے میں اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی وہ وقت کے سیلاب کے سامنے چٹان کی طرح سینہ تان کر کھڑا ہوتا ہے اور کبھی حالات کی ایک چھوٹی سی لہر میں تنکے کی مانند بہہ جاتا ہے۔ یہ لہریں کبھی اسے اتنا اونچا اٹھا دیتی ہیں کہ اس سے بالا بلند کوئی نظر نہیں آتا اور کبھی اتنا نیچے لے جاتی ہیں کہ لہروں کے ہجوم میں اسے دیکھنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ان دنوں میری حالت لہروں کے رحم و کرم پر بہتے ہوئے ایک تنکے ہی کی مانند تھی۔ تقدیر شوخیاں کرتی رہی تھی میرے ساتھ اب تک اور اس نے مجھے جس راہ پر لا ڈالا تھا اگر میں اسے گنوا نہیں دیتا تو وہ مجھے منزل پر پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اب اسی راہ پر چل کر زندگی کا بقیہ سفر طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوست محمد نے میری حالت درست ہونے کے بعد کہا۔ "آپ نے بابا اسحاق کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے سائیں! اس سے معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہ آستانہ مرکز بنا ہوا ہے ان کا۔ اس کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

"مگر اس بہروپیے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی منصوبہ بندی کرنا ہو گی ہمیں ــــ اور بہت دیکھ بھال کے قدم اٹھانا ہو گا اس کی طرف۔ بڑے لامحدود وسائل کے مالک ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے جدید ترین آلات موجود ہوں گے وہاں۔"

"ہاں، کوئی بڑا اور فیصلہ کُن قدم اٹھانے سے پہلے پوری پوری معلومات حاصل کرنا ہوں گی اس جگہ کے بارے میں۔ اس کے چپّے چپّے سے واقفیت حاصل کرنا ہو گی ہمیں اور ایسے انتظامات کرنے ہوں گے کہ کسی صورت میں بھی ناکامی نہ ہو۔ اگر ایک بار ناکامی ہوئی ہمیں تو دوبارہ فوجی کارروائی کیے بغیر اُن پر قابو حاصل کرنا ممکن نہیں رہے گا۔" اللہ دتّہ نے کہا۔

"اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا ہو گا کہ کوئی اتنا بڑا ہنگامہ نہ ہو وہاں، جس کے بارے میں اخبارات سُرخیاں جما جما کر دیں۔ عام لوگوں کا ان سنگین معاملات سے بے خبر رہنا ہی بہتر ہے۔" علی احمد نے کہا۔ "ورنہ شہر کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے گا اور جگہ جگہ میگوئیاں ہونے لگیں گی۔ سیدھی افواہیں پھیلنے لگیں گی۔"

دو گھنٹے تک اس مسئلے کے ایک ایک پہلو پر غور و خوض ہوتا رہا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہودیوں نے اپنے اس خفیہ ہیڈ کوارٹر کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا ہو گا۔ یقیناً بہت سخت انتظامات کر رکھے ہوں گے انھوں نے۔ جدید ترین ہتھیار اور دیکھ بھال کے لیے حساس ترین آلات نصب ہوں گے وہاں۔ لہٰذا پہلے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری تھا اور یہ کام میرے ہی ذمّے لگا دیا گیا کیونکہ اس گروپ میں صرف میں ہی وہ واحد آدمی تھا، جسے وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی تھی۔

میں وہاں سے رُخصت ہوا تو فیروز نے کہا: "میرے ساتھ میری کار میں آ جاؤ جیلانی! راستے میں کوئی ٹیکسی مل جائے گی تو اس میں چلے جانا۔ یہاں سے کوئی سواری نہیں مل سکے گی تمھیں۔"

میں اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کوٹھی سے نکل کر اس نے کار ایک طرف دوڑاتے ہوئے کہا۔ "تمھارے لیے ایک خبر ہے میرے پاس۔ میں نے ان لوگوں کے سامنے تم سے اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔"

"کیسی خبر ہے؟ ایسی کیا بات ہے جس کا ذکر ان لوگوں کے سامنے مناسب نہیں جانا تم نے؟"

"طارق روڈ پر کوئی فردوسی بیگم رہتی ہے، اُسے جانتے ہو تم؟"

"ہاں، ہاں، کیا ہوا ہے فردوسی بیگم کو؟" میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"گھبراتے کیوں ہو یار، کچھ ہوا نہیں ہے تمھاری اس فردوسی بیگم کو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا بات ہے؟ تم نے پوچھا کیوں تھا اس کے بارے میں؟ اور تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

"یہ مت پوچھو، میں اُسے کیسے جانتا ہوں۔ میں ہر اُس شخص سے واقف ہوں جس سے تمھارا ذرا بھی تعلق ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا تم سے کہ وہاں ایک شخص آیا ہوا ہے۔ تم وہاں جا کر اُس سے مل لو۔ مجھے یقین ہے اس سے مل کر تمھیں بہت خوشی ہو گی۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا، وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے۔"

"اچھا۔ تمھیں کس نے بتایا ہے اس کے بارے میں؟"

"اس سے تمھیں کیا غرض ہے میرے یار۔ تم اپنے کام سے غرض رکھو۔ میں طارق روڈ لے چل رہا ہوں تمھیں، کیفے لبرٹی کے پاس اُتار دوں گا۔ پھر تم خود جا کر دیکھ لینا فردوسی بیگم کے ہاں کون شخص ہے وہ؟"

اُس نے مجھے عجیب اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے مگر کسی وجہ سے مجھے بتانا نہیں چاہتا۔ میں اپنے ذہن پر زور دے کر اپنے ملنے والوں کو یاد کرنے لگا مگر کوئی ایسا شخص مجھے یاد نہیں آ سکا جو میرا اور فردوسی کا مشترکہ شناسا ہو۔ لے دے کے ایک ہی تھا مگر وہ فردوسی کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا تھا اور وہاں اُسے جو حالات پیش آئے تھے اس کے بعد اُس کی واپسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں اسی اُلجھی ہوئی گتھی کو سُلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ فیروز نے مجھے مخاطب کیا۔ "لو بھئی یہ آیا کیفے لبرٹی۔ اب تم خود جا کر دیکھ لو فردوسی بیگم کے ہاں کون آیا ہوا ہے؟"

میں اس سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اُس کی کار سے اُتر گیا۔ اور سیدھا فردوسی بیگم کے فلیٹ کی طرف چل دیا۔

پہلی ہی گھنٹی پر فردوسی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "اوہ، جیلانی! تم! آؤ آؤ، اندر آ جاؤ۔ مجھے معلوم ہوا تھا تم ایک بار پہلے بھی آئے تھے یہاں۔"

میں نے دروازے میں قدم رکھتے ہوئے اس سے آنے والے کے بارے میں پوچھنا چاہا مگر اُسی وقت ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کون ہے بھئی جنتی بیگم! کون آیا ہے؟" اس کے ساتھ ہی وہ اندرونی کمرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

میرے قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "اوئے آپی! تُو! یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں۔ اوئے میرے یار! یہ تُو ہی ہے نا؟"

وہ بھی مجھے دیکھ کر بے اختیار ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے زور سے نعرہ مارا۔ "اوئے جیلانی میرے یار! آ گیا تُو؟"

اس کے ساتھ ہی ہم دونوں بے تابانہ لپک کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گرانقدر معاوضے پر چراتا ہے
نک ویلوٹ کی چوریاں
ان چوریوں کی عجیب کہانیاں
وہ تمام کہانیاں جو ابھی تک لکھی گئی ہیں
قیمت ۱۵/ روپے
ڈاک خرچ ۵/ روپے
کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۱

اسلم آبی

وہ میرا جگری یار، میرے سینے سے آلگا تھا۔ فرطِ انبساط سے میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جاتی تھیں۔ اس گھڑی میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ بات تو دُور دُور تک میرے تصور میں کہیں بھی نہیں تھی کہ آبی یوں ایک دم اچانک میرے سامنے آکھڑا ہوگا۔ اس آبی اور آسیہ کی رہائی کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، کس کس کے در پر جبیں نہیں ٹیکا دی تھی لیکن ہر ایک جگہ سے ایک ہی جواب ملا تھا۔ یہ ناممکن ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ان دونوں پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے اور جتنے سنگین پیرویں میں انہیں رکھا گیا تھا اس کے پیشِ نظر ان کی آزادی کا تصور بھی محال تھا۔ ان کے لیے میں نے دشمن اور گریگری سے مدد کی درخواست کی تھی اور ابھی کل ہی رات سیٹھ قاسم کو اپنے ذرائع استعمال کرنے پر آمادہ کیا تھا۔
اسے دیکھ کر اور سینے میں جذب کر کے بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ میرا پیارا اسلم آبی ہی ہے۔ کیسے کیسے بااثر اور بااختیار لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر الگ ہوگئے تھے۔ اس کی منظورِ نظر الماس تک منہ موڑ گئی تھی۔ جس طرح اچانک فیروز نے مجھے اس تک پہنچایا تھا یہ تو میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ اسی لیے بے پناہ انبساط کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے وسوسے بھی میرے دل میں سر اُبھار رہے تھے۔ میں اس سے الگ ہو کر بڑے غور سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اس کے چہرے پر، سب کچھ وہی تھا، بالکل، ہو بہو۔ اس کے نقش و نگار میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پہ شک کیا جاسکتا۔ بس ایک ذرا صحت اس کی پہلے سے گری ہوئی لگتی تھی، مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جن آلام سے وہ گزرتا رہا تھا۔ مصائب کا جو بحرِ بے کنار عبور کر کے آیا تھا وہ، اس کے بعد اس کا سلامت ہونا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔
میری آنکھوں کو اپنے چہرے پر ٹکے دیکھ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا ”اوئے ذیلانی! یہ تو اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے مجھے؟ کوئی سینگ شینگ تو نہیں نکل آئے ہیں سر میں میرے؟“
اس کے اس اندازِ تخاطب نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ آبی ہی تھا۔ اکثر ترنگ میں مجھے جیلانی کے بجائے ذیلانی یا ایسے ہی دوسرے القابات سے نوازا کرتا تھا لیکن اس کے اس انداز میں خلوص اور محبت کی ایسی چاشنی تھی کہ میرا دل جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا ”اوئے آبی، شتابی! تو کہاں جا پھنسا تھا ظالمے؟ میری تو نیندیں حرام ہو کر رہ گئی تھیں۔ سارا کا سارا چین سکون لے گئے تھے تم دونوں اپنے ساتھ اس سرکاری عقوبت خانے میں۔ کیسے گلو خلاصی ہوئی ہے وہاں سے تیری؟ اور وہ آسیہ کہاں ہے؟ وہ میری نصیبوں جلی بہن۔ کچھ بتا تو؟“ میں نے ایک ہی سانس میں سوالوں کی بھرمار کر دی اس پر۔
”چل ادھر آرام سے بیٹھ کر پوچھ، جو کچھ پوچھنا ہے تجھے۔ تُو نے تو یہاں کھڑے ہی کھڑے سوالات انڈیلنا شروع کر دیے ہیں میرے اوپر۔“ آبی مجھے چھوڑ کر اسی کمرے میں واپس جاتے ہوئے بولا، جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔
ہم اندر داخل ہوئے تو فردوسی بیگم بھی ہمارے ساتھ ہی ساتھ وہاں چلی آئی۔ کمرے میں دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگا ہوا ایک پلنگ بچھا تھا اور اس پہ پھیلا ہوا بستر بتا رہا تھا کہ آبی ابھی ابھی وہیں سے اُٹھ کر آیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے دوبارہ اسی بستر پہ جا ٹکا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ فردوسی بیگم بولی ”تو جناب سردار کریم نواز صاحب! کیا خدمت کی جائے اس وقت آپ کی؟ کچھ نوش جاں فرمانا پسند کریں گے آپ؟“
”یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے جنتی بیگم! بڑے لکھنوی انداز میں گفتگو فرما رہی ہیں آپ۔ خیر تو ہے نا؟“ میں نے کہا۔
”آپ کی سرداری کا لحاظ تو رکھنا ہی ہوگا نا ہمیں اب آپ سے گفتگو کرتے ہوئے۔“ وہ شوخی سے بولی۔
”ہاں، یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔ یہ تم مجھے کس نام سے مخاطب کر رہی ہو؟“
”کیوں کیا آپ کا نام سردار کریم نواز نہیں ہے؟“ وہ بولی اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔
میں نے اسے کچھ کہنے کے بجائے آبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا ”ہاں یار! یہ میں نے بتایا ہے انہیں۔ کوئی غیر تو نہیں ہیں نا یہ؟ کون سی بات چھپی ہے ان سے ہماری؟“
”تم کب سے آئے ہوئے ہو یہاں؟“ میں نے آبی سے سوال کیا۔
”پرسوں رات کو پہنچا تھا میں کراچی۔ اور تو کوئی ٹھکانا تھا نہیں میری نظر میں، اس لیے سیدھا یہیں چلا آیا۔ حالانکہ پہلے ہی ہم نے کچھ کم تو پریشان نہیں کیا تھا انہیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر تم یہاں نہیں ہوئے تو یہ دروازے سے ہی لوٹا دیں گی مجھے۔ مگر یار! بڑی ہی بامروت اور بااخلاق خاتون ہیں یہ۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنے گھر کے دروازے وا کر دیے مجھ پر۔“
”کیوں شرمندہ کرتے ہیں آبی صاحب آپ مجھے۔ گھر آنے والے مہمان کو کون دھتکار سکتا ہے؟ کفرانِ ہے یہ تو؟“
”تمہارا یہی خلوص تو ہے فردوسی بیگم! جو ہمیں کھینچ کر یہاں لے آتا ہے ورنہ اور کیا کشش ہے یہاں؟ ہاں اس کریم احمد کا بھی کچھ علم ہے تمہیں۔ واپس نہیں آیا وہ دوبارہ ادھر؟“
”نہیں جی۔ چھوڑیں کس کا ذکر لے بیٹھے ہیں آپ بھی۔ جانے والے واپس آتے ہیں کبھی جو وہ آئے گا؟“
”دیکھیں، دیکھیں یہ نہ کہیں۔ ہماری مثال سامنے ہے کتنی بار جا جا کے واپس آئے ہیں ہم؟“ آبی نے کہا۔
”جی ہاں، لیکن اگر کوئی وعدہ کر رکھا ہوتا آپ نے مجھ سے تو آپ بھی واپسی کا راستہ بھول چکے ہوتے۔“
”اچھا، تو ایسا سمجھتی ہو تم ہمیں؟ ایسے ہی بزدل اور کذاب نظر آتے ہیں ہم تمہیں؟“ میرے لہجے میں زہر گھل گیا۔
”ارے ارے، آپ تو بُرا ہی مان گئے۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ آپ کی دل شکنی تو نہیں کرنا چاہتی تھی میں۔“
”اوئے دفع کر یار! کیا بکواس شروع کر دی ہے یہ تو نے؟ خواتین سے بات کرنے کا سلیقہ بھی گنوا بیٹھا ہے تو۔ اس طرح بات کی جاتی ہے صنفِ نازک سے؟ ہماری میزبان کے چہرے کی ساری شگفتگی غارت کر کے رکھ دی ہے۔“ آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔
”جائیں جی فردوسی بیگم آپ۔ چائے بنا کر لے آئیں ہمارے لیے، اور اس کی باتوں کو زیادہ فیل نہ کریں آپ۔ ایسے ہی کھوپڑی اُلٹ جاتی ہے کبھی کبھی اس ذیلانی کی۔“
”ہاں بی بی! معاف کر دینا مجھے۔ نہ جانے کیوں اس گھڑی یہ بکواس کر بیٹھا میں۔ ورنہ میرے دل میں بڑی عزت ہے تمہاری۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کراچی آتے ہی در پہ حاضری کے لیے دوڑا نہ چلا آتا۔ بتایا ہوگا اُس نے تمہیں۔ وہ... کیا نام ہے اس کا...؟“ میں دماغ پہ زور دے کر اس لڑکی کا نام یاد کرنے لگا جس سے چند دن قبل ملا تھا میں یہاں۔
”ہاں، بتایا تھا نا میں نے ابھی آپ کو۔ معلوم ہوا تھا مجھے آپ کی آمد کے بارے میں۔ گلزار نے بتایا تھا۔“
”ہاں، ہاں۔ وہی... یاد آگیا مجھے یہی نام بتایا تھا اس نے اپنا۔“
”اچھا، آپ لوگ باتیں کریں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے۔ ناشتے کے لیے بھی لاؤں نا کچھ؟“
”نہیں نہیں، اور کچھ نہ لانا چائے کے سوا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے کھانا کھایا ہے میں نے۔“
وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی آبی مجھ پہ برس پڑا ”اوئے کیسا ناہنجار ہو گیا ہے تو جیلانی! ہماری کچھ لگتی تو نہیں ہے وہ کہ مہمان نوازی بھی کرے اور باتیں بھی سنے ہماری۔ زبان کو لگام ہی نہیں ہے تیری۔“
”اوئے لعنت بھیج نا اب اس پر۔ کہہ تو دیا غلطی ہوگئی۔ معافی بھی مانگ لی ہے میں نے اس سے۔“
”یہ اچھا کیا تُو نے، ورنہ بچاری کے دل میں گرہ پڑ کر رہ جاتی۔ کتنا خیال رکھتی ہے وہ ہمارا۔“
”اسی لیے معذرت کر لی ہے اس سے میں نے۔ تو بتا یہ تجھے رہائی کیسے دے دی ان قانون کے بندوں نے؟“
”کیا بات کرتا ہے تو، کسی کو قانونی شکنجوں میں کسنے کے بعد انھوں نے رہائی دی ہے کبھی؟ لحاظ مروت نام کی تو کوئی چیز ان کے قریب سے نہیں گزری کبھی۔ میرے اور آسیہ کے معاملے میں تو رشوت اور سفارش بھی ہار گئی تھی ان سے۔ بڑا سنگین کیس بنایا تھا انھوں نے ہمارے خلاف۔ گوریا کی وہ بہن جس نے امریکا سے آکر یہ سارا فساد برپا کیا تھا بہت ہی لمبے ہاتھوں اور قد کاٹھ والی عورت ہے یار! وہ آسیہ صحیح اندازہ نہیں کر سکی تھی اس کے بارے میں۔“
”وہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا۔ اس نے جو راہ اختیار کی تھی، وہ کسی اس جیسی عورت کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہے۔ یہ یقین تھا مجھے کہ کسی نہ کسی دن اس کی بازی ایسی مات ہوگی کہ اسے پناہ نہ مل سکے گی کہیں۔ اب کہاں ہے وہ؟ کیا اسے بھی آزادی نصیب ہوئی ہے یا تو اکیلا ہی نکل آیا ہے، اور تو نکلا کیسے وہاں سے؟“
”پتا نہیں یار! کون لوگ تھے وہ، اور کس طرح انہیں ہم سے اتنی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ ایک روز جب جیل کی گاڑی میں ہمیں عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو ہمارے ان نامعلوم ہمدردوں نے چاروں طرف سے یلغار کر دی اس گاڑی پر۔ محافظوں کو ہتھیار سنبھالنے تک کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ انہوں نے چند لمحوں میں جیل سے ہماری گاڑی کے ساتھ آنے والے مسلح محافظوں کو بے بس کر کے مجھے اور آسیہ کو باہر نکال لیا۔“
”یہ اندازہ تم نے کیسے لگا لیا کہ وہ تمہیں ہی رہائی دلانے آئے تھے؟ ممکن ہے وہ کسی اور کو چھڑانے آئے ہوں اور محض اتفاقاً تم دونوں بھی اسی گاڑی میں ہونے کی وجہ سے رہائی پا گئے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔
”نہیں بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے آواز دے کر مجھے اور آسیہ کو باہر آنے کے لیے کہا تھا۔ کسی اور قیدی کو تو نکلنے ہی نہیں دیا انھوں نے۔ ہمارے ساتھ دس اور قیدی بھی تھے۔ وہ چاہتے تو گاڑی کا دروازہ کھول کر ان سب کو نکال سکتے تھے مگر انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرے اور آسیہ کے علاوہ جو بھی باہر نکلا اسے گولی مار دیں گے وہ۔“
میرے ذہن میں گریگری کا نام گونجنے لگا۔ یقیناً اسی کے ایما پر یہاں موجود اس کے ماتحتوں یا ایجنٹوں نے ہی یہ کارروائی کی تھی۔

فیروز جس طرح مجھے آبی کی یہاں موجودگی کی خبر دے کر اپنے ساتھ طارق روڈ تک لایا تھا پھر کیفے لبرٹی کے سامنے مجھ سے رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں میں جو ایک خاص قسم کی چمک تھی اور اس کے لبوں پر جو شوخ و شریر سی مسکراہٹ تھی اس کا مفہوم اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ مجھے سرپرائز دیتے ہوئے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر مسرور ہو رہا تھا۔ حقیقت تو اس بات کا کریہ کارنامہ انجام دینے والے گرگ جی ہی کے آدمی تھے۔ اسی کو کریڈٹ پہنچتا تھا اس کا۔ اس کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا ہوتا تو وہ صرف آبی اور آسیہ ہی کو آزادی نہ دلاتے۔ گاڑی میں موجود تمام قیدیوں کو چھڑا کر انہیں اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

"اور وہ آسیہ کہاں ہے اب؟" میں نے پوچھا۔

"اسے میں ماں جی کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ بہت خوش ہوئی تھیں ماں جی اس سے مل کر۔ ایک دم سینے میں جذب کر لیا تھا انھوں نے اسے۔ بس دیکھنے ہی کے قابل تھا وہ منظر۔ پہلی بار معلوم ہوا تھا مجھے کہ ایک ماں جب اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملتی ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے اس کی۔ یار! اولاد کیسی بھی ہو، ماں کے لیے تو اپنے جگر کا ٹکڑا ہی ہوتی ہے بس۔"

"ہاں یار! جانتا ہوں میں۔ ماں بس ماں ہی ہوتی ہے۔ اس کی خوشی اولاد کے لیے وا ہی رہتی ہے ہمیشہ۔ ممتا بڑے اور چھوٹے کی تمیز نہیں کر سکتی ہے آبی یار! اس کی زبان پر خیر اور دل میں دعا ان کے سوا کچھ نہیں ہوتا کبھی۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو جیلانی! تیرے لیے بھی بڑی دعائیں سنی ہیں میں نے ماں جی کے منہ سے۔ وہ کہتی تھیں میرے سو بیٹے بہتر نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے تمہاری رہائی کے لیے۔ آخر خدا نے اسے کامیابی بخش ہی دی۔ تیرے کالے کرتوتوں کی لگتا ہے اسے بالکل ہی خبر نہیں ہے کوئی۔ یا شاید وہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالنا نہیں چاہتی جو تجھے ہلکا کر دے دوسروں کی نگاہوں میں۔"

"ہاں ہے وہ آبی! اپنے پُتر کا برا کیسے چاہے گی۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہو گی۔ ایسی ہی ہے وہ۔"

"اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تو کراچی میں ہے ان دونوں کسی ضروری کام کے سلسلے میں گیا ہے اور پھنس کر رہ گیا ہے وہاں۔ او ئے! کون سا کاروبار کر رہا ہے تو یہاں بیٹھا جس نے اتنا مصروف کر رکھا ہے تجھے اس کراچی میں؟ مجھے بھی تو بتا اس کے بارے میں۔"

"بتا دوں گا تجھے بھی سب کچھ۔ صبر سے تو بیٹھ ذرا۔ بڑا لمبا کاروبار پھیلا ہے میں نے یہاں۔ وقت لگے گا اس کی تفصیلات بتانے میں اور وہ وقت ابھی میرے پاس نہیں ہے۔ کل آؤں گا میں تیرے پاس۔ پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا تجھے۔"

"کل... کیا مطلب؟ کیا ابھی تجھے نہیں رہنا ہو گا؟ میں تیرے ساتھ نہیں چل سکتا کیا؟"

"ہاں، ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ کچھ روز یہاں رہ ابھی۔ میں جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں، وہاں تیرا جانا مناسب نہیں ہے ابھی۔ چند دن میں دُور رکھنا چاہتا ہوں ان کی نظروں سے تجھے۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟ اور تو یہاں کیا کر رہا ہے ان کے ساتھ؟ تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں جیلانی!"

"کل تک صبر کر لے، سب کچھ سمجھا دوں گا تجھے۔ پہلے سے تیرے آنے کی خبر ہوتی مجھے تو تیرے استقبال کی مکمل تیاری کر کے رکھتا میں۔ پھر تجھے ایک لمحے کے لیے اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتا۔"

"تجھے میرے آنے کی خبر نہیں تھی تو یہاں اس گھر میں کیا لینے آیا تھا تو؟ جب کہ فردوسی کے گھر پر ملنے کا وقت بھی نہیں تھا یہ تو۔"

"میرے ایک ہمدرد نے صرف اتنا بتایا تھا مجھے کہ یہاں کوئی شخص آیا ہوا ہے جس سے مل کر مجھے خوشی ہو گی۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ وہی اپنی گاڑی میں مجھے کیفے لبرٹی کے سامنے اتار کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے اسے معلوم تھا تیرے بارے میں مگر مجھے سرپرائز دینا چاہتا تھا وہ۔ اس کا انداز یہی بتاتا تھا۔"

"مگر اسے کیسے علم ہوا میرے بارے میں؟ وہ کیسے جانتا ہے مجھے؟"

"میرا خیال ہے، وہ انھی لوگوں میں سے ہے جنھوں نے تمہیں آزادی دلائی ہے۔ مجھے غلام بنا لیا ہے انھوں نے یہ کام کر کے۔"

اسی لمحے ایک ٹرے میں چائے کی پیالیاں سجائے فردوسی بیگم واپس آ گئی۔ "یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے جناب! کس نے غلام بنا لیا ہے آپ کو؟" فردوسی بیگم ٹرے ہمارے درمیان بستر پر دھرتے ہوئے بولی۔

"آپ ہی کا ذکر خیر تھا بھئی بیگم! آپ بڑے احسانات کرتی رہتی ہیں ہم پر، حالانکہ ہم آپ کو پریشان ہی کرتے ہیں ہمیشہ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب پیرزادہ صاحب! عزیز ہوتے رہے ہیں آپ۔ میں نے کبھی ایسا نہیں سمجھا۔"

"ایسا نہ کہیں فردوسی! آپ غیر سمجھتیں تو بار بار دوڑے نہ چلے آتے ادھر۔ بالکل حقیقت بیان کی ہے آبی نے۔"

"دھیرے آواز دبا کر بولی۔ "آہستہ بولیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور اپنے صحیح ناموں سے نہ پکاریں ایک دوسرے کو۔ پیرزادہ ہی کہیں انھیں اور آپ بھی ہاشم خان ہی بنے رہیں.... ہاشم خان جیلانی یہی نام ہے آپ کا۔"

میں نے اور آبی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ آبی بولا۔ "کیا بات ہے؟ صاف صاف کہیں؟ اندھیرے میں نہ رکھیں ہمیں۔"

"میرے ساتھ والے فلیٹ میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں، وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ پاس پڑوس میں آنے جانے والوں پر ہر وقت نظر رکھتے ہیں۔ پچھلی بار جب آپ آئے تھے تو گلزار ملی تھی آپ کو۔ بڑی بسیار گو کی گانٹھ ہے وہ۔ اگر کسی وقت ذرا سا بھی شبہ ہو گیا اسے آپ لوگوں پر یا کوئی بات کان میں پڑ گئی اس کے تو طوفان کھڑا کر دے گی وہ۔"

"ان لوگوں کو یہاں آباد ہی کیوں ہونے دیا گیا ہے۔ بلڈنگ کے دوسرے مکینوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس پر یا انہیں خبر نہیں ہے کچھ؟ میں نے تو اسی روز اندازہ لگا لیا تھا کہ کہاں سے اٹھ کر آ بیٹھی ہے وہ یہاں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ اسی غلیظ ماحول کی پروردہ ہے وہ۔ ایک پولیس افسر نے یہاں لا کر رکھا ہوا ہے اسے۔ ابتدا میں کچھ لوگوں نے آواز اٹھائی تھی اس کے خلاف تو انہیں تھانے بلا کر گوشمالی کر دی گئی ان کی۔ پھر کسی کو ہمت نہیں ہو سکی۔"

"ہاں یار! یہ پولیس ہی اگر ٹھیک ہو جائے ہمارے تو سارا گند صاف ہو جائے یہاں سے۔" آبی بولا۔

"مگر پولیس کیسے ٹھیک ہو جائے گی پیارے! ہمارے یہاں کی ہر سیاسی پارٹی نے دوسروں کے جلسے جلوس خراب کرانے کے لیے غنڈے پالے ہوتے ہیں۔ پھر جب اس غنڈہ گردی کی بدولت کوئی پارٹی اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے تو ان لوگوں کو پولیس میں بھرتی کر کے ان کے ذریعے اپنے مخالفین کو ذلیل کراتی ہے۔ وہ لوگ اپنے چند روزہ اقتدار کی خاطر انہیں قانون کی باگیں تھما دیتے ہیں، اور یہ جدھر چاہتے ہیں قانون کو ہنکائے پھرتے ہیں۔ یہ بھی قانون کے تابع نہیں ہوتے، قانون ہی ان کے تابع ہوتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد بھی ان کی نوکریاں بچی رہتی ہیں اور یہ بدستور قانون کی آبرو ریزی کرتے رہتے ہیں۔ شریف لوگ اسی لیے ان سے دور دور رہتے ہیں۔ انہیں اپنی عزت عزیز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کے معاملات میں پڑنا پسند نہیں کرتے اور ان کے ظلم سہتے ہیں۔ عوام پولیس سے تعاون نہیں کرتے جب کہ معلوم... کتنے ہیں سب۔"

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔

"اوئے! بڑی معلومات جمع کر رکھی ہیں تو نے ان قانون کے آقاؤں کے بارے میں۔ رشتے داری جو قائم کی ہوئی ہے ان سے۔"

"کیا باتیں شروع کر دیں آپ لوگوں نے۔ چھوڑیں، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، چائے پیئیں آپ۔" فردوسی بیگم نے کہا۔

"ہاں یار دفع کر۔ ہمیں کیا کرنا ہے، ہم کون سے نیت باندھے کھڑے رہتے ہیں، اور تو نے تو بہت جھٹکا کیا ہے ان بے چاروں کا۔"

ہم خاموش ہو کر چائے پینے لگے۔ چائے ختم ہونے کے بعد فردوسی بیگم چائے کے خالی برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تو میں نے آبی سے کہا۔ "اچھا یار آبی! اب مجھے جانے دے پیارے، اگر زندگی رہی تو کل صبح دس بجے میں تجھے لینے آؤں گا، پھر ہم کسی تنہا گوشے میں چل کر اپنے اپنے دل کھول کر رکھ دیں گے ایک دوسرے کے سامنے۔ میری بپتا سن کر حیران رہ جائے گا تو۔"

"ٹھیک ہے بھائی جیلانی! تیری بات تو ماننا ہی ہو گی مجھے ورنہ ارادہ تو میرا کچھ اور ہی تھا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی مجھے دروازے تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو فردوسی بیگم سے جو کچن میں برتن رکھ کر واپس آ رہی تھی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ مجھے پابہ رکاب دیکھ کر بولی۔ "کیا مطلب؟ کیا آپ دونوں کہیں جا رہے ہیں؟"

"دونوں نہیں خانم! صرف یہ سردار کریم نواز صاحب عالی مرتبت تشریف لے جا رہے ہیں۔" آبی نے کہا۔

"یہ نہیں، اوئے کیا بات ہے! ایسے ہی طرح بات نہیں کر سکتا تو؟ ہر ایک کو ہر گھڑی القابات سے نوازنے پر تُلا رہتا ہے۔" میں نے آبی کو محبت سے سرزنش کرنے کے بعد فردوسی بیگم سے کہا۔ "وہ بات یہ ہے فردوسی بیگم! مجھے کچھ بے حد ضروری کام نمٹانا ہیں۔ اس لیے آج زیادہ دیر نہیں رک سکتا میں۔ کل آپ کے ساتھ لمبی نشست رہے گی۔ وعدہ رہا یہ آپ سے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت آپ ادھر بس اتفاقاً ہی نکل آئے تھے۔ پیرزادہ صاحب سے ملنے نہیں آئے تھے؟"

"نہیں جی! اس کی تو مجھے خبر ہی نہیں تھی۔ صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ یہاں میرا کوئی شناسا شخص آیا ہوا ہے۔"

"حیرت ہے! یہ اطلاع کیسے ہو گئی آپ کو... [illegible] شروع کرا دی... [illegible]"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ... [illegible] کیا ضرورت ہے مجھے اس کی... [illegible] ...سے اپنے بھی تو ہمارے دوستوں کی خبر گیری رکھتے ہیں۔ انھی نے بتایا تھا مجھے اس کے بارے میں۔"

"ارے آپ تو برا مان گئے جناب! ایسے ہی... [illegible] کہی تھی وہ بات۔ دوست تو بہت ہیں... [illegible] آپ کی؟"

"ہاں، کیوں نہیں! ایک وقت تو اس عروس البلاد میں آپ ہی ایک سہارا تھیں ہمارا۔ وہ وقت بھولا نہیں ہے مجھے۔"

"دیکھیں جناب! دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔ ایسی باتیں زبان پر نہیں لائی جاتیں۔ کل کس وقت آ رہے ہیں آپ؟"

"صبح دس بجے تک آؤں گا میں۔ لیکن اس سے آپ ترش..."

ہوں گی ہی نہیں گھر پہ آفس ٹائم ہے نا یہ آپ کا؟"

"ہاں، میں اس وقت آفس میں ہوتی ہوں۔ آپ سے اس وقت تو ملاقات نہیں ہو سکے گی میری۔" وہ بولی۔

"چلیں کوئی بات نہیں ہے، میں صبح تو ہیر زادہ کو ساتھ لے جاؤں گا اپنے۔ پھر شام کو واپسی پہ آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ بلکہ آپ رات کا کھانا کل یہیں ہمارے ساتھ کھائیں گے۔" فردوسی بیگم نے خوش دلی سے کہا۔

"بالکل بالکل، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کل رات آپ کی دعوت کھانے ضرور آؤں گا میں۔" میں نے فوراً کہا۔

فردوسی کے فلیٹ سے نکل کر زینے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے گلزار کے فلیٹ کی طرف نظر ڈالی مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ ایک بڑا سا مضبوط تالا اس کے دروازے پہ لٹک رہا تھا۔ وہ دروازہ دیکھ کر مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی بڑا بوجھ میرے سر سے اتر گیا ہے یا میں کسی پُرخطر راہ گزر سے بہ عافیت گزر آیا ہوں۔ عمارت سے باہر نکل کر میں کیفے مسری کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن راستے ہی میں مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی کی عقبی نشست میں دھنس کر ڈرائیور کو جمشید روڈ چلنے کا کہہ کر پشت گاہ پر سر ٹکا دیا۔ میرے سینے میں اس گھڑی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اپنے یار آبی سے میں مل کر ہی آ رہا تھا۔ اس نے مجھے آسیہ کی آزادی کا بھی مژدہ سنایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میری تیرہ بخت بہن، یار لوگوں نے قانون کے نام پر جس کی قوتِ پرواز چھین لی تھی اور اسے جا کر قفس نشین کر دیا تھا، اب آزاد ہو کر ممتا کی پناہ میں جا بیٹھی ہے۔ اسے پا کر ماں جی کیسی نہال ہوئی ہوں گی۔ ان کے وجود میں تپتا ہوا صحرا ٹھنڈا ہو گیا ہو گا اسے سینے سے لگا کر، دل میں ٹیس دیتے ہوئے، مارے کے سارے زخم سکون پا گئے ہوں گے۔ کتنی بے چین تھیں وہ اس آسیہ کے لیے۔ ہر گھڑی اسی کی فکر لگی رہتی تھی انہیں۔ ان کے چمن زارِ حیات میں بس دو ہی تو پھول کھلے تھے۔ انھیں بھی گردشِ زمانہ چین نہیں لینے دیتی تھی۔ پُرجوش آندھیاں اِدھر اُدھر اڑائے پھرتی تھیں۔ ٹک کر بیٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں کہیں کہ ماں جی کے کلیجے کو دو گھڑی بھی ٹھنڈک محسوس ہو سکتی۔ ایک زمانہ بیت گیا، ہم دونوں بہن بھائی ایک ساتھ ماں جی کے پاس نہیں بیٹھ سکے تھے کہ ان کی ممتا کو قرار آتا۔ وہ بخت گزیدہ بے قرار ہی رہتی تھیں، ہم میں سے کسی ایک نہ ایک کے لیے۔ میں قریب ہوتا تو آسیہ کی فکر سلگاتی رہتی تھی اور آسیہ مل جاتی تھی تو میرے لیے سینہ رستا رہتا تھا۔ اب آسیہ ماں جی کی آنکھوں کا کاجل بن گئی تھی تو وہ آنکھیں مجھے تلاش کر رہی ہوں گی۔ میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی، جی چاہا ابھی اڑ کر جا پہنچوں ان کے پاس لیکن خواہشوں کی تکمیل اتنی آسان کب ہوتی ہے؟ ایسا ہو جائے تو سارے دکھ دور نہ ہو جائیں انسانی زندگی سے، آدمی مصائب کی بھٹی میں کیوں جلتا رہے۔ افسوس کہ یہ آدمی کے اختیار میں نہیں ہے، اس خالقِ کائنات نے اتنا مختار نہیں بنایا ہے اسے۔ تقدیر کے ہاتھ میں تھما دی ہیں اس کی باگیں اور وہ جدھر چاہتی ہے، لیے پھرتی ہے ابنِ آدم کو اور اسے تقدیر کی اہمیت کا یقین دلانے کے لیے ہی شاید اس نے ایمان کی بنیادی شرائط میں تقدیر پر ایمان رکھنے کی شرط بھی رکھ دی ہے۔ میں بھی اسی تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بنا پھر رہا تھا زمانے بھر میں اور میری کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ مجھے کسی طرح اجازت ہی نہیں دے رہی تھی، لاہور جا کر ماں جی کی قدم بوسی کی۔

جمشید روڈ پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی اپنی جائے سکونت کی طرف چل دیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں دشمن کے آدمی کس کس گوشے میں میری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن تمام راستے میں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہ آ سکا جس پر میں شبہ بھی کر سکتا دشمن ہونے کا۔ بنگلے کے مین گیٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے دربان سے پوچھا۔ "وہ میم صاحب واپس آ گئی ہیں یا نہیں؟"

"نہیں صاحب! وہ تو ابھی نہیں آئی ہیں۔ البتہ بڑے صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں اندر۔" دربان نے میرے پوچھنے پر جواب دیا۔

"بڑے صاحب کون ہیں بھائی؟ کس کو کہہ رہا ہے تو؟"

"وہ اس بنگلے کے مالک شرافت صاحب کی بات کر رہا ہوں میں۔ وہی بیٹھے ہیں اندر۔"

"اچھا اچھا، تو یوں نام لے کر بتا نا بھائی۔ مجھے کیا معلوم تیرا بڑا صاحب کون ہے۔ کب کے آئے ہوئے ہیں وہ؟"

"کوئی آدھا گھنٹا ہوا ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں سیدھا ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔ وہاں شرافت علی ایک صوفے پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ آہٹ سن کر اس نے گردن اٹھا کے مجھے دیکھا اور اخبار الگ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "یار! کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟ کب سے یہاں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں میں تمھارا۔ آنے سے پہلے تین بار فون کر کے معلوم کیا تھا کہ تم واپس آئے یا نہیں؟"

"مگر کیوں میرے یار! ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا ہے مجھ سے تمہیں؟ کون سی اہم ضرورت آ پڑی ہے تمہیں میری؟"

"یہ دیکھو یہ" اس نے اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اخبار دیکھا ہے تم نے؟"

"کیا کوئی خاص خبر چھپی ہے؟ میں تو بس کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں اخبار شخبار، ورنہ تم تو جانتے ہو پیارے بھائی! مجھے فرصت کہاں ہوتی ہے ان چیزوں کو دیکھنے کی۔ دکھاؤ کیا ہے اس میں؟" میں نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہی صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو، یہ خبر چھپی ہے اس میں۔ تمھارے لیے تو خوشخبری ہے یہ۔" اس نے اخبار میرے سامنے رکھ کر ایک خبر پہ انگلی رکھ دی۔

آسیہ اور آبی کے بارے میں تین کالمی خبر لگی ہوئی تھی وہاں۔ میں نے شرافت علی کے ہاتھ سے اخبار لے کر پوری خبر پڑھ ڈالی۔ پوری کہانی اسی طرح چھاپی تھی اس اخبار کے نیوز ایڈیٹر نے جس طرح آبی نے مجھے سنائی تھی۔ بس اتنا اضافہ کیا تھا کہ پولیس کے ذرائع کے مطابق مفرور ملزمان اور ان کو فرار میں مدد دینے والوں کو جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ پولیس کا خیال ہے کہ یہ کارروائی بدنام اشتہاری مجرم غلام جیلانی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کی ہے۔ اسلم آبی جیلانی کا پرانا ساتھی ہے اور اس کے ساتھ بے شمار قتل اور ڈاکا زنی کی وارداتوں میں شریک رہا ہے جب کہ آسیہ غلام جیلانی کی بہن ہے، اس پر قتل اور لوٹ مار کے متعدد الزامات ہیں۔ اسلم آبی اور آسیہ دونوں کو جاگیردار مکرم علی گورایا کو قتل کر کے اس کی جاگیر پر قبضہ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اس مقدمے کی کارروائی کے سلسلے میں انہیں عدالت لے جایا جا رہا تھا۔ جب راستے میں غلام جیلانی اور اس کے ساتھیوں نے جیل کی گاڑی پہ حملہ کر کے انھیں پولیس کی تحویل سے چھڑا لیا۔ پولیس پوری سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ امید ہے کہ ملزمان جلد ہی دوبارہ گرفتار ہو جائیں گے۔

اس کے بعد مختصر طور پر اخبار کے قارئین کو مجھ سے متعارف کرایا گیا تھا۔ اس تعارف میں میرے جرائم کی فہرست بھی شامل کی گئی تھی۔ غالباً اس سے پڑھنے والوں کو یہ بتانا مقصود ہو گا کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں اور ہماری فرض شناس پولیس عوام کو میرے خوفناک عزائم سے محفوظ رکھنے کے لیے کس قدر کوشاں ہے۔ خبر پڑھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلنے لگی۔ شرافت علی بولا۔ "ہے نا خوشخبری؟ مگر کمال کی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اسے بھی تمھارا کارنامہ سمجھ رہے ہیں۔"

"ہاں، یہ واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ یار لوگوں کو جب کوئی معقول بات نہ سوجھ سکی تو اسے میرے نام سے منسوب کر دیا۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں شرافت علی! اسے تم اپنے بادشمن اینڈ کمپنی کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں یہ کام کن لوگوں نے انجام دیا ہے۔ یہ اطلاع بھی میرے لیے نئی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے پہلے ہی سب کچھ۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کام کن لوگوں نے انجام دیا ہے؟" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا شرافت علی! میرے اپنے ذرائع ہیں، کچھ ایسے جاں نثار ہیں میرے بھی جو میری اور میرے دوستوں کی خبرگیری رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میں اب تک ... نے کب کا خاک میں مل چکا ہوتا۔"

"لیکن تم یہاں کراچی میں بیٹھ کر یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو کہ ... میں پیش آنے والے کسی واقعے کی حقیقت کیا ہے؟"

"تیرا کیا خیال ہے شرافت علی! کیا میں کراچی میں آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوں بالکل؟ مجھے اپنے لوگوں کی کچھ خبر ہی نہیں ہے؟ تو نے تو یہ خبر اخبار میں پڑھی ہے نا؟ جب کہ میں نے آج کا سارا دن اپنے یار آبی کے ساتھ گزارا ہے۔ سمجھا تو؟"

"کیا...؟ کیا کہہ رہا ہے جیلانی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آبی اتنی جلدی کراچی کیسے پہنچ سکتا ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے باعث پوری کھل گئی تھیں اور لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے یقینی بھی نمایاں تھی۔

"یہ واقعہ جو تو نے آج اس اخبار میں پڑھا ہے، آج کا نہیں ہے میرے بھائی! کئی دن ہو چکے ہیں اسے۔ آبی اور آسیہ رہائی ملتے ہی سیدھے لاہور پہنچے تھے۔ وہاں سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ میں ان دنوں کراچی میں ہوں لہٰذا آبی مجھے تلاش کرتا ہوا کراچی آ گیا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔ مجھے جیسے ہی اس کے آنے کی خبر ملی میں اس کے پاس پہنچ گیا۔"

"اچھا، تعجب ہے، ہمیں اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ آج اگر اخبار میں اس واقعے کی روداد نہ چھپتی تو اب بھی ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا جیلانی! کیا اب بھی تمہیں ہماری دوستی پر اعتبار نہیں ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے پیارے بھائی! خواہ مخواہ کی بدگمانیوں کو جگہ نہ دے دل میں۔ تو نے بڑے بُرے وقت میں ساتھ دیا ہے میرا، بڑی خدمت کی ہے تو نے میری، تیرا یہ احسان بھول نہ سکوں گا میں کبھی۔ دراصل وجہ یہ ہے تجھے کچھ نہ بتانے کی کہ مجھے اطلاع دینے والے نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آبی آ گیا ہے۔ اس نے صرف یہ خبر دی تھی کہ میرا ایک دوست یہاں آیا ہوا ہے اور ایک مشترکہ دوست کے ہاں مقیم ہے۔ میں وہاں چلا جاؤں۔ چنانچہ میں یہ جاننے کے لیے دوڑا چلا گیا کہ وہ کون شخص ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے آبی کو دیکھا تو خود میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔"

"خیر چلو کوئی بات نہیں، اصل مسئلہ تو ان کی رہائی کا تھا جو حل ہو گیا۔ اب تو تم اس کشمیر خان سے مل لو۔ اس نے بہت پریشان کر رکھا ہے مجھے۔ خود ڈاکٹر حسن کا بھی کہنا ہے کہ میں ہیروں کو بھول جاؤں اور تمہیں جلد از جلد مال کے ساتھ فرانسکو روانہ کر دوں۔ آج صبح بھی فون کیا تھا انھوں نے مجھے۔ کہتے تھے انھوں نے ولسن کو ہدایت کر دی ہے جس طرح بھی ہو سکے ایک

دو دان میں آبی اور آسیہ کو آزادی دلا دے تاکہ جنیبل ئی ہمارا کام کر سکے۔"

"اوئے، تمھارے دھمن تمھن کو ہر دم اپنے ہی معاملات کی فکر رہتی ہے اور کسی بات سے غرض نہیں ہے اسے؟ میں نے کشمیر خان کا مال لے جانے کا وعدہ اسی صورت میں کیا تھا اس سے کہ جب وہ آسیہ اور آبی کو رہا کرانے میں مدد کرتا میری، اب جب کہ وہ لوگ اسکی کوشش کے بغیر ہی آزاد ہو گئے ہیں تو وہ مجھے کس طرح مجبور کر سکتا ہے اس کام کے لیے؟"

"کیا مطلب؟ تو کیا اب تم مال لے کر نہیں جاؤ گے ان کا؟ وعدہ خلافی کرو گے ان سے؟"

"وعدہ خلافی کیسے ہوئی یہ میرے ویر! یہ تو صاف صاف باہمی افہام و تفہیم کا معاملہ ہے۔ اس نے میرے کام آنے کا وعدہ کیا تھا تو میں نے بھی ہامی بھر لی تھی اس کے کام آنے کی مگر اب تو یہ معاملہ ہی باقی نہیں رہا ہے۔ پھر تو کیوں برہم ہوتا ہے؟"

"میں برہم نہیں ہو رہا ہوں۔ میں تو تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم اس طرح انکار کر کے اچھا نہیں کر رہے ہو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"کیوں؟ کیوں کہہ رہے ہو تم ایسا۔ کیا نقصان ہے میرا اس میں؟" میں نے تیکھے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو تمھارا انکار دشمنی کی بنیاد بن جائے گا۔ ایک بار پھر دشمنی ٹھن جائے گی ڈاکٹر دھمن سے اور یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ وسائل کے مالک ہیں۔ امریکا میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے تمھیں باندھ کر کھینچ لیا تھا وہاں۔ وہ دوبارہ بھی ایسا کر سکتے ہیں اور اس بار صورت حال پہلے جیسی نہیں ہوگی۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ تمھارے ساتھ۔"

میں نے محسوس کیا شرافت علی مجھے سمجھا بجھا کر دھمن کے لیے کام کرنے پر آمادہ تو کر رہا ہے مگر دل سے وہ یہی چاہتا ہے کہ میں یہ کام نہ کروں۔ اس کا لہجہ اس کے جذبات و خیالات کی مکمل عکاسی کر رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ حالات کے ریلے میں بہہ کر جس مقام پر آ ٹھہرا ہے وہ اسے خود بھی پسند نہیں ہے۔ آدمی اگر فطرتاً برا نہ ہو تو وہ اپنے دامن پر زیادہ عرصہ غلاظت برداشت نہیں کرتا۔ چاہتا وہ یہی ہے کہ نادانستگی میں یا مجبوراً اس نے جو راہِ بد اختیار کر لی ہے، اس سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے گزر کر سیدھی اور ستھری راہ پر آ لگے۔ وہ شرافت علی بھی مجھے اس گھڑی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دھمن کے شکنجے سے آزاد ہو جانا چاہتا تھا۔ اس خندق سے باہر آ جانا چاہتا تھا وہ جس میں دھمن نے اسے اتار دیا تھا مگر اس کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ ایک نیم نرم اور اطاعت گزار قسم کا بندہ تھا سرکشی یا منہ زوری اس کے لہو میں شامل ہی نہیں کی گئی تھی۔ عجیب گریہ صفت قسم کا آدمی تھا۔ چاہتا یہ تھا کہ کوئی نجات دہندہ آ کر اسے اس عذاب ناک زندگی سے نجات دلا دے۔ خود ذرا ہاتھ پیر ہلانے کی بھی جرأت نہیں تھی اس میں۔

"ایک بار وہ مجھے دھوکے سے باندھ لے گئے تھے اور یہ دھوکا بھی میں اس وجہ سے کھا گیا تھا پیارے کہ ان دنوں یہ ذہن آسیہ اور آبی میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اپنے گرد و پیش کو سمجھنے کی فرصت ہی نہیں تھی مجھے۔ ورنہ اتنا مٹی کا مادھو بھی نہیں ہوں کہ جو چاہے اپنی حسبِ منشا باندھ کر بٹھا لے مجھے۔ ایسا ہوتا تو وہ دھمن یوں بھاگا بھاگا نہیں پھرتا اپنی منکوحہ کو ساتھ لے کر۔ میرے ہی خوف نے اسے امریکا جیسے دور دراز ملک میں جلاوطنی پر مجبور کیا تھا۔ جانتا نہیں ہے تو؟"

"جانتا ہوں اچھی طرح سب کچھ پھر بھی میرا مشورہ تمھارے لیے یہی ہے جیلانی! دشمنی مول مت لو اس سے۔"

"اوئے چپ کر یار! بزدلی کا درس دینے لگا ہے مجھے۔ تیری زبان تھکتی ہی نہیں ہے اس کی حمایت میں بولتے۔"

عجیب شش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا وہ۔ اس کے چہرے سے بے یقینی برسنے لگی تھی۔ بمشکل وہ بولا۔ "بھائی جیلانی! تیرے خون میں بڑا ابال باقی ہے ابھی تک۔ عالمِ جوش میں بعض خوفناک قسم کی حقیقتیں فراموش کر بیٹھتا ہے تو۔"

"مثلاً۔ ذرا وضاحت تو کر پیارے ان حقیقتوں کی جن کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے تو میری۔"

"میرے یار! سب کچھ ہو چکا ہے تو؟ ذرا بھی خیال نہیں ہے تجھے کسی بات کا۔ ایسا تو کوتاہ بین نظر نہیں آتا تو۔"

"میرے ویر! او الٹی کر بات کرنا۔ بتا مجھے یہ کون سا خسارہ ہے صرفِ نظر کر رہا ہوں میں؟ کچھ پتا تو چلے مجھے بھی۔"

"ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "جیلانی! سچ بتا کیا واقعی تجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر دھمن اور اس کی بیوی عالیہ آج کل کن لوگوں کے لیے کام کر رہے ہیں؟ اور لزی کیوں آئی ہے تیرے ساتھ؟"

اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔ میں تو اب تک سمجھتا رہا تھا کہ شرافت علی کو دھمن اور یہودیوں کے تعلقات کا علم نہیں ہے۔ وہ صرف یہی جانتا ہے کہ دھمن اور عالیہ غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہیں اور ان دنوں منشیات کی اسمگلنگ بھی کر رہے ہیں۔ یہاں سے منشیات امریکا منگواتے ہیں، اور امریکا سے چوری کے جواہرات سستے داموں خرید کر پاکستان پہنچا دیتے ہیں، یہاں اس کے شرافت علی جیسے کارندے ان جواہرات کو عرب شیوخ کے ہاتھوں اچھی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں لیکن

اس وقت اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اتنا بے خبر نہیں ہے حالات کا پورا پورا علم رکھتا ہے مگر میں ابھی اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں بھی اس کی طرح سب کچھ جانتا ہوں۔ ایک خیال یہ بھی تھا مجھے کہ کہیں وہ مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش نہ کر رہا ہو، دھمن اور اس کے آقاؤں کے گٹھ جوڑ کے بارے میں میری زبان سے کوئی ایسی بات کہلوانا چاہتا ہو جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ میں ان کی اصلیت سے واقف ہوں یا نہیں، مجھے الزبتھ کے اپنے ساتھ پاکستان آنے کی اصل وجہ کا بھی کچھ علم ہو سکا ہے یا میں اب تک اس کے بارے میں اسی خوش فہمی کا شکار ہوں کہ وہ بنتِ یہودہ محض میری چاہت میں بندھی چلی آئی ہے۔ چنانچہ میں بے سوچے سمجھے شرافت علی کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے استعجابیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیسی عجیب باتیں کر رہا ہے بھائی شرافت علی تو؟ دھمن اور عالیہ کا اپنا ہی کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے جس کی آمدنی ان سے سنبھالی نہیں جاتی۔ پھر انہیں کسی کے لیے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جہاں تک لزی کا تعلق ہے تو شاید تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ہم دونوں امریکا واپس جانے کے بعد شادی کر لیں گے۔ وہ اسی لیے میرے ساتھ آئی ہے کہ کچھ عرصہ ہم دونوں ایک ساتھ گزار کر ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ویسے اس کے باپ آرتھر نے ہمیں شادی کرنے کی اجازت پہلے ہی دے دی ہے۔"

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا، میں نے اسے جو کچھ بتایا وہ اس کے لیے ایک بالکل نئی اور انوکھی بات تھی۔ وہ بولا۔ "میں تجھے ایسا سیدھا تو نہیں سمجھتا تھا جیلانی! تو نے سارا امیج خراب کر دیا اپنا میری نظر میں۔"

"کیوں؟ ایسی کون سی اپنے کمین ہونے کی دلیل پیش کر دی ہے میں نے، جس سے امیج خراب ہو گیا ہے میرا؟"

وہ کچھ دیر مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تجھے یقین ہے وہ تجھ سے شادی کر ہی لے گی؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔ تجھے اس میں شبہ کیوں ہے؟ ایسا کیوں کہہ رہا ہے تو؟"

"لیکن مجھے یقین ہے وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ لوگ اپنا کام نکالنے کے لیے تجھے بیوقوف بنا رہے ہیں جیلانی!"

"اتنے اعتماد کے ساتھ کیوں کہہ رہا ہے تو یہ بات؟ کیا تو پہلے سے جانتا ہے اسے؟" میں نے قدرے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"پہلے سے میں اسے تو نہیں جانتا ہوں لیکن یہاں جن لوگوں سے وہ ملتی رہتی ہے انھیں میں خوب جانتا ہوں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟ تم ان لوگوں کو کس طرح جانتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک تو وہی جرمن صنعت کار الیگزینڈر ہے جس کے ساتھ تم اور لزی بابا اسحاق کے آستانے پر گئے تھے۔" وہ بولا۔

"الیگزینڈر؟" میں نے یہ نام دہرایا۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ فیروز وغیرہ بھی گفتگو کے دوران یہی نام لے رہے تھے اس جرمن شخص کا۔ اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا تھا ناموں کے اس فرق پر، لیکن اس وقت جب شرافت علی نے یہ نام لیا تو مجھے خیال آیا، لزی نے اسے جیرالڈ کے نام سے متعارف کرایا تھا مجھ سے۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "تمہیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے، ایسا ہی لگتا ہے مجھے۔ وہ شخص جو ہمیں بابا صاحب کے آستانے پر لے گیا تھا اس کا نام الیگزینڈر نہیں ہے، اس نام کے کسی شخص کو تو میں نے دیکھا تک نہیں ہے۔ میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ حیرت سے بولا۔ "الیگزینڈر نہیں ہے اس کا نام تو پھر کیا نام ہے اس کا؟"

"ہے تو وہ جرمن ہی مگر اس کا نام جیرالڈ ہے۔ یہی نام بتایا تھا لزی نے مجھے اس کا۔ اچھی طرح یاد ہے مجھے۔"

"ہوں۔" وہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ تقریباً ایک منٹ سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں میری، یا تو لزی نے کسی مصلحت کے تحت تمہیں اس کا غلط نام بتایا ہے یا پھر وہ یہاں اب تک خود کو غلط نام سے متعارف کراتا رہا ہے۔"

"لیکن اسے غلط نام اختیار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یا لزی کے پیشِ نظر کونسی مصلحت ہو سکتی ہے؟ نہیں یار! میں تیری یہ بات نہیں مان سکتا۔ ایک بار پھر یہی کہوں گا تجھے ضرور کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو کر میری صورت تکنے لگا۔ معلوم یہ ہوتا تھا جیسے اندر ہی اندر اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہو۔ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہو۔ اس وقت کی اس گفتگو سے یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ وہ واقعی مجھے دھمن وغیرہ کے لیے کام کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے یہ بات مجھے بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی اور اب جب تک وہ میرے سامنے پوری طرح کھل نہیں جاتا میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی باتوں کو مسترد کرنے کا مقصد ہی یہ تھا میرا کہ وہ جھنجلا کر خود کو میرے سامنے پوری طرح ظاہر کر دے۔ اپنا دل کھول کر رکھ دے میرے آگے، تاکہ میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔

اسے زبان کھولتے ہوئے جھجکتے دیکھ کر میں نے کہا۔ "شرافت علی! اگر تم کوئی ایسی بات جانتے ہو جو میرے مفاد میں نہیں ہے اور مجھے اس سے نقصان پہنچنے کا امکان ہے تو مجھے تفصیل کے ساتھ صاف صاف بتا دو اور یہ یقین رکھو کہ اگر مجھے

تمھاری بات سچ نہیں معلوم ہوئی یا تم جو کچھ بتاؤ گے وہ درست ثابت نہ ہوا تب بھی ہمارے درمیان ہونے والی کوئی بات کسی تیسرے شخص کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ جو کچھ کہتے ہوئے ڈر رہے ہو، بے خوف ہو کر کہہ ڈالو۔"

وہ بولا "جیلانی! داناؤں کا کہنا ہے، کمان سے نکلے ہوئے تیر اور زبان سے نکلی ہوئی بات پر آدمی کو کوئی اختیار نہیں رہتا اور اس کے نتیجے کا بھی کچھ علم نہیں ہوتا کسی کو۔ بعض اوقات آدمی کے اندازے بہت ہی غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے مگر کبھی کبھی آدمی کو نتائج سے بے پروا ہو کر بھی کوئی جرأت مندانہ قدم اُٹھا لینا چاہیے۔ مجھ سے کچھ کہتے ہوئے تمھیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے اس کے بعد تمھیں کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا طوطا چشم نہیں ہوں میں شرافت علی! تم مجھ پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر سکتے ہو۔"

وہ بولا "جیلانی! میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں، دشمن نے میرے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے دھوکے سے مجھے ایک گردے سے محروم کر دیا۔ میں نے اس پر شور شرابا کیا تو اس نے مجھے روپے کی پیشکش کر دی۔ چونکہ میں ایک غریب آدمی تھا اور بڑی ہی عسرت کی زندگی گزار رہا تھا اس لیے اتنا بہت سا روپیہ دیکھ کر میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ طمع نے مجھے گھیر لیا اور میں نے اس خارزار راہ کی دشواریوں کا اندازہ کیے بغیر اس میں قدم دھر دیا۔ ابتدا میں مجھے یہ زندگی بہت اچھی لگی۔ دولت کی ریل پیل نے میری آنکھیں چندھیا دی تھیں، کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے دوڑا ہی چلا جا رہا تھا لیکن آخر کب تک آنکھیں بند رکھ سکتا تھا، ایک نہ ایک دن تو تھکنا ہی تھا، اور جب تھک کر سستانے کے لیے بیٹھا تو آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کو بھی دیکھا۔ اس وقت یہ احساس ہوا مجھے کہ میں اپنے مقام سے بہت دُور نکل آیا ہوں، ارد گرد کی تمام چیزیں، سارا ماحول نا آشنا اور سب سے اذیت ناک بات یہ تھی کہ یہاں میں آزادی اور سکون کا ایک سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ یہ جان کر مجھے وحشت ہونے لگی اس ماحول میں، اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جی چاہا سب کچھ تلپٹ کر دوں اور نکل جاؤں یہاں سے مگر یہ اب کسی طرح بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں جس دلدل میں اُتر چکا ہوں وہاں سے بہ سلامت واپسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ تم بھی کوئی ایسی راہِ مستقیم کے مسافر تو نہیں ہو، زندگی تمھاری بھی بہت پُر ہنگام رہی ہے، تم نے اپنے لیے قدم قدم پر مصائب کے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں۔ ذہن پر پیر ٹکانے کی جگہ بہت کم رہ گئی ہے تمھارے پاس مگر تمھیں مجھ پر یہ برتری اب بھی حاصل ہے کہ تم میری طرح غلام نہیں ہو کسی کے، کسی انسان کے احکامات کی پابندی فرض نہیں ہوئی ہے تم پر، اور یہ ایک بہت بڑی نعمت حاصل ہے تمھیں۔ میں چاہتا ہوں اسے ضائع نہ کرو۔ دشمن یا اس کے آقاؤں کے ساتھ اس تاریک غار میں نہ اترو جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے آدمی کے لیے۔ وہ لوگ جونک کی طرح چمٹ جائیں گے تمھیں اور تمھارے لہو کی ساری گرمی چوس لیں گے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا "تو تو اندر سے کچھ اور ہی ثابت ہوا ہے یار! بڑا ہی شفاف دل لیے پھرتا ہے تو اپنے سینے میں۔ میں تجھے ایسا بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے، آدمی اگر فطرتاً بُرا نہ ہو تو بُرائی کی راہ پر زیادہ دور نہیں چل سکتا۔ مجھے خوشی ہے میرے عزیز! تیرا ضمیر زندہ ہے ابھی جو تجھے کچوکے دیتا رہتا ہے اندر ہی اندر۔"

"ہاں یار! بڑا احسان ہے اس رب العلمین کا کہ اس نے میرے ضمیر کو موت کی نیند نہیں سلا دیا ورنہ میں بالکل ہی برباد ہو جاتا۔"

"ہاں تجھے شکر گزار رہنا چاہیے اس کا۔ وہی تو سہارا ہے ہم سب کا اور یہ تُو دشمن کے کن آقاؤں کا ذکر کر رہا تھا، یہ تو بتا ذرا۔"

"یہ تیری لزی بیگم جو ہے نا، اس کا باپ آرتھر فنچل وہاں امریکا کی ریاست سان فرانسسکو میں منشیات کے اسمگلروں کا سرغنہ ہے۔ ڈاکٹر دشمن آج کل انھی کے لیے کام کر رہا ہے۔ دشمن ان کے لیے منشیات اسمگل کراتا ہے۔ اس کے عوض آرتھر اسے اور اس کے کالے دھندوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یوں وہ دونوں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں مگر دشمن کی حیثیت اس کے ایک محکوم کی سی ہے۔ آرتھر کی اجازت کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکتا ہے۔ ہر بات کی پیشگی اطلاع دینا ہوتی ہے آرتھر کو۔ تم جو ہیرے لے کر آئے تھے ان کی خبر ہے اسے اور چونکہ آرتھر کو ہیروئن کی نئی کھیپ جلد از جلد مطلوب ہے اس لیے دشمن ہیروں کی گمشدگی کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا ہے ورنہ طوفان کھڑا کر دیا ہوتا اس نے اب تک۔ وہ اسی بات پر زور دے رہا ہے زیادہ سے زیادہ کہ تمھیں ہیروئن دے کر فوراً روانہ کیا جائے۔ وہ تمام رکاوٹیں جو تمھاری راہ میں حائل ہیں جلد از جلد دُور کر دی جائیں۔ چنانچہ پنڈی میں اس کے تمام کارندے تمھاری بہن آسیہ اور اسلم آپی کی رہائی کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ اسی لیے میں نے سمجھا تھا شاید ان دونوں کی آزادی انھی کی مرہونِ منت ہے مگر تم کہتے ہو کہ انھیں کسی اور نے ہی رہائی دلائی ہے۔"

"ہاں، سچ یہی ہے جو میں نے تمھیں بتایا ہے۔ ان لوگوں کا کوئی دخل نہیں ہے اس میں۔" میں نے فوراً کہا۔

"مجھے یقین ہے تمھاری بات پر، تم جیسا شہ زور شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اب میں تمھیں بتاتا ہوں، لزی یہاں کے اسمگلروں کے لیے ایک خاصی جانی پہچانی لڑکی ہے۔ وہ یہاں تمھارے ساتھ اسی لیے آئی ہے کہ ان لوگوں میں تمھیں اچھی طرح روشناس کرا دے تاکہ وہ لوگ وقتِ ضرورت تمھیں کیریئر کے طور پر استعمال کرتے رہیں، اسمگلروں کو نئے چہروں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ دشمن نے تم سے صرف ایک بار اپنا مال سان فرانسسکو پہنچانے کا وعدہ لیا ہے لیکن الزبتھ یہاں ایسا انتظام کرنے میں مصروف ہے کہ تم جب بھی ان کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرو گے، ان سے الگ ہونا چاہو گے یا ان کے کام آنے سے انکار کرو گے، وہ تمھیں مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

"وہ کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے ہیں میرے خلاف؟ کچھ ان کے بارے میں بھی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"ہماری دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر بے حد معزز اور شریف ہیں۔ اپنی اس حیثیت میں وہ خاصے اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ وہ تمھیں ان سے بھی متعارف کرانا چاہتی ہے۔ وہ لوگ تمھیں کبھی بھی اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرنے دیں گے۔ اگر تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو وہ پہلے تو اپنے ذرائع استعمال کریں گے، ڈرا دھمکا کر، تشدد کر کے یا تم سے متعلق کسی شخص کو نقصان پہنچا کے تمھیں روکنا چاہیں گے۔ اس میں بھی ناکامی ہوئی تو پولیس کو پیچھے لگا دیا جائے گا تمھارے۔ غرض زندگی اجیرن کر دیں گے وہ تمھاری۔"

"فرض کرو آخری حربے کے طور پر انھوں نے پولیس کے حوالے کر دیا مجھے تو اس سے انھیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"اگر پولیس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تم نے ان کی بات مان لی تو وہ تمھیں آزاد کرا لیں گے اور یہ ان کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔"

"لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے پیارے بھائی! میں ایک سزا یافتہ جیل توڑ کے بھاگا ہوا اشتہاری مجرم ہوں۔ ایک بار بھی پولیس کے ہاتھ آ گیا تو دوبارہ کوئی میری شکل بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ لہٰذا اس طرح تو میں ہاتھ نہ آ سکوں گا ان کے۔ پولیس کے حوالے کر کے وہ ایک طرح کی انتقامی کارروائی تو کر سکتے ہیں میرے خلاف، کوئی فائدہ مجھ سے حاصل نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو تمھارا خیال ہے جیلانی! تم جانتے نہیں ہو ان .. لوگوں کو اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر اچھا بھلا شریف آدمی پابہ جولاں کال کوٹھری تک جا پہنچتا ہے اور کال کوٹھری میں پڑا ہوا قیدی آزادانہ شہر میں گھومتا پھرتا ہے۔ وہ ان کا مال ادھر سے ادھر کرنے میں مصروف رہتا ہے اور دُنیا سمجھتی رہتی ہے کہ وہ اپنی سزا کے دن پورے کر رہا ہے۔"

"دیکھ یار شرافت علی! کسی دو ٹکے کے چور اچکے کا نام تو .. غلام جیلانی نہیں ہے۔ میرا واسطہ اب تک ایسے ہی لوگوں سے رہا ہے، جن کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی ہے کبھی۔ قتل و غارت گری مشغلہ ہے ان کا۔ میں نے جتنے قتل کیے ہیں ان میں سے کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے اپنے حساب میں ڈالے جا سکیں، بیشتر تو انھی ذی حیثیت لوگوں کے کھاتے میں جاتے ہیں۔ میرے یوں آزادانہ دندناتے پھرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ میرے اور ان کے درمیان باہمی تعاون کا مضبوط رشتہ قائم رہا ہے۔ یہ رشتہ میں ان اسمگلروں کے ساتھ نہیں جوڑ سکتا۔ یہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔ میرے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں، کسی ایک یا دس بیس بُرے لوگوں کو مار دینا کوئی قومی نقصان نہیں ہے۔ جب کہ یہ لوگ میری پوری قوم کا قتلِ عام کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کارِ بد میں ان کی مدد کروں۔ یہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ میرے یار! تو سوچ تو ذرا کیا کام لینا چاہتے ہیں یہ مجھ سے اور کیا میں تجھے ایسا ہی وطن فروش نظر آتا ہوں۔ میں اپنے سوہنے وطن کی مٹی کو ان کے لہو سے لالہ زار تو بنا سکتا ہوں، ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل میں ان کا معاون کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ اب جب کہ تُو نے مجھ پر اعتبار کر کے اپنے دردوں بردوں کو میرے سامنے اُلٹ ہی دیا ہے تو میں بھی تجھ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ تیرے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے شرافت علی کہ اپنے اس شریفانہ نام کی لاج رکھ لے، چھوڑ ان کالے دھندوں کو اور لعنت بھیج دے اس مال و دولت پر جو ایک دن قبر میں تجھے سانپ بچھو بن کر ڈسنے آ جائے گی۔ میری بات مان پیارے بھائی! کچھ اپنی عاقبت سنوارنے کے کام بھی کر لے۔ نیکیاں بھی شامل کر لے کچھ اپنے اعمال نامے میں، ان کی بھی ضرورت پڑے گی تجھے ایک دن۔"

اس نے پُرجوش انداز میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چہرہ اس کا جذبات کی فراوانی کے سبب تمتما اٹھا تھا، وہ بولا "اوہ، جیلانی! میرے عزیز، میرے دوست! تُو نے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ میں تو خواہ مخواہ ہی فکرمند ہو رہا تھا اتنے دن سے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تُو اندر سے کتنا اُجلا ہے، کیسا صاف باطن شخص ہے۔"

"میں بھی تجھے ایسا نہیں سمجھتا تھا یار جی! میں نے تجھے بھی غداروں کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا، آج تو کھل گیا میرے سامنے، ورنہ کسی دن تیرا کام تمام ہو جاتا میرے ہاتھوں۔ حالانکہ تیرے جیسے لوگوں کی ان دنوں مجھے سخت ضرورت ہے۔"

"ہاں بھائی! کچھ خدا کو ہی شاید ہماری بھلائی منظور تھی جو آج یہ موقع فراہم کر دیا ہے اس نے ہمیں۔ اب ہم ساتھ مل کر زیادہ مؤثر انداز میں کام کر سکیں گے۔ تیرا ساتھ ہو جانے کے بعد میری طاقت دوگنی ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہو گیا ہے اب ہم ان کی بیخ کنی میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ کتنی سچی بات کہی ہے کسی نے کہ آدمی نیک مقصد لے کر نکلتا ہے تو لوگ خود بخود اس کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ اب ذرا یہ بھی بتا دے ویر میرے، کچھ لوگ بھی ساتھ ہیں تیرے یا اکیلا ہی اس راہ پر چل پڑا ہے تو؟"

"ہاں ہیں، کچھ اور لوگ بھی ہیں میری طرح کے، جن کی مجبوریوں نے انھیں اس دلدل میں لا ڈالا ہے اور اب وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بھی تیار ہیں۔ کھل کر وہ اس لیے سامنے نہیں آئے ہیں ابھی کہ انھیں اپنے پیاروں کی زندگیاں عزیز ہیں۔ وہ اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کے اقربا مصائب کا شکار نہ ہو جائیں۔"

"ایک بات کا خاص طور پہ خیال رکھنا شرافت علی! ہمیں اس وقت تک کھل کر سامنے نہیں آنا ہے جب تک ایک ایک غدار ہماری نظروں میں نہ آ جائے۔ اگر ایک بھی بچ گیا ہمارے ہاتھ سے تو وہ ہماری ساری کارگزاری پہ پانی پھیر دے گا۔"

"اس کی تم فکر ہی نہ کرو جیلانی! ایک ایک آدمی سے اچھی طرح واقف ہوں میں۔ کوئی چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے۔"

"یہ دعویٰ کیسے کر رہے ہو تم جب کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تم اس بات پہ حیران ہو رہے تھے کہ الیگزینڈر کا اصل نام اگر خیر اللہ ہے تو وہ خود کو اپنے اصل نام سے متعارف کیوں نہیں کراتا ہے لوگوں میں؟"

"ہاں میرے یار! یہ تو واقعی تعجب کی بات ہے میرے لیے۔ اسے یہاں تمام ہی لوگ الیگزینڈر کے نام سے جانتے ہیں جو ایک جرمن باشندہ ہے۔ کچھ انڈسٹریز میں سرمایہ کاری بھی کی ہوئی ہے اس نے، جس کی وجہ سے تاجروں اور صنعت کاروں کی برادری میں جرمن صنعت کار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ بات صرف ہم جیسے لوگ ہی جانتے ہیں کہ وہ صنعت کار منشیات کا کتنا بڑا اسمگلر ہے، خود دولت کے لیے اتنا گھناؤنا کام کرتا ہے اور عام لوگوں میں بیٹھ کر سرمایہ داروں کے خلاف تقریریں جھاڑتا رہتا ہے۔ سوشلزم کا زبردست پرچار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے ہمارے ملک کے لیے سوشلسٹ نظامِ معیشت سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔"

"ہاں اصل مقصد تو یہی ہے اس کا۔ یہی زہر ہماری قوم کو پلانے کے لیے تو اس نے صنعت کار کا لبادہ اوڑھا ہے۔ اس جیسے لوگ جب عوام کے سامنے ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو نا سمجھ لوگ ان سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا جب بھی کسی سرمایہ دار یا جاگیر دار نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی، عوام جوق در جوق ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ وہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کرتے کہ ایک سرمایہ دار انہیں اپنی دولت کیسے دے دے گا، ایک جاگیر دار اپنی زمینیں ان میں کس طرح تقسیم کر دے گا۔ یہ پُرفریب نعرے انہیں مزید پستی میں دھکیل دینے کے لیے ایجاد کیے گئے ہیں، انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینے کے لیے یہ ہمہ رنگ زریں جال تیار کیا گیا ہے۔"

"مگر یار! اس کی ایک بات نے سخت حیران کیا ہوا ہے مجھے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس کو کس خانے میں فٹ کروں میں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟ کون سی چیز دیکھی ہے تم نے اس میں؟ جس نے تمھیں گومگو کی کیفیت سے دوچار کر رکھا ہے۔"

"وہ بابا اسحاق کا بڑا معتقد ہے۔ اکثر ان کے آستانے پہ حاضری دینے جاتا رہتا ہے۔ ایک غیر مسلم کو کسی پیر فقیر کا ایسا معتقد میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، ان کے بڑے گن گاتا ہے وہ، بہت ہی عقیدت اور احترام سے نام لیتا ہے ان کا۔"

مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اسی لیے میں کہہ رہا تھا میرے ویر! تیری معلومات بہت خام ہیں ابھی۔ بس یوں ہی دعوے کر رہا تھا تو کہ ایک ایک آدمی تیری نظر میں ہے، سب سے اچھی طرح واقف ہے۔ حالانکہ مجھے پورا پورا یقین تھا تو صرف ان ہی لوگوں کو جانتا ہے جو منظرِ عام پہ ہیں۔ وہ جو پسِ دیوار بیٹھے ڈوریاں ہلا رہے ہیں، انہیں بالکل نہیں جانتا تو۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا تمھارے خیال میں بابا صاحب کے آستانے میں کوئی ڈوریاں تھامے بیٹھا ہے اس کی؟"

"ہاں، وہ کٹھ پتلی وہیں سے نچائی جا رہی ہے۔ ہیرامن کا اصل طوطا تو اسی پنجرے میں بیٹھا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو جیلانی! اتنے پہنچے ہوئے بزرگ کے آستانے میں کسی بدکار کو کیسے پناہ مل سکتی ہے؟ تم جانتے نہیں ہو بابا صاحب کو۔ بڑے کامل بزرگ ہیں وہ۔ ان کی نظریں آدمی کو اندر تک سے کھنگال ڈالتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اوئے بس چپ کر جا یار! پتا ہے مجھے سب کچھ۔ خوب جانتا ہوں میں اس کامل بزرگ کو۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے اس استعجاب سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میری بات پہ یقین کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس بہروپیے یہودی نے نہ جانے کس طرح لوگوں کو اس قدر متاثر کر لیا تھا۔ نہ جانے کونسا جال ڈالا تھا اس نے ان پر کہ وہ اسے پیرِ کامل سمجھنے لگے تھے۔ اس کے بارے میں کوئی غلط تصور سماتا ہی نہیں تھا کسی کے دماغ میں۔ میں اسے یوں ہی حیران و پریشان چھوڑ کر اٹھ گیا۔ "اچھا بھائی! تو یوں ہی آنکھیں پھاڑے بیٹھا رہ۔ میں ذرا لاہور فون کر کے ماں جی کو اپنی خیریت سے آگاہ کر دوں اور آسیہ سے بھی دو باتیں کر لوں۔ میری بہن وہاں میری منتظر بیٹھی ہو گی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ٹیلیفون کے پاس جا کر اس کا ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تیسری کوشش کے بعد دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد ادھر سے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا گیا۔ میں نے اس کی آواز پہچان کر کہا: "اوئے حیدر! کیا حال ہے بچے! ٹھیک تو ہے نا تو؟"

اس نے بھی فوراً ہی میری آواز پہچان لی تھی۔ جلدی سے بولا۔ "اجی اپنے سردار صاحب، السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! او بھئی کیسا ہے تو؟ خیریت تو ہے نا سب؟"

"ہاں جناب! بالکل اللہ کا فضل ہے۔ آپ کیسے ہیں جناب! آپ تو ادھر کراچی جا کر بھول ہی گئے ہم سب کو۔"

"او نہیں یار! یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے، بس ذرا مصروفیت بڑھ گئی کچھ۔ ماں جی کہاں ہیں؟"

"وہ ادھر کمرے میں ہی ہیں جی! بہت یاد کرتی ہیں وہ آپ کو، اور اپنی آسیہ بی بی بھی بڑا یاد کرتی تھیں جی آپ کو" اور وہ آبی صاحب مل گئے ہیں آپ کو ادھر کراچی میں؟"

"ہاں مل گیا ہے وہ مجھے، اور یہ تو آسیہ کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟ یاد کرتی تھیں سے کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا کہیں چلی گئی ہے وہ؟ گھر میں نہیں ہے کیا؟"

"کہاں جناب! ادھر تو وہ بس چار ہی دن ٹھہری تھیں۔ جس دن آبی صاحب کراچی روانہ ہوئے، اس کے دوسرے ہی دن وہ بھی روانہ ہو گئیں۔ ماں جی کو بالکل چپ ہی لگ گئی ہے ان کے جانے کے بعد۔ کھانے پینے میں بھی جی نہیں لگتا ان کا۔"

"اوہ، لیکن کہاں گئی ہے؟ کچھ بتا کے بھی گئی ہے یا نہیں؟ ماں جی نے روکنے کی کوشش نہیں کی اسے؟"

"بہت کوشش کی تھی انھوں نے تو جناب! مگر وہ رکی ہی نہیں کسی طرح۔ کہتی تھی بہت ضروری کام ہے ادھر سکھر میں۔ جلد ہی آ جاؤں گی۔"

"کیا... کیا کہا تو نے... سکھر گئی ہے وہ؟ تجھے یاد ہے اچھی طرح سکھر ہی کہا تھا اس نے؟"

"بالکل جناب! میں نے خود سنا تھا اپنے کانوں سے۔ کوئی لاکھو لاشاری ہے وہاں، اس سے کچھ حساب کتاب کی بات کی تھی انھوں نے۔"

میرے پورے وجود میں بجلی سی لہراتی چلی گئی یہ سن کر، سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی مجھ پر۔ وہ اپنے بچے کے لیے لاکھو کی طرف گئی تھی۔ اس نے لاکھو کو اپنے ہاتھ سے گولی مارنے کی قسم بھی اٹھائی ہوئی تھی اور لاکھو جس طرح اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا، میں جانتا تھا وہ اس کے ہاتھوں مرنا بھی قبول کر لے گا۔ نہ اس پہ ہاتھ اٹھائے گا وہ اور نہ ہی اس سے بچنے یا بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بخوشی موت کا خیر مقدم کر کے اس کی قسم پوری کر دے گا۔ پھر اس کے آدمی آسیہ کا کیا حشر کریں گے، اس کے خیال سے ہی میرے بدن میں لرزہ طاری ہونے لگا تھا۔ آسیہ کا وہاں سے سلامت واپس آ جانا کسی طرح بھی ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

میری خاموشی طول کھینچنے لگی تو حیدر نے ہیلو ہیلو کہہ کر مجھے پکارنا شروع کر دیا "ہاں۔ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جناب! آپ تو ایک دم ہی چپ ہو گئے۔ میں سمجھا شاید فون رکھ دیا ہے آپ نے۔"

"نہیں نہیں، میں موجود ہوں ادھر۔ تو نے بہت بری خبر سنائی ہے مجھے آسیہ کے بارے میں۔ میں بس سن ہو کر رہ گیا تھا۔"

"ہاں جناب! مگر اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے نا جی! آپ نے خود ہی پوچھا تھا، اس لیے بتانا پڑا مجھے۔"

"میں اگر نہیں پوچھتا تو نہیں بتاتا تو؟ کچھ بھی لاعلمی میں ہی رکھتا مجھے۔ اوئے حیدر کیسا ذلیل آدمی ہے تو؟"

"دیکھیں نا سردار صاحب! بڑے بوڑھے کہتے ہیں تو غلط تو نہیں کہتے ہیں نا وہ کہ پردیس میں آدمی کو کوئی خبر نہیں دینا چاہیے۔"

"اچھا اچھا، بک بک نہیں کر زیادہ، ماں جی کا خیال رکھ صحیح سے۔ ان کا دل بہلانے کی کوشش کیا کر۔"

"وہ تو میں کرتا ہی رہتا ہوں جی! اور جناب! اپنی نصرت بہتر کو تو میں نے ماں جی کی خدمت پر ہی مامور کر رکھا ہے۔"

"یہ تو تو نے بہت اچھا کیا ہے حیدر! اسے کہہ دے کہ وہ ماں جی کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرے۔ اداس نہ ہونے دے بالکل انھیں۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں سردار صاحب! ہمیں یہاں کام ہی کیا ہے ماں جی کی خدمت کے سوا۔ کوشش تو ہم یہی کرتے

ہیں کہ وہ خوش رہیں، پر وہ آسیہ بی بی کے جانے سے اداس ہو گئی ہیں۔ آپ ذرا تسلی دے دیں انہیں۔"

"ہاں یار! یہ بہت ضروری ہے، میری آواز سن کر ان کے دل کو ڈھارس ملے گی۔ ذرا [illegible] کر رہی ہیں وہ، میری بات کرا ان سے۔"

"ابھی ہیں صاحب جی! [illegible] یہ فون اٹھا کر ان کے پاس ہی لے جاتا ہوں، وہ کمرے میں [illegible] اپنے۔"

چند منٹ فون پر خاموشی رہی پھر مجھے حیدر کی آواز سنائی دی۔ وہ ماں جی سے کہہ رہا تھا "لیں ماں جی! یہ فون پہ بات کریں، آپ کے پتّر نے کراچی سے فون کیا ہے اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں وہ۔"

دوسرے ہی لمحے ماں جی کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"پتّر غلام جیلانی! ٹھیک تو ہے نا تو؟"

میں نے انہیں سلام کر کے کہا "آپ کی دعائیں میرے ساتھ رہتی ہیں ماں جی! پھر مجھے کیا ہو سکتا ہے؟ آپ بتائیں آپ تو ٹھیک ہیں نا؟ یہ حیدر ٹھیک ٹھاک خدمت کر رہا ہے آپ کی، پریشان تو نہیں کرتا نا یہ؟"

"نہیں پتّر! یہ دونوں ہی بڑا خیال رکھتے ہیں میرا۔ بہت خدمت گزار بچے ہیں، رب انہیں حیاتی دے، دعائیں بڑی لیتے ہیں۔ بالکل اولاد کی طرح خدمت کرتے ہیں میری۔"

"ماں جی! یہ آپ نے آسیہ کو کیوں جانے دیا؟ بڑی مشکل سے تو جان چھوٹی تھی اس کی، اب پھر کوئی مصیبت لگا لے گی گلے۔"

"بیٹا! ہم نے تو بڑی کوشش کی، پر اس کے منہ کو اب خون لگ چکا ہے، اب گھر میں بیٹھنے کی عادت نہیں رہی ہے اسے، کہتی تھی، ادھر سکھر میں کوئی وڈیرا ہے لاکھو لاشاری۔ اس کی طرف کچھ پرانا قرضہ نکلتا ہے اس کا۔ وہی وصول کرنے جا رہی ہے۔"

"ہاں۔ وہ مجھے پتا ہے۔ اس کا حساب کتاب باقی ہے لاکھو لاشاری کی طرف، پرانا جھگڑا چلا آ رہا ہے ان .... دونوں کا۔"

"کیسا جھگڑا چل رہا ہے اس کا؟ بیٹا! تو جانتا ہے اس لاکھو لاشاری کو؟ کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں ماں جی! آپ فکر مند نہ ہوں۔ بہت اچھا بندہ ہے وہ بے حد چاہتا ہے وہ آپ کی بیٹی کو اور دلھن بنانا چاہتا ہے وہ اسے اپنی مگر وہ آسیہ اس کے لیے راضی نہیں ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ قرضہ واپس نہیں کر رہا ہے اور وہ دیوانی دشمن سمجھ رہی ہے اسے۔"

"میرا تو دل ہول رہا ہے بیٹا! رات دن اسی کی خیر مانگتی رہتی ہوں اپنے رب سے۔"

"ماں جی! آپ کی دعاؤں کی تو ہمیں بہت ضرورت رہتی ہے ہر گھڑی۔ دعائیں ضرور کرتی رہیں آپ ہمارے لیے۔"

"وہ تو پتّر میں کرتی ہی رہتی ہوں، پر تم دونوں کی تقدیر میں یوں لگتا ہے سکھ چین لکھا ہی نہیں گیا۔ اپنے گھر کی چھت تو تجھے اچھی لگتی ہی نہیں ہے۔ جب تجھے یہاں رہنا ہی نہیں تھا تو بتا! تو نے اتنا بڑا محل جیسا مکان خرید کیوں لیا تھا۔ اتنی ڈھیر ساری آسائشیں یہاں جمع کر دی ہیں تو نے اور خود پتا نہیں کہاں جا بیٹھا ہے، واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔"

"ماں جی! ایسی باتیں نہ کیا کریں آپ۔ اس مکان میں آپ تو بیٹھی ہیں نا اور ان ساری آسائشوں سے بہرہ ور ہو رہی ہیں۔ میری کتنی بڑی ضرورت پوری کر رہا ہے یہ مکان۔ یہ مقصد نہیں ہے کیا؟ میری ماں جی اس مکان میں ہیں، یہ کیا کم ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن تو بھی اگر یہیں رہتا میرے ساتھ، میری آنکھوں کے سامنے اور وہ نصیبوں کی ماری آسیہ بھی ہوتی تو میں سکون سے مر سکتی۔ اس عمر میں بیٹا! ماں کی یہی ایک آرزو تو ہوتی ہے کہ جب دم نکلے تو اس کی اولاد خوش و خرم اس کے سامنے موجود ہو۔ اپنے جگر کے ٹکڑے ماں کی آنکھوں کے سامنے نہ ہوں، تو اس کا دم بھی آسانی سے نہیں نکلتا پتّر!"

"رب آپ کا نگہبان ہو اور آپ کو ہمارے لیے دعائیں کرنے کے لیے سلامت رکھے۔ یہ مرنے ورنے کی باتیں نہ کریں ماں جی! کیا اتنی ہی بے زار ہو چکی ہیں آپ ہم سے کہ اب اپنا سایہ بھی ہمارے سروں سے اٹھا لینا چاہتی ہیں، اپنی دعاؤں سے محروم کرنا چاہتی ہیں؟"

"ایسے نہ سوچ کاکا! جو اس دنیا میں آتا ہے اُسے واپس بھی جانا ہوتا ہے ایک دن، اور یہی عمر ہوتی ہے جب آدمی کے پاس اپنے دنیاوی معاملات سے فراغت پا کر موت کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں رہتا۔ میری بھی یہی آرزو تھی پتّر! اس دنیا سے جاتے ہوئے کوئی فکر نہ لے جاتی ساتھ۔ تم دونوں بہن بھائی اپنے اپنے گھر بار سنبھال کے بیٹھ جاتے میرے سامنے تو اچھا تھا۔ پر اب تو یوں لگتا ہے مجھے، یہ آرزو میں ساتھ لے جاؤں گی اپنے۔ تم دونوں کو تو کچھ خیال ہی نہیں ہے اس کا۔"

"دل چھوٹا نہ کریں ماں جی! اللہ کی ذات سے ناامید نہ ہوں۔ یہ دن بھی ضرور دکھائے گا وہ آپ کو۔ وقت تو آ لینے دیں، اس آسیہ کو تو اب میں جلد ہی باندھ دوں گا کسی کھونٹے سے۔ اس کا یوں پھرنا مجھ سے بھی نہیں دیکھا جاتا ہے اب۔"

"خدا کرے تو اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائے۔ مجھے تو اس لڑکی کے تیور بہت ہی خراب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میری وہ آسیہ تو لگتی ہی نہیں ہے، جسے میں نے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آتی بیٹا کہ کیا بن گئی ہے وہ۔"

"فکر نہ کریں آپ۔ سب سمجھ آ جائے گی۔ مجھے ذرا لاہور آ جانے دیں، سب کچھ ٹھیک کر لوں گا میں وہاں آ کر۔"

"ٹھیک ہے کاکا! میں انتظار کر رہی ہوں تیرا۔ کب تک آ رہا ہے تو؟ تیرا کام ختم ہو گیا وہاں یا باقی ہے ابھی؟"

"بس تھوڑے سے دن! ذرا انتظار کر لیں ماں جی! اب اس آسیہ نے ایک کام اور بڑھا دیا ہے میرے لیے۔ اب مجھے سکھر بھی جانا پڑے گا اس کی تلاش میں۔ دعا کریں جلدی مل جائے وہ مجھے۔ کہیں بھٹکتا ہی نہ رہ جاؤں میں اس کی تلاش میں۔"

"رب تجھے کامیابی دے پتّر! بہت پریشان کیا ہے تجھے اس بدبخت بہن نے۔ مجھے احساس ہے تیری تکلیفوں کا بیٹا! کاش اس نے میرے ہاں جنم ہی نہ لیا ہوتا، یا پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی وہ۔ کیا سکھ دیا ہے اس نے ہمیں؟"

"ماں جی! بس کریں، ایسی بری باتیں نہ نکالیں زبان سے۔ یہ تو مرضی ہے سوہنے رب کی۔ وہ جس حال میں چاہے رکھے ہمیں، ہم اس کی مرضی میں دخل دینے والے کون ہیں۔ ہم تو مخلوق ہیں ماں جی! اپنے خالق کی، جیسا اچھا لگا بنا دیا اس نے۔"

"ٹھیک کہتا ہے بیٹا تو۔ اس کائنات کے مالک سے شکوہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ ہمیں تو اس کی رضا میں ہی راضی رہنا چاہیے۔"

"یہی مطلب تھا میرا بھی۔ اچھا، اب اجازت دیں ماں جی! اللہ نے چاہا تو اگلی بار اپنے پہنچنے کی اطلاع ہی دوں گا فون پر۔"

"اچھا کاکا! میں انتظار کروں گی تیرے اس فون کا.. رب راکھا۔"

"رب راکھا تیرا بھی ماں جی!" میں نے جواباً کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

فون سے فارغ ہو کر میں شرافت علی کی طرف پلٹا تو لزی کو اس کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا "واپس آ گئیں لزی بیگم! تم نے تو سارا ہی دن باہر گزار دیا آج۔ کہاں کہاں ہو آئی ہو؟ کوئی جگہ بھی چھوڑی ہے کل کے لیے۔"

"کیوں کیا کل تمام دن آپ کا غائب رہنے کا ارادہ ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری زندگی میں فرصت کے اتنے لمحے کہاں ہیں۔ میں جلد از جلد یہاں کے معاملات نمٹا کر لاہور پہنچنا چاہتا ہوں لزی بیگم! وہاں میری ماں جی میرے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔ دوسرے وہ کشمیر خان بھی بہت بے چین ہے، بار بار فون کر رہا ہے شرافت علی کو۔ اس کا کام بھی جلد ہی نمٹا دینا چاہتا ہوں میں۔"

"ہاں، یہ صحیح فیصلہ کیا ہے آپ نے جناب عالی! ہمیں یہاں کراچی میں زیادہ وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

شرافت علی نے کہا "تم نے ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ سوچا، جو تم دونوں کو اپنے ساتھ ایئرپورٹ سے لے گئے تھے؟"

"آج ہم دوبارہ انہیں تلاش کرنے چلیں گے۔" میں نے کہا "تم نے یہ معلوم کیا اس کوٹھی میں اب کون لوگ آ بسے ہیں؟"

"کس کوٹھی کے بارے میں کہہ رہے ہو تم؟" شرافت علی نے قدرے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسی کوٹھی کی میرے یار! جس میں وہ لوگ ایئرپورٹ سے اپنے ساتھ لے گئے تھے ہمیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ، ہاں۔ وہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ اس کوٹھی میں ایک سفارت خانے کا کوئی افسر آ کر آباد ہو گیا ہے۔"

"کیا کہا سفارت خانے کا افسر؟" میں نے کہا "کیا کوئی بہت ہی اہم آدمی ہے وہ؟"

"نہیں، ایک بہت معمولی سا افسر ہے وہ۔ کوئی خاص اہمیت کا آدمی نہیں ہے۔ مکان کا کرایہ وہ خود ہی دیتا ہے۔"

"ہوں۔ تو اب اس کوٹھی سے ان لوگوں نے اپنا تعلق بالکل ختم کر لیا ہے، وہاں سے کچھ معلوم ہونے کا امکان نہیں رہا۔"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، اب تو وہ مٹی میں گری ہوئی سوئی ہو گئے ہیں ہمارے لیے، مگر یہ یقین ہے مجھے کہ وہ ملیں گے ضرور۔"

"کیوں، یہ بات تم اتنے یقین سے کس لیے کہہ رہے ہو؟ کیا کوئی سرا مل گیا ہے تمہیں؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ سرا تو کوئی نہیں ملا لیکن اس یقین کی ایک وجہ ہے، ذہن پہ زور دے کر حالات کا جائزہ لو گے تو یہ سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے گی۔ بالکل سامنے کی بات ہے، دو اور دو چار کی طرح سیدھی۔"

"پہیلیاں نہ بجھوا یار! جو کچھ تو نے سمجھا ہے، مجھے بھی سمجھا دے۔ کیوں میرا دماغ خرچ کرانے پر تل گیا ہے؟"

وہ ہنس کر بولا "اچھا میرے یار! تو مت کر خرچ اپنا دماغ۔ میں سمجھاتا ہوں تجھے۔ یہ تو جانتا اور سمجھتا ہے نا تو کہ انہوں نے کسی چھوٹے موٹے وقتی فائدے کے لیے تمہیں ایئرپورٹ سے نہیں اٹھایا تھا، کوئی بڑا مقصد ہی حاصل کرنا تھا انہیں اس طرح

جو ہماری بروقت کی مداخلت کی وجہ سے وہ حاصل نہیں کر سکے ۔ ہے نا یہی بات ؟ "

" ہاں، یہی میرا بھی خیال ہے مگر اس سے ان کے دوبارہ مل جانے کا یقین کیسے کیا جاسکتا ہے پیارے بھائی ؟ "

" دیکھو، وہ چونکہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، اس لیے بظاہر انہوں نے خود کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر لیا ہے اور وہ سراغ بھی مٹا دیا ہے جس کے ذریعے ہم ان تک پہنچ سکتے تھے لیکن تم لوگوں کو وہ اتنی آسانی سے گم نہیں ہونے دیں گے ۔ خود وہ چاہے سات پردوں میں چھپے بیٹھے ہوں مگر تم دونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے ۔"

" تمہارا مطلب ہے کہ وہ ہماری نگرانی کر رہے ہیں ۔ وہ یا ان کا کوئی آدمی ہر دم ہمارے ساتھ لگا پھرتا ہے ؟ "

" بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے ۔ یہی بتانا چاہتا تھا میں تمھیں ۔ اب ان کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں گھر سے نکلتے وقت اپنے گرد و پیش پر پوری طرح نظر رکھنے کی ضرورت ہے ۔ کہیں جاتے ہوئے تمام راستے کسی ایسی کار یا موٹر سائیکل وغیرہ کو تلاش کرنا ہے جو مستقل طور پر تمھارے پیچھے یا قرب و جوار میں نظر آتی ہو ۔ اگر ہم نے اس میں کامیابی حاصل کر لی تو اس نگراں کی نگرانی کرتے ہوئے ہم بآسانی اپنے مطلوبہ اشخاص تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے ۔"

" یہ تو کمال کی بات سوجھی ہے یار شرافت علی تجھے ۔ بالکل سامنے کی بات ہے اور میں نہیں سوچ سکا اسے حیرت ہے ! "

" اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے جنابِ عالی ! " لزی نے کہا " ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی ۔ آدمی کسی چیز کو ادھر اُدھر تلاش کرتا پھرتا ہے ۔ حالانکہ وہ چیز اس کے پاس ہی کہیں موجود ہوتی ہے ، بس نظر نہیں پڑتی اس پر ۔"

" آپ کی بات بالکل درست ہے مادام ! ایسا اتفاق اکثر ہو جاتا ہے لوگوں کے ساتھ ۔ مجھے بھی آج بس اچانک ہی یہ خیال آگیا تھا ۔" شرافت علی نے لزی سے کہا ، پھر مجھ سے مخاطب ہوا " کیا خیال ہے جیلانی ! چل کر دیکھیں باہر ؟ "

" ابھی نہیں یار ! یوں بھی اب تو رات ہونے والی ہے ۔ اس وقت یہ اندازہ کیسے ہو سکے گا کہ کون سی گاڑی مستقل ہمارا پیچھا کر رہی ہے ۔ میرا خیال ہے یہ کام دن کی روشنی میں زیادہ بہتر طریقے پر ہو سکے گا ۔"

وہ لزی کے سامنے اس مسئلے کو چھیڑ بیٹھا تھا ۔ اس وقت میں اسے اس کار کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا جس کا ذکر فیروز نے مجھ سے کیا تھا ۔ یوں بھی میں ابھی اسے یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا ۔ پرکھے بغیر اپنے ہر راز میں اس کو شریک کرنے کی حماقت کرنا نہیں چاہتا تھا میں ۔ گو گفتگو کے دوران اس نے خود کو میرا ہم خیال ثابت کر دیا تھا اور ہم ایک دوسرے پر اپنا اپنا اعتماد قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے مگر یہ سب کچھ ابھی صرف گفتگو کی ہی حد تک تھا ۔ عملی طور پر ابھی ہم ایک دوسرے کو مطمئن نہیں کر سکے تھے ۔ مکمل اعتماد کے لیے آدمی کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے ، آدمی کی اصلیت عمل کے میدان میں ہی کھلتی ہے ۔

لزی نے کہا " آپ درست کہہ رہے ہیں جنابِ عالی ! رات کے وقت یہ اندازہ کرنا واقعی دشوار کام ہے ۔ دن کی روشنی ہی اس کے لیے مناسب اور معقول ہے ۔" پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی " آپ شاید ماں جی سے بات کر رہے تھے ابھی فون پر ؟ "

" ہاں، لزی ! تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے ۔ آج کا اخبار تو دیکھا ہو گا تم نے ؟ ایک اہم خبر چھپی ہے آج ۔"

" اوہ، تو آپ نے بھی پڑھ لی ہے وہ خبر ؟ میں تو آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی اس وقت ۔"

" پھر تو یہ بہت برا ہوا لزی بیگم ! تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی ۔ مجھے افسوس ہے اس کا ۔"

ایسے خوشی کے موقعے پر اتنی سی بات کا افسوس نہ کریں آپ جنابِ عالی ! اور مبارک باد قبول کریں میری ۔"

" ابھی مبارک باد دینے کا وقت نہیں آیا ہے لزی ! آسیہ میری بہن جیل سے نکل کر ایک دوسری دلدل میں جا اتری ہے ۔ آزادی راس نہیں آئی ہے اسے ۔ ایک بار پھر اس کی تلاش میں زمین کی پیمائش کا کام کرنا پڑے گا مجھے ۔"

لزی نے حیران حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا ۔ " کیوں ؟ اب کہاں چلی گئی ہے وہ ؟ کیا ہوا ہے اسے ؟ "

شرافت علی بھی ایک دم چونک اٹھا تھا ۔ بولا " کیا وہ لاہور میں ماں جی کے پاس نہیں پہنچی مگر تم تو ۔ ۔ ۔ ؟ "

" وہ ماں جی کے پاس لاہور پہنچی تھی مگر وہاں رکی نہیں فوراً ہی وہاں سے چلی گئی ہے ۔ اس نے بھی میری طرح کچھ بڑے بڑے مسائل میں الجھا لیا ہے اپنے آپ کو ، اور تقدیر اسے بھی کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی ہے ۔"

" ہوا کیا ہے جنابِ عالی ! کچھ بتائیں تو آپ ہمیں ؟ ممکن ہے اس سلسلے میں بھی ہم کچھ مدد کر سکیں آپ کی ۔"

" وہ سکھر چلی گئی ہے ۔ اپنے ایک عجیب دشمن سے پرانا حساب بے باق کرنے نکلی ہے وہ گھر سے ۔"

" عجیب دشمن سے کیا مراد ہے آپ کی ؟ دشمن تو بس دشمن ہی ہوتا ہے ، اس میں عجیب بات کیا ہے بھلا ؟ "

" عجیب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ دشمنی یک طرفہ ہے ۔ وہ خود بالکل دشمنی نہیں رکھتا ہے آسیہ سے ۔ بلکہ اس کے دل میں آسیہ کے لیے اتنی محبت ہے کہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہے جب کہ آسیہ اس کے خون کی پیاسی ہے ۔ اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار کے ختم کرے گی ۔"

" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے آسیہ کے ساتھ کوئی بڑی زیادتی کی ہے ایسی زیادتی جس کی سزا آسیہ کے نزدیک صرف موت ہی ہے جب کہ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے اس کا بڑے سے بڑا مطالبہ بھی پورا کرنے کو تیار ہے ۔" لزی نے کہا ۔

" کسی حد تک تمھارا اندازہ ٹھیک ہے لزی ! زیادتی تو اس نے کی ہے مگر وہ اپنی غلطی پر سخت نادم ہے اور اس ندامت ہی نے اسے آسیہ کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا ہے ، ورنہ وہ بڑا منہ زور شخص ہے ، سر جھکانے کی عادت نہیں ہے اسے ۔"

" تو اب تم اپنی بہن کے پیچھے سکھر جاؤ گے ؟ اس کے اس دشمن کو آسیہ کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے ؟ " شرافت علی بولا ۔

" ہاں ، یہ بہت ضروری ہے شرافت علی ! اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے کھاتے میں ایک اور قتل لکھ دیا جائے گا اور اگر ناکام رہی تب بھی اسے نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے میرے بھائی ! وہ درندوں کے غار میں جا اتری ہے جہاں سے صحیح سلامت نکل آنا ایک بہت دشوار کام ہے ۔"

" کب جانے کا ارادہ ہے تمھارا ؟ اور کیا اکیلے ہی جانا چاہتے ہو ؟ " شرافت علی نے پوچھا ۔

" ہاں ، اکیلا ہی جاؤں گا میں ، چاہتا یہ ہوں میں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے وہاں پہنچ جاؤں ، دیر بالکل مناسب نہیں ہے ۔"

" ہاں جنابِ عالی ! جب وہ اتنے خوفناک ارادے سے گئی ہے وہاں تو آپ کا جلد از جلد پہنچنا بے حد ضروری ہے ۔ اگر اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا ، یا کسی مصیبت میں ڈال دیا اپنے آپ کو تو پھر مشکل پیدا ہو جائے گی ۔"

" میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں پہنچ جاؤں تاکہ اسے بروقت روکا جا سکے ۔"

" پھر تو آپ کو ابھی روانہ ہو جانا چاہیے ۔ میں بھی آپ کے ساتھ چل رہی ہوں ، تنہا نہیں جانے دوں گی آپ کو ۔" لزی بولی ۔

" اور میں بھی چلوں گا تمھارے ساتھ ۔ ایسے کام کے لیے تنہا نہیں جانا چاہیے تمھیں ۔ ایک دو آدمی اور بھی ساتھ لے لوں گا میں ۔"

" نہیں یار ! زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہم کوئی معرکہ سر کرنے تو نہیں جا رہے ہیں ۔ کسی سے لڑنا بھڑنا تو نہیں ہے ۔"

" کچھ بھی ہو جیلانی ! ہم دونوں تو ضرور ہی جائیں گے تمھارے ساتھ ۔ میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ گاڑی کی ٹنکی فل کرا لائے جا کر اور کچھ فاضل پٹرول بھی رکھ لے ۔ اتنی دیر میں ہم لوگ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو لیتے ہیں ۔"

" ٹھیک ہے ، اگر تم نہیں مانتے ہو تو چلے چلو میرے ساتھ ، طارق روڈ سے ہم آبی کو بھی ساتھ لے لیں گے ۔"

" آبی ! " لزی نے چونک کر مجھے دیکھا " یہ تو آپ کا وہی دوست ہے شاید جو آسیہ کے ساتھ جیل سے فرار ہوا ہے ؟ "

" ہاں، ٹھیک پہچانا ہے تم نے ، یہ وہی میرا یار اسلم آبی ہے ، جو مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہے ۔"

" مگر وہ یہاں کہاں سے آگیا ؟ ان لوگوں کو جیل سے نکلے آج دوسرا ہی دن ہے شاید ، اتنی جلدی وہ کراچی بھی آگیا ؟ "

" نہیں لزی ! جیل سے نکلے ہوئے تو کئی دن ہو گئے ہیں انہیں ۔ راولپنڈی سے بھاگ کر وہ دونوں لاہور پہنچے تھے وہاں تین دن رہ کر آبی کراچی روانہ ہو گیا تھا ۔ اس کے دوسرے روز آسیہ سکھر جانے کے لیے نکل گئی ۔ آبی پرسوں رات سے یہاں ہے ۔"

" اوہ ، اس کا مطلب ہے اخبار میں ان کے فرار کی خبر بہت لیٹ شائع ہوئی ہے اور آپ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا سب کچھ ، آپ کو آبی کے کراچی پہنچ جانے کی بھی خبر مل گئی تھی لیکن ہمیں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا آپ نے ۔ کیوں جنابِ عالی ؟ "

" نہیں بھئی ، ایسی بات نہیں ہے ، غلط اندازے قائم کر رہی ہو تم لزی بیگم ! حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آج ہی معلوم ہوا ہے ۔ آج دوپہر کے بعد ایک پرانے دوست کے گھر چلا گیا تھا ۔۔۔ وہاں آبی کو دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا تھا ۔"

" اوہ ، سوری جنابِ عالی ! اپنے غلط اندازوں کے لیے معذرت چاہتی ہوں آپ سے ۔ میں سمجھی تھی آپ کو پہلے سے معلوم تھا سب کچھ ، مگر آپ نے ہمیں اعتبار کے قابل نہیں سمجھا شاید ۔ بہرحال ایک بار پھر معذرت قبول کریں جنابِ عالی ! "

" معذرت کی کوئی بات نہیں ہے لزی ! میں تمھاری جگہ ہوتا تو میرے دل میں بھی یہ بدگمانی پیدا ہو سکتی تھی ۔" میں نے گھڑی دیکھی ۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے ۔ میں نے پھر لزی سے کہا ۔ " باتوں باتوں میں وقت کافی گزر چکا ہے ۔ اب ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے ۔ دیر ہمارے لیے سودمند نہیں ہو گی شرافت علی ! گھر پہ فون کر کے اطلاع دے دو تم ۔"

" ہاں ، یہ ٹھیک ہے ۔ میں فون کر دیتا ہوں گھر پہ ۔ کھانا ہم

باہر چل کر کسی ہوٹل میں کھالیں گے۔" وہ اُٹھ کر فون کی طرف بڑھ گیا۔

وہ فون کر کے فارغ ہوا تو ہم تینوں باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہمارے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ شرافت علی نے ٹیلی فون کے قریب جا کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ "ہیلو" کہہ کر چند لمحے دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا، پھر لزی سے بولا "آپ کا فون ہے۔ کوئی مسٹر جبیر اللہ بات کرنا چاہتے ہیں آپ سے۔"

"اوہ، آپ لوگ چلیں باہر، میں ان سے بات کر کے آ رہی ہوں۔" لزی نے مجھ سے کہا اور آگے بڑھ کر شرافت علی کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

میں شرافت علی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم دونوں کار کی عقبی نشست پر جا بیٹھے۔ شرافت علی بولا "یار جیلانی! کیا اس مصیبت خانم کو ساتھ لے جانا ضروری ہے؟ کسی طرح اس سے جان نہیں چھوٹ سکتی؟"

"میں تو تم دونوں کو ہی ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ کوئی اتنا اہم معاملہ نہیں ہے، کوئی خوفناک مہم تو درپیش نہیں ہے مجھے، جس میں پوری بٹالین کا ساتھ ہونا ضروری ہو۔ زیادہ لوگوں کی موجودگی میرے کام کو مشکل ہی بنا سکتی ہے۔"

"یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ میں تو صرف اس لیے جانا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ کہ راستے میں تم سے تبادلۂ خیالات کا موقع مل جائے گا لیکن لزی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہو سکے گا ہمارے لیے۔ اسی لیے میں اس سے پیچھا چھڑانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں، یہ خیال تو تیرا ٹھیک ہے میرے یار! مگر اس کمبل سے آسانی کے ساتھ جان چھوٹتی نظر نہیں آتی مجھے۔"

اسی وقت شرافت علی کا ڈرائیور جو دربان کے ساتھ بیٹھا تھا، قریب آ کے بولا "کیا چلیں صاحب؟"

"ایک منٹ ٹھہرو، مادام آ رہی ہیں ابھی اور تم ذرا دیکھو گاڑی میں پٹرول کتنا ہے۔ لمبے سفر پہ جانا ہے ہمیں۔"

ڈرائیور نے اپنی نشست کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "آدھی ٹنکی ہے صاحب! ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"سکھر جانا ہے ہمیں۔ راستے میں کسی پٹرول پمپ سے ٹنکی فل کروا لینا۔ یہ بھی دیکھ لینا کوئی خرابی نہ ہو جس کی وجہ سے گاڑی راستے میں دھوکا دے جائے۔ بہت جلدی پہنچنا ہے ہمیں، رُکنے کا وقت بالکل نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"ایسی کوئی خرابی ہے تو نہیں صاحب! پھر بھی احتیاطاً چیک کرالوں گا پٹرول پمپ پر ہی۔"

"ہاں، یہ بھی دیکھ لو، اسلحہ وغیرہ ٹھیک ٹھاک حالت میں موجود ہے گاڑی میں۔ اس کی ضرورت کہیں بھی پڑ سکتی ہے۔"

"دو میں گھر سے نکلتے وقت ہی دیکھ لیتا ہوں صاحب۔ چار پستول، دو اسٹین گنز لوڈ موجود ہیں۔ فاضل راؤنڈ بھی کافی ہیں۔ دستی بم بھی رکھے ہیں دس۔ اس کے علاوہ ایک دو، چار گیس ماسک بھی موجود ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہاں سے طارق روڈ چلنا ہے ہمیں۔ ... صاحب کو اُٹھانا ہے وہاں سے۔ پھر ہم لوگ کسی ہوٹل میں ... کھائیں گے۔ اتنی دیر میں تم کسی پٹرول پمپ سے پٹرول وغیرہ ... کر چیکنگ کرا لینا گاڑی کی۔"

اسی لمحے لزی باہر آتی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر شرافت علی ... کھول کر باہر نکلتے ہوئے لزی سے بولا "آپ ادھر آ جائیں مادام، میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔"

وہ قریب آ کر بولی "مجھے افسوس ہے جناب عالی! میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکوں گی۔ آپ چلے جائیں۔"

"ارے یہ ایک دم ارادہ کیوں بدل دیا تم نے۔ کوئی بات یاد آ گئی ہے کیا؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے، وہ جبیر اللہ نے بتایا ہے مجھے کہ مسٹر آرنک ملنا چاہتے ہیں مجھ سے ابھی فوراً، چنانچہ اب ان کے پاس جانا ہوگا۔ پتا نہیں کونسا اہم کام آ پڑا ہے انہیں مجھ سے۔ یوں بھی آپ کو تو کوئی خاص ضرورت نہیں پڑے گی وہاں میری؟"

"نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں کوئی صورتِ حال پیش نہیں آئے گی وہاں، جس کے لیے زیادہ لوگوں کی ضرورت پڑے۔ تم بے شک نہ جاؤ ہمارے ساتھ۔ مسٹر ... سے ملنا زیادہ ضروری ہے تمہارے لیے۔"

"ٹھیک ہے، پھر اب آپ لوگ جائیں مگر ذرا خیال ... اپنا اور دماغ کو ٹھنڈا رکھیں اپنے۔ گرمی سے بنے کام بھی ... جاتے ہیں۔"

"بہت بہتر مائی ریسپیکٹڈ لیڈی! یاد رکھوں گا میں ... کی یہ نصیحت۔" میں نے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ پھر شرافت علی سے بولا "چل آ بھائی! بیٹھ جا تو ہی اور خدا کے سپرد کر دے اس معزز اور محترم لیڈی کو۔"

شرافت علی مسکراتے ہوئے دوبارہ میرے ساتھ بیٹھ ... اور لزی کو خدا حافظ کہہ کر ڈرائیور کو چلنے کا حکم دے دیا۔

طارق روڈ پہنچ کر جھیل پارک کے قریب ایک چھوٹے صاف ستھرے ریستوران کے سامنے میں نے ڈرائیور سے کار ... کو کہا اور شرافت علی کو اس ریستوران میں بیٹھ کر انتظار کرنے کا ... کر کے کار سے اتر گیا۔

میں نے فردوسی بیگم کے فلیٹ کے دروازے پہ دستک دی ... اس سے پہلے کہ فردوسی بیگم اپنا دروازہ کھولتی، برابر والے فلیٹ ... دروازہ کھول کر کسی نے باہر جھانکا۔ آہٹ سن کر میں نے اُدھر ... دیکھا، اور اس بازاری خانم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ... ہر نکل آئی "آپ ہیں جناب یہ۔ آج شکل دکھائی ہے اس روز ... کے بعد؟ شاید ہم اچھے نہیں لگے ہیں آپ کو، جبھی یوں چپ چاپ ... آنٹی کو آنے لگے ہیں آنٹی سے ملنے تاکہ ہمیں خبر ہی نہ ہو سکے۔ کیوں ... جناب! ہے نا یہی بات؟"

اس اثنا میں فردوسی بیگم نے بھی اپنا دروازہ کھول دیا تھا اور وہ خاموش کھڑی مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ... خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے گل و گلزار خانم! اس دن کے بعد میں آج سہ پہر ہی آیا تھا یہاں مگر افسوس ہے کہ اس وقت آپ کا دیدار میرے مقدر میں نہیں لکھا گیا تھا، اس کے لیے یہ وقت مقرر کیا تھا کاتبِ تقدیر نے۔"

اس کے حلق سے ایک نقرئی قہقہہ آزاد ہو کر میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجا گیا۔ وہ فردوسی بیگم کو مخاطب کر کے بولی "یہ آئے تھے آنٹی! اس روز، انہی کے بارے میں بتایا تھا میں نے آپ کو۔ باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں، کون ہیں یہ آپ کے؟"

"عزیز ہیں میرے۔" فردوسی بیگم نے اسے مختصر سا جواب دے کر مجھ سے کہا "آئیے سردار صاحب! اندر آ جائیں۔"

"اندر آنے یا بیٹھنے کا وقت بالکل نہیں ہے میرے پاس بھی۔ اس پیرزادہ کو بھیج دیں جلدی سے۔ مجھے سکھر پہنچنا ہے فوراً۔"

"سکھر! کیوں خیر تو ہے۔ اس وقت جب آپ آئے تھے، تب تو آپ نے ایسا کوئی ذکر تک نہیں کیا تھا۔ پھر یہ اچانک..."

"ہاں، بس اچانک ہی ایک بے حد ضروری کام آ پڑا ہے۔ اس وقت مجھے خود علم نہیں تھا اس کے بارے میں تو ذکر کیا کرتا؟"

اسی لمحے آپی بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا "اوئے جی..." لیکن اسی لمحے اس کی نظر گلزار پر جا پڑی، اسے دیکھتے ہی جیلانی کہتے کہتے اس نے اپنی زبان کو روک لیا اور بولا "سردار جی! ... کی اے بادشاہو! اندر کیوں نہیں آتے ہیں جناب آپ، اور اس گھڑی آپ کی آمد کا کوئی خاص مقصد ہے یا بس یوں ہی یاد کھینچ لائی ہے کسی کی؟..." یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی اور وہ ترچھی نظروں سے گلزار کو دیکھتا جا رہا تھا۔

"اوئے یار پیرزادہ! شہزادہ بننے کی کوشش نہ کر اس گھڑی۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جا، ہمیں سکھر چلنا ہے فوراً۔"

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا "کیا کہہ رہا ہے تو؟ یہ ایک دم تجھے سکھر کیوں یاد آ گیا ہے، خیریت تو ہے نا؟

کہیں وہ متصل گاؤں کے لاکھو کا تو مسئلہ نہیں ہے کوئی؟ ایسا ہی لگتا ہے مجھے۔ ماں جی کو فون کیا تھا تو نے؟"

"یہ تو تفتیشی افسر کب سے لگ گیا ہے بھائی؟ یہیں کھڑے کھڑے تفتیش کر رہا ہے۔ چلتے وقت راستے میں نہیں پوچھ سکتا ہے تو یہ سب باتیں۔ ابھی وقت ان سارے سوالوں کے جواب چاہئیں تجھے؟"

"ناراض کیوں ہوتا ہے یار! بس غلطی ہو گئی مجھ سے۔ تو ایک منٹ ٹھہر ادھر ہی، میں ابھی آتا ہوں تیار ہو کے۔"

وہ فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فردوسی بیگم نے کہا "واپسی کا کب تک امکان ہے آپ کی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا اس سلسلے میں، حالات پہ ہی دارومدار ہے سارا۔ ممکن ہے کل شام تک واپس آ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ واپس یہاں آنے کے بجائے اور آگے بڑھ جائیں ہم، لاہور میں ماں جی بھی منتظر بیٹھی ہیں میری، ان کے پاس پہنچنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ کاروباری مصروفیات آدمی کو کسی ایک رُخ ہو کر بیٹھنے ہی نہیں دیتی ہیں۔ اب دیکھیں نا، گھر سے ٹرین میں سوار ہوا تھا راولپنڈی جانے کے لیے مگر جا پہنچا امریکا۔ وہاں سے گلو خلاصی ہوئی تو یہاں کراچی میں ایک ماہ کے قریب ہو رہا ہے پھنسے ہوئے۔ آج ایک ہنگامی ضرورت کے تحت سکھر جانا پڑ رہا ہے۔ میری زندگی تو گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے۔ جتنا سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اُلجھتی ہی چلی جاتی ہے۔ آپ پر دعوت ادھار ہے، جب آیا یہ قرض ادا کرنا ہوگا آپ کو۔"

"ہاں ہاں، ضرور ضرور، میں ہر وقت تیار ہوں اس کے لیے، مجھے تو یہی افسوس ہے کہ اس مرتبہ آپ نے اتنے دن یہاں کراچی میں گزار دیے اور ایک رات بھی میری چھت کے نیچے نہیں گزاری۔ ایک وقت کا کھانا بھی میرے ساتھ نہیں کھایا آپ نے۔ حالانکہ پہلے جب بھی کبھی کراچی آئے ہیں، کافی وقت آپ نے میرے ہاں گزارا ہے، میں تو سمجھی تھی شاید اب آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے۔"

"ایسی باتیں نہ کریں فردوسی بیگم۔ یہاں اس اتنے بڑے شہر میں ایک آپ ہی تو ہماری عزیز ہیں۔ آپ کے ہاں تو ہمیشہ ہمیں گھر کا سا آرام ملا ہے۔ ذرا غیریت محسوس نہیں کی، کبھی تکلف نہیں کیا۔ آپ کے گھر کو اپنا گھر ہی سمجھا ہے ہمیشہ۔"

"یہ کس کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی بات کر رہے ہیں آپ جناب سردار کریم نواز صاحب ذیلدار! آپ کی نیت ہمیشہ خراب رہتی ہے دوسروں کے مال پر۔ میرے بھائی! تجھے اللہ نے اتنا دے رکھا ہے پھر بھی بدنیتی سے باز نہیں آ سکتا تو؟" آپی نے واپس آ کر ہماری باتوں میں ٹانگ پھنساتے ہوئے کہا۔

کی شان دیکھنے کے قابل تھی اس سمے۔ سفید بے داغ سلوار کرتے پر سیاہ سرج کی شیروانی خوب سج رہی تھی اُسے۔ پیروں میں اس نے ... یاہ گرگابی پہن رکھی تھی۔ اس لمحے وہ بالکل نواب کالا باغ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "آج لگ رہا ہے کہ تو واقعی کسی درگاہ کا سجادہ نشین ہے۔"

"زبان سیدھی رکھ او نئے سردار یا! پیرزادے ہیں ہم۔ تیری طرح کسی گوردوارے سے اُٹھ کر نہیں آئے ہیں۔"

"اچھا اچھا، اب تشریف لے چلیں جناب پیرزادہ صاحب! ... ہی کافی دیر ہو چکی ہے ہمیں۔"

"ہاں چلو بھئی چلتے ہیں اب۔ اچھا جنتی بیگم! اللہ آپ ... ہو، بڑا خیال رکھتی ہیں آپ ہمارا۔" اس نے فردوسی بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔ پھر قریب کھڑی ہوئی گلزار سے بولا۔ "آپ کا بھی شکریہ پُر بہار خانم۔ آپ نے بھی گزشتہ دو دنوں میں بہت خدمت کی ہے ہماری۔ آپ کو کسی نے یہ گُر کی بات ... بتلائی کہ اس خدمت ہی سے آدمی کو عظمت ملتی ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ بھی ایک دن بہت عظیم عورت کہلائیں گی۔"

گلزار نے اٹھلاتے ہوئے کہا "خدمت تو ابھی آپ ... تے ہم، مگر آپ موقع ہی نہیں دے رہے ...

... بڑے مواقع ملیں گے آپ کو۔ یہ تو کراچی آتے جاتے ہی رہتے ہیں اور یہاں آنے کے لیے نہیں آپ جیسی باغ و بہار شخصیتوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ ناامید نہ ہوں۔ وہ کہا ہے نا کسی نے، یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے فوراً کہا۔

"آپ تو بڑے نبض شناس معلوم ہوتے ہیں ان کے۔ خاصی ریسرچ کی ہے ان کے مزاج پر آپ نے۔"

"جی ہاں، ایسا ہی سمجھیں آپ۔ بڑا مضبوط تعلق ہے ہم دونوں کا۔ کچے دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں ہم۔" میں نے کہا اور آبی کا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیا۔

"یہ کچے دھاگے کا رشتہ بڑا مضبوط ہوتا ہے سردار صاحب! بڑے بڑے زنجیروں سے بندھے رشتے توڑ دیتا ہے یہ۔" ہم نے نیچے اُترتے ہوئے گلزار خانم کو کہتے ہوئے سنا مگر اُس کو کوئی جواب دینا مناسب نہیں جانا میں نے۔ وہ بے حد بے لگام لڑکی تھی۔ اگر ہم وہاں سے چلے نہ آتے تو وہ سوال و جواب کا سلسلہ ٹوٹنے ہی نہیں دیتی کبھی۔ سرے سے سرا جوڑ کر باتوں کی ڈور کو لمبا کرنے کا فن اُس جیسی لڑکیوں کو خوب آتا ہے۔

باہر آ کر آبی نے مجھ سے پوچھا "کیا تو نے ماں جی سے فون پر بات کی تھی، میرے پاس سے جانے کے بعد؟"

"ہاں یار! کی تھی میں نے بات اس سے۔ میرا خیال تھا آسیہ کو پا کر اس کے بے قرار دل کو قرار آ گیا ہوگا۔ آج وہ ... بات کرے گی تو اس کی آواز زندگی سے بھرپور ہوگی۔ ... نغمہ سرا ہوں گی اس کے سینے میں۔ مگر ایسا لگتا ہے یار آبی! ... اس جنم جلی کے مقسوم میں لکھی ہی نہیں گئی ہیں۔ اس کے لبوں کے لیے مسکراہٹیں اُتاری ہی نہیں گئی ہیں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"مگر ہوا کیا ہے کچھ بتا بھی تو؟ کیا آسیہ کو اُٹھوا لیا اس لاکھو لاشاری نے؟" آبی نے جھنجلا کر پوچھا۔

"یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا تو نے میری باتوں سے؟ ایسی کوئی بات کہی تو نہیں ہے میں نے۔ تو نے آسیہ کے لیے لاکھو لاشاری کی بے چینی دیکھی نہیں ہے کیا۔ یا بھول گیا ہے اس کی ... دیوانگی کو؟ آسیہ کے ساتھ دوسری بار کوئی زیادتی کرنے کی ... نظر آتی تھی اس میں تجھے!"

"تو پھر بتا نا مجھے، ہوا کیا ہے؟ یہ اچانک تو نے سکھر ... کا ارادہ کیوں باندھ لیا ہے؟ کیا خبر ملی ہے تجھے؟"

"تیرے لاہور سے کراچی روانہ ہونے کے دوسرے ... آسیہ لاکھو کی طرف چلی گئی۔ تو جانتا ہے وہ کس لیے گئی ہوگی ..."

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے جیلانی! ایسا نہیں کرنا چاہیے ... تھا اُسے۔ وہ اپنے بچے کی خاطر ہی گئی ہے وہاں، اور تو جانتا ہے ... لاکھو اپنا سب کچھ دے سکتا ہے آسیہ کو زندگی سمیت، لیکن ... نہیں دے سکتا ہے اُسے۔ یہ تو وہ اسی صورت میں کر سکتا ہے ... جبکہ آسیہ اس سے شادی کر کے بیوی بن جائے اس کی۔ یہ بات ... میں آسیہ کو سمجھا چکا ہوں اچھی طرح۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟ کیا وہ لاکھو سے شادی کرنے ... آمادہ ہو گئی ہوگی یا بزور بچہ اس سے چھیننے کے لیے گئی ... ہے وہاں؟"

"شادی کے لیے تو وہ کسی صورت بھی آمادہ نہیں ہو ... شدید نفرت ہے اس کے دل میں لاکھو کے لیے۔ اپنی ذلت ... خیال کسی طرح نکلتا ہی نہیں ہے اس کے دل سے۔ البتہ بچہ ... ہر قیمت پر حاصل کر لینا چاہتی ہے اس سے۔ حالاں کہ ... سے بھی اُسے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ اُسے بھی وہ محض ... اذیت پہنچانے کے خیال سے ہی چھین لینا چاہتی ہے اس ..."

"اور ایسا کرنے کے لیے وہ اکیلی ہی جا گھسی ہے ... کے اس بھٹ میں۔ کتنی دیر مقابلہ کر سکے گی وہ اُن کا ..."

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ اچھا نہیں کیا ہے ... اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" آبی فکرمندی سے بولا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اس ریستوران کے دروازے پر پہنچ گئے جہاں بیٹھ کر میں شرافت علی سے انتظار کرنے کو کہہ کر آیا تھا۔ میں ریستوران کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "اس نے اچھا تو نہیں کیا ہے۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں اسے لیکن اب تو اُس نے کر ہی دیا جو کچھ کرنا تھا اُسے، اب اس پر افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟ اب ہمیں اس دلدل سے نکالنا ہے اسے، سوچنے کا وقت بالکل نہیں ہے ہمارے پاس، جو کرنا ہے عملی طور پر ہی کرنا ہے۔ بس متھل گاؤں تک پہنچتے ہوئے کوئی تدبیر سوچ لینا ہے۔"

وہ مجھے ریستوران کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر بولا "ادھر کہاں جا رہا ہے، اس ریستوران میں کیا ہے؟"

"یہاں ہمارا ایک اور دوست انتظار کر رہا ہے۔ وہ بھی ساتھ جائے گا ہمارے۔"

اُس نے میرے ساتھ ریستوران کے دروازے میں قدم دھرتے ہوئے پوچھا "کون ہے وہ؟ کب سے دوست بنا ہے وہ تیرا؟"

"ہے یار! ایک اللہ کا نیک بندہ۔ ایسے نیک بندے خدا نے ہمارے لیے ہر جگہ بٹھا رکھے ہیں۔ شکر کا مقام ہے یہ بھی۔" میں نے اندر داخل ہو کر شرافت علی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ریستوران کا اندرونی ماحول بڑا ہی رومان پرور تھا۔ باہر تو یار لوگوں نے ایسا چراغاں کیا ہوا تھا کہ دن کا گمان گزرتا تھا لیکن اندر اپنے گاہکوں کو ایسا ماحول فراہم کیا ہوا تھا جہاں کسی کو اپنے دائیں بائیں کی اُس وقت تک خبر نہیں ہوتی جب تک کوئی کسی پر نظریں ٹکا کر ہی بیٹھ نہ جائے۔ تیز روشنی سے نیم تاریک ہال میں آنے کے بعد فوری طور پر میری نظریں شرافت علی کو نہ دیکھ سکیں۔ حالاں کہ وہ دروازے کے ساتھ ہی دائیں جانب کی ایک میز پر براجمان تھا۔ مجھے ہال میں نظریں بھٹکاتے دیکھ کر اُس نے خود ہی آواز دے کر کہا "اِدھر آ جاؤ، میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

آواز سُن کر میں نے اُسے دیکھا اور آبی کا ہاتھ تھام کر اُس کی طرف بڑھ گیا "یہ شرافت علی ہے پیرزادہ صاحب! میرا وہی دوست جس کا ذکر ابھی میں کر رہا تھا آپ سے، اور شرافت علی! یہ میرے دیرینہ دوست ہیں پیرزادہ۔"

"لیکن تم تو اپنے یار اسلم ...."

"ہاں ہاں، وہی ہیں یہ۔ چونکہ پیروں کے خاندان سے تعلق ہے ان کا، اس لیے کہلاتے یہ پیرزادہ ہیں۔" شرافت علی کو اس کا اصلی نام لینے سے روکنے کے لیے میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اور آبی کے ساتھ خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تین آدمیوں کے لیے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے میں نے۔ کھانا آتا ہی ہوگا بس۔" ہمارے بیٹھنے کے بعد شرافت علی نے بتایا۔ پھر وہ آبی سے بولا "آپ نے بھی کھانا تو ابھی نہیں کھایا ہوگا پیرزادہ صاحب!"

"ہم ابھی کھانا ہی کھا کر فارغ ہوئے تھے جب یہ سردار صاحب پہنچے ہیں میرے پاس۔" آبی نے جواب دیا۔

"چلیں پھر ٹھیک ہے۔ وہ ڈرائیور کھا لے گا ہمارے ساتھ تیسرے آدمی کا کھانا۔" میں نے کہا۔

"کیا کہتے ہو یار! کچھ تو خیال کیا کرو بولتے وقت۔ ڈرائیور کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ گے میں؟"

"کیا فرق پڑ جائے گا اس سے؟ ڈرائیور ہماری طرح کا انسان نہیں ہے کیا؟ کیا چیز کم ہے اس میں؟"

"مرتبہ کم ہے اُس کا ہم سے۔ انسان تو بے شک ہے وہ ہماری ہی طرح مگر درجے اور صلاحیتوں میں بہت کم تر ہے وہ ہم سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محض ایک ڈرائیور نہیں ہوتا وہ کہیں کسی اعلیٰ مقام پر بیٹھا ہوا ہوتا آج۔"

"ایک تو یار! یہ تم لوگوں کی درجہ بندی جان نہیں چھوڑتی کسی طرح، سوچتے ہی نہیں تم لوگ کہ زمانہ کتنا آگے نکل گیا

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

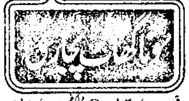

قیمت: =/۳۰ روپے ◎ ڈاک خرچ: =/۱۰ روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مر گیا تھا لیکن اس کی لاش مندر کے تہ خانے میں اصلی حالت میں موجود تھی۔
- سونا گھاٹ کے علاقے پر اس مُردہ پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ برگزیدہ نظر آتا تھا۔
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آ کر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کر لیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟
ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

انکا مکمل، دو حصے	اقابلا مکمل، دو حصے	غلام روحیں مکمل
قیمت فی حصہ ... روپے، ڈاک خرچ ... روپے	قیمت فی حصہ ... روپے، ڈاک خرچ ... روپے	قیمت ۱۵ روپے، ڈاک خرچ ... روپے

کتابیات پبلی کیشنز ...

ہے۔"

"کس زمانے کی بات کرتا ہے بھائی تو؟ وقت کا تو کام ہی آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ اسے کبھی تھمتے دیکھا ہے کسی نے؟ اور یہ درجہ بندی بھی ہم نے تو نہیں کی ہے نا، یہ ازل سے چلی آ رہی ہے اسی طرح۔ چھوٹا بڑا، اعلیٰ ادنیٰ کب نہیں رہا اس دنیا میں۔ کچھ عیّاروں نے مساوات کا نعرہ لگا کر لوگوں کو اُلّو بنایا ہے۔ ورنہ تو نے یہ مساوات دیکھی بھی ہے کہیں! خود یہ نعرہ لگانے والے انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ ایک طبقے میں اُنھوں نے ہم تم جیسے لوگوں کو رکھ کر اُسے عوام کا نام دے دیا ہے، دوسرے طبقے میں اپنے جیسے لوگوں کو شامل کر کے خواص کہلواتے ہیں وہ خود کو۔ کیا خاص و عام کی اس تقسیم کا نام مساوات ہے؟ درجہ بندی تو اُس خالقِ کائنات کی طرف سے کی گئی ہے۔ اس نے انسان تو سب ایک جیسے بنائے ہیں مگر ان کے دماغ، اُن کی صلاحیتیں ایک جیسی نہیں رکھیں۔ کوئی اعلیٰ منصب کا اہل ٹھہرایا گیا اور کسی کو ادنیٰ کاموں پہ مامور کیا گیا ہے۔ پھر ہم اس تفریق کو کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ کبھی تُو نے مساوات کا درس دینے والے کسی لیڈر کو اپنے گھر میں بھی جھاڑو لگاتے دیکھا ہے؟ کبھی کسی ہوٹل میں اُسے لوگوں کی میزوں پر کھانا لگاتے یا اُن کے جھوٹے برتن اُٹھاتے دیکھا ہے؟ کیا وہ خود کبھی ہوٹل میں بیٹھ کر بیرے سے کھانا نہیں منگواتے؟ کیا وہ اپنے گھر میں نوکر چاکر رکھ کر ان سے خدمت نہیں لیتے؟ پھر تو وہ کس مساوات کی بات کرتے ہیں؟ کہاں ہے وہ مساوات؟ کس مساوات سے کام لیتے ہیں وہ؟ میرے بھائی! یہ سبز باغ صرف لوگوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اُنھیں دکھائے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مالک، ملازم، افسر ماتحت، ادنیٰ اور اعلیٰ کی یہ درجہ بندی ہی اس دنیا کے نظام کو چلا رہی ہے۔ اسے ختم کر دیا گیا تو یہ عمارت کس بنیاد پہ کھڑی رہ سکے گی؟ کس طرح چل سکے گا یہ نظامِ دنیا۔ چھوٹے کو بڑے کا لحاظ نہ رہے، کمزور کو طاقت ور کا خوف نہ رہے تو یہ انسان درندہ نہیں بن جائے گا؟"

وہ بڑے جوشیلے انداز میں تقریر کرنے لگا تھا۔ اگر بیرا کھانا لے کر نہ آ جاتا تو اُس کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہی تھا۔ کھانا میز پر چُن دیا گیا تو میں نے اُس سے کہا "اب بس کر بھائی! کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھ اپنی باقی تقریر اور کھانا کھا کر جلدی سے چلنے والی بات کر۔ ان باتوں میں اُلجھنے کے لیے ابھی وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"ٹھیک ہے کھانا کھاؤ جلدی سے۔" وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "ایسی باتیں نہ کیا کر مجھ سے بڑے بھائی، میرے لیے انہیں برداشت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ آگ سی لگا دیتی ہیں میرے اندر یہ منافقوں اور عیّاروں کی باتیں۔"

"چل ٹھیک ہے یار! دفع کر، لعنت بھیج اب ان پر۔ کھانا کھا چپ کر کے۔"

میں اور شرافت علی خاموش ہو کر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ آبی خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے سوال کیا "سکھر ہم تینوں ہی جائیں گے یا ڈرائیور بھی جائے گا ہمارے ساتھ؟"

"وہ کیوں نہیں جائے گا بھئی، اُسے نہیں لے جائیں گے تو گاڑی کون چلائے گا؟" میرے بولنے سے پہلے ہی شرافت بول پڑا۔

"گاڑی چلانا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کوئی بھی چلا سکتا ہے اُسے۔ میرا تو خیال ہے اُسے اس معاملے میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔"

"اُس کی آپ فکر نہ کریں پیرزادہ صاحب! اُسے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ بہت وفادار ہے۔"

"بات یہ نہیں ہے بھائی شرافت علی! اصل میں ہم جا رہے ہیں وہاں اُس کا جانا مجھے مناسب نہیں لگ رہا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہاں کس قسم کے حالات پیش آئیں ہمیں۔ ممکن ہے ہمارے میزبان اسے پسند نہ کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ صرف میں اور سردار صاحب ہی ہو آئیں وہاں۔ زیادہ لوگوں کو دیکھ کر وہ بدک بھی سکتے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں شرافت علی یہ پیرزادہ صاحب، ان کی بات مان لینا چاہیے ہمیں۔" میں نے آبی کی تائید کی۔

"بہت اچھا بھائی! اگر آپ دونوں ہی متفق ہیں اس بات پر تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اُسے یہیں سے واپس بھیج دوں گا۔"

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو شرافت علی کا ڈرائیور کار کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ جلدی سے گاڑی سے اُترا اور ہمارے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے شرافت علی کے ساتھ عقبی نشست میں بیٹھتے ہوئے آبی سے کہا "بھائی پیرزادے! ذرا سی زحمت کر لو۔ یہ ڈرائیور کی خالی سیٹ آپ سنبھال لیں۔"

"واہ بیٹے! جواب نہیں ہے تیرا بھی۔ شرافت علی کے ساتھ بیٹھ کر تجھ پر بھی شرافت کا سایہ ہو گیا ہے۔" وہ گھوم کر ڈرائیور کی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "اچھی بات ہے یہ، تیری زبان کا چال چلن تو بدلا کسی طرح۔ اللہ نے چاہا تو تیرا چلن بھی بدل جائے گا اب۔"

شرافت علی نے زوردار قہقہہ لگایا "بہت خوب پیرزادہ صاحب! جی خوش کر دیا اس وقت تو آپ نے۔ ماشاء اللہ بڑے زندہ دل آدمی ہیں آپ۔ ایسے لوگوں سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ زبان کا چال چلن، واہ کیا بات کہی ہے آپ نے!" پھر اُس نے ڈرائیور سے کہا "تم کوئی رکشا یا ٹیکسی پکڑ لو اور گھر واپس چلے جاؤ۔ بیگم سے کہہ دینا کل شام تک واپس آؤں گا میں۔"

"جی بہت اچھا جناب! گاڑی کی ٹنکی فل کرا دی ہے میں نے۔" ڈرائیور اطاعت گزاری کے انداز میں بولا۔

آبی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "ہاں بھائی! جا تو آرام کر گھر جا کر۔ کہاں ہمارے ساتھ رُلتا پھرے گا۔"

"اوئے سجادہ نشین کے پُتّر! تیرا بولنا ضروری ہے ہر معاملے میں؟ اپنی زبان کو روک کے نہیں رکھ سکتا تو؟"

"آ گیا نا اپنی اوقات پر، آخر ہے نا ذلیلائی! دو منٹ بھی اپنی زبانی شرافت پر قائم نہیں رہ سکا۔"

"بک نئیں اوئے شرافت خان کی اولاد! گاڑی آگے بڑھا جلدی سے۔ تیری زبان چلتی ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی کسی طرح۔"

نیشنل ہائی وے پر ہماری کار ستّر اور اسّی میل کی رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ ہم تینوں ہی اپنے اپنے خیالات میں کھوئے خاموش بیٹھے تھے۔ لانڈھی سے آگے نکلنے کے بعد میں نے شرافت علی سے کہا "تم نے سنا تھا نا اس بنتِ یہودا نے ہمارے ساتھ آنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے جبر اللہ ہی کا نام لیا تھا۔ جبر اللہ ہی کا فون وصول کیا تھا نا اُس نے اس گھڑی؟"

"یہ تم کس بنتِ یہودا کی بات کر رہے ہو؟ تمھاری مراد الزبتھ سے تو نہیں ہے؟ ہمارے ساتھ تو وہی آ رہی تھی۔"

"ہاں ہاں، اسی کی بات کر رہا ہوں میں، اور کس نے فون ریسیو کیا تھا جبر اللہ کا؟" میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"یار! ایک تو یہ تم لوگوں کو نت نئے القابات اس قدر دیتے ہو کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ کس کا ذکر کرنے لگے ہو۔ سیدھا سیدھا نام لے کر نہیں بتا سکتے کسی کے بارے میں اور یہ تم نے الزبتھ کو بنتِ یہودا کس سلسلے میں کہنا شروع کر دیا ہے؟"

"اور کیا اس یہودی کی اولاد کو تمھاری بیٹی کہنے لگوں؟ تمھارا نام لکھ دوں اس کی ولدیت کے خانے میں؟ بولو منظور ہے؟"

"یہودی کی اولاد! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کس نے بتایا ہے تمھیں کہ الزبتھ کسی یہودی کی اولاد ہے؟" شرافت علی نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے نا یہ بات؟ پھر بھی دعویٰ کرتے ہو کہ تم ان لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ میرے بھائی! تجھے اندازہ ہی نہیں کچھ اُن لوگوں کے بارے میں۔ مجھے بھی اگر یہ لوگ امریکا نہ اُٹھا لے گئے ہوتے تو میں بھی زندگی بھر ان کی حقیقت نہ جان سکتا۔ اس اعتبار سے تو اُنھوں نے مجھے امریکا لے جا کر نیکی ہی کی ہے میرے ساتھ۔ ایسے ایسے رازہائے سربستہ کا اظہار ہوا ہے وہاں مجھ پر کہ یہاں رہ کر کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالکل کایا کلپ کر دی ہے انھوں نے میری وہاں لے جا کر۔"

"اوئے یہ کیا سُن رہا ہوں میں؟ امریکا تک ہو آیا ہے تو اس دوران۔ کیا اُس ڈاکٹر دھمّن کے پیچھے وہاں گیا تھا تو؟" آبی بولا۔

"نہیں یار! اس ذلیل دھمّن کے آدمیوں نے مجھے باندھ کر پارسل کر دیا تھا یہاں سے۔ ہیروئن بھر کے لے گئے وہ میرے اندر۔"

اس کی حیرت دیدنی تھی۔ اس نے اپنے سامنے لگے آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا "کیا کہہ رہا ہے میرے یار! کسی جوٹ مل کی تیار کردہ بوری تو نہیں ہے تو، کہ وہ تیرے اندر ہیروئن جیسی غلیظ شے بھر کے لے گئے۔ اور تو نے بھر لینے دی انھیں خاموشی سے؟"

"ہاں بھائی! ایسا ہی ہو گیا تھا میں اس سمے۔ جوٹ کی بوری ہی بن گیا تھا اُس گھڑی۔ اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا اُنھوں نے مجھے کہ کوئی مدافعت کر سکتا میں۔ ایسا ہی بے دست و پا کر کے ڈال رکھا تھا انھوں نے مجھے۔ بڑی کُتی شے ہیں یار یہ لوگ۔"

"عجیب بات ہے یار، یہ تو۔ اس بار تو یہ دنیا کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی ہے مجھے۔ تو بھی مجھے وہ جیلانی نہیں لگتا ہے اب۔"

"جن حالات سے میں گزرا ہوں اس دوران، اور جیسے جیسے انکشافات مجھ پر ہوئے ہیں، اس کے بعد میری سوچ کا رُخ بدل گیا ہے آبی! یہ ٹھیک کہا ہے تو نے، میں بہت بدل گیا ہوں اب۔ پہلے کوئی منزل نہیں تھی میری، کوئی مقصد نہیں تھا زندہ رہنے کے لیے۔ بس ہواؤں کے دوش پر اڑتا پھر رہا تھا میں۔ وہ جدھر لے جاتی تھیں، دوڑا چلا جاتا تھا۔ صرف ایک آسیہ

ہی مرکزِ نگاہ تھی۔ اُسی کی خاطر خرابات کی اس دلدل میں اُترا تھا اور اتنا دھنستا چلا گیا تھا کہ باہر نکلنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تھی۔ شکر ہے اس سوہنے رب کا۔ جس ڈاکٹر دھمن کے ہاتھوں میں برباد ہو کر اپنی راہ گم کر بیٹھا تھا، اسی دھمن کے ذریعے سے میرے رب نے مجھے سیدھی راہ بھی دکھا دی۔ میری منزل جو خرابات میں گم ہو گئی تھی اب نظر آنے لگی ہے۔"

پھر میں نے اُسے سب کچھ پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ وہ تمام حالات جن سے میں اس دوران دوچار رہا تھا، اس کے گوش گزار کر دیے۔ ایسا میں نے اس لیے کیا تھا اس وقت کہ ایک تو ہمارے پاس اس طویل سفر میں بے زاری سے بچنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ خاموش بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہم لوگ۔ میری اس داستان کے دوران کافی راستہ طے ہو گیا اور ہمیں اس کا بالکل احساس نہ ہو سکا تھا، دوسرے میں یہ بھی چاہتا تھا کہ یہ ساری باتیں شرافت علی کو بھی معلوم ہو جائیں تاکہ وہ یہ اچھی طرح جان لے کہ جن لوگوں کے لیے وہ اب تک کام کرتا رہا ہے، ان کے عزائم کیا ہیں اور نادانستگی میں وہ اسی شاخ کو کاٹتے ڈال رہا ہے جس پر اُس نے اپنا آشیانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے اس میں زندگی کی حرارت محسوس کی تھی، اُسے ضمیر کی چبھن سے بے چین ہوتے دیکھا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ حالات کا صحیح علم ہونے کے بعد وہ ضرور تائب ہو جائے گا۔ اس کا ضمیر ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کے مصائب اور ضرورتوں نے اُسے تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا اور جب آدمی کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کسی وقت بھی راہِ راست اختیار کر سکتا ہے۔ بس ذرا اُسے جگانے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے تھوڑی سی۔ اور میں نے اس شرافت علی کے سلسلے میں اپنی سی کوشش کر ڈالی تھی۔ میرا خیال تھا اگر وہ خلوصِ دل اور نیک نیتی سے میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہو جائے تو ہم زیادہ آسانی کے ساتھ یہاں موجود یہودی ایجنٹوں کا خاتمہ کر سکیں گے۔

آبی اور شرافت علی دونوں ہی حیرت سے گُنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی زبانیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں ان کا۔ پوری کہانی سُننے کے دوران اُن میں سے کسی نے بھی کوئی سوال تک نہیں کیا تھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، خاموش بیٹھے بس سنتے ہی رہے تھے۔ میں خاموش ہوا تو آبی نے کار کو سڑک کے ایک کنارے لگا کر روک دیا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کار کیوں روک دی تم نے؟"

"چپ کر جا یار! کیسی ہولناک باتیں بتائی ہیں تُو نے، رونگٹے کھڑے کر دیے ہیں میرے۔ میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا ہے۔ اسٹیئرنگ سنبھالے رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ بار بار پھسلا جا رہا ہے ہاتھ سے۔" آبی نے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے خوف ناک لوگوں کے درمیان تیرے ہوش حواس کس طرح قائم رہے۔ جیلانی یار! تو نہیں سمجھتا تھا میں تجھے یار! چھوٹے موٹے پولیس مقابلے اور ڈاکے اور چیز ہیں۔ ان میں نہ ذہانت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، نہ منصوبہ بندی کی، بس جہاں جو داؤ چل گیا استعمال کر لیا۔ مگر ایسے تربیت یافتہ، منظم اور جہاندیدہ لوگوں کے مقابلے کے لیے تو بڑی سوجھ بوجھ درکار ہوتی ہے۔ کس طرح ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا تو انھیں؟ کون سی گیدڑ سنگھی سنگھائی تھی تو نے انھیں کہ نہ صرف وہ تیری آزادی پر آمادہ ہو گئے بلکہ انھوں نے اپنی اتنی اہم کارکن بھی ساتھ کر دی تیرے؟"

"یہ سب میرے سوہنے رب کی مہربانی سے ہو گیا ہے آبی! میری ناتجربے کاری اور اناڑی پن ہی ضامن بن گئے میرے۔ وہ مجھے تربیت کے مراحل سے گزار کر اپنے سانچے میں ڈھالنے کی آرزو میں مات کھا گئے مجھ سے۔ سچی بات تو یہ ہے یار جی! کہ خدا ہی کو میری بہتری منظور تھی جو اُس نے میرے لیے گل کو فرشتۂ رحمت بنا کر بھیج دیا تھا۔ اگر وہ مجھے نہ ملا ہوتا اور اس نے میرے سامنے ان کا کچا چٹھا نہ رکھ دیا ہوتا تو انھوں نے اندھیرے میں رکھ کر اس انجمن کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑ دیا تھا مجھے۔ جس انداز سے وہ ٹکرائی تھی مجھ سے اور جس معصومانہ انداز میں اس نے جال ڈالا تھا مجھ پر، اس سے بچنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا میرے لیے۔"

"ہاں! یہ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے ہم سب پر جیلانی! میں تو سوچا بھی نہیں تھا کبھی کہ جسے میں ایک معمولی سا منشیات کی اسمگلنگ کا کام سمجھ کر ملوث ہو گیا ہوں، اس کے پیچھے اتنا خوف ناک اور تباہ کن منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا جا رہا ہے۔ کیسی ذلیل قوم ہے یہ، اپنی برتری کے لیے ساری دنیا کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ ایسے سیاہ دل ہوتے ہیں یہ" شرافت علی نے کہا۔

"اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی نافرمان قوم کیوں کہلاتی؟ ہی لعنتی ہیں یہ، انسانوں والی تو کوئی بات ہے ہی نہیں" آبی نے کہا۔

"ہاں یار! جو کچھ جیلانی نے بتایا ہے، اسے سُن کر تو قائم کی جا سکتی ہے ان کے لیے۔" شرافت علی نے کہا۔

"اب آگے بھی چل بھائی! یہ ساری باتیں میں نے اس لیے تو نہیں بتائی ہیں تمھیں کہ تم گاڑی روک کر رات

میں ہی گزارنے کا پروگرام بنا لو۔ یہ بھی یاد رکھ میرے ویر کہ ہمیں جلد از جلد متصل گاؤں کی اس حویلی پہنچنا ہے جہاں لاکھولاشاری قیام پزیر ہے۔"

"اوہ!" آبی نے جلدی سے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تُو نے تو ہوش ہی گم کر کے رکھ دیے ہیں میرے۔"

شرافت علی نے بڑے ہی جذباتی انداز میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔ "جیلانی! میرے بھائی! میں سخت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں، میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے اس خیال سے کہ میں اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے آرام و آسائش کے لیے اب تک اپنے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہا ہوں۔ اپنے اس پیارے وطن کی جس کی بنیادوں میں میرے اجداد کا لہو شامل ہے۔ جسے ہم نے لہو کا سمندر عبور کر کے حاصل کیا تھا۔ کتنا ذلیل ہوں میں، کیسی نیچ حرکت کی ہے میں نے اپنے بزرگوں کا، اپنی ان ماؤں اور بہنوں کا لہو بیچتا رہا ہوں میں — جنھوں نے خود کو اس لیے فنا کر دیا تھا کہ ہم سب آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ دنیا کی دوسری آزاد اور خود مختار قوموں کی طرح ہماری بھی کوئی شناخت ہو، کوئی پہچان ہو ہماری، زمین کا ایک خطہ ایسا بھی ہو جسے برصغیر کے مسلمان اپنا کہہ سکیں، اور اس کے نام سے اپنا تعارف کرا سکیں اقوامِ عالم کے سامنے۔ اسی عظیم مقصد کی خاطر اتنی قربانیاں دی تھیں اُنھوں نے۔ اور اب جب کہ پاکستان ہماری پہچان بن چکا ہے۔ دنیا ہمیں پاکستانی کہہ کر پکارنے لگی ہے، مجھ جیسے عاقبت نااندیش زر کے پجاری اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے اس ملک کو برباد کر دینے کی تگ و دو میں لگ گئے ہیں۔ کیسے ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن ہو گئے ہم یارو! ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر یہ تک نہیں سوچتے کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔"

"ہاں بھائی! یہی تو بدقسمتی ہے ہماری، کسی کی کوئی اچھی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی ہے ہماری۔ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی باتیں دیوانے کی بڑ لگنے لگی ہیں ہمیں۔ کچھ لوگ اپنی محرومیوں کو بہانہ بنا کر اس ملک کی آزادی کو نیلام کر دینے کے درپے ہیں اور کچھ اپنی بڑائی کے زعم میں اس کی بنیادوں پر ضربیں لگانے میں مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے لوٹ مچ گئی یہاں، جو کچھ جس کے ہاتھ لگ جائے حاصل کر لینا چاہتا ہے — پتا نہیں کل کیا ہو، کچھ باقی بھی رہے یا نہ رہے۔ ہر شخص اپنا حال درست کر لینا چاہتا ہے، مستقبل کی کسی کو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔ عجیب افراتفری کا عالم ہے یار! میدانِ حشر کا سا منظر ہے کچھ۔"

"اوئے جیلانی! یہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں تُو نے؟ کس درس گاہ میں جا بیٹھا تھا بھائی تُو؟ پہلے تو میں نے کبھی تیرے منہ سے ایسی باتیں نہیں سنیں۔ سچ بتا یار! تو میرا یار غلام جیلانی ہی ہے نا؟" آبی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"یوں حیرت کا اظہار نہ کر میرے یار! جو کچھ میں دیکھ آیا ہوں امریکا جا کر، جو علم حاصل ہوا ہے مجھے وہاں، اگر تُو نے بھی وہ سب کچھ دیکھ اور جان لیا ہوتا تو تُو بھی ایسی ہی باتیں کر رہا ہوتا اس گھڑی۔"

"میں تو تیری زبانی ساری باتیں سن کر ہی جوش کھانے لگا ہوں، میں اگر وہاں تیری جگہ ہوتا تو میرا دماغ ہی اُلٹ جاتا۔ میں تیری طرح گہرائی میں اُتر کر نہیں سوچ سکتا تھا۔ غضب ناک ہو کر انجام کی پروا کیے بغیر جا پڑتا ان رذیلوں پر، بوٹیاں کر دیتا ان سؤر کے بچوں کی یا خود ختم ہو جاتا۔" آبی بہت ہی خونخوار لہجے میں بولا۔

"یہ تو کوئی سمجھ داری کا کام نہیں ہوتا آبی! اس سے ان کی وہ ریشہ دوانیاں جو ہمارے ملک میں جاری ہیں، ختم نہیں ہو سکتی تھیں۔ نہ ہی ان میں کسی طرح کا کوئی تعطل پیدا ہو سکتا تھا۔ تم اگر وہاں ان کے دس بیس آدمی بھی مار کر مر جاتے تو اس سے ہمارے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا ان کے عزائم کا۔ تیری قربانی رائیگاں ہی جاتی پیارے بھائی! اب ہم یہاں ایک پوری تنظیم قائم کر سکتے ہیں اُن کے خلاف، ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کے ایک یا دس بیس آدمیوں کو مار کر بھی وہ یہاں آزادی سے کام نہ کر سکیں۔ بڑے تحمل کی ضرورت ہے آبی! ہمیں۔ جوش میں آ کر اگر کوئی قدم اٹھا بھی لیا ہم نے تو اس سے اُن کا کوئی بڑا نقصان نہیں ہو گا۔ ہم چند آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر وہ پھر پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے، کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی انھیں اس کام میں۔"

"جیلانی ٹھیک کہہ رہا ہے آبی۔" شرافت علی نے بھی میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی بڑی تنظیم کا مقابلہ ہم دو چار آدمی نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کوئی ایسی ہی تنظیم ہونا چاہیے۔ ایسی منظم اور مضبوط تنظیم جس کے کارکن شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہوں اور ہر جگہ، ہر محاذ پر اُن کو شکست دے کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے لیے ہمیں محبِ وطن لوگوں کو تلاش کر کے انھیں وطنِ عزیز کی سلامتی کے لیے اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کرنا ہو گا۔ ایسے لوگوں کی کمی

نہیں ہے ہمارے ملک میں جو پاکستان کی بقا کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہمیں تو انہیں دشمن کے ارادوں سے باخبر ہی کرنا ہوگا۔ یہ معلوم ہوتے ہی ہر شخص ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن لوگوں کو اپنی صف میں شامل کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی کالی بھیڑ ہم میں نہ گھس آئے۔"

"تو نے تو میرے بھائی! اچھی خاصی منصوبہ بندی کر ڈالی بیٹھے ہی بیٹھے۔ یہ باتیں سوچنا جتنا آسان ہے، اس پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیسے کیسے یہ داستان سناتا پھرے گا اور کس کس کو اس کی سچائی کا یقین دلا سکے گا تو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی تم فکر مت کرو جیلانی! وہ کسی دانا نے کہا ہے نا کہ چار آدمی اگر ہم خیال ہو جائیں تو انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ اب ہم تین آدمی تو ہو ہی گئے ہیں، ایک کو اور ساتھ ملا لیں گے۔ پھر ہم چار مل کر اپنے اپنے حلقۂ احباب میں جا کر انھیں ہمنوا بنانے کی کوشش کریں گے اور وہ نئے شامل ہونے والے اس سے آگے جا کر کام کریں، اسی طرح ایک سے دوسرے تک رسائی ہوتی جائے گی اور بہت جلد ہمارا یہ منصوبہ عملی شکل اختیار کر لے گا۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔"

"ہوں۔ کہتا تو ٹھیک ہے تو بھی، تیری بات دل کو لگتی ہے۔" میرے ذہن میں اسی لمحے سیٹھ قاسم کا نام اُبھرا۔ وہ بھی شرافت علی کی طرح توبہ کر کے راہِ راست اختیار کرنے کی بات کر رہا تھا مجھ سے۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "ایک اور نام یاد آیا ہے مجھے اس لمحے۔ تیری ہی طرح کے ایک اور شخص نے بھی اس راہِ بد کو ترک کر دینے کی بات کی تھی مجھ سے۔ وہ بھی بہت بیزار بیزار سا تھا اس کام سے۔ کہہ رہا تھا اب وہ توبہ کر لینا چاہتا ہے ہمیشہ کے لیے۔"

"کون ہے وہ؟ کس کا ذکر کر رہے ہو تم؟ کیا میں بھی جانتا ہوں اُسے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، تم نے ہی تو ملایا تھا یار! اس سے مجھے۔ وہ اپنے سیٹھ قاسم کی بات کر رہا ہوں میں۔"

"کیا کہہ رہے ہو جیلانی! تمھیں دھوکا تو نہیں ہوا ہے کہیں؟ وہ ایسی بات کہہ سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کبھی۔"

"نہیں پیارے بھائی! مجھے بالکل دھوکا نہیں ہوا ہے۔ میرے کان بہت صاف تھے اس وقت اور سماعت کی قوت بھی پوری طرح بحال تھی۔ اس نے مجھ سے تنہائی میں یہی باتیں کی تھیں اسی لیے تم لوگوں کو اٹھا دیا تھا وہاں سے۔"

"کیا کہہ رہے ہو! اس رات ڈنر کے بعد یہی بات کی تھی اُس نے تم سے؟" شرافت علی کی حیرانی دیدنی تھی۔

"اصل بات تو یہ نہیں تھی۔ جو باتیں کرنے کے لیے اس نے تنہائی حاصل کی تھی، وہ ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے اس کا، مگر باتوں باتوں میں اُس نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کر رہا تھا مجھ سے۔ کہتا تھا خدا نے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میری پشتیں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی ہیں اس کے سہارے، میں اس دلدل میں کیوں پھنسا رہوں؟ اس سے نجات حاصل کر کے سکون کا سانس لینا چاہتا ہوں میں۔"

"اور وہ اہم معاملہ کیا تھا؟ یہ نہیں بتاؤ گے مجھے؟ حالانکہ ہمارے درمیان کوئی راز داری نہیں رہی۔"

"میرے خیال میں تو وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے دوسروں سے چھپایا جائے مگر نہ جانے کیوں وہ اُسے چھپا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کا بیٹا جو چند ماہ ہوئے امریکا گیا تھا سیاحت کی غرض سے، وہ وہاں جا کر لاپتا ہو گیا ہے اور سیٹھ قاسم چاہتا ہے کہ میں امریکا جا کر خاموشی سے اس کا پتا لگانے کی کوشش کروں۔"

"اوہ، یہ بات ہے۔" شرافت علی چونک کر بولا۔ "اس نے کہا ہے تم سے کہ شاہد سیاحت کے لیے گیا تھا امریکا؟"

"ہاں، یہی کہا تھا اُس نے۔ مگر تم اس طرح کیوں پوچھ رہے ہو یہ بات؟ کیا جھوٹ بولا ہے اس نے مجھ سے؟"

"ہاں جھوٹ بولا ہے وہ صحیح بات نہیں بتائی ہے اس نے، اسی لیے اُس نے تنہائی میں بات کی ہے تم سے۔"

"اچھا، تو کیا تم جانتے ہو صحیح بات کیا ہے؟ کیا اس کا بیٹا امریکا نہیں گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گیا تو وہ امریکا ہی ہے، مگر سیاحت کی غرض سے نہیں گیا ہے وہ۔ ڈاکٹر ڈھمّن کی طرف کچھ روپیہ ہے سیٹھ کا۔ اُس نے کچھ مال بھیجا تھا ڈھمّن کو، اس کے آدمیوں نے اُسے وصول بھی کر لیا تھا لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے پولیس نے اس کے آدمیوں کو پکڑ لیا اور مال پر قبضہ کر لیا۔ ڈھمّن نے اُسے بہانہ بنا کر اس کی ادائیگی روک دی۔ اُس نے شاہد کو وہی رقم وصول کرنے بھیجا تھا۔"

"اچھا! یہ بات تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈھمّن نے جو کہانی سُنائی تھی وہ جھوٹ کا پلندہ تھی۔"

"یعنی ڈاکٹر ڈھمّن نے بھی تمھیں کچھ بتایا تھا شاہد کے بارے میں؟ تو ڈھمّن کے پاس پہنچ گیا تھا وہ؟"

"ہاں، اس نے بتایا تھا مجھے اس کے بارے میں۔ اس نے بتایا تھا اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق تو وہ ایک شخص تھا اور اُس کے شناختی کاغذات اتفاقاً اُس کے ہاتھ لگ گئے تھے جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے میرے پاکستان پہنچنے کا انتظام کر دیا تھا۔"

"یعنی تم جن کاغذات کے ذریعے پاکستان واپس آئے ہو، وہ اسی شاہد کے تھے؟ قاسم کے بیٹے شاہد کے؟"

"ہاں، تمھیں نہیں معلوم تھا کیا یہ جو تم اس طرح حیرت کا اظہار کر رہے ہو؟" میں نے اُسے حیران ہوتے دیکھ کر کہا۔

"یہ تو معلوم تھا مجھے کہ تم کسی شاہد حسین کے پاسپورٹ پر واپس آئے ہو لیکن وہ سیٹھ قاسم کا بیٹا شاہد ہے، یہ نہیں جانتا تھا میں۔ اور یہ سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنا پاسپورٹ وغیرہ تمھیں دے کر پاکستان بھیج دے گا اور خود وہیں کہیں روپوش ہو جائے گا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کوئی۔ آخر اُسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ چند لاکھ کی رقم جو اسے ڈھمّن سے وصول کرنا تھی، ہضم کرنے کی خاطر غائب ہوا ہے تو یہ بڑی احمقانہ بات ہوگی۔ وہ سیٹھ قاسم کی کروڑوں کی جائداد اور تمام دولت کا وارث ہو کر ایسی بات کیوں سوچے گا؟"

"تو تمھارا خیال ہے کہ وہ کسی وجہ سے خود ہی غائب ہو گیا ہے کہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"لوگ ایسا کہتے ہیں، مگر یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی۔ میرا اب تک تو یہ خیال تھا کہ اُسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔"

"پہلے خیال تھا یہ تمھارا، اب خیال بدل گیا ہے کیا؟" میں نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، اب خیال بدل گیا ہے میرا، اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈھمّن نے اُسے بے دست و پا کر کے ڈال دیا ہے کہیں۔ اور اس کے کاغذات پر تمھیں پاکستان بھیج کر سرکاری کاغذات میں اس کے واپس چلے جانے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اب اگر وہ ڈھمّن کے چنگل سے آزاد بھی ہو گیا کبھی تو واپس پاکستان نہیں آسکے گا۔ وہیں بھٹکتا پھرے گا۔ سان فرانسسکو جیسی دراز ریاست میں اُس کے لیے کاغذات کے بغیر اپنی شناخت کرانا آسان نہیں ہوگا۔"

"تم نے اپنی دانست میں بالکل صحیح اندازہ قائم کیا ہے لیکن تم اس رذیل ڈھمّن کی درندہ خصلت سے واقف نہیں ہو پوری طرح۔ وہ تمھارے اس اندازے سے کہیں بڑھ کر ذلیل آدمی ہے۔ اس نے مجھے جو کہانی سُنائی تھی، اب میں اسے بالکل درست طریقے پر سمجھ پایا ہوں۔ اس کی ساری حقیقت عیاں ہو گئی ہے مجھ پر۔ اس کتے کو ابھی تم زیادہ نہیں جانتے شرافت علی!"

"کیا سمجھا ہے تم نے؟ مجھے بھی بتا دو تاکہ میں بھی جان سکوں کچھ اس کے بارے میں۔" شرافت علی نے کہا۔

"اس نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ شاہد پاکستان سے سیر و تفریح کی غرض سے امریکا آیا تھا۔ وہ نیویارک کے لنکن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں دو امریکی نوجوانوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ وہ دونوں اسے اپنے ساتھ سان فرانسسکو لے آئے، یہاں آکر سڑک پار کرتے ہوئے وہ گاڑی کی زد میں آکر شدید زخمی ہو گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے اسے زخمی حالت میں ڈھمّن کے کلینک پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گئے۔ شاہد کی حالت اتنی نازک تھی کہ ڈھمّن کو اس کے بچنے کی ایک فیصد بھی اُمید نہیں تھی، پھر بھی اس نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ شاہد کے مرنے کے بعد ڈھمّن نے اس کے کاغذات سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ان ... کاغذات کو مجھے پاکستان بھیجنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اس نے وہ تمام چیزیں جن سے شاہد کی شناخت ہو سکتی تھی حاصل کر کے چھپا دیں اور پولیس کو اس کے زخمی حالت میں کلینک پہنچائے جانے کی اطلاع دے دی۔ ... پولیس جب کافی بھاگ دوڑ کے باوجود اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکی تو اس نے شاہد کو لاوارث قرار دے کر اس کی تدفین کر دی اور یوں اس کا قصّہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، لیکن جو نتیجہ میں نکالا ہے اور جس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نیویارک کے لنکن ہوٹل سے شاہد نے کہاں سے ڈھمّن سے رابطہ قائم کیا ہوگا تبھی اس کمینے نے شاہد کو آدھا پونا لگانے کا منصوبہ بنا لیا ہوگا۔ اسی منصوبے کے تحت اس کے آدمی شاہد کو نیویارک سے لے کر آئے تھے، اپنے پاس بلا کر انسانی اعضا کے اس بیوپاری نے دھوکے سے اس کے گُردے نکال کر بیچ کھائے ہوں گے اور پھر اس کی لاش کو کسی جگہ ڈلوا کر اسے ایکسیڈنٹ کا کیس بنایا اور اپنے کلینک میں واپس منگوا کر اس کے حادثے میں ہلاک ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ پولیس بے چاری اس ذلیل آدمی کی ظاہری شرافت سے دھوکا کھا گئی اور اسے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا۔ اس طرح اس کتے نے ایک تیر سے تین شکار کر لیے۔ یعنی سیٹھ قاسم کا روپیہ ہضم کیا، شاہد حسین کے گُردے بیچ کر مزید مال کمایا اور اس کے کاغذات کے ذریعے مجھے یہاں بھیج کر وہ ہیرے بھی اسمگل کر دیے۔ دیکھا کیسا سوّر کا بچہ ہے وہ یہودیوں کا زر خرید غلام۔"

"یعنی وہ... سیٹھ قاسم کا بیٹا... قتل ہو چکا ہے؟ مر چکا ہے وہ۔ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟"

"ہاں بھائی! یہی کہا ہے میں نے اور تم نے سُننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اسے ڈھمّن ہی نے قتل کیا ہے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے جیلانی! برباد ہو گیا ہے وہ سیٹھ قاسم تو۔ ایک ہی بیٹا تھا اس کا اُسے اس ظالم نے یوں چھین لیا اس سے۔ صرف چند نوٹوں کی خاطر جان لے لی ہے اس نے اس غریب کی۔ کیا کمی ہے اس رذیل دشمن کو دولت کی؟ کس کے لیے لگا رہا ہے وہ دولت کے یہ انبار؟ اُف خدایا! ایسے لوگ بھی پیدا کیے ہیں تُو نے اس دُنیا میں؟"

"ہاں، یار شرافت علی! ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دُنیا میں۔ رذیلوں کو جب اختیار مل جاتا ہے تو ایسے ہی ہو جاتے ہیں وہ۔ رزقِ حرام آدمی کو انسان نہیں رہنے دیتا ہے میرے یار! اور وہ کمینہ تو مجسّم حرام ہی حرام ہے۔"

"ہاں بھائی! گرہ میں باندھ لے یہ بات اور عبرت حاصل کرتا رہ اس سے۔ اسی لیے بار بار حرام سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے ہم لوگ سمجھتے نہیں ہیں ان باتوں کو اور انہیں معمولی سمجھ کر نظر انداز کرتے رہتے ہیں لیکن تم نے دیکھا یہی معمولی سی بات آدمی کو درندہ بنا دیتی ہے ایک دن۔" آبی نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

میں نے ہنس کر کہا "تُو تو چپ بیٹھا رہ واعظ کی اولاد! تُو نے تو جیسے زندگی میں کبھی حرام کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ بڑے پسینے کی کمائی کھا تا رہا ہے نا تو۔ اسی لیے تو پولیس پیچھے پھرتی رہتی ہے۔"

"میرے دشمن نہیں ادئے ذلیلانی! سارا ذائقہ خراب کر دیا سالے کی طرح تو نے بکواس کر کے۔"

"اور یہ تو بس آنکھیں بند کر کے سیدھی دوڑائے چلا جا رہا ہے۔ مجھے اس راہ سے گاڑی کو۔ کچھ ہوش بھی ہے تجھے۔ ہم کہاں گئے ہیں؟"

"فکر مت کر بچے! تجھے تو میں نے سیدھا دریائے سندھ میں لے جا کر غوطہ دینا ہے۔ تبھی آنکھیں کھلیں گی تیری۔ ایسے تھوڑی نظر آئے گا تجھے کچھ۔ دیکھتا نہیں ہے شکار پور کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں ہم اور آگے وہ سڑک آنے والی ہے جو ہمیں سیدھی لگا تار نہر پہ لے جائے گی۔ اُدھر ہی ڈال دوں گا میں گاڑی کو اور نہر عبور کر کے سیدھے متصل گاؤں جا نکلیں گے ہم۔ بالکل اسی جگہ جا ٹھہریں گے جہاں اس لاکھو لاشاری نے حویلی کھڑی کر رکھی ہے۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ سارا راستہ کٹ گیا اور ہمیں باتوں میں کچھ پتا ہی نہیں چل سکا۔"

"باتیں بھی تو ایسی ہی شروع کر دی تھیں تُو نے جنھوں نے ہوش گم کر کے رکھ دیے تھے ہمارے۔ شکر کر منزل پر خیریت سے پہنچا رہا ہوں تجھے، ورنہ کئی بار جی چاہا تھا کہ کسی تناور درخت سے دے ماروں گاڑی کو۔"

"اتنا غیرت مند کب سے ہو گیا ہے تُو کہ ایسی باتوں پر خودکشی کرنے کو جی چاہنے لگا ہے تیرا؟"

"اوئے چپ کر جا دیکھ جیلانی! غصہ دلائے گا مجھے تو۔ رکھ ابھی اسٹیئرنگ ہاتھ میں ہی ہے میرے۔"

"نا میرے بچے! نا۔ ایسی باتیں نہ کر بیٹھے! ابھی تو بہت کام کرنا ہیں ہمیں تجھے ساتھ رکھ کر۔ تُو مر گیا تو میں اکیلے کیسے کروں گا یہ سارے کام۔ بھائی شرافت علی! تو ہی سمجھا یار اس آتش زیر پا کو۔"

"چپ ہو جا یار! تُو نے تو مجھے اُلجھا کے رکھ دیا ہے بُری طرح سے۔ کیسی غفلت کی نیند میں ڈوبا ہوا تھا میں۔ یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کبھی کہ دولت حاصل کرنے کی دُھن میں کس کے ساتھ جا اُترا ہوں میں اور یہ جو الزبتھ تیرے ساتھ لگ کر آئی ہے یہاں تک اور جس طرح اپنے خاص خاص آدمیوں سے متعارف کرا رہی ہے تجھے، اس کے پس پشت کوئی بہت ہی اہم بات کارفرما نظر آتا ہے مجھے۔ یہ لوگ بہت زیادہ ہی اعتماد کر رہے ہیں تجھ پر۔ جبھی تو اس جیرالڈ کو بے نقاب کر دیا ہے تجھ پر۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کا اصل نام جیرالڈ ہے۔ سب الیگزنڈر ہی کے نام سے جانتے ہیں اسے اور جرمن صنعت کار کے طور پر پہچانا جاتا ہے وہ۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"اب کیا باقی رہ گیا ہے سمجھنے کے لیے؟ کون سی بات سمجھنا چاہتا ہے بڑے بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جیرالڈ یا الیگزنڈر جو بھی ہے، وہ تمھیں اور آبی کو بابا صاحب کے آستانے پہ کیوں لے گیا تھا؟"

"تیرے اس بابا صاحب عامل کامل کی اصلیت سے آگاہ کرنے کے لیے۔ آئی سمجھ؟" میں نے جواب دیا۔

"بابا صاحب کی اصلیت! کیا مطلب ہے تیری اس بات کا؟ اب کوئی اور انکشاف کرنا چاہتا ہے کیا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"اوئے انکشاف کے بچے! تیرا وہ بابا اسحاق بہروپیا بھلے آدمی! ایک دم فراڈ ہے، یہ بتانا چاہتا ہوں میں۔"

"کیا کہہ رہا ہے غلام جیلانی! توبہ کر خدا سے۔ معافی مانگ ایسے کامل بزرگ پر بہتان باندھ رہا ہے۔ کون یقین کرے گا اس بات پر، اور کسی کے سامنے ایسی بات کی تُو نے تو اُن کے عقیدت مند زندہ نہیں چھوڑیں گے تجھے۔"

"مجھے ضرورت ہی کیا ہے کسی سے کچھ کہنے کی۔ تو تھا تو میں نے بتایا ہے تجھے۔ یقین نہیں آتا تو نہ کر، مجھ پر فرق نہیں پڑے گا اس سے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اور جو باتیں کی ہیں وہ غلط نہیں ہیں۔ وقت آنے پر سب سے پہلے اسی کی گردن اُڑانا ہے مجھے۔ وہ بہروپیا ہی یہاں ڈوریاں ہلا رہا ہے بیٹھا ہوا۔ اصل آدمی تو وہی ہے۔"

"کیا دیکھا تھا تم نے وہاں؟ اور کیا باتیں کی تھیں بابا صاحب نے تم سے؟ میرا تو خیال ہے کہ وہ کوئی اور ہو گا جس سے تم ملے ہو گے۔"

"دیکھو شرافت علی! میں تمھیں مجبور نہیں کر رہا ہوں کہ تم میری ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کرتے جاؤ۔ اگر تمھیں یقین نہیں ہے میری کسی بات پر تو اچھا یہی ہے تم خود معلومات حاصل کرو اس کے بارے میں اپنا اطمینان کرنے کے لیے۔ ویسے مجھے پورا اطمینان ہے اس سلسلے میں۔ لزی اور جیرالڈ اسے مسٹر آزک کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ مجھ سے انھوں نے اس کا تعارف آزک ہی کی حیثیت سے کرایا تھا۔ انھیں اگر یہ معلوم ہوتا کہ میں ان سب کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہوں، اور انہیں صرف منشیات کے اسمگلروں کی کسی بڑی تنظیم سے وابستہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان کے عزائم سے بھی پوری پوری آگاہی رکھتا ہوں تو وہ کبھی میرے سامنے اسے اس کے اصلی نام سے مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کرتے اور نہ ہی مجھ پر اس درجہ اعتماد کرتے، بہرحال تمھیں اختیار ہے کہ میری جو بات تمھیں مشکوک معلوم ہو، اس کی حقیقت جانے بغیر اس پر یقین مت کرو۔ آدمی کو کسی طرف سے شک و شبے میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔"

"میں شک نہیں کر رہا ہوں تم پر، نہ یہ خیال ہے میرے دل میں کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو گے۔ بات صرف اتنی ہے جیلانی کہ بابا اسحاق کو عوام میں جو مقام حاصل ہے اور جو شہرت ہے ان کی، تمھاری باتیں اس سے بالکل ہی متضاد ہیں۔ یہ بات ذہن قبول نہیں کر رہا ہے کہ ایک ایسا نیک نام اور دین دار شخص فراڈی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ ساری عبادت و ریاضت، سارا زہد و تقویٰ محض دکھاوا ہے اور وہ شخص حقیقتاً مسلمان ہی نہیں ہے بلکہ یہودی ہے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے میرے بھائی! قومیں یوں ہی گھر بیٹھے ہاتھ پیر ہلائے بغیر عروج حاصل نہیں کر لیتی ہیں۔ بڑی محنت کرنا پڑتی ہے افراد کو۔ خود کو فنا کر دینا پڑتا ہے، مٹی میں ملا دینا پڑتا ہے اپنی ذات کو۔ سارے عیش و آرام تج کے جفاکشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تب کہیں کئی نسلیں گزرنے کے بعد سربلندی نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے جیسے تن آسان لوگ جنھیں دوسروں پر تنقید کرنے اور ان کے عیب گنانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے کبھی کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ اب یہی دیکھو، یہ یہودی ایک قوم کی حیثیت سے خود کو منوانے اور اپنے لیے ایک ملک حاصل کرنے کے لیے صدیوں سے جد و جہد کر رہے تھے۔ جہاں جاتے تھے دھتکارے جاتے تھے۔ بیشتر ممالک سے نکالے گئے۔ کئی ملکوں میں ان کا داخلہ بند کیا گیا مگر یہ..... لوگ تھک کے نہیں بیٹھے کبھی اور بالآخر اپنے لیے ایک ملک حاصل کر ہی لیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بعد بھی وہ سکون سے نہیں بیٹھے ہیں۔ اب اقوامِ عالم پر برتری حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ دوسروں کو کمزور اور خود کو طاقت ور بنانے کے لیے سارے حربے، سارے وسائل استعمال کر رہے ہیں اور اگر ہمارا یہی حال رہا، آنکھیں کھول کر اپنے اطراف ہونے والے تماشوں کو سمجھنے کے بجائے یوں ہی بندر بانٹ میں مصروف رہے ہم تو، ایک روز وہ اپنے اس مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے۔ جس قوم کو اپنی حالت بدلنے کا خود ہی خیال نہ ہو، خدا اس کی حالت کبھی نہیں بدلتا۔"

"بڑی دانشوروں جیسی باتیں کرنے لگا ہے جیلانی! تیرا تو یار حلیہ ہی بدل گیا ہے بالکل۔ کیا بن گیا ہے تُو؟"

"میری آنکھیں کھل گئی ہیں آبی! نیند ٹوٹ گئی ہے میری۔ اور جب آدمی آنکھیں کھول کر دیکھنے اور ماحول کو سمجھنے لگتا ہے تو خود بخود دانش بھی آ جاتی ہے اس میں، اور لوگ دانشور کہنے لگتے ہیں اُسے۔"

اسی لمحے ہماری کار اس سڑک کے موڑ پر جا پہنچی جو نہر کی طرف جاتی تھی۔ آبی نے کار کو اس سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا "لے بھائی! آ گئے ہم اب منزل کے قریب، بس یہی کوئی آدھا پونا گھنٹا اور لگے گا ہمیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بجنے میں چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے لیکن صبح ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ میں نے آبی سے کہا "یار! ابھی تو دن کا اُجالا پھیلنے میں بہت دیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں رات کے اس پہر میں لاکھو لاشاری کی حویلی کا بُوہا کھڑکانا کچھ مناسب نہیں ہو گا۔ دن کی روشنی میں ہی پہنچنا چاہیے ہمیں وہاں۔"

"ایسا کیوں سوچ رہا ہے تُو۔ کیا تیرا خیال ہے کہ وہ لوگ

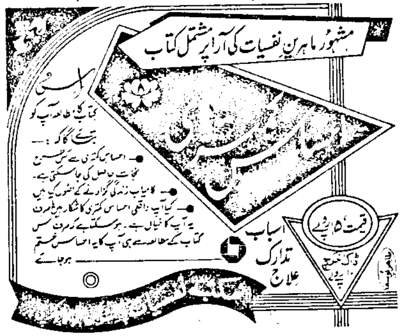

رات کے اس پہر میں دروازہ نہیں کھولیں گے ہمارے لیے۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کر یار! ہمیں ابھی وہاں کے حالات کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ اس حیدر سے یہی تو معلوم ہوا ہے نا کہ آسیہ سکھر گئی ہے لاکھو لاشاری کی طرف، لیکن یہ تو پتا نہیں ہے ابھی کہ وہ وہاں پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ ابھی نہیں پہنچی ہو گی تو ہم خواہ مخواہ ہی جا بھڑیں گے ان سے۔ اور ایک ناکردہ گناہ کی سزا دے ڈالیں گے ان کو اور اگر اس نے وہاں پہنچ کر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے تو وہ پہلے ہی سے تیار ہوں گے اور ہمارے پہنچتے ہی سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چھاپ لیں گے ہمیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ راستے میں کہیں رُک کر پہلے ہمیں لاکھو کی حویلی کے حالات معلوم کرنا چاہئیں۔ پوری آگاہی کے بغیر قدم نہیں دھرنا چاہیے اس حویلی کے اندر۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک سوچا ہے جیلانی! پوری طرح معلومات حاصل کیے بغیر نہیں گھسنا چاہیے ہمیں وہاں" شرافت علی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "اندھیرے میں کہیں ہم مارے ہی نہ جائیں وہاں جا کر۔"

"پھر ایسا کر یار آبی! راستے میں ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے چلتے ہیں۔ کہیں کوئی سرائے یا مسافر خانہ قسم کی کوئی جگہ نظر آئے تو اُدھر ہی لے چلنا گاڑی کو۔ رات کا بقیہ حصّہ تو وہیں گزار لیں گے ہم۔" میں نے آبی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے یاد پڑتا ہے پچھلی بار جب ہم ادھر آئے تھے تو میں نے اس سڑک کے ساتھ ہی ایک ایسی جگہ دیکھی تھی جہاں مسافروں کے آرام اور دیگر چھوٹی موٹی ضروریات کا کچھ انتظام کر رکھا تھا کسی نے۔ اگر اب بھی قائم ہے وہ تو وہیں رُک جاتے ہیں ہم۔ ذرا غور سے دیکھتے ہوئے چلنا، رات کے اندھیرے میں مشکل ہی سے نظر آئے گی وہ جگہ۔"

"ٹھیک ہے ہم دیکھتے چلتے ہیں، تو گاڑی کی رفتار دھیمی کر دے۔ بس آرام آرام سے ٹہلنے کے انداز میں چلتا رہ۔"

آبی نے کار کی رفتار بہت کم کر دی، اور اسے رینگنے کے انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔ شرافت علی نے کہا "دیکھ بھائی! مروا نہ دینا کہیں۔ جہاں بھی رُکو، یہ اطمینان کر لینا پہلے کہ وہ کوئی ایسی ویسی جگہ نہ ہو۔ یہ علاقہ بہت ہی مخدوش معلوم ہو رہا ہے مجھے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بس آرام ہی کرتے رہ جائیں قیامت تک کے لیے۔"

"کیسی بزدلی کی باتیں کر رہا ہے بھائی تو۔ اگر اتنی ہی جان عزیز تھی اپنی تو ہمارے ساتھ گھر سے کیوں نکل آیا بچے؟ سمجھے تو نہیں کچھ، ہم تو یوں ہی زندگی سے عاجز آئے ہوئے لوگ، چاہتے یہ ہیں کہ کسی نیک مقصد میں استعمال ہو جائیں! عاقبت سنور جائے ہماری اور جنت میں کوئی جھونپڑی ڈالنے کی جگہ ہی الاٹ ہو جائے ہمیں۔" آبی نے کہا۔

"اوئے چپ ہو جا یار! لگام دے اپنی زبان کو۔ الٹی سیدھی بکواس ہر وقت اچھی نہیں لگتی ہے۔ کبھی آدمی کو سنجیدگی بھی اختیار کر لینا چاہیے۔" پھر میں نے شرافت علی کو سمجھاتے ہوئے کہا "خطرے والی کوئی بات نہیں ہے بھائی یہاں۔ تم شاید جانتے نہیں ہو سندھ کے لوگوں کو اچھی طرح سے۔ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں یہ، خصوصاً وہ لوگ جو سندھ کے دیہاتوں میں رہتے ہیں وہ مسافروں کا بلا تخصیص بے حد خیال رکھتے ہیں۔ اس علاقے میں جس کے گھر چاہو بے فکر ہو کر لمبی تان کے سو جاؤ۔ تمہارے آرام کا پورا پورا خیال رکھے گا وہ اور کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا تمہیں۔ اگر خطرے والی بات ہوئی بھی کوئی تو رات بھر جاگ کر پہرہ دے لے گا مگر تمہارے آرام میں خلل نہیں آنے دے گا۔ اگر کسی ڈاکو کے گھر میں بھی تم جا ٹھہرو تو وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔"

"یہ مطلب نہیں تھا یار! میرا۔ ان کی شرافت اور مہمان نوازی سے تو میں بھی واقف ہوں اچھی طرح سے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر ہم کسی ایسی جگہ جا ٹھہریں جہاں اور بھی مسافر ہوں تو اس صورت میں ہمیں ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہو گی۔ ان دوسرے مسافروں میں کچھ غلط قسم کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ بات ٹھیک ہے تمہاری۔ اس کا تو یقیناً خیال رکھنا ہو گا ہمیں، لیکن پہلے کوئی جگہ تو مل جائے۔ یہ تو اس جگہ پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہو گا کہ کن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ہمارا۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

عین اسی لمحے آبی کی آواز سنائی دی "وہ دیکھ جیلانی! وہ سامنے سڑک کے بائیں جانب ذرا فاصلے پر کچھ دیے ٹمٹما دکھائی دے رہے ہیں نا۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو یہ وہی جگہ ہے، جس کا میں ذکر کر رہا تھا۔"

اس کے بتانے پر میں نے اور شرافت علی نے ایک ساتھ اس طرف دیکھا جدھر آبی نے اشارہ کر کے دیکھنے کو کہا تھا۔ جس سڑک پر آگے بڑھ رہے تھے، اس سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف تین چراغ سے جلتے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کے بعد کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ جیسے جیسے چراغوں کی روشنی تیزی سے ہمارے قریب آتی جا رہی تھی، کوئی دو منٹ بعد ہی ہم اس جگہ کے بالکل سامنے جا پہنچے۔ عام شاہراہ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک میدان میں چھپر پڑا تھا۔ جس کے نیچے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین روشن لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جن کی مدھم روشنی میں چھپر کے نیچے بہت سی چارپائیاں بچھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک جانب ایک اونچی سی جگہ پر کچھ برتن اور چائے بنانے کی ایک بڑی سی سلور کی کیتلی دھری تھی۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ وہ سارا انتظام وہاں کسی نے ادھر سے گزرنے والے مسافروں کی سہولت کے لیے ہی کر رکھا ہے۔ سڑک سے چھپر کے اس سائبان تک ایک صاف ستھرا میدان تھا۔ آبی نے کار اس میدان میں اتاری تو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں وہ سائبان اور اس میں موجود ہر چیز واضح ہو کر صاف نظر آنے لگی۔ وہاں موجود ساری ہی چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ اس چھوٹے سے چبوترے کے ساتھ جس پر چائے کی کیتلی اور کچھ پتیلے وغیرہ دھرے تھے ایک جھلنگا سی چارپائی پر کوئی گٹھری نما پڑا تھا۔ آبی نے کار کو سائبان کے ساتھ روک کر ہارن بجایا تو اس گٹھری میں حرکت ہوئی اور بے خبر سویا ہوا وہ شخص اپنے اوپر سے چادر پھینک کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہماری کار کو دیکھتا رہا۔ شاید گہری نیند سے اچانک بیدار ہونے اور کار کی تیز روشنی کے باعث اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اسی لیے وہ ایک ہاتھ کی اوٹ کر کے چندھیا دینے والی تیز روشنی سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اور شرافت علی بھی اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کار سے باہر نکل آئے۔ آبی نے کار کا انجن اور وہ خیرہ کن روشنی بند کر دی۔ میں نے سائبان کی طرف سے آنے والے شخص کو مخاطب کر کے کہا "السلام علیکم سائیں! مسافر لوگ ہیں ہم، ادھر تھوڑی دیر سستانے کو جگہ مل جائے گی یہیں؟"

وہ خوش دلی کے ساتھ میرے سلام کا جواب دے کر بولا "ضرور ضرور ادا سائیں! آپ لوگوں کی خدمت کے واسطے ہی ادھر ڈیرہ ڈال رکھا ہے ہم نے۔ شوق سے آرام کرو ادھر، اور کوئی خدمت ودمت ہو تو وہ بھی بولو ہم کو؟"

آواز سے اپنی وہ کوئی بڑا ہی چاق و چوبند جوان معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ اٹھا تھا تو کار کی روشنی اس پر پوری طرح پڑ رہی تھی مگر اس گھڑی میں نے اس کی طرف کچھ دھیان نہیں دیا تھا۔ اسی لمحے پیچھے سے آ کر آبی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "اوئے ہاشم خان! پہچانا نہیں تو نے اسے؟ یہ تو اپنا یار سجل ہے۔ وہی جس نے پہلی بار ہمیں لاکھو تک پہنچایا تھا۔"

آبی کی بات سن کر سجل تیزی سے آگے بڑھا اور گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام کر بولا "سائیں ہاشم خان! ارے آپ ہیں یہ اور آپ کے ساتھ یہ پیرزادہ سائیں ہیں۔ کمال ہے انھوں نے پہچان لیا مجھے مگر آپ نہیں پہچان سکے۔"

میں نے کھینچ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا "پہچانتا کیسے یار جی! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا یار سجل یہاں اس ویرانے میں آ بیٹھا ہو گا۔ بڑی خوشی ہو رہی ہے بھائی جی! تجھے یوں اپنے سامنے پا کر۔"

"خوش تو میں بھی بہت ہو رہا ہوں۔ بڑی خواہش تھی میری آپ لوگوں سے دوبارہ ملنے کی۔ قلندر کی دُعا سے آج میری خواہش پوری ہو ہی گئی۔ قلندر نے آج آپ کو پھر اس راستے پر ڈال دیا جو میری طرف آتا تھا۔"

"ایسی کیا خاص خوبی ہے بھائی ہم میں کہ تو ہم سے دوبارہ ملنے کی دعائیں کرنے لگا تھا؟" آبی نے ہنس کر کہا۔

"شیر مرد ہیں سائیں آپ لوگ، اور سجل ایسے لوگوں کی بڑی قدر کرتا ہے۔ بھلا نہیں سکتا میں کبھی آپ دونوں کو۔" وہ بڑی محبت سے بولا۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر سائبان کے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ادھر آئیں سائیں! آرام سے بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ بھوک لگی ہو گی آپ لوگوں کو۔"

"نہیں سجل سائیں! کھانے وانے کی ضرورت بالکل نہیں ہے اس وقت۔ رات کا کھانا ہم کھا کے چلے تھے۔ البتہ ٹھنڈا پانی اور ایک ایک کپ چائے ہو سکے تو پلا دو۔ اس کے سوا کوئی چیز نہیں چاہیے ہمیں۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"جو حکم سائیں! چائے تو ابھی دو منٹ میں تیار کر دیتا ہوں میں۔ خالص دودھ پتی کی چائے پلاؤں گا آپ کو۔"

وہ اٹھ کر اس طرف چلا گیا جہاں میں نے برتن وغیرہ رکھے دیکھے تھے ہم تینوں چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ شرافت علی بولا "حیرت ہے یار جیلانی! یہاں اس ویرانے میں بھی تمہارا جاننے والا نکل آیا۔ زمین کا کوئی کونا محفوظ بھی رہا ہے تمہارے قدموں سے؟"

"بس یار! ایسے ہی بخت کے مارے ہوئے لوگ ہیں ہم۔ ہماری یہ خم پارہ تقدیر نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی ہے ہمیں، البتہ جہاں جاتے ہیں تجھ جیسے ہی ایک دو مہربان ضرور مل جاتے ہیں ہمیں ایسے ہی لوگ ہماری زندگی کی گاڑی کو آگے دھکا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ گاڑی اب تک رواں دواں نظر آ رہی ہے تجھے۔"

"یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں بھائی! ورنہ جب تک کی زندگی لکھوا کر لایا ہے آدمی اس دنیا میں، اس وقت تک تو اسے رہنا ہی ہے یہاں۔ یہ آدمی کے اختیار میں کہاں ہے کہ وہ کسی کی

زندگی چھین لے یا حیات بخش دے کسی کو۔" شرافت علی بولا۔

آپی بولا" جیلانی! تجھے حیرت نہیں ہوئی اس بات پر کہ یہ سجل اپنے گاؤں، اپنے گھر سے میلوں دور یہاں کیوں آبیٹھا ہے آخر؟ یہ علاقہ تو اس کے دشمنوں سے پٹا پڑا ہے۔ میرن شاہ، کامدار نظامانی اور لاکھو لاشاری، تینوں ہی کو دشمن بنا رکھا تھا اس نے اور اب یہ ان دشمنوں کے بالکل درمیان آبیٹھا ہے۔ کہیں دوستی تو نہیں کر لی اس نے ان لوگوں سے؟"

"یہ تو نے بہت اچھی بات کہی ہے آپی! چائے لے کر آئے گا تو پوچھیں گے اس سے ایسا کیوں ہوا ہے۔ اگر یہ ان کے ساتھ دوستی کر کے ان میں شامل ہو گیا ہے تو ہمیں اس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔" میں نے آپی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان تو حاصل ہونا ہی چاہیے ہمیں۔" شرافت علی نے بھی تائید کی۔

میں نے سجل کو آواز دے کر کہا" کیا تو اس سائبان میں اکیلا پڑا رہتا ہے جوان؟ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیوں سائیں! کیا خرابی والی بات نظر آئی ہے آپ کو میرے یہاں اکیلے رہنے میں؟" سجل کیتلی کے نیچے آگ جلاتے ہوئے بولا۔

"خرابی نہیں ہے کوئی تیرے نزدیک اس میں؟ اپنے گھر بار سے الگ ہو کر یہاں آپڑنے میں کوئی خطرے والی بات نہیں تیرے لیے؟"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا سائیں کہ میں اپنے گھر بار سے الگ ہو کر آپڑا ہوں یہاں؟ میرا اصلی گھر تو یہی ہے ہاشم خان سائیں!"

"تیری بات سمجھ میں نہیں آئی یار جی! تو ہمیں اپنے جس گھر میں لے گیا تھا پہلی بار کیا وہ تیرا گھر نہیں تھا۔ تیری بیوی بھی تو تھی وہاں؟"

"اچھا، اچھا۔ یہ بات ہے۔ ٹھہریں میں چائے بنا لاؤں، پھر آپ کو بتاؤں گا ساری بات۔ وہ گھر تو میرا اپنا نہیں تھا سائیں! میری عورت کے باپ کا گھر تھا وہ، اور ہم وہاں اسی طرح جا ٹھہرے تھے جیسے ادھر سے گزرنے والے مسافر دم لینے کو آ ٹھہرتے ہیں ہمارے اس چھپر کے نیچے۔ ان کے یہاں دو گھڑی آرام کر لینے سے یہ ملکیت تو نہیں بن جاتا ان کی۔ اصل مالک تو ہم ہی رہتے ہیں نا پھر بھی؟"

"ہاں یہ تو ہے بھائی! اب ہمیں کیا معلوم کہ وہ مکان تیرا اپنا نہیں تھا۔ ہمیں تو نے اس روز کچھ بتایا بھی تو نہیں تھا۔"

"موقع ہی کہاں ملا تھا جی اس کا۔ آپ لوگ بھی جلدی میں تھے اس دن اور میں بھی اُلجھا ہوا تھا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے سائیں!"

چائے کی کیتلی کے نیچے پوری طرح آگ جلانے [...]

بعد وہ تین گلاس اور ربانی کی ایک چھوٹی سی مٹکی لے کر ہمارے [...]

پاس آگیا۔ اس نے مٹکی سے گلاسوں میں پانی ڈال ڈال کر [...]

باری ہم تینوں کو دیا۔ ہم تینوں ہی لمبے سفر کے مارے اور [...]

بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ اس گھڑی وہ ٹھنڈا پانی [...]

مزہ دے رہا تھا۔ ہم نے دو دو گلاس پانی پی کر وہیں بیٹھے [...]

اس پانی کو چلوؤں میں لے کر منہ اور آنکھوں پر چھپکے مارے تو [...]

جلتی ہوئی آنکھیں سکون پا گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سجل [...]

گرم گرم بھاپ دیتی خوشبودار چائے سے لبالب بھری [...]

لا کر ہمارے سامنے دھر دیں اور ایک پیالی خود اپنے [...]

پکڑ کر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

میں نے اپنے سامنے دھری پیالی اٹھاتے ہوئے [...]

"ہاں بھائی! اب بتا کیا کہہ رہا تھا تو۔ ادھر پیتر پور میں [...] تھا تیرا؟"

"نہیں جی! وہ میرے سسر کا مکان ہے، اس کی [...] ہیں وہاں۔ رہتا وہ شکار پور میں ہے مگر زمینوں کی دیکھ بھال [...] کے لیے پیتر پور آتا ہے تو اسی مکان میں رہتا ہے۔ اور یہ [...] ہم بیٹھے ہیں، یہ ساری زمینیں بگاڑی نہر تک ہماری ملکیت [...] میں جب بہت چھوٹا تھا تب کسی ضرورت کے تحت میرے [...] باپ نے میرن شاہ سے کچھ قرض لیا تھا جسے وہ وعدے [...] مطابق ادا نہیں کر سکا تو میرن شاہ کے اس بدمعاش کارندے [...] کامدار نظامانی نے ان زمینوں پر قبضہ کر کے ہمیں بے دخل [...] تھا یہاں سے۔ جب تم مجھے ملے تھے یہ اس سے چند ماہ [...] کی بات ہے۔ میرے چچا نے اپنے بھائی کا ساتھ دیا [...] نے اس کے گھر ڈاکا ڈلوا دیا۔ اس غریب آدمی کو... [...] سے بچانے کے لیے ہم نے کامدار کو پندرہ ہزار روپے [...] ادا کر کے چچا کا مال واپس لیا تھا اس سے۔ میں نے جب [...] کہ گھی سیدھی انگلی سے نکلنا بہت مشکل ہے تو میں نے [...] راستہ اپنا لیا، جس پر چل کر کامدار نظامانی اور لاکھو لا[...] اس پورے علاقے کے مالک بن بیٹھے تھے۔ لاکھو سے [...] ایسی کوئی رنجش نہیں تھی۔ میں نے اسے چھیڑنا نامناسب [...] البتہ کامدار نظامانی کو میں نے کئی بار لوٹا اور ایک روز مو[...] اس کا کام تمام کر دیا۔ کامدار نظامانی کی موت نے میر[...] کا بھی زور توڑ دیا۔ اب اس میں وہ پہلے جیسا دم نہیں [...] اس وقت میں نے اس سے یہ مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنا [...] واپس لے کر میرے باپ کی زمینیں میرے حوالے کر د[...] میرن شاہ خود تو کچھ نہیں کر سکا، اس نے لاکھو لاشاری [...]

خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر لاکھو نے اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے تو اپنی پچھلی زندگی کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیا تھا۔ سارے بُرے کاموں سے توبہ کر لی تھی اس نے۔ پھر وہ میرن شاہ کے کہنے سے دوبارہ کیسے یہ زندگی اپنا لیتا۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد آخر میرن شاہ کے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی رقم لے کر یہ زمینیں واپس کر دیں ہمیں۔ اب میں اور میرا بھائی دوبارہ اپنے گھر میں آباد ہو گئے ہیں۔ یہ چھپر کا سائبان جسے آپ سرائے، ہوٹل، یا مسافر خانہ جو بھی کہیں، ہمارے باپ نے ہی قائم کیا تھا یہاں۔ اب میں دیکھتا ہوں اسے۔"

"مگر لاکھو لاشاری نے میرن شاہ کا ساتھ دینے سے انکار کیوں کر دیا تھا؟ میرن شاہ ہی کی وجہ سے تو وہ بیٹھا ہے اپنی حویلی میں، وہ اگر نہیں پناہ دیتا لاکھو کو تو کب کا پھانسی چڑھ گیا ہوتا وہ، یا کسی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوتا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سائیں، بتایا تو ہے میں نے آپ کو، اس نے توبہ کر لی تھی، بدمعاشی اور خون خرابے کی زندگی سے۔" سجل نے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی جی! مگر اس کی بھی کوئی وجہ تو ہوگی نا۔ یوں ہی تو بیٹھے بیٹھے خدا کا خوف نہیں کھا گیا ہوگا وہ؟"

"ہاں سائیں! یہ ٹھیک کہا آپ نے۔ وجہ تو ضرور ہے اس کی مگر اس میں کتنی سچائی ہے، یہ معلوم نہیں ہے مجھے۔" اس نے کہا۔" اس کے ایک آدمی نے ہی بتایا تھا مجھے۔ اُدھر پنجاب کے کسی شہر میں کوئی شب خیر نامی طوائف ہوتی تھی، پتا نہیں اب بھی ہے یا نہیں، اس سے ایک بچہ خریدا ہے لاکھو لاشاری نے پچاس ہزار روپے کے عوض۔ جب سے وہ بچہ اس کی حویلی میں آیا ہے، لاکھو نے بچے کی حفاظت کے علاوہ کسی اور معاملے میں ہتھیار نہیں اٹھائے ہیں۔ وہ کہتا ہے اس بچے پر وہ بدمعاش یا لٹیرے کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔ اسے بالکل صاف اور سیدھی راہ پر چلائے گا وہ۔ کسی ڈاکو کا نام نہیں لگنے دے گا اس کے نام کے ساتھ۔"

"تو اس بچے کے لیے ہتھیار اٹھائے تھے اس نے۔ مگر اس بچے سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بار کچھ آدمی آئے تھے اس بچے کو اٹھانے کے لیے۔ سنا ہے پنجاب ہی کے کسی علاقے کی ایک جاگیردارنی نے بھیجا تھا انھیں۔"

"اچھا، حیرت ہے یار! کسی جاگیردارنی کو کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس بچے سے۔ نام کیا ہے اس جاگیردارنی کا؟"

"اس کے جن آدمیوں کو پکڑا تھا لاکھو لاشاری نے، وہ بہو جی کہتے تھے اسے۔ نام تو انھیں بھی معلوم نہیں تھا اس کا۔ میں خود حیران ہوں سائیں اس بات پر، آخر ایک جاگیردارنی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کسی طوائف کے بچے سے جو اس نے اتنی دور اپنے آدمی دوڑا دیے اس کے پیچھے؟ اور خواہ مخواہ ان غریبوں کو ہاتھ دھونا پڑے اپنی جانوں سے۔"

"اچھا تو لاکھو لاشاری نے ان آدمیوں کو مار دیا تھا؟ یہ تو اچھا نہیں کیا اس نے۔ تمھارا کیا خیال ہے سجل سائیں؟"

"اس نے کیا اچھا کیا اور کیا بُرا، اس بات سے مجھے کیا مطلب ہے سائیں ہاشم خان! بس اس نے اپنے لیے جو ٹھیک سمجھا وہی کر دیا۔ ایک بات البتہ میں جانتا ہوں، اس واقعے کے بعد پھر کوئی آدمی اس بچے کے لیے آیا نہیں ادھر۔"

"چلو چھوڑو مٹی ڈالو یار! اس قصے پر۔ ہمیں کیا لینا اس سے۔ مگر سجل بھائی! یہ میرن شاہ کا کتنا قرضہ تھا تمھارے باپ پر جس کے بدلے میں اس نے اتنی ساری زمین ہتھیا لی تھی تم لوگوں کی؟"

"ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا سائیں! جو میرے باپ نے تھوڑا تھوڑا کر کے لیا تھا اس سے اپنی ضرورت کے وقت۔"

"ڈیڑھ لاکھ روپیہ، اور وہ سارا کا سارا اسے لوٹا دیا ہے تم نے؟ اتنا روپیہ تھا تمھارے پاس؟"

وہ ہنس دیا۔ بولا" اپنے پاس اتنا روپیہ ہوتا سائیں تو یہ زمینیں جاتی ہی کیوں۔"

"پھر، اتنی ساری رقم کا بندوبست کہاں سے کیا تھا تم نے؟ کیا کسی اور سے قرض لیا تھا؟" مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا اور یہ سوال میں نے اس سے اس لیے کیا تھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرن شاہ کے بعد اب وہ شخص جس سے اس نے قرض لیا، ان کی زمینوں پر قابض ہو کر دوبارہ انھیں بے گھر کر دے۔ میرا خیال تھا، میں اسے ڈیڑھ لاکھ روپے دے کر یہ قرضہ ہمیشہ کے لیے اتار دوں گا اس کے سر سے تاکہ وہ پھر کسی اور وڈیرے کے ہاتھوں رسوا نہ ہو سکے۔

سجل نے کہا" بس جی ہو ہی گیا تھا اس کا انتظام بھی۔ قرض نہیں لینا پڑا تھا مجھے کسی سے۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی سجل! صاف صاف بتاؤ مجھے۔ تمھارے پاس روپیہ تھا نہیں اور قرض بھی نہیں لیا تھا تم نے کسی سے، پھر اتنا سارا روپیہ کیسے ادا کر دیا تم نے اس میرن شاہ کو؟"

"چھوڑیں سائیں! آپ بھی کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ ہماری زمین ہمیں مل گئی بس یہی بہت ہے ہمارے لیے۔"

"دیکھو سجل! غلط مت سمجھو مجھے۔ ہم بھی کوئی صراطِ مستقیم پر چلنے والے لوگ نہیں ہیں۔ مگر تم جیسے آدمیوں کے لیے بڑی جگہ ہے ہمارے دل میں۔ تم سے ہمدردی ہوگئی ہے مجھے، اسی لیے میں یہ نہیں چاہتا کہ ایک کا قرض ادا کر کے تم دوسرے کے جال میں جا پھنسو۔ صاف صاف بتا دو ساری بات، میں کام آنا چاہتا ہوں تمھارے۔ اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتا ہوں تمھیں۔"

"آپ بہت اچھے آدمی ہیں سائیں ہاشم خان! فخر کرنا چاہیے مجھے آپ جیسے آدمی کی دوستی پر۔ آپ پریشان نہ ہوں میرے لیے۔ میں نے بتایا تھا ناکہ اس کامدار نظامانی کو لوٹتا رہا تھا میں۔ اسی سے حاصل کیا تھا میں نے وہ روپیہ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اسی کا مال اس کے حوالے کر کے اپنی زمینیں واپس لے لی ہیں میں نے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ جھنگ مِرچی ہیں یہ مجھے۔ یہ لوگ بھی ڈاکے مار مار کے بھتّے وصول کرتے رہے ہیں۔ میں نے بھی انھی کا حربہ استعمال کرلیا ان پر۔"

"واہ بیٹھے! واہ، جی خوش کردیا یار اس گھڑی تو تو نے۔ اس کا مطلب ہے اب جینے کا ڈھنگ آگیا ہے تجھے...." آبی بولا۔

"نہیں پیرزادہ سائیں! ایسا نہ کہیں جناب! دوسروں سے زندہ رہنے کا حق چھین کر زندہ رہنا کوئی زندگی تو نہیں ہے۔ وہ ان رذیلوں نے ہمیں بہت ہی مجبور کردیا تھا اور وقتی طور پر ہم بھی جذباتی ہوگئے تھے۔ یہ اپنی زمین حاصل کرنے کے سوا اس کامدار نظامانی کے مال سے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا ہے میں نے۔ جتنا روپیہ اور دوسرا سامان لوٹا تھا میں نے اس کا وہ ان لوگوں میں تقسیم کردیا جنھیں وہ لوٹتا رہا تھا۔ اصل حق دار تو وہی تھے نا سائیں اس مال کے۔ پھر میں کیوں اسے اپنے پاس رکھ لیتا؟"

"یہ تو تم نے بہت ہی اچھا کیا ہے بھائی! میں سلام کرتا ہوں تمھارے اس جذبے کو۔" شرافت علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اچھا سائیں! اب آپ لوگ آرام کریں۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہی ہے اب۔ کچھ دیر نیند لے لیں تو تازہ دم ہوکر دوبارہ سفر شروع کرسکیں گے۔ رات بھر کی جگار تو نڈھال کرکے رکھ دیتی ہے آدمی کو، رات کی ایک گھنٹے کی نیند بھی بہت ہوتی ہے۔"

"ہاں یار! ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ اسی لیے چلے آئے تھے ادھر۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

سجل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بستر ٹھیک کردیتا ہوں آپ تینوں کے لیے۔ آرام سے سوئیں، اپنا ہی گھر سمجھیں اسے بھی۔"

اس نے جلدی جلدی تین چارپائیوں پر بستر لگا دیے۔ ہم جوتے کھول کر ان بستروں میں جا گھسے۔ نیند تو جیسے تاک لگائے بیٹھی تھی۔ لیٹتے ہی اس نے ہمیں آکر دبوچ لیا تھا۔

بہت سے لوگوں کے ایک ساتھ بولنے کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی مگر میں چپ چاپ دم سادھے لیٹا رہا۔ اٹھنے سے پہلے میں یہ اندازہ کرلینا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو وہاں بیٹھے اتنی زور زور سے باتیں کررہے ہیں۔ ایک ذرا بھاری سی آواز سنائی دی، کوئی سندھی زبان میں سجل سے کہہ رہا تھا "تم نے پوچھا نہیں ان لوگوں سے، کون لوگ ہیں یہ، کہاں سے آئے ہیں اور کدھر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"یہ کہتے تھے کراچی سے چلے ہیں اور لاہور جانا ہے انھیں۔ رات زیادہ ہوگئی تو آرام کے خیال سے ادھر چلے آئے ہیں۔"

"ہاں لگتے تو کراچی کے ہی ہیں۔ ان کی کار پر نمبر پلیٹ بھی کراچی ہی کی ہے۔ پھر بھی تم جگاؤ ان کو، میں بات کروں گا ان سے۔"

"نہیں تھانیدار سائیں! ایسا نہیں ہوسکتا ابھی۔ کسی کو نیند سے جگانا سجل کبھی پسند نہیں کرتا۔ آپ کو کچھ پوچھنا ہے ان سے تو بیٹھ کر انتظار کریں، جب اٹھ جائیں تو پوچھ لینا جو دل چاہے۔ ویسے مسافروں کے آرام کا تو آپ کو بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

"اچھا، تمھیں یقین ہے کہ یہ تین ہی آدمی آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی اور تو نہیں تھا؟"

"نہیں جی! ادھر تو یہ تین ہی آئے تھے۔ اور جب سے سوئے ہیں کوئی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں اٹھا ہے۔ ایسے ہی بے خبر سو رہے ہیں۔ میں تو ان کے سونے کے بعد بھی جاگتا ہی رہا ہوں۔ ذرا آنکھ بند نہیں کی ہے۔ ان کی کار کی نگرانی کرتا رہا ہوں۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے لاکھو لاشاری کے ہاں ہونے والی واردات سے۔ پھر بھی تم ذرا خیال رکھنا اس بات کا۔ اگر کوئی اور ساتھی ان کا آجائے ادھر تو کسی بہانے سے اس کو ادھر ہی روک کے ہمیں خبر کردینا۔"

"آپ بالکل بےفکر رہیں سائیں! ایسی کوئی بات ہوئی تو میں انھیں باندھ کر لے آؤں گا آپ کے پاس۔" سجل کی آواز ابھری۔

"ہاں، مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اجنبی عورت نظر آئے تمھیں۔ اس علاقے میں تو اسے جانے نہ دینا۔ اس کی ضرور خبر دینا ہمیں۔ وہ سیف علی کہتا تھا، وہ گھوڑے پر نکلی ہے حویلی سے۔ سیاہ مشکی گھوڑا ہے جو لاکھو کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے اس علاقے میں۔ دیکھا ہوگا تم نے بھی اسے۔ بہت مشہور گھوڑا ہے وہ تو۔"

"ہاں سائیں! ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ لاکھو سائیں کے مشکی کو کون نہیں پہچانتا ہے۔ اچھا ہوا یہ آپ نے بتا دیا مجھے۔"

ان کی آوازیں دور ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ بالکل معدوم ہوگئیں۔ چند لمحے بعد کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر اس کی آواز بھی دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر آبی آنکھیں کھولے لیٹا مجھے ہی تک رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی چارپائی پر شرافت علی لیٹا تھا مگر اس کی پشت میری طرف ہونے کی وجہ سے میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ بھی جاگ گیا ہے یا نہیں۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر آبی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آنکھوں ہی کے ذریعے اسے سمجھایا کہ ابھی لیٹا رہے۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کے چلے جانے کا اطمینان ہونے کے بعد سجل خود آکر ہمیں اٹھائے گا تاکہ حالات سے باخبر کرسکے وہ ہم لوگوں کو۔ میرا خیال غلط نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سجل نے ہمارے قریب آکر کہا "چلے گئے ہیں وہ سائیں! اب اٹھ جائیں آپ لوگ۔ مجھے پتا ہے سو نہیں رہے ہیں آپ۔"

"اوئے یار! تو تو بڑا پیر فقیر قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے مجھے۔ بند آنکھوں کے پیچھے بھی دیکھ لیتا ہے تو۔" آبی اٹھتے ہوئے بولا۔

سجل آبی کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا قصہ ہے سجل! کس عورت کی بات کر رہے تھے یہ لوگ؟ اور کون سی واردات ہوگئی ہے لاکھو لاشاری کی حویلی میں؟"

"وہ سائیں! رات کو میں نے بتایا تھا نا آپ کو کہ لاکھو لاشاری نے کسی شب خیر نامی طوائف سے ایک بچہ لیا ہے پچاس ہزار روپے میں۔ اور اس بچے کو پنجاب کے کسی علاقے کی کوئی جاگیردارنی بھی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے آدمی بھی بھیجے تھے لاکھو لاشاری کے پاس جنھیں اس نے قتل کر کے نگاڑی نہر میں بہا دیا تھا۔ وہی قصہ پھر کھڑا ہوگیا ہے شاید، رات کو کسی عورت نے گولی چلا دی تھی، لاکھو لاشاری پر۔ اس کا ایک بازو زخمی ہوگیا ہے۔"

"اچھا! حیرت ہے یار! اب عورتیں بھی ایسے کام کرنے لگی ہیں۔ مگر وہ عورت لاکھو کی حویلی میں داخل کیسے ہوگئی تھی؟ اسے روکا نہیں تھا کسی نے۔ لاکھو کے آدمی تو بڑی سخت دیکھ بھال کرتے ہیں، ہر دم ہتھیاروں سے لیس ہوکر نگہبانی کرتے ہیں اس کی۔"

"حویلی کے اندر نہیں ہوئی ہے یہ واردات۔ اُدھر غوث پور گیا ہوا تھا وہ لاکھو لاشاری۔ اور رات واپس آیا تھا، جیسے ہی مقتل کے قریب پہنچا وہ، ایک عورت نے اچانک سامنے آکر گولیاں چلانا شروع کردیں اس پر۔ دو آدمی اور تھے اس کے ساتھ۔ وہ دونوں اسی وقت ڈھیر ہوگئے تھے۔ لاکھو گولی کھا کر گھوڑے سے کود گیا اور بھاگ کر ایک کھیت میں جا چھپا تھا۔ وہ عورت اسے کھیت میں تلاش کررہی تھی کہ گولیوں کی آواز سن کر گاؤں کے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ لوگوں کو آتے دیکھ کر عورت لاکھو کے مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر نکل گئی وہاں سے اور اب پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اسے۔"

"کمال ہے بھائی! بڑی حیرت کی بات ہے یہ تو۔ ایسی عورتیں بھی ہیں ادھر اپنے ملک میں!" آبی نے بھی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے شرافت علی سے کہا۔ "کیوں بھائی شرافت علی! یہ تو بالکل فلموں والا سین ہوگیا۔ میں نے اپنے یہاں فلموں میں ہی دیکھی ہیں ایسی جی دار لڑکیاں، اس کے علاوہ تو نہیں دیکھیں کہیں۔ تم نے دیکھی ہیں کبھی؟"

شرافت علی مسکرا کر بولا "ٹھیک کہتے ہو پیرزادہ سائیں! دیکھی تو میں نے بھی نہیں ہے ایسی کوئی عورت آج تک۔"

سجل نے کہا "آپ لوگ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہولیں سائیں! میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا لے کر آتا ہوں گھر سے۔"

"ہاں بھائی! جا تو ناشتا لے آ ہمارے لیے۔ جلدی ہی نکل جانا چاہتے ہیں ہم یہاں سے۔ خواہ مخواہ کسی سیاپے میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ اس تھانیدار کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں مشکوک سمجھ رہا ہے وہ۔ یہ کار دیکھ کر اس کی نیت میں فتور آگیا ہے شاید۔ خیال یہی ہے اس کا، اس کیس میں پھنسا کر وہ ہم سے کوئی لمبی رقم حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"میں نے بھی یہی اندازہ کیا ہے اس کی باتوں سے۔ اصل مجرم کے تو قریب بھی نہیں جاسکے گا وہ۔ البتہ اس کی آڑ میں آپ جیسے کسی شریف آدمی سے چاندی بنالے گا وہ۔ یہی کرتے ہیں جی یہاں یہ قانون کے رکھوالے۔" سجل نے کہا اور ناشتا لینے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آبی بولا "بھائی ذلیلانی! وہ تو ہم سے پہلے ہی پہنچ چکی ہے یہاں۔ اور کام بھی کر دیا تھا اس نے تو اپنا!"

"ہاں یار! اسی بات سے ڈر رہا تھا میں۔ مگر یہ اچھا نہیں ہوا یار جی! اس نے زخمی کر کے چھوڑ دیا ہے اس لاکھو کو۔ اب تو وہ بہت ہی خطرناک ہو جائے گا۔ اسکے بچے کو اپنے پاس رکھنے کے لیے سب کچھ کر گزرے گا۔ بچے کو کسی اور کے پاس نہیں جانے دے گا کبھی!"

"ہاں، جانتا ہوں میں، اور اس آسیہ کی تڑپ سے بھی ناواقف نہیں ہوں، دیوانی ہو رہی ہے وہ بچے کے لیے!"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی ہے یار جی! اب بچے کو تو اس قدر چاہتی ہے وہ اور اس کے باپ سے نفرت کرتی ہے اتنی ہی شدید۔ اس کی طبیعت کا یہ تضاد سمجھنے سے قاصر ہوں یار! پتا نہیں کیسی ضد ہے یہ اس کی!" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے میرے یار! یہ تضاد تو میری بھی سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا ہے اسے، اس ضد سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی ہے مگر وہ اپنی قسم توڑنے کو تیار نہیں ہوئی کسی طرح بھی۔ لاکھو لاشاری کو اپنے ہاتھ سے گولی مارنے کی قسم ہر حالت میں پوری کرنا چاہتی ہے وہ، اور بچے سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں ہے کسی طرح بھی!"

"پھر اب کیا کریں؟ اس نے تو الجھا کے رکھ دیا ہے یار! ہم اگر پہلے آگئے ہوتے تو کسی نہ کسی طرح نمٹانے کی کوشش کرتے اس معاملے کو مگر اب تو بات اور بھی بگڑ گئی ہے۔ ان حالات میں تو لاکھو لاشاری ہماری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا!"

"ایک صورت آئی ہے میرے ذہن میں!" شرافت علی بولا۔ "شاید اس طرح کوئی حل نکل آئے مسئلے کا!"

"کون سی صورت نظر آئی ہے تمہیں؟ بتاؤ یار! کچھ مدد کرو ہماری تم بھی!" آبی جلدی سے بولا۔

"یہ جو تمہارا یار سجل ہے، یہ مجھے آدمی بہت کھرا معلوم ہوتا ہے۔ کیا تم اسے اعتماد میں لینا پسند کرو گے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ آدمی تو وہ بے حد قابل اعتماد ہے۔ آنکھ بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا ہے اس پر۔ مگر تم کس معاملے میں اعتماد میں لینا چاہتے ہو اسے؟ ذرا صاف صاف بات کرو بھائی! پہیلیاں بجھوانے کا وقت نہیں ہے ہمارے پاس!"

"صاف ہی بات کی ہے یار! میں نے تو، اب تم نہ سمجھ سکو تو میرا کیا قصور ہے اس میں؟"

"کیوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت برباد کر رہا ہے میرے یار! چل مان لیا میں نے بہت کند ذہن آدمی ہوں میں۔ اب ذرا جلدی سے وضاحت بھی کر دے کہ کیا بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے تو مجھے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس سجل کو ساری بات بتا کر اس سے کہو کہ وہ خود جائے یا اپنے کسی آدمی کو لاکھو لاشاری کی حویلی میں بھیج کر وہاں کی صحیح صورت حال سے باخبر کرے ہمیں، پہلے تو صحیح طور پر لاکھو کے تاثرات معلوم ہونے چاہئیں، محض اندازوں پر ہی محل نت کھڑے کرتے رہو۔ اطلاع صرف یہی ہے کہ اس پر ایک عورت نے گولیاں چلائی تھیں، جس کے نتیجے میں اس کے دو آدمی مارے گئے ہیں اور وہ خود زخمی ہو گیا ہے۔ یہ بھی تو معلوم کر دیا رو کہ وہ عورت تمہاری بہن آسیہ تھی بھی یا نہیں؟"

"تیرا کیا خیال ہے میرے ویر! کیا وہ لاکھو لاشاری کی بہن ہو گی جس نے اس کی جان لینے کی کوشش کر ڈالی تھی؟ آسیہ کے سوا اور کون عورت اس کے خون کی پیاسی ہے؟ اور کس کے پیچھے آئے ہیں ہم یہاں؟" آبی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میری بات کا بُرا مت مانو آبی بھائی! کبھی کبھی ایسے عجیب غریب واقعات بھی ہو جاتے ہیں۔ لاکھو لاشاری جس قبیل کا آدمی ہے اسے ذہن میں رکھو۔ اس جیسے لوگوں کے دشمنوں سے تو زمین بھری ہوتی ہے۔ زندگی بھر دشمنیاں ہی کاشت کرتے اور انہی کی فصلیں کاٹتے ہیں ایسے لوگ۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ آسیہ کے سوا کوئی اور عورت اپنے سینے میں انتقام کی آگ بھرے نہیں پھرتی ہو گی؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے آبی! ہمیں اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ سجل کو بتا دینا چاہیے ساری بات، تاکہ وہ صحیح صورتِ حال معلوم کر کے بتا دے ہمیں۔ ورنہ ہمارے اس طرح دوڑے آنے کا تو مقصد ہی فوت ہو کر رہ گیا ہے بھائی جی!"

"ٹھیک ہے، اگر تیری بھی یہی رائے ہے تو بات کر لینا سجل سے۔ خدا کرے تم لوگوں کی بات ہی سچ ثابت ہو!" آبی بولا۔

اسی وقت سجل واپس آگیا۔ وہ ہمارے ناشتے کے لیے اصلی گھی کے تر تراتے پراٹھے اور انڈے لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا "لیں جی ناشتا کریں آپ حضرات جلدی سے۔ اتنے میں چائے بھی لے کر آرہا ہوں!"

میں نے کہا "آجائے گی چائے بھی یار! تم ذرا اِدھر ہمارے پاس بیٹھو، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں مجھے!"

"ضرور، ضرور سائیں! حکم کریں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے جھجک بتائیں مجھے؟" وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر بولا۔

"ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے سجل! مگر پہلے یہ بتاؤ تم کس حد تک جا سکتے ہو ہماری خاطر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"حد کی بات نہ کریں ہاشم خان سائیں! آپ تو بس حکم کریں اس خادم کو۔ جان دے کر بھی تعمیل کروں گا آپ کے حکم کی سجل تو یاروں کا یار ہے سائیں! اور یاری کی کوئی حد مقرر نہیں ہوئی ہے اب تک!"

"ہوں، یہ تو تم نے ٹھیک کہا ہے۔ وفا اور خلوص کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے، اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کسی طرح۔ مگر پھر بھی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں تم سے، اس کے بارے میں مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تم پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"جہاں تک آپ چاہیں بھروسا کر سکتے ہیں۔ یہ اطمینان رکھیں آپ کہ میری طرف سے مایوسی نہیں ہو گی آپ کو!"

"ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ لاکھو لاشاری سے بگاڑ مول لے سکتے ہو ہماری خاطر؟" میں براہِ راست بات کر کے چونکانا چاہتا تھا اُسے۔

وہ یوں مسکرا دیا جیسے میری بات اس کی توقع کے عین مطابق رہی ہو اور میں نے کوئی انوکھی اور چونکا دینے والی بات کہی ہی نہ ہو۔ وہ بولا۔ "کیا بات کرتے ہیں سائیں آپ، میری دوستی ہی کب ہے لاکھو لاشاری سے جو اس میں بگاڑ پیدا ہو گا کوئی؟"

"یہ مطلب نہیں ہے میرا، میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میں کوئی ایسا کام سپرد کر دوں تمہارے جس کی تکمیل کے دوران میں لاکھو لاشاری تمہارا دشمن بن جائے تو کیا تم وہ کام کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ گے؟"

"میں نے کہا نا سائیں ہاشم خان! ان بے کار خیالوں میں وقت نہ برباد کریں آپ۔ بس حکم کریں اپنے اس سجل یار کو، نتیجے کی پروا بالکل نہ کریں آپ۔ دشمنی کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ میں تو اس کا مدار نظامانی پر بھی بے خوف ہو کر جا پڑا تھا۔ اس کے سینے میں سوراخ کرتے ہوئے کچھ نہیں سوچا میں نے، تو لاکھو کے معاملے میں کیا سوچوں گا سائیں؟"

"یہی بات ہے سجل سائیں! اسی لیے تو میں نے تم سے مدد لینے کے بارے میں سوچا ہے۔ غلط تو نہیں سوچا نا میں نے؟"

"بالکل نہیں جناب! کوئی غلطی نہیں کی ہے آپ نے۔ ایسا تو خیال ہی نہ آنے دیں دل میں اپنے۔ یہ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا، پہلے ناشتا کر لیں آپ لوگ، پھر اطمینان سے کہیں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں!" اس نے ہماری توجہ ناشتے کی طرف دلائی۔

"ہاں ہاں، ناشتا بھی کرتے رہیں گے ساتھ ہی ساتھ۔ آئیں شرافت علی اور پیرزادہ! شروع کریں ناشتا!" میں نے چارپائی پر پلتھی مار کے بیٹھتے ہوئے آبی اور شرافت علی سے کہا۔

شرافت علی بولا "یارو! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ منہ ہاتھ تو دھو لو۔ باسی منہ ناشتے پر ٹوٹے پڑ رہے ہو!"

آبی بھی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "ہاں بھائی! آؤ ہم دونوں تو دھو ہی لیں اپنے اپنے منہ۔ یہ ہاشم خان تو شیر کہتا ہے اپنے آپ کو۔ اور کہنا اس کا یہ ہے کہ شیر منہ ہاتھ دھونے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال کچھ اور ہے اس سلسلے میں!"

شرافت علی نے ہنستے ہوئے پوچھا "اور آپکا کیا خیال ہے جناب پیرزادہ صاحب؟"

"میرا خیال یہ ہے کہ آوارہ پھرنے والی بلیاں اور کتے ہی اتنے کاہل ہوتے ہیں کہ منہ دھونے سے جان چراتے ہیں، محض اپنی کاہلی کے باعث۔ اور انہی کے ہم مزاج لوگوں نے شیر بے چارے کو بدنام کرنا شروع کر دیا ہے ورنہ جنگل کا بادشاہ اتنا گندہ تو نہیں ہو سکتا!"

"بک نئیں اوئے فقیر زادے! سالے مجاور کی اولاد! جب بھی بولتا ہے کفن پھاڑ کے ہی بولتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی اُلّو کی رُوح حلول کر گئی ہے تیرے اندر۔ ہنستے بولتے انسان اچھے نہیں لگتے ہیں تجھے!"

"لے بھائی شرافت علی! دیکھ لے اچھی طرح سے۔ ایک ہی جھٹکے میں شیر سے انسان بنا دیا ہے سالے کو!"

"یار! یہ تم دونوں کی نوک جھونک جاری ہی رہتی ہے ہمیشہ۔ موقع ملتے ہی شروع ہو جاتے ہو!" شرافت علی مسکراتے ہوئے بولا۔

"شرافت اسے ہضم نہیں ہوتی ہے بھائی! تھوڑی سی بھی شریفانہ گفتگو کرنا پڑتی ہے اسے تو پیٹ پھول جاتا ہے اس کا۔ نظامِ ہضم بگڑ کے رہ جاتا ہے۔ دیکھا نہیں ہے تم نے تمہارا نام لیتے ہوئے کیسے بُرے بُرے منہ بناتا ہے یہ!" میں نے شرافت علی سے کہا۔

وہ قہقہے لگانے لگا۔ آبی بولا "اوئے اس شریف آدمی کے اچھے بھلے نام کو جمال گوٹا کیوں بنانے پر تُل گیا ہے تو؟"

شرافت علی بولا "مجھے تو معاف ہی رکھو یارو! یہ زبان بولنا

میرے بس کی بات نہیں ہے میرے بھائی! میری مٹی خراب نہ کرو تم۔"

منہ ہاتھ دھو کر ہم تینوں ناشتے پر آبیٹھے۔ سجل نے کہا "سائیں ہاشم خان! پہلی بار جب آپ لوگ پیر و میں ملے تھے مجھے تب بھی آپ اسی لاکھو لاشاری کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وجہ آپ نے مجھے یہ بتائی تھی کہ وہ آپ کا کچھ روپیہ لے آیا ہے جسے واپس لینے آئے ہیں آپ دونوں۔ میں نے آپ کو لاکھو تک پہنچا تو دیا تھا مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا آپ کی بات کا۔"

"کیوں بھائی! کیوں یقین نہیں آیا تھا تمھیں؟" میں نے ذرا حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے سائیں! کہ لاکھو لاشاری جس آدمی کو کہتے ہیں وہ چھین تو سکتا ہے لوگوں سے مگر کسی سے مانگ نہیں سکتا کبھی، اور قرض مانگنا تو گالی سمجھتا ہے وہ۔ یہ سرشت ہی نہیں ہے اس کی۔ آپ کو پتا نہیں تھا یہ، اسی لیے ایسی بات کہہ دی تھی آپ نے۔"

"ہاں یار! سچ کہتا ہے تُو۔ اس کا علم نہیں تھا مجھے۔ مگر تُو نے اُسی وقت جھٹلایا کیوں نہیں تھا مجھے؟"

"بس جی! وہ میں نے یہ سوچا کہ آپ صحیح بات بتانا نہیں چاہتے ہیں مجھے، اسی لیے خاموش ہو گیا تھا میں۔ جب تک کوئی خود ہی نہ بتائے کسی کے رازوں کو کُریدنے کی عادت نہیں مجھے۔ خاموشی ہی بہتر سمجھتا ہوں میں ایسے موقعوں پر۔"

"ہاں، یہ بہت اچھی عادت ہے سجل سائیں تمھاری۔ بہت سی مصیبتیں ایسے آدمی کے دروازے سے ہی واپس چلی جاتی ہیں۔" آبی بولا۔

میں نے کہا "بات تو یہ بہت اچھی ہے۔ مگر پھر آج تم کیوں اس بات کو دُہرا رہے ہو؟"

"ذکر تو آج بھی نہیں کرتا میں اس بات کا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اب خود ہی ساری بات صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں مجھے۔ اب اعتبار کرنے لگے ہیں آپ مجھ پر، اور جب اعتبار قائم ہو جائے تو آدمی کو دل میں کوئی بات رکھنا نہیں چاہیے۔"

"حیرت ہے یار مجھے! ایسا تو نہیں سمجھتا تھا میں تجھے۔ ایسی بھی باتیں کر سکتا ہے تو سجل یار!" میں نے کہا۔

"کیوں بھائی جی! میں کیوں نہیں کر سکتا ایسی باتیں؟ چِٹّا اَن پڑھ تو نہیں ہوں میں، میٹرک کیا ہے میں نے۔"

"اوئے سچ کہتا ہے تو؟ یار کیوں حیرتوں کے پہاڑ تلے دبائے جا رہا ہے آج مجھے۔ لگتا تو نہیں ہے کہ تو نے اسکول کی دیوار بھی دیکھی ہو کبھی۔ مگر تو کہتا ہے تو یقین تو کرنا ہی پڑے گا پیارے بھائی! مگر اب مزید کوئی انکشاف نہ کر بیٹھنا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "رات کو آپ لوگوں کے سو جانے کے بعد میں دیر تک یہی سوچتا رہا تھا کہ آج بھی لاکھو لاشاری ہی کی کشش کھینچ لائی ہے آپ لوگوں کو اِدھر۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ لوگوں کے درمیان تعلق کیا ہے؟"

"اچھا۔ پھر اب سمجھ میں آگیا کیا تعلق ہے ہمارے درمیان؟ رات بھر غور کر کے یہ عقدہ بھی حل کر لیا تم نے؟"

"صبح جب پولیس اس عورت کو تلاش کرتی ہوئی آئی تھی تب یہ خیال آیا تھا مجھے کہ وہ عورت بھی آپ ہی کی ساتھی ہے کوئی۔ آپ نے اس کے ذریعے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی لاکھو لاشاری کو۔ مگر زندگی اس سے بے وفائی پر آمادہ نہیں ہے ابھی۔"

"یہ کیسے سمجھ لیا تُو نے؟ کیا ہم ایسے ہی نظر آتے ہیں تجھے، عورتوں کو آگے بڑھا کر دشمنوں سے لڑانے والے؟" آبی بول اُٹھا۔

"کیوں جناب! ہرج کیا ہے اس میں؟ اکثر جی دار لوگ دشمن کو ذلیل کرنے کے لیے، اسے حقیر ثابت کرنے کے لیے معمولی درجے کی عورتوں سے لڑوا دیتے ہیں یا بھرے بازار میں عورت سے جوتے لگوا دیتے ہیں۔" سجل جلدی سے بولا۔

"ہوتے ہوں گے میرے بھائی! اس دنیا میں ایسے لوگ بھی، مگر ہم ان میں سے نہیں ہیں۔" میں نے اسے... سمجھانے والے انداز میں کہا "ویسے وہ عورت ہمارے لیے کوئی غیر نہیں ہے۔ بہن ہے وہ میری، بالکل سگی بہن، میری ماں جائی۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ بہن ہے آپ کی سائیں ہاشم خان؟"

"ہاں بھائی! جھوٹ نہیں ہے اس میں ذرا بھی اور یہ سچ ہے کہ وہ ہماری اجازت سے نہیں آئی ہے یہاں۔ ہمیں تو بہت بعد میں معلوم ہو سکا کہ وہ اِدھر آئی ہے۔ اطلاع ملتے ہی ہم دوڑے چلے آئے، یہی ڈر لگا تھا مجھے کہ وہ قتل نہ کر دے لاکھو کو۔"

"حیرت ہے! آپ اپنی بہن کے ہاتھوں مرنے سے بچانے کے لیے آئے تھے لاکھو کو، مگر کیوں؟ وہ کیوں مارنا چاہتی ہے اسے؟"

"یہ بڑی دردناک کہانی ہے سجل! اس نے بڑا گہرا زخم لگایا ہے اس معصوم کو۔ ذلیل کر دیا ہے اسے اور اب اس کا بچّہ بھی اٹھا کر لے آیا ہے۔ میری اس مظلوم بہن نے قسم کھائی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے گولی مارے گی اس لاکھو لاشاری کو اور جب تک وہ ایسا نہیں کرے گی اس کے اندر انتقام کا جہنم دہکتا ہی رہے گا۔ اس جہنم کو سرد کرنے کے لیے ہی لاکھو کا لہو درکار ہے اسے۔"

"یہ تو بڑا ظلم ہوا ہے سائیں! اس غریب کے ساتھ۔ پھر آپ کیوں روکنا چاہتے ہیں اسے؟ اس کے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیوں نہیں ہونے دینا چاہتے ہیں آپ؟ یہ تو اچھا نہیں کر رہے ہیں آپ اس کے ساتھ۔" سجل کا سینہ ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا تھا۔

"نہیں یار! یہ کام عورتوں کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ وہ ایک ہی بہن ہے میری۔ میں اس سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں ہے تجھے بھائی! میں نے کیسے کیسے عذاب جھیلے ہیں، اس کی زندگی میں سکھ بھرنے کے لیے دُکھوں کے کیسے کیسے سمندر عبور کیے ہیں، اور وہ یوں بربادیوں کے پاتال میں اُتر جانا چاہتی ہے۔ میں اس کی اجازت کیسے دے دوں اسے؟"

میری آواز بھرا گئی۔ سجل بھی سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ اس کے سینے میں بھی درد جاگ اُٹھا تھا شاید۔ اور شرافت علی بھی حیرت سے منہ تکتا رہ گیا تھا۔ مجھ سے اب مزید لقمے اٹھانا مشکل ہو گیا تھا، لہٰذا میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور گلاس بھر پانی پی کر اُٹھ گیا وہاں سے۔ چند ساعتوں کے لیے فضا میں ایک سوگوار سی خاموشی چھا گئی۔ میں ہاتھ دھو کر اپنی جگہ واپس آیا تو سجل نے اس خاموشی کو توڑا "آپ کونسا کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں سائیں ہاشم خان؟"

میں نے مدھم لہجے میں کہا "اگر تم کر سکو تو بس اتنا کام کر دو میرا، کسی طرح یہ معلوم کرا دو کسی سے کہ رات کو لاکھو لاشاری پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا، اس سلسلے میں لاکھو لاشاری کس کا نام لے رہا ہے؟ ویسے ہمیں پورا پورا یقین ہے کہ یہ کام آسیہ ہی کا ہے، لیکن ایک فیصد امکان اس بات کا بھی ہے کہ وہ آسیہ کے بجائے کوئی اور عورت ہو اور آسیہ ابھی پہنچی ہی نہیں ہو یہاں۔ اگر وہ نہیں پہنچی ہے اور یہ کام کسی اور کا ہے تو پھر ہم لاکھو لاشاری کے پاس جا کر اس مسئلے کو نمٹانے کی کوشش کریں گے مگر حالات کا صحیح علم حاصل کیے بغیر ہمارا لاکھو کے سامنے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ انجانے میں مار بھی کھا سکتا ہے آدمی۔"

"یہ کوئی ایسا اہم کام نہیں ہے سائیں! آپ تو کہتے تھے اس کام پر لاکھو سے دشمنی بھی ہو سکتی ہے میری؟"

"وہ میں نے اس خیال سے کہا تھا کہ ممکن ہے تمھارا یا تمھارے آدمی کا وہاں جانا معمول کے خلاف بات نہ ہو حویلی والوں کے لیے اور جب ان سے لاکھو پہ کیے جانے والے حملہ آور کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ لوگ مشکوک ہو جائیں اس کی طرف سے۔ اگر ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ کڑیاں ملاتے ہوئے ہم تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی ان کے دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤ گے۔ یہ خیال غلط تو نہیں ہے ہمارا؟"

"ہاں جی! یہ تو بالکل ٹھیک سوچا ہے آپ نے، مگر آپ فکر نہ کریں، میں آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل کر لوں گا۔"

وہ اُٹھ کر ہمارے لیے چائے لینے چلا گیا۔ حالانکہ چائے کا سامان وہاں بھی موجود تھا لیکن اس نے ہم لوگوں کے لیے خصوصی طور پر گھر میں چائے بنوائی تھی۔ رات بھر کے سفر کی تکان کی وجہ سے ہم لوگ خاصا دن چڑھے تک سوتے رہے تھے۔ اگر وہ تھانیدار وہاں آکر زور زور سے باتیں نہ کرتا تو اس وقت بھی ہم سو ہی رہے ہوتے۔ سجل پانچ منٹ میں واپس آگیا۔ اس نے پہلے سے وہاں موجود پیالیاں دھو کر ان میں ہمارے لیے چائے انڈیلی اور ایک ایک پیالی ہم تینوں کو تھما کر بولا "آپ لوگ چائے پئیں۔ میں کسی آدمی کو آپ کے کام سے لاکھو لاشاری کی حویلی کی طرف بھیج کر آتا ہوں۔"

وہ دوبارہ چلا گیا۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ اچانک بگاڑی نہر کی طرف سے ابھرنے والی گھوڑوں کی ٹاپوں نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم تینوں کی نگاہیں ایک طرف اُٹھ گئیں۔ چار سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ آبی نے انھیں دیکھ کر کہا۔ "یہ لوگ اس حملہ آور عورت کی تلاش میں نکلے ہیں شاید!"

"ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔" میں نے اس کی تائید کی اور آنے والوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

کچھ اور قریب آنے پر معلوم ہوا وہ چار نہیں، پانچ ہیں۔ ایک سب سے آگے ہے اور چار اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ آگے والا گھوڑا کبھی کبھی اس طرح سامنے آجاتا تھا کہ وہ پانچ کے بجائے چار نظر آنے لگتے تھے۔ آہستہ آہستہ سواروں کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ جلد ہی میں نے سب سے آگے آنے والے سوار کو پہچان لیا۔ وہ سیف علی تھا۔ لاکھو لاشاری کا.. خاص آدمی۔ اس کے ساتھ آنے والے آدمیوں کو بھی میں لاکھو لاشاری کی حویلی میں دیکھ چکا تھا..... گو ان کے نام مجھے یاد نہیں رہے تھے مگر چہرے خوب اچھی طرح محفوظ تھے میرے ذہن میں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ لوگ آسیہ کی تلاش میں نکلے ہیں اور سیدھے سڑک پر آگے بڑھتے چلے جائیں گے، مگر ہمارا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ قریب آکر انھوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہماری طرف موڑ لیں اور پلک جھپکنے میں ہمارے سامنے آٹھہرے۔

سیف علی اور اس کے چاروں ساتھی مسلح تھے۔ ان سب کے شانوں سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں انھوں نے اپنی اپنی کمر سے باندھ رکھی تھیں۔ انہیں یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ لاکھو لاشاری یا اس کے کسی آدمی کو ہماری یہاں موجودگی کے بارے میں قطعی علم نہیں ہے۔ ہم رات کے بالکل آخری پہر میں یہاں پہنچے تھے اور سچل کے سوا، اس علاقے کے کسی بھی شخص نے ابھی تک ہماری شکل نہیں دیکھی تھی بھی تھوڑی دیر پہلے جو تھانیدار یہاں آیا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ وہ بھی ہماری شکلیں دیکھنے میں ناکام ہی رہا تھا کیوں کہ ہم تینوں ہی سر سے پیر تک چادریں لپیٹے سو رہے تھے اور ان میں سے کسی نے ہمیں اٹھانے یا ہمارے چہرے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وجہ اس کی اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ سائبان کے سامنے ہی وہ کار کھڑی تھی جس میں ہم طویل سفر کر کے یہاں تک آئے تھے۔ وہ جہاں دیدہ تھانیدار خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کاروں میں سفر کرنے والے کوئی معمولی درجے کے لوگ نہیں ہوتے۔ وہ یا تو خود خاصے با اختیار ہوتے ہیں یا انہیں اتنا اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے کہ تھانیدار جیسے چھوٹے موٹے اہل کاروں کی ناراضگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر کار ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو وہ یوں سچل سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کر کے نہیں چلے جاتے۔ وہ تو ایسے لاوارثوں کی ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں جن پر کسی سنگین واردات کا بوجھ ڈال کر اپنی اوپری آمدنی میں کچھ اضافہ کر سکیں۔

میرے دل میں فوراً اس بدگمانی نے سر اُبھارا کہ کہیں سچل نے تو ہماری یہاں موجودگی کی خبر نہیں دی ہے ان لوگوں کو۔ کیونکہ موجودہ حالات میں وہی ایک ایسا شخص تھا جس کے ذریعے ہمارے بارے میں لاکھو لاشاری کی حویلی تک کوئی خبر پہنچ سکتی تھی۔ حالانکہ دل اس خیال کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ وہ بہادر اور پُرخلوص جوان کسی کے ساتھ دغا بھی کر سکتا ہے لیکن میرا واسطہ اب تک جن بڑے بڑے گیانیوں اور دھرماتماؤں سے رہا تھا اور میں نے ان کے جیسے رُوپ دیکھے تھے، اس کے بعد کسی کے ظاہر پہ اعتبار نہیں رہا تھا مجھے۔ اپنے گزشتہ تجربات کی روشنی میں مجھے سب سے پہلے سچل کا چہرہ ہی دکھائی دیا تھا۔ سب سے پہلے اسی کا نام آیا تھا میرے ذہن میں اور میں دل ہی دل میں اس کی دغابازی پر کھول کر رہ گیا تھا۔ اس وقت اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اب تو بازی ہمارے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی۔ وہ لوگ بے خبری میں یوں اچانک ہم پر آ پڑے تھے کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

وہ سارے ہتھیار جن کے بارے میں شرافت علی کے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ وہ کار کے خفیہ اسلحہ خانے میں موجود ہیں، اب بھی کار کے اسی خانے میں پڑے تھے اور اس گھڑی ہمارے کسی کام نہیں آ سکتے تھے۔ البتہ میری دشمن نما دوست اور اس رذیل دشمن کی نصف بہتر عالیہ کی دی ہوئی وہ طلسمی انگوٹھی جسے امریکہ کے کچھ سائنسدانوں نے نہ جانے کن کن مراحل سے گزار کر ایسی طاقت بخش دی تھی کہ اس کے سامنے آتشیں اسلحے کی زبانیں گنگ ہو کر رہ جاتی تھیں، اب بھی میری انگلی میں موجود تھی اور اس انگوٹھی کی موجودگی میں مجھے یہ کامل یقین تھا کہ سیف علی اور اس کے یہ مسلح ساتھی ہمارے خلاف اپنا اسلحہ استعمال نہیں کر سکیں گے۔ اگر بات بگڑی تو مقابلہ انھیں بھی خالی ہاتھوں ہی کرنا پڑے گا، یا زیادہ سے زیادہ وہ اپنی بندوقوں کو لاٹھیوں کی طرح استعمال کر سکتے تھے اور اس طرح مقابلہ کر کے وہ ہمیں شکست نہیں دے سکتے تھے۔

سیف علی چند لمحے گھوڑے پر بیٹھا ہمیں دیکھتا رہا۔ سب سے پہلے اس کی نظر شرافت علی پر گئی تھی۔ پھر آبی کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں، دوسرے ہی لمحے اس کی نظر مجھ پر آ ٹکی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔ وہ تیزی سے گھوڑے سے کود کر ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا "ارے ہاشم خان سائیں! آپ ادھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے سائیں یہ تو۔ ایسی کیا خطا ہو گئی ہم سے؟ کیا غلطی کی ہے ہم نے؟ کیا لاشاری سائیں کی حویلی اب اس قابل نہیں رہی ہے کہ آپ وہاں ٹھہر سکیں؟"

اس کا یہ محبت بھرا والہانہ انداز دیکھ کر میرا بھی چہرہ کھل اٹھا میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور آگے بڑھ کر سیف علی سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے سیف علی۔ دراصل ہم لوگ رات تین بجے کے قریب پہنچے تھے یہاں۔ اس لیے ہم نے آتنی رات کو حویلی جا کر تم لوگوں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور صبح کے انتظار میں یہاں رُک گئے۔ بس اتنی سی بات ہے بھائی۔ اس کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کسی بدگمانی کو جگہ نہ دینا اپنے دل میں۔"

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی سائیں۔ آپ نے تو بڑی غیریت برتی ہے ہم سے۔ حالانکہ لاشاری سائیں اپنا بھائی کہتے ہیں آپ کو۔ ان کے حکم کے مطابق حویلی کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ مالک ہیں سائیں آپ حویلی کے اور مالکوں کے گھر میں آنے جانے کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا نا۔ یہ کیسے سوچ لیا آپ نے کہ کوئی پریشان ہوگا آپ کے اس وقت آنے سے۔"

بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا وہ۔ سیف علی کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سارے وسوسے ہمارے تمام کے تمام اندیشے اس نے یکلخت مٹا ڈالے تھے۔ ساری بساط ہی الٹ دی تھی اس نے تو ہماری۔ میں نے معذرت کرنے والے انداز میں اس سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا یار کہ تم لوگ اس چھوٹی سی بات کو اس درجہ محسوس کرو گے ورنہ میں ایسی غلطی ہرگز نہ کرتا۔ مجھے افسوس ہے بھائی کہ میں نے دل دُکھایا تم لوگوں کا۔ میں وہاں چل کر لاکھو لاشاری سے بھی معافی مانگ لوں گا یار!"

"لاشاری سائیں سے ایسی کوئی بات نہ کریں آپ۔ انہیں بہت دُکھ ہوگا یہ سن کر۔ میں بھی کوئی ذکر نہیں کروں گا ان سے اس کا۔ یوں بھی اسوقت ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ان سے کوئی ایسی ویسی بات کہی جائے۔" سیف علی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر حیرت طاری کر کے پوچھا "کیوں کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے؟ کیسی حالت ہے اس کی؟"

"آپ تو جانتے ہیں سائیں کہ وڈیروں اور زمینداروں کے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں۔ کسی دشمن نے اندھیرے میں گولی چلا دی تھی ان کے اوپر۔ دو آدمی مارے گئے ہیں اور لاشاری سائیں کا ایک بازو شدید زخمی ہو گیا ہے۔ طبی امداد ملنے سے پہلے زخم سے بہت خون بہہ گیا ہے جس کی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کو کہا ہے۔"

"اچھا! حیرت ہے یار! یہ سب کچھ ہو گیا ہے اس کے ساتھ۔ کس نے چلائی تھی گولی؟ وہ پکڑا گیا ہے یا نہیں؟"

"نہیں جی! پکڑا ہی تو نہیں جا سکا ہے۔ لاشاری سائیں کے مشکی پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ پہچانا بھی نہیں جا سکا ہے وہ۔ لاشاری سائیں کا کہنا ہے کہ وہ کوئی عورت تھی، سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس، بالکل تاریکی کا ایک حصہ لگتی تھی۔"

"کمال ہے۔ ایک عورت اس حال کو پہنچا گئی ہے اس لاشاری شیر کو۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا سیف علی!"

"ہاں جی، یقین تو کسی کو بھی نہیں آتا مگر اپنے لاشاری سائیں یہی کہتے ہیں۔ ان کی بات جھٹلائی بھی نہیں جا سکتی۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں موجود ہیں؟" میں نے اچانک بات بدل کر سوال کر ڈالا۔

"وہ اس علاقے کے تھانیدار نے بتایا تھا مجھے کہ سچل کے ڈیرے پر تین مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس کا خیال تھا شاید آپ لوگ اس عورت کے ساتھی ہیں جس نے سائیں کو زخمی کیا ہے۔ ہم یہی دیکھنے آئے تھے کہ یہاں سائیں کے دشمنوں میں سے تو کوئی نہیں آ ٹکا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا سائیں کہ یہاں آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب آئیں آپ لوگ چلیں ہمارے ساتھ۔"

اس کے جواب نے میرے دل سے سچل کے خلاف پیدا ہونے والی بدگمانی دھو ڈالی۔ اپنے سینے سے ایک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا مجھے۔ میں نے کہا "کچھ دیر ٹھہر جاؤ یار! ذرا سچل کو واپس آ لینے دو۔ بے چارے نے بڑی خاطر مدارت کی ہے ہماری، یوں اچانک اس سے ملے بغیر چلے جانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ کیا سوچے گا وہ؟"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اس سے اجازت لینا بہت ضروری ہے۔ آپ اس سے رخصت ہو کر آئیں اُدھر، میں جا کر سائیں کو آپ کے آنے کی خوشخبری سُنا دوں۔ اس موقع پر آپ کی آمد انہیں حوصلہ دے گی سائیں، مگر خیال رکھنا سائیں، آپ انہیں یہاں ٹھہرنے کا نہ بتانا۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ راستے میں ملاقات ہو گئی تھی آپ سے۔ سائیں کو خبر کرنے کی خاطر میں جلدی آ گیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ ہم بھی تمھارے پیچھے ہی پیچھے آ رہے ہیں بس۔" میں نے کہا۔

وہ ہم تینوں سے باری باری ہاتھ ملا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہ لوگ سڑک تک ہی پہنچے تھے کہ سچل واپس آ گیا۔ اس نے ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

میں نے مسکرا کر پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو سچل سائیں؟"

"یہ... یہ یہاں آئے تھے سائیں ہاشم خان؟ یہ تو لاکھو کا خاص آدمی سیف علی ہے۔" سچل بولا۔

"ہاں، وہی ہے۔ ادھر ہمارے پاس ہی آیا تھا وہ۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ یہاں کیوں آیا تھا یہ؟" سچل کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"اسے تھانیدار نے خبر دی تھی کہ تم نے یہاں لاکھو لاشاری پر قاتلانہ حملہ کرنے والی کے ساتھیوں کو، لاشاری کے دشمنوں کو اپنے ہاں... پناہ دے رکھی ہے؟" میں نے اُسے بتایا۔

"پھر وہ مجھ سے بات کیے بغیر واپس کیوں چلا گیا؟ اسے بات تو کرنا چاہیے تھی مجھ سے اس سلسلے میں!"

"واپس اس لیے چلا گیا ہے وہ کہ ہم سے ملنے کے بعد

تم سے ملنے کی ضرورت نہیں رہی تھی اسے۔ وہ دشمنوں کی یہاں موجودگی کی اطلاع پر آیا تھا مگر یہاں آکر جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اس کی، وہ دشمن نہیں تھے ان کے۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا ہے یار جی۔ وہ عورت جس نے لاشاری پر حملہ کیا تھا، کوئی بھی رہی ہو، لاشاری اسے پہچان نہیں سکا اس لیے اس نے کسی پر بھی اپنے شک کا اظہار نہیں کیا ہے اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ اب بے خوف ہو کر وہاں جا سکتے ہیں ہم۔ تم نے اپنے کسی آدمی کو بھیجا تو نہیں ہے اُدھر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سائیں؟ میں تو اس وقت گیا ہی اسی کام کے لیے تھا۔ اپنے بھائی کو بھیجا ہے میں نے اُدھر۔"

"اچھا، پھر ایسا کرو تم بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جاؤ گاڑی میں۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا وہ۔ تم اسے راستے ہی سے واپس لے آنا۔ جو کچھ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے، وہ تو ہمیں معلوم ہو ہی گیا ہے نا، پھر کیا ضرورت ہے اسے پریشان کرنے کی۔"

"نہیں جی، اس میں پریشان ہونے کی تو بات ہی نہیں ہے کوئی۔ یوں بھی ہم میں سے کسی نہ کسی کو تو جانا ہی ہے وہاں، اس لاکھو لاشاری کی عبادت کے لیے اور کچھ نہیں تو یہی فرض ادا کر آئے گا وہ۔" سنجل نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ جانے دو اُسے اور اب ہمیں اجازت دو میرے بھائی۔ ہمیں بھی جلد از جلد پہنچ جانا چاہیے، سیف علی حویلی پہنچ کر لاکھو لاشاری کو ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع دے دے گا۔ ایسی صورت میں ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرانا چاہیے اُسے۔ اس موقع پر میں اسے اپنی طرف سے ذرا بھی بدگمان نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے سنجل سے کہا۔

"ٹھیک ہے سائیں۔ ان حالات میں آپ کو مزید روکنے پر اصرار نہیں کروں گا میں۔" سنجل نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

ہم اس سے رُخصت ہو کر جلدی جلدی کار میں جا گھسے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس بار بھی آبی نے ہی سنبھالی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے سڑک کی طرف دوڑا دی۔ سڑک پر پہنچ کر شرافت علی نے کہا "جیلانی! کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھیں وہاں بلانے کے لیے، وہ سیف علی جھوٹ بول گیا ہو تم سے کہ لاشاری حملہ آور عورت کو پہچان نہیں سکا تھا۔ آنکھیں کھلی رکھنا بھائی۔ یوں اندھا دھند مت گھس پڑنا وہاں۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا شرافت علی۔ اتنا تو اندازہ ہے مجھے۔ جھوٹ اور سچ کی تمیز تو کر سکتا ہوں میں۔" آبی جلدی سے بولا۔

"ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے۔ مخاطب کا تعلق اگر صنفِ نازک سے نہ ہو تو آبی دھوکا نہیں کھاتا کبھی۔ اس کی عقل تو بس ریشمی آنچل کی ہوا کے آگے نہیں ٹھہرتی۔ حسینوں کی مسکان البتہ اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔"

"اوئے تو چُپ نہیں رہ سکتا ....؟ سالے، زاہدِ خشک ثابت کرنا چاہ رہا ہے اپنے آپ کو۔" آبی تڑخ کر بولا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھا شرافت علی! اس کا سب سے نازک مسئلہ نوچ لیا تھا میں نے۔ کیسا کاٹنے کو دوڑ رہا ہے اب؟ ویسے یہ غلط نہیں کہا ہے میں نے۔ اس نے دھوکا ہمیشہ حسین صورتوں ہی سے کھایا ہے۔ ایک وہ اس کی منظورِ نظر تھی الماس وہی یار جو فلموں میں کام کرتی ہے۔ اس نے شادی بھی پکی کر لی تھی اس سے مگر جب یہ اُدھر راولپنڈی جیل میں پڑا سسک رہا تھا اور کوئی امید نہیں رہی تھی اس کے باہر آنے کی تو اس نے ایسی آنکھیں پھیری تھیں کہ بتا نہیں سکتا میں کچھ! اس کے ایک شناسا نے تو پنڈی جیل سے معلومات کرنے کے بعد یہ اطلاع ہم پہنچائی تھی ہمیں کہ جیل سے باہر آنا اب آبی کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ بہت سنگین الزامات لگائے گئے ہیں جیل میں بڑی سختی ہو رہی ہے اس پر اور ان سختیوں کی تاب نہ لا کر وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا ہے۔ کیوں آبی! کتنی صداقت تھی اس خبر میں؟ مجھے تو تیری آنکھوں کے دونوں دیے روشن لگتے ہیں۔"

آبی نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ پھر بولا "کیا بات یاد دلا دی ہے تو نے اس گھڑی یار جی! تو آبی کی ہنرمندیوں کو جانتا نہیں کیا؟ وہ سالے یہی سمجھ کر پریشان رہنے لگے تھے کہ ان کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں کے باعث میری آنکھیں قوتِ بصارت سے محروم ہو گئی ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں پر چڑھے ہوئے لینس اُتار کر رکھ لیے تھے اور ڈراما کر دیا تھا کہ تشدد کی وجہ سے آنکھوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ بڑی ہلچل مچ گئی تھی وہاں۔ جیلر اور اس کا ڈپٹی دونوں میرے آگے پیچھے ہونے لگے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے بلا کر ڈاکٹروں سے میری آنکھوں کا معائنہ کرایا جاتا تھا۔"

"کیسے ڈاکٹر تھے یار وہ جو تیری بینائی کھو جانے کا راز نہیں معلوم کر سکے؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"ڈاکٹر بھی آخر انسان ہوتے ہیں یار۔ وہ ان پلسیوں کی طرح ڈھور ڈنگر تو نہیں ہوتے نا جن پر اثر ہی نہیں ہوتا کسی کے دُکھ درد کا۔ جب تک انکے گلے میں پھندا پڑنے کی نوبت نہ آ جائے، یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ بندہ ان کی مار سے بچنے کے لیے مکر کر رہا ہے۔ جتنے بھی ایسے ڈاکٹر آئے جو حقیقت کو پانے میں کامیاب ہو گئے، انہیں میں نے پولیس کے مظالم کی ایسی داستان

سنائی جس نے ان کے دل موم کر دیے میرے لیے اور ان سب نے یہی رپورٹ دی کہ تشدد کی وجہ سے میری بینائی متاثر ہوئی ہے۔"

"اچھا...... کمال کر دیا بھئی تو نے تو۔ معلوم ہوتا ہے الماس کے ساتھ رہ کر تو نے اداکاری خوب سیکھ لی ہے۔"

"لعنت بھیج یار، اس سفلی عورت پر۔ نفرت ہو گئی ہے مجھے اس کے نام سے بھی۔ وہ کُتی مجھے زمیندار سمجھ کر میرے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے میرے پیچھے دُم ہلانے لگی تھی۔ سمجھتی یہ تھی کہ میں اُلو کا پٹھا ہوں، ایک دم سیدھا سادا دیہاتی جو اس کی ریشمی زلفوں کے سائے میں آنکھیں بند کر کے پڑا رہے گا اور وہ میرا ایک ایک تنکا حاصل کرنے کے بعد اپنی زلفوں کا بادل سمیٹ کر چلتی بنے گی اور میں یوں ہی تپتی دھوپ میں پڑا سڑتا رہوں گا۔ وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ شخص جس کا نام اسلم آبی ہے، کتنے گہرے پانی میں رہتا ہے اور جب یہ عقدہ کھلا اس پر تبھی وہ چڑیا اُڑ گئی پھر سے۔"

"لو بھئی جیلانی! یہ تو بات ہی اُلٹی ہو گئی ساری۔ تم تو کہہ رہے تھے یہ حسینوں کے ہاتھوں اُلو بن جاتے ہیں جب کہ ان کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی بڑی اداکارہ کو بھی بے وقوف بنا ڈالا ہے۔" شرافت علی شرارت سے بولا۔

"جھوٹ بولتا ہے بدمعاش، اس کی آنکھوں پر جو لینس چڑھے ہوئے ہیں یہ بھی دو لڑکیوں ہی نے چڑھوائے ہیں —— تم نے سنا ہوگا لوگ دل نکال کر قدموں میں رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس نے آنکھیں نکال کے رکھ دی تھیں ان کے قدموں میں۔"

"کیوں بھئی آبی! ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ جیلانی ؟" شرافت علی نے شوخ نظروں سے آبی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آدمی تو یار تُو بھی کچھ زیادہ ہی کھڑپینچیا لگتا ہے۔ بات سے بات نکالے چلا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں چُپ نہیں رہ سکتا ہے تو؟ اتنی ہی خارش ہے زبان میں تیری تو کوئی کام کی بات کر، یہ کیا بے کار کی بک بک لگا رکھی ہے۔" آبی ہتھے اُکھڑ گیا تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "شیر زخمی ہے بھائی شرافت! خیریت اسی میں ہے کہ زبانیں بند رکھیں ہم اپنی ورنہ یہ گاڑی کو نہر میں نہ غوطہ دے دے کہیں اور ہاں یار! تم وہ اپنے خفیہ اسلحہ خانے سے ایک ایک پستول تو نکال کر تھما دو ہمیں۔ شاید ضرورت پڑ جائے اس کی۔ یوں بھی کسی مشتبہ جگہ جاتے ہوئے اپنی حفاظت کا انتظام ضرور کر لینا چاہیے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اس کا خیال مجھے اس وقت بھی آیا تھا جب وہ سیف علی اسلحہ سجائے اچانک آ پہنچا تھا سر پہ۔" شرافت علی نے کہا اور آبی سے بولا "آبی بھائی! ذرا گاڑی روکو، میں آگے آنا چاہتا ہوں۔"

آبی نے کار کو سڑک کے ایک طرف کر کے روکتے ہوئے کہا۔ "ہاں آگے ہی آ جاؤ تم، وہاں یہ ذلیل پانی سکون سے نہیں بیٹھنے دے گا تمھیں۔"

گاڑی رُکی تو شرافت علی نیچے اُتر گیا اور آگے سے گھوم کر آبی کے ساتھ والی خالی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد آبی نے کار پھر آگے بڑھا دی۔ شرافت علی کار چلتے ہی اپنی سیٹ سے اٹھا اور سیٹ کے نیچے ہاتھ لے جا کر نہ جانے کیا کیا کہ سیٹ کوئی ایک فٹ کے قریب اوپر اُٹھ کر پیچھے سرک گئی۔ آبی نے گردن موڑ کر اس جگہ کو دیکھا جہاں سے سیٹ ہٹی تھی۔ میں بھی ایک دم آگے جھک کر دیکھنے لگا۔ وہاں اب ایک بکس کھلا ہوا نظر آ رہا تھا جس کی گہرائی بمشکل آٹھ یا دس انچ ہو گی۔ وہ بکس نیچے سے ایک نالی کی شکل میں عقبی نشست تک چلا گیا تھا۔ ہمارے سامنے کے کھلے حصے میں چار پستول پڑے تھے اور ان کے ساتھ اسٹین گن کی نالیں نظر آ رہی تھیں۔ شرافت علی نے تین پستول نکال لیے اور سیٹ کھینچ کر اپنی جگہ لانے کے بعد پوری قوت سے نیچے دبایا۔ سیٹ نیچے ہوئی تو ہلکی سی کھٹک کی آواز سنائی دی۔ شرافت علی دوبارہ اس پر بیٹھ گیا اور ایک ایک پستول مجھے اور آبی کو تھماتے ہوئے بولا "انھیں رکھ لو۔ لوڈڈ ہیں یہ۔"

آبی نے پستول ہاتھ میں لے کر قہقہہ لگایا اور بولا "گھروں میں تہ خانے تو بہت دیکھے تھے مگر یہ کار میں تہ خانہ آج پہلی بار ہی دیکھا ہے۔ پہلے سے موجود تھا یہ یا تم نے اپنی ضرورت کے تحت تعمیر کرائی ہے اس کی؟"

"ایسی چیزیں کاروں میں کہاں ہوتی ہیں میرے بھائی۔ یہ میں نے ضرورت کے تحت ہی بنوایا ہے اس میں۔"

اس اثنا میں ہماری کار نے لگاڑی نہر کے اس پل کو جا چھوا تھا جس کے دوسری طرف لاکھو لاشاری کی حویلی تھی۔ یہ پل عبور کرنے کے چند منٹ بعد ہی ہم لاکھو لاشاری کی عالی شان کچی حویلی کے ... پھاٹک کے سامنے جا ٹھہرے۔ وہاں سیف علی ہمارے استقبال کے لیے پہلے ہی موجود تھا۔ اس نے پھاٹک کھلوا کر آبی کو کار اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ حویلی میں داخل ہو کر ہم تینوں کار سے باہر نکل آئے۔ سیف علی نے ہمیں سیدھا لاکھو لاشاری کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ ایک بڑی سی مسہری پر آرام دہ بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا "اوئے یہ کیا کر بیٹھا ہے میرے یار!

تُونے تو لگتا ہے اپنا سارا خون ہی نچوڑ ڈالا ہے؟"

وہ بے جان ہنسی ہنس کر نحیف آواز میں بولا "کوئی خاص بات نہیں ہے ادا سائیں۔ مردوں کو ایسے حادثات بھی پیش آتے رہنا چاہئیں۔ مرد کی شان اسی سے بنتی ہے بھائی جی! آپ سنائیں، کیسے ہیں آپ؟ میری یاد کیسے آگئی آپ کو؟"

"تو بھی کوئی بھولنے والی شے ہے یار۔ بھولا ہی کب تھا میں تجھے جو اب یاد آتی ہے تیری؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یاد رکھا ہے۔ کچھ پتا ہے کتنے عرصے بعد اِدھر قدم آئے ہیں آپ لوگوں کے؟" وہ مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہو تم۔ بہت دن بعد آنا ہوا ہے اِدھر، وجہ یہ ہے اس کی کہ مجھے بہت ہی افراتفری میں امریکا جانا پڑ گیا تھا اور یہ اپنا آبی یار بھی کچھ دنوں کے لیے سرکاری مہمان خانے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کے لیے بھی بہت خوار پھرا ہوں میں۔"

"پتا ہے مجھے ان کے بارے میں تو خبر مل گئی تھی سائیں ان کے ساتھ وہ آپ کی بہن آسیہ بھی تھی نا؟ وہ کہاں ہے اب؟"

"تمہیں معلوم ہے یہ؟" میں نے حیرانی سے کہا "کمال ہے بھئی یہ تو! کیسے معلوم ہوا تمہیں یہ سب کچھ؟"

لاکھولاشاری نے جواب دینے کے بجائے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا اور سیف علی کو دیکھتے ہوئے بولا "سیف علی! تم ان دونوں مہمانوں کو مہمان خانے میں پہنچا دو اور ان کی ضرورت کا خیال رکھو۔ میں ذرا تھوڑی سی باتیں کروں گا جیلانی سائیں کے ساتھ۔"

"جو حکم سائیں۔" سیف علی تابعدارانہ انداز میں بولا۔ پھر اس نے آبی اور شرافت علی کو مخاطب کیا "آئیں آپ لوگ، میرے ساتھ آئیں۔ لمبے سفر نے تھکا بھی دیا ہوگا آپ کو چل کر غسل وغیرہ کر لیں۔"

میں نے شرافت علی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ میرے نئے دوست ہیں لاکھو..... ! بڑے بُرے وقتوں میں کام آنے والے آدمی ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں یہ اور نام ان کا.. شرافت علی ہے۔ آدمی بھی نام ہی کی طرح شریف ہیں۔"

لاکھو نے مسکراتی نظروں سے شرافت علی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ شرافت علی نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ لاکھو بولا "بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔ یہ خوش نصیبی ہے ہماری کہ آپ جیسے لوگ بھی اس حویلی میں تشریف لائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سائیں مجھ جیسے گناہ گار بندوں پر بھی اپنی رحمتوں کے نزول سے ہاتھ نہیں روکتا کبھی۔"

"یہ جیلانی کی محبت ہے کہ اتنی عزت دیتے ہیں مجھے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں بس نام ہی کا شرافت علی ہوں۔ اتنا اچھا آدمی نہیں ہوں میں کہ کوئی مجھے رحمتِ خداوندی سمجھنے لگے۔ شرمندہ نہ کریں بھائی لاکھو آپ مجھے۔"

"نہیں سائیں! شرمندہ کرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے اس میں۔ سائیں جیلانی جس کی عزت کرتے ہیں وہ بندہ اسی قابل ہوتا ہے تبھی یہ ایسا کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں انہیں، جھوٹ نہیں بولتے ہیں یہ اور آدمی پر اس کے نام کا بھی کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے۔"

"ہاں، یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے لاکھو! پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ اس شخص نے اپنے نام کے اثرات ذرا بھی قبول نہیں کیے ہیں۔ ضد ہے یہ اپنے نام کی لیکن جب واسطہ پڑا تو پتا چلا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ آدمی کو پرکھے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے۔"

شرافت نے گفتگو کا رُخ موڑ دیا، بولا "لاکھو سائیں! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کسی شقی القلب عورت نے آپ پر گولی چلا دی تھی کل رات! کون تھی وہ؟ حیرت ہے مجھے۔ آج کل عورتیں بھی ایسے کام کرنے لگی ہیں!"

"ایٹمی دور ہے سائیں یہ۔ عورتیں تو آج بڑے بڑے کام کر رہی ہیں۔ اس کی تو کچھ حیثیت ہی نہیں رہی ہے اب!" لاکھو نے جواب دیا۔

وہ بڑی خوبصورتی سے شرافت علی کے سوال کو گول کر گیا تھا۔ اندازہ یہی ہوتا تھا اس سے کہ وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا "اچھا اب تم دونوں سیف علی کے ساتھ جاؤ۔ میں بھی آ رہا ہوں دو گھڑی لاکھو کے ساتھ بیٹھ کر۔" پھر سیف علی سے کہا "سیف علی! کھانے پینے کے چکر میں نہ پڑنا ابھی۔ ہم ناشتا کر چکے ہیں۔"

سیف علی ان دونوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ حیرت مجھے آبی پر ہو رہی تھی۔ وہ اتنی دیر تک خلافِ عادت بالکل ہی خاموش کھڑا رہا تھا۔ ذرا بھی زبان نہیں ہلائی تھی اس نے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لاکھو کی باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی..... کوشش کرتا رہا ہو۔ یہ اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا تھا کہ لاکھو اکیلے میں مجھ سے اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں ہی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے اس سلسلے میں وہ سب کچھ جو اس نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔ ایسی کونسی بات ہو سکتی تھی جو اس نے اپنے خاص آدمیوں سے بھی چھپائی تھی مگر مجھ سے نہیں چھپائی جا سکتی تھی۔ یقیناً اس کا تعلق میری ذات سے بھی تھا اور یہ اندازہ لگانا میرے اور آبی کے لیے

کچھ دشوار نہیں تھا کہ اس نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا۔ وہ آسیہ ہی تھی جس نے اسے اس حال کو پہنچایا تھا اور یہ آسیہ سے اس کی محبت تھی جس نے لاکھو کی زبان روک رکھی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں سے اس کا نام چھپا رہا تھا۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد لاکھو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر مدھم آواز میں کہا "جیلانی! آپ یہاں کیوں آگئے ہیں؟ نہیں آنا چاہیے تھا آپ کو یہاں، نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟ ایسا کیوں کہہ رہے ہو لاکھو؟ کیا تم مجھ سے میل رکھنا پسند نہیں کرتے؟ یا کوئی خطرے کی بات ہے یہاں میرے لیے؟"

"میل جول...." اس نے اداسی سے کہا "میں تو سائیں آپ سے باندھ کر رکھنا چاہتا ہوں اپنے آپ کو مگر صرف میرے چاہنے سے ہی تو کچھ نہیں ہوتا۔ آپ لوگ بھی اگر چاہیں تو کچھ ہو سکتا ہے، افسوس تو یہی ہے جیلانی کہ آپ نے تو ایسا نہیں چاہا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو لاکھو؟ یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں نہیں چاہتا تم سے کوئی تعلق رکھوں؟ اگر ایسا ہوتا تو آج میں یہاں کیوں آتا؟ کیا ضرورت تھی مجھے مستقل آنے کی؟ اور کون ہے ایسا یہاں جس کی کشش یہاں کھینچ کر لے آئی ہے مجھے؟"

وہ خاموش ہو کر مجھے تکتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے چہرے کو پڑھ کر میری بات کو پرکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند ثانیے بعد وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آدمی کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے لاکھو؟ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے، آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا سمجھانا چاہتے ہو تم؟ کھل کر بات کرو مجھ سے۔"

"کیا بات کروں جیلانی سائیں! میری تو عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ جب تک کسی بات کا صحیح صحیح علم نہ ہو، آدمی کو زبان نہیں کھولنا چاہیے۔ شکوک و شبہات کے سہارے کی گئی باتیں آدمی کو اپنوں سے دُور کر دیتی ہیں خلش بو دیتی ہیں دلوں میں۔ فاصلے پیدا کر کے دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں دشمنی کی۔ اس لیے زبان کھولتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔"

"لیکن شکوک و شبہات دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی دل کی بات زبان پر لے آئے۔ کسی مصلحت سے خاموشی اختیار کر لینے سے بھی تو بدگمانیاں جنم لیتی ہیں دل میں اور ایک روز وہ بڑھ کر دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں سائیں آپ۔ پھر میں جو کچھ بھی کہوں، آپ... بھی صاف اور کھلے دل سے اس کا جواب دیں جیلانی۔ یقین کر لیں کہ میں کسی بدنیتی سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ بس ایک خلش دُور کرنا چاہتا ہوں اپنے دل کی۔"

"تمہیں جو کچھ کہنا ہے بے فکر ہو کر کہو۔ میں بھی تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا، یہ اطمینان رکھو تم۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

وہ پھر خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ شاید بولنے سے پہلے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا یا جو کچھ کہنے جا رہا تھا، اس کے ردِعمل پر غور کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد آخر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ وہ بولا "جیلانی سائیں! ایک بار پھر میں کہہ رہا ہوں آپ سے، اگر میری کوئی بات بُری لگے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں دشمنی نہیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔ بھائی کہا ہے میں نے اور ہمیشہ اپنا بڑا بھائی ہی سمجھا ہے آپ کو۔ شکوک اور بدگمانی بھائیوں کے دلوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ وہ پودا ہے جو اپنوں ہی کے دل میں جڑ پکڑتا ہے...."

"میرے بھائی! میں بھی جانتا ہوں یہ سب کچھ، تجھے جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دے، زیادہ اُلجھن میں نہ رکھ مجھے۔"

"بات یہ ہے جیلانی کہ یہ تو تمہیں بتا ہی دیا ہوگا اس سیف علی نے کہ مجھ پر رات کے اندھیرے میں کسی عورت نے گولیاں چلائی تھیں جس کے نتیجے میں میرا یہ بازو زخمی ہو گیا اور میرے دو بہترین آدمی زندگی سے گزر گئے ہیں؟"

"ہاں، یہ بتایا تھا مجھے سیف علی نے۔ یہ بھی کہتا تھا وہ کہ تم اس عورت کو پہچان نہیں سکے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ان لوگوں سے یہی کہا ہے میں نے مگر حقیقت یہ نہیں ہے جیلانی۔ بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں آدمی کسی اپنے بہت ہی قریبی ساتھی کو بھی نہیں بتا سکتا، بلکہ خود کو بھی نہیں بتا سکتا، اپنے آپ کو جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے وہ۔ یہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اپنے آپ کو کہ خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔ کچھ لوگوں کے بارے میں آدمی ہمیشہ خوش فہمیوں ہی میں مبتلا رہنا چاہتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس عورت کو پہچان لیا تھا۔ یہی بتانا چاہتے ہو نا تم مجھے؟ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے اپنے خاص آدمیوں سے یہ بات کیوں چھپائی تھی۔ البتہ میں یہ ضرور معلوم کروں گا کہ یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"یہ بھی بتا دوں گا میں آپ کو۔ پہلے مجھے آپ یہ بتا دیں کہ کیا سچ مچ آپ مجھ سے ملنے کے خیال سے آئے ہیں یہاں یا کوئی اور ہی خیال لے آیا ہے آپ کو یہاں تک؟ کسی کے تحفظ کا خیال یا کوئی ۔۔۔۔ کوئی اور ۔۔۔۔ ہی بات ۔۔۔؟"

اس کے اس سوال میں وہ سب کچھ تھا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس پر حملہ کرنے والی آسیہ ہی تھی۔ لاکھو لاشاری نے اسے پہچان لیا تھا مگر وہ جھیل گیا تھا اس کے اس وار کو ۔ اس کے ہاتھوں زخم کھانے اور اپنے دو بہترین آدمی گنوا دینے کے باوجود وہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ اتنی جگہ تھی آسیہ کے لیے اس کے دل میں، اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کبھی! پچھلی ملاقاتوں میں یہ تو معلوم ہو گیا تھا مجھے کہ وہ آسیہ کو اپنی شریکِ زندگی بنا لینا چاہتا ہے مگر اس کی وجہ یہی سمجھ رہا تھا میں کہ وہ اس طرح اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا تاوان ادا کرنا چاہتا ہے یا شاید اپنے بچّے کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس نے بتایا تھا مجھے کہ لاشاری خاندان کا خون گھر سے باہر نہیں جاتا کبھی۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ اب اس کا ازالہ بھی کر دوں گا میں اور ہر حالت میں اس بچّے کو اپنے ہی گھر میں دیکھنا پسند کروں گا۔ لہٰذا آسیہ کو اپنی شریکِ حیات بنانے کی اس خواہش کو میں اس کی مجبوری یا مصلحت ہی سمجھتا رہا تھا۔ اسی لیے میرا خیال تھا کہ آسیہ اس کی بیوی بن کر گھاٹے میں نہیں رہے گی۔ اس کے گھر میں اسے وہی مقام مل سکتا تھا جو کسی عورت کا اپنے شوہر کے گھر میں ہوتا ہے مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور نکلی تھی۔ لاکھو لاشاری تو سچ مچ آسیہ کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔ آسیہ جس قدر شدید نفرت کا اظہار کرتی تھی اس سے، اسی قدر لاکھو کی دیوانگی میں، اس کی چاہت میں شدت آتی جاتی تھی۔ ایسا صادق عشق تھا اس کا! میں حیران رہ گیا تھا۔ اس کے اس جذبے کو دیکھ کر میرا دل اس کی ہمدردی سے بھر گیا اور مجھے اس سے کوئی بات چھپائے رکھنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔

میں نے کہا "میں نہیں جانتا کہ تمھارے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا لیکن میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ تم مجھے ایک بھائی ہی کی طرح عزیز ہو اور یہ حقیقت ہے کہ میں تمھاری حفاظت ہی کے خیال سے آیا ہوں یہاں۔ میں نے کل شام کو کراچی سے فون کے ذریعے بات کی تھی لاہور، اپنی ماں جی سے۔ کل ہی مجھے آ.بی اور آسیہ کے جیل سے فرار کی خبر ملی تھی۔ یہ آ.بی کراچی آ گیا تھا مجھے ڈھونڈتا ہوا۔ اسی سے پتا چلا تھا کہ آسیہ لاہور میں ماں جی کے پاس ہے۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہو گیا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہیں آنے پاتی۔ ماں جی نے مجھے بتایا کہ وہ سکھر چلی گئی ہے کسی لاکھو لاشاری سے اپنا کچھ پرانا حساب صاف کرنے کے لیے۔ یہ معلوم ہوتے ہی ہم لوگ کار میں اِدھر دوڑ پڑے۔ خیال یہی تھا میرا کہ اگر آسیہ ابھی نہیں پہنچی ہے یہاں تو میں تمہیں اس کی طرف سے ہوشیار کر دوں اور جب وہ آئے تو اسے سمجھا بجھا کر اپنے غلط ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کروں مگر یار! تقدیر کو کون مات دے سکتا ہے۔ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وار کر گئی تجھ پر۔ کاش یہ خبر مجھے ایک دن پہلے مل گئی ہوتی۔"

لاکھو لاشاری کے چہرے پر میری باتیں سن کر تازگی سی آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل سے کوئی بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو اور وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہو اپنے آپ کو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے سائیں۔ ساری گرد صاف کر دی ہے آپ نے میرے دل کی۔ کتنا سکون ملا ہے اس وقت مجھے۔"

"میرا خیال صحیح ہے نا کہ تم پر اس ضدی اور بدنصیب آسیہ ہی نے گولی چلائی تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، بالکل صحیح اندازہ قائم کیا ہے۔ لیکن اس کو بُرے الفاظ سے یاد نہ کریں آپ۔ میں مجرم ہوں اس کا، بہت بڑا جرم کیا ہے میں نے۔ وہ جتنی بھی بڑی سزا اس کی مجھے دینا چاہے حق ہے اس کا، میں ہر طرح تیار ہوں اس کے لیے۔ مجھے تو اس کا بھی افسوس ہے کہ کل رات اس کی کوئی گولی میرا کام تمام کیوں نہیں کر گئی۔ وہ میرے دونوں آدمی میرے سامنے ڈھال کیوں بن گئے۔ انھوں نے اس کا سینہ ٹھنڈا کیوں نہیں ہونے دیا۔ آپ سے بھی میری یہی درخواست ہے جیلانی! اسے روکنے کی کوشش نہ کریں آپ۔ میں نے اسے اپنا کر اپنے جرم کا ایک طرح سے قصاص دینے کی کوشش کی تھی اسے لیکن اس نے منظور نہیں کیا۔ وہ مجھ پر اپنا خون معاف کرنے کو آمادہ نہیں ہے سائیں تو اسے سزا دے لینے دیں۔ مجھ پر بھی بڑا بوجھ ہے اپنے ضمیر کا، یہ بوجھ اُٹھا کر اب مجھ سے چلا نہیں جاتا جیلانی۔ آپ ہٹ جائیں درمیان سے، میں آپ کی بہن پر آنچ نہیں آنے دوں گا کوئی۔"

اس کی باتیں حیران کر رہی تھیں مجھے۔ بڑا عجیب آدمی ثابت ہو رہا تھا وہ۔ کتنا مختلف تھا اس کا باطن اس کے ظاہر سے، یہ تضاد تو ہمیں آج آدمی میں قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ اس دور میں ایسے لوگ کہاں ہیں جن کا دروں بروں بالکل یکساں ہو مگر وہ متضاد شخصیت رکھنے والے لوگ ایسے کہاں ہوتے ہیں۔ وہ تو بڑے بدباطن ہوتے ہیں۔ اپنے چہروں پر پارسائی کی نقاب ڈالے پھرتے ہیں۔ پیشانیوں پر سجدوں کے نشان سجا کر نکلتے ہیں گھروں سے مگر اندر سے بڑے سیاہ دل

ہوتے ہیں۔ جس کو ڈس لیتے ہیں، پانی نہیں مانگ پاتا وہ پلٹ کے۔ ایسے ہی شیش ناگ ہوتے ہیں یہ لوگ مگر یہ لاکھو لاشاری، یہ تو شے ہی کچھ اور تھی۔ اس کے اندر سے جو انسان برآمد ہو رہا تھا آج، ایسا انسان تو میں نے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ پیشہ اس کا لوٹ مار اور قتل و غارتگری رہا تھا اور کوئی نیک نامی اس کے حصّے میں نہیں آسکی تھی کبھی مگر اندر سے وہ کیسا بے داغ برآمد ہوا تھا! بالکل صاف صاف، اُجلا اُجلا۔ ایسے اُجلے اور صاف باطن لوگ کم ہی آتے ہیں اس دنیا میں اور جو آتے ہیں اس دنیا میں، انھیں دریافت کرنا بھی ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر دریافت ہو جاتے ہیں تو ولیِ کامل سمجھے جاتے ہیں اور اللّٰہ کے محبوب بندوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔ یہ لاکھو لاشاری بھی کوئی ایسا ہی بندہ تھا۔ ایک گناہ کر کے وہ جتنا پچھتا رہا تھا، جس قدر وہ پشیمان تھا اپنے اس گناہ پر، اور جس طرح اپنی جان دے کر بھی اس کا کفّارہ ادا کر دینا چاہتا تھا، ایسا میں نے پہلے تو کسی کو کرتے نہیں دیکھا تھا۔ دانستہ یا نادانستہ سرزد ہو جانے والے گناہوں پر ایسی بے کلی تو انھی کو ہوتی ہے جو اللّٰہ سے خوفزدہ رہتے ہیں اور جنھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ انھیں بالآخر اپنے ربّ کی طرف لوٹ جانا ہے اور ایک دن اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے اس ربِّ کائنات کو۔ ٹھیک ہے کہ اس کی زندگی کا بڑا حصّہ لوٹ مار میں گزرا تھا مگر آدمی کے تائب ہو کر راہِ راست پر آنے کی کوئی عمر تو مقرر نہیں ہے۔ جب بھی اس کا دل پھر جائے، جب بھی ہدایت مل جائے اسے، اس کی زندگی کا رُخ صراطِ مستقیم کی طرف مُڑ سکتا ہے اور شاید لاکھو ہدایت پا گیا تھا۔

میں نے کہا "لاکھو! تو مجھے بے حد عزیز ہے۔ میں تجھے کھونا نہیں چاہتا۔ اسی لیے دوڑا آیا ہوں اِدھر۔ جانتا نہیں ہے تو اس آسیہ کو، ضد کی پکّی لڑکی ہے۔ اپنی ذلّت کے احساس نے مار رکھا ہے اسے، اس نے قسم کھائی ہے تجھے اپنے ہاتھ سے گولی مارنے کی۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں، اسے قسم پوری کر لینے دیں اپنی۔ مجھے بالکل دکھ نہ ہوگا۔ میں تیار ہوں اس کے لیے۔"

"مگر میں بالکل تیار نہیں ہوں میرے یار! تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟ وہ سچ مچ جان لے لے گی تیری۔" میں نے زِچ ہو کر کہا۔

"میں جانتا ہوں، رات کے واقعے کے بعد تو اس میں شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے کوئی اور اب میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اگر وہ مجھے معاف نہیں کر سکتی تو میری جان لے کر اپنا دل ٹھنڈا کر لے۔ مٹا دے مجھ پنچ کو صفحۂ ہستی سے، کیسی ذلیل حرکت سرزد ہوئی ہے مجھ سے جو خود میرے سینے کی پھانس بن کر رہ گئی ہے۔ کیا معلوم تھا مجھے کہ ایسی غیرت مند لڑکی ہے وہ۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا میں نے کبھی کہ جیل کی چار دیواری میں ایسی بھی کوئی لڑکی قدم دھر سکتی ہے۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا اس بارے میں تو اپنی جان دے کر بھی حفاظت کرتا اس کی۔ ایسی جی دار اور غیّور لڑکیاں یوں مجھ جیسے کمینوں کے ہاتھوں رُسوا ہونے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔"

"اور وہ بچّہ کہاں ہے تمھارا؟ اسے کیوں اٹھوا لیا تم نے اس شب خیر کے پاس سے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ یہیں ہے میرے پاس۔ لاشاری کا خون ہے وہ۔ بھلا کسی طوائف کے پاس کیسے چھوڑ سکتا تھا میں اُسے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تو ٹھیک کہا ہے تم نے مگر میرا خیال ہے، وہ بچّہ اگر آسیہ کے حوالے کر دیتے تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ بچّے کو پاکر آسیہ تمھیں بھول جاتی۔ تم نے بچّے کو چھین کر اسے اور بھی بھڑکا دیا ہے۔ اس کے سینے میں دبی آگ کو ہوا دی ہے۔"

"میں مانتا ہوں آپ کی بات کو جیلانی۔ غلط نہیں کہا ہے آپ نے یہ، لیکن میری بھی تو مجبوری ہے کچھ۔ میں اپنے اجداد کی قائم کی ہوئی روایات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہوں میں۔ میرے گناہ کی جو بھی بڑی سے بڑی سزا چاہے دے لے مجھے، ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں مگر بچّے کو نہ مانگے مجھ سے۔ یہ ۔۔۔ [illegible] ہوں گا میں۔" لاکھو بولا۔

"ہوں۔" میں سوچ میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ آسیہ اگر میرے سامنے ہوتی تو میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا مگر وہ نہ جانے کہاں اس کی گھات لگائے بیٹھی تھی۔ اسے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ بھی ڈر تھا مجھے کہ میں اسے تلاش کرنے کے لیے لاکھو کی حویلی سے نکلا تو کہیں وہ میری غیر موجودگی میں اس کا کام ہی تمام نہ کر جائے۔ میں لاکھو کو اس کے ہاتھوں مرنے سے بچانا چاہتا تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ زمین پر اپنے لیے جگہ تنگ کرتی چلی جائے۔ میں اُسے دھرتی کے سینے پر چلتے پھرتے دیکھنا چاہتا تھا، پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتا تھا اور میرے خیال میں لاکھو لاشاری کی حویلی میں اس کی بقیہ عمر بڑے آرام سے گزر سکتی تھی۔ جن حالات سے وہ گزر کر آئی تھی، اس کے بعد اگر جلد ہی اسے کوئی گوشۂ عافیت میسّر نہ آتا تو اس کے لیے زیادہ دن کھلی فضا میں سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ پولیس کو اس کی تلاش تھی، اس پر جن سنگین الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا تھا، انہیں کوئی بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں لاہور اس کے

لیے محفوظ پناہ گاہ نہیں بن سکتا تھا۔ اسے کسی ایسی ہی گمنام جگہ رہنا چاہیے تھا جہاں کسی کا تصور بھی نہ پہنچ سکے اور ایسی جگہ میری نظر میں لاکھو کی حویلی کے سوا کوئی نہ تھی۔

میں نے لاکھو سے پوچھا "تمھارے خیال میں اس وقت آسیہ کہاں ہو گی؟ کچھ اندازہ ہے تمھیں اس کے بارے میں؟"

"نہیں، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ ویسے میں اگر معلوم کرنا چاہوں تو یہ مشکل نہیں ہے۔ وہ میرا گھوڑا لے کر گئی ہے۔ اگر میں اس کے خلاف قدم اٹھانا چاہتا تو اس کی اس غلطی سے فائدہ اٹھا کر اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسے خبر نہیں ہے کہ وہ اس گھوڑے کے ساتھ جہاں بھی جائے گی، سندھ کی جس شاہراہ اور جس بستی سے گزرے گی مجھے اس کی اطلاع مل جائے گی۔ میرا مشکی پورے سندھ میں پہچانا جاتا ہے۔ اس نسل کا کوئی اور گھوڑا کم از کم سندھ میں تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ اپنے علاقے کے کئی مقابلوں میں میرے مشکی نے انعامات جیتے ہیں۔ بچہ بچہ پہچانتا ہے اسے۔"

"پھر تم پتا کرو، وہ کہاں ہے اس وقت؟ میں اس سے مل کر اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں جیلانی! ایسا غضب کر بھی نہ دینا۔ میری حویلی کے لوگوں کو ابھی پتا نہیں ہے کہ وہ میرا گھوڑا لے گئی ہے۔ انہیں میں نے یہی بتایا ہے کہ خود میرے زخمی ہو کر گرنے کے بعد گھوڑا بھاگ گیا ہے کہیں۔" لاکھو نے جلدی سے کہا۔

میں نے ہنس کر کہا "کس خیال میں ہے تو بھائی؟ یہاں سب جانتے ہیں کہ تیرا گھوڑا آسیہ لے گئی ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں یہ! جب کہ میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں ہے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"اگر تم نے نہیں بتایا ہے تو شاید انھوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ گھوڑا آسیہ لے گئی ہے کیونکہ مجھے سیف علی نے یہی کہا تھا کہ تم پر جس عورت نے حملہ کیا تھا وہ تمھارے مشکی پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھر آئیں۔ وہ گھبرا کر بولا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کہا ہے اس سیف علی نے!"

"ہاں، یہی کہا تھا اس نے مجھ سے اور اس میں کسی بھی قسم کے شک و شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا اس نے بالکل بھی، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں پختہ یقین ہے کہ تمھارا گھوڑا آسیہ لے گئی ہے یا شاید کسی نے اسے اس گھوڑے پہ جاتے دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔ ناممکن نہیں ہے یہ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی نے بھی مجھ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔"

"ممکن ہے تمھاری حالت کے پیشِ نظر انھوں نے تمھیں بتانا مناسب نہ سمجھا ہو یا وہ اپنے طور پر اسے گھیر کر پکڑنا چاہتے ہوں تاکہ کسی مناسب موقعے پر اسے تمھارے قدموں میں لا ڈالیں۔ ان کا خیال ہو گا کہ تم ان کے اس عمل سے خوش ہو جاؤ گے۔"

"ہو سکتا ہے، یہ ہو سکتا ہے جیلانی! بہت ممکن ہے یہی سوچ رکھا ہو اس سیف علی نے۔ وہ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو بہت برا ہو گا جیلانی! یہ لوگ.... یہ لوگ کسی طرح بھی معاف نہیں کریں گے اسے۔ اس معاملے میں وہ میری بھی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ کچھ کریں جیلانی، خدا کے لیے کچھ کریں۔ انہیں روکیں، اس تک نہ پہنچنے دیں انہیں۔" وہ اداس ہو کے بولا۔

"میں انہیں کیسے روک سکتا ہوں لاکھو! یہ لوگ جب تمھاری بات نہیں سنیں گے تو میری بات کس طرح اثر انداز ہو گی ان پہ؟"

"پتا نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں جیلانی! میں کچھ نہیں جانتا کس طرح روکیں گے آپ انہیں۔ بس روک لیں کسی طرح بھی۔ کچھ بھی کریں۔ خون میں نہلا دیں ان سب کو مگر اس تک پہنچنے نہ دیں انہیں۔" وہ ادھر ادھر تکیے پر سر مارتے ہوئے ہیجانی انداز میں بولا "جائیں جیلانی! میرے بھائی جلدی جائیں، وقت نہ برباد کریں۔ اگر وہ پہنچ گئے اس تک تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے اس وقت اس کے پاس سے اٹھ جانا ہی مناسب جانا۔ حالانکہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اگر سیف علی نے آسیہ کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھا ہی لیا ہے تو اسے کیسے روک سکوں گا۔ میں نے لاکھو کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا میرے بھائی! جاتا ہوں میں اور دیکھتا ہوں جا کر کہ میں اس بدنصیب کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"جلدی جائیں جیلانی! اور اپنے اس یار آبی سے مشورہ کریں اس سلسلے میں۔ میرا خیال ہے وہ ضرور کوئی راہ نکال لے گا۔"

"ہاں، اسی کے پاس جا رہا ہوں میں۔ ممکن ہے وہ کوئی صحیح مشورہ دے دے۔" میں تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حویلی کا مہمان خانہ میں نے دیکھا ہوا تھا، وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کسی راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ لاکھو کے کمرے سے نکل کر میں سیدھا مہمان خانے کے سامنے جا ٹھہرا۔ آبی اس گھڑی شرافت علی کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول تھا۔ وہ کسی بہت ہی اہم مسئلے پر سر جوڑے

بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے اپنی اپنی نگاہیں سوالیہ انداز میں میرے چہرے پر جما دیں۔ میں آبی کے ساتھ اسی کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا ہے یار! ہماری تو ساری سوچیں غلط ثابت کر دی ہیں اس لاشاری نے۔"

"کیوں، کیا کہتا ہے وہ مہرانی بچہ؟" آبی نے لاکھو کو ایک نیا لقب دیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جو کچھ کہتا ہے اس سے ہمارے سارے اندازے منہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مجھے۔" میں نے کہا۔

"ادئے کچھ بک بھی تو، اصل بات تو بتا اس کی کس بات نے عقل اڑا دی ہے تیری؟ کیوں اتنا حیران پریشان ہو رہا ہے تو؟"

"وہ یار! اس پر جس عورت نے حملہ کیا تھا وہ آسیہ ہی تھی۔ اس نے پہچان لیا تھا اسے۔ یہی بتایا ہے اس نے مجھے۔"

"ادئے بیڑا غرق، یہ تو یار سچ مچ ہوش گم کر دینے والی بات ہے۔ وہ سیف علی سالا دھوکے سے کھینچ لایا ہے ہمیں یہاں۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ حویلی میں داخل ہوتے ہی ہماری مشکیں باندھ لینے کی کوشش ضرور کرتے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا جیلانی! کہنا کیا چاہتا ہے تو، ذرا صاف صاف کھل کے بات کر میرے یار۔ اٹک اٹک کیوں جاتا ہے بار بار؟"

"تو خود ہی بکواس شروع کر دیتا ہے درمیان میں۔ پوری بات بتانے کہاں دے رہا ہے تو۔ تھوڑی زبان کو لگام دے کے رکھ اپنی اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے پوری توجہ سے سن لے۔ پھر جتنی دل چاہے بکواس کرتے رہنا۔"

"اچھا، اچھا نہیں بولوں گا اب میں، بتا کیا بات ہے۔ یہ تقریر اور تمہید ختم کر دے تو بھی اپنی۔" آبی بولا۔

"لاکھو نے آسیہ کو پہچان لیا تھا۔ میں یہ بتا رہا تھا تمھیں۔" پھر میں نے ان دونوں کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو لاکھو نے مجھ سے کی تھیں۔ پھر کہا "مگر یار آبی! ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے میری۔ اس نے مجھے الجھا دیا ہے۔"

"کیا بات ہے؟ کون سی بات نہیں سمجھ پا رہا ہے تو، مجھے بتا شاید میں سمجھ لوں اسے۔" آبی نے کہا۔

"وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے کہ وہ حملہ آور عورت اس کے مشکی گھوڑے پر فرار ہوئی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو سیف علی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاکھو کا مشکی گھوڑا لے گئی ہے۔"

"یہ تو تو نے بالکل صحیح جگہ ہاتھ دھرا ہے.... کہیں وہ سالا فریب تو نہیں کر رہا ہے تجھ سے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر تمھارے گرد جال بن رہا ہو وہ؟ آدمی وہ بھی لومڑی سے کم عیار نہیں لگتا ہے مجھے۔"

"نہیں یار! اتنے تسلسل سے جھوٹ بولنا آسان کام نہیں ہے۔ ایسا آدمی بالکل نہیں ہے وہ۔ جو لوگ اس طرح جھوٹ بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنے بیان میں کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں رہنے دیتے، بڑے فن کار ہوتے ہیں وہ۔"

"تو نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس کے بتائے بغیر سیف علی کو کیسے معلوم ہو گئی یہ بات؟" آبی نے پوچھا۔

"پوچھا تھا میں نے اس سے بھی اور اس بات پر اس نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ بے چین ہو گیا تھا وہ یہ سن کر۔ اس نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ ہم سیف علی اور اس کے آدمیوں کو اگر اس گھوڑے کی تلاش سے نہ روک سکے تو وہ لوگ گھوڑے کے ساتھ ساتھ آسیہ کو بھی پکڑ لائیں گے۔ اس گھوڑے کے ساتھ وہ سندھ میں ہر جگہ ان کی نظروں میں ہو گی اور اگر وہ ہاتھ آ گئی ان کے تو یہ لوگ لاکھو کا پورا پورا انتقام لیں گے اس سے۔ اس وقت لاکھو بھی نہیں بچا سکے گا اسے۔"

"یہ تو بہت غلط بات ہو گئی ہے یار! ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیے اس سلسلے میں۔" شرافت علی فکرمندی سے بولا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیں کچھ کرنا چاہیے اس سلسلے میں مگر کرنا کیا چاہیے؟ اصل مسئلہ تو یہ ہے میرے بھائی۔ کچھ سمجھ میں آتا ہے تمھاری؟"

"ایک بات آئی ہے میری سمجھ میں جیلانی!" آبی بولا "ہم سیف علی سے اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس نے اب تک اس معاملے میں کیا کچھ کیا ہے۔ اگر ابھی تک اسے نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ حملہ آور کون تھی تو وہ ہم سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا پھر ہم اس کے بیان کی روشنی میں کچھ سوچیں گے۔"

"ہاں، یہ صحیح تجویز ہے۔" شرافت علی، آبی کی تائید کرتے ہوئے بولا "اگر اسے آسیہ کے بارے میں علم نہیں ہوا ہے تو ہم اس کی مدد کرنے کے بہانے خود بھی اس کی تلاش میں نکل جائیں گے۔ پھر اگر بات بگڑی بھی تو اس حویلی سے باہر وہ ہم پر اتنی آسانی سے قابو نہیں پا سکیں گے۔ کھلی جگہ پر تو ہم انہیں اچھی طرح سبق پڑھا دیں گے۔"

"ہاں، بات تو تم دونوں کی ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ٹھہرو، میں بلاتا ہوں اس سیف علی کو۔"

میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میرا رخ حویلی کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ مہمان خانہ حویلی کے بالکل عقبی حصے میں تھا۔ مین گیٹ پر پہنچنے کے لیے پوری عمارت کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ میں گھوم کر جیسے ہی سامنے پہنچا میری نظر گیٹ میں داخل ہوتی ہوئی پولیس جیپ پر پڑی جس کے پیچھے ایک عربی نسل کا چمکدار سیاہ گھوڑا چلا آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں تیزی سے واپس پلٹا اور دوڑتا ہوا دوبارہ مہمان خانے میں جا گھسا۔ "ادئے آبی! غضب ہو گیا یار! میرا خیال ہے انھوں نے آسیہ کو پکڑ لیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کس نے بتایا ہے تجھے؟" آبی چیتے کی سی

پھرتی سے اٹھ کر میرے پاس آگیا۔

"بتایا تو کسی نے نہیں، میں نے ابھی ابھی ایک پولیس کی جیپ کو حویلی میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ لاکھو کا وہ مشکی گھوڑا بھی ہے جس کے بارے میں لاکھو نے بتایا تھا کہ اسے آسیہ لے گئی ہے۔ اس گھوڑے کے ملنے کا مطلب تو یہی ہے کہ آسیہ بھی ہاتھ لگ گئی ہے ان کے۔ اتنا موقع نہیں تھا اس وقت کہ جیپ کا تفصیلی جائزہ لے سکتا۔ ورنہ یہ بھی معلوم کر لیتا میں۔"

"یہ معلوم کرنا تو بہت ضروری ہے۔ پتا کرو کسی سے۔ اگر اسے بھی پکڑ لائے ہیں یہ پلسیے تو ان سے دو دو ہاتھ کرنا پڑیں گے ہمیں۔"

اچانک باہر سے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے آبی سے کہا "جلدی سے چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ اور پستول ہاتھ میں رکھنا اپنے۔ شاید ضرورت پڑ جائے ہمیں اس کی۔" یہ کہہ کر میں جلدی سے چارپائی پر بیٹھ کر اپنے جوتے کھولنے لگا۔

آبی اور شرافت علی میری ہدایت کے مطابق تیزی سے اپنے اپنے بستروں میں جا چھپے۔ میں نے پستول اپنے ہاتھ کی پہنچ میں کر لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سیف علی ایک پولیس افسر اور دو سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ میں جوتے چھوڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "آؤ آؤ سیف علی! خیر تو ہے نا؟ کیا ان لوگوں نے حملہ آور کو پکڑ لیا ہے؟"

"نہیں سائیں! وہ تو ہاتھ نہیں آسکی ان کے مگر لاشاری سائیں کا گھوڑا لے آئے ہیں یہ۔" پھر وہ اپنے ساتھ آنے والے تھانیدار سے بولا "لیں جناب! مل لیں آپ ان سے۔ یہ ہاشم خان، پنجاب کے ایک زمیں دار ہیں اور اپنے سائیں کے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں اکثر یہاں۔ انہیں ہی دیکھا تھا آپ نے صبح سچل کے ڈیرے پر۔"

بڑا ہی پالتو قسم کا سانڈ تھا وہ تھانیدار۔ سیدھے سادے غریب دیہاتیوں پر رعب گانٹھنے کے لیے اس نے کوئی ایک ایک بالشت لمبی مونچھیں پال رکھی تھیں چہرے پر۔ مگر مالِ مفت نے اس کا پیٹ اتنا بڑھا دیا تھا کہ... سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اسے۔ گوشت کی ایسی فراوانی تھی اس کے جسم پر جسے دیکھ کر کسی جنگلی بھینسے کا تصور ابھر آتا تھا ذہن میں۔ وہ کچھ دیر بہت غور سے مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر میری طرف بڑھتے ہوئے بولا "بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے یہاں مل کر خان جی! لگتے تو آپ سچ مچ کسی علاقے کے زمیندار ہی ہیں۔ کون سا علاقہ ہے جناب آپ کا؟" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ایسا کوئی مشہور علاقہ تو نہیں ہے جی مگر شاید نام سنا ہو آپ نے۔ اُدھر بھارتی سرحد کے قریب چوگوٹھ نامی جگہ ہے وہ۔"

"اوہو۔ چوگوٹھ۔ جانتا ہوں میں، اخباروں میں نام پڑھا ہے اس جگہ کا میں نے مگر وہاں کے زمیندار کا نام تو شاید ڈھلوں پڑھا

تھا میں نے۔ ہاں، شاید کیپٹن ڈھلوں ہی نام ہے اُن کا۔ سیاسی آدمی ہیں وہ، یاد آگیا مجھے۔"

"ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب آپ۔ ضرور پڑھا ہوگا ان کا نام آپ نے۔ بہت چھپتا رہا ہے یہ نام اخباروں میں مگر حیرت کی بات ہے آپ نے ان کے قتل کی خبر اخباروں میں نہیں پڑھی۔ یا یاد نہیں رہی آپ کو؟"

"قتل! تو کیا قتل ہوگیا ہے ان کا؟ یہ خبر تو نظر سے نہیں گزری میری۔ کب کا واقعہ ہے یہ؟" وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"کافی پرانی خبر ہے یہ تھانیدار جی۔ حیرت ہے آپ کی نظر سے اتنے بڑے کیس کی خبر اوجھل ہوگئی۔ چچا تھے وہ میرے اور اولاد کوئی نہیں تھی ان کی، اس لیے ان کی کل جائیداد مجھے مل گئی۔ ورنہ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے زمینداری کا۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی تقدیر کی بات ہے ساری۔ اور آپ جیسے آدمی کے لیے تو یوں بھی ایک چوگوٹھ کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ پہلے ہی پورے پنجاب کے مالک ہیں۔ آپ کے قدموں کو تو پنجاب کا چپہ چپہ پہچانتا ہے جناب غلام جیلانی صاحب!"

اس نے یوں اچانک میرا نام لے کر مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ کوئی ایسا ہی پرانا پاپی تھا جس نے اپنے ذہن میں میری تصویر میرے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھی تھی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے وہ تصویر نکال کر میری صورت سے ملالی تھی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا تھا اور میں ابھی سنبھل بھی نہیں سکا تھا اس جھٹکے سے کہ اس نے اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "باندھ لو اس ڈکیت کو۔ سالا بڑا تیس مار خاں بنا پھرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ ادھر تھانیدار افضل بیگ کا بھی علاقہ پڑتا ہے۔ بچو! پہچان لے مجھے اچھی طرح سے۔ بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکو ڈر کو پہنچا دیا ہے میں نے۔ اندر پوچھ لینا ادھر جیل میں اگر مل جائے کوئی تو۔"

اس کا حکم سنتے ہی اس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہی تیزی سے میری طرف لپکے۔ میں نے پھرتی سے اٹھنا چاہا مگر اس گوشت کے پہاڑ نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت بہت مضبوط کر رکھی تھی۔ میرے ذرا سا اٹھتے ہی اس نے زور سے جھٹکا دے کر مجھے پھر چارپائی پر بٹھا دیا۔ اس کارروائی کے دوران وہ آبی اور شرافت علی کو بالکل فراموش کر بیٹھے تھے یا شاید انہیں سوتا ہوا جان کر اس نے یہ سوچا ہو کہ مجھے قابو کرنے کے بعد ان سوئے ہوئے آدمیوں کو باندھ لینا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا مگر اس بڑبولے کی یہ غفلت ہی اس کے گلے میں آپڑی تھی۔ وہ تینوں مجھے باندھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ آبی اچانک ان پر آپڑا۔ اس نے اپنا پستول تھانیدار کی گردن پر رکھ کر ایک سپاہی کے منہ پر الٹا ہاتھ مار کے کہا۔ "پرے ہٹو کتے کے بچو! اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو اس تھانیدار کی دُم کا کرسیاکرم کر دوں گا۔" وہ دونوں ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ سیف علی جو ابھی تک

ایک خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا، پانسہ پلٹتے دیکھ کر تیزی سے دروازے کی طرف مڑا مگر شرافت علی نے اس سے پہلے ہی جست کر کے دروازے سے باہر جانے کی راہ مسدود کر دی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے پستول سیف علی کی طرف سیدھا کر کے دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر چڑھا دی۔

میں نے ایک جھٹکا دے کر تھانیدار افضل بیگ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "افضل بیگ! تیرا واسطہ بڑے بڑے ڈاکوؤں سے پڑا ہے مگر کوئی مجھ جیسا پہلی بار ہی ٹکرا تم سے۔ میں چاہوں تو تم سب کی قبریں اسی کمرے میں تیار ہو سکتی ہیں مگر یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں کشت و خون پسند نہیں کرتا۔ جتنا ممکن ہوتا ہے بچنے کی کوشش کرتا ہوں اس سے ورنہ تم جیسے حرام خور میری نظر میں قابلِ گردن زدنی ہیں۔ کبھی بچ نہیں سکتے مجھ سے۔" پھر میں نے اپنا پستول نکال کر سیدھا کرتے ہوئے آبی سے کہا "آبی! انہیں باندھ کر ڈال دے ادھر ہی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں اس رذیل لاکھو کو چل کر۔ دھوکا کیا ہے اس کمینے نے ہمارے ساتھ۔ مکاری آگئی ہے اس میں، میزبانی کے آداب بھلا بیٹھا ہے وہ۔"

سیف علی نے گھگھیاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میرے آگے کر کے جوڑ دیے اور بولا "ایسا نہ کہیں سائیں! ان کا کوئی قصور نہیں ہے ان میں۔ انہیں تو کچھ پتا بھی نہیں ہے سائیں۔ سارا قصور میرا ہے۔ صرف میں مجرم ہوں آپ کا۔ مجھے آپ جیسی چاہیں سزا دے لیں مگر لاشاری سائیں کو نہ کہیں کچھ بھی۔ شہباز قلندر کی قسم سائیں جیلانی وہ بے قصور ہیں۔"

"اوئے لاشاری کے کتے! تو نے کیوں کیا تھا ایسا؟ ہم نے کون سی زمینیں داب لیں ہیں تیری ذلیل آدمی؟"

"اندھا کر دیا تھا مجھے انتقام کی آگ نے۔ لاشاری سائیں نے کچھ نہیں بتایا تھا جی مگر مجھے پتا چل گیا تھا کہ ان پر حملہ آپ کی بہن نے کیا تھا۔ بس اسی کا انتقام میں نے آپ سے لینے کی کوشش کی تھی۔ آپ میرے ٹکڑے کر دیں۔ چاہے کتوں سے بوٹیاں نچوا دیں میری مگر آپ کو اللہ کا واسطہ، لاشاری سائیں سے نہ کہیں کچھ بھی۔ وہ پہلے ہی بہت تکلیف میں ہیں۔"

اسی دوران آبی نے تھانیدار کو چارپائی کی پائینتی سے رسّی نکال کر باندھ دیا تھا اور ایک چادر پھاڑ کر اس کا کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس کر منہ پر چوڑی سی پٹی باندھ دی تھی۔ دونوں سپاہی اس صورتِ حال سے بے حد خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ انہیں شرافت علی نے دھمکی دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آبی تھانیدار افضل بیگ سے نمٹنے کے بعد ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا اور باری باری انہیں بھی باندھ کر ڈال دیا پھر وہ سیف علی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "اسے باندھ کر ڈالیں؟ میرا تو خیال ہے اس ذلیل کی

گردن اُڑا دینا چاہیے۔"

"جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے یار مگر اسے مار کے ہمیں فائدہ کیا پہنچے گا۔ لاکھو کے حوالے کر دیں گے ہم اسے، وہ جیسا چاہے سلوک کرے اس کے ساتھ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" پھر میں نے سیف علی کو مخاطب کیا "بک اوئے کھوتے دے پتر! دیکھ سچ سچ بتا دے ہمیں، کیا آسیہ کو بھی پکڑ لائے ہیں یہ لوگ؟"

سیف علی نے کہا "اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جیلانی سائیں! آپ کی بہن پولیس کے ہاتھ آگئی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟ کیا یہ لوگ ساتھ لائے ہیں اسے؟ لاکھو کا گھوڑا تو میں نے دیکھا ہے ان کے ساتھ۔"

"ہاں، وہ ساتھ ہی ہے ان کے۔ باہر جیپ میں بٹھا رکھا ہے اسے۔ یہاں یہ لوگ لاشاری سائیں سے شناخت کرانے کے لیے لائے ہیں اسے۔ سچ پوچھیں تو اسے دیکھ کر ہی میرے دل میں آپ کے خلاف نفرت جاگ اٹھی تھی۔"

"ٹھیک ہے، آؤ باہر چلو۔ ہم تمہارے ساتھ ہی اس جیپ تک چلیں گے اور خبردار کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو بہت بُرا ہوگا۔" میں نے اسے دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ شرافت علی نے دروازہ کھول کر اسے راستہ دے دیا۔

آبی اور شرافت علی بھی ہمارے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنا پستول جیب میں رکھتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ "اپنے اپنے پستول اس طرح رکھ لو کہ نظر نہ آئیں کسی کو مگر تم ضرورت کے وقت انہیں فوری طور پر استعمال کر سکو اور یہ دروازہ باہر سے بند کر دو۔ ابھی کچھ دیر تک کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے اس کمرے میں پڑے ہوئے لوگوں کے بارے میں۔"

آبی نے دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھائی اور تیزی سے لپک کر سیف علی کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پستول اس نے اپنی شیروانی کی جیب میں ڈال لیا تھا اور چلتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول کی نال سیف علی کی کمر سے لگا دی تھی۔ یوں ہم تینوں اسے اپنے جلو میں لیے حویلی کے مین گیٹ کی طرف چل دیے۔ پولیس کی جیپ مین گیٹ کے اندر حویلی کی عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی عقبی نشست پر دو سپاہی آسیہ کو اپنے درمیان لیے بیٹھے تھے۔ آج میں نے اپنی اس تیرہ بخت بہن کو کافی دنوں کے بعد دیکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا مجھے۔ صحت اس کی بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ راولپنڈی جیل میں اس نے جو صعوبتیں برداشت کی تھیں، اذیتوں کے جو سمندر عبور کر کے آئی تھی وہ، اس کی تمام علامتیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ اس کی وہ دودھ سے غسل کیے ہوئے گلاب جیسی رنگت کڑی دھوپ میں تپے ہوئے تانبے کی مانند ہو چکی تھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے، چہرے کی

ساری تازگی ماند پڑ چکی تھی اور جسم پر گوشت برائے نام ہی رہ گیا تھا. وہ شاخِ گل کی طرح نرم و نازک لڑکی وقت کی بھٹی میں پک کر مضبوط اور سخت جان ضرور ہو گئی تھی مگر اس کی نسوانیت کہیں گم ہو گئی تھی. گردشِ دوراں نے اس کی ساری آب و تاب چھین لی تھی اس سے. میرا دل خون ہونے لگا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر. یہ دن تو اس کے جھولنے پھولنے کے تھے مگر گردشِ ایام اسے کہاں کہاں لیے پھر رہی تھی. جن ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے ہونا چاہیے تھے، وہاں لوہے کی ہتھکڑیاں ڈال رکھی تھیں انہوں نے. میں نے تو ان ہاتھوں میں سہاگ کی چوڑیاں دیکھنا چاہی تھیں مگر میرے لالچی تایا کی حرص نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں سے واپسی کی راہ نہ اسے سجھائی دیتی اور نہ میں ہی کوئی عافیت کی راہ پا سکا تھا. ایک سپاہی نے اسکے ہاتھ میں پڑی ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں لپیٹ رکھا تھا اور دوسرا سپاہی رائفل گود میں رکھے پیر پھیلائے آرام سے بیٹھا تھا. آسیہ نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر شرمندگی سے گردن نیچے جھکا لی۔ دونوں سپاہی سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے. وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ ہم یا تو ان کے لیے تھانیدار افضل بیگ کا کوئی پیغام لے کر آئے ہیں یا ان کے قریب سے گزر کر آگے کہیں جانا چاہتے ہیں. یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ لاکھو پر اندھا دھند گولیاں چلا کر زخمی اور اس کے دو آدمیوں کو ہلاک کرنے والی خطرناک عورت کو وہ رات بھر کی تگ و دو کے بعد پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں. لاکھو ہی کی حویلی کے کچھ لوگ اسے ان کی قید سے آزادی دلانے آ سکتے ہیں. وہ اس حویلی میں ایسی کسی کارروائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور ان کا یہ اطمینان ہی ہمارا کام آسان کر گیا. جیپ کے قریب پہنچتے ہی سیف علی، آبی اور شرافت علی اس طرف بڑھ گئے جدھر وہ سپاہی آسیہ کی ہتھکڑی کی زنجیر تھامے بیٹھا تھا اور میں بندوق بردار سپاہی کی طرف ہو لیا. میں نے سپاہی کے پاس جا کر کہا. "یہ تم کس عورت کو پکڑ کر لے آئے ہو جوان؟ ایسی معصوم صورت عورتیں آگ اور خون کا کھیل بھی کھیل سکتی ہیں، یہ یقین ہے تمہیں؟"

سپاہی ہنس کر بولا. "اسکی معصوم صورت پر نہ جاؤ وڈیرہ سائیں، یہ بڑی خطرناک عورت ہے. جیل توڑ کر آئی ہے یہ؟"

"اچھا! حیرت ہے یار!" آبی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا. "تمہیں غلط فہمی لگی ہے یار. جیل توڑنا کسی اس جیسی عورت کے بس کی بات تو نہیں ہے. شیر کا جگرا چاہیے اس کام کے لیے. کسی نے بہکا دیا ہے بھائی تمہیں. یہ ایسی نہیں لگتی مجھے."

"نہیں جی، ہمارے تھانیدار افضل بیگ صاحب کی بات غلط نہیں ہوتی کبھی. بڑی یادداشت تیز ہے ان کی. ایک بار کسی کا نام سن لیں یا تصویر دیکھ لیں کسی کی تو پھر پچاس سال بعد بھی وہ بندہ ملے گا تو فوراً پہچان لیں گے اسے. اسے بھی دیکھتے ہی پہچان لیا تھا انہوں نے. راولپنڈی جیل سے بھاگی تھی یہ. اس کا ایک ساتھی بھی تھا جی، اسلم آبی. وہ بھی اس کے ساتھ ہی بھاگا ہے جیل توڑ کر اور اس کا ایک بھائی ہے غلام جیلانی۔ بہت مشہور ڈکیت ہے. بڑے قتل شتل کیے ہیں اس نے. بیگ صاحب کہتے تھے، وہ پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگا ہوا ہے. پولیس کے بھی بہت بندے مارے ہیں جناب اس نے."

وہ ایک معمولی سا سپاہی تھا اور ہمیں کوئی وڈیرہ سمجھ کر معلومات سے متاثر کرنا چاہتا تھا...... میں نے پوچھا. "تم نے غلام جیلانی اور اسلم آبی کو دیکھا ہے کبھی. سنا ہے ہر تھانے میں ہے ان کی تصویر. تو دیکھی ہو گی ان کی؟"

"نہیں جی، میں نے تو نہیں دیکھی ان کی تصویر کبھی. تو نے دیکھی ہے پیرو؟" اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو مخاطب کیا.

"لاؤ یار! یہ زنجیر مجھے دو اور اسے نیچے اتار دو، ذرا ہم بھی تو دیکھیں اس شیرنی کو، کیسے یہ کر لیتی ہے ایسے کام؟" آبی نے ہاتھ بڑھا کر آسیہ کے ہاتھ میں پڑی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑتے ہوئے کہا. "کسی شیرنی ہی کی اولاد معلوم ہوتی ہے مجھے تو یہ."

وہ سپاہی اس کے ہاتھ سے زنجیر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا. "نا جی نا! نیچے نہیں اتار سکتے ہم اسے. بڑی خطرناک عورت ہے یہ. بیگ صاحب سختی سے حکم دے کر گئے ہیں کہ نیچے نہ اترے."

آبی نے تیزی سے اس کا گریبان پکڑ کے جیپ سے نیچے کھینچ لیا اسے اور پستول نکال اس کے پہلو میں اس کی نال دھنساتے ہوئے بولا. "بیگ صاحب کے بچے! چھوڑ زنجیر، نہیں تو سینے میں کھڑکی کھول دوں گا سالے کے."

دوسرا سپاہی جلدی سے سنبھل کر بندوق اٹھاتے ہوئے بولا. "اوئے، یہ کیا بدمعاشی ہے قانون کے بندوں کے ساتھ......"

میں نے چیتے کی سی پھرتی سے اس کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ کر الگ پھینک دی اور اسے اپنے پستول کی زد پر رکھ کر کہا. "چپ کر او قانون کی اولاد! جانتا نہیں ہے تو ہمیں. آدمی کو آوارہ کتے کی طرح مار کے پھینک دیتے ہیں ہم."

آبی نے اس دوران دوسرے سپاہی کو قابو کر کے آسیہ سے کہا. "تم نیچے آ جاؤ آسیہ."

آسیہ نے اٹھ کر جیپ سے نیچے چھلانگ لگا دی. آبی نے اس سے کہا. "اوئے ہتھکڑی کھول اس کی. چابی کدھر ہے؟"

سپاہی اس ناگہانی افتاد سے پریشان ہو گئے تھے. انہیں کبھی ایسے حالات سے سابقہ نہیں پڑا تھا شاید. یوں بھی وہ قانون کے بندے تھے اور انہی کے سامنے شیر ہوتے تھے جو قانون کا احترام کرتے تھے. قانون شکنی کرنے والوں سے تو ہمیشہ دور ہی رہتے تھے وہ. ان کا یہ اصول ہی نہیں تھا کہ دنگے فساد میں کود کر اسے ختم کرنے

کی کوشش کریں. یہ تو فساد ختم ہونے کے بعد پکڑ دھکڑ کرنے کے عادی ہوتے ہیں کیونکہ فائدے والا کام یہی ہے. فساد کو روکنے سے کیس نہیں بن سکتا کسی پر جبکہ فساد کے بعد دونوں پارٹیاں مختلف دفعات کی زد میں آ جاتی ہیں اور اس وقت دونوں ہی سے کچھ نہ کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے. آج یہ ایک بالکل نئی بات ہو گئی تھی ان کے ساتھ. ایسے لوگوں سے واسطہ پڑ گیا تھا ان کا جو نہ ان کی وردیوں کے رعب میں آ رہے تھے اور نہ ہی ان کے اسلحے کی برتری قبول کر رہے تھے.

سپاہی نے اپنی لرزتی کانپتی ٹانگوں کو زمین پر جمائے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا. "چابی میرے پاس نہیں ہے، یہ دیکھیں جی، یہ لیں دیکھ لیں." اس نے جلدی جلدی آبی کے سامنے اپنی جیبیں الٹنا شروع کر دیں.

"پھر کس کے پاس ہے چابی؟ بول اوئے بندر کی اولاد؟" آبی نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا.

"وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلا گیا." وہ..... جناب...... وہ بیگ..... بیگ صاحب کے پاس ہے."

آبی نے شرافت علی سے کہا. "جا یار! دیکھ اس لال بیگ کے بچے کو. اس کی جیب میں ہو گی چابی."

شرافت علی پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا اس طرف چلا گیا جہاں ہم اس تھانیدار اور اس کے دونوں ماتحتوں کو گٹھری بنا کر ڈال آئے تھے. وہ سپاہی جسے میں نے پستول کی زد میں لے رکھا تھا کچھ بہادر معلوم ہوتا تھا. اس نے پولیس والوں کے مخصوص انداز سے ہمیں تنبیہ کی. "یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو. قانون سے ٹکر لینا بہت مہنگا پڑے گا تمہیں."

"تو فکر نہ کر میرے یار! ہم اب عادی ہو چکے ہیں یہ مہنگے سودے کرنے کے. کوئی نئی بات نہیں بتائی ہے تو نے ہمیں. اگر شروع ہی میں کسی تجھ جیسے نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہوتی تو آج اتنے آگے نہ بڑھ چکے ہوتے ہم." آبی ہنس کر بولا.

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر ارد گرد کا جائزہ لیا. حویلی کے کئی آدمی مجھے نظر آئے جو مختلف جگہوں پر کھڑے ہم لوگوں کو دیکھ رہے تھے. وہ شاید صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے صورتِ حال کا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم ان پولیس کے وردی پوشوں کی یہ درگت آخر کیوں بنا رہے ہیں. انہیں یہ بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس حویلی کا لاکھو کے بعد سب سے زیادہ با اختیار آدمی سیف علی اس سمے ایک قیدی کی طرح ہمارے درمیان موجود ہے. وہ اس کی موجودگی سے یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ لاکھو لاشاری کی مرضی اور اجازت سے کر رہے ہیں۔ انہیں اگر یہ شبہ بھی ہو جاتا کہ ہم نے سیف علی کو زیرِ حراست رکھا ہوا ہے تو وہ چاروں طرف سے ہم پر یلغار کر دیتے. آبی بھی شاید حالات کے اس رخ کو سمجھ چکا تھا. اس نے آسیہ کے ہاتھ میں پڑی ہتھکڑیوں کی زنجیر اس سپاہی کے گلے میں لپیٹ کر اسے کسی اڑیل جانور کی طرح کھینچتے ہوئے کہا. "اوئے جیلانی! انہیں وہیں لے چلتے ہیں ہم. ان کے افسرِ اعلیٰ کے پاس ہی ڈال دیں گے انہیں بھی. یہاں کھڑے ہو کر انتظار کرنے کا وقت نہیں ہے ہمارے پاس. جلد سے جلد کھنب چھڑا لینا چاہیے ہمیں ان سے."

میں نے بھی دوسرے سپاہی کا گریبان تھام کر اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا. "ٹھیک کہا یہ تو نے. چل بھئی آگے لگ جا تو." میں نے سپاہی کو دوسرا دھکا دے کر آگے بڑھایا. "ورنہ یاد رکھ، ہم نے بھی کچھ اصول وضع کر رکھے ہیں تم جیسوں کے لیے."

آبی نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا اور یہ نام سننے کے بعد وہ قانون کے دونوں بندے سمجھ چکے تھے کہ ان کا واسطہ کن لوگوں سے پڑ گیا ہے. لہٰذا انھوں نے مزید کوئی بات زبان سے نہیں نکالی. وہ دونوں ہی سعادت مند بچوں کی طرح ہمارے اشارے پر چلنے لگے. چند قدم چل کر میں نے محسوس کیا کہ سیف علی کے قدم ہمارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں. میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو پتا چلا کہ وہ اپنی رفتار سست کر کے ہم سے پیچھے رہ جانے کی کوشش کر رہا تھا اور نظریں اس کی حویلی کے ایک دور افتادہ گوشے میں کھڑے ہوئے ایک شخص پر مرکوز تھیں. میں نے اسے تنبیہ کی. "سیف علی! کوئی حرکت کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تیرے کسی آدمی کے ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی تیری روح ساتھ چھوڑ چکی ہو گی تیرے جسم کا. اس کام میں بڑی مہارت حاصل ہے ہمیں. یہ جو شہرت ہے نا ہماری، یہ ایسے ہی چڑیاں مار کر نہیں حاصل کی ہے ہم نے."

سیف علی نے جلدی جلدی قدم اٹھا کر ہم سے آگے نکلتے ہوئے کہا. "نہیں، نہیں، میں نے کوئی حرکت نہیں کی ہے. اگر کروں تو آپ بے شک گولی مار دیں. یہ دیکھیں میں آگے آگے چل رہا ہوں آپ لوگوں کے."

"بک نہیں اوئے. آواز نہیں نکلے تیرے منہ سے کوئی. سالے آواز سنا کے ہوشیار کرنا چاہتا ہے دوسروں کو."

مہمان خانے کے قریب شرافت علی واپس آتا نظر آ گیا ہمیں. اس نے بتایا کہ وہ تھانیدار افضل بیگ کی جیب سے چابی نکال لایا ہے. آبی نے اس کے ہاتھ سے چابی لے کر جلدی سے آسیہ کی ہتھکڑیاں کھول دیں اور اپنا پستول اسے تھما کر بولا. "ذرا گرد و پیش سے ہوشیار رہنا. ہم انہیں اسی ڈربے میں ہانک کر آتے ہیں جہاں ان کے دوسرے ساتھی بند ہیں."

آسیہ اسے جواب دیے بغیر مہمان خانے کے دروازے پر جم گئی. آبی اور شرافت علی دونوں سپاہیوں کو اندر ہانک لے گئے. میں بھی آسیہ کے ساتھ ہی باہر رک گیا. میں نے دروازے میں منہ ڈال کر آبی سے کہا. "آبی! اس سیف علی کو بھی ادھر ہی ڈال دے کہیں، باہر یہ ہمارے لیے کسی وقت بھی کوئی پریشانی کھڑی کر سکتا ہے. اسے ساتھ

لیے بھرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ دونوں کس طرح یہاں پہنچ گئے بھائی جان؟ آپ کو کس نے بتایا میرے بارے میں؟" آسیہ نے اُداس لہجے میں پوچھا۔

"ماں جی نے بتایا تھا مجھے، کل شام کو فون پر بات کی تھی میں نے ان سے۔ تُو نے ان کا بہت دل دکھایا ہے آسیہ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تجھے پہلے ہی وہ بہت دکھی رہتی ہیں اور سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی ہیں رب سے ہمارے لیے۔ آسیہ! یہ تو سوچا ہوتا تُو نے کہ ہم دونوں نے انہیں زندگی میں دکھوں کے سوا دیا ہی کیا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی جان مگر حالات نے ہمیں کچھ کرنے کا موقع ہی کب دیا ہے۔ وقت کی یہ خوف ناک آندھیاں جو ہمیں ادھر اُدھر اُڑائے پھرتی ہیں، ہمارے اختیار میں تو نہیں ہیں۔ یہ ہمارے قدم ٹکنے ہی کہاں دیتی ہیں۔"

"ہاں ٹھیک کہتی ہے تُو، یہ سب جو ہمارے ساتھ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے یا وہ جو ہم کرتے رہے ہیں، اس میں ہماری رضا شامل نہیں ہے، ہم تو خود کو حالات سے بچانے کے لیے ہاتھ پیر چلاتے رہے ہیں۔ بے شک اس میں ارادوں کا ہمارے کوئی دخل نہیں رہا ہے کبھی مگر اب تو تجھے نہیں نکلنا چاہیے تھا گھر سے، اب تو میں نے تیرے اور ماں جی کے تحفظ کے لیے ایک چھت فراہم کر دی ہے۔ تجھے ماں جی کے ساتھ وہاں بیٹھے رہنا چاہیے تھا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے بھائی جان مگر وہ کتا لاکھو لاشاری تو میرے سینے میں کسک دیتا رہتا ہے ہمیشہ، میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سُلا دینے کا عہد کیا ہے اور جب تک میں یہ عہد پورا نہیں کر لوں گی مجھے ایک پل بھی چین نصیب نہیں ہو سکے گا۔ مجھے یہ عہد پورا کر لینے دیں آپ، پھر میں آپ کا ہر حکم بے چون و چرا مان لوں گی، کبھی سرتابی نہیں کروں گی آپ سے۔"

"کیا تو اسے کسی طرح معاف نہیں کر سکتی آسیہ؟ میں نے پہلے بھی بتایا تھا تجھے کہ وہ بہت پشیمان ہے اپنی اس غلطی پر اور تجھے ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہتا ہے وہ۔ جن حالات سے گزر رہی ہے تُو، اس کے بعد اس سے بہتر ٹھکانا میسر آسکتا ہے تجھے کوئی؟ یہ بھی سوچا ہے کبھی تو نے؟ میں تو سمجھتا ہوں بہتر تو کیا اس سے بدتر جگہ ملنا بھی مشکل ہے تیرے لیے اب۔"

"ایسی باتیں نہ کریں آپ، میں بتا چکی ہوں آپ کو، اسے کبھی معاف نہیں کر سکوں گی میں اور اس رذیل کتے کی پناہ حاصل کرنے کے بجائے میں قبر کی پناہ کو ترجیح دیتی ہوں۔ یہ خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی میں۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

آبی اور شرافت علی نے باہر نکل کر دروازے کی کُنڈی چڑھا دی۔ آبی بولا۔ "اب ہمیں فوراً نکل چلنا چاہیے یہاں سے۔"

آسیہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ جائیں۔ میں اس کتے کے بچے کا حساب برابر کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر لاکھو لاشاری کی خواب گاہ کی طرف۔۔۔ اس نے اس حویلی میں چند دن گزارے تھے اور یہاں کے چپے چپے سے واقف تھی وہ۔ اسے کسی سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ لاکھو کہاں مل سکے گا اس وقت۔ میں حیرت سے منہ پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کر کے ایک دم قدم بڑھا دیے تھے اس کے لیے میں اس گھڑی بالکل تیار نہیں تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح اپنے ارادے سے باز رکھوں۔ آبی نے اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ "اوئے یار! کیا تک رہا ہے منہ پھاڑ کر، آگے بڑھ کر روک اسے۔ عجیب سیماب صفت لڑکی ہے کسی جگہ ٹکتی ہی نہیں ہے ذرا دیر بھی۔"

اس کے کہنے پر مجھے بھی جیسے ہوش آ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے لپکا۔ لاکھو کی خواب گاہ زیادہ دور نہیں تھی وہاں سے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی آسیہ کو روک سکتا، وہ جھپٹ کر اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے اندر جاتے ہی دروازہ بند کرنا چاہا مگر آبی جو میرے آگے آگے بھاگا جا رہا تھا، تیزی سے دروازے میں حائل ہو گیا۔ آسیہ اس سنہرے موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اس وقت اگر ذرا بھی تساہل کا شکار ہو گئی وہ تو پھر کسی اور موقعے کے لیے اسے دوبارہ جانے کتنا انتظار کرنا پڑے اور یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اسے اس انتظار کی مہلت بھی مل سکے یا نہیں۔ چنانچہ اس نے آبی کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش میں وقت برباد نہیں کیا۔ اسے یہ خدشہ رہا ہو گا کہ اگر اس نے دروازہ بند کرنے کے لیے زور آزمائی کی تو آبی کے مقابلے میں اس کا کامیاب ہونا تو ممکن نہیں تھا البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ زور آزمائی کے دوران آبی اسے پکڑ کر آگے بڑھنے اور پستول کو استعمال کرنے سے روک دے۔ اس نے آبی کو دروازے ہی میں چھوڑ دیا اور زخمی اور نڈھال بستر پر پڑے ہوئے لاکھو کی طرف دوڑ گئی۔

"پاگل مت بنو آسیہ! ہوش سے کام لو۔ ایک نیم جان شخص کی جان لے کر تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہو سکے گا۔" آبی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میری بات سنو آسیہ! رک جاؤ۔ یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔"

"پاگل میں نہیں تم لوگ ہو گئے ہو۔ تم سب جو مجھے ایک ذلیل اور نیچ آدمی کو اپنی زندگی میں شریک کر لینے پر مجبور کر رہے ہو۔ ان حالات میں تو اس کی موت اور بھی ضروری ہو گئی ہے میرے لیے۔" آسیہ نے کہا اور اس سے پہلے کہ آبی یا میں اس کے قریب پہنچتے، اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کر کے لاکھو پر گولی چلا دی۔

میں اور آبی دونوں ایک ساتھ اندر گھسنے کی کوشش میں

باہم اُلجھ کر رہ گئے۔ بس وہی ایک لمحہ جو ہمیں سنبھلنے میں لگا تھا بدنصیب لاکھو لاشاری کے لیے اجل کا پیامبر بن گیا۔ لاکھو لاشاری بستر میں لیٹا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آسیہ کے روپ میں موت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا مگر اس سے بچنے کی یا اسے روکنے کی بالکل ہی کوشش نہیں کی اس نے، وہ پہلے ہی اپنی زندگی آسیہ کے نام کر چکا تھا۔ موت کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ آسیہ نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے تھے اس پر۔ پہلی گولی لاکھو لاشاری کے بائیں شانے پر لگی اور وہاں سے لہو کا چشمہ اُبل پڑا لیکن فوراً ہی دوسری گولی اس کے سینے میں جا گھسی۔ دوسری گولی کھا کر لاکھو لاشاری بستر سے کوئی ایک فٹ اچھل کر دوبارہ بستر پر گرا تو تکلیف کی شدت سے اس کا جسم اینٹھنے لگا، اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ جاں کنی کے عالم میں بستر پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کے سائے لہرانے لگے تھے لیکن اس عالم میں بھی اس کی آنکھیں آسیہ کے چہرے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہونے سے پہلے آسیہ کا عکس اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

میں اور آبی دونوں ہی جہاں تک پہنچے تھے، ایک جھٹکے سے وہیں ہمارے قدم جم کر رہ گئے۔ دو گولیاں کھانے کے بعد لاکھو لاشاری کے جسم میں رہ ہی کیا گیا تھا جسے بچانے کی ہم کوشش کرتے۔ آبی کی ایک ذرا سی بے احتیاطی اس لاکھو لاشاری کی جان لے گئی تھی جس کے نام کا اس پورے علاقے میں ڈنکا بجا کرتا تھا کبھی۔ اس نے اپنا پستول آسیہ کے ہاتھ میں دے کر سخت غلطی کی تھی، بڑا ظلم کیا تھا لاکھو لاشاری پر۔ وہ کام جو رات کی تاریکی میں آسیہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکی تھی، اسے اس نے اب دن کی روشنی میں آبی کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔ ہم نے اسے بچانے کی اپنی سی کوشش تو بہت کی تھی لیکن لاکھو لاشاری کے نام کا پتّا ہی جھڑ چکا تھا، اس کے حصّے کی ساری سانسیں ہی مُک چکی تھیں اور اس کی زندگی کی ڈور کاٹنے کا کام آسیہ ہی کے سپرد تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تھانیدار افضل بیگ اسے گھسیٹ کر سیدھا یہاں نہ چلا آتا کہ چل بی بی! تیرا کام ابھی پورا نہیں ہو سکا ہے۔ رات کو تاریکی کی وجہ سے تُو اپنا کام نامکمل چھوڑ آئی تھی۔ دو آدمی تو تُو نے روانہ کر دیے ہیں عدم آباد کی طرف لیکن ابھی اس تیسرے کے، جو اصل آدمی ہے، کوٹے میں کچھ سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ تو ہمارے ساتھ واپس چل اور جب وہ اپنی سانسیں پوری کرے تو تُو بھی اپنی قسم پوری کر لینا، کوئی نہیں روک سکے گا تجھے، کیونکہ یہ کام تو تیرے ہی ہاتھوں انجام پانا ہے اور ایسا ہی ہوا تھا، اپنی انتہائی کوشش کے باوجود میں اور آبی لاکھو لاشاری کی زندگی برقرار رکھنے میں ناکام رہے تھے۔

یہ بھی تو اس سوہنے رب کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ جب کسی جاندار کی خدا کی طرف سے مقرر کردہ عمر تمام ہو جاتی ہے تو دنیا کا کوئی شخص بھی اس میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ انسان کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، دنیا کے کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس اب تک کوئی ایسی دوا نہیں پہنچ سکی جو ربِ دوجہاں کی طرف سے مقرر کی جانے والی زندگی کی مدت میں ایک پل کا اضافہ کر سکے۔ ایسی کوئی دوا تو وہ دانا و بینا حکیم لقمان بھی دریافت نہیں کر سکا تھا جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جنگل کی جڑی بوٹیاں اسے مخاطب کر کے خود بتایا کرتی تھیں کہ وہ کس کس مرض میں کام آتی ہیں۔

آسیہ نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائی تھیں اور ان گولیوں کی آواز نے حویلی میں موجود ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پوری حویلی میں یکایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ہر طرف سے لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ شاید وہ یہ نہیں جان سکے تھے کہ گولیوں کی آواز حویلی کے کس حصّے سے سنائی دی تھی، انہیں یہ اندازہ لگانے میں دشواری ہو رہی تھی، اسی لیے وہ اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ اچانک دو کڑیل جوان ہاتھوں میں رائفلیں تھامے، دوڑتے ہوئے اس کمرے میں گھس آئے جہاں ہم تینوں لاکھو لاشاری کے خون میں ڈوبے بے جان جسم کے ساتھ موجود تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے سب سے پہلے لاکھو لاشاری پر نظر ڈالی تھی اور اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں چند ثانیے کے لیے وہیں جم کر رہ گئیں، لاکھو کو اپنے ہی خون میں لت پت اور بے سُدھ پڑے دیکھ کر انہوں نے فوراً ہی حالات کا اندازہ لگا لیا اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنی رائفلیں سیدھی کر کے ہم پر تان لیں۔ اُن کی نظریں آسیہ کے چہرے پر ٹِک کر رہ گئی تھیں۔

اِن دونوں میں سے ایک کو میں پہچانتا تھا۔ اسے میں لاکھو کے ساتھ اس حویلی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ لاکھو کا دستِ راست تھا اور نام اس کا ممتاز بتایا تھا مجھے لاکھو لاشاری نے۔ آدمی وہ بڑا جی دار تھا اور ہر دم لاکھو لاشاری کے پسینے پر اپنا خون گرانے کو تیار رہتا تھا۔ دوسرا جو قد کاٹھ اور ہیئت میں کسی طرح بھی ممتاز سے کم نہیں تھا، میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو وہ میرے سامنے نہیں پڑا تھا یا شاید کہیں گیا ہوا تھا ان دنوں وہ، اس لیے نظر نہیں آیا تھا مجھے۔ لاکھو لاشاری نے اپنے اردگرد جو لوگ جمع کر رکھے تھے، وہ تقریباً سارے ہی اپنے اپنے فن میں طاق تھے اور جان دینے کو تیار رہتے تھے لاکھو پر۔ اجنبی لوگوں کے معاملے میں تو بہت حساس تھے یہ، مگر جس پر اعتبار کرتے تھے آنکھیں بند کر لیتے تھے اس کی طرف سے، یہی ایک کمزوری تھی ان میں، اسی کمزوری نے اس وقت لاکھو لاشاری کی جان لے

لی تھی۔ ہم پر ایسا ہی اندھا اعتبار کر لیا تھا انہوں نے۔ جس کی وجہ سے ہم پر نظر رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، ورنہ اتنی آسانی سے لاکھو شکار نہ ہو جاتا آسیہ کا۔

ہمیں اپنی رائفلوں کی زد پر رکھ کر ممتاز نے کڑک کر کہا: "جو جہاں ہے وہیں کھڑا رہے۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے کوئی ورنہ ہم اس کے جسم میں روشندان کھولنے میں ذرا دیر نہیں کریں گے اور یہ ہتھیار زمین پر ڈال دو اپنے اپنے۔"

میں نے جلدی سے کہا "کیا کرتے ہو ممتاز! دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ جلدی سے باہر جا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرو، وہ جس نے لاکھو کو گولی ماری ہے۔ ابھی ابھی باہر نکلا ہے یہاں سے۔ جلدی کرو وہ نکل نہ جائے کہیں۔"

مگر وہ دونوں بڑے ہی سدھائے ہوئے تربیت یافتہ تھے۔ کوئی اور ان کی جگہ ہوتا تو سوچے سمجھے بغیر میری بات سنتے ہی اُلٹے قدموں پلٹ کر باہر دوڑ پڑتا مگر ان پر تو جیسے اثر ہی نہیں ہوا تھا میری بات کا۔ وہ ہنوز اپنی جگہ پر جمے کھڑے رہے۔ ممتاز بولا "اس کی تم بالکل فکر نہ کرو، حویلی کے چپے چپے کی نگرانی ہو رہی ہے اس وقت۔ ہمارے سارے آدمی چوکنا ہیں اور ان کی ناکیں شکاری کتوں کی طرح اپنے شکار کی بو سونگھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان کی نظروں سے بچ کر اس وقت چیونٹی بھی حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔ تمہیں بھی ہم اطمینان کیے بغیر اس کمرے سے باہر نہیں جانے دیں گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ کیسا اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہو ہماری طرف سے؟ تم جانتے ہو ہم مہمان ہیں لاکھو لاشاری کے۔ کیا تم ہمارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"غصہ مت دکھاؤ جیلانی! یہ فرض ہے ہمارا کہ ہم حویلی میں موجود ہر آدمی کو چیک کریں، اس واقعے کے بعد یہاں موجود باہر کا ہر آدمی مشکوک ہو گیا ہے۔ اسے اپنے بے گناہ ہونے کا ثبوت تو دینا ہی ہو گا۔ اب مجھے یہ بتاؤ تم کہ یہاں تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ اور یہ پستول کیوں اٹھا رکھے ہیں تم نے اور تمہاری بہن نے اپنے ہاتھوں میں؟" ممتاز نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"ہم بھی تمہاری طرح گولیاں چلنے کی آواز سن کر ہی آئے تھے ادھر۔ اس کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہم نے ایک شخص کو پستول ہاتھ میں لیے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا، اس نے ہم پر نظر پڑتے ہی جلدی سے کہا "لاشاری سائیں کو کسی نے گولی ماری ہے، تم لوگ خیال رکھو ان کا، میں باہر جا کر دیکھتا ہوں کس کی حرکت ہے یہ اور کدھر گیا ہے وہ؟ یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف دوڑتا چلا گیا ہم نے اندر آ کر لاکھو لاشاری کی یہ حالت دیکھی تو ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ ہمیں فوری طور پر یہی خیال آیا تھا کہ ہم سے پہلے جو شخص یہاں سے گیا ہے یہ اسی کمینے کی حرکت ہے۔ قاتل وہی شخص ہے، ہمیں چکر دے کر نکل گیا ہے وہ۔ ہم اپنے پستول سنبھال کر اس کے پیچھے جانے والے تھے کہ تم دونوں آ گئے۔" میں نے جلدی سے ایک چھوٹی سی کہانی گھڑ دی۔

میرے خاموش ہوتے ہی آبی نے جھپٹ کر آسیہ کا ہاتھ تھاما اور اسے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

"ہاں یار! اب جلدی کرو، اس ذلیل آدمی کو حویلی سے باہر جانے کا موقع نہیں دینا چاہیے ہمیں۔ وہ ہماری طرح دوسروں کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔"

ممتاز آبی پر اپنی رائفل تان کر گرجا "خبردار! ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔ بچے نہیں ہیں ہم جو تمہاری ان باتوں میں آ جائیں گے ــــ میں نے کہا ہے نا اپنی بے گناہی کا یقین دلائے بغیر تم میں سے کوئی اس کمرے کا دروازہ پار نہیں کر سکتا۔ چلو جلدی کرو، خیریت چاہتے ہو تو اپنے یہ پستول زمین پر ڈال کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ عیار لومڑی کی اولاد ہماری کسی چال میں آنے کو تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہماری کوئی بات اس کے دل کو چھو تک نہیں رہی تھی، کوئی حربہ کارگر ہی نہیں ہونے دیتا تھا وہ۔ اس کی نظریں آسیہ پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آسیہ کے ارادوں سے پوری طرح باخبر تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہم جب لاکھو کی حویلی میں آئے تھے تو آسیہ ہمارے ساتھ نہیں تھی، حویلی کے وہ لوگ جنہوں نے ہمیں آسیہ کو پولیس کی تحویل سے آزاد کراتے دیکھا تھا اسے اس کے بارے میں بتا چکے تھے۔ یہ اسے معلوم ہی تھا کہ رات کی تاریکی میں لاکھو پر ایک عورت نے حملہ کیا تھا جس کی تلاش میں علاقے کی پولیس سرگرداں ہے اور پولیس جس عورت کو قرب و جوار کے کسی علاقے سے پکڑ کر لائی تھی، وہ وہی عورت ہو سکتی ہے۔ حالات کی کڑیاں ملانا اس جیسے آدمی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ آسیہ اور لاکھو کے جھگڑے سے بے خبر نہیں تھا وہ اور آسیہ جب کچھ دن یہاں رہی تھی تو اس نے دیکھا بھی تھا اسے اس طرح وہ اسے پہچانتا بھی تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ لاکھو کے ہاتھوں آسیہ کو کتنا اور کس کس طرح کا نقصان پہنچا تھا اب تک۔ اس کی نظر میں آسیہ کی حیثیت لاکھو کے ایک ایسے دشمن کی سی تھی جو لاکھو کی جان لینے کے درپے ہو اور جب ایک کھلا دشمن سامنے موجود ہو تو کوئی کسی مفروضے کے تعاقب میں کیسے دوڑ سکتا ہے؟ اس کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ

لگا لیا تھا کہ وہ ہمیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے۔ آسیہ اگر اس گھڑی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو وہ ہم پر شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بات آسیہ کی موجودگی نے بگاڑ دی تھی، اسی کو دیکھ کر بھڑک اٹھا تھا وہ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں اپنے کرتب دکھائے بغیر اس سے نجات حاصل کر سکوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شرافت علی کا خیال آ گیا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی اِدھر آیا تھا مگر اب وہ اس کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا تو وہ آسیہ کے گولی چلاتے ہی حالات کے رُخ کا اندازہ کر کے نکل گیا تھا وہاں سے یا پھر ان دونوں کے کمرے میں آنے کے بعد موقع پا کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اس کی مجھے اس سے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی مشکل صورت حال میں میرا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ اس نے اب تک اپنے کسی عمل سے یہ شک بھی نہیں ہونے دیا تھا مجھے کہ وہ موقع پرست اور بزدل شخص ہے لہٰذا دوسری بات ہی درست معلوم ہوتی تھی، وہ یقیناً ان دونوں... کو ہماری طرف متوجہ پا کر مناسب موقع کے انتظار میں کہیں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

آبی جو آسیہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر جانے کے لیے قدم اٹھا چکا تھا، ممتاز کی دھمکی سن کر رُک گیا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی کچھ کر گزرنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ یہ بات اس کے ہی نہیں، ہم سب کے لیے نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں جو ہم پر اپنی رائفلیں تانے، ہمیں قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے دھمکا رہے تھے کوئی سیدھے سادے شریف اور بے ضرر لوگ نہیں تھے اور نہ ہی وہ اپنے جسموں پر سرکاری یونیفارم سجا کر محض اپنی تنخواہیں سیدھی کرنے کی خاطر کسی دکھاوے کے مقابلے کے لیے آ کھڑے ہوئے تھے ہمارے سامنے۔ وہ رنگے سیّار لوگ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر سجائے پھرتے تھے، ہر گھڑی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارا کرتے تھے۔ آدمی کی زندگی کی انکے نزدیک نہ کوئی قیمت تھی نہ کوئی اہمیت۔ جب انہوں نے اپنی جان کی پروا کرنا نہیں سیکھا تھا تو کسی اور کی زیست سے کیا دلچسپی ہو سکتی انہیں۔ بے خطر سانپ کے بِل میں ہاتھ ڈال کر اس موذی کو باہر کھینچ لانے کی جرأت رکھتے تھے وہ، ایسے ہی ہاتھ پیر بچا کر، مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر وقت اور موقع کی مناسبت سے کام کرنے والے ہوتے وہ تو اس مقام تک کبھی نہ پہنچ پاتے۔ اس ممتاز کو لاکھو لاشاری نے ایسے ہی تو اپنا دستِ راست نہیں بنا لیا تھا۔ کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں اُسے ضرور نظر آئی ہوں گی اس میں جو ہر آدمی میں نہیں ہوا کرتیں۔ وہ خود بھی کچھ کم صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا ـــ بس دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا ـــ ورنہ وہ!... جس کا نام لاکھو لاشاری تھا، کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ بڑے معرکے سر کر رکھے تھے اس نے۔ طوطی بولتا تھا اس کا سندھ اور پنجاب کے خاصے وسیع علاقے میں۔ اس سارے علاقے میں ایک طرح کی حکومت قائم تھی اس کی۔ بڑے بڑے سرکش سر جھکا کے چلتے تھے اس کے سامنے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ ایسے سورماؤں کا انجام ہمیشہ عبرت ناک ہی ہوتا ہے۔ ایسے فیل مست قسم کے لوگوں کو اپنے انجام سے دوچار کرنے کا کام قدرت کسی چیونٹی جیسے حقیر بندے سے ہی لیا کرتی ہے، تاکہ جو طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر اپنا چلن کھو دیتے ہیں اور سینہ پھلا کر اور گردن اکڑا کر چلنا سیکھ لیتے ہیں اس زمین پر اور دھرتی کے سینے پر پیر پٹخ پٹخ کر دھما کے کرتے چلتے ہوئے یہ بھول ہی جاتے ہیں کہ ان سے بڑی بھی ایک طاقت ہے، ایک ایسی عظیم طاقت جسے ہر شے پر مکمل اختیار حاصل ہے، اسے اپنے بندوں کا غرور بالکل ناپسند ہے اور جو اس کی عطا پر اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے اپنے زورِ بازو پر نازاں رہتے ہیں، ان کے انجام سے عبرت پکڑیں لیکن اس دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں رہتی کبھی، جو ایسے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں، کسی شخص کے عبرتناک انجام پر اسے تحقیر سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں 'بڑا بے وقوف تھا ایک کمزور اور ناتواں سے شکست کھا گیا۔ ہم ایسے ہرگز نہیں ہیں، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا، ہمیں تو کوئی جواں مرد بھی زیر نہیں کر سکتا اور پھر یہی زعم، یہی غرور انہیں بھی چاٹ جاتا ہے کسی روز۔ اور انہیں اپنے قابلِ عبرت انجام پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور وہ ممتاز بھی ایسے ہی کوتاہ بین، کند ذہن اور عاقبت نااندیش لوگوں میں سے تھا۔ وہ اپنے سرپرست یا سردار "لاکھو لاشاری" کے انجام سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ہمارے سامنے سینہ تانے کھڑا تحقیر آمیز نگاہوں سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں تجھے کبھی نہیں بھول سکتا آسیہ! کسی رنگ، کسی روپ میں بھی میری آنکھیں تجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتیں۔ تُو پہلے بھی اس حویلی کو دو کڑیل شیر جوانوں سے محروم کر گئی تھی اور آج تو تُو نے اسے بالکل ہی ویران کر دینے کا بندوبست کر دیا ہے۔ تیری خوش قسمتی تھی کہ اس روز میں یہاں موجود نہیں تھا اور یہ لاشاری، ہمارا یہ شیر سردار، یہ تو ہمیشہ ہی تیرے سامنے گیدڑ بن جاتا تھا، اس کی اسی کمزوری نے آج اسے اس

انجام سے دوچار کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے رات کو بھی تو ہی تھی جو ہمیں اپنے دو نوجوانوں سے محروم کر کے لاکھولا شاری کو نیم جاں کر گئی تھی۔ آدھی جان تو تو نے اسی کی رات ہی کو نکال لی تھی۔ بقیہ آدھی اب نکال لی ہے۔ کیوں غلط تو نہیں کہا میں نے؟ جناب غلام جیلانی صاحب! یہ آپ کی بہن ہی کا کارنامہ ہے نا؟"

اس سے پہلے کہ میں آسیہ کی طرف سے صفائی میں کچھ کہتا' آسیہ خود ہی بول اٹھی "ہاں' بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے تو نے۔ یہ میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا ہے اور اب مجھے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرا انجام کیا ہوتا ہے۔ ہاں اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ اسے میرے ہاتھوں ہی مرنا تھا کیونکہ میں نے قسم اٹھائی تھی اس آوارہ کتے کو اپنے ہاتھ سے گولی مارنے کی اور آج میں نے وہ قسم پوری کر دی ہے۔ اس کے بغیر مر جاتی اگر میں تو یہ حسرت ساتھ ہی لے جاتی اپنے اور یہ خلش مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتی' یہ کانٹا وہاں بھی میرے دل کو تکلیف ہی دیتا رہتا۔ اب کوئی خلش نہیں ستائے گی مجھے۔"

"یار غلام جیلانی! دیکھ رہا ہے تو؟ تجھ سے تو یہ تیری بہن زیادہ جی دار ہے کہ اپنے جرم کا یوں اعتراف کر رہی ہے' ایک تو ہے کہ کسی طرح مان کے ہی نہیں دیتا تھا یہ بات۔ مسلسل پردہ پوشی کی کوشش کر رہا تھا مگر ہم بھی کوئی پڑیاں تو نہیں مارتے رہے ہیں اب تک۔ بندے مارے ہیں ہم نے بھی۔ تیرے جیسے جیالوں کے جبڑے ہی چیرتے آئے ہیں ہم۔ اب کیا خیال ہے تیرا؟"

میں نے آگے بڑھ کر ان دونوں کی رائفلوں کے سامنے حائل ہوتے ہوئے کہا "جو ہونا تھا ہو گیا' تو اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کر ممتاز' یہ آسیہ اور لاکھولا شاری کا بالکل ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے بچے! ایک بار اس کا داؤ چل گیا تھا تو اس نے اپنی من مانی کر لی تھی' اس مرتبہ آسیہ کا داؤ چل گیا اور اس نے اپنے دل کی کر لی۔"

"ہاں' یہ بات تیری ایک حد تک ٹھیک ہے مگر اب یہ معاملہ ان دونوں کا نہیں رہا ہے۔ لاکھولا شاری زندہ ہوتا تو وہ اسے معاف کر دیتا یا مار دیتا' ہم درمیان میں دخل اندازی بالکل نہیں کرتے مگر اب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اس صورت میں فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔ اس کی غیر حاضری میں میں اور سیف علی ہی فیصلے کرتے رہے ہیں ہمیشہ۔ آج بھی ہم دونوں ہی فیصلہ کریں گے اور ہم تیری بہن سے پورا پورا انصاف کریں گے جیلانی!" وہ مضحکہ اڑانے کے انداز میں بولا۔

"مان لے یار! میری بات کو' ابھی کچھ دیر پہلے ہم اس آسیہ کو بھی یہی سمجھاتے رہے تھے کہ یہ لاکھولا شاری کو معاف کر کے اس کی دوستی قبول کر لے' بخش دے اس خطا کار کو مگر شاید لاکھولا شاری اوپر سے زندگی ہی اتنی لکھوا کر لایا تھا جو اس نے ہماری کسی بات کو قابلِ اعتنا نہیں جانا اور ہماری ہر دلیل مسترد کر کے لاکھولا شاری پر اجل بن کر آ گری۔"

"اور اگر میں بھی تیری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟" میں نے تیوری چڑھا کر حقارت سے کہا۔

"تو میں یہی سمجھوں گا کہ تیری بھی حیاتی کے دن مک گئے ہیں۔ تیرا بھی بلاوا آ گیا ہے اوپر سے۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "لگتا ہے تیرا کسی زور آور سے سابقہ ہی نہیں پڑا ہے اب تک' بچہ سمجھ رہا ہے تو ہمیں"

"میرا بھی یہی خیال ہے تیرے بارے میں' شاید غلام جیلانی کو جانتا ہی نہیں ہے تو۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

آبی کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ تڑخ کر بولا "اوئے ... کی بک بک لائی اے۔ ہٹ پرے میں دیکھتا ہوں اسے۔"

وہ مجھے ایک طرف دھکیل کر چیتے کی سی تیزی سے ممتاز پر جا پڑا۔ اسے حرکت میں آتے دیکھ کر ممتاز اور اس کے دو ساتھی نے بیک وقت اپنی اپنی رائفلوں کی لبلبی پر زور ڈالا تھا مگر وہ تو اپنی جگہ سے جنبش تک کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ دونوں رائفلوں کی اس بے وفائی پر حیران بھی نہ ہو سکے تھے ... طرح کہ آبی نے انہیں ٹکریں مار مار کر زمین بوس کر دیا۔ ان ... گرتے ہی آسیہ نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس ... پہلے کہ میں اس کی طرف متوجہ ہوتا وہ دروازے سے باہر نکل کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے جھپٹ کر ممتاز کے ہاتھوں سے اس کی رائفل چھین لی اور آبی سے کہا۔

"اوئے آبی! جلدی کر' وہ آسیہ باہر نکل گئی ہے۔ دوسری رائفل تو سنبھال لے اور آ جا جلدی سے۔"

میں رائفل ایک ہاتھ سے سنبھال کر دوسرے ہاتھ ... پستول اٹھائے آسیہ کے پیچھے دوڑا۔ آبی نے بھی ذرا سستی نہیں کی تھی۔ وہ میری بات سنتے ہی دوسرے آدمی کی رائفل چھین کر میرے ساتھ ہی ساتھ دروازے سے باہر نکلا تھا۔ باہر ... ہی اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میں مہمان خانے کی طرف لپکا کیونکہ آسیہ کو میں نے ادھر ہی جاتے دیکھا تھا۔ پوری حویلی میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لاکھولا شاری کے مسلح جوان حویلی کے چاروں طرف بھاگے پھر رہے تھے۔ انہیں اندر کا خیال نہیں آیا تھا' یا پھر شاید ان لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ باہر کا خیال رکھیں اور کسی اجنبی کو حویلی سے نہ نکلنے دیں۔ مہمان خانے کے جس کمرے میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا جہاں ہم نے تھانے دار افضل بیگ' اس کے ساتھی ... سیف علی کو باندھ کر ڈالا ہوا تھا' اس کا دروازہ اب بھی باہر سے بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی تک کسی کا اس طرف گزر نہیں ہوا تھا۔ ہم ادھر سے گزر کر دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ اسٹین گن سے گولیاں چلنے کی آواز سن کر ایک دم ٹھٹک گئے۔ میں نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے آبی کی طرف دیکھا وہ بولا۔

"حویلی کے سامنے والے حصے سے یہ آواز آ رہی ہے شاید آسیہ کو باہر جانے سے روکنے کے لیے وہ لوگ اسٹین گن سے گولیاں برسا رہے ہیں اس پر۔ احتیاط سے چوکنا انداز میں آگے بڑھو اور کسی آڑ سے اسٹین گن والے کو دیکھو' ہمیں ہر حالت میں اسے روکنا ہے تاکہ آسیہ سلامتی کے ساتھ باہر نکل سکے۔ میں یہاں آس پاس نظر رکھے ہوئے ہوں تاکہ کوئی تم پر پیچھے سے وار نہ کر سکے۔ جا یار! جلدی کر' سوچنے کا وقت نہیں ہے یہ' آسیہ کی زندگی خطرے میں ہے۔"

میں نے بہت محتاط انداز میں باہر کا جائزہ لیا' اس طرف ان کا کوئی آدمی اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے آسیہ پر نظر پڑتے ہی وہ سب کے سب اسی کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں اور اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کیونکہ اسٹین گن کے ساتھ ہی وقفے وقفے سے پستول اور رائفل چلنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں مطمئن ہو کر باہر نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں سے گھوم کر حویلی کے سامنے اس کے مین گیٹ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ موڑ کاٹ کے ایک دم سامنے جانے سے پہلے میں نے ایک دیوار کی آڑ سے تھوڑا سا سر نکال کر اس حصے کا جائزہ لینا ضروری سمجھا جدھر یہ فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہاں حویلی کے محافظوں نے آسیہ کو روکنے کے لیے فائرنگ شروع کی ہوئی ہے لیکن اب معلوم ہوا تھا کہ وہاں تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔ میرے بالکل سامنے شرافت علی کی کار کھڑی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان بمشکل پچیس گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔ کار کی آڑ میں شرافت علی اسٹین گن لیے بیٹھا حویلی کی جانب گولیاں برسا رہا تھا۔ وہ کسی تربیت یافتہ فوجی کی طرح اس تواتر سے فائرنگ کر رہا تھا کہ اس کے کسی مقابل کو سامنے آ کر جوابی کارروائی کرنے کی مہلت ہی نہیں مل رہی تھی۔ گولیوں کی اس برکھا میں کس کی ہمت ہو سکتی تھی کہ اس کا سامنا کر سکے۔ لاکھولا شاری کے آدمی ادھر ادھر چھپے ہوئے محض اندازے سے اکا دکا فائر کر رہے تھے۔ وہ سارے کے سارے حویلی کے اندر جمع ہو گئے تھے۔ باہر کہیں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ حویلی کے سامنے چار دیواری میں آمد و رفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جسے چھوٹے بڑے لکڑی کے معمولی تختوں سے بنا کر مٹی کی کچی دیواروں میں نصب کر دیا گیا تھا۔ اسی دروازے کو حویلی کا مین گیٹ کہا جا سکتا ہے۔ عام طور پر وہاں ایک شخص محافظ کے طور پر ہر وقت موجود رہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس وقت وہاں وہ محافظ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جہاں کھڑا تھا' وہاں حویلی کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ میرے بائیں جانب کوئی پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں وہیں کھڑا صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے آسیہ کو دوڑتے ہوئے شرافت علی کی کار کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ حویلی کے دروازے سے نکل کر ادھر جا رہی تھی۔ شرافت علی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھتے ہی عمارت کی طرف اندھا دھند کئی فائر جھونک مارے تھے۔ اس طرح وہ آسیہ کو بحفاظت اپنے پاس پہنچنے کا موقع دینا چاہتا تھا' اور اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ آسیہ کو شرافت کے قریب پہنچنے تک کسی نے حویلی کی طرف سے .... نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آسیہ نے شرافت علی کے پاس بیٹھ کر اس سے کچھ کہا۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میں یہ نہیں جان سکا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

شرافت علی کی نظریں اب بھی حویلی کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں' اس کی اسٹین گن بھی اسی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ آسیہ کی بات کا جواب دے کر اس نے حویلی کی طرف ایک اور فائر کیا۔ اس بار گولی چلتے ہی میں نے حویلی کے دروازے میں کسی کے کراہ کر گرنے کی آواز سنی' یہ آواز سن کر میں اپنی جگہ سے نکل کر سامنے آ گیا اور اس طرف دیکھا جہاں وہ شخص گولی کھا کر گرا تھا۔ حویلی کے دروازے کے سامنے کوئی جوان اپنے خون میں لوٹ رہا تھا۔ وہ شاید آسیہ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں آ پہنچا تھا اور حالات کو سمجھے بغیر بے خطر باہر آنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس دروازے کی دہلیز کے پار اجل اس کی گھات لگائے بیٹھی ہے۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں جا اتری تھی' وہ جاں کنی کے کرب سے دوچار تھا اور وہ اسٹین گن جس سے وہ آسیہ کو شکار کرنے دوڑا چلا آیا تھا' اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گری تھی۔ میں نے چند قدم شرافت علی اور آسیہ کی طرف بڑھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل آسیہ کی طرف اچھالتے ہوئے کہا "یہ رائفل تو سنبھال لے آسیہ! میں اس جاں بلب شخص کی اسٹین گن لے کر آتا ہوں۔"

رائفل آسیہ کی طرف پھینک کر میں حویلی کے دروازے پر پڑے ہوئے شخص کی طرف بڑھا تو شرافت علی نے گھبرا کر آواز دی "کیا کر رہے ہو جیلانی! ادھر نہ جاؤ۔ اندر سے کوئی تمھیں نشانہ بنا سکتا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے اور اطمینان سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ زخمی کے قریب جا کر میں اس کی اسٹین گن اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو حویلی کے دروازے کے اندر سے کسی نے للکار کر کہا "خبردار جوان! اسٹین گن کو ہاتھ نہ لگانا' ورنہ بھیجہ اڑا دوں گا۔"

میں نے نیچے جھکے ہی جھکے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ اندر دو آدمی اسٹین گن میری طرف سیدھی کیے کھڑے تھے۔ وہ جہاں کھڑے تھے، وہاں انھیں میں تو دیکھ سکتا تھا مگر شرافت علی اور آسیہ کی نظریں ان تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ دونوں بھی شاید اس باہر پڑے ہوئے شخص کے پیچھے ہی پیچھے وہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے آگے چلنے والے کا حشر دیکھ کر وہاں رک گئے تھے۔ بڑے پلے ہوئے سوَر تھے وہ دونوں، اور چہروں سے ان کے ہیبت برستی نظر آتی تھی۔ سر پر سندھی انداز کے بڑے بڑے پگڑ لپیٹ رکھے تھے انہوں نے اور ماتھے، ناک اور آنکھوں کے سوا پورے چہرے کو گھنی داڑھی اور مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں نے ان کی دھمکی کو نظرانداز کر کے اسٹین گن اٹھالی اور اُسے ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے اُن کی طرف بڑھنے لگا۔ میری اس بے خوفی نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے بیک زبان ایک بار پھر مجھے تنبیہ کی۔ ”رک جا جوان! کیوں اپنی جان دینے پر تُل گیا ہے۔ فوراً یہ اسٹین گن پھینک دے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم جانتے نہیں ہو شاید مجھے، میں لاکھو لاشاری کا مہمان ہوں غلام جیلانی۔“

”جانتے ہیں ہم تجھے بھی اور تیری بہن کو بھی، جو ابھی ابھی باہر نکلی ہے اور اُس نے ہمارے اس آدمی کو گولی ماردی ہے۔“ اس نے باہر پڑے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے حویلی کے اندر بھی گولیاں چلنے کی آوازیں سُنی تھیں۔ وہ بھی شاید اسی نے چلائی تھیں، سائیں ممتاز گیا ہے دیکھنے۔“

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”جوانو! میری بات مانو، اس خون خرابے سے کسی کو بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ جو جس کے لیے لکھ دیا گیا تھا، وہ پورا ہوا، اب بھول جاؤ اس بات کو۔ مٹی ڈالو یارو! اس پر، بات مت بڑھاؤ۔“

”کیا مطلب ہے تیرا جیلانی! کیا کہنا چاہتا ہے تو؟ کس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ کھل کے بات کر۔“ اُن کے چہرے تاریک ہو گئے۔

”میرا مطلب اس واقعے سے ہے جو اس حویلی میں ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ جس کی آجاتی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا یا فیصلہ ہونی کو ٹالنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کدورت دھو ڈالو اپنے دلوں سے اور مان لو کہ اُس سوہنے رب کو یہی منظور تھا۔“

وہ دونوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے تک رہے تھے، ان کے دماغ جیسے سُن ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ یا تو سچ مچ میری باتوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے یا جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ میں ابہام ختم کر کے لاشاری کے بارے میں بالکل سیدھے اور صاف الفاظ میں بات کروں، کھل کر بتا دوں اُنھیں کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔ کیا حویلی میں کوئی سنگین واقع ہوا ہے؟ کیا آسیہ نے لاشاری کو...“

”ہاں، یہی کہہ رہا ہوں میں تم سے۔ ان دونوں کا جھگڑا نمٹ گیا ہے آج۔ آسیہ نے اپنا سینہ ٹھنڈا کر لیا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”حالاں کہ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ اُس کا انجام یہ نہ ہو، مگر تقدیر سے کون لڑ سکا ہے آج تک۔“

”تو اس نے لاشاری سائیں کو مار دیا ہے اور تم آئے ہو بچانے چلے، ہتے ہو ہمارے ہاتھوں سے، ہٹ جا ہمارے سامنے سے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ شیر کی کچھار میں گھس کر کوئی اس کا شکار کرے اور سلامت نکل جائے۔ ہم اسے زندہ نہیں جانے دیں گے۔“

”ایسا نہ کہو یارو! جوش میں مت آؤ، خون کا اُبال آدمی کو بربادی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ گرم خون کبھی صحیح سمت میں رہنمائی نہیں کرتا۔ اُسے ٹھنڈا ہونے دو، پھر کوئی فیصلہ کرنا، جلد بازی سے کام نہ لو اور جو کچھ بچ گیا ہے، اُسے بچا ہی رہنے دو۔“

”او نئے تو بزدلی کا سبق پڑھانے آیا ہے ہمیں یا اپنی بہن کو بچانے کے لیے ہمیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم تیری باتوں میں آنے والے نہیں ہیں اور سلامت تو ہم تجھے بھی نہیں جانے دیں گے۔ پولیس سے تو تُو نے ہی چھڑایا تھا اُسے۔ پہلے تیرا قصہ ختم کر دیتے ہیں ہم۔“

انھوں نے اپنی اپنی اسٹین گنیں سیدھی کر کے مجھے زد پر لے لیا مگر وہ خوف ناک گنیں میرے سامنے زبان کھولنے کو کسی طرح آمادہ ہو سکتی تھیں، وہ دونوں اُن سے اُلجھ رہے تھے انہیں گولیاں اُگلنے پر مجبور کر رہے تھے مگر انہیں تو جیسے پالا مار گیا تھا، زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں تھیں ان کی، ساری گھن گرج بھول گئی تھیں وہ۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یارو! کیوں اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہو۔ میری موجودگی میں یہ تمہارا کوئی اشارہ نہیں سمجھیں گی، ان کے کل پُرزے زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ اس گھڑی کو صبر و سامت کرو۔“

ان کی حالت دیدنی تھی۔ انھوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ یہ تابعدار ہتھیار جو اپنے مالک کی انگلی کے اشارے پر حرکت میں آجانے کے عادی ہوتے ہیں، جن کی دیکھ بھال میں سُستی نہیں برتتے، جنہیں بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ہر روز اُن پر اپنا خاصا وقت صَرف کرتے ہیں۔ وقت پڑنے پر یوں اچانک اُن سے بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔ وہ بُری طرح جھنجلائے ہوئے تھے، یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آرہی

کہ بیک وقت دونوں گنیں کیسے ناکارہ ہو گئی تھیں۔ انھوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ ان کا خیال ہوگا کہ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر میں نے انہیں اپنے ہتھیاروں کے نشانے پر رکھ لیا ہوگا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ان کے خلاف میں کسی بھی قسم کی جوابی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس وقت تک جب تک کہ وہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور ہی نہ کر دیتے۔ میں اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن کی نال زمین کی جانب جھکائے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور ایک ساتھ پلٹ کر اس دروازے کی جانب چھلانگیں لگا دیں جو اندر ایک اور کمرے میں کھلتا تھا۔ میں نے بھی انہیں روکنا مناسب نہیں جانا اور اُن کے جانے کے بعد آگے بڑھ کر وہ دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ پھر باہر آکر وہ دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا جو اس طرف حویلی میں آمد و رفت کا واحد دروازہ تھا۔ اب اس طرف سے کسی کے باہر آکر حملہ کرنے کا امکان نہیں رہا تھا۔

اس کام سے نمٹ کر میں شرافت علی کی جانب مڑا تو میری نظر آسیہ پر پڑی۔ وہ شرافت علی کی کار کے عقب سے نکل کر اس طرف دوڑی چلی جارہی تھی جہاں پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ اسے اس طرح دوڑتے دیکھ کر کسی نے حویلی کی جانب سے اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس پر دو گولیاں چلائی گئی تھیں مگر ابھی اس کی زندگی کے دن تمام نہیں ہوئے تھے، دونوں میں سے ایک گولی بھی اُسے چھو تک نہیں سکی تھی۔ شرافت علی نے جلدی سے اپنی اسٹین گن کا رُخ اس طرف کر کے جہاں سے آسیہ پر گولیاں چلائی گئی تھیں، فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی اس کارروائی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا، پھر کسی نے آسیہ پر گولی چلانے کی جرأت نہیں کی تھی اور آسیہ بحفاظت پولیس کی جیپ تک پہنچ گئی۔ شرافت علی کا مقصد بھی اُسے تحفظ فراہم کرنا ہی تھا، وہ آسیہ کو حویلی سے نکل جانے کا موقع دینا چاہتا تھا اور اُسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ آسیہ پلک جھپکتے میں پولیس کی جیپ پر جا بیٹھی اور اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال کر جیپ کو اسٹارٹ کر دیا۔ اس کی چابی اگنیشن ہی میں موجود تھی۔ آسیہ نے جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس گیئر میں ڈالی اور اسے تیزی سے دوڑاتے ہوئے لکڑی کے بڑے پھاٹک سے جا ٹکرایا جو کچی دیوار میں نصب تھا۔ ایک ہی ٹکر میں پھاٹک اکھڑ کر باہر جا گرا، اس کے ساتھ ہی دونوں طرف کی دیواروں کا کچھ حصہ بھی گر گیا تھا مگر آسیہ کو اس بربادی پر توجہ دینے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ گرے ہوئے پھاٹک کے اوپر سے گزار کر جیپ کو باہر لیے چلی گئی۔ باہر نکلتے ہی اس نے عجلت کے ساتھ جیپ کا رُخ تبدیل کیا اور پھر اُسے پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا اس کی مشتاقی پر حیران ہی ہو تا رہ گیا تھا، اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس کے اس طرح چلے جانے کے بعد مجھے اندیشوں اور وسوسوں نے آگھیرا۔ وہ پولیس کی سرکاری جیپ میں فرار ہوئی تھی، جسے دور ہی سے دیکھ کر پہچانا جا سکتا تھا۔ راستے میں کہیں بھی اُسے کوئی پولیس پارٹی مل سکتی تھی۔ عام گزرگاہوں پر پولیس کی گاڑیاں گشت پر رہتی ہیں۔ ان میں سے کسی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو اسے محکمے کی جیپ میں ایک تنہا لڑکی کو جاتے دیکھ کر وہ خاموش تماشائی نہیں بنا رہ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا کسی محفوظ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی دھر لیا جانا ناممکن نہیں تھا۔ ابھی اسے موت کے منہ سے نکل کر آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوتے تھے۔ ابھی تو قانون کے بندوں کی آنکھوں میں اس کی تصویر دھندلائی بھی نہیں ہوگی۔ ابھی تو وہ پورے شد و مد کے ساتھ اسے تلاش ہی کر رہے ہوں گے، ملک بھر کی پولیس کو اس کی اور آپی کی تصویریں فراہم کر کے ان دونوں کو ڈھونڈنے کا کام سونپ دیا گیا ہوگا۔ کوئی معمولی الزامات نہیں تھے ان پر کہ انھیں نظر انداز کر دیا جاتا اور یوں بھی پولیس ایسے لوگوں کو نظرانداز کرنے کی عادی نہیں ہوتی جو اس کے کھونٹے کو اکھاڑ کر نکل بھاگیں۔ اس سمے وہ نہ جانے کہاں کہاں اس کے لیے ہم رنگِ زمیں جال بچھائے بیٹھے ہوں گے اور معلوم نہیں کدھر کدھر ان دونوں کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ تجربے نے مجھے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی تھی کہ قانون کے یہ بندے اگر کسی مجرم کو پکڑنا چاہیں تو اسے پاتال سے بھی کھوج نکالتے ہیں۔ بڑے سے بڑا چالاک اور عیّار مجرم ان کی نظروں سے زیادہ دن اوجھل نہیں رہ سکتا، زمین کی سات تہوں کے اندر بھی ان کی نظریں اپنے مطلوبہ شخص کو دیکھ لیتی ہیں۔ شرط یہی ہے کہ یہ واقعی اسے پکڑنا چاہیں اور دیانتداری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہیں۔ لیکن فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں اس محکمے سے دیانت کی توقع ایسی ہی ہے جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس برآمد کرنے کی کوشش۔ انگریز نے اپنے اقتدار کی عمر دراز کرنے کی خاطر اس محکمے کی تعمیر ایسی بنیادوں پر کی تھی کہ اس میں کوئی اینٹ سیدھی لگ ہی نہیں سکتی، ان بنیادوں پر جب بھی نئی عمارت کھڑی کی جائے گی، پہلی سے زیادہ ٹیڑھی ہوگی اور اتنی جرأت کوئی نہیں کر سکا کہ اس کی بنیادیں اکھاڑ کر وقت اور موسم کے تقاضوں کے مطابق نئی بنا ڈالے۔ یہ بڑا محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اسے ہر کوئی کر بھی نہیں سکتا، اس کے لیے تو ویسے ہی جذبے اور لگن کی ضرورت ہے جس جذبے اور لگن نے پاکستان کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے لیے ابھی نرگس کو اور نہ جانے کتنے سال اپنی بے نوری کا ماتم کرنا ہوگا۔ یہ لوگ جنہیں عاقبت نااندیش لوگوں نے آج وردیاں پہنا کر قانونی

تحفظ فراہم کردیا ہے، کبھی جرائم پیشہ افراد پر بے سوچے سمجھے محض قانون کی سربلندی کی خاطر ہاتھ نہیں ڈالا کرتے۔ ان کے ریکارڈ میں صرف ان لوگوں کے ہی نام درج ہوتے ہیں جن کی پشت پر کوئی مضبوط ہاتھ نہیں ہوتا، یا جن سے انہیں کوئی فائدہ حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہوتی۔ خود میری مثال سامنے ہے، پولیس کے محکمے کا ایک ایک فرد مجھ سے واقف ہے، میری گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام بھی مقرر ہے۔ پولیس کے درجنوں افراد میرے ہاتھوں عدم کو سدھار چکے ہیں، مگر چونکہ مجھے بڑے صاحب کی آشیرواد حاصل رہی تھی، اس لیے اس محکمے کے ذمّے دار افسران میری حفاظت بھی کرتے رہے تھے، کچھ سیاست دان تھے جنہیں اپنی کُرسیاں مضبوط رکھنے کے لیے مجھ جیسے لوگوں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے لیکن آسیہ کو ایسے کسی ضرورت مند کا تعاون حاصل نہیں تھا، اس کے برعکس اس نے جن لوگوں سے دُشمنی مول لی ہوئی تھی، ان کی جڑیں بہت گہری تھیں اور اس حقیقت سے سارے ہی واقف تھے کہ اس سیاہ بخت آسیہ کے سر پر نہ کوئی سایہ ہے اور نہ ہی اسے کسی بڑے یا چھوٹے صاحب کی آشیرواد حاصل ہے۔ چنانچہ وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں ٹھہرتی۔ اُسے اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کس انداز سے سوچنے لگی تھی وہ اور میرا ساتھ چھوڑ کر کیوں بھاگ رہی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، آخر اُسے مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی، میں اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا تھا، اسے لاکھو لاشاری کے آدمیوں کے حوالے تو نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اُسے لاکھو لاشاری کے کھونٹے سے باندھ دینے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اُسے سمجھا بُجھا کر میں نے اس سے لاکھو کو معافی دلانے کی بھی کوشش کی تھی مگر اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ اب جب کہ اس نے میری ہر تجویز رد کرکے لاشاری کا پتا کاٹ ہی دیا تھا تو میں اسے موت کے منہ میں تو نہیں دے دیتا تحفظ ہی کر رہا تھا میں تو اس کا۔ پھر وہ کس بات سے خوف زدہ تھی؟ کیوں اس طرح میرا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ ایسی کیا بات تھی اُس کے پیشِ نظر؟

میں عجیب سی اُلجھن محسوس کرنے لگا تھا۔ آسیہ میری سمجھ سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ یک وقت کئی بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز نے مجھے مزید اس کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ میں نے چونک کر شرافت علی کو دیکھا۔ وہ حویلی کے اُسی حصّے کی جانب نظریں جمائے کھڑا تھا جہاں سے کچھ دیر قبل میں اِدھر آیا تھا۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں اسی طرف سے آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے ہماری طرف ہی آرہے ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے سامنے کا دروازہ بند کرکے جن لوگوں کو باہر آنے سے روکنا چاہا تھا، وہ اب عقبی دروازے سے نکل کر اِدھر آرہے تھے اور شاید وہ ہم سے ایک فیصلہ کُن جنگ کرنے کے ارادے سے باہر نکلے ہیں۔ وہ یا تو اپنے سردار لاکھو لاشاری کے عوض ہمیں نابُود کر دیں گے یا خود فنا ہوجائیں گے۔ میں نے شرافت علی کو آواز دے کر کہا۔ "شرافت علی! اِدھر میرے پاس آجاؤ، میں یہ دروازہ کھول رہا ہوں۔ ہم دونوں اس کمرے میں مورچہ بنا لیتے ہیں۔"

شرافت علی نے جواب دیا۔ "اب اس کا وقت نہیں رہا ہے، میں کار کے پیچھے جارہا ہوں تم اندر چلے جاؤ۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا..... اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ تک پہنچ سکتا۔ وہ جس جگہ کھڑا ہوا تھا وہاں سے آنے والوں کو دور ہی سے دیکھ سکتا تھا اور اس نے اُنہیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ممتاز جسے آبی لاشاری کے مُردہ جسم کے ساتھ کمرے میں بند کر آیا تھا، اسٹین گن تانے دوڑتا ہوا ہمارے مقابل آگیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے سیف علی اور تھانے دار افضل بیگ بھی تھے۔ ان دونوں نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ میں چونکہ حویلی کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا اس لیے کھلی جگہ پر ہونے کے باوجود وہ گردن موڑے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے، شرافت علی ان کے بالکل سامنے تھا، لہٰذا وہ اُسی کی طرف متوجہ تھے۔ ممتاز نے سامنے آتے ہی شرافت علی پر گولی چلادی، مگر وہ بھی کوئی ناآموز نہیں تھا۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی میری بات کا جواب دے کر کار کے عقب میں چھلانگ لگادی تھی، چنانچہ ممتاز کی چلائی ہوئی گولی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ وہ تینوں میری موجودگی سے بے خبر شرافت علی کی کار کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ شرافت علی کو دیکھ لینے کے بعد انہیں اپنے دائیں بائیں کسی اور کی موجودگی کا خیال نہیں آیا تھا۔ ان کی پوری توجہ سامنے ہی کی جانب تھی۔ ممتاز اندھا دُھند گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا اور شرافت علی کو سر اٹھا کر جوابی کارروائی کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ سیف علی اور افضل بیگ بھی رائفلیں سیدھی کیئے اس کے پیچھے پیچھے بڑھتے جارہے تھے۔ یہ صورتِ حال شرافت علی کے لیے بے حد خطرناک تھی۔ اس طرح تو وہ شرافت علی کے بالکل سر پر جا پہنچتے اور اسے اپنے دفاع میں ایک بھی گولی چلانے کا موقع نہیں ملتا۔ لہٰذا میں نے ان کی اس بے خطر یلغار کو روکنے کے لیے پستول نکال کر ایک گولی ممتاز کے سر پر سے گزار دی۔ میری اس کارروائی کے نتیجے میں وہ تینوں ایک دم زمین پر لیٹ جا گرے اور گرتے ہی سانپ کی طرح بل کھا کر میری طرف پلٹ گئے۔ میں چند قدم اور آگے بڑھ آیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی

نے غصّے سے دانت کچکچا کر کہا۔

"تو اِدھر چُھپا ہوا تھا لومڑی کی اولاد! تیری ہی تو مجھے تلاش تھی۔ اب دیکھتا ہوں تو کیسے بچ کے جاتا ہے مجھ سے۔"

اس نے اپنی اسٹین گن سیدھی کرکے میرا نشانہ لیا اور فائر کرنے کے لیے اُس کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ اُس کی آگ اُگلتی ہوئی اسٹین گن جس کے سینے میں بھری سیسے کی گولیوں نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی تھی، میری جانب اُٹھتے ہی گولیاں اُگلنا بھول گئی۔ ممتاز نے حیران ہوکر اسٹین گن کو دیکھا، اور دوبارہ اُس سے اُلجھنے لگا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اُس کی اس اُلجھن آمیز حیرانی سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "بھول جا بچے! اسے اب۔ بہت دیر تیرے اشاروں پر حرکت کرتی رہی ہے یہ، لیکن اب تیرا ساتھ نہیں دے گی۔ ایسی ہی بیوفا ہوتی ہیں یہ سائنس دانوں کی تخلیق کی ہوئی چیزیں۔ کبھی کبھی تو اپنے مالکوں ہی کو نگل جاتی ہیں اور وقت پڑنے پر تو اکثر میں نے انہیں اسی طرح ہرجائی ثابت ہوتے دیکھا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے تیرے ساتھ۔"

"چُپ کرجا او ئے شیخ چلی کی اولاد! اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لے۔ یہ تو میں بتاؤں گا تجھے کہ ہرجائی کیا ہوتا ہے؟" تھانیدار افضل بیگ نے ممتاز کی اسٹین گن کو ناکارہ سمجھ کر اپنی رائفل میری طرف تانتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

"ہشکے بھئی ہشکے، صدقے جاواں تیریاں اداواں توں۔ بہت خوش فہمی ہے تجھے اپنے بارے میں، مگر یقین کرلے میرے یار! یہ بے جان اشیا کسی پولیس والے کا رعب نہیں مانتی ہیں۔ پر میں جانتا ہوں تو میری کوئی بات ماننے والا نہیں ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تو بھی اپنے دل کی کرکے دیکھ لے، نکال لے یار جی تو بھی اپنی حسرت، پتا نہیں بعد میں تجھے پچھتانے کا موقع بھی ملے یا نہیں۔" میں نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں یہ کہہ کر بڑی زہریلی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالی۔

میری اس بات نے اس کی کھوپڑی میں آگ لگادی تھی۔ وہ پوری قوت سے حلق پھاڑ کر دہاڑا۔ "بھونکنا بند کراوئے کتّے! زندگی چاہتا ہے تو سیدھی طرح ہتھیار پھینک کر گرفتاری دے دے اپنی، تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں میں نے، دانت نکوسنے والے۔"

"ہاں تھانیدار جی! ٹھیک کہتے ہو تم، ضرور دیکھے ہوں گے تم نے مُرے جیسے۔ آج مجھے بھی دیکھ لو اچھی طرح۔"

"تجھے تو ایسا دیکھوں گا میں کہ کوئی اور دیکھ ہی نہیں سکے گا پھر۔ جانتا ہے نا تُو پولیس مقابلے میں مرنے والوں کی داد فریاد نہیں ہوتی کہیں۔"

"ہاں جی، بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں یہ بات مگر تم سوچ کیا رہے ہو؟ چلاؤ نا گولی مجھ پر۔" میں نے اسے طیش دلانے والے انداز میں کہا۔

اُس نے غضب ناک ہوکر میرا نشانہ لے کر رائفل کی لبلبی پر زور ڈالنا شروع کردیا مگر اسے کسی طرح اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ رائفل کی لبلبی حرکت کرنے کو ہی آمادہ نہیں ہورہی تھی، میں نے ہنس کر کہا۔

"تم تینوں کوشش کر دیکھو مل کر، شاید کسی کو کامیابی نصیب ہو ہی جائے اور جب تھک جاؤ تو مجھے بتا دینا، پھر میں بھی ایک کوشش کروں گا لیکن میری کوشش کا نتیجہ ذرا مختلف برآمد ہوگا۔"

میں نے اُدھر نظر اٹھائی جہاں شرافت علی چھپا ہوا تھا۔ وہ اب اپنی جگہ پر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک بالکل ہی انوکھی بات تھی۔ دو رائفلیں اور ایک اسٹین گن میری طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ بچّوں کے لیے بے ضرر سے کھلونے ہوں، نہ میں اُن سے خوف زدہ تھا اور نہ ہی وہ خوفناک ہتھیار اپنا فرض ادا کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے آبی کا خیال آگیا، اسے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا، بلکہ وہ خود ہی میرے پیچھے رہ گیا تھا تاکہ اگر عقب سے کوئی مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو وہ میرا دفاع کرسکے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب تک عالیہ کی دی ہوئی وہ طلسمی انگوٹھی میری انگلی میں موجود تھی کوئی مجھے آتشیں اسلحے سے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور اگر کوئی قریب آکر چاقو، خنجر یا لاٹھی وغیرہ سے ہم پر حملہ آور ہوتا تو وہ فوراً ہماری نظروں میں آجاتا اور ہم اس سے اچھی طرح نمٹ سکتے تھے لیکن یہ سب باتیں میں آبی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اگر میں اسے اپنے عقب کی حفاظت سے منع کرتا تو وہ مجھ سے اس کی وجہ ضرور معلوم کرتا۔ پوری طرح اطمینان کیے بغیر وہ میری کوئی بات کبھی نہیں مانتا تھا اور اس سمے مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ رُک کر اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا، چنانچہ میں نے اس کی بات مان لینے ہی میں عافیت جانی تھی اور اِدھر چلا آیا تھا۔ اب مجھے خیال آرہا تھا کہ یہ لوگ بھی اسی راستے سے گزر کر آئے تھے جس سے میں آیا تھا۔ اس صورت میں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ اُنھیں آبی نہ ملا ہو۔ اس میں تو شک و شبہے کی کوئی گنجائش

مُطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب

[illegible]

قیمت ۱۵ روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۴۴ کراچی نمبر ۱

ہی نہیں رہی تھی کہ وہ یا تو آبی کو کہیں بے بس کر کے ڈال آئے تھے یا پھر اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کیا تھا انھوں نے کہ جس کی وجہ سے وہ ان کی راہ روکنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس خیال نے جیسے میرے تن بدن میں برق سی دوڑا دی، میری رگوں میں جیسے لاوا دوڑنے لگا میں نے عالمِ غیظ میں گرجتے ہوئے پوچھا۔

"اوئے سگ زادو! یہ تم لوگ میرے یار آبی کو کیا کر آئے ہو؟ کہاں ہے وہ؟ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے تم نے؟"

"نقصان ابھی تک تو کوئی نہیں پہنچا ہے اُسے، لیکن اگر تم نے ہمارے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ زندہ نہیں مل سکے گا تمھیں۔" سیف علی بولا۔

"تم لوگ بھی اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو سچ سچ بتا دو آبی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" میں نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔

"گلا نہ پھاڑ اوئے ننگے! سیدھا ہو جا ورنہ ایک منٹ میں کُتّے کی دُم کی طرح لپیٹ کے رکھ دوں گا سالے کو۔" تھانے دار افضل بیگ غصّے سے بولا اور رائفل ایک طرف پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شاید دو بدو مجھ سے مقابلہ کر کے مجھے زیر کرنے کی ٹھان لی تھی۔

"بک بک نہ کر اوئے چڑی کے غلام! بند کر یہ بڑبڑ اور مجھے بتا میرا یار آبی کہاں ہے؟" میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"میں کہتا ہوں بکواس بند کر کے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں سُننا چاہتا ہول میں۔"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تیرے جیسے کم سن بچّوں کو اتنا نہیں اُبلنا چاہیے۔ تُو تو یار گندے پانی کے گٹر کی طرح اُبلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ مان لے میری بات میرے بچّے! میرے بیٹے! آرام سے بتا دے مجھے آبی کو کیا کر آئے ہو تم لوگ؟"

"جہنّم رسید کر آئے ہیں ہم اسے سمجھا؟ اور تجھے بھی اس کے پاس بھیجے دیتے ہیں۔" تھانیدار بولا۔

میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ خون تو میرا پہلے ہی جوش کھا رہا تھا، تھانے دار کی بات نے مجھے آپے سے باہر کر دیا۔ میں نے ہاتھ گھما کر پوری قوّت سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ "ایسے نہیں مانے گا تُو، تجھ سے تیری ہی زبان میں بات کرنا ہوگی مجھے۔"

میرا ہاتھ اتنی زور سے پڑا تھا کہ وہ اُلٹ کر پیچھے جا گرا اور ایک ہاتھ سے اپنا گال سہلاتے ہوئے حیران حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ شاید کسی نے آج تک ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ حیران بھی غالباً اسی وجہ سے ہو رہا تھا کہ میں

نے اس کی کسی دھمکی یا اس کی حیثیت سے متاثر ہوئے [illegible] اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا۔ اسے اپنے بارے میں [illegible] تھا کہ اس کے بدن پر منڈھی ہوئی سرکاری یونیفارم دیکھ [illegible] اس سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا، بڑے سے بڑا مجرم [illegible] کے سامنے سر جھکانے پر مجبور رہے۔ میرے ایک ہی تھپڑ [illegible] سمجھا دیا تھا کہ سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، ان [illegible] جیسے سر پھرے بھی ہوتے ہیں جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

ممتاز ابھی تک اپنی اسٹین گن سے ہی اُلجھا ہوا تھا، [illegible] نے ہر ممکن طریقے سے اسے چیک کر کے دیکھ لیا تھا اور [illegible] کوئی خرابی دریافت نہیں کر سکا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل [illegible] بات پر حیران ہو رہا ہوگا کہ اچھی خاصی چلتی ہوئی اسٹین گن [illegible] اچانک ساکت کیسے ہو گئی تھی۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے تک [illegible] گرجتی برستی رہی تھی مگر میرا نشانہ لیتے ہی وہ کسی برسوں [illegible] خوردہ اور ناکارہ گن کی طرح جام ہو گئی تھی، اس کا ٹریگر [illegible] ہی نہیں کرتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"اسے پھینک دے ممتاز کے بچّے! اب یہ تیرے کسی [illegible] آسکے گی اور آئندہ کے لیے توبہ کر لے کسی ایسے ناقابلِ اعتبار [illegible] بھروسا نہ کرنا اب کبھی بھی۔"

میری بات سُن کر اس نے ایک لمحے کو خونخوار نگاہ [illegible] مجھے دیکھا پھر ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اسٹین گن [illegible] کر مجھ پر پھینک مارنا چاہی لیکن جیسے ہی اس نے ہاتھ [illegible] میں جست لگا کر اُس پر جا پڑا اور اپنے ہاتھ میں دبی اسٹین [illegible] نال سے اس کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں پر ضرب لگائی، سا [illegible] میرا گھٹنا اس کے پیٹ میں جا گھسا۔ میرا حملہ اتنا اچانک [illegible] تھا کہ اس کے ہاتھوں سے اسٹین گن نکل کر دور جا گری او [illegible] 'اوغ' کی آواز کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پیٹ [illegible] جھکتا چلا گیا۔ میں نے اپنی اسٹین گن اور پستول شرافت علی [illegible] پھینک کر کہا "شرافت علی! یہ ہتھیار سنبھالو اور دونوں کا خیال [illegible] میں اس ممتاز سے نمٹ لوں، اُسے شاید اپنی شہ زوری [illegible] ہی زیادہ مان ہے۔ میں اسے مقابلہ کرنے کا پورا موقع [illegible] چاہتا ہوں۔"

شرافت علی نے تیزی سے میری اور ممتاز کی [illegible] اور پستول اٹھا کر اپنی کار میں رکھ دیے اور اپنی اسٹین [illegible] کر تھانے دار افضل بیگ اور سیف علی کو کور کر کے [illegible] اس نے ان دونوں کو تنبیہہ کر دی تھی کہ اگر ان میں سے [illegible] ممتاز کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو وہ اُس کے بدن میں [illegible] روشن دان کھول دے گا۔ وہ دونوں حقارت سے [illegible]

ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ وہ میرے اس فیصلے سے بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ شاید اُن کا خیال تھا کہ میں نے ممتاز سے بغیر ہتھیاروں کے دو بدو مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر کے اپنے حق میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ممتاز اس مقابلے میں مجھے عبرتناک شکست سے دوچار کر دے گا۔

میں الگ کھڑا ممتاز کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ میں اُسے اپنے اوپر حملہ آور ہونے کا موقع دے کر ایک بھرپور مقابلے کے بعد اُسے زیر کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اُسے زیر کر لینے کے بعد ہی میں سیف علی سے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرا سکتا تھا۔ یوں بھی کشت و خون سے بچنے کا یہ مناسب ترین راستہ تھا۔ گولیوں کا تبادلہ کر کے دس بیس آدمیوں کو جان سے مار دینے کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر تھا کہ... ان میں سے سب سے زیادہ طاقت ور اور جنگجو شخص کو شکست دے کر انہیں ہتھیار پھینک دینے پر مجبور کر دیا جائے۔ ورنہ ان پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ اسے میری کمزوری سمجھتے، یہ قتل و غارت گری کے عادی لوگ طاقت ہی کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ وعظ، نصیحتیں اور دلائل ان پر بالکل اثر نہیں کرتے۔

چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد ممتاز سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تجھے اپنی طاقت پر بہت ناز ہے، میں نے بھی بڑے چرچے سُنے ہیں تیرے، تیرے ہاتھوں مرنا ذلّت کی بات نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا تو میں تجھے موقع دیتا ہوں، مقابلے سے دست بردار ہو کر میری اطاعت قبول کر لے۔ تجھ جیسے جواں مردوں کی میں بہت قدر کرتا ہوں ممتاز! بول کیا کہتا ہے تُو؟"

"اطاعت قبول کر لوں میں؟ تیری؟ میں نے تو کبھی لاشاری کی اطاعت بھی قبول نہیں کی۔ پھر تُو کیا چیز ہے؟" اُس نے کہا اور اچانک مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا انداز بے حد خوفناک اور جارحانہ تھا۔

اس کا خیال ہوگا کہ میں اس سے باتوں کے دوران اس کی طرف سے کسی غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں ہوں گا اور وہ اچانک حملہ کر کے مجھے کوئی شدید ضرب لگانے میں کامیاب ہو جائے گا مگر میں اس سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میری نظریں اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لے رہی تھیں چنانچہ جیسے ہی اس نے میری طرف چھلانگ لگائی، میں نے بھی اپنے بائیں جانب جست کر کے وہ جگہ چھوڑ دی۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ میری طرف آیا تھا چنانچہ میری کسی اچانک اور غیر متوقع حرکت کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔ لہٰذا جب اس کے قدم وہاں ٹکے جہاں ایک لمحے قبل میں کھڑا تھا تو اس کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ جھونک میں بُری طرح لڑکھڑاتا ہوا چند قدم آگے نکلتا چلا گیا۔ میں چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر تابڑ توڑ حملے کر کے اسے زمین سے لگا دیتا، مگر اُسے اپنے سارے حربے، تمام ہُنر آزمانے کی کھلی چھوٹ دینا چاہتا تھا میں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لڑنے کا فن خوب جانتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا شدید وار خالی جانے کی وجہ سے اپنی ہی جھونک میں اوندھے منہ گرتا اور دور تک زمین پر گھسٹتا چلا جاتا لیکن اس نے چند قدم لڑکھڑانے کے بعد اپنے آپ کو سنبھال کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ وہ سنبھل کر میری طرف پلٹا تو میں اُس سے ذرا فاصلے پر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ مجھے دیکھا اور دوسرے لمحے میں اُڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے پھر بائیں جانب ہی جست کی اور وہ جگہ چھوڑ دی۔ اس بار وہ پوری طرح تیار تھا، چنانچہ اس مرتبہ اس کے پیر زمین پر ٹکے تو مجھے ایسا لگا جیسے اُس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے اور وہ سر کے بل چت نیچے گرا ہے مگر یہ میری نظر کا فریب تھا۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح گرا تھا، زمین کے قریب پہنچتے ہی اس کا ایک ہاتھ زمین پر ٹکا اور وہ اسی ہاتھ پر اپنا پورا بوجھ ڈال کر تیزی سے لٹو کی طرح گھوم گیا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نیا انداز تھا، اس سے پہلے کہ میں اس کی اس حرکت کو سمجھ سکتا، اس کے دونوں پیر کسی بھاری گُرز کی طرح میری پنڈلیوں پر پڑے اور میں اُچھل کے پشت کے بل زمین پر آ رہا۔ میرے گرتے ہی ممتاز چیتے کی سی پھرتی سے اٹھا اور میرے اوپر جست لگا دی۔ اس کی چستی اور پھرتی قابلِ ستائش تھی، وہ خونخوار چیتے کی طرح پلٹتا اور باز کی طرح جھپٹتا تھا، ایسے شخص سے مقابلہ کرنے کے لیے اس کی ہر حرکت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا بھی نظر چوک جائے تو آدمی کو پچھتانے یا غلطی کا ازالہ کرنے کا موقع نہیں ملتا اور ممتاز تو لومڑی کی طرح چالاک اور عیّار بھی تھا، وہ تو عام زندگی میں اخلاقیات کو اپنے معاملات میں حائل نہیں ہونے دیتا تھا تو دُشمن سے مقابلے کے وقت وہ اخلاق کو درمیان میں کیسے آنے دیتا، وہ تو جو پہلے مارے وہ میر کے اصول پر کاربند تھا اور اس اصول پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ گو میں نے گرنے کے بعد سنبھل کر اٹھنے میں ایک لمحے سے زیادہ دیر نہیں کی تھی، اس کے باوجود نظر اٹھاتے ہی مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی بڑی سی چٹان اُڑتی ہوئی میرے اوپر چلی آ رہی ہو۔ میں کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھے ہی بیٹھے لٹو

کی طرح گھومتا ہوا ایک طرف ہو گیا اور اس جگہ سے کافی دور جا کر گرا۔ میرے ہٹتے ہی ممتاز بھد کی اور زور دار آواز کے ساتھ اوندھے منہ عین اسی جگہ گرا تھا جہاں پل بھر پہلے میں موجود تھا۔ اُس کے گرتے ہی میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ممتاز جس طرح اور جتنی ... رسے گرا تھا، اس کے پیشِ نظر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ... پر سخت چوٹ آئی ہو گی اور عجب نہیں کہ سامنے کے ... دانت بھی ٹوٹ گئے ہوں۔ اُس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا ... سے اپنے حواس قائم رکھنا مشکل ہو جاتا، مگر ممتاز بے پناہ قوتِ برداشت اور فولاد جیسے عزم و حوصلے کا مالک تھا۔ وہ ایک ثانیے کے لیے بھی اس جگہ نہیں ٹھہرا، گرتے ہی تیزی سے کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح پلٹا اور لوٹیں لگاتا ہوا مجھ سے اتنی دور چلا گیا کہ اگر میں اُسے گرتے دیکھ کر اس پر جوابی ... کرنے کی حماقت کر بیٹھتا تو میرا بھی حشر اس سے مختلف نہیں ... اس کی طرح میں بھی اپنا منہ اور سر پھوڑنے کے سوا کچھ حاصل ... کر سکتا تھا لیکن میں نے اس جیسی حماقت نہیں کی۔ اس کی ... وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ میں ابھی اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے خوب تھکا دینا چاہتا تھا، دوسرے میں لڑنے کے دوران عقل و ہوش سے کام لیتا تھا۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر خوب سوچ سمجھ کے موقع و محل دیکھ کر حملہ کرتا تھا۔ کوئی اوچھا وار کر کے خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانے یا جذبات میں اندھے ہو کر نتائج کی پروا کیے بغیر اندھا دھند مخالف پر ٹوٹ پڑنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ لوگ جو طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح دشمن کو حقیر جان کر اس پر جا گرتے ہیں، وہ ایک دن کسی بہت ہی کمزور مگر حاضر دماغ دشمن کے ہاتھوں نہایت عبرت ناک انجام سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

ممتاز دوبارہ کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا، اس کا چہرہ لہو میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے، ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا مگر اسے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی، وہ اب بھی سینہ تانے میرے مقابل کھڑا خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"او یار ممتاز! ابھی تو میں نے تجھے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے اور یہ حالت ہو گئی ہے تیری۔ جا بچے! جا ہٹ جا میرے سامنے سے تو میرے مقابلے کا آدمی نہیں لگتا مجھے۔"

وہ جواب دینے کے بجائے خون آشام نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اس بار وہ کوئی بہت ہی خوف ناک داؤ مجھ پر آزمانا چاہتا تھا مگر اُس کی حالت پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔ وہ شکست مان کر پیچھے ہٹ جانے والوں میں سے نہیں تھا، اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی جان دے دے گا یا مجھے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے گا۔ اس سے کم کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہ ہو گا۔ عمر کے جس طوفانی دور سے وہ گزر رہا تھا، اس دور کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے۔ رگوں میں کھولتا ہوا لاوا دوڑ رہا ہوتا ہے۔ ان دنوں جو ذرا سی حرارت پا کر آدمی کو ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیتا ہے۔ ان دنوں آدمی کا دل خواہ مخواہ ہی چٹانوں سے ٹکرا جانے کو چاہتا رہتا ہے، ایسے میں کوئی اگر اسے للکار بیٹھے تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ یہی حال اس گھڑی ممتاز کا تھا۔ اس کی جوانی جون کی دوپہر کے سورج کی طرح سب کچھ بھسم کر دینے کے درپے تھی۔ بڑا گبرو اور بانکا جوان تھا وہ، رگوں میں اس کے بجلیاں تڑپتی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسے عالم میں تو آدمی کو زندگی کی زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ اپنی اس ضرورت کا خیال ہی نہیں کر رہا تھا۔ ایک ذرا سی انا کی خاطر میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جانا چاہتا تھا، زندگی اور موت کے درمیان کوئی فرق ہی محسوس نہیں کر رہا تھا وہ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ زبردست حملوں کے بعد تھوڑی سی مار کھائے گا، کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گی اس کی تو یہ تندی اور تیزی جاتی رہے گی، اور وہ خود ہی سمٹ کر ایک طرف ہو جائے گا۔ اب اس کے تیوروں سے اندازہ ہوا کہ وہ پیچھے ہٹنے والا آدمی نہیں۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر میں سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ دم بدم میرے قریب ہوتا جا رہا تھا اور جب میرے اور اس کے درمیان تین چار قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے جھکائی دے کر یکدم میرے بائیں جانب جست بھری۔ اس نے دیکھا تھا کہ دو بار میں اسے حرکت میں آتے دیکھ کر بائیں جانب ہی ہٹا تھا چنانچہ اسے یہ یقین ہو گا کہ اس بار بھی ادھر ہی ہٹوں گا مگر اس مرتبہ میں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑے کھڑے ذرا سا دائیں ہو کر اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ایک جھٹکا کھا کر غراتے ہوئے پلٹا مگر میں نے کلائی ہاتھ میں آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں اس پر زور ڈال دیا تھا، نتیجے کے طور پر وہ ابھی پوری طرح میری طرف مڑ بھی نہیں سکا تھا کہ چٹاخ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ میں اُس کی کلائی چھوڑ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا اور وہ اپنی ساری شہ زوری بھول کر دوسرے ہاتھ سے اپنا ٹوٹا ہاتھ تھام کر نیچے بیٹھ گیا۔ تکلیف کی شدت سے اُس کے ہونٹ بھنچ گئے، آنکھوں سے کرب و اذیت کے ساتھ ساتھ بے بسی جھلک رہی تھی۔

میں نے کہا "اب تو آرام سے یہاں بیٹھا رہ میرے یار۔ کیوں جان دینے پر تل گیا تھا تو؟ یہ عمر مرنے کی تو نہیں ہوتی

اس کا یہ حشر دیکھ کر سیف علی سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ شرافت علی کی اسٹین گن کی پروا کیے بغیر اچھل کر مجھ پر آ پڑا۔ میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرافت علی کے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے دبوچ کر پوری قوت سے اپنے سر سے میری ناک پر ٹکر مارنا چاہی۔ غیر ارادی طور پر بس اچانک ہی .... میرا سر آپ سے آپ نیچے جھک گیا اور اس کا سر میرے سر سے ٹکرا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے جس قوت کے ساتھ ٹکر ماری تھی، اگر وہ میرے منہ یا ناک پر پڑ جاتی تو میری حالت بھی بہت زیادہ بگڑ گئی ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر اُسے روکتا، اس نے دو اور ٹکریں میرے سر پر دے ماریں۔ اس کی ٹکروں سے میرا دماغ ہل کر رہ گیا تھا۔ میں نے اُسے مزید ٹکریں مارنے سے روکنے کے لیے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ میں دے مارا، اور جیسے ہی وہ چوٹ کھا کر نیچے جھکا، میں نے اُسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر دور اُچھال دیا۔ میرا سر بُری طرح گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر اس خبیث کو دو ٹکریں اور مارنے کی مہلت مل جاتی تو میرے لیے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ممکن نہ رہتا۔

اس کے مجھ سے الگ ہو کر گرتے ہی شرافت علی نے تنبیہ کی۔

"خبردار! اب اگر جیلانی کی طرف بڑھا تو گولی مار دوں گا میں۔"

میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں دو تین بار جھٹک کر غضب ناک نظروں سے سیف علی کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور بے حد کینہ توز نظروں سے شرافت علی کو دیکھ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں دبی ہوئی اسٹین گن نے اس کے قدم روک رکھے تھے۔ میں نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی اسٹین گن کی گولیاں اس پر ضائع نہ کر یار! اس کتے کے میں یوں ہی ہاتھ پیر توڑ کے ڈال دیتا ہوں۔"

میں نے بڑھ کر سیف علی کا ہاتھ اپنی گرفت میں لینا چاہا تو وہ اُچھل کر ایکدم یوں پیچھے بھاگا جیسے ایک لمحے بھی وہاں کھڑا رہا تو فرشتۂ اجل اس کی روح کھینچ کے لے جائے گا۔ میں اُسے یوں ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ لاکھو کا بہت قریبی اور بے حد معتمد آدمی تھا۔ اس کی کوئی بات لاکھو سے چھپی ہوئی نہیں تھی، وہ اس کے بارے میں جتنا جانتا تھا اتنا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ آسیہ نے لاکھو لاشاری کا قصہ تو ختم کر دیا تھا لیکن وہ اپنے بچے کو حاصل نہیں کر سکی تھی اور نہ ہی اب تک ہمیں حویلی میں اس بچے کی موجودگی کا کچھ پتا چل سکا تھا۔ اگر وہ اس حویلی میں نہیں تھا تو اس کے بارے میں یہ سیف علی ہی بتا سکتا تھا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک بچہ آسیہ کو نہیں مل جاتا، وہ ان درندوں کے مسکن کو بھول نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے بچے کی تلاش میں اس کے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتی اور بار بار اس حویلی میں گھسنے کی کوشش کرتی رہتی۔ جب تک لاکھو لاشاری زندہ تھا، اس کی ہر زیادتی سہہ کر بھی اُس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا، وہ ہر صورت میں اس کا دل جیت لینے کا خواہش مند تھا، اس لیے اُسے کوئی گزند نہیں پہنچاتا تھا لیکن اب صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ اب یہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو آسیہ کے ساتھ ذرا سی رعایت سے بھی کام لیتا۔ اب یہاں سب کے سب خونخوار درندے ہی رہ گئے تھے جو معافی اور درگزر جیسے شریفانہ الفاظ سے آشنا ہی نہیں تھے۔ آسیہ جب بھی ادھر کا رخ کرتی، وہ اسے گھیر کر اُس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے۔ ان درندہ صفت لوگوں سے وہ تنہا کبھی جیت نہیں سکتی تھی۔ اگر میں اسے یہاں آنے سے روکنا چاہتا تھا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس کے بچے کو حاصل کر کے اس تک پہنچا دیا جاتا۔ یہ کام میں سیف علی کے تعاون کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس وقت میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو نہ جانے کس گپھا میں جا بیٹھتا، کس روزن سے گزر کر کہاں جا نکلتا۔ وہ اس علاقے کا، اس حویلی کا باسی تھا، یہاں کا ایک ایک ذرہ اسے پہچانتا تھا، اس خطۂ زمین کے سارے دروں بروں سے وہ واقف تھا، کوئی گوشہ اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں تھا، یہاں کے سارے بھید عیاں تھے اس پر۔ لہٰذا اُسے بھاگتے دیکھ کر میں تیزی سے اس پر جھپٹا اور بھاگتے ہوئے اُس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ نیچے گرا تو میں نے فوراً اُسے دبوچ لیا۔ اس کی قمیض کا کالر پیچھے سے پکڑ کے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "بھاگتا کہاں ہے بچے! تجھ سے تو بڑے کام ہیں ابھی مجھے۔"

اس کے بارے میں اندازہ لگانے میں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ ایسا ہرگز نہیں تھا جیسے اس حویلی کے دوسرے لوگ تھے۔ اس کی ساری اکڑ فوں، ساری تیزی طراری اُسی وقت تک تھی جب تک اُس کی پشت مضبوط تھی۔ حقیقتاً وہ تمام بزدلوں کی طرح بے حد عیار اور موقع شناس شخص تھا۔ اب چونکہ میرا پلہ بھاری تھا اور اسے میرے ہاتھوں سے اپنی جان چھوٹتی نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ اُس نے فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا حالاں کہ گرنے کی وجہ سے اُس کا دایاں رخسار پھٹ چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا، مگر وہ اپنے زخم کو بھول کر میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔

"جیلانی سائیں! رحم، رحم کرو مجھ پر سائیں! میرے بہت ہی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"کتے کے بچے! تو نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اب بول تیرا

"کیا حشر کروں؟" میں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"غلطی ہو گئی سائیں مجھ سے۔ اس سالے تھانے دار نے ورغلایا تھا مجھے۔ توبہ کرتا ہوں سائیں! کان پکڑتا ہوں اپنے، آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا آپ کے حکم کے ذرا بھی خلاف کچھ کروں تو بے شک گولی مار دیں آپ مجھے۔" وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔

"چلو، ادھر" میں نے اُسے شرافت علی کی کار کی طرف دھکا دے کر کہا۔ "اور یاد رکھنا ذرا بھی گڑبڑ کی تو جان سے مار دوں گا۔"

میں اُسے دھکے دیتے ہوئے واپس لایا اور کار کے ساتھ کھڑا کر کے تھانے دار افضل بیگ سے پوچھا۔ "آپ کیا کہتے ہیں جناب قبلہ و محترم تھانیدار افضل بیگ صاحب! وہ آپ کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ انہیں کیوں نہیں لائے اپنے ساتھ آپ؟"

"وہ مُردہ سی آواز میں بولا۔" جیلانی! یہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے ہو اپنے حق میں۔ تم نے ایک ذمے دار پولیس افسر کی نہ صرف تذلیل کی ہے بلکہ میری آنکھوں کے سامنے ایسے جرائم کیے ہیں کہ تم پر تین سو دو کے تحت مقدمہ بن سکتا ہے لیکن اگر تم مجھے اور میرے آدمیوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر جانے دو یہاں سے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اس علاقے سے سلامتی کے ساتھ نکل جانے کا موقع دوں گا۔ کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر اور نہ ہی کوئی تمہارا راستہ روکے گا۔"

"اور جناب ذمے دار افسر صاحب! اگر میں تم سب کو اسی حویلی میں گڑھا کھود کر دفن کر جاؤں تب کیا ہوگا؟ پھر کون میرا راستہ روک سکے گا اور کون میرے خلاف دفعہ تین سو دو کے تحت مقدمہ بنا سکے گا؟" میں نے اس کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ خیال دل سے نکال دو، بچ نہیں سکو گے تم کسی طرح بھی، قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، تمہیں اندازہ نہیں ہے اس کا۔"

"مجھے تمہارا اور تمہارے لمبے ہاتھوں کا بڑا تجربہ ہے مائی ڈیئر پولیس افسر! البتہ تمہیں غلام جیلانی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔"

"پوری فائل موجود ہے میرے پاس تھانے میں، تمہارے جرائم کی ایک ایک تفصیل درج ہے اس میں۔ اور تمہارا طریقہ واردات کا بھی ذکر ہے۔"

"ہاں، ضرور ذکر ہوگا ان باتوں کا، لیکن اس میں کسی نے یہ نہیں لکھا ہوگا کہ میرے ہاتھوں مرنے والوں میں پچھتر فی صد پولیس والے شامل ہیں۔ اور نہ ہی یہ لکھا ہوگا کہ اکثر جرائم کے بعد خطرناک موقعوں پر مجھے تحفظ فراہم کرنے والے بھی پولیس والے ہی ہیں۔ اپنی معلومات میں اتنا اور اضافہ کر لو، یہ بات تمہیں فائلوں میں نہیں مل سکے گی اور اب مجھے بتا دو کہ آبی کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، ہمیں وہ راستے میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اگر مل جاتا تو ہم اُسے اپنے ساتھ اِدھر ہی لے کر آتے۔"

"ہوں، اور تمہارے دوسرے ساتھی؟ انہیں کہاں چھوڑا ہے تم نے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ اُدھر لاکھو لاشاری کی لاش کی حفاظت کر رہے ہیں، اُنہیں ہم لاشاری کے کمرے کی طرف بھیج کر ادھر آ گئے تھے۔"

"زندہ لاشاری جسے حفاظت کی ضرورت تھی، اس کی تو تم حفاظت کر نہیں سکے، اب اس کی لاش پر پہرہ بٹھانے کا کیا فائدہ؟"

وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ شرافت علی بولا۔ "ان پر وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ اندر چلو، ہم خود تلاش کرتے ہیں آبی کو چل کر۔ ان کی بات کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ یہ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔ انھوں نے آبی کو پکڑ لیا ہے شاید۔"

"یہ خیال تجھے کیسے آیا میرے بھائی! اور یہ تو نے کیسے جان لیا کہ یہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"سیدھی سی بات ہے یار! اگر وہ کہیں پھنسا ہوا نہیں ہوتا، تو اب تک ہمارے پاس پہنچ چکا ہوتا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ تیری بات ماننے والی ہے۔ پھر یوں کرو کوئی رسی وغیرہ تلاش کر کے انہیں باندھ کے ڈال دو، پھر ہم اندر چل کر اپنے یار آبی کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے شکنجے سے۔ بڑے ذلیل ہیں یہ تو یار! کبھی سچ بولتے ہی نہیں ہیں۔"

"یہ تھانے دار جی ٹھیک کہہ رہے ہیں جیلانی! ان کی بات پر شک نہ کرو، تمہارا دوست آبی ہمیں راستے میں نہیں ملا، اور پھر تم ہمیں باندھنے کو کیوں کہہ رہے ہو؟ مجھ پر اعتبار کرو ہم اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" سیف علی بولا۔

اس کی بات سن کر ممتاز نے غراتے ہوئے سندھی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ غصّے سے سرخ آنکھوں سے سیف علی کو گھورتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ یقیناً وہ اُسے دھمکیاں اور گالیاں دے رہا ہوگا۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "کیا بات ہے جوان! تیرے بل نہیں گئے ابھی، کیا دوسرا ہاتھ بھی اکھڑوانا چاہتا ہے؟"

"میں تجھے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں جیلانی! شیروں کی لڑائی میں زخم تو لگتے ہی رہتے ہیں، مگر اس دوغلی ذات کے شخص پر بھروسا نہ کرنا کبھی، یہ بتا دیتا ہوں میں تجھے۔ یہ بالکل اعتبار

کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ لاشاری سائیں کے پیر چاٹنے والا کتا، سائیں کی آنکھیں بند ہوتے ہی غداری پر اتر آیا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے یہ اب، تیرے پیر چاٹنا چاہتا ہے۔"

میں نے سیف علی کی پشت تھپکتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہیں ہے یار! یہ تو بڑا وفادار اور مہمان نواز آدمی ہے۔ یہ میرے ساتھ اسی لیے تعاون کر رہا ہے کہ یہاں میں لاکھو لاشاری کا مہمان ہی ہوں۔ یہ خود بلا کے لایا تھا مجھے۔"

"ہاں ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں جیلانی سائیں۔ جھوٹ نہیں کہا ہے انھوں نے کچھ بھی۔ تجھے پتا نہیں ہے، سائیں ان کا کتنا خیال رکھتے تھے، کتنی تعریفیں کرتے رہتے تھے وہ ان کی۔ بالکل بھائی سمجھتے تھے انھیں اپنا۔" سیف علی جلدی سے بولا۔

اس اثنا میں شرافت علی کار کی ڈکی کھول کر اس میں سے رسی نکال لایا تھا۔ میں نے اسے رسی لے کر سیف علی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اچانک سیف علی کو باندھنے کا فیصلہ تبدیل کر دیا۔ اور شرافت علی سے بولا۔ "سیف علی کو باندھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی ضمانت پر تھانے دار صاحب کو معاف کر دیا ہے میں نے بس اس ممتاز کو لپیٹ کے ڈال دو ادھر تاکہ یہ بھاگ نہ سکے یہاں سے البتہ اس کے اکھڑے ہوئے ہاتھ کا خیال رکھنا اسے نہ باندھنا۔ میں اسے بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا کوئی۔"

شرافت علی نے جلدی جلدی ممتاز کو رسی سے اس طرح جکڑ دیا کہ اس کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دینا ممکن نہیں رہا۔ اسے اچھی طرح باندھ کر اُس نے زمین پر لٹا دیا تو میں نے کہا۔ "آؤ اب ہم حویلی کے اندر چلتے ہیں۔ تم اور افضل بیگ آگے آگے چلو۔ میں سیف علی کے ساتھ تم دونوں کے پیچھے چل رہا ہوں۔ کیوں سیف علی ٹھیک ہے نا؟ اس طرح کسی کو کچھ شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں سائیں! شبہ تو آپ کو ہمارے ساتھ دیکھ کر کوئی یوں بھی نہیں کرے گا۔" سیف علی نے جواب دیا۔

تھانے دار افضل بیگ کو بے چون و چرا میری باتوں پر عمل کرنے ہی میں عافیت نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار پولیس افسر تھا، ہوا کے رُخ کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا تھا اس نے میرے بارے میں اندازہ کر لیا تھا کہ میں اس کے عہدے اور منصب کے رُعب میں آنے والا آدمی نہیں ہوں۔ تلخ کلامی یا دھمکیاں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔ ان سے اُسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کے بجائے الٹا نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے شرافت علی کے ساتھ آگے آگے چلنے لگا۔ میں نے سیف علی کے کاندھے پر نہایت دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"انہیں کچھ دور نکل جانے دو، مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنا ہیں، ہم دھیرے دھیرے چلیں گے۔"

"جی اچھا سائیں!" اس نے کہا اور چہرے پر اس کے تازگی سی نظر آنے لگی۔ میرے اس انداز نے اُسے خاصا مطمئن کر دیا تھا۔

شرافت علی اور تھانے دار افضل ہم سے آگے نکل گئے اور ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تو میں نے سیف علی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو سیف علی! میں نے تمہیں دوست کہہ کر تم پر اعتبار کیا ہے تو اب تم اس اعتبار کو قائم بھی رکھنا۔"

"کیسی بات کرتے ہیں جیلانی سائیں! خادم ہوں میں آپ کا، لاشاری آپ کی جتنی عزت کرتے تھے، میں اس سے بھی واقف ہوں، میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، وہ اپنا بڑا بھائی کہتے تھے آپ کو۔ اس رشتے سے بھی اب آپ ہی مالک ہیں ہمارے سائیں۔" وہ بولا۔

"پھر بھی تم نے حملہ کیا تھا مجھ پر۔ ایسا ہی کرتے ہو تم اپنے مالکوں کے ساتھ؟" میں نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب زیادہ شرمندہ نہ کریں نا سائیں! اس ذلیل تھانیدار کی باتوں میں آ کر یہ اوچھی حرکت کر بیٹھا تھا میں۔ اب معافی دے دیں مجھے۔"

"وہ تو میں نے تمہیں اسی وقت دے دی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ تم لاشاری اور آسیہ کی جھگڑے کی وجہ بھی جانتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں، لاشاری سائیں نے بتایا تھا مجھے۔ ایک بار جیل میں ان سے کچھ گستاخی ہو گئی تھی ان کے خلاف۔ اس گھڑی ان کا یہی خیال تھا کہ جیل میں آنے والی دوسری عورتوں کی طرح آسیہ بی بی بھی کوئی بُری عورت ہے۔ بس اسی غلط فہمی نے انہیں گستاخ بنا دیا تھا مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ انھوں نے آسیہ بی بی کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی تو وہ بہت نادم ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو آسیہ بی بی کا مُجرم سمجھنے لگے تھے۔ ان کے سامنے نظر اٹھا کر بات نہیں کرتے تھے کبھی۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے مُجرم کو اپنے ہی دامن میں چھپا لیں اور کسی کو آسیہ بی بی پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ دیں، مگر وہ بھی بڑی غیور عورت ہیں۔ لاشاری سائیں کی عاجزی، انکساری اور خوشامد کا ان پر بالکل اثر نہیں ہوتا تھا اور انہیں کسی قیمت پر بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھیں وہ کہتی تھیں، جب تک میں لاشاری کو اپنے ہاتھ سے موت کی نیند نہیں سلا دوں گی میرا سینہ

ٹھنڈا نہیں ہوگا، ایک مجرم کو زندگی کا مالک بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آخر آج انھوں نے اپنی بات پوری کر کے دکھا دی۔ انھوں نے لاشاری سائیں کو اپنے ہاتھ سے ختم کر دیا۔ یہ بات سائیں بھی جانتے تھے کہ ان کا انجام ایک دن یہی ہوگا اور وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں ہدایت کی ہوئی تھی کہ اگر آسیہ ان کی زندگی کا چراغ بجھانے میں کبھی کامیاب ہو جائے تو ہم میں سے کوئی اس سے انتقام لینے کے بارے میں نہ سوچے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ چاہے وہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں، مجھے یقین ہے اس نے ایسا ہی کہا ہوگا مگر پھر بھی ممتاز اس سے انتقام لینے پر تل گیا تھا، کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ لاشاری سائیں کی اس ہدایت کو کبھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ انہیں سمجھاتا تھا کہ وہ ایک معمولی سے واقعے کو خواہ مخواہ دل پر لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ وہ ایک عورت کی خاطر بہت زیادہ پستی میں چلے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایسا کوئی اہم واقعہ نہیں تھا جو اس سے پہلے کسی کے ساتھ پیش نہ آیا ہو۔ وہ کہتا تھا اس نے پہلے کبھی نہیں سنا کہ کوئی اتنی سی بات کے لیے کسی سے زندگی ہار گیا ہو، لاشاری سائیں تو خواہ مخواہ مجنوں کا جانشین بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے لاشاری سائیں سے صاف صاف کہہ دیا تھا اگر کبھی آسیہ نے اُسے کوئی نقصان پہنچایا تو وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا چاہے غلام جیلانی اس کے عوض اس کے سارے خاندان کو برباد کیوں نہ کر دے۔ ہاں سائیں! ایسا ہی کہا کرتا تھا وہ لاشاری سائیں سے۔"

"اچھا! اور لاشاری یہ سُننے کے بعد اُسے کچھ نہیں کہتا تھا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اُسے یہی کہتا تھا سائیں کہ تو اس کی گرد بھی نہیں پا سکے گا کبھی، وہ ایسی ہی شیرنی ہے۔ اگر تو نے میری بات نہیں مانی اور اُس سے اُلجھنے کی کوشش کی تو وہ تیرے بھی ٹکڑے کر کے نکل جائے گی اور تیرے قابو میں نہیں آئے گی وہ۔" سیف علی نے جواب دیا۔

"اب تیرا کیا خیال ہے سیف علی! لاکھو لاشاری کی موت کے بعد یہ جھگڑا ختم ہو گیا ہے؟ آسیہ اب تو اِدھر نہیں آئے گی کبھی؟"

"اس سلسلے میں کیا کہا جا سکتا ہے سائیں! ویسے لگتا تو ایسا ہی کہ اب وہ اِدھر نہیں آئیں گی۔ بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی اس کی۔"

"تجھے وجہ نظر نہیں آتی لیکن مجھے نظر آتی ہے۔ بڑی معقول وجہ ہے اس کی، ایک بہت اہم کام ابھی باقی رہ گیا ہے، جب تک وہ کام پورا نہیں ہو جاتا، وہ اِدھر ہی منڈلاتی رہے گی اور بار بار اس کے ہاتھوں اس حویلی کے دو ایک افراد کم... ہوتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیوں؟ وہ ایسا کیوں کریں گی؟ کون سا خاص کام رہ گیا ہے اب ان کا؟"

"تو نہیں جانتا میرے یار! حیرت ہے اتنی اہم بات کو تو بھولا ہوا ہے؟"

وہ چند ثانیے پیشانی پر بل ڈالے غور کرتا رہا، پھر بولا۔ "نہیں سائیں! مجھے یاد نہیں آتی کوئی ایسی بات۔ آپ چاہیں تو بتا دیں مجھے بھی۔"

"حیرت ہے یار! تجھے وہ آسیہ کا بچّہ یاد نہیں ہے جسے لاکھو لاشاری نے اُدھر شب خیر سے پچاس ہزار میں حاصل کیا تھا۔"

"اوہ وہ بچّہ! ہاں اسے یہ ممتاز ہی تو لایا تھا، مگر سائیں! وہ تو لاشاری سائیں کا بیٹا ہے۔" سیف علی حیرانی سے بولا۔

"ہاں، اسی کا بچّہ ہے وہ، مگر تم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ آسیہ بھی اس کی ماں ہے۔ وہ اس سے کیسے دست بردار ہو سکتی ہے؟"

"کیا کہہ رہے ہیں سائیں آپ؟" اس کا منہ حیرت کی زیادتی کے باعث کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے لاشاری نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔

"ہاں، ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ تعجب ہے تمہیں لاکھو لاشاری نے یہ بات نہیں بتائی۔" میں نے اسے حیران دیکھ کر کہا۔

"میں خود بھی حیران ہوں، لاشاری سائیں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی پھر اس معاملے میں ایسا کیوں کیا انھوں نے؟"

"ممکن ہے اس نے اس سلسلے میں آسیہ کا نام لینا مناسب سمجھا نہ ہو، یہ اس کے لیے کوئی قابلِ فخر بات تو نہیں تھی نا۔ اور لاکھو کی آنکھ میں بڑی شرم تھی۔ بے حد شریف النفس انسان تھا وہ، پھر پتا نہیں کیوں ان غلط دھندوں میں جا پڑا تھا؛ کوئی ایسی مجبوری ہوگی جو اسے کھینچ کر اس دلدل میں لے آئی ہوگی۔ ورنہ آدمی ایسا بالکل نہیں تھا وہ۔ بڑا دردمند دل رکھتا تھا سینے میں اپنے۔"

"ہاں سائیں! یہ مجبوریاں ہی تو ہیں جو آدمی کو انسان نہیں رہنے دیتی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو کوئی ان کانٹوں بھرے راستوں پر قدم ہی کیوں رکھے۔ کون اپنے پاؤں خوشی سے زخمی کرنا پسند کرتا ہے جیلانی سائیں؟ آپ کو بھی کوئی مجبوری ہی گھیر کر لائی ہوگی اِدھر۔"

"ہاں یار! ٹھیک ہی کہتا ہے تو بھی۔ کوئی اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا پسند نہیں کرتا مگر مجبوری سب کچھ کرا لیتی ہے۔"

"یہ آپ نے بالکل سچ کہا ہے، لاشاری سائیں بے حد شریف اور ہمدرد آدمی تھے۔ چند سال پہلے تک وہ ایک سیدھی سادی بھلے مانسوں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ زمینیں تھیں ان کے پاس اور کچھ مویشی پال رکھے تھے انھوں نے۔ اسی پر گزارہ ہو رہا تھا ان کا۔ بہت چھوٹی عمر میں ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بس ایک بہن تھی جسے انھوں نے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ عزیزوں، رشتے داروں نے ان کی مدد کرنا چاہی مگر سائیں نے کبھی کسی کی مدد قبول نہیں کی۔ وہ کہتے تھے بس اللہ سائیں کے سوا کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بڑے خوش اور مطمئن تھے وہ دونوں بہن بھائی۔ بستی کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے کبھی۔ ایک دن وڈیرا دھنی بخش نے ان کی ہنستی کھیلتی زندگی میں انگارے بھر دیے۔ اس ذلیل انسان نے ان کی غربت اور شرافت کی وجہ سے انھیں مجبور جان کر ان سے بہن کا مول چکانا چاہا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد لاشاری سائیں، بہن سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ کبھی نہ اس سے ملے گا نہ اس کا نام لے گا۔ اس کے لیے وہ انھیں تیس ہزار روپے تک دینے کو تیار تھا مگر لاشاری سائیں نے اس کو صاف جواب دے دیا کہ اس کی بہن کوئی بکاؤ مال نہیں ہے۔ ان شرائط پر انھیں یہ رشتہ کبھی منظور نہیں ہو سکتا۔ وڈیرا دھنی بخش بہت کمینہ آدمی تھا جیلانی سائیں! اس نے اسے اپنی آن کا مسئلہ بنا لیا۔ ایک رات جب زبردست بارش اور گھن گرج میں کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی، وڈیرے کے آدمیوں نے لاشاری سائیں کی جھگی میں گھس کر انھیں مار مار کے بے ہوش کر دیا اور ان کی بہن کو اٹھا کر لے گئے۔ غریب آدمی کے پاس عزت کے سوا ہوتا ہی کیا ہے سائیں؟ وہ کوئی وڈیرا لوٹ لے تو آدمی شریف بن کر کس طرح رہ سکتا ہے۔ لاشاری سائیں نے پہلی بار وڈیرا دھنی بخش کے خلاف اپنی بہن کی خاطر بندوق اٹھائی تھی۔ اس کے بعد پھر ان کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ نہیں سکی کبھی۔ بہن کا انتقام لینے کے لیے بدکرداروں کے لیے عذاب ہی بن کر رہ گئے تھے۔"

"ہاں یار سیف علی! یہ بہن بھائی کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ بہن کے لیے آدمی جہنّم میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے طوفانوں سے ٹکرا جاتا ہے اور ایسی دلدل میں جا اترتا ہے جہاں سے باہر آنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہتا۔ میں بھی ایک رات اپنی بہن آسیہ کے لیے زندگی لینے نکلا تھا گھر سے، پھر دوبارہ واپس جانا نصیب نہیں ہو سکا۔ آج تک اس راہ کو تلاش کر رہا ہوں جس سے گزر کر اِدھر آیا تھا۔ وہ لاشاری کی بہن کہاں ہے اب۔ وہ تو کہیں سکون سے بیٹھی ہے نا؟"

"نہیں سائیں! اس شرماں والی نے تو اسی رات کو کنویں میں کود کر جان دے دی تھی اپنی۔" سیف علی نے جواب دیا۔

میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، رواں رواں لرز اٹھا تھا میرا، چلتے چلتے قدم زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔ سینے میں عجیب سی گھٹن ہونے لگی تھی اور منہ سے آواز نکالنا مشکل ہو گیا تھا۔ تقریباً ایک منٹ تک میں یوں ہی گم صم کھڑا رہا تھا۔ پھر سیف علی نے ہی مجھے آواز دے کر میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے جیلانی سائیں؟ یہ اچانک کیا ہوا ہے آپ کو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟" وہ میری کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

میں نے بمشکل اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں، کچھ نہیں... مجھے کچھ نہیں ہوا ہے... میں... میں بالکل ٹھیک ہوں... سیف علی! چلو آگے چلو، تم رک کیوں گئے ہو؟"

"میں چل رہا تھا، رک تو آپ خود ہی گئے تھے۔" اس نے مجھے استعجابیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہ تو نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔ کیا گزری ہوگی اس غریب لاکھو پر؟ کیسے زخم دل پر لیے پھرتا تھا وہ۔ اس کی اور میری زندگی میں کتنی یکسانیت، موافقت ہے۔ وہ بھی اپنی بہن کی خاطر جرائم کی راہ پر آ پڑا تھا اور میں بھی اپنی آسیہ کی خاطر بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ یار سیف علی کچھ بتا سکتا ہے تو، یہ غریب کی بہن اور بیٹی کب تک ذلیل کی جاتی رہے گی؟ کبھی آسمان ان پر بھی مہربان ہوگا یا نہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سائیں اس سلسلے میں۔ یہ تو اللہ سائیں کے بھید ہیں، وہی جانتا ہے اس کے بارے میں۔"

"ہاں میرے بھائی! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ اصل مالک تو وہی ہے اس پوری کائنات کا۔ عزت اور ذلت سب اسی کے اختیار میں ہیں، وہ جسے جو چاہتا ہے، دے دیتا ہے۔ ہم اس کی مرضی میں دخل دینے والے کون ہیں، ہم تو صرف اطاعت کے لیے ہیں اس کی۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس کمرے کے دروازے تک جا

پہنچے جہاں لاکھو لاشاری کی لاش پڑی تھی۔ پولیس کے وہ سپاہی جنھیں ہم نے باندھ کر مہمان خانے میں ڈال دیا تھا، بندوقیں اٹھائے دروازے کے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنی اپنی بندوقیں مجھ پر تان دیں اور ان میں سے ایک نے کڑک دار آواز میں کہا "خبردار، ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو اور جہاں ہو وہیں کھڑے ہو جاؤ۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر سیف علی کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے سیف علی؟ یہ... یہ تھانیدار افضل بیگ نے دھوکا کیا ہے ہمارے ساتھ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اب۔"

"نہیں سائیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یا شاید تھانیدار انھیں ہدایت کرنا بھول گیا ہوگا۔ ٹھہریں آپ، میں دیکھتا ہوں یہ معاملہ کیا ہے۔" سیف نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کانسٹبل سے جس نے ہمیں للکارا تھا، پوچھا "تھانیدار صاحب کہاں ہیں؟ انھوں نے تمھیں بتایا نہیں کہ اُن کی اِن سے بات ہو چکی ہے؟"

"وہ اس کے دوسرے ساتھی کو لے کر اندر گئے ہیں۔ انھوں نے ہمیں کسی بات وات کے بارے میں نہیں بتایا۔" کانسٹبل نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھہرو، میں پوچھتا ہوں اس سے۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے سے اندر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے سیف علی کو تنہا اندر جانے کی اجازت دے کر اچھا نہیں کیا۔ اگر ان دونوں نے واقعی مجھے فریب دینے کی کوشش کی تھی تو اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ شرافت علی، تھانیدار افضل بیگ کے ہمراہ تھا، اسے بے بس کر کے باندھ لینا ان کے لیے مشکل نہیں ہوا ہوگا۔ آبی کو وہ شاید پہلے ہی قابو کر چکے تھے اور اب مجھے بھی گھیرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی بندوقیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں مگر اتنے سارے لوگ اگر ان بندوقوں کو لاٹھیوں کی طرح استعمال کرنے لگیں، یا ان سے مجھے دست بدست جنگ کرنا پڑے تو میرے لیے ان سب سے بیک وقت مقابلہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ اسی لمحے میں نے شرافت علی کو دیکھا، وہ آہستہ آہستہ منہ لٹکائے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے آبی بھی باہر آ گیا۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے تھانیدار افضل بیگ اور سیف علی تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ تھانیدار افضل بیگ نے مجھے دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بولا۔

"دیکھا سیف علی! میں نے آخر تمھارے اس مٹی کے شیر کو پنجرے میں پہنچا دیا نا۔ اب دیکھوں گا میں اس میں کتنا زور ہے۔ کیوں

جناب غلام جیلانی صاحب! دیکھا آپ نے قانون کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں؟" پھر وہ اپنے ماتحتوں سے بولا "کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو میرا، باندھو سالے کو۔"

ایک

بار پھر میری خم بارہ تقدیر
گھیر کر اس مقام پر لے آئی تھی

جس سے میں کترا کر نکل جانے کو کوشش کرتا ہوں۔ میں نے کبھی خونریزی کو پسند نہیں کیا۔ انسان کی جان لینا میرے نزدیک کبھی اچھا فعل قرار نہیں پایا لیکن نہ جانے کیوں حالات مجھے یہ ناپسندیدہ کام لینے پر کمربستہ رہتے تھے۔ گردش زمانہ مجھے اس مقام پر لا کھڑا کرتی تھی جہاں سے آگے جانے کے لیے انسانی لاشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہر مرتبہ بہت معمولی سے فرق کے ساتھ ایک ہی جیسی صورت حال درپیش ہوتی تھی۔ یا تو اپنی زندگی کا سفر تمام کر لوں یا اپنا راستہ صاف کر کے آگے چلا جاؤں اور اپنی جان کسے بھاری ہوتی ہے؟ کون چاہتا کہ وہ بے شمار ناتمام حسرتوں کو سینے سے لگائے پیوند زمین ہو جائے؟ اس حقیقت کو کون تسلیم نہیں کرتا کہ زندگی ایک انمول اور کمیاب شے ہے کہ ایک بار مٹی میں رل جانے کے بعد دوبارہ کبھی کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوتی، چنانچہ اس کی حفاظت سب پر مقدم ہے۔ اخلاقیات کا سارا فلسفہ انسانیت کا تمام درس اس وقت تک یاد رہتا ہے جب تک آدمی کی جان پر نہ بن آئے۔ بات اپنی بقاء کی ہو تو پھر کچھ یاد نہیں رہتا، اپنی جان بچانے کے سوا کسی کی پروا نہیں رہتی۔ آدمی کی ساری کی ساری جدوجہد، تمام تر ترقی کا منبع اس کا احساس ہی تو ہے۔ یہ ٹینک، طیارے، راکٹ، میزائل اور ایٹم بم اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر انسان اپنی زندگی کی حفاظت کی خاطر انھیں نیست و نابود کر سکے جو اس کی جان کے دشمن ہیں۔ سلامتی سب کو عزیز ہوتی ہے چاہے فرد ہو یا قوم سب زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ میں ایسا چاہتا تھا تو اس میں غلط کیا تھا؟ اس تھانیدار افضل بیگ سے میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تو اپنی پلاٹون کو لے کر خود کشی کی نیت سے میری راہ میں آ کھڑا ہو۔ میں نے تو اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، وہ منافقت پر اتر آیا تھا تو میں اسے سمجھا کیسے سکتا تھا اور وہ مجھے اتنی مہلت ہی کہاں دے رہا تھا کہ میں اس سے کچھ کہہ سکوں۔

پولیس کے چار جوان اس کے حکم کی تعمیل میں میری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میری جانب اپنی بندوقیں تان کر انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ غلام جیلانی کو بے بس کر کے باندھنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بے خوف و خطر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کا یہ انداز کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کہ اب تک کا تجربہ یہی بتا رہا تھا انھیں کہ جب چاروں طرف سے

کسی شخص کو بندوقوں کی سیدھ میں رکھ لیا جائے تو وہ مجبور محض بن کر ہی رہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شیر کا دل سینے میں لیے پھرنے والا بڑے سے بڑا سرکش اور شہ زور بھی گیدڑ بن جاتا ہے۔ یہ اعتماد ہی انھیں دم بدم میرے نزدیک کرتا جا رہا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جن آگ اگلنے والی بندوقوں پر بھروسا کر کے وہ میرے نزدیک آنے کی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں، وہ میرے سامنے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہو جاتی ہیں، ان کے دہانے خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں، زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں ان کی۔ ایسے میں وہ ان کی کوئی مدد کرنے کے قابل نہیں رہتی ہیں۔ البتہ وہ عاقبت نااندیش تھانیدار ہتھیاروں کی اس بے بسی کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی ممتاز کی اسٹین گن اور سیف علی کی بندوق کو میرے سامنے گونگوں بہروں کی طرح گم صم دیکھ چکا تھا مگر اس سے اس نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ شاید اسے کوئی وقتی خرابی ہی سمجھتا رہا تھا اب تک۔ کتنی صحیح اور سچی بات ہے یہ کہ آدمی کی بربادی کا وقت قریب آ جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کی عقل ساتھ چھوڑ جاتی ہے اس کا۔ صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے وہ۔ یہی نہیں بلکہ اچھے مشورے بھی پسند نہیں آتے ہیں اسے۔ ایسا ہی حال اس گھڑی تھانیدار افضل بیگ اور سیف علی کا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے اپنے شکنجے میں بے دست و پا سمجھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے انھیں حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"افضل بیگ! یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے اپنے حق میں۔ غلام جیلانی کو سمجھنے میں غلطی کر گئے ہو تم؟"

"یہ تو تجھے ابھی پتا چل جائے گا کہ کس نے کس کو سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ افضل بیگ نام ہے میرا بیٹے! اچھے اچھوں کی سمجھ ٹھکانے لگا دی ہے میں نے، تو تو چیز ہی کیا ہے۔ بہت تیس مار خاں سمجھتا تھا اپنے آپ کو؟"

"ٹھیک ہے پھر تو ہی ذمے دار ہے اپنے انجام کا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے شانے سے لٹکی ہوئی اسٹین گن پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خبردار، ہاتھ اسٹین گن سے ہٹالے جیلانی! یاد رکھ جتنی دیر میں تو اسے شانے سے اتارے گا، اتنی دیر میں تو آدھی درجن گولیاں تیرے سینے میں اتر چکی ہوں گی۔" تھانیدار افضل بیگ نے مجھے متنبہ کیا۔

میں نے اس کی تنبیہ کی پروا کیے بغیر اطمینان سے اسٹین گن شانے سے اتار کر سیدھی کر لی۔ مجھ پر اپنی بات کا کوئی اثر نہ دیکھ کر تھانیدار افضل بیگ بُری طرح بوکھلا کر چیخا "دیکھتے کیا ہو کم بختو! مار دو جان سے سالے کو۔ دیکھ لوں گا میں۔"

اس کے ماتحتوں نے اس کا حکم ملنے سے پہلے ہی، مجھ پر گولیاں داغنے کے لیے اپنی اپنی بندوقوں سے زور آزمائی شروع کر دی تھی مگر ان میں سے کسی کی بندوق بھی گولی اگلنے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کوشش کرتے تھے۔ بندوقوں کو جھٹکے اور زور لگاتے تھے مگر کسی بندوق سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ تب تھانیدار افضل بیگ کے پیروں کا نشانہ لے کر گولی چلا دی جو اس کی پنڈلی کو ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا تو اس کے ماتحت اپنی اپنی بندوقوں کو لاٹھیوں کی طرح اٹھا کر میری طرف لپکے۔ میں نے ان کی ٹانگوں پر تابڑ توڑ گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ تین چار نیچے گرے تو باقی ایک دم پلٹ کر بھاگے اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر دروازے کے بیچوں بیچ تھانیدار افضل بیگ پڑا دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی ٹانگ تھامے تڑپ تڑپ کر کراہ رہا تھا۔ آبی نے ان لوگوں کی حالت دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا اور حقارت سے ان کی طرف تھوک کر بولا "اوئے بھاگ گئے سالے بزدل۔ نکل گئی ساری فوں فاں سالوں کی۔"

میں نے آبی کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں خون جلاتا ہے اپنا؟ لعنت بھیج کمینوں پر۔ اِدھر آ میرے پاس، یہ جکڑ بند کھول دوں میں تیرے۔ سالوں نے ڈنگر سمجھ کر باندھ لیا تھا کیا تم دونوں کو؟"

آبی اور شرافت علی دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے ایک ہی رسّی سے باندھ رکھے تھے انھوں نے۔ وہ دونوں میرے قریب آ گئے، میں نے انھیں آزاد کر کے کہا "اب جلدی سے نکل چلو یار یہاں سے۔ پھر کوئی نئی افتاد نہ آ گھیرے ہمیں۔ ان کا بھروسا نہیں ہے کوئی۔"

جتنی دیر میں، میں نے آبی اور شرافت علی کو بندشوں سے آزاد کیا تھا، وہ لوگ وقت سے فائدہ اٹھا کر زخمی افضل بیگ کو کمرے میں کھینچ کر دروازہ بند کر چکے تھے۔ آبی نے تیزی سے آگے بڑھ کر باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا کر کہا "چل یار، نکل یہاں سے، ان رذیلوں کو بند کر دیا ہے میں نے، جب تک یہ باہر نکلیں گے یہاں سے ہم بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

ہم تینوں بھاگتے ہوئے باہر نکلے اور حویلی کا چکر کاٹ کر شرافت علی کی کار تک جا پہنچے۔ میں نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار اسٹارٹ کر دی۔ چابی اس کی اگنیشن میں موجود تھی۔ شاید شرافت علی نے یہاں آ کر کار کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان لوگوں نے گولیاں برسا کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا جس کی وجہ سے وہ کار سے نکل کر اس کی آڑ میں مورچا بند ہو گیا تھا۔ آبی اور شرافت علی کے عقبی نشست پر پہنچتے ہی میں نے کار ریورس میں باہر کی طرف دوڑا

دی۔ گرے ہوئے دروازے کے اوپر سے گزر کر باہر نکلنے کے بعد میں نے کار کو اسی طرف موڑ دیا جدھر آسیہ گئی تھی۔ کچی سڑک پر کار کو دوڑاتے ہوئے میں نے شرافت علی سے پوچھا۔ ”تم ہمیں لاکھولاشاری کے کمرے میں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے تھے شرافت علی؟“

یہ سوال میں نے اس سے اس لیے کیا تھا کہ میرا خیال تھا وہ اس خطرناک صورتِ حال میں ہمیں چھوڑ کر فرار ہونا چاہتا تھا۔ وہ میرے اس سوال کا مطلب سمجھ گیا تھا، بولا۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو جیلانی! میرا تمھیں چھوڑ کے بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آسیہ کے لاکھولاشاری کو ہلاک کر دینے کے بعد میں باہر اس لیے نکل گیا تھا کہ اب ہمیں فوری طور پر حویلی سے نکلنا ہو گا۔ یہ تو مجھے امید تھی کہ اندر جو حالات بھی پیش آئیں گے، تم لوگ ان سے بخوبی نمٹ لو گے چنانچہ میں چاہتا تھا، حویلی سے نکلنے کے لیے کار اسٹارٹ کر کے تیار رکھوں، تاکہ اگر تم لوگ لاشاری کے آدمیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے باہر آؤ تو تمھیں ایک لمحے بھی وہاں رکنا نہ پڑے۔ ایسے موقعوں پر ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ ذرا سی غفلت بازی پلٹ دیتی ہے۔“

آپی جلدی سے بولا۔ ”یہ تُو نے بالکل ٹھیک کام کیا تھا، تجھے تو یار بڑا تجربہ معلوم ہوتا ہے ایسے کاموں کا۔“

”اپنی زندگی بھی انھی ہنگاموں میں گزر رہی ہے میرے یار! میں کوئی شریف آدمی تو نہیں ہوں۔“ شرافت علی بولا۔

”حالاں کہ شکل سے بالکل ایسا ہی لگتا ہے جیسے ابھی ابھی وعظ ختم کر کے بس چلا ہی آ رہا ہے کسی مسجد سے۔“ آپی نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔ اس کی طبیعت کی شوخی کسی موقعے پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔

شرافت علی اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تجھے غلط فہمی ہو جاتی ہے اس کی معصوم صورت دیکھ کر۔ حقیقت یہ ہے جسے تو پاکیزگی سمجھ رہا ہے، وہ اس کے نام کا اثر ہے جو اکثر نظر آتا رہتا ہے اس کے چہرے پر۔ کوئی یوں ہی تو شرافت علی نام نہیں رکھ دیا گیا ہے اس کا۔“

”ہاں یار! اس کا تو نام بھی ایسا ہے کہ آدمی بھٹک جاتا ہے سنتے ہی۔ سوچ ہی نہیں سکتا کوئی کہ ایسے صاف ستھرے نام کے پیچھے میونسپلٹی کا کوڑا اٹھانے والا ٹرک کھڑا نظر آئے گا۔“

”اوئے چپ کر سالے دریائی گھوڑے! رُکے بغیر بکتا ہی چلا جاتا ہے جو منہ میں آتا ہے۔“ میں نے آپی کو ڈانٹا۔

شاید اسے بھی اپنی بے ہودہ گوئی کا احساس ہو[illegible] تھا۔ اس نے فوراً شرافت علی سے کہا۔ ”یار! معاف کر دی[illegible] میرے بھائی سالی ایسی بکواس نہیں کرنا چاہیے تھی مجھے [illegible] مگر کیا کروں یار! میری زبان کا ٹانکا اس سالے ذلیلا[illegible] توڑ دیا ہے....“

شرافت علی خاصا کشادہ دل آدمی تھا اور اس [illegible] دیر ساتھ رہ کر آپی کے مزاج کو بھی سمجھ لیا تھا لہٰذا اس [illegible] اس بات کا بُرا ماننے کے بجائے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کو[illegible] بات نہیں یار جی! یاروں کے درمیان ایسی ہی بے تکلفی ہو[illegible] اپنائیت اور خلوص ہوتا ہے اس میں۔ مجھے تمھارا یہ انداز [illegible] پسند آیا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے میرے لیے کہ تم [illegible] مجھے بھی جیلانی کی طرح اپنا سمجھا۔“

”اب یار! زیادہ سر نہ چڑھا اسے اور لعنت بھیج [illegible] ان فضولیات پر، یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے [illegible]

”تو پھر کن باتوں کا وقت ہے یہ؟ یہ بھی فرما دیجیے [illegible] غلام جیلانی المعروف بہ ہاشم خان صاحب!“ آپی نے منہ ب[illegible] سے کہا۔

”میں کہتا ہوں بکواس نہ کر ذلیل آدمی! کبھی وقت [illegible] بھی دیکھ لیا کر۔ زبان کو لگام دے کے رکھ اور دماغ است[illegible] کر لے ذرا سا۔“

”زبان چلانے کے لیے بھی تو دماغ ہی سے کام لینا ہے یار جی! اس کے بغیر زبان بھی کیسے چلائی جا سکتی ہے؟“

”بکتا ہے تُو سالے! یہ غائب دماغ لوگ جن کی کھو[illegible] میں بھُوسے کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے [illegible] کوچوں میں غلاظت کے ڈھیروں پر بھی بسیرا کر لینے میں عا[illegible] محسوس کرتے کوئی، اور پتھر اٹھا کے بچوں کے پیچھے بھاگنے [illegible] انھیں کچھ احساس نہیں ہوتا، زبانیں تو وہ بھی خوب چلاتے [illegible] بلکہ تیری طرح زبان ہی وہ چلاتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر [illegible] یک دم تیکھے سے اکھڑ گیا۔ ”کیا مطلب ہے تیرا [illegible]

ثابت کرنا چاہتا ہے [illegible] ح [illegible] ار شرافت علی! کیہ [illegible] آ لگا ہے یہ۔ کل جگ ہے [illegible] جس سالے [illegible] ساتھ خلوص اور محبت سے [illegible] رہ پاگل سمجھنے لگتا [illegible] بھلے [illegible]

”لیکن یار آپی! جیلانی نے تمھیں پاگل تو نہیں کہا ہے [illegible]“ شرافت علی نے معصومیت سے کہا۔

”قربان جاؤں تیری اس معصومیت اور سادگی [illegible] بھولا بنتا ہے۔ اوئے ہوش دی گل کر، مکھن نہ لگا۔ کوئی [illegible] فارم نہیں کھول رکھا ہے تو نے۔ بڑا تازہ تازہ مکھن ہے [illegible] پاس تو؟“ آپی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”نہیں یار، نہ میرا کوئی ڈیری فارم ہے اور نہ ہی مکھن لگا رہا ہوں میں کسی کو۔ تم خود بتاؤ جو بات میں نے سنی نہیں، اس کا اعتراف کیسے کر لوں؟“

”اچھا میرے بھولے بادشاہ! ذرا یہ تو بتا۔ اس نے جو گلی کوچوں میں غلاظت کے ڈھیروں پر بسیرا کرنے اور بچوں کے پیچھے پتھر لے کر دوڑنے والوں کی جو مثال دی تھی ابھی، تیرے خیال میں اس کا مطلب کیا تھا؟“ آپی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ خدانخواستہ، اللہ نہ کرے، میرے منہ میں خاک، تم پاگل ہو۔“

”اچھا تو اور کیا مطلب تھا؟ یہ بھی تو ارشاد فرما دیجیے۔“ آپی نے اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

”یہ تو کاٹنے کو کیوں دوڑ رہا ہے اس غریب شرافت علی کو؟ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے بھائی آخر؟“ میں نے آپی سے کہا۔

”اب تو خود دیکھ لے اپنے اس یار کو۔ اِن ڈائرکٹ وے میں کتا کہہ رہا ہے یہ مجھ سے بھائی کا رشتہ بھی ظاہر کر رہا ہے، اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ جو میں ہوں وہی یہ بھی ہے۔ یہ خود ہی تسلیم کر رہا ہے تو اب میں کیا کہوں اسے۔“ آپی جلدی سے بولا۔

”اچھا، بہت ہو گئی، اب بس بھی کرو بھائی جی! تجھ سے تو کچھ کہہ کر مصیبت میں ہی پھنس جاتا ہے آدمی، بالکل ہی کمبل ہو جاتا ہے تو، جان ہی نہیں چھوڑتا کسی طرح۔ میں کہہ رہا ہوں، ذرا سنجیدہ ہو کر سوچ میرے بھائی! وہ آسیہ پولیس کی جیپ لے کر بھاگی ہے، راستے میں کسی کی نظر میں آ گئی تو مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی۔“ میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

میری بات سن کر اس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔ آنکھیں اس کی ایک دم حیرت سے وا ہو گئیں۔ ”اچھا! پولیس کی جیپ لے بھاگی ہے وہ! کمال ہے یار! حد کر دی تیری اس بہن نے تو۔ اسے آخر ضرورت کیا پیش آ گئی تھی ا[illegible] ح بھاگنے کی؟ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی تھی کیا وہ؟ تُو نے جانے ہی کیوں دیا اسے اس طرح؟“ آپی حیرانی سے بولتا جا رہا تھا۔

”یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا، اسے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ آخر ہم اسے ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر تو نہیں چلے آتے۔ اسی کی خاطر تو دوڑے آئے تھے ہم یہاں ورنہ ضرورت کیا تھی ہمیں یوں آنے کی۔“ میں نے جواب دیا۔

”شاید اس نے یہ سوچا ہو گا کہ ہم لوگوں کا لاشاری کی حویلی سے بچ کر نکل آنا ممکن نہیں ہے۔ اپنے چاروں طرف خطرات کو دیکھ کر وہ اپنی جان بچا کر نکل گئی ہے۔“ شرافت علی نے کہا۔

”نہیں یار! اس طرح نہ سوچ اس کے بارے میں۔ ایسی موقع پرست بندی نہیں ہے وہ۔ تُو جانتا نہیں ہے اسے بھائی! جیلانی کی بہن کسی طرح بھی جیلانی سے کم نہیں ہے، شیرنی ہے شیرنی، بالکل اسی طرح جھپٹتی ہے آدمی پر۔“ آپی جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”آپی! ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے میری۔ اوہ ہاں، بالکل یہی بات ہو سکتی ہے۔“

”کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی تیری؟ کس بات کا ذکر کر رہا ہے تُو؟ ذرا صاف صاف بات کر، ایک تو تُو ٹینشن بہت کراتا ہے مجھ سے، یہ بہت بُری عادت پڑ گئی تجھ میں۔“ آپی تو ج[illegible] جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

”اوئے دماغ ٹھنڈا رکھ اپنا۔ ذرا تحمل سے بات سن میری۔ ہم میں سے کسی نے بھی غور نہیں کیا اس پر حالاں کہ لاکھولاشاری کی حویلی میں اچھا خاصا وقت گزار کر آئے ہیں ہم اور ہنگامہ بھی خوب ہوا ہے وہاں....“

”وہ تو ہوا ہی، ہم میں سے کون نہیں جانتا یہ بات؟ [illegible] اس میں غور کرنے والی کیا بات ہے؟“ آپی نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”اوئے جٹ بہادر! پوری بات تو سُن لیا کر، پہلے ہی بکواس شروع کر دیتا ہے۔“

”اچھا اچھا، بک نئیں زیادہ۔ بتا کیا کہہ رہا تھا تُو؟ وہ غور [illegible] طلب بات کون سی ہے تیری؟“

”وہ بات یہ ہے کہ اس سارے وقت میں ہمیں کوئی [illegible] علامت نظر نہیں آئی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس حویلی [illegible] کہیں کوئی بچہ بھی موجود ہے۔ حالانکہ اگر وہاں کوئی بچہ ہوتا [illegible] اتنے ہنگامے کے بعد خاموش نہیں رہتا۔ رو رو کے پوری حویلی سر پر اٹھا لی ہوتی اس نے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”لے بھائی شرافت علی! اب دیکھ لے تُو خود ہی۔ پاگل تو یہ مجھے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ دماغ خود اس کا اُلٹا گھوم رہا ہے۔ اچھی خاصی آسیہ کے بارے میں باتیں کرتے کرتے یہ بچہ....“ آپی بولتے بولتے اچانک یوں خاموش ہو گیا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات ایک دم یاد آ گئی ہو۔

”ہاں ہاں، بک نا اب، چپ کیوں ہو گیا ہے؟ پاگل ہو گیا ہوں میں۔ یہی کہنا چاہ رہا ہے نا تُو؟“ میں تلخی سے بولا۔

"اوئے جیلانی! یہ تُو آسیہ کے بچّے کی بات تو نہیں کر رہا ہے کہیں؟" آبی نے میرے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"اور کیا تیری اس ہیروئن الماس کے کسی گم شدہ بچّے کی بات کر رہا تھا میں؟ جو تُو یوں بھڑک اٹھا تھا اچانک؟"

"اس غلیظ شے کا نام نہ لے یار جی! میرے سامنے۔ اس سالی سفید پاؤڈر کی ہرجائی بڑھیا کو کہاں سے گھسیٹ لایا تُو درمیان میں؟ وہ بچّہ میرے ذہن میں نہیں تھا اس گھڑی، بالکل ہی بھول بیٹھا تھا میں اسے۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تُو، ذرا گمان تک نہیں ہوا تھا اس کا وہاں۔ وہ بچّہ اس حویلی میں نہیں ہے شاید۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے بچہ حویلی میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟"

"یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔ اس کا سراغ تو ضرور لگانا چاہیے ہمیں۔ جب تک بچّہ نہیں ملے گا آسیہ اس حویلی کی تھا نہیں چھوڑے گی، وہ بار بار چڑھ کر آتی رہے گی یہاں۔ یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے یار!"

"پھر کیا خیال ہے اب تیرا؟ کیا ہم واپس چلیں حویلی کی طرف؟ اُس بچّے کو تو ہمیں حاصل کرنا ہی ہے کسی نہ کسی طرح۔"

"مگر حویلی جا کر یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ بچّہ حویلی میں نہیں ہے تو پھر کہاں رکھا گیا ہے؟" آبی نے سوال کیا۔

"پہلے تو ہم اسے حویلی میں ہی تلاش کریں گے۔ وہاں نہیں ملا تو پھر ممتاز یا سیف علی سے معلوم کریں گے۔ انھیں ضرور پتا ہوگا کہ بچّہ کہاں رکھا ہوا ہے لاکھو لاشاری نے سے معلوم ہو سکتی ہے یہ بات۔" میں نے

"معلوم تو ہوگا انھیں ... تہ ... پنے پر آسانی سے بتا دیں گے اس کے بار ... نے پھر سوال کر دیا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کم کر کے اس کو روکتے ہوئے کہا "کیوں نہیں بتائیں گے وہ؟ اب انھیں دلچسپی کیا رہ گئی ہے بچّے سے؟"

"انھیں بچّے سے کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو مگر وہ ہمیں اس کے بارے میں بتائیں گے کچھ نہیں۔ انھیں کیا ہمدردی ہے آخر ہم سے؟"

"اگر وہ یوں نہیں بتائیں گے تو ہم انھیں بتانے پر مجبور کر دیں گے.. اور تُو یہ کیا بکواس کرنے لگا ہے؟ کیا جانتا نہیں ہے تُو، ہم نے تو مُردوں کو بولنے پر مجبور کر دیا ہے' ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ وہ سیف علی تو منٹوں میں فر فر بولتا نظر آئے گا تجھے۔"

"وہ تو تم سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہو جیلانی! مگر تم یہ بات پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ اب تک اسی کمرے میں بند ہوں گے جس طرح ہم انھیں بند کر آئے تھے۔ اب واپسی پر کیا حالات پیش آئیں گے، ان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی ان سے کہ وہ بار بھی ہمارے قابو آ جائیں گے۔" شرافت علی نے خدشے کا اظہار کیا۔

"وہ وہاں بند نہیں ہوں گے تو کہاں چلے گئے ہوں گے بھائی جی! کیا اس کمرے سے نکلنے کا کوئی اور بھی راستہ ہے تمھاری نظر میں، جس سے وہ باہر نکل سکتے ہیں؟" آبی نے

آبی کی یہ بات سن کر مجھے خیال آیا کہ لاکھو لاشاری کے اس مخصوص کمرے سے جس میں وہ بستر لگائے لیٹا تھا ملحق ایک اور کمرہ تھا جس کی دو کھڑکیاں عمارت کے عقبی حصّے میں کھلتی تھیں۔ اس کے علاوہ لاشاری کے کمرے کے بیرونی دروازے کے دائیں بائیں بھی دو کھڑکیاں دیکھی تھیں میں نے۔ وہ چونکہ اس وقت بند تھیں، اس لیے ہم میں سے کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ کھڑکیاں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے آدمی بآسانی گزر سکتا تھا۔ میں نے آبی کو مخاطب کر کے کہا "یہ شرافت علی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے آبی! تم نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا مگر جلدی میں ہم تینوں میں سے کسی نے بھی کھڑکیوں کا خیال نہیں کیا۔ وہاں چار کھڑکیاں موجود ہیں جن میں سے گزر کر وہ عمارت سے باہر آ سکتے ہیں۔ دو کھڑکیاں تو سامنے ہی ہیں اور دو ساتھ والے کمرے میں ہیں، وہ دونوں حویلی کے عقبی حصّے میں کھلتی ہیں۔ وہ اب تک تو کمرے سے نکل آئے ہوں گے۔"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں جلد از جلد حویلی سے نکل آنے کے سوا کوئی اور خیال ہی نہیں تھا اس وقت۔ چنانچہ جیسے ہی ہمیں نکلنے کا موقع ملا ہم فوری طور پر نکل بھاگے وہاں سے۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ ہمیں واپس بھی جانا پڑے گا۔" شرافت علی نے کہا۔ "اگر وہیں یہ خیال آ جاتا تو اس سے فارغ ہو کر ہی نکلتے ہم۔"

"ہاں یار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تُو۔ اگر حویلی میں ہی یہ کا خیال آ جاتا تو ہم اسی وقت یہ کام بھی کر لیتے، پھر واپس جانے کی ضرورت پیش نہ آتی ہمیں۔ حالانکہ میں اس سیف سے یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب تھانیدار نے ایک دم بازی پلٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے نمٹنے کے دوران یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی بس۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار! حالات ہی ایسا رُخ اختیار کر گئے تھے اچانک۔ سالوں نے ایک دم ہی بازی پلٹ کر رکھ دی تھی، کیسا سیاپا دکھایا تھا اس اُلّو کے پٹھّے افضل بیگ نے۔ بے خبری میں پیچھے سے آ کر مشکیں کس لی تھیں میری۔ مگر یہ شرافت علی کیسے آ گیا تھا اس کے پھندے میں؟ یہ تو آسیہ کے لاشاری کو گولی مارتے ہی نکل گیا تھا کمرے سے۔ پھر یہ کہاں مل گیا انھیں؟ کیوں بھائی شرافت علی؟"

شرافت علی کے بجائے میں نے کہا۔ "وہ یار! غلطی مجھ سے ہو گئی تھی دراصل۔ یہ بات بھول گیا تھا میں کہ وہ سالا پولیس کا سدھایا ہوا شاطر بن مانس ہے۔ چال چل گیا تھا وہ مجھ سے پولیس والی۔ ایسا گر بہ مسکین بن گیا تھا وہ کہ میں سمجھا اب اس کے پر پُرزے ناکارہ ہو گئے ہیں۔ یہی سوچ کر میں ذرا سا غافل ہو گیا تھا اس کی طرف سے۔ میری اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کے اس نے شرافت علی کو باندھ لیا تھا۔ سالا گرگٹ کی طرح پل پل رنگ بدلتا ہے۔"

"ہاں یار! ایسے ہی شاطر ہوتے ہیں یہ، ان کے ظاہر پہ تو جانا ہی نہیں چاہیے کبھی۔ موقع ملتے ہی مخالف کی بساط لپیٹ کے رکھ دیتے ہیں مگر ایک بات تو بتائیں حضرت غلام جیلانی مدظلہ' یہ آپ کے حصّے میں کس پیرِ کامل کی سجادہ نشینی آ گئی ہے، کس نے خلافت عطا کی ہے آپ کو؟"

"اوئے دماغ تو ٹھیک ہے نہ تیرا؟ یہ ایک دم تیری کون سے رگ پریشان کرنے لگی ہے تجھے؟ کیا بک رہا ہے تُو؟"

"بک نئیں سالے! سچ سچ بتا دے مجھے، یہ تجھ میں پیروں فقیروں والی صفات کہاں سے بھر گئی ہیں۔ کن پہنچے ہوئے لوگوں کے حجرے میں جا گھسا تھا تُو، کون سا چلّہ کاٹ کے آ گیا ہے تُو ان کے درمیان بیٹھ کر؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "چپ کر جا ذلیل آدمی! کیوں اللہ کے نیک بندوں کو مذاق کا نشانہ بنا رہا ہے۔ جہنّم کی ایک بھٹّی تو تجھے پہلے ہی اَلاٹ ہو چکی ہے، اب کیا پورا جہنّم اپنے نام کرانا چاہتا ہے جو مجھ جیسے گناہ گار اور دنیا کی دلدل میں گلے تک دھنسے ہوئے شخص کو ان عابد و زاہد لوگوں کی صف میں کھڑا کر رہا ہے۔ سالے میرے گناہوں کا بھی بوجھ بڑھا رہا ہے۔"

"جہنّم کا ایندھن تو پیارے تجھے بھی بننا ہے۔ ہم جیسے لوگوں سے ہی پیٹ بھرا جائے گا اس کا۔ چاہے کتنے ہی رنگ بدل لے مگر اپنے اعمال کی سیاہی پھر بھی صاف نہیں کر سکے گا تُو۔ پتا ہے مجھے اس بار جون بدل کے آ گیا ہے تو کہیں سے، ایسی باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں تجھے اب، لیکن ذرا مجھے بھی تو بتا دے یہ قصّہ کیا ہے آخر؟ کون سا عمل کرنے لگا ہے تُو، یا کوئی گنڈا تعویذ مل گیا ہے تجھے کہیں سے؟"

"کون سا قصّہ یار جی! کس کی بات کر رہا ہے تو؟ میری سمجھ میں نہیں آئی تیری بات۔ پتا نہیں کیا سما گیا ہے دل میں تیرے۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے انجان بن کر کہا تھا۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا' وہ کس سلسلے میں خلجان میں مبتلا ہو گیا ہے، اس کی بے چینی کا سبب کیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی مجھ سے اس سلسلے میں ضرور استفسار کرے گا مگر یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی بے چینی اور اضطراب اس درجہ بڑھے گا کہ وہ شرافت علی کی موجودگی ہی میں یہ قصّہ چھیڑ بیٹھے گا۔ ممکن ہے' اس نے سوچا ہو، اب شرافت علی کوئی غیر نہیں رہا ہے، ہماری کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی ہے چنانچہ اس کی موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بے شک وہ ہمارے معاملات میں شریک ہو کر ہمارا ہم راز اور دوست بن گیا تھا لیکن جو ربط مجھے آبی سے یا آبی کو مجھ سے تھا' وہ شرافت علی کو اتنی جلدی تو حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اور آبی تو ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چل رہے تھے۔ زندگی کا اچھا خاصا سفر ہم نے ایک ساتھ طے کیا تھا اور ایک دوسرے کی راہوں سے کانٹے چُنتے آئے تھے۔ ہمارے درمیان دوئی کا تو تصوّر تک نہیں رہا تھا' ایسے یکجان و دو قالب تھے ہم۔ آبی کے بغیر جیلانی اور جیلانی کے بغیر آبی نامکمل سے لگتے تھے۔ یہ مقام شرافت علی کو تو حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے اس قصّے کو چھیڑ بیٹھا تھا۔ اوروں کو تو میں اب تک مختلف تاویلوں سے ٹالتا رہا تھا مگر آبی ایک ضدّی اور منہ زور شخص تھا۔ اس پر میری کوئی ایسی ویسی بات تو اثر کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن میں بھی اس گھڑی مجبور تھا۔ شرافت علی کے سامنے صحیح بات منہ سے نکال ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ بھی اپنی بات کا جواب لیے بغیر باز آنے کو تیار نہیں تھا' بولا "بک نئیں جیلانی! تو جانتا ہے' میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ اُڑنے کی کوشش نہ کر مجھ سے سچ سچ بتا دے، ان سب کی بندوقیں تیرے اوپر گولیاں کیوں نہیں اُگل رہی تھیں؟"

میں نے کار دوبارہ حویلی کی طرف موڑتے ہوئے کہا "اوئے تیرا دماغ بالکل ہی الٹ گیا ہے کیا؟ یہ بات کیسے سما گئی تیرے دماغ میں؟ کیا مجھے کوئی جادوگر سمجھ لیا ہے تو نے کہ میں بندوقوں میں گولیاں جام کر دیتا ہوں، جادو کے زور پر؟"

"اچھا' تو پھر کیا وجہ تھی تیرے خیال میں؟ کیوں نہیں چل سکی تھیں گولیاں اس وقت؟" آبی نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں؟ ہو گیا ہوگا کوئی ایسا ہی نقص ان میں، میں کوئی اسلحے کا ماہر تو نہیں ہوں۔"

شرافت علی بھی بول اٹھا" یہ بات حلق سے اتر نہیں رہی ہے جیلانی! کسی ایک آدھ ہتھیار کی بات ہوتی تو سمجھ لیا جاتا، اس میں اچانک کوئی خرابی ہوگئی ہوگی۔ اُدھر کار کے پاس ممتاز کی اسٹین گن، افضل بیگ اور سیف علی کی رائفلیں نہیں چل سکی تھیں جس کے نتیجے میں تم نے ممتاز کو مغلوب کر کے ان دونوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر لاشاری کے کمرے کے باہر بیک وقت کئی رائفلیں ایک دم ناکارہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ کوئی بھید ہے ضرور اس میں، مجھے بھی حیران کر رکھا ہے ان واقعات نے۔"

میں نے قدرے ناگواری سے کہا" اگر تم لوگوں کو بھید نظر آرہا ہے کوئی تو پھر خود ہی کھول لو اس بھید کو۔ مجھے تو ایسی کوئی بات سمجھ نہیں آتی۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ میں جس اعتماد کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑا تھا، اس نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور اسی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں وہ اپنے ہتھیار استعمال نہیں کر سکے تھے مجھ پر۔"

"ہو سکتا ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہی درست ہو بحث میں تم سے اس لیے نہیں کر سکتا کہ اس کی کوئی وجہ نظر بھی نہیں آتی مجھے۔ یہ کوئی جادو یا ٹونا ٹوٹکا بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی میں اسے کوئی اور نام دے سکتا ہوں" شرافت علی نے کہا۔

آبی بولا" میری سمجھ میں آگیا ہے شرافت علی! بالکل یہی بات ہے۔ جبھی تو خود اسے بھی معلوم نہیں ہے کچھ؟"

"اچھا! کیا سمجھا ہے بھائی آبی! تم ذرا مجھے بھی سمجھا دو تاکہ میں بھی مطمئن ہو جاؤں" شرافت علی نے اس سے کہا۔

"وہ بات یوں ہے یار کہ اپنے اس جیلانی پر جنوں کے بادشاہ کی بیٹی عاشق ہوگئی ہے اور وہ اسے ہر مصیبت سے بچاتی رہتی ہے۔ کسی کا کوئی داؤ کارگر نہیں ہونے دیتی اس پر۔ بندوقیں اور اسٹین گنیں کیا ہیں بھائی، وہ تو توپیں تک جام کر سکتی ہے۔"

شرافت علی نے ہنستے ہوئے کہا" ہاں، ایسا ہی لگتا ہے مجھے بھی، بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے آبی!"

"ہاں یار شرافت علی! اسی لیے تو یہ بتا نہیں رہے ہیں۔ اس نے کہہ رکھا ہوگا اگر کسی کو بھی بتایا تو اس نے اب تک جتنی بھی گولیاں جام کر کے روک دی تھیں، ان سب کو آزاد کر دے گی ایک ساتھ۔ اب تو خود سمجھ لے، اس کے بعد اس بیچارے کا کیا حشر ہوگا۔"

میں نے کہا" اوئے لفنگے، سالے بکواس بند نہیں کرے گا اپنی، زبان چلاتے وقت ذرا یہ بھی خیال کر لے کہ گاڑی کا اسٹیئرنگ میرے ہاتھوں میں ہے اس گھڑی۔ اگر جنوں کی اس شہزادی نے بُرا مان کے اس کا رُخ کسی تناور درخت یا کسی اور خوف ناک مقام کی طرف کر دیا تو حشر نشر ہو جائے گا ہم تینوں کا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو کر رہ جائے گی یہ تیری زبان۔"

"او ہاں یار شرافت علی! ہمیں اس کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں یہ لوگ، انھیں ناراض نہیں کرنا چاہیے۔" آبی نے خوف زدہ ہونے والے انداز میں اس طرح کہا کہ میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

شرافت علی بھی ہنس پڑا تھا۔ پھر وہ بولا" جیلانی! کیا سچ مچ حویلی کی طرف واپس چل رہے ہو؟"

"ہاں، چل کے دیکھتے ہیں اُدھر، ممکن ہے وہ لوگ ابھی باہر نہ نکلے ہوں کمرے سے، اس خیال سے بند ہوں ابھی تک کہ ہم حویلی سے گئے نہیں ہیں، باہر کہیں ان کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیں حویلی کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے چلو دیکھتے ہیں چل کر۔ یہ کام بھی ابھی نمٹ جائے تو اچھا ہے ورنہ جن معاملات میں ہم نے ٹانگیں پھنسا رکھی ہیں، ان سے نجات ملنا آسان نہیں ہے۔ پتا نہیں دوبارہ آسیہ ادھر آئے تو ہم بر وقت اس کی مدد کو پہنچ سکیں یا نہیں" آبی بولا۔

"کوشش یہ کرنا ہے ہمیں کہ بچہ ملے یا نہ ملے، آسیہ کو تلاش کر کے ضرور ساتھ لے چلیں۔ اسے چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ دیوانی کسی دن ماری جائے گی، نہ جانے بچے کے پیچھے۔"

ہم حویلی کے قریب پہنچے تو ہم نے دس بارہ سواروں کو تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے بگاڑی نہر کے اس پُل کی طرف جاتے دیکھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ گرد و غبار کا ایک بادل تھا جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے تھے اور اس غبار ہی کی وجہ سے وہ ہماری کار کو دیکھ نہیں سکے تھے شاید۔

آبی بولا" لے بھئی جیلانی! یہ لوگ ہمارے ہی تعاقب میں دوڑے ہیں اُدھر۔ یہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم جس راستے سے آئے تھے اُدھر ہی سے واپس گئے ہیں۔ بہرحال موقع اچھا ہے ہم لوگوں کے لیے۔"

"ہاں، مگر پھر بھی احتیاط سے قدم دھرنا حویلی کے اندر۔ یہ مت سمجھ لینا کہ وہ حویلی کو بالکل ہی خالی چھوڑ گئے ہوں گے۔"

میں نے کار دوبارہ حویلی میں داخل کر کے، عمارت کے بالکل قریب لے جا کر روک دی اور انجن بند کرتے ہوئے بولا" تم دونوں ابھی قدم نہ دھرنا گاڑی سے باہر، میں نیچے اتر کے دیکھ لوں، یہاں کون کون موجود ہے۔"

"نہیں یار جی! اب ایسا بھی بزدل نہ سمجھ ہمیں....." آبی بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔

اس نے بھی...... افضل بیگ اور سیف علی کو کمرے سے باہر آتے دیکھ لیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی نہایت تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر کار سے باہر آگیا۔ کار سے اترتے ہوئے اپنے ساتھ سیٹ پر رکھی ہوئی اپنی اسٹین گن اٹھانا نہیں بھولا تھا میں۔ باہر نکلتے ہی میں نے اسٹین گن ان کی طرف کر کے کہا" پستول پھینک دو تم دونوں۔"

مجھے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے باعث وا ہوگئیں۔ انھوں نے جلدی سے پستول زمین پر پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ میں نے آبی سے کہا۔ "آبی! پستول اٹھا لے ان کے اور پوچھ ان سے اور کتنے آدمی رہ گئے ہیں حویلی کے اندر۔"

آبی جلدی سے کار سے اتر کر ان کی طرف بڑھا۔ میں نے ان دونوں کو للکارتے ہوئے کہا" تم دونوں چار چار قدم گن کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ خبردار! اگر بھاگ کے اندر گھسنے کی کوشش کی تو دروازے تک بھی پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل میں چار چار قدم پیچھے چلے گئے۔ میں انھیں نشانے پر رکھ کے آگے بڑھتے ہوئے ان کے قریب جا کر دو تین قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ آبی بھی دونوں کے پستول اٹھا کر میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا" ہم تو چلے ہی گئے تھے یارو! مگر شاید اس سوہنے رب کو ہی منظور نہیں تھا کہ ہم تمھیں اس طرح چھوڑ کے چلے جائیں۔ اسی لیے وہ دوبارہ واپس لے آیا ہے ہمیں، شاید تم دونوں کی موت بھی اس نے ہمارے ہی کھاتے میں ڈال دی ہے، اس کا حساب بھی وہ ہم سے ہی لے گا۔"

آبی کا لہجہ ایسا خوفناک تھا کہ سیف علی کے پیر کانپنے لگے تھے۔ وہ گھگھیاتے ہوئے بولا" مجھے معاف کر دو سائیں! میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے، میں بہت غریب آدمی ہوں، میرے بعد میرے بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے۔"

"یہ بات اب یاد آئی ہے تجھے کتے۔ اس وقت کیوں خیال نہیں آیا تھا اپنے بچوں کا جب اس موٹے کا پلڑا ذرا سا بھاری دیکھ کر اپنے سارے قول و قرار بھلا رہا تھا۔ کیسی حقارت تھی اس گھڑی تیری نظروں میں میرے لیے" میں نے گرج کر کہا۔

"مم... مم... مجھ سے بھول ہوگئی تھی... سائیں!.... بس.... آنکھوں پر... پٹی چڑھ گئی تھی۔"

آبی نے آگے بڑھ کر اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر مار کے کہا" الو کے پٹھے! دھوکا کرتا ہے ہم سے اور کہتا ہے بھول ہوگئی تھی۔ تیرے جیسے بدنسل کتوں کو زندہ چھوڑنا ہی نہیں چاہیے کبھی" آبی نے ایک اور جھانپڑ رسید کیا اس کے۔

افضل بیگ غصے سے دانت پیستے ہوئے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ بولا۔ "ایک ذمے دار افسر... کے سامنے یہ بدمعاشی کر کے بچ نہیں سکو گے تم لوگ۔"

آبی نے طیش میں آ کر اس پر ہاتھ گھما دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کا بھرپور ہاتھ افضل بیگ کے منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلا گیا۔ آبی بولا" سالے! بدمعاشی تو میں اب دکھاؤں گا تجھے۔ اور دیکھوں گا کہ تو کتنا بڑا افسر ہے۔"

میں نے کہا" لعنت بھیج یار آبی! کیوں وقت برباد کر رہا ہے اس پر اپنا۔"

آبی نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا" لعنت تو میں اس پر بہت اچھی طرح بھیجوں گا، پہلے اس سیف علی کو بھگت لوں میں۔" وہ سیف علی کی طرف مڑ کر بولا" ہاں بھئی، مٹھو بیٹے! ذرا بول تو جلدی جلدی، کون کون ہے حویلی کے اندر؟"

"ہم دونوں کے سوا بس ایک ممتاز ہے سائیں! اس کا ایک بازو جیلانی سائیں نے پہلے ہی اکھاڑ دیا ہے۔"

"ہوں" میں بولا" اگر اس میں ذرا بھی جھوٹ ہوا سیف علی! تو سمجھ لے تیری جان لیے بغیر نہیں جاؤں گا اس بار میں۔"

"بالکل جھوٹ نہیں بول رہا ہوں میں سائیں! آپ جیسے چاہیں اطمینان کر لیں اپنا۔ جھوٹ نکلے تو بے شک گولی مار دیں مجھے۔"

"ٹھیک ہے، اندر چلو تم دونوں" میں نے انھیں کہا۔

وہ دونوں فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ آبی کے ایک ہی ہاتھ نے اس افضل بیگ کی عقل ٹھکانے کر دی تھی۔ انھیں آگے بڑھتے دیکھ کر آبی نے چلا کر کہا" ٹھہرو! رک جاؤ ابھی۔ ایسے کیسے بڑھنے لگے ہو اُدھر؟"

وہ دونوں رک کر آبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے بھی اسے دیکھا اور پوچھا" کیا بات ہے؟ کیوں روکا ہے انھیں؟"

آبی آگے بڑھتے ہوئے بولا" ان ذلیل فریب کاروں سے ایک بار دھوکا کھا کے بھی ان پر اعتبار کر رہا ہے تو؟ پہلے مجھے جانے دے اندر، ورنہ یہ سالے اندر گھستے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کریں گے۔ یا بھاگ کے کسی اور کمرے میں

جا چھپیں گے۔"

آبی کا دماغ ایسے موقعوں پر خوب کام کرتا تھا۔ اسے بہت بروقت یہ بات سوجھی تھی اور بالکل ٹھیک سوجھی تھی۔ وہ ہم سے چند قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی تیزی سے دروازہ بند کر کے ہمیں اپنے پیچھے اندر داخل ہونے سے روک سکتے تھے وہ۔ آبی تیز تیز قدم اٹھاتا ان سے آگے نکل کر دروازے کے پاس پہنچ گیا تو میں نے ان دونوں کو دوبارہ آگے بڑھنے کو کہا۔ اس دوران شرافت علی بھی میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ اندر جا کر میں نے آبی سے کہا" آبی! اس موسٹے کی دُم کو تو باندھ کے کسی کمرے میں ڈال دے یار! اس کا کوئی بھروسا نہیں ہے، کسی وقت بھی اس پر تھانیداری کا بھوت سوار ہو گیا تو خواہ مخواہ کی مصیبت کھڑی کر دے گا ہمارے لیے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کے خون کا الزام لینا پڑے گا اپنے سر۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ میں بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا اس کے بارے میں۔" آبی نے جواب دیا۔ پھر ان دونوں سے بولا۔ "ذرا سی دیر اِدھر ہی کھڑے ہو جاؤ جوانو! میں کوئی رسّی تلاش کر لوں تمھارے لیے۔"

آبی نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک جانب دیوار کے ساتھ ایک چارپائی ٹکی کھڑی تھی۔ آبی بڑھ کر اس کی پائینتی سے رسّی کھول کر لے آیا۔ پھر اس نے شرافت علی کی مدد سے..... افضل بیگ کو باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا اور باہر سے اس کی کنڈی چڑھا کر بولا" لے بھائی ذمے دار افسر! تو تو یہاں آرام کر یار! ہمیں بڑے کام نمٹانا ہیں ابھی تو کہاں رُلتا پھرے گا ہمارے ساتھ۔"

میں نے سیف علی سے کہا" چل بھئی اب ذرا ہمیں حویلی کی سیر کرا دے۔ ہم بھی تو دیکھیں تیرے مالک لاکھو لاشاری نے کیا کیا بنا رکھا ہے یہاں۔ سنا ہے تعمیرات کے سلسلے میں بڑا ستھرا اور اعلیٰ ذوق رکھتا تھا وہ؟"

سیف علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا" سائیں! آپ کو کسی خاص چیز یا مال کی تلاش ہے تو آپ مجھے بتا دیں۔ میں سیدھا آپ کی مطلوبہ جگہ پر لے چلوں گا آپ کو۔ یوں حویلی میں کہاں کہاں دیکھتے پھریں گے آپ؟"

"یہ تو نے کیسے اندازہ لگایا کہ ہم یہاں مال لینے آئے ہیں؟ مال کی کمی نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہم سچ مچ حویلی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو بس اتنا ہی کر دے ہمارے لیے، ایک ایک کمرہ، ایک ایک جگہ دکھا دے ہمیں یہاں کی۔"

"جو حکم سائیں! مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہے، آئیں آپ لوگ میرے ساتھ، ایک ایک کونا دکھاؤں گا میں آپ لوگوں کو۔ ویسے اگر آپ مجھ کو ٹھیک بات بتا دیتے سائیں تو اچھا ہوتا۔ ادھر پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا ہے۔ لاشاری سائیں مارا گیا، ممتاز کا بازو اکھاڑ دیا ہے آپ نے، میں چاہتا تھا اور زیادہ نہیں ہو، بس اس لیے کہتا تھا آپ کو کہ...."

"کیا مطلب ہے تیرا اس بات سے... اور کیسی گڑبڑ ہو سکتی ہے اب؟ سارے لوگ تو جا چکے ہیں یہاں سے، پھر گڑبڑ کیسے ہو گی؟"

"لوگ گئے ہیں پَر وہ واپس بھی آسکتے ہیں سائیں! کوئی ہمیشہ کے واسطے تو نہیں چلے گئے ہیں نا وہ۔ کیا پتا واپسی پر وہ اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی لیتے آئیں، ان کے ساتھ پولیس کے جوان بھی ہیں۔ وہ بھی تھانے پہنچ کر مزید پولیس والے اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے یار آبی! میرا تو خیال ہے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر لی جائے۔" میں نے آبی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کر کے دیکھتے ہیں۔" آبی نے جواب دیا، پھر وہ سیف علی سے بولا" ایک بات سچ سچ بتا دے سیف علی! یوں سمجھ لے کہ میرے سوال کے صحیح جواب پر ہی تیری موت اور زندگی کا دارومدار ہے، سچ بول دیا تو جان بچ سکتی ہے تیری۔"

"پوچھیں سائیں! جو کچھ مجھے معلوم ہے ضرور بتا دوں گا۔ کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر ہمیں بتاؤ لاشاری نے آسیہ کے بچے کو کہاں چھپایا ہے؟ کیا وہ اس حویلی میں ہے؟"

"اوہ، تو آپ اس بچے کی خاطر واپس آئے ہیں۔ یہ تو آپ آتے ہی پوچھ لیتے مجھ سے، اسی وقت بتا دیتا میں۔"

"بکواس نہ کر سیف علی! جلدی سے بتا دے کہاں ہے وہ؟" آبی نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر نہیں ہے سائیں وہ، لاشاری سائیں نے اس کو حویلی میں تو لانے تک نہیں دیا تھا۔"

"جھوٹ نہیں بک اوئے سیف علی کے بچے! مغز کھول دوں گا میں، جانتا نہیں ہے تو مجھے۔ جیلانی کی طرح میرے دل میں ذرا بھی معاف کر دینے یا رحم کھانے کا جذبہ نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لے اپنے۔" آبی نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ میں بالکل نہیں بول رہا ہوں سائیں آپ میری بات کا یقین کر لیں۔ بچہ یہاں نہیں لایا گیا کبھی۔ لاشاری سائیں کا کہنا تھا، اس بچے پر اس حویلی کا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اُسے دور ہی رکھو اس سے۔" سیف علی نے گھبرا کر جلدی جلدی کہا۔

"اچھا! ایسا کہتا تھا وہ؟ خود تو یہاں رہتا تھا اور بچے کو اپنے سے دور رکھنا چاہتا تھا اس جگہ سے۔ ایسا کیوں چاہتا تھا وہ، یہ بھی کبھی بتایا تھا اس نے تم میں سے کسی کو؟ کم از کم تجھے تو ضرور بتایا ہوگا۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں جی! میرے پوچھنے پر بتایا تھا اس نے مجھے۔ اس کا کہنا تھا، یہ جگہ بھلے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہاں تو بس لوٹ مار کرنے والے ہی رہ سکتے ہیں، ایسے لوگ ہی یہاں لائے جا سکتے ہیں جنھیں ڈاکو اور قاتل بنانا مقصود ہو۔ بھلے لوگوں کو تو ہوا بھی چھو کر نہیں گزرنا چاہیے اس پورے علاقے کی۔" سیف علی نے بتایا۔

"اچھا تو وہ اس بچے کو قاتل اور ڈاکو نہیں بنانا چاہتا تھا مگر اس کی پرورش جہاں بھی رکھ کر کرنا چاہتا تھا اس پر پیسہ تو اپنا ہی خرچ کرتا نا وہ... اور یہی کر بھی رہا ہوگا۔ بچے کے سارے اخراجات وہ اس ڈاکے اور لوٹ مار کی حرام کمائی سے ہی پورے کر رہا ہے نا، یہی رزق حرام جاتا ہے اس کے پیٹ میں بھی یا اس کے لیے کوئی اور بندوبست کیا ہے اس نے؟"

"وہ تو مجبوری ہے سائیں! ہم لوگوں کا دھندا یہی ہے، اس کے سوا کوئی اور ذریعہ تو نہیں ہے ہماری آمدنی کا۔ پھر اپنے بچوں کے لیے حلال روزی کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں ہم؟ پر یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ بچے ہمارے پیشے کے بارے میں نہ جان سکیں اور بھلے لوگوں کے درمیان اچھے انسانوں کی طرح عزت سے رہیں۔" سیف علی نے عاجزی سے کہا۔

"اچھا استدلال ہے یہ تم لوگوں کا۔ بچوں کو حرام کھلاتے ہو اور چاہتے یہ ہو کہ وہ اچھے انسان بن کر رہیں۔ تمھیں کسی نے یہ نہیں بتایا سیف علی کہ اچھا انسان بننے کے لیے آدمی کی رگوں میں گردش کرنے والے لہو کا صاف ستھرا، ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہونا بہت ضروری ہے۔ آدمی کے کردار کا تمام تر دارومدار اس رزق پر ہی ہوتا ہے سیف علی! جس سے پرورش ہوتی ہے اس کی۔ رزق حرام سے پرورش پانے والے بچے کبھی اچھے انسان نہیں بن سکتے۔"

"ایسا نہ کہیں سائیں! ایسی بد دُعا تو نہ دیں بچوں کو ہمارے۔ حالات نے جس راہ پر ڈال دیا ہے ہمیں، یہ مجبوری ہے ہماری۔ مگر ہم اپنے بچوں کو اس ماحول میں گھسیٹنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کو پتا تک نہیں اس گندگی کے بارے میں، جب انھیں کچھ علم ہی نہیں ہوگا، وہ اس راہ کو جانتے ہی نہیں ہوں گے تو ادھر کا رُخ کیوں کریں گے؟"

"خیال ہے یہ تمھارا۔ اور یہی سوچ تو آج ہماری بربادی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ محنت مشقت کر کے تنکا تنکا جوڑنے کے بجائے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ ایک بار حرام حلال کے فرق کو نظر انداز کر کے دولت مند بن جائے، اس کے بعد پھر زندگی بھر سیدھے راستے پر چلتا رہے گا اور اپنے بچوں کو برائی کے قریب تک نہیں پھٹکنے دے گا مگر یہ نادان لوگ یہ نہیں جانتے کہ ایک بار دلدل میں اتر جانے کے بعد دوبارہ زمین پر پاؤں دھرنا اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ پھر آدمی اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہے بس۔ اور جس اولاد کی بہتری کی خاطر وہ یہ جہنم قبول کرتا ہے، وہ اولاد بھی اس آگ سے بچا نہیں پاتی اپنے آپ کو۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، میرے سوہنے رب کے بھیجے ہوئے پیغمبر کہتے اور سمجھاتے آئے ہیں دنیا والوں کو کہ رزقِ حرام آدمی کو نیکی کے قریب بھی نہیں جانے دیتا۔ دل کو سخت اور ضمیر کو مردہ کر دیتا ہے، آنکھوں کا پانی خشک کر کے انسان کو بے غیرت اور بے حیا بنا دیتا ہے۔ یوں سمجھ لو انسانیت کے لیے سمِ قاتل ہے یہ۔ پھر کوئی یہ کیسے سمجھ لیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حرام مال سے پروان چڑھانے کے بعد اچھا انسان بھی بنتے ہوئے دیکھ سکے گا۔ وہ ان سے بھلائی کی امیدیں باندھ کر کیوں بیٹھ جاتا ہے؟ یارو! اس طرح جوان ہونے والی اولاد تو خود تمھارا بڑھاپا عذاب بنا دے گی...!"

آبی نے میری بات کاٹ دی۔ وہ بولا" بس... بس بھائی۔ غلام جیلانی! بس کر یار تو نے تو رزق حرام کے موضوع پر باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔ میرے یار! وعظ کہنے لگا ہے تو تو۔ غلط تو نہیں کہا تھا میں نے کہ تو نے ضرور پیروں فقیروں کی صحبت میں بیٹھنا اٹھنا شروع کر دیا ہے آج کل، یقین ہو گیا ہے اب تو مجھے یوں ہی نہیں بدل گیا ہے یہ تیرا چال چلن۔"

میں نے کہا" فضول نہ بکا کر آبی! کیوں میرے گناہوں کا بوجھ بڑھاتا چلا جاتا ہے؟ کبھی کوئی نیک کام بھی کر لینے دیا کر مجھے۔"

"اچھا تو، یہ نیک کام کر رہا تھا تو اس گھڑی؟ مجھے کیا پتا تھا یار! بتا دیا ہوتا تو نہ ٹوکتا میں تجھے۔ میرا تو خیال تھا کہ تو نے اس کام کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کر لیا ہے۔ یہ وقت اس کام کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔" آبی ہنستے ہوئے بولا" اور کیا تو محض سیف علی کو یہ باتیں بتانے کے لیے ہی واپس لے کر آیا ہے ہمیں؟"

"ہاں، کسی گم کردہ راہ کو صراطِ مستقیم کا پتا بتانا بہت بڑی نیکی ہے آبی، تو جانتا نہیں ہے یہ بات۔ اور ایسے کاموں کے لیے کوئی موقع نہیں ڈھونڈا جاتا، کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس کے لیے، اس کا موقع تو وقت خود فراہم کر دیتا ہے آدمی کو۔"

آبی قدرے طنز کرنے کے انداز میں بولا" اوئے چپ

کرجا اب سالے نیم ملّا خطرۂ ایمان! تجھے یہ نہیں بتایا کسی نے کہ عالم بے عمل کی کسی بات میں اثر نہیں ہوتا کبھی۔ کسی دیولے کی بکواس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ایسے آدمی کی کوئی نصیحت بھی۔ پتا نہیں لوگ دوسروں کے عیب گنواتے ہوئے اپنے اعمال کو کیوں بھول جاتے ہیں، اپنی کوئی برائی یاد ہی نہیں رہتی ہے انھیں، کیوں بھائی شرافت علی! تو کچھ روشنی ڈالنا پسند کرے گا اس معاملے پر؟" اس نے شرافت علی کی طرف رُخ کر لیا۔

وہ جلدی سے بولا "بس جی، بھائی جی! مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ۔ میری مٹی کیوں خراب کرنا چاہتے ہیں..."

"لے سن لے جیلانی! کیا کہہ رہا ہے یہ تیرا یار شرافت علی؟ اس کی مٹی خراب ہو جائے گی تیری ان باتوں سے۔" آبی نے بات کاٹ کر کہا۔

شرافت علی ہنس کر بولا "میری مانو تو جس کام کے لیے ہم دوبارہ آئے ہیں یہاں، اسے نمٹا کر جلد سے جلد یہاں سے نکلنے والی بات کرو بھائی۔ اس عالمانہ گفتگو میں پھنس گئے تو واپسی کا راستہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ہاں، یار! دیکھ نا میں بھی یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اس کو اتنی دیر سے۔ مگر اس پیرِ جاہل پر تو پند و نصائح کا دورہ پڑا ہوا ہے اس گھڑی۔ سالا مانے کے ہی نہیں دے رہا ہے کسی طرح۔" پھر وہ سیف علی سے مخاطب ہوا "ہاں بھئی کیا نام ہے تیرا سیف علی! تو بس یہ بتا دے میرے دیر ہمیں کہ تیرے اس مرحوم و مغفور لاکھو لاشاری نے آسیہ بی بی کے اس نورِ نظر، لختِ جگر کو اس حویلی میں نہیں رکھا ہے تو پھر اور کہاں رکھا ہے؟ اُسے اگر ہم حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں کہاں جانا ہو گا اس کے لیے؟ کس آستانے پہ جبیں ٹکانا ہو گی؟ کس کا بوہا کھڑکانا ہو گا ہمیں پیارے بھائی؟"

"یہ تو میں آپ کو بتا ہی دوں گا سائیں! لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ بچّہ کہاں اور کس کے پاس ہے، آپ حاصل نہیں کر سکیں گے اُسے۔ بلکہ زیادہ امکان تو اس بات کا ہے کہ شاید پہنچ بھی نہ پائیں آپ اُس تک۔" سیف علی نے کہا۔

"اچھا! ایسی بات ہے کوئی؟ پھر تو یار ضرور بتا ہمیں تو۔ پتا تو چلے وہ کون سا مقام ہے جہاں ہمارے قدم نہیں پہنچ سکتے ہے؟"

"کراچی میں لاشاری سائیں کے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ وہ بچّہ ان میں سے ہی کسی کے پاس ہے۔" سیف علی نے بتایا۔

"کہاں رہتے ہیں وہ؟ میرا مطلب ہے کراچی میں کس جگہ ہیں وہ رشتے دار لاشاری کے؟ اور بچّہ ان میں سے کس کے پاس ہے؟"

"یہ تو مجھے پتا نہیں ہے سائیں! میں کبھی گیا نہیں، بس سنا ہی ہے ان کے بارے میں۔"

"بک نہیں او چوہڑے!" آبی نے طیش میں آ کر اس کے منہ پر مارا "ٹھیک ٹھیک بتا دے کہاں ملیں گے وہ لوگ؟"

اس کا ہاتھ اتنے زور سے پڑا تھا سیف علی کے، وہ اُلٹ کے پیچھے جا پڑا تھا۔ گرتے ہی اس نے سنبھل کر، ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر گھگیاتے ہوئے کہا "یقین سائیں! میں جھوٹ نہیں بول رہا آپ سے۔ مجھے پتا معلوم کا تو ضرور بتا دیتا میں۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے بتا دیا آپ کو۔"

"میں کہتا ہوں سیدھی طرح بک دے خبیث کی اولاد، میرے ہاتھوں مرنا چاہتا ہے؟" آبی نے اس کی کمر پر ٹھوکر مار کر کہا۔

"آپ مالک ہیں سائیں! اگر مارنا ہی چاہتے ہیں تو مرضی ہے آپ کی۔ مجھے جو کچھ پتا تھا بتا دیا میں نے۔" سہلاتے ہوئے عاجزی سے بولا۔

میں نے آبی کا بازو پکڑ کے اسے الگ ہٹا دیا "تم مجھے بات کرنے دے اس سے۔" میں نے سیف علی کے سامنے ہوئے کہا۔

"تُو خواہ مخواہ وقت برباد کرے گا اپنا، یہ چوہڑا ہے، بکے گا کچھ بھی۔ مجھے نمٹ لینے دے اس سے جیلانی!"

"نہیں یار! مانا بھی کر کبھی، بال بچّوں والا آدمی ہے بچّے رُل جائیں گے غریب کے۔ تُو ہٹ پرے، یہ بتا دے" میں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے آبی کو دور جانے کے لیے کہا۔

آبی غصّے سے دانت بھینچتا ہوا دور جا کر کھڑا "میری بات لکھ لے جیلانی! یہ لاتوں کا بھوت ہے، باتوں سے نہیں مانے گا کبھی۔"

"اچھا اچھا، چُپ کر جا اب۔" میں نے اسے کہتے ہوئے سیف علی سے پوچھا "ہاں تو بھائی سیف علی! یہ ذرا گرم مزاج آدمی ہے۔ اس کی کھوپڑی جلدی سے سالا آؤٹ ہو جاتا ہے بالکل۔ اب تُو مجھے تو"

وہ پھر عاجزی سے بولا "جیلانی سائیں! یقین کر بات کا، میں نے جھوٹ ایک لفظ نہیں بولا ہے اب۔"

"اچھا تو سچ مچ تجھے کچھ پتا نہیں ہے ان کے نام تو سنے ہی ہوں گے نا ان کے تو نے، وہی بتا دے"

"وہ جی لاشاری سائیں نے اس کا نام پیرو بتایا تھا اس نازکو۔ پیر محمد نام ہو گا اس کا۔" سیف علی بولا۔

"او ہو، تو یہ ممتاز پہنچا کے آیا تھا اسے پیرو کے پاس، یوں سیف علی ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی اسی کو بھیجا تھا لاشاری سائیں نے اُدھر۔ اس کو سب کچھ معلوم ہے مگر اس سے کچھ اگلوانا آسان کام نہیں ہے۔"

"چل بھئی آبی! دیکھتے ہیں اسے بھی چل کر، کتنی دیر منہ بند رکھتا ہے وہ ہمارے سامنے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو، تو بھی اٹھ جا سیف علی! اور آگے لگ جا ہمارے۔ تجھے بھی ہم یوں چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔" آبی بولا۔

میں نے بھی اسکی تائید کی "ہاں یار! تجھے ہمارے ساتھ ہی رہنا ہے جب تک اس حویلی میں ہیں ہم۔ فیصلہ تیرا یہاں سے جاتے ہوئے ہی کر سکیں گے، ویسے یہ اطمینان رکھ اگر تو نے یوں ہی تعاون جاری رکھا تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تجھے۔"

وہ سہمی سہمی خوفزدہ نگاہوں سے آبی کو دیکھتے ہوئے اٹھا اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ میں نے شرافت علی سے کہا "یار جی! اپنی گاڑی کا بھی خیال رکھنا، غافل نہ ہو جانا اس کی طرف سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اُدھر پوچھ گچھ ہی کرتے رہیں اور کوئی ہماری اس سواری کو غائب ہی کر دے۔ پھر تو پیدل ہی دھکّے کھاتے پھریں گے ہم سب۔"

"میں اسے لاک کر کے آجاتا ہوں۔ ویسے امکان کم ہی ہے ایسی کسی بات کا۔" شرافت علی بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔

اس خیال میں نہ رہنا، یہاں جو کچھ ہونے کا امکان، دُور دُور نظر نہیں آتا، وہی کام ہو جاتا ہے لمحوں میں اور آدمی کو حیرت کے اظہار تک کا موقع نہیں ملتا۔ حویلی کے تمام ہی لوگ باہر ہیں اس وقت اور وہ کسی بھی لمحے واپس آسکتے ہیں۔ باہر تمھاری کار کھڑی دیکھ کر انھیں اندر کے حالات کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی، پھر وہ ہمیں گھیرنے کے لیے سب سے پہلے ہمارے بچ نکلنے کے راستے بند کریں گے۔"

"ہاں، یہ تو بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے جیلانی! کھوپڑی تمھاری بھی خوب کام کرتی ہے۔ تمھارے اب تک محفوظ رہنے کا راز یہی ہے، تم کوئی کام کرتے وقت یا کسی معاملے سے نمٹتے ہوئے کبھی ایک کھو کر نہیں رہ جاتے۔ اپنے گرد و پیش پر پوری نظر رکھتے ہو اور ہر قسم کی صورتِ حال سے مقابلے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہو۔ یہ بات مجھے بہت پسند آئی ہے تم دونوں کی..." شرافت علی میری تعریف میں بولتا ہی چلا جا رہا تھا اس کے لہجے اور انداز سے میرے لیے بڑی محبت اور بے پناہ خلوص کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ رہ کر اب تک جو کچھ دیکھا تھا اس نے میرا گرویدہ بنا دیا تھا اسے مگر ابھی میرے پاس اس کے اس اظہارِ عقیدت سے لطف اندوز ہونے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے جذبوں کے اظہار کی پوری پوری آزادی دے دیتا۔ اسے روکنے کی بالکل بھی کوشش نہیں کرتا لیکن اس نے اس کام کے لیے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ یہ وقت اس کام کے لیے مناسب نہیں تھا چنانچہ میں نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ میں نے کہا "چھوڑ یار! ان باتوں کو اور جا کر گاڑی سنبھال اپنی اس کا رُخ باہر نکلنے کے راستے کی طرف کر کے بہت ہوشیاری سے بیٹھنا۔ ہتھیار بالکل تیار رکھنا اپنے، ذرا بھی گڑبڑ کا امکان نظر آئے تو بھون کے رکھ دینا سالوں کو، گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہی ہم تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔ ہماری فکر نہیں کرنا تو۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ، میں خیال رکھوں گا ادھر کا۔ کسی کو اس راستے سے تم تک نہیں پہنچنے دوں گا۔" شرافت علی بولا۔

وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اور میں نے تیزی سے ادھر قدم اٹھانا شروع کر دیے جدھر آبی سیف علی کو ہانک کر لے گیا تھا۔ وہ دونوں مجھے اسی کمرے میں ملے تھے جہاں لاکھو لاشاری کی خون میں لت پت بے گور و کفن لاش پڑی تھی اب تک۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ فی الحال وہ سب ہمیں بھول کر اپنے اس سرپرست کو پورے عزت و احترام کے ساتھ زیرِ زمیں پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ مگر وہ لاشوں پر کھڑے ہو کر شادیانے بجانے والے منتقم مزاج لوگ مجھ سے، آسیہ سے اور میرے ساتھیوں سے لاشاری کا انتقام لینے کے لیے ایسے دیوانے ہو رہے تھے کہ انھوں نے اس غریب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا اور ہماری تلاش میں، خاک چھاننے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ممتاز بھی وہاں موجود تھا۔ وہ لاشاری کی چارپائی کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے بہت ہی بُرا سا منہ بنایا۔ معلوم یہ ہوتا تھا اُسے دیکھ کر کہ اس کے ہاتھ کی تکلیف کسی حد تک کم ہو گئی تھی، مگر وہ اپنے اکھڑے ہوئے ہاتھ سے کام نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی ہم سے زور آزمائی کی غلطی کر سکتا تھا۔ کیونکہ طاقت کے مظاہرے کے دوران اس کا ہاتھ ذرا بھی جھٹکے کھاتا تو اس سے درد کی ٹیسیں اٹھ اٹھ کر اسے بے حال کر دیتیں۔ میرے کمرے میں قدم دھرنے کے بعد آبی نے ممتاز کو مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی ممتاز جی! رب تہانوں ہمیشہ ممتاز ہی رکھے اس جہان میں، پر بادشاہو ایک بات تو بتا دو ہمیں۔"

ممتاز نے کچھ بولے بغیر سوالیہ نگاہوں سے آبی کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پر سلوٹیں اور آنکھوں میں حقارت اب بھی موجود تھی۔

آبی نے اس کے قریب جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا ”میں کیا بادشاہ ہوں! کچھ عرض کیا تھا میں نے آپ سے۔“

”پھر کیا کروں میں؟ تیرے بیوہ دا خادم تو نہیں ہوں میں کہ تیری ہر بات کا جواب دینا فرض ہو گیا ہے مجھ پر۔“ وہ کڑک کر بولا۔

”اوئے صدقے جائیے، کیسی کراری آواز ہے بھئی تیری، کمزور دل لوگ تو تیری آواز سن کر ہی سانس لینا بھول جاتے ہوں گے۔“ آبی نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”مگر یار اب اسے کیا کریں کہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی ایسا کمزور دل نہیں ملا ہے۔ ہم پر تیری کی گرج چمک الٹا ہی اثر کرتی ہے بھائی جی! ہم ایسے لوگوں کے حلق بند کر دیتے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ اس لیے تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ ہمیں یہ طنطنا دکھانے کی کوشش نہ کر ورنہ ہاتھ کی طرح زبان بھی باہر لٹکتی نظر آئے گی تیری۔ ہمیں اس گناہ پر مجبور نہ کر بھائی اور ہم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تجھ سے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دے ہمیں۔“

وہ بولا ”یہ نہ سمجھنا کہ ایک ہاتھ کی وجہ سے ناکارہ ہی ہو گیا ہوں۔ میں ایک ہاتھ سے بھی گردن توڑ سکتا ہوں تیری۔“

”ضرور توڑ دینا یار جی تو گردن میری مگر اس سے پہلے میری ایک بات کا جواب دے دینا بھائی۔“ آبی مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں کسی کی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں، ویسے تم پوچھو کیا پوچھنا ہے؟ اگر مناسب سمجھوں گا دے دوں گا جواب بھی۔“

آبی نے طیش میں آ کر پوری قوت سے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا اور بولا ”مناسب کے بچے! جواب تو تیرا باپ بھی دے گا۔ زندگی چاہتا ہے تو ہمیں سچ سچ بتا دے وہ پیر محمد کہاں رہتا ہے؟ اس سے ہم کہاں مل سکتے ہیں؟“

ممتاز دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ آبی نے ہاتھ مارا تو اس کا سر ایک دھماکے سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور اس کی باچھوں سے بہتے ہوئے خون کی لکیریں بننے لگیں۔ اس نے اپنے صحیح ہاتھ کی پشت سے بہتا ہوا خون صاف کرتے ہوئے خونخوار نظروں سے آبی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہوتے تھے۔ آبی اس کے نزدیک ہی کھڑا اس کے جواب کا منتظر تھا لیکن جو جواب ممتاز نے آبی کو دیا تھا اس کی

اُسے توقع بھی نہیں تھی۔ ممتاز ایک لمحے آتش بار نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر اچانک اس کا گھٹنا چل گیا۔ گو آبی نے غیر متوقع حملے سے بچنے میں خاصی تیزی دکھائی تھی مگر گھٹنے کی ضرب کام کر ہی گئی۔ آبی دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر پیچھے ہٹا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی مدد کو پہنچتا، اس نے آگے بڑھ کر آبی کے ایک ... کرتے ہوئے کہا ”کتے! کیا سمجھتا ہے تو؟ جان نکال دوں تیری اس حالت میں بھی۔“

اس کی لات کھا کر آبی جیسے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر ممتاز کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پشت کے بل زمین پر آ رہا۔ مگر وہ کسی بھی آبی سے کم تر نہیں تھا۔ لڑنے کے فن میں بڑی مہارت تھی اسے۔ گرتے ہوئے اسے اتنا ہوش تھا کہ اپنا سر زمین سے نہیں لگنے دیا تھا اس نے۔ وہ بس اپنے اکھڑے ہوئے بازو سے مجبور ہو کر رہ گیا تھا ورنہ یہ تو طے ہے کہ آبی کے لیے اسے زیر کرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ نیچے گرنے کے بعد جس تیزی سے سنبھل کر دوبارہ اٹھنے کی ضرورت تھی اسے، ایک ہاتھ ... ہونے کی وجہ سے وہ اس تیزی سے حرکت نہیں کر سکا۔ اتنا میں آبی کو کھڑے ہونے کا موقع مل گیا۔ میں جو آبی کو لات کھا کے پیٹ پکڑے بیٹھا دیکھ کر اس کی مدد کے لیے ... تھا انھیں ایک دوسرے پر جوابی حملے کرتے دیکھ کر ... اور ان دونوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا۔ آبی نے اس کی ایک ٹانگ اپنے پاؤں کے نیچے دبائی اور دوسری کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر پوری قوت سے مخالف سمت میں موڑ کر بل دینا شروع کر دیا۔ ممتاز نے تیزی سے اسی طرف کروٹ لے کر جس طرف آبی اس کی ٹانگ موڑ رہا تھا، اس کی گرفت کمزور کرنے کی کوشش کی مگر اس کی دوسری ٹانگ آبی کے پیر کے نیچے دبی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا اور آبی نے ٹانگ کو نصف بل دے کر دہرا کرتے ہوئے اچھل کر زور اس پر ڈال دیا۔ نتیجتاً چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کا جوڑ اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ ممتاز کے حلق سے کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخ نکلی تھی۔ پھر وہ زمین پر مچلتے ہوئے بکنے لگا۔ آبی نے فاتحانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پیر محمد کا پتا بتا دے سالے لاشاری کے کتے! ورنہ ٹانگ بھی توڑ کے اپاہج کر دوں گا زندگی بھر کے لیے۔“

سیف علی اس کی حالت دیکھ کر تھر تھر کانپنے ... جلدی سے بولا ”بتا دے ممتاز! ضد نہ کر ان سے ...

ظالم لوگ ہیں یہ۔“

”تو چپ نہیں رہ سکے گا ممتاز کے بچے! زبان تو کھولنا ہی پڑے گی تجھے۔ چاہے ایسا کرنے کے لیے مجھے تیرے بدن کے سارے ہی جوڑ کیوں نہ اکھاڑنے پڑ جائیں۔ ہڈیوں کا سرمہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا میں۔“ آبی غضب ناک انداز میں بولا۔

ممتاز بری طرح مچل رہا تھا۔ پاؤں کی تکلیف اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی شاید۔ اس عالم میں بھی اس نے آبی کی بات کا جواب دینے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس نے تو اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کا یہ انداز آبی کے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو مزید ہوا دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گرجتے ہوئے کہا ”اوئے بول، بتا دے سالے چوہڑے! کیوں موت کو پکارنے لگا ہے ابھی سے۔ ایسی بھرپور جوانی میں دنیا سے اتنی بیزاری کیوں دکھا رہا ہے تو۔ کیا جی اٹھ گیا ہے تیرا دنیا سے بالکل ہی؟“

”ایسا نہ کہہ یار آبی! یہ عمر موت کو گلے لگانے کی تو نہیں ہوتی۔ ابھی تو اس نے سیرِ جہاں شروع ہی کی ہے، اتنی جلدی جی کیسے بھر سکتا ہے۔“

آبی بولا ”جنھیں جان عزیز ہوتی ہے اپنی، وہ بے مقصد ضدیں نہیں کیا کرتے جیلانی! ایسا تو وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں زندگی کی ضرورت نہیں رہتی، جو دنیا سے بیزار ہو چکے ہوتے ہیں۔“

ممتاز کو قدرے پرسکون دیکھ کر میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”ضد چھوڑ دے ممتاز! اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا تجھے۔ ہم جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ آج نہیں تو کل معلوم ضرور کر لیں گے۔ پھر تو کیوں اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے؟“

”ظلم میں کر رہا ہوں اپنے اوپر!“ ممتاز حیرانی سے بولا۔ ”تو نے... تو نے میرا بازو اکھاڑ دیا اور تیرے اس یار آبی نے تیرے سامنے میری ٹانگ بےکار کر دی۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں چھوڑا اور اس سارے ظلم، ساری زیادتی کا الزام بھی تو میرے ہی سر پر دھر دینا چاہتا ہے۔ کیسے ذلیل لوگ ہو تم؟“

”ہاں اب ہم تجھے ذلیل نظر آنے لگے ہیں، ظلم کر رہے ہیں تجھ پر۔ حالانکہ میں نے پہلے ہی تجھے سمجھایا تھا کہ جو ہو گیا اس پر خاک ڈال دے۔ میں خود بھی لاشاری کا یہ انجام پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے آخر وقت تک بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب کسی کی زندگی کا پیمانہ چھلک چکا ہو، کسی کا وقت پورا ہو چکا ہو تو کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی اُسے بچانے کی۔ لاشاری بھی اپنا وقت پورا کر چکا تھا لہٰذا کوئی تدبیر کارگر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر اس گھڑی بھی تو نے میری بات پر کان نہیں دھرے تھے اور مجھ سے الجھ بیٹھا تھا۔ اس بار تجھے آبی نے بتا دیا تھا کہ پیر محمد کا پتا ٹھکانا بتا دے ہمیں، ہم کوئی زیادتی نہیں کرنے آئے تیرے ساتھ، مگر تو نے آبی کی بات نہیں مانی نتیجہ تیرے سامنے ہے۔ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ اب بھی تجھے عقل نہیں آئی ہے۔“

”اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے جیلانی! تم دونوں بلے تک میری بوٹی بوٹی الگ کر دو، ایک ایک جوڑ اکھاڑ ڈالو یا میری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر بیچ دو۔ میں یہی کہوں گا تم سے کہ میں کسی پیر محمد کو نہیں جانتا۔“ ممتاز فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”میں کہتا ہوں فائدہ کیا ہو سکے گا اس سے تجھے؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”بات فائدے اور نقصان کی نہیں ہے جیلانی! آدمی کی زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر۔ میں نے وعدہ کیا تھا لاشاری سائیں کے ساتھ اور اس وعدے کو کسی صورت بھی توڑ نہیں سکتا میں۔ زبان سے پھرنا مردوں کا شیوہ نہیں ہوتا جیلانی!“ وہ بولا

”جانتا ہوں میں بھی، بہت اچھی بات ہے یہ، آدمی کو ایسا ہی قابلِ اعتبار ہونا چاہیے۔ مگر اعتبار زندہ لوگوں میں قائم کیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد آدمی کو ضرورت نہیں رہتی ان باتوں کی۔ اسے اپنے اعمال کی جواب دہی سے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے بھائی! جو وہ ادھر دھیان دے سکے۔ یقین کر یار! یہ سارے جھگڑے قضیے، تمام رشتے ناتے آدمی اس دنیا میں ہی چھوڑ جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے کہ لاشاری سائیں اب اس دنیا میں نہیں ہے، اس کا ہم سے یا ہمارے اعمال سے اب کوئی تعلق نہیں رہا ہے مگر میں تو اب بھی موجود ہوں نا یہاں۔ میں اگر آج اسے مردہ جان لے اس سے کیا ہوا وعدہ توڑ دوں گا تو میرے ساتھ اس دنیا میں رہنے بسنے والے دوسرے لوگ مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں گے۔ نہیں جیلانی! نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کبھی۔“

آبی بولا ”جیلانی! تو وقت برباد کر رہا ہے اپنا۔ یہ اس طرح نہیں بتائے گا کچھ بھی۔ میں کہتا ہوں تو ہٹ جا اس کے پاس سے، میں ابھی اسے مجبور کر دیتا ہوں زبان کھولنے پر۔ ایسے لوگوں سے بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے مجھے۔“

مجھے ممتاز کی حالت پر ترس آنے لگا تھا۔ بڑا بانکا اور گبرو جوان تھا وہ، اس کے ساتھ ہی خلوص اور وفا کا پیکر

بھی تھا۔ آج کے دور میں ایسے لوگ ملتے کہاں ہیں۔ ریاکاروں کے اس ہجوم میں وہ نہ جانے کہاں سے آکر شامل ہوگیا تھا۔ یوں وہ کوئی نیک نام شخص بھی نہیں تھا۔ اور نہ ان لوگوں کا شمار بھلے آدمیوں میں کیا جاسکتا تھا جن کے ساتھ وہ رہ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا ایک اندازِ فکر تھا، ایک طریقۂ حیات اور زندگی کے کچھ اصول بنا رکھے تھے اس نے جنھیں وہ کسی وقت، کسی قیمت پر بھی فراموش کرنے کو تیار نہ تھا۔ مجھے اس کی بس یہی ادا بھا گئی تھی، اس کے انداز نے میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُبھار دیا تھا اس کے لیے۔ ایسا بے بدل شخص ضائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے آبی کو مخاطب کیا۔ ”آبی! لعنت بھیج یار اس پر، دفع کر سالے کو، ہمیں ضرورت ہی کیا ہے اس پر اپنا وقت اور انرجی ضائع کرنے کی۔ وہ پیر محمد ادھر کراچی ہی میں تو رہتا ہے نا، ہم تو سالے کو زمین سے بھی کھود کے نکال لیں گے۔ یہ نہیں بتانا چاہتا، نہ بتائے، اس کے بغیر ہی ہم ڈھونڈ لیں گے اسے اور دکھا دیں گے اس ممتاز کو کہ دیکھ تیرے بعد بھی دنیا کا کاروبار چل سکتا ہے۔“

آبی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مگر اسے یوں زندہ تو نہیں چھوڑ کر جائیں گے ہم۔ اس کا بوجھ تو ہلکا کر ہی جائیں گے اس زمین کے سینے سے۔“

وہ جھپٹ کر اسے روند ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا سینہ چھید ڈالنا چاہتا تھا پستول کی گولیوں سے۔ مگر میں نے تیزی سے اس کے سامنے آکر اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”اوئے یں دسیا نئیں تینوں، ہٹ پرے، مٹی پا ایدے اُتّے۔“

سیف علی نے جلدی سے آبی کے پیر پکڑ لیے جھک کر اور بولا۔ ”معاف کر دیں سائیں! غصہ تھوک دیں اب، دیکھیں نا یہ جیلانی سائیں بھی معاف کر چکے ہیں اسے، یوں بھی اب اس میں رہا ہی کیا ہے۔ ایک ہاتھ اور ایک پیر تو آپ نے ناکارہ ہی کر دیا ہے اس کا۔ کھڑا تک تو ہو نہیں سکتا اب یہ۔“

”اوئے لعنت ہو تجھ پر سالے سُور کے بچّے! جا دفع ہو جا اِدھر سے۔“ آبی نے اُسے پیر سے دھکا دے کر الگ گرا دیا۔

چہرہ اس کا غصّے کی زیادتی سے تم تم کر رہا تھا اس گھڑی، بالکل شکار پر جھپٹتے ہوئے باز کی طرح بپھرا ہوا تھا، صاف لگتا تھا کہ اب ممتاز کی حیات کا ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا کر ہی دم لے گا وہ۔ اس کے ہاتھوں سے ممتاز کا بچ جانا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا مگر میری بات یا شاید سیف علی کی التجا اثر کر گئی اس پر۔ سیف علی کو دھکا دے کر الگ کرنے کے بعد

وہ تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا باہر کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اب جلدی نکل چل یہاں سے جیلانی! ایسا نہ ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل کر دوں۔“

میں اس کے پیچھے لپکتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھائی چل رہا ہوں میں تیرے ساتھ، تو ارادہ تبدیل نہیں کر۔ بس اب نکل ہی چل یہاں سے۔“

ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نکلے اور سیدھے کار کی عقبی نشست میں جا دھنسے۔ شرافت علی اسٹیرنگ پر کار اسٹارٹ کیے کسی بھی قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں ہمیں لے کر بھاگنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے کار کو آگے بڑھا دیا۔ مجھے اس سے کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ حویلی سے نکل کر اس نے کار اس راستے پر ڈال دی جو بگاڑی نہر کے اس پل کی طرف جاتا تھا جسے عبور کرکے ہم اِدھر آئے تھے۔ آبی خاموش بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ اندر ہی اندر اس بات پر بل کھا رہا تھا کہ میں نے ممتاز کو زندہ کیوں چھوڑ دیا۔ میں نے اسے اپنی بھڑکتی آتشِ انتقام پر قابو پانے کے لیے چھوڑ دیا اور اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس گھڑی اگر میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میرے لیے اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

نہر عبور کرنے کے بعد شرافت علی نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیا پروگرام ہے جیلانی؟ کدھر چل رہے ہیں ہم؟“

”سیدھا کراچی ہی نکل چل یار! یہ تو ساری دوڑ بھاگ بے مقصد ہی ہو کر رہ گئی ہماری۔ نہ آسیہ ہی کو روک سکے نہ ہی لاشاری کی جان بچ سکی۔ یار یہ زندگی کتنی بے وفا شے ہے۔ مشکل گھڑی میں کس طرح ساتھ چھوڑ دیتی ہے آدمی کا اور ہم کتنے بے وقوف، کیسے اندھے ہیں کہ ہمیشہ اسے اپنا کر ہر چیز سے زیادہ حفاظت کرتے رہتے ہیں اس کی اور کیسی کیسی آسائشیں فراہم کرتے ہیں اس کے لیے؟ کسی وقت تجھے یہ خیال آیا ہے شرافت علی؟ تو نے بھی سوچا ہے کبھی اس طرح؟“ میں نے شرافت علی سے سوال کیا۔

”نہیں بھائی! ایسا کوئی لمحہ مجھ پر نہیں گزرا ابھی تک اور نہ ہی آج سے پہلے کسی نے توجہ دلائی تھی اس طرف۔“ شرافت علی بولا۔

”اب میں نے دلا دی ہے تمھیں توجہ۔ کبھی فرصت میں بیٹھ کر غور کرنا تم بھی اور جو نتیجہ اخذ کرو اس سے مجھے بھی آگاہ کرنا۔“

”اچھی بات ہے، تم کہتے ہو تو ضرور کروں گا غور لیکن یہ وقت تو مناسب نہیں ہے اس کام کے لیے۔“

”ابھی نہیں میرے یار! یہ تو نہیں کہا میں نے کہ ابھی سے غور کرنا شروع کر دے۔ ابھی تو ہمیں اپنی اپنی جان کراچی تک صحیح سلامت لے جانے کی فکر کرنا چاہیے۔ لاکھ ہرجائی ہی مگر ابھی تو ہمیں ضرورت ہے نا اس زندگی کی۔ بڑے کام نمٹانے ہیں ابھی تو ہمیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لاکھ بے وفا، بے مروّت سہی اور وہ ہماری ضرورت سے کتنا ہی انکار کرتی ہو مگر ہمیں تو اس کی ضرورت ہے۔ اور جب ہمیں ضرورت ہے تو ہم اس کی ناز برداریاں بھی ضرور کریں گے۔ کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟“

”اوئے بڑا ذلیل آدمی ہے بھئی تُو تو۔ لمحوں میں کھال اتارنا شروع کر دیتا ہے آدمی کی۔ ابنِ قصاب تو نہیں ہے؟ کیا پیشہ تھا تیرے آبا کا؟“

”میرے آبا کا پیشہ تو سپہ گری ہوا کرتا تھا بھائی جیلانی! گوشت کبھی نہیں بیچا میرے خاندان میں کسی نے بھی۔“

”بات ایک ہی ہے پیارے بھائی! گوشت بیچیں یا نہ بیچیں، کاٹنے پیٹنے کا کام تو کرتے ہی رہے ہیں نا وہ بھی۔“

”آبی جس نام سے پکارتا ہے تجھے، وہ درست ہی ہے کچھ۔“ شرافت علی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔

آبی کا موڈ بھی شاید ہماری باتوں سے بحال ہو گیا تھا۔ وہ فوراً بول اٹھا۔ ”کچھ نہ کہہ بھائی! بالکل فٹ بیٹھتا ہے وہ نام اس پر۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اوئے تیرے سوگ کا پیریڈ ختم ہو گیا کیا جو پھر چہکنے لگا ہے تُو؟“

”شکر کر ذلیل آدمی، میں نے برداشت کر لیا کسی نہ کسی طرح۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس ممتاز کی جگہ تجھے لٹا کے ذبح کر ڈالوں۔ سالے بوچڑ! یہ کیا حرکت کی تھی تو نے اچانک؟ کیوں چھوڑ کے چلا آیا ہے تُو اسے؟“ آبی ایک دم چڑھ دوڑا مجھ پر۔

”غصّہ نہ کر میرے چاند! تو نے دیکھا نہیں، غصّے اور جنون نے اندھا کر رکھا تھا تجھے۔ ہوش کھو بیٹھا تھا تو۔ اسی لیے غصّے کو حرام قرار دیا گیا ہے، آدمی کو بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہتی اس عالم میں۔ عقل تو ٹھہرتی ہی نہیں ہے اس گھڑی انسان کے پاس۔“

”اچھا! تو تجھے کوئی خاص چیز نظر آگئی تھی اس میں؟ کوئی نور چمکتا دکھائی دے گیا تھا اس کے ماتھے پر؟“ آبی جھنجلا کر بولا۔

”ہاں، ایسا ہی سمجھ لے، خلوص اور وفا کا روشن ستارہ دکھائی دیا تھا مجھے اس کی آنکھوں میں۔ بڑا منفرد انسان ہے وہ، اس دور میں بار بار ایسے انسان نظر نہیں آتے آبی! اس کی قدر کرنا چاہیے یار ہمیں اور زیادہ سے زیادہ عرصہ اس دنیا میں رہنے کا موقع دینا چاہیے۔ ایسے خلوص و وفا کے پیکر کو مٹی میں نہیں ملانا چاہیے میرے بھائی، میرے دوست، میرے عزیز! سمجھا کچھ؟“

”ہاں، سمجھا، خوب اچھی طرح سمجھ گیا۔ آج کل تیرے اندر کوئی بہت ہی نیک اور پارسا روح حلول کر گئی ہے۔ سچ بتا یار کیا تو وہی غلام جیلانی ہے جس سے میرا یارانہ تھا؟ جو میرے جیل جانے سے پہلے شانے سے شانہ ملا کر چلا کرتا تھا؟“ آبی بولا۔

”تجھے یہ خیال کیسے آیا آبی؟ کون سی خامی دکھائی دی ہے تجھے مجھ میں جس نے اس خیال کو تیرے دل میں جگہ دی ہے؟“

”خامی ہی تو کوئی نظر نہیں آئی ہے تجھ میں۔ حیرت تو اسی پر ہے۔ ایسا تو چھوڑ کر نہیں گیا تھا میں تجھے۔ رحم کے ایسے دریا تیرے سینے میں پہلے تو کبھی موجزن نہیں رہا کرتے تھے اسی لیے مجھے شبہ ہونے لگا ہے تیری اصلیت پر۔“ آبی نے جواب دیا۔

”میں نے بے وجہ تو پہلے بھی کسی کو نہیں ستایا تھا کبھی بھائی جی! میرے ہاتھوں سے وہی لوگ نقصان اٹھاتے رہے ہیں جنھوں نے خود بڑھ کے پہل کی، یا میرے لیے مشکلات پیدا کرکے مجھے بے دست و پا کرنے کی کوشش کی۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے لوگوں کو میں اب بھی معاف کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اور نہ ہی میں نے کسی کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اب تک۔“

”اور یہ جو تُو ممتاز جیسے باؤلے کُتّے کو یوں کُھلا چھوڑ آیا ہے۔ اس کی بھی کوئی معقول وجہ ہے تیرے پاس؟“

”بتایا تو ہے میں نے تجھے، اس کے اندر ایک اچھا انسان دکھائی دیا تھا مجھے۔ سچا، مخلص اور قول کا پکّا انسان۔ اور تُو جانتا ہے، ایسے لوگ میری کمزوری ہوتے ہیں۔ تیری میری دوستی کی ابتدا بھی تو اسی طرح ہوئی تھی بھول گیا ہے کیا اس بات کو؟“

”اچھا تو کیا اب اس سے بھی یاری بڑھانے کا ارادہ کر رہا ہے؟ مگر وہ ہاتھ نہیں آسکے گا تیرے، یہ بات لکھ لے میری۔“

"کوئی خاص بات دیکھی ہے کیا تُو نے جو اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ یہ... کہہ رہا ہے تُو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں ہے کچھ۔ بس اپنے تجربے کی روشنی میں کہی ہے یہ بات میں نے جس کے غلط ہونے کا امکان کم ہی ہے۔"

"ممکن ہے ٹھیک ہی کہتا ہو تُو۔ لیکن کوشش کرنے میں ہرج ہی کیا ہے آخر؟ نقصان کیا ہے اس میں اپنا؟"

میں اور آبی باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ اپنے گرد و پیش کو بھلا بیٹھے تھے۔ کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں، کدھر جا رہے ہیں اور کن حالات کا سامنا ہے ہمیں۔ لیکن شرافت علی ہماری طرح کھویا ہوا نہیں تھا۔ اس نے اچانک ہمیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "جیلانی! ایسا معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے ہماری تلاش میں ناکام ہو کر اس غریب سجل کو جا گھیرا ہے اور اس سے ہمارے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے چھپر کے سامنے ہجوم نظر آ رہا ہے مجھے۔"

میں نے اور آبی نے ایک ساتھ چونک کر ادھر دیکھا۔ شرافت علی نے گاڑی ٹھہرا لی تھی۔ سجل کے مسافر خانے کا فاصلہ اس جگہ سے اچھا خاصا تھا۔ وہاں بہت لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ گھوڑے بھی تھے۔ گو ان کی شکلیں یہاں سے صاف طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ وہ سب وہی لوگ تھے جو لاشاری کی حویلی سے ہمارے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہ وہاں کیوں جا پہنچے تھے، شاید شرافت علی کا اندازہ درست تھا اور اگر ایسا تھا تو غریب سجل کے ساتھ انھوں نے پتا نہیں کیا سلوک کیا تھا۔ وہ اس سے خوش تو پہلے بھی نہیں تھے مگر اس پر ہاتھ ڈالنے کا شاید کبھی کوئی مناسب جواز ہاتھ نہیں آ سکا تھا ان کے۔ آج ضرور وہ اس پر ہماری مدد کرنے کا الزام لے کر جا چڑھے تھے۔

شرافت علی بولا "کیا کہتے ہو جیلانی! گاڑی کو واپس موڑ کر کسی اور راستے سے نکلنے کی کوشش کریں؟"

"نہیں یار! کیسی موقع پرستوں والی باتیں کرتا ہے تُو؟ ایک ذرا سی ہوا مخالف دیکھ کر منہ پھیر لینا چاہتا ہے اس غریب آدمی سے؟ اس کی خدمت اور محبت کا یہ صلہ دینا چاہ رہا ہے اسے؟ چل آگے بڑھا گاڑی، ہم دیکھتے ہیں چل کر انھیں۔"

شرافت علی گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا "وہ بہت سے لوگ ہیں اور علاقے کی پولیس کا تعاون بھی حاصل ہے انھیں۔ اس لیے ایسا کہا تھا میں نے، ورنہ میں بُرے وقت میں ساتھ چھوڑ

جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ نہ سمجھ لینا تم۔"

"سمجھتا ہوں میرے یار! میں یہ بات۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے تجھے اس سلسلے میں۔ وہ ہتھیار سنبھال کے میگزین چیک کر لو۔"

وہ بولا "تینوں اسٹین گنیں چیک کر چکا ہوں میں۔ اور پستول بھی لوڈ ہیں۔ ان کی فکر نہ کرو تم۔"

"یہ تو نے بہت اچھا کیا ہے۔ میں نے نوٹ کیا ہے، ہتھیاروں کو ہر وقت پوری طرح تیار رکھنے کا عادی ہے" آبی نے کہا۔

پستول تو ہمارے پاس پہلے ہی موجود تھے۔ میں نے اور آبی نے ایک ایک اسٹین گن اٹھا لی۔ شرافت علی تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا منٹوں، سیکنڈوں میں ان لوگوں کے سر پر جا پہنچا۔ کار کی آواز سنتے ہی وہ سب کے سب چونک کر کار کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور حیرت سے آنکھیں واکیے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی ہو گی کہ جن کی تلاش میں وہ یوں سرگرداں ہیں اور ساری دوڑ دھوپ کے باوجود وہ جن کی گرد بھی نہیں پا سکے تھے، وہ اچانک اس طرح سامنے پہنچ جائیں گے۔ میں نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ لاکھولا شاری کے ہی آدمی تھے۔ ان میں سے کئی کو میں نے حویلی میں دیکھا تھا۔ کار رُکتے ہی میں، آبی اور شرافت علی جھپکتے میں اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر اسٹین گنیں اٹھا کر باہر نکلے اور ان سب کو نشانے پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شرافت علی نے انھیں فوراً للکارا "خبردار! اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو بھون کے رکھ دیں گے ہم۔"

وہ سب ایک دم مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیوں جمع ہوئے ہو یہاں؟"

"کچھ نہیں سائیں! ہم ذرا سجل سے کچھ باتیں کر رہے تھے اِدھر آپ لوگ...." ایک شخص نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

آبی نے اس کی بات کاٹ کر سخت اور سرد لہجے میں کہا "چپ کر جا اوئے چوہڑے! تم لوگوں نے یہ کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟ ہٹو، کُتّے کے بچّو! اس کے پاس سے ہٹ جاؤ اور ادھر چھپر کی دیوار کی طرف منہ کر کے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

آبی کا حکم سن کر انھوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کے عمل سے صاف ظاہر تھا کہ وہ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ انھیں اس کی کیفیت میں دیکھ کر مجھے فوراً خیال آیا کہ ان لوگوں نے یقیناً سجل کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے درمیان سجل مجھے نظر ہی نہیں آیا تھا اب تک، مگر شاید آبی نے اسے دیکھ لیا تھا یا اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اب تک سجل کے ساتھ کوئی زیادتی کرتے رہے ہیں۔ بندوقیں ان کے شانوں سے لٹکی ہوئی تھیں، کچھ لوگ چھپر کے باہر یا اِدھر اُدھر بکھرے کھڑے تھے البتہ دس بارہ آدمی ایک گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ ان کی بندوقیں الگ چارپائیوں پر پڑی تھیں۔ ان کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی کو اپنے درمیان گھیرے کھڑے ہیں۔ میں نے ان گھیرا ڈالنے والوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "سُنا نہیں تم نے۔ چلو جلدی جلدی اِدھر دیوار کے ساتھ جا لگو ورنہ ایک ایک کا مغز باہر پڑا ہو گا ابھی۔"

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹنے لگے۔ ان میں وہ جوان بھی موجود تھا جو ممتاز کے ساتھ لاشاری کے کمرے میں گھس کر ہماری راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "یہ بات کان کھول کے سن لے جوان! تو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں نکل سکے گا اس علاقے سے۔ اچھا یہی ہے بات زیادہ نہ بڑھا۔"

آبی کڑک کر بولا "اوئے تو ہٹے گا اُدھر سے یا میں لہو کے چشمے جاری کر دوں تیرے سینے سے؟ کیا چاہتا ہے بھئی تُو؟"

"پچھتاؤ گے تم...." اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ اور حقارت سے ہمیں گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ گھاس پھونس کی دیوار کی طرف سرکنے لگا۔

آبی سے اس کا یہ انداز برداشت نہ ہو سکا، وہ ایک دم اس کی طرف لپکا اور قریب پہنچتے ہی اسٹین گن کی نال اس کے سینے پر رکھ کر زور سے اسے دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ آبی نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر دو انگلیاں سیدھی کر کے اس کے منہ کے سامنے لے جاتے ہوئے کہا "آنکھیں نیچے کر لے اُلّو کی اولاد، دیدے پھوڑ دوں گا سالے کے۔"

وہ بھی پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسی خونخوار لہجے میں بولا "ہتھیار پکڑ کے شیر بننے لگا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا میری، گالی سننے کی عادت نہیں ہے مجھے، اب اگر گالی نکالی تو نے تو میں زبان کھینچ لوں گا تیری۔ یہ نہ جاننا کہ اسٹین گن کی وجہ سے بالکل ہی بے بس ہو گیا ہوں میں۔ شیروں کے جبڑے چیر دیا کرتا ہوں میں خالی ہاتھوں سے، یوں ہی رستم نام نہیں پڑ گیا ہے میرا۔"

"پھر تو میں یہ ضرور معلوم کروں گا آخر لوگوں نے ایسا جواں مردوں والا نام کیوں دے دیا ہے تجھے؟ جو تجھ پر سج ہی نہیں رہا ہے کسی طرح بھی۔ یہ کیا سوجھی ہے یار ان لوگوں کو، بچارے رستم کے مرنے کے بعد اس سے ایسا مذاق کرنے کی؟" آبی مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

وہ اسے طیش دلا کر لڑا مرنے کے لیے اکسا رہا تھا۔ شاید ممتاز کا حساب اس سے چکانا چاہتا تھا۔ جبکہ یہ وقت جھگڑا بڑھانے کا نہیں تھا، اس گھڑی سجل کو ہماری مدد کی ضرورت تھی، ہمیں فوراً اس کی خبر گیری کرنا چاہیے تھی۔ کیونکہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ ایک چارپائی پر بندھا ہوا پڑا تھا اور اس کے رخساروں اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی دانت ٹوٹ گیا تھا اس کا۔ وہ آنکھیں بند کیے نڈھال پڑا تھا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھیں کھول کر ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ غالباً ہلنے جُلنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی اس میں۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں لرز کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے آبی سے کہا "اسے چھوڑ یار آبی! کیوں اس کی جان کو اٹک کر رہ گیا ہے تُو؟ اِدھر سجل کو دیکھ، اس کی کیا حالت کر دی ہے ان رذیلوں نے۔ لگتا ہے جان ہی نکال لی ہے انھوں نے اس غریب آدمی کی تو۔"

میرے توجہ دلانے پر اس نے بھی گردن موڑ کر سجل کی طرف دیکھا۔ وہ اس چارپائی کے قریب ہی کھڑا تھا جس پر سجل بندھا پڑا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر آبی بھی پریشان ہو گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ارے یہ تو بے ہوش معلوم ہوتا ہے یار!"

اس دوران میں تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور تیزی سے اس کے جکڑ بند کھولتے ہوئے بولا "آبی! جلدی سے کسی برتن میں پانی لا، یہ تو واقعی بے ہوش پڑا ہے یار! ہوش میں لانے کی کوشش کر اسے۔"

میں فوراً اس طرف لپکا جہاں پانی کے مٹکے رکھے تھے اور ایک برتن میں پانی بھر کے لے آیا۔ ہم دونوں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔ میں نے چُلّو میں لے کر تھوڑا سا پانی اس کے حلق میں بھی پہنچانے کی کوشش کی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد سجل کے پپوٹے حرکت میں آ گئے، اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، چند ثانیے وہ میرے چہرے پر نگاہیں جمائے رہا، یوں لگتا تھا مجھے پہچان نہیں رہا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نظر آنے لگی۔ میں نے ایک

ہاتھ اس کی گردن کے نیچے ڈال کر اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا حال ہے اب؟"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "حال کیا بتاؤں سائیں! سالوں نے بہت مارا ہے۔ جوڑ جوڑ الگ کر کے رکھ دیا ہے۔"

میں نے اس رستم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کس نے پہل کی تھی سجل یار! تجھ پر ہاتھ اٹھانے میں؟ ذرا بتا تو مجھے؟"

"چھوڑیں جی! لعنت بھیجیں اب اُن پر۔ بس ایک سبق ملنا تھا مل گیا۔ آئندہ احتیاط برتوں گا میں۔" اس نے جواب دیا۔

آبی نے اس کے منہ سے پانی کا برتن لگاتے ہوئے کہا "لے بھائی! دو چار کلّیاں کر کے منہ صاف کر لے۔ بہت خون بہا ہے تیرے منہ سے۔ کوئی دانت تو نہیں توڑ دیا ہے ان کتّے کے بچّوں نے تیرا؟ دیکھ ذرا پورے بتّیس دانت موجود ہیں کم تو نہیں ہوا کوئی؟"

آبی کی رگِ ظرافت کو اس گھڑی بھی قرار نہیں تھا، اس کی بذلہ گوئی ایسے نازک لمحے میں بھی جاری تھی۔ سجل اس کی بات سُن کر ہنس پڑا۔ اس نے کُلّی کرنے کے لیے منہ میں پانی بھر رکھا تھا جو ہنسنے کی وجہ سے باچھوں سے بہہ کر اس کے کپڑوں پر گر گیا اور اس کی قمیص خون سے سُرخ ہو گئی۔

میں نے آبی کو سرزنش کرتے ہوئے کہا "کبھی تو تھوڑی دیر کے لیے سنجیدہ بھی ہو جایا کر۔ سالے کبابی! ساری قمیص رنگ دی اس کی۔"

سجل کُلّی کر کے جلدی سے بولا "انھیں کچھ نہ کہیں جیلانی: بہت اچھے، بڑے دلچسپ آدمی ہیں یہ، موت بھی آسان کر دیتے ہیں آدمی کے لیے۔"

"ہاں، دوسروں کی مشکلیں آسان کرنا عادت بن گئی ہے اس کی۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں، موت اس کی بہت بُری ہوگی۔"

"نہیں، نہیں، ایسا نہ کہیں سائیں ان کے بارے میں۔ ایسی بددُعا تو نہ دیں جی انھیں۔ اللہ سائیں ایسا وقت نہ ڈالے ان پر کبھی۔"

"تُو فکر نہ کر سجل! اس کی کوئی بات اثر نہیں رکھتی۔ کوّوں کی بددُعاؤں سے ڈنگر مر نہیں جایا کرتے۔" آبی جلدی سے بولا۔

"اچھا سالے ڈنگر! نہ مر میرا کیا بگڑتا ہے اس سے۔ جتنے دن جیے گا اپنے گناہوں کا بوجھ ہی بڑھاتا رہے گا۔"

اچانک گولی چلنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ سجل کو صحیح سلامت اور باتیں کرتے دیکھ کر ہم اس وقت کی خوفناک صورتِ حال کو بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے۔ یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی ہم میں سے کسی کو بھی کہ ہمارے مقابل وہ دشمن صف ہے جسے ہم نے فی الحال ہراساں کر کے اپنے حکم کی تعمیل پر ... کر دیا ہے لیکن وہ ایسا بودا اور بے عقل تو نہیں ہے کہ ... سے ہمیں غافل پا کر بھی ہاتھ باندھے کھڑا رہے گا۔ آزادی ... زندگی تو جنگل میں رہنے والے جانوروں کو بھی عزیز ہوتی ہے ... وہ بھی آسانی سے آزادی کھونے کے لیے تیار نہیں ہوتے ... پھر وہ لوگ تو انسان تھے بغیر جدّوجہد کیے ہمارے قابو ... آ سکتے تھے۔ مصلحتاً اگر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے تو ... سے یہ ظاہر کہاں ہوتا تھا کہ وہ ہماری برتری قبول کر کے ... کے لیے غلامی میں چلے آئے ہیں۔ چنانچہ ہماری غفلت سے ... نے فائدہ اٹھانے اور بازی اپنے حق میں پلٹ دینے کی کوشش ... کرنا چاہی تھی مگر شرافت علی کی نظریں بیک وقت ان سب ... احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس نے ان میں سے دو آدمیوں ... اپنے شانوں سے بندوقیں اتارنے کی کوشش کرتے ... لیا تھا اور انھیں مہلت دیے بغیر ان پر گولی چلا کر تنبیہ ... "خبردار! کسی کا ہاتھ بھی نیچے گیا تو دوسری بار گولی ... میں اتار دوں گا اس کے۔"

میں نے چونک کر شرافت علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا "کون سورما بننے کی کوشش کر رہا تھا؟ سالے کا بھیجا ... نہیں دیا! تو نے خواہ مخواہ ایک گولی ضائع کر دی ہے یار ... کی بار ایسا نہیں کرتا ہلتے دیکھتے ہی قصہ پاک کر دینا ..."

سجل جو اب تک اس صورتِ حال سے بے خبر ... یہی سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ہم نے ... آزاد کیا ہے، بولا "جیلانی سائیں! یہ کیا کر رہے ہو تم؟ ان لوگوں ... بکریوں کا ریوڑ کیوں بنا رکھا ہے تم نے؟ اور یہ قابو کیسے ... آ گئے تمھارے؟"

"ہاں، یہ تو نے ٹھیک کہا ہے سجل! بکریوں کا ریوڑ ... ہے یہ۔ تجھے اکیلا اور نہتا دیکھ کر آ پڑے تھے تجھ پر اور ... رہے تھے کہ بڑے جنگجو اور شجاع ہیں جو تجھ جیسے ... کو ... کر لے بس کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر جیسے ہی ... دیکھ کر اپنی حقیقت یاد آ گئی ہے انھیں اور سب کے سب ... چھوڑ کر کونے کھدروں میں سمٹ گئے۔" آبی نے سجل کو سمجھا ... ہوئے کہا۔

"نہیں یار! ایسے تو نہیں ہیں یہ، میں جانتا ہوں ان لوگوں کو، ان میں سے کچھ تو لاکھو لاشاری کے آدمی ہیں۔" سجل نے ...

"کیسے کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا یہ سب لاشاری کے آدمی نہیں ہیں؟" میں نے ان سب کو بغور دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

"نہیں جی! سب کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ دس بارہ آدمی پولیس کے ہیں ان میں۔" اس نے رستم کے آس پاس کھڑے ہوئے ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس کے گرد گھیرا ڈالے اس کی مرمّت کرتے رہے تھے۔

"اچھا تو یہ قانون کے وہ محافظ ہیں جو ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر تجھ جیسے اَمن پسند اور بے ضرر لوگوں کو نشانہ بنانے کے بعد انھیں پولیس مقابلے میں مارے جانے والے ڈاکو قرار دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے علاقے کو ڈاکوؤں سے پاک کر دیا ہے۔"

"ایسا نہ کہیں جیلانی سائیں! بڑے پہنچے ہوئے لوگ ہوتے ہیں یہ۔ جس کے بارے میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ان پر جرائم میں ملوّث ہونے کا الزام لگاتا ہے اس کے پاس سے یہ فوراً کوئی چیز برآمد کر لیتے ہیں جس کی پاداش میں اس کی شرافت اور نیک نامی کا سارا طلسم توڑ کر اسے سرکاری مہمان بنا دیا جاتا ہے۔" سجل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ بھائی سجل! تیری اس بات پر یقین کون کرے گا۔ حالانکہ ان کے کارنامے اب کوئی ڈھکے چھپے نہیں رہے ہیں کسی سے بھی، بچّہ بچّہ جانتا ہے ان کے ہتھکنڈوں کو، صرف ان کے افسرانِ اعلیٰ کے سوا کوئی یقین نہیں کرتا ان کی کسی کارروائی پر اور افسرانِ اعلیٰ بھی ضرورتاً ہی انکار کرتے ہیں ان باتوں سے کیونکہ یہ باتیں ان کی دسب ٹھیک ہے سر، والی پالیسی کا حصہ ہوتی ہیں۔"

"بکواس نہ کر او ئے جیلانی! جانتا نہیں ہے تو ہمیں، جس دن بھی ہاتھ آ گیا سالے لاک اَپ میں ہی جان نکال لیں گے ہم تیری بچّے! ہم سے پنگا لے کے کوئی جی نہیں سکتا زیادہ دن۔ تیرے دن پورے ہو گئے ہیں، معلوم تو یہی ہوتا ہے ہمیں۔" ان پولیس والوں میں سے ایک نے اپنے پیشہ ورانہ رعب و دبدبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! ایسے بھی بے خبر نہیں ہیں ہم۔ بڑا پرانا یارانہ ہے ہمارا، تیری ذات برادری کے لوگوں سے۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا تم لوگوں کو؟ اسی لیے میں ہمیشہ بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں پولیس والوں کے راستے سے مگر نہ جانے کیا بات ہے ہر راستہ مجھے کسی نہ کسی طرح تم تک لے جاتا ہے جس کے نتیجے میں ہر تھانے میں موجود میری فائل موٹی ہی ہوتی جاتی ہے۔"

"فکر نہ کر! ایک دن ہم تیری فائل بند ہی کر دیں گے یہ لکھ کر کہ مشہور ڈاکو غلام جیلانی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گیا۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں، ایک دن ہونا یہی ہے میرے ساتھ بھی مگر اتنی آسانی سے نہیں مار سکو گے تم مجھے جیسا تم نے سمجھ رکھا ہے دل میں اپنے۔ کئی تھانے ویران ہو جائیں گے تب کہیں جا کر میرا نمبر آئے گا، غلام جیلانی کوئی لقمۂ تر نہیں ہے بچّے!"

"او ئے کیا بک بک لگا رکھی ہے تو نے غلام جیلانی! کس کے ساتھ مغز کھپانے لگا ہے تو میرے یار! ان کی سمجھ میں تیری باتیں آنے والی نہیں ہیں، دماغوں میں غلاظت بھر رکھی ہے ان رشوت خوروں نے جو یوں آسانی سے نہیں نکل سکے گی۔" آبی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سجل سے پوچھا "سجل! کچھ تو ہی بتا یار! اب ان اتنے سارے لوگوں کا کیا کریں ہم؟ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہے کچھ۔"

آبی جلدی سے بولا "کرنا کیا ہے سالوں کا۔ ایک لائن میں کھڑا کر کے گولیاں گزار دو سب کے سینے سے، بس پھر انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے ہم، اب جس کی آئی ہوگی وہ سدھار جائے گا دنیا سے، جس کی باقی ہوگی وہ بچ ہی جائے گا کسی نہ کسی طرح۔"

"تُو تو چپ ہی رہ بھائی! سالا ہر وقت ملک الموت کا کام آسان کرنے پر تُلا رہتا ہے۔ اس کا جواب طلب کیا جائے گا تجھ سے روزِ حشر میں۔ مداخلتِ بے جا کا مرتکب ٹھہرایا جائے گا تجھے۔" میں نے آبی کی مداخلت سے چڑ کر کہا۔

"مگر بیٹے! جان وہاں بھی نہیں چھوٹے گی مجھ سے تیری۔ سزا اور جزا دونوں میں برابر کا شریک ہوگا تو۔" آبی بولا۔

میں نے اس سے کہا "اچھا بھائی شراکت خان! تو جا کر ان سب بندوقچیوں کی بندوقیں اتار لے ان کے شانوں سے، شیطان لعین، مردود کا کوئی بھروسا نہیں ہے کب بہکانے میں کامیاب ہو جائے ان میں سے کسی کو۔ ان کا نہتّا ہونا ہی بہتر ہے ہمارے لیے۔"

"ٹھیک ہے میں ان کے کندھوں کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہوں، اتنی دیر میں تو ان کے کریا کرم کا طریقہ سوچ لے۔"

آبی ان لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے سجل سے پھر پوچھا "ہاں تو بتایا نہیں تو نے سجل سائیں! کیا کریں ہم ان کا؟"

"ہمیں ان کا کرنا ہی کیا ہے جیلانی سائیں! ان کے ہتھیار رکھوا کے ہانک دیں سالوں کو اپنے اپنے باڑے کی طرف۔"

"اور انھوں نے تیری یہ جو حالت بنائی ہے اس کا حساب نہیں لے گا تو ان سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دفع کریں سائیں! میں زیادہ دشمنی بڑھانا نہیں چاہتا ان سے۔ آخر تو مجھے ان کے ساتھ ہی رہنا ہے۔" وہ بولا۔

یہ اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ہم نے اسے ان کے چنگل سے چھڑا دیا تھا، بس یہی کافی تھا اس کے لیے۔ اب اگر

ہم ان کے خلاف کوئی کارروائی کرتے تو یہ سجل کے حق میں بہتر نہ ہوتا۔ ہمیں تو اپنا کام کر کے چلا ہی جانا تھا وہاں سے، ہمارے جانے کے بعد وہ اس غریب کی زندگی اجیرن کر دیتے، نہ جانے کیسے کیسے خوف ناک عذابوں سے گزارتے اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو۔ اس کی دو صورتیں اور بھی تھیں۔ ہم یہ کر سکتے تھے کہ سجل کو اپنے ساتھ لے جاتے مگر ایسا کرنے سے اس کا خاندان زیرِ عتاب آ جاتا، یہ پتھر دل لوگ ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہم ان سب کو آبی کے مشورے کے مطابق ایک لائن میں کھڑا کر کے گولیاں چلا دیتے لیکن یہ بہت ہی المناک کام ہوتا میرے لیے، اتنے سارے لوگوں کا خون ایک ہی وقت میں گردن پر آ پڑتا میری، قتلِ عام ہوتا یہ جسے میں کسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی بات دل کو لگتی تھی جو سجل نے کہی تھی۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر رستم کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے کہا۔ ”جوان! بات تو تو شیر دل کے لہجے میں کرتا ہے اور کام تیرے مُردار خور گدھوں جیسے ہیں۔ یہ تم اتنے سارے لوگوں نے مل کر سجل کی یہ حالت کیوں بنائی ہے؟ کچھ بتانا پسند کرو گے مجھے، اس شریف اور بے ضرر شخص نے آخر کیا بگاڑا تھا تم لوگوں کا؟“

”ہم اس سے تم لوگوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے مگر یہ کچھ بتا کے ہی نہیں دیتا تھا، کہتا تھا مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اس ضد کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔“ رستم نے جواب دیا۔

”اور تم سمجھتے تھے یہ جھوٹ بول رہا ہے، اس کی رشتے داری ہے ہم سے اس لیے ہمیں بچانا چاہتا ہے یہ کیوں ٹھیک کہا میں نے ہے بس اسی لیے تم نے اس کی یہ حالت بنا ڈالی۔ بیس پچیس آدمی مل کر اپنا زور دکھانے لگے اور شرم تک نہ آئی کسی کو بھی؟“

”ہم میں سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے اسے بلکہ پولیس والوں نے اپنے طریقے سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی تھی۔“ رستم بولا۔

”اچھا! تو یہ ان بھیڑیا صفت لوگوں کی کارگزاری ہے، انھیں بڑی مشق ہے اس کام کی۔ شریفوں کی پگڑیاں اچھالنے اور انھیں تختۂ مشق بنانے کی خصوصی تربیت حاصل کی ہوتی ہے انھوں نے۔ یہ شیر ہی ہمیشہ بکریوں کو دیکھ کر ہوتے ہیں ورنہ شیروں کے تو سامنے جاتے ہوئے بھی ٹانگیں لرزتی ہیں ان کی۔ اس میں ان بچاروں کا قصور بھی کیا ہے، ان کے انسٹرکٹر یہی سمجھا کر بھیجتے ہیں انھیں کہ جس پر بس نہ چلے اس کے آگے سر جھکا کے رہو اور جو قابو آ جائے اس کا سر سلامت نہ رہنے دو۔ یہ اصول و ضوابط انگریزوں نے بنائے تھے ان کے لیے۔ اسے ان کے ذریعے برصغیر کے لوگوں کو غلام بنائے رکھنا تھا لہٰذا وہ انھیں برائے نام تنخواہوں پر ملازم رکھ کے عوام کا خون پینے کی آزادی دے دیتا تھا۔ یہ لہو اس محکمے کو ایسا منہ لگ... یہ آج بھی انگریزوں کے قاعدے قوانین کو سینے سے لگائے ... ہیں۔ ایک آزاد قوم کے محافظ بن کے رہنا یہ سیکھ ہی نہیں ... جب تک ان کے بڑوں کے ذہن انگریزوں کی غلامی سے ...

آبی بولا۔ ”یہ تو اچھا ہی ہوا یار! ہم اُدھر آسیہ کے گھر ... کے بجائے پلٹ کر اِدھر آ گئے ورنہ انھوں نے تو حشر نشر ... تھا اس کا۔“

”ہاں، یہ اچھا ہی ہو گیا آبی یار! یہ غریب مفت میں ... ہمارے چند گھنٹے یہاں قیام کی بڑی سخت سزا ملی ہے اسے۔“

”میں کہتا ہوں بات مان لے میری۔ ان سب کو لائن ... کر گولیاں اتار دیتے ہیں ہم ان کے سینوں میں۔“ آبی ان کی بند... طرف ڈال کر میری طرف واپس آتے ہوئے بولا۔ ”یوں چھوڑ ... گئے ہم انھیں تو یہ پھر کوئی مصیبت کھڑی کر دیں گے ہمارے ...“

”بک نئیں اوئے، ہم یہاں لاشاری کو آسیہ سے ... غرض سے آئے تھے، بربریت ہمارا شیوہ نہیں ہے، کوئی قتل ... نہیں آئے تھے ہم ادھر۔ انھیں نہتا کر دیا ہے ہم نے یہ بہت ہے بس۔ ان سب کی بندوقیں ایک جگہ کر کے گٹھر باندھ... کا اور اسے ایک گھوڑے کی پشت سے خوب مضبوط ... ان گھوڑوں کو متصل کی طرف ہانک دو، یہ لاکھو لاشاری کے گھوڑے ہیں، سیدھے اُدھر ہی جائیں گے۔ اس کے بعد انھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے اور یہ پیدل چل کر جتنی ... کسی ایسے مقام تک پہنچیں گے جہاں سے ہمارے خلاف ... کر سکیں، اتنی دیر میں ہم اس علاقے سے بہت دور نکل چکے ...“ میں نے اسے سمجھایا۔

”ہاں، یہ اچھی تجویز پیش کی ہے جیلانی نے۔ بالکل ... چاہیے ہمیں۔ میں تائید کرتا ہوں اس کی۔“ شرافت علی نے فوراً ...

”چلو پھر یونہی کر لو۔ مگر میری بات یاد رکھنا، یہ سنپولیے ملتے ہی ڈسنے کی کوشش کریں گے ہم تینوں کو، تیرے جیسی ... ظرفی کا مظاہرہ یہ کبھی نہیں کر سکیں گے بلکہ یہ بھی امکان ہے ہمارے جاتے ہی اس غریب سجل کو پھر باندھ لیں گے۔“ آبی ... تندی سے بولا۔

”ایسے بے غیرت نہیں ہیں جیلانی سائیں، ہم اب ... نہ کریں آپ ہمیں سائیں!“ رستم نے لجاجت سے کہا۔ ”ہمیں ... تھا کہ آپ لاشاری سائیں کے ہمدرد ہیں، ہم تو ان کا دشمن ... تھے آپ لوگوں کو بھی۔ ساسی غلط فہمی میں یہ کمینہ پن کر بیٹھے ہیں ... اطمینان رکھیں، آپ کو کسی اور شکایت کا موقع نہیں ملے گا ... طرف سے۔ تو بھی معافی دے دے سجل سائیں! بڑی بھول ... ہم سے، کیسے اندھے ہو گئے تھے ہم یار، دوست دشمن کی تمیز ...

... بالکل۔“ اس نے سجل کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

آبی حیران حیران سا رستم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا ... یہ وہی رستم ہے جو ابھی چند منٹ قبل ہماری ہڈیاں تک ... کو بے چین ہو رہا تھا۔ سجل اپنے زخموں سے اٹھنے والی ... کو جیسے بھول گیا تھا، مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو تم لوگوں ... پہلے ہی بتایا تھا رستم! جیلانی سائیں دشمن نہیں ہیں لاشاری سائیں کے۔ یہ اسے مار ہی نہیں سکتے کبھی۔ مگر تو نے مانا ہی نہیں۔“

”تو ٹھیک کہتا تھا بھائی! غصے نے میری عقل چھین لی تھی اور جس طرح جیلانی سائیں نے حویلی میں مجھے اور ممتاز کو روکا تھا اس سے میں نے یہی سمجھا تھا کہ لاشاری سائیں انھی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“ رستم نے پشیمانی سے کہا۔

آبی اور شرافت علی نے اس اثنا میں ان سب کی بندوقیں گٹھڑ کی شکل میں باندھ دی تھیں۔ میں نے رستم کو یوں پشیمان دیکھ کر آبی سے کہا۔ ”آبی! ان کے ہتھیار واپس کر دے، میرا خیال ہے اب ضرورت نہیں رہی ہمیں انھیں نہتا اور پیدل کرنے کی۔“

آبی نے مڑ کر عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا، چند ثانیے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے جیلانی؟ ایسا تو نہیں تھا تو پہلے کبھی بھی۔ ذرا سا نرم آواز میں بولا وہ تو ایک دم بھول گیا سب کچھ۔ تیرے نزدیک ایسے زبان کے سچے لوگ ہیں یہ؟“

”ہاں، ایسا ہی سمجھتا ہوں میں اس جوان کو، جھوٹ کی آمیزش نہیں معلوم ہوتی مجھے اس کی باتوں میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، تو جو دل چاہے سمجھتا رہ، انھوں نے اس سجل کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی سزا تو بھگتنا ہی چاہیے انھیں۔ اگر ان کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں رہا ہے تو انھیں متصل تک پیدل جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں رستم غلط کہا میں نے؟“

”نہ جی نا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے اس میں۔“ رستم جلدی سے بولا۔ ”اس سے بھی بڑی کوئی سزا چاہیں تو دے لیں آپ۔“

”بس پھر ٹھیک ہے۔ تو اپنی زبان بند کر لے اب جیلانی! جب ان لوگوں کو اعتراض نہیں ہے تو تجھے بھی بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ درس و تدریس کا کام کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھ، یہ وقت اس کام کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے اور نہ ہی یہ مقام اس کے لیے موزوں ہے۔ پتا نہیں اتنا رحم کہاں سے بھر گیا ہے ... تیرے ہے؟“ آبی نے کہا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں اس کے ... نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے رستم کے انداز اور عاجزانہ لہجے کا ... اثر قبول کر لیا تھا شاید۔ وہ کوئی تنہا آدمی نہیں تھا جو ہمارے ... غلطی سے چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی لوگ ... کے حکم یا مرضی کے تابع تھے یا نہیں، اس بارے میں مجھے علم نہیں تھا کوئی۔ ان کے علاوہ سادہ لباس میں پولیس کے آدمی بھی تھے جن کے لیے موجودہ مسئلہ کچھ بھی حیثیت رکھتا ہو، اس سے قطع نظر ایک یہی بات بہت اہم تھی کہ میں غلام جیلانی ہوں اور میرے ساتھ اسلم آبی بھی ہے۔ ہم دونوں ہی ان کے لیے بے حد کشش رکھتے تھے۔ وہ ہم سے اور ہمارے نامۂ اعمال سے جتنی واقفیت رکھتے تھے اتنی واقفیت تو خود ہمیں بھی حاصل نہیں تھی۔ پھر وہ کسی رستم علی کے کہنے سے ہمیں کیسے بھول سکتے تھے، کس طرح وہ ہم دونوں کو بخیر و خوبی اپنے علاقے سے گزر جانے کی اجازت دے دیتے۔ یہ ساری باتیں میرے دماغ سے بالکل ہی نکل گئی تھیں اس گھڑی، مگر وہ آبی بہت گہری نگاہ رکھتا تھا اور ہر لمحے اس کی کھوپڑی کام کرتی ہی رہتی تھی۔ اس لمحے بھی اپنی چوکسی کے باعث وہ اس منحوس ساعت کو ٹالنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو میری ذرا سی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں دبوچ لینے کے لیے دبے پاؤں بڑھنے لگی تھی ہماری طرف۔

آبی اور شرافت علی نے مل کر بندوقوں کا گٹھر اٹھایا اور اسے ایک گھوڑے کی پشت پر لاد کر مضبوطی سے باندھنے کے بعد تمام گھوڑوں کو متصل گاؤں کی طرف ہانک دیا۔ گھوڑا آدمی کی طرح بے وفا، موقع شناس اور برے وقت میں ساتھ چھوڑ دینے والا جانور نہیں ہوتا۔ آبی اور شرافت علی، ان کا رُخ متصل گاؤں کی طرف کر کے انھیں ہانکتے تھے تو وہ بار بار پلٹ کر ان لوگوں کی طرف دیکھتے تھے جنھیں وہ اپنے اوپر سوار کر کے یہاں تک لائے تھے۔ ان دونوں نے بڑی مشکل سے، مار مار کر انھیں بھاگنے پر مجبور کیا تھا، تب کہیں جا کر ٹلے تھے وہ وہاں سے۔ گھوڑوں کو بھگا دینے کے بعد بھی ہم کافی دیر تک وہاں ٹھہرے رہے تھے اور جب ہمیں یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ اب وہ لوگ کسی طرح بھی لاشاری کی حویلی پہنچنے سے پہلے ان گھوڑوں کو دوبارہ نہیں پکڑ سکتے۔ تب ہم نے سجل سے رخصت کی اجازت لی اور اس کو یہ یقین دلایا کہ اگر یہ لوگ دوبارہ اسے پریشان کرنے کی کوشش کریں گے تو ہم ان کی گوشمالی کے لیے جلد ہی اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس بار ایسی سزا دیں گے انھیں کہ وہ پھر کبھی اس کی طرف کا رُخ نہیں کر سکیں گے۔

”نہیں سائیں! اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی... آپ کو اب۔ یہ جو کچھ ہوا ہے میرے ساتھ، بس ذرا سی غلط فہمی میں ہو گیا ہے۔ ایسا بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے، انسان خطا کا پتلا ہے سائیں! غلطی کس سے نہیں ہوتی ہے۔ ہم لوگ یہاں باپ دادا کے زمانے سے رہ بس رہے ہیں اور جہاں انسان رہتے ہیں تھوڑی بہت اونچ نیچ بھی ہو جایا کرتی ہے۔ ان باتوں کو جتنی جلدی ممکن ہو معاف ہی کر دینا اچھا ہوتا ہے۔ دل میں رکھ کے

نہیں بیٹھا جاتا۔" سچل نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔

رستم بولا "آپ بالکل بے فکر ہو جائیں جیلانی! سچل بھائی ہے ہمارا، ہمارے دل میں تو پہلے ہی اس کی بڑی عزت ہے۔"

"وہ تو اس کی حالت سے ظاہر ہے۔ ایسی ہی عزت کرتے ہو تم اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کی؟" آبی نے طنزاً کہا۔

"کیوں ہمیں شرمندہ کرتے ہو یارو! میں نے بتایا نہیں، یہ جو کچھ ہوا ہے سچل کے ساتھ، اس میں ہماری مرضی ذرا بھی شامل نہیں تھی۔ یہ ان پولیس کے بندوں کی کارروائی ہے جو انھوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کی ہے۔" رستم نے جواب دیا۔

"تیرا کیا خیال ہے بھائی رستم خان! کیا یہ اب دوبارہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے؟ کیا اب ان کے دل صاف ہو گئے ہوں گے سچل کی طرف سے؟ انھیں اس کی بے گناہی پر یقین آگیا ہو گا؟ یہ تو ان کی فطرت کے بالکل خلاف ہو گا اگر ایسا ہوا۔"

"اس کی تو فکر ہی نہ کریں جی، اب اگر انھوں نے ہاتھ بھی لگایا سچل کو تو سیدھا کر دوں گا میں انھیں۔" وہ بولا۔

"زیادہ بڑی باتیں نہ کر یار! یہ پولیس والے بڑے اڑیل ٹٹو ہوتے ہیں۔ اڑ جاتے ہیں تو اپنے باپ کی بھی نہیں سنتے۔ بڑا سحر ہے ہمیں ان کا، اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکال بھائی، جسے پورا کرنا تیرے اختیار میں نہ ہو۔" آبی نے کہا۔

"بے شک آپ ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے مگر ابھی رستم کو نہیں جان سکے ہیں سائیں آپ۔ رستم جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔ میری بات نہ مانی انھوں نے تو پورا تھانہ الٹ کر رکھ دوں گا میں۔" رستم سینہ تان کر بولا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر اب ہم تیری ضمانت پر یہاں چھوڑے جا رہے ہیں اس غریب آدمی کو۔ دوبارہ جب بھی ادھر آئیں ہمیں اسی طرح صحیح سلامت ملنا چاہیے یہ۔" میں نے رستم کو سچل کی حمایت کے لیے مزید پکا کرنے کے لیے کہا۔

"ہاں ہاں جی، بالکل۔ آپ جب بھی ادھر آئیں گے، سچل آپ کو ایسا ہی ملے گا۔" رستم نے وعدہ کیا۔

ہم تینوں باری باری سچل اور رستم سے ہاتھ ملا کر کار میں جا گھسے۔ اسٹیئرنگ اس بار بھی شرافت علی ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جلد ہی ہماری کار ایک بار پھر شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد آبی بولا "یہ تو نے بہت اچھا کیا جیلانی! اس رستم کے پتر کو ضمانتی بنا دیا سچل کا۔"

"ہاں یار! وہ آدمی مجھے اپنے ہی قبیلے کا لگا تھا۔ مجھے یقین ہے اپنے وعدے پر جان کی بازی لگا دے گا وہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ایسا ہی ہے وہ۔ بڑا بے جگر اور کشادہ دل ہے، ایسے لوگوں پر آنکھ بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔" آبی بولا۔

"اور اس ممتاز کے بارے میں کیا خیال ہے تیرا؟ کیا وہ ایسا ہی قابلِ اعتبار آدمی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہے تو وہ بھی ایسا ہی مگر تجربات نے ضعیف... ہے اسے۔ مصلحت کوش زیادہ ہو گیا ہے وہ، اس کا دل... مشکل ہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آبی! تو نے اس کے ساتھ... نہیں کیا، ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا تجھے۔ اب بیچارہ... دن تک اٹھ نہیں سکے گا بستر سے۔ لاکھوں شادی کی آخری رسومات میں بھی شریک نہیں ہو سکے گا۔ میں ایسا نہیں..."

"اوئے چپ ہو جا یار! تیری تو اب اوور ہالنگ... ضرورت محسوس ہونے لگی ہے مجھے۔ سارے ہی پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔"

"مجھے تو تم دونوں ہی کے پرزے ڈھیلے معلوم ہو... ہیں۔ اوور ہالنگ کی ضرورت تم دونوں کو ہے۔" شرافت... شرارت سے بولا۔

"اوئے تو بھی ..." آبی بولا "میرا مطلب ہے تو... بولنا جانتا ہے؟ تیرے منہ میں بھی زبان موجود ہے؟"

"تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا اب تک میں تمھاری... سے اپنا مطلب بیان کرتا رہا ہوں؟" شرافت علی نے... ہوئے کہا۔

"لگتا تو کچھ ایسا ہی تھا، میری نہیں تو کسی اور کی زبان... لے کر کام چلاتا رہا ہو جیسے۔ ویسے یہ تو بتا دیں برادر! کچھ... تو فرما دیں جناب کراچوی! آپ کو ہم دونوں کے پرزے ڈھیلے... جانے کی نوید کس نے دی ہے؟"

"ایسی باتیں کسی کے بتانے سے تو معلوم نہیں ہو... دریائی بھائی! جب پرزے کھڑکھڑ کی آواز دیتے ہیں... ہی جاتا ہے۔"

"اوئے کیا کہا تو نے؟ تجھے ہمارے پرزے کھڑ... کب سنائی دے گئے تھے اور تو نے کیا نام لیا ہے یہ... سے کیا مراد ہے تیری؟ کیا مجھے پانی میں رہنے والا کوئی... ثابت کرنا چاہتا ہے تو؟" آبی بگڑ کر بولا۔

"ثابت کرنے کی کون سی بات ہے اس میں؟ سارا... تمھیں آبی کہہ کر پکارتی ہے، اس کا کبھی برا نہیں مانا تم... نے وضاحت سے کہہ دیا تو گرمی دکھا رہے ہو مجھے...

نہیں ہے اس کی کہ پرزے کام نہیں کر رہے ہیں تمھارے؟" میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ آبی مجھے گھورتے ہوئے بولا "تو کیوں خوش ہو رہا ہے بیٹے؟ تجھے بھی پاگل قرار دے رہا ہے یہ تیرا یار۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، ممکن ہے اس کا تجربہ یہی بتاتا ہو لیکن یہ آبی کی جو تشریح ہوئی ہے، جو مفہوم اس کا آج معلوم ہوا ہے، اس کا تو پیارے جواب ہی نہیں کوئی۔ اس پر تو میں نے آج تک غور ہی نہیں کیا تھا۔"

"اوئے بک نہیں سالے، اگر میرا نام بدلنے کی کوشش کی تو نے تو بہت برا ہو گا۔" آبی بری طرح بھڑک گیا تھا۔

میں نے اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "اچھا یار تو خود ہی بتا دے ایمانداری سے اس میں غلط کیا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ اس شرافت علی نے اب بھی رعایت سے ہی کام لیا ہے تیرے ساتھ۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کیسی رعایت کی ہے اس نے؟ اب اور کیا کہلوانا چاہتا ہے تو اس طرح؟"

"یہ رعایت نہیں کی ہے اس نے، تجھے پانی کا بلبلا کہنے کے بجائے دریائی کہہ کر عزت بڑھا دی ہے تیری؟"

"اوئے بک نہیں ذلیل! تجھے پانی کا بلبلا دکھائی دیتا ہوں میں؟"

میں نے کہا "اور کیا مطلب ہونا ہے آبی کا۔ ذرا غور کر تیرا پورا نام اسلم آبی ہی ہے نا۔ یعنی اسلم پانی کا بنا ہوا۔"

"نہیں یار جیلانی! اب اتنا بھی نہ گراؤ اس غریب کو، آخر اللہ کی مخلوق میں سے ہے اور پانی میں رہنے والی مخلوق کو بھی آبی ہی کہا جاتا ہے، البتہ وہ زمین جو پانی دے کر قابلِ کاشت بنائی جائے اسے بھی آبی ہی کہا جاتا ہے اور ایک نانِ آبی ہوتی ہے جو اکثر میتوں میں تقسیم کی جاتی ہے ..."

آبی ایک دم غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ شرافت علی کی بات کاٹ کر گرجا "تو چپ نہیں ہو گا سالے ابنِ لشکری، کفن پھاڑ کے بولے چلا جا رہا ہے۔ مغز کھول کے ساری اردو دانی باہر نکال کے رکھ دوں گا ابھی۔"

وہ غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔ میں نے بات بگڑ جانے کے خیال سے اسے ذرا سخت لہجے میں ٹوکا "اکبو اس زبان کو قابو میں رکھ اپنی۔ یار دوست اس لہجے میں بات نہیں کرتے، دل آزاری نہیں کرتے ان کی۔"

"اور یہ جو کچھ بکواس کر رہا ہے وہ سنائی نہیں دیتی تجھے۔ منہ سے پھول جھڑتے نظر آ رہے ہیں کیا؟"

"اوئے مذاق کی باتوں کو فیل کرنے لگا ہے تو کیا ہو گیا ہے تجھے؟ میں نے تو کبھی برا نہیں مانا تیری کسی بات کا۔" میں بولا۔

"نہیں جیلانی! اسے کچھ نہ کہو تم۔ کہنے دو اسے جو کچھ کہتا ہے یہ۔ چھیڑا تو خود میں نے ہی ہے اور جب پہل میری طرف سے ہوئی ہے تو میں اس کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ یہ اگر سچ مچ میرا سر توڑ دے تب بھی کچھ نہ کہنا اسے۔" شرافت علی نے کہا۔

میں نے آبی کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ وہ جواب میں کچھ کہے گا مگر شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ مذاق کی باتوں میں سنجیدہ ہو کر بے قابو نہیں ہونا چاہیے آدمی کو۔ لہٰذا وہ شرافت علی کو کچھ کہنے کے بجائے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنے مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور میں بھی اپنی جانب کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر دیکھتے ہوئے مجھے آسیہ کا خیال آگیا۔ وہ نہ جانے کس سمت نکل گئی تھی۔ پولیس کی جیپ اس نے چھوڑ دی بھی تھی یا نہیں، اسے جلد از جلد اس جیپ سے جان چھڑا لینا چاہیے تھی۔ میں نے سوچا، کہیں وہ اس جیپ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کے خیال سے اب تک اسے ساتھ لیے نہ بھاگی پھر رہی ہو، یہ اس کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے شرافت علی سے پوچھا "شرافت علی! کچھ اندازہ بھی ہے ہم کدھر جا رہے ہیں؟ یہ راستہ کدھر لے جائے گا ہمیں؟"

"بس کچھ ہی دیر میں شکارپور پہنچ جائیں گے ہم۔ وہاں پہنچ کر میرا خیال ہے یہ گاڑی ہم ریلوے والوں کے سپرد کر دیں۔ وہ اسے کسی ٹرین میں لاد کر کراچی پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد ہم لوگ بھی ٹرین سے ہی کراچی روانہ ہو جائیں گے۔"

"ہاں، یہ تو نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔ ہائی وے پر تو جگہ جگہ پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا ہمیں، ہم نے اس افضل بیگ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ اس کا انتقام لینے کے لیے بے چین ہو گا۔ موقع ملتے ہی وائرلیس کے ذریعے دور دور تک پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دے گا اور وہ لوگ پتا نہیں کہاں کہاں ناکہ بندی کر کے بیٹھ جائیں گے۔"

"ہاں، یہی خیال مجھے بھی آیا تھا۔ اسی لیے میں نے ٹرین سے سفر کے بارے میں پروگرام بنایا ہے۔" شرافت علی نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے شکارپور کے بجائے ہمیں سکھر جا کر ٹرین پکڑنا چاہیے۔ یہ زیادہ بہتر ہو گا ہمارے لیے۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ یہ کیوں بہتر ہو گا؟ سکھر پہنچنے میں تو ہمیں

زیادہ دیر لگے گی۔ ممکن ہے اس اثنا میں پولیس کو اطلاع کر دی جائے ہمارے بارے میں اور ہم سکھر پہنچتے ہی ان کے شکنجے میں جا پھنسیں۔" شرافت علی۔ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس کا امکان تو ہے لیکن میرا خیال ہے، سکھر زیادہ محفوظ مقام ہے ہمارے لیے۔ یہاں شکارپور ریلوے اسٹیشن پر ہم اپنی گاڑی چھوڑیں گے تو وہاں نہ جانے کب تک یہ گاڑی کھڑی رہے گی اور جب تک یہ وہاں رہے گی، تھانیدار افضل بیگ یا اس کے ان ماتحتوں میں سے جو ہمیں اس گاڑی کے ساتھ دیکھ چکے ہیں، کسی کی نظر کسی وقت بھی اس پر پڑ سکتی ہے۔ اس کے بعد ریلوے اسٹیشن سے معلومات کر کے وہ یہ بھی جان لیں گے کہ ہم شکارپور سے ٹرین میں سوار ہو کر کہاں گئے ہیں۔ پھر ان کے لیے ہم تک پہنچنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ میں بار بار ان سرکاری اہلکاروں سے ٹکرانا نہیں چاہتا۔ ان سے دُور رہنا ہی اچھا ہے۔"

"یہ بہت اچھی بات سوچی ہے تم نے جیلانی! میں بھی ان سے اُلجھنے کا قائل نہیں ہوں بالکل بھی مگر اس کے لیے ہمیں سکھر تک اس گاڑی میں جانے کا رِسک نہیں لینا چاہیے۔ گاڑی کے میک اور رنگ سے اس کے مالک کا پتا نہیں چل سکتا۔ اصل چیز اس کے نمبر ہیں۔ ان میں سے جس نے بھی ہمیں اس گاڑی میں دیکھا ہوگا، گاڑی کے نمبر ضرور یاد کر لیے ہوں گے لیکن ان بے چاروں کو یہ پتا نہیں ہے کہ یہ نمبر جعلی ہیں۔ ایسے موقعوں پر میں اپنی گاڑی کی اصل نمبر پلیٹ تبدیل کر دیا کرتا ہوں ہمیشہ۔ خطرناک کاموں میں استعمال ہونے والی گاڑیوں میں صحیح نمبر پلیٹ کبھی نہیں رہنے دی جاتی ہے۔ اب چونکہ یہ نمبر پولیس کے علم میں آگئے ہیں لہٰذا شکارپور پہنچنے سے پہلے ہی انھیں تبدیل کر دوں گا میں ـــــ اور ایسے نمبروں والی پلیٹ لگا دوں گا اس پر جس کا رجسٹریشن میرے ایک نہایت قابلِ اعتبار آدمی کے نام ہے۔ وہ لوگ تمھاری زبانی میرا نام بھی کئی بار سُن چکے ہیں چنانچہ انھوں نے اگر اس گاڑی کو ریلوے اسٹیشن پر دیکھ کر اس کے نمبروں کے ذریعے کراچی سے اس کے مالک کا پتا کرنا بھی چاہا تو وہاں انھیں شرافت علی کا نام نہیں مل سکے گا اور بالفرض وہ ہمارے فراڈ کا کھوج لگانے کی خاطر اس شخص تک پہنچ بھی گئے تو وہ ایک بالکل ہی نئے آدمی سے مل کر خود ہی شرمندہ ہو جائیں گے۔ انھیں ہم تینوں میں سے کوئی بھی اس گاڑی کے ذریعے نہیں مل سکے گا۔ احتیاطاً شکارپور پہنچ کر تم اور آ.بی کسی ہوٹل میں بیٹھ جانا۔ اسٹیشن تک گاڑی میں اکیلا ہی لے جاؤں گا تاکہ انھیں یہی پتا چلے کہ گاڑی وہاں چھوڑ کر جانے والا ایک ہی شخص تھا۔ دوسرے ہم لوگ شکارپور سے ٹرین میں سوار ہونے

کے بجائے وہاں سے کسی بس یا ٹیکسی میں سکھر چلے جائیں اور ٹرین سکھر جا کر پکڑیں گے۔ اس طرح کسی کو یہ پتا نہیں سکے گا کہ ہم کہاں گئے ہیں۔ کیا خیال ہے آ.بی! کیسلے..." اس نے اچانک آ.بی کو مخاطب کیا۔

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔ تیری کھوپڑی تو بہت کام کرتی ہے۔ حیران کر دیا ہے اس گھڑی تو نے مجھے۔" بول اُٹھا۔ شرافت علی کی باتوں نے مجھے بھی حیران کر وہ ایک بہت اچھا منصوبہ ساز .... ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی نظر بہت گہری تھی اور بہت دُور دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ایک ایک بات پر نظر تھی کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "تو تو بڑا گہرا آدمی ثابت ہو یار شرافت علی!"

وہ ہنس کر بولا۔ "تمھارا کیا خیال تھا؟ کیا مجھے بس اپنے معاملات سونپ دیے ہیں ڈاکٹر دھمن نے؟ میرے کچھ تو دیکھا ہی ہوگا اس نے مجھ میں۔ ورنہ اس جیسے آدمی کو گھبرانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"ہاں، یہ تو نے ٹھیک کہا ہے۔ بڑا دُور بیں اور شخص ہے وہ جس کا نام دھمن ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اسے گھٹی میں شامل کر کے پلائی گئی ہے اور کجی اس کی ہی رہ گئی ہے۔ ورنہ آدمی وہ بلا کا ذہین اور بے پناہ صلاحیتوں والا ہے۔ اگر لالچ اس پر حاوی نہ آ گیا ہوتا تو اپنے ملک کے قابلِ فخر شخص ہوتا وہ۔ بس ابلیس کی شاگردی نے برباد کر دیا ہے اسے۔ اس لعین نے شاید ہوش سنبھالتے ہی لیا تھا اسے اور پھر نکلنے نہیں دیا اپنے پنجے سے۔"

"ہاں بھائی! اس لعین ہی کی وجہ سے یہ دُنیا جہنم جا رہی ہے۔ ذہین لوگ ہی تو غذا ہیں اس کی۔"

شرافت علی نے گاڑی سڑک کے ایک کنارے روک گاڑی کے اس خفیہ خانے سے جہاں ہتھیار وغیرہ چھپا رکھے اس نے دو نمبر پلیٹیں نکال کر کار کے آگے اور پیچھے دونوں سے پُرانے نمبروں والی پلیٹیں نکال دیں اور ان کی جگہ وہ پلیٹیں لگانے کے بعد دوبارہ کار آگے بڑھا دی۔ وہ ایک جرائم پیشہ تنظیم کا رکن تھا، اس کے پاس وسائل کی کوئی کمی تھی۔ ہر وقت ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونے کو وہ تیار رہتے تھے۔ اس معاملے میں اسے ہم پر برتری حاصل ہم کبھی بھی آنے والے سیلاب کو روکنے کے لیے پہلے سے تیار نہیں کرتے تھے۔ دن اور رات طوفانوں اور سیلابوں نبرد آزما رہتے تھے مگر ان بارے میں کچھ

ہو جاتا تھا۔ اس ہنگامہ خیز زندگی کا میں اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اگر چند دن پُرسکون گزر جاتے تھے تو مجھے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ زندگی بے مزہ ہو کر رہ جاتی تھی۔

شکارپور پہنچ کر ہم راہ گیروں سے پوچھتے پاچھتے ریلوے اسٹیشن تک جا پہنچے۔ اسٹیشن کے قریب ہی ہمیں ایک چھوٹا سا ہوٹل دکھائی دے گیا۔ ہوٹل کیا تھا بس ایک چھوٹی سی دکان تھی جہاں چائے اور کھانا فروخت کیا جاتا تھا۔ میں اور آ.بی کار سے اُتر کے اس دکان کے ایک گوشے میں جا بیٹھے جہاں سڑک سے گزرنے والے راہگیروں کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جب تک کوئی شخص اندر داخل نہ ہوتا، ہمارے دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔ رات کو جب ہم کراچی سے روانہ ہوئے تھے تو ہمارے لباس اور حلیے ایسے تھے کہ عام آدمی ہمیں دیکھ کر رعب کھا جاتا، لیکن رات بھر کے سفر اور اب تک کی ہنگامہ خیزی کے بعد ہم ان حالوں کو پہنچ گئے تھے کہ اس ہوٹل کے ماحول میں اجنبی نہیں لگتے تھے۔ گنجلے ہوئے میلے کپڑے، بکھرے ہوئے بال اور بڑھے ہوئے شیو ہمیں اسی ماحول کے افراد ظاہر کر رہے تھے۔ اسی لیے ہمیں وہاں داخل ہوتے دیکھ کر کسی نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک میلا کچیلا دس گیارہ سالہ بچہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "کیا چاہیے جی؟" اس نے اس انداز میں پوچھا تھا ہم سے، جیسے ہم جیسے آوارہ گردوں کو منہ لگانے کا عادی نہ ہو۔

ہم نے صبح سچل کے مسافر خانے میں ناشتا کرنے کے بعد اب تک کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ حالات نے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی ہمیں اور نہ ہی ہوش تھا اس کا۔ لڑکے کے پوچھنے پر اچانک ہی مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا تھا۔ میں نے آ.بی سے کہا۔ "کیوں جی پیرزادہ سائیں! کچھ بھوک شوک لگی ہے آپ کو بھی یا نہیں؟ میرا تو بھوک سے بُرا حال ہے بھائی جی۔"

"ہاں بھائی ہاشم خان! بھوک تو مجھے بھی زور کی لگی ہوئی ہے مگر پہلے اس اپنے رہبر خان کو تو آ جانے دو۔ بھوکا تو وہ بھی ہوگا نا۔ اس کے بغیر اپنا پیٹ بھر لینا اچھی بات تو نہیں ہوگی۔ تھوڑی دیر صبر کر لو تو اچھا ہی ہے۔"

"ہاں، یہ بات ٹھیک کہی ہے تم نے۔ آ جانے دو اسے بھی۔ اتنی دیر میں کوئی موت واقع نہیں ہو جائے گی ہماری۔"

"ہاں، یہی خیال ہے میرا بھی۔" آ.بی نے کہا۔ پھر وہ لڑکے سے بولا۔ "ہمارا ایک ساتھی اور آ رہا ہے ابھی۔ اس کے آنے تک ٹھہر جا بیٹے! وہ آ جائے تو تیرے اس ہوٹل میں کھانے پینے کا جتنا سامان موجود ہے، سب لا کر ڈھیر کر دینا ہمارے آگے۔ سمجھ گیا نا؟"

لڑکے نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر آ.بی کو دیکھا۔ ایسا گاہک آج پہلی بار ہی ٹکرایا تھا اسے۔ اس سے پہلے کبھی اس کا واسطہ کسی ایسے گاہک سے نہیں پڑا تھا جس نے یوں ہوٹل میں موجود کھانے پینے کی تمام اشیا اپنے سامنے ڈھیر کرنے کا آرڈر دیا ہو اُسے۔ وہ یوں ہی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے ہوٹل کے دروازے کے ساتھ میز کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے اس شخص کے پاس چلا گیا جو اپنے ہر انداز سے اس بھٹیار خانے کا مالک لگتا تھا۔ لڑکے نے اس کی طرف جھک کر دبی آواز میں کچھ کہا تھا۔ جواب میں اس شخص نے ہمیں نظریں اُٹھا کے ایک لمحے کو دیکھا، پھر ذرا اُونچی آواز میں بولا۔ "کیا مانگتے ہو سائیں آپ لوگ؟ مذاق کیوں کرتے ہو بچے سے؟"

میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر آ.بی مجھ سے پہلے ہی بول پڑا۔ "کونسا مذاق کیا ہے ہم نے اس بچے سے؟ کیا بکتا ہے تو؟"

آ.بی کے لہجے کی کرختگی نے اسے سہما کر رکھ دیا۔ اپنے چہرے مُہرے اور قد کاٹھ سے وہ اچھا خاصا بارعب آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن سینے میں اپنے چڑیا کا دل لیے پھرتا تھا۔ جلدی سے بولا۔ "ناراض نہ ہوں پہلوان جی! میرا مطلب یہ نہیں تھا جی جو آپ نے سمجھ لیا۔ میں تو یہ پتا کرنا چاہتا تھا کہ آپ لوگ کیا کھانا پسند کریں گے؟ یہ بچہ بولتا ہے آپ ہوٹل میں جتنا کھانا ہے سب لانے کو بول رہے ہیں۔ یہ سالا گدھا اسی کی مافوق بات بولتا ہے۔ ہوٹل کا سارا کھانا کون مانگتا ہے؟"

"کیوں؟ کیوں نہیں مانگ سکتا کوئی سارا کھانا۔؟ میں نے یہی کہا تھا اس لڑکے سے۔" آ.بی نے تیوری پر بل ڈال کے کہا۔

"اچھا، یہی بولا تھا آپ نے اس کو!" وہ حیرت سے بولا۔ "ٹھیک ہے جی، جو مرضی حکم کریں آپ۔ ہم کیا بول سکتا ہوں۔" پھر وہ لڑکے سے بولا۔ "اوئے جا، نا سالا، اِدھر کھڑا کیا کرتا ہے؟ جا کر سالن گرم کرا اور ماسی کو بول، روٹی پکا کے دے گرم گرم۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یار پیرزادہ! کیوں اس غریب کو پریشان کر رہا ہے؟ کیا بگاڑا ہے اس نے تیرا؟"

ہوٹل کا مالک جلدی سے بولا۔ "نہیں سائیں! ایسا نہیں بولو۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو خوشی کی بات ہے، ہمارا مال سیل ہوئے گا تو ہم پریشان کیسے ہوئے گا۔ نہیں جی نہیں، میں بالکل پریشان نہیں ہوتا ہوں اس بات سے۔"

میں نے شرارت سے آ.بی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم بہت خوش ہو رہے ہو لیکن مال دینے کے بعد جب تمھیں کچھ ملے گا نہیں تب پتا چلے گا تمھیں کہ اس کا کہنا مان کے خوش ہوتا

ہے آدمی یا پریشان ہوتا ہے۔ پیسے نہیں دے گا یہ تمھیں کھانے کے۔"

"کیوں جی؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ پیسے کیوں نہیں دیں گے؟ اچھے بھلے شریف آدمی لگتے ہیں مجھے تو یہ؟"

"آدمی تو بُرے نہیں ہیں مگر بس اُدھار کھانے کی عادت پڑ گئی ہے انھیں۔ ان سے پوچھ، پیسے ہیں ان کے پاس؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی! بس رہنے دیں آپ، پتا چل گیا مجھے، مذاق کر رہے ہیں آپ، اپنے دوست کو پریشان کرنا چاہتے ہیں۔"

"دیکھا تُو نے ہاشم خان، سارے لوگ بے وقوف نہیں ہوتے، یہ سمجھ گئے ہیں میرا مطلب کیا ہے، اب یہ تیری باتوں میں نہیں آئیں گے۔ تو یہ کچھ بھی کہتا رہ، کھانا تو ہمیں کھلا کے رہیں گے۔ مہمان جو ہوئے ہم ان کے۔" آبی نے سینہ پھلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے اس ہوٹل والے کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔ بے چارہ عجیب صورتِ حال سے دوچار تھا اس گھڑی۔ زبان سے وہ آبی کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں نکال رہا تھا جس سے بے اعتباری یا شک کا اظہار ہوتا ہو لیکن صورت سے اس کی بے چارگی اور یتیمی ٹپک رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر یقین بالکل رکھتا ہے مگر آبی نے جس لہجے میں اس سے بات شروع کی تھی، وہ لہجہ اس کے دل میں خوف بن کر سما گیا تھا، وہ اس سے بُری طرح خائف دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بظاہر وہ ایسا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کسی کے سخت لہجے یا بگڑے ہوئے تیوروں سے خوف زدہ کر سکیں مگر آبی کی ایک ڈانٹ نے اسے بالکل چوہا بنا کے رکھ دیا تھا۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اُتر رہی تھی کسی طرح بھی۔ دو ہی باتیں سمجھ میں آتی تھیں، یا تو وہ لڑائی جھگڑے سے بہت ہی خوف زدہ رہنے والے لوگوں میں سے تھا۔ جھگڑے کے تصور ہی سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں یا پھر وہ ان عیّار لومڑی صفت لوگوں میں سے تھا جو بظاہر پسپائی اختیار کر کے دشمن کو اپنے پسندیدہ میدان میں لے جاتے ہیں اور اس طرح گھیر کر مارتے ہیں اسے کہ بچ کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہتا دشمن کے لیے۔

شرافت علی کے آتے ہی ہمارے سامنے کھانا لگ گیا۔ گو یہ کھانے کا وقت نہیں تھا، شام کے پانچ بجنے کو تھے۔ اس وقت عموماً ہوٹلوں میں یا تو کھانا ملتا ہی نہیں ہے اور اگر کہیں مل بھی جائے تو صبح کا بچا ہوا، ٹھنڈا اور بدمزہ ہوتا ہے۔ جسے آدمی شدید بھوک میں ہی زہر مار کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن اس نے ہمیں گرم، نرم اور نہایت لذیذ کھانا دیا تھا اس وقت بھی۔ ہم نے

خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد چائے پی اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عین اس وقت جب ہم ہوٹل والے کو کھانے کے پیسے دے رہے تھے، ایک جوانِ رعنا ہوٹل میں داخل ہوا اور آ کر ہمارے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ آبی نے اپنی شیروانی کی جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہوٹل والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لے یار! تو بھی کیا یاد کرے گا کوئی سخی آیا تھا ہوٹل میں تیرے۔"

ہوٹل والے نے نوٹ ہاتھ میں لے کر لڑکے کو آواز دی اور بولا "لے بیٹا، ذرا سو کا کھلا تو لے آ جا کے جلدی سے۔"

آبی آگے بڑھتے ہوئے بولا "نہیں بھائی! کھلا منگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رکھ لے یہ پورا نوٹ اپنے پاس۔"

ہوٹل والا ہکا بکا ہو کر آبی کو دیکھنے لگا۔ میں نے ہنس کر کہا "رکھ لے بھائی! حیران نہ ہوا ور شکر کر اس نے اُدھار کرنے کی کوشش نہیں کی تیرے ساتھ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کھانا جو تو نے ہمیں کھلایا ہے اس وقت، بے حد لذیذ تھا۔"

ہوٹل والا ہکلاتے ہوئے بولا "مگر... وہ کھانے کے... پیسے تو صرف... پچیس روپے بنتے ہیں۔"

"اوئے کیسا اُلو کا پٹھا ہے تو پیر محمد! اگر یہ اپنی خوشی سے پچیس کے بجائے سو دے رہے ہیں تو تجھے کیا اعتراض ہے اس میں؟ اگر تُو نہیں رکھتا تو لا مجھے دے دے یہ۔" نوارد جوان نے یہ کہتے ہوئے نوٹ ہوٹل والے کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اب تک توجہ نہیں دی تھی اس کی طرف۔ اس کی اس حرکت پر میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی بائیس چوبیس برس کا لمبا تڑنگا پہلوان نما نوجوان تھا۔ باڈی کاٹھی سے خاصا مضبوط لگتا تھا وہ۔ چہرے پر اس نے بڑی گھنی مونچھیں پال رکھی تھیں، جن کی وجہ سے وہ بے حد بارعب لگتا تھا۔ اس نے ٹخنوں سے ذرا اوپر تک کا سیاہ کُرتا پہن رکھا تھا اور اس کے اوپر سیاہ رنگ کی ہی بڑی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ پیروں میں اس کے بڑی ہی خوبصورت تلّے والی جوتی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر بولا "تیرا نوٹ اسے ہضم نہیں ہوتا جوان! یہ بڑا ہی ہلکے خون کا ہے۔ آدمی کو کچھ دیتے ہوئے سامنے والے کی اوقات بھی دیکھ لینا چاہیے۔"

"تیری اوقات کیا ہے پیارے بھائی! ذرا تعارف تو کرا اپنا۔ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ تُو ہے کیا شے؟" میں نے پوچھا۔

"تعارف نہ ہی پوچھ جوانا! یہی بہتر ہے تیرے حق میں۔ تعارف کرا دیا تو تیرے پیر اُٹھ نہیں سکیں گے زمین سے۔" وہ بولا۔

"اچھا، پھر تو ہم ضرور واقفیت حاصل کریں گے تجھ

ایسے جوان کی تو ہمیں بہت تلاش تھی جو پاؤں زمین پہ جما دے ہمارے۔ یار! ہم بھی تنگ آ چکے مسلسل سفر کرتے کرتے۔ ایک جگہ جم کے کھڑے ہو جانا چاہتے ہیں ہم بھی۔"

ہوٹل والا جلدی سے بولا "ان کے متھے نہ لگو بھائی! یہ مالک ہیں اس شہر کے۔ حاکم ہیں جی یہاں کے۔"

میں نے سر سے پاؤں تک اس جوان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "حاکم ہے یا بدمعاش ہے یہ اس علاقے کا؟"

"ایک ہی بات ہے بادشاہو۔ شہر کے اصل حاکم کو لوگ بدمعاش ہی کہتے ہیں، پر حکم اسی بدمعاش کا مانتے ہیں سب۔ کیوں جوانو! غلط تو نہیں کہا ہے میں نے؟ حاکم تو ہر کوئی بن سکتا ہے پر بدمعاشی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہوتی۔ یہ ہر آدمی نہیں کر سکتا۔ چلو میں تعارف بھی کرا دیتا ہوں اپنا۔ نام میرا اسلم آبی ہے۔ سُنا ہو گا کبھی تم نے۔ اخباروں میں بہت آتا رہتا ہے۔ ابھی دو ہفتے پہلے پنڈی کی جیل توڑ کر آیا ہوں میں غلام جیلانی کی بہن آسیہ کے ساتھ۔"

اس کے اس تعارف نے سچ مچ میرے پیر زمین سے چپکا دیے تھے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سندھ کے اس شہر شکار پور میں کوئی ایسا جوان بھی ہو گا جو غلام جیلانی اور آبی کے نام پر اپنا سکّہ چلا رہا ہو گا۔ شرافت علی نے میرا بازو تھام کر ہلاتے ہوئے کہا "یہ... یار یہ کیا ہے؟ یہ کیا سُن رہا ہوں میں؟ تم..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "چُپ ہو جا یار! یہ تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا ہے۔ یہ تو بڑا نامی گرامی جوان ہے۔" پھر میں نے آبی کو آواز دی جو ہوٹل سے باہر ہم سے دُور کھڑا ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا "او بھائی پیر زادہ! اِدھر تو آ یار! ایسے مشہور زمانہ آدمی سے ملے بغیر ہی چلا جا رہا ہے۔ ذرا اِن سے ملاقات تو کر آ کر۔"

آبی قدرے جھنجلاتے ہوئے ہماری طرف بڑھا اور بولا۔ "کیوں فضول وقت برباد کر رہے ہو یار! ہمارے پاس ٹھٹول کرنے کا وقت نہیں ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو یہ بات؟"

"پتا ہے پُتر، پتا ہے سب کچھ مجھے، مگر اِدھر آ کے اس جوان سے مل۔ اس سے مل کر وقت ہی وقت نکل آئے گا تیرے پاس بھی۔"

"اچھا! ایسی کون سی اہم شخصیت ہے یہ ذات شریف، بتا تو بھائی مجھے؟" آبی نے قریب آ کر اُسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو نے اخباروں میں غلام جیلانی اور اسلم آبی کے نام تو پڑھے ہوں گے، وہی یار! لاہور کے مشہور غنڈے اور ڈکیت جن کی گرفتاری

کے لیے ملک بھر کی پولیس جھک مارتی پھرتی ہے؟" میں نے آبی کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ انھیں کون نہیں جانتا، مگر اس وقت ان کا کیا ذکر نکال لیا ہے تو نے؟ کیا کہیں نظر آ گئے ہیں وہ تجھے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہو گیا ہے۔ یہ جوان جو یہاں کھڑا ہے، اس کو جانتا ہے تو؟" میں نے جعلی آبی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

آبی پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا، بولا "کہیں تو اسے غلام جیلانی تو نہیں سمجھ بیٹھا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں، غلام جیلانی تو نہیں ہے یہ مگر اس نے اپنا تعارف اسلم آبی کے نام سے کرایا ہے مجھ سے۔"

"اوئے ہاشم خان! پاگل تو نہیں ہو گیا ہے تو۔ یہ آبی کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اِدھر کہاں سے آ جائے گا۔ کیوں بھائی جی! جھوٹ بول رہا ہے نا یہ؟ ایسے ہی سالے کا دماغ چل جاتا ہے کبھی کبھی، تم بُرا نہ ماننا اس کی کسی بات کا۔"

"یہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ میں اسلم آبی ہی ہوں۔ تم اس فیض محمد سے پوچھ سکتے ہو۔" اس نے ہوٹل والے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "اسے یقین نہیں آ رہا ہے فیض محمد! تُو بتا دے اسے کون ہوں میں۔"

فیض محمد بولا "ہاں جی! ٹھیک کہتے ہیں یہ۔ اسلم آبی ہی نام ہے ان کا۔ شکار پور کا بچہ بچہ جانتا ہے انہیں۔"

"اچھا! تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ ویسے میری سمجھ میں یہ بات آتی نہیں ہے برادر! میں نے تو ابھی چند روز پہلے ہی کسی اخبار میں پڑھا تھا آبی کے بارے میں کہ وہ راولپنڈی جیل سے غلام جیلانی کی بہن آسیہ کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔ شاید کسی بہت بڑے آدمی کے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا ان دونوں پر۔ کسی علاقے کا زمیندار تھا شاید وہ۔" آبی نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہاں سے نکل کر میں اور آسیہ سیدھے اِدھر ہی آئے ہیں، کیونکہ غلام جیلانی اب یہاں شکار پور ہی میں آ کر آباد ہو گیا ہے اور اس شہر پر اب اسی کا راج ہے۔ مالک ہے وہ اس شہر کا۔"

آبی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "بڑی خوشی ہو رہی ہے برادر! اس وقت مجھے۔ میری دلی خواہش تھی تم دونوں سے ملنے کی، اور وہ آسیہ کہاں ہے؟ اس سے ضرور ملا دے بھائی جی مجھے۔ اس شیرنی کو دیکھنے کے لیے بہت دل کرتا ہے میرا۔ کیوں بھائی! ملا سکتا ہے اس سے مجھے تو۔ یہیں ہے نا وہ بھی تمھارے ساتھ ہی، اسی شہر میں؟"

"ہاں جی، کیوں نہیں، ضرور ملا سکتا ہوں۔ مگر تم ہو کون؟ کہاں سے آئے ہو؟" اس نے آبی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

آبی نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”ہم مامے ہیں تیرے یار غلام جیلانی کے۔ ہمیں لے تو چل اُس کے پاس پُتر! ایک بار ملا دے ہمیں اس سے۔ وہ دیکھتے ہی فوراً پہچان لے گا، اپنے مامے کو پہچاننے سے انکار نہیں کرے گا۔“

آبی کی بات سُن کر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے جوان! پریشان نہ ہو، ہمیں ساتھ لے جانے پر غلام جیلانی اور آسیہ بالکل ناراض نہیں ہوں گے، بلکہ وہ خوش ہی ہو جائیں گے تجھ سے۔ تُو ان کی ناراضی کے ڈر سے ہی پریشان ہو رہا ہے نا؟ تو اس کی بالکل فکر نہ کر تُو۔“

”ٹھیک ہے بھائی جی.....“ وہ اچانک خاموش ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ شاید اُسے ایک دم ہی احساس ہوا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایک دم بھڑک کر بولا ”اوئے کیا بکواس لگا رکھی ہے یہ تم لوگوں نے؟ ابھی تو تو اس پیرزادے کو سمجھا رہا تھا کہ غلام جیلانی اور آبی لاہور کے ڈکیت ہیں، اخباروں میں تم نے نام پڑھے ہیں اُن کے اور اب یہ پیرزادہ غلام جیلانی کا ماما بن گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اوئے کھوتے دا پُتر سمجھیا اے تُساں مینوں؟“

”اس میں سمجھنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے بچے! تُو خود ہی ثابت کر رہا ہے یہ بات۔ تُو نے نوٹ کیوں چھینا تھا اس سے! اُلو کے پٹھے! تیرے مامے کا مال ہے یہ جسے یوں جھپٹ لیا ہے تُو نے اس کے ہاتھ سے؟“ میں نے ایک دم تیور بدل کر کہا۔

”معلوم ہوتا ہے تم لوگوں کی موت کھینچ لائی ہے تمھیں اِدھر شکارپور میں۔“ وہ آستین چڑھاتے ہوئے بولا۔

فیض محمد نے ایک بار پھر مداخلت کی ”چھوڑیں آبی پہلوان! معافی دے دیں انھیں، بے چارے مسافر ہیں، جانتے نہیں ہیں آپ کو۔“

”تو چُپ ہو جا فیض محمد! ابھی جان لیں گے یہ مجھے۔ ایسی پہچان کراؤں گا انھیں کہ زندگی بھر بھول نہیں سکیں گے پھر یہ۔“ وہ بولا۔

”وہ بھی ہو جائے گا بچے! پہچان بھی کرا دینا اپنی مگر پہلے وہ نوٹ واپس کر دے اسے۔“ میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

”نوٹ تو اب میں تجھے ہی دوں گا۔ پہلے سنبھال اسے۔“ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔

آبی نے اسے مجھ تک پہنچنے کی مہلت نہیں دی۔ اس نے میرے قریب آنے سے پہلے ہی اس کی کمر پکڑ کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ ایک کرسی سے ٹکرا کر نیچے گرا لیکن اس نے دوبارہ اُٹھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔ وہ اُچھل کر اُٹھا اور غضبناک انداز میں آبی پر جا پڑا، مگر وہ آبی تھا، میرا یار اسلم آبی۔ اس نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر روک کر کسی ننھے سے بچے کی طرح دور اُچھال دیا۔ اس مرتبہ بھی وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا، فرش پر پڑ جا گرا تھا۔ اب اسے بھی کچھ عقل آ گئی تھی۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا اُسے کہ خالی ہاتھوں وہ آبی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے پڑے ہی پڑے شلوار کے نیفے سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا، پھر نہایت سفاکانہ انداز میں آبی کو گھورتے ہوئے اطمینان سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کر بولا ”تیرے تو میں ٹکڑے ہی کر دوں گا کُتے۔ سمجھا کیا ہے تُو نے؟ لاشیں گرا دوں گا میں تم سب کی۔ تمھاری موت ہی آ گئی ہے اب۔“

وہ خنجر تول کر چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ آبی پر آیا تھا مگر اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ میں نے حرکت کی تھی اور وار کرنے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھنے سے پہلے ہی میری گرفت میں آ چکا تھا۔ ہاتھ پکڑتے ہی میں نے ایک لمحے میں اپنا مخصوص حربہ استعمال کر ڈالا۔ وہ چوٹ کھائے ہوئے بیل کی طرح ڈکرا کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے اُس کا وہ ناکارہ ہو جانے والا ہاتھ فوراً ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس ہاتھ کو اپنی رانوں کے درمیان دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے درد و کرب جھلک رہا تھا۔ میں نے فیض محمد سے کہا ”آگے بڑھ فیض محمد اور اس لفنگے کی جیب سے نوٹ نکال لے اپنا۔ سالا بڑا رستم پاکستان سمجھ رہا تھا اپنے آپ کو۔ آبی کے نام سے رُعب میں لینا چاہتا تھا ہمیں۔“

فیض محمد اسے اس حال میں دیکھ کر بھی اس کے قریب جا کر اس کی جیب سے نوٹ نکال لینے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ بولا ”چھوڑیں سائیں! آپ نہ پڑیں اس چکر میں۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے جی۔ ان پہلوان لوگوں کو خرچہ تو دینا ہی ہوتا ہے ہمیں۔ میں اکیلا تو نہیں دیتا ہوں، سارا بازار ان کا حصہ نکالتا ہے۔ یہ حفاظت بھی تو کرتے ہیں ہمارے کاروبار کی۔“

”اچھا تو یہ غنڈہ ٹیکس وصول کر رہے ہیں یہاں؟ غلام جیلانی نے یہ دھندا کب سے شروع کر دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسا نہ کہیں بھائی جی! یہ غنڈہ ٹیکس نہیں ہے، یہ تو پہلوانوں کا خرچہ ہے۔ یہ خرچہ دیتے ہوئے ہمیں کوئی سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں جب یہ لوگ اِدھر آئے تھے تو ماچھی نامی بدمعاش کا راج تھا پورے شکارپور پہ۔ وہ ہر دکان دار سے غنڈہ ٹیکس لیتا تھا پھر بھی ہمیں تنگ کرتا رہتا تھا۔ مار پیٹ، دھونس اور دھاندلی تو روز کا معمول تھا اس کا۔ کبھی کبھی کسی دُکان میں گھس کے پورا گلہ صاف کر جاتا تھا۔ بہت تنگ تھے جی ہم لوگ اس سے۔ پھر یہ جیلانی، اس کی بہن اور آبی پہلوان آ گئے یہاں۔ انھوں نے ماچھی اور اس کے آدمیوں کو مار مار کے نکال دیا شکارپور سے۔“

”اچھا! اس کے بعد یہ خود تم لوگوں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرنے لگے پہلوانوں کے خرچے کے نام پر؟“ میں نے کہا۔

”نہیں جی! آپ نے غلط سمجھا ہے۔ یہ تو جانا چاہتے تھے یہاں سے لیکن ہم لوگوں نے خود ہی روک لیا انھیں۔ ہمیں یہ ڈر تھا کہ ان کے جانے کے بعد ماچھی واپس آ کر بڑی تباہی پھیلائے گا شہر میں۔ ہم نے خود ہی انھیں پیش کش کی تھی کہ ان کا سارا خرچہ ہم لوگ برداشت کریں گے، بس یہ ہمارے کاروبار کی حفاظت کا ذمہ لے لیں۔ بڑی مشکلوں سے رُکنے کو تیار ہوئے تھے یہ۔“

فیض محمد نے عجیب ہی کہانی سُنائی تھی۔ اس کی باتیں سُن کر مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نادانستگی میں زیادتی کر بیٹھا اس نقلی آبی کے ساتھ، مگر اس میں میرا اتنا زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس نے جب آبی کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا تو میرے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ ان لوگوں نے میرے اور آبی کے نام سے فائدہ اٹھا کر اپنا بدمعاشی کا کاروبار جما رکھا ہے شکارپور میں۔ یہ جاننے کے بعد میری رگوں میں خون اُبلنے لگا تھا۔ کنپٹیاں جل اٹھی تھیں میری۔ کوئی اپنے اعمال کی سیاہی میرے منہ پر مل دے، یہ میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میرا اپنا اعمال نامہ ہی مجھے کیا کم خوار کر رہا تھا کہ اب میں دوسروں کے جرائم بھی اپنے حساب میں ڈلوا لیتا۔ میں نے کہا۔ ”تیری بات سمجھ میں نہیں آئی فیض محمد! اگر تیرا بیان درست مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے ساتھ بدمعاشوں کے انداز میں چھیڑ کیوں کی تھی؟ وہ نوٹ کیوں چھینا تھا تیرے ہاتھ سے؟“

”میرا خیال ہے پہلوان نے آپ لوگوں کو ماچھی کا بھیجا ہوا سمجھا ہو گا۔ وہ لوگ اب بھی کبھی کبھی آ کر ان سے اُلجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ موقع کی تاک میں ہیں، شکارپور والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے مجھ جیسے چھوٹے لوگوں کو اسی طرح رقمیں دیتے رہتے ہیں، جس طرح آپ نے مجھے کھانے کے چار گنا پیسے دیے تھے۔ بس اسی بات نے پہلوان کو مشکوک کر دیا تھا آپ کی طرف سے۔ آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے سائیں؟ یہ تو بہت تکلیف میں معلوم ہوتا ہے۔ ہڈی تو نہیں ٹوٹ گئی ہاتھ کی؟“

”نہیں میرے بھائی! ہڈی شڈی بالکل نہیں ٹوٹی ہے، بس ذرا جوڑ کھل گیا ہے کہنی کا۔“ میں نے اسے جواب دے کر آبی سے کہا ”لے بھئی پیرزادہ! یہ تو معاملہ ہی دوسرا نکل آیا ہے اب کیا کہتا ہے تُو؟ میرا تو خیال ہے مٹی ہی ڈال دیں اس قصے پر۔“

”نہیں یار! کیا کہہ رہا ہے تُو، یہ قصہ مٹی میں دبانے کے قابل تو نہیں ہے۔ اس کے کچھ سر پیر کا تو پتا کرنا چاہیے ہمیں۔“ آبی بولا۔

”خوامخواہ وقت برباد کرنے کا فائدہ کچھ نہیں ہے اور پھر ہمیں نقصان بھی کیا پہنچ رہا ہے اس سے؟“ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ابھی اگر نہیں پہنچ رہا ہے کوئی نقصان تو آگے چل کر کبھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات اگر عام ہو گئی، کچھ اور بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے تو ہم تو کہیں کے بھی نہیں رہیں گے یار! ذرا بات کو سمجھنے کی کوشش تو کر برادر! اس کی اہمیت کا اندازہ کر کچھ۔“

”ہاں یہ تو نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ مرض بڑھ گیا تو جان لے لے گا ہماری۔ اس کا علاج تو ضرور کرنا چاہیے۔“ میں نے آبی سے اتفاق کیا۔

شرافت علی بولا ”کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا اب تم اس کی مزید گوشمالی کرنے کا ارادہ کر رہے ہو؟ مگر اس سے کیا حاصل ہو گا تمھیں؟“

”اس کی گوشمالی سے تو واقعی ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا میرے بھائی! اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے بس۔ یہ ایک ڈوز ہی بہت دنوں تک یاد رہے گا اسے۔ آبی کا کہنا یہ ہے کہ چلتے چلتے ہم اس ذاتِ شریف سے بھی شرفِ ملاقات حاصل کرتے چلیں، جس کی پشت پناہی اسے حاصل ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں بھئی! وہ کون اللہ کا ایسا نیک بندہ ہے جو شکارپور والوں پر سایہ کیے بیٹھا ہے۔“ میں نے کہا۔

آبی نے اپنے ڈپلی کیٹ کے قریب جا کر کہا ”ہاں تو برادر! کیا تو ہماری آنکھوں کو غلام جیلانی کے دیدار کا شرف بخشنا پسند کرے گا؟“

اس نے آبی کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو تم لوگ مجھ سے؟ ذرا سیدھی سیدھی اُردو میں بات کرو۔“

”اچھا! ہماری زبان سمجھ میں نہیں آتی ہے تیرے؟ حالانکہ میں نے اُردو ہی میں کہا ہے، کسی اور زبان کا ٹانکا نہیں لگایا ہے۔ خیر تو اگر نہیں سمجھ سکا ہے تو آسان زبان میں یوں سمجھ لے کہ ہم تیرے یار غلام جیلانی سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے پاس لے چل۔“

”کیوں؟ کیوں ملنا چاہتے ہو تم جیلانی سے؟ میرے ساتھ یہ سلوک کرنے کے بعد تم سمجھتے ہو میں تمھارا تابعدار ہو گیا ہوں۔ تم جو کچھ کہو گے، میں بے چون و چرا مان لوں گا وہ سب کچھ۔ تم نے غلط اندازہ لگایا ہے میرے بارے میں۔“

”تو تو برادر! خوامخواہ ہی بُرا مان رہا ہے، حالانکہ ساری غلطی

تیری اپنی ہی تھی۔ تُو نے اگر وہ بدمعاشوں والا انداز اختیار نہیں کیا ہوتا تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی، بلکہ ہمیں یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ اس چھوٹے سے شہر شکارپور میں دو ایسے مشہور و معروف شخص بھی رہتے ہیں جن کے تذکرے ہم اکثر اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں، جیسے آئے تھے، ویسے ہی خاموشی سے گزر جاتے اس علاقے سے۔ اس اعتبار سے تو یہ ٹکراؤ سود مند ہی ہوا ہے ہمارے لیے۔ اب دل سے غبار دھو دے برادر۔"

"یہ اچھی بات کہی ہے تُو نے جوان! میرا ہاتھ اکھاڑ کے کہتا ہے یہ سُود مند ہوا ہے اور چاہتا یہ ہے کہ میں دل سے غبار دھو دوں۔"

"چھوڑ یار! دل میں جما کر بیٹھ گیا ہے تو تو اتنی سی بات کو۔ جوان مردوں والی باتیں کر بھائی۔ ایسی گرمی نرمی تو ہوتی ہی رہتی ہے اور یہ چھوٹی موٹی چوٹیں تو نوجوانوں کی ہمت اور حوصلے کے لیے مہمیز ہوتی ہیں۔ جینے کا قرینہ سکھاتی ہیں یہ۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "کمال ہے بھئی! تیری تو باتیں ہی عجیب ہیں یار! تُو بندہ کس قبیلے کا ہے؟"

میں نے نرمی سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تیرا میرا قبیلہ ایک ہی ہے۔ ہم قبیلہ ہیں ہم دونوں اور اپنوں کی کوئی بات دل میں نہیں رکھی جاتی۔ زیادہ کھڑ پینچ نہ ڈال یار جی! چل اُٹھ کر کھڑا ہو جا اب اور ہمیں اپنے یار کے پاس لے چل، اُٹھ میرا ویرا شاباش!"

فیض محمد نے بھی میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "چھوڑیں پہلوان جی! غصّہ تھوک دیں، بھلے لوگ لگتے ہیں یہ، ملا دیں انھیں غلام جیلانی سے، قدر داں ہیں یہاں کے۔ نام سنتے ہی کیسے بے چین ہو گئے ہیں ملنے کے لیے۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، چلو آؤ میرے ساتھ۔ مگر ایک بات سُن لو میری۔ اسے جب یہ معلوم ہو گا کہ تم نے میرا ہاتھ اکھاڑا ہے تو وہ تم تینوں کے ہاتھ کٹوا کے کتّوں کے آگے ڈلوا دے گا۔ نقصان پہنچانے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا ہے وہ۔"

"اچھا! ایسا منتقم مزاج آدمی بھی ہے وہ؟ چلو کوئی بات نہیں، اس سے ملنے کی یہ قیمت بھی دے دیں گے ہم اُسے۔"

وہ اُٹھ کر باہر جانے لگا تو آبی نے اُسے روک کر کہا۔ "جانے سے پہلے وہ نوٹ بھی دیتے چلو فیض محمد کو تاکہ یہ جھگڑا ختم ہی ہو جائے۔"

فیض محمد جلدی سے بولا۔ "نہیں جی! اس کی ضرورت نہیں ہے اس بات کو دوبارہ نہ اکھاڑیں آپ، رہنے دیں اسے۔"

"تُو چُپ رہ فیض محمد! یہ ہمارا اُصول ہے، ہم جب جھگڑا ختم کرتے ہیں کسی سے تو اس کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکتے ہیں۔" آبی نے کہا۔

"لیکن ہمارا بھی ایک اُصول ہے۔ ہم جب تک اپنے اوپر ہاتھ اٹھانے والے کو ہاتھوں سے محروم نہیں کر دیتے، چھوڑتے نہیں ہیں اُسے۔" نقلی آبی نے نفرت سے کہا اور سو کا نوٹ نکال کر فیض محمد کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "اسے رکھ لے فیض محمد! تجھ سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

فیض محمد نے جلدی سے جھک کر نوٹ اٹھا لیا اور خوشی سے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی مرضی ہے سائیں! آپ خوشی سے دیتے ہیں تو میں رکھ لیتا ہوں خوشی کے ساتھ۔ ناراض نہیں کروں گا میں آپ کو اور ان بھلے لوگوں کو معاف کر دیں سائیں! آپ تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"چُپ ہو جا! جس بات سے تیرا واسطہ نہ ہو، اس میں ٹانگ نہ اَڑایا کر اپنی۔ پچھتائے گا کسی دن بہت۔" وہ ڈانٹتے ہوئے بولا۔

ہم سب فیض محمد کے ہوٹل سے نکل کر ڈپلی کیٹ آبی کی قیادت میں ایک طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ اُسے ہم نے اپنے درمیان لے لیا تھا۔ وہ اپنے صحیح سلامت ہاتھ سے اُکھڑے ہوئے ہاتھ کو یوں سہارا دیے چل رہا تھا کہ چلتے ہوئے اس ہاتھ کو ٹھیس نہ پہنچے۔ کوئی دس منٹ بعد وہ ہمیں لیے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں دونوں طرف دو دو، تین تین منزلہ مکان تھے جنھیں سُرخ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ گلی کا فرش بھی انھی اینٹوں سے پختہ کیا گیا تھا، گلی کے دونوں طرف مکانوں کی دیواروں کے بالکل ساتھ گندے پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں بنائی گئی تھیں۔ پوری گلی نہایت صاف سُتھری نظر آ رہی تھی، کوڑے، کچرے یا گندگی کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ گلی کے اندر غالباً ساتویں یا آٹھویں مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازے کا کُنڈا کھٹکا دیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دروازہ کُھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک نہایت ہی فربہ اور ضعیف العمر شخص تھا۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا اور بدن کی کھال کسی بوڑھے اور کمزور ہاتھی کی کھال کی طرح لٹکی ہوئی تھی۔ کبھی اس کے جسم پر اتنا گوشت رہا ہو گا کہ وہ شخص گوشت کا پہاڑ معلوم ہوتا ہو گا۔ یقیناً وہ اپنے زمانے میں پہلوانی کرتا رہا ہو گا اور جس ڈیل ڈول کا وہ مالک تھا، اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہ تھا کہ اس نے بڑے بڑے شہ زوروں کی پُشت زمین سے لگا دی ہو گی، بڑا نام کمایا ہو گا اپنے وقت میں، لیکن اب تو اس کے جسم و جان کی شاندار عمارت ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے ضعف سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے بھئی! کیا بات ہے؟"

ڈپلی کیٹ آبی نے آگے بڑھ کر دروازے میں قدم دھرتے ہوئے کہا۔ "یہ میں ہوں بابا جی۔ جیلانی تو اندر ہی ہے نا؟"

"ہاں ہاں... پُتر آبی! تو اتنی جلدی کیسے مڑ آیا، خرچہ وصول ہو گیا ہے کیا...؟"

وہ بابا جی کی بات کاٹ کر بولا۔ "یہ کچھ پرونے آئے ہیں بابا جی! جیلانی سے ملنا چاہتے ہیں یہ۔" پھر وہ ہم سے بولا۔ "آ جاؤ۔ آ اندر آ جاؤ، جیلانی اندر موجود ہے۔ بابا جی کے ساتھ چلو تم لوگ، یہ اُدھر بیٹھک میں لے جا کر بٹھلائے گا تمھیں۔ میں جیلانی کو بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ اندر چلا گیا۔ ہم تینوں بابا جی کے پیچھے ہو لیے۔ اُس نے ہمیں ایک کشادہ اور صاف ستھرے کمرے میں پہنچایا اور بولا۔ "اِدھر بیٹھو جوانو! اور یہ بتاؤ کچھ کھانے پینے کی حاجت تو نہیں ہے؟ اگر ہو تو بے جھجک بول دو، اپنا ہی گھر سمجھو اسے بھی۔"

آبی بولا۔ "نہ بابا جی! مہربانی ہے آپ کی۔ ہم ابھی کھا پی کر ہی آئے ہیں اِدھر۔ آپ تکلیف نہ کریں کوئی۔"

"مہمانوں کی آؤ بھگت میں تکلیف! کیسی بات کرتا ہے تُو جوان؟ مہمان تو رحمت ہوتے ہیں رب کی۔ انھیں زحمت سمجھنے والے بڑے بدنصیب ہوتے ہیں بچّے! کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟ اس شہر کے تو نہیں لگتے ہو مجھے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے بابا جی! کراچی سے آئے ہیں ہم۔ ہمیں پہلے پتا ہوتا کہ اس شہر میں غلام جیلانی بھی آ بسا ہے تو ہم کہیں اور جانے کے بجائے اِدھر ہی آتے اور آپ کو مہمان نوازی کا موقع ضرور دیتے۔" میں نے رسانیت سے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تم لوگ بیٹھو اِدھر، کوئی ضرورت ہو تو آواز دے کر بلا لینا مجھے۔" یہ کہہ کر وہ دائیں طرف ایک دروازے میں چلا گیا۔

وہ کمرہ جس میں وہ ہمیں پہنچا گیا تھا، اتنا بڑا تھا کہ اس میں پچاس آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ پورے کمرے میں سفید بے داغ چاندنی کا فرش بچھا تھا اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہم اندر داخل ہو کر بیٹھنے کے لیے جگہ کا انتخاب ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر آہٹ سُن کر اُدھر مڑ گئے۔ وہ ڈپلی کیٹ آبی دروازے کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "یہ ہیں وہ تینوں رُستم کے بیٹے، جنھوں نے میرا ہاتھ اکھاڑا ہے۔ تینوں نے مل کے بے بس کر دیا تھا مجھے، ورنہ ایک اکیلا تو ٹک کے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا میرے سامنے۔"

وہ کہہ رہا تھا اور میں آنکھیں پھاڑے اُس شخص کو دیکھ رہا تھا جس سے وہ مخاطب تھا۔ وہ حیران حیران دروازے میں کھڑا ہی رہ گیا تھا، اس کی نظریں کبھی آبی پر جا ٹکتی تھیں اور کبھی مجھ پر۔ ہم تینوں ہی کے لیے یہ لمحہ نہایت حیران کن تھا۔ اس نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا ہو گا کہ گردشِ زمانہ کسی روز ہمیں یوں اس کے روبرو لا کھڑا کرے گی اور نہ ہی مجھے یا آبی کو یہ گمان ہوا تھا کہ اس سے ہماری اگلی ملاقات اس طرح ہو گی۔ چند ثانیے ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد آبی حیرت میں ڈوبی آواز میں بولا۔ "اوئے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں کہیں؟ یہ تُو ہی ہے نا جمیل؟"

ہاں وہ جمیل ہی تھا، آبی کا دوست جمیل، وہی پاکستان اور بھارت کی سرحد پر واقع گاؤں 'ابری' میں زرگری کی آڑ میں اسمگلنگ کرنے والا جمیل، جس کے گھر میں ہم نے اس وقت پناہ لی تھی جب میں اور آبی ڈھلوں صاحب مرحوم کو تلاش کرنے کے لیے بھارت کی سرحد میں گھسنا چاہتے تھے، اس جمیل نے بڑا ساتھ دیا تھا اس وقت ہمارا۔ وہ ایک دم تیزی کے ساتھ آبی کی طرف لپکا اور قریب جا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "اوئے میرے یار! میرے بھائی! آبی! تو کہاں تھا یار جی! اور کدھر بھٹکتا بھٹکتا اِدھر آ نکلا ہے تُو؟"

وہ ڈپلی کیٹ آبی جو اب تک جمیل کی گرم جوشی پر ہی حیرت زدہ ہو رہا تھا، اس کی زبانی آبی کا نام سُن کر بُری طرح چونک اٹھا تھا۔ اُس کے تصوّر میں بھی نہیں ہو گا کہ جسے وہ کچھ دیر پہلے تک دھمکیاں دیتا رہا تھا، وہ اجنبی دراصل وہی شخص ہے جس کے نام پر وہ شکارپور میں سر اٹھا کر چلتا رہا ہے۔ چند لمحے آبی سے بغل گیر رہنے کے بعد جمیل میری طرف بڑھا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "وہیں رُک جا جمیل! میرے قریب آنے سے پہلے یہ بتا دے مجھے کہ تُو نے یہاں اپنی دُکان چمکانے کے لیے ہمارا نام کیوں استعمال کیا ہے؟ ہماری رُسوائی کا سبب کیوں بنا ہے تُو؟"

وہ میری طرف بڑھتے بڑھتے رُک کر کھڑا ہو گیا اور شرمندگی کے عالم میں مجھ سے نظریں چُراتے ہوئے بولا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں جیلانی! یہاں اچانک حالات ایسے پیش آ گئے تھے کہ مجھے نہایت عجلت میں یہ فیصلہ کرنا پڑ گیا۔ تم یقین کرو برادر! میرا ارادہ مستقل طور پر اس نام کو استعمال کرنے کا بالکل نہیں تھا مگر ایک بار یہ نام استعمال کرنے کے بعد میں اس کی اردب میں ایسا پھنسا کہ پھر نکل ہی نہیں سکا۔"

آبی نے چونک کر اُسے دیکھا اور بولا۔ "اوئے ذلیل آدمی! تو یہ تُو ہے جو یہاں غلام جیلانی بنا بیٹھا ہے، یہ صلہ دیا ہے تُو نے ہمیں یاری کا؟"

"میں نے کہا نا، بس حالات نے مجبور کر دیا تھا مجھے اور پھر یہ بھی اعتماد تھا کہ تم میری اس جسارت کا زیادہ بُرا نہیں مناؤ گے۔" وہ بولا۔

"یہ کیسے سمجھ لیا تھا تُو نے؟ کیا تیرے خیال میں ہم ایسے ہی اُلّو کی دُم ہیں کہ جس کا بھی جی چاہے ہمارے نام سے اپنی بدمعاشی کی دُکان سجا کے بیٹھ جائے۔ ہم تو زمین تنگ کر دیں گے ایسے

آدمی پر، سمجھا کیا ہے تُو نے ہمیں ؟" آبی غضب ناک ہو کر اُس کی طرف بڑھا۔

میں نے آواز دے کر کہا "ٹھہر جا آبی ! جلد بازی سے کام نہ لے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑ جائے۔ اس کی بات سُن لیں پہلے اسے صفائی پیش کرنے کا موقع ضرور ملنا چاہیے۔ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے منہ کھولنے کی مہلت بھی نہ دیتا۔ ارادہ یہی تھا میرا کہ سامنا ہوتے ہی گردن جھٹک دوں گا اس جعل ساز کی، جس نے ہمارے چہرے پر سیاہی ملنے کی جسارت کی ہے لیکن اسے دیکھ لینے کے بعد میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے کبھی ہمارے ساتھ بھلائی کی تھی، کام آیا تھا یہ ہمارے۔ چنانچہ ایسے آدمی کو صفائی پیش کرنے کا موقع تو ضرور دینا چاہیے۔ اس کی مجبوری کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے ہم اس کے بارے میں۔"

آبی جھنجلا کر بولا "ایک تو یہ تیری صلح پسندی مصیبت بننے لگی ہے میرے لیے۔ پتا نہیں کہاں سے یہ روگ لگا لایا ہے تو۔ نہ وقت دیکھتا ہے نہ موقع دیکھتا ہے، بس مصلحتوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں، اتنا وقت ہے تیرے پاس جسے تحقیق و تفتیش میں گنوا سکے تو ؟"

"دھیرج سے کام لے یار ! غصہ نہ کھا خواہ مخواہ۔ کسی کے بارے میں کوئی خطرناک فیصلہ کرتے وقت اس سے اپنے تعلق کو بالکل ہی فراموش نہیں کر دینا چاہیے۔ اپنوں کے بارے میں غلط فیصلے خون رُلا دیتے ہیں کبھی کبھی۔" میں نے آبی کو سمجھایا۔

شرافت علی جو اس نئی صورت حال پر حیران ہو رہا تھا بولا۔

"یہ اگر تمھارا کوئی پُرانا شناسا ہے تو اس کے بارے میں یوں آنکھ بند کر کے قدم اٹھانا ٹھیک نہیں ہے آبی ! جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرو۔ اُسے بتلانے دو کہ اُس نے ایسا کیوں کیا ہے ؟"

جمیل بولا "میں تمھارا مجرم ضرور ہوں آبی ! لیکن یقین کرو میں نے ایسا کوئی کام تمھارے نام سے نہیں کیا ہے جس پر تمھیں شرمندہ ہونا پڑے کسی کے سامنے یا جس کی وجہ سے تمھارے نام سے نفرت کرنے لگیں دوسرے لوگ۔ یہاں لوگ آبی اور جیلانی کی بے حد عزت کرتے ہیں، تمھیں نجات دہندہ سمجھتے ہیں اپنا اور صرف تمھارے نام پر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو، یہ منظر دیکھ چکا ہوں میں ابھی تھوڑی دیر پہلے، ریلوے اسٹیشن کے قریب۔" میں نے کہا "اسی لیے تیرے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا ہے میں نے اور تیری بات سُننے کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔ اب تو سب کچھ سچ سچ بتا دے ہمیں۔"

"جھوٹ بولنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے، میں سب کچھ سچ سچ ہی بتاؤں گا، مگر تم لوگ آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔ آؤ ادھر بیٹھو، کھڑے کیوں ہو، اپنا گھر سمجھو یار ! ویسے بھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے تمھارا ہی ہے۔ تمھارے ہی نام پر یہاں تک پہنچا ہے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ آؤ، اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔ اور ذرا پانی منگواؤ، خوب ٹھنڈا ٹھار میرے اور آبی کے لیے۔"

"ابھی لو جی، پانی کیا بوتلیں نہ منگوا لوں، برف کی لگی ہوئی، برف جیسی ٹھنڈی، تاکہ آبی کے دماغ کی گرمی دور ہو جائے اور یہ ہماری باتیں توجہ سے ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ سُن کر سمجھ بھی سکے۔ ابھی تو کوئی بات سمجھ میں مشکل ہی سے آئے گی اس کے۔"

"بک نہیں اوئے سالے چیچک زدہ ! زیادہ بکواس کرے گا تو یہ نقش و نگار اور بھی ابھار دوں گا تیرے چہرے کے۔" آبی بھڑک کر بولا۔

"نہ نہ یار ! ایسا نہ کرنا۔ بس یہ دو عیب ہی اگر نہ ہوتے تو میں تو وہ سُنبلہ بہن بن کر نہ رہ جاتی میری۔" جمیل بولا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے بھئی، وہ سُنبلہ ابھی ہے تیرے ہی پاس ؟ اگر یہ بہن والا کیا چکر ہے کچھ بتا تو ؟" میں نے کہا۔

"بتا دوں گا یہ بھی، پہلے اپنے دلوں کے غبار صاف کر لو تو دونوں۔" پھر اُس نے ڈبلی کیٹ آبی سے کہا "بھائی فیدے پہلوان ! جا ذرا، بابا جی سے ٹھنڈی بوتلیں لانے کو تو کہہ دے، کہنا بالکل برف جیسی ہوں۔ ایک دم ٹھنڈی ٹھار، اور دیکھ تو ادھر پہلوان کے پاس چلا جا، اپنی یہ کُہنی سِکھوا لے جا کر اس سے اورم بڑھنے لگا ہے اس پر، زیادہ سوجن چڑھ گئی تو جوڑ مشکل سے بیٹھے گا۔"

وہ ابھی تک دروازے ہی میں کھڑا اُلّو کی طرح دیدے نچا نچا کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ جمیل کی بات سُن کر پیچھے مڑتے ہوئے بولا "اچھا جی ! میں ابھی کہہ دیتا ہوں بابا جی سے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

میں نے اس کے جانے کے بعد جمیل سے کہا "ہاں بھئی اب بتا کیا قصہ ہے ؟ یہ سوانگ کیوں رچایا ہے تو نے ؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "میرا خیال ہے سب بات شروع ہی سے سنانا چاہیے۔ درمیان سے پوری بات سمجھ آئے گی تمھارے۔"

"جہاں سے تیرا دل چاہے سُنا دے۔ ہم کوئی اعتراض نہیں کریں گے جو بات سمجھ نہیں آئے گی اُسے پوچھ لیں گے تجھ سے۔"

"وہ قصہ یوں ہے جی کہ یہ تو تم کو پتا ہی ہے کہ میں ادھر ابھی، میں زرگر کا کام کیا کرتا تھا لیکن اصل میں میرا کام دو نمبر تھا۔ انڈین بارڈر بار بار عبور کرنا کوئی کھیل تو نہیں ہوتا بچوں کا، بارڈر کے محافظوں کو ملا کر رکھنا پڑتا ہے اپنے ساتھ، تبھی آدمی یہ دھندہ کر سکتا ہے۔ میری بھی اچھی خاصی یاد اللہ تھی ان کے ساتھ۔ بڑا معقول حصہ دیتا تھا میں اُنھیں، پھر بھی آنکھیں دکھاتے رہتے تھے وہ، جس کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ اُدھر سرحد پار سے بھی اکثر لوگ آتے رہتے تھے مال لے کے میرے پاس۔ ایسے دو آدمیوں کی تلاش میں تمھاری موجودگی میں بھی ایک بار چھاپا ڈالنے آ گئے تھے سرحدی چوکیدار۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایسا بھی ہوتا ہی رہتا تھا کبھی کبھی۔ ہم لوگ معمولات ہی میں شمار کرتے تھے ایسے واقعات کو بھی۔ مگر ایک رات اُدھر سے آنے والے دو سکھوں کی وجہ سے زبردست گڑبڑ ہو گئی۔ انھوں نے حصہ دیے بغیر ہی محافظوں کو چکر دے کر نکلنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے خوب گولیاں چلیں اور دو محافظ اُن کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس واقعے نے محافظوں کو مشتعل کر دیا۔ اُنھوں نے سرحد کی نگرانی اس قدر سخت کر دی کہ کسی چڑیا کے بچے کے لیے بھی سرحد پار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ سرحدی دیہات میں جو لوگ اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے، انھوں نے ان کی پکڑ دھکڑ بھی شروع کر دی۔ ایسے لوگ ان سے پوشیدہ تو نہیں رہتے۔ ایک ایک آدمی کا پتا ٹھکانا جانتے تھے وہ۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنا اثاثہ اور سنبلہ کو ساتھ لے کر ابری سے لاہور آ گیا لیکن اُنھوں نے لاہور میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تو میں نے سمجھ لیا کہ پنجاب میں یہ لوگ کہیں بھی ہمیں چین نہیں لینے دیں گے۔ یوں بھی میں سُنبلہ کو ملتان سے ورغلا کر لایا تھا جس کی وجہ سے پنجاب کے بڑے شہروں سے دور ہی دور رہتا تھا۔ چھوٹی جگہوں پر رہنا تو ایک اجنبی کی حیثیت سے جلدی لوگوں کی نظروں میں آ جاتا۔ لہٰذا میں نے سنبلہ کے مشورے سے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لاکھوں کی آبادی کے میلوں پھیلے ہوئے اس پُر ہنگام شہر میں سُنا ہے کسی کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ لوگ اپنے پڑوسیوں سے بھی بہت کم ہی واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم لاہور سے روانہ ہو کر بچتے بچاتے نکل کر شکارپور تک آ گئے۔ یہ فیدا اُدھر ابری میں ہی ملا تھا مجھے۔ اور بہت جلدی ہم بہت گہرے یار بن گئے تھے۔ آدمی بڑا مخلص اور یاروں کا یار ہے۔ میرے کاروبار میں بھی شریک رہا ہے اور ابری سے میرے ساتھ ہی آ گیا تھا۔ شکارپور میں ایک بڑا بدمعاش تھا، ماچھی نام تھا اُس کا۔ کراچی کے سفر کے دوران ریل میں اس کے ایک آدمی سے یہ جھگڑ بیٹھا تھا اور اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی اس کی۔ اس نے اسے چیلنج کر دیا شکارپور میں دوبارہ مقابلہ کرنے کا۔ کہا یہ تھا اس نے کہ ریل میں دھوکے سے مار کھا گیا ہے وہ، فیدے جیسے دس بھی اسے زیر نہیں کر سکتے اور فیدا اگر واقعی جواں مرد ہے تو اس کے ساتھ شکارپور چلے جہاں اپنی چوٹوں کا علاج کرانے کے بعد اس سے وہ دوبارہ مقابلہ کرے گا اور اگر اس مقابلے میں فیدے نے اُسے مغلوب کر لیا تو وہ فیدے کو بیس ہزار روپے دے گا۔ روپیہ فیدے کی بڑی کمزوری ہے۔ بیس ہزار کے لیے وہ شکارپور کیا جہنم میں بھی جانے کو تیار ہو جاتا۔ ہمارے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ نہیں مانا اور شکارپور آنے کو تیار ہو گیا۔ مجبوراً ہمیں بھی اس کے ساتھ آنا پڑا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ وہ ماچھی بدمعاش کے گروہ کا آدمی تھا اور بیس ہزار روپے کا لالچ دے کر فیدے کو اس لیے یہاں لایا تھا کہ ماچھی اس سے انتقام لے سکے۔ ہم جس رات یہاں پہنچے تھے اس کے دوسرے ہی روز ماچھی دو آدمیوں کے ساتھ اس سرائے میں آ پہنچا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس روز ماچھی سے ہمارا زبردست مقابلہ ہوا اور اس مقابلے کے دوران ہی مجھ پر یہ عقدہ کُھلا کہ سنبلہ لڑائی کے فن میں خوب طاق ہے۔ اس نے ماچھی جیسے بدمعاش کو صرف گردن پکڑ کر لمحوں میں بے ہوش کر ڈالا تھا۔ اس کی گرفت ایسی زبردست ہوتی ہے کہ جس کی گردن پر ایک بار ہاتھ ڈال دیتی ہے، وہ کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے بے سُدھ ہو جاتا ہے بس اس کے اسی کمال کی وجہ سے ہم نے ماچھی کا شکارپور میں رہنا مشکل کر دیا۔ اسی دوران ہم نے ماچھی اور اس کے ساتھیوں پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے اپنے آپ کو جیلانی اور آبی کی حیثیت سے متعارف کرانا شروع کر دیا۔ تم دونوں کی شہرت اور ناموری نے بڑا اثر دکھایا۔ ماچھی نے ہمیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے بڑی بڑی پیش کشیں کرنا شروع کر دیں۔ ہمیں اس دوران یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں کے لوگ اس گروہ کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے ہیں۔ ماچھی اور اس کے آدمیوں نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے ان کے لیے۔ خصوصاً تاجر برادری تو بہت ہی تنگ تھی ان سے۔ ان کے چار آدمی ہمارے پاس آئے اور اُنھوں نے ہمیں یہ پیش کش کی کہ اگر ہم ماچھی کے ظلم و تشدد سے اُنھیں نجات دلا دیں تو وہ ہمیں پچاس ہزار روپے دینے کو تیار ہیں۔ تم جانتے ہو جیلانی ! میں کوئی نیکوکار آدمی تو ہوں نہیں۔ میں تو ماچھی کی پیش کش بھی قبول کر لینے کے بارے میں غور کرنے لگا تھا۔ ہم لاہور سے نکلے ہی اس غرض سے تھے کہ اپنے لیے مناسب آمدنی کا کوئی ذریعہ اور ایک ایسی پناہ گاہ تلاش کریں جہاں یہ بُرا وقت سکون سے گزار سکیں۔ ماچھی کے پاس ہمیں یہ دونوں چیزیں مل رہی تھیں مگر جب تاجروں کی طرف سے پچاس ہزار روپے کی پیش کش ہوئی تو میں نے سوچا اتنی بڑی رقم کمانے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ آدمی کے پاس پیسے کی کمی نہ ہو، سر چھپانے کی جگہ تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ بس یہی سوچ کر ہم نے ماچھی پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے نتیجتاً وہ شکارپور سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ شکارپور سے نکل کر

ابھی تک کہیں پرچم نہیں سکے ہیں اس کے۔ ادھر آس پاس گڑھی یاسین، حبیب کوٹ، رستم اور لاکھی وغیرہ میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اس علاقے میں پہلے ہی بڑے بڑے خونخوار لوگ موجود ہیں۔ ان کے سامنے ماچھی کی حیثیت ہی کیا ہے۔ اتنا ہی دم ہوتا اس میں تو یہاں سے کیوں بھاگتا وہ۔"

"اس کے جانے کے بعد تم نے جگہ سنبھال لی اس کی اور پہلوانوں کے خرچ کے نام پر غنڈہ ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ماچھی کو بھگانے کے بعد یہاں کے لوگوں نے ہمیں ستر ہزار روپے دیے تھے، حالانکہ انھوں نے وعدہ پچاس ہزار کا کیا تھا مگر جب وہ پیسہ جمع کرنے نکلے تو ان کے پاس ستر ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ انھوں نے وہ سارا کا سارا لا کر میرے سامنے ڈال دیا۔ مجھے جب پتا چلا کہ وہ پچاس ہزار کے بجائے ستر ہزار روپے لے آئے ہیں تو میں نے اپنے کاروباری اصول کے تحت زیادہ رقم انھیں واپس کرنا چاہی۔ انھوں نے وہ رقم واپس نہیں لی اور میری اس بات سے اتنے متاثر ہوئے کہ ہمیں یہیں رہ جانے پر مجبور کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا اگر ہم چلے گئے تو ماچھی دوبارہ یہاں آجائے گا اور اس مرتبہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پریشان کرے گا ان لوگوں کو۔ ان کی یہ بات نہایت مناسب تھی۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ ہمارے شکارپور سے جاتے ہی ماچھی واپس آجائے گا، چنانچہ میں نے یہیں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں رکنے میں میرے لیے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، ویسے یہ بھی سوچ لیا تھا میں نے کہ اگر کسی وقت خطرہ محسوس کیا میں نے تو فوراً کراچی کے لیے کوچ کر جاؤں گا مگر رب کی مہربانی سے اب تک اس کی نوبت نہیں آسکی ہے۔ یہاں کے لوگ ہمارا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ رہنے کے لیے شاندار مکان دے رکھا ہے انھوں نے ہمیں۔ اور ضرورت کی ہر چیز وہ خود پہنچا جاتے ہیں۔ یہ باباجی کبھی بڑا مشہور پہلوان ہوا کرتا تھا۔ اب اپنی عمر کے آخری دن گزارنے یہاں چلا آیا ہے اور یہاں کے نوجوانوں کو پہلوانی کا فن سکھا رہا ہے تاکہ وہ لوگ غنڈوں اور بدمعاشوں سے اپنے علاقے کا تحفظ کر سکیں۔ ماچھی نے اپنے زمانے میں اسے بھی بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ یہاں آنے والوں کو مارتا پیٹتا رہتا تھا جس کی وجہ سے کوئی ٹکنے نہیں پاتا تھا یہاں۔ اب میں نے انہیں موقع دیا ہے کہ وہ باباجی سے کچھ سیکھ کے کسی قابل بن جائیں۔ یہ اپنا نیدا بھی شاگرد ہو گیا ہے باباجی کا۔ شہر کے دکان دار یہاں پہلوانی سیکھنے کے لیے آنے والے جوانوں کا سارا خرچ اٹھاتے ہیں۔ ہر دکان دار پہلوانوں کے خرچ کے لیے حسب حیثیت جو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی پر کوئی زور زبردستی نہیں کی جاتی، نہ کوئی رقم مقرر کی گئی ہے۔ اس مد میں جو کچھ بھی وصول ہوتا ہے، ان ہی جوانوں پر خرچ کر دیا جاتا ہے جو باباجی سے پہلوانی سیکھنے آتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ جیلانی! اس میں تمھاری نیک نامی ہے یا رسوائی؟"

"یہ تو نیک نامی ہی کا کام ہے مگر یہ بس اتفاقی طور پر ہو گیا ہے سب کچھ۔ تم نے جب ہمارا نام استعمال کرنا شروع کیا تھا، اس وقت تمھارے ارادے نیک نہیں تھے۔ تم نے شاید یہ سوچ رکھا تھا کہ ماچھی کو میرے نام سے خوف زدہ کرکے میدان خالی کرا لینے کے بعد تم خود اپنی چودھراہٹ قائم کر لو گے۔ اس طرح تمھیں ایک معقول آمدنی اور بہترین پناہ گاہ مل سکتی تھی۔"

اس دوران ایک لڑکا ٹھنڈی بوتلیں لا کر ہمیں پکڑا گیا تھا۔ وہ بوتل سے ٹھنڈے مشروب کے چند گھونٹ لے کر بولا "یہ جو ساری صورتِ حال میں نے تمھارے سامنے رکھ دی ہے، جو حالات پیش آئے تھے اس کی ایک ایک تفصیل بیان کر دی ہے۔ اب بھی اگر تمھارا اطمینان نہیں ہو سکا ہے تو تم جو سزا چاہو مجھے دے سکتے ہو، میں تیار ہوں اس کے لیے لیکن تمھیں واسطہ ہے سوہنے رب کا، میری نیت پر شبہ نہ کرو یار! میں یاروں کے بارے میں کوئی برا خیال نہیں لا سکتا دل میں۔"

شرافت علی بولا "جیلانی! اس کی باتوں میں سچائی ہے۔ میرا خیال ہے درگزر سے کام لینا چاہیے تمھیں۔ یوں بھی یہ تمھارا دوست ہے، اتنا حق تو اسے حاصل ہے کہ نازک وقت میں دوستوں کو آواز دے۔ اگر وہ قریب نہ ہوں تو ان کے نام سے فائدہ اٹھالے۔"

"اوئے شرافت علی! اس کی باتوں میں آ گیا ہے تو، پتا نہیں ہے ابھی تجھے کچھ اس کے بارے، بڑا خبیث آدمی ہے یہ۔" آبی شرارت سے بولا۔

"اوئے آبی! یہ تو کہہ رہا ہے میرے بارے میں؟ میں نے کیا خیانت کی ہے تیرے ساتھ؟" جمیل حیرانی سے بولا۔

وہ آبی کی زبان سے اپنے بارے میں ایسے ریمارکس سن کر گھبرا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ اسے پوری طرح یقین تھا کہ اس کی روداد سن کر میں اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکوں گا۔ اسی یقین کے ساتھ اس نے اپنی صفائی میں اتنی لمبی داستان سنائی تھی لیکن آبی کے یہ چند الفاظ اس کے اثرات کو زائل کر سکتے تھے، چنانچہ اس کا گھبرا جانا فطری تھا۔ میں نے اسے زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شرافت علی نے درست ہی کہا تھا کہ برے وقت، مشکل گھڑی میں اسے ہمارا نام استعمال کرنے کا حق حاصل تھا، کر کے اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور پھر اس کے اس عمل سے ہمیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا تھا۔ لہٰذا میں نے آبی کو ڈانٹ کے انداز میں کہا۔

"بک نہیں اوئے آبی شتابی! یاروں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں نکالنا چاہیے تجھے۔ شرافت علی ٹھیک کہتا ہے۔" پھر میں نے جمیل سے کہا "اور وہ سنبلہ کا قصہ کیا ہے۔ وہ تو بیوی تھی نا تیری! پھر اب بہن کیسے بن گئی ہے وہ؟"

"بس یار! اس عورت ذات کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ کب کیا سے کیا بن جائے۔ بیوی تو وہ کبھی بننے کو تیار ہی نہیں ہوئی میری۔ حالانکہ ملتان میں بڑی محبت بھری باتیں کیا کرتی تھی مگر جب میں اسے وہاں سے نکال لایا تو نکاح کرنے پر راضی ہی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی، پہلے میں کم از کم میٹرک کر لوں۔ اب یار! یہ عمر میری ایسی ہے کہ اسکول میں داخلہ لے لوں میں؟ اور وہ اس کے بغیر کسی طرح مانتی نہیں تھی۔"

"اور تو ایسا ذلیل آدمی ہے کہ بغیر نکاح کے ہی اسے بیوی ظاہر کرتا رہا لوگوں کے سامنے۔" آبی نے کہا۔

"صرف ظاہر ہی کرتا تھا، سمجھا تو نہیں تھا نا کبھی ایسا۔ آخر کسی آبادی کے درمیان ایک جوان لڑکی کے ساتھ رہنے کے لیے اس سے کوئی ایسا رشتہ بھی تو ہونا چاہیے جس کی بنا پر لوگ انھیں ساتھ رہنے کا حق دے سکیں۔ اس کے بغیر ہم رہ کہاں سکتے تھے ایک ساتھ؟"

"یہ کوئی ضروری تھا کہ تم لوگوں کے سامنے اسے بیوی ہی ظاہر کرو، بہن بھی تو بتا سکتے تھے اسے اپنی!"

"ہاں بتا سکتا تھا لیکن اگر وہ مجھ سے نکاح کر ہی لیتی، تب پھر میں کیا کہتا لوگوں سے۔ یہ کہ میں نے بہن کو بیوی بنا لیا ہے؟ اوئے کچھ تو سوچ سمجھ لیا کر یار بولنے سے پہلے۔ کیا بالکل ہی بھوسا بھرا ہوا ہے کھوپڑی میں تیری۔" جمیل آبی کا مذاق اڑانے لگا تھا۔

مجھے بھی ہنسی آگئی تھی آبی کی اس بات پر۔ میں نے کہا "یار آبی! پنڈی جیل میں تشدد کے دوران تیرے سر کے اندرونی حصے میں کوئی شدید چوٹ آگئی ہے، معلوم ہوتا ہے اسی ضربِ شدید کی وجہ سے تو کبھی کبھی بہکنے لگتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ بکواس نہیں کر سالے! پتا ہے تیری دماغی حالت کا مجھے۔ جانتا ہوں کتنا فرزانہ ہے تو۔" آبی خجل ہو کر بولا۔

میں نے جمیل سے کہا "پھر کیا ہوا یار! تو بتا مجھے، لعنت بھیج اس کی بکواس پر۔"

وہ بولا "میں اسے دلاسے دیتا رہا کہ جلد ہی میٹرک کر لوں گا۔ خیال میرا یہ تھا کہ جب یہ اپنے والدین کو چھوڑ کر میرے ساتھ اپنے گھر سے نکل ہی آئی ہے تو اب جائے گی کہاں۔ تنگ آ کر ایک دن اپنی شرطوں سے خود ہی دستبردار ہو کر نکاح کے لیے رضامند ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے کبھی اسے مجبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اسے سچ مچ دل و جان سے چاہتا تھا، اس لیے کسی بھی صورت میں اس کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتا تھا، اس پر جبر تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا، چنانچہ ابری میں ہم اسی طرح رہتے رہے لیکن جب یہاں شکارپور میں آ کر آباد ہوئے تو اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ مجھے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ یہاں میں اسے لوگوں کے سامنے بیوی کے بجائے بہن ظاہر کروں۔"

"اچھا! کمال ہے تجھ جیسے گھاگ آدمی کو بھی چکر دے دیا اس نے! ایسا کیسے کر لیا بھئی؟ بڑی چلتر باز لگتی ہے وہ تو مجھے؟" آبی سے خاموش نہیں رہا گیا، وہ پھر درمیان میں بول پڑا تھا۔

"تو نے کسی سے محبت نہیں کی بیٹے! محبت کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ چالاک ترین آدمی بھی ایک بھولی بھالی معصوم صورت لڑکی سے کس طرح الو بن جاتا ہے۔ عشق میں آدمی کی عقل گھاس کھانے لگتی ہے بچے!" جمیل بولا۔

"تم نے اسے سمجھایا نہیں کہ بہن بھائی ظاہر کرنے کے بعد ہم لوگ نکاح کس طرح کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"کہا تھا میں نے اس سے یہ سب کچھ اور اس کا جو اس نے جواب دیا تھا، اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔"

"ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے جس نے تجھے لاجواب کر کے رکھ دیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا میرے سامنے، صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی ہے کبھی۔ اس نے اپنے لیے جیسے جیون ساتھی کے خواب دیکھے ہیں، ان میں کسی جگہ بھی میں فٹ نہیں ہوتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اچھا! حیرت ہے یار! ایسا کہہ دیا اس نے۔ پھر وہ تیرے ساتھ گھر سے کیوں بھاگ آئی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ اپنی سوتیلی ماں کے مظالم سے بہت پریشان تھی اور ان پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھ سے دوستی بڑھائی تھی۔ اس کی بات بھی غلط نہیں ہے یار، میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی کبھی، سوچا ہی نہیں تھا کبھی کہ آخر وہ میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے کیوں نہیں کہتی ہے۔ اس نے ہمیشہ اللہ اور رسولؐ کے واسطے دے دے کر یہی کہا تھا مجھ سے کہ میں کسی بھی طرح اسے اس کے ماں باپ کے گھر سے نکال کر کہیں بھی لے چلوں۔ میں اگر شادی کی بات کرتا بھی تھا تو خوب صورتی کے ساتھ مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر اس قصے کو گول کر جاتی تھی۔ میں ایسا گدھا تھا یار کہ میں نے کبھی یہ تک سوچنے کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ آخر مجھ میں ایسی کون سی خوبی ہے، جس کی وجہ سے اس جیسی حسین و جمیل لڑکی مجھ پر یوں مرمٹی ہے۔ صورت شکل میرے پاس نہیں ہے۔ چہرہ میرا چیچک کے نشانوں

کی وجہ سے مسخ ہو کر رہ گیا ہے، علم کی دولت سے بھی میں محروم ہوں۔ کام میں وہ کرتا ہوں جس میں زندگی ہمیشہ سولی پر لٹکی معلوم ہوتی ہے۔ بس سینے میں ایک محبت بھرا دل ہے جس میں اس کی چاہت کا خزانہ دفن تھا۔ اُسے میں نکال کر دکھا نہیں سکتا تھا اسے۔" بولتے بولتے اس کی آواز میں لرزش پیدا ہونے لگی تھی۔ "میرے اس خلوص اور محبت کے شدید جذبے کی وہ معترف ہے جیلانی! اور اسی کی وجہ سے اس نے مجھے ایک بہن کا پیار دینا منظور کر لیا ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ کسی بھی شکل میں سہی، اس سے تعلق تو برقرار ہے نا میرا، اس کے سوا مجھے اور چاہیے بھی کیا ہے؟"

"واہ بیٹے! کیسا صادق عشق ہے تیرا، یہ بات خوب سوجھی ہے تجھے، اگر تجھ سے پہلے گزرنے والے عشاق کو بھی سوجھ گئی ہوتی تو آج لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور سوہنی مہینوال میں سے کسی کی بھی داستانِ عشق یوں زبان زدِ خاص و عام نہ ہوتی۔ بڑے بے وقوف تھے وہ جو ایک دوسرے کے لیے مر مٹے۔ بہن بھائی بن جاتے تو یوں فلم والوں کے ہاتھوں خواری سے بچ جاتے۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خوش قسمت ہے بیٹے تو۔ اگر ذرا بھی چوک جاتا تو مستقبل میں کوئی فلمساز سنبلہ جمیل کے نام سے فلم بنا ڈالتا۔"

"مذاق نہ کر آبی! تیرے جیسے آدمی کے سمجھنے والی بات نہیں ہے یہ۔ تو سمجھ ہی نہیں سکتا محبت ہے کیا شے؟" جمیل بولا۔

"یہ نہ کہہ جمیل بھائی! اس معاملے میں تو آبی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ تو ایک ہی سے عشق کر کے دل ہار بیٹھا ہے، جبکہ اپنا یار آبی ایک دن میں دو دو عشق کرنے کے بعد بھی زندگی کو زندگی ہی کی طرح برت رہا ہے اب تک۔ عشق کرنے کی جیسی مشق اسے ہے اور کسی کو مشکل ہی سے ہوگی۔ الماس جیسی مشہور اداکارہ تک دُم ہلاتی پھرتی تھی اس کے پیچھے پیچھے۔ بس ایک بار ذرا سی چوٹ ہو گئی تھی اس کے ساتھ۔ دو عشوہ گروں نے اسے عشوہ و غمزہ و ادا کا ایسا کرشمہ دکھایا تھا کہ بہت دنوں تک دنیا اندھیر ہو گئی تھی اس کے لیے۔ دن اور رات کی تمیز اٹھ گئی تھی اس سے۔ مگر ہمت اس نے پھر بھی نہیں ہاری پیارے، اچھی صورت دیکھ کر اب بھی مچل اٹھتا ہے دل سینے میں اس کے، کیوں آبی! غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا میں؟ غلط کہوں تو ٹوک دینا مجھے۔"

"اوے بکواس نئیں کر بوہڑ! بھول نہیں سکتا سالے تو اُس واقعے کو؟ بڑی کُتّی شے ہے بھئی یہ غلام جیلانی ذلیلانی! تو اس کی باتوں میں نہ آ جانا جمیل! مٹی خراب کر دیتا ہے یہ آدمی کی۔ دور ہی رہنا اس سے۔" آبی نے جمیل کو سمجھایا۔

"تو فکر ہی نہ کر یار! تیرے حق پر ڈاکا مارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس سرپرستی چاہتا ہوں اس کی۔" جمیل بولا۔

"یہ بکواس کرنے لگا ہے تو؟ سرپرستی حاصل کرے گا تو اس کی! اسے تو خود میری دعاؤں اور تعاون کی ضرورت رہتی ہے ہمیشہ۔"

"ہاں بھئی جمیل! تو بھی اس کی آشیرواد حاصل کرنے کی کوشش کر، بڑا سادھو سنت قسم کا آدمی ہے یہ، گیان پڑھ سمجھا سے تو۔"

"زبان بند کرا دے اپنی، سالے ہندو ثابت کرنے لگا ہے تو مجھے، حالانکہ خود امریکا سے اپنے عقائد تبدیل کر کے آیا ہے۔" آبی بولا۔

"اچھا! تو تم اس عرصے میں امریکا تک ہو آئے ہو؟ پھر تو یارو! تمھاری شخصیت بین الاقوامی ہو گئی ہے۔" جمیل حیرت سے بولا۔

"میں نہیں گیا تھا بھائی! یہ تیرا اسماب صفت جیلانی ہی پارسل ہو گیا تھا اُدھر۔ سالا بڑا سینہ چوڑا کر کے پھرتا ہے اِدھر ہم لوگوں کے درمیان۔ پتا ہے تجھے، ایک عورت بنڈل بنا کے ساتھ لے گئی اسے امریکا کی ریاست سان فرانسسکو تک۔ بڑی مشکل سے نجات ملی ہے۔"

"ہیں، یہ میں کیا سُن رہا ہوں جیلانی؟ کہیں جھوٹ تو نہیں بک رہا ہے یہ۔ اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں آتا ہے مجھے؟"

"نہیں یار! ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اس وقت تو یہ۔ کچھ لوگوں نے دھوکے سے........ باندھ لیا تھا مجھے۔ بڑی عجیب صورتِ حال تھی وہ بھی، ہمیشہ یاد رہے گی۔"

"اچھا! ہوا کیا تھا یار! کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟ کون لوگ تھے جو تمھیں اس طرح باندھ لے گئے تھے؟" جمیل نے تجسس میں مبتلا ہو کر پوچھا۔

میں اُسے جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ "آہا بھئی جان آئے ہیں اور مجھے خبر تک نہیں کی تم نے جمیل؟"

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ سروقامت، شاخِ گُل دھنک کے سارے ہی رنگوں سے سجی سنوری کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیے سے جلتے دکھائی دے رہے تھے اور لبِ شیریں پر شوخ مُسکان نے غنچے سے کھلا رکھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی میں بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آئیے آئیں سنبلہ جی، شکر ہے اس سوہنے رب کا، آج آپ کا دیدار تو نصیب ہوا۔"

"واہ جناب! کیا بات کہی ہے آپ نے، کیا حسنِ ظن ہے آپ کا۔ حالانکہ اُدھر ابری سے واپسی میں بھی گزر ہوا ہوگا آپ کا، مگر ایک بار رُخصت ہو جانے کے بعد پھر کبھی خیال نہیں آیا ہوگا آپ کو ہمارا۔ میں تو حیران ہوں کہ آج اِدھر کیسے قدم اٹھ گئے آپ کے؟"

"ایسا نہ کہیں سنبلہ! آپ لوگ کبھی کوئی بھولنے والی شے ہیں، وہ ابری میں آپ لوگوں کی مہمان نوازی تو کبھی بھول ہی نہیں سکتا میں۔"

وہ اندر قدم دھرتے ہوئے بولی۔ "جی ہاں میں بھی وہ آپ کی مُرغی پکڑنے کی ترکیب بھول نہیں سکی ہوں۔ جب بھی مرغی پکڑنا ہوتی ہے اسی ترکیب سے پکڑ لیتی ہوں، بڑی آسانی سے ہاتھ آ جاتی ہے اور مرغی جس سے بھی ذبح کراتی ہوں، اسے تکبیر پڑھنے کو کہنا بھی نہیں بھولتی۔ کیوں جی مسٹر پیرزادہ! آپ نے تکبیر یاد کر لی ہے یا اب تک جھٹکے کی مرغیاں ہی کھا رہے ہیں؟" وہ آبی کو دیکھ کر کھلکھلا کے ہنس دی۔

اس کے ہنسنے کا انداز ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ زندگی ہنسی خوشی گزارنے کی وہ ہمیشہ ہی قائل رہی تھی۔ میں نے ابری میں بھی اُسے یوں ہی فضا میں جلترنگ کی مدھر آوازیں بکھیرتے دیکھا تھا، چاندی کی گھنٹیوں کی یہ کھنکھناہٹ وہاں بھی بہت سُنی تھی میں نے، اس کی ہنسی میں یہ نغمگی اب بھی موجود تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں میں اس نغمے کی لے سُن کر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں نے پرواز کے لیے پَر پھڑپھڑانا شروع کر دیے تھے مگر اس غنچہ دہن، شیریں سخن کو سمجھنے میں غلطی کر گیا تھا میں، جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پرواز سے پہلے اس نے پَر کتر دیے تھے میرے۔ مجھے میرے ہی ہُنر سے زیر کر کے پرسمیٹ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ آج میں اس کے سحر میں یوں گرفتار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں میں ہوش کا دامن کسی طرح بھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

آبی نے اس کی بات پر پُرزور قہقہہ لگا کے کہا۔ "بڑی زبردست یادداشت ہے بی بی تیری۔ وہ بات ابھی تک یاد رکھی ہے تُو نے۔ حیرت ہے بھئی۔ ویسے اس دن کے بعد پھر کبھی مجھے مرغی ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہیں آ سکی ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا، اس طرح کم از کم بھئی جان کا ایمان تو سلامت رہ گیا ہوگا۔ آپ کے ایمان کا تو مجھے یقین ہے سلامت نہیں رہا ہوگا۔"

"لے بھئی جمیل اسنبھال کے رکھ اسے۔ عورت ذات کے سامنے مجھے زبان پر کنٹرول کیے رہنے دے۔ اسے بھی مشقِ ستم کے لیے میں ہی دکھائی دیا ہوں؟"

"میں تمھارے درمیان میں نہیں بول سکتا بھائی! مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔ میں کیا جانوں، تم لوگوں کے درمیان کیا کچھ ہوتا رہا تھا اس روز۔ یہ تو آج ہی پتا چلا ہے مجھے کہ تم نے بغیر تکبیر... پڑھے مرغی ذبح کر ڈالی تھی اس روز۔" جمیل نے ہنستے ہوئے اپنا دامن صاف بچا لیا۔

شرافت علی بولا۔ "یار آبی! ایک بات مجھے بہت حیران کر رہی ہے۔ یہ آخر ہر جگہ ہر شخص تمھیں ہی کیوں گھیر لیتا ہے؟"

"تو اپنی چونچ بند ہی رکھ، پتا ہے مجھے، کم نہیں ہے تو بھی بی جمالو سے۔ چنگاری ڈال کے معصومیت سے پوچھتا ہے، آگ کیسے لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسے نہ چھیڑ زیادہ بھائی شرافت! اپنی عزت کا خیال کر لے خود ہی، کیوں کیچڑ میں پتھر پھینک رہا ہے۔"

میری بات پر سب ہی قہقہے لگانے لگے۔ آبی تلخی سے بولا۔ "یار کن کمینوں سے یاری لگا بیٹھا ہے آبی تو بھی۔ ایسا ہی صلہ ملے گا تجھے رذیلوں کو منہ لگانے کا۔ اتنا گر گیا ہے تو۔ لڑکیاں بالیاں بھی ہنسی اڑانے لگی ہیں تیری اب۔"

جمیل جلدی سے بولا۔ "دل کیوں تھوڑا کرتا ہے یار! کس میں ہمت ہے جو ہنسی اڑائے تیری۔ خود اُسی کو نہ اُڑا دوں گا میں۔"

میں نے کہا۔ "دفع کر دو یار! لعنت بھیجو ایسی باتوں پر جن سے میرے یار کی دل شکنی ہوتی ہے اور سُن بھئی جمیل! اب تو یہاں شکارپور میں چودھری بن کے بیٹھ ہی گیا ہے تو ایک کام میرا بھی کر دے یار! آپ بیٹھیں نا سنبلہ بی بی۔ میرا خیال ہے آسیہ کا رول آپ ہی کر رہی ہیں یہاں؟"

"آپ بیٹھیں بھئی جان! میں آپ لوگوں کے کھانے۔ پینے کا انتظام کر لوں جا کر۔ یہ جمیل سنگھ تو بس لے وئی ای ہے، اس نے مجھے خبر تک نہیں کی کہ آپ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ میزبانی کے آداب تک بھلا دیے ہیں اس نے یہاں آ کر۔"

"نہیں سنبلہ جی! اس کی بالکل زحمت نہ کریں آپ۔ خوب کھا پی کر ہی یہاں پہنچے تھے ہم لوگ اور جمیل کو ہم نے خود ہی منع کر دیا تھا کھانے پینے سے۔ پریشان بالکل نہ ہوں، یہ گھر ہے ہمارا، جس چیز کی ضرورت ہوگی، ہم خود مانگ لیں گے آپ سے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ نے اچھا نہیں کیا بھئی جان! جب آپ کو یہاں آنا ہی تھا تو باہر سے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟" سنبلہ شکایتی انداز میں بولی۔

"بات یہ ہے کہ ہمیں آپ لوگوں کی یہاں موجودگی کا پتا ہی اس وقت چلا جب ہم کھانا کھا چکے تھے۔ پہلے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا تو ہم ایسا ہرگز نہیں کرتے۔ آپ کے ہاتھوں کی لذت چھوڑ کر ہم ہوٹل میں کھانا کبھی بھی پسند نہیں کر سکتے تھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، رات کو سہی، رات کے کھانے میں کیا پسند کریں گے، آپ ابھی سے بتا دیں تاکہ اس کا انتظام کر لوں میں۔" وہ بولی۔

"دیکھیں، اب اس چکر میں نہ پڑیں، ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہریں

گے یہاں ہمیں جلدی ہے بہت۔ آج ہی کراچی پہنچنا ہے، بس کچھ ضروری باتیں جمیل سے کر کے ہم رخصت ہو جائیں گے، ویسے اب ہم نے یہ گھر دیکھ ہی لیا ہے۔ آئندہ جب بھی اِدھر آئے، یہیں ٹھہریں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے دیپ بجھ سے گئے۔

وہ خاموشی سے مڑی اور بوجھل بوجھل قدموں سے واپس چلی گئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہمارے نہ رکنے سے اُسے دُکھ پہنچا تھا۔ میں اگر تنہا ہوتا یا حالات کے تیور اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے تو میں اُسے یوں اداس کبھی نہ کرتا۔ اس کے جانے کے بعد میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں نے جمیل سے کہا۔ "یار! اُسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ حالات نے اگر مجبور نہ کر رکھا ہوتا تو ہم اُسے میزبانی کا موقع ضرور دیتے۔ یہ عورتیں بڑی نازک مزاج ہوتی ہیں یار! سمجھے بوجھے بغیر ہر بات کو دل پر رکھ لیتی ہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو تم، وہ زیادہ دیر اُداس نہیں رہ سکے گی، اس پر غم کے سائے زیادہ دیر ٹھہر ہی نہیں سکتے۔ ویسے کوئی ہرج تو نہیں تھا اگر آج کی رات تم یہاں رُک جاتے۔" جمیل نے کہا۔

"کہا نا میں نے، اگر ہرج نہ ہوتا تو ہم ضرور رُک جاتے میرے بھائی۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"چلو خیر، کوئی بات نہیں، تم کسی کام کی بات کر رہے تھے؟"

"ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں ہم ایک بہت ہی ضروری کام سے آئے تھے۔" میں نے اسے اپنے آنے کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے پورا پورا یقین ہے کہ آسیہ اس علاقے کو چھوڑ کر گئی نہیں ہے۔ وہ یہاں سے سکھر تک کہیں نہ کہیں موجود ہوگی اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جائے گی جب تک اپنے بچے کو حاصل نہ کرلے۔ میں تمہارے ذمے یہ کام لگانا چاہتا ہوں کہ تم اس کا خیال رکھو اور ضرورت پڑنے پر اس کی مدد اور حفاظت کرو۔"

"یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ میں تمہارے کام آسکوں اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی میرے لیے، لیکن میں نے آج تک آسیہ کو دیکھا نہیں ہے، میں اُسے پہچان کیسے سکوں گا؟" جمیل نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ لاکھو لاشاری کی حویلی پر اپنا کوئی قابلِ اعتماد آدمی لگا دو۔ وہاں جو بھی جوان عورت گھس کر ہنگامہ کرے گی، وہ آسیہ ہی ہوگی۔ وہ تمہاری نظر میں آجائے تو تم کسی طرح اس سے مل کر اسے میرے حوالے سے یہ بتا دینا کہ اس کا بچہ اس حویلی میں نہیں ہے۔ وہ کراچی میں لاکھو کے کسی رشتے دار کے پاس ہے جس کا پتا حویلی میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ خواہ مخواہ ان حویلی والوں سے نہ الجھے۔ میں کراچی میں اسے تلاش کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ وہ لاہور جا کر ماں جی کے پاس سکون سے رہے۔ انہیں اس عمر میں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی جیلانی! میں کوشش کروں گا کسی طرح میرا اس سے رابطہ قائم ہو جائے۔ میں اسے سمجھا بجھا کر لاہور واپس جانے کے لیے راضی کر لوں گا، تم اب بے فکر ہو جاؤ اس کی طرف سے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ اب ہمیں اجازت دے یار، سکھر پہنچ کر ہمیں گاڑی پکڑنا ہے کراچی کے لیے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں گاڑی میں سکھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں۔"

"نہیں بھائی! تو اس کی تکلیف نہ کر، بس اتنا کر دے کہ کسی ٹیکسی والے کو سکھر تک جانے کے لیے راضی کر لے۔"

"چلیں، پھر میرے ساتھ چلیں باہر سب لوگ۔ میں کوئی ٹیکسی پکڑ دوں گا۔ یہاں ٹیکسیاں زیادہ نہیں ہیں جو ہیں وہ لمبی سواریاں ہی تلاش کرتی ہیں۔ سکھر، خیرپور، لاڑکانہ ہی کی طرف چل جاتی ہیں وہ۔ واپسی میں کبھی کبھی دو دن بھی لگ جاتے ہیں انہیں۔ اتنی دور سے خالی تو نہیں آسکتے نا۔ جب کوئی سواری ملتی ہے تبھی آتے ہیں واپس۔"

ہم لوگ اس کے ساتھ باہر گلی میں نکل آئے۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر مین بازار کی طرف چل دیا۔ سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد ایک دکان کے سامنے ایک وین کھڑی دیکھ کر اس نے دکان دار سے پوچھا۔ "یہ وین کس کی ہے؟"

دکان دار جمیل کو دیکھ کر جلدی سے دُکان سے باہر نکل آیا اور بولا۔ "یہ اخبار والوں کی گاڑی ہے سائیں۔ سکھر سے اخبار وغیرہ آتے ہیں نا اس میں۔"

"اچھا، تو یہ واپس سکھر جائے گی ابھی؟" جمیل نے پوچھا۔

"ہاں جی بس جانے ہی والی ہے ابھی۔ وہ سامنے کتابوں کی دُکان میں کچھ دینے گیا ہے اس کا ڈرائیور۔" اس نے جواب دیا۔

جمیل کتابوں کی دُکان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہر جاؤ! میں دیکھتا ہوں، اگر یہ گاڑی سکھر جا رہی ہے تو اسی میں چلے جانا تم لوگ بھی۔"

وہ کتابوں کی دُکان میں جا کر دکان دار سے باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی وہ ایک خوش پوش شخص کے ساتھ واپس آگیا۔ "لو بھئی جوانو! یہ اپنے عابد صاحب سکھر جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ تم لوگ بھی۔ یہ سکھر ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دیں گے تمہیں۔"

"شکریہ بھائی! یہ بہت اچھا ہو گیا۔ ورنہ پتا نہیں ٹیکسی کے لیے کتنا خوار ہونا پڑتا ہمیں۔" میں نے کہا۔

عابد صاحب نے وین کا دروازہ کھول کر ہمیں اندر بٹھایا

اور پھر جمیل سے ہاتھ ملا کر اسٹیئرنگ سیٹ پر جا بیٹھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وین سکھر کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں اپنے سوہنے رب سے دعائیں کر رہا تھا کہ ہم مزید کسی کھڑاک میں پڑے بغیر خیریت کے ساتھ کراچی پہنچ جائیں۔

سکھر اور شکارپور کے درمیان تقریباً بائیس میل لمبی جو سڑک یار لوگوں نے بنائی ہے، وہ اتنی تنگ ہے کہ اس پر یک طرفہ ٹریفک بھی اسی صورت میں جاری رہ سکتی ہے کہ کوئی گاڑی کسی کو اوورٹیک نہ کرے۔ اس شاہراہ پر دو طرفہ ٹریفک چلانے کی اجازت دینا نہایت سنگ دلی اور بے حسی ہے۔ اس مختصر اور خطرناک شاہراہ پر ٹریفک کا جو اژدہام ہے، اسے دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سڑک بنانے والوں اور اس پر دو طرفہ ٹریفک چلانے والوں کا ضرور گورکنوں کے خاندان سے تعلق رہا ہوگا۔ انھوں نے گورکنوں کے کاروبار کو پھلنے پھولنے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ ان ڈرائیوروں کے حوصلے اور ہمت کی داد دینا چاہیے جو اس پل صراط سے بے خطر اپنی گاڑیاں دوڑاتے گزر جاتے ہیں۔ یقیناً انہیں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر چلنے کی بڑی مشق ہوگی۔ ہم جس وین میں سفر کر رہے تھے اسے چلانے والا بھی کوئی ایسا ہی شخص تھا۔ اس کا ظاہر دیکھ کر یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کوئی عابد و زاہد قسم کا خدا کا اتنا نیک بندہ ہے جس کے شانوں پر گناہوں کا بالکل بوجھ نہیں ہے اور وہ اپنے نامۂ اعمال میں صرف نیکیاں ہی نیکیاں درج کراتا رہا ہے اب تک، اور ہم جو اس کے ساتھ اس راہ پُرخطر سے بہ عافیت گزر آئے ہیں تو اس سلسلے میں بھی اس کا ہی اعمال نامہ کام آیا ہے ہمارے۔ رات کی سیاہی کا پردہ چاک کرنے کے لیے شہر والوں نے واپڈا کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ یہی کوئی ساڑھے آٹھ کا عمل ہوگا جب ہمارا وہ محسن ہمیں سکھر کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے اتار کر رخصت ہوا۔ سکھر ایکسپریس نو بجے کے بعد کراچی کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کسی اعلیٰ درجے میں ریزرویشن کرانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ نچلے درجے کے ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم کا رُخ کیا۔ ایک مہربان قلی نے پہلے ہی سے ہم جیسے ضرورت مندوں کے لیے کچھ سیٹیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ جہاں اس نے اپنے آدمی بٹھا رکھے تھے۔ اس سے ہم نے تین سیٹیں خرید کر اپنے قبضے میں کر لیں۔

اسی تگ و دو میں گاڑی کی روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد گاڑی حرکت میں آگئی۔ جس ڈبے میں ہم بیٹھے تھے، اس میں بھیڑ اتنی تھی کہ آدمی بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لوگوں کو پیر جما کر کھڑے ہونے تک کی جگہ ہی مشکل سے مل سکی تھی اور ایسے لوگ بھی اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کر رہے تھے۔ ورنہ بیشتر تو ایسے تھے جو مسلسل دھکے کھا کھا کر اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔ ان کے لیے کھڑے رہنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ چیونٹی کی رفتار سے برابر حرکت میں تھے۔ ہر چند منٹ بعد ان کی جگہ تبدیل ہو جاتی تھی۔ ایک نوجوان نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "یارو! کیسا اندھیر ہے۔ ریلوے کی گاڑی میں سفر کرنے کا ٹکٹ خریدنے کے بعد آدمی ان قلیوں سے بیٹھنے کی جگہ بھی خریدے، جو ایسا نہیں کر سکتا، وہ راستے بھر دھکے کھاتا جائے۔"

"ہاں بھائی! غریب کو تو لوگ جینے کا حق دے دیتے ہیں، یہی بڑی مہربانی ہے ان کی۔ پیسے اور اختیار کی اس دوڑ میں جو پیچھے رہ جاتا ہے، وہ اسی طرح بھاگنے والوں کی ٹھوکروں میں رُلتا رہتا ہے۔ ہر آدمی دولت کمانے کی دھن میں اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ پیچھے رہ جانے والے کو مڑ کر دیکھ لے یا گر جانے والے کو سہارا دے کر کھڑا کر سکے۔ یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے کہ کہیں ڈور کا سرا ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر یہ قلی اور ٹرین کے ساتھ چلنے والے محافظ بھی اس دوڑ میں شریک ہیں، وہ ٹرین میں سفر کرنے والوں سے ٹرین کی ایک ایک انچ جگہ کی قیمت وصول کر کے اپنی ضرورت کا منہ بند کرتے ہیں۔ یہ ہماری قومی ریلوے ہے اور اس کے کارکن بھی ہماری قوم ہی کے افراد ہیں لہٰذا انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان گاڑیوں میں بیٹھنے، لیٹنے یا کھڑے ہونے کی جگہ جس دام میں فروخت ہو سکے فروخت کریں۔ آخر وہ پیسہ کمانے کے لیے گھروں سے نکل کر آتے ہیں۔ پھر کمانے کا اتنا آسان اور منافع بخش ذریعہ کیوں ہاتھ سے جانے دیں۔" ایک بزرگوار نے جلے بھنے انداز میں تقریر کر ڈالی۔

لوگ راستے بھر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں مصروف رہے۔ وہ اس وقت ریلوے حکام کی نااہلی کی سزا بھگت رہے تھے۔ لہٰذا انہیں ریلوے والوں کی کوتاہیوں، لوٹ کھسوٹ اور اندھیر گردی کے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ جس کے خلاف ایک شخص بولنا شروع کر دے، سب کے سب اس کے بارے میں اپنے اپنے تلخ تجربات سے دوسروں کو آگاہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ میرے یار! یہ جو تو بغیر کامے اور فل اسٹاپ کے اس شخص یا محکمے کے خلاف بولے چلا جا رہا ہے تو میرے بھائی، کیا تو اتنا ہی بے خطا اور پاک باز ہے کہ تجھے دوسروں کے عیب گنانے کا حق حاصل ہو گیا ہے؟ کیا تو بھی اپنے فرائض ایسی ہی دیانت داری اور بے غرضی سے انجام دیتا ہے جس کی توقع تو نے دوسروں سے باندھ رکھی ہے؟ کیا خلقِ خدا تیرے ہاتھوں کبھی پریشان نہیں ہوتی؟ کیا تو رشوت کو اُوپر کی آمدنی قرار دے کر کبھی اپنے اوپر حلال کرنے کی کوشش نہیں کرتا؟ ایسے سوال کوئی کسی سے کر ہی نہیں سکتا، کیوں کہ ان سوالات سے ... دینی

گردن پھنس جانے کا خوف ہوتا ہے۔ پہلا پتھر پھینکنے کے لیے اگر پاک باز ہونے کی شرط قبول کر لی جائے تو کسی ہاتھ میں پتھر نظر ہی نہیں آسکتا۔ اسی لیے لوگ ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس طرح کم از کم وقتی طور پہ ہی سہی ان کی ذات تنقید کا ہدف بننے سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس طرح انہیں یہ اطمینان بھی حاصل ہوتا رہتا ہے کہ وہ خود غرضی اور ذاتی مفادات کی اس دلدل میں اترنے والے تنہا آدمی نہیں ہیں بلکہ اور بھی بے شمار لوگ ہیں جو ان کی طرح ملکی مفادات اور قومی ترقی کی راہ میں گڑھے کھودنے میں مصروف ہیں۔

ہمارے پاس بھی بس اتنی ہی جگہ تھی کہ بیٹھے بیٹھے سفر کر سکیں چنانچہ ہم نے سکھر ایکسپریس کے اس ڈبے میں ایک ہی انداز سے بیٹھے بیٹھے صبح سات بجے کے بعد کراچی شہر کو جا چھوا۔ کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن پر ہم نے اس قیدِ بامشقت سے نجات حاصل کی اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ شرافت علی نے کہا۔ "یار! ٹرین کے نچلے درجے میں سفر کرنا بھی سزا ہی ہے۔ میری تو کمر تختہ ہو گئی بیٹھے بیٹھے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ہاں، تم جیسے نازک مزاج اور تعیش پسند لوگوں کے لیے یہ سزا ہے اور غریب و محنت کشوں کے لیے ضرورت ہے یہ۔ شکر ادا کرو خدا کا، تمہیں بیٹھنے کو جگہ تو مل گئی تھی۔ ان بیچاروں کا تصور کرو جو تمام رات کھڑے رہے ہیں۔"

"ہاں یار! وہ بےچارے تو واقعی قابلِ رحم ہیں۔ پتا نہیں ہم کب دوسروں کی تکلیف کا احساس کرنا سیکھ سکیں گے۔"

"جس روز ہماری ضروریات محدود ہو جائیں گی، ہم قناعت کی خو اپنا لیں گے اور ایسا ہماری زندگی میں تو ممکن نظر نہیں آتا۔"

"چھوڑ یار اس قصے کو، ہم کہاں کے پاک دامن لوگ ہیں جو دوسروں پر انگلی اٹھانے لگے ہیں۔ پہلے اپنے گریبان کی تو خبر لے، اپنا محاسبہ تو کر لے، اپنے اندر کی ٹیڑھ تو نکال لے، اوروں کا غم بعد میں کر لینا اور پھر تو اچھا بھی لگے گا ایسی باتیں کرتے ہوئے۔" آبی بولا۔

شرافت علی نے کہا۔ "ہاں یار! آبی ٹھیک کہتا ہے۔ اُدھر ایک ذرا معقول سا ہوٹل ہے، ہم وہاں چل کر ناشتا کرتے ہیں، وہیں سے میں گھر پہ فون کر کے دوسری گاڑی بھیجنے کے لیے کہہ دوں گا۔ جب تک ہم ناشتے سے فارغ ہوں گے، ڈرائیور گاڑی لے کر آجائے گا۔"

میں نے کہا۔ "خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں بے شمار ٹیکسیاں موجود ہیں۔ ہم کوئی ٹیکسی پکڑ کر چلے چلیں گے۔ اپنی کار نہیں ہوگی تو کیا گھر کا راستہ بھول جاؤ گے تم؟"

"نہیں یار۔" شرافت علی ہنس کر بولا۔ "احتیاط کا دامن تھامے رہنا چاہیے ہمیشہ۔ بعض اوقات ایک بظاہر معمولی سی غلطی کسی بڑی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو تو بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی شرافت علی۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی میں جانے میں کون سی غلط بات ہو سکتی ہے؟"

"تم نے یہ بات نظر انداز کر دی جیلانی کہ اس وقت ہمارے حلیے اتنے خراب ہیں کہ اس حلیے میں ہم متوسط طبقے کے افراد بھی نہیں لگ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ٹیکسی کے ذریعے اپنے گھروں پر پہنچے تو یہ بات ٹیکسی ڈرائیور کے لیے بڑی حیران کن ہوگی۔ اس حلیے میں وہ ہمیں کہیں بھی پہنچانے پر کوئی اعتراض تو نہیں کرے گا لیکن وہ مجھے ایک عالی شان کوٹھی اور تم دونوں کو جدید طرز کے بنگلے پر اتارنے کے بعد کبھی بھلا نہیں سکے گا۔ یہ بات اسے ہمیشہ یاد رہے گی کہ اس نے تین ایسے آدمیوں کو جو کسی طرح بھی اعلیٰ طبقے سے متعلق نہیں لگتے تھے کہاں پہنچایا تھا۔ پھر اگر کوئی ہمارے بارے میں تفتیش کرتا ہوا اس تک پہنچ گیا تو وہ بآسانی ہماری نشاندہی کر کے اسے ہم تک پہنچنے کی راہ بتا دے گا۔ کیا یہ بات ہمارے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی؟"

اس کی بات سن کر آبی حیرانی سے بولا۔ "یار شرافت علی، تو تو بڑا ہی سمندر صفت آدمی لگتا ہے مجھے۔ اتنی گہرائی میں بھی جا سکتا ہے تو، تجھے دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا ہے کوئی۔ اتنی احتیاط پسندی ہے تجھ میں، یہ نہیں جانتا تھا میں۔"

"یہ جس دنیا کا باسی ہے، وہاں ان باتوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ سارے قاعدے، قانون اور نشیب و فراز سمجھائے جاتے ہیں آدمی کو۔ اسے بھی یہ ہنر سکھائے گئے ہیں جبھی تو جرائم کے سمندر میں غوطہ زنی کے باوجود اس کا دامن بھیگا ہوا دکھائی نہیں دیتا کسی کو بھی۔ ایسا صاف اور بے داغ نظر آتا ہے یہ کہ کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا اس پر۔ ان رموز سے ہم نے کبھی واقفیت حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اسی لیے ہمارے چہرے کی تحریر آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے اور ہم منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار جیلانی! یہ میں بھول ہی گیا تھا کہ اس شرافت علی کا تعلق تیرے دیرینہ دشمنوں ڈاکٹر دھمن اور رعنالیہ سے ہے۔ بہت بلند پرواز پرندے ہیں وہ دونوں۔ جرائم کی دنیا کے وہ ہیں سالے جو آسمانوں میں پرواز کرتے ہوئے بھی زمین کے چپے چپے پر نگاہ رکھتے ہیں اور جہاں اپنا راتب نظر آتا ہے لمحوں میں وہاں جا اترتے ہیں۔ کسی غلط جگہ تو جا کر بیٹھتے ہی نہیں وہ۔ ٹھیک اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں ان کے لیے دسترخوان بچھا ہوتا ہے۔" آبی نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو بہت معمولی آدمی ہوں یار، مجھ میں سمندر جیسی گہرائی کہاں تلاش کرنے لگے ہو۔ یہ تشبیہ تو صرف ڈاکٹر دھمن کے لیے مناسب ہے۔ اس کی گہرائی کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ تم لوگ عرصے سے اس کے خلاف صف آرا ہو، بڑی معلومات جمع کی ہیں تم نے اس کے بارے میں، بے شمار تاریک گزرگاہیں تلاش کی ہیں تم نے اس کے اندر لیکن اس کے باوجود میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس کے بارے میں پچاس فیصد بھی معلومات حاصل نہیں کر سکے ہو گے تم۔ میں بھی کئی سال سے اس کے لیے کام کر رہا ہوں اور اب تک ایسا کوئی شخص مجھے نہیں مل سکا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ ڈاکٹر دھمن کے ہر راز، اس کے ہر کاروبار اور اس کی طرف جانے والے ہر راستے سے واقف ہے۔ میں صرف کراچی کی حد تک جانتا ہوں کہ یہاں اس کے کون کون سے کاروبار ہیں اور کون لوگ اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ معلومات بھی ہمیں دھمن ہی نے فراہم کی ہیں تاکہ کبھی نادانستگی میں ہم لوگ آپس میں نہ الجھ جائیں۔ اس کے علاوہ کراچی کے باہر کے چند ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جن سے کبھی نہ کبھی کسی کام کے سلسلے میں واسطہ پڑ چکا ہے۔ یہی دیکھ لو کہ جیلانی نے سان فرانسسکو میں اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا ہے، اس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ حالاں کہ بارہا وہ وہاں سے مجھے فون کر کے ہدایتیں دیتا رہتا ہے۔ میں تو حیران ہوں، اس شخص کی جڑیں دنیا کے کس کس خطے تک پھیلی ہوئی ہیں اور دنیا کی کوئی برائی، بدی کی طرف جانے والا کوئی راستہ اس کی دست برد سے بچا بھی ہے یا نہیں؟"

"میرے یار! میں تو آج تک یہی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ اس خبیث کا جرائم پیشہ افراد کے کس قبیلے سے رشتہ جوڑا جائے! اس کا تو نسب ہی نہیں ملتا کسی سے، ہر جگہ کوئی نہ کوئی بات مختلف ہو جاتی ہے، کسی خانے میں فٹ ہی نہیں ہوتا وہ، کبھی وہ کوئی معمولی درجے کا چور نظر آتا ہے، کبھی اسمگلر اور کبھی اعلیٰ درجے کا بازی گر تو کبھی بین الاقوامی غنڈہ اور کبھی جعلسازی کا ماہر، ایک غیر ملکی ایجنٹ۔ اس کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم کر کے اس پر کوئی مخصوص لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ لاہور میں وہ مجھے ایک شقی، نقلی ڈاکٹر کے روپ میں ملا تھا جو انسانی گردے چرا کر بیچا کرتا تھا۔ یہاں کراچی میں انکشاف ہوا کہ وہ گردوں کے ساتھ آنکھوں کے قرنیے بھی فروخت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسمگلنگ اور اسی قسم کے دوسرے دھندے بھی کر رکھے ہیں اس نے۔ پھر وہاں سان فرانسسکو میں ایک بالکل ہی مختلف روپ سامنے آیا تھا اس کا۔ وہاں وہ اپنے دیگر دھندوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے خوف ناک منصوبوں میں شریک نظر آتا ہے اور بہت ہی ادنیٰ درجے کے شباب فروشوں سے بھی اس کے روابط ہیں۔ وہ ان کی دکانوں سے چرائی ہوئی قیمتی اشیاء بھی ٹھکانے لگانے کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔"

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے جیلانی۔ اسے تو میرا خیال ہے، جرائم کی دنیا کا آکٹوپس کہا جائے، یہی مناسب ترین نام ہے اس کے لیے۔ وہ آکٹوپس ہی کی طرح اپنی بے شمار سونڈوں کے ذریعے اپنے گرد و پیش کی تمام اشیا کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے پیٹ میں اتارتا چلا جاتا ہے پھر بھی اس کا پیٹ کبھی بھر نہیں پاتا، بھوک کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے ہر دم۔" شرافت علی نے کہا۔

"ہاں یار! تیری یہ تشبیہ مناسب ہی لگتی ہے مجھے اور دین دھرم اس کا کوئی ہے نہیں۔" آبی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ شرافت علی بیرے کو ناشتا لانے کا کہہ کر کاؤنٹر پر گاڑی کے لیے گھر فون کرنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آبی بولا۔ "یار جیلانی! یہ تو نے اپنے آپ کو کس راندن میں پھنسا لیا ہے؟ یہ اتنی بڑی بڑی تنظیمیں اور اعلیٰ پیمانے کی بین الاقوامی سازشیں، یہ ہمارے بس کی باتیں کہاں ہیں یار جی۔ اتنے بڑے بڑے چکی کے پاٹوں کے درمیان ہم پس کر ہی نہ رہ جائیں کہیں؟"

"تو نے غلط نہیں کہا ہے۔ اس کا امکان تو نوے فیصد ہے سمجھ لے۔ مگر یہ میرے اختیار کی باتیں تو نہیں ہیں، یہ مصیبت میں نے خود تو اپنے گلے سے نہیں لگائی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے کہ اس مصیبت نے خود آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا ہے اور اب وہ کمبل ہو گئی ہے۔"

"ہاں یار! ہم بھی عجیب و غریب قسم سے تعلق رکھتے ہیں انسانوں کی، اور بے اختیار ایسے ہیں کہ ہمیں خود اپنی ذات پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ جس کا جدھر جی چاہتا ہے نکیل پکڑ کے ہانکنے لگتا ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں!"

"اسی لیے تو میں نے سوچا ہے میرے بھائی کہ جب زندگی یوں ہی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بسر کرنا ہے تو اسے کسی بھلائی کی راہ پر کیوں نہ ڈال دیا جائے۔ بے مقصد ہنگامہ آرائی کو کوئی مقصد کیوں نہ فراہم کر دیا جائے۔ یہ تو ہم نے جان ہی لیا ہے کہ اب ہم تھک کر ہی گر پڑیں تو اور بات ہے ورنہ کہیں ستانے کے لیے بھی سکون سے بیٹھ نہیں سکیں گے۔ پارے کی طرح ہر دم حرکت میں رہنا ہی مقدر ہے ہمارا!"

اسی وقت شرافت علی فون کر کے واپس آ گیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا کس کا مقدر بن گیا ہے؟ کس کا ذکر ہو رہا ہے یہ؟"

"کسی کا نہیں یار! ہمارے پاس بیان کرنے کو اپنے ہی

وسانے کیا کم ہیں جو ہم دوسروں کی داستانیں سنائیں گے۔" آبی نے جواب دیا۔

شرافت علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بیرے کے آجانے کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ ناشتے کے دوران ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہوٹل سے باہر نکل کر سڑک پر آئے تو ایک سفید کرولا کار ہمارے نزدیک آ رکی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر لزی کو بیٹھے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ لزی نے مسکرا کر شوخ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ والی نشست کا دروازہ کھول کر کہا۔ "آئیں جناب عالی! بیٹھیں، اندر آجائیں جلدی سے، حیران تو آپ یہاں بیٹھ کر بھی ہو سکتے ہیں، منع بالکل نہیں کروں گی میں۔"

میں نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم یہاں کیسے پہنچ گئیں اس وقت۔ تمہیں کس نے خبر دی ہمارے آنے کی؟"

"آپ گاڑی میں تو بیٹھیں جناب عالی! سوالات بیٹھنے کے بعد بھی کیے جا سکتے ہیں۔ آپ بھی بیٹھ جائیں آبی صاحب!" اس نے آبی کو مخاطب کر کے عقبی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اور یہ شرافت علی، کیا اسے یہیں چھوڑ جاؤ گی؟"

"ان کی گاڑی بھی موجود ہے یہاں، آپ ان کی فکر نہ کریں، یہ بھی آجائیں گے۔" لزی نے مجھے مطمئن کر کے شرافت علی سے کہا۔ "تمہارا ڈرائیور گاڑی لے آیا ہے۔ تم اپنے گھر پہنچو، انہیں میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

"جی بہتر مادام! آپ لوگ جائیں، میں اب شام کو آپ سے ملوں گا جیلانی۔" شرافت علی سعادت مندی سے بولا۔

لزی نے کار آبی کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا دی۔ آبی بولا۔

"جیلانی! یہ میم صاحب کون ہے بھئی؟ تعارف تو کرا دے اس سے میرے یار!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوئے کیسا کوڑھ مغز ہے تو! میں نے بتایا نہیں تھا تجھے لزی بیگم کے بارے میں!"

"اوہ اچھا! تو یہ ہیں وہ امریکا بہادر کی امپورٹڈ تیری لزی خانم؟ یعنی میری نصف بھابی۔"

لزی کے نقرئی قہقہے نے جیسے فضا میں نغمے بکھیر دیے۔ وہ بولی۔ "یہ نصف والی بات آپ نے خوب کہی آبی صاحب مگر یہ سوجھی کیسے آپ کو؟"

"وہ جی اب دیکھیں نا، آپ نے میرے یار جیلانی سے عقد تو نہیں کیا نا ابھی، صرف اقرار ہی کیا ہے، یعنی اس کی نصف بہتر بننے کی حامی ہی بھری ہے ابھی۔ چنانچہ میرا رشتہ بھی آپ سے ابھی ادھورا ہی ہے۔ کچھ غلط تو نہیں کہا ہے نا میں نے؟" آبی بولا۔

"ناجی نا، بالکل غلط نہیں کہا ہے آپ نے بلکہ میں تو حیران ہوں، آپ کو رشتوں کی اتنی اچھی پہچان ہے۔" لزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں ایک ہی سوال چبھ رہا تھا۔ لزی کو کیسے پتا چل گیا کہ ہم لوگ اس وقت یہاں ہیں؟ وہ عین وقت پر یہاں کیسے پہنچ گئی۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ "لزی! تم نے بتایا نہیں، تمہیں ہماری اس وقت یہاں موجودگی کا علم کس طرح ہوا؟"

"اوہو، آپ یہ بات بھول نہیں سکے ہیں اب تک! آخر میں نے آپ کو جیون ساتھی کے طور پر منتخب کیا ہے، میں آپ کی طرف سے غافل تو نہیں رہ سکتی۔ آپ کی سلامتی کے لیے آپ کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا ضروری ہے میرے لیے۔ آپ جیسے تلوار کی دھار پر چلنے والے آدمی کی زندگی ہر لمحہ داؤ پر لگی رہتی ہے۔ ایسے میں کیا یہ فرض نہیں ہے میرا کہ میں آپ کے ایک ایک پل کا حساب رکھوں؟"

"کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کہاں کہاں اور کن حالات سے دوچار رہا ہوں گزشتہ دنوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، میرے پاس آپ کے ایک ایک لمحے کی مصروفیات کا حساب موجود ہے۔" اس نے کہا۔ اور کراچی سے شکار پور تک جو واقعات ہمیں پیش آئے تھے، ان کی پوری تفصیل ہمیں سنا ڈالی۔ "اب بتائیں کیا میری معلومات غلط ہیں یا کوئی کمی رہ گئی ہے ان میں؟"

آبی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے بولا۔ "کمال ہے بھئی! اس سے تو یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے ہمارے آس پاس ہی موجود رہی ہوں آپ۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں کسی بھی لمحے یہ احساس تک نہیں ہوا کہ کوئی ہماری مسلسل نگرانی کر رہا ہے۔"

لزی ہنسنے لگی۔ آبی بولا۔ "پھر تو ہمیں آسیہ کی فکر بھی کرنا چاہیے۔ آپ کے آدمی اس کی بھی نگرانی کر رہے ہوں گے۔"

وہ بولی۔ "مجھے افسوس ہے ایسا نہ ہو سکا۔ بابا صاحب نے جن لوگوں کو آپ کا خیال رکھنے اور ضرورت کے وقت مدد کرنے کی ہدایت کی تھی، انہیں آسیہ کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا لہٰذا جب وہ جیپ لے کر لاشاری کی حویلی سے نکلی تو کسی نے اس کا خیال نہیں کیا۔ وہ وہاں سے نکل کر کہاں گئی ہے، یہ علم ہم میں سے کسی کو بھی نہیں ہے۔"

لزی ہمیں سیدھی جمشید روڈ کے اسی بنگلے میں لے گئی جو شرافت علی نے ہمارے سپرد کر رکھا تھا۔ دربان نے گیٹ پر داخل ہوتے ہی اطلاع دی کہ چند منٹ پہلے مسٹر جبر اللہ کا آدمی آیا تھا۔ اس نے پیغام چھوڑا ہے کہ لزی جلد از جلد بابا صاحب کے آستانے پہنچ جائے۔ یہ پیغام سن کر میں آبی کے ساتھ وہیں کار سے اتر گیا۔ میں نے لزی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اب تم بابا صاحب کے آستانے چلی جاؤ۔"

وہ اسی وقت گاڑی بیک کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دربان کو ہدایت کی۔ "دیکھو، ہم لوگ غسل کر کے سو رہیں گے اور جب تک نیند پوری کر کے اٹھ نہ جائیں، ہمیں ڈسٹرب نہ کرنا۔ بیگم صاحبہ واپس آئیں تو انہیں بھی بتا دینا کہ ہماری نیند خراب نہ کریں۔ کوئی فون آئے تو کہہ دینا گھر پر کوئی نہیں ہے۔"

"جی بہت اچھا صاحب جی۔ کل کوئی ظہیر احمد صاحب آپ کو بار بار فون پر پوچھتے رہے تھے۔ ان کو میں نے یہی بولا تھا کہ صاحب لوگ گھر پر نہیں ہیں، کدھر گئے ہیں ہم کو کچھ پتا نہیں۔ رات کو بارہ بجے تک وہ فون کرتا رہا تھا صاحب۔" دربان نے بتایا۔

"اچھا۔ بیگم صاحبہ کو بتا دیا تھا تم نے اس فون کے بارے میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ان کو کیسے بتاتا صاحب۔ وہ تو کل صبح ادھر سے گئی تھیں تو ابھی آپ لوگوں کے ساتھ واپس آئی ہیں۔"

"اچھا، تو کل تمام دن اور رات بھر وہ یہاں نہیں رہی! کمال ہے، پھر کہاں رہی تھی وہ؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "ویسے سنا ہے صاحب جی، یہ میم صاحب لوگ جو ہے بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ اس پر ہمارے لوگوں کو بھروسا نہیں کرنا چاہیے بالکل بھی۔ یوں آپ مالک ہیں جناب، ہم آپ کو کیا بول سکتا ہے؟"

وہ سیدھا سادا آدمی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ لزی میری بیوی ہے اور وہ میری غیر حاضری میں مجھ سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔ وہ اپنی دانست میں ایسے الفاظ میں مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جن کا میں برا نہ مناؤں۔ میں نے کہا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو، تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جب تک کسی کو اپنی آنکھ سے برائی میں مبتلا نہ دیکھو، محض اندازہ لگا کر اس کے بارے میں کوئی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ سمجھ گئے نا میری بات؟ اب جاؤ گیٹ بند کر کے اپنی جگہ جا کر بیٹھو۔"

میں آبی کا ہاتھ تھام کر اسے بنگلے میں لے گیا۔ آبی بولا۔ "یہ دربان شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ لزی تیری بیوی ہے۔"

"ہاں، یہی خیال ہے اس کا۔ بے چارہ سیدھا سادا ہے۔ لزی کو گھر سے غائب دیکھ کر یہی سوچا ہوگا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔"

"اس میں اس کا کچھ قصور بھی نہیں ہے۔ اس کی جگہ جو بھی ہوگا، یہی اندازہ قائم کرے گا۔" آبی نے کہا۔

"ہاں یار، چھوڑ ان بے کار باتوں کو۔ اس رات اور دن کی بھاگ دوڑ نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔ میں اب غسل کر کے سونے جا رہا ہوں۔ تو بھی چلا جا اس ساتھ والے کمرے میں۔" میں نے اسے اپنے بیڈ روم کے برابر والا کمرہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "کمرے میں اٹیچ باتھ موجود ہے۔ جا کر غسل کر لے اور بستر میں گھس جا تو بھی۔ تیری بھی حالت مجھ سے کچھ کم خستہ اور خراب نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "مجھے تو تو فردوسی بیگم کے مرقد میں ہی چلا جانے دے اب۔ وہاں میں سکون سے اپنی نیند پوری کر لوں گا۔"

"اوئے، یہ کیا چکر ہے بھئی؟ کیا اس تکریم احمد کی جانشینی کے خواب تو نہیں دیکھنے لگا ہے تو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں یار، تو غلط سمجھا ہے۔ تکریم احمد کی جانشینی تو تجھے ہی زیب دیتی ہے، تیری بڑی یاری تھی اس سے"

"اور پھر کیا رکھا ہے وہاں جس کی کشش تجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اوئے بڑا بدذوق ہے بھئی تو۔ سالے وہ گل و گلزار بیگم یاد نہیں رہی تجھے؟ اسے کوئی اتنی آسانی سے تو نہیں بھول سکتا نا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اس کی گل بدنی تیری آنکھوں میں بھی سمائی ہوئی ہے، مگر بیٹے، یہ پتا ہے تجھے کہ ایک بہت بڑے افسر نے اسے اس فلیٹ میں لے جا کر سجایا ہوا ہے۔ اگر اسے بھنک بھی مل گئی تیری، تو سالے حشر نشر کر دے گا وہ تیرا"

"کیا کہتا ہے تو؟ وہ وہاں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی ہی رہتی ہے۔ میں نے تو کسی آدمی کا سایہ تک نہیں دیکھا ان کے فلیٹ میں۔"

"اچھا، اور فردوسی نے بھی کچھ نہیں بتایا تجھے اس کے بارے میں؟ حیرت کی بات ہے یہ۔ میرا خیال ہے اس نے تیری نگاہوں کے زاویوں کو سمجھا نہیں ہوگا۔ تیری آنکھوں میں اس محشر بداماں کا پیکر اسے نظر نہیں آیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے تجھے اس میں دلچسپی لینے سے روکنے کی خاطر کوئی کہانی گھڑ دی ہو اس کے بارے میں۔"

"اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ یہ خیال کیسے آیا تیرے دل میں؟"

"اس لیے کہ میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ تجھے تکریم احمد

کی جگہ دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔" آبی مسکراتے ہوئے بولا۔
"ایسی بے وقوف نظر نہیں آتی ہے وہ مجھے۔ جان بوجھ کر کوئی بھی کنوئیں میں چھلانگ لگانا پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی تیرا اندازہ درست ہو یا غلط تیرے لیے احتیاط ہر حال میں لازم ہے۔ تجھے ہر اس راستے سے بچ کر گزرنا ہے جہاں تیری آزادی کو خطرہ ہو۔"
"ہاں، یہ بات تیری ٹھیک ہے کسی حد تک احتیاط کا دامن بہر حال ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"
"بس تو پھر چل اب اُدھر چلا جا، اس کمرے میں اور اپنے آپ کو تازہ دم رکھنے کی کوشش کر۔ امن و امان ہمارے مقدر میں لکھے نہیں گئے ہیں ابھی۔ فرصت کا جو لمحہ میسر آجائے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے ہمیں۔" میں نے اُسے کمرے میں دھکا دے کر دروازہ بھیڑ دیا۔
حلیہ میرا نہایت ہی خراب اور خستہ تھا مگر مجھے اس کی فکر زیادہ اس لیے نہیں تھی کہ یہ میرے لیے کوئی نئی اور اہم بات نہیں تھی۔ میں اکثر اس سے بھی زیادہ بُری حالت میں پھرتا رہا تھا۔ میری سج دھج کبھی دیرپا نہیں رہی تھی لیکن فی الوقت چونکہ کوئی اہم مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا میں نے مناسب جانا کہ سونے سے پہلے اپنے آپ کو انسانوں کی شکل میں لے آؤں۔ چنانچہ میں نے الماری میں سے لباس نکالا اور غسل خانے میں جا گھسا۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد جسم خاصا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ناشتا ہم نے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں کر ہی لیا تھا۔ اس لیے غسل کرنے کے بعد سیدھا بستر میں جا گھسا۔
دوپہر ڈھل چکی تھی جب آبی نے مجھے بُری طرح جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ میں نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولے بغیر دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا "کون ہے بھئی؟ کیا مصیبت آگئی ہے؟ سونے دے بھائی! زلزلہ تو نہیں آگیا ہے نا کوئی؟"
"اوئے زلزلہ ہی آگیا ہے، تو اٹھ کے باہر تو چل میرے یار۔ بڑی مشکل سے روکا ہے میں نے اُسے۔ دیر کر دی تو وہ زلزلہ خان اِدھر ہی گھس آئے گا۔ اٹھ یار، جلدی کر۔" مجھے آبی کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک دم چونک کر آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
میں نے آبی کی شکل تکتے ہوئے پوچھا "کیا کہہ رہا ہے؟ کس زلزلہ خان کے گھس آنے کی بات کر رہا ہے تو؟"
"پتا نہیں یار، میں تو حیران ہوں، کس کس جنگل کے جانوروں سے دوستی لگالی ہے تُو نے اس دوران میں۔ میں تو جانتا تک نہیں ہوں اُسے۔ یوں لگتا ہے جیسے بندرابن سے نکل کر سیدھا اِدھر ہی بھاگا چلا آیا ہے۔ جی تو چاہتا ہے اس کے گلے میں رسہ ڈال کر کسی کھونٹے سے باندھ دوں، پھر پوچھوں، اب بتا، جنگل کا بھاگا ہوا کون سا جانور ہے تو؟"
میں نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا "ایک تو تیری ... کے بربک ہر وقت فیل رہتے ہیں۔ جب چل پڑتی ہے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ میں پوچھتا ہوں کوئی نام بتایا ہے اس نے اپنا ... کرائی ہے کچھ اپنی؟"
"نام تو مجھے لگتا ہے رکھا ہی نہیں گیا ہے اس کا۔ ... کیا وہ مجھے۔ پہچان کے طور پر اپنا تعلق ظہیر احمد سے ظاہر کر ... کہتا ہے جلدی سے غلام جیلانی کو میرے سامنے کر دو نہیں ... کراچی شہر کو اُلٹ کے رکھ دوں گا۔ یہ ظہیر احمد وہی تو نہیں ہے ... جس نے میری آنکھوں کے دیے بجھانے کے سلسلے میں اہم ... ادا کیا تھا، جس کی قید سے تو نے نکالا تھا مجھے؟"
"اس کے سوا کسی اور ظہیر احمد کو میں جانتا تک نہیں ... اسی کا بھیجا ہوا لگتا ہے یہ مجھے۔ وہ فون کر کے پوچھتا بھی رہا ... کل دن بھر۔ دربان نے بتایا نہیں تھا صبح۔ آؤ دیکھوں میں کیا ... ہے وہ۔ پستول لے لینا اپنا، شاید ضرورت پڑ جائے اس کی۔"
نیند اب میری آنکھوں سے بالکل اُڑ چکی تھی اور بدن میں سستی یا کسلمندی بالکل نہیں رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نیند میرے قریب سے کبھی نہ گزری ہو۔ میں اور آبی آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ قد کاٹھ میں وہ میرا ہم پلّہ دکھائی دیتا تھا۔ چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی اور لمبی لمبی اُوپر اٹھی ہوئی مونچھیں پال رکھی تھیں اس نے، آنکھیں اس کی جنگلی کبوتر کی طرح سُرخ تھیں جن سے شرارے چھوٹتے محسوس ہوتے تھے۔ کمرے میں قدم دھرتے ہی وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے غرّانے کے انداز میں بولا "تم ہے غلام ...؟"
میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا اور اس کے سراپا پر نظریں دوڑاتے ہوئے اسی کے انداز میں بولا "ہاں، میں ہی غلام جیلانی ہوں، تم کون ہو؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟"
"اس بندر کی شکل نے بتایا نہیں تم کو، ہم کون ہے؟" اس نے آبی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔
آبی میرے قریب ہی آ ٹھہرا تھا۔ اس کی اس بات نے آبی کی کھوپڑی اُلٹ دی۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا "سالے افریقی ... مجھے بندر کی شکل کہتا ہے۔ تو اس طرح نہیں مانے گا ... کی زبان سمجھنے والوں میں سے لگتا ہی نہیں ہے تو مجھے ..." اس نے دوسرا ہاتھ گھمایا۔
وہ جس نے ہماری کچھار میں گھس کر ہمیں للکارنے کی جرأت کی تھی، ایسا نہیں تھا کہ آبی سے ایک ہاتھ کھا لینے کے بعد دوسرا ہاتھ مارنے کا موقع بھی فراہم کر دیتا۔ چنانچہ اس بار آبی کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔ اس نے جھکائی دے کر آبی کا بازو پکڑ لیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے اپنی پشت پر لے کر آگے اُلٹ دیا۔ آبی اس کے اُوپر سے ہوتا ہوا اس کے سامنے آکر چت گرا تھا۔ ہاتھ اس کا اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔ آبی کے زمین سے لگتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اپنا دایاں پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا مگر آبی نے اسے کسی شدید قسم کی کارروائی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ لیٹے ہی لیٹے اپنے نچلے دھڑ سے اُوپر اچھلا اور دونوں ٹانگیں اس کی گردن میں ڈال کر اسے پورے زور سے اُلٹ کر زمین پر دے مارا۔ اس کے گرتے ہی آبی تڑپ کر اٹھا مگر اس کے مقابل نے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں ایسی ہی تیزی دکھائی تھی۔ دونوں اٹھتے ہی خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹے۔ آبی کا خیال تھا وہ نیچے گرا ہوا ہے لہٰذا وہ پوری طرح اٹھنے کے بجائے آگے جھکے جھکے ہی اس پر جا پڑنے کے ارادے سے اس کی طرف لپکا تھا اور یہی حکمت عملی اس کے کام آگئی۔ اس کا مقابل زیادہ پھرتیلا تھا سو سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب وہ دونوں اندھا دھند اپنے زور میں متصادم ہونے کو جھکے ہونے کی وجہ سے آبی کا سر پورے زور سے اپنے مقابل کے سینے میں جا گھسا۔ آبی اسے کسی بھینسے کی طرح رگیدتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس زوردار ٹکر نے اس کے مقابل کے قدم پہلے ہی اکھاڑ دیے تھے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش میں دونوں ہاتھ فضا میں چلاتا ہوا پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا۔ آبی نے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے دیوار کے ساتھ لگا کر اس کے پیٹ میں دو زوردار ٹکریں اور لگا دیں۔ اس کے مقابل کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ آبی کے اس حملے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ آبی اُسے چھوڑ کر الگ ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا کر دُہرا ہو گیا۔
آبی نے اُسے گھورتے ہوئے کہا "ہاں میرے بچے! اب جیلانی کے سوال کا جواب دے دے تو، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، تیری زبان بالکل سیدھی چلنا چاہیے، اگر ذرا بھی پٹری سے اُتری تو سمجھ لے اس بار زبان باہر کھینچنے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گا۔ یہ کام میں کر سکتا ہوں یا نہیں یہ تُو نے دیکھ ہی لیا ہے ابھی۔"
عین اسی لمحے لزی کمرے میں قدم دھرتے ہوئے بولی۔ "کیا ہو رہا ہے جناب عالی؟" پھر اس کی نظر آبی اور ظہیر احمد کے بھیجے ہوئے شخص پر پڑی تو وہ چونک کر بولی "اوہ، یوں لگتا ہے جیسے یہاں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے جناب عالی؟"
"کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے یہ دونوں لڑ نہیں رہے تھے۔ دراصل یہ ظہیر احمد کا پالتو جانور بھونک رہا تھا، اس لیے آبی نے اسے انسانوں کی زبان سکھانے کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھیں، کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اسے۔" میں نے جواب دیا۔
"اچھا! مگر یہ بھونک کیوں رہا تھا آخر؟ کیا یہ لوگ اپنے اس رستم زماں جانو کے انجام سے کوئی عبرت نہیں پکڑ سکے ہیں؟"
"عبرت پکڑنے والے دوسری ہی نسل کے ہوتے ہیں، ان کی نسل وہ نہیں ہے۔" آبی ہنستے ہوئے بولا۔
"بکواس نئیں کرو اوئے، تم لوگ جانتے نہیں ہو ہم کو، ہمارا ڈسا ہوا تو پانی نہیں مانگتا ہے۔ ایسے ہی تو لوگ ہم کو شیش ناگ نہیں بولتے ہیں۔ جانو کا بدلہ ہم ضرور لے گا تم سے جیلانی کا بچہ! بچ نہیں سکے گا تم ہم سے۔" وہ غصے سے بھڑک کر بولا۔
"تو تم جانو کا بدلہ لینے آئے ہو یہاں، وہ بھی جیلانی سے؟ تمہارا خیال ہے جانو کو جیلانی نے مارا ہے؟" لزی بولی۔
"اس میں خیال کا کون سا بات ہے میم صاب! سب کو پتا ہے جانو کو کس نے مارا ہے۔" شیش ناگ سیدھا ہو کر بولا۔
میں نے طنزیہ انداز میں کہا "اوئے ہوش کی بات کر یار۔ ہم لوگ زنانیوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے کبھی۔ اس جانو کو میں نے نہیں، اس میم صاحب نے ہی ٹھکانے لگایا تھا۔ تجھے کسی نے غلط بتایا ہے۔ جو آدمی انگلی لگانے سے مر سکتا ہو اُسے ہم لاٹھی سے نہیں مارا کرتے۔"
"بک نئیں اوئے، میرا یار اتنا کمزور ایسا موم کا بنا ہوا نہیں تھا جسے یہ میم صاب مار سکے۔" وہ دہاڑا۔
"میں تو تیرا ابھی جھٹکا کر سکتی ہوں، جانو کیا چیز تھی، تجھے اگر کچھ زعم ہے اپنے اوپر تو آجا، نکال لے اپنی حسرت۔" لزی بولی۔
"ورنہ خاموشی سے چلا جا یہاں سے اور آئندہ کبھی اِدھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمیں بار بار معاف کرنے کی عادت نہیں ہے۔"
وہ غصے سے لزی کو گھورتے ہوئے بولا "دیکھو میم صاب! ہم تم کو رسانیت سے بولتا ہے، تم ہمارے بیچ میں نہ پڑو۔ عورت ذات کو مرد لوگوں کے جھگڑے میں نہیں بولنا چاہیے۔ ہم لوگ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ہم کو غصہ نہیں دلاؤ تم۔"
"یہی بات میں بھی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں تمہیں۔ اب دیکھو نا، عورتوں سے لڑنے میں تمہاری توہین ہے اور مردوں سے تم مقابلہ کر نہیں سکتے۔ پھر کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے اور ظہیر احمد سے کہو اگر اس میں ہمت ہے تو خود آئے جیلانی کے مقابل، کرائے کے آدمیوں کو مروانے سے کچھ نہیں ملے گا اُسے۔"
"بکواس نہیں کرو میم کی بچی! میں نے بہت لحاظ کیا ہے

تیرا۔ جانو یار تھا میرا جگری یار، کرائے کا آدمی مت بولو مجھے۔ میں اس کا بدلہ لیے بنا واپس نہیں جا سکتا۔ ابھی تم زیادہ اڑی تڑی کرے گی تو تمہارا ابھی فریم ٹیڑھا کر دوں گا میں۔"

اس نے یہ کہتے ہی اچانک مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ خیال اس کا یہی رہا ہوگا اس گھڑی کہ میں اس کی اور لزی کی نوک جھونک میں محو ہو کر اس کی طرف سے غافل ہو چکا ہوں مگر اس کا یہ اندازہ غلط ہی تھا۔ میں اس تمام عرصے میں ایک پل کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کے چھلانگ لگاتے ہی میں نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر وہ جگہ چھوڑ دی جہاں اس کے چھلانگ لگاتے وقت کھڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس نے اس جگہ پہنچ کر اپنے قدم زمین پر جمانا چاہے تو وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ نیچے گرا۔ اس کی پھرتی اور چستی حیرت انگیز تھی۔ بے شک وہ ایک تجربے کار شخص تھا اور لڑتے ہوئے خود کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھتا تھا جس طرح غیر متوقع طور پر میں نے اس کی کمر پر لات مار کر اسے زمین بوس کیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا ماتھا، ناک اور ہونٹ زمین سے ٹکرا کر ضرور زخمی ہو جاتے لیکن اس نے گرتے گرتے اچانک اپنے دونوں ہاتھ سامنے کر کے اپنا چہرہ زمین پر لگنے سے بچا لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ زمین سے لگتے ہی وہ لوٹ لگا کر فوراً اس جگہ سے ہٹ گیا تھا جہاں گرا تھا۔ اگر میں یا کوئی اور اُسے گرتے دیکھ کر اس پر جا پڑنے کی حماقت کر بیٹھتا تو یقیناً اس کی جگہ زمین پر پڑا ہوتا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر اپنے پیروں پر کھڑا کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اُسے غصہ دلانے کے خیال سے تضحیک آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح غراتے کے انداز میں بولا" ایک بار میرے ہاتھ آ گیا تو یوں مسکرانا بھول جائے گا۔"

اس نے اپنی قمیص کے دامن کے نیچے دونوں ہاتھ ڈال لیے اور پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں بہت غور سے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر اس نے ہماری طرف سے تھوڑا سا رُخ موڑا، بس ایک لمحے کے لیے رُخ پھیر کر وہ دوبارہ سیدھا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ بھی باہر نکل آئے تھے۔ اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اب اس کے دائیں ہاتھ پر ایک ایسا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس کی پانچوں انگلیوں میں شیر کے پنجے کی شکل کے کوئی ایک ایک انچ لمبے نوکیلے فولادی ناخن چمک رہے تھے۔ صورتِ حال بہت خوف ناک ہو گئی تھی۔ اب اگر وہ ایک بار بھی اس پنجے کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا حلیہ بگڑ جانا یقینی تھا۔ ایک ایک انچ لمبے نوکیلے یہ ناخن جسم کے جس حصے میں پیوست ہو جاتے، وہاں سے کم از کم آدھا سیر گوشت تو ضرور ہی نوچ لاتے اور اگر چہرے یا سینے پر اس کا وار پڑ جاتا تو میرے عبرت ناک انجام پر دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے۔ میری نظریں اس کے دائیں ہاتھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں اس کی ہر حرکت کا پلکیں جھپکائے بغیر نہایت ہوشیاری سے جائزہ لے رہا تھا۔

وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے دونوں ہاتھ مجھے گھیرنے کے انداز میں پھیلائے پنے تلے قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اس طرح بڑھتے دیکھ کر آبی اور لزی بھی ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ان کی کوئی حرکت مجھے ان کی طرف متوجہ کر کے اس خونخوار شیش ناگ کی طرف سے غافل نہ کر دے۔ وہ کسی فیلِ مست کی طرح جھومتا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں نے سوچنے سمجھنے کی کچھ اور مہلت حاصل کرنے کے ارادے سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ مجھے پیچھے ہٹتے دیکھ کر اس نے ایکدم دو قدم تیزی سے آگے بڑھ کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے آگے بڑھتے ہی میں نے بھی چیتے کی طرح جست لگا کر اپنی جگہ چھوڑ دی تو اصولی طور پر مجھے اس سے بچنے کے لیے اس کے خالی ہاتھ کی طرف جانا چاہیے تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ میں اسی طرف جاؤں گا لہٰذا وہ اسی انداز میں مجھ پر جھپٹا تھا کہ بائیں ہاتھ سے مجھے روک کر دائیں ہاتھ کا پنجہ میرے جسم میں پیوست کر سکے لیکن میں نے اس کی توقع کے برعکس دائیں ہاتھ کی جانب جھکائی دے کر اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ ایک بار دشمن کی کلائی میرے ہاتھ میں آ جانے کے بعد اس کا سلامتی کے ساتھ میری گرفت سے آزاد ہو جانا اس وقت تک ممکن نہیں رہتا تھا جب تک میں خود ایسا کرنا نہ چاہوں۔ چنانچہ کلائی تھامتے ہی میں نے اس پر اپنے مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا۔ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے پورے زور سے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کے اس عمل نے میرا کام آسان کر دیا۔ جھٹکا لگتے ہی کڑک کی آواز کے ساتھ اس کی کہنی کا جوڑ کھل گیا تھا۔ عین اسی وقت آبی نے اس کی کمر پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ کسی مُردہ چھپکلی کی طرح دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا اور زمین پر لوٹتے ہوئے اپنا اُکھڑا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا کر ہائے ہائے کرنے لگا۔

لزی نے اسے تڑپتے مچلتے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھا جنابِ شیش ناگ صاحب! میں اسی لیے کہہ رہی تھی ان لوگوں کے منہ نہ لگو، یہ تمہارے بس کے نہیں ہیں۔ تم جیسا شیش ناگ کیسے کی طرح مارا گیا نا ان کے ہاتھوں؟"

میں نے اس سے کہا" اگر تیرے ارمان نکل گئے ہوں میرے ویر، تو اب اٹھ کے دوڑ لگا جا اس ظہیر احمد کی طرف اور اسے کہہ دے، اب اس کی حیاتی کے دن مُک چکے ہیں اور ہم بہت جلد اسے دوسرے جہان پہنچا دیں گے۔"

آدمی وہ خاصا سمجھ دار تھا۔ میری بات سُن کر اس نے زمین سے اُٹھنے میں ذرا دیر نہیں کی تھی اور اپنے ناکارہ ہاتھ کی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھامے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ لزی اس کے جانے کے بعد مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی" واہ جنابِ عالی! آپ نے تو کمال ہی کر دیا اس وقت۔ سچ پوچھیں تو اس کے ہاتھ میں پنجہ دیکھ کر میں پریشان ہو گئی تھی۔ اگر اس کا ایک بھی وار کارگر ہو جاتا تو... اُف میرے خدا! میرے تو اس تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔"

"یہ سب وقت کی بات ہوتی ہیں لزی بیگم۔ اس گھڑی وقت ہم پر مہربان ہے، بگڑے ہوئے کام بھی آسانی سے بن جاتے ہیں۔ جس روز اس نے تیور بدل لیے، ہمیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ یہ جو ہم قدم قدم پر دشمنیاں بوتے چلے آ رہے ہیں، یہ فصل جب کٹنا شروع ہو گی تو ہماری حالت قابلِ عبرت ہو گی۔ لوگ کان پکڑ پکڑ کر توبہ کریں گے ہمیں دیکھ دیکھ کر۔"

لزی بولی۔" میں نے واپس آتے ہوئے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ایک سرخ رنگ کی کار کھڑی دیکھی تھی۔ اس کی عقبی نشست خالی تھی اور اگلی دونوں نشستوں پر دو بدمعاش صورت شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں ہمارے بنگلے کے گیٹ پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس وقت تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید یہ دونوں بنگلے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں اُن کے قریب سے اس طرح گزر آئی تھی جیسے میں نے انہیں دیکھا ہی نہ ہو۔ سوچا میں نے یہ تھا اُن کے بارے میں کہ بنگلے میں پہنچتے ہی جیرالڈ کو فون کر کے ان دونوں کے بارے میں بتاؤں گی اور کہوں گی کہ انہیں اور بنگلے کے اردگرد موجود ہر اس شخص کو جس پر اس بنگلے کی نگرانی کا شبہ بھی ہو اپنی نگاہ میں رکھے اور تعاقب کر کے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرے، یہ بھی پتا کرے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے انہیں اس کام پر لگایا ہے اور خود ان کی ڈور تھامے ہماری نگاہوں کی پہنچ سے بہت دور کہیں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ دونوں اس شیش ناگ ہی کے ساتھی تھے اور اسی کے انتظار میں وہاں بیٹھے تھے۔"

"ہاں، لگتا یہی ہے مجھے بھی۔ سبھی وہ کمزور پڑتے ہی فوراً بھاگ کھڑا ہوا تا کہ باہر موجود اس کے ساتھی اسے سلامتی کے ساتھ نکال لے جائیں۔ آؤ دیکھیں، ممکن ہے گیٹ پر دربان نے اسے روک لیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ان باہر والوں کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔" میں آگے بڑھا۔

" اوئے چھڈ یار جیلانی! مٹی پا ذلیلوں پہ۔ گیٹ پر کسی نے نہیں روکا ہوگا اُسے۔" آبی بولا۔

"کیوں بھئی، کیوں نہیں روکا ہوگا اس کو دربان نے؟ اسے وہاں بٹھایا اور کس کام کے لیے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کے بندے تیرا دماغ بالکل ناکارہ ہو چکا ہے کیا! اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی، دربان کو اگر روکنا ہوتا تو یہ تو وہ اندر ہی کیسے آ سکتا تھا؟ انھوں نے اسے پہلے ہی گٹھری بنا کر ڈال دیا ہوگا کسی کونے میں۔ یقین نہیں ہے تو جا کر دیکھ لو۔" آبی نے جواب دیا۔

اس کی یہ بات معقول ہی لگتی تھی مجھے لہٰذا میں تیزی سے باہر کی طرف لپک پڑا۔ لزی اور آبی نے بھی میری تقلید کی۔ ہم تینوں تقریباً دوڑتے ہوئے مین گیٹ تک پہنچے لیکن وہاں دربان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا، میں نے آگے بڑھ کر گیٹ سے باہر گلی میں نظریں دوڑائیں تو مجھے وہ سُرخ کار نظر آ گئی جو تیزی سے مین روڈ کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ گلی کا موڑ گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لزی بھی اس دوران میرے قریب ہی آ ٹھہری تھی۔ وہ بولی:" یہ وہی کار تھی جنابِ عالی جو کچھ دیر پہلے یہاں کھڑی تھی۔"

"ہوں۔" میں نے واپس پلٹتے ہوئے کہا" آؤ پہلے ہمیں دربان کو تلاش کرنا ہے۔ کہیں اُسے مار ہی نہ دیا ہو ان رذیلوں نے۔"

میری نظر آبی پر پڑی۔ وہ گیٹ کے دائیں جانب بنے دربان کے کیبن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ہمیں گیٹ سے ہٹ کر اُدھر بڑھتے دیکھ کر بولا" اِدھر کیبن میں آ کر خود دیکھ لو اپنی آنکھوں سے۔ اسے پارسل بنا کر یہاں ڈال رکھا ہے، ان لوگوں نے۔"

میں اور لزی تیزی سے کیبن کے دروازے پر پہنچے۔ آبی نے ایک طرف ہو کر ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ دربان کو اس ذلیل شیش ناگ نے رسّی سے جکڑ کر کیبن کے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا لیکن آنکھیں اس کی پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر اس نے عاجزی سے 'اوں اوں' کرتے ہوئے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی طرف اشارے کرنا شروع کر دیے۔ شاید وہ ہم سے اپنے جکڑ بند کھولنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ منہ پر ٹیپ چپکا ہونے کی وجہ سے اس کی زبان سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ لزی نے آگے بڑھ کر ٹیپ اس کے منہ سے نوچ کر الگ پھینک دیا۔ میں نے جلدی جلدی اُس

کے سارے جکڑ بند کھول کر اُسے آزاد کیا۔ بندشوں سے آزاد ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے سر کے پچھلے حصے کو ٹٹولتے ہوئے بولا "سالا ذلیل لوگ، کا پھر کا بچہ! دھوکے سے ہمارے سر پر وار کرکے ہم کو گرا دیا۔"

میں نے پوچھا "ہوا کیا تھا؟ گیٹ تو بند رہتا ہے، پھر کیا وہ گیٹ کے اُوپر سے چڑھ کے اندر آیا تھا؟"

"نہیں صاب جی! ایسی حرکت کرتا وہ تو ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیتا نیچے آنے سے پہلے ہی، مغز کھول دیتا اس کا۔ اس نے اُدھر باہر سے گیٹ کھڑکایا تھا۔ بولتا تھا، پیاس لگی ہے تھوڑا پانی پلاؤ ہم کو۔ ہم نے چھوٹا گیٹ کھول کے بولا، اندر آجاؤ اور اس کے واسطے پانی نکالنے لگا — بس اتنا ہی غلطی کیا تھا ہم نے صاب کہ اس پر یقین کرکے گیٹ کھول دیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی بے خبری میں کوئی چیز ہمارے سر پر مار دیا اور ہم چوٹ کھا کے گر گیا۔ تھوڑی دیر ہم کو ایسا لگا جیسے ہم مر چکا ہے۔ پھر ہوش آیا تو اِدھر بندھا پڑا تھا۔ خدا کا شکر ہے آپ لوگ ہوشیار تھے۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا صاب؟"

"نہیں یار! وہ ہمارا کیا نقصان کرتا، خود اپنا ہی نقصان کرنے آیا تھا اِدھر، اور وہ کرکے چلا گیا۔ تم فکر نہ کرو کوئی، اور آئندہ کوئی کچھ بھی کہے، کسی کے لیے ترس کھا کے گیٹ نہ کھولنا۔ آئی سمجھ؟"

"ہاں صاب، سمجھ گیا۔ اب تو کوئی مرتا بھی ہوگا، جب بھی ہم گیٹ نہیں کھولے گا اس کے واسطے۔"

میں آبی اور لزی کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آگیا۔ آبی ایک صوفے میں دھنستے ہوئے بولا "یار! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہ آیا تو اِدھر شیروں کی طرح تھا۔ اس کی تن پھن دیکھ کر میں تو یہی سمجھا تھا کہ آج کسی شیر نر سے سامنا ہو گیا ہے مگر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ چوٹ کھاتے ہی وہ گیدڑوں کی طرح دُم دبا کر بھاگ نکلا۔ ایک لمحے بھی نہیں رُکا پھر وہ۔"

"ممکن ہے وہ اس وقت صرف یہی اندازہ لگانے آیا ہو کہ آپ لوگوں سے مقابلے کے لیے اُسے کتنی طاقت درکار ہوگی۔" لزی بولی۔

"اندازہ ہی لگانا مقصود ہوتا تو یہ کام وہ کہیں سرِ راہ ہمیں روک کر بھی کرسکتا تھا۔ اس کے لیے بنگلے میں گھسنے کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں تھی اسے۔ یہ تو وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ جانو جیسا شہ زور جن کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھا، وہ کوئی معمولی لوگ تو نہیں ہوں گے۔ دراصل غلطی وہ اپنی طاقت کا اندازہ کرنے میں کر بیٹھا تھا۔ اسی لیے اپنی اوقات معلوم ہوتے ہی وہ اپنی جان بچا لے گیا۔"

"یار، یہ ظہیر احمد آخر ہے کیا شے؟ ایسے ایسے خونخوار بھی پال رکھے ہیں اس نے۔ میں اُسے کوئی ایسا ہی کرائے کا ٹٹو سمجھا تھا، میرا خیال تھا ڈاکٹر دھمن جیسے اس کے ذریعے چھوٹے موٹے فراڈ کرکے یا اسے چارہ بنا کے اس کے لیے روزی کا انتظام کر دیتے ہیں لیکن لگتا یوں ہے جیسے وہ کوئی مجرموں کی باقاعدہ انجمن چلا رہا ہے اور بھانت بھانت کے جرائم پیشہ لوگ اس کی زنبیل میں ہر گھڑی پڑے رہتے ہیں اور جہاں جس کی ضرورت ہوتی ہے، اسے نکال کر سامنے رکھ دیتا ہے۔" آبی نے کہا۔

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کہا ہے آبی۔ وہ یہاں ایک ایسی ہی انجمن چلا رہا ہے۔ اسے دھمن نے تیرے خلاف استعمال کرنے کا مناسب معاوضہ دیا تھا۔ لیکن اب وہ معاوضہ اس کے حلق میں اٹک گیا ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے پیسے کمانے کے چکر میں بے سوچے سمجھے شہد کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔ اس کا یہ عمل جان کا عذاب بن کے رہ گیا ہے اس کا۔" میں نے کہا۔

"یہ کچھ مناسب نہیں ہے جناب عالی! آپ کو ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں اُلجھ کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی آپ کو کئی بڑے بڑے کام نمٹانا ہیں۔ بہت سے اہم معاملات آپ کی توجہ کے طالب ہیں لیکن آپ کی جان ان ہی چکروں سے نہیں چھوٹ رہی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کراچی آنے کے بعد آپ کو ایک دن بھی ایسا نہیں مل سکا ہے جب آپ تنظیم کے معاملات پر توجہ دے سکے ہوں۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لزی لیکن تم یہ بھی دیکھ رہی ہو کہ یکے بعد دیگرے جن حالات کا مجھے سامنا کرنا پڑا ہے، وہ میرے اپنے پیدا کیے ہوئے تو نہیں تھے۔ کراچی کی زمین پر قدم دھرتے ہی حالات کا سیلاب ہمیں بہا کر لے گیا اور اب تک مجھے پاؤں جمانے کو زمین نہیں مل سکی ہے۔ ایسے میں تم خود بتاؤ میں کیا کروں۔ تقدیر میرے ساتھ ہمیشہ یوں ہی آنکھ مچولی کھیلتی رہی ہے۔ کبھی کسی ایک راستے پر زیادہ دور تک چل نہیں سکا ہوں میں۔ ہر راہ مجھے بھٹکا کے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے اور میں حیران و پریشان کھڑا بس سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ میں کہاں جانے کے ارادے سے نکلا تھا اور کہاں پہنچ گیا ہوں۔" میں نے جواباً کہا۔

"ہاں یار جیلانی! یہ تو بڑی عجیب بات ہو رہی ہے ہمارے ساتھ۔ ہم اس دنیا کی بھول بھلیّوں میں پھنس کر رہ گئے۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں مل رہا ہے۔ جس راہ پر پاؤں دھرتے ہیں اس کا اختتام دار پر ہی ہوتا نظر آتا ہے۔" آبی نے میری تائید کی۔

لزی کچھ دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہی، پھر بولی "میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جناب عالی!"

"جو کچھ کہنا ہے بے فکر ہو کر کہو۔ آبی اور جیلانی کوئی دو آدمی نہیں ہیں چنانچہ جو بات کرنا ہے آبی کے سامنے ہی کرلو، کیوں کہ دنیا کے کسی ویران ترین گوشے میں بھی تم جو کچھ مجھ سے کہو گی، وہ سارا کا سارا، لفظ بلفظ آبی کے کانوں تک پہنچ جائے گا۔ لہٰذا کوئی احتیاط بے کار رہی ہے اس سلسلے میں۔ ہاں، کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

لزی نے ذرا حیران ہو کر آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا "تو کیا آپ کوئی کام بھی آبی صاحب کے علم میں لائے بغیر نہیں کرتے ہیں؟"

"نہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو کچھ کریں، اس کے بارے میں پہلے سے ایک دوسرے کو آگاہ کر دیں۔ البتہ جب بھی موقع ملتا ہے، اپنی اپنی کارگزاری سے ایک دوسرے کو باخبر کر دیتے ہیں۔ کوئی راز ہمارے درمیان راز نہیں رہتا ہے کبھی بھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے آپ نے سان فرانسسکو میں ہونے والے معاہدے کے بارے میں بھی انہیں بتا دیا ہے۔"

"ہاں، یہ اس سلسلے میں بھی ہر بات جانتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں جانتا ہوں۔"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی "حیرت ہے۔ اتنی یگانگت تو میں نے کبھی دو حقیقی بھائیوں میں بھی نہیں دیکھی۔"

"ممکن ہے تمہارے مغرب میں ایسا نہ ہوتا ہو لیکن ہمارے ہاں تو دوستی کا یہی مفہوم ہوتا ہے لزی خانم۔" آبی نے کہا۔

"واقعی، مجھے اتفاق ہے آپ سے۔ آپ دونوں کی دوستی میرے لیے مثالی ہے۔ ایسی دوستی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ بہرحال یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے جناب عالی! آپ جسے چاہیں اپنے رازوں میں شریک کرلیں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس پر۔ اس وقت تک جب تک کوئی بات غلط کانوں تک نہ پہنچے، آپ کو کوئی روکے گا نہیں اس سے۔" لزی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ہاں کسی کو ہم دونوں کے ذاتی تعلق پر اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تم بتاؤ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔"

"جس رات آپ شکارپور کے لیے روانہ ہوئے تھے، اس رات کچھ نامعلوم لوگوں نے بابا صاحب کے آستانے میں گھسنے کی کوشش کی تھی، انہیں پکڑنے کی کوشش کی گئی مگر وہ بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے...."

"اچھا! حیرت ہے۔ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ اور کیوں گھسنا چاہتے تھے وہاں؟" میں نے لزی کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہی تو معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ اگر یہ پتا چل جاتا کہ وہ کون لوگ تھے تو اُن کا مقصد بھی معلوم ہو جاتا۔ اب بابا صاحب نے ہم سب کو حکم دیا ہے کہ ہمیں تین دن کے اندر اندر ان کا سراغ لگانا ہے بلکہ انہیں پکڑ کر بابا صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔"

"ہوں" میں نے کہا "تو آج کل تم جیرالڈ کے ساتھ انہی کے پیچھے بھاگی بھاگی پھر رہی ہو۔"

"ہاں، ہم نے ان تمام لوگوں کو چیک کرلیا ہے جن سے ایسی کسی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی، مگر ان میں سے کوئی اُدھر نہیں گیا۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے وہ تمام لوگ اس رات اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔"

"میرا خیال ہے یہ کام غیر ملکیوں میں سے ہی کسی کا ہو سکتا ہے۔ تمہیں کراچی میں موجود تمام غیر ملکیوں کو چیک کرنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ کوئی ایسا کام تو نہیں ہے جسے مقامی لوگ انجام نہ دے سکیں؟"

"نہیں لزی! مقامی لوگ مذہبی معاملات میں بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ یہاں لوگوں میں بابا صاحب کو جو مقام حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر کوئی مقامی شخص بابا صاحب کو ناراض کرنے یا اس آستانے کی بے حُرمتی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہ بات آپ نے خوب سمجھائی ہے۔ اس طرح ہماری تلاش کا دائرہ سمٹ کر بہت چھوٹا رہ جائے گا اور کامیابی ہمارے نزدیک آجائے گی۔" لزی بولی "اب ہم اسی انداز میں کام کریں گے اور اب آپ کو میرے ساتھ بابا صاحب کے آستانے پر چلنا ہے۔"

"ابھی، اسی وقت" میں نے حیران ہو کر کہا "لیکن یہ اچانک اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی تمہیں؟"

"اچانک نہیں جنابِ عالی! میں تو اس وقت گھر آئی ہی آپ کو لینے کے لیے تھی لیکن یہاں پہنچ کر جس صورتِ حال کا سامنا ہوا تھا اس میں یہ بات کہنا بے وقوفی ہی ہوتی میری۔ اس لیے میں نے اس وقت آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی اچانک اتنے زور سے چیخی تھی کہ میرا بولنے کے لیے کھلا ہوا منہ ایک دم بند ہو گیا۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ چونک کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ دوسری گھنٹی پر میں نے اپنی

جگہ سے اٹھ کر قریب جا کر ریسیور اٹھا لیا۔ میرے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے کسی نے غراتے ہوئے کہا "غلام جیلانی کو بلاؤ۔"

میں نے مہذب انداز میں پوچھا "آپ کون صاحب بول رہے ہیں جناب؟ نام تو بتا دیں اپنا؟"

"میں کہتا ہوں بک بک نئیں کر کتے! جو کہتا ہوں وہ کر، غلام جیلانی کو بلا دے جلدی سے۔ دیر کی تو بنگلے میں کوئی زندہ نہیں بچے گا۔"

"اوہو، کون سورما ہے بھئی تو؟ نام تو بتا دے اپنا، میں جیلانی ہی بول رہا ہوں میرے بچے۔" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا "اوئے رستم کی اولاد! میں خبردار کر رہا ہوں تجھے۔ اب گھر سے باہر نکلے تو بہت محتاط ہو کر نکلنا۔ تیری موت کا حکم صادر ہو چکا ہے مگر بس یہ بھی نہیں چاہتا کہ تجھے بے خبری میں ذبح کر کے ڈال دیا جائے۔ لہٰذا اپنے دفاع کا انتظام رکھنا اور ساتھ ہی کفن دفن کا بھی۔ یہاں قبروں کی کھدائی بہت مہنگی ہے۔ اس شرافت سے کہہ دے کسی گورکن کو بیعانہ دے دے۔"

"شاباش بھئی، موت کے فرشتے بھی اب ٹیلی فون کر کے آنے لگے ہیں، مگر جناب یہ بتا دیں آپ مجھے کہ آپ میری روح قبض کرنے کے لیے میرے گھر سے نکلنے کا انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ کیا یہاں آ کر اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے آپ؟ سنا تو یہ تھا میں نے کہ آپ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

"بکواس نہیں کر کتے! میرا نام ظہیر احمد ہے، میں کتوں کو گھروں سے باہر نکال کر ہی مارا کرتا ہوں سمجھا تو؟" وہ پھر دہاڑا۔

"اچھا، تو یہ آپ ہیں پردہ نشین خاتون۔ شاید وہ لنگڑا لولا ناگ تمہارے پاس پہنچ گیا ہے، مگر یار تو نے اس کے انجام سے کوئی عبرت نہیں حاصل کی۔ اسے دیکھ کر بھی تیرے بھونکنے کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"انجام سے تو لوگ تیرے عبرت حاصل کریں گے۔ میں تو تجھے ڈھیل ہی دیتا رہا ہوں اب تک۔ میرا خیال تھا کوئی ہلکی پھلکی سزا تیرا دماغ درست کرنے کے لیے کافی ہو گی مگر معلوم یہ ہوتا ہے تیرا جی بھر چکا ہے اب اس دنیا سے۔ ٹھیک ہے تیری خواہش آج کل میں ہی پوری ہو جائے گی۔ اب تجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا اپنے انجام کا۔" اس نے ریسیور زور سے پٹخ دیا۔

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد میں نے بھی ریسیور رکھ کر لزی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی "کون تھا؟ بڑی تلخ گفتگو کر رہے تھے آپ، کہیں ظہیر احمد نے تو فون نہیں کیا تھا؟"

"ہاں، وہی تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کہہ رہا تھا باہر ہوشیاری سے نکلوں، اس نے میری موت کا حکم صادر کر دیا ہے۔"

آبی ہنس کر بولا "اوئے، اے کام خدا نے ایہدے سپرد کر دیتا ہویا اے؟"

"کہہ تو وہ اسی انداز سے رہا تھا جیسے آج کل لوگوں کو مارنے کا کام اسے ٹھیکے پر ملا ہوا ہے۔" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"چھوڑیں جناب! لعنت بھیجیں اس پہ۔ میں ابھی جیرالڈ کو فون کر کے اس کا انتظام کرا دیتی ہوں۔ آپ باہر چلنے کی تیاری کریں۔ وہاں ہمارا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہو گا۔" لزی نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے آبی سے کہا "آبی! تو بھی اپنے کپڑے شپڑے بدل لے بھائی، میں تجھے بھی لے چلوں گا اپنے ساتھ۔ اب تو تو بھی ہمارے شانے سے شانہ ملا کر ہی چلے گا، اس لیے تو بھی سب سے مل لے چل کر۔"

"اسی لیے تو کہا تھا میں نے کہ مجھے ادھر فردوسی بیگم کی طرف چلا جانے دے۔ اب یہاں کپڑے کہاں رکھے ہیں میرے۔" آبی بولا۔

"ادھر امریکا سے میں بہت سے سوٹ لے کر آیا ہوں، انہی میں سے کوئی منڈھ لے اپنے اوپر بھی۔" میں نے کہا۔

"سوٹ نہیں اوئے، بالکل چپڑی کا غلام لگوں گا میں تو۔ کوئی پینٹ بشرٹ ہو تو نکال دے مجھے، وہی ٹھیک رہے گی۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ لے جا کر ایک پتلون اور بشرٹ اس کے حوالے کر دی۔ وہ اسے لے کر باتھ روم میں جا گھسا۔ چند منٹ بعد وہ باہر نکلا تو پتلون بشرٹ میں اس کی شان دیکھنے ہی والی تھی۔ یہ لباس اس کے بالکل ٹھیک آیا تھا اور خوب جچ رہا تھا اس کے اوپر۔ اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ لوگ جو اسے ایک قاتل، ڈاکو اور جیل سے بھاگے ہوئے کی حیثیت سے جانتے اور تلاش کرتے پھر رہے تھے، اگر اس گھڑی اسے دیکھ لیتے تو پہچاننے سے انکار کر دیتے۔ میں نے کہا "اس لباس میں تو تیرا روپ ہی بدل گیا ہے یار!"

ہم دونوں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچے تو لزی ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بولی "آئیے جناب عالی، چلیں۔"

ہم باہر آ کر اس کرولا میں جا گھسے جس میں لزی صبح ہمیں

ریلوے اسٹیشن سے لے کر آئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ لزی نے ہی سنبھالی تھی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے بنگلے سے باہر لے آئی۔ چند لمحے بعد ہماری کار تیز رفتاری سے جیل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ جیل کے دروازے کے سامنے سے اس نے کار ناہیر کالونی کی طرف موڑ لی۔ چند ثانیے بعد کار تین ہٹی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تین ہٹی سے وہ لیاقت آباد کے پل پر جا چڑھی۔ پل کے درمیان پہنچ کر لزی نے کہا "جناب عالی! ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

اس کی بات سنتے ہی میں نے اور آبی نے ایک ساتھ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ہمارے پیچھے کاروں، بسوں اور رکشاؤں کا ایک ریلا سا بہا چلا آ رہا تھا۔ اس موج در موج ٹریفک میں کسی ایسی گاڑی کو جس پر ہمارا تعاقب کرنے کا شبہ کیا جا سکے، تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے پیچھے آنے والی کاروں کا جائزہ لیتے ہوئے لزی سے پوچھا "کون سی گاڑی تعاقب کر رہی ہے ہمارا، پیچھے تو بہت سی کاریں ہیں؟"

"ایک نہیں دو کاریں ہیں ہمارے پیچھے۔ ایک تو وہ تیسرے نمبر پر چلنے والی گرے کلر کی ڈاٹسن نظر آ رہی ہے۔" لزی نے عقب کا منظر پیش کرنے والے شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا "دوسری اس سے کچھ پیچھے ایک ٹیکسی کے ساتھ پیلی مزدا ہے۔"

عین اسی وقت میری نظر بھی اس پیلی مزدا پر جا ٹکی تھی۔ وہ وہی مزدا تھی جس کے بارے میں فیروز مجھے بتا چکا تھا۔ اس میں فیروز کے آدمی میری حفاظت کی غرض سے ہمیشہ میرے ارد گرد موجود رہتے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا، فیروز کے کہنے کے مطابق یہ لوگ وقت اور موسم کا لحاظ کیے بغیر ہر گھڑی میرے قریب موجود رہتے ہیں۔ مگر میں نے کراچی سے متصل گاؤں میں لاکھو لاشاری کی حویلی تک اور وہاں سے سکھر تک ایک بار بھی اس کار کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اس دوران انہوں نے کس طرح میری خبر گیری کی ہو گی؟ لیکن یہ وقت اس مسئلے پر دماغ کھپانے کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس دوران ہم لیاقت آباد کے اندر ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں ایک چھوٹا سا گول پارک تھا۔ اس پارک کے چاروں طرف چار سڑکیں مختلف سمتوں کو جاتی تھیں۔ یہاں ٹریفک کا بے پناہ ہجوم تھا۔ لزی نے وہاں پہنچتے ہی تیزی سے اپنی گاڑی بائیں سمت جانے والی سڑک پر موڑ کر اس کی رفتار بڑھا دی۔ چند ہی لمحوں میں ہماری کار خشک ندی کے ایک اور پل پر جا چڑھی۔ میں نے مڑ کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا۔ گرے رنگ کی ڈاٹسن اب بھی ہمارے پیچھے موجود تھی۔ البتہ اس بار فاصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ پل عبور کرتے ہی لزی نے کار جلدی سے ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس علاقے میں دو دو اور تین تین منزلہ خوشنما بنگلے دو رویہ قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی گلیاں بھی تھیں۔ لزی نے اپنی کار کو ادھر ادھر گلیوں میں چکرانا شروع کر دیا۔ چار پانچ گلیوں میں چکر کھانے کے بعد ہم ایک بار پھر مین روڈ پر جا چڑھے لیکن یہ سڑک وہ نہیں تھی جس پر سے گزر کر ہم یہاں آئے تھے۔ یہ گولی مار والی سڑک تھی۔ ہمارے دائیں ہاتھ چورنگی تھی اور سامنے رضویہ کالونی۔ لزی نے چورنگی کی طرف جانے کے بجائے کار کو رضویہ کالونی میں جا گھسایا اور وہاں سے سیدھی سڑک پر کار دوڑاتے ہوئے ایک لمبا سا موڑ کاٹ کے اس سڑک پر نکل آئی جو چورنگی سے سیدھی سائٹ ایریا جاتی تھی۔ اس سڑک پر آنے کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ لزی کی یہ ساری تگ و دو بے کار ہی رہی تھی۔ وہ گرے رنگ کی ڈاٹسن جس سے جان چھڑانے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا، رضویہ کالونی سے نکلنے والی اس سڑک سے ذرا پیچھے ایک طرف کھڑی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی وہ حرکت میں آ گئی۔ اس کار میں ہمارا پیچھا کرنے والے بہت ہی عیار لوگ تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہم بالآخر اسی سڑک پر پہنچیں گے اسی لیے انہوں نے ہمارے پیچھے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنے کے بجائے یہاں آ کر ہمارا انتظار کرنا مناسب جانا تھا اور ان کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔

سائٹ ایریا کی طرف کار موڑتے ہوئے لزی کی نظر اس ڈاٹسن پر پڑی تو وہ بے ساختہ بولی "لعنت ہو تم پر، میں تو سمجھی تھی تم سے اب جان چھوٹ گئی ہے۔ ٹھیک ہے چلو، پہلے تم سے ہی نمٹ لیا جائے۔ جوتے کھائے بغیر تم پیچھا نہیں چھوڑو گے، لگتا یہی ہے مجھے۔"

آبی بولا "دن کی روشنی میں اتنی بھری پری سڑک پر ان سے بھڑنا اچھا نہیں ہو گا۔ پولیس ولیس کا چکر نہ چل پڑے کہیں۔"

میں نے کہا "اتنے بے وقوف وہ بھی نہیں لگتے ہیں مجھے۔ اسی لیے اب تک کوئی کارروائی نہیں کی ہے انہوں نے ہمارے خلاف۔ کسی مناسب موقع اور جگہ کا انتظار ہے انہیں۔ کسی ایسے ویران مقام پر ہمیں گھیرنا چاہتے ہیں وہ جہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہ ہو۔"

"یہ اس ظہیر احمد ہی کے بھیجے ہوئے لگتے ہیں مجھے جناب عالی! آپ نے اندازہ لگایا کچھ ان کے بارے میں؟" لزی نے دریافت کیا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو لزی! اسی کے آدمی ہیں یہ اور اس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے فون پر جو دھمکی دی تھی، اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ بہتر یہی ہے انہیں اپنی حسرتیں نکالنے کا موقع فراہم کر

دیا جائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ممکن ہے اس طرح ان سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے۔ یہ تو جان کو چمٹ کر ہی رہ گئے ہیں۔" لزی بولی۔

ہم اب اس سڑک پر آ گئے تھے جو سیدھی منگھو پیر کی پہاڑیوں میں لے جاتی ہے۔ لزی نے کار کی رفتار اتنی رکھی تھی کہ تعاقب میں آنے والوں کو دشواری نہ ہو اور دیکھنے والے کبھی یہ نہ سوچ سکیں کہ دو کاریں کسی خوف ناک طوفان کی طرح منگھو پیر کی طرف کیوں بھاگی جا رہی ہیں۔ ملوں اور فیکٹریوں کی قطاریں ختم ہونے کے بعد ویرانہ شروع ہوتے ہی ڈاٹسن نے ہماری کار سے آگے نکلنے کی کوشش شروع کر دی مگر لزی نے اس وقت تک اُسے آگے نہیں جانے دیا جب تک بابا اسحاق کے آستانے والی پہاڑی نظر نہیں آئی۔ پہاڑی کو دیکھ کر لزی بولی "لیں جناب عالی! ہوشیار ہو جائیں۔ میں انہیں اپنی پسند کی جگہ تک لانے میں کامیاب ہو گئی ہوں اور اب ان کی گاڑی کو آگے جانے کے لیے راستہ دے رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم انہیں گاڑی آگے لے جانے دو۔ اس کے بعد اپنی کار اس چھوٹی پہاڑی کی طرف موڑ لینا۔" میں نے آستانے والی پہاڑی سے کچھ پہلے پڑنے والی ایک چھوٹی پہاڑی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ادھر کیوں جانا چاہتے ہیں آپ؟" لزی نے اپنی کار کی رفتار کم کر کے اُسے سڑک کے ایک طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس پہاڑی کی اوٹ میں ہی ہم ان سے دو دو ہاتھ کریں گے تاکہ ادھر سے گزرنے والے ہمیں دیکھ نہ سکیں۔" میں نے بتایا۔

لزی نے جیسے ہی اپنی کار ایک طرف کی، ڈاٹسن طوفانی رفتار سے آگے نکلتی چلی گئی۔ اس میں ظہیر احمد کے علاوہ چار افراد اور بھی موجود تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور بقیہ تین عقبی نشست میں دھنسے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی کار جب ہمارے قریب سے گزر رہی تھی تو میں نے ظہیر احمد کو اشتعال دلانے کے لیے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا تھا۔ جواب میں اس نے غصے سے مُکا لہرا کر جو کچھ کہا تھا وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکا مگر یہ یقین ہے کہ اس نے ضرور کوئی گندی سی گالی مجھ تک پہنچانے کی کوشش کی ہو گی جسے تیز ہواؤں اور کار کے شیشوں نے مجھ تک نہیں پہنچنے دیا تھا۔

ڈاٹسن نے آگے نکل کر ہماری کار کے سامنے لہرانا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی رفتار بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ ہمیں رُکنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے اب عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن میں یوں ان سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا جیسے ہی انھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی، لزی نے میری ہدایت کے مطابق کار کچے میں اتار کر پہاڑی کی طرف دوڑا دی۔ وہ اُونچی نیچی زمین اور جگہ جگہ پھیلی ہوئی خود رو جھاڑیوں کی پروا کیے بغیر نہایت مشاقی سے کار مطلوبہ پہاڑی کی طرف لیے جا رہی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ظہیر احمد کی کار سڑک پر رُک گئی تھی۔ انہیں شاید یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ ایک نازک اندام لڑکی ایسے پُرخطر راستے پر کار ڈالنے کی جرأت بھی کر سکے گی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی کار بھی سڑک سے اتر کر ہماری طرف بڑھنے لگی تھی لیکن اس کی رفتار بے حد سست تھی۔ شاید اس کار کے ڈرائیور کو لزی جیسی مہارت حاصل نہیں تھی ابھی۔ مطلوبہ پہاڑی کے عقب میں پہنچ کر میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اِدھر دُور دُور تک کسی جاندار کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میلوں دور مکانات نظر آ رہے تھے لیکن اتنی دور سے ہمارے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پہاڑی کے بالکل نیچے ایک ڈھائی تین فٹ گہرا اور خاصا لمبا چوڑا گڑھا تھا۔ یہاں سے شاید کچھ لوگ ضرورت کے وقت مٹی کھود کھود کر نکالتے رہے تھے۔ میرے کہنے پر لزی نے کار اس گڑھے کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی۔ ہم دونوں اپنے اپنے ہاتھوں میں پستول پکڑ کر کار سے نکل کر اس گڑھے میں اُتر گئے۔ وہاں سیدھے کھڑے ہونے کے باوجود ہم کار کے پیچھے پوری طرح چھپ جاتے تھے۔ پہلے آنے کا ایک یہ فائدہ حاصل ہو گیا تھا ہمیں۔ ہم یہاں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

کوئی دو یا تین منٹ کے انتظار کے بعد ہم کار کے انجن کی ہلکی ہلکی گھر گھراہٹ سن کر چوکنا ہو کے اُدھر دیکھنے لگے جدھر سے وہ آواز آ رہی تھی۔ ہم جس طرف سے آئے تھے انہوں نے اس کی مخالف سمت کا انتخاب کیا تھا۔ شاید انہیں یہ گمان گزرا ہو گا کہ ہم انہیں چکر دے کر نکل بھاگنا چاہتے ہیں، اسی لیے تو اُدھر کا رُخ کیا ہے۔ لہٰذا وہ ہمیں سامنے سے روکنے کی غرض سے اس طرف سے آ رہے تھے۔ پھر اُن کی کار پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس طرف آتے ہی ان کی نظر ہماری کار پر پڑی۔ بیک وقت کئی آوازیں سُنائی دیں "وہ کھڑی ہے ان کی کار۔" پھر کوئی بولا "مگر یہ تو خالی معلوم ہوتی ہے۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔"

اس کے بعد کار کے دروازے بند ہونے کی یکے بعد دیگرے تین آوازیں سنائی دیں۔ پھر ظہیر احمد کی آواز اُبھری "دیکھتے رہیں وہ ہم سے بچ کر۔ یہاں قُرب و جوار میں نہ کوئی آبادی ہے نہ کوئی پناہ گاہ۔ انہیں یہاں چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ دیکھو ادھر کسی ٹیلے یا جھاڑی کے پیچھے نہ چھپ گئے ہوں۔ ذرا ہوشیاری سے قدم بڑھانا۔ اگر وہ مسلح ہوئے تو مصیبت بن جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو باس! ہم انہیں ہتھیاروں سمیت ان پہاڑیوں میں دفن کر کے ہی جائیں گے اب۔ بچ نہیں سکیں گے آج وہ۔"

وہ کار سے اُتر کر مختلف سمتوں میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر ان میں سے کسی کا بھی رُخ ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے سر اٹھا کر ان کی کار کی طرف دیکھا۔ ظہیر احمد کار کے قریب کھڑا اپنے آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی پشت ہماری طرف تھی، مگر وہ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے گھومتا بھی جا رہا تھا۔ میں نے لزی اور آبی کو وہیں کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور اپنی کار کے پیچھے سے گھوم کر ظہیر احمد کے سامنے آ گیا۔ اس کے چاروں ساتھی اِدھر اُدھر جھاڑیوں کے پیچھے جھانکتے پھر رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔ ظہیر احمد کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی جسے کندھے پر رکھے آرام سے کھڑا وہ اپنے آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں پستول سیدھا کیے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی اس کی طرف بڑھائے تھے میں نے کہ اس کے آدمیوں میں سے کسی ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے وہیں سے چلا کر ظہیر احمد کو ہوشیار کر دیا۔ "وہ... اُستاد... وہ ہے... اُدھر..."

ظہیر احمد ایک دم چوکنا ہو کر میری طرف پلٹ پڑا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے نہایت پھُرتی کے ساتھ اپنی اسٹین گن مجھ پر سیدھی کرتے ہوئے کہا "اوہ، تو تم یہاں چھپے ہوئے تھے؟ اچھا ہوا خود ہی باہر آ گئے۔ ورنہ یوں بھی زیادہ چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔ میرے آدمی ان پہاڑیوں کے اندر سے بھی تمہیں کھود کر نکال لاتے..."

میں نے اُسے زیادہ دیر بکواس کرنے کی مہلت نہیں دی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے دیر کر دی تو اُن کے وہ چاروں ساتھی جو ہماری تلاش میں اِدھر اُدھر منتشر پھر رہے تھے یکجا ہو کر اس کے پاس پہنچ جائیں گے، پھر میرے لیے ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ ابھی بڑھکیں مار کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ میرا نشانہ بے خطا تھا۔ گولی سیدھی اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر لگی۔ اسٹین گن پر وہ اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکا، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر الگ جا پڑی اور ظہیر احمد بائیں ہاتھ سے اپنا دایاں ہاتھ پکڑ کر ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون کا پرنالہ سا بہہ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت کے باعث چہرہ اس کا بُری طرح بگڑ کر رہ گیا تھا۔ میں چیتے کی سی جست لگا کے اس کے سر پر جا پہنچا اور جھک کر اس کے ہاتھ سے نکلی ہوئی اسٹین گن اٹھانے کے لیے نیچے جھکا لیکن زخمی ہونے کے باوجود وہ مجھے اسٹین گن اٹھانے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں جیسے ہی نیچے جھکا، اس نے پیچھے سے پوری قوت کے ساتھ مجھے دھکا دے کر میرے پاؤں اُکھاڑ دیے۔ میں دھکا کھا کر آگے بڑھا تو میرا سر اس کی کار کے دروازے سے ٹکرا گیا اور پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر سیدھا ہوتا، میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ظہیر احمد کے کسی ساتھی نے پیچھے سے آ کر اپنے پستول کے دستے سے میری کھوپڑی بجا ڈالی تھی۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا۔ میرے حواس جیسے گم ہونے لگے تھے۔ پھر گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی مجھے اپنے قریب ہی کسی کی کراہ سنائی دی۔ شاید آبی یا لزی میں سے کسی نے مجھ پر حملہ آور ہونے والے کو نشانہ بنا دیا تھا۔ میں ظہیر احمد کی کار کی باڈی کے ساتھ سر ٹکائے، ایک ہاتھ اس کی کھڑکی پر جمائے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے سے دُھند چھٹنے لگی، حواس بحال ہونے لگے اور میں دھیرے دھیرے سیدھا کھڑا ہوتا چلا گیا۔ کھڑے ہوتے ہی میں ایک دم ظہیر احمد کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون اب تک تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ اس خون کو بہنے سے روکنے کے لیے اپنے زخمی ہاتھ کی کلائی پر رومال لپیٹ کر اسے سختی سے باندھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کا وہ ساتھی جس نے میرے سر پر ضرب لگائی تھی، میرے قریب ہی دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے اوندھا پڑا زمین پر پیر رگڑ رہا تھا۔ شاید آبی یا لزی نے اس کے پیٹ میں گولی اتار دی تھی اور اب وہ بس اپنی سانسیں پوری کر رہا تھا۔

ظہیر احمد کے بقیہ تین ساتھیوں نے مختلف ٹیلوں کی آڑ پکڑ لی تھی اور وہاں سے وقفے وقفے سے ہماری کار کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ لزی اور آبی ابھی تک اپنے مورچے میں جمے ہوئے تھے۔ لزی نے البتہ ایسی پوزیشن اختیار کر لی تھی جہاں سے وہ مجھے اور ظہیر احمد کو بھی اپنی نگاہ میں رکھ سکتی تھی۔ شاید وہیں سے اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے والے شخص کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ظہیر احمد کی اسٹین گن اٹھالی اور اپنا پستول پتلون کی بیلٹ میں گھسیڑتے ہوئے ظہیر احمد کو مخاطب کیا۔

"ظہیر احمد! تیری بدمعاشی کے دن پورے ہو گئے۔ اب تیرے لیے اچھا یہی ہے کہ توبہ کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھ اور

بقیہ عمر یاد اللہ میں گزار دے۔"

"بک نئیں اوئے۔ اَیے تے ہُن ای پتا لگ جاندا اے کہ کس دے دِن مُکے ہوئے نے۔ سالے اَج میں تینوں زندہ نئیں چھڈاں گا۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور اس سے پہلے کہ میں اس کے ارادے کو سمجھ سکتا وہ مجھ پر آ پڑا اور بائیں ہاتھ سے دو تین گھونسے میرے منہ پر جڑ دیے۔ کمبخت میں بڑی جان تھی۔ اس کی پوری ہتھیلی اُدھڑی ہوئی تھی، بڑی مقدار میں خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے بائیں ہاتھ میں اتنی جان باقی تھی کہ اس کے گھونسے مجھے اپنے منہ پر ہتھوڑے کی طرح پڑتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کی اس حرکت پر میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور مشتعل ہو کر میں نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مار دیا۔ گھٹنے کی ضرب بہت شدید تھی۔ وہ ذبح ہونے والے بیل کی طرح ڈکراتا ہوا پیٹ پکڑ کر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مجھ پر جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسٹین گن کو نال کی طرف سے پکڑا اور اُسے لاٹھی کی طرح تھام کر ظہیر احمد پر پل پڑا۔ میں نے بڑی بے دردی سے اسے زدوکوب کیا تھا۔ اس کے بدن کا ایک ایک حصہ لہولہان کر دیا تھا اور شاید کوئی ہڈی اس کی سلامت نہیں رہی تھی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا، مجھ سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا مگر میں نے اس درندے پر ذرا بھی رحم نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ لہٰذا میرے ہاتھ اس وقت تک نہیں رُکے جب تک وہ بے دم ہو کر گر نہیں پڑا۔

اس کے گرنے کے بعد میں اسٹین گن سیدھی کر کے اس طرف چل دیا جہاں اس کے بقیہ ساتھی دبکے بیٹھے تھے۔ انھوں نے میرے ہاتھوں اپنے باس کو مٹی میں رُلتے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر مجھ سے مقابلہ کرنے کی حماقت جاری رکھی تو خود اُن کا انجام بھی نہایت دردناک ہو گا۔ لہٰذا مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ اپنی اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے پستول میرے قدموں میں پھینک کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

ان کے ہتھیار پھینکتے ہی آبی اور لزی بھاگتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ آبی نے فوراً تینوں پستول اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لیے۔ اور ان سے بولا "اوئے بس اتنا ہی دم تھا تم لوگوں میں؟ اوئے اتنے سے کام کے لیے ہمارے پیچھے لگ کر یہاں تک آئے تھے تم؟"

ان میں سے ایک قدرے تلخ لہجے میں بولا "آبی پہلوان، ہمارا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے تمہیں۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لڑائی میں دو حریفوں میں سے کسی ایک کو شکست تو ہی پڑتی ہے۔ اس سے شکست خوردہ کو کمزور یا کم تر نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ اس وقت جیلانی کی چال کامیاب ہو گئی۔ وہ ہمیں اپنے پیچھے لگا کر اپنے پسندیدہ میدان تک لانے میں کامیاب ہو گیا اور ہم اس کی چال کو سمجھے بغیر یہ سمجھ کر یہاں تک آ گئے کہ تم لوگ ہم سے جان بچا کر بھاگنا چاہتے ہو، نتیجہ بازی ہار گئے۔ یہ خالصتاً ایک جنگی چال تھی جس نے ہمیں مات دی۔ اس سے ہماری کمزوری یا بزدلی ظاہر نہیں ہوتی۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے آبی۔" میں نے اس شخص کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے بدمعاشوں کے جتھے کا آدمی بالکل نہیں لگتا تھا۔ نہ جانے کون سے حالات تھے جنھوں نے اسے ان بے رحم قاتلوں اور بدمعاشوں کے ساتھ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کوئی معقول اور پڑھا لکھا آدمی لگتا تھا۔ میں نے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا "تو کون ہے جوان؟ جن لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے، ان کے قبیلے کا لگتا تو نہیں ہے تو؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ اگر میں ان کا ساتھی نہ ہوتا تو ان کے ساتھ تمہارے مقابلے کو کیوں نکلتا؟" اس نے جواب دیا۔

"نہیں، جوان! غلام جیلانی کی آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں۔ کسی کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہونے اور کسی کا ساتھی ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تیرا ایک ایک انداز بتا رہا ہے کہ تو اس راہ کا مسافر ہے نہیں جس پر چلتا نظر آ رہا ہے۔"

"بہرحال تمہیں اس سے کیا غرض ہے۔ تم نے اپنے پسندیدہ میدان میں لا کر ہم پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اب ہماری حیثیت جنگی قیدیوں جیسی ہے۔ بحث کرنے کے بجائے فیصلہ سنا دو کہ اب تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ تو بار بار اپنی پسند کے میدان کی کیا بات کر رہا ہے جوان! فتح مندی کیلیے میدان کی نہیں حوصلے، عزم اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حوصلے بلند اور ہمتیں جوان ہوں تو ہر مقام پر دشمن کو منہ توڑ جواب دیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جنگ میں مقام کو بڑی اہمیت حاصل ہے جیسے دشمن کو اس کے اپنے علاقے میں جا کر شکست دینے کے لیے اس سے کئی گنا زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے، کسی کمزور اور بے مایہ فوج نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" وہ بولا۔

میں نے ہنس کر کہا "اس کا مطلب ہے تو نے تاریخ پڑھی ہی نہیں ہے جوان! اور تاریخ کے حوالے سے بات کرتا ہے۔"

"اب تم اسلامی تاریخ کے حوالے دو گے لیکن وہ یک وقتی جذبہ تھا جس نے اس وقت کے مسلمانوں کو غیر معمولی قوت عطا کر دی تھی۔ جیسے جیسے اس جذبے میں کمی آتی گئی مسلمان دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہونے کے باوجود شکستیں کھاتے چلے گئے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"بہت خوب یار! تیری معلومات خاصی وسیع ہیں لیکن تو یہ بھول گیا ہے جوان کہ سکندر جب پورس کے مقابل ہوا تھا تو وہ ایسے کسی جذبے کے زیرِ اثر نہیں تھا۔ اس کی فوج بھی مختصر، سفر اور موسم کے ہاتھوں پریشان اور پراگندہ تھی۔ پورس اپنے ملک میں اپنی کثیر فوج اور سامانِ حرب کے ساتھ اپنے پسندیدہ میدان میں تھا لیکن سکندر کے عزم اور حوصلے کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ پھر ابھی کل کی بات ہے جب بابر ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ کتنی کم فوج تھی اس کے ساتھ۔ دنیا بھر کا ستایا ہوا بھٹکتا بھٹکتا اِدھر آ نکلا تھا وہ۔ اس کے مقابل لودھی بادشاہ کی افواج تھیں اور اُن کا پسندیدہ میدانِ جنگ بھی تھا لیکن بابر کی جرأت اور حوصلے نے لودھیوں کو دربدر کر کے آوارہ گرد بابر کو ہندوستان کی سلطنت بخش دی تھی۔ شاید تو نے تاریخ میں ایسے واقعات نہیں پڑھے۔"

"چھوڑیں جنابِ عالی! آپ اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان باتوں کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" لزی نے مداخلت کی۔

"اوئے ہاں یار! یہ کیا قصے لے بیٹھا ہے تو اس گھڑی۔ یہاں مناظرہ کرنے تو نہیں آئے ہیں ہم۔ ان کی چھٹی کر کے آگے بڑھنے کی بات کر اَب۔"

"اوئے چپ کر جا سالے! یوں لگتا ہے مجھے جیسے تیرے اندر چنگیز خان کی روح حلول کر گئی ہے۔ ہر وقت، مارنے کاٹنے کی ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اسے مار دو، اُسے قتل کر دو، اس کا پیٹ چاک کر دو۔ اس کے سوا بھی کچھ آتا ہے تجھے؟ بتایا نہیں ہے کسی نے اب تک تجھے کہ مسلمان پر مسلمان کا خون حرام قرار دیا گیا ہے۔ دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا گیا ہے ایسے شخص کو۔"

"اچھا اچھا مولوی صاحب! یہ مجھے پتا نہیں تھا مگر آپ کو علم تھا اس شرعی مسئلے کا؟ پھر کبھی آپ کے ہاتھوں سے بے مسلمان جنت کو سدھار گئے۔ اس وقت آپ کو اس کا خیال نہیں آیا کبھی۔" آبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں تیری طرح انسان ہی تو ہوں۔ کبھی اس شیطان لعین کا وار مجھ پر بھی چل ہی جاتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا پھر لزی کو مخاطب کر کے بولا "چلیں لزی بیگم! اپنی گاڑی میں بیٹھیں۔ بہا کر ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں پلٹ کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ ان تینوں کے پستول آبی کے قبضے میں تھے لہٰذا اُن کی طرف سے ہمیں اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر آبی اور لزی بھی میرے پیچھے ہو لیے۔ لزی بولی "کیا آپ انہیں یوں ہی چھوڑ جائیں گے؟ اگر یہ پھر ہمارے پیچھے آئے، تو؟"

"نہیں، یہ اب اس غلطی کو دہرانے کی کوشش بالکل نہیں کریں گے۔ یوں بھی وہ ظہیر احمد اب ایک لمبے عرصے تک بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اس کے بغیر یہ لوگ ہمارے لیے بالکل بے ضرر ہیں۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"پھر بھی انہیں اس طرح کوئی سزا دیے بغیر چھوڑنا اچھا نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی کر رہے ہیں آپ۔" لزی بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آبی کی طرح تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں ختم کر دیا جائے؟"

"سانپ کا سر عقل مند لوگ ڈسے جانے سے پہلے ہی کچل دیتے ہیں۔ اس کے ڈسنے تک انتظار نہیں کرتے۔"

"نہیں لزی بیگم! میں بے مقصد خون خرابے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ بے ہودہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دو۔"

ہم کار کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میں اس کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر سیٹ پر جا گرا۔ آبی بھی میرے پاس ہی بیٹھ گیا اور لزی نے ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ آبی اور لزی کو میرا یہ عمل بالکل پسند نہیں آیا تھا کہ میں اپنے ایک خطرناک دُشمن کے تین قابو میں آئے ہوئے آدمیوں کو نظر انداز کر کے واپس جا رہا تھا لیکن انھوں نے اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ البتہ ان کا موڈ اتنا آف تھا کہ پھر بابا اسحاق کے آستانے پہنچنے تک ان میں سے کسی نے بھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا تھا۔ میں نے انہیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اس گھڑی۔

بابا صاحب کے آستانے والی پہاڑی کے نشیب میں لزی نے اپنی کار روکی تو شام کے چھ بجنے کو تھے۔ سورج اپنی تمام دن کی مسافت طے کر کے مغرب میں بہت نیچے اتر چکا تھا، اس کی تمازت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ کار کے رُکتے ہی ہم باہر نکل آئے اور آہستہ آہستہ آستانے کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمارے پہنچنے کی اطلاع شاید بابا اسحاق کو ہو چکی تھی۔ ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا تو خیر اللہ ایک ٹیلے کی آڑ سے نکل کر ہمارے سامنے آ ٹھہرا۔ لزی نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

وہ بولا "آپ لوگوں نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اس

وقت یہاں عقیدت مندوں کی خاصی بھیڑ ہے۔ اب ایسا کریں آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں مسٹر آرزک وہیں آئیں گے۔" پھر وہ آبی کی طرف دیکھ کر بولا "یہ کون ہے؟"

"یہ مسٹر اسلم آبی ہیں، جنابِ عالی کے دوست۔ ان پر ہم پوری طرح اعتماد کرسکتے ہیں۔" لزی نے جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا جو ہماری کار کے برابر ہی کھڑی ہوئی تھی "مگر شاید مسٹر آرزک یہ بات پسند نہ کریں۔ اصولی طور پر ہائی کمان کی ہدایت یا اجازت کے بغیر ہمیں کسی پر خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔"

"ہاں۔" لزی بولی "اصول تو یہی ہے مگر بعض خاص قسم کے معاملات میں اصولوں کو نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"بہرحال اس کے ذمّے دار آپ ہوں گے۔" جیرالڈ نے آگے بڑھتے ہوئے عجیب سے رُکھے اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھے اس کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آبی کے تیور بگڑ رہے ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے ذرا سختی سے کہا "جیرالڈ! تمھیں آبی کی طرف سے فکرمند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا دوست، میرا یار، میرا بھائی ہے۔ اس کی اور عالیہ کی خاطر ہی میں نے تم لوگوں سے تعاون پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ تمھارے بڑوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو جیل سے رہائی دلا دیں گے۔ حالانکہ وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکے پھر بھی میں نے تم لوگوں سے منہ نہیں موڑا ہے۔ اب اگر تمھیں یا تمھارے مقامی سربراہ کو آبی کا میرے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے تو میں تم سے علیحدگی اختیار کرلوں گا۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔"

"اوہ نہیں جنابِ عالی! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ایسا خیال کبھی دل میں نہ لائیں۔" لزی جلدی سے بولی۔

جیرالڈ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے مسٹر جیلانی! جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کس کام کی بات کررہے ہو؟" میں نے اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"علیحدگی اختیار کرنے والی بات جو تم نے کہی ہے، اسی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ایک بار جسے ہم اپنے رازوں میں شریک کرلیتے ہیں، پھر وہ جیتے جی ہم سے الگ ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم جانتے نہیں ہو ابھی ہمیں!"

"بک نئیں اوئے سفید کتّے! جانتا نہیں ہے تو ہمیں۔ برتری ہم نے کبھی کسی کی قبول ہی نہیں کی ہے۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ تو نے ہمیں اپنے ساتھ باندھ لیا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دے، نہیں تو یہاں تیری لاش پر رونے والا بھی کوئی نہیں ملے گا۔" آبی نے بھڑک کر کہا۔

اس کے اس انداز پر لزی بوکھلا سی گئی۔ گھبرا کر بولی "دیکھیں، دیکھیں، ہمیں آپس میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں" پھر وہ مجھ سے بولی "آپ اپنے دوست کو سمجھائیں جناب انہیں اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو نہ بول بی بی ہمارے درمیان میں۔ اور اگر سمجھانا ہے تو اس چوہڑے کو سمجھا، یہ ہم سے حاکموں والے انداز میں بات نہ کیا کرے۔ حاکمیت ہم کسی کی برداشت نہیں کرسکتے۔ اب اگر یہ بولا اس لہجے میں تو اس کی زبان کاٹ دوں گا میں۔" آبی غصّے سے بولا۔

جیرالڈ ایک دم مشتعل ہوگیا۔ اس نے طیش کے عالم میں ریوالور نکال کر آبی کی طرف تانتے ہوئے کہا "آپ ہٹ جائیں لزی! اس کی تو ساری اکڑفوں میں ابھی ایک سیکنڈ میں نکالے دیتا ہوں۔" وہ دانت بھینچ کر آبی کی طرف بڑھا۔

صورتِ حال ایک دم بے حد نازک ہوگئی۔ وہ ذلیل چوہڑا آبی کی جان لینے کے درپے تھا۔ ایسے میں میں خاموش تماشائی نہیں بنا رہ سکتا تھا چنانچہ میں نے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور اچھل کر آبی اور جیرالڈ کے درمیان حائل ہوگیا۔ میں نے جیرالڈ کو تنبیہ کی "دیکھو جیرالڈ! یہ ریوالور واپس رکھ لو۔ بات کو بڑھانے کی غلطی مت کرو، ان کھلونوں سے کھیلنا ہمیں بھی خوب آتا ہے۔"

"اس نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ گالی دی ہے اس نے مجھے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم ہٹ جاؤ سامنے سے۔" جیرالڈ گرجا۔

"ٹھیک ہے، اس نے ذلیل کیا ہے تمھیں لیکن پہل تمھاری طرف سے ہوئی ہے۔ تمھارے اشتعال دلانے پر ہی ایسا کیا ہے اس نے۔"

"اوئے تو ہٹ جا یار جیلانی! اس چوہڑے کو چلانے دے گولی۔ دیکھوں تو اس کا نشانہ کتنا سچا ہے۔" آبی نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ وہ اُسے مشتعل کرکے دیوانہ کردینے پر تلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

جیرالڈ پر آبی کی بات کا اثر اس کی توقع کے عین مطابق ہی ہوا تھا۔ وہ بُری طرح بھڑک کر ریوالور تانتے ہوئے بولا "جیلانی! ہٹ جاؤ ورنہ میں تم پر بھی گولی چلا دوں گا۔" اس نے ریوالور میری طرف سیدھا کرلیا۔

میں نے لزی سے کہا "تم دیکھ رہی ہو لزی! یہ کتا بالکل پاگل ہوگیا ہے۔ اسے چھوڑ دینا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں ہٹ جاؤ ورنہ . . . . میں تین تک گنوں گا جیلانی! اگر تم پھر بھی نہیں ہٹے تو نتیجے کے ذمّے دار تم خود ہوگے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی آبی اچانک میرے پیچھے سے نکل کر کسی شکار پر چھوڑے ہوئے باز کی طرح اس پر جا پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ریوالور والا ہاتھ تھاما اور اسے اوپر اٹھا کر اس زور سے نیچے جھٹکا کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی آبی نے اسے پیچھے الٹ دیا۔ جیرالڈ فوراً ہی اٹھ کر ریوالور اُٹھانے کے لیے لپکا مگر آبی نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ پھنسا دی نتیجے کے طور پر وہ ایک بار پھر نیچے جا پڑا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر زمین پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ جیرالڈ نے اس بار لیٹے ہی لیٹے سانپ کی طرح بل کھا کر آبی کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ یہ حرکت اس نے اس قدر اچانک اور اس تیزی سے کی تھی کہ آبی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ آبی پشت کے بل گرا تھا۔ اس کے گرتے ہی جیرالڈ نے اٹھنے کا موقع نہ دینے کے خیال سے پھرتی سے اُٹھ کر اس پر چھلانگ لگائی لیکن آبی نے لیٹے ہی لیٹے اسے اپنی ٹانگوں پر لے کر اوپر اچھال دیا اور خود تیزی سے لوٹ لگا کر اُس جگہ سے ہٹ گیا۔ جیرالڈ عین اسی جگہ گرا تھا جہاں ایک لمحہ پہلے آبی پڑا تھا مگر وہ ایک بین الاقوامی تنظیم کا تربیت یافتہ لڑاکا تھا۔ گرتے گرتے اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کرکے زمین پر ٹکا دیے پھر وہ دونوں ہاتھوں پر زور ڈال کر اوپر اُچھلا اور کسی ماہر بازی گر کی طرح فضا میں قلابازی کھا کر اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس دوران آبی بھی کھڑا ہوچکا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے گہری نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ دونوں نظروں ہی نظروں میں اپنے مدِمقابل کو تول رہے تھے اور منتظر تھے کہ ان کا مخالف کوئی غلطی کرے یا اس کی کوئی کمزوری اس کی نظر میں آجائے۔ اچانک جیرالڈ یوں نیچے جھکا جیسے وہ جھک کر آبی کی ٹانگ پکڑنا چاہتا ہو۔ آبی نے اسے حرکت کرتے دیکھ کر ہی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی مگر جیرالڈ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی، وہ نیچے جھک کر اپنی پتلون کا پائنچہ الٹنے لگا تھا۔ آبی نے ایک لمحہ اس کے ہاتھ کی حرکت کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح سر جھکا کر اُس پر جھپٹ پڑا۔ جیرالڈ نیچے جھکا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ پتلون کے پائنچے کے اندر کچھ ٹٹول رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بروقت اپنا بچاؤ نہ کرسکا۔ شاید اسے آبی کی طرف سے کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ آبی نے کسی سانڈ ہی کی طرح اپنے سر سے اس کے سر پر زوردار ٹکر ماری تھی۔ جیرالڈ ٹکر کھاتے ہی اُچھل کر پیچھے الٹ گیا تھا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ پتلون کے پائنچے میں ہاتھ ڈال کر دراصل اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال رہا تھا۔ آبی نے یہ بات سمجھ لی تھی اور خنجر کے استعمال سے باز رکھنے کے لیے اس نے اس کے سر میں اتنی زوردار ٹکر ماری تھی کہ خنجر نکال لینے کے باوجود جیرالڈ اسے استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آبی کی ٹکر سے اس کے ہوش گم ہوکر رہ گئے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا جسے دور کرنے کے لیے وہ بار بار اپنے سر کو جھٹک رہا تھا۔ آبی نے دُشمن کو کمزور پڑتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اس کے پیٹ میں پوری قوت سے ایک لات رسید کردی۔ جیرالڈ کراہ کر ایک بار پھر زمین سے جا لگا۔ آبی نے اس کے سینے پر ایک ٹھوکر لگائی اور جھک کر اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پکڑ کے پیچھے موڑ دی۔ جیرالڈ نے درد سے کراہتے ہوئے ہاتھ سے خنجر چھوڑ دیا۔ آبی خنجر اٹھا کر جیرالڈ کے اوپر چڑھ بیٹھا اور اس سے پہلے کہ میں یا لزی اس کے ارادے کو سمجھ کر اسے روکنے کی کوشش کرتے، اس نے خنجر جیرالڈ کے پہلو میں اتار کر اسے نیچے تک چیر ڈالا۔ جیرالڈ کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی تھی اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے اور لزی نے ایک ساتھ لپک کر آبی کو پکڑ کے اس کے اوپر سے کھینچا۔ لزی آبی کو چھوڑ کر جیرالڈ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے آبی سے کہا "اوئے یہ کیا کردیا تو نے یار! سچ مچ مار ہی ڈالا ہے اِسے؟"

اسی وقت دو آدمی اوپر آستانے کی طرف سے بھاگتے ہوئے آئے "کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کون چیخا تھا بھئی؟" انھوں نے ہمارے قریب آکر پوچھا۔ پھر جیرالڈ پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک حیرانی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا "ارے یہ تو اپنے جیرالڈ صاحب ہیں۔ کیا ہوا انہیں مس صاحبہ؟ کس نے مارا ہے انہیں؟" وہ جیرالڈ کی طرف لپکا۔

لزی نے اس کی طرف مڑ کر پوچھا "کوئی بڑا سا رومال یا کپڑا ہو تو دو مجھے۔ جلدی کرو۔"

اس نے اپنے سر سے لپٹا ہوا بڑا سا ریشمی رومال کھول کر لزی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا "انہیں ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو؟"

لزی نے رومال اس کے ہاتھ سے لے کر کہا "فضول سوالات میں وقت برباد مت کرو۔ جلدی سے ادھر آکر میری مدد کرو۔"

اس نے اس شخص کی مدد سے رومال کس کے جیرالڈ کے پیٹ کے گرد لپیٹ کر باندھ دیا۔ پھر ان دونوں نے مل کر جیرالڈ کو اس کی کار کی عقبی نشست پر لٹا دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر لزی نے مجھ سے کہا "جنابِ عالی! آپ لوگ اب گھر واپس چلے جائیں۔ میں جیرالڈ کو لے کر کلینک جا رہی ہوں۔ آپ گھر پہ ہی میرا انتظار کریں۔"

وہ جیر اللہ کو لے کر چلی گئی۔ میں اور آبی لزی کی کار میں آبیٹھے اور آستانے کی طرف سے جیر اللہ کی چیخ سُن کر صورت حال معلوم کرنے کے لیے آنے والوں کو حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر ہم بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پختہ سڑک پر آکر میں نے کار واپسی کے راستے پر دوڑاتے ہوئے آبی سے کہا "آبی! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا یار۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اوئے چپ ہو جا یار! تُو تو بہت ہی بزدل ہوتا جا رہا ہے۔ کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے ایسا؟" اس کا اشتعال ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"بزدلی کا طعنہ نہ دے یار جی مجھے۔ مصلحتوں کو سمجھنے کی بھی کوشش کیا کر کبھی۔ بڑے کینہ پرور اور خود غرض لوگ ہیں یہ، جن سے ہمارا واسطہ پڑ گیا ہے۔ حکومتیں خوف زدہ رہتی ہیں ان سے۔ لہٰذا ان پر یوں اوچھا وار ڈالنا خطرناک ہی ہوتا ہے۔"

"میں نے کوئی اوچھا ہاتھ نہیں ڈالا تھا اس ذلیل ہوئی پر۔ اگر تم لوگ مجھے روک نہ لیتے تو ختم کر کے ہی چھوڑتا میں اُسے۔"

"اوئے عقل کے دُشمن، بات کو سمجھا بھی کر کبھی۔ ایک اس شخص کو مارنے سے پوری تنظیم تو نہیں مر جاتی نا! ایک کیا دو چار یا دس بیس آدمیوں کے مر جانے سے بھی ان پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا، البتہ تم ان کی نظروں میں معتوب ہو کر اپنے لیے مصیبتوں کے انبار لگا سکتے ہو۔ یہ دنیا کے کسی کونے میں بھی تمھیں چین نہیں لینے دیں گے۔ ان کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں میرے یار!"

"بس کر یار! چُپ ہو جا اب تُو۔ مجھ سے نہیں برداشت ہوتا یہ سب کچھ۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے ان کی شکلیں دیکھ کر ہی۔ یہ ذلیل لوگ میرے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں اور تُو ان کی جڑیں ہی تلاش کرتا پھر رہا ہے اب تک۔ میں کہتا ہوں لعنت بھیج ان جڑوں پر کہیں انکے چکر میں یہ سارا گھر ہی نہ برباد ہو کر رہ جائے ہمارا، بس جو سامنے پڑتا جائے، جھٹکا کرتے چلو اس کا، انہیں کام کرنے کا موقع بالکل نہ دو یار، اچھا تھا آج اس جیر اللہ کا کام تمام ہو جاتا۔ پھر کسی وقت ہم اس بہروپیے بابا کا پتا صاف کر دیتے۔ ظاہر ہے اس کے بعد لزی ہمیں کچھ اور لوگوں سے ملوا دیتی اور ہم انکا بھی اسی طرح صفایا کر دیتے۔ بس یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا۔ لوگ ہمارے سامنے آتے جاتے اور ہم ایک ایک کر کے انہیں ختم کرتے جاتے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تُو۔ ایسا ہی عقل کا اندھا سمجھ لیا ہے تُو نے انہیں۔ تو ان کے مُہرے پیٹتا چلا جاتا اور وہ ایسے ہی نادان ہیں کہ تجھ سے مرواتے رہتے انہیں۔ کچھ پتا ہی نہیں انہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟" میں طنز کرتے ہوئے بولا "اپنے دماغ کو درست رکھ۔ بڑے منصوبہ ساز لوگ ہیں یہ بیٹے! پہلے میلوں آگے تک دیکھ کے یہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ آگے کوئی خطرہ تو نہیں ہے اُن کے لیے۔ اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد ہی وہ پاؤں دھرتے ہیں کسی راہ پر۔ یوں ہی اندھا دھند نہیں چل پڑتے وہ۔"

"اچھا یار! اگر تجھے ایسی ہی فکر ہے اپنی جان کی تو کہہ دے ان سے کہ تیرا کوئی تعلق نہیں ہے اب مجھ سے۔ وہ مجھے جو سزا بھی دینا چاہیں دے دیں۔ بلکہ مجھے پکڑ کے ان کے حوالے کر دینا تاکہ تجھ پر کوئی الزام نہ آنے پائے۔"

"بک نئیں اوئے۔ ایڈا ذلیل سمجھ لیا اے توں میں نوں! اوئے میں اکھیاں کڈ دیاں گا اُس دیاں، جنّے تینوں بُری نظر نال تکیا وی۔ خبردار، اس توں بعد کوئی ایہو جئی گل زبان تے لیاندی تے۔ میں تاں تینوں آئندہ دے واسطے احتیاط کرن لئی کہہ رہیا سی۔ جو کچھ ہو گیا اے، اس دے لئی دماغ نوں کھپان دا ہُن کوئی فائدہ نئیں۔ چل جا اس نوں اور مٹی ڈال اُہدے اُتے۔ جو ہووے گا ویکھیا جاوے گا۔"

"یہ تیری لزی بیگم اسے کسی کلینک میں لے گئی ہے اسے وہاں ڈال کر وہ اپنے بڑوں کو اس کے بارے میں اطلاع ضرور دے گی۔ ان کی ہدایت کے مطابق ہی وہ آئندہ کے لیے کوئی فیصلہ کرے گی۔ ویسے یہ یقین کر لے جیلانی! وہ ہم پر اعتبار کسی صورت نہیں کریں گے۔"

"اعتبار تو وہ ہم پر اب بھی نہیں کرتے ہیں یار جی! انھوں نے ہمیں اپنے حقیقی عزائم کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں بتایا ہے۔ منشیات کے اسمگلروں کے روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں اور اسی کی آڑ میں ہمیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں دوسرے ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئی ہیں ورنہ انہوں نے تو ہمیں اندھے کنویں میں اتارنے میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہیے۔ کوئی تدبیر ہے تیرے ذہن میں؟"

"نہیں، ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔ میرا خیال ہے، ہم گھر پہنچ کر شرافت علی سے رابطہ قائم کریں۔ اور اس کے سامنے ساری صورت حال رکھ کر اس سے مشورہ کریں۔ تینوں مل کر بیٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے تُو۔ ہمیں اس سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔" آبی نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔

بنگلے پر واپس پہنچتے ہی میں نے شرافت علی کو فون کیا۔ معلوم ہوا وہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا اور اب مجھے فون کرنے والا تھا۔ اسے دوپہر کو بنگلے میں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع مل چکی تھی، لہٰذا وہ مجھ سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔

میں نے کہا "اس کی تم فکر نہیں کرو، وہ کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں تھا اور جس قدر جلد ممکن ہو میرے پاس پہنچو ایک نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے۔ اس سلسلے میں تمھارے مشورے کی ضرورت ہے مجھے مگر جلدی آؤ، دیر بالکل نہ کرنا۔"

"بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو یار! آخر ایسا کون سا اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"تم آجاؤ تو میں سب کچھ بتا دوں گا تمھیں۔ فون پر کرنے والی بات نہیں ہے یہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، پھر میں آ رہا ہوں، تم انتظار کرو اور وہ تمھاری لزی کہاں ہے اس وقت؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"اوئے یار! کیسا آدمی ہے تو؟ میں کہہ رہا ہوں وقت برباد نہ کر اور تو سوال پہ سوال کرتا چلا جا رہا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"اچھا بھائی اچھا، ناراض نہ ہو یار۔ بس میں پہنچ رہا ہوں ابھی دس منٹ میں۔" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میں بھی ریسیور رکھ کر آبی کے پاس آبیٹھا۔ آبی نے پوچھا "کیا ہوا؟ آ رہا ہے وہ؟"

"ہاں، کہہ رہا تھا ابھی دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں میں۔ اسے دوپہر والے قصے کی بھی خبر ہو گئی ہے۔" میں نے آبی کو بتایا۔

"اچھا تو کیا وہ ہماری غیر موجودگی میں یہاں آچکا ہے؟" آبی نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ تو تمام دن سوتا رہا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اٹھا ہے سو کر۔ شاید بنگلے کے دربان نے ہمارے جانے کے بعد فون کیا ہو گا اسے اور اس کے کسی ماتحت کو یہاں کی رپورٹ دے دی ہو گی۔ جس نے بیدار ہوتے ہی اسے خبر کر دی۔"

"یار، یہ شرافت علی بھی مجھے کوئی معمولی آدمی نہیں لگتا۔ کافی ہاتھ پیر پھیلا رکھے ہیں اس نے بھی۔ ہر طرف مخبر چھوڑ رکھے ہیں اس نے۔ جو پل پل کی خبریں اس تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟" آبی نے سوال کیا۔

"وہ ایک بین الاقوامی تنظیم کا اہم مہرہ ہے، وہ جانتا ہے کہ تنظیمیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ چنانچہ اس نے مقامی طور پر اپنے معاملات کو بھی اسی طرح چلانا شروع کر دیا ہے۔ پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ کام کرنے والے آدمی پیسہ ہو تو خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔ پیسہ اور تجربہ اس کا ہے، کام دوسرے کرتے ہیں اس کے لیے، پھر وہ باخبر کیوں نہ رہے گا؟"

"ہاں یار، ٹھیک کہتا ہے تو، ذہین اور سمجھدار لوگ تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خود پیچھے جا کر دوسروں کو ڈھال بنا لیتے ہیں اپنے لیے۔ ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں عزت بھی پا جاتے ہیں۔ ایک ہم ہیں جنہیں آج تک ایک پناہ گاہ بھی میسر نہیں آسکی ہے۔"

"بات یہ ہے آبی! ہم نے اپنی موجودہ زندگی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ ہم نے ذہنی طور پر کبھی اسے قبول ہی نہیں کیا۔ حالات ہمیں نت نئے راستوں پر ڈالتے اور ہم سے طرح طرح کے جرائم کراتے رہے ہیں، ہم نے کبھی اپنے ذاتی فائدے کے لیے یا دولت کے لالچ میں کوئی جرم نہیں کیا، اسی لیے کسی کام کی کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ یہی خیال کرتے رہے کہ بس اس بار ہمیں اس دلدل سے نکلنے کا راستہ مل جائے گا اور ہم کسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر ایک باعزت زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔ ہم نے اپنے لیے جرائم کے راستے کا انتخاب ہی کب کیا تھا یار جو اس کے بارے کچھ سوچتے اور اس میں کامیابی کی راہیں تلاش کرتے؟"

"ہاں یار! ہم تو بس حالات کے ریلے میں بہتے پھر رہے ہیں، ورنہ ہم نے ایسا سوچا تو نہیں تھا کبھی۔" آبی بولا۔

"اور یہ حالات ہمیں بہاتے ہوئے اب اس مقام پر لے آئے ہیں جہاں سے ہم نظر بچا کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمارے سامنے ایسے لوگ آگئے ہیں جو ہمارے ملک کی سلامتی اور قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر دینے کے درپے ہیں۔ وہ نہایت مکّار اور بڑے وسائل کے مالک ہیں، ان کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے ہمیں سمجھ بوجھ اور سرد مزاجی سے قدم قدم آگے بڑھنا ہے۔ ہماری ذرا سی غلطی، معمولی سی چوک ہماری تمام محنت پر منٹوں میں پانی پھیر سکتی ہے۔ اسی لیے میں تمھیں جذبات میں بہہ جانے سے روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب یہ جیر اللہ ہمارے لیے پریشانیاں کھڑی کر سکتا ہے۔ بہرحال اب جو ہو گا اس سے بھی نمٹنا ہی ہو گا ہمیں۔"

"کیا ہوا بھئی؟ کس سے نمٹنے کی بات کر رہے، کیا کوئی اور پھڈا کر بیٹھے ہو؟" شرافت علی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوتے بولا۔

"آؤ بھئی شرافت علی! آؤ یار بیٹھو۔ یہ پھڈے شڈے تو اب ہمارا اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گئے ہیں۔ ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں، کوئی ایک دن بھی تو ایسا نہیں گزرتا جب کوئی ہنگامہ نہ ہوتا ہو۔" میں نے مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے قریب صوفے پر دھنستے ہوئے بولا "ہاں، اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟ کیوں بلایا ہے مجھے؟"

میں نے آبی اور جیر اللہ کے جھگڑے کی ساری تفصیل اسے بتانے کے بعد کہا "اب تو ہی بتا یار جی! اس نئی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اسی سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے میں نے بلایا ہے تجھے۔"

وہ سب کچھ سننے کے بعد جیسے سکتے کا شکار ہو گیا تھا۔ کئی لمحے وہ ساکت بیٹھا مجھے تکتا رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر آہستہ سے بولا "یہ تو بہت بُرا ہوا یار جیلانی! بہت ہی بُرا۔ جیر اللہ جیسے کاروباری، اور عوامی حلقوں میں الیگزینڈر کے نام سے جانا جاتا ہے، ان کا بہت خاص آدمی ہے۔ یہاں ان کا سارا جائز و ناجائز

کاروبار سارا لین دن اسی کے ذمے ہے۔ اپنے اتنے اہم آدمی کا نقصان وہ خاموشی سے تو برداشت نہیں کریں گے جبکہ تمھیں وہ ایک پیدل مہرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔"

"ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں میرے یار! اسی لیے تو میں نے مشورے کے لیے تمھیں بلایا ہے اس وقت!" میں نے کہا۔

"یہ واقعہ لزی کے سامنے ہوا تھا۔ اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا اس پر؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اس نے۔ جیرالڈ کے زخم کو وقتی طور پر باندھنے کے بعد وہ اسے کسی کلینک لے گئی ہے، مجھ سے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں آبی کو لے کر فوراً گھر واپس چلا جاؤں۔ چہرے سے اس کے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا!"

"ایسا ہی ہوا ہوگا، اس کے چہرے سے کچھ اندازہ لگا لینا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ چہرے کے تاثرات چھپانے میں تو اسے ملکہ حاصل ہے۔ آخری لمحے تک کسی کو پتا نہیں چلنے دیتی ہے کہ وہ اگلے لمحے کیا کر گزرنے کا فیصلہ کیے ہوئے ہے۔"

آبی بولا "کیوں نہ ہم اس لزی کو بھی ٹھکانے لگا کے لاہور واپس چلے جائیں یہاں سے۔ یہ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا سارا!"

"نہیں بھائی آبی! ایسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں۔ لزی کو ختم کرنے سے جھگڑا کبھی ختم نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے بعد تو وہ تم دونوں کو ہر قیمت پر ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ محفوظ تم دنیا کے کسی آخری سرے تک کہیں بھی نہیں رہ سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ معاملے کو خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹانے کی کوشش کی جائے۔ عجلت میں اٹھایا ہوا ہر قدم ہمیں بربادی کی طرف ہی لے جائے گا۔" شرافت علی نے سمجھایا۔

"اسی لیے تو تمھیں بلایا ہے یار! تم ہی کوئی تدبیر سوچو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے شرافت علی سے کہا۔

"ایسا کرو، فی الحال میں تمھیں یہاں سے ایک اور جگہ پر منتقل کر دیتا ہوں، ایسی جگہ جس کے بارے میں میرے دو تین خاص آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ تم دونوں وہاں رہو اور میں لزی سے مل کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ اگر جیرالڈ مر جاتا ہے تو تنظیم تمھارے خلاف کس حد تک جا سکتی ہے اور اس کے بچ جانے کی صورت میں ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم کچھ سوچیں گے۔"

"ہاں، تمھاری یہ تجویز کچھ اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن تم خود کہتے ہو کہ ان کے وسائل لامحدود ہیں۔ پھر کیا وہ یہ نہیں جان سکیں گے کہ ہم کہاں ہیں اور کس نے ہمیں ان کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی ہے؟ انھیں اس کا علم ہو جانے کے بعد تمھاری کیا پوزیشن ہو گی؟ میں یہ نہیں پسند کروں گا میرے بھائی کہ میری وجہ سے تم مصائب کا شکار ہو جاؤ۔"

"نہیں یار! میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔ میں انھیں اپنے اوپر شک تک نہیں ہونے دوں گا۔ بس یہاں سے نکلتے وقت اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی ہماری نگرانی پر مقرر نہ ہو اور وہ تعاقب کرتا ہوا تمھارے نئے ٹھکانے تک نہ جا پہنچے۔"

اس کی اس بات پر مجھے اچانک فیروز کا خیال آ گیا۔ لزی کے ساتھ جاتے وقت میں نے ظہیر احمد کی کار کے پیچھے اس کے آدمیوں کی پیلی مزدا کار بھی دیکھی تھی۔ وہ رضویہ کالونی سے نکلنے کے بعد دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن مجھے اس وقت خیال بھی نہیں رہا تھا۔ ظہیر احمد کے چکر میں پڑ کر میں اسے بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا۔ وہ کار اب بھی بنگلے کے آس پاس کہیں موجود ہو گی۔ میں اس کار میں اپنی نگرانی کرنے والوں کے ذریعے فیروز سے رابطہ قائم کر کے امداد طلب کر سکتا تھا۔ میں نے شرافت علی سے کہا "یار شرافت علی! میں یہ تو بھول ہی گیا تھا، میرے یار گر بگری نے یہاں میری حفاظت اور دیکھ بھال کا خاصا معقول انتظام کر رکھا ہے، اس کے آدمی ہر وقت میری نگرانی کرتے رہتے ہیں مگر اب تک میں نے ان سے کسی معاملے میں امداد طلب نہیں کی ہے۔ اس لیے وہ بس دور ہی دور سے تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ اب میرا خیال ہے وقت آ گیا ہے، مجھے ان سے مدد لے لینا چاہیے۔"

آبی جلدی سے بولا "یہ تو بہت ہی اچھی بات ہو گی یار! اس طرح تو شرافت علی پر بھی کوئی بات نہیں آ سکے گی!"

"ہاں اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح میں تمھاری طرف سے مطمئن ہو کر ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح شریک ہو جاؤں گا اور تمھارے بارے میں وہ جو فیصلہ کریں گے، تمھارے خلاف جو کارروائیاں کرنا چاہیں گے، اس کی مجھے بھی خبر ہو گی۔ میں موقع ملتے ہی تمھیں اس کی اطلاع کر دیا کروں گا۔ تم فوراً ان سے رابطہ قائم کر کے انھیں اس صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔" شرافت علی نے کہا۔

"آؤ پھر باہر چلیں۔ میں اور آبی، لزی کی کرولا میں جائیں گے۔ تم اپنی گاڑی میں ہمارے آگے آگے چلنا۔ بس یونہی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی گھماتے رہنا۔ وہ راستے میں ہمیں کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جائیں گے۔" میں نے اٹھتے ہوئے اسے سمجھایا۔

ہم تینوں تیزی سے لپکتے ہوئے باہر نکلے اور پروگرام کے مطابق دونوں گاڑیاں لے کر بنگلے سے باہر آ گئے۔ ہماری گاڑیاں درمیانہ رفتار سے گرومندر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میری نظریں عقب کا منظر پیش کرنے والے شیشے میں اپنے پیچھے دور دور تک اس پیلے رنگ کی مزدا کار کو تلاش کر رہی تھیں۔ گرومندر سے ہم قائد کے مزار کی طرف ہو لیے، پھر بھی مجھے وہ مزدا نظر نہیں آئی تو میں نے آبی سے کہا "یار! حیرت ہے ہم یہاں تک آ پہنچے مگر ان کی کار اب تک دکھائی نہیں دی ہے مجھے۔ تو ذرا پیچھے مڑ کر دیکھ تو، پیلے رنگ کی کوئی مزدا کار نظر آ رہی ہے کہیں؟ ذرا دور تک نظر دوڑا کر دیکھنا۔"

آبی میری ہدایت پر کھڑکی سے باہر سر نکال کے دیکھنے لگا۔ مزارِ قائد کے سامنے سے ہم گزر رہے تھے جب آبی نے مجھے بتایا "ایک پیلی مزدا کار دکھائی تو دے رہی ہے مگر صاف طور پر سامنے نہیں آ رہی ہے وہ۔ بڑی بڑی بسوں کے درمیان کبھی کبھی بس ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دے جاتی ہے اس کی۔"

"ٹھیک ہے، اس پُرہجوم شاہراہ پر ہم اسے کوئی اشارہ دیں بھی تو شاید اسے نظر نہ آ سکے۔ اس کے لیے کسی ایسی سڑک پر چلنا چاہیے جہاں ٹریفک کم سے کم ہو۔" یہ کہہ کر میں نے شاہراہِ قائدین پر اپنی گاڑی موڑ دی۔

شرافت علی کی گاڑی ہمارے آگے تھی اور میں نے اسے مڑنے کے لیے اشارہ بھی نہیں دیا۔ چنانچہ وہ ایم اے جناح روڈ پر سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اس نے اگر مجھے مڑتے ہوئے دیکھا بھی ہوگا تو اتنی مصروف سڑک پر اس کے لیے فوری طور پر شاہراہِ قائدین کی طرف واپس آنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے ایک لمبا چکر کاٹنا ضروری تھا۔ شاہراہِ قائدین پر کچھ دور چلنے کے بعد میں نے اس مزدا کو ادھر آتے دیکھ لیا۔ اسے دیکھ کر جس نے اپنی کار سڑک کے ایک طرف کر کے اس کی رفتار بہت سست کر دی اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر مزدا کو قریب آنے کا اشارہ دینے لگا۔ چند لمحے کے بعد ہی مزدا میری کار کے برابر آ گئی۔ میں نے اس کے قریب آتے ہی اپنی کار کی رفتار بڑھا دی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مزدا میں دو افراد بیٹھے تھے۔ ایک کار ڈرائیو کر رہا تھا اور دوسرا اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا "مجھے فوری طور پر فیروز سے ملنا ہے۔"

"ایک منٹ جناب۔ میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں آپ کو۔" اس نے کہا۔ اور جیب سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نما وائرلیس نکال کر اپنے منہ کے قریب کر لیا اور اس میں کچھ دیر کوئی کارروائی کرنے کے بعد کسی نامانوس آواز میں کچھ بولنے لگا۔ پھر دوسری طرف سے شاید اسے کوئی جواب موصول ہوا تھا جسے سن کر اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیونگ کرنے والے شخص سے کچھ کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا "آپ ہمارے پیچھے چلے آئیں جناب!"

انھوں نے اپنی کار ہم سے آگے نکال لی۔ ہم مختلف اونچے نیچے اور سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے راستوں سے گزرتے ہوئے شارع فیصل پر جا نکلے۔ وہاں پہنچ کر ہمارے آگے چلنے والی مزدا ایک دم لہرانے لگی اور پھر سڑک کے ایک طرف ہو کر رک گئی۔ اسی کے ساتھ جس شخص سے میری بات ہوئی تھی، وہ کار سے اتر کر یوں اس کا جائزہ لینے لگا جیسے کار میں خرابی ہو گئی ہو اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اپنی کار ان کی کار سے آگے نکال کر کھڑی کر دی اور نیچے اتر کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"

اس نے اسی طرح اپنی گاڑی کے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "ہمارا تعاقب ہو رہا ہے جناب! ایک سفید کرولا بہت دیر سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لگا کر اپنے کسی ٹھکانے تک نہیں لے جا سکتے۔" وہ اس دوران پورے انہماک سے گاڑی کا جائزہ لینے میں مصروف رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر یہی ہوتا تھا جیسے مجھ سے اپنی گاڑی کی کسی خرابی کی بات کر رہا ہو۔

"سفید کرولا؟" میں نے آہستہ سے کہا اور سوچنے کے انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جدھر سے ہم آئے تھے، اس پوری سڑک پر نظریں دوڑانے لگا۔ وہ سفید کرولا ہم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ رینگتی ہوئی فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کی عقبی کھڑکی سے ایک سفید فام سنہرے بالوں والی حسینہ اپنا سر باہر نکالے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ کون ہو سکتی ہے، کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

"یہ اس جرمن صنعت کار الیگزنڈر کی سیکریٹری ہے جناب! مجھے حیرت ہے یہ آپ کا تعاقب کیوں کر رہی ہے۔"

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے انھوں نے ہم پر پہلے ہی پہرہ بٹھا دیا ہے۔ ہم نے فیصلہ کرنے میں دیر کر دی۔"

"کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی جناب! یا انھیں کسی طرح کا شک ہو گیا ہے آپ پر۔"

"زبردست گڑبڑ ہو گئی ہے یار! میرے دوست آبی نے الیگزنڈر کو شدید زخمی کر دیا ہے۔"

"پھر تو آپ کا ہر حال میں باس تک پہنچنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے آپ اپنی کار میں بیٹھیں چل کر، میں اس کا انتظام کر کے ابھی آتا ہوں۔" اس نے سیدھے ہو کر کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

میں واپس آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا اور اسے اسٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔ وہ شخص چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اس سفید کرولا کی طرف چل دیا۔ میری کار کو حرکت میں آتے دیکھ کر کرولا کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کرولا کو رکنے کے لیے کہا، مگر وہ اس کا اشارہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتی چلی آئی۔ میں نے اپنی کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا اور اگلے چوراہے پر پہنچ کر تیزی سے اسے واپس آنے والی سڑک پر موڑ دیا۔

مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میرے اس نگہبان نے کہا تھا، میں اپنی کار میں بیٹھوں، وہ اس تعاقب کرنے والی کار کا کوئی انتظام کرکے آتا ہے۔ میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے کے بجائے کار آگے بڑھا دی تھی جس کی وجہ سے تعاقب کرنے والی کار بھی میرے پیچھے لگ کر چلی آئی تھی اور اُسے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اگلے چوراہے پر پہنچتے ہی اپنی گاڑی واپسی کے لیے موڑ دی تھی۔ ارادہ یہی تھا میرا کہ اب میں دوبارہ اپنی کار مزدا کے پاس لے جا کر روک دوں گا اور تعاقب کرنے والی کار میرے پیچھے وہاں پہنچے گی تو وہ اس سے نجات کی کوئی صورت نکال لے گا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر آبی بولا "یہ تُو واپس کہاں جا رہا ہے میرے یار؟"

"وہ یار! بس غلطی ہو گئی ہے مجھ سے، مجھے وہیں رُکنا چاہیے تھا مگر میں خواہ مخواہ گاڑی دوڑانے لگا تھا۔"

وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولا "مگر وہ کار جو ہمارے آگے آگے تھی، وہ رُک کیوں گئی تھی وہاں۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی کیا اس میں؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی — اگر کوئی خرابی ہی تھی اس میں تو ہمارے روانہ ہوتے ہی وہ ہمارے پیچھے کیسے چل پڑی؟"

"کیا کہتا ہے یار تُو؟ وہ تو وہیں کھڑی تھی۔ ہمارے پیچھے ایک اور کار لگی تھی۔ رات کے وقت تجھے سفید اور پیلے رنگ کی صحیح تمیز نہیں ہو سکی شاید۔ اس سفید کرولا کو دیکھ کر ہی مزدا والوں نے اپنی کار خراب ہونے کا ڈراما کیا تھا۔"

"اب اتنا بھی اندھا نہیں ہوں یار جی کہ اتنی کشادہ اور دن کی طرح روشن سڑک پر ایک کار کے رنگ کی پہچان نہ کر سکوں میں۔ ہمارے پیچھے سفید کرولا ہی تھی مگر اس کرولا کے پیچھے وہ مزدا لگ گئی تھی۔ تُو نے تو اپنی گاڑی اِدھر موڑ لی ہے مگر وہ گاڑیاں سیدھی چلی گئی ہیں۔ یقین نہ ہو تو خود دیکھ لے، وہ مزدا نظر آ رہی ہے تجھے کہیں؟" آبی بولا۔

اس اثنا میں ہم اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں میں مزدا کو کھڑا چھوڑ کر گیا تھا۔ آبی ٹھیک کہہ رہا تھا، وہاں اب کوئی کار موجود نہیں تھی۔ مزدا واقعی کرولا کے پیچھے جا چکی تھی۔ لہٰذا میں نے اسی چوراہے سے اپنی کار ایک بار پھر موڑ کر ڈرگ روڈ کی طرف دوڑانا شروع کر دی۔ میں نے آبی سے کہا "یہ تو بہت بُرا ہوا یار آبی! پتا نہیں وہ کدھر گئے ہوں گے۔ اگر سیدھے گئے ہیں تو اس سڑک کا آخری سرا ہمیں سیکڑوں میل چلنے کے بعد بھی نہیں مل سکے گا اور . . . ستے میں وہ کسی طرف . . . گئے ہیں، تب بھی ہمارے لیے یہ معلوم کرنا ناممکن ہی ہے کہ وہ کس طرف مڑے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا تو بہت مشکل ہو جائے گا یار۔"

"آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جانا اسی کو کہتے ہیں بیٹے جی! اب رات بھر کراچی کی سڑکیں ناپتے پھرو۔ شاید کہیں مل ہی جائیں وہ، مگر یہ اب مقدر کی بات ہوگی۔ آج کی رات اگر خوار ہونا لکھ دیا گیا ہے تو پھر اُسے کون مٹا سکتا ہے!"

"بکواس ہی نہ کرتا رہا کر ہر گھڑی۔ کبھی کوئی اچھی بات بھی نکال دیا کر زبان سے اپنی۔ آخر تیرے مغز میں کوئی اچھی بات کیوں نہیں سماتی؟"

"ٹھیک ہے، لے میں منہ بند کر لیتا ہوں اپنا، تُو سوچتا رہ اچھی اچھی باتیں اور دوڑاتا پھر گاڑی کو چاروں سمتوں میں!"

"اچھا اب بک بک بند کر لے اپنی اور اس ساتھ والی سڑک پر نظر رکھ، اگر وہ واپس آئے تو اِدھر ہی سے گزریں گے۔ میں سامنے دیکھ رہا ہوں، آگے کہیں رک کر وہ ہمارا انتظار کرتے ہوں گے تو مجھے دکھائی دے جائیں گے۔" میں نے آبی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں دیکھ رہا ہوں، اِدھر سے گزرنے والی گاڑیوں کو، ویسے مجھے . . . ." آبی کچھ کہتے کہتے ایک دم چُپ ہو گیا۔

"کیوں، چپ کیوں ہو گیا ہے تُو؟" میں نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا "کیا یاد آ گیا ہے تجھے اچانک؟"

"بس اب مجھے خاموش ہی رہنے دے تُو۔ کچھ زبان سے نکل گیا تو خواہ مخواہ تیرا پارہ چڑھ جائے گا۔" آبی نے جواب دیا۔

"لگتا ہے اس گھڑی شیطان کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو رہا ہے تجھ پر۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"جب تجھ جیسا شیطان مجھ پر مسلط ہے تو اس عزازیل کی کیا مجال ہے جو قابض ہو جائے مجھ پر۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے اس گھڑی تُو میرا معمول بنا ہوا ہے۔ تو جناب معمول صاحب، اب ذرا پوری توجہ سے سڑک کا خیال رکھیں۔ ایسا نہ ہو آپ کی بزلہ سنجی آپکی آنکھوں پر پردہ ڈال دے اور ہم رات بھر سچ مچ مارے مارے ہی پھرتے رہیں۔"

کارساز کے قریب پہنچ کر مجھے اپنی کار کی رفتار دھیمی کرنی پڑی کیوں کہ یہاں ہمارے آگے جانے والی گاڑیاں بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راستہ بہت تنگ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کو گزرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔ گاڑیاں جس قدر آگے بڑھتی جا رہی تھیں ان کی رفتار میں کمی آتی جا رہی تھی۔ آبی نے جھنجلا کر کہا "یار! اسی رفتار سے چلتے رہے ہم، تو اسٹار گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ہی صبح ہو جائے گی۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی ہمارے لیے۔ رات بھر مارے مارے پھرنے سے تو بچ جائیں گے نا!"

"ہاں، رات تو گزر ہی جائے گی لیکن صبح ہونے کے بعد تیرے ان یہودی یاروں کے کتے بھی نکل پڑیں گے ہماری تلاش میں اور انہیں زیادہ دشواری نہیں ہو گی ہمیں ڈھونڈ نکالنے میں، کیوں کہ ہم جس کار میں پھر رہے ہیں، یہ بھی انہی کی ہے۔ ان کا ہر آدمی پہچانتا ہو گا اسے۔ یا اس کا نمبر تو بتا ہی دیا جائے گا انہیں جو ہماری تلاش میں نکلیں گے۔"

"ہاں یار! یہ تو بالکل صحیح بات بتائی ہے تُو نے۔ صبح تک اگر ہم بنگلے میں واپس نہ پہنچے تو انہیں یہ یقین ہو جائے گا کہ ہم اُن کے جال کو توڑ کر نکل بھاگے ہیں۔ اس صورت میں وہ ہمیں تلاش کر کے پکڑنے کی کوشش تو ضرور کریں گے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں یار جی! اس بھیڑ بھاڑ سے نکلنے کی کوشش کرو جلد از جلد۔ آگے کارساز سے ایک سڑک نیشنل اسٹیڈیم کی طرف جاتی ہے، میرا خیال ہے اُدھر ہی نکل چلو، شاید اُدھر وہ تیرے ہمدرد بھی مل ہی جائیں۔" آبی نے کہا۔

"اور اگر وہ نہیں مل سکے، تب کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر وہ نہیں ملے تو ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہو گا کہ ہم بنگلے پر صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جائیں۔"

"نہیں یار! یہ تُو کیسی بات کر رہا ہے۔ پسپائی اختیار کرنا چاہتا ہے، حالاں کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ایک بار کوئی قدم اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا ہماری فطرت تو نہیں رہی ہے آبی! یہ آج کیا ہو گیا ہے تجھے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"کبھی کبھی مصلحتاً دُشمن کو شکست دینے کے لیے ایسی چالیں بھی چلنا پڑتی ہیں جن سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قدم اُکھڑ رہے ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے، اسے بُزدلی نہیں جنگی چال کہتے ہیں یار۔" آبی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "حیرت ہے یار! تو بھی مصلحتوں اور حکمتِ عملیوں کی باتیں کرنے لگا ہے۔ حالانکہ اسی بات پر میرا مذاق اڑاتا رہا ہے اب تک۔ یہ بتا، تجھے تقدیر کدھر لے جاتی ہے ویسے جنت نگر کے بارے میں کیا کہتا ہے تُو؟"

"کیا مطلب ہے بھئی تیرا؟ یہ اچانک اس گھڑی تجھے جنت نگر کا خیال کیسے آ گیا؟" آبی آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکتے ہوئے بولا۔

"بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ ہم بنگلے پر واپس جانے کے بجائے فردوسی کے فلیٹ پر کیوں نہ چلیں؟ وہ بھی ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔"

"ہاں، کہنا تو ٹھیک ہی ہے تُو۔ حیرت ہے! مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا مگر یار جیلانی! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے وہ غریب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اب تک تو ہم نے صرف پولیس سے بچنے کے لیے وہ ٹھکانہ استعمال کیا ہے لیکن اب جن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہے انھوں نے ہمارے ایک ایک واقف کار کے بارے میں معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔ فردوسی بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل تو نہیں ہو گی۔ وہ ہمیں ڈھونڈنے نکلیں گے تو فردوسی کے فلیٹ کو بھی ضرور کھنگالیں گے۔" آبی نے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہی کہی ہے تُو نے۔ چلو پھر یوں کرتے ہیں، میں نے ایک ٹھکانہ دیکھا ہوا ہے فیروز کا جس روز تجھ سے ملا تھا میں اسی روز فیروز مجھے لے گیا تھا وہاں۔ اس جگہ پہنچنے کا راستہ تو ذہن میں نہیں رہا ہے میرے، پھر بھی کوشش کروں گا شاید پہنچ ہی جاؤں۔ وہ مجھے ہل پارک سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم اب اُدھر ہی چلتے ہیں۔ ہل پارک پہنچ کر میں اسی طرف چلوں گا۔ مجھے اُمید ہے اس راستے پر پڑ کر میرا حافظہ میری راہنمائی کرنے لگے گا۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد تو پھر مسئلہ ہی نہیں رہے گا کوئی۔"

اس دوران ہماری کار کارساز کے اس سرے پر پہنچ گئی تھی جہاں سے ایک سڑک نیشنل اسٹیڈیم کو جاتی ہے میں نے اپنی کار اسی سڑک پر موڑ دی۔ اس طرف مڑتے ہی میری نظر سڑک کے ایک کنارے کھڑی ہوئی اس مزدا کار پر جا ٹکی جس کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ اب دوبارہ اس کا ملنا مشکل ہے۔ اسے دیکھتے ہی میں خوشی سے کھل اٹھا۔ آبی نے اس کار کو پہچان لیا تھا، بولا "ادے جیلانی! کچھ دیکھا تُو نے؟ وہ پیلے رنگ کی مزدا ہی ہے نا، جو سامنے کھڑی ہے۔"

گو مزدا جس جگہ کھڑی تھی، وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی ہم نے اُسے بآسانی پہچان لیا تھا۔ میں نے اپنی کار مزدا کے بالکل پیچھے روکتے ہوئے کہا "ہاں یار! ہے تو یہ وہی گاڑی، لیکن یہ یہاں کیوں کھڑی ہے؟ یہ بات سمجھ نہیں آئی ہے میرے۔"

ہماری کار کی ہیڈ لائٹس نے مزدا میں موجود دونوں اشخاص کو ہماری طرف متوجہ کر دیا تھا اور انہوں نے ہمیں پہچاننے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ مجھے گاڑی رکتے دیکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنی کار آگے بڑھا دی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آبی نے کھڑکی سے سر نکال کر دوسری سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ابے جیلانی! ایسا لگتا ہے . . . یہاں کوئی زبردست ایکسیڈنٹ

ہوگیا ہے۔ کسی بس نے کار کو بُری طرح رگید کے رکھ دیا۔ اسی لیے ٹریفک جام ہوگیا ہے یہاں۔"

"یہ کراچی ہے پیارے بھائی! یہاں ایسے تماشے جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حادثات تنگ اور مصروف سڑکوں پر کم اور کشادہ اور صاف راستوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کشادہ سڑکوں پر ڈرائیونگ بے خطر ہو کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے راستوں پر اکثر گاڑیاں بے قابو ہو کر ایک دوسرے میں جا گھستی ہیں۔ یہ تو یہاں کے معمولات میں سے ہے۔ کوئی انوکھی بات نہیں ہے یہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار! اس شہر میں زندگی بڑی ارزاں شے ہوگئی ہے، پروا ہی نہیں ہے کسی کو کسی کی۔" آبی سرد آہ بھر کر بولا۔

اسی وقت آگے جاتی ہوئی مزدا کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ وہ سڑک کے کنارے رک کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے بھی اپنی کار اس کے ساتھ ہی روک دی۔ مزدا میں سے وہی شخص اتر کر باہر آگیا جس سے پہلے بھی میری بات چیت ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے بھئی؟ یہاں گاڑی کیوں روک لی تم نے۔ کیا پھر کوئی تعاقب میں لگ گیا ہے ہمارے؟"

وہ میرے قریب آکر بولا۔ "آپ دونوں باہر آجائیں جناب، اب اس گاڑی میں مزید آگے جانا مناسب نہیں ہے۔"

میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "کیوں بھئی! ایسی کیا بات ہوگئی ہے اس گاڑی میں؟ مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔"

دوسری طرف سے آبی بھی اتر آیا تھا گاڑی سے۔ ہم دونوں اس کے پاس پہنچے تو وہ بولا۔ "یہ کار جس میں آپ دونوں سفر کر رہے ہیں، اس جرمن صنعت کار الیگزینڈر کی ملکیت ہے جسے آبی صاحب زخمی کر آئے ہیں۔ مجھے شبہ ہے، اس کار میں کچھ ایسے خفیہ آلات بھی نصب ہوں گے جو اس گاڑی کے بارے میں ایک ایک لمحے کی اطلاع کسی جگہ پہنچا رہے ہوں گے اور اس میں بیٹھ کر آپ دونوں نے جو گفتگو کی ہوگی اس کا ایک ایک لفظ یا تو کوئی سنتا رہا ہوگا یا کہیں ریکارڈ ہوتا رہا ہوگا۔ لہٰذا اس گاڑی کو وہاں لے جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔ جہاں ہم آپ دونوں کو لے جا رہے ہیں۔ اگر یہ ہمارے ساتھ ہوئی تو دشمن کو وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

آبی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "اچھا! تو کیا ہم اب تک جو باتیں کرتے رہے ہیں یا جہاں سے گزرے ہیں، اس کی انہیں خبر ہے؟"

"میں نے شبہے کا اظہار کیا ہے۔ یقین سے اس لیے نہیں کہہ سکتا ہوں میں کہ میں نے اس گاڑی کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ اسے اچھی طرح چیک کیے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور اتنا وقت بھی ہمارے پاس ہے نہیں کہ اسے چیک کیا جا سکے۔ یوں یہ گاڑی ہمارے کسی کام کی تو ہے نہیں۔ پھر ہم کیوں اس پر اپنا وقت برباد کریں۔ آپ دونوں ہماری گاڑی میں آجایئے، اسے ہم یہیں چھوڑے جاتے ہیں۔"

"ہاں بھئی! اس مصیبت سے جان چھڑا ہی لینا چاہیے ہمیں۔ پتا نہیں کب یہ ہمیں کسی رانڈن میں اتار دے۔" میں نے کہا اور مزدا کی طرف بڑھ گیا۔

میں اور آبی مزدا کی پچھلی نشست میں دھنس گئے تو وہ ایک بار پھر فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے اشخاص کو مخاطب کر کے کہا۔ "دوستو! تم ہمارے لیے اتنی بھاگ دوڑ کر رہے ہو لیکن ہمیں اب تک اپنے ایسے مہربان دوستوں کے نام بھی نہیں معلوم ہو سکے ہیں!"

وہی شخص جس سے میری اب تک گفتگو ہوتی رہی تھی، بولا۔ "یہ ہماری بدقسمتی ہے جناب! حالاں کہ ہم آپ دونوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ یوں بھی آپ دونوں خاصی شہرت کے مالک ہیں، ہماری طرح گمنام آدمی تو نہیں ہیں کوئی۔ مجھے آپ انور کمال کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ میرا ساتھی ہے گل زمان۔ بڑی خوبیوں اور بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے یہ۔ اسے بھی دشمنوں نے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا تھا۔ بہت کم عمری میں یہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس کی بڑی زبردست تربیت کی تھی انہوں نے لیکن اسے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اس کے ہاتھوں سے اس کے اپنے ملک کی بربادی چاہتے ہیں تو اس نے انہی کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ اسے ملک دشمنوں سے برسرِپیکار دیکھ کر فیروز صاحب نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ گل زمان کی وجہ سے ہم نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس کے بہت سے آدمی اور کئی اہم اڈے گل زمان کی نشاندہی پر تباہ کر دیے ہم نے۔"

"آفرین ہے بھائی گل زمان تجھ پر! کاش ہمارے ملک کے نوجوان تیری طرح وطن کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ کاش وہ جو دوسروں کی خاطر مادرِ وطن کو لہو سے غسل دینے پر کمربستہ ہیں، قتل و غارت اور ڈاکا زنی جن کا شعار بن گیا ہے، یہ سمجھ سکیں کہ ان کا یہ عمل خود ان کی اور ان کے خاندانوں کی بربادی کا باعث بن رہا ہے۔ وطن کی آزادی کا سودا کرنے کے بعد خود ان کے لیے زمین کا کون سا گوشہ باقی رہے گا جہاں وہ اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق گزار سکیں گے۔ قوموں کو زوال ہمیشہ جبھی ہوتا

ہے جب گھر میں نقب زن پیدا ہونے لگیں۔ دشمن یہ بات خوب جانتا ہے، اسی لیے وہ گھر کے لوگوں کو اپنے گھر کی دیواروں میں نقب لگانے کی تربیت دے رہا ہے تاکہ جب وہ ہمارا گھر لوٹنے کے لیے آئے تو اسے روکنے کے لیے کوئی دیوار کوئی دروازہ سلامت نہ ہو۔ وہ بے دھڑک، بے کھٹکے جدھر چاہے گھستا چلا جائے، جسے چاہے ڈنڈا لے اور جو چاہے اٹھا کر لے جائے۔"

"ہاں جی، یہ تو بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ ناسمجھ بچے نہیں ہیں نا یہ کہ انہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت ہو۔ جذبات میں بہہ کر اپنے ہی گھر کو آگ لگانے پر تل گئے ہیں، عقل کے اندھے۔ اللہ ہی چاہے تو انہیں عقل دے دے، ورنہ آدمی کی بات تو سمجھتے ہی نہیں ہیں یہ۔"

آبی بولا۔ "وہ یار انور کمال! وہ کار کہاں غائب ہوگئی بھئی، جس کے پیچھے لگ کر تم آئے تھے؟ اس کا تو پتا ہی نہیں چلا کچھ اب تک؟"

"ارے؟ آپ نے دیکھا ہی نہیں اسے؟ کمال ہے بھئی! حالاں کہ سارا ٹریفک جام کر رکھا ہے اس گاڑی نے۔" انور کمال بولا۔

"کون سا ٹریفک جام کر رکھا ہے اس نے؟ وہ جو کارسلز پر ٹریفک رکا ہوا ہے اس کی بات تو نہیں کر رہے ہو تم؟" آبی حیرانی سے بولا۔

"بالکل بالکل، اسی کی بات کر رہا ہوں میں۔ وہ سارا ٹریفک اسی گاڑی نے روک رکھا ہے وہاں۔" انور کمال نے جواب دیا۔

"مجھے تو وہاں وہ کار نظر نہیں آئی کہیں بھی۔ پھر اس نے کیسے ٹریفک جام کر دیا؟ وہاں تو شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" آبی بولا۔

"ہاں جناب! ہوا تو ایکسیڈنٹ ہی ہے مگر وہ خود ہی نہیں ہوگیا ہے، کرایا گیا ہے اور تباہ ہونے والی کار وہی ہے جس کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں۔ اب آیا سمجھ میں آپ کی، اسی کار کے حادثے نے پوری سڑک بند کر دی ہے۔" انور کمال نے وضاحت کی۔

"اچھا! مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا مطلب ہے، اسے بس نے کس طرح ٹکر ماری تھی؟" آبی کے ساتھ ہی میں بھی حیران ہو کر بولا تھا۔

"وہ بس ہماری کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی اور کار ہمارے آگے تھی۔ بس کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی تھی۔ میں نے سائیلنسر لگے ہوئے پستول سے بے آواز فائر کر کے کار کا ایک ٹائر پھاڑ دیا۔ ٹائر کے پھٹتے ہی کار بُری طرح لہراتی ہوئی ایک دم بس کے آگے آگئی۔ نتیجے کے طور پر بس نے اس کا کچومر بنا کر رکھ دیا۔ اس حادثے کے بعد ہی ہم نے اپنی کار دوسری سڑک پر موڑ کر روک دی تھی۔ میں نے کار سے اتر کر حادثے کے مقام پر جا کر اس کو دیکھا تھا، اس میں ڈرائیور اور الیگزینڈر کی حسین سیکریٹری کے سوا کوئی نہیں تھا اور ان دونوں کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ان میں سے کوئی زندہ بھی بچ گیا ہوگا۔" انور کمال نے بتایا۔

"یعنی ان کی بالکل ہی چھٹی کر دی تم نے؟" آبی مسکرا کر بولا۔

"بالکل اس دنیا سے ہی گزار دیا ہے انہیں!"

"ہاں جی، میرے نزدیک ایسے لوگ، دوسروں کی بربادی جن کا نصب العین ہو، کسی طرح بھی ہمدردی یا رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔"

بالکل سچ کہتے ہو تم، کتا بڑا وفادار جانور ہے لیکن اگر پاگل ہو جائے تو دوسروں کی سلامتی کے لیے اسے مار دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

باتوں کے دوران ہمیں یہ پتا ہی نہیں چل سکا کہ ہم کن راستوں سے گزرتے ہوئے کدھر جا رہے ہیں۔ چونکا تو میں اس وقت جب میں نے کار کو ایک خوشنما اور عالی شان کوٹھی کے پورچ میں رکتے دیکھا۔ میں نے انور کمال سے کہا۔

"یہ تم کہاں لے آئے ہو ہمیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں، کسی غلط جگہ نہیں لائے ہیں ہم آپ کو۔ آئیے اب باہر آجایئے آپ بھی، فیروز صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔"

میں نے کار کا دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے کہا۔

"تم تو یار اپنے نام کی طرح آدمی بھی کمال کے ہی لگتے ہو۔ تم بھی میرے ساتھ ہی اس گاڑی میں موجود تھے، پھر تمہیں یہ کیسے پتا چل گیا کہ فیروز صاحب ڈرائنگ روم میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "بابا اسحاق کے آستانے پر جانے لگا ہوں میں آج کل۔ یہ چھوٹی موٹی کرامات انہی سے ملی ہیں مجھے۔"

"اچھا تو اس فراڈیے کے پاس کرامات بھی ہیں...! اپنے معتقدین کو کرامات بھی دکھایا کرتا ہے وہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں جی! کیوں نہیں۔ اتنے سارے لوگ یوں ہی تو اس

کا دم نہیں بھرنے لگے ہیں۔ ضرورت مندوں کے بہت کام آتا ہے جی وہ۔"

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں سچ مچ فیروز موجود تھا۔ اس وقت وہ بالکل اکیلا ہی تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے اور آبی کو اس نے اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا کر انور کمال سے کہا۔ "کوئی اور مصیبت تو پیچھے نہیں لگی تھی دوبارہ، اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا نا؟"

"نہیں سر، اس کے بعد پھر کوئی نہیں آیا۔ شاید انہیں ان دونوں کے انجام کی ابھی خبر ہی نہیں ہو سکی ہے۔" انور کمال نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم باہر جاؤ اور آس پاس کا چکر لگا کر دیکھو کوئی تمہاری لاعلمی میں یہاں تک پہنچ ہی نہ گیا ہو۔"

"جی بہتر ہے سر، ویسے مجھے اطمینان ہے لیکن آپ کا حکم ہے تو میں علاقے کا جائزہ لے کر مزید اطمینان کیے لیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

انور کمال فوراً ہی الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فیروز مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بھائی غلام جیلانی! اب کہو، کیا بات ہے؟ مجھ سے ملنے کی ایسی کون سی ضرورت پیش آگئی تھی تمہیں آج۔ ویسے آج تم نے اس ظہیر احمد کو اچھا سبق دیا ہے۔"

"سبق دینے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔

"اب وہ کسی سبق کو یاد رکھنے کے قابل ہی کہاں رہا ہے میرے یار!"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اس کے چوٹیں ضرور شدید آئی ہیں۔ ایک بازو کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ ٹانگیں دونوں ٹوٹ گئی ہیں، زخم بھی خاصے آئے ہیں مگر مرا نہیں ہے وہ اور نہ ہی مرنے کا کوئی امکان ہے اس کے۔ البتہ ایک لمبے عرصے کے لیے بستر سے ضرور لگ گیا ہے وہ۔"

"اچھا!" آبی نے ذرا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمال لوگ ہو یار تم بھی۔ آس پاس دور دور تک تمہارا کوئی پتا نشان نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے تمہیں۔ ہم تو اسے مُردہ سمجھ کر ہی آگئے تھے وہاں چھوڑ کر اور تم نے میڈیکل رپورٹ بھی دیکھ لی اس کی۔"

"اس میں حیران ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے آبی بھائی۔ جو ذمے داریاں ہم نے اپنے سر لے رکھی ہیں، ان کا تقاضا بھی ہے کہ ہم اپنے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں پل پل کی خبر رکھیں۔ غفلت ہم کسی کی طرف سے ذرا بھی نہیں برت سکتے کیا معلوم ہماری نظروں سے اوجھل ہونے والا وہ ایک ہی ہماری بربادی کا سبب بن جائے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا اور باخبر رہنا پڑتا ہے، اس کے باوجود دشمن کچھ ایسی چالیں چل جاتے ہیں جن کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہو پاتی۔ یہی دیکھو، جیلانی کے بتانے سے پہلے ہم بابا اسحاق کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھے، حالاں کہ یہاں وہی ان کا سرخیل ہے۔ جیلانی نے اس کے بارے میں بتایا تو ہمیں یقین نہیں آتا تھا لیکن جب ہم نے اس بہروپیے کو نظر میں رکھ کر تفتیش کی تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔" فیروز نے کہا۔ "خیر چھوڑیں اس قصے کو اور اب یہ بتائیں آپ لوگ مجھے کہ میں آپ حضرات کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ کس سلسلے میں آئے ہیں آپ دونوں میرے پاس؟"

میں نے کہا۔ "کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے فیروز کہ تم ایک ایک پل کی خبر رکھنے کا دعویٰ کر رہے ہو مگر ہمارے آنے کا مقصد نہیں جانتے؟"

"اوہ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہیر احمد کے ساتھ فیصلہ کن معرکے کے بعد بھی کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟" فیروز چونک کر بولا۔

"ہاں، بہت زبردست قسم کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آبی نے جیرالڈ کا پیٹ چاک کر ڈالا ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔

"یہ جیرالڈ کون ہے؟" فیروز نے سوال کیا۔

"وہی تمہارا جرمن صنعت کار، جسے تم لوگ الیگزینڈر کے نام سے جانتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اوہ، مگر کیوں؟ ایسا کیسے ہو گیا۔ شام کو بابا اسحاق کے آستانے کی طرف گئے تھے نا تم لوگ، لزی کے ساتھ؟ تو کیا وہ وہاں آستانے پر مل گیا تمہیں؟ مگر اس سے جھگڑے کی نوبت کیسے آگئی؟" وہ بہت حیران ہو رہا تھا۔

میں نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ تفصیل سننے کے بعد فیروز نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم سے اندازہ لگانے میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ اس معاملے میں قصوروار جیرالڈ ہی ہے اور یہ بات لزی اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تھی اور اس سارے واقعے کی عینی شاہد ہے وہ، چنانچہ تم پر یا آبی پر اس سلسلے میں کوئی الزام آنے کی مجھے بالکل توقع نہیں ہے۔"

"پھر کیا تمہارے خیال میں ہمیں واپس وہیں چلے جانا چاہیے؟" آبی نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ تم نے غلط مطلب اخذ کر لیا ہے میری بات کا۔" فیروز اس کے لہجے کی تلخی کو

نظرانداز کر کے بولا۔ "تم یہ بھول رہے ہو کہ وہاں سے نکلنے کے بعد تمہارا تعاقب کیا گیا تھا اور تعاقب کرنے والے گو اب کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے ہیں لیکن اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ تعاقب کے دوران انہوں نے تم دونوں کے بارے میں اپنے ہیڈکوارٹر کو کوئی اطلاع نہیں دی ہو گی۔ انھوں نے یقیناً ایسی اطلاعات پہنچا دی ہوں گی جن کی وجہ سے اب تمہاری پوزیشن خراب ہو چکی ہو گی مگر یہ سب میرا اندازہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل تم شرافت علی کو فون کر کے صورتِ حال کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر واقعی شرافت علی تمہارے ساتھ مخلص ہے تو وہ تمہیں سب کچھ صحیح صحیح بتا دے گا۔ دوسری صورت میں وہ گول مول باتیں کر کے تمہیں واپس آنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ مجھے بتاؤ ٹیلی فون کدھر ہے؟ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔" میں فیروز سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

آبی بولا۔ "لیکن پتا نہیں، وہ بنگلے پر پہنچا بھی ہو گا یا نہیں۔ ہم تو بس اچانک ہی مڑ گئے تھے۔ اگر اس نے ہمیں مڑتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا تو پتا نہیں کہاں ہمیں ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔ کہیں وہ بدگمان ہی نہ ہو گیا ہو ہماری طرف سے۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہ بنگلے پر نہیں ہوا تو میں اس کے گھر فون کروں گا۔ دونوں جگہ نہیں ملا تو کچھ دیر بعد پھر ٹرائی کریں گے ہم، بہرحال اس سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔ ان لوگوں کے درمیان وہی ایک دوست ہے ہمارا۔ اسی سے صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکتا ہے ہمیں۔" میں نے آبی سے کہا۔

فیروز مجھے اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ریسیور اٹھا کر... شرافت علی کے اس بنگلے کے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے جہاں اس نے ہمیں ٹھہرایا ہوا تھا۔ دوسری ہی گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور ریسیور اٹھانے والا شرافت علی تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔ "میں تمہارے فون کا انتظار ہی کر رہا تھا یہاں۔"

"اچھا، حیرت ہے! تمہیں یہ یقین کیوں کر ہو گیا کہ میں تمہیں فون ضرور کروں گا؟" میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

"میں نے تمہیں شاہراہِ قائدین پر مڑتے دیکھ لیا تھا اور اس زرد رنگ کی مزدا کو بھی تمہارے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ پھر میں نے تم لوگوں کے قریب جانا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا صدر کی طرف نکلا چلا گیا۔ صدر میں تھوڑی سی شاپنگ کی تاکہ اگر کوئی میری نگرانی کر رہا ہو تو یہ سمجھے کہ میں شاپنگ کی غرض سے نکلا ہوں۔ اس کے بعد بنگلے پر واپس آ کر تمہارے فون کا انتظار کرنے لگا۔" شرافت علی نے بتایا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ لزی تو ابھی واپس نہیں آئی ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں، وہ ابھی نہیں آئی ہے۔ ویسے میں نے دربان کو ہدایت کر دی ہے کہ اگر کوئی تم دونوں کے بارے میں پوچھے تو وہ کہہ دے کہ تم دونوں شام کے قریب میم صاحب کے ساتھ گئے تھے، اس کے بعد سے اب تک واپس بنگلے پر نہیں پہنچے ہو۔" شرافت نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے میرے یار، لیکن ایک اور گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک سفید کرولا کار میں جیرالڈ کی سیکریٹری اور ایک اور شخص نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ ان کی کار اور وہ دونوں تو کارساز کے قریب ایک حادثے میں کام آگئے ہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ انھوں نے تعاقب کے دوران ہمارے اور ہمارے دوستوں کے بارے میں کسی کو کوئی رپورٹ دے دی ہو گی، چنانچہ تم یہ پتا کرو کہ وہ لوگ ہمارے بارے میں کس انداز میں سوچ رہے ہیں؟ اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ تم بنگلے پر رک کر لزی کا یا اس کے فون کا انتظار کرو۔ وہ ضرور تمہیں ہدایت دے گی ہمارے بارے میں۔"

"یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ جیرالڈ کی سیکریٹری نے اگر کوئی ایسی ویسی رپورٹ دی ہے تو لزی ضرور اس سلسلے میں مجھے بتائے گی۔"

"میں تھوڑی دیر میں دوبارہ فون کروں گا تمہیں۔ اگر کوئی خطرے والی بات ہو تو میری آواز سنتے ہی رانگ نمبر کہہ کر ریسیور رکھ دینا۔ یہ بھی کوشش کرو کہ جیرالڈ اور آبی کے بارے میں ہائی کمان، یعنی اس بہروپیے بابا کے تاثرات کیا ہیں؟" میں نے اسے سمجھایا۔

"یہ معلوم کرنے کی میں پہلے ہی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک کوئی سن گن مل نہیں سکی ہے مجھے۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے یار! تم کوشش جاری رکھو اپنی، میں پھر فون کروں گا تمہیں۔ ہمارے آئندہ اقدام کا تمام تر دارومدار اب تمہاری طرف سے ملنے والی اطلاع پر ہے۔"

اچانک فیروز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا

تھا مجھ سے۔ میں شرافت سے ہولڈ کرنے کے لیے کہہ کر فیروز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں کیا بات ہے؟" میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر فیروز سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "اس بنگلے میں تم کئی دن سے رہ رہے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس فون پر ہونے والی گفتگو ٹیپ کی جاتی ہو؟"

"ابھی تک تو ایسی کوئی بات ہوئی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ ایسا ہوتا ہوگا۔"

"شاید اب تک تم نے اس فون پر ایسی کوئی بات کی بھی نہیں ہوگی۔" فیروز نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔" میں نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے آج ظہیر احمد نے مجھے فون کر کے دھمکیاں دی تھیں، اگر فون ٹیپ کیا جا رہا ہوتا تو ان لوگوں کو ظہیر احمد کی دھمکیوں وغیرہ کے بارے میں ضرور معلوم ہو جاتا لیکن جب ہم ظہیر احمد سے نمٹنے کے بعد آستانے کی طرف گئے تھے تو جبیر اللہ نے ہمارے دیر سے آنے کی شکایت کی تھی۔ اس کی باتوں سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ظہیر احمد اور میرے درمیان ہونے والی چپقلش کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ یوں بھی وہ فون ان کے ایک قابلِ اعتبار آدمی کا ہے۔ ایک ایسے شخص کا جو ان کی صرف ظاہری حیثیت سے واقف ہے۔ ان کی حقیقت کا کوئی علم نہیں رکھتا۔"

"خیر، ابھی اس سے کچھ مت کہو، تھوڑی دیر بعد دوبارہ فون کرو گے تو کچھ اندازہ ہو سکے گا۔" فیروز نے کہا۔

میں نے شرافت علی سے کہا۔ "اچھا یار جی! کوئی اور بات تو نہیں کرنا ہے تمہیں؟ میں سلسلہ منقطع کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کرنا۔ شاید اس وقت میں صورتِ حال کے بارے میں صحیح طور پر بتا سکوں تمہیں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر میں تمھیں ایک گھنٹے کے بعد فون کروں گا۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ صبح میں نے شرافت علی کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ناشتا کیا تھا، اس کے بعد سے اب تک کچھ کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے بعد آبی نے مجھے سوتے سے جگایا تھا اور جب سے اٹھا تھا، بھاگ دوڑ، ہنگامہ آرائی نے مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اب ذرا فرصت میسر آئی تو بھوک کا احساس شدید ہو گیا۔ میں نے فیروز سے کہا۔ "یار! بڑے زور کی بھوک لگی ہے میرے بھائی! کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست ہے یہاں یا نہیں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں۔ ایک گھنٹا تو اطمینان کا ہے تمھارے پاس، اتنی دیر میں کھانا وغیرہ کھا لو۔"

"ہاں یار! بھوک تو مجھے بھی اچھی خاصی لگ رہی ہے اس گھڑی۔ کھانے کا انتظام ضرور کر دو برادر!" آبی نے بھی جلدی سے کہا۔

فیروز اٹھ کر ہمارے لیے کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ میں نے آبی سے کہا۔ "آبی یار! یہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔"

"اوئے، ساڈے نال پہلے کدی اچھا ہویا اے جو ہُن ہُندا۔ اساں تے ہمیشہ ای ایہو جیے اچانک آن والیاں طوفاناں دا مقابلہ کیتا اے۔"

"ہاں یارا! ہُندا تے ایویں رہیا اے اَج تک، مگر اس دی کوئی انتہا وی ہووے گی کدی؟ میں تے عاجز آ گیا واں یار، ایہہ ہر وقت دے دوڑن بھجن کولوں۔ ہُن تے میرا سارا وی پُھل گیا اے میرے ویر! تھک گیا ہوں میں، ہُن میں چاہنا واں کہ کچھ دیر لئی سکون دے نال بیٹھ کے آرام کر لواں۔" آبی نے کہا۔

"اور یہ سکون نام کی کوئی شے ہمارے بھاگ میں لکھی ہی نہیں گئی ہے پیارے بھائی غلام جیلانی! یہ تجربہ ہمیں ہزار بار ہو چکا ہے۔ اس لیے اچھا یہی ہے کہ جو تقدیر میں لکھا نہیں گیا، اس کی تمنا ہی نہ کی جائے۔ قسمت سے کون لڑ سکا ہے میرے یار؟"

"ہاں بھئی، تیری بھی بات غلط نہیں ہے۔ یہ ہماری خم پارہ تقدیر ہی تو ہے جو ہمیں پارے کی طرح حرکت میں رکھتی ہے ہر گھڑی، کسی ایک جگہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتی۔ پتا نہیں کتنے خم ہیں اس میں کہ کسی طرح سیدھی ہونے ہی نہیں دیتی ہے۔" میں نے آبی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جیلانی! اس کتے جبیر اللہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے میں نے، وہ کچھ زیادہ بُرا نہیں کیا ہے۔ آخر تو ایک دن یہی کرنا تھا ان سب کے ساتھ۔ ان کتوں کو ہم اپنی دھرتی پر مزید گڑھے کھودنے کی اجازت تو نہیں دے سکتے اور اب جب کہ یہ سلسلہ چل ہی نکلا ہے تو ہمیں جب زجلد بقیہ لوگوں کا بھی جھٹکا کر ہی دینا چاہیے۔ کیوں نہ آج رات ہم اس بھرے پیسے کو بھی جا دبوچیں۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے مجھے کہ اب یہی کرنا پڑے گا۔ ابھی وہ ہماری طرف سے مطمئن ہیں۔ زیادہ خطرہ نہیں محسوس کر رہے ہوں گے وہ ہم سے۔ بلکہ شاید اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ جب چاہیں گے ہمارا گلا دبوچ لیں گے۔ للہٰذا اُن کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی ان کی شہ رگ کاٹ دینا چاہیے ہمیں۔ فیروز آئے تو پھر کوئی پروگرام بنا لیتے ہیں اس سلسلے میں۔" میں نے کہا۔

"اوئے لعنت بھیج یار! اس فیروز پر، اسے اس معاملے میں گھسیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس ڈبا پیر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں گا۔ سالے کی ساری چالاکی اور عیاری نکال کے باہر ڈھیر نہ کر دوں تو آبی نہ کہنا مجھے۔ اس سے پہلے بھی ہمیں کتنے ظرم خان ملے ہیں۔ ان سب سے ہم اکیلے ہی تو نمٹتے رہے ہیں۔ پھر اب کیا ہو گیا ہے کہ دوسروں کی طرف دیکھنے لگا ہے تو؟"

"تو یہ بات بھول رہا ہے آبی! اب سے پہلے جن لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے ہمارا، وہ بھی ہماری ہی طرح کے تھے۔ اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنے والے۔ ان میں سے کسی کا بھی تعلق کسی ایسی تنظیم سے نہیں تھا جس کی جڑیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ بلکہ وہ تو کوئی چھوٹی موٹی بین المملکتی تنظیم کے بھی رکن نہیں تھے۔ اس لیے وہ ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کر سکے۔"

"یہ تو کیسے کہہ رہا ہے؟ وہ جن کے پیچھے ہم امرتسر وغیرہ تک دوڑے چلے گئے تھے وہ کوئی معمولی لوگ تھے۔ باقاعدہ سرکار دربار سے تعلق تھا ان کا اور بھارتی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی انھیں مگر ہم اُن کے گھروں میں گھس کر نمٹا آئے تھے انھیں۔"

"ہاں، سچ کہہ رہا ہے تو، مگر وہ سب اسی خطے کے باسی تھے۔ اُن کا مزاج، تہذیب و تمدن اور خصائل ہم سے بہت ملتے جلتے تھے اور ان کے وسائل کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے تھے۔ جب کہ اِن کے بارے میں اب تک ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بے حد حیران کن ہے۔ جدید ترین سائنسی آلات ان کے پاس ہیں جو میلوں دور بیٹھے ہوئے دشمن کی نقل و حرکت کی انھیں ہر وقت خبر دیتے رہتے ہیں۔ ان سے ٹکرانے کے لیے اُنھی جیسے وسائل کی ضرورت ہے میرے بھائی! جو فیروز کے تعاون سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔"

"یہ وسائل تو مجھے یوں لگتا ہے تیرے پاس بھی بہت ہو گئے ہیں۔ امریکا کے ایک ہی دورے نے تجھے بہت اہم شخصیات کی لائن میں کھڑا کر دیا ہے۔ تیرے سوچنے کا انداز بڑی حد تک تبدیل ہو گیا ہے اور سائنس مجھے تیرے سامنے بے بس نظر آنے لگی ہے۔"

"کیا مطلب ہوا بھئی تیری اس بات کا؟ یہ سائنس کی بے بسی کا ذکر کر کے کیا ظاہر کرنا چاہتا ہے تو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ سائنس کی بے بسی نہیں ہے کہ تیرے سامنے پستولیں اور اسٹین گنیں کان پکڑ لیتی ہیں اپنے۔" وہ بولا۔

"اوہ، یہ بات ہے، بھولا نہیں ہے تو ابھی اس قصے کو؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھولنے والی بات تو نہیں ہے یہ، ایسا واقعہ جو عقل و ہوش گم کر کے رکھ دے، بھلایا جا سکتا ہے کبھی؟" آبی نے کہا۔

"اب یار تجھ سے تو چھپانے والی بات نہیں ہے یہ، میں خود تجھے بتا دینا چاہتا تھا، بس دھیان نہیں رہا مجھے۔"

"ٹک نئیں اوئے، دھیان نہ رہن دا بہانہ نئیں کر میرے نال ——— میں تے آپے ای معلوم کرن دی کوشش نئیں کیتی۔ اوس وقت تے توں ہیبا۔ نجان بن گیا ساں جیویں اس دے بارے کج جاندا ای نئیں، تے ہُن اتفاق قرار دے رہیاں اُس گل نوں۔"

"تو بھی تو بے سوچے سمجھے، موقع بے موقع زبان چلانے لگتا ہے۔ شرافت علی کے سامنے میں تجھے کیسے بتا دیتا اتنی اہم بات؟"

"اچھا! اس کا مطلب ہے کوئی کرامت حاصل ہو گئی ہے تجھے، جس کا علم اوروں کو نہیں ہے؟" آبی شوخی سے آنکھیں نچا کر بولا۔

"ہاں مگر وہ کرامت مجھ میں نہیں، اس انگوٹھی میں ہے۔" میں نے اُسے اس طلسمی انگوٹھی کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

آبی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انگوٹھی کو تکتے ہوئے بولا۔ "کمال ہے بھئی! ایسی طلسم ہوشربا ہے یہ انگوٹھی اور یہ تجھے عالیہ نے دے دی۔ اس فتنہ گر عالیہ نے جو تجھے ان راہوں میں لا پھینکنے کی ذمے دار ہے۔ جس نے تیری واپسی کے سارے دروازے بند کر کے ان کے نشان تک مٹا دیے اور ایک ایسی دلدل میں لا چھوڑا ہے جس سے نکلنے کی کوئی اُمید تک نظر نہیں آتی ہے؟"

"ہاں یار آبی! یہ مجھے اسی عالیہ نے دی ہے۔ وہ اب تک دنیا کے ذلیل ترین کاموں میں بھی دشمن کا ساتھ دیتی آئی تھی مگر اپنے ملک کی بربادی اور یہودیوں کے عزائم کی تکمیل میں ان کی معاونت کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔ اس مقام پر وہ دشمن سے بغاوت کرنے پر تل گئی ہے۔ اس نے دشمن اور یہودیوں کے خلاف مضبوط کرنے کے لیے ہی یہ انگوٹھی مجھے دی ہے۔" میں نے آبی کو بتایا۔

"کمال ہے یار! اپنے اعمال اور کردار سے وہ ایسی لگتی تو بالکل بھی نہیں ہے کہ اسے اپنے وطن سے اتنی محبت ہوگی۔" آبی بولا۔

"ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے آبی! دنیا کے بدترین آدمی پر بھی ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنے گناہوں کا بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر اس بوجھ میں مزید اضافہ کرنے کا حوصلہ نہیں رہتا اس میں، بلکہ وہ اسے ہلکا کرنے کی فکر کرنے لگتا ہے۔ عالیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے شاید۔ وہ اب معصیت کے اس بوجھ کو اٹھائے پھرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تجھے عالیہ کا تعاون حاصل ہوگیا ہے تو اس دشمن کی گردن مروڑنا بھی آسان ہوگیا ہے تیرے لیے، اس رذیل کا کام کیوں نہیں تمام کر دیتا ہے اب تو۔ اسے کیوں ڈھیل دے رکھی ہے اس قدر تو نے؟ حالانکہ پہلا کام یہی کرنا تھا [illegible]"

"کسی [illegible] تیری یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ گو دشمن کے خلاف کسی اقدام کے موقع پر اب بھی عالیہ میرا ساتھ نہیں دے گی۔ وہ اپنا سہاگ اپنے ہی ہاتھوں اجاڑنے کے لیے کس طرح تیار ہوگی! لیکن اس کے باوجود میں دشمن کے بوجھ سے دھرتی کو نجات دلادوں گا، یہ عہد ہے میرا، مگر اس کے لیے یا تو مجھے ایک بار پھر امریکا جانا ہوگا یا اس کے یہاں آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ بہرحال اس سے پہلے ان ذلیل یہودیوں کا قصہ ختم کرنا ہے ہمیں۔ یہ جونک کی طرح ہمارے جسم میں پیوست ہوکر ہمارا لہو پینے میں مصروف ہیں۔ اگر ان کی طرف سے ذرا بھی توجہ ہٹائی ہم نے تو یہ ہماری ساری توانائی نچوڑ لیں گے۔"

کمرے کے دروازے پر آہٹ سن کر میں نے ادھر نظریں اٹھائیں۔ اسے پہچاننے میں، مجھے ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ وہ زلیخا تھی۔ وہ جس سے کراچی میں قدم دھرتے ہی فیروز کے اس مکان میں.... مڈبھیڑ ہوئی تھی میری، جہاں فیروز ایئرپورٹ سے مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ چالیس پچاس سالہ ملازمہ جس کی زبان اور آنکھیں ایک ساتھ بولتی ہوئی تھیں۔ اس گھڑی بھی وہ بڑی بڑی غزال آنکھیں شاعری کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناز سے سمٹتے شرماتے ہوئے کہا "صاحب جی! ادھر ڈائننگ روم میں چلیں۔ کھانے پر انتظار ہو رہا ہے آپ دونوں کا۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلو چلتے ہیں اور زلیخا ہو زلیخا بی بی! ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟"

"ہائے میں مرجاؤں۔ آپ کو میرا نام بھی یاد ہے اب تک۔ میں تو سمجھ رہی تھی بھول بھال چکے ہوں گے۔" وہ لجا کر بولی۔

"رکھنے والوں نے نام ہی ایسا رکھا ہے بی بی تیرا کہ آدمی کبھی بھول ہی نہیں سکتا ہے اسے۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

وہ مڑ کر میرے آگے آگے چلنے لگی۔ آبی میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "تو تو کہتا تھا جیلانی! تجھے ان کا ٹھکانا معلوم نہیں ہے؟"

"تیرا کیا خیال ہے، کیا جھوٹ بولا تھا میں نے؟ یہ خیال کیسے آیا تیرے دل میں؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تو اس گھر میں آج سے پہلے نہیں آیا تھا تو یہ تجھے کیسے جانتی ہے؟ اور تو اسے کس طرح جاننے لگا؟" آبی بولا۔

"میں نے بتایا نہیں تھا تجھے کہ سان فرانسسکو سے کراچی پہنچتے ہی ہمیں فیروز لے گیا تھا اپنے ساتھ۔ وہیں یہ بھی موجود تھی۔ ملازمہ ہے یہ فیروز کی۔" پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہوشیار رہنا اس سے، بڑی کمبل قسم کی عورت ہے یہ۔"

"وہ تو اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہا ہے۔" آبی نے کہا۔ "اسی لیے تجھے یاد رہ گئی ہے اب تک۔"

زلیخا چلتے چلتے گردن موڑ کر ہمیں دیکھتے ہوئے بولی "جی کسی کے بارے میں یوں کھسر پھسر کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا؟"

"نہ بی بی! کسی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دے۔ ہم تیری برائی نہیں کر رہے ہیں۔ اپنے دوست سے تعارف کرا رہا تھا میں تیرا۔"

"ہائے میں مرجاؤں۔ اب میں بھی اس قابل ہوگئی کہ تعارف کرائے میرا کسی سے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

آبی بولا۔ "زلیخا بی بی! کیا تیرا جی بالکل اٹھ گیا ہے اس دنیا سے؟ جینے کی چاہ بالکل ختم ہوگئی ہے تیرے دل سے؟"

"کیوں صاحب جی! اللہ نہ کرے جی، میرا دل کیوں نہ چاہے گا جینے کو؟ دکھ کیا ہے مجھے جو مرنا چاہوں گی میں؟" وہ جلدی سے بولی۔

"مجھے کیا پتا بھئی تو کیوں مرنا چاہتی ہے۔ تو خود ہی مرنے کی دعا کر رہی تھی اپنے لیے۔ جبھی پوچھا تھا میں نے۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہائے میں مرجاؤں۔ میں نے کب دعا مانگی ہے جی مرنے کی۔ ایسی باتیں نہ کریں، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے مرنے سے۔"

میرے لیے ہنسی روکنا ناممکن ہوگیا اور میں بے ساختہ قہقہے لگانے لگا۔ آبی نے اسے بری طرح گھیر لیا تھا۔ "ہائے میں مرجاؤں" شاید اس کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ وہ بے ساختہ یہ جملہ کہہ جاتی تھی۔ اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ آبی نے اسے حیران و پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں ہنستے دیکھ کر وہ اور بھی پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے اور آبی کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میری ہنسی میں اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میرے ہنسنے کی آواز سن کر فیروز بھی وہاں آگیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا "کیا ہوا بھئی! اس قدر زبردست قہقہے کیوں لگا رہے ہو؟"

میں نے ہنستے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑ کر زلیخا کی طرف اشارہ کر کے اسے بتانا چاہا کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں لیکن میری زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ "یہ یار یہ... زلیخا..."

"کیا ہوا ہے زلیخا کو؟ کیا کوئی بہت دلچسپ بات کی ہے اس نے؟" فیروز متعجب ہوکر بولا۔

"کچھ نہیں بھائی۔ کوئی دلچسپ لطیفہ نہیں سنایا ہے اس بے چاری نے۔ یہ تو بس یوں ہی پاگل ہوگیا ہے۔ آؤ چلیں۔"

زلیخا جھنجلا کر پیر پٹختے ہوئے ایک طرف چل دی۔ فیروز نے میرے قریب آکر میرا بازو پکڑ کے کہا۔ "میں سمجھ گیا، کوئی حماقت سرزد ہوئی ہے اس سے، بہت بے وقوف عورت ہے۔ بڑھاپے میں پہنچتی ہوئی عمر کا احساس ہی نہیں ہے اسے۔"

میں نے بمشکل اپنی حالت پر قابو پا کر کہا۔ "نہیں یار! یہ بات نہیں تھی۔ یہ آبی جو ہے نا، یہ بڑا ذلیل ہے۔ اس نے اس غریب کو بوکھلا کے رکھ دیا تھا بری طرح، اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ مجھے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"اوہ، میں سمجھا آج پھر وہ کوئی حماقت کر بیٹھی ہے۔ خیر چھوڑو، آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے میز پر رکھا ہوا۔"

کھانے کے دوران میں نے فیروز سے کہا۔ "فیروز! یار! اگر آج رات اس بہروپیے کے مرقد پر ریڈ کر دیں تو کیسا رہے گا؟"

"کون سا مرقد؟ کس کی بات کر رہے ہو بھائی؟ میں سمجھا نہیں؟" فیروز نے لقمہ چباتے چباتے رک کر پوچھا۔

"میرا مطلب اس پہاڑی ہیڈ کوارٹر سے ہے، جسے لوگ بابا صاحب کا آستانہ کہتے ہیں۔" میں نے وضاحت سے کہا۔

"اوہ اچھا، خیال تو ٹھیک ہی ہے تمہارا مگر یہ کام آسان نہیں ہے۔ دو روز قبل ہم نے ایک کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوسکی ہمیں۔ اس ناکامی سے ایک بات یہ ضرور معلوم ہوگئی کہ آنزک کی قیام گاہ تک جانے والے عام راستے کے علاوہ کسی اور طرف سے وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنزک اور اس کے گرگوں کی نظروں میں آئے بغیر کوئی شخص اس کے آستانے تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا اچانک اس کے خلاف کوئی کارروائی تو کی ہی نہیں جاسکتی۔" فیروز نے جواب دیا۔

"اچھا، تو وہ تم ہی لوگ تھے جن کے بارے میں لزی نے بتایا تھا کہ کچھ لوگوں نے آستانے میں گھسنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں، مگر انھوں نے بہت سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں وہاں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔ "عام راستے کے علاوہ کسی اور طرف سے وہاں پہنچنے سے روکنے کے لیے کیا انتظام کیا ہے انھوں نے؟"

"اگر کوئی شخص عام راستے سے ہٹ کر کسی اور طرف سے پہاڑی پر چڑھتا ہے تو کوئی پچاس قدم اوپر جاتے ہی آستانے کے اندر گھنٹے بجنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف سے کئی بے آواز پستول یا رائفلیں گولیاں اگلنے لگتی ہیں۔ مسلسل برستی ہوئی ان گولیوں سے بچ کر، جن کے بارے میں یہ بھی پتا نہ ہو کہ وہ آ کہاں سے رہی ہیں، آگے بڑھنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔" فیروز نے بتایا۔

"کچھ اندازہ کیا ہے تم نے کہ وہ گھنٹے کیسے بجنے لگتے ہیں؟

میں نے سوال کیا۔

"یہ کوئی معما نہیں ہے جیلانی! ان لوگوں نے پہاڑی کے اس حصے پر تانبے کے بہت باریک تار بچھا رکھے ہیں اور ان کا تعلق اندر مختلف جگہوں پر لگے گھنٹوں سے قائم کر دیا ہے۔ جیسے ہی اوپر چڑھنے والے کا پیر ان میں سے کسی تار پر پڑتا ہے، گھنٹے بجنے لگتے ہیں۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ہونے والی فائرنگ کا تعلق بھی اسی نظام سے ہے یا گھنٹوں کی آواز سے ہوشیار ہونے کے بعد کوئی شخص کسی اور نظام سے منسلک فائرنگ کھول دیتا ہے؟"

"ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں ہم آج معلوم کر لیتے ہیں۔ کوئی ایسا طریقہ ہے تمہارے ذہن میں جس سے گھنٹے بجانے والا نظام ناکارہ کیا جا سکے۔ یعنی ان تاروں کو پھلانگ کر ہم اُوپر جا سکیں؟"

"ہاں جی کیوں نہیں، ہم کوئی آٹھ دس فٹ لمبے اور ڈیڑھ دو فٹ چوڑے تختے کے دونوں کناروں پر پائے لگا کر وہ تختہ اس جگہ رکھ دیں جہاں تار بچھے ہیں۔ تار زیادہ سے زیادہ تین یا چار فٹ تک ہوں گے۔ چنانچہ تختہ اس پوری جگہ کو ڈھک دے گا اور چونکہ اس میں دونوں سروں پر آٹھ دس انچ لمبے پائے لگے ہوں گے جن کی وجہ سے وہ تاروں سے آٹھ دس انچ اوپر ہی رہے گا، تاروں کو چھو نہیں سکے گا، اس طرح ہم تاروں کو چھیڑے بغیر تختے پر سے اوپر جا سکتے ہیں لیکن فائرنگ کا سامنا اس کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظام کو سمجھے بغیر ناکارہ نہیں کیا جا سکتا اور اسے سمجھنے کے لیے آستانے کے اندر جانا ضروری ہے۔ بلکہ اسے ناکارہ بھی اندر ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم کیونکہ ان کا اعتماد حاصل کر چکے ہو لہٰذا تمہارے ذریعے یہ کام کیا جا سکتا ہے مگر اب تو صورتِ حال ہی مختلف ہو گئی ہے، کوئی اور آدمی تلاش کرنا پڑے گا اس کام کے لیے۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہو گی۔ تم وہ تختہ تیار کرا لو۔ فائرنگ سے نمٹنے کا بندوبست میں کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" فیروز ایک دم چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری پوزیشن ابھی واضح نہیں ہوئی ہے۔ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ تمہیں پہلے ہی کی طرح اُن کا اعتماد حاصل ہے، تمہارا آستانے کی طرف رخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس کام کے لیے مجھے بھیڑیوں کے اس جھنڈ میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں تمہاری یہ بات نہیں آ رہی ہے جیلانی! ذرا مجھے بھی بتاؤ تم یہ کام کرو گے کس طرح؟" وہ اُلجھ کر بولا۔

"تمہیں کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم اسے میرے اوپر چھوڑ دو، میں مایوس نہیں کروں گا تمہیں۔"

وہ چند ثانیے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے مجھے تکتا رہا پھر آبی سے بولا۔ "تم بتاؤ یار آبی! کیا کہہ رہے ہیں یہ جیلانی؟"

"میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے بھائی جی! ایک ذمے داری یہ خود قبول کر رہا ہے تو اسے اس کا موقع دو، تمہیں اس سے کیا غرض ہے کہ یہ کس طرح کرے گا جب کرے گا کچھ تو تم بھی ساتھ ہی ہو گے اس کے۔ دیکھ لینا کس طرح کیا ہے اس نے۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھی بات ہے جیلانی! چلو پھر آج تمہاری قیادت میں چل کر گھیرتے ہیں اس اسرائیلی کو۔"

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور آبی دوبارہ اسی کمرے میں آ بیٹھے جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ فیروز، آئزک کے ٹھکانے پر یلغار کرنے کے لیے ضروری تیاریاں کرنے کی غرض سے کہیں چلا گیا۔ شرافت علی کو فون کرنے کا جو وقت مقرر کیا تھا میں نے، اس میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہمارے کمرے میں آتے ہی زلیخا ہمارے پیچھے ہی پیچھے چائے لے کر آ گئی مگر اس بار اس نے ہمارے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ چائے رکھ کر فوراً ہی واپس چلی گئی تھی وہ۔ شاید ناراض ہو گئی تھی وہ ہم سے۔

ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد میں نے حسبِ پروگرام شرافت علی کو فون کیا لیکن دوسری طرف سے شرافت علی کے بجائے لزی کی آواز سن کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا مگر میں نے اسے اپنے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرنے کا موقع نہیں دیا۔ فوراً ہی خود کو سنبھال کر پوچھا۔ "مجھے اُمید تھی تم اب تک گھر پہنچ گئی ہو گی، اسی لیے میں نے فون کیا تھا اس وقت۔"

"جی ہاں، آپ نے صحیح اندازہ کیا تھا۔ میں کوئی پندرہ منٹ پہلے گھر پہنچی ہوں، لیکن آپ کہاں ہیں؟ گھر کیوں نہیں پہنچے ہیں آپ اب تک؟ وہ بے چارہ شرافت علی بھی دو گھنٹے یہاں بیٹھ کر گیا ہے ابھی۔"

"اچھا، اس غریب کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا بالکل۔ میں ذرا اِدھر اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ ہوں۔ ایک عرصے کے بعد آج اچانک مل گیا ہے یہ۔ تم بتاؤ جیرالڈ کا کیا حال ہے اب؟ اس کی طرف سے بڑی فکر لگی ہوئی ہے مجھے۔"

"جی ہاں، وہ تو ہونا ہی چاہیے۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اب، بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے خطرہ ٹل گیا ہے مگر مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا۔ کافی بڑا زخم ہے، اندر گردہ تک متاثر ہے۔"

"شکر ہے خدا کا! جان بچ گئی اس کی۔ ورنہ اس ذلیل آبی نے تو اس غریب کا کام ہی تمام کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں جنابِ عالی! اس میں آبی صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے خود ہی اپنی موت کا سامان کیا تھا۔ اسے آپ کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ اشتعال انگیزی جیرالڈ کی طرف سے ہوئی تھی، جس کا نتیجہ مل گیا ہے اس نے۔ مسٹر آئزک کو میں نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بھی جیرالڈ کی اس حرکت سے خوش نہیں ہیں۔ بہت ناراض ہوئے ہیں وہ اس بات سے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے خواہ مخواہ طبی امداد پہنچا کر جان بچائی اس کی۔ اسے تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اُن کا ایک پرانا اور نہایت قابلِ اعتبار ساتھی ہے۔ اس کے بارے میں ایسے الفاظ زبان سے ادا نہیں کرنا چاہئیں انہیں۔ اس سے دوسروں کا اعتماد مجروح ہوتا ہے۔"

"آپ جانتے نہیں ہیں جنابِ عالی! اس میں کچھ دنوں سے بہت خود سری آ گئی تھی۔ سبھی کو شکایات پیدا ہو گئی ہیں اس سے، اس کے لیے کسی کے دل میں ہمدردی نہیں ہے اب۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ کچھ عرصے سے وہ مسٹر آئزک کی جگہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔"

"اچھا، اتنا ذلیل آدمی ہے وہ! اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مسٹر آئزک اس شخص کو برداشت کر رہے ہیں۔ کوئی کارروائی نہیں کی انہوں نے اس کے خلاف اب تک۔ ایسے خطرناک آدمی کو تو ایک دن بھی ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔"

"کسی حد تک آپ کی یہ بات درست ہے جنابِ عالی! جب تک اس کی تمام مخالفانہ سرگرمیاں مسٹر آئزک یا ان کے مخلص ساتھیوں تک ہی محدود رہی ہیں، اس نے تنظیم سے سرکشی نہیں کی اور نہ ہی اس کی ذات سے تنظیم کو کوئی نقصان پہنچا ہے بلکہ اس کا وجود بے حد وفادار رہا ہے، اس لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی ہے جنابِ عالی! تنظیم میں افراد کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ اجتماعی مفاد کے لیے ایک یا چند افراد کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ جیرالڈ چونکہ تنظیم کے لیے بہت مفید شخص رہا ہے، اسی وجہ سے مسٹر آئزک اسے طرح دیتے رہے ہیں۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر وہ ایک کارآمد شخص سے تنظیم کو محروم نہیں کرنا چاہتے۔"

"بے شک، بے شک، جب مسئلہ اجتماعی مفاد کا ہو تو افراد کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک بڑی تنظیم میں جس کے پیشِ نظر بڑے اور نیک مقاصد بھی ہوں، کسی فرد کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ مقصد کے حصول کی خاطر بڑے سے بڑے اہم ترین شخص کو قربان کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ جنابِ عالی! لیکن ہماری تنظیم کے مقاصد اب اتنے نیک بھی نہیں ہیں کہ جیرالڈ جیسے اقتدار پرست پر مسٹر آئزک جیسے شخص کو قربان کر دیا جائے۔ اس کی بے اعتدالیاں اسی وقت تک برداشت کی جا سکتی تھیں جب تک اس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا ہمارے پاس۔ اب ہمیں اس کی بالکل ضرورت نہیں رہی ہے، چنانچہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔"

"کیا مطلب؟ تو کیا اب اس کا نعم البدل تلاش کر لیا گیا ہے۔ کون ہے وہ شخص جسے اس کی جگہ دی جا رہی ہے؟"

"جی ہاں، اس کا نعم البدل مل گیا ہے۔ اور آپ کے لیے یہ خوشی کی خبر ہے جنابِ عالی کہ اس کی جگہ آپ کام کریں گے اب۔"

"کیا؟ کیا ....؟ کیا کہہ رہی ہو لزی تم؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کس نے کیا ہے آخر!"

"یہ فیصلہ ہائی کمان کا ہے جنابِ عالی! اس کی تفصیل میں آپ کو ملاقات ہونے پر بتا دوں گی۔ فون پر اتنی طویل گفتگو نہیں کی جا سکتی، بس اب جلد از جلد گھر پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ میں انتظار کر رہی ہوں آپ کا۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں جلدی نہیں آ سکوں گا تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کر رہی ہوں۔ ویسے بھی اب مجھے کہیں جانا نہیں ہے، گھر پر ہی رہوں میں۔" لزی نے کہا۔

میں ریسیور رکھ کر حیران و پریشان سا آبی کو تکنے لگا۔ آبی بولا۔ "کیا بات ہے بھئی! کیا کہہ دیا ہے اس بنتِ یہود نے؟ تیری تو حالت ہی بدل گئی ہے ایکدم۔ کچھ بتا تو کس بات نے تجھے اس قدر حیرانی میں مبتلا کر دیا ہے؟"

"یار! میری تو عقل ہی گم کر دی ہے اس اسرائیل زادی نے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا سمجھوں اسے؟" میں نے کہا۔

"اوئے کُجھ دس تے سہی، ہویا کی اے؟ کی کہہ دیتا اے اوس نے۔ کی سمجھ نئیں آرہیا تیری؟" آبی بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتا کر کہا۔ "ہن دس، کُجھ تیری سمجھ وچ آیا۔ سمجھ لیا اے توں اس معمّے نوں؟"

"اس میں معمّا کیا ہے؟ کون سی بات ہے جو تیری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ جو کچھ کہا ہے، صاف اور سیدھے الفاظ میں کہا ہے اس نے؟"

"ہاں کہا تو بے شک صاف اور سیدھے الفاظ میں ہی ہے لیکن اس کے پس منظر میں تجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے؟"

"مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ تجھے اگر کچھ دِکھ رہا ہے تو بتا مجھے کیا ہے وہ؟" آبی نے جواب دیا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایسی باتیں کر کے ہمیں اپنے جال میں پھانس رہی ہو؟ کچے دھاگے سے باندھ کر کھینچ رہی ہو اپنی طرف؟ ہمیں اپنے ہاتھوں کی زد سے دور دیکھ کر کوئی ہم رنگِ زمیں جال بچھایا ہو ہمارے لیے۔" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

آبی میری بات سُن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اب تک اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ تصویر کا یہ رُخ دیکھا ہی نہیں تھا اس نے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں اس گھڑی۔ "بات تو تیری کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے جیلانی۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن سوال یہ ہے، اس کا پتا کس طرح چلے کہ لزی کے ان الفاظ کی حقیقت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مگر یار، یہ لزی کہاں سے آ ٹپکی درمیان میں؟ وہ شرافت علی کہاں چلا گیا، اس سے بات نہیں ہوئی تیری؟" آبی نے پوچھا۔

"وہ لزی کے آجانے کی وجہ سے اپنے گھر چلا گیا ہے شاید۔ اس نے لزی کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس سے بھی کہا ہے اس نے کہ وہ وہاں بہت دیر سے بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا لیکن ہم دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں، اسے کچھ پتا نہیں ہے۔"

"تو پھر اس کے گھر فون کر کے بات کر واس سے، شاید لزی نے اُسے بھی کچھ بتایا ہو اور وہ کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہا تو نے، اس کا تو دھیان ہی نہیں رہا مجھے۔" میں نے دوبارہ ریسیور اٹھا کر شرافت علی کے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے۔

فون کسی خاتون نے اٹھایا تھا مگر جب میں نے ان سے کہا کہ مجھے شرافت علی سے بات کرنا ہے تو انہوں نے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر ایک منٹ سے پہلے ہی مجھے ریسیور میں شرافت علی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم وہاں سے کیوں چلے آئے بھئی؟"

وہ بولا۔ "پہلی بات تو یہ کہ وہاں وہ تمہاری لزی بیگم آ گئی تھی۔ اب اس کی موجودگی میں ہم کُھل کر تو باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے لزی کی زبانی جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے بعد انتظار کرنے کی تو کوئی بات رہی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے وہاں سے ٹل جانا ہی بہتر جانا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ تم بنگلے پر نہیں آ سکو گے تو تم مجھے یہاں ضرور فون کرو گے۔ یہاں میں تم سے آزادی کے ساتھ باتیں بھی کر سکوں گا۔"

"لزی نے تمہیں کیا بتایا تھا جس کے بعد تم مطمئن ہو گئے تھے ہماری طرف سے؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی ہے اس سے؟ کیا بنگلے پر کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تمہارا؟" وہ حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے، وہاں لزی نے بات کی تھی مجھ سے اور اس نے جو کچھ کہا ہے نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا ہے اس پر یقین کرنے کو۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے انھوں نے مجھے پھانسنے کے لیے یہ جال پھینکا ہے میری طرف۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا خیال تم سے مختلف ہے۔ میں نے اس سے بالمشافہ گفتگو کی ہے، اس لیے اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی مگر مجھے وہاں فریب اور ریا کا سایہ تک نظر نہیں آیا تھا بلکہ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی مجھے۔"

"پھر تم کیا کہتے ہو، میں واپس اُن لوگوں میں چلا جاؤں؟" میں نے اس سے معلوم کیا۔

"ہاں، میری رائے تو یہی ہے۔ اور ضرورت بھی ہے اس وقت، ہم اپنا کام جتنی عمدگی سے ان کے درمیان رہ کر کر سکتے ہیں، علیحدہ ہو کر نہیں کر سکتے۔ علیحدگی میں مشکلات بھی بڑھ جائیں گی اور خطرات بھی۔" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

اس کے اس مشورے نے مجھے اس کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گو اس کی وفاداری اور خلوص کو [illegible] پرکھ لیا تھا اور مجھے اس میں ذرا سا بھی کھوٹ نظر نہیں آیا تھا لیکن جن لوگوں کے درمیان وہ رہتا تھا اور جو کچھ وہ کرتا تھا اب تک، اس کے پیشِ نظر اس کی طرف سے دھڑکا تو ہر لمحے رہتا تھا کہ نہ جانے کب اس کی وفاداریاں بدل جائیں۔ پتا نہیں کون سا حادثہ یا واقعہ اُسے دوبارہ ہم سے چھین لے۔ اس کے باوجود اس پر اعتماد کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب تک تو وہ ہر آزمائش میں پورا ہی اترا تھا مگر پھر بھی میرے دل میں اس کی طرف سے طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے اُسے ایک اور کسوٹی پر پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں لیکن آج رات ہم نے آئزک کے ٹھکانے پر کچھ ہنگامہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ لہٰذا یہ کام کرنے کے بعد ہی میں بنگلے پر واپس جاؤں گا۔"

"لیکن تم وہاں کیا کرو گے؟ اور اگر گڑبڑ کے دوران تم یا آبی وہاں کسی کی نگاہ میں آ گئے تو پھر تمہاری واپسی تمہارے لیے خوف ناک ثابت ہو گی۔ میری بات مانو جیلانی! ابھی ایسی کوئی حرکت مت کرو، ان پر ہاتھ ڈالنا اُسی وقت مناسب ہو گا جب یہ اطمینان ہو جائے گا کہ اب اُن کے لیے بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔ دشمن پر اوچھا ہاتھ ڈالنا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔"

"ہاں یار! بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی ہے۔ پھر ب... اچھا خیر ٹھیک ہے۔ میں ذرا آبی سے بھی بات کر لوں پھر فیصلہ کروں گا کوئی اور جو بھی فیصلہ ہو گا اس کی اطلاع تمہیں ضرور دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے ریسیور رکھتے دیکھ کر آبی نے پوچھا۔ "کیا بات ہوئی، کیا کہتا تھا وہ؟"

"وہ کہتا ہے ہمیں ابھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس دوران ہم ان کی نظر میں آ گئے تو یہ ہمارے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ ہمیں کُھل کر اُن کے مقابل اسی وقت آنا چاہیے جب ہم ان کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑ دیں۔"

"یہ شرافت علی کہیں اُن کو بچانا تو نہیں چاہتا ہے یار! ایسا تو نہیں ہے کہ یہ دوہری چالیں چل رہا ہو ہمارے ساتھ؟"

"نہیں یار! ایسا لگتا تو نہیں ہے وہ۔ اگر یہی کر رہا ہوتا تو اب تک ہم دونوں یوں آزادانہ گھوم پھر رہے ہوتے کیا دھرتی پر۔ یہ تو ایسے لوگ ہیں کہ غداری کا شبہ بھی ہو جائے کسی پر تو اس کی جان لینے میں دیر نہیں کرتے ذرا بھی۔ ڈھیل دینا جائز نہیں سمجھتے ہیں یہ۔"

"ہاں، یہ تنظیمیں ہوتی تو ایسی ہی ہیں۔ اور جن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہے ان کے پاس تو رعایت کا خانہ ہی نہیں ہوتا کوئی۔"

"شرافت علی کہتا تو ٹھیک ہی ہے مگر اب میں فیروز سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ یہ پروگرام ملتوی کر دے۔ کیوں کہ یہ تجویز بھی اس کے سامنے میں نے ہی رکھی تھی یار! اور بڑے اعتماد سے ایک ذمے داری قبول کی ہے۔ اب اُسے باز رکھنے کی کوشش کی میں نے تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے بے سوچے سمجھے اتنا بڑا دعویٰ کر دیا تھا، اب خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ بڑی بے عزتی ہو گی یار آبی اس طرح تو.. اور آئندہ یہ لوگ ہماری کسی بات پر آسانی سے یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔" میں نے آبی سے کہا۔

"اوئے چل دفع کر یار! جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پروگرام ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آبی نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"کس پروگرام کے ملتوی ہونے کی بات ہو رہی ہے؟" فیروز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

اس نے آبی کی بات سُن لی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔ "کچھ نہیں یار! کسی پروگرام کو ملتوی کرنے کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ تم بتاؤ کیا انتظامات کر کے آئے ہو؟ وہ تختہ تیار ہو گیا ہے؟"

"ایک گھنٹے کے اندر اندر سارا انتظام ہو جائے گا لیکن اس کام کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ آدھی رات کے بعد ہی چلیں گے ہم۔"

"ہاں، یہ بہترین وقت ہوتا ہے اس قسم کے کاموں کے لیے۔" میں نے کہا۔ پھر لزی اور شرافت علی سے ہونے والی گفتگو کی ساری تفصیل اسے بتا کر کہا۔ "مگر ہم اپنے پروگرام پر عمل ضرور کریں گے۔ میں لزی کو فون کر کے اس سے کہہ دیتا ہوں کہ میں صبح سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکوں گا اور ہاں یار! وہ ہماری کار جو ہم انور کمال کے کہنے پر راستے میں چھوڑ آئے تھے، اسے اب یہیں منگوالو۔ ہمیں صبح اسی کار میں گھر واپس جانا چاہیے۔ ورنہ اسے یوں سڑک کے کنارے چھوڑ دینے کا کوئی جواز نہیں پیش کر سکیں گے ہم۔"

"وہ میں ابھی منگوا لیتا ہوں۔ اس کی فکر نہ کرو تم اور وہ شرافت علی نے میرا خیال ہے ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔ ہم آج کا پروگرام فی الحال ملتوی ہی کر دیں تو اچھا ہے۔" فیروز نے مجھے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! اس شرافت علی نے اس کا ایک نقصان دہ

پہلو ہی دیکھا ہے بس، مفید پہلو نظر نہیں آیا ہے اسے۔ اس کارروائی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا ہمیں کہ اس طرح دشمن بوکھلا جائے گا۔ وہ یہ جاننے کے بعد کہ کوئی قوت اس کے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہوگئی ہے، اپنی تمام سرگرمیاں ترک کر کے اس کا پتا چلانے کی کوشش میں مصروف ہو جائے گا اور یوں جب تک ہم اس کے خلاف بھرپور کارروائی کرنے کے قابل ہوں گے، اس وقت تک وہ ہمیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ دشمن کو اپنی سرگرمیاں ملتوی کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اس طرح۔" آبی نے کہا۔

آبی کی اس بات نے مجھے ایک اور راہ سُجھادی۔ میں نے کہا "یہ تو تُو نے بہت اچھی بات سُجھائی ہے یار آبی! یہ تُو نے بالکل ٹھیک کہا ہے، ان کی سرگرمیاں روک دینا بھی بہت بڑا کام ہے۔ لہٰذا محض ہنگامہ آرائی اتنی سود مند نہیں ہوگی۔ احتیاطی تدابیر کو ایک طرف رکھ دو فیروز! اب ہم سیدھے راستے سے اندر چلیں گے۔ آٹزک کے خاص کمرے کے باہر کچھ چرسی اور نشہ باز ملیں گے، انہیں قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اگر دو چار ہوش مند قسم کے محافظ بھی ہوئے تو انہیں ٹھکانے لگا دینا۔ پھر ہم اندر گھس کر اس بہروپیے کو یہاں اٹھا لائیں گے، تم اس کے لیے کسی اچھے سے مہمان خانے کا بندوبست کر سکتے ہو فیروز؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو جیلانی! مہمان خانہ تو ہم اسے ایسا مہیا کر دیں گے کہ پورا اسرائیل جمع ہو کر بھی اُسے وہاں سے نہیں نکال سکے گا۔ اس وقت تک وہ آسمان نہیں دیکھ سکے گا جب تک ہم نہیں چاہیں گے، مگر بھائی میرے، آٹزک کو اس خانقاہ سے اغوا کر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ باہر ایسے انتظامات ہیں تو اندر انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا؟ ہر در و دیوار سے گولیاں اولوں کی طرح برس سکتی ہیں وہاں۔ اس کام کے لیے باقاعدہ فوج درکار ہوگی۔" فیروز نے کہا۔

"ان انتظامات کی پروا ہی نہ کرو یار! ایک بہت اچھی ترکیب آئی ہے میرے دماغ میں۔" آبی جلدی سے بولا۔

"وہ کیا؟ کیا سوچا ہے بھئی تُو نے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہم چھ آدمی چلیں گے وہاں کسی گاڑی میں بھر کے۔ دو تو میں اور جیلانی ہیں ہی، فیروز! تم اپنے ساتھ تین بہترین لڑاکے اور لے لو۔ ہم آستانے کے سامنے گاڑی روکیں گے۔ پہلے تم چاروں نیچے اترنا، اس طرح کہ تمہارے ہاتھ اپنے اپنے سروں پر رکھے ہوں گے۔ پھر میں اور جیلانی ہاتھوں میں پستول پکڑے گاڑی سے اتریں گے اور تم چاروں کو کور کر کے آستانے کی طرف لے جائیں گے۔ ہمارے اس طرح وہاں پہنچنے کی اطلاع آٹزک کو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گی، وہ یہی سمجھے گا کہ ہم کچھ لوگوں کو پکڑ کر اس کے پاس لائے ہیں، چنانچہ ہمیں بغیر کسی رکاوٹ کے بغیر اس تک پہنچنے کا موقع مل جائے گا، اس کے بعد اچانک یہ ڈراما ختم کر کے اصل کھیل شروع ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں چھ آدمیوں کو اس ایک شخص پر قابو پانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔ کیوں جیلانی کیا کہتا ہے تو اس مسئلے کے؟" آبی نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا سازشی ذہن ہے بھئی تیرا آبی! ایسے معاملات میں تیری کھوپڑی کافی تیز چلتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"پلاننگ تو واقعی زبردست کی ہے آبی! ٹھیک ہے تین آدمیوں کو ساتھ لے لوں گا میں اپنے۔ بالکل اسی پلاننگ کے مطابق کام کریں گے ہم۔ ایک آٹزک تک پہنچ جانا شرط ہے، اس کے بعد تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔" فیروز بولا۔

"اور ہم اس کام کے لیے آدھی رات گزرنے کا انتظار نہیں کریں گے، ایسے کاموں کے لیے وہ وقت مناسب نہیں ہوتا۔" آبی بولا۔

"کیوں؟ وہ وقت مناسب کیوں نہیں ہوتا؟ بھائی رات کے اس حصے میں عموماً لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔" فیروز بولا۔

"ہاں، عام لوگ تو واقعی بے خبر ہوتے ہیں اس وقت، لیکن جن سے ہمارا واسطہ ہے، وہ عام لوگ نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں، دشمن پر شب خون مارنے کے لیے وہی وقت مناسب ہوتا ہے، چنانچہ وہ لوگ اس وقت ہی غفلت سے بیدار ہوتے ہوں گے۔ آدھی رات کے بعد وہاں محافظ زیادہ ہوتے ہوں گے، لہٰذا ہم دس اور گیارہ بجے کے درمیان کسی وقت پہنچیں تو اچھا ہے۔"

"دیکھا فیروز! میں غلط تو نہیں کہتا تھا نا کہ منصوبے بنانے میں اس کی کھوپڑی بہت تیز کام کرتی ہے۔" میں نے آبی کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو واقعی بالکل صحیح بات کی ہے انھوں نے۔ سامنے کی بات ہے یہ اور حیرت یہ ہے کہ ہمیں اس کا خیال نہیں آسکا۔" فیروز بولا "تم تو یار بہت کام کے آدمی ہو، یہی وجہ ہے کہ جیلانی تمہاری آزادی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ تمہاری غیر موجودگی میں یہ خود کو نامکمل سمجھتے تھے حالاں کہ اس وقت بھی بڑے بڑے کام کیے ہیں انھوں نے۔"

"بس جناب! یہ محبت ہی تو ہے اس کی جس نے مجھے پابند کر رکھ دیا ہے اس کے ساتھ۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کی بے لوث محبت دیکھ کر رشک آتا ہے۔ جنہیں ایسے مخلص اور جاں نثار دوست میسر آ جائیں آج کے دور میں، ان کی خوش بختی پر کون شک کر سکتا ہے بھائی! بہرحال، انور کمال اور گل زمان دو آدمی تو اس وقت ہیں ہی میرے ساتھ، یہ دونوں بہترین تربیت یافتہ جوان ہیں۔ ایک خان کو اور بلا لیتا ہوں فون کر کے، بہت دن سے اس نے کوئی کام بھی نہیں کیا ہے۔"

"یہ خان وہی ہے نا جو تمہارے ساتھ ایئرپورٹ سے لایا تھا مجھے، اس رات جب میں سان فرانسسکو سے آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہی، وہ ہمارا کوئی باقاعدہ ممبر نہیں ہے اور معاشرے میں کوئی باعزت مقام بھی نہیں رکھتا ہے وہ، مگر پاکستان کی خاطر اپنی جان دینے کو بھی تیار رہتا ہے ہر وقت۔ ایک بار ہم نے اس سے معاوضے پر کچھ کام کروایا تھا، تب اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہم اپنے ملک میں ملک دُشمنوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس کے بعد جب بھی اس کی ضرورت ہوئی وہ بھاگا چلا آیا میرے پاس اور اب کسی کام کا معاوضہ بھی نہیں لیتا ہے وہ۔ بڑی عقیدت ہے اسے اپنے وطن سے۔" فیروز نے بتایا۔

"ہاں یار! کون بدنصیب ہوگا جو اپنے وطن کی محبت سینے میں نہ رکھتا ہوگا۔ اپنا گھر، اپنا ملک کسے پیارا نہیں ہوتا۔" آبی بولا۔

"یہ بات نہ کہو آبی! ہماری بدنصیبی یہی ہے کہ ہم میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اپنے ملک سے اتنی محبت نہیں رکھتا جتنی محبت اپنے نظریات سے رکھتا ہے۔ یہ بڑے انتہا پسند لوگ ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ یہ ملک یا تو ان کے پسندیدہ راستے پر چلے یا پھر سب کچھ ختم ہو جائے۔ یہ خود تو کسی کا رنگ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے، کسی کی اچھی سے اچھی بات سُننے پر آمادہ نہیں ہوتے اور چاہتے یہ ہیں کہ ساری دنیا ان کے رنگ میں رنگ جائے، ان کی آواز کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دے، ان کے سوا کسی کے الفاظ کی بازگشت باقی نہ رہے، جو کچھ ہو، ان کی مرضی کے مطابق ہو یا پھر کچھ بھی نہ ہو۔ حکمرانی کا تاج یا تو ان کے سر پر ہو یا پھر مٹی میں رُلتا رہے۔ کوئی اور اُس کا حق دار نہ ٹھہرے۔ اور یہ اسرائیل زادے دنیا کے تمام ممالک میں ایسے ہی خوف ناک اور تباہ کن خیالات رکھنے والوں کو تلاش کر کے ان کے جذبات کو ہوا دیتے ہیں، ان کے ہاتھوں سے ان کے اپنے گھر کو آگ لگواتے ہیں اور پھر ان احمقوں کے ساتھ ساری قوم کے جلنے کا مسکرا مسکرا کر تماشا دیکھتے ہیں۔" فیروز بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ شدتِ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا اور آواز اس کی دم بہ دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے کہا "دھیرج، میرے بھائی دھیرج سے کام لو۔ تم خود بھی جذباتی ہوتے جا رہے ہو۔"

وہ بولا "جیلانی! تم نہیں جانتے، جب بات میرے ملک کی سلامتی کی ہو تو میں اپنے جذبات کو قابو کرنے میں ناکام ہو جاتا ہوں۔ میرے عزیز! ہمارے اجداد نے آزادی کی جنگ اس لیے تو نہیں لڑی تھی، ہم نے لاکھوں جانیں اور اپنی ماؤں، بہنوں بیٹیوں کی آبرو اس لیے تو نہیں قربان کی تھی، اپنے تن من دھن کی قربانی اس لیے تو نہیں دی تھی کہ ایک دن چند سر پھرے عالمِ دیوانگی میں اٹھیں اور محض ایک نظریے کو پھلتا پھولتا دیکھنے کے لیے اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ اور وہ نظریہ بھی اللہ کی معتوب قوم یہودیوں کا عطا کردہ ہو، یا چند اقتدار پرست لوگ اپنے سر پر تاج سجانے کی آرزو پوری کرنے کے لیے اپنے آقاؤں کو پوری قوم کی آزادی سلب کرنے کی دعوتیں دینے لگیں کیوں کہ قوم نے انہیں کبھی اقتدار کا اہل نہیں سمجھا لہٰذا وہ قوم کو آزادی کا مستحق نہیں جانتے۔"

"ہاں یار! یہ ایک المیہ تو ہے ہمارے ساتھ، اگر ہماری طرح پاکستان سے محبت رکھنے والے تمام ہی لوگ اُٹھ کھڑے ہوں یہ عہد کر کے کہ اب ایک بھی دشمنِ وطن باقی نہیں رہنے دیا جائے گا تو یہ مسئلہ چند روز میں بالکل ختم ہو جائے گا۔ یہ یقین ہے مجھے۔" میں نے کہا۔

"اوئے چھڈ یار! اتنی فرصت ہے کسے جو اتنے بڑے بڑے مسائل پر سر کھپائے..... یہاں تو لوگ آٹے دال کا مسئلہ ہی اس قدر اُلجھا چکے ہیں کہ ایک عام آدمی دال روٹی کے سوا کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے۔ حکمران ٹولہ سمجھتا ہے کہ اس طرح عوام کو اس کا محاسبہ کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا لیکن انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ عوام اگر اپنے مسائل میں الجھ کر امورِ مملکت کی طرف سے غافل ہو جائیں گے تو خود انہیں جب اپنی عوام کی ضرورت پڑے گی تو ان کا ساتھ کون دے گا؟ آج کے دور میں عوام کی مدد اور حمایت کے بغیر کس کی اقتدار کی کرسی مضبوط رہ سکتی ہے۔ عوام کا سیلاب تو بڑے بڑے پہاڑوں کو بہا لے جاتا ہے۔" آبی بولا۔

"ہاں یار، یہ بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے تُو، یہ سب عوام کو حکومت سے دور رکھنے کا ہی نتیجہ ہے۔ بہرحال ہم تو اپنی سی کوشش کرتے

ہی رہیں گے بھائی جی! اور ساتھ ہی دعا بھی کرتے رہو کہ ربّ کریم اس ملک پر اس قوم پر اپنا کرم رکھے۔" میں نے کہا۔

فیروز نے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں خان کو فون کر دوں کہ دس بجے تک وہ آجائے یہاں، بشرطیکہ وہ مل جائے، آج کل وہ گھر پر مشکل ہی سے ملتا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے چھپّر پھاڑ کے دے دیا ہے اسے خدا نے۔ بس وہی ٹھکانے لگانے میں مصروف ہے وہ۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا کہیں سے بہت زیادہ مال مل گیا ہے اسے۔" میں نے پوچھا "کرتا کیا ہے وہ؟"

"لوگوں کے اپنے مال کی طرف سے غافل ہونے کا منتظر رہتا ہے، بس یہی پیشہ ہے اس کا۔" فیروز ہنستے ہوئے بولا۔

"یعنی یہ کہ چوریاں کرتا ہے، اٹھائی گیرا ہے وہ؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی جیلانی! ایسے بُرے الفاظ استعمال نہ کریں اس کے لیے۔ آخر تو اپنا ساتھی ہے وہ۔" فیروز نے کہا۔

"ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور مالِ مفت ٹھکانے لگانے کا کام اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو وہ اس رات کے بعد سے ہی کر رہا ہے جس رات میں نے اور لزی نے امریکا سے آنے کے بعد چند گھنٹے تمہاری کوٹھی میں گزارے تھے۔"

"اوہ۔" فیروز ٹیلی فون کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ اندازہ کیسے قائم کیا تم نے؟"

"پہلے میری بات کا جواب دو، میں نے غلط اندازہ تو قائم نہیں کیا ہے نا؟"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا، تم نے ایسا کیوں کہا۔ کوئی خاص بات ضرور ہے اس کے پیچھے۔"

"ہاں، اور وہ خاص بات یہ ہے کہ اس رات میری اٹیچی میں کوئی دو لاکھ روپے کی مالیت کے ہیرے موجود تھے جو کوٹھی سے جانے کے بعد مجھے اٹیچی میں نہیں ملے۔ حالاں کہ میں نے سونے سے پہلے ہی انہیں اٹیچی میں رکھا تھا۔" میں نے اُسے بتایا۔

وہ ریسیور کریڈل پر پٹخ کر تیزی سے میرے قریب آکر بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو یار! پہلے کبھی ذکر نہیں کیا تم نے اس کا؟"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جب ہم ملے تھے تو اس قسم کی کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور پھر مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہوا کہ تمہاری کوٹھی میں بھی کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے۔ لزی نے کہا بھی تھا مگر میں نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہیں دی تھی اور اگر تم اس وقت خان کی موجودہ مصروفیات کا اندازہ کرتے تو اس وقت بھی میں یہ بات نہیں کرتا۔ اس کی مصروفیات اور اچانک کہیں سے بہت سا مال مل جانے کے ذکر پر ہی مجھے کا خیال آیا ہے، ورنہ میں تو اب بھول ہی چکا تھا اس ذات کو۔"

"کمال ہے بھئی، اتنا بڑا نقصان تم نے یوں نظر انداز کر دیا جیسے تمھارے نزدیک لاکھ دو لاکھ کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔"

"نہیں یار! بات میرے نظر انداز کر دینے کی نہیں ہے دراصل وہ ہیرے جس کے تھے اسے ہی اس کی پروا نہیں ہے میں نے تو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں اور بھاگ دوڑ بھی خاصی کی تھی مگر ہیروں کے مالک نے خود ہی کہہ دیا، گم ہوگئے تو جانے دو، ان کی تلاش میں وقت برباد کرنے کے بجائے دوسرے اہم کاموں کی طرف توجہ دو، لہٰذا میں نے بھی زیادہ تگ و دو نہیں کی پھر سوچا یہی تھا میں نے کہ کسی غریب کا بھلا ہو گیا ہے اس سے تو ہو جانے دو، دشمن نے بھی تو اسے چور رستے ہی سے حاصل کیا تھا، چنانچہ کوڑیوں کے مول ہی لیا ہوگا۔ یوں بھی اس دولت کے پُجاری کے پاس کمی نہیں ہے مال و زر کی۔"

"اچھا تو ڈاکٹر دھمن کے تھے وہ ہیرے۔ اس نے ہی کے ذریعے اسمگل کیا ہوگا انہیں یہاں۔" فیروز نے پوچھا۔

"ہاں، جو پلاستر چڑھایا گیا تھا ٹانگوں پر میری، اس پلاستر میں چھپائے گئے تھے وہ سب ہیرے۔" میں نے بتایا۔ "اس رات میں نے تمہاری کوٹھی میں ہی پلاستر کاٹا تھا۔ اور اسے اپنی اٹیچی میں رکھ دیا تھا۔ شاید خان نے مجھے پلاستر کاٹتے ہوئے کہیں چھپ کر دیکھا ہوگا۔ کاٹنے کے دوران اس میں سے دو ایک نکل کر گر بھی پڑے تھے، انہیں دیکھ کر ہی اس کی نیت بگڑ گئی ہوگی۔"

"بالکل بالکل، ایسا ہی ہوا ہے۔ اب ساری بات سمجھ میں آگئی ہے میری۔ تم فکر مت کرو، میں اس سے وہ تمام ہیرے اُگلوا لوں گا۔"

"نہیں یار! لعنت بھیجو ان پتھروں پر۔ حرام کا مال تھا جس راہ سے آیا تھا اسی راہ سے چلا گیا۔ دھمن کو ذرا سی بھی پروا نہیں ہے اس کی، اور پھر ہمارا مقصد بھی تو اس اسرائیلی کو نقصان پہنچانا ہی ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی میرے، لیکن خان نے یہ کوئی اچھی حرکت نہیں کی ہے۔ وہ ہیرے تمہاری ملکیت بھی نہیں تھے۔ اسے تو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کی ملکیت ہیں، اس نے دانستہ طور پر تمہیں ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔"

"ہاں بھئی، یہ تو بہت ہی ذلیل کام کیا ہے اس خان نے۔ معاف تو اسے کرنا ہی نہیں چاہیے بالکل بھی۔" آبی جلدی سے بولا۔

"وہ ہمارے لیے بہت مفید آدمی ہے آبی! اُسے کھونا نہیں چاہیے ہمیں۔ اگر وہ بددل ہو گیا تو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، گھر کا بھیدی ہے۔ ایسے لوگوں کو یوں معمولی معمولی باتوں پر ناراض نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اوئے لعنت بھیج یار ایسے ذلیل آدمی پر جس کی نیت اتنی خراب ہو اس سے تو ہر وقت نقصان پہنچنے کا امکان رہتا ہے۔ پیسے کا پجاری کسی بھی وقت اپنی وفاداریاں چند پیسوں کی خاطر تبدیل کر سکتا ہے۔" آبی نفرت سے بولا۔ "مجھے تو حیرت ہے اس تیرے یار فیروز پر، اس نے ایسے آدمی کو اپنے ساتھ رکھا ہی کیوں؟ یہ تو امریکا جیسی سُپر طاقت کے اتنے اہم ادارے کا ممبر ہے، اسے یہ تک پتا نہیں ہے کہ ایسے لوگ قابلِ اعتبار کبھی نہیں ہوتے۔ کیا سی آئی اے میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں سب؟ میں نے تو یار بڑی بڑی باتیں سُن رکھی ہیں، ان لوگوں کے بارے میں۔"

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی آبی صاحب۔" فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ نے کیسے جان لیا کہ ہمارا تعلق امریکی سی آئی اے جیسے بدنامِ زمانہ ادارے سے ہے۔ کس نے کہا ہے یہ آپ سے؟"

"اوئے چھڈ یار! ساڈے کولوں چھپاون دا کی فائدہ ہے۔ اسیں کسے نوں دسن تے نئیں جا رئے تیرے بارے۔" میں نے کہا۔

"نہیں جی! چھوڑنے والی بات نہیں ہے یہ۔ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو کہ میرا کوئی تعلق سی آئی اے سے بھی ہے۔ ایسی گالی نہ دو یار مجھے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکوں گا۔ ایسا زر پرست، وطن فروش نہیں ہوں میں۔"

"کیا...؟ کیا...؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا سچ مچ تم...؟ مگر یہ کیسے مان لوں میں، سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"کیوں؟ اس میں نا سمجھنے والی کون سی بات ہے؟ کوئی پہیلی تو نہیں پوچھی ہے بھائی میں نے۔" فیروز بولا۔

"اچھا تو ایک یہ بات بھی بتا دو کہ سی آئی اے سے تمہارا تعلق نہیں ہے تو گریگری سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

"ارے تو تم گریگری سے تعلق کی بناء پر مجھے سی آئی اے سے منسوب کر رہے ہو، حالاں کہ مسٹر گریگری کا بھی اس سے اس کے سوا کوئی تعلق نہیں ہے کہ سی آئی اے ان کے ملک کا ایک ایسا ادارہ ہے جو بین الاقوامی غنڈہ گردی کے لیے بدنام ہے۔"

"اوئے جیپ کر جا یار! کیا تو نے مجھے بالکل ہی الو کی دُم سمجھ لیا۔ گریگری ایک کھاتے پیتے خوش حال خاندان کا فرد ہوتے ہوئے بھی سان فرانسسکو کے محکمۂ پولیس میں معمولی درجے کا افسر لگا ہوا ہے اور نظر اس کی بین الاقوامی معاملوں پر لگی رہتی ہیں۔ امریکا اور اسرائیل کے یہودی پوری دنیا میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس سے پوری طرح باخبر ہے اور پھر بھی تو کہتا ہے کہ اس کا سی آئی اے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات میں کیسے مان لوں بھئی؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"یہ تم مان لو جیلانی! ہر ملک میں ہر شخص ایک ہی انداز میں نہیں سوچتا میرے عزیز! تم شاید جانتے نہیں ہو امریکی حکومت اور انتظامیہ یہودیوں کے سامنے کتنی بے بس ہے۔ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانا تو بہت بڑی بات ہے، وہ تو ان کی مرضی کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان حالات میں کیا سی آئی اے کا محکمہ یہودیوں کے خلاف کچھ کر سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ اسے اس کی اجازت ہی نہیں مل سکتی، اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ مسٹر گریگری کا سی آئی اے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

فیروز کی بات میں وزن تھا، دلیل اس کی خاصی مضبوط تھی اس سلسلے میں۔ میں نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ گریگری نے خود مجھے بتایا تھا کہ امریکی انتظامیہ یہودیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر ان کے خلاف اقدامات کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور سی آئی اے کا محکمہ انتہائی رازداری کے ساتھ ان کے خلاف سرگرم ہے۔"

"ممکن ہے انھوں نے ایسا کہا ہو۔ ہم لوگ اکثر نئے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے سی آئی اے کا حوالہ دے دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے جس طرح ہمارا اپنی حکومت یا اس کے کسی ادارے سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود ہم اپنے ملک کے مفاد میں یکجا ہو کر کام کر رہے ہیں، اسی طرح مسٹر گریگری بھی امریکا میں یہودیوں کے اثرات اور بدمعاشیوں سے نالاں ہیں۔ انہوں نے وہاں اپنے کچھ ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک مہم چلائی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ملک کو منشیات کی لعنت سے نجات دلانے کے لیے اس کاروبار میں ملوث یہودیوں اور اُن کے کاروبار کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں اور چونکہ اس کے ڈانڈے پاکستان، بھارت، افغانستان اور نیپال سے ملے ہوئے ہیں چنانچہ انھوں نے ان ممالک میں ایسے لوگوں کو تلاش کر کے اپنے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ کیا ہے جو اپنے اپنے ملک کے بہی خواہ

اور یہودیوں کے دشمن ہیں۔ ان کے پاس بے اندازہ دولت ہے جسے وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ہمارا ابھی فائدہ ان سے تعاون کرنے میں ہے معلومات اور سرمایہ وہ فراہم کرتے ہیں۔ کچھ سرمایہ ہم بھی اپنے وسائل سے جمع کر لیتے ہیں اور تم جیسے محبِ وطن لوگوں کو ساتھ لے کر اپنے وطن میں یہودیوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اب تو ساری بات سمجھ میں آگئی نا۔" فیروز نے تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

"آفرین ہے یار! بڑے دل جگرے والے لوگ ہو تم۔ یوں بے سروسامانی کے عالم میں اتنی بڑی قوت سے ٹکرا رہے ہو۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ سی آئی اے کی پشت پناہی حاصل ہے نہیں۔ اور یہ گرگرگی بھی بھٹی کمال آدمی ہے۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

"ہاں جی، یہی وجہ ہے کہ ہمیں خان جیسے لوگوں کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر وہ بھی وسیلہ بن جاتا ہے ہمارا۔"

"ٹھیک ہے یار! اب تو فون پر بات کر اس سے اور وہ ہیروں والا معاملہ گول ہی کر جا اب۔ اس سلسلے میں خان سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے کہ ہمیں خبر ہوگئی ہے اس معاملے کی۔"

وہ مجھے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آدمی تو تم بھی کم عظیم نہیں ہو برادر! حالات نے تمہیں بے راہ کر دیا... ورنہ تم جیسا وطن دوست اور باصلاحیت آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال اب خدا نے ایک موقع دیا ہے تمہیں ملک و ملت کے کام آنے کا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اسے استعمال کس طرح کرتے ہو۔"

رات کے دس بج چکے تھے۔ فیروز نے خان کو دس بج کر پندرہ منٹ تک پہنچنے کی ہدایت کی اور اس وقت... ہم لوگ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ فیروز نے انور کمال اور گل زمان کو بھی بلا لیا تھا، وہ لوگ فیروز کے حکم پر وہ کار بھی لے آئے تھے جسے ہم نے راستے میں چھوڑ دیا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ خان کے آتے ہی ہمیں بابا صاحب کے آستانے کی طرف آپریشن کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ عین اسی وقت باہر سے کسی کار کے انجن کی مدھم آواز سنائی دی۔ فیروز بولا۔ "لو بھئی، وہ خان بھی آگیا۔ کیا خیال ہے اب اٹھیں ہم لوگ؟"

"ہاں چلو، اٹھو، اب زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے ہمیں۔" آبی نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں بھی اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور چار ہٹے کٹے آدمی ہاتھوں میں اسٹین گنیں اور ریوالور اٹھائے سیلاب کے منہ زور ریلے کی طرح اندر گھس آئے۔ "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔"

میں نے چونک کر ان آنے والوں کو دیکھا۔ وہ چاروں ہی نہایت کسے ہوئے بدن کے مضبوط اور توانا جوان تھے۔ عمریں بھی ان کی زیادہ نہیں تھیں۔ کوئی پچیس چھبیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ آنکھیں ان کی جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح سرخ تھیں اور وہ خاصے تندخو دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے دو نے اسٹین گنیں اٹھائی ہوئی تھیں اور دو کے ہاتھوں میں ریوالور دبے ہوئے تھے۔ ان کا سرغنہ شاید وہی تھا جس نے اندر داخل ہونے کے بعد ہمیں للکارا تھا۔ میں بغور ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ آبی نے انہیں مخاطب کیا۔ "شاباش ہے بھئی جوانو! بڑے دلیر لگتے ہو تم مجھے۔ کیا چاہتے ہو بھئی ہم سے تم؟"

"بک نئیں اوئے مسخرے، یہ ہتھیار جو تم ہمارے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہو، یہ بالکل اصلی ہیں اور جب یہ ہنستے ہیں تو ہمارا مذاق اڑانے والا اپنے ہی خون میں لوٹتا نظر آتا ہے۔ یقین نہیں ہو تو تجربہ کر کے دکھاؤں ابھی۔" اندر آنے کے بعد ہمیں متنبہ کرنے والے نے خونخوار نگاہوں سے آبی کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ آبی کے مضحکہ اڑانے والے انداز پر چراغ پا ہوگیا تھا۔

"نہیں یار! اب ایسی بھی کیا ناراضگی۔ ہمیں پتا ہے یہ ہتھیار بالکل اصلی ہیں۔ میں تو جناب، یہ معلوم کرنا چاہتا تھا آپ سے کہ آپ حضرات کے اس شریفانہ انداز میں یہاں تشریف لانے کا کوئی مقصد تو ہوگا۔ بہتر ہے ہمیں بتا دیں۔"

"اوئے تو بہت بک بک کر رہا ہے۔ ایسے نہیں مانے گا تو۔" آنے والوں کے سرغنہ نے اپنی اسٹین گن آبی کی طرف سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "لے میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے ساکت کیے دے رہا ہوں اور دیکھتا ہوں تیری یہ بزلہ سنجی تجھے کس طرح بچاتی ہے۔"

میں نے تیزی سے اٹھ کر آبی کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں یارو! اتنی سی بات کی اتنی بڑی سزا تو نہ دو اس بیچارے کو۔"

سرغنہ نے کسی درندے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔ "زندگی چاہتے ہو تو لگام دے کر رکھو اس بلو مڑکے منہ کو ورنہ میں زبان کاٹ دوں گا سالے کی۔"

"ٹھیک ہے بھائی جی، یہ اب نہیں بولے گا کچھ۔" میں نے اس سے کہا، پھر آبی سے کہا۔ "اوئے چپ کر جا اب، زبان بند رکھ اپنا بالکل۔ تیری یہ زبان بس چلتی ہی رہتی ہے ہر دم۔ کبھی تو کوئی موقع محل بھی دیکھ لیا کر۔"

"ہاں، تم مجھے کچھ سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔" سرغنہ نے کہا۔ "چلو اب اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھ کر اُدھر ایک کونے میں سمٹ کر کھڑے ہو جاؤ، اور اگر مرنا نہیں چاہتے ہو تو کوئی حرکت کرنے کی کوشش بالکل نہ کرنا، سمجھے؟ چلو جلدی کرو۔"

"لیکن میرے بھائی، اتنا تو بتا دو ہمیں کہ تم ہو کون، اور ہم سے چاہتے کیا ہو؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

"یہ بھی ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں، فکر مت کرو۔ چلو اُدھر کونے میں ہو جاؤ جلدی، شاباش۔ ہری اپ۔" سرغنہ نے کہا۔

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "نہیں دوست، یہ نہیں ہوگا۔ جب تک تم اپنی اس غنڈہ گردی کا مقصد نہیں بیان کرو گے، ہم تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں کر سکیں گے، کم از کم تمہارا تعارف تو حاصل ہونا ہی چاہیے نا ہمیں۔"

اس نے مجھے اپنی طرف قدم بڑھاتے دیکھ کر اسٹین گن کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں سب ہی زندگی سے تنگ آئے ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں تمہاری یہ خواہش پوری کیے دیتا ہوں۔"

اس نے یہ کہہ کر مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی، مگر اس کی وہ اسٹین گن جس پر اعتبار کر کے وہ یہاں یوں دندناتا ہوا گھس آیا تھا عین وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے میں مصروف تھا لیکن اسٹین گن کسی طرح اس کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوئے تو جھوٹ بولتا تھا ہم سے کہ یہ ہتھیار اصلی ہیں۔ نقلی ہتھیاروں سے لوگوں کو دھمکاتے ہو، شرم نہیں آتی ہے تمہیں۔ یہ کھلونے کیوں لے کر آئے ہو یہاں؟"

اس نے بوکھلا کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "بھون ڈالو ان سب کو، دیکھتے کیا ہو۔ ایسے نہیں مانیں گے یہ۔"

میں چونکہ ان کے بہت نزدیک پہنچ چکا تھا، لہٰذا انہیں فوری طور پر خطرہ میری ہی طرف سے محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بقیہ تین ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار مجھ پر تان کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن ان کے ہتھیاروں نے بھی گولیاں اگلنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان چاروں کی حالت دیدنی تھی۔ ہتھیاروں کے دھوکا دیتے ہی ان کا اعتماد ہوا ہوگیا تھا۔ چہروں سے گھبراہٹ اور پریشانی جھانکنے لگی تھی۔ میں سرغنہ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نزدیک ہوتے ہی میں نے پوری قوت سے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر کے کہا۔ "اوئے بے غیرت کے بچے! ان نقلی ہتھیاروں کے ساتھ لوگوں کو لوٹتے ہو تم۔"

میرا ہاتھ پڑتے ہی وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، وہ جو کوئی بھی تھا، اتنا کمزور اور بزدل بالکل نہیں تھا کہ آسانی سے پٹ جاتا میرے ہاتھوں۔ ہتھیاروں کے ناکارہ ہونے سے وہ وقتی طور پر کچھ نروس ہوگیا تھا مگر میرا ہاتھ پڑنے کے بعد اس کے اندر کا درندہ ایک دم بیدار ہوگیا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ اور تیور بے حد خوفناک ہوگئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی اسٹین گن مجھ پر پھینک ماری۔ میں اس کی زد سے بچنے کے لیے ایک طرف ہوگیا۔ اتنی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور اسے حرکت دیتے ہوئے مجھ پر نظریں جما کر

آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔

آبی نے مدھم آواز میں کہا" تُو ہٹ جا جیلانی! اس سے مجھے نمٹ لینے دے اب۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں اس کا دم خم۔"

" نہیں یار! تُو بس کھڑا رہ اپنی جگہ اور خیال رکھ کوئی اور مداخلت نہ کرے ہمارے درمیان۔" میں نے جواب دیا۔

مجھے آبی سے مخاطب دیکھ کر وہ سمجھا ہوگا کہ دوسری طرف توجہ مبذول ہو جانے کی وجہ سے میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا ہوں، لہٰذا میری اس غفلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے اچانک میری جانب جست لگائی اور میرے پہلو میں خنجر سے وار کرنے کی کوشش کی۔ میری نظریں اس کے خنجر والے ہاتھ پر تھیں۔ چنانچہ میں اسے حرکت کرتے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گیا اور اسے جُھکائی دے کر اس کے خنجر والے ہاتھ کو دبوچنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ایسا ہی چھوٹا موٹا لٹیرا ہے جو اپنے خوف ناک ہتھیاروں کے بل پر بے ضرر قسم کے شہریوں کو لوٹتا پھرتا ہے۔ یہ اندازہ میں نے اس بنیاد پر قائم کیا تھا کہ اس نے اپنے ہتھیاروں کے زور پر ہمیں ایک کونے میں سمٹنے پر مجبور کرنا چاہا تھا تاکہ ان میں سے کوئی ایک ہمیں اسٹین گن کی زد میں لے کر کھڑا ہو جائے اور بقیہ تینوں مل کر گھر میں موجود قیمتی اشیاء اور نقدی وغیرہ سمیٹ لیں۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ان کا تعلق میرے یا فیروز کے کسی دُشمن یا ہماری مخالف کسی تنظیم سے ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اندر گھستے ہی یا تو اپنے مطلوبہ آدمی کو گولیوں کا نشانہ بنا دیتے یا پھر اسے ساتھ لے کر نکل جانے کی کوشش کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ محض مال سمیٹنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا مگر اس شخص کے بارے میں میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ محض ہتھیاروں پر بھروسا کرنے والا آدمی ہے۔ اس نے کسی اچھے استاد کی شاگردی قبول کر کے لڑنے بھڑنے کے سارے گُر سیکھے ہوئے تھے۔ سارے داؤ پیچ اسے ازبر معلوم ہوتے تھے۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں آتے ہی اس نے فضا میں اُچھل کر الٹی قلا بازی کھائی اور اس انداز سے اپنا ہاتھ جھٹکا کہ وہ میری گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ سب کچھ بس ایک پل میں ہو گیا تھا۔ دوسرے پل وہ پھر میرے سامنے دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ میں اس کی پھرتی اور مہارت پر حیران رہ گیا مگر اس نے مجھے حیرت کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ چند سیکنڈ اس نے مجھے نگاہوں میں تولا اور پھر اچانک اُچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کک لگائی۔ میں نے اس کک سے بچنے کے لیے بہت تیزی دکھائی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے دونوں مُڑے ہوئے پیر میرے شانے پر پڑے اور میں اُچھل کر پہلو کے بل نیچے جا گرا۔ مجھے اس سے اس مہارت اور چابکدستی کی بالکل توقع نہیں تھی اسی لیے وہ مجھے زمین بوس کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن نیچے گرتے ہی میری عقل ٹھکانے آ گئی، چنانچہ اس کے مزید حملوں سے بچنے کے لیے میں نے اٹھنے کی کوشش کرنے کے بجائے تیزی سے لوٹ لگائی اور اس مقام سے خاصا دور چلا گیا تھا جہاں گرا تھا، یہ بس ایک اضطراری حرکت تھی جو مجھ سے سرزد ہو گئی تھی اور یہ حرکت میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی تھی، اگر اس جگہ سے ہٹنے میں مجھے ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو میرے سینے میں اس کا خنجر اتر چکا ہوتا۔ اس نے پورے زور سے مجھ پر جست لگا کر خنجر چلایا تھا، جو میرے اس جگہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے فرش سے ٹکرا کے رہ گیا تھا، فرش پر دبیز قالین بچھا ہونے کے باوجود خنجر کے فرش سے ٹکرانے کی آواز ایسی تھی جیسے خنجر کی نوک کسی پتھریلی جگہ سے ٹکرائی ہو۔ حملہ اس نے اس بار اس قدر شدید کیا تھا کہ وار خالی جانے کی وجہ سے وہ خود اس سے خاصا متاثر ہوا تھا، چند ثانیے کے لیے تو وہ بالکل ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں مَیں سنبھل کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اب آبی کے لیے اس صورتِ حال کو برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا شاید، چنانچہ اس نے حملہ آور کو دوبارہ اٹھتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بڑھ کے اس کے خنجر والے ہاتھ پر زبردست ٹھوکر ماری۔ آبی کی لگائی ہوئی ٹھوکر اتنی اچانک اور بھرپور تھی کہ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے خنجر نکلتے ہی اس کے ایک ساتھی نے آبی پر گولی چلا دی۔ آبی کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ اُچھل کر ایک طرف گر گیا۔ اس دوران فیروز وغیرہ نے بھی اپنے پستول نکال لیے تھے۔ آبی کو اُچھل کر گرتے دیکھ کر فیروز نے اس شخص کو گولی کا نشانہ بنا دیا جس نے آبی پر گولی چلائی تھی، گولی لگتے ہی وہ اُچھل کر اپنے ساتھی پر اُلٹ گیا۔ آبی کو گرتے دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا تھا۔ میں بے چین ہو کر اس کی طرف لپکا اور قریب جا کر اس پر جھکتے ہوئے پوچھا" تو ٹھیک تو ہے نا میرے یار؟"

آبی پلٹ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا" سالے نے میری ٹانگ اُدھیڑ دی ہے تو میری فکر نہ کر، اس کتے کا دھیان رکھ، تجھے بے خبر پا کر پیچھے سے تجھ پر نہ آن پڑے۔ جا یار! اسے

بچہ، میرا زخم زیادہ گہرا نہیں ہے شاید۔"

میں نے مڑ کر حملہ آور کی طرف دیکھا لیکن اب میرے اور اس کے درمیان گل زمان حائل ہو چکا تھا۔ وہ اس کی طرف پستول تانے کھڑا کہہ رہا تھا" اب اگر تُو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لے تیرا بھیجا باہر کر دوں گا میں۔"

میں نے اس سے کہا" نہیں گل زمان، تو ہٹ جا درمیان سے، یہ میرا شکار ہے، اس سے میں خود ہی نمٹوں گا۔"

"انور کمال بولا" آپ آبی صاحب کی فکر کریں جیلانی صاحب اور اسے گل زمان کے لیے چھوڑ دیں۔ یہ سنبھال لے گا اسے۔"

میں نے مڑ کر انور کمال کو دیکھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دو پستول پکڑے اس لٹیرے کے ساتھیوں کو کور کیے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیروز بھی موجود تھا، اس کے ہاتھ میں بھی پستول دکھائی دے رہا تھا مجھے۔ وہ دونوں انہیں پوری طرح بے بس کر چکے تھے۔ ایک کو وہ گولی کا نشانہ بنا کر عدم کی طرف روانہ کر چکے تھے، دوسرا جس پر مرنے والا گولی کھا کر گرا تھا نیچے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا، اور تیسرا سامنے والے کے قریب کھڑا حیرت سے آنکھیں پھاڑے سے تک رہا تھا۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہو کر آبی کے پاس بیٹھ گیا" دکھا یار کون سی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ زخم کیسا ہے، مجھے دکھا ذرا۔" میں نے آبی کی ٹانگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے تکلیف سے منہ بناتے ہوئے اپنی بائیں ٹانگ میرے سامنے کر دی" یہ ادھر پنڈلی میں لگی ہے گولی۔" وہ بولا۔

اس کی پنڈلی سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے آبی سے پوچھا" گولی ہڈی میں تو نہیں لگی ہے۔ وہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"پتا نہیں یار! مجھے کچھ پتا نہیں کہاں گولی لگی ہے اور کیا کام کیا ہے اس نے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری پنڈلی میں انگارے بھر دیے گئے ہیں۔ آگ لگی ہے...... مار پورے پاؤں میں۔" آبی کی آواز میں نقاہت آ گئی تھی۔ شاید یہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جس رفتار سے خون بہہ رہا تھا اس کی ٹانگ سے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اگر جلد از جلد اسے روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کے جسم کا سارا خون بہہ جائے گا۔ اور پھر اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں رہے گی، اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے فیروز کی طرف مڑ کر اسے مخاطب کیا" یار فیروز! اس کا تو خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے، اسے اگر فوراً نہ روکا گیا تو یہ ختم ہو جائے گا یار! اس کے لیے کچھ کرو، کسی ڈاکٹر کو بلاؤ جلدی سے۔"

فیروز نے اپنی ٹائی کھول کر میری طرف پھینکتے ہوئے کہا" اسے زخم والی جگہ سے کچھ اوپر کس کے باندھ دو۔ میں فرسٹ ایڈ بکس لے کر آتا ہوں ابھی۔" وہ اپنے عقب میں ایک دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے انور کمال سے بولا" کمال! تم اور گل زمان ہوشیار رہنا۔ ان میں سے کوئی بھی بھاگنے نہ پائے اور اگر کوئی ذرا بھی گڑبڑ کرے تو بے دریغ گولی مار دینا اسے۔"

"ان کی آپ بالکل فکر نہ کریں جناب! ان میں سے اب کوئی ذرا سی بھی جنبش نہیں کر سکتا۔" انور کمال نے جواب دیا۔

فیروز چلا گیا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق آبی کے پاؤں میں گھٹنے سے ذرا اوپر خوب کس کے ٹائی باندھ دی۔ اس بندش کے بعد خون کے بہنے کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ میں نے پنڈلی پر سے اس کی پتلون کا پائنچہ پھاڑ کر الگ کر دیا اور ہاتھ سے ٹٹول کر پنڈلی کی ہڈی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ہڈی مجھے سلامت ہی لگی تھی۔ گولی شاید گوشت کو پھاڑ کر نکل گئی تھی یا شاید وہیں اٹک گئی تھی۔ یہ فیصلہ تو کوئی ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا۔ آبی بے حد نڈھال اور کمزور ہوتا جا رہا تھا، اس کی آواز جیسے ڈوبتی جا رہی تھی۔ اتنی دیر میں فیروز فرسٹ ایڈ بکس لے کر آ گیا، میں نے نڈھال پڑے ہوئے آبی کو اس کی طرف کر دیا اور خود اٹھ کر ان لٹیروں کی طرف بڑھ گیا۔ گل زمان اور انور کمال نے انہیں اپنے پستولوں سے اس طرح کور کر رکھا تھا کہ ان میں سے کسی کو جنبش تک کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی میں نے آگے بڑھ کر ان کے نیچے پڑے ہوئے ہتھیار اٹھا کر ایک کونے میں ڈال دیے۔ اور ان میں سے ایک کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے غرّانے کے سے انداز میں پوچھا" کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

اس نے مجھے جواب دینے کے بجائے اپنے سرغنہ کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ شاید کوئی بہت زیادہ سخت گیر آدمی........ اسی لیے اس کے ساتھی اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس کی بے خوفی اور خونخواری کا مظاہرہ تو میں ابھی کچھ ہی دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھ جیسے گھاگ کو لمحوں میں زچ کر کے رکھ دیا تھا، ان نئی عمر کے ناتجربے کار چھوکروں کے ساتھ تو وہ نجانے کیسا سلوک کرتا رہا ہوگا جو وہ اس قدر سہما ہوا تھا اس کے سامنے۔ میں نے اسے دوبارہ

تھنجھوڑا۔" جلدی بک ادئے، کون ہو تم لوگ؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو یہاں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے گالوں پر دو تھپڑ بھی لگا دیے۔

وہ گھگھیاتے ہوئے اپنے سرغنہ کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔
"وہ ... وہ ...." اس کی زبان پھر اٹک گئی۔

میں نے جھنجلا کر اسے دھکا دے کے ایک طرف پھینک دیا اور پلٹ کر سرغنہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔" تو ہی بول ادئے، بتا کون ہے تو اور یہاں کس ارادے کے ساتھ آیا ہے؟" میں اس کے سامنے جا ٹھہرا۔

وہ مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔" تجھے اس سے کیا مطلب ہے بھئی، کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے یہ تو؟"

میں نے اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔" میں جاننا چاہتا ہوں تیرا حدود اربعہ کیا ہے آخر؟ کس جنگل سے بھاگا ہوا جانور ہے تو؟ جانوروں کی کس قسم اور کس ریوڑ سے تعلق ہے تیرا؟"

میرے اس انداز نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس نے اپنے سامنے تنے ہوئے دو پستولوں کی پروا کیے بغیر غصے سے دانت بھینچ کر اچانک میرے منہ پر تھپڑ دے مارا اور دہاڑ کر بولا۔" بجوا س نہیں کرا دئے کتے! جان لے لوں گا میں تیری۔ سمجھا کیا ہے تو نے مجھے؟" یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے اس طرح گتھم گتھا ہو گیا کہ گل زمان یا انورکمال کے لیے اس پر گولی چلانا ناممکن ہو گیا۔

وہ شاید کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا اور میں نے طیش کے عالم میں اس کے نزدیک جا کر اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ اسے اپنی قوت پر بے حد ناز تھا، لگتا یہ تھا کہ وہ مجھے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہے۔ میرا سینہ تو پہلے ہی سُلگ رہا تھا۔ آبی کا زخم دیکھ کر میری کنپٹیاں چٹخنے لگی تھیں۔ جی چاہتا تھا ان چاروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کے ڈال دوں اور ان کے تڑپنے کا نظارہ کرتا رہوں۔ اس نے مجھ سے لپٹ کر مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر پوری قوت سے بھینچنا شروع کر دیا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے جیسے جیسے مزاحمت کرتا جاتا تھا، اس کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ مجھے اپنے سینے میں سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور پسلیاں یوں لگتا تھا جیسے بس ابھی کڑکڑا کر ٹوٹیں گی اور سینے کے اندر گھستی چلی جائیں گی۔ بڑی جان تھی اس ذلیل میں، حالاں کہ دیکھنے میں وہ بالکل ایسا نہیں لگتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اسے دور ہٹانے کی کوشش میں میرے اور اس کے سینے کے درمیان پھنس کر رہ گئے تھے۔ میں نے ایک بار اپنی پوری جان لگا کر اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے سینے کے ساتھ بھینچ کر میری پسلیاں چٹخانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید میرے ہاتھ اس کے ارادے کی تکمیل میں حائل ہو رہے تھے اور اسے غالباً اپنی قوتِ بازو پر کچھ زیادہ ہی اعتبار تھا چنانچہ اس نے مجھے ہاتھوں کو آزاد کرانے کی جستجو کرتے دیکھ کر اپنی گرفت تھوڑی سی ہلکی کر دی تاکہ میں اپنے ہاتھوں کو وہاں سے نکال لوں۔ سوچا اس نے یہی ہو گا کہ ہاتھوں کو آزاد کر دینے کے بعد بھی میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکوں گا اور اسے میری پسلیاں توڑ دینے میں آسانی ہو جائے گی۔ وہ میرے ہاتھوں کی فنونِ کاری سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ آزاد ہوں تو میں ہاتھی کو بھی چند سیکنڈ میں بے بس کر کے زمین پر ڈال سکتا ہوں۔ اس کی گرفت ہلکی ہوتے ہی میرے دونوں ہاتھ اس کی بغلوں سے گزر کر پشت کی طرف چلے گئے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچا کر ایک مخصوص حصے پر جما دیا اور پھر میرے انگوٹھے کو اس کی رگِ حساس تلاش کرنے میں ایک سیکنڈ سے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ کسی بے جان جُثے کی طرح میرے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔ میں نے اسے ہاتھوں سے جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا۔

اس کے دونوں ساتھیوں کے لیے اس کا یہ انجام قطعی... غیر متوقع اور ناقابلِ یقین تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کبھی مجھے اور کبھی اپنے سردار کو دیکھنے لگتے۔ ان میں سے ایک نے متعجب انداز میں پوچھا۔" کیا ... کیا تم نے ... اسے جان سے مار دیا ہے؟"

میں اسے چھوڑ کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو جوانو! یہ اتنا غیرت والا نہیں لگتا ہے مجھے کہ یوں آسانی سے مر جائے۔ وہ اور ہوتے ہیں جو شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ہیں اور وہ باحیا لوگ اس جیسے ہرگز نہیں ہوتے ہیں۔"

"مگر یہ ... یہ تو ... یہ تو بالکل بے سُدھ پڑا ہے... حرکت کیوں نہیں کر رہا ہے یہ؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے یارو! اتنی دیر سے حرکتیں کر کر کے تھک گیا ہے بے چارہ۔ اب کچھ دیر سستانے کے لیے لیٹ گیا ہے۔ میں نے کہا نا تم یہ فکر نہ کرو اس کی اور اب اچھے بچوں کی طرح یہ بتا دو مجھے کہ کون لوگ ہو تم اور یہاں کیوں آئے تھے؟"

وہ جس سے میں نے پہلے سوال کیا تھا، اس وقت تو اپنے سردار کے خوف سے منہ نہیں کھول سکا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کا حشر دیکھ کر اس میں جرأت پیدا ہو گئی، جلدی سے بولا۔ "جسے تم نے بے سُدھ کر کے ڈال دیا ہے، اس کا نام تو تاج الدین ہے جی، پر لوگ اسے تاجو کہتے ہیں۔ چار سال پہلے یہ ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک بڑے خوش حال گھرانے کا فرد ہے یہ۔ اس کے باپ کا شمار شہر کے معزز لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے باہر بھیج دیا تھا۔ کئی سال بعد واپس آیا تو بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ جب تک یہاں تھا کبھی سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا اس نے۔ باہر سے آیا تو شراب، چرس اور ہیروئن اس کی زندگی بن چکے تھے۔ ہماری اس سے کالج کے زمانے ہی سے دوستی تھی۔ اس نے ہمیں ان چیزوں کا عادی بنا دیا ہے اور اب ہم ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہمارے معاشی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق یہ چیزیں خرید سکیں۔ ابتدا میں تاجو ہماری ضرورت پوری کیا کرتا تھا مگر جب ہمیں اس کی لت پڑ گئی تب اس نے ہمیں ترسانا شروع کر دیا۔ پھر اس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اپنے نشے کی طلب پوری کرنے کے لیے ہم اس کی سربراہی میں ڈاکے ڈالیں۔ بس جی اتنی سی بات ہے۔ نشے کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے اور نشہ آور اشیا حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم تاجو کے ساتھ لوٹ مار میں شریک ہوں۔ ہم تو جی اب گلے گلے تک دھنس چکے ہیں اس دلدل میں۔"

میرا دل تو چاہا کہ اس رذیل کے منہ پر تھوک دوں۔ وہ ایک غریب گھرانے کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس کے والدین نے نجانے کیسے کیسے مصائب سے گزر کر اسے علم کی روشنی سے منور کیا تھا۔ انہوں نے کیسے کیسے حسین اور پُرفریب سپنے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ انھوں نے کیسی کیسی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں ان دونوں کی ذات سے۔ تعلیم نے یہ جلا بخشی تھی ان کے دماغوں کو۔ آج یہ اپنے والدین، اپنے خاندان اور اپنے ملک و ملت کے لیے ایک گالی بن کر رہ گئے تھے۔ یہ ننگِ انسانیت اس قابل بالکل نہیں تھے کہ ان پر رحم کیا جاتا یا انہیں کسی ہمدردی کا مستحق سمجھا جاتا لیکن چاہنے کے باوجود میں انہیں ذلیل کرنے کے لیے ان کے منہ پر تھوک نہیں سکا کیوں کہ صرف یہی دو نوجوان ہی ایسے نہیں تھے جو اس دلدل میں جلتے بجھتے جا گرے تھے۔ یہاں تو پتا نہیں کتنے ایسے عقل کے دشمن تھے جو ان سے بھی زیادہ غلاظت میں اتھڑے ہوئے تھے۔ جنہیں یہودیوں نے مختلف نعرے عطا کر کے میرے ملک کی بربادی اور قوم کے نوجوان خون کو گندہ کرنے کا کام سونپ رکھا تھا۔ کسی کو انہوں نے قومیتوں کا نعرہ دے کر بھیجا تھا تو کسی کی آنکھوں پر علاقائی تعصب کی عینک چڑھا دی تھی۔ کسی کے دل میں راجا داہر کا بُت رکھ دیا تھا تو کسی کے سینے کو رنجیت سنگھ کی محبت سے معمور کر دیا تھا۔ میں نے خود سے کہا۔" غلام جیلانی! ان دو جوانوں کے منہ پر تھوکنے سے، انہیں ذلیل کرنے سے یہ مسئلہ حل تو نہیں ہو جائے گا۔ اگر تھوکنا ہی ہے تو ان سب کے چہروں پر تھوک، ذلیل ہی کرنا ہے تو ان سب کو ذلیل کر جو اپنے بدیسی آقاؤں کے اشارے پر ان معصوم اور ناپختہ ذہنوں میں زہر بھر رہے ہیں۔ جو دنیا میں یہودیوں کے اقتدارِ اعلیٰ کی راہیں ہموار کرنے کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں ننھے بچوں کو ورغلا کر اس قوم کا مستقبل تاریک کرنے پر مامور ہیں۔"

میرے نزدیک قابلِ گردن زدنی وہ نہیں، تاجو تھا جسے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرونِ ملک بھیجا گیا تھا مگر وہ وہاں سے میری قوم کے ان سیدھے سادے صاف دل نوجوانوں کو موذی نشے کا عادی بنانے اور شریف اور بے ضرر شہریوں کا سکون غارت کر کے ملک میں افراتفری پھیلانے کی تربیت حاصل کر کے آیا تھا۔ میں نے اس جوان سے کہا۔" تم اگر علم حاصل کرنے کے بعد بھی بُرے بھلے میں تمیز کرنا نہیں سیکھ سکے، اپنے والدین کا نام روشن کرنے کے بجائے ان کے لیے گالی بن گئے ہو تو بہتر یہی ہے کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ کسی کے گھر میں گھسنے یا کسی کو لوٹنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ دوسری بار اس رُوپ میں ملے تم مجھے، تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے، میرا نام غلام جیلانی ہے۔ اگر اخبار پڑھتے ہو تو تم نے غلام جیلانی اور اسلم آبی کا نام ضرور پڑھا ہو گا۔ کوئی نیک نام لوگ نہیں ہیں ہم۔ ہماری زندگی بھی لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں ہی گزرتی رہی ہے۔ سارے ملک کے تھانوں میں ہماری فائلیں موجود ہیں، ملک بھر کی پولیس کو تلاش ہے ہماری۔ اتنے بدنام اور بُرے لوگ ہیں ہم، لیکن تمہارے جتنے ذلیل لوگ تو ہم بھی نہیں ہیں یارو۔ چرس اور ہیروئن جیسی ذلیل اشیا کے لیے ہم نے اپنی زندگیاں کبھی داؤ پر نہیں لگائیں۔ جاؤ بھاگ جاؤ ادھر سے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں بیک وقت بولے۔" آپ ... آپ غلام جیلانی ہیں؟"

"ہاں، میں غلام جیلانی ہوں، غور سے دیکھ کر پہچان کر لو

میری۔ میں جس شہر میں ہوتا ہوں، وہاں ہونے والی کوئی واردات چھپی نہیں رہتی ہے مجھ سے۔ اگر اب آج کے بعد مجھے ڈاکے یا لوٹ مار کی کسی واردات کی اطلاع ملی تو میں تمہیں ہی اس کا ذمے دار ٹھہرا دوں گا اور پھر پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا میں تمہیں۔ یہ یاد رکھنا، چھپ نہیں سکو گے تم مجھ سے۔ نام کیا ہیں تمہارے؟"

"میرا نام رضا حیدر ہے اور یہ رشید ہے، رشید خان۔"

اس نے جلدی سے بتایا۔ پھر بولا۔ "مجھے حیرت ہے، اخبارات میں جس غلام جیلانی کے بارے میں پڑھتے رہے ہیں ہم، اگر آپ وہی غلام جیلانی ہیں تو ... تو ... حیرت ہے یقین نہیں آتا۔"

میرے بولنے سے پہلے ہی انور کمال بول پڑا۔ "یہ ہیں تو وہی غلام جیلانی، مگر اخبارات میں ان کے بارے میں جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے، وہ پولیس کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہے۔ اسی لیے تمہیں ان سے مل کر اتنی حیرت ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب تم دونوں دوڑ لگا دو یہاں سے۔ چلو، جلدی کرو، مجھے اور بھی معاملات نمٹانا ہیں ابھی۔"

وہ دونوں جانے کے لیے تیار تھے، رشید بولا۔ "اور یہ ... ان دونوں کا کیا ہوگا؟ کیا انہیں بھی لے جائیں ہم؟"

"وہ جسے گولی لگی ہے اگر وہ زندہ ہے اور اس قابل ہے کہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو سکے تو اسے بے شک لے جا سکتے ہو تم لیکن یہ تمہارا باس تاجو اب نہیں جائے گا کہیں۔ ایسے ضمیر فروشوں کو ڈھیل دینا ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں ایک ساتھ اپنے ساتھی پر جھک کر اُسے ٹٹولنے لگے۔ پھر سیدھے ہو کر رضا حیدر نے کہا۔ "اس میں تو اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر پڑا رہنے دو یہیں اسے، اس کی لاش کو ہم ٹھکانے لگا دیں گے۔ تم اسے لے کر جاؤ گے تو خواہ مخواہ مصیبت بن جائے گا یہ تمہارے لیے۔"

رشید نے میری تائید کرتے ہوئے رضا حیدر سے کہا۔ "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں یار! ہم کہاں لیے پھریں گے اسے۔ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ ایسے معاملات میں کرنا کیا چاہیے۔ لاشیں ٹھکانے کا تجربہ بھی تو نہیں ہے ہمیں۔"

رضا حیدر نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا اور پھر وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے شکرگزار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں فیروز اور آبی کی طرف مڑ گیا۔ فیروز نے آبی کے پیر کی پٹی کر دی تھی اور خون بھی بڑی حد تک بہنا بند ہوگیا تھا۔ آبی پر نقاہت طاری تھی، کمزوری بہت زیادہ تھی اسے، چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اس کے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی ٹانگ کے زخم سے خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ جس جگہ وہ پڑا تھا وہاں اس کے پیروں کے نیچے وہ پوری جگہ اور اس کے آس پاس گاڑھا گاڑھا سرخ سرخ خون کیچڑ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی حالت دیکھ کر فیروز سے کہا۔ "اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے یار!"

"ہاں، خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے۔ دوسرے گولی بھی شاید اندر ہی موجود ہے، اسے بھی نکالنا ضروری ہے، چنانچہ ہمیں اس کے لیے فوری طور پر کسی ایسے ڈاکٹر کو تلاش کرنا ہوگا جو اس معاملے کو پولیس کے علم میں لائے بغیر انہیں ٹریٹمنٹ دے سکے۔"

"تو کیا تمہارا کسی ایسے ڈاکٹر سے رابطہ نہیں ہے؟" میں نے قدرے حیرانی کے ساتھ فیروز سے پوچھا۔

"ہمارے پاس کوئی مستقل ڈاکٹر ایسا نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت جرائم پیشہ افراد کے تعاون سے کسی کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں ہم۔"

"اچھا، ٹھہرو پھر میں لزی سے بات کرتا ہوں، مگر یار ان رذیلوں کی وجہ سے ہمارا آج کا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔" میں نے ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آبی اگر زخمی نہیں ہوتا تو ہم منصوبے پر عمل ضرور کرتے۔"

"ہاں، یہ بھی شاید ہونا ہی تھا۔ بہرحال تھوڑا بہت ہنگامہ تو ہم اب بھی کر سکتے ہی۔ کچھ تھوڑا سا ہراس تو پھیلنا ہی چاہیے ان میں۔ یوں سکون سے کام کرنے کا موقع تو نہیں دیں گے ہم انہیں۔" فیروز نے فرسٹ ایڈ بکس بند کر کے اُٹھتے ہوئے کہا۔

عین اسی لمحے دروازہ کھول کر خان کمرے میں داخل ہوا، مگر یہاں کا منظر دیکھ کر وہ دروازے کے پاس ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ حیرت سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "خیر تو ہے بھئی؟ یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی جنگ ختم ہوئی ہے؟"

"ہاں یار! کچھ لٹیروں نے دھاوا بول دیا تھا ابھی کچھ پہلے۔ ان کا ایک ساتھی وہ اُدھر اوندھا پڑا ہے اور سرغنہ کا یہ ادھر پڑا ہوا ہے مگر سالے۔ اپنے آبی صاحب کو بھی زخمی کر گئے ہیں، انہیں طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔" فیروز نے جواب دیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "ارے تو پھر جلدی کرو، دیر کیوں کر رہے ہو پھر؟"

فیروز بولا۔ "لے کر کہاں جائیں گے؟ پہلے کسی ڈاکٹر کا انتظام ہو جائے۔ یہ جیلانی صاحب لزی سے بات کرنے جا رہے ہیں۔"

"لعنت بھیجو یار، اس ہیوڈن پر۔ چلو انہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔ میں لے چلتا ہوں ڈاکٹر کے پاس انہیں۔" خان بولا۔

"کیا کوئی ڈاکٹر ہے تمہاری نظر میں ایسا، جو پولیس کو اطلاع دیے بغیر اسے مناسب طبی امداد دے سکے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ فکر نہ کریں جی! پولیس ولیس کو ہوا بھی نہیں لگ سکے گی اس معاملے کی۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔" خان نے کہا۔

میں نے لزی کو فون کرنے کا ارادہ منسوخ کر دیا اور آبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے پھر آؤ چلیں، زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے ہمیں۔ پہلے ہی خون بہت ضائع ہو چکا ہے اس کا۔"

میری بات سنتے ہی گل زمان اور انور کمال تیزی سے آبی کی طرف لپکے اور ان دونوں نے آبی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ فیروز نے اس کی زخمی ٹانگ کو سنبھال لیا تھا۔ میں نے بڑھ کر آبی کی ٹانگ کو تھامتے ہوئے کہا۔ "اسے مجھے پکڑا دو فیروز! اور تم اس تاجو کے پاس ٹھہرو، اگر اسے ہوش آ گیا، اور یہاں کوئی نہیں ہوا تو پھر یہ کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دے گا ہمارے لیے۔"

"اوہ، تو یہ صرف بے ہوش ہوا ہے؟ میں تو سمجھ رہا تھا یہ بھی زندگی کے اس عذاب سے نجات پا گیا ہے۔" فیروز نے کہا۔

"نہیں بھئی، مرا ورا نہیں ہے یہ اور اسے ہوش میں آنے کی زیادہ جلدی بھی نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاطاً ایک آدمی کو اس کے پاس رہنا ضرور چاہیے۔ کبھی کبھی اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں آدمی کے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اسے باندھ کر کہیں ڈال دو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ایسا ہی کرتا ہوں میں، آپ لوگ جائیں اور ان کی حالت سے آگاہ کرتے رہیں مجھے فون پر۔" فیروز نے کہا۔

ہم آبی کو اٹھائے ہوئے باہر آ گئے۔ یہاں وہ سفید کرولا موجود تھی جس میں ہم شرافت علی کے بنگلے سے نکلے تھے۔ میں نے آبی کو اسی کار کی عقبی نشست پر لٹا دیا۔ ڈرائیونگ سیٹ خان نے سنبھال لی تھی۔ میں نے انور کمال سے کہا۔ "تم یا گل زمان کوئی ایک آدمی یہاں فیروز کی مدد کے لیے رک جائے۔ یوں بھی ہم کسی محاذ پر تو جا نہیں رہے ہیں کہ زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہو۔"

انور کمال بولا۔ "اچھی بات ہے، میں ہی رک جاتا ہوں یہاں، شاید انہیں میری ضرورت پیش آ ہی جائے۔"

گل زمان کے اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہی خان نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ آبی درد سے نڈھال ہو رہا تھا، آنکھیں اس نے بند کر رکھی تھیں اور ہونٹ اس زور سے بھینچ لیے تھے جیسے بے ساختہ نکل جانے والی کراہوں کو اندر ہی اندر اپنے سینے میں دفن کر دینا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے بے شمار قطرے جھلملا رہے تھے۔ میں نے اپنی قمیص کے دامن سے یہ پسینہ صاف کر کے اسے مدھم آواز میں پکارا۔ "آبی، آنکھیں کھول یار! اِدھر میری طرف دیکھ، کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے پاؤں میں تیرے؟"

اس نے آنکھیں کھولے بغیر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "پانی ... میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ بہت زور کی پیاس لگی ہے ... جیلانی ... میرے یار ... تھوڑا سا پانی ... ڈال دے ... منہ میں میرے۔"

"حوصلہ رکھ یار! ہمت سے کام لے، ہم جلد ہی تجھے اس عذاب سے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

اس نے خاموش رہ کر دوبارہ اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میرا دل اس کی اس حالت پر بے چین ہوا جا رہا تھا۔ میں نے خان سے کہا۔ "خان! جلدی کر یار! ذرا رفتار بڑھا گاڑی کی، آبی بہت تکلیف میں ہے۔"

"بس ابھی دو منٹ میں پہنچ جائیں گے ہم، زیادہ دور نہیں جانا ہے ہمیں۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے ایک عالی شان کوٹھی میں لے جا کر کار روک دی۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کوٹھی کے دربان کو ہدایت کی تھی کہ وہ ڈاکٹر کو مطلع کر دے ایک ایمرجنسی کیس ہے۔ دربان نے شاید اپنے کیبن سے ہی ٹیلی فون کے ذریعے اندر اطلاع کر دی تھی۔ ہماری کار جیسے ہی عمارت کے سامنے جا کر کھڑی، اندر سے ایک ملازم نے آ کر کار میں جھانکا۔

خان نے اس سے کہا۔ "دیکھ کیا رہا ہے یار میرے۔ جلدی اسٹریچر لے کر، ڈاکٹر صاحب تو موجود ہیں نا؟"

"ہاں جی، آپ ٹھہریں میں انہیں خبر کرتا ہوں ابھی اور

اسٹریچر بھی لے کر آتا ہوں۔" اس نے کہا اور واپس اندر کی طرف دوڑ گیا۔

خان گاڑی کا انجن بند کر کے نیچے اتر گیا۔ میں اور گل زمان بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔ ایک منٹ کے بعد ہی وہ ملازم اسٹریچر لے کر آ گیا اور بولا "آئیں جی پیشنٹ کو اٹھوائیں۔ ڈاکٹر صاحب اُدھر آپریشن تھیٹر میں گئے ہیں۔ وہیں لے جانا ہے نا آپ کے بندے کو بھی؟"

"ہاں چلو اٹھاؤ جلدی کرو۔ گل زمان ہاتھ لگا بھئی ذرا۔" خان نے گل سے کہا اور خود بھی آپی کی طرف بڑھا۔

اس نے گل زمان اور ملازم کے ساتھ مل کر آپی کو کار سے نکال کے اسٹریچر پر ڈال دیا۔ گل زمان اور ملازم نے اسٹریچر اٹھا لیا اور اسے لے کر اندر چلے گئے۔ خان نے مجھ سے کہا۔ "آئیں جیلانی! چلیں، ہم اندر چلتے ہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا "کمال ہے بھئی، اس ڈاکٹر کو کیسے پتا چل گیا کہ آنے والے مریض کو آپریشن کی ضرورت ہے، وہ اسے دیکھے بغیر ہی آپریشن تھیٹر میں جا پہنچا ہے، ایسا ولی کامل ہے یہ ڈاکٹر؟"

خان نے ہنس کر جواب دیا "بات یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی عام کلینک نہیں ہے۔ یہ رہائش گاہ ہے اس ڈاکٹر کی، لیکن اس نے یہاں ہم جیسے ضرورت مندوں کے لیے ایک چھوٹا سا کلینک بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس کے بارے میں عام لوگوں کو پتا نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہر ایک کو یہاں بُلاتا ہے۔ اس جگہ تو صرف ہمارے ہی بھائی بند آتے ہیں جنہیں قانون کی نگاہوں میں آئے بغیر میڈیکل ایڈ درکار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جانتا ہے جب یہاں آنے والے کسی مریض کے لیے اسٹریچر کی ضرورت ہوتی ہے تو ایسے مریض کو آپریشن تھیٹر ہی لے جانا پڑتا ہے۔ عموماً اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے گولیاں برآمد کرنا پڑتی ہیں۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ایک بڑے ہال نما قیمتی اور جدید ترین فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم سے گزر کر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے کے دائیں بائیں دو دروازے اور بھی نظر آ رہے تھے۔ خان مجھے ساتھ لیے دائیں طرف والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس دروازے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں آ گئے۔ خان راہداری میں عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ عمارت کے اختتام پر راہداری بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اس طرف ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک خوشنما چمن زار تھا جس کے بیچوں بیچ سرو کے درختوں کے درمیان ایک مختصر سا راستہ تھا جس پر سُرخ بجری بچھی ہوئی تھی۔ خان سے اتر کر اس راستے پر گامزن ہو گیا۔ اس راستے کے اختتام پر ایک قطار میں کوئی دس بارہ چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بنے ہوئے تھے جو شاید اس کوٹھی میں کام کرنے والے ملازمین کے لیے بنوائے گئے تھے۔ خان اس قطار کے بالکل آخری کوارٹر کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ دروازہ بند تھا، خان نے اس پر تین بار ہلکی سی دستک دی۔ کوئی تیس سیکنڈ کے انتظار کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا، خان نے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔ "آپریشن تھیٹر؟"

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے جناب۔ ڈاکٹر صاحب وہیں موجود ہیں۔"

خان میرا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مختصر سا صحن عبور کر کے ہم جس کمرے میں داخل ہوئے، اس کے عقب میں ایک اور دروازہ موجود تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا مگر پردہ پڑا ہونے کی وجہ سے دوسری طرف مدھم روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گل زمان اسی کمرے میں بائیں جانب دیوار کے ساتھ پڑی لمبی سی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھتے ہوئے بولا "وہ آپی صاحب کو اُدھر لے گئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے بیٹھو اِدھر ہی۔ آئیں جیلانی صاحب آپ بھی بیٹھ جائیں۔" اس نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ پتا تو کرو آپی کی حالت کیسی ہے؟ کوئی خون شون کی ضرورت تو نہیں ہے اس کے لیے۔" میں نے کہا۔

"اُن کی طرف سے اب آپ بے فکر ہو جائیں بالکل۔ ہم نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد اب ساری ذمے داری ڈاکٹر کی ہے۔ جو کچھ کرنا ہو گا یا جس چیز کی ضرورت ہو گی، اس کا بندوبست وہ خود کرے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔" خان نے مجھے سمجھایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر نے ہم جیسے لوگوں کے لیے خاصا معقول انتظام کر رکھا ہے۔" میں نے مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی، جب پیسے معقول لیتا ہے تو انتظام معقول کیوں نہیں کرے گا، سارا کھیل تو پیسے کا ہے جناب۔"

"ہاں یار! یہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہو تم۔ ویسے اس طرح کے معاملات میں کتنے پیسے لے لیتا ہے یہ؟"

"اس کی آپ فکر کیوں کر رہے ہیں۔ جو کچھ بھی لے گا دے دیا جائے گا اسے۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے اب۔"

میں مسکرا کر چپ ہو گیا۔ وہ یا تو مجھے زیر بارِ احسان کر کے ہیروں کے معاملے میں خود کو شکوک و شبہات سے بری کرا لینا چاہتا تھا، یا پھر وہ اس طرح اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ یہ اندازہ تو میں لگا ہی چکا تھا اس کے بارے میں کہ گو وہ تاریک راہوں کا مسافر بن گیا تھا، لیکن اس کے اندر بڑی روشنی تھی۔ دل اس کا بے حد اُجلا اور شفاف تھا۔ کبھی کبھی آدمی کو حالات ایسی راہوں پہ چلنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں جو اس کے لیے کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہوتیں، آدمی حالات کا غلام ہے۔ اس غلامی سے اسے کبھی نجات نہیں ملتی۔ ایک دنیادار شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس غلامی کا جوا اتار سکے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جس راہ پر وہ گامزن ہے، یہ اس کی منزل کی طرف نہیں جاتی، آدمی انہی راہوں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، جدھر حالات اسے ڈال دیتے ہیں، لیکن اس کا ضمیر چونکہ اسے پسند نہیں کرتا، چنانچہ وہ اُسے کچوکے لگاتا رہتا ہے اور وہ اس ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرتا رہتا ہے جو اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔

میری نظریں مسلسل اس کھلے ہوئے دروازے پر مرکوز تھیں جہاں پردے کے پیچھے مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی، دم بدم میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرے لیے انتظار کی یہ طویل ہوتی گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ خان بولا "آپ پریشان نہ ہوں۔ اندر سب ٹھیک ہی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو اب تک ہمیں بتا دیا جاتا۔ اطمینان رکھیں، وہ لوگ اب باہر آنے ہی والے ہوں گے۔"

"اگر سب ٹھیک ہے تو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے آخر۔ آپریشن سے گولی نکالنے میں اتنا وقت تو نہیں لگتا۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے جی، بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔" اس نے مجھے تسلی دینے کو کہا۔

"ہم اندر چل کر دیکھیں، کیا کر رہے ہیں وہ اس کے ساتھ۔ میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے یار اس طرف سے۔"

"آخر آپ اس قدر غیر مطمئن کیوں ہیں؟ خدشہ کیا ہے آپ کو ان کی طرف سے؟"

"وہ یار تم سمجھتے نہیں ہو۔ ایسے غیر قانونی کام کرنے والے ڈاکٹروں کا بہت تلخ تجربہ ہے مجھے۔ آدمی جاتا ان کے پاس اپنے جسم کے اعضا کی سلامتی کے لیے ہے اور یہ لوگ اسے اپنے کسی عضو سے محروم کر دیتے ہیں، اس طرح اتنی مہارت سے کہ مریض کو پتا بھی نہیں چل پاتا۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس کے معالج نے اسے صحت عطا کر دی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ جیلانی! میں سمجھا نہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو کسی مریض کے جسم سے کوئی عضو نکالنے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ وہ کیا کرے گا اس کو؟ یہ بڑی عجیب بات کہہ رہے ہیں آپ؟" خان چونک کر بولا۔

"تم نہیں جانتے ہو یار! میرا واسطہ ڈاکٹر رحمن اور اس کی نصف بہتر عالیہ سے پڑتا رہا ہے۔ وہ لوگ یہی کرتے تھے۔ مریضوں کو آپریشن تھیٹر میں لے جا کر ان کا گردہ نکال لیتے تھے اور اُسے کسی ضرورت مند کو لاکھوں روپے میں بیچ دیتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ سرپرستوں سے محروم لوگوں کو پکڑ کر ان کی آنکھوں کے قرنیے بھی نکال کر فروخت کر دیا کرتے تھے۔"

خان ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا "کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ کیا یہ ڈاکٹر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں؟"

"سب تو ایسے نہیں ہوتے مگر بُرے اور بھلے لوگ کہاں نہیں ہوتے؟ کسی کے ماتھے پر تو لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے لیکن، ہمیں خود بھی سمجھنا چاہیے جو شخص پیسے کی خاطر خلافِ قانون کام کرنے کو تیار رہتا ہے، وہ کیا نہیں کر سکتا۔ اس سے تو ہر بُرے سے بُرے عمل کی توقع رکھنا چاہیے ہمیں۔ عقل کا تقاضا تو یہی ہے۔"

"آپ نے تو مجھے دہلا کر رکھ دیا جیلانی! بڑی عجیب بات بتائی ہے آپ نے، ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کبھی۔ آئیں، آپ میرے ساتھ آئیں، ہم دیکھتے ہیں چل کر اندر کیا ہو رہا ہے۔" وہ تیزی سے اس کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

عین اسی وقت وہ ملازم جو آپی کو اسٹریچر پر ڈال کر لایا تھا، پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ میں اور خان اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا "آپ میرے ساتھ اندر چلیں، ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"کیوں بھائی خیریت تو ہے، وہ ہمارا پیشنٹ تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں جی، ٹانگ سے اس کی گولی تو نکال لی ہے ہم نے اور زخم کی پٹی بھی کر دی ہے لیکن انہیں شاید مثانے کی کچھ تکلیف ہے۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کچھ بات کرنا چاہتے ہیں آپ

سے۔ آئیں اندر آجائیں، آپ دونوں۔" وہ مُڑ کر پردے کے پیچھے غائب ہوگیا۔

میں نے خان کو دیکھا۔ وہ سوالیہ انداز میں مجھے ہی دیکھ رہا تھا، بولا۔ "اب کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اوئے یہ تو بالکل وہی کیس لگ رہا ہے مجھے۔ وہ دھمن اور عالبہ والا۔ وہ بھی مریضوں کو کوئی خاص انجکشن لگا دیا کرتے تھے جس سے ان کو مثانے کی تکلیف کی شکایت ہوجاتی تھی، پھر وہ مریض کے ورثا کو بتاتے تھے کہ اس کا ایک گردہ ناکارہ ہوچکا ہے۔ اگر اسے فوری طور پر نکالا نہیں گیا تو مریض کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تم دیکھ لینا، یہ ڈاکٹر بھی یہی کہے گا۔" میں نے خان کے قریب جا کر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"آئیں دیکھتے ہیں، ابھی پتا چل جاتا ہے اس کا بھی۔ یہ تو بہت خوف ناک ڈاکٹر ہے بھئی۔ اس پر تو بھروسا کرنا ہی نہیں چاہیے بالکل۔"

گل زمان نے اٹھ کر ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی، یہ بہت خوف ناک بات ہے۔ میں بھی چل رہا ہوں آپ کے ساتھ۔ اگر اس ذلیل کے بچے نے ایسی کوئی بات کی تو میں زبان باہر کھینچ لوں گا اس کی گدی سے۔"

ہم تینوں آگے پیچھے ڈاکٹر کے اس آپریشن تھیٹر میں پہنچے جہاں انھوں نے ایک بڑی سی آپریشن ٹیبل پر آبی کو ڈالا ہوا تھا۔ اس کی زخمی ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے کی رونق بھی خاصی بحال ہوچکی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے گردن گھما کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ خوش دلی سے بولا۔ "لے بھئی میرے یار! آئے تو ہم یہاں ناز بخشوانے تھے مگر روزے گلے پڑے جارہے ہیں یہاں تو۔"

اُسے چہکتے دیکھ کر مجھے ایک ذرا اطمینان ہوا۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے بھئی، کن روزوں کی بات کر رہا ہے تو میرے یار؟"

"یہ ہمارے کرم فرما، مہربان ڈاکٹر صاحب کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ تُو خود ہی ان کی زبانی کلام سُن لے ان کا۔ جی خوش ہو جائے گا تیرا۔"

وہاں آپریشن ٹیبل کے گرد ڈاکٹر کے ساتھ دو حور شمائل نازنین جنہیں حوریں کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا بھی موجود تھیں۔ رنگ روپ اُن کا ایسا تھا کہ نظر ٹکائی ہی نہیں جاتی تھی ان پر، یونیفارم نے انہیں جو تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہوئی تھی اس گھٹیا پن کی وہ ان کی آنکھوں میں کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ قدرت نے انسان کے جسم میں یہ ایک ایسی کل فٹ کر دی ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ دل کے سارے بھید کھول کر رکھ دیتی ہیں یہ اور کبھی کبھی اتنی رازداری سے یہ کام کرتی ہیں کہ آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا، وہ کب عریاں ہوگیا دوسروں پر۔ ان کے علاوہ وہ ملازم بھی وہیں موجود تھا جو ہمیں بلانے گیا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے اپنے انداز سے وہ بھی کوئی میل نرس ہی لگتا تھا۔ ڈاکٹر کوئی چالیس بیالیس سالہ خاصا صحت مند اور خوبرو شخص تھا اور شاید اسی لیے وہ اپنے گرد خوبروؤں ہی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اندر گھستے ہی ان سب کا جائزہ لے ڈالا تھا۔ خان نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہاں جی، فرمائیں ڈاکٹر صاحب! کس سلسلے میں یاد کیا ہے آپ نے ہمیں؟ مریض کیسا ہے ہمارا؟"

"اس وقت تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ پنڈلی میں گولی لگی تھی جو میں نے نکال دی ہے۔ یہ دیکھو ادھر ٹب میں پڑی ہے۔" ڈاکٹر نے آپریشن ٹیبل کے نیچے رکھے ہوئے پلاسٹک کے ٹب کی طرف اشارہ کیا، جس میں خون میں ڈوبی ہوئی روئی کے بہت سے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ "لیکن اس دوران اس کے ایک اور خطرناک قسم کے مرض کا علم ہوا ہے مجھے، اسی لیے بلایا تھا میں نے تمہیں۔"

"اوہ، اچھا! ایسا کون سا مرض دریافت کر لیا آپ نے بھئی؟ جس کا علم ہمیں آج تک نہیں ہوسکا۔ میرا تو خیال ہے، خود مریض کو بھی پتا نہیں ہوگا کہ یہ کسی انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہے۔" خان نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! یہ ایسا ہی مرض ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر آدمی کو گھن کی طرح کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کسی کو، اور جب معلوم ہوتا ہے اس کے بارے میں تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اور موت کے سوا کوئی نجات نہیں دلا سکتا پھر اس سے۔"

"لیکن اسے مرض کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں جناب! پتا تو چلنا چاہیے نا ہمیں بھی اس کے بارے میں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، اور بلایا کیوں ہے میں نے آپ کو۔ آپ سے بات کرنا بے حد ضروری تھا۔ آپ لوگوں کی اجازت اور تعاون کے بغیر میں کر بھی کیا سکتا ہوں اس معاملے میں۔ ویسے یہ خوش قسمت آدمی ہیں کہ کوئی خطرناک شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی مجھے پتا چل گیا ہے اس مرض کے بارے میں۔ یوں سمجھیے کہ ان کی زندگی ابھی بہت باقی ہے۔ کافی دن جینا ہے انہیں ابھی۔"

"ہاں عمر تو کسی گدھ کی اپنے نام کرا کے آیا ہے یہ۔ ہر بار موت اس کے قریب سے کترا کے نکل جاتی ہے۔ آپ بتائیں بات کیا ہے؟"

"اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کریں آپ۔ بہت

سنجیدہ اور فوری توجہ کا طالب مسئلہ ہے یہ۔ ان کا دایاں گردہ بالکل ناکارہ ہوچکا ہے۔ اگر اسے فوری طور پر نکالا نہیں گیا تو دوسرا گردہ بھی متاثر ہوجائے گا۔ دونوں گردے خراب ہوجانے کی صورت میں آدمی کا زندہ رہنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایک گردہ کم ہونے سے ان کی صحت پر ذرا بھی اثر نہیں پڑے گا۔" ڈاکٹر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے خان کی طرف دیکھا، وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا، بولا۔ "حیرت ہے پورا گردہ ناکارہ ہوگیا مگر انہیں خبر تک نہیں ہوئی، ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر آپ نے یہ کیسے جان لیا ڈاکٹر صاحب؟ ٹانگ سے گولی نکالنے کے دوران کیا آپ کو الہام ہوگیا تھا؟"

"فضول بکواس مت کرو۔ میں ڈاکٹر ہوں کوئی مجمع باز مداری نہیں ہوں۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد یہ شکایت کی تھی مجھ سے کہ اسے مثانے میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ ایسی تکلیف عموماً گردے کی خرابی سے ہی ہوتی ہے، چنانچہ میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ چیک اپ کیا ہے اس کا، جس کے نتیجے میں یہ انکشاف ہوا ہے۔ تم اپنے مریض سے معلوم کر سکتے ہو چیک اپ کے بارے میں۔"

"کیا مریض کو یہ بھی پتا ہے کہ تم نے اس کے مثانے میں تکلیف پیدا کرنے کے لیے کوئی ٹیکہ لگایا تھا اس کے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا؟" ڈاکٹر چونک کر بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا چند لمحے کے لیے، لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور خفگی سے بولا۔ "کیا بکواس کرتے ہو، کس نے بولا ہے یہ تم سے کہ میں نے ایسی کوئی ذلیل حرکت کی ہے اور مجھے فائدہ بھی کیا ہے اس کا؟"

"بک نہیں اوئے ذلیل کتے! تیرے جیسے کمینوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ آج سے پہلے بھی میرا واسطہ پڑ چکا ہے تجھ جیسے دولت کے پجاریوں سے۔ کب سے کر رہا ہے تو یہ کاروبار؟ کس نے سجھائی ہے تجھے یہ راہ؟" میں نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

"تم ہوش میں ہو یا نہیں؟ یہ مت بھولو کہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہو تم؟ زیادہ بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو پولیس کے حوالے کر دوں گا میں تم سب کو۔" اس نے مجھے دھمکی دی لیکن اپنے لہجے کا کھوکھلا پن چھپانے میں وہ ناکام رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک چھانپڑ رسید کر کے کہا۔ "دھمکی دیتا ہے سگ زادے! جانتا نہیں ہے مجھے تو ابھی، تجھ جیسوں کو زندہ جلا ڈالتا ہوں میں، مرگھٹ لے جائے بغیر ہی کریا کرم کر دیتا ہوں میں ایسے بے ضمیروں کا۔ بول کب سے کر رہا ہے تو یہ کاروبار؟ اور اب تک کتنوں کے گردے چھین کر ان کے دام کھرے کیے ہیں تو نے؟"

میں نے ایک اور جھانپڑ رسید کیا اس کے۔ اس بار وہ اُلٹ کر نیچے جا پڑا۔ دونوں پری چہرہ نازنینیں چیخیں مار کر ڈاکٹر کی طرف لپکیں اور جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان میں سے ایک نے ڈاکٹر کو سہارا دیتے ہوئے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ کیا جنگلی پن ہے یہ؟ شرم نہیں آتی آپ کو ایک معزز ڈاکٹر سے ایسا سلوک کرتے ہوئے؟"

"تیرے اس معزز ڈاکٹر کو شرم نہیں آتی، ایک اتنے شریفانہ پیشے کی آڑ میں انسانی اعضاء کا کاروبار کرتے ہوئے؟ ہٹ جاؤ تم دونوں اس کے پاس سے۔ اس کی حمایت جاری رکھی تم نے تو میں یہ لحاظ بالکل نہیں کروں گا کہ تمہارا تعلق صنفِ نازک سے ہے۔"

ڈاکٹر دونوں نرسوں کے سہارے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بدمعاشی تو ابھی دیکھ لیتا ہوں میں۔ اسلم! ذرا جا کر فون کر پولیس اسٹیشن کو۔ کہنا چند ڈاکو گھس آئے ہیں ہماری کوٹھی میں۔"

اس کا یہ حکم سنتے ہی وہ میل نرس ایک دم باہر کی طرف لپکا لیکن گل زمان نے جھپٹ کر اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ گل زمان نے پیچھے سے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا واپس لا کر ایک کونے کی طرف دھکا دے کر بولا۔ "تو ادھر بیٹھ چپ کر کے۔ اب اگر تیزی دکھانے کی کوشش کی تو ٹانگیں توڑ دوں گا دونوں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر کا گریبان پکڑ کے اسے اپنے قریب کیا اور دائیں بائیں دونوں طرف چٹاخ چٹاخ دو زوردار طمانچے لگا کر دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ "بک اوئے کتے...... کس نے ڈالا ہے تجھے اس دھندے میں۔ کون ہے تیرا سرپرست؟"

ڈاکٹر کو شاید کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا سابقہ کیسے لوگوں سے پڑ گیا تھا۔ یہ جان لیا تھا اس نے کہ دھونس دھاندلی ہم پر کوئی اثر نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی عاجزانہ انداز اختیار کر لیا۔ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ "یقین کرو، ایسی کوئی بات نہیں ہے، تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے، میرے بارے میں غلط تاثر دیا ہے تمہیں۔ تم خود سوچو، کسی آدمی کا گردہ خرید کے کوئی کیا کرے گا!

یہ کوئی بکنے والی چیز تو نہیں ہے، کوئی آدم خور شاید خرید لے مگر اسے میں تلاش کہاں کروں گا۔"

"اچھا، تو تیرا خیال ہے ہمیں کسی نے تیری طرف سے بدگمان کر دیا ہے اور ہم ایسے پاگل کے پتر ہیں کہ کسی کی باتوں میں آ کر بغیر سوچے سمجھے تجھ پر چڑھ دوڑتے ہیں، کیوں؟ ایسے ہی کھسکے ہوئے دماغ کے لگتے ہیں ہم تجھے ..... ؟"

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تو ... میں تو ..." وہ ہکلانے لگا۔

میں نے اس کی پنڈلی کی ہڈی پر اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھوکر مار کے کہا۔ "سچ سچ بک دے اوئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلا مت مجھے۔"

وہ ٹھوکر کھا کر بری طرح بلبلانے لگا۔ روہانسا ہو کر بولا۔ "آخر تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یقین میں کیسے کر لوں بچے! میں اگر ان مراحل سے گزر نہ چکا ہوتا تو شاید یقین کر لیتا تیری بات کا۔"

اُس نے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا، بولا۔ "تم ... تم ... کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس طرح کے مرحلے سے گزر چکے ہو تم؟"

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر پیٹ کا وہ حصہ اس کے سامنے کرتے ہوئے جہاں دھمن درنالیبہ کا دیا ہوا نشان تھا، کہا۔ "یہ دیکھ کیا ہے یہ؟ یہ نشان مجھے تجھ جیسے ہی ایک گردے فروش ڈاکٹر نے دیا ہے اور اس کی وجہ سے میں آج اشتہاری مجرم بنا پھر رہا ہوں۔ میں اکیلا ہی ان کے اس ستم کا نشانہ نہیں بنا ہوں۔ انھوں نے میری بہن کا ایک گردہ اسی طرح نکال لیا تھا اور اسے زندہ رکھنے کے لیے مجھے ان گردے فروشوں کے ایک ساتھی ڈاکٹر فرحان کے گردے اپنی بہن کو لگوانا پڑے تھے اور یہ تو نے اس شخص کی آنکھوں کو دیکھا ہے جس کا گردہ نکالنے کی بات کر رہا تھا تو۔ غور سے دیکھ اس کی آنکھوں پر کونٹیکٹ لینس چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی انہی ذلیلوں کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس کی آنکھوں کے قرنیے نکال کر بیچ کھائے تھے۔ جواباً میں نے ان کے اس ڈاکٹر کو جس نے اس کے قرنیے نکالے تھے، بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ دیکھا تو نے، کیا اب بھی تو انکاری ہے اپنے جرم سے؟ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہیں تیرے کرتوت مجھ پر ظاہر کرنے کے لیے؟"

ڈاکٹر اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دونوں نرسوں کے چہرے بجھ کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں جو پہلے ہی اس سوراخ سے ڈسا جا چکا ہوں۔ اب دوبارہ ان کا شکار نہیں بن سکوں گا۔ ان کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ گنگ ہو کر مجھے تکتے رہ گئے تھے۔

آبی نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے کہا۔ "اوئے اب سانپ کیوں سونگھ گیا ہے تمہیں؟ بولتے کیوں نہیں ہو تم؟"

خان نے ڈاکٹر کے قریب جا کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو جناب ڈاکٹر صاحب! کس کو سپلائی کرتے ہو تم یہ گردے؟"

"وہ ... وہ ڈاکٹر خرطومی ہے ایک اُدھر ہڈل الیسٹ میں۔ مگر یقین کرو میں نے آج تک ایسا کوئی کام کیا نہیں تھا۔ یہ پہلا کیس کرنے جا رہا تھا میں، لیکن خدا کا شکر ہے اس نے مجھے بال بال بچا لیا۔" وہ شرمندگی سے نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر خرطومی۔ ہاں، یہ نام میں نے سنا ہے پہلے بھی۔ شاید ڈاکٹر عذرا نے مجھے بتایا تھا کہ دھمن سے بھی وہی گردے منگوایا کرتا تھا۔"

"مجھے بھی یہی بتایا تھا ان لوگوں نے۔ وہ پہلے ڈاکٹر دھمن سے مال لیا کرتے تھے لیکن غلام جیلانی نامی ایک بدمعاش نے اُن کی زندگی اجیرن کر دی تو وہ یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ کر امریکا چلے گئے ہیں اور اب انہیں ڈاکٹر دھمن کے متبادل کی تلاش ہے۔"

"اور تم نے اس کا متبادل بننا منظور کر لیا۔ کیوں یہی بات ہے نا؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اس گھناؤنے کام کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، لیکن انھوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ پولیس کو میرے پیچھے لگا دیں گے۔ نہ جانے کیسے انھوں نے میری کچھ ایسی تصویریں تیار کر لی تھیں جن میں میں کسی نہ کسی بدنام جرائم پیشہ شخص کو طبی امداد دے رہا ہوں۔ انھوں نے یہ تصویریں ایک مکمل فیچر کے ساتھ ملک کے کسی بڑے اخبار میں شائع کرا کے مجھے ملک بھر میں رسوا کر دینے کی بھی دھمکی دی تھی۔ میں ایک باعزت شخص ہوں۔ ذلت اور رسوائی سے بچنے کے لیے میں نے ان کی بات مان لی، میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ سوچا میں نے یہ تھا کہ شریف اور بے ضرر لوگوں کے بجائے میں اُن لوگوں کے گردے حاصل کیا کروں گا جو قانون کی نگاہوں سے بچنے کے لیے میرے گھر علاج کرانے آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے گردے نکالتے ہوئے مجھے یہ دکھ نہیں ہوگا کہ میں نے کسی شریف آدمی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجرم تو یوں بھی سزا کے مستحق ہی ہوتے ہیں۔"

"تم جانتے ہو تم نے اپنے پہلے جرم کے لیے جس آدمی کا انتخاب کیا ہے وہ کون ہے؟" خان نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس بارے میں اتنا ہی کافی تھا میرے لیے کہ گولی کھا کر میرے گھر آیا ہے لہٰذا کوئی مجرم ہی ہو سکتا ہے۔"

"ذلیل آدمی! یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر دھمن کو اپنا کاروبار سمیٹ کر پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر آبی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ غلام جیلانی ہے؟"

"نہیں، یہ غلام جیلانی نہیں ہے جیلانی کا دوست اور دست راست اسلم آبی ہے یہ، غلام جیلانی یہ ہے۔" خان نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اوہ، تو تم غلام جیلانی ہو!" اس نے حیرت کی زیادتی سے وا آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے کہا۔

دونوں نرسیں بھی استعجاب کے عالم میں مجھے تکنے لگی تھیں۔

آبی بولا۔ "اب پتا چلا تجھے۔ میں نہیں کہتا تھا تجھ سے کہ ایسی باتیں نہ کر، میرے وارثوں کو پتا چلا کہ تو نے میرا گردہ ناکارہ قرار دے دیا ہے تو وہ تیرے دونوں گردے نکال دیں گے مگر تو نے میری کوئی بات نہیں مانی، بڑا مان تھا تجھے اپنی ڈاکٹری پر کہ تو جو بتا دے گا اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی! اور زیادہ شرمندہ نہ کرو مجھے۔ آئندہ میں ایسا خیال بھی دل میں نہیں آنے دوں گا کبھی۔"

"ہاں، یہی بہتر بھی ہوگا تمھارے لیے، لیکن وہ لوگ تمہیں دوبارہ مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت کیا کرو گے تم؟" آبی نے پوچھا۔

"اب میں کسی قیمت پر بھی ان کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔ چاہے وہ کچھ بھی کریں میرے ساتھ۔" ڈاکٹر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"جو لوگ خرطومی کی یہ پیش کش لے کر آئے تھے تمھارے پاس، تم انھیں جانتے ہو؟ وہ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتا نہیں، وہ رہتے کہاں ہیں۔ البتہ ایک ٹیلیفون نمبر دے گئے ہیں وہ تاکہ جب بھی کوئی گردہ فراہم ہو میں انھیں خبر کر دوں۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر اب تم انھیں فون کر کے اطلاع دو کہ ایک گردہ مل گیا ہے، آ کر لے جائیں وہ تم سے۔" میں نے کہا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیسے کہہ سکتا ہوں میں، اگر وہ لینے کے لیے آ بھی گئے تو میں کہاں سے دوں گا انھیں گردہ؟"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ بس ان کے کسی آدمی کو بلا لو یہاں، باقی معاملات ہم خود نمٹا لیں گے اُن سے۔"

"میں سمجھا نہیں، تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟ کیا تم ان سے گردے سپلائی کرنے کی بات کرو گے؟ مگر تم لاؤ گے کہاں سے گردے؟"

"تیری کھوپڑی میں بھی بھوسا بھرا ہوا لگتا ہے مجھے۔ میں نے کب کہا ہے کہ میں انھیں گردے سپلائی کر سکتا ہوں۔ یہ اندازہ تم نے کیسے لگا لیا ہے؟"

"پھر تم انھیں یہاں بلانے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟ یہ تو ظاہر ہے وہ آئیں گے تو وہ آتے ہی مجھ سے گردے طلب کریں گے۔"

"بھلے آدمی! میں ہمیشہ کے لیے اُن سے تیری جان چھڑا دینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ ان کا ایک آدمی بھی ہمارے ہاتھ آ گیا تو میں ان کی جڑیں تک اکھاڑ پھینکوں گا یہاں سے۔ پھر وہ تمھیں بلیک میل کرنے کبھی نہیں آ سکیں گے تمھارے پاس۔ آئی کچھ سمجھ؟"

"اوہ کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر یہ کر سکو تو زندگی بھر میں تمھارا یہ احسان نہیں بھولوں گا دوست! بے دام کا غلام بن جاؤں گا میں تمھارا۔"

"خیر یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اب تم جاؤ ... ان میں سے کسی کو یہاں بلانے کی کوشش کرو۔ ہم بھی دیکھیں اس کارِ خیر میں آخر کیسے کیسے لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ ہوں گے وہ بہت ہی پہنچے ہوئے لوگ۔ اتنا تو یقین ہے مجھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر فوراً پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ ٹھہرو یہیں، میں فون کر کے بس ابھی آتا ہوں۔ پانچ منٹ میں۔"

آبی نے اسے پکار کر کہا۔ "مگر ایک بات کا خیال رکھنا، اگر کوئی چالاکی دکھائی تم نے ہمیں تو ہم اس پوری کوٹھی کو کھنڈر بنا دیں گے۔ ہم سے دغا کر کے کوئی بچ نہیں سکا ہے آج تک۔ اتنی بات اور گوش گزار کر دے رہا ہوں تمھارے۔"

ڈاکٹر جاتے جاتے واپس پلٹ آیا۔ بولا۔ "تم میرے ساتھ چلو جیلانی! نمبر میری ڈائری میں موجود ہے، خود ہی ملا کر بات

کر لینا۔"

"ہاں بھائی، چلا جا تُو بھی اس کے ساتھ۔ بزرگوں نے کہا ہے جو آدمی ایک بار بے اعتبار ہو جائے، اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔" آپی نے فوراً کہا۔ "اور یہ بندہ ایک بار ہمیں غوطہ دینے کی کوشش کر چکا ہے لہٰذا تُو ضرور جا اس کے ساتھ۔"

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپی کی بات مان ہی لینا چاہیے، مگر جانے سے پہلے ان مستورات سے یہ تو کہہ دو کہ اب وہ آپی کو آپریشن ٹیبل سے ہٹا کر کسی مناسب جگہ لٹا دیں۔ یہاں اب اس کی ضرورت تو نہیں رہی شاید۔"

خان جلدی سے بولا۔ "ان کی آپ فکر نہ کریں۔ انھیں میں بیڈ پہ پہنچوا دیتا ہوں ابھی، آپ گل زمان کو بھی ساتھ لے لیں اپنے۔"

"نہیں یار! اب ایسا بھی نہ سمجھو اس بے چارے کو، میری موجودگی میں اس کا دل کبھی بے ایمان نہیں ہوگا۔ چلو بھئی ڈاکٹر!"

ڈاکٹر مجھے ساتھ لے کر اپنی رہائش گاہ کے ایک خوبصورت، آراستہ بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے ڈبل بیڈ کے سرہانے ایک دراز سے ڈائری نکال کر کھولی اور رُکے والے صفحے پر ایک ٹیلیفون نمبر پہ انگلی رکھ کر بولا۔ "یہ نمبر ہے ان کا اور وہ سامنے اسٹینڈ پہ ٹیلیفون سیٹ رکھا ہے۔ اُٹھ کر نمبر ڈائل کر لو۔ سلسلہ ملنے کے بعد کہنا کے ایچ ٹو سے بات کرا دیں۔"

میں نے جُھک کر ٹیلیفون نمبر دیکھا۔ اس کے سامنے کے ایچ ٹو ڈاکٹر خرطومی لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم خود ہی نمبر ملا کر بات کر لو یار! مجھے یقین ہے تم کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے۔ میں آدمی کے لہجے سے اس کی صداقت کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ تمھارے لہجے میں کھوٹ نہیں تھا کوئی۔"

"پھر بھی تمھیں احتیاط ضرور کرنا چاہیے، آپی نے ٹھیک کہا تھا جو ایک بار بے اعتبار ہو جائے اس کی طرف سے ہوشیار ہی رہنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے یار! میں اس کے کہنے سے ساتھ آگیا ہوں تمھارے، لیکن اس کی بات کا تمھیں بُرا نہیں ماننا چاہیے، وہ آدمی ذرا بے باک اور منہ پھٹ ضرور ہے، مگر دل کا بُرا نہیں ہے... یاروں کے لیے جان بھی دینے کو تیار رہتا ہے ہر دم۔"

"نہیں بھئی! میں نے بُرا بالکل نہیں منایا ہے اس کی بات کا۔ وہ ایک حاضر دماغ اور چوکنا رہنے والا آدمی ہے۔ جس راہ پر تم لوگ چل رہے ہو، وہاں آدمی کو ایسا ہونا ہی چاہیے۔ خیر، چلو میں فون کرتا ہوں، تم ریسیور سے کان لگا کر ہماری باتیں سُنتے رہنا۔"

"اچھی بات ہے بھائی! تم کہتے ہو تو ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ بہرحال بات تم ہی کرنا اس سے۔" میں نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری ہی گھنٹی پہ دوسری طرف سے ریسیور اُٹھا لیا گیا۔ ریسیور اُٹھانے والی آواز میں بڑی شیرینی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ "کے ایچ ٹو سے بات کرا دو۔ میں ڈاکٹر بجے۔ اے قاضی بول رہا ہوں۔ ضروری بات کرنا ہے۔"

"ایک منٹ ہولڈ کیجیے ڈاکٹر! میں دیکھتی ہوں وہ ہیں بھی اس وقت یا نہیں؟" شہد میں ڈوبی ہوئی آواز نے کہا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقفے کے بعد ریسیور میں ایک مردانہ آواز اُبھری۔ "ہیلو ڈاکٹر! میں کے ایچ ٹو بول رہا ہوں، کہو کیا بات ہے؟"

"میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے اس وقت کہ ایک بکرا مل گیا ہے آ کر لے جاؤ اسے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں پندرہ منٹ میں، رکھا کہاں ہے اسے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"گھر میں رکھا ہے ابھی تو، وہیں آجاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "لو بھئی! وہ خود ہی آرہا ہے۔ کہاں استقبال کرو گے اس کا؟ یہیں یا آپریشن تھیٹر میں؟"

"یہاں گھر میں دوسرے افراد بھی ہوں گے۔ میرا مطلب ہے تمھارے بیوی بچّے اور ملازمین وغیرہ؟" میں نے کہا۔

"ہاں، وہ لوگ آس پاس ہی ہوں گے کہیں۔ اس کے علاوہ یہ ساتھ والے کمرے میں میری والدہ ہوتی ہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"پھر تو اُدھر آپریشن تھیٹر میں ہی چلو۔ اگر بات بگڑی، اور کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی تو سب لوگ دوڑ پڑیں گے اس طرف۔ میں چاہتا ہوں، گھر کے دوسرے افراد کو اس معاملے کی خبر نہ ہو اور میرا خیال ہے تم بھی یہ بات پسند نہ کرو گے۔"

"صحیح تو یہی ہے جو تم نے کہا ہے لیکن اگر مجبوری ہی آن پڑے کوئی تو میں اسے بھی گوارا کر لوں گا۔ گھر والوں کو اعتماد میں لینا مشکل کام نہیں ہے۔"

"کوئی ایسا موقع آ ہی گیا تو دیکھا جائے گا بعد میں۔ چلو ابھی تو چلے چلتے ہیں ہم یہاں سے۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو، اسلم کو یہاں بھیج دُوں گا میں۔ وہ آنے والوں کو ساتھ لے کر اُدھر ہی آجائے گا۔" ڈاکٹر نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں واپس چل دیے۔ لان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے ایک خیال نے آگھیرا۔ میں نے وہیں رُک کر ڈاکٹر کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "رُکو ڈاکٹر! بات سنو میری! تم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے نہ جانے کس طرح تمھاری کچھ تصویریں بنالی ہیں۔"

"ہاں، یہی بتایا تھا میں نے، لیکن اس وقت تمھیں اس کا خیال کیسے آگیا۔؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ تصویریں تمھارے اسی آپریشن تھیٹر میں بنائی گئی تھیں؟" میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

"ہاں، وہ یہیں بنائی گئی تھیں۔ حیرت تو اسی بات پر ہے مجھے۔ ان کا آدمی یہاں پہنچا کس طرح؟ یہ نہیں جان سکا ہوں میں۔"

"یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام نہیں ہو سکتا کیا؟ اس پر بھی غور کیا تم نے کبھی؟"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو، مگر یہاں سب ہی میرے انتہائی اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں شک کسی پر نہیں کر سکتا۔"

"سب کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کوٹھی کے تمام افراد کو تو یہ پتا نہیں ہوگا کہ یہاں تم کیا کرتے ہو؟"

"ہاں، تمھارا اندازہ درست ہے۔ اسلم اور دو نرسوں کے علاوہ ایک دربان اور ہے جسے علم ہے اس بات کا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"شاید میرا اندازہ ٹھیک ہی ہے۔ تم ایسا کرو اسلم کو اِدھر بھیجنے کے بجائے دربان کو ہدایت کر دو کہ وہ آنے والوں کو آپریشن تھیٹر والے حصّے میں پہنچا دے، یا تم خود اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرو ان کا۔ پھر اپنے ساتھ ہی اِدھر لے آنا۔"

"مگر کیوں۔؟ اسلم کو اِدھر بھیجنے میں کیا ہرج ہے آخر؟ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟" ڈاکٹر متعجب ہو کے بولا۔ "کیا تمھیں شبہ ہے کہ اسلم ان سے ملا ہُوا ہے، مگر وہ بہت پرانا اور بے حد وفادار ملازم ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے یار! اگر وہ گھر کا بھیدی جس کی مدد سے ان لوگوں نے تمھاری تصویریں حاصل کی ہیں، اسلم ہے تو اسے ہمارے پروگرام کا بھی علم ہو چکا ہے، ہم نے ساری باتیں اس کے سامنے ہی کی ہیں۔ میں نے اس پر صرف شبہے کا اظہار کیا ہے کیونکہ پیسہ بہت بری شے ہے ڈاکٹر! اسے دیکھ کر ایمان سلامت رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، تم تو صرف اعتماد کی بات کر رہے ہو۔ اب اگر اسے بھیجا گیا تو وہ ہم تک پہنچانے سے پہلے ہی انھیں ہمارے ارادوں سے باخبر کر دے گا۔ نہیں بھئی، اس کو اس کام کے لیے بھیجنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔"

"اوہ۔" وہ چونک کر بولا۔ "کمال ہے بھئی، اتنے سامنے کی بات کی طرف میرا دھیان بھی نہیں جا سکا تھا اب تک۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر ڈاکٹر خرطومی کے آدمی میرے خلاف کچھ ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو اس کام میں ان چاروں میں سے کسی ایک کا تعاون ضرور حاصل رہا ہے انھیں۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا ان کے لیے۔ اب مجھے ان چاروں کو چیک کرنا پڑے گا۔"

"یہ چیکنگ ویکنگ تم بعد میں کرتے رہنا۔ ابھی تو ہمیں اس موجودہ مسئلے سے نمٹنا ہے۔ جاؤ، تم جا کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھو۔"

"نہیں، اسے وہاں لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا، میں دربان سے کہے دیتا ہوں وہ اسے اِدھر ہی بھیج دے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو، کر لو۔ بس اس کا خیال رکھنا، انھیں ہمارے سامنے آنے تک شبہ نہ ہو کسی بھی طرح کا؟"

"مطمئن رہو۔ میں دربان کو اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تم اُدھر اُن تینوں کا خیال رکھنا اور ان میں سے کسی کو بھی باہر نہ آنے دینا۔"

وہ واپس پلٹ گیا۔ میں دوبارہ اس کوارٹر میں جا گھسا۔ میری واپسی بہت بروقت ہوئی تھی۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ دونوں چڑیاں اُڑ چکی ہوتیں۔ دروازے سے اندر قدم دھرتے ہی وہ مجھے صحن عبور کر کے اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک ثانیے کے لیے ٹھٹکیں، پھر ان میں سے ایک اپنی پُر فریب مسکان کا جال پھینکتی آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "آپ کے مریض کو ہم نے بیڈ پر آرام سے لٹا دیا ہے۔ نگہداشت اس کی اسلم کے ذمّے ہے۔ لہٰذا اب یہاں کوئی کام تو رہا نہیں ہے، اس لیے اب ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"نہیں جی، اس طرح نہیں سوچا کرتے۔ کام تو انسان کے لیے ہر جگہ، ہر گھڑی موجود رہتا ہے۔ یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے کہ اب کام نہیں رہا ہے کوئی یہاں آپ کے لیے؟"

دوسری شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے توبہ شکن انداز میں مسکرا کر بولی۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، کام تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا، لیکن ہمارے جانے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اب ہم تھک گئے ہیں.. کام کر کر کے اور کچھ دیر آرام کر کے تازہ دم ہونا چاہتے ہیں۔"

"نا جی! یہ بات تو میں آپ کی مان ہی نہیں سکتا کبھی۔ تر و تازہ تو آپ دونوں پہلے ہی اچھی خاصی ہیں، اور آرام کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ اِدھر میرے یار آپی کے آس پاس کچھ اور بیڈ بھی ضرور پڑے ہوں گے۔ وہاں آرام کریں آپ دونوں۔ دیکھیں یہ بات ہمارے اور آپ دونوں ہی کے فائدے میں جاتی ہے۔"

"آپ ہمیں غلط سمجھے ہیں جناب! فضول باتیں نہ کریں ہم سے، ہٹیں، جانے دیں ہمیں۔" پہلی نے تڑخ کر کہا۔

"بُرا نہ مانیں جی، میں نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے آپ سے۔ آپ اسے غلط سمجھ لیں تو بات دوسری ہے۔"

"اچھا جی، ہم نے سمجھنے میں غلطی کی ہے تو پھر آپ ہی بتائیں ذرا، یہ دونوں کے فائدے سے مطلب کیا تھا آپ کا؟"

"بہت آسان سا مطلب تھا اگر آپ سمجھنے کی کوشش کریں تو۔ دیکھیں نا میرے یار آبی کے پاؤں میں گولی کا جو زخم ہے وہ تو دیکھا ہی ہے نا آپ دونوں نے، آپ خود سوچیں اس زخم میں تکلیف کتنی ہوتی ہو گی۔ آپ دونوں اگر اس کے سامنے رہیں گی تو اس تکلیف کو بھول کر آپ کو دیکھتا رہے گا وہ، حسین چہرے اس کی کمزوری ہیں۔ آپ کی موجودگی میں اسے بڑا آرام ملے گا اور آپ دونوں بھی وہاں آرام کرتی رہیں گی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے اتنی حسین نرسوں کا انتخاب اسی لیے تو کیا ہے نا کہ ان کے سامنے مریضوں کو دکھ درد کا احساس نہ رہے۔ یہ تو فرض بھی ہے آپ کا۔ پھر اس میں غلط بات کہاں نظر آگئی آپ کو؟"

دوسری والی نے میری بات سُن کر اپنے حلق میں جل ترنگ بجانا شروع کر دیے۔ پہلی والی اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تجھے کیا ہُوا ہے شیریں؟ کیوں اس طرح قہقہے لگائے جا رہی ہے، دماغ تو نہیں چل گیا ہے تیرا؟"

شیریں نے اپنے بے ساختہ قسم کے نقرئی قہقہوں پر قابو پا کر کہا۔ "تیری ایک نہیں چل سکے گی ان کے سامنے عشرت بیگم! ان کی تو زبان بھی اتنی ہی تیز چلتی ہے جتنے ہاتھ چلتے دیکھے تھے ہم نے، آل راؤنڈر آدمی ہیں یہ، یوں ہی تو اتنی شہرت نہیں مل گئی ہے انھیں۔"

اسی وقت ڈاکٹر بھی وہاں آگیا اور ہمیں اس طرح کھڑے دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے بھئی؟ یہاں کیوں کھڑے ہو تم لوگ؟"

عشرت جلدی سے بولی۔ "ہم اپنا کام ختم کر کے گھر جانا چاہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! مگر یہ صاحب راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہیں ہمارا۔ جانے ہی نہیں دے رہے ہیں ہمیں۔ کہتے ہیں ادھر مریضوں کے بیڈ روم پر جا کر آرام کرلو جا کر۔"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے دونوں لڑکیوں کی نظر بچا کر اسے آنکھ سے اشارہ کرنے کے بعد کہا۔ "میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا ہے نا ڈاکٹر! شاید ان کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہیں۔ یہ یہاں رہیں گی تو فوراً دستیاب تو ہو جائیں گی نا ہمیں۔"

ڈاکٹر میری بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔ "ہاں، کہتے تو ٹھیک ہی ہیں یہ۔ کیا حرج ہے تھوڑی دیر اور رُک جاؤ تم دونوں۔"

ان دونوں نے خالی خالی اور ویران نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کی جگ مگ کرتی روشن آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے سارے ستارے غروب ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں بجھ کر رہ گئی تھیں ڈاکٹر کو میری تائید کرتے دیکھ کر۔ پھر انھوں نے نظریں جھکائیں، اور پلٹ کر بوجھل بوجھل قدموں سے اندر کی طرف چل دیں۔

ڈاکٹر نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "انھیں اس کی توقع نہیں تھی کہ میں تمھارے کہنے سے انھیں روک دوں گا۔ دونوں بہت بد دل ہو گئی ہیں اس وقت، لیکن میں سمجھتا ہوں انھیں روک لینا ہی بہتر تھا۔"

"ہاں، ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے اس گھڑی ڈاکٹر! لیکن تمھیں اگر ان کے چہروں پر پژمردگی دیکھ کر دُکھ ہو رہا ہے تو پھر جانے کی اجازت دے دو انھیں۔ پھر جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ ان کی اُداسی تو دُور ہو ہی جائے گی نا کم از کم۔"

اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "مذاق اُڑا رہے ہو میرا حالانکہ حسین صورت تو ازل سے کمزوری ہے مرد کی۔"

"ہاں بھائی! یہ کمزوری ہوتی ہی اتنی کمزور ہے کہ ذرا سی بات پر شکستہ دل ہو جاتی ہے۔ ہزاروں بار دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے اس کا، مگر کام پھر بھی وہ پوری طرح کرتا رہتا ہے۔ حرکت کرنا کبھی نہیں بھولتا ہے وہ۔"

"معلوم ہوتا ہے تم میں جمالیاتی حس بالکل نہیں ہے جبھی حسینوں کے بارے میں اتنی بے دردی سے سوچتے ہو تم۔"

"حسین تو میرے اندر عام آدمیوں سے کچھ زیادہ ہی ملیں گی تمھیں، لیکن یہ پری چہرہ لوگ راس نہیں آتے ہیں کبھی مجھے۔ جب بھی کسی کی طرف توجہ کرتا ہوں کسی نہ کسی مشکل میں پھنس کر رہ جاتا ہوں، کہیں سے کہیں جا نکلتا ہوں، پھر دوبارہ اُدھر جانا نصیب ہی نہیں ہوتا۔"

اس بار ڈاکٹر مجھے جس کمرے میں لے کر گیا وہ کوئی دوسرا ہی کمرہ تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور ایک صوفہ سیٹ سلیقے سے لگا ہُوا تھا۔ یہاں شاید ڈاکٹر مخصوص لوگوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس کمرے سے ملحق ایک کمرہ اور تھا۔ جسے ایک دروازہ اس کمرے سے ملاتا تھا۔ اس کمرے میں مریضوں کو علاج کے لیے رکھا جاتا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازہ کھُلا ہونے کی وجہ سے بس ایک طرف پڑے ہوئے مریضوں کے بیڈ مجھے دکھائی دے رہے تھے اور اُدھر ہی سے آبی کے چہکنے کی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر ایک صوفے پر بیٹھ گیا مگر میں سیدھا اس کمرے کی طرف بڑھا چلا گیا۔

آبی ایک بیڈ روم پر لیٹا ہُوا خوشگوار موڈ میں شیریں اور عشرت کی طرف دیکھ دیکھ کر گل زمان اور خان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چلّایا۔ "اوئے آ بھئی غلام جیلانی میرے یار! خدا تجھے خوش رکھے اور ہر کسی کو تیرے جیسا یارِ جانی عطا کرے، تُو کتنا خیال رکھتا ہے بھئی میرا۔ بڑے احسانات ہیں یار میرے اُوپر تیرے۔"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "بک نہیں اور ربائی ہوئے۔ ایسی والی خواتین کے سامنے تیری زبان کے سارے بریک فیل ہو جاتے ہیں ایک دم۔ حالانکہ تجھے ان کی ذاتِ بابرکات سے فیض حاصل نہیں ہوتا کبھی بھی۔"

"اوئے چُپ ہو جا سالے مولوی چراغ دین! میں جانتا ہوں تُو جلنے لگا ہے مجھ سے اب، مگر اس میں میرا کیا قصور ہے بھئی۔ اب تک خدا نے تیرے لیے اس دُنیا میں کوئی حور شمائل بھیجی ہی نہیں تو میں کیا کروں؟ تجھے تو خوش ہونا چاہیے یار کہ اس مالک نے اس فانی دنیا میں تیرا حصّہ بھیجنے کے بجائے اسے اُدھر ہی کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ حوریں ملیں گی تجھے بیٹا وہاں ان کے بدلے میں اور ہم جیسے دُور بیٹھے تیری قسمت پر رشک کیا کریں گے۔ کیوں بھئی خان! غلط تو نہیں کہا ہے نا میں نے؟"

"بہت دلچسپ اور زندہ دل آدمی ہیں جیلانی صاحب! آپ کے دوست۔ اس حالت میں بھی ان کی طبیعت کی شگفتگی میں کمی نہیں آئی ہے۔ بڑا حوصلہ بخشا ہے خدا نے انھیں۔" خان میری طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

"ارے بڑا ذلیل آدمی ہے یہ، تم جانتے نہیں ہو اسے۔ صنفِ نازک کو دیکھ کر اس کی طبیعت یوں لہرانے لگتی ہے جیسے بین کی دُھن پر سانپ لہراتا ہے۔ ایک ہزار سال کا شیش ناگ ہے یہ، جو اب انسان کے رُوپ میں آگیا ہے۔"

آبی جواب میں کچھ کہنے والا تھا مگر پیچھے سے ڈاکٹر نے مجھے آواز دے کر کہا۔ "ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو جیلانی! میرا دل بُری طرح ہول رہا ہے۔ وہ لوگ کسی بھی لمحے پہنچنے والے ہوں گے۔"

"اچھا اچھا یار! آ رہا ہوں میں۔" میں نے اسے جواب دے کر کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

ایک کونے میں ایک بیڈ پر شیریں اور عشرت بیٹھی ہمیں گھور رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دُوسرے بیڈ پر اسلم بیٹھا تھا۔ میں نے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر خان سے کہا۔ "خان! تم اور گل زمان ادھر میرے ساتھ آؤ۔ ریوالور وغیرہ تو ہیں نا تمھارے پاس؟"

وہ دونوں اُٹھتے ہوئے بولے۔ "ہاں، پستول ہم نے رکھے ہوئے ہیں اپنے پاس۔"

میں نے آبی کے اُوپر جھک کر اپنا ریوالور جیب سے نکال کر اس طرح اس کے تکیے کے نیچے سرکا دیا کہ شیریں، عشرت یا اسلم میں سے کوئی اندازہ نہ لگا سکے کہ میں نے کیا کیا ہے۔ پھر آبی سے کہا۔ "ان تینوں پر نظر رکھنا۔ ان میں سے کوئی بھی اس کمرے سے باہر جانے کی کوشش کرے تو ریوالور نکال کر اسے کوَر کر لینا۔ جانے نہ دینا باہر۔ نہ مانے تو بے شک گولی مار دینا اسے۔"

میں خان اور گل زمان کو لے کر اس کمرے سے نکل کر ڈاکٹر کے پاس آگیا۔ ادھر آ کر میں نے گل زمان سے آبی والے کمرے کا دروازہ بند کروا دیا۔ پھر اسے اور خان کو اس دروازے کے دائیں بائیں کھڑا کر دیا جدھر سے مہمانوں کے آنے کی توقع تھی۔ ڈاکٹر کو میں نے رائٹنگ ٹیبل کے پیچھے کرسی پر بٹھا دیا اور اسے کہا کہ وہ ٹیبل لیمپ جلا کر اس طرح رکھ لے کہ اس کی روشنی صرف میز پر پڑے اور اس روشنی میں کوئی فائل وغیرہ کھول کر اس کا مطالعہ کرنے کی پوزیشن اختیار کر لے۔ ڈاکٹر نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں کمرے کی تمام لائٹیں بجھا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ اب کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی محدود روشنی میں خان اور گل زمان کا دیکھ لیا جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا اور مجھے بھی پوری توجہ دیے بغیر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس سارے انتظام کے بعد ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کمرے کے بیرونی دروازے پر قدموں کی بھاری آواز اُبھری اور چند لمحے بعد ہی دو سائے کمرے میں رینگ آئے۔ ان میں سے ایک ذرا لمبا اور دوسرا درمیانے قد کا تھا۔ اندر پاؤں دھرتے ہی ان میں سے ایک نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "ہیلو ڈاکٹر! اندھیرا کر کے انتظار کر رہے ہو ہمارا۔ کیا روشنی میں لین دین کرتے ہوئے شرماتے ہو؟ حالانکہ تم جیسے آدمی کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"آہستہ بولو۔ اندھیرا میں نے اس لیے کر دیا ہے کہ برابر والے کمرے میں مریض اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ انھیں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ بے حد خوفناک لوگ ہیں وہ، اگر شبہ بھی ہو گیا انھیں کسی گڑبڑ کا تو مصیبت کھڑی کر دیں گے وہ ہمارے لیے۔"

"اوہ، مگر ایسے خطرناک لوگوں پر ہاتھ ہی کیوں ڈالا ہے تم نے۔ تمھیں خیال رکھنا چاہیے تھا اس بات کا۔"

میں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر سُوئچ بورڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔"

میری آواز سُن کر وہ دونوں بجلی کی سی تیزی سے میری طرف گھومے۔ "یہ کون ہے ڈاکٹر؟" اسی شخص نے پوچھا جو ڈاکٹر سے مخاطب تھا۔

میں نے سوئچ بورڈ کے پاس پہنچ کر کمرے کی تمام لائٹیں روشن کر کے کہا۔ "لو، دیکھ لو مجھے اچھی طرح سے اور اگر پہچان سکتے ہو تو پہچان بھی لو کہ میں کون ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں دونوں کے قریب چلا گیا۔

وہ دونوں مقامی ہی تھے۔ اپنے چہرے مہرے اور لباس سے وہ اچھے خاصے مہذّب اور پڑھے لکھے لگتے تھے۔ انھیں دیکھ کر کوئی یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کے سینوں میں اتنے سیاہ

دل رکھے ہوں گے۔ دراز قد شخص نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون ہو تم؟ اور یہ بات کس لہجے میں کر رہے ہو تم ہم سے ... انسانوں کی طرح بات کرنا نہیں سیکھا ہے کیا تم نے؟"

"انسانوں کی طرح بات میں صرف انسانوں سے ہی کرتا ہوں، وحشی درندوں سے بات اسی طرح کی جاتی ہے۔" میں بولا۔

"کیا بکتے ہو، ہم بہت مہذب، شریف لوگ ہیں۔" پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑ کر بولا "یہ کیا چکر ہے ڈاکٹر؟ کون ہے یہ شخص؟"

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر لگاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر سے کیا پوچھتا ہے خنزیر کے بچے! ادھر مجھ سے بات کر، میں کراؤں گا تجھ سے تعارف اپنا۔"

وہ مار کھا کے چند قدم لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے چلا گیا۔ اس کے پستہ قد ساتھی نے اس کا حشر دیکھ کر تیزی سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ لے جانا چاہا مگر میں نے اسے مہلت نہیں دی اس کی، اور چیتے جیسی پھرتی سے پلٹ کر اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ ایک دم پیچھے اُلٹ گیا۔ اس اثنا میں دراز قد شخص نے سنبھل کر ریوالور نکال لیا اور اسے مجھ پر سیدھا کر کے دہاڑا۔ "بس، خبردار! اب حرکت نہ کرنا اپنی جگہ سے، نہیں تو لاش گرا دوں گا میں تیری۔" اب اس کے لہجے سے درندگی پوری طرح عیاں تھی۔

اس کے ریوالور پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اپنے ساتھ ایک چُپ شاہ لیے پھرتا تھا لیکن یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ اسے اس کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا۔ یوں بھی میرے سامنے اس کا وجود ایک قدرے بھاری پتھر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اسے پھینک کر مجھے مارنے کی کوشش کرنے کے سوا کسی اور خطرناک طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا تھا مگر خان نے اسے اس کا بھی موقع نہیں دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک چُپ شاہ دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے ریوالور مجھ پر تان کر مجھے دھمکایا، خان کے ریوالور سے ہلکی سی ٹھک کی آواز کے ساتھ ایک شعلہ لپکا اور دراز قد شخص کے ہاتھ سے اس کا ریوالور نکلے ... کر دُور جا گرا۔ اس کے ساتھ وہ شوخ لہجے میں بولا۔

"یہ ایکانی نہیں چلے گی مسٹر! اسلحے کے استعمال کی نہیں ہو رہی ہے۔"

اس کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ گولی دراز قد کے ریوالور پر ہی لگی، اس کے ہاتھ کو بالکل چھوا تک نہیں تھا اس نے۔ میں نے اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "قربان جایئے، بھئی تیری اس نشانے بازی کے۔ کمال کا نشانہ ہے یار تیرا تو۔"

دراز قد شخص طیش میں آکر تیزی سے خان کی طرف پلٹا مگر اس طرف خان اور گل زمان کو ریوالور تانے دیکھ کر اس کا سارا جوش ہوا ہو گیا۔ اس کا ساتھی میری لات کھا کر نیچے گرا تھا اور میں اس ریوالور بازی کے چکر میں اس کی طرف سے چند سیکنڈ کے لیے غافل ہو گیا، موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ لومڑی کی سی عیاری سے کام لے، نہ جانے کس طرح میرے پیچھے پہنچ گیا۔ مجھے اس وقت پتا چلا جب اُس نے پیچھے سے مجھے للکارا "خبردار، حرکت نہ کرنا، تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ اپنے ہاتھ اُوپر اٹھا لو جلدی سے۔"

میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ریوالور مجھ پر تانے کھڑا خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ دوبارہ گرجا "سُنا نہیں تم نے۔ ہاتھ اُٹھاؤ اُوپر، ورنہ گولی مارنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کروں گا میں۔"

میں آہستہ آہستہ اس کی طرف گھوم گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقارت سے کہا "تو بھی اپنی حسرت نکال لے بچے، لیکن ایک بات سُن لے میری، آج کے بعد تم لوگوں کو یہ ذلیل کام کرنے کا دوبارہ موقع نہیں مل سکے گا۔ ایسے شیطان صفت لوگوں کو زندہ چھوڑ دینا میں بالکل پسند نہیں کروں گا۔"

اس نے میری بات پر دھیان دیے بغیر خان اور گل زمان سے کہا "تم دونوں اپنے اپنے ریوالور پھینک کر ہاتھ اُٹھا لو اُوپر، ورنہ تمھارا یہ ساتھی میری گولی کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکے گا۔"

میں نے گردن پیچھے موڑ کر خان سے کہا "تم لوگ اس بندر بھبکی میں آئے بغیر اپنا کام کرو، اس کی فکر نہ کرو تم، ایسے بدذات اور ننگِ انسانیت آدمی کے ہاتھوں میری زندگی برباد نہیں ہو سکے گی کبھی۔ تم دونوں اس کے ساتھی کو باندھ لو آگے آ کے!"

پستہ قد شخص نے طیش میں آکر میرا نشانہ لیتے ہوئے کہا "اوہ، تو تیرا خیال ہے میں صرف دھمکی دے رہا ہوں تجھے، گولی چلا نہیں سکوں گا میں۔ ٹھیک ہے، تُو نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

اس نے ریوالور کے ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، لیکن گولی چلنے کے بجائے اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے سبب دُہری ہوتی چلی گئیں۔ ٹرائیگر اپنی جگہ سے جنبش تک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا پورا زور صرف کر دیا تھا مگر اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس نے گھبرا کر ریوالور کو دیکھا۔ میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا "کیا بات ہے بھئی؟ گھر سے نکلتے وقت چیک بھی کر لیا تھا اسے یا نہیں؟ میرا تو خیال ہے زنگ آلود ہو چکا ہے یہ۔ اگر موقع ملے تو گھر واپس جا کر مٹی کے تیل سے صفائی کر لینا اس کی۔"

میری بات نے اس کی کھوپڑی میں انگارے بھر دیے تھے شاید۔ اس نے جھنجلا کر ریوالور پوری قوّت سے مجھ پر کھینچ مارا لیکن میں اس کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ میں جانتا تھا کہ بالآخر وہ جھنجلا کر یہی حربہ استعمال کرے گا۔ چنانچہ اسکا ہاتھ حرکت میں آتے ہی میں ایک طرف ہو گیا اور وہ ریوالور اُڑتے ہوئے میرے منہ کے سامنے سے گزر کر میرے پیچھے کھڑے ہوتے اس کے ساتھی کی پشت سے جا ٹکرایا۔ اس نے پلٹ کر غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "یہ میرا داؤ چل گیا تو ہڈیاں بھی سلامت نہیں چھوڑوں گا تیری۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھ پر کیوں غصّے ہو رہے ہو بڑے بھائی! میں نے تو نہیں مارا ہے تمہیں۔ یہ تمہارے ساتھی نے ہی ریوالور پھینکا ہے تمہاری طرف، وہی لگا ہے جا کر تمہیں۔"

میں اس کی طرف متوجّہ ہو کر بھی دوسرے کی طرف سے غافل نہیں ہُوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کی طرف سے تھوڑا سا رُخ پھیرا تھا تا کہ وہ مجھے اپنی جانب سے غافل پا کر، مجھ سے دست بدست آ بھڑنے کی کوشش کرے۔ کن انکھیوں سے میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ توقع کے مطابق اس نے مجھے دوسری طرف متوجہ پا کر چیتے کی طرح مجھ پر جست لگائی۔ میں اسے فضا میں بلند ہوتے دیکھ کر پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس سے ایک بار پھر اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ اُڑتا ہوا اپنے ہی ساتھی پر جا پڑا تھا اور وہ دونوں باہم ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے زمین پر جا گرے تھے۔ ان کے گرتے ہی خان اور گل زمان ایک کر ان کے سروں پر جا پہنچے۔ انھوں نے اپنے اپنے ریوالور ان کی طرف کر کے کہا "خبردار! اب اُٹھنے کی کوشش نہیں کرنا۔"

وہ دونوں جہاں گرے تھے، وہیں ساکت ہو کر پڑے رہے۔ میں نے انھیں مخاطب کیا "کیوں بھئی، تمھارے دل کی حسرتیں نکل گئیں یا ابھی کچھ باقی ہیں؟"

دراز قد نے سر اٹھا کر مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "یہ ریوالور الگ رکھ دو، پھر بتاؤں گا میں تمھیں کہ میرے دل کی حسرتیں کس طرح نکلتی ہیں۔ ریوالور کی زد میں لے کر تو زنانے بھی چوڑے ہونے لگتے ہیں۔"

"حالانکہ ریوالور کا استعمال پہلے تم نے ہی کیا تھا۔ پھر بھی میں تمھاری یہ آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ یوں بھی مرنے والوں کے سینے میں کوئی ادھوری آرزو رہنا نہیں چاہیے۔ تم دونوں مقابلہ کرو گے ایک ساتھ یا باری باری آؤ گے؟"

"اگر میرے ہاتھوں سے بچ پاؤ تب دونوں سے لڑنے کی تمنا بھی پوری کر لینا۔" وہ حقارت سے بولا۔

میں نے خان سے کہا "ٹھیک ہے بھئی، تم دونوں اس دوسرے مرغے کو لے کر الگ ہٹ جاؤ، میں اس کے بازوؤں کا زور بھی دیکھ لوں۔ بڑا ناز ہے اسے شاید اپنے زورِ بازو پر۔"

ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا "یہ کیا کر رہے ہو تم۔ یہ میدانِ جنگ کیوں بنانے پر تُل گئے ہو تم اس جگہ کو۔ اگر اتنا شوق ہے ریسلنگ کا تو یہاں سے کہیں اور جا کر یہ شوق پورا کر لو اپنا۔ مجھے کیوں سُولی پر لٹکا رکھا ہے آخر؟"

"اوئے، تم کیوں پریشان ہو رہے ہو بھائی جی! خدا کا شکر کرو تمھیں سچ مچ سُولی چڑھانے سے پہلے ہی اصل آدمی سامنے آ گئے ہیں ہمارے۔ ورنہ تم نے جو حرکت کی ہے ہمارے آدمی کے ساتھ، وہ تمھیں قبر میں ضرور اُتار دیتی۔"

"میں .... میں نے .... کیا کیا .... ہے .... تم مجھے ..."

وہ بُری طرح ہکلانے لگا۔

"اچھّا اب چُپ کر کے دیکھتے رہو یہ تماشا۔ درمیان میں بک بک نہ کرنا بالکل بھی۔" میں نے سخت لہجے میں تنبیہ کی اسے۔

وہ اس صورتِ حال سے پہلے ہی خاصا پریشان ہو رہا تھا، میرے لہجے کی سختی نے اسے اور سہما دیا۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

میرا مقابل اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ، اور ٹائی اُتار کر ایک طرف صوفے پر اُچھال دی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھڑی کر کے کراٹے کی پوزیشن اختیار کر لی۔ وہ مسلسل پینترے بدل بدل کے حرکت کرتا جا رہا تھا اور میں اس پر نظریں جمائے اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ جوڈو کراٹے کے فن میں ماہر اگر نہ سہی تو کم از کم شُدبُد ضرور رکھتا تھا۔ جب کہ مجھے اس فن کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لہٰذا مجھے نہایت حاضر دماغی اور پوری توجہ سے اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس نے حرکت کرتے کرتے اچانک حلق سے مخصوص قسم کی آواز نکالی اور ہوا میں اُچھلا۔ میں فوراً ہی نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے فلائنگ کک لگانے کے لیے چھلانگ لگائی تھی مگر میرے بیٹھ جانے کی وجہ سے اُڑتا ہوا میرے پیچھے نکل گیا اور چونکہ اس کا وار خالی گیا تھا، اس وجہ سے اسے وہ سہارا ابھی نہ مل سکا جس سے فلائنگ لگانے کے بعد آدمی دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس اثنا میں میں اُٹھ کر اس کی طرف گھوم چکا تھا چنانچہ نیچے گرتے ہی میں نے اس کے سر پر اپنے بوٹ کی نوک سے زور کی ٹھوکر لگائی۔ وہ پیر جما کر اُوپر اُچھل کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کراٹے کا ماہر اگر وار خالی جانے کی وجہ سے گر بھی جائے تو وہ عام آدمی کی طرح پلٹی کھا کر ہاتھوں کے سہارے دوبارہ اُٹھنے میں وقت برباد نہیں کرتا۔ وہ گرتے ہی زمین پر پیر جما کر اپنے جسم کو ایک خاص انداز سے اُوپر اُچھال دیتا ہے، یوں وہ بس پلک جھپکنے میں اپنے پیروں پر کھڑا نظر آتا ہے مگر میں نے اس پر وار کرنے میں اتنی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا

اسے وہ ایک پل بھی نصیب نہ ہوسکا اُٹھنے کے لیے ٹھوکر کھاتے ہی وہ بے توازن ہوکر پھر پیچھے جا پڑا۔ میں نے دوسری ٹھوکر پھر اسی جگہ لگائی۔ وہ بُری طرح بلبلا اُٹھا مگر میں اسے دوبارہ اُٹھنے کی مہلت دینے کو بالکل تیار نہیں تھا۔ چنانچہ تابڑ توڑ اس کے سر پر ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ ہر ٹھوکر پر اس کے منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔ پانچ چھ ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کے سر سے خون جاری ہوگیا،

اور کراہیں چیخوں میں تبدیل ہونے لگیں تو وہ اچانک سانپ کی طرح بل کھا کر پلٹا اور دونوں ٹانگیں تیزی سے اُٹھا کر میرے سینے پر دے ماریں۔ وہ کسی مگدر کی طرح مجھے لگی تھیں اور میں اُلٹ کر پیچھے جا پڑا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ٹانگیں اس وقت میرے سینے پر لگ جاتیں، جب اس نے فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی تھی تو اس وقت صورتِ حال بالکل ہی مختلف ہوتی۔ کچھ قسمت ہی اچھی تھی کہ اس گھڑی میں ان سے بچ گیا تھا۔

میرے گرنے کے بعد اسے اتنا تو موقع مل ہی گیا تھا کہ وہ سنبھل کر دوبارہ کھڑا ہو جاتے۔ میں نے دوبارہ اُٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور اس اثنا میں وہ بھی اُٹھ گیا تھا، لیکن میری اس کے سر پہ لگائی ہوئی ٹھوکروں نے اس کا بھیجا ہلا کر رکھ دیا تھا شاید، اور قدم جما کر کھڑے ہونے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے خون آشام نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑا، اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن تھام کر سر سے اس کی ناک پر زوردار ٹکر لگائی۔ اس کے لیے یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور شاید ناک کا بانسہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ناک سے بھی نلکے کی طرح خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا دے مارا۔ اب اس کے سارے بل نکل چکے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اُوندھے منہ زمین پر جا گرا۔

میں نے اس کے دوسرے ساتھی کو دیکھ کر کہا "اوئے آجا بھئی، تو بھی نکال لے اپنی حسرتیں، تُو کیوں اپنا دل چھوٹا کرتا ہے۔"

گل زمان نے تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "اُستاد! اس سے تو مجھے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ بہت دن ہوگئے ہیں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے۔ بڑا اکڑ رہنے لگا ہے بدن ہی میرے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا بھئی چل تو بھی اپنا بدن دبوا لے، مجھے اعتراض نہیں ہے کوئی۔ مگر دیکھ لے یہ ٹھیک سے دبا بھی سکے گا تجھے۔ مالش والش بھی کر سکتا ہے یہ یا نہیں۔"

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر جلدی سے اس نیم جان زخمی کے پاس آ بیٹھا "کیا اسے بالکل ہی ختم کر دیا ہے تم نے، یہ تو... یہ تو بہت بُرا کیا ہے، ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تمہیں۔ میں پولیس ولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکوں گا۔" وہ جلدی جلدی اسے ٹٹولنے لگا۔

"اوئے تو کیسا بزدل آدمی ہے یار! غیر قانونی کام بھی کرتا ہے اور پولیس سے بھی ڈرتا ہے۔ فکر نہ کر اس کی، مرا وراہیں ہے یہ۔ ابھی مر بھی کیسے سکتا ہے۔ ابھی تو بڑے کام لینا ہیں مجھے اس سے۔ یہ چاہے گا بھی تو مرنے نہیں دوں گا میں اسے۔"

"خدا کے لیے بھائی! رحم کرو مجھ پر، یہاں یہ خون خرابہ نہ کرو تم۔ انہیں یہاں سے لے جاؤ، پھر جو دل چاہے کرتے رہنا ہاں لے جاؤ... لے جاؤ انہیں..." وہ میرے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر گھگھیانے لگا۔

مجھے اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی، میں بولا "اچھا اچھا مرا کیوں جاتا ہے میرے یار تو۔ ہم ساتھ ہی لے جائیں گے انہیں اپنے، لیکن اس سے پہلے ایک کام کرنا ہوگا پیارے تجھے ہمارا۔ بول کیا کہتا ہے؟ کرے گا نا تو وہ کام؟"

وہ جلدی سے بولا "ہاں ہاں، کر دوں گا، ضرور کر دوں گا بولو... بولو... کیا چاہتے ہو تم؟"

"ان دونوں کو ہم اُدھر آپریشن تھیٹر میں لے چلتے ہیں۔ تم ان کے گردے نکال لو، پھر ہم انہیں لے جائیں گے اپنے ساتھ۔"

"کیا... کیا... ان کے گردے...! مگر تم کیا کرو گے ان کے گردوں کا؟ تمہارے کس کام آئیں گے وہ؟" ڈاکٹر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ اس کا منہ بھی حیرت کی زیادتی کے سبب کھل گیا تھا۔

"میرے محلے کے کتے آدمی کے گردے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ انہیں کھلاؤں گا میں۔"

وہ پستہ قد شخص میری بات سن کر زور سے چیخا "کمینے بند کرا دے کھوتے۔ خون پی جاؤں گا میں تیرا۔"

وہ چلاتا ہوا میری طرف دوڑا لیکن گل زمان نے اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی کمر سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ ایک صوفے پر جا کر گرا مگر فوراً ہی اٹھ کر میری طرف جھپٹا، اس بار گل زمان نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ مار کر اسے نیچے گرا دیا۔ اس نے پھر اٹھنا چاہا تو گل زمان نے پیچھے سے اس کا کالر پکڑ کر تیزی سے اپنا گھٹنا اس کی کمر پر رکھ کر اس کا

سر زمین پر دے مارا۔ وہ بُری طرح مچلتے ہوئے مغلظات بکنے لگا۔ اس پر شاید دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میری زبانی اپنے انجام کے بارے میں سن کر اس کی کھوپڑی سُلگ اٹھی تھی اور وہ ریوالور کی زد میں ہونے کے باوجود اپنے انجام سے بے پروا ہوکر میری طرف دوڑ پڑا تھا۔

گل زمان نے دو تین بار اس کا سر زمین سے ٹکرایا تو اس کا سارا جنون ختم ہوگیا۔ چیختے چیختے اس کی آواز بھرا گئی اور کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ ظالم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں ہوتا۔ آج تک وہ دوسروں کے گردے نکلوا نکلوا کر دولت سمیٹتے رہے تھے، ایسا کرتے ہوئے کبھی ان کے دل میں کسی کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوسکا تھا۔ انہوں نے اپنے اس ذلیل کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے ڈاکٹر قاضی کو بلیک میل کرتے وقت اس پر ذرا رحم نہیں کھایا تھا مگر آج اپنے گردے نکالے جانے کا سن کر وہ جیسے پاگل ہوگیا تھا۔ گل زمان نے اس کی کمر پر سے اپنا گھٹنا ہٹا کر اسے کھینچ کے کھڑا کر دیا۔ وہ رونے اور گھگھیاتے ہوئے بولا "تمہیں اللہ کا واسطہ میرے گردے نہ نکالو۔ معاف کر دو مجھے۔ میں کان پکڑتا ہوں اب کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔"

میں نے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا "اب اپنی باری آئی ہے تو اللہ یاد آگیا ہے تجھے۔ پہلے پتا نہیں تھا تجھے کہ ایک خدا بھی ہے جو کل جہان کا مالک اور ہر شے پر قادر ہے۔ ظالموں کو وہ اس دنیا میں ہی دوسروں کے لیے عبرت بنا دیتا ہے۔ چلو اوئے گل زمان اسے لے چلو اسے اس ذلیل آپریشن تھیٹر میں اور تم اس دوسرے شیطان کو لے کر چلو خان! زیادہ تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ایک ٹانگ پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے لے چلو مُردہ کتے کی طرح۔"

اچانک بیرونی دروازے کی طرف سے کسی نے ہمیں للکارا "خبردار! ہاتھ نہ لگانا اسے، اور جو جہاں ہے وہیں کھڑا رہے۔ کسی نے ذرا بھی حرکت کی تو بھون کے رکھ دوں گا اسے۔"

یہ آواز سنتے ہی ہم سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں اور بے ساختہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی، البتہ ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں اور منہ کھل گیا تھا اس کا۔ یوں لگتا تھا جیسے سکتہ ہوگیا ہو اُسے۔

ڈاکٹر کی حیرانی بجا تھی، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اپنی آستین میں سانپ پال رہا ہے، اس نے نادانستگی میں ایک چور کو اپنے گھر کی چوکیداری پر مقرر کر رکھا ہے۔ لیکن مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں تھی۔ مجھے تو پہلے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر کو بلیک میل کرنے کے معاملے میں اس کے کسی بے حد قریبی، بہت ہی قابلِ اعتبار شخص کا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا یہ خفیہ کلینک اپنی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹرز کے نیچے اس طرح بنوایا تھا کہ کسی انجان شخص کو تو یہ گمان تک نہیں ہوسکتا تھا کہ وہاں ایسی بھی کوئی چیز موجود ہوسکتی ہے۔ کسی گھر کے بھیدی کے تعاون کے بغیر کسی کے لیے اس جگہ تک پہنچنا قطعی ناممکن تھا، وہاں جاکر آپریشن تھیٹر میں کام کرتے ہوئے ڈاکٹر کی تصویریں بنانا تو بہت دور کی بات تھی۔

ڈاکٹر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی کوٹھی کے دربان کو دیکھ رہا تھا جو اس وقت دروازے کے بیچوں بیچ دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑے کھڑا ہمیں للکار رہا تھا "سنا نہیں تم نے؟ اپنے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو اور اِدھر دیوار کے پاس چلے جاؤ۔"

شاید اس نے یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں یا نہیں، ورنہ وہ ہتھیار پھینکنے کو نہ کہتا ہمیں۔

میرے پاس تو کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں اور گل زمان اور خان اپنے اپنے ریوالور پہلے ہی جیبوں میں ڈال چکے تھے۔ میرا خیال ہے اگر خان کا ریوالور اس گھڑی اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ اب تک اس نمک حرام دربان کے ہاتھوں سے دونوں ریوالور نکال چکا ہوتا۔ اس کا نشانہ ایسا ہی بے خطا تھا اور اس کی پھرتی، چابک دستی کا مظاہرہ میں ابھی کچھ دیر قبل ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا "تم اس کا کہنا مان لو یار۔ جاؤ اُدھر چلے جاؤ، اس دیوار کے پاس۔ یہ کتا مجھے لگتا ہے پاگل ہوچکا ہے!"

وہ شخص جو گل زمان کے ہاتھوں مار کھا کر بچوں کی طرح رو رہا تھا، دربان کو ریوالور بدست اپنی حمایت میں کھڑے دیکھ کر رونا بھول گیا اور تیزی سے اٹھ کر گل زمان کی طرف لپکا۔ میں نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، لہٰذا جیسے ہی اس نے گل زمان کی طرف قدم بڑھایا میں نے پھرتی سے بڑھ کر اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا دی۔ وہ اچھل کر ایک بار پھر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ دربان نے اپنے دائیں ہاتھ کا ریوالور میری طرف تانتے ہوئے

غضبناک لہجے میں للکارا۔ ”اوئے تیری سمجھ میں آئی نہیں ہے میری بات ابھی تک۔ میں کہتا ہوں سیدھا کھڑا رہ نہیں تو ساری گولیاں اتار دوں گا تیرے بدن میں، چھلنی کر کے رکھ دوں گا سالے کو۔ اور مسٹر شاہ! آپ ان لوگوں سے الجھنے کے بجائے اپنے ملک صاحب کو اٹھا کر لے آئیں ادھر، لگتا ہے یہ بے ہوش ہو گئے شاید۔ انھیں اٹھا لیں پھر ان رذیلوں سے نمٹ لوں گا میں۔“

اس کے انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے معاوضے کے لیے ان کا ساتھ دے رہا ہو، یا محض وقتی طور پر ان سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا ہو۔ بلکہ وہ ان سے کا کوئی پرانا ساتھی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لہجہ بھی عام گھریلو چوکیداروں جیسا نہیں تھا اس وقت۔ میں ڈاکٹر سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اسے کب ملازم رکھا تھا، کتنے دن سے وہ اس کی کوٹھی کی دربانی کر رہا ہے؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ زیادہ پرانا ملازم نہیں تھا، حال ہی میں آیا تھا اس کے پاس اور اس نے یہ ملازمت محض ڈاکٹر کی کمزوریاں معلوم کرنے کی خاطر ہی اختیار کی تھی ورنہ وہ چوکیداروں کے قبیلے کا آدمی بالکل نہیں تھا۔ لیکن یہ وقت ان باتوں کے لیے موزوں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر سے اس کے بارے میں معلوم کرنے کے بجائے بے دم پڑے ملک کی طرف بڑھتے ہوئے شاہ کو تنبیہ کی۔ ”خبردار شاہ جی! حرکت بالکل نہ کرنا اپنی جگہ سے ورنہ میں ابھی اسی جگہ گردن نکال لوں گا تیری اپنے ہاتھوں سے۔“

”رک جا جوان! اب اتنی بھی جی داری دکھانے کی کوشش نہ کر کہ پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے تجھے۔“ دربان نے پھر تنبیہ کی مجھے۔

”ان بالشت بھر کے اوزاروں پر اتنا مان نہ کر، جانتا نہیں ہے تو مجھے۔ میرے سامنے یہ ہتھیار اپنے مالک سے باغی ہو جاتے ہیں۔“ میں نے بڑھ کر اطمینان سے شاہ کی قمیص کا کالر پیچھے سے تھام کے اسے ایک جھٹکے سے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

میری اس جرأت نے دربان کو پریشان کر دیا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی تھی۔ شاید اس نے اس دوران مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی اور یہ جان کر ہی وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا کہ ریوالور اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میری توجہ کیونکہ اس کی طرف نہیں تھی لہٰذا میں اس کی یہ کوشش ناکام نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے شاہ کو سیدھا کر کے اپنے سامنے کر لیا تاکہ دربان اگر ریوالوروں کی طرف سے مایوس ہو کر کوئی دھاردار ہتھیار استعمال کرنا چاہے تو میں شاہ کو اس

کے اوپر پھینک کر اس کی یہ کوشش بھی آسانی کے ساتھ ناکام بنا دوں۔ میں شاہ کو اپنے سامنے لگا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ شاہ کا سر پہلے ہی زخمی تھا، گل زمان نے اس بری طرح اسے زمین پر مارا تھا کہ اس کا ماتھا دو جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میرے ٹانگ اڑا کر گرانے کے بعد ان زخموں کے ساتھ نیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ابھر آئی تھی۔ اس کے باوجود آگے بڑھنے میں وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر زور سے گھٹنا مار کر کہا۔ ”او خبیث کی اولاد! سیدھا چل نہیں تو بیچ سے دو ٹکڑے کر کے ڈال دوں گا ابھی۔“

اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، شاید گھٹنا زیادہ ہی زور سے لگ گیا تھا اس کی کمر میں۔ وہ بلبلا کر مغلظات بکنے لگا تھا۔ میں نے غضبناک ہو کر کہا۔ ”اوئے جو ہڑے دے ڈڈو، منہ بند نہیں کر سکتا ہے تو اپنا۔ کمر کی ہڈی توڑ دوں گا سالے تیری جو اب تو نے بکواس کی تو۔ گالیاں بکنے والوں کو تو زندہ نہیں رہنے دیتا ہوں میں، یہ بات دماغ میں بٹھا لے اپنے۔“

اس کی زبان کو ایک دم جیسے بریک لگ گئے تھے۔ میرے لہجے کی سفاکی نے اسے سہما کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاموش ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میرے آگے آگے چلنے لگا۔ دربان نے مجھے اسے ڈھال بنا کر اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ جلدی سے کمرے میں گھس آیا۔ اور تیزی سے پہلو بچا کر میرے پیچھے نکل گیا۔ میں نے جس ہاتھ سے شاہ کی قمیص کا کالر تھام رکھا تھا، اتفاق سے وہ وہی ہاتھ تھا جس کی ایک انگلی میں عالیہ کی دی ہوئی وہ حیرت انگیز اور جادوئی اثر رکھنے والی انگوٹھی ڈال رکھی تھی میں نے۔ دشمن کو اپنے خلاف آتشیں اسلحہ استعمال کرنے سے روکنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس انگوٹھی کا رخ اپنے خلاف استعمال کیے جانے والے ہتھیار کے سامنے ہو، اس گھڑی مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا کہ انگوٹھی شاہ کی گردن کے پیچھے چھپی ہونے کی وجہ سے دربان کا ریوالور مجھ پر گولی اگل سکتا ہے۔ ایسے میں اگر تقدیر یاوری نہ کرتی تو میری زندگی کی کہانی کا یہیں اینڈ ہو جاتا، لیکن ابھی میری خواری کے دن باقی تھے، ابھی مجھے اور بھی نہ جانے کب تک یوں ہی اللہ تلل رہنا تھا۔ ادھر اس نے میری پشت میں کھڑکی کھولنے کا حکم دے کر اپنے ریوالور کی ایک گولی میری طرف روانہ کی، ادھر میں نے شاہ کو دبوچ کر اپنا رخ پھیر لیا۔ بس یہ کام پلک جھپکنے جتنی دیر میں ہوا تھا اور وہ گولی جسے میری پشت میں دھنسنا تھا، میری آستین کو چھیدتی ہوئی شاہ کی پسلیوں میں کہیں جا ٹھہری۔ شاہ تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور ماہی بے آب کی طرح فرش پر گر کر پھڑپھڑانے تڑپنے لگا۔ گولی چلنے کی آواز اس نیم اور زیر زمین کمرے میں گونج کر رہ گئی تھی۔ برابر کے کمرے میں موجود نرسیں، آبی اور جیلی

...یں اسلم بھی یہ دھما کا سن کر بے چین ہو گئے تھے شاید۔ ایک ...ے کے بعد ہی اُدھر سے دروازہ پیٹا جانے لگا۔ اس کے ...ساتھ ہی آبی کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”اوئے جیلانی! یہ ...ولی کس نے چلائی ہے بھئی؟ تُو تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے اس طرف توجہ دیے بغیر خان سے کہا۔ ”خان! ...دروازے کے پاس جا کر ان لوگوں کو تسلی دے کے یہ شور ...ابند کراؤ، میں اس ذلیل کی نشانے بازی دیکھ لوں جب تک۔ ...ے شاید اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی معلوم ہوتی ہے مجھے۔ اور دیکھو، وہ دروازہ کھولنا نہیں۔ وہ لوگ ادھر گھس آئے تو پریشانی کا سبب بن جائیں گے میرے لیے۔“

”مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے، البتہ تیرا دماغ کھسکا ہوا لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے دنیا سے جی اُکتا گیا ہے تیرا۔“

”یہ ابھی پتا چل جائے گا تجھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا یہ دونوں ریوالور لوڈ ہیں؟“

”ہاں، ابھی صرف ایک ہی گولی نکلی ہے ان میں سے اور تو نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا تو یاد رکھ ایسی ہی گیارہ گولیاں اور نکل سکتی ہیں ان دونوں میں سے جب کہ ان میں سے نکلی ہوئی صرف ایک گولی ہی کافی ہو گی تیرے لیے۔“ وہ حقارت سے بولا۔

”یہی دیکھنا چاہتا ہوں میں بھی کہ وہ گولی جو میرے لیے بنائی گئی ہے وہ ان دونوں ریوالوروں میں سے کسی میں ہے بھی یا نہیں؟“

”اچھا تو لے پھر، تو نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں تیرے لیے۔“ دربان نے کہا اور ریوالور سیدھا کر کے ٹریگر دبانے لگا۔

اس بار اس کا ریوالور ساتھ دینے کو بالکل تیار نہیں ہو رہا تھا اس کا۔ وہ پورا زور صرف کیے دے رہا تھا لیکن ریوالور کی نال سے کسی طرح گولی نکل ہی نہیں رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چہرے پر میرے درندگی چھائی ہوئی تھی اس گھڑی۔ جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں جیسے شعلے اگل رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ ہمارے درمیان فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ کافی زور آزمائی کے بعد بھی ریوالور سے گولی نہیں نکل سکی تو اس نے جھنجلا کر ریوالور میری طرف پھینک دیا۔ میں چونکہ اس کے اس ردعمل کے لیے پہلے سے تیار تھا لہٰذا میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں کیچ کر لیا۔ ریوالور کا دستہ میری ہتھیلی پر آ کر لگا تھا لیکن چوٹ اتنی زیادہ نہیں آئی تھی کہ میں اس طرف توجہ دیتا۔ میں نے ریوالور سنبھال کر اس کی طرف سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چاہوں تو اس کی ایک گولی تیری کھوپڑی میں اتر کر تجھے دنیا کی ہر فکر سے آزاد کر سکتی ہے لیکن میں پٹاخے بازی کو پسند نہیں کر سکتا

اس گھڑی۔ اور یوں بھی جب گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا ہو تو خواہ مخواہ انگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں پیارے بھائی، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“

اس دوران وہ دوسرے ریوالور کو مجھ پر آزمانے کے لیے اس سے الجھنے لگا تھا۔ اب یہ اس کی بدبختی ہی تو تھی کہ آج وہ ان ریوالوروں پر بھروسا کر کے ایک ایسے شخص کے سامنے آ ٹھہرا تھا جس پر یہ ہتھیار بے اثر ہو کر رہ گئے تھے۔ جس کے سامنے پڑتے ہی یہ اپنی کارکردگی بھول جاتے تھے اور ایک بے جان پتھر سے زیادہ حیثیت ہی نہیں رہتی تھی ان کی کوئی۔ میں اس کے بے حد قریب پہنچ گیا۔ اور پاس جاتے ہی الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”اوئے کمینے! اس رذیل شے پر اتنا پھول رہا تھا تُو؟ اس ناکارہ اور بے وفا ہتھیار پر اترا رہا تھا۔ دیکھ لی تُو نے اس کی اوقات؟ چلا نہ گولی اب۔“

مار کھا کر وہ ایک دم پیچھے جا پڑا تھا، میری بات کا جواب کیا دیتا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ ”اٹھ اوئے تیس مار خان کی اولاد۔ ایک ہی ہاتھ میں لمبا لمبا لیٹ گیا ہے، اٹھ کھڑا ہو۔“ میں نے اس کا گریبان تھام کر اسے اوپر اٹھا لیا۔

اس پر بہت ہی گہرا کوئی نشہ چڑھا ہوا تھا۔ مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو اپنے حق میں، تمھیں معلوم نہیں ہے کہ کن لوگوں سے تعلق ہے ہمارا۔ قبر سے بھی نکال لائیں گے وہ تمھیں ہمارا انتقام لینے کے لیے۔“

”تجھے بھی یہ نہیں پتا ہے کہ کن لوگوں میں آ پھنسا ہے تو۔ انتقام لینے کا مرحلہ تو بہت بعد میں آئے گا۔ پہلے انھیں وہ مرگھٹ تلاش کرنا پڑے گا جہاں تمھاری راکھ انھیں دستیاب ہو سکے گی۔ پھر وہ اس راکھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو خاک میں ملانے والے کون لوگ تھے، کس کس نے حصہ لیا تھا اس کارِ خیر میں۔“ میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا اور اسے ایک اور زبردست قسم کا جھانپڑ رسید کر کے خان کی طرف دھکیل دیا۔

خان بند دروازے کے پیچھے شور مچانے والوں کو چپ کرا کے اسی طرف چلا آیا تھا۔ اس نے اسے بازوؤں میں سنبھال کر کہا۔ ”کیا انھیں اب کریا کرم کے لیے کہیں لے کر چلنا ہے یا اسی جگہ کوئی انتظام کریں گے ان کا؟“

”اس کو باندھ کے ڈال دے یار ادھر ایک کونے میں اور ان تینوں کو ادھر آپریشن تھیٹر میں لے چلو اٹھا کر باری باری۔ اب تو چھ گردوں کا انتظام ہو گیا ہے یار۔ محلے کے کتوں کی تو آج عید ہو جائے گی۔“ میں نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

دربان، خان کے بازوؤں میں مچلتے ہوئے گھگیانے لگا۔

"نہیں نہیں... تم جھوٹ بول رہے ہو... ایسا نہیں کر سکتے تم..."

"کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتے ہم ایسا؟ تو روک سکتا ہے ہمیں ایسا کرنے سے؟" میں نے حقارت سے کہا۔

"یہ تو... یہ تو بہت سنگدلی کی بات ہے... نہیں... تم... تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"ہاں ہے تو یہ واقعی سنگدلی لیکن جو لوگ دوسرے پر رحم نہ کرتے ہوں، جو لوگوں کے گردے نکال نکال کر روپیہ کماتے رہتے ہوں ان کے ساتھ ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم لوگوں کے تو ٹکڑے کر کے کتّے بلیوں کو کھلا دینے چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے کہ ہم ایسا کرتے ہیں لیکن ہم نے جان نہیں لی ہے کبھی کسی کی۔ اور ایک گردہ نکال لینے سے آدمی کی صحت پر کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ زندہ اور صحت مند رہنے کے لیے ایک گردہ ہی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کا ایک گردہ کسی ضرورت مند کے کام آجائے تو یہ کوئی برائی والی بات تو نہیں ہے نا! ایک طرح کی نیکی ہی ہے یہ تو۔"

"ہاں یار! یہ تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کارِ ثواب ہے یہ آدمی کے لیے۔ اور اس گردے کے عوض تم لوگوں کو جو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں، یہ تو اور بھی زیادہ ثواب کا مستحق بنا دیتی ہیں گردے کے مالک کو! کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں تو پھر برائی والی کیا بات دکھائی دیتی ہے تمھیں اس میں؟ ان سے گردے کی قیمت تو نہیں لیتے ہیں ہم۔"

"اچھا! یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا یارو! میں نے تو سنا تھا تم لوگ بڑی بھاری قیمت وصول کرتے ہو اس کی۔"

"کسی نے غلط بات بتا کر تمھیں گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم صرف اپنے اخراجات اور گردے کے مالک کے لیے تھوڑی سی رقم کے سوا کچھ نہیں لیتے کسی سے بھی... اگر دیکھا جائے تو ہم ایک فلاحی کام کر رہے ہیں اس طرح۔"

"اوہ، تم تو بڑے نیکوکار لوگ ہو یار! اتنے اچھے کام کرتے ہو تم مگر ساری نیکی اکیلے ہی اکیلے اپنے نامۂ اعمال میں درج کرا رہے ہو، کچھ تو ہمارے حصّے میں بھی آجانے دو۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے نا!"

"ٹھیک ہے، اگر تم یہی چاہتے ہو تو ہم تمھارا حصّہ بھی لگا لیں گے اس میں۔ بولو، کیا چاہتے ہو تم؟" وہ بولا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں ان کے اس گندے کاروبار میں شریک ہونا چاہتا ہوں لہٰذا وہ میرا مطالبہ معلوم کر رہا تھا۔

میں نے کہا "میرا مطالبہ کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے پیارے بھائی! تم تینوں کے گردوں کے سوا اور کچھ نہیں مانگتا ہوں میں

تم سے اور شاید اس شاد کو تم نے ختم ہی کر دیا ہے، اسے تو اب یوں بھی ضرورت نہیں رہی ہے گردوں کی۔"

اس کا چہرہ سُت کر رہ گیا تھا میرا جواب سن کے۔ اس جواب کی اسے توقع نہیں تھی مجھ سے۔ سمجھ وہ یہی رہا تھا کہ کچھ دے دلا کر گلو خلاصی ہو جائے گی ان کی۔ اس خیال نے اس کے دل سے سارا خوف مٹا ڈالا تھا مگر میرے جواب نے اس کے دل کی دھڑکنوں میں اچانک اضافہ کر دیا تھا۔ زندگی کی آس بڑی چیز ہوتی ہے۔ آدمی کے چہرے پر بڑی تازگی نظر آتی ہے، اس وقت تک جب تک اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ ابھی اس دنیا میں اس کے حصّے کے بے شمار شب و روز باقی ہیں، ابھی زندگی سے حظ اٹھانے کے لیے بہت وقت ہے اس کے پاس لیکن جب یہ آس ٹوٹ جائے اور موت کے سائے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دینے لگیں تو آدھی جان خود بخود نکل جاتی ہے جسم سے، لہو کی سرخی میں موت کی زردی گھلنے لگتی ہے۔ ایسی ہی کیفیت اس کی بھی تھی اس گھڑی۔ اسے بھی خلافِ امید بس اچانک ہی فرشتۂ اجل اپنے سامنے کھڑا نظر آگیا تھا۔ آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی اور آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں اس گھڑی اس کی۔

میں نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا "ڈاکٹر! میرا خیال ہے پہلے اس کی مشکل آسان کر دی جائے۔ یوں بھی اس کے گردے زیادہ جان دار معلوم ہوتے ہیں مجھے، زیادہ دیر سہما رہا یہ تو ڈر ہے وہ کمزور نہ پڑ جائیں۔"

وہ دہشت زدہ ہو کر چیخ پڑا "نہیں... نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے خوف زدہ کر کے لمبی رقم حاصل کرنا چاہتے ہو مجھ سے۔ بولو... بولو کیا چاہیے تمھیں؟ ایک لاکھ... دو لاکھ... دس لاکھ... بتاؤ کتنی رقم چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

"میں نے کہا نا، مجھے تمھارے گردے کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر گھگیانے لگا "پلیز، ایسا نہ کرو۔ ہمیں مار کر تمھارے ہاتھ کچھ نہیں آسکے گا۔ جب کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں..."

خان نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "ذرا میری ایک بات سن لو جیلانی! فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا "کیا بات ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم بولو؟"

اس نے دربان کو گل زمان کی طرف دھکیل دیا جو اس دوران ہمارے قریب ہی چلا آیا تھا۔ بولا "گل زمان! اسے سنبھالو، میں جیلانی سے بات کر لوں۔ دھیان سے پکڑنا نکل نہ جائے ہاتھ سے یہ۔" پھر میرے قریب آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے

ٹک لے جاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا "نادانی کی باتیں نہ کرو یار، وہ دس لاکھ روپے تک دینے کو تیار ہے، اگر دوں کا ہم کیا کریں گے، رقم بہت کام آئے گی ہمارے۔ میرا خیال ہے دس لاکھ روپیہ نہیں گنوانا چاہیے ہمیں۔"

دس لاکھ روپے کا سن کر اس کا دل بے ایمان ہونے لگا تھا۔ چھوٹی موٹی چوریوں پر گزارا کرنے والے کے لیے یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اس نے کبھی ایک ساتھ اتنی رقم دیکھی بھی نہ ہو گی۔ مگر اس کی یہ بات سن کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ میں نے نفرت اور حقارت سے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ایک دم سٹپٹا گیا۔ بوکھلا کر بولا "میری بات کا غلط مطلب نہ لو، میرا مطلب ذاتی فائدے سے نہیں ہے۔"

"اچھا، پھر کیا مطلب ہے تمھارا، اس کی بھی وضاحت کر دو تم خود ہی۔" میں نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے نفرت سے پوچھا۔

"تمھیں شاید پتا نہیں ہے، ہمیں اپنی تنظیم کو قائم رکھنے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کہیں اور سے امداد نہیں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ہونے والے اخراجات ہمیں اپنے ہی وسائل سے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ دس لاکھ روپیہ تنظیم کے کام آسکتا ہے۔ ان دنوں ضرورت بھی ہے ایسے پیسے کی۔ بس یہی مطلب تھا میرا۔ تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے ہو۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

یہ بات فیروز بھی بتا چکا تھا مجھے، لہٰذا خان کی بات میری بھی سمجھ میں آگئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا اس کی اس بات سے۔ حالاں کہ میرا ارادہ ان رذیل لوگوں کو چھوڑنے کا بالکل نہیں تھا مگر خان کی بات ماننے کا مطلب یہی تھا کہ میں انھیں آزادی دے کر اور نہ جانے کتنے بھلے مانسوں کو ایک ایک گردے سے محروم کر دوں۔ میں نے دبی زبان سے کہا "خان! تیری بات تو دل کو لگتی ہے لیکن روپیہ لینے کے بعد ہمیں ان گردہ فروشوں کو چھوڑنا بھی پڑے گا۔ بس یہی نہیں چاہتا ہوں میں، انھیں اس کاروبار کو مزید جاری رکھنے کی اجازت تو میں کسی طرح بھی دینے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ تو بڑی گھٹیا، بڑی انسانیت سوز حرکت ہو گی۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا "واہ یار جیلانی! کمال کرتے ہو تم بھی۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے آخر۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ رقم لینے کے بعد ہم انھیں چھوڑ ہی دیں۔ ان کا کریا کرم تو ہمیں ضرور ہی کرنا ہے۔"

"اوئے یار! کیسی باتیں کرتے ہو۔ روپیہ بھی لے لو گے اور کریا کرم بھی ضرور کرو گے ان کا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تم اب مجھے بات کرنے دو اس سے اور دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔" خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم بات کرو اس سے لیکن ایک بات یاد رکھو، میں اسے چھوڑوں گا کسی قیمت پر بھی نہیں۔ ایسا کوئی وعدہ نہ کر لینا تم۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو، ایسے بے ضمیر اور ننگِ انسانیت لوگوں سے کیے ہوئے وعدوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ یہ خود بھی دوسروں کے ساتھ وعدے کر کے ان پر عمل نہیں کرتے۔ ان کے وعدے بھی فریب ہی ہوتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ انھی جیسا سلوک کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے میری نظر میں۔ ان کے سلسلے میں اخلاقیات کی دفعہ نہیں لگتی ہم پر۔"

ہم واپس پلٹے تو نیچے پڑا ہوا ملک کسمسانے لگا تھا۔ خان نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لیتے ہوئے گل زمان سے کہا۔ "اسے چھوڑ دو گل زمان! اور تم کوئی رسّی وغیرہ تلاش کر کے ان دونوں کو باندھ لو اچھی طرح سے۔ اس کے بعد ہی ہم اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر ان سے مذاکرات کریں گے۔ اب ان کی زندگی کا انحصار ان مذاکرات کی کامیابی اور ناکامی پر ہے۔"

گل زمان اسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر! ایک مضبوط سی رسّی دو ہمیں۔"

ڈاکٹر نے سہمی ہوئی نظروں سے اپنے دربان کو دیکھتے ہوئے کہا "کیوں میری جان کے دشمن ہو گئے ہو تم لوگ۔ میں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکوں گا تمھاری۔ تمھیں جو کچھ کرنا ہے کہیں اور جا کر کرو، خدا کے لیے میری بربادی کا سامان نہ کرو۔"

"تُو تو بہت ہی بزدل آدمی ہے... ! تجھے ڈاکٹر کس نے بنا دیا ہے، تجھے کوئی کچھ نہیں کہہ رہا ہے۔"

"مگر یہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہاں، اس کے بعد یہ لوگ مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ تم جانتے نہیں ہو انھیں۔" ڈاکٹر عاجزی سے بولا۔

"اگر انھوں نے یا ان کے کسی ساتھی نے تمھیں تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں ان کے لیے زمین تنگ کر دوں گا۔ واسطہ نہیں پڑا ہے کبھی پہلے ان کا مجھ سے لیکن اتنا تو یہ جانتے ہی ہیں کہ ان کے پہلے سپلائر ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کو میں نے ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا... ! کیا... ! کیا کہا تم نے؟ ڈاکٹر دھمن کو تم نے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا!" دربان حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا "تو کیا تم وہی ہو... وہی غلام جیلانی؟ ابھی تمھارے ساتھی نے نام لیا تھا تمھارا تو میں یہی سوچنے لگا تھا کہ یہ نام میں نے پہلے کہاں سنا ہے؟"

"ہاں بیٹے! میں وہی غلام جیلانی ہوں۔ تمھاری قسمت خراب

ہے شاید کہ آج اس نے تمھیں میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں، یہ قسمت کی خرابی نہیں، یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمھیں ہم سے ملا دیا ہے۔ اب تو تم جو کچھ بھی مانگو گے ہم سے ہم دینے کو تیار ہیں۔ تمھاری دوستی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے تو ہمارے بڑے تمھارا ہر مطالبہ تسلیم کر لیں گے۔" دربان نے مسرور لہجے میں کہا۔

شاید اسے یہ یقین ہو گیا تھا اب کہ میں اس کی پیش کش قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤں گا۔ اس نے اگر ایسا سوچا تھا میرے بارے میں تو یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس تک میری جو شہرت پہنچی تھی اس کے پیش نظر اسے ایسی ہی توقعات وابستہ کرنا چاہیے تھیں میری ذات سے اور ابھی میں خود بھی اسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر! اپنے دل سے سارے وسوسے نکال دو۔ اور جا کر گل زمان کو رسی تلاش کر کے دے دو کوئی مضبوط سی۔ بس اب مزید کوئی بات نہیں ہوگی، جلدی کرو، ہری اپ۔"

ڈاکٹر نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور سر جھٹک کر بولا۔ "یہ برابر میں، مریضوں والے کمرے میں ایک نائیلون کی رسی الگنی کے طور پر بندھی ہے۔ اسے کھول لاؤ جا کر۔"

خان نے اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے گل زمان سے کہا۔ "ان لوگوں کا خیال رکھنا۔ میں خود جاتا ہوں اور رسی لے کر ابھی آتا ہوں۔"

گل زمان نے ریوالور نکال کر ان دونوں کو نشانے پر لے لیا۔ خان دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر ادھر چلا گیا۔ ملک کو اب پوری طرح ہوش آ چکا تھا اور بیٹھا ہوا آنکھیں پھاڑے زمین پر بے حرکت پڑے شاہ کو تک رہا تھا۔ پھر وہ دربان کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ "یہ.... یہ کیا ہے....؟ اسے کس نے مارا ہے...؟ یہ زندہ ہے یا....!" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے تکنے لگا۔

دربان نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "ارے، ملک صاحب! کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ یہ کون ہیں؟" اس نے میری طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "دیکھا نہیں آپ نے انھیں۔ یہ غلام جیلانی ہیں، لاہور والے غلام جیلانی۔ ڈاکٹر دشمن والے۔"

ملک نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرانی سے بولا۔ "کیا... کیا ...کہا، غلام جیلانی! یہ غلام جیلانی ہے؟"

میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "ہاں، میں غلام جیلانی ہی ہوں۔ اچھی طرح دیکھ کر پہچان لو مجھے۔ آئندہ ملاقات

کے موقع پر کام آئے گی یہ شناسائی تمھارے۔ دوسروں کو بھی حلیہ بتا دینا میرا تاکہ وہ بھی میرے راستے سے بچ کر نکل جایا کریں۔"

دربان بولا۔ "میں نے آپ کی اور اپنی جاں بخشی کے عوض انھیں ایک چھوٹی سی رقم کی پیش کش کی ہے، اگر یہ مان لیں تو۔"

اسی وقت خان ایک لمبی سی رسی لے کر واپس آ گیا۔ میں نے اسے دربان کو باندھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً اسے جکڑ کے باندھنا شروع کر دیا۔ میں آگے بڑھ کر ملک کے پاس جا پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر اس کی رگِ احساس مسل ڈالی۔ میرے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ ایک بار پھر زمین پر اوندھ گیا۔ دربان نے اسے گرتے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے، یہ ملک صاحب کو کیا ہوا؟"

میں نے اس کے شانے پر پاؤں رکھ کر اسے لڑھکا کے کروٹ کے بل کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو مرگی کا دورہ معلوم ہوتا ہے مجھے۔"

"کیا کہہ رہے ہو! پہلے تو کبھی ایسا کوئی دورہ نہیں پڑا انھیں۔" وہ متعجب ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پہلے نہیں پڑا ہو گا لیکن آج پڑ گیا ہے تو اب کیا کیا جائے۔ شاید آج ہی سے ابتدا ہوئی ہے اس کی۔ بہر حال ڈاکٹر تو موجود ہی ہے، دیکھ لے گا اسے بھی۔ ویسے سنا ہے جوتی سنگھانے سے یہ دورہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس اثنا میں خان نے اسے اچھی طرح رسی سے جکڑ دیا تھا اور اس نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی تھی۔ وجہ اس کی اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ اسے یہ جکڑ بند عارضی معلوم ہو رہے تھے، اسے یہ کامل یقین ہو چکا تھا کہ میں اس کے ذریعے کوئی بڑی رقم حاصل کرنے کے بعد اسے رہائی دے دوں گا، اور یہی بات وہ اس ملک کو بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی خود غرضی کا عالم یہ تھا کہ اس نے خون میں ڈوبے بے سدھ پڑے ہوئے شاہ کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی اب تک۔ یوں لگتا تھا اس کے انداز سے کہ شاہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو کبھی۔ میں نے خان اور گل زمان سے کہا۔ "اسے ادھر صوفے پر ڈال دو، تاکہ یہ ہم سے بات چیت کر سکے ٹھیک سے۔"

ان دونوں نے اسے اٹھا کر صوفے پر ڈال دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یارو! تم نے تو مجھے بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہنے دیا ہے۔"

"بیٹھنے لیٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ تم لیٹ کر زبان آسانی سے چلا سکتے ہو۔ کوئی دشواری نہیں ہو گی اس میں تمھیں اور نہ ہی تمھارے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گا اس طرح سے۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ دس لاکھ روپیہ جو تم دینے کی پیش کش کر رہے تھے — کیا واقعی اتنی رقم دے سکتے ہو ہمیں تم۔ اور کیا اس وقت اتنی بڑی

ہے تمھارے پاس؟" خان کے بجائے میں نے ہی اس سے وال کر ڈالا۔

"ہاں، میں نے اس سلسلے میں کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے۔ رقم میں اب بھی دینے کو تیار ہوں لیکن اتنی بڑی رقم ہر وقت ساتھ ان لیے پھرتا ہے؟"

"پھر، پھر تم یہ رقم کس طرح دے سکو گے ہمیں؟ یہ خیال رکھنا م روپیہ حاصل کیے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دیں گے تمھیں۔" مان بولا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے تم سے کہ رقم لیے بغیر تم مجھے آزاد کر دو؟" وہ ہنوز مسکراتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا صورت ہو گی اس کی وصولیابی کی اور تمھاری آزادی ی۔ کوئی ترکیب ہے تمھارے ذہن میں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، بہت آسان ترکیب ہے۔ اگر یہاں فون ہے تو اسے میرے پاس لے آؤ یا مجھے فون کے پاس لے چلو۔ میں اپنے بڑوں کو تمھاری شرائط سے آگاہ کر دوں گا۔ یہ جاننے کے بعد کہ ہم لوگ تمھارے قبضے میں ہیں، وہ ہر مطالبہ پورا کر دیں گے تمھارا۔" وہ بولا۔

"لیکن یہاں ٹیلیفون نہیں ہے اور جہاں ہے ہم تمھیں اس جگہ لے جا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ بتاؤ۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک منٹ تک وہ خاموش رہ کر سوچتا رہا۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ پھر وہ بولا۔ "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ٹیپ ریکارڈر لے آؤ میرے پاس۔ میں اس میں ان کے لیے پیغام ریکارڈ کرا دوں گا۔ پھر تم خود فون کر کے انھیں وہ پیغام سنا دینا۔"

میں نے گردن موڑ کر ڈاکٹر کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیوں بھئی ڈاکٹر! کوئی ٹیپ ریکارڈ مل سکتا ہے یہاں؟"

"مل تو جائے گا مگر اپنی رہائش گاہ تک جانا پڑے گا مجھے۔ کیا تم وہاں تک جانے کی اجازت دے سکو گے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ اتنا تو اعتبار کر ہی لیں گے تم پر ہم لیکن پھر بھی خان کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ یہ پاسبان عقل کی طرح ساتھ ہو گا تمھارے تو شیطان لعین تم پر قابو نہیں پا سکے گا۔ کیوں ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟" میں شوخی سے بولا۔

"ٹھیک ہے پھر آؤ میرے ساتھ۔" وہ مردہ دلی سے بولا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

میں نے خان کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے ایک ٹیلی فون یہاں بھی لگوا ہی لو اب ڈاکٹر! ہم جیسے لوگوں کی آمد و رفت ہو گی تو اکثر اس کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ اسے بھی ایک مستقل سلسلہ ہی سمجھو اب تم۔"

ڈاکٹر نے جاتے جاتے پلٹ کر عجیب بے بسی اور بے چارگی کے سے انداز میں مجھے دیکھا۔ مگر کچھ کہے بغیر ہی دوبارہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد دربان بولا۔ "تم نے اسے بڑے عذاب سے دوچار کر رکھا ہے۔ خوف سے اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے اس وقت۔"

"ایسے دھندے کرنے کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملنا ہی چاہیے اسے بھی۔ یوں بھی ایسے بزدل آدمی کو یہ کام زیب نہیں دیتا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ ہم نے اسے گھیرنے کے لیے بڑی زبردست پلاننگ کی تھی۔ خیال یہی تھا ہمارا کہ مجرموں اور قانون شکنی کرنے والوں کی مدد کرتا ہے تو کوئی معمولی آدمی نہیں ہو گا یہ۔ مگر اس نے تو ایک ہی جھٹکے میں گھٹنے ٹیک دیے تھے۔"

"تم یہاں دربانی کا کام کب سے کر رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں مجھے یہاں، یہی کوئی تین ساڑھے تین مہینے ہوئے ہوں گے؟" اس نے جواب دیا۔

"اچھا! پھر تو کمال ہی کیا ہے تم نے کہ اتنی جلدی ڈاکٹر کا اعتماد حاصل کر کے اس کے رازوں میں شریک ہو گئے۔" میں بولا۔

"یہ تو کوئی ایسا خاص مشکل کام نہیں تھا میرے لیے۔ ہمارا ایک آدمی میرے ملازمت حاصل کرنے کے بعد زخم لگا کر ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے آیا تھا، اس کے ایک پرانے جاننے والے کے توسط سے۔ واپس جاتے ہوئے جان بوجھ کر وہ میرے سامنے آ گیا اور ڈاکٹر کی موجودگی میں میرے ساتھ اپنی پرانی شناسائی کا اظہار کرتے ہوئے باتیں کرنے لگا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ میں اس شخص سے اچھی طرح واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قسم کے لوگ اس کے پاس کیوں آتے ہیں۔ مگر وہ میری طرف سے بالکل مطمئن رہے۔ میں اس کا یہ راز کبھی کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ ڈاکٹر کو پہلے ہی یہ فکر تھی کہ وہ کسی طرح مجھے اعتماد میں لے کر میرا منہ بند کر دے کیوں کہ اس کے سارے پرائیویٹ مریض میرے سامنے سے ہر وقت گزرتے رہتے تھے اور اسے میری طرف سے ہر دم دھڑکا لگا رہتا تھا۔"

"ڈاکٹر کو اپنے کام کے لیے آمادہ کر لینے کے بعد بھی تم نے اس کے گھر کی دربانی جاری رکھی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟"

"نگرانی۔ ڈاکٹر کی نگرانی کہ کسی وقت وہ دھوکا نہ کر سکے ہم سے۔ ہر روز اس کے بارے میں مجھے رپورٹ دینا پڑتی ہے۔"

"کیا جن لوگوں کے لیے تم کام کر رہے ہو، ان کی نظر میں تمھاری اتنی اہمیت ہے کہ وہ تمھاری خاطر دس لاکھ کی خطیر رقم دینے کو تیار ہو جائیں؟"

"اس کا اندازہ ابھی چند منٹ میں ہو جائے گا تمھیں اور

یہاں میں اکیلا ہی تو نہیں ہوں ملک صاحب اور شاہ جی بھی ہیں اور یہ دونوں بہت اہم آدمی ہیں۔ میرے یہاں رہنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ لوگ جب ڈاکٹر کے پاس مال لینے آئیں تو میں ان کی حفاظت کروں۔ یہ لوگ لڑنے بھڑنے میں اتنے ماہر نہیں ہیں کہ کسی تم جیسے آدمی سے نمٹ سکیں۔ اس لیے یہ کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔"

"لیکن تم کیسے محافظ ہو ان کے۔ اس وقت ان کی مدد کو پہنچے تھے جب یہ بالکل ناکارہ ہو کر ڈھیر ہو چکے تھے؟" میں نے طنزاً کہا۔

"مجھے یہی حکم ہے کہ جب یہ شکست کھانے لگیں اور کامیابی کی بالکل امید نہ رہے تب میں سامنے آؤں۔ اس سے پہلے میں خود کو ظاہر نہ کروں۔"

خان نے یہ اچھی بات سجھائی تھی مجھے کہ میں ان کے ذریعے ایک بڑی رقم حاصل کر کے ان لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں، ان کے مالی مسائل بڑی حد تک حل کر سکتا ہوں۔ اس نے ایک راہ سجھا دی تھی مجھے اور اب میرا ذہن اس راہ پر تیزی سے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میں دس لاکھ روپے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان آدم خوروں سے چھ گردوں کی قیمت بھی وصول کرنے کے منصوبے بنانے لگا تھا اور جب ڈاکٹر خان کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لے کر واپس آیا تو میں ایک جامع منصوبے کو آخری شکل دے چکا تھا۔ میں نے خان سے کہا۔ "خان جی! تم اس کا پیغام ریکارڈ کر دو، میں ذرا ڈاکٹر سے چند باتیں کر لوں جب تک۔ مگر یہ خیال رکھنا اس پیغام میں یہ کوئی خفیہ اشارہ نہ دے دے اپنے سرپرستوں کو۔"

"اس کی تم فکر ہی نہ کرو، اگر اس نے کوئی ایک بھی ذو معنی جملہ ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

میں ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کی میز کی طرف لے جاتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "ڈاکٹر! اپنے دل سے ہر برا خیال، ہر بدگمانی جو تمھیں میری طرف سے پریشانی میں مبتلا کر رہی ہے نکال دو۔ یقین کرو میرے عزیز تمھیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔ میں ان رذیل اور بدفطرت لوگوں کو ایک اچھا سبق دینا چاہتا ہوں اور اس کام میں تمھارا تعاون درکار ہے مجھے۔"

"میں ایک عزت دار آدمی ہوں کسی لمبے چکر میں نہ پھنسا دینا بھائی مجھے تم، بہت ڈر لگتا ہے تم لوگوں سے مجھے۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"نہیں بھئی! تم تو بس خواہ مخواہ ہی خوف زدہ ہو رہے ہو۔ تمھیں اگر کوئی نقصان پہنچانا چاہتا میں تو اب تک حشر خراب کر چکا ہوتا تمھارا۔ مگر ایسا نہیں کیا میں نے۔ تمھاری مجبوری کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی ہے البتہ ان گردہ فروشوں کو معاف نہیں کروں گا میں۔ میری اس کارروائی کے نتیجے میں جو میں کرنا چاہتا ہوں، تمھیں بھی ان سے نجات مل جائے گی ہمیشہ کے لیے۔"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو ان کے ساتھ؟ میرا کس طرح کا تعاون حاصل کرنے کی بات کر رہے ہو تم کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ تمھیں ایک گردے کے عوض کتنی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا ان لوگوں نے؟" میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

"ایک گردے کے عوض وہ مجھے ایک لاکھ روپے دینے کو کہتے تھے۔ اب پتا نہیں وہ اتنے پیسے دیتے بھی یا نہیں — مجھے تو امید نہیں تھی۔"

میں ہنس دیا۔ "تمھیں پتا ہے ڈاکٹر دھمن ایک گردہ کتنے میں فروخت کیا کرتا تھا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ کہتے تھے ڈاکٹر دھمن کو ایک گردے کے اسی ہزار دیا کرتے تھے۔ مجھے بیس ہزار زیادہ دے رہے ہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہیں وہ، میں جانتا ہوں ڈاکٹر دھمن دس لاکھ لیا کرتا تھا ایک گردے کے۔ تمھیں انھوں نے اُلّو بنانے کی کوشش کی ہے۔"

"اوہ، دس لاکھ! یقین نہیں آتا کیا تم بالکل سچ کہہ رہے ہو؟ تمھیں کیسے معلوم ہوئی یہ بات؟ کس نے بتایا تھا تمھیں؟"

"ڈاکٹر دھمن کی ایک پرانی ساتھی، لیڈی ڈاکٹر عذرا نے۔ بعد میں اس نے دھمن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اسی سے معلوم ہوا تھا مجھے۔ میرا خیال ہے یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو دھمن سے گردے خریدا کرتے تھے۔ مجھے تو یہ درمیانی لوگ لگتے ہیں۔ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق ہے شاید ان کا۔ دھمن کے جانے کے بعد ان کے پاس کوئی آدمی نہیں رہا ہو گا تو انھوں نے انھیں اس پر آمادہ کیا ہو گا کہ یہ کسی ڈاکٹر کو آمادہ کریں اس کام کے لیے۔ تم چونکہ جرائم کی دنیا میں خفیہ علاج معالجے کے لیے مشہور ہو لہٰذا انھوں نے پہلے تمھیں ہی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہو گی اور اپنی پہلی ہی کوشش میں زبردست کامیابی ہوئی انھیں۔ تم نہ صرف ان کے لیے کام کرنے پر راضی ہو گئے بلکہ جو معاوضہ انھوں نے دینے کو کہا تم نے اسے بھی بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔ ان کی دونوں طرف سے چاندی ہو گئی۔ اصل لوگوں سے کچھ نہ کچھ طے ضرور کیا ہو گا انھوں نے اور تم سے بھی فی گردہ نو لاکھ روپے بچانے کا بندوبست کر لیا، اس کا مطلب ہے اصل فائدہ یہ لوگ اٹھاتے۔ سچ کہا ہے کسی نے فاختہ کے انڈے کوّے ہی کھاتے ہیں۔"

"بڑے ذلیل لوگ ہیں بھئی! ان کے ساتھ تو بالکل بھی رعایت نہیں کرنا چاہیے۔ تم کیا کرنے کو کہہ رہے تھے ابھی مجھ سے؟"

ڈاکٹر تھا تو بے حد بزدل لیکن لالچ اور دولت کی ہوس اس میں کوٹ کوٹ کے بھر دی گئی تھی۔ یہ جاننے کے بعد کہ وہ لوگ اسے بے وقوف بنا کر لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے، اس کے سینے میں ان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اب وہ اُن کے خلاف بھرپور انداز میں میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ دکھائی دینے لگا تھا — میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً ہی اس پر ضرب لگا دی۔ میں نے کہا۔ "یہ تینوں ہمارے قبضے میں ہیں اس وقت۔ میں ان کی آزادی کے عوض دس لاکھ روپے کا مطالبہ رکھ دوں گا ان کے بڑوں کے سامنے۔ اگر انھوں نے اسے منظور کر لیا تو کوئی جگہ منتخب کر کے میں وہاں انھیں دس لاکھ روپے پہنچانے کو کہہ دوں گا۔ لیکن روپے وصول کرنے کے بعد بھی میرا ارادہ ان کو آزاد کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد تم تینوں کے گردے نکال کر محفوظ کر لینا۔ لاشیں ان کی ہم اٹھا کر لے جائیں گے یہاں سے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"لیکن ان کے گردوں کا کیا کرو گے تم؟" ڈاکٹر نے چند لمحے خاموش رہ کر سوچنے کے بعد پوچھا۔

"میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح میرا رابطہ اصل خریداروں سے ہو جائے۔ اگر میں ان سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہم فی گردہ دس لاکھ روپے کے حساب سے چھ گردے ساٹھ لاکھ میں فروخت کر دیں گے۔ اس میں سے آدھی رقم تمھاری ہو گی اور آدھی میری۔"

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ شاید ابھی سے اسے تیس لاکھ روپے اپنی جیب میں نظر آنے لگے تھے۔ اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ بولا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ تیس لاکھ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بعد میں پھر تو نہیں جاؤ گے اپنی زبان سے؟"

"نہیں، غلام جیلانی زبان دے کر پھرا نہیں کرتا کبھی، میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں جھوٹ بالکل نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو میں ان تین کے ہی نہیں، تمھارے کہنے پر تیس آدمیوں کے گردے بھی نکال کر رکھ دوں گا تمھارے سامنے۔"

"بس تو پھر بات پکی ہو گئی۔ اس کا پیغام ٹیلیفون پر سنانے کے بعد تم آکر آپریشن کی تیاری شروع کر دو۔ تمھارا وہ اسلم اور دونوں نرسیں ادھر دوسرے کمرے میں موجود ہی ہیں۔ ان کی مدد سے کام آسانی سے ہو جائے گا تمھارا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے رات کافی گزر چکی ہے، ان نرسوں کے گھر والے تو پریشان نہیں ہوں گے ان کی طرف سے۔ ایسا نہ ہو ان میں سے کوئی آدھمکے عین وقت پر۔"

"ان کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ آج کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ وہ اکثر کام کی وجہ سے رُک جاتی ہیں یہاں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر خان کے پاس واپس آ گیا۔

اس دوران وہ پیغام ریکارڈ کر چکا تھا۔ میں نے اسے چلا کر سنا۔ اس میں کوئی مشکوک بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے کسی باس کو مخاطب کر کے یہ اطلاع دی تھی اسے کہ یہاں اچانک بات بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے لاعلمی میں مشہور زمانہ غلام جیلانی کے دوست اسلم آپی کا گردہ نکالنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے جیلانی نے اسے پکڑ لیا ہے اور جب ہمارے آدمی یہاں پہنچے تو وہ بھی اس کے شکنجے میں جا پھنسے۔ انھیں بچانے کی کوشش میں، میں بھی باندھ لیا گیا ہوں۔ جیلانی ڈاکٹر کو مجبور کر کے ہمارے گردے نکلوانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے دس لاکھ روپے کے عوض اپنی اور اپنے آدمیوں کی رہائی کے لیے راضی کیا ہے۔ آگے کے معاملات آپ خود طے کر لیں اس سے۔ میں نے مطمئن ہو کر ٹیپ ریکارڈر اٹھا لیا اور ڈاکٹر سے کہا۔ "چلو ڈاکٹر! ایک بار پھر تمھیں ٹیلیفون تک چلنے کی زحمت دے رہا ہوں میں، مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے، جانا تو پڑے گا ہی وہاں ہمیں۔"

اس بار ڈاکٹر نے کوئی حیل حجت نہیں کی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ ہو لیا۔

میں نے ڈاکٹر کو اپنے آگے کر لیا اور خود اس سے چند قدم پیچھے چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولنے کو ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ وہ خود ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کھل گیا۔ ڈاکٹر ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹا۔ یہی کچھ میں نے بھی کیا تھا اور یہ ایک اضطراری فعل تھا۔ غیر متوقع طور پر اچانک دروازہ کھلنے کی وجہ سے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دو نہایت گرانڈیل قسم کے آدمی اندر گھس آئے تھے۔ دونوں کے قد چھ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے تھے۔ بدن ان کے نہایت مضبوط، بالکل فولاد سے ڈھلے ہوئے لگتے تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں ٹی شرٹس کی آدھی آستین کے نیچے پھڑپھڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انھوں نے اندر گھس کر کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ پہلے انھوں نے فرش پر پڑے ہوئے ملک اور شاہ کو دیکھا۔ انھیں دیکھتے ہی ان میں سے ایک چونک کر بولا۔ "اوہ، یہ تو شاہ جی اور ملک صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہوا ہے انھیں؟ اور یہ شاہ جی کے آس پاس فرش پر خون کیوں بہہ رہا ہے؟" وہ تیزی سے ان دونوں کی طرف لپکا۔ "اوئے کاکا! دیکھ تو انھیں۔ اس ڈاکٹر سے پوچھ اس نے کیا کر دیا ہے ان کو، یہ تو بالکل بے جان لگ رہے ہیں۔"

دوسرا شخص جسے اس نے کاکا کہہ کر مخاطب کیا تھا، غضبناک نگاہوں سے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا ہے انھیں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں انھیں دیکھ کر ہی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے پر ہلدی پھیر دی گئی ہو۔ وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولا۔ "مجھے... مجھے کچھ نہیں معلوم... میں سچ کہتا ہوں...

ہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔ ان سے..... ان سے پوچھو..... ان سے۔"

اس نے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا۔" انھوں نے ہی کچھ کیا ہے ان کے ساتھ..... شاہ جی کو تو... گو... لی..... گولی لگی ہے اس کی...۔" اس نے دربان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔" اس نے گولی چلائی تھی... شاہ جی کو بچانے کے لیے... مگر وہ گولی خود شاہ جی کو جا لگی...۔"

کاکا نے ڈاکٹر کے اشارہ کرنے پر دربان کو دیکھا۔ اسے رسّیوں میں جکڑا دیکھ کر وہ بولا۔" اسے کس نے باندھ کے ڈالا ہے یہاں؟"

دربان نے اپنی جگہ پڑے پڑے کہا۔" بہت اچھے وقت پر آئے ہو تم دونوں۔ اسے پکڑو، اس ذلیل غلام جیلانی کو، اسی نے ہمارا یہ حشر کیا ہے اور یہ ساتھی ہیں اس کے، یہ دونوں۔ انھیں باندھ کے لے چلو باس کے پاس۔ بڑے شہ زور بنے پھرتے ہیں سالے۔"

"اچھا! تو یہ غلام جیلانی ہے۔" کاکا نے مجھے سر سے پاؤں تک نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔" اور جو ادھر بیٹھا ہے تمھارے پاس وہ اسلم آپی ہوگا پھر؟ مگر یہ دونوں یہاں کیا لینے آئے ہیں؟ اور تم سے کیوں الجھ بیٹھے ہیں یہ؟ کیوں بھئی کیا بات تھی؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔" تو تم دونوں ساتھی ہو ان تینوں کے؟"

"وہ تو ہماری باتوں سے ہی پتا چل گیا ہوگا تمھیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم ان کی تلاش میں یہاں کیوں آتے؟" اس نے جواباً کہا۔

"ان گردہ فروشوں میں تمھاری حیثیت کیا ہے بھئی؟ مجھے تو تم ان کے زرخرید لگتے ہو، قربانی کے بکرے۔" میں نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔

"بک نہیں اوئے۔ میں لحاظ کر رہا ہوں تمھارا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم جو منہ میں آئے بکتے چلے جاؤ۔ زبان کو قابو میں رکھو اپنی۔ میں آدمی بہت خراب ہوں۔ منٹوں سیکنڈوں میں آدمی کا حلیہ تبدیل کر دیتا ہوں۔ شناخت باقی نہیں رہنے دیتا آدمی کی کوئی۔"

"ہشکے بھئی ہشکے۔ جی خوش کر دیا ہے تو نے تو یار اس گھڑی میرا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید اب شہ زوروں کی پیدائش کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا ہے مگر تجھ سے مل کر اپنا یہ خیال بدلنا پڑے گا مجھے اب۔ تیرے جیسے جی دار کی بڑی تلاش تھی مجھے میاں!"

وہ سمجھا کہ میں نے سچ مچ اس کی تعریف میں زمین آسمان کو ایک ہی لڑی میں پرونا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کی باچھیں پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ اسی وقت اس کے دوسرے ساتھی نے شاہ کے قریب سے اٹھ کر ہماری طرف آتے ہوئے کہا۔" کاکا! شاہ جی تو ٹُھک گئے نے بالکل ای۔" پھر وہ میری طرف مڑ کر بولا۔" ہلا بھئی جواناں کی ناں اے تیرا، گلام جیلانی۔ توں دس ایہدے نال کی ہویا سی؟"

"ہونا کی سی جواناں، بس وکت مُک گیا سی، رب دا حکم ہو گیا سی فرشتہ اجل نوں۔ ہور تے گل ای کوئی نئیں۔"

"اوئے بک نئیں اوئے، جاندا نئیں ایں توں ٹینوں، سال مُکا چھڈاں گا تیرے ہن ای ایں۔" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ گھوم گیا۔

میں اس کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کی یہ حرکت بالکل ہی غیر متوقع تھی میرے لیے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے منہ پر ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ ایسا بھرپور ہاتھ پڑا تھا کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور میں الٹ کر پشت کے بل فرش پر جا گرا۔ سنبھل کر دوبارہ اٹھا تو مجھے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میں نے ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کرتے ہوئے زمین پر تھوک دیا۔ میرا اوپر والا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہہ بہہ کر میرے منہ میں جا رہا تھا۔ غصّے سے میری کنپٹیاں جلنے لگیں اور عالم غیظ میں بے قابو ہو کر میں اس پر جا پڑا مگر اس نے مجھے دونوں ہاتھوں پر روک کر فٹبال کی طرح اچھال دیا۔ میں نے پھر سنبھل کر اس پر چھلانگ لگائی، اس بار میں نے اس کے ہاتھ کو تاکا تھا تاکہ اس پر اپنا مخصوص حربہ استعمال کر کے اسے ایک ہاتھ سے محروم کر دوں۔ میں اس حد تک تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا ہاتھ میری گرفت میں آگیا تھا مگر میں اسے اکھاڑنے کی حسرت پوری نہ کر سکا۔ جیسے ہی میں نے اس پر زور ڈال کے اسے اکھاڑنے کی کوشش کی، اس نے نہ جانے کس طرح اپنے ہاتھ کو گھمایا کہ میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر سے گزر کر دیوار سے جا ٹکرایا اور پھر کسی مُردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر ٹپک گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ پہلو کے بل دیوار سے ٹکرا کر گرا تھا جس کی وجہ سے کوئی خاص ٹوٹ پھوٹ نہیں ہو سکی تھی مجھ میں۔ یہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے مقابلہ کرنا اور اسے شکست دینا میرے بس کی بات نہیں تھی، اس بار میں نے دھوکے سے لوہے کے چنے ہی منہ میں ڈال لیے تھے اپنے اور اب وہ میرے دانت توڑے دے رہے تھے۔

میں آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ایسا لگا جیسے کوئی بھاری شہتیر زمین پر گرا ہو۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا اور یہ دیکھ کر میری آنکھیں ایک دم پوری طرح کھل گئیں کہ وہ جس نے مجھے فٹ بال بنایا تھا، زمین پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے مقابل گل زمان کھڑا مسکراتے ہوئے اسے دوبارہ اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بچے کو نیچے گرا کے چمکارتے ہوئے دوبارہ اٹھ جانے کو کہہ رہا ہو۔ گرنے والے نے تھوڑا سا اٹھ کے خون آشام نگاہوں سے گل زمان کو دیکھا اور پھر اچانک جیسے اسے کسی طاقت ور اسپرنگ نے اچھال دیا۔ وہ کئی فٹ اوپر اچھل کر نیچے آیا تو اس کے پیر سیدھے ہو کر زمین پر پڑے تھے لیکن وہ ایک پل بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ پیر زمین سے لگتے ہی وہ پھر اچھلا اور اڑتا ہوا گل زمان پر جا پڑا۔ میں نے اسے یوں خوفناک انداز میں جست کرتے دیکھ کر سمجھا تھا کہ اب وہ گل زمان کو بُری طرح رگید کے رکھ دے گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے خود اسے لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا۔ گل زمان نے اس کے فضا میں بلند ہوتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور جب وہ اس جگہ جا کر رکا جہاں ایک لمحے پہلے گل زمان کھڑا تھا تو گل زمان نے گھوم کر اس تیزی سے اس کے سینے پر لات ماری کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے جا گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ دوسری لات اس کے منہ پر پڑی، وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ پھر سر اٹھاتے ہی چہرے پر ایک اور لات پڑی، وہ اٹھتے اٹھتے پھر زمین پر گر گیا۔ گل زمان مشینی انداز میں گھوم گھوم کے لاتیں چلا رہا تھا، اسے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ رک کر اپنے حریف کی حالت یا اس کی پوزیشن کو دیکھتا، چنانچہ چوتھی بار اس کا اندازہ غلط ہو گیا کیونکہ اس مرتبہ اس کے مقابل نے اٹھنے کی کوشش کرنے کے بجائے لیٹے ہی رہنا مناسب سمجھا تھا اور جیسے ہی گل زمان کی ٹانگ اس کی طرف بڑھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ کر اوپر اچھال دیا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو اس کی اس حرکت پر اچھل کر سر کے بل نیچے جا گرتا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ گل زمان نے ہوا میں ہی الٹی قلابازی کھائی اور عین اسی جگہ سیدھا کھڑا ہو گیا جہاں ایک پل پہلے اس کا حریف پڑا تھا۔ وہ بھی کوئی فن کار ہی تھا اور اس فن کے سارے داؤ پیچ جانتا تھا۔ وہ گل زمان کو اوپر اچھالتے ہی لوٹ لگا کر اس طرف چلا گیا تھا جہاں سے گل زمان اس پر لاتیں چلا رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو گل زمان اس کے سینے پر کھڑا ہوتا اس لمحے اور جس انداز سے اس نے زوردار جھٹکے کے ساتھ اپنے پاؤں جمائے تھے زمین پر، اگر یہ پاؤں حریف کے سینے پر پڑے ہوتے تو اس کے سینے کا پنجر کڑکڑا کے اندر دھنستا چلا جاتا۔ ادھر گل زمان کے پاؤں زمین پر ٹِکے اور اُدھر اس کا مقابل اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ مگر وہ گل زمان تو یوں لگتا تھا جیسے اس کی رگوں میں پارہ بھر دیا گیا ہے۔ زمین پر اس کے پیر جمنے ہی نہیں پا رہے تھے پوری طرح اور پتا نہیں نظر اس کی کتنی تیز تھی کہ پل بھر میں اپنے حریف کی پوزیشن کا جائزہ لے لیتا تھا وہ۔ ابھی وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ گل زمان ایک پیر پر نیچے بیٹھا اور دوسرا پاؤں سیدھا تان کر چکری کی طرح گھوم گیا۔ اس کی تنی ہوئی ٹانگ بھاری لٹھ کی طرح اس کے مقابل کی ٹانگوں پر لگی اور اس کے پیر ایک بار پھر زمین سے اکھڑ گئے اور پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز..... یقین نہ کرنے کی حد تک چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ گل زمان نے پلک جھپکتے میں لیٹ کر اپنے گرتے ہوئے حریف کو دونوں ٹانگوں میں لے کر پورے زور سے اوپر اچھال دیا۔ وہ تندرست و توانا، بھاری بھرکم شخص کسی پلاسٹک کے بے جان گڈے کی طرح فضا میں بلند ہوتا ہوا کمرے کی چھت سے جا ٹکرایا۔ گل زمان کی یہ حرکت خود اس کے حریف کے لیے بھی انوکھی اور غیر متوقع تھی، وہ ایسے کسی عجوبے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ نتیجے کے طور پر گل زمان نے اسے اوپر پھینکا تو وہ اپنے اوسان گنوا بیٹھا اور چھت سے ٹکرانے کے بعد کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے نیچے آگرا۔ اتنی بلندی سے اس طرح گرنے کے بعد اس سے دوبارہ اٹھا نہیں گیا۔ اس کا ساتھی کاکا اب تک یہ مقابلہ مسکراتے ہوئے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنے ساتھی کی فتح کا کامل یقین ہو۔ اسے ساکت پڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے باعث جھپکنا بھول گئی تھیں۔ خود میں اس دلچسپ اور سنسنی خیز مقابلے کو اتنے انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے یہ تک ہوش نہ رہا تھا کہ میں فرش پر پڑا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی اس حالت کا احساس اس وقت ہوا جب گل زمان اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے کاکا کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "اب تیرا کیا خیال ہے برادر؟"

میں نے چونک کر جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔ میری کمر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اور گھٹنوں میں بھی سخت چوٹیں آئی تھیں۔ پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون بہہ بہہ کر ٹھوڑی اور گردن تک پہنچ چکا تھا جسے میں نے قمیص کی آستین سے صاف کرنے کی کوشش کی، پھر ایک ہاتھ زمین پر ٹکا کر اور دوسرا کمر پر رکھ کے آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شکر ہے کہ مجھے صرف چوٹیں ہی آئی تھیں، تمام ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ تھیں۔ اٹھنے کے بعد میں دیوار سے پشت لگا کے کھڑا ہو گیا۔ کاکا اور گل زمان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ کاکا کی آنکھیں شعلے اگلتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور اس نے اتنی زور سے اپنے دانتوں پر دانت جمائے ہوئے تھے کہ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہو گئی تھیں۔

اچانک گل زمان نے اچھل کر ہوا میں ایک الٹی قلابازی کھائی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر اپنی دونوں ٹانگیں

اس کے سینے پر دے ماریں۔ کاکا کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا اور گل زمان نے بس پل بھر میں یہ سب کچھ کر ڈالا تھا۔ حملے کی شدّت اور گل زمان کی چستی اور پھرتی نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا، کہ اس سے مقابلہ کر کے وہ اسے زیر نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ کاکا نے دوبارہ۔۔۔۔ اس کے مقابل آنے کے بجائے تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن اسے باہر نکلنا نصیب نہ ہو سکا، اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی خان نے اپنے سائلینسر لگے ریوالور سے اس کے پیروں کو نشانہ بنا دیا۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی وہ بائیں ران کے پیچھے ہاتھ رکھ کر دائیں پیر پر اچھلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن خان نے اس کے دائیں پیر میں بھی ایک گولی اتار دی۔ دوسرے پیر میں گولی لگتے ہی وہ کسی زخم کھائے ہوئے شیر کی طرح غرّا کر پلٹا اور۔۔۔۔

اندھا دھند گل زمان پر جا پڑا، مگر گل زمان نے اسے دونوں ہاتھوں پر سنبھال کر اس کے بے سدھ پڑے ہوئے ساتھی پر اچھال دیا۔ وہ چت گرا تھا اور گرتے ہی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر قلابازی کھانے والے انداز میں دوسری طرف الٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مگر اب اس کی ٹانگیں اس قابل نہیں رہی تھیں کہ وہ اس کا بوجھ سہار سکیں، چنانچہ کھڑے ہونے کے بعد اس کے گھٹنے کانپتے ہوئے جھکنا شروع ہو گئے، تکلیف کی شدت سے اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

گل زمان نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں اسے ایسا بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ فیروز نے اس کے بارے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک باقاعدہ تربیت یافتہ تخریب کار ہے، جو اب توبہ کر کے ہمارے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا تھا وہ چھاپا مار قسم کی نیم فوجی تربیت کر کے آیا ہوگا مگر اب یہ پتا چلا تھا مجھے کہ وہ کیسا زبردست فائٹر تھا۔ دو فیل تن اور فولادی اعضا رکھنے والے جوانوں کو اس نے جس خوبی اور مہارت سے زیر کیا تھا وہ اس کی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت تھا۔ اس میں شک نہیں اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اس گھڑی گل زمان نہ کود پڑا ہوتا درمیان میں تو میں اپنی یہ داستانِ حیات سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ اس گینڈے نے جس طرح مجھے اپنے ہاتھ کی ایک جنبش سے اچھال دیا تھا، اس سے میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں میری حیثیت کسی طفلِ مکتب سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے جو میرا حشر کیا تھا اس کے بعد تو میرا اس کے سامنے جم کر کھڑے ہونا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

گل زمان کے اس کارنامے پر میں اتنا مسرور تھا کہ اپنی چوٹوں اور تکلیف کو بھول کر بے اختیار اس کی طرف لپکا اور اسے سینے سے لگا کر اس کی پشت تھپکتے ہوئے بولا۔ "واہ یار گل زمان! تُو تو بڑا شیرِ نر ہے۔ اس گھڑی! تو نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔"

خان بھی ہمارے نزدیک آ گیا۔ وہ بھی اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب تک تو تمھاری تعریفیں ہی سنتا رہا تھا آج پہلی بار تمھیں لڑتے دیکھا ہے۔ جی خوش کر دیا تم نے آج گل زمان! کوئی بہت بڑا انعام ملنا چاہیے تمھیں آج۔"

وہ انکساری سے بولا۔ "یہ سب اس میرے مولا کی مہربانی ہے جی، اور انعام ونعام کی بات ہی نہ کریں آپ۔ جس دن میں اپنے ملک کے بدخواہوں کو مٹی میں ملا دوں گا وہ دن میرے لیے خوشی کا اصل دن ہوگا۔ اور یہی میرے لیے سب سے بڑا انعام بھی ہوگا۔"

"آفرین ہے تجھ پر اور تیرے اس جذبے کو میں سلام کرتا ہوں۔ کاش ہم سب کے دلوں میں وطن کی محبت اسی طرح جاگزیں ہو سکے جیسی تیرے دل میں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کسی بدخواہ کو ہمارے وطن کی بربادی کے بارے میں سوچنے کی بھی جرأت نہ ہو کبھی۔" پھر میں نے خان سے کہا۔ "لو بھئی خان! یہ گل زمان نے تمھارے لیے چار گردوں کا اور انتظام کر دیا ہے۔ بڑے صحت مند گردے ہوں گے ان کے، میرا یہی خیال ہے۔"

خان نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو کیا اب ان دونوں کے گردے بھی نکالنے کا ارادہ ہے تمھارا؟"

"اور کیا ارادہ ہے تمھارا؟ کیا ان کی کھال ڈھول پر منڈھواؤ گے۔ مگر یہ اس کام نہیں آ سکے گی۔ آدمی کی کھال۔۔۔"

ٹانگوں سے مفلوج پڑے ہوئے کاکا نے غرّاتے ہوئے میری بات کاٹ کر کہا۔ "بکو نہیں اوئے۔ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے ہو تم لوگ۔"

"کیوں بھئی، کیوں نہیں کر سکتے ہم ایسا؟ کون روکے گا ہمیں یہ کام کرنے سے؟" میں نے اس سے چڑانے والے انداز میں کہا۔

"میں۔۔۔۔ میں تمھاری کھال۔۔۔۔ کھال کھینچ لوں گا۔۔۔۔ ذلیل آدمی۔۔۔۔ تم جانتے۔۔۔۔ نہیں ہو مجھے۔" وہ غصّے سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ ادھر اس کی زخمی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں جس کی وجہ سے زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"جانتا ہوں بچّے! اب تو بہت اچھی طرح جان گیا ہوں میں تمھیں گُتّے! دوسروں کے گردے نکال نکال کر بیچتے رہے ہو اب تک تم، اور کبھی کسی پر رحم نہ آیا تمھیں۔ اب اپنی باری آئی ہے تو بھونکنے لگا ہے۔ گردے تو اب دینا ہی پڑیں گے تجھے برخوردار۔"

"خون پی لوں گا ایک ایک کا۔۔۔۔ دیکھوں گا۔۔۔۔ دیکھوں گا میں۔۔ کون نکالتا ہے۔۔۔۔ گردے۔۔۔۔ میرے۔۔۔۔"

"اوئے چپ کر جا، جانتا ہوں خون آشاموں سے ہی تعلق ہے تیرا۔ مگر آج تو تیرا یومِ حساب ہے بچّے! تو جانتا نہیں ہے، تیری چیخ و پکار ہم پر بالکل اثر نہیں کرے گی کوئی۔ زیادہ ہلا

ہلا ہوگا تو تیرا ہی نمبر پہلے لگا دوں گا میں۔"

"کیا خیال ہے جیلانی! ایک گولی اس کے حلق میں بھی اتار دوں تاکہ بک بک بند ہو جائے اس کی؟" خان نے پوچھا۔

"گولی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے یار جی! یوں ہی میں اس کی بتّی گل کر دیتا ہوں۔" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ کہنیوں کے بل اوپر اور نفی میں زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے چیخنے لگا۔ "نہ نہیں میں قریب نہیں آنے دوں گا تمھیں۔۔۔ خبردار۔۔۔ خبردا ہاتھ نہیں لگانا مجھے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

وہ چلّاتا ہی رہ گیا۔ میں نے قریب پہنچتے ہی نیچے جھک کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور رگِ احساس مسل ڈالی اس کی۔ وہ ایک دم خاموش ہو کر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس کے دوسرے بے ہوش پڑے ہوئے ساتھی کی طرف توجّہ کی۔ بظاہر اس سے کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن کوئی بھروسا بھی نہیں تھا اس کا۔ کسی غلط موقع پر اسے ہوش آ جاتا تو وہ مصیبت بھی بن سکتا تھا ہمارے لیے۔ اسی خیال سے میں نے ایک ہلکا سا ہاتھ اس کی رگِ احساس پر بھی پھیر ہی دیا۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں صوفے پر بیٹھے بڑے ہوئے دربان کی طرف مڑا۔ اس کی حالت دیدنی تھی اس گھڑی، آنکھیں اس کی یوں پھٹی پڑی تھیں جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو یا فرشتۂ اجل اپنے سامنے کھڑا دکھائی دے گیا ہو اسے۔ منہ بھی پوری طرح کھلا ہوا تھا اس کا۔ لگتا تھا اس نے ابھی چند لمحے پہلے جو کچھ دیکھا تھا یہاں، اس پر یقین نہ آ رہا ہو اسے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب قدم بڑھا کر کہا۔ "کیا حال ہے بچّے تیرا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟ ویسے یہ بات تو نے ٹھیک ہی کہی تھی ان دونوں سے کہ بہت اچھے موقع پر آئے ہیں وہ یہاں۔ تیرا یہ خیال غلط نہیں تھا۔ مجھے پورا پورا اتفاق ہے تیری اس بات سے۔ اگر وہ اس سمے نہ آتے اور انھیں تھوڑی سی دیر ہو جاتی یعنی ایسے وقت آئے ہوتے وہ جب ہم کہیں اور مصروف ہوتے تو میرے یار تُو تو مچھلی کی طرح پھسل کر نکل جاتا ہمارے ہاتھوں سے۔ کیوں میرے ویر، غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا میں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی مجھ سے۔ ایسا ہرگز نہیں سمجھتا تھا میں تمھیں۔ یہ ہمارے بہترین آدمی تھے دونوں، آج سے پہلے کوئی انھیں زمین کی طرف جھکا تک نہیں سکا تھا۔"

"ہاں بیٹے! ایسا ہی ہوتا ہے۔ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہیں گزرتا اسے سب بونے ہی لگتے ہیں مگر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر سیر کا غرور توڑنے کے لیے کہیں نہ کہیں سوا سیر موجود ضرور ہوتا ہے۔ یہ واسطہ پڑنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے آدمی کو۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے جیلانی! آدمی کو اس کا غرور کھا جاتا ہے۔ تکبّر نے ہی عزازیل کو شیطان لعین بنا یا تھا۔"

مَیں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آئیں جی ڈاکٹر صاحب! لعنت بھیجیں ان پر اور چلیں اپنا کام کریں چل کر۔ اب تو ہماری پوزیشن کچھ اور بھی مضبوط ہو گئی ہے، اب ہم دس کے بجائے بیس لاکھ کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں ان کے سرپرستوں سے۔"

"کیا مطلب! کیا تم اب بھی انھیں فون کر کے اپنا مطالبہ رکھو گے ان کے سامنے؟" ڈاکٹر نے قدرے حیرانی سے کہا۔

میں ہنس کر بولا۔ "کیوں بھئی، اب ایسی کون سی بات ہو گئی ہے کہ اپنا ارادہ تبدیل کر دوں میں؟ حیرانی کس بات پر ہے تمھیں؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس وقت تمھاری حالت اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے مجھے۔ شاید کمر میں چوٹ آئی ہے تمھارے، جس کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونا بھی دشوار ہو رہا ہے تمھارے لیے۔ اس حالت میں تم چلنے میں دشواری نہیں محسوس کرو گے؟"

"او چل میاں! کیسی زنانیوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ ایسا ہی گل اندام، نازک بدن دکھائی دیتا ہوں میں تجھے کہ اتنی معمولی معمولی چوٹیں میرے پاؤں تھام کر چلنے پھرنے سے روک دیں مجھے؟ ان میں سے نہیں ہوں میں جن کے پاؤں فرشِ مخمل پر بھی چھلنے لگتے ہیں، ان قدموں کو تو سنگلاخ چٹانیں اور خاردار راہیں بھی نہیں روک سکی ہیں آج تک۔"

میں نے آگے بڑھ کر نیچے پڑا ہوا ٹیپ ریکارڈر اٹھا لیا۔ ڈاکٹر نے مزید کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس کے سوا دُور دُور تک کوئی ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ شام کی سیاہی پھیلنے سے پہلے ہم گھر سے نکلے تھے اور اب تک کسی جگہ سکون سے بیٹھ کر سانس لینے کا موقع بھی میسّر نہ آ سکا تھا۔ حادثات اور واقعات کی ایک ایسی چیز میں الجھ کر رہ گیا تھا میں جس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا میرے۔ ساری خلقت خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ ایک پُرہنگام دن گزار کر لوگ اپنے اپنے بستروں میں لیٹے آنے والے دن کی ہنگامہ خیزیوں کے لیے خود کو تازہ دم کر رہے تھے اور ایک میں تھا جس کے لیے رات اور دن میں کوئی تمیز ہی نہیں رہی تھی۔ حالات کا بھنور مجھے مسلسل چکرا تا پھر رہا تھا اور میں ایک

بے دست و پا مفلوج انسان کی طرح اس بھنور سے نکل ہی نہیں پاتا تھا۔ یہی میری تقدیر تھی، اسی خم پارہ تقدیر نے ایک ایک کرکے میرے سارے بال و پر نوچ پھینکے تھے۔ قوتِ پرواز سے بالکل محروم کرکے رکھ دیا تھا اس نے مجھے۔ جب بھی اڑنے کی کوشش کرتا تھا، اچھل کر کسی راندن میں جا گرتا تھا۔

اپنی خواب گاہ میں آکر ڈاکٹر نے ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ ادھر بھی شاید لوگوں کی آنکھوں سے نیند اڑی ہوئی تھی، ان کے چار آدمی ہماری طرف آکے واپسی کا راستہ گم کر بیٹھے تھے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے ہی وہ ٹیلی فون کے قریب موجود تھے، اتنی رات گزر جانے کے باوجود ان کے کان فون کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے۔ لہٰذا بیل بجتے ہی دوسری طرف سے رسیور اٹھا لیا گیا۔ ڈاکٹر نے کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد انھیں بتایا کہ غلام جیلانی ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے رسیور میری طرف بڑھا دیا۔ ”ہیلو دوست! کیا حال ہے تمھارا؟ مجھے تو جانتے ہی ہو نا تم۔ اخبار والوں نے بڑا نام اچھالا ہے میرا؟“ میں نے رسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔

”تم وہ لاہور والے غلام جیلانی تو نہیں ہو؟ جس کی پولیس کو تلاش ہے؟ اخباروں میں تو اکثر اسی کا نام پڑھا ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”بالکل ٹھیک سمجھے ہو تم، میں وہی غلام جیلانی ہوں پیارے جس کا ایک گردہ ڈاکٹر دھمن نے تمھارے ہاتھ بیچا تھا کبھی۔“

”کیا بکواس ہے یہ، دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمھارا؟ کسی آدمی کا گردہ ہم کیوں خریدیں گے؟ آدم خور تو نہیں ہیں ہم......“

”چپ کرا وئے، صفائیاں پیش نہ کر میرے سامنے۔ جانتا ہوں میں تم لوگوں کو خوب اچھی طرح سے اور تمھاری ضرورتوں کا بھی علم ہے مجھے۔ ڈاکٹر قاضی ساتھ ہی بیٹھا ہے میرے، اور تمھارے وہ چار بندے جو اس سے گردہ حاصل کرنے آئے تھے، انھیں بھی باندھ رکھا ہے میں نے، اب مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو، اپنے کسی بڑے کو بلاؤ، اس سے بات کرنا چاہتا ہوں میں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کن چار آدمیوں کی بات کر رہے ہو؟ ڈاکٹر قاضی کے پاس تو ملک صاحب گئے تھے اپنی دوا لینے کو۔“

”انھی کا ذکر ہے بھئی! وہ تمھارے ملک صاحب دوا تو حاصل کر نہیں سکے، بس ادھر لمبے لمبے لیٹ گئے اور ان کے ساتھ شاہ جی جو آئے تھے وہ بھی ان کے ساتھ ہی لیٹ گئے۔ شاید مقابلہ کر رہے ہیں کہ کون دیر تک بے ہوش رہ سکتا ہے۔ ان کے بعد دو ٹارزن نما آدمی آئے تھے مگر وہ ان دونوں کو بے ہوش پڑے دیکھ کر اس صدمۂ جاں کاہ کو برداشت نہ کر سکے اور وہ بھی لہرا کر ایک دوسرے پر گر پڑے، میں نے انھیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا کر آرام دہ بستروں پہ لٹا دیا ہے۔ ان کے ساتھ دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر کے دربان کو بھی وہیں پہنچا دیا ہے میں نے۔ اب آئی سمجھ کہ کیا کہہ رہا ہوں میں؟ انھی کے سلسلے میں ان کے کسی سرپرست سے بات کرنا چاہتا ہوں میں۔“ میں نے کہا۔

”اوہ...... اوہ...... تم نے کوئی زیادتی تو نہیں کی ہے ان کے ساتھ؟ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا یہ تمھارے لیے۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔

”اوئے تو کیسا الّو کا فرزند ہے بھئی۔ میں ان کے کسی سرپرست سے بات کرنے کو کہہ رہا ہوں اور تو دھمکیاں دے رہا ہے مجھے!“

”تمھیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہہ سکتے ہو...... مجھے یقین ہے تم نے کوئی چال چلی ہے ان کے ساتھ، یوں آسانی سے ڈھے جانے والے تو نہیں ہیں وہ لوگ۔ بلکہ انھیں زیر کرنے کی کوشش میں اچھے اچھوں کو برباد ہوتے ہی دیکھا ہے میں نے اب تک۔“

”یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔ آدمی کو چھوٹی موٹی کامیابیوں پر اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار نہیں ہو جانا چاہیے۔ تم نے جن اچھے اچھوں کو ان کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھا ہے ممکن ہے وہ صرف نام کے ہی اچھے ہوں اور اندر سے بالکل کھوکھلے ہو چکے ہوں۔ مجھے تو ان دونوں باڈی بلڈروں میں کوئی بھی ناقابلِ شکست چیز دکھائی دی نہیں اب تک۔“ میں نے جواباً کہا۔

”خیر، خیر...... مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ ان کے سلسلے میں کیا بات کرنا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان پانچوں آدمیوں کی کوئی قیمت ہے تمھاری نظر میں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”قیمت سے کیا مراد ہے تمھاری؟ کھل کے بات کرو۔ میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔“ وہ بولا۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا اور یہ جھوٹ اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا۔ شاید اس طرح وہ مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ حالات کا اسے اندازہ ہو چکا تھا اچھی طرح اور ان کی اہمیت کم کرکے وہ مجھے مایوسی کا شکار کر دینا چاہتا تھا تاکہ میں کوئی بڑا مطالبہ نہ پیش کر سکوں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تمھاری سمجھ خاصی موٹی معلوم ہوتی ہے مجھے۔ پھر بھی تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکے گا ایسی باتیں کرکے۔ اگر تم اپنے آدمیوں کو صحیح سلامت واپس لینا چاہتے ہو تو تمھیں بولی لگانا ہوگی ان کی۔ یہ اطلاع تمھارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ایک پارٹی دو لاکھ فی کس دے رہی ہے مجھے۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم!“ اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ ”کسی اور کو ان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ جھوٹ بولتے ہو تم۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟“ میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ”اگر تم نہیں مانتے ہو تو ٹھیک ہے، میں زیادہ اصرار بھی نہیں کروں گا۔ دس لاکھ روپے برے نہیں لگتے مجھے، میں ان سے سودا کر لیتا ہوں ان کا۔ شاید ایک دو لاکھ اور بڑھ جائیں۔“

”لیکن وہ ہیں کون لوگ؟ مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔ آخر اتنی بڑی آفر کیوں کر دی ہے انھوں نے تمھیں؟“ وہ نرم پڑ گیا تھا۔

”یہ بات کاروباری اصولوں کے خلاف ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا میں تمھیں۔ میں تو تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا ان کے بارے میں۔ اس ڈاکٹر کے دربان نے مجبور کیا تھا مجھے تم سے بات کرنے کو۔ اس کا خیال تھا تم اس پارٹی کے مقابلے میں ان لوگوں کی زیادہ قیمت دے سکو گے۔ اب تم نہیں مانتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ بیٹھے بٹھائے کے دس لاکھ بھی برے نہیں ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔“ میں نے یوں فیصلہ کن انداز میں کہا تھا جیسے بات ختم کرکے سلسلہ منقطع کرنے لگا ہوں اس سے۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”ٹھہرو، رابطہ منقطع نہ کرنا۔ تم مجھ سے کیا قیمت وصول کرنا چاہتے ہو ان کی؟“

”قیمت تم لگاؤ گے، میں کچھ نہیں بتاؤں گا اس بارے میں۔ یہ تو ایک طرح کا نیلام عام ہے جو بڑی بولی دے گا، مال اسی کے نام چھوٹ جائے گا۔ پہلی بولی دس لاکھ کی ہے اب تم جو بولی دو گے وہ میں دوسری پارٹی کو بتا دوں گا، اگر اس نے تم سے زیادہ بولی دے دی تو پھر تم سے رجوع کروں گا ورنہ بولی تمھارے نام پر ہی ختم ہو جائے گی۔ سمجھ گئے نا، اب بولی دو تم۔“

”ٹھیک ہے، میں تمھارے اس چکر کو کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ پھر بھی میں فی کس تین لاکھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے پیش کش کی۔

”اچھی بات ہے، اب تم نے شاید کچھ سمجھ داری سے کام لیا ہے۔ ہولڈ کرو، میں دو منٹ کے بعد جواب دوں گا تمھیں۔“ میں نے کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر رسیور دور کرکے ڈاکٹر سے بولا۔ ”لو بھئی ڈاکٹر! وہ پندرہ لاکھ پر تو ایک ہی جھٹکے میں آگئے ہیں۔“

ڈاکٹر کچھ پریشان نظر آ رہا تھا مجھے، بولا۔ ”میں حیران ہوں تم یہ کیا چکر چلا رہے ہو۔ اگر انھوں نے تمھارا مطالبہ مان بھی لیا تو ادائیگی کے ساتھ ہی وہ ان پانچوں کا مطالبہ بھی کریں گے تم سے۔ تم ان سب کو صحیح سلامت کس طرح پیش کر سکو گے انھیں؟ اور اگر تم نے کسی طرح انھیں موجودہ حالت میں ہی قبول کرنے پر مجبور کر بھی لیا تو پھر میں تو مارا ہی جاؤں گا بے موت۔ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟“

”اس کی تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں بتا چکا ہوں تمھیں، ان پانچوں میں سے ایک بھی آدمی کو ہم ان کے حوالے نہیں کریں گے، کسی قیمت پر بھی۔ ہم تو صرف ان سے پیسہ وصول کرنا چاہتے ہیں، زیادہ سے زیادہ۔ بڑی دولت جمع کر رکھی ہے انھوں نے گردے بیچ بیچ کر۔“

”اپنے آدمیوں کو حاصل کیے بغیر وہ ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے تمھیں۔ تم انھیں اس قدر بے وقوف کیوں سمجھ رہے ہو آخر...؟“

”تو بہت بزدل آدمی ہے یار! تجھ سے اس سلسلے میں بات کرنا ہی بے کار ہے۔ تیرے دل میں خوف بٹھا دیا ہے ان لوگوں نے اپنا۔“ پھر میں نے رسیور قریب لا کر اسے مخاطب کیا جو دوسری طرف رسیور پکڑے میرے جواب کا منتظر تھا۔ ”ہیلو! تم موجود ہو لائن پر؟“

”ہاں، میں انتظار کر رہا ہوں، بولو کیا کہتے ہو؟“ دوسری طرف سے فوراً ہی پوچھا گیا تھا۔

”چار لاکھ فی کس کی بولی آئی ہے دوسری طرف سے۔ اور اتفاق سے ان کی آپس کی کچھ باتیں بھی میرے کان میں پڑ گئی ہیں جس سے یہ اندازہ ہو گیا ہے مجھے کہ وہ ان لوگوں کو کیوں خریدنا چاہتے ہیں اور کہاں تک بولی دے سکیں گے۔“ میں نے اس کے تجسس کو ہوا دینے کو کہا۔

”مجھے بتاؤ کہاں تک بولی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اور کیوں خرید رہے ہیں ان لوگوں کو؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”حالانکہ یہ بھی کاروباری اصولوں کے خلاف ہے مگر تمھارے ساتھ اتنی رعایت کر رہا ہوں میں، میرا خیال ہے تم مستحق بھی ہو اس کے۔ تو سنو! وہ یہی کاروبار کرتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ تمھارے اور ان کے طریقۂ کار میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تم ڈاکٹروں کے پاس زیرِ علاج مریضوں کو تاکتے ہو اور وہ ایسے لوگوں کا سودا کرتے ہیں جن سے کسی کو ہمدردی نہ ہو۔ شاید ایسے لوگوں کی وہ ہر وقت نگرانی کرتے رہتے ہیں اور موقع دیکھ کر یا تو خود اچک لیتے ہیں یا اگر... وہ کہیں پھنس جائیں تو قیمتاً حاصل کر لیتے ہیں انھیں۔ دو آدمیوں کے ہمارے جال میں پھنستے ہی کوئی پندرہ منٹ بعد انھوں نے فون پر ہم سے رابطہ قائم کرکے ان کی قیمت لگا دی۔ ابھی بات چیت جاری ہی تھی ان سے کہ ڈاکٹر کا دربان بھی بے نقاب ہو کر آ پھنسا پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ دو باڈی بلڈر بھی پھندے میں آ گئے۔ اس طرح ان کے لیے بیک وقت دس گردوں کا انتظام ہو گیا۔ جن کی قیمت دو

کسی خرطومی سے دس لاکھ روپے فی گردہ کے حساب سے پورے ایک کروڑ روپے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے وہ پچیس لاکھ تو خرچ کر ہی دیں گے۔"

خرطومی کا نام سن کر اسے میری باتوں پر یقین آ گیا تھا کیوں کہ خرطومی ہی ان گردوں کا خریدار تھا۔ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ بھی اسی کے ہاتھوں گردے فروخت کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کا بھی وہی ایک گاہک تھا۔ یہ بات مجھے دھمن کے زمانے میں ہی معلوم ہو چکی تھی کہ وہ ایک گردے کے دس لاکھ دے دیتا ہے۔ چنانچہ خرطومی کا نام اور گردوں کی صحیح قیمت میری زبانی سننے کے بعد اس کے پاس شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

وہ چند ثانیے خاموش رہ کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم ہر بات سے واقف ہو چکے ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں تم یہ کہانی لے کر پولیس کے پاس نہیں جا سکتے۔ یوں بھی تم کوئی نیک نام آدمی نہیں ہو، اسی لیے ان لوگوں کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہو۔ تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ پچیس لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھیں گے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا ہے تم سے کہ وہ اس سے زیادہ نہیں بڑھیں گے۔ میں کہہ رہا تھا کہ پچیس لاکھ تو وہ خرچ کر ہی دیں گے۔ یقیناً اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں وہ لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھارے آدمی تمھیں ہی لوٹا دیے جائیں بشرطیکہ تم تیس لاکھ تک دینے کو تیار ہو۔ اس سے کم ہرگز نہیں لوں گا۔ یہ رعایت ہے تمھارے لیے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ تیس لاکھ مجھے منظور ہیں۔ اب یہ بھی بتا دو کہ رقم کی وصولی اور میرے آدمیوں کی واپسی کا طریقۂ کار کیا ہو گا؟"

"روپیہ تم میرے بتلائے ہوئے پتے پر پہنچا دو گے۔ وہاں سے جیسے ہی مجھے وصولی کی اطلاع ملے گی، تمھارے آدمی چھوڑ دیے جائیں گے۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ روپیہ وصول کرنے کے بعد تم انھیں چھوڑ دو گے؟" اس نے میری توقع کے عین مطابق پوچھا۔

"اس سوال کے لیے میں پہلے ہی تیار تھا۔" میں نے فوراً کہا۔ "اس کے لیے میری زبان پر اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہوں۔" اس نے کہا اور پھر چند لمحے کے لیے لائن پر خاموشی طاری ہو گئی۔

میں نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔ "ہیلو، کیا سوچنے لگے؟ اگر منظور نہیں ہے تو بات ختم سمجھو۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مجھے امید ہے تم کوئی دھوکا نہیں کرو گے میرے ساتھ۔ وہ پتا بتاؤ جہاں رقم پہنچانا ہے؟"

"پانچ منٹ انتظار کرو، میں دوبارہ فون کر کے تمھیں طریقۂ کار سے آگاہ کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اٹھتے ہوئے ڈاکٹر سے بولا۔ "آؤ واپس چلیں۔ پانچ منٹ کے بعد اس سے دوبارہ رابطہ قائم کریں گے۔"

"جب پانچ منٹ کے بعد یہاں پھر واپس آنا ہی ہے تو اتنی سی دیر کے لیے واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"میں اپنے دوستوں سے اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے پانچ منٹ انتظار کرنے کو کہا ہے۔"

ڈاکٹر خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ باہر آ کر وہ بولا۔ "تمھاری یہ شہرت بلا وجہ نہیں ہے جیلانی! میں اب تک یہی سمجھتا رہا تھا، پولیس خواہ مخواہ ہی معمولی معمولی مجرموں کو اہمیت دے کر بڑا بنا دیتی ہے اور یہ اخبار والے انھیں ہیرو بنا ڈالتے ہیں لیکن آج تمھارے ساتھ اتنا وقت گزارنے کے بعد اندازہ ہوا کہ میں اب تک غلط انداز سے سوچتا رہا ہوں۔ تم تو بہت حیرت انگیز آدمی ہو۔"

"نہیں یار! تمھارا وہ پہلے والا اندازہ ہی درست ہے۔ مجھ میں واقعی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دوسرے انسانوں میں نہ ہوتی ہو۔ بس ساری بات سر پر آ پڑنے والی افتاد کی ہے۔ تم کبھی غیر معمولی واقعات سے دوچار نہیں ہوئے، اس لیے تمھارے اندر پوشیدہ بے شمار صلاحیتیں کہیں دبی پڑی ہیں۔ اگر تم میرے جیسے حالات سے گزرے ہوتے تو میں تمھیں حیرت انگیز کبھی نہ لگتا۔"

"ہاں، شاید تمھاری بات ہی درست ہو۔" وہ چلتے چلتے ایک دم ٹھٹک کر چاروں طرف پھیلی ہوئی نیم تاریکی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو جلد از جلد کر کے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لیے میری کوٹھی پر دھاوا بول دیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ قصہ طول ہی پکڑتا چلا جائے گا۔ وہ ایک باقاعدہ گروہ ہے جب کہ تم صرف چار آدمی ہو یہاں، ان میں بھی ایک اتنا زخمی ہے کہ چل پھر بھی نہیں سکتا ابھی کچھ دنوں تک۔ دوسرے میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بات پولیس تک جا پہنچے۔"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ سودے بازی کے ساتھ ساتھ طاقت کا استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ خیر آؤ، ہم کچھ سوچیں گے اس سلسلے میں بھی۔"

میں واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہماری غیر حاضری کے دوران میں خان اور گل زمان نے ان سب کو باندھ کے ڈال دیا تھا۔ میں خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "میں نے انھیں تیس لاکھ روپے دینے پر راضی کر لیا ہے۔ اب اس رقم کی وصولی

کا مسئلہ در پیش ہے۔ سوچا یہ ہے میں نے کہ انھیں رقم فیروز کو پہنچانے کے لیے کہہ دوں۔ وہ رقم وصول کرنے کے بعد فون پر ہمیں خبر دے گا۔ پھر ہم مزید کارروائی کے بارے میں سوچیں گے۔ چھوڑوں گا تو میں ان میں سے ایک کو بھی نہیں لیکن میں یہاں زیادہ دیر رک کر کوئی خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتا ہوں۔ وہ یہاں یلغار بھی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ خیال صحیح ہے تمھارا۔ لیکن انھیں فیروز کی طرف بھیجنا بھی مناسب نہیں ہو گا۔ وہاں فیروز اور انور کمال کے علاوہ ہمارا ایک شکار بھی موجود ہے۔ اُدھر کا رُخ بھی نہ کرنے دو انھیں۔ رقم کی وصولی کے لیے تم کوئی اور جگہ بتا دو انھیں، وہاں وہ رقم چھوڑ کر چلے جائیں تو ہمارا کوئی آدمی بھی اسے اٹھا کر لے آئے گا اور ان پانچوں کو یہاں سے لے جانے کے لیے کسی وین کا انتظام کرنا پڑے گا۔ جس گاڑی میں ہم آئے تھے، وہ تو مناسب نہیں ہے اس کام کے لیے۔ وین کے آنے تک تو رکنا ہی پڑے گا ہم کو یہاں۔"

"ہاں، یہ مجبوری تو ہے ہمارے ساتھ۔ پھر یوں کرتے ہیں، یہاں گل زمان کو ان کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر ہم دونوں چلتے ہیں اور فون پر فیروز سے بات کرتے ہیں ..... رقم کی وصولی کے لیے جگہ کا انتخاب کر کے وہ بتا دے گا تو انور کمال کو یہ ذمے داری سونپ دی جائے گی۔"

"ہاں چلو۔ وین کا انتظام بھی وہ کر دے گا مگر وین لینے جانا مجھے ہی پڑے گا۔ اس نے یہ جگہ دیکھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر آؤ چل کر بات کرتے ہیں اس سے۔ تم اسے اس جگہ کا پتا بتا دینا۔ وین لے کر وہ خود آ جائے گا یہاں۔"

ہم گل زمان کو قیدیوں کی نگرانی پر مامور کر کے ڈاکٹر کے ساتھ ایک بار پھر اس کی خواب گاہ کی طرف چل دیے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے ڈاکٹر! آج ہماری وجہ سے تمھیں بہت تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔ رات بھی آنکھوں ہی میں کٹ گئی تمھاری۔"

"جو ہو گیا اس کا اب غم نہ کرو۔ میرے لیے تو یہ تکلیف بھی ایک طرح سے راحت ہے۔ کیوں کہ اس کے عوض مجھے ایک نہایت ہی گھناؤنے فعل سے نجات مل جائے گی۔ کیسے ذلیل کام میں پھنسا رکھے تھے یہ لوگ مجھے۔ اگر میں نجات پا گیا ان کے چنگل سے تمھاری اس کارروائی کے طفیل تو زندگی بھر احسان مند رہوں گا تمھارا۔ خدا تمھیں اپنے اس مقصد میں کامیاب کرے، میری فکر نہ کرو۔"

خواب گاہ میں آنے کے بعد خان نے ٹیلیفون اٹھا کر فیروز سے رابطہ قائم کیا۔ پھر میں نے مختصراً اسے تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد پوچھا۔ "اب تم بتاؤ رقم کہاں اور کس طرح وصول کی جائے ان سے؟"

"یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے کہو رقم ایک تھیلے میں بھر کر وہ بھٹی پارک پہنچ جائے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یعنی اس وقت رات کے تین بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ اسے ٹھیک تین بج کر پچاس منٹ پر وہاں پہنچنا ہے۔ اس وقت سے نہ ایک منٹ پہلے نہ بعد۔ وہاں ہمارا آدمی اس سے رقم وصول کر لے گا۔ وصولیابی کے ایک گھنٹے بعد اس کے آدمی اسی جگہ پہنچا دیے جائیں گے اور پھر وہ ٹھیک پانچ بجے وہاں سے اپنے آدمیوں کو لے جائے۔ اسے ہدایت کرنے کے بعد تم ان سب کو لے کر یہاں چلے آؤ۔ میں اور انور کمال دو گاڑیاں لے کر تمھارے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں گے۔ ایک گاڑی تمھارے پاس موجود ہی ہے، میرا خیال ہے تین گاڑیوں میں ہم انھیں بہ آسانی لا سکیں گے یہاں۔"

"ہاں، اگر وین کا انتظام نہیں ہو سکتا تو تین گاڑیاں اس کام کے لیے کافی ہوں گی مگر احتیاط بہت کرنا ہو گی ہمیں۔" میں نے کہا۔ پھر ڈاکٹر کو مخاطب کر کے اس سے کہا۔ "ڈاکٹر! مکان کا پتا اور اس کا محلِ وقوع بتاؤ ذرا تاکہ میں گاڑیاں منگوا سکوں یہاں تک۔"

وہ بولا۔ "گاڑیاں منگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گیراج میں ایک ایمبولینس موجود ہے، اس میں ان سب کو ٹھونسا جا سکتا ہے۔ تمھارا زخمی ساتھی ایک آدمی کے ساتھ اس کار میں آ جائے گا جس میں ڈال کر تم اسے یہاں لائے تھے۔ تم فون کر کے پروگرام طے کر لو اس سے پھر ہم نکل چلتے ہیں۔"

"ہم سے کیا مراد ہے؟ کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتے ہو؟" میں نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"ہاں، میں بھی ساتھ چلوں گا تمھارے تاکہ انھیں مجھ پر شبہ نہ ہو سکے۔ میں یہیں رہ گیا تو وہ سمجھیں گے کہ میں نے تم سے ساز باز کر رکھی ہے۔"

خان بولا۔ "ہاں جیلانی! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یوں بھی ہمارا نقصان ہی کیا ہے انھیں ساتھ رکھنے میں۔"

میں نے فیروز سے کہا۔ "لو بھئی اب تمھیں گاڑیاں لے کر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں انتظام ہو گیا ہے اس کا۔ ہم لوگ آ رہے ہیں اب۔"

"ٹھیک ہے، میں نے سن لیا ہے۔ ڈاکٹر کی ایمبولینس ہی زیادہ بہتر رہے گی اس کام کے لیے۔ اب تم جلدی روانہ ہو جاؤ وہاں سے۔"

میں نے فیروز سے سلسلہ منقطع کر کے گھڑی کی طرف دیکھا۔

اس تمام چکر میں پندرہ منٹ گزر چکے تھے جب کہ میں نے اس گردہ فروش کو صرف پانچ منٹ تک انتظار کرنے کو کہا تھا۔ لہٰذا فوراً ہی اس کے نمبر ڈائل کر کے اس سے سلسلہ قائم کیا۔ وہ منتظر ہی بیٹھا تھا۔ میں نے فیروز کی ہدایت کے مطابق اسے تین بج کر پچاس منٹ پر راجہ عزیز بھٹی پارک پہنچنے کو کہا۔ وہ بولا ”ٹھیک ہے میں رقم بھیج رہا ہوں لیکن جو رقم وصول کرے گا اس کی کچھ نشانی بتاؤ۔“

”نشانی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خود ہی تم سے رابطہ قائم کرلے گا، تمھیں اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ایک بات تم کان کھول کر سن لو اور ذہن میں بٹھالو اسے خوب اچھی طرح سے۔ اگر تم نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تو نتائج کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہوگی۔“

”تم مطمئن رہو۔ لین دین میں ہم بے ایمانی کے قائل نہیں ہیں اور امید ہے تم بھی ہمیں مایوس نہیں کرو گے۔“

میں رسیور کریڈل پر ڈال کر اٹھ گیا۔ ”آؤ بھئی ڈاکٹر، وہ ایمبولینس نکالو جلدی سے۔ اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے۔“

ایمبولینس اچھی خاصی بڑی تھی۔ ان پانچوں کو گٹھریاں بنا کر ہم نے اس میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ خان کو میں اپنے ساتھ بٹھانا چاہتا تھا مگر وہ بولا ”نہیں، تم اپنے ساتھ گل زمان کو بٹھالو، میں آبی کو کار میں لے کر چلوں گا آگے آگے۔“

”ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی۔“ میں نے کہا۔

وہ کار لے کر ہم سے دو منٹ پہلے کوٹھی سے نکل گیا۔ دونوں نرسیں اور ذیل نرس اسلم مریضوں کے لیے پڑے ہوئے بستروں پر بے خبر سو رہے تھے۔ ہم نے انھیں اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی، انھیں یوں ہی سوتا چھوڑ کر ایمبولینس میں آبیٹھے اور خان کی روانگی کے ٹھیک دو منٹ بعد میں ایمبولینس کو باہر نکال لایا۔ کوٹھی کے گیٹ سے نکلنے کے بعد میں نے ایمبولینس روک کر گل زمان سے کہا ”یار! یہ کوٹھی کا گیٹ تو بند کر دو جا کر۔ ایسا نہ ہو راستہ صاف دیکھ کر کوئی ڈاکٹر کے گھر کی صفائی کر جائے۔“

”ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ ڈاکٹر کو ہم سے تعاون پر سزا نہیں ملنا چاہیے۔“ گل زمان یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گیا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ اور عقبی حصے کے درمیان موجود چھوٹی سی کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا ”میں نے اسے گیٹ بند کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ مگر وہ گیٹ کے ساتھ کا بغلی دروازہ تو بند نہیں کر سکے گا۔“

”اللہ مالک ہے۔ میرا خیال ہے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہونے کی کوئی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رہ رہ کر تم ان کی نفسیات سے بھی کافی حد تک واقف ہو گئے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

میں ایک ہلکا سا دھماکا سن کر چونک اٹھا۔ یوں لگا تھا جیسے قریب ہی کوئی بلندی سے کودا ہو۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ گل زمان لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے اس سے پوچھا ”یہ دھماکا سنا تھا تم نے؟“

”کیا مطلب، کیسا دھماکا؟ میں نے کچھ نہیں سنا۔“ وہ حیران حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ابھی ابھی ایسا لگا تھا مجھے جیسے کوئی بلندی سے کودا ہو نیچے زمین پر۔“ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اسے بتایا۔

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا ”تو تم نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا تھا؟“

”نہیں، میں ڈاکٹر کی طرف متوجہ تھا لیکن اس بات سے دھماکے کا کیا تعلق ہے؟ یہ سوال کیوں کیا تم نے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”تعلق یہ ہے کہ وہ دھماکا جس نے تمھیں پریشان کر دیا ہے، میرے ہی کودنے کا تھا۔ میں نے گیٹ کو پھلانگ کر عبور کیا ہے۔ کیونکہ اگر میں بغلی دروازہ کھول کر باہر آتا تو پھر وہ دروازہ بند کرنا مسئلہ بن جاتا۔ چنانچہ میں نے ہائی جمپ کی مشق کر ڈالی۔“

میں نے ایک نظر کوٹھی کے گیٹ کو دیکھا جو کسی طرح آٹھ فٹ سے کم بلند نہیں تھا۔ پھر گل زمان کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا ”کمال ہے بھئی۔ اتنے اونچے گیٹ کو تم نے چھلانگ لگا کر عبور کیا ہے! یقین نہیں آتا۔ بڑی حیرت کی بات ہے یار یہ تو!“

”آپ شاید بھول گئے ہیں، میں نے خصوصی تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میں پندرہ فٹ تک چھلانگ لگا سکتا ہوں۔“

میں نے ایمبولینس آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں ایسا نہیں سمجھتا تھا تمھیں۔ اب ایک ایک کر کے تمھارے جوہر کھل رہے ہیں اور میں حیران ہو رہا ہوں۔“

وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر نے

ہنستے ہوئے کہا ”کیسے عجیب آدمی ہو بھئی تم بھی۔ یہ تمھارے ساتھی ہیں اور تم ان کی صلاحیتوں تک سے ناواقف ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم لوگوں کا ساتھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔“

”تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے ڈاکٹر! ان سے متعارف ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”حیرت ہے، اتنی سی دیر کی شناسائی میں تم لوگ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے ہو جیسے برسوں کا ساتھ ہو تمھارا!“ ڈاکٹر بولا۔

”ہاں جب دو آدمیوں کا مقصد ایک ہی ہو تو انھیں آپس میں گھلنے ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ڈاکٹر!“ گل زمان نے جواب دیا۔

سامنے سے کوئی کار گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی ہیڈلائٹ سے خارج ہونے والی تیز روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا۔ میں نے جلدی سے ایمبولینس ایک سائڈ پر کر کے اسے گزرنے کے لیے راستہ دے دیا اور اس کی طرف دھیان دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ گلی کا موڑ کاٹتے ہی میری نظر کچھ دور کھڑی ہوئی اس کار پر پڑی جس میں خان، آبی کو لے کر روانہ ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کے برابر میں ایمبولینس روک کر کار کے اندر جھانکا۔ ایمبولینس کے رکتے ہی خان کار سے نکل کر میرے قریب آتے ہوئے بولا ”تم نے اسے دیکھا؟“

”کسے؟ کس کی بات کر رہے ہو بھائی! ذرا وضاحت سے بات کیا کرو مجھ سے۔ پہیلیاں نہ بجھوایا کرو۔“ میں نے کہا۔

”وہ کار جو ابھی ابھی اسی گلی میں داخل ہوئی ہے، اس کی بات کر رہا ہوں میں؟“ خان نے گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں، دیکھی تھی وہ کار میں نے۔ کیا کوئی خاص چیز نظر آئی تھی تمھیں اس میں؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو اس میں ہمارے قیدیوں کے حمایتی ہی ہیں اور یقیناً ڈاکٹر کی کوٹھی پر دھاوا کرنے گئے ہیں۔“

”اچھا! میں نے تو دھیان ہی نہیں دیا تھا اس کی طرف۔ یہ تو بہت غلط بات ہو گئی ہے یار! وہاں کوئی گڑبڑ نہ کر دیں وہ. ڈاکٹر کے گھر والوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس چل کر دیکھنا چاہیے انھیں۔“ میں نے فکرمندی سے کہا۔

”یہ ایمبولینس یہیں کھڑی رہنے دو اور آبی کو بھی اسی میں منتقل کر دیتے ہیں ہم۔ اگر وہاں ہنگامہ ہوا تو آبی کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گا ہمارے لیے۔“ خان نے تجویز پیش کی۔

میں اور گل زمان تیزی سے ایمبولینس سے باہر آگئے۔ پھر اسی تیزی سے آبی کو ایمبولینس میں منتقل کرنے کے بعد تینوں کار میں جا گھسے۔ خان نے کار ریورس کر کے گلی میں موڑ دی مگر اس نے کار کی تمام روشنیاں گل کر دیں تھیں۔ دور ہی سے ہم نے ایک گہرے رنگ کی کار کو ڈاکٹر کی کوٹھی کے سامنے کھڑے دیکھ لیا۔ گیٹ پر کافی روشنی تھی، اس روشنی میں ہمیں وہ دو آدمی بھی نظر آگئے جو گیٹ کے پاس کھڑے یہ اندازہ کر رہے تھے کہ گیٹ کو کھلوائے بغیر ان کے لیے کوٹھی میں داخل ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ ہماری کار کی آمد کا انھیں احساس تک نہ ہو سکا۔ خان نے اپنی کار ان کی کار کے ساتھ لگا کر روک دی۔ ان کی کار میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ میں نے کار سے اتر کر اس کا دروازہ بند کیا تو وہ چونک کر پیچھے پلٹے اور حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ انھوں نے اپنے ریوالور نکال لیے جن پر سائلینسر چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ریوالوروں کو نظر انداز کر کے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”نہ..... نہ..... گولی نہ چلا دینا کہیں۔ میں کسی خطرناک ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ مجھے ابھی جلد از جلد ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میری بیوی ان کے زیر علاج ہے اور اس وقت وہ بہت تکلیف میں ہے، میں بہت دیر سے فون کر رہا تھا مگر یہاں کوئی اٹھا ہی نہیں رہا ہے فون۔ تنگ آکر مجھے خود ہی آنا پڑا ہے۔“

”اچھا اچھا۔ معاف کرنا بھائی ہم ڈر گئے تھے، اس لیے یہ ریوالور نکال لیے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم بھی ڈاکٹر کو لینے ہی آئے ہیں۔ ہم نے بھی پہلے ٹیلی فون ہی پر بات کرنے کی کوشش کی تھی ڈاکٹر سے اور جب کسی نے اِدھر سے فون نہیں اٹھایا تو خود چلے آئے۔ اب یہاں بھی کئی بار بیل بجا چکے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اندر ہے ہی نہیں۔ کمال ہے! چوکیدار کو تو ہونا چاہیے تھا کم از کم۔“

”میرا خیال ہے ڈاکٹر گھر میں موجود نہیں ہے شاید۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی ہے کہ آخر یہ ڈاکٹر اکثر راتوں کو غائب کہاں ہو جاتا ہے؟“

ان دونوں نے میری طرف سے مطمئن ہو کر اپنے اپنے ریوالور واپس رکھ لیے تھے۔ میں باتیں کرتے ہوئے ان کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔ تھے تو وہ دونوں ہی دُبلے پتلے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے [illegible] کی تیلیوں سے ان کے پتلے بنا کر انھیں سوٹ

پہنا دیے گئے ہوں۔ لیکن اپنے انداز اور شکل وصورت سے وہ پکے بدمعاش لگتے تھے اور ان کی ساری بدمعاشی ان سائلینسر لگے ریوالوروں کی مرہونِ منت تھی جو انھوں نے اپنے اپنے کوٹ کے نیچے شاید بغلی ہولسٹروں میں لگا رکھے تھے۔ میں نے ان کے قریب جاتے ہی دونوں ہاتھوں میں دونوں کے گریبان تھام لیے اور انھیں ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا لیا۔ وہ دونوں میری اس حرکت پر بوکھلا اٹھے تھے اور مچل مچل کر خود کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "ارے ارے... یہ کیا بدتمیزی ہے بھئی... چھوڑو ہمیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا ہاں!"

میں نے انھیں کچھ اور اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو سچ سچ بتا دو یہاں کیا کر رہے تھے ابھی تم؟"

"آپ جیسی چاہیں قسم لے لیں جی، جھوٹ بالکل نہیں بولا ہے ہم نے۔" وہ دونوں بیک زبان بول رہے تھے۔

"ایک ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ریوالور ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے دانت بھینچ کر غرّاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جی بس رات کا وقت ہے نا۔ اپنی حفاظت کے خیال سے ساتھ لے آئے تھے ہم یہ ریوالور۔" انھوں نے جواب دیا۔

میں نے ان دونوں کو زور زور سے جھنجوڑ کر ان کے سر آپس میں ٹکرا کے کہا "بکو نہیں الو کے۔ کیا ایسا ہی بچہ نظر آتا ہوں میں تمھیں کہ تمھاری ان بے سروپا باتوں سے بہل جاؤں گا۔ سچ سچ بتا دو ورنہ اپنے پیروں سے چل کر واپس نہیں جا سکو گے تم دونوں!"

دونوں کے سر اس زور سے ٹکرائے تھے کہ یقیناً چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے ان پر۔ ان میں سے ایک انکساری سے بولا "دیکھیں جی، ہم نے آپ کے ساتھ تو کوئی زیادتی بھی نہیں کی ہے۔ پھر بھی آپ ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوئی نا جی!"

اس عرصے میں خان اور گل زمان بھی گاڑی سے اتر کر میرے قریب آ گئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو خان کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا "لو بھئی معلوم ہوتا ہے یہ یوں نہیں کھولیں گے زبان اپنی۔ انھیں اپنے ساتھ لے چلو اور الٹا لٹکا کے کھال اتارلو ان کی!"

ان دونوں کو دیکھ کر بالکل ہی ان کے دیوتا کوچ کر گئے۔ میرے پنجے میں پھنسے ہوئے شخص نے جلدی سے کہا "مجھے آرام سے کھڑا تو کرو۔ میں اب سب کچھ سچ بتا دوں گا تمھیں۔ یقین کرو ہم یہاں کسی بری نیت سے ہرگز نہیں آئے ہیں!"

میں نے اسے زمین پر ٹکا کر کہا "بکو جلدی سے۔ بُری نیت سے نہیں آئے تھے تو کیا فاتحہ خوانی میں آئے تھے، یہ ریوالور لے کر؟"

"وہ جناب! بات یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے پرانے جاننے والے ہیں۔ اکثر ہنگامی حالات میں ان کی مدد حاصل کرنے آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ایک پھڈے میں ہمارا ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ ہم اسی کو لے کر آئے ہیں اس وقت!"

"کہاں ہے وہ شدید زخمی؟" میں نے پوچھا "تم دونوں میں سے تو کوئی... معمولی سا زخمی بھی نہیں لگتا مجھے!"

"وہ اُدھر کار کی پیچھے والی سیٹ پر بے ہوش پڑا ہے۔ آپ بے شک دیکھ لیں اسے!" وہ اپنی کار کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

میں نے گل زمان سے کہا "دیکھو یار! ان کی کار میں دیکھ اسے جا کر۔ اگر غلط ہوا تو میں زبان کھینچ لوں گا ابھی اس کی!"

گل زمان نے اس کی کار کے اندر جا کر اندر جھانکنے کے بعد اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا "ہاں جی کوئی لیٹا تو ہے اندر!"

میں نے خان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا ہے یار! خواہ مخواہ ہی وقت برباد کیا ہے ہم نے اپنا!"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ان دونوں سے بولا "تمھاری قسمت اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اسی وقت تصدیق بھی ہو گئی تمھارے بیان کی۔ ڈاکٹر گھر پر نہیں ہے، وہ ایک اور پارٹی کے ساتھ ابھی چند منٹ پہلے ہی گیا ہے کہیں۔ لہٰذا اب تم بھی یہاں سے فوراً بھاگ ہی لو!" یہ کہہ کر اس نے اپنے شکار کے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کا ریوالور نکال لیا اور اسے کار کی طرف دھکیل دیا۔

میں نے بھی اپنی گرفت میں آئے ہوئے شخص کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ وہ ہمارے چنگل سے آزاد ہوتے ہی جلدی سے اپنی کار میں جا گھسے اور پھر اس تیزی سے بھاگے جیسے انھیں شبہ ہو کہ ہم کہیں اپنا ارادہ تبدیل کر کے دوبارہ نہ پکڑ لیں انھیں۔ ان کے جانے کے بعد خان نے مجھ سے کہا "آئیں بھئی چلیں۔ وہاں ایمبولینس میں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔"

ہم تینوں جلدی جلدی اپنی کار میں جا بیٹھے اور پھر خان نے پوری رفتار سے گاڑی ریورس گیئر میں ڈال کر پیچھے دوڑا دی۔ گل زمان نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا "یہ اچھا ہی ہوا جو ہم ان کے پیچھے واپس آ گئے ورنہ یہ ڈاکٹر کی فیملی کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتے!"

"ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ شاید وہ گیٹ کا جائزہ اسی لیے لے رہے تھے کہ اسے پھلانگ کر اندر داخل ہوا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ہم بروقت ہی پہنچ گئے ورنہ وہ کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو ہی جاتے!" خان نے جواب دیا۔

اس دوران کار گلی سے نکل آئی تھی۔ خان نے اسے موڑ کر ایمبولینس کے پاس جا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے جلدی سے کار سے نکل کر ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ آپی مجھے دیکھ کر بولا "کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں تھی جیلانی؟"

"نہیں یار! وہ کوئی ضرورت مند لوگ تھے۔ کسی زخمی کو لے کر آئے تھے ڈاکٹر کے پاس۔ البتہ ہم واپس نہیں جاتے تو شاید وہ کچھ پریشانی کھڑی کر دیتے اپنے... ڈاکٹر قاضی کے لیے۔ دیوار پھلانگ کر کوٹھی میں گھسنے کی کوشش میں مصروف تھے وہ۔ ہم نے بروقت پہنچ کر ان کی کوشش ناکام بنا دی!"

"میں تو اس بے ہودہ کام میں ہاتھ ڈال کر پچھتا رہا ہوں۔ سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے میرا۔ عجیب قسم کے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے جو نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات بس دندناتے ہوئے گھس آتے ہیں گھر میں۔" ڈاکٹر بے زاری سے بولا "کبھی کبھی تو آدھی آدھی رات کو آ کر اٹھوا لیتے ہیں۔ منع کرو تو خوفناک دھمکیاں دینے اور مارنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بہت تنگ ہوں میں ان کے زور زبردستی سے۔ ایک بار نجات مل جائے پھر کبھی ایسے لوگوں کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کروں گا۔ میں تو انجانے میں پھنس گیا ہوں۔ پتا ہوتا تو کبھی اس کام کے قریب بھی نہ پھٹکتا!"

"یہ سب باتیں پیٹ بھرنے کے بعد سجھائی دیتی ہیں ڈاکٹر! پیٹ خالی ہو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تو آدمی یہی چاہتا ہے کہ جیسے بھی ہو پیسہ مل جائے۔ تاکہ وہ اپنے پیٹ کا دوزخ پاٹ سکے۔ اس وقت اخلاقیات کا کوئی سبق یاد نہیں رہتا ہے آدمی کو۔ شاید یہی فطرت ہے انسان کی۔ ہزار دو ہزار میں کوئی ایک ایسا ہو گا جس کی عقل بھوک میں بھی ساتھ رہتی ہو اس کے!" میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ہاں، شاید تم بھی ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مفلسی میں عقل بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے آدمی کا۔ اس کا تجربہ ہو چکا ہے مجھے!" ڈاکٹر بولا۔

میں نے دروازہ بند کر کے ایمبولینس دوبارہ گل زمان کے حوالے کر دی اور خان کے ساتھ جا بیٹھا۔ اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے منزل کی طرف گامزن ہو گئیں۔ منزل بھی ہماری کوئی ایسی زیادہ دور نہیں تھی۔ پانچ یا سات منٹ بعد ہم فیروز کی اقامت گاہ پر موجود تھے۔ اس وقت تین بج کر بیالیس منٹ ہو چکے تھے۔ اگر ہم نے ڈاکٹر کی کوٹھی پر واپس جا کر ان دونوں آدمیوں کے ساتھ وقت نہ ضائع کیا ہوتا تو آٹھ دس منٹ پہلے ہی ہم وہاں پہنچ گئے ہوتے۔ اب ہمارے پاس صرف آٹھ منٹ رہ گئے تھے۔ ٹھیک تین بج کر پچاس منٹ پر ہم میں سے کسی ایک کو عزیز بھٹی پارک کے پاس ہی موجود ہونا چاہیے تھا تاکہ تیس لاکھ کی رقم حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہی میں نے گل زمان سے کہا "گل زمان! یار تو میرے ساتھ عزیز بھٹی پارک چل۔ ان بے جان لاشوں کو یہ لوگ پہنچا دیں گے ان کی جگہ!"

وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ میں نے اسٹیئرنگ اس کے حوالے کر کے خود اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ گل زمان نے باہر آتے ہی گاڑی کو پوری رفتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔ یہ احساس اسے بھی تھا شاید کہ ہمیں وقت سے ایک آدھ منٹ پہلے ہی عزیز بھٹی پارک پہنچنا ہے اور وقت ہمارے پاس بہت کم رہ گیا ہے۔ رات کے اس ویران سمے میں اسے سڑکیں صاف ہی مل رہی تھیں جس کی وجہ سے اس رفتار کے ساتھ ڈرائیونگ میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ سبزی منڈی پہنچ کر البتہ اسے رفتار خاصی کم کرنا پڑی۔ کیوں کہ یہاں کا کاروبار اس وقت اپنے شباب پر تھا۔ سبزیوں سے لدے ہوئے ٹرک، اونٹ گاڑیاں اور منی ٹرک جابجا کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ اشیائے خورد و نوش کے بہت سے ٹھیلے

بھی سڑک کے دونوں طرف کھڑے کر رکھے تھے لوگوں نے جن کے گرد کھانے پینے والوں کا خاصا ہجوم تھا۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ریلوے کراسنگ کو عبور کرنے کے لیے بڑھے تو آگے جانے کے لیے راستہ نہیں تھا۔ کوئی ٹرین ادھر سے گزرنے والی تھی جس کی وجہ سے گیٹ بند کر کے سڑک سے گزرنے والے ٹریفک کو روک دیا گیا تھا۔ حالاں کہ اس وقت سڑکیں بالکل ویران پڑی تھیں اور کوئی اِکّا دُکّا ہم جیسا ضرورت مند ہی اس وقت گھر سے نکلنے پر آمادہ ہو سکتا تھا یا پھر وہ جن کی صبح نصف رات گزرنے کے بعد ہوتی ہے اور جو ایسے ہی وقت کاروبار کے لیے گھر سے نکلتے ہیں جب خلقت غفلت کی نیند میں ڈوبی ہوتی ہے۔ گیٹ کے دوسری طرف سڑک پر کوئی سایہ تک نظر نہیں آرہا تھا کسی جاندار کا۔ البتہ اس طرف جدھر ہم تھے، ہمارے علاوہ ایک اور کار بالکل گیٹ سے لگی کھڑی تھی۔ روشنی ناکافی ہونے کی وجہ سے کار کے رنگ اور میک کا پتا چلانا مشکل تھا۔

ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس گل زمان نے سبزی منڈی سے نکلتے ہی بجھا دی تھیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اگر وہاں کوئی ہماری تاک لگائے بیٹھا ہو تو اسے ہماری آمد کا اس وقت تک پتا نہ چل سکے جب تک ہم اس کے سر پر ہی نہ پہنچ جائیں۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر تھی ورنہ اس سڑک پر اتنی روشنی تو تھی ہی کہ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر چلتا ہوا آدمی ایک سائے کی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم تو پھر کار میں تھے اور کار کا رنگ بھی سفید تھا اس لیے یہ سوچنا تو حماقت ہی ہوتی کہ ہماری کار دیکھی نہیں جا سکے گی۔

گل زمان نے اپنی کار پہلے سے کھڑی ہوئی کار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ میں نے برابر والی کار میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اس میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کے سوا کوئی اور نظر نہیں آیا مجھے۔ کار کے اندر کیوں کہ اس نے اندھیرا کر رکھا تھا اس لیے اس کی عقبی نشست کو ٹھیک سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہاں کوئی لیٹا ہوتا تو اسے میں بالکل نہیں دیکھ سکتا تھا اس وقت تک جب تک کہ اس کی کھڑکی کے پاس جا کر اس کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا جاتا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال نے سر ابھارا۔ میں نے گل زمان کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا: "یہ جو کار ہماری کار کے برابر کھڑی ہے، مجھے شک ہے کہ اس میں بیٹھا ہوا شخص ہماری مطلوبہ رقم لے کر آیا ہے۔"

اس نے گردن موڑ کر برابر والی کار میں بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا: "ابھی پتا چل جاتا ہے، ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو۔" پھر وہ اس شخص کو مخاطب کر کے بولا: "اے مسٹر! کیا ہمیں بتا سکتے ہو کہ عزیز بھٹی پارک کتنی دور ہے یہاں سے؟"

اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اور چند ثانیے سوچ کر بولا: "پارک تو زیادہ دور نہیں ہے لیکن یہ گیٹ بند ہونے کی وجہ سے تم وہاں وقت پر پہنچ نہیں سکو گے اب۔ کیا خیال ہے؟ میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے نا؟"

اس نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم وہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے اسے اتنی رات گئے یہاں تک دوڑ لگانا پڑی ہے چنانچہ اس نے جواب میں ایسے الفاظ استعمال کیے تھے کہ اس کا اندازہ اگر صحیح ہو تو ہم خود کو اس پر ظاہر کر دیں.... اور اگر غلط ہو تو ہم کچھ سمجھ نہ سکیں۔ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کار سے باہر آ گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "تمھارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے دوست! تین بج کر پچاس منٹ ہونے والے ہیں اور ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے تو پارک تک جانا کوئی ضروری نہیں رہا ہے اب۔ لاؤ وہ تھیلا میرے حوالے کر دو!"

"ہاں اب ضرورت تو نہیں رہی ہے اس کی، پھر بھی میں تمھاری امانت مقررہ جگہ پہنچ کر ہی تمھارے حوالے کروں گا۔ کوئی بات طے ہو جانے کے بعد اس میں ردّ و بدل اصولوں کے خلاف ہے ہمارے۔" اس نے انکار کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں!" میں نے کہا: "اگر ایسا ہے تو مقررہ وقت گزر جانے کے بعد کسی طے شدہ بات پر ہنوز قائم رہنا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ تین بج کر اکیاون منٹ پر ہم یا تو کوئی دوسرا معاہدہ کریں گے یا دوسری پارٹی سے سودا کر لیں گے۔ تم لوگوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے پابند نہیں رہیں گے ہم۔ اس وقت تین بج کر انچاس منٹ اور چالیس سیکنڈ ہو چکے ہیں۔ تمھارے پاس فیصلہ کرنے کو صرف بیس سیکنڈ ہیں۔"

اس نے جلدی سے گاڑی کے اندر روشنی کر کے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنے پیروں میں سے ایک تھیلا اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا: "ٹھیک ہے، یہ لو اور اب واپس چل کر ہمارے آدمیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔"

میں نے تھیلا اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر کہا: "اگر اس میں رقم پوری ہوئی اور تم لوگوں کی طرف سے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی تو اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد اپنے آدمیوں کو عزیز بھٹی پارک میں سے لے جانا۔ مگر خیال رہے، اس سے پہلے تم یا تمھارا کوئی بھی آدمی پارک میں یا پارک کے آس پاس دیکھا گیا تو نتائج کی ذمّے داری ہم پر نہیں ہوگی۔"

میں نے تھیلا اپنی کار میں ڈال دیا اور خود بھی اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی گل زمان نے کار ریورس گیئر میں ڈال کے پیچھے دوڑا دی اور اس سے کافی دور آنے کے بعد کار کا رُخ موڑ کر واپس ہو لیا۔ واپسی کا سفر کرتے ہوئے اس نے کار کی ہیڈ لائٹس وغیرہ دوبارہ روشن کر دی تھیں۔ سبزی منڈی سے گزر کر ہماری کار نئی نمائش سے آگے نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ گل زمان بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کو دیکھ رہا ہے مگر میں نے اس سے اس بارے میں کوئی سوال کرنے کے بجائے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر مجھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے گل زمان سے پوچھا: "کیا یہ گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے؟"

"شبہ تو ہے مجھے بھی اس پر مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اس وقت سبزی منڈی سے منی ٹرک سبزیاں وغیرہ لے کر شہر کے مختلف علاقوں کی طرف جاتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ کوئی ایسا ہی منی ٹرک ہو۔ بہرحال اگلے موڑ پر چیک کریں گے ہم اسے۔" وہ بولا۔

سینٹرل جیل کے چوراہے پر پہنچ کر گل زمان نے کار سوسائٹی کی طرف موڑ کر اس کی رفتار خاصی کم کر دی۔ اس چوراہے پر چاروں طرف بجلی کے کئی پول تھے جن میں کئی کئی ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے یہاں روشنی بھی خوب تھی۔ ہمارے موڑ کاٹنے کے بیس یا تیس سیکنڈ بعد پیچھے آنے والی گاڑی کو بھی ہم نے اسی طرف مڑتے ہوئے دیکھا مگر یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ سبزیوں کی پیٹیوں سے لدا ہوا منی ٹرک ہی تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر گل زمان نے گاڑی کی رفتار دوبارہ بڑھا دی۔

تین یا چار منٹ کے بعد گل زمان نے بائیں ہاتھ کی ایک ذیلی سڑک پر کار موڑنے کے بعد اسی جانب کے تیسرے مکان کے سامنے کار روک کر ہارن بجایا۔ میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ یہ وہ جگہ ہرگز نہیں تھی جہاں سے ہم روانہ ہوئے تھے۔ "یہ کون سی جگہ ہے بھئی؟ وہ کوٹھی تو نہیں ہے یہ جس میں ہم فیروز سے ملے تھے اور جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے قیدیوں کو پہنچایا تھا ہم نے؟"

گل زمان میری طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس کر بولا: "کوٹھی تو وہی ہے، غور سے دیکھیں تو پہچان لیں گے آپ اسے، البتہ یہ راستہ وہ نہیں ہے جدھر سے آپ پہلے آتے جاتے رہے ہیں۔ اس بار میں دوسری طرف سے لے آیا ہوں آپ کو۔"

"کمال ہے بھئی۔ یہ گورکھ دھندا سمجھ میں نہیں آرہا ہے میری۔ ایک مکان کے دو راستے، وہ بھی ایسے کہ ایک کے بجائے دو مکان معلوم ہوں، آج سے پہلے ایسا دیکھا نہیں ہے میں نے کبھی کہیں۔ یقین نہیں آرہا ہے مجھے۔" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مکان فیروز صاحب نے اس کی اسی خوبی کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔" اس نے دوبارہ ہارن بجاتے ہوئے کہا: "دراصل لینڈ لارڈ نے اسے دو حصوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ اس میں دو خاندان رہ سکیں۔ پہلے اس میں دونوں طرف دو کرائے دار تھے۔ اب پورا مکان فیروز صاحب کے پاس ہے۔ اسے انھوں نے اس وجہ سے لیا ہے کہ اگر کبھی دشمن یہاں آ گھسے اور اسے زیر کرنا ممکن نہ رہے تو ہم لوگ دوسری طرف سے بہ آسانی باہر نکل جائیں۔ اسی لیے زیادہ آمد و رفت دوسری طرف سے ہوتی ہے۔"

گیٹ ابھی تک بند تھا۔ دو بار ہارن بجانے کے باوجود کسی نے باہر جھانکا تک نہیں تھا۔ گل زمان کار کا انجن بند کر کے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا: "شاید اس طرف کوئی نہیں ہے۔" اس نے گیٹ کے قریب جا کر اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

تیسری بار گھنٹی بجانے کے بعد بغلی دروازہ کھول کر کسی نے باہر جھانکا۔ یہ انور کمال تھا۔ اس نے گل زمان کو دیکھ کر کچھ کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ گل زمان واپس پلٹ آیا۔ ابھی وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ گل زمان کار اسٹارٹ کر کے کوٹھی کے اندر لے گیا۔

میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا فیروز کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا: "لو بھئی، یہ رقم گن لو، پوری ہے بھی یا نہیں۔ اور ذرا نوٹوں کو اچھی طرح دیکھ لینا کہ سب اصلی ہی ہیں۔ ایسا نہ ہو ان گردہ فروشوں نے ہمیں پھنسانے کے لیے جعلی نوٹ تھما دیے ہوں۔"

فیروز نے تھیلے کا منہ کھول کر اسے فرش پر اُلٹ دیا۔ سو سو روپے کے نئے اور پرانے نوٹوں کی بہت ساری گڈیاں فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ یہ پوری تیس گڈیاں تھیں۔ انھیں شمار کرنے اور چیک کرنے میں اچھا خاصا وقت لگا تھا۔ اس کام سے فراغت حاصل کرتے کرتے فجر کی اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے وہ تمام روپے فیروز کے حوالے کر دیے۔ وہ میری اس فراخ دلی پر بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ میں نے اس سے قیدیوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا: "ان سب کو باندھ کر ہم نے ایک کمرے میں ڈال دیا ہے فی الحال تو۔ اب تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟

خان نے بتایا ہے کہ تیس لاکھ روپے وصول کرنے کے بعد بھی انھیں تم آزاد نہیں کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بڑے ذلیل لوگ ہیں یہ بھئی وہ، انھیں چھوڑنا گناہِ کبیرہ ہے میری نظر میں۔ میں یہ کبھی نہیں کر سکتا۔"

"ہاں ہے تو واقعی یہ بہت ذلیل حرکت۔ مجھے جب خان نے ان کے بارے میں بتایا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ ایسا بھی کوئی کر سکتا ہے کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کبھی۔ یہ کیا ہو گیا ہے یار د اس انسان کو، کس قدر گر گیا ہے یہ! کتنی پستی میں چلا گیا ہے یہ! یہ صفت تو صرف کتوں میں ہوتی ہے، وہ کسی دوسرے کتے کا وجود برداشت نہیں کرتے، صرف اس کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں جو روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیتا ہے انھیں۔ یہ لوگ تو کتوں کو بھی مات دینے پر تلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی اعضا کی تجارت کرتے ہیں اور اچھے خاصے زندہ اور صحت مند لوگوں کے دھوکے سے گردے نکال کر بیچ دیتے ہیں۔ انتہا ہے بھئی یہ تو کمینگی کی! شیطان بھی پناہ مانگتا ہے ان سے تو۔ ان کی تو بوٹیاں کر کے کتوں کی خوراک بنا دینا چاہیے انھیں۔"

"ہاں یار! بالکل ایسا ہی کرنا چاہیے ان کے ساتھ۔ کسی رعایت یا ہمدردی کے ذرا بھی مستحق نہیں ہیں یہ۔" میں نے کہا۔ "اس ذلیل دشمن اور اس کی اس نصف بہتر عالیہ کو بمشکل بھاگنے پر مجبور کیا تھا میں نے۔ خیال یہی تھا میرا کہ ان دونوں کے جانے کے بعد لوگوں کو نجات مل گئی ہے ان بد باطن لوگوں سے مگر اب یہ دوسرے ڈاکٹروں کو اس راہ پر لگانے لگے ہیں۔ بلیک میل تک کرنے لگے ہیں ڈاکٹروں کو! اب میں اس پورے گروہ کے گردے نکال کر بیچ دوں گا اور وہ پیسہ جو اس طرح حاصل ہوگا، اپنے ملک کو یہودیوں کے ایجنٹوں سے نجات دلانے کے کام میں خرچ کروں گا۔ تمھارے پاس فنڈ کی کمی ہے فیروز! اسے میں ان کے ذریعے دور کروں گا۔ تم اب اپنے کام کی رفتار بڑھا دو۔ اللہ نے چاہا تو ہم اب بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ خرطومی جو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان سے یہ ذلّت آمیز کام کراتا ہے... انھیں گردوں کے آرڈر دیتا ہے، ایک دن میں اس کے گردے بھی نکال لوں گا اور انھیں کتوں ہی کو کھلاؤں گا... تم دیکھ لینا۔"

"ایسے سفّاک لوگوں کا ایسا ہی عبرتناک انجام ہونا چاہیے۔ مجھے تم سے مکمل اتفاق ہے۔" فیروز نے میری تائید کی۔

"وہ آبی اور ڈاکٹر کہاں ہیں؟ اس ڈاکٹر کو ابھی جانے نہ دینا تم، بہت کام لینا ہیں اس سے تو ہمیں۔" میں نے کہا۔

"آبی کو آرام سے ایک کمرے میں لٹا دیا گیا ہے۔ وہ شاید سو چکے ہیں اب اور ڈاکٹر اس برابر والے کمرے میں موجود ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے، خوف سے مرا جا رہا ہے وہ۔ ایسے میں تم اس سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟" فیروز نے پوچھا۔

"یہ جو پانچ درندے ہم نے باندھ کے ڈالے ہوئے ہیں، ان کے گردے نکالنے کے لیے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے کیا ہمیں؟" میں نے کہا۔

"اوہ، تو تم یہ کام اسی ڈاکٹر سے لوگے! وہ تیار ہو جائے گا اس کام کے لیے؟" فیروز نے قدرے حیرانی سے سوال کیا۔

"کیوں تیار نہیں ہوگا؟ اسے بھی تو ان لوگوں نے مرغا بنا رکھا تھا۔ شدید نفرت ہے اس کے دل میں ان کے لیے۔ میرا خیال ہے میں اس سے اس کام کے لیے کہوں گا تو وہ خوشی خوشی تیار ہو جائے گا اور صرف گردے ہی نہیں، اندر کا سارا سامان نکال کر ڈھیر کر دے گا میرے سامنے۔ پتا نہیں ہے تمھیں ان لوگوں نے اسے پھانسنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے اس کے ساتھ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر وہ راضی ہو بھی گیا تمھارے کہنے سے تب بھی یہاں تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔" اس نے کہا۔

"کیوں بھئی، یہاں کیوں نہیں ہو سکے گا یہ کام؟ کیا قباحت ہے بھلا اس میں؟" میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"یار! اتنی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ یہ کام کسی آپریشن تھیٹر میں ہی ہو سکتا ہے جہاں تمام سہولتیں موجود ہوں آپریشن کی۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے میرے بھائی! پھر کیا یوں قصائی کی چھری سے ان کے پیٹ چاک کرنا چاہتے ہو تم؟"

"کیا ہرج ہے اس میں بھی؟ آپریشن تھیٹر اور سہولتوں کی ضرورت تو ان کے لیے ہوتی ہے جنھیں آپریشن کے بعد زندہ بھی رکھنا مقصود ہو اور ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہم تو زمین کو ان کے بوجھ سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ یوں بھی جب آدمی کے دونوں گردے نکال لیے جائیں تو اس کے زندہ رہنے کا امکان ہی کہاں رہتا ہے؟" میں نے جواباً کہا۔

"ہاں، اس کا تو خیال نہیں رہا تھا مجھے کہ تم انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عہد کیے بیٹھے ہو۔" فیروز نے کہا۔ "مگر اب تو صبح ہو گئی ہے۔ رات بھر کے جاگے اور تھکے ہوئے ہو تم بھی۔ فی الحال تو ناشتا وغیرہ کر کے نیند پوری کر لو اپنی۔"

"ناشتا تو ڈاکٹر کو بھی کرا دو بھئی، وہ مہمان ہے اب تمھارا۔ ذرا دیکھو ابھی سویا تو نہیں ہوگا وہ۔ جن حالات سے دوچار رہا ہے وہ آج رات بھر، ان حالات میں نیند کہاں آئی ہوگی اسے۔ دیکھو یار خان! بلا لو اسے بھی یہیں۔" میں نے کہا۔

فیروز ہنس کر بولا۔ "خان یہاں ہے کہاں بھائی! وہ تو اب کم از کم چھ گھنٹے سے پہلے تمھاری آواز سننے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔"

میں نے فیروز کی بات سن کر اس طرف دیکھا جہاں خان ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں ٹیڑھا میڑھا صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ پیر اس کے نیچے لٹکے ہوئے تھے اور وہ خود سوالیہ نشان بنا پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے صوفوں پر انور کمال اور گل زمان بھی نیم دراز اونگھ رہے تھے۔ میں نے کہا "یہ تو بڑا ظلم ہوا ہے یار! آج ان بے چاروں کے ساتھ۔ ساری رات بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائی میں ہی گزر گئی۔ ذرا بھی تو آرام نہیں کیا انھوں نے۔"

"اسی لیے تو میں تم سے بھی کہہ رہا ہوں کہ کچھ دیر آرام کر لو تاکہ تازہ دم ہو سکو۔ یہ ہنگامے تو خیر اب ختم نہیں ہو سکیں گے اس وقت تک جب تک کہ ہم اپنے ملک سے یہودیوں کے ایک ایک ایجنٹ کو اکھاڑ نہ پھینکیں یا پھر خود فنا نہ ہو جائیں۔"

کھڑکیوں کے شیشوں پر صبح کی سفیدی نظر آنے لگی تھی۔ باہر درختوں پر چڑیوں نے بھی چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ تھکن اور نیند کے باعث مجھے اپنی آنکھیں سلگتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ رات میں نے لزی سے بنگلے پر واپس پہنچنے کے لیے کہا تھا اس کے بعد حالات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اسے فون بھی کر سکتا۔ میرے نہ پہنچنے پر وہ نہ جانے کیا کیا خیالات باندھ رہی ہوگی اپنے دل میں۔ اس نے جبر اللہ والے معاملے میں میرے سارے خدشات دور تو کر دیے تھے لیکن رات بھر میں وہاں نہ جانے کن حوادث نے جنم لیا ہوگا۔ ایک تو جبر اللہ کی سیکرٹری کی کار کا حادثہ ہی خاصا اہم واقعہ تھا۔ حادثے کی نوعیت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جبر اللہ کی سیکرٹری اور اس کا ڈرائیور کام آ چکے ہیں۔ لیکن میرے اس اندازے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ ضروری تو نہیں ہے کہ جس حادثے میں پوری کار تباہ ہو گئی ہو، اس میں کار کے مسافر بھی ہلاک ہی ہو گئے ہوں۔ ایسے بے شمار حادثوں کی یاد میرے دل میں محفوظ تھی جن میں گاڑیاں بالکل تباہ و برباد ہو گئیں مگر مسافر معجزانہ طور پر بچ گئے۔ یا کئی مسافر بری طرح کچلے گئے اور ایک یا دو شخص اس طرح بچ گئے کہ ان کے جسم پر کہیں کوئی خراش تک نہ آ سکی تھی۔ چنانچہ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی بچ گیا ہے تو اس نے اپنے بڑوں کو تو یہ ضرور بتا دیا ہوگا کہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا اور وہ کیوں اس مقام تک پہنچا تھا جہاں حادثہ رونما ہوا۔ ان تمام باتوں کے جواب کے لیے میرا لزی سے رابطہ قائم کرنا بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے فیروز سے کہا۔ "تم ناشتے کا انتظام کرو، جب تک میں لزی کو فون کر کے اس سے دو باتیں کر لوں۔ وہاں کے تازہ ترین حالات کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے میرے لیے۔"

"ٹھیک ہے تم اس دخترِ یہود سے باتیں کرو، میں انور کمال کو جگا کر اس سے ناشتا منگواتا ہوں۔" فیروز اٹھ کر انور کمال کی طرف چل دیا۔

میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون سیٹ کے پاس جا پہنچا اور ریسیور اٹھا کر بنگلے کا فون نمبر ڈائل کرنے لگا۔

پانچویں یا چھٹی گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا تھا اور ریسیور اٹھانے والی الزبتھ ہی تھی۔ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی خمار آلود آواز سن کر میں نے کہا "کیا بات ہے لزی بیگم! کیا رات بھر جاگتی رہی ہو، جو اس وقت اتنی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی ہو؟"

میری آواز سن کر شاید اس کی آنکھوں سے ایک دم نیند اڑ گئی تھی۔ چہک کر بولی "اوہ جنابِ عالی! کہاں ہیں آپ؟ میں تمام رات آپ کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی میری، آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"میں تو خیریت سے ہوں مگر وہ اپنا آبی ہے نا، وہ خیریت سے نہیں ہے۔ بس اس کی وجہ سے میں واپس نہ آ سکا رات کو۔" میں نے بتایا۔

"اوہ، کیا ہوا ہے آبی صاحب کو؟ کل شام کو تو انھوں نے جبر اللہ جیسے سرکش کے سارے بل نکال ڈالے تھے۔ پھر یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

"یہ کوئی نئی اور عجیب بات نہیں ہے ہمارے لیے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ رات کو ہم واپس آ رہے تھے گھر کی طرف کہ راستے میں اچانک کچھ لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ اپنے انداز و اطوار سے تو وہ لٹیرے ہی لگتے تھے مجھے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی لٹیرے ہی تھے۔ ممکن ہے ہمارے کسی دشمن نے انھیں ہمیں گھیرنے کے لیے بھیجا ہو۔ آبی جوش میں آ کر ان سے جا بھڑا تھا، جس کے نتیجے میں اس کی پنڈلی میں گولی لگ گئی ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی وہ سکون سے سویا ہے تو میں نے تمھیں فون کر لیا۔" میں نے اسے ایک کہانی گھڑ کے سنا دی۔

"یہ تو بہت برا ہوا جنابِ عالی! آپ لوگ کہاں ہیں اس وقت، مجھے پتا بتائیں میں آ رہی ہوں ابھی۔" لزی نے بے تابی سے کہا۔

"یہ ایک خفیہ قسم کا کلینک ہے جہاں قانون ابھی تک داخل نہیں ہو سکا ہے۔ لہٰذا تم اس طرف نہ ہی آؤ تو اچھا ہے۔

یوں بھی اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے تک تمھارے پاس پہنچ رہا ہوں، تم گھر پر ہی رُک کر انتظار کرو میرا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے جنابِ عالی! اگر آپ نہیں چاہتے تو میں بھی آنے پر اصرار نہیں کروں گی۔ آپ آئی صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوئے بغیر انھیں تنہا چھوڑ کر ہرگز نہ آئیں۔ ان کی تیمارداری کے لیے آپ جیسے مخلص دوست کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے اس وقت۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ جس ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے، اس نے نرسیں بھی رکھی ہوئی ہیں مریضوں کی خدمت کے لیے اور وہ بڑی تن دہی سے اپنا فرض ادا کرتی ہیں۔ لہٰذا میرا یہاں رہنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ میں بس ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں آپ کے لیے ناشتا وغیرہ تیار کر لیتی ہوں اتنی دیر میں۔ ہم ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔" وہ بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں ناشتا وہاں آ کر تمھارے ساتھ ہی کروں گا۔" میں نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

فیروز نے میرے ریسیور رکھ کر پلٹتے ہی کہا۔ "تو کیا اب تم لڑکی کے پاس واپس جاؤ گے؟"

"ہاں یار بس مجھے چلا ہی جانا چاہیے اب۔ وہاں کی صورتِ حال کا صحیح اندازہ ادھر جائے بغیر نہیں ہو سکے گا۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمھیں ان کے ساتھ ہی رہ کر ان کے منصوبوں کے بارے میں صحیح علم ہو سکتا ہے۔ دشمن کے قلب میں رہنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی کو ان کی ہر حرکت اور ہر قدم کے بارے میں ٹھیک پتا چلتا رہتا ہے۔"

"اچھی بات ہے، میں ذرا ڈاکٹر سے دو باتیں کر لوں۔ پھر واپس چلا جاتا ہوں۔ ان قیدیوں کی دیکھ بھال میں غفلت نہ برتنا تم ذرا بھی اور ہاتھ پیر ان کے بالکل نہ کھولنا، بے حد خطرناک ہیں یہ لوگ۔ وقفے وقفے سے ان کے جکڑ بند کا جائزہ لیتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ انھیں ڈھیلا کر کے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں سورماؤں کو الگ کر کے دو الگ الگ کمروں میں بند کر دو۔ وہ دونوں بڑے فنکار قسم کے بندے ہیں، ان کا دوسروں کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔" میں نے فیروز سے کہا۔

"ہاں، یہ اچھی تجویز ہے تمھاری۔ میں ابھی انھیں ہٹا دیتا ہوں وہاں سے۔ بلکہ یوں کرتا ہوں کہ ڈاکٹر سے کہہ کر کوئی بے ہوش کر دینے والا انجکشن لگوا دیتا ہوں تاکہ دن بھر غافل پڑے رہیں۔" فیروز نے کہا۔

"آؤ پھر مجھے بتاؤ ڈاکٹر کو کہاں رکھا ہے تم نے؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا ہے نا، یہ برابر والے کمرے میں ہے وہ۔" فیروز میرے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ڈاکٹر آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور بولا۔ "آؤ آؤ، میں تو سمجھ رہا تھا شاید تم اب تک واپس نہیں آئے ہو۔ رقم وصول ہو گئی نا آسانی سے؟"

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، رقم تو انھوں نے پوری ادا کر دی ہے اور اب وہ اپنے بندوں کو پارک میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ بہرحال اب لعنت بھیجو ان پر، ہم تیس لاکھ روپے وصول کر ہی چکے ہیں، آٹھ دس لاکھ اور وصول کر لیں گے۔ اس کے بعد اس پورے گروہ میں سے زندہ ایک کو بھی نہیں رہنے دینا ہے ہمیں۔ اس خرطومی کو بھی ڈھونڈ کر اس کا بھی قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دینا ہے ہمیں۔ جو بڑی بڑی رقموں کے لالچ دے کر ضرورت مندوں کے ضمیر خریدتا پھرتا ہے۔ اس کا خاتمہ زیادہ ضروری ہے۔"

"لیکن یہ آٹھ دس لاکھ روپے کیسے وصول کرو گے ان سے تم جب کہ پہلے ہی معاملے میں تم نے ان سے دھوکا کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس کی پروا نہیں کرو بالکل۔ جس طرح یہ تیس لاکھ انھوں نے ادا کیے ہیں، اسی طرح مزید بھی ہنسی خوشی دے کر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ آپریشن کے ذریعے گردے نکالنے کے لیے تمھیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہو گی؟ میرا مطلب ہے سرجری کا سامان وغیرہ۔"

"تو کیا تم سچ مچ ان کے گردے نکالنا چاہتے ہو؟ یہ بہت غلط بات ہو گی، جس کام کی سزا دی ہے تم نے، وہی خود کرو گے!"

"کسی اور کے ساتھ نہیں کروں گا میں ایسا۔ اتنا بھیڑیا صفت نہیں ہوں میں۔ مگر یہ جو اب تک نہ جانے کتنوں کو ایک ایک گردے سے محروم کر چکے ہیں، انھیں میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ ان کی رسّی جو بہت دراز تھی اب کھینچ لی گئی ہے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ان پر کوئی گرفت نہیں کر سکے گا کبھی۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ کام تم مجھ سے ہی کیوں کرانا چاہتے ہو؟ کسی اور کو یہ ذمّے داری نہیں سونپ سکتے تم؟" ڈاکٹر نے ناجزی سے کہا۔

"یار کیسی باتیں کرتے ہو ڈاکٹر تم بھی۔ میں نے کوئی ڈاکٹروں کی ٹیم تو نہیں بنا رکھی ہے کہ کسی اور کو یہ ذمّے داری سونپ دوں۔ یہ کام تمھارے سوا کسی اور سے نہیں کرا سکتا ہوں میں۔ اصل مسئلہ ان گردوں کو محفوظ کرنے کا ہے۔ صرف نکالنا ہی ہوتے تو میں یک خنجر لے کر ابھی نکال پھینکتا انھیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "انھیں محفوظ کرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب تو میرے اس پرائیویٹ کلینک میں موجود ہیں۔ میں اسلم کو فون کر کے کہہ دیتا ہوں، وہ سب سامان لے کر آ جائے گا لیکن زیادہ اچھا ہوتا کہ یہ کام کسی آپریشن تھیٹر میں کیا جاتا، یہاں پوری سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کیس خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔"

"اس کی تم بالکل بھی فکر نہ کرو۔ ان میں سے کسی کی بھی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں، تمھیں ان سب کے دونوں ...... گردے نکالنا ہیں۔ پورے دس گردے جن کی اصل قیمت ایک کروڑ روپے ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے اگر ہم یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لو ہم اپنی سرزمین کو یہودیوں اور ان کے حواریوں سے پاک کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ اس مسئلے میں یہودی کہاں سے آن کودے ہیں۔ ان کو کہاں سے کھینچ لائے ہو تم یہاں؟" ڈاکٹر قدرے حیرت سے بولا۔

"یہ الگ مسئلہ ہے، اس سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے فی الحال۔ تم اس میں اپنا مغز مت کھپاؤ۔ اس اسلم سے بات کرو اور جو کچھ اس سے منگوانا ہے وہ تمام چیزیں منگوا لو اس سے۔ یہ سارے آپریشن آج ہی رات میں کرنا ہیں تمھیں۔ ان پانچ کے علاوہ ایک آدمی اور بھی ہے ہمارے پاس۔ میرا خیال ہے اس کے گردے بھی قوم و ملک کے کام آ جائیں تو اچھا ہی ہے۔ موجودہ صورت میں تو وہ بھی ایک بدنما داغ ہی ہے ملک کے لیے۔"

"وہ کون آدمی ہے بھئی، کس کی بات کر رہے ہو تم، کچھ ہمیں بھی بتاؤ اس ذاتِ شریف کے بارے میں؟" فیروز نے پوچھا۔

"وہ جسے رات کو پکڑا تھا ہم نے۔ جس کی وجہ سے آئی کو گولی کھانا پڑی ہے۔ اب اسے مہمان بنا کر تو نہیں رکھ سکتے ہم۔ اور آزاد بھی نہیں کر سکتے ہم اسے۔ باہر جانے کے بعد وہ پھر تخریب کاریوں میں مصروف ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کی تو گردن ہی مار دینا چاہیے ہمیں۔"

"ہاں، یہ بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے تم نے جیلانی! نوجوانوں کے خون میں زہر کی آمیزش کرنے والے زندہ رہنے کے حق دار نہیں ہوتے۔" فیروز مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ "انھیں تو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی مناسب ترین اقدام ہے۔"

"یارو! تم لوگوں کی باتوں نے میری عقل ہی خبط کر کے رکھ دی ہے۔ میں نے آج تک کسی جرائم پیشہ شخص کو ایسی باتیں کرتے نہیں سنا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم ہو کون آخر؟ جرائم سے تو کوئی تعلق نہیں لگتا مجھے تمھارا؟" ڈاکٹر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہم بڑے عجوبۂ روزگار لوگ ہیں ڈاکٹر! تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکیں گے ہم۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ قانون کو بھی ہماری تلاش ہے بڑی شدت سے اور بہت سے بین الاقوامی قسم کے جرائم پیشہ افراد بھی ہماری جان کے درپے ہیں۔ دونوں ہی کے لیے ناپسندیدہ ہیں ہم۔" میں نے اسے جواب دیا۔

●

فیروز اور ڈاکٹر سے رخصت ہو کر میں سیدھا جمشید روڈ کے اس بنگلے پر پہنچا جو شرافت علی نے ہمیں دے رکھا تھا۔ وہاں الزبتھ میری منتظر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ "آئیں جنابِ عالی! یہ آپ کا تو حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا ہے بالکل اور تھکے ہوئے بھی بہت معلوم ہو رہے ہیں آپ۔ پہلے غسل کر لیں، اس کے بعد ناشتا کریں اور یہ کپڑے بھی بہت گندے ہو گئے ہیں، انھیں بدل لیں۔" وہ ایک خدمت گزار بیوی کی طرح بولی۔

"بہت بہتر بیگم صاحبہ! آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔" میں نے اسے شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی حکم؟"

وہ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ مذاق نہ اڑایا کریں میرا جنابِ عالی! آپ کو زندگی کا مالک بنانے کا فیصلہ کیا ہے میں نے تو آپ کی ہر بات کا خیال رکھنا میرا فرض ہو گیا ہے۔ یوں بھی یہاں میرے سوا اور کون ہے آپ کا جو آپ کی ضروریات اور آرام و آسائش کا خیال رکھے گا۔ ایسی صورت میں تو یہ میری ہی ذمّے داری ہے نا۔"

"بالکل بالکل۔ میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ مذاق اُڑانے والی بات کیسے کہی ہے تم نے؟ یہ خیال تمھیں کیسے آیا؟ میری کس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں تمھارا مذاق اڑا رہا ہوں؟ ایسی بات پھر کبھی نہ کرنا۔"

"دیکھیں، میں آپ کو پہلے بھی سمجھا چکی ہوں یہ بات کہ آپ مجھ سے آپ جناب نہ کیا کریں۔ اس اندازِ تخاطب سے یا تو اجنبیت کا اظہار ہوتا ہے یا پھر یہ احساس ہوتا ہے مجھے کہ جیسے میرا مذاق اُڑا رہے ہوں آپ۔" وہ افسردہ سا منہ بنا کر بولی۔

"اوہ، ویری سوری۔ میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا یہ بات۔"
میں نے کان پکڑ کر اپنے منہ کو پیٹتے ہوئے کہا۔
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر ایک ادا سے بولی "ذرا بھی اچھے نہیں لگتے ہیں یہ بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہوئے آپ۔"
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "لزی! نہ جانے کیوں تمھارے سامنے آ کر میرا دل چاہنے لگتا ہے کہ کاش میں ننھا سا بچہ ہوتا۔"
وہ شوخی سے اٹھلا کر بولی "اگر آپ بچہ ہوتے جنابِ عالی! تو نہ آپ سان فرانسسکو تک پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی میں آج آپ کے ملک میں آپ کے ساتھ یوں آنے کو تیار ہوتی۔ یقین کریں زندگی کا ایسا ہم سفر مجھے کبھی بھی قبول نہ ہوتا جس کی پرورش بھی مجھے اپنے ہی ہاتھوں کرنا ہوتی۔ میں جانتی ہوں آپ کے ملک میں بعض علاقوں میں نوجوان لڑکیوں کی شادیاں شیر خوار بچوں سے کر دی جاتی ہیں۔ لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں شاید کہ میں امریکا کی شہری ہوں۔ جہاں والدین کو ایسے فیصلے کرنے کا حق بالکل نہیں ہے۔"
میں نے ہنس کر کہا "لعنت بھیجو یار! ہم کیسی غیر شاعرانہ باتیں لے بیٹھے۔ حالاں کہ تمھیں دیکھ کر شاعروں پر اچھے اچھے شعروں کا نزول ہونے لگتا ہوگا۔ کاش میں تمھاری شان میں ایک شعر ہی کہہ سکتا کبھی۔"
"عجیب دل ہے آپ کا اور بڑی عجیب عجیب خواہشیں جنم لیتی رہتی ہیں آپ کے دل میں۔ میرا خیال ہے یہ سب رات بھر نہ سونے اور شدید تھکن کا نتیجہ ہے۔ نیند کا خمار طاری ہے آپ کے دل و دماغ پر، وہی ایسے بے ربط خواب دکھا رہا ہے آپ کو۔ اب میری بات مان لیں جلدی سے باتھ روم جا کر غسل کریں۔ لباس تبدیل کریں اور ناشتا کر کے بستر پر دراز ہو جائیں۔ آپ نیند پوری کر کے تب اٹھیں گے نا..... تو سارے بخارات نکل چکے ہوں گے دماغ سے۔" لزی نے مجھے باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔
ناشتا کرتے ہوئے، لزی نے مجھ سے کہا "اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کلینک کا پتا بتا دیں مجھے جہاں آپ آپی کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ آپ کی نیند کے دوران میں ان کی خبر گیری کرنے چلی جاؤں گی اور اگر وہاں مناسب علاج اور دیکھ بھال نہ ہو سکی تو میں انھیں وہاں سے لا کر اس کلینک میں داخل کر دوں گی جہاں جیرالڈ داخل ہے۔ اس کلینک میں بہترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ موجود ہے اور تربیت یافتہ نہایت ہوشیار نرسوں کی خدمات بھی حاصل ہیں۔ دوسرے علاج ۔۔۔ پر کچھ خرچ بھی نہیں ہوگا۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے تمھارے وہاں جانے پر مگر وہ ڈاکٹر جس نے وہ کلینک اپنی کوٹھی کے ایک تہ خانے میں قائم کر رکھا ہے، اس بات کو بالکل پسند نہیں کرے گا۔ اسی کے منع کرنے پر میں نے تمھیں فون پر اس کا پتا نہیں بتایا تھا۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپی کو اس جگہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے جہاں جیرالڈ ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکے گا۔ تم جانتی نہیں ہو اسے۔"
"یہ آپ سچ کہہ رہے ہیں، میرے ذہن سے نکل گئی تھی یہ بات۔ ویسے جیرالڈ کا تو اب قصہ ختم ہی سمجھیں آپ۔" لزی بولی۔ "اور ہاں، وہ آج اخبار تو آپ نے دیکھا ہی نہیں ہوگا اب تک۔ ایک بڑی اہم خبر چھپی ہے ہمارے لیے آج کے اخبارات میں۔"
"اخبار تو میں سچ مچ نہیں دیکھ سکا ہوں اب تک۔ کون سی اہم خبر چھپ گئی، ذرا بتاؤ تو؟" میں نے پوچھا۔
"رات کو کارساز پر ایک حادثہ ہوا ہے۔ ایک سفید کرولا کو ایک بس نے بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے۔ کرولا میں ایک عورت اور ایک مرد سفر کر رہے تھے۔ دونوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ گاڑی کے کاغذات اور مرد کی جیب اور عورت کے پرس سے برآمد ہونے والے کاغذات سے پتا چلا ہے کہ کار مشہور جرمن صنعت کار الیگزینڈر کی ملکیت تھی، عورت الیگزینڈر کی سیکریٹری اور مرد اس کا ڈرائیور تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ دونوں ہی بے حد خطرناک تھے۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح کر لیں کہ محض ان ہی دونوں کی وجہ سے مسٹر آٹزک آج تک چاہنے کے باوجود الیگزینڈر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دونوں اس وقت کارساز کی طرف کیوں گئے تھے؟ انھیں تو اسپتال میں جیرالڈ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا یا آپ دونوں کی تلاش میں نکلنا چاہیے تھا۔ یہ تو انھیں پتا چل ہی گیا تھا کہ جیرالڈ کو زخمی کرنے والا کون ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ دونوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے چنانچہ انھیں جیرالڈ کا انتقام لینے کے لیے اس بنگلے کی طرف آنا چاہیے تھا۔"
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے چونک کر لزی کو دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم لوگ مجھ سے اور آپی سے جیرالڈ کا انتقام لوگے؟"
"آپ غلط سمجھے ہیں جنابِ عالی! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ جیرالڈ کے ساتھ آپی نے جو کچھ کیا ہے، اس سے مسٹر آٹزک بہت خوش ہیں۔ وہ اس سلسلے میں آپ دونوں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے بارے

میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ بلکہ وہ تو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنا چاہتے ہیں آپ دونوں کو۔ ہماری طرف سے کسی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دیں۔"
"پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ان دونوں کو ہماری تلاش میں ادھر آنا چاہیے تھا؟ یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا جب انھیں اس کا حکم دیا جاتا۔"
"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ ان کا فرض یہی تھا۔ ان دونوں کا تنظیم سے کوئی تعلق نہیں رہا کبھی، وہ جیرالڈ کے ذاتی ملازم تھے اور اس سے اس کام کی تنخواہ پاتے تھے کہ اگر کبھی جیرالڈ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے تو وہ دونوں ایسا کرنے والے کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں۔ جیرالڈ کے دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ان کی ذمے داری تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے جیرالڈ سے بگاڑ کیا ہو اور ان دونوں نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہو۔ یہی بات تو میرے لیے حیران کن ہے کہ وہ تمھارا پیچھا کرنے کے بجائے کارساز کی طرف کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے جیرالڈ کو اسپتال پہنچانے کے بعد اسے میڈیکل ایڈ دلوا دی تھی۔ یہ دونوں بھی وہاں موجود تھے۔ جیرالڈ نے ہوش میں آتے ہی انھیں بتا دیا تھا کہ اسے اس حال کو پہنچانے کا ذمے دار کون ہے۔ یہ جاننے کے بعد ہی وہ دونوں وہاں سے نکل گئے تھے۔ میں جانتی تھی کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ چنانچہ میں بھی فوراً ہی یہاں آنے کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں ایک جگہ رک کر چند منٹ ٹیلی فون پر مسٹر آٹزک سے بات کی تھی اس مسئلے پر۔ انھیں آپ کی حمایت میں دیکھ کر میں نے کھل کے آپ دونوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا مگر جب میں یہاں پہنچی تو دربان سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ اُدھر گئے ہی نہیں تھے۔"
"اگر مسٹر آٹزک ہماری حمایت نہ کرتے تو ہمارا ساتھ نہیں دیتیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔
"یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے؟" وہ چونکنا ہو کر بولی "میں آپ کا ساتھ چھوڑنے کا تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی۔"
"تم نے خود ہی کہا تھا ابھی کہ مسٹر آٹزک نے ہماری حمایت کی تو تم نے کھل کر ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔" میں نے کہا۔
"اس کا مطلب یہ تو نہیں جنابِ عالی! جو آپ نے اخذ کر لیا ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ان کی حمایت دیکھ کر میں نے کھل کر ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں اس طرح آپ کا ساتھ دیتی کہ کسی کو یہ پتا نہیں چلتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔"
"اگر ایسا ہے تو میں بھی تمھارے دل کی خلش دور کیے دیتا ہوں کہ وہ دونوں اِدھر آنے کے بجائے کارساز کیوں گئے تھے؟"
"اچھا، تو آپ جانتے ہیں اس بارے میں؟" وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"جانتا تو نہیں تھا میں لیکن تمھاری باتیں سن کر سب گتھی سلجھ گئی ہے میرے ذہن کی۔" میں نے کہا "میں بھی کل رات سے ان کے بارے میں الجھن کا شکار تھا اور ان کی دشمنی کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میری۔"
"کچھ بتائیں تو ہوا کیا تھا؟ کیسی الجھن کا شکار تھے آپ؟ کیا آپی کو انھی لوگوں نے زخمی کیا ہے؟" لزی بے چینی سے بولی۔
"نہیں، آپی کے زخمی ہونے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ تم سے رخصت ہونے کے بعد میں اور آپی یوں ہی بے مقصد اِدھر اُدھر سڑکوں پر گھومتے رہے تھے بہت دیر تک۔ ایک بار ہم اس طرف بھی آئے مگر مزارِ قائد پر پہنچ کر میں نے بے سوچے سمجھے کار کو شاہراہِ قائدین پر موڑ دیا۔ وہاں سے جب میں شارع فیصل پر پہنچا تو مجھے اچانک احساس ہوا کہ ایک سفید کرولا کار کافی دیر سے ہماری کار کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں یہ جاننے کے لیے تعاقب کرنے والے کون ہیں سیدھا کارساز کی طرف ہو لیا لیکن کارساز سے پہلے آنے والی ٹرننگ سے میں نے اپنی گاڑی اچانک واپس آنے والی سڑک پر موڑ لی اور سب سے پہلے آنے والی ٹرننگ سے میں نے اسے دوبارہ پھر اسی سڑک پر ڈال دیا۔ مقصد میرا یہ تھا کہ میں اس تعاقب کرنے والی کار کے پیچھے لگ کر ان لوگوں کو ہراساں کر دوں۔ جو میرے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں۔ مجھے اپنے اس مقصد میں اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ وہ میرے اچانک عمل کی وجہ سے میرے پیچھے آنے کے بعد سیدھے نکلے چلے گئے تھے مگر جب میں دوبارہ اس سڑک پر آیا تو وہ کار بہت آگے نکل چکی تھی۔ آگے ٹریفک جام تھا جس کی وجہ سے ہم چیونٹی جیسی رفتار سے کارساز تک پہنچے تھے۔ وہاں پتا چلا کہ کوئی زبردست حادثہ ہوا ہے وہاں، چنانچہ میں نے حادثے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے اپنی کار اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ کار تو مجھے راستے میں کہیں ملی نہیں پھر، البتہ نیشنل اسٹیڈیم کے قریب اچانک سامنے آ کر چار لٹیروں نے ہمیں روک لیا جس کے نتیجے میں آپی کی پنڈلی اُدھڑ گئی ایک گولی سے۔" میں نے تھوڑی بہت ردّ و بدل کے ساتھ اسے ساری تفصیل بتا دی۔ فیروز وغیرہ کا ذکر میں کیوں کہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجھے اس میں یہ ردّ و بدل کرنا پڑی تھی۔
لزی ساری داستان سن کر بولی "اس کا مطلب یہ ہے

کہ وہ آپ ہی لوگوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے اور بدقسمتی نے وہاں انھیں شکار کر لیا۔ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ آپ کا نہیں دراصل اپنی موت کا تعاقب کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔"

"ہاں لزی بیگم! یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ آدمی پتا نہیں کس بات پہ اتراتا ہے اس قدر، اپنی صلاحیتوں اور کامیابیوں پر پھولا پھرتا ہے، حالانکہ اسے یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ آنے والا لمحہ اس کے لیے اپنی جھولی میں کیا لے کر آ رہا ہے۔"

"آپ نے درست کہا ہے جناب عالی! یہ خاک کا پتلا مگر اپنی عقل پر بہت نازاں ہے یہ، اوقات بھولا ہوا ہے اپنی حالاں کہ بار بار حادثوں اور رو باؤں کے ذریعے تنبیہہ کی جاتی ہے اسے، اس کی حیثیت کا احساس دلایا جاتا ہے مگر کسی کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں، کوئی ہوش میں آنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھے ہوئے ہے اپنے دل میں کہ یہ میرے ساتھ نہیں ہوگا، یہ میرے لیے نہیں ہے۔ لوگ خود سر اور ظالموں کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کرنے کے بجائے ان کی ناکامیوں کے اسباب جاننے کے لیے ان کی راکھ کریدنے بیٹھ جاتے ہیں تاکہ وہ عوامل جو ایک شخص کی بربادی کا سبب بنے تھے، ان کا کوئی ایسا بندوبست کر دیں کہ وہ خود ان سے محفوظ ہو جائیں۔ حالاں کہ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود ہوتا وہی ہے جو ان جیسوں کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔" اس نے اس انداز میں یہ بات کہی تھی کہ میرا دل کانپ اٹھا تھا۔

ناشتے کے بعد میں اپنے کمرے میں جا کر بستر میں گھس گیا اور لیٹتے ہی چند لمحوں میں سپنوں کی وادیوں میں جا اترا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیلنا شروع ہو چکے تھے۔ میرا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، کمر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور بایاں کاندھا بھی بہت تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے پیر سمیٹ کر اٹھنے کی کوشش کی تو میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ میرے دونوں گھٹنے بُری طرح دکھ رہے تھے، تکلیف کی وجہ سے پاؤں موڑا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے لزی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ چار پانچ بار پکارنے کے بعد بھی جب اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ گھر میں موجود نہیں ہے اس وقت۔ میں نے گردن گھما کر اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ میرے سرہانے رکھی میز پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ٹیلی فون اٹھایا تو اس کے نیچے ایک پرچا رکھا نظر آیا مجھے۔ وہ شاید فون کے نیچے دبا کر رکھا گیا تھا اس طرح کہ فون کی طرف دیکھتے ہی وہ اس کے نیچے رکھا ہوا نظر آ جاتا مگر میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اسی لیے وہ مجھے فوراً

دکھائی نہیں دے سکا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پرچا اٹھا لیا۔ وہ لزی نے ہی وہاں میرے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"جناب عالی!

جیرالڈ کی سیکرٹری کی موت کے بعد مقامی انتظامیہ نے اس کی لاش جیرالڈ کے گھر پہنچا دی ہے۔ تنظیم کے تمام ارکان اس لاش کو جرمنی بھیجنے تک اس کے قریب موجود رہیں گے اور اس کا سوگ منائیں گے۔ چنانچہ میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ آپ کے لیے کھانا تیار کر کے فریج میں رکھ دیا ہے۔ جب بھی بیدار ہوں گرم کر کے کھانا کھا لیں اور آبی کے پاس جا کر اس کی خیریت ضرور معلوم کریں۔ رات گیارہ بجے ایک خصوصی پرواز کے ذریعے سیکرٹری کی لاش روانہ کرنے کے بعد ہی میں واپس آ سکوں گی لہٰذا میرا انتظار نہ کریں۔

آپ کی لزی بیگم"

پرچا پڑھ کر میں نے دوبارہ وہیں ڈال دیا جہاں سے اٹھایا تھا، پھر شرافت علی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ادھر بیل بج رہی تھی مگر شاید کوئی ٹیلی فون اٹھانے والا قریب موجود نہیں تھا۔ غالباً چھٹی یا ساتویں گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔ اور ریسیور اٹھانے والا خود شرافت علی ہی تھا۔ میری آواز سن کر وہ بولا۔ "تم اٹھ گئے۔ میں کوئی تین گھنٹے تمھارے ڈرائنگ روم میں گزار کر آیا ہوں مگر تم تو یار ایسا لگتا ہے جیسے آج گھوڑے بیچ کے سوئے تھے۔ آبی کا کیا حال ہے اب؟"

"تو تمھیں معلوم ہو چکا ہے اس کے بارے میں۔ میں ابھی ابھی سو کر اٹھا ہوں، سب سے پہلے تم سے بات کر رہا ہوں۔ ویسے مجھے امید ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ البتہ میری اپنی حالت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی ہے اس وقت۔ کسی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آ جاؤ۔"

"کیوں خیر تو ہے نا؟ کیا ہوا ہے تمھیں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے یار! رات بڑا ہنگامہ رہا ہے۔ آبی کی تو پنڈلی میں گولی لگی ہے۔ میری اپنی بھی اچھی خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ کمر، شانے اور گھٹنوں میں شدید چوٹیں آئی ہیں۔ رات بھاگ دوڑ میں تکلیف کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب سو کر اٹھا ہوں تو سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ اٹھا نہیں جا رہا ہے بستر سے۔ تم جلدی سے آ جاؤ۔ باقی باتیں تمھارے آنے کے بعد ہوں گی۔"

"اچھا، میں بس پندرہ منٹ میں آ رہا ہوں، ڈاکٹر کو ساتھ لے کر، تم انتظار کرو میرا۔" اس نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ کر ٹیلیفون کو دوبارہ میز پر دھر دیا اور پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ اٹھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی مجھ میں۔

شرافت علی پندرہ منٹ کے اندر ہی ایک ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آ پہنچا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ہے، معمولی چوٹیں ہیں۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں اور کچھ دوائیں دے دیتا ہوں، انھیں استعمال کریں۔ چوٹوں پر ہلکی سکائی کر دیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے شرافت علی سے کہا۔ "لزی فریج میں کھانا رکھ گئی ہے، اسے گرم کروا لو دربان کو بلا کر۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے یار! یہ تو بڑا غلط کام ہوا ہے، اس وقت مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔"

شرافت علی اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے آپ کو پُرسکون رکھو، ہر کام ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کھانا لے کر آتا ہوں تمھارے لیے۔"

دس منٹ میں وہ ٹرے میں کھانا لگا کر لے آیا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا اور میری کمر کے پیچھے تکیے لگا دیے۔ تکیوں کے سہارے بیٹھنے سے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھا کر میری پھیلی ہوئی ٹانگوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لو کھانا کھاؤ اور اس دوران مجھے بتاتے جاؤ کہ رات کیا واقعات پیش آئے تھے..... میں صبح سے بے حد فکرمند تھا۔ صبح نو بجے کے قریب لزی نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ رات کسی سے تمھاری مڈبھیڑ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں آبی زخمی ہو گیا ہے۔ جانتے ہو اس نے اور کیا کہا تھا مجھ سے؟"

"کیا کہا تھا اس نے تم سے، میں کیا بتا سکتا ہوں! تم بتاؤ کیا کہتی تھی وہ؟" میں نے اس سے پوچھا اور لقمہ چبانے لگا تھا۔

"وہ کہہ رہی تھی میں تمھارے پیچھے کسی ہوشیار آدمی کو لگا دوں۔ وہ یہ معلوم کر کے بتائے کہ میں کہاں کہاں جاتا ہوں اور کن کن لوگوں سے ملتا ہوں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے تمھاری سرگرمیوں کی مکمل رپورٹ درکار ہے۔ شاید یہ لوگ تمھاری طرف سے مشکوک ہو گئے ہیں۔"

"بہت بدطینت لوگ ہیں یار یہ، شکوک و شبہات تو ان کی سرشت میں داخل ہیں۔ اس معاملے میں تو یہ اپنے باپ کو معاف نہیں کرتے، اسے بھی ہر وقت شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب اس نے اپنے سوالوں کے جواب میں کہی ہوئی میری ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لی۔ میں جانتا تھا وہ اپنے طور پر ان سوالوں کے صحیح جواب معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو مجھے بہت حیرانی ہوتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے شرافت علی سے کہا۔

"پھر تو اس نے جو کچھ کیا ہے، تمھاری توقع کے عین مطابق کیا ہے، میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا تھا۔"

"ہاں یار! وہ تو بس عین موقع پر گڑبڑ ہو گئی۔ ورنہ اس نے تو وہ کسی پاگل کتیا کی طرح بھونکتی اور بال نوچتی پھر رہی ہوتی اپنے۔ شاید ان لوگوں کے کھاتے میں کچھ دن اور باقی ہیں۔" میں نے یہ کہہ کر رات کو پیش آنے والے تمام واقعات کی تفصیل کے ساتھ بابا اسحاق کے آستانے پر دھاوا کرنے کے پروگرام کے بارے میں بھی بتا دیا۔

سب کچھ سننے کے بعد شرافت علی بولا۔ "ایسی ہنگامہ خیز رات گزاری ہے تم نے! اور یہ تو کمال ہی ہو گیا بھئی، اگر وہ فرقان کے گروہ سے بھی جا ٹکرائے ہو تم! ان سے تیس لاکھ روپے بھی حاصل کر لیے ہیں تم نے اور ان کے پانچ آدمی بھی باندھ لیے۔ بہت ہی اچھا ہوا ہے، بڑا ہی نیک شگون ہے یہ۔ کراچی میں ان دن رکنا تمھارے لیے مفید ہی ثابت ہو رہا ہے۔"

"ہاں کسی حد تک لیکن اصل مقصد جب تک حاصل نہ ہو، مجھے چین نہیں مل سکے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے خدا کی ذات سے، وہ ہماری کوششوں کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔"

کھانے کے بعد اس نے مجھے چائے بھی بنا کر پلائی اور پھر میری چوٹوں کی سکائی کے لیے ربر کی بوتل میں گرم پانی بھی بھر کر لے آیا۔ میں نے بوتل دیکھ کر پوچھا۔ "یہ یہاں کہاں مل گئی تھیں؟ کیا اپنے مہمان خانے میں ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی رکھتے ہو تم؟"

"ہاں، ضرورت کی ہر چیز موجود ہے یہاں، تم جانتے ہو یہاں آ کر میرے مہمان بننے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں کسی وقت بھی کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ بعض اوقات ضرورت پڑنے پر چیز ملنا مشکل ہو جاتی ہے اس لیے انتظام کر رکھا ہے ہر چیز کا۔"

تھوڑی دیر سکائی کرنے کے بعد تکلیف میں بڑی حد تک کمی محسوس ہوئی۔ اور میں اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینے کے قابل ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر تھوڑی سی چہل قدمی بھی کی۔ اب مجھے زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے شرافت علی سے

"یار! اب تو میری حالت بہت بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ تم مجھے فیروز کے ٹھکانے پر لے چلو۔ آج کی رات بڑے ضروری کام نمٹانا ہیں مجھے وہاں۔"

"میرا خیال ہے تمھیں آج صرف آرام کرنا چاہیے۔ وہاں فون تو ہوگا ہی، تم فون کر کے انھیں اپنی حالت کے بارے میں بتا دو۔"

"نہیں برادر! اب میری حالت اتنی بُری نہیں ہے۔ یوں بھی آج کا کام کل پر ٹالنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ آدمی کاہل ہو جاتا ہے اس طرح اور وہ پھر دنیا میں کامیابیاں حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہانہ کبھی نہیں بنانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو چلو، میں لے چلتا ہوں تمھیں وہاں۔ لیکن وہاں کوئی میری موجودگی کو ناپسند تو نہیں کرے گا؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس بات کا۔ میرے ساتھ جانے والے کسی شخص کو وہاں ناپسند نہیں کر سکتا کوئی۔ تم چلو میرے ساتھ، بالکل بے فکر ہو کر۔ کسی قسم کا خدشہ نہ کرو ذرا بھی۔ یوں بھی غائبانہ طور پر وہ لوگ متعارف ہیں تم سے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"اچھا ٹھیک ہے، چلو۔" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں تمھیں سہارا دے کر لے چلتا ہوں باہر کار تک۔"

"نہیں، سہارے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں خود چل کر جا سکتا ہوں وہاں تک، تم میرا اعتماد متزلزل نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم خود ہی چلنا چاہتے ہو تو چلو مگر چلنے میں دشواری ہو تو خواہ مخواہ بہادر بننے کی کوشش مت کرنا۔"

مجھے اس کے ساتھ کار تک جاتے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہاں وہ سفید کرولا بھی موجود تھی جو رات بھر میرے استعمال میں رہی تھی مگر شرافت علی نے مجھے اپنی کار میں بٹھا دیا اور پھر کار اسٹارٹ کر کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہوئے اس نے گیٹ پر رک کر دربان کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اگر لزی ہماری واپسی سے پہلے آ جائے تو وہ اسے یہ نہ بتائے کہ میں اس کے ساتھ گیا ہوں۔ وہ اس سے یہی کہے کہ میں اکیلا ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں گیا ہوں۔ وہ بہت ہی ہوشیار اور محتاط آدمی تھا۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا وہ۔ اس کی یہ خوبی مجھے بہت پسند تھی۔ چونکہ لزی نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ میرا پیچھا کر کے میری مصروفیات کے بارے میں معلوم کرے چنانچہ وہ لزی کے کانوں تک یہ اطلاع نہیں پہنچنے دینا چاہتا تھا کہ وہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر کہیں گیا ہے۔

رات کی سیاہی دن کے اجالے کو پوری طرح نگل چکی تھی، جب ہم فیروز کی اقامت گاہ میں داخل ہوئے۔ وہاں اس وقت صرف فیروز اور ڈاکٹر ہی موجود تھے۔ فیروز نے بتایا کہ خان ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا، اس وقت وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے، جلد ہی واپس آ جائے گا۔ انور کمال اور گل زمان اپنی ڈیوٹی پر ہیں اور میرے پیچھے ہی پیچھے واپس آ رہے ہوں گے۔ میں نے شرافت علی کا ان سے تعارف کرایا۔ آبی کو انھوں نے کوٹھی کے اس دوسرے حصے میں منتقل کر دیا تھا جہاں... عزیز بھٹی پارک سے واپسی پر گل زمان مجھے لے کر آیا تھا۔ اسے دوپہر کے وقت بخار ہو گیا تھا۔ مگر اب اس کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ قیدیوں کو انھوں نے تین مختلف کمروں میں بانٹ دیا تھا۔ وہ دونوں قسہ زور جنھیں گل زمان نے زیر کر کے قابو کیا تھا الگ الگ رکھے گئے تھے، انھیں چند منٹ سے زیادہ ہوش میں نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ میں نے فیروز سے کہا۔ "مجھے آبی کے پاس لے چلو، اسے دیکھنا چاہتا ہوں میں۔"

"ٹھیک ہے چلو۔ مجھے تو تم بھی کچھ زیادہ بہتر دکھائی نہیں دے رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا؟" فیروز نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یار! رات کو اچھی خاصی مرمت کر دی تھی اس پہلوان کی دُم نے۔ بدن کئی جگہ سے چٹخ گیا ہے شاید۔ بہرحال تشویش کی بات نہیں ہے کوئی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا ہے اور کیپسول وغیرہ بھی دے دیے ہیں۔ بھائی شرافت علی نے چوٹوں کی سکائی بھی کر دی ہے۔"

ڈاکٹر نے مجھے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس طرح اس نے تمھیں اُچھال کر دیوار پر پھینکا تھا، اس کے بعد تمھارا دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہو جانا ہی میرے نزدیک کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ دیوار سے ٹکرا کے اتنی بلندی سے گرنے کے بعد ہڈیاں سلامت کیسے رہ سکتی ہیں؟"

"میں اگر پہلو کے بل نہ گرا ہوتا تو یقیناً دوبارہ نہیں اٹھ سکتا تھا۔ اب تو صرف شانے، کمر اور گھٹنوں میں چوٹ آئی ہے۔ وہ بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں ہے۔ ایک آدھ روز میں ٹھیک ہو جائے گی بالکل ہی۔" میں نے انھیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

اسی وقت گل زمان اور انور کمال بھی آ گئے۔ میں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیوں بھئی، کسی نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش تو نہیں کی تھی نا؟ ہم نے راستے میں اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا بالکل بھی۔ تم نے دیکھا تھا شرافت علی؟" میں نے شرافت علی سے بھی پوچھا۔

وہ بولا۔ "ایک بلو کلر کی مزدا کار پر شبہ ہوا تھا مجھے۔ وہ تھوڑی دیر نظر آئی تھی مگر پھر غائب ہو گئی۔"

میں نے اس سے کچھ کہنے کے بجائے مسکرا کر انور کمال کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "نہیں جناب! ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی ہیں۔

جس کے بارے میں ہم سوچ سکتے کہ وہ آپ کے تعاقب میں ہو گی۔ البتہ اس کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف ایک کار کو رینگنے کے انداز میں گزرتے ہوئے دیکھا ہے ہم نے ابھی ابھی۔ معلوم یوں ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا پتا تلاش کر رہے ہوں مگر مجھے شبہ ہے کہ یہ صرف بہانہ تھا ورنہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص جس طرح کوٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے میں نے یہی رائے قائم کی ہے کہ دراصل وہ ہماری کوٹھی کا ہی جائزہ لے رہا تھا۔ شاید یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اندر کتنے افراد موجود ہیں اور کس قسم کے لوگ رہتے ہیں یہاں۔"

"کتنی دیر ہوئی ہے اس بات کو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ میری چھٹی حس نے یہ سنتے ہی خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی میرے دماغ میں۔

"بس اتنی دیر ہوئی کہ ہم وہاں سے یہاں تک پہنچے ہیں۔" گل زمان نے جواب دیا۔

میں نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ بھئی ادھر چل کر دیکھتے ہیں۔ کوئی ایسی جگہ تو ہو گی نا وہاں جہاں سے باہر والوں کو نظر آئے بغیر گیٹ سے باہر گلی کا جائزہ لیا جا سکے؟"

"ہاں ہاں، ایسی کئی کھڑکیاں ہیں جن سے باہر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان پر پڑے ہوئے پردوں کی وجہ سے یہ اور آسان ہو جائے گا۔"

ہم سب لوگ کوٹھی کے اس حصے کی طرف چل دیے۔ وہاں ہر کمرہ بالکل تاریک پڑا تھا۔ فیروز نے اندر گھستے ہی کہا۔ "کوئی لائٹ نہ جلائے کسی بھی کمرے کی۔ باہر اگر کوئی کوٹھی کا جائزہ لے ہی رہا ہے تو اسے یہی تاثر دیا جائے کہ یہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔"

اسے عین موقع پر یہ بہت اچھی بات سوجھی تھی۔ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی روشنی بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

میں اور فیروز ایک ساتھ ایک ہی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگے مگر کھڑکی بند تھی اور اس پر گہرے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے دوسری طرف کچھ دیکھنا ناممکن ہی تھا۔ لہٰذا میں نے کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا کھول دیا۔ اس وقت ایک شخص کوٹھی کے بالکل سامنے سے چہل قدمی کرنے کے انداز میں گزر رہا تھا۔ نظریں اس کی کوٹھی کی طرف ہی اٹھی ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوٹھی کا ہی جائزہ لے رہا ہے۔ فیروز بولا۔ "تم جانتے ہو جیلانی اسے، کون ہے یہ؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے آج سے پہلے اس شخص کی صورت بھی نہیں دیکھی کبھی۔ کہیں یہ ان قصابوں کا ہی تو کوئی ساتھی نہیں ہے جنھیں ہم نے باندھ کے ڈال رکھا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ وہ شاید جانتا ہو اسے۔"

فیروز نے ڈاکٹر کو اپنے قریب بلا کر کہا۔ "ڈاکٹر! باہر ایک آدمی موجود ہے، تم دیکھ کر بتاؤ پہلے کبھی دیکھا ہے تم نے اسے؟"

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی جگہ کھڑے ہو کر باہر دیکھا۔ اس شخص پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر بولا۔ "ارے یہ یہاں کس طرح پہنچا؟ اسے یہ کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ یہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "مگر یہ ہے کون یہ تو بتاؤ پہلے؟ اپنی حیرت کا اظہار بعد میں بھی کر سکتے ہو تم۔"

"یہ وہی ہے، وہی جس نے مجھے اس گندے کام کے لیے مجبور کیا تھا۔ ان سب کا باس ہے شاید یہ۔ مگر یہ یہاں پہنچا کس طرح؟"

"ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پتا لگا ہی لیا انھوں نے کسی نہ کسی طرح۔"

گل زمان آگے بڑھ کے بولا۔ "کیا خیال ہے جیلانی صاحب! باندھ لاؤں اسے بھی؟ میرا تو خیال ہے یہ آ ہی گیا ہے یہاں تک تو لگے ہاتھوں اس کا پوسٹ مارٹم کر ہی ڈالیں۔ کیا یاد کرے گا یہ بھی کہ اس نے دنیا میں کوئی کاروبار کیا تھا جس میں خود بک گیا۔"

"نہیں یار! ابھی نہیں، اگر یہ باس ہے ان کا تو اس کا تعلق براہِ راست خرطومی سے ضرور ہوگا۔ اصل آدمی تو وہی ہے برادر! جب تک وہ ختم نہیں ہوگا، ان درمیانی آدمیوں کو مارنے کا فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے ذریعے میں خرطومی تک پہنچنا چاہتا ہوں، تم اس کا پیچھا کر کے ٹھکانہ معلوم کرو اس کا اور کوئی ایسا انتظام بھی کر دو کہ اس کی نقل و حرکت کا ہمیں پتا چلتا رہے ہر وقت۔"

"اس کا انتظام میں کر دوں گا۔" فیروز بولا۔ "تم جا کر اس کا پتا ٹھکانہ معلوم کر آؤ بس۔ اور اگر یہ کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کرے تو اسے روکنا ٹوکنا نہیں۔ ہم آبی کو اُدھر دوسرے حصے میں لے جاتے ہیں۔ اچھا ہے وہ اندر آ کر دیکھ لے کہ یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ اسے یہی تاثر لے کر واپس جانا چاہیے کہ یہ مکان بالکل خالی پڑا ہے، صبح ہم اس پر کرائے کے لیے خالی ہے کی تختی لگا دیں گے۔"

"کیوں، یہ تختی کیوں لگاؤ گے تم؟ اس معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تعلق یہ ہے کہ اس وقت مکان کو خالی پا کر وہ یہ سمجھے گا... کہ مکین کہیں گئے ہوئے ہوں گے چنانچہ یقیناً کل دن میں پھر آئے گا اس کی تصدیق کرنے کے لیے اور وہ تختی دیکھ کر اسے یہ یقین ہو جائے گا کہ اس کے مکین اسے خالی کر کے کہیں اور چلے گئے ہیں۔"

میں نے اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کھوپڑی تمہاری بھی شیطان کی طرح ہی کام کرتی ہے، یہ ماننا پڑے گا۔"

وہ ہنس کر بولا "اگر ایسا نہ ہوتو اتنی بڑی اور منظم قسم کی بین الاقوامی تنظیم سے ٹکر کیسے لیں گے ہم؟ آؤ! ادھر آبی کے پاس چلیں، اسے جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے ہٹا دینا چاہیے ہمیں، پتا نہیں وہ کس وقت گھس آئے یہاں۔"

گل زمان پہلے ہی جا چکا تھا اپنے شکار کی تاک میں۔

ہم پانچوں تیزی سے پلٹ کر آبی کے کمرے کی طرف چل دیے۔ آبی جاگ رہا تھا۔ اس نے کمرے کے باہر ہماری آہٹیں سن لی تھیں لہٰذا جب ہم اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دروازے پر ہی نظریں جمائے لیٹا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا "اوئے ذلیل آدمی کہاں جا کے مر گیا تھا تو کہ اب صورت دکھائی دی ہے تیری؟"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے فیروز سے کہا "اسے اٹھاؤ یار! سہارا دو اسے۔ ہم دونوں دو طرف سے پکڑ کر لے چلتے ہیں اسے۔ اپنے پیروں پر چل کر تو یہ شاید اس کمرے سے باہر بھی نہ جا سکے۔"

شرافت علی نے آگے بڑھ کر کہا "تم ہٹ جاؤ جیلانی! تمہاری حالت ایسی نہیں ہے ابھی کہ کوئی مشقت کا کام کر سکو۔ آبی کو میں سہارا دے دوں گا۔ اس کی تم پروا نہیں کرو آخر ہم لوگ کس دن کے لیے ہیں؟"

آبی بولا "اچھا تو یہ شرافت کو بھی بلا لیا ہے تو نے یہاں اور یہ تیری حالت میں ایسی کیا خرابی آگئی ہے جس کی وجہ سے یہ ہاتھ نہیں لگانے دے رہا ہے تجھے؟ کیا ان آدم خوروں نے تیرا بھی دوسرا گردہ نکالنے کی کوشش کر ڈالی ہے؟"

"چپ ہو جا یار تھوڑی دیر کے لیے، ہمیں کام کر لینے دے اپنا۔ پھر جتنے جی چاہے سوالات کرتے رہنا، کوئی منع نہیں کرے گا تجھے۔"

"مگر یہ تو بتا دو یارو! تم لوگ مجھے لے کہاں جا رہے ہو اب؟ یہیں کیوں نہیں پڑا رہنے دیتے؟" آبی قدرے الجھتے ہوئے بولا۔

"کہیں لمبے سفر پر نہیں لے جا رہے ہیں ہم تجھے۔ کوٹھی کے اس حصے سے رات بھر کے لیے ہٹا رہے ہیں بس۔ یہاں کچھ گڑبڑ ہونے کا امکان ہے۔ خطرہ ٹل جانے کے بعد پھر یہیں لے آئیں گے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

آبی نے شرافت علی اور فیروز کے سہارے سے اٹھ کر اپنی صحیح سلامت ٹانگ کو زمین پر ٹکاتے ہوئے کہا "یہ خطرے تو اب ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں یار! ان سے جان چھوٹتی دکھائی نہیں دیتی ابھی۔ پھر ان سے یوں بھاگے بھاگے پھرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"ہاں یار، کہتا تو ٹھیک ہی ہے تو بھی لیکن جان بوجھ کے کنوئیں میں کون گرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مرنا تو ایک دن سب کو ہی ہے اس کے باوجود زندہ رہنے کی تگ و دو سب کرتے رہتے ہیں، کوئی آسانی سے خود کو فرشتہ اجل کے حوالے نہیں کرتا۔"

ہم اسے لے کر کمرے سے نکل کے اوپر چھت کی طرف جانے والے زینے کی جانب جانے لگے تو ڈاکٹر بولا "اس زینے پر چڑھنے میں بہت دشواری ہوگی، انھیں ایک کرسی پر بٹھا لو اور اس کرسی کو اٹھا کر لے چلو اوپر، یہ زیادہ آسان رہے گا۔"

"ہاں یہی کریں گے، صبح بھی ہم انھیں اسی طرح لے کر آئے تھے۔"

یہ مکان کچھ اس طرح بنا تھا کہ اس کا اگلا اور پچھلا حصہ ایک ہی جیسا تھا۔ دونوں حصے تو الگ الگ تھے مگر ان کی چھت ایک ہی تھی، ایک سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے چھت ہی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ نیچے کہیں کوئی دروازہ، یا کھڑکی ایسی نہیں تھی جس سے گزر کر دوسرے حصے میں پہنچا جا سکتا۔ چھت کے چاروں طرف قد آدم دیوار کھنچی ہوئی تھی اور درمیان میں تین فٹ اونچی دیوار کھینچ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ تین فٹ اونچی دیوار پار کر کے ہی دوسری طرف جایا جا سکتا تھا۔ زینے کے اختتام پر موٹی موٹی سلاخوں سے بنا ہوا لوہے کا ایک مضبوط دروازہ تھا۔ آبی کو کرسی پر بٹھا کر اوپر لے جانے کے بعد انور کمال نے وہ دروازہ بند کر دیا اور سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ ڈال کر اس میں اندر کی جانب سے تالا بھی ڈال دیا.... اوپر چھت پر آنے کے بعد بھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ وہ ایک مکان ہے۔ یہاں بھی یہی احساس ہوتا تھا کہ دو مکانوں کی چھتیں باہم ملی ہوئی ہیں۔

آبی کو ایک کمرے میں لٹانے کے بعد میں نے فیروز سے پوچھا "ڈاکٹر کو ان کی ضرورت کا سامان منگوا دیا ہے نا؟"

"ہاں سب کچھ بالکل تیار ہے۔ دس بجے انور کمال ڈاکٹر کے کلینک جا کر ان کے معاون اسلم کو بھی لے آئے گا، اس کے آتے ہی آپریشن شروع کر دیے جائیں گے۔ کوئی احتیاط تو کرنا نہیں ہے، بس یہی خیال کرنا ہے کہ کوئی گردہ خراب نہ ہوسکے۔ چند گھنٹوں میں سارا کام مکمل ہو جائے گا اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو۔ اور مجھے امید ہے گڑبڑ کوئی نہیں ہوگی۔"

آبی بولا "اوئے جیلانی! یہ تو کس کے گردے نکالنے کی بات کر رہا ہے بھئی؟ یہ کام تو نے کب سے شروع کیا ہے؟"

"وہ جو پانچ آدم خور کل رات کو پکڑے تھے ہم نے، انہی کے گردے نکلوا رہا ہوں میں۔ وہ گردے ان کے باس کے ہاتھوں فروخت کر دیے جائیں گے۔ اس مد میں تیس لاکھ روپے ایڈوانس بھی وصول کر چکا ہوں میں۔ ٹھیک کام کیا ہے نا میں نے؟"

"یہ تو بہت ہی اچھا کام کیا ہے تو نے میرے یار! اس ننگِ انسانیت کے بھی گردے نکلوا لے جس نے میرے پاؤں کا یہ حال کیا ہے۔"

"ہاں ہاں فکر نہ کر اس کی۔ اس کا نام بھی فہرست میں موجود ہے میری۔ معاف تو میں اسے بھی نہیں کروں گا۔"

*

دس بجے تک تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں۔ انور کمال جا کر اسلم کو لے آیا تھا، خان بھی واپس آگیا اس عرصے میں البتہ وہ گل زمان ابھی نہیں آیا تھا جسے فیروز اور میں نے بقول آبی، آدم خوروں کے باس کے پیچھے بھیجا تھا۔ ٹھیک دس بج کر تیس منٹ پر ڈاکٹر نے آپریشن شروع کر دیے۔ اس کے لیے ہم نے ڈنر ٹیبل کو آپریشن ٹیبل کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ایک بجے کے قریب بارہ عدد انسانی گردے میرے سامنے رکھے تھے جنھیں میرے کہنے پر ڈاکٹر نے شیشے کے ایک مرتبان میں کچھ دوائیں وغیرہ لگا کر حفاظت سے رکھ دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر خان اور انور کمال ان سب کی لاشیں ایک وین میں ڈال کر لے گئے۔ یہ وین اسی کام کے لیے خان اپنے ساتھ لے کر آیا تھا کہیں سے۔ ان کے جانے کے بعد فیروز اور ڈاکٹر نے مل کر ڈنر ٹیبل، سرجری کا سامان اور وہ کمرہ جس میں یہ کام انجام دیا گیا تھا، بالکل صاف کر ڈالا۔ انھوں نے ایک ایک نشان مٹا ڈالا تھا۔ پورے فرش پر فنائل اور سرف کے کئی ڈبے انڈیل دیے تھے۔

صبح پانچ بجے کے قریب میں آبی کو ڈاکٹر کی وین میں ڈال کے اپنے ساتھ بنگلے پر لے گیا۔ اسلم اور انور کمال میرے ساتھ تھے اسلم ڈاکٹر کا شریکِ راز تھا، میں نے فیروز سے کہہ کر اسے بیس ہزار روپے دلوا دیے تھے۔ اس کے بعد تو وہ میرے اشاروں پر ناچنے لگا تھا۔ اس نے اور انور کمال نے آبی کو ایک کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا اور واپس چلے گئے۔ جاتے ہوئے میں نے اسلم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ہر روز آ کر آبی کے پاؤں کی پٹی تبدیل کر دیا کرے اور ڈاکٹر کو اس کی کیفیت سے آگاہ کر کے دوائیں وغیرہ بھی لے آیا کرے اس کے لیے۔ اسے بھلا کیا انکار ہوسکتا تھا۔ وہ میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

لزی گھر واپس آچکی تھی اس وقت شاید اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ گھر میں چہل پہل اور ہم لوگوں کی آوازیں سن کر وہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر آگئی۔ آبی کو دیکھ کر اس نے کہا۔ "یہ آپ نے بہت اچھا کیا جنابِ عالی! جو انھیں اپنے ساتھ گھر لے آئے۔" پھر وہ آبی کے پاس بیٹھ کر اس کی مزاج پرسی کرنے لگی۔ انور کمال اور اسلم کو رخصت کر کے میں بھی ان دونوں کے پاس ہی آبیٹھا۔

اتنی ساری بھاگ دوڑ کے بعد میری کمر میں تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میں نے لزی سے کہا "لزی بیگم! ادھر میرے بستر پر ربر کی بوتل پڑی ہے۔ تھوڑا سا پانی گرم کر کے بوتل میں بھر دو، میں اپنی کمر کی سکائی کروں گا۔ اس میں درد بڑھ گیا ہے۔"

وہ اور آبی ایک ساتھ چونک کر بولے "کیوں کیا ہوا ہے کمر کو تمہاری؟"

"رات جن لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی ان سے فری اسٹائل کشتی لڑنا پڑی تھی مجھے۔ نتیجے میں کچھ چوٹیں لگ گئی ہیں، میرے بھی معمولی چوٹیں ہیں، زیادہ فکر کی بات نہیں ہے کوئی۔ ڈاکٹر نے دوا دے دی ہے۔ ایک آدھ دن میں آرام آجائے گا۔"

"یہ بات آپ نے صبح نہیں بتائی تھی مجھے۔" لزی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"صبح مجھے خود اندازہ نہیں تھا اپنی ٹوٹ پھوٹ کا، شام کو سو کر اٹھا تو پتا چلا کہ مجھے بھی مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔"

لزی پانی گرم کرنے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی تو آبی بولا "اوئے ذلیل آدمی اس حال میں بھی تو بیٹھ نہیں سکا ہے چین سے۔ پوری رات گزار دی بھاگ دوڑ میں۔ وہ لوگ بھاگے تو نہیں جا رہے تھے کہیں۔ ایک دو دن کے بعد بھی ان کے پیٹ چاک کیے جا سکتے تھے۔"

"نہیں یار! تو سمجھتا نہیں ہے، یہ کام جلد سے جلد نمٹانا بے حد ضروری تھا۔ ان کے باس کو کوٹھی کا پتا تو مل ہی گیا تھا کسی طرح۔ اگر وہ اس کے دوسرے حصے کے بارے میں بھی جان جاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ شاید وہ ان سب کو آزاد ہی کرا لیتا۔ دوسرے تیرا بھی خیال تھا مجھے، تجھے وہاں سے نکالنا بہت ضروری تھا۔ لزی تیری مزاج پرسی کے لیے جانا چاہتی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سامنا فیروز اور خان سے ہو جائے۔"

"ہاں، یہ تو بالکل ٹھیک سوچا تھا تو نے۔ پھر بھی تجھے کسی اور ذریعے سے یہ کام کرا لینا چاہیے تھا۔ اپنا خیال رکھ یار! میں تو معذور ہو کر پڑ ہی گیا ہوں، اگر تو بھی لیٹ گیا تو ہم دونوں ان مارِ آستین قسم کے لوگوں کے درمیان بالکل ان کے رحم و کرم پر ہو کر رہ جائیں گے۔"

"ہاں یار! تیری یہ بات بھی سچ ہے۔ مگر حالات پر تو کسی کا زور نہیں ہوتا نا۔ اور ہر کام میں اپنی نگرانی میں اس لیے کراتا رہا ہوں کہ ان لوگوں پر مجھے اعتبار نہیں آتا۔ یہ مطلب

نہیں ہے میرا اس بات سے کہ یہ مخلص نہیں ہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ انھیں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی ذہنیت سے واقف نہیں ہیں یہ، وہ ڈاکٹر انہی لوگوں کا ساتھی رہا ہے، امکان اس بات کا ہے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں اپنی مظلومیت کی داستان سنا دی ہو۔ میں اگر سارا کام ان لوگوں پر چھوڑ دیتا تو وہ شاید انھیں کوئی چکر دے کر نکل جاتا اور ان لوگوں کو بھی چھڑا کر لے جاتا۔ یوں بھی وہ سارے ہی نیک کام تو نہیں کرتا رہا ہے۔"

"کون نیک کام نہیں کرتا رہا ہے جنابِ عالی؟" لزی کمرے میں قدم دھرتے ہوئے بولی۔ اس نے میرا آخری جملہ سُن لیا تھا۔

"اس ڈاکٹر کی بات کر رہا ہوں میں جس کے پاس کل سے آبی کو چھوڑا ہوا تھا میں نے۔ ایسا آدمی جو کوئی خفیہ کلینک قائم کر کے بیٹھا ہو اور وہاں قانون سے چھپتے پھرنے والے مجرموں کو طبی امداد دیتا ہو، اسے کوئی نیک اور قابلِ اعتبار تو نہیں سمجھ سکتا۔"

"ہاں، یہ بالکل درست بات ہے آپ کی۔ میں بھی تائید کروں گی اس کی۔ ایسے لوگوں پر بھروسا بالکل نہیں کرنا چاہیے۔"

"اسی لیے میں آبی کو یہاں لے آیا ہوں۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنھوں نے نیشنل اسٹیڈیم کے ویرانے میں ہمیں گھیرا تھا۔ اس سے پہلے وہاں جن لوگوں نے یہ حرکت کی تھی وہ ظہیر احمد کے آدمی تھے مگر اب تو اس کا بھی قصہ ختم ہو گیا ہے اور کوئی آدمی ایسا دکھائی نہیں دیتا یہاں جسے ہم سے کوئی دشمنی ہو۔" میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ آبی یہ سمجھ لے کہ میں نے لزی کو اس کے زخمی ہونے کے بارے میں کیا بتایا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا اسے یہ بتانے کا اور میری غیر موجودگی میں اگر لزی اس سے اس سلسلے میں پوچھ لیتی تو اس کا امکان تھا کہ وہ میرے بیان کی نفی نہ کر بیٹھے۔

مَیں جو کچھ آبی کو سمجھانا چاہتا تھا اسے اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا لہٰذا وہ بولا "اس کی تو فکر نہ کرو یار جی! اگر یہ کام ہمارے کسی دشمن کا ہے تو وہ پھر دوبارہ ٹکرائے گا ہم سے اور اگر سچ مچ وہ لٹیرے ہی تھے جو ظاہر کر رہے تھے تو پھر کبھی نظر نہیں آئیں گے ہمیں۔"

لزی بولی "لیکن یہ بات آپ اپنے ذہن سے نکال دیں جنابِ عالی کہ ظہیر احمد کا قصہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ شدید زخمی ضرور ہوا ہے مگر کئی گھنٹے موت سے شدید جنگ کر کے آخر اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لہٰذا اسے بالکل ہی فراموش نہ کر دیں آپ۔ اس کے بارے میں جو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں مجھے، ان کی روشنی میں یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بسترِ مرگ پر بھی وہ اپنے دشمن کے لیے خوفناک ثابت ہو سکتا ہے، اس کی طرف سے بالکل ہی مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہیں آپ۔"

"اوہ، یہ تو تم نے بہت اہم خبر سنائی ہے۔ پھر تو یقیناً اسی کے آدمیوں کی حرکت تھی یہ بھی۔ بڑا سخت جان آدمی ہے یہ ظہیر احمد تو!"

"ہاں، اس کے بارے میں ہر اُس شخص کا یہی بیان ہے، جو اسے جانتا ہے۔ کئی بار ایسے مراحل سے گزر چکا ہے وہ۔" لزی نے کہا۔

"چلو... دیکھ لیں گے اسے ایک بار پھر۔ اس کی یہ سخت جانی آخر کب تک اس کا ساتھ دیتی رہے گی۔" میں نے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا "اچھا اب میں لیٹ کر اپنی چوٹوں کی سکائی کروں گا۔ کوئی اہم ضرورت ہو تو اٹھا لینا مجھے۔"

"آپ آرام کریں جنابِ عالی! آرام کی سخت ضرورت ہے آپ کو۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے میں موجود ہوں، ان کی فکر نہ کریں۔"

*

تیسرے دن میری حالت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ اب میں بہ آسانی نہ صرف چل پھر سکتا تھا بلکہ ضرورت پڑ جاتی تو کسی سے دو دو ہاتھ بھی کر سکتا تھا۔ لزی نے گزشتہ دو دنوں میں میری اور آبی کی جیسی تیمارداری کی تھی اسے دیکھ کر میرے دل سے یہ غبار بالکل صاف ہو گیا تھا کہ جبرالڈ والے معاملے کے بعد وہ لوگ مجھے مشکوک سمجھنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں لزی کا بیان مجھے سچ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے قومی معاملات میں دنیا کے تمام یہودی ایک تھے اور ایک ہی انداز میں سوچتے اور عمل کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہی تھے اور جذبات و احساسات بھی دنیا کے دوسرے انسانوں ہی جیسے تھے۔ اپنے آپ کو دنیا کی عظیم ترین اور افضل ترین قوم سمجھنے کے باوجود وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہی سوچتے تھے۔ خود کو نمایاں کر کے دوسروں پر برتری حاصل کرنے کی انسانی خو ان میں بھی موجود تھی..... چنانچہ جبرالڈ اور آٹزک ایک ہی مقصد رکھنے کے باوجود ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے خواہشمند تھے اور آٹزک کو جو برتری حاصل تھی، جبرالڈ اسے ختم کر کے اس کی جگہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ لہٰذا جبرالڈ کے معاملے میں آٹزک کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں اور لزی چونکہ آٹزک کی حامی تھی اس لیے اس نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا تھا اس سلسلے میں اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔

تیسرے روز صبح دس بجے میں اخبار میں شہر کے مختلف علاقوں سے دستیاب ہونے والی چھ لاشوں کے بارے میں ایک خبر کی تفصیلات پڑھ رہا تھا۔ خبر کے مطابق تمام لاشیں ناقابلِ شناخت تھیں اور سب کی اموات کا سبب ایک ہی تھا۔ یعنی ان سب کے پیٹ چاک کر کے کسی شقی القلب نے ان کے گردے نکال لیے تھے۔ اخبار کے خیال کے مطابق یہ کام کسی ایسے جنونی کا تھا جو غالباً انسانی گردے کھانے کا عادی تھا۔ اس نے مختلف مقامات پر وارداتیں کیں اور گردے نکالنے کے بعد لاشوں کو ناقابلِ شناخت بنا کر وہیں چھوڑ گیا تھا۔

میں ابھی پوری خبر نہیں پڑھ سکا تھا کہ لزی نے آ کر اطلاع دی "جنابِ عالی! مسٹر آٹزک آپ کی اور آبی کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر اخبار ایک طرف ڈالا اور اٹھتے ہوئے بولا "مسٹر آٹزک یہاں آئے ہیں! کہاں ہیں وہ؟"

"اُدھر آبی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں انھیں اُدھر چھوڑ کر آپ کو اطلاع دینے آئی ہوں۔" وہ بولی۔

مَیں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "آؤ پھر ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔"

"آپ چلیں، میں ان کے لیے ناشتے کا کچھ سامان لے کر آتی ہوں۔" لزی یہ کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

میں حیران تھا کہ یہ بہروپیا یہودی اچانک یہاں کیسے پہنچا ہے۔ اس کی آمد محض ہماری عیادت کے لیے نہیں ہو سکتی، اس کے پس پشت میں ضرور کوئی اہم مقصد پوشیدہ ہوگا۔ ایسے دشمن جو دوستی کا لبادہ پہنے ہوں زیادہ خوفناک ہوتے ہیں۔ ان سے ہر دم ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس کی آمد کی گتھی سلجھانے کی کوشش کرتا ہوا آبی کے کمرے میں جا پہنچا تھا۔

آٹزک، آبی کے بستر کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ آبی تکیوں سے پشت ٹکائے بیٹھا مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ آٹزک کی پشت چونکہ دروازے کی طرف تھی اس لیے وہ مجھے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ آبی نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر مجھے چڑانے کے انداز میں کہا "لیں جی، وہ آ گیا اپنا غلام جیلانی بھی۔ یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔ دشمنیاں یہ خریدتا پھرتا ہے لوگوں سے، سزا دوسرے بھگتتے ہیں۔"

"بک نئیں اوئے، میں نے تیرے ہاتھ نہیں جوڑے تھے کہ بیچ میں آ کے گولی کھالے میرے حصّے کی۔" میں نے اندر قدم دھرتے ہوئے کہا۔

آٹزک نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولا "آؤ بھئی غلام جیلانی! یہ تمھارے دوست تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔"

"جوکر ہے جی بالکل، کبھی کبھی تو بہت ہی زیادہ اوور ایکٹنگ کرنے لگتا ہے۔ اگر دوست نہیں ہوتا تو ایک منٹ برداشت نہیں کرتا اسے۔ آپ بیٹھیں جناب! آپ نے کیوں زحمت کی یہاں تک آنے کی، ہم خود حاضر ہو جاتے آپ کے پاس۔" میں نے بڑی اطاعت گزاری کا اظہار کیا۔

وہ خوش ہو کر میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا "یہ کوئی زحمت کی بات نہیں ہے۔ میرا فرض تھا یہ بھئی۔ آخر تم دوست ہو ہمارے۔"

"نوازش ہے جناب آپ کی جو ایسا سمجھتے ہیں آپ۔" میں نے انکساری سے کہا "مجھے تو پہلے ہی شرمندگی ہے۔ اس روز آپ کے بلانے پر میں لزی کے ساتھ آستانے پر گیا تھا مگر وہاں باہر ہی مسٹر جبرالڈ اور آبی لڑ پڑے اور....."

"اوہو، لعنت بھیجو یار اس قصّے پر۔ اس کو تم سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔ آبی نے اچھی سزا دی ہے اسے اور لزی نے مجھے بتایا ہے کہ جبرالڈ کا بدلہ لینے کے لیے اس کی سیکریٹری اور ڈرائیور جو اصل میں جبرالڈ کے دست و بازو تھے تمھارے پیچھے لگ گئے تھے مگر حادثے کا شکار ہو گئے۔ میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں کہ قسمت نے تمھارا ساتھ دے کر انھیں تمھارے راستے سے ہٹا دیا۔ دیکھا جائے تو اس طرح نئی زندگی ملی ہے تم دونوں کو۔ کچھ معلوم نہیں ہے تمھیں ان کے بارے میں۔ بہت ہی خطرناک تھے وہ لوگ۔ سب ہی خوف زدہ رہتے تھے ان سے۔"

"جی ہاں، یہ بعد میں لزی نے بتایا تھا مجھے۔ اب کیا حال ہے جبرالڈ کا؟ آپ نے اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لزی تو چاہتی تھی کہ علاج کے دوران اس کا کیس خراب کر کے اسے بھی ختم ہی کر دیا جائے لیکن میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ محض ذاتی دشمنی کی بنا پر کسی ایسے شخص کو ختم کر دیا جائے جو تنظیم کا وفادار اور اس کے لیے نہایت مفید ہو۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ صحت مند ہو جانے کے بعد میں اسے ہیڈ کوارٹر واپس بھیج دوں گا۔ اس کے بارے میں رپورٹ میں نے اوپر بھیج دی ہے۔ وہ لوگ بھی متفق ہیں مجھ سے۔"

"یہ بہت اچھا کیا آپ نے، بڑی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے آپ نے یہ۔ واقعی کام کے آدمی کو اپنی ذات پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ کوئی آدھے گھنٹے ہمارے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا گیا۔ لزی اسے آستانے تک پہنچانے کے لیے ساتھ گئی تھی اس کے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد آبی بولا۔

"یار! بڑا گہرا آدمی ہے بھئی یہ۔ کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ اگر آدمی کو اس کی حقیقت کا پتا نہ ہو تو گرویدہ ہو کر رہ جائے

اس کا۔"

"اس کے اسی انداز نے تو عوام النّاس کو گرویدہ کر رکھا ہے اس کا۔ بڑے معتقد ہیں لوگ اس کے۔ بہت احترام سے نام لیتے ہیں۔"

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "اب تو تیری طبیعت ٹھیک لگ رہی ہے مجھے۔ وہ فیروز وغیرہ کی بھی تو خبر لے اب میرے یار! کوئی چکر نہ چل گیا ہو اُدھر۔"

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ابھی جا رہا ہوں میں اُدھر ہی۔ آج کے اخبارات میں ان چھ آدمیوں کی لاشوں کے بارے میں خبر بھی چھپی ہے جن کے گردے ہم نے نکلوائے تھے۔ خان وغیرہ انھیں شہر کے مختلف علاقوں میں پھینک آئے تھے۔" میں نے اسے بتایا۔

"یہ تو بہت بُرا کیا یار انھوں نے۔ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح تو پورے شہر کی پولیس ہماری طرف متوجہ ہو جائے گی۔" آپی بولا۔

"چھوڑ یار! اس چکر میں نہ پڑ تُو۔ ان لاشوں پر ہمارے نام تو نہیں لکھے ہیں کوئی کہ پولیس ہماری طرف متوجہ ہو جائے گی۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا ہمیں کہ ان آدم خوروں کے گروہ میں ہلچل مچ جائے گی، خوف زدہ ہو جائیں گے وہ ہم سے بہت زیادہ۔"

"انھیں خوفزدہ کر کے تُو کیا حاصل کرے گا بھئی؟ تیس لاکھ روپے وصول کر کے تو پہلے ہی فیروز کو دے چکا ہے۔ اب وہ ایک پیسہ نہیں دیں گے تجھے۔ اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد تو تیری کسی بات پر بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں گے وہ۔"

"اچھا یار! اب چھوڑ اس قصّے کو، میں ذرا فیروز کی طرف جا رہا ہوں۔ لزی آئے تو کہہ دینا اس سے کہ یوں ہی کہیں گھومنے پھرنے گیا ہے۔ گھر میں پڑے پڑے بور ہو گیا تھا بہت۔" میں نے آپی سے کہا اور اٹھ کر اس کمرے سے نکل آیا۔

کرولا کار لزی لے گئی تھی لہٰذا میں نے گیراج سے دوسری کار نکال لی جو شرافت علی نے ہمارے استعمال کے لیے یہاں چھوڑی ہوئی تھی۔ وہ کار نکال کر میں باہر جانے والے راستے پر پہنچا تو شرافت علی کی کار کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر میں نے اپنی کار وہیں روک لی۔ شرافت علی کار خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ سیدھا میری ہی طرف چلا آیا اور کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔ "کدھر جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں ذرا فیروز کی طرف جا رہا تھا۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے بھی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

وہ بولا۔ "ایسا کوئی خاص کام تو نہیں ہے۔ تم یہ گاڑی گیراج ہی میں کھڑی کر آؤ۔ میں اپنے ساتھ لے چلتا ہوں تمھیں۔"

"ٹھیک ہے تم گاڑی واپس موڑو، میں آتا ہوں ابھی۔" میں نے شرافت علی کو جواب دے کر اپنی کار واپس گیراج کی طرف بیک کر لی۔

گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میں شرافت علی کے پاس ہی خالی نشست پر آ بیٹھا۔ گیٹ سے باہر آنے کے بعد شرافت علی نے کہا۔ "تم نے اخبار دیکھا آج کا۔ جن چھ آدمیوں کے تم نے گردے نکلوائے تھے، ان کی لاشیں پولیس کی تحویل میں پہنچ گئی ہیں۔"

"ہاں، میں پڑھ چکا ہوں یہ خبر لیکن وہ جان کچھ بھی نہیں سکیں گے ان کی مدد سے۔ ابھی تو ان کی شناخت ہی کا مسئلہ درپیش ہے انھیں، اگر کسی طرح وہ پہچان بھی لی گئیں تو یہ کون بتائے گا انھیں کہ ان لوگوں کو کس نے اور کیوں اس عبرتناک انجام سے دوچار کیا ہے۔"

"ہاں، یہ مسئلہ تو ہے۔ یہ کام ہماری پولیس کے لیے ناممکن تو نہیں ہے لیکن بے وجہ محض ان کے ورثا کا پتا لگانے کے لیے اتنی دردِ سری کرے گا کون؟ چند روزہ رسمی سی کارروائی کے بعد کیس فائل کر کے ڈال دیا جائے گا کسی کونے میں تاکہ ثبوت رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔"

"خاصا تجربہ ہے تمھیں بھی ان سرکاری درباری اہلکاروں کا۔ خیر چھوڑو اسے میں ایک اور کام لینا چاہتا ہوں تم سے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں، بولو۔ کیا کام لینا چاہتے ہو تم مجھ سے۔ بے دھڑک ہو کر کہہ دیا کرو کسی بھی کام کو۔ غیریت نہ برتا کرو یار مجھ سے۔" وہ بولا

"تم ٹیلی فون کے ذریعے ان لوگوں سے رابطہ کر کے بات کرو...... جو ڈاکٹر قاضی کو بلیک میل کر کے انسانی گردے حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"لیکن ان کا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملے گا مجھے؟ اور میں کیا بات کروں گا اُن سے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ٹیلی فون کی تم فکر نہ کرو۔ وہ میں فراہم کر دوں گا تمھیں۔ تم ان کے باس سے بات کرو گے اور اسے بتاؤ گے، تمھارے پاس چار گردے موجود ہیں۔ اگر وہ انھیں حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو دس لاکھ فی گردہ کے حساب سے رقم لے کر آجائیں۔ تم انھیں یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ اس سے پہلے تم ڈاکٹر دھمن کو گردے سپلائی کرتے رہے ہو اور ان کا پتا اور فون نمبر تمھیں ڈاکٹر دھمن ہی سے ملا ہے۔"

میں نے اس سے باتیں کرتے ہوئے عقب کا منظر پیش کرنے والے آئینے پر نظر ڈالی تو ایک دم چونک اٹھا۔ انور کمال کی بیلی مزدا کار ہماری گاڑی کے بالکل پیچھے موجود تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پیچھے دیکھا۔ گل زمان بھی انور کمال کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ہاتھ باہر نکال کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "گاڑی ایک طرف لگا کے روک لے میرے بھائی! یہ لوگ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں؟"

شرافت علی نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے پوچھا۔ "کون لوگ بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"انور کمال نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا ہے۔ اسی کی بات کر رہا ہوں میں۔" میں نے اسے بتایا۔

شرافت علی نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کار ایک طرف فٹ پاتھ کے ساتھ لگا دی اور بولا۔ "ارے یہ کب ہمارے پیچھے آ گئے ہیں بھئی؟ باتوں کے دوران میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی بالکل۔"

انور کمال کار روک کر باہر نکل آیا اور ہماری کار کے پاس آ کر عقبی دروازہ کھول کے اندر گھستے ہوئے بولا۔ "رکیں نہیں جناب! چلتے رہیں، میں چند اہم باتیں کر کے اُتر جاؤں گا کہیں بھی۔"

شرافت علی نے اس کے اندر آتے ہی کار آگے بڑھا دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر انور کمال سے پوچھا۔ "ہاں، کہو کیا بات ہے؟"

"یہ جو شخص آپ لوگوں کے بنگلے سے نکلنے سے پہلے لزی کے ساتھ گیا ہے یہ کیوں آیا تھا آپ کے پاس؟" انور کمال بولا۔

"یوں ہی آپی کی عیادت کو آیا تھا وہ۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا آپ کے پرانے مراسم ہیں اس سے؟ میرا مطلب ہے آپ لوگ پرانے شناسا ہیں؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"زیادہ پرانے تو نہیں ہیں، مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟ ویسے میرا خیال ہے تم اس سے واقف نہیں ہو شاید حالاں کہ اسے آدھے سے زیادہ شہر جانتا ہے۔"

"اچھا! کیا کوئی بہت اہم شخص ہے وہ! میں اس کی کسی دوسری حیثیت سے واقف نہیں ہوں۔"

"تم نے منگھو پیر کی پہاڑیوں میں واقع بابا اسحاق کے آستانے اور بابا اسحاق کے بارے میں سنا ہے کبھی؟"

"ہاں، سنا تو ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ بڑے بڑے لوگ ان کے معتقد ہیں۔" انور کمال نے جواب دیا۔

"یہ وہی بابا اسحاق تھا جسے تم نے لزی کے ساتھ میرے گھر سے جاتے دیکھا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"اوہ، یہ بابا اسحاق...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے آپ کو؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"غلط فہمی کیسی بھئی؟ اور تم اس قدر حیران کس بات پر ہو رہے ہو، کیا تم اسے کسی اور حیثیت سے بھی جانتے ہو؟"

"آپ لوگوں نے گل زمان کو ان پانچ افراد کے باس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا جن کے آپ نے گردے نکلوائے تھے۔ وہ اس شخص کا پیچھا کرتے ہوئے اس بابا اسحاق تک پہنچا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ان لوگوں کا اصل سربراہ یہ بابا اسحاق ہی ہے۔ یہی خرطومی کے نام سے ان لوگوں کو آرڈر دیتا ہے اور ایسے لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو اس کام میں ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بس اتفاقاً ہی گل معلوم ہو گیا تھا گل زمان کو۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ بابا اسحاق اور خرطومی ایک ہی شخص ہے!" میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں اور منہ پوری طرح کھل گیا تھا اور میں انور کمال کو تکتا رہ گیا تھا۔

انور کمال کی بات پر یقین نہ کرنے کی ایسی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آتی تھی مجھے۔ جو شخص یہودی ہونے کے باوجود میرے ملک کے سیدھے سادے لوگوں کو ایک تارک الدنیا، عابد و زاہد مسلمان کا روپ دھار کر ایک عرصے سے بے وقوف بنا رہا ہو، اس کے بارے میں کوئی بھی انکشاف اتنا چونکا دینے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایسی عیار اور مکار قوم سے تعلق رکھتا تھا جس کے نزدیک دوسری اقوام کو فریب دینا، اپنی چالاکی اور مکاری سے نقصان پہنچانا عین عبادت تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس خبیث بہروپیے سے ذلیل ترین حرکتوں کی بھی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ یہاں یہ روپ دھارے بیٹھا ہی اس لیے تھا۔ انور کمال کے انکشاف سے یہ بات بھی عیاں ہو گئی تھی کہ دھمن ابتدا ہی سے دانستہ یا نادانستہ طور پر یہودیوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔ اور اب مکمل طور پر ان کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ بلکہ اب تو میں یہ سوچتے ہوئے بھی اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا کہ دھمن نسلاً ہے ہی یہودی۔ اس کا ہر انداز اور ہر عمل اس کے یہودی ہونے کی چغلی کھاتا رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس راندۂ درگاہ قوم سے ناواقف ہونے کی بنا پر میں اسے پہچان نہیں سکا۔

میں نے انور کمال سے پوچھا۔ "گل زمان کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی کہ وہ بہروپیہ ہی دراصل خرطومی بھی ہے؟"

"گل زمان کو آپ نے جس شخص کے پیچھے لگایا تھا اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اس کی رہائش گاہ تک جا پہنچا تھا۔ وہ شخص اپنی رہائش گاہ پہنچنے کے بعد آدھی رات کے قریب ایک اور شخص کے ساتھ واپس آیا اور اس نے فیروز صاحب کی کوٹھی

کا وہ حصہ پوری طرح کھنگال ڈالا جہاں سے ہم نے اسے دیکھنے کے بعد آپ صاحب کو ہٹایا تھا۔ گل زمان نے فیروز صاحب کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ کوٹھی کے اندر موجود ہے۔ فیروز صاحب خود یہ چاہتے تھے کہ وہ وہاں کی تلاشی لے کر پوری طرح مطمئن ہو جائے چنانچہ انھوں نے اس کے کام میں مداخلت نہیں کی۔ آپ لوگ اس وقت آپریشن والے کمرے میں بیٹھے ڈاکٹر کی کارکردگی دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ نامراد واپس لوٹے تو گل زمان ایک بار پھر ان کے تعاقب میں چلا گیا۔ ان پانچ آدمیوں کے آپ کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد شاید وہی دو آدمی رہ گئے ہیں۔ اب اس مکان میں۔ کیوں کہ ان کے بارے میں کھوج لگاتے کے لیے جب گل زمان اس مکان میں داخل ہوا تو وہاں کوئی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا۔ پورے مکان میں ان دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے گل زمان کو پتا چلا کہ رقم کی ادائیگی کے بعد اس شخص نے یہاں خرطومی کے نمائندے کو اطلاع دے دی تھی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اس نے اپنے اتنے بڑے نقصان کی تلافی کے لیے بھی کہا تھا، جواب میں خرطومی کے نمائندے نے اسے بتایا تھا کہ ایک دو دن میں خود خرطومی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ان سے خود بات کرے۔ یہ بات جب گل زمان نے فیروز صاحب کو بتائی تو انھوں نے اسے مستقل طور پر اس شخص کی نگرانی پر لگا دیا اور ہدایت کر دی کہ وہ اس شخص خرطومی اور ان لوگوں کی ملاقات میں ہونے والی تمام گفتگو سننے کی کوشش کرے۔

کل خرطومی اس شخص کے پاس پہنچا تھا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو تو گل زمان نہیں سن سکا مگر اس نے خرطومی کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ آج جب اس نے اسے آپ کے بنگلے میں جاتے دیکھا تو اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نے مجھے اس شخص کی اصلیت بتائی تو میں بھی فکرمند ہو گیا۔ پھر ہم دونوں نہایت چوکنا انداز میں بنگلے کی نگرانی کرنے لگے۔ اگر ہمیں اندر ذرا بھی گڑبڑ کا شبہ ہوتا تو ہم بے دریغ بنگلے میں گھس پڑتے۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ واپس ہوا تو لزی کو اس کے ساتھ دیکھ کر ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ شخص آپ کے ساتھ کوئی چال چلنے میں کامیاب ہو گیا ہے شاید۔ اسی لیے میں احتیاط کو پس پشت ڈال کر اس وقت آپ کے پاس چلا آیا۔ لیکن یہاں آکر جو انکشاف ہوا ہے اس کے بارے میں، اس نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔"

میں نے شرافت علی سے کہا "یار شرافت علی! اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ اور لزی دونوں ہی ہماری سرگرمیوں سے

واقف ہیں۔ اس کے باوجود وہ انجان بنے ہوئے ہیں۔ مجھ پر یہی ظاہر کر رہے ہیں جیسے میرے بیان پر ذرا بھی شک نہ ہوا ہو انھیں۔"

"یہ بات تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ رہے ہو؟ ہو سکتا ہے انھیں کچھ بھی پتا نہ ہو اس بارے میں۔" شرافت علی نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے جس سے تیس لاکھ روپیہ وصول کیا ہے اسے میں نے بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں۔ پھر کیا اس نے اس خبیث کو یہ نہیں بتایا ہو گا کہ اس سے روپیہ کس نے وصول کیا ہے؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کبھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن تمھیں اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اپنا اصلی نام اسے بتایا ہی کیوں تھا تم نے؟ یہ تو بڑی حماقت کی ہے تم نے۔"

"اس کے بغیر وہ اتنی بڑی رقم اُگلنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ میرے نام کی ہیبت نے ہی اسے آمادہ کیا تھا روپیہ دینے کے لیے۔"

"ہاں، یہ بات تمھاری ٹھیک ہی لگتی ہے مجھے بھی۔ لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ لزی اور بابا اسحاق تمھاری سرگرمیوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ تمھیں ڈھیل نہیں دیتے بالکل بھی۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھی تنظیم ایک لمحے برداشت نہیں کرتی جو کسی طرح بھی تنظیم کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بابا اسحاق کو تم پر شبہ ہو گیا ہو اور اس کی تصدیق کے لیے وہ اس وقت عیادت کے بہانے تم سے ملنے آیا ہو۔ اور اب لزی سے کچھ معلومات کر کے اندازہ لگانے کی کوشش کرے شاید۔"

"یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں نے ان لوگوں سے تیس لاکھ روپے وصول کر کے بھی ان کے آدمیوں کو نہیں چھوڑا، اور ان سب کی لاشیں شہر کے مختلف علاقوں سے دستیاب ہو جانے کے بعد تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ میں نے اب سب کو قتل کر دیا ہے۔ اب وہ کس بارے میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا میرے پاس؟ اور لزی سے وہ کیا معلوم کرنے کی کوشش کرے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم ایک اہم بات بھول رہے ہو۔ جو لاشیں شہر کے مختلف حصوں سے دستیاب ہوئی ہیں پولیس کو، وہ سب ناقابلِ شناخت تھیں۔ ان کے بارے میں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سے لوگ تھے بس ایک ہی قدر مشترک تھی ان میں کہ ان سب کے گردے غائب تھے۔ اور پھر وہ پانچ نہیں چھ تھے۔ لہٰذا یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ لوگ تمھارے ہاتھوں اس انجام کو پہنچے ہیں۔ تم نے بتایا تھا کہ تم نے روپیہ وصول کرنے کے لیے انھیں یہ باور کرایا تھا کہ کوئی اور پارٹی بھی گردہ فروشی کے کاروبار میں ملوث ہے اور وہ تمھیں ان پانچ افراد کے پچیس لاکھ تک دینے کو تیار ہے۔ تمھارے اس بیان کی روشنی میں وہ تمھارے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے ہیں کہ تم نے روپے کے لالچ میں ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ ان سے تیس لاکھ روپے وصول کرنے کے بعد بھی ان پانچوں کو پچیس لاکھ کے عوض دوسری پارٹی کے حوالے کر دیا۔ اس کے سوا لزی اور بابا اسحاق اور کچھ نہیں سوچ سکتے۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے ان کی نظر میں۔ انھیں ان لوگوں کے مارے جانے کا بھی کوئی ملال نہیں ہو گا کیوں کہ وہ تنظیم کے آدمی نہیں تھے۔ یہ نقصان تو دراصل ان لوگوں کا ہے جن کے لیے وہ کام کر رہے تھے اور جنھوں نے ان کے عوض تمھیں تیس لاکھ روپے ادا کیے ہیں۔ وہ لوگ ضرور تمھاری تلاش میں ہوں گے۔ اس کے برعکس بابا اسحاق اور لزی تم سے بڑی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ تنظیم کے لیے تمھیں استعمال کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ اتنی آسانی سے تمھیں گنوانا پسند نہیں کریں گے۔ بلکہ تمھارے لیے کوئی خطرہ محسوس کریں گے تو اس سے دفاع ہی کریں گے تمھارا۔" شرافت علی نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

اس کی باتیں میرے بھی دل کو لگی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر نہ جانے کیوں میرا دل پوری طرح مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے کہا "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ عیادت کے بہانے اپنے شبہے کی تصدیق کرنے آیا ہو گا اور لزی سے معلومات حاصل....."

وہ میری بات کاٹ کر بولا "ہاں، یہ بات میں نے کہی تھی لیکن پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہی تھی نا؟ خیال ظاہر کیا تھا اپنا۔ مگر حالات کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد اب میں اس خیال کو خود ہی رد کر رہا ہوں۔ اگر یہ بات درست بھی ہے کہ وہ تمھارے پاس کچھ جاننے کے لیے آیا تھا تو یوں سمجھ لو کہ وہ یہی جاننا چاہتا تھا کہ یہ کام تم نے کیا ہے یا نہیں۔ اگر اسے یہ یقین ہو گیا، یعنی اسے کسی طرح پتا چل گیا کہ تم نے ہی ان لوگوں کو دوسری پارٹی کے ہاتھوں تک پہنچایا ہے تو پھر وہ تمھارا دفاع کرنے لگے گا — تمھارے دشمنوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ کسی نے تمھارا نام استعمال کر کے انھیں لوٹا ہے۔"

"لیکن اگر خرطومی وہی ہے تو یہ بات اس کے علم میں ہو گی کہ دوسری ایسی کوئی پارٹی نہیں ہے۔ میں نے کسی فرضی پارٹی کا حوالہ دے کر زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کی تھی اور میری یہ چال کامیاب بھی رہی ہے۔" میں نے ایک اور پوائنٹ اٹھا دیا۔

"یہ تم کیسے کہہ رہے ہو کہ کوئی دوسری پارٹی اس کے لیے کام نہیں کر رہی ہے؟ ممکن ہے اس نے کئی ایسی پارٹیوں کو اس کام پر مامور کر رکھا ہو۔ بہرحال اس سلسلے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر بات اچانک کسی موڑ پر خراب ہونے لگے گی تو ہم پوری قوت سے ان کے خلاف میدان میں آجائیں گے اور جتنے بھی لوگ ہماری نظروں میں ہیں اس وقت، ان سب کا تو کام تمام ہی کر دیں گے۔ جو بچ جائیں گے انھیں بعد میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگاتے رہیں گے۔ ملکی سالمیت کے اس مسئلے میں شرافت علی تن من دھن سے تمھارا ساتھ دینے کا عہد کر چکا ہے دوست، اسے تم ہر وقت اپنے ساتھ پاؤ گے۔ یہ ساری دولت جو میں نے چور دروازے سے، اپنے ملک کو نقصان پہنچا کر حاصل کی ہے، یہ اگر میرے ملک کے کام آجائے تو میں سمجھوں گا میرے گناہوں کی کچھ تلافی ہو گئی ہے، شاید میرے ضمیر کا بوجھ ہی کچھ ہلکا ہو جائے اس طرح۔" شرافت علی انتہائی جذباتی ہو گیا تھا۔

انور کمال جو اَب تک خاموش بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا، شرافت علی کی باتوں سے متاثر ہو کر بولا "اللہ نے چاہا تو ہم سب مل کر ان دشمنانِ ملک و ملت کا نام و نشان تک مٹا ڈالیں گے۔ جناب! آپ جیسے محبِ وطن لوگوں کا تعاون حاصل ہونے کے بعد تو اب ہماری قوت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ بہت سے لوگ ہماری نظروں میں ہیں اور ہم انھیں ڈھیل صرف اسی لیے دیتے رہے اب تک کہ ان سے کھل کر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ابھی ہم، دوسرے یہ بھی چاہتے ہیں کہ زنجیر کی ہر کڑی سامنے آجائے تو اس پوری زنجیر کو توڑنے کی کوئی آسان راہ تلاش کی جائے۔ ویسے خاموش اب بھی نہیں بیٹھے ہیں ہم لوگ۔ جہاں موقع یا ضرورت ہوتی ہے کوئی ضرب لگا ہی دیتے ہیں ان پر کہیں نہ کہیں سے، ورنہ تو اب تک یہ نہ جانے کیا کچھ کر چکے ہوتے۔"

"ہاں، مگر بات اب اس مقام تک آپہنچی ہے کہ انھیں مزید ڈھیل دینے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔" میں نے کہا "اب ہمیں ان پر ایک بھرپور وار کر دینا چاہیے۔ تم کیا کہتے ہو شرافت علی؟ میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں، کسی حد تک تمھاری بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہی ہو گا کہ اگر ہم کسی طرح اس جعلساز بابا اسحاق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ لوگ جو اَب تک ہمارے سامنے نہیں آسکے ہیں کسی نہ کسی وجہ سے وہ اپنے اپنے بلوں سے نکل کر منظرِ عام پر آجائیں گے۔ پھر ہم ان سے نمٹنے کے لیے کوئی ٹھوس اور جامع منصوبہ بندی کر سکیں گے۔ یوں شاید ہمارا کام

جلدی اور آسان ہو جائے۔"

"اب تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے جناب! اس واقعے کے بعد اگر انھیں آپ پر کوئی شک ہو گیا ہے تو وہ آپ کو آزادی سے گھر سے نکلنے بھی نہیں دیں گے اب۔ اپنے شک کو یقین میں تبدیل کرنے کے لیے آپ کی سختی کے ساتھ نگرانی کی جائے گی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جب تک وہ مطمئن نہ ہو جائیں آپ کی طرف سے، ہمیں پس منظر میں چلے جانا پڑے گا۔" انور کمال نے خیال ظاہر کیا۔

"میں اس خبیث یہودی کو اس کا موقع ہی نہیں دوں گا۔ اگر اس رات وہ عاقبت نااندیش لٹیرے درمیان میں نہ آ جاتے اور آپی کے پاؤں میں گولی نہ لگ گئی ہوتی تو آج وہ ذلیل آدمی اس قابل بھی نہ ہوتا کہ مجھ پر شک کر سکے۔" میں نے جواب دیا۔

انور کمال بولا "جی ہاں، میرا بھی یہی مطلب تھا۔ اس رات ہم جو کام نہیں کر سکے تھے، اسے آج یا کل، جس قدر جلد ممکن ہو پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں تاکہ اس کا نتیجہ جلد از جلد سامنے آ جائے۔ سچ پوچھیں تو یہ انتظار اب مجھے بد دل سا کرنے لگا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو برادر! اور بد دل ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہم ابھی فیروز کے پاس چل کر اس معاملے کو نمٹانے کے لیے کوئی کارروائی کرنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں اور اس بار اللہ نے چاہا تو اس پر عمل بھی کر ہی لیں گے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی قدرے حیرانی سے مجھے تکتے ہوئے بولا "کس منصوبے کا ذکر ہے یہ؟ کون سا منصوبہ بنا رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "تم گاڑی روک کر انور کمال کو اتار دو یہیں کہیں، یہ اپنی گاڑی میں واپس چلا جائے تو تمھیں بھی سب کچھ بتا دوں گا۔ اس کا زیادہ دیر تک ہمارے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ہے بھئی۔ ان کی گاڑی ہمارے بالکل پیچھے لگی ہوئی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ کار ہمارے دشمنوں کی نظر میں آ جائے۔" پھر انور کمال سے بولا "تم اپنی گاڑی میں واپس جاؤ، ہم لوگ اب سیدھے فیروز کی طرف ہی چل رہے ہیں۔ بس اب ہم وہیں ملیں گے۔"

اس اثنا میں شرافت نے کار سڑک کے کنارے لگا کر روک دی۔ کار رکتے ہی انور کمال دروازہ کھول کر آہستہ سے باہر رینگ گیا۔ شرافت علی نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور بولا "ہاں، اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟"

"میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا اس رات جس رات آپی زخمی ہوا ہے کہ ہم نے بابا اسحاق کے آستانے پر شب خون مارنے کا پروگرام بنایا ہے۔" اس کے بعد میں نے اسے بابا اسحاق کے آستانے پر شب خون مارنے کے پروگرام کی تفصیل دوبارہ بتانے کے بعد کہا "تمھارا کیا خیال ہے اس بارے میں اب؟ اس رات تو تم

اس سے متفق نہیں تھے!"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر غالباً اس پر غور کرتا رہا، پھر بولا۔ "منصوبہ ٹھیک ہی ہے مگر یہ صرف ہنگامہ کر کے واپس چلے آنے والی بات سمجھ میں نہیں آتی میرے۔ اس طرح تو تم انھیں چوکنا کر دو گے اور انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے حفاظتی نظام میں کہاں کہاں کون کون سی خامیاں رہ گئی ہیں۔ اس واقعے کے بعد وہ ان خامیوں کو دور کر کے زیادہ محفوظ ہو جائیں گے نہیں میرے یار! یہ بہت بڑی غلطی کرو گے تم، یہ احساس تو انھیں ہونے ہی نہیں دینا چاہیے کہ ان کا کوئی کمزور پہلو بھی ہے جہاں سے ان پر ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ اچھا ہوا جو تم لوگوں کو اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا اس رات۔"

بات اس کی دل کو لگتی تھی، بڑا اہم نکتہ سمجھائی دیا تھا اسے اس گھڑی۔ میں نے کہا "ہاں یار جی! کہتا تو ٹھیک ہی ہے، مگر ہم یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے آخر کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ پیش رفت تو ہونا ہی چاہیے نا!"

"ہاں، پیش رفت تو ضرور ہونا چاہیے لیکن یہ جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو اس کا فائدہ اتنا نہیں جتنا نقصان ہے اس میں، دھاوا ہی کرنا ہے اس ابن یہود کی کمین گاہ پر تو پورے انتظامات کے ساتھ اس طرح کرو کہ اس کے پاس بچ نکلنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ یہی بات اس رات بھی کہی تھی میں نے، یاد رکھو جیلانی! سانپ پر ادھورا وار کرنا خودکشی کرنے جیسا ہی ہوتا ہے۔ اسے سنبھلنے اور پلٹ کر حملہ کرنے کا موقع دینا انتہائی خطرناک ہے۔ اس کی تائید بالکل نہیں کروں گا میں۔" شرافت علی نے کہا۔

"لیکن میرے یار! دشمن کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا بھی تو ضروری ہے۔ اس کے بارے میں جانے بغیر اس کی حدود میں جا اترنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ خطرہ مول لیے بغیر تو ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے بھائی جی!"

"بے شک، خطرہ مول لیے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ میں تمھاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اور جب یہ ضروری ہی ہے تو پھر آنکھ مچولی کھیلنے کا کیا فائدہ؟ میں تو کہتا ہوں اس اگر، مگر، چنانچہ، چونکہ کو دل و دماغ سے ایک دم جھٹک دو اور تخت یا تختہ کے اصول کے تحت جا پڑو دشمن پر۔ سمجھ لو یا تو ہم مٹ جائیں گے یا ان ذلیلوں کو مٹا ڈالیں گے صفحۂ ہستی سے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے فیروز کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ شرافت علی نے پورچ میں کار روکی تو میں یہ کہتے ہوئے کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا "ٹھیک ہے، آؤ فیروز سے بات کر لیتے ہیں اس سلسلے میں۔ اس سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔"

"ہاں، یہ درست کہا ہے تم نے۔ ایسے معاملات میں تمام دوستوں کی تائید اور حمایت حاصل کر لینا چاہیے۔" وہ انجن بند کر کے کار سے باہر آتے ہوئے بولا "اتفاق اور اتحاد کسی بھی کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری شرط ہے۔"

"کس اتفاق اور اتحاد کی بات ہو رہی ہے بھئی؟" فیروز نے دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے کہا "وہ شاید ہماری کار کی آواز سن کر یہ جاننے کے لیے ادھر آیا تھا کہ آنے والا کون شخص ہے۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

میں نے اور شرافت علی نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ہم تینوں ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے اسے اپنے اور شرافت علی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ..... آگاہ کر کے پوچھا "تمھاری کیا رائے ہے اس سلسلے میں؟"

"میں بھائی شرافت علی کی رائے سے متفق ہوں۔ بڑی دور اندیشی کی بات کی ہے انھوں نے۔ دشمن کی طاقت کا اندازہ تو ہے ہمیں۔ جب ہم اس بات سے واقف ہیں کہ دشمن کون ہے تو اس کے وسائل اور مقاصد کا علم بھی ہے ہمیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کتنی قوت رکھتا ہے اور کس حد تک جا سکتا ہے، پھر یہ جاننے کے لیے وقت برباد کیوں کیا جائے؟" فیروز بولا۔

"تو تم بھی یہی چاہتے ہو کہ ہم کھل کر سامنے آ جائیں اور جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں، بالکل ہمیں اپنی طاقت کا بھرپور اظہار کر دینا چاہیے اس پر اور جہاں تک کھل کر سامنے آنے والی بات ہے تو اس سلسلے میں پہلی کوشش تو ہم یہی کریں گے کہ دشمن ہمارے بارے میں کچھ جان نہ سکے۔ اگر اس میں کامیابی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی بھی زیادہ پروا نہ کرو، ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے، اس کے بغیر تو بات نہیں بن سکے گی۔"

"لیکن اب تک ہم ان کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل صرف اس لیے کھیلتے رہے ہیں کہ ان کے تمام لوگ ہماری نظروں میں آ جائیں، ان کے سارے منصوبے، طریقۂ کار اور ایک ایک ٹھکانے سے ہم واقف ہو جائیں تاکہ ان کی مکمل صفائی کی جا سکے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، چاہتے تو ہم بھی یہی تھے مگر اس طرح بس وقت ہی برباد ہوا ہے اب تک، کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے بجائے اگر ہم ان کے خلاف حرکت میں آ جاتے تو وہ ہمارے مقابلے کے لیے ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے اور خود بخود ہمارے سامنے آتے چلے جاتے۔ شرافت بھائی کا کہنا ٹھیک ہے۔ انھیں اپنی کمین گاہوں سے باہر لانے کے لیے ہمیں حرکت میں آنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی ہے۔" فیروز نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم سب کی یہی رائے ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے یارو! میں تمھارے ساتھ آگ اور خون کے دریا میں اترنے کو ہر وقت تیار ہوں لیکن اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں آپی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اسے اس حال میں ان کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتے نا ہم۔ اگر بات بگڑ گئی تو وہ آپی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔ اسے ان کے چنگل سے نکالنا بے حد ضروری ہے۔" میں نے ان کے پروگرام سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ بات تم نے بالکل ٹھیک کہی ہے۔ ان حالات میں آپی کا ان کے درمیان رہنا بالکل مناسب نہیں ہے۔" شرافت علی بولا۔

"مجھے بھی اتفاق ہے اس بات سے۔ تم یوں کرو جیلانی! اسے واپس یہیں لے آؤ۔" فیروز نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا "نہیں، یہ بات مناسب نہیں ہے۔ یا تو اس کے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کا انتظار کرو یا پھر میں اسے کسی ایسی جگہ منتقل کر دوں گا جس کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ہو۔ ایک ایسی جگہ ہے نظر میں میری۔"

"ہاں، یہ ٹھیک سوچا ہے تم نے جیلانی! وہ طارق روڈ پر فردوسی بیگم کا فلیٹ محفوظ ترین جگہ ہو گی اس کے لیے۔" فیروز بولا۔

"بالکل بالکل، یہی سوچا ہے میں نے بھی اس کے لیے۔ اس کا کسی کو پتا نہیں ہے، وہاں اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہو گی۔"

"بس تو پھر یہ طے ہو گیا کہ آج رات ہم آستانے پر چڑھائی کریں گے اور کوشش یہ ہو گی کہ آئزک سمیت وہاں موجود تمام لوگوں کا خاتمہ کر دیا جائے، کسی کو زندہ نہ چھوڑا جائے اور نہ بھاگنے کا موقع دیا جائے کسی کو۔ غرض یہ کہ آستانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا ہے ہمیں آج رات کو۔ چنانچہ اب تم شام سے پہلے پہلے آپی کو فردوسی بیگم کے فلیٹ میں پہنچا دو۔ میں اس دوران اپنے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے سارا پروگرام سمجھا دوں گا انھیں۔ کوشش ہماری یہی ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ طاقت جمع کر کے ان پر ٹوٹ پڑیں۔ تم بھی شرافت علی! اپنے جاں نثار قسم کے ساتھیوں کو جمع کر لو اور اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے تمام وسائل اکٹھے کر لو دوست! آج کی مہم سر کر لی ہم نے تو سمجھو پچھتر فیصد ملک و ملت کے دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ یہ بہت اہم اور بے حد مضبوط گڑھ

ہے ان کا۔" فیروز نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"اس کی تم بالکل فکر نہ کرو، میں کوئی کمی نہیں رہنے دوں گا اپنی طرف سے۔ شام تک میرے آدمی کیل کانٹے سے لیس یہاں موجود ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی آدمی پشت دکھانے والا نہیں ہو گا، ہر شخص جان دے کر بھی اس مہم کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے گا۔" شرافت علی نے کہا۔

فیروز کے گھر سے نکل کر واپس جاتے ہوئے شرافت علی بولا۔ "یار جیلانی! اس اپنی لزی بیگم کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے تم نے؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہ رہے ہو تم، ذرا وضاحت سے بات کرو۔" میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں میرے عزیز کہ ہماری اس کارروائی کے موقع پر لزی کو وہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا بندوبست کرنا ہے تمھیں۔"

"کیوں؟ اس کے وہاں ہونے سے کیا فرق پڑے گا؟ جب ہم آج کی کارروائی میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو لزی کو تم کیوں بچانا چاہتے ہو؟ میرا تو خیال ہے آج اس کا بھی قصہ ختم ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں میرے بھائی! سب کچھ برباد کر دینے کے بعد کوئی ایک ایسی ہستی باقی رہنا چاہیے جو اپنی بچی کھچی طاقت کو یکجا کر کے ہمارے سامنے لے آئے۔ یہ کام لزی کر سکتی ہے لہٰذا اسے سلامت رہنے دو ابھی۔ آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد وہی ایک ایسی ہستی ہو گی جس پر نظر رکھنے کے بعد ہم بچ جانے والے دوسرے تخریب کاروں تک بھی پہنچ جائیں گے۔" شرافت علی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم نے بہت دور کی بات سوچی ہے یار! یہ بہت ضروری ہے۔ لیکن لزی کو آستانے سے دُور رکھنا کیسے ممکن ہے؟ اگر وہ کسی ضرورت سے وہاں جا ہی پہنچی تو ہم کیا کریں گے؟"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں برادر! اس سلسلے میں کچھ سوچو، کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ کسی بھی حالت میں اُدھر نہ جا سکے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے کہیں جانے آنے سے میں کیسے روک سکتا تھا۔ اگر خود موجود ہوتا تو اسے ساتھ لے کر کہیں تفریح وغیرہ کے لیے ہی نکل جاتا۔ یا کوئی اور بہانہ کر کے اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیتا، مگر میری غیر موجودگی میں وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے شرافت علی سے پوچھا۔ "تمھیں وہ کلینک یاد ہے یار! جہاں جیرالڈ زیرِ علاج ہے؟"

"ہاں، وہ وہی جگہ ہے جہاں کبھی آبی کی آنکھوں کے قرینے نکالے گئے تھے۔ مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو...؟" وہ بولا۔

"ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس پر کامیابی سے عمل ہو جائے تو لزی خود بخود رک جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کون سی ترکیب آئی ہے تمھارے ذہن میں، مجھے بتاؤ؟" شرافت علی نے سوال کیا۔

"کسی ایسے آدمی کو جسے اس کلینک میں پہچان لیے جانے کا اندیشہ نہ ہو، وہاں بھیج کر جیرالڈ کا جھٹکا کرا دو۔ یہ اطلاع ملتے ہی لزی سیدھی کلینک جائے گی اور اس وقت تک جیرالڈ کی لاش کے ساتھ ہی رہے گی جب تک اسے جرمنی روانہ نہ کر دیا جائے یا اس کی تدفین نہ کر دی جائے۔ یہ کام اگر شام سے پہلے ہو جائے تو سمجھ لو لزی اس وقت تک آستانے کا رُخ نہیں کرے گی جب تک اسے آستانے اور وہاں موجود تنظیم کے ارکان کی مکمل بربادی کی خبر نہیں پہنچے گی۔" میں نے اسے ترکیب بتائی۔

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے، بہت آسان اور بہت اچھی ترکیب آئی ہے تمھارے ذہن میں۔ اس طرح ان کے ایک اور نہایت اہم مہرے کو پیٹنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے ہم۔ ایک پنتھ اور دو کاج والی ترکیب ہے یہ تو۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"بس تو پھر اب یہ تمھاری ذمّے داری ہے۔ تم مجھے بنگلے پر چھوڑ کر فوراً واپس جاؤ اور اس کام کا انتظام کرو۔" میں نے کہا۔

"ہاں، بالکل، یہ میری ذمّے داری ہے اب اور تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اس طرف سے۔ یہ کام ہو گیا سمجھو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

شرافت علی مجھے بنگلے کی باہر ہی اتار کر چلا گیا۔ میں اندر پہنچتے ہی سیدھا آبی کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لزی کا ایک فلک شگاف، جاندار قسم کا قہقہہ سُن کر میرے بڑھتے ہوئے قدم سست پڑ گئے۔ وہ آنرک کو چھوڑ کر واپس آ چکی تھی اور اب آبی کے پاس بیٹھی اس کی پُرلطف باتوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ لڑکی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ تو ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کا تعلق دنیا کی خوفناک ترین تنظیم سے ہے۔ میں اب تک اس کے مختلف روپ دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے جانو جیسے شہ زور کو کسی کمزور چوہے کی طرح مارتے دیکھا تھا۔ اگر وہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ ایسی کم سن اور معصوم دکھائی دینے والی یہ نازک

اندام سی حسین بلا ایسی زور آور بھی ہو سکتی ہے۔ البتّہ وہ ایسی ضرور تھی کہ اس کی جنبشِ ابرو پر ہر شخص نقدِ جاں نثار کرنے کو تیار ہو سکتا تھا۔ اس کے نقرئی قہقہوں میں آبی کے قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے۔

میں نے کمرے میں قدم دھرتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے بھئی! آج تو بڑے قہقہے لگا رہے ہو تم لوگ؟ کیا مل گیا ہے آج تم دونوں کو؟"

مجھے دیکھتے ہی آبی بولا۔ "اوئے تو کدھر غائب ہو گیا تھا بھئی؟ بغیر کچھ بتائے نکل جاتا ہے گھر سے، کسی کی پریشانی کا خیال ہی نہیں ہے تجھے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اوہو، تو کوئی میری بیوی تو نہیں ہے جو میری غیر موجودگی نے پریشان کر دیا تھا تجھے...؟"

"بک نئیں اوئے، میں اپنی پریشانی کی بات تو نہیں کر رہا ہوں۔" آبی نے میری بات کاٹ کر غصّے سے کہا۔

"پھر کس کی بات کر رہا تھا بھئی؟ کون پریشان ہو رہا تھا میرے لیے؟" میں نے لزی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تیری ہونے والی نصف بہتر فکرمند تھی تیرے لیے۔ میں لطیفے سنا سنا کر اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا کتنی دیر سے۔" وہ بولا۔

لزی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف بڑھتے ہوئے محبّت سے کہا۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے جنابِ عالی! میں فکرمند ہو گئی تھی۔"

میں نے بھی جواباً محبت بھرے انداز میں سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی بچّہ تو نہیں ہوں جس کے لیے تم یوں پریشان ہو جاتی ہو۔"

"اوہ، یہ بات نہیں ہے، آپ کے چاروں طرف جس قدر دشمن بکھرے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے جب آپ گھر سے باہر ہوتے ہیں تو اس وقت تک دل ہولتا ہی رہتا ہے جب تک واپس نہیں آ جاتے آپ۔ میری مانیں تو کسی کو ساتھ لیے بغیر باہر نہ جایا کریں۔"

"یہ کس نے کہا تم سے کہ میں تنہا گیا تھا باہر؟ وہ اپنا شرافت علی ساتھ لے گیا تھا بھئی مجھے۔ اسی کے ساتھ گیا تھا میں۔" میں نے کہا۔

"اوئے جھوٹ کیوں بول رہا ہے سالے! پتا ہے قبر میں کیڑے پڑ جاتے ہیں جھوٹ بولنے والوں کے۔" آبی نے اس طرح ہاتھ نچا کر بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا کہ لزی کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔

"تو یہ آگ لگانے والی باتیں کر رہا تھا تو لزی سے۔ یہ بی جمالو کی جانشینی کب سے مل ہے بھئی تجھے؟"

"دیکھ رہی ہو تم بہن جی! یہ صلہ ہے اس دنیا میں کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا۔ بڑا ہی ذلیل طوطا صفت آدمی ہے یہ جسے تم نے اپنا شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی وقت ہے سوچ لو اچھی طرح سے، ابھی تو بیٹی باپ ہی کے گھر ہے، باپ کا گھر چھوڑ کر آ گئی اس ہرجائی کے ساتھ تو پچھتانے کے سوا کچھ نہیں ملے گا...۔" آبی کی زبان چل پڑی تھی۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "لزی! تم اس لنگڑے کی باتوں میں نہ آنا، بڑی کُتّی شے ہے یہ۔ آدمی کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا ہے۔ نہ جانے کتنی تو اس کے گاؤں میں بیٹھی رو رہی ہیں اسے اور پتا نہیں کتنی اِدھر اُدھر کے شہروں میں پیٹ رہی ہیں اس کی جان کو، ایک تو بہت مشہور اداکارہ ہے یہاں کی لاہور میں بیٹھی اس کا ماتم کر رہی ہے کئی سالوں سے۔"

"کیوں بدنام کر رہا ہے ایک شریف اور سیدھے سادے آدمی کو، قسم لے لیں جی جو میں نے کبھی کسی کو میلی نگاہ سے دیکھا بھی ہو۔"

"تیری شرافت کو تو میں خوب جانتا ہوں بیٹے! لگتا ہے یہاں پڑے پڑے جی اُکتا گیا ہے تیرا۔ کیا خیال ہے پھر اِدھر اس گل و گلنار بیگم کے پڑوس میں پہنچا دوں تجھے؟ کہیں اسی کے فراق میں تو ہذیان نہیں بکنے لگا ہے تو؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ایک دم۔ جلدی سے بولا۔ "کیا بات کہی ہے یار تو نے اس گھڑی۔ اپنے سارے گناہ بخشوا لیے ہیں تو نے یہ کہہ کر مجھ سے۔ شاید مجھ سے غلطی ہو گئی تھی تجھے سمجھنے میں، تُو تو بہت ہی اچھا آدمی ہے یار!"

"میں جانتا ہوں بیٹے! تیری یہ ساری بکواس اسی لیے تھی۔ ٹھیک ہے میں پہنچا دوں گا تجھے وہاں۔ بس اب بکواس نہ کرنا۔"

"نہیں بھئی، میری باپ دادا کی توبہ جو اب ایک لفظ بھی بولوں تیرے خلاف۔ کب لے چل رہا ہے تو مجھے جنّتی بیگم کے پاس؟"

"فکر نہ کر آج ہی شام تک لے چلوں گا۔ پھر مکمّل طور پر صحت یاب ہونے تک وہیں رہنا تو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تُو بہت اچھا کرے گا میرے یار! بڑا احسان ہو گا تیرا مجھ پر۔ یہاں میں اچھی صورت دیکھنے کو بھی ترس گیا ہوں۔ کیسے بنجر اور بے آب و گیاہ جزیرے میں لا پھینکا ہے تُو نے مجھے، میرے جمالیاتی ذوق کا ذرا بھی احساس نہیں کیا اِدھر لاتے سمے۔" وہ بولا۔

لزی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے تکتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ نے انھیں کہاں لے جانے کی نوید دے دی ہے۔ ان کا تو انداز ہی بدل گیا ہے اچانک؟ کون ہیں یہ جنّتی بیگم اور وہ کیا نام لیا تھا آپ نے..... ہاں..... وہ گل و گلنار بیگم..... کون ہیں یہ ان کی؟"

"تم خود ہی اندازہ کرو، وہ کون ہو سکتی ہے جس کے نام پر اس کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی ہے ایک دم؟" میں نے کہا۔

"کوئی بہت ہی عزیز از جان خواتین ہیں یہ دونوں، کیوں آبی! غلط تو نہیں سمجھا ہے ناں میں نے؟" لزی شرارت سے بولی۔

"بالکل غلط سمجھا ہے تم نے۔ خواتین کہہ کر توہین کر رہی ہو تم اس گل و گلزار بیگم کی۔ جنتی بیگم کو تم بے شک خواتین میں شامل کر سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر وہ گل و گلزار نو بہار بیگم، اس کے تو ابھی مُرادوں کے دن ہیں بی بی! اتنا ظلم تو نہ کرو غریب پر۔"

"اوہ سوری، ویری سوری، مجھ سے سچ مچ اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی، لیکن ابھی آپ یہاں سے جانے کے بارے میں نہ سوچیں۔ ابھی تو آپ کو خاصی دیکھ بھال اور مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ پھر علاج میں بھی خلل پڑ جائے گا اس طرح تو۔" لزی نے کہا۔

"اس کی تم پروا نہ کرو۔ وہ جنتی بیگم جو ہے نا، وہ بہت اچھی دیکھ بھال کر لیتی ہے۔ آگے بھی اس خلوص کی بندی نے بڑی خدمت کی ہے ہماری، اور علاج میں ذرا بھی خلل نہ پڑے گا کیوں کہ اس شہرِ نگاراں و خرابات میں ڈاکٹر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔" آبی جلدی سے بولا۔

اسے فردوسی بیگم کے فلیٹ پر پہنچانا تو ہمارے پروگرام میں پہلے ہی شامل تھا، اب قسمت کی خوبی سے صورتِ حال خود بخود ہمارے حق میں ہو گئی تھی تو میں اس موقع کو ہاتھ سے کس طرح جانے دیتا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "اسے کچھ سمجھانا فضول ہے لزی! اگر تم نے اسے رُکنے پر آمادہ کر بھی لیا تو یہ تمہاری زندگی اجیرن کر دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ جو چاہتا ہے اسے کر لینے دو۔ یوں بھی یہاں یہ کبھی کبھی تو بالکل ہی تنہا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے بہت دُکھ ہوتا ہوگا۔ میں ابھی تھوڑی دیر بعد اسے چھوڑ ہی آؤں گا جا کر۔"

"ٹھیک ہے اگر ان کے آرام کے لیے یہ ضروری ہے تو میں انھیں یہاں روکنے پر اصرار نہیں کروں گی۔ ویسے میں ان سے ملنے اور ان کی مزاج پُرسی کے لیے آپ لوگوں کی اُس جنتی بیگم کے گھر جا تو سکتی ہوں نا؟" لزی نے مجھے آبی کی حمایت کرتے پا کر کہا۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ وہاں آنے جانے کے سلسلے میں تم پر پابندی کون لگا سکتا ہے۔ جب بھی جی چاہے چلی جایا کرنا۔" میں نے جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ آج رات کے بعد وہ جن حالات سے دوچار ہوگی ان میں اسے آبی کا خیال تک نہ آسکے گا پھر خواہ مخواہ اسے مشکوک کیوں کیا جائے۔

اس نے یہ سوال بھی غالباً اسی لیے کیا تھا کہ اس کے جواب کی روشنی میں ہمارے عزائم کے بارے میں کچھ اندازہ کر سکے۔ بظاہر بہترین دوست اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے باوجود جس طرح میں ان پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اعتماد ہی نہیں بلکہ میں تو انھیں دوست تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں تھا، اسی طرح وہ بھی میرے بارے میں ہر دم فکر مند رہتے ہوں گے۔ حالاں کہ میں ابھی تک ان سے وفاداری اور مکمل تعاون کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن میری سرگرمیاں ان کے خلاف تھیں۔ کئی موقعوں پر انھیں مجھ پر شک بھی ہوا ہوگا، مگر یہ میری خوش بختی تھی کہ ہر چال میرے حق میں ہی ہو جاتی تھی، کسی نہ کسی طرح۔

مجھے شرافت علی کی طرف سے جبیر اللہ کے بارے میں اطلاع کا انتظار تھا۔ یہ خبر ملتے ہی لزی فوراً اس کلینک کی طرف روانہ ہو جاتی جہاں جبیر اللہ زیرِ علاج تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہی میں نے آبی کو لے کر فردوسی بیگم کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس کے سامنے جاتا تو یہ خدشہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ لگ جاتی اور اس طرح فردوسی بیگم کی وہ محفوظ پناہ گاہ اس کی نظروں میں آجاتی جب کہ میں ان یہودی شیطانوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ ایک بار لزی کے ساتھ طارق روڈ سے گزرتے ہوئے میں فردوسی بیگم سے ملنے اس کے فلیٹ پر گیا تھا لیکن لزی کو میں اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ وہ سڑک پر کھڑی کار میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس نے مجھے اس گلی میں داخل ہوتے دیکھا ہوگا جس میں فردوسی بیگم کا فلیٹ تھا، لیکن وہ خاصی لمبی گلی تھی۔ اور اس میں بے شمار دکانیں اور فلیٹس تھے محض گلی سے کسی کے فلیٹ کا پتا کرنا آسان نہیں تھا اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ آبی اپنی گفتگو کے دوران اسے جنتی بیگم کہتا رہا تھا۔ لزی کو فردوسی بیگم کا صحیح نام بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا اس طرح۔

جس کا مجھے انتظار تھا وہ خبر شام کو چار بجے کے بعد بالآخر لزی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ فون پر یہ اطلاع پاتے ہی دوڑی ہوئی میرے پاس آکر بولی۔ "جنابِ عالی! غضب ہو گیا۔ کسی نے کلینک میں گھس کر جبیر اللہ کو گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔"

وہ خاصی بدحواس ہو رہی تھی اس گھڑی۔ میں اس سمے آبی کے پاس بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا اس سے۔ یہ خبر سُن کر آبی نے چونک کر لزی کو دیکھا اور بولا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا یار و! کس نے کی ہے یہ حرکت؟"

میں نے بھی حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "کون تھا وہ؟ کلینک میں کس طرح پہنچ گیا، پکڑا نہیں اسے کسی نے؟"

"تفصیل ابھی معلوم نہیں ہوئی ہے مجھے، حملہ آوروں کو پکڑا نہیں جا سکا۔ گولیوں کی آواز سُن کر عملے کے لوگ اس طرف دوڑے تھے مگر دونوں حملہ ریوالوروں سے فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ دیگر تفصیلات وہاں جانے کے بعد معلوم ہو سکیں گی۔ میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی کہ میں کلینک کی طرف جا رہی ہوں۔ واپسی کب تک ہو سکے گی، کچھ پتا نہیں ہے مجھے۔ اگر جبیر اللہ مر گیا تو آج رات میری واپسی ناممکن ہی ہوگی۔" لزی نے جواباً کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ، میں تمھیں فون کر کے واقعے کی تفصیل معلوم کر لوں گا۔ مجھے فون نمبر دے دو وہاں کا۔" میں نے کہا۔

لزی نے ایک کاغذ پر کلینک اور جبیر اللہ کے گھر کا فون نمبر لکھ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہ دونوں نمبر اس لیے لکھ دیے ہیں کہ اگر جبیر اللہ کی موت واقع ہو چکی ہے جس کا زیادہ امکان ہے تو ہم اس کی لاش گھر لے جائیں گے اس کے۔ لہٰذا آپ کلینک میں نہ ملنے کی صورت میں گھر پر فون کر لیں مجھے۔ ویسے میں کوشش کروں گی کہ کلینک سے فون کر کے صورتِ حال آپ کو بتا دوں۔"

"میں آبی کو لے کر جا رہا تھا اس وقت، مگر ٹھیک ہے، اب میں ایک گھنٹے تک یہاں رُک کر فون کا انتظار کروں گا تمھارے۔ ایک گھنٹا اگر گزر جائے تو پھر تم فون نہ کرنا میں خود ہی فون کر لوں گا تمھیں کہیں سے۔" میں نے اسے بتایا۔

لزی تیزی سے باہر آگئی۔ میں لپک کر اس کھڑکی پر پہنچا جہاں سے بیرونی گیٹ دکھائی دیتا تھا اور پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر جھانکنے لگا۔ چند لمحے بعد ہی میں نے لزی کو سفید کرولا میں باہر جاتے دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد چوکیدار کے گیٹ دوبارہ بند کرتے ہی میں واپس پلٹ آیا۔ "لے بھئی آبی پیارے! میدان صاف ہو گیا ہے اب ہمارے لیے۔"

آبی نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا یہ خبر غلط تھی، تو نے لزی کو یہاں سے ہٹانے کے واسطے کوئی چکر چلایا ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، تو نے ٹھیک سمجھا ہے۔ یہ سارا چکر لزی کو یہاں سے ہٹانے اور رات بھر کے لیے دوسری طرف الجھائے رکھنے کے لیے چلایا گیا ہے لیکن خبر غلط نہیں ہے۔ ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں ہم نے۔ لزی کا بندوبست بھی ہو گیا اور جبیر اللہ کا بھی۔"

"اچھا! مگر وہ تو پہلے ہی ادھ موا پڑا تھا یار! اس پر گولیاں ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟" آبی بولا۔

"لزی کو اُدھر الجھانے کے لیے۔" میں نے بتایا۔ پھر آبی کو پورے پروگرام سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "یہ پروگرام بہت ہی ایمرجنسی میں بنایا گیا ہے، مجھے افسوس ہے آبی تو اُس کارِ خیر میں شریک نہیں ہو سکے گا ہمارے ساتھ۔ مگر مجبوری ہے یار! صبر کر لے۔"

"ہاں یار! شاید میرے رب کو ہی یہ منظور نہیں ہے۔ اس رات جب ساری تیاریاں مکمل تھیں، ان ذلیل لٹیروں نے درمیان میں آکر گڑبڑ کر دی تھی۔ میرے پاؤں میں گولی لگ جانے کی وجہ سے ہی یہ کام ملتوی ہو گیا تھا اس رات۔" آبی نے اداسی سے کہا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کی آواز سُن کر میں آبی کے پاس سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ لزی نے اتنی جلدی مجھے فون کر دیا تھا، مگر ریسیور اٹھانے پر پتا چلا وہ فون لزی کا نہیں شرافت علی کا تھا۔ اس نے مجھے جبیر اللہ کے بارے میں بتانے کے لیے ہی فون کیا تھا اس وقت۔ میں نے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ "ہاں مجھے اطلاع مل چکی ہے، لزی کو کسی نے فون پر بتایا تھا، وہ خبر ملتے ہی سیدھی کلینک کی طرف دوڑ گئی ہے۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی، کام ٹھیک ہو گیا ہے نا؟"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی، قسمت ہم پر مہربان معلوم ہوتی ہے، ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم فیروز کی طرف چلے جاؤ اپنے آدمیوں کے ساتھ۔ میں ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ابھی مجھے یہاں رُک کر لزی کے فون کا انتظار کرنا ہے۔ ایک گھنٹے تک انتظار کرنے کو کہہ چکا ہوں میں اس سے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم اطمینان سے آؤ۔ جلد بازی کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کام بگڑ جانے کا خدشہ رہتا ہے اس طرح۔" شرافت علی نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ٹیلیفون اٹھا کر اپنے ساتھ آبی کے کمرے میں ہی لے آیا۔

آبی بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ آنے والا ٹیلیفون لزی کا ہی ہے۔ میرے کمرے میں قدم دھرتے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی تھی وہ تیری سیو دن گل بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن؟ بڑی جلدی فون کر دیا اس نے، شاید کہیں قریب ہی ہے وہ کلینک۔"

"نہیں یار! اس کا فون نہیں تھا، شرافت علی نے کیا تھا فون اس وقت، تیرے یار جبیر اللہ کے الم ناک انجام کی اطلاع دینے کو۔"

"کیا بتایا اس نے، اس کا کوئی آدمی پکڑا تو نہیں گیا نا اس کارروائی کے دوران؟" آبی نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ کہتا تھا سارا کام نہایت آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد لزی کا بھی فون آگیا۔ اس نے بتایا۔ "جبیر اللہ کے سینے اور پیٹ میں آٹھ گولیاں لگی ہیں۔ ڈاکٹر اپنی سی کوششوں میں مصروف ہیں لیکن اس کے بچنے کی امید ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ آپ آبی کو لے کر جائیں، میں رات کو نہیں آسکوں گی شاید۔"

"اچھی بات ہے، میں آبی کو لے کر جا رہا ہوں۔ واپس آکر تمھیں پھر فون کروں گا اس کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھا تو آبی نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا ہوا بھئی، کیا بچ گیا ہے وہ آج بھی؟ بڑا بے غیرت ثابت ہوا ہے یار یہ تو۔"

"ہاں، ہے تو ایسا ہی مگر اطمینان رکھ آٹھ گولیاں جب ایک ساتھ سینے اور پیٹ میں جا گھسیں تو بڑے سے بڑے بے غیرت کو عدم کی سیر کرا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر امید انھیں ایک فی صد بھی نہیں ہے۔ لعنت ہی بھیج دے اب اس پر تو یار جی!"

"آٹھ گولیاں اتار دی ہیں انھوں نے اس کے اندر، موت کا پورا پورا سامان کر کے لوٹے ہیں وہ اس کی۔" آپی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، شرافت علی نے بہت ہی تجربے کار آدمی بھیجے تھے اس کی طرف۔ کمی نہیں چھوڑی ہے انھوں نے ذرا بھی، اب جو منظور ہو رب کو۔"

میں نے باہر آ کر گیراج سے کار نکال کر بالکل دروازے کے ساتھ لگا دی، پھر واپس جا کر آپی کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ باہر لایا اور کار کی عقبی نشست پر لٹا دیا۔ میں ڈرائیونگ نشست سنبھال کر کار اسٹارٹ کرنے جا رہا تھا کہ آپی بول اٹھا۔ "یار! پہلے فون کر کے یہ تو معلوم کر لیا ہوتا کہ وہ جنتی بیگم اس سمے گھر پر ہے بھی یا نہیں۔ کہیں ہماری یہ دوڑ بے نتیجہ ہی ثابت نہ ہو۔"

میں نے مڑ کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑے موقع سے سوجھی ہے تجھے یہ بات۔ کبھی کبھی تو یار تو بھی عقل سے کام لے لیتا ہے۔"

"بکواس نہیں کر اوئے! زیادہ دانشوروں کی دُم بننے کی کوشش مت کیا کر میرے سامنے، جانتا ہوں تیری کھوپڑی کی حالت بھی میں۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ میں اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کار سے نکل کر اندر چلا گیا۔

چوتھی گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا کر جس نے "ہیلو" کہا تھا وہ فردوسی بیگم ہرگز نہیں تھی۔ مجھے گمان گزرا، شاید غلط نمبر ڈائل کر دیا ہے میں نے۔ چنانچہ تصدیق کرنے کے لیے میں نے فردوسی کا ٹیلیفون نمبر دہرایا۔ دوسری طرف سے نہایت شیریں اور شائستہ لہجے میں کہا گیا۔ "جی ہاں، یہی نمبر ہے ہمارا، آپ کو کس سے بات کرنا ہے؟"

"فردوسی بیگم سے بات ہو سکے گی؟ کیا وہ گھر میں موجود ہیں اس وقت؟" میں نے بھی شائستہ انداز میں کہا۔

"فردوسی بیگم۔ اوہ، آنٹی کو پوچھ رہے ہیں آپ۔ ہاں ہاں وہ موجود ہیں۔ آپ کون صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ان سے کہیں ہاشم خان کا فون ہے۔" میں نے جواباً کہا۔

"ارے، یہ آپ ہیں جناب خان صاحب! جائیے ہم نہیں بولتے آپ سے، بڑے وہ ہیں آپ پلٹ کر خبر تک نہیں لیتے کسی کی۔" اس نے بڑے محبوبانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے تو حد ہی کر دی کے بے مروّتی کی۔"

اس کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ گلزار خانم ٹکرا گئی ہے مجھے۔ میں نے کہا۔ "دیکھیں بی بی! یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ مجھے فردوسی بیگم سے بے حد ضروری بات کرنا ہے۔ آپ انھیں بلا دیں جلدی سے۔"

"اف اللہ! اتنے دنوں کے بعد آواز سنائی ہے اپنی۔ پھر بھی ہم سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے آپ کے پاس۔۔۔"

اسی وقت فردوسی بیگم کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "گلزار! کس کا فون ہے بھئی؟"

"یہ آپ کے دوست ہاشم خان ہیں آنٹی! یہ کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں آپ سے۔" اس کا جواب سنائی دیا۔

"ارے، اور تم مجھے بتانے کے بجائے خود ہی باتیں کرنے لگی ہو ان سے۔ لاؤ مجھے دو فون۔" فردوسی بیگم نے شاید بُرا مناتے ہوئے کہا تھا، پھر ریسیور اس سے لے کر بولی۔ "اسلام علیکم خان صاحب! بھئی کہاں غائب ہیں آپ؟"

میں نے اس کے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "غائب کہاں ہو سکتے ہیں جی ہم، اِدھر ہی تمھاری کراچی میں رُلتے پھر رہے ہیں۔"

"کمال ہے، کراچی میں ہوتے ہوئے بھی آپ کو ہماری یاد نہیں آئی کبھی۔ ایسی کون سی مصروفیات تھیں بھئی؟"

"میں ابھی آ رہا ہوں تمھارے پاس ہی، پھر پوچھ لینا جو پوچھنا ہو۔ فون تو میں نے یہ جاننے کو کیا ہے کہ تم گھر میں ہو بھی یا نہیں۔"

"بہ سرو چشم، تشریف لائیں جناب! دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں آپ کے لیے۔ اور وہ پیرزادہ صاحب کہاں ہیں ان دنوں؟"

"بھئی یہ اس قدر گاڑھی اردو بول رہی ہو خیر تو ہے نا؟ پڑوسیوں کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کر لیا ہے شاید۔"

"اب آپ جیسے معزز لوگوں کے ساتھ گستاخانہ انداز تو نہیں اختیار کر سکتی نا میں۔ یوں بھی آپ ہر روز تو آتے نہیں ہیں جو بے تکلفانہ انداز اختیار کرنے کی جرأت کر سکوں۔ خیر چھوڑیں اس بات کو، میں نے پیرزادہ صاحب کا پوچھا تھا آپ سے۔"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی آ رہے ہیں۔ ویسے گلہ کرنے کا انداز بہت خوبصورت ہے، میں نے بُرا نہیں منایا ہے بالکل، یہ تو حق بنتا ہے بھئی تمھارا، لیکن یہ بھی تو دیکھو، اچھے وقت میں تمھیں یاد رکھیں یا نہ رکھیں، بُرے وقت میں تمھارے پاس پناہ لیتے ہیں آ کر۔ ایسا انھی لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن سے قربت اور اپنائیت بے پناہ ہو، جن کی محبت اور خلوص پر آدمی کو کامل یقین ہو۔ اگر ہم تمھیں غیر سمجھتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔" میں نے اس سے کہا۔

"عنایت ہے، نوازش ہے اگر ایسا سمجھتے ہیں آپ مجھے۔

اب جلدی سے آ جائیں، میں انتظار کر رہی ہوں آپ کا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں بھی ریسیور کریڈل پر ڈال کر باہر آ گیا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ مین گیٹ سے باہر آنے کے بعد آپی نے پوچھا۔ "کیا ہوا، وہ گھر پر ہی موجود ہے نا۔"

"ہاں یار! ہے تو وہ گھر پر ہی، لیکن اس وقت اس کی باتیں سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، بڑی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں میں۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات کہہ دی اس نے۔ کیا وہ اس حالت میں ہمارے آنے سے خوش نہیں تھی؟" آپی نے پوچھا۔

"نہیں یار! بات یہ نہیں ہے، وہ خلوص و محبت کی بندی تو ہر وقت ہمارے لیے اپنے دل کے دروازے کھلے رکھتی ہے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں اس کا خیال ہمیشہ ایسے وقت آتا ہے جب کوئی اُفتاد پڑی ہوتی ہے ہم پر یا اس کی مدد درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہم کبھی اس کے گھر کا رُخ بھی نہیں کرتے۔ اس سے کبھی یہ تک نہیں پوچھا ہم نے کہ اس کی زندگی کیسے گزر رہی ہے؟"

"ہاں، یہ تو بڑی زیادتی کرتے ہیں ہم اس کے ساتھ۔ بڑی خود غرضی ہے یہ ہماری۔ کیا اس کا گلہ کر رہی تھی وہ؟"

"یہ تو نہیں کیا اس نے مگر اسے ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے، کرنا چاہیے اسے اس کا گلہ ہم سے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"خیر یار! تو اپنا موڈ نہ خراب کر، آئندہ خیال رکھیں گے ہم اس بات کا۔ اس کی خبر گیری کرتے رہیں گے ہم۔" آپی نے مجھے تسلی دی۔

"نہیں یار! ہم بہت ہی گھٹیا، بہت ہی خود پرست لوگ ہیں آپی۔ ہم تو اپنی ماؤں کو بھی بھولے رہتے ہیں، ان کی آنکھیں بھی پتھرا کر رہ گئی ہیں ہماری راہ تکتے تکتے۔ ہم ان کا کلیجہ نہیں ٹھنڈا رکھ سکتے تو اس غریب کو کون سی خوشی دے سکیں گے؟"

"ہاں یار! بدبختی نے ہماری کسی بھی کام کا نہیں رہنے دیا ہے ہمیں۔ ذلتوں، رسوائیوں اور محرومیوں کے سوا ہے ہی کیا ہمارے پاس؟ زندگی کبھی اطمینان کا سانس لے تو ہم مڑ کے دیکھیں کسی اپنے پیارے کی طرف، ہماری تو سانسیں بھی مشکل سے آتی جاتی ہیں بھائی!"

آپی کو سیڑھیاں چڑھنے میں بہت ہی دشواری ہو رہی تھی مگر اس کی ہمت کی داد دیتا ہوں میں کہ وہ میرے کاندھے پر زیادہ بوجھ ڈالے بغیر ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر کسی نہ کسی طرح فردوسی بیگم کے فلیٹ تک پہنچ گیا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اس دردمند دل کی مالک عورت کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دوسری طرف سے آپی کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "ارے، یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟ آپ کی تو صحت بھی بڑی خراب نظر آ رہی ہے مجھے؟"

"مجھے افسوس ہے میری بہن! ہم ہمیشہ تجھے کوئی نہ کوئی تکلیف دینے آ جاتے ہیں۔۔۔" آپی نے اُداسی سے کہا۔

فردوسی بیگم نے اس کی بات کاٹ کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ آپی بھائی! مجھے بہن بھی کہتے ہیں اور غیریت بھی برتتے ہیں مجھ سے۔ یہ کیسے جان لیا آپ نے کہ آپ کی خدمت کر کے تکلیف ہوتی ہے مجھے؟"

"یہ تم دونوں کن فضول باتوں میں الجھ گئے ہو۔ اسے اندر بستر پر لے چلو فردوسی! اس کی ایک ٹانگ میں بہت گہرا زخم ہے اور یہ خیال نکال دو دل سے اپنے، تمھیں غیر سمجھتے تو ہر بار دوڑے ہوئے اِدھر نہیں آتے کبھی۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

میرے اس اندازِ تخاطب پر فردوسی بیگم کی آنکھوں کے دیے جل اُٹھے تھے۔ وہ جلدی سے بولی۔ "چھوڑیں جی لعنت بھیجیں ان دل جلانے والی باتوں پر، آئیں اندر چلیں آپ، بستر پر لیٹیں چل کر، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

آپی کو آرام سے بستر پر لٹا کر ہم سیدھے ہی ہوئے تھے کہ وہ آفت کی پڑیا گلزار خانم چہکتی ہوئی آن ٹپکی۔ "آ گئے آپ جناب خان صاحب! فون پر تو آپ کو فرصت ہی نہیں تھی بات کرنے کی اب بھی وقت ہے آپ کے پاس یا نہیں۔"

"وقت تو کم بختوں کے پاس بہت ہوتا ہے ضائع کرنے کو۔ میں کیا تمھیں کم بخت نظر آتا ہوں بی بی؟" میں نے کہا۔

"ہائے میں مر گئی، آپ تو یوں لگتا ہے جیسے لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ نہیں جناب! میں آپ سے لڑ نہیں سکتی کبھی بھی۔" پھر وہ آپی کو دیکھ کر بولی۔ "اچھا یہ پیرزادہ صاحب بھی آئے ہیں۔ مگر آپ لیٹے کیوں ہیں جی کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے ان کا۔ ٹانگ میں زبردست چوٹ آئی ہے۔ یوں سمجھ لو لنگڑے ہی ہو چکے ہیں یہ اب۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"بک نہیں اوئے خانچے، سالے لنگڑا تو تجھے ہونا ہے ایک دن۔ میرے لیے کیوں بکواس کرتا ہے۔" آپی کو گلزار کے سامنے لنگڑا کہنا بہت بُرا لگا تھا، وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔

میں نے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہو! معاف کر دے یار غلطی ہو گئی مجھ سے۔ مجھے ان کے سامنے یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ ابھی تو تمھاری شادی بھی نہیں ہوئی ہے پھر تو لنگڑا کیسے ہو سکتا ہے۔"

فردوسی بیگم میری بات کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولی۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے یہ گلزار سے شادی کرنے

والے ہوں۔"

فردوسی بیگم کی بات سن کر گلزار ایک دم گلنار ہوگئی۔ اس نے ایک ادا سے شرما کر اپنے دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبایا اور پلٹ کر بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "واہ بھئی جنتی بیگم جواب نہیں ہے تمھارا بھی۔ کیسی بھاگی ہے دُم دبا کے۔"

فردوسی بیگم اور آپی بھی گلزار کے اس انداز پر قہقہے لگا رہے تھے۔

شام سے ہی مطلع ابرآلود تھا۔ گہرے سیاہ بادلوں کے قافلے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جن کی وجہ سے آسمان بالکل چھپ گیا تھا مگر روشنیوں کے اس شہر کراچی کی سڑکیں اور گلیاں پوری طرح روشن تھیں۔ جگ مگ جگ مگ کرتے اس شہرِ نگاراں سے تاریک رات کی سیاہی بھی شکست کھا چکی تھی۔ رات کے ٹھیک گیارہ بجے پانچ لمبی لمبی کاریں فیروز کی کوٹھی سے نکل کر تیزی سے منگھوپیر کی طرف دوڑنے لگیں۔ ہر کار میں پانچ آدمی سوار تھے اور وہ سب کے سب رائفلوں، ریوالوروں، اسٹین گنوں اور دستی بموں سے مسلح تھے۔ میں فیروز، شرافت علی، خان اور گل زمان کے ہمراہ سب سے آگے والی کار میں تھا۔ آہستہ آہستہ کاروں کے درمیان فاصلہ بڑھنا شروع ہوگیا۔ جلد ہی ہر کار دوسری کار سے اتنے فاصلے پر چلنے لگی کہ اب کوئی انھیں دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہے اور وہ پانچوں آگے پیچھے ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ہم سائٹ کے علاقے سے ملوں اور فیکٹریوں کی دورویہ قطاروں کو پیچھے چھوڑ کر چھوٹی بڑی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان پہنچ گئے۔ اس روشن علاقے سے نکلتے ہی ہم نے اپنی کار کی ہیڈلائٹس سمیت تمام روشنیاں بجھادیں۔ یہاں رات پوری طرح اپنا دامن پھیلائے کھڑی تھی۔ ہر سُو گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑے فاصلے کی چیز بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود صاف دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جلد ہی ہم اس پہاڑی کے نزدیک پہنچ گئے جس کی نصف بلندی پر بابا کا آستانہ تھا۔ یہاں پہنچ کر پروگرام کے مطابق تمام کاریں سڑک سے اتار کر اِدھر اُدھر مختلف ٹیلوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں اور ان میں سوار لوگ پانچ پانچ کی ٹولیوں میں اطراف میں پھیل کر آستانے کی طرف بڑھنے لگے۔ فیروز، خان اور گل زمان تینوں مجھ سے جدا ہوکر چلنے لگے تھے، میں اور شرافت علی ساتھ ساتھ تھے۔ منصوبہ یہ تھا ہمارا کہ دوسرے تمام لوگ آستانے والی پہاڑی کے گرد تین اطراف

سے گھیرا ڈال کر اس وقت تک وہیں رُکے رہیں گے جب تک انھیں آگے بڑھنے کا اشارہ نہ ملے۔ میں اور شرافت علی سامنے سیدھے راستے سے جائیں گے اور ہمارے اندر جانے کے بعد ہمارے پیچھے آنے والے فیروز، خان اور گل زمان اندر داخل ہونے والے راستے کے دائیں بائیں چھپ کر اس کی نگرانی کریں گے، تاکہ اگر اندر جانے کے بعد ہمیں کوئی مشکل پیش آئے تو ہم انھیں اپنی مدد کے لیے بلاسکیں۔ اس کی امید کم ہی تھی کہ ہمیں اندر کسی مشکل صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ ہمیں باہر ہی روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ آستانے کی حفاظت پر مامور لوگ سامنے ہی ہوسکتے تھے۔ پہاڑی کے بقیہ تین طرف تو انھوں نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اُدھر سے کوئی خطرہ ہی نہیں رہا تھا انھیں۔

جیسے ہی ہم اوپر چڑھ کر غار کے دہانے نما دروازے کی طرف مُڑے، اچانک ہم دونوں روشنی میں نہا گئے۔ اس اچانک ہونے والی روشنی نے میری آنکھیں چُندھیا دی تھیں۔ چند لمحے تو مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ایک ہاتھ کی ہتھیلی کی اوٹ میں لے کر روشنی کے مخزن کی طرف دیکھا۔ وہ روشنی کسی طاقت ور ٹارچ سے خارج ہو رہی تھی۔ کوئی ٹارچ روشن کرکے ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرکے کہا۔ "کون ہے بھئی، یہ ٹارچ بُجھاؤ، تم نے بالکل اندھا کرکے رکھ دیا ہے ہمیں۔"

دوسرے ہی لمحے ٹارچ بُجھ گئی اور کسی نے میرا نام لے کر کہا۔ "ارے غلام جیلانی! تم اس وقت کیوں آئے ہو یہاں؟"

"تم کون ہو میرے بھائی؟ ذرا اپنی شکل تو دکھاؤ مجھے۔ تاکہ میں یہ جان سکوں کہ تمھیں مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق بھی ہے یا نہیں۔"

"ضرور ضرور۔ تم میری شکل ضرور دیکھو لیکن یہ بات ذہن نشین کرلو کہ.... یہ سوال کرنے کا حق مجھے ہر اس شخص سے ہے جو بے وقت اور بغیر اطلاع کے یہاں آتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی بڑے مرتبے والا کیوں نہ ہو۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب ہی دیوار میں لگا ہوا کوئی سوئچ آن کیا تھا، فوراً ہی غار کے دہانے کی چھت میں لگا ایک ہلکی روشنی کا بلب روشن ہوگیا۔ اس کی روشنی اتنی تھی کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہ ایک دراز قامت، کسے ہوئے جسم کا خاصا تندرست اور توانا شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا جس پر سائلنسر بھی چڑھا رکھا تھا اس نے۔ غالباً وہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ آستانے پر ہونے والی کسی بھی گڑبڑ کی دوسروں کو خبر ہوسکے۔ عوام میں اس آستانے کی شہرت بہت اچھی تھی۔ لوگ اسے ایک کامل بزرگ کا آستانہ جان کر وہاں حاضری

کے لیے آتے تھے۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ آس پاس کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آرہا تھا مجھے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمھیں بابا صاحب نے بڑے اختیارات دے رکھے ہیں، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے ہو تم؟"

"اس ویرانے میں اس کے بغیر تو رہا بھی نہیں جاسکتا ناجی! دشمن کا کس کو پتا ہوتا ہے، کب کس روپ میں آگھسے وہ یہاں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ شرافت علی کو اپنے ساتھ کیوں لائے ہو تم اِدھر؟"

"مجھے بابا صاحب سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنا ہیں، اس وقت اسی لیے آیا ہوں میں۔ یہ مجھے پتا نہیں تھا کہ بابا صاحب کے پاس آنے سے پہلے اطلاع دینا ضروری ہے اپنے آنے کی۔ اور شرافت کے ساتھ آنے پر کیا اعتراض ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تمھیں بابا صاحب ہی بتاسکیں گے۔ تم ٹھہرو اِدھر ہی، میں انھیں خبر کرتا ہوں تمھارے آنے کی۔" یہ کہہ کر وہ اندر جانے کو مڑا۔

میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو بھائی! بات سنو میری، تم کھو گئے کیا، بابا صاحب سے؟"

وہ آگے بڑھتے بڑھتے رُک کر میری طرف مڑ کے بولا۔ "کیا کوئی خاص پیغام دینا چاہتے ہو تم؟"

"ہاں یار! اِدھر آؤ میں بتاتا ہوں تمھیں کیا کہنا ہے ان سے۔" میں اس کے بالکل قریب پہنچ کر رک گیا۔

وہ سمجھا واقعی میں اس سے کوئی اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہوکر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے اس طرح اپنی طرف جُھکایا جیسے میں اس سے کوئی راز کی بات کہنے جارہا ہوں چنانچہ وہ سعادت مندی سے میرے اور قریب ہوگیا۔ میرا ہاتھ جو اس کے کندھے پر دھرا تھا، سرک کر گردن پر آگیا اور پلک جھپکتے میں اس کی رگِ احساس میرے انگوٹھے کے نیچے آکر مَسل گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی تناور کٹے ہوئے درخت کی طرح مجھ پر گرنے لگا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر آرام سے نیچے لٹادیا۔ شرافت علی لپک کر میرے پاس پہنچا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے تکتے ہوئے بولا۔ "یہ اسے ایک دم کیا ہوگیا بھئی؟ یہ تو بالکل بے جان لگ رہا ہے مجھے۔"

میں نے گرنے والے کے ہاتھ سے بے آواز ریوالور لے کر سرگوشی کے انداز میں شرافت علی سے کہا۔ "اونچی آواز میں بات مت کرو یار! اور فیروز وغیرہ کو سگنل دے دو اِدھر آنے کا، میں اندر جارہا ہوں، تم ان میں سے ایک آدمی کو یہاں چھوڑ دینا، وہ اس بے ہوش پڑے ہوئے شخص کی نگرانی بھی کرے گا اور یہ بھی خیال رکھے گا کہ اندر ہماری کارروائی کے دوران کوئی باہر سے اندر نہ آسکے۔ اس کے بعد تم پہاڑی کے اطراف میں پھیلے ہوئے اپنے تمام آدمیوں کو سگنل دے دو گے۔ مجھے امید ہے جب تک وہ پہاڑی کے خطرناک مقام تک پہنچیں گے میں اندر کا کام نمٹا چکا ہوں گا۔" اسے ہدایت دینے کے بعد میں نے بے ہوش شخص کی ٹارچ بھی اٹھالی، اور اندر داخل ہوگیا۔

پہلے وسیع ہال میں پاؤں دھرتے ہی میری نظر ایک شخص پر پڑی جو بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ایک بڑے سے ٹیلیویژن کے سامنے کرسی پر بیٹھا اس کی اسکرین کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی وژن کی اسکرین پر رات کی سیاہی میں کسی پہاڑی کا دھندلا دھندلا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ اور پہاڑی کے دامن میں کچھ متحرک سائے نظر آرہے تھے۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ رات کے وقت آستانے کی حفاظت کے لیے کیا انتظام کر رکھا ہے ان لوگوں نے۔ اس روز جب لنزی کے ساتھ میں یہاں آیا تھا تو اس جگہ نہ ٹیلی وژن تھا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص نظر آیا تھا مجھے جسے ہوش مند کہا جاسکے۔ اس وقت تو یہاں بہت سے ملنگ ٹائپ لوگ ادھر ادھر بیٹھے نشہ آور اشیا کے دم لگا رہے تھے یا نشے میں ڈوبے منہ اوندھائے پڑے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پہاڑی کی نگرانی کا انتظام ابھی حال ہی میں کیا گیا تھا۔ یقیناً یہ سب کچھ پہلے بھی موجود تھا یہاں اور دن کے وقت کیوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی، بے شمار لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے چنانچہ اس وقت کوئی خطرہ نہیں ہوتا لہٰذا وہ اسے دن میں کسی نہ کسی طرح آنے جانے والوں کی نظروں سے چھپا دیتے ہیں۔ اسے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ کون سا طریقہ استعمال کرتے ہیں یہ کسی وقت دن میں آکر یہاں کا جائزہ لینے پر ہی معلوم ہوسکتا تھا۔

اس وقت ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی پوری توجہ ٹیلی وژن کی اسکرین کی طرف تھی لہٰذا اسے میری وہاں موجودگی کا احساس تک نہیں ہوسکا تھا۔ اسکرین پر چونکہ پہاڑی کے دامن میں کچھ سائے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے چنانچہ وہ پورے انہماک کے ساتھ ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ میں دبے پاؤں چلتے ہوئے اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ ہنوز ٹیلی وژن اسکرین کی طرف متوجہ تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی کی ناب گھمانا شروع کر دی۔ اسکرین پر نظر آنے والی پہاڑی آہستہ آہستہ گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی، دھیرے دھیرے پہاڑی کے دوسرے حصے اسکرین پر نمودار ہوتے جارہے تھے۔ ہر طرف منظر ایک ہی جیسا تھا۔ وہی تاریکی اور اس تاریکی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں حرکت کرتے ہوئے سائے

جو آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ پھر اچانک ہلکی ہلکی روشنی کے جھماکے ہونے، اس کے ساتھ ہی سائے تیزی سے اوپر چڑھتے دکھائی دینے لگے۔ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے تیزی سے ناب گھمانا شروع کی اور جب آستانے میں داخل ہونے والے دروازے کا منظر سامنے آیا تو اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ یہاں مدھم روشنی میں ایک شخص دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑے کھڑا کسی ایسے چوکنّا ہرن کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا جس نے قریب ہی کہیں شکاری کی آہٹ سُن لی ہو یا اس کی بُو ہوا کے دوش پر اس کی ناک تک پہنچ گئی ہو۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا، وہ گل زمان تھا۔ اس کی وہاں موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ فیروز وغیرہ بھی میری طرح اس ہال میں آ چکے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جدھر سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ تینوں مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر موجود تھے۔ وہ بھی میری ہی طرح دبے قدموں سے یہاں تک آئے تھے، ان کے آنے کا مجھے تک احساس نہ ہو سکا تھا۔ فیروز اور خان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں، جنھیں ان دونوں نے اس شخص کی طرف تان رکھا تھا۔ میں نے فیروز کو ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس شخص کو سنبھالے اور شرافت علی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اس طرف مڑ گیا جدھر اس بہروپیے یہودی سے میں لزی کے ساتھ ملا تھا۔ میں یہاں رک کر اور کسی جھگڑے میں الجھ کر اندر موجود آئزک کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ ہمارا پروگرام اسے زندہ پکڑ کر اس سے پاکستان میں ان کے آلۂ کاروں کے بارے میں معلومات اگلوانے کا تھا۔ ارادہ یہ تھا میرا کہ اچانک اس کے سامنے پہنچ کر اسے آستانے پر دشمنوں کے حملے کی خبر دے کر بوکھلا دوں گا اور پھر اسی گھبراہٹ کے عالم میں اسے اپنے ساتھ باہر نکال لاؤں گا جہاں فیروز وغیرہ اسے پکڑ کر باندھ لیں گے۔ لیکن جیسے ہی میں اُدھر جانے کے لیے مُڑا، آستانے کے اندر بیک وقت کئی مقامات پر زور زور سے گھنٹے بجنے لگے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، فیروز اور خان کی اسٹین گنوں نے عین اسی لمحے شعلے اگلنا شروع کر دیے۔ میں مزید کچھ دیکھنے کے لیے وہاں رکنے کے بجائے آئزک والے حصّے کی طرف دوڑ پڑا۔ شرافت علی میرے ساتھ تھا۔

آئزک کے ساتھ تین آدمی اور بھی وہاں موجود تھے اور وہ تینوں ہی یورپی باشندے معلوم ہوتے تھے۔ وہ چاروں حیرت اور تجسّس کے عالم میں اِدھر ہی دیکھ رہے تھے جدھر سے میں اور شرافت علی اندر داخل ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو ریوالور بدست یوں اندر گھستے دیکھ کر وہ چاروں نہایت تیزی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ آئزک اٹھتے ہی گرج کر بولا: "کیا بات ہے؟ تم دونوں اس طرح آستانے میں کس نیّت سے گھسے چلے آئے ہو۔ خبردار، اپنی جگہ سے ایک قدم آگے نہ بڑھانا اب۔"

میں نے اس کی وارننگ کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بوکھلاہٹ کے انداز میں کہا: "اوہ جناب! آپ ہماری طرف سے کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ جلدی سے باہر نکلیں، یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے اب، دشمن نے تین طرف سے پہاڑی پر یلغار کی ہوئی ہے۔ ہم آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ دیر نہ کریں جی، زیادہ وقت نہیں ہے اب!"

"لیکن وہ دشمن ہے کون اور تمھیں کیسے علم ہوا کہ اس نے پہاڑی پر یلغار کی ہوئی ہے؟" آئزک نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"وہ جناب! ہم دونوں بس اتفاق سے آ گئے تھے اِدھر اس وقت۔ باہر موجود ایک شخص نے ہمیں اندر آنے سے روکا۔ ہم نے آپ کا حوالہ دیا تو وہ ہمیں اندر اپنے دوسرے ساتھی کے پاس لے آیا۔ وہ اس وقت ٹیلی ویژن اسکرین پر پہاڑی کا جائزہ لے رہا تھا جہاں ہر طرف بے شمار سائے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں ساتھ لانے والا صورتِ حال کو صحیح طور پر جاننے کے لیے باہر دوڑ گیا اور ہم دونوں آپ کو لینے کے لیے اِدھر آ گئے۔ یہاں آتے ہوئے ہم نے گھنٹے بجنے اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں اپنے پیچھے۔"

"اور تم دونوں اس وقت یہاں کیوں آئے تھے؟ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے؟" آئزک مجھ پر اعتبار کرنے کو آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

میں اُس سے کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ پیچھے سے فیروز نے چلّا کر کہا: "یہ تمھاری بات نہیں مانے گا جیلانی! سامنے سے ہٹ جاؤ، ہم اسے ابھی سمجھا دیتے ہیں کہ تم دونوں کس لیے آئے تھے یہاں اس وقت۔"

وہ دونوں بھی باہر والے آدمی کو شاید ٹھنڈا کر کے ہمارے پیچھے ہی چلے آئے تھے۔ میں اور شرافت علی ان چاروں کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ ہمارے پیچھے سے انھیں نشانہ بنانا ممکن نہیں رہا تھا۔ فیروز کی آواز سن کر میں نے سمجھ لیا کہ اب آئزک کو زندہ پکڑنے کے لیے ہماری چال کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ وہ اگر اندر آنے کے بجائے باہر ہی رک کر انتظار کرتے تو شاید میں کسی نہ کسی طرح آئزک کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن انھوں نے اندر آ کر اور مجھے مخاطب کر کے مجھ سے اپنا تعلق ظاہر کر دینے کے بعد اسے ناممکن بنا دیا تھا۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں کھل کر آئزک کے سامنے آ جاتا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنا ریوالور آئزک پر سیدھا کر کے کہا: "تمھارا کھیل ختم ہو چکا ہے آئزک! زندگی چاہتے ہو تو خود کو ہمارے حوالے کر دو، تم چاروں اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

میرے ساتھ ہی ساتھ شرافت علی نے بھی اپنے ریوالور کا رُخ ان لوگوں کی طرف کر دیا تھا۔ آئزک کے ساتھ کھڑے ہوئے تینوں افراد نے جلدی سے اپنے اپنے ہاتھ اٹھا کر سر پر دھر لیے تھے، مگر آئزک میری بات سُن کر قہقہہ لگا کے بولا: "بچّے ہو ابھی برخوردار! میرے بارے میں جانتے نہیں ہو ابھی۔ میں تیری سرگرمیوں کو پہلے ہی شک کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا لیکن وہ بے وقوف لزی میری باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی، اسے بڑا مان ہے اپنے حُسن پر، وہ کہتی تھی اس نے تجھے اپنی زلفوں سے باندھ کر بے بس کر رکھا ہے، تو ہمارے خلاف سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرے گا کبھی۔ مگر میں کسی مسلمان پر اندھا اعتبار نہیں کرتا، میں جانتا ہوں تمھاری قومی غیرت کسی لمحے بھی بیدار ہو سکتی ہے، تم لوگ کسی وقت بھی سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو سکتے ہو۔ مجھے بتاؤ، لزی کے ساتھ کیا سلوک کر کے آئے ہو تم؟ وہ زندہ ہے یا اسے ٹھکانے لگا دیا ہے تم لوگوں نے؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو یہودی کُتّے! ہم نے سب کا انتظام کر دیا ہے۔ اگر تم نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا اور مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچ سکو گے آج۔ تم دونوں آگے آ کر انھیں سنبھالو، میں اس بہروپیے کو دیکھتا ہوں۔" میں نے خان اور فیروز کو مخاطب کیا۔

انھیں آگے بڑھتے دیکھ کر آئزک نے بجلی کی سی تیزی سے جست لگائی اور ہوا میں اُڑتا ہوا ایک نیم تاریک گوشے میں جا ٹھہرا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن دوسرے لمحے جب میرے سامنے آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو دستی بم پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی ایک دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر میری طرف اچھال دیا۔ بم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس نے کیا حرکت کی ہے، میں نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے پھرتی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور بم کے قریب آتے ہی والی بال کے انداز میں اسے ہاتھ مار کر آئزک کی طرف واپس کر دیا۔ میری اس حرکت نے آئزک کو بوکھلا دیا۔ وہ دوسرے بم کی پن کھینچنے کے لیے اسے منہ کے قریب لے جا چکا تھا لیکن پہلے پھینکے ہوئے بم کا نتیجہ دیکھتے ہی اس نے پھر ایک جست کی اور دائیں جانب کی دیوار کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ عین اسی وقت دھماکا ہوا اور چاروں طرف ہلکے گہرے رنگ کا دھواں پھیلنا شروع ہو گیا۔ دھوئیں کو دیکھتے ہی فیروز نے چلّا کر کہا: "جیلانی! ہوشیار، یہ بم دھوئیں کا تھا جو اس نے تمھاری طرف پھینکا تھا۔ اس دھوئیں کی آڑ میں یہ شاید اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے۔"

دھواں ابھی زیادہ نہیں پھیلا تھا۔ اس کا حجم آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے فیروز سے کہا: "تم ان تینوں کا ٹنٹا کرو، میں اس کو دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دھوئیں کی دیوار پار کرنے کے لیے اس طرف چھلانگ لگا دی جدھر ابھی دھواں نہیں پھیلا تھا۔

دھوئیں کے اس پار جاتے ہوئے میں نے خان کو یہ کہتے سنا: "ختم کرو یار ان سالوں کو یہیں، ہم کہاں لیے پھریں گے انھیں۔"

اس کے ساتھ ہی اسٹین گن سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور پھر انسانی چیخیں اور کراہیں ابھرنے لگیں۔ میں نے اُدھر پہنچ کر آئزک کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں، مگر اس کا کہیں نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتّہ جدھر وہ بھاگا تھا اس طرف دیوار میں ایک دروازہ کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھا شاید اُدھر کوئی کمرہ ہے جہاں اس بہروپیے نے اسلحہ وغیرہ جمع کر رکھا ہے، لہٰذا میں نے بھی اس دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے تک پہنچتا میں نے دروازے کو سمٹتے ہوئے محسوس کیا، یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں طرف کی دیواریں آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کو بند کر دینا چاہتی ہیں۔ یہ دیکھتے ہی میں پوری قوت سے دوڑتا ہوا دروازے کو پار کر گیا۔ میں جب اس کے بالکل نزدیک پہنچا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے دونوں طرف سے بڑھتی ہوئی دیواریں ایک جھٹکے کے ساتھ رک کر یوں پیچھے ہٹی تھیں جیسے وہ مجھے اس دروازے سے گزرنے کے لیے راستہ دے رہی ہوں۔ اس طرف دو یا ڈھائی فٹ ہموار زمین کے بعد سیمنٹ کا پختہ فرش ڈھلوان کی طرح نیچے ہوتا چلا گیا تھا۔ تقریباً آٹھ دس فٹ چوڑی اس پختہ ڈھلوان کے دونوں طرف تین تین فٹ چوڑے چھوٹے چھوٹے زینے بنے ہوئے تھے۔ یہ کوئی تہ خانہ معلوم ہوتا تھا جس کی دیواروں پر دونوں جانب روشنی کے لیے بلب لگے ہوئے تھے جن کی مدّھم روشنی میں یہاں کی ہر چیز دیکھی جا سکتی تھی۔ میں اس ڈھلوان پر دوڑتا چلا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی سرنگ تھی جو ایک ڈھلان کی شکل میں نیچے ہی نیچے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے اپنے آگے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجھ سے چند قدم آگے دوڑ رہا ہے۔ یقیناً یہ آواز آئزک کے قدموں کی تھی، وہی مجھ سے پہلے اس سرنگ میں گھسا تھا مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گو یہاں بہت مدّھم روشنی تھی مگر اس ہلکی روشنی میں بھی اپنے سامنے کافی آگے تک بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ آئزک کے نظر نہ آنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ مجھ سے آگے اتنے فاصلے پر تھا کہ میری نظر اس کا احاطہ نہیں کر پا رہی تھی مگر تنگ اور بند جگہ ہونے کی وجہ سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں مجھ تک ضرور پہنچ رہی تھیں، جس طرح میں آئزک کے قدموں کی

آوازیں سُن رہا تھا اسی طرح آنزک بھی یقیناً میرے قدموں کی آوازیں سُن رہا ہوگا جبھی وہ اب تک بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ورنہ اس سرنگ میں اتنی دور آجانے کے بعد اسے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے اس طرح بھاگنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس سرنگ کے دوسری جانب بھی باہر نکلنے کے لیے کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ یوں بھی سرنگ جس طرح بنائی گئی تھی اسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی زیرِ زمین ایسا راستہ ہے جس کے ذریعے تنظیم کے لیے کام کرنے والے ایسے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہوگی جو کسی کی نگاہ میں آئے بغیر آنزک تک پہنچنا چاہتے ہوں گے، اس کی لمبائی چوڑائی اور پختگی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں چھوٹی بڑی گاڑیوں کی آمد و رفت بھی ہوتی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی تھا کہ اس آستانے کو منشیات کے کاروبار کے مقامی مرکز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کراچی کے باہر سے آنے والی تمام منشیات، ہیروئن، چرس، کوکین اور دیگر تمام قسم کی نشہ آور اشیاء یہیں اسٹور کی جاتی تھیں اور یہیں سے انھیں دیگر علاقوں میں سپلائی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ منشیات کو آستانے تک پہنچانے کے لیے بھی شاید راستہ بنایا گیا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس سرنگ کا اختتام کسی عمارت کے احاطے میں ہونا چاہیے تھا۔

ہم بہت دور تک آچکے تھے لیکن سرنگ کا آخری سرا اب تک نہیں آسکا تھا، میرے آگے بھاگتے ہوئے آنزک کے قدموں کی آواز سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ شاید آنزک بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سُست پڑنے لگے تھے۔ یہ اندازہ ہوتے ہی میں نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ چند ہی ثانیے بعد آگے چڑھائی شروع ہوگئی، میں نے آنزک کو اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے اور اس کے درمیان اب بھی اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ مگر میں اب اسے بخوبی دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگا جا رہا تھا لیکن اس کے قدم پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت تھک چکا تھا، میرے ہاتھ میں سائیلنسر لگا ہوا ریوالور موجود تھا میں نے ریوالور سیدھا کر کے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی اچانک مجھے اپنے پیچھے سے بھی بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس سرنگ نما راستے پر دوڑنے والے آنزک اور میں صرف دو ہی افراد ہیں۔ لیکن کسی تیسرے شخص کے وجود کا احساس ہوتے ہی میں چونک پڑا۔ میری حیرانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے راستے میں کوئی موڑ یا کوئی ایسا دروازہ نہیں دیکھا تھا جس کے بارے میں یہ سوچا بھی جا سکتا کہ میرے تعاقب میں آنے والا اس طرف سے نکل کر میرے پیچھے لگ گیا ہوگا۔ آنے والے کے قدموں کی آواز زیادہ دور نہیں تھی لہٰذا آواز سنتے ہی میرا پیچھے مڑ کر دیکھنا ایک فطری امر تھا۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ میرے تعاقب میں آنے والا شرافت علی تھا۔ لیکن میرا یہ لمحے بھر کا پیچھے مڑ کر دیکھنا آنزک کو زندہ رہنے کا بہانہ مہیا کر گیا۔ شرافت علی کو دیکھ کر میں دوبارہ آنزک کی طرف پلٹا تو وہ، غائب ہو چکا تھا۔ اسے نہ پا کر میں پوری قوت سے دوڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شرافت علی نے پیچھے سے مجھے آواز دی: "جیلانی! آگے نہ جاؤ، وہ ادھر ہی بائیں ہاتھ کو ایک دروازے میں گھسا ہے۔"

میں نے شرافت علی کی بات سنتے ہی رک کر اپنے بائیں ہاتھ کی دیوار کو دیکھا، دیوار بالکل ہموار تھی۔ وہاں کسی دروازے یا کھڑکی کا کوئی نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ میں نے حیران ہو کر شرافت علی کو دیکھا اور بولا: "کون سے دروازے کی بات کر رہے ہو بھئی؟"

وہ میرے قریب پہنچ کر اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: "ادھر یہاں۔" اس نے دیوار پر ایک جگہ ہاتھ رکھ کر مجھے بتایا: "ٹھیک اسی جگہ سے اندر گیا ہے وہ۔ میں نے دیکھا ہے خود اپنی آنکھوں سے۔"

"لیکن یہاں تو کسی دروازے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پوری دیوار بالکل سپاٹ ہے۔ پھر وہ دیوار میں کیسے گھس سکتا ہے۔ کوئی جادوگر یا آسیب تو نہیں ہے وہ کہ اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ آگے گیا ہوگا۔"

"غلط فہمی کیسی؟ تم یقین کرو میں نے اسے ٹھیک، اسی جگہ دیوار میں گھس کر غائب ہوتے دیکھا ہے۔" وہ دیوار کو ٹٹولنے لگا۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر دیوار پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ دیوار پر سیمنٹ کا پلاستر تھا جس میں اوپر سے نیچے تک کوئی ایک ایک فٹ کے فاصلے پر سیاہ رنگ کی لائنیں دی ہوئی تھیں۔ شرافت علی نے دیوار کو ہاتھ سے ٹھونکتے ہوئے کہا: "اس جگہ کوئی خفیہ راستہ ضرور ہے جس سے گزر کر آنزک دوسری طرف گیا ہے۔ اس دروازے کو کسی میکانکی نظام کے تحت کھولا اور بند کیا جاتا ہوگا۔ تم نے اس دروازے کو تو دیکھا ہی ہے جس سے گزر کر ہم یہاں آئے ہیں۔ اس کا سسٹم کچھ ایسا رکھا گیا ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص دروازے کے قریب پہنچتا ہے دیوار کا ایک حصہ پیچھے ہٹ کر اسے گزرنے کے لیے راستہ دے دیتا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں موجود دروازہ کسی اور طریقے سے کھولا جاتا ہوگا۔ اگر ہم کوشش کریں تو اسے کھولنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ موجود ہو۔ یہ بات میری سمجھ میں آ نہیں رہی ہے شرافت علی! اگر یہاں کوئی دروازہ ہے تو اسے کھولنے اور بند کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہوگا نا، ایسا جادوئی دروازہ نہیں ہو سکتا کوئی کہ لمحوں میں آنزک کو نگل کر اس طرح بند ہو جائے، جیسے اس کا پہلے کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ تم یہ بات اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہو؟ مان لو کہ تمھاری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔"

"نہیں جیلانی! میں نے یہ کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ یہاں دروازہ ضرور ہے۔ یہ جو تم اس دیوار پر اوپر سے نیچے تک سیاہ لائنیں بنی دیکھ رہے ہو، یہ اس دیوار کی زیبائش کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔ تم خود سوچو، ایک ایسے تہ خانے میں جس کا چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی کو علم بھی نہ ہو، زیب و زینت کا سامان کرنے کی کیا ضرورت ہے کسی کو، کون اسے دیکھنے آتا ہے یہاں؟"

"بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی ہے شرافت علی! پھر ان لائنوں کا کیا مقصد ہے تمھارے خیال میں؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ مسکرا کر بولا: "یہ یہاں موجود دروازے کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں۔"

میں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا: "کیا مطلب ہے تمھارا؟ تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے اب تک۔ ان ایک ایک انچ کی سیاہ پٹیوں کا کسی دروازے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میرے بھائی! اتنی سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تمھاری، حیرت ہے مجھے۔ تم تو یہ جانتے ہو نا کہ اگر دیوار میں کوئی خفیہ دروازہ بنا ہو تو اس کے جوڑ دیوار میں الگ ہی نظر آتے ہیں۔ کتنی ہی مہارت سے کام کیا جائے ایک باریک سی لکیر نظر ضرور آتی رہتی ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ پٹیاں اس لکیر کو چھپانے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں۔ اب سمجھے؟" اس نے کہا۔

میں اس کی بات سُن کر اچھل پڑا، اس نے واقعی ایک ایسی بات بتائی تھی جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے مسلسل دیوار پر ہاتھ پھیرتا اور اسے ٹٹولتا جا رہا تھا۔ اس کی بات سُن کر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے جب دیوار پر ہاتھ پھیرا تھا تو میری انگلیاں ایک جگہ اٹکی تھیں، ایسا ہی لگا تھا جیسے اس جگہ سے دیوار کا پلاستر ہلکا سا چٹخ گیا ہو، جس کی وجہ سے وہاں ہلکی سی دراڑ پڑ گئی ہو۔ میں نے یہ خیال آتے ہی فوراً اس دراڑ کو دوبارہ تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی، اور جلد ہی مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں نے شرافت علی سے کہا: "ادھر آؤ، یہ دیکھو شرافت علی! میرا خیال ہے جو کچھ تم اس دیوار میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو، میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔"

شرافت علی نے قریب آ کر اس جگہ ہاتھ پھیرا جہاں میرا ہاتھ رکھا ہوا تھا، پھر ایک دم اچھل کر بولا: "بالکل ٹھیک جگہ ہاتھ رکھا ہے تم نے۔"

وہ اپنے ہاتھ کو اوپر تک لے گیا، اس کے بعد نیچے لایا اور مسکراتے ہوئے بولا: "یہی ہے وہ دروازہ، لیکن یہ کھلے گا کس طرح سے؟"

میں نے کہا: "میرا تو خیال ہے آنزک نے دوسری طرف جا کر اسے اس طرح بند کر دیا ہے کہ اب اس طرف سے اسے کھولا نہیں جا سکے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم یہاں وقت برباد کرنے کے بجائے واپس چلیں۔ وہ یہودی بچّہ تو اب ہمارے ہاتھوں سے نکل ہی گیا سمجھو۔"

"اس کا اس طرح نکل جانا ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا جیلانی! اب تو ہماری تنظیم سے کھلی جنگ شروع ہو چکی ہے سمجھ لو۔"

"اوئے دفع کر یار! جو ہونا تھا ہوگیا۔ پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اب۔ اور یہ کوئی خلافِ توقع بات تو نہیں ہوئی ہے نا، ایسا ہونا تو ایک دن ضروری تھا۔ اچھا ہے اب کھُل کر مقابلہ ہوگا اور ہم ایک ایک کو چُن چُن کر ختم کرتے جائیں گے۔ یہ بات گرہ میں باندھ لو شرافت علی! اب کوئی مصلحت ہمارے آڑے نہیں آئے گی۔ کسی کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کریں گے ہم۔ جہاں جو ہمارے سامنے آگیا، اسے مٹی میں ملانے کی کوشش ہی کرنا ہے ہمیں بس، اس کے سوا کچھ نہیں کرنا اب۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"ہاں، اب تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" وہ میرے پیچھے پیچھے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولا: "جو لوگ ہمارے سامنے ہیں انھیں تو اب پہلی فرصت میں ان کے چوکنا ہونے سے پہلے ہی ٹھکانے لگا دینا چاہیے ہمیں۔ یہاں سے نکلتے ہی سیدھے لنزی کی قبر کا انتظام کرنے چلو پہلے۔"

"ہاں، اب اس مارِ آستین کا ہمارے درمیان رہنا مناسب نہیں ہے کسی طرح بھی۔ شاید آنزک بھی یہاں سے نکل کر سیدھا لنزی کے پاس ہی پہنچے گا۔ وہ اگر وہاں ٹکرا گیا ہمیں تو ان دونوں کو ہی ٹھکانے لگا دیں گے ہم۔ ان کا زندہ اور آزاد رہنا خطرناک ہے ہمارے لیے۔" میں بولا۔

ہم دونوں بھاگتے ہوئے آستانے کی طرف واپس ہوئے۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اپنے سامنے سے بہت سے لوگوں کی بھاگتے ہوئے اپنی طرف آنے کی آوازیں سُن کر ٹھٹک کے رک گئے۔ شرافت علی بولا: "جیلانی! کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں میں۔ ممکن ہے ہمارے ہی ساتھی ہوں اور ہماری تلاش میں آ رہے ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن کے آدمی

ہوں۔ اگر یہ دشمن ہوئے تو سمجھ لو شرافت علی! کہ باہر موجود ہمارے آدمی کام آ چکے ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

شرافت علی کی نظریں بھی تیزی سے گردش کر رہی تھیں لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جس کی آڑ بھی لی جاسکتی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا جب کہ شرافت علی اسٹین گن لیے ہوئے تھا۔ میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ ریوالور تم لے لو شرافت علی، اور مجھے اسٹین گن دے دو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں یہ کون لوگ ہیں۔ اگر دشمن کے آدمی ہوئے تو میں اسٹین گن سے انھیں بھون کر رکھ دوں گا۔ اور اگر اپنے ساتھی ہوئے تو تمھیں آواز دے کر بلا لوں گا۔ تم اس وقت تک یہیں دیوار سے لگ کر کھڑے رہو۔"

وہ بولا۔ "نہیں، یہ بہت خطرناک ہوگا تمھارے لیے۔ تم یہاں رکو، میں آگے جا کر دیکھتا ہوں انھیں۔ شاید اپنے ہی آدمی ہیں یہ۔"

میں نے اسٹین گن اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بے کار باتوں میں وقت نہ برباد کر یار! لا مجھے دے اس کو۔"

"میں کہہ رہا ہوں نا، میں خود جا رہا ہوں۔۔" اس نے اسٹین گن پر اپنی گرفت مضبوط کر کے کہا۔

میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو شرافت علی! ضد نہ کرو، خواہ مخواہ مارے جاؤ گے اس ضد میں۔"

"یہ خطرہ تو تمھارے لیے بھی اتنا ہی ہے۔ کیا تم نہیں مارے جاؤ گے آگے جا کر؟" شرافت علی نے گن پر اپنی گرفت نرم کرتے ہوئے کہا۔

"میری تم فکر نہ کرو، مجھے ایسے حالات سے نمٹنے کا بہت تجربہ ہے۔ میرے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

میں اس کے ہاتھ سے اسٹین گن جھپٹ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے دو چار قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ پیچھے سے شرافت علی نے پکار کر کہا۔ "جیلانی! واپس آ جاؤ۔ اب اُدھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چھپنے کی جگہ مل گئی ہے مجھے۔"

اس کی آواز سن کر میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ دیوار کے اندر کھلے ہوئے ایک دروازے میں کھڑا مجھے بلا رہا تھا۔ میں مڑ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ دروازے میں داخل ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ۔۔۔۔ تقریباً دس یا بارہ فٹ چوڑا ایک چوکور کمرہ تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ اندر داخل ہونے کا دروازہ دیوار ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا جس میں اندر کی جانب ہینڈل اور ایک موٹی سی لوہے کی سلاخ چٹخنی کی طرح لگی ہوئی تھی جسے اندر سے بند کیا جا سکتا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں سوئچ لگا ہوا تھا جسے آن کرتے ہی مدھم روشنی کا بلب جل اٹھا۔ اسے دیکھ کر میری کھوپڑی میں جیسے بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ مجھے خیال آیا آئزک جس دروازے میں غائب ہوا تھا یقیناً وہ بھی ایسا ہی کمرہ ہوگا، جس میں گھسنے کے بعد اس نے اسے اندر سے بند کر لیا ہوگا۔ شرافت علی نے دروازہ بند کر کے اندر وہ موٹی اور مضبوط چٹخنی چڑھا کر کہا۔ "اس کمرے کو میں نے دیکھ کر اندازہ کیا ہے کہ اس سُرنگ میں دونوں طرف کی دیواروں کے پیچھے ایسے بے شمار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ آئزک نے بھی جب تمھیں اپنے سر پر پہنچتے دیکھا تو وہ ایسے ہی ایک کمرے میں گھس کر روپوش ہو گیا تھا، کیوں کہ اس جگہ سرنگ ختم نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے واپس آنے کے بعد وہ کمرے سے نکل کر سرنگ کے دہانے کی طرف گیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے ہم دھوکا کھا گئے اس سے۔"

"ہاں یار! جس قوم کے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے ہمیں، مکاری اور عیاری میں ہم ان کا مقابلہ تو کر ہی نہیں سکتے۔ مگر تم نے اچانک اس کمرے کا پتا کیسے چلا لیا؟ بہ ظاہر تو یہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں ایسا کوئی کمرہ بھی موجود ہے۔"

"بس یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے امداد ہی سمجھ لو تم۔ تمھارے آگے بڑھنے کے بعد میں جہاں کھڑا تھا اسی جگہ دیوار سے ٹک گیا۔ میرے ٹیک لگاتے ہی دیوار اندر دبنے لگی۔ میں نے چونک کر دونوں ہاتھوں سے اس پر دباؤ ڈالا تو دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ میں نے فوراً تمھیں آواز دے کر واپس بلا لیا۔ آؤ ذرا دیکھیں، یہ دیوار کے ساتھ بنی ہوئی الماریوں میں کیا ہے؟" وہ بولا۔

اس کے کہنے پر میں نے ادھر دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں دیوار میں چار دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے شرافت علی کے ساتھ اس طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ذرا ہوشیاری سے آگے بڑھو، ایسا نہ ہو جنھیں تم الماریوں کے دروازے سمجھ رہے ہو، وہ کسی ایسے کمرے کے دروازے ہوں جن کے پیچھے ہماری موت تاک لگائے کھڑی ہو۔"

وہ بولا۔ "ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن بہ ظاہر یہ دروازے الماریوں ہی کے لگتے ہیں، پھر بھی ہمیں احتیاط ضرور کرنا چاہیے۔"

ہم دونوں دبے قدموں، بہت ہی چوکنا انداز میں اس طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر میں اسٹین گن تان کر کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی خطرہ نظر آئے تو فوراً اس سے نمٹ سکوں۔ شرافت علی نے سامنے سے ہٹ کر ہاتھ بڑھا کے دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ وہ واقعی الماری ہی تھی۔ اس کے تین خانے تھے۔ اوپر کے دو خانے چھوٹے تھے جن میں رکھی ہوئی سلوفین کی تھیلیوں میں سفید رنگ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ اور نیچے کا خانہ خاصا بڑا تھا جس میں ایک قطار میں چار اسٹین گنیں، چار رائفلیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں دھری تھیں۔ شرافت علی نے ہاتھ بڑھا کر درمیانی خانے سے ایک تھیلی اٹھا کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہیروئن ہے یہ تو۔۔۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور تمھیں کیا ان الماریوں سے آبِ حیات ملنے کی توقع تھی؟"

"یہ تو کروڑوں روپے کا مال ہے جیلانی! معلوم ہوتا ہے، ابھی ایک آدھ دن میں ہی یہ مال پہنچا ہے یہاں۔" وہ بولا۔

"ہوگا۔ فی الحال اسے واپس رکھ دو اور الماری سے ایک اسٹین گن اور کچھ فاضل راؤنڈ لے کر ہٹ آؤ وہاں سے۔ وہ لوگ معلوم ہوتا ہے بہت قریب آ چکے ہیں، ان سے نمٹنے کے بعد ہم اس تہ خانے کا پوری طرح جائزہ لیں گے۔" میں نے زمین پر بہت سے قدموں کی تیز دھمک محسوس کر کے شرافت علی سے کہا۔ اور مڑ کر، دروازے کی طرف چل دیا جس سے ہم اندر آئے تھے۔

میں نے آہستہ سے چٹخنی ہٹا کر دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ شرافت علی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ "جیلانی! دروازہ نہ کھولنا ابھی۔ پہلے اندر کا بلب بجھا دو ورنہ اندر روشنی دیکھ کر دشمن چوکنا ہو کے اس طرف متوجہ ہو جائے گا۔"

میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ شرافت علی دو اسٹین گنیں اور ان میں استعمال ہونے والی گولیاں لے کر میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا تو میں نے دروازہ دوبارہ اتنا کھول دیا کہ سامنے سے گزرنے والوں کو دیکھا جا سکے۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد میں نے اسٹین گن تھامے دو تندرست اور توانا اشخاص کو تقریباً دوڑتے ہوئے ادھر آتے دیکھا۔ ان کے پیچھے چھ افراد اور تھے۔ ان سب کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اور ہاتھوں میں انھوں نے پستول پکڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارا ساتھی نہیں تھا۔ وہ دونوں جو اسٹین گنیں لیے آگے آگے آ رہے تھے، یورپ یا امریکا کے باشندے معلوم ہوتے تھے، بقیہ چھ میں سے چار یا تو امریکی نیگرو تھے یا افریقہ کے کسی ملک سے تعلق تھا ان کا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جنھیں پاکستانی کہا جا سکتا تھا۔ وہ سب جیسے ہی ہمارے قریب پہنچے، میں نے پھرتی سے دروازہ کھول کر اپنی اسٹین گن سیدھی کر کے آگے آنے والے دونوں اسٹین گن بر داروں کو نشانہ بنا ڈالا۔ انھیں شاید اس طرح کی کسی اچانک کارروائی کا گمان تک نہیں تھا۔ گولیاں کھا کر وہ اچھلے، اسٹین گنیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑیں اور وہ دونوں الٹ کر پیچھے آنے والے اپنے ساتھیوں پر جا گرے۔ پھر اس سے پہلے کہ بقیہ لوگ صورتِ حال کو سمجھ کر کوئی جوابی کارروائی کرتے، شرافت علی کی اسٹین گن نے بھی شعلے اگلنا شروع کر دیے۔ لمحوں میں وہ آٹھوں زمین پر پڑے خاک اور خون میں لوٹ رہے تھے۔ شرافت علی نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں وی کی شکل میں اوپر اٹھا کر مسرور لہجے میں چلّایا۔ "وہ مارا۔"

میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "جذبات پر قابو رکھو دوست! اس چھوٹی سی ابتدائی کامیابی پر ہمیں اتنا زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ آج تو اس معرکہ آرائی کا پہلا دن ہے۔ آج کے بعد ہمیں جو حالات پیش آئیں گے اور جن مراحل سے ہمیں گزرنا پڑے گا، ان کے مقابلے میں یہ کامیابی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لہٰذا ہمیں خوش فہمی کا شکار ہونے کے بجائے حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں یار! ہمارا مقابلہ جن لوگوں سے ہے، انھیں میں بہت اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہوں، مگر ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے آئندہ کے اندیشوں کی وجہ سے منہ نہیں موڑ لینا چاہیے ہمیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں مل کر ہی کسی بڑی خوشی کا روپ دھار لیں گی ایک دن۔ ہم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ کوئی برا کام تو نہیں ہے نا۔ اور نیک کام کرنے والوں کی اللہ ہر طرح مدد کرتا ہے۔ اس کی ذات پر بھروسا رکھو دوست! جس نے آج آٹھ بدی کے کارندوں کو مٹی میں ملوایا ہے ہمارے ہاتھوں، وہی کل ان کے سیکڑوں ساتھیوں کو بھی ہمارے ہی ہاتھوں سے کیفرِ کردار کو پہنچائے گا۔ کیا تمھیں اس کی ذات پر بھروسا نہیں ہے؟" شرافت علی بولا۔

"اسی کی ذات پر بھروسا کر کے تو میں نے اس اتنی بڑی اور منظم تنظیم کی بیخ کنی کا عہد کیا ہے شرافت علی! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ربِ کائنات اس نیک مقصد کو پورا کرنے میں ہماری مدد ضرور کرے گا۔ چلو آؤ، اب باہر چل کر دیکھیں۔ فیروز وغیرہ ہمارے منتظر ہوں گے اُدھر آستانے میں۔ ایسا نہ ہو وہ ہماری طرف سے مایوس ہو کر کوئی غلطی کر بیٹھیں۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے ان لوگوں سے نمٹ کر اس تہ خانے کا اچھی طرح جائزہ لیں گے ہم۔ میرا خیال ہے اس جگہ چھوٹی بڑی کوٹھڑیوں کا جال بچھا ہوا ہے جہاں مختلف قسم کی خوفناک ترین نشہ آور اشیا کا ذخیرہ کر رکھا ہے ان لوگوں نے۔ جن کے ذریعے یہ ہماری نوجوان نسل کو ناکارہ بنانے کے ساتھ ہمارے ملک کی دولت بھی سمیٹ کر اسرائیل لے جائیں گے اور اس کو ہم پر بالادستی حاصل کرنے پر صرف کریں گے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں، یہ آستانہ اور یہ زیرِ زمین لمبی چوڑی سرنگ اسی مقصد سے بنائی گئی ہے۔ ہم آج اسے مکمل طور پر برباد کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے یہاں سے۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے اس کے ایک ایک گوشے کی تلاشی لے کر وہ تمام چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں گے جن سے اپنی طاقت میں اضافہ کر کے ان رذیلوں کے خلاف بھرپور کارروائی کرنے کے قابل ہو سکیں ہم۔" میں نے اسے بتایا۔

"لیکن تم تو یہاں سے واپس جانے کو کہہ رہے ہو۔" شرافت علی نے فکر مند سا ہو کر کہا۔

"او یار! بے کار کی جرح میں وقت برباد نہ کر میرے بھائی! آستانے میں چل کر وہاں سے کچھ اور لوگوں کو بھی ساتھ لائیں گے تاکہ جلد از جلد اس کام کو نمٹایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات کو تو بالکل ہی بھول بیٹھا ہے، اس کا بھی تو خیال کر میرے بھائی۔"

"کون سی اہم بات؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کس کا خیال کروں میں؟" شرافت علی متذبذب ہو کر بولا۔

"یہ آٹھ آدمی میرے بھائی! جنھیں تم نے اس تہ خانے میں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے، یہ لوگ بھی تو اُدھر سے ہی آ رہے تھے۔ اور ہاں آستانے میں کھلنے والے سرنگ کے دہانے پر ہمارے آدمیوں کا قبضہ تھا۔ باہر بھی پہاڑی کے چاروں طرف اور آستانے کے داخلی دروازے پر ہمارے ساتھی موجود تھے، پھر یہ آٹھ آدمی یہاں تک کیسے پہنچے؟ ان کی یہاں موجودگی کا تو یہی مطلب ہے کہ باہر کے حالات ہمارے لیے موافق نہیں رہے ہیں، دشمن نے ہمارے آدمیوں کو یا تو بے بس کر کے ڈال دیا ہے یا شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں پہلے ان کی خبر گیری کرنا چاہیے۔"

"اوہ!" شرافت علی ایک دم اچھل پڑا۔ "میری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں یار! کمال ہے اتنی سیدھی سی بات کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں پیارے بھائی! آدمی کو جذبات میں آ کر ہوش سے بے گانہ نہیں ہونا چاہیے۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔"

ہم دونوں ایک بار پھر اسی طرف بھاگنے لگے جہاں سے اس سرنگ نما تہ خانے میں گھسے تھے۔ قریب پہنچ کر ہم نے دوڑنا ختم کر کے محتاط انداز میں اس طرح آگے بڑھنا شروع کیا کہ باہر موجود لوگوں کو ہمارے قدموں کی آواز نہ سنائی دے سکے۔ وہ دروازہ جس سے گزر کر ہم آئے تھے، اب بند دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے شرافت علی کی طرف دیکھا، وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھا تم نے، وہی ہوا نا جس کا خدشہ تھا مجھے۔ لگتا ہے ہم دونوں اس چوہے دان میں پھنس کر رہ گئے ہیں اب۔ یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچو۔"

وہ فکر مندی کے ساتھ سپاٹ دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا ہے جیلانی! نہ جانے ہمارے ساتھیوں کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ ہم لوگ اس سرنگ میں بہت آگے تک چلے گئے تھے، اسی وجہ سے باہر ہونے والے مقابلے کی ہمیں بالکل خبر نہ ہو سکی۔ حالاں کہ انھوں نے سخت مقابلے کے بعد ہی آستانے پر دوبارہ قبضہ کیا ہوگا۔ فیروز وغیرہ نے یوں آسانی سے تو ہتھیار نہیں ڈال دیے ہوں گے۔"

"ہاں، وہ تو ہو گیا جو کچھ ہونا تھا، اب اس کا ذکر چھوڑو اور یہ سوچو ہم زندہ سلامت یہاں سے کیسے نکلیں؟" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچ کر بولا۔ "جیلانی! ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے بے حد ہوشیاری، پھرتی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا ہمیں۔ بس یوں سمجھو جو پہل کرنے میں کامیاب ہو گیا جیت اس کی ہوگی۔ ہمیں اس معاملے میں ایک سہولت یہ حاصل ہوگی کہ ہم پوری طرح سوچ سمجھ کر پہلے سے اس کے لیے تیار ہوں گے اور دشمن کو ہماری چال سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا اور اس وقت کا صحیح استعمال ہی ہماری کامیابی کا ضامن ہوگا..."

"یہ لمبی چوڑی تمہید ہی باندھتے رہو گے یا بتاؤ گے بھی کہ وہ ترکیب ہے کیا آخر؟" مَیں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"وہی بتانے جا رہا ہوں، تم سنو تو صبر کے ساتھ۔" وہ بولا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ وہ لوگ اِدھر سے ہی اندر داخل ہوئے ہیں اور اگر ان کے کچھ اور ساتھی باہر موجود ہیں تو وہ ان کی واپسی کے بھی منتظر ہوں گے۔ لہٰذا ہم اوپر دیوار کے پاس جا کر دیوار پر ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر انھیں اس طرف متوجہ کریں گے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ان کے ساتھی واپس آئے ہیں اور دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں پھر وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر ہمارے سامنے آئیں گے ہم انھیں بے دریغ بھون ڈالیں گے۔"

"ہوں، ترکیب تو اچھی ہے۔ چلو پھر اوپر چلیں اب، اور جیسے ہی دیوار کو حرکت ہو اسٹین گن تان کر تیار ہو جانا۔"

ہم نے اپنی اپنی اسٹین گن سیدھی کر لی اور سامنے نظریں جما کر ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم چل کر شرافت علی بولا۔ "ہم دونوں کا ایک ساتھ دروازے کی سیدھ میں چلنا ٹھیک نہیں ہے جیلانی! میرا خیال ہے ہمیں یہ تختہ چڑھائی چھوڑ کر دونوں طرف کے زینوں پر ہو کر چلنا چاہیے۔ تاکہ دروازہ کھلے تو ہم فوراً ہی اس طرف والوں کو نظر نہ آ سکیں۔"

مَیں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور ہٹ کر اپنی طرف والے زینے کی طرف چلا گیا۔ شرافت علی نے دوسری طرف جا کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھتے چڑھتے ایک زینے پر پاؤں دھرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے قدم ڈگمگا گئے ہوں۔ میں نے جلدی سے دوسرا پاؤں بھی اٹھا کر زینے پر مضبوطی سے قدم جما لیے۔ ایک لمحے کے لیے میری توجہ زینوں کی طرف ہوئی تھی۔ اسی وقت شرافت علی نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "جیلانی! ہوشیار، دروازہ کھل رہا ہے اوپر، اس کے پوری طرح کھلنے سے پہلے ہی ہمیں اوپر پہنچنا ہے۔"

میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ واقعی اوپر کی دیوار دو حصّوں میں تقسیم ہو کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میں نے ایک دم جست

کی اور دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ شرافت علی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ اوپر پہنچے تھے۔ غالباً اس زینے کے نیچے جس پر میرے قدم ڈگمگائے تھے، کوئی ایسی کاریگری کی گئی تھی کہ اس پر وزن پڑتے ہی دروازہ آپ ہی آپ کھل جاتا تھا۔ اوپر آ کر میں نے دروازہ پورا کھلنے کا انتظار کیے بغیر گردن ہلا کر شرافت علی کو اندر گھسنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے دروازہ پار کر کے اسٹین گن سیدھی کر لی۔ لیکن اندر پہنچتے ہی چونک کر اسٹین گن نیچے جھکا لینا پڑی۔ یہاں کے بارے میں ہمارے تمام اندیشے، سارے کے سارے خدشات غلط ثابت ہوئے تھے۔ یہاں فیروز، انور کمال اور تین اور جوان نہایت اطمینان کے ساتھ آتزک کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینے میں منہمک تھے۔ ہم اندر پہنچے تو انھوں نے بھی چونک کر ہمیں دیکھا۔ فیروز جلدی سے ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آ گئے تم، وہ کہاں ہے، وہ بہروپیہ یہودی؟ کیا وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے؟"

"ہاں، وہ ہمیں دھوکا دے کر نکل بھاگا ہے لیکن... لیکن.. یہاں تو سب خیریت ہے نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں تو، یہاں ہے ہی کون اس وقت جو کچھ گڑبڑ کرے گا۔ دو آدمی باہر بندھے پڑے ہیں، دو کو یہاں ٹھنڈا کر دیا ہے ہم نے اور ایک کو اُدھر پہلے کمرے میں ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی تو دکھائی ہی نہیں دیا ہمیں۔" فیروز بولا۔

اس کمرے میں دو لاشیں پڑی تھیں جو ان لوگوں کی تھیں جنھیں میں نے آتزک کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ والا تیسرا شخص مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے فیروز سے کہا۔ "مگر یہاں تو آتزک کے ساتھ تین آدمی تھے۔ وہ تیسرا کہاں ہے؟"

"وہ تو یار بہت ہی بزدل نکلا، نہ جانے ایسے کم ہمت شخص کو ان لوگوں نے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہوا تھا۔ ہم نے جیسے ہی اپنی اسٹین گنیں سیدھی کیں، وہ تھر تھر کانپتا ہوا میرے قدموں میں گر کر جاں بخشی کی التجائیں کرنے لگا تھا۔ ہم نے اسے مارنے کے بجائے ہاتھ پیر باندھ کر باہر ڈال دیا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہو سکیں گی، ذرا سی سختی کر کے اسے زبان کھولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"باہر کی کیا پوزیشن ہے۔ اُدھر تو کسی مقابلے کی نوبت نہیں آئی؟" میں نے سوال کیا۔

"ابھی تک تو اُدھر بھی سکون ہی ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہاں بس یہی آدمی تھے جنھیں ہم نے ٹھکانے لگا دیا۔" فیروز بولا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ اُدھر نیچے تہ خانے میں بھی آٹھ لاشیں پڑی ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ وہ آٹھ آدمی آخر کہاں سے آئے تھے۔ ان سے ہماری واپس آتے ہوئے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ لوگ تم سب کو بے بس کر کے وہاں پہنچے ہیں۔"

"شاید وہ پہلے ہی وہاں موجود ہوں گے۔ آتزک نے کچھ محافظ تہ خانے کی کوٹھریوں میں بھی رکھ چھوڑے تھے شاید۔" شرافت علی نے کہا۔

"ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ٹھیک ہے آؤ، ہم چل کر دیکھتے ہیں وہاں اور کیا کیا بھرا پڑا ہے۔ فیروز تم کم از کم آٹھ نو آدمیوں کو ساتھ لے کر تہ خانے میں آ جاؤ، میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو وہاں سے ہمیں بہت سارا اسلحہ اور منشیات مل سکے گی۔ ایک جگہ کچھ اسلحہ اور ہیروئن کا ذخیرہ تو دیکھ کر آئے ہیں ابھی ہم۔" میں نے فیروز سے کہا اور شرافت علی کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ تہ خانے میں چلا گیا۔

شرافت علی میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ آٹھ آدمی اسی تہ خانے میں موجود تھے تو اب ہمیں یوں اندھا دھند آگے نہیں بڑھنا چاہیے جیلانی! ہو سکتا ہے ان کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہوں۔ ہمیں ابتدا سے ہی دونوں طرف کی دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے چلنا چاہیے۔ جو بھی کوٹھری ملے اس کی مکمل تلاشی لیے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے اب ہم۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں یار! ہم تو بس قسمت سے بچ گئے ہیں اس وقت، اگر وہ ہمارے پیچھے آ جاتے تو مارے گئے تھے ہم دونوں ہی بے خبری میں۔ مجھے حیرت ہے انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اتنی دیر کیوں کی انھوں نے آنے میں؟" میں بولا۔

"وہ شاید یہ سمجھتے رہے تھے کہ ہمارے علاوہ بھی اور لوگ اِدھر آ رہے ہیں۔ انھوں نے آتزک کے پیچھے تمھیں اور پھر مجھے دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے کوئی انھیں بھی پیچھے سے نشانہ نہ بنا دے۔ یا پھر اصل معاملہ ہی دیر میں سمجھ میں آیا ہو ان کی۔ پہلے وہ یہی سمجھتے رہے ہوں گے کہ آتزک ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"ہاں یار! اور جو کچھ بھی ہوا وہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا ہے۔ شاید ابھی ہمارا وقت پورا نہیں ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

ہم آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جس سیڑھی پر میرے قدم ڈگمگائے تھے اسے آزما کر دیکھنا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں فوراً سیڑھیوں پر جا پہنچا اور پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ہم کافی نیچے آ چکے تھے۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "شرافت علی! یہیں رُک جاؤ ذرا دیر،

ان سیڑھیوں سے اوپر جا رہا ہوں۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو ان سیڑھیوں میں کوئی ایسا میکینزم موجود ہے جس کے ذریعے اوپر کا دروازہ کھلتا ہے۔ ابھی جب ہم اوپر گئے تھے تو ایک زینے پر پاؤں دھرتے ہی میں لڑکھڑا گیا تھا، اور جب سنبھلا تو تم نے بتایا کہ دروازہ کھل رہا ہے۔ میں ان زینوں سے اوپر جا کر دیکھتا ہوں کہ میرا اندازہ درست ہے یا نہیں۔"

میں ایک ایک زینے پر جما جما کر قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک زینے پر پاؤں دھرتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے زینہ ہل رہا ہو، میں نے پاؤں زینے پر رکھ کر دائیں بائیں حرکت دی، وہ زینہ سچ مچ ہل رہا تھا۔ یہ جاننے کے بعد میں نے پورا زور زینے پر ڈال دیا۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ زور پڑتے ہی اوپر دیوار کو ہلکا سا جھٹکا لگا تھا اور پھر وہ آہستہ آہستہ دو حصوں میں تقسیم ہونے لگی تھی۔ شرافت علی خوش ہو کر بولا۔ "اب تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔ تم نے یہ معما حل کر کے راستہ تلاش کرنے کی پریشانی ختم کر دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس سرنگ کے دوسرے سرے پر بھی ایسا ہی میکینزم موجود ہوگا۔ ہم ادھر سے ہی باہر نکل کر دیکھیں گے یہ راستہ کہاں نکلتا ہے؟"

اسی وقت فیروز کھلے ہوئے دروازے کو عبور کر کے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے اور بھی کئی لوگ تھے۔ وہ سب لوگ ادھر آ گئے تو میں اس زینے سے ہٹ کر ان سب کے ساتھ شامل ہو گیا۔ پھر ہم سب لوگ دونوں طرف کی دیواروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ سب سے پہلا کمرہ جو ہمیں ملا اس میں بے شمار بوریاں اوپر سے نیچے تک چنی ہوئی تھیں، کوئی آدھا کمرہ ان بوریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ شرافت علی نے اندر داخل ہوتے ہی ناک سکوڑ کر دو تین لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد کہا۔ "ان بوریوں میں چرس بھری ہوئی ہے۔" فیروز نے آگے بڑھ کر چاقو سے ایک بوری کو چیر کر دیکھا۔ شرافت علی کا کہنا ٹھیک تھا۔ اس میں سے چرس ہی برآمد ہوئی تھی۔ ہم نے وہاں سے نکل کر مزید تلاش شروع کی۔ سرنگ کے دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے کوئی بیس کمرے اور کوٹھریاں ہم نے دریافت کیں، جن میں ہر قسم کی نشہ آور اشیاء کے علاوہ اسلحے کا بھی بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ ہمارے پاس پانچ کاریں تھیں۔ طے یہ ہوا کہ ان کاروں میں جتنا بھی اسلحہ آ سکے گا، وہ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ باقی سارا اسلحہ اور نشہ آور اشیاء کو کمروں سے نکال کر سرنگ میں ایک جگہ ڈھیر کر کے آگ لگا دی جائے گی۔

تاکہ یہ زیرِ زمین اڈہ بالکل تباہ و برباد ہو جائے۔ جس کمرے میں آٹزک گھس کر بیٹھ گیا تھا اس کا دروازہ اس بار کھلا ہوا ملا تھا ہمیں۔ اس کمرے میں پٹرول کے خالی ٹین اور مختلف ایسی چیزیں پڑی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ کسی کار کے گیراج کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ شاید یہاں آٹزک کی کار کھڑی رہتی تھی۔ اور ہمارے جانے کے بعد وہ اسی کار کے ذریعے یہاں سے فرار ہوا تھا۔ اس طرف سے باہر نکلنے کے لیے ہم نے ادھر کے ایک ایک زینے کو آزما کر دیکھا۔ پندرہ منٹ کی تگ و دو کے بعد وہ زینہ تو ہمیں مل گیا جس کے ذریعے راستہ کھل سکتا تھا مگر اس پر دو دو، تین تین آدمیوں کے کھڑے ہونے کے باوجود راستہ نمودار نہ ہو سکا۔ ہر بار زینے کے اختتام پر دیوار ہلکی سی جنبش کر کے رہ گئی تھی۔

شرافت علی بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے آٹزک نے باہر نکلنے کے بعد یا تو اس کا میکینزم ناکارہ کر دیا ہے یا باہر سے کسی اور طریقے سے اس راستے کو بند کر دیا ہے۔ اب اس سے الجھنا بے کار ہے۔ واپس چل کر یہاں سے روانگی کی تیاریاں کرو، اور جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو، آٹزک کے فرار کے بعد یہاں زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے کسی طرح بھی۔"

میں نے اس کی تائید کی اور ہم سب ناامید ہو کر واپس لوٹ آئے۔ تمام کمروں سے سامان نکال نکال کر سرنگ میں ڈھیر کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اس دوران کچھ آدمیوں نے بہت سی اسٹین گنیں، رائفلیں، ریوالور، کارتوسوں کی پیٹیاں، دستی بم اور پلاسٹک کے بنے ہوئے دھوئیں کے بم باہر پہنچا دیے تھے۔ یہ بم تھے تو پلاسٹک کے لیکن ان پر رنگ ایسا کیا گیا تھا کہ دیکھنے میں وہ دستی بم ہی لگتے تھے۔ یہ بالکل اسی بم کی طرح تھے جو آٹزک نے فرار ہونے کا موقع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ سب سے آخر میں چرس کی بوریاں تمام اشیاء کے ڈھیر کے چاروں طرف چن کر کچھ بوریاں ڈھیر پر بھی ڈال دی گئیں اور ان بوریوں کو آگ لگا کر ہم سب دوڑتے ہوئے سرنگ سے نکل آئے۔ باہر آ کر فیروز وغیرہ نے آٹزک کے کمرے کو بھی آگ لگا دی۔ ان دونوں کو جنہیں فیروز وغیرہ نے باندھ کر ڈالا ہوا تھا اسلحے کے ساتھ کار تک پہنچا دیا گیا تھا چنانچہ آگ لگانے کے بعد ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنی گاڑیوں تک پہنچے اور بہ عجلت تمام اس علاقے سے دور نکل آئے۔ کافی دور نکل آنے کے بعد ہمیں اپنے عقب میں پہاڑیوں کی طرف سے یکے بعد دیگرے کئی دھماکے سنائی دیے مگر ہم نے پیچھے دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں؛

آٹھواں حصہ
(آخری حصہ)

ناآسودہ جذبوں کی تسکین اور آتشِ انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرائم
اس کے پیروں کی زنجیر بن گئے۔ نادیدہ منزلیں انجانے راستے اور غیر متوقع
حادثات اس کی تقدیر بن گئے۔ ایک مردم گزیدہ زمانے کے ستم رسیدہ
وقت کے ٹھکرائے ہوئے انسان کی سرگزشت

تین بج کر کچھ منٹ ہو چکے تھے جب ہم فیروز کی اقامت گاہ پر واپس پہنچے۔ قیدیوں کے جکڑ بند کا جائزہ لے کر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ان کے لیے آزادی حاصل کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، انھیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، اس دوران دوسرے لوگوں نے اسلحہ کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شرافت علی بولا "کاش وہ کُتا یہودی ہمارے ہاتھ آجاتا۔۔!"

"فکر نہیں کرو یار! بہت جلد وہ بھی ہمارے قبضے میں ہوگا۔ آج کی رات ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کے جتنے بھی ٹھکانے ہماری نظر میں ہیں ان سب کو صبح ہونے سے پہلے پہلے کھنگال ڈالیں گے ہم، کوشش یہی کریں گے کہ آج رات میں ہی وہ ہاتھ آجائے ہمارے۔" فیروز بولا۔

خان نے کہا "اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کے بجائے ان دونوں قیدیوں سے کیوں نہ پتا کیا جائے کہ وہ کہاں گیا ہوگا بھاگ کے؟"

"ابھی نہیں، ان سے ہم فرصت کے وقت پوچھ گچھ کریں گے۔ ابھی تو ہمیں اپنے طور پر ہی اقدامات کرنا چاہئیں۔ آستانے پر ہماری یلغار کی یہاں موجود ان کے ہر آدمی کو خبر ہو چکی ہوگی لیکن انھیں یہ توقع ہرگز نہیں ہوگی کہ ہم آج ہی رات میں ان کے خلاف کوئی اور کارروائی بھی کر گزریں گے۔ ایسے میں اگر ہم بے خبری میں ان پر جا پڑیں تو ان کے زیادہ سے زیادہ آدمی ختم کیے جا سکتے ہیں۔" فیروز نے جواب دیا۔

میں نے فیروز کی تائید کرتے ہوئے کہا "یہ بالکل ٹھیک کہتے ہو تم، دشمن کو برباد یا کمزور کرنے کا کوئی موقع کھونا نہیں چاہیے ہمیں۔"

شرافت علی نے کہا "اور اس سلسلے میں پہل ہمیں اپنے گھر سے ہی کرنا چاہیے، کیوں جیلانی! کیا خیال ہے؟"

میں نے حیرانی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا "کیا مطلب ہے تمھارا؟ ہمارے گھر میں کون دشمن بیٹھا ہے؟ کھُل کر بات کرو بھائی!"

"میرا مطلب لزی سے ہے۔ وہ مارِ آستین تمھیں یاد نہیں رہی ہے کیا۔ یا اسے دُکھ دینے کو جی نہیں کرتا تمھارا؟" شرافت علی شوخی سے بولا۔

فیروز نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "ایسی حسین صورت کو تکلیف پہنچانے کو کس کا دل چاہے گا بھائی جی! کنول کا کھلا ہوا پھول ہے وہ تو اور ایسے کمیاب پھول مسل کے پھینک دینے کے لیے تو نہیں ہوتے۔ کیسی ظالمانہ سوچ ہے یار تمھاری!"

"بکواس نہیں کرو فیروز! یہ بات کوئی راز نہیں ہے میرے لیے کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ میری فہرست میں اس کا نام پہلے نمبر پر رہا ہے ہمیشہ۔ ہم آج تک ایک دوسرے کو فریب دیتے آئے ہیں؟ آج اس کا قصّہ بھی پاک کر دیں گے ہم۔ لیکن یہ خیال رکھنا، وہ پھول آسانی سے نہیں مسلا جا سکے گا۔ بہت سخت جان اور بے حد شہ زور ہے وہ، اس پر اچانک بے خبری میں ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

خان بولا "لیکن تمھارے کھُل کر آزک کے سامنے آجانے کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اب بھی تمھارے اسی بنگلے میں موجود ہو؟"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "جلدی کرو شرافت علی! یہ بہت اچھی بات سمجھائی ہے خان نے۔ ہو سکتا ہے اب وہ وہاں نہیں ہو، لیکن زیادہ امکان اس بات کا بھی ہے کہ وہ اب تک وہیں ہو اور آزک بھی فرار ہو کر اسی کے پاس پہنچ گیا ہو اور وہ دونوں وہاں ہمارے

منتظر ہوں۔ یہ تو وہ جانتے ہی ہیں کہ میں بالآخر واپس اسی بنگلے پر پہنچوں گا۔"

"اوہ، اس بات کا تو مجھے دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ چلو ہم چل کر دیکھتے ہیں، اگر وہاں ہوا تو وہ اب بچ کر نہیں جا سکے گا۔" شرافت علی نے کہا۔

"ٹھہرو بھئی ایسی بھی کیا جلدی ہے، ہم بھی چل رہے ہیں، تم دونوں کے ساتھ۔ اگر وہاں وہ یہودی بچہ مل گیا تو تم دو کے لیے ان دونوں کو قابو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں اس لزی کو اچھی طرح۔ دو چار آدمیوں کے بس کی چیز نہیں ہے وہ۔" فیروز بولا۔

فیروز نے خان اور گل زمان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

طے یہ ہوا کہ میں اور شرافت علی ساتھ جائیں گے اور فیروز وغیرہ چند منٹ کے بعد ہمارے پیچھے آئیں گے۔ شرافت علی نے بتایا تھا کہ بنگلے میں داخل ہونے کا ایک چھوٹا سا عقبی دروازہ بھی ہے جس کا شاید کسی کو علم نہیں ہے کیوں کہ ادھر کسی کا گزر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم دونوں کو اسی راستے سے بنگلے میں جانا ہے، فیروز وغیرہ سامنے کی طرف سے ہی آئیں گے۔ عقبی دروازے میں باہر سے تالا پڑا رہتا ہے جس کی چابی شرافت علی کے پاس ہر وقت موجود رہتی ہے۔

چنانچہ میں اور شرافت علی پہلے روانہ ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے بنگلے پر فون کر لیا جائے تاکہ یہ پتا چل جائے کہ لزی وہاں تنہا ہی ہے یا آئزک بھی اس کے پاس موجود ہے۔ لیکن شرافت علی اور فیروز وغیرہ نے میرے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے جبکہ ہمیں ان کو بے خبری میں ہی جا دبوچنا ہے۔ آپ جانتے ہیں، میں تو ایک عملی آدمی ہوں، دماغ سے زیادہ ہاتھ پیروں سے کام لینے کا عادی رہا ہوں۔ جب بھی میرے راستے میں کوئی سنگ گراں حائل ہوا، میں نے اسے بے سوچے سمجھے اکھاڑ پھینکا ہے مگر اس بار میرا واسطہ دنیا کے شاطر ترین لوگوں سے تھا، ایسے لوگوں سے جو مجھے اب تک ملنے والے تمام لوگوں سے بہت مختلف، بالکل جدا مزاج رکھتے تھے۔ ان کے شاطر ذہن ایسی ایسی چالیں چلتے تھے کہ عام آدمی تو دو ہی چالوں میں مات کھا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ دماغ کو استعمال کرنے کی عادت نہیں تھی، اس لیے میں فیروز کے مشورے مان لیا کرتا تھا۔ اور اب تک مجھے ان کے کسی مشورے پر عمل کر کے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا چنانچہ میں نے آج بھی اُن کی بات مان لی تھی اور شرافت علی کے ساتھ چل دیا تھا۔

بنگلے کے عقب میں جو عمارت تھی، وہ شاید برسوں سے ویران پڑی تھی، اس کے مالک کو اس کی دیکھ بھال سے بھی کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ہم جس تنگ سی گلی میں کھڑے تھے وہ شرافت علی کے بنگلے اور اس ویران و شکستہ عمارت کے عقب میں واقع تھی۔ آس پاس کے دوسرے مکان پوری طرح آباد تھے لیکن رات کے سمے میں تو وہ بھی ویران ہی لگ رہے تھے۔ ایک بات جو تمام مکانوں میں مجھے مشترکہ نظر آئی یہ تھی کہ ہر مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ اس گلی میں کھلتا تھا، گلی تنگ ضرور تھی لیکن اس میں گندگی نام کو نہیں تھی، ایسا لگتا تھا جیسے دن میں وہاں آمدورفت جاری رہتی ہو۔ فیروز نے جیب سے چند چابیوں کا ایک گچھا نکال کر دروازے کا تالا کھولا۔ اور پھر کنڈی کھول کر دروازے کو اندر دھکا دے کر کھولنا چاہا مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔ اس کے زور لگانے کے باوجود دروازہ نہیں کھل سکا تو وہ بولا۔ "یار، ایسا معلوم ہوتا ہے دربان نے اندر سے دروازہ بند کر دیا ہے۔ یہ تو بہت برا ہوا جیلانی۔ اب کیا کیا جائے؟"

میں نے بنگلے کی عقبی دیوار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے اس طرف سے، دوسری طرف اس کی بلندی کتنی ہے یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ کیا اس پر چڑھ کر دوسری طرف اترا جا سکتا ہے؟"

"بلندی تو دونوں طرف تقریباً یکساں ہی ہے مگر سوال یہ ہے اس پر چڑھے گا کون اور کیسے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"اس پر چڑھنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ میں ابھی چڑھ جاتا ہوں البتہ دوسری طرف اترنے کا مسئلہ تھا، اب اگر دونوں طرف کی بلندی یکساں ہے تو میں آسانی سے اُدھر اتر بھی سکتا ہوں۔ میں اندر جا کر دروازہ کھول دوں گا پھر تم بھی آ جانا اندر۔"

"لیکن تم چڑھو گے کس طرح دیوار پر؟ یہاں تو ایسی اونچی جگہ بھی نہیں ہے اور یوں کھڑے کھڑے دیوار کی کگر تک ہاتھ کیسے جائے گا؟"

"کیا تم میرا بوجھ سہار سکو گے؟ مجھے اپنے کندھوں پر لے کر کھڑے ہو سکو گے؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"اوہ، تو تم میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر چڑھو گے۔ ٹھیک ہے آؤ پھر، میرا خیال ہے میں اٹھا لوں گا تمہیں۔"

وہ دیوار کی طرف منہ کر کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ میں بہت سنبھل کر رسانیت کے ساتھ اس کے کندھوں پر جا چڑھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں پکڑ کر آہستہ آہستہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے اُٹھتے ہی میرے ہاتھوں نے دیوار کی کگر کو چھو لیا۔ میں نے مضبوطی سے اسے تھام کر اپنے آپ کو اوپر اُچھالا۔ پہلی ہی کوشش میں میرا دایاں پیر دیوار پر جا ٹکا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سرک کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ دیوار پر جما کر دوسری طرف لٹک گیا۔ اس کے بعد میں نے ہاتھوں سے دیوار چھوڑ دی۔ ایک ہلکی سی دھمک کے علاوہ میرے کودنے کی کوئی زیادہ آواز نہیں ہوئی تھی۔ اندر کودنے کے بعد چند ثانیے میں نے چوروں کی طرح وہیں بیٹھے بیٹھے اطراف میں نظریں دوڑا کر دیکھا اور مطمئن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بنگلے کے اس حصے میں مکمل تاریکی اور سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ میں نے آگے

بڑھ کر دروازے کی کنڈی تلاش کر کے کھول دی۔ شرافت علی دروازے کو دھکا دے کر اندر آ گیا اور دروازہ دوبارہ بند کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "یہاں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے اندر کوئی بھی موجود نہ ہو۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے، پھر بھی ہم بہت احتیاط سے آہٹ پیدا کیے بغیر آگے بڑھیں گے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اندر اندھیرا کر کے ہماری گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ لہٰذا ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، احتیاط سے آگے بڑھنا، اور ہمیشہ احتیاط کو ملحوظ رکھنا اچھی بات ہے لیکن سامنے گیٹ پر چوکیدار کے ہوتے وہ ہمیں یہ تاثر دینے کی کوشش کریں کہ اندر کوئی نہیں ہے، یہ تو حماقت ہی ہو گی سراسر۔" شرافت علی نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اندر داخل ہو کر ہم نے ایک ایک کمرہ دیکھ ڈالا، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ پورا بنگلا خالی پڑا تھا۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا جو لزی کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں الماری میں لزی کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی موجود نہیں تھا۔ بستر کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے کوئی یہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ "ہمیں دیر ہو گئی دوست، چڑیا اڑ چکی ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "آؤ باہر چل کر چوکیدار سے پتا کریں وہ کب اور کس کے ساتھ گئی ہے یہاں سے۔"

ہم دونوں باہر آ کر چوکیدار کے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی آواز سن کر بندوق لیے باہر آ گیا اور بندوق کی نال ہماری طرف اٹھا کر کڑک کر بولا۔ "کون ہے؟ رک جاؤ، آگے بڑھنے سے پہلے شناخت کراؤ اپنی۔"

شرافت علی کوئی جواب دینے کے بجائے رک کر زیادہ تیز روشنی میں ہو گیا۔ گیٹ کے دونوں جانب اور چوکیدار کے کیبن کے دروازے پر طاقت ور بلب رات بھر روشن رہتے تھے۔ اور ان کی روشنی میں بنگلے کے سامنے کا یہ پورا حصہ واضح اور صاف نظر آتا تھا۔ چوکیدار نے شرافت علی کو دیکھتے ہی بندوق کی نال نیچے کر کے کہا۔ "ارے صاحب! آپ۔ آپ اندر کب گئے تھے؟ میں نے تو آپ دونوں کو اندر جاتے ہوئے بالکل نہیں دیکھا، نہ ہی میں نے گیٹ کھولا تھا آپ کے اندر جانے کے لیے؟ پھر آپ اندر کیسے چلے گئے صاحب؟" وہ حیران اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔

شرافت علی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ابھی ابھی کوئی پانچ منٹ پہلے پیچھے والے دروازے سے آئے ہیں۔ تم یہ بتاؤ وہ میم صاحب کب باہر گئی تھی، اب تک واپس نہیں آئی وہ؟"

"وہ تو ابھی کوئی آدھا پونا گھنٹا ہوا جب ہی گئی ہے صاحب اور جاتے ہوئے یہ خط دے گئی ہے جیلانی صاحب کے واسطے۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر آگے بڑھا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر جھپٹنے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر جلدی سے چاک کیا اور اندر سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"جنابِ عالی! ابھی ابھی آئزک نے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ آپ نے اس کے آستانے پر حملہ کر کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بمشکل تمام اپنی جان بچا کر وہاں سے نکل سکا ہے۔ اس نے مجھے بھی اپنے پاس پہنچنے کو کہا ہے کیونکہ اب یہاں میری بھی جان کو خطرہ ہے۔ آئزک پر ناکام حملے کے بعد آپ مجھے ہی نشانہ بنائیں گے۔ یہ بات میں بھی جانتی ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کے واپس آنے سے پہلے پہلے میں یہاں سے نکل جاؤں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں آپ کی نظر میں قابلِ گردن زدنی ہوں حالانکہ میں نے آپ سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔ آپ کے تمام منصوبوں اور ساری سرگرمیوں سے واقف ہونے کے باوجود میں نے آئزک یا کسی اور تنظیم کے اہم شخص کو آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنے دی۔ میں خوب جانتی تھی کہ آپ شرافت علی اور فیروز کے ساتھ مل کر کیا منصوبے بنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ باتیں کبھی کبھی آئزک کے کانوں میں بھی پڑ جاتی تھیں، وہ آپ کی طرف سے مشکوک ہو جاتا تھا لیکن میں ہر بار اُسے مطمئن کر دیتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ آج رات آپ لوگ آستانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ میں نے آپ کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لیے وہاں کے بہت سے خوفناک قسم کے محافظوں کو مختلف کاموں کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ آپ اور آپ کے ساتھی اپنے مشن سے کامیاب و کامران لوٹیں اور آپ اس یہودی آئزک کا کام تمام کرنے میں کامیاب ہو جائیں، لیکن بدقسمتی سے اس شیطان کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں؟ تو سنیں، میں آپ کو ایک راز کی بات بتا دوں، میں دراصل وہ نہیں ہوں جو آپ آج تک مجھے سمجھتے رہے ہیں۔ میں کون ہوں، یہ وقت آنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا، اور مجھے یقین ہے، جب آپ کو میری حقیقت کا علم ہو گا تو آپ مجھے اپنانے میں ذرا بھی تامل نہیں کریں گے۔ میرے یہاں

سے جانے کی دوسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ میں ابھی آرزک وغیرہ پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی۔ میں نے برسوں کی محنت کے بعد تنظیم میں ایک اہم مقام اور تنظیم کے بڑوں کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ میرے سامنے بہت بڑے بڑے مقاصد ہیں، جن کی تکمیل سے قبل میں یہ اعتماد کھونا نہیں چاہتی۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ اس بنگلے میں اپنی سکونت قائم رکھیں، اسے ترک نہ کریں تاکہ میں وقتِ ضرورت آپ سے رابطہ قائم کر سکوں۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہاں رہتے ہوئے تنظیم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ آپ کے خلاف ہونے والے ہر فیصلے اور ہر کارروائی کا آپ کو قبل از وقت علم ہو جایا کرے گا۔ آپ لوگوں نے آج کی کارروائی سے مجھے دور رکھنے کے لیے جیرالڈ کو قتل کرا دیا، یہ بھی اچھا ہی ہوا، ایک خطرناک کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا اس طرح، اگر آپ لوگ ایسا نہ بھی کرتے تب بھی میں آپ کو اپنا کام کرنے کا موقع فراہم کر ہی دیتی۔ ایک بات میں آپ کو خاص طور پر بتا رہی ہوں۔ تنظیم کے پاس آپ کے دوستوں اور بہی خواہوں کی جو فہرست ہے، اس میں فردوسی بیگم کا نام اور پتا بھی موجود ہے۔ تنظیم نے آپ کے امریکا سے روانہ ہونے سے پہلے ہی اپنے کچھ کارکنوں کو ایسے تمام لوگوں پر نظر رکھنے کی ہدایت کر دی تھی تاکہ اگر کبھی آپ تنظیم کے مفاد کے خلاف سوچیں بھی تو تنظیم کو اس کا علم ہو جائے۔ فردوسی بیگم کے پڑوس میں گلنار خانم نامی لڑکی اسی مقصد سے رہ رہی ہے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اب تک آپ کے بارے میں مجھے ہی رپورٹیں دیتی رہی ہے جنھیں میں نے آگے نہیں جانے دیا ہے۔ آپ نے آبی کو اس لیے فردوسی بیگم کے پاس پہنچایا ہے کہ وہاں وہ محفوظ رہیں گے، حالانکہ وہ جگہ ان کے لیے سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے، انھیں جتنی جلدی ممکن ہو سکے وہاں سے ہٹا لیں۔ باقی باتیں بشرطِ ملاقات پھر ہوں گی۔ اب اجازت دیں۔

بقول آبی۔ آپ کی کوارٹر بہتر لنزی۔"

خط پڑھ کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میری آنکھیں حیرت کی زیادتی سے جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ میں اب تک شدید خوش فہمی کا شکار تھا، میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ میں لنزی کو بیوقوف بنانے میں کامیاب رہا ہوں، حالانکہ میری یہ کامیابیاں خود لنزی کی ہی مرہونِ منت تھیں۔ اگر وہ نہیں چاہتی تو میں شاید ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکتا۔ اتنے منظم اور بے پناہ وسائل رکھنے والوں کے سامنے میری حیثیت ہی کیا تھی، جب وہ چاہتے مجھے چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ غلام جیلانی، عالم میں جس کا شہرہ تھا، اچانک کہاں گم ہو گیا۔ آسمان کھا گیا یا زمین نے نگل لیا اسے۔ کسے اتنی فرصت تھی جو یہ جاننے کی بھی کوشش کرتا کہ میرا انجام کیا ہوا۔

مجھے یوں حیران و پریشان کھڑے دیکھ کر شرافت علی بولا "کیا بات ہے جیلانی۔ کیا لکھا ہے اس میں؟ تم اتنے حیران پریشان کیوں ہو؟"

میں نے وہ خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جواباً کہا "تم خود پڑھ کر دیکھ لو۔ اس نے تو مجھے عجیب الجھن میں مبتلا کر دیا ہے یار۔"

شرافت علی نے خط میرے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کیا۔ خط کو پڑھتے ہوئے اس کے ماتھے پر بھی تردّد کی لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ پورا خط پڑھنے کے بعد وہ بولا "یہ تو بڑی عجیب بات ہے جیلانی۔ ہم نے اس کے بارے میں اس طرح تو سوچا نہیں تھا کبھی، جھوٹ تو نہیں بولا ہے اس نے؟"

میں نے دربان سے گیٹ کھول کر فیروز وغیرہ کو اندر بلانے کے لیے کہا۔ پھر شرافت علی سے بولا "ان لوگوں کو آ جانے دو، دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں۔ ویسے مجھے یقین ہے اس نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا کہ جیرالڈ کے آبی کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد ہمیں کتنا پختہ یقین تھا کہ تنظیم اب ہمارے خلاف کوئی سنگین قدم اٹھائے گی، لیکن لنزی سے ہماری بات ہوئی تو اس نے نہ صرف خود جیرالڈ کو قصوروار ٹھہرا کر معاملے کی سنگینی کو بہت حد تک کم کر دیا بلکہ آرزک کی طرف سے بھی ہمیں مطمئن کر دیا تھا۔ اور پھر اگر اسے ہمیں نقصان پہنچانا یا ہم سے آستانے کی بربادی کا انتقام لینا ہوتا تو وہ آبی کو فردوسی بیگم کے فلیٹ سے ہٹا لینے کا مشورہ ہرگز نہ دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ آبی میری کمزوری ہے۔ اس کی سلامتی کے لیے میں جان بھی دے سکتا ہوں، وہ لوگ آبی کو یرغمال بنا کر مجھے اپنے پاؤں چاٹنے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ لنزی اگر نہیں بتاتی تو میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چل سکتا تھا کہ فردوسی بیگم کا فلیٹ ان کی نظر میں ہے۔"

اس دوران دربان نے گیٹ کھول کر فیروز کو گاڑی اندر لانے کے لیے راستہ دے دیا تھا۔ اس نے اندر آ کر گاڑی میرے اور شرافت علی کے نزدیک روک کر کھڑکی سے سر باہر نکال کے پوچھا "تم دونوں یہاں کیوں کھڑے ہو؟ خیریت تو ہے نا؟ کیا لنزی یہاں نہیں ملی؟"

"ہاں وہ ہمارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے نکل گئی ہے یہاں سے۔ تم لوگ اندر ڈرائنگ روم میں چلو، وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے بھائی، صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے میں ان کے دو اور ٹھکانوں کو ختم کر دینا چاہتا ہوں اور صبح

ہونے میں ایک گھنٹہ ہی رہ گیا صرف۔ وہ نکل گئی ہے تو خاک ڈالو اس پر ابھی تو۔ ہم جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے ان دونوں کو۔"

"نہیں یار، بات یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ معاملہ کچھ اور ہی رُخ اختیار کر گیا ہے۔ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں میں تم سے۔ اب مزید کوئی کارروائی کرنے سے پہلے ہمیں سوچنے سمجھنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ تم اندر تو چلو یار۔" میں نے عمارت کی طرف مڑ کر کہا۔

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاڑی وہیں چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ خان اور گل زمان نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم سب ساتھ ہی ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے، کون سا نیا رُخ اختیار کر لیا ہے معاملات نے؟" فیروز ایک صوفے میں دھنستے ہوئے بولا۔

میں نے شرافت علی کے ہاتھ سے خط لے کر اس کی طرف بڑھا کر کہا "لو اسے پڑھ لو پہلے۔ یہ لنزی چھوڑ گئی ہے میرے لیے۔"

فیروز نے میرے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے خط پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ خط ختم کر کے اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ خط لنزی نے ہی لکھا ہے؟ تم اس کی تحریر پہچانتے ہو؟"

"ہاں میں پہچانتا ہوں اس کی تحریر، اس کے علاوہ یہ خط وہ جاتے ہوئے لفافے میں بند کر کے دربان کو دے گئی تھی۔ مجھے اسی کے ذریعے ملا ہے یہ۔ اب یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ جعلی ہوگا۔ دربان شرافت علی کا قابلِ اعتبار آدمی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اگر لنزی یہودی نہیں ہے اور وہ ہم ہی میں سے ہے تو اس نے یہودیوں کا اس قدر اعتماد کیسے حاصل کر لیا ہے۔ اور پھر ایک بات جسے شاید تم بھول رہے ہو یہ ہے کہ وہ امریکا کی ریاست سان فرانسسکو سے تمہارے ساتھ آئی ہے، اپنے رنگ روپ اور چہرے مُہرے سے بھی وہ پاکستانی یا ایشیائی نہیں لگتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" فیروز الجھ کر بولا۔

"تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سب درست ہے لیکن اس کے اب تک کے طرزِ عمل کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتا یہی چلے گا کہ جو کچھ اس نے اس خط میں لکھا ہے غلط وہ بھی نہیں ہے۔ پھر اگر ہمیں فریب دینا ہی اس خط کا مقصد تھا تو وہ آبی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کی ہدایت کرنے کے بجائے اسے یرغمال بنا کر ہمیں اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ ایک بات اس کے حق میں جاتی ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر اُسے بھی آزما کر دیکھ لو۔ اگر وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہے تب تو ہم بہت جلد پورے ملک سے اس تنظیم کا جلوس نکال دیں گے۔ کیوں خان، تمھارا کیا خیال ہے؟" فیروز نے خان کو مخاطب کیا جو لنزی کا خط پڑھنے کے بعد گم صم بیٹھا ہمیں دیکھ رہا تھا۔

فیروز کے مخاطب کرنے پر وہ چونک کر بولا "آں، کیا کہا؟ کچھ مجھ سے کہا ہے تم نے؟"

اس کے اس انداز پر ہم سب قہقہے لگانے لگے۔ فیروز نے اپنی ہنسی کو بمشکل روک کر کہا "تم کہاں گم ہو گئے تھے میرے بھائی۔ کچھ پتا ہی نہیں تمہیں یہاں کون سا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں لکھی ہے اس خط میں جس نے تمہارے ہوش گم کر دیے۔"

"نہیں یار۔ میں اس کے مضمون پر غور کر رہا تھا۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہیں آ سکا ہے۔" خان خجل ہو کر بولا۔

"ارے تم کہاں مغز کھپانے لگے بھائی؟ اس میں بچوں کی سمجھ میں آنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ لاؤ یہ خط مجھے دو۔" فیروز نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو بھئی جیلانی، میرا مشورہ ہے کہ اسے جلا ڈالو اب، کسی کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔"

"ہاں، یہی کروں گا میں بھی۔ اب کیا پروگرام ہے تم لوگوں کا؟" میں نے خط جیب میں رکھتے ہوئے فیروز سے پوچھا۔

"پروگرام اب کیا ہو سکتا ہے؟ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے بُری طرح تھکا ڈالا ہے۔ آرام ہی کرو اب تو۔"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن اس کمینے آرزک کا نکل جانا اچھا نہیں ہوا یارو۔ اس کی طرف سے بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے ہمیں۔" شرافت نے کہا "ان یہودیوں سے کسی بھلائی یا رعایت و مروّت کی اُمید بالکل نہیں رکھنا چاہیے۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے شرافت علی۔" فیروز بولا "جیلانی، تم بھی اب یہاں اکیلے مت رہا کرو۔ تمھاری جان کا تو وہ زیادہ دشمن ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر میں یہاں سے جاؤں گا نہیں کہیں۔ لنزی کو آزمانے کے لیے میرا یہاں رہنا بے حد ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں۔" فیروز ہنکارا بھر کر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا "ٹھیک ہے جیلانی۔ اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو میں گل زمان اور انور کمال کو مستقل طور پر تمھارے ساتھ ہی چھوڑ دوں گا۔ ابھی تک یہ دونوں دُور دُور رہ کر تمھاری نگرانی کرتے رہے تھے مگر آج سے یہ تمھارے باڈی گارڈ کی حیثیت سے ہر وقت تمھارے ساتھ ہی رہا کریں گے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شرافت علی اور خان بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ گئے۔ میں انھیں دروازے تک الوداع کہتے ساتھ گیا تھا۔

شام کے پانچ بجے تھے جب گل زمان نے آ کر مجھے جگایا۔ نیند سے اس وقت بھی میرا بُرا حال تھا لیکن جب اس نے بتایا کہ لنزی کا فون ہے تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں انور کمال بھی موجود تھا۔ میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

دوسری طرف لزی ہی تھی، میری آواز سُن کر شوخ انداز میں بولی "کیا بات ہے جنابِ عالی۔ آج تو آپ نے پورا دن سو کر گزار دیا؟"

"ہاں، دراصل رات میں ایک لمحے کے لیے نہیں سو سکا تھا لیکن تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"دوپہر سے اب تک یہ تیسری بار فون کیا ہے میں نے آپ کو۔ دو بار تو میں نے یہ سُن کر کہ آپ سو رہے ہیں سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔"

"اچھا۔ ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لیے تم دوپہر سے مجھے فون کر رہی ہو؟" میں نے معلوم کیا۔

"بہت خاص بات ہے۔ پہلے تو آپ یہ بتائیں، میں جو خط دربان کے پاس چھوڑ کر آئی تھی وہ آپ نے پڑھ لیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، وہ پڑھ لیا تھا میں نے اسی لیے اب تک اس بنگلے میں موجود ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے آپ نے میری باتوں پر یقین کر کے میرے مشورے پر عمل کیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی جنابِ عالی۔"

"وہ کون سی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آسکی ہے تمھاری؟ ذرا وضاحت کرو۔" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کو لکھا تھا آپ کو فردوسی بیگم کے گھر سے الگ کر دیں لیکن میری اطلاع کے مطابق وہ ابھی تک وہیں ہیں۔"

"اوہ، تھکن اور نیند نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ بہرحال اب میں بہت جلد اسے وہاں سے لے آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، جتنی جلدی ہو سکے انھیں ہٹا لیں وہاں سے اور فردوسی بیگم سے بھی کہیں وہ ایک آدھ مہینے کی دفتر سے چھٹی لے کر کہیں چلی جائے۔ وہ وہاں نہیں ہو گی تو کوئی اُدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ شرافت علی کو ہوشیار کر دیں۔ آج رات ایک اور دو بجے کے درمیان اس کی کوٹھی پر ڈاکا پڑے گا۔ ابھی کافی وقت ہے، وہ ڈاکوؤں سے نمٹنے کا انتظام کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کہیں وہ اپنے بیوی بچوں کو کچھ عرصے کے لیے کہیں بھیج دے لیکن اس طرح کہ ان کی نقل و حرکت کا کسی کو پتا نہ چل سکے۔" اس نے کہا۔

"کیوں کیا اس کے بچوں کے لیے کوئی خطرہ ہے یہاں؟ کیا تنظیم ان معصوموں کو نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان سفاک اور درندہ صفت لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہے لہٰذا احتیاطاً ایسا کرنا کوئی نقصان دہ تو نہیں ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ تمھاری اس اطلاع اور مشورے کے لیے میں شکر گزار ہوں تمھارا۔ لیکن ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آخر تم تنظیم کے خلاف ہماری مدد کیوں کر رہی ہو اور تمھاری اصلیت کیا ہے؟ عجیب مخمصے میں گرفتار کر رکھا ہے تم نے مجھے۔"

"اپنے ذہن کو زیادہ نہ تھکائیں جنابِ عالی! میں نے کہا ہے نا، وقت آنے پر آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا پھر کوئی الجھن نہیں رہے گی آپ کو۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ میں آپ کے اور آپ کے ملک کے بہی خواہوں میں سے ہوں اور آپ کی سلامتی چاہتی ہوں۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے فوراً شرافت علی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فون خود شرافت علی نے ہی اٹھایا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا "شرافت علی! جتنی جلدی ہو سکے، میرے پاس چلے آؤ، بے حد ضروری اطلاع ہے تمھارے لیے۔"

"اوہ۔ ٹھیک ہے، میں بس پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں تمھارے پاس۔" شرافت علی نے کہا۔

میں نے اس کا جواب سننے کے بعد ریسیور کریڈل پر ڈال کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ انور نے پوچھا "کیا کوئی بہت اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا لزی نے؟ اس لڑکی نے تو ذہن کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ کیا آپ کو اعتبار ہے اس پر؟"

میں نے اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "کسی کو پوری طرح آزمائے بغیر اعتبار یا بے اعتباری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے اس وقت اس نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ درست ہے تو ہمیں اس پر تھوڑا بہت اعتبار تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"اوہ اچھا! ایسی کیا بات کہہ دی ہے اس نے جناب! یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں میں۔" اس نے کہا۔

"اس نے اطلاع دی ہے کہ آج رات ایک اور دو بجے کے درمیان شرافت علی کی کوٹھی میں ڈاکا زنی کی واردات ہو گی۔ تم جانتے ہو ڈاکا زنی کے وقت ایک دو آدمی قتل بھی کیے جا سکتے ہیں ممکن ہے اُن کے پروگرام میں شرافت علی یا اس کے بچوں میں سے کسی کا قتل ہی شامل ہو اور اس طرح وہ اسے سزا دے کر دوسرے لوگوں کے لیے عبرت کا سامان کرنا چاہتے ہوں۔"

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ شرافت علی کو محض انتقاماً ہی قتل کرنا چاہتے ہوں گے کیونکہ اس کا تنظیم سے تو کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہے پھر وہ اسے سزا کیوں دیں گے۔" انور نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"بہ ظاہر اس کا تنظیم سے تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن وہ ایک عرصے سے ڈاکٹر دھمّن کے لیے کام کر رہا ہے اور دھمّن کے بارے میں یہ بات اب پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے یہودیوں کا آلۂ کار رہا ہے چنانچہ اس کے لیے کام کرنے والے بھی دراصل تنظیم ہی کے کارکن سمجھے جاتے ہوں گے۔" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"ہاں یہ بات آپ کی درست معلوم ہوتی ہے۔ پھر تو جناب! وہ اور اُن کے بچے سخت خطرے میں ہیں۔" انور کمال نے کہا۔

"ہاں لزی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ شرافت علی کو کچھ عرصے کے لیے اپنے بیوی بچوں کو کہیں بھیج دینا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے اُنھوں نے۔ میں بھی یہی کہنے جا رہا تھا۔ ان کی حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے جناب!"

"اسی لیے میں نے شرافت علی کو یہاں بلا لیا ہے۔ اس سے یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں میں، اس کے بچوں کی حفاظت کا کیا انتظام ہے۔"

گل زمان بولا "میں نے اس بنگلے کے چاروں طرف گھوم پھر کے اچھی طرح جائزہ لیا ہے اس کا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح سامنے والے حصے میں ایک دربان بٹھا رکھا ہے اسی طرح پیچھے والے حصے میں ایک قابلِ اعتماد دربان ضرور ہونا چاہیے۔"

"کیوں بھئی! کس بنا پر ایسا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے اس کی بات سُن کر چونکتے ہوئے کہا۔

"اس بنا پر کہ بنگلے کا عقبی حصہ محفوظ نظر نہیں آیا مجھے۔ اس کے بنگلے کے بالکل پیچھے والا مکان ویران پڑا ہے۔ اس کی عقبی دیواریں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں۔ پورا مکان ہی بے حد شکستہ ہے۔ لگتا ہے برسوں سے وہاں کوئی نہیں رہتا لہٰذا دشمن اسے مورچہ بنا کر بیٹھ سکتا ہے اور چونکہ اس طرف دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے اسے اس طرف سے بنگلے میں داخل ہوتے وقت کسی پریشانی کا امکان بھی نہیں ہے اسی لیے میں نے کہا ہے کہ اُدھر کا کوئی مناسب بندوبست ضرور ہونا چاہیے۔" گل زمان نے کہا۔

"ہاں یار! یہ بات تو میں نے رات کو اس وقت بھی محسوس کی تھی جب میں شرافت علی کے ساتھ اس طرف سے بنگلے میں گھس رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس طرف کسی دربان کو بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے گل زمان! اس حصے کو یوں ہی رہنے دو۔ وہاں درخت وغیرہ تو نہیں ہیں؟" انور کمال بولا۔

"نہیں، وہ حصہ بالکل صاف ہے۔ پورے میں سیمنٹ کا فرش ہے۔ دائیں بائیں لکڑی کے دو کھمبوں پر بڑے بڑے بلب لگے ہوئے ہیں۔"

"پھر تو ادھر سے خطرے کی بات ہی نہیں ہے کوئی، بس یہ چیک کر لو کہ دونوں بلب قابلِ استعمال بھی ہیں یا نہیں اور اُن کے سوئچ بھی پتا کر لو کہاں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں بس اس طرف سے بے حد چوکنا رہنے کی ضرورت ہو گی۔ ذرا سا شبہ بھی ہو تو فوراً اس طرف روشنی کر کے دیکھ لو، ایسی جگہ پر کوئی چھپ تو نہیں سکتا ہے، جو کچھ ہو گا نظر آجائے گا۔ دشمن ہوا تو اسے اچھا سبق بھی دیا جا سکے گا اس طرح۔" انور کمال نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات سوجھی ہے تمھیں۔ اس حصے کو دشمن کے لیے چوہے دان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "ابھی دن کی روشنی ہے، ہم ادھر چل کر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی چیز ٹھیک کرنا ہے تو وہ ابھی کرا لیں گے۔"

ہم تینوں اٹھ کر باہر نکل آئے لیکن شرافت علی کی کار کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ شرافت علی نے ہمارے قریب آ کر کار روکی اور انجن بند کر جلدی سے کار سے باہر نکلتے ہوئے بولا "کیوں بھئی خیر تو ہے نا، تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو سب خیریت ہی ہے۔ ہم ذرا اُدھر بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جا رہے تھے، تمھاری گاڑی کو دیکھ کر رُک گئے۔"

"کوئی خاص بات ہے اُدھر کیا؟ اس طرف جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تمھیں اس وقت؟" شرافت علی نے پوچھا۔

میں نے اُسے ساری بات بتا کر کہا "یہی دیکھنے جا رہے تھے ہم کہ اُدھر سے دشمن آئے تو اس کو وہاں پھانسا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

"خیال تو اچھا ہے یہ مگر اس طرف کی دیکھ بھال نہیں ہوتی کیونکہ اُدھر جانا آنا ہی نہیں ہوتا کسی کا۔ میں نے بھی دھیان نہیں دیا کبھی۔ وجہ شاید یہی ہو سکتی ہے کہ پہلے کبھی ایسے حالات پیش نہیں آئے تھے۔ اب تو ہر طرف کا ہی دھیان رکھنا پڑے گا۔" شرافت علی نے کہا "آؤ اندر چلو، اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں چوکیدار سے کہہ دوں گا وہ اُدھر کی لائٹیں وغیرہ ٹھیک کرا دے گا۔ تم یہ بتاؤ کون سی اہم خبر سنانے کے لیے بلایا ہے مجھے؟"

"ہاں یار! وہ لزی کا ٹیلی فون آیا تھا ابھی۔ اُس نے یہ اطلاع دی ہے کہ آج رات ایک اور دو بجے کے درمیان تمھاری کوٹھی میں ڈاکا زنی کا پروگرام ہے اور اس کی آڑ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید تمھیں غدّاری کی سزا دینے کے لیے تمھارے خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیا جائے یا پھر تم جیسے دوسرے لوگوں کی عبرت کے لیے خود تمھیں ہی قتل کرنے کا پروگرام ہو اُن کا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، یہ پروگرام تمھیں سزا دینے کے لیے بنایا گیا ہے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکتے ہوئے بولا "یہ اطلاع لزی نے دی ہے تمھیں؟ کب آیا تھا اس کا ٹیلی فون؟"

"کہہ تو یہ رہی تھی وہ کہ دوپہر سے تیسری بار فون کیا ہے۔ دو مرتبہ میرے سونے کی وجہ سے اس نے بات نہیں کی تھی۔ تیسری بار اس کا فون اسی وقت آیا تھا جب میں نے تمھیں فون کیا تھا۔ اس سے رابطہ ختم کرتے ہی میں نے تمھیں فون کر دیا تھا۔" میں نے اُسے بتایا۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ اس نے بالکل صحیح خبر دی ہے؟ یہ کوئی چال بھی تو ہو سکتی ہے اُن کی۔" شرافت علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"چال کیا ہو سکتی ہے اس میں اُن کی؟ کیا تمھیں پتا نہیں ہے، کن لوگوں کو زور آزمائی کے لیے منتخب کیا ہے اُنھوں نے؟ اس طرح اطلاع دے کر ہمیں کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کا خیال پاگل پن

ہی کہلا سکتا ہے اُن کا۔“ میں نے کہا۔

”میرا مطلب ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں اِدھر اُلجھا کر کوئی اور بڑا اور اہم کام کر گزرنا چاہتے ہوں“ شرافت علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”برادر! جو کچھ بھی ہو..................محض شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اور وہ آزادی سے جو اُن کا جی چاہے کر گزریں۔ اگر یہ اطلاع غلط ہے تب بھی اس کی تصدیق کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ تاکہ بعد میں لکیر کو نہ پیٹنا پڑے“ میں بولا۔

”یہ میں نے کب کہا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اور کچھ نہ کریں؟ میں تو یہ کہہ رہا تھا میرے بھائی! کہ ہمیں اور مس کی طرف سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ فی الحال آرتھر کو سب سے زیادہ غصہ تم پر ہو گا لہٰذا ہم تمھیں تنہا نہیں چھوڑیں گے ایک لمحے کو بھی۔ اور وہ آبی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں چنانچہ اسے بھی کسی محفوظ مقام پر پہنچانا بے حد ضروری ہے لیکن ایسی کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آ سکی ہے اب تک۔“

”ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے یار! اسے بھی آج ہی کہیں پہنچانا ہو گا۔ کیوں نہ اُسے لاہور جانے والی کسی فلائیٹ میں سیٹ حاصل کر کے لاہور بھیج دیا جائے، وہاں ماں جی کے ساتھ اسے خطرہ نہیں ہو گا۔ کیوں، کیا خیال ہے تمھارا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات ہو گی۔ اگر اسے لاہور ہی بھیجنا ہے تو اس کے لیے کسی ایسی فلائیٹ کی ضرورت ہو گی جو بارہ بجے سے پہلے پہلے روانہ ہو جائے یہاں سے کیونکہ اس کے بعد ہمیں اس ڈاکا زنی کی واردات سے نمٹنے کے لیے گھر پر موجود رہنا ہے۔“

”فیروز سے بات کریں، شاید وہ اس معاملے میں کچھ کر سکے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے ہمارے پاس۔ اگر میں سویا نہیں ہوتا تو دوپہر کو ہی یہ اطلاع مل جاتی۔ اس وقت شاید کسی طیارے میں سیٹ مل جاتی۔ خیر کوشش کریں گے تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔

”فیروز صاحب ضرور کوئی بندوبست کر لیں گے، آپ لوگ گھبرائیں نہیں بالکل بھی۔ کچھ نہ ہوا تو آبی صاحب کو فیروز صاحب کی کوٹھی کے اس حصے میں بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے جہاں انہیں پہلے رکھا گیا تھا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں وہ بہترین پناہ گاہ ہے اُن کے لیے وہاں اب تک کرائے پر خالی ہے، کی تختی لگی ہوئی ہے۔ اس طرف دھیان بھی نہیں جا سکے گا کسی کا“ انور کمال نے کہا۔

میں اس کی بات سن کر اُچھل پڑا۔ میں نے کہا۔ ”اوئے میرے یار! اتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھا باتیں سُن رہا تھا ہماری، پہلے ہی نہیں بتا سکتا تھا یہ بات۔ میں ابھی فیروز سے بات کرتا ہوں، یہ بات تو اس کے ذہن میں بھی ہو گی۔“

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھانے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور اُٹھا کر ”ہیلو“ کہا تو پتا چلا فون کرنے والا خان تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو یار! مجھے فیروز سے بات کرنا تھی۔ اُسے ہی فون کرنے جا رہا تھا میں، ابھی جب فون کی گھنٹی بجی ہے۔ تمھیں کیا کوئی بہت ضروری بات کرنا ہے مجھ سے؟“

”میں یہاں فیروز ہی کے پاس ہوں اور اس کے کہنے پر ہی تمھیں فون کیا ہے، لو بات کرو اس سے۔“ اس نے جواباً کہا۔

اس کے ساتھ ہی فیروز کی آواز سُنائی دی۔ ”ہیلو جیلانی! کیا بات ہے؟ خیریت سے تو ہو نا؟“

”تم نے دو دو باڈی گارڈ میرے ساتھ لگا رکھے ہیں، ایسے میں میری خیریت کو تو کوئی خطرہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں دراصل تم سے آبی کے معاملے میں بات کرنا چاہتا تھا، اسے فردوسی بیگم کے فلیٹ سے کہاں لے جایا جائے؟“ میں نے اس سے کہا۔

”کمال ہے بھئی یہ تو۔ میں نے بھی تمھیں اسی سلسلے میں فون کیا ہے اس وقت۔ آبی کو لے کر کہاں جانا ہے؟ یہاں میرے پاس لے آؤ۔ اس سے زیادہ محفوظ و مامون کوئی اور مقام کراچی میں نہیں مل سکے گا تمھیں۔“ فیروز نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں یار! انور کمال نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ ٹھیک ہے، پھر ہم اسے لے کر آ رہے ہیں تمھارے پاس۔ اس کے علاوہ اس اپنی فردوسی بیگم کا بھی کچھ انتظام کرنا ہے ہمیں ہی۔ ایسا نہ ہو ہم سے دوستی اور تعاون کی پاداش میں وہ ماری جائے غریب، بے موت ہی۔“

”فی الحال تو اسے بھی یہیں لے آؤ۔ پھر دیکھیں گے اس کے لیے کیا مناسب ہے۔ بہرحال فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمھیں بالکل بھی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ نے چاہا تو کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ اور اس گلزار خانم کا بندوبست کر دیا ہے میں نے۔“

”کیا مطلب؟ اس سے تمھیں کیا لینا ہے بھائی جی! کیا بندوبست کیا ہے تم نے اس کا؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بس تم دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ جو کچھ بھی ہو گا تم خوش ہو جاؤ گے بس۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے یار، تم جو جی چاہے کرو اس کا، مجھے ایسی کسی پری جمال نازنین پر کبھی بھی ذرا سا رحم نہیں آئے گا جو میرے ملک کے دشمنوں کے لیے کام کرتی ہو۔ ایسے ذلیل کام سے تو یار جی! بھوک پیاس اور افلاس کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانا بہتر ہے۔“

میں نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر شرافت علی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے بھئی شرافت علی! ہم لوگ طارق روڈ جا رہے ہیں۔ وہاں سے آبی اور فردوسی بیگم کو ساتھ لے کر فیروز کے پاس چلے جائیں گے، تم جا کر اپنے کچھ آدمیوں کو اپنی کوٹھی کی نگرانی پر مقرر کر دو۔ ابھی سے ہر مشکوک آدمی کو واچ کرتے رہیں گے وہ۔ تقریباً گیارہ بجے ہم لوگ بھی پہنچ جائیں گے وہاں اور دیکھیں گے کون کون سورما کا بچہ آتا ہے تمھیں سزا دینے کو۔“

”ٹھیک ہے، میں جا کر انتظام کرتا ہوں، تم لوگ ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا یار! رات کا کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔“ وہ بولا۔

”اوئے نہیں یار! کھانے شانے کی تم ٹینشن نہ لگاؤ۔ ویسے ہم جس قدر جلد ہو سکے گا آنے کی کوشش کریں گے مگر تم بھوکے نہ بیٹھے رہنا ہمارے انتظار میں۔“

فردوسی بیگم گھر پر ہی موجود تھی۔ میری دستک کے جواب میں دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ ”کیا حال ہے فردوسی؟“ میں نے پوچھا۔

”آئیں آئیں جناب، تشریف لائیں۔ خدا کا شکر ہے کسی کے طفیل ہی سہی زیارت تو ہو جاتی ہے آپ کی۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

”ہم جیسے خانہ بدوشوں سے دل لگانے والے کبھی خوش نہیں دیکھے جاتے فردوسی بیگم! تمھارے چہرے پر میں ہمیشہ گلاب ہی کھلے دیکھتا ہوں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو دل اس طرف سے مطمئن ہی رہتا ہے۔“ میں نے اس کے دمکتے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

وہ اک ادائے ناز سے شرماتے اور نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کوئی شکایت تو نہیں کی کبھی آپ سے جیلانی! میں جانتی ہوں آپ کو ایک پل بھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا ہے کوئی، میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ بھولے نہیں کبھی مجھے۔ آئیں اندر چلیں، وہ آبی بہت یاد کر رہے ہیں آپ کو۔ صبح سے بار بار پوچھ رہے ہیں۔ نہ جانے کیا پریشانی ہے انھیں آپ کی طرف سے۔“ اس نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا تھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے آبی کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”اوئے آ بھئی آ میرے یار! تو نے تو بڑی راہ دکھائی آج۔“

میں نے قریب جا کر نہایت گرم جوشی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”بس یار! رات بھر کا تھکا ہوا اور نیند کا مارا ایسا سویا کہ اب ہوش میں آیا ہوں، اور اگر لنزی فون نہ کرتی تو شاید اب بھی نہ اُٹھتا۔“

”کیا ہوا؟ وہ میرا مطلب ہے رات کو جو تم لوگوں نے اس کتے یہودی کی موت کا بندوبست کیا تھا اس کا کیا رہا؟“

”بڑا لومڑ صفت شخص ہے یار وہ اور شاید اس کا کچھ وقت ابھی باقی ہے۔ ہاتھوں میں آ کر پھسل گیا وہ ہمارے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا یار۔ اب تو وہ جینا دو بھر کر دے گا تیرا۔ بہت خوفناک بات ہو گئی ہے جیلانی یہ تو۔“

”اوئے چھوڑ یار، لعنت بھیج اس خبیث پر۔ ہم پہلے ہی کون سی پُرسکون زندگی گزارتے رہے ہیں کیا فرق پڑ جائے گا اس سے ہم پر۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ مرنا ہمیں اسی طرح دوڑ بھاگ کرتے ہوئے ہے۔ ہم کسی کے پیچھے یا آگے بھاگے جا رہے ہوں گے جب فرشتۂ اجل کسی بھی موڑ پر اچانک سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا ہمارے اور ایک مژدۂ جاں کاہ سُنائے گا۔ ”پتر وا! چلو میرے نال۔ تُسی ساہ مک گئے تہاڈے۔“

”ہاں یار! کہتا تو ٹھیک ہی ہے تو۔ ہونا تو ایک دن ایسا ہی ہے ہمارے ساتھ مگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو اچھا ہی ہے نا یہ۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ! خدا نہ کرے جو ایسا دن آئے کبھی۔ مریں آپ کے دشمن۔“ فردوسی بیگم تڑپ کر بول اٹھی۔

آبی نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے تجھے کیا ہوا ہے بھئی جنتی بیگم! تو کیوں ڈرتی ہے کملی؟ ہم تیری موت کی بات تو نہیں کر رہے ہیں نا۔ ایسی موت تو بس ہمارا ہی حصہ ہے۔ تجھے تو ماسٹر کی مولٹی فوم کے ڈبل بیڈ پر تھپک تھپک کر سُلانے آئے گا فرشتۂ اجل اور پھولوں کی سیج پر لٹا کر قبرستان پہنچایا جائے گا تجھے۔ قبر تیری گلاب، موتیا، چنبیلی، جوہی اور رات کی رانی کے ڈھیر میں بنائی جائے گی۔ اور یقین کر بی بی، پورے چالیس گز کا ململ کے تھان سے بنا ہوا تیرا آخری لباس ہو گا۔ تو نے ہماری خدمت کر کے جتنی نیکیاں کمائی ہیں، اُن کا صلہ تو اسی طرح ملنا چاہیے تجھے۔ وہ شاعر نے کہا ہے نا کہ دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہو گا تو یہ بات تیرے لیے نہیں کہی گئی ہے بی بی! یہ تو اُن کے ساتھ ہو گا جو اپنے حصے کا سب کچھ اسی دُنیا میں حاصل کر لینے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ وہ آج ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کل پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے لیے کسی نے یہ بھی کہا ہے۔ ”سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ“ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ تیرے ساتھ نہیں ہونا یہ کچھ...... تجھے تو دونوں جہانوں میں خصوصی رعائتیں ملتی رہیں گی......“

میں نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اوئے بس کر بھی پانی کے باسی! تیری زبان کو تو لگام نہیں ہے ذرا بھی۔“

”تو جتنی بھی بکواس کر لے تیرے ساتھ بالکل رعایت نہیں کی جائے گی بچے! تجھے وہاں بھی دھمن اور آرتھر جیسوں کے حوالے.....!“

”او یار کیا بکواس شروع کر دی ہے تو نے۔ وقت اور موقع بھی دیکھا کر کبھی۔ میں یہاں تجھ سے مرنے کے بعد کا حال پوچھنے نہیں آیا ہوں۔ ابھی تیری زندگی کی ضرورت ہے ہمیں اس لیے تجھے فرشتۂ اجل کی نگاہوں سے دُور لے جانا چاہتے ہیں ہم۔ باہر دو شریف آدمی انتظار کر رہے ہیں ہمارا۔“ میں نے پھر اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم بھی کچھ ضروری سامان لے لو فردوسی بیگم! تمھیں ہمارے

ساتھ چلنا ہے۔“

”اوہ، مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟ ابھی کل ہی تو آپ نے انھیں یہاں پہنچایا ہے۔ ابھی تو یہ بالکل چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں۔“

”میں جانتا ہوں آبی کو آرام کی ضرورت ہے ابھی۔ مگر یہ جان بچانے سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔ حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میرے سارے اندازے غلط ہو گئے ہیں۔ دشمن اس سے کہیں زیادہ چالاک ہے جتنا ہم نے سمجھا تھا۔ دیر نہیں کرو، جلدی سے نکل چلو میرے ساتھ۔“

”کچھ بتا تو بھائی! آخر ہوا کیا ہے؟ کون سی آفت آ رہی ہے اور۔ اس آفت نے فردوسی بیگم کا گھر کیسے دیکھ لیا ہے؟“ آبی نے پوچھا۔

”یہاں سے نکلنے کے بعد سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی یہ بات مت پوچھو، جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو بس۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”ٹھیک ہے یار، چل میں چلنے کو تیار ہوں۔“ آبی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی اس کی بات مان لو فردوسی بی بی! معاملہ زیادہ گمبھیر لگتا ہے مجھے۔“

”آپ ایک آدمی کو اور بلا لیں جیلانی! دو آدمیوں کے سہارے انھیں زینے اترنے میں زیادہ مشکل نہیں پیش آئے گی۔ اتنی دیر میں میں اپنے چند جوڑے اور کچھ ضروری چیزیں اٹیچی میں رکھ لیتی ہوں۔“ فردوسی بیگم یہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ اور جب انور کمال کو ساتھ لے کر واپس پہنچا تو فردوسی بیگم چھوٹی سی اٹیچی سنبھالے تیار کھڑی تھی۔ میں اور انور کمال آبی کو سہارا دے کر نیچے لا رہے تھے کہ سیڑھیوں کے درمیان نیچے سے آتی ہوئی وہ گل و گلزار خانم ٹکرا گئی۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ اس زہر کی پڑیا سے ملاقات نہ ہو جائے لیکن وہ ٹکرا ہی گئی۔ اور بہت برے وقت میں ٹکرائی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ چہکتے ہوئے انداز میں بولی ”ارے خان صاحب! یہ بچارے پیرزادہ صاحب کو اس حالت میں کہاں لے جا رہے ہیں آپ لوگ؟“

”کہیں نہیں بی بی! وہ ذرا ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں ہم انھیں۔ ابھی واپس آتے ہیں بس آدھا گھنٹا لگے گا صرف۔“ میں نے فوراً بات بنائی۔

”ہائے ایسا کون سا ظالم ڈاکٹر ہے جو انھیں اس حالت میں اپنے پاس بلا رہا ہے۔ کیا وہ یہاں آکر نہیں دیکھ سکتا ہے انھیں؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”بس کیا کیا جائے بی بی! بعض ڈاکٹر ایسے ہی سنگ دل ہوتے ہیں۔ تمھیں پتا نہیں ہے اگر مریض کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اس کے گردے نکال کر بیچ کھاتے ہیں اور پتا بھی نہیں چلنے دیتے آدمی کو کہ اس کے جسم کا کون سا حصہ کم کر دیا ہے انھوں نے۔“

میری بات سن کر اس کے چہرے کی رنگت چند ثانیے کے لیے اڑ سی گئی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور مسکراتے ہوئے بولی ”تو یہ بات ہے بھئی، آپ تو بڑی عجیب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بھلا ایسا کون ڈاکٹر ہو سکتا ہے؟ اور آدمی کے گردے کون خریدنے لگا ان سے۔“ وہ ایک طرف ہو کر ہم سے کترا کر اوپر چڑھتے ہوئے بولی ”واپس آنے کے بعد چپکے سے نہ نکل جائیں۔ مل کر جائیے مجھ سے۔“

”ہاں ہاں، ضرور۔ تم نہیں کہتیں تب بھی میں تم سے ملے بغیر واپس نہیں جاتا۔ میرا انتظار کرنا ابھی واپس آتا ہوں۔“

میں نے گردوں کی بات جان بوجھ کر کہی تھی اس سے۔ میں اس طرح لڑکی کی بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس ذکر پر اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر دھمن اور اس کے کاروبار سے واقف تھی۔ یا شاید آتزک نے کسی اور ڈاکٹر کو پھانسنے کے لیے اسے استعمال کیا تھا۔ کچھ بھی بات ہو بہر حال یہ ثابت ہو چکا تھا کہ وہ اس کالے کاروبار سے واقف تھی۔ فردوسی بیگم ہمارے پیچھے ہی پیچھے چلی آ رہی تھی لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ گلزار کے جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا ”کیا بات ہے فردوسی بیگم! گلزار سے تمھاری اَن بَن ہے کیا؟ اس وقت تو وہ تمھیں یوں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی جیسے تمھیں جانتی ہی نہ ہو؟“

”ہاں، میں خود حیران ہوں اسی بات پر۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی اور گئی ہے۔ آپ سے زیادہ باتیں بھی نہیں کیں اس نے ورنہ وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والی تو ہے نہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اسے ایک دم، پہلے تو حسب معمول چہک رہی تھی۔“ فردوسی بیگم الجھتے ہوئے بولی۔

”گئی بھی وہ بہ ظاہر مسکراتے ہوئے ہی ہے لیکن پیچھے پیچھے جا کر دیکھو۔ بارہ بج رہے ہوں گے شکل پر۔ ایسی ہی چٹکی لی ہے میں نے اس کے دل میں اس گھڑی۔ بوکھلا اٹھی تھی۔ چین نہیں آئے گا اسے اب بہت دیر تک۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ ایسی کیا بات کہی تھی اس سے آپ نے، کوئی انجانی زبان تو استعمال نہیں کی تھی آپ نے۔“

”تم نہیں سمجھ سکو گی اسے جنتی بی بی! یہ آنکھوں میں ہی نہیں کانوں میں بھی دھول جھونک دیتا ہے آدمی کے۔“ آبی بولا۔

”پریشان نہ ہو میرے ویر! صبر کر لے ذرا سا، گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جو کچھ بتاؤں گا تیری کھوپڑی اڑانے کے لیے وہی کافی ہو گا۔“

”یار جیلانی! کیا تو مجھ پر ایک اور مہربانی نہیں کر سکتا ہے۔ اس چمنستان خانم کو ساتھ نہیں لے چل سکتا ہے تو؟“ آبی عاجزی سے بولا۔

میں نے اسے آخری سیڑھی پر اتارتے ہوئے کہا ”فکر کیوں کرتا ہے میرے یار! فرہاد کے مقبرے کی سجادہ نشینی دلوا دوں گا میں تجھے۔ تو ایک چمنستان کی بات کر رہا ہے میں دنیا بھر کی بہاریں تیری جھولی میں لا ڈالوں گا، ذرا گاڑی تک تو چلا چل تو۔“ میں نے کہا۔

”اللہ تیری مرادیں پوری کرے، بڑا دیالو ہے تو مجھے یقین تھا تو میری بات ٹالے گا ہرگز نہیں۔“ آبی خوش ہو کر بولا۔

”آگے کبھی کوئی بات ٹالی ہے میں نے تیری؟ ایک تو ہی تو ہے میرے یار! جس نے مجھے زندگی سے تباہ کرنے پر مجبور کر رکھا ہے اب تک۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے ان کی باتیں سن کر جیسے آبی صاحب کو رنگین آنچلوں کی چھاؤں بہت پسند ہے۔“ انور کمال مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم صرف پسند کی بات کر رہے ہو، ارے ان کی تو زندگی قائم ہی ان کے وجود سے ہے۔ ان آنچلوں کی مہک ہوا سے نکال کر پھر دیکھنا دم گھٹ کر رہ جائے گا اس کا۔ سانس لینا بھول جائے گا یہ۔ فیروز سے کہنا اس کی جلدی صحت یابی کے لیے دو پری چہرہ نرسوں کا انتظام کر دے۔ ڈاکٹر اور دواؤں سے زیادہ ضروری ہے یہ۔ یوں سمجھ لو کہ وجودِ زن سے ہے آبی کی زندگی قائم۔“

میری اس بات پر انور کمال اور فردوسی بیگم دونوں کے بے اختیار قہقہے ابل پڑے۔ آبی جھنجلا کر بولا ”بک نہیں او دُئے سالے۔ تو تو جیسے ابھی ابھی سیدھا مسجد سے آ رہا ہے۔ نو سو کی گنتی پوری کر کے پاکیزگی کے دعوے کرنے لگا ہے میرے سامنے۔ دیکھ بھئی جنتی بی بی! لگام دے کے رکھ اس اپنے مستقبل کو۔ بہت خوش ہو رہی ہے اس ذلیل کی بکواس سن کر۔ ویسے کم تو بھی نہیں ہے۔ وہ جنھوں نے تیرا نام فردوسی رکھا تھا وہ اب بہت پچھتاتے ہوں گے۔ میں بھی خواہ مخواہ ہی جنتی کہنے لگا ہوں تجھے حالانکہ جنت والوں جیسی کوئی بات ہے نہیں تجھ میں۔ جس کی دوستی جیلانی سے ہو، اس کا نام رہ ہی نہیں سکتا ہے جنتیوں کی فہرست میں۔“

”پھر تو آبی صاحب! آپ سے مجھے زیادہ ہمدردی ہے، آپ تو جنت کا دروازہ تک دیکھنے کا حق نہیں رکھتے ہوں گے۔ یہ تو بہت برا ہوا۔“ فردوسی بیگم نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھئی، یہ کیسے سمجھ لیا تم نے؟ میں کون سے اتنے بڑے کبیرہ جیسے گناہ کا مرتکب ہوا ہوں؟“ آبی بولا۔

”آپ ہی تو کہہ رہے تھے ابھی کہ جیلانی سے دوستی کرنے والوں کے نام جنتیوں کی فہرست میں نہیں رہ سکتے ہیں۔ آپ سے زیادہ قریبی اور پرانا تو ان کا کوئی بھی دوست نہیں ہے...“ فردوسی بیگم نے اپنی ہنسی روکنے کے لیے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا جلدی سے۔

آبی کی حالت دیدنی تھی اس وقت۔ فردوسی بیگم نے اس کا داؤ اسی پر الٹ دیا تھا اور اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر قہر آلود نظروں سے گردن موڑ کر فردوسی بیگم کو دیکھا پھر بولا ”اچھا تو مینڈکی کو بھی زکام ہونے لگا ہے۔“

اس دوران ہم سڑک کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ گل زمان ہمیں دیکھتے ہی کار کا عقبی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ ہم آبی کو سہارا دے کر رسانیت سے عقبی نشست پر بٹھلانے کے بعد اس کے آس پاس بیٹھ گئے۔ انور کمال ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر گل زمان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو میں نے انور کمال سے کہا ”ذرا اس کا خیال رکھنا کوئی ہمارے پیچھے نہ لگا ہو۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ ہم بہت جلدی معلوم کر لیں گے۔“ انور کمال نے جواب دیا۔

میں نے آبی کو، اسے اور فردوسی بیگم کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ بتا دی۔ وہ دونوں حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ آبی بولا۔ ”اودُئے یہ بات ہے۔ وہ گلزار خانم بھی ان ذلیلوں ہی کی آلۂ کار ہے۔ شکل سے تو بڑی معصوم لگتی ہے۔ شبہ بھی نہیں کر سکتا کوئی اس پر کہ وہ کسی ایسے ذلیل کام میں ملوث ہو گی۔ عجیب بات ہے یار! کسی پر بھروسا ہی نہیں کیا جا سکتا یہاں تو۔“

فردوسی بیگم بولی ”اب سمجھی میں، وہ گردے بیچنے والی بات سن کر ہی گھبرا گئی تھی اس وقت۔ آپ نے شاید جان بوجھ کر ہی یہ بات کہی تھی اس سے۔“

”ہاں، میں لڑکی کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ بھروسا تو ہم لڑکی پر نہیں کر سکتے نا۔ اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے ہمیں، اس کے بعد وہ قابلِ اعتبار ٹھہرتی ہی نہیں ہے کسی طرح بھی۔ لیکن اس کے موجودہ طرزِ عمل نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے، بری طرح سے۔“

”مگر اس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی نا اب تک۔ یہ اطلاع جو گلزار کے بارے میں دی تھی اس نے یہ صحیح ثابت ہوئی ہے نا۔ اور جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں اس کے سلسلے میں تنظیم کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی ہمارے خلاف نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی وہاں ہمارا دفاع کرتی رہی ہے۔ آج رات شرافت کے گھر ڈاکا زنی کی واردات سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ اس کی یہ اطلاع بھی درست تھی۔ پھر اس کی پوزیشن صاف ہو جانا چاہیے

تمھاری نظر میں۔ اسے دشمنوں کی فہرست سے نکال دینا چاہیے ہمیں۔" آبی بولا۔

"ہاں، یہ تم نے سچ کہا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اسے ہم دشمن نہیں کہہ سکتے، لیکن میرے یار! یہ یہودی بہت ہی عیار ہوتے ہیں، ان کی چالیں اس قدر گہری اور دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہیں کہ انھیں آسانی کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا۔ بڑے زبردست شاطر ہوتے ہیں یہ مقابل کو شکست دینے کے لیے اپنے بڑے بڑے مہرے بھی بے دریغ پٹوا دیتے ہیں۔ یہ تو شکست کھانے کے بعد ہی پتا چلتا ہے مقابل کو کہ انھوں نے ہر مُہرہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پٹوایا تھا۔ لزی کے بارے میں بھی دل میں یہی وسوسے جنم لیتے رہتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی ان کامیابیوں کے پیچھے جو اس کے تعاون سے حاصل ہوں گی، کوئی بڑی ہی عبرت ناک شکست نہ پوشیدہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو تو ٹھیک ہی کہتا ہے یار جی! میں حیران ہوں تیری بینائی بہت تیز ہوتی جا رہی ہے آج کل، بہت دور تک دیکھنے لگا ہے تو۔"

آبی اور فردوسی بیگم کو فیروز کی کوٹھی کے اس حصے میں پہنچانے کے بعد جو اسی کوٹھی کا ایک حصہ ہونے کے باوجود بظاہر اس سے الگ تھلگ لگتا تھا، میں فیروز اور خان کے ساتھ لزی کے معاملے میں تبادلۂ خیال کرنے بیٹھ گیا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے خط اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنا پر اس پر بھروسا کرنے کو آمادہ نہیں تھا۔ بالآخر اس کے بارے میں یہی فیصلہ کیا گیا کہ اس پر اپنے اس عدم اعتماد کا اظہار تو نہ کیا جائے لیکن اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار بھی نہ کیا جائے۔ ظاہر یہ کیا جائے کہ اس کے مشورے اور معلومات ہمارے لیے بے حد مفید ہیں اور ہمیں اس کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن وہ جو بھی معلومات فراہم کرے اس کے بارے میں ہم اپنے طور پر تحقیق کر کے اطمینان کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ طریقہ کار مستقل رہے گا ورنہ اس بات کا امکان ہر وقت ہے کہ وہ کسی بھی لمحے کوئی چال چل کر بازی پلٹ سکتی ہے اور اپنا سارا نقصان کئی گنا منافع کے ساتھ پورا کر سکتی ہے۔"

انور کمال کو آبی اور فردوسی بیگم کے پاس چھوڑ کر اور کئی دوسرے لوگوں کو کوٹھی کے اطراف میں نگرانی کے لیے مقرر کر کے تاکہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں وہ بروقت انور کمال کی مدد کو پہنچ سکیں، میں، فیروز، خان اور گل زمان کی معیت میں شرافت علی کی کوٹھی پر جا پہنچا۔ یہاں شرافت علی نے بھی پورا پورا انتظام کر رکھا۔ اس نے اپنی کوٹھی میں ایک محفلِ موسیقی سجا رکھی تھی۔ جس میں اس کے تین تاجر دوست اور دو اعلیٰ سرکاری افسر شریک تھے۔ ہم چاروں کو اس نے ان لوگوں سے اپنے دوستوں ہی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ اس محفل کو سجانے کا مقصد یہ تھا کہ جب اس کی کوٹھی پر ڈاکا پڑے تو شہر کے پانچ معزز لوگ اس کے عینی شاہد ہوں جو ضرورت کے وقت پولیس کو یہ بتا سکیں کہ ہماری کارروائی دراصل دفاعی نوعیت کی تھی۔ میں شرافت علی کی ذہانت اور خوش تدبیری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس نے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ اگر ہم دشمن کے بندوں کا قتلِ عام بھی کر دیتے تو ہم مجرم قرار نہیں پا سکتے تھے۔ پانچ معزز ترین افراد کی چشم دید گواہیاں اور ان کا اثر و رسوخ ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیتا جب کہ خود شرافت علی بھی اعلیٰ طبقے میں ایک باعزت مقام رکھتا تھا۔ میں نے شرافت علی سے سرگوشی میں کہا۔ "تم نے اتنی جلدی یہ سارا انتظام کیسے کر لیا یار؟"

"یہ کوئی خاص کام تو نہیں ہے۔ آدمی میں پیسہ خرچ کرنے کی طاقت ہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ان کے استقبال کے لیے کیا کیا ہے تم نے؟" خان نے بھی سرگوشی میں ہی سوال کیا تھا۔

"اس کا بھی مناسب انتظام ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف میرے آدمی موجود ہیں۔ ان کی نظروں سے بچ کر چوہا بھی کوٹھی میں قدم نہیں دھر سکے گا۔ ہمیں ان کے آنے کی بروقت اطلاع مل جائے گی، لیکن خیال رہے ایک بھی آدمی زندہ نہ رہے۔ ایک ایک کو بھون کے رکھ دینا۔"

تھی تو یہ چند مخصوص لوگوں کی مختصر سی محفل لیکن گلوکارہ نے ایسا سماں باندھا تھا کہ ہر شخص خاموش، ساکت و صامت بیٹھا بس اس کا منہ تکے جا رہا تھا۔ میں نے موسیقی کی بہت سی محفلیں دیکھی ہیں، ان گنت ایسے پروگراموں میں شرکت کی ہے لیکن یقین کریں اس رات جیسا لطف کبھی نہیں آیا۔ ہم سب ہی گلوکارہ کی آواز کے سحر میں ایسے گم تھے کہ تن من کا ہوش نہیں رہا تھا۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ "خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے کوئی۔"

ہم سب نے بیک وقت چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ہمارے دائیں جانب دو انتہائی خونخوار شکلوں والے آدمی اسٹین گنیں ہم پر تانے کھڑے تھے اور ان کے دونوں جانب چار چار آدمی اور تھے جو ہمارے گرد نیم دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں پستول تھے اور شانوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں، انہیں دیکھتے ہی تینوں تاجروں، اعلیٰ افسروں اور ان کی بیگمات پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ شرافت علی نے کڑک کر پوچھا۔ "کون ہو بھئی اور کیا چاہتے ہو ہم سے؟"

اس کی آواز میں کڑک ایسی تھی کہ معمولی چور اُچکا ہوتا کوئی تو ساری اکڑفوں بھول جاتا۔ دونوں اسٹین گن برداروں میں سے ایک نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آدمی تو بہت کڑک بھڑک والا ہے، پر یار، ہم بھی کیا کریں۔ ہمیں بھی ہر طرح کے موسم اور قسم قسم کے آدمیوں سے نمٹنے کی عادت ہو گئی ہے پیارے! اس لیے ہم میں سے کسی پر بھی اس گرج چمک کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ مال تم خود نکالو گے یا یہ کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا؟ ویسے اچھا یہی ہے کہ تم ہی اپنے ہاتھوں سے سخاوت کا مظاہرہ کرو۔"

"سخاوت میں تو کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا دوست!" فیروز نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "حاتم ثانی سمجھو ہمیں تم۔"

فیروز کے کھڑے ہوتے ہی وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہی شخص جس نے شرافت علی پر طنز کرنے کی کوشش کی تھی، بولا۔ "ایسے لوگوں سے مل کر ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے، تمھارے تیور بتا رہے ہیں جوان کہ یہاں ڈاکا ڈالتے ہوئے ہمیں ابھی خاصی محنت کرنا پڑے گی جس کا مطلب ہے آج کی روزی حلال ہو جائے گی ہماری۔"

شرافت علی نے جلدی سے کھڑے ہو کر کہا۔ "یہ تم کیا کرنے لگے ہو یار! کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ گھر میں جو زیورات اور نقدی ہے وہ میں خود دے دوں گا انہیں۔ تمھاری زندگی سے زیادہ قیمتی چیزیں تو نہیں ہیں وہ۔ آئیں جی آپ لوگ میرے ساتھ۔"

شرافت علی مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا تو خان بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اور فیروز نے شرافت علی کو پکڑ کر روک لیا۔ "نہیں دوست! یہ نہیں ہو سکتا کبھی بھی۔ ہماری موجودگی میں یہ اُچکے تمھیں لوٹ کر لے جائیں، یہ تو ڈوب مرنے والی بات ہے یار ہمارے لیے۔ ایسا تو ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔"

ان تینوں کے درمیان تکرار شروع ہو گئی۔ شرافت علی بار بار آگے بڑھتا تھا ان سے چھوٹ چھوٹ کر اور وہ دونوں دوڑ دوڑ کر اسے پکڑ لیتے تھے اور وہ جو ڈاکا ڈالنے کے لیے بھیجے گئے تھے یہاں، عجیب مخمصے میں گرفتار ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں شاید کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرانی سے منہ پھاڑے انہیں تک رہے تھے۔ ان سب کی توجہ انہی تینوں کی طرف تھی۔ گل زمان نے میری طرف دیکھے بغیر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "جیلانی صاحب! موقع اچھا ہے، ہماری طرف کسی کا بھی دھیان نہیں ہے۔ میری طرف جو چار آدمی ہیں انہیں میں سنبھال لیتا ہوں۔ آپ ان بقیہ چار کو سنبھال لیں۔ اسٹین گن والوں کو یہ تینوں دیکھ لیں گے۔"

ہم دونوں نے اپنے اپنے سائلنسر لگے ہوئے پستول نکال کر دونوں طرف کے آخری آدمیوں کو نشانہ بنا کر لبلبی دبا دی۔ دوسرے ہی لمحے دو کراہیں ابھریں اور وہ دونوں الٹ کر پیچھے جا گرے۔ ان کے گرتے ہی دوسرے چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے، دونوں طرف کے دو اور آدمیوں کی کھوپڑیوں سے خون اُبلنے لگا اور وہ بھی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہے۔ ان کے ساتھی اس ناگہانی آفت کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ دو اور زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگے۔ چھ آدمیوں کے گرنے کے بعد انہیں جیسے ہوش آ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی اسٹین گنیں ہمارے عقب میں کھڑی مہندی کی باڑ کی طرف کر کے بے دریغ گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ شاید وہ یہی سمجھے تھے کہ کوئی اس باڑ کے پیچھے چھپ کر ان کے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کا صحیح اندازہ لگا کر ہماری طرف متوجہ ہوتے، ہم نے ان کے بقیہ دو آدمیوں کے سروں میں بھی گولیاں اتار دیں۔ اب صرف دو باقی رہ گئے تھے جن کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ وہ مسلسل مہندی کی باڑ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی توجہ شرافت علی وغیرہ کی آواز سے ہٹ گئی تھی۔ ان لوگوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور خان اور شرافت علی ایک دم جست لگا کر ان دونوں پر جا پڑے۔ وہ ان کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ گرتے گرتے ان کے ہاتھوں سے اسٹین گنیں نکل کر دور جا گریں۔ ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ ہم ان کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے کیوں کہ ہمارے اور ان کے درمیان شرافت علی، خان اور فیروز حائل تھے۔ ویسے اب ان دونوں کے ہاتھوں سے اسٹین گنیں نکل چکی تھیں اور ہمیں امید تھی کہ وہ لوگ ان دونوں کو دوبارہ ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دیں گے چنانچہ ہم اپنے اپنے پستول جیبوں میں ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس بدلی ہوئی صورت حال نے شرافت علی کے پانچوں معزز مہمانوں اور ان کی بیگمات کی خاصی ڈھارس بندھائی تھی۔ اب وہ لوگ خوفزدہ ہونے کے بجائے حیرت آمیز دلچسپی کے ساتھ اپنے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں خاصے تندرست و توانا تھے۔ اور ان کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ لڑنا بھڑنا ان کے لیے کوئی نئی اور غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود شرافت علی اور خان ان کو بُری طرح رگید رہے تھے۔ فیروز نے ان کی اسٹین گنیں اٹھا کر دور پھینک دی تھیں اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا اس مقابلے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر اس گلوکارہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی مدبھری میٹھی آواز نے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تک ماحول پر سحر طاری کر رکھا تھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے گل زمان سے کہا۔

"یار گل زمان! وہ ساحرہ کہاں غائب ہو گئی جس کی آواز نے ہمیں اتنی دیر سے مسحور کر رکھا تھا؟"

وہ اس اسٹیج کی طرف جس پر گلورہ بیٹھی فضا میں نغمیں بکھیر رہی تھی، اشارہ کر کے بولا۔" وہ اس کے نیچے ہے۔ ایسے موقعوں کے لیے انھیں خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ عموماً ایسی جگہوں کو پناہ گاہ کے طور استعمال کرتی ہیں یہ۔"

ہم آگے بڑھ کر فیروز کے پاس جا ٹھہرے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔" یار! یہ تو مسئلہ ہی کچھ نہیں تھا۔ ایسے گیدڑوں کو اتنا اہم کام دے کر بھیج دیا تھا تمھارے اس آرزک نے۔ اتنا گدھا تو ہو نہیں سکتا ہے وہ۔"

"میرا خیال ہے اس طرح وہ ہماری طاقت کا اندازہ لگانا چاہتا ہوگا۔ یہ جو لوگ یہاں آئے ہیں، یہ تو مجھے کوئی پیشہ ور قسم کے غنڈے لگتے ہیں، انھیں کچھ دے دلا کر قربانی کا بکرا بنایا ہے شاید اس نے۔" گل زمان میرے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"ہاں، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے یار! ان کا تعلق تنظیم سے معلوم نہیں ہوتا۔" میں نے گل زمان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اچانک کڑکڑ کی آواز سن کر ہم تینوں نے ایک ساتھ چونک کر ان لٹنے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بدمعاش جن کی شرافت علی اور خان مرمت کر رہے تھے، اب سنبھل کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان دونوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے گراری والے کھلے ہوئے چاقو دکھائی دے رہے۔ دونوں ہی رکوع کے انداز میں جھکے ہوئے خونخوار نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے، اُن کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ ہر چکر پہ ان کے اور شرافت علی اور خان کے درمیان فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں گو نہتے تھے اس گھڑی مگر اناڑی نہیں تھے۔ ایک دوسرے کی طرف پُشت کیے، چاقوؤں پر نظریں جمائے، وہ بھی آگے جھک کر ان کے ساتھ ہی ساتھ گھوم رہے تھے۔

میں نے گل زمان کی طرف دیکھا، وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کر کے آہستہ آہستہ مخالف سمتوں میں ہٹنے لگے۔ پھر جیسے ہی ایک بدمعاش چکر کاٹ کر گل زمان کے سامنے آیا وہ چیتے کی طرح جست کر کے اس پہ جا پڑا۔ اُدھر میں نے بھی دوسرے .... کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا لیکن اس بار وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل ہی بے خبر نہیں تھے، ایک بار چوٹ کھانے کے بعد انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ آ پھنسے ہیں۔ چنانچہ گل زمان کے ساتھ کیا ہوا یہ تو میں دیکھ نہیں سکا۔ البتہ جس پر میں نے چھلانگ لگائی تھی، میرے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کسی زخمی جنگلی بھینسے کی طرح ایک دم میری طرف پلٹ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ اس سمے ذرا سی چُوک ہو جاتی مجھ سے تو میری آنتوں کی دکان لگا دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اس نے۔ قسمت ہی مجھ پر مہربان تھی اس دن کہ میں نے بر وقت اسے پلٹتے ہوئے دیکھ لیا اور رُخ بدل کر اس سمت نکل گیا جدھر سے اس نے رُخ بدلا تھا اپنا۔ نتیجتاً اس کا وار خالی گیا، اور میں نے اسے اپنی طرف دوبارہ پلٹنے کی مہلت دینے کے بجائے اس کی کمر پہ پوری قوت سے لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم دور اوندھے منہ جا گرا۔ عین اسی لمحے میں نے اپنے بائیں جانب سے کراہ سنی، میں فوراً ادھر مڑ گیا۔ ادھر نہ جانے کس طرح خان دوسرے بدمعاش کے چاقو کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کا چاقو خان کی پُشت میں دھنسا ہوا تھا اور وہ اسے باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے بجلی کی سی تیزی سے پستول نکال کر اس پر گولی چلا دی جو اس کے بازو کے نیچے پسلیاں توڑتی ہوئی اندر جا دھنسی تھی۔ اس کے گرتے ہی میں نے مُڑ کر اسے دیکھا جسے لات مار کر گرایا تھا میں نے۔ وہ اٹھ کر نہایت غیظ کے عالم میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس جھگڑے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک گولی اس کی طرف بھی روانہ کر دی، جس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا تھا۔

"چلو، خس کم جہاں پاک۔" شرافت علی نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ جھاڑ کر اپنے مہمانوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ بھی جلدی جلدی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور تحسین آمیز انداز میں بیک زبان ہو کر بولے۔" آپ لوگوں نے تو کمال کر دیا بھئی۔"

میں نے پلٹ کر گل زمان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہوا اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اور فیروز، خان کی پُشت میں دھنسا ہوا چاقو نکال کر اس کے زخم سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوا یارو؟"

گل زمان قدرے خجالت سے بولا۔" بس اندازے کی ذرا سی غلطی ہو گئی جی! میں سمجھا تھا وہ پلٹ کر میری طرف آئے گا مگر اس نے خان صاحب پر حملہ کر دیا۔ وہ تو خیر ہوئی یہ بہلو بچا گئے۔"

شرافت علی بھاگتا ہوا واپس آ کر بولا۔" کیا ہوا بھائی؟ کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں یار! کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی ذرا سا زخم آ گیا ہے چاقو کا۔" خان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے بھئی! میں نے دیکھا ہی نہیں یہ۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ اندر فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ خان کے بازو تھام کر اسے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

ہم سب بھی ان کے ساتھ ہی ہو لیے۔ اندر پہنچے تو وہاں

ایک افراتفری کا سماں تھا۔ شرافت علی کے بیوی بچوں نے بھی باہر ہونے والا سارا ڈراما دیکھا تھا اور وہ صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین تھے۔ شرافت علی نے انھیں دلاسے دے کر واپس بھیج دیا اور فرسٹ ایڈ بکس لے کر خان کی مرہم پٹی کرنے بیٹھ گیا۔ زخم تو زیادہ گہرہ نہیں تھا البتہ چاقو نے شانے کی ہڈی کو زیادہ متاثر کیا تھا۔

خان کو ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد ہم اسے باہر لے آئے اور فیروز سے کہا کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ فوراً۔

فیروز اسے ساتھ لے کر اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔" مجھے بھی ان کے ساتھ ہی چلا جانے دو یار! میں پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا ابھی۔"

"ہاں یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ تم بھی چلے جاؤ ان کے ساتھ اور گل زمان کو بھی لے جاؤ۔ یہاں کے معاملات کو میں سنبھال لوں گا۔"

ہم ابھی کار کے قریب ہی پہنچے تھے کہ اچانک فضا گولیوں کی تڑ تڑ اور خوف ناک دھماکوں سے گونج اٹھی۔

الف

دھماکوں اور فائرنگ کی آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔ شرافت علی نے ایک لمحے کی بھی دیر کیے بغیر جلدی سے اپنے مہمانوں کو کوٹھی کے اندر پناہ لینے دوڑا دیا اور خود بھاگتے ہوئے ہمارے نزدیک آ کر بولا۔" چلو چلو، تم لوگ بھی اندر چلو۔ شاید ان کے کچھ ساتھی باہر موجود ہیں۔ جو کسی بھی وقت پہنچ سکتے ہیں یہاں۔ ہمیں اندر چل کر مناسب جگہوں پر مورچابندی کر لینا چاہیے۔"

ہم تینوں میں سے کوئی بھی کچھ بولے بغیر شرافت علی کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہمارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچنے والوں کی لاشیں اور ان کے ہتھیار لان میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں اسٹین گنیں اٹھا لیں۔ گل زمان جلدی سے میرے پاس آ کر بولا۔" ایک مجھے دے دیں جیلانی صاحب! شاید ہمیں ان کے استعمال کی ضرورت پڑ ہی جائے اب۔"

میں نے ایک اسٹین گن اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے کوٹھی کے اندر جا گھسے۔ شرافت علی، خان اور فیروز ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ فائرنگ کی آواز مسلسل آ رہی تھی، البتہ دھماکے اب نہیں ہو رہے تھے۔ اندر سے عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔" یار! ان عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ مقام پر نہیں پہنچا سکتے ہو تم؟"

"میں ان سب کو ابھی نیچے تہ خانے میں پہنچا دیتا ہوں۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا ان کے لیے، تم خان کے ساتھ اسٹین گن لے کر ادھر الگ الگ کھڑکیوں میں کھڑے ہو جاؤ، فیروز اور گل زمان کو میں دوسری طرف بھیج دیتا ہوں۔ نیچے اسلحے کا خاصا ذخیرہ کر دیا ہے میں نے۔ کچھ دستی بم اور دیگر اسلحہ بھی میں لے آؤں گا نیچے سے۔ ایسا لگتا ہے، ایک زبردست جنگ لڑنا پڑے گی آج ہمیں۔"

شرافت علی اندر عورتوں اور بچوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک ایسی کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر پوزیشن سنبھال لی جس سے کوٹھی کے سامنے کا حصہ پوری طرح دکھائی دے رہا تھا۔ خان میرے قریب ہی دوسری کھڑکی میں کھڑا تھا۔ باہر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دو ملکوں کی فوجیں لڑ پڑی ہوں، عین شرافت علی کے مکان کے سامنے۔ رات کے اس سمے فائرنگ کے اس زبردست تبادلے کے نتیجے میں علاقے میں رہنے والے دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوگا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی فرصت تھی کسی کو یہ جاننے کی۔

میں نے خان سے کہا۔" یار خان! تم زخمی ہو، تمھیں کوئی دشواری تو نہیں ہو رہی ہے یہاں کھڑے ہونے میں؟ میرا خیال ہے تم ادھر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ کسی صوفے پر۔"

"نہیں یار! اب ایسا بھی کمزور اور کم ہمت نہ سمجھو مجھے۔ یہاں کھڑے رہنے اور پستول چلانے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی مجھے۔"

"حیرت مجھے اس بات پر ہے یار! کہ حملہ آور آخر کوٹھی کے اندر کیوں نہیں آتے؟ یہ باہر ہی سے فائرنگ کیوں کیے جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے شرافت علی نے باہر اپنے جن آدمیوں کو مقرر کیا ہوا تھا، ان سے ٹکراؤ ہو گیا ہے ان کا۔ جب تک وہ لوگ راستہ نہیں دیں گے انھیں، وہ اندر کیسے آ سکیں گے۔" خان نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ بات تو میرے دماغ سے نکل ہی گئی تھی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شرافت علی نے اچھا خاصا بندوبست کر رکھا تھا ان لوگوں کے استقبال کا لیکن ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے مجھے۔" میں نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کون سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تمھاری؟" خان نے استفہامیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس شرافت علی نے جب ایسی زبردست فوج لگا رکھی تھی باہر تو پھر یہ جنھیں ہم نے ابھی ابھی ٹھکانے لگایا ہے کس طرح اور کہاں سے اندر آ گئے تھے۔ انھیں نہیں روکا کسی نے؟ یہ تو سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ ان کی نظروں سے بچ کر آ گئے

ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ـ بات واقعی غور طلب ہے، اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں آیا تھا اب تک۔" خان نے فکرمندی سے کہا۔ "مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا ان پر آٹزک کے بھیجے ہوئے آدمی ایسے چوپٹ تو نہیں ہو سکتے تھے۔ جس طرح وہ مارے گئے، اتنی بڑی اور منظم تنظیم کے کسی ایک بھی تربیت یافتہ آدمی سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خودکشی کرنے چلے آئے ہوں۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے ہو کہ وہ آٹزک کے آدمی نہیں تھے؟" میں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن شبہ یہی ہے مجھے ان کے بارے میں۔" خان نے جواب دیا۔

"سوال یہ ہے کہ اگر وہ آٹزک کے بندے نہیں تھے تو پھر کون تھے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سوال تو میرے دل و دماغ میں چبھ رہا ہے میرے بھائی! کہیں وہ سچ مچ ڈاکو ہی نہ رہے ہوں۔" خان بولا۔

میں چند لمحے کیلئے سوچ میں پڑ گیا۔ خان نے مجھے بھی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ پھر میں نے کہا ــــ" اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ آٹزک کے بھیجے ہوئے نہیں تھے اور سچ مچ ڈاکا ڈالنے کی نیت سے آگھسے تھے کوٹھی میں، تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ لوگ باہر موجود شرافت علی کے آدمیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندر کس طرح آ گئے تھے؟"

خان نے جو نظریں باہر کی سمت جمائے میری بات سن رہا تھا، میری بات کا جواب دینے کے بجائے کھڑکی کی اوٹ لیتے ہوئے کہا "وہ دیکھو، وہ سامنے کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے کوئی باہر سے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

میں نے جلدی سے آڑ میں ہو کر کھڑکی پر پڑا ہوا پردہ برابر کر کے اس کے پیچھے سے جھانکا۔ جلد ہی مجھے سامنے کی ایک نیم تاریک دیوار پر ایک شخص لیٹا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ پیٹ کے بل پھسل کر دیوار سے نیچے لٹکا اور پھر دونوں ہاتھ چھوڑ کر نیچے کود گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد عین اسی جگہ ایک اور شخص کا سر نمودار ہوا اور چند لمحے کے بعد پہلے آدمی کی طرح وہ بھی اندر کود گیا اور اس کی جگہ تیسرا شخص دیوار پر چڑھتا دکھائی دینے لگا۔

میں نے خان سے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے دیوار کے اُس طرف اِس جگہ کوئی اونچی چیز رکھ دی ہے اور اس کے سہارے دیوار پر چڑھ کر اندر آ رہے ہیں۔ تم باہر سے آنے والوں پر نگاہ رکھو، میں انھیں دیکھتا ہوں جو اندر آ چکے ہیں"

"ٹھیک ہے اس طرف جا رہے ہیں وہ لوگ جدھر مہندی کی باڑ لگی ہے۔ شاید اس باڑ کی اوٹ میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں یہ۔"

"تم فکر مت کرو یار! میں ان میں سے ایک کو بھی باڑ تک نہیں پہنچنے دوں گا۔" میں نے یہ کہہ کر سب سے آگے والے کو نشانہ بنانا چاہا۔

میرے فائر کرنے سے پہلے ہی کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف گولی چلی اور دیوار سے سر ابھارنے والا ایک شخص پیچھے الٹ گیا۔ میں نے فوراً گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں دربان بالکل سامنے کھڑا اپنی بندوق سیدھی کیے کسی اور کو نشانے پر لے رہا تھا۔ عین اسی وقت خان نے گولی چلا دی۔ اس نے دیوار سے لگے ہوئے اس شخص کو نشانہ بنایا تھا جو دربان کو اپنی رائفل سے نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن بھی گولیاں اگلنے لگی۔ اس دوران چار آدمی اندر آ چکے تھے۔ پانچویں کو دربان نے اوپر آنے ہی نہیں دیا تھا۔ ایک کو خان نے گرا دیا اور دو میری گولیوں کی زد میں آ کر گر پڑے مگر جو سب سے پہلے اندر آیا تھا، دربان کے گولی چلاتے ہی دوڑ لگا کر مہندی کی باڑ کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ ہماری طرف سے گولیوں کی آواز سن کے فیروز اور گل زمان دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آ کر بولے۔ "کیا ہوا؟ کیا دشمن ادھر سے اندر آنے میں کامیاب ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "چار آدمی آ سکے تھے۔ ایک کو خان نے اور دو کو میں نے لمبا کر دیا ہے لیکن چوتھا مہندی کی باڑ کے پیچھے روپوش ہو گیا ہے۔ گل زمان! تم ادھر میری جگہ کھڑے ہو کر اسے دیکھو، میں باہر جا کر تلاش کرتا ہوں اسے۔"

گل زمان جلدی سے بولا۔ "نہیں آپ باہر نہ جائیں، ادھر ہی کھڑے رہ کر اس کے برآمد ہونے کا انتظار کریں، میں اوپر جا رہا ہوں، اس کمرے کے بالکل اوپر جو کمرا ہے اس کی کھڑکی سے باڑ کے پیچھے کا حصہ دکھائی دے جائے گا۔ شاید، بس اسے وہاں نشانہ بنانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ بھاگ کر ادھر آئے تو آپ نمٹ لینا اس سے۔" وہ پلٹ کر بھاگتا ہوا دوسرے کمرے میں جا گھسا۔

اسی وقت شرافت علی بھی واپس آ گیا۔ اس کے پاس دو اسٹین گنیں اور خاصی مقدار میں فاضل راؤنڈ تھے۔ کاندھے سے اس کے ایک وزنی تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی ایک اسٹین گن فیروز کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ وہ اندر آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کیا؟"

"جو آئے تھے ان میں سے ایک بچ کر مہندی کی باڑ کے پیچھے چلا گیا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے گل زمان اوپر گیا ہے۔" فیروز نے جواب دیا۔

"مگر تم اُدھر سے کیوں ہٹ گئے جہاں میں نے کھڑا کیا تھا تمھیں۔ اس طرف میں نے جان بوجھ کر اندھیرا رکھا ہے اور اپنے آدمیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ آنے والوں کو اس طرف اندر آنے کا موقع دیں۔ چنانچہ ہمیں اُدھر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔" شرافت علی بولا۔

"یہ تو بہت برا ہوا بھئی۔ پھر تو ہمیں وہاں سے ایک لمحے کو بھی نہیں ہٹنا چاہیے تھا۔ یہ بات تم نے پہلے ہی بتا دی ہوتی مجھے تو میں خیال رکھتا اس بات کا۔ آؤ دیکھیں اُدھر کوئی گڑبڑ ہی نہ ہو گئی ہو۔" فیروز واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔

شرافت علی نے عین وقت پر واپس آ کر اُس طرف متوجہ کیا تھا فیروز کو۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہم لوگوں پر اُدھر سے۔ فیروز اور شرافت علی ایک ساتھ اُس طرف لپکے تھے۔ اتنی دیر میں تین افراد اُدھر سے بھی اندر گھس آئے تھے۔ جنھیں فیروز نے دیکھتے ہی اسٹین گن سے بھون کے رکھ دیا تھا۔ میں نے آواز دے کر شرافت علی سے کہا۔ "کیا اس طرف روشنی کا انتظام نہیں ہے شرافت علی؟"

"ایک سیکنڈ رکو، میں لائٹ جلا رہا ہوں اب اُدھر کی۔" وہ یہ کہہ کر برابر والے کمرے میں گھس گیا۔

میں دوڑ کر فیروز کے پاس جا پہنچا کیوں کہ دشمن نے اب سامنے والے حصے کی دیوار پھاندنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا شاید۔ پانچویں آدمی کے گولی کھا کر پیچھے الٹنے کے بعد سے پھر کوئی دیوار پر چڑھتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا۔ یوں بھی ادھر دربان چوکنا تھا اور گل زمان اوپر کی منزل پر جا پہنچا تھا جہاں وہ مجھ سے زیادہ اچھی پوزیشن میں تھا۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ نیچے والوں کو زیادہ بہتر طریقے پر دیکھ سکتا تھا۔ اس طرف سے یوں لگتا تھا جیسے دشمن نے یلغار کر رکھی ہو۔ تین آدمیوں کو فیروز ٹھکانے لگا چکا تھا لیکن دیوار پر مجھے کئی سائے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے، اچانک کوٹھی کا وہ حصہ بقعۂ نور بن گیا۔ روشنی ہوتے ہی میں نے دو آدمیوں کو دیوار کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا۔ تین یا چار افراد پیٹ کے بل دیوار پر لیٹے تھے۔ روشنی ہوتے ہی وہ نہایت سرعت سے باہر ہی کی طرف کود گئے۔ مگر وہ دونوں جو دیوار کے ساتھ کھڑے تھے ان کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوٹھی کے اس حصے میں چھپنے کی کوئی بھی جگہ نہیں تھی۔ لہٰذا ان دونوں میں سے ایک کو میں نے اور دوسرے کو فیروز نے نشانہ بنا لیا۔ عین اسی لمحے کوٹھی کے سامنے والے حصے سے گولی چلنے کی آواز سن کر میں صورتِ حال جاننے کی غرض سے اُدھر لپکا۔ یہاں دربان کو کسی دشمن نے شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنا شانہ پکڑے ایک ہاتھ سے رائفل سنبھالے آگے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے مہندی کی باڑ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اوپر سے گولی چلی اور اگلے ہی لمحے مہندی کی باڑ کے پیچھے چھپا ہوا شخص لنگڑاتا ہوا باہر نکل کر دربان کی طرف لپکا۔ اس نے رائفل اپنے کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ اور ہاتھ میں پستول پکڑ رکھا تھا، جس کا رُخ دربان کی طرف تھا۔ شاید وہ دربان کو ہلاک کر کے مین گیٹ کھول کر اپنے ساتھیوں کو اندر بلانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی نیت جانتے ہی اپنی اسٹین گن اس کی طرف سیدھی کی لیکن میرے فائر کرنے سے پہلے ہی اوپر کی منزل میں موجود گل زمان نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ میں بھاگتا ہوا باہر نکلا اور دربان کے پاس جا پہنچا۔ "کیا ہوا خان؟ مجھے دکھاؤ کدھر لگی ہے گولی تمھارے؟" میں نے دربان سے کہا۔

"اوہ، صاحب! آپ جاؤ اندر، ایدر تو سالا بزدل لوگ گھس آیا ہے۔ عورتوں کا مافق چھپ چھپ کر گولی چلاتا ہے۔ مرد کا بچہ ہے تو سامنے آ کر چلائے گولی، پھر پتا پڑے اس کو گولی چلانا کس کو بولتے ہیں۔" وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے دکھاؤ یار! زخم زیادہ خطرناک تو نہیں ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زخم پر ســـ ہٹاتے ہوئے کہا۔

ہاتھ کے ہٹتے ہی اس کے کندھے کے نیچے سینے سے ایک دم خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ لہو کی ایک موٹی سی دھار میرے سینے پر پڑی، میں اچھل کر الگ ہٹ گیا۔ مگر اتنی ہی دیر میں میں گرم گرم لہو سے نہا کر رہ گیا تھا۔ دربان جواب تک نہایت ہمت اور حوصلے کے ساتھ کھڑا تھا، اپنے جسم سے فوارے کی طرح لہو ابلتا دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا۔ اور لہرا کر نیچے گرنے لگا، میں نے اسے سہارا دے کر گرنے سے بچایا اور دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر آرام سے نیچے لٹا دیا۔ اس اثنا میں شرافت علی بھی بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔ اس نے دربان کی حالت دیکھ کر کہا "یہ تو کام آ گیا جیلانی؟ زخم بہت بڑا ہے، رائفل کی گولی کا لگتا ہے مجھے، خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔"

"ہاں یار! ہم تو اس کے لیے فوری طبی امداد بھی حاصل نہیں کر سکتے ورنہ شاید یہ بچ سکتا تھا۔" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"افسوس مت کرو اس کا جیلانی! افسوس ان معاملات پر ہوتا ہے جن پر پچھتاوا ہو۔ ہم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس میں افسوس یا پچھتاوے کی کوئی گنجائش نہیں ہے دوست! اس عظیم مقصد پر تو ہم اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ ہماری ایک نسل پاکستان بنانے میں کام آ گئی اور ایک نسل اس

کی تعمیر اور ترقی میں، اب ہماری زندگیاں اگر اس کی بقا کی جنگ میں ختم ہو جائیں تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ یہ دربان اپنے ملک کی بقا کی اس جنگ کا پہلا شہید ہوگا۔ اس پر افسوس کرکے اس کی اہمیت کو کم نہ کرو جیلانی!"

باہر سے اب گولیاں چلنے کی آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا دشمن شکست کھا کر پسپائی پر مجبور ہو گیا ہے۔ شرافت علی اٹھ کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آؤ، ذرا باہر کی صورتِ حال معلوم کریں۔ اُدھر سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

میں بھی اُٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ شرافت علی نے بغلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا، میں بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ باہر بالکل سناٹا تھا۔ کوئی ایک متنفس بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے، یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ وہاں دور دور دشمن کا نام و نشان بھی نہیں ہے، شرافت علی بولا۔ "کوٹھی کے اندر پڑی ہوئی تمام لاشیں پولیس کے آنے سے پہلے ہی باہر پھنکوا دینا چاہئیں تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ اس سارے ہنگامے کا مرکز ہمارا گھر تھا۔"

ہم نے اندر واپس جا کر فیروز خان اور گل زمان کو بلا کر جلدی جلدی کوٹھی کے احاطے میں پڑی ہوئی تمام لاشیں باہر گلی میں ڈال دیں۔ وہاں اتنی زبردست فائرنگ ہوئی تھی کہ آس پاس کے مکانوں کے سارے مکین اپنے اپنے مکان کے کسی محفوظ ترین حصے میں جا چھپے تھے۔ تمام مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور کسی کھڑکی کے پیچھے کوئی سایہ تک حرکت کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ یہ یقین تھا مجھے کہ ہر گھر سے علاقے کے تھانے میں اس صورتِ حال کے بارے میں فون ضرور پہنچ چکا ہوگا لیکن انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں غلام ہندوستان کی پولیس کے لیے جو اصول اور ضابطے بنائے تھے گو وہ اس کے اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے کے لیے تھے لیکن یہ اصول، یہ قواعد و ضوابط ہمارے سیاستدانوں کو بھی بے حد پسند ہیں کیوں کہ کرسیٔ اقتدار پر بیٹھنے والے ہر شخص کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ جو رات اور دن گلی کوچوں میں جمہوریت کا راگ الاپتے پھرتے ہیں وہ بھی جمہوری طریقوں سے اقتدار حاصل کرنے یا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے انھیں بھی ایسی پولیس اور انتظامیہ درکار ہے جو ان کے مفاد میں جمہوریت کو دبانے اور کچلنے کے کام آ سکے۔ آزادی حاصل کرنے کے اتنے عرصے بعد بھی ہماری پولیس غریب یہ نہیں جانتی کہ اس کا فرض کیا ہے، اسے کس مقام پر کب پہنچنا چاہیے، کسی زخمی کو طبی امداد دینا زیادہ ضروری ہوتا ہے یا قانونی خانہ پُری زیادہ اہم ہوتا ہے۔ وہ آج بھی انگریز آقاؤں کے اسی اصول پر سختی سے کاربند ہے کہ زخمی کو طبی امداد دینے سے پہلے قانون کے تمام تقاضے پورے کرو۔ اس تمام کارروائی کے بعد بھی اگر کوئی سخت جان زندہ رہ جائے تو اسے ڈاکٹروں کے حوالے کردو، ان کے نزدیک آج بھی آدمی سے زیادہ اہم قانون ہی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قانون انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بنایا جاتا ہے۔ انسان قانون کے لیے نہیں پیدا ہوتا لیکن ہماری انتظامیہ اور پولیس جس قانون کی محافظ ہے وہ انسانوں کے لیے بنایا جانے والا قانون نہیں ہے۔ چنانچہ اس سارے ہنگامے میں پولیس کا کردار بس اتنا ہی تھا کہ جب اسے یہ اطمینان ہو جاتا کہ سارا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اب قانونی کارروائی کے لیے حالات پُرسکون ہو گئے ہیں تو وہ آ کر اپنا کام شروع کر دیتی۔ چنانچہ ہم نے پولیس کو بھاگ دوڑ اور پریشانی سے بچانے کے لیے دربان اور اس شخص کی لاش کے سوا جس نے دربان کو گولی ماری تھی، باقی تمام لاشیں باہر گلی میں اِدھر اُدھر اس طرح ڈال دیں کہ پولیس بہ آسانی یہ جان لے کہ یہ ہنگامہ ڈاکوؤں کے دو گروہوں میں تصادم کا نتیجہ تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں، فیروز خان اور گل زمان، شرافت علی کو خدا حافظ کہہ کر اپنے ٹھکانے کی طرف واپس چل پڑے۔ گلی سے نکل کر جب ہماری کار مین روڈ پر بڑھ رہی تھی اس وقت میں نے پولیس کی دو گاڑیوں کو اس طرف جاتے دیکھا تو پولیس کی اس برق رفتاری پر میرے ہونٹ خود بخود مسکرانے کے انداز میں کھل گئے تھے۔

صبح کے اخبارات میں رات کے اس ہنگامے کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھیں۔ حسبِ توقع پولیس نے اسے ڈاکوؤں کے دو گروہوں میں تصادم کا نتیجہ ہی قرار دیا تھا۔ شرافت علی کے دربان کے قتل کا بھی ذکر تھا۔ اس کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ دونوں طرف سے زخمی ہونے والے کئی ڈاکو مشہور تاجر شرافت علی کی کوٹھی میں دیوار پھاند کر داخل ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو شرافت علی کی کوٹھی کے دربان نے دیکھ کر للکارا، جواب میں ڈاکو نے اس پر گولی چلا دی لیکن دربان نے مرتے مرتے بھی اس ڈاکو کو ہلاک کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ خبر کو یہ رنگ دینے میں شرافت علی اور اس کے معزز مہمانوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ فیروز نے خبر پڑھ کر زبردست قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یار! پولیس مقابلے کی خبریں تو پڑھتے ہی تھے، آج ڈاکو مقابلے کی خبر بھی شائع ہو گئی۔ بڑی باکمال ہے بھئی پولیس ہماری۔ سچ پوچھو تو آزادی تو انہی کو ملی ہے، ہم لوگ تو خواہ مخواہ ہی خود کو آزاد سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"ہاں بھئی تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو، کیوں نہ ہم بھی آج ایک ایسا ہی ڈاکو مقابلہ ترتیب دے ڈالیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" فیروز نے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ تم آٹزک کے گرگوں کے کئی ٹھکانوں سے واقف ہو۔" میں نے ہنوز مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہ میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن اس سے اس کا کیا تعلق؟" پھر وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔ "اوہ، میں سمجھا۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم، یہ پروگرام تو ہمارا تھا ہی، اگر رات کو لزی نے شرافت علی کے گھر پر حملے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو ہم رات ہی ان کے کسی ٹھکانے پر جا چڑھتے۔ تم شرافت علی کو فون کرکے بلا لو، پھر پروگرام بناتے ہیں ہم سب مل کر۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ایک اور بہت ضروری بات تو بھولے ہی بیٹھے ہیں ہم۔ رات میں نے تمھارے ہی گھر پر گزاری ہے۔ میرا خیال ہے صبح سے لزی کئی بار بنگلے پر فون کر چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کوئی نئی خبر ہو اس کے پاس ہمارے لیے۔"

"ہاں بھئی، یہ شرافت علی والی خبر تو اس کی بالکل درست ہی ثابت ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے یار!"

"ہاں یار! بڑی بھول بھلیاں قسم کی شے لگنے لگی ہے اب وہ مجھے، اطلاعات اس کی چاہے کتنی ہی سچی اور درست ثابت ہوں لیکن ہمیں احتیاط کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ایک یہودی النسل عورت کسی دن، کسی وقت اور کسی لمحے بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے لہٰذا جب تک وہ فائدے پہنچا رہی ہے اس کی بات سنتے رہو لیکن آنکھ بند کرکے اس کی کسی بات پر اعتبار کرنے کے بارے میں ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں شرافت علی کو فون کرکے پتا کرتا ہوں شاید اس سے بات ہوئی ہو لزی کی۔"

"ہاں، اسے ضرور فون کرو! اور یہ بھی معلوم کرو اس سے کہ پولیس کو کیا بیان دیا ہے اس نے۔ یہ بہت ضروری ہے جیلانی بھائی!"

میں نے ٹیلیفون اٹھا کر شرافت علی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والا خود شرافت علی ہی تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔ "تم کہاں ہو بھئی، ایک گھنٹا ہو گیا تمھیں ڈھونڈتے ہوئے، کیا رات کو گھر واپس نہیں پہنچے تھے؟"

"ہاں بھئی یہ اپنے فیروز باؤ جو ہیں نا انھوں نے رات کو اپنے ہی پاس روک لیا تھا۔ تم سناؤ رات کیسے کٹی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو یار! سارے معاملات ٹھیک کرتے کرتے کوئی چار بج گئے تھے۔ اس کے بعد ہی لیٹنا نصیب ہوا تھا۔"

"میں ابھی بنگلے پر جا رہا ہوں، تم سے یہ معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا کہ لزی نے آج کوئی فون تو نہیں کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں، میری طرف تو اس نے کوئی فون نہیں کیا، بنگلے پر کیا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں ذرا آپی کی مزاج پُرسی کرکے آدھے گھنٹے کے بعد بنگلے پر پہنچوں گا۔ تم بھی ادھر ہی آ جاؤ۔" میں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دن کے دو بجنے والے تھے۔ فیروز بولا۔ "دوپہر کا کھانا ہم اُدھر آپی کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ تمھاری فردوسی بیگم نے کھانا خود تیار کیا ہے۔ یوں سمجھ لو انھوں نے ہماری دعوت کی ہے اپنے گھر میں شاید کھانے پکانے کا بہت شوق ہے انھیں۔"

"ہاں یار! وہ بہت اچھی عورت ہے، کھانے تو وہ ایسے اچھے پکاتی ہے کہ کھانے والا انگلیاں چاٹنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر پتا نہیں اتنی پُرخلوص اور محبت کرنے والی تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں کی مالک عورت کو اب تک کوئی قدرداں کیوں نہیں مل سکا؟ اس معاملے میں بڑی بدقسمت ہے یار وہ بچاری۔ اس کی تنہا اور اداس زندگی پر میرا دل اکثر کڑھتا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا! تو وہ اب تک غیر شادی شدہ ہے، اور اس اتنی بڑی دنیا میں تنہا زندگی گزار رہی ہے وہ؟" فیروز نے حیرانی سے پوچھا۔

"اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ کیوں چلی آتی؟ یہی تو ایک المیہ ہے اس غریب کے ساتھ۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تو وہ بڑی ہی قابلِ رحم اور ہمدردی کی مستحق عورت ہے۔" فیروز نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہے تو ایسا ہی مگر اس کے سامنے کبھی ہمدردی کا اظہار کرنے نہ بیٹھ جانا۔ بے حد خوددار اور رکھ رکھاؤ والی عورت ہے، کسی پر اپنے دُکھ درد کا اظہار نہیں ہونے دیتی ہے وہ، اور نہ ہی یہ پسند کرتی ہے کہ لوگ اس پر ترس کھا کر اس کے ساتھ ہمدردی کریں — پڑھی لکھی عورت ہے، ایک دفتر میں ملازمت کرتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ بہت سلوک کرنے کی عادی ہے، اور احسان لینا کسی کا بھی ذرا پسند نہیں کرتی۔ ہماری خوش نصیبی ہے یار! اتنی اچھی عورت ہماری دوست بن گئی ہے اس پردیس میں۔"

"ایسی بات نہیں کرو جیلانی! کراچی [illegible] پاکستان کا حصہ نہیں ہے، یا تم پاکستانی نہیں جو اسے پردیس کہتے ہو؟" فیروز نے —

"میرا یہ مطلب [illegible] تھا یار! یہ شہر تو میرے ملک کا دروازہ ہے، پاکستان کی رگوں میں دوڑنے والا لہو ہے، اس کا دماغ ہے۔ اس کے بغیر تو پاکستان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، میرے ملک کی ساری آن بان اسی شہرِ نگاراں کے دم سے ہے۔" میں نے

جلدی سے کہا۔

"اس میں شک نہیں ہے کہ لاہور اگر پاکستان کا دل ہے تو کراچی پاکستان کا دماغ ہے۔ پاکستان اگر جسم ہے تو یہ دونوں شہر اس جسم کے ایسے نازک حصے ہیں جن میں سے کسی ایک کی علیحدگی کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لیے دل جتنا اہم ہے زندگی سے استفادہ کرنے کے لیے دماغ بھی اسی قدر اہم ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں۔" فیروز بولا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے آبی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چلایا "لے بھئی جنتی بیگم! یہ تیرے مہمان آ پہنچے ہیں، اب تو لگا دے بھئی کھانا شانا، بھوکا ہی مار دیا ہے آج تو تُو نے زبردستی کی میزبان بن کر۔"

"یہ کیا بکواس ہے بھئی؟ تجھ سے کس نے کہا تھا ہمارا انتظار کرنے کو؟ بھوک لگی تھی تو کھا لیا ہوتا کھانا؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اس سے کہ بھوکا مار کے تُو مجھے ہی ہلکان کرے گی، وہ جس کی خاطر تُو میرا خون کر رہی ہے، میری اس قربانی کی ذرا سی بھی قدر نہیں کرے گا۔ اب تُو خود ہی دیکھ لے اپنی آنکھوں سے میری اس ناقدری کو۔"

فیروز بولا "نہیں بھئی آبی! ایسی بات تو نہیں ہے۔ یہ تو بالکل سگے بھائیوں کی طرح چاہتے ہیں تمھیں۔"

"بس کرو بھائی، جانتا ہوں میں اس کی زبان میں بڑی تاثیر ہے، اس کے اثر سے بچ ہی نہیں سکتا کوئی، ابھی تو تم اسی کے گن گاتے رہو گے اس وقت تک جب تک میری طرح تلخ تجربات سے نہیں گزرو گے۔" آبی [illegible] انداز میں بولا۔

فیروز پریشان سا ہو کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیا بات ہے بھئی جیلانی؟ یہ تو بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں اس وقت؟"

مجھے اس کی پریشانی دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اس کی بکواس پر کان نہیں دھرو بھائی! تم جانتے نہیں ہو اسے، یہاں خاموش پڑے پڑے اس کی زبان میں خارش ہونے لگی ہے، اب یہ کچھ دیر اسی طرح بکواس کرے گا ہر آنے جانے والے سے، اس کی تم پروا نہیں کرو بالکل بھی، ابھی ٹھیک ہو جائے گا اپنے آپ یہ۔"

"دیکھا... دیکھا تم نے۔ خود تو ہے ہی بے وفا، بے مروت، ہرجائی۔ تمھیں بھی کہہ رہا ہے پروا نہ کرو۔" آبی جلدی سے بولا۔

"[illegible] ہوا بھائی آبی! کس کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا شکوہ کر رہے ہیں آپ؟" فردوسی بیگم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے سوا اور کون ہے جسے یہ مشقِ ستم بنا سکے۔ میری ہی شان میں قصیدہ پڑھ رہے ہیں آپ کے یہ برادرِ عزیز۔ اس ذلیل کو کھانا کھلا دو بھئی جلدی سے نہیں تو یوں ہی گھاس چرتا رہے گا یہ۔"

"اچھا اچھا، یہ بات ہے، بھئی آپ نے بھی حد ہی کر دی، دو بجے تک بھوکا مار دیا انھیں، ذرا جلدی نہیں آ سکتے تھے؟" وہ بولی۔

"یہ تو کہہ رہا تھا تم نے اسے کھانا نہیں دیا اب تک۔ تم الٹا مجھ کو قصوروار ٹھہرا رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں جی، میں نے ایک گھنٹے پہلے ہی کہا تھا ان سے کہ کھانا کھا لیں۔ یہ خود ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کے ساتھ ہی کھائیں گے۔" وہ بولی۔

"تجھے جنت کبھی نہیں مل سکتی جنت بی بی! تو چاہے جتنا بھی فردوسی بیگم کہلاتی رہ اپنے آپ کو لوگوں سے۔" آبی بولا۔

"کیوں بھئی، یہ بات تم اتنے یقین سے کس بنا پر کہہ رہے ہو؟" فیروز نے آبی کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے جی! اللہ نے جنت نافرمانوں کے لیے تو بنائی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے گھس سکتی ہے وہاں؟" آبی بولا۔

"لیکن انھوں نے ایسی کون سی نافرمانی کر دی ہے؟ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ دوسروں کا پردہ رکھو، کسی کے سامنے ان کی باتیں بیان نہ کرو لیکن اس نے میری بات ظاہر کر دی۔"

"باتیں بیان نہ کرو، والی بات آج ہی سُن رہا ہوں میں ورنہ شاید کہا تو یہ گیا ہے کہ کسی کے عیب دوسروں پر ظاہر نہ کرو۔" فیروز بولا۔

"ایک ہی بات ہے، ایک ہی بات ہے..." آبی بولا۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ایک ہی بات ہے فیروز! سمجھنے کی کوشش کرو یار! جھوٹ بولنا بھی تو عیب ہی ہے نا۔ بلکہ یہ تو تمام عیبوں کا سردار ہے اور فردوسی بیگم نے اس کے جھوٹ کا پردہ چاک کر کے اس کا یہ عیب ظاہر کر دیا ہم پر۔ انھوں نے یہ بتایا ہے ہمیں کہ کھانے کے لیے اس نے خود ہی منع کیا تھا جب کہ اس کے بیان کے مطابق فردوسی بیگم نے اسے ہمارے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا تھا۔"

"اوہ... اوہ..." فیروز ہنستے ہوئے بولا "یہ تو بڑے دور کی کوڑی لائے ہیں بھئی آبی، یہاں تک تو میں کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"ہاں جی، ان کے رمز کو آپ کہاں سمجھ سکتے ہیں، آخر تو پیرزادے ہیں۔ ہر آدمی ان کے دماغ تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔" فردوسی بیگم شرارت سے بولی۔

آبی غصے سے بولا "اب جا کے کھانا لائے گی یا ابھی شام تک اپنی ظرافت کے جھنڈے ہی اٹھائے پھرے گی؟ جا بی بی اپنی تو آنتیں کبڈی کبڈی کھیلنے لگی ہیں۔ سب کو اپنے جیسا نہ سمجھا کر، میرا پیٹ نہیں بھر سکتا تیرے اس جیلانی کے دیدار سے۔"

فردوسی بیگم ایک دم مڑی اور تیزی سے کمرے کے باہر چلی گئی۔ میں نے آبی سے کہا "تو اسے زیادہ تنگ نہ کیا کر آبی! کچھ خیال کر لیا کر غریب کا۔"

"اوئے تو کیسا پتھر دل ہو گیا ہے جیلانی! میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے تجھے۔ ایک تو یہاں باندھ کے ڈال دیا ہے مجھے اور پھر کہتا ہے دل بہلانے کو ذرا ہنسا بولا بھی نہ کروں۔ اس کے سوا یہاں اور کون ہے جس سے بات بھی کر سکوں میں دو گھڑی؟" آبی جھنجلا کر بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، میں نے تیرے ہنسنے بولنے پر پہرہ تو نہیں بٹھایا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں اپنی زبان کو کھولنے سے پہلے یہ سوچ لیا کر کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ وہ ہماری کوئی لگتی تو نہیں ہے نا کہ خدمت بھی کرے اور باتیں بھی برداشت کرتی رہے۔" میں نے آبی کو سمجھایا۔

میری بات آبی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ہاں یار! یہ تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ اس بات کا مجھے خیال رکھنا چاہیے مگر پتا نہیں اس سے اتنی اپنائیت کیسے محسوس ہونے لگی۔ پتا نہیں کیوں دل کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ وہ میری کسی بات کا بُرا نہیں منائے گی۔"

"یہ اس کی بے لوثی اور بے پناہ خلوص ہے آبی! جس نے اسے اتنے قریب کر دیا ہے ہمارے لیکن آخر تو وہ بھی انسان ہی ہے، اس کے بھی کچھ جذبات اور احساسات ہیں جن کا ہمیں اس طرح خیال رکھنا چاہیے جس طرح وہ ہمارا خیال رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا اس سالی زبان کو قابو میں رکھنے کی۔ ویسے تجھے اس گلزار خانم کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔" آبی بولا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟ اس سے کیا تعلق ہے ہمارا؟ یہودیوں کی زرخرید کُتیا کا کیوں خیال کریں ہم؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اوئے جیلانی! تجھے کیا ہوا بھئی؟ تو جانتا ہے کہ وہ کُتیا یہودیوں کے اشارے پر دُم ہلاتی ہے۔ کیا پتا خود بھی یہودی ہو۔ لہٰذا اس کا خیال رکھنا تو سب سے ضروری ہے، بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہمیں وہاں سے لانے سے پہلے اس کا بندوبست کیا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک طرف تو تم لوگ پاکستان میں موجود اسرائیلی ایجنٹوں کو ختم کرنے کی باتیں کرتے ہو، دوسری طرف جب کوئی ان کا مہرہ سامنے آتا ہے تو اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہو، اس میں کیا مصلحت ہے آخر؟" آبی نے سوال کیا۔

میں نے اس کی بات پر چونک کر فیروز کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "بات تو ٹھیک ہی کہی ہے جیلانی انھوں نے، ہونا تو یہی چاہیے کہ جب اور جہاں بھی دشمن دکھائی دے ہم وہیں اس کا کام تمام کر دیں۔ گلزار خانم کو ہمیں چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ دشمن کو مہلت تو بالکل دینا ہی نہیں چاہیے، ہم آج ہی اس کا قصہ پاک کر دیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"کس کا قصہ پاک کر رہے ہیں جناب یہ آپ لوگ؟" فردوسی بیگم کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی

آبی شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا "فکر بالکل نہیں کرو جنت بی بی! تمھارا قصہ یہ میرے ہوتے ہوئے پاک نہیں کر سکے گا کبھی۔"

وہ آبی کے بستر پر ٹرے رکھتے ہوئے بولی "آپ جیسے بھائی کی موجودگی میں مجھے فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے بھلا۔ اٹھیں اب سیدھے ہو کر بیٹھ جائیں آپ، میں ہاتھ دھونے کو پانی لا رہی ہوں آپ کے لیے۔ آپ دونوں بھی ہاتھ دھو لیں اور آبی بھائی کے بستر کو ہی کھانے کی میز سمجھ لیں۔"

"ہاں ہاں، اس میز دیز کے چکر میں نہ پڑو بی بی! ہر جگہ بیٹھ کر کھانا کھا لیں گے ہم، آبی کو تکلیف نہیں ہونا چاہیے بس۔" فیروز بولا۔

ہم دونوں اٹھ کر ہاتھ دھونے کے لیے چلے گئے۔ واپس آئے تو آبی کے بستر پر جا بجا پلیٹیں اور ٹرے سجی ہوئی تھیں۔ فردوسی بیگم نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ چکن بریانی، چکن قورما، شامی کباب اور سلاد وغیرہ کے ساتھ چاندی کے ورق لگا کر فیرنی کے پیالے رکھے تھے۔ میں نے کہا "واہ بھئی فردوسی بیگم! تم نے تو سچ مچ ہی دعوت کر ڈالی ہماری آج۔ لگتا ہے اچھا خاصا وقت گزارا ہے باورچی خانے میں؟"

"کہاں جی، یہ اس طرح بھی کوئی دعوت ہوتی ہے۔ یہ تو بس بے کار مباش کچھ کیا کر والی نصیحت پر عمل کیا ہے میں نے، آخر وقت تو گزارنا ہی ہے نا کسی نہ کسی طرح۔ دعوت تو میں آپ لوگوں کی اس دن کروں گی جس روز آبی بھائی غسلِ صحت کریں گے۔" فردوسی بیگم نے کہا۔

"ہاں بیٹے! کیا سمجھا ہے تُو نے میری بہن کو، میرا جشنِ صحت منائے گی یہ۔" آبی نے چہک کر کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے آبی کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے اٹھ آئے۔ اس دوران انور کمال اور گل زمان آ گئے تھے۔ انور کمال نے بتایا کہ وہ فیروز کے کہنے پر فردوسی بیگم کے فلیٹ پر گیا تھا اور گلزار کے دروازے پر دستک دے کر اس نے گلزار کو بلا کر فردوسی بیگم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟ گلزار بیگم نے اس کے

بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی۔ اور اسے انتظار کرنے کو کہہ کر اپنے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ وہاں دو آدمی اور بھی بیٹھے تھے جو بظاہر اپنے چہرے مہروں اور لباس سے تو بھلے آدمی ہی لگتے تھے لیکن ان کی گفتگو کا انداز بالکل بازاری قسم کا تھا۔ انھوں نے باتوں کے دوران انور کمال سے ایسے سوالات کیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کے اور فردوسی بیگم کے تعلقات کی نوعیت جاننا چاہتے ہوں۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ خود تو فردوسی بیگم سے واقف بھی نہیں ہے۔ اسے ہاشم خان نامی ایک دوست نے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے فردوسی بیگم کے پاس۔ ہاشم خان کا نام سن کر گلزار بیگم نے بتایا کہ اس نے کل شام کو فردوسی بیگم کو ہاشم خان اور اس کے ایک دوست کے ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا، ان کے ساتھ ہاشم خان کا دوست پیرزادہ بھی تھا جس کی ایک ٹانگ زخمی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے وہ لوگ پیرزادہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد سے اس نے ان میں سے کسی کی بھی شکل نہیں دیکھی ہے اب تک۔ وہ دونوں آدمی گلزار بیگم کی بات سن کر چوکنا ہو گئے تھے۔ وہ، دونوں وہاں آپ ہی کے لیے بیٹھے تھے جیلانی صاحب! اور گلزار بیگم نے یہ ساری باتیں ان کے سامنے جان بوجھ کر ہی کی تھیں تا کہ وہ جان سکیں کہ ہاشم خان دراصل وہی شخص ہے جس کی انھیں تلاش ہے۔" انور کمال بولا "گلزار بیگم کی بات ختم ہوتے ہی ان میں سے ایک نے کہا: تو تم ہاشم خان کے دوست ہو اور اس کا پیغام لے کر آئے ہو فردوسی بیگم کے پاس؟'

میں نے جواب دیا۔ نہیں جی دوست تو نہیں ہوں، بس واقفیت ہے ذرا سی دیر کی۔ صبح میں کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن جا رہا تھا اپنے ایک عزیز کو لینے، وہ خیبر میل سے آنے والے تھے۔ راستے میں ایک شخص نے مجھے روک کر لفٹ مانگی، اسے بھی ریلوے اسٹیشن ہی جانا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کی ایک عزیزہ فردوسی بیگم کو جا کر صرف اتنا بتا دوں کہ ہاشم خان کو بہت جلدی میں لاہور جانا پڑ گیا ہے، وہ اس کا انتظار نہ کرے، بس جی اتنی سی بات تھی، میں نے ان سے یہاں کا پتا لے لیا اور اپنے عزیز کو گھر پہنچانے کے بعد یہاں چلا آیا۔ آپ لوگ ان کے پڑوسی ہیں، اگر ہو سکے تو فردوسی بیگم کو یہ پیغام پہنچا دیں اور مجھے اجازت دیں۔

انھوں نے میری باتوں پر یقین کر کے پیغام پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ اور مجھے واپس آنے کی اجازت دے دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اور میرا تعاقب کر کے اصل حقیقت جاننے کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ میں راستے بھر کسی ایسی گاڑی کو تلاش کرتا رہا جس پر تعاقب کا ذرا بھی شبہ کر سکوں لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ کسی نے میرا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ انھیں میرے بیان پر شبہ نہیں ہوا تھا۔"

"یہ تو یار تم نے بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔ آئزک وغیرہ کو اس کی اطلاع ملے گی تو وہ یہی سمجھیں گے کہ جیلانی لاہور چلا گیا ہے چنانچہ وہ لاہور میں مجھے تلاش کریں گے اور میں یہاں آرام سے ان کی قبریں بناتا رہوں گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر ایسا ہے تب تو ہمیں جلد از جلد بنگلے پر پہنچ جانا چاہیے۔ لزی یہ اطلاع ملتے ہی وہاں فون کر کے اس کی تصدیق کرنا چاہے گی، یہ بہترین موقع ہے جیلانی! اسے آزمانے کا۔" فیروز نے کہا: "چلو اٹھو جلدی کرو — ہمیں فوراً بنگلے پر پہنچنا ہے اب۔"

"میں سمجھا نہیں تمھارا مطلب؟" میں نے اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا: "اس طرح لزی کا امتحان کیسے ہو جائے گا؟"

فیروز آگے بڑھتے ہوئے بولا: "سیدھی سی بات ہے یار! وہ تمھیں فون کرے گی اور تم اس سے بات کرو گے تو اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ تم کراچی ہی میں موجود ہو، تمھارے لاہور جانے کی خبر غلط ہے۔ اس کے بعد اگر آئزک تمھیں لاہور میں تلاش کرنے کے بجائے کراچی ہی میں یہ کوشش کرتا رہتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہی ہو گا کہ لزی نے اسے تمھاری کراچی میں موجودگی کی خبر دے دی ہے۔"

میں نے اس کے ساتھ باہر آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں فیروز! اس طرح کی کسی بات سے لزی کے بارے میں ہم کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وہ جس عیّار قوم سے تعلق رکھتی ہے اسے پرکھنے کے لیے کوئی کسوٹی بنائی ہی نہیں جا سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ اسے دماغ سے نکال ہی دیں ہم اور اس کو بھی انھی لوگوں کی فہرست میں رکھیں جنھیں دیکھتے ہی گولی مار دینا ہے ہمیں۔"

"بات تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو برادر! خیر دیکھا جائے گا، ابھی تو وہ ہمارے کام ہی آ رہی ہے لہٰذا کچھ رعایت تو دی جا سکتی ہے اسے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں، جب وقت آئے گا کوئی فیصلہ کر لیں گے اس کے بارے میں۔ میرا خیال ہے ہم بنگلے کی طرف جاتے ہوئے اس کمینی کٹیا گلزار اور اس کے دونوں مہمانوں سے نمٹتے چلیں، اسے اب زیادہ مہلت نہیں دینا چاہیے ہمیں۔" میں نے کہا۔

"یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ لوگ ابھی تک گلزار کے فلیٹ پر موجود ہوں۔ ٹیلی فون ہے اس کے گھر میں؟" فیروز نے پوچھا۔

"مجھے پتا نہیں، اگر ہو گا تب بھی مجھے اس کا نمبر تو معلوم نہیں ہے۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہتا تھا ان دونوں کے بارے میں، اگر وہ ہوتے وہاں تو ہم چل کر دیکھ لیتے انھیں۔" فیروز نے جواب دیا۔

"وہ نہ بھی ہوئے تو گلزار تو ہو گی ہی نا۔ دشمن کی نفری جتنی بھی کم ہو جائے اچھا ہی ہے، اس کام میں سستی نہ کرو یار!" میں نے کہا۔

ٹھیک ہے، پھر یوں کرتے ہیں، میں اور انور کمال چلے جاتے ہیں وہاں۔ تم نیچے سیڑھیوں میں کھڑے رہو۔ ضرورت ہو گی تو بلا لیں گے ہم تمھیں بھی، ورنہ تمھارا ان لوگوں کے سامنے نہ جانا ہی اچھا ہے۔ انھیں اس غلط فہمی کا شکار ہی رہنے دو کہ تم لاہور چلے گئے ہو۔"

فیروز نے کار کا رُخ طارق روڈ کی طرف موڑ دیا۔ میں نے کہا: "مگر انور کمال ہے کہاں جو تمھارے ساتھ گلزار کے فلیٹ پر جائے گا؟"

"ارے تمھیں پتا ہی نہیں ہے کچھ۔ ذرا پیچھے نظر ڈالو انور کمال ہے یا نہیں۔" فیروز نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہماری کار سے کچھ ہی فاصلے پر انور کمال کی پیلی مزدا کار چلی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں نے پوچھا: "کیا تم نے اسے کوٹھی سے چلتے وقت پیچھے آنے کو کہا تھا؟"

"اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دونوں جانتے ہیں کہ انھیں کس وقت کیا کرنا چاہیے۔" فیروز نے جواب دیا۔

"یار! اس گل زمان نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کو لڑنے کا فن خوب آتا ہے۔ لگتا ہے جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ اس نے باقاعدگی سے سیکھا ہے، حالانکہ اپنی عمر کے اعتبار سے یہ بالکل ناتجربے کار ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ اسے ہمارے کچھ دشمنوں نے پاکستان میں تخریبی کارروائی کے لیے خصوصی تربیت دی تھی۔ بارہ برس کی عمر میں اس کے گاؤں کے ایک بااثر شخص نے اس کے باپ کو قتل کر کے اسے ایک گروہ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا جو اسمگلنگ کے لیے کم عمر بچوں کو استعمال کرتا ہے۔ اسی دوران ہمارے ملک کی ایک تنظیم نے اسے اسمگلروں کے چنگل سے نکال کر ایک بڑے ملک میں بھیج دیا، وہاں اسے بہترین تربیت دی گئی، ہر قسم کے ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ لڑنے کے وہ سارے ہی گُر سکھائے گئے جو دنیا کے بیشتر حصوں میں مروّج ہیں۔ لڑکا کیونکہ بے حد ذہین ہے اور اس کی یادداشت بہت تیز ہے چنانچہ جوان ہونے کے بعد بھی یہ اپنے باپ کی المناک موت کو بھولا نہیں تھا۔ پاکستان واپس آتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کو نہایت عبرت ناک انجام سے دوچار کیا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میں اسی علاقے میں تھا۔ یہ وہاں مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس نے مجھے ساری صورتِ حال بتا کر کہا کہ اسے اپنے ملک پاکستان سے بہت محبت ہے۔ بہت ہی کم سنی میں اس کے باپ نے اس کے دل میں یہ بات اتار دی تھی کہ آدمی کی پہچان اس کے اپنے ملک، اپنی زمین سے ہوتی ہے، اس سے ہمیشہ محبت کرو اور ملک کی سلامتی کے لیے اپنی جان بھی دینا پڑے تو کبھی دریغ نہ کرو۔ چنانچہ اسے ملک میں تخریبی کام کرنے کے لیے بھیجا گیا تو اس کے کانوں میں اپنے باپ کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے ملک کے مخالفوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، میں اس سلسلے میں اس کی مدد کروں کیوں کہ جس تنظیم نے اسے اس کام کے لیے تیار کیا ہے اگر اسے اس بات کا علم ہو گا تو وہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کا ساتھ دیا اور ہم دونوں نے مل کر ایسے تمام لوگوں کا خاتمہ کر دیا جنھیں گل زمان جانتا تھا کہ یہ اس تنظیم کے رکن ہیں۔ کیسے، کس طرح معلوم ہوا، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ خدا کو پاکستان کی سلامتی مقصود تھی اور اس نے ہمارے ذریعے یہ کام کروا دیا لیکن اسی دوران ہمیں پاکستان میں یہودیوں کی سرگرمیوں کا علم ہو گیا۔ چنانچہ ہم اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہی لوگ جو گل زمان کے معاملے میں ہمارے ساتھ تھے، اب بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ کچھ نئے لوگ بھی ہمارے ساتھ آ ملے ہیں، اللہ نے چاہا تو ہم اس بار بھی سُرخ رُو رہیں گے۔"

اس نے کار روک دی۔ ہم طارق روڈ پر اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ چکے تھے۔ فیروز مجھ سے کچھ بولے بغیر انجن بند کر کے کار سے اتر گیا۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ اسی وقت انور کمال نے اپنی کار ہمارے پاس لا کر روک دی۔ وہ اور گل زمان دونوں جلدی جلدی کار سے اُتر آئے اور سوالیہ نظروں سے فیروز کو دیکھنے لگے۔ فیروز نے کہا: "گلزار اور اس کے فلیٹ میں موجود دونوں آدمیوں کی چھٹی کرنا ہے۔"

"انور کمال بولا: "آپ دونوں یہیں رکیں، ہم ابھی پانچ منٹ میں یہ کام کر کے آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو ہم لوگ نیچے زینے میں موجود ہوں گے۔ فوراً سگنل دے دینا۔" فیروز نے کہا۔

وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ فیروز نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے مجھ سے کہا: "آؤ ہم ٹہلتے ہوئے چلتے ہیں اُدھر۔" ہم آرام سے ٹہلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ہم مطلوبہ عمارت سے دور ہی تھے کہ انور کمال اور گل زمان تیز تیز قدم

اٹھاتے ہوئے واپس آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس عمارت میں کسی کا قتل ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے پوری عمارت میں پولیس بھری پڑی ہے۔ اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ واپس چلیں اور اس معاملے کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔

ہم فوراً ہی واپس مڑ گئے۔ میں نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے انور کمال سے پوچھا "کچھ پتا نہیں چلا قتل کس کا ہوا ہے؟"

"یہ تو معلوم نہیں ہو سکا، صرف اتنا پتا چلا ہے کہ قتل کی یہ واردات دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں ہوئی ہے۔" انور کمال نے کہا۔

"دوسری منزل کے فلیٹ میں!" میں نے چونک کر کہا۔ "فردوسی بیگم اور گلزار کے فلیٹس بھی تو دوسری منزل پر ہی ہیں۔"

فیروز نے مسکراتے ہوئے مجھے کار میں دھکیل کر کہا "تم پریشان کیوں ہوتے ہو میرے بھائی! تمھاری وہ فردوسی بیگم تو یہاں ہے ہی نہیں لہٰذا اس کے قتل کا تو سوال ہی نہیں ہے کوئی اور اگر گلزار ماری گئی ہے تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہی ہوا ہے۔ تمھاری جان چھوٹ گئی اس سے۔ اس کے قتل کی زحمت سے بچ گئے تم۔ تمھارے اعمال نامے میں ایک قتل درج ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔"

"نہیں یار! ایسے نہ کہو، اس بنت الحرام کا قتل تو ایک اعزاز ہے میرے لیے۔ وہی تو ایک قتل ایسا ہو گا میرے نامۂ اعمال میں جو پچھلے تمام گناہوں کو دھو ڈالے گا۔ اسے تو میں اپنے ہاتھوں سے ہی قتل کروں گا، خدا کرے وہ کسی اور کے ہاتھوں سے جہنم رسید نہ ہوئی ہو ابھی۔" میں نے کہا۔

فیروز نے کار اسٹارٹ کر کے بلند آواز میں کہا "آمین" اور ہنستے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

میں اس وقت بہت سنجیدہ ہو رہا تھا لہٰذا فیروز کا یہ انداز مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ میں نے ذرا تلخی سے کہا "مذاق مت اڑاؤ میرا۔"

وہ ترچھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اوہو، تم تو سچ مچ سنجیدہ ہو اس وقت، چلو پھر میں اب کچھ بھی نہیں بولوں گا۔"

... اس معاملے کو جتنی جلدی نمٹانا چاہتا تھا یہ اتنا ہی طول پکڑتا جا رہا تھا۔ آئزک ہاتھ میں آ کر مچھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔ اور اب کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں کس روپ میں مل سکے گا، اس کی طرف سے ناامید ہو کر لزی کی طرف پلٹا تو وہ بھی میری پہنچ سے دور چلی گئی تھی اور اس کا جو نیا روپ سامنے آیا تھا اس نے چکرا کر رکھ دیا تھا ... کو۔ پھر آج گلزار کا قصہ ختم کرنے کا ارادہ کیا تو اس تک پہنچنا بھی ناممکن ہو گیا ... چانک مجھے خیال آیا کہ انور کمال نے گلزار کو یہ بتایا تھا کہ میں لاہور چلا گیا ہوں، یہ اطلاع آئزک کو بھی مل چکی ہوگی۔ لاہور میں اسے میرے گھر کا پتا ضرور معلوم ہو گا۔ چنانچہ وہ لاہور میں موجود تنظیم کے لوگوں کو میرے گھر بھیجے گا میری تلاش میں، اور وہ درندہ صفت لوگ میرے بارے میں جاننے کے لیے نہ جانے ماں جی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ وہاں ایسا ہے ہی کون جو اُن کی راہ روک سکے۔ حیدر ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا اور وہ ڈرائیور وہ تو پہلے ہی منافع میں جی رہا تھا، وہ ماں جی کو کیا تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ آسیہ پتا نہیں کہاں تھی۔ واپس ماں جی کے پاس پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ ایسی صورت میں ماں جی تو بالکل غیر محفوظ ہی تھیں۔ سب سے پہلے تو مجھے ان کی حفاظت کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔ اس خیال سے میرا دل لرز اٹھا۔ میں نے فیروز سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس سے، وہ بولا "کس خیال میں گم ہو بھائی، اترنا نہیں ہے، کیا اب کہیں اور جانے کا ارادہ ہے تمھارا؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ فیروز گاڑی کا میری طرف والا دروازہ کھولے کھڑا مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک پاؤں کار کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دھرتے ہوئے کہا۔ "ارے کیا ہم بنگلے پر پہنچ گئے؟ کمال ہے یار مجھے تو پتا ہی نہیں چل سکا۔"

"کیوں؟ تم کہاں کھوئے ہوئے تھے؟ موجودہ حالات میں گرد و پیش سے اتنی بے خبری اچھی بات نہیں ہے جیلانی! اس طرح تم کوئی بھاری نقصان بھی اٹھا سکتے ہو۔ دشمنوں کے درمیان آدمی کو ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہیے۔" فیروز نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کار سے اتر کر آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "بس یار وہ کچھ ایسا ہی خیال آ گیا تھا" اس گھڑی جس نے مجھے غافل کر دیا ہر طرف سے۔"

"شارع عام پر اپنے دماغ میں ایسے خیالات کو مت آنے دیا کرو، یہ بہت خوفناک بات ہے۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا "شرافت علی کی گاڑی کھڑی ہے یہاں معلوم ہوتا ہے وہ ہم سے کافی پہلے پہنچ چکا ہے۔"

"ہاں، پہنچ بھی جانا چاہیے تھا اسے۔ ہم نے پہلے تو گھر سے نکلنے ہی میں دیر کر دی تھی، پھر راستے میں پروگرام تھوڑا سا تبدیل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہاں پہنچنے میں اچھی خاصی دیر ہو گئی ہے ہمیں۔" میں نے جواب دیا۔

ہم اندر پہنچے تو شرافت علی ڈرائنگ روم میں بیٹھا کسی سے ٹیلیفون پر بات کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ٹیلیفون کے ماؤتھ پیس میں بولا "لیں جی وہ آ ہی گئے ہیں آخر، اب آپ خود بات کر لیں ان سے۔" اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ریسیور لینے کو ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا "کون ہے بھئی، کس کا فون ہے؟"

"خود ہی دیکھ لو، تمھارے پرستاروں میں سے ہی ہے کوئی۔ اور یہ کیا قصہ ہے بھئی؟ سنا ہے تم لاہور چلے گئے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے اس بات کا جواب دینے کے بجائے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا "ہیلو کون ہے بھئی؟"

دوسری طرف سے لزی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "آپ کہاں ہیں جناب عالی؟ میں کب سے تلاش کر رہی ہوں آپ کو۔"

"اوہ، تو یہ تم ہو۔ کہو کیا بات ہے، مجھے کیوں تلاش کر رہی تھیں تم؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ کوئی دو گھنٹے پہلے گلزار کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ آپ آج صبح گیارہ بجے کراچی ایکسپریس کے ذریعے لاہور روانہ ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ خبر درست ہو سکتی ہے اس لیے فون پر بات کر کے تصدیق کرنا چاہتی تھی۔" لزی نے جواب دیا۔

"آئزک کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟ کیا اسے بھی یقین نہیں ہے؟ اسی کے کہنے پر تو تصدیق نہیں کر رہی ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب عالی! ایسی باتیں نہ کریں مجھ سے۔ اسے تو میں نے یہی یقین دلایا ہے کہ آپ لاہور چلے گئے ہوں گے۔ خود اس کا بھی یہی خیال ہے کہ رات کو شرافت علی کی کوٹھی پر جس انداز میں ہلّہ بولا گیا تھا اس سے خوف زدہ ہو کر تم نے کراچی چھوڑ دی ہے۔" وہ بولی۔

"تو کیا اب وہ میرے پیچھے لاہور جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ یا لاہور میں موجود تنظیم کے لوگوں کو استعمال کرے گا میرے خلاف؟"

"وہ لاہور میں تنظیم کے سربراہ کو آپ کے لاہور روانہ ہونے کی اطلاع فون پر دے چکا ہے۔ یہاں وہ شرافت علی کو تمھارا ساتھ دینے کی سخت سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد خود بھی لاہور جانے کا پروگرام ہے اس کا۔ کیوں کہ آپ کے بارے میں اس نے قسم کھائی ہے، وہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا۔ لاہور کی تنظیم کے سربراہ کو اس نے ہدایت کی ہے کہ وہ لوگ آپ کو نظر میں رکھیں اور لاہور سے کہیں باہر نہ جانے دیں، باقی کام وہ خود لاہور پہنچ کر انجام دے گا۔" لزی نے بتایا۔

"یہ تو بہت بڑا اعزاز بخش رہا ہے وہ مجھے، آخر ایسی کیا بات ہے مجھ میں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتا ہے مجھے؟"

"آپ نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آستانہ چھوڑنے پر مجبور کیا ہے، اسے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ آستانے کی تباہی سے تقریباً ایک ارب روپے کی منشیات کے ذخائر تباہ ہو گئے ہیں جس پر وہ بُری طرح بلبلایا ہوا ہے۔"

"اچھا! اتنا بڑا ذخیرہ تھا وہاں۔ مگر میں نے جو اشیا جلائی ہیں وہاں ان کی مالیت تو شاید اتنی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی تھا وہاں بہت کچھ۔ ساٹھ کروڑ سے زیادہ کی تو صرف ہیروئن بھری ہوئی تھی ایک کوٹھڑی میں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے، آپ نے تو تنظیم کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے ایک ہی حملے میں۔ ان کے تو ہوش اڑے ہوئے ہیں۔" لزی نے جواب دیا۔

"اسی بوکھلاہٹ میں شرافت علی کی کوٹھی پر انھوں نے ایسے لوگوں کو بھیجا تھا جو اپنے ساتھیوں کی لاشیں تک نہیں اٹھا کر لے گئے۔ کیا آئزک نے اپنی اسی فوج کے بل پر مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی قسم کھائی ہے؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"ان کا تنظیم سے یا اس کی فورس سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ تو صرف قربانی کے بکرے تھے جنھیں آپ لوگوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ آئزک کا خیال تھا کہ شرافت علی چونکہ ایک عرصے سے ڈاکٹر دھمن کے لیے کام کر رہا ہے لہٰذا اس نے اپنی کوئی ٹیم بھی ضرور بنائی ہو گی۔ ٹیم کے بغیر کوئی شخص تنہا یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس حملے کا مقصد یہی جاننا تھا جو معلوم کر لیا گیا ہے اب۔"

"پھر اب کیا پروگرام ہے ان کا؟ اور کتنے آدمی مروانا چاہتے ہیں وہ شرافت علی کی کوٹھی میں؟" میں نے شوخ لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ میں شرافت علی کو بتا چکی ہوں آپ ان سے معلوم کر لیں اس بارے میں۔ میں اب سلسلہ منقطع کر رہی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے مجھے۔"

"لیکن ایک بات میری سُن لو پہلے۔ اس یہودی النسل کتے آئزک کو یہ بتا دو تم کہ میں لاہور نہیں گیا ہوں ابھی۔ اور جب تک اس کے سینے میں سانسیں باقی ہیں کہیں جاؤں گا بھی نہیں یہاں سے۔ چنانچہ وہ لاہور میں اپنے گرگوں کو بتا دے کہ وہاں میری ماں جی کو تنگ نہ کریں بالکل بھی، اگر ایسا ہوا تو کتے کی موت ماروں گا ان سب کو، میرا قہر و غضب دیکھا نہیں ہے انھوں نے ابھی۔ چین نہیں لینے دوں گا دنیا کے کسی خطے میں بھی۔"

"اگر ایسا ہی تھا تو آپ نے اپنے لاہور جانے کی افواہ کیوں پھیلائی تھی، یہ بات تو پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھی آپ کو۔" لزی نے کہا۔

"یہ کام میں نے نہیں کیا تھا اور نہ ہی جان بوجھ کر آئزک

کو گمراہ کرنے کے لیے کسی نے ایسا کیا تھا۔ بس اتفاقاً ہی ایسا ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں کسی نہ کسی طرح اس تک یہ بات پہنچا دوں گی۔ اب مجھے اجازت دیں اور میں نے شرافت علی کو جو کچھ بتایا ہے اس پر غور کر کے کوئی مناسب اور مؤثر کارروائی کریں اس سلسلے میں۔" لزی نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور کریڈل پر ڈال کر شرافت علی کی طرف پلٹا تو فیروز بولا۔

"یہ تم نے کیا کیا جیلانی! اپنے لاہور نہ جانے کی خبر دینے کو کیوں کہہ دیا ہے اس آٹزک کو؟ اسے غلط فہمی کا ہی شکار رہنے دینا چاہیے تھا نا؟"

"نہیں یار! یہ بے حد ضروری تھا۔ مجھے بعد میں خیال آیا اس کا کہ اس طرح وہ لوگ لاہور میں میری تلاش شروع کر دیں گے اور جب میں وہاں انھیں کہیں نہیں مل سکوں گا تو وہ ذلیل لوگ میری ماں جی کو پریشان کریں گے۔ ظاہر ہے وہ میرے بارے میں انھیں کچھ نہیں بتا سکیں گی لیکن یہ اُن کی بات پر یقین نہیں کریں گے، ان کی زبان کھلوانے کے لیے انھیں پتا نہیں کن کن اذیتوں سے گزاریں گے۔ ہماری اس غلط بیانی کی وجہ سے بےچاری ماں جی اس بڑھاپے میں اذیتیں سہنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ یہ تو بڑی شرم کی بات ہو گی میرے لیے۔"

"ہاں، یہ تم نے بالکل صحیح بات سوچی ہے، اس طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ یہ بہت اچھا کیا تم نے جیلانی کہ آٹزک کو اپنے کراچی ہی میں ہونے کی خبر دے دی۔ ماں جی پہلے ہی بہت دُکھی ہیں، انھیں زیادہ دُکھ نہیں دینا چاہیے ہمیں۔" فیروز بولا۔

میں نے شرافت علی سے پوچھا: "ہاں بھئی شرافت علی! تھیں کیا بتایا ہے لزی نے آٹزک کے آئندہ پروگرام کے بارے میں؟"

"اس نے مجھے فیڈرل بی ایریا کا ایک پتا لکھوایا ہے، وہاں آج رات دس بجے آٹزک نے تنظیم کے سرکردہ لوگوں کو جمع ہونے کے لیے کہا ہے۔ اس میٹنگ میں وہ لوگ اپنے آئندہ اقدامات کی منصوبہ بندی کریں گے۔ اس نے بتایا ہے کہ فی الحال انھوں نے اپنے تمام پروگرام ملتوی کر دیے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ ہم پر مبذول کیے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہم سب کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس کے بعد یکسوئی کے ساتھ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ وہ بیک وقت دو محاذوں پر تقسیم ہونا نہیں چاہتے۔ آج وہ یہی طے کرنے کے لیے جمع ہوں گے کہ ہمارا قصہ نمٹانے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کیا جائے۔ جس مکان میں وہ لوگ جمع ہوں گے اس کا سارا حدود اربعہ اس نے لکھوا دیا ہے مجھے۔ حفاظتی انتظامات کے لیے انھوں نے انسانوں سے زیادہ جانوروں پر بھروسا کیا ہے، گیٹ پر ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہو گا اور نہ ہی عمارت کے آس پاس یا اندر لان میں کوئی شخص ہو گا۔ وجہ اس کی یہ بتائی ہے اس نے کہ کوئی بھی غیر معمولی بات چونکہ پاس پڑوس والوں کو اس مکان کی طرف متوجہ کر سکتی ہے اور وہ کسی کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتے لہٰذا مکان کی چار دیواری کے اندر حفاظت کی غرض سے چند کُتّے چھوڑ دیے جائیں گے بس۔ لزی کا کہنا ہے اگر گیارہ بجے رات کو ہم اس مکان پر ریڈ کریں تو تنظیم کے کئی سرکردہ افراد آٹزک سمیت ہمارا نشانہ بن سکتے ہیں۔"

شرافت علی سے ساری تفصیل سننے کے بعد میں نے فیروز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا: "کیا کہتے ہو فیروز؟ اس لڑکی پر اعتبار کیا جائے یا نہیں؟ میرا تو خیال ہے ہمارے پاس کافی وقت ہے ابھی۔ اس مکان کے بارے میں چھان بین کر کے اپنا اطمینان کر لیا جائے پہلے۔ ہم نے لزی سے ملنے والی اطلاعات کے بارے میں یہی طے کیا تھا۔"

"ہاں، اگر شرافت علی کی کوٹھی پر حملے کی خبر کی طرح یہ خبر بھی درست ہوئی تو ہمیں اس کی تجویز پر عمل نہ کر کے بہت پچھتانا پڑے گا، بہتر یہی ہے کہ اس کی تصدیق کر کے عمل کر ہی لیا جائے اس پر۔" فیروز نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ کون اور کیسے معلوم کرے گا کہ لزی کا بیان غلط نہیں ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ کوئی چال نہیں چلی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، اپنا انور کمال ایک گھنٹے کے اندر اندر عمارت میں موجود تہ خانے تک کی معلومات اکٹھا کر لائے گا۔" فیروز بولا۔

"ارے ہاں، اسے تو میں بھول ہی گیا یار! وہ کہاں رہ گئے دونوں، ہمارے پیچھے ہی پیچھے تو آ رہے تھے وہ؟" میں نے کہا۔

فیروز میری بات سُن کر چونک پڑا، بولا: "ہاں، اس طرف تو میں نے بھی دھیان نہیں دیا اب تک۔ حالانکہ انھیں ہمارے ساتھ ہی آنا چاہیے تھا۔" پھر وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "ٹھہرو، میں دیکھ کر آتا ہوں انھیں باہر۔"

میں نے بھی اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا: "ہاں، دیکھو کہیں کسی مصیبت میں نہ گھر گئے ہوں وہ دونوں۔"

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے باہر نکلے مگر باہر آتے ہی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ انور کمال اور گل زمان ایک تقریباً چالیس سالہ، صحت مند اور دراز قد شخص کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ اس کا حلیہ بے حد خراب اور خستہ دکھائی دے رہا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، چہرے پر آنکھ کے نیچے چوٹ کے نشان تھے اور ہونٹوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ قریب آ کر گل زمان نے اسے دھکا دے کر میرے قدموں میں گرا دیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ کون ہے یہ اور کیا حالت بنا دی ہے تم لوگوں نے اس کی؟"

"یہ کون ہے، یہ بات تو یہ خود ہی بتلائے گا جناب! ہم نے اسے باہر گلی میں اس بنگلے سے آگے جو نیم کا درخت ہے اس پر سے اُترتے ہوئے پکڑا ہے۔ جس وقت آپ کی کار بنگلے میں داخل ہو رہی تھی، تب یہ نیم کی گھنی شاخوں میں چھپ کر آپ کو اپنی رائفل سے نشانہ بنا رہا تھا، آپ گیٹ پر رُکے بغیر اندر چلے آئے تھے، اگر آپ کو گیٹ کھلا ہوا نہ ملتا اور چند سیکنڈ کے لیے بھی باہر رُک کر گیٹ کے کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا تو یہ اپنا کام کر جاتا۔ ہماری کار آپ کی کار سے کافی پیچھے تھی اور ہم ارد گرد کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے چل رہے تھے، اسی وجہ سے ہم نے اسے دیکھ لیا۔ آپ کی کار بنگلے میں چلی گئی تو ہم نے اپنی کار کی رفتار دھیمی کر دی، اسے یہ پتا نہیں چل سکا کہ ہم لوگ آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔ یہ شاید اپنے ارادے میں ناکام رہنے کے بعد کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی غرض سے درخت سے نیچے اُترنے لگا اور اس کے نیچے آتے ہی ہم نے اسے جا لیا۔" انور کمال نے بتایا۔

اس اثنا میں وہ میرے قدموں میں سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "کیوں بھئی، کون ہے تُو اور ہم سے تیری کیا دشمنی ہے جو تُو ہمیں مار دینا چاہتا تھا جان سے؟"

"یہ لوگ خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں جی مجھے۔ میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں پھر دشمنی کیا ہو سکتی ہے۔ غلط فہمی ہو گئی ہے انھیں۔ ہاں جی بس غلط فہمی ہی میں ایسا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے مار مار کر میری یہ حالت بنا دی ہے۔ انھیں سمجھائیں جی کہ جانے دیں مجھے۔" وہ بولا۔

"ہوں، تو یہ بات غلط ہے کہ تم نیم پر چڑھ کر رائفل سے ہمیں گولی کا نشانہ بنا رہے تھے؟" فیروز نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ہاں جی بالکل غلط بات ہے یہ، دھوکا ہوا ہے انھیں۔ میں تو ادھر سے ایک ڈنڈی توڑ رہا تھا دانتوں کے لیے۔"

"اچھا! یہ تو بڑی غلط بات ہے یار! تم ڈنڈی توڑ رہے تھے اور ان دونوں نے سمجھ لیا کہ تم وہاں سے گولی چلانے کی کوشش کر رہے تھے ہم پر، یہ تو واقعی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے انھیں لیکن تم رائفل لے کر کیوں چڑھے تھے؟ شاید اسی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے یہ۔"

"ہاں جی بس یہی ایک غلطی ہوئی ہے مجھ سے۔ میں نے سوچا تھا رائفل نیچے چھوڑ دی تو کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔"

"تم رہتے کہاں ہو میرے بھائی؟ اور یہ رائفل کیا تم ہر وقت اپنے ساتھ لیے پھرتے ہو؟ لائسنس تو ہو گا نا اس کا تمھارے پاس؟"

"یہ اپنے دوست سے شکار کے لیے مانگ کر لایا تھا جی! میرا گھر اُدھر تیسری گلی میں ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، تم پتا بتاؤ، ہم آدمی بھیج کر معلوم کر لیں گے، اگر تم واقعی کوئی شریف اور بے ضرر آدمی ثابت ہوئے تو ان دونوں کو تمھارے ساتھ زیادتی کرنے پر سخت سزا دی جائے گی اور یہ معافی بھی مانگیں گے تم سے۔" فیروز نے اس سے کہا۔

"پتا... وہ... وہ جی.... اصل میں بات یوں ہے کہ ابھی کل ہی میں نے مکان کرائے پر لیا ہے، اس کا نمبر وغیرہ تو مجھے ابھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ آپ میری بات کا یقین کریں، میں کوئی غلط آدمی نہیں ہوں۔" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اچھا، چلو پھر اپنے اس دوست کا ہی پتا بتا دو جس سے یہ رائفل مانگ کر لائے ہو؟" فیروز نے اس کا جواب سُن کر کہا۔

"وہ... وہ... پتا تو جی اس کا بھی یاد نہیں ہے مجھے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

"نہ تجھے اپنا پتا یاد ہے اور نہ اپنے دوست کا۔ اوئے بڑا بھولا بھالا آدمی ہے بھئی تُو تو۔ ماں باپ کا نام بھی یاد ہے یا وہ بھی بھُول چکا ہے تُو؟" میں نے آگے قدم بڑھا کر ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر کے کہا: "اسے اندر لے چلو بھئی، میں دیکھوں گا کب تک اس کی یادداشت کام نہیں کرتی ہے۔ میں نے تو اچھے اچھوں کو فر فر بولنے پر راضی کر لیا ہے یہ تو شے ہی کیا ہے یار!"

انور کمال نے اسے آگے دھکا دیتے ہوئے کہا: "چل بھئی آگے بڑھ، تیری یادداشت ابھی کام کرنے لگے گی، بالکل ٹھیک ٹھیک۔"

وہ فیروز کی طرف مڑ کر عاجزی سے بولا: "انھیں سمجھائیں جی آپ، یہ زیادتی کر رہے ہیں میرے ساتھ، اچھی بات نہیں ہے یہ۔"

میں نے اسے دھکا دے کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "چل اوئے اُدھر، زیادتی کی اولاد! تیرا تو قیمہ کر کے کتّوں کو کھلا دوں گا میں، اگر تو نے سچ سچ بات نہیں بتائی تو۔ جانتا نہیں ہے بچّے تو مجھے۔ اندر چل، وہاں میں اپنا تعارف پیش کروں گا تجھے۔"

وہ دھکا کھا کر چند قدم آگے بڑھا پھر رک کر رحم طلب نگاہوں سے فیروز کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اُسے زبان کھولنے کا موقع نہیں دیا ـــــ اسے دھکا دے کر چند قدم اور آگے بڑھا دیا ـــــ انور کمال اور گل زمان نے بھی اسے آگے دھکیلنا شروع کر دیا۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس دوران شرافت علی بھی باہر آگیا تھا اور خاموش کھڑا اسے گھور رہا تھا جسے گل زمان اور انور کمال پکڑ کر لائے تھے۔ وہ بولا "اسے اُدھر لے چلو گیراج کے پیچھے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے ادھر مناسب انتظام کر رکھا ہے میں نے۔"

اس کے کہنے پر انور کمال اور گل زمان نے اس شخص کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے گیراج کی سمت لے چلے۔ ان لوگوں کے آگے جانے کے بعد فیروز نے شرافت علی سے کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم اس شخص کو جانتے ہو۔ کون ہے یہ شرافت علی؟"

"بہت خوب، بڑی تیز نظر ہے بھئی تمھاری، مگر تم نے اندازہ کیسے لگا لیا حالانکہ میں نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا؟"

"تم آنے کے بعد جس طرح خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے تھے، اس سے یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ تم اسے جانتے ہو، اگر تم اسے نہیں جانتے ہوتے تو فطری طور پر آتے ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ شخص کون ہے اور اسے کیوں پکڑ کر لایا گیا ہے۔" فیروز نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے برادر! دراصل میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا کہ یہ یہاں کس طرح پہنچ گیا اور آپ لوگوں کے ہاتھ کس طرح آگیا؟"

"اب زیادہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرو نا یار! بتاتے کیوں نہیں ہو کہ یہ شخص کون ہے اور کیوں حیران ہوئے تھے تم اسے دیکھ کر؟" میں نے شرافت علی سے پوچھا "اگر یہ تمھارا کوئی جاننے والا ہے تو اس کا یہاں پہنچنا اتنی حیرانی کی بات کیوں ہے؟"

"میں اسے صرف اس حد تک جانتا ہوں کہ یہ کشمیر خان کا آدمی ہے۔ باہر سے جو ٹرک کشمیر خان کا مال لے کر کراچی آتا ہے یہ ڈرائیور ہے اس ٹرک کا۔ اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ جو جگہ بتائی جائے وہاں جا کر مال اتار دے۔ اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی اسے یہاں دیکھ کر۔"

"لیکن اس کو گل زمان اور انور کمال نے رائفل سے ہمیں نشانہ بناتے دیکھ کر پکڑا ہے۔ یہ اس وقت یقیناً مجھے ہی گولی مار دینا چاہتا تھا جب ہماری کار بنگلے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ انور کمال کا کہنا ہے اگر بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا نہ ملتا ہمیں اور ہم باہر رک کر اس کے کھلنے کا انتظار کرتے تو ضرور اس کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ یہ اس بنگلے سے کچھ آگے جو نیم کا بڑا سا درخت ہے، اس پر چڑھا بیٹھا تھا۔ درخت پر سے اترتے ہی ان دونوں نے اسے جا پکڑا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر ہے کہ وہ آسانی سے ہاتھ نہیں آیا ہے ان کے۔"

"خیر، دیکھتے ہیں معاملہ کیا ہے، وہ زیادہ دیر اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا ہمارے سامنے۔" فیروز نے کہا۔

شرافت ہمیں گیراج کے پیچھے لے گیا۔ اس طرف بھی ایک ایسا ہی دروازہ تھا، جیسا گیراج کے سامنے والے حصے میں تھا۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ گیراج کے دونوں طرف دروازے رکھے گئے ہیں۔ اس طرف والے دروازے میں تالا نہیں پڑا تھا۔ شرافت علی نے کنڈی کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "اسے اندر لے چلو گل زمان۔"

یہ ایک علیحدہ ہی کمرا تھا۔ اس میں جا بجا پرانا سامان بکھرا تھا۔ شرافت علی نے ایک کونے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر سیڑھیاں ہیں نیچے جانے کے لیے۔ اسے نیچے لے چلو۔"

اس طرف نیچے اُترنے کے لیے کوئی باقاعدہ زینہ نہیں تھا بلکہ لکڑی کے کوئی چھ انچ چوڑے تختوں سے بنائی ہوئی ایک سیڑھی رکھی تھی وہاں۔ وہ اس سیڑھی کے پاس پہنچ کر کسی اڑیل گھوڑے کی طرح اڑ گیا، کسی طرح نیچے اُترنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ شاید سیڑھی دیکھ کر اسے خیال آگیا تھا کہ اس سیڑھی پر سے اسے زبردستی نیچے کوئی نہیں لے جا سکے گا۔ اس پر سے دو آدمی ایک ساتھ نہیں اُتر سکتے تو اسے لے کر نیچے اُترنے کی حماقت کون کرے گا۔ شاید اسے یہ بھی خیال ہو گا کہ نیچے زیرِ زمین کسی بند جگہ پر اس پر جس قدر تشدد کیا جا سکتا ہے وہ اوپر رہنے کی صورت میں نہیں ہو سکے گا۔ یہاں اس پر تشدد کرتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا ہو گا کہ اس کی چیخ پکار باہر نہ جا سکے۔ چنانچہ وہ ہماری اس مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ کسی طرح نیچے قدم دھرنے کے لیے رضامند ہی نہیں ہے تو آواز دے کر سخت لہجے میں کہا "گل زمان! اگر یہ خود سے نیچے نہیں جا رہا ہے تو تم دونوں اسے اٹھا کر نیچے پھینک دو۔ مہمان تو نہیں ہے نا یہ ہمارا کہ اس کی ناز برداریاں کریں گے۔ دھکا دے دو سالے کو نیچے۔"

میرا یہ حربہ کارگر رہا۔ وہ فوراً نیچے اُترنے لگا۔ ہم سب لوگ بھی ایک ایک کر کے نیچے پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا

کمرا تھا جسے اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں دیواروں کے ساتھ اسٹیل کی تین گرد آلود الماریاں دھری تھیں، چند لکڑی کے صندوق نیچے اوپر قرینے سے رکھے تھے۔ دو ٹوٹی ہوئی چارپائیاں بھی وہاں پڑی تھیں اور لوہے کی چار کرسیاں رکھی تھیں لیکن ہر چیز پر اتنی گرد جمی ہوئی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے یہاں کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ شرافت علی نے ایک الماری کھول کے نائلون کی ڈوری کا لچھا نکال کر گل زمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو، یہ ڈوری ہے تو بہت پتلی مگر مضبوط اتنی ہے کہ اس سے تم ہاتھی بھی باندھ سکتے ہو۔ یہ کرسیاں جو تم دیکھ رہے ہو نا، ان کے پائے زمین میں اتنی مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں کہ کسی کے لیے بھی کرسی کو ذرا سی حرکت دینا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کرائے کے قاتل کو ان میں سے کسی کرسی پر بٹھا کر اس ڈوری کے ساتھ باندھ دو اچھی طرح سے، اس کے بعد پوچھنا جو کچھ پوچھنا ہے لیکن پہلے اوپر جا کر وہ دروازہ بند کر آنا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ روشنی کا یہاں معقول بندوبست ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دائیں جانب دیوار میں لگے ہوئے سوئچ بورڈ کا ایک سوئچ آن کر دیا۔

کمرے میں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی۔ گل زمان ڈوری لے کر اس شخص کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "اب تم خود ہی ان چاروں میں سے کسی ایک کرسی کو منتخب کر کے بیٹھ جاؤ اس پر، اسی میں بھلائی ہے تمھاری۔ زیادہ اچھا تو یہ ہوتا کہ تم ہمیں تھکاتے اور اپنے آپ کو نیم جان کرنے سے پہلے ہی اپنے بارے میں سچ سچ سب کچھ بتا دیتے۔"

اُس نے گل زمان کو کوئی جواب دینے کے بجائے شرافت علی کو غضبناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو اپنے حق میں۔ کشمیر خان تمھاری نسلیں تک مٹا دے گا، تم جانتے ہو اسے اچھی طرح سے۔"

شرافت علی نے مسکراتے ہوئے کہا "میری فکر مت کرو پیارے! فی الحال تو اپنی خیر مناؤ، جن لوگوں کے قبضے میں ہو تم یہ بھی کم خطرناک لوگ نہیں ہیں، ان سب سے اب واسطہ پڑا ہے تمھارا تو ذرا تجربہ کر کے مجھے بھی بتانا کہ کیا کشمیر خان ان سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔"

گل زمان اور انور کمال نے اسے ایک کرسی سے باندھ دیا تو انور کمال اوپر کا دروازہ بند کرنے چلا گیا۔ میں نے کہا "یہ تو ہمیں پتا چل گیا ہے کہ تو کشمیر خان کا ڈرائیور ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تجھے اُسی نے بھیجا ہے یہاں، لیکن کیا اس نے مجھے قتل کرنے کو کہا تھا تجھ سے؟"

"نہیں، کشمیر خان نے قتل کرنے کو نہیں کہا تھا بلکہ اس نے تو مجھے ادھر بھیجا ہی نہیں ہے۔ اِدھر تو میں اپنی مرضی سے ہی آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا! تو تُو اپنی مرضی سے بھی ایسے کام کر لیتا ہے۔ نام کیا ہے بھئی تیرا؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو جیلانی! تمھیں میرے نام سے کیا لینا ہے؟" وہ بڑے ہی تلخ انداز میں بول رہا تھا۔

"وہ بھئی، بات یہ ہے کہ دو آدمی جب باہم گفتگو شروع کریں تو انھیں ایک دوسرے کے نام تو معلوم ہونا چاہئیں نا۔ اس کے بغیر وہ ایک دوسرے کو مخاطب کس طرح کریں گے۔ تجھے تو میرا نام پتا ہی ہے پھر اپنا نام بتانے میں کیا شرم ہے۔ کوئی ایسا ویسا نام تو نہیں ہے تیرا کہیں؟"

وہ غصّے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کابل خان نام ہے میرا، اس میں ایسی ویسی کیا بات دکھائی دیتی ہے تمھیں؟"

"میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا "اچھا تو کابل خان! اب یہ بھی بتا دو تمھیں میرے قتل پر کس نے مامور کیا تھا؟"

"مجھے کسی نے نہیں کیا تھا مامور وامور، میں نے کہا نا، میں خود اپنی مرضی سے آیا ہوں اِدھر۔" وہ غصّے سے بولا۔

"چلو یہی سہی، تم اپنی مرضی سے ہی آئے ہو، تو پھر یہ بتا دو دشمنی کیا ہے تمھیں مجھ سے؟ کیوں قتل کرنا چاہتے ہو مجھے تم؟"

"تم نے وعدہ خلافی کی ہے ہمارے ساتھ، عہد شکنی کی ہے تم نے۔ اس لیے واجب القتل ہو تم میری نظر میں..."

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "لیکن بڑے بھائی! میں نے تو آج پہلی بار شکل دیکھی ہے تمھاری، پھر کب اور کیا وعدہ کر لیا تھا میں نے تم سے، کون سا عہد کر بیٹھا ہوں جس کی پاداش میں تم میری جان لے لینا چاہتے ہو؟"

"مجھ سے نہیں، تم نے ڈاکٹر دھمن سے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر خان کا مال لے کر تم ایک بار امریکا اور جاؤ گے لیکن تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ تم نے ابھی تک خان سے ملاقات تک نہیں کی حالانکہ وہ تمھارے انتظار میں لاہور میں خوار ہوتا پھرا۔"

"اس کا مطلب ہے تمھیں کشمیر خان نے ہی بھیجا ہے میری تلاش میں۔" میں نے اس کی بات سُن کر کہا۔

"نہیں، تم خان کو درمیان میں نہیں لاؤ، اس نے مجھے نہیں بھیجا ہے، وہ تو اب تک دو بار مال بھیج چکا ہے اُدھر اپنا۔ اس کو پروا بھی نہیں ہے تمھاری لیکن میں ایسے آدمی کو بالکل پسند نہیں کرتا ہوں جو جھوٹا اور وعدہ خلاف ہو۔ میں نے اپنے طور پر پتا نکالا ہے تمھارا، اور خود ہی تم کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ تمھاری تقدیر ہی اچھی ہے کہ کابل خان کو گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔" وہ بولا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے جیلانی! اس طرح نہیں اُگلے گا، یہ سچی بات۔ تم ہٹو، میں زبان کھلواتا ہوں اس کی ابھی۔" فیروز بولا۔
"نہیں نہیں، تم ٹھہرو یار! یہ خود ہی بتا دے گا، کوئی زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی تمھیں اس کے ساتھ۔ کیوں ٹھیک ہے نا کابل خان؟" میں بولا۔
"جو بات تھی وہ میں تم کو بتا چکا ہوں، اب مانو یا نہ مانو، تمھاری مرضی ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں۔" وہ بولا۔
میں نے آگے بڑھ کر الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ پوری طاقت سے اس کے منہ پر مارا۔ "تو یوں نہیں ملنے گا کتے، لگتا ہے تیری کھال بہت مضبوط ہو چکی ہے، مگر تو جانتا نہیں ہے مجھے، میں آدمی کی کھال اتارنے میں بہت مہارت رکھتا ہوں۔"
اس نے غصّے سے سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "بزدل مجھے باندھ کے اپنی بہادری دکھاتا ہے۔۔۔"
گل زمان نے فوراً اس کی بات کاٹ دی، بولا "بیٹے! تیس مار خان! تیری طرح چھُپ کر تو گولی نہیں چلاتے ہم، ایسا ہی مارتے خان ہے تو چپ چاپ بندھوا کیوں لیا اپنے آپ کو سیدھی طرح بک دے سچ سچ ورنہ ایک ایک جوڑا کھاڑ دوں گا میں تیرا۔"
شرافت علی بولا "تم لوگ کیوں خواہ مخواہ اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو یار! یہ وطن فروش اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی رعایت کی جائے ان کے ساتھ۔ تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ، یہ تو خود بخود بولے گا ابھی، اس کرسی کی خصوصیات کا علم نہیں ہے ابھی اسے۔"
میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ سوئچ بورڈ کے پاس جا ٹھہرا، اور پھر اس نے نیچے جھک کر زمین سے ایک تار اٹھا لیا۔ تار کے سرے کو اس نے سوئچ بورڈ میں لگے ساکٹ کے اندر گھسیڑ کر ایک سوئچ آن کر دیا۔ اس کے ایسا کرتے ہی یوں لگا جیسے کابل خان کی گھگّی بندھ گئی ہو ایک دم۔ اس کے دانت بھنچ گئے تھے، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئی تھیں اور اس کا پورا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے جاڑے کا بخار چڑھ گیا ہو بُری طرح سے۔ شرافت علی نے لوہے کی ایک کرسی میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے سوئچ دوبارہ آف کر دیا لیکن اتنی ہی دیر میں اس کابل خان کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور زبان گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ شرافت علی نے کوئی ایک منٹ تک اس کے پُرسکون ہونے کا انتظار کرنے کے بعد پوچھا "ہاں بھئی کابل خان! کیا حال ہے اب تمھارا؟ سچ بولو گے یا ابھی اور ایک آدھ ڈوز کی ضرورت ہے؟ ایک بات سن لو کان کھول کر، اگر تم نے ضد نہیں چھوڑی اپنی تو میں سوئچ آن کرنے کے بعد اسے دوبارہ آف کرنا بھول بھی سکتا ہوں، میری یادداشت ایسی ہی ہے ذرا۔ بولو کس نے بھیجا تھا تمھیں اِدھر؟"
شرافت علی کا دیا ہوا یہ ایک ہی ڈوز کافی ہو گیا اس کے لیے۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی نظروں سے شرافت علی کو دیکھتا رہا۔ اس کا سارا اُبال جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ آنکھوں میں درندگی کی جگہ خوف سمٹ آیا تھا۔ اور جب وہ بولا تو اس کی آواز کسی بستر مرگ پر پڑے ہوئے شخص کی طرح نحیف اور بے جان تھی۔ اس نے کہا "میں اِدھر ہائی کمان کے حکم سے آیا تھا، تم کو قتل کرنے کے لیے۔"
"مجھے قتل کرنے کے لیے!" شرافت علی نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ہائی کمان نے میرے قتل کا حکم دے کر بھیجا تھا تمھیں؟"
اس نے جواب میں کچھ بولنے کے بجائے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے حیرت سے شرافت علی کو دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کس ہائی کمان کی بات کر رہا ہے شرافت علی؟ اسے تم سے کیا پرخاش ہے آخر؟"
"یہاں جتنے بھی کالے کاروبار کرنے والے ہیں، ان کی ایک باقاعدہ ایسوسی ایشن ہے۔ جس کے عہدیداروں کی یہ ذمّے داری ہوتی ہے کہ وہ اس کاروبار میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں دور کرتے رہیں، اپنے ممبران کے مفادات کو تحفّظ فراہم کریں اور اگر کبھی کسی پر کوئی اُفتاد آ پڑے تو اسے اس سے نکالنے کے لیے ہر ممکن اقدام کریں اور جائز و ناجائز جیسے بھی ہو اسے مصیبت سے نکالیں۔ ان لوگوں کے کام کی نگرانی تین افراد پر مشتمل ایک ہائی کمان کرتی ہے۔ کاروبار کے تحفظ کے لیے ضرورت کے وقت قاعدے قانون بنانا، ان پر عمل کرانا اور تمام اہم فیصلے کرنا، ہائی کمان ہی کے اختیار میں ہے۔ شاید کشمیر خان نے ہائی کمان کو میرے خلاف فیصلہ دینے پر مجبور کیا ہے۔"
"لیکن تم نے کشمیر خان کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے پھر وہ تمھارے خلاف کیوں ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں چونکہ کشمیر خان سے ہی مال لیا کرتا تھا، للہٰذا میرے کاروبار بند کرنے سے اسے خاصا نقصان پہنچا ہو گا۔ اس کے علاوہ شہر میں میرے جتنے بھی اڈّے تھے، ان پر جو لوگ کام کرتے تھے، وہ بھی اب بے کار ہو گئے ہیں۔ میں نے کسی کو پیشگی اطلاع نہیں دی تھی اپنا کاروبار بند کرنے کی اور چونکہ یہ قانون کے خلاف ہے اس لیے ہائی کمان میرے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا حق رکھتی ہے۔ گزشتہ ہفتے مجھے تین نوٹس مل چکے ہیں جن میں مجھے ہائی کمان کے روبرو پیش ہو کر جواب دہی کے لیے کہا گیا تھا۔

لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ ہائی کمان مجھ پر اس سلسلے میں روایت کے مطابق کوئی بھاری جرمانہ عائد کر دے گی جو میں ادا کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں سے میرے قتل کا حکم صادر ہو جائے گا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"
میں نے کابل خان سے کہا "تمھیں شرافت علی کے قتل کا حکم ملا تھا تو پھر تم نے ہم پر کیوں گولی چلانے کی کوشش کی تھی؟"
"مجھے کہا گیا تھا کہ شرافت علی کے ساتھ ساتھ اس کے اس بنگلے میں جو بھی موجود ہو، یا آتا جاتا دکھائی دے، میں اسے بھی قتل کر دوں۔"
میں نے چونک کر فیروز اور شرافت علی کو دیکھا۔ فیروز نے کہا "ہاں، تم ٹھیک سمجھے ہو جیلانی! اصل ٹارگیٹ تم ہی ہو ان کا، شرافت علی کو تو محض تمھارا ساتھ دینے کی پاداش میں لپیٹا گیا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور کسی کو آئندہ اس کی جرأت نہ ہو سکے۔"
میں نے سیڑھیوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اسے کابل خان کو ایسے ہی بندھا رہنے دو اِدھر اور سب لوگ چلو یہاں سے۔"
ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے شرافت علی سے کہا۔ "شرافت علی! کابل خان نے جو کچھ بتایا ہے اس سے تو یہی بات سامنے آئی ہے کہ تمھاری اس ایسوسی ایشن کو بھی آٹزک ہی کنٹرول کر رہا ہے در پردہ۔ اور وہ جو ہائی کمان ہے، وہ بھی آٹزک ہی کے آدمیوں پر مشتمل ہے۔"
"ہاں، میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ورنہ ہائی کمان ایسے معاملات میں ملوّث ہی نہیں ہوتی ہے۔ عموماً تو ایسوسی ایشن ہی تمام معاملات کو ٹھیک ٹھاک کر لیتی ہے۔ ہائی کمان تک تو بات اس وقت جاتی ہے جب نیچے والے کچھ نہ کر سکیں۔ میں تو یہی سوچ سوچ کر حیران ہو تا رہا تھا کہ میرا معاملہ براہِ راست ہائی کمان تک کیسے پہنچ گیا۔ اصل بات اب سمجھ میں آئی ہے۔" شرافت علی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
فیروز بولا "ایک اعتبار سے یہ ہمارے لیے اچھا ہی ہوا ہے۔ دشمن کے تین اہم مہرے اور ہماری نظر میں آ گئے ہیں، اب ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ یارو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بھی ہمارے ساتھ ہے، دشمن خود ہی بے نقاب ہو کر سامنے آتے جا رہے ہیں۔"
"ہاں، یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو برادر کہ ان لوگوں سے واقف نہیں ہوا ابھی، حقیقت یہ ہے کہ اب ہمارے راستے میں مشکلات زیادہ ہو جائیں گی، بہت ہی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑے گا اب ہمیں۔ ہم نے آستانے پر حملہ کرنے میں کچھ جلدی کر دی، اس کا احساس اب ہو رہا ہے مجھے۔ اس ذلیل یہودی، آٹزک کے ہاتھ کہاں کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں، یہ جانے بغیر اسے چھیڑنا نہیں چاہیے تھا ہمیں۔" شرافت علی بولا۔
"چھوڑو یار! لعنت بھیجو اس پچھتاوے پر، کیا صحیح ہوا اور کیا غلط، یہ سوچنے میں وقت ضائع نہ کرو، جو کچھ ہو گیا ہے اسے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے حسبِ منشا انجام تک پہنچانے کے بارے میں سوچو بس۔ مجھے بتاؤ، یہ ہائی کمان میں تمھاری کون کون لوگ ہیں؟" فیروز بولا۔
"یہ تو شاید کوئی بھی نہ بتا سکے تمھیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ تین بڑوں پر مشتمل ہے لیکن وہ بڑے کون سے ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں آتے اور نہ ہی براہِ راست کسی سے بات چیت کرتے ہیں۔" شرافت علی بولا۔
"لیکن تم نے تو ابھی بتایا تھا کہ تمھیں ہائی کمان کے روبرو پیش ہونے کے سلسلے میں تین نوٹس مل چکے ہیں۔ اگر وہ کسی کے سامنے نہیں آتے اور براہِ راست بات چیت نہیں کرتے تو تمھیں جواب دہی کے لیے کس کے سامنے پیش ہونے کو کہا گیا تھا؟" فیروز بولا۔
شرافت علی مسکراتے ہوئے بولا "اس کا ایک مخصوص طریقۂ کار ہے۔ اگر میں اس کے لیے آمادہ ہو جاتا تو مجھے بتایا جاتا کہ مجھے کب اور کہاں پہنچنا ہے۔ مقررہ وقت پر مقررہ مقام پر پہنچنے کے بعد مجھ کو ایک کمرے میں بٹھا دیا جاتا اور میرے سامنے مائک رکھ دیا جاتا۔ پھر میرے سامنے دیوار پر یا کسی طرف لگے ہوئے سینما اسکرین کی طرح کے ایک پردے پر بالکل سینما ہی کی طرح عکسی تحریر کے ذریعے میری فردِ جرم مجھے پڑھوائی جاتی۔ مجھے جو کچھ کہنا ہوتا اپنی صفائی میں وہ میں مائک پر کہہ سکتا تھا لیکن میری ہر بات کا جواب مجھے اسی پردے پر ہی ملتا، آواز کسی کی بھی سنائی نہیں دیتی مجھے۔"
"کمال ہے بھئی، یہ تو بالکل پردہ نشین خواتین کا انداز ہے لیکن اتنی زیادہ احتیاط تو وہ بھی نہیں کرتیں۔ پردے کے پیچھے سے جواب تو دیتی ہی ہیں وہ۔ اگر خود نہ دیں تو اپنی کسی ملازمہ یا بچے کے ذریعے دیتی ہیں، گھر کو سینما ہال تو نہیں بناتیں وہ بھی۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے بھائی! اگر ایسا ہے تو ان کے لیے ہمیں بھی کوئی ایسا ہی پیچیدہ اور پوشیدہ قسم کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ بہر حال چھوڑیں گے ہم انھیں بھی نہیں، کسی نہ کسی چوہے دان

میں تو پھنسنا ہی پڑے گا انھیں۔ بقول شخصے بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آخر تو ایک دن اسے چھری کے نیچے آنا ہی پڑے گا۔" فیروز بولا "یہ بتاؤ اس کابل خان کا کیا کروگے اب تم ہلسے چھوڑا تو نہیں جاسکتا بالکل بھی۔"

"کرنا کیا ہے یار! سلسلے کے پارچے بنا کر واپس بھیج دو اُدھر ہی جدھر سے آیا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی بھائی شرافت علی! اس کابل خان کو ہی کیوں بھیجا گیا ہے اس کام کے لیے؟ کیا یہاں کراچی میں ان کے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے جیلانی! اسے بھیج کر وہ مجھے اور دوسرے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ میرا قتل کشمیر خان کی شکایت پر ہوا ہے۔ کیوں کہ قواعد کی رو سے جو شخص کسی کے خلاف شکایت لے کر آتا ہے، جُرم ثابت ہو جانے کے بعد تجویز کردہ سزا اسے خود ہی دینا ہوتی ہے، چاہے وہ خود یہ کام کرے یا اپنے کسی آدمی کے ذریعے کرائے۔ تین مہینے کے اندر اندر اسے فیصلے پر عمل درآمد کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ تین ماہ میں ایسا نہ کرسکا تو فیصلہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ پھر سزا نہیں دی جا سکتی کسی کو۔"

"اچھا! یہ بھی ہوتا ہے! یہ تو بڑا عجیب قانون ہے یار تمھاری دنیا کا، کاش ہمارے ملک میں بھی یہی قانون نافذ ہو جائے۔" میں بولا۔

"دنیا جہنم بن جائے اگر ایسا قانون ملکوں میں نافذ ہو جائے تو۔ سانس لینا مشکل ہو جائے گا عام آدمی کے لیے۔" فیروز نے کہا۔

"اوئے چھوڑو یار! پہلے ہی کون سی یہ دنیا فردوس بریں کا منظر پیش کر رہی ہے۔ عام آدمی کی زندگی تو اب بھی کانٹوں کی سیج ہی ہے پیارے بھائی! آدمی تو یہاں زندگی گزارتا ہی دکھائی نہیں دیتا۔ یوں لگتا ہے جیسے زندگی آدمی کو گزار رہی ہے۔" میں نے کہا۔

انور کمال اور گل زمان بے ساختہ قہقہے لگانے لگے۔ فیروز اور شرافت علی بھی ہنس پڑے تھے۔ فیروز بولا "تمھاری یہ بات مجھے پسند آئی ہے جیلانی! تم انتہائی ناسازگار حالات میں بھی پریشان نہیں ہوتے، ہنسنے ہنسانے کی باتیں ایسے موقعوں پر بھی کرتے رہتے ہو۔"

میں نے ایک دم بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا [illegible] کے حملے اور اس وقت کی کارروائی کا جواب دینے سے [illegible] لزی کی آج کی اطلاعات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے ہمیں۔ اگر ہمیں پچاس فی صد بھی کامیابی ہوئی تو سارا حساب صاف ہو جائے گا ان کا اور رات جو لوگ مارے گئے ہیں ان کے وہ سمجھ لو کہ ہمارا منافع ہوگا۔ کیوں دوستو! کیا رائے ہے تم لوگوں کی اس بارے میں؟"

"حالانکہ لزی کے کہنے کے مطابق رات کی کارروائی میں کرانے کے لوگ شامل تھے سب، ان میں تنظیم کا ایک بھی شخص نہیں تھا۔ پھر بھی تم انھیں اپنے منافع میں شامل کر رہے ہو؟ ان کے مرنے سے تنظیم کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔" شرافت علی بولا۔

"وہ کوئی بھی ہوں، آئے تو تنظیم کی ہی طرف سے تھے نا۔" فیروز بولا "یہ تو ہوگا۔ جوابی کارروائی تو ہماری طرف سے ہوگی تاکہ وہ یہ جان لیں کہ ہم ان کے مقابلے میں کوئی گئے گزرے نہیں ہیں۔ ہمارے ذرائع اور وسائل بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں، پھر ایک خفیہ مقام پر کی جانے والی خفیہ میٹنگ کے دوران ہماری کارروائی انھیں بوکھلا کر رکھ دے گی۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان کے درمیان ہمارے آدمی بھی موجود ہیں اور یہ بے حد خوفناک بات ہوگی ان کے لیے۔ وہ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں گے — اپنے نہایت قابلِ اعتبار آدمیوں کے سامنے بھی زبان سے کوئی بات نکالتے ہوئے ڈریں گے۔ یوں ان کی رفتار بہت سست ہو جائے گی۔ پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھانے پر مجبور ہو جائیں گے وہ۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے بھائی! مگر پہلے اس کی تصدیق تو کرالو کہ لزی کی اطلاع درست بھی ہے یا نہیں۔"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا نا یہ کام اپنے انور کمال کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، چٹکی بجاتے میں ہو جائے گا۔" فیروز نے کہا۔

انور کمال جلدی سے بولا "ہاں ہاں، اگر میرے کرنے کا کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں آپ لوگ، میں تیار ہوں ہر وقت [illegible] کے لیے۔"

شرافت علی نے اسے لزی کا بتایا ہوا پتا سمجھا کر کہا "اس مکان میں رات کو دس بجے آنزک نے اپنے خاص خاص [illegible] تمھیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں کون [illegible] آیا یہ اطلاع درست ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ [illegible] حفاظتی انتظامات کس قسم کے ہیں۔ بغرض جتنی بھی زیادہ [illegible] ہو سکیں معلومات حاصل کرنا ہیں تمھیں۔"

"ٹھیک ہے جی، آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ شام [illegible] آپ کو اس سلسلے میں ایک ایک تفصیل معلوم ہو جائے گی۔"

[illegible] ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے شرافت علی سے کہا "میں بھی ذرا لاہور فون کرکے ماں جی کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں، لزی بتا رہی تھی کہ آنزک نے اپنے لاہور کے ایجنٹ کو فون کرکے مجھے لاہور میں تلاش کرنے کو کہا ہے۔ کہیں وہ ذلیل لوگ ماں جی کو پریشان کرنے نہ پہنچ گئے ہوں۔ ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے یار! خواہ مخواہ بڑھاپے میں انھیں اذیتیں دینا شروع نہ کر دیں کہیں۔"

"ہاں۔ یہ ضرور کرو تم جیلانی! اور ان سے کہہ دینا کوئی تمھارا پتا پوچھے تو اسے بتا دیں تم کراچی میں ہو۔" فیروز بولا۔

میں نے فوراً ٹیلیفون اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور لاہور میں اپنے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف بیل بج رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں کافی دیر انتظار کرنے کے بعد پریشان ہو کر ریسیور رکھنے کو ہی تھا کہ اُدھر سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ وہ حیدر تھا۔ میں نے اس کی آواز سن کر غصے سے کہا "اوئے حیدر کے بچے! کدھر مر گیا تھا تو؟ کتنی دیر سے گھنٹی بج رہی تھی فون کی!"

وہ میری آواز سن کر ایک دم چلّایا "ارے یہ آپ ہیں صاحب جی! السلام علیکم جناب! گھنٹی کی آواز تو سنی تھی میں نے جی، پر میں یہ سمجھا کہ باہر کے دروازے پر آیا ہے کوئی۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا اب چاہے جتنی بھی گھنٹی بجائے کوئی، میں جا کر نہیں دیکھوں گا، پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آج ان لاہور والوں کو، سویرے سے ہر دو چار منٹ بعد کوئی آ کے گھنٹی بجا دیتا ہے۔ جا کر دیکھو تو ہر دفعہ کوئی نیا آدمی کھڑا ہوتا ہے اور ایک ہی سوال پوچھتا ہے۔ جیلانی صاحب ہیں۔ میں تو جی تنگ آگیا ہوں لوگوں کو جواب دیتے دیتے۔ یوں لگتا ہے جیسے آج سب کو آپ کی یاد بُری طرح ستانے لگی ہے....." وہ مسلسل بولے [illegible] چلا جا رہا تھا، چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اوئے تو نے بھنگ تو نہیں پی لی ہے آج؟ چُپ ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔"

"او ہو، بس جناب! ناراض نہ ہوں، میں اب نہیں بولوں گا بالکل بھی، بس سنتا ہی رہوں گا۔ بولیں کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

میں نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا "اوئے حیدر! سیدھے دا پُتر بن جا، نہیں تو ماں جی سے کہہ کر تیرے دونوں کان اکھڑوا دوں گا۔"

صاحب جی، آپ تو اب بس خواہ مخواہ ہی نا [illegible] رہے ہیں، میں تو بول بھی نہیں رہا ہوں کچھ۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"اچھا ایک بات بتا، تو نے گولی کھائی ہوئی ہے نا؟" میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"نا جی نا۔ میں نے نہیں کھائی ہے وہ سالا اپنا کبری ہے نا، اس نے زبردستی کھلا دی تھی، بس ایک چنے جتنی تھی جی، میں نے بھی اس کا دل توڑنا اچھا نہیں جانا تھا جناب! یہ سوچ کے کھالی کہ چلو اتنی سی تو ہے کھا لوں گا تو کیا بگڑ جائے گا۔" وہ پینک میں بولتا چلا گیا۔

میں نے کہا "اچھا، یہ کبری کہاں سے آمرا ادھر؟ اسے بھی آج ہی آنا تھا، کہاں ہے اب وہ؟"

"وہ ادھر بالی کے پاس بیٹھا ہے جی، اور آئے گا کدھر سے، وہ تو اب رہتا ہی ہمارے ساتھ ہے۔ ماں جی نے یہیں رکھ لیا ہے اسے۔"

"کیا مطلب؟ کیا بک رہا ہے تو؟ وہ آہو کو چھوڑ کر یہاں کیوں رہ رہا ہے؟ کیا آہو نے نکال دیا ہے اسے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے جناب! کیا بات کہہ رہے ہیں آپ، وہ آہو صاحب اب کہاں ہیں اس دنیا میں۔ ان کا تو کریا کرم ہو چکا ہے جی کب کا۔"

"کیا... کیا... کیا کہہ رہا ہے تو؟ کیا ہوا تھا انھیں؟ یہ اچانک کیسے فرشتۂ اجل نے تاک لیا انھیں؟"

"وہ جی بس..... وہ تھی نا ان کی بیگم.... وہ جی کیا نام تھا ان کا.... مجھے تو نام بھی یاد نہیں آرہا ہے ان کا اس گھڑی...."

"سروری خانم۔" میں نے اسے اٹکتے دیکھ کر جلدی سے سروری کا نام بتا دیا۔

"ہاں ہاں جی وہی..... وہی سروری خانم.... [illegible] اس نے کچھ ساز باز کر لی تھی ملک الموت سے شاید۔ کبری بتا رہا تھا جی کہ انھوں نے ایک روز اس سے یہ ڈھیر سارا کانچ بالکل باریک میدے جیسا پسوایا تھا، پھر اسی رات کو اسے شراب میں ملا کے پلا دیا آہو صاحب کو۔ بس پھر کیا تھا صبح تک ان کے اندر کچھ بھی نہیں بچا، دل، گردے، کلیجی، پتہ، بڑے آنتیں، اوجھڑی، سبھی کچھ تو کٹ کٹ کر نکل گیا۔ بچارہ دل کا [illegible] آپ ہی بتائیں جناب! اتنے نقصان کے بعد کوئی جی سکتا ہے اس دنیا میں؟"

"اچھا، ایسا کیا ہے اس سروری خانم نے بڑی خطرناک نکلی بھئی یہ عورت تو۔ وہ ہے کہاں اب؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جی، اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے بعد آدمی کہاں ہو سکتا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں سے۔"

وہ بولا۔

میں نے کہا "اوئے حیدر! تُو تو یار بقراط ہوتا جا رہا ہے، مجھے لگتا ہے تیری کھوپڑی کچھ تیز کام کرنے لگی ہے آج کل۔ اور تیری جو نصف بہتر ہے بالی، اس کا کیا حال ہے بھئی۔ ماں جی کا بھی کچھ کام شام کرتی ہے یا بس تیری خدمت کر کے جنت کما رہی ہے وہ؟"

"بالکل ٹھیک ہے جی وہ، موٹی بہت ہوگئی ہے۔ مجھے تو جناب وہ گھاس ہی نہیں ڈالتی آجکل، ہردم ماں جی کی خدمت میں ہی دست بستہ کھڑی رہتی ہے۔ وہ تو جناب، کھاتی پیتی بھی ماں جی کے ہی ساتھ ہے۔ جبھی تو چربی چڑھ گئی ہے اس پر۔"

"اچھا، وہ ماں جی کہاں ہیں اس وقت، کیا کر رہی ہیں وہ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں صاحب جی وہ۔ اور کرنا کیا ہے انھیں، اللہ اللہ کرتی ہوں گی یا سو رہی ہوں گی وہ۔" حیدر نے کہا۔

"اچھا، ذرا جا کر دیکھ کیا کر رہی ہیں وہ۔ اگر سو نہیں رہی ہوں تو میری بات کرا دے ان سے۔" میں نے اس سے کہا۔

"بہت اچھا جی، ابھی جاتا ہوں۔ اتنے میں آپ کبری سے باتیں کر لیں، بہت یاد کرتا ہے آپ کو، بلاؤں اسے؟"

"ابھی نہیں، پہلے ماں جی کو دیکھ کر آ، ان سے بات کرنے کے بعد کبری سے بھی بات کروں گا۔ اس سے تو بہت سی باتیں کرنا ہیں مجھے۔"

"ٹھیک ہے جی، میں ابھی دیکھتا ہوں جا کر انھیں، آپ بس ایک منٹ ٹھہریں۔" اس کے ساتھ ہی لائن پر سناٹا چھا گیا۔

ایک منٹ کے بعد میرے کانوں میں ماں جی کی آواز امرت بن کر ٹپکنے لگی "ہیلو پُتّر! غلام جیلانی! خیر سے تو ہے نا تُو؟"

"اوہ، ماں جی السلام علیکم۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا؟" میں نے ماں جی کی آواز سنتے ہی کہا۔

"ٹھیک میں کدھر ہو سکتی ہوں پُتّر! جس ماں کے جگر کے ٹکڑے اس کے پاس نہ ہوں، وہ ماں کبھی سکھی رہ سکتی ہے بیٹا؟ یہ تو نہیں سمجھ سکتا ابھی۔ نہ تُو نہ آسیہ۔ تم دونوں نہیں سمجھ سکتے اس بات کو۔ کیوں کہ تم دونوں ہی اولاد والے نہیں ہو۔"

ماں جی کے ان الفاظ نے میرا دل کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ سینے میں ایک ہوک سی اٹھی اور کوئی گولا حلق میں آ کر پھنس گیا، آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ کیسا بدنصیب تھا میں، اپنے ماں کے سینے کی ٹھنڈک بننے کے بجائے انھیں انگاروں پر لوٹا رہا تھا میں۔ مجبوریوں نے مجھے کیسا بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تھا اور یہ میری خم پارہ تقدیر مجھے اپنی مرضی سے ایک قدم چلنے نہیں دیتی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں بڑا بدنصیب ہوں ماں جی! آپ دُعا کریں میرے حق میں، خدا سے التجا کریں کہ وہ میرے پیر دل کی زنجیریں کاٹ دے تاکہ میں آپ کے پاس آسکوں۔"

"تیرا کیا خیال ہے، کیا ایک ماں اپنے جگر گوشوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے صحیح سلامت دیکھنے کے سوا کوئی اور دُعا بھی کرتی ہوگی اپنے رب سے۔"

"نہیں نہیں، ماں جی! ایسا نہ کہیں، میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کبھی۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں، آپ کی یہ ناراضی بجا ہے ماں جی! یہ حق ہے آپ کا، میرے جیسے نالائق اور نافرمان بیٹے کی ماں اس سے راضی رہ بھی کس طرح سکتی ہے؟ میں تو آپ کو راضی کرنے کے لیے اب کچھ... بھی نہیں کہہ سکتا۔ جو کچھ پہلے کہتا رہا ہوں، اس کے بعد اب رہ ہی کیا گیا ہے میرے پاس کہنے کو؟"

میرے اس درد بھرے لہجے نے ماں جی کی ساری ناراضی جیسے دھو کر رکھ دی تھی۔ وہ ماں تھی جس کے سینے میں اپنی اولاد کے لیے ممتا کے سوا کچھ اور سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اولاد چاہے جیسی بھی ہو، ساری زندگی ماں کو دُکھ دیتی رہے، اسے انگاروں پر لوٹاتی رہے مگر وہ اولاد کی آواز میں لکنت دیکھ کر اپنے سارے دُکھ، ساری اذیتیں بھول جاتی ہے۔ میری ماں جی میرے لہجے کی بھرّاہٹ اور آواز کے بھاری پن سے ایک دم موم ہوگئی تھی۔ جلدی سے بولی "نہیں نہیں بیٹا! تُو جی میلا نہ کر اپنا۔ ناراض نہیں ہوں میں بالکل تجھ سے۔ وہ تو نے اس بدبخت آسیہ کا پتا کیا؟ جب سے گئی ہے واپس نہیں لوٹی ہے اب تک، اس کے لیے جی بہت پریشان رہتا ہے۔"

"وہ اُدھر شکارپور میں ہے ماں جی! اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ سے بڑی شرمندگی ہے اسے، اسی لیے آپ کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھا بجھا کر آپ کے پاس بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ماں جی کو جھوٹی تسلّی دی۔

"اور تو خود کب تک آئے گا بیٹا! کوشش کرو کہ تم دونوں ساتھ ہی ساتھ آجاؤ۔" ماں جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے ماں جی! اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد آسیہ کے ساتھ آپ کے پاس آجاؤں گا۔ پھر میں آپ کو حج پر بھیج دوں گا ماں جی! کیوں ٹھیک ہے نا؟ اُدھر مدینے اور مکے میں آپ میرے اور آسیہ کے لیے دُعا کریں گی نا جا کر۔"

"ہاں ہاں، بیٹا کیوں نہیں، ضرور جاؤں گی میں اس بڑی سرکار میں۔ وہاں میری دُعائیں ضرور سنی جائیں گی۔"

ماں کا رشتہ بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ ذرا سی دیر میں نے محبت اور اپنائیت سے باتیں کیں تو ماں جی کا سارا غصّہ یوں بیٹھ گیا جیسے انھیں غصّہ آیا ہی نہ ہو کبھی۔ ساری کدورت، سارے گلے شکوے پل بھر میں ختم ہوگئے تھے، سب کچھ بھول گئی تھی وہ، اور صرف یہ یاد رہ گیا تھا اسے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور وہ مجھ سے ہم کلام ہے۔ میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اپنی اور آسیہ کی باتیں، لاہور اور کراچی کی باتیں۔ وہ بے حد خوش معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے آج فیصلہ کر لیا تھا، جب تک ماں جی خود ہی منع نہ کریں گی میں ان سے باتیں کرتا ہی رہوں گا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد انھوں نے کہا "اچھا پُتّر! اب تو آرام کر، میں بھی نماز پڑھ لوں، عصر کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! آپ تھک بھی گئی ہوں گی اب۔ جائیں نماز پڑھ کر آرام کریں جا کر اور یہ فون اسے حیدر کو پکڑا دیں۔"

"اچھا بیٹا! میں ابھی بھیج دیتی ہوں اسے۔ اچھا رب راکھا!" وہ ریسیور رکھ کر چلی گئیں شاید۔

چند لمحے کے بعد مجھے حیدر کی آواز سنائی دی "جی صاحب جی! حکم کریں۔"

میں نے کہا "حیدر! وہ کبری کہاں ہے؟ اسے بلا بھئی، میں بات کروں گا اس سے اب۔"

"لیں جی کریں بات، یہ اِدھر میرے پاس ہی کھڑا ہے۔" حیدر نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی کبری کی آواز سنائی دی "سلام علیکم اوستاد! یہ میں کبری بول رہا ہوں۔ کیا حال ہے تمھارا؟"

"میں تو ٹھیک ہوں پر تُو یہ بتا، یہ حیدر کیا کہہ رہا ہے؟ کیسے ہوگیا بھئی یہ سب کچھ؟ میرا مطلب ہے وہ آہو اور سروری خانم.... کیا قصّہ ہے بھئی یہ؟ کچھ بتا تو، مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے بالکل۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ.... اوستاد! بس کیا بتاؤں، وہ عورت تو آہو صاحب کی بھی اوستاد نکلی۔ سارا جھگڑا ہی مکا دیا جی! اس نے تو ایک ہی رات میں۔ آہو صاحب نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کی موت ایک زنانی کے ہاتھوں لکھی ہوگی۔"

"مگر ہوا کیا تھا بھئی؟ آخر یہ نوبت آئی کس طرح؟ ویسے وہ سروری سرکش تو بہت پہلے سے ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"وہ جی ان دونوں کے درمیان جھگڑا تو بہت دنوں سے چل رہا تھا۔ آہو صاحب کو اس کے چال چلن پر شبہ تو رہتا ہی تھا۔ اس بچّے کی ولادت باسعادت نے اس شبہے کو یقین میں بدل دیا۔ بس اسی بات پر جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ تمھیں تو پتا ہے اوستاد کہ آہو صاحب کی نظریں اپنے سُسر ہادی علی کی زمینوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کے لیے انھوں نے ہادی علی کو تمھارے ہاتھوں ختم کرایا تھا۔ پھر وہ چھوٹی بی بی مسند آرا کو راستے سے ہٹانے کے لیے موت کے منہ تک لے آئے تھے لیکن جب سے خانم کے ساتھ ان کی لڑائی شروع ہوئی تھی، ان کی سوچ نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا تھا۔ اب وہ سروری خانم سے جان چھڑا کر مسند آرا بی بی سے شادی کرنے کی فکر میں تھے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے وہ۔ یعنی یہ کہ سروری خانم سے نجات بھی مل جاتی انھیں اور مسند آرا سے شادی کے بعد ہادی علی کی زمینداری بھی ان کے قبضے میں آجاتی۔ سروری خانم بھی جانتی تھی آہو صاحب کی نیّت کیا ہے چنانچہ وہ ان کے آگے سینہ سپر ہوگئی اور جب اس نے دیکھا کہ اب آہو صاحب اس کے ہاتھوں سے نکلنے کے لیے پر پھڑپھڑا رہے ہیں تو ایک رات وہ آہو صاحب پر مہربان ہوگئی۔ اس نے ان سے رو رو کر معافی مانگی اور یہ یقین دلایا کہ وہ مسند آرا سے ان کی شادی کی راہ میں حائل نہیں ہوگی بلکہ خود مسند آرا کو ان سے شادی پر آمادہ کر کے ان کی شادی اس سے کرا دے گی۔ آہو صاحب تو پہلے ہی کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو مسند آرا کو راضی کر سکے ان سے شادی کرنے کے لیے۔ سروری خانم کو اس کام پر آمادہ دیکھ کر وہ خوش ہوگئے۔ دونوں میں بظاہر ملاپ ہو گیا تھا مگر دل دونوں کے صاف نہیں تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بیوقوف ہی بنانے کی کوشش کی تھی۔ دونوں میں معاہدہ ہوگیا تو آہو صاحب شراب کی بوتل نکال لائے۔ سروری خانم کو ساقی گری کے لیے کہا۔ وہ فوراً خوشی خوشی تیار ہوگئی۔ اس نے چند دن پہلے ہی مجھ سے بہت سارا کانچ پسوایا تھا۔ کہا یہ تھا اس نے کہ وہ بسنت پر پتنگ بازی کرے گی اور اس کانچ سے وہ ڈور تیار کرا رہی ہے پتنگ کے لیے۔ اس رات اس نے آہو صاحب کو پلا پلا کر خوب مدہوش کر

دیا اور پھر وہ کانچ بھی شراب کے ساتھ ان کے معدے میں اتار دیا۔ بس یہ سارا قصہ ہے ان کا۔"

"اور وہ سروری خانم کہاں ہے اس وقت؟ اس نے یار حیران کر دیا ہے مجھے۔"

"وہ اور کہاں ہو سکتی ہے اوستاد! جیل کے سوا؟ اس کے تو گلے میں پھندا ہی پڑنا چاہیے بڑی ذلیل عورت ہے وہ۔"

"یہ بات نہیں کہنا چاہیے تجھے سالے! تیرے لیے دونوں ایک ہی جیسے تھے۔ وہ آہو بھی کوئی شریف آدمی تو نہیں تھا۔"

"اس کی بات نہیں کر رہا ہوں میں اوستاد! ذلالت تو اس نے میرے ساتھ کی تھی۔ مجھے پھنسانے لگی تھی آہو صاحب کے قتل کے الزام میں، کہتی تھی میں نے کبری کو کانچ پیستے ہوئے دیکھا تھا، اسی نے آہو صاحب کی شراب میں کانچ ملایا ہوگا۔"

"اچھا! ایسا کیا تھا اس نے؟ یہ تو بڑی ذلیل حرکت کی تھی۔ تیری تو گردن ہی ناپ دی تھی یار اس نے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں جی، وہ تقدیر اچھی تھی میری۔ چار دن حوالات میں روئی کی طرح دھنا گیا ہوں میں، سالے مانتے ہی نہیں تھے کہ یہ کام سروری کا ہو سکتا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ مانے اور پھر جا کر سروری کا سامان الٹ پلٹ کرنے کے بعد انھوں نے پسا ہوا کانچ اس کے پاس سے برآمد کر لیا۔ تب کہیں جا کر جان چھوٹی تھی میری۔ بس کچھ قسمت ہی ساتھ دے گئی اوستاد! اگر وہ سروری اس کانچ کو کہیں پھینک دیتی تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ایسا کام کیا تھا اس کُتی عورت نے۔"

"ہاں یار! یہ تو تیرے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ وہ سروری کا بچہ، کیا اس کے ساتھ ہی ہے جیل میں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، وہ تو اس کی گرفتاری کے تین چار دن کے بعد مسند آرا لے گئی تھی اپنے ساتھ۔ وہ بڑی رحم دل بی بی ہے اوستاد! اس سروری خانم کی بہن تو لگتی ہی نہیں ہے کسی طرح بھی۔ حالاں کہ وہ جانتی ہے اس کے باپ ہادی علی کو آہو صاحب نے تمھارے ذریعے قتل کرایا تھا اور وہ ان کی زمینوں پر قبضہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی وہ آہو صاحب کے بچے کو اپنے ساتھ لے گئی سینے سے لگا کر۔"

"ہاں یار! وہ بہت ہیرا لڑکی ہے مگر افسوس یہ ہے کہ زمانے نے قدر نہیں کی اس کی، بہت دُکھ دیے ہیں اس آہو نے اس غریب کو۔"

"اوستاد! اب تمھارے راستے کی ساری ہی رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔ اب تو تم اس کو اپنے گھر لا سکتے ہو ماں جی کی بہو بنا کر۔"

اس نے انجانے میں چٹکی نوچ لی تھی میرے دل میں، تلملا کر رہ گیا تھا میں۔ مسند آرا کا حسین سراپا میری آنکھوں میں پھر گیا ایک دم۔ کتنی چاہ تھی مجھے اس کومل کومل چاندنی کو اپنے آنگن میں اتارنے کی۔ خود اس کی آنکھیں بھی ہر دم یہی پیغام دیتی تھیں مجھے کہ میں جتنی جلدی ہو سکے اس سراپا ناز کو اپنے سینے کی مسند پر سجا لوں، اگر ایسا ہو جاتا تو آج میری زندگی کی یہ داستان ایسی پُرالم اور عبرت انگیز ہرگز نہ ہوتی۔ مگر اس بدبخت آہو نے مجھے ایسی کھپ میں اتار دیا کہ میں مسند سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت بھی کھو بیٹھا، تقدیر نے ایسی چالیں چلیں میرے ساتھ کہ سپنوں کے سارے محل ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور بکھرتے چلے گئے۔ اب میں ایسا کہاں رہا تھا کہ وہ سرو دسمن میری تصویر اپنے دل کے نہاں خانے میں محفوظ کر کے رکھتی۔ میں تو اس کا مجرم بن چکا تھا۔ اس کے باپ ہادی علی کا قتل کر کے میں نے خود کو اس کی نظروں سے گرا لیا تھا۔ اب میں اس کے لیے معتبر نہیں رہا تھا۔ اور کسی نامعتبر شخص کو دنیا کی کوئی بھی مسند آرا اپنی زندگی کیسے سونپ سکتی ہے۔ میں تو خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی خواہش بھی کر سکوں۔

میں نے کبری سے کہا: "نہیں یار ایسی باتیں نہ سمجھا مجھے۔ ہیروں کو اپنے پاس رکھنے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔"

"نہیں اوستاد! کیسی باتیں....." وہ شاید مجھے قائل کرنے کے لیے کوئی دلیل دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں سنی۔

اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا: "اچھا اب بس کر۔ بہت دیر ہو گئی ہے، میں فون رکھ رہا ہوں۔"

میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ریسیور کریڈل پر دھر دیا۔ ٹیلیفون رکھ کر میں شرافت علی اور فیروز کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دونوں حیران حیران سے مجھے ہی تک رہے تھے۔

فیروز بولا: "خیر تو ہے نا؟ یوں لگتا ہے جیسے تم نے کوئی اچھی خبر نہیں سنی ہے۔"

"اچھی خبر سنے تو ایک زمانہ بیت گیا ہے یارو! اب میرے مقدر میں کوئی اچھی خبر ہے ہی کہاں جسے میں سنوں گا۔" میں نے کہا۔

"اور یہ آسیہ کے بارے میں تم نے ہمیں تو کبھی نہیں بتایا کہ وہ شکار پور میں ہے اور تمھیں یہ خبر کس طرح ملی؟" شرافت علی بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں نے کب کہا کہ وہ شکار پور میں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔" میں حیرانی سے بولا۔

" ابھی تم ٹیلیفون پر شاید اپنی ماں جی کو یہی بتا رہے تھے کہ آسیہ شکار پور میں ہے اور تم اسے ساتھ لے کر جلد ہی لاہور پہنچ رہے ہو۔"

"وہ تو یار! میں نے ماں جی کو تسلی دینے کے لیے جھوٹ بول دیا ہے، وہ بہت پریشان تھیں اس کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا جیلانی! ماں جی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ماؤں کے دل بہت ہی حساس ہوتے ہیں۔" فیروز بولا۔

"کاش یہ بات آسیہ بھی سمجھ سکتی مگر اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں، وہ تو وہی کچھ لوٹا رہی ہے جو اس دنیا نے اسے دیا ہے۔ وہ تو ایک سیدھی سادی مٹیار تھی یارو! ایک ایسی لڑکی جو تنہا گھر سے باہر قدم دھرتے ہوئے ڈرتی تھی، جو کسی پٹاخے کی آواز سُن کر بھی ماں جی کے پیچھے جا چھپتی تھی۔ اس کے بارے میں تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کسی کے سامنے اونچی آواز میں بول بھی سکے گی مگر اس دنیا نے اسے ایک قاتل اور ڈاکو کا روپ دے دیا۔ عزت اور شرافت کے معنی تک بھلا دیے اسے۔ اس میری بہن، میری ماں جائی کے سینے سے دل نکال کر زمانے نے وہاں ایک پتھر دھر دیا ہے تو اب اس سے کیا گلہ ہے؟"

"ہاں بھائی جیلانی! یہ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ہم نے انگریز سے آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن اپنے دورِ اقتدار میں وہ ہمارے دلوں میں درندگی کی جو فصل بو گیا ہے، وہ نہ جانے کب خشک ہو گی، پتا نہیں اس سے کب نجات حاصل ہو گی ہمیں۔ ہم نے خود کو ایک آزاد قوم کہلانے کا حق تو حاصل کر لیا، لیکن پتا نہیں انسان کہلانے کا حق کب مل سکے گا ہمیں۔" فیروز نے دُکھ بھرے انداز میں کہا۔

"غلامی کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے میرے بھائی کہ انسان غلام ہو جانے کے بعد انسان نہیں رہتا۔ غلامی اس کے اندر سے انسانیت کی ساری خُو نکال کر اسے ایک دو پایہ حیوان بنا دیتی ہے۔" شرافت علی بولا۔

○○○

طے یہ ہوا تھا کہ فیڈرل بی ایریا کے اس مکان میں جس کا پتا لزی نے دیا تھا اور جہاں رات کے دس بجے آٹزک نے تنظیم کے اہم افراد کی میٹنگ بلائی تھی، میں اپنے ساتھ صرف شرافت علی اور گل زمان کو لے جاؤں گا۔ فیروز اور خان چند آدمیوں کے ساتھ مکان سے کچھ دور موجود رہیں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے ورنہ دشمن کے شکست کھا کر فرار ہونے کی صورت میں وہ اس کا پیچھا کر کے اس کی کمین گاہ کا پتا لگائیں گے۔ انور کمال اور گل زمان پانچ بجے کے قریب واپس آئے تھے اور انھوں نے لزی کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ انور کمال نے بتایا کہ ان دنوں آٹزک اور لزی اسی مکان میں مقیم ہیں۔ وہ لوگ اس وقت مکان میں موجود نہیں تھے لیکن نو بجے رات تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ یہ معلومات اس نے بوڑھے دربان سے حاصل کی تھیں جو محض آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔ مکان کی نگرانی کا اصل کام تو تین خوفناک قسم کے بلڈ ہاؤنڈ کرتے تھے جو نیم تاریکی میں دور سے دیکھنے والوں کو کتوں کے بجائے اعلیٰ نسل کے قدآور اور صحت مند بکرے معلوم ہوتے تھے۔ یہ کتے تمام رات کھلے رہتے تھے۔ ان کی موجودگی میں مکان کے احاطے میں داخل ہونے والا کوئی بھی اجنبی اپنے پیروں پر چل کر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ گل زمان نے ان کتوں کا مسئلہ حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس نے کہا تھا: "آپ لوگ کتوں کی فکر بالکل نہ کریں، وہ کچھ نہیں کہیں گے آپ کو۔"

میں نے اس کی بات سُن کر کہا: "کتوں کی فکر تو سب سے پہلے کرنا چاہیے برادر! کیوں کہ کتے کی وفاداری ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

"میں یہ بات غلط ثابت کر دوں گا جیلانی بھائی! کُتا چاہے جتنا بھی خوفناک اور اپنے مالک کا وفادار کیوں نہ ہو، میرے ایک اشارے پر بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔ آپ کہیں تو اس آٹزک کو ان کتوں سے ہی نچوا ڈالوں۔" گل زمان بولا۔

"کیا کہہ رہا ہے بھائی! کیا کوئی خاص ہُنر آتا ہے تجھے ان کتوں کو اپنے اشاروں پر چلانے کا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، بہت ہی خاص ہُنر ہے میرے پاس، کُتوں کو اپنے پیچھے دُم ہلانے پر مجبور کرنے کا۔" گل زمان مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کے اسی دعوے کی بنا پر میں نے اسے اپنے ساتھ مکان میں داخل ہونے کے لیے منتخب کیا تھا۔

تمام معاملات طے ہو جانے کے بعد فیروز نے شرافت علی سے کہا: "اس کابل خان کے بارے میں کیا سوچا ہے بھئی، اسے

کیا کریں اب ہم؟"

شرافت علی بولا "ہم نے ایک بات طے کر لی ہے کہ دشمن کا جو بھی آدمی نظر آئے گا ہمیں، اسے ہم عدم آباد بھیج دیں گے تو کابل خان کے بارے میں فیصلہ تبدیل تو نہیں ہو سکتا۔ پھر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو کہ اسے کیا کریں؟"

گل زمان بولا "اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں آپ کو تجربہ بھی کرا دوں گا اس پر کہ کتے کس طرح میرے اشارے پر چلتے ہیں۔"

میں نے فیروز کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "کیا ہرج ہے، ٹھیک ہی تو کہتا ہے گل زمان۔ اس طرح تمھیں ایک تجربہ بھی ہو جائے گا، تمھارے دل میں وسوسہ نہیں رہے گا کوئی اس سلسلے میں، اور تم کو کابل خان کے سلسلے میں پریشانی بھی نہیں ہوگی کوئی۔ کتے کے کاٹنے سے اگر کوئی مر جائے تو اس کا الزام دنیا کا کوئی بھی قانون کسی انسان پر عائد نہیں کر سکتا، یوں سمجھ لو کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی بچ جائے گی۔"

"لیکن یار! یہ تو بہت ہی درندگی والی بات ہے، ایک انسان کو کتے کے ذریعے شکار کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ اچھی بات ہے کوئی؟" فیروز تلخی سے بولا "یہ اسی قابل ہیں جیلانی کہ ان پہ کتے چھوڑ دیے جائیں۔"

"لیکن وہ آئزک کا آدمی تو نہیں ہے۔ یہ فیصلہ تو ہم نے اپنے ملک میں موجود یہودیوں اور ان کے ایجنٹوں کے بارے میں کیا ہے۔ کابل خان اس کشمیر خان کا آدمی ہے اور شرافت علی کے قتل کا فیصلہ منشیات فروشوں کی تنظیم کے تین بڑوں نے کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ذرا سوچو! کابل خان ڈرائیور ہے کشمیر خان کا، اس کا مال لے کر آتا ہے اور اسے ڈیلروں تک پہنچاتا بھی ہے۔ کشمیر خان کا تعلق ڈاکٹر دھمن سے ہے۔ دھمن نے تمھیں اس وعدے کے بعد پاکستان واپس بھیجا ہے کہ تم اس کے لیے کشمیر خان سے مال لے کر ایک بار امریکا اور آؤ گے۔ یہ بات اب تم سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ ڈاکٹر دھمن اسرائیل کا ایجنٹ ہے اور آئزک ہمارے ملک میں یہودیوں کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل کو پہنچا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ہائی کمان نے جس طرح میرے قتل کا حکم صادر کیا ہے، اس کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ ایسے معاملات میں ہمیشہ بھاری جرمانہ ہی ہوتا آیا ہے البتہ اگر کوئی جرمانہ ادا نہ کرے تب کوئی دوسری سخت سزا دی جاتی ہے۔ قتل کی نوبت تو بالکل آخری صورت میں آتی ہے۔ جب کسی طرح کوئی شخص قابو میں ہی نہ آ رہا ہو تب ایسا فیصلہ ہوتا ہے۔ میرے معاملے میں تو انھوں نے اپنے سارے اصول اور ضابطے ایک طرف رکھ دیے ہیں، جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ فیصلہ آئزک کے اشارے پر ہوا ہے، کیوں کہ اس وقت ایک وہی ایسا شخص ہے جو میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے، حالانکہ بہ ظاہر اس کی مجھ سے شناسائی تک نہیں ہے، نہ آستانے کی تباہی والی رات سے پہلے کبھی اس نے میری شکل دیکھی تھی۔ زنجیر کی ساری کڑیاں خود بخود مل رہی ہیں، اس میں شبہے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کابل خان کس کی خواہش کی تکمیل کرنے آیا تھا یہاں۔" شرافت علی بولا "جبکہ میری کوٹھی پر ہونے والی یلغار کی ایک ایک تفصیل سے تم... واقف ہو۔ لزی نے تمھیں ہی اطلاع دی تھی اس کی۔"

"ٹھیک ہے یار! مجھے اتفاق ہے تم لوگوں کے فیصلے سے، پتا نہیں کیوں اس سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ شاید یہ ماں جی سے اتنی دیر باتیں کرنے کا اثر تھا۔ آج تو ماں جی کی باتوں نے میرے لہو کی ساری گرمی ختم کر دی تھی۔" میں بولا۔

انور کمال بولا "اور تو ساری باتیں ٹھیک ہیں لیکن یہ کتے کہاں سے آئیں گے اس وقت؟ ایسے کتے جو خوفناک بھی ہوں اور گل زمان سے نامانوس بھی؟ ایسے کتوں کے بغیر یہ تجربہ کیسے ہو سکے گا کہ گل زمان کا دعویٰ کتنا صحیح ہے؟"

"اس کی تم فکر مت کرو، کتوں کا انتظام ابھی ہو جاتا ہے۔" شرافت نے کہا۔ اور اٹھ کر ٹیلیفون کے پاس پہنچا۔

چند لمحے بعد وہ ٹیلیفون پر کسی ماسٹر کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا "ماسٹر! جتنی جلدی ہو سکے، دو بہترین تربیت یافتہ بلڈ ہاؤنڈ لے کر میرے جمشید روڈ والے بنگلے پر پہنچ جاؤ۔ یہ خاص طور پر خیال رکھنا، کتے نہایت خونخوار اور بہترین تربیت یافتہ ہوں۔" ٹیلی فون رکھ کر وہ ہماری طرف مڑ کر بولا "لو بھئی، میں نے بلڈ ہاؤنڈ ہی منگوائے ہیں خصوصیت کے ساتھ، کیوں کہ رات کو ہمارا اسی نسل کے کتوں سے واسطہ پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں وہ پہنچ جائیں گے یہاں۔"

گل زمان بولا "ٹھیک ہے، میں اب باہر چلا جاتا ہوں کتوں کے آنے کے بعد آپ لوگ کابل خان کو ساتھ لے کر ان کے سامنے جائیں تاکہ کتے آپ لوگوں کے ساتھ کابل خان کی بو سے بھی مانوس ہو جائیں۔ بلکہ کوشش یہ کریں کہ وہ کابل خان کے ساتھ زیادہ گھل مل جائیں۔ اس کے بعد کابل کے ساتھ ہی انھیں باہر بھیج دیجیے۔ پھر دیکھیے تماشا اس

جاں نثار جانور کی بے وفائی کا۔"

گل زمان باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے کوئی پندرہ منٹ بعد ایک شخص دو قد آور اور صحت مند کتوں کی زنجیریں تھامے اندر داخل ہوا۔ خاصے بڑے بڑے کانوں اور پھیلے ہوئے دہانے والے ان کتوں کو دیکھ کر عام آدمی کی آدھی جان تو نکل ہی جاتی ہوگی۔ جس شخص کے ہاتھوں میں ان کتوں کی زنجیریں تھیں، وہ بھی کم خوف ناک نہیں لگتا تھا۔ دیکھنے میں وہ افریقہ کے جنگل سے پکڑا ہوا کوئی گینڈا معلوم ہوتا تھا۔ سیاہ فام رنگت، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور بے حد مضبوط کاٹھی کا مالک تھا وہ، اس کے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں اور چٹان کی طرح فراخ سینہ صاف کہہ رہا تھا کہ وہ سخت محنت کرنے کا عادی ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش کسی افریقی ہی کی طرح کمزور دلوں پر ہیبت طاری کر دینے والے تھے۔

شرافت علی اسے دیکھتے ہی بولا "آؤ بھئی ماسٹر! لے آئے کتوں کو؟ دھوکا تو نہیں دے جائیں گے نا یہ موقع پر؟"

ماسٹر نے تھوڑا سا خم ہو کر شرافت علی کو تعظیم دیتے ہوئے کہا "ان کتوں پر میں نے بڑی محنت کی ہے سر! یہ شیر کے سامنے بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ انھیں کسی کے ساتھ شکار پر بھیجا جائے اور یہ اُلٹا شکاری ہی کو شکار کر لیں؟" میں نے پوچھا۔

"نو سر! یہ تو کتے کی فطرت ہی نہیں، اور یہ کتے تو باقاعدہ تربیت یافتہ ہیں، یہ خوب جانتے ہیں کہ انھیں کس وقت کیا کرنا ہے۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

شرافت علی نے خان سے کہا "جاؤ بھئی اس کابل خان کو لے آؤ، ہم ابھی ان کے دعوے کی تصدیق کیے لیتے ہیں۔"

خان، انور کمال کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا تو شرافت علی نے ماسٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا "یار شرافت علی! کیا تم اپنے ان ماسٹر سے ہمیں متعارف نہیں کراؤ گے؟ یہ ان کتوں کے ٹرینر تو نہیں ہیں؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے یہ ہمارے کتوں کی دیکھ بھال اور انھیں تربیت دینے کا کام کرتے ہیں، بہت وفادار آدمی ہیں یہ۔"

"جن کے ساتھ رات دن رہتے ہیں، ان کا کچھ نہ کچھ اثر تو آنا چاہیے نا۔ وفاداری تو بہت بڑی خوبی ہوتی ہے یار آدمی کی۔" میں بولا۔

میری بات سن کر ماسٹر کا چہرہ کچھ بگڑ سا گیا تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں، شاید یہ اس خوئے وفا کا ہی اثر تھا جو اس میں پائی جاتی تھی لیکن شرافت علی نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی "یار! کسی کو معاف بھی کر دیا کرو کبھی۔ اسے تمھاری بات ناگوار گزری ہے۔ مخلص لوگوں کی دل آزاری اچھی نہیں ہوتی۔"

"اوہو، اگر ایسی بات تھی تو پہلے بتا دینا چاہیے تھی تمھیں مجھے کیا پتا تھا کہ تم بھی اس کے ساتھ اسی قدر مخلص ہو۔" میں نے سرگوشی ہی میں جواب دیا۔

وہ ہنس کر بولا "تم بھی آپی سے کچھ کم نہیں ہو جیلانی! تم دونوں کی دوستی اسی لیے نبھ رہی ہے اب تک۔"

میں نے پوچھا "یہ کتے تمھارے اپنے ہیں کیا؟"

"ہاں، میرے پاس اس وقت تقریباً تیس نسلیں ہیں کتوں کی۔ ان تیس نسلوں کے دو سو سے زیادہ کتے موجود ہیں۔" شرافت علی نے کہا۔

"اچھا! اس کا تو مطلب ہے اچھا خاصا کُتّا خانہ ہے تمھارے پاس۔ کرتے کیا ہو تم ان کا۔ ویسے کاروبار بُرا یہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو یہ کتے میرے کاروبار کی نگرانی اور ادھر کا مال اُدھر کرتے رہے ہیں لیکن اب یہ تم نے اچھی بات سُجھائی ہے۔ ان کا کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ فرصت ملنے کے بعد اگر زندہ رہ گیا تو اس کے بارے میں ضرور سوچوں گا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا نا آخر۔" شرافت علی بولا۔

"اتنی بڑی تعداد میں ایسے خوفناک قسم کے کتے ہیں تمھارے پاس۔ انھیں دشمن کے خلاف ایک باقاعدہ فوج کی طرح بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یار! ان کے ذریعے ہم دشمن کو کسی بھی علاقے میں گھیر سکتے ہیں۔" فیروز نے تجویز پیش کی۔

"نہیں بھئی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ چھوٹے موٹے دیہاتوں میں تو یہ کر سکتے ہم لیکن کراچی جیسے بارونق شہر میں یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ناممکن کوئی کام نہیں ہوتا شرافت علی! ہم کسی دن فرصت سے بیٹھ کر بات کریں گے اس سلسلے میں۔" فیروز نے کہا۔

اسی وقت خان اور انور کمال، کابل خان کو اپنے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھیں دیکھتے ہی شرافت علی نے ماسٹر سے کہا "ماسٹر! ہم جتنے لوگ اس وقت اس کمرے میں موجود ہیں، دونوں کتوں کو ان سب سے اس طرح مانوس کرا دو کہ یہ ہم میں سے کسی پر حملہ نہ کریں کہیں کسی حالت میں بھی۔ اور ہم میں سے جو بھی انھیں کسی پر حملہ آور ہونے کو کہے تو اس کے حکم کی فوراً ہی تعمیل کریں۔"

"ابھی لیں جناب! یہ تو بس پانچ منٹ کا کام ہے۔" ماسٹر یہ کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

وہ کتّوں کی زنجیریں پکڑ کر ہمارے پاس لے آیا اور باری باری ایک ایک کے پاس کھڑا کر کے ان کی پشت پر ہلکی ہلکی تھپکیاں دیتا جا رہا تھا۔ کتّے عجیب سی باریک باریک آوازیں نکالتے ہوئے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھ کر اپنی دُم ہلا رہے تھے۔ اس کے بعد ماسٹر واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور کتّوں کو زنجیریں کھول کر آزاد کر دیا۔ کتّے زنجیریں کھلتے ہی ایک دم چاق و چوبند نظر آنے لگے تھے، وہ دونوں اپنے اپنے پیٹ فرش سے لگا کر یوں بیٹھ گئے جیسے ماسٹر کا اشارہ پاتے ہی شکار پر جھپٹ پڑیں گے۔ ماسٹر نے آہستہ آہستہ دونوں کی پشت پر ہاتھ پھیر کر تین بار انھیں تھپکی دی تو وہ اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دُمیں ہلاتے ہوئے ٹہلنے کے سے انداز میں ہمارے قریب آ کر باری باری ہمارے پیر سونگھنا شروع کر دیے۔ انھوں نے ہمارے گرد کئی چکّر لگا لیے تو ماسٹر بولا ”لیجیے جناب! اب آپ میں سے کسی پر یہ اس وقت تک حملہ نہیں کریں گے جب تک میں انھیں ایسا کرنے کا اشارہ نہ دوں۔“

میں نے کہا ”کیا یہ ہمارے کہنے پر بھی کسی اجنبی پر حملہ کر سکتے ہیں؟ یا اس کے لیے بھی تمھاری مدد کی ضرورت ہو گی؟“

”نہیں، میری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے جناب۔ آپ اشارہ دیں، یہ فوراً اس پر عمل کریں گے۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

”کیا کوئی مخصوص قسم کا اشارہ ہوتا ہے وہ یا بس یوں ہی کسی کی طرف انگلی اٹھا دینا کافی ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب! صرف انگلی اٹھا دینا تو کافی نہیں ہوتا، ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرنے کے بعد کتّے کی پشت پر تین بار ہلکے سے تھپکی دیں اور پھر اسے آگے کی طرف ہلکا سا دھکا دے دیں اور اگر حملے سے روکنا ہو تو پشت پر تھپکی دینے کے بعد کتّے کی گردن اور سر پر ہاتھ پھیریں۔“ ماسٹر نے بتایا۔

میں نے کابل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کابل خان! ہم نے تمھیں آزاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیوں کہ تم ہمیں قصوروار معلوم نہیں ہوتے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے بڑوں کے حکم کی تعمیل میں کیا ہے۔ اصل قصوروار تو وہی لوگ ہیں۔ تم جا سکتے ہو اب!“

کابل خان حیرت سے منہ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت ہی تعجب خیز بات تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک ہم اس کے ساتھ جو سلوک کرتے رہے تھے، اس کے بعد ہمارا یہ انداز سمجھ میں نہ آنے والا ہی تھا اس کے لیے۔ شرافت علی اسے گومگو کی کیفیّت میں مبتلا دیکھ کر بولا ”ہاں ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا کوئی۔“

وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا ”حیرت ہے، یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر میں ہوتا تمھاری جگہ تو ایسا ہرگز نہ کرتا کبھی بھی نہیں!“

”خیر یہ بعد کی بات ہے، جب ہم میں سے کوئی تمھارے ہاتھ لگے تو بے شک تم نہیں چھوڑنا اُسے، ہم اس کی توقع بھی نہیں کریں گے تم سے۔“

وہ تذبذب کے عالم میں کبھی ہمیں دیکھتا تھا کبھی اس دروازے کو جسے عبور کرنے کے بعد شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہماری دسترس سے آزاد ہو جائے گا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا ہماری بات پر، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ چوہے بلّی والا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں، ابھی اسے آزادی کا مژدہ سنا رہے ہیں لیکن جیسے ہی وہ باہر جانے کے لیے دروازے کے قریب پہنچے گا، ہم میں سے کوئی اچانک دبوچ لے گا اُسے، چوہے اور بلّی کا کھیل تو ہم بے شک کھیلنا چاہتے تھے اس سے لیکن اس کا جو طریقہ ہم نے سوچ رکھا تھا اپنے ذہنوں میں وہ اس کا تو تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یوں متذبذب دیکھ کر میں نے کہا ”حیران یہاں سے جانے کے بعد ہوتے رہنا، بڑا وقت ہو گا اس کے بعد تیرے پاس، یہ خیال رکھ کہ یہاں زیادہ وقت نہیں ہے تیرے لیے، ابھی فیصلہ تیرے حق میں ہو گیا ہے اسے غنیمت جان، دیر کی تو یہ فیصلہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے، کسی کو بھی کوئی نکتہ سوجھ گیا تو پچھتاوے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آ سکے گا تیرے۔“

میری بات شاید اس کی سمجھ میں آ گئی تھی، وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے دروازے کی طرف مڑا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک فیروز نے اسے آواز دے کر کہا ”ارے بھئی کابل خان! ان دونوں کتّوں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ، باہر لان میں چھوڑ دینا انھیں۔ ہم نے رکھنے کے لیے منگوایا ہے انھیں۔ اپنے آقاؤں کو بھی بتا دینا جا کر، آئندہ کسی کو ادھر بھیجیں تو ان کتّوں کو نہ بھولیں۔“

وہ ٹھٹک کر دروازے میں رُک کر اور پیچھے مڑ کر کولوں دیکھنے لگا جیسے اس سے زیادہ بے وقوف آدمی اس نے دیکھا ہی نہ ہو کبھی۔ پھر اس نے واپس آ کر دونوں

کتّوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے چمڑے کے پٹّے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر انھیں باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ کتّے فوراً اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ جس طرح کتّوں کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں ہے، وہ ان کتّوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا شاید۔ کتّے اس سے مانوس ہو چکے تھے اور اگر انھیں روکنے کی کوشش نہ کی جاتی تو وہ اس کے ساتھ ضرور چلے جاتے۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شرافت علی بولا ”وہ ہمیں اوّل درجے کا گدھا سمجھ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم نے اسے آزادی دینے کے ساتھ ساتھ اپنے دو بہترین تربیّت یافتہ کتّے بھی اس کے حوالے کر دیے ہیں۔ وہ انھیں باہر لے جا کر چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ ہی لے جانے کی کوشش کرے گا۔“

فیروز اٹھ کر اس کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے جو باہر لان کی طرف کھلتی تھی بولا ”ہاں، اگر وہ ایسی کوشش نہ کرے تو بے وقوف ہی ہو گا۔“

اس کھڑکی سے پورا لان اور بنگلے کے مین گیٹ تک سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔ فیروز نے کھڑکی کے پاس جا کر اس کا پردہ ہٹا دیا۔ ہم لوگ بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر فیروز کے پاس کھڑکی میں جا ٹھہرے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔ کابل خان دونوں کتّوں کے پٹّے تھامے انھیں ساتھ لیے بیرونی گیٹ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ہم سب پوری توجہ سے اسے دیکھتے رہے۔

کابل خان ابھی گیٹ کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ گیٹ کی بغلی کھڑکی کھول کر گل زمان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی کابل خان ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے رکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے اچانک اپنے سامنے کوئی خطرہ دیکھ لیا ہو۔ اسے یوں رُکتے دیکھ کر دونوں کتّوں نے اپنی دُمیں لہرائیں، کان کھڑے کیے اور گل زمان پر نظریں جما کر آہستہ آہستہ غرانے لگے۔ گل زمان نے ایک لمحے رک کر کتّوں کو دیکھا اور پھر اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ ان سے بچ کر نکل جانا چاہتا ہو۔ اسے کتراتے ہوئے دیکھ کر کتّے بُری طرح بپھر گئے۔ کابل خان نے کتّوں کے یہ تیور دیکھے تو ان کا پٹّا چھوڑ کر انھیں گل زمان پر چڑھ دوڑنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کتّے ایک ساتھ گل زمان کی طرف جھپٹے تھے۔ عین اسی لمحے گل زمان نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر ایک عجیب سی آواز نکالی، جسے سنتے ہی کتّے ایک دم یوں رُک گئے تھے جیسے ان کے پاؤں زمین سے چپک کر رہ گئے ہوں، گل زمان نے فوراً ہی ہلکی سی سیٹی بجا کر عجیب انداز میں ہاتھ کو حرکت دی۔ اس کے اس عمل میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ دونوں کتّے یک دم واپس پلٹے اور جس تیزی سے گل زمان پر جھپٹے تھے، اسی تیزی کے ساتھ کابل خان پر جا پڑے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور اتنی جلدی ہوا تھا کہ کابل خان کو کچھ سمجھنے یا اپنا بچاؤ کرنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی، اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کا اندازہ کرتا، ایک کتّے کے دانت اس کے نرخرے میں اور دوسرے کے اس کے پیٹ میں پیوست ہو چکے تھے۔ کتّوں نے اسے زمین پر گرا دیا تھا۔ اور طیش کے عالم میں بُری طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ کابل خان دونوں ہاتھوں سے انھیں دھکیل کر دور ہٹانے اور ادھر اُدھر لوٹیں لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کتّوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اس کے پیٹ سے لہو اُبل اُبل کر آس پاس زمین پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کی قوتِ مدافعت دم توڑتی جا رہی تھی۔

یہ منظر بڑا ہی پُرہیبت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ میں ایک لمبے عرصے سے انسانی لہو سے ہولی کھیل رہا تھا۔ میں نے کشت و خون کے بازار خوب سجائے تھے، اذیتیں دے دے کر اور سسکا سسکا کر لوگوں کو مارا تھا میں نے لیکن اس منظر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مدافعت کمزور پڑتے دیکھ کر تو وہ بالکل بھیڑیے بن گئے تھے، جگہ جگہ اس کے جسم میں دانت پیوست کر کے گوشت کے بڑے بڑے پارچے نوچ نوچ کر پھینک رہے تھے۔ مجھ سے یہ دردناک منظر دیکھا نہیں گیا۔ میں نے ادھر سے منہ موڑ کر آہستہ سے کہا ”یہ کتّے ہیں یا بھیڑیے شرافت علی؟ آج سے پہلے میں نے ایسے درندہ صفت کتّے کبھی نہیں دیکھے تھے، ایسا المناک انجام کرتے ہیں یہ آدمی کا؟“

”ہاں، بڑی محنت سے ان میں یہ صفت پیدا کی گئی ہے، اب تو بھیڑیے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ شرافت علی نے جواب دیا۔

”اور یہ گل زمان، یار فیروز! آخر یہ چیز کیا ہے بھئی؟ اس کی تو ہر روز ایک نئی خوبی سامنے آ رہی ہے، آہستہ آہستہ ایک ایک گرہ کھل رہی ہے اس کی اور ہر گرہ کے کھلنے کے بعد ایک نیا گل زمان نمودار ہو رہا ہے۔ کیا کیا چھپائے پھرتا ہے یہ اپنے اندر؟“ میں نے فیروز سے کہا۔

”اس کی اس صلاحیّت کا تو مجھے بھی آج پہلی بار ہی علم ہوا ہے۔ لگتا ہے اس کی تراش خراش بہت ہی ماہر ہاتھوں نے کی ہے۔“ وہ بولا۔

"ہاں، یہ خوبی میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص ایسا بھی کر سکتا ہے۔" شرافت علی نے کہا۔

"بڑا ہی اذیت ناک منظر تھا یار! میرے تو رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی ہے اب تک۔" میں نے کراہیت سے منہ بنا کر کہا۔ "یہ بہت ہی درندگی کا مظاہرہ کیا ہم نے، کسی انسان کو ایسی اذیت ناک موت سے دوچار کرنا انسانیت تو نہیں ہے یارو!"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے جیلانی!" فیروز بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی انسان کو ایسی سزا نہیں دینا چاہیے لیکن درندوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک تو نہیں کیا جا سکتا نا، وہ تو اس کے مستحق نہیں ہوتے۔"

"لیکن کابل خان کوئی درندہ تو نہیں تھا جسے اس سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تو وہ درندوں سے زیادہ خوفناک تھا۔ محض انسانوں جیسی شکل و صورت کی بنا پر ہم اسے انسان تو نہیں قرار دے سکتے۔ وہ لوگ جو منشیات فروش ہیں، جو محض اپنے عشرت کدے آباد رکھنے کے لیے نوجوانوں کی رگوں میں زہر کی آمیزش کر رہے ہیں، جو اس ملک اور قوم کو تازہ اور صحت مند لہو سے محروم کر دینے کے درپے ہیں انھیں انسان کہنا اور سمجھنا اور انسانوں کی توہین ہے جیلانی! یہ بھیڑیے کسی طرح بھی انسانوں میں رہنے اور ان جیسے سلوک کے مستحق نہیں قرار دیے جا سکتے۔ بدترین معاشرے میں بھی ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ اجتماعی مفاد کے لیے فرد کی قربانی ہر جگہ جائز سمجھی جاتی ہے، فرد کی خاطر افراد کو قربان کرنے پر کوئی راضی نہیں ہو سکتا۔ مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے جیلانی! کہ ہمارے یہاں افراد کو فرد پر قربان کرنے کا رواج سا پڑ گیا ہے۔ زر پرستی نے ہم سے انسانی صفات چھین لی ہیں دوست!" فیروز نے کہا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم بہت ہی خود غرض اور کوتاہ بیں ہو گئے ہیں، اپنے سامنے والا آدمی تک ہمیں دکھائی نہیں دیتا ہے، اپنی ذات کے سوا کسی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے ہیں ہم، ہر معاملے میں خود کو مستثنا قرار دے لیا ہے ہر شخص نے، جسے دیکھو وہ یہ یقین کیے بیٹھا ہے کہ اس پر کسی قاعدے قانون، کسی ضابطے یا اصول کا اطلاق نہیں ہوتا، ان کی پابندی دوسروں کو کرنا چاہیے خود وہ اس سے بری الذمہ ہے، ہر شخص دوسرے کی آنکھ میں تنکا تلاش کر رہا ہے اور خود اپنی آنکھ میں پڑے ہوئے شہتیر کی طرف توجہ ہی نہیں کر رہا ہے، اور جب صورتِ حال یہ ہو تو کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

"ہاں یار! یہ تو ٹھیک ہی کہتا ہے، یہ انسان نما درندے کسی رعایت یا ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔" میں نے اعتراف کر لیا۔

گل زمان مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، فیروز نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اُسے سینے سے لگا لیا اور بولا "شاباش ہے تمھیں میرے دوست! آج تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے اپنی اس خوبی کا پہلے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا تم نے ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "پہلے کبھی موقع ہی نہیں آیا، ایسا کوئی اور خواہ مخواہ ڈینگیں مارنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"یہ تو بڑے ظرف کی بات ہے گل زمان! تو تو بڑا ہی بالا بلند شخصیت کا مالک ثابت ہو رہا ہے۔ ایسا تو نہیں سمجھا تھا میں تجھے۔" میں بولا۔

"ایسا نہ کہیں جیلانی بھائی! میں تو بہت معمولی سا آدمی ہوں، بس اللہ کا کرم ہو گیا ہے کچھ کہ اس نے مجھ میں کچھ صفات پیدا کر دی ہیں، اس پر میں نازاں نہیں ہوں، شکر گزار ہوں اس ربِ دو جہان کا جو کُل کائنات کا مالک ہے۔" گل زمان نے عاجزی سے کہا۔

"ہاں بھئی، شکر تو ہم سب کو ہی ادا کرتے رہنا چاہیے اس ربِ کائنات کا۔" میں نے اس کی بات سے متاثر ہو کر کہا۔

◻◻◻

رات کے ٹھیک دس بج کر پچاس منٹ پر ہمارا ٹرک آئزک کے مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ باہر گلی میں نصب بجلی کے پول کے ساتھ جا ٹھہرا۔ اس پول کے تاروں میں سے ایک تار ٹوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے آس پاس کے ان تمام مکانوں کی جن کو اس پول سے کنکشن دیے گئے تھے، بجلی کی سپلائی منقطع ہو گئی۔ یہ کام انور کمال نے دکھایا تھا۔ اس نے شام کے وقت یہاں آ کر کسی طرح یہ تار کاٹ دیا تھا۔ دراصل جس وقت ہم اس مکان کی چار دیواری عبور کر کے اندر داخل ہونے کی تدبیریں سوچ رہے تھے اس وقت گل زمان نے بتایا تھا کہ اس نے مکان کی پچھلی گلی میں ایک ایسا بجلی کا پول دیکھا ہے جو مکان کی دیوار سے بالکل ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس پول کے ذریعے ہم بہ آسانی عبور کر کے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کی بات سن کر ہی کو یہ تدبیر سوجھی تھی کہ ہم تینوں یعنی میں، شرافت علی اور گل زمان اگر کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کی گاڑی میں وہاں پہنچیں تو یہ کام اور زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔ پول پر چڑھ کر کام کی آڑ میں مکان کے اندر کی صورتِ حال کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم عین اس وقت مکان میں داخل ہو سکتے ہیں جب وہاں تمام لوگ جمع ہو چکے ہوں اور میٹنگ بھی شروع ہو چکی ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم دس بجے سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں تاکہ ہم میں سے کوئی ایک پول پر چڑھ کر اندر کا جائزہ لیتا رہے۔ سب نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس پر عمل درآمد کے لیے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کی ایک ایسی گاڑی کی ضرورت پیش آئی جس پر اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھی لگی ہو۔ ایسی گاڑی کی فراہمی کا کام فیروز نے اپنے ذمے لے لیا۔ اور پول میں خرابی پیدا کرنے کی ذمے داری انور کمال کو سونپ دی گئی۔ چنانچہ انور کمال نے سرِ شام ہی یہاں آ کر اپنی ذمے داری پوری کر دی تھی۔ اور فیروز نے ایک ایسے ٹرک کا بندوبست کر دیا تھا جس پر لکڑی کی ایک مضبوط اور خاصی لمبی سیڑھی موجود تھی۔ ٹرک کی پیشانی پر کے، ای، ایس، سی، آن ڈیوٹی کی چھوٹی سی تختی آویزاں تھی۔ تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد میں، گل زمان اور شرافت علی کے ساتھ دس بج کر پچاس منٹ پر اس پول کے نیچے جا ٹھہرا۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے سیڑھی لگا کر گل زمان کو اوپر چڑھا دیا۔ مجھے اور شرافت علی کو آئزک اچھی طرح پہچانتا تھا، چنانچہ ہم دونوں میں سے کسی نے اوپر چڑھ کر کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔

فیروز نے اپنی کار اس گلی کے بالکل سامنے سڑک کے دوسری طرف کھڑی کی تھی۔ وہاں سے وہ اور انور کمال آئزک کے مکان کے مین گیٹ میں آنے جانے والوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے، جس گلی میں ہمارا ٹرک کھڑا تھا اس کے کونے پر خان نے مورچہ سنبھالا ہوا تھا تاکہ اگر کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کی کوئی گاڑی اس طرف آئے تو ہمیں خبردار کر سکے۔ یہ خدشہ تو بہر حال موجود ہی تھا کہ علاقے کے لوگوں کی شکایت پر نہ سہی کسی با اثر شخص کے ٹیلیفون پر بجلی کا پورا محکمہ ہی ادھر دوڑا نہ چلا آئے۔ اس محکمے کی طرف سے صارفین کی شکایت پر تو آدھی رات سے پہلے کسی کارروائی کی امید نہ تھی مگر یہاں ایسے لوگ بھی آباد تھے جو متمول ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے دراز دست بھی تھے۔ ایسے لوگوں سے ہر سطح کے سرکاری اہلکار ہمیشہ چوکنا رہتے ہیں اور انھیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیتے تاکہ انھیں سب کچھ ٹھیک ہی نظر آتا رہے۔

گل زمان بجلی کے پول پر چڑھا ہوا اس طرح الٹے سیدھے ہاتھ ادھر اُدھر چلا رہا تھا کہ جس نے بھی اسے دیکھا ہو گا یہی سمجھا ہو گا کہ وہ ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چونکہ پول مکمل تاریکی میں تھا اور اس پر چڑھا ہوا گل زمان دُور سے ایک سائے کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا چنانچہ کسی کے لیے اس کی حرکات کو سمجھنا مشکل ہی تھا۔ اس دوران وہ آئزک کی کمین گاہ میں جھانکتا بھی جا رہا تھا۔ اس کی پتلون کی جیب میں ایک چھوٹی سی دوربین موجود تھی جس کی مدد سے وہ وقفے وقفے سے اندر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس مکان میں بجلی کا کنکشن کسی اور پول سے دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی بجلی کی سپلائی بحال تھی اور ہر کمرا روشن نظر آ رہا تھا، گل زمان کو کسی بھی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ٹرک پر کھڑے ہونے کے بعد دیوار چونکہ ڈیڑھ یا دو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں رہتی تھی چنانچہ تین چار بار میں نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیوار کے دوسری طرف جھانکا تھا لیکن روشن کمروں کے سوا کچھ نظر نہ آ سکا تھا۔ مجھے یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ اس وقت وہاں کوئی آیا نہیں ہو گا، دس بج چکے تھے اور یقیناً سب لوگ آ چکے تھے وہاں لیکن وہ کسی ایسے کمرے میں تھے جہاں انھیں میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ گل زمان اتنی بلندی پر ہے، اس سے کچھ پوشیدہ نہیں ہو گا۔

دس بج کر دس منٹ پر گل زمان نے سیڑھی سے نیچے اتر کر کہا "وہ لوگ تعداد میں چھ ہیں اور سب کے سب اوپری منزل کے ایک کمرے میں جمع ہیں، لیکن ان میں آئزک دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید وہ عمارت میں موجود نہیں ہے۔"

"اور لزی؟ وہ بھی نظر آئی ہے اندر تمھیں؟" میں نے فوراً اس سے لزی کے بارے میں سوال کر ڈالا۔

"نہیں جی، نظر تو وہ بھی نہیں آئی ہے اب تک مجھے۔ اس کے علاوہ وہ کتے بھی کہیں دکھائی نہیں دیے ہیں اب تک۔" گل زمان بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ اندھیرے میں کہیں چھپے بیٹھے ہوں، اس قسم کے کتے یوں اعلانیہ نہیں پھرتے، بس اچانک ہی نمودار ہوتے ہیں، کسی تاریک گوشے سے اور جا پڑتے ہیں اپنے شکار پر۔ انھیں یہی تربیت دی جاتی ہے۔" شرافت علی نے فوراً کہا۔

"انھوں نے عمارت کے ہر کمرے اور راہداری کو روشن کر رکھا ہے جس کی وجہ سے عمارت کے گرد اتنی روشنی ہر جگہ موجود ہے کہ کوئی چیز کسی کی نظر سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے وہ سامنے کے حصے میں ہوں۔ بہر حال وہ کوئی مسئلہ نہیں ہیں، انھیں تو میں ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اپنے سامنے آنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ اصل مسئلہ تو اس روشنی کا ہے۔ اندر اترنے کے بعد کوئی چھپنے کی جگہ نہیں ہے وہاں، ہم لوگ دور ہی سے دیکھ لیے جائیں گے۔" گل زمان نے دھیمی آواز میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو، تم بس کتوں کو تلاش کر کے ان کا بندوبست کر دو کسی طرح سے۔ اندر اترنے کے بعد تو ہم اس تیزی سے کارروائی

کریں گے کہ اگر کسی نے عمارت کے اندر سے ہمیں دیکھ بھی لیا تو بس دیکھتا ہی رہ جائے گا وہ۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو خود کو موت کے منہ میں جھونک دینے والی بات کر رہے ہو تم جیلانی! تم جانتے ہو ہمارا مقابلہ جس دشمن سے ہے، وہ بے حد عیار اور مکار ہے، بہت دور تک دیکھتا اور بہت پہلے سوچتا ہے وہ۔ اور پھر ہم تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ لڑکی نے سچ مچ ہماری مدد کرنے کے لیے ہی یہ اطلاع دی ہے ہمیں یا ان لوگوں نے ہمیں گھیرنے کے لیے کوئی چال چلی ہے یہ... یہ بھی تو ہو سکتا ہے برادر! کہ اندر ہمارے لیے کوئی چوہے دان تیار کر کے رکھ دیا گیا ہو اور ہم وہاں پہنچتے ہی اس میں پھنس کر رہ جائیں۔ بہت ہوشیاری اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ہر قدم اٹھانا چاہیے ہمیں، یوں آنکھ بند کر کے نہیں کود پڑنا چاہیے ہر جگہ۔" شرافت علی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو شرافت علی!" میں نے کہا "لیکن زیادہ ہوشیاری اور احتیاط ہر جگہ کام نہیں آتی، بعض موقعوں پر یہ نقصان بھی پہنچا دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دشمن بے اندازہ وسائل کا مالک ہے اور ہم سے کہیں زیادہ ذرائع ہیں اس کے پاس لیکن ہم صرف اپنے سوہنے رب کی ذات پر بھروسا کر کے اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے ہیں، اس کے وسائل اور ذرائع کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اس کی مدد ہمیں حاصل ہے تو انشا اللہ ہم اس بار بھی کامیاب اور کامران واپس جائیں گے۔ یہ بات یاد رکھو شرافت علی، کمزور طاقتور پر بھی فتح پا سکتا ہے جب وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو جائے۔ اپنی واپسی کے سارے راستے بند کر کے خود کو یہ یقین دلا دو کہ اب یا تو دشمن کو نیست و نابود کر دینا ہے یا خود فنا کے گھاٹ اتر جانا ہے۔ بس تخت یا تختہ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

"ٹھیک ہے یار! جو تم کہتے ہو وہی ٹھیک ہے مجھے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے، اگر یہ زندگی میرے ملک، میرے وطن کے دشمنوں کی تعداد کم کرنے کے کام آ سکے تو میرے لیے یہ ایک سعادت ہو گی۔ میری جان کے عوض پاکستان کا ایک دشمن بھی کم ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے مجھے۔ خدا کی قسم جیلانی! اگر اس ملک کے آدھے لوگ بھی تمھاری طرح وطن کی سلامتی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور ان میں بھی وطن پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ سازشیں اور تخریب کاریاں اسی افراتفری کا ہی تو نتیجہ ہیں جو ہمارے عوام و خواص کے ہر طبقے میں نظر آتی ہے۔ اے کاش یہ قوم اپنے ملک کے لیے مخلص اور سنجیدہ ہو جائے۔" شرافت علی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں ہے یار شرافت علی! ہمارے ملک کے لوگ تو بہت مخلص اور محب وطن ہیں بھائی، وہ تو ہر وقت اور ہر جگہ پاکستان کو سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی سلامتی اور بقا کے لیے اپنی پوری پوری نسلیں قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں، مگر المیہ یہ ہے میرے بھائی کہ ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا نہیں ہے کوئی۔ ہمارے یہاں کے سیاسی بازیگر ماضی میں انھیں نت نئے نعرے دے کر اور اپنے گرد اکٹھا کر کے جس طرح بھائی کو بھائی سے لڑاتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا اعتماد مجروح ہو گیا ہے، وہ مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ دوست اور دشمن کی تمیز نہیں رہی ہے انھیں کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہیں وہ اب۔ شیر کے آنے کا شور مچا مچا کر انھیں اتنے فریب دیے گئے ہیں کہ اب وہ شیر کو سامنے دیکھ کر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ شیر اصلی ہی ہے۔ اسے بھی وہ کوئی نیا شعبدہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ ضرورت ایسے شخص کی ہے.... جو عوام کا کھویا ہوا اعتماد واپس دلا دے انھیں۔"

اس اثنا میں گل زمان ایک بار پھر اوپر پہنچ چکا تھا۔ شرافت علی نے ٹرک کے ایک کونے میں دھری ہوئی لکڑی کی پیٹی کھول کر اس میں سے ایک اسٹین گن نکال کے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو یہ سنبھالو جلدی سے، کام کا وقت ہو گیا ہے، باتیں ختم کرو اب۔"

میں نے اسٹین گن اس کے ہاتھ سے لے کر کندھے سے لٹکا لی تو اس نے ایک تھیلا میری طرف بڑھا دیا۔ اس تھیلے میں دس دستی بم تھے۔ یہ تھیلا گل زمان کے لیے تھا، پروگرام کے مطابق اسے اپنے ساتھ بم لے کر عمارت میں داخل ہونا تھا اور انھیں اسی وقت استعمال کرنا تھا جب دشمن مقابلے سے فرار ہو کر کسی محفوظ پناہ گاہ میں جا چھپتا، یا کسی دیوار یا دروازے کو گرانے کی ضرورت پیش آ جاتی۔ میں نے وہ تھیلا دوسرے کندھے سے لٹکا کر اوپر سر اٹھا کر گل زمان کو دیکھا۔ عین اسی لمحے گل زمان کے منہ سے بالکل ایسی ہی آواز نکلی جیسی آواز اس نے شرافت علی کے کتوں کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر نکالی تھی۔ دوسرے ہی لمحے دیوار کے دوسری طرف سے کوں کوں کی ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسی عموماً کتے اپنے مالک کی ٹانگوں سے اپنی پشت رگڑ رگڑ کر اور اسی کے قدموں میں لوٹتے ہوئے نکالتے ہیں۔ مجھے یہ آوازیں سن کر اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ کتے گل زمان کے اسیر ہو چکے ہیں۔ بڑی عجیب بات تھی، یہ کوئی حیرت انگیز جادو ہی معلوم ہوتا تھا اس کے منہ سے نکلنے والی ایک ہلکی سی آواز سرکش اور خونخوار کتوں کو اچانک اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور کر دیتی تھی، بڑا ہی انوکھا تجربہ ہوا تھا اس روز یہ مجھے۔

میں گل زمان کو نیچے آتے دیکھ کر جلدی جلدی دو چار سیڑھیاں چڑھ گیا اور سرگوشی میں پوچھا۔ "کیوں، کیا ہوا؟"

"سب ٹھیک ہے، یہ تھیلا مجھے دے دیں آپ اور وہ رسی کی سیڑھی دیوار کے دوسری طرف لٹکا دیں، میں اُدھر جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

وہ مجھ سے بموں کا تھیلا لے کر دیوار پر جا چڑھا۔ اسی وقت شرافت علی نے رسی کی سیڑھی دیوار پر پھینک کر اسے ٹرک سے باندھ دیا۔ گل زمان سیڑھی پکڑ کر تیزی سے دوسری طرف اتر گیا۔ میں نے دیوار پر ہاتھ جما کر اس طرف جھانکا، مگر کتے مجھے وہاں دکھائی نہیں دیے لیکن جیسے ہی گل زمان کے پیروں نے زمین کو چھوا، وہ اچانک نمودار ہو کر اس کے پیروں میں لوٹنے لگے۔ وہ واقعی انتہائی قد آور اور صحت مند بلڈ ہاؤنڈ ہی تھے۔ گل زمان ان کے قریب بیٹھ کر پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے اطراف کا چوکنا نگاہوں سے جائزہ لینے لگا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کے وہاں پہنچنے پر ماحول میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی ہے، گل زمان نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور ہاتھ سے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

اشارہ ملتے ہی میں نے پتلون کی بیلٹ میں پھنسا ہوا بے آواز ریوالور نکال کر ہاتھ میں لیا اور جست لگا کر دیوار پر جا چڑھا۔ رسی کی سیڑھی پکڑ کر نیچے اترتے ہوئے میں نے پلٹ کر گل زمان کو دیکھا۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس کے ساتھ دونوں کتے بھی تھے اور وہ دونوں گل زمان کے آگے آگے اس طرح چل رہے تھے کہ گل زمان ان کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ سامنے سے دیکھنے والے کو وہ فوری طور پر نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نیچے اتر کر زمین پر لیٹ گیا.... اور شرافت علی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی وہ بھی میرے پاس پہنچ گیا لیکن اس دوران گل زمان عمارت کے بہت نزدیک پہنچ چکا تھا۔ عین اسی وقت میں نے اوپری منزل کی ایک کھڑکی سے کسی شخص کو باہر جھانکتے دیکھا۔ اس کی نظریں ہماری طرف تھیں۔ شاید اندر سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور صورت حال جاننے کے لیے کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تھا۔ ہم جہاں تھے، وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر ہم دم سادھے پڑے رہیں، کوئی حرکت نہ کریں تو تیز روشنی میں کھڑا ہوا وہ شخص ہمیں دیکھ نہیں سکے گا۔ میں نے شرافت علی سے دھیمی آواز میں کہا۔ "شرافت علی، حرکت نہ کرنا ذرا بھی، کوئی شخص اوپر کھڑکی میں کھڑا ہمیں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انھیں شاید کچھ شبہ ہو گیا ہے۔"

شرافت علی نے اسی طرح مدھم آواز میں جواب دیا۔ "ہاں میں دیکھ چکا ہوں اسے کہیں اس کی نظر گل زمان پر نہ پڑ جائے۔"

چند لمحے وہ شخص کھڑکی میں کھڑا رہا پھر پلٹ کر واپس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ہمیں نہیں دیکھا ہے اور محض اپنا اطمینان کر کے واپس چلا گیا ہے وہ۔ چنانچہ میں نے اس کے کھڑکی سے ہٹتے ہی شرافت علی سے کہا "اٹھو اور جلدی سے دوڑ کر گل زمان کے پاس پہنچو۔"

یہ کہتے ہی میں تیزی سے اٹھ کر گل زمان کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور اطمینان سے ٹہلنے کے سے انداز میں کتوں کے ساتھ ساتھ سامنے نظر آنے والے ایک بند دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہم نے اسے دروازے کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا۔ کتوں نے ہمیں دیکھ کر اپنے تیور بگاڑے تھے، مگر گل زمان نے ان کی گردنوں پر ہاتھ پھیر کر انھیں شانت کر دیا تھا۔ اچانک بند دروازے کے پیچھے سے ایک آواز ابھری۔ "تمھارا وہم بھی تو ہو سکتا ہے یہ، اگر کوئی ہوتا تو کتے اس کی بو محسوس کرتے ہی اس پر ٹوٹ پڑتے۔"

"وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن آخر اپنا شبہ دُور کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے؟" ایک دوسری آواز ابھری۔

ان آوازوں کو سن کر میں نے چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔ گل زمان نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا اور دونوں کتوں کی پشت سہلاتے ہوئے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ چند ثانیے کے بعد ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو افراد دروازے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انھیں شاید یہ توقع نہیں تھی کہ اگر کوئی اس مکان کی چار دیواری میں گھس ہی آیا ہے تو اس دروازے تک بھی پہنچ گیا ہو گا۔ اسی لیے وہ بے دھڑک ہو کر دروازہ کھولتے ہی باہر آ گئے تھے لیکن ہمیں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں تقریباً پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہے ہوں گے اور ان کے بڑھے ہوئے پیٹ یہ بتا رہے تھے کہ وہ محنت و مشقت کے عادی نہیں ہیں، ان کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئی تھیں۔ ان کی حیرانی سے گل زمان نے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے ہلکی سی سیٹی بجا کر کتوں کو اشارہ کر دیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں کتوں نے اپنی اپنی جگہ سے جست کی اور ان دونوں پر جا پڑے۔ میں نے کہا۔ "انھیں کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو اور جلدی سے اندر چلو، دیر کی تو اندر والے چوکنا ہو جائیں گے۔" یہ کہتے ہی میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

بھاگتے ہوئے میں نے اسٹین گن کندھے سے اتار کر سیدھی کر لی تھی تاکہ ضرورت پڑتے ہی اسے استعمال کیا جا سکے۔ یہ ایک خاصا کشادہ کمرا تھا جسے قیمتی فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا، سامنے

ہی اوپر جانے کے لیے زینہ موجود تھا۔ میں بھاگتا ہوا زینے پر پہنچا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چڑھنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے سے اسٹین گن کی گرج سنائی دی، دوسرے ہی لمحے زینے کے اوپر آخری سرے پر ایک چیخ ابھری اور کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا، کوئی شخص قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے چلا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آرزنک بھی نظر آیا، وہ ایک دروازے کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ میں نے اسٹین گن اس کی طرف سیدھی کرکے اسے نشانہ بنانا چاہا لیکن میرے ٹریگر دبانے سے پہلے ہی وہ دروازے میں گھس کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اسے دیکھ کر جیسے مجھ پر جنون طاری ہوگیا۔ میں نے اندھا دھند کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھنا شروع کیا اور لمحوں میں زینے عبور کرکے اس دروازے تک جا پہنچا جس کے پیچھے میں نے آرزنک کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ جلدی میں وہ اُسے بند نہیں کرسکا شاید۔ میں رُکے بغیر اندر گھستا چلا گیا۔ یہاں ایک گول میز کے گرد دائرے میں کئی کرسیاں پڑی تھیں، ہر کرسی کے سامنے ایک ایک فائل میز پر پڑی تھی۔ تین کرسیوں پر تین افراد بھی بیٹھے وہ حیرانی سے منہ کھولے آرزنک کو تک رہے تھے جو اُن کے قریب کھڑا کچھ کہہ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی دبا ہوا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس نے ریوالور مجھ پر سیدھا کرنا چاہا، مگر اس سے پہلے ہی میری اسٹین گن قہقہے لگانے لگی۔ مگر اس ذلیل ابن یہودا کی زندگی ابھی باقی تھی، عین اس وقت جب میری اسٹین گن نے گولیاں اُگلنا شروع کیں، وہ تینوں اشخاص جو کرسیوں پر براجمان تھے اچانک مشینی انداز میں ایک ساتھ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس طرح وہ میرے اور آرزنک کے درمیان حائل ہوکر میری چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آگئے تھے اور آرزنک کو ایک بار پھر نکل بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے کسی بندر ہی کی طرح دائیں جانب ایک کھلے ہوئے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور کسی چھلاوے کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہوکر بھڑاک سے دروازہ بند کردیا۔ میں نے بند ہوتے ہوئے دروازے پر فائر کیا تھا مگر میری کوئی گولی کارگر نہ ہوسکی تھی۔ میں نے لمبی لمبی چھلانگیں بھرتے ہوئے اس دروازے پر پہنچ کر اسے اندر دھکا دے کر کھولنا چاہا، پیچھے ہٹ ہٹ کر اپنے شانے سے کئی زوردار ٹکریں مار کر اُسے توڑنے کی بھی کوشش کی لیکن میری ہر کوشش رائیگاں ہی گئی۔ اتنی دیر میں شرافت علی اور گل زمان بھی بھاگتے ہوئے میرے پاس آپہنچے۔ گل زمان بولا "آپ ہٹ جائیں جیلانی بھائی، میں ابھی اس کے پرخچے اڑائے دیتا ہوں۔"

میں اس کا مطلب سمجھ کر فوراً شرافت علی کا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ گل زمان نے بھی ہمارے ساتھ بھاگتے ہوئے اپنے تھیلے سے دو دستی بم نکالے، پھر ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لیں جیلانی بھائی! اِدھر دروازے پر پہنچ کر ایک بم آپ پھینکیں اور ایک میں پھینکوں گا۔ دو بم تو اس پوری دیوار کو ڈھا دیں گے۔"

ہم کمرے کے اس دروازے تک پہنچ چکے تھے جہاں سے گزر کر ابھی چند لمحے قبل اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے دروازے میں رک کر گل زمان کے ہاتھ سے بم لے لیا اور بولا "آج اس اسرائیلی کتے کو بچ کر نہیں جانے دینا ہے، شرافت علی! تم اسٹین گن سنبھال کر تیار رہو، دروازہ ٹوٹنے کے بعد جیسے ہی وہ دکھائی دے ایک پل کی بھی مہلت دیے بغیر ساری گولیاں اتار دینا اس خنزیر کے بدن میں۔" پھر گل زمان سے بولا "تیار گل زمان۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ بم مارنا ہیں دروازے پر۔"

"بالکل جناب! میں تیار ہوں۔ بس ایک، دو، تین۔" گل زمان نے جواب دے کر تین تک گنتی گنی۔

اس کے تین کہتے ہی ہم دونوں نے مشینی انداز میں بموں کی پنیں دانتوں میں دبا کر کھینچیں اور بیک وقت دونوں بم اس دروازے کی طرف اچھال دیے جس کے پیچھے وہ سگ زادہ آرزنک چھپا بیٹھا تھا۔ بم پھینکتے ہی ہم دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ بیک وقت دو بموں کے دھماکے ایک ساتھ ہوئے اور پوری عمارت ہل کر رہ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس خوفناک دھماکے سے اس عمارت کے ہی نہیں آس پاس کی اور بھی کئی عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشے سلامت نہیں رہے ہوں گے۔ دھماکے کی بازگشت ختم ہوتے ہی ہم پلٹ کر دوبارہ اس کمرے میں جا گھسے۔ دھماکے کی وجہ سے یہاں کی ساری کرسیاں اچھل اچھل کر اِدھر اُدھر جا گری تھیں، وہ گول میز جس کے گرد بیٹھ کر وہ لوگ صلاح مشورے کر رہے تھے الٹ کر ان تینوں پر جا پڑی تھی جو میری اسٹین گن سے آرزنک پر چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آکر پہلے ہی خاک و خون میں لوٹ چکے تھے۔ آرزنک جس کمرے میں گھسا تھا اس کا دروازہ اور دیوار کا ایک بڑا حصہ غائب ہو چکا تھا اور اس کا ملبہ دونوں طرف کمروں میں بکھرا پڑا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے ٹوٹی ہوئی دیوار کو عبور کرکے دوسرے کمرے میں پہنچے، وہاں بھی ہر طرف افراتفری کا سا سماں تھا، کمرے کا فرنیچر اور الماریاں الٹی پڑی تھیں۔ دیواریں جگہ جگہ سے شق ہوگئی تھیں، پورے کمرے میں کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے بکھرے پڑے تھے مگر آرزنک کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا کہیں۔ کوئی دروازہ بھی اس کمرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا جو یہ سمجھ لیا جاتا کہ وہ اُدھر سے دوسری طرف نکل گیا ہوگا۔ کھڑکیاں کمرے کی بقیہ تینوں دیواروں میں موجود تھیں اور سب کی سب چوپٹ کھلی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک کا بھی شیشہ سلامت نہیں تھا۔ آرزنک کمرے میں نظر نہیں

آیا تو ہم تینوں طرف کی کھڑکیوں کی جانب جھپٹ پڑے۔ میں سیدھا سامنے کی کھڑکی پر پہنچا تھا، اس طرف ایک تنگ سی گلی تھی جو اس مکان کو برابر والے دوسرے مکان سے جدا کرتی تھی۔ برابر والے مکان کی دو کھڑکیاں اس طرف کھلتی تھیں، ان کھڑکیوں کے بھی شیشے ٹوٹ چکے تھے اور ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اس پار کمرے میں تین خوف ناک شکل والے غنڈوں کے ساتھ مجھے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ تینوں غنڈے کھڑکیوں کے پاس سے ہی ہٹے تھے اور اب بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر کی طرف جارہے تھے شاید، جب کہ وہ شناسا صورت اب بھی کھڑکی میں کھڑی اس مکان کو ہی دیکھ رہی تھی جس میں ہم لوگ موجود تھے۔ وہ لڑکی تھی اور اس طرف ہونے والے دھماکے کی نوعیت اور اس سے ہونے والی بربادی کا اندازہ لگا رہی تھی شاید، ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنا کر مجھے دکھایا اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس لڑکی نے مجھے بُری طرح اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسے کیا سمجھوں۔ میں اسے ایک کمرے کے گوشے میں غائب ہوتے دیکھ رہا تھا کہ شرافت علی نے آواز دے کر کہا "یہ دیکھو جیلانی! وہ اس طرف نیچے اترا ہے۔"

میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس طرف کھڑکی کے قریب کوئی دو یا تین فٹ کے فاصلے پر ایک لوہے کا زینہ بل کھاتا ہوا نیچے سے اوپر تک گیا تھا۔ کوئی بھی شخص اس کھڑکی پر کھڑے ہوکر اس زینے تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا۔

"اوہ، یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ چلو جلدی کرو، وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔" میں یہ کہہ کر جلدی سے کھڑکی پر چڑھ گیا۔

ہمیں اس لوہے کے زینے کے ذریعے نیچے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن ہمارے نیچے پہنچتے ہی اچانک پوری عمارت تاریک ہوگئی، شرافت علی بولا "اوہ، معلوم ہوتا ہے کسی نے مین سوئچ آف کردیا ہے۔ رُک جاؤ جیلانی! وہ شاید اندھیرے میں کہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ ہمارا یوں اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے اب ہمیں نکل چلنا چاہیے یہاں سے۔"

میں نے رک کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کیوں، یہ کیوں کہہ رہے ہو تم؟"

"اس لیے کہ اس تاریکی میں اس کا مل جانا ممکن نہیں ہے اب، اور اتنے زبردست دھماکے کرکے پورے علاقے میں ہلچل مچا دینے کے بعد ہمارا زیادہ دیر اس مکان کی چار دیواری میں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ دھماکے کی آواز دُور دُور تک سُنی گئی ہوگی، اس کے علاوہ علاقے کے لوگوں کی طرف سے اب تک پتا نہیں کتنے فون پولیس اسٹیشن پہنچ چکے ہوں گے۔ پولیس کے آنے تک ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔" شرافت علی بولا۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو یار! لیکن مجھے افسوس ہی رہے گا کہ آج پھر وہ ابلیس کا بچہ بچ نکلا ہے میرے ہاتھوں سے!" میں نے کہا۔

"پروا نہیں کرو یار! ہم نے اُن کے کئی اہم آدمی ٹھکانے لگا دیے ہیں آج، ناکام تو نہیں جائیں گے نا اب ہم۔ جلد ہی اس کا جھٹکا کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے ہم انشا اللہ، کب تک بچتا رہے گا وہ ہمارے ہاتھوں سے، ایک نہ ایک دن تو..."

اچانک اندھیرے میں ایک گولی سنسناتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان سے گزر گئی۔ شرافت علی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ مجھ سے بھی غیر ارادی طور پر یہی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ میں شرافت علی کے ساتھ زمین پر اوندھے منہ لیٹ گیا تب مجھے خیال آیا کہ یہ گولی ہماری طرف آ کیسے گئی تھی؟ کسی نے بے آواز ریوالور استعمال کیا تھا مگر اس ریوالور نے میری طرف گولی کیسے اُگل دی تھی؟ یہ خیال آتے ہی میں نے دوسرے ہاتھ سے اس ہاتھ کی انگلی کو ٹٹولا جس میں وہ عالیہ کی دی ہوئی طلسمی انگوٹھی پڑی رہتی تھی جس کی موجودگی میں آتشیں اسلحہ میرے خلاف اپنی تخلیق کا مقصد بھول جاتے تھے۔ حیرت یہی تھی مجھے کہ اس کی موجودگی میں کوئی ریوالور کارگر کس طرح ہوگیا لیکن اس وقت میری حیرت دوچند ہوگئی جب مجھے پتا چلا کہ میری انگلی بالکل خالی ہے، انگوٹھی اس میں موجود ہی نہیں ہے۔ میں نے بوکھلاہٹ میں جلدی جلدی دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی دیکھ ڈالی لیکن انگوٹھی کا کہیں نشان تک موجود نہیں تھا۔ پتا نہیں کہاں اور کب غائب ہوگئی تھی وہ۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی بہت کوشش کی کہ انگوٹھی میں نے کب اتاری تھی انگلی سے اور اگر اتاری تھی تو اسے رکھا کہاں تھا مگر اپنی انتہائی کوشش کے باوجود مجھے کچھ یاد نہیں آسکا۔ مجھے جو بات یاد تھی، وہ یہ تھی کہ میں نے کبھی کسی بھی موقع پر اپنے ہاتھ سے انگوٹھی کو جدا نہیں کیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا کہ شرافت علی کو زمین پر گرتے دیکھ کر بے اختیار میں بھی نیچے گر گیا تھا، اگر مجھ سے یہ اضطراری حرکت سرزد نہ ہوئی ہوتی اور میں حسب عادت انگوٹھی کے زعم میں اس فائر کرنے والے کی طرف بڑھتا چلا جاتا تو اس رات میری تدفین کا سامان ضرور ہو جاتا اور آرزنک کو ختم کرنے کی خواہش میرے ساتھ ہی قبر کی تاریکی میں اتر جاتی۔

میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھ کر میں نے اپنی اسٹین گن سیدھی کرنا چاہی، مگر اس کے استعمال کی نوبت ہی نہ آسکی، مجھ سے پہلے ہی کسی نے میری دائیں جانب سے اس سائے پر گولی چلا دی، وہ ہمارے اس قدر نزدیک آچکا تھا کہ گولی چلانے والے کا نشانہ خطا ہو جانے کا امکان ہی نہیں رہا تھا۔ گولی چلتے ہی وہ کراہ کر پیچھے الٹ گیا۔ عین اسی لمحے میری بائیں جانب سے اسٹین گن گنگنا اٹھی۔ میں نے چلنے والے سائے سے چند ہی قدم پیچھے دو اور سایوں کو اچھل کر گرتے دیکھا۔ پھر کئی دوڑتے ہوئے قدموں کی بھاری آوازیں دور ہوتی سنائی دیں۔ میں نے اندازے سے ان آوازوں کی طرف فائر جھونک مارا، ایک ہلکی چیخ سن کر میں نے سمجھ لیا کہ میں بھی ایک دشمن کو کم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے مدھم آواز میں شرافت علی اور گل زمان سے کہا۔ "اٹھ کر اندازے سے اس طرف دوڑ لگا دو جدھر ہمارا ٹرک کھڑا ہے۔ اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور پلٹ کر پیچھے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

شرافت علی اور گل زمان نے بھی میری تقلید کی تھی۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ پیچھے سے کتوں کے غرانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، کتے ہم سے کافی دور تھے۔ عین اسی لمحے عمارت کی تمام روشنیاں جل اٹھیں اور مجھے وہ چاروں کتے نظر آگئے جو ہماری طرف لپکے چلے آرہے تھے۔ دشمن نے ہمیں کتوں کے ذریعے گھیرنے کی کوشش کی تھی...
گل زمان بھاگتے بھاگتے رک گیا، اس کے منہ سے ایکبار پھر وہی آواز نکلی جو کتوں پر سحر طاری کر دیتی تھی۔ آواز کے نکلتے ہی کتوں کی غراہٹ ختم ہو گئی۔ چاروں کتے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر گل زمان کو تکنے لگے۔ گل زمان نے اپنے ہونٹوں سے سیٹی بجاتے ہوئے ایک ہاتھ کو یوں حرکت دی جیسے کوئی چیز عمارت کی طرف پھینکی ہو۔ کتوں نے ایک لمحے گل زمان کو دیکھا اور پھر پلٹ کر عمارت کی طرف دوڑ پڑے۔ گل زمان واپس مڑ کر بولا۔ "بھاگ لیں جلدی سے اب، یہ کتے اب کسی کو ہمارے پیچھے نہیں آنے دیں گے۔"

ہم بھاگتے ہوئے عمارت کا چکر کاٹ کے جس جگہ نکلے، وہ عمارت کا سامنے والا حصہ تھا۔ وہاں بہت تیز روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی دیکھ کر ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ہم فوراً وہیں رک گئے۔ شرافت علی بولا۔ "یہ تو ہم غلط سمت میں آگئے ہیں یار! واپس پلٹو۔"

میں نے عمارت کے ایک دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا "نہیں، واپس گئے تو مارے جائیں گے، دشمن ادھر ہی موجود ہے۔ اس دروازے سے عمارت کے اندر گھس جاؤ اور جو بھی نظر آئے اسے گولیوں سے چھلنی کرتے ہوئے عمارت کی پشت پر پہنچنے کی کوشش کرو۔"

وہ میری بات سنتے ہی جھپٹ کر اس دروازے میں گھس گیا۔ یہ ڈائننگ روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کے وسط میں کھانے کی میز لگی ہوئی تھی، دیواروں کے ساتھ شوکیس دھرے تھے، جن میں چینی کے برتن وغیرہ کبھی قرینے سے رکھے ہوں گے اس وقت تو سب ٹکڑوں میں بٹے باہر فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً ان بموں کے دھماکے کا نتیجہ تھا جو میں نے اور گل زمان نے اوپر کا دروازہ توڑنے کے لیے استعمال کیے تھے۔ اس کمرے میں اس دروازے کے علاوہ جس سے ہم اندر آئے تھے، دو دروازے اور بھی تھے۔ ایک بالکل ہمارے سامنے تھا اور دوسرا دائیں جانب۔ ہم سامنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ خاصا آراستہ ڈرائنگ روم تھا لیکن اس وقت یہاں بھی ابتری ہی پھیلی نظر آرہی تھی ہر سُو۔ اس کمرے کے چاروں طرف ہی دروازے تھے۔ بائیں جانب کا دروازہ تو یقیناً سامنے ہی کی طرف لے جاتا ہمیں۔ سامنے والے دروازے سے کتوں کے غرانے اور کئی آدمیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں چنانچہ ہم دائیں طرف والے دروازے کی جانب بڑھ گئے، میرا اندازہ تھا کہ اس طرف سے ہم مکان کے عقبی حصے میں ضرور پہنچ جائیں گے۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک ہی تھا۔ ہم اس دروازے سے گزر کر جس کمرے میں پہنچے، وہ وہی کمرا تھا جس میں اوپر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ اس کمرے سے ہم باہر نکلے تو ہمارے سامنے ہی وہ دیوار تھی جس پر رسّی کی سیڑھی لٹکا کر ہم یہاں آئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، یہاں میدان بالکل صاف تھا۔ دروازے سے کچھ دور تک خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آرہے تھے۔ یہ خون انہی دو کتوں کا تھا جن پر ہم کتے چھوڑ کر اندر گھسے تھے لیکن اس لمحے وہاں نہ کتے ہی کہیں نظر آرہے تھے اور نہ ہی ان دونوں کا کچھ پتا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے اس طرف بڑھتے چلے گئے جہاں ہم نے دیوار پر سیڑھی لٹکائی ہوئی تھی۔ سیڑھی دیوار کے ساتھ اسی طرح لٹکی ہوئی تھی، ہم باری باری کسی دشواری سے گزرے بغیر ٹرک پر واپس پہنچ گئے۔ گل زمان نے پول سے لگی ہوئی سیڑھی وہاں سے ہٹا کر ٹرک کے اگلے حصے سے لگا کر کھڑی کر دی، اس دوران شرافت علی نے رسّی کی سیڑھی دیوار سے کھینچ کر ٹرک میں ڈال دی۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں میں بہت سے مرد اور عورتیں کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے لیکن ہم ان کی طرف توجہ دیے بغیر ٹرک کے اگلے حصے میں جا گھسے۔ میں نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر ٹرک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

گلی سے نکلتے ہوئے اچانک پولیس کی ایک جیپ ہمارے سامنے آگئی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک پل کے لیے میرا پاؤں بریک پر پڑا تھا لیکن دوسرے ہی پل میں نے پاؤں ہٹا کر ٹرک کی رفتار اور بڑھا دی۔ جیپ کے ڈرائیور کو اس کی توقع بھی نہیں ہو گی کہ کوئی پولیس کی جیپ کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے کی جرأت کر سکتا ہے، اس کا خیال ہو گا کہ میں اسے سامنے دیکھ کر ٹرک کو روک دوں گا لیکن میری خلاف توقع حرکت سے وہ بُری طرح بوکھلا گیا اور جیپ کو خوفناک حادثے سے بچانے کی کوشش میں ایک مکان کی دیوار سے ٹکرا دیا، پھر بھی ٹرک اس کے پچھلے حصے سے پورے زور سے ٹکرا ہی گیا۔ جیپ الٹ کر دیوار سے جا لگی تھی لیکن پھر بھی گلی تنگ ہونے کی وجہ سے ٹرک سے الگ نہ جا سکی اور ٹرک اسے رگیدتا ہوا گلی سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر آتے ہی میری نظر ایک طرف کھڑی ہوئی خان کی کار پر پڑی۔ وہ ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اپنی کار میں آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگاتے ہوئے گل زمان اور شرافت علی سے کہا۔ "جلدی سے اتر کر خان کی گاڑی میں چلو۔"

ہم تینوں نہایت عجلت کے ساتھ ٹرک کو چھوڑ کر خان کی کار میں جا گھسے۔ کار کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ تھا، ہمارے بیٹھتے ہی خان نے کار تیزی سے دوڑانا شروع کر دی۔ میں بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا کہ کسی نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش تو نہیں کی ہے لیکن ہمارے پیچھے دور تک سڑک سنسان نظر آرہی تھی، ہم نے اتنی تیزی دکھائی تھی وہاں سے نکلنے میں کہ کسی کو سنبھلنے اور تعاقب کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا شاید۔ کافی دور نکل آنے کے بعد خان نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے یار! تم لوگ بخیریت واپس آگئے، میں تو مایوس ہونے لگا تھا تمھاری طرف سے، بہت دیر کر دی تھی تم نے واپس آنے میں۔"

"ہاں یار! وہ ابلیس کا بچہ آج پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اس بار بھی، اسی کو ڈھونڈنے میں دیر ہو گئی ہمیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ، تو ایکبار پھر بچ نکلا ہے وہ کمینہ، معلوم ہوتا ہے اس کی زندگی کے دن تمام نہیں ہوئے ہیں ابھی۔" خان نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

شرافت علی بولا۔ "ہمیں وہ ٹرک وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا جیلانی! اس کے ذریعے پولیس ہم تک پہنچ سکتی ہے اور ایسی صورت میں جبکہ تم نے ان کی جیپ کو ٹکر مار کر انھیں نقصان بھی پہنچایا ہے، وہ یقیناً ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ اپنے معاملے میں بڑے فرض شناس ہو جاتے ہیں یہ۔"

"اس کی تم فکر مت کرو شرافت علی! ٹرک کے ذریعے وہ قیامت تک ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ اس ٹرک کا رجسٹریشن انھیں کہیں نہیں لے جا سکے گا، وہ بغیر رجسٹریشن کے جعلی نمبر پلیٹوں پر ہی چلتا رہا ہے ہمارا اب تک۔" خان نے میرے بولنے سے پہلے ہی اسے مطمئن کر دیا۔

ooo

صبح کے اخبارات ایکبار پھر غلام جیلانی اور اس کے ساتھی پنڈی جیل کے مفرور اسلم آبی کے نام کی مالا جپ رہے تھے۔ رات کو ہم جس ٹرک کو چھوڑ کر آئے اس کے متعلق اس نے پولیس کو یہی بتایا تھا کہ اس ساری بربادی کا ذمے دار غلام جیلانی نامی ایک ڈاکو ہے۔ اخبارات نے جو کہانی نکالی اس کے مطابق رات کو دس اور گیارہ بجے کے درمیان غلام جیلانی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ فیڈرل بی ایریا کے ایک مکان میں ڈاکا ڈالنے پہنچا تھا، یہ مکان ایک جرمن صنعت کار مسٹر الیگزینڈر کی ملکیت ہے، یہاں وہ اپنے ان مہمانوں کو ٹھہراتے تھے جو دوسرے ملکوں اور شہروں سے کاروباری امور طے کرنے یا کسی اور کام کے سلسلے میں ان کے پاس آتے تھے۔ اخبارات نے الیگزینڈر کی موت کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق اب الیگزینڈر کے کاروبار کی دیکھ بھال اس کی بہن الزبتھ کرتی تھی۔ ان دنوں یورپ کے ایک ملک سے آیا ہوا ایک بڑا صنعت کار اسمتھ، الزبتھ کا مہمان ہے، وہ پاکستان میں سرمایہ کاری کے مواقع کا جائزہ لینے کے لیے یہاں آیا ہے، رات وہ کچھ پاکستانی تاجروں اور صنعت کاروں کے ساتھ ایک میٹنگ میں مصروف تھا جب غلام جیلانی وہاں پہنچا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی گولیاں برسانا شروع کر دیں، اسمتھ کے ساتھ میٹنگ میں شریک تین تاجر، ایک صنعت کار اور دو الزبتھ کے محافظ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ ایک محافظ کے پیر میں اسٹین گن کی گولی لگی ہے۔ اس ہنگامہ آرائی نے مکان میں حفاظت کے لیے کھلے ہوئے کتوں کو بدحواس کر دیا اور انھوں نے دو مہمان صنعت کاروں پر حملہ کر کے انھیں بُری طرح زخمی کر دیا ہے۔ دونوں اسپتال میں داخل ہیں۔ ڈاکٹر ان کی زندگیاں بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی بچنے کی امید کم ہی ہے۔ مسٹر اسمتھ کا بیان ہے، دو ڈاکو اپنے سردار کو جیلانی کہہ رہے تھے جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ واردات بدنام زمانہ ڈاکو اور مفرور مجرم غلام جیلانی.... نے کی ہے جسے عدالت سزائے موت سنا چکی تھی اور وہ لاہور جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ غلام جیلانی کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام بھی مقرر ہے لیکن ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ اب تک پولیس کی دسترس سے محفوظ ہے۔

اس کے بعد اخبار نے پولیس کی نااہلی اور میرے ماضی کے قصے خوب نمک مرچ لگا کر شائع کیے تھے۔ ایسے ایسے واقعات اور قتل و غارت گری کی ایسی وارداتیں میرے نامۂ اعمال میں درج کر دی گئی تھیں جن کی مجھے خبر تک نہیں تھی۔ فیروز یہ ساری تفصیل پڑھ کر بولا۔ "یار جیلانی! تمھیں تو ان لوگوں نے ہیرو بنا ڈالا ہے کسی فلم کا۔"

اور یہ اسٹنٹ کون ہے بھئی جس نے پولیس کے سامنے تمہارا نام لیا ہے؟"

"اسی ذلیل آدمی یعنی یہودا آنزک کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ اس کمینے نے اپنا نام بدل کر پولیس کو بیان دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"بہرحال تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، اور وہ تمہاری لڑکی بیگم ایلیزبتھ یعنی جیراللہ کی بہن بنا کر یہاں اس کا کاروبار اس نے شروع کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے یہ بات تو ہمیں آج اخبار کے ذریعے ہی معلوم ہوئی ہے، لڑکی نے تو نہیں بتایا تھا ناتمہیں کچھ؟"

"ان لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے بھائی۔ پل بھر میں کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں یہ، ویسے رات میں نے آنزک کو تلاش کرنے کے دوران ساتھ والے مکان میں لڑکی کو دیکھا تھا، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور انگلیوں سے فتح کا نشان مجھے دکھا کر غائب ہو گئی تھی۔"

"اچھا! وہ برابر والے مکان میں موجود تھی اس وقت...!" فیروز نے حیرانی سے کہا۔ "یار یہ لڑکی تو ہمارے لیے معمّا ہی بن کر رہ گئی ہے۔"

"ہاں یار! اس کی تو کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا ہے کہ کس کھاتے میں ڈالا جائے، کون سے خانے میں رکھا جائے اسے۔ ایک طرف تو وہ ان ابلیس زادوں کی ایسی معتمد خاص ہے کہ انھوں نے اسے یہاں جیراللہ کا جانشین بنا دیا ہے اور اس کی بہن بنا کر سارا کاروبار اس کے حوالے کر دیا ہے، دوسری طرف لڑکی کا ایک یہ روپ بھی ہے ہمارے سامنے کہ اس نے پیشگی اطلاع دے کر شرافت علی کے خلاف آنزک کی کارروائی کو ناکام بنا دیا اور پھر ہمارے ہاتھوں اُسے شدید قسم کی زک بھی پہنچا دی۔"

میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں جو معلومات مجھے سان فرانسسکو میں گریگری نے فراہم کی تھیں، اس کے مطابق تو وہ ایک کٹر قسم کی یہودن ہے جسے اسرائیل کے بدنام زمانہ محکمے موساد نے بچپن ہی سے سخت تربیت دے کر اسرائیلی مفادات کے لیے کام کرنے کو تیار کیا ہے۔ سان فرانسسکو سے یہاں تک اس کا ... اس کی تائید کر رہا ہے کہ گریگری کی اطلاعات درست تھیں، لیکن اب ... اس کا ایک بالکل مختلف روپ ہمارے سامنے آیا ہے جس نے الجھا کے رکھ دیا ہے ہم سب کو۔ اس طرح تو ہم مارے جائیں گے کسی دن، ہمیں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر ہی لینا چاہیے۔"

"اور فیصلہ کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے، کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے تمہیں ایک بار اس سے مل کر ... باتیں کرنی چاہئیں۔" فیروز بولا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" خان بولا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کوئی فیصلہ کر بیٹھیں، جس پر ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"ہاں ... ٹھیک کہتے ہو ... ایک بار سب کچھ کھل کر سامنے آ جانا چاہیے ...

... بولا۔ لیکن میرا خیال ہے یار، کہ وہ جس طرح ہم سے متعارف ... ہے یعنی جو نقشِ اوّلیں ہمارے دلوں میں ... ہے ... اس کے بعد اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں ... شک و شبہے کی نظر سے ہی دیکھتے رہیں گے۔"

"ہاں! تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہی لگتی ہے مگر پھر بھی اس اونٹ کو کسی کروٹ تو بٹھانا ہی پڑے گا ہمیں۔" فیروز بولا۔

"اس مسئلے پر بعد میں غور کریں گے کسی وقت ... جب ... اکٹھے ہوں گے۔ ابھی میں ذرا آبی کے پاس جا کر اس کی خبر لے آؤں، ورنہ وہ قیامت کھڑی کر دے گا میرے لیے۔ وہ بے چاری فردوسی بیگم تنہا ہے اس کی خبر گیری کرنے کے لیے، ذرا اس کی ڈھارس بھی بندھاتے رہنا چاہیے ہمیں، آبی کی زبان کو تو جانتے ہو کیسے کیسے گل کھلاتی رہتی ہے، خاصا ... دیا ہو گا اس غریب کو اس نے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو میں بھی چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ تمہارا دوست تو بہت دلچسپ آدمی ہے جیلانی! اس کی باتوں سے کوئی عاجز نہیں آسکتا۔ فردوسی بیگم کو اس نے بوریت کا ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیا ہو گا۔ ویسے یہ عورت بڑی مخلص ہے، ورنہ کوئی کسی کے لیے خود کو خطرات میں ڈالنا کہاں پسند کرتا ہے۔ وہ تو اس آبی کی خدمت ایسے کر رہی ہے جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو، ماں جایا ہو وہ اس کا۔" فیروز بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے، ایسا لگتا ہے جیسے اس کے خمیر میں خلوص کچھ زیادہ ہی شامل ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کا دنیا میں ہے ہی کون، اتنی بڑی دنیا میں وہ تنہا ہی زندگی کے سرد و گرم سہتی رہی ہے، ایسے میں ہماری دوستی اس کے لیے سرمایۂ حیات ہی ہے۔"

"ہاں بھائی! تنہائی کا عذاب بڑا ہی اذیت ناک ہوتا ہے انسانوں کے اس جمِ غفیر میں جب کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو جس سے آدمی اپنا دکھ سکھ بیان کر سکے تو زندگی ایک کرب مسلسل بن کر رہ جاتی ہے۔" فیروز نے میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے ... "یہ دنیا بڑی ... ہے ... یار یہاں ... کوئی نظر نہیں آئے گا، ہر شخص کو بے شمار گلے شکوے ہیں اس ... پھر بھی یہ زندگی اتنی عزیز ہے آدمی کو کہ عمر کے ... میں بھی دنیا کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

آبی مجھے دیکھتے ہی چلایا۔ "اوئے جیلانی! یہ رات تم لوگوں نے ... شب خون ... فرزند اسرائیل پر۔"

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ... افسوس ... وہ کمبخت آنزک پھر بچ گیا ...

... سے آدمی مار آئے ہو تم ان کے۔ ایسا عذاب اس سے پہلے کہاں دیکھا ہو گا انھوں نے۔ اور یہ میرا نام کس لیے شامل کر دیا گیا ہے اس معرکہ آرائی میں؟"

"یہ اخبار والوں کی اپنی کارگزاری ہے۔ تو جانتا ہے نا ... جوڑ کر ... انھیں ... ہیں ... ہیں کہ غلام جیلانی اور اسلم آبی ... آبی کا ذکر سن کر انھوں نے فوراً یہ سوچ لیا ہو گا کہ ان دونوں میں سے ایک ... اسلم آبی ہے۔ ان بے چاروں کو یہ کیا معلوم کہ آبی آج کل اللہ کے نام پر پھلجھڑی پھیلانے کی ریہرسل میں مصروف ہے۔"

"بک نہیں اوئے، کیا سمجھتا ہے تو کیا میں اب ٹھیک ہی نہیں ہو سکوں گا کبھی۔ یہ خیال دل سے نکال دے ... آج میں باتھ روم تک خود چل کر گیا تھا اپنے پیروں سے، اللہ نے چاہا تو جلد ہی دوڑتا بھاگتا بھی نظر آیا کروں گا میں تجھے۔"

"اچھا! یہ تو تو نے بڑی اچھی خبر سنائی ہے بھئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا تیری لمبی ہی چھٹی ہو گئی ہے اس بار۔" میں نے کہا۔

"غلط سمجھ رہا تھا تو بیٹے! ابھی تک ایسا کوئی زخم دریافت نہیں ہو سکا ہے جو آبی کی لمبی چھٹی کرا دے۔" آبی سینہ پھلا کر بولا۔

"اتنے غرور سے بات نہ کر بچے! اچھا نہیں ہے تو یہ بات سوہنے رب کو پسند نہیں ہے، توبہ کر جلدی سے۔" میں نے ذرا تلخی سے کہا۔

اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کان کھینچ کر گالوں پر طمانچے مارتے ہوئے کہا۔ "ویری سوری، بڑی بھول ہو گئی ہے مجھ سے۔ رب! میں تیرا عاجز اور گناہ گار بندہ معافی کا خواست گار ہوں تجھ سے۔ مجھے معاف کر دینا میرے مولا!"

"وہ فردوسی بیگم کدھر چلی گئی آبی! وہ دکھائی نہیں دے رہی ہے کہیں۔" میں نے فردوسی بیگم کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"جائے گی کہاں وہ تجھے چھوڑ کر، اب تو وہ تیرے نام لکھ دی گئی ہے پیارے! مجھے رشک آتا ہے یار تیری قسمت پر۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"فضول مت بکا کر اوئے، الٹا سیدھا ... کر اپنی زبان تو، وہ غریب اتنے خلوص سے تیری خدمت کرتی ہے اور تو یوں بکواس کرتا ہے اس کے لیے، دل آزاری نہ کیا کر کسی کی، ایسی باتیں اس کے کانوں میں پڑ جائیں تو کیا سوچے گی وہ ہمارے بارے میں کہ کیسے ذلیل لوگ ہیں ہم۔" میں نے اُسے سرزنش کی۔

وہ ہنس کر بولا۔ "تیرا کیا خیال ہے، کیا اس نے کبھی نہیں سنی ہیں ایسی باتیں؟ بیٹے جیلانی! وہ تو ... سن کر خوش ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں جھانک کے تو دیکھو۔ کیسے کیسے سپنے بسا رکھے ہیں اس نے اپنی ان ہرنی جیسی آنکھوں میں۔ بڑا سنگدل اور خود غرض ہے یار تو جیلانی! تجھے اپنے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا ہے۔ ایسی وفا کی بندی، خلوص بیگم کا حال جاننے کی بھی فرصت نہیں ملتی تجھے۔"

فیروز نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں بھئی جیلانی! ایسا نہیں کرنا چاہیے تمہیں، اس کا خیال ضرور رکھا کرو، آبی نے ٹھیک کہا ہے۔"

"اچھا اچھا یار! ... ختم کرو یہ قصہ۔ میں پوچھ رہا تھا وہ ہے کہاں؟" میں نے بات کو مزید بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"کہاں بھائی! ... کہیں کسی جگہ جنت پر اپنا حق تسلیم کرانے میں مصروف ہو گی، تیرا دل بہت بے چین ہے ملنے کو تو بلا دوں؟"

میں نے فیروز سے کہا۔ "چلو بھائی فیروز! اٹھو یہاں سے، اس پر شیطان کے کسی چیلے نے قبضہ کر رکھا ہے اس سمے۔ یہ کوئی قاعدے کی بات نہیں کرے گا اس گھڑی۔ ہم چل کر شرافت علی کی خیریت معلوم کریں فون پر۔ آنزک نے پولیس کے سامنے میرا نام لیا ہے تو اسے کسی نہ کسی طرح یہ بھی خبر کر دی ہو گی کہ میرا اٹھنا بیٹھنا، ان دنوں شرافت علی کا جمشید روڈ والا بنگلہ ہے۔ یہ خیال ابھی ابھی آیا ہے مجھے۔"

یہ حقیقت بھی تھی کہ مجھے بس اچانک ہی یہ خیال آ گیا اس گھڑی۔ میری بات سن کر فیروز بھی چونک پڑا، بولا۔ "یہ تو تمہیں بہت ہی پتے کی بات سوجھی ہے جیلانی! میں خبر پڑھنے کے بعد سے اب تک اسی پر غور کر رہا تھا کہ آنزک نے کسی خاص مقصد کے بغیر تمہارا نام نہیں لیا ہو گا پولیس کے سامنے لیکن وہ مقصد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب بات سمجھ میں آئی ہے، وہ تمہارے ساتھ شرافت علی کو بھی پولیس کے چکر میں الجھا کر اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ بڑی گہری چال چلی ہے اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔"

ہم تیز تیز قدم ... آبی کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے۔ میں نے واپس آتے ہی ٹیلی فون اٹھا کر شرافت علی کے نمبر ڈائل کر دیے۔ دوسری طرف سے فون کسی لڑکے نے ریسیو کیا تھا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ میں شرافت علی سے بات کرنا چاہتا ہوں تو اس نے فوراً ہی ریسیور شرافت علی کو دے دیا۔ وہ شاید قریب ہی موجود تھا اس ... میں نے اس سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ "... دیر میں یہ خیال آیا ہے تمہیں۔ یہاں تو یہ معاملہ ... چکا ہے میرے بھائی! میں ابھی تمہارے پاس آنے کو گھر سے نکل رہا تھا جی۔

بہرحال پندرہ منٹ انتظار کرو، میں اُدھر ہی آرہا ہوں۔ وہیں آکر اس کی تفصیل بتاؤں گا تمھیں۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے شرافت علی سے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہوئی یہ، تم نے تو دو ہی باتیں کرکے فون رکھ دیا؟" فیروز نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہیں آرہا ہے۔ کہہ رہا تھا مجھے بہت دیر میں خیال آیا اس بات کا، شاید پولیس وہاں بہت پہلے پہنچ گئی تھی۔"

"اچھا!" وہ حیرانی سے بولا "کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں شاید ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے، وہ کہہ رہا تھا، اس نے معاملہ نمٹا دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

شرافت علی نے مجھ سے پندرہ منٹ میں پہنچنے کو کہا تھا مگر جب وہ میرے پاس پہنچا تو چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے پوچھا "کیوں خیریت تو ہے نا شرافت علی! تم پندرہ منٹ کے بجائے چالیس منٹ میں پہنچے ہو یہاں؟"

وہ بولا "گھر سے نکلنے کے بعد تھوڑی ہی دور چل کر مجھے پتا چلا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ چنانچہ میں اس سے جان چھڑانے کی خاطر اِدھر آنے کے بجائے سیدھا ٹاور کی طرف چلا گیا۔ وہاں میری کچھ دکانیں اور آفس ہیں۔ میں نے کار ایک دکان کے سامنے کھڑی کردی، اور آفس چلا گیا۔ چند منٹ آفس میں بیٹھنے کے بعد میں عقبی دروازے سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی کے ذریعے اِدھر آگیا۔ تعاقب کرنے والا جو کوئی بھی تھا، وہیں میری کار پر نظریں جمائے بیٹھا سوکھ رہا ہوگا۔"

"ویسے تم نے کچھ اندازہ کیا اس کے بارے میں، وہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، میں یہ نہیں معلوم کرسکا۔ دراصل میں اس پر کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میں اس تعاقب سے واقف ہو چکا ہوں، اسی لیے میں نے اُسے ڈاج دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اسے اگر اس کا پتا چل جاتا تو آئندہ وہ بہت زیادہ محتاط ہو کر تعاقب شروع کر دیتا اور اس طرح وہ میرے ساتھ ہر جگہ پہنچ جایا کرتا۔"

"یہ تو واقعی تم نے اچھا کیا ہے شرافت علی! فی الحال تم ہی وہ واحد آدمی ہو جس کا تعاقب کرکے وہ مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح تو اب تم بھی ان کی زیادتیوں سے محفوظ ہو گئے ہو۔ اب وہ تمھیں بھی اس وقت تک کچھ نہیں کہیں گے جب تک انھیں میرا سراغ نہیں مل جاتا۔"

"ہاں ... ہے پہلے تو وہ میرا پیچھا کرکے تمہارا ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، اس کے لیے انھیں میری ضرورت رہے گی اور جب تک میری ضرورت باقی ہے وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا پائیں گے مجھے۔" شرافت علی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"وہ پولیس کا کیا قصہ تھا؟ تم نے وہ معاملہ کس طرح نمٹایا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں صبح اذان کے وقت اُٹھنے کا عادی ہوں۔ چنانچہ حسبِ معمول آج بھی اُٹھ کر اپنی کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کرنے لگ گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے اخبار کا بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ رات آنزک کے مکان سے نکل کر بھاگتے ہوئے تم نے پولیس کی جیپ کو بُری طرح رگید ڈالا تھا۔ مجھے یقین تھا تمھاری اس حرکت نے پولیس کے پورے محکمے کو مشتعل کر دیا ہوگا اور وہ تمھاری تلاش میں سرگرداں ہو گئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پولیس اس سلسلے میں کیا اندازے قائم کر رہی ہے۔ للٰہذا اخبار کے آنے تک لان میں ٹہلتا رہا۔ اخبار کے آتے ہی میں نے وہیں کھڑے کھڑے رات کے ہنگامے کی ساری خبریں پڑھ ڈالیں۔ گو اخبار میں جیپ والے واقعے کی خبر نہیں تھی لیکن آنزک نے پولیس کو تمھارا نام بتا دیا تھا، یہ معلوم ہوتے ہی مجھے فوراً خیال آیا کہ وہ پولیس کو تمھارا پتا میرے ذریعے سے ضرور دے گا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت بنگلے کے چوکیدار کو فون کرکے ہدایت کردی کہ اگر پولیس وہاں آکر تمھارے بارے میں معلوم کرے تو وہ تم سے ناواقفیت کا اظہار کرے۔ وہ پولیس کو یہ بیان دے کہ وہ غلام جیلانی نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہے۔ اس بنگلے میں میرے دو مہمان گزشتہ ایک ہفتے سے ٹھہرے ہیں مگر وہ ان کے نام نہیں جانتا۔ اگر اس سے ان مہمانوں کے حلیے معلوم کیے جائیں تو وہ انھیں میرے بتائے ہوئے حلیے بتا دے۔ اسے اپنے دو خاص آدمیوں کے حلیے بھی بتا دیے۔ وہ دونوں ہانگ کانگ کے باشندے ہیں اور اتفاق سے ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی ہانگ کانگ ہو کر آئے ہیں۔ ان کے پاسپورٹوں میں اندراج موجود ہے۔ پھر ان دونوں کو فون کرکے ساری صورت بنا کر بنگلے پر پہنچنے کی ہدایت کی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ دونوں پولیس کے پہنچنے سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ گئے تھے۔ پولیس جب وہاں پہنچی تو اس نے بنگلے میں دیکھا جو میں اسے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ بڑے کروفر اور پورے اس یقین کے ساتھ وہاں پہنچے تھے کہ آج وہ غلام جیلانی جیسے مشہور و معروف مجرم کو پکڑ کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دینے والے ہیں۔ کل کے اخبارات ان کے اس کارنامے سے بھرے ہوں گے، انھیں ترقیوں اور انعامات و اعزازات سے نوازا جائے گا مگر مایوسی کے سوا بے چاروں کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

فیروز قہقہہ لگا کر بولا "کاش وہ منظر ہم بھی دیکھ سکتے، یادرہ جانے والا منظر ہوگا وہ تو۔"

میں نے کہا "یہ بڑی خوبی ہے شرافت علی میں، حالات کا اندازہ کرکے صحیح نتائج اخذ کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ اگر خبر پڑھنے کے بعد یہ فوری اقدامات نہ کرتے تو پولیس انھیں بُری طرح شکنجے میں کس کے رکھ دیتی۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ میرے جسم سے گوشت کا ایک ایک ریشہ الگ کر دینے کے بعد بھی وہ مجھ سے غلام جیلانی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ یوں بھی شرافت علی کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہے جس کے ساتھ پولیس والے جیسا تیسا بھی سلوک کریں۔"

"اس کا تو مطلب ہے کہ اب ہم اس بنگلے میں دوبارہ نہیں جا سکتے اور وہاں نہیں جا سکے تو لنزی سے ہمارا رابطہ بالکل ہی ٹوٹ جائے گا، ہمیں آنزک کے آئندہ پروگرام کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چل سکے گا۔ یہ تو بڑا نقصان ہو گیا ہے یار ہمارا۔" میں نے کہا۔

"نہیں یار! اس کی تم بالکل فکر نہیں کرو، وہاں تو میں تمھیں اب بھی لے جا سکتا ہوں۔" شرافت علی بولا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر چلو، ہمیں آج کے دن تو وہیں ہونا چاہیے۔ لنزی اگر ہمارے ساتھ فراڈ نہیں کر رہی ہے تو وہ وہاں مجھے فون ضرور کرے گی۔ رات کی کارروائی میں ہم نے کیا کامیابی حاصل کی تھی، یہ تو وہی بتا سکے گی صحیح طور پر۔"

"ٹھیک، تو پھر چلو اُٹھو، پہلے میں تمھیں اپنے ایک دوست کے پاس لے چلوں گا، وہ تمھارا حلیہ تھوڑا سا تبدیل کر دے گا، اس کے بعد تم آزادی سے پورے شہر میں دندناتے پھرنا، کوئی شناخت نہیں کرسکے گا تمھیں۔" شرافت علی بولا۔

"یعنی میک اپ کراؤ گے تم میرا اس سے۔ ٹھیک ہے، چلو چلتے ہیں ہم۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

فیروز بھی میرے ساتھ ہی اُٹھ کر بولا "میں بھی ساتھ چلوں گا تمھارے۔" "تم دونوں کا اس طرح ایک ساتھ پھرنا ٹھیک نہیں ہے ابھی، اس وقت تک جب تک میک اپ کے ذریعے تمھارا حلیہ تبدیل نہ ہو جائے۔ کسی نے دیکھ لیا تم دونوں کو ایک ساتھ تو مشکلات کھڑی کر دے گا وہ۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، میں فیروز کے ساتھ رہوں گا، تم ٹیکسی میں آگے آگے چلنا۔"

"نہیں، ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔ گاڑیاں دو دو فاضل موجود ہیں گیراج میں، ایک گاڑی نکال لو اپنے لیے وہاں سے۔" فیروز نے کہا۔

عین اس وقت جب باہر آکر فیروز، شرافت علی کے لیے گاڑی نکالنے گیراج کی طرف جا رہا تھا، انور کمال کی مزدا مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر فیروز نے شرافت علی سے کہا "لو بھئی وہ انور کمال آگیا، تم اس کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ جاکر۔"

دونوں کاریں آگے پیچھے فراٹے بھرتی ہوئی طارق روڈ جا پہنچیں، یہاں ایک بیوٹی پارلر کے سامنے شرافت علی کار رکوا کر اتر گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بیوٹی پارلر کے اندر لے گیا۔ جہاں ایک چالیس بیالیس سالہ خاصی فربہ خاتون نے ہمارا استقبال کیا۔ شرافت علی نے اس سے کچھ دیر سرگوشی کی۔ وہ خاتون اس دوران بڑی ہی گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ شرافت علی نے اس سے بات کرنے کے بعد جیب سے چیک بک نکال کر ایک چیک لکھا اور اُسے پھاڑ کر خاتون کے حوالے کردیا۔ چیک لے کر اس نے خاموشی سے ایک دراز میں رکھ کر دراز کو لاک کردیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں چلی گئی۔ جہاں چاروں طرف دیواروں میں قدِ آدم شیشے لگے ہوئے تھے، ان کے سامنے فارمیکا کے خوب صورت بکسوں میں میک اپ کا سامان قرینے سے سجا ہوا تھا۔ جابجا مختلف انداز کی وگیں بھی لٹکی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی میں خود اپنے آپ کو نہیں پہچان رہا تھا۔

پارلر سے نکل کر شرافت علی بھی میرے ساتھ فیروز کی گاڑی میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ فیروز گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تمھارا تو بالکل نقشہ ہی بدل گیا ہے جیلانی! اس وقت تو آنزک بھی تمھیں نہیں پہچان سکے گا، اگر اس سے سامنا ہو جائے تو۔"

"ہاں یار! اس شرافت علی نے تو بڑے بڑے فن کاروں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔" میں بولا۔ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی جو ایک دکان سے کچھ بنڈل اٹھائے نکل رہی تھی۔ میری نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ میں اسے ہزاروں کے مجمع میں ہر حال میں پہچان سکتا تھا، اس وقت وہ ایک سبز رنگ کی قیمتی ساری میں ملبوس تھی اور بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھا ہوا تھا اس نے اور ہائی ہیل کی سینڈل پہن کر وہ نہایت نزاکت سے قدم اٹھا رہی تھی۔ مگر میری نظریں اسے پہچاننے میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ بالکل وہی تھی میری بہن آسیہ، میری ماں جائی۔

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گرانقدر معاوضے پر چراتا ہے

نک ویلوٹ کی چوریاں

ان چوریوں کی دلچسپ کہانیاں

وہ تمام کہانیاں جو آج تک لکھی گئی ہیں

قیمت ۲۵/- روپے

ڈاک خرچ ۱۰/- روپے

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۱

ہاں وہ آسیہ ہی تھی، شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اس میں۔ وہی بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، وہی سرو جیسا قامت اور وہی قدم اٹھانے کا اس کا مخصوص انداز۔ سرِ مُو فرق نہیں تھا کسی چیز میں بھی۔ اس سے میرا اتنا قریبی رشتہ تھا کہ میں اُسے پہچاننے میں غلطی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ خون کے رشتے ایسے تو نہیں ہوتے کہ اُنھیں شناخت کرنے میں دشواری ہو، وہ تو خود بول پڑتے ہیں مُنہ سے، لہو کی بُو میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ دُور ہی سے کھینچ لیتی ہے آدمی کو اپنی طرف۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی اُسے دیکھتے ہی، وہ بس اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر نظر آ گئی تھی اُس وقت مجھے، اس کی کراچی میں موجودگی کے بارے میں تو میں نے سوچا تک نہیں تھا، چنانچہ اب وہ یوں اچانک نظر آئی ــ تو میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا مگر پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر ایک بار پھر اُدھر نظر دوڑائی جہاں وہ نظر آئی تھی مجھے لیکن اتنی دیر میں ہماری کار اُس جگہ کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے بیتابی سے کہا۔ ”فیروز! گاڑی روکو جلدی سے۔“

شرافت علی حیرت سے بولا۔ ”کیوں، گاڑی کیوں رکوا رہے ہو؟ کیا نظر آ گیا ہے یہاں تمہیں اچانک؟“

”وہ... وہ... آسیہ... میری بہن... آسیہ ہے وہاں۔ جلدی سے گاڑی روکو یار، وہ نکل نہ جائے کہیں۔“ میں بے صبری سے بولا۔

”کہاں ہے آسیہ؟“ فیروز گاڑی کی رفتار کم کر کے اُسے فٹ پاتھ کے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”وہ یہاں کہاں سے آ گئی بھائی؟ دھوکا ہوا ہو گا تمھیں۔“

”ہاں بھئی، وہ یہاں کہاں ہو سکتی ہے؟ تمہیں دھوکا ہی ہوا ہے شاید۔“ شرافت علی بھی فیروز کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار! کیسی باتیں کرتے ہو تم لوگ، وہ بہن ہے میری، اُسے پہچانتے ہیں میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں کبھی بھی۔ میں اُسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا، خواہ وہ کسی جگہ اور کسی بھی روپ میں کیوں نہ ہو۔ میں نے اُدھر ایک دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے اُسے۔“

میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا اور تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اس طرف چل دیا جہاں چند سیکنڈ پہلے آسیہ کو دیکھا تھا میں نے۔ میری نظریں میرے پیروں سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں، مگر فیروز اس دوران اس جگہ سے بہت دُور نکال لایا تھا کار کو۔ وہاں فٹ پاتھ پر اور دُکانوں میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں موجود تھیں لیکن اُن میں سے کسی نے بھی سبز رنگ کی ساڑی نہیں پہنی ہوئی تھی جبکہ

میری آنکھیں سبز رنگ کی ساڑی کو تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر وہ مجھے نظر آ گئی، مگر ہمارے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ میں اگر آواز دیتا تو سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے اس شور میں یہ آواز اُس کی سماعت کو چھو نہیں سکتی تھی۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے کھڑی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کار کی عقبی نشست کے دروازے میں جھکی اپنے ہاتھوں کے بنڈل کار کے اندر رکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی تیز رفتاری سے اس کی طرف دوڑنا شروع کر دیا، مگر میری یہ تیز رفتاری میرے کام نہ آ سکی۔ دوسرے لمحے وہ خود بھی کار میں بیٹھ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی رفتار مزید تیز کرتا کار کا عقبی دروازہ بند ہو گیا اور کار سڑک پر تیرتی ہوئی مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی۔ میں نے اُسے جاتے دیکھا تو اندھا دھند دوڑتے ہوئے زور زور سے اُسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ یہ میری دیوانگی ہی تھی جو میں ایسی حرکتیں کر رہا تھا، ورنہ میں خوب جانتا تھا کہ میری یہ تمام کوشش لاحاصل ہی ہے، نہ میری ٹانگیں مرسیڈیز کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں اور نہ میری آواز اس تک پہنچ سکتی تھی، پھر بھی میں چیختا چلاتا بھاگا جا رہا تھا سڑک کے بیچوں بیچ۔ کچھ ہوش نہیں تھا مجھے کہ کیا کر رہا ہوں، میری اس دیوانگی نے سڑک پر چلتے ہوئے ٹریفک کا سارا نظام گڑبڑا کر ڈالا تھا، میرے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گاڑیوں کے ہارن پورے زور شور سے چیخ رہے تھے۔ آخر جب مرسیڈیز میری نظروں کی حد سے بھی آگے نکل گئی اور میں اُسے دیکھنے کے قابل بھی نہ رہا تب میری رفتار میں کمی واقع ہوئی اور میں نے اپنے چاروں طرف ہونے والے گاڑیوں کے شور کی طرف توجہ دی۔

میں نے رک کر اپنے اطراف نظریں دوڑائیں اور جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ دونوں طرف فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں اور دُکان داروں صورتِ حال جاننے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ فٹ پاتھ پر چڑھتے ہی بہت سے لوگوں نے مجھے گھیرے میں لے کر طرح طرح کے سوالات شروع کر دیے۔ ”کیا ہوا بھائی جی۔ کیا جیب کاٹ کے بھاگ گیا کوئی؟“ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسرے نے سوال داغ دیا۔ ”کیا کوئی بہت بڑی رقم لے گیا ہے وہ؟“

”ہاں جی، بڑی رقم ہی ہو گی، چھوٹی موٹی رقم کے لیے کوئی جان کی پروا کیے بغیر دوڑ سکتا ہے؟“ کسی تیسرے نے فوراً کہا۔ ”بڑا بُرا وقت آ گیا ہے جی، اللہ اپنی امان میں رکھے سب کو۔ دن دہاڑے لوگوں کے ہاتھوں سے رقمیں چھنتے لگی ہیں اب تو۔“

”ہاں جی، بالکل ٹھیک کہتے ہیں بڑے صاحب آپ، سب حکومت کی نااہلی کی وجہ سے ہو رہا ہے، چھوٹ ملی ہوئی ہے چور اُچکوں کو۔“ مجمع میں کسی سیاسی بازی گر نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً حکومت کو مطعون کرنے کی کوشش کی۔

میں حیران تھا کہ یار لوگوں نے اصل بات جانے بغیر خود ہی ایک فرضیہ گھڑ کے اس پر یقین کر لیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ مجھے بھول کر حکومت کو بُرا بھلا کہنے اور ہر بُرائی کا اُسے ذمے دار ٹھہرانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور انھیں تبصروں میں مصروف چھوڑ کر آہستہ سے ان کے درمیان سے سرک آیا۔ فیروز اور شرافت علی بھی بھاگتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے تھے، وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس کار کی طرف چل دیے۔ میں نے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”ہماری گاڑی بہت آگے نکل گئی تھی، مجھے دیر ہو گئی واپس آنے میں، میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک مرسیڈیز کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔“

فیروز بولا۔ ”کیا تمھیں کامل یقین ہے کہ وہ تمھاری بہن آسیہ ہی تھی؟ اچھی طرح دیکھا تھا تم نے اسے؟“

”تمھیں یقین کیوں نہیں آ رہا ہے یار؟ تم یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ میں نے اپنی بہن کو شناخت کرنے میں غلطی کی ہے؟“

”سوال یہ ہے میرے بھائی کہ اگر وہ تمھاری بہن آسیہ تھی تو وہ ایک دم اتنی دولت مند کیسے ہو گئی کہ مرسیڈیز میں گھومنے لگی۔“

”یہ کوئی بہت اہم بات نہیں ہے، تم جانتے نہیں ہو اُسے ورنہ ایسا نہیں کہتے، اس کے لیے دولت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میری طرح وہ بھی بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی ہے، حالات کی بھٹی میں بہت زیادہ پک چکی ہے وہ۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہے تو تم اس کے لیے اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہو؟“ فیروز نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

شرافت علی نے بھی مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”جب تم جانتے ہو کہ وہ کوئی نازک اندام سی گھریلو قسم کی لڑکی نہیں ہے۔ بدترین حالات کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے اور وقت کو اپنے حق میں موڑ دینے کی صلاحیت بھی ہے اس میں، اپنی حفاظت بھی کر سکتی ہے وہ، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ دوسروں پر بُرا وقت بھی ڈال سکتی ہے، پھر اس کے لیے فکر کرنے کی کیا بات رہ جاتی ہے تمھارے لیے؟“

”وہ یار! میں نہیں رہتا ہوں اب اس کے لیے زیادہ فکر مند، میں جانتا ہوں وہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکی ہے جہاں بھائی اپنی بہنوں اور والدین اپنی بیٹیوں کے لیے فکر مند ہو جاتے ہیں، جانتی تو ماں جی بھی ہیں یہ سب کچھ مگر وہ ماں ہیں، ان کی ممتا انھیں پریشان کرتی رہتی ہے، ان کی نظروں میں آسیہ اب بھی معصوم اور شرمیلی سی الھڑ مٹیار ہے جیسی عہدِ شباب میں قدم دھرنے سے پہلے تھی، وہ اب بھی اس کی حفاظت اور نگہداشت کو اپنی ذمے داری سمجھتی ہیں اور زمانے کے سرد و گرم سے بچائے رکھنا چاہتی ہیں، ان کے سینے میں یہ خواہش ابھی تک جوان ہے کہ وہ اپنی پھول سی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے اس کا ڈولا اپنے دروازے سے رخصت کریں، ان کے وہ خواب ابھی منتشر نہیں ہوئے ہیں جو ہر ماں اپنی بیٹی کی پیدائش کے دن سے ہی دیکھنے لگتی ہے۔ شاید ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھنے کے لیے ہی وہ جی رہی ہیں اب تک، جس دن یہ خواب بکھر گئے شرافت علی وہ سانس لینا بھول جائیں گی۔ اسی دن، اسی لمحے اور یہی میں نہیں چاہتا ہوں، میں اپنے سینے کو ماں کے وجود کے اطمینان سے خالی کرنا نہیں چاہتا دوست۔ میں ان کی دعاؤں کا یقین کھونا نہیں چاہتا۔ کل جب میں نے فون پر بات کی تھی ان سے تب بھی وہ زیادہ وقت آسیہ ہی کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ تم خود سوچو ایسے میں اُسے کس طرح بھول سکتا ہوں میں؟“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”ہاں، مجھے یاد ہے، تم نے وعدہ کیا تھا اُن سے کہ بہت جلد آسیہ کو ساتھ لے کر پہنچ رہے ہو تم ان کے پاس، ہر ماں کا دل ایک ہی جیسا ہوتا ہے جیلانی۔ اسے اپنے بچوں کی سلامتی اور بہتری کی ہر لحظہ فکر رہتی ہے، ہر ماں اپنے بچوں کو ہمیشہ اتنا ہی معصوم سمجھتی ہے جتنا انھیں اپنی گود میں دیکھا ہوتا ہے اُس نے۔ ماں جی بھی اگر تم دونوں بہن بھائی کو ایسا سمجھتی ہیں تو یہ کوئی عجیب بات تو نہیں ہے، یہ تو فطرت ہے ان کی اور ممتا کی مجبوری ہے یہ۔ لیکن ماں جی کے دُکھ سکھ اور ان کی خواہشوں کا جتنا خیال تم رکھتے ہو، میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں تمھاری بہن بالکل خیال نہیں رکھتی ان کا۔ وہ تو اپنے ہی حال میں مگن و مست رہتی ہے ہر دم۔“ شرافت علی نے کہا۔

”اس کی بھی وجہ ہے شرافت علی۔ دراصل اس میں غلطی زیادہ اس کی نہیں ہے، قصوروار ہم ہی ہیں اس معاملے میں بھی۔ دراصل بچپن ہی سے ہم لوگ اس کی ناز برداریاں کرتے چلے آ رہے ہیں، اسے یہ بتانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی کبھی کہ کچھ ذمہ داریاں، کچھ فرائض اس پر بھی عائد کیے گئے ہیں قدرت کی طرف سے۔ اسے احساس ہی نہیں دلایا گیا ہے کبھی کسی بات کا۔ بتایا ہی نہیں گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں اسی طرح اسے بھی خیال رکھنا چاہیے دوسروں کا۔ یوں سمجھ لو ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار نے اسے بے حس بنا دیا ہے دوسروں کی طرف سے۔“

”کچھ بھی ہے اسے ماں جی کے معاملے میں بہر حال اتنا بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ضرور رکھنا چاہیے اسے۔“ شرافت علی بولا۔

"ہاں بھائی! بات تو ٹھیک ہی کہی ہے تم نے مگر میں کیا کر سکتا ہوں اب، ملنی بھی تو نہیں ہے مجھے وہ کہیں کہ سمجھا بجھا کر اُسے ماں جی کے پاس واپس جانے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کروں میں جب بھی سامنا ہوتا ہے اس سے کوئی ہنگامی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور جیسے ہی اطمینان سے بیٹھ کر بات کرنے کا وقت آتا ہے وہ غائب ہو چکی ہوتی ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم اس مقام تک پہنچے جہاں فیروز نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ جوشِ جنوں میں میں کتنی دور تک دوڑتا چلا گیا تھا۔ یہاں سے کار سے اتر کر دیوانوں کی طرح سڑک پر دوڑنے کے بجائے اگر میں فیروز کو کار واپس موڑنے کے لیے کہہ دیتا تو شاید آسیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ فیروز نے کار میں بیٹھ کر دوبارہ اسٹیئرنگ سنبھال لیا، میں شرافت علی کے ساتھ عقبی نشست میں دھنس گیا تو فیروز کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی جذبات میں بہہ کر تم حماقتیں کرنے لگتے ہو جیلانی۔ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنا چاہیے تمھیں ہمیشہ۔"

"ہاں یار! مجھے بھی اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ یوں سڑک پر دوڑنے کے بجائے مجھے کار واپس موڑنے کے لیے کہنا چاہیے تھا تمھیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی تم سے ایک حماقت سرزد ہوئی ہے اس وقت جس کا شاید اب تک احساس نہیں ہے تمھیں۔" فیروز بولا

"اچھا!" میں نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے لیکن مجھے کچھ یاد نہ آسکا تو میں نے پوچھا۔ "کس کی بات کر رہے ہو بھائی تم؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے کون سی حماقت کر ڈالی ہے اس گھڑی؟"

"آسیہ کو دیکھ کر تم یہ بات بالکل بھول گئے کہ بھائی شرافت علی نے تمھارا حلیہ اس حد تک بگاڑ رکھا ہے کہ تم اگر خود اپنے سامنے بھی کھڑے ہو جاؤ تو اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دو گے۔ ایسے میں وہ غریب آسیہ کس طرح پہچان لیتی تمھیں؟ اگر اس تک پہنچ جاتے اس وقت تو ایک نیا ہی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا تمھارے لیے۔ وہ تمھیں پہچاننے سے صاف انکار کر دیتی اور تم مشتعل ہو کر نہ جانے کیا سلوک کرتے اس کے ساتھ اور بھرے بازار میں ہم سب تماشا بن کر رہ جاتے۔ مجمع لگ جاتا ہمارے اردگرد اور اس مجمع میں تم چلّا چلّا کر آسیہ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ تم غلام جیلانی ہو اور وہ تمھاری گمشدہ بہن آسیہ ہے۔ کیا اس طرح تمھارا یہ اعتراف پریشانیاں نہیں کھڑی کر دیتا ہم سب کے لیے؟"

"ہاں بھئی جیلانی! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اپنے آپ پر قابو رکھا کرو بھائی یوں ایک دم بے قابو مت ہو جایا کرو۔ مسائل پہلے ہی تمھارے اردگرد کم نہیں ہیں ان میں مزید مسئلے کھڑے مت کرو، ورنہ الجھتے ہی چلے جاؤ گے، جان چھڑوانا مشکل ہو جائے گا۔" شرافت علی بولا۔

وہ دونوں ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ واقعی آسیہ کو دیکھنے کے بعد مجھے اپنی موجودہ حیثیت کا ذرا بھی خیال نہیں رہا تھا اور جس طرح میں دوڑا تھا اس کی طرف اگر اس کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا مجھے لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ کوئی اتنی اہم چیز نہیں ہے کہ ہمارے لیے پریشانی کا سبب بن جاتی۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" شرافت علی بولا۔ "تم وہاں بیچ سڑک پر سیکڑوں آدمیوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر اُسے یہ بتلاتے کہ تم غلام جیلانی ہو اور تم نے اپنے دشمنوں کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے میک اپ کے ذریعے اپنا حلیہ تبدیل کیا ہوا ہے۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تمھارے نزدیک؟ کیا کہہ رہے ہو جیلانی تم! کچھ سوچا بھی ہے تم نے؟"

"او یار! خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ، ہرج ہی کیا ہے اسے یہ بتلانے میں؟" میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ بہن ہے میری، مجھے اس سے یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ وہ یہ بات جا کر میرے دشمنوں کے گوش گزار کر دے گی۔ ایسا کبھی نہیں کر سکتی ہے وہ۔"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو جیلانی! ہم تمھاری بہن پر بے اعتمادی کا اظہار نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تمھارے دشمنوں کو کچھ نہیں بتائے گی، وہ تمھیں نقصان پہنچانے والا کوئی کام کبھی نہیں کرے گی لیکن اس کی کیا ضمانت ہے تمھارے پاس کہ وہاں جو مجمع لگتا اس میں تمھارے دشمنوں کا کوئی آدمی نہیں ہوتا، کوئی بھی ایسا شخص جو تمھاری باتیں سُن کر اُن تک پہنچاتا وہاں نہیں ہوتا؟" شرافت علی جھنجلا کر بولا۔

"اچھا یار، ٹھیک ہے، جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہی ٹھیک ہوگا مگر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اور شکر کرو کہ جس کا ڈر تھا تمھیں وہ نہیں ہوا اور جب کچھ ہوا ہی نہیں تو خواہ مخواہ میرا دماغ کیوں کھا رہے ہو تم؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بُرا ماننے کی بات نہیں ہے جیلانی۔ ہم تو تمھیں صرف یہ بتا رہے ہیں کہ آئندہ ایسی غلطی مت کرنا، یہ خطرناک بھی ہو..."

میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا، اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "بس کرو یار، سمجھ لی میں نے تمھاری بات، اب خاموش ہو جاؤ بس۔"

اس وقت میرے دماغ میں آسیہ کے سوا کچھ نہیں سما رہا تھا یہ باریکیاں میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھیں اس گھڑی۔ آسیہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ کوئی فریبِ نظر نہیں تھا۔ میرا ضمیر اس خیال سے سلگ رہا تھا کہ وہ یہیں اسی شہر میں موجود ہے اور میں

اس سے ملنا تو دور کی بات ہے، دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اُسے۔ یہ خیال بار بار میرے دل کو کچوکے لگا رہا تھا کہ وہ ملنے کے بعد بھی مجھے نہیں مل سکی تھی، دو باتیں تک نہ کر سکا تھا میں اُس سے، یہ بھی نہیں معلوم کر سکا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے، کہاں مل سکتی ہے وہ مجھے اور نہ ہی اپنے بارے میں کچھ بتا سکا تھا۔ اسے میرا اور مجھے اس کا پتا ٹھکانہ چاہیے تھا۔ کم از کم یہی معلوم ہو جاتا اُسے کہ میں اس کی کراچی میں موجودگی سے واقف ہو چکا ہوں۔ مگر یہ کچھ بھی نہ ہو سکا تھا۔ اب میں اُسے کہاں تلاش کرتا، کس سمت میں ڈھونڈنے جاتا اُسے۔ صرف اتنا ہی جان لینا کافی نہیں تھا میرے لیے کہ وہ کراچی میں ہے۔ کراچی کسی چھوٹی موٹی بستی کا نام تو نہیں ہے جہاں کسی کے سامنے میں اس کا نام لے کر پتا پوچھ لیتا اس کا۔ میلوں میں پھیلے ہوئے انسانوں کے اس بحرِ بےکراں میں کسی ایک فرد کی حیثیت ہی کیا ہے، کسے خبر کہ کون کس پاتال میں گم ہے۔ یہاں تو میں نے ایسے علاقے بھی دیکھے ہیں جہاں کسی کو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان کے پڑوس میں، بالکل ان کی دیوار کے ساتھ جس مکان کی دیوار لگی ہے اس مکان میں کون رہتا ہے، صبح و شام جس کے سامنے سے گزرتے ہیں اُس کا نام کیا ہے۔ اور وہ سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کار بھی اس کی تلاش میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ ایسی نہ جانے کتنی کاریں کراچی کے کتنے علاقوں میں کن کن لوگوں کے پاس ہوں گی۔ ایسے میں اسے کہاں تلاش کرتے جاتا میں؟ کس سے پوچھتا پتا اس کا، کس کے سامنے اس کا حلیہ دہراتا؟ اس کا سراپا بار بار میری آنکھوں کی اسکرین پر ابھر رہا تھا اور کانوں میں اس کی آواز بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ میں آسیہ کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ شرافت علی اور فیروز بھی خاموش تھے، انھوں نے شاید مجھے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس گھڑی میرے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بنگلے پر پہنچنے کے بعد شرافت علی نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

میں نے چونک کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آں... ہاں... ہاں کیا بات ہے؟"

وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اب مراقبے سے نکل آؤ۔ منزل آگئی ہے۔"

"اوہ اچھا۔" میں نے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کار سے باہر نکل آیا۔

فیروز مجھ سے پہلے ہی کار سے اتر چکا تھا۔ اُس نے میرے پاس آکر میرے گلے میں بازو ڈال دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے جیلانی تمھیں میری باتوں سے تکلیف پہنچی۔ مجھے اس وقت ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ مجھے معاف کر دو بھائی۔ ہم جس عظیم مقصد کے لیے ساتھ ہوئے ہیں اس میں آپس کا اختلاف بہت نقصان دہ ہے۔ ایک دوسرے کے جذبات کا ہمیں احترام کرنا چاہیے۔"

میں بالکل بھول چکا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان کس قسم کی گفتگو ہو چکی ہے۔ اُس کی بات سُن کر میں نے حیرانی سے اُس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون سی بات، کیسا نقصان؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے میرے بھائی!"

"نہیں یار! اب اس قدر بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ مت کرو کہ خود اپنی نظروں سے گر جاؤں میں۔" فیروز اداسی سے بولا۔

شرافت علی اس دوران کار سے اتر آیا تھا۔ وہ بولا۔ "بھائی فیروز! بھول جاؤ اس بات کو۔ تم جانتے نہیں ہو جیلانی کو، یہ دل کا بہت صاف آدمی ہے۔ اس وقت سچ مچ اُسے کچھ یاد نہیں ہوگا کیونکہ یہ اس وقت آسیہ کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔"

شرافت علی کی بات سُن کر مجھے خیال آیا کہ میں نے راستے میں ان دونوں کے ساتھ کیسی تلخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ شرافت علی واقعی بڑے ظرف والا بندہ تھا، وہ میری ساری تلخ کلامی کو امرت سمجھ کر پی گیا تھا اور اب فیروز کو بھی یہی باور کرا رہا تھا کہ میں نے جس بددماغی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ ایک ایسا فعل تھا جو عالمِ مدہوشی میں مجھ سے سرزد ہو گیا تھا چنانچہ وہ اُسے سنجیدگی سے نہ لے۔ میں نے بے حد مشکور نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوئے چھوڑ یار! مٹی ڈالو ان فضول باتوں پر۔ آدمی خطا کا پتلا ہے، غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ اور میں بھی ابنِ آدم ہی ہوں، کوئی فرشتہ تو نہیں ہوں۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل میلا نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر ہم تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

ہمیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ باہر سے دربان کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کو نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ اندر آنے سے روک رہا ہے لیکن آنے والا اس کی عاجزی اور انکساری کی پروا کیے بغیر اندر گھسا چلا آ رہا ہے۔ شرافت علی تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ارے کون ہے بھئی جو اس طرح اندر گھسا چلا آ رہا ہے۔ یہ خان کس سے الجھ رہا ہے آخر؟"

"ہاں بھئی چلو دیکھو، کہیں وہ ابنِ یہودا ہی نہ آ گھسا ہو اپنی پوری بٹالین کو ساتھ لے کر۔" میں نے اُس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔

میرے ساتھ فیروز بھی اُٹھ کر آ گیا تھا۔ باہر قدم دھرتے ہی ہم تینوں ہی ایک دم چونک کر ساکت کھڑے ہو گئے۔ میرے تو جیسے پاؤں زمین سے چپک کر رہ گئے تھے، قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی میرے پیروں میں۔ میں فیروز کا بازو تھام کر جہاں کا تہاں کھڑا ایک ٹک اس پولیس افسر کو دیکھتا رہ گیا جو چار سپاہیوں کے آگے آگے ہماری طرف چلا آ رہا تھا اور دربان اس سے التجا کرنے کے انداز میں روکنے کی کوشش کرتا اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ شرافت

علی کو دیکھ کر وہ دوڑا ہوا اس کے پاس آکر بولا۔ "دیکھیں صاحب! میں انھیں سمجھا رہا ہوں کہ اس طرح اندر نہ جائیں لیکن یہ میری بات ہی نہیں سُن رہے ہیں۔ زبردستی مجھے دھکا دے کر اندر آگئے ہیں۔"

شرافت علی پولیس افسر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم جاؤ واپس اپنی جگہ پر، میں خود دیکھ لوں گا اُسے۔"

دربان واپس چلا گیا اپنے کیبن کی طرف۔ اس دوران وہ پولیس افسر ہم تینوں کو بغور دیکھتے ہوئے ہمارے قریب آکھڑا ہوا۔ شرافت علی سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جی فرمایئے؟ کیسے زحمت دی ہے آپ نے اپنے قدموں کو غریب خانے تک آنے کی؟"

پولیس کا وہ افسر جو دربان کے منع کرنے کے باوجود اپنے جسم پر منڈھی ہوئی سرکاری یونیفارم اور اپنی افسری کی زعم میں مُنہ اٹھائے چلا آرہا تھا، شرافت علی کے لہجے کی کاٹ سے بوکھلا اُٹھا تھا۔ ایک لمحے کو اس نے شرافت علی سے نظریں چُرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس دوران وہ اپنے منتشر ہو جانے والے حواس کو یکجا کر چکا تھا۔ پھر وہ نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "ویری سوری سر۔ میں تکلیف دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ یقین کریں آپ، بہت ہی مجبوری کے عالم میں مجھے یہ ناخوشگوار کام انجام دینا پڑ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اپنی آمد کا مقصد بیان کرو، صرف یہ بتاؤ کہ وہ کونسی مجبوری ہے جو تمھیں یہاں تک کھینچ لائی ہے؟" شرافت علی بولا۔

"ابھی چند منٹ قبل ہمیں اطلاع دی گئی ہے کہ لاہور کے بدنامِ زمانہ جیل توڑ کر فرار ہونے والے اشتہاری مجرم غلام جیلانی کو آپ کے اس بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔ وہ ایک بے حد خطرناک مجرم ہے سر۔ اس کی گرفتاری انتہائی اہم ہے۔ آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں اس بات کو۔" وہ بولا۔

"مفرور مجرم غلام جیلانی!" شرافت علی نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہی تو نہیں جس کی تلاشی میں صبح ہی صبح تمھارے محکمے کے کچھ اور لوگ یہاں آئے تھے؟ وہ بھی شاید ایسا ہی کوئی نام لے رہے تھے۔"

"جی... جی... جی ہاں جناب، اُسی کی بات کر رہا ہوں میں بھی۔ رات اُس نے فیڈرل بی ایریا میں ایک بڑی واردات کی ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا اخباروں میں، کئی لوگ مارے بھی گئے ہیں وہاں، ان ڈاکوؤں نے بڑی تباہی مچائی ہے، بم بھی استعمال کیے ہیں۔" پولیس افسر بولا۔

"ہوں، صبح جو لوگ یہاں آئے تھے، انھیں بھی کچھ ہاتھ نہیں آسکا تھا اس بنگلے سے۔ انھوں نے تمھیں بتایا نہیں کہ یہاں عادی اور خطرناک قسم کے مجرم نہیں رہتے۔ یہ شریفوں کے رہنے کی جگہ ہے اور شرفا اپنے گھروں میں پولیس کا گھس آنا پسند نہیں کرتے۔" شرافت علی نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے جناب۔ صبح میں بھی آیا تھا اپنے افسران کے ساتھ لیکن جو اطلاع اِس وقت ملی ہے مجھے، اُسے بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، ایسے خطرناک لوگوں کے بارے میں ملنے والی اطلاع پر کارروائی کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے ہمارے لیے، یہ مجبوری ہے جناب ہماری۔" وہ بولا۔

"نہیں، کوئی مجبوری نہیں ہے ایسی، صبح میں نے تم لوگوں کو پورا بنگلا دکھا کر مطمئن کر دیا تھا، اب میں بار بار اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"میں آپ سے قانون کے نام پر اپیل کر رہا ہوں جناب کہ آپ قانون سے تعاون کرتے ہوئے مجھے بنگلے کی تلاشی لے لینے دیں۔" وہ بولا۔

"میں تعاون کروں تم سے قانون کے نام پر، اور تم اسی قانون کے نام پر شریفوں کو رسوا کرتے پھرو۔ وارنٹ لائے ہو تلاشی کا؟"

"وارنٹ تو نہیں لا سکا ہوں، اتنا وقت نہیں مل سکا ہے، ہنگامی طور پر یہاں آنا پڑا ہے مجھے اور اس یقین کے ساتھ چلا آیا ہوں کہ آپ ایک صلح پسند اور شریف شہری ہیں، قانون سے تعاون ضرور کریں گے۔ یہی ہر شہری کا اخلاقی فرض بھی ہے..."

"جی ہاں، سارے کا سارا اخلاق اور تمام فرائض صرف شہریوں کے لیے ہیں، تم پر نہ تو کچھ فرض کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی اخلاقی ذمے داری عائد ہوتی ہے تم پر۔ یہ سرکاری یونیفارم بدن پر منڈھتے ہی تمھیں یہ اختیار مل جاتا ہے کہ ہر جگہ، ہر گھر میں دندناتے ہوئے جا گھسو اور جس کی دل چاہے پگڑی اپنے پیروں میں روند ڈالو، کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" شرافت علی غضبناک ہو کر بولا۔

"آپ تو بے وجہ ناراض ہو رہے ہیں جناب! میں نے صرف درخواست کی ہے آپ سے، کوئی زور زیادتی تو نہیں کی ہے نا؟" وہ بولا۔

"زور زیادتی کر بھی کس طرح سکتے ہو، اتنی طاقت ہے تم میں...؟"

غصے کی زیادتی کے باعث شرافت علی کے مُنہ سے جھاگ اُڑنے لگے تھے، آنکھیں اس کی کسی جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح سُرخ ہو گئی تھیں اور گلے کی رگیں بُری طرح پھُول گئی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ تھپکتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "ہوش میں نہیں آؤ بھائی شرافت علی۔ غصہ آدھی عقل سلب کر لیتا ہے، اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اس حالت میں، ان کی بات کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بیچارے تو اپنا فرض ادا کرنے کی خاطر چلے آئے ہیں اِدھر، ان کا کیا قصور ہے جو تم ان پر خفا ہو رہے ہو؟"

"کیوں، قصور کیوں [illegible] ہے ان کا؟ میں نے صبح بنگلے کا ایک ایک کونا دکھا دیا تھا انہیں پھر اب یہ کیا لینے آئے ہیں یہاں؟"

"او یار، سمجھا کرو کچھ، وہ صبح کی بات تھی، اب اگر انھیں کسی نے مجرم کی یہاں آمد کی خبر دی ہے تو انھیں اطمینان کر لینے دو اپنا، اگر ان کا مجرم یہاں آیا ہے تو ہمیں کیا دلچسپی ہے اس سے، اگر وہ مل جائے تو لے جائیں یہ پکڑ کر اسے۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

فیروز بھی میری تائید کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھئی، ٹھیک تو ہے یار۔ تم خواہ مخواہ کیوں اپنی پوزیشن خراب کرتے ہو، چلو ہٹو ان کے سامنے سے، انھیں اپنا کام کرنے دو۔ کیا پتا کوئی تمھاری لاعلمی میں آہی گھسا ہو، ان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

پولیس افسر نے ہمیں اپنی حمایت میں بولتے دیکھا تو جلدی سے بولا۔ "ہاں جی، دیکھیں نا آپ لوگ ہی سمجھائیں۔ میری بات تو یہ سنتے ہی نہیں ہیں۔ میری پوزیشن کو بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں جناب! میں کوئی اپنی مرضی سے محض آپ کو پریشان کرنے کی خاطر تو نہیں آگیا ہوں اِدھر۔ ایک تو وہ مجرم بے حد خطرناک ہے، اُسے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آپ خود سوچیں جو اسٹین گنوں سے قتلِ عام کرتا اور بموں سے عمارتیں مسمار کرتا پھر رہا ہو اس کی آزادی عوام کے لیے کس قدر خوفناک ہے۔ جب تک وہ پکڑا نہیں جائے گا، کوئی شہری رات کو سکون کی نیند نہیں سو سکے گا۔ اس کے علاوہ جناب، اوپر کے احکامات ہیں کہ جا کر فوراً پورے بنگلے کی تلاشی لو، اب واپس جا کر اوپر والوں کو بھی جواب دینا ہے۔ آپ تعاون نہیں کریں گے تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی سر۔"

میں نے شرافت علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں جی، بالکل بالکل ہمیں پتا ہے آپ کی مجبوریوں کا۔ پولیس سے تو ہر شریف شہری کو تعاون کرنا چاہیے اور یہ تو معاملہ بھی بے حد گمبھیر قسم کا ہے۔ ایک اتنا خوف ناک مجرم کہ پُرامن شہریوں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے ہے، اس کا پکڑا جانا تو بہت ضروری ہے۔ آپ جائیں جی اندر اور تلاش کریں اس بدمعاش کو۔ ان کی تلخی اور ناراضی کو بھول جائیں۔ انھیں پتا نہیں ہے کچھ آجکل کے مجرموں کے بارے میں، بڑے ہی ہوشیار اور چالاک ہو گئے ہیں یہ اور ہتھیار تو ایسے استعمال کرنے لگے ہیں کہ لگتا ہے کوئی فوج گھس آئی ہے گھر میں۔ ہو سکتا ہے آپ لوگوں کو ملنے والی اطلاع ٹھیک ہی ہو، ہم لوگ ابھی آئے ہیں یہاں اور صرف ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے رہے ہیں، ہمیں کیا خبر بنگلے کے کسی حصے میں کوئی گھُسا ہی بیٹھا ہو شاید، ہمیں جب پتا ہی نہیں ہے اس بارے میں کچھ تو خواہ مخواہ پولیس کے فرائض میں ٹانگ بھی نہیں اڑانا چاہیے ہمیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب! سمجھ دار لوگ دوسروں کی ذمے داریوں کو سمجھ کر بات کرتے ہیں۔ اب دیکھیں نا، ایسے تو کسی بھی مجرم کا آزاد رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور کسی خطرناک مجرم کو ایک گھنٹے بھی آزاد نہیں رہنا چاہیے، اس میں نقصان عوام کا ہی ہوتا ہے، پولیس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ان کی آزادی سے۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ کیا اسمِ گرامی ہے جناب آپ کا؟" وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے نظر ہی نظروں میں تولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"غوث احمد کہتے ہیں اس خاکسار کو۔ اور آپ سے زیادہ سمجھ بوجھ یقیناً نہیں رکھتا ہوں میں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

اس کی نظریں مجھے اپنے چہرے میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاید وہ میک اَپ کے پیچھے میرے اصل چہرے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں اسے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، میں کسی طرح بھی اسے اپنی جانب متوجہ کر کے اپنے اصل چہرے تک نہیں پہنچنے دینا چاہتا تھا، چنانچہ اس کی توجہ بھٹکانے کی خاطر میں نے اپنے ساتھ ساتھ فیروز کا بھی تعارف کرا ڈالا۔ "اور یہ ڈاکٹر فیروز ہیں، خاصے مشہور آدمی ہیں یہ۔ معززینِ شہر میں نمایاں مقام ہے ان کا۔ شرافت علی صاحب خود بھی ایک معزز آدمی ہیں۔ ان کے حلقۂ احباب میں بھی ایسے لوگ شامل ہیں، مجھے یقین ہے یہ آپ کے فرائض کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کوئی شریف آدمی یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اسے شرفا کی محفل میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے۔ بس اسی لیے اس وقت آپ کا یہاں آنا ناگوار گزرا ہے انھیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب! میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ شرافت علی صاحب جیسا آدمی یوں عدم تعاون کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے آخر۔ صبح تو انھوں نے ہر طرح تعاون کیا تھا ہم سے۔ اب سمجھ میں آیا کہ بات کیا تھی۔" پولیس افسر مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ مطمئن رہیں جناب، ہم آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے ذرا بھی۔" وہ مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس طرف بڑھ گیا جدھر سے ہم لوگ آئے تھے۔

میں نے شرافت علی سے کہا۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو یار، خواہ مخواہ ہی گرمی کھا رہے تھے اس غریب پر، اس طرح اسے تم پر شبہ بھی ہو سکتا تھا۔ پولیس والوں کو تنگ کرنے کا موقع تو دینا ہی نہیں چاہیے بالکل بھی۔ اب اس اپنے دربان سے کہو، اندر جا کر اس کی مدد کرے اور جو جگہ بھی وہ دیکھنا چاہے اُسے دکھا دے اچھی طرح سے تاکہ وہ یہاں سے مطمئن ہو کر واپس جائے۔"

فیروز بولا۔ "نہیں بھئی، یہ جو کچھ کیا ہے شرافت علی نے، بہت ٹھیک کیا ہے، اگر یہ ایسا نہ کرتے تو جان کا روگ بن جاتے یہ پولیس والے۔ اب واپس جانے کے بعد یہ دوبارہ اِدھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ آئی سمجھ میں مسٹر غوث احمد صاحب؟"

"ہاں جناب ڈاکٹر صاحب! آگئی سمجھ خوب اچھی طرح۔ آپ

جیسے معزز لوگ کبھی غلط بات نہیں کرتے۔" میں نے اس کے لہجے کی نقل کر کے کہا۔

شرافت علی نے دربان کو آواز دے کر کہا۔ "خان! تم اندر چلے جاؤ یار، اور ایک ایک کمرا، ایک ایک گوشہ دکھا دو بنگلے کا اس پولیس افسر کو۔ پوری طرح اطمینان کر لینے دینا اسے اپنا۔ کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"اچھا جناب! ایسا ہی ہوگا بالکل۔" دربان نے کہا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اُدھر چلا گیا جدھر وہ پولیس والے گئے تھے۔

چند منٹ بعد ہم تینوں واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پولیس افسر ڈرائنگ روم میں آیا تو اس کے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ انھیں دوسرے راستے سے باہر بھیج دیا تھا اس نے اور خود دربان کے ہمراہ اِدھر چلا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شرافت علی نے ماتھے پر بل ڈال کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "ہاں جی تھانیدار صاحب! آ گئے آپ، تلاشی لے لی ہے نا آپ نے پورے گھر کی، کوئی جگہ رہ تو نہیں گئی ہے دیکھنے سے؟"

"جی ہاں، آپ کے دربان نے مکان کا ایک ایک حصہ دکھا دیا ہے۔ لیکن آپ اب تک ناراض معلوم ہوتے ہیں مجھ سے۔" وہ خجل ہو کر بولا۔

"آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟ آپ کو کوئی پروا نہیں ہونا چاہیے میری ناراضگی کی۔ آپ تو صرف یہ بتائیں کہ کتنے چور، ڈاکو، لٹیرے اور قاتل برآمد کیے ہیں آپ فرض شناس لوگوں نے میرے اس بنگلے سے؟" شرافت علی نے ہنوز تلخی سے پوچھا۔

"ویری سوری سر۔ میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے اس تکلیف دہی کے لیے، سخت شرمندہ ہوں میں، مگر ہماری مجبوری کو بھی پیشِ نظر رکھیے، ایک ایسا شخص جس کی تلاش میں پورے ملک کی پولیس سرگرداں ہے، اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملنے پر کارروائی کرنا ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ایک تو مخبر ہمارے لیے کام کرنا چھوڑ دیں، دوسرے حکامِ بالا جینا مشکل کر دیں ہمارا۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ ہمارے کسی مخبر کی دی ہوئی اطلاع غلط ثابت ہوتی ہو۔ ننانوے فیصد تو صحیح خبریں ہی دیتے ہیں وہ۔" وہ بولا۔

"لیکن آج تو تمھارے مخبر نے تمھیں صحیح اطلاع نہیں دی شاید۔ آج وہ دھوکا کھا گیا لگتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں جناب! ہو سکتا ہے دھوکا ہی ہو گیا ہو اُسے یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے مجرم کو سچ مچ آپ کے اس بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہو اور جب وہ ہمیں اس کی اطلاع دینے کے لیے یہاں سے ہٹا ہو تو اسی دوران مجرم یہاں سے نکل گیا ہو۔ اب وہ مستقل تو اس کی نگرانی نہیں کر سکا ہوگا نا، تنہا آدمی عموماً دھوکا کھا جاتا ہے۔" پولیس افسر نے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ تمھارے آنے سے زیادہ سے زیادہ پندرہ یا بیس منٹ پہلے تو ہم لوگ آئے ہیں یہاں۔ اس عرصے میں ہم نے اپنے سوا کسی اور کو نہیں دیکھا۔ تم دربان سے پتا کرو۔ اگر کوئی آیا ہے یہاں تو اُسے ضرور خبر ہوگی، بشرطیکہ آنے والا سامنے مین گیٹ سے ہی اندر آیا ہو۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی طرف سے دیوار پھاند کر اندر آیا ہو اور ہم لوگوں کے آتے ہی اُدھر سے ہی نکل گیا ہو۔"

"وہ میں معلوم کر چکا ہوں جناب آپ کے دربان سے، اس کا بیان تو یہی ہے کہ آپ تینوں کے سوا کوئی اور نہیں آیا ہے، نہ آپ سے پہلے نہ بعد میں۔ ہمارے مخبر نے بھی اندازاً ہمارے یہاں پہنچنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی فون کیا تھا ہمیں۔ اس نے بھی یہی بتایا تھا کہ مجرم دو آدمیوں کے ساتھ ایک کار میں بنگلے کے اندر گیا ہے۔ ایسی صورت میں تو اس کی آمد و رفت مین گیٹ سے ہی ہوئی ہوگی۔"

اس کی بات سن کر میرے ساتھ ساتھ شرافت علی اور فیروز بھی چونک پڑے۔ فیروز بولا۔ "اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ اس نے تمھیں ہمارے بنگلے میں داخل ہونے کی اطلاع دی ہے۔ کار میں تو ہم ہی لوگ آئے ہیں۔ اس نے یقیناً ہمیں ہی دیکھا ہوگا مسٹر آفیسر۔ ہم لوگوں کو غور سے دیکھ کر بتاؤ تو تمھارا مجرم ہم میں سے تو کوئی نہیں ہے؟"

"ہاں بھئی، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب، اپنا اطمینان کر لو اچھی طرح سے... ہم تینوں میں... سے تو کوئی نہیں ہے تمھارا نامی گرامی اشتہاری مجرم وہ... وہ... کیا نام بتایا تھا اس کا تم نے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"غلام جیلانی نام ہے جناب اس کا، اور ایک ساتھی اس کا اسلم آبی ہے۔ رات فیڈرل بی ایریا میں ان دونوں نے بڑی تباہی پھیلائی تھی، آپ نے اخبارات میں اس کی تفصیل ضرور پڑھی ہوگی۔ دونوں جیل سے بھاگے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ جیلانی کی ایک بہن بھی ہے، اس کا نام آسیہ ہے۔ وہ اور اسلم آبی ابھی حال ہی میں پنڈی جیل سے بھاگے ہیں۔" پولیس افسر نے تفصیل بتائی۔

"اچھا، کمال ہے بھئی، اب عورتیں بھی ایسے کاموں میں شریک ہونے لگی ہیں؟ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے یارو۔" میں نے حیرت سے کہا۔

فیروز بولا۔ "عورتیں اب زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہیں برادر! یہ کوئی اتنی زیادہ حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اور ہمارے لیے تو مقامِ شکر ہے یہ کہ ہم میں سے کوئی بھی عورت نہیں ہے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ تعداد میں تین ہونے کی بنا پر ہم پر ہی تہمت کی کوئی دفعہ لگا دیتے۔"

"ہاں بھئی، یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے ڈاکٹر صاحب۔ کیوں بھائی آفیسر، کیا خیال ہے تمھارا؟" میں نے پولیس افسر سے سوال کر دیا۔

"نہیں جناب۔ اب ایسے بھی عقل کے اندھے نہیں ہم کہ آپ جیسے معزز لوگوں کو اُلجھا دیتے اس معاملے میں۔ ان تینوں کی تصویریں ہیں ہمارے پاس۔ اگر وہ سامنے پڑ جائیں تو ہم بہ آسانی شناخت کر سکتے ہیں انھیں۔ ملک کے ہر تھانے میں فائل موجود ہے اُن کی۔ وہ کوئی اجنبی اور ناقابلِ شناخت لوگ نہیں ہیں، ملک بھر کے کسی بھی تھانے کے لیے۔" آفیسر نے فوراً میرے سوال کا جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو اس کی واضح شناخت ہمیں بھی بتا دو بھائی، ممکن ہے کہیں نظر پڑ جائے اس پر ہماری۔" میں نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "کیوں مذاق کرتے ہیں سر آپ؟ اچھا اب اجازت دیجیے مجھے، میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں آپ سے۔"

وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ شرافت علی جو اب تک خاموش بیٹھا تھا اُسے جاتے دیکھ کر بولا۔ "جانے سے پہلے ایک بات سن لو کان کھول کر دوبارہ اِدھر آؤ تو وارنٹ کے بغیر بنگلے میں قدم دھرنے کی کوشش بھی نہ کرنا کبھی ورنہ انجام کے تم خود ذمے دار ہو گے۔"

اس نے جاتے جاتے مڑ کر شرافت علی کو دیکھا۔ چند لمحے وہ اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "جی بہتر ہے جناب۔ معلوم ہوتا ہے آپ بہت زیادہ ناراض ہیں مجھ سے۔ میری معذرت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ حالانکہ میں نے کوئی بداخلاقی نہیں کی ہے آپ کے ساتھ۔"

شرافت علی غصے سے بپھر کر بولا۔ "کر بھی کیسے سکتے تھے تم بداخلاقی۔ ہمت ہے تم میں اتنی..."

فیروز نے شرافت علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمھاری معذرت سے پاس پڑوس والوں کی نظر میں شرافت علی کی پوزیشن تو صاف نہیں ہو گئی ہے نا۔ تم جس طرح سپاہیوں کو ساتھ لے کر بنگلے میں گھسے ہو، اس طرزِ عمل کو دیکھ کر انھوں نے جو رائے قائم کر لی ہوگی، اس بنگلے اور اس کے مکینوں کے بارے میں، اس کا تمھیں اندازہ نہیں ہے شاید۔ پولیس والوں کو وردی پہن کر کسی کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر ہی لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں۔ کیا تم یہاں سے جاتے ہوئے ایک ایک شخص کے پاس جا کر اس کے دل سے ساری غلط فہمیاں دور کرتے ہوئے جاؤ گے؟ اگر تم ایسا کر سکو تو میں وعدہ کرتا ہوں، تمھارے اِدھر آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کسی کو بھی۔ بات شرافت علی کی معقول ہی ہے مسٹر آفیسر۔ تمھیں بُرا بالکل نہیں ماننا چاہیے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کوئی بھی شریف آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ پولیس اس کے گھر پر ریڈ کرے، کیونکہ جس گھر میں پولیس کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا جائے وہ گھر بدنام ہو جاتا ہے پورے علاقے میں۔ تم تو کسی کی غلط اطلاع پر چلے آئے تھے اور اب واپس جا رہے ہو لیکن جن لوگوں نے تمھیں یہاں آتے دیکھا ہے، انھیں یہ کون یقین دلائے گا کہ یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنے ملنے جلنے والے کو مزے لے لے کر یہ قصہ سناتے رہیں گے اور ہر شخص جب بھی اس مکان کے سامنے سے گزرے گا مشکوک نظروں سے اِدھر دیکھے گا اور لوگ تاک جھانک کر کے یہ جاننے کی کوشش ہر وقت کرتے رہیں گے کہ یہاں وہ کون سا غیر قانونی کام ہوتا ہے جس کی وجہ سے پولیس نے ریڈ کیا تھا یہاں۔"

پولیس افسر نے ایک لمبی سی سانس لے کر افسردگی سے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب! آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

اس کے جانے کے بعد دیر تک ہم تینوں اپنے اپنے خیالوں میں گُم خاموش بیٹھے رہے۔ شاید ہم تینوں ہی ایک طرح سوچ رہے تھے۔ ہمارا یہی خیال تھا کہ وہ پولیس افسر باہر نکل کر دروازے پر ہماری گفتگو سننے کے لیے شاید کھڑا ہو گیا ہو۔ ایسے زبان کھول کر ہم میں سے کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ چند ثانیے بعد شرافت علی نے دربان سے کہا۔ "خان، تم جا کر باہر گیٹ سنبھالو اور دیکھو آئندہ کسی کو بھی بغیر میری اجازت اندر نہ گھسنے دینا۔ پولیس کا کوئی کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ آ جائے، صاف کہہ دو مالک کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہو تو اس سے پوچھ لیا کرو، جسے وہ اجازت دیں بس اسی کو اندر آنے دینا۔ سمجھ گئے نا میری بات کو۔ بس اب جاؤ۔"

"بہت اچھا جی۔ یہ تو ہم کو دھوکا دے کر اندر آ گیا تھا، میں تو اس کو بھی اندر آنے نہیں دیتا تھا۔" دربان دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

دربان کے باہر نکلتے ہی ٹیلی فون چیخ اُٹھا۔ شرافت علی نے اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا، میں نے اُسے روک کر خود اٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں برادر تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ لڑکی کا فون ہونا چاہیے۔"

میں نے آگے بڑھ کر ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا لیا۔ ریسیور کو کان سے لگاتے ہی تصدیق ہو گئی کہ اس گھڑی میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دوسری جانب لڑکی ہی تھی جو میرے کان میں امرت انڈیل رہی تھی۔ میرے ہیلو کہتے ہی اس نے شہد میں ڈوبی ہوئی آواز اور مسرور لہجے میں میری مزاج پُرسی کی۔ "کیا حال ہیں جناب عالی! خیریت سے تو ہیں نا آپ؟"

"ہاں جی! اب تک ہر طرح خیریت سے ہی رکھا ہوا ہے اس خدائے بزرگ و برتر نے۔" میں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

"شکر ہے خدا کا۔" وہ اس طرح بولی جیسے اس کے دل سے کوئی بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو، کوئی بے چینی دُور ہو گئی ہو اس کی۔ "مجھے اس فکر نے پریشان کر رکھا تھا رات سے ہی کہ اتنی زبردست ہنگامہ آرائی میں کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو آپ کو۔ آپ ٹھیک کہہ رہے

ہیں نا؟ بالکل، ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا ہے نا آپ کو؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا اضطراب موجود تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے دل کے کسی چور خانے میں کوئی وسوسہ چھپا بیٹھا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں نے اس سے جھوٹ بول کر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔

"ہاں ہاں بھئی! بالکل ٹھیک ہوں میں۔ تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے مجھے۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور وہ آپ کے ساتھی... میرا مطلب ہے وہ بھی سب ٹھیک ہیں نا؟" اس نے میری طرف سے مطمئن ہو کر سوال کیا۔

"وہ بھی سب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میرے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی، میرے علاوہ صرف دو ہی آدمی اور تھے۔ اور وہ دونوں پوری طرح خیریت سے ہیں، ان میں سے کسی کو ذرا سی خراش تک نہیں آئی ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔

"کیا؟" وہ حیران ہو کر بولی "یعنی آپ صرف تین آدمی تھے۔ یقین نہیں آرہا ہے مجھے، صرف تین آدمی یہ سب کیسے کر سکتے ہیں لگتا یوں تھا جیسے کوئی باقاعدہ فوج گھس پڑی ہو وہاں۔ حیرت یہ ہے کہ کتوں نے بھی کچھ نہیں کہا آپ کو۔"

"تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی یہ باتیں۔ لزی بیگم! ارادے نیک ہوں تو قدرت بھی ہر طرح مدد کرتی ہے آدمی کی۔ وہ رب ہے کل جہانوں کا، اپنے بندوں کو ہر آفت ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ نہ چاہے تو کسی کی مجال ہے کہ جنبش بھی کر سکے اپنی جگہ سے۔ تم اُدھر کا حال سناؤ، کیا حال ہے ان لوگوں کا، میرا خیال ہے کچھ ٹوٹ پھوٹ زیادہ ہی ہو گئی ہے وہاں؟"

"ہاں جناب عالی! بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے آپ نے، بڑی بربادی ہوئی ہے اِدھر تو۔ پانچ افراد بالکل جان سے ہی گزر گئے اور چار زخمی ہیں۔ دو کے گولیوں کے زخم ہیں اور دو کو کتوں نے بُری طرح اُدھیڑ ڈالا ہے۔ میں حیران ہوں جناب عالی! کتوں کو کون سی بوٹی سنگھا دی تھی، کون سا عمل کیا تھا ان پر آپ لوگوں نے کہ اپنے مالکوں کا حکم ماننے اور اُن کا ساتھ دینے کے بجائے پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنوں ہی پر جا پڑے۔ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے ہی آدمیوں کو بھنبھوڑ کھایا۔"

میں ہنس کر بولا "یہ اسرار تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا ہے نا، ارادے نیک ہوں تو قدرت ہر طرح مدد کرتی ہے۔ یہ سب قدرت کی کاریگری ہے لزی بیگم۔ انسان کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے ایسے موقعوں پر۔"

"لیکن قدرت کی ایسی کاریگری میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس بات پر تو آرنگ بھی سر دھن رہا ہے اپنا کل رات سے۔ اس نے کتوں کے ٹرینر کی جان عذاب کر رکھی ہے۔ صبح سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟" لزی نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے لزی۔ وہ کتا رات کو ایکبار پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے میرے ہاتھوں سے۔ دو مرتبہ اس کا اور میرا آمنا سامنا ہوا تھا مگر مجھے پہلی بار تو گولی چلانے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی اور دوسری مرتبہ وہ تینوں اس کی ڈھال بن گئے تھے، اس کے حصے کی ساری کی ساری گولیاں ان تینوں نے اپنے جسموں میں اتار لیں جن کی لاشیں اوپری منزل کے تباہ شدہ کمرے سے ملی ہوں گی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے نشانہ بناتا، وہ ایک چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں شاید ابھی اس کا وقت پورا نہیں ہوا ہے۔ اندازے کی غلطی کر گئے تھے آپ، لوہے کے اس گول زینے پر پہنچنے کے بعد آپ نیچے چلے گئے تھے۔ اس کو بھی صرف ایک فی صد امید تھی آپ کے اوپر جانے کی۔ ننانوے فی صد اُسے یہی یقین تھا کہ آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس زینے پر پہنچ بھی گئے تو نیچے کا ہی رخ کریں گے۔ اگر آپ اوپر چلے جاتے تو ناکامی نہیں ہوتی آپ کو۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا وہ عمارت کی چھت پر جا چڑھا تھا لیکن وہاں تو فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا شاید۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، وہ اسی لیے اوپر جا پہنچا تھا کہ آپ ادھر نہیں آئیں گے اور اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ اس پر قسمت مہربان لگتی ہے ابھی۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے چال چل گیا وہ میرے ساتھ۔ ٹھیک ہے، اب یہی دیکھنا ہے مجھے کہ کب تک قسمت اس پر مہربان رہتی ہے۔ اب کی بار ایسا نہیں ہو سکے گا شاید، اب جب بھی سامنا ہو گا میں اسے گولی مارنے میں ایک لمحے سے زیادہ دیر نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ وہ اب کب اور کہاں مل سکے گا مجھے؟ میں اس جھگڑے کو جلد سے جلد نمٹا دینا چاہتا ہوں۔" میں نے لزی سے پوچھا۔

"وہ اسی مکان میں ہے جس کی ایک کھڑکی میں کل رات آپ نے مجھے دیکھا تھا، لیکن ابھی کچھ روز آپ ادھر کا رُخ بھی نہ کریں بالکل، پولیس نے بہت سخت انتظامات کر رکھے ہیں، کیوں کہ آرنگ نے حکام سے اپنی زندگی کو درپیش خطرے کے پیش نظر اس کی درخواست کی تھی۔" لزی نے بتایا۔

"یہ تو تم نے بہت بُری خبر سنائی ہے۔ اس طرح تو اسے کچھ اور مہلت مل جائے گی اپنی کارروائیاں جاری رکھنے کے لیے۔"

"یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اب اس پر ہمیں کوئی اختیار بھی تو نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایسے شواہد نہیں ہیں جو حکام کو اس کا اصلی چہرہ دکھا کر اسے تحفظ فراہم کرنے سے روک سکیں۔ اگر

آپ یا آپ کے ساتھی ایسا کر سکتے ہیں تو کوشش کر دیکھیں۔" لزی نے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں ہے لزی بیگم۔ اس کا واسطہ غلام جیلانی سے ہے، زیادہ دیر بچ نہیں سکے گا وہ میرے ہاتھوں سے۔" میں نے کہا۔

"میری دعا ہے جناب عالی، خدا آپ کو کامیاب کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے اردگرد سے ہوشیار رہیں ان دنوں۔ خطرات آپ کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ میرا مشورہ مانیں تو اس بنگلے کو چھوڑ دیں جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔" لزی بولی۔

"میں سمجھا نہیں، تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ ذرا کھل کر بات کرو، صاف صاف۔ بتاؤ بات کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس بنگلے کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ آرنگ ہر قیمت پر آپ کی جان لے لینا چاہتا ہے۔ کچھ لوگ پولیس کی یونیفارم میں چوبیس گھنٹے بنگلے کی نگرانی پر متعین کر دیے گئے ہیں۔ انھیں ہدایت ہے کہ جب بھی کوئی بنگلے میں داخل ہو، وہ فوراً اندر جا کر اسے چیک کریں اور جیسے ہی آپ نظر آئیں آپ کو ہتھکڑی لگا کر آرنگ کے پاس پہنچا دیا جائے۔ کیونکہ وہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے کی قسم پوری کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے اپنے تمام لوگوں کو آپ کی جان نہ لینے کی ہدایت کی ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ کا بنگلے پہنچتے ہی ان جعلی پولیس والوں سے واسطہ پڑ چکا ہو گا اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو وہ لوگ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ کوشش کریں ان سے آپ کا سامنا نہ ہو تو بہتر ہے۔"

لزی کا یہ انکشاف نہایت چونکا دینے والا تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں اور دماغ میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ شرافت علی نے اگر میرا حلیہ تبدیل نہ کروایا ہوتا تو میں اس ذلیل یہودی کی چال میں آکر بُری طرح مارا گیا تھا۔ مجھے پہچانتے ہی وہ جعلی پولیس افسر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا دیتا۔ شرافت علی اور فیروز میں سے کوئی بھی انھیں روک نہیں سکتا تھا، وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے تھانے سے چھڑا لائیں گے۔ اور پھر وہ بیچارے شہر بھر کے تھانوں میں مارے مارے پھرتے، ایک ایک حوالات میں جھانکتے پھرتے مگر میرا سراغ انھیں کہیں نہیں ملتا۔ میں ان کے تصور سے بھی پرے، بہت دُور کسی تہ خانے میں پابہ جولاں ابن یہودا کے حضور کھڑا اپنی کم عقلی پر ماتم کر رہا ہوتا اور وہ مکار و عیار لومڑی اور بھیڑیے کی مشترکہ صفات کا مالک مجھے زندگی سے دُور، موت سے قریب تر کرنے کی تدبیریں کر رہا ہوتا اس گھڑی۔

لزی نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں: "ہیلو... ہیلو جناب عالی۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

میں نے چونک کر کہا "آں... ہاں... کیا... کیا کہا تم نے...؟ کون ٹھیک نہیں ہے... کسے کیا ہو گیا ہے؟"

"ارے! آپ کہاں کھو گئے تھے جناب عالی، میں آپ ہی کو پوچھ رہی ہوں، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" وہ دوبارہ بولی

"اوہ، ہاں... بالکل... بالکل... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمھیں کچھ اور تو نہیں کہنا ہے؟ میں فون رکھ رہا ہوں۔"

"نہیں، کوئی خاص بات تو نہیں کہنا ہے اب مجھے لیکن یہ آپ اچانک فون کیوں رکھنے لگے ہیں؟ کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"نہیں گڑبڑ تو کوئی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے ایک اہم کام یاد آ گیا ہے۔ بہت جلدی پہنچنا ہے کسی جگہ۔" میں نے اُسے بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر اتنا تو بتا دیں آپ کہ میں دوبارہ آپ سے کس نمبر پر بات کروں؟ آپ یہ جگہ چھوڑ رہے ہیں یا نہیں؟"

"اس سلسلے میں تو دوستوں سے مشورہ کر کے ہی بتا سکوں گا بس۔ تم یوں کرو کہ مجھے کوئی ایسا نمبر بتا دو جہاں میں تم سے رابطہ کر سکوں، کوئی ایسا قابل اعتماد شخص نہیں ہے جو تمھارا رازدار ہو، میرے پیغامات تم تک پہنچا سکے؟"

"میں نے شاید آپ کو بتایا تھا کہ میں پبلک ٹیلی فون سے بات کرتی ہوں آپ سے۔ ویسے یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی کہ کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیے کہ ہم ہر وقت ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکیں یوں بھی مجھے اپنے کام کے سلسلے میں کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جنھیں بوقت ضرورت میں استعمال کر سکوں۔ کچھ لوگوں سے ملی بھی ہوں میں اور دو آدمی مجھے کچھ اپنے ڈھب کے معلوم ہوئے ہیں۔ میں آج ان میں سے کسی ایک یا دونوں سے معاملات طے کرنے کی کوشش کروں گی۔ شام تک آپ انتظار کر لیں، ٹھیک چھ بجے شام کو میں فون کر کے بتاؤں گی کہ ہمیں آئندہ کس طرح رابطہ قائم کرنا ہے۔"

فیروز اور شرافت علی دونوں ہی خاموش بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے اور شاید ہمارے درمیان ہونے والی بات چیت سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے جیسے ہی بات ختم کر کے ریسیور واپس کریڈل پر ڈالا، وہ دونوں بیک زبان بولے "کیا ہوا جیلانی! کیا کہتی تھی وہ تمھاری لزی بیگم؟ کوئی خاص خبر سنائی ہے اس نے؟"

میں ٹیلی فون کے پاس سے ہٹ کر ان دونوں کے درمیان آ بیٹھا اور انھیں لزی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر کے کہا۔ "اب بتاؤ تم لوگ کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے ہمیں؟"

وہ دونوں بھی کچھ دیر پہلے آنے والے جعلی پولیس افسر کے بارے میں جان کر حیران رہ گئے تھے۔ شرافت علی بولا "کمال ہے بھئی، بہت ہی گُنی شے ہے یہ آرنگ تو یار! وہ تو خیر ہی کر دی کچھ

خدا نے، اگر لگتے ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا جیلانی پر تو انھیں ہمارے درمیان سے اُٹھا لے جاتا تو وہ اور ہم بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔ کیسی عیاری کی ہے یارو اس یہودی بچے نے۔"

فیروز بولا۔ "اگر یہ بات صحیح ہے، وہ پولیس افسر اور اس کے ساتھ آنے والے سپاہی اگر فراڈ تھے تو اس کا مطلب یہ ہے جیلانی کہ اب ہمیں لزی کے بارے میں اپنے رویے اور انداز فکر میں ترمیم کر لینا چاہیے۔ اب ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ ہماری پُرخلوص دوست اور بہی خواہ ہے۔ اسے مشکوک لوگوں کی فہرست سے نکال کر قابلِ اعتبار اور مخلص لوگوں کی صف میں شامل کر لینا چاہیے اب۔"

"بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی ہے برادر فیروز! لیکن میرا دل کسی یہودی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اس نے جو کچھ کیا ہے ہمارے ساتھ اور جس طرح وہ ساتھ دے رہی ہے ہمارا، اس کے بعد بھی کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہو سکا ہے اس کے لیے تمھارے دل میں۔ اس نے اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے اپنے ہی لوگوں کو ہمارے ہاتھوں کتنا نقصان پہنچایا ہے، یہ بھی تو سوچو۔"

"تم ان اسرائیلی سوّروں کو جانتے نہیں ہو فیروز۔ یہ بڑے شاطر ہوتے ہیں۔ شاہ کو شکست دینے کے لیے یہ اپنے بڑے سے بڑے مہرے کو بے دریغ پٹوا دیتے ہیں اور جب دشمن کامیابی کے نشے میں سرشار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو وہ چال چل دیتے ہیں جس کے لیے اپنے بڑے بڑے مہروں کی قربانی دی ہوتی ہے انھوں نے۔ وہ چال جس کے ذریعے ساری بازی الٹ جاتی ہے، اسے ہمیشہ چھپا کر رکھتے ہیں یہ۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کیا تم یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ لزی یہودی ہے؟" فیروز نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، سان فرانسسکو میں اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا مجھے، اس سے اس کا یہودی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہاں یہ جس شخص کے ساتھ رہتی تھی اس کی بیٹی بن کر وہ وہاں کی تنظیم کا سربراہ تھا اور یہاں بھی اس کا تعلق تنظیم کے سربراہ آئزک سے ہے۔"

"ہاں، یہ تو تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہودیوں کی تنظیم میں کوئی بڑی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی یہودی ہے، اور یہودیوں کے کاذ کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ممکن ہے کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے وہ ان میں شامل ہو کر ان کا اعتماد حاصل کر کے ان کے بڑوں تک پہنچ گئی ہو اور اب ان کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہو۔" فیروز نے کہا۔

اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ اس طرح میں نے لزی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کا ہر عمل مجھے حیران کرتا رہا تھا۔ میں ایک اسرائیلی ایجنٹ ہونے کے رشتے سے اس سے جو توقعات باندھتا تھا، وہ اس کے خلاف جا رہی تھیں اور میں نے اس کے اس عمل کو اس کی عیاری اور مصلحت بینی سمجھ لیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ اس نے یہاں سے جاتے ہوئے جو رقعہ چھوڑا تھا اس میں بھی اپنے بارے میں یہی لکھا کہ وہ جو کچھ دکھائی دیتی ہے، اصل میں وہ ہے نہیں۔ میرے ذہن میں اس خیال کے ساتھ ہی ایک سوال نے سر ابھارا، اگر وہ جو کچھ دکھائی دیتی ہے وہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ میں نے یہی سوال فیروز سے کر دیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمھارے اس سوال کا صحیح جواب تو میں نہیں دے سکتا، یہ تو وہ خود ہی بتائے گی کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا تم سے کہ وہ جو کوئی بھی ہے، نہیں ہے جو تم سمجھتے رہے ہو۔ جلد ہی اس کی اصلیت تم پر آشکار ہو جائے گی۔ حالات جو رُخ اختیار کرتے جاتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تمام چہرے بے نقاب ہو جائیں گے، سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا تمھارے۔ اس وقت تمھیں اس سے شرمندہ نہ ہونا پڑے اسی لیے میں کہہ رہا ہوں اس کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ بنا کر رکھو۔"

فیروز کی اس وقت کی باتوں سے میرے دل میں مسرتوں کے پھول کھلنے لگے تھے، شادیانے سے بجنے لگے تھے میرے رگ و پے میں اور فضا سے نغمے برستے ہوئے معلوم ہونے لگے تھے۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ نازپرور نازآفریں تو پہلے ہی میرے دل کے نہاں خانوں میں جلوہ فرما ہے۔ وہ سرو قد چاند سا مکھڑا میری آنکھوں میں یوں بسا ہوا ہے کہ زندگی کی ساری بہاریں اسی کے گرد رقصاں دکھائی دیتی ہیں۔ اچانک مجھے ایسا لگنے لگا کہ میں آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز ہوں اور اس کی آواز کی نغمگی میرے کانوں میں شہد گھول رہی ہے، اس پری رو کے جلوے ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں اور میرا دل شادمانی کے جھولے میں جھول رہا ہے۔

خود فراموشی اور سرشاری کی اس کیفیت میں مجھے زیادہ دیر نہیں رہنے دیا گیا۔ شرافت علی کی آواز نے یہ سارا طلسم چکنا چور کر کے رکھ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ارے یار! کس خیال میں کھو گئے! آؤ ذرا باہر نکل کر اس جعلی پولیس افسر اور اس کے ماتحتوں کو دیکھیں۔ اگر وہ موجود ہوئے باہر اب بھی تو یہاں لا کر ان کی تدفین کا انتظام بھی کر دیں اب۔"

"ہاں بھئی یہ تو کرنا ہی اب، بس کام میں دیر نہیں کرنا چاہیے بالکل بھی۔ سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے اب تو ہمیں۔" فیروز بولا

ہم تینوں اٹھ کر ایک بار پھر باہر آ گئے لیکن مین گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے کہا "میرا خیال ہے یارو۔ ہمیں خود نہیں جانا چاہیے ان کے پاس، کیونکہ بنگلے کے باہر دشمن کی تعداد اور پوزیشن کا ہمیں کچھ پتا نہیں ہے۔ اگر بات بڑھ گئی تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ یوں کرتے ہیں دربان کو بھیج کر انھیں یہیں بلا لیتے ہیں۔"

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے یار۔ یہاں ہم انھیں آسانی کے ساتھ باندھ لیں گے۔" شرافت علی نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے دربان کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا "خان باہر جا کر دیکھو، وہ پولیس افسر اگر ابھی تک موجود ہو تو بلا کر لے آؤ یہاں۔"

"بہت اچھا صاحب! ہمارا خیال ہے وہ ادھر ہی ہو گا، ابھی لاتا ہوں اسے۔" دربان نے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم پلٹ کر ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ شرافت علی کو ہم نے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھا دیا اور میں فیروز کو ساتھ لے کر ساتھ والے دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور تو ہم تینوں کے پاس پہلے ہی سے موجود تھے، میں نے دو اسٹین گنیں بھی نکال لیں ایک فیروز کو دے دی اور دوسری خود رکھ لی۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر سے بھاری قدموں کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ ہم دونوں نے چوکنّا ہو کر ڈرائنگ روم کے دروازے کے دائیں بائیں پوزیشن سنبھال لی۔ چند لمحوں کے بعد ہی ڈرائنگ روم میں سے اس جعلی پولیس افسر کی آواز سنائی دی، وہ شرافت علی سے پوچھ رہا تھا "فرمایئے جناب کیسے یاد کیا آپ نے ہمیں ہے؟"

شرافت علی کی مدھم آواز سنائی دی۔ "آہستہ بولو یار! تم کیسے پولیس افسر ہو، مجرم تمھارے سامنے موجود تھا اور تم چھوڑ کر چلے گئے اسے۔"

"جی جی، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کون سا مجرم تھا میرے سامنے، کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" پولیس افسر نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ارے بھئی میں اس غلام جیلانی کی بات کر رہا ہوں، جسے تلاش کرنے تھوڑی دیر پہلے تم آئے تھے۔" شرافت علی بولا۔

"کیسی بات کر رہے ہیں جناب آپ، وہ تو ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیا تھا یہاں اور آپ نے بھی یہی کہا تھا۔ آپ تو ناراض بھی ہو گئے تھے ہم پر اسی بات پر۔ معاف کیجیے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے میری۔" جعلی پولیس افسر نے کہا۔

"ارے یار، وہ تو مجبوری تھی میری۔ ان دونوں نے مجھے مجبور کر رکھا تھا کہ تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دوں یہاں سے۔ ان کے سامنے میں کچھ کہہ نہیں سکا تھا ان کے بارے میں۔ اب وہ دونوں اندر سو رہے ہیں جا کر باندھ لو سالوں کو۔" شرافت علی بولا۔

"آپ کیا کہہ رہے جناب۔ میں ان دونوں کو کیوں باندھ لوں مجھے تو یہاں مشہور ڈاکو غلام جیلانی اور اس کے ساتھی اسلم آبی کو پکڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔" پولیس افسر نے جواب دیا۔

"یہیں تو دھوکا کھا رہے ہو تم، وہ دونوں غلام جیلانی اور اسلم آبی ہی ہیں۔ انھوں نے میک اپ کر کے اپنے اصلی چہرے چھپا رکھے ہیں۔ یہاں وہ زبردستی کے مہمان بنے ہوئے ہیں ہتھیاروں کے زور پر۔" شرافت علی نے اُسے بتایا۔

"اوہ، یہ بات ہے۔ کس کمرے میں سو رہے ہیں وہ دونوں، فوراً چل کر بتا دیں ہمیں۔" پولیس افسر جلدی سے بولا۔

"نہیں جی، میں نہیں جا سکتا تمھارے ساتھ ان کے سامنے، بڑے خونخوار آدمی ہیں وہ دونوں، تمھارے ساتھ دیکھتے ہی گولی مار دیں گے مجھے۔"

گولی تو یوں بھی لگے گی تمھیں، وہاں نہیں جاؤ گے تو ہم قصّہ ختم کر دیں گے، تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ آگے آگے چلو ہمارے۔" اس نے شاید ریوالور کی زد میں لے لیا تھا شرافت علی کو۔

شرافت علی گھبرائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا "ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو تم، میں نے تمھارے مجرم کا پتا بتایا ہے تمھیں اور مجھ پر ہی ریوالور تان کر کھڑے ہو؟"

"ہاں یہ ہماری مجبوری ہے مسٹر شرافت علی۔ ہمیں حکم ہے کہ غلام جیلانی کو پکڑ کر باس کے پاس پہنچا دیں اور تمھیں اور اسلم آبی کو ہم جس طرح چاہیں ٹھکانے لگا دیں... باس کا حکم ہے یہ، جسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے ہمارے پاس۔" وہ بولا۔

"باس!" شرافت علی بولا۔ "کون باس؟ کس باس کی بات کر رہے ہو تم؟ وہ مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟"

"بہت بھولے ہو شرافت علی۔ تمھیں پتا نہیں ہے، غداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے باس؟" جعلی پولیس افسر حقارت سے بولا۔

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرا کسی باس یا غداری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"سب پتا چل جائے گا ابھی۔ پہلے ادھر لے چلو ہمیں جیلانی اور آبی کے پاس۔" جعلی پولیس افسر نے ڈپٹ کر کہا۔

"تم مجھے پولیس والے نہیں لگتے ہو۔ میں تمھیں کہیں نہیں لے جاؤں گا اس طرح۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"تیرا تو باپ بھی لے جائے گا ہمیں وہاں تک جہاں وہ دونوں سو رہے ہیں۔" وہ گرج کر بولا۔ پھر شاید اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا۔ "ارے دیکھتے کیا ہو کھڑے کھڑے پکڑ کر لے چلو اسے اندر۔ یہ سیدھی طرح چلتا ہے تو ٹھیک ہے نہیں تو سالے کا گلا

دبا کر مار دینا! اسے ذرا بھی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس سے۔ ان دونوں کو ہم اس کے بغیر بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

ہمارا خیال تھا کہ وہ جعلی پولیس افسر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں اور آپی بنگلے میں موجود ہیں اور اندر کسی خواب گاہ میں پڑے سو رہے ہیں، فوراً اندر دوڑ پڑے گا لیکن وہ ہماری توقع کے بالکل برعکس جا رہا تھا، اس نے اندھا دھند کوئی قدم اٹھانے کے بجائے اس طرح اپنے کام کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی جیسے اسے اس سلسلے میں پہلے ہی ہدایات مل چکی ہوں یا خود اس نے کوئی باقاعدہ پلاننگ کر رکھی ہو۔ چنانچہ فوری طور پر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں ان کے کمرے میں داخل ہونے کے انتظار میں اپنی جگہ چھپا کھڑا رہا تو کہیں بساط ہی نہ الٹ جائے، وہ لوگ اکیلے شرافت علی کو قابو کر کے سچ مچ اس کا گلا نہ گھونٹ دیں۔ یہ بات تو بالکل صاف تھی کہ آئزک اور اس کی تنظیم میرے ساتھ ساتھ شرافت علی کے بھی خون کی پیاسی ہو رہی تھی لیکن اب تک وہ اسے مالی نقصانات پہنچانے کی ہی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس کی جان لینے کی کوشش شاید اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ فی الحال ان کے سامنے وہی ایک ایسا شخص تھا جس پر نظر رکھ کر وہ مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ شرافت علی کی باقاعدہ نگرانی کر رہے تھے، یہ اس کی اور میری خوش بختی تھی کہ شرافت علی نگرانی کرنے والوں کو چکر دے کر نکل جاتا تھا اور ان کا کوئی بھی آدمی اب تک اس کا تعاقب کرتے ہوئے مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر فیروز کو دیکھا، وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی تائید کی اور ایک دم اسٹین گنیں تانے ڈرائنگ روم میں گھس پڑے۔ میں نے اندر گھستے ہی انھیں للکارا "خبردار، کوئی حرکت نہ کرے اپنی جگہ سے، نہیں تو بھون کے رکھ دوں گا۔"

میری للکار سن کر وہ چونک کر ہماری طرف پلٹے مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ وہ جعلی پولیس افسر بازی کو اپنے حق میں کر چکا تھا۔ اس کے دو آدمیوں نے شرافت علی کو دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور وہ خود ریوالور لیے شرافت علی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر ریوالور شرافت علی کی گردن سے لگا دیا اور تضحیک آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے غلام جیلانی! تمہارے حق میں یہی بہتر ہے اب کہ اپنے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ میں شرافت علی کا بھیجا باہر کر دوں گا۔"

صورت حال واقعی بہت نازک تھی، میرے اور فیروز کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں، ہم ان سب کو لمحوں میں خاک اور خون میں لوٹا سکتے تھے مگر اس کی جو ہمیں قیمت ادا کرنا پڑتی وہ بہت زیادہ تھی۔ ہمارے حرکت میں آتے ہی وہ شرافت علی کو گولی دیتا جو میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ ایک شرافت علی کے عوض میں ان کے پانچ آدمی مار دیتا مگر ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں تھی۔ میں پہلے ہی کافی آدمی مار چکا تھا ان کے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ انھیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اس سے۔ ان کے نزدیک آدمیوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ ایک مرتا تھا تو چار اس کی جگہ آ جاتے تھے۔ ان کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان کی جڑیں بہت گہری ہو کر زمین کے اندر ہی اندر بہت دور تک پھیل گئی تھیں جب کہ میرے لیے شرافت علی بے حد قیمتی تھا۔ ان پانچ افراد کی کیا، ان جیسے پانچ سو افراد کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی اس کے مقابلے میں۔ جعلی پولیس افسر کی دھمکی سن کر میرے سینے میں دل کانپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے فیروز کو دیکھا۔ اسے بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا، اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن آپ ہی آپ نیچے جھکتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر جعلی پولیس افسر نے کڑک کر کہا "تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں جیلانی! میں تین تک گنتی کروں گا، اگر تین کہنے سے پہلے تم نے اسٹین گن نہیں پھینکی تو میری انگلی ریوالور کا ٹرائیگر دبا دے گی۔ بے شک اس کے بعد ہم پانچوں میں سے شاید کوئی بھی نہ بچ سکے لیکن یہ یقین ہے کہ تم کمینوں میں سے بھی کوئی نہیں بچ سکے گا۔ ہم پانچ آدمی اپنی اپنی جانیں دے کر تمہارے شر سے دنیا کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر جائیں گے۔"

اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرے گا پھر بھی میں آخری لمحے تک ہتھیار پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ناامیدی میرے مذہب میں حرام تھی، میں سوچتا تھا کہ شاید کوئی لمحہ کوئی پل مجھ پر مہربان ہو جائے لہٰذا جب تک مہلت حاصل ہے گزرنے والے ہر پل پر نظر جمائے رکھو، چنانچہ اس وقت بھی اس نے مجھے اتنی مہلت دے دی تھی کہ وہ تین تک گنتی پوری کر لے اور اب میں کم از کم اس وقت تک ہتھیار اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا جب تک وہ دو تک نہ گن لے۔ اس نے چند ثانیے تک انتظار کیا۔ وہ یہی جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کی دھمکی سے مرعوب ہو کر اس کے حکم کی تعمیل میں ہتھیار پھینک رہا ہوں یا نہیں، لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ میں ایسا کرنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتا تو وہ مجھے کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "ایک... دو....!"

اس سے پہلے کہ وہ تین کہتا میں نے اچانک اضطراری طور پر اسٹین گن اس کی طرف زور سے اچھال دی، وہ میری طرف سے کسی ایسی حرکت کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تیزی سے نیچے جھک گیا۔ شرافت علی بھی شاید میری ہی طرح گزرنے والے ہر پل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جعلی پولیس افسر کے نیچے جھکنے سے اس کا ریوالور جیسے اس کی گردن سے ہٹا، اس کی ٹانگ چل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس تیزی سے گھوما کہ وہ دونوں جو نہایت اطمینان کے ساتھ اس کے دونوں بازو پکڑے کھڑے تھے، اچھل اچھل کر ادھر ادھر جا گرے۔ فیروز اس دوران اپنی اسٹین گن پھینک چکا تھا۔ اس نے بھی فوراً اس مہربان لمحے سے فائدہ اٹھایا اور اچھل کر اپنے قریب کھڑے ہوئے شخص پر جا پڑا۔ میں نے پلک جھپکتے میں ایک شخص پر چھلانگ لگائی اور اسے لیے ہوئے جعلی پولیس افسر پر جا گرا جو سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریوالور تو شاید ہم میں سے ہر ایک کے پاس ہی تھے، مگر اس مہربان لمحے نے صورت حال کو اتنی تیزی سے بدلا تھا کہ کسی کو بھی ریوالور نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ اور پھر جیسے ہی مقابلہ ہاتھوں اور پیروں سے شروع ہوا، انور کمال اور گل زماں بھی دربان کے ساتھ وہاں آ گئے۔ وہ لوگ باہر کھڑے کسی ایسے ہی موقعے کے منتظر تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہمارا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ مقابل بھی کوئی معمولی لوگ نہیں تھے، وہ جی جان سے بازی کو دوبارہ اپنے حق میں پلٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اب یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا تھا ان کے لیے۔ جعلی پولیس افسر جو ان کا سردار تھا، لڑنے کے فن میں ان سب سے زیادہ طاق تھا، وہ بڑھ بڑھ کر مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی، ہم دونوں بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح لڑ رہے تھے، وہ ٹکریں مار مار کر میرے چہرے کو مسخ کر دینے کے درپے تھا مگر میں نے اسے اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ میں اس کی ٹکریں اپنے سر پر روک کر اس کا ہاتھ گرفت میں لینے کی فکر میں تھا مگر وہ اس تیزی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا کہ ہر بار اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ پارے کی طرح حرکت ہی کیے جا رہے ہیں اور کسی طرح ایک پل کے لیے بھی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ تو میں نے جھنجلا کر اپنا دایاں گھٹنا اس کے پیٹ پر مار دیا۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں چیتے جیسی پھرتی سے جھپٹ کر اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اسے اپنے مخصوص انداز سے دبا کر جھٹکا دیا۔ چٹ کی ایک ہلکی سی آواز ابھری جو اس کی دلدوز چیخ میں ڈوب کر رہ گئی۔ وہ اپنا ہاتھ رانوں کے درمیان دبا کر نیچے گر گیا اور ماہی بے آب کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔

اس سے فارغ ہو کر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا۔ اس کے بقیہ چاروں ساتھی بہت پہلے ہی فرش پر لیٹ گئے تھے اور اب بالکل بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے اپنے لوگوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا "کوئی زندہ بھی ہے ان میں؟"

فیروز مسکراتے ہوئے بولا "اتنا باحیا کوئی نہیں ہے ان میں جو صرف ہاتھ پیروں سے مار کھا کر مر جائے، بے ہوش ہیں یہ۔"

"ٹھیک ہے، ان سب کے ہاتھ باندھ کر انہیں ادھر گیراج کے نیچے تہہ خانے میں ڈلوا دو یار شرافت لی!"

"تم بھول رہے ہو میرے بھائی! ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ ان تنگ وطن لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" وہ بولا۔

فیروز نے بھی اس کی تائید کی "یہ بالکل درست بات جیلانی! سانپ کو تو دیکھتے ہی مار دینا بہتر ہوتا ہے، ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کر کے تم کوئی فیض حاصل نہیں کر سکتے، انہیں جب بھی موقع ملے گا یہ ڈس لیں گے تمہیں۔"

"ٹھیک ہے یارو! تم جو مناسب سمجھو حشر کر دان کا، جو لوگ اپنے مفادات کی خاطر ملک کا مفاد قربان کرنے پر تل جائیں ایسے آستین کے سانپ سے یہ دھرتی جتنی جلدی پاک ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ورنہ دوسروں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ سکون غارت کر دیتے ہیں انسانوں کا، جینا دوبھر کر دیتے ہیں، انہیں سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی نے دربان سے کہا "خان! ابھی تو ان کے ہاتھ پاؤں بہت مضبوطی سے باندھ کر انہیں تہہ خانے میں ڈال دو، رات کے اندھیرے میں کسی ویرانے میں ایک گڑھا کھود کر ان سب کو وہاں دبا دیا جائے گا۔"

دربان نے انور کمال اور گل زمان کی مدد سے ان سب کو

نائیلون کی رسیوں سے جکڑ دیا تھا۔ جعلی پولیس افسر نے بہت ہنگامہ کیا، پہلے تو وہ دھمکیاں دیتا رہا ہمیں زندگی بھر جیل میں سڑا دینے کی اور جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کون ہے تو وہ اپنے باس کے انتقام سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے زچ آکر اسے کہا، "دیکھ او بھئی جعلی پولیسیے، ایک بات میری سن لے کان کھول کر! اگر تو نے خاموشی سے ہاتھ پیر نہیں بندھوائے تو میں تیرے دوسرے ہاتھ اور دونوں پیروں کے جوڑ بھی اکھاڑ دوں گا۔ پھر بے شک تو بغیر ہاتھ پاؤں بندھوائے پڑے رہنا ان لوگوں کے ساتھ۔"

میری یہ دھمکی کارگر رہی، اس نے مزید مزاحمت نہیں کی۔ انہیں باندھنے کے بعد تہ خانے میں لے جا کر ڈال دیا گیا۔ فیروز ایک صوفے میں دھنستے ہوئے بولا، "اس نے تو یار! اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر دی تھی ہمارے لیے۔"

میں نے کہا، "دراصل ہم سے ہی غلطی ہو گئی تھی یار! ہم ایک بالکل سامنے کی بات فراموش کر بیٹھے تھے۔"

"کون سی بات فراموش کر دی تھی ہم نے؟" شرافت علی نے چونک کر حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل سیدھی سی بات تھی میرے بھائی! جب ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ جعلی پولیس والا ہے اور اس کا تعلق آرنگ سے ہے، میری تلاش کا کام سپرد کر کے اسے یہاں بھیجا ہے تو ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہو گا۔ اسے میرے اور تمہارے تعلق کا بھی علم ہو گا اچھی طرح سے۔ وہ جانتا ہو گا کہ آرنگ اور اس کی تنظیم کے خلاف تم میرا ساتھ دے رہے ہو اور ہر طرح میری مدد کر رہے ہو۔ یہ سب کچھ جاننے والے شخص نے جب یہ دیکھا کہ تم اسے واپس بلا کر اپنے بنگلے میں میری اور آپی کی موجودگی کی اطلاع دے رہے ہو تو اس کا چوکنا ہو جانا فطری تھا۔ اگر کسی اور ذریعے سے اسے یہ اطلاع ملتی تو وہ ہماری توقع کے مطابق ہی عمل کرتا لیکن تم سے یہ بات سن کر وہ سمجھ گیا کہ ہم اسے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! یہ تو بہت بڑی غلطی کی تھی ہم نے۔ حیرت ہے اتنے سامنے کی بات نظر انداز کر گئے تھے ہم، کیا ہو گیا تھا ہمیں؟" شرافت علی بولا۔

فیروز نے کہا، "یہ تو واقعی بڑی عجیب حرکت سرزد ہوئی ہے ہم سے۔ ہم تینوں میں سے کسی کو بھی خیال نہیں آیا اس کا۔"

"ہاں بھئی! جب کوئی برائی آتی ہے تو آدمی کی عقل یوں ہی گھاس چرنے چلی جاتی ہے، بینائی سے محروم ہو جاتا ہے وہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اس وقت تو اللہ نے بڑا کرم کیا ہے ہم پر، ورنہ ہم نے کام تو ایسا کیا تھا کہ بچ نہیں سکتے تھے، اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی جا پھنسے تھے۔ جیلانی! تم نے اگر حاضر دماغی سے کام نہیں لیا ہوتا تو اس وقت ان کی جگہ ہم تینوں بندھے پڑے ہوتے۔۔۔" شرافت علی بولا۔

"خیر چھوڑو یار! جو ہو گیا مٹی ڈالو اس پر۔ بس آئندہ ایسا کام نہ کرنا، کوئی بھی کام کرنے سے پہلے دماغ سے اچھی طرح کام لیا کرو یار! کیونکہ یہ ہمیں دیا ہی اس لیے گیا ہے، دماغ کو استعمال کرتے رہنا چاہیے نہیں تو زنگ لگ جاتا ہے اسے، پھر یہ کسی کام کا نہیں رہتا اور آدمی سڑکوں اور گلیوں سے کوڑا کچرا جمع کرتے پھرنے کے کام کا ہی رہ جاتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

فیروز بولا، "لزی کی یہ اطلاع بھی درست ثابت ہوئی ہے حقیقت تو یہ ہے، اس نے ان کے بارے میں بتا کر ہمیں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ میں تم سے ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ اب اسے اپنے مخلص دوستوں اور بہی خواہوں کی طرف میں شامل کر لو۔ شام کو جب اس کا فون آئے تو تم اسے میرا فون نمبر بتا دینا اور وہاں رابطہ قائم کرنے کے لیے کہہ دینا اس سے۔"

"ہاں جیلانی! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس طرح اس کی ایک اور طرح بھی آزمائش ہو جائے گی۔" شرافت علی نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں، اسے ٹیلی فون نمبر بتانے سے اس کی آزمائش کس طرح ہو جائے گی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سیدھی سی بات ہے بھائی! اگر وہ واقعی ہماری دوست ہے، کوئی فریب نہیں کر رہی ہے ہم سے تو ٹیلی فون نمبر معلوم ہونے کے بعد وہ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرے گی کہ اس نمبر کا ٹیلیفون کہاں لگا ہوا ہے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا اور فیروز کے گھر کا پتا چلا کر وہاں کوئی کارروائی کی تو اس کا سارا فریب کھل جائے گا ہم پر۔" شرافت علی نے کہا۔

"ہوں، لیکن اگر اس نے خود سامنے آنے کے بجائے آرنگ کو ہمارا پتا بتا کر اس کے آدمیوں کے ذریعے کوئی گڑبڑ کرائی تو ہم کیسے جان سکیں گے کہ اس کام میں وہ ملوث ہے یا نہیں؟" میں نے شرافت علی کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ بھی کوئی بات ہے، بھئی جب ہم لزی کے سوا کسی کو کچھ بتائیں گے ہی نہیں تو ہر بات کی ذمے داری اسی پر ہوگی، آرنگ اور وہ کوئی الگ الگ نہیں ہیں نا ہماری نظر میں۔ اس مکان کے بارے میں اب تک کوئی نہیں جانتا لہٰذا لزی کے جاننے کے بعد وہاں جو کچھ بھی ہو گا وہ اس کے کھاتے میں ہی جائے گا۔ ظاہر ہے ہم میں سے تو کوئی آرنگ کو اس کا پتا بتانے نہیں جائے گا۔"

"تمہاری بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے یہ تجربہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں آج۔ اس لڑکی نے ہمیں بڑا الجھا رکھا ہے۔"

"اس الجھن کو زیادہ دن تک برقرار نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ بات کسی وقت ہمارے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔" فیروز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

میں نے شرافت علی سے کہا، "شرافت علی! حالات دن بدن خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، بھیڑیوں کے جس غول کو ہم نے چھیڑ دیا ہے وہ بہت ہی خوفناک ہے اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم ان کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہیں۔ اب تک جو کامیابیاں ہمیں حاصل ہوئی ہیں، یہ بس تقدیر کی مہربانی ہی کہی جا سکتی ہے، آرنگ جس دن پوری قوت سے ہمارے مقابل آکھڑا ہوا، ہماری ایک نہیں چل سکے گی اس کے آگے۔ کچھ سوچو یارو! اس سلسلے میں، کوئی ایسی تدبیر سوچو جس سے ہماری طاقت اور ہمارے وسائل میں اضافہ ہو، ہم ان کی بیخ کنی کرنے کے قابل ہو سکیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو جیلانی! میں کوشش کر رہا ہوں، بہت سے لوگوں کو میں نے آمادہ کر لیا ہے۔ میں نے اپنی تمام دولت اور سارے وسائل اس کے لیے وقف کر دیے ہیں، کئی اور لوگوں کو بھی راضی کر لیا ہے جو ہمیں ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم کرتے رہیں گے۔ اس کی تو پروا ہی نہ کرو تم، ضرورت پڑی تو ہم جدید ترین لڑاکا طیارے اور ٹینک بھی خرید سکتے ہیں۔ میں نے فی الحال دو کاریں تیار کروائی ہیں جو بظاہر عام سی کاریں معلوم ہوتی ہیں جیسی ہم سڑکوں پر دوڑتی ہوئی دیکھتے رہتے ہیں، لیکن ان کو میں نے ایسا بنوا دیا ہے کہ گولیاں کیا معمولی بم بھی اس پر اثر نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام شیشے بلٹ پروف ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں چاروں طرف خفیہ مشین گنیں اور رائفلیں اس طرح لگائی گئی ہیں کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی صرف ایک بٹن کے ذریعے کسی بھی طرف سے حملہ کرنے والے دشمن کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی خوبیاں ہیں ان میں، انشاءاللہ آئندہ ہفتے وہ دونوں کاریں ہمیں مل جائیں گی۔ ان میں سے ایک تمہارے استعمال میں رہے گی اور ایک میرے استعمال میں۔ ضرورت ہوئی تو ایسی اور بھی گاڑیاں تیار ہو سکتی ہیں، صرف دس دن کے نوٹس پر۔ اس کے علاوہ میں نے ایک کراٹے سینٹر کے انسٹرکٹر کو بھی آمادہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے کئی شاگردوں کو خصوصی تربیت دے کر تیار کر رہا ہے۔ تم دیکھو گے، بہت جلد ہم ایک بہترین تربیت یافتہ فوج تیار کر کے لے آئیں گے ان اسرائیلی ایجنٹوں کے مقابلے کے لیے۔" شرافت علی نے مجھے بتایا۔

میں نے بے اختیار شرافت علی کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے بھینچ لیا اور جذبات کی شدت سے رندھی ہوئی آواز میں بولا، "او یار شرافت علی! کیا شے ہے میرے یار تو۔ جس ملک میں تیرے جیسے لوگ بستے ہوں اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

فیروز بولا، "یہ تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے بھئی! چپکے چپکے یہ سب کچھ کرتے رہے اور ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"بتانے کی کیا بات تھی اس میں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے ملک کی سلامتی اور بہتر مستقبل کے لیے کر رہا ہوں، کسی صلے یا ستائش کے لیے تو نہیں کر رہا ہوں۔ فرض ہے یہ میرا، یہ خطۂ زمین جو آج میرا وطن ہے، جس کے نام سے میں پہچانا جاتا ہوں، جس کے حوالے سے اقوامِ عالم میں شناخت کراتا ہوں میں اپنی، اگر یہ نہ رہی تو میری اور میرے بچوں کی کوئی پہچان بھی نہیں رہے گی یارو! ہم دنیا کی آزاد قوموں میں کس کے حوالے سے شناخت کرائیں گے اپنے آپ کو۔ کیا دنیا ہم پر ہنسے گی نہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بزرگوں نے دنیا میں انہیں ایک باعزت مقام دلوانے کے لیے ان تھک محنت اور بے شمار قربانیوں کے بعد ایک آزاد وطن حاصل کیا تھا، زندہ قوموں میں انہیں مقام دلایا تھا لیکن یہ ایسے ناکارہ، نااہل اور۔۔۔ نا اندیش لوگ ہیں کہ سندھی، بلوچی، پختون، پنجابی اور بنگالی میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ یہ ایسے کور چشم ہیں کہ دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکے اور ایک متحد اور مضبوط قوم بن کر رہنے کے بجائے کئی چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹ کر کمزور اور بے سہارا ہو گئے کہ جس کا دل چاہے انہیں ایک ایک کر کے ہڑپ کر جائے۔ نہیں میرے دوست! میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ یہودیوں کی سازش ہے، وہ جانتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں پاکستان ہی ان کے مذموم ارادوں کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک پاکستان مضبوط اور متحد ہے وہ دنیائے اسلام کو غلام بنانے کے اپنے صدیوں پرانے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے نہیں دیکھ سکیں گے چنانچہ وہ پاکستان پر ہر جانب سے یلغار کر رہے ہیں، ہمیں کمزور کر کے تباہ کرنے کے لیے وہ کسی سے چار قومیتوں کا نعرہ لگوا رہے ہیں، کسی کے ذریعے صوبائیت کا پرچار کر رہے ہیں اور کہیں پاکستان کے خلاف نعرے لگوا رہے ہیں۔ ہم اگر اب بھی ہوش میں نہ آئے، اب بھی ہم نے ملک کے خلاف کام کرنے والوں سے رواداری برتی اور جمہوری آزادیوں کے نام پر یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے تو تاریخ شاہد ہے میرے دوست کہ وقت گزر جانے کے بعد پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ جب یہ ملک ہی نہیں رہے گا تو تمہاری یہ جمہوریت، رواداری اور آزادی کہاں رہ جائے گی جس کے نام پر آج ملک کو بربادی کے غار تک لے جایا جا رہا ہے۔"

"آفرین میرے بھائی! اے کاش ہمارے ملک کے یہ جذباتی نوجوان بھی اس بات کو سمجھ سکیں کہ وہ لوگ، وہ ممالک جو انہیں اپنے ملک میں تخریب کاری کی تربیت دے رہے ہیں اور ان پر بے شمار دولت

صرف کر رہے ہیں وہ ان کے اور ان کے ملک کے دوست کس طرح ہو سکتے ہیں؟ لے کاش وہ یہ جان سکیں کہ وہ اپنے آج کو روشن بنانے کے لیے جو کچھ دوسروں کے اشاروں پر کر رہے ہیں وہ دراصل ان کا کل تاریک کرنے کے لیے دشمن کی ایک چال ہے، اگر وقت گزرنے کے بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو بھی گیا تو پھر کیا ہو سکے گا؟ وہ اپنے اس گناہِ عظیم کا کفارہ کس طرح ادا کر سکیں گے؟ وہ جنہوں نے اپنوں سے منہ موڑ کر غیروں سے ناتا جوڑا، ان سے وفا کی، ان کے انجام سے تاریخ بھری پڑی ہے، مگر نہ جانے کیوں اپنے ملک و قوم کی بربادی میں دوسروں کے ساتھ شرکت کرتے ہوئے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم جن کا ساتھ دے رہے ہیں، وہ ایسے طوطا چشم نہیں ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ماضی میں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونے والے بھی یہی سمجھتے رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنوں کے مقابلے میں غیروں پر اعتبار کرنے کی غلطی کی تھی اور پھر اس غلطی کا خمیازہ بھی بھگتا تھا۔" فیروز نے کہا۔

"ہاں یارو! یہ انسان ہے ہی کچھ ایسا۔ قدرت نے اس کے لیے قدم قدم پر عبرت کا سامان کر رکھا ہے مگر یہ اس سے عبرت پکڑنے کے بجائے اس پر ہنستا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے، اسے دوسرے انسانوں کی غلطی اور بے وقوفی کہہ کر ان کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے اور یہ یقین کر لیتا ہے اپنے دل میں وہ خود ایسا نہیں ہے، اس سے ایسی غلطی کبھی سرزد نہیں ہوگی، وہ اس انجام سے کبھی دوچار نہیں ہوگا۔"

★

تقریباً ساڑھے چھ بجے میں گل زمان کے ساتھ بنگلے سے باہر نکلا تھا۔ فیروز، شرافت علی اور انور کمال بہت پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے کیوں کہ ان لوگوں کو دوسرے معاملات دیکھنا تھے۔ مجھے چونکہ چھ بجے لزی کا فون ریسیو کرنا تھا اس لیے میں یہیں رک گیا تھا اور کسی امکانی خطرے کے پیشِ نظر فیروز، گل زمان کو میرے ساتھ لگا گیا تھا حسبِ وعدہ لزی نے ٹھیک چھ بجے فون کر کے مجھے ایک ٹیلی فون نمبر اور ایک پتا لکھوا دیا تھا۔ میں اس نمبر پر بروقتِ ضرورت اسے کال کر سکتا تھا اور اس کے لیے کوئی پیغام چھوڑ سکتا تھا۔ جواب میں اسے میں نے فیروز کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا تھا۔ تاکہ وہ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ قائم کر سکے۔ فیروز اور شرافت علی نے لزی کی اتنی بھرپور انداز میں وکالت کی تھی کہ میں اس کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا اور میرے دل میں اس کے لیے جو لطیف جذبات تھے، جنہیں میں نے گرگری سے حاصل ہونے والی اطلاعات کے بعد دل کے کسی ویران اور سرد خانے میں ڈال دیا تھا، دوبارہ سر ابھارنے لگے تھے۔ میں دل ہی دل میں یہ دعائیں کرنے لگا تھا کہ کاش وہ وہی کچھ ہو جو فیروز اور شرافت علی سمجھ رہے ہیں اسے۔ کیوں کہ اب میں اس کے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مزارِ قائد کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرا دل آپ ہی آپ بھر آیا اور آنکھیں نم ہونے لگیں۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے قائدِ اعظم میرے سامنے کھڑے مجھ سے پوچھ رہے ہوں، "کیا میری اور میرے ساتھیوں کی عمر بھر جدوجہد اور قربانیوں کا یہی صلہ ہے؟ کیا ہم نے تم لوگوں کو انگریز اور ہندو کی غلامی سے اسی لیے آزاد کرایا تھا کہ تم اپنے ہاتھوں کسی اور کی غلامی کا جوا اپنے کاندھے پر رکھ لو؟"

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے روتے دیکھ کر گل زمان بولا "کیا بات ہے جیلانی بھائی! یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟"

میں نے خود کو سنبھال کر آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا "کچھ نہیں یار! کوئی خاص بات نہیں ہے، نہ جانے کیوں قائد کے مزار کو دیکھ کر یک بیک دل بھر آیا تھا اس سمے۔ ایسا کیوں ہوا، یہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

وہ چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ بولے بغیر مجھ پر سے نظریں ہٹا کر خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی اس سے اور اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ میری نظریں باہر سڑک پر رواں چھوٹی بڑی گاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ طرح طرح کے خیالات، وسوسوں اور اندیشوں نے یلغار کر رکھی تھی مجھ پر۔ اس اندیشۂ سود و زیاں کا پردہ چاک کر کے اچانک لزی کا مسکراتا ہوا تر و تازہ حسین چہرہ نمودار ہوا اور میرے کانوں میں اس کی مدھم سرگوشی سی ابھری، "کیا ہوا ہے جنابِ عالی! آپ کو؟" میں ابھی اس کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا کہ بہت دور جیسے بادلوں کے اس پار سے کسی کی بے جان سی سسکی سنائی دی اور نہایت نحیف و نزار مسند آرا نگھن غمگین، اداس اداس سی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بے شمار سوال تھے میرے لیے، لیکن مجھ میں اس سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، میں نظریں چرا رہا تھا اس سے کیوں کہ میں مجرم تھا اس کا۔ اس نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا، اپنے سپنوں کی حسین وادیوں میں وہ مجھے ساتھ لیے لیے پھرتی تھی، اس کی نازک نازک حنائی انگلیوں نے بارہا مجھے کنپٹیوں میں سجا سجا کر دیکھا تھا اور بڑی امیدیں باندھی تھیں اس نے مجھ سے، لیکن میں نے اس ذلیل شخص آہو کے کہنے پر اس کے باپ کو مٹی میں ملا ڈالا تھا انجانے ہی میں سہی مگر یہ جرم سرزد تو ہوا نا مجھ سے۔ میں نے سوچا تھا، میں اسے ایک نہ ایک دن راضی کر لوں گا، وہ مجھے معاف کر کے اپنے دل کے دروازے ایک بار پھر میرے لیے وا کر دے گی لیکن پھر اس کی بہن سروری خانم نہایت ہی بھیدن بھرے انداز میں میری راہ میں حائل ہو گئی اور پھر تو مجھ میں مسند آرا کا سامنا کرنے تک کی طاقت نہیں رہی۔ میں بالکل ہمت ہار بیٹھا اور اپنے دل پر صبر کا پتھر رکھ لیا۔ آشنا نراشا میں تبدیل ہو گئی تو مسند آرا میرے دل کے کسی تاریک گوشے میں جا چھپی اور میں وقت سے پنجہ لڑانے میں ایسا مصروف ہوا کہ پھر اس کا خیال ہی نہیں آیا مجھے۔ میں اسے تقریباً بھول ہی چکا تھا اور اگر وہ کبری مجھے آہو کے انجام اور سروری خانم کی گرفتاری کے بارے میں بتانے کے بعد یہ نہ کہتا کہ سروری کا وہ بچہ جسے وہ میرے نام سے منسوب کرتی تھی، مسند آرا کے پاس پرورش پا رہا ہے تو مجھے اب بھی اس کا خیال نہ آتا۔ آہو بڑا ہی سنگدل اور ظالم شخص تھا، اس نے سب سے بڑا ظلم تو یہ کیا تھا کہ میرے اور مسند آرا کے درمیان ایک ایسی خلیج قائم کر دی تھی جسے عبور کرنا یا پاٹنا میرے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ اس خلیج کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف مسند آرا تھی اور ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میری کوئی فریاد، کوئی دلیل اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس وقت مسند آرا کے خیال نے میرے دل کو بری طرح مسل کر رکھ دیا تھا۔ میرے ذہن کی اسکرین پر کبھی مسند آرا کی معصوم اور مغموم شبیہ ابھر آتی تھی اور کبھی لزی کا ہنستا مسکراتا کھلے ہوئے کنول جیسا حسین چہرہ ابھر آتا تھا۔ پھر دونوں تصویریں ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے آنے کی جستجو میں باہم الجھنے لگتی تھیں، میرے سینے میں طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہونے لگتے تھے۔

ایک ہلکا سا جھٹکا لگا تو میں چونک کر دل و دماغ کی اس کشمکش سے باہر نکل آیا۔ ہماری کار ایک جگہ رکی ہوئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے تا حدِ نگاہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے گل زمان کو دیکھا۔ وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولا "آپ مجھے کچھ پریشان سے لگ رہے تھے جیلانی بھائی! لہٰذا میں دل بہلانے کے لیے ادھر ساحلِ سمندر پر لے آیا آپ کو۔"

سورج سمندر کے اس پار آدھا غروب ہو چکا تھا، شام کے سائے ہر سو پھیل چکے تھے، ساحل پر دور دور اِکّا دُکّا آدمی سمندر کی سرکش لہروں سے الجھتا دکھائی دے جاتا تھا، ہر سمت ویرانی کا راج تھا۔ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کار سے باہر نکلتے ہوئے بولا "یہ تم نے بہت اچھا کیا برادر! مجھے ساحلِ سمندر سے غروب ہوتے ہوئے سورج کا منظر بہت اچھا لگتا ہے۔"

میرے ساتھ ہی ساتھ گل زمان بھی کار سے باہر آ گیا تھا دروازہ بند کرتے ہوئے میری نظر اپنے عقب میں ساحل کی طرف آنے والی سڑک کی جانب اٹھ گئی۔ ایک سرخ رنگ کی لمبی سی کار تیزی سے ساحل کی طرف چلی آ رہی تھی، وہ اتنے قریب آ چکی تھی کہ جتنی دیر میں، میں نے اپنی کار کا دروازہ بند کیا، وہ میرے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں سمجھا شاید ہماری ہی طرح کے کچھ لوگ ہوں گے یہ بھی جو غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے ساحل پر آئے ہیں۔ چنانچہ میں نے آنے والوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے گل زمان کو دیکھا۔ وہ اس آنے والی کار پر نظریں جمائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے بھئی؟ کیا مطلب ہے اس مسکراہٹ کا؟"

وہ بولا "یہ لوگ بہت دیر سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں، میں اسی لیے ادھر لے آیا ہوں انہیں، شاید تنہائی میں یہ کوئی اہم مسئلہ پیش کرنا چاہتے ہیں ہمارے سامنے۔"

میں نے فوراً پلٹ کر آنے والی کار کی طرف دیکھا۔ اس کے چاروں دروازے کھلے ہوئے تھے اور چار خونخوار قسم کے بندے چاروں دروازوں پر ہاتھ رکھے باہر کھڑے ہمیں حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔ عین اسی وقت عقبی دروازے پر کھڑے ہوئے شخص کو الگ ہٹا کر جو شخص کار سے باہر نکلا، اسے دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی صحت یاب ہو کر دوبارہ میرے مقابل آ کھڑا ہوا ہے لیکن یقین نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی، وہ ظہیر احمد ہی تھا۔ میرا پرانا دشمن جسے میں نے منگھو پیر کی پہاڑیوں میں تقریباً ختم ہی کر دیا تھا لیکن بہت ہی سخت جان ثابت ہوا تھا وہ۔ اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا مجھے، اس کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ اسے فی الحال تو بستر سے اٹھنے میں ہی کئی مہینے لگ جائیں گے۔ اس کے بعد بھی اس کی جو حالت ہوئی ہے میرے ہاتھوں اس کے پیشِ نظر اب کبھی وہ میری راہ روکنے کی جرأت نہ کر سکے گا مگر وہ تو میرے سارے اندازوں کو شکست دے کر آج پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا لیکن گاڑی سے اتر کر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ چونک کر بولا "ارے، یہ تم لوگ کس کے پیچھے لگ گئے؟ یہ وہ تو نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر وہ چاروں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر ڈرائیونگ نشست والا بولا "مگر وہاں سے تو یہی نکلے تھے۔"

ظہیر احمد میک اپ کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔

وہ لوگ جیلانی سمجھ کر ہی ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے مگر یہاں آکر جب ظہیر احمد نے میری شکل دیکھی تو وہ گڑبڑا گیا۔ ڈرائیور کا جواب سن کر وہ کرخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کون ہو تم؟ اس بنگلے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

یہ بات گل زمان بھی سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ میرا ہی پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں اور میک اپ کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں رہے..... چنانچہ اس نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ظہیر احمد کو اپنی آواز سناتا، وہ بول اٹھا۔ ”کس کی بات کر رہے ہو بھائی! کس بنگلے سے ہماری رشتے داری معلوم کرنا چاہتے ہو؟ ذرا وضاحت سے تو بات کرو۔“

”جس بنگلے سے نکل کر تم لوگ آئے ہو یہاں تک، اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں میں۔“ ظہیر احمد نے ہنوز کرخت لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو ہم سے؟ کیا وہ بنگلا تمہاری ملکیت ہے اور کوئی غلط اطلاع ملی ہے تمہیں ہمارے بارے میں؟“

ظہیر احمد کے جو گرگے اس کے اردگرد کھڑے تھے، ان میں سے ایک کو گل زمان کا یہ انداز کچھ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ غرانے کے انداز میں بولا۔ ”اُئے تم بات کیسے کرتا ہے، جانتا نہیں ہے ہم لوگوں کا باس ہے یہ۔ ٹھیک ٹھیک بات کرو، اکڑی نئیں دکھاؤ نئیں تو لمبا کر دیں گا ہم تم کو ہاں۔“

ظہیر احمد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا بالکل سیدھا اور سچا جواب دو لڑکے، ورنہ یہ لوگ اگر بگڑ گئے تو انھیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی ہڈیاں تڑوانا چاہتے ہو؟“

”اوہ جناب! میں معافی چاہتا ہوں، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسے خطرناک لوگ ہیں آپ۔ اب پوچھیں کیا پوچھا تھا آپ نے؟“ گل زمان نے اس کی دھمکی سے سہمنے کی اداکاری کرتے ہوئے خوف زدہ سے لہجے میں بولا۔

”میں نے پوچھا ہے تم لوگ جس بنگلے سے نکل کر آئے ہو، اس میں تم کیوں گئے تھے؟“ ظہیر احمد نے اپنا سوال دہرایا۔

”یقین کریں جناب! ہم بہت شریف لوگ ہیں، کسی بری نیت سے نہیں گئے تھے وہاں۔ ہم اسے کرائے پر لینا چاہتے ہیں، اسی کی بات کرنے گئے تھے وہاں لیکن اگر آپ کو یہ بات پسند نہیں ہے تو آئندہ نہیں جائیں گے وہاں، وعدہ ہے یہ ہمارا۔“

”کس سے ملے تھے وہاں تم؟ وہ غیر آباد بنگلا ہے، اس کا مالک تو کہیں باہر ہی رہتا ہے، بنگلے میں صرف مہمان ٹھہرتے ہیں اس کے۔“

”ہاں جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ چوکیدار بھی یہی کہہ رہا تھا، اسی لیے ہم واپس آگئے۔“ گل زمان عاجزی سے بولا۔

ظہیر احمد کی کار کا ڈرائیور بولا۔ ”جھوٹ بولتا ہے باس! یہ کوئی دو گھنٹے سے زیادہ رہا تھا یہ اندر، جس کے ساتھ گیا تھا وہ آدمی دو اور آدمیوں کے ساتھ بہت پہلے واپس جا چکا تھا، یہ اب نکلا ہے اس آدمی کو ساتھ لے کر۔“

ظہیر احمد نے خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم یوں نہیں مانو گے۔ اس سے پہلے تمہارا واسطہ نہیں پڑا ہے نا مجھ سے، اسی لیے میرے سامنے تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے...“

میں نے ظہیر احمد کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو ظہیر احمد! اس کا پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے تم سے لیکن مجھے حیرت یہ ہے کہ تمہارا مجھ سے واسطہ پڑ چکا ہے، پھر بھی تم میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں زندگی عزیز نہیں ہے اپنی؟“

میری آواز سن کر ظہیر احمد یوں اچھلا تھا جیسے اچانک بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اسے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اوہ، تو تم نے حلیہ بدل رکھا ہے اپنا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ میرے آدمی غلطی کس طرح کر گئے۔“

”ہاں یار! یہ بڑی مجبوری ہے میری۔ جہاں تم جیسے کتّے موجود ہوں، وہاں اپنے اصل چہرے کے ساتھ گھر سے نکلنا آسان کام تو نہیں ہے۔ اب دیکھو میک اپ کے باوجود تم لوگ مجھے پہچان کر میرے پیچھے چلے آئے۔“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”موت آدمی کو ہر روپ میں پہچان لیتی ہے جناب غلام جیلانی صاحب! فرشتۂ اجل سے کوئی نہیں چھپ سکتا۔“ وہ بولا۔ پھر اپنے آدمیوں کو مخاطب کر کے چلّایا۔ ”ذبح کر دو سالے کو نیچے گرا کر، بڑا سورما بنا پھرتا ہے۔“

اس کا حکم سنتے ہی وہ چاروں غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ انھیں شاید اپنے قوتِ بازو پر بہت بھروسا تھا اور تعداد کا گھمنڈ بھی تھا، جبھی انھوں نے ہتھیار لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ یا ممکن ہے ظہیر احمد نے گزشتہ مقابلوں کے تجربے کی روشنی میں انھیں ہاتھ پیروں ہی سے لڑنے کی ہدایت کی ہو۔ ان چاروں کو میری طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر گل زمان بولا۔ ”یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے دوستو! تم چار آدمی ایک آدمی کی طرف بڑھ رہے ہو۔ دو میری طرف بھی تو آؤ۔“

ظہیر احمد بولا۔ ”فکر مت کرو بچّے! تمہاری خواہش بھی ضرور پوری کی جائے گی، پہلے اس سے نمٹ لیں ذرا۔“

”نہیں بھئی، یہ بے ایمانی ہے، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ یہ کہتے ہی وہ جست لگا کر ظہیر احمد کے پاس جا پہنچا۔

ظہیر احمد نے تیزی سے پلٹ کر کار میں گھسنا چاہا لیکن گل زمان نے اسے پیچھے سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے باہر کھینچا اور چکر دے کر یوں اس کے ساتھیوں کی طرف پھینک دیا جیسے وہ انسان نہیں کوئی وزنی اور بڑا سا پتھر ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی گل زمان سے ایسی کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ ظہیر احمد کسی شہتیر کی طرح اپنے آدمی پر آکر گرا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ کر نیچے گر پڑے۔ اس دوران گل زمان ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور ایک اور شخص کی پشت پر فلائنگ کک لگا کر اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ بقیہ دو صورتِ حال کو سمجھ کر ہوشیار ہوتے، ایک شخص کی ٹانگوں پر گل زمان کی ٹانگ پڑی اور وہ اچھل کر نیچے جا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی چوتھے آدمی پر میں نے چھلانگ لگا دی تھی اور اسے لیے ہوئے نیچے گر گیا تھا لیکن میرا مقابل خاصا جان دار تھا۔ اس نے نیچے گرتے ہی مجھے اپنے اوپر سے الٹ کر پیچھے پھینک دیا تھا۔ میں تیزی سے پلٹ کر کھڑا ہو گیا، اتنی دیر میں وہ بھی اٹھ چکا تھا، میرے اٹھتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی، میں چونکہ ابھی پوری طرح سنبھل نہیں سکا تھا، اس لیے اس کا یہ حملہ کارگر رہا اور وہ مجھے دبوچ کر دونوں ہاتھوں پر اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے سر سے اونچا اٹھا کر کئی چکر دیے اور پھر پورے زور سے ایک طرف اچھال دیا۔ تو وہ خیر یہ ہوئی کہ جس جگہ ہم باہم دست و گریباں تھے وہاں ہر طرف نرم ریت تھی جس کی وجہ سے مجھے کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نیچے گرتے ہی لوٹ لگا کر گرنے والی جگہ سے دور ہٹ گیا تھا، میرا یہ عمل اضطراری تھا جو اس گھڑی میرے کام آگیا، اگر میں ایک لمحے بھی وہاں پڑا رہ گیا ہوتا تو میری ہڈیاں کڑکڑا کر کئی جگہ سے ٹوٹ جاتیں اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ میرے گرتے ہی اس پہاڑ جیسے شخص نے جست کر کے میرے اوپر گرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی بدقسمتی کہیے یا میری خوش بختی کہ جب اپنے پورے زور کے ساتھ وہ اس جگہ گرا تو وہاں میں موجود نہیں تھا۔ وہ دھپ کی آواز کے ساتھ ریت میں اوندھے منہ گرا تھا۔ اپنے چونکہ اس جگہ میری موجودگی کا کامل یقین تھا، اس لیے اس نے اپنے چہرے کو ریت سے بچائے رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ گرتے ہی اس کا چہرہ ریت میں دھنس سا گیا۔ اس کے گرنے کی دھمک سے ریت اچھل کر اس کی آنکھوں اور منہ میں گھس گئی تھی، وہ بوکھلا کر پلٹا اور اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے منہ سے ریت تھوکنے لگا۔ میرے لیے یہ بہترین موقع تھا، میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر شکاری باز کی طرح جھپٹ کر اس کا دایاں ہاتھ گرفت میں لے کر اپنا مخصوص فن اس پر آزما ڈالا۔ اس کی کہنی کا جوڑ اکھڑنے کی ہلکی سی چٹ کی آواز سنائی دی اور وہ کسی چوٹ کھائے ہوئے کتّے کے پلّے کی طرح بلبلاتا ہوا اپنا اکھڑا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا کر نیچے بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں اس کے ریت بھری ہوئی تھی جو کسی طرح آنکھیں نہیں کھولنے دے رہی تھی اسے، دوسری طرف اکھڑے ہوئے ہاتھ کی تکلیف تھی جو چین نہیں لینے دیتی تھی۔

میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر دوسروں کی طرف پلٹا تو پتا چلا کہ دو کو گل زمان لمبا کر چکا تھا اور تیسرے کو وہ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ظہیر احمد موقع کی نزاکت کا اندازہ کر کے اپنی کار میں جا بیٹھا تھا اور گھبراہٹ کے عالم میں کار کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کار کسی طرح اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی اس سے۔ میں اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی کار کے پاس جا پہنچا اور تیزی سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ ظہیر احمد مجھے کار میں گھستے دیکھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول کر جلدی سے کار سے باہر نکل کر ایک طرف دوڑ پڑا لیکن گل زمان نے اسے بھاگنے نہیں دیا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ گل زمان نے اس کی طرف لپک کر اس شخص کو جسے وہ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھا، ظہیر احمد کے اوپر پھینک دیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ گل زمان اور میں بھاگتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی ظہیر احمد کے پاس پہنچے تھے۔ گل زمان نے ظہیر احمد کو گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ میں نے اس شخص کو جسے گل زمان نے اس پر پھینکا تھا، اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ تو دنیا جہان سے غافل پڑا تھا، اس میں اٹھنے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے گل زمان کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں، مرا کوئی نہیں ہے، ان میں سے اتنے باحیا یہ لوگ نہیں ہیں، انھیں مارنے کے لیے تو ہمیں سمندر کی مدد درکار ہوگی۔“

ظہیر احمد اس کی گرفت میں مچلتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے، تم سمندر میں نہیں ڈال سکتے انھیں۔“

”کیوں بھئی، کیوں نہیں ڈال سکتے ہیں ہم سمندر میں انھیں؟ کون روکے گا ہمیں ایسا کرنے سے؟“ میں نے اسے گھورتے

ہوئے کہا۔
"اگر تم نے ایسا کیا تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔"
وہ ایک دم آگ بگولا ہو کر بولا۔
مجھے ہنسی آ گئی۔ گل زمان نے اسے اٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "پہلے اپنی زندگی تو بچا لے کھوتے جیلانی صاحب کو مارنے کے بارے میں تو بعد میں سوچنا، اس وقت جب تو میرے ہاتھوں سے بچ کر صحیح سلامت چلا جائے یہاں سے۔"
وہ ریت پر چت گرا تھا اور گرتے ہی اس نے اپنی پتلون میں سے چاقو نکال لیا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے ہاتھ میں چھ انچ کے چمک دار پھل والا کھلا ہوا چاقو دیکھ کر ٹھٹک کے رک گیا۔ گل زمان بھی خاموش کھڑا رہ گیا تھا اس کا یہ تیز دھار چاقو دیکھ کر۔ چاقو نکالنے کے بعد وہ اچھل کر اٹھا اور طنزیہ نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے چاقو لہرا کر بولا۔ "اگر تم دونوں میں سے کوئی بھی میرے قریب آیا تو سمجھ لو اس کی آنتیں باہر نکال دوں گا۔"
وہ چاقو لہراتے ہوئے ہم پر نظریں جمائے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اور گل زمان بھی اس کے چاقو کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے رہے۔ میرا خیال تھا جب وہ دروازہ کھول کر کار میں بیٹھنے لگے گا اس وقت میں اس پر جا پڑوں گا اور اس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے کی کوشش کروں گا لیکن ظہیر احمد کے اس ساتھی نے جسے میں ناکارہ کر کے ڈال آیا تھا، ہماری مشکل آسان کر دی۔ وہ اس دوران اپنی آنکھیں صاف کرنے اور ہاتھ کی تکلیف کو برداشت کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ظہیر احمد کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر آمادہ دیکھ کر آواز دی۔ "میں بھی آتا ہوں استاد! مجھ کو چھوڑ کر نہ جانا۔"
اس کی آواز نے لمحہ بھر کے لیے ظہیر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور یہی لمحہ اس سے بے وفائی کر گیا۔ گل زمان نے اپنی جگہ سے جست کی اور اڑتا ہوا ظہیر احمد پر جا پڑا۔ اس نے زمین پر پیر ٹکتے ہوئے ظہیر احمد کے چاقو والے ہاتھ پر زبردست ٹھوکر لگائی تھی۔ چاقو ظہیر احمد کے ہاتھ سے نکل کر اڑتا ہوا دور جا گرا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس اچانک پڑنے والی افتاد کو سمجھ سکتا، گل زمان نے کراٹے کا مضبوط ہاتھ اس کی گردن پر رسید کر دیا۔ چٹ کی ایک آواز ابھری اور ظہیر احمد کسی کٹے ہوئے بے جان شہتیر کی طرح ریت پر گر گیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی شاید۔ اس کا دھڑ وقفے وقفے سے یوں اچھل رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا مرغ دم توڑ رہا ہو۔
میں نے گل زمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو شاید مر رہا ہے گل زمان! اس کی گردن تو نہیں توڑ دی ہے تم نے؟"

"ہاں، شاید ہاتھ کچھ سخت ہی پڑ گیا غصے میں۔" وہ جواب دے کر اس کی طرف بڑھا۔
اچانک مجھے یوں لگا جیسے میری کمر پہ کوئی بھاری ہتھوڑا چلا دیا ہو کسی نے۔ میں اچھل کر اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ چند ثانیے کے لیے تو میرے لیے دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔ نہ کچھ سجھائی دیا تھا اور نہ ہی یہ سمجھ سکا تھا میں کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ آہستہ آہستہ آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹا اور میں دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا تو پتا چلا کہ وہ تینوں جنہیں گل زمان بے ہوش کر کے ڈال چکا تھا ایک بار پھر اس کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف ہیں۔ وہ تینوں تین طرف سے اس پر حملہ کر رہے تھے مگر کوئی ایک بھی اسے ہاتھ تک نہیں لگا پا رہا تھا۔ میں نے گل زمان کی مدد کے لیے اٹھنے کی کوشش کی تو میری کمر میں بری طرح ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کمر کی ہڈی چٹخ گئی ہو۔ پتا نہیں کیا چیز ماری تھی ان میں سے کسی نے، حالانکہ تینوں میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں مجھے کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گل زمان جس طرح اپنے چاروں ہاتھ پیروں سے ان کی مرمت کر رہا تھا اس نے تینوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ خود کو اس کے ہاتھ پیروں کی زد سے بچا کر اسے زیر کر لینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی ایک نہیں چل رہی تھی اس کے سامنے۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اس کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہے تھے۔
کسی کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر ہمارے ساتھ ہی ان تینوں نے بھی گردنیں گھما کر ادھر دیکھا جدھر سے آواز سنائی دی تھی۔ پتا چلا کہ ان کا وہ ساتھی جس کا دایاں ہاتھ میں نے اکھاڑ دیا تھا، اپنی کار میں پہنچ کر اسے اسٹارٹ کر چکا ہے۔ وہ تینوں گل زمان کو بھول کر ایک دم کار کی طرف دوڑ پڑے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کار میں گھس گئے۔ اس اثنا میں کار حرکت میں آ چکی تھی۔ وہ تیزی سے مڑی اور پلک جھپکتے میں گھوم کر پختہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ وہ اس تیزی سے بھاگے تھے کہ انہوں نے بے جان پڑے ہوئے ظہیر احمد کو ساتھ لے جانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ گل چند لمحے ان کی دور ہوتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا۔ پھر میری طرف مڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھاگ گئے سالے! اپنے باس کو بھی ساتھ نہیں لے گئے۔ بڑے نمک حرام نکلے یہ تو۔" پھر میرے قریب آ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چلیں جیلانی بھائی! ہم بھی واپس چلیں اب۔ ایسا نہ ہو وہ جاتے ہوئے پولیس کو اطلاع دے کر ادھر بھیج دیں۔ انہوں نے یہاں دو آدمیوں کو ایک شخص کی جان لیتے ہوئے دیکھا ہے یہاں رک کر کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہیے۔"
میں نے کہا۔ "یار! میرے ساتھ پتا نہیں کیا گیا ہے انہوں نے۔ مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جا رہا ہے۔ کمر بری طرح درد کر رہی ہے۔"

"ارے!" وہ بولا۔ "ٹھہریں میں دیکھتا ہوں، یہ تو بڑی بری خبر سنائی ہے جناب آپ نے۔"
"ہاں یار! ہے تو یہ بڑی ہی خبر لیکن اب تو اسے بھگتنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔
اس نے میرے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کس جگہ چوٹ لگی ہے؟ ذرا ہاتھ رکھ کر بتائیں مجھے۔"
میں نے ایک ہاتھ پیچھے لے جا کر اس جگہ رکھ دیا جہاں چوٹ لگی تھی۔ اس نے اس جگہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا پھر وہ اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ چند ثانیے اس جگہ کو زور زور سے ملا بھی، اس کے بعد دونوں ہاتھوں سے کمر کی کھال پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے۔۔۔ اچانک اوپر کھینچ لیا۔ درد کی ایک شدید ٹیس نے مجھے بے جان کر دیا، میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے گردن موڑ کر اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتا ہے ذلیل آدمی؟ اب کیا میری کمر توڑنے لگا ہے تو؟"
میرے منہ سے بے اختیار اس کے لیے گالی نکل گئی تھی مگر اس کے ماتھے پر ذرا بھی بل نہ آیا۔ وہ مسکراتے ہوئے میری کمر ملتے ہوئے بولا۔ "بس اب کوشش کریں، میرا خیال ہے اب آپ آسانی سے اٹھ کر بیٹھ جائیں گے۔"
میں نے اس کے کہنے سے دونوں ہاتھ ریت پر ٹکا کر اپنا آپ اوپر اٹھانا شروع کیا تو مجھے ذرا بھی تکلیف کا احساس تک نہ ہو سکا اور میں بڑے آرام سے یوں اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرانی سے گل زمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوئے تو ہے کیا شے بھئی؟ تیری تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ سکی آج تک مجھے یار! ہر روز ایک نیا شعبدہ کر دیتا ہے تو۔"
وہ ہنستے ہوئے کار کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کار میں بیٹھ کر وہ اسے اسٹارٹ کر کے واپسی کے لیے موڑتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے یہ لاش ہم یہیں پڑی رہنے دیں، پولیس خود اٹھا کر لے جائے گی اسے۔"
"اور تو تم کیا سمجھتے ہو ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے کے ایم سی سے شہر کو صاف رکھنے کا۔" میں نے کہا۔
"آپ کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے جیلانی بھائی! کہ آپ کسی بڑے سے بڑے واقع کو بھی دل پر نہیں لیتے اور کسی بات سے ذرا دیر کو بھی نروس نہیں ہوتے۔ آپ کی بذلہ سنجی ہر وقت برقرار رہتی ہے، یہ خوبی کم ہی ہوتی ہے کسی میں۔" وہ بولا۔
"نہیں یار! وہ اپنا آلی شبیر جو ہے نا، اسے تو میں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے فکری سے قہقہے لگاتے دیکھا ہے۔ اس جیسا حوصلہ اور برداشت تو میں اپنے اندر پیدا ہی نہیں کر سکتا ہوں کبھی۔" میں نے جواب دیا۔
"اس میں شک نہیں آدمی وہ بھی بے پناہ خوبیوں والے ہیں۔" گل زمان نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔
رات کی سیاہی ہر سمت پھیل چکی تھی۔ اس شہر نگاراں میں چار سو روشنیاں ہی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور ہماری کار روشن شاہراہوں پر متحرک روشنیوں کے رواں دواں قافلے کے ساتھ جیسے ہوا میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ ان معروف اور پر پیچ گزر گاہوں پر ہمیں دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم اسی جگمگاتے شہر کے ایک قدرے ویران اور نیم تاریک ساحل پر ایک شخص کا زندگی سے رشتہ منقطع کر کے آ رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے آباد یہ شہر بھی انسانوں کا ایک سمندر ہی ہے، جہاں ہر شخص اپنی دھن میں مگن، اپنے حال میں مست ہے، کسی کو کسی کی نہ خبر ہے، نہ کوئی کسی کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس کے سامنے سے گزرنے والا یا اس کے ساتھ ساتھ چلنے والا شخص اپنے ساتھ کتنی اور کیسی کیسی داستانیں لیے پھر رہا ہے۔ مجھے اس شہر کی یہ ادا بہت اچھی لگتی ہے۔ ہم جیسوں کے لیے تو یہاں فکر اور پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں تھی، مجھ جیسے بدنام زمانہ اور معروف اشتہاری مجرم بھی یہاں آزادی سے رہ سکتے تھے۔
فیروزہ اور شرافت علی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہماری کار جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہمارے پاس آ ٹھہرے۔ "کہاں چلے گئے تھے بھئی تم دونوں؟ شہر کا کونہ کونہ چھان ڈالا ہم نے تمہاری تلاش میں۔"
میں نے کار سے اترتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔ "کیوں، خیر تو ہے نا؟ کیوں تلاش کر رہے تھے تم ہمیں؟"
"اب تک تو خیر ہی ہے مگر تم لوگ تھے کہاں کچھ بتاؤ تو؟" شرافت علی نے پوچھا۔
"یعنی تم صرف ہماری وجہ سے پریشان تھے۔ کوئی بچے تو نہیں ہیں یار وہم دونوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔
"کمال ہے بھئی، پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے تمہارے نزدیک۔ ساڑھے چھ بجے نکلے تھے تم بنگلے سے اور اب نو بجے کے قریب پہنچے ہو یہاں، قدم قدم پر دشمنوں نے جال بچھا رکھے ہیں، جگہ جگہ گھات لگائے بیٹھا ہے وہ اور آپ ہیں کہ پندرہ منٹ کی مسافت ڈھائی گھنٹے میں طے کرنے کے بعد یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم پریشان کیوں تھے۔" وہ چڑ کر بولا۔
میں نے ان دونوں کی گردنوں میں اپنے بازو ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "یار! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ یہ اپنا جو گل زمان ہے نا، یہ مجھے ادھر ساحل سمندر پر لے گیا تھا ذرا جی بہلانے کو، مگر یار وہاں ایک پھڈا ہو گیا چھوٹا سا۔"
میں نے انہیں ساحل سمندر پر پیش آنے والا واقع سنا دیا۔ شرافت علی ساری بات سن کر بولا۔ "اچھا! وہ کمینہ ظہیر احمد زندہ ہے

اب تک گزشتہ دنوں کی مار بھول گیا ہے کیا وہ؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "زندہ ہے تہیں تھا اب سے کچھ دیر پہلے تک وہ۔ اب بالکل نہیں رہی جان اس میں۔ بہ اپنے گل زمان نے ٹھکانے لگا کر دیا ہے اب اس کا۔"

"یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ ایسے موقع پر جب ہماری تمام تر توجہ ایک بڑے اور عظیم مقصد پر مرکوز ہے، ایسے لوگوں کا وجود کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جو کبھی کسی بھی موڑ پر اچانک راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔" شرافت علی بولا۔

"ہاں، ہر کام میں اللہ کی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس وقت ہمارا ساحل پر جانا کارآمد ہی ہوا ہے ہمارے لیے اور وہ اپنے آبی یار کا کیا حال ہے؟ اس کی بھی خبر گیری کی تم لوگوں نے یا وہ وہاں اکیلا پڑا فردوسی بیگم کو ہی نئے نئے القابات سے نواز رہا ہے؟"

"تمہارے پاس سے آنے کے بعد میں کوئی گھنٹا بیٹھا تھا اس کے پاس۔ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔ اس کی ٹانگ کا زخم تو بھر ہی چکا ہے تقریباً، چلنے پھرنے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے ابھی زخم اندر سے پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا ہے، کوئی ہفتہ بھر اور لگے گا اسے بشرطیکہ اس دوران وہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے ٹانگ پر اور اس کا عالم یہ ہے کہ وہ اب ایک دن بھی بستر پہ لیٹے رہنے کو تیار نہیں ہو رہا ہے، تم جا کر سمجھاؤ اسے شاید تمہاری بات مان لے وہ۔" فیروز نے مجھے بتایا۔

"وہ بڑا سیماب صفت آدمی ہے یار! ہر دم حرکت میں رہتا ہے اس جیسے آدمی کو بستر پر چین کیسے آ سکتا ہے بھائی! وہ چھبتا رہتا ہوگا اسے۔ خیر میں کوشش کروں گا اسے سمجھانے کی۔" میں نے جواب دیا۔

فیروز بولا۔ "وہ تمہاری فردوسی بیگم ہم لوگوں کے شرافت علی کے بنگلے پر جانے کے بعد آبی سے اپنے آفس جانے کا کہہ کر گئی تھی مگر اب تک واپس نہیں آئی ہے وہ، کہیں اپنے گھر تو نہیں چلی گئی ہے، پتا کریں اس کا کچھ یا ابھی انتظار کریں کچھ دیر اور؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟ اسے جانے کس نے دیا یہاں سے۔ یہ تو بہت برا ہوا ہے، فوراً طارق روڈ بھیجو کسی کو۔"

گل زمان جلدی سے بولا۔ "آپ لوگ بیٹھیں میں جا کر دیکھتا ہوں ان کے فلیٹ پہ۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

فیروز بولا۔ "وہ آبی کی مرضی سے ہی گئی ہے بھائی! وہ چونکہ اب چھوٹے موٹے کام خود ہی کر لیتا ہے اس لیے جانے کی اجازت دے دی اسے۔"

"یہ تو بہت برا کیا ہے یار! اس نے۔ اسے پتا نہیں ہے کہ باہر اس کے لیے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔" میں نے فکر مندی سے کہا۔

اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فیروز نے بڑھ کر فون ریسیو کیا پھر مجھ سے بولا۔ "تمہارا فون ہے جیلانی!"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اوہ، لزی کا فون ہوگا، یہاں کا نمبر اسی کو دیا ہے میں نے آج شام کو۔"

"ہاں، وہی ہے شاید۔" فیروز نے مجھے ریسیور تھماتے ہوئے کہا۔

میں نے ریسیور لے کر جلدی سے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی بولو کیا بات ہے؟ اتنی جلدی کیسے فون کر لیا تم نے مجھے؟"

"اوہ جنابِ عالی! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بہت بری خبر ہے آپ کے لیے۔" لزی میری آواز سن کر جلدی جلدی بولی۔

"کیا بات ہے۔ کیا گڑبڑ ہو گئی جلدی بتاؤ؟ کیا تم نظروں میں آ گئی ہو آئزک کی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں جنابِ عالی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ آپ کی دوست فردوسی بیگم ہے نا، اسے اٹھا لیا ہے ان لوگوں نے۔"

"کیا! کیا... کہہ رہی ہو تم... فردوسی کو اٹھا لیا ہے... مگر کیوں، اس سے کیا دشمنی ہے انہیں؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"آئزک کا خیال ہے آپ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے پاس ضرور آئیں گے اور وہ آپ کو اپنے شکنجے میں پھانسنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے اس بار آپ کو حراساں کر کے اپنی طرف بلانے کا بڑا خوف ناک منصوبہ بنایا ہے۔ اگر فردوسی بیگم کے ذریعے آپ کو پھانسنے میں ناکام رہا وہ تو اس کے بعد آپ کی ماں جی کو اٹھوانے کا پروگرام ہے اس کا..."

"کیا... ماں جی کو!" میں لزی کی بات کاٹ کر چیخ پڑا۔ "نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اگر اس نے میری ماں جی کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو بڑی عبرت ناک موت ماروں گا میں اسے۔ تم... تم بتا دو اس یہودی کتے کو، ماں جی کے بارے میں سوچے بھی نہیں وہ..."

"اوہ جنابِ عالی! صبر سے کام لیں، یوں جذباتی نہ ہوں آپ وہ یہی تو چاہتا ہے کہ پے در پے ایسے واقعات ہوں جو آپ کو جذبات سے مغلوب کر کے اس کے سامنے لے آئیں۔ اس طرح تو آپ اس کا منصوبہ کامیاب کر دیں گے۔" لزی بولی۔

"وہ جانتا نہیں ہے مجھے۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر اندھا ہوتا ہوں نہ دیوانہ، ایسے عالم میں آدمی کی بوٹیاں نوچ لیا کرتا ہوں میں۔ میرا خیال ہے اس کے دن پورے ہو گئے اب، جبھی اس کے دماغ میں خودکشی کا خیال آنے لگا ہے۔"

"دیکھیں میں آپ کو اسی لیے یہ بات بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا یہی اندازہ تھا کہ آپ کوئی نقصان کر بیٹھیں گے اپنا لیکن میری ایک یہ بھی مجبوری تھی کہ آپ اندھیرے میں رہ کر مار نہ کھا جائیں کہیں اور میری طرف سے بدگمان نہ ہو جائیں۔ اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھیں جنابِ عالی! اللہ نے چاہا اس کی نوبت نہیں آ سکے گی، ہم اس سے پہلے ہی اس کا قصہ پاک کر دیں گے۔"

"ایک بات کا خیال رکھو لزی! ماں جی کے بارے میں اس ابلیس زادے کے ذہن میں جو بھی خیال آئے تم اس سے مجھے آگاہ کرتی رہو گی، اگر انہیں میری بے خبری میں ذرا بھی تکلیف پہنچی تو اس کی تم ذمے دار ہو گی۔ ویسے میں ان کا کوئی بندوبست کر دیتا ہوں آج ہی۔"

"آپ سے کہا نا میں نے، آپ فکر مند نہ ہوں، ان شاء اللہ اس کی نوبت نہ آ سکے گی۔" لزی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اب تم مجھے فردوسی بیگم کے بارے میں بتاؤ۔ اسے کہاں رکھا ہے انہوں نے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بولی۔ "اس سلسلے میں بڑی عجیب حرکت کی ان لوگوں نے۔ پہلے تو وہ آپ کے بنگلے پر فون کر کے اس کی اطلاع دینا چاہتے تھے اور خود ہی اس مقام کی نشان دہی کر دینا چاہتے تھے جہاں اسے رکھا جاتا مگر انہوں نے پروگرام تبدیل کر دیا اپنا۔ اب ان کا یہ پروگرام ہے کہ اسے ایک بند گاڑی میں ڈال کر وہ ان سڑکوں پر پھرتے رہیں گے جدھر سے آپ گزرتے دیکھے گئے ہیں اکثر۔ جب بھی آپ ادھر سے گزرنے لگیں گے کسی نہ کسی طرح آپ کو گاڑی کے اندر فردوسی بیگم کو دکھا دیا جائے گا پھر وہ گاڑی اس طرف روانہ ہو جائے گی جہاں وہ آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے آپ فردوسی بیگم کو دیکھنے کے بعد اس گاڑی کا پیچھا ضرور کریں گے۔"

"کیا تم اس گاڑی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو مجھے؟ اس کا میک اور نمبر وغیرہ۔" میں نے سوال کیا۔

"میں نے وہ گاڑی دیکھی تو نہیں ہے مگر اتنا پتا ہے کہ وہ ایک سوزوکی منی ٹرک ہے۔ جس کا پچھلا حصہ ایسا بنا ہوا ہے جیسے عموماً مختلف کمپنیوں کی گاڑیاں اپنی مصنوعات دکانوں پر لے جانے کے لیے بنوا لیتی ہیں۔ پیچھے ایک دروازہ ہے جس کے بالائی حصے میں جالیاں لگی ہیں۔ اس پر کسی کمپنی کا نام بھی لکھا ہے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ وہ گاڑی کمپنی کی مصنوعات سپلائی کرتی پھر رہی ہے دکانوں دکانوں۔ نمبر اور رنگ اس کا مجھے معلوم نہیں۔ کل صبح سے وہ گاڑی نکلے گی سڑکوں پر۔"

"ٹھیک ہے، اتنا کافی ہے، اب میں دیکھ لوں گا اسے۔ بس اب تم ماں جی کے بارے میں ان کے پروگرام پر نظر رکھو۔"

ریسیور کریڈل پر ڈال کر میں نے فیروز سے کہا۔ "دیکھا تم نے، کیسا خبیث کا بچہ ہے یہ اسرائیلی کتا؟"

"کیا کہہ رہی تھی وہ؟ کیا ان لوگوں نے تمہاری ماں جی کو اغوا کر لیا ہے یا ایسا کرنا چاہتے ہیں وہ؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"وہ مجھے گھیرنے کے لیے اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ فردوسی کو کہیں سے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور آئندہ کے لیے ماں جی پر نظر ہے ان کی۔" میں نے انہیں لزی سے ہونے والی ساری گفتگو تفصیل سے سنا دی۔

"حرکت تو بڑی ذلیل کی ہے اس یہودی بچے نے لیکن تم فکر مت کرو، ہم اسے اس کی ایسی سزا دیں گے کہ ہمیشہ یاد رکھے گا وہ اسے۔ یہ لزی بہت کام کی ثابت ہو رہی ہے یار! ورنہ ایسے درندہ صفت دشمن سے نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔" فیروز بولا۔

"ہاں بھئی، ہم کیا سمجھتے رہے تھے اس لڑکی کو اور کیا نکلی ہے یہ۔" شرافت علی اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"ارے چھوڑ دو یار! ان بے کار باتوں کو، ٹھیک ہے خدا نے اس کے دل میں ہمدردی کا کوئی ایسا جذبہ ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے کام آنے لگی ہے۔ یہ سب اس مولا کا کرم ہے، وہ ہماری بربادی نہیں چاہتا۔ اس لیے دشمنوں کے درمیان بھی ہمارے دوست پیدا کر دیے ہیں اس نے۔ وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے اور اسے قدرت حاصل ہے کل شئے پر جو کچھ ہم زمینوں اور آسمانوں میں دیکھتے ہیں اور ان پر بھی جنہیں ہماری نگاہیں احاطہ نہیں کر پاتیں۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے، سب کچھ کر سکتا ہے وہ، اس نے موسیٰؑ کو فرعون کے گھر میں پروان چڑھوایا تاکہ لوگ یہ جان سکیں، وہ اس کائنات میں وہ کچھ کرنے پر قادر ہے جو اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، تو میرے بھائی! خود کو اسی فکر میں ہلکان نہ کرو کہ لزی کون ہے، لزی کیا ہے، لزی کیا کر رہی ہے اور لزی کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ باتیں اس وقت کرنے کی نہیں ہیں۔ اس وقت تو ہمیں صرف یہ سوچنا چاہیے کہ فردوسی بیگم کو ان کے پنجے سے کس طرح آزاد کرایا جائے؟" میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

شرافت علی شوخی سے بولا۔ "تمہارا بھی استاد ثانی مشکل سے ملے گا۔ ابھی خود اللہ کی قدرت اور اس کارسازی کے گن گا رہے، اس پر اپنے ایمان کی پختگی کا ایسا اظہار کر رہے تھے کہ اگر کوئی زاہد صد سالہ بھی سن لیتا تمہاری باتیں تو اش اش کر اٹھتا اور دامن تھام کر تمہارا بیٹھ جاتا تمہارے قدموں میں۔ جب کہ حال تمہارا یہ ہے کہ فردوسی بیگم کی فکر میں گھلے جا رہے ہو۔ کیا جو خدا دشمنوں کے درمیان لزی جیسی ہمدرد ہستی پیدا کر سکتا ہے جو موسیٰؑ کو فرعون کے گھر میں پرورش کرا سکتا ہے وہ فردوسی بیگم کو تمہارے دشمنوں سے آزادی دلانے کی کوئی صورت پیدا نہیں کر سکتا؟"

میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ میں اسے کیا جواب دیتا، بزرگوں نے سچ کہا ہے "پہلے تولو پھر بولو۔" بغیر سوچے سمجھے بولتے چلے جانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی زبان کے جال میں خود ہی پھنس کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو گیا تھا اس سمے۔ مجھے خاموش دیکھ کر فیروز بولا۔ "یار شرافت علی! ہمارے

یار کو شرمندہ تو نہ کر، زبان پکڑ کے اس کی، بندہ بشر ہے غلطی کس سے نہیں ہوتی۔"

شرافت علی بولا "نہیں بھائی! میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا میں نے تو مذاق کیا تھا یار جیلانی! کیا تم بُرا مان گئے ہو؟"

"نہیں یار! میں نے بُرا تو بالکل نہیں مانا، میں تو یہ سوچنے لگا تھا بزرگوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں جو نصیحتیں کی ہیں اور جو اقوال چھوڑ گئے وہ آئندہ اپنے بعد آنے والے کے لیے، اُنھیں کسی وقت بھی بھولنا نہیں چاہیے اسی میں نجات ہے اس کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک بات کہی ہے تم نے۔ بہرحال فردوسی بیگم کی تم زیادہ فکر مت کرو، وہ انشا اللہ آج کی رات سے زیادہ وقت نہیں گزارے گی ان کی تحویل میں۔ کل ہم اسے آزاد کرا لیں گے۔ لزی نے جو کچھ بتایا ہے تمھیں یہ بہت کافی ہے، اب تو پاتال سے ڈھونڈ نکالیں گے ہم اسے۔" شرافت علی بولا "البتہ اپنی ماں جی کے بارے میں سوچو وہ اگر یہاں ہمارے ساتھ ہوتیں تو ان تک کسی کا بُرا خیال بھی نہیں پہنچنے دیتے ہم لیکن وہاں لاہور میں اتنی جلدی کیا ہو سکتا ہے؟ تمھارا کوئی ایسا خفیہ ٹھکانا نہیں ہے وہاں، جہاں ماں جی کو پہنچا دیا جائے عارضی طور پر!"

"لاہور یا اس کے قرب و جوار میں جہاں جہاں انھیں پناہ مل سکتی تھی وہ سب برباد ہو چکے ہیں، وہاں تو اب کوئی بھی محفوظ جگہ نہیں رہی ہے۔" میں نے کہا۔

فیروز بولا "تو پھر تم یہاں کراچی کیوں نہیں بلا لیتے ہو انھیں؟ یہاں ہم کوئی تکلیف انھیں نہیں ہونے دیں گے۔"

شرافت علی بولا "ہاں یار، یہ تو بالکل ٹھیک کہا ہے انھوں نے۔ آج رات یا کل صبح کی پہلی فلائٹ سے بلا لو۔"

ان دونوں نے مناسب ترین مشورہ دیا تھا مجھے۔ ماں جی اگر یہاں کراچی میں آ جاتیں میرے پاس تو آزنک کے لیے ان تک پہنچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا۔ یہاں وہ لاہور سے زیادہ محفوظ ہو جاتیں لیکن پتا نہیں اس کے لیے وہ راضی بھی ہوتیں یا نہیں اور پھر ہوائی جہاز کا سفر اُن کے لیے ایک بالکل ہی نیا تجربہ ہوگا۔ شاید وہ اس طرح آنا پسند نہ کریں۔ میں نے کہا "تجویز تو بہت اچھی ہے تم لوگوں کی لیکن میرا خیال ہے شاید ماں جی اس کے لیے تیار نہ ہوں۔ انھوں نے کبھی جہاز میں سفر کیا نہیں ہے۔"

"اگر جہاز میں آنے کو تیار نہ ہوں وہ تو ٹرین میں بلا لو یار، انہیں۔ مقصد تو ہمارا اُنھیں جلد از جلد اس جگہ سے ہٹانا ہے۔"

"اچھا، پھر میں فون کر کے کہتا ہوں ان سے یہاں آنے کے لیے۔" میں نے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اُدھر لاہور میں اس وقت تک تو لوگ اپنی آدھی نیند لے چکے ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں نیند سے بیدار ہونا پڑے کسی کو تو بڑا ہی چڑچڑا لگنے لگتا ہے وہ۔ کوئی ساتویں یا آٹھویں گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھایا تھا دوسری طرف سے اور نیند میں ڈوبی ہوئی نہایت ہی جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولا "کوئی وخت ویلا تو دیکھا کر دیا را۔ ہُن دَسو کی گل اے؟"

میں نے سختی سے کہا "اوئے ہوش میں آ جا حیدر کی دم سالے! کیا گولی کھا کر سویا تھا؟"

وہ حیدر ہی تھا۔ میری آواز سنتے ہی اس کی نیند اُڑ گئی تھی، وہ جلدی سے بولا "اوہ جناب، یہ آپ ہیں سرکار! میں سمجھا کوئی رانگ نمبر والا ہے۔ حکم کرو جناب، فرماؤ کیسے تکلیف کی ہے رات کے اس ویلے آپ نے؟"

"بک نئیں اوئے، زیادہ تابعداری نہیں دکھا۔ وہ ماں جی کیا سو رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں جناب، وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ اب میں کیا بتا سکتا ہوں کہ وہ کیا کر رہی ہیں اپنے کمرے میں۔ یوں اندازہ تو آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ گیارہ بجے رات کو اپنے کمرے میں بندہ سوتا ہی ہوگا اور کیا کرے گا۔" وہ بولا

"اچھا اچھا، تیری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے ابھی میرے پاس۔ جلدی سے جا کر ماں جی کو جگا کے فون اُنھیں دے دے۔"

"بہت اچھا جناب، کیا کوئی بہت ہی ضروری بات ہے! میرا مطلب ہے اُن کی نیند...."

میں نے اُس کی بات کاٹ کر ڈانٹتے ہوئے کہا "اوئے تو بکواس بند نہیں کرے گا اپنی۔ میں جو کہہ رہا ہوں تجھ سے، جا کے ماں جی کو اٹھا دے۔ ان سے کہہ جیلانی نے فون کیا ہے کراچی سے، بے حد ضروری بات کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے جناب! میں ابھی جا کر اٹھاتا ہوں اُنھیں، آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے شاید ریسیور نیچے رکھ دیا تھا۔ میں نے بالی کی آواز سنی۔ وہ پوچھ رہی تھی "کون تھا....؟"

پھر دور سے حیدر کی آواز آئی "چپ کر کے سو جا، زیادہ نہ کر۔" وہ میرا غصہ اس غریب پر اُتارنے لگا تھا۔

کوئی ایک منٹ کے بعد میرے کانوں نے ماں جی کی ممتا بھری آواز سنی "ہاں پتر جیلانی، ٹھیک تو ہے نا بیٹے تو؟"

میں نے سلام کر کے کہا "ہاں ماں جی! بڑا کرم ہے سوہنے رب کا۔ آپ کو سوتے سے اٹھایا، اُس کی معافی چاہتا ہوں!"

"نہ پتر نہ، ایسی بات نہ کر، یہ کوئی جرم تو نہیں کیا نا تُو نے، پھر معافی کس بات کی؟" ماں جی محبت بھری آواز میں بولیں۔

"وہ ماں جی! ایک چھوٹی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں میں آپ کو۔ میری ایک بات مان لیں گی نا آپ؟" میں نے کہا۔

"یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے جیلانی پتر آج؟ کیوں نہیں مانوں گی تیری کوئی بات میں، ایک کیا سو باتیں منوا لے تو۔" وہ بولیں۔

"اچھا تو پھر یوں کریں، میں ابھی انتظام کر دیتا ہوں سارا، آپ ائیرپورٹ سے پتا کروائیں، لاہور سے پی آئی اے کا پہلا جہاز کراچی کب جا رہا ہے۔ میں اسی جہاز میں آپ کے لیے ایک سیٹ کا بندوبست کر دیتا ہوں، آپ فوراً کراچی آ جائیں اسی جہاز سے۔"

"میں کراچی آ جاؤں ابھی؟" ان کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "مگر کیوں؟ تو مجھے وہاں کیوں بلا رہا ہے؟"

"بس ماں جی! میرا جی چاہ رہا ہے کہ آپ یہاں میرے ساتھ رہیں۔ آپ کو دیکھنے کو بڑا جی کرتا ہے۔ میں تو یہاں ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا نکل بھی سکوں گا یہاں سے یا نہیں؟ اس لیے میں چاہتا ہوں آپ ہی میرے پاس آ جائیں۔"

"اور یہ بات کہنے کے لیے تو نے مجھے اتنی رات کو فون کیا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ فوراً آ جاؤں میں تیرے پاس۔ نہیں بیٹا! یہ بات سچ نہیں لگتی مجھے، ضرور تو اصل بات چھپا رہا ہے مجھ سے۔ سچ سچ بتا بات کیا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری پتر؟"

یہ ماں کا رشتہ بھی کیسا عجیب رشتہ ہے۔ اپنی اولاد کی سلامتی کے سوا کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں ہے اُسے۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس سے اصل بات چھپا رہا ہوں مگر یہ جاننے کے بعد کوئی اور بات نہیں سوجھی اُسے، فوری طور پر اس کے دل نے یہی سمجھایا تھا اُسے کہ شاید میں خیریت سے نہیں ہوں، اسی لیے ماں جی کو اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں میں۔

میں نے کہا "میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہے، یقین کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری آواز سے اندازہ نہیں ہو رہا ہے آپ کو؟ پریشان نہ ہوں آپ میری طرف سے بس فوراً چلی آئیں یہاں، آ کر خود دیکھ لینا میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اچھا، اگر تو کہتا ہے تو میں مان لیتی ہوں، آ جاؤں گی میں کراچی لیکن ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھوں گی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، البتہ ریل سے آ جاؤں گی۔ صبح حیدر کو بھیج کر سیٹ بک کرا لوں گی، کل ٹیلی فون کر کے پتا کر لینا کون سی گاڑی کی اور کب کی ٹکٹیں ملی ہیں۔ یا مجھے اپنا فون نمبر بتا دو، میں خود فون کر کے بتا دوں گی تمہیں۔"

"لیکن ریل سے تو کئی دن کا چکر ہو جائے گا، چلو ٹھیک ہے یونہی سہی۔ جس طرح آپ کو آسانی ہو ویسے ہی کر لیں۔ فون نمبر آپ لکھ لیں میرا۔" میں نے اُنھیں فیروز کا ہی ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا۔

وہ بولیں "اچھا ٹھیک ہے پتر! میں کل شام میں فون کر کے بتا دوں گی تجھے اور وہ آسیہ کا بھی کچھ پتا چلا؟ وہ اُدھر ہی ہے۔ ابھی تک شکارپور میں؟ اِدھر نہیں آئے گی وہ؟" ان کے لہجے میں ایک دم دُکھ سما گئے تھے۔

"وہ اِدھر کراچی آ گئی ہے ماں جی! انشا اللہ آپ کو یہاں ضرور مل جائے گی وہ۔" میں نے انھیں بتایا۔

"تو کیا وہ کراچی میں بھی تیرے ساتھ نہیں ہے؟ کہیں الگ رہ رہی ہے تجھ سے؟"

انھوں نے میری بات سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ آسیہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ کتنی حساس تھیں اپنی بیٹی کے بارے میں۔ میں نے جواب دیا "ہاں ماں جی! بات کچھ یوں ہی ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھ سے کتراتی پھرتی ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا مجھے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، آپ آ جائیں گی تو میں اُسے پکڑ کر آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔ اب فون ذرا حیدر کو دے دیں آپ۔"

"اچھا ٹھیک ہے بیٹا! لے تو حیدر سے بات کر، میں کل بات کروں گی اب تجھ سے۔" انھوں نے یہ کہہ کر ریسیور حیدر کو پکڑا دیا۔

حیدر نے ریسیور لے کر پوچھا تھا "جی جناب! اب کیا حکم ہے میرے لیے؟"

میں نے اس سے کہا "دیکھ بھئی حیدر! کل ماں جی سے پیسے لے کر اسٹیشن جانا اور کراچی آنے کے لیے کل ہی کی کسی گاڑی میں ماں جی کے لیے سیٹ حاصل کر لینا۔ پیسوں کی فکر نہ کرنا، اگر کچھ پیسے اوپر سے بھی دینا پڑیں تو دے دینا مگر سیٹ کل ہی لینے کی کوشش کرنا اور دیکھ ائیر کنڈیشنڈ یا سلیپر میں کوشش کرنا۔ ماں جی کو سفر کے دوران تکلیف نہیں ہونا چاہیے ذرا بھی، تجھے بھی ان کے ساتھ آنا ہے۔ راستے میں اُن کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔"

"کیا... کیا... میں بھی آؤں گا کراچی، ماں جی کے ساتھ۔ یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی ہے آپ نے جناب۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"ہاں، تو بھی آئے گا ماں جی کے ساتھ، نہیں تو وہ اتنا لمبا سفر کیا اکیلے کریں گی؟ اُنھیں یہاں پہنچا کر واپس چلے جانا تو۔"

"جی اچھا، تو پھر ماں جی کے ساتھ میں اکیلا ہی آؤں گا، وہ بالی نہیں آئے گی میرے ساتھ؟" اس نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

"اسے کیوں لانا چاہتا ہے تو اپنے ساتھ۔ اوئے حیدر کے بچے، بندے دا پتر بن۔ لگتا ہے تو کمبل ہی بننے لگا ہے اب، چار چھ دن کے لیے بالی کو نہیں چھوڑ سکتا، اس کے بغیر رہ نہیں سکتا

سلسلے، رانجھا بن گیا ہے کیا؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"وہ جی آپ تو بس یوں ہی گرمی دکھانے لگے ہیں صاحب دیکھیں نا، کچھ سوچا بھی تو کریں۔ ایک تو وہ ماں جی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ان دنوں میں وہ ان کی عادتوں کو خوب اچھی طرح پہچان گئی ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ ماں جی کو کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں جی کو بھی عادت پڑ گئی ہے جی اس کی، بڑی خدمت کرتی ہے وہ اُن کی۔ اس کے علاوہ یہاں کبری بھی ہے اور آپ کو تو پتا ہے اس کا۔"

"تو یہ بات ہے، کبری کی طرف سے خدشہ ہے تجھے اور ماں جی کو خواہ مخواہ ہی گھسیٹ لیا ہے تو نے" میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"نہیں جناب، آپ خواہ مخواہ نہ کہیں اسے، یقین نہ ہو تو خود پوچھ لیں ماں جی سے، بلکہ پوچھ ہی لیں آپ ان سے بلاؤں بھیجا اُنھیں؟"

"نہیں، ابھی نہیں، آرام کرنے دے اُنھیں، میں کل جب اُن سے بات کروں گا تو پوچھ لوں گا۔ صبح ٹکٹیں کرانے جانے لگے تو ان سے پوچھ لینا تو بھی، اگر وہ بالی کو ساتھ لانا چاہیں تو پھر اس کا بھی ٹکٹ لے لینا، بس رکھ دے فون کو، کل بات کروں گا اب میں۔"

"یہ بہت اچھا ہو گیا، ماں جی کا ایسے موقع پہ ہمارے ساتھ ہی رہنا مناسب ہے۔" شرافت علی نے میرے فون رکھتے ہی کہا۔

"اس اعتبار سے تو بہت اچھا ہوا ہے مگر ایک طرح سے یہ بُرا بھی بہت ہی ہوا ہے شرافت علی۔" میں نے اُس کی بات سُن کر کہا۔

"کیوں، یہ کیوں کہا تم نے؟ بُرائی کیا نظر آئی ہے تمھیں اس میں۔" شرافت علی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے نہیں ہو، میں جب بھی اُن سے ٹیلی فون پر بات کرتا ہوں، وہ آسیہ کے بارے ضرور استفسار کرتی ہیں۔ یہاں آنے کے بعد تو وہ اس وقت تک مجھے چین نہیں لینے دیں گی جب تک آسیہ اُن کے پاس نہیں پہنچ جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"یار! ابھی سے اس غم میں کیوں گھلنے لگے ہو، آنے تو دو انہیں، کر لیں گے اس سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ۔" فیروز بولا۔

شرافت علی نے کہا "ایک بہترین تجویز ہے اس سلسلے میں۔ یہاں آتے ہی میں اُن کا پاسپورٹ وغیرہ بنوا دوں گا تم انہیں عمرہ کرنے بھیج دو یار جیلانی! جب تک وہ واپس آئیں گی وہاں سے، مجھے اُمید ہے یہاں حالات معمول پر آ چکے ہوں گے۔ شاید آسیہ بھی مل جائے ہے تب تک۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" فیروز جلدی سے بولا۔ "بہترین تجویز ہے یہ، ایسا ہی کرو یار، دیر بالکل نہیں کرنا چاہیے اس کام میں۔"

"ہاں، شرافت علی، واقعی بہت اچھی بات سوچی ہے، اب میں اُنھیں بلانے کا ایک معقول جواز بھی پیش کر سکوں گا ان کے سامنے۔" میں نے کہا۔

وہ رات میں نے جیسے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزاری تھی۔ یہ خیال میرے سینے پہ بار بار نشتر چلا رہا تھا کہ فردوسی بیگم غریب محض میری محبت میں ماری جا رہی تھی۔ آزک نے مجھے اذیت دینے کی خاطر اس خلوص و وفا کی نیدی کو ایک اور امتحان میں ڈال دیا تھا۔ پتا نہیں وہ اُس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہوں گے۔ ان یہودی شیطانوں سے کسی رعایت یا مروت کی تو توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ انھوں نے ذرا سی شائستگی بھی برتی ہوگی اس کے ساتھ۔ بس یہ ایک خیال دل کو ڈھارس دیتا تھا کہ وہاں لزی موجود ہے۔ ممکن ہے اس نے انہیں کوئی زیادتی نہ کرنے دی ہو اس کے ساتھ۔ ساری رات طرح طرح کے وسوسے اور واہمے مجھے ڈراتے رہے۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو ایسے ایسے ہولناک مناظر ذہن کے اسکرین پر اُبھرنے لگتے تھے کہ دل کانپ اٹھتا تھا اور میں گھبرا کے آنکھیں کھول دیتا تھا۔ کبھی ذرا سی آنکھ لگتی تھی تو سینے میں سانپ پھن پھنس آتے تھے اور میری آنکھ کھلتی تھی تو خود کو پسینے میں شرابور پاتا تھا۔ مسجد سے موذن نے جب اللہ کی بڑائی کا اعلان کرتے ہوئے یہ مژدہ سنایا کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔ آؤ نماز کی طرف، تو میں نے بے اختیار بستر چھوڑ دیا وضو کر کے مصلا بچھایا اور اپنے رب کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد میں نے خود کو اس کے حضور کھڑا کیا تھا، اتنا طویل عرصہ میں نے گمراہی میں گزار دیا تھا اور اس تمام عرصے میں مجھے ایک دن بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس ربِ کائنات نے ہی مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے نیک و بد کا شعور دے کر اور ایک دن مجھے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے اور اس زمین پہ کیے ہوئے اپنے ایک ایک عمل کا حساب اس کے سامنے پیش کرنا ہے لیکن میری جھولی میں تو کچھ بھی نہیں تھا اسے پیش کرنے کے لیے۔ میں نے زندگی کا اتنا طویل سفر طے کر لیا تھا اور میرے اعمال نامے میں نیکیوں والے صفحات ابھی تک سادہ ہی پڑے تھے، جب کہ بدی والا حصہ پورا کا پورا بھر چکا تھا، اتنا کہ اب اس میں مزید کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ میں تو اب تک خسارے میں رہی ہوں، وقت میرے ہاتھوں سے کھسکتا ہی چلا گیا اور میں نے ذرا بھی نہیں سوچا اس کے بارے میں۔ چنانچہ اس روز میں نے نہ جانے کتنے عرصے کے بعد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اس ربِ کریم کی بارگاہ میں پیش ہو کے رکوع و سجود کے دوران

اس کی عظمت اور بلندی کا اعتراف کیا اور اس سے مدد چاہی۔

نماز سے فارغ ہوا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے کاندھوں پر کوئی بھاری بوجھ تھا جو اب اتر گیا ہے، میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی تھی اس صبح۔

ایک گھنٹے کے بعد میں ابھی آبی کے پاس جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ باہر کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ ایک ہیوی ٹرک جس کے پیچھے بڑا سا ٹرالر لگا ہوا تھا، گیٹ کے ساتھ کھڑا تھا اور دو آدمی ٹرالر کے پیچھے کھڑے اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عین اُسی وقت میں نے شرافت علی کی کار کو آتے دیکھا۔ وہ ٹرالر کے قریب آ کر رک گئی اور ڈرائیونگ نشست سے سر باہر نکال کر شرافت علی نے ان دونوں اشخاص سے کچھ کہا جو ٹرالر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے، ان دونوں نے بیک وقت گردن موڑ کر شرافت علی کی طرف دیکھا پھر ان میں سے ایک دوسری طرف سے گھوم کر ٹرک ڈرائیور کے پاس چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے ٹرک حرکت میں آ گیا اور رینگتا ہوا گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرک کے ہٹتے ہی شرافت علی کی کار گیٹ میں داخل ہو گئی۔ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

ایک منٹ کے بعد شرافت علی اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ فردوسی بیگم کو دیکھ کر میں ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شرافت علی میری طرف بڑھتے ہوئے مسکرا کر بولا "لو بھئی جیلانی! یہ آ گئی ہیں تمھاری فردوسی بیگم۔ دیکھ لو بالکل صحیح سلامت ہیں نا۔"

میں نے فردوسی بیگم کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔ وہ بے حد مضمحل اور مغموم دکھائی دے رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا ٹھہرا اور اس کی جھلملاتی، ڈبڈباتی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تم ٹھیک تو ہو نا فردوسی!"

اس نے ایک لمحے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی، گلا رندھ گیا اور ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی، آنکھیں ایک دم برس پڑیں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا لیکن اس کا پورا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور سسکیاں دم بہ دم تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

میں نے اُسے اس طرح روتے دیکھا تو میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے شرارے سے رقص کرتے دکھائی دینے لگے۔ میں نے شرافت علی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے شرافت علی؟ کیا ان کتوں نے اس کی . . ."

"نہیں نہیں، اس طرح نہ سوچیں . . . آپ . . . جیلانی! ایسی کوئی . . . بات نہیں ہے۔" فردوسی بیگم میری بات کاٹ کر بول اُٹھی۔

شرافت علی بھی حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ وہ بولا۔ "بی بی! کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے آپ کے ساتھ، تو آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

وہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی "مجھے افسوس ہے میں اپنے جذبات پہ . . . قابو نہ رکھ سکی۔ دراصل میری زندگی . . . میں یہ پہلا موقع ہے . . . جب میں نے . . . کسی کو اپنے لیے بے چین دیکھا ہے . . ."

"اوہ، تو کیا تمھارا خیال تھا اس دنیا میں تمھاری فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے؟ کسی کے دل میں تمھارے لیے اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ وہ تمھاری پریشانیوں اور دُکھوں میں ہمدردی کا اظہار بھی نہ کر سکے تم سے؟" میں نے کہا۔

وہ اس دوران اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی، بولی "یہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ آج سے پہلے میرے ساتھ کبھی ایسا ہوا نہیں تھا۔ اب تک تو میں ہی لوگوں کے لیے ہلکان ہوتی رہی ہوں، میں سمجھتی تھی شاید میرے مقدر میں یہی لکھا ہے۔"

"مگر تم نے میرے بارے میں ایسا کیسے سوچ لیا تھا؟ تم جانتی نہیں ہو جو لوگ میرے لیے تکلیف اٹھاتے ہیں میں انہیں زمانے کے رحم و کرم پر اکیلا نہیں چھوڑتا ہوں۔ ایسا کمینہ کم ظرف کیوں سمجھ لیا تھا تم نے مجھے فردوسی بیگم؟ کیا میں ایسا ہی لگتا ہوں تمھیں؟"

"نہیں نہیں، آپ کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا میں نے، آپ کسی بدگمانی کو جگہ نہ دیں اپنے دل میں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تمھارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی نہ ان لوگوں نے، کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی تمھیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس کے سوا کوئی تکلیف نہیں دی انھوں نے مجھے کہ رات بھر ایک تاریک کوٹھری میں بند رکھا تھا۔" وہ بولی۔ "ویسے ان کے درمیان ایک بے حد حسین لڑکی ہے، یورپین ہے شاید، وہ لوگ اسے میڈم کہہ رہے تھے، اس سے میں نے جانا کہ اُسے کوئی بڑا اور اہم مقام حاصل ہے ان کے درمیان۔ وہ لڑکی دل کی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے کسی کو میرے قریب تک نہیں آنے دیا تھا اور سختی سے کہہ دیا تھا سب سے کہ میرے ساتھ کوئی گڑبڑ کی کسی نے تو اسے گولی مار دے گی وہ۔"

"اس کا مطلب ہے اس نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا مگر

"یہ تمہیں سوجھی کیا تھی۔ تم باہر نکلی ہی کیوں تھیں آخر یہاں سے؟"

وہ مسکرا کر آگے بڑھی اور ایک صوفے میں دھنس کر بولی "میرے ساتھ یہ سب کچھ تو ہونا تھا، مقدر کا لکھا میں کیسے مٹا دیتی؟"

"عجیب عورت ہو، غلطی خود کرتی ہو اور دوش دیتی ہو مقدر کو، ایسی باتیں مقدر میں نہیں لکھی ہوتیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"خیر چھوڑیں، نہ ہوتی ہوں گی، یہ بتائیں وہ آبی بھائی کا کیا حال ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے موضوع بدل کر کہا۔

"ٹھیک ہے وہ، ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا ہے تمہارے بارے میں۔ تم بھی نہیں بتانا، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ وہ آپے سے باہر ہو کر انتقام لینے نہ نکل کھڑا ہو۔ ایسے معاملات میں بہت جذباتی ہو جاتا ہے وہ اور کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ تمہیں کیوں کہ بہن کہتا ہے وہ، اس لیے اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس حالت میں اسے اشتعال دلانے والی کوئی بات نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے زخم میں تکلیف بڑھ سکتی ہے اور مکمل طور پر صحت یاب ہوئے بغیر ان کا سامنا کرنا خودکشی کے برابر ہوگا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ نہیں کہوں گی ان سے۔ آیئے چلیں ادھر، ان کے پاس ہی چلتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

شرافت علی بولا "آپ جائیں بی بی! اُدھر جا کر ناشتا بھی تیار کریں ہم لوگوں کے لیے، ہم آ رہے ہیں فیروز کو ساتھ لے کر۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے روک کر کچھ بات کرنا چاہتا ہے مجھ سے۔ لہٰذا میں نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں، تم جاؤ، ہم آ رہے ہیں ابھی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں جا کر ناشتا بناتی ہوں آپ لوگ زیادہ دیر نہ لگائیں۔" وہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد شرافت علی بولا "وہ یار! دو آدمی مع ان کی اس گاڑی کے جس میں وہ فردوسی بیگم کو لیے پھر رہے تھے، ہم باندھ کر اپنے ساتھ ہی لے آئے ہیں۔ فیروز کو اٹھا کر پوچھو، یہاں کوئی جگہ ہے انہیں رکھنے کے لیے یا میں ہی کچھ کروں ان کا انتظام بھی؟"

میں نے کہا "تم بھی کمال کرتے ہو یار شرافت علی! انہیں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ سالوں کا جھٹکا کر کے ڈال آتے کہیں بھی۔"

"ہم نے انہیں گرومندر کے چوراہے پر پکڑا تھا۔ لمحوں میں بھیڑ لگ گئی تھی وہاں، ٹریفک بھی جام ہو گیا تھا۔ ہم نے لوگوں کے سامنے خود کو پولیس کے محکمے کا ظاہر کر کے انہیں مجرم بتایا تھا۔ پھر جب ان کی گاڑی سے فردوسی بیگم کو برآمد کیا گیا تو کسی کو ہمارے بیان پر شبہ نہیں ہو سکا تھا چنانچہ انہوں نے ان کی گاڑی کو ہمارے ٹریلر میں چڑھانے میں مدد بھی کی ہماری۔ اب اتنے بڑے مجمع میں ہم انہیں مار کس طرح سکتے تھے؟ یہی مناسب سمجھا کہ پہلے فردوسی بیگم کو یہاں پہنچا دیں اس کے بعد کچھ کریں گے ان کے سلسلے میں۔"

"اوہ، تو وہ ٹریلر جو باہر کھڑا تھا تمہارا ہی تھا مگر اتنا بکھیڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کی اپنی گاڑی میں ڈال کر بھی لایا جا سکتا تھا انہیں؟"

"یہ بہت ضروری تھا، تم یہ بھول جاتے ہو کہ ہمارا مقابلہ کسی چھوٹے موٹے گروہ سے نہیں ہے۔ یہ بڑے منظم اور بہت لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں، پتا نہیں کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں وہ، اگر ان میں سے کسی کی نظر پڑ جاتی اس گاڑی پر تو وہ مشکوک ہو جاتا اور پھر اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک چلا آتا چنانچہ اس کو ان کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے لیے یہ بے حد ضروری تھا۔ یہ بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھی کہ ہمیں ان کے خلاف کارروائی کسی بھی مصروف شاہراہ پر ہی کرنا ہوگی، جہاں پبلک سے واسطہ پڑے گا، سب کچھ سوچ سمجھ کر ہی منصوبہ بنایا تھا ہم نے۔" شرافت علی نے مجھے تفصیل بتائی۔

"ٹھیک ہے یار! ان دونوں کو یہیں کسی کمرے میں بند کر دیتے ہیں اور گاڑی ان کی گیراج میں کھڑی کروا دو۔ رات میں کسی وقت ان سب سے پیچھا چھڑا لیں گے۔ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ تو نہیں جو فیروز کے بغیر حل ہی نہ ہو سکے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کون سا مسئلہ ہے۔ کس مسئلے کی بات کر رہے ہیں آپ یہ صبح ہی صبح؟" فیروز کمرے میں قدم دھرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے دیکھ کر خوش دلی سے کہا "چلو اچھا ہوا تم اٹھ گئے، جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ، وہ فردوسی بیگم ناشتا تیار کرنے چلی گئی ہے ہمارے لیے۔" پھر میں نے اسے فردوسی بیگم کی بازیابی اور دیگر معاملات کی تفصیل بھی بتا دی۔

وہ خوش ہو کر بولا "یہ تو آپ نے کمال ہی کر دیا بھائی شرافت علی! کیا صبح ہوتے ہی نکل پڑے تھے اس مہم پر؟"

"ہاں، اذان کے وقت ہی ہم نے گرومندر پر مورچا لگا لیا تھا۔ کیوں کہ میرا اندازہ تھا کہ وہ لوگ جمشید روڈ سے نمائش تک کے علاقے پر زیادہ توجہ دیں گے اور صبح کے وقت اسی علاقے میں گھومتے رہیں گے۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔" شرافت علی نے بتایا۔

"اندازے تو تمہارے ہمیشہ ہی درست ثابت ہوتے ہیں، یہ بات بڑے تجربات سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے کسی میں۔" فیروز بولا۔

پھر وہ باتھ روم کی طرف چلا گیا اور شرافت علی باہر چلا گیا، ان دونوں قیدیوں اور ان کی گاڑیوں کا بندوبست کرنے۔

ناشتے کے دوران فردوسی بیگم نے بتایا کہ اس کے پڑوس میں رہنے والی گلزار خانم کی ماں کو قتل کر دیا ہے ان لوگوں نے جنہیں لوگوں نے گلزار کے ساتھ اس کے فلیٹ میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے ان دونوں کا وہاں آنا پسند نہیں تھا کیوں کہ وہ صورت سے ہی غنڈے لگتے تھے۔ جس روز وہ قتل ہوئی ہے اس دن اس نے ان دونوں کو بہت برا بھلا کہا تھا اور اپنے گھر سے نکالنے کی کوشش کی تھی جس پر مشتعل ہو کر ان

میں سے ایک شخص نے ریوالور نکال کر اسے گولی مار دی۔ قاتل یا اس کا ساتھی تو پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا مگر پولیس گلزار کو پکڑ کے لے گئی تھی لیکن چند گھنٹے کے بعد ہی انہوں نے اسے دوبارہ گھر پہنچا دیا۔ اس دن کے بعد سے ان غنڈوں میں سے کسی کو اس کے فلیٹ پر نہیں دیکھا گیا۔"

آبی نے یہ سن کر جلدی سے کہا "ارے تو وہ گل و گلزار خانم اکیلی ہی رہ گئی ہے اب؟"

میں نے ہنس کر کہا "بیٹے! اکیلا جان کر کبھی اس کے پاس جا نہ پہنچنا ورنہ تیرا تو نقش پا بھی نہیں مل سکے گا ہمیں۔"

"ویک نہیں اوئے جیلانی! جانتا نہیں ہے تو مجھے، اس سارے گلستان کو یوں اٹھا کے لے آؤں گا کہ وہ اسرائیل زادے اس کے نقش پا ڈھونڈتے ڈھونڈتے جہنم واصل ہو جائیں گے۔ اس رات کی رانی، چمپا چنبیلی کی خوش بو تک نہیں پہنچنے دوں گا میں ان تک۔" آبی بولا۔

میں نے کہا "ایسا کر بھی مت بیٹھنا کبھی کم از کم اس مکان میں تو اس کے لیے جگہ نہیں مل سکے گی تجھے اور کوئی ٹھکانا ہے نہیں تیرے پاس۔"

"کیوں، اس مکان میں کیا تو روکے گا اسے آنے سے۔ اتنا بڑا مکان ہے، کوئی چھوٹا کمرا اس کے نام الاٹ ہو جائے گا تو کیا جائے گا تیرا؟"

"میرا تو کچھ نہیں جائے گا پیارے! جو کچھ جائے گا تیرا ہی جائے گا۔ کیوں کہ تو ماں جی کو مطمئن نہیں کر سکے گا اس کے بارے میں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ماں جی کو کہاں سے گھسیٹ لایا بھئی بیچ اس معاملے کے۔ انہیں کیا پتا ہمارے ساتھ کون کون قیام پذیر ہے یہاں؟" آبی بولا۔

"کیوں؟ جب وہ یہاں ہوں گی تو کون سی بات چھپی رہے گی ان سے، وہ دیکھ نہیں سکیں گی اسے کیا؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا... کیا... کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا ماں جی یہاں آ گئی ہیں؟ کہاں ہیں وہ، تو نے مجھے ملایا کیوں نہیں اب تک ان سے؟"

"ابھی نہیں وہ یہاں، دو چار دن میں پہنچنے والی ہیں۔ شام کو فون کروں گا میں انہیں تو پتا چلے گا کب کی سیٹ ملی ہے انہیں۔"

"اوئے یہ تجھے سوجھی کیا ہے بھئی، انہیں کیوں بلا رہا ہے یہاں؟ وہ تو باندھ کے رکھ دیں گی ہم سب کو اور پھر یہ تیری جنت بیگم... اس کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے تو نے... یہ کہاں رہے گی ان کے آنے کے بعد؟"

"اس کی تو فکر نہ کر، وہ میری ماں جی ہیں، تجھ سے زیادہ جانتی ہیں مجھے وہ۔ یوں بھی یہ تیری بہن ہے۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"اوئے تیرا بیڑا غرق ہو جائے۔ تو دھوکا دے گا ماں جی کو؟ یہ بتلائے گا انہیں کہ یہ بہن ہے میری؟ میں صاف انکار کر دوں گا۔ تو دیکھ لینا بیٹے! صاف صاف بتا دوں گا انہیں کہ ماں جی! یہ جھوٹ بولتا ہے، اصل میں تو یہ تیری ہونے والی لوٹن ہے۔"

اس نے یہ بات گو مذاق میں کہی تھی لیکن فردوسی بیگم کے دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے تھے اس کی بات سن کر، نظریں اس کی آپ ہی آپ جھک گئی تھیں، ہونٹ لرزنے لگے تھے اور رخساروں پر شعلے رقص کرتے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں نے آبی کو ایسے سخت مذاق پر تنبیہ کرنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن فردوسی بیگم کی کیفیت دیکھ کر آبی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا مجھے۔ وہ نہ جانے کب سے ایسی ہی کسی بات کو سننے کی منتظر بیٹھی تھی، حالانکہ میں نے کبھی اپنے کسی عمل سے بھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ میری طرف سے کوئی امید باندھ لے مگر دل پر کسے قابو ہوتا ہے، اس کے دل نے اسے سپنے دکھانا شروع کر دیے تھے اور وہ پتا نہیں کتنی دور نکل گئی سپنوں کی حسین وادیوں میں کہاں کہاں گھومتی پھری تھی۔ میں اگر اس گھڑی آبی کو سرزنش کرتا تو اس کے یہ حسین سپنے بکھر جاتے، اس کے چہرے پر جو شادمانی دوڑ گئی تھی جو گل ہائے رنگ رنگ اس کے سینے میں کھل اٹھے تھے، میں ان کے مرجھانے کے خوف سے اس گھڑی کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ آبی نادانستگی میں کیا کر بیٹھا تھا اس کا اسے احساس تک نہیں تھا۔ وہ شاید یہی سمجھ رہا تھا کہ مسند آرا کی طرف سے ناامید ہو کر میں نے فردوسی کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا لیا ہے۔

فیروز اور شرافت علی سے بھی فردوسی بیگم کی یہ شادمانی چھپی نہیں رہی تھی۔ ان دونوں نے اس کے گلنار چہرے سے نگاہیں ہٹا کر مجھے دیکھا تھا اور میری طرف سے تردید نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے بھی میری خاموشی کو رضامندی ہی جانا تھا، اور وہ کچھ بولے بغیر معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئے تھے۔

اس کے بعد ہم میں سے کسی نے بھی کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی اور آبی نے بھی شاید ماحول کے اس سکوت کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم وہاں سے اٹھ آئے اور سر جوڑ کر آئندہ کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

تین بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے شاید جب ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہمیں چونکایا۔ فیروز نے اٹھ کر فون ریسیو کیا، پھر مجھ سے بولا "جیلانی! تمہارا فون ہے، کوئی خاتون بول رہی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مسکرا کے ایک آنکھ دبائی۔

میں نے اس کی اس حرکت سے فوراً اندازہ کر لیا کہ فون کرنے والی لڑکی ہی ہے۔ میں نے ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا، یقیناً اس نے اس وقت مجھے فردوسی بیگم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے فون ہے۔ میں نے فیروز کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا "ہیلو، میں بول رہا ہوں، کہو؟"

میرا اندازہ اس حد تک صحیح تھا کہ فون کرنے والی لڑکی ہے لیکن یہ اندازہ غلط ہو گیا کہ وہ فردوسی بیگم کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا "جناب عالی! جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنی ماں جی کو اپنے مکان سے کہیں اور منتقل کرنے کا بندوبست کر دیں۔ آنرک

نے لاہور میں تنظیم کے سربراہ کو حکم دے دیا ہے کہ آج رات آپ کے مکان کو آگ لگا کر آپ کی ماں جی کو وہاں سے اُٹھوا کر کراچی بھیج دیا جائے۔"

"کیا... کیا کہہ رہی ہو تم... کہیں دھوکا تو نہیں ہوا ہے تمہیں؟" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"دھوکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میرے سامنے فون کیا ہے اس نے لاہور ابھی پندرہ منٹ پہلے۔ وہ فردوسی بیگم کے، ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سے پاگل سا ہو رہا ہے۔"

میرے تو جیسے ہوش گم ہو کر رہ گئے تھے، آسمان اپنے سر پر گرتا ہوا سا محسوس ہونے لگا تھا اور زمین پیروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ تو میں جان چکا تھا کہ وہ ذلیل ابلیس زادہ ماں جی پر ہاتھ ڈال کر مجھے بے بس اور مجبور بنا دینے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا، بُرے سے بُرے کام اور دنیا کی بدترین ذلالت کی توقع کی جا سکتی تھی اس سے، یوں بھی مشہور ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے لیکن آئزک جس قوم سے تعلق رکھتا تھا وہ اللہ کی طرف سے معتوب کی گئی تھی، اخلاق اور تہذیب سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، وہ لوگ ایک چھوٹے سے فائدے کے لیے انتہائی پستی میں جا سکتے تھے۔ انسانیت سے وہ اپنا ہر رشتہ منقطع کر چکے تھے اور اپنے آپ کو تمام انسانوں میں افضل اور سب سے الگ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے لومڑی اور بھیڑیے کی خُو اپنا لی تھی۔ وہ تو جسمانی ساخت میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے پر قادر نہیں تھے ورنہ اپنی شکل و صورت بھی دوسرے انسانوں سے الگ کر لیتے۔ وہ ایک ایسی قوم تھی جو بوڑھوں اور بچّوں کے لیے بھی اپنے دل میں ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں رکھتی تھی چنانچہ آئزک سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ماں جی کی بزرگی کا خیال کر کے ان کے ساتھ ہمدردانہ رویّہ رکھے گا یا کسی طرح کی رعایت یا نرمی برتے گا ان سے۔

مجھے یوں گم صُم ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑا دیکھ کر شرافت علی اور فیروز تقریباً ایک ساتھ ہی بول اٹھے "کیوں بھائی جیلانی! خیر تو ہے نا؟ کیا کہہ رہی تھی وہ؟ کیا کوئی بہت ہی الم ناک اطلاع دی ہے اس نے اس وقت؟ کچھ بتاؤ تو یار! بولو تو کچھ؟"

میں نے ریسیور کو کریڈل پر ڈال کر غصّے سے دانت پیستے ہوئے کہا "اس کتّے یہودی نے مجھے ماں جی کے ذریعے بلیک میل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے لاہور میں میرا گھر جلا کر میری ماں جی کو کراچی پہنچا دینے کا حکم دے دیا ہے، یہ کام آج ہی رات کو ہونا ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت خوف ناک بات ہوئی ہے، کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں کراچی لا کر رکھا کہاں جائے گا؟" فیروز نے پوچھا۔

اس کی بات سن کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے لڑکی سے یہ ضرور معلوم کر لینا چاہیے تھا مگر اس کی زبانی آئزک کے ارادوں کا علم ہونے کے بعد میرا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا، میرے اعصاب کو سُن کر دینے کے لیے یہی اتنا ہی کافی تھا کہ میرے ملک کے دشمنوں نے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے میری ماں جی کو ڈھال بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا "یہ میں معلوم نہیں کر سکا لڑکی سے۔"

"حالانکہ ماں جی کے بارے میں علم ہوتے ہی تمہیں سب سے پہلے اس سے یہ بات معلوم کرنا چاہیے تھی۔" فیروز نے کہا۔

"ہاں یار! مجھے اب احساس ہو رہا ہے اپنی اس غلطی کا۔ اس گھڑی تو مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا، میرا تو دماغ ہی سُن ہو کر رہ گیا تھا، اس کی زبانی ماں جی کے بارے میں خبیث آئزک کے ارادوں کا علم ہوتے ہی۔" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ تم ٹھیک کہتے ہو، اس ہول ناک خبر کا ردِ عمل یہی ہونا چاہیے تم پر۔ مجھے افسوس ہے میں یہ بات فراموش کر بیٹھا۔" فیروز

شرافت علی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلّی دیتے ہوئے کہا "چھوڑو اس قصّے کو اور حوصلہ پکڑو یار جیلانی! لگتا ہے تم تو ابھی سے دم نڈھال ہونے لگے ہو، تم جیسا جواں مرد اگر ایسے موقعوں پر ہمّت ہار بیٹھے گا تو بات کیسے بنے گی! ابھی بڑا وقت ہے، دن پڑا ہے ابھی اور یہ سارا کا سارا وقت ہمارے قبضے میں ہے، اگر ہم اسے ٹھیک سے استعمال کر سکیں تو کچھ بگڑ نہیں سکے گا۔"

"کیا کہتے ہو تم! یہ جو چند گھنٹوں کی مہلت ہے ہمارے پاس، اس میں ہم کیا کر سکیں گے؟ کیا تم کوئی طیّارہ چارٹر کرنے کی سوچ رہے ہو؟ مگر مجھے یہ کام بھی اتنا آسان نہیں لگتا اور پھر ماں جی کو طیّارے میں سفر کرنے کے لیے راضی کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔

فیروز بولا "ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے، تم ماں جی کو فون کر کے ان سے کہو کہ وہ اس مکان سے کہیں اور منتقل ہو جائیں اور ریزرویشن ہونے کے بعد وہیں سے یہاں آنے کے لیے روانہ ہو جائیں، اپنے مکان کی طرف رخ بھی نہ کریں۔"

"ہاں، تجویز تو اچھی ہے تمہاری لیکن وہ گھر سے نکل کر جائیں گی کہاں؟ اب تو لاہور میں کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں رہا۔"

"یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے یار! انہیں کہو کسی ہوٹل میں جا ٹھہریں ایک دو دن کے لیے۔" شرافت علی نے کہا۔

یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اس وقت میرا اپنے دماغ پر بالکل قابو نہیں تھا۔ کوئی بھی کام کی بات سوجھ ہی

رہی تھی مجھے اس گھڑی، شرافت علی کے کہنے پر میں جلدی سے اٹھا اور جھپٹ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو... ہیلو کون ہے بھئی؟ کس سے بات کرنا ہے تمہیں؟" تیسری گھنٹی کے بعد دوسری طرف سے کبری کی آواز سنائی دی مجھے۔

میں نے اس سے پوچھا "اوئے کبری! وہ حیدر کہاں ہے؟ ذرا جلدی سے بلا اسے، بہت ضروری بات کرنا ہے مجھے۔"

"حیدر کو بلا، بات کرنا ہے مجھے۔" وہ میرے ہی انداز میں بولا۔ "مگر تو ہے کون بھئی لاٹ صاحب؟ نام تو بتا اپنا؟"

اس کے اس انداز پر میرا پارہ چڑھ گیا ایک دم۔ میں نے ڈپٹ کر کہا "بدذات! کیا بکواس لگا رکھی ہے یہ تو نے؟ پہچانا نہیں ہے مجھے؟ میں تیرا ماما بول رہا ہوں، اس مکان کا مالک سردار کریم نواز۔ حیدر کو بلا جلدی سے، وہ نہ ہو تو ماں جی کو بلا لے۔"

"اوہ، اچھا تو یہ تم ہو استاد! معاف کرنا یار! بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے، پہچان نہیں سکا تھا میں تمہیں۔ خیر خیریت سے تو ہو نا تم؟"

"ہاں ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے زیادہ، جلدی سے حیدر کو بلا لا جا کر۔" میں نے کہا۔

"وہ حیدر تو کہتا تھا استاد! کہ کل رات کو بھی ٹیلی فون کیا تھا تم نے اور اسے ماں جی کو ساتھ لے کر کراچی آنے کو کہا تھا۔ وہ اس گھڑی اپنی اور ماں جی کی ٹکٹیں لینے گیا ہوا ہے۔ میں ماں جی کو بلاتا ہوں، تم تھوڑا انتظار کر لو۔" کبری نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مگر جلدی سے بلا انہیں، وقت نہ برباد کر میرا۔" میں نے اس کی لمبی چوڑی باتوں پر جھنجلا کر کہا۔

وہ شاید ماں جی کو بلانے جا چکا تھا، میری بات سنی ہی نہیں تھی اس نے، نہیں تو وہ اس کا بھی کچھ نہ کچھ جواب دیتا ضرور۔ چند لمحوں کے بعد مجھے حیدر کی آواز سنائی دی، وہ شاید اسی وقت آیا تھا اور ریسیور کو کریڈل سے الگ رکھا دیکھ کر اس نے اسے اٹھا لیا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا یہاں فون کس نے کیا ہے اور اسے کس سے بات کرنا ہے؟

میں نے اس کی آواز سن کر کہا "اوہ حیدر! تو آ گیا، جلدی سے بتا، ٹکٹوں کا کیا ہوا؟"

وہ میری آواز سن کر چہک اٹھا "اوہ جناب! آپ ہیں یہ! اچھا ہوا آپ نے خود ہی فون کر لیا اس وقت، میں نے ریزرویشن کرا لی ہے جی، ایئر کنڈیشن میں جگہ مل گئی ہے، آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا جی! پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پچاس روپے زیادہ دینے پڑے ہر ٹکٹ پر اور آج ہی تیز گام سے روانہ ہو رہے ہیں ہم، اس کا مطلب ہے کل ہم کراچی میں ہوں گے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حالانکہ یہ رشوت اور بلیک مارکیٹنگ نہایت ہی باعثِ زحمت اور پریشانی بنی ہوئی ہیں عام آدمی کے لیے لیکن اس روز تو یہ چیزیں مجھے بہت ہی اچھی لگی تھیں، میری ساری پریشانیاں اور الجھنیں جنہوں نے ایک لمحہ پہلے تک مجھے بری طرح جکڑ رکھا تھا اپنے شکنجے میں، پل بھر میں یوں دور ہو گئیں جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ میں نے حیدر سے کہا "یہ تو نے بہت اچھی خبر سنائی ہے حیدر مجھے، ایک بہت بڑی پریشانی سے چھوٹ گیا ہوں میں۔"

"کیوں جناب! ایسی کون سی مصیبت آ پڑی تھی جس کی وجہ سے پریشان تھے آپ؟" حیدر نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

"وہ یار! ذرا غور سے سن میری بات اور دیکھ، ماں جی کو یا بالی کو بالکل ہوا بھی نہ لگنے دینا اس کی، وہ دونوں عورتیں ہیں خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی، حالانکہ یہاں کراچی پہنچ جانے کے بعد پریشانی یا فکر کی بات ہی نہیں رہے گی کوئی۔" میں نے اسے سمجھانے کے بعد کہا "میرے کچھ بہت خطرناک قسم کے دشمن ہیں جو بہت دنوں سے پیچھے ہیں میرے۔ ان ہی کی وجہ سے میں اب تک لاہور واپس نہیں آ سکا ہوں۔ یہی ڈر تھا مجھے کہ وہاں گیا تو میری وجہ سے ماں جی کو پریشانی ہو جائے گی مگر اب مجھے پتا چلا ہے کہ مجھے جھکانے کے لیے انہوں نے ماں جی کو اغوا کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ اسی لیے میں ماں جی کو اپنے پاس بلانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تم لوگ جتنی جلدی ہو سکے گھر سے نکل کر اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ کبری سے کہہ دینا وہ بھی یہ مکان چھوڑ کر میرے لاہور واپس آنے تک کہیں اور ٹھکانا کر لے اپنا، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اسے ہی پکڑ لے جائیں اور اس پر میرا پتا اگلوانے کے لیے مشقِ ستم کریں۔ خواہ مخواہ مارا جائے گا وہ غریب مگر بتانا اسے بھی کچھ نہیں۔ سمجھ گیا نا؟"

"ہاں جی بالکل... بالکل سمجھ گیا ہوں میں۔ آپ اب فکر نہ کریں کسی بات کی، اللہ نے چاہا تو کل ماں جی آپ کے پاس ہوں گی۔"

اسی وقت ماں جی کی آواز سنائی دی مجھے۔ وہ حیدر سے کہہ رہی تھیں "میرے بیٹے کا ٹیلی فون آیا ہے، لا مجھے دے، میں خود بات کروں گی اس سے اور وہ تو نے کیا کیا؟ ٹکٹیں لے آیا ہے تو؟ کب کی ملیں؟" انہوں نے حیدر سے سوال کیا۔

"لیں آپ بات کریں صاحب جی سے اور جلدی سے چلنے کی تیاری کریں، بس ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا ہے گاڑی جانے میں۔"

"تو جا کے بالی کے ساتھ سامان اکٹھا کر، میں اپنے بیٹے سے بات کر کے آتی ہوں ابھی۔" ماں جی نے حیدر سے کہا پھر مجھ سے بولیں "رے بیٹا! سن لیا نا تو نے؟ ٹکٹیں لے آیا ہے یہ اپنا حیدر۔ بڑا کام کا آدمی ہے یہ اور وہ بالی بھی، بڑی خدمت کرتے

ہے میری؟"

"ہاں ماں جی! بے چارے غریب اور بے سہارا لوگ ہیں، ایسے لوگوں سے ہمدردی اور محبت کا سلوک کرو تو یہ بچھ جاتے ہیں آدمی کے آگے۔ بڑے مخلص اور وفادار ہوتے ہیں ماں جی یہ لوگ "، میں نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تو بتا تو نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟ کیا کوئی بہت ہی ضروری بات ہے؟" ماں جی نے تشویش سے پوچھا۔

"ارے نہیں ماں جی! ایسا کیسے سوچ لیا آپ نے، فکر اور پریشانی کی تو کوئی بات بھی نہیں ہے۔ وہ اصل میں بات یوں ہوگئی ہے کہ میں نے شام کو ایک پارٹی میں جانا ہے، اس کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی چلا ہے مجھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شام کو میں آپ کو فون نہ کر سکوں شاید اور اگر آپ نے فون کیا مجھے تب بھی میں تو گھر پر ہوں گا نہیں، آپ نہ جانے کیا سمجھیں اس لیے ابھی فون کر لیا میں نے۔"

"یہ تو نے بہت اچھا کیا بیٹے! میں سچ مچ بہت پریشان ہو جاتی اگر تو فون پہ نہ ملتا تو پھر شاید میں کراچی آنے سے بھی انکار کر دیتی۔" وہ بولیں۔

"ہاں، یہی خیال آیا تھا مجھے بھی۔ آخر بیٹا ہوں نا آپ کا، اپنی ماں جی کے مزاج کو پہچانتا ہوں اچھی طرح سے۔" میں نے جواب دیا۔

"چل پھر ٹھیک ہے، اب میں کراچی آکر ہی تجھ سے باتیں کروں گی جی بھر کے۔ تو کوشش کرنا، تیری بہن آسیہ بھی کل تک مل جائے کسی طرح۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں پوری پوری کوشش کروں گا، آپ بھی دعا کرتی رہیں سوہنے رب سے۔" میں نے کہا۔

"دعا تو میں ہر دم ہی کرتی رہتی ہوں بیٹا! مگر پتا نہیں اس کے مقدر میں کیا لکھا ہوا ہے؟ کچھ پتا ہی نہیں چلتا اس کا۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"اس کے بھید وہی جانے ماں جی! ہم تو بندے ہیں اس کے، اس کی مرضی کے غلام ہیں، کیا کر سکتے ہیں؟ اچھا اب میں فون بند کر دوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کر دے بند، میں نے بھی روانگی کی تیاری کرنا ہے، حیدر اور بالی کے ساتھ۔ اچھا پتر! اللہ بیلی۔" انہوں نے اپنا ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا تھا۔

میں نے بھی ان کی تقلید میں، اللہ بیلی کہہ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر میں نے مڑ کر شرافت علی اور فیروز کو مخاطب کر کے کہا۔ "وہ جو کہا جاتا ہے ناکہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور اور بااختیار ہے، تو وہ غلط نہیں ہے یار! اس نے پہلے ہی انتظام کر دیا ہے سارا۔ حیدر نے ٹکٹوں وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے، ماں جی آج ہی تیز گام سے روانہ ہو رہی ہیں یہاں آنے کے لیے۔"

"ویری گڈ!" فیروز نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا، ساری بازی پلٹ گئی ہے اس طرح تو۔"

"وہ بڑا کارساز ہے اور لگتا یوں ہے کہ وہ ہماری پشت پناہی کر رہا ہے۔ جس کام کا بیڑا اٹھا کر ہم میدان میں اترے ہیں، وہ بھی ہمارے ذریعے اس کام کی تکمیل کرانا چاہتا ہے شاید۔ تم خود سوچو اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی بڑی بین الاقوامی قسم کی تنظیم کے مقابلے میں جسے ہر طرح کی سہولتیں اور وسائل حاصل ہیں، ہماری کیا حیثیت ہے، ہم کس شمار قطار میں ہیں؟" شرافت علی نے تشکر گزاری سے کہا۔

"ہاں بھائی شرافت علی! تم ٹھیک کہتے ہو، ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے اس مالک کل کا، اس کی مدد کے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔" فیروز بولا۔

میں نے شرافت علی سے کہا۔ "شرافت علی! کچھ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے بارے میں بھی سوچ لو، اس ابن میہود اگی تا کی توجہ اب تک صرف میری طرف ہے، میرے خلاف وہ جو آخری قدم اٹھا سکتا تھا اس وقت، وہ ماں جی کے بارے میں ہی تھا۔ اب ماں جی بھی اس کی دسترس سے نکل جائیں گی تو وہ پاگل کتا ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنا شروع کر دے گا۔ اس وقت اسے تمہارا خیال ضرور آئے گا۔ اب تک اس نے تمہیں صرف سزا دینے کے خیال سے جو کچھ کیا، اسے تو تم نے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا لیکن اگر میری طرح وہ تمہیں بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنانے لگا تو تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے اس سے۔ تمہارا تو پورا خاندان اس کے سامنے ہے اور چونکہ انہیں حالات کا علم نہیں ہے، اس لیے سب ہی آزادانہ سے گھومتے پھرتے رہتے ہیں لہٰذا تمہیں چاہیے کہ ان کا کوئی معقول بندوبست کر دو، آئزک کے ان کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے اپنے پورے خاندان کو کسی ایسی جگہ بھیج دو جہاں کسی کا تصور بھی نہ پہنچ سکے۔ یہ بہت ضروری ہے دوست!"

"یہ تم نے بہت صحیح بات سجھائی ہے۔" شرافت علی ایک دم منہ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا و یسے اپنے مکان، دکانوں اور دفتر وغیرہ کی حفاظت کا میں نے مناسب بندوبست کیا ہوا ہے لیکن اپنے خاندان والوں کے لیے میں نے بالکل بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا، یہ خیال ایک لمحے بھی میرے دل میں نہیں آیا تھا کہ وہ لوگ انہیں بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔"

"کمال ہے یار! اتنے عرصے ان لوگوں کے ساتھ کام کرتے رہے ہو اور ان کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکے اب تک!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں یار! ایسی بات تو نہیں ہے۔ ان لوگوں سے تعلق ضرور رہا ہے میرا لیکن ان کے ساتھ کام کبھی نہیں کیا میں نے۔ بس کاروباری لین دین ہی ہوتا رہا ہے ہمارے درمیان۔ تمہارے ساتھ ملنے کے بعد جو کچھ انکشافات ہوئے ہیں ان کے بارے میں، اس نے تو خود مجھے حیران کر دیا تھا، میں تو اس بہروپیے بابا اسحاق کو بھی دوسروں کی طرح کوئی پہنچا ہوا بزرگ، کوئی برگزیدہ انسان ہی سمجھا کرتا تھا جیلانی! اور یہی سمجھتا رہا تھا اپنے دل میں کہ یار لوگوں نے اتنے نیک اور ولی صفت انسان کی خانقاہ میں کیسا کاروبار شروع کر رکھا ہے، اگر کبھی یہ راز کھل گیا اور پولیس نے ریڈ کیا آستانے پر تو وہ نیک آدمی خواہ مخواہ رسوا ہوتا پھرے گا۔" شرافت علی نے کہا۔

"چلو اب تو معلوم ہو گیا ہے نا سب کچھ تمہیں، اب جاؤ اور جس قدر جلد ممکن ہو اپنے اہل و عیال کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو۔ اس کام میں ذرا بھی سستی نہیں کرنا چاہیے تمہیں۔ یہ بات غلام جیلانی نے بہت بروقت سوچی ہے۔" فیروز نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بڑی غفلت برتی ہے اس معاملے میں، یہ کام تو مجھے اسی وقت کر لینا چاہیے تھا جب میرے مکان پر حملہ ہوا تھا۔ وہ تو بس خدا ہی کو منظور نہیں تھا شاید ورنہ اب تک میں بڑا نقصان اٹھا چکا ہوتا۔"

وہ ایک منٹ بھی مزید ضائع کیے بغیر اٹھ کر فوراً باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فیروز بولا۔ "یہ تم نے بڑا احسان کیا ہے اس پر اس وقت۔"

"نہیں یار! ایسی بات نہ کہو، وہ بہت کام آتا رہا ہے ہمارے، بہت احسان کیے ہیں اس نے مجھ پر۔ اسی کی وجہ سے میں آج اپنے قدموں پر کھڑا ہوں ورنہ اس ظہیر احمد نے تو بہت پہلے میری موت کا سامان کر دیا تھا، اگر یہ ساتھ نہ دیتا تو میں زندہ ہی کہاں ہوتا آج۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے جیلانی! شرافت علی کا تعاون، ہمدردی اور پُرخلوص دوستی اپنی جگہ ہے لیکن یہ ساری چیزیں کسی کو نہ زندگی دے سکتی ہیں اور نہ ہی زندگی لے سکتی ہیں کسی کی۔ جلانا اور مارنا تو صرف خدا کے اختیار میں ہے، وہ جب تک نہ چاہے کوئی کسی کو نہ بچا سکتا ہے نہ مار سکتا ہے چنانچہ وہ کام جو کسی انسان کے بس میں ہے ہی نہیں اسے انسانوں سے منسوب کرنے کا گناہ مت کرو۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ زندگی اور موت اس رب کے ہاتھ میں ہے جو مالک ہے کل جہانوں کا، لیکن وہ جب کسی انسان کو ذریعہ بنا کر ہماری مدد کرتا ہے، کسی ہمارے ہی جیسے انسان کے ذریعے ہمیں کوئی فائدہ پہنچاتا ہے تو ہمیں اس رب کائنات کے علاوہ اس انسان کا بھی احسان مند ہونا چاہیے اور اس کے احسان کا بدلہ احسان ہی سے دینا چاہیے، کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟" میں نے فیروز کو سمجھاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بے شک! بے شک۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے جیلانی! یہ بات میں نے یہی جاننے کے لیے کہی تھی، میں جاننا چاہتا تھا کہ تم اپنے محسنوں کے لیے کیسے جذبات و خیالات رکھتے ہو اپنے دل میں۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ تم ایک باایمان آدمی ہو۔" فیروز مسرور لہجے میں بولا۔

میں ہنس کر بولا۔ "اچھا تو یہ امتحان تھا میرا! امتحانی پرچا حل کرایا ہے تم نے مجھ سے۔ ہاں یار! آدمی کی اگر شہرت اچھی نہ ہو، وہ بدنام ہو چکا ہو تو بڑا ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چاہے جتنے بھی اچھے کردار اور نیک اعمال کا مظاہرہ کرتا رہے، لوگ اسے شک و شبہے کی نگاہ سے ہی دیکھتے رہتے ہیں ہمیشہ، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پتا نہیں کب اپنا اصل رنگ دکھا دے۔ کیوں، ہے نا یہی بات؟"

فیروز کچھ شرمندہ سا نظر آنے لگا، خجالت سے بولا۔ "شاید، شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اسی لیے کہتے ہیں، بد اچھا، بدنام بُرا۔"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا، اس کی بات سے مجھے اپنے دل پر چوٹ سی لگتی محسوس ہوئی تھی لیکن میں نے ضبط سے کام لیا، اپنے آپ کو سمجھایا۔ اس میں بُرا منانے کی بات تو کوئی نہیں ہے جیلانی یار، تو نے جو کچھ بویا ہے اسے تو کاٹنا ہی ہے نا تجھے، یہ تو تیری اپنی فصل ہے اس سے انکار کس طرح کر سکتا ہے تو؟ فیروز ایک اچھا آدمی ہے، اس کے دل میں جو خیال آیا تھا اس کا برملا اظہار کر دیا اس نے، منافقوں کی طرح دل میں رکھ کر نہیں بیٹھا رہا۔ ایسے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں یار! ان کی قدر کر، تیرا اللہ مہربان ہے تجھ پر کہ ایسا کھرا آدمی دوست بن گیا ہے تیرا۔ تو اس قابل کہاں تھا کہ ایسے لوگ تیرے دوست بنتے۔ تیرے ہمدردوں میں تو ڈھلوں اور آہو جیسے لوگ ہی شامل ہو سکتے تھے جنہوں نے قربانی کا بکرا بنا کر رکھا ہوا تھا تجھے۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر کہا۔ "شرمندہ نہ ہو میرے یار! کوئی جھوٹ تو نہیں بولا ہے تم نے، کوئی کفر تو نہیں تولا ہے، حقیقت بیان کی ہے اور سچ بول کر آدمی کو شرمندہ بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں میرے بھائی! یقین کرو تمہاری دل آزاری کرنا نہیں چاہتا تھا میں۔" وہ نظریں چرا رہا تھا مجھ سے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوئے چھوڑ یار! اب اس قصے کو، کوئی دل آزاری نہیں کی ہے تو نے کسی کی۔ چل اٹھ، آبی کے پاس چلتے ہیں۔"

وہ چند ثانیے مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے میرے دل کے اندر جھانک کر میرے الفاظ کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہو، میری سچائی کو تول رہا ہو۔ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں سمجھنا بہت ہی مشکل کام ہے جیلانی! کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے یہ۔"

میں نے اس کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے برادر! اصل میں آدمی اپنے دل و دماغ میں کسی کے لیے کوئی مقام بنا لیتا ہے، اپنی معلومات کے مطابق کسی کا بت بنا کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے تو وہ اس شخص کو اپنے تصور کے مطابق ہی دیکھنا بھی چاہتا ہے اور اگر کبھی اس پہ یہ انکشاف ہو کہ وہ اس کے تصور کے بالکل برعکس ہے تو اس کا دماغ یہ بات آسانی کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بس یہی بات ہے جو آدمی کو معمّا بنا دیتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آپاتا حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔"

"ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، بہر حال میں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا: "اپنے دماغ کو زیادہ نہ تھکاؤ، بس اتنا یاد رکھو کہ ہم دونوں پاکستانی ہیں اور ہمیں اپنے ملک کی سلامتی، اس کی بقا کے لیے مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے اور متحد رہنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ لوگوں کی ذاتیات کو نہ کریدا جائے، ان کے ذاتی اعمال پر نظر رکھنے کے بجائے ان کے اجتماعی کردار کو دیکھا جائے۔ ہمارے اندر سب سے بڑی خرابی ہی یہ ہے کہ ہم دوسروں سے جس بھلائی کی توقع کرتے ہیں وہ بھلائی خود کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے، اپنے اعمال کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی، دوسروں کے اعمال پر انگشت زنی عادت بن کر رہ گئی ہے ہم سب کی۔"

"اور یہ جو ہمارے چاروں طرف ہر شخص غلاظت میں لپٹا پھر رہا ہے، اس کی یہی وجہ ہے دوست! جسے دیکھو وہ اپنے چہرے پر لگی سیاہی سے بے خبر دوسروں کے کالے چہرے دیکھ کر قہقہے لگانے میں مصروف ہے، آئینہ دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہے کسی کو۔"

"یہ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کس کو فرصت نہیں ہے آئینہ دیکھنے کی؟" فردوسی بیگم کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اس حصے میں آ گئے تھے۔ جہاں آبی اور فردوسی بیگم دونوں موجود تھے۔ فردوسی بیگم کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کا سامان اور کپ رکھے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً باورچی خانے سے چائے بنا کر لا رہی تھی اپنے اور آبی کے لیے۔ میں نے اسے دیکھ کر شوخی سے کہا: "واہ بھئی واہ! تم نے تو کمال ہی کر دیا آج، تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم دونوں چائے پینے کے لیے ادھر آ رہے ہیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی: "کبھی کبھی مجھ پہ الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے اور بہت سی باتیں وقت سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہیں۔"

فیروز نے شرارت سے کہا: "تم نے سنا ہے، بزرگ کہتے آئے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ سارا کمال اسی عشق زندہ آباد کا ہے جس نے تم دونوں کو باندھ رکھا ہے کچے دھاگے سے۔ اس میں حیران ہونے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے میرے بھائی!"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا: "بس بس، زیادہ ہوشیار، تم آبی بننے کی کوشش مت کرو فیروز!"

وہ بے چارہ پہلی بار ذرا سا بے تکلف ہونے لگا تھا، میری بات سن کر ایک دم خجل سا ہو گیا اور اچانک اس کے چہرے پر ایسی یتیمی طاری ہو گئی کہ جسے دیکھ کر فردوسی بیگم کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ اسے یوں قہقہے لگاتے دیکھ کر وہ کچھ اور بدحواس سا ہو گیا، اس کی اس وقت کی حالت ایسی تھی کہ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اس اثنا میں ہم آبی کے کمرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہم لوگوں کے ہنسنے کی آواز سن کر آبی کمرے سے باہر آتے ہوئے بولا: "ارے کیا بات ہے بھئی، یہ تمہیں کس نے گدگدیاں کرنا شروع کر دی ہیں؟ کیوں اس طرح ہنس رہے ہو؟"

آبی کو دیکھ کر فردوسی بیگم ایک دم ہنسنا بھول کر جلدی سے اس کمرے میں گھس گئی جہاں سے آبی برآمد ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر آبی کے دونوں بازو تھام کر کہا: "شکر ہے خدا کا آج تجھے میں اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑے دیکھ رہا ہوں، بڑا مبارک دن ہے بھئی آج کا تو۔"

آبی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا: "میں نے تجھے بتایا نہیں تھا کہ اب میں تھوڑا تھوڑا چلنے پھرنے لگا ہوں۔"

"ہاں، بتایا تھا تو نے لیکن اس گھڑی تجھے چلتے ہوئے دیکھ کر جو خوشی ہو رہی ہے مجھے، یہ اس وقت نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

میں اس کے گلے میں بازو ڈال کر اسے واپس کمرے میں لے آیا۔ فردوسی بیگم ایک میز پر ٹرے رکھ کر پیالیوں میں چائے بنا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا: "آج خالی چائے سے کام نہیں بنے گا فردوسی بیگم! اس وقت تو ہم مٹھائی بھی کھائیں گے چائے کے ساتھ۔"

وہ ایک کپ میں چینی ڈال کر چمچہ ہلاتے ہوئے بولی۔

"مٹھائی کس سلسلے میں بھئی؟ کیا کوئی خوش خبری لائے ہیں آپ؟"

"ارے، یہ تم کیسی بات کر رہی ہو؟ تمہیں پتا نہیں ہے کیا؟ میرے یار نے صحت پائی ہے۔ اس کی صحت یابی کی مٹھائی نہیں کھلاؤ گی ہمیں؟ اپنے بھائی کی صحت یابی کا جشن نہیں مناؤ گی؟ کیوں بھئی فیروز، کیا خیال ہے تمہارا؟" میں نے فیروز کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"اس میں تو شک نہیں کہ آبی کی صحت یابی کی خوشی میں جشن ضرور منانا چاہیے مگر اس کا انتظام تمہاری طرف سے ہو گا۔" فیروز نے میری تائید کرتے ہوئے کہا: "کیونکہ آبی کا

رشتہ تم سے ہے، وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا، میں نے غلط تو نہیں کہا ہے نا؟"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، میں اپنے یار کی صحت یابی کا جشن بہت دھوم دھام سے مناؤں گا، کل کی رات ہم اس کوٹھی کو دلھن کی طرح سجائیں گے اور کل ماں جی بھی اس جشن میں شریک ہوں گی۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ماں جی؟" آبی حیرانی سے مجھے تکتے ہوئے بولا: "تو کیا ماں جی آ گئی ہیں یہاں؟ اور تو نے مجھے ملایا بھی نہیں ان سے اب تک۔"

میں نے کہا: "ابھی نہیں یار! وہ کل تیز گام سے پہنچ رہی ہیں یہاں۔ وہ حیدر اور بالی بھی ہوں گے ان کے ساتھ۔"

آبی سنجیدہ ہو کر بولا: "جیلانی! یہاں ہم ہر طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں، ہر روز ان سے معرکہ آرائی ہو رہی ہے ایسے میں تو نے ماں جی کو یہاں کیوں بلا لیا یار! وہ وہاں سکون سے بیٹھی ہوئی تھیں، اب یہاں ان کی بھی حفاظت کرنا پڑے گی ہمیں۔"

"اگر ایسا ہی ہوتا تو میں انہیں ان حالات میں کبھی یہاں نہ بلاتا۔ میں نے بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسی کیا مجبوری آ پڑی تھی؟ کون ان کا سکون چھین رہا تھا وہاں؟ کیا آسیہ نے کوئی گڑبڑ کی ہوئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں یار! آسیہ ہے ہی کہاں وہاں؟ وہ تو خود ادھر کراچی میں ہی رل رہی ہے کہیں۔ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی ادھر طارق روڈ پہ۔" میں نے کہا۔ پھر اسے بتایا کہ آئزک نے کس طرح ماں جی کے لیے لاہور کی زمین کو تنگ کر دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔

"اوہ، تو وہ اسرائیلی کتا ایسی ذلیل حرکتوں پہ اتر آیا ہے! اتنا پیچ ہے وہ!" آبی غضب ناک ہو کر بولا۔

"ان بدذات یہودیوں سے اور کیا امید کرتا ہے تو؟ یہ بہت ہی رذیل قوم ہے اس دنیا کی، انہیں یونہی لعنتی قرار نہیں دیا ہے خداوند کریم نے، دغا، فریب اور درندگی میں اس وقت دنیا بھر میں ثانی نہیں ہے کوئی ان کا۔" میں نے کہا۔

"پھر تو یار تو نے اچھا ہی کیا ہے انہیں یہاں بلا کر اور یہ تیری لزی بیگم، اس نے تو میری کھوپڑی کے سارے نٹ بولٹ ڈھیلے کر کے رکھ دیے ہیں، میں اسے اب تک سمجھ ہی نہیں سکا ہوں، بڑی گرگٹ صفت لڑکی ہے، اتنے دنوں میں جتنے رنگ اس نے بدلے ہیں اور جس جس طرح سامنے آئی ہے، اس نے تو مجھے حیران ہونے کے قابل بھی نہیں رہنے دیا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے آبی! لیکن اگر غور کرو تو ہمیں ایک بھی ایسا لمحہ نہیں مل سکے گا جس میں اس نے ہمیں کوئی معمولی سا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ تم خوب سوچ کر بتاؤ، تمہیں یاد ہے کوئی ایسا ایک آدھ بھی واقعہ؟"

آبی کے ماتھے پر غور و فکر کی سلوٹیں ابھر آئیں، وہ دیر تک اپنے ذہن کے ایک ایک خانے کو کرید کرید کر دیکھتا اور کوئی ایسا لمحہ، ایسا پل تلاش کرتا رہا، جب لزی نے ہم میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو مگر کافی دیر سوچنے کے بعد بھی اسے اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "تو ٹھیک کہتا ہے یار! ایسا کوئی لمحہ نہیں ہے میری یادداشت میں۔"

"کوئی ایسا لمحہ ہے ہی نہیں تو ہماری یادداشت میں محفوظ کہاں سے ہو سکتا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ بظاہر جو کچھ بھی نظر آتی ہو حقیقت میں ہماری دشمن نہیں ہے، اس نے ہمیں دشمن کے ارادوں اور عزائم سے جس طرح باخبر رکھا ہے ایسا کوئی دشمن کبھی مصلحتاً بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اس نے اپنے کسی بڑے مفاد کے پیش نظر یہ روپ دھارا ہوتا، تب وہ اتنی درست اور ایسی اہم خبریں ہمیں نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس نے تو ہمارے ذریعے اس قدر نقصان پہنچایا ہے اپنے لوگوں کو کہ وہ بوکھلا کر اوندھی سیدھی حرکتیں کرنے لگے ہیں، ان کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو رہا ہے، کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ وہ جتنے منظم اور طاقت ور لوگ ہیں، ان کی جڑیں جس قدر اندر تک اتری ہوئی ہیں اور جیسے جیسے منصوبے بنائے ہیں انہوں نے ہمیں تباہ کرنے کے، اگر وہ ہمیں ان کی اطلاع بروقت نہ دیتی تو ہم چیونٹی کی طرح مسل دیے گئے ہوتے اب تک مگر حالت یہ ہے کہ اب وہ ہم سے خوف زدہ ہیں۔ آئزک جیسا شیطان جس نے نہ جانے کب سے سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا تھا، چوہے کی طرح بل میں جا گھسا ہے۔"

"ہاں، مجھے اتفاق ہے جیلانی سے۔" فیروز بولا: "جو کامیابیاں ہمیں حاصل ہوئی ہیں آئزک اور اس کی تنظیم کے خلاف، اس میں کوئی شک نہیں کہ لزی کی مدد اور تعاون کے بغیر ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

"میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ ابتدا میں یہ شک ضرور ہوا تھا کہ شاید وہ ہمیں کسی بڑی دلدل میں دھکیلنے کے لیے ایک نئے انداز سے سامنے آئی ہے مگر بعد کے حالات نے اسے غلط ثابت کر دیا۔ یہی سوچ سوچ کر تو میں پریشان ہوتا رہتا ہوں کہ آخر اس کی اصلیت کیا ہے؟ وہ کیوں ایسا کر رہی ہے؟ اسے ہم سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" آبی نے سوال کیا۔

"تم اس فکر میں کیوں مبتلا ہو میرے بھائی! یہ خیالات اپنے دل و دماغ سے نکال پھینکو۔" فیروز نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: "وہ جو کوئی بھی ہے، جو کچھ بھی ہے، ایک دن کھل ہی جائے گی ہمارے سامنے۔ پھر ہم کیوں اس کے غم میں مبتلا رہیں، ہمیں بس آم کھانے سے غرض ہونا چاہیے، پیڑ گننے کی کوشش کیوں

کرنے لگے ہو تم؟ وہ جب مناسب سمجھے گی اپنے چہرے سے نقاب اٹھا کر اپنی اصلی شکل دکھا دے گی ہمیں، فی الحال اپنے کام سے کام رکھو یار، خواہ مخواہ کے غم نہ پالو۔"

"ہاں، تمہاری بات ایک حد تک ٹھیک ہی لگتی ہے مجھے۔" آبی بولا۔ "اگر وہ اسی طرح ساتھ دیتی رہی تو ہم بہت جلد ان یہودیوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں گے اپنی سوہنی دھرتی سے، اور انہیں ایسا سبق دیں گے کہ آئندہ یہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے کبھی۔"

"انشاء اللہ! اگر اللہ کو منظور ہوا تو ایسا ہی ہوگا، مجھے یقین ہے اس نیک کام کے لیے خدا نے ہمارا ہی انتخاب کیا ہے۔" فیروز بولا۔ باتوں کے دوران ہم چائے بھی پیتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی پیالی خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔ "آبی! اب تیرا پاؤں کیسا ہے؟"

وہ بولا "بہت ٹھیک ہے، بس معمولی سی تکلیف باقی رہ گئی ہے۔ چلتے میں جب وزن پڑتا ہے اس پاؤں پر تب کچھ درد ہوتا ہے، ویسے زخم تو بالکل بھر چکا ہے۔ وہ ڈاکٹر جس کے میں زیرِ علاج ہوں، بہت اچھا اور تجربے کار آدمی ہے، اس کی مسیحائی نے مجھے بہت جلدی دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا ہے جس کی مجھے بالکل امید نہیں تھی۔"

"پھر کیا خیال ہے، ہم لوگ آج کی شام کہیں باہر نہ گزاریں، کسی تفریحی مقام پر، اس یکسانیت سے جہاں کچھ دیر کے لیے نجات مل سکے ہمیں؟" میں نے تجویز پیش کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"یہ تو تو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے یار! میرا دم گھٹنے لگا ہے، یہاں ایک ہی کمرے میں پڑے پڑے۔" آبی جلدی سے بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو جیلانی؟ کہیں دماغ تو نہیں پھر گیا ہے تمہارا؟" فیروز حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "باہر جگہ جگہ دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے، شہر کا کونہ کونہ چھانا جا رہا ہے، تمہاری تلاش میں انہوں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی ہوگی اب تک اور جو کام وہ اتنی جستجو، اس قدر تگ و دو کے بعد بھی نہ کر سکے اسے تم باہر جا کر ان کے لیے آسان بنا دینا چاہتے ہو؟ یہ بات سمجھ نہیں سکا ہوں میں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو برادر! لیکن تم جانتے ہو نا کہ وہ خبیث یہودی بھی سات تالوں میں جا بیٹھا ہے۔ اس نے اپنے گرد پہرے بٹھا دیے ہیں، ان پہروں میں ہمارے لیے اس تک پہنچنا مشکل ہو گیا ہے اور اب اسے باہر نکالنے کے لیے ہمارا باہر نکلنا ضروری ہو گیا ہے فیروز!"

"یہ بالکل ٹھیک بات کہی ہے! چوہے کو بل سے باہر لانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا دکھانا ضروری ہوتا ہے۔" آبی جلدی سے بولا۔

"اوہ، تو تم اسے باہر لانے کے لیے خود کو چارہ بنا کر پیش کرنا چاہتے ہو لیکن یہ بہت خطرناک کام ہے۔" فیروز نے کہا۔

"خطرات سے ڈر کر ہم یوں چھپ کر بیٹھ گئے تو زندگی بھر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے میرے بھائی! خطرات سے نمٹنے کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنا ہی پڑتا ہے اور ہم تو عادی ہو چکے ہیں اس کے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی ہمارے لیے۔" آبی بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا خیال تھا ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور ابھی تم بھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے ہو۔" فیروز نے جواب دیا۔

"ایسا وقت خود چل کر نہیں آیا کرتا برادر! اسے لانا پڑتا ہے، وقت کا انتظار کرنے والے ہمیشہ نقصان میں ہی رہتے ہیں۔ اور تم بالکل فکر نہ کرو، میرے پاؤں میں جو تھوڑی سی تکلیف رہ گئی وہ تو اب بھاگتے دوڑتے ٹھیک ہو جائے گی خود ہی۔" آبی بولا۔

"اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے فیروز! میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں آرزک کے مقابلے کے لیے نکلوں تو مجھے کسی اور طرف سے کسی دوسرے دشمن کے آپڑنے کا خدشہ نہ رہے، میں یکسوئی کے ساتھ آرزک کا مقابلہ کر سکوں۔"

"ظہیر احمد کے بعد اس شہر میں ایسا کون ہو سکتا ہے جو تمہاری راہ میں حائل ہو سکے؟ ایک وہی تھا جس سے خطرہ ہو سکتا تھا اور اسے ساحلِ سمندر پر گل زمان نے دنیا کے سارے معاملات سے بے نیاز کر دیا۔ اب تو وہ اپنے اعمال نامے میں ایسے نکات تلاش کر رہا ہوگا جنہیں وہ اپنی بخشش کے لیے پیش کر سکے اس مالکِ حقیقی کے، تم جانتے ہو اس کے لیے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ اسے چھوڑ کر وہ دنیا کی طرف توجہ بھی دے سکے ذرا سی۔" فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! اس طرح مت سوچو۔ ظہیر احمد کوئی تنہا اور بے بس شخص نہیں تھا، بے شمار گرگے پال رکھے تھے اس نے، ان میں ایسے بھی ہوں گے جو اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتے ہوں گے، مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے، میں جب بھی انہیں نظر آ گیا کہیں، وہ مجھے گھیر کر ظہیر احمد کے پاس پہنچانے کی ضرور کوشش کریں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو بالکل صحیح سوچا ہے بھئی تم نے۔ میں نے اس طرح سوچا تھا کبھی۔" فیروز مجھے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے نہیں سوچا تھا کیونکہ تمہاری توجہ صرف آرزک اور اس کی تنظیم کی طرف ہے۔ میں چونکہ اکثر ایسے حالات سے گزرتا ہوں، ایک ہی وقت میں کئی کئی دشمنوں سے نمٹنا پڑتا ہے مجھے، اس لیے میں اپنے چاروں طرف نظر رکھتا ہوں، کوئی ایسا شخص جس سے ذرا بھی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے، میرے ذہن سے محو نہیں ہوتا کبھی۔ اس روز منگھو پیر کی پہاڑیوں میں ہمارا ظہیر احمد سے جو خونی مقابلہ ہوا تھا، اس مقابلے کے دوران میں نے ظہیر احمد کے گروہ میں ایک نوجوان کے بڑے خطرناک تیور دیکھے تھے، اس کے خون میں گرمی دوسروں سے بہت زیادہ تھی اور شہ زوری میں بھی وہ

سب میں منفرد دکھائی دیا تھا۔ اس نے اس سمے شکست تسلیم کرتے ہوئے ظہیر احمد سے اپنی وفاداری کا جس انداز سے اظہار کیا تھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ وہ انہی لوگوں میں سے ہے جو اپنے باس کی خاطر آنکھ بند کر کے آگ کے سمندر میں کود پڑتے ہیں، میری آنکھوں میں اس کی صورت بس کر رہ گئی ہے، جب بھی میں باہر نکلتا ہوں میری نظریں اپنے اطراف میں اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ وہ ہمارے لیے کسی وقت بھی خطرہ بن سکتا ہے۔"

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پہلی فرصت میں ہمیں اس سے نمٹ لینا چاہیے۔" فیروز نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

آبی اب تک خاموش بیٹھا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا "مگر اس ظہیر احمد کو کیا ہوا؟ کیا وہ مارا گیا ہے؟"

"ہاں، اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مجھے اور گل زمان کو ساحلِ سمندر پر جا پکڑا تھا، شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے ہمارے پیچھے اس کی موت نے ڈال رکھا ہے۔ یہ تعداد کا غرور آدمی کو ہمیشہ موت کے دہانے پر پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ وہ شخص جسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے تو وہ اپنے مددگاروں کی اس بھاری تعداد کے بل پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور یہ خوش فہمی اسے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتی ہے۔ ظہیر احمد بھی اسی زعم میں مارا گیا کہ ہم صرف دو آدمی تھے وہاں اور وہ چار آدمی تھے، ان کا خیال ہوگا کہ وہ ہمیں آسانی سے سمندر کی سرکش لہروں کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ہوا یہ کہ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو ظہیر احمد کی بے گور و کفن لاش منہ کے بل زمین پر پڑی تھی۔" میں نے آبی کو تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

آبی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "اچھا! کمال کا آدمی ہے یار یہ گل زمان تو! ایک ہی ہاتھ میں گردن توڑ کے رکھ دی ظہیر احمد کی!"

"ہاں بھئی، بڑا ہنرمند ہے یہ اپنا گل زمان۔ اس نے تو مجھے بے حد متاثر کیا ہے یار! جوڈو کراٹے، مارشل آرٹ اور پتا نہیں کون کون سے آرٹ اپنے اندر سمائے پھرتا ہے، اس سب کے باوجود ایسا عاجز و مسکین دکھائی دیتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہ ہو۔"

"اور تو نے اپنے فن کار آدمی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کچھ حاصل نہیں کیا اب تک، کیسا بدنصیب ہے یار تو!" آبی بولا۔

"خیال تو مجھے بھی آیا تھا کہ اس کی شاگردی میں دے دوں خود کو مگر وہ اسرائیلی کتا اتنی مہلت ہی نہیں دے رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک کہتا ہے، مگر یاد رکھ اس قصے کو نمٹا کے ہمیں یہ کام کرنا ضرور ہے۔" آبی نے میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے کہا۔

دن کے دو بجے میں نے لزی کے دیے ہوئے نمبر پر فون کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "آپ اپنا فون نمبر لکھوا دیں، وہ شام پانچ بجے یہاں آئیں گی تو آپ کو خود فون کر لیں گی، اس وقت تو ان سے رابطہ قائم ہونا ناممکن ہے۔" میں نے اپنا فون نمبر لکھوا کر سلسلہ منقطع کر دیا اور کمرے میں جا کر بستر میں گھس گیا۔ شام کے ٹھیک پانچ بجے تھے جب گل زمان نے مجھے بیدار کر کے یہ اطلاع دی کہ لزی کا فون آیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جا کر ٹیلی فون ریسیو کیا۔ لزی نے میری آواز سن کر پوچھا۔

"ہاں جنابِ عالی! فرمائیے کیسے یاد کیا تھا مجھے آپ نے؟ لیکن پہلے مجھے یہ بتائیں آپ نے اپنی ماں جی کے سلسلے میں کچھ کیا؟"

"ہاں، ان کی تم فکر مت کرو، وہ لوگ میرے مکان کو بے شک آگ لگا دیں لیکن ماں جی تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا اب۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں پوچھوں گی آپ سے کہ آپ نے کیا کیا ہے ان کے لیے کیونکہ آپ نے جو کچھ بھی کیا ہے ٹھیک ہی کیا ہوگا۔ اب بتائیں کیا بات ہے؟"

"تم نے بتایا تھا کہ تم تنظیم کے کئی بڑوں کے نام اور پتے جانتی ہو، تو آج میں نے اسی لیے فون کیا تھا تمہیں، تم ان لوگوں کے نام اور پتے مجھے لکھوا دو، آج رات میں کسی وقت ان میں سے کچھ کو کم کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں یہ خیال تو اچھا ہے آپ کا، مگر آج یہ خیال کیسے آ گیا آپ کو؟ کیا کوئی اور اہم واقعہ ہوا ہے جس کی مجھے خبر نہیں ہو سکی ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہم لوگ آج کچھ تفریح کی غرض سے باہر نکل رہے ہیں، آرزک تو کچھ دنوں کے لیے بل میں گھس کر بیٹھ گیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے تو مجھے اس کے گرد سے پہرہ اٹھنے کا انتظار کرنا پڑے گا، لہٰذا میں نے سوچا جب باہر جانا ہی ہے تو کیوں نہ کچھ بٹیروں کا ہی شکار کر لیا جائے۔ اس کے بغیر تو تفریح ادھوری ہی رہے گی نا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک سوچا ہے جنابِ عالی!" اس نے کہا اور پھر مجھے تین نام اور پتے لکھوا کر بولی۔ "ان میں سے دو سرکاری محکموں کے اعلیٰ عہدے دار ہیں اور ایک جسے لوگ حاجی کہتے ہیں پرانا گولی مار میں منشیات کا بہت بڑا اڈا چلا رہا ہے۔ یہ جو پتا میں نے لکھوایا ہے آپ کو، یہ اسی اڈے کا ہی ہے۔ یہ شخص بسم اللہ ہوٹل کے پیچھے ایک گلی میں رہتا ہے جہاں بنگالی رہتے ہیں، اسی گلی میں اس کا ایک اور اڈا بھی ہے۔ اس اڈے پر منشیات فروشی کے علاوہ وی سی آر پر فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ایک بڑے احاطے میں جہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں محنت کش بنگالی رہتے ہیں۔ ایک قدرے وسیع ہال نما کمرا ہے، اس کمرے میں دن و رات وی سی آر چلتا رہتا ہے۔ دیواروں پر اندر اور باہر پورے ہفتے کے پروگرام لکھے ہوتے ہیں اور کھلے عام

آوازیں لگا لگا کر ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں۔ یہ حاجی آپ کو وہیں مل سکے گا۔"

"کمال ہے، کھلے عام یہ کام ہو رہا ہے اور کوئی ان سے کچھ پوچھنے والا نہیں ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جب کسی کو پولیس کا تعاون حاصل ہو جائے تو کس کی مجال ہے کہ اس سے کچھ کہنے کی جرأت بھی کر سکے۔" اس نے کہا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہو تم، ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر تو کوئی سات پردوں میں چھپ کر بھی جرم نہیں کر سکتا، ایک معمولی سا لوٹا بھی چوری کر کے بچ نہیں سکتا ان کی دسترس سے، کھلے عام اڈّے چلانا بہت بڑی بات ہے۔"

"جی ہاں، میں بھی یہی کہہ رہی تھی آپ سے۔ آپ تو جانتے ہیں سب کچھ پھر بھی یوں حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔" لزی بولی۔

"جانتا کون نہیں ہے، بچے بچے کو معلوم ہے کہ قانون کے بخیے اُدھیڑنے کا کام کون کر رہا ہے، یہ بات خود قانون بنانے والے بھی جانتے ہیں اور وہ جان بوجھ کر قانون میں اس کی گنجائش رکھتے ہیں چونکہ وہ بھی بہرحال اسی معاشرے کے فرد ہوتے ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو کسی دن خود ان کی گردن بھی پھنس سکتی ہے۔ فرشتے تو وہ بھی نہیں ہوتے ہیں نا؟"

"خیر چھوڑیں اس بحث کو، لعنت بھیجیں اس پر، خواہ مخواہ جی کڑھتا ہے اس پر، میرا خیال ہے آج آپ اس حاجی کو ہی نشانہ بنائیں اپنا۔ ایسے خوف ناک لوگ اپنے لیے عیش و آرام حاصل کرنے کی خاطر اپنے ملک کی نئی نسل کو برباد کرنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے جو ملک کے جوان اور حرارت سے بھرپور لہو کو منجمد کر دینے پر تُلے بیٹھے ہوں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں، وہ لوگ جو انسانوں سے زندہ رہنے کا حق چھین رہے ہوں ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنا انسان اور انسانیت کی توہین ہے جنابِ عالی!"

"ہاں، تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے لزی! ہم آج رات اس اڈّے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور اس حاجی اور اس کے گرگوں کو ایسے خوف ناک عذاب سے گزاریں گے کہ دیکھنے والے کان پکڑنے لگیں گے اور عبرت پکڑیں گے وہ ان سے۔" میں نے کہا۔

"میں یہی چاہتی ہوں جنابِ عالی! قدرت نے آپ کو اپنے اعمال نامے کو درست کرنے کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو آپ کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خدا آپ کی حفاظت اور مدد کرے گا اس معاملے میں۔" لزی نے مجھے سمجھایا۔

میں نے لزی کو خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر کے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے گل زمان سے پوچھا۔ "وہ فیروز کہاں ہے بھئی؟"

"وہ انور کمال اور خان صاحب کے ساتھ شرافت صاحب کی طرف گئے ہیں، وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی شاید!" گل زمان بولا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا مطلب، کیسی گڑبڑ ہو گئی ہے؟ انہیں کیسے پتا چلا وہاں کسی گڑبڑ کا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کیسی گڑبڑ ہوئی ہے، کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا، فون کیا تھا شرافت صاحب نے، وہ فون سنتے ہی چلے گئے تھے۔"

"تم کیوں نہیں گئے ان لوگوں کے ساتھ اور اگر ایسی ہی بات تھی تو انہوں نے مجھے کیوں نہیں ساتھ لیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کوئی زیادہ سنگین معاملہ نہیں ہے، ضرورت محسوس کی وہاں پہنچنے کے بعد تو وہ فون کر دیں گے، اس کے بعد میں آپ کو ساتھ لے جاؤں ان کے پاس، اب ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے مگر اب تک تو فون آیا نہیں ہے ان کا۔"

"ان کا فون نہ آنے سے تم نے یہ سمجھ لیا کہ حالات ان کے قابو میں ہیں، انہیں ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے؟"

"ہاں جی، بالکل یہی بات ہے اسی لیے میں نے آپ کے آرام میں مخل ہونا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔" گل زمان نے جواب دیا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہوں اور انہیں فون کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔"

"نہیں جناب! ایسا نہیں ہے، آپ بالکل بے فکر رہیں اس طرف سے، وہ بالکل ٹھیک ہیں، نہیں تو ہمیں فون ضرور کرتے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا "بے کار باتیں مت کرو، اس [illegible] نے بہت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تمہیں۔ ہم لوگ جن حالات سے گزر رہے ہیں ان حالات میں ایسی غفلت ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے گل زمان!"

"ارے جیلانی بھائی! میری بات کا یقین کریں، آپ غلط [illegible] ہوں، جو آپ سمجھ رہے ہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔" گل زمان [illegible]

اس کے چہرے پر پھیلا ہوا اطمینان ثبوت تھا اس بات کا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں میرے دل کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا، طرح طرح کے خدشات میرے دل میں ابھر رہے تھے۔ میں نے گل زمان سے کہا۔ "گاڑی ہے کوئی؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں ہے۔ کیا آپ جانا چاہتے ہیں کہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہوں، چلو گاڑی نکالو جلدی سے، میں بھی شرافت علی کے ہاں جاؤں گا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہاں خیریت نہیں [illegible]"

"ٹھیک ہے، اگر جانا چاہتے ہیں تو چلیں، میں روکوں گا [illegible] آپ کو، ویسے میں سمجھتا ہوں ایسا ہے نہیں۔" گل زمان نے کہا۔

"خدا کرے تمہاری ہی بات ٹھیک ہو، مگر پھر بھی [illegible] ضرور ہے وہاں، تم جا کر گاڑی نکالو، میں آبی کے پاس ہو کر [illegible]"

"جی اچھا، جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے دروازے کی [illegible] قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

مڑ کر ادھر [illegible] میں آبی کے پاس جا پہنچا۔ وہ کمرے کے باہری ورانڈے میں بیٹھا چائے کی ہلکی ہلکی چسکیوں کے ساتھ فردوسی بیگم سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا "او بھئی جنتی بیگم! یہ تمہارا مستقبل بھی آ گیا ہے۔ اسے بھی چائے بنا کر پلاؤ بھئی۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "ابھی جیلانی! ذرا یہ چائے پی کر تو دیکھ، لگتا ہے آج اس جنتی بیگم نے اپنی محبت کی ساری کی ساری شیرینی گھول دی ہے اس میں۔"

میں نے کہا "نہیں یار! چائے تم لوگ ہی پیو، مجھے بالکل خواہش نہیں ہے اس وقت چائے کی، میں تو تجھے یہ کہنے آیا تھا کہ میں گل زمان کے ساتھ باہر جا رہا ہوں، تو ادھر دوسری طرف جا کے بیٹھ جا۔ شاید لزی کا ٹیلی فون آ جائے تو بات کر لینا تو اس سے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا "اوئے یہ تیری شکل پہ زردی کیوں کھنڈ آئی ہے؟ خیر تو ہے نا، کوئی گڑبڑ شڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟"

"کچھ پتا نہیں یار! میں تو سو رہا تھا، ابھی ابھی لزی کا ٹیلی فون آیا تو اٹھایا ہے اس گل زمان نے۔ اسی سے پتا چلا کہ فیروز خان اور انور کمال کو شرافت علی نے ٹیلی فون کر کے بلایا تھا، اس کے مکان پر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فکر کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے یہاں سے گئے ہوئے، ابھی تک نہ تو ان میں سے ہی کوئی واپس آیا ہے اور نہ ہی کوئی خبر ملی ہے ان کی۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

آبی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "یہ کیا کہہ رہا ہے یار تو؟ اگر ایسا ہے تو چل میں بھی ساتھ چلتا ہوں تیرے۔ پتا تو کرنا چاہیے ہمیں ان کا۔"

"نہیں یار! تو بیٹھ ادھر ہی، یہاں بھی ایک آدمی کا موجود ہونا ضروری ہے اور اس فردوسی بیگم کو بھی اکیلا نہیں چھوڑنا ہے یہاں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یار! اس گل زمان سے کہہ دے، وہ رہ جائے گا یہاں، میں تیرے ساتھ ضرور چلوں گا۔" آبی نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

فردوسی بیگم آبی کو ضد کرتے دیکھ کر بولی "میری پروا نہ کریں آپ جیلانی! میں تمام دروازے بند کر کے بیٹھ جاؤں گی۔ یوں بھی یہاں کون آتا ہے۔"

"ایسا نہ کہو فردوسی بیگم! تم ابھی پوری طرح جان نہیں سکی ہو انہیں جن سے اس مرتبہ واسطہ پڑ گیا ہے ہمارا۔ بڑے ہی دراز دست لوگ ہیں وہ اور بینائی ان کی ایسی ہے کہ زمین کے پردوں میں چھپی ہوئی شے تک کو دیکھ لیتے ہیں آسانی سے۔" میں نے کہا۔

"یوں متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں آپ مجھے ان لوگوں سے۔ ایسے ہی روشن ضمیر ہوتے تو وہ اب تک یہاں آ چکے ہوتے کب کے اور ہم سب لوگ یہاں پناہ گزین بن کر زیادہ دن نہیں گزار سکتے تھے۔ میں نہیں مان سکتی آپ کی یہ بات۔" فردوسی بیگم مضبوط لہجے میں بولی۔

"خیر، یہ تمہاری مرضی ہے، تم مانو یا نہ مانو لیکن میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ ایک آدمی یہاں رہے گا ضرور تمہارے پاس، چاہے وہ آبی ہو یا گل زمان اور دیکھو، ہمارے جانے کے بعد تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے آبی سے بولا "ٹھیک ہے جناب اسلم آبی صاحب! آئیے اُٹھیے، ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

ہم دونوں باہر آئے تو گل زمان کار اسٹارٹ کیے اسٹیرنگ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا، میرے ساتھ آبی کو دیکھ کر وہ جلدی سے کار سے باہر آ گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا کر آبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ارے آبی صاحب! خدا کا شکر ہے آپ ٹھیک ہو گئے۔"

آبی اس سے مصافحہ کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر اسے پورے جوش کے ساتھ اپنے بازوؤں میں بھر کر بولا "اوئے، آ یار گل زمان! کیسا ہے پیارے تو؟ تیرے بارے میں تو سُن سُن کر ہی میں گرویدہ ہو چکا ہوں، تیرا پرستار بن گیا ہوں یار جی میں۔"

گل زمان عاجزی سے بولا "کیوں شرمندہ کر رہے ہیں آبی صاحب آپ مجھے، میں کوئی بڑا نامی گرامی آدمی تو نہیں ہوں۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہہ۔ تو نے تو بڑے بڑے نامیوں کا رنگ پھیکا کر دیا ہے، ان کا سورج غروب ہوتا دکھائی دینے لگا ہے مجھے، جنکے نام کا شہرہ تھا چار سو اب تو وہ بھی تیرے گن گا رہے ہیں میرے یار!" آبی نے شرارت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ مجھے چھیڑنے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "بس اب معافی بھی دے دے اس غریب کو، کمبل ہی ہو کر رہ گیا ہے تو تو اس سے، چھوڑ اسے اور جلدی سے بیٹھ گاڑی میں، برباد کرنے کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس ابھی۔"

وہ گل زمان کو چھوڑ کر الگ ہوتے ہوئے بولا "یہ ظالم سماج تو ہمیں دو گھڑی کے لیے ملتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا یار!"

وہ اس سے الگ ہو کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسا۔ میں نے گل زمان سے کہا "گل زمان! تم یہیں رک جاؤ بھائی! یہ آبی ضد کر رہا ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔ یہاں بھی کسی نہ کسی کو موجود رہنا چاہیے۔ ہم سب چلے گئے تو یہاں کون رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! آپ آبی صاحب کو لے جائیے اپنے ساتھ، ویسے بھی یہ کئی روز سے باہر نہیں نکل سکے ہیں گھر سے۔" وہ بولا۔

میں نے کار میں گھس کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی باہر لے آیا۔ کار تیزی سے شفاف سڑک پر دوڑتے ہوئے شرافت علی

کے گھر کا فاصلہ بتدریج سمٹتی جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا خداوند کریم سے کہ شرافت علی اور فیروز وغیرہ بخیریت ہوں، ان پر کوئی افتاد نہ آ پڑی ہو۔ آبی کو شاید میری یہ خاموشی اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ پیچھے سے مجھے مخاطب کر کے بولا "جیلانی! وہ انور کمال بتا رہا تھا کہ آسیہ یہیں کراچی میں موجود ہے تو نے اسے طارق روڈ پر ایک دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں یار! دیکھا تو تھا میں نے اسے لیکن اس تک پہنچ نہیں سکا تھا میں، وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے آدمیوں کے اس بحرِ بیکراں میں گم ہوگئی تھی۔ ماں جی ہر بار اسے ضرور پوچھتی ہیں۔ کل یہاں پہنچنے کے بعد وہ تو میرا جینا دوبھر کر دیں گی۔ میں اب تک انہیں جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا ہوں لیکن اب اس طرح زیادہ دن بات نہیں بن سکے گی یار! آسیہ کو اب تلاش کر کے لانا ہی پڑے گا۔ ہمیں اس کے لیے کراچی کا ایک ایک کونا کھنگال ڈالنا ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی، کس طرح مل سکے گی؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔"

"یہ تو ہمیں پتا چل ہی چکا ہے کہ وہ کراچی میں ہے۔ اسے یہاں سے ڈھونڈ نکالنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے یار!" آبی نے کہا۔

میں نے حیرانی سے کہا "کیا کہتا ہے یار تو؟ تیرے نزدیک کراچی کوئی ایسی چھوٹی سی جگہ ہے جہاں کسی کو ڈھونڈ نکالنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا؟"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیلانی! کہ آئزک نے تیرے دماغ سے سارا گودا نچوڑ لیا ہے۔ آج کل تجھے اس کے سوا کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے بھائی تیرا؟ کیا بتانا چاہ رہا ہے تو مجھے؟ ذرا صاف صاف بات کرنا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کچھ۔" میں نے کہا۔

"یار دیکھ، ہمیں ایک دو دن کے لیے شکارپور چلنا ہوگا۔ وہاں جا کر ہم اس تیرے ڈپلی کیٹ یعنی جمیل کے ذریعے متصل گاؤں اور اس کے قرب و جوار میں کسی ایسے شخص کو تلاش کریں گے جو کراچی میں لاکھو لاشاری کے دوستوں اور عزیزوں کو جانتا ہو۔ مجھے امید ہے کہ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد بالآخر ہم ایسے لوگوں کے کچھ نام اور پتے ضرور حاصل کر لیں گے۔ پھر واپس آکر آسیہ کا سراغ لگانا آسان ہو جائے گا ہمارے لیے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم آنکھ بند کر کے آسیہ تک پہنچ جائیں گے۔ اب آئی کچھ سمجھ؟" آبی نے کہا۔

"سچی بات یہ ہے یار آبی! میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ لاکھو لاشاری کے عزیزوں اور دوستوں کے پتے حاصل کرنے سے آسیہ تک پہنچنے میں کس طرح آسانی ہو جائے گی؟ ہم آنکھ بند کر کے اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ذرا مجھے سمجھاؤ تو۔"

"اوئے! کیا ہوا ہے بھئی تجھے؟ لگتا ہے تیری عقل بالکل ہی گھاس چرنے لگی ہے ان دنوں۔ اتنی سی بات سمجھ نہیں آئی؟ کیا تجھ کو پتا نہیں ہے، آسیہ صرف اپنے بچے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے؟ اپنے بچے کے سوا اسے اور کسی بات کی نہ فکر ہے، اس بچے کو حاصل کرنے کے لیے ہی وہ متصل گاؤں گئی تھی، اسی خاطر اس نے لاکھو کو قتل کرنے کے بعد ہمارے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا، یہ بات تو ہمیں بھی معلوم ہو چکی تھی لاکھو لاشاری کی بیوی ہی کہ اس نے بچے کو کراچی میں اپنے کسی عزیز یا دوست کے پاس رکھا ہوا ہے۔ آسیہ نے وہاں رہ کر یہ پتا کر لیا ہوگا کہ بچہ کراچی میں کس کے پاس اور کس جگہ ہے۔ یہ پتا لگانے کے بعد ہی وہ کراچی آئی ہے۔ اب یہی پتا کرنا ہے ہمیں بھی وہاں جا کر کہ آسیہ کا بچہ یہاں کس کے پاس ہے۔ یہ سمجھ لو جہاں اس کا بچہ ہے وہیں کہیں آسیہ بھی ہوگی، بچے کے پاس یا اس کے قرب و جوار میں، ایک بار اس جگہ پہنچ جانے کے بعد آسیہ کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ ہوگا ہمارے لیے۔"

"ہوں" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "یار تو نے ٹھیک ہی کہی ہے بات۔ مجھے تو اس کا دھیان ہی نہیں آیا تھا اب تک۔ وہاں وہ بھی موجود ہے یار، وہی اپنا یار جمیل، وہ ہماری مدد کرنے سے کبھی انکار نہیں کرے گا۔ البتہ ایک خطرہ ہے، پچھلی بار جب ہم وہاں گئے تھے تو ہم نے وہاں کے تھانیدار کو اپنی جان کا دشمن بنا لیا تھا۔ اس سے اگر سامنا ہو گیا کہیں تو پھر ہمیں وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو جائے گا اور اگر ہم ہاتھ لگ گئے اس کے تو پھر دوبارہ آسمان نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"ہاں یہ ذرا سی فکر والی بات تو ہے لیکن مجھے امید ہے وہ لوگ ہماری طرف سے ناامید ہو کر ہمیں بھول چکے ہوں گے اب تک اور پھر یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا، اگر آسیہ کو ڈھونڈ نکالنا ہے تو یہ رسک ضرور لینا ہوگا۔" آبی نے کہا۔

"ٹھیک ہے یار! وہ آئزک تو سالا ہم سے ڈر کر اپنے حصار کھینچ کر بیٹھ گیا ہے۔ ابھی چند دنوں تک ہمارا اس تک پہنچنا ممکن نہیں رہا ہے لہٰذا اس دوران ہم کام نمٹا آتے ہیں نشکارپور کا۔ کل ماں جی کے آنے کے بعد ہم روانہ ہو جائیں اُدھر۔" میں

اس دوران ہم شرافت علی کے مکان کے قریب آ پہنچے تھے۔ میں نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی اور گہری نظروں سے اور اس کے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے رکے بغیر نکلا چلا گیا۔ وہاں مجھے کسی گڑبڑ کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ ہر سو مکمل خاموشی تھی۔ پاس پڑوس کے مکانوں کے کئی دربان گیٹ کے باہر کھڑے یا بیٹھے ہوئے جس طرح مطمئن اور بے فکر دکھائی دے رہے تھے، اسے دیکھ کر تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہاں کسی طرح کی کوئی بدامنی کبھی ہوئی ہوگی کبھی۔ میں نے ایک مکان کے سامنے کھڑے ہوئے دربان کے قریب گاڑی روک کر اس سے پوچھا "کیوں بھئی، یہاں کوئی شرافت علی صاحب بھی رہتے ہیں؟"

اس نے شرافت علی کے مکان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ جناب اپ نے اس کا مکان پیچھے چھوڑ دیا ہے، مگر اس ٹیم تو اس مکان میں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ملے گا ادھر آپ کو۔"

"کیوں؟ کیا شرافت علی صاحب اپنے بال بچوں کے ساتھ کہیں گئے ہوئے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"بس صاب کیا بتائے ہم آپ کو۔ ایسا لگتا ہے کسی نے نظر لگا دی ان کو۔ اس کا گھر دکھایا ہوا ہے ابھی کچھ دن پہلے بھی رات کے وقت ڈاکو آئے تھے اس کے گھر۔ اس روز کچھ جی دار قسم کے مہمان آئے ہوئے تھے شرافت سیٹھ کے گھر میں۔ ان لوگوں نے ڈاکوؤں کو مار بھگا دیا تھا۔ کئی ڈاکو مار بھی دیے تھے انہوں نے۔ آج شاید وہ اس دن کا بدلہ لینے کے واسطے ہی آئے تھے۔ اس ٹیم شرافت سیٹھ اکیلا تھا گھر میں اور ایک اس کا چوکیدار تھا بس۔ مگر سیٹھ نے خوب مقابلہ کیا ڈاکوؤں کا۔ اس ٹیم تین آدمی ادھر سے گزر رہے ایک کار میں، انہوں نے دیکھا کہ بہت سے ڈاکو سیٹھ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دنادن گولیاں چل رہی ہیں تو صاب وہ تینوں بھی اسٹین گنیں اپنی کار سے نکال کر ڈاکوؤں پر چڑھ دوڑے۔ کئی ڈاکو زخمی ہو گئے اور پھر بھاگنا ہی پڑا جی انہیں۔"

"اچھا، اتنا کچھ ہو چکا ہے یہاں، پھر تو بڑا ہنگامہ رہا ہوگا یار! لیکن اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کبھی یہاں! ماحول میں ذرا سی بھی تو کشیدگی کے آثار نظر نہیں آتے! یہ سب کچھ کس وقت ہوا تھا بھئی؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہنگامہ تو جی کوئی ایک گھنٹے تک ہوتا رہا تھا پھر پولیس آگئی تھی، ابھی کوئی آدھے گھنٹے پہلے ہی گئی وہ۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر آبی کو دیکھا۔ وہ بولا "اس کا مطلب ہے اب یہاں کوئی نہیں مل سکے گا۔ شرافت علی بھی نہیں ہوگا شاید۔"

"ہاں جی، وہ بھی پولیس کے جاتے ہی چلے گئے تھے، پھر میں نے تو واپس آتے ہوئے دیکھا نہیں انہیں۔" چوکیدار فوراً بولا۔

"ٹھیک ہے بھائی! شکریہ بہت بہت تمہارا۔ تم نے بڑی مدد کی ہے یار ہماری ورنہ شاید ہمیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔" میں نے چوکیدار سے کہا اور کار آگے بڑھاتے ہوئے آبی سے بولا۔ "اب تو ہمیں واپس ہی چلنا چاہیے۔ کیوں پیرزادہ صاحب! کیا خیال ہے آپ کا؟"

آبی بولا "ہاں ہاشم خان صاحب! بالکل صحیح سوچا ہے آپ نے، چلیں واپس ہی چلیں اب۔ مگر یہ ہوا بہت برا ہے۔"

میں نے کار واپسی کے لیے موڑ لی، مگر فیروز کے گھر کی طرف جانے کے بجائے میں نے اسے پرانا گولی مار کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ آبی مجھے اس طرف جاتے دیکھ کر بولا "یہ اب کدھر کا ارادہ کر لیا ہے تو نے؟ کیا کوئی اور کام یاد آگیا ہے اس وقت تجھے؟"

"ہاں وہ لڑکی نے ایک پتا بتایا ہے آج ہی مجھے۔ میں نے سوچا جب گھر سے نکلے ہی ہیں تو اس کی بھی تصدیق کرتے ہی چلیں کیونکہ اگر لڑکی کی اطلاع درست ہے تو ہمیں وہاں بھی پہنچنا ہی پڑے گا کسی روز۔ چنانچہ اس کے بارے میں معلومات بھی کر لیں تو اچھا ہی ہے۔"

"اچھا کوئی بہت اہم جگہ ہے وہ، کیا آئزک وغیرہ کے استعمال میں رہتی ہے وہ جگہ بھی؟" آبی نے سوال کیا۔

"ان کے استعمال میں براہِ راست تو نہیں رہتی لیکن وہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہمارے اور ہمارے ملک و قوم کے مفاد کے خلاف اور یہودیوں اور اسرائیل کے مفاد میں ہے۔ وہاں کے کرتا دھرتا وہی کچھ کر رہے ہیں جو اسرائیلی کر رہے ہیں یہاں۔ اس اعتبار سے وہ بھی اسرائیل کے ایجنٹ ہی ہیں اور ممکن ہے آئزک ہی سے تعلق ہو ان کا بھی ورنہ لڑکی اس کا پتا کیوں بتاتی؟" میں نے کہا۔

"پھر تو ضرور چل یار ادھر۔ دیکھنا تو چاہیے ہمیں بھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جو جان بوجھ کر یا انجانے میں محض تھوڑے سے مالی مفاد کی خاطر اسرائیل کے مذموم مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہیں؟" آبی نے دکھ سے کہا۔

بسم اللہ ہوٹل سے تھوڑا پہلے ہی میں نے اپنی کار ایک طرف لگا کے کھڑی کر دی اور انجن بند کر کے نیچے اترتے ہوئے آبی سے کہا "آ بھئی باہر آجا تو بھی، کار یہیں چھوڑ کر آگے پیدل چلیں گے اب۔ بسم اللہ ہوٹل کے پیچھے ایک گلی میں جانا ہے ہمیں۔"

آبی کار سے باہر آکر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "یہ بسم اللہ ہوٹل ہے کس جگہ، کیا تو پہلے آ چکا ہے یہاں؟"

"آیا تو نہیں ہوں میں پہلے کبھی مگر اس علاقے کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے مجھے اس کے مطابق بسم اللہ ہوٹل ادھر آس پاس ہی کہیں ہونا چاہیے۔ چلو تھوڑا آگے چل کر کسی سے پتا کر لیں گے۔ مشہور جگہ ہے، اسے ڈھونڈنے میں خوار نہیں ہونا پڑے گا زیادہ۔" میں نے کہا۔

کار کے شیشے چڑھا کے اور دروازے لاک کر کے ہم آگے چل دیے۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک راہ گیر سے میں نے بسم اللہ ہوٹل کے بارے میں معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑا سا آگے جا کر جو پہلا بس اسٹاپ آئے گا وہی بسم اللہ ہوٹل کا اسٹاپ ہے۔ میں نے پوچھا "ارے تو اس بس اسٹاپ کا نام بسم اللہ ہے؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ بسم اللہ ہوٹل سچ مچ کا ہوٹل ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟"

"آپ کو ٹھیک بتایا ہے جی. بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بسم اللہ ہوٹل بھی موجود ہے، آپ میرے ساتھ آجائیں میں بتا دوں گا۔"

ہم دونوں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ چلتے چلتے بولا "بسم اللہ ہوٹل پر کسی سے ملنا ہے آپ کو یا گھر جانا ہے کسی کے؟"

میں نے کہا "نہیں یار، نہ ملنا ہے کسی سے اور نہ ہی کسی کے گھر جانا ہے، سنا ہے ادھر وی سی آر پر بڑی زبردست فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ انڈین، پاکستانی اور انگریزی زبان کی ایسی فلمیں جو اگر سنسر کے لیے پیش کی جائیں تو سنسر بورڈ کبھی اجازت نہ دے انہیں چلانے کی۔"

وہ ہنس کر بولا "اچھا تو یہ بات ہے، شوقین مزاج لوگ ہیں آپ۔ ہاں جی، یہاں تو زبردست فلمیں چلتی ہیں، بہت دور دور سے لوگ آتے ہیں یہاں اور پینتالیس پچاس منٹ کی فلم دیکھنے کے لیے پچیس پچیس اور تیس تیس روپے کے ٹکٹ خریدتے ہیں۔"

"اچھا! اتنا مہنگا ٹکٹ ہوتا ہے اس کا! یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی، آخر منتظمین والوں کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے جی! پانچ ہزار روپے ہر ہفتے پہنچانا ہوتے ہیں حاجی کو پھر اس کے اپنے آدمیوں کا بھی خرچہ ہے، کوئی پندرہ سولہ آدمی اس نے رکھے ہوئے ہیں انہیں دہاڑی بھی دینا ہوتی ہے، یہ سارا خرچہ اسی سے نکلتا ہے جی!"

"ہاں یار! ایسا تو ہے، اس کے بغیر آدمی کوئی ایسا دھندا کیسے کر سکتا ہے؟ کبھی چھاپا واپا تو نہیں پڑتا نا ادھر؟ کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا؟"

"نا جی! خطرہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حاجی اس بات کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم کو بھتہ بڑھانا ہو تو ہم کو بولو مگر کبھی چھاپا واپا نہیں ڈالو، ایسے ہماری گراہکی خراب ہوتی ہے۔ یوں تو شہر میں بہت سی جگہ یہ دھندا ہوتا ہے۔ ادھر ٹکٹ بھی چار پانچ روپے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر ادھر کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ وہاں کسی وقت بھی چھاپا ڈال سکتی ہے پولیس۔ ادھر ایسا نہیں ہوتا، اسی بات کا پیسا ہوتا ہے۔"

اس نے ہمیں بسم اللہ ہوٹل پہنچا کر اس گلی کی بھی نشاندہی کر دی جہاں حاجی کا پرائیویٹ سینما ہال قائم تھا۔ اس تنگ سی گلی میں صرف بنگالی ہی آباد تھے۔ البتہ ایک مکان ایسا تھا جہاں کچھ بلوچ یا مکرانی عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ ذرا آگے ایک قدرے کشادہ جگہ تھی جہاں بہت سی بائیک کھڑی ہوئی تھیں، ایک دیوار کو بلیک بورڈ کی طرح سیاہ کر کے اس پر سفید چاک سے آج کا پروگرام لکھا تھا، وہیں دو لڑکے ہاتھوں میں کچھ کارڈ لیے کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا "پچیس روپیہ پچیس روپیہ۔ شاندار پروگرام شروع ہونے والا" میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ کچھ آگے گلی ختم ہو جاتی تھی۔ عین اس جگہ جہاں گلی کا اختتام ہوتا تھا، ایک لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک شخص بیٹھا تھا اور ایک اور شخص گلی کے کونے پر لگے نل کے پاس بیٹھا تھا جیسے نل سے پانی لینے آیا ہو۔ گیٹ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے ہمارے قریب پہنچتے ہی آہستہ سے کہا "جلدی کرو، جلدی کرو جوان! پروگرام چالو ہونے والا ہے۔"

میں نے اس کے اشارے پر گیٹ میں جھانکا۔ اندر بہت ساری کوٹھریاں دکھائی دے رہی تھیں، ایک تنگ سی گلی کے دونوں طرف۔ گلی کے سرے پر بہت سارے لوگ قطار باندھے کھڑے تھے اور دو آدمی لکڑی کی ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ پتا یہ چلا کہ بنچ پر بیٹھے ہوئے افراد ٹکٹ فروخت کر رہے ہیں اور قطار باندھے کھڑے ہوئے لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ اندر چلنے والی فلم ختم ہو اور تماشائی باہر نکل جائیں تو وہ اندر جا کر بیٹھیں۔ میں نے ایک دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا جس کے سامنے یہ قطار لگی تھی۔ اندر دری کے فرش پر بہت سے لوگ بیٹھے نظر آئے جو ایک طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ اندر سے فلم چلنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبی بنچ پر چھ سات تنومند سے افراد براجمان تھے، ان کی شکلوں سے ظاہر تھا کہ وہ سب قانون کے محافظ تھے۔ حالانکہ ان کے جسموں پر سرکاری لباس نہیں تھے لیکن انہیں دیکھ کر پہچان لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہاں بھی دیواریں بلیک بورڈ بنی ہوئی تھیں اور چاروں طرف ہفتے بھر کے سارے پروگرام کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔

میں بظاہر دیواری اشتہارات پڑھ رہا تھا لیکن میری نظریں چاروں طرف کسی ایسے شخص کو تلاش کر رہی تھیں جسے اس کاروبار کا مالک سمجھا جا سکے۔ گویا وہاں سات آٹھ ایسے آدمی موجود تھے جو کاروبار سے منسلک معلوم ہوتے تھے مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس پر حاجی ہونے کا شبہ ہو سکتا۔ میں ان سب کی شکلوں کو ذہن نشین کر کے آبی کو اشارہ کرتے ہوئے باہر کی طرف چل دیا۔

میں نے اپنی کار کے قریب پہنچ کر دروازے کا لاک کھولنے کے لیے چابی والا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "اوئے کیدر بھی، کیدر جانے کا ہے تم کو؟ بہوت جلدی کرتا پڑا ہے یار تم تو۔ جرا ایدر ہم سے ملاکات کرو۔"

میں نے چونک کر اپنے مخاطب کو دیکھا۔ ایک چھ فٹ کا سیاہ فام شخص جسے میں نے حاجی کے اڈے والی گلی سے نکلتے ہوئے ایک بنگالی پان والے کی دکان پر کھڑے دیکھا تھا، میرے سامنے کھڑا تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور تھا، اسے میں نے گلی کے کونے پر نل کے پاس بیٹھا دیکھا تھا۔ کچھ دور سڑک کے دوسری طرف انہی دونوں جیسے دو آدمی اور کھڑے تھے جو نہایت ہی دلچسپی کی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے مخاطب سے نرم لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے؟ تم کون ہو؟ پہچانا نہیں میں نے۔"

"اسی واسطے تو آیا ہوں ہم تمہارے پیچھے پیچھے کہ اپنی پہچان کرا دے تم لوگ کو۔ پہلے تم بولو ایدر کیا لینے آیا تھا؟"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا اس طرف آنے پر کوئی پابندی لگی ہے؟ اگر ایسا ہے تو معاف کرنا بھائی، مجھے پتا نہیں تھا اس بات کا۔"

"اچھا تم کو سمجھ نہیں آیا ہم کیا بولتا ہوں؟ بچہ ہے تم بالکل۔ ارے ہم بولتا ہوں تم اودر کیا لینے گیا تھا؟" وہ ایک دم بگڑ کر بولا۔

"ادھر یعنی تمہارا مطلب ہے وہاں جہاں فلمیں چل رہی ہیں، اس چھوٹے سے سینما ہال میں؟" میں نے سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں کہا۔ "ہم لوگ آج کا پروگرام دیکھنے گئے تھے ادھر۔ کمال ہے یار! اس سے پہلے تو کبھی کسی نے ہم سے نہیں پوچھا کہ یہاں کیوں آئے ہو، پھر آج کون سی نئی بات ہو گئی ہے جو تم ہم سے اس طرح پوچھ گچھ کر رہے ہو؟"

میں نے اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں ان کا پرانا اور مستقل گاہک ہوں، ہر روز نہیں تو اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں۔ میری اس بات نے اس کے چہرے کی سختی دور کر دی تھی، وہ کچھ سوچنے لگا تھا مگر اس کے ساتھ جو دوسرا شخص تھا وہ بہت کائیاں تھا۔ جلدی سے بولا "استاد! ماں کسم سالا ایک دم جھوٹ بولتا پڑا ہے۔ آج سے پہلے تو اپن نے اس کا چوکھٹا نئیں دیکھا ایدر۔" پھر وہ مجھ سے بولا "سچ سچ بول دو تم کائے کو آیا تھا ایدر، نئیں تو سمجھ لو اپن آدمی بہوت خراب ہے، ایک ہاتھ میں یہ پھر ما کھراب کر دیگا تیرا۔"

میں نے اس مچھندر کو غور سے دیکھا جو ایک ہاتھ میں میرا چہرہ بگاڑ دینے کا دعویٰ کر رہا تھا اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "بکواس نہیں کرو اوئے، میں تم سے نرمی سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ڈرتا ہوں تم سے۔ شرافت سے زبان سنبھال کر بات کرو۔"

وہ سیاہ فام شخص جس نے میرا کندھا پکڑ کر روکا تھا مجھے ایک دم مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرا گریبان پکڑ کر غصّے سے کہا "شراپھت کا بچہ! سالا رعب دکھاتا ہے، ابھی باہر کر دیں گا۔ یہ مت سمجھنا تیری کار

بدنام ترین مُجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمّل تفصیل

قیمت ۲۰ روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بُک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

دیکھ کے رعب میں آجائیں گے۔ بول کاہے کو آیا تھا ادھر؟"

اس کی اس حرکت پر میری بھی کھوپڑی گھوم جانا چاہیے تھی مگر میں نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے خود پر قابو رکھا اور نرمی سے بولا "تم تو یار خواہ مخواہ ناراض ہوتے، ہو پہلوان۔ چھوڑو، میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے۔"

اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ اس دوران وہاں کچھ راہ گیر جمع ہو گئے تھے۔ اس نے ان کی طرف مڑ کر تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "او ئے تم لوگ کاہے کو کھڑے ہو، چلو بھاگو سالے لوگ، کیا ڈانس ہونا پڑا ہے ادھر؟" یہ کہہ کر وہ ان کی طرف لپکا۔

تمام لوگ ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ پھر میری طرف مڑ گیا "ہاں بولو کیا بولتا ہے تم؟"

اس اثنا میں میں اور آبی آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کر چکے تھے لہٰذا جیسے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا میں نے اچانک پوری طاقت سے اس کے پیٹ میں گھٹنا دے مارا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز نکال کر نیچے جھکا تو میں نے اسی گھٹنے سے دوسری ضرب اس کے چہرے پر لگائی، وہ الٹ کر پیچھے جا پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے میری طرف بڑھنا چاہا تو اسے آبی نے سنبھال لیا، میرا مقابل اس کے مقابلے میں زیادہ جان دار اور پھرتیلا تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا بھاری بھرکم آدمی تھا، اس کا پیٹ کسی مشک کی طرح پھولا ہوا تھا۔ کسی ایسے شخص سے آنی پھرتی اور تیزی طراری کی توقع نہیں کی جاتی۔ وہ نیچے گرتے ہی لوٹ لگا کر اٹھ گیا تھا مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ کس سے ہے۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی جھپٹ کر اس کا دایاں ہاتھ پکڑا اور اپنے مخصوص انداز میں اس پر دباؤ ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ کٹ کی ہلکی سی مانوس آواز کے ساتھ ہی اس کے حلق سے تیز کراہ نکلی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر اس کی طرف پلٹ گیا جس سے آبی برسرِپیکار تھا۔ وہ آج ہی بستر سے اٹھا تھا اور اس کے پاؤں کا زخم بھی ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ جتنی دیر میں میں نے اپنے مدمقابل کو زیر کیا تھا اتنی ہی دیر میں وہ بھی اپنے مقابل کو زمین پر لٹا چکا تھا۔ وہ اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑے زمین پر لوٹ رہا تھا اور میرا مقابل اپنے ہاتھ کو دونوں رانوں میں دبائے بیٹھا عجیب سے ناقابلِ یقین انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

عین اسی وقت میری نظر سڑک کے اس پار اٹھ گئی، جہاں میں نے ان دونوں کے دو اور ساتھیوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ مجھے بہت دیر میں ان کا خیال آیا، وہ اتنی دیر میں بالکل ہمارے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں لمبے پھل والے چمک دار چاقو دبے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً آبی کو آواز دے کر کہا "آبی ہوشیار، ان کے پاس چاقو ہیں۔"

آبی انہیں مجھ سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور اس سے پہلے وہ ہم تک پہنچتے، اس نے اپنی جیب سے پستول نکال کر انہیں للکارا "خبردار! اگر کوئی قریب آیا ہمارے تو گولی مار دوں گا اسے۔"

آبی کی للکار سن کر وہ دونوں جہاں تھے، ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔ آبی نے انہیں کور کر کے مجھ سے کہا "دروازہ کھول جیلانی! جلدی سے نکل چل یہاں سے، ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ہماری راہ روکنے کی کوشش کی تو میں گولی مار دوں گا اسے۔"

میں نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر گھس کر دوسری سیٹ کا دروازہ آبی کے لیے کھول دیا۔ وہ پستول ان دونوں کی طرف سیدھا کیے ہوئے پچھلی سیٹ پر دھنس گیا تو میں نے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور تیزی سے لمبا چکر کاٹ کر اسے واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ ہمارا پیچھا کر سکتے لہٰذا وہ اپنی جگہ کھڑے بے بسی کے عالم میں ہمیں واپس جاتے ہوئے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔ میں گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا چند ہی لمحوں میں اس علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ ان کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد آبی نے پستول دوبارہ اپنی جیب میں ڈال کر کہا "خدا کا شکر ہے یار! میں نے چلتے وقت بس احتیاطاً ہی یہ پستول جیب میں ڈال لیا تھا جو اس وقت کام آگیا۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ تیرا کیا خیال ہے، ہم گھر سے شرافت ہی کے بارے میں سن کر نکلے تھے تو کیا میں بس یونہی خالی ہاتھ پیر ہی سے نکل پڑا تھا ایسے خطرناک کام کے لیے۔ ہماری کار میں اسٹین گنیں بھی موجود ہیں اور ریوالور بھی۔ غلطی مجھ سے یہ ہو گئی کہ اس حاجی بدمعاش کی طرف جاتے ہوئے کوئی ریوالور تک ساتھ نہیں لے گیا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے ہمیں۔"

"مگر اب مجھے ایسی حماقت کرنے کی عادت نہیں رہی ہے، تجربات نے یہ سبق دیا ہے کہ جب بھی گھر سے نکلو، اپنا ہتھیار ساتھ لے لو، برائی کبھی اجازت لے کر نہیں آتی۔ وقت کی رفتار کسی وقت بھی بدل سکتی ہے، لہٰذا آدمی کو بُرے وقت کا سامنا کرنے کو تیار رہنا چاہیے ہمیشہ۔"

"یہ اچھی عادت ہے۔ تیری اس عادت نے اس وقت ہمیں بہت سی آفات سے بچا لیا ہے ورنہ پتا نہیں کب نجات ملتی ان سے۔" وہ بولا۔

"مگر یار جیلانی! ایک بات سمجھ نہیں سکا ہوں میں، یہ سارے لوگ جو اس اڈے میں دیکھے تھے ہم نے اور جن سے واسطہ پڑا تھا، وہ سب کے سب تو مقامی ہی تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا جس پر کہیں باہر کا ہونے کا گمان بھی گزرتا ہو۔ پھر یہ آئزک کس طرح انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہو گا؟ کہیں تم غلطی سے کسی اور جگہ تو نہیں پہنچ گئے تھے؟" آبی نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"نہیں، ہم پہنچے تو بالکل صحیح جگہ پر تھے۔ میرا خیال ہے اس کا یہ غنڈہ حاجی جو منشیات کا کاروبار بھی کرتا ہے اس کا تعلق آئزک یا اس کے کسی قریبی آدمی سے ہے وہ اس کے ذریعے صرف منشیات کو عام کرنے اور نوجوانوں کا اخلاق اور کردار بگاڑنے کا کام کر رہے ہیں، انہیں منشیات اور دیگر تمام غلاظتیں وہیں سے پہنچائی جاتی ہیں، اور یہ جاہل، بدقماش لوگ نتائج سے بے خبر محض روپیہ کمانے کی خاطر نادانستہ طور پر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ ان میں اتنا شعور ہی کہاں ہے کہ یہ اس کے خوف ناک نتائج کو سمجھ سکیں۔"

"ہاں یار! یہ بات تو ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک ہم بھی ایسے ہی بے شعور تھے۔ ہمیں بھی کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔" آبی بولا۔

"اس کی وجہ ہمارا ماحول ہے، چونکہ ہمارے ملک کی اکثریت ناخواندہ اور بے شعور ہے چنانچہ وہ پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں کو بھی اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ دیوانوں کے ہجوم میں دو چار فرزانے اگر گھس بھی جائیں کسی طرح تو وہ انہیں بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں۔"

باتوں کے دوران ہم دونوں میں سے کسی کو بھی یہ احساس تک نہ ہو سکا کہ کب ہمارے دائیں بائیں دو جیپیں ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگی ہیں۔ پتا تو مجھے اس وقت چلا جب سامنے سے آنے والی ایک بس کے ڈرائیور نے راستہ نہ پا کر زور زور سے ہارن بجانا شروع کیا۔ میں نے چونک کر اسے راستہ دینے کے لیے اپنی گاڑی ایک طرف کرنا چاہی تو میری نظر اس جیپ پر پڑی جو ادھر سے میری کار کو اوورٹیک کر رہی تھی۔ میں نے اسے گزر جانے کا موقع دینے کے لیے کار کی رفتار کم کر دی۔ جیپ میرے قریب سے گزر کر آگے نکلنے کے بعد میری کار کے بالکل سامنے آگئی اور اس کی رفتار تیزی سے کم ہونے لگی۔ اسی وقت دوسری طرف سے کسی نے گرج دار آواز میں کہا "اڑے گاڑی روکو رستم کا بچہ نئیں تو ٹکر مار کے کلٹی کر دیں گا ابی ادھر ہی۔" میں اور آبی دونوں ہی آگے والی جیپ کی طرف متوجہ تھے،

اس طرف سے آواز سن کر ہم نے ادھر دیکھا، اس جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ تین نہایت تندرست و توانا چھ چھ فٹ کے سیاہ فام حبشی رائفلیں پکڑے بیٹھے تھے۔ انہی میں سے ایک نے مخاطب کیا تھا مجھے۔ آگے جانے والی جیپ میں مجھے وہ شخص نظر آگیا تھا جسے آبی نے زمین پر لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں نے فوراً آبی سے کہا "لے بھئی آبی! یہ آگئے ہیں ہمیں روکنے کے لیے اور اس بار مقابلہ زیادہ سخت لگ رہا ہے مجھے، یہ اسٹین گن سنبھال تو، میں ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے پیروں کے پاس پڑی ہوئی دو اسٹین گنوں میں سے ایک اٹھا کر آبی کی طرف سرکا دی۔

اس نے اسٹین گن ہاتھ میں آتے ہی چیتے کی سی تیزی کے ساتھ اس کی نال کار کی کھڑکی پر رکھ کر گولیاں برسانا شروع کر دیں برابر والی جیپ پر۔ میں نے انہیں یہ تاثر دینے کے لیے کہ میں ان کی دھمکی سے مرعوب ہو کر اپنی گاڑی روک رہا ہوں، کار کی رفتار کم کرتے ہوئے اسے فٹ پاتھ کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ میری اس چال میں آگئے تھے، انہوں نے جیپ کو ایک دم بریک لگائے اور میری کار کے پیچھے چلے گئے تھے۔ عین اس وقت آبی نے فائر کھول دیا تھا ان پر، آبی کی چلائی ہوئی گولیاں جیپ کے سامنے کا شیشہ توڑ کر ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے سینے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ شکر یہ ہوا کہ اس وقت تک جیپ بہت آہستہ ہو چکی تھی اور گولی کھانے کے بعد ڈرائیور کا پیر بریک پر ہی جم کر رہ گیا تھا ورنہ اس سمے اس بھری پُری سڑک پر وہ جیپ تباہی مچا کر رکھ دیتی۔ جیپ پر سوار بقیہ دونوں آدمی چھلانگیں لگا کر جیپ سے کود پڑے اور تیزی سے انہوں نے جیپ کے پیچھے جا کر پوزیشن لے لی۔ میں نے بھی فوراً کار روک کر دوسری اسٹین گن اٹھالی تھی۔ آگے والی جیپ میں صرف دو ہی آدمی تھے۔ گولیوں کی آواز سن کر وہ شاید یہ سمجھے تھے کہ ان کے ساتھیوں نے ہماری کار روکنے کے لیے ہم پر گولیاں چلائی ہیں چنانچہ وہ اپنی جیپ روک کر جلدی جلدی نیچے کود دے اور ہماری کار کی طرف بڑھنے لگے۔ ان دونوں نے ریوالور پکڑ رکھے تھے اپنے ہاتھوں میں۔ میں نے آبی سے کہا "تو پیچھے والوں کو دیکھ آبی! میں ان سامنے والوں سے نمٹتا ہوں۔"

انہوں نے ہماری کار کے آگے پیچھے اس طرح جیپیں لگا رکھی تھیں کہ میرے لیے کار کو آگے یا پیچھے لے جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں ہماری کار کے دونوں طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سمجھ وہ یہی رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھیوں کی فائرنگ نے ہمیں خوف زدہ کر کے سہما دیا ہے اور ہم دونوں سے

سکتے کے سے عالم میں بے حس و حرکت بیٹھے رہ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ بے خوف و خطر ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ریوالور نکال کر تیزی سے ہاتھ کھڑکی کے باہر نکالا اور اس سے پہلے کہ اس طرف سے آنے والا میرے ارادے کو سمجھ سکتا میں نے اس پہ گولی داغ دی۔ اس کے پیٹ سے ایک دم خون اُبلنے لگا، وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام کر دُہرا ہو گیا۔ عین اسی لمحے آبی نے اسے نشانہ بنایا جو دوسری طرف سے آ رہا تھا۔ میں نے اسے گولی کھاتے ہی اچھل کر نیچے گرتے دیکھا۔ اسی وقت پیچھے والی جیپ کی آڑ سے دو فائر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری کار کا پچھلا حصہ تیزی سے نیچے بیٹھنے لگا، انہوں نے کار کے پچھلے دونوں ٹائر پھاڑ ڈالے تھے۔

آبی ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ "بے بھئی جیلانی! یہ ہمیں جان سے مارے بغیر چھوڑیں گے نہیں اب۔ بھاگنے کا راستہ تو بند ہی کر دیا ہے انہوں نے۔"

"ہاں یار! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ارادے ان کے بالکل بھی اچھے معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ گناہوں کی معافی مانگ لے اپنے، ابھی وقت ہے تیرے پاس اور توبہ کا دروازہ بھی بند نہیں ہوا ہے ابھی۔ میں ان سے کہہ دیتا ہوں، اتنی مہلت اور دے دیں گے وہ تجھے۔"

"بس نیئں اوئے۔ ایسے وقت میں بھی تجھے دل لگی سوجھ رہی ہے۔ خود کو بڑا پھنے خان کا سالا سمجھتا ہے تو۔" آبی جھنجلا کر بولا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "وقت سے پہلے ہی تیری جان کیوں نکلی جا رہی ہے یار! ذرا سنبھل کر بیٹھ اور اسٹین گن سیدھی رکھ اپنی۔ میں کار کو ریورس کر کے پیچھے والی جیپ کے ساتھ لگا رہا ہوں۔ پھر اس سے جیپ کو بھی پیچھے دھکیلنا شروع کروں گا، اس طرح وہ دونوں جنہوں نے جیپ کے پیچھے مورچا بنا رکھا ہے باہر نکلنے پہ مجبور ہو جائیں گے، تو انہیں دیکھتے ہی ان کی ٹانگوں پہ گولیاں چلا دینا، کوشش کرنا جان سے نہ مریں یار! پہلے ہی چار آدمی ٹھنڈے کر دیے ہیں ہم نے۔ تجھے تو لگتا ہے انسانی جانوں کی بالکل پروا ہی نہیں ہے۔"

"اوئے چپ کر جا مبلغِ انسانیت، بڑا دوست بنتا ہے انسانوں کا۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ رعایت کی جائے کوئی؟ انہیں تو میں اس پاک سرزمین میں سانس لینے کا حق بھی نہیں دے سکتا۔" آبی نے مشتعل ہو کر غضب ناک انداز میں کہا۔

میں نے اس سے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور کار کو ریورس کر کے جیپ کے ساتھ لگا دیا۔ پھر ایک جھٹکے سے جیپ کو پیچھے دھکیلا، جیپ جھٹکا کھا کر رہ گئی۔ ایسا لگا تھا جیسے جیپ کے پچھلے پہیوں کے ساتھ کوئی چیز لگا کر اسے پیچھے ہٹنے سے روک دیا گیا ہے۔ میں نے دوبارہ زیادہ زور دار جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ جیپ پیچھے ہٹتی چلی گئی، مگر یوں لگا تھا جیسے اس کا ایک پہیہ کسی چیز کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ میں نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا۔ ان دونوں میں سے ایک لوٹ لگا کر جیپ کے نیچے سے نکل کر اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا کر بیٹھ گیا تھا۔ شاید جیپ کا پہیہ اس کے ہاتھ پر سے گزر گیا تھا۔ میں تیزی سے کار کو ریورس کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچا۔ وہ جیسے ہی میری طرف کے دروازے کے سامنے آیا، میں نے اچانک پوری قوت سے دروازہ کھول دیا۔ اس شدید ٹکر نے اسے زمین پر گرا دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی اس دوران آبی کے سامنے آ چکا تھا، چنانچہ آبی نے اسے دیکھتے ہی گولی چلا دی تھی۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کا انجام جاننے کی کوشش کرتا۔ میں نے تیزی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل کر آگے والی جیپ کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہمارے پیچھے کئی گاڑیاں راستہ نہ ملنے کی وجہ سے کھڑی ہو گئیں تھیں اور سامنے سے آنے والا ٹریفک بھی رکنے لگا تھا۔ بہت سے پیدل چلنے والے لوگ دونوں طرف فٹ پاتھوں پر جمع ہو گئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی طرف بھی توجہ نہیں دی اور اسٹین گن اٹھائے بھاگتا ہوا جا کر آگے والی جیپ میں چڑھ گیا۔ میں وہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ اس وقت رات کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ اسٹریٹ لائٹیں روشن ہو چکی تھیں۔ یہ سڑک بے حد مصروف نظر آ رہی تھی اور مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر ایک منٹ بھی ہم اور یہاں رُکے رہے تو ہمارے لیے یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ٹریفک کا اتنا ازدحام ہو چکا ہو گا کہ ہم اس میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آبی کو بلانے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے بھی موجودہ صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ تھا لہٰذا وہ بھی میرے پیچھے ہی پیچھے کار سے نکل آیا تھا، اسے دیکھتے ہی میں نے جیپ کو آگے بڑھا دیا۔ آبی لپک کر جیپ میں چڑھ گیا اور میں نے ایک جھٹکے سے جیپ کو آگے دوڑا دیا۔ میں اس کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس لمحے مجھے اس کے سوا کسی بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے اس جگہ سے دور نکل جائیں ہم۔ پھر جیسے ہی میں ایک چوراہے پر پہنچا میں نے بائیں طرف والی سڑک پہ تیزی سے جیپ موڑ دی، اور اس کی رفتار کم کیے بغیر اسے بھگاتا چلا گیا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے اس سڑک پہ کہ آبی مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "اوئے یار جیلانی! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آج کا دن ہمارے نئی نئی مشکلات

سے دوچار ہونے کا دن ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ "کیوں؟ ایسا کیوں کہہ رہے ہو بھئی تو؟ کیا کوئی اور افتاد دکھائی دے گئی ہے تجھے؟"

"ہاں شاید تجھ سے ٹریفک کے کسی قاعدے کی خلاف ورزی ہو گئی ہے، ایک ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اوئے یار! یہ کون سی نئی مصیبت لگ گئی ہے ہمارے پیچھے۔ اس سے جان چھڑانا آسان کام نہیں ہے یار!"

"تو فکر نہ کر یار! میں کوشش کروں گا کچھ دے دلا کے اسے ٹالنے کی، گاڑی ایک طرف لگا لے تاکہ میں بات کر لوں اس سے۔" آبی نے کہا۔

"نہیں یار! گاڑی روکنا ٹھیک نہیں ہے ابھی، اگر یہ تیری بات نہیں مانا اور تکرار کرنے لگا تو کوئی اور آفت نہ آ پڑے سر پہ ہمارے۔" میں بولا۔

"پھر یوں کر کسی کم چلنے والی سڑک پہ گاڑی موڑ لے جہاں روشنی بھی زیادہ نہ ہو، میں اس کے بدن میں بھی دو چار گولیاں اتار دیتا ہوں۔"

"اوئے چپ کر یار! تیرے سر پہ تو ہر دم گولیاں ہی مسلط رہتی ہیں، ہر مسئلے کا حل گولیوں ہی میں نظر آتا ہے تجھے۔"

"اچھا پھر یوں کر، کسی جگہ اس کو آگے نکلنے کا موقع دے دے اور جب یہ ہماری جیپ کو روکنے کے لیے اپنی موٹر سائیکل آگے لائے گا تو اسے جیپ سے ایک ٹھوکر مار کر دور اچھال دینا اس کی موٹر سائیکل سمیت۔ ٹھیک ہے یہ تو کر لے گا نا؟" وہ بولا۔

میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، سارجنٹ کی موٹر سائیکل مجھے جیپ کے قریب ہی نظر آ گئی۔ وہ شاید وائرلیس پر اپنے دوسرے ساتھیوں کو ہمارے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں نے آبی سے کہا۔ "آبی! اس کی موٹر سائیکل کا پہیہ بے کار کر دے یار! یہ مصیبت کھڑی کرنے لگا ہے اب۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں لیکن موٹر سائیکل کے ساتھ یہ خود بھی بے کار ہو جائے تو الزام نہ دینا مجھے۔" وہ اسٹین گن سنبھال کر پیچھے والی سیٹ پر جاتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو سامنے کا خیال رکھ، مجھے لگتا ہے ہم ون وے روڈ پر آ گئے ہیں۔"

آبی کے کہنے پر میں نے اس طرف توجہ دی تو پتا چلا وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی میں جیپ ایک ایسی سڑک پر ڈال دی تھی جس طرف یک طرفہ ٹریفک چل رہا تھا اور وہ اس طرف ہرگز نہیں جا رہا تھا جدھر ہمارا رُخ تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی میرے کہ وہ ٹریفک سارجنٹ میری جیپ کے پیچھے کیوں لگا تھا۔ آبی کی چلائی ہوئی گولی کی آواز سن کر میں نے چونک کر عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں نظر ڈالی۔ سارجنٹ کی موٹر سائیکل بُری طرح لہرانے لگی تھی۔ میں نے آبی سے پوچھا۔ "کیا ہوا آبی، گولی سارجنٹ کو تو نہیں لگی ہے نا؟"

"نشانہ تو میں نے اس کی موٹر سائیکل کے اگلے وھیل کا ہی لیا تھا، اب گولی کس کو لگی ہے یہ پتا نہیں مجھے۔" آبی نے جواب دیا۔

اسی وقت میں نے سامنے ایک موڑ سے دو اور سفید یونیفارم والوں کی موٹر سائیکلیں مڑ کر اپنی طرف آتے دیکھیں۔ اس کا مطلب تھا اس تعاقب کرنے والے سارجنٹ نے ہمیں گھیرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے آبی سے کہا۔ "آبی ہم کو گھیرا جا رہا ہے، ہوشیار ہو کر بیٹھ جا۔"

وہ دونوں جو سامنے سے نمودار ہو گئے تھے، اپنی موٹر سائیکلیں لہراتے ہوئے جیپ کے سامنے چلے آ رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے رکنا کسی صورت میں بھی نہیں ہے، اگر وہ میرے سامنے سے نہیں ہٹے تو میں انہیں روندتا ہوا گزر جاؤں گا۔ اسی وقت مجھے اپنے پیچھے سے دوسرے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے آبی کو آواز دے کر کہا۔ "یہ اب کس پر گولی چلائی ہے تو نے؟"

وہ بولا۔ "وہی سارجنٹ کی دُم ہے یار! سالا گاڑی کو لہرا کر دھوکا دے رہا تھا کہ گولی لگ گئی ہے اسے۔ وہ اب بھی ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس طرح موٹر سائیکل کو لہراتا آ رہا ہے کہ اسے نشانہ بنانا مشکل ہو رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسٹین گن سے تڑا تڑ کئی فائر کر ڈالے کسی وقفے کے بغیر۔ پھر خوش ہو کر چلایا۔ "وہ مارا، اُلٹ دیا سالے کو۔"

اس وقت تک سامنے سے آنے والے دونوں سارجنٹ میرے بالکل قریب آ چکے تھے۔ میرے پاس یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ آبی نے پیچھے آنے والے کا کیا حشر کیا ہے۔ میں نے جیپ کی رفتار کم کیے بغیر سامنے سے آنے والوں پر چڑھا دی۔ وہ دونوں اس کے لیے پہلے ہی تیار معلوم ہوتے تھے۔ دونوں نے تیزی سے لہرا کر میرے دائیں بائیں سے نکل جانا چاہا۔ میں نے جیپ کو انہی کے انداز میں لہرا دیا تھا چنانچہ ان میں سے ایک جو میرے دائیں طرف سے نکل رہا تھا اس کی موٹر سائیکل کا پچھلا حصہ میری جیپ سے ٹکرا گیا اور وہ موٹر سائیکل پر سے اڑتا ہوا دور جا گرا۔ میں اس کے انجام کی پروا کیے بغیر نکلا چلا گیا۔ پھر جس طرف سے وہ دونوں برآمد ہوئے تھے وہاں پہنچ کر میں نے جیپ کو پھر دائیں جانب موڑ دیا، اس سڑک پہ گو ٹریفک اسی طرف جا رہا

تھا جدھر میرا رخ تھا مگر میں نے اپنی جیپ کی رفتار میں ذرا بھی کمی نہیں کی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب بھی ایک سارجنٹ ہمارا پیچھا ضرور کر رہا ہوگا۔

آبی پیچھے سے اٹھ کر میرے برابر والی سیٹ پر آتے ہوئے بولا "شکر ہے یار! جان تو چھوٹی ساوں سے، ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں اور پتا نہیں صحیح سلامت زمین پر پہنچ بھی سکیں گے کہ نہیں۔"

میں نے کہا "بیٹے! ابھی مطمئن ہو کر مت بیٹھ جاؤ۔ ہمارے تعاقب میں آنے والے سارجنٹ نے وائرلیس پر ہمارے بارے میں بتا دیا ہے دوسروں کو بھی۔ یہ جو دو سارجنٹ سامنے سے آئے تھے یہ اسی کی اطلاع پر آئے تھے۔ ان میں سے بھی ایک بچ کر نکل گیا ہے اور جلد ہی وہ لوگ چاروں طرف سے ہمیں گھیر کر پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ اسلحہ کے استعمال کا کوئی ایسا موقع آ جائے تو بہت ہی احتیاط سے استعمال کرنا۔ ہمارے پاس فاضل راؤنڈ بالکل نہیں ہیں، سب کچھ ہم اپنی کار میں چھوڑ آئے ہیں۔"

آبی نے مجھے چونک کر دیکھا اور پھر بولا "اوہ، اس کا تو یہ مطلب ہے کہ ابھی گلو خلاصی نہیں ہو سکی ہے ہماری۔ پھر تو یہ سڑک چھوڑ کیوں نہیں دیتا یار! اِدھر اُدھر گلیوں میں سے چکر کاٹ کر نکل چل۔ یہاں تو ہم آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔"

"سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں یار! لیکن سمجھ میں نہیں آتا کس گلی میں گھسا جائے۔ یہ علاقہ ہمارا دیکھا ہوا بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کدھر آ گئے ہیں ہم۔ کسی ایسی گلی میں گھس گئے انجانے میں جس سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہوا تب کیا ہوگا، یہ بھی سوچا تو نے؟"

"کہتا تو ٹھیک ہے تو مگر میں نے اب تک کراچی میں ایسی کوئی گلی دیکھی نہیں ہے جس میں سے نکلنے کا دوسرا راستہ نہ ہو۔" آبی بولا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے سے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے آبی سے کہا "دیکھ یار! یہ پولیس کی گاڑی لگتی ہے مجھے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے جیپ کو۔۔۔ سب سے پہلے آنے والی گلی میں موڑ دیا۔ یہ گلی بہت ہی مختصر ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر ایک اور سڑک تھی۔ میں نے یہاں جیپ کی رفتار سست کر کے گزرنے والے ٹریفک کا جائزہ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی میں پھر کسی ایسی ہی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھوں اور خود کو تارِ عنکبوت میں الجھاتا ہی چلا جاؤں۔ میری یہ احتیاط ٹھیک ہی تھی۔ اب میں جس سڑک پر نکلا تھا، اس پر ٹریفک بائیں جانب سے چل رہا تھا۔ اس سڑک پر بہت کم گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنی جیپ ادھر ڈال تو دی مگر چاہتا یہی تھا میں کہ جلد از جلد وہ سڑک بھی چھوڑ دوں کیونکہ یہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی ہمارے لیے۔ ابھی میں نے جیپ موڑ کر آگے بڑھائی ہی تھی کہ آبی پیچھے دیکھتے ہوئے بولا "جیلانی! جلدی نکلو یہاں سے، پولیس کی ایک گاڑی ادھر ہی آ رہی ہے۔"

میں نے جیپ کی رفتار بڑھاتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں۔ مجھے کسی ایسی ہی گلی کی تلاش تھی جس سے گزر کر ہم کسی اور سڑک پر پہنچ سکتے لیکن وہاں کوئی گلی سرے سے موجود ہی نہیں تھی البتہ سامنے کچھ دور چوراہا تھا جہاں سے میں جیپ کو دائیں یا بائیں کسی بھی سمت موڑ سکتا تھا؟ مگر وہاں اس بات کا بھی امکان تھا کہ پولیس ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے موجود ہوتی۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ واپسی کے لیے بھی تو کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ چوراہے پر تو پہنچنا ہی تھا، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ دل کو ایک خیال ڈھارس دے رہا تھا کہ اس علاقے میں ہمیں داخل ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ابھی لہٰذا اتنی جلدی تمام سڑکوں اور چوراہوں کی ناکہ بندی ہو جانے کی توقع نہیں تھی مجھے، ہماری پولیس اتنی چاق و چوبند تو نہیں تھی کہ چند منٹوں میں تمام راستے مسدود کر کے رکھ دیتی۔ چنانچہ میں جیپ کو دوڑاتا ہوا چوراہے تک جا پہنچا۔ حسبِ توقع یہاں میدان بالکل صاف تھا۔ دور دور تک کسی پولیسیے کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے جیپ کو دائیں طرف والی سڑک پر ڈال دیا۔ رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا، مگر ان سڑکوں پر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جگمگ کرتی دکانوں اور تیز اسٹریٹ لائٹس نے بالکل دن کا سا اجالا ہر سو پھیلا رکھا تھا، دور دور تک چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس سڑک پر بڑی بڑی بسوں اور رنگ برنگ کی منی بسوں نے پوری طرح قبضہ کر رکھا تھا۔ ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ جانے کی تگ و دو میں وہ جیسے سمندر کی سطح پر دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ پوری سڑک کو انہوں نے اس طرح روک رکھا تھا کہ اگر یہاں ہمیں گھیر لیا جاتا تو کوئی راہِ فرار نہیں مل سکتا تھا ہمیں چنانچہ میں نے پھر بائیں ہاتھ پر ایک ذیلی سڑک دیکھتے ہی جیپ ادھر ڈال دی تھی۔

اس طرف جیپ موڑتے ہی آبی بولا "ارے یہ تو ادھر کہاں جا رہا ہے بھائی! پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کیوں کھیل رہا ہے؟"

"کیا مطلب ہے بھئی تیرا؟ اس طرف جانے سے تیری اس بات کا کیا تعلق ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا "میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو یہ سڑک پھر ہمیں اسی سڑک پر پہنچا دے گی جہاں سے بھاگ کر ہم آئے ہیں اِدھر۔"

میں نے اس کی بات سنتے ہی پوری قوت سے بریک لگا کے جیپ روک دی اور کہا "بات تو تو نے ٹھیک ہی کہی ہے یار! ہم اگر دوبارہ ادھر جا نکلے تو دھر لیے جائیں گے، اب تک تو وہاں پولیس نے مورچہ بندی کر لی ہوگی۔ ہمیں اس جیپ سے جان چھڑا کر کسی اور گاڑی کا بندوبست کرنا چاہیے اب، جیپ کی وجہ سے وہ ہمیں ہر جگہ پہچان لیں گے۔"

"میں بھی یہی کہنے جا رہا تھا تجھ سے۔ یہاں بسیں بہت ہیں، کیوں نہ ہم جیپ چھوڑ کر بس پکڑ لیں کوئی؟" آبی نے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے تیری، مگر پھر اسٹین گنیں ہمیں جیپ میں ہی چھوڑ دینا پڑیں گی۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار! وہاں بس میں ہمیں ان کی ضرورت ہی کیا پیش آئے گی۔ چلو نکلو یہاں سے جلدی کرو۔" وہ جیپ سے باہر پاؤں لٹکا کر بولا۔

نیچے اترنے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔ ابھی زمین پر پاؤں ٹکا بھی نہیں سکا تھا کہ پتا نہیں کسی نیم تاریک گوشے سے دو پولیس والے نکل کر ہمارے پاس آ ٹھہرے۔ ان دونوں نے رائفلیں ہماری طرف اٹھائی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا "اوئے کون ہو تم دونوں، ادھر کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہو؟ اور اسٹین گنیں کیوں اٹھا رکھی ہیں تم نے ہاتھوں میں؟ ڈاکا مارنے کا ارادہ ہے کہیں؟"

وہ دونوں ان میں سے نہیں تھے جو ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ گشت پر نکلے ہوئے سپاہی تھے وہ دونوں اور یہیں کہیں قریب میں بیٹھے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ ہم نے اگر اپنے آس پاس نظر ڈال کر دیکھا ہوتا تو وہ ہمیں ضرور دکھائی دے جاتے۔ آبی نے نیچے اترتے اترتے دوبارہ پاؤں اوپر سمیٹ لیے۔ شکر یہ ہے کہ میں نے جیپ کا انجن ابھی تک بند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس پولیسیے کی بات ختم ہوتے ہی میں نے جیپ کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا کر لہرا دیا۔ میری یہ حرکت بالکل اچانک اور غیر متوقع تھی ان دونوں کے لیے۔ جیپ کے لہراتے ہی وہ اس کے پچھلے حصے سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر جا گرے اور میں نے جیپ آگے دوڑا دی۔

آبی بولا "سارے بیڑا غرق، یہ کہاں سے آ ٹپکے تھے یار!"

میں نے ہنس کر کہا "یہ سب تیرے ہی قدموں کی برکت معلوم ہوتی ہے بیٹے! کئی دن کی گوشہ نشینی کے بعد آج آپ کے مبارک قدم باہر نکلے ہیں تو شہر کے معززین کو آپ کا استقبال تو کرنا چاہیے تھا نا۔ دیکھ ہر جگہ کیسا شاندار استقبال ہو رہا ہے تیرا۔"

وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا "لگتا تو ایسا ہی ہے یار! لیکن اب تو یہ بہت ہو چکا۔ کسی نہ کسی طرح ان کے حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کر بھائی! ایسا نہ ہو کہ ہم رات بھر انہی سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتے پھریں۔ یہ راستے ہمیں ابھی تک پہچان نہیں سکے ہیں۔"

اس دوران ہم پھر اسی سڑک پر جا چڑھے جہاں پولیس کی گاڑیاں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ جیسے ہی ہماری جیپ اس سڑک پر نمودار ہوئی کسی طرف سے ایک سوزوکی وین نکل کر ہمارے پیچھے لگ گئی اور اس میں سے مائیکرو فون کے ذریعے ہمیں جیپ روک کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دینے کا حکم بار بار دہرایا جانے لگا۔ آبی اپنی جگہ سے اٹھ کر پیچھے جاتے ہوئے بولا "تو آگے کا خیال رکھ جیلانی! ان سے میں نمٹ لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "جہاں تک ممکن ہو سکے خون خرابے سے بچنا، انہیں روکنے کے لیے ان کی گاڑی کا ٹائر پھاڑ دینا کافی ہوگا۔"

آبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جیپ کی رفتار کو تیز کیے چلا جا رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک سوزوکی پر پڑی جو سامنے کی ایک گلی سے نکل کر آہستہ آہستہ سڑک کے درمیانی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں مجھے کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا تھا۔ شاید اسے میرا راستہ روکنے کے لیے دھکا دے کر سڑک کے بیچوں بیچ پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی مگر میری جیپ کی رفتار ایسی بلاخیز تھی کہ اس کے سڑک کے درمیان پہنچنے سے پہلے ہی جیپ اس جگہ سے گزر گئی، قریب سے گزرتے ہوئے جیپ کا پچھلا حصہ سوزوکی سے ٹکرا گیا تھا اور اس ٹکر نے یقیناً سوزوکی کو پیچھے الٹ دیا ہوگا۔ اسی وقت آبی کی اسٹین گن چنگھاڑنے لگی۔ دوسری طرف سے بھی جیپ پر فائرنگ کی گئی تھی لیکن کوئی گولی جیپ کو چھو بھی نہیں سکی تھی۔ میں نے آبی سے پوچھا "کیا ہوا آبی! تجھے کامیابی ہوئی یا نہیں؟"

"نہیں یار! تو گاڑی اتنی تیز بھگا رہا ہے کہ ان کی گاڑی اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہی، وہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔" وہ بولا۔

"پھر یہ گولیاں کہاں سے چلائی گئی تھیں ہماری جیپ پر! یہ بھی دیکھ سکا تھا تو یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جہاں تو نے سوزوکی کو ٹکر ماری تھی وہاں کچھ نشانچی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہی جیپ پر نشانہ بازی کی مشق کرنے کی کوشش کی تھی۔"

مجھے سامنے بائیں ہاتھ کو ایک سڑک مڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے آبی سے کہا "میں بائیں ہاتھ کو جیپ موڑ رہا ہوں، تو دھیان رکھنا اگر کوئی ادھر آئے ہمارے تعاقب میں تو آنے نہ دینا کسی کو، میں کوئی نیم تاریک جگہ دیکھ کر اس جیپ سے جان چھڑا لوں گا۔"

میں نے رفتار کم کیے بغیر جیپ کو ادھر موڑ دیا۔ ایک لمحے کو تو ایسا لگا تھا جیسے جیپ الٹ جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں، اس طرف مڑتے ہی میں نے دائیں طرف ایک گلی دیکھ لی، میں نے

جیپ کو ادھر ہی لے گیا۔ آگے پھر ایک کشادہ سڑک تھی۔ میں نے آبی سے پوچھا "کچھ دکھائی دیا تجھے؟ کوئی گاڑی ہے ہمارے پیچھے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے خود بھی عقبی منظر دکھانے والے آئینے پہ نظر ڈالی۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔

آبی نے بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا "تو تو ایسا آندھی طوفان بنا ہوا ہے یار! پولیس کی یہ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں اس رفتار کا مقابلہ کہاں کر سکتی ہیں۔ وہ پتا نہیں کتنے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہوں گے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں اب اس سامنے والی سڑک سے بائیں طرف ہی موڑ لیتا ہوں جیپ کو۔ کچھ دور اور نظر نہیں آیا کوئی تو ہم جیپ کو سڑک کے کنارے پر لگا کر اتر پڑیں گے اس میں سے۔ اس کے بعد ہی جان چھوٹے گی ان سے ہماری۔"

"ہاں یہ ٹھیک کہتا ہے تو۔ یہ جیپ ہی ہماری پہچان بن کر رہ گئی ہے۔ اسے تو چھوڑنا ہی پڑے گا اب۔" آبی بولا۔

میں نے ایک بار پھر بائیں طرف جیپ موڑ دی۔ اس طرف گاڑیاں اِکا دُکا ہی نظر آ رہی تھیں، جگہ جگہ گھنے سایہ دار درخت بھی کھڑے تھے یہاں۔ ایک درخت کے نیچے مجھے ایک ٹیکسی کھڑی دکھائی دے گئی۔ اس کا ڈرائیور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولے باہر ہی کھڑا تھا۔ شاید وہ گرمی سے گھبرا کر وہاں ہوا کھانے کے لیے رُک گیا تھا یا پھر کوئی سواری اتاری تھی اس نے وہاں۔ میں نے آبی سے کہا "آبی! اس ٹیکسی والے کو راضی کر، ہم اس جیپ کو چھوڑ کر ٹیکسی میں چلے چلتے ہیں۔ بشرطیکہ ڈرائیور تیار ہو جائے چلنے کو۔"

"تو گاڑی روک یار! چلے گا تو اس کا باپ بھی۔ انکار کرے گا تو یہ اسٹین گن کس کام آئے گی۔" آبی نے کرخت لہجے میں کہا۔

میں نے جیپ کی رفتار کم کر کے بریک لگاتے ہوئے کہا "کوئی بدمعاشی نہیں دکھانا اسے۔ خواہ مخواہ کوئی نئی افتاد نہ کھڑی کر دے یہ۔"

جیپ کے رکتے ہی آبی نے نیچے چھلانگ لگا دی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ٹیکسی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں نے بھی نیچے اتر کر اس کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی کیونکہ میں جانتا تھا، آبی اپنی عادت کے مطابق دھونس دھاندلی سے کام نکالنے کی کوشش کرے گا۔ آبی ٹیکسی کے پاس پہنچتے ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا تھا۔ اس کو ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ کر ڈرائیور بھی اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور پیچھے مڑے بغیر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "کدھر جاؤ گے صاحب؟"

اس اثنا میں میں بھی ان کے پاس جا پہنچا اور آبی کے ساتھ پچھلی سیٹ میں دھنستے ہوئے بولا "محمد علی سوسائٹی لے چل بھائی!"

یا تو وہ ڈرائیور ہی کوئی بھلا آدمی تھا، یا شاید ہمارا منفرد ... دے رہا تھا کہ وہ کوئی اور بات کیے بغیر آگے چل پڑا تھا۔

"یہ محمد علی سوسائٹی کس لیے؟ کیا ...؟" آبی نے ٹیکسی پر میری طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی "ہاں بہت ضروری کام ہے وہاں۔ پہلے اسے نمٹا لیں، پھر چلیں گے" میں نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اسے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ بک دے جو ٹیکسی ڈرائیور کو مشکوک کر دے ہماری طرف سے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی مصیبت بن سکتا تھا ہمارے لیے۔ میں اب مزید کسی بکھیڑے میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کار کی ... تھی جس میں ہم دونوں گھر سے نکلے تھے اور جس کے دونوں وہیل ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے ہم نے اسے ایک ... سڑک پہ چھوڑ کر دشمن کی جیپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ کار اب ... کے قبضے میں ہو گی اور پولیس کے لیے کار کے رجسٹریشن ... ذریعے فیروز تک جا پہنچنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا لہٰذا ... تھا کہ پولیس کے فیروز تک پہنچنے سے پہلے ہی فیروز کو صورتحال سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ کوئی مناسب بندوبست کر ... ڈرائیور نے میرے جواب سے اندازہ لگایا کہ ہمیں محمد علی سوسائٹی ... بعد بھی کہیں اور جانا ہے۔

وہ بولا "بھائی جی! میں آپ کو صرف محمد علی سوسائٹی ... لے جا سکتا ہوں۔ اس کے بعد کہیں اور نہیں جاؤں گا۔"

آبی جلدی سے بولا "کیوں بھئی، کہیں اور کیوں نہیں؟ تو کیا ہم پیسے نہیں دیں گے تجھے؟"

"صاحب جی! پیسوں کی بات نہیں ہے۔ مجھے اب ... بند کرنا ہے، ٹائم پورا ہو گیا ہے جی میرا۔" ڈرائیور نے جواب ...

"اگر تیرا ٹائم پورا ہو گیا ہے تو پھر محمد علی سوسائٹی بھی کیوں جا رہا ہے بھائی تو ہمیں؟" آبی نے پھر سوال کر ڈالا۔

"وہ جی، مجھے ڈرگ روڈ کالونی جانا ہے اس لیے ... میں آپ لوگوں کو راستے میں چھوڑ دوں گا محمد علی سوسائٹی ... طرف جانا ہوتا آپ کو تو میں بالکل نہیں جاتا آپ کو لے کر ... کر دیتا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

آگے سڑک پر ٹریفک جام ہوتا دکھائی دے رہا ... جانے والی گاڑیوں کی رفتار بتدریج سست ہوتی جا رہی ... میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا "یوں لگتا ... راستہ بند ہے، ادھر پھنس گئے تو پتا نہیں کب تک ... جائیں گے۔ تم اپنی گاڑی کو کسی گلی میں موڑ کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ہاں جی، ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ سامنے پولیس کی گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دے رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی ہے یا ملّا کا پھڈا لگا ہے یہاں کسی دکان شکان میں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیکسی بائیں ہاتھ کی ایک گلی میں موڑ دی۔

"او تیرے جیلانی! یہ کہیں ہماری ہی تلاش ..." آبی بے ساختہ بول اٹھا۔

میں نے جلدی سے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرا دیا مگر ٹیکسی ڈرائیور اس گھڑی پوری طرح ہماری طرف متوجہ تھا۔ وہ آبی کی بات سن کر چونک پڑا تھا اور اس نے شیشے میں مجھے آبی کا منہ بند کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ تھا وہ کوئی بہت ہی سیانا، اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں غلط قسم کے لوگوں کو جگہ دے بیٹھا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ یوں انجان اور بے پروا ہو کر بیٹھ گیا تھا جیسے اس نے کچھ سنا اور دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کا یہ اندازِ بے نیازی دیکھ کر مجھے خطرے کی گھنٹیاں بجتی سنائی دینے لگی تھیں، میرا تجربہ تھا کہ ایسے گربہ مسکین نظر آنے والے لوگ بہت ہی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ہم کہاں تھے، کس علاقے اور کن راستوں سے گزر رہے تھے ہمیں کچھ خبر نہیں تھی۔ ایسے میں وہ کسی دلدل میں لے جا کر اتار دیتا تو ہمیں بالکل بھی خبر نہ ہوتی اور ہم بے چون و چرا کسی کھڈ میں جا اترتے۔ مجھے آبی پر غصہ آ گیا۔ اس کی اس موقع بے موقع چل پڑنے والی زبان نے بدنصیبی کو آواز دے کر بلا لیا تھا۔ اس نے ایک بڑی بے وقوفی یہ کی تھی کہ مجھے جیلانی کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس طرح ٹیکسی ڈرائیور پر یہ بھی عیاں ہو گیا تھا کہ وہ جنہیں اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہے وہ کون لوگ ہیں اور پولیس کی ساری بھاگ دوڑ اور چھان پھٹک ہمارے ہی لیے ہو رہی ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مزید آگے جانا خودکشی کرنے کے ہی مترادف ہوتا چنانچہ میں نے آبی کو ڈانٹتے ہوئے کہا "اوئے تیری یہ زبان بند نہیں رہ سکتی تو کاٹ کے پھینک دے اسے۔ تیرا کیا خیال تھا تیرا یہ ماما اپنے کان بند کر کے بیٹھا ہوا ہے؟" پھر میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "بس کر بھائی، روک لے یہ ٹیکسی اب ادھر ہی۔"

اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کیے بغیر حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "کیوں بھائی جی! کیا محمد علی سوسائٹی نہیں جاؤ گے؟"

میں نے ریوالور نکال کر اس کی گردن سے لگاتے ہوئے کرخت آواز میں کہا "میں کہتا ہوں ٹیکسی روک لے ایکٹر کی اولاد! نہیں تو کھوپڑی اڑا دوں گا میں۔"

اس نے گھبرا کے پوری قوت سے بریک لگا کر ٹیکسی کو روک دیا اور گھگھیاتے ہوئے بولا "مجھے گولی نہ مارنا مائی باپ! میرے بہت چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ برباد ہو جائیں گے، ان کا کوئی اور سہارا نہیں ہے دنیا میں میرے سوا۔ مجھ سے قسم لے لو جی، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"اگر تم نے میری ہدایت پر عمل کیا تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ہم سے لیکن اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو اس کی ذمے داری تم پر ہی ہو گی۔ سیانے لوگوں کو میں بالکل نہیں چھوڑا کرتا ہوں، سمجھ گئے نا میری بات کو؟" میں نے مضبوط اور سرد لہجے میں اسے بتایا۔

"ہاں، ہاں، بالکل بالکل، سمجھ گیا مائی باپ! بالکل سمجھ گیا۔ بولو اب کیا حکم ہے؟" اس نے سہم کر خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے پاس جا کر اسے کھولتے ہوئے بولا "باہر نکلو تم اور ادھر جا کر میری جگہ بیٹھ جاؤ مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر کوئی حرکت کی الٹی سیدھی تو ایک ریوالور میرے ساتھی کے پاس بھی ہے۔"

وہ سہما ہوا سا رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ چھوڑ کر باہر نکلا اور چپ چاپ جا کر آبی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی جگہ سنبھال کر ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے آبی کو مخاطب کیا "خیال رکھنا آبی اس کا اور اب کوئی حماقت نہ کر بیٹھنا۔"

آبی کو اپنی غلطی کا شدت کے ساتھ احساس تھا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے سوچا ٹیکسی ڈرائیور سے یہاں سے نکلنے کا کوئی محفوظ راستہ معلوم کروں، لیکن پھر اس خیال سے ارادہ تبدیل کر دیا کہ وہ مجھے کسی ایسے راستے پر نہ ڈال دے جو سیدھا بھیڑیوں کے بھٹ میں جا کر نکلتا ہو۔ میں نے گاڑی کو بالکل ناک کی سیدھ میں دوڑانا شروع کر دیا۔ وہ ذیلی سڑک جس پر میں گاڑی دوڑا رہا تھا، بالکل سیدھی چلی جا رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بے شمار پختہ اور کشادہ گلیاں

تھیں۔ میں نے ان تمام گلیوں کو نظر انداز کر دیا اور سیدھا چلتا ہوا چند منٹ کے بعد ایک ایسی سڑک پر جا چڑھا جہاں چھوٹی بڑی ہر قسم کی گاڑیاں دونوں جانب آجا رہی تھیں۔ یہاں میں نے ٹیکسی کو پھر دائیں جانب موڑ دیا۔ اچانک میری نظر ایک جگہ پبلک کال آفس کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے بے اختیار بریک لگا کر اس کال آفس کے سامنے ٹیکسی کو روک دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے آبی سے بولا۔ ”میں سامنے پبلک کال آفس سے فون کر کے دوسری گاڑی منگواتا ہوں، تو اس کا خیال رکھنا۔ اگر یہ ڈرائیور ذرا بھی کوئی حرکت کرے تو بے دریغ گولی مار دینا اسے۔“

”تو فکر نہ کر یار، یہ ایسا الو کا پٹھا نہیں لگتا ہے مجھے کہ خواہ مخواہ خودکشی کرنے کی کوشش کرے گا۔“ آبی نے جواب دیا۔

میں جلدی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کال آفس کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسا۔ وہاں ایک خوبرو نوجوان ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ میز پر دو عدد ٹیلی فون دھرے تھے اور اس کے سامنے ایک برقع پوش نازنین اپنا آدھا چہرہ نقاب میں چھپائے، میز پر دونوں کہنیاں ٹکائے آگے جھکی نوجوان کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھی۔ میرے اندر گھستے ہی ان دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ نوجوان سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جی فرمائیے جناب! کیا خدمت کر سکتے ہیں ہم آپ کی؟“

میں نے بے وقت مداخلت پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک بے حد ضروری کال کرنا تھی ورنہ میں بالکل ڈسٹرب نہ کرتا آپ کو۔“

میرے اس مصالحانہ انداز نے اسے بھی مصالحت پر آمادہ کر دیا تھا شاید، ورنہ اس وقت وہ مجھے جلد از جلد وہاں سے ٹالنے کے لیے ٹیلی فون کی خرابی کا بہانہ ضرور کر دیتا۔ وہ ایک ٹیلی فون سیٹ میری طرف سرکاتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے جناب! آپ فون کر لیں، جب تک ہم باہر سے کوئی سواری پکڑ کر اپنی بیگم کو رخصت کر دیں۔“ اس نے بڑی ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا اس گھڑی۔ پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے اس برقع پوش نازنین سے بولا تھا۔ ”آؤ بیگم! دیکھو وہ سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی ہے۔“

میں نے اس کے اس اندازِ تخاطب پر اس کی بیگم کی آنکھوں میں حیا کے جو سائے سے لہراتے دیکھے تھے۔ وہ صاف صاف بتا رہے تھے کہ اس کے سینے میں بیگم بننے کے ارمان پرورش ضرور پا رہے تھے لیکن ابھی تکمیلِ آرزو ہنوز باقی تھی۔ بہرحال مجھے کیا غرض تھی اس سے، میں جس کام کے لیے وہاں گیا تھا مجھے صرف اس سے غرض تھی، اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ اس طرح مجھے تنہائی میں فیروز سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

میں نے جلدی جلدی فیروز کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا، فیروز ٹیلی فون کے پاس موجود تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔ ”تم کہاں ہو بھئی؟ ہم بہت پریشان ہیں تم دونوں کے لیے۔ خیریت تو ہے؟“ جواب میں، میں نے اسے اپنی خیریت پوری تفصیل کے ساتھ سنا دی۔ وہ بولا۔ ”اس ہنگامے کی اطلاع لنزی نے دی ہمیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم جو کار لے کر گئے تھے اسے تم نے ایک مقابلے کے دوران سڑک پر چھوڑ دیا ہے اور دشمن کی جیپ ساتھ لے گئے ہو اپنے۔ ہی میں نے ایک دوست کے ذریعے اس کار کی چوری کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ کار شام کے سات سے رات کے آٹھ بجے کے درمیان کسی وقت اٹھائی گئی ہے۔ اس کار کو اب بھول جاؤ، ادھر کا رخ بھی نہ کرنا اب جہاں کار چھوڑی تھی تم نے، شرافت علی، خان، گل زمان اور انور کمال تمہاری تلاش میں شہر کے مختلف علاقوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے جو بھی تمہیں دکھائی دے جائے تم فوراً اس کے ساتھ واپس آجاؤ۔ ٹیکسی کو یہاں تک نہ لانا، کوشش کرو اس سے جلد از جلد نجات حاصل کر لو۔ لنزی کی اطلاع کے مطابق آنرزک اور اس کے گرگے بھی تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ اگر بتا سکتے ہو تو مجھے بتاؤ تم اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو۔ میں تمہیں وہاں سے لینے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔“

میں نے اس نوجوان سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ پبلک کال آفس کس علاقے میں واقع ہے، پلٹ کر دیکھا۔ وہ تو وہاں نہیں تھا البتہ اس کے آفس کے شیشے سے باہر سڑک پر مجھے لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ اس ٹیکسی کا کہیں پتا نہیں تھا جس میں میں آبی کو بیٹھا چھوڑ کر آیا تھا۔ میں نے فیروز سے کہا۔ ”فیروز! یہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔“

میں نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ سڑک کے کنارے جہاں میں نے ٹیکسی کھڑی کی تھی، وہیں کال آفس والا وہ نوجوان بھی مل گیا مجھے۔ وہ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا اس واقعے پر تبصرہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آتے ہوئے بولا۔ ”حد ہو گئی ہے جناب! دیکھا آپ نے کیسا اندھیر مچا ہوا ہے؟ آدمی کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے!“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا بھائی؟ قصہ کیا ہے؟“

”بس جی کیا بتاؤں آپ کو۔ میں نے کہا تھا نا آپ سے، میں بیگم کو اس ٹیکسی میں بٹھانے کے لیے جب ٹیکسی کے پاس پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں، ٹیکسی کی پچھلی والی سیٹ پر ایک شخص بندھا پڑا ہے، اس کے منہ پر بھی ٹیپ چپکا ہوا تھا اور ٹیکسی والا آگے بیٹھا ٹیکسی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر آس پاس کے دکان داروں کو آوازیں دے کر بلایا تاکہ ہم سب لوگ مل کر ٹیکسی والے سے اس غریب آدمی کو چھڑائیں جسے اس نے پیچھے باندھ کے ڈالا ہوا تھا، مگر اس سے پہلے کہ لوگ یہاں تک پہنچتے، وہ ٹیکسی کو بھگا کر لے گیا۔ پتا نہیں وہ کون تھا بے چارہ؟ اب تو صاحب! ٹیکسی میں بھی اکیلا دکیلا آدمی سفر نہیں کر سکتا۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے آخر، میں کیا بھول اسے، کیسے روؤں، کس کا ماتم کروں؟ پتا نہیں آبی نے ٹیکسی ڈرائیور کی کس حرکت پر مشتعل ہو کر اسے باندھ کر ڈال دیا تھا اور پھر لوگوں کو اس طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر اسے لے بھاگا ہے یہاں سے یا اس ٹیکسی ڈرائیور نے کسی طرح آبی کو بے بس کر کے یہ کام دکھایا تھا۔ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اگر موقع پا کر کسی طرح آبی پر قابو پا ہی لیا تھا تو وہ اسے لے کر بھاگا کیوں ہے؟ اسے تو چاہیے تھا کہ وہ آبی کو قابو کرنے کے بعد لوگوں کو جمع کر کے اپنی مظلومیت کی داستان سنا کر ان کی ہمدردیاں حاصل کرتا اور مجھے بھی پکڑوانے کی کوشش کرتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تکرار سی ہو رہی تھی، دل ایک بات کہتا تھا تو دماغ اس کی نفی کر کے کوئی دوسری بات سمجھا دیتا تھا اور پھر دل اسے رد کر کے کوئی اور ہی نکتہ بیان کرنے لگتا تھا۔ میں اسی کشمکش میں گرفتار تھا کہ کال آفس والے نوجوان نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”کیا بات ہے جناب! کس خیال میں گم ہیں آپ؟ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں میں آپ کو۔“

”اوہ کچھ نہیں یار، بس یوں ہی ذرا غور کرنے لگا تھا اس صورتِ حال پر۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا، کچھ بتا سکتے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”کس نے کیسا کیوں کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں جناب آپ؟ کہیں اس ٹیکسی والے کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بھئی، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کون تھا جس نے اسے باندھ کے ڈال رکھا تھا پچھلی سیٹ پر؟“ میں نے سوال کیا۔

”پتا نہیں کون تھا وہ، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اسے۔“ وہ بولا۔ ”اس علاقے کا تو نہیں لگتا تھا۔“ وہ اس کا حلیہ بتانے لگا۔

یہ حلیہ بالکل آبی پر فٹ آتا تھا۔ اس کا تو مطلب تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور آبی کو بے بس کر کے لے بھاگا تھا۔ مگر پھر وہی سوال ذہن کو پریشان کرتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ضرورت تھی اسے ایسا کرنے کی؟ جب کہ اسے ہم سے پیچھا چھڑانا ہی تھا تو وہ بہ آسانی لوگوں سے مدد حاصل کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں تو ہمارے لیے جان بچانا بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ اس کے بھاگ جانے سے میں کم از کم صاف بچ گیا تھا۔ میں نے نوجوان سے پوچھا۔ ”یہ کون سا علاقہ ہے بھائی؟“

اس نے ذرا حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھا اور میرے سراپے کا جائزہ لے کر بولا۔ ”حیرت ہے آپ کو اس علاقے کا پتا نہیں ہے اور فون کرنے آ گئے آپ۔“

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے میرے بھائی؟ اور کیا تمہارے اس کراچی شہر میں اجنبیوں کو کہیں فون کرنے کی اجازت نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ایک دم گڑبڑا سا گیا۔ بولا۔ ”وہ... وہ... میرا مطلب یہ نہیں... تھا... کیا آپ یہاں کراچی کے باشندے نہیں ہیں؟“

”نہیں بھائی! میں تو لاہور سے آیا ہوں، محض تمہارا شہر دیکھنے کے لیے۔ وہاں تو میں نے بہت تعریفیں سنی تھیں کراچی شہر کی۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تو کیا آپ کو ہمارا شہر پسند نہیں آیا؟ کیا لوگوں نے غلط تعریفیں کر دی تھیں آپ کے سامنے کراچی کی؟“

”بس یار! کیا بتاؤں، شہر تو ٹھیک ٹھاک ہی لگا ہے مجھے یہ، مگر بندے ادھر کے کچھ سمجھ نہیں آئے۔ اجنبی کو پتا تک نہیں بتاتے ٹھیک سے۔ اب دیکھو نا ڈیڑھ گھنٹے سے مارا مارا پھر رہا ہوں میں۔ کتنے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی میں جس سڑک سے گزر کر آیا ہوں ادھر وہ سڑک کہاں ہے؟ پر کوئی بتا کے ہی نہیں دیتا کچھ بھی۔ اب ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اتنی بڑی اور ایسی معروف سڑک کو کوئی جانتا ہی نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا۔ ”ہاں صاحب! یہ ہے تو واقعی بڑی عجیب بات مگر کیا آپ نے کسی کو یہ بتایا کہ اس سڑک کا کیا نام ہے؟“

”نام ہی یاد ہوتا مجھے تو میں دوسروں سے کیوں پوچھتا پھرتا، یہی معلوم کرنے کے لیے تو میں آیا تھا یہاں۔“ میں نے کہا۔

”اوہ، اچھا۔ پھر کیا ہوا؟ معلوم کر لیا نام آپ نے اس سڑک کا؟“ نوجوان نے ہمدردی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں یار! جن کا میں مہمان ہوں وہ کہتے ہیں جس جگہ میں موجود ہوں اس وقت اس جگہ کا نام بتا دوں تو وہ گاڑی بھیج کر مجھے بلوا لیں گے۔ اسی لیے میں نے پوچھا تھا تم سے کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔“

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے، تو یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی آپ نے مجھے۔ آپ نہیں ہے دیں، رن چھوڑ لائن بھیج دیں وہ گاڑی، ہین روڈ پہ ہی پبلک کال آفس پر آپ انتظار کر رہے ہیں گاڑی کا۔ اور جب تک گاڑی آئے یہیں بیٹھیں آپ۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

میں نے فیروز کو فون کر کے بتا دیا کہ میں کہاں ہوں! اس نے مجھے وہیں انتظار کرنے کو کہا تھا۔ فون کرنے کے بعد میں نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوجوان کے سامنے میز پر ڈالتے ہوئے کہا "تیرا بہت بہت شکریہ بھائی! بڑی مصیبت سے بچایا ہے اس گھڑی تو نے مجھے۔ خدا تیرے اس کال آفس کو اور بھی ترقی دے، تو لوگوں کی بڑی خدمت کر رہا ہے برادر۔"

اس نے نوٹ اٹھا کر اپنی دراز میں ڈال دیا اور تین روپے مجھے واپس لوٹاتے ہوئے بولا "لیں جناب! آپ جیسے لوگوں کی خدمت ہی ہمارا نصب العین ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہی رہے ہیں اب تک۔"

میں نے اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا "یہ پیسے تو اپنے پاس ہی رکھ یار! جس طرح تو کام آیا ہے اس گھڑی میرے، اس کے مقابلے میں پانچ روپے کی تو حیثیت ہی نہیں ہے یار کوئی۔ مجھے تیری ہزار دو ہزار سے خدمت کرنا چاہیے تھی اس لمحے، مگر افسوس مجھے یہ ہے کہ میری جیب خالی ہے اس وقت۔ اگر تو اجازت دے تو میں یہاں بیٹھ کر اپنے میزبان کی بھیجی ہوئی کار کا انتظار کر لوں؟"

وہ تین روپے دوبارہ اپنی دراز میں ڈال کر مجسم اخلاق بن گیا۔ بولا "ارے جناب! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں آپ مجھے، اجازت کی اس میں کیا بات ہے؟ میں نے تو خود آپ سے کہا ہے کہ آپ یہیں بیٹھ کر انتظار کریں، یوں بھی باہر کب تک کھڑے رہیں گے آپ؟"

میں خود بھی باہر کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کسی دکان دار نے مجھے اس ٹیکسی سے اترتے دیکھا ہوگا اور اس وقت ہنگامے میں اسے میرا خیال نہ رہا ہوگا تو مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر اسے یہ بات ضرور یاد آ جائے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو میرے لیے ایک بار پھر مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ دوسرے آئزک کے آدمی بھی میری تلاش میں شہر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے، اور یہ خدشہ بھی تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر میں نہ آجاؤں میں۔ یہ جگہ ایسی تھی جہاں سے باہر سڑک پر بھی نظر سکتا تھا میں اور دوسروں کی نظروں سے محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ میں اس جوان کا شکریہ ادا کر کے وہیں تھم گیا۔

میرا ذہن آبی کے لیے پریشان تھا، رہ رہ کر اس کا آ رہا تھا مجھے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کون تھا اور کیوں اس طرح لے گیا تھا آبی کو؟ یہ گتھی کسی بھی طرح سلجھ نہیں رہی تھی۔ خاموش بیٹھ کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرنا چاہتا لیکن اس نوجوان کو یا تو چپ بیٹھنے کی عادت نہیں تھی یا وہ مجھے خاموشی کی اذیت سہتے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے ایک لمحے کو بھی خاموش ہو کر نہیں بیٹھنے کوئی بیس منٹ بعد مجھے فیروز نظر آ گیا۔ وہ سڑک کے آہستہ آہستہ کار چلاتا ہوا مجھے تلاش کرتا آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا، میرے میزبان کی کار آ گئی ہے، اب مجھے اجازت دو۔"

میں دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ فیروز بھی مجھے باہر نکلتے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں لمبے لمبے قدم اس کی کار کے نزدیک پہنچا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کر تیزی سے اندر گھستے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے یار آ گئے۔ چلو اب جلدی سے نکل چلو یہاں سے۔"

وہ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اور آبی میرا مطلب ہے وہ نہیں جائے گا ہمارے ساتھ؟ خیر سے تو ہے نا وہ ....؟"

"نہیں یار! کچھ پتا نہیں مجھے کیا بیتی ہے اس کے، جس ٹیکسی میں ہم یہاں تک پہنچے تھے اس ٹیکسی کا ڈرائیور لے بھاگا ہے اسے، پتا نہیں کیا ضرورت پیش آ گئی تھی آبی کی۔" میں نے اسے پوری بات بتا کر کہا "پتا نہیں کن راندن میں جا اترا ہے وہ میرا یار!"

فیروز نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تو برا ہوا ہے یار! کیا پتا.... کہاں لے گیا ہے وہ اسے۔ تلاش کریں ہم اس کو؟"

"میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اگر اس ڈرائیور کسی طرح نجات حاصل کر لی تھی اس سے تو اسے لے جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ مجھے تو یوں لگ برادر! کہ وہ کوئی بہروپیا تھا جو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں تاریک گوشوں میں شکار تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب شاید سے آبی کے بدلے کسی لمبی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ تمہارا خیال ہے؟" میں نے فیروز سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تب تو ہم جلد ہی اسے دوبارہ حاصل کر لیں گے۔" فیروز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ اس مسئلے کو کسی اور طرح دیکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا "کیا تمہارے ذہن میں کوئی اور نکتہ بھی ہے؟"

"ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس ٹیکسی ڈرائیور کا تعلق پولیس کے سادہ لباس والے شعبے سے نہ ہو۔ تم بتا رہے ہو کہ آبی نے تمہیں نام لے کر مخاطب کیا تھا تو وہ چونک اٹھا تھا اور پھر ایک دم انجان بن گیا تھا، تبھی تم نے اسے ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا کر خود اس کی جگہ سنبھال لی تھی۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو وہ تم دونوں کو پہچان چکا تھا اور چونکہ دونوں پر بیک وقت ہاتھ ڈالنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے موقع ملنے پر اس نے آبی کو لے بھاگنا ہی بہتر سمجھا۔ اسے یہ یقین ہوگا کہ آبی کے ہاتھ آ جانے کے بعد تم پر ہاتھ ڈالنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ وہ آبی پر تشدد کر کے تمہارا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔" فیروز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

اس کی باتیں سن کر مجھے اپنے سر پر آسمان گرتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر فیروز کا اندازہ درست تھا تو یہ افتاد بالکل غیر متوقع اور بے موقع تھی۔ ابھی تو مجھے بہت سے اتنے اہم کام درپیش تھے جن کی طرف سے میں ذرا بھی غفلت نہیں برت سکتا تھا اور جس کام کی تکمیل کا بیڑا میں نے اٹھایا ہوا تھا ان دنوں، اس کام کے لیے مجھے آبی جیسے مخلص اور جاں نثار دوستوں کی شدید ضرورت تھی۔ ایسے میں اس کا پولیس کے ہاتھ لگ جانا، بہت ہی نقصان دہ تھا میرے لیے۔ وہ یہ تو پہلے ہی جان چکے تھے کہ میں ان دنوں کراچی میں ہوں، اس ذلیل یہودی آئزک نے پولیس کو بتا دیا تھا کہ اس کے مکان پر حملہ آور ہونے والے جیلانی اور آبی تھے۔ اس کے بیان کے بعد سے پولیس پوری شد و مد کے ساتھ ہمیں کراچی میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں وہ اگر کوئی پولیس کا آدمی ہی تھا تو یقیناً اس نے یہ بہروپ ہمارا ہی کھوج نکالنے کے لیے بھرا تھا اور بالآخر اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی تھی۔ وہ ہم میں سے ایک پر جال ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ آبی سے میرا پتا معلوم کرنے کے لیے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے، اسے ایسے ایسے دردناک عذاب سے گزاریں گے کہ وہ موت کی آرزو کرنے لگے گا۔ پنڈی جیل میں اسے اور آسیہ کو نیم جاں کر کے ڈالا ہوا تھا انہوں نے اور یہ سمجھ لیا تھا کہ اب ان کے سارے بل نکالے جا چکے ہیں، اب وہ کبھی سرکشی کا تصور بھی اپنے ذہنوں میں نہیں سمانے دیں گے، لیکن ان کے سارے اندازوں پر پانی پھر گیا تھا اور وہ دونوں ایک بار پھر آزاد فضاؤں میں چہلیں کرنے نکل پڑے تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہونے لگا تھا کہ اگر آبی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو اس بار اسے دوبارہ آسمان بھی دیکھنا نصیب نہیں ہو سکے گا۔

مجھے خاموش دیکھ کر فیروز نے پوچھا "چپ کیوں ہو گئے ہو؟ کیا سوچ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "تم نے تو مجھے فکرمند کر دیا ہے۔ فیروز! اگر تمہارا اندازہ صحیح ہے تو ہمیں آبی کو ان کے شکنجے سے نجات دلانے کے لیے فوری طور پر کوئی مناسب کارروائی کرنا ہوگی ورنہ وہ لوگ اس بار اسے سلامت نہیں رہنے دیں گے۔ کچھ سوچو اس کے لیے۔"

"یہ تو میں نے محض خیال ظاہر کیا ہے اپنا۔ خدا کرے یہ غلط ہو۔ تم ابھی سے اتنے پریشان کیوں ہونے لگے ہو؟" وہ بولا۔

"کیا بات کرتے ہو تم، وہ میرا یار ہے، میرے دکھ سکھ میں شریک رہا ہے، ایک لمبے عرصے سے ہم ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ اب تم کیا چاہتے ہو، چند دن سے تمہارا ساتھ ہو گیا ہے تو کیا میں اسے فراموش کر دوں؟ ایسا ہی خود غرض سمجھتے ہو تم مجھے؟"

میرے تیور بدلتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولا "تم نے غلط سمجھا ہے جیلانی! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتے ہو، تمہارے دماغ میں گرمی بہت ہے، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، آدمی کو سمجھے بوجھے بغیر گرمی نہیں دکھانا چاہیے۔"

مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ میرا رویہ اچھا نہیں ہے، مجھے اس طرح نہیں بھڑک اٹھنا چاہیے۔ فیروز نے ایسی تو کوئی بات نہیں کہی تھی جس پر میں یوں چراغ پا ہو جاتا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ حالات اور واقعات کے پیش نظر ایک اندازہ تھا اس کا۔ محض شبہ ظاہر کیا تھا اس نے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یقین سے تو کچھ نہیں کہا تھا اس نے پھر میں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آبی پولیس کی تحویل میں ہی چلا گیا ہے۔ میں نے فیروز سے کہا "مجھے افسوس ہے یار! میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ آبی میرے لیے کتنا اہم ہے۔ یوں سمجھ لو وہ میرے ہی جسم کا ایک حصہ ہے اور جب آدمی کے جسم کا کوئی حصہ الگ کر دیا جائے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے؟ آدمی عقل و ہوش کھو دیتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن

ہلاتے ہوئے بولا "اسی لیے میں نے تمہیں احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں ہے۔ دشمن چاروں طرف سے گھیرا ڈالے تمہارا ہانکا کر رہے ہیں ایسے میں تم اگر ذرا سی دیر کو بھی غافل ہو گئے کسی ایک طرف سے بھی تو وہ ادھر ہی سے وار کر جائیں گے تم پر۔ کبھی کبھی آدمی کو بڑے سے بڑا حادثہ بھی یوں سہہ جانا پڑتا ہے جیسے اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ تم خود سوچو یار آبی کی سلامتی کے لیے بھی تمہیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں یار! یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پچھلی بار پنڈی جیل سے اسے اور آسیہ کو آزادی تم نے ہی دلائی تھی۔ اس وقت تو ہم اتنے مضبوط بھی نہیں تھے۔ اب تو ہم باقاعدہ ایک چھوٹی موٹی تنظیم کی تشکل اختیار کر چکے ہیں، اب ہمارے لیے آبی کو آزادی دلانا اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بات تو میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ لیکن ہمیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ آبی پولیس کی تحویل میں ہے بھی یا نہیں؟"

"یہ کوئی فکر کرنے والی بات نہیں ہے، اگر آبی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو پولیس اپنے اس کارنامے کی تشہیر ضرور کرے گی۔ یہ کوئی ایسی غیر اہم بات نہیں ہے کہ خاموشی سے نظر انداز کر دی جائے۔ تم جانتے ہو، یہ لوگ کبھی کبھی تو کسی مجرم پر ہاتھ ڈالتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب ان سے کارکردگی کی رپورٹ طلب کیے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ وہ تو ایک معمولی گرہ کٹ کو پکڑ کے اخباروں میں خبریں لگا دیتے ہیں، آبی کے معاملے میں خوب بڑھ چڑھ کے دعوے کریں گے وہ لہٰذا صبح کے اخبارات پولیس کے اس کارنامے سے بھرے پڑے ہوں گے۔ ساری تفصیل معلوم ہو جائے گی ہمیں بشرطیکہ اسے پولیس نے ہی پکڑا ہو۔ اور اگر آئرنک اینڈ کمپنی کے کسی آدمی نے آبی پر ہاتھ صاف کیا ہے تمہیں اپنے سامنے جھکانے کے لیے تو اس کی اطلاع لزی کے ذریعے مل جائے گی ہمیں۔ اس کی تو ہمیں بالکل پروا ہی نہیں کرنا چاہیے ممکن ہے لزی تمہیں اطلاع دینے سے پہلے ہی آبی کو رہائی دلا دے اور ہمیں کچھ کرنا ہی نہ پڑے اس کے لیے۔"

"ہاں یہ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میرا خیال ہے صبح تک ہمیں آبی کے بارے میں کوئی نہ کوئی اطلاع مل ہی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہی کہہ رہا ہوں میں بھی لہٰذا اب ہمیں گھر چل کر صبح ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ جلد بازی کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بالکل بھی۔ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا، نقصان ضرور پہنچ سکتا ہے۔" اس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

بات اس کی نہایت مناسب اور معقول تھی۔ لہٰذا میرے لیے خاموش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میرے دل میں جو خدشے اور اندیشے سر ابھار رہے تھے ان سے نجات کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، کل ماں جی بھی آ رہی تھیں اور انہیں ریسیو کرنے کے لیے میرا یا آبی کا اسٹیشن پر موجود ہونا بے حد ضروری تھا۔ ہم دونوں کے سوا ایسا شخص نہیں تھا جو انہیں جانتا ہو۔ اگر کسی طرح ان کی ٹرین بتا کر کسی اور کو اسٹیشن بھیج بھی دیا جاتا تو ماں جی اور حیدر کسی شخص کے ساتھ آنا پسند نہیں کرتے۔ کم از کم حیدر تو کسی کے ساتھ کسی گاڑی میں بیٹھنے کو نہ خود تیار ہوتا اور نہ ماں جی کو کرنے دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے گرد ہر وقت اور ہر جگہ خطرہ کا حصار قائم رہتا ہے اور مجھے گرفت میں لینے کے لیے دشمن میرے متعلقین کے ساتھ کوئی بھی چال چل سکتے ہیں۔ چنانچہ میرا اسٹیشن پہنچنا بے حد ضروری تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جب تک میں ماں جی کو کراچی پہنچنے کے بعد کسی محفوظ جگہ تک نہ پہنچا دیتا میرے لیے آبی کے سلسلے میں کوئی بھی عملی قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔

میں اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ فیروز نے میرا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا تھا "اب جاگ جاؤ میرے جانی ہماری منزل آگئی ہے۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ گاڑی سے باہر میری طرف کا دروازہ کھولے کھڑا مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا! ایسا گم تھا میں سوچوں میں۔"

ڈرائنگ روم میں قدم دھرتے ہی میں ٹھٹک کر دروازے ہی میں رک گیا۔ حیرت سے میری آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں تھی کہ میں تمام راستے اپنے یار اسلم کے لیے پریشان ہوتا رہا تھا، اس کی سلامتی کی صدقِ دل سے دعا کرتا رہا تھا اور وہ آبی میری آنکھوں کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ فیروز بھی چند ثانیے حیرت سے منہ کھولے اسے تکتا رہا تھا، پھر وہ ایک دم خوشی سے چلا اٹھا تھا۔ "ابے جیلانی! یہ ... یہ دیکھا تم نے ... یہ آبی تو ہم سے پہلے پہنچ چکا ہے یہاں! تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے تھے۔"

میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آبی کی طرف بڑھتے ہوئے جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا "اوئے آبی! کتنا پریشان کیا ہے تو نے مجھے۔ کیوں بھاگ کھڑا ہوا تھا، وہاں سے تو؟ میں تو... میں تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا یار!"

آبی ہنستے ہوئے اٹھ کر میرے پاس آگیا اور میرے دونوں بازو تھام کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اوئے ذلیلا! کیا سمجھ بیٹھا تھا بھئی تو؟ کہیں یہ تو نہیں سمجھ لیا تھا تو نے کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے اغوا کر کے لے گیا ہے؟"

"ہاں یار! ایسی ہی بات تھی۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ آخر تو نے ایسا کیوں کیا تھا یار! یوں اچانک وہاں سے بھاگ نکلنے کی کون سی ضرورت پیش آگئی تھی تجھے؟" میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یار! بس اچانک ہی ہو گیا تھا سب کچھ۔ تیرے جاتے ہی وہ ٹیکسی ڈرائیور پہلے تو منت سماجت کرنے لگا میری لیکن جب اس نے ایک جوان کو برقع پوش خاتون کے ساتھ آتے دیکھا ٹیکسی کی طرف تو مجھ سے الجھ بیٹھا ایک دم۔ میں نے اپنے ریوالور کے دستے سے سالے کی کنپٹی بجا دی۔ وہ کسی شرابی کی طرح لہرانے لگا تو جلدی سے نیچے ڈال کر اسی کے رومال سے ہاتھ باندھ دیے اس کے۔ وہیں ڈیش بورڈ میں چوڑا سا ٹیپ مل گیا مجھے جسے میں نے اس کی دونوں ٹانگوں پر لپیٹ کر منہ پر بھی چڑھا دیا۔ اس اثنا میں وہ دونوں ٹیکسی کے بالکل قریب آپہنچے تھے۔ تجھے آواز دینے یا بلانے کا بالکل بھی موقع نہیں رہا تھا۔ بس پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ سوال جواب کرتے میں نے ٹیکسی دوڑا دی۔"

"کمال ہے جیلانی! تم نے تو دوسری ہی کہانی سنائی تھی مجھے۔ میں تو سمجھا تھا شاید کسی سادہ لباس والے پولیس کے آدمی کے ہتھے چڑھ گئے ہو تم۔" فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹیکسی ڈرائیور اور اس کی ٹیکسی اب کہاں ہے؟ انہیں کیا کیا تم نے؟"

"وہ ٹیکسی والا سچ مچ پولیس کا ہی بندہ تھا۔ مخبر تھا سالا کوئی، میری خوشامد کرتے ہوئے یہی کہہ رہا تھا کہ وہ پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ اس نے بتایا کہ شہر میں اور بھی بہت سے مخبر چھوڑ رکھے ہیں پولیس نے جن کے پاس ہماری تصویریں بھی ہیں۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی کی پولیس نہایت رازداری کے ساتھ ہمارے لیے جگہ جگہ پھندے لگا رہی ہے۔" آبی نے بتایا۔

میں نے کہا "ہاں یار! وہ یہودی بازی گر آئرنک اور اس کے ساتھی پتا نہیں کب سے یہاں بیٹھے دیمک لگا رہے ہیں ہمارے ملک کی بنیادوں کو۔ پتا نہیں کہاں کہاں، کن کن لوگوں سے تعلقات استوار کر رکھے ہوں گے انہوں نے اور کیسے کیسے سوانگ بھر رکھے ہوں گے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے۔ وہ انہیں بہت ہی معزز لوگوں میں شمار کرتے ہوں گے اور یہ معلوم ہونے کے بعد ان شریف لوگوں پر بدنامِ زمانہ قاتل اور ڈاکو غلام جیلانی اور اسلم آبی آپڑے تھے جنہوں نے ان کے مرقد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی ہے، وہ اس ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے پوری تندہی کے ساتھ ہمیں تلاش کر رہے ہیں، ان کے خیال میں ہماری یہ حرکت ملک کی بدنامی کا باعث ہو گی۔"

"اس میں ان کا قصور بھی کیا ہے۔ وہ تو وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ حقیقت کا تو انہیں علم نہیں ہے نا۔" فیروز بولا۔

"ہاں، اور انہیں علم بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ جیسا اعتبار حاصل کر چکے ہیں حکام کا اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سننا بھی گوارا نہیں کریں گے وہ اور ہم جیسے اشتہاری مجرموں کی بات پر تو بالکل بھی کان دھرنے کو تیار نہیں ہو گا کوئی بھی۔" آبی بولا۔

"ہاں، ہمارے یہاں جو نظام رائج ہے اس میں یوں بھی عوام کی آواز کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ غلاموں کو غلام بنائے رکھنے کے لیے قائم کیا جانے والا یہ نظام جب تبدیل نہیں ہو گا جب تک عام آدمی قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک کچھ بھی اصلاحی کام نہیں ہو سکے گا۔ جس نظام میں گواہ اور ثبوت کو اتنی اہمیت حاصل ہو کہ رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا راشی افسر بھی ناکافی ثبوت کی رعایت حاصل کر کے اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہو، وہاں انصاف کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب تک عام آدمی کو یہ یقین نہ ہو کہ اس سے انصاف کیا جائے گا اس وقت تک وہ قانون سے تعاون کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو گا۔" فیروز بولا۔ "خیر چھوڑو اس مسئلے کو، اسے حل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، یہ ہمارے بڑوں کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہمیں تو بہرحال اپنا فرض نبھانا ہے۔ تم نے بتایا نہیں آبی کہ اس ٹیکسی اور اس کے ڈرائیور کا کیا کیا تم نے؟"

"کرنا کیا تھا ان کا میں نے۔ جی تو کرتا تھا اس سالے مخبر کا جھٹکا کر کے ڈال دوں کسی کھڈ میں مگر پھر اس کے بچوں کا خیال آگیا۔ کہتا تھا بہت چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور اس کے سوا کوئی سہارا بھی نہیں ان کا دنیا میں۔ لہٰذا میں ایک ویران

رک پہ چھوڑ آیا ہوں اسے۔ اسی طرح بندھا پڑا رہنے دیا تا میں نے اسے پچھلی سیٹ پر۔ کسی راہ گیر کی نظر پڑ گئی ں پر تو وہ آزادی دلا دے گا اسے یا پھر پولیس کی ی گشتی پارٹی کام آجائے گی اس کے۔"

"یہ بہت اچھا کیا تم نے کہ اسے یہاں تک نہیں لائے چھ اندازہ ہے یہاں سے کتنی دور چھوڑا ہے تم نے سے؟" فیروز نے سوال کیا۔

"کافی دور ہے وہ جگہ یہاں سے۔ میں وہاں سے س میں آیا ہوں یہاں تک۔ کوئی آدھا گھنٹا لگا ہو گا مجھے یہاں پہنچنے میں۔" آبی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، پھر تو ہمارے لیے خطرے کی کوئی ت نہیں ہے، اگر کہیں قریب ہی چھوڑ آئے ہوتے م اسے تو اس بات کا امکان تھا کہ پولیس اس علاقے ں تمہاری موجودگی کا یقین کر کے پورے علاقے کی اکہ بندی کر دیتی اور پھر جب بھی تم میں سے کوئی باہر نکلتا ان کی نگاہوں میں ضرور آجاتا۔" وہ بولا۔

"شاید ہماری تقدیر ہی ساتھ دے رہی ہے ہمارا وہیں نے اتنی دور جان چھڑائی اس ٹیکسی سے۔ اس قت مجھے ان باتوں کا تو بالکل بھی خیال نہیں تھا، میں نے ولیس اس ٹیکسی سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ یہ بات تو اب سُجھائی ہے تم نے۔" آبی اطمینان کا سانس لے کر بولا۔

تیز گام کے کراچی پہنچنے کے مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہم کراچی چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ یہ امکان قوی تھا کہ پولیس جس شد و مد کے ساتھ ہمیں تلاش کر رہی ہے، اس نے شہر سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی کا زیادہ فعال انتظام کر رکھا ہو گا چنانچہ اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہمیں شرافت علی اس بیوٹی پارلر میں لے گیا تھا جہاں اس نے ایک بار پہلے بھی میرے چہرے کی مرمت کرا کے میرا حلیہ تبدیل کرا دیا تھا۔ آج بھی وہاں میرے اور آبی کے چہروں کی اوور ہالنگ کی گئی تھی۔ خود شرافت علی نے اپنا چہرہ خاصا بدلوا لیا تھا۔ ایک ہلکا سا گمان اس کا بھی تھا ہمیں کہ ماں جی کے لاہور میں نہ ہونے کی خبر آرنک کو ضرور مل گئی ہو گی۔ کیوں کہ گزشتہ رات اس کے گرگوں نے میرے لاہور والے گھر پر پروگرام کے مطابق کارروائی کی ہو گی تو ماں جی کو وہاں نہ پا کر انھوں نے فوراً

آرنک کو اس بات کی اطلاع دی ہو گی اور آرنک جیسے عیار اور مکار شخص نے کراچی پہنچنے والی تمام ٹرینوں اور ایئر پورٹ پر آنے والی ہر اس فلائیٹ کی چیکنگ شروع کرا دی ہو گی جو لاہور سے آ رہی ہو گی۔ یہ خیال اسے بھی آسکتا تھا کہ چونکہ میں آبی کے ساتھ کراچی میں موجود ہوں اس لیے ماں جی نے بھی کراچی ہی کا رُخ کیا ہو گا لہٰذا ہم نے اس سے مڈ بھیڑ ہو جانے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہماری پوری ہی ٹیم اسٹیشن پہنچی تھی مگر سب الگ الگ کاروں میں تھے اور ایک دوسرے سے اتنے بے تعلق اور دور تھے کہ کوئی ہمیں دوسرے کا شناسا بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ تیز گام پورے چھ گھنٹے لیٹ آ رہی ہے۔ لہٰذا چھ گھنٹے وہاں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں انکوائری سے یہ معلوم ہوتے ہی الٹے قدموں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ابھی میں نے سیڑھیاں اتر کر اس طرف رخ ہی کیا تھا جہاں میری کار کھڑی تھی کہ ایک ٹیکسی سے چند پولیس والوں کو اترتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مجھے ان کے درمیان میں ایک عورت نظر آئی تھی جو سر جھکائے پچھلی سیٹ سے اتر کر باہر آ رہی تھی اور جیسے ہی اس نے ٹیکسی سے باہر نکل کر سر اوپر اٹھایا، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ میری آنکھوں نے آسیہ کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ آسیہ ہی تھی اور اس وقت پولیس کی حراست میں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں جن کی زنجیر اس کے پیچھے اترنے والے ایک مریل سے سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ تین سپاہی تھے جن میں سے ایک ہیڈ کانسٹیبل معلوم ہوتا تھا اور ایک انسپکٹر تھا شاید جو ٹیکسی کی اگلی سیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ میں ششدر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے آخر۔ ابھی ایک ہی دن پہلے میں نے آسیہ کو طارق روڈ پر کسی خوش حال گھرانے کی بیگم کی طرح ایک مرسیڈیز کار میں دیکھا تھا اور آج وہ پولیس کی حراست میں ریلوے اسٹیشن پر نظر آ رہی تھی۔ وہ لوگ ٹیکسی سے اتر کر میری ہی طرف آ رہے تھے۔ آسیہ اور وہ سپاہی جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کی زنجیر تھی سب سے آگے تھے، ان سے کوئی چار قدم پیچھے ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہی تھا، ان... دونوں سے دو تین قدم پیچھے انسپکٹر تھا۔ وہ لوگ سڑک کے درمیان پہنچے تھے کہ میں نے آبی کی کار کو تیزی سے ان کی طرف بڑھتے دیکھا۔ آناً فاناً میں اس کی

کار ان کے بالکل سر پہ پہنچ گئی۔ کار کے بریک پوری قوت سے چیخ اٹھے۔ پیچھے آنے والے سپاہی اور انسپکٹر خود کو کار کی زد سے بچانے کے لیے مشینی انداز میں اچھل اچھل کر پیچھے ہٹے تھے، لیکن آسیہ کے ساتھ چلنے والا سپاہی کوشش کے باوجود بچ نہیں سکا۔ وہ غریب بچ بھی کس طرح سکتا تھا آسیہ نے اسے اس کے ارادے میں کامیاب ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ کار کو اپنے قریب دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا کر خود آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ حرکت اس نے اس تیزی سے کی تھی کہ سپاہی کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ وہ کار کی ٹکر سے اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ آسیہ نے اسے گرتے دیکھ کر زور سے جھٹکا دے کر ہتھکڑی کی زنجیر اس کے ہاتھ سے چھڑائی اور ابھی اس نے بھاگنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ آبی نے کار کا دروازہ کھول کر چلا کے کہا۔ "آسیہ! ہری اپ۔"

آسیہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا اس گھڑی کہ سپاہی کو ٹکر مارنے والی کار میں سوار شخص اسے اپنی کار میں سوار ہونے کو کہہ رہا تھا۔ اسے تو ہر حال میں وہاں سے نکل جانا تھا اس وقت ہچکچانے یا سوچنے سمجھنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ تیزی سے پلٹی اور پلک جھپکتے میں ہتھکڑیوں سمیت آبی کی کار میں گھس گئی! اس سے پہلے کہ انسپکٹر اور دوسرے سپاہی کچھ سمجھتے، آبی کی کار گھومتی ہوئی آندھی طوفان کی رفتار سے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ لمحوں میں لوگوں نے انسپکٹر اور سپاہیوں کو گھیرے میں لے کر ان سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ کوئی سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ وہاں ہوا کیا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار ایک سپاہی کو ٹکر مار کر بھاگ گئی ہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ انسپکٹر کو اپنی کمر سے لٹکا ہوا سروس ریوالور نکالنے کا جب ہوش آیا تو وہاں دور دور آبی کی کار کا نشان تک نہیں تھا۔ آبی کی تیزی اور مہارت دیکھ کر میں خود بھی حیران رہ گیا تھا اور میرے دل نے اسے بے اختیار داد دی تھی۔ اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ میں اس وقت بہت سی کاریں، موٹر سائیکلیں اور ٹیکسیاں موجود تھیں، ان میں سے کئی گاڑیاں ایسی بھی تھیں جن کی ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بھی موجود تھے مگر ان میں سے کسی کو بھی آبی کے پیچھے جانے کا خیال نہیں آسکا تھا۔ میں نے کسی ایک گاڑی کو بھی اس کے پیچھے جاتے نہیں دیکھا تھا کراچی کی سڑکوں پہ حادثات کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ تو یہاں کے معمولات میں شامل ہو چکے ہیں چنانچہ یہاں کے لوگ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کسی چھوٹے موٹے حادثے کو نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں ہیں۔ اس حادثے پر بھی انھوں نے زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی تھی کہ ٹکر کھا کر گرنے والے سپاہی کی جان بچ گئی تھی اور لوگوں نے اسے اٹھ کر اپنے ہاتھ پیروں کی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لیتے دیکھا تھا۔

"یہ سب کیا ہوا ہے جیلانی! یہ قیدی عورت کون تھی اور آبی کیوں اسے چھڑا کے لے گیا ہے؟" مجھے اپنے قریب سے فیروز کی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا وہاں قریب کوئی اور شخص نہیں تھا اور فیروز مجھ سے ایک قدم پیچھے یوں کھڑا تھا جیسے وہاں کھڑا حادثے والی جگہ کو دیکھتے ہوئے کسی اجنبی کی طرح یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہاں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ میں نے بھی اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں اسے بتایا۔ "وہ آسیہ تھی، میری بہن۔ وہ پھر پولیس کے ہتھے چڑھ گئی تھی کسی طرح۔"

"اوہ اچھا، میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی قریبی تعلق رکھتی ہے تم دونوں میں سے کسی سے، جبھی آبی نے یہ اندھا دھند قدم اٹھایا ہے۔ اس وقت تو وہ بالکل جنونی ہو رہا تھا اور اسی جنون کے عالم میں یہ سب کر گزرا ہے وہ۔" فیروز کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ہم سب یکے بعد دیگرے اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے آئے۔ آبی اس وقت تک گھر پہنچ چکا تھا اور اس نے آسیہ کو ہتھکڑیوں سے نجات بھی دلا دی تھی۔ میں جس وقت گھر پہنچا اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا آسیہ کی ہی پناسن رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آسیہ دوپٹے کا پلو سر پر سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آبی نے اسے بتایا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اسے دیکھ کر میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی، میں اس سے بہت کچھ پوچھنا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی مجھ سے ایک لفظ بھی بولا نہیں گیا اس کے سامنے۔ میں چند ثانیے خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ وہ بھی بس گم صم مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شبنم کے قطرے سے تھرتھراتے دکھائی دے رہے تھے اور ہونٹ بار بار کپکپا کر رہ جاتے تھے۔ آخر وہ بے اختیار دوڑ کر میرے سینے سے آلگی۔ اس کے

ہونٹوں سے صرف "بھائی جان" نکل سکا تھا اور پھر وہ بری طرح سسک اٹھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور اپنے آنسوؤں سے میرے سینے پر جما ہوا سارا گرد و غبار دھوئے ڈال رہی تھی۔ اس کی اس حالت نے میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلکا دیا تھا اور میری آنکھیں بھی ساون کی طرح برس پڑی تھیں۔ آبی خاموش کھڑا دو بچھڑے ہوئے بھائی بہن کے ملاپ کا یہ منظر دیکھتا رہا۔

میں نے آسیہ کو آبی کے ساتھ فردوسی بیگم کے پاس بھیج دیا تھا اور جاتے ہوئے اسے تاکید کر دی تھی کہ اب وہ یہاں سے کہیں جانے کا خیال دل میں نہ لائے۔ وہ خود بھی باہر قدم نکالنے کے لیے تیار نہ تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ باہر پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں ہوگی۔ اس نے جو جرم کیا تھا وہ ایسا ہی سنگین تھا کہ پولیس اس کی گرفتاری کے لیے کراچی کا کونہ کونہ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتی تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ اس کے جرائم کی فہرست پہلے ہی کچھ کم طویل نہیں تھی کہ اب اس نے ایک بہت بڑے آدمی کو قتل کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی تھی۔ وہ دیوانی اپنے بچے کے لیے پاگل ہوئی پھر رہی تھی۔ لاکھو لاشاری کو قتل کرنے کے بعد وہ اس بچے کا ہی سراغ لگانے کی خاطر وہاں رہ گئی تھی۔ وہ لاکھو لاشاری کی حویلی سے میرا ساتھ چھوڑ کر اسی ڈر سے بھاگ گئی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرتا جب کہ وہ اس وقت تک اس علاقے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی جب تک اسے اپنا بچہ یا اس کا کوئی اتا پتا نہ مل جاتا۔ پھر وہ بچے کا پتا معلوم ہونے کے بعد ہی کراچی آئی تھی، اس کا بچہ کراچی میں لاکھو لاشاری کے ایک دوست کے پاس تھا، اس کا نام غلام مرتضیٰ شاہ تھا، وہ ڈیفینس میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہتا تھا۔ لاکھو لاشاری اور غلام مرتضیٰ ایک دوسرے کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ لاکھو نے اپنا بچہ اسی کے پاس رکھوایا ہوا تھا، اس کا بچہ اور تمام زمین جائداد بھی اب غلام مرتضیٰ شاہ ہی کی نگرانی میں تھی۔ آسیہ اسے تلاش کرتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی تھی، اس نے مرتضیٰ شاہ کے سامنے خود کو ایک مظلوم اور بے سہارا عورت ظاہر کر کے اس سے ملازمت کی درخواست کی تھی۔ غلام مرتضیٰ شاہ نے اسے اپنے گھر میں ملازمت دے دی تھی اور چند دن بعد جب آسیہ نے اس کی بیوی کو بتایا کہ وہ ایک معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے تو اس نیک بخت عورت کو اس پہ بہت ترس آیا اور اس نے آسیہ کو ملازمہ کے بجائے گھر کے ایک فرد کا درجہ دے دیا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ غلام مرتضیٰ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے آسیہ کو بہن بنا لیا اور اپنے گھر میں اسے وہی مقام دے دیا جو اس کی چھوٹی بہن کو مل سکتا تھا۔ اسی روز طارق روڈ پر میں نے اسے جس کار کے ساتھ دیکھا تھا وہ سب غلام مرتضیٰ شاہ کی عنایت کا نتیجہ تھا۔ آسیہ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، ہر طرح کا عیش اور ایک باعزت مقام ملا ہوا تھا اسے۔ اس کا بچہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا تھا اس کے۔ مگر آسیہ عیش و آرام کی زندگی گزارنے نہیں گئی تھی۔ وہ صرف بچے کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے وہاں رہ کر یہ دیکھ لیا تھا کہ غلام مرتضیٰ شاہ اور اس کی بیوی اس بچے کی نگہداشت اور پرورش بالکل اپنے بچوں کی طرح کر رہے تھے۔ شاید لاکھو لاشاری نے یہ بتا دیا تھا کہ بچے کی ماں ایک بے حد خطرناک عورت ہے اور وہ ہر قیمت پر بچے کو حاصل کر لینا چاہتی ہے۔ چنانچہ چند سالوں تک جب تک بچے کے نقوش تبدیل نہ ہو جائیں بچے کو کسی بھی حالت میں گھر سے باہر نہ جانے دیں کسی کو۔ لہٰذا وہ لوگ اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بچے کو کوٹھی کے اندر بھی ایسی جگہوں پر رکھا جاتا تھا کہ باہر سے کسی کی نظر تک نہ پڑ سکے اس پر۔ کوئی اجنبی ہوتا تو اس کے سامنے بچے کو لانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ آسیہ کو بھی اس وقت تک اس کوٹھی میں رہتے ہوئے بچے کی وہاں موجودگی کا علم بھی نہیں ہو سکا تھا جب تک اس نے ان لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کر لیا تھا۔ اتنی سخت حفاظت سے بچے کو نکال لانا آسان کام نہیں تھا لیکن رات آسیہ نے ساری حفاظتی بندشیں توڑ کر اپنے بچے کو وہاں سے نکال لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آدھی رات کے بعد جب کوٹھی کا ہر فرد گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا تو سے بچے کی خواب گاہ تک پہنچ کر اسے اٹھا لیا لیکن عین اس وقت جب وہ اسے لے کر دروازے سے نکل رہی تھی، بچے کی آنکھ کھل گئی اور وہ رو پڑا۔ بچے کی دیکھ بھال والی عورت جو بچے کے ساتھ اسی کمرے میں سوئی تھی، کے رونے کی آواز سن کر جاگ گئی... اس نے آسیہ کو بچہ اٹھائے کمرے سے جاتے دیکھا تو چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ آسیہ نے بات بگڑتے دیکھی تو بچے کو لے کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن عورت کی چیخ پکار سن کر کوٹھی

لان میں گشت کرنے والا مسلح محافظ دوڑتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ اس نے آسیہ کو ریوالور دکھا کر رکنے کا حکم دیا۔ دوسری طرف سے غلام مرتضیٰ شاہ اور اس کی بیوی بھی آ گئے تھے۔ آسیہ کو فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ تمام راستے مسدود پا کر اس نے بچے کو فرش پر ڈال دیا اور اچانک جست لگا کر ریوالور بردار محافظ پر جا پڑی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی عورت ریوالور جیسے ہتھیار کی پروا کیے بغیر یوں اس پر آ پڑے گی۔ آسیہ نے بجلی کی سی تیزی سے اس کا ریوالور والا ہاتھ تھام کر زور سے جھٹکا دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گرا تو اس نے جھپٹ کر ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس دوران غلام مرتضیٰ شاہ ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے آسیہ کو پکڑنے کی کوشش کی مگر آسیہ نے اس کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کے ہاتھوں سے نکلی اور بے دریغ اس پر گولی چلا دی۔ گولی غلام مرتضیٰ شاہ کے سینے میں لگی تھی، اسے سینہ پکڑتے گرتے دیکھ کر اس کی بیوی اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے جنونی انداز میں آسیہ پر آ پڑی پھر فوراً ہی محافظ نے پیچھے سے آ کر اسے دبوچ لیا۔ اس اثنا میں کوٹھی کے سرونٹس کوارٹروں سے ملازمین نکل کر دوڑتے ہوئے وہاں آ پہنچے تھے ان سب نے مل کے آسیہ کو بے بس کر کے ڈال دیا اور پھر اسے پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ گولی کا زخم ایسا تو نہیں تھا کہ غلام مرتضیٰ شاہ کی ہلاکت کا خطرہ ہو لیکن گولی لگنے اور زخمی ہونے کی بنا پر اس پر غلام مرتضیٰ شاہ پر قاتلانہ حملہ کرنے کا الزام لگا دیا گیا تھا۔ پولیس کے پاس اس کے سابقہ جرائم کی بھی خاصی طویل فہرست پہلے ہی سے موجود تھی اور پنڈی کی مفرور ملزمہ کی حیثیت سے بھی پولیس کو مطلوب تھی وہ۔ جس پولیس پارٹی سے آبی چھڑا کر لایا تھا اسے، وہ اس کو لے کر پنڈی جا رہی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے آسیہ نے بتائی تھیں۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ پولیس کے ریکارڈ کے مطابق آسیہ بے حد خطرناک مجرم تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس کا مجھ سے کیا رشتہ ہے اور یہ بھی کہ وہ راولپنڈی جیل میں آبی کے ساتھ پکڑ کر لائی گئی تھی اور دونوں پر ایک ہی جیسے الزامات تھے، دونوں کے جرائم کی فہرست میں ایک دوسرے کا نام بھی درج کر رکھا تھا انہوں نے اور آبی کے ساتھ میرے تعلق سے بھی آگاہ تھے وہ۔ اس کے باوجود انہوں نے صرف چار آدمیوں کے ساتھ اسے راولپنڈی پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ آسیہ کو بہ حفاظت راولپنڈی پہنچانے کے لیے پولیس کی یونیفارم ہی کافی ہوگی یا شاید انہیں وہ دیگر عورتوں کی طرح ایک عام سی عورت لگی تھی اور اس کے کارناموں کی جو فائل ان کے پاس تھی، اس کے اندراج کو انہوں نے پولیس کی معمول کی کارکردگی سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، وہ خود بھی اسی محکمے سے تعلق رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ افسرانِ بالا کو مطمئن کرنے اور ان سے تعریفی اسناد حاصل کرنے کے لیے کس طرح بلی کو شیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے آسیہ کو بھی ایسی ہی بلی سمجھا ہوگا جسے ضرورت کے تحت ان کے کچھ بھائی بندوں نے ان فائلوں میں شیرنی بنا دیا تھا۔

فیروز اور شرافت علی وغیرہ بھی اس وقت تک واپس آ چکے تھے۔ لیکن مجھے آسیہ کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہماری باتوں کے درمیان مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آسیہ کے فردوسی بیگم کی طرف جاتے ہی وہ لوگ اٹھ کر میرے پاس آ گئے اور ان سب نے مجھے آسیہ کے مل جانے پر مبارک باد دی۔ میں نے کہا۔ "یارو! آسیہ مل گئی یہ ایک کام تو ٹھیک ہو گیا ہے لیکن ماں جی ابھی ہمارے پاس نہیں پہنچی ہیں ان کی فکر ہنوز باقی ہے ابھی، دعا کرو وہ بھی پہنچ جائیں خیریت سے۔"

"آسیہ کا یوں اچانک اور خلافِ توقع مل جانا بہت نیک شگون ہے جیلانی! تم فکر مت کرو، انشاءاللہ ماں جی بھی بہ حفاظت پہنچ جائیں گی ہمارے پاس۔" فیروز بولا۔ "ویسے تم نے اسٹیشن پر کوئی ایسا شخص دیکھا تھا جس پر یہ شبہ ہوا ہو کہ وہ آٹرک کا بھیجا ہوا ہے؟"

"نہیں، اس کی مجھے مہلت ہی کہاں مل سکی تھی، انکوائری سے گاڑی کے بارے میں معلوم کر کے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا ہی تھا کہ آسیہ نظر آ گئی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس دوران کسی اور طرف نظر اٹھانے کا بھی خیال نہیں آ سکا تھا۔" میں نے کہا۔

شرافت علی بولا۔ "ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔ اس پر عمل کر کے ہم ماں جی کو یوں لے آئیں گے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے گی۔"

"وہ کون سی تجویز ہے مجھے بھی بتاؤ۔ ویسے تمہاری کھوپڑی ایسے معاملات میں بہت تیز چلتی ہے، اس کا تجربہ ہے مجھے۔" میں بولا۔

دوسرے لوگ بھی اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ "ریلوے والوں کی اطلاع کے مطابق تیزگام پورے چھ گھنٹے لیٹ ہے اگر ہم سپر ہائی وے سے سفر کریں تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے میں حیدرآباد پہنچ سکتے

ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم حیدرآباد یا کوٹری پہنچ کر ماں جی کو وہاں اتار لیں گاڑی سے اور پھر اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر کراچی لے آئیں۔"

میں نے ایک دم خوشی سے اچھل کر کہا "بہت ہی بہت اچھی بات سوجھی ہے تمہیں شرافت علی۔ کیوں فیروز! کیا خیال ہے تمہارا؟"

"مجھے بھی اتفاق ہے شرافت علی کی اس تجویز سے۔ آرنگ کے آدمی کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر جھک مارتے رہ جائیں گے اور ہم اطمینان سے انہیں لے کر یہاں پہنچ جائیں گے۔ یہ بات پہلے ہی کیوں نہیں سوجھ لی یار شرافت علی تم نے؟" فیروز بھی اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

میں جلدی سے بولا "یہ بہت ہی اچھا ہوا یار! انہیں پہلے یہ خیال نہ آیا، نہیں تو ہم صبح ہی صبح حیدرآباد کی طرف روانہ ہو جاتے اور پولیس والے اطمینان کے ساتھ آسیہ کو لے کر راولپنڈی چلے جاتے۔ وہ پھر ہمیں کیسے مل سکتی تھی؟ یہ نہیں سوچا تم نے؟"

"قدرت کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ آسیہ کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا ریلوے اسٹیشن جانا ضروری تھا، شاید اس لیے یہ بات پہلے مجھے نہیں سوجھی۔ اور اب یہ خیال مجھے اس وجہ سے آیا کہ میں دیر سے کوئی متبادل راستہ تلاش کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات چبھ رہی تھی بار بار کہ ممکن ہے ریلوے اسٹیشن پر کوئی ایسا شخص بھیج رکھا ہو آرنگ نے جو آسیہ کو بھی پہچانتا ہو۔ اس نے بھی اگر آسیہ کو دیکھ لیا ہے وہاں تو اس نے آبی کو بھی دیکھا ہو گا آسیہ کی مدد کرتے ہوئے اور اس کار کو ذہن میں محفوظ کر لیا ہو گا جو آسیہ کو لے کر بھاگی تھی۔ ممکن ہے ہم میں سے بھی کسی کی کار یا شکل اسے یاد رہ گئی ہو تو دوبارہ وہاں جا کر ہم ان کے لیے آسان شکار بن سکتے ہیں۔ یوں بھی کراچی کے اسٹیشن پر ماں جی کو ریسیو کرنے والا تو ان کی نظروں سے نہیں بچ سکے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یار! اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے۔ فوراً روانہ ہو جانا چاہیے یہاں سے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اب کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟ کیا مجھے ساتھ نہیں لے چلو گے لپٹنے؟" آبی نے کمرے میں قدم دھرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے شرافت علی کی تجویز سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "اب ہم لوگ حیدرآباد چل رہے ہیں ماں جی کو ریسیو کرنے کے لیے۔"

حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد ہم وہاں انکوائری سے پتا کیا تو معلوم ہوا، ابھی تیزگام کے پہنچنے میں تقریباً پچاس منٹ ضرور لگیں گے۔ چنانچہ انتظار گزاری کے لیے ہم اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ یہاں چونکہ کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لیے انور کمال اور گل زمان کو ہم ساتھ نہیں لائے تھے۔ دونوں کو آسیہ اور فردوسی بیگم کی خبرگیری کے لیے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہم چار افراد دو گاڑیوں میں حیدرآباد پہنچے تھے۔ تیزگام کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہم دوبارہ اسٹیشن جا پہنچے اور پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر اس پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں تیزگام آکر رکنے والی تھی۔ ہمارے پلیٹ فارم پر پہنچنے کے کوئی دو منٹ بعد ہی گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ہمیں معلوم تھا کہ حیدر نے ایئرکنڈیشنڈ میں سیٹیں حاصل کی ہیں لہٰذا ٹرین کے رکتے ہی میں آبی کے ساتھ ایئرکنڈیشنڈ میں جا گھسا۔ اس ٹرین میں شاید ایک ہی بوگی ایئرکنڈیشنڈ تھی۔ ہم نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک کر کے تمام کیبن دیکھا۔ ڈالے بیگم ماں جی اور حیدر میں سے کوئی بھی ہمیں دکھائی نہیں دیا وہاں۔ سب سے آخری کیبن میں ایک باوردی پولیس کانسٹیبل آرام سے ٹانگیں پھیلائے پڑا سو رہا تھا۔ ہم اس بوگی سے نیچے اتر آئے۔ پھر ہم نے ٹرین کا ایک ایک ڈبا دیکھ ڈالا لیکن پوری ٹرین میں کوئی شناسا صورت دکھائی نہیں دی ہمیں۔ میں نے مایوس ہو کر آبی سے کہا "یار! سمجھ نہیں آتی آئے کیوں نہیں یہ لوگ۔ آنا تو انہیں اسی گاڑی سے تھا۔"

آبی بولا "تجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ ٹھیک سے سنا بھی تھا تو نے تیزگام ہی کہا تھا اس نے، تیزرو تو نہیں کہا تھا؟"

"تیرا کیا خیال ہے، میرے کان اتنے چوپٹ ہو گئے ہیں کہ میں تیزرو کو تیزگام سن لوں گا؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تیزگام ہی کہا تھا حیدر نے۔"

"تو پھر شاید دن نہیں یاد رہا ہو گا تجھے۔ اس نے کل سے روانہ ہونے کو کہا ہو گا۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہیں کرا دئیے۔ تجھے مذاق سوجھ رہا ہے اس گھڑی۔ حالانکہ میری جان آدھی نکل چکی ہے۔ کہیں انہیں کوئی حادثہ..."

آبی ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا میری بات کاٹ کر بولا "ٹھہر جا یار! میں پتا کرتا ہوں ابھی۔"

اسی لمحے فیروز اور شرافت علی آ پہنچے۔ فیروز بولا "کیا ہوا بھئی! تم دونوں منہ لٹکائے کیوں کھڑے ہو؟ ماں جی نہیں ملیں کیا؟"

"نہیں یار! ہم نے پوری گاڑی دیکھ لی، ان لوگوں کا کہیں پتا نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے؟" میں نے فکرمندی سے کہا۔

شرافت علی بولا "وہ لوگ تو ایئرکنڈیشنڈ میں آ رہے تھے نا اور اے سی کی تو صرف ایک ہی بوگی ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں تم نے؟"

"پوچھتا کس سے؟ کون جانتا ہو گا انہیں اس گاڑی میں۔ کون بتائے گا مجھے کہ وہ ٹرین میں سوار ہوئے بھی تھے یا نہیں؟"

"میں نے ایک مسافر سے ٹرین کے لیٹ ہو جانے کی وجہ معلوم کی تھی۔ اس نے بتایا کہ ادھر سکھر پر ایک لاش اتاری گئی ہے ٹرین سے۔ اسے کسی نے پھانسی دے کر ہلاک کیا تھا، چلتی ٹرین میں اور یہ حادثہ اے سی میں ہی ہوا ہے۔" شرافت علی نے کہا۔

"کون تھا وہ؟ یہ پتا نہیں چلا؟" میں نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولا "مگر ایک اکیلے شخص کی لاش سے ہمارا کوئی تعلق کیسے بن سکتا ہے؟ حیدر اکیلا تو سفر نہیں کر رہا ہو گا، اس کے ساتھ ماں جی ہوں گی، اس کی بیوی بالی ہو گی۔ نہیں، وہ حیدر نہیں ہو سکتا۔"

آبی بولا "جیلانی ٹھیک کہتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مرنے والا حیدر ہی تھا تو پھر ماں جی اور بالی کہاں گئیں؟ انہیں تو گاڑی میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے گاڑی کا ایک ایک ڈبا دیکھا ہے، وہ کوئی سوئی تو ہیں نہیں کہ ہمیں نظر نہ آ سکیں۔"

"پھر یوں کریں کہ ہم واپس کراچی چل کر دیکھیں، ممکن ہے وہ لوگ کسی اور گاڑی سے وہاں پہنچ گئے ہوں اور ہم لوگ خواہ مخواہ یہاں دھکے کھاتے پھر رہے ہوں۔ اگر وہاں بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تو تم لاہور ٹیلی فون کر کے پتا کرنا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ کسی وجہ سے روانہ ہی نہ ہو سکی ہوں لاہور سے۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے، کوئی اچانک بیمار بھی ہو سکتا ہے۔" فیروز بولا۔

"ایسا نہ کہو یار! خدا کرے وہ گھر چھوڑ دیا ہو ماں جی نے رات سے پہلے ہی۔ تمہیں پتا ہے نارانت کوان فیلیل میودیوں کے زرخرید غلاموں نے وہاں دھاوا بول دیا ہو گا۔ اور جو بھی وہاں ملا ہو گا انہیں، اس کا پتا نہیں کیا حشر کیا ہو گا اور مکان کی شاید اب راکھ ہی باقی بچی ہو گی۔ جلا کر خاکستر کر دیا ہو گا وہ تو، یہی پروگرام تھا ان لوگوں کا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

سب لوگوں پر سوگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ کسی سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کسی کے بھی کہ کیا کیا جائے، کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا، مکمل اور گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا موجودہ صورت حال کے بارے میں کوئی رائے بھی ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں کسی کے پاس بھی۔ عجب بے کسی اور بے چارگی کا عالم تھا۔

چند منٹ ہم سب اداس، مضمحل اور تھکے تھکے سے کھڑے ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے، پھر آہستہ آہستہ مڑ کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑے۔

واپسی کا سفر انتہائی بے کیف تھا۔ تمام راستے ہر شخص منہ بند کیے بیٹھا رہا تھا۔ میں جس کار میں تھا اسے شرافت علی ڈرائیو کر رہا تھا۔ تمام راستے نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ مجھے ماں جی کی فکر نے گھیر رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں اس رب کائنات سے دل کی گہرائیوں کے ساتھ ماں جی کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے ایک جلتے ہوئے مکان کا منظر ابھر آتا تھا جہاں سے کچھ لوگ ماں جی کو انتہائی بے دردی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کیا ماں جی کی تقدیر میں عمر کی اس آخری منزل میں یہ عذاب سہنا بھی لکھا دیا گیا تھا۔

"جیلانی بھائی! کوئی خاتون گزشتہ دو گھنٹے میں چار بار فون کر کے پوچھ چکی ہیں آپ کو۔" ہمارے گھر پہنچتے ہی انور کمال نے مجھ سے کہا۔

"اچھا، کون تھی وہ اور کیوں فون کیا اس نے مجھے، یہ نہیں بتایا اس نے تمہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے کہا اپنا نام بتا دیں اور میسج دے دیں۔ میں آپ کے آتے ہی میسج پہنچا دوں گا آپ کو لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹیلی فون رکھ دیا ہر بار کہ میں تھوڑی دیر میں پھر ٹیلیفون کروں گی۔ آپ آ جائیں تو صرف اتنا کہہ دیں کہ میرے فون کا انتظار کریں۔" اس نے جواب دیا۔

"شاید وہ لزی ہی ہوگی۔ ماں جی کے بارے میں بتلانے کے لیے فون کیا ہوگا اس نے،" میں پُرخیال انداز میں بولا۔ عین اسی لمحے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا کر کہا: "ہیلو، کس سے بات کرنا ہے بھئی؟"

"اوہ، شکر ہے آپ مل گئے۔" دوسری طرف سے لزی کی آواز سنائی دی: "میں چار مرتبہ فون کر چکی ہوں آپ کو۔"

"ہاں، مجھے بتا دیا گیا ہے، میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم ماں جی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہو۔ جلدی بتاؤ وہ کہاں ہیں اس وقت؟"

ایک لمبی سی سانس لے کر وہ بولی: "تو اس کا مطلب ہے آپ کو اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے افسوس ہے جنابِ عالی! ....."

میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "افسوس بعد میں کر لینا، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس کتے نے کیا سلوک کیا ہے ماں جی کے ساتھ؟ وہ کہاں ہیں اس وقت اور خیریت سے بھی ہیں یا نہیں؟ جلدی بتاؤ، میں بہت پریشان ہوں ان کے لیے۔"

"وہ تو بالکل خیریت سے ہیں، ان کی فکر میں خود کو ہلکان نہ کریں آپ۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ انہیں آٹزک کے ہاتھ نہ لگنے دوں۔ آٹزک کو اس سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن وہ آپ کے بارے میں نرم رویّہ اختیار کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے اور اب اسے یہ شبہ بھی ہو گیا ہے کہ اس کے اردگرد کوئی آپ کا ہمدرد ضرور ہے جس کے ذریعے اس کے منصوبوں کا علم آپ کو ہو جاتا ہے۔ اس نے چار بہترین آدمی اپنی حفاظت کے لیے مقرر کر دیے ہیں جو دن رات اس کے آس پاس موجود رہ کر چاروں طرف نظر رکھیں گے تاکہ کسی بھی طرف سے اس کی بے خبری میں آپ یا آپ کے ساتھی اس پر حملہ نہ کر سکیں۔ وہ سخت خطرہ محسوس کرنے لگا ہے آپ سے۔" لزی نے بتایا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ماں جی پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب کس طرح ہو گیا؟ اس نے تو رات کے وقت میرے مکان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا اپنے آدمیوں کو، اور ماں جی دوپہر میں ہی حیدر اور بالی کے ساتھ گھر چھوڑ کر نکل گئی تھیں۔ انہیں تیز گام سے یہاں آنا تھا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ جنابِ عالی! آٹزک نے ایسا ہی کرنے کو کہا تھا انہیں۔ مگر انہوں نے آٹزک کا حکم ملتے ہی آپ کے مکان کی نگرانی شروع کر دی۔ جیسے ہی آپ کی ماں جی ایک ملازم اور اپنی ملازمہ کے ساتھ گھر سے نکلی تھیں، دو آدمی ان کے پیچھے لگ گئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان تینوں کو تیز گام میں سوار ہوتے دیکھ کر انہوں نے اسٹیشن ہی سے فون کر کے سربراہ کو اطلاع دی کہ وہ لاہور چھوڑ رہے ہیں۔ ان دونوں کو ٹرین میں ان کے پیچھے لگے رہنے کی ہدایت کر کے آٹزک کو اس کی اطلاع دیے بغیر ٹرین میں سفر کے دوران آپ کی ماں جی کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اور خان پور پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ کے ملازم نے مزاحمت کی تھی مگر انہوں نے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر ٹرین کے ڈبے کی چھت سے لٹکا دیا تھا جس میں وہ لوگ سفر کر رہے تھے۔ اس کے بعد ماں جی اور ان کی ملازمہ کو بے ہوش کر کے خان پور اتار لیا گیا۔ وہاں سے ایک بند پک اپ میں ڈال کر ان دونوں کو کراچی لے آیا گیا اور سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ اسی مکان کے تہ خانے میں رکھا گیا ہے جہاں خود آٹزک موجود ہے۔ اب وہ اس کی اطلاع آپ کو دینا چاہتے ہیں مگر آپ کا کوئی سراغ ان کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا طریقہ ان کی سمجھ میں آ رہا ہے جس پر عمل کر کے وہ آپ کو خبر کر سکیں اس کی۔ میری ایک بات ذہن نشین کر لیں جنابِ عالی! آپ ماں جی کو آزاد کرانے کے لیے اُدھر کا رُخ بالکل نہیں کریں گے، وہاں آپ کو پھانسنے کے لیے قدم قدم پر پھندے لگا رکھے ہیں انہوں نے۔"

"اس کی تم پروا نہ کرو، مجھے اس مکان کے اندر کا نقشہ سمجھا دو تم اور یہ بتا دو کہ پولیس اب بھی مکان کے آس پاس موجود ہے یا نہیں۔"

"اوہ جنابِ عالی! آپ میری بات مان لیں، خدا کے لیے۔ اس بار انہوں نے بہت سخت انتظامات کیے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے آپ کی ماں جی کو صرف اس لیے اغوا کیا ہے کہ آپ انہیں ان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے وہاں دوڑے چلے آئیں جہاں وہ آپ کو بلانا چاہتے ہیں۔ اس جگہ آپ کو ان کا کوئی ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔ آپ اس مکان کے جس حصے میں بھی قدم رکھیں گے اسی وقت سارے ہی دیوار و در بے آواز گولیاں اگلنے لگیں گے آپ پر۔ پوری عمارت میں ایسا ہی گورکھ دھندا پھیلایا ہے انہوں نے۔ پولیس کو آٹزک نے وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ حکام کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی سکونت وہاں سے ختم کر کے ایک دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا ہے لہٰذا اب اس مکان کی حفاظت یا نگرانی کی ضرورت نہیں رہی۔ مقصد اس کا صرف یہی ہے کہ تم کسی طرح بے روک ٹوک اس عمارت میں پہنچ جاؤ۔"

"اوہ، یہ سارا کچھ کر رکھا ہے اس خبیث نے وہاں، مگر میں اپنی جان بچانے کے لیے ماں جی کو اس شیطان کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتا نا۔ ان کی آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا مجھے، یوں بھی موت تو ہر دم ہمارے گرد منڈلاتی رہتی ہے، اس سے کیا ڈرنا۔" میں بولا۔

"نہیں وہ اور بات ہے جنابِ عالی لیکن یہ تو جان بوجھ کر خود کو موت کے منہ میں ڈال دینا ہے۔" لزی ایک دم جیسے تڑپ کر بولی۔

"میں سمجھ رہا ہوں جو کچھ تم کہہ رہی ہو لیکن پھر ماں جی کا کیا ہوگا؟ انہیں کیسے نجات ملے گی اس سے؟ میں....."

"ان کا مسئلہ مجھ پر چھوڑ دیں آپ، اعتبار کریں مجھ پر اور اطمینان رکھیں، میں جلد از جلد انہیں نکالنے کی کوشش کروں گی وہاں سے۔"

"کیا یہ ممکن ہے تمہارے لیے؟ میرا مطلب ہے تمہاری پوزیشن مشکوک تو نہیں ہو جائے گی اس طرح؟ تم نظر میں تو نہیں آ جاؤ گی اس کی؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ جہاں تک آٹزک کی نظروں میں مشکوک ہونے کا تعلق ہے تو میرا اندازہ ہے وہ ان دنوں میری طرف سے مطمئن نہیں ہے، شکوک و شبہات تو جنم لینے لگے ہیں اس کے دماغ میں لیکن اس کا کھل کر اظہار نہیں کیا ہے اس نے۔" لزی نے کہا۔

"پھر تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ وہ مشکوک ہو گیا ہے تمہاری طرف سے؟ جب کہ اس نے کسی طرح اظہار بھی نہیں کیا اس کا؟"

وہ ہنس کر بولی: "چھوڑیں آپ اس قصّے کو، آپ صرف آم کھانے سے غرض رکھیں، پیڑ کیوں گننے لگے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو نہیں گنتا ہوں میں پیڑ لیکن ماں جی کے بارے میں مجھے اندھیرے میں مت رکھنا۔ جب اور جہاں بھی میری ضرورت پیش آئے مجھے بتا دینا، میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔ اس کا خیال نہ کرنا کہ وہاں موت میری منتظر ہوگی۔ موت سے میں بالکل نہیں ڈرتا ہوں، وہ تو ایک دن آنا ہی ہے، اس سے میں بچ تو نہیں سکتا، اور جب بھی آئے گی اپنے وقتِ مقررہ پر ہی آئے گی۔ یہ ایمان ہے ہمارا، موت کا ایک دن اور وقت متعین ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا اور نہ ہی موت اس وقت سے پہلے آ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پہلے مجھے کوشش کر لینے دیں آپ۔ اگر مجھے کامیابی نہ ہو سکی تو میں بتا دوں گی آپ کو۔" لزی نے جواب دیا۔

جس مصیبت سے بچنے کے لیے میں کل صبح سے جدوجہد کر رہا تھا، وہ میری کوشش اور تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود ٹل نہیں سکی تھی، ماں جی کو آٹزک نے مجھ تک نہیں پہنچنے دیا تھا۔ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ان لوگوں نے آٹزک کا حکم ملنے کے بعد سے میرے مکان کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ تیز ثابت ہوئے تھے اور اگر لزی میرے لیے فرشتۂ رحمت نہ بن گئی ہوتی تو اب تک میرے وجود کا کوئی حصہ باقی نہیں بچا ہوتا۔ لزی میرے بہت کام آ رہی تھی۔ حالانکہ یہ بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکی تھی اور یہ راز ہنوز ایک سربستہ راز ہی تھا کہ وہ مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو گئی ہے کہ یہودیوں کی روایات کے خلاف اپنی قوم کے مقابلے میں نہ صرف میری مدد کر رہی تھی بلکہ دیکھا جائے تو ایسے اقدامات کر رہی تھی جن کی وجہ سے اسرائیل کے کاز کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ یہ بات حیرت انگیز بھی تھی۔ میں نے اب تک یہودیوں کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سنا تھا اس کے مطابق تو شاید یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ ایک یہودی لڑکی اپنی قوم کے خلاف ایک غیر قوم کے شخص کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک ایسے شخص کا ساتھ جو اپنے ملک میں یہودیوں کے عزائم کی راہ میں دیوار بن گیا تھا۔ تاریخ میں خصوصاً گزشتہ صدیوں کی تاریخ میں کوئی ایسا یہودی نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کے مفاد کے خلاف جان بوجھ کر کوئی کام کیا ہو۔ ایسے تو بے شمار یہودی مل جائیں گے جنہوں نے اس ملک کے خلاف جہاں وہ رہ رہے تھے غدّاری کی، اس کی بربادی کا سامان کیا، جنگیں لڑوائیں اور دو لڑنے والے ملکوں کو امداد دیتے رہے تاکہ وہ لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں۔ دو قوموں میں اختلاف کا بیج بویا اور طرح طرح کے نئے نئے نظریات کا پرچار کر کے ان میں نفاق اور افتراق کی کاشت کرتے رہے لیکن یہ سب یہودی قوم کے مفاد میں اور اس کی سربلندی اس کی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے کرتے رہے تھے وہ۔ اس طرح انہوں نے اقوامِ عالم کو زیر بارِ احسان کر کے

نہ صرف اپنی ہمنوائی پہ مجبور کیا بلکہ ان کی حمایت اور تعاون سے اسرائیل نامی ایک مملکت قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ آج بھی دنیا کا ہر یہودی چاہے وہ افریقہ کے تاریک جنگلوں میں رہتا ہو یا یورپ کے کسی مہذب اور روشن ملک میں، چاہے وہ برطانوی جمہوریت کا دلدادہ ہو یا کٹر قسم کی کمیونسٹ آمریت کا نقیب ہو، اس کی تمام تر ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہیں اور اسرائیل کی بقا کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ یہودیوں کے اس کردار کو دیکھتے ہوئے یہ بات انتہائی عجب اور حیرت کا باعث تھی کہ لزی یہودی ہوتے ہوئے بھی یہودیوں کے خلاف میرا ساتھ دے رہی تھی، یہودیوں کے عزائم کو ناکام بنانے میں میری بھرپور مدد کر رہی تھی۔ ایسا کیوں کر رہی تھی وہ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

ابتدا میں ہم سب ہی یہ سمجھتے رہے تھے کہ شاید اس طرح وہ اپنا اعتماد قائم کر کے کسی دن اچانک ہماری گردنوں پر چھری پھیر دینا چاہتی ہے لیکن وہ بھی بس ایک خیال ہی ثابت ہوا تھا اور اب آہستہ آہستہ ہمارے دلوں میں اس کی طرف سے ذرا سا بھی میل نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے خود کو ہمارا بہی خواہ اور مخلص دوست ثابت کر دیا تھا اور اب تو ہم میں سے کسی کو بھی شاید یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ یہودی ہے، یا ہمارے ذہنوں نے اسے یہودی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، وجہ اس کی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ ہمیں اس میں یہودیوں والی کوئی بات بھی نظر نہیں آتی تھی۔ دھوکا، فریب، عیاری اور مکاری جو کہ واضح شناخت ہیں یہودیوں کی، لزی میں یہ علامات نہیں ملتی تھیں اور تھیں بھی تو ہمارے لیے نہیں تھیں ان کا استعمال وہ آئزک اور اس کی تنظیم کے خلاف ہی کر رہی تھی۔

لزی پہ اب میرے سب ہی ساتھی اس حد تک اعتبار کرنے لگے تھے کہ میں نے جب انہیں ماں جی کے بارے میں بتا کر یہ کہا کہ لزی نے ماں جی کو آئزک کے پنجے سے آزاد کرانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے اور ہمیں اس مکان کے قریب تک جانے کو منع کر دیا ہے جہاں ماں جی کو رکھا گیا ہے کیونکہ وہاں آئزک نے ہمارے استقبال کی پوری پوری تیاری کر رکھی ہے۔ تو فیروز نے فوراً کہا "ہمیں چاہیے کہ ہم لزی کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے اس طرف کا رخ بھی نہ کریں۔ مجھے یقین ہے وہ ماں جی کو جلد ہی ہمارے درمیان پہنچا دے گی۔"

اس کے اس مشورے کی سب نے تائید کی، کسی نے یہ شبہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ مجھے بھی لزی کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا البتہ میں نے ان لوگوں سے یہ کہہ دیا کہ خدانخواستہ لزی کو اس میں کامیابی نہ ہوئی کسی وجہ سے تو ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے ہر وقت۔ آئزک نے اس عمارت کو جس طرح شجرِ ممنوعہ بنایا ہے ہمارے لیے اس کا کوئی تدارک ضرور کر لینا چاہیے ہمیں۔ اس اذیل، ابلیس زادے نے ماں جی کو اسی عمارت میں رکھا ہے۔ اس لیے کہ ماں جی کو آزاد کرانے کے لیے ہم وہاں ضرور جائیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں تھا اس کے پاس، ہمیں وہاں جانے پر مجبور کرنے کا۔ یہ لزی کی مہربانی ہے کہ وہ ہمیں اس کے منصوبوں سے آگاہ کر کے کسی اندھے کنوئیں میں گر کر جان دینے سے بچا لیتی ہے۔

شرافت علی بولا "یہ کام مجھ پہ چھوڑ دو، اگر کبھی ہمیں اس عمارت میں داخل ہونا پڑا تو اس کا انتظام میں کر دوں گا۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا بھئی! تم لوگ باتیں کرو، میں تو ذرا اُدھر جا رہا ہوں آسیہ کے پاس۔ وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے اسے کہا تھا وہ انتظار کرے میں ماں جی کو لینے جا رہا ہوں۔ وہ بچاری ماں جی سے ملنے کی آس لگائے بیٹھی ہوگی۔"

آبی بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "ہاں یار! چل میں بھی چل رہا ہوں تیرے ساتھ۔ اسے تسلی ضرور دینا چاہیے ہمیں۔"

ہم دونوں اس طرف آ گئے جہاں فردوسی بیگم غریب محض ہم دونوں سے دوستی رکھنے کی پاداش میں قیدِ تنہائی کاٹ رہی تھی۔ آبی نے فردوسی کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے دبی آواز میں کہا "میرا تو خیال ہے جیلانی! ہمیں آسیہ کو ابھی ماں جی کے بارے میں بتانا ہی نہیں چاہیے۔"

"کیوں بھئی، کیوں نہیں بتانا چاہیے ہمیں اسے ماں جی کے بارے میں، آخر حرج ہی کیا ہے اس میں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں یار! وہ بچاری پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ اسے بچے کی جدائی نے نڈھال کر رکھا ہے، یہ خبر اس کے لیے اور بھی تکلیف دہ ہوگی۔"

"ہاں یار! کہتا تو ٹھیک ہی ہے تو۔ اچھی بات ہے ہم اس سے بہانہ کر دیں گے کچھ بھی۔" میں نے آبی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے، ہم اس سے کہہ سکتے ہیں، وہ کسی وجہ سے آ نہیں سکی ہیں، اب دو روز کے بعد روانہ ہوں گی، اس طرح تین چار دن تو گزر ہی جائیں گے، ہو سکتا ہے اسی دوران لزی ماں جی کو نکال لائے وہاں سے۔" آبی نے کہا۔

"ہاں یار! مگر یہ ہوا بہت بُرا۔ آئزک نے ہمیں ماں جی کی نظروں سے گرا دیا ہے یہ ذلیل حرکت کر کے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ کہ ان کا بیٹا ایسے بُرے کام کرنے لگا ہے اب کہ اس کی ماں بھی ان کے بُرے اثرات سے محفوظ نہیں رہی ہے۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"نہیں یار! وہ ایسی نہیں ہیں۔ بدگمان تو وہ ہو ہی نہیں سکتیں کبھی تیری طرف سے۔ ان دنوں جب تو سچ مچ بُرے کام کر رہا تھا، ایسا تو انہوں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے کبھی تم دونوں بہن بھائی سے بدگمان نہیں دیکھا انہیں۔ ہمیشہ اچھے ہی کلمات ادا ہوتے دیکھے ہیں ان کی زبان سے تم دونوں کے لیے میں نے۔ ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے جیلانی! اسی کو ممتا کہا جاتا ہے۔"

"کس ماں کی ممتا کا ذکر ہو رہا ہے بھئی یہ؟ آبی بھائی بھی ایسی سنجیدہ گفتگو کر لیتے ہیں! یہ تو پتا ہی نہیں تھا مجھے۔"

فردوسی بیگم کی آواز سن کر ہم دونوں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ وہ سامنے ہی اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آسیہ بھی موجود تھی۔ اس کے لبوں پر بھی بڑی شوخ سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ فردوسی بیگم نے اسے پہننے کے لیے اپنا لباس دے دیا تھا۔ غسل کرنے اور لباس تبدیل کر لینے کے بعد آسیہ کی شخصیت نکھر آئی تھی۔ اس کی اور فردوسی بیگم کی جسامت میں بس انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ لہٰذا فردوسی بیگم کا لباس آسیہ کو بالکل فٹ آیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "تم ٹھیک تو ہو آسیہ! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے تمہیں؟ اگر کچھ چاہیے تو بے جھجک بتا دینا، تکلف نہ کرنا بالکل بھی۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں جیلانی! بہنیں کبھی بھائیوں سے تکلف کرتی ہیں جو آسیہ کو یہ بات بتا رہے ہیں آپ۔ اسے تو جس چیز کی ضرورت ہوگی یہ زبردستی کر کے بھی منگوائے گی آپ سے اور آپ کو اس کی فرمائش پوری کرنا پڑے گی۔" فردوسی بیگم آسیہ سے پہلے ہی بول پڑی۔

"یہ باجی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی جان! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اب میں آپ سے تکلف کروں گی؟" آسیہ نے کہا "اور وہ آپ نے تو کہا تھا آج ماں جی بھی آ رہی ہیں لاہور سے، انہیں لینے ہی گئے تھے نا آپ، پھر کیا ہوا، کہاں چھوڑ آئے آپ ماں جی کو؟"

میں نے آگے بڑھ کر اسے کمرے میں چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں ادھر ہی آ رہا ہوں ابھی ریلوے اسٹیشن سے۔ وہ اس گاڑی سے نہیں آئی ہیں۔ شاید انھوں نے پروگرام ملتوی کر دیا ہے اپنا، میں ٹیلی فون کر کے پتا کروں گا کیا بات ہے۔"

"ارے تو کر لیں نا ٹیلی فون انھیں ابھی۔ پھر کب کریں گے، بلکہ آپ کو تو چاہیے تھا سب سے پہلے انھیں ٹیلی فون ہی کرتے۔ پتا تو کرنا تھا نا کیا وجہ ہو گئی ہے کہیں بیمار نہ ہو گئی ہوں یا راستے میں ہی کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو؟" آسیہ نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں ہاں ابھی جا کر کروں گا انھیں ٹیلی فون میں، تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہوئی ہوگی۔ تیرے دل میں بس یونہی واہمے پیدا ہوتے ہیں۔ اب ماں جی کے ساتھ کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے راستے میں؟" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہ کہیں، اتفاقات اور حادثات کسی کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں، ان پر اختیار نہیں ہوا کرتا کسی کو بھی۔ آپ جائیں پہلے فون کر کے ان سے بات کریں پھر آ کے بتائیں مجھے کیا بات ہے کیوں نہیں آئی ہیں وہ۔" وہ اس طرح بولی تھی کہ میرے پاس کوئی راستہ ہی نہیں

جاسوسی ادب کی معیاری کتابیں کم سے کم قیمت میں

جاسوسی ناولوں کے مقبول ترین مصنف ایچ اقبال کے قلم سے

عمران سیریز

بے باک لڑکی — دہری چال

ایک جلد میں دو کتابیں ○ قیمت: ۲۰/- روپے

پرمود سیریز

جاسوس شہزادہ — لیڈی بلیک

ایک جلد میں دو کتابیں ○ قیمت: ۲۰/- روپے

آج ہی طلب فرمائیے

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

رہا تھا۔

اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ نا کچھ تو کرنا ہی تھا اب، ورنہ میں خوب جانتا تھا اسے، اس کی ضدی اور شکی طبیعت اسے چین نہیں لینے دیتی اور جب تک وہ خود مطمئن نہیں ہو جاتی، مجھے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ لہٰذا میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا اچھا، ناراض نہ ہو، میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔ تو اِدھر ہی بیٹھ آبی ان کے پاس۔"

میں آبی کو ان دونوں کے پاس چھوڑ کر واپس ہو گیا۔ مجھے اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر شرافت علی حیرانی سے بولا۔ "کیوں خیر تو ہے نا جیلانی؟ اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے ہو تم؟ آسیہ تو اندر موجود ہے نا؟"

"ہاں یار! وہ موجود ہے مگر مجھ سے ہی غلطی ہو گئی ہے ذرا سی جس کی وجہ سے واپس آنا پڑا ہے مجھے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں کیا ہو گیا بھئی؟ ایسی کون سی غلطی کر بیٹھے ہو جس نے اندر رکنے ہی نہیں دیا تمھیں؟" فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ یار! میں نے آسیہ سے جھوٹ بول دیا ہے ماں جی کے بارے میں۔ آبی کا خیال تھا کہ اگر ہم نے اسے صحیح بات بتا دی تو بے قابو ہو جائے گی۔ وہ ایسی ہی ہو گئی ہے یار! کسی کی ذرا سی بھی زیادتی وہ برداشت نہیں کر پاتی ہے بالکل بھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ماں جی کو ایک شیطان صفت شخص نے راستے سے اٹھوا لیا ہے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے، وہ یا تو غش کھا کر گر پڑتی یا غصے سے بے قابو ہو کر فوراً باہر نکل پڑتی تاکہ آرزک کو تلاش کر کے اس کی تکا بوٹی کر ڈالے۔ اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا کہ کسی وجہ سے شاید ماں جی نے یہ سفر ملتوی کر دیا ہے۔ شاید میں کسی وقت فون کر کے پتا کروں گا ان سے۔ یہ سن کر وہ بھڑک اٹھی کہ میں نے پہلے ماں جی کو فون کر کے ان کی خیریت کیوں نہیں معلوم کی۔ مجھے گاڑی دیکھنے کے بعد فوراً لاہور فون کرنا چاہیے تھا۔" میں نے ان لوگوں کو بتایا۔

"تمھیں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ فون کروں گا۔ اسے بتا دیتے کہ فون پر بات کر چکے ہو تم ماں جی سے۔" فیروز بولا۔

"بس یار! یہی تو غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں سمجھا تھا وہ خاموش ہو جائے گی اتنا ہی جان کر۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے سمجھ لیا تھا تم نے؟ وہ بھی تو آخر تمھاری بہن ہی ہے۔ ایک زمانہ شناس اور سرد و گرم چشیدہ بہن، جو اس حقیقت سے خوب آشنا ہے کہ وہ اور اس کا بھائی کن مراحل سے گزر رہے ہیں، کس کس قسم کے حالات اور واقعات سے انھیں صبح و شام گزرنا پڑ رہا ہے۔ اسے معلوم ہے جیلانی کہ ان حالات میں آدمی کو کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ اسے تم سے کسی ایسی غفلت کی اُ... نہیں رہی ہوگی۔ تم نے اس پہلے ہی مرحلے میں اس پر کچھ اچھا... نہیں چھوڑا ہے اپنے بارے میں۔" شرافت علی بولا۔

"بس یار! کہہ دیا نا، ہو گئی ایک غلطی مجھ سے۔ ہے تو میری چھوٹی بہن ہی نا۔ لہٰذا میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ اب... جہاندیدہ ہو چکی ہوگی۔ میں شاید یہی سمجھ رہا تھا کہ جیسے بچپن میں... میری بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا کرتی تھی اور میری... سے بڑی غلطی پر بھی مجھے ٹوکتی نہیں تھی، ایسی ہی وہ اب... ہو گی۔ یہ بات مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی کہ اب جو آسیہ میرے سامنے کھڑی ہے، وہ میری وہ سیدھی سادی، الھڑ اور ناتجربہ... بہن نہیں ہے جس کا ڈولا اٹھانے کی قیمت میرے تایا نے... لاکھ روپے مقرر کی تھی تو اس کی گلابی رنگت میں ہلدی جیسی زردی... گھنڈ گئی تھی اور آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرا ڈال لیا تھا... چہرے پر ایسی مُردنی چھا گئی تھی کہ مجھے اپنے سینے میں دل... ہوا سا محسوس ہونے لگا تھا اور اس کے چہرے کی کھوئی... آنکھوں کی ویرانی اور رنگت کی سرخی اور تازگی لینے کے لیے... گھر سے نکلا تھا تو پھر واپسی کا راستہ ایسا گم ہوا تھا کہ دوبارہ اب... تک نہ مل سکا تھا۔ اس منحوس ساعت نے ماں بیٹے اور بہن... اس مثلث کو ایسا بگاڑا تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی اپنی... قائم نہیں رہ سکا تھا۔ وقت ہمیں مسلسل اپنی ٹھوکروں میں... رہا ہے۔ زمین پر دوبارہ قدم جمانے کی جستجو کرتے ہوئے ہم... سے کہاں جا پہنچے ہیں مگر وقت کا دھارا ہمارے قدم جمنے... دے رہا ہے کہیں بھی۔"

میری باتوں نے میرے ان بہی خواہوں اور جاں نثاروں کو اداس اور مضمحل کر دیا تھا۔ وہ سب کے سب منہ لٹکا کر بیٹھ گئے تھے، کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں چند منٹ ان کے ساتھ گزار کر آسیہ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میں نے اسے جھوٹی تسلی بھی دے دی کہ ماں جی نے طبیعت کی خرابی اور ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اپنا سفر تین دن کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ تین دن کے بعد وہ ضرور آ جائیں گی یہاں۔ اس نے میری زبان پر اعتبار بھی کر لیا تھا مگر میرے چہرے پر جو تحریر اس نے پڑھی تھی وہ اس کے دل میں سوالات ابھارنے لگی تھی۔ اس نے زبان سے تو اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر آنکھیں اس کی مسلسل سوالات کر رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے بہلاوے میں آنے کو تیار نہیں ہے۔ میرے لیے دو گھڑی بھی اس کے سامنے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا اور اس سے آنکھیں چار کرنے کا بالکل حوصلہ نہیں رہا تھا مجھ میں۔

بالآخر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور آبی سے بولا ـــــ "یار آبی! اسے بہلانا بہت مشکل ہے۔ میں جا رہا ہوں یہاں سے، تو اسے بتا دے یار! سب کچھ صاف صاف بتا دے، کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا کیوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اب۔" میں ان کے پاس سے اُٹھ کر دوبارہ شرافت علی وغیرہ کے پاس آ بیٹھا۔ فیروز بولا۔ "اب کیا ہوا، کوئی اور مسئلہ...؟"

"کچھ نہیں یار! وہ آبی کا مشورہ ہی غلط تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے اس پر عمل کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ آسیہ کو سمجھانا اب میرے بس کی بات نہیں رہی ہے، وہ میری توقع سے بہت زیادہ پختہ کار ہو چکی ہے۔ حالات کی بھٹی نے اسے بہت زیادہ پکا دیا ہے، اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا اب کوئی بھی، اس کی آنکھیں دل میں اتر کر آدمی کو اندر سے پڑھ لیتی ہیں۔ میں آبی سے کہہ آیا ہوں، اس سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کرنا فضول ہے، بہتر یہی ہے اسے سب کچھ صاف صاف بتلا دے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا، وہ تمھاری بہن ہے جیلانی! اس سے تمھیں کوئی بات چھپانا ہی نہیں چاہیے۔" فیروز بولا۔

یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ میں نے آسیہ کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا ورنہ اُس دن کی رات گزارنے کے بعد میں بالکل بھی اس سے نظریں چار کرنے کے قابل نہ رہتا۔ صبح کے اخبارات نے میرے جھوٹ کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ اخبار دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا، مجھے تو کبھی یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ہماری پولیس اس قدر چاق و چوبند بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تو بڑے بااثر اور نامی گرامی لوگ قتل ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہیں ملتا۔ کتنی لاشیں ایسی دستیاب ہوتی رہتی ہیں جن کے وارثوں کا کبھی پتا نہیں چل پاتا اور وہ سرکاری خرچ پر لاوارث قرار دے کر دفنا دی جاتی ہیں لیکن حیدر کی لاش دستیاب ہونے کے چند ہی گھنٹے بعد پولیس نے اس کے بارے میں تمام کوائف جان لیے تھے، اور اخبارات کو اشاعت کے لیے ساری معلومات بھی فراہم کر دی تھیں۔

اخبارات نے اس کی جو تفصیل لکھی تھی اس کے مطابق،

"مقتول کا نام حیدر خان ولد ... لاہور کے ایک بڑے زمین دار سردار کریم نواز کا گھریلو ملازم تھا اور سردار کریم نواز کی ماں اور ایک ملازمہ کو لے کر کراچی جا رہا تھا، اس کے بعد یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ سردار کریم نواز کے بارے میں پولیس کا خیال ہے کہ یہ نام اصلی نہیں ہے۔ پولیس کو اس شخص کے پاس پڑوس والوں نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے وہ بدنام زمانہ ڈاکو اور سزائے موت کے مفرور مجرم غلام جیلانی کا ہے جو ایک طویل عرصے سے پولیس کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ غلام جیلانی نے لاہور کے ایک فیشن ایبل علاقے کی وہ عالی شان کوٹھی جو کبھی ڈاکٹر مسعود حسن اور ڈاکٹر عالیہ کی ملکیت تھی، ان دونوں کے ملک سے باہر جانے کے بعد خریدی تھی اور وہاں ایک معزز زمیندار سردار کریم نواز کا نام اختیار کر کے اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ گزشتہ دنوں کراچی میں ہونے والی ایک بڑی ڈکیتی میں غلام جیلانی اور اس کے ساتھی اسلم آبی کا نام سننے میں آیا تھا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلام جیلانی اور اسلم آبی ان دنوں کراچی میں ہیں اور شاید غلام جیلانی کی بہن آسیہ بھی جو اسلم آبی کے ساتھ راولپنڈی جیل توڑ کر فرار ہوئی ہے اس کے ساتھ ہی کراچی میں موجود ہے۔ ان لوگوں نے اپنے ملازم، ملازمہ اور اپنی ماں کو کراچی اپنے پاس بلایا تھا مگر دورانِ سفر غلام جیلانی کا کوئی دشمن اس کے ملازم حیدر کو قتل کر کے اس کی ماں اور ملازمہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تاکہ اس طرح وہ غلام جیلانی کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکے۔ پولیس ابھی تحقیقات کر رہی ہے۔ عنقریب سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی آسیہ اخبار پڑھ چکی تھی۔ وہ ہر روز صبح اخبار پڑھنے کی عادی تھی۔ چنانچہ اخبار لینے کے لیے وہ صبح ہی صبح اس طرف آ ئی تھی، جدھر ہم لوگ رہا کرتے تھے اور ہمیں نیند میں ڈوبا دیکھ کر وہ اخبار اٹھا کر لے گئی تھی۔ چنانچہ اس طرح وہ ہم سے پہلے ہی یہ خبر پڑھ چکی تھی اور میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میں بروقت ماں جی کے بارے میں اسے ساری تفصیل بتا کے اس صبح شرمندہ ہونے سے بچ گیا۔ ورنہ تو وہ شاید خبر پڑھتے ہی اخبار ہاتھ میں لیے میرے سرہانے کھڑی ہوتی اور میں مجرموں کی طرح اس کے سامنے نظریں جھکائے کھڑا ہوتا۔

اسی اخبار میں ایک دو کالمی خبر آسیہ کے بارے میں بھی تھی۔ آسیہ کے پولیس کی حراست سے نکل جانے کی اس خبر کو اخبار نے پوری تفصیل کے ساتھ خوب نمک مرچ لگا کر شائع کیا تھا اور اسے پولیس کی غفلت اور نااہلی کا شاخسانہ قرار دے کر عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس واقعے کو اخبار نے اتنی اہمیت دی تھی کہ اس پر اداریہ بھی لکھ ڈالا تھا۔ اخبار کا ایڈیٹر کوئی بہت ہی جہاندیدہ اور ذہین آدمی معلوم ہوتا تھا' اس نے بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اس واقعے کی کڑیاں مجھ سے اور آبی سے جوڑ کر پولیس کو صحیح راہ دکھانے کی کوشش کی تھی اور سمجھایا تھا کہ اسے تفتیش کا آغاز کیسے اور کہاں سے کرنا چاہیے۔ اس نے لکھا تھا۔

"پولیس کو اس سنگین واقعے کی جلد از جلد تفتیش کر کے اور اس میں ملوث مجرموں کو گرفتار کر کے اپنی بدنامی کا داغ دھونا ہے۔ اس واقعے کی تفتیش کے دوران اگر یہ بات نظر انداز نہ کی جائے کہ مجرمہ آسیہ جو خود بھی کئی سنگین جرائم کا ارتکاب کر چکی ہے اور ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے عرصے سے پولیس کو مطلوب رہی ہے' لاہور کے بدنام زمانہ مفرور اشتہاری مجرم غلام جیلانی کی بہن ہے تو پولیس کو کام کرنے کے لیے نہ صرف ایک سیدھی راہ مل جائے گی بلکہ تفتیش بھی بڑی حد تک آسان ہو جائے گی۔ گزشتہ چند روز سے شہر میں غلام جیلانی اور اسلم آبی کا نام سننے میں آ رہا ہے اور ناریتھ ناظم آباد میں ہونے والی ڈکیتی کی ایک ہولناک واردات جس میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا' غلام جیلانی اور اسلم آبی ہی سے منسوب کی گئی تھی۔ اس طرح یہ بات پولیس کے علم میں آ چکی ہے کہ غلام جیلانی اور اسلم آبی ان دنوں کراچی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں اور یہاں وارداتیں بھی کر رہے ہیں۔ پھر پولیس کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ غلام جیلانی کی ماں اور اس کی ملازمہ لاہور سے کراچی آتے ہوئے لاہور اور خان پور کے درمیان کہیں غائب کر دی گئی ہیں اور پولیس کو تیز گام کی ائر کنڈیشنڈ بوگی کے ایک کیبن سے اس کے ملازم حیدر کی لاش دستیاب ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم پولیس کی سہولت کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے خیال کے مطابق واقعات کی کڑیاں اس طرح جڑ سکتی ہیں کہ غلام جیلانی کی ماں' جیلانی کے بلاوے پر لاہور سے کراچی آنے کے لیے تیز گام میں سوار ہوئی مگر خان پور تک آتے آتے غلام جیلانی کے کسی مخالف گروہ کے ارکان نے جیلانی کو زک دینے کے لیے چلتی ٹرین میں کسی طرح کیبن میں گھس کر اس کے ملازم حیدر کو قتل کر دیا' اس کی ملازمہ اور ماں کو کسی اسٹیشن پر اتار کر اپنے ساتھ لے گئے لیکن اس واقعے کی اطلاع غلام جیلانی اور اسلم آبی کو نہیں ہو سکی' چنانچہ ان میں سے کوئی ایک یا شاید وہ دونوں ہی تیز گام کے کراچی پہنچنے کے وقت کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے لیکن وہاں جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ تیز گام اپنے وقتِ مقررہ سے چھ گھنٹے لیٹ آ رہی ہے تو وہ فوراً ہی اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل گئے' وہ دونوں چونکہ اشتہاری مجرم ہیں اور نہ صرف یہ کہ ملک کے ہر تھانے میں ان کی تصویریں اور فائل موجود ہے بلکہ بارہا ان کی تصویریں اخبارات میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ اس لیے کسی پبلک مقام پر ہر گھڑی ان کے پہچان لیے جانے کا خدشہ رہتا ہے لہٰذا وہ زیادہ دیر اسٹیشن پر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت پولیس آسیہ کو لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچی تھی۔ غلام جیلانی اور اسلم آبی نے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے یا شاید کار میں بیٹھنے کے بعد آسیہ کو پولیس کی حراست میں اسٹیشن کی عمارت کی طرف جاتے دیکھ لیا اور تیزی سے کار کو دوڑاتے ہوئے سڑک کے عین درمیان میں پولیس والوں پر کار چڑھا دی اور پھر اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر نہایت تیزی کے ساتھ آسیہ کو ہتھکڑیوں سمیت کار میں ڈال کر لے گئے۔ ایک بھری پُری سڑک پر دن کی روشنی میں یہ سب کچھ ہو گیا مگر کسی میں اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی کہ انھیں روکنے کی کوشش کرتا یا کم از کم ان کی کار کا تعاقب کر کے ان کا ٹھکانہ ہی معلوم کر لیتا۔ حالانکہ اس وقت وہاں بہت سی پرائیویٹ کاریں اور ٹیکسیاں ایسی بھی موجود تھیں جن کے ڈرائیور اپنی نشستوں پر بیٹھے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔"

اداریہ پڑھنے کے بعد میں اس ایڈیٹر کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا جس نے یہ اداریہ لکھا تھا۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا تھا۔ "واہ' کمال کر دیا ہے یار اس نے تو۔ شکر ہے کہ یہ شخص پولیس کے محکمے میں نہیں ہے ورنہ زنگ لگ چکا ہوتا اس کی ذہانت کو۔"

آبی جو اخبار کا فرنٹ پیج لیے بیٹھا تھا' چونک کر بولا۔ "کیا ہو گیا بھئی! کس کی ذہانت کی تعریف میں یہ کلمات جاں فزا ادا ہوئے ہیں آپ کی زبانِ مبارک سے جنابِ عالی؟"

"یہ تو مجھے جنابِ عالی کہہ کر کیوں مخاطب کر رہا ہے؟ لنگی کے حق پر ڈاکا تو نہیں ڈالنا چاہتا ہے تو؟"

"بک نہیں اوئے' مذاق میں ہی نہ ڈوبا رہا کر ہر وقت۔ میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تو فضول بکواس بھی نہ کر مجھ سے۔"

"اس اخبار کے ایڈیٹر کی تعریف کر رہا تھا یار میں۔" میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "اس نے آسیہ کو پولیس کی حراست سے نکالنے والے واقعے پر اداریہ لکھا ہے اور پورا واقعہ اس طرح بیان کر دیا ہے جیسے وہ خود دیکھتا رہا ہو اس پوری کارروائی کو اور اس کے پس منظر سے بھی واقف ہو۔"

آبی نے میرے ہاتھ سے اخبار جھپٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا' مجھے بھی دکھا یار! میں بھی تو دیکھوں کیا لکھ دیا ہے اس نے۔"

اس نے اخبار لے کر جلدی جلدی پورا اداریہ پڑھ ڈالا پھر بولا۔ "کمال ہے بھئی' حالانکہ دونوں خبروں کے متن میں بڑا فرق ہے۔ حیدر اور ماں جی کے بارے میں جو خبر چھپی ہے' اس میں رپورٹر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آسیہ کراچی میں ہمارے ساتھ ہے۔ جبکہ آسیہ والی خبر سے یہ بالکل ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ اس کا ہم سے بھی کوئی تعلق ہے لیکن اداریے میں وہ کچھ موجود ہے جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔"

"یہ اخبار والے ایسے ہی گھنے ہوتے ہیں یار! ان کی شکل دیکھ لو تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی نکل کر آ رہے ہوں کسی دماغی امراض کے اسپتال سے اور دنیا کے بارے میں انھیں اتنی بھی خبر نہیں ہو گی جتنی کسی رکشا ٹیکسی والے کو ہو گی۔ مگر جب قلم چلتا ہے ان کا تو دنگ کر دیتا ہے سب کو۔"

"تیرا کیا خیال ہے' کیا پولیس ہم تک پہنچ سکتی ہے اس راہ پر چل کر جو سجھائی ہے اس اخبار نے؟" آبی نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' ہو سکتا ہے پہنچ ہی جائے مگر ہمارے لیے کیا فرق پڑے گا اس سے؟" میں نے کہا۔

"اوئے پولیس ہمیں پکڑ کر چڑھا دے گی تختۂ دار پر' پھانسی چڑھ جائیں گے ہم اور تو کہتا ہے کوئی فرق ہی نہیں پڑے گا اس سے!"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہو گی یہ ہمارے لیے۔ پولیس تو پہلے بھی ہمیں پکڑ چکی ہے اور عدالت سزائے موت بھی سنا چکی ہے مجھے تو۔ لہٰذا جو ملک تجھے جیتا جاگتا' چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہوں تو یہ سب کچھ بونس سمجھ۔ پھانسی تو ایک دن لگنا ہی ہے مجھے بھی اور تجھے بھی۔ ہاں بری اس بدنصیب بہن آسیہ کو بھی کیونکہ اس نے بھی ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جو قانون میں رحم کی گنجائش نکل آئے اس کے لیے۔"

"نہیں یار! ایسی سنگ دلی کی باتیں نہ کر۔ اسے پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ سنا ہے قانون میں عورت کے لیے پھانسی ہے ہی نہیں۔" آبی اداسی سے بولا۔

"قانون میں ہو یا نہ ہو لیکن یار لوگ اس کا وجود اس دھرتی پر برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی شق ڈھونڈ ہی نکالیں گے وہ۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ غلام جیلانی کو تو دار پر لٹکا دیا جائے مگر اس کی بہن پھر بھی ان پر زمین تنگ کرتی رہے۔" میں نے کہا۔

"چھوڑ یار! مٹی ڈال اب اس قصے پر۔ تجھے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی' ایسی دل دہلانے والی باتیں کہنے لگتا ہے۔" آبی گھبرا کر بولا۔

"آدمی کو اپنے انجام پر نظر رکھنا چاہیے ہر وقت۔ اور اپنے اعمال کی روشنی میں ہی اس انجام کو دیکھتے رہنا چاہیے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی جَو بو کر گندم کاٹنے کی تیاریاں کرنے بیٹھ جائے۔ یہ پاگل پن نہیں ہے کیا؟" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"بس کر یار! چُپ بھی ہو جا اب۔ جزا اور سزا کا اختیار تجھے کس نے دے دیا ہے کہ تو پہلے ہی سے اس کا اعلان کرنے لگا ہے؟ آدمی کو ہمیشہ بہتری کی توقع کرنا چاہیے اور اس سوہنے رب کی ذات سے مایوس کبھی نہیں ہونا چاہیے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے' وہ نہ خود ظلم کرتا ہے کسی پر اور نہ کسی کو کرنے دیتا ہے...!"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اور تجھ جیسے نافرمانوں کی رسّی صرف اس لیے دراز کر دیتا ہے وہ کہ یا تو تم اپنے گناہوں سے تائب ہو جاؤ اور صدقِ دل سے توبہ کر لو یا پھر اپنا حصّہ اسی دنیا میں وصول کر کے جہنم کا ایندھن بننے کو تیار ہو جاؤ۔"

"یار! تُو ہے بڑا ذلیل آدمی۔ تیری زبان سے کوئی اچھی بات تو نکل ہی نہیں سکتی کبھی۔ بس بغیر سوچے سمجھے کفن پھاڑ کے بولتا ہی چلا جائے گا' چاہے کسی کے دل پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے۔ ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے کسی کمزور دل کا' تیری یہ باتیں سُن کر۔ اور دل آزاری سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے' یہ نہیں بتایا کسی نے تجھے۔ واعظِ بے عمل' ناصح کی دُم؟"

"تُو کچھ بھی کہہ لے آبی! اپنے دل میں کیسے ہی خیال باندھ لے' اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کیسی ہی دلیلیں گھڑ لے' مگر بیٹے! میری ایک بات گرہ میں باندھ کر رکھ لے کہ تیری بخشش ہو نہیں سکے گی۔ تجھے جہنم کا ایندھن ہی بننا ہے وہاں جا کر۔"

"اور تو بھی کان کھول کر سُن جیلا! میرے سامنے کیسے بھی وعظ کہہ لے۔ یہ لمبی گز بھر لی داڑھی رکھ کے گیسو دراز کر لے اپنے اور لمبا سا جبّہ قبّہ پہن کر فقیری لے لے یا تکیے دار بن جا' پر یاد رکھ جنّت میں تو بھی نہیں جا سکے گا۔ بلکہ تجھے تو ہوا بھی نہیں لگ سکے گی فردوسِ بریں کی۔" آبی نے ایسے جلے کٹے انداز میں کہا کہ میرے لیے اپنی

ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ اور بھی چراغ پا ہو گیا اور اُٹھ کر پاؤں پٹختے ہوئے باہر کی طرف چل دیا۔

وہ ابھی دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جاتے جاتے مڑ کر اپنے بائیں ہاتھ رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا اور پھر اچانک جھپٹ کر اس کے پاس پہنچ کے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا لیا۔ میں اس کی حرکت پر ایک بار پھر ہنس پڑا اور اس پر جملہ چُست کرنے کی غرض سے بولا۔ "کیا بات ہے بھئی، خیر تو ہے، کیا کسی حسینہ دلنواز کے فون کا انتظار ہے۔ کہیں اس گل دگلزار خانم سے تو رابطہ نہیں ہو گیا دوبارہ۔"

اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ریسیور میں ہیلو کہا۔ پھر دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے، اس وقت آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے کیونکہ وہ بے چارہ آج صبح ہی صبح ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے۔"

اس کے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہے ہوئے ان الفاظ کو سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں سوچنے لگا پتا نہیں آبی کا کون جاننے والا صبح ہی صبح کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اس بات کا بھی افسوس ہونے لگا تھا مجھے کہ میں نے ایسے سوگوار وقت میں اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے اسے تکلیف پہنچائی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی بات سن کر میری کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں جی بس کیا کیا جائے، اللہ کو یہی منظور رہا تھا۔ اس مالک کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اس نے اسی طرح لکھ دی تھی اس غریب کی۔ افسوس تو مجھے یہ ہے کہ اسے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی، کیسا خبیث تھا، دھرتی کا سینہ کانپنے لگتا تھا اس کے چلنے کی دھمک سے، اور وہ گبرو جوان سیدھا جہنم میں لے جایا جائے گا۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اوئے کیا بک رہا ہے سالے پانی کے مینڈک! یہ کس سے بات کر رہا ہے تو؟"

وہ جلدی سے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اوئے چپ ہو جا اب تو، مرنے کے بعد منکر نکیر کے سوا کسی سے نہیں بولا کرتے۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹتے ہوئے کہا۔ "بک نہیں اوئے۔ یہ ہر کسی سے موقع بے موقع مذاق کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"واہ بیٹے ابھی بات میں کہہ رہا تھا تو تیری رگِ ظرافت میں ہلچل ہونے لگی تھی۔ اپنا وقت آیا تو اچھی بات نہیں ہے یہ۔" آبی طنزیہ انداز میں بولا اور ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑا کر مسکراتے ہوئے دروازے سے دوسری طرف چلا گیا۔

میں نے ریسیور کان سے لگا کر ماؤتھ میں کہا۔ "ہیلو کون ہے بھئی، کس سے بات کرنا ہے آپ کو؟"

جواب میں مجھے لزی کی مترنم آواز سنائی دی۔ "اوہ جناب! خدا کا شکر ہے آپ کے دوست آبی نے تو میری جان ہی نکال لی تھی۔"

"میں سن رہا تھا اس کی باتیں۔ اصل میں وہ اسوقت بہت ہی تپا ہوا اُٹھا تھا میرے پاس سے۔ تمہارے فون نے اسے جوابی [illegible] کا موقع فراہم کر دیا اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس نے [illegible] بکواس شروع کر دی۔" میں نے لزی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور جنابِ عالی! آپ ایسے شخص کو دوست کہتے ہیں اپنا، جس کی خاطر خود کو مصیبتوں میں ڈالتے رہے ہیں۔ اس شخص کے لیے [illegible] کا ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتا اور ایسی خوف ناک باتیں کر رہا وہ آپ کے لیے۔" لزی نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"اس کی بات کا بُرا نہیں مانو لزی! تم جانتی نہیں ہو [illegible] زبانی بکواس ہے اس کی۔ اگر کہیں سچ مچ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہوتا [illegible] تو اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ یقین نہ ہو تو [illegible] کبھی میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی خبر سنا کر آزما لینا۔"

"آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہو گا۔ ویسے مجھے اس وقت ان کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔ انھیں ایسا مذاق میں بھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ میں کتنی [illegible] سے اس سے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اگر تم ہمارے ساتھ موجود ہوتیں تو کبھی [illegible] کی باتوں کا بُرا نہ مناتیں بلکہ یہی کہتیں کہ آبی نے بہت اچھا کیا [illegible] ہی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "خیر چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ اس وقت فون کیوں کیا تم نے؟ ماں جی کے سلسلے میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"ابھی تو کچھ نہیں ہو سکا ہے مگر آپ مطمئن رہیں ان کی طرف سے۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گی میں۔" لزی نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "بات یہ نہیں ہے لزی! انھیں تکلیف کیسے پہنچے گی، یہ تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ رہی ہو۔ وہ آر کے کی قید میں ہیں، اس ذلیل شخص نے انھیں ایک ایسے مکان میں بند کر رکھا ہے کہ اس کے در و دیوار میں موت پوشیدہ ہے۔ کیا یہ اذیت کم ہے ان کے [illegible]"

"ہاں، یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہے تو یہ بھی تکلیف [illegible] میں کوشش کر رہی ہوں کہ انھیں جلد از جلد اس سے نجات مل جائے۔" لزی بولی۔

"اگر یہ کام تمھارے بس کا نہ ہو تو خود کو کسی خطرے میں [illegible] کی ضرورت نہیں تھیں۔ تم مجھے بتا دینا پھر میں اپنے طور پر کچھ کروں گا۔"

"میں نے کہا نا آپ سے، میں اس سلسلے میں بالکل بھی [illegible] نہیں لوں گی کوئی۔ میں جانتی ہوں، بے احتیاطی سے اُٹھایا ہوا کوئی قدم جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ ماں جی کے لیے بھی اور خود [illegible] کرنے والے کے لیے بھی۔ چنانچہ بہت ہی سوچ سمجھ کر اور بے حد محتاط انداز میں کام کرنا ہے ہمیں۔ کچھ دن سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ آر کے اہم معاملات کو مجھ سے بھی چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔"

"اس کا تو صاف صاف یہی مطلب ہے کہ وہ تمھاری طرف سے مشکوک ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تم اس کا ساتھ چھوڑ کر ہماری طرف چلی آؤ، اس سے پہلے کہ وہ تمھارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر کے تمھارے راستے مسدود کر دے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

وہ شاید میری اس بوکھلاہٹ پر ہنس دی تھی۔ بولی۔ "میری پروا نہ کریں آپ، میں کوئی لقمۂ تر ثابت نہیں ہوں گی اس کے لیے۔ اگر اس نے میرے خلاف کچھ کرنا چاہا تو خود اپنے لیے کوئی پناہ تلاش کرنے کی ضرورت پڑ جائے گی اسے۔ ویسے ایک دن ہونا تو یہی ہے، آخری معرکے میں آپ مجھے بہرحال اپنے شانہ بہ شانہ پائیں گے۔ یہ میں طے کر چکی ہوں کہ جب میں آپ کے پاس آؤں گی، اس کے بعد کوئی دشمن باقی نہیں رہے گا آپ کا۔"

"اوہو، پھر تو شاید میں بھی باقی نہ رہ سکوں۔ میرا تو وجود ہی بے کار ہو کر رہ جائے گا پھر لزی بیگم! ایسا غضب نہ کر دینا کبھی۔" میں نے کہا۔ اس کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو قائم و دائم رکھنے کے لیے مجھے دشمن بن کر رہنا ہو گا آپ کے ساتھ۔ نصف بہتر تو کہا ہی جاتا ہے بیوی کو، عموماً مجھے لوگ نصف بہتر اور نصف بدتر کہا کریں گے پھر۔"

"نہ نہ۔ ایسا کبھی خیال بھی نہ لانا دل میں۔ تمھاری دشمنی بالکل برداشت نہیں ہو سکے گی مجھ سے، تم تو مکمل بہتر بن کر ہی رہو گی۔"

"پھر مجھے آپ کے لیے دشمنوں کا بھی اسی طرح بندوبست کرنا پڑا کرے گا جس طرح آپ کے آرام و آسائش اور کھانے پینے کا۔" وہ بولی۔

"تمھیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کبھی۔ یہ کام میں بہت اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ دشمن تو میں لمحوں میں ہزاروں بنا سکتا ہوں البتہ دوست بنانا بہت مشکل کام ہے میرے لیے۔ تمھاری موجودگی میں مجھے اس طرف سے بے فکری ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ سچے اور مخلص دوست واقعی بڑی مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ اسی لیے میں آپ کو گنوانا نہیں چاہتی۔"

"یہ تمھاری محبت ہے لزی جو تم ایسا سمجھتی ہو ورنہ ایسے بھی بہت ہیں جو مجھے اس دھرتی پر چلتے پھرتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں، پیوندِ زمین کر دینا چاہتے ہیں مجھے۔ ایسے ہی لوگوں نے مجھے اس راہ پر لا ڈالا ہے جس پر چل کر کبھی کوئی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ راہ ایسی ہی ہے، اس پر جس سمت بھی سفر کیا جائے اس کا اختتام وادیٔ فنا پر ہی ہوتا ہے۔"

"خیر چھوڑیں، دفع کریں۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا، ابھی سے کیوں گھلنے لگے ہیں آپ اس غم میں۔" لزی نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی، میں نہیں گھلتا وُلتا ایسے غموں سے۔ تم بتاؤ، کوئی خاص بات ہے یا بس یوں ہی فون کر لیا تھا گپ شپ لڑانے کو؟"

"خاص بات تو کوئی نہیں تھی۔ میں نے ابھی ابھی کچھ دیر ہوئی ایک خبر پڑھی ہے اخبار میں، اسی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

"اچھا اچھا۔ تمھاری مراد آسیہ کے بارے میں چھپنے والی خبر سے ہے۔ کیا معلوم کرنا چاہتی ہو تم اس کے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بس تصدیق کرنا چاہتی تھی آپ سے۔ اخبارات میں آپ کا بھی نام آیا ہے اس سلسلے میں، کیا واقعی آپ ہی لوگوں نے رہائی دلائی ہے اسے یا محض قیاس آرائی کی ہے اخبار والوں نے؟" لزی نے سوال کیا۔

"تم نے کیا رائے قائم کی ہے اس خبر کو پڑھ کر۔ تمھارے خیال میں کچھ صداقت ہے اس میں یا نہیں؟" میں نے اُلٹا اسی سے سوال کر دیا۔

"معاف کیجیے جنابِ عالی! آپ کے یہاں کے اخبارات کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون سی خبر سچ مچ خبر ہے اور کون سی محض ٹیبل نیوز ہے اور جو کوئی خبر ہے بھی تو اس میں صداقت کتنی ہے۔ ایک تو یہاں سنسنی خیز خبروں کو بہت اُچھالا جاتا ہے بلکہ انھیں خاصی رنگ آمیزی کے ساتھ نمایاں مقام پر شائع کیا جاتا ہے۔ دوسرے رپورٹر حضرات رپورٹنگ کرتے ہوئے اپنی رائے کو اس طرح شامل کر دیتے ہیں اس کے ساتھ کہ وہ بھی خبر ہی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں آدمی کیا سچ سمجھے؟"

"ہاں، کسی حد تک یہ شکایت درست ہے تمھاری لیکن سب ایسا نہیں کرتے۔ کچھ سنجیدہ اور قابلِ اعتبار اخبارات بھی ہیں جو دروغ گوئی سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال یہ خبر درست ہے بلکہ ایک اخبار نے تو اداریہ بھی لکھ ڈالا ہے اس پر اور میں حیران ہوں کہ اس نے ننانوے فی صد صحیح اندازے لگائے ہیں۔ میں ابھی آبی سے بھی یہی بات کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"یعنی یہ درست ہے کہ اسے پولیس سے آپ نے اور آبی نے چھڑایا ہے؟" اس کے لہجے سے استعجاب جھلک رہا تھا۔

"میں نے نہیں، صرف آبی نے۔ ویسے میں بھی موجود تھا اس وقت وہیں لیکن یقین کرو، میں نے آسیہ کو دیکھ کر حیران ہونے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا، کچھ کرنے کا خیال تک نہیں آ سکا تھا میرے دل میں۔ یہ کریڈٹ صرف آبی ہی کو جاتا ہے۔ اس نے پلک جھپکتے میں اتنی ہوشیاری اور مہارت سے یہ کام کیا تھا کہ بہت سے لوگوں کو تو پتا ہی نہیں چل سکا، ہو کیا گیا ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ ہو گیا ہے، شاید وہ کار کسی کو ٹکر مار کے بھاگ گئی ہے اور ایسا تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"حیرت ہے، یہ تو واقعی کمال کے آدمی ہیں۔ میں انھیں ایسا ہرگز نہیں سمجھتی تھی۔" لزی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے کہا نا، تم اسے جانتی نہیں ہو ابھی، وہ ایسے ہی ناقابلِ یقین کارنامے کر گزرتا ہے کبھی کبھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے جھٹلانے کی کوشش تو نہیں کی ہے آپ کو۔ کیوں کہ میرا خیال ہے آپ جیسا باکمال آدمی جس کی تعریف کر رہا ہے وہ کوئی معمولی شخص تو نہیں ہو سکتا۔ اب آپ کی بہن آسیہ بھی آپ کو مل گئی ہے، یہ فکر بھی ختم ہو گئی آپ کی۔"

"فکریں کبھی ختم نہیں ہوا کرتیں لزی بیگم! آسیہ ملی ہے تو وہ گم ہو گئی ہے جس کے دم سے ہم دونوں کا وجود ہے۔" میں بولا۔

"میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ماں جی کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں۔ وہ میری ذمّے داری ہیں۔ کیا مجھے اپنا نہیں سمجھتے آپ؟"

"یہ بات نہیں ہے لزی! تم پر اعتماد نہ ہوتا، تمھیں اپنا نہ سمجھتا ہوتا تو اب تک وہ پورا علاقہ جہاں ماں جی کو رکھا ہے اس سنگدل اور بے ضمیر شخص نے، الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہوتا میں نے۔ یہ تمھارا اعتبار ہی تو ہے جس نے مجھے روک کر رکھا ہوا ہے۔"

"جب آپ کو اتنا اعتماد ہے مجھ پر تو پھر صرف تین دن صبر کر لیں۔ اللہ نے چاہا تو تیسرا دن ختم ہونے تک وہ آپ کے پاس ہوں گی۔"

"کوشش تو بہت کر رہا ہوں مگر دل بے قابو ہوا جاتا ہے لزی! میری ماں نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں، اس کی کمر دُہری ہو گئی ہے دُکھوں کا بوجھ اُٹھا کر چلتے چلتے، اس میں مزید دُکھ سہنے کا دم نہیں رہا ہے۔ کیسی بدنصیبی ہے یہ ہماری کہ ہم اپنی ماں کو کوئی سُکھ تو دے نہیں سکتے، اُلٹا وہ ہماری وجہ سے نت نئی آفتوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ اسے کسی ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر فرشتۂ اجل کا انتظار بھی نہیں کرنے دیتے ہیں ہم۔ یہ خیال کتنا اذیت ناک ہے لزی! تم نہیں سمجھ سکو گی اسے۔"

"مجھے افسوس ہے جنابِ عالی! میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے لیکن یقین کریں میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا، میں آپ کو اذیت دینے کا کبھی خیال بھی نہیں لا سکتی دل میں اپنے۔ بڑی بھول ہو گئی مجھ سے، مجھے معاف کر دیں آپ۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"نہیں لزی! مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے تم سے، نہ میں ناراض ہوا ہوں تمھاری کسی بات سے۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو۔"

ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا مجھے۔ چند لمحے میں بھی خاموش رہ کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ بہت دل گرفتہ اور ملول ہو گئی تھی میری باتوں سے۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہی تھی سا اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ اس کی باتوں سے میرے سینے کے زخم ہرے ہو کر کسک دینے لگے ہیں اور میرے جذبات کا جوالا مکھی پھٹ پڑا ہے شاید۔ کافی دیر جب لائن بے جان رہی اور اُدھر سے آواز سنائی نہیں دی تو میں نے "ہیلو ہیلو" کہہ کر اسے مخاطب...

میرے مخاطب کرنے پر اس کی آواز سنائی دی۔ "جی... رہی ہوں، آپ کہیں جو کچھ کہنا ہے۔"

"تم خاموش کیوں ہو گئی ہو، بولتیں کیوں نہیں؟" میں نے...

"کچھ نہیں، وہ میں کچھ سوچنے لگی تھی۔ آپ کہیں کیا بات ہے..." اس نے دریافت کیا۔

"کیا سوچنے لگی تھیں تم۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو مجھے بتائی جا سکتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"اوہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایک خیال آ گیا... نہیں کیوں، یہ خیال اکثر آتا ہے مجھے کہ آپ شاید مجھ پر مکمل... نہیں کرتے۔ میری طرف سے کچھ شکوک و شبہات رہتے ہیں... کے دل میں۔" وہ بولی۔

"یہ خیال کیوں آتا ہے تمھیں؟ کیا میری کسی بات سے... ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اصل بات تو یہی ہے۔ آپ نے کبھی اپنی کسی بات یا... یہ ظاہر نہیں ہونے دیا مجھ پر کہ آپ کو مجھ پر مکمل اعتماد نہیں... آپ کے اس عمل نے ہی مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے۔" اس... دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"کمال ہے بھئی، آدمی کا کسی پر کبھی عدم اعتماد کا اظہار نہ... اس شخص کو مشکوک بنا سکتا ہے! کیا یہ عجیب بات نہیں ہے...

"جن حالات میں اور جس طرح ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی... میں یہ بات عجیب بالکل نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"میں نہیں سمجھا لزی بیگم! تم آخر مجھے کیا سمجھانا چاہ رہی... طرح؟ کیا یہ کہ میں تم پر یوں اعتماد نہ کیا کروں؟"

"نہیں جنابِ عالی! میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آ... اصلیت اور تنظیم سے میری وابستگی کے بارے میں جاننے کے... آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا؟ کیا یہ بات تعجب خیز نہیں... یہ جاننے کے باوجود کہ میرا تعلق آپ کے اور آپ کے ملک... سے کتنا گہرا ہے، آپ نے مجھ پر اندھا اعتبار کر لیا۔ کسی ایک... پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی میرے مشوروں اور... فراہم کردہ اطلاعات کو کبھی شک و شبہے کی نظر سے دیکھا۔ کیا... یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ میں آپ کو اعتماد حاصل کرنے کے بعد... اچانک کسی اندھے کنوئیں میں دھکا نہ دے دوں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لزی بیگم! یہ آج کیا ہو گیا ہے تمھیں... باتیں کر رہی ہو آج تم مجھ سے؟"

"میں کوئی غلط بات نہیں کر رہی ہوں، آپ میری بات... دیں، ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"کیا تمھارے خیال میں میں ایسا ہی بے وقوف آدمی ہوں کہ بغیر تحقیق اور تفتیش کے محض لوگوں کے ظاہر پر ایمان لے آتا ہوں؟ نہیں لزی بیگم! ہم نے ہر طرح آزمانے اور بہت سوچ بچار کے بعد تم پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خدا نے ہمیں دیکھنے کو دو آنکھیں اور سوچنے سمجھنے کو ذہن عطا کیا ہے اور یقین کرو ہم ان چیزوں کو استعمال بھی کرتے ہیں لہٰذا ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔"

"اچھا! اور یہ آزمائشی دور کون سا تھا؟ کب گزاری گئی تھی میں اس مرحلے سے؟ مجھے تو کبھی گمان تک نہیں گزرا اس کا۔" اس نے پوچھا۔

"بس گزر ہی گیا کسی وقت بھی۔ اگر تمھیں کبھی شک بھی ہو جاتا اس کا تو یہ آزمائش قابلِ اطمینان کہاں رہتی؟" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے! یہ بتا کر تو آج آپ نے حیران ہی کر دیا ہے مجھے۔" وہ بولی۔

"لیکن میں اس طرح تمھارے تعاون اور عنایات کی وجہ نہیں جان سکا ہوں لزی!" میں نے اسے بتایا۔

"وجہ..." وہ بولی۔ "وجہ آپ سے قربت، آپ کو اپنا بنانے کی خواہش کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بس یہی ایک وجہ ہے۔"

"یقین نہیں آتا اس بات پر — امریکا کے انتہائی جدید اور آزاد معاشرے کی پروردہ یہودی لڑکی کسی سے دل لگا کر اتنی زیادہ محبت اور ایسے خلوص کا اظہار کرے، اپنی قومی روایات سے باغی ہو کر کسی کا ساتھ دے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی میری۔"

"اصل بات تو یہی ہے جنابِ عالی! اسی لیے تو یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے صرف اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہوں میں اس وقت کہ نہ میں امریکی معاشرے کی پروردہ ہوں اور نہ ہی یہودی ہوں۔ تصحیح کر لیں اس بات کی آج۔"

"اوہ!" مجھے حیرت کا اتنا شدید جھٹکا لگا تھا اس کی یہ بات سُن کر کہ کچھ دیر کے لیے میری زبان بالکل گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک لفظ بولنا مشکل ہو گیا تھا میرے لیے۔ آخر تھوڑی دیر بعد بمشکل اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا۔ "کک... کک... کیا... کہہ... کہہ رہی ہو... تت... تم...؟ سُننے میں... غلطی... تو نہیں ہوئی مجھ سے؟"

"نہیں جناب! بالکل غلطی نہیں کی ہے آپ نے میری بات سُننے میں۔ آپ نے وہی سُنا ہے جو میں نے کہا تھا۔ سمجھے جناب... عا... لی!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔ اور میں حیران و پریشان ریسیور کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کہیں درمیان میں کسی اور کی لائن تو نہیں مل گئی ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ میرے ساتھ سان فرانسسکو سے آئی ہے اور آرتھر فینلی جو سان فرانسسکو میں... کی ایک بین الاقوامی تنظیم کا مقامی سربراہ ہے وہاں وہ اس کی بیٹی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی اور اسے آرتھر نے میرے ساتھ اسی لیے بھیجا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح شیشے میں اتار کر ان کے لیے منشیات کی اسمگلنگ پر آمادہ کر لے۔ اگر وہ یہودی نہیں تھی تو ان لوگوں کے ساتھ کیسے رہ رہی تھی؟ انھوں نے اسے اتنی عمدہ تربیت کیوں دی تھی؟ اور اس پر اعتماد کر کے اسے میرے ساتھ پاکستان تک کیوں بھیج دیا تھا؟ اور یہاں آرتھر سمیت تنظیم کا ہر فرد اس کا اتنا احترام کیوں کرتا تھا! یہ تو بڑی ہی عجیب، بہت ہی ناقابلِ یقین بات کہہ دی تھی اس نے۔ کہیں وہ میرے ساتھ کوئی بہت ہی لمبا فراڈ تو نہیں کر رہی تھی؟ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ میرے ہاتھوں چند مُہرے پٹوا کر میرا اور میرے ساتھیوں کا اس حد تک اعتماد حاصل کر لینا چاہتی ہو کہ ہمارے درمیان گھُس کر ایک ہی وار میں ہم سب سے نجات دلا دے ان یہودیوں کو تاکہ پھر ان کا ہاتھ روکنے والا، انھیں پہچاننے اور ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی ایک شخص بھی باقی نہ رہے۔

میری خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو وہ بولی۔ "ہیلو... ہیلو جنابِ عالی! آپ چپ کیوں ہو گئے؟"

میں نے جلدی سے خود کو سنبھال کر کہا۔ "کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے کہ..."

"کہ جو آپ کی توقع، آپ کے اندازوں کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں جنابِ عالی! یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟" میری بات کاٹ کر وہ بولی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے، میں کیا کہوں تم سے۔ تمھارے اس انکشاف نے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگایا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کہوں اور کیا سمجھوں تمھیں؟" میں نے اپنی کیفیت کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اس سلسلے میں میرا مشورہ آپ کے لیے یہ ہے کہ آپ اپنے دماغ کو نہ تھکائیں اور جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر یقین کر لیں۔"

"ہاں کرنا تو یہی پڑے گا لیکن میری ایک بات کا جواب دے دو تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں، اگر ممکن ہوا تو ضرور جواب دوں گی۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"صرف اتنا بتا دو مجھے، تم یہودی نہیں ہو تو کون ہو؟ تمھاری اصلیت اگر یہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے تو پھر کیا ہے؟"

"اوہ، شاید کوئی آ گیا ہے۔ میں پھر کسی وقت بات کروں گی آپ سے۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ وہ کسی وجہ سے مجھے اپنے بارے

میں حقیقت بتانے سے گریزاں تھی اور وہ وجہ کیا تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب بھی لزی کے ہی پاس تھا۔ میں چند لمحے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریسیور کو گھورتا رہا، پھر اسے کریڈل پر ڈال دیا۔

دو دن خاموشی سے گزر گئے تھے۔ اس دوران کوئی ہنگامہ کوئی ہلچل نہیں ہو سکی تھی۔ نہ ہی لزی نے فون کر کے یا کسی اور ذریعے سے کوئی خبر دی تھی، نہ ماں جی کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ تین دن تک میں لزی کی کوشش کے نتیجے کا انتظار کروں گا، اگر ان تین دنوں میں وہ ماں جی کو آرزک کی گرفت سے چھڑا لاتی ہے تو ٹھیک ہے، نہیں تو چوتھے روز میں خود ہی کچھ نہ کچھ کروں گا۔

جب سے آسیہ آئی تھی، اسلم آبی اس حصے سے باہر ہی نہیں نکلتا تھا جدھر فردوسی بیگم اور آسیہ مقیم تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ کبھی کبھی بلانے پر آتا بھی تھا تو چند منٹ بیٹھ کر پھر اُدھر ہی جا گھستا تھا۔ یہ بات میرے لیے تعجب خیز اس لیے نہیں تھی کہ میں آسیہ کے ساتھ مکرم علی گورایا کی جاگیر پر چند روزہ قیام کے دوران ہی یہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آبی برا آدمی نہیں تھا اور آسیہ کا ہاتھ مجھے کسی نہ کسی کے ہاتھ میں تو ایک نہ ایک دن دینا ہی تھا۔ پھر اگر اس نے آبی کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ آبی اگر قانون کی نظر میں قابلِ گردن زدنی تھا اور پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی تو خود آسیہ بھی اب کوئی نیک نام اور سیدھی سادی سی گھریلو لڑکی نہیں رہی تھی، اس کا دامن بھی آبی کے مقابلے میں کچھ کم آلودہ نہیں تھا اور پولیس کو وہ بھی آبی ہی کی طرح مطلوب رہی تھی۔ میں تو اسے بھی آبی کا احسان ہی سمجھتا تھا کہ وہ میری ایسی داغ داغ بہن کا ہاتھ تھام کر میرے سر سے اس کا بوجھ ہلکا کر دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ ان کی ایک دوسرے کے لیے یہ دلچسپی اور وارفتگی دیکھ کر ہی میں مکرم علی گورایا کی جاگیر سے آبی کے بغیر اکیلا ہی چلا آیا تھا۔ کیوں کہ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آبی اب آسیہ کو چھوڑ کر میرے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ یہ ان دونوں کی بدنصیبی ہی تھی کہ میرے آنے کے چند دن بعد ہی گورایا کی جاگیر کے اصل وارث لندن سے آ گئے اور انھوں نے آسیہ اور آبی کو اپنے دفاع کا موقع تک نہیں دیا اور ان کی اس وارفتگی نے انھیں ہوش میں آنے سے پہلے ہی راولپنڈی جیل کی مضبوط اور فلک بوس چار دیواری کے اندر پہنچا دیا۔ طویل جدائی کے بعد وہ دونوں دوبارہ یکجا ہوئے تھے تو انھوں نے ایک بار پھر مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس بات کو سبھی نے محسوس کیا تھا مگر کسی نے اس معاملے میں لب کشائی کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ یوں انجان نظر آتے تھے سب لوگ جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو۔ ممکن ہے میری غیر موجودگی میں وہ لوگ اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے ہوں لیکن میں نے کبھی کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اس بارے میں۔ کم از کم اتنی احتیاط انھوں نے رکھی تھی کہ ان کی زبان سے ادا ہونے والا کوئی ایسا لفظ میرے کانوں تک نہ پہنچے جس سے میری دل آزاری ہوتی ہو۔ جو میرے لیے شرمندگی کا باعث بن سکے۔ ان دونوں کی خودغرضی کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا جیسے انھیں کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔ میرے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، حالانکہ ان کا رویہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اگر آسیہ میری چہیتی بہن نہ ہوتی یا آبی میرا جگری یار نہ ہوتا تو میں کبھی ان دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حیرت مجھے آسیہ پر تھی کہ اسے ماں جی پر پڑنے والی افتاد کی بھی فکر نہیں تھی۔ وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن نظر آتی تھی۔ تیسرے دن جو میرے حساب سے ماں جی کے سلسلے میں لزی کی والی چھوٹ کا آخری دن تھا، میں آبی اور آسیہ سے مشورہ کرنے ان کے پاس پہنچا تو مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دونوں ماں جی کو بھول کر غلام مرتضیٰ شاہ سے آسیہ کے بچے کو حاصل کرنے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھے۔ آبی مجھے دیکھ کر بولا۔ "آخر ہم ایسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کب تک بیٹھے رہیں گے؟ ہمیں اس غلام مرتضیٰ شاہ کے پاس چل کر اس سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ بچے کو ہمیں دے دے۔ اگر سمجھانے سے بات سمجھ میں آتی ہے اس کے تو اچھا ہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے ایسے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ وہ کوئی وڈیرا ہے اور خاصے اثر رسوخ کا مالک بھی ہے۔ اگر نہ ہوتا تو لاکھو اشتہاری بچے کو اس کے پاس کبھی نہ بھیجتا۔ اس کے گھر کو ایک بہترین پناہ گاہ سمجھ کر ہی اس نے ایسا کیا ہے۔"

"اگر وہ یوں نہیں مانے گا تو ہمیں دوسری زبان میں بات کرنا بھی آتی ہے۔ پھر ہم وہی زبان استعمال کریں گے جسے وہ سمجھتا ہے۔" آبی بولا۔

میں نے کہا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے، ایسا کر سکتے ہیں ہم لیکن اس طرح ہم اپنے لیے ایک نیا محاذ کھول لیں گے۔ ہماری توجہ ایک طرف ہو گی تو دوسری طرف پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک طرف آرزک ہو گا، دوسری طرف پولیس ہو گی اور تیسری طرف یہ غلام مرتضیٰ شاہ آ کھڑا ہو گا ہماری راہ روکنے کے لیے۔ اس کے بعد چوتھی سمت صرف سمندر ہی رہ جائے گا خودکشی کرنے کے لیے۔"

"کیسی بزدلوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے تو جیلانی! کیا یہ چاہتا ہے کہ ہم آسیہ کے بچے کا خیال نکال دیں دل سے؟" آبی تیز آواز میں بولا۔

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں تم دونوں کو کہ یہ وقت اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے۔" میں بولا۔

آسیہ نے آبی کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی تم سے کہ بھائی جان سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کرو آسیہ! تم میری بہن ہو، میں تمھارے ہر معاملے میں دل و جان سے تمھارے ساتھ ہوں، میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم بچے کو حاصل نہیں کریں گے۔ تمھیں شاید آبی نے بتایا نہیں کہ ہم ان دنوں کن حالات سے دوچار ہیں۔ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ تمھارے مسئلے سے بہت زیادہ اہم ہے، پہلے اسے نمٹا لیں پھر بچے کو حاصل کرنا تو زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔"

"بھائی جان! میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ میں سمجھتی ہوں جس مسئلے کو آپ اتنی اہمیت دے رہے ہیں وہ سرے سے ہمارا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ ہمارے اپنے دکھ کیا کم ہیں کہ دوسروں کے دکھ بانٹنے بیٹھ جائیں، یہ کام انھی کے لیے رہنے دیں آپ، جو ملک اور قوم کا غم کھاتے کھاتے بے اندازہ دولت اور اختیارات کے مالک بن چکے ہیں اور جن کی شب و روز کی کوششوں کی بدولت ایک ایسی نسل تیار ہو کر میدانِ عمل میں آ چکی ہے جس کے دل میں نہ بزرگوں کا ادب و احترام، محبت و مروت باقی رہی ہے اور نہ دوسروں کے لیے جینے کا جذبہ باقی رہا ہے۔ اُن خود پرست، خودغرض لوگوں نے اپنی سیاست کی دکان چمکانے کی خاطر لاقانونیت، بربریت اور ناانصافی کو جس طرح فروغ دیا ہے اس کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔ جس خطۂ زمین سے انصاف اُٹھ جائے، اس کی سلامتی سے کسی کو دلچسپی نہیں رہتی بھائی جان! یہ انسانی فطرت بھی ہے اور قانونِ قدرت بھی۔ اس قوم کو عذابِ الٰہی سے کون بچا سکتا ہے جس میں مظلوم کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ ہو، بربادی اور ویرانی اس خطۂ زمین کا مقدر بن جاتی ہے جہاں ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ رہے۔ آپ خود ہی بتائیں بھائی جان! آپ کے ساتھ، میرے ساتھ اور ہماری بوڑھی اور بے سہارا ماں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے کیا یہ انصاف ہے؟ ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے والے، ہم پر ظلم کرنے والے آج بھی معاشرے میں باعزت سمجھے جاتے ہیں اور قانون کی نظر میں وہ باحیثیت اور صاحبِ ثروت ہونے کی بنا پر معزز ہیں اور ہم ان کے مظالم کا نشانہ بننے کے باوجود اشتہاری ملزم ہیں، قانون کے مجرم ہیں اور گردن زدنی ہیں کیوں کہ ہم انصاف کو خریدنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔"

میں حیران اور ششدر بیٹھا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ شدتِ جذبات سے تمتا رہا تھا اور زبان زہر اُگل رہی تھی۔ میرے دل پر نشتر سے چل رہے تھے لیکن وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے جھٹلانے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی۔ میرا دل خون رو رہا تھا اس کی اس آتش بیانی پر اور میرے ذہن میں ایک دانا حکمراں کے یہ الفاظ بار بار گردش کر رہے تھے۔ "انصاف قائم کرو اگر اپنی، اپنی قوم کی اور اس خطۂ زمین کی سلامتی چاہتے ہو جہاں تم آباد ہو۔ یاد رکھو کہ مظلوم کے دل میں سب سے پہلے اس شخص کے لیے نفرت پیدا ہوتی ہے جو اس پر ظلم کرتا ہے، اگر ظالم کے خلاف اس کی دادرسی نہ کی جائے، ظالم کو ظلم کرنے سے نہ روکا جائے تو اس مظلوم کو اس حکمراں سے نفرت ہو جاتی ہے جس کی حکمرانی میں اس پر ظلم ہو رہا ہو اور جب اس حکمراں کا محاسبہ کرنے والا بھی کوئی نہ ہو تو اسے اس خطۂ زمین سے بھی نفرت ہو جاتی ہے جہاں اس پر ظلم ہو رہا ہو۔"

میرا دل بری طرح لرز اُٹھا۔ میں بے اختیار چیخ پڑا۔ "بس کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ تم میری بہن ہو کر اس طرح سوچتی ہو، یہ سرکشی، یہ باغیانہ سوچ کس نے عطا کی ہے تمھیں؟ تم اس دھرتی سے بے زاری کا اظہار کر رہی ہو جس کی مٹی سے تمھاری پرورش ہوئی ہے۔ یہ اپنی ماں سے نفرت کرنے کا سبق کس نے پڑھایا ہے تمھیں آسیہ؟ یہ کس نے سمجھا دیا ہے تمھیں کہ ہماری دھرتی پر ظلم اور ناانصافی کے سوا اور کچھ نہیں ہے؟ کون کہتا ہے کہ یہاں مظلوموں کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں رہا ہے؟ نہیں آسیہ! میری بہن! ایسی بات نہیں ہے۔"

"اگر ایسا نہیں ہے بھائی جان! تو پھر آج آپ اشتہاری مجرم، قاتل اور ڈاکو بنے قانون سے کیوں چھپتے پھرتے ہیں؟ ملک کی بقا کے خلاف ہونے والی سازشوں کی بیخ کنی کے سلسلے میں آپ کو قانون کا تعاون کیوں حاصل نہیں ہے؟" وہ اسی زہریلے لہجے میں بولی۔

"قانون کو دوش نہ دو آسیہ! اس میں قصوروار ہم ہی ہیں۔ ہم پر جو ظلم پہلی بار ہوا، ہم نے اس کے خلاف قانون سے مدد لینے کے بجائے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر ظالم کو خود ہی سزا دینا چاہا تھا۔ ہم مظلوم بننے کے بجائے مجسّم انتقام بن گئے تھے۔ تم مجھے بتاؤ تم نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف فریاد کی تھی قانون کے سامنے؟ کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر انصاف مانگا تھا؟"

"ایسا میں نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ میں جانتی تھی، وہ باحیثیت لوگ ہیں، ان کے مقابلے میں میری بات کوئی نہیں سنے گا اور اگر کسی نے سننا گوارا بھی کر لیا تو اس پر یقین نہیں کرے گا کوئی بھی۔ پھر میں وہاں جا کر لوگوں کے مذاق کا نشانہ کیوں بنتی؟ کیوں تماشا بناتی اپنے آپ کو۔ چنانچہ میں نے وہی کیا جو ان حالات میں کوئی بھی مسلا کچلا، عاجز آیا ہوا شخص کر سکتا ہے، اپنی طاقت اور اپنی بساط کے مطابق۔ وہ سنا

نہیں ہے آپ نے، چیونٹی بھی پیر کے نیچے آکر جب نکلنے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتی تو کاٹنے لگتی ہے۔"

"ہاں، اور کاٹنے کے بعد ہی مَسل بھی دی جاتی ہے ورنہ پاؤں کے نیچے آنے کے بعد بھی زندہ تو رہتی ہے وہ۔" میں نے جواب دیا۔

آبی جو اب تک خاموش بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا، بولا "یہ آبی نہیں ہے آسیہ! اس پر تیری کسی دلیل کا اثر نہیں ہو سکے گا۔ یہ غلام جیلانی ہے، تیرا بھائی۔ اسے بھی تیری ہی طرح دوسروں کو اپنی باتوں کے جال میں الجھا لینے کا فن آتا ہے۔ اس سے بحث نہ کر۔"

"بک نہیں اوئے مرغابی! سالے تیری طرح بغیر پیندے کا تو ہوں نہیں میں کہ جدھر چاہے لڑھکا دے مجھے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

میرے اس اندازِ تخاطب پر آسیہ ایک دم ہنس پڑی۔ وہ بولی "یہ آپ نے انھیں آبی سے مرغابی کیوں بنا دیا بھائی جان؟"

آبی مجھے گھورتے ہوئے بولا "ارے آسیہ! تو کیا سمجھتی ہے اپنے بھائی کو۔ بہت ذلیل آدمی ہے یہ اور ایسے ہی ہشت پا قسم کے جانوروں سے دوستی کرلی ہے اس نے۔ سالے بیک وقت آٹھ طرف سے حملہ کرتے ہیں آدمی پر، بچ نکلنے کا راستہ ہی نہیں چھوڑتے ہیں کوئی۔ وہ جو ہے نا اس کا ایک لے پالک، جس کا نام اس کے والدین نے شرافت علی رکھ دیا تھا، یہ جانے بغیر ہی کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اب آدمی محض نام کی وجہ سے تو کوئی شریف نہیں ہو جاتا، اس کا بھی یہی حال ہے، شرافت تو اس میں سونگھنے کو بھی نہیں ہے البتہ پگڑیاں خوب اُچھال لیتا ہے دوسروں کی۔ اسی نے ایک دن آبی کے معنی اور مطلب سمجھا دیے تھے اسے۔ اسی وجہ سے یہ مرغابی کہہ رہا ہے مجھے۔"

آسیہ نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر ایک دم قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا ہنستے ہنستے اور آبی کی حالت دیدنی تھی۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی عاجزی اور انکساری کے ساتھ آسیہ کو دیکھنے لگتا تھا۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر ترس آگیا اس پر۔ میں نے آسیہ سے کہا "بس کرو آسیہ! زیادہ نہ ہنسو، نہیں تو یہ... پانی کا باسی رو پڑے گا بچارہ۔"

آبی پھاڑ کھانے والے انداز میں جھنجلا کر بولا "بک نہیں اوئے۔ میں لحاظ کر رہا ہوں تیرا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے..."

"او نہیں یار! مجھ پر خواہ مخواہ ہی لال پیلا ہو رہا ہے تو، میں نے تو کچھ نہیں کہا نا تجھے۔ شرافت علی کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہا ہے بھائی؟"

آسیہ اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولی "ویسے اس شرافت علی نے طبیعت بڑی ظریفانہ پائی ہے آبی! واہ کیا خوب تشبیہ دی ہے۔"

"ہوا" ناظریفانہ۔" آبی منہ ٹیڑھا کر کے بولا "ایسے ستم ظریفانہ کی داد دینا بھی کچھ کم ستم ظریفی نہیں ہے آسیہ بی بی!"

"ارے، تم کیسے بدذوق آدمی ہو آبی! اتنا چھوٹا سا دل ہے میں ہوتی تمھاری جگہ تو سر پر بٹھاتی ایسے ظریف شخص کو۔"

"اوئے چپ ہو جا بھئی اب۔ مر گیا وہ ظریف بھی اور مجھ جیسے لوگ سر پر بٹھاتے تھے۔ میں نے کہا نا وہ تو صرف ہے، ستم ظریف بس۔" پھر وہ میری طرف مڑ کر بولا "دیکھ بھئی ہمارا ساتھ دے یا نہ دے، ہم نے فیصلہ کرلیا ہے آج رات کو غلام مرتضیٰ شاہ کے قلعے پر حملہ کرنے کا۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے "کیوں آسیہ! کیا کہہ رہا ہے یہ؟ کیا واقعی تم دونوں یہ فیصلہ کر چکے ہو؟"

"ہاں بھائی جان!" آسیہ نظریں چُراتے ہوئے بولی "مجبوری ہے۔ میں جلد از جلد اپنے بچے کو اپنے پاس دیکھنا"

"اور تمھیں ماں جی کی بالکل پروا نہیں ہے؟ تمھارے میں وہ ماں نہیں ہیں ہماری اور ان کا دل جلد از جلد اپنے پاس پہنچنے کو بے چین نہیں ہوگا؟ کیا ان کے دل میں ہماری تڑپ ہے یا ان کا سینہ ممتا سے بالکل خالی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے ایسا کب کہا ہے بھائی جان! کب میں نے اہمیت سے انکار کیا ہے؟ میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر تو نہیں ہوں کہیں۔ اور پھر آج تو آپ ان کے سلسلے میں کچھ نہیں کر رہے ہیں نا، تو کیوں نہ اس طرف سے ہی نمٹ لیا جائے۔" وہ بولی۔

اس کی یہ بات کچھ نامناسب بھی نہیں تھی۔ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی وہ۔ کل کی صبح ہونے تک ہم یہ کام کر سکتے تھے۔ اتنا وقت تھا ہمارے پاس۔ لہٰذا میں نے کہا "ٹھیک ہے، اگر تم چاہو تو ہم آج یہ کوشش بھی کر لیتے ہیں۔ شاید کامیابی ہو ہی جائے۔ خدشہ یہی ہے کہ اس کے بعد یہ معاملہ طول نہ پکڑ جائے۔ غلام مرتضیٰ شاہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ایک مستقل دردِ سر نہ بن جائے ہمارے لیے۔"

"او یار! اس کی فکر نہ کر تُو، اگر محض اتنی سی بات سوچ رہا ہے تُو، تو ہم اسے زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے جو ہمارا کچھ کر سکے۔ بچے کو لے کر وہاں سے نکلتے وقت اس کے سر میں ایک گولی اتارتے آئیں گے، بس سمجھ لے کہ خس کم جہاں پاک۔" آبی مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے اب جبکہ تم دونوں نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میرا کچھ کہنا سننا بے کار ہی ہے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے، ماں جی کی رہائی کے بعد کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ ماں جی ہم سے ملنے کو بہت بے چین ہیں اور میں نے انھیں اطمینان دلایا

تھا کہ وہ جب یہاں پہنچیں گی تو آسیہ بھی انھیں یہاں موجود ملے گی۔ میرے سوہنے رب نے میرے اس وعدے کی لاج رکھتے ہوئے آسیہ کو پہنچا دیا ہے تو اب اسے کسی ایسے بکھیڑے سے میں دور ہی رکھنا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں اس کے پھر سے گم ہو جانے کا امکان ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں بھائی جان! ایسا کوئی خیال دل میں نہ لائیں آپ۔ یہ کوئی اتنا خوف ناک کام نہیں ہے کہ میں واپس ہی نہیں آسکوں گی وہاں سے۔ وہاں کوئی بہت ہی خوف ناک قسم کے درندہ صفت لوگوں سے سامنا ہونے کا امکان نہیں ہے۔ صرف دو محافظ ہوتے ہیں رات کو پہرے پر اور ان کے پاس صرف پستول ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو کتے ہیں اور وہ دونوں مجھ سے مانوس ہیں، لہٰذا ان سے بالکل خطرہ نہیں ہے۔ اندر غلام مرتضیٰ شاہ اور اس کی بیوی کے علاوہ بچہ اور اس کی دیکھ بھال کرنے والی بوڑھی عورت ہوتی ہے۔ نوکر چاکر سب دس بجے تک اپنے اپنے کوارٹرز میں جا چکے ہوتے ہیں۔ وہاں کسی زیادہ سخت مقابلے کی توقع نہیں ہے۔" آسیہ نے بتایا۔

میں نے ہنس کر کہا "آسیہ! تُو نے بندوق چلانا سیکھ لی ہے اور اس کے ذریعے کچھ ہنگامے بھی کرتی رہی ہے تُو مگر انسانوں کو سمجھنے اور حالات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرنے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے تجھ میں۔ یہ جو کچھ تُو نے مجھے بتایا ہے، یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں جب تُو وہاں رہتی تھی اور وہ غلام مرتضیٰ شاہ بھروسا کرتا تھا تجھ پر، تیری حقیقت سے وہ جب تک واقف نہیں ہوا تھا اور اسے یہ یقین تھا کہ تجھے بالکل پتا نہیں ہے کہ بچہ کہاں اور کس کے پاس ہے۔ اب اسے تیرے بارے میں معلوم ہو چکا ہے، وہ یہ بھی جان چکا ہے کہ تُو نے بچے کا پتا لگا لیا ہے۔ اسے تیری رہائی کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ یہ خبر اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی اور اگر نہ بھی ہوئی ہوتی تب بھی پولیس نے اسے ضرور خبردار کر دیا ہوگا کہ وہ تیری طرف سے ہوشیار رہے بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے وہاں باقاعدہ پولیس لگا دی گئی ہوگی اور جب ہم وہاں پہنچیں تو ہمارا ٹکراؤ پولیس سے ہی ہوگا۔"

آسیہ نے اس انداز سے آبی کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو "اب بتاؤ اس کے جواب میں کیا کہتے ہو تم؟" آبی بھی چند ثانیے آسیہ کو دیکھتا رہا پھر بولا "یہ تو تُو نے بالکل ٹھیک کہا ہے بھائی! اس طرف تو ہم نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کیوں آسیہ! تیرا کیا خیال ہے؟"

وہ بولی "اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن پولیس اگر ہوگی بھی تو مکان کے سامنے والے حصے میں، مین گیٹ پر ہوگی اور پولیس کی موجودگی میں اندر والے پہرے دار اور بھی مطمئن ہو گئے ہوں گے، ممکن ہے اندر ہمیں زیادہ محنت ہی نہ کرنا پڑے۔"

"اصل مسئلہ تو اندر داخل ہونے کا ہی ہے۔ مکان کے سامنے والے حصے میں پولیس موجود ہوگی، دائیں بائیں اور عقب میں دوسرے مکان ہوں گے۔ پھر ہم اندر داخل کس طرح ہو سکیں گے؟ سامنے سے پولیس تو اس کی اجازت نہیں دے گی، ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم غلام مرتضیٰ شاہ کے کسی پڑوسی کے گھر میں داخل ہو کر اس طرف سے دیوار پھاند کر چلے جائیں اندر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، اس کے مکان کے عقب میں ایک جواں سال جوڑا رہتا ہے۔ بیوی کوئی آرٹسٹ ٹائپ کی چیز ہے، فنکشنوں اور اسٹیج ڈراموں میں حصہ لیتی ہے اور اس سلسلے میں اکثر راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہتی ہے۔ شوہرِ نامدار چونکہ اپنی بیگم کے پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور باڈی گارڈ کے بھی لہٰذا وہ بھی ہر وقت بیوی کی دُم کے ساتھ ہی بندھے رہتے ہیں۔ گھر میں صرف ان کی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ اور اس کا تقریباً بوڑھا شوہر ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں کو میں نے پہلے ہی شیشے میں اتار رکھا ہے۔ پہلے بھی میں نے بچے کو لے کر ادھر سے نکلنے کا پروگرام بنایا تھا اور ان دونوں نے میرے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن عین وقت پر گڑبڑ ہو جانے سے مجھے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اب بھی ہم وہ راستہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کی پشتیں اس طرح ہیں کہ درمیان میں موجود چار فٹ چوڑی گلی اوپر سے بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کی رہ گئی ہے۔ یعنی دونوں ہی عمارتوں کی چھتوں پر گلی کی طرف چھجے نکلے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک آٹھ دس سال کا بچہ بھی اگر چاہے تو چھلانگ لگا کر ایک سے دوسرے مکان کی چھت پر جا سکتا ہے۔"

"لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آج بھی وہ دونوں میاں بیوی کسی پروگرام میں شرکت کے لیے گئے ہوئے ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ان کا تقریباً روز ہی کا معمول ہے۔ کبھی اتفاقاً ہی مہینے دو مہینے میں کوئی رات ان کی گھر پر گزرتی ہوگی۔" آسیہ نے جواب دیا۔

"ہوں۔" میں نے کہا "اور وہ رات آج کی رات بھی ہو سکتی ہے۔ کیا تم کسی طرح ان کا آج کا پروگرام معلوم کر سکتی ہو؟"

"ایک ہی طرح ہو سکتا ہے یہ کام کہ میں خود وہاں جاؤں اور معلوم کروں۔ وہاں رہتے ہوئے مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ کسی وقت حالات ایسا رخ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ٹیلی فون نمبر معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی میں نے۔" آسیہ نے تذبذب کرتے ہوئے کہا۔

"تمھارا وہاں جانا تو خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اس کے

علاوہ یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے ہمیں کہ بچہ اب وہاں ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ غلام مرتضیٰ شاہ نے اسے وہاں سے ہٹا دیا ہوگا۔ ایسی صورت میں وہاں جاکر خود کو خطرے میں ڈالنے کا فائدہ؟ ہماری دشمنی تو نہیں چلی آرہی ہے اس غلام مرتضیٰ شاہ کے ساتھ کہ کچھ بھی ہو ہمیں انتقام ضرور لینا ہے اس سے؟" میں نے کہا۔

آبی بولا "میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے جیلانی کہ تو اب بزدل ہوگیا ہے اور معرکہ آرائی سے دامن بچانے کے لیے اگر مگر اور چنانچہ کا سہارا لینے لگا ہے۔ وہ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے والا جذبۂ عشق باقی نہیں رہا ہے تیرے اندر اب۔"

"بک نہیں اوئے، تیری عقل تو ان دنوں گھاس کھانے گئی ہوئی ہے۔ کیا چاہتا ہے تو؟ کیا ہم بس یونہی جا پڑیں اس غلام مرتضیٰ شاہ کے آشیانے پر اور کچھ ہاتھ آئے یا نہ آئے اسے نوچ کھسوٹ کر پھینک آئیں بس۔ یہ بہادری ہے تیرے نزدیک؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں آبی! ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا چاہیے، محض جذبات سے کام نہیں بنتے۔ فیصلہ کرتے ہوئے ہم نے اس امکان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ سوچا تک نہیں تھا کہ اگر بچہ وہاں نہیں ہوا تو ہماری یہ ساری تگ و دو، تمام تر محنت اور کوشش رائیگاں ہی جائے گی۔ لہٰذا پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بچہ اب بھی وہاں موجود ہے یا نہیں۔" آسیہ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں بہن بھائی کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ کم از کم میرے جیسے آدمی کے بس کی بات تو نہیں ہے یہ۔" آبی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "کل سے میری جان عذاب میں ڈال رکھی تھی تو نے اور بضد تھی کہ کچھ بھی ہو جائے، آج کی رات غلام مرتضیٰ شاہ سے اپنے بچے کو ضرور چھین لائے گی۔ مجبور ہو کر میں نے ہامی بھر لی تیرا ساتھ دینے کی۔ پھر گھنٹوں بیٹھ کر منصوبہ بنایا اور ایک ایک بات پر بحث مباحثہ کرکے اسے آخری شکل دینے کے بعد یہاں آئے۔ جیلانی سے بات کرنے کے لیے یہ طے کرکے آئے تھے کہ جیلانی ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوا تب بھی ہم آج رات اپنے منصوبے پر عمل ضرور کریں گے لیکن اب جیلانی کی ایک ذرا سی بات پر تو اس کی حمایت کرنے لگی ہے، سارا جوش، سارا ولولہ مٹی ہوگیا نا تیرا؟"

"بے کار بات نہ کرو آبی! تم نے ایسی مناسب اور معقول بات کی ہی نہیں کوئی۔ اگر تم نے ایسی کوئی بات سمجھائی یا سُجھائی ہوتی اور میں ماننے سے انکار کر دیتی اس بات کو تب تم یہ بات کہتے ہوئے اچھے لگتے۔ پھر تمہیں شکوہ کرنے کا بھی حق پہنچتا۔ اب تم یہ بات کہتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے ہو مجھے۔" وہ بولی۔

"اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ چل مان لیا میں نے تیرا یہ بھائی عاقل، بالغ قسم کا آدمی ہے۔ اب یہ بتا مجھے، یہ پتا کیسے چلے گا کہ بچہ غلام مرتضیٰ شاہ کے پاس ہی ہے یا اس نے کہیں اور منتقل کر دیا ہے؟" آبی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"یہ پتا کرنے کے لیے مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ اس کی ملازمہ کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں گی اس سلسلے میں۔" آسیہ نے جواب دیا۔

"کیا اس کا آنا جانا ہے غلام مرتضیٰ شاہ کے گھر میں؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہاں، اس کی ایک نوکرانی سے خاصی راہ و رسم ہے۔ اکثر ملنے کے لیے جاتی رہتی ہے وہ اکثر اس گھر میں۔" آسیہ نے جواب دیا۔

"پھر تو اسے پتا ہی ہوگا، بچہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔ پھر کیوں کہہ رہی ہو کہ اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں گی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ عورت ذرا ایسی ہی ہے۔ مہربان ہو تو سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے اور کوئی بات ذرا بھی مرضی کے خلاف ہو جائے اس کی تو پھر لاکھ جتن کر لو کوئی بات مان کے نہیں دیتی۔ اب اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی آگئی ہے میری طرف سے یا نہیں..." اس نے کہا۔

"ایسے لوگ تو کبھی بھی اعتبار کے قابل نہیں ہوتے آسیہ! خطرہ ہی رہتا ہے ان کی طرف سے ہر دم۔ تم نے غلط عورت پر تکیہ کیا ہے۔" وہ بولا۔

"اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا میرے پاس۔ گھر کے ملازمین میں کوئی ایسا تھا ہی نہیں جسے میں اپنا ساتھ دینے کے لیے آمادہ کر سکتی۔ سارے ہی نوکر غلام مرتضیٰ شاہ کے اپنے لائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے تو کوئی اس کے خلاف جانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے وفادار ہوں یا نہ ہوں، اس سے خوف زدہ ضرور رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے خود غلام مرتضیٰ شاہ کو اپنے کچھ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا..." آسیہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، پھر ہم یوں کرتے ہیں، رات کو نو دس بجے غلام مرتضیٰ شاہ کی اس آرٹسٹ پڑوسن کے گھر پہنچ جائیں گے اور اس کا شوہر گھر پر موجود نہ ہوئے تو ہم وہیں اس کے گھر میں غلام مرتضیٰ شاہ کے گھر میں سب کے سو جانے کا انتظار کریں گے۔ دوران تم ملازمہ سے بچے کے بارے میں پتا کر لینا۔ وہ وہاں موجود ہو تو ٹھیک ہے نہیں تو ہم بھی ہمت نہیں گے وہیں سے۔" میں

"مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی جلدی ہم تینوں وہاں جاکر کیا کریں گے؟ کیوں نہ میں پہلے ہی معلوم کر آؤں جاکر؟" آسیہ نے کہا۔

"نہیں، ایسے بے اعتبار لوگوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے ایک لمحے کے لیے بھی، یا تو انھیں کسی معاملے میں ساتھ لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر مجبوراً ایسا کرنا ہی پڑے تو بہت ہوشیار، بہت چوکنا رہنا چاہیے ان کی طرف سے۔ یوں بھی یہ چھوٹے لوگ پیٹ کے بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ تم اس سے معلوم کرکے واپس آجاؤ گی اور اس کے بعد اس کی ملاقات اگر غلام مرتضیٰ شاہ کی اس ملازمہ سے ہوگئی جو اس کی دوست ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس سے ذکر کر دے اور تمہاری آمد کا مقصد بتا دے۔ اگر ایسا ہوگیا تو بات غلام مرتضیٰ شاہ تک ضرور پہنچ جائے گی۔ پھر ہمارے لیے یہ راستہ بھی باقی نہیں رہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں جاکر کسی نادیدہ جال میں پھنس جائیں۔"

"اوہ آپ تو بہت دُور دُور کی باتیں سوچتے ہیں بھائی جان! میں اس طرح نہیں سوچتی۔ میں تو بس حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہوں اپنے آپ کو، انجام سے بے خبر ہو کر کود پڑتی ہوں میدانِ عمل میں، تن بہ تقدیر ہو کر۔" آسیہ نے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ حالات تمھیں ہمیشہ کسی نہ کسی دلدل میں اتار دیتے ہیں لے جاکر۔ اسی وجہ سے بار بار پولیس کے ہاتھوں میں جا پڑتی ہو تم۔ یہ کوئی دانشمندی والی بات تو نہیں ہے۔ یوں بھی جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو جانا اچھی بات نہیں ہوتی۔ آدمی اس طرح اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ لہٰذا ہر کام بہت ہی سوچ سمجھ کر سرد دماغ کے ساتھ کرنا چاہیے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے تو پھر آپ جس طرح کہتے ہیں اسی طرح کریں گے ہم۔ کیوں آبی ٹھیک ہے نا؟" اس نے آبی کو مخاطب کیا۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا تم سے یہ بات مگر میری بات پر کان ہی نہیں دھرتی تھیں تم۔ شاید میری زبان میں اثر نہیں ہے۔"

"بے کار باتیں نہیں کرو۔ تم نے اس طرح دلائل کے ذریعے مجھے قائل نہیں کیا۔ یوں کہتے ہو ہر بات کو جیسے بس میری مخالفت کرنا ہی مقصود ہو۔ ایسے تو میں کسی کی بات بھی نہیں مان سکتی، تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟" آسیہ نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اوئے یار جیلانی! یہ جو تیری بہن ہے نا، بس یوں لگتا ہے جیسے ہر دم انگاروں پر پاؤں دھرے کھڑی رہتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں ایسے لوگوں کو... ہاں... وہ یاد آگیا مجھے... آتش زیرِ پا... ہاں بس سمجھ لے آتش زیرِ پا ہے یہ جیسے تو بہن کہتا ہے اپنی۔ غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے ہر دم۔ مگر تیرے سامنے اس طرح بھیگی بلی بن جاتی ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو بے چاری۔"

آسیہ اسے گھورتے ہوئے اٹھ گئی اور بولی "اچھا بھائی جان! میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔ مجھے یہ بتا دیں میں کب تک تیار ہو جاؤں چلنے کے لیے؟ میں سمجھتی ہوں ہمیں ایسے وقت وہاں پہنچنا چاہیے جب گھر والے جا چکے ہوں۔"

"ہاں، دس بجے کا وقت ٹھیک رہے گا وہاں پہنچنے کے لیے لہٰذا ساڑھے نو بجے روانہ ہو جانا چاہیے ہمیں یہاں سے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں بالکل تیار ملوں گی آپ کو ساڑھے نو بجے۔" آسیہ نے کہا اور آبی کو قہر بار نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آبی سے کہا "اوئے ذلیل آدمی، تو اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آتا۔ کیسا آدمی ہے تو؟"

"نہیں یار! میں اسے کہاں تنگ کرتا ہوں۔ میں تو یہ کوشش کرتا ہوں، وہ خوش رہا کرے بس۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اسے خوش رکھنے کے لیے سرکس کے جوکر کی طرح تیری زبان بھی بس چلتی ہی رہتی ہے بغیر سوچے سمجھے۔ اور یہ جانے بغیر کہ دوسرے پر کیا گزر رہی ہے، تیری اس وقت کی باتوں کا بہت بُرا منایا ہے آسیہ نے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کی طرف سے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کبھی کسی بات پر ناراض ہو کر وہ ایک بار پھر ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلی نہ جائے کہیں۔"

"نہیں یار! تو ایسا کوئی خیال نہ لا اپنے دل میں۔ اب وہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔" آبی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے اس پُر اعتماد لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید ان دونوں کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ طے پا گیا ہے کہ اب وہ کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بات میرے لیے اس اعتبار سے بہت ہی خوش آئند تھی کہ آسیہ کسی طرح اس پُر خطر اور خار دار راہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ تو ہوئی تھی۔ آبی یوں بھی مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا لیکن اس لمحے تو وہ بہت ہی پیارا لگ رہا تھا مجھے۔

شام ہونے سے ذرا پہلے شرافت پہنچ گیا۔ وہ میرے لیے ایک لمبی سی اوپل کار لے کر آیا تھا۔ یہ ان دو کاروں میں سے ایک تھی جو اس نے کچھ خصوصی انتظامات کے ساتھ ری اسمبل کرائی تھیں۔ اسے کار سے زیادہ ایک جدید بکتر بند گاڑی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بظاہر ایک عام سی نظر آنے والی اس کار میں بڑی خوبیاں پوشیدہ تھیں۔ اسے دیکھ کر میں شرافت علی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ کار کے ڈیش بورڈ میں ایک خفیہ خانہ ایسی جگہ بنایا گیا تھا جو ڈرائیور کے بہت قریب تھا۔ اس خانے میں مختلف رنگوں کے کچھ بٹن اوپر نیچے دو لائنوں میں لگے ہوئے تھے۔ کسی بھی ہنگامی حالت میں ڈرائیونگ کرنے والا یا اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص ضرورت کے مطابق ان بٹنوں کو بہ آسانی استعمال کر سکتا تھا۔ ایک بٹن کو دبانے سے

گاڑی کے پیچھے ڈگی کا ڈھکنا کھل کر دو انچ اوپر اٹھ جاتا تھا اور وہاں سے دو اسٹین گنوں کی نالیاں برآمد ہو کر ایک تسلسل کے ساتھ گولیاں برسانا شروع کر دیتی تھیں۔ گاڑی کے آگے بونٹ کے سرے پر اسٹیل کا بنا ہوا ایک خوبصورت باز پر پھیلائے کھڑا تھا۔ اس پر اس مہارت سے رنگ کیا گیا تھا کہ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر بالکل اصلی کا گمان ہوتا تھا۔ قد قامت بھی اس کا ایک پورے باز جتنا ہی تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی لمبائی ایک ایک فٹ تھی۔ ایک بٹن دبانے سے وہ دونوں بازو یوں حرکت کرتے تھے جیسے باز اڑنے کے لیے پر تول رہا ہو۔ اس کے ساتھ بازوؤں سے بیک وقت چھ گولیاں سنسناتی ہوئی نکلتی تھیں۔ جن کی آواز بالکل نہیں ہوتی تھی۔ یوں دیکھنے والے اسے ایک خوبصورت ڈیکوریشن پیس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایک بٹن دبانے سے کار کے چاروں پہیوں پر ایسے کور سا یہ کر لیتے تھے جن سے ٹکرا کر گولیاں بے اثر ہو جاتی تھیں۔ کھڑکیوں اور ونڈ شیلڈ میں لگے ہوئے تمام شیشے بلٹ پروف تھے اور ان کے ذریعے کار میں بیٹھنے والوں کو باہر سے دیکھنا ممکن نہیں تھا البتہ اندر بیٹھے ہوئے لوگ باہر والوں کو بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دو بٹن کار کا رنگ تبدیل کرنے کے لیے تھے۔ ایک بٹن دبانے سے گہرا نیلا رنگ ایک دم ہلکا... ہو جاتا تھا، دوسرا بٹن دباتے ہی جگہ جگہ لال پیلی پٹیاں ابھر آتی تھیں اور ایک بٹن کے ذریعے کار کی نمبر پلیٹ تبدیل کی جا سکتی تھی۔

میں نے اس کار سے مکمل طور پر متعارف ہونے کے بعد شرافت علی سے کہا۔ ”یہ تو بڑی عجیب و غریب گاڑی تیار کروالی ہے یار تم نے۔“

شرافت علی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں کاروں کی کارکردگی دیکھنے کے بعد میں نے دو اور کاریں دے دی ہیں ری اسمگلنگ کے لیے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا ایسی بکتر بند گاڑیوں کی پوری رجمنٹ بنانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟“ میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

فیروز بولا۔ ”اگر انھوں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا ہے تو یہ بہت اچھا فیصلہ ہے ان کا۔ جن لوگوں سے ہمارا مقابلہ ہے ان کے لیے ہمیں ایسے سامان کی بے حد ضرورت ہے۔ ایسی کچھ گاڑیاں ہمارے پاس ہوں تو ہم چند ہی دنوں میں ان کا پوری طرح صفایا کر دیں گے اپنے ملک سے۔“

شرافت علی بولا۔ ”ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو فیروز۔ میرے پیش نظر یہی کچھ ہے۔ اس طرح کی ایک گاڑی کے ذریعے ہم ان کے کئی ٹھکانے اور ان گنت لوگوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ بے دھڑک برستی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں گھس کر انھیں دنداں شکن جواب دے سکتے ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے، آج کی مہم میں ہم لوگ یہی گاڑی استعمال کریں گے۔ آج ہی ابتدا ہو جائے گی اس کی۔“ میں نے کہا۔

”آج کی مہم!“ شرافت علی نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ فیروز بھی آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکنے لگا تھا۔ ”آج کس مہم...“

”وہ یار! ہمارا بالکل ذاتی معاملہ ہے یہ۔ تم لوگ اس کی فکر... ہم خود نمٹ لیں گے اس سے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب...

”کمال کرتے ہو جیلانی! یہ بات تو بڑی عجیب کہی ہے تم نے... کیا ابھی تک تم ہمیں اپنا نہیں سمجھتے ہو؟“ فیروز نے ذرا حیرت... کرتے ہوئے کہا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا یار! وہ کوئی اتنا سنگین مسئلہ نہیں... میں تم لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑے۔ اس لیے یہ بات کہی تھی... معمولی سا کام ہے۔ ہو سکتا ہے اکیلی آسیہ ہی سب کچھ کر لے اور... ہماری بھی ضرورت نہ پڑے۔“ میں نے انھیں سمجھاتے ہوئے...

”کیسی بات کر رہے ہو تم جیلانی! میں حیران ہوں آخر تم... گیا ہے؟ ہمارے ہوتے ہوئے آسیہ مسئلے حل کرے گی اب!...“ استعجابیہ انداز میں بولا۔ ”یہ تو ڈوب مرنے کا وقت ہے یار... لیے اب اتنے گئے گزرے ہو گئے ہیں ہم۔“

”نہیں یار! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ خواہ مخواہ بدگمانیوں کو جگہ نہ دو دل میں اپنے۔ وہ اصل میں آسیہ ہی کا معاملہ... تم کو تو پتا ہے یار شرافت علی! تم جانتے ہو وہ اتنے دنوں سے...

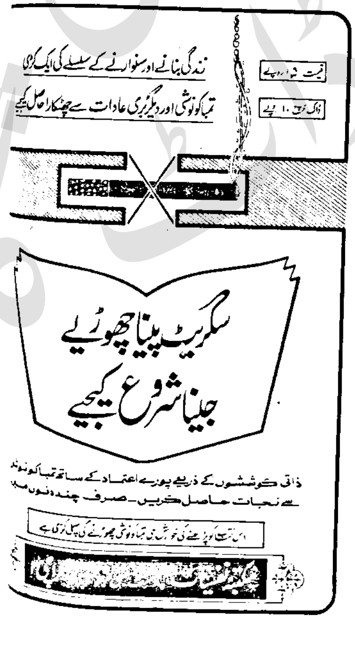

چھوڑ کر کیوں ادھر ادھر ماری پھر رہی ہے...“

شرافت علی نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”تو اس کے بچے کا پتا چل گیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟ کس کے پاس ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ بچہ کہاں اور کس کے پاس ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پوری بات سننے کے بعد فیروز بولا۔ ”اور تم کہتے ہو کہ یہ کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں پولیس بھی موجود ہوگی اور اس وڈیرے غلام مرتضیٰ شاہ کے پالتو آدمی بھی۔ پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم لوگ وہاں سے آسانی کے ساتھ بچے کو نکال لاؤ گے؟ اور یہ کام صرف آسیہ ہی کرے گی؟“

”سیدھی سی بات ہے بھائی! پولیس کی کوئی بھاری نفری تو ہوگی نہیں وہاں۔ دو چار کانسٹیبل قسم کے بندے ہوں گے اور وہ بھی باہر گیٹ پر۔ چنانچہ ان سے آمنا سامنا ہونے کا امکان صفر کے برابر ہے۔ اندر صرف ایک آدمی اور دو کتوں سے ملاقات ہونے کا امکان ہے۔ کتے دونوں آسیہ سے مانوس ہیں لہٰذا انھیں ان سے خطرہ بالکل نہیں ہے۔ ایک پہرے دار ہے اگر مڈ بھیڑ ہو بھی گئی تو اس سے نمٹنا زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ یہ کون سا سنگین مسئلہ ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو جیلانی! یہ کیا ضروری ہے کہ تمام حالات اسی طرح پیش آئیں جس طرح تم سمجھے بیٹھے ہو؟ تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے، صورتِ حال اس سے بالکل مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم سب ساتھ چلیں گے تمہارے۔“ فیروز بولا۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے میرے بھائی! کہ ایک پُر سکون ماحول میں بہت سے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر خواہ مخواہ ہی مشکوک ہو جائے یا وہ جن کے گھر سے ہمیں سارا کام کرنا ہے وہ دونوں ملازم اتنے سارے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر بھڑک اٹھیں اور ہمیں موقع ہی نہ دیں گھر میں آنے سے روک دیں۔ ایسی صورت میں تو ہمارا سارا منصوبہ ہی دھرا رہ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

شرافت علی بولا۔ ”ہاں، یہ بات سمجھ میں آتی ہے تمہاری۔ اس کے لیے ہم یوں کرتے ہیں کہ تم تینوں اپنے منصوبے کے مطابق ہی کام کرنا، ہم لوگ وہاں سے دور رہ کر حالات پر نظر رکھیں گے بس، اگر بات بگڑتی دیکھیں گے تو تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کسی کو شبہ نہ ہو سکے تم پر۔“ میں نے کہا۔

”نہیں یار! اتنی سمجھ تو ہم میں بھی ہے، تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔ ہماری گاڑی تم سے بہت پیچھے رہے گی۔“ شرافت علی بولا۔

فیروز نے کہا۔ ”لیکن تم گل زمان کو اپنے ساتھ رکھتے تو زیادہ اچھا تھا۔ تم کہہ رہے تھے وہاں کتے بھی ہوں گے۔ لہٰذا گل زمان وہاں.... “

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نے بتایا ہے نا آسیہ کے کہنے کے مطابق وہاں دو کتے رات بھر چوکیداری کے لیے کھلے رہتے ہیں لیکن وہ آسیہ سے خوب مانوس ہیں کیونکہ وہ کچھ دن وہاں رہ چکی ہے لہٰذا ان سے کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے۔“

”خیر، اگر تم سمجھتے ہو کہ اس کی ضرورت نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ بہر حال وہ ہمارے ساتھ رہے گا ہی۔“ فیروز نے کہا۔

■ ■

دس بج کر پانچ منٹ پر ہماری کار اس خوش نما بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے جا ٹھہری۔ آسیہ نے بنگلے کے اندرونی حصے میں روشنی دیکھ کر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بے کار ہے۔ قسمت ہی خراب ہے میری۔ آج وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں باہر ہی سے کیسے پتا چل گیا کہ وہ دونوں گھر کے اندر موجود ہیں؟“

”اندر کمروں میں روشنی نہیں دیکھ رہے ہیں آپ۔ ان کی غیر موجودگی میں سارے کمرے بند ہوتے ہیں اور لائٹیں بھی بند رکھی جاتی ہیں۔ ملازمہ باہر برآمدے میں لیٹتی ہے اور وہاں بھی وہ روشنی نہیں کرتی۔“ آسیہ نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

آبی بولا۔ ”پروا نہیں کرو۔ وہ اگر گھر میں ہیں تو ہونے دو، ہم ان سے تعاون کی درخواست کریں گے، اگر انہوں نے مان لی اور ہمارا ساتھ دیا تو ٹھیک ہے، نہیں تو باندھ کے ڈال دیں گے انہیں کسی کونے میں۔ یہاں تک آ کر نامراد واپس نہیں جائیں گے ہم۔“

”یہ بہت خطرناک بات ہوگی آبی! بات بگڑ گئی تو خواہ مخواہ ایک اور واردات ہمارے نام درج ہو جائے گی۔ اتنی جلد بازی کی آخر ضرورت بھی کیا ہے، ہم کل بھی آ سکتے ہیں یہاں، دو چار دن بعد بھی آ سکتے ہیں۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اوئے چپ کر یار! تیری اس مصلحت کوشی نے تو مجھے بھی ناکارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔“ آبی بولا۔

میں اسے جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ بنگلے کے گیٹ کا بغلی دروازہ کھول کر ایک پینتالیس، پچاس سالہ دراز قد اور صحت مند شخص نے پوچھا۔ ”کون صاحب ہیں آپ؟ کس کو ملنا ہے؟“

آبی کو شاید آسیہ اس خاتون آرٹسٹ کا نام بھی بتا چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔ ”زرین بی بی گھر پر

ہی ہے نا آج۔ اس کو بولو ہاشم خان صاحب آئے ہیں فنکشن کے لیے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا صاحب! آپ ٹھہرو ادھر ہی، ہم ابھی بتاتا ہوں بیگم صاحب کو۔" وہ دروازہ بند کر کے اندر جاتے ہوئے بولا۔

وہ شاید گیٹ کے قریب ہی کہیں بیٹھا تھا اور بنگلے کے سامنے کار کے رکنے کی آواز سن کر ہی اِدھر آگیا تھا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد آبی سے کہا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! وہ لوگ آسیہ کو پہچانتے ہوں گے۔ اسے دیکھ کر وہ مشکوک ہو جائیں گے ہماری طرف سے۔"

"پروا نہ کر یار! ہمیں بس کسی نہ کسی طرح اندر پہنچنا ہے۔ پھر اگر وہ ہمیں بھی پہچان لیں تو فرق کچھ نہیں پڑے گا اس سے ہم پر۔ وہ تیرے پاس پستول تو ہے نا۔ اس پر سائیلنسر چڑھالے بس، اس کے بعد تو پھر وہ وہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔" آبی بولا۔

میرے پاس اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا کوئی۔ وہ اندر اطلاع کرا چکا تھا اور اب کسی بھی لمحے ہمیں اندر بلایا جانے والا تھا۔ میں نے خاموشی سے پستول نکال کر اسے چیک کیا۔ وہ گولیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا اور سائیلنسر اس پر پہلے ہی سے چڑھا رکھا تھا میں نے۔ آسیہ اس دوران بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگتا یہی تھا مجھے کہ خود وہ بھی وہی کچھ چاہتی تھی جو آبی کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید ان لوگوں نے یہ سب کچھ پہلے ہی طے کر رکھا تھا۔

ایک منٹ کے بعد ہی بنگلے کا گیٹ کھول کر ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دے دیا گیا۔ آبی نے جلدی سے کار کو اسٹارٹ کیا اور اسے لیے ہوئے سیدھا اندر چلا گیا۔ پورٹیکو میں ایک چھوٹی سی نیلی کار پہلے ہی کھڑی تھی۔ آبی نے اپنی کار اس کے پیچھے ہی لگا کر روک دی۔ سامنے ہی کھلے ہوئے دروازے میں ایک تیس بتیس سالہ سرخ و سپید رنگت اور تیکھے نقوش والا لیڈی ٹائپ جوان ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھا۔ میں اور آبی ایک ساتھ اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر کار سے باہر نکلے۔ دروازے میں کھڑا ہوا شخص اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ کار کی کون سی سیٹ سے برآمد ہونے والا شخص کس حیثیت کا اور کون ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میرے کار سے اترتے ہی وہ اپنے ہونٹوں پر ایک دل خوش کن مسکراہٹ سجا کر میری طرف بڑھتے ہوئے بڑے ہی مہذب انداز میں بولا۔ "آیئے آیئے جناب خان صاحب! ادھر تشریف لے آیئے۔"

اس نے ہمیں ایک صاف ستھرے اور بڑے ہی قرینے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ آبی نے ایک جدید

طرز کے نرم و گداز صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔ "وہ مس زر[illegible] ہیں؟ انھیں اطلاع نہیں دی ہے خان صاحب کے آنے کی[illegible]"

"انھیں خبر ہو چکی ہے جناب! بس ایک منٹ انتظ[ار] کریں آپ لوگ، وہ آتی ہی ہوں گی۔" اس نے بڑے ہی عا[جزانہ] انداز میں کہا۔

میں اور آسیہ خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے [کے قریب] پر بیٹھ گئے۔ میں بہت غور سے اس شخص کے چہرے کے [تاثرات] کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے آسیہ کو دیکھنے کے بعد اس [کی آنکھوں] میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ آسیہ کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی اس نے پہلے [کبھی دیکھا] تھا اسے۔ ہم لوگوں کے بیٹھنے کے بعد وہ ہنوز عاجزی سے [بولا]۔ "آپ کیا لینا پسند کریں گے، ٹھنڈا یا گرم؟" پھر خود ہی بولا۔ "اس موسم میں کولڈ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"نہ نہ، پُتر! ہمیں بالکل بھی خواہش نہیں ہے کسی چیز کی۔ بس تو بیٹھ جا ادھر تکلف نہ کر ہمارے لیے۔" آبی اکھڑ پنجابی لہ[جے میں بولا]۔

اس کے اس انداز پر اس کے چہرے پر ناگواری کی لکیر ابھری مگر فوراً ہی مٹ گئی۔ اسے ایسے لوگوں سے ڈیل [کرنے] کی بہت اچھی تربیت دی گئی تھی جن سے کچھ ملنے کی توقع ہو۔ [ہم] نے چونکہ اپنی آمد کا مقصد بھی بتایا تھا لہٰذا ہماری کسی بات [پر اس] کی پیشانی شکن آلود ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ آبی جانتا تھا اس طر[ح کے لوگوں] میں سے کسی کی زبان سے گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا[۔] جبھی اس نے جان بوجھ کر اس کے ساتھ ایسا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ آبی کی بات سن کر ہنوز عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تکلف کیسا جناب! یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے معزز لوگ ہمارے گھر تشریف [لائے ہیں۔] کچھ تو خدمت کا موقع دیں آپ ہمیں۔"

"وہ تو ہم دیں گے ہی برخوردار آپ کو۔ ہماری یہاں تش[ریف] آوری کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ کو کچھ موقع فراہم کریں ہم اپنی خد[مت کا]۔ اور اگر آپ نے ہماری بات مان لی، معاملات خوش اسلوبی [سے] طے ہو گئے تو ہم کولڈ کافی بھی ضرور پئیں گے آپ کی۔"

آبی نے اس بار لکھنؤ والوں کو مات دینے کی کوشش کی[۔] اس کی زبان رُکنے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اصل میں وہ اسے باتوں میں الجھا کر وہیں روکے رکھنا چاہتا تھا تاکہ اسے آسیہ [پر شبہ] ہوا بھی ہو تو وہ اپنے شبہے کا اظہار کسی اور سے نہ کر سکے۔ وہ [بولا]۔ "اور ہمیں امید ہے معاملات طے کرنے میں آپ زیادہ حیل حجت [نہیں] کریں گے اس لیے کہ یہ جو ہمارے خان صاحب ہیں نا، یہ ہاش[م خان،] انھیں ایسے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے ہیں جو ہیر پھیر کی باتیں کر کے [رقم] وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انکار تو یہ سننے کے عاد[ی نہیں]

میزبانی کا حق تو نہ چھینیں جناب آپ ہم سے۔" وہ بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے بی بی! آپ اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہ لائیں۔ کسی کا حق چھیننے کا ہم بالکل کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

"بس تو پھر اب آپ انکار نہیں کریں گے۔" وہ بولی۔ پھر جعفری کی طرف منہ کر کے کہا۔ "جاؤ کھانے پینے کے لیے کچھ لاؤ۔"

"ارے بھئی، اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے میاں! تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ، ان دونوں کو واپس تو آ جانے دو۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں کافی لے کر آؤں گا، وہ لوگ بھی آ چکے ہوں گے۔"

جعفری یہ کہتے ہوئے ایک دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آبی کی واپسی سے پہلے جائے یہاں سے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آسیہ کو زرّین کی نظروں سے دور رکھنے کے لیے اسے کار میں بٹھا کر واپس آ جائے گا۔ اور میں جعفری کو اسی لیے روکنا چاہتا تھا کہ وہ آسیہ کو کار میں بیٹھے دیکھ کر چوکنا نہ ہو جائے۔ ابھی میں اسے روکنے کے لیے آواز دینا ہی چاہتا تھا کہ کمرے کے اس دروازے سے جس سے ہم ڈرائنگ روم میں آئے تھے...... آبی، ملازم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ آتے دیکھ کر جعفری خود ہی رُک گیا اور سوالیہ نظروں سے اپنے ملازم کو دیکھنے لگا۔ عین اسی لمحے آسیہ، ملازمہ کا ہاتھ تھامے اس دروازے میں نمودار ہو گئی جس سے جعفری باہر جا رہا تھا۔ آہٹ سن کر جعفری نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے، ارے، یہ آخر چکر کیا ہے بھئی۔ یہ آپ دونوں ہمارے گھریلو ملازمین کو کیوں لے کر آئے ہیں اپنے ساتھ؟"

آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں پریشان یا حیران ہونے کی کیا بات ہے برادر؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہم تم لوگوں سے جو مذاکرات کرنے آئے ہیں، اس گفتگو کے دوران جو کچھ طے پائے گا اس کے گواہ بھی ہونا چاہئیں۔ لہٰذا میں نے سوچا، ان دونوں کو گواہ کے طور پر ساتھ لے چلنا چاہیے۔ کیونکہ ان کی گواہی تمھارے لیے بھی ناقابلِ قبول نہیں ہو گی۔"

زرّین نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں وا کر کے مجھ سے کہا۔ "یہ کیا قصّہ ہے جناب! کیسے مذاکرات کریں گے آپ ہم سے؟"

میں نے نرمی سے کہا۔ "پریشان نہ ہوں بی بی! ہم کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں تم لوگوں کو۔ اگر ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تم لوگ تو میں وعدہ کرتا ہوں تم سے، تمھارا بال بھی بیکا نہیں ہو گا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچے گا تمھیں۔"

آبی نے دونوں ملازمین اور جعفری سے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھے اور سعادت مند بچوں کی طرح اُدھر جا کر بیٹھ جاؤ اور جو کچھ کہا جائے اس پر حرف بحرف عمل کرنے کی کوشش کرو،

نہیں ہیں، کسی بھی معاملے میں — تو اب اگر تم چاہتے ہو میاں صاحبزادے کہ
ہم تمھاری کولڈ کافی ضرور پئیں تو ان باتوں کا خیال رکھنا۔"
"اوہو، اس کی آپ ذرا بھی فکر نہ کریں، ہمارا سابقہ ہمیشہ ایسے ہی
معزز لوگوں سے رہتا ہے چنانچہ ان کے مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ تو
ہمیں بھی ہے۔ ویسے آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ مجھے پہلے سے آگاہ کر
دیا۔ اب میں پورا پورا خیال رکھوں گا۔" وہ شخص سعادت مندی سے بولا۔
عین اسی لمحے کمرے میں جیسے چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ "کس
بات کا خیال رکھنے کو کہہ رہے ہو جعفری؟"
آواز سن کر میں نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ایک سرو قد، چاند سا مکھڑا،
معطر پیرہن میں ملبوس، لب شیریں کو ایک دلکش مسکان سے آراستہ
کیے، چشمِ غزالاں میں ہمیں تول رہا تھا۔ نوجوان جسے اس نے جعفری کہہ کر
مخاطب کیا تھا، جلدی سے اس کے قریب جا کر بولا۔ "آیئے مس زرّین!
ان سے ملیں، یہ جناب ہاشم خان صاحب ہیں۔ شہر کے بڑے اور معزز لوگوں
میں سے ہیں اور ہماری عزت بڑھانا چاہتے ہیں۔"
زرّین نے ایک ادائے ناز سے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا
اور آ کر میرے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "زہے نصیب!
آپ جیسے لوگوں نے اس لونڈی کو اس قابل سمجھا۔ فرمایئے، میں آپ کی
کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

میں نے محسوس کیا، اس دوران اس کی نظریں کئی بار آسیہ کی طرف اٹھی تھیں۔ مجھے گمان گزرا کہ وہ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ آبی نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور آسیہ کو مخاطب کر کے بولا۔ "ارے بی بی! ذرا اٹھ تو جلدی سے، میرے ساتھ کار تک چل، وہ اہم چیز تو میں کار میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

آبی کی اس اچانک حرکت پر آسیہ الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ آبی آخر باہر کیوں لے جانا چاہتا ہے اسے۔ جب کہ میں جان گیا تھا کہ کس طرح وہ آسیہ کو زرّین کی نظروں سے دور کر دینا چاہتا تھا تاکہ اگر اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہونے لگی ہے تو وہ فوری طور پر یاد نہ آ سکے اس کو۔ میں نے آسیہ کو متذبذب دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "سوچ کیا رہی ہو، جاؤ جلدی سے اس کے ساتھ۔" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی پشت تھپک کر اٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔

آبی اسے ساتھ لے کر تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد زرّین نے جعفری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے جعفری! تم نے خان صاحب کو ایسے ہی بٹھا رکھا ہے اب تک۔ کوئی خاطر تواضع نہیں کی؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہ، نہ۔ بی بی! انھیں کچھ نہ کہیں آپ، ہم نے خود ہی منع کر دیا تھا انھیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔"
"یہ تو آپ نے زیادتی کی ہے خان صاحب! ہمارے ساتھ۔

ورنہ یقین کرو ہم اتنے اچھے لوگ ہیں نہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں۔"

آبی کے انداز نے زرّین کو مشتعل کر دیا۔ وہ ایک دم بھڑکی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔"میں پوچھتی ہوں کون لوگ ہیں آپ اور کیا چاہتے ہیں ہم سے؟ یہ سب کیا تماشا ہے آخر؟"

میں نے کہا۔"غصّہ نہ کرو بی بی! میں نے کہا ہے نا، ہم سے تعاون کرنے کی صورت میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بیٹھ جاؤ اپنی جگہ پر۔"

"نہیں، پہلے اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔ یہ خیال رکھنا کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں فون کرکے پولیس کو بلا لوں گی۔"

آبی نے جعفری سے کہا۔"دیکھ بھئی جوان! اپنی اس بلبلِ شیریں دہن کو کہنا کچھ دیر کے لیے چہکنا بند کر دے اور بات سن لے ہماری، پولیس ولیس کی دھمکی ہمیں نہ دے۔ ہمارے ہاتھوں کی لمبائی کا اندازہ نہیں ہے ابھی اسے۔"

"یہ تو آپ لوگ بڑی زیادتی کر رہے ہیں ہمارے ساتھ۔ ہمارے ہی گھر میں بیٹھ کر حکم چلا رہے ہیں ہم پر۔" جعفری بولا۔

آبی نے آگے بڑھ کر ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔"بک بک نہ کر اوئے۔ چپ چاپ بیٹھ جا ادھر جا کر۔"

زرّین آبی کی اس حرکت پر بھڑکی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی طرف کھلے ہوئے ایک دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ "ٹھہرو میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں، میں یہ غنڈہ گردی برداشت نہیں کر سکتی اپنے گھر میں۔ تم لوگوں نے سمجھا کیا ہے مجھے؟"

آبی نے جلدی سے اپنی جیب سے پستول نکالا اور لپک کر اس کا راستہ روکتے ہوئے پستول اس کے سامنے کرکے بولا۔"دیکھ رہی ہو یہ کیا ہے، پہچانتی ہو نا اسے؟ اصلی ہے بالکل اور گولی اگلتے وقت آواز ذرا سی بھی نہیں کرتا ہے یہ۔ یہ جو ہاشم خان ہے نا اس کی اسی خوبی کی بنا پر چپ شاہ کہتا ہے اسے۔ ادھر جا کر چپ چاپ بیٹھ جاؤ اگر اپنی اس زندگی سے عاجز نہیں آگئی ہو تو۔"

پستول دیکھتے ہی وہ خوف زدہ ہو کر سہم گئی، اس کے گلنار چہرے پر ایک دم زردی کھنڈ گئی تھی۔ اس نے عجیب سی بے بسی کے ساتھ آبی کو دیکھا اور کوئی لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر بوجھل قدموں سے واپس آکر صوفے پر گر سی پڑی۔

"یہ اچھی دھونس دھاندلی ہے۔ کہہ تو یہ رہے ہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے ہمیں اور ساتھ پستول نکال کر دھمکا بھی رہے ہیں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ آخر آپ لوگ بتاتے کیوں نہیں کیوں آئے ہیں یہاں اور یہ کہ ہیں کون آپ لوگ؟" جعفری رو دینے والے انداز میں بولا۔

"سب تعریفیں اور توصیف تو اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے جو مالک ہے کُل جہانوں کا۔ بہر حال تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جو مخاطب ہوں تم سے ایس جی ایم ایم پیرزادہ ... مختصر سے نام سے پہچانا جاتا ہوں اور یہ مردِ قلندر جو تمھارے ... بیٹھا ہوا ہے اس کا نام اس کے برتھ سرٹیفکیٹ میں ہاشم خان ... درج ہے۔ اور یہ بی بی جو ہمارے ساتھ ہے یہ ایک مظلوم ... آفت گزیدہ، دکھیاری، ممتا کی ماری خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ... ہونے والی زیادتیوں کی داستان بڑی المناک ہے۔ تم سنو ... تو کلیجہ تمھارا پھٹ جائے گا۔ خون کے آنسو رونے لگو گے اور ... خاک ڈال کر ویرانوں کی خاک چھاننے نکل پڑو گے۔ بس یوں ... اس کی داستانِ الم سن کر اسے زمانے سے انصاف دلانے ... نکلے ہیں اور تم سے بھی اس سلسلے میں تعاون چاہتے ہیں۔" آبی ... بڑے ہی رقت آمیز انداز میں انہیں بتایا۔

اس کا یہ انداز اور لمبی چوڑی تقریر زرّین کے دل پر اثر کر گئی ... ترحم آمیز نظروں سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بو... "کیا ظلم ہوتے ہیں بہن تم پر اور اس سلسلے میں ہم سے کیا چاہتی ہو ... ویسے عورت کی ذات تو ہر زمانے میں ستم کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ تم ... ہمت سے کام لینا چاہیے۔ عورت سدا کی مظلوم ہے۔ ازل سے ... ظلم سہتی چلی آرہی ہے۔ تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ دو مرد تمھار... دادرسی کر رہے ہیں۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو زرّین خانم تم۔ دنیا کی سب ... پہلی مظلوم عورت اماں حوّا تھیں جو باوا آدم کو جنت سے نکا... کا سبب بنی تھیں۔ بس اسی دن سے عورت پر ظلم ہو رہا ہے ... اسے محض اس لیے ستم کا نشانہ بناتے ہوتے ہے کہ اس کی و... ہمیں جنت کی پُرسکون زندگی سے محروم ہونا پڑا۔ اور ایسی آرام د... ہر غم سے آزاد زندگی کو چھوڑ کر اس خرابے میں آنا پڑا جہاں ہر ... دوسرے کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔"

"فضول بکواس نہیں مسٹر مرغابی! کام کی بات کر سکتے ہو تو ... نہیں تو خاموش ہو جاؤ۔ کسی دوسرے کو بات کرنے دو۔" میں ... آبی کی بات کاٹ کر کہا۔

آبی نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہو... "ٹھیک ہے۔ اب نہیں بولوں گا بالکل بھی، تم ہی بکتے رہو جو ...

زرّین کی ملازمہ آسیہ کو قہر بھری نظروں سے دیکھتے ... بولی۔"اس بی بی کو بھی میں جانتی ہوں مالکن۔ اس کے ساتھ بہت ... ہے جی۔ بہت دکھیاری ہے بے چاری۔ ان لوگوں نے اس کا بچہ ... ہے بے چاری اپنے بچّے کے واسطے دیوانی ہوئی پھرتی ہے۔"

"اچھا تم بھی جانتی ہو اسے ماسی! کن لوگوں نے چھینا ... بچہ اور تمھیں کیسے معلوم ہوا یہ؟" زرّین نے چونک کر پوچھا۔

"آپ نے پہچانا نہیں بی بی اسے۔ یہ وہی تو ہے جس ...

والے شاہ جی نے چوری کا الزام لگا کر پولیس کو پکڑوا دیا تھا۔ ان کے گھر میں جو بچہ ہے، وہ اسی کا تو ہے۔ کیسا اندھیر ہے، کیا زمانہ آگیا ہے۔ اس غریب کا بچہ بھی نہیں دیتے اور اُلٹا چوری کا الزام لگا کے پکڑوا دیا بے چاری کو۔"

"اچھا تو یہ ہے وہ!" زرّین نے حیرانی سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔"مجھے بتایا تھا ماسی نے تمھارے بارے میں۔ بہت دکھ ہوا ہے یہ جان کر کہ ان لوگوں نے ایسی زیادتی کی ہے تمھارے ساتھ۔ تمھارے شوہر نے کچھ نہیں کیا اس سلسلے میں، تم اکیلی ہی دھکے کھاتی پھر رہی ہو بچے کے لیے۔"

شوہر کے ذکر پر آسیہ نے چونک کر زرّین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھلکنے لگی تھی اور غصّے سے چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ آبی نے جلدی سے کہا۔"اصل بات تو یہی ہے جی! شوہر ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ اس کے مرنے کے بعد ہی تو ظلم کا نشانہ بنی ہے یہ۔"

"چہ... چہ... چہ۔" زرّین تاسف سے بولی۔"عورت کے سر پر مرد کا سایہ نہ رہے تو اپنے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں اس سے۔ مجھے پوری پوری ہمدردی ہے تم سے۔ تم بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں تمھارے لیے؟ جو کچھ میرے بس میں ہے اس سے انکار نہیں کروں گی۔"

"دیکھیں بی بی! ہم ایسا بڑا کام لینا نہیں چاہتے ہیں آپ سے جسے آپ کر نہ سکیں۔ ہم صرف آپ کے اس پُرسکون گھر میں چند گھنٹے گزارنا چاہتے ہیں۔ صرف اتنی دیر جتنی دیر غلام مرتضیٰ شاہ اور اس کے گھر کے لوگوں کو خوابِ غفلت میں جانے میں لگے گی۔ ان کے گھر میں سناٹا طاری ہوتے ہی ہم آپ کے مکان کی چھت کے ذریعے اس کے گھر میں جائیں گے اور بچے کو لے کر اسی راستے سے واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد ایک لمحہ بھی رُکنے کی کوشش کریں تو دھکے دے کر نکال دینا آپ لوگ ہم سب کو۔" میں نے انھیں سمجھایا۔

"ہمارے مکان کی چھت سے ہو کر شاہ جی کے گھر میں داخل ہوں گے آپ!" زرّین نے حیرانی سے کہا۔"یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔ ان کے احاطے میں کتّے پھرتے رہتے ہیں رات بھر۔ اور سنا ہے آج کل تو گیٹ پر پولیس والے بھی ہوتے ہیں۔"

"اس کی تم بالکل فکر نہ کرو، یہ سب ہمارا دردِ سر ہے اور یہ بھی اطمینان رکھو کسی کو ذرا سا شبہ بھی نہیں ہو سکے گا کہ ہم کس طرف سے آئے اور کدھر چلے گئے۔ ہماری وجہ سے آپ لوگوں پر ذرا بھی آنچ نہیں آسکے گی۔ یہ وعدہ ہے میرا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب تک چاہیں یہاں بیٹھیں اور جب اپنا کام کرکے جانے لگیں تو چاچا جی کو اٹھا کر بتا دیں ___ یہ گیٹ اور لائٹیں وغیرہ بند کر دیں گے۔" زرّین نے اپنے ملازم کی طرف اشارہ کرکے کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ پھر میری طرف مڑ کر بولی۔"چائے وغیرہ کی ضرورت ہو اس دوران تو ماسی کو بتا دیں تکلف نہ کریں۔"

اس کے جاتے ہی جعفری، ماسی اور چاچا جی بھی چلے گئے۔ آبی سب کے جانے کے بعد میرے پاس آبیٹھا اور مدھم آواز میں پوچھنے لگا۔"تیرا کیا خیال ہے جیلانی! کیا سچ مچ وہ ہم سے تعاون کرنے پر تیار ہو گئی یا محض میرے پستول کے خوف سے یہ بات کہہ دی۔"

"زرّین کے لہجے میں تو مجھے ذرا بھی کھوٹ محسوس نہیں ہوا ہے مگر اس جعفری کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بھی اس کی باتوں سے متفق ہے یا نہیں۔ اس دوران وہ بالکل گم صُم ہی کھڑا رہا تھا۔ کسی طرح اس کے بارے میں پتا کرو آبی!" میں نے کہا۔

"آپ لوگ بیٹھیں ادھر ہی۔ میں ماسی سے بات کرکے آتی ہوں۔ شاید وہ کچھ معلوم کرکے بتا سکے اس کے بارے میں۔" آسیہ نے کہا۔

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تو آبی بولا۔"آدمی مجھے یہ چاچا جی بھی بہت گھنّا معلوم ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔"مگر اس کی طرف سے زیادہ خطرہ نہیں ہے ہمیں۔ آسیہ نے بتایا تھا کہ ماسی کی حمایت وہ حاصل کر چکی ہے پہلے ہی اور اس کے شوہر نے بھی اس کی مدد کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ مگر آدمی کا بھروسہ کچھ نہیں ہے آبی! کاغذ کے چند ٹکڑوں کی خاطر یہ اپنی وفاداریاں چند لمحوں میں تبدیل کر لیتا ہے، وعدے وعید سب بھول جاتا ہے یہ۔ وعدوں پر مر مٹنے والے لوگ اب نہیں رہے دنیا میں۔"

"یہ تو نے بالکل سچ کہا ہے جیلانی! ہمیں آنکھیں بند کرکے نہیں بیٹھ جانا چاہیے ادھر۔ ان دونوں کی طرف سے بہت ہی چوکنّا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کسی بہت تاریک گپھا میں اتار دیں یہ ہمیں بے خبری میں۔" آبی نے فکرمندی سے کہا۔

"آیار! ذرا باہر چل کر دیکھتے ہیں، یہ لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں اس سمے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

آبی بھی فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں اس دروازے کی طرف بڑھنے لگے جس سے گزر کر زرّین اور جعفری گئے تھے۔ وہ دروازہ جس کمرے میں کھلتا تھا وہاں ایک چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ ٹیبل کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک فریج رکھا تھا اور دوسری جانب کی دیوار کے ساتھ شیشے کا بڑا سا شوکیس دھرا تھا جس میں کراکری سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ یہ ان لوگوں کا ڈائننگ روم تھا۔ اس دروازے کے سوا جس سے گزر کر ہم وہاں پہنچے تھے، دو دروازے اور بھی تھے اس کمرے کے۔ دونوں دروازوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور ایک پردے کے پیچھے سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ زرّین اور جعفری اسی کمرے میں تھے۔

اور شاید ہمارے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے کیونکہ اس کے سوا ان دونوں کے لیے کوئی اور موضوع اتنا اہم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے آبی کا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کے ساتھ جا ٹھہرے۔ اندر سے آنے والی آوازیں بالکل صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک ہی تھا۔ ان دونوں کا موضوعِ گفتگو ہماری ذات ہی تھی۔

جعفری اپنی آواز کو دبا کر اس طرح بول رہا تھا کہ وہ زیادہ دور تک نہ جا سکے۔ وہ کہہ رہا تھا: "میری سمجھ میں ایک بات آج تک نہیں آسکی ہے زرین! آخر تم کسی عورت کی مظلومیت کی داستان سن کر ایک دم موم کیوں ہو جاتی ہو؟"

"اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہی ہوں کہ انھیں ذرا سی رعایت دے دینے سے ہمارا نقصان کیا ہو جائے گا آخر؟" زرین بولی۔

"تم نقصان کی بات کر رہی ہو، اگر شاہ جی کو شبہ بھی ہو گیا نا کسی وقت کہ ہم نے انھیں اپنے گھر سے راستہ دیا تھا اس کی طرف جانے کے لیے تو یاد رکھو ہمیں اپنے نقصان پر ماتم کرنے کا بھی موقع نہیں مل سکے گا، سمجھیں؟ تم جانتی نہیں ہو اسے ابھی۔"

"تو تم کیا چاہتے ہو کیا نکال دوں میں انہیں اپنے گھر سے؟ مگر وہ آسانی سے جانے والے لگتے نہیں ہیں مجھے۔ پستول ساتھ لیے پھر رہے ہیں وہ، اس کے زور پر ہمیں مجبور کر کے زبردستی بھی اپنے مقصد کی تکمیل تک رُک سکتے ہیں۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں ان کا؟" زرین نے کہا۔

"ہم خود تو کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن فون کر کے پولیس کو خبر دیں یا شاہ جی کو ساری بات بتا دیں تو وہ ضرور کوئی بندوبست کر سکتے ہیں ان کا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں زرین! تم جانتی نہیں ہو، پولیس تو ایک عرصے سے تلاش کر رہی ہے انھیں۔" جعفری بولا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے جعفری کہ تم نے جن کے بارے میں پڑھا تھا اخبار میں، یہ وہ لوگ نہ ہوں۔ اخبار نے صرف شبہے کا ہی اظہار کیا تھا، یقین سے نہیں لکھا تھا کہ یہ وہی ہیں۔ تم خواہ مخواہ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر لینا۔" اس نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے کہ اخبار نے شبہ ظاہر کیا تھا مگر وہ یقین کی حد تک تھا اور پھر جس طرح اس نے تمہارا راستہ روک کر پستول نکالا تھا تم پر اور دھمکایا تھا تمھیں، یہ طریقہ، یہ انداز شریفانہ تو ہرگز نہیں تھا۔ تم کچھ بھی کہتی رہو زرین، میں فون کرنے جا رہا ہوں شاہ جی کو۔"

"جو تمہارا دل چاہے کرو لیکن یہ یاد رکھنا کہ نتائج کے تم خود ذمّے دار ہو گے۔ اگر تمھارے کہنے کے مطابق وہ وہی لوگ ہیں جن کا تم کو گمان ہے، تب تو اور بھی زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے ہمیں۔ ان کے خلاف کسی کارروائی میں، مَیں شریک نہیں ہو سکتی۔ مجھے تو وہ عورت بہت ہی مظلوم لگتی ہے۔ شاہ جی نے اس کا بچّہ چھین کر ظلم کیا ہے۔ [illegible] پر، مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔" زرین تلخی سے بولی۔

"تم ہمدردی کرتی رہو اس سے، میں تو شاہ جی کو مطلع کرنے [illegible] رہا ہوں۔ میں اپنے بنگلے سے ان کے خلاف کسی کارروائی کی اجازت [illegible] دے سکتا۔"

میں نے آبی کو دیکھا۔ وہ سرگوشی میں بولا: "بہت ہی گیگرا [illegible] یار یہ تو۔ ٹھہر جا میں کرتا ہوں ابھی اس کا بندوبست۔"

اس نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور تیزی سے پردہ [illegible] ان کے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی اندر چلا گیا۔ [illegible] ہی بروقت وہاں پہنچے تھے۔ اگر ذرا بھی غفلت ہو جاتی ہم سے [illegible] پر بھروسہ کر کے بیٹھے رہتے تو اس ابنِ رذیل نے ہمیں پھنسا دیا ہوتا [illegible] طرح سے۔ وہ ٹیلی فون گود میں رکھے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ آبی نے اندر گھستے ہی للکار کر کہا: "اسے الگ رکھ دے کُتّے کی نسل کے [illegible] سمجھا کیا ہے ہمیں؟ ہم شکل سے ایسے ہی اُلّو کے پٹھے لگتے ہیں [illegible] کی زبان پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے۔"

آبی کی آواز سن کر وہ ایک دم یوں اُچھل کر کھڑا ہوا تھا جیسے اچانک بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈ گئی تھی۔ آنکھیں اور منہ حیرت سے کُھلے کے کُھلے رہ گئے [illegible] اس نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں کہنا چاہا: "و... و... وہ... آپ کو...!"

اس کی زبان بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی اور کسی طرح اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ آبی نے ڈپٹ کر کہا: "کُتّے کے بچّے تو شاہ جی کو ٹیلیفون کر رہا تھا نا؟ اسے بتانا چاہتا تھا ہمارے بارے میں کیوں؟ کیا ہے وہ تیرا جس سے اتنی ہمدردی رکھتا ہے تو؟"

"نہ... نہ... نہیں جناب! کچھ... کچھ... غا... غا... فہمی... ہوئی ہے... آ... آ... آپ...!"

"بک نہیں کُتّے! ہم کافی دیر سے باتیں سُن رہے ہیں تم دونوں [illegible]" آبی نے غضب ناک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کے ایک ہاتھ [illegible] کر دیا اس کے۔ "تیرے جیسے کتّوں کو سدھانا خوب آتا ہے [illegible] تیرے گلے میں اب پٹّہ ڈال کر رکھوں گا تاکہ ہماری مرضی کے خلاف کہیں جا نہ سکے تو۔" اس نے جعفری کا گریبان پکڑ کے کھینچ کر میرے [illegible] لاتے ہوئے کہا۔

اس نے جعفری کو کھینچتے ہوئے لا کر میرے قدموں میں [illegible] دیا۔ جعفری جو ابھی چند ہی لمحے پہلے بڑی روانی سے ہمارے [illegible] بکواس کر رہا تھا، اب دونوں ہاتھ جوڑ کر رحم طلب نظروں [illegible] دیکھتے ہوئے گھگھیا رہا تھا۔ میں نے آبی سے کہا: "نہیں یار [illegible] تشدد نہ کرو۔ ہم یہاں انھیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے نہیں [illegible]

ہیں۔ ہم نے شریفانہ طریقے سے تعاون کی درخواست کی تھی ان سے۔ اب اگر یہ ہماری بات ماننے کو تیار نہیں ہیں تو یہ ان کی مرضی ہے۔ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں یہاں، اسے تو بہرحال حاصل کر کے ہی جائیں گے لیکن زبردستی بھی بس اتنی ہی کرو جس سے ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ مارنے پیٹنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتا ہے یار تو؟ میں تو اس کی کھال اتار دوں گا۔ اس نے دھوکا کیا ہے ہمارے ساتھ۔" آبی غصّے سے پھنکارتے ہوئے بولا۔

"نہیں یار! یہ بات غلط کہہ رہا ہے تو۔ اس نے کوئی دھوکا، فریب نہیں کیا ہے ہمارے ساتھ۔" میں نے جواب دیا۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے بھئی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے بعد بھی تسلیم نہیں کر رہا ہے تو؟"

"دماغ تیرا کام نہیں کر رہا ہے آبی! ہم نے جو کچھ دیکھا اور سُنا ہے اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ اس نے دھوکا کیا ہے ہمارے ساتھ؟"

"اچھا یہ لوگ اُدھر سے تعاون کا وعدہ نہیں کر کے آئے تھے ہم سے؟ اور یہاں یہ جو کچھ کر رہا تھا اس وعدے کے خلاف نہیں تھا وہ؟"

"تعاون کا وعدہ اس نے کب کیا تھا ہم سے؟ وہ مس زرین کا وعدہ تھا۔ یہ تو ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اس سلسلے میں، مس زرین اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہے۔ تو نے سنا نہیں تھا یہ روک رہی تھی اسے ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے۔ اس کے کچھ نہ کہنے کی بنا پر ہی تو ہمیں شک گزرا تھا کہ اسے زرین کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہم آئے بھی تھے یہاں تک۔" میں نے اسے بتایا۔

آبی نے بے بسی سے کندھے جھٹک کر کہا: "ایک تو یار تجھے یہ دلیلیں دینے کی بہت بُری عادت پڑ گئی ہے، وکالت کرنے لگتا ہے ہر ایک کی۔"

میں نے ہنس کر کہا: "غصّہ نہ کر یار! آدمی کو کوشش یہی کرنا چاہیے کہ دنیا سے جب جائے تو اس کے کاندھوں پر گناہوں کا بوجھ کم سے کم ہو۔ ہم نے یار! اپنا اعمال نامہ سارے کا سارا سیاہ کر ڈالا ہے، اب اس پر مزید سیاہی پھیرنے کی گنجائش ہی کب رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تو اب تو اپنے اعمال نامے کی سیاہی دھو تا رہ یہاں بیٹھ کر، میں جا رہا ہوں یہاں سے۔" وہ پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔

زرین اور جعفری حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے بعد زرین بولی: "عجیب آدمی ہو تم۔ قتل و غارت گری جیسے سنگین جرائم میں ملوث ہوتے ہوئے بھی ظلم و زیادتی سے اجتناب کرتے ہو۔ گناہوں کی دلدل میں اترنے کے بعد بھی اپنے دامن کو گناہوں کی آلودگی سے بچائے رکھنا چاہتے ہو۔ یہ تو بالکل خلاف ہے تمھارے پیشے اور تمھاری عادتوں کے۔"

"نہ تو یہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری میرا پیشہ ہے اور نہ ہی لوگوں کی زندگیاں چھیننا، ہنستے مسکراتے گھر اجاڑنا عادت ہے میری۔ کبھی کبھی مجبوریاں آدمی کو ایسی راہ پر ڈال دیتی ہیں جو کسی طرح بھی اس کی پسندیدہ راہ نہیں ہوتی۔ وہ اس راہ پر ایک قدم بھی آگے بڑھانے کو تیار نہیں ہوتا مگر حالات اور وقت اسے دھکیل دھکیل کر آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور پھر لوگ اسے عادت اور پیشہ سمجھنے لگتے ہیں اس شخص کا۔"

"تو کیا تم وہ نہیں ہو جو میں نے سمجھا ہے تمھیں، یا جو اخبارات نے بیان کیا ہے؟" جعفری حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں جانتا تم کیا سمجھتے رہے ہو مجھے اور اخبارات کیا بیان کرتے رہے ہیں میرے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جو عورت ہے آپ کے ساتھ، یہ وہی آسیہ ہے نا، غلام جیلانی کی بہن جس نے بڑے سنگین جرائم کیے ہیں؟" جعفری نے پوچھا۔

"ہے تو یہ وہی آسیہ، مگر جو جرائم اس سے منسوب ہیں وہ اس نے خود نہیں کیے، مجبور کر کے کرائے گئے ہیں اس سے۔"

"اور غلام جیلانی آپ دونوں حضرات میں سے کون ہے؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"میں... میں ہوں غلام جیلانی۔ وہ شخص جس سے لوگ زندہ رہنے کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

عین اسی لمحے آسیہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی اور گھبرائے ہوئے انداز میں بولی: "جلدی سے یہاں سے بھاگ چلیں بھائی جان! غلام مرتضٰی شاہ کے آدمی پولیس کے ساتھ اس مکان کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں ہمارے بارے میں پتا چل گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ کس نے خبر کی ہے اسے؟ کیسے پتا چلا اسے ہماری موجودگی کا؟" میں نے متعجب ہو کر اس سے پوچھا۔

"وہ کمینہ چاچا جو ہے نا، وہ غلام مرتضٰی شاہ کا آدمی ہے۔ اسی نے فون کر کے بتایا ہے اسے۔ میں نے اسے فون پر بات کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا مگر تھوڑی سی دیر ہو گئی مجھے۔ وہ سب کچھ بتا چکا تھا اس غلام مرتضٰی شاہ کو۔" آسیہ نے بتایا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چلو جلدی نکلو یہاں سے۔ وہ آبی کہاں ہے؟" میں نے تیزی سے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

"وہ اُدھر مشکیں کس رہا ہے اس مخبر کی اولاد کی۔ آپ گاڑی کی طرف چلیں، وہ وہیں آ جائے گا۔" آسیہ نے میرے ساتھ

دوڑتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں بھاگتے ہوئے کار کے قریب جا پہنچے۔ میں نے جلدی سے کار کے اندر گھستے ہوئے اسٹیئرنگ ویل سنبھالا اور کار کو اسٹارٹ کر دیا۔ اسی وقت میں نے بنگلے کے اندرونی گیٹ کو کھلتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ کھولنے والا آبی تھا۔ اس نے چاچا کو باندھنے کے بعد مجھے اور آسیہ کو کار کی طرف دوڑ لگاتے دیکھ لیا تھا اور فوراً ہی جا کر ہمارے لیے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں کار کو ریورس گیئر میں ڈال کر تیزی سے کھلے ہوئے گیٹ سے گزار لے گیا۔ باہر نکل کر جتنی دیر مجھے کار کو سیدھی راہ پر ڈالنے میں لگی، اتنی دیر میں آبی بھی کار میں آ بیٹھا۔ کار کو سیدھا کرتے ہی میں نے سامنے سے آتی ہوئی اس جیپ کو دیکھ لیا تھا جس میں بہت سے خوفناک شکلوں والے لوگ ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے کھڑے تھے۔ میں نے انھیں دیکھتے ہی ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر اس بٹن پر انگلی رکھ لی جسے دبانے سے میری گاڑی پر کھڑا ہوا باز گولیاں اگلنے لگتا تھا اور کار کو مناسب رفتار سے آگے بڑھا دیا۔ سامنے سے آنے والوں نے بھی میری کار کو دیکھ لیا تھا اور انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ کار کس بنگلے سے نکلی ہے۔ لہٰذا انھوں نے قریب آتے ہی جیپ کو سڑک کے درمیان آڑا کر کے روک دیا۔ اور اس میں سوار رائفل بردار اپنی اپنی رائفلیں سیدھی کر کے جیپ سے نیچے کود کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ انداز ان کا ایسا تھا کہ اگر میں نے کار کو نہیں روکا تو وہ بے دریغ فائرنگ کر کے جیپ سمیت ہم تینوں کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ جیپ کا ڈرائیور اور ایک اور شخص جیپ میں ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔ شاید انھیں یہ یقین تھا کہ وہ آٹھ آدمی ہمیں باندھ لینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن میں نے جیسے ہی کار ان کے قریب کوئی پانچ گز کے فاصلے پر روکی، سڑک کے درمیان کھڑے ہوئے آٹھ آدمیوں میں سے چار لہرا کر نیچے گر پڑے۔ ان میں تین کے سینے اور پیٹ سے خون اُبلنے لگا تھا۔ اور ایک کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ گرنے والوں کے بقیہ ساتھی ابھی یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ اچانک اور دبے پاؤں آنے والی موت آئی کس سمت سے ہے کہ جیپ کا ڈرائیور اور نیچے کھڑے ہوئے دو اور آدمی زمین پر لوٹنے لگے۔ اس اچانک افتاد سے وہ لوگ بُری طرح بوکھلا اٹھے تھے۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے دوسرے شخص نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ وہ اسٹیئرنگ پر اوندھے ہوئے ڈرائیور کو نیچے دھکیل کر اس کی جگہ بیٹھا اور بہت ہی عجلت کے ساتھ جیپ کا رُخ واپسی کے لیے موڑ کر اسے دوڑا دیا۔ بچ جانے والے دونوں افراد بھی جیپ کو موڑنے کے دوران ہی اچھل اچھل کر جیپ میں سوار ہو گئے تھے۔ میں اگر چاہتا تو ان میں سے کسی ایک کو بھی بچ کر نہیں جانے دیتا لیکن میں نے انھیں ہوتے دیکھ کر بٹن پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ اب میں بلاوجہ کسی کی جان لینا پسند نہیں کرتا تھا۔

انھیں یوں دُم دبا کر بھاگتے دیکھ کر آبی اور آسیہ قہقہے لگانے لگے تھے۔ آبی بولا ”اوئے یہ تو گیدڑ نکلے یار جیلانی! انھوں نے تو ایک گولی بھی چلانے کی ضرورت نہیں سمجھی، ایسے ہی بھری ہوئی رائفلیں لے کر واپس دوڑ پڑے ہیں۔ جیسے بس اتنے ہی کام کے لیے...“

”اوئے زیادہ اونچا نہ بول بیٹے! شکر ادا کر اس رب کا جس نے شرافت علی جیسا دوست عطا کر دیا ہے ہمیں۔ اگر یہ کار نہ ہوتی ہمارے پاس تو وہ تجھے یوں قہقہے لگانے کے لیے چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے، ایسے بھی گیدڑ نہیں تھے وہ۔“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار! یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ واقعی یہ غلطی ہو گئی ہے اس وقت مجھ سے۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے گالوں کو...

میں نے کار کو آگے بڑھا کر سڑک پر پڑی ہوئی بے جان اور نیم جاں لاشوں کے پاس روکتے ہوئے آبی سے کہا ”انھیں بیچ سے ہٹا کر ایک طرف کر دے یار! مرنے کے بعد بھی راستہ نہیں دے رہے ہیں یہ تو ہمیں گزرنے کے لیے۔“

آبی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولا ”دُر فٹے منہ۔ یہ جمعداروں والا کام میرے حصے میں آیا ہے اب۔“ اس نے قریب جا کر دو دو آدمیوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر نہایت بے دردی کے ساتھ گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ آخری لاش کو سڑک سے ہٹا کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ عقبی منظر دکھانے والے آئینے کی چمک میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا کسی گاڑی کی دو ہیڈ لیمپس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے آبی کو آواز دے کر کہا ”آبی، جلدی کر، واپس آ جا! شاید پیچھے سے ان کے دوسرے ساتھی آ رہے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے کار کو آگے بڑھا دیا۔ آبی بہت ہی تیزی کے ساتھ میرے برابر والی نشست کا دروازہ کھول کر اندر گھس آیا۔ میں نے اس کے اندر آتے ہی کار کی رفتار بڑھا دی۔ اگلا موڑ مڑتے ہی میں نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا جدھر دوسری کار تھی۔ وہ کار ہمارے پیچھے آنے کے بجائے اب ایک جگہ رکی ہوئی تھی۔ وہ شاید سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر وہاں رک گئے تھے۔ آبی بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا ”ایسا لگتا ہے، پیچھے آنے والی کار میں یا تو ادھر سے گزرنے والا کوئی راہ گیر ہے یا پولیس موجود ہے اس میں۔“

”کیوں؟ یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے؟“ میں نے سامنے پر نظریں جماتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وہ لوگ ان لاشوں کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، اگر وہ بھی جیپ میں سامنے سے آنے والوں کی طرح غلام مرتضیٰ شاہ کے ہی بندے ہوتے تو وہاں رک کر ہمیں نکل جانے کا موقع دینے کے بجائے سیدھے ہمارے پیچھے ہی آتے وہ۔“ آبی بولا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا ”وہ فیروز وغیرہ کو بھی تو یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا آبی! وہ دکھائی تو نہیں دے رہے ہیں کہیں۔“

”ہاں، طے تو یہی ہوا تھا ان لوگوں سے۔ ہو سکتا ہے، وہ اس جیپ کے پیچھے لگ گئے ہوں۔“ آبی سوچتے ہوئے بولا۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے بھائی جان! اس پیچھے آنے والی کار میں وہی لوگ ہوں۔“ آسیہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہاں، یار جیلانی! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے آسیہ! اس طرف تو دھیان ہی نہیں گیا تھا ہمارا۔“ آبی نے فوراً آسیہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

ہم ایک چوراہے کے قریب پہنچے جس کے درمیان ایک چھوٹا سا گول پارک بھی بنا ہوا تھا۔ ایسے پارک میں نے کراچی کے اکثر چوراہوں پر بنے دیکھے ہیں۔ ادھر سے گزرنے والی گاڑیوں کو اس پارک کے گرد ایک لمبا چکر لگا کر گزرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے یہ امکان نہیں رہتا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی گاڑی آ کر ہم سے ٹکرا جائے گی۔ میں نے یہاں پہنچتے ہی دائیں جانب سے پولیس کی کئی گاڑیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنی کار کو بائیں طرف موڑ دیا۔ میں سمجھا تھا، وہ ہمارے بارے میں اطلاع پا کر آئے ہیں اور سامنا ہوتے ہی ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پولیس کی گاڑیاں ہمیں نظرانداز کر کے اسی سڑک پر مڑ گئی تھیں جدھر سے ہم آ رہے تھے۔ اس میں تو شک نہیں کہ وہ آئے ہمارے ہی لیے تھے لیکن شاید انھیں یہ گمان بھی نہیں ہوا ہو گا کہ ہم کسی ایسی قیمتی اور شاندار قسم کی کار میں ہو سکتے ہیں۔ ایسی بڑی اور عمدہ قسم کی کاروں کی طرف عام طور پر اس وقت تک پولیس والے نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرتے جب تک انھیں یہ پختہ یقین نہ ہو کہ یہ کار حقیقتاً کسی غیرقانونی کام کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی کاروں میں ایسے ہی بااثر اور صاحبِ حیثیت لوگ ہوتے ہیں جنھیں محض شبہے میں روک لینے کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ اس وقت مجھے یہ پتا چلا کہ شرافت علی نے اس کام کے لیے اتنی قیمتی کاریں کیوں تیار کرائی ہیں۔

ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر پتا نہیں کن کن سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے سبزی منڈی کی طرف جا نکلے۔ وہاں سے میں نے اپنی کار نیشنل اسٹیڈیم کی طرف موڑ لی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ اس سڑک پر آمد و رفت اِکّا دُکّا ہی تھی اس وقت نیشنل اسٹیڈیم کے برابر سے گزرتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو دیکھا۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے آپس میں کچھ تکرار کر رہے تھے۔ ہماری کار کی ہیڈ لیمپس کی روشنی ان پر پڑی تو وہ دونوں چونک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے ہماری کار کی طرف اشارہ کر کے دوسرے سے کچھ کہا۔ جواب میں اس نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ اس اثنا میں کار ان کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی لیکن وہ کار کے سامنے سے ہٹنے کے بجائے دونوں ہاتھ اٹھا کر کار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے اور مجھے کار روکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ اپنے حُلیے سے وہ کوئی مزدور پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ سروں پر انھوں نے بڑے بڑے پگڑ باندھ رکھے تھے اور ان کے قریب ہی سڑک پر بڑے بڑے چھابے پڑے تھے۔ قد کاٹھ کے بھی بس واجبی سے ہی تھے وہ۔ میں نے ان کے بالکل پاس جا کر کار روک دی اور کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھا۔

”کیا بات ہے بھئی، کیا تکلیف ہے تم دونوں کو اور اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو؟“

وہ دونوں لپک کر میرے قریب آ گئے اور دونوں نے جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں ان کی ایک بات بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس صورتِ حال نے آبی کو جھنجلا دیا۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترا، اور سامنے سے چکّر کاٹ کر ان کے پاس آ کر انھیں ڈانٹتے ہوئے بولا ”اوئے کیا بکواس لگا رکھی ہے یہ، ایک ایک آدمی، باری باری بولو کیا بات ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

ان دونوں نے آبی کی طرف مڑ کر پھر ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ آبی نے جھنجلا کر ان کے بازو تھام کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

”میں کہتا ہوں بکواس بند کرو، ایک آدمی بولو صرف ایک آدمی۔“

پھر اس نے ان میں سے ایک سے کہا ”تو بتا بھئی کیا بات ہے؟“

وہ جلدی سے آبی کے قریب ہو کر بولا ”دیکھیں جی بالو جی! یہ میرے ساتھ پھڈا کر رہا ہے جی۔ دبانا چاہتا ہے مجھے اکیلا جان کے۔“

”کیوں بھئی، کیا بات ہے؟ کیوں پریشان کر رہا ہے تو اس اکیلے آدمی کو؟“ آبی نے دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

”نہ جی نہ، میں کوئی ظُلم جاستی نئیں کرتا ہوں۔ پھڈا تو جی یہ کھود کرتا ہے۔ نیّت خراب ہو گئی ہے صاب جی اس کی۔“ وہ بولا۔

میں نے ڈپٹ کر کہا ”اوئے آخر یہ چکر کیا ہے؟ صاف صاف بتاؤ کس بات پر جھگڑ رہے ہو تم؟“

پہلے والا لپک کر میرے پاس آ کے بولا ”دیکھیں جی بالو جی!

میں بتلاتا ہوں آپ کو اصل بات . . .“

دوسرا جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا ”بات بتانے سے پہلے ایک بات میری بی سن لے۔ میں اپنا حصّہ پورا لوں گا دس ماں سے ایک ٹیڈی پائی دینے والا نیئں۔ بات سن کے جو اس بابو نے مانگا نہ اپنا حصّہ تو تو اپنے ماں سے دینا اسے ۔“

آبی نے آگے بڑھ کے اس کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ ”اوئے کس حصّے کی بات کر رہا ہے بھئی تو۔ بتا مجھے بات کیا ہے؟“

”نہ جی نہ۔ ماں نیئں بتانے کا کچھ بی۔ اوہی بتاوے گا جن نے بات بولی ہے تیرے کو۔ وِں سے ہی پوچھ۔“ وہ بولا۔

آبی نے اس کی گردن چھوڑ کر دوسرے کی گردن تھام لی۔ ”چل تو ہی بتا بھئی، کیا بات ہے۔ یاد رکھنا اگر ذرا بھی جھوٹ بولا نا تو کھال کھینچ لوں گا میں تم دونوں کی۔ یہ خیال رکھنا۔ اب بک جلدی سے۔“

وہ گھگھیاتے ہوئے بولا ”بتاتا ہوں جی، بتاتا ہوں، میری گردن تو چھوڑ دو، ماں کسم بڑی دُکھ رہی ہے ۔“

آبی نے اس کی گردن چھوڑ کر اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”لے چھوڑ دی گردن، اب بک جلدی سے ۔“

”وہ جناب! بات یہ ہے، ہم دونوں بس سے اتر کے سبزی منڈی کی طرف جا رہے تھے دکان کے لیے مال لینے۔ بس سے اتر کے تھوڑی دور چلے تھے کہ میری نظر سڑک پر پڑی ہوئی ایک چمک دار چیز پر پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ اس نے وہ چیز دیکھی تو یہ کہنے لگا، اس میں آدھا حصّہ میرا ہوگا۔ وہ چیز مجھے ملی تھی، حق تو میرا ہی بنتا نا جی اس پر؟ پھر بھی میں نے اسے آدھا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اب یہ بولتا ہے اپنا آدھا حصّہ ابھی لے گا۔ اب آپ ہی بتاؤ بابو جی! ہم اتنی رات کو، اس جنگل بیابان میں اس کو آدھا حصّہ کہاں سے دیں؟ میں بولتا ہوں سویرے دکانیں کھلیں گی تو بیچ کے پیسے آدھے آدھے کر لینا، تو میری بات مانتا نہیں ہے کہتا ہے بس آدھا حصّہ دو، میں ابھی لے کر جاؤں گا۔ اب آپ بولو میں کیا کروں؟ دیکھو انصاف سے بولنا ہاں ۔“

”وہ ہے کیا چیز؟ یہ نہیں بتایا تم نے۔ اس کے بغیر میں کیسے بتاؤں گا تمھیں کیا کرنا چاہیے ۔“ آبی مسکراتے ہوئے بولا۔

وہ شخص چند لمحے سوچ کر ہچکچاتے ہوئے بولا ”ایک چوڑی ہے جی وہ سونے کی ۔“

”کہاں ہے وہ مجھے دکھاؤ۔ میں دیکھوں تو وہ ہے کتنی بڑی اور کتنے پیسے مل سکتے ہیں تمھیں اس کے ۔“ آبی بولا۔

وہ شخص آبی کو چوڑی نکال کر دکھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”گھبراؤ مت، دکھا دو، ہم لیں گے نہیں تم سے وہ۔“

”ہاں ہاں جی! لیں دیکھیں۔ میں گھبرا تو نہیں رہا ہوں بابو جی! آپ اتنے بڑے لوگ ہیں، ایک چوڑی کیا ہے جی آپ کے [illegible]“

اس نے چوڑی اپنے پگڑ سے نکال کر آبی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ آبی نے چوڑی کو ہاتھ میں لے کر تولتے ہوئے کہا ”[illegible] تولے کی ہو گی یہ۔“ پھر اسے کار کے سامنے لے جا کر ہیڈ لیمپ کی روشنی میں الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے بولا ”اور ہے بھی خالص سونا۔ ہزار بارہ سو تو مل ہی جائیں گے اس کے بغیر رسید کے، رسید ہوتی تو اور زیادہ بھی مل سکتے تھے۔“

آبی کی بات سن کر وہ شخص جس کے پاس وہ چوڑی تھی، دوسرے آدمی سے بولا ”لے بھئی سن لے بابو صاحب کیا کہہ رہے ہیں [illegible] سو چھوڑ تو ہزار ہی لگا لے۔ لا پانچ سو دے دے مجھے اور لے یہ چوڑی۔ صبح بیچ لینا دکان پہ لے جا کر، تیری قسمت ہے جتنے میں بک جائے ۔“

”ماں کو سسر الکھ پتی تو نیئں۔ پانچ سو ماں کدر سے لاؤں؟ چوڑی تو رکھ لے، روپیہ منے دے دے پانچ سو۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”روپے تو پانچ سو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اب تو انتظار ہی کرنا پڑے گا صبح تک ۔“ پہلا شخص کندھے اُچکا کر بولا۔

”نہ جی نہ۔ سویرے تو تو نے مکّر جانا ہے۔ فیر ماں کیا کروں گا؟ تیرا۔ روپیہ ابی دے نیئں تو چوڑی ماں رکھاں گا ۔“

”دیکھیں بابو جی! یہ دھاندلی نہیں ہے اس کی؟ میں اس کو کدھر ڈھونڈتا پھروں گا، پتا ٹھکانہ بھی تو معلوم نہیں ہے مجھے اس کا ۔“ پہلا بولا۔

”اچھا تو پھر ایسا کر دیا رو! یہ چوڑی تم ہمیں دے دو، ایک ہزار روپے ہم تمھیں دے دیتے ہیں، تم آپس میں بانٹ لینا، ٹھیک ہے ؟“ آبی نے کہا۔

”ہاں جی، یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔ یہ تو بابو جی آپ نے ساری مشکل ہی آسان کر دی ہے ہماری ۔“ پہلا شخص خوش ہو کر بولا۔

”مگر روپے لینے کے لیے تم دونوں میں سے ایک کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ پیسے یہاں نہیں ہیں ہم گھر جا کر دے سکیں گے۔“ آبی نے کہا۔

”ہم دونوں چلے چلتے ہیں جی آپ کے ساتھ۔ جانا کتنی دور ہے ؟“ پہلا شخص جلدی سے بولا۔

”دونوں کو ہم نہیں لے جا سکتے۔ ہمارے پاس صرف ایک آدمی کی جگہ ہے گاڑی میں۔ تم میں سے ایک ہی چل سکتا ہے۔“ آبی معنی خیز انداز میں بولا۔

میں حیران تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اگر واقعی اس کو ان کی مشکل آسان کرنا چاہتا تھا وہ تو دونوں کو ساتھ لے جا سکتا تھا۔ صرف ایک آدمی کو ساتھ لے جانے کی بات کیوں کر رہا تھا؟ اور اگر اس کا مقصد یہ تھا، ایک آدمی کو پیسے دینے کے بہانے ساتھ لے جا کر اسے راستے میں کہیں مار پیٹ کر کے ڈال دے اور چوڑی اپنے قبضے میں کر لے تو یہ کام تو وہ یہاں بھی کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے حیثیت ہی کیا رکھتے تھے۔ پھر یہ بات آبی کی فطرت کے بھی بالکل خلاف تھی، اس کی ذات سے غریبوں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ضرورت مندوں کی تو ہمیشہ مدد ہی کرتا رہا تھا وہ۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اور پھر وہ دونوں آبی کی بات مان بھی کیسے سکتے تھے، میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے درمیان جھگڑے کی وجہ یہی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہمارے ساتھ چلا جاتا اور دوسرا وہیں رک کر انتظار کرتا اس کا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہیں رہی اس وقت جب میں نے ان دونوں کو اس بات پر متفق دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص ہمارے ساتھ چلا جائے گا۔

انھیں اس کے لیے راضی دیکھ کر آبی بولا ”چلو تم دونوں ہی چلے چلو یار، ہمارے ساتھ۔ ہم اپنی زنانی سواری کو آگے بٹھا کر پیچھے والی سیٹ خالی کر دیتے ہیں ۔“

اس نے پیچھے والی سیٹ کا دروازہ کھول کر آسیہ کو میرے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود ان دونوں کو ساتھ لے کر پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بہت خوش دکھائی دینے لگے تھے۔ پانچ پانچ سو روپے مفت ہاتھ آ رہے تھے ان کے اور اس فاضل اور غیر متوقع آمدنی کی خوشی میں انھیں اپنے چھالوں کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ وہ انھیں وہیں سڑک پر ہی پڑا چھوڑ آئے تھے۔ میں آبی کی اس بے موقع کارگزاری سے ذرا بھی خوش نہیں ہوا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ کی مصیبت گلے لگالی تھی یہ۔ اگر ایک ہزار روپے دے کر وہ چوڑی خریدنا ہی چاہتا تھا تو اپنے ساتھ ساتھ گھر تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی انھیں، پیسے تو یہاں بھی دیے جا سکتے تھے ان کو۔ اس سے کہیں زیادہ روپے آبی کی جیب میں اس وقت بھی موجود تھے۔ خود آسیہ کے چہرے سے بھی ناگواری جھلک رہی تھی۔ شاید وہ بھی دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی آبی کی اس حرکت پر۔ مگر میں اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ آبی نے یہ مصیبت بے وجہ گلے نہیں لگائی ہو گی، ایسا آدمی ہی نہیں تھا وہ۔ کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور تھی اس کے اس عمل میں، لہٰذا میں نے اس کے معاملے میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی کوئی سوال کیا تھا اس سے اس سلسلے میں۔ آسیہ بھی منہ پھلائے بیٹھی ہی رہی تھی بس۔ بولی وہ بھی کچھ نہیں تھی۔ آبی ہمارے ردِ عمل سے بے پروا ان کے ساتھ پیچھے بیٹھا خوب ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہا تھا۔ وہ یوں گھل مل گیا تھا ان کے ساتھ جیسے وہ اس کے کوئی بہت پرانے جاننے والے رہے ہوں۔

گھر پہنچ کر آبی ان دونوں کو سیدھا ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ آسیہ وہاں رکے بغیر فردوسی بیگم کی طرف چلی گئی۔ آبی نے اپنی جیب سے سونے کی چوڑی نکال کر سینٹر ٹیبل پر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا ”یار ہاشم خان! ذرا دیر ادھر ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا ہو جا بھائی! آج کل لٹیرے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ کیا خبر کوئی گھس ہی آئے یہاں تو خواہ مخواہ ایک ہزار روپے اور اس سونے کی چوڑی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے ہمیں۔ دو ہزار روپے بہت ہوتے ہیں میرے بھائی ہم جیسے غریب آدمی کے لیے کیوں برادر! ٹھیک کہا نا میں نے ؟“ اس نے ان دونوں سے تصدیق چاہی۔

وہ شخص جس نے اسے چوڑی دی تھی ــ بے ہنگم سے انداز میں ہنس کر بولا ”بابو جی! آپ جیسے غریب ہیں اگر تو ہم کیا کہلائیں گے ؟“

”اوئے کیا کہتا ہے بھائی! میں تجھے کوئی رئیس آدمی دکھائی دیتا ہوں ؟“ آبی ان دونوں کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اتنے بڑے مکان میں رہنے اور ایسی شاندار کار میں پھرنے والے غریب لوگ تو نہیں ہوتے بابو جی! اتنا تو پتا ہے مجھے بھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ارے تو کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ سب ہمارا ہے، نہیں یار! غلط فہمی ہو گئی تجھے۔ ہم نوکری کرتے ہیں بھائی یہاں۔ یہ جو ہاشم خان ہے جسے میں نے ادھر دروازے پر کھڑا کیا ہے یہ ڈرائیور ہے یہاں، اور میں اس بی بی کا باڈی گارڈ ہوں جو ہمارے ساتھ کار میں تھی اور ابھی ابھی اندر گئی ہے۔ ویسے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں تم نے۔ کیا نام ہے تمھارا ؟“

”مجید نام ہے میرا۔ ادھر لیاری میں دکان ہے سبزی ترکاری کی ۔“ چوڑی والا جلدی سے بولا۔

”اور تیرا نام کیا ہے پہلوان ہے؟ ویسے تو مجھے اپنے مطلب کا آدمی لگتا ہے پیارے ؟“ آبی نے دوسرے شخص سے پوچھا۔

”نورا پہلوان ہے مھارا نام۔ یہ تیں کے کیوے ہے مطبل کا آدمی لگوں ماں تیرے ؟ ایدا کے مطبل سے ؟“ وہ بولا۔

”مطبل میرا کوئی برا نہیں ہے نورا پہلوان! سیدھی سی بات ہے تم دونوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے یار مجھے۔ کافی عرصہ ہو گیا تھا کسی اپنے جیسے سے ملے ہوئے۔ میں تو سمجھنے لگا تھا کہ شاید یہ فن ہی اٹھ گیا ہے دنیا سے اب۔ آج تم دونوں کو دیکھ کر اور تم سے باتیں کر کے دل کو بڑا سکون ملا ہے کہ سارے ہی نہیں مٹی میں مل گئے ہیں، کچھ لوگ ہیں ابھی ایسے جو اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں ۔“ آبی بولا۔

وہ دونوں ایک دم چونک کر آبی کی شکل دیکھنے لگے۔ چند ثانیے

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد بولے: "اچھا! یار معاف کرنا بھائی! پتا نہیں تھا ہم کو کہ ایسی شاندار کار میں اپنی ہی برادری کا کوئی بندہ موجود ہے۔"

"نہیں یار! معافی تلافی کی تو بات ہی نہیں ہے کوئی۔ انجانے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ تم دونوں کب سے ہو اس دھندے میں؟"

"ادھر کراچی میں کوئی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے اُدھر صادق آباد میں تھے۔ کوئی چار پانچ دھندے کیے ہیں ادھر، مگر یار! ادھر آنا تو بالکل بے کار ہی ہوا ہے ہمارے لیے۔ سمجھا یہ تھا ہم نے کہ بڑا شہر ہے لاکھوں کی آبادی۔ بڑے خوب اچھا دھندہ ہوگا۔ مگر یار! لوگ بڑے سیانے ہیں ادھر کے۔ اوّل تو کوئی ہماری بات سننے کے واسطے رکتا ہی نہیں اور اگر کوئی ایک آدھ بندہ مل بھی جاتا ہے! ایسا تو اس کی جیب خالی ہوتی ہے، سو پچاس سے زیادہ نہیں ملتے۔ اتنے تو خرچ ہو جاتے ہیں مال کی تیاری میں۔ پھر ہمیں کیا ملا؟" مجید بولا۔

"یہی تو بات ہے میرے بھائی! اسی لیے تو میں نے یہ دھندا چھوڑ کر نوکری کرلی ہے۔ میں تو حیران تھا کہ تم کیسے کر رہے ہو اب تک یہ کام۔ تم سے یہی گُر معلوم کرنے کے لیے میں تم دونوں کو ساتھ لایا تھا اپنے۔ مگر بے کار ہی ہوا یار! تمھارا لانا بھی۔" آبی منہ لٹکا کر بولا۔

"ہم بھی اب واپس صادق آباد جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں جی! ادھر بھوکے مرنے لگیں گے کچھ دن اور رہے تو۔" مجید بولا۔

نورا جھنجلاتے ہوئے انداز میں اٹھتے ہوئے بولا: "اوئے جیدے! چل اٹھ یار ادھر سے۔ چھ مہینے میں ایک موٹی آسامی ملی تھی تو وہ بھی اپنا ہی بھائی بند نکلا۔ اُٹھ یار! لعنت بھیج اس شہر کراچی پر۔ یہاں اپنے جیبوں کا گزارا مشکل ہے۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہوتے ہیں وہ جو اس شہر سے خوب کما کما کے لے جاتے ہیں۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آیا یہ روشنیوں کا شہر۔"

میں اسے اس قدر صاف اردو بولتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب تک وہ جیسی دیہاتیوں کی لٹھ مار زبان بولتا رہا تھا اسے سن کر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اتنی صاف اردو بھی بول سکتا ہے۔ میں حیرت سے اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا تھا۔

نورا کے ساتھ مجید بھی اٹھ کھڑا ہوا اور چوڑی سینٹر ٹیبل سے اٹھا کر دوبارہ اپنے پگڑ میں گھسیڑتے ہوئے بولا: "اچھا یار! جانے دے اب ہمیں۔ تُو نے تو دو چھابوں کا بھی نقصان کرا دیا ہمارا۔ پورے بیس روپے کے خریدے تھے ہم نے وہ۔"

آبی مسکراتے ہوئے بولا: "کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے پیارے بھائی! لگتا ہے تم دونوں کا ستارہ گردش میں ہے ان دنوں۔ ایسے میں تم نے یہاں آکر غلطی ہی کی ہے۔ میرا [illegible] یہ ہے تمھارے لیے کہ جو پہلی گاڑی ملے اس سے واپس چلے جاؤ۔"

"ہاں بھاجی! اب ایسا ہی کرنا ہے ہمیں۔ تو نے خواہ مخواہ مشورہ دینے کی تکلیف کی۔ کرنا تو یوں بھی ہمیں یہی تھا۔" نورا جل کر بولا۔

وہ دونوں واپس جانے کے لیے مڑے تو آبی بولا: "تو گل ای کوئی نئیں ہوئی جی! نہ تسی چا شاپی، نہ ٹکر شکر..."

نورا دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے غصّے سے بات کاٹ کر بولا: "نہ جی نہ، مٹی پاؤ چا شا... ٹکر شکر اُتے۔ جان اِی دو سانوں۔ اساں ہور نئیں رکنا ایک منٹ دی۔ بھئی جیدے! آجا یار۔"

وہ پتا نہیں کیا کیا بکتا جھکتا باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی جیدا بھی چلا گیا۔ آبی معنی خیز نظروں سے مسکراتے ہوئے انھیں جاتے دیکھتا رہا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے آبی سے کہا: "یہ کیا مذاق ہے بھئی۔ کیوں لایا تھا تو انھیں اور چکر کیا تھا؟"

آبی ہنستے ہوئے بولا: "بس یار! اس کی باتیں سن کر یاد آگیا تھا مجھے اپنا۔ ایسی ہی نوسربازی سے میں نے بھی ابتدا کی تھی اپنی مجرمانہ زندگی کی۔ جب حوصلہ، ہمّت اور تجربہ نہیں تھا تو ایک بوڑھے شخص کے ساتھ میں بھی ان ہی کی طرح شکار پر نکلا کرتا تھا۔"

آبی مجھے جواب دے ہی رہا تھا کہ باہر کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی، دوسرے ہی لمحے شرافت علی، فیروز، گل زمان اور انور کمال ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے دوبارہ لے آئے۔ وہ دونوں بہت ہی ہراساں ہو رہے تھے۔ اندر آتے ہی ہماری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: "پوچھ لو آپ ہی۔ یہ موجود ہیں وہ دونوں۔ یہی ہمیں لے کر آئے تھے [illegible] چور شور نہیں ہیں جی۔"

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا: "کیا بات ہے فیروز! کیا [illegible] تھے یہ دونوں؟ کہاں سے پکڑ کر لائے ہو انھیں تم؟"

"پکڑا تو یہ کچھ بھی نہیں رہے تھے۔ ہم جب یہاں پہنچے تو یہ مین گیٹ سے نکل کر جا رہے تھے۔ ہمیں شبہ ہوا کہ شاید یہ کچھ کر کے نکلے ہیں یہاں سے، لہٰذا میں نے انھیں آواز دے کر روکا۔ یہ رکنے کے بجائے ہم سے بچنے کے لیے بھاگنے لگے لیکن انور نے ان کے پیچھے گاڑی دوڑا کر انھیں جا پکڑا۔ پکڑے جانے کے بعد انھوں نے یہ عجیب بیان دیا کہ اس کوٹھی کا ڈرائیور اور اس کی مالکن خود انھیں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے سبزی منڈی کے نزدیک سے۔ اب یہ واپس جا رہے تھے۔ ہم انھیں اپنے ساتھ اس لیے لے آئے کہ ان کے بیان کے مطابق نہ تو یہاں کوئی مالکن ہے جس کے ساتھ باڈی گارڈ چلتا ہو اور نہ ہی کوئی ڈرائیور ہے یہاں۔"

آبی اس کی بات سن کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بُری طرح ہنس رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر کہا: "چھوڑو یار! جانے دو انھیں۔ یہ سب اس سالے پانی کے جانور کی کارستانی ہے۔ یہی لایا تھا انھیں اپنے ساتھ لگا کر۔ اب پتا نہیں کیا بکواس کر رہا ہے۔ میری تو سمجھ میں آ نہیں رہی ہے اس کی بات۔ تم سنو شاید کچھ سمجھ سکو تم۔"

فیروز آبی کو ہنستے دیکھ کر خود بھی مسکرانے لگا۔ اُس نے مجید اور نورا کو جانے کے لیے کہہ کر آبی سے پوچھا: "یہ کیا شرارت ہے بھئی؟"

وہ دونوں تیزی سے یوں باہر کی طرف بھاگے تھے جیسے انھیں خدشہ ہو کہ اگر انھوں نے جانے میں ایک لمحے کی بھی دیر کی تو وہ پھر پکڑ لیے جائیں گے اور اس بار انھیں رہائی نہیں مل سکے گی شاید۔ آبی انھیں اس طرح بھاگتے دیکھ کر ہنسی سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر کے بولا: "اب صبح سب سے پہلی گاڑی پکڑ کر بھاگ جائیں گے یہاں سے اور پھر کبھی کراچی آنے کے لیے کہے بھی نا کوئی تو کان پکڑا کریں گے کراچی کا نام سُن کر سالے نوسرباز۔"

میں نے چڑ کر کہا: "اوئے ذلیل آدمی، سالے پانی کے کچھوے! کیوں خواہ مخواہ سسپنس میں مبتلا کر رہا ہے، سیدھی طرح بکتا کیوں نہیں ہے کون لوگ تھے یہ اور یہ چکر کیا تھا جس کی وجہ سے تو انھیں یہاں تک کھینچ لایا تھا؟"

آبی بولا: "دیکھ یار شرافت علی! یہ شرافت ہے کوئی اس سالے کی۔ نوسرباز کا مطلب یہ نہیں سمجھتا تو اب میں کیا بتاؤں اسے۔ تو کسی ڈکشنری میں دیکھ کے سمجھا دے یار اسے نوسرباز کا مطلب۔"

"اچھا تو نوسرباز تھے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔ ان کی تو کھال اتار لیتا میں۔" فیروز جلدی سے بولا۔

آبی بولا: "نہیں یار! دفع کر دو سالوں کو جانے دو۔ یوں ہی بے ضرر سے لوگ ہیں۔ جس طرح یہ ٹھگنا چاہتے ہیں لوگوں کو، ان چالوں کو تو بچے بھی سمجھتے ہیں اب۔ بہت پرانا طریقہ ہے یہ ان کا، سالے کسی دن پکڑے جائیں گے۔"

میں نے کہا: "کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا وہ کوئی چکر کر رہے تھے ہمارے ساتھ، مگر میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا قصّہ کیا تھا؟"

آبی بولا: "وہ جو سونے کی چوڑی تھی نا، وہ اصلی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی پڑی ہوئی ملی تھی۔ یہ سارا ڈراما کیا تھا انھوں نے صرف اس لیے کہ ہم لالچ میں آکر یا ان کے درمیان جھگڑا ختم کرانے کی خاطر وہ چوڑی ایک ہزار روپے میں لے لیں ان سے، جس پر سو سوا سو سے زیادہ خرچ نہیں کیے ہوں گے انھوں نے یا شاید اتنے کی بھی نہ ہو وہ۔"

"اوئے یہ چکر چلایا تھا انھوں نے ہمارے ساتھ اور تُو نے یوں ہی چلے جانے دیا انھیں۔" میں نے طیش میں آکر کہا۔

"چھوڑ یار! لعنت بھیج ان پر، اُن کے ساتھ کچھ کر کے خواہ مخواہ گناہ گار ہی ہونا تھا ہمیں بھی۔ آپ پکڑے جائیں گے ایک نہ ایک دن۔ یا پھر کوئی دل جلا ٹکرا گیا تو سالوں کی ہڈیوں کا سُرمہ بنا دے گا۔ ہونا یہی ہے ان کے ساتھ۔" آبی بولا۔

شرافت علی ہنستے ہوئے بولا: "چھوڑو یار جیلانی! ہم تو بہت تجربہ کار آدمی سمجھتے تھے تمھیں مگر تم کو اتنی سی بات بھی معلوم نہیں تھی۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آبی کی وجہ سے تم بچ گئے آج ورنہ وہ دونوں تو تمھیں اُلّو بنا ہی جاتے۔"

"او نہیں یار! یہ نہیں ہوتا اگر تو اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اسی کو زیادہ ہمدردی تھی اُن سے کہ گاڑی سے اتر کر جا پہنچا تھا یہ اُن کے پاس پُرسشِ احوال کے لیے۔ میں نے تو ایک منٹ بھی نہیں رکنا تھا اُن کے پاس۔ بات ہی نہیں سنتا میں ان کی تو اُلّو کیسے بنا لیتے وہ مجھے۔ اسی بات سے تو وہ تنگ ہیں، یہاں کے لوگوں کو اتنی بھی فرصت نہیں ہے کہ دو گھڑی ان کے پاس رک کر بات بھی سُن لیں ان کی۔ اور یار، کراچی جیسے مصروف زندگی والے شہر میں اتنا وقت کسے ملتا ہے۔"

"خیر چھوڑو لعنت بھیجو ان پر، یہ بتاؤ جس کام کے لیے گئے تھے اُس کا کیا بنا؟" فیروز نے ایک صوفے میں دھنستے ہوئے پوچھا۔

"کہاں یار! اُدھر تو معاملہ ہی اوندھا ہو گیا سارا۔ ابتدا ہی غلط ہو گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی جن کے مکان سے کارروائی کرنا تھی ہمیں، آج گھر میں ہی تھے۔ پھوپھی بیوی تو ہمارا ساتھ دینے کو دل سے تیار تھی لیکن شوہر سالا انجانے میں ہمیں پھنسانے کی فکر میں تھا۔ وہ تو قسمت ہی اچھی تھی کہ عین موقع پر اتفاق سے ہم نے باتیں سُن لیں اس کی اور اُسے قابو کر لیا جا کر، مگر وہ دوسرا جو اُن کا ملازم ہے وہ سالا مخبر نکلا۔ ہم اندر مصروف تھے، اس نے باہر سے ٹیلی فون کر کے ہمارے بارے میں اطلاع کر دی غلام مرتضیٰ شاہ کو۔ نتیجے میں ہمیں ناکام ہی راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ وہ تو آسیہ کو کسی طرح پتا چل گیا تھا، نہیں تو اس سالے دوغلے نے تو ہماری قبریں بنوانے کا پورا پورا انتظام کر دیا تھا۔"

"فکر نہ کر یار! میں بھی پورا پورا ہی انتظام کر کے آیا ہوں بلکہ بنیاد رکھ آیا ہوں اُس کے مزار شریف کی۔" آبی نے کہا۔

"کیا مطلب ہے؟ کیا تو جان سے مار آیا ہے اُسے؟" میں نے ذرا حیران ہو کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور تیرا کیا خیال تھا، کیا میں اس ہوس کے پُتلے کو زندہ چھوڑ آتا۔ اسے مار دینا بہت ضروری تھا تاکہ پتا تو چلے اس وڈیرے غلام مرتضیٰ شاہ کو کہ اس جیسے لوگوں کے پالتو کتّوں کا ہم کیا حشر کرتے ہیں؟" آبی نے ماتھے پر بل ڈال کر تلخی سے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ بھی تو تم اس کے سات آدمی مار آئے ہو، یہ زخم بہت گہرا ہے، اس کی تکلیف آسانی سے نہ سہہ سکے گا وہ۔"
فیروز بولا۔

"ہاں یہ بالکل صحیح کہا ہے فیروز نے۔" شرافت علی بولا "سارے شہر کی خاک چھان ڈالے گا اب وہ تمھیں تلاش کرنے کے لیے۔"

"پروا نہیں کرو، اس جیسے اور بھی پتا نہیں کتنے ہیں جو ہمارے لیے جگہ جگہ جال لیے بیٹھے ہیں۔ ایک اور کے اضافے سے کیا فرق پڑ جائے گا ہماری صحت پر؟ بلکہ صحت برقرار اور لہو گرم رکھنے کے لیے ایسے لوگوں کا وجود ضروری ہے۔" آبی مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے اتفاق نہیں ہے تم سے آبی۔" شرافت علی بولا "ایسے لوگوں کی موجودگی میں کسی ناگہانی کا ہر دم دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بُرا وقت دبے پاؤں اس طرح آتا ہے کہ کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے اس پر کیا بیتنے والی ہے۔ آدمی کو اپنے دائیں بائیں اور پیچھے سے مطمئن اور بے خوف رہنے کے لیے دشمنوں کی کاشت بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ طریقہ بہت غلط ہے تمھارا۔"

میں نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوئے چھوڑ یار! مٹی ڈال ان سالے دشمنوں پر۔ ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے میرے ویر! اسے کون ٹال سکا ہے کبھی؟ بُرا سمے جب آتا ہے تو چاہے دبے پاؤں آئے یا ڈھول تاشے پیٹتا ہوا آئے، اُسے روک نہیں سکتا ہے کوئی بھی، اور موت کا ایک دن مقرر ہے، جو آیا ہے اس دنیائے ناپائیدار میں اُسے واپس بھی جانا ہے اپنے وقت پر۔ یہ وقت ٹالنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔"

"جیلانی کی بات صحیح ہے شرافت علی! بُرے وقت اور موت کے خوف سے کوئی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتا۔ دُنیا کا کاروبار تو چلتا ہی رہتا ہے۔ دوستیاں اور دشمنیاں سب ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ یہ کسی کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ آدمی حالات کا غلام ہوتا ہے، وہ اُسے جس طرف لے جاتے ہیں وہ جانے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ کوئی اپنے لیے خطرات خریدنا نہیں چاہتا۔ دشمنیاں رکھنا کوئی پسند نہیں کرتا مگر پھر بھی دشمن تو بن ہی جاتے ہیں کچھ نہ کچھ۔ مرنے کے لیے خوشی سے کوئی تیار نہیں ہوتا لیکن مرنا ہر ایک کو پڑتا ہے۔" فیروز نے کہا۔

"ہاں دوست! یہ تم نے سچ کہا ہے، آدمی حالات کا غلام ہوتا ہے، ان کے اشارے پر چلنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ اس کی اپنی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق وہ کوئی کام کر ہی نہیں سکتا، جب تک حالات اجازت نہ دیں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

حالات کے سامنے آدمی کی بے اختیاری کا مجھ سے زیادہ تجربہ کسے ہوگا۔ ایک رات حالات نے میرے سکون کے سمندر میں جو پتھر پھینکا

تھا اُس نے ایسا تلاطم برپا کیا تھا میری زندگی میں کہ اب تک ... لہروں کے رحم و کرم پر ادھر اُدھر ڈولتا پھر رہا تھا۔ میرا وہ جھونپڑا ... جس میں اپنی مہربان ماں اور محبت کرنے والی فرشتوں جیسی بہن کے ساتھ رہ رہا تھا، میں اپنا وجود کھو بیٹھا تھا۔ میرے تایا نے ... معصوم بہن کا ڈولا اٹھانے کی اتنی بھاری مزدوری طلب کر ... اپنے بیٹے کی ایسی قیمت لگا دی تھی کہ کسی مجھ جیسے آدمی کے لیے تصور بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ یہ حالات کی ہمارے خلاف سازش تو تھی کہ یوں خون کے رشتے ہمارا خون پینے پر آمادہ ہو گئے ... لہو پانی ہو گیا تھا اُن کا، پہچان بھلا بیٹھے تھے وہ اپنے بیگانے ... حالات نے وہ چال نہیں چلی ہوتی ہمارے خلاف تو ہمارا تین افراد پر مشتمل یہ کنبہ کبھی در بدر نہیں ہوتا۔ اگر مجھے اُس رات تایا جی کے ... کو پورا کرنے کے لیے گھر سے نہ نکلنا پڑتا تو وہ گھر آج بھی ہمارا ... ہوتا۔ یہ سب حالات کی ستم ظریفی ہی تھی۔ اسی کی کرشمہ کاری ... جس نے مجھے انسان کے بجائے ایک عبرت ناک داستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ فیروز کی باتوں کی تائید مجھ سے زیادہ کون کر سکتا تھا ...

شرافت علی بولا "لیکن اس ناکامی نے بے چاری آسیہ کو ... مایوس کیا ہوگا۔ اُس کا دل بہت ملول، بے حد رنجیدہ ہوگا اس ...

شرافت کی بات سُن کر مجھے احساس ہوا کہ واپسی میں آسیہ ... راستے گم صم اور کھوئی کھوئی سی کیوں تھی۔ ابھی تک اس طرف دھیان ... کی مہلت ہی نہیں ملی تھی مجھے۔ آسیہ واقعی بے حد مغموم تھی، ایسا لگتا تھا کہ ... ساتھ واپس تو آ گئی تھی مگر اس کا دل وہیں اٹکا رہ گیا اپنے بچے ... ہی۔ وہ واپس آنے کے بعد بغیر کچھ کہے سُنے سیدھی اندر چلی گئی تھی ... ایک لمحہ بھی یہ جاننے کے لیے نہیں رُکی تھی کہ آبی جن لوگوں کو ساتھ لگا لایا ہے وہ کون ہیں اور آبی آخر کس مقصد سے ساتھ ... ہے انھیں۔ میں نے آبی سے کہا۔ "اوئے آبی! آ یار دیکھیں ... کر۔ اس گھڑی کوئی تسلی دینے والا، کوئی اُس کی آنکھوں کے ... پونچھنے والا اس کے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ پتا نہیں کیا حالت ہو گی اس نے اپنی۔"

ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے آسیہ کے کمرے تک ... تھے، البتہ اس کے کمرے سے کچھ فاصلے پر ہم نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ ہمارے قدموں کی آواز اُس تک نہ پہنچے۔ دروازے کے ... پاؤں رکھتے ہی میری نظر اس پر پڑی۔ وہ اپنے بستر پر اوندھی ... سسک رہی تھی اور فردوسی بیگم اس کے پاس بیٹھی ... اس کی پشت سہلاتے ہوئے اُسے تسلیاں دے کر چپ ... کی کوشش کر رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر میں ٹھٹک کے دروازے ہی میں رُک ... عورت کا جذبۂ ہمدردی اور خلوص مجھے بوجھ سے دبائے ڈال ...

ہی خلوص اور محبت کے سانچے میں ڈھلی عورت تھی وہ۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے احسانوں کے بوجھ کے نیچے دبانے پر تلی بیٹھی رہتی تھی ہر وقت۔ رات آدھی گزر چکی تھی، لوگ اپنے اپنے بستروں پر دراز میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوں گے اس وقت، اور وہ آسیہ کے پاس بیٹھی اس کا دکھ بانٹنے، اس کے آنسو روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انداز اس کا بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں اپنے روتے مچلتے ہوئے بچے کو بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر سلانے میں کامیاب ہوئی ہو اور اُسے یہ خدشہ ہو کہ اگر کسی نے ذرا سی بھی آواز نکالی تو اس کا کچی نیند سویا ہوا بچہ بے چین ہو کر دوبارہ اُٹھ جائے گا۔

میں نے خاموشی سے آبی کا ہاتھ پکڑا اور آہٹ پیدا کیے بغیر دبے پاؤں واپس ہو لیا۔ باہر آ کر آبی دبی آواز میں بولا۔ "یار! کیا شے ہے یہ تیری جنتی بیگم، میں تو حیران ہوں، میرا خیال تھا اتنی رات گزر چکی ہے اب تک تو یہ بہت گہری نیند سو چکی ہوگی۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے اُس نے تو ذرا سی پلک بھی نہیں جھپکائی ہے اب تک۔ شاید بیٹھی آسیہ کی واپسی کا انتظار ہی کر رہی تھی اس وقت تک۔"

"ہاں یار! لگتا ہے یہ مجھے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ یہ تو اپنی خدمت سے مول چکانے پر تلی بیٹھی ہے ہمارا، خریدے لے رہی ہے ہمیں۔"

"مجھے تو رشک آنے لگا ہے تیری قسمت پر جیلانی! ویسے تُو ہے نہیں اس قابل کہ اس کا شوہر نامدار کہلائے۔" آبی شوخی سے بولا۔

"بک نہیں اوئے۔ زبان کو قابو میں رکھ اپنی اور رشک کرنے کی ضرورت نہیں ہے تجھے۔ شوہر نامدار تو بھی بن سکتا ہے۔"

"اچھا! تو کیا اس کی کوئی بہن بھی ہے اسی جیسی؟ میرے سامنے کبھی ذکر تو نہیں کیا اُس نے اس کا۔" آبی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"بہن کو کیوں پوچھ رہا ہے تو؟ بیٹے، پتا نہیں ہے تجھے، شرع میں اجازت نہیں ہے اس کی۔ دو بہنیں ایک ہی گھر میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔"

"بک نہیں اوئے، اتنا شرع تو میں بھی جانتا ہوں۔ دو بہنیں ایک ہی آدمی کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں ایک ساتھ۔ ایک گھر میں ان کے ایک ساتھ رہنے پر شرع کو بالکل بھی اعتراض نہیں ہے۔ اپنی دینی معلومات درست کر لے بیٹے! نہیں تو منکر نکیر کو بھی نہیں جیت سکے گا کبھی جانا ہو گیا تو۔ میں نے دیکھا ہے وہاں دین کے بارے میں بڑے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے پوچھا تھا بچے کہ بہن کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے تو، میں دست بردار ہونے کو تیار ہوں فردوسی سے تیرے حق میں۔"

وہ ایک دم چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سچ کہہ رہا ہے تو؟ بعد میں پھر تو نہیں جائے گا زبان سے اپنی؟"

"مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے بیٹے! جو کچھ کہہ دیتے ہیں اس سے پھرا نہیں کرتے کبھی بھی۔" میں نے سینہ تان کر کہا۔

وہ ایک لمحے سوچ کر بولا "مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جنتی بیگم بھی مجھے قبول کرنے کو تیار ہو جائے گی؟ نہیں یار رہنے دے، تو اس قصے کو یہیں ختم کر دے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تو صرف تیری ہی تصویر دیکھی ہے۔"

"تو اگر تیار ہے تو اس کی فکر نہ کر، میں راضی کر لوں گا اُسے یہ ضمانت دیتا ہوں میں تجھے۔" میں نے اُس کی ہمت بڑھائی۔

"چپ کر اوئے۔ شیطان سے کم تو بھی نہیں ہے۔ مجھے بہکا رہا ہے، بے وفائی کی تہمت لگوانا چاہتا ہے مجھ پر۔"

"کون تہمت لگائے گا تجھ پر بے وفائی کی؟ اُن کی بات تو نہیں کر رہا ہے تو جنھیں اپنے گاؤں لے جا لے جا کر جمع کرتا رہا ہے اپنی ماں کے پاس، وہ بے چاریاں تیرے انتظار میں کب سے دروازے پر آنکھیں جمائے بیٹھی ہیں آبی! کچھ تو خیال کر اُن کا۔ وہ بے چاریاں کب تک اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرتی رہیں گی۔ یوں لگتا ہے جیسے تو انھیں وہاں رکھ کر بھول ہی گیا ہے بالکل۔"

"چپ ہو جا یار! ایک تو یہ تیری بے وقت کی راگنی مجھے برباد کر کے رکھ دے گی کسی دن۔ اب کون سا وقت تھا اس بات کا، کیوں ان لوگوں کا ذکر نکال بیٹھا تو اس گھڑی۔ پتا ہے تجھے، انھیں تو میں نے ریزرو میں رکھا ہوا تھا۔ اگر کوئی نہ ملتی تو ان میں سے ہی کسی کو منتخب کرنا تھا مجھے مگر اب میں خط ڈال دوں ماں کو کہ گاؤں میں اچھے لڑکے دیکھ کے رشتہ کر دے وہ ان سب کا۔"

"کیوں کیا اب کوئی مل گئی ہے تجھے؟ اب ضرورت نہیں رہی ہے کیا تجھے ان میں سے کسی کی بھی؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لے، اب مجھے ان میں سے کسی کو منتخب کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔" آبی مسکراتے ہوئے بولا۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، مگر اچانک مجھے آسیہ کا خیال آ گیا۔ جس کے ساتھ اُسے دیکھ کر اکثر میری آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ گو ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی، جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر میں نے دنیا میں ہر طرح کے تماشے دیکھے تھے۔ اُن کی زبان سے کچھ سُنے بغیر، میں ان دونوں کی آنکھوں میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ ان کے شب و روز میرے سامنے تھے، ایسے میں کب تک چھپے رہ سکتے تھے ان کے چور جذبے میری آنکھوں سے۔ آسیہ کا

خیال آتے ہی مجھ میں اس سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

بستر پر کروٹیں بدل بدل کر میں تنگ آچکا تھا۔ دو گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے مجھے بستر پر دراز ہوئے، لیکن یوں لگتا تھا جیسے بستر پر کانٹے بچھا رکھے ہیں کسی نے کسی کروٹ چین نہیں آرہا تھا۔ میں نے بڑے بوڑھوں کو کہتے سنا تھا کہ نیند جب آتی ہے تو کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے مگر یوں لگتا تھا جیسے اس رات میرے حصے کی نیند کسی اور کو مل گئی تھی اور اب میرے لیے ساری رات کروٹیں بدل بدل کر صبح کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں رہا تھا۔ عاجز آکر میں نے بستر چھوڑ دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہ داری میں ٹہلتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ میں تو اس لیے یہاں ٹہل رہا ہوں کہ مجھے نیند نہیں آرہی ہے لیکن دوسرے لوگ تو اپنے اپنے کمروں بے خبر سو رہے ہیں میرے قدموں کی آہٹ سے اُن کی نیند میں خلل پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر جا پہنچا۔ آسمان پر چاند بہت چھوٹا رہ گیا تھا اور اس کی روشنی زمین تک پہنچتے پہنچتے بالکل ہی دم توڑ دیتی تھی۔ البتہ باہر کشادہ گلی میں کے ای ایس نے روشنی کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اُس نے گلی کے ساتھ ساتھ عمارتوں کے بیرونی در و دیوار خوب روشن کر رکھے تھے۔ باہر کی ہر چیز مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا چھت کے اُس حصّے کی طرف چلا گیا جدھر سے زینہ اُتر کے فردوسی بیگم اور آسیہ کی طرف پہنچا جا سکتا تھا۔ فردوسی بیگم اور آسیہ کے علاوہ آپی بھی اب تک وہی کمرا استعمال کر رہا تھا جہاں اُسے زخمی ہونے کے بعد رکھا گیا تھا۔ کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اب وہ صحت مند ہوچکا ہے تو اُسے دوسرے لوگوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ میں جس جگہ تھا وہاں روشنی اتنی نہیں تھی کہ کوئی دور سے مجھے دیکھ سکتا۔ البتہ میں پولوں پر جلتی ٹیوب لائٹس کی روشنی میں باہر گلی اور آس پاس کے مکانوں کے لان میں کتے بلی کو حرکت کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا۔ لوگوں نے اپنے اپنے مکانوں کے بیرونی دروازوں میں بھی روشنی کا خاصا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے پوری گلی میں تاریکی نام کو بھی نہیں نظر آتی تھی کہیں۔ میں ٹہلتا ہوا چھت کے آخری حصّے تک چلا گیا میری نظر فردوسی بیگم والے حصّے کے لان پر جا پڑی۔ میں ایک دم چونک کر جہاں تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک شخص بیرونی دروازے کے ساتھ لگا ہوا کھڑا تھا اور اس کی چوکنا نظریں تیزی سے اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ وہ بار بار عمارت کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے اُسے ادھر سے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ اُس کے اس انداز نے مجھے احساس دلایا کہ عمارت کے اندر اس چھت کے نیچے جہاں میں کھڑا تھا اس وقت ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میں تیزی [...] کے بل چلتا ہوا سیڑھیوں کے پاس پہنچا اور پیروں سے چپلیں [...] ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر نیچے اُترتا چلا گیا۔ آخری سیڑھی [...] پہنچتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اس گیلری میں جہاں سیڑھیوں کا [...] کھلتا ہے کچھ لوگ سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ میں نے آہستگی سے [...] میں تھوڑی سی جھری پیدا کر کے دوسری طرف جھانکا، وہاں تین [...] سے مجھے سر جوڑے کھڑے دکھائی دیے۔ وہ تینوں چونکہ سیاہ [...] ملبوس تھے اس لیے اس نیم تاریکی میں وہ سائے ہی کی طرح دکھ[...] رہے تھے۔ پھر وہ الگ الگ ہوگئے اور ان میں سے دو دبے [...] سنبھل سنبھل کر سامنے والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ[...] لگے اور تیسرا ہاتھ میں پستول تھامے وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ دونوں [...] محتاط انداز میں، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جس کمرے کی طرف بڑھ [...] تھے، وہ کمرا فردوسی بیگم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا کمرا آپی [...] اور ایک کمرا چھوڑ کر جو تھا اور آخری کمرا آسیہ کا تھا۔ وہ دونوں [...] کے کمرے میں گھس گئے تو میں نے گیلری میں رک جانے والے [...] شخص کو دیکھا۔ وہ میری طرف پشت کیے کھڑا تھا اور اس کی [...] پوری طرح آپی کے کمرے کی طرف تھی۔ وہ شاید اسی لیے وہاں [...] کہ اگر کسی گڑبڑ کا احساس ہونے کے بعد آپی کی آنکھ کھل جائے [...] صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اٹھ کر باہر نکل آئے تو وہ اس [...] نمٹ سکے۔ اپنے پیچھے سے کسی کے آنے کا شاید انھیں گمان [...] رہا ہوگا یا ممکن ہے وہ لوگ میرے چھت پر آنے سے پہلے [...] اور چھت پر دیکھ کر جا چکے ہوں۔ اُسے پشت کی طرف سے [...] دیکھ کر میں بہت ہی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا [...] بے آواز چلتا ہوا اس کے بالکل نزدیک جا پہنچا۔ اچانک ہی [...] چھٹی حس نے اُسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ ایک دم چونک [...] مڑا تھا لیکن اُسے دیر ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھ [...] ہاتھ اس کی گردن پر جا ٹکا تھا اور اس کی رگ احساس میرے انگو[...] کے نیچے مسلی جا چکی تھی۔ لہٰذا مڑتے ہی وہ بے جان ہو کر میرے [...] میں جھول گیا۔ میں نے اُسے ایک ہاتھ پر سنبھالتے ہوئے بہت [...] پھرتی سے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے پستول چھینا [...] اُس کو آرام سے فرش پر لٹا کر فردوسی بیگم کے کمرے کی طرف [...] کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اندر جھانکا۔ وہ دونوں [...] جلدی فردوسی بیگم کو باندھنے میں مصروف تھے۔ اس کے دونوں [...] پشت پر لے جا کر باندھ دیے تھے۔ [...]ں نے، اور منھ پر ٹیپ [...] چکے تھے، اب ایک شخص اُسے مچلنے سے روکنے کے لیے دبوچے [...] تھا اور دوسرا اُس کے دونوں پاؤں ایک رسّی سے لپیٹ رہا [...] اُن کی کارروائی مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا وہ فردوسی بیگم کے [...]

باندھنے کے بعد الگ ہوئے تو میں پستول سیدھا کر کے اندر جا گھسا۔ آہٹ سن کر وہ دروازے کی طرف پلٹے مگر میں نے پستول اُن کی طرف تان کر کہا: "بس میرے بچو! اپنے اپنے ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھ لو، تمھارا کام اب ختم ہوگیا۔"

انھوں نے پستول دیکھتے ہی جلدی سے اپنے اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لیے تھے اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آدمی وہ دونوں ہی اچھے خاصے تندرست و توانا تھے۔ سینے اُن کے چٹان جیسے مضبوط اور کوئی گز گز بھر چوڑے ضرور رہے ہوں گے، قدمیں بھی وہ خوب نکلتے ہوئے تھے، چہروں سے اُن کے ایسی شرافت جھلکتی تھی کہ انھیں دیکھنے والا یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ ایسے غیر شریفانہ کاموں میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ بدن اُن کے ایسے ہوئے اور سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے کہ رشک آتا انھیں دیکھ کر میں نے اُن کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "کس کے لیے یہ خدمت انجام دے رہے ہو میرے بچو؟"

وہ جواب دینے کے بجائے خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میں نے دوبارہ کہا: "بولو، بولو، میرے لاڈلو! خاموشی سے کام نہیں بنے گا۔"

وہ اب بھی کچھ نہیں بولے۔ یوں لگتا تھا جیسے انھیں بولنا آتا ہی نہ ہو۔ بالکل گونگے ہوں وہ دونوں ہی۔ میں نے اُن کی اس مسلسل خاموشی سے تنگ آکر سخت لہجے میں ڈانٹ کر کہا: "بولو اوئے کھوتے دے پترو! جلدی بکو، یہ نہ سمجھنا کہ یہاں اب تمھاری مدد کے لیے آجائے گا کوئی، وہ جسے تم باہر چوکیداری پر کھڑا کر آئے تھے، اُدھر پڑا سو رہا ہے بے خبر اور ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے اس کی بیداری کا کوئی امکان نہیں ہے لہٰذا زندگی چاہتے ہو تو سچ بول دو اور یاد رکھو، سچ کے سوا کچھ نہ بولنا۔"

اُن میں سے ایک نے بڑے نپے تلے انداز میں میری طرف قدم بڑھاتے ہوئے بہت ہی پُر اعتماد لہجے میں کہا: "ٹھیک ہے، ہم نے تمھارے کہنے سے کسی بھی مدد کا خیال نکال دیا ہے دل سے۔ اچھا ہوگا اگر تم بھی یہ کھلونا الگ پھینک دو، کیوں کہ یہ ہمارے مقابلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا پیارے غلام جیلانی۔"

"اچھا، تو تم جانتے ہو مجھے۔" میں نے اُن کی زبان سے اپنا نام سن کر کہا: "صرف نام ہی جانتے ہو میرا یا کچھ معلومات بھی ہیں تمھیں میرے بارے میں۔ ویسے مجھے اُمید ہے جس نے میری شناخت کرائی ہے اس نے مکمل تعارف نہیں کرایا ہوگا میرا؟"

"اس کی تم فکر مت کرو میرے بچے! مکمل تعارف ہم خود حاصل کر لیں گے تم سے۔ تم نے یہ کھلونا پھینکا نہیں اب تک؟" وہ بولا۔

مجھے فوراً خیال آیا، پستول کی موجودگی میں اس بے خوفی سے بات کرنے اور آگے بڑھتے چلے آنے کی وجہ کہیں وہ انگوٹھی تو نہیں ہے، جس کی موجودگی ہتھیاروں کو ناکارہ کر دیتی ہے؟ یہ خیال آتے ہی میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا مگر دونوں ہاتھوں کی کسی ایک انگلی میں بھی مجھے کوئی انگوٹھی کیا ایک معمولی سا چھلا تک دکھائی نہ دیا۔ میں عجیب سے شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ آخر کس بنا پر اس قدر بے خوفی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ میں ابھی اسی گومگو کی کیفیت سے دوچار تھا کہ اس نے نزدیک آکر اچانک مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے بروقت اُسے حرکت کرتے دیکھ لیا تھا چنانچہ جیسے ہی اُس نے جست کی، میں پھرتی سے اُسے جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ مگر وہ بھی کوئی اناڑی نہیں تھا۔ اُسے بھی اس کا اندازہ تھا اور اس نے جست اس لیے نہیں کی تھی کہ مجھ سے گتھم گتھا ہو جائے یا دھوکا دے کر نکل بھاگے وہاں سے۔ اُس کا مقصد صرف میرے ہاتھ سے پستول چھیننا تھا۔ وہ پستول چھین تو نہیں سکا مجھ سے مگر میرے ہاتھ سے پستول نکالنے میں ضرور کامیاب ہوگیا۔ اُس کا ہاتھ بچتے بچتے بھی میری کلائی پر ایسا زبردست پڑا تھا کہ پستول میرے ہاتھ سے نکل دُور جا گرا تھا۔ میں نے پستول دوبارہ اٹھانے کے لیے اُس طرف بڑھنا چاہا جہاں پستول پڑا تھا مگر میرے اُس تک پہنچنے سے پہلے ہی کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ پستول اُس جگہ سے اُچھل کر کچھ اور دور چلا گیا۔ میں نے ٹھٹک کر اس دوسرے شخص کو دیکھا جو اَب تک اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ اس نے اتنی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنا پستول نکال لیا تھا اور اب فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پستول سیدھا کیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بولا: "پستول اٹھاؤ غلام جیلانی! کیا بات ہے، رُک کیوں گئے تم؟"

میں پستول کا خیال دل سے نکال کر اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا: "اگر تم نہیں چاہتے، ہو تو ٹھیک ہے، میں نہیں اٹھاؤں گا اب اسے۔ غلطی مجھ سے ہی ہوگئی تھی، مجھے پہلے ہی خیال رکھنا چاہیے تھا کہ عورتوں کو اُٹھانے والے ایسے نہیں ہوتے کہ ان کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے۔"

"شاباش، یہی اُمید تھی مجھے تم سے، مگر تم کچھ بھی کہتے رہو.... غلام جیلانی! مجھے غصّہ بالکل نہیں آئے گا۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

"غصّہ تو غیرت مند لوگوں کو آتا ہے ایسی باتوں پر بے غیرتوں کو تو پتا بھی نہیں ہوتا کہ غصّہ کس چڑیا کا نام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ لو، کیوں کہ اس کے بعد تمھیں کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا: "تم اس عورت کو کہاں اور کیوں اٹھا کیے جا رہے

تھے۔ اس نے کیا گناہ کیا ہے؟ بتانا پسند کرو گے؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اسے لے جانے کا مقصد تمھیں اپنی کمین گاہ سے نکالنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا چنانچہ اب جب تم خود ہی ہمارے پاس پہنچ گئے ہو تو اس عورت کو لے جا کر وقت برباد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہمیں۔ چلو آگے ہو جاؤ اچھے بچوں کی طرح۔ ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو یہ خیال کر لینا، باس کا حکم ہے تمھیں زندہ یا مردہ دونوں حالتوں میں اس کے پاس پہنچایا جائے۔ اس کے بعد ہی تمھیں لانے والے کو دو لاکھ روپے کا انعام مل سکے گا، سمجھ گئے نا؟" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمھارے باس نے میرے سر کی قیمت دو لاکھ روپے لگائی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں، دو لاکھ روپے، کیا یہ رقم کم لگ رہی ہے تمھیں؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں یار! یہ بات نہیں ہے۔ در اصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارے ملک کی پولیس سے زیادہ قدر داں تو تمھارا باس ہے۔ اس کی نظر میں میرا مول دو لاکھ روپے ہے جبکہ پولیس نے صرف پچاس ہزار روپے مقرر کیے ہیں میرے۔ تمھارا باس اچھا آدمی لگتا ہے مجھے۔"

"ہاں، ہمارا باس بے ایمان آدمی نہیں ہے۔ وہ مول تول میں تو کبھی بے ایمانی کرتا ہی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ بہت کھرا آدمی ہے۔ تم نے اُس سے بگاڑ کر کے اچھا نہیں کیا غلام جیلانی! بہت پسند کرتا تھا وہ تمھیں، اگر تم اُس سے دغا نہ کرتے تو پاکستان بھر میں تم سے زیادہ دولت مند کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ تم نے بڑی غلطی کی ہے غلام جیلانی! اپنے پاؤں پر خود ہی اپنے ہاتھوں سے کلہاڑی ماری ہے تم نے۔" پھر وہ اُس شخص سے مخاطب ہوا جس نے مجھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی تھی "اس عورت کو آزاد کر دو جانی! اب ہم غلام جیلانی کو لے چلیں گے اپنے ساتھ۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ باس کس کو کہہ رہا تھا اور کس نے بھیجا تھا اُسے یہاں۔ حیرت مجھے اس پر تھی کہ آٹزک کو اس مکان کا پتا کیسے چلا۔ میرا ذہن پھر لزی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ میں نے اُس پر اعتماد کرتے ہوئے یہاں کا ٹیلی فون نمبر دے دیا تھا اور ٹیلی فون نمبر کے ذریعے اس جگہ کا پتا معلوم کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا جہاں اس نمبر کا ٹیلی فون لگا ہوا تھا لیکن اگر لزی کو بتائے ہوئے ٹیلی فون نمبروں کے ذریعے وہ یہاں تک پہنچے ہوتے تو مکان کے اس حصّے کی طرف آنے کے بجائے وہ اس طرف جاتے جہاں ٹیلی فون تھا۔ میں نے اس کی تصدیق کرنے کے لیے کہ وہ آٹزک ہی کے آدمی ہیں اور اُسی نے اُنھیں بھیجا ہے، اس سے پوچھا "تم کس باس کی بات کر رہے ہو؟"

"کمال ہے، اتنا عرصہ مادام کے ساتھ گزارا ہے تم نے اور اتنی جلدی باس کو بھول گئے ہو، شاید اپنی ماں بھی یاد نہیں رہی تمھیں"

"مگر تمھیں یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم باس کے وسائل سے ناواقف تو نہیں ہو غلام جیلانی۔ اس کے لیے پاتال سے بھی کسی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل کام نہیں۔ تم سمجھ رہے تھے کہ وہ کبھی تمھارا ٹھکانہ معلوم نہیں کر سکے گا، یہ تمھارا خیال تھا۔ باس محکمۂ پولیس کا سربراہ نہیں ہے جو محض اپنے عملے کی جھوٹی سچی رپورٹوں پر بھروسا کر کے صرف اندازوں پر کام چلا رہا ہو۔ تم پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہو، باس کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے تمھارے لیے۔"

"ہاں یار! جانتا ہوں تمھارے باس کے وسائل کے بارے میں بھی اور اس کے جاں بازوں کے بارے میں بھی۔ شاید تمھیں معلوم نہیں ہے کہ دو بار میرے ہاتھوں فنا ہونے سے بال بال بچا ہے" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں، جانتا ہوں میں سب کچھ۔ ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو بڑی جیت سمجھنے لگے ہو، ناقابلِ شکست سمجھ لیا ہے تم نے اپنے آپ کو۔ تم یہ نہیں جانتے کہ ایک بڑی اور مکمل فتح کے لیے چھوٹی چھوٹی پسپائیاں اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔ دشمن کو فریب میں مبتلا کرنے یعنی اُس کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کرنے کے بعد ہی اس پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اب تم سیدھے ہو کر دروازے کی طرف بڑھو اور شرافت سے ہمارے ساتھ چلے چلو ورنہ اپنی موت کے ذمے دار خود ہی ہو گے اور ہاں، وہ تمھارا یار اسلم آبی کدھر ہے؟"

"وہ یہاں نہیں ہے اسی لیے تم دونوں نے مجھے قابو کر لیا، اگر وہ ہوتا تو صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہوتی۔" میں نے کہا۔

اس عرصے میں اُس کا دوسرا ساتھی جسے اُس نے جانی کہہ کر مخاطب کیا تھا فردوسی بیگم کے جکڑ بند کھول چکا تھا۔ مگر وہ آزاد ہونے کے بعد بھی اسی طرح بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ ان لعنتی لوگوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا شاید یا دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی وہ۔ میں اُس شخص کے ساتھ اچھی خاصی اونچی آواز میں باتیں کرتا رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح ہماری آوازیں آبی کے کانوں تک پہنچ جائیں جو کمرے کے ساتھ والے کمرے میں سو رہا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آبی بہت بے خبر سو رہا تھا شاید۔ میں اُن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکل کر میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں خود کو آزاد کرا لیتا۔ وہ مجھ سے کوئی آٹھ دس قدم پیچھے تھے۔ میں دروازے سے نکل کر تیزی سے آبی کے کمرے میں گھس کر اپنے آپ کو ان کی دسترس سے محفوظ کر سکتا تھا، مگر میرے اس عمل سے فردوسی بیگم کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہ مجھے فردوسی بیگم کو ساتھ لے جانے یا اُسے گولی مار دینے کی دھمکی دے کر مجبور کر سکتے تھے لہٰذا میں نے ایسی کوئی حرکت کرنا مناسب نہیں سمجھا جس کا نتیجہ بربادی یا شرمندگی کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ دوسری بار سامنے آنے پر وہ مزید کسی کارروائی سے باز رکھنے کیلیے مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ انھیں ہر حالت میں کرنا تو یہی تھا۔ اس آٹزک نے میرے سر کا سودا کر لیا تھا، اُسے اب میری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میرا وجود تو اب اس کے لیے ایک مستقل جان لیوا روگ ہی بنا ہوا تھا۔ اگر جلد از جلد مجھے ختم نہیں کرتا وہ تو کسی وقت میں خود اُس کی جان لے لیتا۔ میں اپنی اس سوہنی دھرتی پر اس کا وجود ایک لمحے کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بات وہ خوب اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے میری حیات کی ڈور کاٹ دے ورنہ موقع ملنے پر یہ کام میں کر دیتا اس کے ساتھ۔ اُس نے مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار کر ہلاک کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی، اسی لیے اپنے لوگوں کو ہدایت کی ہوئی تھی کہ مجھے اس تک زندہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا کرنا کسی طرح ممکن نہ رہے تو پھر میری لاش بھی قابلِ قبول ہو گی اس کے لیے۔ کسی یہودی سے یہ توقع ہی فضول ہے کہ وہ اپنا وعدہ، قسم یا عہد ہر حالت میں پورا کرے گا۔ ایسے زبان کے پکے نہیں ہوتے یہ لوگ، ریا اور فریب ان کے ضمیر میں اتنا زیادہ ہے کہ ایسی باتوں کی بالکل پروا نہیں ہوتی انھیں۔

وہ دونوں بھی یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ میں فردوسی بیگم کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گا۔ لہٰذا وہ بڑے مطمئن انداز میں مجھ سے خاصا فاصلہ رکھ کر کمرے سے نکلے تھے۔ پستول اب ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ جیسے ہی کمرے سے باہر آئے، اچانک جانی نے پستول ہاتھ سے پھینک کر دوسرے ہاتھ سے اُس ہاتھ کی وہ کلائی تھام کر رانوں کے درمیان دبالی جس میں وہ پستول پکڑے ہوئے تھا۔ اُس کی یہ حرکت اس قدر اچانک اور اضطراری تھی کہ وہ دوسرا شخص کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا، پھر اس سے پہلے کہ وہ جانی کے ہاتھ سے بہتا ہوا خون دیکھ کر کچھ سمجھ سکتا خود اُس کے ہاتھ سے بھی پستول چھوٹ کر الگ جا گرا اور وہ بھی بلبلاتے ہوئے خالی ہاتھ سے اپنا پستول والا ہاتھ تھام کر نیچے بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے زور زور سے بولنے کی آواز سن کر ضرور آبی بیدار ہو گیا ہے۔ وہ بستر سے اُٹھ کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے فردوسی بیگم کے کمرے کی طرف آیا ہو گا مگر دروازے سے ہماری باتوں سے اصل حقیقت جان کر واپس ہو گیا ہو گا اور پستول پر سائلنسر چڑھا کر ان دونوں کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا ہو گا، پھر وہ جیسے ہی باہر آئے اُس نے اُن دونوں کو باری باری نہتا اور معذور کر کے میری مشکل آسان کر دی۔ یہ محض میرا اندازہ تھا، حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ان دونوں کو اپنے اپنے ہاتھ دبائے اذیت سے منہ بناتے دیکھ کر میں نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے گرے ہوئے دونوں پستول اٹھا لیے اور انھیں حقارت سے دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا "اب کیا حال ہے میرے بچو! اپنے باس کی فتح یابی کے بارے میں اب کیا رائے ہے تمھاری؟"

اسی وقت چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ پوری گیلری بقعۂ نور بن گئی۔ میں نے فوراً چونک کر اُدھر دیکھا جدھر سوئچ بورڈ تھا۔ اور میری آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ وہاں آسیہ ہاتھ میں ایک سائلنسر چڑھا ہوا پستول لیے کھڑی تھی۔ میں جسے آبی کا کارنامہ سمجھے ہوئے تھا، وہ کام اصل میں آسیہ نے کیا تھا۔ آسی نے بے آواز فائر کر کے ان دونوں کے ہاتھوں کو پستول پکڑنے کی طاقت سے محروم کیا تھا۔ حیرت کی بات میرے لیے یہ تھی کہ گیلری میں نیم تاریکی تھی۔ کوئی چیز واضح اور صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں بالکل ٹھیک نشانے پر لگی تھیں۔ ایسی ماہر نشانہ باز ہو چکی تھی وہ میری بہن جو کبھی پٹاخے کی آواز سن کر سہم جاتی تھی اور چھپتی پھرتی تھی کونے کھدروں میں۔ اچانک مجھے اُن کے اس چوتھے ساتھی کا خیال آ گیا جو باہر بیرونی دروازے پر کھڑا انتظار کر رہا تھا ان تینوں کی واپسی کا۔ میں نے جلدی سے آسیہ کو آواز دے کر کہا "آسیہ! لائٹ بند کر دو یہاں کی، ان کا ایک اور ساتھی باہر بیرونی دروازے کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ روشنی دیکھ کر وہ چوکنا ہو جائے گا اور خطرہ محسوس کر کے نکل بھاگے گا یہاں سے۔ میں اُسے ان کے ساتھ ہی باندھنا چاہتا ہوں۔"

آسیہ نے فوراً لائٹ بجھا دی اور میرے قریب آ کر بولی۔ "انھیں باندھنا کیوں چاہتے ہیں بھائی جان؟ ایک ایک گولی اُتاریں ان کتوں کے سینوں میں اور ٹھنڈا کر کے کسی گندے نالے میں پھنکوا دیں۔ وقت نہ برباد کریں اپنا ان پر۔"

"طے تو میں نے یہی کیا ہے، لیکن پہلے ان کا دیدار کرا دوں باقی لوگوں کو اس کے بعد کرنا یہی ہے ہمیں ان کے ساتھ۔" میں نے جواب دیا اور ان دونوں کے پیچھے جا کر بولا "تو اُدھر جا کے آبی کو جگا دے آسیہ! اور اسے اِدھر بھیج کے فردوسی بیگم کے پاس چلی جا، وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ ان ذلیل کتوں نے پتا نہیں کیا کیا ہے۔ صرف دہشت کے مارے تو ہوش گم کر دینے والی عورت وہ ہے نہیں۔"

آسیہ جلدی سے آبی کے کمرے میں جا گھسی۔ میں نے پیچھے سے ان دونوں کی گردنوں میں ہاتھ ڈال کر باری باری ان کی رگِ احساس مسل ڈالی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی تکلیف سنبھال کر چپ چاپ جہاں بیٹھے تھے وہیں لمبے لمبے لیٹ گئے۔ ان دونوں سے فارغ ہو کر میں نے گیلری میں لگی گرل کے ساتھ کھڑے ہو کر عمارت کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ شخص جسے میں نے لوہے کے گیٹ

سے لگا دیکھا تھا، شاید آسیہ کے گیلری میں روشنی کرنے سے چوکنا ہوگیا تھا، اس نے خطرے کی بو محسوس کر لی تھی یا ممکن ہے روشنی میں اُس نے آسیہ کو اور مجھے گیلری میں پُراسرار طور پر حرکت کرتے دیکھ لیا ہو، وہ دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن سنبھالے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اوپر آنے کے لیے زینوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پستول سیدھا کرکے اُسے نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ میں گولی چلاتا وہ زینے میں داخل ہوگیا۔ میں بے آواز دوڑتا ہوا آبی کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور آسیہ کو دھیمی آواز میں کہا: "آسیہ! ابھی باہر نہ نکلنا جب تک میں نہ کہوں اور آبی کو بھی روکے رکھنا اندر ہی۔"

اُسے ہدایت دے کر میں اُسی طرح بے آواز دوڑتا ہوا زینے کے دروازے کی آڑ میں جا ٹھہرا۔ نیچے سے آنے والا بہت ہی محتاط انداز میں اوپر چڑھ رہا تھا، اُس کے قدموں کی ہلکی سی آواز بھی سیڑھیوں پر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد مجھے احساس ہوا جیسے کوئی شخص اوپر آخری سیڑھی پر کھڑا ہے، مجھے اس کی سانسوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید اوپر آنے کے بعد آخری سیڑھی پر رُک کر ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ وہ گیٹ کے پاس تیز روشنی میں کھڑا رہا تھا لہٰذا گیلری کے نیم تاریک ماحول میں اسے دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگا سانس روکے اُس کے سیڑھیوں سے باہر قدم رکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ چند ہی لمحے کے بعد میں نے اس کا پاؤں آگے بڑھتے دیکھا اور جیسے ہی اُس کا دوسرا پاؤں باہر آیا، میری ٹانگ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آگئی دوسرے ہی لمحے وہ دھپ کی آواز کے ساتھ اوندھے منہ گیلری میں آگرا، گرتے ہوئے اسٹین گن اس کے سینے کے نیچے دب گئی تھی۔

میں اس کے گرتے ہی اس پر جھپٹا تھا مگر وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پُھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوٹ لگا کر سیدھا ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنی اسٹین گن تیزی سے میری طرف سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ سیدھا ہوگیا تھا۔ لبلبی دبا کر مجھے گولی کا نشانہ بنانے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا اور نہ ہی میں اتنی مہلت دینے کو تیار تھا اُسے، لہٰذا اُس کے پلٹتے ہی میری ٹھوکر اس کے بائیں پہلو میں عین اُس جگہ پڑی جہاں گُردہ ہوتا ہے۔ وہ تڑپ اٹھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی اسٹین گن چھوٹ کر اُس کے سینے پر گری تھی۔ میری دوسری ٹھوکر اُس کے چہرے پر لگی، اِس کے ساتھ ہی میں نے لات مار کر اسٹین گن اُس کے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور پھینک دی۔ اسٹین گن اُس کی پہنچ سے ذرا دُور ہوگئی مگر میری ٹانگ اس کی گرفت میں آگئی۔ اُس نے لیٹے ہی لیٹے میرے پاؤں کا پنجہ اور ایڑی تھام کر اُسے موڑنا شروع کر دیا اور پھر اچانک جھٹکے سے اوپر اُچھال دیا۔ میرے لیے اپنا توازن قائم رکھنا ممکن نہیں رہا، میں سنبھلنے کی انتہائی کوشش کے باوجود کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گر پڑا۔ وہ میرے نیچے گرتے ہی اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے اسٹین گن اٹھانے کے لیے لپکا، میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اُٹھ کر اُسے پکڑنے اور اسٹین گن حاصل کرنے سے روک سکتا لہٰذا میں نے لیٹے ہی لیٹے اسٹین گن کی طرف جست لگائی اور عین اسی لمحے جب وہ اسٹین گن اُٹھانے کے لیے نیچے جھکا تھا، میں اس پر جا گرا اور بجلی جیسی تیزی کے ساتھ اسٹین گن کو نال سے پکڑ کر دُور پھینک دیا۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ میری دونوں ٹانگیں اُس کے سینے پر اس زور سے پڑیں کہ وہ اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔ میں نے اُٹھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی تھی۔ بہت ہی تیزی سے اٹھ کر اُس پر جا پڑا تھا۔ میں اُسے کسی صورت پر بھی اسٹین گن دوبارہ حاصل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، اُس کی بھی تمام تر کوشش یہی تھی، وہ بھی مجھے اسٹین گن پر گرفت کرنے کی ذرا بھی مہلت دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اس بات کو خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم میں سے جسے بھی اسٹین گن حاصل کرنے کا موقع مل گیا وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرے گا دوسرے کے بدن کو گولیوں سے چھلنی کرنے میں۔ ہم دونوں ہی کی زندگی کا دار و مدار اس پر تھا کہ دوسرا اسٹین گن حاصل نہ کر سکے۔ میں نے اُسے دبوچ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر وہ بھی کچھ کم جنگجو نہیں تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے پکڑ کر اُس نے مجھے پرے دھکیل دیا اور بہت ہی تیزی کے ساتھ اُٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی اُٹھنے میں اُسی جیسی چستی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"بس... بس... اب کھیل ختم میرے بچّو! شیر اور چیتے کی لڑائی سے فائدہ ہمیشہ بی لومڑی ہی کو ہوتا ہے۔" اچانک آبی کی آواز سنائی دی۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ نگاہ اٹھا کر آبی کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ آبی دروازے کے درمیان اپنا پستول تھامے کھڑا تھا اور اس سے دو قدم آگے آسیہ کھڑی تھی، اس کے ہاتھوں میں وہ اسٹین گن موجود تھی جس کے حصول کے لیے ہم دونوں زور آزمائی کر رہے تھے۔ بازی کو یوں اچانک اپنے ہاتھوں سے جاتے دیکھ کر میرے ساتھ زور آزمائی کرنے والے نے ایک لمحے آسیہ کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا: "ایک اکیلے اور نہتے آدمی پر دو آدمی ہتھیار تان کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی جواں مردوں والا کام تو نہیں ہے۔"

آبی مضحکہ اُڑانے والے انداز میں بولا: "ایسے مذاق تو نہ اُڑاؤ ہماری جواں مردی کا۔ دیکھتا نہیں ہے تو ہم میں سے ایک خاتون ہے اور تمھیں اصل خطرہ اس خاتون کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن ہی سے ہے۔ جبھی تو میں نے کہا تھا، شیر اور چیتے کی لڑائی میں فائدہ ہمیشہ بی لومڑی کا ہوتا ہے۔ تو کیا سمجھ رہا تھا کہ یہ بات میں نے اپنے لیے کہی تھی؟"

"کیا فرق پڑ جاتا اس سے اگر تو اپنے بارے میں بھی اسی خیال کا اظہار کر دیتا تو؟" میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ادئے کیا بک بک لائی ہے؟ تو زنانیوں میں شامل کرنے لگا ہے مجھے؟ عورت لگتا ہوں میں تجھے؟" آبی آنکھیں نکال کر بولا۔

ہمیں آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ کر اُس شخص نے موقع غنیمت جانا اور ایک دم پیچھے مڑ کر دوڑ لگا دی۔ اُسے بھاگتے دیکھ کر آسیہ نے للکار کر کہا۔ "بزدل، کمینے! رُک جاؤ نہیں تو میں گولی چلا دوں گی۔"

اس نے آسیہ کے للکارنے کی ذرا بھی پروا کیے بغیر برآمدے کی گرل کے پاس پہنچ کر دونوں ہاتھوں سے گرل تھام لی اور پھر اِس سے پہلے کہ آسیہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن کی گولیاں اُس تک پہنچتیں، وہ جیسے ہوا میں اُڑتا ہوا گرل کے اوپر سے گزر گیا۔ ہم تینوں دوڑتے ہوئے گرل کے پاس پہنچے، اِس دوران وہ نیچے لان میں پہنچ چکا تھا اور دوڑتا ہوا عمارت کے مین گیٹ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آسیہ نے دوبارہ اسٹین گن اُس کی طرف سیدھی کی مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح تھا۔ میں نے کسی شخص کو اتنا تیز دوڑتے ہوئے اس دن سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آسیہ، اسٹین گن سیدھی کرکے اس کا نشانہ ہی لیتی رہ گئی اور وہ پلک جھپکتے میں بغلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گولی چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں دُور دُور تک سنائی دی ہوگی۔ آس پاس کے گھروں میں اچانک چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ مکان کی لائٹیں جلائی جانے لگی تھیں اور ہر مکان کے مین گیٹ پر متقرر مسلح چوکیدار جلدی جلدی باہر نکل کر ایک دوسرے سے صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ چھلاوا نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا کہ کسی کو بھی نظر نہ آسکا تھا۔ میں نے آبی سے کہا: "یہ تو بہت بُرا ہوا آبی! تو اُدھر جا کر فیروز وغیرہ کو خبر کر جلدی سے، میں ان تینوں کو کسی کمرے میں ڈال دیتا ہوں اتنی دیر میں۔ بات پولیس تک ضرور پہنچے گی اب۔"

"ہاں یار! یہ تو بہت ہی بُرا ہوگیا۔ سالا کوئی بازی گر لگتا ہے مجھے تو۔ اتنے اوپر سے کودنے کے بعد بھی صحیح سلامت چلا گیا یہاں سے، کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے یہ، سالا کوئی جن وِن کی قوم سے لگتا ہے مجھے۔" آبی نے حیرانی سے کہا۔

"او جا یار! خواہ مخواہ وقت برباد نہ کر، ابھی ہمارے پاس حیران ہونے اور تبصرہ کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے، جا کر جلدی سے فیروز کو خبر کر، اس ناگہانی مصیبت سے نمٹ لیں پہلے پھر کہہ لینا جو کچھ بھی کہنا ہے تجھے۔" میں نے اُسے اوپر جانے والے راستے پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آسیہ کے ساتھ مل کر ان تینوں بے ہوش پڑے ہوئے آدمیوں کو اُٹھا کر آبی کے کمرے میں ڈال دیا اور ایک چادر پھاڑ کر اس کی پٹیوں سے اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر نکلے تو اسی وقت آبی کے ساتھ فیروز، انور کمال اور گل زمان تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ فیروز نے گرل کے پاس رک کر عمارت کے مین گیٹ کے کھُلے ہوئے بغلی دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا: "انور کمال! تم فوراً گیٹ پر پہنچو اور باہر موجود لوگوں میں گھُل مل کر اسی طرح اس واقعے کے بارے میں سوالات کرنا جیسے تمھیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو، اگر کوئی اس خیال کا اظہار کرے کہ گولی چلنے کی آواز ہمارے گھر سے آئی تھی تو تم اس کی نفی کر دو گے اور لوگوں کو یہ یقین دلاؤ گے کہ اس سلسلے میں تم بھی دوسروں سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر انور کمال تیزی سے نیچے چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد فیروز میری طرف مڑ کر بولا: "کون شخص تھا یہ غلام جیلانی! کچھ اندازہ کیا ہے تم نے؟"

"شخص نہیں تھا وہ اشخاص تھے برادر! چار آدمی تھے وہ اور فردوسی بیگم کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ تو میں بروقت پہنچ گیا ورنہ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اِدھر کیا ہوگیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اِس آئزک کے بچّے کو اس جگہ کا پتا کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"اوہ، چار آدمی تھے! یہ تو اور بھی زیادہ حیرت کا مقام ہے۔ بقول تمھارے وہ آدمی آئزک کے تھے تو کیسے بزدل اور کم ہمت تھے وہ کہ ذرا دیر بھی جم کر مقابلہ نہیں کر سکے اور معمولی درجے کے چور اُچکّوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔" فیروز نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سب نہیں بھاگے ہیں یار! تین اُدھر لیٹے ہیں آرام سے، بس ایک ہی بھاگا ہے، وہ کسی نٹ کی اولاد تھا شاید۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، تو تین کو تم پکڑنے میں کامیاب ہوگئے ہو، کیا کہتے ہیں وہ؟ آئزک نے بھیجا تھا انھیں؟" فیروز اس کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا جس میں ان تینوں کو باندھ کر ڈال دیا تھا ہم نے۔

میں نے اُس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا: "ابھی وہ کوئی بیان دینے کے قابل نہیں ہیں، بہت گہری نیند سو رہے ہیں۔ ایک گھنٹے سے پہلے تو وہ حرکت کرنے کی بھی کوشش نہیں کریں گے۔ ویسے ان سے سوال جواب کرکے وقت ضائع نہ کرنا فیروز میاں۔"

فیروز کمرے کے دروازے میں رک کر میری طرف مڑ کے چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا "میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا جیلانی!"

"مطلب یہ ہے کہ ابھی اس کام کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ سب سے پہلے تو ہمیں پولیس کو یہاں تک پہنچنے سے روکنے کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ میں، آبی اور آسیہ ہم تینوں ہی پولیس کو مطلوب ہیں۔ اگر حقیقتِ حال جاننے کے لیے پولیس یہاں آئی اور ہم میں سے کسی کی جھلک بھی نظر آ گئی اس کو، ہماری یہاں موجودگی کا شبہ بھی ہو گیا اُنھیں، تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا اُن سے، اور تم لوگ بھی بلیک لسٹ ہو جاؤ گے۔ بے شمار اُلجھنیں اور پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی ہم سب کے لیے۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

وہ مسکرا کر بولا "اس کی تم فکر نہیں کرو۔ انور کمال کو میں نے اسی لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ کسی کو اس طرف نہیں آنے دے گا۔ کسی کو پتا ہی نہیں چل سکے گا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی۔ لوگوں نے نیند کی حالت میں گولی چلنے کی آواز سنی تھی چنانچہ کوئی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ گولی کی آواز کسی مکان سے آئی تھی یا سڑک سے اور یہ کہ حقیقتاً وہ آواز گولی چلنے کی ہی تھی یا نہیں، کسی گاڑی کے بیک فائر کی آواز بھی تو ہو سکتی ہے وہ۔ انور کمال ان لوگوں کو اس طرف بہرحال نہیں آنے دے گا، یہ اطمینان رکھو تم۔"

میں نے اس کے ساتھ کمرے میں قدم دھرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ ٹھیک ہی سہی پھر بھی احتیاط تو کرنا ہی چاہیے نا ہمیں۔ ان تینوں کو اور آسیہ وغیرہ کو ہمیں اس حصّے سے فوری طور پر ہٹا دینا چاہیے۔"

"رات کے اس پہر میں اگر ہم ان لوگوں کو لے کر یہاں سے نکلے تو کیا علاقے کے لوگ متوجہ نہیں ہو جائیں گے ہماری طرف؟" فیروز بولا۔

"میں یہاں سے باہر نکلنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ مکان کے اس حصّے سے نکال کر اُدھر لے جانے کو کہہ رہا ہوں، جدھر ہم رہتے ہیں۔"

"کیوں، ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟ اگر پولیس کے آنے کا ہی خوف ہے تو یہ کام تو ہم پولیس کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں یار! اس کے لیے اتنی جلد بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" فیروز تینوں حملہ آوروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"میرے یار! بات صرف پولیس ہی کی نہیں ہے۔ یہ بھی تو خیال کرو کہ اس کتّے آئزک کو اس جگہ کا پتا چل گیا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"تمھارا کیا خیال ہے آئزک کو جب اس جگہ کا علم ہو ہی گیا ہے تو کیا وہ اُس جگہ سے واقف نہیں ہو گا جہاں تم لے جانا چاہتے ہو انھیں؟"

"ہاں، اُس جگہ کا علم نہیں ہے اسے۔ یہ بات میں پو... سے کہہ سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ میری طرف مڑ کر حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے... "تم کیسے کہہ رہے ہو؟ یہ یقین کیوں ہے تمھیں کہ وہ اس... نہیں رکھتا؟"

"سیدھی سی بات ہے یار۔ حیرت ہے تمھاری سمجھ... آ رہی ہے میرے بھائی! وہ فردوسی بیگم کو اسی لیے تو اُٹھا کر... چاہتے تھے کہ اس سے ہمارا پتا معلوم کریں، اُسے پکڑ کر ہمیں... اُوسامنے آنے پر مجبور کریں۔ ورنہ اس سے کیا دلچسپی ہے... کا صاف مطلب یہی ہوا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ اسی مکان... پر جو مکان ہے وہاں میں موجود ہوں۔ اگر وہ یہ جانتے ہوتے... بیگم کو اٹھوانے کے بجائے پوری قوت سے عمارت کے... پر دھاوا بولتے جہاں میں موجود تھا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"ہاں، تمھاری بات سمجھ میں آتی ہے جیلانی! اس کا... یہ ہے کہ آئزک یا اس کے کسی آدمی نے فردوسی بیگم کو... لیا ہے کسی طرح۔ شاید وہ برآمدے یا کھڑکی میں کسی باہر... والے کو دکھائی دے گئی تھی اور انھوں نے رات ہوتے ہی... کر دی یہاں۔ چونکہ پہلا ہی کمرا فردوسی بیگم کا تھا۔ اس لیے... سے پہلے وہی مل بھی گئی انھیں۔ مگر تم یہاں کیسے پہنچ گئے...؟"

میں نے اسے اپنے اِدھر آنے کے بارے میں بتا... بعد کہا "میں بہت بروقت پہنچا تھا، اسی لیے ان لوگوں کو... بیگم کے ہی کمرے میں جا پکڑا، اگر میں نہ آتا تو وہ فردوسی بیگم... باندھنے کے بعد دوسرے کمروں کی بھی تلاشی لیتے اور پھر... آسیہ بھی ہتھے چڑھ جاتے ان کے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم... میں بری طرح مارے جاتے یار! برباد کر دیا تھا ان ر... نے تو ہمیں۔"

"لیکن اللہ کو یہ منظور نہیں تھا، اسی لیے وہ کامیاب... ہو سکے اپنے ارادوں میں۔ ابھی وہ اس ملک کے لوگوں پر... دراز کیے ہوئے ہے۔ وہ موقع دے رہا ہے... تنبیہ کر کر کے چھوڑ رہا ہے کہ ہم راہِ راست پر آ جائیں... ترک کر دیں، ایک دوسرے کے حقوق اور دکھ درد کا احسا... دولت کی پوجا نے ہمیں بے حسی اور بے ضمیری کی جس دلد... اتار دیا ہے، اس سے نکل آئیں تو بہتر ہے ورنہ وہ... پناہ سے نکال دے گا تو کہیں امان نہیں مل سکے گی۔"

مطلب ہے اس کا۔" فیروز نے کہا۔

"ہاں بھائی! مطلب تو یہی ہے اس کا۔ وہ خالق... وہ مالکِ کُل یوں ہی تو رسّی دراز نہیں کرتا کسی کی۔ وہ... سنبھلنے کے لیے موقع فراہم کرتا رہتا ہے، وقت دیتا ہے کہ اب بھی اصلاح کر لو اپنی، بچا لو خود کو برباد ہونے سے، مگر ہم لوگ اس کی اس بار بار کی تنبیہ کے باوجود ڈھیٹ بنے ہی چل رہے ہیں اب تک۔ بربادی کے کنارے سے سلامت لوٹ آنے کو اپنا کارنامہ، اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ قرار دے کر دوسروں کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کی طرف سے ملنے والی مہلت کو اپنی کامیابی اور کامرانی قرار دیتے ہیں۔ ایک لمحے کو بھی اسے خداوندکریم کی مہربانی سمجھ کر اس موقع کو اپنے لیے غنیمت نہیں جانتے، ایک بار بچ جانے کے بعد دوبارہ توبہ کر کے اس راہ کو ترک کرنے کے بجائے اسے کلید سمجھنے لگتے ہیں کامیابی کی، یہی وجہ ہے کہ ہم تیزی سے اجتماعی خودکشی کی راہ پر گامزن ہیں۔"

"جب اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں کو انصاف سے محروم کر دیا جاتا ہے تو ایسے ظالم اور جابر لوگوں کو وہ چنگیز اور ہلاکو جیسے لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ بھی اس ظلم کا مزہ چکھ لیں جو دوسروں پر کرتے رہے ہیں۔ یہ نظام ہے قدرت کا، جو اپنے لیے جس راہ کا انتخاب کرتا ہے، وہ ربِ کُل جہانوں کا، اسے اسی راہ پر لا ڈالتا ہے۔ اس سے نجات نہیں ہے کسی کے لیے بھی۔ اس کے لیے تو تمام ہی انسان ایک جیسے ہیں، سب اسی کی تخلیق ہیں اور کسی کو اپنی تخلیق مٹانے یا بگاڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا وہ۔" فیروز بولا۔

"اچھا، اب ان تینوں کو لے کر چلو یہاں سے، ایسا نہ ہو کہ ہم باتیں کرتے رہیں اور وہ جو نکل بھاگا ہے بچ کر، ایک پوری فوج لے کر آ چڑھے ہم پر۔ یہ تو وہ جان ہی چکا ہے کہ اس کے باس کے تمام مطلوبہ لوگ جمع ہیں یہاں پر۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ وہ ہمیں نکلنے کا موقع نہیں دیں گے یہاں سے۔ واپس آئیں گے ضرور ہمیں گھیرنے کے لیے۔"

وہ تین آدمی تھے، ہم تینوں نے ایک ایک کو کندھے پر ڈال لیا اور لے جا کر ایک خالی کمرے میں بند کر دیا۔ اس دوران آسیہ کی کوششوں نے فردوسی بیگم کے ہوش بحال کر دیے تھے اور وہ اسے ساتھ لے کر دوسری طرف آ گئی تھی۔ انھیں اس طرف چھوڑ کر ہم دوبارہ اس حصّے میں واپس پہنچ گئے۔ انور کمال بھی واپس آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے، کسی کو یہ شبہ تک نہیں ہو سکا کہ گولی ہمارے مکان میں چلی تھی۔ لوگوں کا خیال ہے چونکہ گولی کی آواز کے ساتھ کسی انسان کی چیخ نہیں سنی گئی اور گولی بھی صرف ایک ہی بار چلی تھی۔ لہٰذا یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے، شاید قرب و جوار میں کہیں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ سب لوگ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے ہیں، کسی نے پولیس کو بھی اطلاع نہیں دی، کیونکہ کوئی خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑ کر اپنی نیند خراب کرنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت تو بات ٹل گئی ہے لیکن اب ہمیں فوری طور پر کسی اور ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"ہاں، یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے جیلانی! صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے ہمیں۔ یہ مکان اب محفوظ نہیں رہا ہے۔"

مکان کے اس حصّے کو یوں ہی چھوڑ کر ہم سب واپس آ گئے۔ نیندیں سبھی کی اُڑ چکی تھیں۔ یوں بھی صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ سوا چار بج رہے تھے اس گھڑی۔ ہم ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ آسیہ اور فردوسی بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ فردوسی بیگم نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا "کون لوگ تھے، یہ کچھ پتا چلا؟"

آبی جلدی سے بولا "فرشتے تھے، تمھیں لینے آئے تھے، کہتے تھے تمھارے بغیر جنت میں رونق نہیں رہی ہے اور اُن کا دل گھبرانے لگا ہے وہاں۔ اسی لیے تمھیں لینے آئے تھے وہ۔"

میں نے کہا "اوئے کھوتے دے پُتر، کبھی وقت موقع بھی دیکھ لیا کر۔ ہر ویلے بکواس اچھی بات تو نہیں ہے۔"

وہ معصوم سی صورت بنا کر بولا "اچھا یار! اب نہیں بولتا میں، بتا دے تو خود ہی جو کچھ بتانا چاہتا ہے، مگر دیکھ جھوٹ بول کر اس غریب کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہ کرنا، یہ بات تیری مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی ہے، تو اس بے چاری کو جھوٹے دلاسے دیتا رہتا ہے ہمیشہ۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ یہ صرف تیری خاطر اپنا گھر چھوڑ کر یوں جان ہتھیلی پر لیے پھر رہی ہے۔"

میں نے اُسے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے

۶ حصے مکمل مفرور

۲ حصے مکمل طالوت

۵ حصے مکمل صدیوں کا بیٹا

کتابی شکل میں تیار ہیں

آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

"اوئے ذلیل آدمی! یہ تُو نے بی جمالو والا کام کب سے شروع کر دیا ہے؟ شرم نہیں آتی تجھے یہ دوغلا پن کرتے ہوئے۔ ہمدردی کی آڑ میں دشمنیاں بونے لگا ہے تو۔"

فیروز ہنستے ہوئے بولا۔ "نہیں یار! غصّہ نہ کر اس اپنے یارِ غار پر، اس کا دَم بڑا غنیمت ہے ہمارے درمیان۔ ایسے لوگ جو اس قدر اعصاب شکن ماحول میں بھی ہنستے ہنساتے رہیں، آدمی کے لیے ٹانک سے کم نہیں ہوتے۔"

آبی ایک دم دونوں ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "اوئے بڑا غرق ہوگیا آبی تیرا۔ ان کے درمیان جوکر بن کر رہ گیا ہے تو۔ یہ مقام ملا ہے تجھے!"

انور کمال ہنس کر بولا۔ "آبی بھائی! اسی لیے تو بزرگوں نے کہا ہے 'پہلے تولو پھر بولو'، موقع بے موقع زبان چلاتے رہنے کا نتیجہ تو یہی ہوتا ہے۔"

آبی نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب بی بی مینڈکی کو بھی نال ٹھکوانے کا شوق ہوا ہے۔ کیوں بھئی؟"

"نہیں جناب! مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ۔ ہم اپنے بڑے بھائی کی شان میں گستاخی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔ "لعنت بھیجو یار! کس جھگڑے میں اُلجھ گئے ہو۔ دن کا اُجالا پھیلنا شروع ہوگیا ہے۔ دوبارہ رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں کسی دوسرے ٹھکانے کا بندوبست کر لینا چاہیے نہیں تو شاید کل کا سورج دیکھنا ہمیں نصیب نہ ہو۔"

آبی بولا۔ "اس شرافت علی کو فون کرو، اس کے پاس کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہوگی ایسی جہاں ہم ڈیرا ڈال سکیں۔"

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک کہا ہے آبی نے، شرافت علی ضرور کوئی انتظام کر سکتا ہے۔" فیروز بولا۔ "فردوسی بیگم! آپ سب لوگوں کے لیے ناشتے وغیرہ کا انتظام کریں۔ اس وقت تک دن پوری طرح نکل آئے گا، پھر ہم شرافت علی سے رابطہ قائم کریں گے۔"

"جی اچھا۔" فردوسی بیگم نے کہا اور اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

آسیہ بھی جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ "چلو میں بھی چل رہی ہوں تمھارے ساتھ۔ کچھ مدد ہی کروں گی تمھاری۔"

شرافت علی نے میری بات سنتے ہی کہا۔ "فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیلانی! گلشنِ اقبال میں ایک مکان ہے میرا جو ابھی پرسوں ہی خالی کرایا ہے میں نے محض اسی خیال سے کہ کبھی دشمن فیروز کے مکان تک جا پہنچا تو تم لوگ فوری طور پر ادھر منتقل ہو سکتے ہو۔ یہ بات اسی دن سے میرے ذہن میں تھی جس دن تم کو فیروز کی طرف منتقل ہونا پڑا تھا۔ لہٰذا اسی روز سے میں نے شہر کے مختلف علاقوں میں کرائے پر اُٹھے ہوئے اپنے مکانوں کو خالی کرانے کی مہم شروع کر دی تھی تاکہ بوقتِ ضرورت انھیں کام میں لایا جا سکے اور دیکھو، میرا اندازہ درست ہی نکلا، آج اس کی ضرورت پڑ ہی گئی۔ تم انتظار کرو میں آ رہا ہوں تمھارے پاس، اس دوران تیاری کر لو تم سب لوگ یہاں سے نکلنے کی۔ اب اس مکان میں زیادہ دیر ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے مجھے۔"

"یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا ہے یار!" میں نے کہا۔ "تم میں ایک یہ بڑی خوبی ہے کہ تم ہر قسم کے حالات کا پہلے ہی سے اندازہ کر لیتے ہو اور اُن کے نتائج کا مقابلہ کرنے کے لیے بروقت تیار رہتے ہو۔ بہرحال تم آؤ، یہاں سب لوگ تیار ہی ملیں گے تمھیں۔"

میں نے ریسیور کریڈل پر ڈالا تو فیروز نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا ہوا بھئی، کس بات پر اتنی تعریف کر رہے تھے تم اس کی؟"

میں نے اسے بتایا کہ شرافت علی نے پہلے ہی سے ایسی کسی ضرورت کے پیشِ نظر چند مکانوں کا بندوبست کر لیا ہے جو ضرورت پڑنے پر کام آتے رہیں گے ہمارے۔ "کیا یہ بات قابلِ تعریف نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں۔ یہ شخص تو یار بہت ہی ذہین اور دور اندیش ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ خوش بختی ہے ہماری جیلانی! ایسا مخلص اور ذہین آدمی ہمیں عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ نے۔" فیروز جلدی سے بولا۔

"ہاں یار! یہ شخص بہت کام آ رہا ہے ہمارے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر شرافت علی کا تعاون حاصل نہ ہوتا ہمیں تو وہ آئزک پتا نہیں کیا حشر کر چکا ہوتا اب تک ہمارا۔" آبی نے فیروز کی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور کمال نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹیلی فون ریسیو کیا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "جیلانی صاحب! آپ کا فون ہے، کوئی خاتون بات کرنا چاہتی ہیں آپ سے۔"

"لزی ہوگی شاید۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور کون خاتون ہو سکتی ہے اس کے سوا، جو مجھ سے بات کرے گی یہاں۔"

وہ لزی ہی تھی۔ میری آواز سُن کر وہ بولی۔ "کیسے ہیں جناب آپ؟ ٹھیک تو ہیں نا آپ بالکل؟"

"جی ہاں لزی بیگم! فی الحال تو میں بالکل خیریت سے ہوں اور تمھاری خیریت خداوندِ کریم سے نیک مطلوب ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر خوش دلی سے بولی۔ "خدا نظرِ بد سے بچائے اس وقت طبیعت بہت موزوں معلوم ہوتی ہے آپ کی۔"

"لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں نے شعر وغیرہ کہنے کا کوئی نامعقول کام شروع کر دیا ہے اب۔" میں نے فوراً کہا۔

"ارے ارے، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ جنابِ عالی! شعر کہنا نامعقول کام ہے آپ کی نظر میں۔ ادبِ لطیف کی توہین کر رہے ہیں آپ۔"

"زیادہ وکالت نہ کرو اس بے ہودگی کی۔ جو لوگ دنیا میں کوئی کام نہیں کر پاتے وہ شیخ چلی کی طرح خواب دیکھتے ہیں اور ان خوابوں کو خوب صورت الفاظ میں لپیٹ کر بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کو کم از کم میں تو معقول آدمی نہیں کہہ سکتا۔"

"خیر چھوڑیں ان فضول باتوں کو، یہ ہماری لائن ہی نہیں ہے تو ہم کیوں اس موضوع پر سر کھپا رہے ہیں اپنا۔" وہ بولی۔

"مجھے تم سے مکمل اتفاق ہے۔ یہ بتاؤ تم نے ماں جی کے سلسلے میں کیا کیا ہے؟ آج تک کی ہی مہلت ہے تمھارے پاس، یعنی آج اس کام کو کر دینا ہے تمھیں۔ شام تک ماں جی نہیں پہنچیں میرے پاس تو پھر میں اپنے طور پر کام شروع کر دوں گا۔" میں نے اُس سے کہا۔

"میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اس وقت۔ میں اُنھیں اس قید سے رہائی دلانے ہی جا رہی ہوں آپ میرا انتظار کریں۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تک ماں جی کو ساتھ لے کر پہنچ رہی ہوں میں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم آجاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں تمھارا، اور ہاں، وہ بالی کہاں ہے؟ اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تم نے؟ اُسے مت بھول جانا، اُس کو ضرور ساتھ لے کر آنا تم۔" میں نے کہا۔

"اوہ لیکن... لیکن... اسے آپ کیوں اتنی اہمیت دے رہے ہیں، صرف ایک ملازمہ ہی تو ہے نا وہ؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی حیثیت کچھ بھی ہو، مجھے ہر وہ شخص بے حد عزیز ہے جس کا مجھ سے کچھ بھی تعلق ہے۔"

"لیکن اُسے تو آئزک نے اپنی خدمت کے لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جنابِ عالی! اس کے لیے باقاعدہ جنگ کرنا پڑے گی مجھے۔"

میرے سینے پر ایک گھونسا سا لگا تھا۔ اس ذلیل یہودی نے بالی کو اپنی کنیز بنا لیا تھا۔ لُوٹ کا مال سمجھ رہا تھا وہ اسے اور یہ سمجھ لیا تھا اُس نے کہ میں بالی جیسی معصوم اور خدمت گزار عورت کو اس کی تحویل میں رہنے دوں گا۔ میں بھول جاؤں گا اُسے اور اس کی وفاداریوں کو۔ ایک معمولی ملازمہ سمجھ کر نظرانداز کر دوں گا یہ بھول تھی اُس کی، وہ معمولی ملازمہ اس جاں نثار حیدر کی آبرو تھی جس نے میری ماں جی پر اپنی جان نثار کر دی تھی، جو دشمن کی راہ میں ایسی دیوار بن گیا جسے ڈھائے بغیر وہ ماں جی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے وہ دیوار گرا دی تھی، حیدر کو ہلاک کرنے کے بعد ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں حیدر کی عزت کو ایک لعنتی یہودی کے قدموں میں رُلنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ میں نے لزی سے کہا۔ "اگر تم بالی کو نہیں لا سکتیں لزی بیگم! اسے اس کُتے آئزک کے شکنجے سے آزاد نہیں کرا سکتیں تو ماں جی کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دو، میں خود ان کے لیے ان بھیڑیوں کے غار میں اُتر جاؤں گا اور یا تو ان دونوں کو وہاں سے نکال لاؤں گا یا خود بھی اُن کے ساتھ فنا ہو جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں، جنابِ عالی! ایسا نہ کہیں آپ، میں وعدہ کرتی ہوں جان کی بازی لگا کر بھی ان دونوں کو ساتھ لانے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔ بس آپ دعا کریں کہ ربّ العزت میرے وعدے کی لاج رکھ لے۔"

"نہیں، اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لزی بیگم! میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں، یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے، اسے مجھ پر ہی چھوڑ دو، میں خود نمٹ لوں گا اس سے۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اب ایسی باتیں تو نہ کریں جنابِ عالی! لگتا ہے آپ نے اب تک مجھے دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ میرا اور آپ کا مسئلہ الگ الگ تو نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم کسی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو اور دیکھو اگر کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے اطلاع ضرور کر دینا، میں فوراً پہنچ جاؤں گا تمھاری مدد کے لیے۔ وعدہ پورا کرنے کے چکر میں کسی پریشانی میں نہ ڈال لینا اپنے آپ کو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، اگر ایسا موقع آیا تو ضرور خبر کر دوں گی آپ کو، اب مجھے اجازت دیں۔" لزی نے سعادت مندی سے کہا۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ وہ دو گھنٹے کے اندر ماں جی اور بالی کو ساتھ لے کر یہاں آنے کو کہہ رہی ہے مگر اُسے اس جگہ کا پتا تو معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ آئے گی کس طرح؟ چنانچہ میں نے فوراً کہا۔ "لیکن تم یہاں آؤ گی کیسے؟ یہ جگہ تو تم نے دیکھی ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے یہاں کا پتا بتایا ہے تمھیں کبھی۔"

"پتا ہی تو نہیں بتایا ہے آپ نے مجھے، ٹیلی فون نمبر تو بتایا ہے نا۔ مطمئن رہیں، میں پہنچ جاؤں گی۔" لزی نے جواب دیا۔

اس کی بات سُن کر میری تو جیسے کھوپڑی اُڑ گئی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں آئزک کو لزی نے ہی تو پتا نہیں بتایا ہے میرا؟

حیرت کی زیادتی کے سبب میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ذہن میں ایک ہی بات چبھ رہی تھی۔ لزی ڈبل کراس کر رہی ہے، وہ ہمیں چھوٹے چھوٹے نقصانات سے بچا کر ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے بعد ہمارے درمیان جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئی اور اب جلد ہی وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آنے والی ہے۔ رات کی کارروائی اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ خیال چند لمحے کے تجزیے ہی آیا تھا۔ جن حالات سے میں گزر رہا تھا اور جو کچھ بیت چکی مجھ پر اس کے بعد ایسا ہونا فطری امر تھا۔ جب آدمی کے گرد دوست کم اور دشمن زیادہ ہو جائیں تو وہ اسی طرح چوکنّا رہتا ہے۔ ہر دم خطرات میں گھرا ہوا شخص اپنے سائے سے بدگمان رہتا ہے اور ایک پتّے کی آواز بھی اسے بھڑک اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں بھی اس وقت خوف ناک قسم کے درندوں سے بھرے ہوئے جنگل سے گزر رہا تھا اور ہر لمحے کسی گھنی جھاڑی، کسی تناور درخت یا کسی تاریک گوشے سے کسی درندے کے جھپٹ پڑنے کا خدشہ میرے دل میں موجود تھا اسی لیے میرا ہر موئے تن ہر وقت خطرے کی الاپ کرتا رہتا تھا۔ لزی کی طرف سے یہ بدگمانی اسی کیفیت کی غماز تھی۔

دوسرے ہی لمحے عقل نے میری رہنمائی کی۔ اگر لزی نے آرک کو اس جگہ کا پتا بتایا ہوتا تو وہ لوگ اس دوسرے حصّے میں جا کر فردوسی بیگم کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے ادھر ہی آتے اور یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ یہ بات تو رات ہی کو سمجھ چکا تھا میں، پھر بھی بہکنے لگا تھا اس وقت۔ وہ ساری کارروائی جس طرح کی گئی تھی اس سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ کارروائی کرنے والوں کو وہاں میری موجودگی کا یقین نہیں تھا۔ یہ یقین حاصل کرنے کے لیے ہی اتنے محدود پیمانے پر کارروائی کی گئی تھی۔ میری طرف سے اچانک خاموشی نے شاید لزی کو فکرمند کر دیا تھا۔ اس نے ہیلو، ہیلو، کہہ کر مجھے پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "ہاں... ہاں کہو کیا بات ہے؟ میں لائن پر موجود ہوں، سلسلہ منقطع نہیں کیا ہے میں نے۔"

وہ بولی "یہ آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے ہیں جنابِ عالی! کوئی بدگمانی تو سر نہیں ابھارنے لگی ہے؟"

"اوہ، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ خیال تمھیں کیسے آیا کہ میں کسی بدگمانی کا شکار ہونے لگا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کے اچانک خاموش ہو جانے سے یہ خیال آیا تھا مجھے۔ شاید آپ یہ سوچنے لگے تھے کہ میں نے آپ کا پتا آرک کو تو نہیں بتا دیا ہے۔ کیوں، ہے نا یہی بات؟ اندازہ تو غلط نہیں ہے نا میرا؟" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"ہاں، تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل نے یہ سوال کیا تھا۔" میں نے اسے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔

"کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے جنابِ عالی کہ یہ کیوں کیا تھا آپ کے دل نے؟ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اب تک آپ کی نگاہ میں معتبر نہیں ٹھہری ہوں؟" اس نے پژمردہ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے لزی! ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ بدگمانیاں سر ابھارنے لگتی ہیں اس طرح سے۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ آپ ایسی ہی باتیں سوچا کرتے ہیں۔ یہ آپ ... نہیں کر رہے ہیں میرے ساتھ؟" وہ بولی۔

"اگر تم میری جگہ ہوتیں لزی! اور وہ حالات جو مجھے پیش آ رہے ہیں، تمھیں پیش آتے تو تم بھی ایسا ہی کرتیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ اب کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟ مجھے بتائیں نا، کیا سوچا ہے آپ نے؟" لزی نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔" اس کے بعد میں نے اسے ... کے ہنگامے کی تفصیل بتانے کے بعد کہا "اب تم خود ہی بتاؤ لزی کیا میں ایسا نہیں کرتا؟ یہ الگ بات ہے کہ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تم پر کوئی الزام ثابت نہیں، اسی لیے تمھاری طرف سے دماغ میں کوئی غلط خیال قائم نہیں رہ سکا۔ ایسے ... ہر آدمی سب سے پہلے اپنے ارد گرد ہی نظر ڈالتا ہے۔"

وہ میری بات کاٹ کر بولی "شکر ہے آپ نے خود ہی اس بُرے خیال کو مسترد کر دیا ورنہ میرے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آدمی کے دل میں جو بات بیٹھ جائے ... جو خیال جو رائے قائم کر لی جائے اس سے پھیرنا ناممکن حد تک ... ہوتا ہے۔"

"لیکن ایک بات سمجھ میں اب تک نہیں آ سکی ہے میری کہ آدمی فردوسی بیگم تک پہنچے کس طرح آخر؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ باہر نکلی ہو اور کوئی اس کا تعاقب کر کے ... تک جا پہنچا ہو۔ یہ بات اتنی اہم نہیں میرے لیے جنابِ عالی! مجھے تو ایک اور ہی خیال پریشان کرنے لگا ہے آپ کی زبانی اس واقعے کی روداد سننے کے بعد۔" لزی نے کہا۔

"وہ کیا؟ کون سا خیال پریشان کر رہا ہے تمھیں؟ میں ... سکا کچھ۔" میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ سوچ رہی ہوں جنابِ عالی! اگر آرک نے ... کیا تھا تو مجھے اس کی خبر کیوں نہیں دی گئی؟ اسے اس کے ... مجھے ضرور بتانا چاہیے تھا بلکہ مجھ سے ڈسکس کیے بغیر اس ... کر ہی نہیں سکتا تھا وہ۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"ممکن ہے اس نے ضروری نہیں سمجھا ہو یا تم وقت پر اسے مل نہ سکی ہو۔ وہ اس کا پابند تو نہیں ہے نا؟" میں نے کہا۔

"یہ بات آپ اس لیے کہہ رہے ہیں جنابِ عالی کہ آپ کو تنظیم میں میری حیثیت، میرے مقام اور مرتبے کا علم نہیں ہے۔ میری یہاں موجودگی کی صورت میں آرک میرے مشورے اور مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ رات کے آپریشن کی مجھے اب تک کوئی اطلاع نہیں دی گئی، اس کی وجوہ دو ہی ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ کام تنظیم کا نہیں ہے، کسی نے تنظیم کے نام کو استعمال کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے یا پھر آرک ہائی کمان کو میری طرف سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ وہ میری طرف سے مشکوک ہو گیا ہے لیکن اس کی جانب سے مجھے کسی قسم کا خطرہ اس لیے نہیں تھا کہ محض شک کی بنا پر ہائی کمان میرے خلاف اس کی کسی بات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھ سکتی۔ میرا خیال ہے اس نے میرے خلاف باقاعدہ جاسوسی کر کے کچھ شواہد جمع کر لیے ہیں۔ ایسی صورت میں میرے لیے اب کھل کر اس یہودی کتے کے مقابل آ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔"

"اگر ایسا ہوا ہے تو یہ اچھا نہیں ہوا لزی بیگم! اب وہ ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے گا اور کسی اندھیرے گوشے سے چلائی جانے والی گولی کی طرح بالکل بے خبری میں ہم پر آ پڑے گا کسی وقت بھی۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"نہیں جنابِ عالی! اب بھی ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اگر نہ بھی رہوں اس کے ساتھ تب بھی اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ بڑی حد تک وہ پھر بھی میری نظروں میں ہی رہے گا۔ آخر یہاں کچھ میرے بھی ہمدرد ہیں، جنھیں وہ نہیں جانتا۔ لہٰذا اس کی ایک ایک حرکت کا علم تو ہوتا ہی رہے گا۔ اسے اندازہ نہیں ہے یہاں میرا گروپ بہت مضبوط ہے۔ اس نے اگر میرے مقابل آنے کی غلطی کی ہے تو یہ غلطی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ بہرحال ابھی کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ آپ میں سلسلہ منقطع کر رہی ہوں۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں بھی معلومات کرنا ہیں۔"

لزی کی باتوں نے میرے دل کی ساری کدورت صاف کر دی تھی۔ اس کی طرف سے میرے دل کا سارا غبار صاف ہو گیا تھا اور اس کی ذات پر میرا اعتبار متزلزل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا مگر اس کی جانب سے یہ فکر دامن گیر ہو گئی تھی کہ اگر آرک نے تنظیم کی ہائی کمان کو لزی کی تنظیم سے غداری کا یقین دلا دیا ہے تو اب لزی کسی بھی وقت زیرِ عتاب آ سکتی ہے۔ پتا نہیں تنظیم نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح کی خطرناک اور بڑی تنظیموں میں کسی ادنیٰ یا اعلیٰ شخصیت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی اس وقت جب یہ پتا چل جائے کہ اس کے کسی عمل سے تنظیم کو نقصان پہنچا ہے یا پہنچنے کا احتمال ہے۔ ایسے معاملات میں محض شبہے کی بنیاد پر بھی بڑے سے بڑے شخص کی جان لی جا سکتی ہے۔ پھر لزی کے ساتھ رعایت کیوں کی گئی ہے؟ اس کے خلاف کوئی فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا ہے؟ میں ریسیور تھامے گم صم کھڑا ان باتوں پر غور کر رہا تھا۔ فیروز نے مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر قریب آ کے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "کیا بات ہے جیلانی! کیا کوئی بُری خبر سنائی ہے اس وقت لزی نے۔ یوں گم صم کیوں ہو گئے ہو آخر؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور ایک بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "ہاں یار! بہت بُری خبر سنائی ہے اس نے۔"

آسیہ میری بات سنتے ہی ایک دم یوں اُچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی "کیا... کیا ہوا ہے بھائی جان؟ خیر تو ہے نا؟... ماں... ماں جی تو...؟"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ماں جی کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں، اللہ نے چاہا تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوں گی۔"

"اوہ، میں سمجھی تھی ماں جی کے بارے میں کوئی بُری خبر... مگر پھر کون سی خبر سنائی ہے اس نے آپ کو؟" وہ بولی۔

"وہ خبر خود لزی کے بارے میں ہے۔ تم مطمئن رہو، ماں جی کو چند گھنٹوں میں لے آئے گی وہ۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"لزی کے بارے میں کیا بُری خبر ہے؟ کس نے سنائی ہے یہ خبر تمھیں؟ تمھاری باتوں سے تو یوں لگ رہا تھا کہ فون پر تم لزی سے ہی باتیں کر رہے تھے۔" فیروز نے کہا۔

"فون لزی کا ہی تھا لیکن رات کو جو لوگ یہاں گھسے تھے اور فردوسی بیگم کو اُٹھا کر لے جانا چاہتے تھے، ان کے بارے میں لزی کچھ نہیں جانتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یا تو انھیں آرک نے نہیں بھیجا ہے، وہ کسی اور ہی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر خود اس کی پوزیشن خراب ہو گئی ہے تنظیم میں۔ آرک نے ہائی کمان کو اس کے خلاف کر کے یہ اختیار حاصل کیا ہو گا کہ لزی سے مشورہ کیے بغیر انھیں یہاں بھیج دیا۔ اس کا خیال ہے شاید آرک نے اس کے خلاف کچھ ثبوت حاصل کر کے ہائی کمان کو پیش کر دیے ہیں۔ وہ محض شک کا اظہار کر کے یہ اختیار حاصل نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے فیروز کو بتایا۔

فیروز چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ اگر آرک تنظیم کو لزی کے خلاف ثبوت پیش کر کے غدار ثابت کر دیتا تو وہاں سے سب سے پہلے لزی کو ٹھکانے لگانے کا حکم ملتا اسے۔ اس کے

بعد ہی کوئی اختیار دیا جاتا۔"

"بات تو تم نے بھی ٹھیک ہی کہی ہے۔ مگر پھر وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آئزک کے بندے ہیں۔"

"اس کی تم کیوں فکر کرتے ہو، یہ ہم ابھی اگلوا لیتے ہیں ان سے وہ خود بتا دیں گے، ان کا تعلق کس گروہ یا تنظیم سے ہے۔" فیروز بولا۔

گل زمان اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "اس کی تو پروا ہی نہ کریں جیلانی صاحب! آپ دیکھیں گے خود ہی، ان کی تو ایک ایک بوٹی منہ سے بولے گی ابھی ابھی آپ کے سامنے، وہ خود بتائیں گے، انھیں کس نے بھیجا ہے یہاں۔"

"ٹھیک ہے چلو معلوم کریں چل کر، لیکن رات ان سے جو باتیں ہوئی تھیں اس کے بعد مجھے پورا یقین ہو چکا ہے کہ وہ آئزک ہی کے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔

ان تینوں کو رات ہی سے باندھ کر ڈالا ہوا تھا ہم نے ایک ایسی کوٹھری میں جو کئی کمروں کے درمیان اس طرح بنائی گئی تھی کہ وہاں کوئی کتنی ہی قوت سے چیخے چلائے آواز باہر نہیں جا سکتی تھی اور اس کوٹھری سے ان کے فرار ہو جانے کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کئی کمروں سے گزرنے کے بعد اس کوٹھری تک پہنچنا ممکن ہوتا تھا تو ظاہر ہے کہ وہاں سے باہر آنے کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا تھا۔ انھیں باندھ کے ڈالنے کے باوجود ہر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ تربیت یافتہ گُرگے کسی طرح اپنے جکڑ بند کھولنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تب بھی اس عمارت سے باہر نکلنا آسان نہ ہو ان کے لیے۔ انور کمال کو آسیہ اور فردوسی بیگم کے پاس چھوڑ کر میں، فیروز اور گل زمان کے ہمراہ قیدیوں کی اس کوٹھری میں پہنچا تو وہ تینوں اسی طرح بندھے پڑے تھے جس طرح انور کمال اور گل زمان نے ان کو باندھ کر ڈالا تھا یہاں۔ ان دونوں کی لگائی ہوئی بندشیں ایسی زبردست تھیں کہ ان تینوں میں سے ایک بھی انھیں ڈھیلا تک نہ کر سکا تھا۔ انھوں نے تینوں کے ہونٹوں پر ٹیپ چپکا کر ان کی زبانیں بھی بند کر دی تھیں اور ان کے منہ بھی اس قابل نہیں چھوڑے تھے کہ وہ دانتوں سے ہی ایک دوسرے کی بندشیں کھولنے کی کوشش کر سکتے۔ وہ صحیح معنوں میں بالکل ہی بے دست و پا ہوئے پڑے تھے وہاں اور یقیناً ان کے جسموں میں لہو کی گردش بھی متاثر ہوئی تھی۔

میں نے ان میں سے ایک کے منہ پر سے ٹیپ ہٹا کر اس سے کہا "ہاں دوست! اب کیا حال ہے تمہارا؟ اور کیا کہتے ہو اپنے اس ناقابلِ شکست باس کے بارے میں جس کی شان میں بڑے رطب اللسان تھے رات کو تم؟"

وہ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "میں اب بھی یہی کہہ رہا ہوں، تم نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے بار... بارے میں۔ تم نہیں جانتے میرے جیسے پتا نہیں کتنے ... باس کے اوپر قربان ہونے کو تیار رہتے ہیں۔ میری بات مانو اپنی جوانی پر ترس کھاؤ، یہ عمر زندگی سے لطف اٹھانے کی ... اس عمر میں کوئی بھی سمجھ دار آدمی مرنا پسند نہیں کرتا ہے۔ ... پہنچ سے بہت دور کی چیز ہے، وہاں تک کسی کی میلی نظر ... پہنچ سکتی، اس سے دشمنی راس نہیں آتی ہے کسی کو بھی۔ ابھی ... صدق دل سے معافی مانگ کے اس کی اطاعت قبول کر لو ... لوگ۔"

میں نے طیش میں آ کر الٹا ہاتھ مارا اس کے منہ پر ...

"بچے! تو جانتا نہیں ہے مجھے اور افسوس اس بات کا ... یہودی سؤر کا انجام نہیں دیکھ سکے گا۔ تیری زندگی تجھے ... نہیں دے سکے گی۔"

"بکواس نہیں کرو، میں یہودی ہوں گا تو خود کتے تو ہمارے ... یہودی کی گالی دیتا ہے۔" وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔

فیروز مسکراتے ہوئے بولا "تیرا کیا خیال ہے ... کسی یہودی کو یہودی نہ کہیں تو کیا کہیں پھر؟"

"بکواس کرتے ہو تم لوگ، وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ... کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے شرم آنا چاہیے ..."

"پہنچے ہوئے بزرگ! میں ذرا حیرانی سے ... بات کر رہا ہے بھائی تو؟ میرا خیال ہے کسی بزرگ ہستی ... کوئی دشمنی رہی نہیں ہے اب تک۔ پھر یہ کون بزرگوار ... نے تمھیں یہاں بھیجنے کی زحمت کی ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم وہ غلام جیلانی نہیں ... لیے پولیس جال ڈالتی پھرتی ہے جگہ جگہ اور جو پولیس کو ... لیے درکار ہے، وہ اس کی گرفتاری کے لیے اس لیے ... سے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں کہ انھیں پچاس ہزار روپے ... توقع ہے اس کی گرفتاری کے عوض اور وہ جو پانچ روپے ... بیچ دیتے ہیں، ان کے لیے پچاس ہزار بہت ہوتے ہیں ..."

"بیشک بیشک ہوں تو وہی غلام جیلانی لیکن ... بزرگی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی کبھی۔ یہ تو سراسر الزام ہے ..."

"بکواس کرتے ہو تم۔ مجھے پتا ہے بابا صاحب ... کو تم نے ہی تباہ کیا تھا۔ سب جانتے ہیں یہ بات۔ ... دن سے تلاش کر رہے تھے تم لوگوں کو، رات بابا صاحب ... مؤکلوں کے ذریعے پتا نکالا تھا کہ تمہارا ایک ساتھی ... یہاں ہے اور جب ہم فردوسی بیگم کو ... ساتھی بھی مل جائیں گے ہمیں۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا ... وقت جب ہم فردوسی بیگم کو بے ہوش کر کے باندھ چکے تھے تم وہاں پہنچ گئے۔ بابا صاحب کے مؤکلوں نے غلط نہیں کہا تھا۔۔۔"

"اچھا! تو تیرے اس بابا صاحب کے پاس ایسے مؤکل بھی ہیں جو گم شدہ لوگوں کا پتا بتا دیتے ہیں۔ مگر ان مؤکلوں نے بابا صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہاں پہنچ کر جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو حشر کیا ہوگا تمہارا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس کی ہمیں پروا نہیں، بابا صاحب کو جیسے ہی خبر ہوگی، وہ منٹوں میں ہماری مشکل آسان کر دیں گے۔ بس اتنی دیر ہی تم ہمیں اپنے پاس رکھ سکتے ہو جتنی دیر بابا صاحب کو خبر نہیں ہوتی۔" وہ بڑے ہی بڑے اعتماد انداز میں بولا۔

مجھے اس کا یہ اعتماد دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ یہ کیسے کمزور عقیدے اور ذہن کے لوگ تھے کہ ایک جعلساز پیر جس نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر یہ روپ دھار لیا تھا، اتنا اندھا اعتقاد رکھتے تھے۔ عقل کے اندھے لوگ یہ تک سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ جو مخلص اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ تیاگ کر صرف اللہ کا ہو گیا ہو، اسے کسی کی دشمنی اور دوستی سے کیا واسطہ۔ وہ آئزک ہی کی بات کر رہا تھا۔ ان کا وہ بابا صاحب، وہ پہنچا ہوا بزرگ اپنے آستانے میں منشیات اور اسلحے کا اتنا بڑا ذخیرہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کے آستانے پر آزادانہ منشیات کا استعمال ہوتا تھا اور شاید منشیات فروخت بھی ہوتی تھی وہاں۔ دنیا داری کے تمام لوازمات بلکہ یوں کہیے کہ حرام اور حلال کی تمیز کے بغیر کاروبارِ زندگی چل رہا تھا وہاں اس کے باوجود یہ لوگ اس بہروپیے کو خدا کا برگزیدہ بندہ تسلیم کیے ہوئے تھے۔ اور اتنے معتقد تھے اس کے کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے اس سے کہا "تم لوگ اسے اللہ کے محبوب بندوں میں شمار کرتے ہو جس کے پاس دنیا بھر کے چرسی موالیوں کا ہجوم رہتا تھا جو لوگوں کو برائی کے راستے سے روکنے کے بجائے انھیں نشہ آور اشیا فراہم کر کے بربادی کے راستے پر ڈالنے کا ذمے دار ہے۔"

"یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں، تم انھیں نہیں سمجھ سکو گے۔ تمہارے پاس وہ آنکھ ہی نہیں ہے جو حقیقت کو دیکھ سکے۔ تم بھی دنیا والوں کی طرح اندھے ہو۔ عام آدمی کو وہ نشہ آور اشیا دکھائی دیتی ہیں مگر اصل میں وہ کیا ہے یہ چشمِ بینا ہی دیکھ سکتی ہے۔ اس کی حقیقت وہی لوگ جانتے ہیں جو انھیں استعمال کرتے ہیں یا وہ جنھیں بابا صاحب دکھانا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھا! یہ تو تم نے بڑی عجیب بات بتائی ہے یار! تو وہ اصل میں نشہ آور چیزیں نہیں ہوتیں؟" میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

وہ میری اس کم علمی پر مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "ہاں تم جیسے دنیا دار لوگوں کو اس کی اصلیت کا پتا نہیں چل سکتا کبھی بھی۔ یہ اللہ والوں کے رمز ہیں۔ جاننے والے ہی جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ والے اپنے آس پاس لوگوں کی بھیڑ اکٹھا کرنا پسند نہیں کرتے، اگر وہ لوگوں کو نہ روکیں تو لوگ ان کے لیے عبادت، ریاضت کرنا مشکل کر دیں۔ ہر وقت سائلوں کا اژدہام لگا رہے۔ وہ لوگوں کو منع بھی نہیں کر سکتے اپنے پاس آنے سے، ایسا کرنے سے لوگ انھیں مغرور سمجھنے لگتے ہیں، چنانچہ آستانوں اور مزاروں پر ایسے ہی لوگ نظر آتے ہیں جو کسی طرح بھی اس در کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ پھر انھیں ایسے کام پر لگا دیا جاتا ہے جسے دیکھ کر عام لوگ اس طرف کا رخ نہیں کرتے، وہ یہی سمجھتے ہیں، یہ کوئی جعلی پیر ہے جو لوگوں کو شیطان کے حوالے کر رہا ہے یہ اللہ والوں... کی باتیں ہیں، ان کی مصلحتیں وہی جانتے ہیں، ہم تو ان کے تابعدار ہیں بس۔"

اس ذلیل ابنِ یہودہ نے ان کی کم علمی اور سادگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا، انھیں ہر سوال کا جواب ازبر کرا دیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کے جادو کا توڑ کرنے کی کوشش کرے تو اسے کامیابی نہ ہو سکے۔

اس دوران آبی بھی وہاں آ گیا تھا۔ وہ بولا "تو کس کے ساتھ مغز کھپانے لگا ہے جیلانی! ان پر تیری باتیں اثر نہیں کر سکیں گی۔ یہ لوگ ایسے ہی سمجھنے والے ہوتے تو ڈبا پیروں کی چاندی نہیں ہو سکتی تھی یہاں۔ دیکھتا نہیں ہے تو اخباروں میں کیسی کیسی خبریں چھپتی ہیں، پھر بھی یہ لوگ ہوش میں نہیں آتے۔"

"بات یہ ہے میرے بھائی! ہم لوگ آرام طلب اور کم ہمت ہو گئے ہیں۔ محنت سے جی چراتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ دنیا کی ہر آسائش گھر بیٹھے میسر آ جائے ہمیں۔ چنانچہ اس کا آسان طریقہ یہی نکالا ہے لوگوں نے۔ جنھیں مواقع میسر ہیں وہ رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور قومی سرمائے کے حصے بخرے کر کے اپنی طلب کا پیٹ بھرنے میں مصروف ہیں جو حرام کے پیسے سے کبھی نہیں بھرا کرتا۔ مالِ حرام بھوک مٹانے کے بجائے بھوک بڑھاتا ہے آدمی کی، بلکہ ہوس پیدا کرتا ہے، اور نت نئی ضرورتیں ایجاد کرتا ہے۔ جنھیں حرام خوری کے مواقع میسر نہیں ہیں وہ پیروں فقیروں کے ذریعے اور جوئے اور لاٹری کے ذریعے دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ جتنا وقت وہ ان فضول اور تباہ کن کاموں میں صرف کرتے ہیں اگر اس وقت کا صحیح استعمال کیا جائے، دیانت داری سے محنت کی جائے تو وہ سچ مچ وہ تمام آسائشیں حاصل کر لیں جن کی خاطر وہ بربادیوں کے راستے پر گامزن ہیں۔ ہمارے یہاں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو اپنی کاہلی اور کام چوری کی عادت کی بنا پر تباہ حال ہے مگر الزام اس تباہی کا انھیں دیتا ہے جو محنت کر کے اس

کا پھل کھا رہے ہیں۔ خدا نے انھیں سونا اُگلنے والی زمینیں دیں جن پر محنت کر کے سونا حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے انھیں دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ پھر جب اس خریدنے والے نے شدید محنت کر کے ان سے سونا حاصل کرنا شروع کیا تو وہ اب دُہائی دیتے پھرتے ہیں کہ لوگوں دیکھو ہم لٹ گئے' ان لوگوں نے ہمیں لوٹ لیا۔ ہماری زمینیں ہم سے چھین لی ہیں' ہمارا حق مار لیا گیا ہے۔ کیسے لوگ ہیں یہ جو اپنی غلطی کا احساس کر کے شرمندہ ہونے اور آئندہ خود کو بہتر بنانے کے لیے مشقّت کی عادت ڈالنے کے بجائے دوسروں کی محنت سے کمائی ہوئی روزی چھین لینے کے درپے رہتے ہیں۔۔۔!"

فیروز بے حد جذباتی ہو گیا تھا اس وقت۔

میں نے دیکھا کہ اس کا سلسلۂ کلام کسی طرح ٹوٹنے والا نہیں ہے اب' تو میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ بولا "بس کر دیار! تم نے باقاعدہ تقریر ہی شروع کر دی ہے۔ یہ کون سا موقع ہے ان باتوں کا؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "معاف کرنا یار! میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا اس وقت۔ دراصل ایسے کم عقل اور عقائد کے کمزور لوگوں کو دیکھ کر میرے لیے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ شیخ چلّی صفت لوگ مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ محنت کی عظمت اور اہمیت کا تو جیسے انھیں احساس ہی نہیں ہے۔ کسی طرح نیند سے بیدار ہی نہیں ہوتے ہیں یہ!"

"چھوڑ دیار! لعنت بھیجو ان پر' کیوں خون جلاتے ہو اپنا۔ ایسے لوگوں ہی کی وجہ سے تو دشمنوں کو ہمارے درمیان پیر جمانے کی جگہ مل گئی ہے ورنہ زندہ قومیں اپنے ملک' اپنی دھرتی کو نقصان پہنچانے والوں کا وجود برداشت نہیں کرتیں۔ وطن کے خلاف کوئی لفظ سننا پسند نہیں کرتیں۔ دشمنی کو اپنے گھر میں جگہ دینا اور اپنے ملک کے خلاف باتیں کرنا تو صرف بے غیرت اور بے ضمیر لوگوں ہی کا کام ہے۔" میں نے کہا۔

گُل زمان بولا "ہم لوگ جس مقصد سے آئے ہیں' شاید آپ لوگ اسے بھول گئے ہیں۔"

"اب اس کا کیا ذکر ہے؟ جو کچھ جاننا چاہتے تھے ہم' وہ تو معلوم ہو ہی گیا نا۔ تصدیق ہو گئی اس بات کی کہ انھیں اسی اسرائیلی گُرگے نے بھیجا ہے۔ اسی کے لے پالک ہیں یہ تینوں لہٰذا یہ حلال ہیں ہمارے لیے۔ ان پر تو کلمہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" آبی جلدی سے بولا۔

اس کی بات سن کر ان تینوں کی آنکھوں میں پہلی بار مجھے تشویش کی جھلک دکھائی دی تھی' ورنہ اب تک تو وہ بے حد مطمئن نظر آتے رہے تھے۔ انھیں یہ یقین تھا شاید کہ ان کا باباصاحب جلد ہی انھیں رہائی دلا دے گا اور انھیں یہ بھی اطمینان ہوگا کہ ہم ساتھ کوئی ایسی زیادتی نہیں کریں گے جو اُن کے لیے کسی کا باعث ہو سکے۔ ہم انھیں قید کرنے کے سوا کچھ نہیں چھوٹی موٹی اذیتیں بھی برداشت کرنے کو تیار رہیں گے۔ آبی کی باتوں نے انھیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ شاید یہ احساس ہوا تھا کہ ان کے باباصاحب کی بزرگی اور ان کی سے بالکل بھی متاثر نہیں ہیں ہم' ان کی شخصیت کا جادو ہم پر سکے گا اور ہم ان کے ساتھ کوئی بھی سخت سے سخت اقدام ہیں۔ ہماری طرف سے انھیں کسی رعایت کی اُمید نہیں رہی تھی۔ میں نے انھیں اسی طرح تشویش میں مبتلا چھوڑ کر واپسی کے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا "آؤ یار! چلو واپس چلیں۔ ہمیں کچھ دوسرے معاملات بھی دیکھنا ہیں چل کر۔"

آبی میرے ساتھ دروازے سے نکلتے ہوئے میں بولا "گُل زمان! اس کے مُنہ پر ٹیپ چڑھاتے آنا۔"

میں نے پلٹ کر کہا "او نہیں یار! ضرورت ہی کیا ہے ان کی چیخ و پکار سے کوئی نقصان تو پہنچ ہی نہیں سکے گا ہمیں۔ ان دونوں کے بھی مُنہ کھول دو تاکہ یہ آپس میں کم از کم ایک پر لعن طعن تو کر ہی لیں۔ چند لمحوں کی زندگی میں دل کا کچھ تو بوجھ کر لیں یہ۔"

واپس آئے تو آسیہ نے پوچھا "کیا رہا بھائی جان! انھوں نے کس کے بھیجے ہوئے ہیں وہ؟"

"وہ اس اسرائیل زادے کے ہی بھیجے ہوئے ہیں۔ کوئی تعلق نہیں ہے ان کا۔ آرٹک کے اپنے ہی آدمی ہیں اس کی دوسری حیثیت کے گرویدہ' اس کے معتقدین میں سے نے جواب دیا۔

"دوسری کون سی حیثیت ہے اس کی؟ میں سمجھی نہیں کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" آسیہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے

"ارے بھئی وہی باباسحاق والی حیثیت۔ بتایا نہیں تھا نے تمھیں اس کے اس بہروپ کے بارے میں؟" آبی نے

"اوہ' اچھا' یہ بات تو بھول ہی گئی تھی میں۔ پھر اب ہے آپ لوگوں نے؟" اس نے پوچھا۔

"سوچنا کیا ہے۔ قابلِ گردن زدنی ہیں سالے۔ جائے گا ان کا۔" آبی نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے بولا "جیلانی! اس مصیبت کو یہیں دفن کر کے جائیں گے یا بندوبست کیا ہے ان کی قبروں کے لیے؟"

"اس زمین پہ اُن کے لیے جگہ نہیں ہے۔ جس دشمن کے حوالے کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اس میں

توہین ہے میرے اس پاک وطن کی۔ ان کی تو بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو یار! یا کتوں کی ضیافت کا انتظام کر دو۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"یہ کیسے سنگدلانہ انداز میں باتیں کرتے ہیں جیلانی آپ' میرا تو رُواں رُواں لرز اٹھا ہے آپ کی بات سن کر۔ انسان ہو کر درندوں جیسا انداز اختیار کر لیتے ہیں کبھی کبھی تو آپ۔" فردوسی بیگم لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ درندوں جیسے انداز والی بات خوب کہی ہے بی بی آپ نے۔ ایسے انسان سے بڑا درندہ تو ہے ہی نہیں کوئی روئے زمین پر۔ آپ سمجھتی کیا ہیں انسان کو؟ حیرت ہے مجھے کہ ایک پڑھی لکھی خاتون ایسی باتیں کر رہی ہے۔" فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں جنتی بیگم' بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ مسٹر فیروز' تمھاری معلومات تو بہت ناقص ہیں انسان کے بارے میں۔" آبی جلدی سے بولا۔

"ہاں' یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ انسانوں کے بارے میں میرا علم ناقص ہی ہے۔ اسی لیے میں لوگوں کے نت نئے روپ' انوکھے انداز دیکھ کر حیران ہونے لگتی ہوں۔ انسان واقعی بڑا درندہ ہے۔ فیروز صاحب کی یہ بات خاصی وزنی لگی ہے مجھے۔" فردوسی بیگم نے کہا۔

"کمال ہے بھئی' تم نے اتنی جلدی وزن بھی کر ڈالا ان کی بات کا۔ یہی صفات تو تمھیں جنتی ظاہر کرتی ہیں۔" آبی شرارت سے بولا۔

"چلیں کوئی صفت تو ہے مجھ میں جس سے میں پہچان لی جاتی ہوں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ پہچانے ہی نہیں جاتے کسی طرح بھی! چنانچہ ان کی صفات ظاہر کرنے کے لیے اُن کے نام ایسے رکھے جاتے ہیں جن سے وہ پہچانے جا سکیں۔" فردوسی نے مسکراتے ہوئے برجستہ کہا۔

میں نے کہا "یہ تم نے کیا بات کہی ہے فردوسی بیگم! کن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم' کوئی ایک آدھ مثال تو دے کر بتاؤ!"

آبی نے بھی جلدی سے میری ہاں میں ہاں ملائی "ہاں' ہاں مثال دے کر بتاؤ کن لوگوں کا ذکر ہے یہ؟"

"ارے بھئی خدا کی مخلوق کی بات کر رہی ہوں میں۔ حیرت ہے آپ نہیں سمجھے۔ اب دیکھیں نا وہ ایک مخلوق ہے جسے کہا جاتا ہے آتشی' ایک ہے خاکی اور ایک ہے آبی۔۔۔"

"اوئے لعنت ہو تم پر۔" آبی جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا "تم جیسے لوگ جنتی ہو ہی نہیں سکتے کبھی۔ تم اپنے نام کیسے دل رکھ لو' یہ میں لکھ کر دے سکتا ہوں تمھیں بی بی' تم کو تو جنت کا دروازہ بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ سمجھیں جہنمی بیگم!"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ خدا نے ہمیں اس دنیا میں اکٹھا کر دیا ہے تو وہاں بھی دونوں بہن بھائی ساتھ ہی رہ لیں گے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اس خیال میں نہ رہنا۔ میں ایسی کسی جگہ رہنا پسند نہیں کروں گا جہاں کسی حوّازادی کا سایہ بھی پڑتا ہوگا۔" آبی فوراً بولا۔ "ناجی نا' مجھے دوبارہ جنت سے نکالا جانا بالکل منظور نہیں ہے۔ ایک دفعہ کا تجربہ کافی ہے بس۔"

آبی نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ بے اختیار سب کے حلق سے قہقہے ابل پڑے۔ فردوسی بیگم ہنستے ہوئے بولی "آبی بھائی بہت ہی زخم خوردہ ہیں۔ لگتا ہے حوّازادیوں نے کچھ زیادہ ہی ستایا ہے انھیں۔"

"ہاں' یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے شرارت سے آبی کو دیکھتے ہوئے کہا "حالانکہ یہ اپنے دل میں بڑا درد رکھتا ہے ان کے لیے۔ جب بھی کوئی مجبور اور بے سہارا لڑکی دکھائی دیتی ہے' لے جا کر اپنے گاؤں میں جمع کر آتا ہے اپنی ماں کے پاس تاکہ سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں یعنی جب ہر طرف سے مایوس ہو جائے' زندگی کا کوئی من پسند ساتھی نہ مل سکے یا یوں کہہ لو کہ جب کوئی اسے مُنہ لگانا پسند نہ کرے تو یہ ان میں سے کسی ایک سے دو بول پڑھوا کر سر اُٹھا کے چلنے کے قابل ہو جائے۔"

"اوئے بک نہیں ذلیل آدمی' ایک شریف آدمی پر بہتان باندھتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے۔" آبی ایک دم بھڑک اٹھا۔

"ہاں بھئی جیلانی! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کسی شریف آدمی کی یوں سرِ بازار پگڑی نہیں اچھالنا چاہیے تمھیں۔" فیروز بولا۔

"ویسے آبی بھائی اب تک کتنی۔۔۔ جمع کر چکے ہیں آپ اپنے گاؤں میں؟" فردوسی بیگم آج اُس سے سارا حساب چکانے پر تُلی ہوئی تھی۔

"او بس' اب چپ بھی کر جا میری ماسی! تیری زبان کے تو لگتا ہے بریک ہی فیل ہو گئے ہیں۔" آبی جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

باہر کسی کار کے رُکنے کی آواز سن کر ہم سب کے سب اُدھر متوجہ ہو گئے۔ آنے والا شرافت علی تھا۔ اس نے اندر آتے ہی سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ لوگ بالکل تیار ہی بیٹھے ہیں چلنے کے لیے۔"

میں نے کہا "ہاں بس تیار ہی سمجھو لیکن جانے سے پہلے چند اہم کام انجام دینا ہیں۔"

"کون سے اہم کام ہیں؟" شرافت علی نے سوال کیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "ان تینوں کا کیا کیا جو رات پکڑے گئے تھے؟"

"ایک تو یہی اہم کام ہے' ان تینوں کا کریاکرم کرنا ہے کسی ویرانے

ں بچاکر اس طرح آٹزک کو جلد ہی ان کے عبرت ناک انجام کی خبر بھی ہو جائے گی۔ یعنی ان کی لاشیں جلد ہی مل جائیں پولیس کو۔" میں نے اس سے کہا۔

فیروز بولا "مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انھیں یہیں پڑا رہنے دو۔ بس اتنا کرو کہ یہ مکان چھوڑتے وقت ان تینوں کے سینوں میں ریوالور کی گولی آتار دو۔ رات کو جب آٹزک شب خون مارنے آئے گا تو ان کی لاشیں مل جائیں گی انھیں۔"

"لیکن اس طرح تمھارا نام اور حلیہ بھی پولیس کے ریکارڈ میں درج ہو جائے گا۔ لاشیں ملنے کے بعد پولیس مالک مکان کو جا پڑے گی، اور وہ پولیس کو بتانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائے گا کہ اس نے مکان کن لوگوں کو کرائے پر اٹھایا ہوا تھا۔ پھر تم بھی چھپتے پھرو گے قانون کے محافظوں کی نظروں سے اور تم لوگوں کے لیے بھی آزادی سے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات بھی رکھو اپنے دھیان میں۔" میں نے کہا۔

"بات تو ٹھیک کہی ہے تم نے مگر میرا خیال ہے ایسا ہوگا نہیں۔ آٹزک اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں پہلے تو اسے پولیس کو یہ بتانا پڑے گا کہ س کے آدمی یہاں آئے کیوں تھے اور اس کا ہم سے کیا تعلق ہے؟"

فیروز بولا۔

"ضروری تو نہیں ہے کہ وہ پولیس کے سامنے انھیں اپنا آدمی ظاہر کرے یا وہ خود سامنے آئے پولیس کے۔ لاشیں دیکھنے کے بعد وہ ایک گمنام ٹیلی فون کر کے پولیس یہاں بھیج کے خود دور بیٹھا تماشا دیکھتا رہے گا اور پھر یہ بھی تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عمارت کے اس حصے میں آ کے لاشیں دریافت کر ہی لے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اِدھر آئے ہی نہیں۔ اسی طرف سے یہ دیکھ کر واپس چلا جائے کہ جیلانی وغیرہ یہ مکان خالی کر کے کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں۔ ایسا ہوا تو یہ لاشیں مکان مالک ہی دریافت کرے گا جب وہ مکان خالی ہونے کی اطلاع ملنے کے بعد اپنے مکان کا جائزہ لینے یا کسی نئے کرائے دار کو مکان دکھانے کے لیے آئے گا یہاں سے۔"

شرافت علی نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

فیروز اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "یہ بالکل صحیح کہا ہے تم نے۔ ان امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے کہا "یہ بڑی خوبی ہے اس شرافت علی میں کہ اس کی بات کو رد کرنا آسان نہیں ہوتا کسی کے لیے بھی۔ بہت گہری نظر ہے اس کی اور بڑا مشاہدہ ہے میرے اس یار کا۔ جب سے اس کا ساتھ ہوا ہے، میں بھی خاصا محتاط ہو گیا ہوں۔ اس سے پہلے میں اپنے ہاتھ پیروں کو زیادہ استعمال کرتا تھا اور دماغ کو بہت کم کام میں لاتا تھا۔ نتیجے کے طور پر سارے ملک میں میری دھوم ہو گئی۔ ہر شخص پہچاننے لگا اور کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکا، جبکہ لوگ عقل استعمال کر کے دن و رات لوٹ مار میں مصروف ہیں پھر بھی باعزت ہیں۔ کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا ان کی طرف۔ خود شرافت علی ہی کی مثال تمھارے سامنے ہے۔ کتنا معتبر اور معزز شخص سمجھا جاتا ہے یہ۔"

شرافت علی ہنس کر بولا "زیادہ تعریفیں نہیں کرو میری۔ آبی کا بھی خیال کرو کچھ۔ ان کا تو کہنا ہے کہ تم بزدل ہو گئے ہو اب۔"

"نہیں یار! اسے نہیں چھیڑو اب، شیر زخمی ہے اس وقت، ایسا نہ ہو تمھاری ہی تِکا بوٹی کرنے پر تُل جائے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اس نے آبی سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں بھائی آبی! کیا کہہ رہے ہیں یہ، کس نے نشانہ بنا دیا تمھیں؟"

آبی بولا "یار شرافت علی! تو بڑا دانا بینا، ارسطو اور افلاطون بنا ہے، کیا تو ایک کام نہیں کر سکتا؟"

"کون سا کام؟ کیا کام کروانا چاہتے ہو مجھ سے؟ بتا دو بے دھڑک ہو کر، تمھارے لیے کیا نہیں کر سکتا میں۔" شرافت علی بولا۔

"کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے۔ تو اتنے کام آتا ہے ہم لوگوں کے، یار بس اتنا سا کام اور کر دے کہ جہاں سے تو نے عقل حاصل کی ہے اس دکان کا پتا بتا دے اس غلام جیلانی کو یا ہو سکے تو تھوڑی سی عقل خود ہی دے دے بھائی اسے۔" آبی نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

شرافت علی مسکرا دیا، بولا "حد ہو گئی یار تم سے بھی۔ میں سمجھا شاید کوئی کام واقعی کروانا چاہتے ہو مجھ سے۔" پھر وہ مجھ سے بولا "آج تو تمھاری لزی بیگم کو تمھاری ماں جی کو رہائی دلا کر پہنچانا ہے تمھارے پاس۔ تین دن کی مہلت تو رات کو ختم ہو گئی ہے نا؟"

"ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری بات ہوئی ہے اس سے، دو گھنٹے کے اندر اندر اس نے ماں جی کو ساتھ لے کر آنے کو کہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب! کیا وہ خود آئے گی انھیں لے کر؟ مگر اس کا تو ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے لزی کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"کیوں ٹھیک نہیں ہے اس کا یہاں آنا؟ اس کی ذات سے ہمیں کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہمیں تو ظاہر ہے کوئی خطرہ نہیں ہے اس سے لیکن وہ اگر اسے پتا چل گیا لزی کے یہاں آنے یا تم سے ملنے کا تو اس کے لیے نقصان دہ بات نہیں ہوگی یہ؟ یہ تو وہ بتا ہی چکی ہے کہ اس کی طرف سے مشکوک ہو چکا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ جب باہر نکلتی ہوگی آٹزک اس کی نگرانی ضرور کراتا ہوگا چنانچہ اسے خبر ہو جائے گی کہ لزی تم سے ملی ہے۔" شرافت علی نے کہا۔

"بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی ہے یار شرافت علی بحالانکہ رات کے واقعے کے بعد یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ آٹزک اب لزی پر بالکل اعتبار نہیں کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں لزی کے مجھ سے ملنے کی خبر سننے کے بعد اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ لزی کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لے، یا یہ کہ دونوں کے درمیان کھلی جنگ شروع ہو جائے۔ البتہ ہمارے لیے یہ بات زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر آٹزک نے لزی سے یہ بات پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو چکا ہے اور ہنوز اس کی نگرانی پر ہی اکتفا کیا تو ہم اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ وہ البتہ ہماری ساری نقل و حرکت سے آگاہ رہے گا اور جب بھی چاہے گا ہمارے خلاف کامیاب کارروائیاں کرتا رہے گا۔ یہ تو بہت ہی بُرا ہوگا یار! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے بہت اچھی بات سجھائی ہے شرافت علی! —— اس طرح تو ہم میں سے کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔" فیروز نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کوئی تجویز ہے تمھارے ذہن میں اس کے تدارک کی؟" میں نے شرافت علی سے پوچھا۔

"تجویز تو فی الحال کوئی نہیں ہے میرے ذہن میں۔ سوچنا پڑے گا۔" شرافت علی ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔

آسیہ نے کہا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح لزی سے کہہ دیا جائے کہ وہ یہاں نہ آئے۔ ہمیں صرف خبر کر دے کہ ہم کہاں آ جائیں ماں جی کو لینے کے لیے؟ یا اگر ہو سکے تو ہمارا کوئی آدمی ابھی سے اس کے ساتھ لگ جائے۔"

"مگر بی بی! بات تو پھر بھی وہی ہوئی نا، آٹزک اگر نگرانی کرا رہا ہے لزی کی تو وہ یہاں آئے یا ہم میں سے کوئی جائے اس کے پاس، دونوں صورتوں میں آٹزک ہمارے ٹھکانے تک جا پہنچے گا اور یہی ہم نہیں چاہتے۔" شرافت علی نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں، ہم میں سے کسی کے لزی کے پاس جانے کی صورت میں آٹزک ہمارے ٹھکانے تک کیسے پہنچ سکے گا؟" آسیہ نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے، جو شخص لزی کی نگرانی کر رہا ہوگا، وہ لزی کو چھوڑ کر اس شخص کے پیچھے لگ جائے گا جو ماں جی کو ساتھ لے کے آئے گا وہاں سے۔ اس طرح اسے ہم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔" شرافت علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے شرافت علی!" میں نے اس سے کہا۔

"ہوں، بتاؤ کون سی بات آئی ہے ذہن میں تمھارے؟" شرافت علی میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ہم یوں کرتے ہیں کہ الگ الگ گاڑیوں میں فیڈرل بی ایریا چلتے ہیں۔ وہاں ہم اس مکان کے چاروں طرف ناکہ بندی کریں گے جہاں ماں جی کو رکھا گیا ہے۔ لزی جب انھیں وہاں سے نکال کر رخصت ہونے لگے گی تو اسے ہم راستے ہی میں روک لیں اور ہلکے پھلکے مصنوعی مقابلے کے بعد ماں جی کو چھین لائیں گے اس سے ...."

شرافت علی اور فیروز بیک وقت چلا اُٹھے "واہ، بہترین ترکیب سوچی ہے تم نے جیلانی!" شرافت علی بولا "اس طرح لزی پر یہ الزام بھی نہیں آ سکے گا کہ وہ ہم سے ملی ہوئی ہے۔ آٹزک کو یہی رپورٹ ملے گی کہ جیلانی نے لزی کو زیر کر کے اپنی ماں کو چھڑا لیا ہے اس سے۔ آٹزک کو اگر شک ہے لزی پر تو وہ بھی رفع ہو جائے گا۔"

"نہیں، یہ شک تو پھر بھی رفع نہیں ہو سکے گا بلکہ اس پر غداری کرنے کا شبہ یقین میں بدل جائے گا۔" فردوسی بیگم نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟ ایسا کیوں کر ہوگا۔ جب اسے یہ پتا چلے گا کہ ہم لزی سے لڑ بھڑ کر ماں کو اس کے قبضے سے نکال کر لے گئے ہیں تو پھر کیوں کر اس پر غداری کا جرم ثابت ہو سکے گا؟" میں نے فردوسی بیگم کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھا ہے جیلانی! دوسرا رُخ دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہیں آپ۔ بے شک آپ جس طرح ماں جی کو چھین کر لائیں گے لزی سے، اس طرح کسی کو یہ شک تو نہیں ہو سکے گا کہ اس کا آپ کے گروپ سے کچھ تعلق ہے لیکن اس پر غداری کا الزام یوں ثابت ہو جائے گا کہ اس نے ماں جی کو آٹزک کی قید سے نکالا کیوں تھا۔ اس کا آٹزک کی مرضی یا اس سے....... مشورے کے بغیر ماں جی کو وہاں سے نکالنا بھی تو اس کے مجرم ہونے کا ثبوت ہی ہوگا نا۔ پھر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ لزی نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا یہ اقدام بہرحال اسے آٹزک کا مخالف تو ثابت کر ہی دے گا۔" فردوسی بیگم نے جواب دیا۔

"یہ فردوسی بیگم نے بالکل ٹھیک کہا ہے جیلانی!" آبی نے کہا۔ "لزی کی پوزیشن تو خراب ہو ہی جائے گی اس طرح بھی تنظیم میں۔"

"ہاں یار! یہ تو معاملہ الجھتا ہی جا رہا ہے۔ غور و فکر سے تو ہر بار کوئی نہ کوئی تاریک پہلو سامنے آ ہی جاتا ہے۔ پھر اس مسئلے کو کس طرح سلجھایا جائے؟ یار شرافت علی! یہ کس مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے تم نے ہمیں؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

فیروز نے انور کمال اور گل زمان کو مخاطب کر کے کہا "فی الحال ایک کام کرو تم لوگ۔ فوراً فیڈرل بی ایریا جا کر اس مکان کی نگرانی شروع کر دو جہاں ماں جی کو رکھا ہے انھوں نے۔ وہاں جو کچھ بھی ہو اس میں مداخلت بالکل نہیں کرنا۔ بس تماشائی بنے رہنا اور وائرلیس پر پل پل کی

خبر دیتے رہنا ہمیں۔ تمھاری اطلاعات کی روشنی میں ہی ہم کوئی قدم اُٹھائیں گے اب۔"

وہ دونوں زبان سے ایک بھی لفظ کہے بغیر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُٹھے اور باہر چلے گئے۔ "لیں جی! اس مسئلے کا تو فیصلہ ہو گیا سمجھو۔ اب ان قیدیوں کا کیا کیا جائے، یہ سوچنا چاہیے۔" ان... دونوں کے جانے کے بعد شرافت علی بولا۔

"ان کے بارے میں تو ہم نے بہت پہلے فیصلہ کر دیا ہے۔ اب مزید کیا سوچنا ہے ان کے بارے میں؟" آپی نے کہا۔

"فیصلہ کر دیا ہے!" شرافت علی حیران ہو کر بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے ان کے بارے میں۔"

"یار عجیب لوگ ہو تم، ایک بار طے کر لیا گیا کہ آٹزک یا تنظیم کا جو بھی فرد ہمارے ہاتھ آئے گا اُسے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ پھر یہ کیا کرتے ہو تم لوگ کہ اُنھیں پکڑنے کے بعد سوالات شروع کر دیتے ہو، ان کا کیا کریں اب، یہ کیسے کریں اب۔" آپی نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ آپی۔ اس بات کا خیال ہی نہیں رہتا ہے ہم میں سے کسی کو بھی۔" فیروز نے آپی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ ٹیلی فون اُٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ تم اب ٹیلی فون کسے کرنے لگے ہو؟"

"میں خان کو بلا رہا ہوں ٹیلی فون کر کے۔ ان تینوں کو کسی مرگھٹ پر لے جا کر ہی ٹھکانے لگانا ہو گا۔ یہاں تو مناسب نہیں ہے یہ۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو برادر! یہ کام میں کر دوں گا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکے گا کہ کس شکاری کا شکار بنے ہیں یہ۔" شرافت علی بولا۔

"یہی تو نہیں کرنا ہے میرے بھائی! کسی اور کو پتا چلے یا نہ چلے مگر اسے تو معلوم ہونا ہی چاہیے جس نے ہنکایا تھا اُنھیں اِدھر۔ اسے ایسے تحفے ملتے رہنا چاہئیں تاکہ وہ یہ اندازہ لگا سکے کہ اس کے مقابل کون لوگ ہیں۔" میں نے شرافت علی سے کہا۔

"ہاں بھائی شرافت علی! یہ تحفے تو ہمیں آٹزک کو پہنچانا چاہئیں۔ یہ جیلانی نے اچھی بات بتائی ہے۔" فیروز ریسیور کان سے لگا کر بولا۔

آپی نے بھی میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے یار! دشمنوں کو ذہنی طور پر شاک پہنچاتے رہنا چاہیے۔ ایسے ہلکے پھلکے ڈوز اسے دیے جاتے رہیں وقفے وقفے سے تو جلد ہی دشمن احساسِ کمتری کا شکار ہو کر حملے کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گا اور صرف دفاع پر ہی پوری توجہ صَرف کرنے لگے گا۔ پَر کٹ جائیں گے اس کے، اُڑ نہیں سکے گا وہ پھر۔"

"بالکل بالکل، یہی چاہتا ہوں میں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ انھیں ختم کرنے کے بعد کسی طرح پارسل بنا کے آٹزک کے پاس پہنچا دیا جائے۔

بہت خوش ہو گا وہ انھیں اس طرح وصول کر کے۔" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سا مشکل کام ہے یار! تم پتا بتا دو مجھے اس کا، دو گھنٹے بعد وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہو گا۔" شرافت علی بولا۔

"پتا..." میں نے اسے تکتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے ٹیلی فون کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کیسی عجیب بات ہے یہ، لزی نے کتنی بار فون پر بات کی اور اس کے ہر منصوبے کی خبر بھی دی ہے ہمیں لیکن یہ نہیں بتایا کہاں رہا ہے ان دنوں۔ اور نہ ہی تو نے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی جیلانی!" آپی جلدی سے بولا۔

"نہیں یار! مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے بتایا تو تھا مجھے کہاں رہ رہا ہے مگر مجھے ہی یاد نہیں رہا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

شرافت علی بولا۔ "فی الحال تم سب لوگ میرے ساتھ چلو، ہم آسیہ اور فردوسی بیگم کو اس نئے ٹھکانے پر پہنچا دیں جس کا بندوبست کیا ہے۔ ان دونوں کو محفوظ جگہ پر پہنچانے کے بعد کوئی صورت نکالیں گے اس کی بھی۔"

"تو کیا ان تینوں کو یہیں بند رہنے دیں، انھیں چھوڑ کر یہاں آنے کا ارادہ ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! انھیں یہاں کیوں چھوڑیں گے۔ گاڑیاں ہیں ہمارے پاس، ایک ایک کار کی ڈکی میں ایک ایک آدمی کو باندھ کر، وہیں چل کر جھٹکا کر دینا۔ آٹزک کو بالکل تازہ مردے ملیں گے، ممکن ہے وہ اپنے کتوں کے راتب میں شامل کرے ان تینوں کو۔" فیروز بولا۔

فردوسی بیگم نے بُرا سا منہ بنا کر جھرجھری لے کے کہا۔ "بھئی، چپ بھی ہو جائیں اب۔ کیسی اذیت ناک باتیں کرنے لگے آپ لوگ۔ میرے تو سُن کر رونگٹے کھڑے ہونے لگے ہیں۔ آپ لوگوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ ہے ہی نہیں سرے سے۔"

"ایسا نہ کہو بی بی! یہ الزام نہ دو ہمیں، ایسے درندہ ہوتے ہم تو یوں سوچ بچار میں وقت نہ ضائع کرتے اپنا، دھڑا دھڑ اقدامات کرتے چلے جاتے، زمین کا چپہ چپہ لال کر دیتے، کسی کی پروا کیے بغیر لہو سے رنگتے چلے جاتے اس دھرتی کو۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اپنا پیٹ بھرنے کے سوا کچھ اور سوچتے ہی نہیں ہم۔ درندے دوسروں کا درد نہیں رکھا کرتے، انھیں غرض نہیں ہوتی کسی کے مرنے جینے سے، نہ ان کا کوئی وطن ہوتا ہے نہ زمین سے کوئی ناتا رکھتے ہیں وہ۔ انھیں تو صرف اپنے آپ سے غرض ہوتی ہے جو ان کا پیٹ بھرنے کے کام آتا ہے اور جیسے بھی بنے حاصل کرنے کی جستجو میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ تمھیں ایسے ہی نظر آتے ہیں فردوسی بیگم! ایسا ہی بے ٹھکانہ، بے ضمیر اور بے اعتبار سمجھتی ہو تم ہمیں؟ یہ کوئی انصاف والی بات نہیں ہے۔" فیروز نے فردوسی بیگم سے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"اوہ، نہیں بھائی فیروز! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ وہ... وہ بات... یہ تھی کہ...!" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

میں نے کہا۔ "بُرا نہ مانو یار فیروز! یہ عورتیں بہت کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائیں تو کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ شیرز کو بھی ٹکنے نہیں دیں گی اپنے سامنے، مگر ان کی فطری کمزوری ہر حالت میں برقرار رہتی ہے۔ تم نے جس انداز سے اُنھیں کتوں کا راتب بنانے کی بات کی تھی، اس انداز نے اس کے اندر کی عورت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو گا۔"

"چپ کر جاؤ اوئے وکیل کی دُم، سالے ہر معاملے میں وکالت کرتا ہے اس کی..." آپی آسیہ کو دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ جو کچھ کہنے لگا تھا وہ آسیہ کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔

خان کے آنے کے بعد یہ طے پایا کہ شرافت علی، خان، آسیہ اور فردوسی بیگم تین الگ الگ کاروں میں یہاں سے روانہ ہو جائیں، تینوں قیدیوں کو بے ہوش کر کے ایک ایک کار کی ڈکی میں ڈال دیا جائے اور میں، آپی اور فیروز کے ساتھ وہیں رُک کر لزی کا انتظار کروں، لزی کے آنے کے بعد ہمیں اس کو بھی اپنے ساتھ رکھنا ہو گا، اب اُسے آٹزک کے پاس واپس نہیں جانے دیا جائے گا اور آٹزک کو بھی مزید کسی تاخیر کے جلد از جلد ایک عبرت ناک انجام سے دوچار کر دینا چاہیے، اس قصے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہیے۔

ضروری اور مختصر سامان کے ساتھ جتنی دیر میں وہ لوگ اپنی اپنی کار کے اندر پہنچے، اتنی دیر میں تینوں قیدیوں کی رگِ احساس کو میں نے ذرا بھاری ہاتھ سے مسل کر کئی گھنٹے کے لیے دنیا سے غافل کر دینے کے بعد کاروں کی ڈکیوں میں لے جا کر لٹا دیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے فیروز سے کہا۔ "یار فیروز! میرا تو خیال ہے، یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے ہم بھی فیڈرل بی ایریا ہی چلیں، ہو سکتا ہے لزی کو ہماری مدد کی ضرورت پیش آ جائے وہاں۔ نزدیک ہوں گے تو فوراً مدد کو پہنچ سکیں گے اس کی۔"

"ہاں، سوچ تو میں بھی کچھ اسی طرح رہا تھا۔ ٹھیک ہے، چلو پھر چلتے ہیں اُدھر ہی۔ مگر دو منٹ ٹھہرو، میں وائرلیس پر انور کمال سے بات کر کے وہاں کی صورتِ حال تو معلوم کر لوں پہلے۔" فیروز نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اس نے میز پر پڑا ہوا ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو اُٹھا کر گھمانا شروع کر دیا۔ میں بالکل ایسا ہی ایک ریڈیو نما چھوٹا سا وائرلیس سیٹ انور کمال کے پاس بھی دیکھ چکا تھا لہٰذا میرے لیے وہ کوئی نئی چیز نہیں رہی تھی۔ وہ یوں ہی میز پر پڑا رہتا تھا، اُسے دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ریڈیو کے سوا کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ جلد ہی فیروز کا انور کمال سے رابطہ قائم ہو گیا۔ ریڈیو سے مدھم آواز سنائی دی۔ "یس، ایس کے کالنگ ہئیر۔ اوور۔"

فیروز نے جواب میں کہا۔ "میں الف بول رہا ہوں ایس کے! تم اس وقت کہاں ہو؟ اوور۔"

"میں اس مکان کے قریب ہی موجود ہوں جناب! ابھی ابھی کوئی دو تین منٹ پہلے اس مکان کی چھت پر ایک ہیلی کاپٹر اترا ہے۔ اس علاقے میں چونکہ یہ ایک بالکل نئی اور انوکھی بات ہے۔ اسی لیے لوگ اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے اس ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہے ہیں اور بے شمار بچے، بوڑھے اور جوان مکان کے سامنے کھڑے اس کی چھت کو تک رہے ہیں۔ میلے کا سا سماں ہے یہاں۔ اوور۔"

"اوہ، یہ پتا نہیں چلا کہ اس ہیلی کاپٹر میں وہاں کوئی آیا ہے یا کسی کو لے جایا جا رہا ہے وہاں سے؟ اوور۔" فیروز نے پوچھا۔

"یہاں نیچے سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے جناب! ہیلی کاپٹر اس طرح کھڑا ہے کہ نیچے سے اس میں چڑھنے یا اترنے والے کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ عمارت کے گیٹ پر موجود چوکیدار جس بے پروائی سے بیٹھا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس مکان کی چھت پر اکثر ہیلی کاپٹر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اوور۔" انور کمال کی طرف سے جواب ملا۔

"نہیں، شاید ایسا نہیں ہے، اگر ہیلی کاپٹر وہاں آتے جاتے ہوتے تو علاقے کے لوگوں کے لیے بھی یہ معمول کی بات ہوتی پھر وہ کسی ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر یوں تماشا دیکھنے کو جمع نہیں ہو جاتے وہاں۔ کسی سے معلوم کرو، پہلے بھی وہاں ہیلی کاپٹر آتے جاتے رہے ہیں یا آج پہلی بار ہی ایسا ہوا ہے۔ چوکیدار کی بے پروائی سے کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ ہو سکتا ہے اسے اطلاع دینے کے بعد ہیلی کاپٹر آیا ہو وہاں، اس کی بے پروائی اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اوور۔" فیروز نے اس سے کہا۔

"جی بہتر ہے جناب! میں کسی سے معلوم کر کے ابھی بتاتا ہوں آپ کو۔ اوور۔" انور کمال کی طرف سے جواب موصول ہوا۔

"ٹھیک ہے تم معلوم کر کے رابطہ قائم کرو، میں اب سلسلہ منقطع کر رہا ہوں۔ اوور اینڈ آل۔" فیروز نے یہ کہہ کر سلسلہ ختم کر دیا۔

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ انور کمال کا جواب آنے تک ہمیں یہیں انتظار کرنا ہو گا اب؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وائرلیس سیٹ تو ہمارے پاس موجود ہی ہے، کار میں سفر کے دوران بھی بات ہو سکتی ہے انور کمال سے۔ پھر ہمیں یہاں بیٹھ کر وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں تو جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہیے ہمیں۔"

چند ثانیے کے بعد ہی ہم تینوں شرافت علی کی فراہم کردہ مخصوص کار میں فیڈرل بی ایریا کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی جیلانی! یہ ہیلی کاپٹر کیوں پہنچا ہے وہاں؟ اور کیا آئزک کے پاس ہیلی کاپٹر بھی ہے؟" آ بی نے پوچھا۔

"جس بین الاقوامی تنظیم سے آئزک کا تعلق ہے، وہ ہیلی کاپٹر تو کیا، کانکرڈ طیارے اور راکٹ بھی فراہم کر سکتی ہے اسے۔ اس میں حیران ہونے یا سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"یار جیلانی! کیا ہم لوگ اپنی طاقت سے اونچا نہیں اُڑنے لگے ہیں؟ کیا یہ بات نقصان دہ نہیں ہے ہمارے لیے؟" آ بی بولا۔

"ہو سکتا ہے تیرا خیال درست ہی ہو، مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ لے آ بی۔ چیونٹی جیسی چھوٹی اور حقیر نظر آنے والی شے ہاتھی جیسے پہاڑ کو ڈھا دیتی ہے تو وہ کون سی طاقت ہے جو اسے اتنی بڑی اور طاقت ور شے پر حاوی کر دیتی ہے۔ یہ کبھی سوچا ہے تو نے؟" میں نے کہا۔ "جو قوت چیونٹی کو فتح دیتی ہے ہاتھی پر، کیا وہ ہمیں اپنے جیسے چند شیطان صفت انسانوں پر برتری نہیں عطا کر سکتی؟"

"اس کی ذات سے کیا بعید ہے۔ وہ اگر چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ مگر پتا نہیں کیوں مجھے طرح طرح کے واہمے گھیرنے لگتے ہیں کبھی کبھی۔" آ بی نے کہا۔

"نہیں یار! ایسی باتیں نہ سوچا کر۔ یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ بھروسا رکھ اس سوہنے رب کی ذات پر جو حق کا ساتھ دیتا ہے ہمیشہ، اور راہِ حق پر چلنے والوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور فتح سے ہمکنار کرتا ہے بالآخر حق پرستوں کو۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"تُو یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتا ہے جیلانی؟ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم ہی حق پر ہیں اور وہ ربِ کائنات اس معرکے میں ہمارا ہی ساتھ دے گا؟ ذرا سوچ تو یار، ہم نے اب تک کتنی نیکیاں کمائی ہیں؟ کتنے نیک اعمال درج کرائے ہیں اپنے اعمال نامے میں؟ فرشتوں نے کیا لکھا ہے، یہ تو حشر کے روز ہی پتا چلے گا لیکن ہم بھی تو اپنے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ آدمی اپنے بارے میں تو جانتا ہی ہے سب کچھ۔ اپنی زندگی کا کوئی گوشہ تو چھپا نہیں ہوتا اس سے۔ تو میرے یار! ہماری زندگی میں قتل و خون اور لوٹ کے سوا ہے ہی کیا اور میری معلومات کے مطابق تو ان میں کوئی بھی کام اللہ کا پسندیدہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"اوئے یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو آ بی! یہ کون سا دورہ پڑا ہے آج تجھے۔ اب تک تو مجھے ناصح اور واعظ کہہ کہہ کر میرا مذاق اڑاتا رہا ہے تو اور اب خود ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کیا مجھوں میں اس تبدیلی کو آخر؟" میں نے حیرانی سے...

"پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے جیلانی کہ میرے نام کا پتا جھڑ چکا ہے۔ میری حیات کے دن ختم ہونے والے ہیں، فرشتۂ اجل نے میری روح کو نکال لینے کے سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں، بس ڈور ختم ہونے کا انتظار ہے جو کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔"

"اوئے آ بی! یہ کیا ہوا ہے بھئی تجھے؟ کیسی بہکی باتیں کر رہا ہے تو، کوئی دورہ تو نہیں پڑ گیا تجھے مایوسی کا؟ پہلے تو یار کبھی تو نے ایسی مایوسانہ باتیں نہیں کیں، پھر آج ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے بھائی؟" میں نے اسے فکرمندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے آج۔ ایسے ایسے خوفناک مراحل سے گزرے ہیں ہم، مگر ہمیشہ مجھے یہ پختہ یقین رہا ہے کہ ہم بخیر و خوبی گزر جائیں گے ہر مرحلے سے لیکن اب وہ یقین کچھ متزلزل ہوتا جا رہا ہے۔ طرح طرح کے شکوک سر ابھارنے لگے ہیں، عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے یار! لگتا ہے اب کسی دلدل میں پاؤں پڑ گیا ہمارا تو ہم میں سے ایک ضرور بھینٹ چڑھ جائے گا۔ ہمارا یہ طویل ساتھ..." اس کی زبان جیسے بولتے بولتے اٹک گئی۔ شاید دل بھر آیا تھا اس کا۔

میں نے اس کا کندھا پکڑ کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، لگتا ہے ہاضمہ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ جبھی ایسے ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ کو آیۃ الکرسی پڑھ کے سویا کرتے ہیں، بہت سی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتا ہے اس سے آدمی اور ہاضمے کے لیے نمک اور نوشادر سے چورن بنا کے رکھ لے، ایک چٹکی لے لیا کر اس کی بھی، دماغ پر بخارات نہیں چڑھیں گے۔"

"یہ باتیں ختم کرو اور رفتار تیز کرو گاڑی کی، وہاں کچھ ہو گیا ہے۔" فیروز نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"کیا... کیا... کہاں ہو گیا ہے ہنگامہ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہیں جہاں ہم جا رہے ہیں۔ زبردست فائرنگ ہو رہی ہے، دو پارٹیاں ٹکرا گئی ہیں شاید۔" فیروز نے جواب دیا۔

"اوہ، مگر تمھیں کیسے پتا چلا؟ کیا انور کمال سے بات ہوئی ہے وائرلیس پر؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں، اس سے معلوم ہوا ہے مجھے۔ میں چاہتا ہوں پولیس کے اُدھر متوجہ ہونے سے پہلے ہم وہاں پہنچ کر ماں جی کو نکال لائیں وہاں سے، اگر پولیس بھی پہنچ گئی تو مشکل ہو جائے گی بہت۔"

میں نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا: "ہاں، یہ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو یار! یہ بھی پتا چلا کہ کون سی دو پارٹیاں لڑ پڑی ہیں وہاں؟"

"یہ معلوم تو نہیں ہو سکا ہے مگر اندازہ ہے میرا کہ شاید لزی کو آئزک اور اس کے آدمیوں نے گھیر لیا ہے۔ ہیلی کاپٹر کے ذریعے لزی ہی پہنچی ہوگی وہاں، ماں کو نکالنے کے لیے۔ اور دوسرے مکان میں موجود آئزک کے آدمیوں نے اس پر فائرنگ شروع کر دی ہوگی۔" فیروز بولا۔

"ہو سکتا ہے تمھارا اندازہ ٹھیک ہو لیکن لزی ہیلی کاپٹر میں کیوں گئی ہے وہاں۔ یہ تو بے حد خطرناک کام کیا ہے اس نے۔ اس طرح تو وہ دشمن کی نظروں سے بچ ہی نہیں سکتی کبھی بھی۔ ہیلی کاپٹر کے مکان کی چھت پر اترنے کے بعد تو دشمن غافل نہیں رہ سکتا تھا۔" میں بولا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ دشمن نے ماں جی کو اس مکان میں قید کرنے کے بعد سیدھے راستے سے مکان کے اندر داخل ہونے کے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ ان تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر موت کے پہرے بٹھا دیے ہیں جن سے اندر جایا جا سکتا ہے۔ لزی کو معلوم ہے کہ دروازے یا کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے چنانچہ اس نے چھت کے راستے مکان میں گھسنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ یقیناً چھت پر سے نیچے جانے کے لیے کوئی راستہ ہوگا جسے دشمن نے اپنی آمد و رفت کے لیے کھلا رکھا ہوگا۔" فیروز نے کہا۔

"ہوں، بات تو ٹھیک ہی ہے تمھاری۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لزی نے تمام تر احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اب علی الاعلان آئزک کے سامنے آ کر اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے اس عمل سے یعنی ماں جی کو رہائی دلانے کی کوشش کی وجہ سے آئزک پر یہ بات بھی عیاں ہو گئی ہوگی کہ وہ ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔ صحیح صورتِ حال تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔" فیروز نے جواب دیا۔

ہماری کار منزل کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ سڑک کے کنارے اچھا خاصا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ میں نے کار عین اس مکان کے سامنے لے جا کر روک دی جس کی چھت پر ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ مگر ابھی ہم صورتِ حال کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر بلند ہونے لگا۔ ساتھ والے مکان کی چھت سے فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں ایک پوری فوج مورچہ بند بیٹھی ہو۔ ہیلی کاپٹر نے بلند ہو کر اپنا رخ تبدیل کیا تو میری نظر اس کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی جہاں لزی اسٹین گن ہاتھ میں پکڑے بیٹھی تھی۔ اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ کوئی چیز اس مکان کی چھت پر پھینکی جہاں سے اس کے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے جھنجھنا اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسٹین گن سیدھی کر کے چھت پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ لزی کی اس کارروائی کے فوراً ہی بعد چھت پر سے اس پر فائرنگ کرنے کا سلسلہ ایک دم رک گیا اور چھت پر سے لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

فیروز بولا: "ہیلی کاپٹر لزی ہی کا ہے جیلانی! جو یقیناً ماں جی کو نکال کر لے جا رہی ہے اور یہ دوسرے مکان سے فائرنگ کرنے والے آئزک اور اس کے آدمی ہی ہو سکتے ہیں۔"

اسی وقت مجھے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اس مکان سے نکلتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہیلی کاپٹر کو دیکھتے جا رہے تھے اور باہر آ کر ایک وین میں گھستے جا رہے تھے۔ وین میں بیٹھنے کے بعد بھی وہ اس کی کھڑکیوں سے سر نکال نکال کر دور جاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے نگاہ میں رکھ کر اس کا پیچھا کرنا چاہتے تھے شاید تاکہ جس جگہ وہ ہیلی کاپٹر اترے، وہ لوگ اسے فوراً گھیر لیں۔ میں نے کہا: "یار فیروز! انھیں ہیلی کاپٹر کے پیچھے جانے نہیں دینا ہے ہمیں۔"

"فکر ہی مت کرو ان کی۔ اپنی گاڑی آگے بڑھاؤ اور اس وین کے پاس سے تیزی سے نکلے چلے جاؤ۔ اس کا انتظام میں کر دوں گا۔"

میں نے کار کو آگے بڑھا دیا۔ ہم جیسے ہی وین کے نزدیک پہنچے، فیروز نے کوئی چیز پھرتی کے ساتھ وین کی ونڈ اسکرین پر دے ماری۔ اسکرین کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ یہ...

تیزی سے کار کو دوڑاتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔ وین سے کوئی پچاس ساٹھ گز آگے ہی نکلے تھے ہم لوگ، کہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ وین کے پرخچے اُڑ گئے اور پھر اس میں سوار ہونے والوں کا کیا حشر ہوا ہوگا، یہ بتانا ضروری تو نہیں ہے، تصوّر کی آنکھ بخوبی وہ منظر دکھا سکتی ہے۔ "وہ مارا!" آبی نے زوردار نعرہ لگا کر قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

میں نے اگلے ہی موڑ سے کار کا رخ اُدھر کر دیا جس طرف ہیلی کاپٹر کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہم سے بہت آگے کافی بلندی پر چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا: "اس تک پہنچنا ہمارے لیے تو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔"

"ہمیں ضرورت بھی کیا ہے اس تک پہنچنے کی۔ لزی نے ماں جی کو...... نکال تو لیا ہے وہاں سے، اب وہ خود آئے گی انھیں لے کر ہمارے پاس۔ لہٰذا تم گاڑی کا رخ اُدھر ہی موڑ دو جہاں سے ہم آئے ہیں۔" فیروز نے کہا۔

ہمارے واپس پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد ایک تاریک شیشوں والی، چاروں طرف سے بند گاڑی میں لزی اپنے ساتھ ماں جی کو لے کر وہاں پہنچ گئی۔ چار مسلح باڈی گارڈ اسٹین گنیں کندھوں سے لٹکائے اور کمر میں ریوالور لگائے اس کے ساتھ تھے۔ ماں جی بے حد مضمحل اور اداس اداس دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سارے دکھ درد جیسے بھول گئیں۔ ایک دم تیزی سے آگے بڑھ کر میرا سر اپنے ممتا بھرے سینے سے لگا کر بے تابی سے پوچھا: "تُو ٹھیک تو ہے نا میرے بیٹے! یہ تو نے کیا کھڑاک پھیلا رکھا ہے ادھر؟"

"کوئی کھڑاک شڑاک نہیں ہے ماں جی! اور میں بھی بالکل ٹھیک ہوں آپ فکر نہ کریں کسی طرح کی بھی۔" میں نے جواب دیا۔

"پُتّر! کیسی بات کرتا ہے تو، یہ چاروں طرف سے چلتی ہوئی گولیاں، خوفناک دھماکے، میرا اغوا اور حیدر کا قتل، یہ سب کیا ہے۔ انھوں نے چلتی ہوئی گاڑی میں گھس کر میری آنکھوں کے سامنے حیدر کی جان لے لی اور مجھے بالی کے ساتھ اٹھا لے گئے اور تو کہتا ہے فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے، یہ تو نے کن لوگوں سے دشمنی باندھی ہے پُتّر! لگتا ہے ان کے سینوں میں دل تو ہیں ہی نہیں، بالکل یہودی لگتے ہیں اپنی عادات و اطوار سے مجھے؟"

"ہاں، یہ آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے ماں جی! وہ یہودی ہی ہیں اور میری ان سے دشمنی جو ہے وہ بھی کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، آپ اطمینان رکھیں۔ اب وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے کبھی بھی۔" میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھ تک تو پہنچنا بھی نہیں چاہتے ہیں بیٹا! مجھ سے انھیں کیا لینا ہے۔ وہ تجھ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہیں، مجھے بھی انھوں نے اسی لیے پکڑا تھا کہ میری وجہ سے تو ان کے پاس ضرور پہنچے گا۔ وہ تیری جان کے دشمن لگتے ہیں، یہ بات مجھے پریشان کرنے والی ہے اور تو کوئی پریشانی نہیں ہے مجھے۔" ماں جی فکرمندی سے بولیں۔

"اس کی تم فکر نہ کرو ماں جی! تمھارے پُتّر کی حفاظت ربِّ کریم خود کر رہا ہے، اور دشمن کے مقابلے کے لیے جیلانی اکیلا نہیں ہے۔ ہم سب لوگ ہیں اس کے ساتھ، ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس پر جان نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں ہر دم، اور سب سے بڑھ کر تو آپ کی دعائیں ہیں اس کی نگہبانی کو، پھر آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟" آبی نے ماں جی کو سمجھایا۔

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم لوگ، مجھے تو کچھ پتا نہیں چلتا ہے تمھارا۔" ماں جی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ کون ہے؟ یہ لڑکی جو مجھے چھڑا کر لائی ہے ان خوف ناک لوگوں سے، میں نے تو ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی کبھی۔ یہ تو ان لوگوں سے زیادہ خطرناک لگی ہے مجھے۔ یوں مار دیتی ہے بندے کو جیسے وہ کوئی مکھی مچھر ہو، انسان نہ ہو۔"

"یہ اس سوہنے رب کی دین ہے ماں جی! اور جب وہ مہربان ہوتا ہے تو پتا نہیں کہاں کہاں، کیسے کیسے لوگوں کے دلوں میں ہمدردیاں پیدا کر دیتا ہے، یہ اس رب ذوالجلال کا کام ہے جس نے فرعون سے موسیٰؑ کی پرورش کرائی تھی۔" ... نے جواب دے کر کہا۔ "اب چلیں ماں جی! یہاں سے تو ... جو کچھ پوچھنا اور کہنا ہے وہ اب وہیں چل کر کہہ سن لینا ... کی بیٹی آسیہ انتظار کر رہی ہے آپ کا۔ کیا آسیہ سے ... گی آپ؟"

"کیوں نہیں ملوں گی میں اپنی بیٹی سے۔ کیا وہ ... ہے؟ جلدی لے چل مجھے اس کے پاس، کہاں ہے وہ ..."

میں نے ماں جی کو جواب دینے کے بجائے ... کہا: "یار فیروز! یہ شرافت علی ان لوگوں کو تو لے کر چلا ... اس نے پتا تو دیا ہی نہیں ہے اس نئے مکان کا ... طرح پہنچیں گے وہاں؟"

"ہاں بھئی، یہ تو بڑی غلطی ہو گئی ہے یار، ہم ... خود بھی اس سے پتا لینے کا خیال نہیں آیا۔" فیروز نے ...

"آبی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "لو بھئی کر لو ... کہتے ہیں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنا۔ کیوں ماں ..."

لزی بولی: "تو کیا آپ لوگوں نے آسیہ اور فردوسی بیگم کو کہیں اور منتقل کر دیا ہے یہاں سے؟"

"بی بی! صرف ان دونوں کو ہی نہیں کیا ہے، ہم سب ہی یہاں سے منتقل ہو رہے ہیں۔" آبی نے جواب دیا۔

"مگر کیوں، ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ لوگ؟ میرا خیال ہے یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے ہمیں۔" لزی نے کہا۔

"احتیاط، محض احتیاط کے طور پر ہم نے ایسا کیا ہے۔ اس امکان کے پیشِ نظر کہ کہیں آنزک کو اس جگہ کا سراغ نہ مل گیا ہو۔"

"مگر یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟ آنزک کو اس جگہ کا سراغ کس طرح مل سکتا ہے؟" لزی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا: "رات یہاں جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں تم کو صبح بتا چکا ہوں میں۔ اسی واقعے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر وہ آنزک کے آدمی تھے تو اپنے تین آدمی کھونے کے بعد آنزک خاموش تو نہیں بیٹھا رہے گا، آج رات کو وہ پھر بھیجے گا کسی کو۔ جو شخص یہاں سے جان بچا کر نکل بھاگا ہے اس نے یہ بھی بتا دیا ہوگا اسے کہ جن کی تلاش میں وہ دیوانہ ہوا پھر رہا ہے وہ بھی اسی جگہ موجود ہیں۔ یہ جان لینے کے بعد تو یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ آنزک اب ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوتا جنابِ عالی! آنزک اگر خود آ جائے ہمارے پاس تو اس کے سوا ہمیں اور کیا چاہیے؟ بجائے اس کے کہ ہم اس پر چڑھائی کریں اور اس کے منتخب کردہ میدان میں مقابلہ کریں اس سے، یہ زیادہ اچھا ہوگا کہ وہ ہماری پسندیدہ جگہ پر ہم سے پنجہ لڑائے۔ یہاں ہم اس کو اپنے جال میں آسانی سے پھانس سکتے ہیں۔" لزی نے کہا۔

"تجویز تو یہ بھی معقول ہی معلوم ہوتی ہے یار جیلانی!" فیروز بولا: "آج کی رات ہم ان کا یہیں انتظار کرتے ہیں، اگر تقدیر آنزک کو لے آتی ہے تو سمجھ لو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ ایسا انتظام کریں گے ہم کہ وہ نکل کر جا نہیں سکے گا گُھسنے کے بعد۔"

"اور اس معرکے کے بعد ہمیں پولیس سے بھی سامنا کرنا پڑے گا، پھر، یہ بھی سوچا ہے تم نے؟" میں نے کہا۔

"اس کی تم فکر مت کرو، میں ٹیلی فون کر کے مالک مکان کو کہہ دیتا ہوں کہ ہم نے مکان خالی کر دیا ہے، یہ خبر اس وقت دی جائے گی اسے جب اس کا یہاں آنا ممکن نہ رہے، یعنی رات کے نو دس بجے اسے فون کیا جائے گا۔ آنزک سے نمٹنے کے بعد ہم یہاں ایک منٹ نہیں رکیں گے چنانچہ پولیس یہی رائے قائم کر سکے گی کہ اس خالی مکان میں جرائم پیشہ افراد کے دو گروہ لڑ پڑے ہیں، یوں بھی ہمارا کوئی پتا، کوئی نام و نشان تو ہوگا نہیں ان کے پاس کہ وہ ہمیں تلاش کر سکیں۔" فیروز نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگوں کی یہی رائے ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن، ماں جی کو تو بہر حال ہمیں آسیہ وغیرہ کے پاس پہنچانا ہی ہوگا نا؟" میں بولا۔

"انھیں ہم پہنچا دیتے ہیں وہاں۔ ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔" فیروز نے جواب دیا۔

"مگر یار ہم......" آبی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر باہر کسی کار کی آواز سُن کر ہم سب ادھر متوجہ ہو گئے۔

ہم سب ہی آہٹ پر دیر تک کان لگائے آنے والے منتظر رہے، کئی منٹ تک جب کوئی بھی اندر نہ آیا تو میں نے اپنا جیب شاہ نکال کر ہاتھ میں لیا اور بے آواز پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کے قریب جا پہنچا، چند ثانیے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سُن گُن لینے کے بعد میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے قہقہے ابل پڑے۔

باہر شرافت علی، انور کمال اور گل زمان اپنے اپنے ہاتھوں میں پستول تھامے نہایت چوکنّا انداز میں کھڑے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے جس سے میں باہر نکلا تھا۔ پتا یہ چلا کہ انور کمال اور گل زمان جب وہاں پہنچے تو لزی کی وین کو میری گاڑی کے پیچھے کھڑے دیکھ کر چوکنّا ہو گئے اور اپنی کار کو گیٹ کے باہر ہی چھوڑ کر اندر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے آہٹ پیدا کیے بغیر اندر آ گئے۔ ابھی وہ سُن گُن لینے میں ہی مصروف تھے کہ شرافت علی کی کار اندر داخل ہوئی، پھر وہ تینوں مل کر اندر کی صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لزی کی وین نے انھیں شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ آنزک رات ہونے کا انتظار کیے بغیر ہم لوگوں پر چڑھ دوڑا ہے اور اب اندر یا تو ہمارے درمیان جنگ ہو رہی ہے یا ہم میں سے کوئی ایک فریق دوسرے کو زیر کر چکا ہے، چنانچہ وہ باہر رک کر صحیح صورتِ حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اندھا دھند اندر گھس کر دشمن کے کسی نادیدہ جال میں نہ پھنس جائیں۔ میں نے انھیں صحیح بات بتا دی اور انھیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ شرافت علی، لزی کو اپنے سامنے دیکھتے ہی عادت کے مطابق مؤدب ہو گیا اور بولا: "اوہ، مادام! آپ کو اپنے سامنے

دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

لزی نے مسکراتے ہوئے کہا: "اب میں کسی کی مادام نہیں ہوں شرافت علی! آئندہ تم مجھے مادام کہہ کر مخاطب نہیں کروگے۔ ہم سب ساتھی اور دوست ہیں، سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں، نہ کوئی کسی سے بڑا ہے، نہ کسی کو کسی بھی وجہ سے دوسرے پر فوقیت حاصل ہے لہٰذا ہم سب ایک دوسرے کو ناموں سے ہی مخاطب کریں تو بہتر ہوگا۔"

"ہاں بھائی شرافت علی! یہ لزی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہم سب ایک ہی مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں اور ہر شخص اس مقصد کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کر رہا ہے۔ بھائی چارے اور محبت کی اس فضا کو قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کو برابر کا درجہ حاصل ہو کوئی کسی پر اپنی برتری جتانے کی کوشش نہ کرے۔" فیروز نے لزی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

ماں جی جو اب تک خاموش بیٹھی ہم سب کی باتیں سن رہی تھیں، بولیں: "میری تو کچھ سمجھ نہیں آتی تم لوگ کر کیا رہے ہو یہاں جمع ہو کر اور تم لوگوں کا وہ مقصد ہے کیا جس کے لیے تم اکٹھے ہوئے ہو، یہ جو خوف ناک قسم کے ہتھیار اٹھا رکھے ہیں تم لوگوں نے، ان سے تو ظاہر یہی ہوتا ہے کہ تمھارا وہ مقصد نیک نہیں ہے، خون خرابہ مجھے تو بالکل بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں تجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی جیلانی! یہ سن لے تو کان کھول کر۔"

"اوہو ماں جی! آپ تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہی ہیں، یقین کریں ہمارا مقصد بہت نیک ہے، ہم یہاں اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی اس سوہنی دھرتی کی سلامتی کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ پاکستان کے ہر صوبے، ہر علاقے کے لوگ ہیں، یہ سب اس سوہنے دیس کو دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جدّوجہد کر رہے ہیں، آپ کو پتا نہیں ہے ماں جی! یہودیوں نے ہمارے خلاف زبردست محاذ کھول رکھا ہے، وہ اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعے طرح طرح کے نعرے لگا رہے ہیں یہاں اور ایسے نظریات پھیلا رہے ہیں ہمارے ملک میں کہ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جائیں، تقسیم ہو جائیں بے شمار حصوں میں تاکہ وہ اور ہندو مل کر آسانی کے ساتھ اس دھرتی سے ہمارا وجود ختم کر سکیں۔ ہمارے اتحاد اور یکجہتی کو پارہ پارہ کر کے وہ ہمیں فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ مٹا دینا چاہتے ہیں اس دنیا سے تاکہ وہ دنیا پر بالادستی قائم کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں۔"

مگر بیٹا! یہ تو بہت بڑا کام ہے، تم یہ کار[illegible] گے۔ یہ تو حکومت کے ہی بس کا ہے، کیا اسے نہ[illegible] یہاں کیا ہو رہا ہے؟ تم اس جھگڑے میں پڑ کر[illegible] کو کیوں ہلاک کر رہے ہو، جس کا کام ہے اسی[illegible] دو اسے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماں جی! ہم اور حکو[illegible] الگ تو نہیں ہیں، اس ملک پر ہمارا بھی اتنا ہی حق[illegible] حکمران کا ہو سکتا ہے۔ یہ صرف حکمرانوں کا ہی نہیں[illegible] ہے اور اس کی حفاظت ہماری بھی ذمے داری[illegible] دشمن نے کیسے کیسے روپ دھار رکھے ہیں آپ نہیں[illegible] وہ ہم پر ہر طرف سے حملے کر رہا ہے۔ مذہب کے[illegible] پیروں فقیروں کے روپ میں، سیاست کے راستے[illegible] کے روپ میں اور پتا نہیں کس کس روپ میں کس کس طرح زہر[illegible] رہے وہ لوگوں کے ذہنوں میں اور اگر ہم اسے پہچا[illegible] اس کی طرف سے غافل رہے، نظر انداز کرتے رہے[illegible] حکومت کی ذمے داری سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے[illegible] تو ہمارا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ ہم اگر اپنی بربادی[illegible] تماشا کرتے رہے تو کل ہماری حالتِ زار پر کوئی آنسو[illegible] بھی نہ ہوگا۔"

"پتا نہیں بیٹا! کیسی باتیں کرنے لگے ہو تم بھی[illegible] ہمارے زمانے میں نہ تو ایسے لوگ تھے نہ ایسی باتیں[illegible] اس زمانے کے لوگوں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے جس[illegible] بنا کر رہتے ہیں اسی کو کاٹ دینا بھی چاہتے ہیں، جس[illegible] نیچے پناہ گزیں ہیں اسی کی چھت میں سوراخ کر رہے[illegible] کبھی کوئی ٹھنڈ سے بچنے کے لیے اپنے گھر کو آگ[illegible] یہ ریت اس زمانے میں ہی دیکھی ہے ہم نے۔ بہرحال[illegible] بیٹا! تم جو اچھا سمجھتے ہو وہی کرو مگر ایک بات کا خیال[illegible] مظلوم کی آہ نہ لینا کبھی۔ مظلوم کی آہ سے آسمان بھی[illegible]

میں نے شرافت علی سے کہا: "یار! تم ماں جی[illegible] پاس پہنچا آؤ۔ آج کی رات ہم یہاں اس اسرائیلی[illegible] سے ایک فیصلہ کن معرکہ کریں گے۔ اللہ نے چاہا تو[illegible] سارے منصوبے سمیت فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔"

"مگر یہ اچانک پروگرام تبدیل کیوں کر دیا تم[illegible] تو یہ مکان چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا آج؟" شرافت[illegible]

"یہ تجویز لزی کی ہے اور چونکہ ایک معقول تجو[illegible] لیے سب نے اتفاق کر لیا ہے اس سے۔" میں نے[illegible]

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ان شاء اللہ[illegible] ہم بہترین طریقے سے استقبال کریں گے اس کا۔" شرافت[illegible]

ہے بولا: "آئیں اماں جی! آپ میرے ساتھ چلیں، آسیہ بے چینی سے انتظار کر رہی ہے آپ کا۔"

ماں جی اور شرافت علی کے جانے کے بعد میں نے لزی سے کہا: "لزی بیگم! ہمارے درمیان اب کوئی پردہ تو حائل نہیں رہا ہے، اور ہم ایک دوسرے پر مکمل اعتماد بھی کرنے لگے ہیں، لہٰذا میں جاننا چاہتا ہوں تم اپنے بارے میں ہمیں اب صاف صاف سب کچھ بتا دو، تم کون ہو، کیا ہو اور آئزک کے خلاف ہمارا ساتھ دینے پر کیوں آمادہ ہوئی ہو۔ یہ تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم یہودی نہیں ہو، پھر کیا وجہ ہے کہ تم اتنے عرصے ان کے ساتھ رہ کر ان کے مفادات کے لیے کام کرتی رہیں؟"

"یہ یقین کیسے کر لیا آپ نے کہ میں یہودی نہیں ہوں؟" لزی نے مجھے مسکراتی ہوئی شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سیدھی بات ہے، جو شخص یہودیوں کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے، اس کے لیے یہ جان لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہودی کچھ بھی کرتا ہو، دنیا کے کسی حصے سے تعلق ہو اس کا اور وہ اسرائیلی حکومت سے کتنا ہی بڑا اختلاف کیوں نہ رکھتا ہو مگر یہودیوں کے خلاف کسی غیر یہودی کا ساتھ دینے کو کبھی تیار نہیں ہوتا۔ جبکہ تم ایسا کر رہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ آپ نے بالکل درست کہا ہے جنابِ عالی! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہودیوں کے بارے میں اس قدر معلومات رکھتے ہیں۔"

"یہ معلومات مجھے سان فرانسسکو میں حاصل ہوئی تھیں، اس سے پہلے تو میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی قوم ہیں اور خدا کے معتوب کہلاتے ہیں۔ سان فرانسسکو میں انسپکٹر گریگری سے ان کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں، اس کے بعد میں نے اپنے طور پر بھی معلومات حاصل کی ہیں، کیوں کہ میں نے کسی دانا کا یہ قول پڑھا ہے کہ دشمن کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات معلوم ہونا چاہیے، تبھی اس پر مکمل فتح پائی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ بات درست ہے کہ دشمن کے بارے میں معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔" لزی بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خیال ہے کہ آدمی کو دوستوں کے بارے میں بھی پوری پوری واقفیت رکھنا چاہیے۔ اس طرح باہمی محبت کی فضا قائم رکھنے میں آسانی ہوتی ہے اور شکوک و شبہات دلوں میں جگہ نہیں بنا پاتے۔ کیوں لزی بیگم! غلط تو نہیں کہا میں نے؟" آبی بولا۔

"بالکل بھی غلط نہیں کہا ہے آپ نے آبی بھائی! شکوک و شبہات تو دوستی کے لیے سمِ قاتل ہوتے ہیں۔" لزی نے اس سے اتفاق کیا۔

"جب آپ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں تب تو آپ کو اپنے بارے میں کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہیے ہم سے۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اپنے بارے میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گی؟" لزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتا بھی چکو نا اب، زیادہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟" آبی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

لزی نے اپنے ساتھ آنے والے مسلح جوانوں سے کہا۔ "تم لوگ باہر جاؤ اور عمارت کے چاروں طرف پھیل کر نظر رکھو پوری عمارت پر، خبردار کسی بھی غیر متعلقہ شخص کو اندر داخل نہیں ہونا چاہیے۔"

"او کے میڈم! آپ مطمئن رہیں آپ کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا اس عمارت میں۔" ان میں سے ایک بولا۔

وہ سب تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح سیلوٹ مار کر دروازے کی طرف مڑے اور فوجیوں ہی کے انداز میں چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد لزی چند ثانیے خاموش بیٹھی شاید دل ہی دل میں اپنی کہانی کی کڑیاں جوڑتی رہی، پھر اس نے سر اٹھا کر وہاں موجود ہر شخص کا باری باری جائزہ لیتے ہوئے مجھ پر نظریں ٹکا دیں اور بولی۔

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے جنابِ عالی کہ میں نسلاً یہودی نہیں ہوں۔ یہ بات مجھے بھی ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔ سان فرانسسکو میں آپ سے ملاقات ہونے سے کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا اور اس انکشاف ہی نے مجھ میں یہ زبردست تبدیلی پیدا کی تھی۔ میری اس معلومات کا ذریعہ یا سبب بھی انسپکٹر گریگری ہی تھا۔ اسی نے مجھے پہلی بار یہ باور کرایا تھا کہ میں جو یہودیوں کے مفادات کے لیے اس قدر سرگرمِ عمل ہوں حقیقتاً یہودی النسل نہیں ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انسپکٹر گریگری کو یہ بات کیوں کر معلوم ہوئی۔ اس کی زبانی اپنے بارے میں سن کر تعجب مجھے بھی بہت ہوا تھا اور یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے مگر اس نے بتایا کہ وہ گزشتہ ایک سال سے رات دن میری نگرانی کرا رہا ہے۔ گزشتہ ایک سال کی میری ساری مصروفیات، میرا ایک ایک لمحہ اس کے سامنے ہے۔ ابتدا میں وہ مجھ سے منشیات کی ایک کامیاب اسمگلر کی حیثیت سے واقف ہوا تھا اور مجھے اسمگلنگ کے مال سمیت پکڑنے کے لیے ہی میرے پیچھے لگا تھا۔ ہمارے کام کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ مجھے پکڑنے میں کبھی کامیاب نہیں

ہو سکا لیکن میری رات دن کی نگرانی کے نتیجے میں کچھ ایسے لوگ بھی اس کی نگاہوں میں آ گئے جن کی نگرانی کرنے کے بعد گریگری کو میرے بارے میں حقائق کا علم ہو گیا۔ یہ جاننے کے بعد ہی کہ میں دراصل یہودی النسل نہیں ہوں، وہ مجھ سے ملا تھا اور مجھ پر وہ انکشافات کیے تھے جو اگر وہ نہ کرتا تو میں نادانستگی میں اب تک یہودی کتوں کی آلۂ کار بنی رہتی اور آپ بھی جنابِ عالی! ان کی کسی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔ آرتھر فنیلی نے مجھے آپ کے ساتھ لگایا ہی اس لیے تھا کہ جب آپ تنظیم کے لیے سود مند نہ رہیں تو آپ کو دنیا سے رخصت کر دیا جائے لیکن میں آپ سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی اپنی حقیقت کو پا چکی تھی لہٰذا میں نے آرتھر فنیلی کے منصوبے پر عمل کرنے کے بجائے ایک نیا منصوبہ بنا کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ آئزک سے کھلی دشمنی مول لینے کے باوجود زندہ و سلامت ہیں۔''

''ہاں، یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمھاری فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے میں بہت سی ناگہانی آفات سے محفوظ رہا ہوں ورنہ آئزک جیسے خونخوار بھیڑیے نے مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہوتا اب تک۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ گریگری نے تم پر کیا انکشافات کیے تھے اور تمھاری اصلیت کیا ہے؟''

''وہی بتانے جا رہی ہوں اب میں آپ کو۔'' وہ بولی۔

''ایک رات سان فرانسسکو کے ایک کلب میں گریگری مجھ سے مل بیٹھا۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ وہاں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر ہے مگر اس وقت تک یہ پتا نہیں تھا مجھے کہ وہ بھی مجھے جانتا ہے۔ میں کلب میں اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ بیٹھی شیمپین کی ہلکی ہلکی چسکیاں لگاتے ہوئے ڈانسنگ فلور پر محوِ رقص جوڑوں کو دیکھ رہی تھی جب گریگری نے میرے قریب آ کر رقص کے لیے مجھے اپنی پارٹنر بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں کے ہر سطح کے افسران کو شیشے میں اتارنے کے لیے ان سے مل بیٹھنا ہماری ضرورت بھی تھی اور ہمارے بڑوں کی ہدایت بھی۔ چنانچہ میں نے گریگری کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے فوراً اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ وہ مجھے لے کر رقص کرنے والے ہجوم میں شامل ہو گیا مگر جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ وہ رقص کرتے ہوئے غیر محسوس طریقے پر مجھے لے کر ایک علیحدہ اور پُرسکون گوشے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شکار خود جال میں پھنسنے پر مائل ہے تو مجھے اپنی کامیابی کا صد فی صد یقین ہو گیا اور میں کوئی تعرض کیے بغیر اس کے ساتھ تنہائی میں چلی گئی۔ ہم وہاں سبزہ زار میں ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گئے تو گریگری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جانتی ہو مس فنیلی! میں تمھیں اپنے ساتھ اس ویران گوشے میں کیوں لایا ہوں؟''

میں نے بھی مسکراتے ہوئے ہی جواب دیا۔ ''اب اتنی بھی نہیں ہوں میں کہ مجھے آپ کے اس طرف آنے کا مقصد نہ ہو، میں جانتی ہوں نوجوان تنہائی میں اپنا حالِ دل کہنے کو یہاں لڑکیوں کو۔''

وہ ہلکا سا قہقہہ لگانے کے بعد بولا۔ ''لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں مس فنیلی! دوسرے یہ کہ میں چونکہ پہلے ہی شادی شدہ ہوں اس لیے میں اس مقصد سے تمھیں یہاں نہیں لایا ہوں جس کے لیے نوجوان اِدھر آتے ہیں۔''

''اوہ۔'' میں نے چونک کر اسے دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی بہت اہم بات ہو گی جس کے لیے یہ پولیس انسپکٹر مجھے یہاں لایا ہے۔ میں نے کہا۔ ''پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں مسٹر گریگری؟''

''میں تمھیں یہ بتانے کے لیے یہاں لایا ہوں کہ تم جو زندگی گزار رہی ہو، وہ ایک مصنوعی زندگی ہے۔ یہ زندگی تمھاری اپنی زندگی ہرگز نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس حقیقت کا کچھ علم ہے؟'' اس نے نہایت سنجیدہ اور مضبوط لہجے میں کہا۔

پہلے تو میں سمجھی کہ شاید وہ مجھ سے کسی قسم کا مذاق کر رہا ہے۔ مگر اس کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر میں بھی سنجیدہ ہو گئی اور پوچھا۔ ''مصنوعی زندگی سے آپ کی کیا مراد ہے مسٹر گریگری؟ آپ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ میں مر چکی ہوں اور مجھے طریقے پر زندہ رکھا جا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے مصنوعی وغیرہ کے ذریعے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے میرے علم میں تو...''

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تمھاری موجودہ زندگی وہ نہیں جو ہونا چاہیے۔ یعنی تم اپنے والدین، اپنے عزیز و اقارب سے الگ ایسے لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہو جن سے تمھارا کوئی کوئی قرابت نہیں ہے۔ یہ سارے رشتے مصنوعی رشتے ہیں۔ آرتھر فنیلی تمھارا باپ نہیں ہے۔''

اس کا یہ انکشاف میرے لیے کسی خوفناک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ میری آنکھیں حیرت کی زیادتی کے باعث پھٹی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ذہن کو اتنا شدید جھٹکا لگا تھا کہ چند لمحوں کے لیے جیسے میری قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے گم صم بیٹھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کیا یہ بات ایٹمی دھماکے سے کم تھی؟ کہ وہ لوگ جن کے ساتھ میں نے بچپن گزارا تھا، جنھوں نے میری تعلیم و تربیت اپنی اولاد کی طرح کی تھی، وہ میرے اپنے نہیں تھے۔ وہ آرتھر فنیلی جس نے برسوں شدید محنت کی تھی اور مجھے مختلف تربیت گاہوں میں تربیت دلوائی تھی کہ میں ہر فن میں طاق ہو گئی تھی، جس نے میرے لیے ہر طرح کا عیش و آرام مہیا کیا تھا۔ اور شناخت کے لیے مجھے اپنا نام دیا تھا۔ وہ آرتھر فنیلی میرا باپ نہیں تھا۔ گریگری نے مجھے ایک دم آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ وہ سارے رشتے ناتے جن پر میں برسوں سے فخر کرتی آئی تھی اور جن کے لیے میں ہر دم ہر عذاب سے گزرنے کے لیے تیار رہتی تھی، سراب تھے۔ یہ میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے بمشکل اپنے دل و دماغ میں اٹھنے والے طوفان سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ مسٹر گریگری! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آرتھر فنیلی میرے والد نہیں ہیں تو انھوں نے کس رشتے سے اس قدر لاڈ پیار کے ساتھ میری پرورش و پرداخت کی ہے؟ کیوں میری تعلیم اور تربیت کی ہے؟ کیا میں ان کی لے پالک ہوں؟ اگر ایسا ہے تب بھی وہ میرے والد ہی تو ہوئے نا؟''

''نہیں، مس فنیلی! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ آرتھر نے آپ کی دیکھ بھال یا تعلیم و تربیت آپ کی بھلائی کے لیے نہیں کی ہے۔ اس میں اس کا اپنا مفاد ہے، اس کی تنظیم کا مفاد ہے اور پوری یہودی قوم کا مفاد ہے۔''

''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اپنی قوم کے مفاد کے لیے کام کرنا تو ہر انسان کا فرض ہے مسٹر گریگری! پھر اگر میں یا کوئی بھی یہودی ایسا کرتا ہے تو آپ لوگ اس پر اعتراض کیوں کرتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ گریگری مجھے صیہونیت کے مفاد کے لیے کام کرنے سے روکنے کی خاطر ایسی باتیں کر رہا ہے مجھ سے۔

وہ بولا۔ ''بے شک ہر شخص پر اس کے ملک، اس کی قوم کی طرف سے کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں جنھیں پورا کرنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ تم بھی اگر نسلاً یہودی ہوتیں یا اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود کہ تمھارا بنی اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کے لیے کچھ بھی کرتیں تو مجھے یا کسی بھی شخص کو کوئی اعتراض نہ ہوتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''یہ کیا فضول بکواس ہے۔'' میں نے چراغ پا ہو کر کہا۔ ''آرتھر فنیلی سے میرے رشتے کی نفی کرتے کرتے اب تم میری قومیت کو بھی جھٹلانے لگے ہو۔ میری شناخت کی نفی کرنے لگے ہو۔ ہو سکتا ہے مسٹر آرتھر فنیلی سے میرا کوئی رشتہ نہ ہو، میرے والدین، میرے عزیز و اقارب کوئی بھی ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میرا دین یہودیت کے سوا کوئی اور ہو۔ میرے یہودی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، مسٹر گریگری میں ایک یہودی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، میری تمام تعلیم و تربیت یہودی انداز میں ہوئی ہے، آپ کو شاید پتا نہیں ہے کہ ہم یہودی کبھی کسی غیر قوم کے فرد کو اپنے میں شامل نہیں کرتے۔ ہم کسی ایسے شخص کو یہودی تسلیم ہی نہیں کرتے جس کے آبا و اجداد یہودی نہ رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کو جو اپنا دین، اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی بننا چاہیں انھیں ہم کبھی قبول نہیں کرتے کیونکہ ہمارے نزدیک ایسے لوگ جو اپنے اجداد کے دین اور بزرگوں کے عقائد سے منہ موڑ کر کسی اور دین میں شامل ہو جاتے ہیں کبھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کو کوئی لالچ یا کوئی مصیبت عقائد تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ذرا سے فائدے یا نقصان کی خاطر پوری قوم کے لیے بربادی کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا یہودیوں نے دوسرے مذاہب کے لیے اپنے دروازے ہمیشہ بند رکھے ہیں۔''

وہ میری یہ جذباتی تقریر سن کر کبیدہ خاطر یا بد دل ہونے کے بجائے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ تم نے صحیح کہا ہے کہ یہودی کسی غیر یہودی کو اپنے مذہب میں شامل نہیں کرتے لیکن شاید تم یہ نہیں جانتیں کہ یہودیوں کی بین الاقوامی تنظیم یہودہ غیر اقوام کے ایسے لاوارث بچّوں کو جن کی عمریں بہت ہی کم ہوں یعنی دو تین سال تک کی عمر کے بچّوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیتی ہے اور انھیں بالکل

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

* کیا آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔
* کیا آپ کی آنکھیں بھینگی ہیں۔
* کیا آپ چشمہ لگاتے ہیں۔
* یا آنکھوں کے کسی مرض کا شکار ہیں؟

تو کتاب

کم نظری اور اس کا سدِ باب

قیمت روپے۔ ڈاک خرچ روپے

آپ کو بتائے گی کہ

عینک سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بغیر دواؤں کے اپنی آنکھیں کس طرح صحت مند بنائی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں صحت مند ہیں تو انہیں ہمیشہ کس طرح صحت مند رکھا جا سکتا ہے

ہر شخص کے لئے یکساں طور پر مفید کتاب

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۲۳ کراچی

اپنے بچّوں کی طرح پرورش کرتی ہے اور پھر جوان ہونے کے بعد ان سے تخریب کاری، اسمگلنگ وغیرہ قسم کے خطرناک کام لیتی ہے۔ انھیں خصوصی طور پر ایسے ہی کاموں کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ اس طرح کے کاموں کے لیے کوئی یہودی اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ یہودہ کو ایسے پُرخطر کاموں کے لیے قربانی کے بکروں کی ضرورت رہتی ہے اور تم جیسے لوگ اسی لیے رکھے جاتے ہیں۔ یقین نہیں ہے میری باتوں پر تمھیں تو گھر جاکر کسی پُرسکون جگہ بیٹھ جانا اور اپنی پوری زندگی کو آموختے کی طرح دل ہی دل میں دُہراتی چلی جانا تمھیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ تمھارا تعلق بھی قربانی کے انھی جانوروں میں سے ہے۔ اب تک تم نے آرتھر کے کہنے پر جتنے بھی کام کیے ہیں وہ سب ایسے ہیں کہ جن کی تکمیل کے بعد تمھیں ایک نئی زندگی ملنے کا احساس ہوا ہے۔"

گرگیری کی اس بات نے میری زبان کو جیسے تالا لگا دیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ ماضی قریب اور بعید کے وہ تمام خوش گوار اور ناخوش گوار لمحے جنھیں میں پیچھے چھوڑ آئی تھی ایک ایک کرکے میرے ذہن کے اسکرین پر ابھرتے جا رہے تھے اور ہر لمحہ، ہر پل، ہر واقعہ گرگیری کی تائید کرتا نظر آرہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنا سر جھٹک دیا اور گرگیری سے نظریں چُراتے ہوئے بولی "میں گھر جاکر آپ کے مشورے پر ضرور عمل کروں گی مسٹر گرگیری! مگر مجھے یقین ہے آپ کی باتیں سچ ثابت نہیں ہو سکیں گی اور میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکے گی۔"

یہ کہتے ہوئے میں خود بھی اپنے لہجے کا کھوکھلا پن محسوس کر رہی تھی۔ گرگیری نے بھی پوری طرح اسے محسوس کیا تھا اور اس کے لبوں پر فتح مندی کی مسکان ابھر آئی تھی۔ وہ بولا "میری باتوں کی صداقت تو تمھارے لہجے سے عیاں ہے مس فنیلی! بہرحال ایک بات کا خیال رکھنا، جب تم پر حقیقت آشکار ہوجائے تو اس کا اظہار کرنے آرتھر کے پاس نہ چلی جانا۔ یہ میرا کارڈ اپنے پاس رکھ لو، کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد مجھ سے مل لینا۔" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا "چلو اب واپس چلیں، زیادہ دیر ہوگئی تو تمھارے سرپرست مشکوک ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "پلیز مسٹر گرگیری! آپ جائیں، میں ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی۔ یہ جگہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی۔" گرگیری نے جواب دیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے ماضی کو کھنگالنا شروع کردیا۔ ابتدا سے ایک ایک دن کے ایک ایک پل کا حساب کرنا شروع کیا اور میرے دل و دماغ میں زبردست بھونچال آگیا تھا۔ اس رات کے کئی گھنٹے میں نے اسی نیم تاریک گوشے کی نذر کردیے اور جب میں نے وہ جگہ چھوڑی تو اس وقت گرگیری کی ہر بات کی تصدیق ہوچکی تھی۔ مجھے اپنی اہمیت اور حیثیت کا پورا پورا ادراک ہوچکا تھا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ میں واقعی آرتھر فنیلی کے اشاروں پر ناچنے والی ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہیں ہوں اور میری حیثیت قربانی کے اس جانور جیسی ہی ہے جسے قربان کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح کھلا پلا کر تیار کیا جاتا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے قصائی کے حوالے کرکے اپنی طرف آنے والے اِدبار کا رخ موڑا جاسکے۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ تنظیم یہودہ کے پاس قربانی کے ایسے بے شمار جانور ہیں لیکن یہ انکشاف مجھ پر اسی رات کو ہوا تھا کہ خود میرا شمار ایسے ہی جانوروں میں ہے۔

آرتھر فنیلی کے ذاتی آفس کی ایک الماری میں ایسی فائلیں بھری پڑی تھیں جن میں مجھ جیسے لوگوں کے سارے کوائف درج تھے۔ آرتھر چونکہ سان فرانسسکو میں تنظیم کا سربراہ تھا، اس لیے اس ریاست میں موجود ایسے تمام لوگوں کی فائلیں اسی کی تحویل میں رہتی تھیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ ایسے تمام لوگ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر تنظیم کے آلۂ کار ہیں اور ان کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں ہے یعنی وہ نسلاً یہودی نہیں ہیں ان کی باقاعدہ ایک فائل تیار ہوتی ہے جس میں تفصیل کے ساتھ اس شخص کی پوری سرگزشت موجود ہوتی ہے کس قوم سے اس کا تعلق ہے، اس کے والدین کون تھے کس ملک اور کس مذہب سے تعلق تھا ان کا، وہ شخص کب اور کن حالات میں تنظیم کے پاس پہنچا، تنظیم نے اس کی تعلیم و تربیت کس شخص کے ذمّے لگائی، کن کن مراکز میں اس کی تربیت ہوئی، کون کون سے فن میں اس نے مہارت حاصل کی، کہاں اور کتنی تعلیم اس نے حاصل کی، کون کون سے کام اس سے لیے گئے، کتنی کامیابیاں اس نے حاصل کیں اور تنظیم کے لیے کتنا سودمند ہے، کن کن ممالک اور شہروں میں اسے کیا کیا فرائض سونپے جاچکے ہیں، اب کہاں ہے اور کیا ذمّے داری اسے دی گئی ہے۔ یہ ساری تفصیل اس فائل میں موجود ہوتی ہے اور جہاں اسے بھیجا جاتا ہے وہاں کے سربراہ کے پاس اس کی فائل بھیجی جاتی ہے تاکہ وہ اس کی مصروفیات اس میں درج کرتا رہے۔ اس شخص کی موت کے بعد یہ فائل ضائع کردی جاتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بارے میں بھی آرتھر کے پاس ایسی ہی فائل ضرور ہوگی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ فائل تلاش کرکے میں اپنے بارے میں ضرور معلوم کروں گی کہ میں

کون ہوں، میرے والدین کون تھے اور ان لوگوں نے مجھے کہاں سے کن حالات میں حاصل کیا تھا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی مجھے اس کا موقع بھی میسّر آگیا۔ گرگیری سے ملاقات کے چند ہی روز بعد یہودہ کے ہیڈکوارٹر میں تنظیم کے تمام سربراہوں کی سالانہ میٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں یہودہ کے ذیلی مراکز ہیں، ان تمام کے سربراہوں کی ہر سال ایک میٹنگ یروشلم میں واقع تنظیم کے ہیڈکوارٹر میں ہوتی ہے، جہاں سب اپنے اپنے علاقے کی سال بھر کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ یہ اجلاس پورے ایک ہفتے جاری رہتا ہے چنانچہ اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے آرتھر اسرائیل گیا تو اس کی غیر موجودگی میں جوزفائن اس کی قائم مقام بنی۔ جوزفائن یوں تو بڑی تیز طرّار اور ہر دم چوکنّا رہنے والی عورت ہے لیکن شراب اس کی بہت بڑی کمزوری ہے اور یہ اس کا معمول ہے کہ رات کو وہ نشے میں بدمست ہوکر سوتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے جام اس وقت تک نہیں چھوٹتا جب تک اس میں اسے پکڑ کر اٹھانے کی طاقت ہوتی ہے۔ آرتھر کے اسرائیل جانے کے بعد دوسری ہی رات کو میں نے اسے خوب پلانا شروع کی اور اس وقت تک اس کے حلق میں شراب انڈیلتی رہی جب تک وہ اسے حلق سے اتارتی رہی۔ جب اس میں اس کی بھی طاقت نہیں رہی تب کہیں میں نے اپنا ہاتھ روکا اور اس کے پاس سے اٹھ کر سیدھی آرتھر کے آفس کے اس تہ خانے میں جا پہنچی جہاں انتہائی خفیہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ وہاں کئی الماریاں لائن سے رکھی تھیں۔ وہ تمام الماریاں اور وہ تہ خانہ میرا خوب دیکھا بھالا ہوا تھا۔ اکثر آرتھر کے ساتھ اور اکیلے بھی میں وہاں جاتی رہتی تھی۔ کبھی کوئی چیز لینے اور کبھی کچھ رکھنے کے لیے آرتھر مجھے وہاں بھیجتا رہتا تھا لیکن وہاں موجود الماریوں میں ایک سرخ رنگ کی الماری ایسی بھی تھی جسے میں نے کبھی نہیں کھولا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس الماری میں مجھ جیسے آلۂ کاروں کی فائلیں رکھی ہوئی ہیں لیکن چونکہ مجھے اپنے بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا لہٰذا کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ الماری میں موجود فائلوں میں کیا کچھ ہے۔ آرتھر کے ماتحت ایسے جتنے بھی لوگ کام کر رہے تھے ان کے بارے میں آرتھر نے خود ہی مجھے سب کچھ بتا رکھا تھا۔ دراصل یہ بھی ان لوگوں کی ایک بڑی کامیاب چال ہے، وہ ہر آدمی کو دوسروں کے بارے میں باخبر رکھتے ہیں اور اسے یہ ہدایت کردیتے ہیں کہ یہ راز ان لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دینا ہے۔ اس طرح ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تصور کرتا رہتا ہے، کسی کے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو نہیں کرتا اور سب کے ساتھ اس یقین کے ساتھ کام کرتا رہتا ہے کہ تنظیم کی

طرف سے اس پر ان سب کی نگرانی کی ذمّے داری بھی عائد ہے اس طرح تنظیم کی طرف سے کوئی نگراں نہ ہونے کے باوجود بھی ہر آدمی کی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے تہ خانے میں جاتے ہوئے تمام الماریوں کی چابیاں ساتھ لے لی تھیں لیکن اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ان میں سے کوئی بھی چابی اس سرخ رنگ کی الماری کا تالا کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس رات پہلی بار مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آرتھر جو چابیاں دے کر مجھے تہ خانے میں بھیجتا رہا تھا ان میں اس الماری کی چابی سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھ پر بے پناہ اعتماد کا اظہار کرنے کے باوجود بالکل بھی اعتماد نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے چابیوں کا پورا گچھا تھما کر یہ تاثر دیتا تھا کہ میں چونکہ انھی میں سے ہوں، اس لیے وہ مجھ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے تہ خانے کی تمام چابیاں میرے حوالے کردیتے ہیں لیکن اس نے اس الماری کی چابی کبھی مجھے نہیں دی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ کبھی میں تجسّس دور کرنے کی خاطر بھی وہ الماری کھول کر دیکھنا چاہوں تو نہ دیکھ سکوں۔

جب سے گرگیری نے مجھے اپنی حیثیت سے آگاہ کیا تھا، مجھے قدم قدم پر ایسے ثبوت مل رہے تھے جن سے گرگیری کی ایک ایک بات کی تائید ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ تو پہلے بھی میرے ساتھ ہوتا رہا تھا بلکہ ہمیشہ ہی سے ہورہا تھا، مگر پہلے کبھی مجھے اس کا احساس تک نہ ہوسکا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس وقت تک میرا ذہن بالکل صاف تھا، آرتھر یا تنظیم کے کسی بھی شخص کی طرف سے میرے دل میں ذرا بھی مَیل نہیں آیا تھا۔ اب دل کا شیشہ ذرا سا دھندلایا تھا تو نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی بھی شکلیں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ مجھے... نے بہت کوشش کی، کوئی دو گھنٹے تک الماری کے تالے سے الجھتی رہی مگر تالا کسی طرح بھی نہ کھل سکا۔ تالا توڑنا میرے لیے بہت آسان تھا مگر اس طرح چوری کھل جانے کا اندیشہ تھا میں نہیں چاہتی تھی کہ آرتھر کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ ہو۔ چنانچہ اس رات دو گھنٹے سے زیادہ اس تالے سے سر پھوڑنے کے بعد بالآخر میں نامراد تہ خانے سے واپس آگئی۔ دوسرے روز میں گرگیری سے اس کے گھر پر ملاقات کی اور اسے ساری بات بتا کر اس سے مدد کی درخواست کی۔ میں نے اس سے کہا "مسٹر گرگیری! آپ نے جہاں مجھ پر اتنی مہربانی کی ہے تھوڑی سی مہربانی اور کردیں مجھے یہ بتادیں کہ میں کس ملک اور کس قوم سے تعلق رکھتی ہوں اور میرے والدین کون تھے؟"

گرگیری نے کہا "مجھے افسوس ہے مس فنیلی! اس بارے

میں آپ کو میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ اتنا کر دیں کہ آج رات میرے ساتھ چل کر کسی طرح وہ الماری کھول دیں جس میں میرے بارے میں ساری معلومات بند ہیں۔ بولیں، کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟" میں نے اس سے کہا۔

"کوشش کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "ایک شخص سے واقف ہوں جو ہر طرح کے تالے کھولنے میں ماہر ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں اسے تلاش کر کے لے آتا ہوں، وہ تمھارے ساتھ جا کر اس الماری کا تالا کھول دے گا۔"

"تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے وہاں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میری وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تمھیں۔ خواہ مخواہ ساتھ چلنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں مسٹر گریگری! میں آپ کے سوا کسی اور شخص پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ نہیں چلیں گے تو میں کسی اور کو ساتھ لے کر وہاں نہیں جاؤں گی۔ آپ نہیں جانتے، یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہلاکت میں ڈال سکتی ہے مجھے۔"

"ٹھیک ہے بھئی، اگر تم یہی چاہتی ہو کہ میں تمھارے ساتھ ضرور چلوں، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، میں تیار ہوں تمھارے ساتھ چلنے کو لیکن ایک بات واضح کر دوں تم پر کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کے نتیجے کی ذمے دار تم ہی ہو گی۔" گریگری بولا۔

"میں سمجھی نہیں، آپ کس گڑبڑ کی بات کر رہے ہیں۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا کر کسی مصیبت میں پھنسا دینا چاہتی ہوں؟" میں نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"دیکھیں مس فنیلی! ہم پولیس والوں کو دن رات بدقماش اور بدکردار لوگوں سے ہی نمٹنا پڑتا ہے، اس لیے ہم شک کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات میں بھی کوئی نہ کوئی ہیر پھیر تلاش کر کے نکال ہی لیتے ہیں۔ اس لیے میری کسی بات سے یہ نہ سمجھ لینا تم کہ میں تمھارا ساتھ دینے سے کترا رہا ہوں یا تم پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری آپ سے کوئی پرانی شناسائی تو ہے نہیں۔ نہ آپ مجھے جانتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا بھی نہیں چاہیے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت بھی نہیں کرنا چاہیے اس سلسلے میں..."

"تم غلط سمجھی ہو مس فنیلی! میں اگر تمھیں جانتا نہ ہوتا تو تمھارے بارے میں وہ سب کچھ کیسے جان لیتا جس کی خود تمھیں بھی خبر نہیں تھی؟ لہٰذا تمھارا یہ کہنا بالکل درست نہیں کہ میں تمھیں جانتا نہیں ہوں۔ بہرحال اب اس بات کو دل سے نکال دو، میں نے کہہ دیا ہے نا کہ میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" گریگری نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"چلیں، آپ کہتے ہیں تو دل سے نکال دیتی ہوں اس بات کو۔ پھر یہ طے ہو گیا نا اب کہ آپ آج رات کو بارہ بجے تک تالا کھولنے والے کو ساتھ لے کر میرے پاس پہنچ رہے ہیں؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور ضرور۔ اب اس میں کسی ردوبدل کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ ویسے کوئی الجھن یا پریشانی ہو اور تم اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی کرنا چاہو تو فون کر کے مجھے اطلاع دے دینا۔" گریگری بھی میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی، اگر پروگرام میں کوئی تبدیلی کرنا پڑی تو اس کی اطلاع دینا آپ کو ضروری ہے۔"

پروگرام کے مطابق رات کے ٹھیک بارہ بجے گریگری ایک شخص کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے پہلی رات کی طرح اس رات بھی جوزف ائن کو شراب پلا پلا کر دنیا جہان سے بالکل بے خبر کر دیا تھا اور اب اس کے صبح نو دس بجے سے پہلے بستر سے اٹھنے کا کوئی امکان تک نہیں رہا تھا، اس کے باوجود میں نے احتیاطاً اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر کے اس کی چابی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ گریگری کے ساتھ جو شخص آیا تھا، وہ وہی تھا جس کے بارے میں گریگری نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہر قسم کے تالے کو منٹوں میں کھول سکتا ہے۔ اس شخص نے کوئی ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد ایک ایسی چابی تیار کر کے میرے ہاتھ میں تھما دی جس سے الماری کا تالا بہ آسانی کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا۔ اس کام کے بعد گریگری اس شخص کو رخصت کرنے باہر چلا گیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے الماری کھولوں اور وہ شخص یہ جان لے کہ میں نے الماری کی چابی کس مقصد کے تحت بنوائی ہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے الماری کھول کر اس میں سے ایک ایک فائل نکال نکال کر دیکھنا شروع کر دی۔ میرے نام کی فائل سب سے نیچے دبی ہوئی ملی تھی مجھے۔ فائل دیکھنے کے بعد میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور بدن کا رواں رواں تن گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں اور میں بے یقینی کے عالم میں اس فائل کو دیکھ رہی تھی۔ میری حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس وقت بالکل اس ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح جس نے تنکے کو اس امید پر پکڑ رکھا ہو کہ وہ اس کے سہارے کنارے تک پہنچ جائے گا مگر اچانک وہ تنکا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ میں بھی کچھ ایسے ہی فریب کا شکار تھی اب تک، سب کچھ جان لینے کے باوجود یہ آس لگائے ہوئے تھی کہ اس الماری میں میرے نام کی کوئی فائل نہیں ہو گی اور جو کچھ میں نے اب تک سمجھا اور محسوس کیا ہے، وہ صرف میری بدلی ہوئی سوچ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ میں فنیلی خاندان کی ایک فرد ہوں، آرتھر فنیلی میرا باپ ہے اور یہودیت میرا دین ہے۔ اس فائل کے دستیاب ہونے سے پہلے تک میں خود کو یہودیت سے جدا کرنے کو تیار نہ کر سکی تھی..."

"کمال ہے بھئی، اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی یہودیت تمھارے دل میں بسی ہوئی تھی۔" آبی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "ایسی کیا خوبی، کون سی کشش ہے اس خدا کی معتوب قوم میں؟"

"بات کشش اور خوبی کی نہیں ہے آبی بھائی! میں نے بچپن سے اسی مذہب کو دیکھا اور سمجھا تھا۔ مجھے اسی کے بارے میں پڑھایا اور بتایا گیا، اس کے اصول اور قاعدے قانون مجھے پڑھائے اور سمجھائے گئے تھے اور میں ان پر عمل کرنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اب ان سے منہ موڑنا بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔ تمام مذاہبِ عالم کے خلاف میرے ذہن میں بچپن ہی سے جو زہر بھرا گیا تھا، اس کے بعد یہودیت کے سوا مجھے کوئی مذہب اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ آپ کو پتا نہیں ہے، دنیا کے تمام مذاہب کے جتنے بڑے اور سخت دشمن یہودی ہیں، کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہودی دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کا کہنا ہے، اگر دنیا میں صیہونیت کا غلبہ چاہتے ہو، بنی اسرائیل کی دنیا پر حاکمیت چاہتے ہو تو یہودیوں کے سوا دنیا کے ہر شخص کے دل سے اس کے مذہب اس کے دین کی محبت نکال پھینکو، اس کے عقائد کی دیواریں گرا دو۔ کیونکہ انسانوں کو دین اور مذہب ہی یکجا کر کے ناقابلِ شکست بنا دیتے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی حفاظت آدمی اپنی جان سے زیادہ کرتا ہے اور جن کی خاطر تن من دھن سے ہر وقت قربان ہو جانے کو تیار رہتا ہے۔ آدمی کے سینے میں اگر دین سے محبت کا جذبہ نہ ہو تو وہ ملّت سے کٹ کر فرد رہ جاتا ہے، جو کچھ سوچتا ہے اپنی ذات کے لیے سوچتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کرتا ہے۔ اس سے وہ کچھ نہیں ہوتا، اس کی کوئی طاقت، کوئی آواز، کوئی مقام اور مرتبہ نہیں ہوتا، پھر اسے مسل دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہودی دنیا کے ہر مذہب کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی یہ جنگ صدیوں سے جاری ہے۔ انھوں نے سیکولرازم اور کمیونزم کو دنیا میں اسی لیے متعارف کرایا ہے تاکہ لوگ دین اور مذہب سے فرار حاصل کر کے ان میں پناہ تلاش کریں اور اب وہ اپنے مقصد میں بہت تیزی سے کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ یورپ کو اور عیسائیت کو انھوں نے تقریباً فتح کر لیا ہے۔ انھوں نے وہاں خدا اور بادشاہ کو الگ الگ رکھنے کا جو شوشا چھوڑا تھا اس کی وجہ سے یورپی معاشرہ تباہ ہو چکا ہے، لوگوں کے دلوں سے مذہب کی محبت نکل جانے کے بعد وہ جس بے راہ روی کا شکار ہوئے ہیں، اس کے نتیجے میں یورپ کی معاشرت اور معیشت مکمل طور پر یہودیوں کے قبضے میں جا چکی ہے۔ اب وہ پوری طرح یہودیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ ان کی مرضی کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے۔ زیادہ سخت حریف ان کے مسلمان ثابت ہوئے ہیں۔ انھیں زیر کرنے کے لیے یہودیوں کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑ رہے ہیں چونکہ اسلام میں تفریق نہیں ہے، درجہ بندی اور اونچ نیچ نہیں ہے لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے انھوں نے کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرازم کو کھڑا کیا۔ اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی تو مسلمانوں کو دوسرے طریقوں سے مذہب کے خلاف اکسانا شروع کیا ہے۔ یورپ اور امریکا وغیرہ میں جو مسلمان تعلیم حاصل کرنے یا دیگر کاموں کے لیے جا کر کچھ عرصے رہتے ہیں، ان کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کر کے انھیں پس ماندہ اور رجعت پسند قوم کہہ کر ان کا اس طرح مضحکہ اڑایا جاتا ہے کہ ناپختہ ذہن احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنے مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کرنے لگتے ہیں اور پھر ان میں مذہب کے خلاف بغاوت سر ابھارنے لگتی ہے۔ یہ حربہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ یہودیوں کی اس چال نے اسلامی دنیا کے اتحاد کی دیوار میں بڑے بڑے شگاف ڈال دیے ہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا جس کے ختم ہونے کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آتا تو آپ نہیں تو آپ کی اولادیں ضرور اپنی شناخت کھو کر یہودیوں کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہو جائیں گی۔ دنیائے اسلام میں ان کی تمام تر توجہ اس وقت پاکستان پر مرکوز ہے۔ وہ اس ملک کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو چکے اور اب کھلے عام یہ کہا جانے لگا ہے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ بنیاد گر گئی جس پر قائدِ اعظم اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اب انھوں نے یہاں چار قومیتوں اور فرزندِ زمین کے نعرے لگوانا شروع کیے ہیں۔ آپ کے قومی شاعر اقبال کے شعر۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

کی تفسیر پاکستانیوں سے بہتر یہودی جانتے ہیں اور وہ یہاں اسی اصول

کے تحت کام کر رہے ہیں۔ چار قومیتیں اور فرزندِ زمین کے نعرے فرد کو ملت سے جدا کر کے کچھ نہیں بنا دینے ہی کے لیے لگوائے جا رہے ہیں۔ آج ملک پر صوبے کو ترجیح دینے کا مطالبہ ہے پھر صوبے پر شہر کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کے بعد شہر پر گاؤں اور محلوں کو ترجیح دی جائے گی اور بالآخر آدمی سمٹ سمٹا کر اپنے گھر اپنی ذات تک محدود ہو جائے گا۔ پھر کون اس کی سلامتی کا ضامن بنے گا اور کون اس کی آزادی کا محافظ ہوگا۔ پھر وہی کچھ ہوگا جو یہودی چاہیں گے اور یہودی پوری دنیا پر اپنی برتری، اپنے تسلط اور اپنی حاکمیت سے کم کوئی بات نہیں چاہتے۔ وہ اقوامِ عالم کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بی بی! یہ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ اس حقیقت کو وہ لوگ نہیں دیکھ پاتے، وہ کور چشم، غرض کے بندے جن کے منہ میں یہودیوں نے یہ خوف ناک نعرے بھر دیے ہیں، وہ ان نعروں کے طلسم میں اس بری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ان کی ہلاکت خیزی کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔" فیروز سرد آہ بھر کر بولا۔

"فکر نہ کرو یار! ہم پہلے ان نعرہ بازوں کے آقا آتزک سے نمٹ لیں اس کے بعد ان سے بھی نمٹ لیں گے۔" آبی نے کہا۔

"قابلِ گردن زدنی تو وہ لوگ ہیں جو عوام کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی حوصلہ افزائی کر کے ان میں احساسِ محرومی پیدا کرتے ہیں اور ایسے تباہ کن نعروں کو قبولیتِ عام حاصل کرنے کے لیے زمین تیار کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو جسم کے سڑے گلے اعضا کو کاٹ کر مریض کی جان بچانے کی کوشش کرنے کے بجائے محض دعاؤں اور نیک تمناؤں کے اظہار سے اسے اچھا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر لزی سے بولا "ہم کچھ راہ سے بھٹک گئے ہیں لزی بیگم! تم اپنے بارے میں بتاتے بتاتے دوسری طرف نکل گئی ہو۔ تم بتا رہی تھیں کہ تم نے وہ فائل حاصل کر لی، پھر کیا ہوا؟"

"ہاں، وہ فائل جس میں میرے بارے میں سارے کوائف موجود تھے، میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد اسے کھول کر دیکھا۔ عین اسی وقت گریگری اس شخص کو رخصت کر کے واپس آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں فائل دیکھ کر پوچھا "کیوں مس فنیلی! فائل مل گئی آپ کو۔ ذرا مجھے بھی دکھائیں، اس میں کیا لکھا ہے آپ کے بارے میں؟"

میں نے دوبارہ فائل کو بند کر کے کہا "اسے پڑھنے کے لیے ساتھ لے چلتے ہیں ہم، یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں ہے ہمارے لیے۔ جوزفائن اگر وقت سے پہلے بیدار ہو گئی یا کوئی باہر سے ہی آ گیا اچانک تو مشکل پیدا ہو جائے گی ہمارے لیے۔"

"ہاں، یہ تم نے صحیح کہا ہے، بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس فائل کو بھی یہاں سے باہر نہ لے جایا جائے۔ اس سے پہلے اگر آرتھر آ گیا یا تمھارے کسی بڑے نے تم کے لیے یہ فائل طلب کر لی تو بات کھل جائے گی۔"

"اوہ، مسٹر گریگری! اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آپ نے بالکل صحیح کہا ہے۔ پھر ہم یوں کرتے ہیں اس کی مائیکرو فلم تیار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اسے جوں کا توں رکھ کر چلے جائیں گے یہاں سے۔" میں
"کیا مائیکرو فلم بنانے کے لیے کیمرا دستیاب ہے یہاں؟" گریگری نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے
"ہاں، آپ ٹھہریں میں کیمرا لے کر ابھی آتی ہوں۔" میں نے جواب دیا اور وہاں سے باہر نکل آئی۔

ہمارے گھر میں اس وقت مائیکرو فلم بنانے کے موجود تھے۔ میں وہ دونوں کیمرے اٹھا کر تہ خانے میں ایک کیمرے سے میں نے اپنی فائل کی فلم بنانا شروع کی گریگری کو تھما کر کہا "یہ آپ لے لیں مسٹر گریگری! اور کے ڈھیر میں سے جس کی چاہیں فلم تیار کر لیں ممکن ہے کوئی کسی وقت ہمارے کام آ جائے۔"

میری فائل زیادہ ضخیم نہیں تھی، کیوں کہ میں نے کی چند مہمات کے سوا کوئی زیادہ اہم کام ابھی تک نہیں صفحات میں میرے والدین کے بارے میں تفصیلات تھیں بس انھی کی فلم تیار کی تھی، اپنے جرائم کی تفصیلات اور میں بنائی ہوئی تصویروں کو میں نے اس خیال سے چھوڑ جو کام میں نے انجام دیے تھے ان کے بارے میں جانتی تھی، دوسرے میں انھیں گریگری کے علم میں نہیں تھی۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ میرے بارے میں جو کچھ تھا، اسے گریگری بھی ضرور پڑھتا اور اس طرح وہ کی اسمگلنگ کے جرائم سے واقف ہو جاتا۔ اس وقت معلوم تھا کہ میں جو کچھ اس سے چھپانا چاہ رہی ہوں پہلے ہی پوری طرح آگاہ ہے۔ میں نے اور گریگری نے فائلوں کی تفصیلات مائیکرو فلم کے فیتے پر منتقل کر الماری میں جس طرح پہلے رکھی تھیں، بالکل اسی طرح بند کر دی۔

دوسرے روز تمام دن میں گریگری کے ساتھ ڈارک روم میں ان فلموں کی ڈیولپنگ اور پرنٹنگ تیسرے دن مجھے اپنی اس کارگزاری کی تفصیلات کا

موقع میسر آ سکا۔ میں اپنی فائل کے پرنٹس لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور انھیں ابتدا سے پڑھنا شروع کر دیا۔ گریگری دوسری فائلوں کے پرنٹس لے کر دوسری کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ پرنٹس کے مطالعے کے بعد میں اپنے بارے میں ایک ایک بات جان چکی تھی۔ اب مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہی تھی، میری آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اور ذہن میں کوئی گرہ باقی نہیں رہی تھی۔"

"تو کیا تم اپنے بارے میں ہمیں وہ باتیں نہیں بتاؤ گی جو تمھیں اس فائل سے معلوم ہوئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو اپنی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے وہ سب کچھ تو بتانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر آپ لوگ میری باتوں پر یقین کس طرح کریں گے۔ اب میں جو کچھ بتانے لگی ہوں آپ کو اس میں سے میں طوالت سے بچنے کے لیے غیر ضروری تفصیلات حذف کر دوں گی۔ ان کے بیان کرنے سے وقت ضائع ہونے کے سوا اور کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔

میرے دادا مسلمان تھے اور مصر کے ایک اعلیٰ خاندان سے ان کا تعلق تھا، وہ مصری حکومت میں ایک بہت ہی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ میرے والد کو وقت کے تقاضوں کے مطابق سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم دلا کر ایک ایسا سائنس دان بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے جو مصر کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی راہ پر ڈال سکے۔ وہ اپنے ملک کو دنیا کے ترقی یافتہ جدید ترین سائنسی نظام میں خود کفالت کی حد تک آگے لے جانے کے خواہشمند تھے اور اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ میرے والد کو انگلستان، جرمنی اور فرانس کی درس گاہوں میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم دلانے کے بعد امریکا بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے سائنسی آلات تیار کرنے والی ایک بڑی فرم میں محض تجربہ حاصل کرنے کی خاطر ملازمت کر لی لیکن اپنے اس مقصد کو کسی پر ظاہر اس لیے نہیں کیا کہ اس طرح ایک تو انھیں امریکا کے ایسے کسی ادارے میں ملازمت ملنا مشکل ہو جاتا، دوسرے اس کا بھی امکان تھا کہ امریکی حکومت انھیں امریکا میں زیادہ دن رہنے کی اجازت ہی نہ دیتی۔ وہ فرم جس میں میرے والد کو ملازمت ملی تھی، امریکا میں سامانِ حرب تیار کرنے والے بیشتر اداروں کی طرح ایک بہت بڑے یہودی سرمایہ دار کی ملکیت تھی اور وہاں کام کرنے والے اسّی فی صد لوگ یہودی تھے، ان میں بے شمار یہودہ اور اس کی ذیلی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ میرے والد کے بارے میں مصر میں موجود یہودہ کے ایجنٹ اپنے ہیڈ آفس کو یہ اطلاع دے چکے تھے کہ انھیں کس مقصد کے لیے امریکا بھیجا گیا ہے لہٰذا انھیں وہاں ملازمت ہی یہودہ کی ہدایت پر دی گئی تھی تاکہ انھیں ان کے اصل مقصد سے ہٹا کر یہودہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکے۔ چنانچہ ان کے گرد غیر محسوس طریقے پر جال بچھائے گئے۔ کئی حسین ترین یہودی لڑکیوں کو ان پر اپنی زلفوں کی کمندیں ڈالنے پر مامور کر دیا گیا۔ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ لڑکیاں نسلاً یہودی ہی تھیں یا وہ بھی میری ہی طرح کی آلۂ کار لڑکیاں تھیں۔ میرے والد بے حد ذہین اور شریف النفس انسان تھے مگر آپ جانتے ہیں کہ اتنی ساری ایک سے بڑھ کر ایک حسینائیں اگر کسی زاہدِ صد سالہ کے گرد بھی ہر وقت عشوہ و غمزہ و ادا کے ساتھ منڈلانے لگیں تو وہ بھی ثابت قدم نہیں رہ سکے گا۔ میرے والد تو ایک جواں سال اور دنیا دار انسان تھے۔ وہ اپنا دامن کب تک بچا سکتے تھے، بالآخر میری والدہ الزبتھ فنیلی نے انھیں اپنے تیرِ نظر کا شکار کر ہی لیا۔۔۔"

"الزبتھ فنیلی! مگر یہ تو تمھارا نام ہے!" میں نے اس کی بات کاٹ کر حیرانی سے کہا۔

"آپ خاموشی سے سنتے رہیں، درمیان میں سوالات نہ کریں۔ میں جب اپنی بات ختم کر لوں تو جو کچھ سمجھ میں نہ آ سکے، اس کے بارے میں سوال کر کے وضاحت طلب کر لیجیے گا۔ ویسے میرا خیال ہے، پوری بات سن لینے کے بعد آپ کو کوئی سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" لزی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم بتاؤ کیا بتا رہی تھیں، میں اب درمیان میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ کہنے لگی "میرے والد خود بھی خاصے وجیہ و شکیل آدمی تھے لہٰذا میری ماں بھی ان کی چاہت کو اپنے دل میں سمانے سے نہیں روک سکی تھی۔ یوں سمجھ لیں، دونوں ہی طرف برابر کی آگ لگی ہوئی تھی، چنانچہ میرے والد نے جب میری ماں کے سامنے انھیں اپنانے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط رکھی تو تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد بالآخر وہ اس کے لیے تیار ہو گئیں اور ایک روز انھوں نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا اور پھر وہ دونوں اسلامی طریقے کے مطابق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

اپنی دانست میں انھوں نے بے حد احتیاط برتی تھی اور کسی کو اس واقعے کی کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی تھی مگر یہودہ کے ان ایجنٹوں سے جو رات دن ان کے پیچھے لگے رہتے تھے کوئی بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میری ماں سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو اس سے یہودہ کو اس وقت تک کوئی غرض نہیں ہوگی جب تک تم سلمان کو ان

کے بارے میں کچھ بتانے یا امریکا سے باہر لے جانے کی کوشش نہیں کرو گی۔ یہودہ کو سلمان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ (سلمان میرے والد کا نام تھا) یہودہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ سلمان یہاں سے مصر واپس نہ جائے۔ اس کے علم اور تجربے سے مصر کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکے۔ اگر اُس نے امریکا سے واپس جانے کی کوشش کی تو سمجھ لو، وہ دن اُس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ یہودہ کی طرف سے اس تنبیہ کے بعد میری ماں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ میرے والد مصر واپس جانے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ دو سال اطمینان سے گزر گئے۔ وہ لوگ نہایت خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ میری پیدائش کے بعد تو ان کی چاہت اور بھی بڑھ گئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ میرے والد اب کبھی مصر جانے کا نام تک نہیں لیں گے لیکن اچانک ایک روز اُنھیں اطلاع ملی کہ اُن کے والد یعنی میرے دادا کا حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا ہے۔ میرے والد یہ اطلاع ملتے ہی مصر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میری والدہ انھیں جانے نہیں دینا چاہتی تھی مگر موقع ایسا تھا کہ وہ انھیں روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ یہودہ کے مقامی سربراہ سے جا کر ملیں اور اُس سے اپنی مجبوری بیان کر کے والد کے ساتھ مصر جانے کی اجازت چاہی۔ وہ اس بات کی ضمانت دینے کو تیار تھیں کہ میرے والد کو مصر میں رہنے نہیں دیں گی اور جلد ہی انھیں ساتھ لے کر واپس آ جائیں گی۔ لیکن سربراہ نے اُن کی کوئی بات نہیں مانی اور اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اُدھر سے مایوس ہونے کے بعد میری ماں نے میرے والد کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ مصر واپس گئے تو تنظیم انھیں اس کی سخت ترین سزا دے گی۔ میرے والد کو یہ سب کچھ جان کر بے حد دکھ ہوا اور پہلی بار انھیں یہ احساس ہوا کہ وہ اَب تک کیسے سنگدل اور خوفناک لوگوں کے درمیان رہتے رہے ہیں۔ لیکن مسئلہ اُن کے والد کی موت کا تھا چنانچہ وہ ہر بات بھلا کر اور ہر خطرہ مول لے کر مصر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر عین اُس وقت جب وہ ائیرپورٹ کی طرف جا رہے تھے اُن کی گاڑی میں بم پھٹا اور اُن کا تندرست و توانا جسم گوشت کے پارچوں میں تبدیل ہو گیا۔ میری ماں اِس صدمے کی تاب نہ لا سکی اور اپنے محبوب شوہر کی موت کی خبر سننے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر اس کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ یُوں میرے والدین اِن یہودی کتوں کی مسلمانوں سے دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ میں اُس وقت صرف چھ ماہ کی تھی۔ یہودہ نے مجھے اپنی تحویل میں لے کر میری پرورش کی ذمے داری آرتھر فنیلی پر ڈال دی کیوں کہ میری ماں الزبتھ فنیلی اس کی بہن تھی۔ یہ آرتھر کے لیے یہودہ کی طرف سے میری ماں کے مسلمان ہونے

اور ایک مسلمان کی بیوی بننے کی سزا بھی تھی۔ یہودہ نے اُس کو [...] کی تھی کہ وہ مجھے پوری طرح تیار کر کے میری ماں کی جگہ یہود[...] کر دے۔ میرے والدین نے میرا نام فاطمہ سلمان رکھا تھا [...] یہودہ کے حکم پر تبدیل کر کے الزبتھ فنیلی کر دیا گیا کیوں [...] مجھے میری ماں کا نعم البدل کہتے تھے۔"

لزی خاموش ہو گئی۔ اس کی داستان سُن کر ہم سب [...] دل بوجھل اور اداس ہو گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا [...] کس طرح تسلّی دیں، کس طرح اِس سے ہمدردی کا اظہار [...] وہ بڑے ہی مضبوط اعصاب کی بہت ہی سخت جان [...] تھی جو کچھ اِس پر گزری تھی اور جو حال اس کے دل کا اپنے [...] اور اپنے والدین کے بارے میں جاننے کے بعد ہوا تھا [...] وہ سب کچھ بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ سہہ لیا تھا اور [...] کے لیے کچھ فیصلے بھی کر لیے تھے، جبھی وہ اتنی مطمئن اور [...] دکھائی دیتی تھی۔ اَب یوں بھی اُسے کسی کی طفل تسلّیوں اور [...] کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہم سب دیر تک نظریں جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر فیروز نے مہرِ سکوت توڑتے [...] کہا یہ بڑے ہی درندہ صفت لوگ تھے وہ جنھوں نے [...] دردناک داستان کو جنم دیا مجھے بہت ہی افسوس ہوا [...] کچھ سُن کر۔"

"دیکھیں یہ جو کچھ ہوا برسوں پہلے ہو چکا۔ اب اس طرح [...] کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یوں بھی اس طرح حالات [...] کرتے، دُکھوں کا مداوا نہیں ہوا کرتا۔ نہ ہی یہ داستان سنا [...] میرا یہ مقصد تھا کہ آپ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کروں [...] چونکہ اِن بھیڑیوں کے درمیان ہی پرورش پائی ہے۔ اِن کی عادات و اطوار، طور طریقوں اور فطرت سے میں خوب اچھی [...] واقف ہوں اور بڑی حد تک میرا دل بھی دشمن کے لیے رحم [...] جذبے سے بالکل خالی ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تمھاری داستان [...] ردِعمل ہم پر ہوا ہے۔ وہ بالکل فطری ہے۔ ویسے یہ سب [...] کے بعد تمھارا ردِعمل کیا تھا؟ تم نے آرتھر کے یا یہودہ [...] خلاف اعلانِ جنگ تو نہیں کیا تھا اتنا اندازہ تو ہے مجھے [...]"

"ردِعمل تو بہت شدید ہوا تھا، جی چاہتا تھا اُن تمام [...] کو جو اس کے ذمے دار تھے فوراً قتل کر دوں جا کر، لیکن ایسے [...] میں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے [...] عالی! مجھے انھوں نے کسی سنگین واقعے پر اچانک بھڑک اٹھنے [...] جذبات کے شعلوں کو سرد کر کے عقل کو جذبات پر حاوی کر دینے [...] تربیت دی تھی۔ میں نے اُس وقت اسی تربیت سے [...]

[...] جذبات کو دبا کر ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا، گرگیری سے بھی [...] اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں مشورہ کیا اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال [...] موجودہ صورتِ حال کو ہی برقرار رہنے دیا جائے، میں کسی پر یہ ظاہر [...] کروں کہ برسوں سے میری آنکھوں کے سامنے جو پردے حائل کر [...] رکھے تھے ان لوگوں نے، وہ اب ہٹ چکے ہیں اور میں اُن سب [...] کی اصل شکلیں دیکھ چکی ہوں۔ میں نے اور گرگیری نے یہ طے کر لیا تھا [...] کہ بظاہر میں ان کے ساتھ ان کی فرماں بردار اور مطیع بن کر رہتی رہوں [...] گی مگر اُن کے ناپاک عزائم اور تباہ کن منصوبوں سے جو میرے [...] علم میں آئیں گے، گرگیری کو مطلع کرتی رہوں گی۔ چنانچہ اس کے [...] میں نے منشیات کی اسمگلنگ کے کئی منصوبے گرگیری کی مدد [...] سے ناکام بنا دیے، اور یوں ڈالر کی منشیات تباہ کروا دیں یا پولیس [...] سے پکڑوا دیں۔ ان کے لیے امریکا میں منشیات اسمگل کرنا تقریباً [...] ناممکن ہو گیا تھا۔ تنظیم کے بڑے پریشان تھے کہ یہ سب کچھ کیسے [...] ہو رہا ہے۔ ہر طرح ناکام ہو جانے کے بعد انھوں نے آپ جیسے [...] لوگوں کو کیریئر بنانے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر [...] دھمن اُن کا بہت بڑا مددگار ثابت ہوا۔ آپ تیسرے آدمی تھے [...] جس کے ذریعے وہ اس نئے طریقے سے منشیات امریکا تک لانے [...] میں کامیاب ہوئے تھے۔"

"ڈاکٹر دھمن کو دولت حاصل کرنے کی بہت ہوس ہے۔ [...] یہ شخص کب سے یہودیوں کے لیے کام کر رہا ہے؟ میرا خیال ہے [...] اس کی بھی کوئی فائل ضرور تیار کی ہوگی انھوں نے۔ کیوں کہ نسلاً تو وہ [...] بھی یہودی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہے اس کی بھی فائل اور آرتھر ہی کے پاس ہے وہ۔ [...] جن دیگر فائلوں کی ہم نے فلمیں بنائی تھیں اُن میں ایک فائل ڈاکٹر [...] دھمن کی بھی تھی، کیوں کہ سان فرانسسکو میں وہ بھی آرتھر ہی کی ماتحتی [...] میں کام کر رہا ہے۔" لزی نے بتایا۔

"تم اور گرگیری ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے۔ [...] مگر وہاں سان فرانسسکو میں، تم دونوں میں سے کسی نے بھی یہ [...] ظاہر نہیں کیا مجھ پر۔ گرگیری نے تمھارے اور یہودیوں کے بارے [...] میں مجھے سب کچھ بتایا لیکن یہ بات چھپا گیا وہ مجھ سے۔" میں نے کہا۔

"اُس وقت تک ہم آپ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں [...] کر سکے تھے جنابِ عالی! یہ خوف تھا ہمیں کہ کہیں آپ سچ مچ اُن کے [...] ساتھی نہ ہوں اور انھوں نے آپ کو اپنے گزشتہ نقصانات کے ذمے داروں [...] کو بے نقاب کرنے کی غرض سے نہ بھیجا ہو وہاں۔ پھر بھی ہم نے آپ [...] کی مدد کی اور آپ کو سان فرانسسکو سے نکالنے کے لیے بھرپور [...] کوشش کی۔ میں نے ہی ڈاکٹر دھمن کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ [...] آپ کو جعلی نام کے جعلی کاغذات پر ایک مریض کی حیثیت سے ہی پاکستان

واپس بھیج دے۔ اتفاق سے ڈاکٹر دھمن کے پاس ایک ایسے شخص کے کاغذات موجود تھے جو امریکا آنے کے بعد قتل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر دھمن نے اُن میں تھوڑی سی ردّ و بدل کر کے انھیں آپ کے لیے قابلِ استعمال بنا دیا تھا۔ آپ کو جس طرح فریب کاری سے کیریئر بنایا گیا تھا، وہ ہمیں معلوم ہو چکا تھا اور یہ بھی یقین تھا ہمیں کہ اب دوبارہ وہ آپ کو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ پھر بھی محض اس خیال سے کہ دولت کے لالچ میں آ کر آپ پھر اُن کے لیے کام کرنا قبول نہ کر لیں، گرگیری نے آپ کو اُن کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا لیکن ڈاکٹر دھمن بہت ہی لالچی اور بدفطرت شخص ہے۔ وہ آپ کو ایک بار اور کیریئر بنانے کے لیے بضد تھا اور یہ اُسی کی تجویز تھی کہ مجھے آپ کے ساتھ نرس کے طور پر بھیجا جائے۔ اور میں آپ کو پاکستان پہنچنے کے بعد کشمیر خان سے ملنے اور کیریئر بننے پر مجبور کرتی رہوں۔ یہاں آنے کے بعد آپ کے ارادے کو تبدیل نہ ہونے دوں۔ اُن کا خیال تھا کہ آپ چونکہ پوری طرح میرے حسن کے جال میں پھنس چکے ہیں لہٰذا آپ کو ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں اُن سے تو انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں آپ کو دوبارہ امریکا نہیں جانے دوں گی، اگر لالچ یا کسی اور وجہ سے آپ نے کیریئر بننا چاہا تو میں مخبری کر کے آپ کو پکڑوا دوں گی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اِس کی نوبت نہ آ سکی۔ آپ کی حب الوطنی اور قومی غیرت نے آپ کو اُن کے ارادوں کی راہ میں کھڑا کر کے میرا کام آسان کر دیا اور تنظیم کو نقصان پہنچانے کا مجھے ایک اور موقع فراہم کر دیا۔ میری زندگی کا تو اَب بس یہی ایک مقصد باقی رہ گیا ہے کہ جہاں اور جس طرح بھی ہو سکے تنظیم کے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہوتی رہوں اور اُسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاتی رہوں۔ یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہے میرے لیے۔ پوری تنظیم کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکنا تو ظاہر ہے میرے بس کی بات نہیں، نہ اتنی طاقت ہے مجھ میں اور نہ ہی اتنے وسائل ہیں میرے پاس۔"

"تم نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر دھمن اور اُس کی بیوی عالیہ کی فائل بھی آرتھر کے پاس موجود ہے اور تم نے اُس کی بھی فلم تیار کی تھی، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جن فائلوں کی تم نقل بنانے میں کامیاب ہو گئی ہو، تم نے انھیں پڑھا نہ ہو۔ لہٰذا اب تم مجھے ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کے بارے میں بتاؤ، وہ لوگ کب اور کس طرح ان یہودیوں کے آلۂ کار بنے تھے اور وہ ان کے لیے کیا کیا کام کرتے رہے ہیں؟"

"میں نے اُن دونوں کی فائل کا ذکر نہیں کیا تھا جنابِ عالی! شاید آپ نے دھمن کے بارے میں جان کر یہ رائے قائم کر لی ہے کہ اُس کے ساتھ ڈاکٹر عالیہ کی بھی فائل ہے، ایسی بات بالکل نہیں ہے مگر کیوں کہ وہ دھمن کی بیوی ہے اس لیے فائل میں کہیں کہیں اُس

کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔ ویسے عالیہ یہودہ اور یہودیوں کی ناپسندیدہ شخصیت ہے۔ اگر ڈاکٹر دھمن نے تنظیم کو اس کی طرف سے مطمئن کر کے اُس کے تمام اعمال و افعال کی ذمے داری قبول نہ کر لی ہوتی تو تنظیم اُسے زندہ رہنے کا حق کبھی نہ دیتی۔ ڈاکٹر دھمن کا قصہ یوں ہے کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے یہودہ نے اُسے نظر میں رکھا ہوا تھا اور اُسے یہودیوں کے شکنجے میں پھانسنے کے لیے اُس پر جال ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ وہ ایک انتہائی شری اور فتنہ پرور طالب علم تھا۔ فتنہ و فساد یوں لگتا تھا جیسے اُس کے خمیر میں شامل رہے ہوں۔ اُس کی چیرہ دستیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو اُسے ناپسندیدہ قرار دے کر میڈیکل کالج سے نکال دیا گیا۔ آدمی بے حد ذہین و فطین تھا۔ اگر وہ اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کو مثبت انداز میں استعمال کرتا تو آج اپنے ملک میں اُسے بہت بڑا مقام حاصل ہوتا۔ ملک و قوم کے معماروں میں جگہ حاصل کر سکتا تھا وہ مگر چونکہ اُس کی فطرت میں لالچ بہت زیادہ تھا۔ دولت اُس کا دین مذہب، اخلاق، قاعدہ ضابطہ سب کچھ تھی، چنانچہ دولت کا حصول ہی اُس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ حصولِ زر کے لیے وہ انتہائی پستی میں بھی اُترنے کو تیار رہتا تھا ہر وقت۔ ایسے لوگ یہودہ کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں اور بہت جلد قابو میں بھی آ جاتے ہیں ان کے۔ لہٰذا ایک یہودی ڈاکٹر والِس نے جسے اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا یہاں، دھمن سے دوستی کر کے اُسے سرجری کی خصوصی تربیت دی اور اُسے ڈاکٹر خرطومی یعنی آئزک سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر والِس اور آئزک کی مدد سے ہی اُس نے لاہور میں شفا بار کلینک قائم کیا اور وہاں گردہ فروشی کا کاروبار شروع کیا۔ ڈاکٹر خرطومی (آئزک)، نے اُسے دولت حاصل کرنے کا یہ آسان اور محفوظ راستہ دکھایا تھا۔ اور ضرورت مندوں کو گردے سپلائی کرنے کی ذمے داری خود قبول کی تھی۔ وہ ڈاکٹر دھمن سے گردے خریدتا تھا اور اُسے بتاتا کہ مڈل ایسٹ اور دیگر عرب ممالک کے شیخوں کو ان کی ضرورت رہتی ہے اور انھی کے آرڈر پر وہ یہ گردے اُنھیں سپلائی کر دیتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ اسرائیل، امریکا اور یورپ کے مال دار یہودی جو بڑی تعداد میں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں، یہ گردے اُن کے لیے محفوظ کر لیے جاتے ہیں تاکہ یہ مرض جب اُن کے گردوں پر حملہ آور ہو کر انھیں ناکارہ کر دے تو اُن کے ناکارہ گردوں کی جگہ یہ گردے لگا دیے جائیں۔ ڈاکٹر دھمن نے گردوں کے اس کاروبار میں بہت دولت پیدا کی اور نئے نئے ساتھی تلاش کر کے اس کاروبار کو خاصی وسعت بھی دے لی، لیکن اُسے یہ پتا نہیں تھا کہ اُس نے اس بے شمار دولت کے ساتھ ساتھ اپنے گلے میں یہودیوں کی غلامی کا طوق بھی ڈال لیا ہے۔ اُس نے بہت سے مجبور، مفلس اور نادار قسم کے لوگوں کی مجبوریوں سے فائدے اٹھائے تھے اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ان افعال کا اصل فائدہ یہودیوں کو پہنچ رہا ہے۔ پھر قسمت نے آپ کو اُس کی راہ میں لا ڈالا۔ اُس نے آپ کا اور آپ کی بہن آسیہ کا ایک ایک گردہ حاصل کر کے اُن کے لاکھوں روپے تو ضرور حاصل کر لیے لیکن پھر یہی دو گردے اُس کے حلق میں ہڈی بن کر پھنس گئے۔ آپ نے اُسے پے در پے زک پہنچا کر بُری طرح بوکھلا دیا۔ اُسے اپنی زندگی خطرے میں محسوس ہونے لگی چنانچہ وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا۔ مگر جلد ہی آپ نے وہاں بھی اُسے جا پکڑا۔ اُس نے آپ کو اور آبی بھائی کو ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ بڑا روپیہ صرف کیا۔ اپنے کئی آدمی مروا دیے مگر اُسے اس میں کامیاب ہونے کے بجائے اپنے کئی قابلِ اعتماد اور بے حد مفید ساتھیوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ نتیجے میں وہ یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ کر امریکا سدھار گیا۔ وہاں پہنچتے ہی یہودہ نے اُسے دبوچ لیا۔ اُن کے پاس بے شمار ایسے ثبوت ہیں جو دھمن کو ایک بین الاقوامی مجرم ثابت کر کے برباد کر سکتے ہیں، دھمن مکمل طور پر اُن کی گرفت میں ہے۔ اب وہ گردوں کے علاوہ دوسرے نازک قسم کے انسانی اعضا بھی فراہم کر رہا ہے انھیں۔ اس کے علاوہ وہ منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ بھی کر رہا ہے اِن کے لیے اور کچھ سائنسی انتہائی اہم اور خفیہ قسم کے کاموں میں بھی اُن کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ وہ مجبوری سے کم اور حصولِ زر کے لیے زیادہ کر رہا ہے۔ عالیہ نے ابتدا میں اِس کی زبردست مخالفت کی تھی، اُسے جب یہ پتا چلا تھا کہ دھمن یہودیوں کا آلۂ کار بن گیا ہے تو اُس کی قومی غیرت جاگ اُٹھی تھی، وہ یہودیوں کے لیے کام کرنے پر موت کو ترجیح دیتی تھی مگر نہ جانے کس طرح دھمن نے بالآخر اُس کو بھی رام کر لیا۔ گو تنظیم کو عالیہ پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے اور وہ اُسے ختم کر دینا چاہتی تھی مگر دھمن شاید دنیا میں عالیہ وہ واحد شخصیت ہے جس کے معاملے میں سنجیدہ اور مخلص ہے، جسے وہ خلوصِ دل سے چاہتا ہے لہٰذا اُس نے اس کی طرف سے تنظیم کو پورا پورا یقین دلا دیا ہے اور اس کی ہر طرح کی ذمے دار قبول کر کے ضمانت دی ہے کہ اُس کی ذات تنظیم کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بنے گی۔ امریکا میں ڈاکٹر دھمن آپ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اُسے آپ کا خوف وہاں بھی لاحق رہتا تھا ہمیشہ اور اسی مقصد کے لیے کے ایما پر تنظیم کے کارندوں نے آپ کو پارسل بنا کر امریکا بھیجا تھا مگر تنظیم نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اُنھیں آپ

لیے مفید آدمی معلوم ہوئے تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح آپ کو اپنے ساتھ شامل کر لینا چاہتے تھے۔ میری آپ سے قربت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، شاید یہ بات آپ نے بھی محسوس کر لی تھی۔ آپ نے وہاں سان فرانسسکو میں اور یہاں آنے کے بعد بھی جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس سے مَیں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ اس کے علاوہ گرمگیری نے ہمارے سان فرانسسکو سے روانہ ہوتے وقت مجھے یہ اشارہ دے دیا تھا کہ وہ آپ کو حقائق سے آگاہ کر چکا ہے۔"

"اور تم نے مجھ پر اپنی اصلیت بالکل ظاہر نہیں ہونے دی۔ مَیں خواہ مخواہ ہی تم سے خوف زدہ ہوتا رہا۔" مَیں نے مسکرا کر کہا۔

"وجہ یہ ہے اس کی کہ مَیں خود آپ سے خوف زدہ تھی۔ مَیں ڈرتی تھی کہ میرے بارے میں اور میرے عزائم کے بارے میں جاننے کے بعد کہیں آپ تنظیم میں اپنا اعتماد قائم کرنے کی خاطر انھیں میرے عزائم سے آگاہ نہ کر دیں۔ دیکھیں نا آپ سے میری ملاقات کو زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا، ہم ایک دوسرے کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو شکار کر لینے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں جیلانی! بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب تم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہے۔ دونوں میں سے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے پورے گروپ میں سے کسی کے بھی دل میں کسی کے لیے کوئی مَیل نہیں رہا ہے۔ کوئی مشکوک نہیں رہا ہے۔" فیروز بولا۔

"یہ کون لوگ ہیں لزی! جو تمھارے ساتھ، تمھارے باڈی گارڈ کی حیثیت سے آئے ہیں؟" مَیں نے سوال کیا۔

"یہ بھی ایسے ہی لوگ ہیں جن کی یہودہ میں فائلیں بنا کر رکھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ یہاں آئزک کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ مَیں نے ان کے سامنے ان کی حقیقتیں بیان کر کے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ان میں سے دو بھارتی مسلمان ہیں اور دو اردُنی۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنھیں میں آئزک ہی کے پاس چھوڑ آئی ہوں تاکہ اُس کے بارے میں بھی اطلاعات ملتی رہیں مجھے۔" وہ بولی۔

"یہ تو بہت ہی اچھا کیا تم نے۔ تمھیں چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے تمام لوگوں کو حقائق سے آگاہ کر کے یہودہ سے انتقام لینے کی ترغیب دیتیں انھیں۔ اس طرح اس تنظیم کو جڑ سے بھی اکھاڑا جا سکتا تھا۔" مَیں نے اس سے کہا۔

"جڑ سے اکھاڑنا تو بہت مشکل کام ہے لیکن اس طرح تنظیم کو بہت بڑا نقصان ضرور پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایسا بڑا اور شدید نقصان جو اُس کی کمر توڑ دے اور جس کی تلافی بھی جلد ممکن نہ ہو۔ مَیں بالکل اسی لائن پر کام کر رہی تھی اب تک۔ سان فرانسسکو میں بھی ایسے کچھ لوگوں کو باغی کر دیا ہے میں نے اور انھیں اس کام پر لگا دیا ہے۔ وہ اپنے جیسے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں آئزک کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ سب انشاء اللہ بہت جلد اُس کا ساتھ چھوڑ کر ہم سے آ ملیں گے۔ بس وہ چند افراد جو واقعی نسلاً یہودی ہیں اور یہاں اسرائیل اور یہودہ کے مفادات پورے کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، چُن چُن کر مار دیے جائیں گے۔ اس کے بعد علاقہ غیر میں واقع وہ فیکٹریاں تباہ کر دینا زیادہ مشکل نہیں ہو گا ہمارے لیے جو نئی نسلوں کو تباہ کرنے کے لیے رات دن منشیات کا زہر تیار کر کر کے یہودیوں کے عزائم کی تکمیل کے لیے ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا!" مَیں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہاں یہودیوں نے منشیات تیار کرنے کی فیکٹریاں بھی لگا رکھی ہیں؟ کیا تم سچ کہہ رہی ہو لزی؟"

"اوہ تو آپ کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ مَیں تو سمجھ رہی تھی آپ اُن کے متعلق ضرور جانتے ہوں گے۔" لزی نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "افغانستان اور پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ طویل اور خطرناک پہاڑی علاقہ ایسے کاموں کے لیے بہترین جگہ ہے۔ یہاں دنیا کی نظروں سے چھپ کر ایسے خوفناک منصوبے بہ آسانی پایۂ تکمیل تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔ اس علاقے پر اُن کی بہت عرصے سے نظر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ پہاڑی علاقے ان کے کنٹرول میں آ جائیں تاکہ انھیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں آسانی ہو۔"

فیروز بولا۔ "مَیں جانتا ہوں وہاں منشیات بڑے پیمانے پر تیار ہوتی ہے مگر یہ انکشاف مجھ پر بھی آج پہلی بار ہی ہوا ہے کہ یہ کام یہودی کر رہے ہیں وہاں۔ یہ تو بڑی تشویش ناک صورتِ حال ہے یارو! اِس کے لیے تو ہمیں ضرور کچھ کرنا چاہیے۔"

"بالکل، بالکل۔ اس کمینے آئزک کا تیا پانچا کرنے کے بعد یہی کام رہ جائے گا ہمارے کرنے کے لیے۔ اور یہ ہم ضرور کریں گے۔" مَیں نے کہا۔

"آئزک کو تو انشاء اللہ ہم آج ہی رات پیوندِ زمین کر دیں گے۔ کل صبح کا سورج اُسے دیکھنا نصیب نہ ہو سکے گا۔" لزی نے فوراً کہا۔

"ہاں، مگر یہ تو جبھی ہو سکے گا جب کہ رات کو وہ خود بھی آئے اُس طرف۔ اگر آج بھی اُس نے اپنے آدمیوں ہی کو قربانی کے لیے بھیج دیا تب؟" آبی بولا۔

"آپ فکر نہ کریں، وہ اگر نہیں آیا تو میں جانتی ہوں کہ وہ گیدڑ کہاں منہ چھپائے بیٹھا ہے، ہم خود اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

دیر سے بالی کا خیال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آخر میں نے لزی سے پوچھا۔ "اور وہ بالی کہاں ہے؟ اُسے بھی تو ساتھ لانا تھا تمھیں۔"

"مجھے افسوس ہے جناب عالی! میں اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اُسے نہیں لا سکی اپنے ساتھ۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناکہ اُسے آئزک نے اپنی خدمت کے لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے اور چونکہ آج کل وہ آپ لوگوں کے خوف سے باہر بالکل نہیں نکلتا ہے اس لیے بالی کو وہاں سے نکالنا ممکن نہیں ہو سکا۔ آپ اطمینان رکھیں، صبح ہونے تک وہ بھی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"کون صبح سے پہلے پہنچ جائے گی؟ یہ کس خاتون کا ذکرِ خیر ہے بھئی؟" شرافت علی کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔

"ہیں ایک خاتون، لیکن تم مطمئن رہو، تمھیں کوئی خطرہ نہیں ہے ان کی طرف سے۔" آبی نے جلدی سے کہا۔

"دیکھو برادر آ... بی۔" شرافت علی نے آبی پر زور دینے کے لیے 'آ' اور 'بی' ذرا کھینچ کر کہا تھا۔ "تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو، پانی کے مینڈک انسانوں کی زبان کبھی ٹھیک سے نہیں بول سکتے۔ اردو کو یوں ردیف قافیے کے بغیر نہیں بولنا چاہیے۔"

"میرا تو خیال ہے تیرے جیسے نام کے شریفوں کا ہمیشہ قافیہ تنگ ہی رکھنا چاہیے، ورنہ اِدھر اُدھر لڑھکنے کا ڈر رہتا ہے۔ نام شرافت علی رکھ لینے سے شریفوں کے طور طریقے نہیں آجایا کرتے آدمی میں۔" آبی جلے کٹے انداز میں بولا۔

فیروز نے شرارت سے مسکراتے ہوئے آبی سے کہا۔ "ویسے میں نے دیکھا ہے اکثر قافیہ بھی تنگ رکھتے ہیں تمھارا۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟ یعنی کہ اب تم بھی... یہ گھوڑے کی دیکھا دیکھی بی مینڈکی کو بھی نال ٹھکوانے کا شوق ہوا ہے۔" آبی نے فوراً کہا۔

اس کی اس بات پر سب ہی قہقہے لگانے لگے۔ میں نے کہا۔ "یار آبی! کبھی تو کسی سے اُدھار کر لیا کر بھائی! تو نے سبھی کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکنا شروع کر دیا ہے۔ کسی کو ذرا سا بھی ہنستے بولتے نہیں دیکھ سکتا ہے تو۔"

فیروز جلدی سے بولا۔ "نہیں، نہیں جیلانی! ایسی بات نہیں کرو یار! آدمی کو ہنستے بولتے رہنا چاہیے اور ہمارے درمیان چھوٹے بڑے اور اونچ نیچ کی بھی تفریق نہیں ہے، ہم سب بے تکلف دوست ہیں بس، اس کے سوا کچھ نہیں۔"

"او یار! کس کو کہہ رہے ہو یہ بات۔ یہ تو چاہتا ہے کہ ہر وقت آدمی گدھوں کی طرح منہ لٹکائے بیٹھا خواب ہی دیکھتا رہے ہری ہری گھاس کا، جو آج کل اس غریب کو میسّر نہیں ہے۔" آبی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

میں نے کہا۔ "اوئے دفع کر یار! یہ کیا بے وقت کی راگنی شروع کر دی ہے۔ ابھی ہمیں بہت سے کام کرنا ہیں شام سے پہلے پہلے۔"

"دیکھا بھائی فیروز! میں غلط تو نہیں کہتا تھا نا اور دوسروں کو الزام دیتا ہے کہ ہنستے بولتے نہیں دیکھ سکتے کسی کو۔" آبی بولا۔

مجھے ہنسی آگئی اُس کی اِس بات پر۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوئے تو ہے بڑا ذلیل یار! زبان تیری چل پڑے تو اُسے روکنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے تو اپنی ظرافت کے پھول کھلا لے پہلے۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔"

"جب تو نہیں بولے گا تو میرے کیا دماغ میں کیڑا نکلا ہے کہ خواہ مخواہ بک بک کرتا رہوں میں۔" دُرفٹے منہ۔ آبی نے اس طرح کہا کہ کسی کے لیے اپنے بے ساختہ اُبلنے والے قہقہے کو روکنا ممکن نہ رہا۔

***

وہ رات ہمارے صبر کے امتحان کی رات ثابت ہوئی تھی۔ ایک ایک پل جیسے صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ لمحوں کی گھڑیاں کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ یہ لمحات شاید اس لیے اور جاں گسل ہو گئے تھے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی جگہ تنہا تھا۔ کسی کے بھی ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کر کے ان بوجھل لمحوں کو کچھ ہلکا کر لیتے۔ ایسا ہم نے اسی خیال سے کیا تھا کہ کہیں دو آدمی یکجا ہونے کے بعد باتوں میں مشغول ہو کر غافل نہ ہو جائیں۔ اور ان کی یہ غفلت دشمن کے کام نہ آ جائے۔ لزی کے ساتھ آنے والے چاروں آدمیوں کو ہم نے مکان کے دونوں حصوں کی چھتوں پر بٹھا دیا تھا۔ جہاں سے وہ کسی بھی طرف سے آنے والوں کو بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ لزی اور گل زمان جس طرف سے کل رات آئزک کے آدمی فیروز کو اٹھانے کے لیے گھسے تھے، اس طرف گیلری میں اندھیرا کر کے بیٹھے تھے۔ میں، فیروز، شرافت، آبی، خان اور لزی مکان کے چاروں طرف علیحدہ علیحدہ کاروں میں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے سے مکان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی اپنی کاریں اس طرح دوسرے مکانوں کی دیواروں کے سائے میں کھڑی کر رکھی تھیں کہ کسی کو ان پر شبہ نہ ہو۔ کار کے اندر اور باہر کی لائٹیں بھی ہم نے بجھا رکھی تھیں۔ تاریکی میں عقبی نشستوں پر اسٹین گنیں سنبھالے تیار بیٹھے تھے۔ ہمیں اسی طرح بیٹھے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے لیکن کسی مشتبہ آدمی کی جھلک تک دکھائی نہ دی۔ تین بجے کے قریب لزی اپنی کار اسٹارٹ کر کے میرے قریب لے آئی۔ اور مجھے مخاطب کر کے دبی دبی مدھم آواز میں بولی۔ "ہم یہاں بیکار ہی وقت ضائع کر رہے ہیں جناب عالی! وہ لوگ اِدھر نہیں آئیں گے آج۔ پہلے مجھے خیال نہیں آسکا تھا اس کا۔ آج تو انھیں اِدھر کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیوں؟ یہ کیوں کہہ رہی ہو تم؟ آج انھیں کیوں نہیں آنا چاہیے اِدھر؟" میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے جس کو ہمیں پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ کل ان کے تین آدمی پکڑے گئے ہیں یہاں اور ایک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس نے ظاہر ہے آپ لوگوں کے بارے میں بتا دیا ہوگا آئزک کو۔ سب کچھ جان لینے کے بعد کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا جو دوسرے ہی دن پھر آجائے گا یہاں۔ پہلے دن اچانک بے خبری میں گھس آنے کے باوجود چار میں سے تین پکڑے گئے تو آج تو ان کے استقبال کی پوری تیاری کر رکھی تھی ہم نے۔ اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کل کے واقعے کے بعد آج ہم یا تو اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے یا پھر ہم نے ان کے استقبال کی خوب تیاری کر رکھی ہوگی۔ ایسے میں وہ اب اِدھر کیوں آئیں گے؟" لزی نے کہا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، ہم لوگ خواہ مخواہ اپنی رات کالی کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی طرف سے آج کسی کارروائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب تک کے انتظار کا جو نتیجہ ہمارے سامنے تھا وہ بھی اس کے خیال کی تائید کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "پھر تو ہمارا اس طرح یہاں بیٹھے رہنا بے کار ہی ہے اب چلو باقی لوگوں کو بھی واپس چلنے کو کہہ دو۔"

لزی اپنی کار آگے بڑھا لے گئی۔ میں بھی عقبی نشست سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہمارا قافلہ لزی کی قیادت میں آئزک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم ایک عالی شان کوٹھی کے پاس پہنچ گئے۔ لزی اور میں ایک ہی کار میں سب سے آگے تھے۔ لزی نے کوٹھی کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ "بس یہیں رک جائیں جناب عالی! یہ سامنے والی کوٹھی ہی ہماری منزل ہے۔ ہمارا شکار یہیں چھپا ہوا ہے۔"

میں نے کار روک کر کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ اب بھی یہیں موجود ہے؟"

"ہاں، بالکل۔ وہ یہیں ہے، اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" لزی نے جواب دیا۔ "چونکہ یہاں اس نے اپنی حفاظت کا نہایت مناسب اور معقول بندوبست کر رکھا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں گیا نہیں ہوگا۔"

"ہوں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر اس کوٹھی میں داخل ہونے کا کوئی طریقہ ہے تمھارے ذہن میں؟"

"جیسی صورتِ حال سامنے آئے گی اس کے مطابق ہی عمل کریں گے ہم۔ اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے مجھے۔" وہ بولی۔ "مین گیٹ پر موجود دربانوں کو قابو کر کے ہی اندر داخل ہو سکیں گے ہم۔ احاطے کے اندر خونخوار قسم کے کتوں سے نمٹنا ہوگا۔ اور اندر گشت کرنے والے محافظوں سے بھی۔ عمارت میں گھسنے کے بعد یہ پتا کرنے کے دوران کہ آئزک کس کمرے میں ہے، کوٹھی کے ہر کمرے اور راہداری میں اس کا محافظوں سے سامنا ہوگا۔ لہٰذا بہت ہی ہوشیاری اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "ہم دونوں آگے چلیں گے۔ مین گیٹ کے محافظوں کو قابو کرنے کے بعد گل زمان کو آگے کر دیں گے۔ اسے کتوں کو قابو کرنے کا فن خوب آتا ہے، میرا خیال ہے احاطے میں گشت کرنے والوں کو ہم تینوں بہ آسانی بھگت لیں گے۔"

اس آپریشن کی کمان سب نے متفقہ طور پر لزی کو سونپ دی تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق سب لوگوں نے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر اس طرح اپنی اپنی گاڑیاں لے جا کر کھڑی کر دی تھیں کہ بظاہر وہ سب ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتے تھے۔ رات کے اس پہر میں گو وہاں ہر طرف سناٹے کا ہی راج معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی ہم نے اس بات کا خیال رکھنا ضروری سمجھا تھا کہ اگر اتفاقاً کوئی اِدھر آ نکلے یا کسی مکان میں کسی ضرورت سے نیند سے بیدار ہونے والے کسی شخص کی نظر سڑک پر پڑ جائے تو اسے کسی غیر معمولی نقل و حرکت کا احساس نہ ہو سکے۔ میں، لزی اور گل زمان ایک ہی کار میں سیدھے کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ لزی نے کار کو بالکل گیٹ کے ساتھ کھڑا کر کے ایک دو بار انجن کو ریس دی تاکہ گیٹ کے دوسری طرف موجود دربان آنے والوں کے بارے میں معلوم کرنے کی غرض سے بغلی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ گل زمان کار کے رکتے ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر رینگ گیا اور میں اپنا بے آواز ریوالور نکال کر کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ لزی کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ بند گیٹ کے دوسری طرف کچھ آہٹیں سنائی دینے لگی۔

تھیں۔ پھر بغلی دروازہ کھول کر کسی نے باہر جھانکا اور گیٹ کے ساتھ ایک کار کو کھڑا دیکھ کر یہ جاننے کے لیے باہر نکل آیا کہ رات کے اس پہر یہاں آنے والا کون ہے۔ وہ خاصا تندرست و توانا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کے شانے سے رائفل لٹکی ہوئی تھی اور پستول اس کی کمر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں رہا ہوگا کہ جس بُری گھڑی سے نمٹنے کے لیے اس نے یہ رائفل اور پستول اپنے بدن پر سجائے ہوئے ہیں، وہ گھڑی اس کے سر پر آپہنچی ہے۔ وہ کسی غیر متوقع مہمان کی آمد کا تصور لیے نہایت اطمینان اور بے فکری سے باہر نکل کر ہماری کار کے قریب چلا آیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ کار کے اندر جھانکنے کے لیے نیچے جھکا اچانک پیچھے سے اس کی کمر پر ایک زوردار لات پڑی۔ وہ اچھل کر کار کے اوپر اس طرح گرا کہ اس کا سر شانوں تک کار کے اندر گھس گیا۔ میں نے پھرتی سے اس کی گردن دبوچ کر اس کی رگِ احساس مسل ڈالی۔

وہ غریب کچھ سمجھے بوجھے بغیر ہی کسی مردہ چوہے کی طرح کھڑکی میں یوں لٹک کر رہ گیا کہ اس کا سر اور دونوں شانے کھڑکی کے اندر جھول رہے تھے اور بقیہ جسم باہر تھا۔ وہ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست کے دروازے کی کھڑکی میں لٹکا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا مگر گل زمان نے مجھ سے پہلے ہی اس کو کار کے دروازے سے کھینچ کر الگ کر لیا تھا۔ ہم دونوں اسے اٹھا کر ایک تاریک حصے کی طرف لے گئے اور اسے آرام سے زمین پر لٹا دیا۔ گل زمان اسے لٹانے کے بعد سرگوشی میں بولا "یہ ابھی زندہ ہے جیلانی بھائی! لگتا ہے آپ نے ہاتھ نرم رکھا تھا اپنا۔"

"ہاں، یہ مرا نہیں ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے لیے بے ہوش ہوا ہے صرف۔ اس کی تم فکر نہ کرو بالکل اب۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو غلط ہے جناب! ان لوگوں کے ساتھ نرمی بالکل نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا سائلینسر لگا ہوا ریوالور نکال کر ٹھیک اس کے دل کے مقام پر گولی اتار دی۔

گولی کھاتے ہی دربان ہر احساس سے عاری ہونے کے باوجود تڑپ کر بہت زور سے اچھلا اور کسی ذبح کرکے ڈالے ہوئے جانور کی طرح بُری طرح مچلنے اور تڑپنے لگا۔ میں نے حیرت سے گل زمان کو دیکھا۔ وہ میرا بازو تھام کر کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آئیں اب، جلدی کریں، وقت بہت کم ہے ہمارے پاس۔"

میں اس سے کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گیا۔ ہم کار کے قریب پہنچے تو لزی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اسے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اسی وقت مجھے دھیمی آواز سنائی دی "جلدی سے آجائیں راستہ گیا ہے۔"

اس کی آواز سن کر میں نے ادھر دیکھا۔ وہ گیر اسی اَدھ کھلے بغلی دروازے میں کھڑی ہمیں بلا رہی تھی سے وہ دربان نکل کر ہماری طرف آیا تھا۔ ہم دونوں اس کے پاس جا پہنچے۔ اس نے بتایا کہ ادھر کیبن میں شخص بیٹھا تھا جسے اس نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اندر جا کر کیبن میں دیکھا۔ وہاں ایک فیل تن زمین پر پڑ ہی خون میں لوٹ رہا تھا۔ لزی نے بھی اسے اپنے ریوالور کی گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ میں نے گل زمان سے کمے سے انداز میں کہا "تم ذرا کوٹھی کے احاطے میں کون جائزہ لے لو گل زمان! اگر ان لوگوں نے کتے چھوڑ رکھے کے احاطے میں تو ان کا انتظام کرنا تمھارا کام ہے۔"

"آپ ان کی فکر نہ کریں۔ کتے تو یہاں ضرور ہیں، بُو محسوس کر رہا ہوں۔" گل زمان نے جواب دیا اور اپنی ناک کچھ سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے کیبن سے نکل گیا۔

"اس کی ناک بہت تیز ہے، اس نے اتنی دور کتوں کی بُو محسوس کر لی۔ حالاں کہ یہاں قریب میں کہیں موجود نہیں ہیں، اگر وہ آس پاس نزدیک ہی موجود ہوتے یوں اطمینان کے ساتھ اس کیبن تک نہیں پہنچ سکتے تھے کو کسی بھی قسم کی بُو محسوس ہو رہی ہے یہاں؟ مجھے تو بالکل نہیں محسوس ہو رہی۔" اس نے ناک سکوڑ کر سونگھنے کی کوش کرتے ہوئے کہا۔

"بُو تو مجھے بھی محسوس نہیں ہو رہی ہے، مگر شاید اس کی ایک عام آدمی سے زیادہ ہی تیز ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اُسی وقت مجھے کتے کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سنتے ہی میں نے اور لزی نے ایک ساتھ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاید کتوں نے گل زمان کو لیا تھا یا اس کی اجنبی بُو اُن کی ناک تک پہنچ گئی تھی ایک ہلکی سی سیٹی کی آواز اُبھری، اس کے فوراً ہی بعد نے غرانا بند کرکے کُوں کُوں کرنا شروع کر دیا۔ چند کی خاموشی کے بعد کیبن کے باہر دو آدمیوں کے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، پھر کسی شخص نے کہا "یار! یہ جیکی آج کل کچھ زیادہ ہی نہیں پینے لگا ہے کاسو کے ساتھ مل کر۔ اب دیکھو اس وقت بھی گیٹ

نہیں دے رہا ہے۔ لگتا ہے کاسو کے ساتھ کیبن میں دم لگا رہا ہے۔ باس کو پتا چل گیا نئیں تو سالے لوگوں کو سگریٹ میں بھر کے پھونک ڈالے گا۔ آج کل اس کا بھیجا پہلے ہی بھوت گرم ہے۔ یار، پتہ نہیں کون ہے یہ غلام جیلانی! اپنے کو مل جائے ایک بار نی تو سالے کے سینے میں ہوا دان بنا کے باس کے سامنے ڈال دے۔ سالے نے اُسی نے باس کا بھیجا پھیرا ہوا ہے آج کل۔ جانی بولتا تھا اور جانے کوئی بدمعاش ودماس ہے وہ۔"

"نہیں یار! اپنا باس ایسا چڑیا کے دل کا آدمی بھی نہیں ہے کہ کسی بدمعاش کو اتنی اہمیت دے گا۔ وہ تو کوئی بہت ہی آکٹوپس قسم کا آدمی ہوگا یار! جس نے باس جیسے آدمی کو کوٹھی میں بند ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ کوئی معمولی بدمعاش نہیں ہے یار۔"

لزی نے ایک لمحے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں اُس کی اس اچانک حرکت پر حیران ہو رہا تھا کہ اُس کی آواز سنائی دی "نہیں میرے شیرو! ہتھیاروں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلدی سے اچھے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ چلو شاباش! جلدی کرو، ورنہ تم دیکھ رہے ہو یہ دونوں ریوالور گونگے بہرے ہیں بالکل۔"

"اوہ، مادام! مگر... مگر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم... ہم نے ...جرم کیا کیا ہے مادام؟" اُن میں سے ایک نے گھبرا کر پوچھا۔

"سب سے بڑا جرم تو یہ ہے تمھارا کہ تم کبھی اختلاف نہیں کرتے اپنے باس سے۔ اُس کے حکم پر آنکھیں بند کرکے اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتے ہو اور میرے حکم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی سوالات کرتے ہو مجھ سے۔" وہ بولی۔

"نہیں نہیں مادام! آپ حکم کریں۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنی جانیں بھی دینے کو تیار ہیں۔" انھوں نے بیک آواز کہا۔

"اگر ایسا ہے تو جاؤ اپنے باس کو پکڑ کے لے آؤ یہاں میرے پاس اور میرے سامنے گولی مار دو اُسے۔" لزی نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ایک دم چپ ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے لزی کا یہ حکم اُن کے لیے بالکل غیر متوقع رہا ہو۔ چند ثانیے کے بعد اُن میں سے ایک نے قدرے ہچکچاتے ہوئے متعجب لہجے میں کہا "یہ... یہ... آپ کیا... کہہ رہی ہیں... مادام؟"

اُسی وقت میں بھی کیبن سے باہر نکل کر اُن کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ دونوں بھی پلے ہوئے سانڈوں کی طرح مضبوط اور توانا تھے۔ اِن کے جسم بالکل سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا ایک ایک عضو فولاد کا بنا ہوا لگتا تھا۔ رنگت ان کی سیاہ فام تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھے تھے "یہ... یہ... کون ہے... مادام! ... یہ تو جی... جی..."

"ہاں، تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ یہ وہی غلام جیلانی، وہی آکٹوپس ہیں، جن کا تم دونوں ذکر کر رہے تھے ابھی۔ اب تم یا تو اپنے باس کو پکڑ کر ان کے حوالے کر دو یا انھیں اپنے باس کے حوالے کر دو۔ دونوں میں سے ایک کام ضرور کرنا ہے تم لوگوں کو۔" لزی نے کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو تکتے ہوئے لزی کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے شاید۔ عین اُسی لمحے ایک نیم تاریک گوشے سے دو قدآور کتوں کو میں نے جیسے ہوا میں اُڑتے ہوئے ان پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ دونوں کتے اُن سے اس قوت کے ساتھ ٹکرائے تھے کہ وہ دونوں ہی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور اوندھے منہ زمین پر آرہے۔ وہ نیچے گرتے ہی انسانی فطرت کے عین مطابق پلٹا کھا کر سیدھے ہوئے تھے تاکہ خود کو اس اچانک افتاد سے بچا سکیں مگر اُن کے سیدھے ہوتے ہی دونوں کتوں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے اپنے دانت اُن کے نرخروں میں پیوست کرکے اُنھیں بُری طرح جھنجوڑنا اور بھنبوڑنا شروع کر دیا۔ لزی نے ایک طرف جست لگاتے ہوئے مجھ سے کہا "جلدی کریں جناب عالی! ادھر سے نکل چلیں اب۔"

اُس کا رُخ کوٹھی کی طرف تھا، میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

ابھی ہم چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ دائیں جانب سے کسی نے للکارنے کے انداز میں کہا "کون ہے۔ رُک جاؤ، ورنہ گولی مار دی جائے گی۔"

لزی نے رُکنے کے بجائے اپنے ریوالور کا رُخ اُدھر کرکے جدھر سے ہمیں رکنے کو کہا گیا تھا ایک فائر کر دیا۔ اُس کے نشانے کی داد نہ دینا بڑا ستم ہوگا۔ اس نے دوڑتے ہوئے، للکارنے والے کو دیکھے اور نشانہ لیے بغیر محض آواز پر فائر کیا تھا اور پھر بھی گولی رائیگاں نہیں گئی تھی اس کی۔ دوسری طرف سے فوراً ہی ایک کراہ سنائی دی تھی اور کسی نے حیرت بھری آواز میں کہا تھا۔

"ارے کیا ہوا ہے تمھیں؟"

گولی چونکہ بے آواز ریوالور سے چلائی گئی تھی شاید اسی لیے للکارنے والے کے ساتھی کو یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ اُسے اچانک کیا ہو گیا ہے لیکن یہ ناواقفیت اور حیرت آمیز جستجو اس کے لیے بھی پیغامِ اجل بن گئی تھی۔ لزی نے دوسرا فائر اُس

کی آواز بند کیا تھا اور اس کے کراہنے کی آواز بھی ہمارے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ ہم جس جگہ دوڑ رہے تھے، یہ کوٹھی کا لان تھا اور یہاں لان کے کنارے کنارے سیمنٹ کی کئی بنچیں پڑی تھیں۔ ہم اُن کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دوسرے شخص کی کراہ سنتے ہی لزی ایک بنچ کے عقب میں اوندھے منہ گرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔"لیٹ جائیں جنابِ عالی! جلدی سے لیٹ جائیں آپ بھی۔"

اسے مجھے ایسی کوئی ہدایت دینے کی ضرورت تو نہیں تھی کیوں کہ اُسے نیچے گرتے دیکھ کر میں بھی فوراً ہی اوندھے منہ نیچے گر گیا تھا۔ ہم چند لمحے زمین پر پڑے ہی پڑے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے، دشمن کی پوزیشن کا اندازہ لگاتے رہے لیکن اب ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ کہیں کوئی سایہ تک حرکت کرتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ گیٹ کے قریب سے کتوں کے غرّانے کی آوازیں ہم تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کتے ہنوز اپنے اپنے شکار کو ادھیڑنے میں مصروف تھے۔ لزی نے میرے کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے کہا۔"یہ کتے لگتا ہے پاگل ہو گئے ہیں، انھوں نے انھی لوگوں کو شکار کر لیا جن کے ساتھ یہ تمام رات اس احاطے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ انھیں ہم پر حملہ آور ہونے کا اشارہ ملا ہوگا۔ اگر ہم فوراً وہاں سے نہ بھاگ آتے تو وہ ہمیں معاف نہیں کرتے۔ اب وہ ان دونوں کو ادھیڑنے میں مصروف رہیں گے۔ آپ گل زمان کو اشارہ دیں ادھر آنے کا۔"

میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ کتوں کی اس کارروائی کو ان کا پاگل پن سمجھ رہی تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اُس نے وہاں سے بھاگ کر بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے کہا۔"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم وہاں سے ان کتوں کی وجہ سے بھاگی تھیں۔ ورنہ میں تمھیں وہیں بتا دیتا کہ کتوں پر پاگل پن کا دورہ نہیں پڑا ہے بلکہ وہ باغی ہو گئے ہیں اپنے مالکان سے، بالکل اُسی طرح جس طرح نارتھ ناظم آباد والی کوٹھی پر ہماری چڑھائی کے وقت ہو گئے تھے اور تمھیں پتا ہے بغاوت کرنے والے اپنوں ہی کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میرا منہ تکتے ہوئے بولی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ جنابِ عالی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا بہت آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے لزی بیگم! کیسے ہوتا ہے، یہ تمھیں گل زمان بتائے گا کیوں کہ اُسی کے پاس یہ حیران کن ہُنر ہے۔ اُس کی ایک ہی سیٹی پر کتے اُس سے دشمنی بھول جاتے ہیں اور اپنے مالک کے خلاف اُس کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں بہرحال ہمارا وہاں سے ادھر چلے آنا بھی نقصان دہ تو نہیں رہا، دو دشمنوں کو تم نے یہاں بھی ٹھکانے لگا ہی دیا ہے اور۔۔۔"

اچانک میری نظر کوٹھی کے نچلے حصے میں روشن ہو... ایک کھڑکی پر پڑی۔ میں بولتے بولتے ایک دم خاموش... گیا اور کہنی لزی کے بازو پر مار کر اُسے اُس طرف متوجہ... شاید کوٹھی کے اندر والوں کو باہر کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا... لزی چونک کر بولی۔

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے مجھے بھی، سامنے کے دروازوں... رکھو اور جیسے ہی کوئی باہر نکلے بے دریغ گولی مار دو۔ اُسے... آئزک بھی بیدار ہو گیا ہے، وہ بھی باہر کے حالات معلوم... کے لیے باہر نکلے گا۔" میں نے لزی سے کہا۔

"نہیں۔ اوّل تو وہ چونکہ اوپر ہوتا ہے اور بالکل درمیا... تک محدود رہتا ہے کوٹھی کے، لہٰذا جب تک یہاں باقاعدہ... آوازوں کے ساتھ نہ ہو یا کوئی اُس کے پاس جا کر اُسے اطلاع... اُس کو کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ دوسرے کسی بھی ہنگامہ آرائی کے... پر وہ باہر آنا تو بہت بڑی بات ہے کسی ایسی کھڑکی یا دروازے کے قریب بھی نہیں جائے گا جو باہر کی طرف کھلتا ہو۔" لزی... جواب دیا۔

"بڑا بزدل آدمی ہے بھئی یہ تمھارا آئزک تو، اُسے کر... سربراہ بنا کر بھیجا ہے یہاں؟" میں نے تضحیک آمیز لہجے...

"سربراہوں کے لیے بہادر اور جنگجو ہونا ضروری نہیں... جنابِ عالی! اسے صرف ذہین اور فطین ہونا چاہیے۔ جنگجوئی... بہادری اگر کسی میں ہے تو یہ اضافی صفت ہے اس کی... آئزک ذہین۔۔۔"

میں نے سامنے ایک دروازہ کھلتے دیکھ کر اُس کے منہ... ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے بھی اس دروازے کو دیکھ لیا تھا۔ چند... کے بعد دروازے کے پیچھے سے ایک شخص اپنے گاؤن... ڈوریاں باندھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ وہ یقیناً باہر کی صورت... کا جائزہ لینے کے لیے ہی نکلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لزی... کان میں بولی۔"یہ پیڈرو ہے، اس کوٹھی کے تمام محافظو... کا انچارج۔"

پیڈرو نے باہر نکل کر راہداری عبور کی اور مین گیٹ... طرف دیکھتے ہوئے بالکل ہماری سیدھ میں آگے بڑھنے لگا... نے اپنا ریوالور سیدھا کر لیا تھا اور جیسے ہی وہ رینج میں آیا... نے لبلبی دبا کر گولی کو آزاد کر دیا۔ گولی سیدھی پیڈرو کے... پر جا کر لگی تھی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر اُلٹ کر پیچھے جا... عین اُسی وقت جب لزی نے گولی چلائی تھی، پیڈرو کے... کے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر ایک اور شخص بھی... نکل آیا تھا۔ اُس کی نظریں پیڈرو پر ہی ٹکی ہوئی تھیں... پیڈرو کو اُلٹ کر گرتے دیکھا تو بے اختیار اُس کی طرف...

ہوئے بولا۔"ارے، اُستاد پیڈرو کو کیا ہوا ہے؟"

وہ شخص بھی جیسے ہی زمین پر پڑے ایڑیاں رگڑتے ہوئے پیڈرو کے نزدیک پہنچا لزی کی ایک گولی اُس کے ماتھے پر بھی سوراخ بناتی ہوئی اندر گھس گئی مگر اُس کی آواز نے دوسروں کو چوکنا کر دیا تھا۔ وہ پیڈرو کو گرتے دیکھ کر اس زور سے چلّا کر بولا تھا کہ اس کی آواز دور دور تک سُنی گئی ہوگی۔ کتوں کے غرّانے اور لزی کی گولیاں کھا کر گرنے والوں کی کراہیں رات کے اس سناٹے میں جو کتا نیند سونے والوں کو پہلے ہی ہوشیار کر چکی تھیں، اُس کی آواز نے لوگوں کو بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور کوٹھی کا ہر دروازہ دھڑا دھڑ کھلتا چلا گیا۔ سارے کے سارے کمرے روشن نظر آنے لگے۔ کون ہے؟ اور کیا ہوا؟ جیسے سوالات ہر طرف سے سنائی دینے لگے تھے۔ کوٹھی کی راہ داری میں اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ایسے میں احتیاط کا تو کوئی مقصد ہی نہیں رہ گیا تھا چنانچہ ہم نے ریوالور رکھ کر اسٹین گنیں سنبھال لیں، ابھی ہم انھیں استعمال کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ کوٹھی کے مین گیٹ سے اسٹین گنیں چلنا شروع ہو گئیں۔ لزی فوراً مجھے فائرنگ کھولنے سے منع کرتے ہوئے بولی۔"ایک منٹ صبر کر لیں جنابِ عالی! انھیں پوری طرح مین گیٹ کی طرف متوجہ ہو جانے دیں، پھر ہم ان کی محویت سے فائدہ اٹھائیں گے۔"

اُس کا دماغ ایسے معاملات میں بہت تیز چلتا تھا۔ شاید یہ اُس کی اس تربیت کا نتیجہ تھا جو آرتھر فنیلی نے یہودہ کے مفادات کی خاطر خصوصی طور پر اُسے دلائی تھی۔ اس نے بہت بروقت اور بے حد مفید فیصلہ کیا تھا۔ اگر ہم اسی وقت فائرنگ شروع کر دیتے تو وہ لوگ فوری طور پر اپنے اپنے کمروں میں جا کر مورچا بند ہو جاتے اور پھر ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔

مین گیٹ کی طرف سے ایک تسلسل کے ساتھ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شاید گل زمان نے باہر والوں کو حملے کا سگنل دے دیا تھا اور وہ لوگ بہت ہی مناسب وقت پر اندر گھس آئے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی اس فائرنگ سے دشمن کا جانی نقصان کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا اور دشمن جلدی جلدی مسلح ہو کر ان کے مقابلے پر آ گیا تھا۔ دشمن کی پالیسی یہ تھی کہ حملہ آوروں کو مین گیٹ پر ہی روک دیا جائے، چنانچہ وہ فائرنگ کرتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم ان کے ایک ایک فرد کے آگے نکل جانے تک بالکل دم سادھے خاموش پڑے رہے۔ جب وہ سب آگے نکل گئے تو ہم دونوں نے پلٹ کر پیچھے سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ گل زمان بھی ہم سے زیادہ دور نہیں تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی دشمن کے عقب پر ٹوٹ پڑا تھا۔

دشمن اس اچانک افتاد سے بوکھلا اٹھا تھا۔ وہ کُل بارہ یا تیرہ آدمی تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر کوئی مناسب کارروائی کرتے اُن کی تعداد تیزی سے گھٹتے ہوئے صرف تین رہ گئی تھی۔ وہ تینوں بوکھلاہٹ میں مین گیٹ کی طرف بھاگ اُٹھے اور سامنے سے آنے والی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس ساری کارروائی میں شاید ایک یا ڈیڑھ منٹ لگا تھا اور میدان صاف ہو گیا تھا۔ مجھے بالکل بھی اُمید نہیں تھی کہ اتنے منظم اور طاقت ور دشمن پر ہم اتنی جلدی اور اس آسانی سے فتح پا لیں گے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ بے اندازہ وسائل اور بے پناہ طاقت کی مالک فوج اپنے کمزور دشمن کو حقیر جان کر اپنی طاقت کے زعم میں اس حقیر دشمن کے ہاتھوں ہی برباد ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔ ہمارا دشمن بھی اس وقت اسی غرور کا شکار ہو گیا تھا۔ کثرت اور طاقت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نے اُسے برباد کر دیا تھا۔ لیکن یہ فتح کوئی مکمل فتح نہیں تھی۔ اس ہنگامہ خیز معرکے کے فوراً ہی بعد کوٹھی کی اوپری منزل بھی روشن ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی کوٹھی کے دونوں کونوں پر تقریباً چھت کے قریب سرچ لائٹیں جل اٹھیں، جنھوں نے کوٹھی کے آس پاس اور سامنے کا چپہ چپہ روشن کر دیا تھا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک صورتِ حال تھی، لزی نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسٹین گن کا رُخ اوپر کر کے اپنے قریب والی سرچ لائٹ کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیے۔ لہٰذا ہماری طرف کا وہ حصّہ جو ابھی لمحہ بھر پہلے بقعۂ نور بن گیا تھا دوبارہ تاریک ہو گیا مگر اسے تاریکی کہنا مناسب نہیں ہے۔ ایک سرچ لائٹ تباہ کرنے کے بعد بھی دوسری کی روشنی اس حد تک تو اس جگہ ضرور پہنچ رہی تھی کہ دشمن ہماری نقل و حرکت بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میں لزی اور گل زمان راہداری سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اور کوٹھی کی دوسری منزل سے چلائی جانے والی گولیاں ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ لہٰذا ہم تینوں نے اللہ کا نام لے کر راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔ راہداری میں پہنچتے ہی لزی نے چلّا کر کہا۔"گل زمان تم اُدھر جا کر وہ دوسری سرچ لائٹ بھی تباہ کر دو۔ ہم اوپر جا رہے ہیں۔"

گل زمان یہ سنتے ہی اُس طرف دوڑتا چلا گیا جہاں سے وہ سرچ لائٹ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں لزی کے ساتھ دوڑتا ہوا ایک کمرے میں جا گھسا۔ یہ وہی کمرے تھے جہاں سے پیڈرو برآمد ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس کمرے کے بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں، جن پر سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور نیچے سے چند سیڑھیاں اوپر ایک شخص کسی عورت

کو پکڑ کر اوپر کھینچتے ہوئے مادر پدر آزاد قسم کی گالیاں دے رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس شخص نے اپنی کمر سے لٹکے ہوئے پستول کی جانب ہاتھ لے جانا چاہا تھا مگر میں نے اُسے اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کا موقع نہیں دیا۔ لزی اور میری اسٹین گنیں ایک ساتھ غرائی تھیں اور وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کر لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا تھا۔ وہ عورت جس کی اب تک میں پُشت ہی دیکھ سکا تھا، گولیوں کی آواز سُن کر ایک دم ہماری طرف پلٹی اور اُسے دیکھتے ہی جیسے مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ بالی تھی۔ میرے جاں نثار ملازم حیدر کی بیوہ، جسے آٹزک نے اپنی اس کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی زور سے 'صاحب جی' کا نعرہ مار کر میری طرف لپکی۔ اچانک اور غیر متوقع ملنے والی خوشی میں وہ اُس کا خیال نہیں رکھ سکی تھی شاید کہ وہ زینے پر کھڑی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور اوندھے منہ نیچے آ گری مگر فرش پر بھی دبیز قالین ہونے کی وجہ سے، وہ گرتے ہی دوبارہ تیزی سے اُٹھ کر میری طرف دوڑ پڑی۔ میں اور لزی دونوں ہی بالی کی طرف متوجہ تھے جس کی وجہ سے زینے پر نگاہ نہ رکھ سکے تھے۔ بالی جیسے ہی دوڑتی ہوئی ہمارے قریب پہنچی، ایک فائر ہوا اور وہ اپنی کمر پکڑ کر ایک لمحے کے لیے رُکی پھر آ کر لہراتے ہوئے میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ میں نے گولی چلنے کی آواز سنتے ہی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ شخص فوراً ہی دکھائی دے گیا جو زینے کے درمیان میں ریلنگ تھامے کھڑا تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ پلٹ کر اوپر کی طرف بھاگا مگر میری اسٹین گن سے نکلنے والی گولیاں اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار تھیں۔ انھوں نے اُسے بھاگنے کا بالکل ہی موقع نہیں دیا۔ گولیاں کھا کر وہ سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے چلا آیا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر بالی کو دیکھا۔ گولی اس کی پُشت میں لگی تھی اور آر پار نہیں ہو سکی تھی۔ ہو سکتا ہے اسے فوری طبّی امداد مل جاتی تو اس کی زندگی بچ جاتی مگر اُس سمے نہ تو اس کا موقع تھا اور نہ ہی وقت تھا میرے پاس۔ چاہنے کے باوجود دونوں طرف سے برستی ہوئی گولیوں کے درمیان سے اسے لے کر گزرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا اس وقت۔ وہ گولی جسے اُس نے اپنی پُشت پر لے لیا تھا یقیناً اُس کے لیے نہیں تھی۔ وہ میرے یا لزی کے لیے چلائی گئی تھی مگر عین وقت پر فرشتۂ اجل نے اُسے گولی کی راہ میں حائل کر دیا تھا کیوں کہ اُس کا وقت پورا ہو چکا تھا اور ہمارے حصّے کا ابھی کام باقی تھا یہاں۔ مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ تھا، میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا اُسے اس عالم میں دیکھ کر مگر... [illegible]ل اور مشیّتِ الٰہی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اُس کے لیے۔ میں نے اُس کی ڈوبتی ہوئی نبض کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "بالی! یہ تو نے کیا کیا، تو میری موت کے راستے کی دیوار بن گئی۔ ابھی تو تو نے بہت کچھ دیکھنا تھا اس دنیا میں۔ تو نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو دنیا دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوئی تھی تو۔"

وہ اُکھڑی اُکھڑی آواز میں بولی "نہیں صاحب جی! میں نے بہت دیکھ لی یہ دنیا... اب... اب... اور کچھ دیکھنے کی بالکل... بالکل بھی تمنا... نہیں رہی تھی... وہ... وہ دیکھیں جی... اُدھر... وہ... میرا حیدر... حیدر بُلا رہا ہے... مم... مم... مجھے... ب... ب... بس صاحب... جج... جج... جی... بس۔"

بالی کی آواز ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا، دل بھر آیا تھا، آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ لزی نے میری کیفیت دیکھی تو میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی "کیا کر رہے ہیں۔ خود کو سنبھالیں جنابِ عالی! یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔ چلیں اُٹھیں، اوپر چلیں، ایسا نہ ہو آج پھر وہ خبیث نکل جائے بچ کر۔ ایسا موقع دوبارہ ہاتھ آنا بہت مشکل ہو گا۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "آؤ، آج میں اسے بچ کر نکلنے نہیں دوں گا۔ اس کی زندگی کی آخری رات ہے یہ۔"

میں اسٹین گن سنبھال کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ لزی میرے پیچھے دوڑتے ہوئے بولی "یوں اندھا دھند نہ بھاگیں جنابِ عالی! اوپر کا خیال رکھیں، کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو اوپر۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی اسٹین گن کا رُخ اوپر کر کے ایک برسٹ مارا۔

اس کا خیال بالکل درست ثابت ہوا تھا، ایک شخص سیڑھیوں کے اوپر موجود تھا جو لزی کی چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آ کر چیخ مار کے لُڑھکتا ہوا نیچے چلا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں جلدی سے ایک طرف ہو کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور اسٹین گن کا رُخ اوپر کر کے آنکھیں پھاڑ کر اوپر کا جائزہ لینے لگا۔ موت میرے بالکل قریب سے ایک بار پھر کترا کے نکل گئی تھی۔ اگر لزی نے مجھے متنبہ کرتے ہی اوپر کی طرف برسٹ نہ مار دیا ہوتا تو اس سمے ان سیڑھیوں کے نیچے پڑا میں جاں کنی کے عالم سے گزر رہا ہوتا۔ لزی کی حاضر دماغی نے ایک اور دشمن کو ملک الموت کے حوالے کر دیا تھا۔ اب میں بہت آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہا تھا، لزی بھی قدم بقدم میرے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک اوپر سے تڑتڑ کے ساتھ اسٹین گن چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس آواز میں انسانی چیخیں اور کراہیں بھی شامل تھیں۔ میں نے چونک کر لزی کو دیکھا۔ وہ بولی "ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے کچھ ساتھی کسی اور راستے سے اوپر پہنچ گئے ہیں۔"

میں تقریباً بھاگتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز میرے دائیں جانب کے ایک کمرے سے آ رہی تھی۔ میں بھاگتا ہوا اس کمرے کے دروازے تک جا پہنچا اور دیوار سے پُشت لگا کر اسٹین گن کی نال سے کمرے کے بند دروازے کو اندر دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا، دباؤ پڑتے ہی آہستہ آہستہ اندر دبنے لگا۔ لزی بھی آ کر میرے سامنے دروازے کے دوسری سمت میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کر آہستہ سے اندر جھانکا۔ میرے بالکل سامنے دو آدمی ایک کھڑکی میں کھڑے اسٹین گن سے باہر کی طرف گولیاں برسا رہے تھے۔ میں نے گردن ہلا کر لزی کو اشارہ کیا پھر ہم دونوں نے اچھل کر کھلے ہوئے دروازے کے سامنے آ کے اسٹین گنوں کے دہانے کھول دیے۔ اندر موجود دونوں آدمی اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر نیچے گر پڑے اور زمین پر لوٹنے لگے تھے۔ ہم چند ثانیے خاموش کھڑے اندر سے کسی جوابی کارروائی کا انتظار کرتے رہے۔ مگر اس کمرے میں شاید وہی دو آدمی تھے، ان کے گرتے ہی وہاں سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئی تھیں۔ چند ثانیے انتظار کرنے کے بعد ہم دونوں ایک جھٹکے سے پورا دروازہ کھول کر کمرے میں گھس پڑے۔ کمرا بالکل خالی تھا، اُن دونوں کے سوا جو اب تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے تھے اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کمرے کے بقیہ تین اطراف میں بھی تین دروازے موجود تھے۔ میں نے لزی کے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے دائیں بائیں کے دروازوں پر پہنچ کر اُنھیں اندر دبا دیا مگر وہ دونوں دروازے بند تھے پھر ہم سامنے والے دروازے پر پہنچے۔ میں نے اس دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو لزی نے مجھے روکتے ہوئے کہا "یہ کمرا آٹزک کا ہے۔ وہ دونوں اسی کمرے میں کسی پر فائرنگ کر رہے تھے۔ پہلے اس کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھ لیں وہ لوگ کس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ ایسا نہ ہو غلط فہمی کا شکار ہو کر آپس ہی میں ایک دوسرے پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔"

اس کی بات معقول ہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر آہستہ سے اندر جھانکا۔ وہ آٹزک کا بیڈ روم تھا اور بالکل خالی پڑا تھا، کوئی ایک بھی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا وہاں، البتہ دیواروں اور مختلف اشیاء کی کیفیت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہاں ابھی چند ثانیے پہلے ہی زبردست معرکہ ہوا ہے۔ دیواروں اور نرم قیمتی قالین پر خون کے بڑے بڑے دھبّے دکھائی دے رہے تھے پورے کمرے میں جا بجا۔ میں نے آہستہ سے لزی سے کہا۔ "یہ کمرا تو بالکل خالی ہے مگر ایسا لگتا ہے، یہاں زبردست جنگ ہو چکی ہے۔"

لزی نے میرے قریب آ کر کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا "واقعی زبردست جنگ ہوئی ہے یہاں تو، آئیں اندر چل کر دیکھیں، اس کے دوسری طرف کی پوزیشن کیا ہے۔ اُدھر بھی کوئی موجود ہے یا نہیں۔ پتا نہیں کون آ کر یہ تباہی پھیلا گیا ہے یہاں۔"

میں نے دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر جا کر اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ دروازہ بند تھا۔ چند لمحے اسے آگے پیچھے دھکّے دینے کے بعد میں نے لزی سے کہا "دروازہ تو بند ہے، ہم کھڑکی میں چڑھ کر اُدھر کود جاتے ہیں۔"

میں کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھے اس دروازے پر ہلکی سی آہٹ سُنائی دی جس سے ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ میں تیزی سے پلٹ کر اس دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اُدھر دو یا تین ہی قدم بڑھائے تھے کہ آٹزک مجھے دروازے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے تیزی سے اسٹین گن سیدھی کی تھی۔ آٹزک جلدی سے بولا "ٹھہرو،

ایم اے راحت کے چار سنسنی خیز ناول
عمران، ناصر آفریدی اور پروفیسر ڈارک
وہی تین ہنگامے
طنز و مزاح سے بھرپور
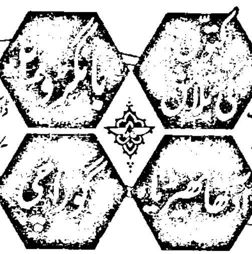
قیمت فی کتاب
/۱۵ روپے
ڈاک خرچ فی کتاب
/۱۰ روپے
چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

ایک منٹ ٹھہرو۔ ابھی گولی نہ چلانا، پہلے میری بات سُن لو پھر جو جی چاہے کرنا۔"

میں نے لبلبی پر انگلی جمائے رکھی اور اس سے کہا۔" جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ دے۔ میں اسے تیری آخری خواہش سمجھ کر سُن لوں گا۔"

"بالکل بالکل۔ میں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ کوٹھی پر تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا مکمل کنٹرول ہے، میرے سارے ہی آدمی مارے جا چکے، ایسے میں تم لوگوں سے مقابلہ کرنا خودکشی ہی کے برابر ہے۔ حالانکہ مرنا مجھے اس کے باوجود بھی ہے اور میں مرنے کے لیے تیار ہوں، مجھے لزی سے ایک سوال پوچھ لینے دو پھر بے شک تم مجھے گولی مار دینا۔" وہ التجا کرنے کے انداز میں بولا۔

میں نے دیکھا اُس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور ایک شکست خوردہ شخص کی طرح اداس اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے اسے لزی سے بات کرنے کی اجازت دے کر اپنی اسٹین گن نیچے جھکالی۔ وہ دروازے میں ایک قدم آگے آ کے بولا۔" مس الزبتھ! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کو ہم سے ایسی کیا شکایت پیدا ہوئی تھی جو تم جیلانی کی طرف چلی گئیں؟ تم نے اپنی قوم سے غدّاری کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"مجھ سے فضول باتیں مت کرو آٹزک! میں جانتی ہوں تمھیں کوئی بات نہیں کرنا ہے مجھ سے۔ ہمیں باتوں میں الجھا کر کوئی حرکت کرنا چاہتے ہو تم۔ خبردار...!"

آٹزک نے اچانک ہمارے پیچھے یوں دیکھا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔ ہم دونوں اس کی اس حرکت پر ایک دم مشینی انداز میں پیچھے مڑے۔ بس ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ہٹی تھیں اس پر سے۔ اسی ایک لمحے سے فائدہ اٹھا کر باہر نکل گیا اور ایک دھماکے سے دروازہ باہر سے بند کر کے ایک پُر زور قہقہہ لگایا اس نے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچے اور اسے کھولنے کے لیے زور آزمائی کرنے اور ٹکریں مار کر اسے توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ آٹزک نے دوسری طرف سے چلا کر کہا۔" بے کار ہے، بالکل بے کار میرے بچو! اس کوٹھی کے تمام دروازے بے حد مضبوط ہیں، انھیں توڑنے یا کھولنے کی کوشش میں اپنی جان ہلکان کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گے۔ تم دونوں اپنی تمام تر ذہانت، ہوشیاری اور بے جگری سمیت یہاں بند رہ کر اپنی موت کا انتظار کرو، اب جو بہت جلد تم تک پہنچنے والی ہے۔ آٹزک کو تم جانتے نہیں ہو میرے بچو! تم نے بہت غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے دشمنی کے لیے، آٹزک سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے اور تم نے مجھے ختم کرنے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے، اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جس سے اب تم دونوں دوچار ہو۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں میرے بے وقوف دشمنو! دیر ہے تمھاری اس مشترکہ خودکشی کا مجھے ملال رہے گا۔"

میں نے غیظ و غضب میں دروازے پر زوردار ٹکریں مارتے ہوئے کہا۔" بزدل کمینے! تو بچ کر نہیں جا سکتا یہاں سے، باہر قدم قدم پر ہمارے ساتھی موجود ہیں جو تجھے دیکھتے ہی تیرے ٹکڑے کر کے ان کتوں کو کھلا دیں گے جنھیں تو نے اپنی حفاظت کے لیے یہاں رکھا ہوا ہے۔"

لزی نے میرا بازو تھام کر مجھے روکتے ہوئے کہا۔" بے کار انرجی ضائع نہ کریں جنابِ عالی! اس طرح یہ دروازہ نہیں کھل سکے گا۔ ادھر آئیں، ہم دوسرے کمرے کے دروازے کو دیکھتے ہیں، ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ وہ کھلا ہوا ملے گا ہمیں۔"

ہم دونوں واپس پلٹ کر تیزی سے کھڑکی کے راستے دوسرے کمرے میں پہنچے۔ لزی کا اندازہ ٹھیک ہی تھا اس کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ ہم نے ادھر سے مایوس ہو کر کھڑکیوں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن وہاں موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں ہمارا راستہ روکے کھڑی تھیں، باہر نکلنے کا ہر راستہ مسدود تھا، ہم ان دو کمروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے اس لیے زیادہ تشویش کا باعث نہیں تھی کہ باہر ہمارے ساتھی موجود تھے، وہ جب اوپر آتے ہمیں اس قید سے نجات مل جاتی، فکر یہ تھی مجھے کہ وہ کمینہ یہودی کسی خفیہ راستے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا اور ہمیں ایک بار پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

میں نے لزی سے کہا۔" ہم واپس اسی کمرے میں چل کر اس دروازے کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج کی رات آٹزک کو کسی بھی طرح بچ کر نہیں جانے دینا چاہیے۔"

"جی ہاں جنابِ عالی! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ آئیں! ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔" لزی نے جواب دیا۔

ہم دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ جو اس طرف سے بند تھا کھول کر دوبارہ اسی کمرے میں واپس آ گئے لیکن یہاں اب ایک اور مصیبت ہماری منتظر تھی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ اور بند دروازے کے نیچے سے زرد رنگ کا دھواں سا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ لزی نے یہ دھواں دیکھتے ہی کہا۔

"اوہ جنابِ عالی! فوراً سانس روک لیجیے، اس ذلیل آٹزک نے کمرے میں زہریلی گیس چھوڑ دی ہے۔"

میں حیرانی سے کبھی لزی کو اور کبھی دروازے کے نیچے سے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی گیس کو دیکھ رہا تھا جس کا حجم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

بس ایک لمحے کے لیے ہماری توجہ آٹزک کی طرف سے ہٹی تھی اور وہی ایک لمحہ ہمارے خوف چال چل گیا تھا۔ ایک ایسی خوفناک چال جس کا توڑ فوری طور پر بے حد ضروری تھا۔ وقت کی سُولی پر ہم اس طرح چڑھا دیے گئے تھے کہ ہمارے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں رہا تھا۔ زندگی کی بساط پر آٹزک جو چال چل گیا تھا، جیسی شہ وہ دے گیا تھا اُس کو کاٹنے کی فوری تدبیر اگر ذہن میں نہ آتی اور کوئی محفوظ چال جلدی ہی سجھائی نہ دیتی تو مات یقینی نظر آنے لگی تھی مجھے۔ وہ کمینہ خالی ہاتھ آیا تھا، اُسے نہتا دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا تھا اُس کی طرف سے اور اطمینان اب فرشتۂ اجل کو کشاں کشاں ہماری طرف لیے چلا آ رہا تھا۔ اس عیار شخص کو کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار تھی، دروازہ چونکہ کمرے کے اندر کی طرف کھُلا ہوا تھا، للٰہذا کمرے میں آئے بغیر اُسے بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ آٹزک نے اس دروازے تک پہنچنے کے لیے عاجزی و انکساری کا... جال پھینکا تھا مجھ پر، اور میں اُس کی توقع کے عین مطابق اُس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اُس کی چال سمجھنے کے بعد میری کنپٹیاں غصے سے سُلگ اٹھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر دانت کچکچاتے ہوئے آٹزک کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

لزی نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔" نہیں، نہیں جنابِ عالی! دماغ کو ٹھنڈا رکھیں آپ۔ غلطی ہماری تھی، ہم اُس کی چال کو نہیں سمجھ سکے اور باتوں میں آ گئے اُس کی۔ اب اپنے بچاؤ کی تدبیر بھی ہمیں کرنا ہے۔ دشمن تو ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، یہ حق ہے اُس کا۔ ہم بھی تو اُس کے لیے گلدستے نہیں لے کر آئے ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔" دیکھو یہ گیس تیزی سے کمرے میں گھس کر پھیلتی جا رہی ہے، اس سے بچنے کے لیے کوئی صورت کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ کمروں کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں ہم۔"

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس طرح گیس کمرے میں رُک نہ سکے گی۔ آپ کھڑکیاں کھول لیں، میں گیس کو اندر آنے سے روکنے کی تدبیر کرتی ہوں۔"

وہ ایک کر دوسرے کمرے میں پڑے بیڈ پر سے بیڈ شیٹ کھینچ لائی اور اسے لے کر اُس دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں سے گیس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کمرے میں آ کر اُس کی دونوں کھڑکیاں پوری طرح کھول دیں۔ اُن کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں ہمیں تو کمرے سے باہر جانے سے روک سکتی تھیں لیکن اس زہریلی گیس کو روکے رکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ بات تو آٹزک بھی جانتا ہوگا لیکن اُس نے ایسا کرتے ہوئے یہی سوچا ہوگا کہ وہ ہمیں جس طرح جس قدر بھی نقصان پہنچا سکتا ہے، پہنچا دے۔ اور ہمیں یہاں پھنسا کر اپنے لیے بھاگ نکلنے کی کوئی تدبیر کر لے۔

کھڑکیاں کھولنے کے بعد میں کمرے کے ایک کونے میں دکھائی دینے والے دروازے کی طرف لپکا۔ وہ دروازہ فوراً ہی کھُل گیا۔ پتا چلا یہ اس کمرے کے اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ باتھ روم میں گھس کر میں نے اُس کا روشن دان بھی پوری طرح کھول دیا۔ میری نظر وہاں ایک جانب واش بیسن کے ساتھ لٹکے ہوئے بڑے تولیے پر پڑی، میں نے جلدی سے تولیہ اٹھا کر اُسے واش بیسن میں ڈال کر پانی کا نل کھول دیا۔ تولیے کو پانی سے خوب اچھی طرح تر کر کے اُسے لزی کے پاس لے گیا۔ وہ بیڈ شیٹ دروازے کے نیچے جھرّی میں ٹھونس کر گیس کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے وہ گیلا تولیہ اُس بیڈ شیٹ پر ڈال کر دروازے کی پوری چوڑائی میں پھیلا دیا۔ ایسا کرنے سے گیس کے اندر آنے کا راستہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ لزی فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکیاں کھول دینے کی وجہ سے جو گیس کمرے میں گھس کر اندر پھیلنے لگی تھی کھڑکیوں کے راستے باہر نکل گئی تھی اور کمرے کی فضا اس خطرناک گیس سے پاک ہو چکی تھی۔ لزی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی ہے ہمیں۔ اب یہاں سے باہر نکلنے کی تدبیر کریں کوئی۔"

میں نے کہا۔" اس کی فکر تم نہ کرو لزی بیگم! جلد ہی ہمارا کوئی ساتھی اِدھر ضرور آئے گا، پھر ہمیں باہر نکلنے کا راستہ بھی مل جائے گا۔"

"دیکھیں جنابِ عالی! میں آپ کو اپنی پوری داستان سُنا چکی ہوں کہ میرے والدین نے میرا نام فاطمہ رکھا تھا، پھر آپ مجھے فاطمہ کے بجائے یہودیوں کے دیے ہوئے نام الزبتھ یا لزی سے مخاطب کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ کو یقین نہیں آیا میری روداد پر؟"

"ارے نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں لزی زبان پر اتنا چڑھ گیا ہے کہ اب فاطمہ کا خیال ہی نہیں آتا۔ بہرحال اب یہ وعدہ ہے میرا، کہ آئندہ تمھیں فاطمہ ہی کے نام سے مخاطب کیا کروں گا۔ یہ غلطی دانستہ تو نہیں کی تھی میں نے، تم اپنا دل میلا نہ کرو اس پر۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"دوسرے لوگوں کو سمجھا دیں آپ کہ وہ بھی اب مجھے لزی نہ کہا کریں۔ میرے والدین کے دیے ہوئے نام سے ہی پکارا کریں۔" وہ بولی۔

"ہاں، ہاں تم بالکل فکر نہ کرو، اب کوئی بھی تمھیں لزی یا الزبتھ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ کسی مسلمان لڑکی کا یہ نام ہو بھی نہیں سکتا۔"

باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں لیکن اب ان میں وہ پہلا سا تواتر نہیں رہا تھا۔ یوں لگتا تھا مقابلہ کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ کوٹھی کے اطراف میں چند لوگوں کے درمیان رُک رُک کر فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اچانک آئزک کی خواب گاہ کے دوسری جانب والے دروازے پر پڑنے والی شدید ضربوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی اس دروازے پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی اسٹین گنیں سنبھال کر پوزیشن لے لی۔ اُمید تو یہی تھی ہمیں کہ آنے والے اپنے ہی آدمی ہو سکتے ہیں، پھر بھی احتیاط لازم تھی، ہمارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا، اگر وہ دشمن کے آدمی ہوتے تو ہمیں دیکھتے ہی گولیوں سے ہمارے جسم چھلنی کر کے رکھ دیتے لیکن جب دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا تو آنے والوں کو دیکھ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ گل زمان اور آبی تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ہم ان کی طرف لپکے۔ میں نے کہا: "جلدی سے اس آئزک کے بچے کو دیکھو، وہ نکل نہ جائے۔"

"ہم نے پوری کوٹھی دیکھ لی ہے، ایک ایک کمرہ دیکھ آئے ہیں ہم، اُس کا کہیں نشان تک نہیں ہے۔ وہ شاید یہاں موجود ہی نہیں تھا۔" آبی بولا "اور یہ تم دونوں یہاں کس طرح بند ہو گئے تھے۔ کیا قصہ ہے یہ؟"

"یار، وہ لعنتی آئزک، ہمیں دھوکے سے بند کر گیا ہے یہاں۔ حیرت ہے تمھیں نہیں ملا وہ۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آئزک بند کر گیا ہے!" آبی نے حیرانی سے کہا، پھر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "بیٹے! یہ چکر کسی اور کو دے جا کر، میرے ساتھ نہیں چلے گا۔ ہم لوگ باہر موت کا مقابلہ کر رہے تھے اور تم دونوں یہاں گل و بلبل کے قصے سُنا رہے تھے ایک دوسرے کو..."

میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "بک نہیں اُو ذلیل آدمی، سب کو اپنے جیسا ہی سمجھ رکھا ہے تُو نے۔ سالے وہ ہمیں یہاں بند کر کے کمرے میں زہریلی گیس چھوڑ گیا تھا۔ اُدھر دوسرے دروازے کے باہر شاید گیس سلنڈر موجود ہو گا۔ وہاں دیکھ لے جا کر۔"

گل زمان بولا "اوہ، تو وہ دروازہ بھی اسی کمرے کا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں اُسے۔ میں نے ہی گیس بند کی ہے اس کی۔ شاید آپ لوگوں نے دروازے میں کچھ لگا کر گیس کو اندر آنے سے روک دیا تھا اور گیس باہر ہی پھیلنے لگی تھی۔ میں نے بروقت وہاں پہنچ کر دیکھ لیا اُسے۔ اس گیس کی وجہ سے ہی وہ دروازہ بند چھوڑ کر ہم اِدھر آ گئے ہیں۔"

میں نے انھیں اپنے اس کمرے میں پھنس جانے کی روداد سنانے کے بعد کہا: "شاید وہ یہودی کی اولاد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔"

آبی نے استعجابیہ انداز میں کہا "کمال ہے، وہ گیا کدھر ہے؟ کوٹھی میں تو ہر طرف ہمارے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔"

اسی وقت فیروز اور شرافت علی بھاگتے ہوئے گزرے۔ انھوں نے بھی اسٹین گنیں سنبھال رکھی تھیں۔ میں انھیں آواز دیتا ہوا، اُن کی طرف دوڑ پڑا۔ "ارے کہاں جا رہے ہو؟ میری بات سنو، اِدھر آؤ۔"

شرافت علی نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "اوہ، آؤ، وہ اُدھر کوٹھی کی چھت پر ہے۔"

وہ پھر دوڑ پڑا۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہو لیا، میرے ساتھ آبی، گل زمان اور فاطمہ بھی تھے۔ (میں لڑکی کو اب فاطمہ ہی لکھوں گا کیوں کہ اس کی داستان سننے کے بعد اُسے لڑکی کہنا اُس کی توہین ہو گا اور پھر اب تو سب ہی جان چکے ہیں کہ اس کا اصل نام فاطمہ ہے۔ فاطمہ کے نام سے اسے پہچاننے میں کسی کو دشواری نہیں ہو گی۔) کمروں میں چکرانے کے بعد ہمیں ایک کمرے میں اوپر جانے والا زینہ دکھائی دے گیا اور ہم سب دھڑ دھڑاتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ فاطمہ نے پیچھے سے چلّا کر کہا "یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ، احتیاط سے اوپر چڑھیں، وہ خالی ہاتھ نہیں ہو گا، ہو سکتا ہے کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہوں اور یوں اندھا دھند اُن کے سامنے جا کر ہم اُن کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔ پلیز رُک جائیے... روکیے انھیں..."

اچانک اوپر سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سب سے آگے آگے جانے والا فیروز کراہ کر رہ گیا۔ ہم سب بھی ایک دم ٹھٹک کر رُک گئے۔ شاید بہت سی گولیاں فیروز پر پڑی تھیں۔ ایک لمحے کے بعد فیروز دوبارہ اٹھا، مگر دوسرے ہی لمحے لہرا کر نیچے بیٹھ گیا۔ ہم دم بخود اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ چند ثانیے کے لیے تو جیسے سب کو سکتہ ہو گیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ فیروز سیڑھیوں کے اختتام پر پڑا تھا۔ اور اس کا بدن یوں بل کھا رہا تھا جیسے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ ہم لوگ ابھی حیرانی کے اس شدید جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے کانوں نے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز سنی جو بہت تیزی سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گولیاں چھت سے اوپر جانے والے راستے کی طرف ایک بار پھر برسائی جانے لگیں۔ فاطمہ نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا: "وہ بھاگ رہا ہے... وہ بھاگ رہا ہے جناب! یقیناً ہیلی کاپٹر اُسی کو لینے کے لیے آیا ہے، جبھی وہ سیڑھیوں کی طرف مسلسل فائرنگ کر کے ہمیں اوپر جانے سے روکنا چاہ رہا ہے۔ پلیز ذرا راستہ دیں مجھے، میں دیکھتی ہوں اوپر جا کر۔"

وہ آگے بڑھنے لگی تھی مگر میں نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے روکتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، ان برستی ہوئی گولیوں میں تم اوپر جا کر اُسے کس طرح روک سکتی ہو؟ یہ تو سراسر خودکشی ہو گی۔ نہیں تم اوپر نہیں جاؤ گی، ٹھہرو میں دیکھتا ہوں اُسے۔"

میں نے اوپر جانے کی کوشش کی لیکن شرافت علی میری راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بولا "کیا کرتے ہو یار! انھیں روک رہے ہو خودکشی کرنے سے اور خود اوپر جا کر وہی کام کرنا چاہتے ہو۔ وہ دیوانہ ہو رہا ہے اس وقت اور تواتر کے ساتھ اس طرف گولیاں برسا رہا ہے۔ وہ ہر قیمت پر نکل جانا چاہتا ہے یہاں سے۔ ایسے میں ذرا سی بھی بے احتیاطی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ فیروز کو وہ نشانہ بنا ہی چکا ہے۔"

"لیکن اس طرح تو وہ نکل جائے گا اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے اس کا۔" میں نے جھنجلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب ہمیں بالکل اپنے سروں پر سنائی دینے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بھی رُک گئی تھی۔ شرافت علی نے میرا کندھا دبا کر کہا "ٹھہرو، میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں اُسے۔"

وہ دیوار کے ساتھ پُشت لگا کر آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگا اور دو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ عین اُسی لمحے ہیلی کاپٹر کی آواز دُور ہونے لگی۔ "اوہ، وہ نکل گیا۔" شرافت علی ایک دم چونک کر بولا اور اُچھل کر اوپر بھاگا۔

اُس کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ مگر ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر کافی دُور جا چکا تھا۔ اس سے رسّی کی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی اور کوئی شخص اس سیڑھی سے لٹکا ہوا آہستہ آہستہ ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ یقیناً آئزک ہی تھا۔ ہمارے پاس غصّے سے دانت بھینچنے اور ہاتھ ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ فاطمہ، آبی اور گل زمان بھی اوپر آ گئے تھے۔ ہم سب بے بسی سے ہیلی کاپٹر کو دور جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ پو پھٹ رہی تھی، آسمان سے رات کی تاریکی آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی اور ہماری نظریں ہیلی کاپٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک فاطمہ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا، وہ کہہ رہی تھی "اس کا رُخ مغرب کی جانب ہے، اس پر نظر رکھو۔ ہیڈ کوارٹر کو کہو فوراً ایک ہیلی کاپٹر اس کے پیچھے بھیجے۔ سمندر پر بھی نظر رکھنے کو کہو۔ کوئی بوٹ یا جہاز ایسا نظر آئے جس پر وہ اُترے تو فوراً اسے تباہ کرنے کی کوشش کی جائے، ایک ہیلی کاپٹر اِدھر بھیجنے کو کہو، میں اس کے پیچھے جانا چاہتی ہوں، اوور۔"

وہ وائرلیس پر کسی کو ہدایات دے رہی تھی۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ ہدایات دینے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر کے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے وائرلیس سیٹ کو بند کیا اور اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ میں نے پوچھا "یہ تم کس کو ہدایات دے رہی تھیں۔ کون سے ہیڈ کوارٹر کو پیغام بھیجا ہے تم نے؟"

"وہ جو چار آدمی میرے ساتھ آئے ہیں، انھی میں سے ایک سے بات کی ہے میں نے۔ آپ فکر نہ کریں، ہم پوری کوشش کریں گے آئزک تک پہنچنے کی۔ ممکنہ حد تک اُس کا پیچھا کریں گے ہم۔ آئیں فیروز کو دیکھیں چل کر، انھیں طبی امداد جلد از جلد ملنا چاہیے۔" وہ فیروز کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

آئزک کے ہاتھ سے نکلنے کا ہمیں اتنا افسوس ہوا تھا کہ اُس لمحے فیروز کا خیال ہی نہیں رہا تھا کسی کو بھی۔ فاطمہ کے توجہ دلانے پر سبھی چونکے اور تیزی سے پلٹ کر فیروز کے پاس جا پہنچے۔ اُسے سیدھا کر کے دیکھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ سُرخ سُرخ لہو کسی پرنالے کی طرح اس کے سینے سے اُبل رہا تھا۔ اور اُس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ اُس کی موت کے انکشاف نے ہم میں سے ہر ایک کو افسردہ کر دیا۔ مجھے تو جیسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سر پر سے آسمان ہٹ گیا ہو اور ایک کبھی نہ ختم ہونے والے خلا کے سوا کچھ نہ رہا ہو۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح اچانک ہمارا ساتھ چھوڑ جائے گا، یوں راستے میں ہی ہم سے بچھڑ جائے گا۔ میرا سینہ جیسے پھٹتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے سمندر رواں تھا۔ چند ثانیے کے لیے ہر شخص جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا لیکن یہ موقع ایسا نازک تھا، ہم ایک ایسے پل صراط پر کھڑے تھے کہ اپنے اس عزیز از جان بھائی، دوست، ساتھی کا سوگ بھی نہیں منا سکتے تھے۔ اس کی لاش پر جی بھر کے رو بھی نہیں سکتے تھے، ماتم بھی نہیں کر سکتے تھے اس شہیدِ وطن کا، جس نے اپنے وطن کو یہودیوں کی سازش کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا، وہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے والا ایک گمنام شہید تھا جس کے بارے میں قیامت تک کوئی کچھ نہیں جان سکتا تھا۔ وہ کون تھا؟ کس خاندان اور کس خطۂ زمین سے تعلق تھا اس کا، یہ تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں جانتا تھا، بس اتنا معلوم تھا مجھے کہ وہ ایک دردمند دل رکھنے والا محبِ وطن پاکستانی تھا جو دشمن کے پاکستانی قوم کے

اتحاد کا شیرازہ منتشر کر کے اُسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینے کے ارادے کی راہ میں سینہ سپر ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک بار پاکستان کے دولخت ہونے اور بنگلہ دیش کے عبرت ناک حالات سے سبق حاصل کر کے اتحاد اور یک جہتی کی افادیت و اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ جو اس روزِ روشن کی طرح عیاں حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتا تھا کہ بقا اتحاد میں ہے انتشار میں نہیں اور قومیتوں کا نعرہ قوم کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایجاد ہوا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک قوم بن کر جو ملک حاصل کیا ہے اُسے دشمن ہمیں کئی قومیتوں میں تقسیم کر کے ہم سے چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں جو کچھ نہیں حاصل کر سکا، وہ ہمارے درمیان انتشار پیدا کر کے، ہمارے اتحاد کی دیوار گرا کے بہ آسانی حاصل کر لینے کے خواب دیکھ رہا ہے اور وہ زر کے بندے، دولت کے پُجاری، جن کا دین، ایمان، ملک اور ملت صرف اور صرف پیسا ہے۔ میر جعفر، میر صادق اور مرزا الٰہی بخش کے نقشِ قدم پر چل کر دشمن کے منصوبوں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ ان تینوں اور دنیا بھر کے ملت فروشوں کے انجام کو فراموش کر چکے ہیں۔ وہ یہ بھول چکے ہیں کہ جنھوں نے اپنے ملک و ملت اپنے وطن سے وفا نہیں کی وہ کبھی کہیں بھی قابلِ اعتبار نہیں ٹھہرے۔ دشمن نے اُن کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد انھیں کسی اور کے لیے یہ خدمات انجام دینے کے لیے باقی نہیں رہنے دیا۔ محبِ وطن سرفروشوں کو سب نے سینے سے لگایا لیکن وطن فروشوں کو ضرورت سے ایک دن بھی زیادہ جینے کی مہلت نہیں دی گئی۔

گل زمان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، وہ کسی یتیم ہونے والے بچے کی طرح فیروز کی لاش پر رو رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فیروز کی اس اچانک اور بے وقت موت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، لیکن یہ محض میرا خیال تھا۔ میرا تو اس سے صرف چند روز کا ساتھ تھا۔ انور کمال، گل زمان اور خان اس کے پُرانے ساتھی۔ وہ چاروں نہ جانے کب سے ایک ساتھ یہ جہاد کر رہے تھے اور فیروز کو انھوں نے اپنے بزرگ، سردار، سرپرست یا یوں کہیے کہ باپ کا سا درجہ دیا ہوا تھا لہٰذا انھیں اس کی موت کا ایسا ہی غم ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں اُن کا تڑپنا دیکھ کر اپنا غم بھول گیا تھا اور آبی اور فاطمہ کے ساتھ انھیں سنبھالنے اور تسلیاں دینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک فکر یہ بھی دامن گیر تھی کہ یہاں زبردست ہنگامہ ہو چکا ہے، فائرنگ کی آوازوں سے پورے علاقے کا سکون درہم برہم ہو چکا ہے چنانچہ کسی وقت بھی پولیس کی یلغار ہو سکتی ہے یہاں۔ ایسے میں ہمارا زیادہ دیر رُکنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ ہم نے بمشکل سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جلدی سے فیروز کی لاش اٹھا کر نکل جائیں۔ موقع کی نزاکت کا انھیں بھی علم تھا لہٰذا گل زمان نے بے جان جسم اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور وہ لوگ واپسی کے لیے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ آبی کو بھی میں نے ان کے ساتھ ہی بھیج دیا۔

اُن کے جانے کے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی وہ ہیلی کاپٹر کوٹھی کی چھت پر اترا تھا جسے فاطمہ نے طلب کیا تھا۔ میں اور فاطمہ تیزی سے ہیلی کاپٹر میں چڑھ گئے۔ اندر پائلٹ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ ہمارے اوپر چڑھتے ہی ہیلی کاپٹر دوبارہ اوپر اٹھ کر فاطمہ کی ہدایت پر اُس طرف روانہ ہو گیا جدھر آئزک کا ہیلی کاپٹر گیا تھا۔ فاطمہ اور میں دُور بینوں کی مدد سے اُس کے ہیلی کاپٹر کو تلاش کرتے جا رہے تھے۔ ہم نے پورے شہر کا چکر لگا لیا۔ دُور بینوں کی مدد سے ہر وہ جگہ دیکھ ڈالی جہاں کوئی ہیلی کاپٹر اتر سکتا تھا، لیکن ہمیں اُس کا کوئی ہلکا سا سراغ تک نہ مل سکا۔

میں نے فاطمہ سے کہا "اب اُس کی تلاش بے سود ہے مجھے۔ دن کا اُجالا کافی پھیل چکا ہے۔ ایسا نہ ہو ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں، کیوں کہ پولیس کو یہ اطلاع تو مل ہی چکی ہو گی کہ اس علاقے میں فائرنگ کے زبردست تبادلے کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو ہیلی کاپٹر کچھ لوگوں کو لے جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ ہمیں گھیرا جائے یہ ہیلی کاپٹر چھوڑ دینا چاہیے ہمیں۔"

"جی ہاں، میں بھی یہی سوچ رہی ہوں، ویسے آپ فکر نہ کریں وہ بچ کر جا نہیں سکے گا کہیں۔ یہاں کراچی میں اس کے سارے ٹھکانوں کا پتا ہے مجھے، چھوڑنا نہیں ہے آج ہمیں اس کو کسی بھی قیمت پر۔" فاطمہ نے کہا، پھر پائلٹ سے بولی "ٹھیک ہے اب واپس چلو۔"

پائلٹ نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ہیلی کاپٹر مشرق کی سمت سیدھا چلنے لگا۔ میں نے فاطمہ سے پوچھا۔ "اب ہم کہاں چل رہے ہیں؟"

"ہم اپنے ہیڈ کوارٹر چل رہے ہیں، وہیں جہاں سے یہ ہیلی کاپٹر منگوایا ہے میں نے۔" اُس نے جواب دیا۔

"لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، ہمیں جلد از جلد فیروز کی تدفین کا بندوبست کرنا ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔

ہیلی کاپٹر نے ہمیں ایک ایسے میدان میں اُتارا تھا جس کے چاروں طرف بلند چار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ بائیں جانب ایک دو منزلہ عمارت تھی جس پر کسی فیکٹری کا گمان ہوتا تھا۔ عمارت کے ساتھ ایک

پارکنگ تھی جس میں کئی قیمتی کاریں کھڑی تھیں اور ایک کار ہم سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پختہ سڑک پر کھڑی تھی۔ جس کے ساتھ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس ایک شخص ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ فاطمہ ہیلی کاپٹر سے اُترنے کے بعد مجھے ساتھ لے کر اُس شخص کی طرف چل دی۔ قریب پہنچنے پر اُس نے ایک نہایت ہی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے ہوئے پوچھا "مجھے اُمید ہے مادام آپ اپنے مشن سے کامیاب لوٹی ہوں گی۔ میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے؟"

وہ شخص شکل و صورت سے پاکستانی تو نہیں لگتا تھا لیکن اردو وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے یہ اُس کی مادری زبان ہو۔ فاطمہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا "آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے مسٹر رابرٹ! وہ شیطان اس بار بھی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔"

"اوہ، یہ کیسے ہوا مادام؟ میری اطلاع کے مطابق تو آپ کا ہیلی کاپٹر اُسے شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا **تھا**۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ہم بہت دیر بعد اُس کے پیچھے گئے تھے، وہ ہمیں کہیں دکھائی ہی نہیں دیا۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

وہ ایک دم چونک پڑا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر فاطمہ کو دیکھتے ہوئے بولا "تو کیا . . . تو کیا ہمارا وائرلیس . . . نہیں . . . ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے وائرلیس پر آپ کے ہیلی کاپٹر سے یہ بتایا گیا تھا، میں نے خود رابطہ قائم کر کے پائلٹ سے پوچھا تھا۔"

میں نے اور فاطمہ نے ایک ساتھ چونک کر اُسے دیکھا۔ حیرت کی بات تھی، وہ کہہ رہا تھا اُس نے ہمارے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے بات کی تھی وائرلیس پر، جبکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پرواز کے دوران، جب سے میں اور فاطمہ اس ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے تھے، ہم نے اُس پائلٹ کو ایک چھوٹا سا جملہ تک بولتے نہیں سُنا تھا۔ پورے وقت وہ زبان بالکل بند کیے یوں بیٹھا رہا تھا جیسے اُسے بولنا آتا ہی نہ ہو۔ پھر اُس نے رابرٹ سے کب اور کیسے بات کر لی کہ ہمیں اُس کی آواز تک سنائی نہ دے سکی۔

فاطمہ بولی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر رابرٹ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ جبکہ کم از کم میں نے تو پرواز کے دوران پائلٹ کی آواز تک نہیں سنی۔" پھر وہ میری طرف رُخ کر کے بولی "آپ نے بولتے سُنا تھا اُسے جنابِ عالی؟"

"نہیں، میں خود حیران ہو رہا ہوں اس بات پر، کہ اُس نے ان سے کب اور کس طرح بات کر لی۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

عین اُسی وقت وہ پائلٹ بھی ہیلی کاپٹر سے اُتر کر ہمارے پاس آ گیا۔ رابرٹ نے استعجابیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا "اسمتھ! تم بتاؤ کیا پرواز کے دوران جب تم مادام کو لے کر آئزک کے پیچھے گئے تھے، میں نے وائرلیس پر تم سے بات نہیں کی تھی؟"

پائلٹ کی آنکھوں سے بھی حیرانی جھانکنے لگی۔ وہ جلدی سے بولا "اوہ نو مسٹر رابرٹ! ایسا تو بالکل نہیں ہوا، میں نے پرواز کرتے ہوئے نہ آپ کی آواز سنی اور نہ ہی کوئی بات کی تھی، مادام گواہ ہیں، آپ معلوم کر سکتے ہیں ان سے۔"

"حیرت ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسے ہوا؟ آخر وہ کون تھا جس نے مجھ کو جواب دیا تھا۔ میں نے تو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ نے اُس مکّار دشمن کو نشانہ بنا دیا ہے، اپنی گاڑیوں کو جو اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں، واپس آ جانے کا حکم دے دیا تھا۔" رابرٹ پریشانی سے بولا۔

میں نے کہا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے! زمین پر شہری آبادی کے درمیان دوڑتی ہوئی گاڑی سے فضا میں اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو کس طرح نظر میں رکھا جا سکتا ہے؟"

"یہ آپ نے بالکل درست کہا ہے جناب! ایسا کرنا کسی آدمی کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے لیکن چونکہ ہم اُن عام لوگوں میں سے نہیں ہیں لہٰذا ہمارے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ مادام نے آپ کو بتایا ہے کہ ہم لوگ برسوں سے اس تنظیم کے کام کر رہے ہیں اور تنظیم کے نہایت ہی قابلِ اعتبار لوگوں میں سے ہیں، چنانچہ وہ سب کچھ جس کی دوسروں کو ہوا بھی نہیں لگ سکتی، ہمارے علم میں ہے۔ ہم نے تنظیم پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ ہم اپنے بارے میں حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد اب اس تنظیم اور اسرائیل کے وفادار نہیں رہے اور ان سے انتقام لینے کے لیے ان کے ساتھ مل گئے ہیں جنھیں وہ برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں وہ ساری سہولتیں اور وہ تمام مراعات اب بھی حاصل ہیں جو پہلے تھیں۔ ہمارے پاس کچھ مخصوص قسم کی گاڑیاں ہیں جنھیں ہم عموماً ایسے موقعوں پر ہی باہر نکالتے ہیں جب کوئی معرکہ درپیش ہوتا ہے۔ ان گاڑیوں پر ریڈار کی قسم کے آلات بھی نصب ہیں جو ہمیں دشمن کا پتا دیتے رہتے ہیں۔ یہ خودکار نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔ مثلاً ہمیں کسی کا تعاقب کرنا ہو، چاہے وہ زمین پر ہو یا فضا میں تو ہمیں اُسے صرف ایک بار اس ریڈار کی زد میں لانا ہو گا۔ اس کے بعد وہ جدھر بھی جائے گا، ہمیں اُس کی سمت اور فاصلے کا پتا چلتا رہے گا۔ اس کی حرکات و سکنات سے تعاقب کرنے والے پوری طرح باخبر رہیں گے۔ جو ہیلی کاپٹر آئزک کو لے کر روانہ ہوا تھا وہ تعاقب کرنے والی گاڑی کے ریڈار کی زد میں تھا لیکن جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ مادام کا ہیلی کاپٹر اُسے نشانے پر لے چکا ہے تو میرے حکم پر متعاقب کار نے اس سے رابطہ منقطع کر دیا اور یوں وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"

رابرٹ نے بتایا۔

"وائرلیس پر ہیلی کاپٹر سے رابطہ تم نے کیا تھا یا انھوں نے خود تمھیں مخاطب کیا تھا؟" فاطمہ نے رابرٹ سے پوچھا۔

"اوہ" رابرٹ چونک کر بولا "اس کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا مجھے۔ اُن کا سگنل ملنے کے بعد ہی میں نے وائرلیس آن کیا تھا اپنا۔ دوسری طرف سے مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ آپ کے ہیلی کاپٹر کا پائلٹ ہے، پھر اُس نے کہا تھا کہ چونکہ اب ٹارگیٹ ان کے سامنے ہے اور وہ اُسے نشانے پر لے چکے ہیں لہٰذا میں اپنے آدمیوں کو واپس بُلا لوں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا مسٹر رابرٹ! اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ آئزک یہ جان گیا ہے کہ مقامی تنظیم کی کراچی شاخ کے تمام ہی لوگ اس سے باغی ہو چکے ہیں اور ہم سب مل کر اُسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔" فاطمہ نے قدرے فکر مندی سے کہا۔

"آپ نے بالکل درست سمجھا ہے مادام! اور اب وہ کراچی میں ایک دن بھی نہیں رُکے گا۔ ہمیں فوری طور پر ائیرپورٹ، ریلوے اسٹیشن اور نیشنل و سُپر ہائی وے کی نگرانی کا انتظام کرنا چاہیے۔ وہ یہاں سے نکل کر لاہور یا پنڈی ہی جائے گا۔ کیوں کہ وہاں کے لوگ ابھی یہودیوں کے طلسم سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ وہ انھیں ہمارے خلاف کھڑا کر سکتا ہے۔" رابرٹ نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہاں کی فضا اپنے خلاف دیکھ کر وہ اسرائیل یا کسی اور ملک چلا جائے۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تنظیم کے بڑے یہ بات کبھی بھی برداشت نہیں کریں گے۔ یہاں کے حالات اس کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہو جائیں، وہ بڑوں کی اجازت کے بغیر ملک نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ یہاں کی تنظیم کا سربراہ ہے اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر کے انھیں اپنے حق میں کرنے کی ذمے داری اُس کے کاندھوں پر ہے۔ اسے ہر حالت میں یہاں رہ کر ہمارا مقابلہ کرنا ہے البتہ وہ ہر قسم کے حالات کی رپورٹ بھیجنا اور اس کے سلسلے میں نئے احکامات حاصل کرتا رہے گا۔ اس کے علاوہ وہ امداد بھی طلب کر سکتا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"اگر ایسا ہے، پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یار! اپنے ملک میں تو ہم اُسے کہیں پناہ نہیں لینے دیں گے۔" میں نے جوش میں کہا۔

"نہیں جناب، ایسا تر نوالہ بھی نہیں ہے اب وہ۔ آپ کو پتا نہیں ہے اس کے ہاتھوں کی لمبائی چوڑائی کے بارے میں ابھی، جبھی اتنے اعتماد سے کہہ دی ہے آپ نے یہ بات۔ آپ کے ملک میں بھی بے سہارا نہیں ہے وہ۔ بے شمار بے ضمیر، کج رو، کوتاہ عقل و زر پرستوں کا بھرپور تعاون حاصل ہے اُسے۔ اُس کے حمایتی بہت با اثر ہیں، وہ آئزک کے بجائے اُلٹا آپ ہی کو اسرائیل یا کسی دشمن کا ایجنٹ ثابت کر دیں گے۔" رابرٹ نے کہا۔

"اس کی فکر تم نہ کرو یار! مجھے تم نہیں جانتے ہو، میرے بارے میں کوئی کچھ بھی ثابت کرتا رہے اس کی بالکل بھی پروا نہیں ہے مجھے۔ میں کسی با اثر شخص کے اثرات کی پروا نہیں کیا کرتا۔ ایسے لوگوں کو بے اثر کرنا مجھے خوب آتا ہے۔ میرا پستول کسی کا اثر قبول نہیں کرتا میرے یار۔" میں نے جواب دیا۔

فاطمہ نے بھی میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں آپ کسی کے اثر و رسوخ کے حوالے سے متاثر نہیں کر سکیں گے مسٹر رابرٹ! ان میں یہ ایک سب سے بڑی خوبی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے با اختیار شخص کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں یہ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو آئزک سے بگاڑ کبھی نہیں ہوتا ان کا۔"

"یہ ہم کن باتوں میں اُلجھ گئے ہیں یار۔ ہمیں جلد از جلد واپس جا کر فیروز کی تدفین کرنا ہے اور اس یہودی کتے آئزک کو روکنے کے لیے ناکا بندی کرنا ہے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی۔ جلدی نکلو یہاں سے۔" میں نے فاطمہ سے کہا۔

"اوہ، ہاں چلیں، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" فاطمہ کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "مسٹر رابرٹ! آپ اپنے آدمیوں کو ہر طرف اس طرح سے پھیلا دیں کہ آئزک اُن کی نظروں سے بچ کر یہاں سے کہیں نہ جا سکے۔ ہر شخص کو یہ ہدایت کر دیں کہ اُسے دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ اب جب کہ ساری بات کھل ہی چکی ہے اور آئزک ہمارے ارادوں سے باخبر ہو چکا ہے تو اب کسی احتیاط اور راز داری کی ضرورت نہیں رہی ہے۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیں مادام! ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ کراچی سے باہر اپنی چلتی ہوئی سانسوں کے ساتھ نہ جا سکے۔" رابرٹ بولا۔ ہم جلدی جلدی کار میں جا گھسے۔ فاطمہ نے اسٹیرنگ سنبھال کر کار کو آگے بڑھا دیا۔ باہر آ کر اس نے سڑک پر کار کو دوڑاتے ہوئے پوچھا "وہ لوگ فیروز کو کہاں لے گئے ہوں گے جناب عالی! ہمیں کہاں جانا چاہیے اب؟"

"یہ تو مجھے بھی پتا نہیں ہے۔ ان سے پوچھنے کا بھی خیال نہیں آیا اس وقت ہمیں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ موقع ہی ایسا تھا، کسی کو بھی کسی بات کا ہوش نہیں تھا اس وقت تو، میرا خیال ہے اسی جگہ چلتے ہیں جہاں سے آئے تھے۔" فاطمہ بولی۔

"ہاں، اس کے سوا جا بھی کہاں سکتے ہیں ہم، اس نئے مکان کا جہاں شرافت علی نے ماں اور آسیہ وغیرہ کو پہنچایا ہے مجھے تو کچھ پتا ہی ہے۔ یوں بھی اب فیروز والے مکان میں بھی خطرے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آئزک تو خود اپنے لیے جائے پناہ تلاش کرتا پھر رہا ہوگا۔" میں بولا۔

"ایسا نہ کہیں جناب عالی! وہ لومڑی کی طرح عیار شخص ہے۔ عرصے سے یہاں کے سفید و سیاہ کا مالک ہے وہ۔ تنظیم کے علاوہ بھی نہ جانے کہاں کہاں اس کے تنخواہ دار غنڈے اس کے ایک اشارے پر جان کی بازی لگا دینے کو تیار بیٹھے ہوں گے۔ وہ حشرات الارض کی طرح خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے بل کے چاروں طرف بے شمار راستے بنا کر رکھتا ہے۔ یہ سوچ کر مطمئن نہ ہو جائیں اس کی طرف سے کہ یہ جو تنظیم کے لوگ اس سے باغی ہو چکے ہیں تو اس شہر میں تنہا اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا ہے اب وہ۔ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں اور ہر روپ میں اُس نے کچھ ایسے لوگ بھی جمع کیے ہوئے ہیں اپنے گرد، جو اُسے صرف اُسی روپ میں پہچانتے ہیں۔ آئزک کی حیثیت سے وہ تنظیم کا سربراہ ہے اور تنظیم کے لوگ اس کے تابع ہیں، بابا اسحاق کے روپ میں وہ ایک برگزیدہ شخص ہے جس کے بے شمار عقیدت منداس کے لیے نقدِ جاں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور ڈاکٹر خرطومی کی حیثیت میں لیٹروں، بے ضمیروں اور بد معاشوں کا ایک گروہ اُسے اپنا سرپرستِ اعلیٰ مانتا ہے اور اس کے حکم پر بدترین کام بھی کرنے کو تیار رہتا ہے ہر وقت۔ ایسی صورت میں مقامی تنظیم کی بغاوت زیادہ تشویش ناک بات تو نہیں ہے اس کے لیے۔" فاطمہ نے مجھے بتایا۔

میں نے کہا "وقت آدمی کے ساتھ ہو تو ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی بہت کافی ہوتا ہے فاطمہ! اگر وقت مُنہ پھیر لے اس سے تو دیو ہیکل جہاز بھی اُسے غرقابی سے بچا نہیں سکتے اور میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وقت نے آئزک کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں، لیکن میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ اس کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں مجھے پورا یقین ہے ابھی وہ اتنا بے بس و مجبور نہیں ہوا ہے کہ ہم اُسے وقت کا ٹھکرایا ہوا سمجھ لیں۔ ایک مرا ہوا ہاتھی سمجھیں آپ اُسے اور اس کی طرف سے غافل تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جانتا ہے کہ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے کون سا وقت بہتر ہوتا ہے۔ یہ بات میں آپ کے بھی گوش گزار کر دوں، کسی فاتح کے لیے سب سے بُرا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ شکست خوردہ مفتوح کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی فتح کا جشن منانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ مفتوح اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لے اور سنبھل کر حملہ کر دے تو فتح کے اس جشن کو شکست کے سوگ میں بہ آسانی بدل سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں آئزک کی طرف سے کسی بھی جوابی کارروائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" فاطمہ نے کہا۔

"میں نے کبھی پہلے سے آنے والے، اچھے یا بُرے وقت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔ موقع محل اور حالات کے مطابق جو وقت پر سوجھ گیا کر گزرا ہوں، نتیجہ اس کا اکثر میرے حق میں ہی برآمد ہوا ہے اور بازی اگر کبھی پلٹی بھی ہے تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکا اس کا۔"

"یہ اُس وقت کی بات ہے جناب عالی! جب آپ کے دشمن بھی آپ ہی کی طرح کسی منصوبہ بندی کے بغیر مقابل آ جایا کرتے تھے۔ اس بار آپ کا مقابلہ جس دشمن سے ہے وہ صدیوں کی پلاننگ کر کے قدم اٹھاتا ہے، وہ دو سو سال بعد کسی بہت بڑی کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے آج سے عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس محاذ پر بغیر پلاننگ کے جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ یہ بات گرہ میں باندھ لیں آپ۔"

اُس کی نگاہیں بہت دُور تک دیکھنے کی عادی تھیں اور اپنے اطراف سے ہر دم وہ چوکنا رہتی تھی۔ بال کی کھال نکالنے کی یہ عادت اُس تربیت ہی کا نتیجہ تھی جو یہودیوں نے اُسے دی تھی۔ اپنے بارے میں حقائق کا انکشاف ہونے کے بعد اس کی وفاداری تو تبدیل ہو گئی تھی مگر بچپن سے ملنے والی تربیت نے اس کی جو فطرت بنائی تھی، وہ تبدیل نہیں ہو سکی تھی اور ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ مثل مشہور ہے کہ لوہے کو لوہے سے ہی کاٹا جا سکتا ہے چنانچہ قدرت نے فاطمہ کے روپ میں مجھے وہ لوہا عطا کر دیا تھا جس سے میں اپنے اور اپنی قوم و ملک کے اس دشمن کو کاٹ سکتا تھا۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، میری اس سرگزشت کو پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ایک شریف گھرانے کا سیدھا سادا کرد برادری سے تعلق رکھنے والا شخص ہوں۔ میں نے نہ تو بدمعاشوں، غنڈوں اور ڈاکوؤں کی صحبت کبھی اختیار کی تھی اور نہ ہی کسی ایسے ادارے یا تنظیم سے تعلق رہا تھا میرا جہاں جنگ و جدل کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ میں جو کچھ ہوں اس کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا میں نے یا میرے والدین نے، یہ تو بس اتفاق ہی ہے، حالات نے مجھے ایسی راہ پر لا ڈالا تھا جو میرے لیے قطعی اجنبی اور نامانوس تھی۔ وقت مجھے اس راہ پر اتنی دور لے گیا تھا کہ میں واپسی کا راستہ گم کر بیٹھا تھا مجھے وہ راستہ کبھی کسی طرح مل ہی نہیں سکتا تھا جو مجھے میرے شفاف ماضی میں دوبارہ لے جاتا۔ میں نے اس دلدل سے نکلنے کے لیے جو راہ بھی اختیار کی، وہ مجھے مزید گہرائی میں اتارتی چلی گئی۔ میرا دامن آلودگیوں میں لتھڑتا ہی چلا گیا۔ اب تقدیر نے مجھے ایک موقع عطا کیا تھا اپنے دامن سے لپٹی آلودگی کو دھو دینے کا اور فاطمہ جیسی ہم سفر مل گئی تھی جو مجھے کھینچ کر اس دلدل سے نکال لے جانا چاہتی تھی تو میں بھی اس کے ارادوں کی راہ میں مزاحم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ دانا بینا، دور بین اور دُور اندیش لڑکی جسے ہر راستے کے نشیب و فراز کا بخوبی علم تھا، میں اس سے کچھ سیکھتی

نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے خود کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا۔ یہی کیا کم تھا میرے لیے کہ مجھ سے ہر طرح برتر ہونے کے باوجود اس نے میری بالادستی قبول کر لی تھی اور آزمائش کی ہر گھڑی میں خود کو باوفا ثابت کرتی رہی تھی۔

اس نے فیروز کی کوٹھی کے احاطے میں کار روکی تو معلوم ہوا شرافت علی وغیرہ فیروز کی لاش لے کر وہیں پہنچے تھے، کیونکہ آسیہ ساتھ نئی اقامت گاہ پر لے جا کر وہ ماں جی وغیرہ کو ہراساں نہیں کرنا چاہتے تھے، دوسرے انھیں یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اور فاطمہ کو نئی جگہ کا پتا نہ ہونے کی وجہ سے وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ فیروز کے ساتھ بالی کی لاش بھی اٹھا لائے تھے اور جس وقت ہم وہاں پہنچے وہ انھیں غسل دے کر کفن پہنا چکے تھے اور انور کمال نے قریبی قبرستان میں ان کے لیے قبروں کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ جہاں ہر طرح کے سوال جواب اور پوچھ گچھ کے بغیر ان کی تدفین ہو سکتی تھی۔ سچ کہتے ہیں لوگ، پیسے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی مشکل راہ میں حائل ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر کام خود بخود آسان ہوتا چلا جاتا ہے پیسے کے سامنے دنیا بھر کے اصول، ضابطے اور قاعدے قانون دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ بالکل بے بس، بے اختیار سے۔

فیروز اور بالی کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی ہم نے فیروز کا وہ مکان چھوڑ دیا تھا اور شرافت علی کے اس مکان میں چلے آئے تھے جہاں ماں جی، آسیہ اور فردوسی بیگم پہلے سے موجود تھیں۔ ہم دونوں بہن بھائی کو اپنے سامنے دیکھ کر ماں جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ بالی کی موت کا انھیں بہت افسوس ہوا تھا اور فاطمہ کو وہ ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو ان کے لیے۔ انھوں نے آسیہ کو اپنی رہائی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا: "اس لڑکی نے جیسی زبردست تباہی مچائی تھی وہاں اور جس بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کر کے آزادی دلائی ہے مجھے، اس کی کسی لڑکی سے تو توقع بھی نہیں کی جا سکتی ہے اور یہ تیرا بھائی غلام جیلانی، یہ کیا شے بن گیا ہے؟ ایسے خطرناک لوگوں سے کیوں دشمنیاں پال لی ہیں اس نے؟ اسے اس کا بھی خیال نہیں ہے کہ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا کبھی تو ہم دونوں ماں بیٹی کیا کریں گے، کہاں جائیں گے ہم؟ کس کے سامنے جھولی پھیلائیں گے جا کر۔ کیا بھیک منگوانا چاہتا ہے یہ ہم سے؟"

"بات یہ ہے ماں جی! کہ یہ جو دشمن ہے یہ کوئی تمھارے بیٹے غلام جیلانی کا ہی دشمن نہیں ہے، یہ تو ہماری پوری قوم کا، ہمارے ملک کا دشمن ہے۔ یہ اس ملک کی تمام بیٹیوں کو یتیم اور بے سہارا کر دینا چاہتا ہے، یہ ہمیں طرح طرح کے نعرے دے کر ایک دوسرے سے لڑا کر برباد کر دینا چاہتا ہے۔ بھائی جان ان لاکھوں ماؤں، بیٹیوں کے سروں کے سائبان قائم رکھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ صرف میرا اور آپ کا ہی مسئلہ نہیں ہے، ملک کی ہر ماں، ہر بہن، ہر بہو کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہمیں بھائی جان کو روکنا نہیں چاہیے [illegible] سے۔" آسیہ بولی۔

"بیٹی! اگر پورے ملک کا مسئلہ ہے تو پورے ملک کو دشمن کے عزائم ناکام بنانے کے لیے میدان میں آنا چاہیے نا...!"

فردوسی بیگم نے ماں جی کی بات کاٹ کر کہا: "یہی تو رونا ہے ماں جی! دشمن کے آلۂ کار ایسے لوگ ہیں جن پر پوری قوم اندھا اعتبار کرتی ہے۔ کوئی ان کے بارے میں یہ سننا تک پسند نہیں کرتا کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ پھر اس بات پر کوئی کیا یقین کرے گا کہ وہ اس ملک اور قوم کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ کوئی یہ بات کیسے مان لے گا کہ جنھیں وہ تقلید رہنما سمجھ کر اپنے سینوں میں ان کے بت سجائے ان کی پرستش کر رہے ہیں وہ دراصل رہنما نہیں راہ زن ہیں، ایسے بردہ فروش ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی "انا"، اپنی "بالادستی"، اپنی حکمرانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اس پوری قوم کا سودا کر رکھا ہے۔ یہی تو ہماری ایک مجبوری ہے، ایک المیہ ہے اور ہماری بربادی کا اصل سبب ہے کہ عام آدمی شخصیتوں کے بت سینوں میں چھپائے ان کی پرستش میں مصروف ہے، لوگ کھرے کھوٹے کی پہچان بھول گئے ہیں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کی موت کو شہادت کا درجہ دے کر اس کا سوگ مناتے اور شرفا کو ذلیل کر کے شادیانے بجاتے ہیں۔ ماں جی! جب تک اس ملک پر جاگیرداروں کا تسلط قائم ہے یہی ہوتا رہے گا۔ غلام جیلانی اور شرافت علی جیسے لوگ دراصل ایسے ہی مارِ آستین [illegible] کے لوگوں کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ اگر خدا نے ان کی جدوجہد کامیاب کر دی ماں جی! تو ہر شخص عزت سے جی سکے گا، یہاں اور کس کے سر کی چادر سلامت ہے، کس کی چار دیواری محفوظ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا سہارا دیرپا اور مضبوط ہے؟"

"ہاں ماں جی! آپ بھائی جان کی راہ نہ روکیں۔ انھیں ان کا کام کرنے دیں۔ دنیا میں ہم دو ہی تو نہیں ہیں جنھیں ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ پتا نہیں کتنی ایسی ہیں جو کسمپرسی کے عالم میں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہی ہیں۔ ہمارے دو کے ان میں شامل ہو جانے سے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا، قیامت نہیں آجائے گی اور یوں بھی ہم دونوں اب تک کوئی پھولوں کی سیج پر تو نہیں بیٹھی رہی ہیں نا، زندگی کی خارزار راہوں میں زخم کھاتے اور لہولہان ہوتے ہوئے ہی یہاں تک پہنچی ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی نیا تجربہ تو نہیں ہوگا۔" آسیہ بولی۔

میں نے کہا: "ماں جی! آپ تو جانتی ہیں، ابا جی کے لیے زندہ لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کو باعزت طریقے سے قائم رکھے ہوئے تھے اور اگر ہمارا لالچی تایا اپنے ڈاکٹر بیٹے کی قیمت نہ لگاتا، اگر وہ اپنے لہو کو نیلام پر نہ چڑھاتا تو آج بھی ہم اسی طرح زندگی کا سفر طے کرتے رہتے۔ اس ذلیل آدمی کے لالچ نے ہمیں گناہ کی دلدل میں بہت دور تک گھسیٹا ہے۔ اتنی دور اور اتنی دیر کہ اب میرا بال بال، میرا ہر رُواں تک گناہ کی کیچڑ میں بری طرح لتھڑ چکا ہے۔ اب قدرت نے مجھے ایک موقع عطا کیا ہے اس غلاظت کو دھو دینے کا، اس کیچڑ کو صاف کر دینے کا، تاکہ اپنی پشت پر لدی ہوئی گناہوں کی گٹھڑی کا بوجھ ہلکا کر کے میں اپنے رب کے حضور سیدھا کھڑے ہونے کے قابل ہو سکوں تو ماں جی! خدا کے لیے مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھا لینے دیجیے۔" میری آواز بھرا گئی، الفاظ کے گولے حلق میں پھنستے ہوئے معلوم ہونے لگے اور آنکھیں اشکوں کے سیلاب کو مزید روکے رکھنے میں ناکام ہو گئیں۔

میری اس حالت نے ماں جی کو بھی تڑپا دیا تھا۔ وہ آخر تو میری ماں تھیں اور ماؤں کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کی اشکبار آنکھیں دیکھ کر بے حال ہو جاتی ہیں اور پھر انھیں ان کے آنسو پونچھنے کی تدبیریں کرنے کے سوا کسی بات کا خیال رہتا ہے نہ ہوش۔ ماں جی کا بھی یہی حال ہوا تھا اس گھڑی۔ انھوں نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے بھینچ کر کہا: "نہ... نہ پُتّرا! دل نہ میلا کر اپنا۔ میں کوئی تجھے روک تو نہیں رہی ہوں نا۔ تیرے رستے کی دیوار تو نہیں بن رہی ہوں میں۔ ٹھیک ہے، تو نہیں چاہتا ہے تو اب کبھی میں ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لاؤں گی۔ تو اپنے دل، اپنے ضمیر کی بات سنتا اور اس پر عمل کرتا رہ۔ میں تیری کامیابی کے لیے اپنے موہنے رب کے حضور دعا کرتی رہوں گی۔ لے بس اب چپ ہو جا، آنسو پونچھ لے اپنے۔" وہ اپنے دوپٹے کے آنچل میں میرے آنسو جذب کرتے لگیں۔

یہ منظر ایسا دل گداز تھا کہ اس وقت وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور فاطمہ کے لیے تو یہ بالکل ہی نیا تجربہ تھا، اس نے ممتا کا روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ محبت کا یہ دل میں اتر جانے والا انداز اس کے دل کو پانی پانی کر گیا تھا، اس کی آنکھوں کے سوتے بری طرح ابل پڑے تھے، ہچکیاں بندھ گئی تھیں اس کی۔ ماں جی، آسیہ اور فردوسی بیگم تینوں ہی اسے سنبھالنے میں مصروف تھیں مگر وہ اسے جس قدر سنبھالنے کی کوشش کرتی تھیں وہ اسی قدر بکھرتی چلی جا رہی تھی۔

آٹزک کی تلاش پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھی۔ رابرٹ اور فاطمہ کی زیرِنگرانی تنظیم کے وہ تمام باغی جنھیں فاطمہ کے انکشافات نے آٹزک اور سیودہ کا دشمن بنا دیا تھا، اپنے تمام تر تجربے اور وسائل کے ساتھ اس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ شرافت علی نے بھی اپنے سارے آدمیوں کو اسی ایک کام پر لگا رکھا تھا، اس کے علاوہ میں بھی گل زمان اور انور کمال کے ساتھ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا مگر ہم میں سے کوئی بھی اس کا کوئی نشان تک نہیں پا سکا تھا اب تک۔ کراچی جیسے شہر میں، جہاں انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رواں دواں رہتا ہے ہر دم، کسی پتے نشان کے بغیر کسی شخص کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریگستان میں سوئی کو تلاش کرنا۔ شہر سے باہر جانے والے ہر راستے کی پہلے ہی دن سے سخت نگرانی کرنے والے ایسے ہی لوگ تھے جو آٹزک کے ہمیشہ بہت قریب رہے تھے اور بدلے ہوئے حلیے میں بھی کسی نہ کسی طرح اسے پہچان سکتے تھے۔ وہ گھر کے بھیدی تھے، ان سے آٹزک اور تنظیم کا درون بروں پوشیدہ نہیں تھا لہٰذا میرا خیال تھا کہ آٹزک کے لیے ان کی نگاہوں کو دھوکا دے کر نکل جانا آسان کام نہیں تھا۔

انور کمال اور گل زمان کو فیروز کی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ اس کے بغیر وہ دونوں اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگے تھے۔ میں نے اور شرافت علی نے بمشکل دلاسے اور تسلیاں دے کر انھیں سنبھالا تھا۔ وہ دونوں آٹزک سے فیروز کا انتقام لینے کے لیے بے تاب تھے اور ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں ہی زمانے کے ستائے ہوئے بے سہارا اور الم گزیدہ انسان تھے۔ فیروز نے ان کے سروں پر دستِ شفقت رکھ کر انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی تھی اور دنیا میں زندہ رہنے کے اصول سمجھائے تھے۔ اس نے ان کے سینوں میں وطنِ عزیز کی محبت کے دیے روشن کیے تھے اور انھیں وطن کی آن بان اور سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دینے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ ان کا باپ تھا، بھائی تھا، سرپرست تھا۔ اس نے ان کے آنسو پونچھ کر دکھوں کا بوجھ بانٹا تھا۔ چنانچہ انھیں اس کی بے وقت اور اچانک موت پر ایسے ہی شدید جذبوں کا اظہار کرنا چاہیے تھا جیسا وہ کر رہے تھے۔ حالانکہ شرافت علی نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے کر ان کے تمام معاملات، ساری ضروریات اپنے ذمے لے لی تھیں لیکن ان کے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی اسے وہ آٹزک کے لہو سے ہی سرد کر سکتے تھے۔

فیروز کا مکان ہم نے فیروز اور بالی کی تدفین کے چند گھنٹے بعد ہی چھوڑ دیا تھا۔ شرافت علی اور خان دونوں ہی کا یہ خیال تھا کہ اب وہاں مزید ہمارا قیام کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، ہمارے لیے بے شمار مصائب کھڑے ہو سکتے تھے وہاں۔ لہٰذا اسی روز شام سے پہلے ہم وہاں سے شرافت علی کے اس مکان میں منتقل ہو گئے تھے جہاں ماں جی، آسیہ اور فردوسی بیگم پہلے سے موجود تھیں۔ یہاں

آنے کے بعد ہی ہم نے پورے زور شور کے ساتھ آٹزک کی تلاش شروع کی تھی۔ دو دن میں شہر کا کوئی علاقہ ایسا نہیں بچا تھا جس کی خاک ہم نے نہ چھانی ہو۔ اس روز بھی رات کے گیارہ بجے ہم لوگ تھکے ماندے گھر پہنچے تھے اور آتے ہی اپنے اپنے کمرے میں گھس کر بستروں پر گر پڑے تھے۔

رات کے تین بجے تھے، میں بے حد گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ میں ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور نیند سے بوجھل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھنجوڑنے والے کو دیکھنے لگا۔ میری نظر پہلے اپنے سامنے کھڑی ہوئی فاطمہ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے دیوار میں لگے وال کلاک پر جو ٹھیک تین بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں تنداً جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کیا ہوا بھئی، یہ رات کے تین بجے کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم پر؟"

"وہ... وہ... جنابِ عالی! آپ اٹھیں جلدی سے۔ شرافت علی پر سچ مچ قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔" وہ ہکلا کر بولی۔

میری آنکھیں ایک دم وا ہو گئیں۔ نیند یوں اڑ گئی جیسے میں ابھی سویا ہی نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا ہے شرافت علی کو؟"

"یہ پوچھیے کیا نہیں ہوا ہے اس غریب کے ساتھ..." وہ یک لخت خاموش ہو گئی، اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔

"اوہ، جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے شرافت علی کے ساتھ۔ بولو بولو، تم چپ کیوں ہو گئیں؟" میں نے بے تابی کے ساتھ بستر سے اٹھ کر اس کے دونوں شانے تھام کے اسے جھنجوڑتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ... وہ..." ایک بار پھر اس کی آواز بھرّا گئی اور اس کے منہ میں الفاظ جیسے گھُٹ کر رہ گئے۔

"ہاں ہاں، بولو بولو۔ کیا ہوا ہے شرافت علی کو جلدی بتاؤ؟" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تباہ ہو گیا... جنا آ آ... ب... عا عا عالی!... وہ برباد کر دیا گیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بمشکل بولی۔ "دشمنوں نے مٹی میں ملا دیا ہے اس... اس کا... سب کچھ... خاک کر دیا ہے..."

"مگر کیسے؟ وہ رات کو ہمارے ساتھ ہی واپس آیا تھا اور یہیں رُک گیا تھا۔ پھر دشمن نے کس طرح وار کیا اس پر کہ مجھے خبر بھی نہیں ہو سکی؟"

"بس یہی تو کرم ہوا ہے اس پر اللہ کا۔ یہاں ہونے کی وجہ سے وہ خود بچ گیا ہے۔ اس کے سوا اس کے گھر کا ایک ایک فرد کام آ گیا ہے، کوئی بھی نہیں بچا، نہ گھر نہ گھر والے۔ انھوں نے اس کی کوٹھی کو بموں سے یوں اڑایا ہے کہ ایک اینٹ تک سلامت نہیں رہی۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے۔ اس کے بیوی بچوں کی خیریت بھی ملی؟ وہ تو ٹھیک ہیں نا؟" میں نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے بتایا نا آپ کو، سب کچھ ختم ہو گیا ہے، کچھ بھی نہیں بچا۔ وہ بے چارہ تو برباد ہو کر رہ گیا ہے بالکل ہی۔" اس نے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ؟ کیا اسے خبر ہو گئی ہے اس المناک حادثے کی؟" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، ٹیلی فون انھوں نے ہی ریسیو کیا تھا۔ مجھے اطلاع دینے کے بعد وہ انور کمال اور گل زمان کے ساتھ اپنی کوٹھی کی طرف گئے ہیں۔ اتنے مضبوط اعصاب کا مالک شخص میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے چہرے یا انداز سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ کتنے عظیم نقصان سے دوچار ہوا ہے یہ شخص۔ نہایت اطمینان کے ساتھ مجھے ساری بات بتانے کے بعد ان دونوں کو ساتھ لے کر یوں چلے گئے جیسے شکار کو جا رہے ہوں۔"

"ہاں، یہ تم نے صحیح کہا ہے، وہ واقعی شکار کرنے ہی گیا ہے آٹزک کا شکار کرنے۔ آؤ ہم بھی دیکھیں چل کر کیا ہوا ہے وہاں۔"

"نہیں جنابِ عالی! آپ کا وہاں جانا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ رُخ بھی نہ کریں اُدھر کا۔" وہ میرے پیچھے لپکتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ میرا وہاں جانا کیوں مناسب نہیں ہے؟ اس بُرے وقت میں تو ہمیں شرافت علی کے ساتھ ہی موجود رہنا چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آپ کا کہنا لیکن وہاں پولیس کے بڑے بڑے افسر موجود ہوں گے۔ پورے علاقے کی سخت نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ ہر شخص کا گہری نظروں سے جائزہ لیا جا رہا ہوگا۔ ایسے میں آپ وہاں جا کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیں گے۔" اس نے مجھے سمجھایا۔

بہت ہی مناسب بات کہی تھی اس نے، اس کا تو مجھے بالکل دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ جیسی زبردست تباہی کے بارے میں بتایا تھا فاطمہ نے مجھے، اس کے بعد تو وہاں شہر بھر کی پولیس کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس وقت اگر میں بھی وہاں جا پہنچتا تو میرا پہچان لیا جانا یقینی تھا۔ مجھے پہچانتے ہی پولیس سارے کام چھوڑ کر میرے پیچھے لگ جاتی۔ میری گرفتاری سے افضل کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا تھا ان کے لیے۔ میں نے تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بہت بروقت سوجھی ہے تمھیں یہ بات۔"

وہ بولی "آپ کبھی کبھی جذبات میں آ کر بالکل سامنے کی بات بھول جاتے ہیں جنابِ عالی! حالانکہ شرافت علی نے بھی اس کا خیال کرتے ہوئے ہی آپ کے پاس خود آنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ساری بات بتا کر چلے گئے تھے۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے فاطمہ بی بی! جب سے تم لوگوں کا ساتھ ہوا ہے، میں اپنے بہت سے معاملات میں بے پروا ہو گیا ہوں۔ اس سے پہلے میں بہت ہی چوکنا اور باخبر رہا کرتا تھا اپنے گرد و پیش سے۔ اپنے خطرات میں گھرے رہنے کا احساس ہر دم رہتا تھا مجھے۔"

"ہوتا ہے یہ، آدمی جب خود کو محفوظ سمجھ لیتا ہے تو بے فکر ہو جاتا ہے اور یہ احساسِ تحفظ آدمی کے اعصاب کو زنگ لگا دیتا ہے، ایسی ایسی حماقتیں سرزد ہونے لگتی ہیں پھر آدمی سے کہ وہ خود حیران ہو جاتا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

میں نے واپس پلٹ کر بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "وہ آپی کہاں ہے اس وقت؟ اسے بھی خبر ہے اس واقعے کی یا نہیں؟"

"وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں، میں نے انھیں بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا، ظاہر ہے وہ بھی آپ کی طرح پولیس کا سامنا نہیں کر سکتے، پھر ان کی نیند خراب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ صبح اٹھنے کے بعد تو معلوم ہو ہی جائے گا انھیں بھی سب کچھ۔" فاطمہ بولی۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہی کیا ہے تم نے۔ اسے جگانے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر فاطمہ، وہ بے چارہ شرافت تو بالکل ہی برباد ہو گیا ہے۔ اللہ کرے اس کے بچے بچ ہی گئے ہوں۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی ہیں وہ۔ انھی کی بہتری کی خاطر اس نے خود کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔"

"یہ مقامِ عبرت ہے جنابِ عالی! آدمی کے بے حیثیت ہونے کی زندہ مثال ہے یہ۔ ایسی بے شمار مثالیں اس دنیا میں آپ کو ملیں گی۔ آدمی جن کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، جائز ناجائز، حرام اور حلال کے فرق کو مٹا کر جن کے لیے بہتر مستقبل اور بہترین آسائشیں خریدتا ہے، وہ رشتے کتنے ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں اور کس طرح اسے گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہوا چھوڑ کر اچانک چلے جاتے ہیں۔ اس دنیائے فانی کی ہر چیز ناپائیدار اور فانی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں لوگ ایسی راہوں کا انتخاب کر لیتے ہیں جن میں قدم قدم پر خار ہی خار ہیں، جہاں سستانے کے لیے کوئی سایہ تک نہیں ہے۔"

"ہاں فاطمہ! یہ دنیا ایسی ہی جگہ ہے اور یہ سب بس کہنے کی باتیں ہیں، آدمی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے خود کو غلاظت میں ڈال دیتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے، انسان بس نفس کا غلام ہے۔ اپنے نفس کی تسکین کے لیے چاہتا ہے ساری دنیا کو اپنے نیچے سمیٹ کر بیٹھ جائے، کسی کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہنے دے اور پھر دوسروں کی محتاجی اور بے بسی کا تماشا دیکھتا رہے دور بیٹھ کر۔" میں نے حقارت سے کہا۔

اس نے شاید میرے مزاج کی تلخی کو محسوس کر کے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولی "بڑا ظلم ہوا ہے یہ بے چارے شرافت علی پر۔ کمینگی کی انتہا ہے یہ۔ ایسے درندوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملنا چاہیے جنابِ عالی!"

"یہ دنیا ایسے درندہ صفت، بے ضمیر لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ایسے ایسے لوگ دیکھے ہیں میں نے جو اپنی فرعونیت کا سکہ جمانے کے لیے پورے پورے خاندانوں کو زندہ جلا دیتے ہیں اور ایک شخص کا انتقام لینے کی خاطر کروڑوں انسانوں کی بربادی کا سامان کر دینے میں ذرا نہیں جھجکتے۔ ایسے ایسے جاگیردار دیکھے ہیں میں نے اپنے ملک میں جو اپنے علاقے میں کوئی کارخانہ محض اس لیے قائم نہیں ہونے دیتے کہ کارخانہ لگ جانے سے لوگوں کو روزگار ملنے میں آسانی ہو جائے گی، لوگ خوش حال ہو جائیں گے اور پھر اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی خاطر ان کے در پر سر جھکانا چھوڑ دیں گے۔ پڑھ لکھ کر بالغ نظر ہو جائیں گے تو ان کی شیطانی چالوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جایا کریں گے۔ ان کی فرعونیت کو سمجھ لینے کے بعد ان کی اطاعت کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں گے۔ کمینگی اور ابلیسیت کے انھی مظاہروں نے ہمارے عوام میں عدم تحفظ اور محرومی کا احساس پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے دشمنوں کو یوں آزادانہ اپنے مقاصد پورے کرنے اور اس ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دینے کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ ان شیطان صفت لوگوں نے عوام کی محرومی کو وہابیت، علاقائیت اور تعصب کی کارفرمائی قرار دے کر ان محروم اور سیدھے سادے لوگوں کی رہنمائی کا فرض بھی اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہ زر کے بندے، دولت کے پجاری جن کا نہ کوئی دین دھرم ہے، نہ ملک اور وطن ہے، جب ملک و قوم پر کوئی بُرا وقت آتا ہے تو یہ یورپ اور امریکا جا کر عیش و نشاط میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جیسے ہی حالات بدلتے ہیں یہ دوبارہ واپس اپنی اپنی لیڈری کی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تم ایک شرافت علی کے خاندان کی بربادی پر اس قدر چراغ پا ہو، یہاں تو ان گنت ایسے شرافت علی ملیں گے تمھیں جن کی نسلوں کو ان انسان نما بھیڑیوں نے کھا کے ختم کر دیا ہے۔ پتا نہیں میرے ملک میں کوئی ماؤزے تنگ، کوئی چو این لائی کب پیدا ہوگا، کب عوام کو ان ظالموں کے چنگل سے نجات مل سکے گی۔ مجھے یقین ہے، ایک روز کوئی فیروز یا شرافت علی جیسا محبِ ملک و قوم اٹھ کر ان فرعونوں سے حساب ضرور لے گا۔"

"اوہ جنابِ عالی! آپ تو بہت ہی جذباتی ہو گئے ہیں، قوموں پر ایسا کڑا وقت آتا ہی رہتا ہے، اس سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مشکلات ہی تو ہوتی ہیں جو قوموں میں نئی روح پھونکتی ہیں، ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی اور انھیں کندن بناتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح لوہا آگ میں تپنے کے بعد فولاد بنتا ہے اسی طرح

مصائب قوموں کو عروج کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ زیادہ سبق نہ پڑھاؤ مجھے۔ میں بھی جانتا ہوں یہ ساری باتیں تو لیکن..."

فاطمہ نے میری بات کاٹ کر کہا "اوہ جنابِ عالی! میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے ناوقت آپ کو نیند سے بیدار کر کے غلطی کی ہے۔ مجھے یہ اطلاع دینے کے لیے صبح آپ کے بیدار ہونے تک انتظار کر لینا چاہیے تھا۔ نامکمل نیند اور اس المناک خبر نے آپ کے ذہن پر برا اثر کیا ہے، آپ کچھ چڑچڑے ہو رہے ہیں اس وقت۔ بہتر ہے لیٹ کر دوبارہ سو جائیں۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں اس گھڑی سچ مچ بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شرافت علی کے ساتھ جو ہوا تھا، اس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کم ظرف اور بدطینت دشمن نے محض ہمیں اذیت پہنچانے کے لیے ان معصوم اور بے گناہوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا تھا جو کسی طرح بھی اس کے لیے نقصان دہ نہیں تھے۔ ان غریبوں کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ان کا باپ کن لوگوں کے پنجے میں پنجہ پھنسا بیٹھا ہے۔ کون اس کے دوست ہیں اور کون دشمن۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتے تھے کہ انھیں کس جرم کی پاداش میں اتنی بڑی سزا دی گئی ہے۔

میرا سینہ بری طرح سلگ رہا تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ ذلیل کمینہ یہودی آنزک اس وقت کہاں ہے تو میں اسی وقت اس پر جا پڑتا اور یا تو اسے فنا کے گھاٹ اتار دیتا یا میں خود فنا ہو جاتا لیکن میں اس کی کمین گاہ سے ناواقف تھا اور اس مجبوری نے میرے اندر ایک آتش فشاں دہکا رکھا تھا۔ فاطمہ نے زبردستی مجھے بستر پر لٹا کر میری آنکھیں بند کر دی تھیں اور اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیاں میرے بالوں میں پھیرتے ہوئے مجھے سلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں جس اذیت ناک کیفیت سے دوچار تھا اس لمحے اس میں نیند کیسے آ سکتی تھی۔ اس بات سے وہ خود بھی بے خبر نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کی کوشش جاری تھی۔

صبح کے چھ بجے انور کمال اور گل زمان گھبرائے ہوئے سے واپس آئے تو ان کے پاس ایک اور دل آزار خبر تھی۔ پولیس نے شرافت علی کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر انھوں نے تخریب کاری میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ گزشتہ چند ہفتوں سے اس کی سرگرمیاں بے حد مشکوک ہو گئی تھیں۔ ایک بار اس کی کوٹھی پر زبردست فائرنگ ہوئی تھی جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے تھے، شرافت علی نے اسے ڈاکا زنی کی کوشش قرار دے کر مرنے والوں کو ڈاکو بتایا تھا۔ پولیس کو اسی روز یہ شبہ ہو گیا تھا کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو ظاہر کی گئی ہے، پھر اس کے ایک بنگلے میں ... کو وہاں بدنام ڈاکو غلام جیلانی اور اس کے دستِ راست ... کی موجودگی کی اطلاع ملی لیکن شرافت علی نے اپنی حیثیت سے ... اٹھاتے ہوئے پولیس کو وہاں کارروائی نہیں کرنے دی۔ چنانچہ ... کو یقین ہو گیا کہ وہ غلام جیلانی وغیرہ کی پشت پناہی کر رہا ہے ... اور تخریب کاروں سے ملا ہوا ہے۔ آج اس کی کوٹھی میں ہونے ... دھماکوں میں جس میں اس کے بیوی بچے ہلاک ہوئے اور پوری کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی ہے، یہ دھماکے اس آتشی اسلحہ کے کسی طرح پھٹ جانے کی وجہ سے ہوئے ہیں جو تخریب کاری کی غرض سے اس نے اپنی کوٹھی کے کسی حصے میں اسٹور کیے ہوئے تھے۔ ... پولیس مزید پوچھ گچھ کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

اس پوری خبر میں ایک جو بہت ہی اہم بات تھی وہ یہ تھی ... جس پولیس انسپکٹر نے اپنے افسران کے سامنے یہ ساری تفصیلات بیان کر کے پوچھ گچھ کے لیے شرافت علی کو اپنے ساتھ لے جا... کی اجازت حاصل کی ہے وہ شرافت علی کا قریبی عزیز ہے اور ا... کے کالے کرتوتوں میں اس کے ساتھ تعاون کرتا اور اسے تحف... فراہم کرتا رہا ہے۔ یہ سننے کے بعد میرے ذہن میں فوراً یہ خیال ابھرا کہ شرافت علی کے خلاف اس کی یہ کارروائی شرافت علی ... دوبارہ اس کالے کاروبار کی طرف واپس لانے کی خاطر کی گئی ... تاکہ اس کے تائب ہو جانے کے بعد اس کا جو حصہ اسے مل... بند ہو گیا تھا وہ دوبارہ بحال ہو سکے۔ مجھے اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی اسے پھانسنے کی۔ چنانچہ میں نے انور کمال سے ... "اس انسپکٹر کے گھر کا پتا معلوم کرو، ہم اس کے پاس چل کر معاملے سلجھانے کی کوشش کریں گے۔"

"جی!" وہ ذرا حیران ہو کر بولا "کیا... کیا آپ اس کے گھر ... اس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ہاں یار، یہی مطلب ہے میرا۔ کیا تمھارے نزدیک ... میں ہرج ہے کوئی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"آپ کو اپنی پوزیشن کا خیال نہیں رہا ہے شاید۔ ورنہ ایسا ... کبھی نہ کہتے آپ۔" انور کمال پریشان ہو کر بولا۔

"کیسی پوزیشن یار؟ ذرا صاف صاف بات کر، کس بات کا ... دلانا چاہتا ہے تو مجھے؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"حیرت ہے آپ کو کچھ احساس ہی نہیں ہے اپنی پوزیشن کا۔" وہ بولا "وہ ایک پولیس انسپکٹر ہے جناب اور آپ پولیس کو مطلوب ....."

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "تو تم یہ بتانا چاہ ... تھے مجھے، میرے یار! کسی حرام خور سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ...

کبھی بھی ایسے لوگوں کی ایک قیمت ہوتی ہے، وہ قیمت انھیں نہ دی جائے تو انھیں نہ کچھ یاد رہتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے بلکہ قانون سے وہ خود ایسی شقیں نکال کر تمھارے سامنے رکھ دیں گے جو تمھیں آزادی دلا سکیں۔ اس نے شرافت علی کو بھی اسی لیے تو پکڑا ہے کہ اس نے بہت دنوں سے قیمت ادا نہیں کی تھی اس کی۔ ہم یہ قیمت دے کر شرافت علی کو بھی نکال لائیں گے اور خود بھی سلامتی کے ساتھ واپس آ جائیں گے۔ ان بکنے والوں کی پروا ہی نہیں کرنا چاہیے بالکل بھی۔ بچنا صرف ان سے چاہیے جو کبھی خریدے نہیں جا سکیں۔ جاؤ پتا کرو اس کا۔"

انور کمال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ گل زمان بولا "بڑے حرام لوگ گھس آئے ہیں اس محکمے میں بھی۔ انھیں اتنی مہلت بھی دینا منظور نہیں کیا اس نے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی تدفین بھی کرا سکیں۔ یہ کام وہ سرکاری طور پر کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ بھی اس لیے کیا ہے اس نے کہ ان کی آخری رسومات میں شرکت کی خاطر شرافت علی اس کا ہر مطالبہ بے چون و چرا منظور کر لے۔ سودے بازی میں اپنا پلہ بھاری رکھنا چاہتا ہے وہ ولد الحرام۔ ہر طرح سے مجبور کر کے جھکا لینا چاہتا ہے وہ اسے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ اس کا یہ مطالبہ پورا کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ حوصلہ افزائی نہیں ہوگی اس کی؟" گل زمان بولا۔

"ہاں لیکن، جب کتا کاٹنے کے لیے ہی آمادہ نظر آئے تو اس کے آگے ہڈی پھینک ہی دینے میں عافیت ہے۔" میں نے کہا۔

گل زمان میرا جواب سن کر مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ فاطمہ ناشتے کا انتظام کرنے شاید کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ ماں جی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مصلے پر ہی بیٹھی تسبیح پھیرتی رہتی تھیں۔ وہ اس وقت وہاں سے اٹھتی تھیں جب انھیں ناشتا لگ جانے کی اطلاع دی جاتی تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر واپس پلٹا تو آبی اور آسیہ بھی اٹھ چکے تھے اور دونوں میرے کمرے میں موجود تھے۔ انھیں میری غیر حاضری میں گل زمان نے شرافت علی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ دونوں بہت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آبی بولا "اوئے جیلانی! یہ کیا ہو گیا یار؟ یہ شرافت علی تو بالکل ہی برباد ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا "مرضی ہے مولا کی، ہم کیا کر سکتے ہیں اس معاملے میں۔ جو اس نے لکھ دیا وہ تو اٹل ہے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے تو، پر تو نے مجھے کیوں نہیں خبر کی، اتنی بڑی قیامت گزر گئی اور تو پڑا سوتا ہی رہا رات بھر۔" وہ بولا۔

"اگر تو اٹھ جاتا اور تجھے بھی تین بجے رات کو ہی خبر ہو جاتی تو کیا تو اس قیامت کو روک سکتا تھا جو گزر چکی تھی اس وقت تک؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا خجل سا ہو کر بولا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ پھر بھی خبر تو کرنا تھی مجھے تم لوگوں کو۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"اوئے چپ کر جا یار! کیا بے کار کی باتیں لے بیٹھا ہے۔ تیری اہمیت یا حیثیت میں کوئی کمی نہیں ہو گئی اس طرح۔ ہم کچھ کر تو سکتے نہیں تھے۔ خبر کر دی جاتی تو تو بھی میری طرح بقیہ رات انگاروں پر لوٹ کر ہی گزار دیتا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"سنا ہے پولیس اس بے چارے شرافت علی ہی کو مجرم ٹھہرا رہی ہے اور اسے پکڑ کر لے گئی ہے؟" آسیہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا، پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے اس میں۔" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "ماں جی سے کچھ نہ کہنا اس سلسلے میں، خواہ مخواہ پریشان ہوں گی وہ۔ شرافت علی کو ہم شام سے پہلے پہلے واپس لے آئیں گے۔"

"وہ کس طرح؟ کیا ایک بار پھر پولیس کے ساتھ ٹکرانے کا ارادہ ہے؟" آسیہ نے سوال کیا۔

"یہ میں ابھی نہیں کہہ سکتا۔ انور کمال کو بھیجا ہے میں نے، اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کچھ فیصلہ کریں گے ہم۔" میں نے جواب دیا۔

آبی بولا "جیلانی! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ عنقریب ہمیں ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنا پڑے گی ان لوگوں سے۔ زبردست تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور ہم میں سے کون سلامت رہ سکے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ ایسے نازک وقت ماں جی کی دیکھ بھال اور حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گی ہمارے لیے۔ کیوں نہ انھیں میرے گاؤں بھیج دیا جائے میری ماں کے پاس۔"

"نہیں یار! ان کی تو فکر نہ کر، ان کا ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔ جلد ہی میں انھیں یہاں سے روانہ کر دوں گا۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"کیا انتظام کیا ہے آپ نے ان کا؟ کہاں بھیج رہے ہیں آپ انھیں؟ ہمیں بھی تو بتائیں کچھ؟" آسیہ جلدی سے بولی۔

"انھیں یہاں بلانے سے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا ہم نے کہ ماں جی کو عمرہ کرنے بھیج دیا جائے۔ اسی لیے تو ہم نے انھیں بلایا ہے یہاں۔ اس کا سارا انتظام شرافت علی کے ذمے ہے اور وہاں سعودیہ میں بھی اس کا کوئی عزیز ہے جس کے پاس ماں جی کے رہنے کا انتظام کر دیا جائے گا چھ ماہ کے لیے۔ چھ مہینے ماں جی نہایت اطمینان کے ساتھ سعودیہ میں رہیں گی، اس عرصے میں ہم

یہاں کا مسئلہ نمٹا لیں گے۔" میں نے انھیں بتایا۔
"یہ تو بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔ اس طرح تو ہم ان کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں گے۔" آسیہ نے خوش ہو کر کہا۔
"ہاں یار! یہ بات تو میں بالکل بھول ہی گیا تھا۔ خود شرافت علی نے یہ تجویز پیش کی تھی شاید۔ میرا تو خیال ہے جیلانی! اس میں تھوڑی سی ترمیم اور کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ ماں جی کے ساتھ آسیہ کو بھی بھیج دیتے ہیں ہم۔" آبی نے کہا۔
"نہیں، میں ماں جی کے ساتھ نہیں جاؤں گی، میرا یہیں موجود رہنا ضروری ہے۔ تمھیں میری حفاظت کے لیے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں اب وہ نازک اندام لڑکی نہیں رہی ہوں جسے قدم قدم پر سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" آسیہ بولی۔
"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا، تم تو خواہ مخواہ بُرا مان گئیں۔ میرا خیال تھا اس طرح تمھیں کچھ سکون میسر آ جائے گا۔" آبی بولا۔
"سکون ہمارے مقدر میں ہے کہاں جو میسر آ جائے گا۔ ہمارے حصے کا سکون تو اسی دن ختم ہو گیا تھا یار! جس روز ہمارے حریص نانا نے ماں جی سے اپنے بیٹے کی قیمت طلب کی تھی۔ اس دن کے بعد سے ہم سکون اور اطمینان جیسی چیزوں کے بس نام سنتے اور ان کی خواہش کرتے رہے ہیں، انھیں دیکھ نہیں سکے ہیں، پا نہیں سکے ہیں ایک پل کو بھی۔" میں نے دکھ کے ساتھ کہا۔
دن کے دس بجے کے قریب انور کمال نے آ کر مجھے بتایا کہ وہ پولیس انسپکٹر جس نے شرافت علی کو پھانس رکھا ہے لیاقت آباد میں رہتا ہے۔ اس نے اس کا مکمل پتا بتانے کے بعد کہا "ویسے میں اس کا مکان دیکھ آیا ہوں، آپ کو ڈھونڈنا نہیں پڑے گا اسے۔"
"اور اس کے بارے میں کیا معلومات حاصل کی ہیں، ان کی تفصیل بھی بتا دو۔" میں نے اس سے کہا۔
"اسّی گز کے پلاٹ پر دو منزلہ مکان بنا رکھا ہے اس نے جس کی اوپری منزل میں کرائے دار ہیں، نیچے وہ خود رہتا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی صرف دو ہی افراد ہیں گھر میں، بچہ وچہ ان کا کوئی نہیں ہے۔ دونوں میاں بیوی بے حد کنجوس اور لالچی ہیں، حریص اتنے ہیں کہ پیسے کے لیے اپنے آپ کو بیچ دینے میں بھی ذرا تامل نہیں کریں گے۔ پورے خاندان سے الگ تھلگ ہیں، نہ کوئی ان سے ملنے آتا ہے نہ وہ خود کسی سے ملنے جاتے ہیں، محلے پڑوس والے بھی ان سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتے۔"
"اس کا مطلب ہے یہ آسانی خریدے جا سکتے ہیں وہ۔ کیا وہ انسپکٹر اس وقت گھر پر مل سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"نہیں، وہ شام چھ بجنے سے پہلے گھر نہیں پہنچے گا۔ تھانے میں شرافت علی سے پوچھ گچھ میں مصروف ہے وہ۔" انور کمال۔۔۔
"ٹھیک ہے، پھر تو یہ کام اور بھی آسان ہو جائے۔۔۔ کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی کو آسانی سے شیشے میں اتارا جا۔۔۔ آؤ اٹھو، اس کام میں دیر بالکل نہیں کرنا چاہیے۔" میں۔۔۔ سے اٹھ کر باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے۔
انسپکٹر کا مکان ایک مسجد کے بالکل ساتھ لگا۔۔۔ جسے یقیناً مسجد کے زیرِ سایہ خرابات میں شمار کیا جا۔۔۔ دروازے پر پولیس انسپکٹر اے۔ اے شیروانی کے نام۔۔۔ پاس پڑوس والوں کو مرعوب کرنے کی ہی کوشش کی گئی۔۔۔ انور کمال کی اطلاع کے مطابق ان کے گھر کوئی میل ملاقات سے تو آتا ہی نہیں تھا جسے وہ مکان تلاش کرنے میں دشو۔۔۔
دستک کے جواب میں جس خاتون نے دروازہ کھولا تھا وہ۔۔۔ پینتیس سال کی پستہ قامت اور خاصی فربہ عورت تھی۔ اگر۔۔۔ گورا چٹا نہ ہوتا تو رات کے اندھیرے میں اس پر تارکول۔۔۔ کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ ہم شاید اس کے آرام میں مخل ہوئے گھڑی۔ حالت اس کی یہی بتاتی تھی کہ وہ بستر سے اٹھ کر۔۔۔ آئی ہے۔ بال اس کے کسی آوارہ گرد کے خیالات کی طرح۔۔۔ اور آنکھیں نیند کے خمار کی چغلی کھاتی دکھائی دیتی تھیں۔۔۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر خود کو اس کی جگہ فٹ کر۔۔۔ کے سے انداز میں پوچھا "کیا بات ہے جی، کسی سے ملنا۔۔۔ لوگوں نے یا یتیم خانے کا چندہ لینے آئے ہیں؟"
"کمال کرتی ہو بی بی! ہم تمھیں یتیم خانے کا چندہ ما۔۔۔ لگتے ہیں شکل سے؟" آبی نے چڑ کر کہا۔
میں نے جلدی سے کہا "چپ کر جا یار! تجھے کیا۔۔۔ دروازہ صرف یتیم خانے والے ہی کھٹکھٹاتے ہوں اور۔۔۔ آتا ہے نہیں ان کے گھر۔" پھر میں اس خاتون سے۔۔۔ جو اپنے انداز سے ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی ہی لگتی تھی۔۔۔ ہمیں دراصل آپ کے شوہر نام دار سے ملنا تھا۔ میرا مطلب۔۔۔ وہ پولیس انسپکٹر اے۔ اے۔ شیروانی صاحب سے۔"
"وہ گھر پر نہیں ہیں، انھیں ملنا ہے تو ادھر تھانے جاؤ، یہاں کیا لینے آ گئے ہو۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹی دروازہ بند کرنے کے لیے۔
میں نے اسے واپس جاتے دیکھ کر جلدی سے۔۔۔ بات تو سن لیں جی ہماری، ہم ان سے وہاں نہیں مل سکتے۔۔۔ بے حد ضروری ہے جس کی وجہ سے بنا دو بھی نہیں۔۔۔ آپ ذرا سی مہربانی کریں، ہمیں اندر بٹھا کے انھیں یہاں۔۔۔ طرح بھی فائدہ ہی ہوگا اس سے آپ کو۔"
وہ واپس جاتے جاتے رک کر بغور ہمارا جائزہ لیتے ہوئے۔۔۔ کام نہیں ہے ان سے، مجھے تو نہیں ہے جس سے مجھے فائدہ ہوگا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے کہ کام ہمارا ہے لیکن ہم آپ کو بھی اس سے۔۔۔ پہنچانا چاہتے ہیں، جبھی تو یہاں آئے ہیں۔ اب دیکھیں نا، تھانے۔۔۔ لین دین ہوگا تو اس میں دوسرے بھی شریک ہو جائیں گے، اس طرح آپ کا حصہ تو تھوڑا ہی رہ جائے گا نا، جبکہ یہاں معاملہ۔۔۔ میں سب کچھ آپ کو ہی ملے گا۔ ایک لاکھ روپے کی رقم ایک۔۔۔ ہاتھ میں جائے تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔" میں نے اسے ترغیب دینے کے انداز میں کہا۔
"ارے تو یوں کہو نا سیدھی طرح۔" اس کی باچھیں کھل گئی تھیں، لاکھ روپے آتے دیکھ کر اس کا انداز ہی بدل گیا تھا ایک دم۔
میں نے کہا "کہیں کیا جی، آپ نے تو ہمیں بیٹھنے تک کو نہیں کہا ہے اب تک۔ کیا ہم باہر ہی کھڑے رہیں اتنی بڑی رقم کے ساتھ؟"
اس نے چند ثانیے کچھ سوچا، پھر بولی "تم لوگ سچ بول رہے ہو نا، اس کے سوا کوئی اور بات تو نہیں ہے؟"
"آپ ڈریں نہیں، ہم نے جو کچھ کہا ہے آپ سے، اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہے۔ ہم شیروانی صاحب سے ایک آدمی کو چھوڑ دینے کی درخواست کرنے آئے ہیں، اگر انھوں نے ہماری درخواست منظور کر لی تو ایک لاکھ روپیہ سمجھ لیں آپ کا ہو گیا۔" انور کمال نے اسے مزید لالچ دیا۔
"ڈرنے کی کیا بات ہے، میں کیوں ڈروں گی تم سے؟ میرے میاں پولیس انسپکٹر ہیں، سب کو پتا ہے یہ۔" وہ دروازے سے ہٹتے ہوئے بولی "تم لوگ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھو، آ کر میں شیروانی صاحب کو فون کر کے بلاتی ہوں ابھی۔"
اس نے ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو پتا چلا کہ وہ دروازہ جس سے ہم اندر گئے تھے، ڈرائنگ روم ہی کا دروازہ تھا۔ کمرے میں پلاسٹک کا فرش بچھا ہوا تھا، اندر درمیانہ درجے کے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ٹیلی وژن بھی رکھا ہوا تھا، مگر ٹیلی فون وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ شاید کسی اور کمرے میں تھا۔ ہمارے اندر جانے کے بعد بیگم شیروانی نے صوفے کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "آپ لوگ بیٹھیں، میں شیروانی کو فون کر کے بتاتی ہوں آپ کے بارے میں۔" وہ دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف چند قدم بڑھنے کے بعد ایک دم پلٹ کر بولی "لیکن آپ نے اپنے مسئلے کے بارے میں کچھ بتایا تو ہے نہیں مجھے۔ میں بھلا کیا بتاؤں انھیں کہ آپ لوگ کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں ان سے؟"

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ہَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔
****
وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصّوں میں مکمّل

قیمت فی حصہ/۲۵ روپے ✱ ڈاک خرچ فی حصہ/۱۰ روپے

"آپ انھیں صرف یہ کہیں کہ شرافت علی کے معاملے میں کچھ گفتگو کرنا ہے ہمیں ان سے۔" میں نے اُس سے کہا۔

شرافت علی کا نام سن کر وہ بُری طرح چونک پڑی اور آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھتے ہوئے بولی: "اوہ، تو آپ شرافت بھائی کی رہائی کے سلسلے میں ان سے ملنے آئے ہیں۔ آج صبح ہی تو انھیں گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ کیوں انھیں رہا کرانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ ہمارے دوست ہیں اور پولیس نے انھیں بے گناہ پکڑا ہوا ہے۔ حالاں کہ اُن کے ساتھ تو ہمدردی کرنا چاہیے تھی اُسے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی سان کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے گھر بار اور بیوی، بچّے بے موت مارے گئے ہیں اور آپ کہتے ہیں پولیس نے انھیں بے گناہ پکڑا ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بُرے آدمی کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے جناب، پولیس کسی بے گناہ کو نہیں پکڑا کرتی۔"

"یہ غلط ہے بی بی! شرافت علی بُرا آدمی نہیں ہے اب۔ ناانصافی کی بات تو یہی ہے کہ جب تک وہ جرائم میں ملوّث رہا کسی نے بھی آنکھ اٹھا کر اُسے دیکھا تک نہیں اور جب اُس نے بُرائی کا راستہ چھوڑ کر توبہ کر لی تو گرفتار کر لیا گیا اُسے۔ پولیس کیا کرتی ہے یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ارے واہ، تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو، پولیس کو الزام دیتے ہو۔ اگر انھوں نے توبہ کر لی تھی تو اپنے گھر میں وہ بم کیوں رکھے ہوئے تھے جو رات کو اچانک پھٹ گئے؟ بے گناہ تو وہ تھے جو بے چارے اپنے باپ کے گناہوں کی پاداش میں بے موت مارے گئے۔" وہ غصّے سے آنکھیں نکال کر بولی۔

"اچھا اچھا، اب ختم کرو اس جھگڑے کو بی بی۔ یہ باتیں تمھاری موٹی عقل میں نہیں سما سکیں گی۔ تم شیروانی کو بلاؤ جلدی سے۔" مَیں نے کہا۔

"کیا کیا... کیا کہا۔ مَیں موٹی عقل کی ہوں، بے وقوف ہوں میں؟ ٹھیک ہے پھر اب جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔ ٹھینگے سے نہیں بلاتی میں شیروانی کو۔ لو بھلا میرے گھر میں بیٹھ کر میرے ہی خلاف باتیں کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں کام آؤں ان کے۔"

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی تھی اور ہمیں گھر سے نکالے دے رہی تھی مگر میرے پاس ایسی چابی تھی جس سے اس تھانیدارنی کا دماغ لمحوں میں درست ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے آبی سے کہا: "چلو یار! اٹھو یہاں سے۔ لگتا ہے، انھیں اس ایک لاکھ روپے کی ضرورت نہیں ہے جو ہم اِن کے لیے لے کر آئے ہیں۔ اب ہم یہ کسی اور ضرورت مند کو دے کر کام کرا لیں گے۔"

ایک لاکھ روپے کی رقم کو یوں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر اس کی ساری اکڑفوں لمحوں میں ختم ہو گئی۔ وہ جلدی سے اپنے ... زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی: "لو اب تم ناراض ہو رہے ہو۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ تم بیٹھو، میں ... ہوں شیروانی کو۔ ایک لاکھ روپے کے لیے تو میں ایک ... آپ کو کم عقل اور بے وقوف کہنے کو تیار ہوں۔"

وہ پلٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں ... ہوئے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ انور کمال بولا: "عجیب ہے یہ۔"

"حریص اور لالچی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں یار! ... اگر گالیاں بھی دی ہوتیں تو ایک لاکھ روپے کے عوض یہ انھیں بھی برداشت کر لیتی۔ ایسی ہی فطرت ہوتی ہے ان لوگوں کی ... سب کچھ ہوتا ہے ان کے لیے، اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں یہ۔"

"صحیح کہا ہے آپ نے جیلانی بھائی! ایسے ہی لوگ ... روپے میں ایمان کا سودا کرتے پھرتے ہیں اپنے۔ ایسے ... لوگوں کو اتنی اہم ذمّے داریاں سونپ کر ان کے ہاتھوں میں ... کا کوڑا پکڑا دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، جو دیکھ رہے ہیں ... دن رات۔"

"چھوڑ یار! لعنت بھیج اِن سالے ایمان فروشوں پر ... کرنا ہے، ہمارے لیے تو ایسے ہی لوگ نعمت ہیں۔ یہ اگر نہ ہوتے تو کیا ہم شرافت علی کو اس طرح رہائی دلانے کے ... میں سوچ بھی سکتے۔ ہمیں تو ان کے بارے میں ایسی باتیں ... چاہئیں۔" آبی بولا۔

"کیا کہتا ہے یار تو، ہمارا یہ مسئلہ بھی تو اسی ... بے ضمیری کا پیدا کردہ ہے۔ اس نے شرافت علی کے ... ڈالنے کی کوشش بھی تو اسی لیے کی ہے کہ اس طرح کچھ ... اس سے۔ ورنہ جس کی دنیا برباد ہو گئی، زندگی بھر کی کمائی ... ہو، اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے اسے اس طرح ... کی کیا ضرورت تھی اسے؟" مَیں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"آہستہ بول یار! تیرے سامنے تو زبان کھولنا بھی ... ہر وقت کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" آبی منہ بنا کر بولا۔

"تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے تُو؟ یہ ذلیل اس ... انھیں تُو نعمت قرار دے لینے لیے۔" میں نے جواب ...

اسی لمحے مسز شیروانی دوبارہ نمودار ہو کر بولی:

"ابھی پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں یہاں۔ مَیں نے انھیں ٹیلی فون پر نہیں بتایا ہے کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں یہاں۔ اپنا مسئلہ انھیں آپ خود ہی بتائیے اب۔" پھر وہ واپس اُس کمرے کی طرف جدھر سے آئی تھی، بڑھتے ہوئے بولی: "آپ لوگ بیٹھیں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے۔"

وہ چلی گئی تو آبی بولا: "اوئے جیلانی یار! یہ عورت کوئی چال تو نہیں چل رہی ہے ہمارے ساتھ۔ اس کی یہ شرافت اور خاطر داری یوں ہی نہیں لگ رہی ہے مجھے۔ ایسی مہمان نواز ہے نہیں یہ جیسی ٹیلی فون کرنے کے بعد دکھائی دینے لگی ہے۔"

"ایک لاکھ روپے میں بڑی کشش ہوتی ہے یار! یہ ساری شرافت اس کے چہرے پر ان نوٹوں نے منڈھ دی ہے جن کا خواب ہم نے اُسے دکھایا ہے۔ پھر بھی، ہو سکتا ہے تیرا اندازہ درست ہی ہو، تو یوں کر، باہر نکل جا یہاں سے اور دُور دُور سے نگرانی کرتا رہ اس مکان کی۔ اگر وہ شیروانی اکیلا آتا ہے تو ٹھیک ہے اور اگر باقاعدہ فوج لے کر آئے تو سالے کے حرص بھرے سینے میں گولیاں اتار دینا۔ ایسے لوگ رعایت کے مستحق بالکل بھی نہیں ہوتے ہیں۔ ریوالور تو ہے نا تیرے پاس؟" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں، ریوالور تو ہر دم ساتھ رکھتا ہوں میں۔ تم لوگ بھی ہوشیار رہنا۔ آ بھئی گل زمان تو بھی چل میرے ساتھ۔" آبی اٹھتے ہوئے بولا۔

گل زمان اُٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد انور کمال بولا: "یہ اچھا کیا آپ نے ان دونوں کو باہر بھیج دیا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو یہ ہماری مدد کر سکیں گے اب۔ کسی پولیس والے کے جھنٹ میں گھستے ہوئے احتیاط بہرحال لازم ہے۔"

مسز شیروانی ایک بار پھر واپس آ گئی۔ وہ اندر گھستے ہی آبی اور گل زمان کو نہ پا کر بولی: "ارے، یہ آپ کے دو ساتھی اور کہاں چلے گئے؟"

میں نے کہا: "انھیں ایک اور ضروری کام سے بھیج دیا ہے میں نے۔ یہاں دیر ہو جانے کی صورت میں وہ کام نہیں ہو سکتا تھا...۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں کو شیروانی سے صرف بات ہی تو کرنا ہے اپنے معاملے کی۔ اس کے لیے تو دو آدمی بھی زیادہ ہیں۔" وہ بولی۔

انور کمال نے کہا: "اگر آپ کو ہم دو آدمی زیادہ لگ رہے ہیں تو پھر میں بھی واپس چلا جاتا ہوں۔ جیلانی صاحب اکیلے ہی طے کر لیں گے، معاملات کو۔"

وہ شوخ نظروں سے انور کمال کو دیکھتے ہوئے بولی: "ایک تو آپ لوگ بُرا بہت جلدی منا جاتے ہیں ہر بات کا۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے آدمی کو۔ دیکھنے میں تو آپ سب ہی بڑے تندرست توانا اور مضبوط لگتے ہیں، پھر یہ مزاج میں اتنی نزاکت کہاں سے آ گئی ہے؟"

میں نے شرارت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا: "ہم نازک مزاج تھے تو نہیں بی بی! لگتا ہے آپ کو دیکھ کر ہم میں نزاکت آ گئی ہے۔"

وہ ایک ادا سے اٹھلا کر بولی: "اللہ مَیں، ہم نہیں بولتے۔ بڑے وہ ہیں آپ۔ چھیڑے ہی چلے جا رہے ہیں۔"

میں اُس کی اس ادا پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ اور بل کھانے لگی۔ میں نے پوچھا: "آپ کو پتا چل گیا کہ میں چھیڑ رہا ہوں آپ کو؟"

وہ شرمیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی: "شیروانی کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنے لگنا۔ وہ بہت شکی مزاج آدمی ہیں۔ پولیس والے ہیں نا۔"

"نہیں جی توبہ کریں، اُن کے سامنے ایسی باتیں کر کے مرنا تو نہیں ہے نا ہمیں۔ ویسے آپ ہیں بہت اچھی، نام کیا ہے آپ کا؟" میں نے تفریح لیتے ہوئے پوچھا۔

"مسرت جبیں ہے میرا نام اور آپ کا کیا نام ہے؟" وہ اپنا نام بتانے کے بعد میرا نام معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"مجھے لوگ ہاشم خان کے نام سے جانتے ہیں، ادھر پنجاب میں چھوٹی موٹی زمین داری ہے اپنی۔" میں نے اُسے بتایا۔

"اچھا تو زمیندار ہیں آپ۔" وہ بے تکلّفی سے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی: "مگر یہ آپ کے ساتھی تو ابھی کچھ اور نام لے رہے تھے آپ کا... کیا... بھلا سا نام تھا... ہاں جیلانی، شاید یہی نام لیا تھا انھوں نے آپ کا، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"نہیں بھئی، غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔ اور یہ جیلانی شیلانی بھی کوئی نام ہوتا ہے۔ میں نے تو ایسا نام سنا ہی نہیں کبھی کسی کا۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ اُلّو بنا رہے ہیں آپ مجھے۔ میری یادداشت اتنی بھی خراب نہیں ہے۔ ابھی انھوں نے کہا تھا، 'میں چلا جاتا ہوں، جیلانی صاحب اکیلے ہی معاملات طے کر لیں گے شیروانی سے۔' کیوں جی، کہا تھا نا آپ نے یہی؟" وہ انور کمال کی طرف رُخ کر کے بولی۔

وہ ہنس کر بولا: "مجھے تو معاف ہی رکھیں بھئی، مجھے نہ ہی گھسیٹیں آپ لوگ اپنے معاملے میں تو اچھا ہے۔"

"ارے، واہ یہ کیا بات ہوئی۔ ایسا ہمارا کون سا معاملہ ہے جس میں ہم گھسیٹ رہے ہیں تمھیں؟ دیکھیں جی ہاشم خان

صاحب! آپ روکیں انھیں، منع کریں ایسی باتیں کرنے سے۔ یہ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ہمارے درمیان کوئی خفیہ معاملہ چل رہا ہو پہلے سے، حالاں کہ آج سے پہلے میں نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی آپ لوگوں کی، نام تک نہیں سُنا تھا۔" وہ انور کمال کی بات کا بُرا مان کر بولی۔

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا: "غلطی تو تمھاری ہی ہے مسرت بیگم یہ۔ تمھیں ان سے کسی بات کی تصدیق کرلنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"یعنی۔۔۔ یعنی آپ بھی ان کی ہی طرف داری کر رہے ہیں اور مجھے۔۔۔" دروازے پر دستک سُن کر بولتے بولتے وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ پھر آگے جُھک کر دھیمی آواز میں بولی: "شیروانی شاید آ گئے ہیں۔ ان کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کرنا اب۔"

وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ آنے والا ایک چھ فٹ کا تنومند شخص تھا۔ میں نے اس کے جسم پر منڈھی ہوئی سرکاری یونیفارم دیکھ کر فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ انسپکٹر شیروانی ہی ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا، پھر فوراً ہی سنبھل کر مُسکراتے ہوئے میری طرف آیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "انسپکٹر شیروانی۔"

میں نے اٹھ کر اس کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "مجھے ہاشم خان کہتے ہیں۔ ایک بہت ہی اہم معاملے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔" "یہ یقین رکھیں، مایوس میں بھی نہیں کروں گا آپ کو۔"

"ضرور، ضرور، آپ حکم کریں جناب! آپ جیسے لوگوں کی خدمت کرکے دلی مسرت حاصل ہوتی ہے مجھے۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر بولا: "حالاں کہ مسرت نے میرے گھر میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے کوئی دس سال سے۔ بہرحال آپ فرمائیں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اس کی بیوی اس کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکراتے ہوئے کچن کی طرف چل دی اور بولی: "آپ لوگ باتیں کریں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"ارے، تم نے ہاشم خاں صاحب کو اب تک چائے بھی نہیں پلائی ہے۔ جاؤ جلدی سے لے کر آؤ جا کر۔" انسپکٹر شیروانی نے بیوی سے کہا۔

"بس آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی ایک منٹ میں لے کر آتی ہوں میں۔" اُس نے مسرور لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

میں نے انسپکٹر شیروانی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا: "انسپکٹر صاحب! میں جس کام کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں وہ میرے یا کسی اور کے لیے کتنا ہی مشکل اور اہم ہو لیکن آپ کے لیے بہت آسان ہے مگر ہم آپ کو اس کا بہت ہی مناسب اور معقول معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کام بھی تو بتائیں مجھے۔ میرے علاقے میں منشیات کا کاروبار تو نہیں کرنا چاہتے ہیں آپ لوگ؟" وہ بولا۔

"نہیں جی توبہ کریں، ایسے ذلیل کام کے بارے میں تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کبھی۔ ہمیں تو ایک آدمی کو حوالات سے نکلوانا ہے بس۔" میں نے کہا۔

"اوہ، اچھا، کون ہے وہ؟ اگر پرچہ نہیں کٹا ہے اس کا تو میں کوشش کردوں گا، ہو سکتا ہے کام ہو ہی جائے تمھارا۔"

"وہ جی شرافت علی نام ہے اُس کا۔ صبح تین ساڑھے تین بجے ہی اٹھا کر لائے ہیں آپ اُسے۔ یقین کریں، وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

وہ شرافت کا نام سُن کر ایک دم چونک پڑا تھا۔ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا: "تمھارا کیا تعلق ہے شرافت علی کے ساتھ؟"

"دوست ہے جی وہ ہمارا بس، اس کے سوا اور کیا تعلق ہونا ہے اس کے ساتھ ہمارا۔ بہت اچھا آدمی ہے جی وہ، پتا نہیں کیوں پکڑ لیا ہے پولیس نے اُسے۔ شہر کے خوش حال اور معزز لوگوں میں شمار ہوتا ہے اس کا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"ہوں، جانتا ہوں اس کے بارے میں سب کچھ۔ وہ کتنا معزز اور اچھا آدمی ہے، یہ بھی خبر ہے مجھے۔" وہ تلخی سے بولا: "اور تم جو اس کی رہائی کے لیے بھاگے چلے آئے ہو یہاں، اس کے دوست ہو تو اس کے کالے کاروبار کے بارے میں بھی ضرور جانتے ہوگے!"

"یہی تو غلط فہمی ہے آپ لوگوں کو اس کے بارے میں۔ کبھی کرتا تھا وہ کالے دھندے لیکن اب تو اُس نے سب کچھ چھوڑ رکھا ہے بہت دنوں سے۔ اب تو وہ تائب ہو چکا ہے جی غلط قسم کے کاموں سے۔ اپنے رب سے معافی مانگ لی ہے اُس نے تو آپ بھی معافی دے دیں جناب اُسے۔"

"ٹھیک ہے آپ بیٹھیں، میں کپڑے بدل لوں ذرا پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔" وہ اُٹھ کر برابر والے کمرے میں چلا گیا۔

انور کمال میرے قریب ہو کر سرگوشی میں بولا: "کپڑے تبدیل کرنے کا تو صرف بہانہ کیا ہے اس نے۔ اُدھر سے اس کی بیوی نے اشارہ کرکے بلایا ہے اُسے۔"

"اچھا، مجھے بھی شبہ ہوا تھا کہ کسی کے بلانے پر ہی یوں اچانک اٹھا ہے یہ۔ ٹھیک ہے تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں معاملہ کیا ہے۔"

میں اٹھ کر دبے پاؤں اُس دروازے تک جا پہنچا جس کے پیچھے شیروانی غائب ہوا تھا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ایک پٹ تو پوری طرح بند تھا مگر دوسرا کوئی چار انچ کے قریب کُھلا ہوا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ دوسری طرف اُس کی بیوی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی: "لگتے تو مجھے یہ بھی مشکوک ہی لوگ ہیں مگر وہ ہاشم خان ایک لاکھ روپے دینے کو کہہ رہا تھا اس کام کے۔ تم کچھ زیادہ ہی مانگنا اس سے۔ دس بیس ہزار کی بات کرکے اتنی بڑی رقم نہ گنوا دینا، سمجھے۔"

"تم نے ایسا ہی کم عقل سمجھا ہے مجھے؟ پتا ہے تمھیں یہ ہاشم خان کون ہے جسے تم نے اتنے اطمینان سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہوا ہے؟ پولیس کو اگر خبر ہو جائے تو پورے لیاقت آباد کو گھیر لے گی وہ آ کر۔" انسپکٹر شیروانی نے کہا۔

وہ گدھا مجھے پہچان چکا تھا۔ شاید پہلی ہی نظر میں وہ جان گیا تھا کہ اُس کی بیوی نے کس کو اپنے ڈرائنگ روم میں جگہ دے دی ہے۔ وہ جو اندر گھستے ہی ٹھٹکا تھا مجھے دیکھ کر تو اس کی وجہ یہی تھی، مگر میں سمجھا تھا کہ وہ اجنبی اور ناآشنا چہرے دیکھ کر ٹھٹکا ہے۔ وہ بہت ہی ذہین پولیس انسپکٹر تھا۔ اُس کی یادداشت بھی بہت تیز تھی۔ میں پوری توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا، کیوں کہ اب میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا تھا کہ مجھے پہچان لینے کے بعد کہیں وہ میرے خلاف کوئی کارروائی تو نہیں کرنا چاہتا ہے۔

شیروانی کی بات سن کر اُس کی بیوی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا: "ہائے اللہ! کون ہے یہ؟ کیا کوئی بہت ہی خطرناک قسم کا آدمی ہے؟ بتائیں نا کون ہے۔ آپ نے تو دل دہلا کر رکھ دیا ہے میرا۔"

"آہستہ بولو، اس کے اگر بھنک بھی پڑ گئی کانوں میں کہ میں سے پہچان چکا ہوں تو ہم دونوں کو جان سے مار دے گا وہ۔ بہت ہی خطرناک مجرم ہے۔ سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا ہے اس کو۔ اور کال کوٹھری سے جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے۔ سارے ملک کی پولیس تلاش میں ہے اس کی۔ پچاس ہزار روپے انعام مقرر ہے اسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر۔ سمجھیں؟ غلام جیلانی نام ہے اس کا۔"

"اُف اللہ! اور میں نے اسے خود ہی اپنے گھر میں گھسیڑ لیا ہے۔ مگر یہ تو اپنا نام ہاشم خان بتاتا ہے اور پنجاب کا زمیندار بتاتا ہے خود کو۔"

"اور تو کیا تمھارے خیال میں یہ بتاتا پھرے دنیا کو کہ وہ پولیس کو مطلوب مجرم غلام جیلانی ہے؟" شیروانی چڑ کر بولا تھا۔

"حیرت ہے، یہ شرافت بھائی نے ایسے خطرناک لوگوں سے دوستی کر رکھی ہے۔ میری مانیں تو چھوڑ دیں انھیں۔ اس غلام جیلانی سے ایک لاکھ روپے مل رہے ہیں ابھی تو۔ انکار کی صورت میں پتا نہیں کیا کر گزرے وہ ہمارے ساتھ۔" مسرت جبیں نے شوہر کو مشورہ دیا۔

"بے وقوفی کی باتیں نہیں کرو۔ شرافت بھائی کے خلاف میں پہلے ہی ایسا کیس بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو انھیں پھانسی کے تختے تک لے جا سکے۔ اب اس غلام جیلانی سے اُن کا تعلق ظاہر ہونے کے بعد میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔" شیروانی بولا۔

"ہائے اللہ! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ آخر ہمیں کوئی دشمنی تو نہیں ہے اُن سے۔ بے چارے پہلے ہی برباد ہو چکے ہیں۔"

"بے وقوف عورت! حرام کی کمائی کا بہت سا مال جمع ہے اُن کے پاس اور مجھ سے زیادہ قریبی اُن کا کوئی عزیز نہیں ہے دُنیا میں۔ اگر انھیں پھانسی ہو گئی تو اُن کی کروڑوں کی جائداد اور روپیہ پیسہ سب کچھ ہمارا ہو جائے گا۔ یہ جو ایک لاکھ روپیہ غلام جیلانی دے رہا ہے ہمیں، اُس دولت کے سامنے اس روپے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار کا انعام، ترقی اور تعریفی سند مجھے غلام جیلانی کو گرفتار کرنے کے صلے میں ملے گی۔ تم جا کر چائے وغیرہ لگاؤ اُن کے سامنے، میں اتنی دیر میں گارد طلب کرکے اس کی گرفتاری کا انتظام کرتا ہوں۔ خبردار! اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہم نے اُسے پہچان لیا ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔"

"نہیں، اب میں اُس کے سامنے نہیں جا سکوں گی۔ دل ہول رہا ہے میرا اُس کے سامنے جانے کے تصور سے ہی۔" مسرت جبیں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں، ہمت سے کام لو۔ دس پندرہ منٹ کی بات ہے۔ تھانے سے جیسے ہی پولیس کے جوان پہنچیں گے ہم اُسے پکڑ لیں گے۔"

"مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں لالچ نہیں کریں زیادہ، وہ ایک لاکھ روپے تو دے ہی رہا ہے، بہت ہیں وہی ہمارے لیے۔"

انسپکٹر شیروانی نے غصّے سے کہا: "بکواس نہیں کرو بزدل عورت! میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو بس۔ جاؤ یہاں سے۔ مجھے فون کرنے دو۔"

اس کی طمع نے اُسے اندھا کر دیا تھا اور ایک لاکھ روپیہ اُسے بے حقیقت لگ رہا تھا اس گھڑی۔ میں نے دیکھا کہ

وہ کسی طرح ماننے والا نہیں اور تھانے ٹیلی فون کرکے مجھے گرفتار کرنے کا انتظام کرنے پر ہی تُلا ہوا ہے تو میں نے اپنا چپ شاہ نکال کر ہاتھ میں لیا اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر اُن کے سامنے جا پہنچا۔ اندر جاتے ہی میں نے گرج کر کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا وقت اور حالات کے ساتھ چلنے کی تجھ میں بڑی صلاحیت ہے مگر تُو تو بالکل اُلّو کا پٹھا ہے یار! تجھ سے تو یہ تیری بیوی زیادہ سمجھ دار لگی ہے مجھے۔"

وہ دونوں یُوں اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گئے ایک دم۔ اُس کی بیوی مسرّت جیسیں میرے ہاتھ میں تنا ہوا ریوالور دیکھ کر ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی اور یُوں تھر تھر کانپنے لگی جیسے لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو اُسے۔ شیروانی کی رنگت میں بھی زردی گھنڈ گئی تھی مگر وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا، اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا اُس نے۔ وہ مجھ پر اپنی کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ایک پولیس افسر پر ریوالور تان کر تم قانون شکنی کے مرتکب ہو رہے ہو۔"

میں نے اُس کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ رسید کرکے کہا۔ "چُپ کراوئے قانون کے بچّے۔ میں جانتا ہوں تجھے اور تیرے قانون کو اچھی طرح سے۔ اب زندگی چاہتا ہے اپنی اور اپنی اس نصف بہتر کی تو میں جیسا کہتا ہوں ویسا ہی کرتا رہ خاموشی کے ساتھ۔"

"میں کہہ رہا ہوں تم سے، پچھتاؤ گے تم۔ ایک پولیس افسر کے ساتھ اس طرح کا سلوک بہت مہنگا پڑے گا تمھیں۔" وہ گال سہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے انور کمال کو آواز دے کر بُلایا اور اُس سے کہا۔ "باہر جا کر دیکھ یار! وہ آبی دکھائی دے کہیں تو ذرا بُلا لے اُس کو۔ یہ یُوں نہیں مانے گا۔"

انور کمال کے جانے کے بعد میں نے شیروانی سے کہا۔ "ایک بات تیرے گوش گزار کر دوں شیروانی! یہ جو اسلم آبی ہے نا، یہ بڑا جلّاد صفت آدمی ہے۔ رعایت مروّت تو کرتا ہی نہیں ہے کسی سے بھی، اور پولیس والوں سے تو لگتا ہے اُس کی کوئی خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ بڑے پُولیسیے مارے ہیں اُس نے۔ ابھی میری بات مان لو تو ٹھیک، ورنہ اُس کے آنے کے بعد تمھاری سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکوں گا میں۔"

ہر زر پرست کی طرح بزدلی اس کے بھی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ حرام اور حلال کی تمیز کیے بغیر دولت کے پیچھے دوڑنے والے موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُن کی جمع کی ہوئی دولت اُن کے ساتھ نہیں جا سکتی لہٰذا وہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ دن رہ کر دولت سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہتے ہیں، جی بھر کے دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا دل کبھی بھرتا ہی نہیں ہے۔ شیروانی پر میری دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے اس وقت میں تمھارے قبضے میں ہوں جو تم کہو گے کر دوں گا لیکن اس کے بعد جب میں تمھارے اختیار میں نہیں رہوں گا اُس وقت کے بارے میں بھی سوچ لو۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ تم لوگوں سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے یہ میں خوب جانتا ہوں، میرے لیے یہ کوئی نیا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اُسی لمحے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر آبی گھس آیا وہاں۔ اُس کے ساتھ گل زمان اور انور کمال بھی تھے۔ "کیا بات ہے بھئی جیلانی! کیا تیری بات سمجھ نہیں آ سکی ہے اس وردی پوش کے؟ اگر اس کی عقل زیادہ ہی موٹی ہے تو میرے حوالے کر دے اس کو، ابھی سمجھ جائے گا سب کچھ۔"

میں نے کہا۔ "نہیں یار! اب ایسا بھی کُند ذہن نہ سمجھ اسے۔ تھوڑی بہت تو پہچان ہے اسے ہَوا کے رُخ کی۔ لگتا ہے کسی ہم جیسے سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے اس کا، اور زبان کو اس کی ڈرانے دھمکانے کی عادت میں خاصی پختگی حاصل ہو چکی ہے پھر بھی راہِ راست پر آ گیا ہے یہ۔"

"اچھا تو یہ راضی ہو گیا ہے شرافت علی کو چھوڑ دینے کے لیے؟ یہ تو بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے اِس نے۔" آبی بولا۔

میں نے انور کمال اور گل زمان سے کہا۔ "تم دونوں ذرا باہر کا خیال رکھو ہم اِن شیروانی صاحب کو..." میں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ وہ دونوں میری بات کا مطلب سمجھ کر فوراً باہر چلے گئے۔ میں نے شیروانی سے کہا۔ "ہاں بھئی، تو اب ٹیلی فون ابھی کر تھانے کا نمبر ڈائل کر و لینے اور ماتحت عملے سے کہو کہ شرافت علی صاحب کو باعزت طور پر آزاد کر دیا جائے۔ یہ حکامِ بالا کا حکم ہے۔"

"یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ پورے عملے کو پتا ہے کہ ہم نے اوپر کے احکامات کی تعمیل میں ہی اُسے پکڑا ہے۔ اگر اعلیٰ افسران کی مرضی نہیں ہوتی تو اتنے با اثر اور معزز شخص پر ہاتھ ڈالنا تو مجھ جیسے کے بس کی بات تو نہیں تھی۔" شیروانی نے بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سے اعلیٰ افسران کی مرضی شامل ہے اس کارروائی میں جناب شیروانی صاحب! کچھ بتانا پسند فرمائیں گے آپ؟" آبی طنز سے بولا۔

"وہ جی، ہم سے اوپر آفیسر ہیں، اُن کی بات کر رہا ہوں دیکھیں ہم تو حکم کے غلام ہیں بس، ہماری مرضی تو نہیں چلتی ہے نا۔" وہ بولا۔

چٹاخ کی آواز کے ساتھ میرا ایک اور اُلٹا ہاتھ اُس کے مُنہ پر پڑا۔ "تو سپھر بکنے لگا ہے، سبق پڑھانے کی کوشش کر رہا ہے ہمیں۔ اٹھا ریسیور اور ٹیلی فون کرکے کہہ اپنے عملے کو شرافت علی کو چھوڑنے کے لیے، نہیں تو مار مار کر ادھ موا کر دوں گا سالے کو۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ خود اُس نے ہی شرافت علی کی جائیداد ہتھیانے کے لیے کوئی چکّر چلایا تھا یہ تو میں سُن ہی چکا تھا اس کے مُنہ سے کہ وہ شرافت علی کی دولت اور جائیداد پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ اس کے اوپر آئی جی کا کوئی آدمی یونیفارم پہنے بیٹھا ہوا اور اُس نے آئی جی کے اشارے پر شرافت علی کو کسی کیس میں پھانسنے کے لیے شیروانی کو استعمال کر لیا ہو یا اس کے کسی افسر کے نام سے اُسے فون کرکے ایسا کرنے کو کہا ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن فی الحال شرافت علی کو چھوڑنے کا اختیار شیروانی کے پاس تھا، اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے اس اختیار کو استعمال کرے۔

اس بار میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زوردار پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رِسنے لگا تھا۔ وہ دوسروں کو اسی طرح ذلیل کرتا اور چھتر ڈالتا آیا تھا۔ خود اُسے ایسی ذلّت کا سامنا آج پہلی بار ہی کرنا پڑ رہا تھا لہٰذا اس کی کھوپڑی بار بار سُلگ اٹھتی تھی جسے وہ بڑی مشکل سے قابو کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سے خون پونچھتے ہوئے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور ماتھے پر بَل ڈال کر میری طرف لپکا۔ آبی نے تیزی سے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ پھنسا دی۔ میں اُچھل کے ایک طرف ہو گیا اور شیروانی پورے زور سے اوندھے مُنہ فرش پر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی دوڑ کر اس کے پاس پہنچی اور اس کا سر اٹھا کر اُسے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے رحم کرو ہم پر ظالمو! کیوں ظلم کر رہے ہو ان پر۔ کیا بگاڑا ہے انھوں نے تمھارا؟" اس کی آنکھوں سے دریا رواں تھا۔

آبی تلخی سے بولا۔ "اب پتا چلا ہے تجھے کہ یہ ظلم ہوتا ہے۔ جب یہ بے گناہوں کو مار مار کر کسی ناکردہ گناہ کو قبول کر لینے پر مجبور کرتا ہے اس وقت تجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ یہ ظلم کر رہا ہے غریب لوگوں پر۔ اور شرافت علی کے ساتھ جو کیا ہے اِس نے، کیا وہ ظلم نہیں ہے؟"

اُس نے روتے ہوئے شیروانی سے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ کیوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ فون کرکے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ چھوڑ دیں انھیں۔"

شیروانی کو بھی اب عقل آ گئی تھی اور اُس نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ ہے نہیں اس کے پاس۔ لہٰذا وہ اٹھا اور کسی کی طرف نظر اٹھائے بغیر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ "میں شیروانی بول رہا ہوں حوالدار! رات ہم نے شرافت علی نامی جس شخص کو پکڑ کر لاک اَپ میں بند کیا تھا، اُسے چھوڑ دو۔"

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد دوبارہ بولا۔ "ہاں، ہاں، یار ٹھیک ہے، تم جانے دو اُسے، مجبوری ہے ابھی، ہم اُسے نہیں روک سکتے، پھر دیکھیں گے۔ فی الحال وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور..."

میں نے آگے بڑھ کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیروانی چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس سے کہو، شرافت علی کو لاک اَپ سے نکال کر یہاں لائے، میں اس سے بات کروں گا۔"

میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق کہا۔ "ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا شرافت علی کو لاک اَپ سے نکال کر ٹیلی فون کے پاس لے آؤ، میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک یا ڈیڑھ منٹ کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "ہاں ریسیور دو انھیں..." دوسری طرف سے شاید اُسے شرافت علی کے آنے کی خبر دی گئی تھی۔ پھر شرافت علی کے مخاطب کرنے پر اُس نے کہا۔ "شرافت بھائی! یہ لیں اپنے دوست سے بات کر لیں۔"

اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ریسیور لے کر پوچھا۔ "ہیلو کون شرافت علی؟"

دوسری طرف سے شرافت کی آواز سنائی دی۔ "ہاں، اور یہ تم ہو کیا جی..."

میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کیا کر رہے ہو، پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر میرا نام لینے کی حماقت نہ کرنا۔"

"اوہ، مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ تم کہو کیا بات ہے؟ کوئی خاص وجہ ہے یہاں فون کرنے کی؟" اس نے سنبھل کر پوچھا۔

"میں نے تمھارے اس حریص اور حرام خور رشتے دار شیروانی کو مجبور کرکے تمھاری آزادی کا انتظام کر دیا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر مجھے فون پر بتاؤ کہ تم خیریت کے ساتھ پہنچ گئے ہو اور اُن لوگوں نے کوئی چال تو نہیں چلی ہے ہمارے ساتھ۔ میں اس وقت تک یہیں بیٹھا ہوں اس شیروانی کے سر پر، اس کے گھر میں۔ یہ ٹیلی فون نمبر لکھ لو اس کا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں میرے پیاروں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔" وہ بولا۔

"اوہ، ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا یار! ٹھیک ہے تم پہلے ان کا انتظام کر دو۔ میں آج دن بھر اس کو گھر سے نہیں نکلنے دوں گا۔ یہیں سر پر بیٹھا رہوں گا اس کے۔ تم فارغ ہو کر ماں جی کے پاس پہنچ جانا اور پھر فون کر دینا مجھے۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"وہ سب بھی تو پولیس کی ہی تحویل میں ہیں۔ پوسٹ مارٹم کے بغیر ان کی لاشیں مجھے کیسے مل سکیں گی۔ پتا نہیں کب تک ملیں گی وہ۔" وہ بولا۔

"اچھا ایک منٹ ہولڈ آن کرو۔" میں نے اس سے کہہ کر شیروانی کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "شرافت علی کے بیوی بچوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ وہ کب تک واپس ملیں گی اسے؟"

"یہ تو مجھے پتا نہیں۔ اسپتال والے ہی بتا سکتے ہیں اس سلسلے میں تو۔" اُس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات کان کھول کر سن لو کہ جب تک وہ لاشیں شرافت علی کو نہیں مل جاتیں اور ان کی تدفین نہیں ہو جاتی، تمھیں مجھ سے نجات نہیں مل سکے گی۔ لہٰذا اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو وہ لاشیں جلد از جلد شرافت علی کو دلوانے کا بندوبست کر دو۔" میں نے اُس سے کہا۔

"اور کوئی گڑبڑ بالکل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ تم جانتے ہو نا، بندے مارنا ہمارے لیے ایسا ہی ہے جیسے مکھی مچھر مار دینا۔" آبی نے مزید کہا۔ "یہ بات بھی بھولنے والی نہیں ہے کہ ہماری آزادی سلب کرنے کی حسرت تم جیسے پتا نہیں کتنے لیے سینوں میں لیے پھر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو ان سب میں ممتاز کرنے کا خیال اگر کبھی آئے تمھارے دل میں تو اُن کے انجام کو ضرور یاد کر لینا جو اسی کوشش میں پیوندِ زمین ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر خودکشی کرنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ جیل ابھی تک تم ایسی نہیں بنا سکے ہو جو ہمیں زیادہ دن برداشت کر سکے اپنی چار دیواری کے اندر۔ اس کی گواہی تمھیں اپنی فائلوں سے بھی مل جائے گی۔"

یہ شاید شیروانی کی زندگی کا سب سے بُرا دن تھا۔ اس کی بیوی مسرت جبیں کی تو پہلے ہی حالت خراب ہو رہی تھی۔ آبی کی اس تنبیہ کے بعد وہ شیروانی بھی کانپ اٹھا تھا۔ آبی کا لہجہ اور انداز تھا ہی ایسا جان لیوا۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے ہمیں کوئی جواب دینے کے بجائے مُردہ دلی کے ساتھ ایک بار پھر ٹیلی فون اٹھانے کے لیے ہاتھ ... نے آگے بڑھ کے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"اُسے واپس رکھ دے بچے! کہیں کسی کو بھی ٹیلی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ... وہ میں... تھانے میں فون کر رہا تھا... کہنے کے لیے کہ لاشیں جلد از جلد دے دی جائیں شرافت ...۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ کام ٹیلی فون پر کرنے کا نہیں۔ تم خود جاؤ گے اور ہمارا ایک آدمی تمھارے ساتھ جائے گا۔ اگر تم نے کوئی ... کی تو تمھیں وہیں گولی مار دے گا وہ۔ لہٰذا باہر جانے کے بعد سمجھ لینا کہ ہماری دسترس سے آزاد ہو گئے ہو تم۔" میں نے ... سے کہا۔

میری بات سن کر اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی ... ہونے لگی۔ وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں، نہیں، تم مطمئن رہو۔ تم ... شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

میں نے آبی سے کہا۔ "آبی! ان دونوں کو بُلا یار! ان ... بھی سمجھا دوں، یہ شیروانی صاحب تو بہت ہی بھلے آدمی ... ہوئے ہیں، بہت جلدی سمجھ لیا ہے انھوں نے حالات ... مجھے یقین ہے یہ ہم سے بھرپور تعاون کریں گے۔ لہٰذا ان کے ... کوئی زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔"

آبی پلٹ کر باہر چلا گیا۔ شیروانی عاجزی سے بولا۔ "تم ... رہو، میں وعدہ کر رہا ہوں تم سے، بالکل ویسا ہی کروں گا جیسا ...۔"

اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا، اور اس کا ذہن بھی ... سے کام کرنے لگا تھا۔ شاید اس سمے تو اس کا ذہن کچھ زیادہ تیزی ... کام کر رہا تھا۔ اُس کے اس عاجزانہ انداز میں مجھے خباثت کی ... دکھائی دے رہی تھی۔ وہ باہر جانے کے بعد کوئی ذلالت ... کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ شاید وہ مجھے بہت ہی احمق ... رہا تھا۔ آبی، انور کمال اور گل زمان کو بُلا کر لے آیا۔ میں نے ... سے کہا۔ "تم ان کے ساتھ چلے جاؤ اور جب یہ شرافت ... اور اس کی بیوی کی لاشیں اُس کے حوالے کر دیں تو انھیں ساتھ ... کر یہاں آ جانا۔ میں اور آبی اُس وقت تک یہاں ان کی نصف ... کی دلجوئی کرتے رہیں گے۔ ہاں آنکھیں اور کان ذرا کھلے ... اگر اس کے دماغ میں کوئی کیڑا کلبلائے اور یہ کوئی چال چلنے ... کرے تو تم اسے گولی مارنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ ... تم ہمیں ٹیلی فون پر خبر کر دینا۔ ہم اس کی نصف بہتر کو بھی فوراً ... پاس دوسری دنیا میں بھیج دیں گے۔ کیوں کہ مجھے لگتا ہے ... دوسرے کے بغیر ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکے ... ٹھیک اندازہ لگایا ہے نا میں نے شیروانی صاحب؟ آپ ... دلی جذبات کے بارے میں ...؟" میں نے شیروانی کو ...

... سے پوچھا۔

میری ہدایات سن کر اُس کے چہرے پر ایک بار پھر زردی ... رہی تھی۔ میں اُس کے اندازوں پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا ... کہ میں ایسا ہی پاگل کا پتر ہوں کہ اُسے باہر جا کر اپنے اور شرافت علی ... کے خلاف بدمعاشی کرنے کا آسانی کے ساتھ موقع فراہم کر دوں گا۔ ... میں نے انور کمال اور گل زمان کو اس کے ساتھ لگا کر اور اس کی ... بیوی کو یرغمال بنا کر رکھنے کا اعلان کر کے اُس کی اُمیدوں پر پانی پھیر ... دیا تھا۔ وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھ پر اعتبار کریں جیلانی صاحب! میں آپ کے ساتھ دھوکا نہیں کروں گا۔ آپ بالکل مطمئن ہو کر چلے جائیں یہاں سے۔ یہ مسرت بہت ہی نازک مزاج عورت ہے، جب تک آپ یہاں رہیں گے، یوں سمجھیں یہ سُولی پر لٹکی رہے ... رحم کر دیں اس غریب پر۔"

"ہم نے بھی اس کے تکّے بنا کر نوشِ جاں نہیں کرنے۔ تم بالکل مطمئن رہو۔ جب تک ہم کو تمھاری کسی بدمعاشی کی اطلاع نہیں ملے گی اسے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچ سکے گا ہم سے۔ اب دیکھنا ہے کہ تم خود اپنی بیوی کو کتنا چاہتے ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

شیروانی کی بیوی مُنہ بسورتے ہوئے بولی۔ "شیروانی! خدا کے لیے کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا۔ جیسا یہ لوگ چاہتے ہیں ویسا ہی کرنا۔"

اُس نے بے بسی سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم گھبرانا مت مسرت! میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ ویسے یہ اچھا نہیں کیا ہے ان لوگوں نے۔ قانون کے ہاتھوں سے زیادہ دن بچے نہیں رہ سکیں گے یہ۔ اور یہ شرافت بھائی، رشتہ کیا ہے آخر ان کا؟"

"تم جیسے بے ضمیر لوگوں کو اس کی فکر نہیں کرنا چاہیے شیروانی! رشتے ناتے تمھاری طرح وقت پر دغا دے جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ شرافت علی سے ہمارا ایسا کوئی رشتہ نہیں جو ہمیں اس کی جان لینے پر آمادہ کر سکے۔ تم جاؤ ان لوگوں کے ساتھ اور جو کچھ تم سے کہا گیا ہے اس پر عمل کرو۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو بالکل۔" ... نے اُسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے مسرت جبیں سے کہا۔ "ہم ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ تم بھی چائے کے ساتھ کھانے کے لیے کچھ لے کر آ جاؤ اُدھر ہی۔ گھبراؤ نہیں، ہم نے وعدہ کیا ہے جب تک ہمارے لیے شیروانی کوئی خطرہ پیدا نہیں کرے گا، ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

اُس نے اداس نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر خاموشی سے مڑ کر بوجھل قدموں سے چلتی کچن کی طرف چلی گئی۔ آبی بولا۔ "ابے جیلانی! یہ کیا کیا ہے تُو نے؟ اُس کو تو ایک لمحے کو بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے اور اس کے ہاتھ سے کھانا پینا تو کچھ چاہیے ہی نہیں۔"

"کیوں، کیا تیرا خیال ہے یہ ہمیں کچھ کھلا دے گی؟ کوئی ایسی ویسی چیز جس سے ہماری موت واقع ہو جائے یا ہم بے ہوش ہو جائیں؟"

"ہاں، ایک پولیس افسر کی بیوی ہے وہ، کچھ بھی کر سکتی ہے۔ پچاس ہزار کا انعام اُسے کچھ بھی کرنے پر اُکسا سکتا ہے۔" آبی بولا۔

"ہاں یار! کہتا تو ٹھیک ہی ہے تُو، یہ زن اور شوہر دونوں ہی لالچی ہیں، ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے بالکل بھی۔ تو اس کے پیچھے کچن میں جا کر دیکھ وہ کر کیا رہی ہے۔ کوئی گڑبڑ کرے تو گردن دبا دینا اس زہر کی پڑیا کی۔" میں نے آبی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

آبی فوراً ہی دبے پاؤں کچن میں داخل ہو گیا۔ میں اُن کے ڈرائنگ روم میں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا اس کے۔ پانچ منٹ کے بعد ہی آبی چائے کی کیتلی اور دو کپ اُٹھائے وہاں آ گیا۔ اُس کے پیچھے ہی مسرت جبیں ایک ٹرے اٹھائے ہوئے آئی تھی جس میں دو پلیٹوں میں کچھ میٹھے اور نمکین بسکٹ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے آبی سے پوچھا۔ "کیوں بھئی آبی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہے نا۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں دیکھی نا تُو نے؟"

"نہیں یار! کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے، سب ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ یہ خاتون تو ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہے یار! وہ شیروانی بڑا خوش نصیب لگ رہا ہے مجھے۔ اُسے خدا نے ایسی بیوی عطا کر دی ہے۔" وہ چائے کی کیتلی اور کپ میرے سامنے رکھی میز پر سجاتے ہوئے بولا۔

مسرت بسکٹوں کی پلیٹیں میز پر رکھ کر واپس جانے لگی۔ میں نے اُسے آواز دے کر کہا۔ "تم کہاں جا رہی ہو بی بی! تم بھی تو آؤ نا۔"

وہ میری طرف مڑ کر دیکھے بغیر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ لوگ کھائیں پئیں، میرا جی نہیں چاہ رہا ہے اس وقت۔"

"وہ تو ہمیں بھی پتا ہے۔ جی تو نہیں چاہ رہا ہوگا تمھارا، لیکن مجبوری ہے، ہمارے ساتھ تو بیٹھنا ہی پڑے گا تم کو۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔

اُس نے پلٹ کر میری طرف یوں دیکھا جیسے میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنے کے بجائے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کر دیا۔

اُس نے ایک لمحے کچھ سوچا، پھر واپس آکر سر جھکائے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

دو گھنٹے کے بعد انور کمال اور گل زمان، شیروانی کو ساتھ لے کر واپس آگئے۔ انھوں نے بتایا، لاشیں شرافت علی کو واپس کر دی گئی ہیں اور وہ انھیں ساتھ لے کر تکفین و تدفین کا انتظام کرنے چلا گیا ہے۔ آبی بولا "ٹھیک ہے اب اِن دونوں کا کفن دفن بھی کوئی نہ کوئی کر ہی دے گا۔ ہمیں ان دونوں کا کام تمام کر کے رخصت ہو جانا چاہیے اب۔" اور اپنا سائیلنسر لگا ریوالور مسرّت اور شیروانی کی طرف سیدھا کر دیا۔

وہ دونوں بُری طرح گھگیانے اور عاجزی کرنے لگے۔ اُن کی آدھی جان تو آبی کی بات سُن کر ہی نکل گئی تھی۔ میں نے کہا "اوئے آبی! یہ کیا کرتا ہے، انھیں نہ مار، ہم اِن سے وعدہ کر چکے ہیں اِن کی سلامتی کا۔ کیا سوچیں گے یہ کہ کیسے زبان کے کچّے لوگ ہیں یہ۔"

"اوئے سوچنے دے یار! جو اِن کا دل چاہے سوچیں، ہم نے پابندی تو نہیں لگائی ہے نا کسی کی سوچ بچار پر۔ اور وعدہ ہم نے یہی کیا تھا اِن سے کہ شرافت علی کے ساتھ کوئی دھوکے بازی نہیں کی اس نے تو اُسے واپسی پر بیوی اس کی سلامت مل جائے گی۔ یہ وعدہ تو پورا کر دیا ہم نے۔"

شیروانی گڑگڑاتے ہوئے بولا "لیکن ہماری جان لے کر تمھیں کیا مل جائے گا؟ کیوں ہماری جان لینا چاہتے ہو تم؟"

"اس لیے میرے بچّے کہ اب ہم ہمیشہ تو یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے، اور یہ یقین ہے کہ ہمارے جاتے ہی تُو پولیس کو لے کر دوبارہ جا پہنچے گا شرافت علی پر۔ تیری نیّت اُس کے مال پر خراب ہو چکی ہے۔ سوئر کا بال پڑ گیا ہے آنکھ میں تیری۔ ہم تو چھوڑ دیں گے تجھے مگر تُو اس غریب کو نہیں چھوڑے گا۔" آبی بولا۔

"آپ لوگوں سے میرا وعدہ ہے، یقین نہ ہو تو چاہے جیسی قسم لے لیں آپ۔ میں اب شرافت بھائی کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔" شیروانی بولا۔

"ہم تیرے وعدے اور قسم پر کیسے اعتبار کر لیں۔ بدنیت آدمی پر تو اعتبار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مارِ آستیں سے کم نہیں ہوتا ہے ایسا شخص اور ہمیں اپنی آستین میں سانپ پالنے کا شوق بالکل نہیں ہے۔ جو آدمی لالچ میں اندھا ہو کر کسی کو اپنی بربادی کا ماتم بھی نہ کرنے دے، اپنے پیاروں کی بے گور و کفن لاشوں پر بین تک نہ کرنے دے، ایسے پتھر سے بھلائی کی اُمید رکھنا عقل مندی نہیں ہے شیروانی! تجھے تو مرنا ہی پڑے گا بچّے۔" آبی نے کہا۔

اس کے بعد اُس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ریوالور کی لبلبی دبا دی۔ گولی سیدھی شیروانی کے سینے میں اس کے دل کے مقام پر جا اُتری تھی۔ وہ گولی لگتے ہی دونوں ہاتھوں سے سینے کو پکڑ کر صوفے سے نیچے گر پڑا۔ اس کی بیوی ہر چیخ مار کر اس کی طرف لپکی تو آبی کی چلائی ہوئی دوسری گولی نے اُسے بھی شیروانی کے اوپر ڈھیر کر دیا۔ میں نے مسرّت جبیں کو گرتے دیکھ کر چونک کے آبی کو دیکھا "یہ کیا کر دیا ہے تُو نے آبی! اس عورت کو کیوں مار دیا تُو نے؟"

وہ بولا "اور کیا اُسے زندہ چھوڑ دینا چاہیے تھا، تاکہ یہ پتا کرتی پھرتی کہ اُس کے شوہر کو کن لوگوں نے مارا ہے؟"

"کیا فرق پڑ جاتا یار اس سے ہماری صحت پر۔ پولیس کے ریکارڈ پر تو ہم قاتل اور ڈاکو کی حیثیت سے موجود ہی ہیں پہلے سے۔"

"ہم پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر پولیس کے فائل میں انور کمال اور گل زمان کے نام بھی شامل ہو جاتے اور وہ شرافت علی بھی ہمارے ساتھی کی حیثیت سے اُن کے ریکارڈ پر آ جاتا۔ یہ ایک ایک بات بتا دیتی کہ ہم نے شیروانی کو مجبور کیا تھا، شرافت علی کو لاک اپ سے رہائی دلانے کے لیے اور ہمارے ساتھ اس کام میں انور کمال اور گل زمان بھی شریک تھے۔ پھر پولیس ان لوگوں کے پیچھے پڑ جاتی، ہمارا شہر میں رہنا مشکل ہو جاتا یار! شرافت کی ساری بات کا کھوج نکال کر وہ کہیں نہ کہیں ہم پر کمندیں ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے۔" آبی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

انور کمال نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا "یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جیلانی بھائی! اپنا کھوج مٹانے کے لیے یہ ضروری تھا۔"

"ٹھیک ہے یار! تم لوگ کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہی کیا اس نے۔ مگر اس عورت کے قتل سے مجھے بہت دُکھ ہوا ہے، ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔"

"ہاں، یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے اس بات سے لیکن مجبوری تھی یہ ہماری۔ کبھی کبھی کرنا پڑتا ہے۔ مصلحت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر ناپسندیدہ کام بھی کرنا پڑتے ہیں۔" انور کمال نے افسردگی سے کہا۔

"اب کیا کریں ہم ان کا؟ میرا مطلب ہے ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا بھی کوئی بندوبست کرنا چاہیے اب۔" گل زمان نے کہا۔

"اتنا وقت کہاں ہے ہمارے پاس یار! تُو تو بس عجیب عجیب باتیں کرنے لگا ہے۔" آبی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم باہر نکل کر کسی پڑوسی کو خبر کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ کچھ نہ کچھ کر دیں گے اِن کے لیے۔ اتنے میں تو بڑی سنگ دل ہو گی یار! آخر تو ایک دن ہمیں بھی مرنا ہے۔ لہٰذا مرنے والوں کے ساتھ ہمدردی ضرور کرنا چاہیے اس کا خیال رکھا کر یار جی!" میں نے کہا۔

عین اُسی لمحے کسی نے بیرونی دروازے پر کوئی چیز زور سے مار کر بلند اور کرخت آواز میں پوچھا "کون ہے اندر، کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

ہم سب چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ آبی نے تیزی سے اپنا چپ شاہ نکال کر آبی کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ کھول کر آنے والے کو اندر آنے کا موقع دے دے۔ "پتا نہیں کون آ گیا ہے اس وقت۔" میں نے انور کمال اور گل زمان سے سرگوشی میں کہا "تم دونوں اُدھر دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ کوئی خطرے والی بات ہو تو مدد کو آجانا۔ لگتا ہے باہر والوں کو یہاں کسی لڑائی کی بُو مل گئی ہے شاید۔"

اُسی وقت باہر سے کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں "دروازہ توڑ دو پہلوان۔ یہ کار یہاں کئی گھنٹے سے کھڑی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے شیروانی صاحب دو آدمیوں کو لے کر اندر گئے تھے، اس کے چند منٹ بعد ہی ہم نے کسی عورت کی چیخ سُنی تھی اندر سے۔"

کسی نے کہا "نہیں بھئی! دروازہ نہ توڑو، پولیس کو خبر کر دو۔ پولیس انسپکٹر کا گھر ہے کوئی مصیبت نہ پڑ جائے گلے میں ہم لوگوں کے۔"

"مولوی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، دو آدمی جا کر پولیس کو لے آئیں۔ وہ خود دیکھ لے گی کہ قصّہ کیا ہے۔ ویسے لگتا یہی ہے، شیروانی نے بیوی کو قتل کروا دیا ہے کرائے کے آدمیوں سے۔" ایک اور آدمی نے پہلے والے کی تائید کرتے ہوئے اپنی رائے بھی دے ڈالی۔

میں نے انور کمال اور گل زمان کو روکتے ہوئے کہا "محلّے کے لوگ ہیں یہ، پولیس نہیں ہے ان کے ساتھ۔ دروازہ کھولو اور اپنے اپنے پستول ہاتھوں میں پکڑ کر باہر نکل چلو۔ ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے یہاں سے۔"

آبی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہی ڈانٹ کر کہا "کون ہو بھئی تم لوگ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کے لیے کیوں جمع ہو یہاں؟"

اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اور اس کی ڈانٹ سُن کر ایک دم جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا وہاں۔ اس دوران ہم لوگ بھی پستول لہراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہاں بیس پچیس آدمی جمع تھے۔ میں نے انھیں دیکھتے ہی کہا "تم لوگ اپنی خیریت چاہتے ہو تو ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

ایک لمحے کے لیے مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ اُبھری اور پھر آہستہ آہستہ وہ لوگ ہمارے سامنے سے اِدھر اُدھر ہٹنے لگے۔ جلد ہی انھوں نے ہمیں اپنی کار تک جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ راستہ ملتے ہی ہم انہیں پستول دکھاتے ہوئے کار تک جا پہنچے پھر وہاں سے نکلتے ہوئے ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اور شیروانی اور اس کی بیوی کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ بھی آپ ہی آپ حل ہو گیا تھا۔

شرافت علی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اُس کے ہونٹ مُسکرانا تو جیسے بھول ہی گئے تھے۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک دکھائی دیتا تھا لیکن وہ پہلے جیسا جوش، ولولہ اور بزلہ سنجی اس میں بالکل نہیں رہی تھی۔ دل اس کا بُجھ کر رہ گیا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھ کر بھی اس کی زبان سے ہوں ہاں اور اچھّا کے سوا کچھ نہیں نکلتا تھا۔ سب ہی لوگ اس کی دلجوئی کر کے اس کے دل سے غم کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مگر کوئی بربادی جیسی بربادی تھی جسے وہ آسانی سے بھول جاتا۔ اس کا سارا خاندان ختم ہو گیا تھا ایک ہی رات میں۔ دو جوان بیٹے، دو بیٹیاں، بڑے بیٹے کے دو پھول سے نازک اندام بچّے، بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی ہوئی گھر بھر کی آنکھ کا تارا بہو اور زندگی کی وہ ہم سفر جس نے ہر بُرے بھلے وقت میں اُسے سہارا دیا تھا۔ یہ سب ایک رات میں چھن گئے تھے اس سے۔ اس سنگدل اور بے رحم یہودی نے اس کی خوشیاں اس طرح چھینی تھیں کہ وہ ایک دم سے بالکل تہی دست ہو گیا تھا۔ زندگی بھر کی جدّوجہد اور تگ و دو سے حاصل ہونے والے سارے کے سارے ثمر مٹّی میں مل گئے تھے۔ پوری کی پوری دو نسلیں ختم ہو گئی تھیں، کوئی نام لیوا نہیں رہا تھا اُس کا۔ جس کی دنیا یوں اچانک اُجڑ جائے اُس کے سینے میں اُمنگیں اور جذبے تو سب سے پہلے دم توڑ دیتے ہیں۔ یہ بھی اُسی کی ہمّت اور حوصلہ تھا کہ اتنے عظیم نقصان کے بعد بھی وہ زندہ تھا اور اُس کا دماغ بھی صحیح سلامت تھا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس واقعے کے بعد کم از کم پاگل ضرور ہو گیا ہوتا۔

شرافت علی کی اس حالت نے فاطمہ کو بہت متاثر کیا تھا اور اُس نے قسم اٹھائی کہ جب تک آئزک کو برباد نہیں کر دے گی چین سے نہیں بیٹھے گی۔ چنانچہ تیسرے روز اُس نے مجھ سے کہا "جنابِ عالی! آج رات ہم اُس فیکٹری پر حملہ کر کے دشمن کو شدید نقصان پہنچائیں گے جس کے زیرِ زمین گودام میں بے اندازہ اسلحہ اور منشیات کا ذخیرہ کر رکھا ہے ان لوگوں نے۔ مجھے امید ہے وہاں آئزک بھی موجود ہو گا۔ نہ ہوا تب بھی وہ نقصان اتنا زبردست ہو گا کہ وہ پاگل ہو کر دوڑتا چلا آئے گا

ہمارے سامنے۔"

"یہ کام تو ہمیں فوری طور پر کرنا چاہیے تھا۔ دو دن گزر جانے کے بعد اس کا خیال آیا ہے تمھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ بولی "اس کے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خبر ملی ہے مجھے۔ جس رات میں ماں جی کو نکال کر لائی تھی، اُس رات کی صبح ہوتے ہی انھوں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ جن جن اڈّوں اور اہم مراکز کے بارے میں میں جانتی تھی، وہ سب تبدیل کر دیے تھے آئزک نے۔ تنظیم کے سربراہ کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ اگر اُس کا کوئی آدمی دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے یا باغی ہو کر دشمن سے جا ملے تو اُسے سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ جن معاملات کا اسے علم ہے ان سب میں ردّ و بدل کر دیا جائے تاکہ دشمن اس کی معلومات سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اب یہ اُن کی بدقسمتی ہے کہ میں نے اُن کے درمیان رہتے ہوئے بہت سی ایسی باتوں کا بھی پتا چلا لیا ہے جو آئزک یا اُس کے حواریوں کے خیال کے مطابق میرے علم میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں اُن کے درمیان چھوڑ آئی ہوں جو اب اُن سے باغی ہو کر میرے وفادار بن چکے ہیں۔ لہٰذا اُن کا کوئی راز زیادہ دن مجھ سے راز نہیں رہ سکتا۔ میں چاہ رہی تھی، مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ آئزک کہاں چھپا ہوا ہے تو میں پہلے اس کو اُس کے بِل سے نکال کر شرافت علی کے سامنے لا ڈالتی، مگر افسوس مجھے اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔"

"پھر تم یہ کیسے کہہ رہی ہو کہ وہ وہاں موجود ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے صرف خیال ظاہر کیا ہے اپنا، یقین کے ساتھ تو نہیں کہا ہے یہ۔ البتہ یہ یقین ہے مجھے اس ذخیرے کی تباہی کی خبر ملتے ہی وہ وہاں ضرور پہنچے گا۔ رک نہیں سکے گا اپنی پناہ گاہ میں۔ اس کے علاوہ ایک ایسے مقام کا بھی پتا چلا ہے مجھے جس کی بربادی کے بعد پاکستان میں یہودہ کی ساری کامیابیاں خاک میں مل جائیں گی، تنظیم کی ساری عمارت نیچے بیٹھ جائے گی۔ اس طرح کمر ٹوٹ جائے گی اُن کی، کہ برسوں انھیں سنبھلنے میں لگ جائیں گے۔ اس دوران اگر ہم زندہ رہ گئے تو مکمل طور پر بیخ کنی کر دیں گے ان کی۔ جڑیں اُکھاڑ پھینکیں گے اس تنظیم کی یہاں سے۔"

"اچھا، وہ کیا چیز ہے بھئی، ایسی کون سی جگہ ہے جس کی اتنی اہمیت ہے اس تنظیم کو چلانے کے لیے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہے وہ ایک ایسی ہی جگہ۔ تنظیم کی طاقت کا منبع ہے وہ۔ پہلے یہاں اس آئزک سے نمٹ لیں ہم، اس کے بعد دوسرا ٹارگیٹ وہی ہوگا ہمارا۔ اس کے لیے بڑی زبردست تیاری کرنا پڑے گی ہمیں اور جب تک شرافت علی بھی اس صدمے سے سنبھل جائیں گے۔" اُس نے جواب دیا۔

وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ابھی مجھے اس کے بارے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے بھی اُسے زیادہ مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مجھے اس مہم کے بارے میں بتاتی رہی جو آج رات کو درپیش تھی ہمیں۔ بہت دیر تک ہم اس پر بحث کرتے رہے۔ اس کی ساری نوک پلک درست کرنے کے بعد بالآخر اسے آخری شکل دے کر وہ ٹیلی فون سنبھال کر بیٹھ گئی اور اپنے لوگوں کو اس کی تفصیل بتانے لگی۔ میں اُٹھ کر شرافت علی کے پاس چلا آیا کیوں کہ میں اُسے اس کے بارے میں بتا کر اُسے بھی اس مہم میں شامل کر لینا چاہتا تھا تاکہ اُس کا کچھ دھیان بٹے اور دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ وہاں آبی، آسیہ، فردوسی بیگم، انور کمال اور گل زمان سبھی شرافت علی کو گھیرے بیٹھے تھے اور طرح طرح سے اُس کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت شرافت علی کے چہرے پر بھی رنج نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ ان سب سے ٹھیک ٹھاک انداز میں بات بھی کر رہا تھا۔ میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ جا بیٹھا اور اُن کی گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولا "کیا بات ہے بھئی، یہ محفل کس لیے سجی ہے کچھ بتا تو چلے؟"

آبی بولا "تو کہاں تھا بھئی، وہ تیری لنزی بیگم ڈھونڈ رہی تھی تجھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جا دیکھ جا کر اُسے کیا تکلیف ہے؟"

"اوئے یہ تو اُسے لنزی بیگم کیوں کہتا ہے اب تک، تجھے بتایا نہیں کسی نے کہ اس کا نام فاطمہ ہے؟" میں نے گھورتے ہوئے کہا۔

"بتایا تو ہے مگر یہ زبان جو ہے نا، یہ ابھی عادی نہیں ہوئی، پھسل جاتی ہے کبھی کبھی۔ اس میں گھورنے والی کیا بات ہے؟" وہ بولا۔

"ہے نا آخر پانی کا جانور، ہر دم پانی میں رہنے کے ساتھ ساتھ زبان بھی چکنی ہو کر قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔" ... نے کہا۔

میری بات پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ آبی مجھے غصے سے گھورتے ہوئے کہا "اوئے تیری زبان کیوں قابو ہوگئی ہے اتنی؟" پھر وہ آسیہ کی طرف مڑ کر بولا "آسیہ لے اپنے اس برانوں، ہر ویلے بے عزتی خراب کرنے کی فکر میں رہتا ہے میری یہ۔"

فردوسی بیگم جلدی سے بولی "نہیں بھئی جیلانی! ایسا تو نہ کریں نا آپ، آبی بھائی کی بے عزتی تو نہ خراب کیا کریں۔"

"اوئے تو تو چپ ہی رہ جنتی بیگم! تیری زبان اس سے زیادہ بے لگام ہو چکی ہے۔ میں بتا چکا ہوں تجھے، نام تیرا فردوسی ہے، مگر تو بھی اپنی بے لگام زبان کی وجہ سے جنت میں کبھی نہیں جا سکے گی۔ تو نے ایسے لوگوں کے لیے وہاں کوئی جگہ رکھی ہی نہیں گئی ہے۔"

"آپ کو کچھ پتا بھی ہے، میں نے آپ کی جگہ اپنے نام الاٹ کرانے کے لیے درخواست جو دی ہوئی تھی، وہ منظور ہو چکی ہے، وہ جگہ اب میرے نام الاٹ ہوگئی ہے، لہٰذا مجھے اب فکر نہیں رہی اس کی۔ آپ اپنی فکر کریں اب۔ آپ کا کیا بنے گا وہاں جانے کے بعد؟" فردوسی نے برجستہ کہا۔

اُس کی بات پر شرافت علی بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ بولا "لو بھئی آبی! انھوں نے تمھارے ساتھ بھی ہیرا پھیری کر ڈالی ہے۔ اب کوئی انتظام کر لو اپنے لیے جلدی سے، سُنا ہے پلاٹ ختم ہونے والے ہیں وہاں بھی۔"

آبی مجھے گھورتے ہوئے بولا "اوئے شیطان کی دُم، تو اِدھر کے آ گھسا ہے یہاں۔ اتنے اچھے موڈ میں باتیں کر رہے تھے سب لوگ، سالے نے آتے ہی گند گھول دیا ہے ہر آدمی کے دماغ میں۔ ہر ایک کی زبان زہر اگلنے لگی ہے چند ہی لمحوں میں۔"

"دیکھیں آبی صاحب! سب کو نہ کہیں آپ۔ میں نے تو ایک لفظ بھی نہیں بولا ہے اب تک، نہ آپ کے خلاف نہ حمایت میں۔" انور کمال مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں یو اِین، او کی طرح خاموش تماشائی بنا ہوا ہے تو۔ جس کا پلہ بھاری دیکھے گا، اُس کی حمایت میں بول پڑے گا۔" آبی جھنجلا کر بولا۔

انور کمال ہنستے ہوئے بولا "دیکھیں، دیکھیں آبی بھائی! آپ بڑی زیادتی کر رہے ہیں میرے ساتھ۔"

"ارے نہیں یار! یہ تو محبت ہے آبی بھائی کی، یہ جس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، اس سے لڑتے بھی بہت ہیں۔ دیکھا نہیں تم نے، سب سے پرانی اور گہری دوستی جیلانی بھائی سے ہے ان کی۔ اور ان سے کتنا لڑتے رہتے ہیں یہ۔" گل زمان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"او میاں! تو تو اپنی چونچ بند رکھ یار! مجھ پر لڑائی جھگڑا کرنے کا الزام لگاتا ہے اور سالے جیلانی کو نہیں دیکھتا جو مجھے مذاق بنانے کا کوئی موقع بھی نہیں جانے دیتا ہاتھ سے۔ پکا شیطان کا چیلا ہے، تیر لگا کے آدمی لڑا دیتا ہے۔" آبی پھر مجھ پر پلٹ پڑا۔

ایک دم چیخنے چلانے کی آواز سُن کر ماں جی وہاں آ گئیں۔ بولیں "ارے کیوں لڑ رہے ہو تم لوگ؟ پاگل تو نہیں ہو گئے کیا؟"

آبی جلدی سے بولا "ماں جی آئیں، دیکھیں ذرا اپنے پُتّر کی حرکتوں کو۔ ہر ویلے لڑائی جھگڑا کرتا رہتا ہے یہ مجھ سے۔"

ماں جی مجھے مخاطب کر کے بولی "ہائے پُتّر جیلانی! کیوں جھگڑتا ہے تو میرے بیٹے سے۔ بُری بات، پُتّر آپس میں جھگڑا نہیں کرتے۔"

"او نہیں ماں جی، کوئی جھگڑا شگڑا نہیں کر رہا ہے اس سے۔ اس کا دماغ خراب ہے، خواہ مخواہ لڑنے کی باتیں نکالتا ہے ہر ایک سے۔" میں نے کہا "میں نے تو کہا بھی نہیں اس کو کچھ، پوچھ لیں آپ ان لوگوں سے، میں نے کچھ بھی کہا ہو اس کو اگر۔"

"ہاں ماں جی! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں جیلانی۔ انھوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ یہ آپ ہی سب سے لڑ رہے ہیں۔" فردوسی بیگم نے کہا۔

سب نے فردوسی بیگم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے آبی کو ہی موردِ الزام ٹھہرانا شروع کر دیا تھا۔ سب کو ایک زبان دیکھ کر آبی بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا "ارے ظالمو! کوئی تو میری حمایت کرو، سارے کے سارے اُسی کی طرف ہو گئے ہو۔"

ماں جی کو اُس کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ وہ اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "ارے کیوں ستاتے ہو میرے پُتّر کو سارے مل کر۔ تو اِدھر آ میرے ساتھ چل۔ مجھ سے باتیں کرنا۔ چل اُٹھ، لعنت بھیج ان سب پر۔"

"ہاں، ہاں، چلیں ماں جی! میں چل رہا ہوں آپ کے ساتھ، بھیج دی لعنت میں نے ان سب پر۔" وہ اُٹھ کر ماں جی کے ساتھ چلا گیا۔

شرافت علی بولا "ارے ارے، یہ سچ مچ ہی چلا گیا ہمیں چھوڑ کر۔ اسے روکو یار! محفل ویران ہو جائے گی اس کے بغیر تو۔" اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "آ جائے گا یار خود ہی ابھی۔ رہ کہاں سکتا ہے وہ ہمارے بغیر۔ میں ذرا تم سے کچھ باتیں کرنے آیا تھا۔"

"ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے؟ ان لوگوں کی موجودگی میں کرنے کی نہ ہوں تو اُدھر دوسرے کمرے میں چلے چلیں؟" شرافت نے کہا۔

"نہیں یار! اِن سے چھپانے والی کون سی بات ہو سکتی ہے۔ یہ سب تو ہماری آنکھیں، ہمارے ہاتھ پاؤں اور دماغ ہیں ہمارے۔"

میں نے اُسے فاطمہ سے ہونے والی ساری گفتگو کی تفصیل بتانے کے بعد کہا "میں چاہتا ہوں کہ اس مہم میں تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو۔"

"یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔ کیا تمھارا یہ خیال تھا کہ میں اب اس معاملے سے الگ ہو گیا ہوں۔ ایسی بات کبھی نہ

سوچنا۔ اب تو میری زندگی کا مقصد ہی صرف یہ رہ گیا ہے جیلانی! مَیں ان یہودیوں کو ختم کرنے کے لیے اپنا وہ سب کچھ بھی قربان کر دوں گا جو بچ گیا ہے میرے پاس۔"

"مجھے یہی اُمید تھی تم سے، اسی لیے مَیں نے اس معاملے کو تمھارے سامنے رکھا تھا۔ بس تو پھر اب تیاری شروع کر دو، زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ اور دعا کرو کہ وہ ذلیل آئزک بھی وہاں موجود ہو۔ مَیں اُسے جلد از جلد جہنّم میں پہنچا دینا چاہتا ہوں۔" مَیں نے کہا۔

"وہاں تو اُسے ایک دن جانا ہی ہے، کب تک بچتا رہے گا وہ ہمارے ہاتھوں سے۔ خدا ان رشوت خوروں کو جہنّم واصل کرے۔ یہ لوگ چند ٹکوں کی خاطر ملک دشمن لوگوں کے اشارے پر ناچنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے ہیں کہ یہ رشوت پیش کرنے والا ہے کون، اور جو کام لینا چاہ رہا ہے یہ ہم سے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے ملک و قوم کو داؤ پر لگا دیتے ہیں یہ بے غیرت اور بے ضمیر نفس کے غلام لوگ۔ ایک زمانہ تھا اگر کوئی رشوت لے لیتا تھا کسی سے تو چھپاتا پھرتا تھا ایک ایک سے۔ نظریں ملا کے بات نہیں کر پاتا تھا کسی سے۔ گھر والوں کو بتاتے ہوئے ڈرتا تھا اور اگر گھر کے کسی فرد کو پتا چل جاتا تھا تو وہ لعنت ملامت کر کے اس قدر ذلیل کرتا تھا اسے کہ دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اُسے۔ ایک یہ زمانہ ہے کہ حلال کی ملنے والی تنخواہ چھپا کر حرام میں ملنے والی رشوت کو اوپر کی آمدنی کہہ کر فخریہ طور پر بتایا جاتا ہے۔ لوگوں کو حرام کے رزق سے پرورش پانے والوں کے لیے نیکی شرمندگی کا باعث ہے جو اگر سرزد ہو بھی جائے تو چھپاتے پھرتے ہیں ایک دوسرے سے اور گناہوں پر فخر کرتے ہیں۔ سر اٹھا کر چلتے ہیں گناہ کرنے کے بعد۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں شرافت بھائی!" فردوسی بیگم بولی۔ "اس قوم کی بربادی کا باعث وہ لوگ ہیں جنھوں نے چند روزہ آرام اور آسائش کی زندگی کی خاطر اپنی اولادوں کو رزقِ حرام سے پرورش کر کے حرام و حلال اور نیکی بدی کی پہچان ختم کر دی۔ اپنی نسلوں کے لہو میں حرام کو شامل کر کے ان کے دل سیاہ اور احساس کو مردہ کر دیا ہے۔ اب وہ اولاد کی نالائقی پر لہو روتے ہیں، مگر اپنے اعمال پر شرمندہ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اب بھی اپنے گناہوں اور زندگی بھر کے جرائم کو اولاد کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔ کہتے ہیں، ہم نے یہ سب کچھ اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے کیا تھا۔ یہ ہے اولاد کا وہ بہتر مستقبل، جس کی خاطر ان کوتاہ اندیشوں نے پوری قوم کو بربادی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بی بی! مَیں بھی ان کج رو اور کم... میں شامل ہوں۔ مَیں نے بھی اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے... کی اسی راہ کا انتخاب کیا تھا۔ بھلا ہو اس غلام جیلانی کا جس... میری آنکھوں کو بینائی دے کر مجھے اس راہ سے ہٹایا اور شکر... ہوں اس ربِ جلیل کا کہ اس نے رزقِ حرام سے پرورش پا... جوان ہونے والی میری اولاد کو دوسروں کے لیے عذاب... سے پہلے ہی دُنیا سے اُٹھا لیا۔" شرافت علی رقت سے بولا۔

مَیں نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "ہمت سے کام لو شرافت علی! اگر واقعی شکر گزار ہو اپنے رب کے تو تم... خوش و خرم نظر آنا چاہیے، افسردہ اور ملول بالکل نہیں ہونا چاہیے... اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کا صلہ بہت... ملے گا تمھیں۔"

"میں بالکل اداس نہیں ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں خوش... بہت۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے میری خوشی کا۔" وہ بولا۔ "اور یہ... اس بات کی بھی ہے کہ اب میرے پاؤں میں ایسی کوئی زنجیر... رہی ہے جو میرے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک... اب میں آزاد ہوں۔ مادرِ وطن کی خدمت کے سوا اب کوئی... مجھے اور نہ کوئی ذمّے داری ہے مجھ پر۔"

"آفرین ہے دوست تجھ پر۔ تیرے ہی جیسے لوگ... ہیں وہ جو امر ہو جاتے ہیں۔ جن کے کارنامے کتابوں میں محفوظ... دیے جاتے ہیں، آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے لیے۔ جنھیں... طور پر پیش کیا جاتا ہے صدیوں تک۔" میں نے اس کے... سے متاثر ہو کر کہا۔

فردوسی بیگم نے کہا۔ "ہر پاکستانی کو اسی طرح سوچنا... یہ ملک کوئی تحفے میں تو نہیں مل گیا ہے ہمیں۔ لاکھوں جانیں... ہوئی ہیں، گھر بار لٹے ہیں۔ صدیوں کے مکینوں کو بے گھر... ہے اس کی خاطر۔ پوری ایک نسل قربان ہو گئی ہے اس... سرزمین پر اور ایک نسل اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے... اسے سجانے سنوارنے میں کام آ گئی۔ چند مفاد پرستوں کی... کی وجہ سے ہم اپنے چمن کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے... لوگ ہیں، اپنے آشیانے کو خود ہی جلانے کی تدبیریں کر... ہیں۔ یہ تک نہیں سوچتے کہ یہ ملک نہیں رہا تو وہ خود کہاں... رہیں گے۔ ان مفاد پرستوں کا خاتمہ کرنے کے بجائے... دشمن اپنا گھر پھونک دینا چاہتے ہیں۔ کیا بھارت میں... حالتِ زار دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ بنگلہ دیش... بھی انھیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا نہ کر سکی۔ یہ بھارت...

...کے اکھنڈ بھارت کے خواب کو سچ کر دکھانے کو تو تیار ہیں۔ بھارت سے اور اس پورے برصغیر سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے کی ہندوؤں کی صدیوں پرانی خواہش کو پورا کرنے پر تو یہ آمادہ ہیں۔ اپنی بقا، اپنی سلامتی انھیں ذرا بھی عزیز نہیں رہی ہے۔ انھیں کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ ہندو صدیوں سے انھیں مٹانے کے خواب دیکھ رہا ہے اور یہ جن لوگوں کو رہنما سمجھ کر اُن کے اشارے پر خود کو برباد کر دینے پر تُل گئے ہیں وہ راہنما نہیں راہ زن ہیں۔ وہ ہمیشہ ہر بُرے وقت میں ان لوگوں کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں، یورپی ممالک میں عیاشیاں کرنے اور اپنے آقاؤں کے ساتھ ان کی بربادی کے نئے نئے منصوبے بنانے کے لیے۔ کیسے دُکھ کی بات ہے، جو بات ایک معمولی عقل رکھنے والا بچّہ بھی سمجھ لیتا ہے، وہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں، خودکشی ہی کر لینا چاہتے ہیں یہ؟"

"بس کرو بی بی! جو لوگ محنت کرنے کے عادی نہیں ہوتے، اپنی کاہلی اور کم عقلی کی وجہ سے سب سے پیچھے رہ جاتے ہیں، وہ اسی طرح جھنجلا کر اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ دوسروں کی ترقی اور خوش حالی کو یہ بددیانتی اور بے ایمانی کہہ کر اپنی کوتاہیوں کو چھپاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو گھر بنانے کے لیے ایک اینٹ بھی اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنی زمین دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں اور جب وہ اس زمین پر عالی شان محل بنا کر کھڑا کر دیتا ہے اپنی رات و دن کی محنت سے، اپنا خون پسینہ بہا کر، تو اس پر اپنا دعویٰ کرنے آ جاتے ہیں، اپنا حق مانگنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ساری بات یہی ہے بھائی، اگر آدمی محنتی ہو تو اپنی محنت سے اپنا مقام خود بنا لیتا ہے، کسی کو الزام نہیں دیتا، اپنی کوتاہیوں کو کسی کے سر منڈھنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔ یہ باتیں کام چور اور محنت سے جی چرانے والے ہی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

شرافت علی بولا۔ "نہیں جیلانی! سارا الزام انھیں ہی نہ دو، بہت زیادتیاں تو کی گئی ہیں ان کے ساتھ۔ حق تلفیاں ہوئی ہیں اُن کی، یہ مان لو۔ یہ ناانصافیاں اگر نہیں ہوتیں تو ذکر بھی نہ ہوتا۔ کسی چیز کا جب وجود ہوتا ہے، تبھی ذکر بھی ہوتا ہے اس کا۔ مانا کہ سارا قصور ان کا ہی نہیں ہے، کچھ کوتاہیاں خود ان شکایت کرنے والوں کی بھی ہیں۔ غلطیوں کی ابتدا انھوں نے ہی کی ہے۔ یا اثر و رسوخ والوں کی اطاعت نے انھیں صحیح اور مخلص رہنماؤں کا انتخاب نہیں کرنے دیا۔ صحیح قیادت حاصل نہیں ہوئی انھیں کبھی بھی۔ یہ سیدھے سادھے لوگ انھیں ہی اپنا قائد سمجھتے رہے جو صدیوں سے ان کا استحصال کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں اتنا شعور ہی نہیں پیدا ہونے دیا گیا کہ یہ بُرے اور بھلے میں تمیز کر سکتے۔ بس سب سے بڑا جرم، غلطی یا کوتاہی تم جو کچھ کہو، یہی ہے ان کی۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں تمھاری بات کو شرافت علی! لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب بھی یہ کسی مخلص اور صحیح قیادت کے تحت کام نہیں کر رہے ہیں۔ وہی لوگ جن کے باپ دادا انھیں چکّی کے پاٹوں میں پیستے رہے ہیں، اب بھی ان کی لگام تھامے ہوئے ہیں۔ اب بھی دوست اور دشمن کی تمیز کرنے کو تیار نہیں ہیں یہ۔ اب بھی انہی کی انگلی تھام کر بربادی کی راہ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اپنی سوہنی دھرتی سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہیں۔ اسے تو برباد کر دینے پر تیار ہیں مگر اس جاگیردار اور وڈیرے کے خلاف اب بھی بغاوت نہیں کرنا چاہتے جس نے انھیں ایک باعزت زندگی سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ کم عقل لوگ اب تک انھیں اپنے سروں پر بٹھائے پھر رہے ہیں جنھوں نے ہندو کے ہاتھوں انھیں فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ نہیں جانتے انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر قصائی کے پاس فروخت کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے تاکہ ان کی فروخت سے ہونے والی آمدنی سے یورپ جا کر عیش و نشاط کی محفلیں سجائی جا سکیں۔ یہ اندھے مقلد دیکھتے ہی نہیں کہ کس کے پیچھے کس طرف جا رہے ہیں۔ ان کے یہ رہنما تو اپنے اجداد سے بھی زیادہ خود غرض اور ظالم ہیں۔ یہ تو ان کی رگوں میں دوڑتے والے لہو کی ایک ایک بوند کو، ان کی ایک ایک بوٹی، ایک ایک ہڈی بلکہ ہر موئے تن کو بیچ کھانا چاہتے ہیں۔ اور یہ خوشی خوشی اُن کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس امید میں کہ وہ ان کے لیے کسی نئی دنیا، کسی جنت کا انتظام کر کے آئے ہیں ان کے پاس۔"

"یہ سب جہالت کی سوغات ہے دوست۔ علم کی روشنی سے محروم لوگ جہالت کے اندھیرے میں کچھ دیکھ ہی کہاں سکتے ہیں۔" شرافت علی بولا۔

"ہاں، مگر وہ اب آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں، انھوں نے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے اس اندھے کنویں میں چھلانگ لگائی ہے۔ انھیں تم کیا کہو گے، یہ تو جاہل نہیں ہیں۔ علم کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں سب کچھ۔" مَیں نے ذرا تلخی سے کہا۔

"احساسِ کمتری نے ڈبو دیا ہے انھیں۔ اپنے اجداد کی کسمپرسی نے ان کے سینے جلا کر رکھ دیے ہیں۔ جذبات کی آندھی کی زد میں آ گئے ہیں۔ عیّار اور موقع شناس جاگیردار نے اس آندھی سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کا رخ چالاکی سے اُس طرف موڑ دیا، جہاں پہنچ کر یہ سب فنا ہو جائیں گے۔ اور اس جاگیردار کے اقتدار کا سورج یوں ہی چمکتا رہے گا۔ اس نے ان کے انتقام اور دشمنی کا

رُخ چالاکی سے انہی کی طرف موڑ دیا ہے جنھوں نے انھیں علم کی روشنی دے کر اپنے استحصال کا احساس دلایا ہے۔ جنھوں نے ان کچلے ہوئے انسانوں کو زندہ رہنے کے طریقے اور اصول سمجھائے ہیں۔ جنھوں نے ان کے لیے درسگاہیں بنا کر ان کے اندر شعور کی آبیاری کی ہے۔ اس طرح وہ ایک ہی حربے سے اپنے دونوں دشمنوں کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔"

"یہ بالکل صحیح تجزیہ پیش کیا ہے شرافت بھائی نے۔" انور کمال بولا "بالکل یہی ہوا ہے۔ اپنی حاکمیت کو بچانے کے لیے ان خود غرض لوگوں نے اس تعلیم یافتہ نسل کو اور اسے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے والوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر ختم کر دینے کی سازش کی ہے یہ۔ اور اس کش مکش، اس افراتفری سے فائدہ اٹھانے کے لیے دشمن نے اپنے ایجنٹ ہمارے درمیان چھوڑ کر ہماری صحیح سمت میں واپسی کے راستے بند کرنا شروع کر دیے ہیں۔"

"اور ہم نے اپنی غلطی کا احساس کر کے اپنا یہ سفر ترک نہیں کیا، اپنی سمت تبدیل نہیں کی۔ دوست اور دشمن کو اب بھی نہ پہچان سکے تو اس کوتاہی کی بڑی عبرت ناک سزا ملے گی ہمیں۔ اس سزا کے لیے بھی اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیے ہم سب کو۔" گل زمان گلوگیر آواز میں بولا۔

شرافت علی نے کہا۔ "جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے، وہ ہم کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، زندگی کی آخری سانس تک۔ کم عقل اور کوتاہ بیں لوگوں کے دل پھیرنا بہر حال ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ انھیں تو اللہ ہی چاہے تو راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ اب اگر اس نے اس قوم کو اپنی ناشکری اور نافرمانی کی سزا دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر ہم تم کیا کر سکتے ہیں۔ پھر تو سمجھو بربادی مقدر ہو چکی ہے اس قوم کی۔"

۳۶

فیکٹری کی عمارت تو بہت چھوٹی سی تھی لیکن اس کے گرد چار دیواری کھینچ کر جو قطعہ فیکٹری کی ملکیت ظاہر کیا گیا تھا، وہ بہت بڑا تھا۔ فیکٹری کی عمارت اس قطعۂ آراضی کے بالکل درمیان میں تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے سامنے کی طرف ایک خاصا بلند آہنی گیٹ تھا جس کی جالیوں سے اندر گیٹ کے بالکل ساتھ چوکیدار کا کیبن دکھائی دے رہا تھا۔ کیبن کے سامنے کرسی پر چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گیٹ پر روشنی کا خاصا معقول انتظام کر رکھا تھا انھوں نے۔ گیٹ سے ایک پختہ سڑک فیکٹری کی عمارت کی طرف سیدھی چلی گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں ہر طرف خودرو جنگلی پودے اور جھاڑیاں ہی دکھائی دیتی تھیں بس۔ اس جگہ کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس بہ ظاہر غیر محفوظ سی چار دیواری کے اندر کہیں اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ہو سکتا ہے۔ گیٹ کے سوا ہر سمت تاریکی کا راج تھا وہاں، فیکٹری کی عمارت بالکل تاریک تھی۔ شاید وہاں رات کے وقت کام نہیں ہوتا تھا۔ یا ممکن ہے، وہ فیکٹری بند ہی پڑی ہو۔ وہاں سرے سے کام ہوتا ہی نہ ہو۔ شرافت علی اور ان کے معتمد ساتھی فیکٹری کی چار دیواری کے باہر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ میں مورچے بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ فاطمہ نے بتایا تھا کہ ہمارے مطلوبہ گودام کا راستہ فیکٹری کے عقبی حصے میں واقع ایک چھوٹے سے کارخانے میں ہے۔ لیکن ہم اس راستے سے اندر نہیں جا سکیں گے کیونکہ اُدھر حفاظت کا بہت سخت انتظام ہے۔ ہم کسی طرف سے دیوار پھاند کر بھی اندر نہیں جا سکتے۔ اس لیے کہ چاروں طرف دیوار کے اوپر بہت ہی باریک تار بچھا ہوا ہے۔ اس تار سے کوئی چیز ٹکرا جائے تو کارخانے میں خطرے کے الارم بج اٹھتے ہیں۔ چنانچہ دیوار پھاند کر اندر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اندر جانے کے لیے شمال کی سمت کی دیوار میں نقب لگانا ہے ہمیں۔

"لیکن ہم نقب لگانے کے لیے سامان تو اپنے ساتھ لائے ہی نہیں ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ "اس کے بغیر تو بہت مشکل پیش آئے گی۔"

"اس کا میں نے بندوبست کر دیا ہے، ہمارے پہنچتے ہی نقب زنی کا کام شروع ہو جائے گا۔ وہ لوگ منتظر ہی ہوں گے ہمارے۔" وہ بولی۔

آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد دیوار میں اتنا بڑا سوراخ ہو سکا تھا کہ ایک آدمی لیٹ کر گھسٹتے ہوئے اس میں سے گزر کر دوسری طرف جا سکتا تھا۔ میں نے ان دونوں سے جو دیوار توڑ رہے تھے، کہا۔ "بس کرو بھئی اب... زیادہ وقت برباد نہ کرو۔ اتنی جگہ کافی ہے اندر جانے کے لیے۔"

وہ دونوں رک کر فاطمہ کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔ "ٹھیک ہے، اب تم دونوں اپنی اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔"

وہ اٹھ کر جانے لگے، اسی لمحے ایک ہلکی سی سیٹی کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ فاطمہ دھیمی آواز میں بولی۔ "خطرہ، جناب عالی ہوشیار۔"

ہم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی میں نے چار دیواری کے عقبی حصے کی طرف سے کسی گاڑی کے ہیولے کو تیز رفتاری کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ فاطمہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "کون ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جو کوئی بھی ہو، دوست بہر حال نہیں ہو سکتا یہ ہمارا۔ ہمارے آدمیوں میں سے کوئی اگر نکلتا اپنے مورچے سے تو ہمیں سگنل ضرور مل جاتا۔ مجھے تو یہ گاڑی بھی اپنی نہیں معلوم ہوتی۔ جلدی سے گاڑی کے اندر چلی چلو۔ یہاں کھڑے رہنا نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے تیزی سے قریب کھڑی ہوئی اپنی کار کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ فاطمہ نے بھی میری تقلید میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دونوں جنھوں نے دیوار میں راستہ بنایا تھا، بھاگتے ہوئے ایک ٹیلے کی اوٹ میں جا چھپے تھے۔ میں اور فاطمہ جس کار میں تھے اس میں آبی اور گل زمان بھی موجود تھے۔ اور یہ وہی کار تھی جو شرافت علی نے خصوصی طور پر تیار کرائی تھی میرے لیے۔ اندر گھستے ہی میں نے آبی اور گل زمان سے کہا۔ "اپنے ہتھیار سنبھال لو... شاید دشمن کو ہماری یہاں موجودگی کی خبر ہو گئی ہے۔"

اس دوران وہ گاڑی بھی نزدیک آ گئی تھی ہمارے۔ جو لوگ اس گاڑی میں سوار تھے، انھوں نے ہماری کار کو دیکھ لیا تھا اور اپنی کار کو آہستہ کر کے شاید گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ہماری کار میں ایسے شیشے لگے ہوئے تھے جن کے ذریعے باہر والے ہمیں بالکل نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ ہم انھیں بخوبی دیکھ سکتے تھے اور اندر بیٹھے ہی بیٹھے ان کے خلاف کارروائی بھی کر سکتا تھا میں۔ انھوں نے اپنی گاڑی ہمارے کار کے بالکل ساتھ لا کر روک دی۔ وہ چاروں طرف سے بند ایک جیپ تھی۔ سامنے کی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ کے عقبی حصے میں بھی کوئی تھا یا نہیں، یہ ہم نہیں جان سکے تھے۔ ہماری کار کے ساتھ جیپ روک کر ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کار کے اندر دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس طرح کچھ دیکھ نہیں سکے تو دونوں اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر جیپ سے باہر نکل آئے۔ ان دونوں کی کمروں سے ریوالور لٹکے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں انھوں نے اسٹین گنیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ بہت محتاط انداز میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک جیپ ڈرائیو کرنے والے شخص کی نظر دیوار کے اس بڑے سے ہول پر جا پڑی، جو ہم نے اندر گھسنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا اور پھر اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے شخص نے چونک کر اِدھر دیکھا اور پھر وہ دونوں ہی تیزی کے ساتھ لپکتے ہوئے دیوار کے اسی سوراخ کے پاس جا پہنچے۔ فاطمہ نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "موقع اچھا ہے جناب عالی! آپ کار اسٹارٹ کریں۔ یہ دونوں کار کے انجن کی آواز سن کر بدحواس ہو جائیں گے۔ آپ اس بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر کار ان پر چڑھا دیں۔ روند ڈالیں انھیں۔ رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے ان پر۔ دشمن کی تعداد جتنی بھی کم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ وہ دونوں نیچے جھکے ہوئے اسی سوراخ کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ توقع کے عین مطابق وہ دونوں کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر ایک ساتھ اچھل کر کار کی طرف پلٹے۔ میں نے کار ان کی طرف موڑتے ہوئے خفیہ خانہ کھول کر فائرنگ والا بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ان میں سے ایک لہرا کر نیچے گر پڑا اور دوسرا اچھل کر جیپ کی طرف بھاگا۔ میں نے کار کو ایک دم دوڑا کر اس سے ٹکرا دیا۔ ٹکر لگتے ہی وہ کئی فٹ اوپر اچھل کر دوبارہ نیچے گرا تو کار اُسے روندتی ہوئی آگے نکلتی چلی گئی۔ میں نے بریک لگا کر کار کو روکتے ہوئے مڑ کر جیپ کے عقبی حصے پر نظر ڈالی۔ وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیپ میں بس وہی دونوں آئے تھے۔ فاطمہ بھی جیپ ہی کو دیکھ رہی تھی، وہ بولی۔ "یہ دو ہی تھے اس جیپ میں۔ آئیں دیکھیں کیا گزری ہے ان پر۔"

وہ اپنی سمت کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ اس سے پہلے ہی آبی اور گل زمان نیچے اتر چکے تھے اور میں جب کار سے باہر نکلا تو زمان اس شخص پر جھکا ہوا تھا جسے میں نے کار سے روند ڈالا تھا اور آبی اس کی طرف دوڑا جا رہا تھا جو گولی کھا کر دیوار کے قریب گرا تھا۔ وہ رینگتا ہوا دیوار کے سوراخ سے دوسری طرف نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آبی اسے پکڑنے کے لیے ہی اس کی طرف لپکا تھا۔ اس کا آدھا جسم سوراخ کے دوسری طرف جا چکا تھا۔ کمر سے نیچے کا حصہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ آبی نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور پوری قوت سے جھٹکا دے کر اسے باہر کھینچ لیا۔ "اوئے جاتا کدھر ہے کتے! تیرا مقبرہ تو ہم نے ادھر بنایا ہے، تو ادھر کہاں جا رہا ہے۔" وہ اسے گھسیٹتے ہوئے بولا۔

اس کے کندھے میں گولی لگی تھی اور زخم سے خون پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ آبی کی گرفت سے اپنی ٹانگ چھڑا لینے کی جدوجہد برابر کیے جا رہا تھا۔ وہ کئی بار آبی کو اپنی دوسری ٹانگ سے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس کی اس حرکت پر آبی طیش میں آ گیا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ موڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کے گھٹنے کا جوڑ کھل گیا اور وہ چیخ مار کر زمین پر کسی پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے اور لوٹیں لگانے لگا۔ آبی دانت پیستے ہوئے بولا۔ "کتے! تجھے پتا نہیں ہے، میں ایک لمحے میں آدمی کی ٹانگیں توڑ کر اسے کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا ہوں۔ اب چلا ٹانگ اپنی، میں بھی دیکھوں کتنا جواں مرد ہے تو۔"

میں نے کہا۔ "اوئے آبی! یہ کیا کر دیا ہے یار تو نے۔ اب اسے اٹھا کر کہاں لیے پھریں گے ہم؟"

وہ بولا۔ "کہیں لے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے اس ذلیل یہودی کو۔ بوٹیاں کر کے ڈال دیں گے یہیں، کتے بلیوں کی خوراک

بننے کو۔"

"نہیں بھائی! یہودی کا گوشت کھا کر اپنے ملک کی بلیاں اور کتے بھی ان کی طرح پاگل ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں کرو آبی بھائی! کیوں ان وفا شعار جانوروں کی آنکھوں کا پانی مار دینا چاہتے ہو۔ رحم کرو ان مظلوموں پر۔" گل زمان ہنس کر بولا۔

میں نے کہا۔" کہتا تو یہ ٹھیک ہی ہے یار آبی! یہ واقعی بڑا ظلم ہو گا ان جانوروں پر۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ انھیں زندہ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ اس دوسرے کو دیکھو یار! اس کی سانسیں ابھی چل رہی ہیں یا ٹھنڈا ہو گیا وہ؟"

فاطمہ میرے کہنے سے پہلے ہی اس کے پاس جا کر اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی۔" مرا نہیں ہے، یہ صرف بے ہوش معلوم ہوتا ہے۔" پھر وہ ایک دم چونک کر کوئی چیز اس کے قریب سے اٹھاتے ہوئے بولی۔" اوہ جناب عالی! یہ وائرلیس سیٹ دیکھیں، یہ آن کیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے یہاں ہونے والی تمام باتیں کسی جگہ سنی جا رہی ہیں۔"

میں لپک کر اس کے پاس جا پہنچا اور اس سے وہ سیٹ لے کر دیکھنے لگا۔ وہ واقعی آن تھا۔" پتا نہیں اس نے پہلے ہی سے اسے آن کر رکھا تھا یا گاڑی کی ٹکر لگنے کے بعد جھٹکے سے یہ آپ ہی آن ہو گیا ہے۔" میں نے آف کرنے کے لیے الٹ پلٹ کر مختلف بٹنوں کو آزماتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے اسے جلدی سے میرے ہاتھ سے لے کر پوری قوت کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف پھینک دیا اور بولی۔" جلدی سے یہاں سے نکلیں جناب عالی! میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو دشمن ہماری یہاں موجودگی سے واقف ہو چکا ہے اور اب ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہو گی۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔ گل زمان! اپنے آدمیوں کو اس علاقے سے نکل جانے کا سگنل دو۔" میں نے گل زمان کو مخاطب کر کے کہا۔

آبی نے پستول نکال کر ان دونوں زخمیوں کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک ایک گولی اتار دی۔ فاطمہ نے دو انگلیاں منہ میں ڈال کر مخصوص انداز میں سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو اپنے مورچے چھوڑ کر واپس چلے جانے کا اشارہ دے دیا اور ہم سب تیزی سے اپنی کار کی طرف لپک پڑے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھسنے ہی لگا تھا کہ میری نظر اس سیاہ رنگ کی کار پر پڑی جو بہت ہی تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے بالکل نزدیک آ چکی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے اپنے پستول پر ہاتھ ڈالا مگر پھر کار کو پہچان کر پستول نکالنے کا ارادہ ترک کر کے اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کار شرافت علی کی تھی۔ اس میں شرافت علی کے ساتھ خان اور انور لال تھے۔ منصوبے کے مطابق ان لوگوں کو اس وقت تک فیکٹری کے سامنے والے حصے میں اس موڑ پر رکنا چاہیے تھا جہاں سے ہم اس طرف مڑے تھے، جب تک ہم انھیں سگنل دے کر یہ نہ بتاتے کہ نقب لگ چکی ہے، اب ہم اندر گھس رہے ہیں لہٰذا وہ بھی آ جائیں۔ شرافت علی نے میرے قریب کار روکتے ہوئے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔" جلدی سے نکل چلو جیلانی! دشمن کو شاید ہمارے ارادے کا علم ہو چکا ہے۔ میں نے فیکٹری کے گیٹ سے کئی گاڑیوں کو نکل کر ادھر آتے دیکھا ہے۔ تین گاڑیاں دوسری طرف بھی گئی ہیں۔ جلدی کرو۔" وہ اس پہنچنے والے ہوں گے۔

میں تیزی سے واپس پلٹ کر اپنی گاڑی میں گھس گیا اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ میرا خیال تھا دشمن جس طرف سے بڑھ رہا ہے، ہماری طرف، ہم اس کی مخالف سمت سے نکل جائیں گے۔ مگر یہ میرا خیال تھا جو بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ ہم تھوڑا ہی آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی تین گاڑیوں کو دیکھ کر میں اپنی کار کے بریک پر پاؤں کا بوجھ ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ شرافت علی نے اپنی کار میری کار کے ساتھ لگا کر مجھے آواز دے کر کہا۔" جیلانی! فائرنگ کرتے ہوئے ان سے کترا کر نکلنے کی کوشش کرو۔ پیچھے جانے کا راستہ نہیں ہے۔"

" ٹھیک ہے تم اپنی گاڑی میری گاڑی کے ساتھ ہی رکھو ہم دونوں ایک ساتھ ان پر راکٹ فائر کریں گے۔" میں نے چلا کر کہا۔

ہم دونوں کی گاڑیاں یوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں جیسے دو نوں شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھ رہی ہوں۔ دشمن نے بھی ہمیں اس طرح آگے بڑھتے دیکھ لیا تھا اور ہمارا راستہ روکنے کے لیے اُس نے بھی یہی حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔ وہ تینوں گاڑیاں بھی برابر ایک ساتھ آگے بڑھنے لگی تھیں۔ ہیڈ لائٹس نہ اُن کی گاڑیوں کی روشن تھیں اور نہ ہی ہم نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ تینوں گاڑیاں رینج میں آئیں شرافت علی نے چلا کر کہا۔" ریس جیلانی! دیکھو بہکنے نہ پائے۔ یہ۔ ون... ٹو... تھری... فائر..."

اس کے فائر کہتے ہی میں نے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر راکٹ لانچر کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک زبردست دھماکے کے ساتھ سامنے سے آنے والی دو گاڑیوں کے پرخچے اُڑ گئے۔" وہ مارا۔" فاطمہ نے خوشی سے چلا کر زوردار نعرہ لگایا۔

دو گاڑیوں کا حشر دیکھ کر تیسری گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس میں سے لوگ نکل نکل کر اِدھر اُدھر ٹیلوں کے پیچھے چھپنے کے لیے دوڑ پڑے۔ میں اپنی گاڑی دوڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آبی نے پچھلی سیٹ سے چلا کر کہا۔" شرافت علی اپنی گاڑی پیچھے موڑ رہا ہے۔"

میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ شرافت علی اپنی کار کو واپس موڑ رہا تھا۔ اُس نے پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کو نزدیک آتے دیکھ لیا تھا اور اب پلٹ کر اُن پر بھی وہی حربہ آزمانا چاہتا تھا شاید جو ہم نے سامنے سے آنے والوں پر آزمایا تھا۔ میں نے بھی اُس کی مدد کے لیے اپنی کار کو اُدھر موڑنا چاہا مگر سامنے سے دو اور کاروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے گاڑی وہاں روک دی۔ فاطمہ چونک کر بولی۔" اوہ جناب عالی! دو گاڑیاں اور آ رہی ہیں سامنے۔ یہ لوگ یوں نہیں نکلنے دیں گے ہمیں۔ باقاعدہ مقابلہ کرنا پڑے گا ان سے۔"

اس نے اسٹین گن اٹھا کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور تیزی سے کار سے باہر نکل گئی۔ اس کے اُترتے ہی آبی اور گل زمان بھی اپنی اپنی اسٹین گنیں سنبھال کر کار سے اُتر گئے تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ کا وہ خفیہ خانہ کھول لیا جس میں اس کار کے خفیہ میکنزم کو استعمال کرنے کے لیے مختلف بٹن لگے ہوئے تھے۔ دونوں کاریں اپنے آگے آنے والوں کے انجام سے بے خبر تیز رفتاری سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ دُور سے تباہ شدہ کاروں کو دیکھ کر صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل تھا اُن کے لیے، اور جب وہ صورت حال کو صحیح طور پر سمجھنے کے قابل ہوئے تو اُس وقت تک وہ میری رینج میں آ چکے تھے اور میں نے انھیں ذرا سی بھی مہلت دیے بغیر اُن کی طرف راکٹ فائر کر دیا۔ دونوں میں سے ایک کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گئی۔ لیکن دوسری کار اس سے سبق لینے کے بجائے اُسی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ اس کا ڈرائیور یا تو کوئی بہت ہی جیالا تھا یا پھر وہ اپنے ساتھ چلنے والی کار کو ٹکڑے ہو کر بکھرتے دیکھ بوکھلا گیا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ میں ایک اور راکٹ فائر کر کے اس کار کو بھی تباہ کر دینا چاہتا تھا مگر عین اُسی لمحے جب میں بٹن کو دبانے ہی والا تھا، فاطمہ اسٹین گن سے فائرنگ کرتے ہوئے میری کار کے سامنے آ گئی۔ میں نے فوراً ہی بٹن پر سے اُنگلی ہٹائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک لمحے کا فرق ہو جاتا تو اس وقت میرے راکٹ نے فاطمہ کے چیتھڑے اڑا کر رکھ دیے ہوتے۔ فاطمہ نے بہت ہی بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر سامنے آ گئی تھی کہ پہلی تین گاڑیوں میں بچ جانے والے کار میں سوار لوگ کار سے نکل کر اِدھر اُدھر چھوٹے بڑے ٹیلے کی آڑ میں مورچے سنبھال چکے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر فائر کھول سکتے تھے اس پر اور کوئی آڑ نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی گولیوں کی زد میں آ سکتی تھی لیکن شاید وہ تین کاروں کی خوفناک تباہی اور ان میں سوار اپنے ساتھیوں کے عبرت ناک انجام سے بری طرح نروس ہو رہے تھے اس وقت اور کسی کی جان لینے کے بجائے خود اپنی جانیں بچانے کی فکر میں مبتلا تھے ورنہ یہ اُن کے لیے بہترین موقع تھا، وہ فاطمہ کا جسم گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے لیکن فاطمہ کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ابھی اس کے کرنے کے کچھ ایسے کام باقی تھے جو قدرت نے اس کے نام لکھ دیے تھے۔ چنانچہ فاطمہ کی چلائی ہوئی گولیاں کار کی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو چاٹ گئیں۔ ڈرائیور کے گولی لگتے ہی کار اس کے قابو سے نکل گئی اور لہراتی ہوئی آ کر اُن کی اپنی ہی خالی کھڑی ہوئی کار سے پوری قوت کے ساتھ ٹکرا گئی۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ وہ جو اس تصادم میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے۔ انھوں نے تو یہ سوچا تک نہ ہو گا کہ---- ایسا بھی ہو جائے گا ان کے ساتھ۔ عین اُسی لمحے جب اُدھر بے قابو کار زوردار دھماکے کے ساتھ دوسری کار سے ٹکرائی تھی، میں نے اپنے پیچھے بھی ایک زبردست دھماکا سنا تھا۔ وہ دھماکا شرافت علی کی طرف سے اُس کامیاب کارروائی کا نتیجہ تھا جو اُس نے اُدھر سے آنے والی کاروں کے خلاف کی تھی۔ میں نے کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر چلاتے ہوئے کہا۔" آبی! تم ان کاروں سے اُترنے والوں کو دیکھو، میں شرافت علی کی مدد کو جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی کار کو شرافت علی کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

میرے

اُدھر مڑنے تک دو اور زبردست دھماکے ہوئے تھے اور اِدھر بھی ان کی مزید دو اور کاریں پُرزے پُرزے ہو کر بکھر گئی تھیں لیکن ان کاروں کے تباہ ہونے سے پہلے ہی ان میں سے بہت سے لوگ نکل کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال کر انہوں نے تین طرف سے شرافت علی کی کار پر گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ جواب میں شرافت کی کار سے بھی فائرنگ کی جانے لگی۔ میں نے قدرے اونچے ٹیلے کی اوٹ سے تواتر کے ساتھ شعلے لپکتے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ وہاں سے کم از کم دو آدمی مشین گنوں کے ذریعے مسلسل گولیوں کی بوچھار کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی کار کا رُخ اُدھر کر کے ایک لمبا سا چکر لیا اور ان کے پیچھے جا پہنچا۔ انہوں نے میری کار کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اپنی مشین گنوں کا رُخ میری طرف پھیر دیا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ ان کی گولیاں میری ٹینک کی طرح مضبوط اور محفوظ کار کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ چنانچہ میں بے خوفی سے ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے اپنی گولیاں بے اثر ہوتے دیکھ کر بوکھلاہٹ میں وہ پناہ گاہ چھوڑ دی اور اُٹھ کر میری کار پر گولیاں برساتے ہوئے اس ٹیلے کے اوپر چڑھتے چلے گئے جہاں موت ان کی گھات میں بیٹھی تھی۔ وہ جیسے ہی اوپر پہنچے، شرافت علی کی کار سے چلائی جانے والی گولیوں نے ان کا استقبال کیا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اُلٹ کر پیچھے جا گرے۔ میں نے ان کے گرتے ہی کار کو دوسری طرف موڑ دیا، اُدھر مڑتے ہی مجھے ایک اور شخص دکھائی دے گیا جو بڑے سے پتھر کے پیچھے لیٹا شرافت علی کی کار کی طرف گولیاں چلا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اس پر چڑھ دوڑا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے میری کار کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ گولیوں کی مسلسل تڑاتڑ کا اتنا شور تھا کہ کار کی آواز کا سنائی دینا مشکل ہی تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب کار بالکل اس کے سر پر جا پہنچی اور بچنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا اس کے پاس، لہٰذا کار اس کی دونوں ٹانگوں کو روندتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی دردناک چیخ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں۔ میں نے ریورس گیئر ڈال کر کار کو ایک بار پھر اس کے اوپر سے گزار دیا تھا تاکہ اگر کچھ کمی رہ بھی گئی ہو تو پوری ہو جائے اور اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہیں۔

اس دوران شرافت علی وغیرہ دوسروں کو ٹھکانے لگا چکے تھے اور آبی، فاطمہ اور گل زمان نے بھی اپنے حصے میں آنے والے ایک ایک دشمن کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ہر طرف لاشیں اور تباہ شدہ کاریں بکھری دکھائی دے رہی تھیں۔ گو بظاہر ہم جس مقصد سے یہاں آئے تھے اس میں ناکامی ہی ہوئی تھی ہمیں لیکن اسے مکمل طور پر ناکامی اس لیے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم نے ان کی افرادی قوت کو بہرحال اچھا خاصا نقصان پہنچا دیا تھا۔ میں نے شرافت سے کہا: جس کام کے لیے ہم آئے تھے یہاں شرافت علی! اسے تکمیل دینا تو ممکن نہیں رہا ہے۔"

"ہاں، لیکن پھر بھی گھاٹے میں نہیں رہے ہیں ہم۔ آرزک کو رونے کا اچھا خاصا انتظام کر دیا ہے ہم نے۔" شرافت علی بولا۔

"اور اب ہمیں جلد سے جلد واپس چلے جانا چاہیے۔ اتنی زبردست اور خوفناک جنگ کے بعد مزید یہاں رکے رہنا پریشانی کا سبب بن سکتا ہے ہمارے لیے۔ رات کے سناٹے میں گولیوں اور راکٹوں کے دھماکوں کی آواز بہت دور دور تک سنی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس کا بھی امکان ہے کہ پولیس صورتِ حال معلوم کرنے کی غرض سے ادھر آ پہنچے یا خود آرزک ہی کی طرف سے پولیس کو یہاں کے مخدوش حالات کی اطلاع دے کر اسے ادھر متوجہ کر دیا جائے۔ دونوں صورتوں میں مشکلات کا سامنا ہمیں ہی کرنا ہوگا۔" فاطمہ نے کہا۔

"ہاں یار! اب جلدی سے نکل چلو یہاں سے کوئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے سچ مچ۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

سب لوگ جلدی جلدی گاڑیوں پر سوار ہو گئے اور دونوں کاریں آگے پیچھے تیزی کے ساتھ واپس روانہ ہو گئیں۔ میرے ذہن میں یہ بات دیر سے چبھ رہی تھی کہ اس طرف جگہ جگہ فاطمہ نے اپنے وفادار ساتھیوں کو بٹھایا ہوا تھا جس وقت فاطمہ نے انہیں واپس جانے کا سگنل دیا تھا عین اسی وقت دشمن کی گاڑیاں ہمارے سر پر پہنچ گئی تھیں اور تصادم بھی شروع ہو گیا تھا، اس کے باوجود ان میں سے کوئی بھی نہ ہماری مدد کے لیے آیا تھا اور نہ ہی کسی نے ایک گولی تک چلائی تھی ہمارے کسی دشمن پر۔ وہ سب کے سب خاموشی سے میدان خالی کر کے یوں چلے گئے تھے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو وہاں پر۔ میں نے اس سلسلے میں فاطمہ سے استفسار کرتے ہوئے کہا: "اتنی جلدی وہ چلے تو نہیں گئے ہوں گے جو یہ سمجھ لیا جائے کہ انہوں نے دشمن کو آتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔"

"اوہ، یہ بات نہیں ہے جنابِ عالی! وہ لوگ اصولوں کے بے حد پابند ہیں چاہے قیامت ہی کیوں نہ آ جائے وہ صرف وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جائے۔ انہیں یہی سکھایا گیا ہے ایسی ہی تربیت دی گئی ہے ان لوگوں کو، لہٰذا واپسی کا حکم ملنے کے بعد اگر دنیا بھی لُٹ رہی ہوتی یہاں تو وہ مداخلت نہیں کر سکتے تھے جب تک انہیں حکم نہیں ملتا ایسا کرنے کا۔ میں اگر چاہتی تو انہیں رکنے کا سگنل دے کر حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کو کہہ سکتی تھی لیکن میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ میرا خیال تھا، ہم لوگ خود بھی ان سے نمٹ سکتے ہیں اور میرا خیال غلط نہیں نکلا۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو کسی ایک شخص کو بھی واپسی کے راستے کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ چلے کیسے گئے آخر؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو کر ایک ایک دو دو کر کے نکل گئے ہوں گے۔ آپ مطمئن رہیں، ان میں سے کسی کو بھی گزند نہیں پہنچ سکا ہے کسی طرح کا بھی۔ وہ سب بخیریت واپس چلے گئے ہیں۔ کسی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہوتا تو مجھے اطلاع مل چکی ہوتی اب تک۔"

"تم نے انہیں واپس بھیج کر اچھا نہیں کیا۔ دشمن اگر تعداد میں بہت زیادہ ہوتے تو ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ دوبارہ آ سکتے تھے وہاں۔ واپس بھیج دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بے ضرورت ان میں سے ایک کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ رات کا وقت ہے جنابِ عالی! اگر مقابلے کے دوران ان میں سے کوئی مارا جاتا اور ہم بے خبری میں اس کی لاش یہاں چھوڑ کر چلے جاتے تو دشمن کی لاشوں کے ساتھ اس کی لاش بھی شامل کر دی جاتی اور وہ لاش اگر آرزک یا اس کا کوئی ایسا ماتحت دیکھ لیتا جو اسے جانتا ہوتا تو ان سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔ یہ سارے لوگ جیرالڈ کے ماتحت ہوا کرتے تھے اور ان اداروں اور کارخانوں میں متعین ہیں جو پہلے جیرالڈ کے کنٹرول میں تھے اور اس کی موت کے بعد میری ملکیت قرار دے دیے گئے۔ چنانچہ یہ لوگ اب میرے ماتحت ہیں، میں نے انہیں حقائق سے آگاہ کر کے تنظیم کا باغی بنا دیا ہے۔ یہ بات آرزک نہیں جانتا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میں کیوں اس کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں یہاں کی تنظیم کی سربراہی کی خاطر اسے زک پہنچا کر اوپر والوں کو اس سے بدظن کر دینا چاہتی ہوں۔ چنانچہ اسے اگر یہ پتا چل گیا کہ کون لوگ تنظیم میں میرا ساتھ دے رہے ہیں تو وہ ان نچلی سطح کے لوگوں کو بغاوت کا الزام لگا کر ختم کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں ان میں سے کسی کو اس کی نظروں میں آنے نہیں دینا چاہتی۔ جب تک کوئی مجبوری نہ آ پڑے۔ اس وقت تک میں اسے بے خبر رکھ کر زیادہ سے زیادہ جتنا بھی نقصان پہنچا سکوں پہنچا دینا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جب تک ہو سکے ان لوگوں کو ہر قسم کے شک و شبے سے دور رکھا جائے۔"

"اگر ایسا ہے تو تمہیں ان لوگوں کو ایسے معاملات سے دور ہی رکھنا چاہیے جن میں ان کی پوزیشن مشکوک ہو جانے کا احتمال ہو۔ آئندہ کسی ایسی مہم میں انہیں شامل نہ کرنا، آدمیوں کی ہمارے پاس کمی نہیں ہے۔ شرافت علی نے پوری فوج تیار کر رکھی ہے اور یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا کہ انہیں واپس بھیج دیا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فیکٹری کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کا بلند و بالا گیٹ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور دو ہیوی ٹرکس اس گیٹ سے گزر کر باہر آنے کے لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ سامنے سے گزرتے ہوئے سرسری نظر میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ ان ٹرکوں میں کیا تھا۔ لیکن حالات کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ٹرک ہمارے مقابلے کے لیے تازہ نفری لے کر باہر نکل رہے ہوں گے۔ فاطمہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا: "یہ ہمیں گھیرنے کے لیے ہی باہر آ رہے ہیں جنابِ عالی! ہم بہت بروقت نکل آئے ہیں ادھر سے۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ ہم جیسے ہی فیکٹری کے اگلے موڑ پر پہنچے، ہمیں پوری قوت سے اپنی اپنی گاڑیوں کو بریک لگا کر رکنا پڑا۔ اگر مجھ سے یا شرافت سے ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی تو ہم دونوں کی یا ہم میں سے کسی ایک کی گاڑی سامنے قطار باندھے کھڑے ہوئے تین ٹرکوں سے بری طرح ٹکرا گئی ہوتی۔ وہ تینوں ٹرک بھی بالکل ویسے ہی تھے جیسے ہم نے ابھی ابھی فیکٹری کے گیٹ میں کھڑے دیکھے تھے۔ وہ تینوں سڑک کی چوڑائی کو پوری طرح گھیرے ہوئے برابر کھڑے تھے۔ تینوں نے اپنے اپنے ہیڈلیمپس بجھا رکھے تھے، البتہ انجن ان کے اسٹارٹ تھے۔ ایک زوردار چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہماری گاڑیاں ٹرکوں سے چند انچ کے فاصلے پر جا ٹھہری تھیں۔ میرا دماغ بُری طرح جھنجھنا اٹھا تھا۔ میں نے جھنجھلاہٹ میں ان ٹرک ڈرائیوروں کو گالیاں دیتے ہوئے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ گرانا شروع کیا تاکہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر ان کی اس حرکت پر انہیں جی بھر کے گالیاں سنا سکوں۔ مگر فاطمہ نے جلدی سے مجھے روکتے ہوئے کہا: "یہ کیا کر رہے ہیں جنابِ عالی آپ؟ ریورس گیئر ڈال کے گاڑی کو تیزی سے بیک کریں، ہمیں گھیرا جا رہا ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسی کے ساتھ میری نظر شرافت علی کی کار پر جا پڑی، جو ایک جھٹکا لے کر تیزی سے پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ بے اختیار میں نے بھی ریورس گیئر ڈال کر اپنی کار کو پیچھے دوڑا دیا۔ ہمیں پیچھے ہٹتے دیکھ کر وہ تینوں ٹرک ایک ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ میں نے انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر کار کو واپس موڑنا چاہا تو پیچھے سے گل زمان بولا: "بے کار ہے جیلانی بھائی! ہمارے پیچھے فیکٹری کے گیٹ کے سامنے بھی دو ٹرک کھڑے ہو گئے ہیں اندر سے آ کر۔ انہوں نے ہمارے پیچھے جانے کا بھی راستہ بند کر دیا ہے۔"

"ہمیں دونوں طرف سے گھیر لیا گیا ہے جنابِ عالی! وہ دونوں ٹرک جو ہم نے فیکٹری کے گیٹ میں کھڑے دیکھے تھے، انہیں اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا وہاں۔ آگے تو انہوں نے سڑک بلاک کر ہی رکھی تھی۔ ہماری گاڑیاں ادھر آتے دیکھ کر واپسی کا راستہ بھی بند کر دیا ہے اب!" فاطمہ بولی۔

"راستہ تو ان کے باپ کو بھی دینا پڑے گا ہمیں۔ میں سامنے سے آنے والوں کو اڑا کر رکھ دوں گا ابھی۔" میں نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے انہیں راکٹوں سے اڑا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

میں ابھی وہ خفیہ خانہ کھول ہی رہا تھا کہ میں نے شرافت علی کی کار میں سے انگارے کی طرح دہکتی ہوئی کسی چیز کو تیزی سے سرسراتے ہوئے آگے والے ٹرکوں کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ انگارہ عین ٹرکوں کے اوپر جا کر ہلکی سی آواز کے ساتھ پھٹا اور بے شمار روشن ستارے سے فضا میں بکھر گئے۔ ان سے خارج ہونے والی روشنی اتنی تیز تھی کہ وہ پورا علاقہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ فاطمہ نے فکرمندی سے کہا: "اوہ، یہ کیا کیا شرافت علی نے۔ اس طرح تو وہ لوگ ہمیں بڑی آسانی کے ساتھ نشانہ بنا لیں گے۔ یہ روشنی نہیں کرنا چاہیے تھی اس کو۔"

"شرافت علی کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ تم دیکھتی رہو، ہوتا کیا ہے اب۔" میں نے اسے جواب دیا۔

عین اسی لمحے ایک دھماکے کے ساتھ ان تین میں سے ایک ٹرک کے پرخچے اڑ گئے اور اس میں سے آگ کے گولے اڑ اڑ کر ساتھ والے دونوں ٹرکوں پر جا جا کر گرنے لگے۔ ان ٹرکوں میں سوار لوگ ابھی صورتِ حال کو سمجھ بھی نہیں سکے تھے کہ ایک اور دھماکا ہوا اور ایک اور ٹرک اڑ گیا۔ ابھی اس دھماکے کی بازگشت بھی ختم نہیں ہو سکی تھی کہ تیسرے دھماکے کے ساتھ تیسرا ٹرک بھی فضا میں منتشر ہو گیا۔ پوری سڑک پر ان تینوں ٹرکوں کے جلتے ہوئے ملبے کے ساتھ ان میں سوار لوگ بھی ادھر ادھر زخمی یا مردہ حالت میں پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ جو زیادہ زخمی نہیں تھے، اٹھ اٹھ کر ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جان بچانے کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن اتنی روشنی میں کوئی جائے پناہ نہیں رہی تھی ان کے لیے۔ پھر اچانک ہی مخالف سمت سے گولیاں اولوں کی طرح برسنے لگیں اور پناہ کی تلاش میں بھاگنے والے اچھل اچھل کر گرنے لگے۔

"ارے! یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟ ادھر شرافت علی کی کار تو پیچھے آنے والے ٹرکوں کی طرف گھوم چکی ہے؟" فاطمہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ شرافت علی کی کار پیچھے فیکٹری کے گیٹ سے نکل کر سڑک کے درمیان حائل ہو جانے والے ٹرکوں کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ میں نے کہا: "اوہو، مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ادھر شرافت علی نے اپنے آدمی بٹھائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں دشمن کے گھیرے میں دیکھ کر یہ کارروائی کی ہے شاید۔ میں یہی سمجھ رہا تھا اب تک کہ یہ کام شرافت علی وغیرہ نے دکھایا ہے۔"

اچانک ہمارے عقب سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا۔ ادھر دونوں ٹرکوں اور فیکٹری کے گیٹ کی طرف سے تواتر کے ساتھ شعلے لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ دشمن شرافت علی کی کار پر اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی کار موڑ کر شرافت علی کی کار کی طرف دوڑاتے ہوئے آبی اور گل زمان سے کہا: "آبی! تم دونوں اپنی اسٹین گنیں سنبھال کر تیار رہو جاؤ۔"

فاطمہ بولی: "مگر یہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ کر ادھر کیوں جا رہے ہیں؟ پہلے انہیں ختم کر لیں ورنہ پیچھے سے یہ نہ ٹوٹ پڑیں ہم پر۔"

"ان کی تم پروا نہیں کرو۔ وہ لوگ جنہوں نے تینوں ٹرک تباہ کیے ہیں وہ سنبھال لیں گے انہیں۔ ہمیں شرافت علی کی مدد کرنا چاہیے۔"

میں کار دوڑا کر شرافت علی کی کار کے پاس جا پہنچا۔ شرافت علی نے مجھے اپنے قریب دیکھ کر چلا کے کہا: "جیلانی! راکٹ فائر کرو ان ٹرکوں پر۔ میرے پاس راکٹ ختم ہو چکے ہیں۔ جلدی کرو، ان ٹرکوں کو اڑا دو۔"

میں نے پھرتی سے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر بٹن دبایا۔ کار نے ہلکا سا جھٹکا کھایا اور دوسرے ہی لمحے میری کار کے سامنے کھڑا ہوا ٹرک فضا میں منتشر ہو کر جلنے لگا۔ میں نے تیزی سے رخ بدل کر دوسرے ٹرک کو نشانے پر لے کر ایک بار پھر بٹن دبایا۔ پلک جھپکنے میں دوسرا ٹرک بھی تباہ ہو گیا اور دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ آبی اور گل زمان نے دونوں ٹرکوں کے تباہ ہوتے ہی گاڑی چھوڑ دی۔ وہ دونوں کار سے باہر نکل کر اسٹین گنوں سے گولیاں برساتے ہوئے فیکٹری کے گیٹ کی طرف دوڑ پڑے جہاں سے اب تواتر کے ساتھ ہم پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ یہ صورتِ حال بہت ہی خطرناک تھی۔ ان گولیوں کے درمیان یوں کھلے میدان میں دوڑتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھنا بے حد خطرناک کام تھا۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں رکنے کے لیے آواز دیتا، وہ دونوں بہت آگے جا چکے تھے اور پھر وہی ہوا جس کے تصور سے خوف زدہ ہو کر میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں گیٹ کے نزدیک پہنچتے ہی دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ان کے جسموں سے میں نے خون کے فوارے چھوٹتے دیکھے تو میں تڑپ اٹھا۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر اپنی گن اٹھائی اور غصے سے دیوانہ ہو کر باہر نکلنا چاہا مگر فاطمہ نے تیزی سے میرا بازو تھام کر روکتے ہوئے کہا: "ارے ارے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ خودکشی کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "چھوڑ دو مجھے جانے دو۔ وہ دیکھو، انہوں نے آبی کو اور گل زمان کو زخمی کر دیا ہے۔ ہٹو میرا ہاتھ ۔۔۔۔ چھوڑ دو ۔۔۔۔ ان دونوں کو ۔۔۔ ان کو مدد کی ضرورت ہے ۔۔۔ جلدی چلو، ان کے جسم خون میں نہائے پڑے ہیں۔"

"صبر کریں جنابِ عالی! جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے اب۔ انہوں نے غلطی کی ہے۔ انہیں یوں اندھا دھند نہیں گھسنا چاہیے تھا ان کے درمیان۔ اب آپ بھی وہی غلطی کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ آپ باہر نہیں جائیں گے۔" اس نے مجھے اندر کھینچ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: "میں آپ کو مرنے کے لیے نہیں جانے دوں گی ۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ ۔۔۔"

"اوہ ۔۔۔ مجھے جانے دو ۔۔۔ چھوڑ دو، مجھے نہ روکو ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ بہت زخمی ہیں ۔۔۔ دیکھو دیکھو ۔۔۔ کیسے تڑپ رہے ہیں وہ ۔۔۔۔ لگتا ہے جیسے جان نکل رہی ہو ان کی ۔۔۔ وہ مر رہے ہیں فاطمہ! وہ مر رہے ہیں۔ انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہمت سے کام لیں جنابِ عالی! ایسے کاموں میں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسے بڑے بڑے نقصانات کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے ہر دم۔ یوں جذباتی ہو کر آپ اس نقصان کی تلافی کرنے کے بجائے اس میں اضافہ ہی کریں گے۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔

"مگر وہ ۔۔۔۔ وہ میرا یار آبی ۔۔۔۔ وہ دم توڑ رہا ہے میری آنکھوں کے سامنے۔ میں اسے یوں نہیں مرنے دوں گا۔ ہٹو مجھے جانے دو۔" میں نے اسے دھکا دے کر خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہا: "وہ میرا یار آبی ۔۔۔ وہ گل زمان مر جائیں گے وہ دونوں۔ انہیں مدد چاہیے ۔۔۔ بے وقوف لڑکی، مجھے جانے دو ان کی مدد کے لیے۔۔ میں انہیں اٹھا کر لے آؤں گا۔"

اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی کوشش کی اس کی گرفت سے نکل جانے کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے دو بازو کٹ کر گر پڑے تھے۔ میرا دل ان کے لیے مچل رہا تھا۔ میں انہیں موت کے منہ سے نکال لانا چاہتا تھا۔ اس وقت میری حالت ناقابلِ بیان تھی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ مجھے فاطمہ کا اس وقت کا روکنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرا جگری یار آبی، اور میرے لیے اپنی جان پر کھیل جانے کو ہر دم تیار رہنے والا گل زمان میرے سامنے لہو میں نہائے پڑے تھے اور وہ مجھے ان کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ ان کی مدد سے روک رہی تھی مجھے۔ میں نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا: "چھوڑ دے مجھے الو کی پٹھی، جانے دے مجھ کو ان کی مدد کے لیے۔ وہ مر رہے ہیں ۔۔۔ انہیں مدد کی ضرورت ہے۔"

میں اسے گالیاں دے رہا تھا، برا بھلا کہہ رہا تھا مگر وہ کسی طرح بھی مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میری ہر بات کا صرف ایک ہی جواب تھا اس کے پاس: "نہیں جنابِ عالی! میں آپ کو خودکشی نہیں کرنے دوں گی۔"

شرافت علی کی کار میری کار کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ وہ لوگ بھی میری اس وقت کی کیفیت کو دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ مجھے فاطمہ کے ہاتھوں سے نکلنے کی شدید جدوجہد کرتے دیکھ کر خان، اس کار سے اتر کر ہماری کار میں آ گھسا۔ اس نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ سے دھکیل کر اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے فاطمہ سے کہا: "تم اسے پکڑے رہو مضبوطی سے، میں کار لے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اسی لمحے میرے کانوں نے پولیس کار کے سائرن کی آواز سنی جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ خان نے یہ آواز سنتے ہی کہا: "اوہ، لگتا ہے پولیس آ رہی ہے ادھر ہی۔" اس نے کار کی رفتار بڑھا کر اسے مخالف سمت میں پوری رفتار کے ساتھ دوڑانا شروع کر دیا۔

وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانے کے لیے تیزی سے کار دوڑاتا چلا جا رہا تھا اور میرا دل جیسے اندر ہی اندر بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ آبی کبھی بھی مجھے آفت میں گھرا چھوڑ کر اپنی جان بچا کے نہیں بھاگا تھا۔ اس نے برے سے برے حالات میں بھی میرا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا کبھی اور یہ لوگ ایسے وقت میں مجھے اس کے پاس سے لے بھاگے تھے جب وہ گولیوں سے چھلنی، خون میں ڈوبا پڑا تھا اور موت تیزی سے اس کی طرف لپکی چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے ایسا کسی بری نیت سے نہیں کیا تھا۔ وہ بھی میرے ہمدرد دوست تھے اور میری زندگی انہیں اتنی ہی عزیز تھی جیسی مجھے آبی اور گل زمان کی زندگیاں عزیز تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت اگر انہوں نے مجھے آبی اور گل زمان کے قریب جانے دیا تو میری زندگی سے بھی ان کو ہاتھ دھو لینا پڑیں گے۔ میں جذبات میں اندھا ہو رہا تھا۔ مجھے دم بہ دم موت کی تاریک وادی کی طرف بڑھتے ہوئے آبی اور گل زمان کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس سمے۔ ایسے میں فاطمہ مجھے نہ پکڑ لیتی تو میری زندگی کی بھی آخری رات ثابت ہوتی وہ مگر میرے ان ہمدردوں نے مجھے اس رات موت کی اس وادی میں اترنے نہیں دیا اور وہاں سے نکال ہی لائے کسی نہ کسی طرح۔

گھر آ کر بھی میرا جنون کم نہیں ہوا تھا۔ خان، انور کمال اور شرافت علی مجھے پکڑ پکڑ کر زبردستی روکے ہوئے تھے اور میں تڑپ تڑپ کر ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ ان سب کو پتا نہیں کیا کیا کہہ ڈالا تھا میں نے۔ آسیہ اور فردوسی بیگم بھی جاگ گئی تھیں اور اپنے اپنے بستروں سے اٹھ کر میرے پاس آ کر مجھے دلاسے اور تسلیاں دے دے کر سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں اور جب کسی طرح بھی میرا

جنون کم نہیں ہوا تو وہ جا کر ماں جی کو بلا لائیں۔ ماں جی کو دیکھ کر میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی اور میں تڑپ کر بلکتا ہوا ان کے سینے سے جا لگا اور پھر میری آنکھیں بے طرح برس پڑیں، اشکوں کا ایسا سیلاب آیا کہ سب کچھ اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ زندگی میں بے شمار دکھ دیکھے تھے میں نے۔ پتا نہیں کتنے ایسے موقعے آئے تھے کتنی راتیں ایسی گزری تھیں مجھ پر جب ضبط کے سارے بند ٹوٹنے لگے تھے، مگر ہر بار میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ مگر اس رات ایسا منتشر ہوا تھا میں، اس طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا کہ کسی سے سمیٹا نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں، ماں کے سینے میں کتنا سکون بھر رکھا ہے ربِ کائنات نے اولاد کے لیے۔ کتنی راحت ہے ممتا میں کہ ماں جی کے سینے سے لگ کر آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب میرے بے تاب جذبوں کو سکون سے آ گیا، میری بے قراری قرار پا کر ساکت ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ کب میں سسکیاں لیتے لیتے ماں جی کی آغوش میں سو گیا تھا۔

وہ رات میری زندگی کی سب سے زیادہ تاریک سب سے زیادہ المناک رات تھی۔ اس سیاہ رات نے مجھ سے میرا رفیق، میرا ہمدم، میرا یار آبی چھین لیا تھا اور اس کے بغیر میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا سمجھنے لگا تھا۔ اس رات میری زندگی کی ساری حرارت، ساری توانائی ختم ہو گئی تھی۔ میں ادھورا رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے دونوں بازوؤں سے محروم ہو گیا ہوں۔ اس وقت اگر فاطمہ، شرافت علی، انور کمال اور خان جیسے مخلص اور محبت کرنے والے لوگ میرے ساتھ نہ ہوتے تو میری زندگی کی کہانی، میری یہ آرزوؤں، امنگوں اور جذبوں بھری داستان اس رات تمام ہو گئی ہوتی اور آج کسی کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ غلام جیلانی نام کا کوئی گم کردہ راہ شخص بھی اس دنیائے ناپائیدار میں کبھی آیا تھا کچھ دن گزارنے۔ کسی ایسے شخص نے بھی اس سرائے فانی میں کچھ دن قیام کیا تھا اور اپنے مختصر سے قیام کے دوران کتنے ہنگامے کر گیا تھا وہ۔ آبی کے بعد بھی میرے چاہنے والے بہت باقی تھے یہاں، میرے گرد ایسے جاں نثار بھی موجود تھے جو میرے لیے جان سے گزر سکتے تھے اور میرا ہر دکھ بانٹنے کو ہر دم تیار رہتے تھے۔ مگر آبی کے بغیر میرے لیے یہ دنیا بے رنگ، بے لطف اور بے کار سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بس ایک ماں جی کی ذات ایسی تھی جن کے ساتھ بیٹھ کر اور جن کی باتیں سن کر کچھ ڈھارس بندھتی تھی اور جن کی صورت دیکھ کر جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

اس واقعے نے آسیہ کی صورت کو بھی دھندلا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر رنج و الم کے سائے منڈلاتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے حسین چہرے کی ساری رعنائی ماند پڑ گئی تھی، کسی شاخ سے توڑ لیے جانے والے پھول کی طرح مرجھا کر رہ گئی تھی۔ زندگی کی حرارت اس میں بھی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا، وہ اور آبی ایک دوسرے کے قریب آ چکے ہیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا مجھے کہ ان کی رفاقت اتنی گہری، اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ آبی کے بغیر جینے کا حوصلہ ہی ہار جائے گی، اس سے بچھڑ کر یوں مرجھا کر رہ جائے گی۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت زیادہ باہمت اور حوصلے والی تھی۔ گو اس کا دل خود اچاٹ ہو گیا تھا، آبی کے بعد وہ خود بکھر گئی تھی لیکن میری ڈھارس بندھانے اور مجھ میں جینے کا حوصلہ پیدا کرنے میں وہ سب سے زیادہ پیش پیش تھی۔ وہ میرے سینے میں آبی کے خون کے انتقام کی آگ کو ہوا دے کر مجھ میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی تھی اور یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ میری زندگی کی داستان میں کچھ اور اوراق کا اضافہ ہو گیا۔

ہم آبی اور گل زمان کو جس حال میں چھوڑ کر آئے تھے اور جس طرح میں نے انہیں گولیاں کھا کر گرتے اور ان کے جسموں سے خون ابلتے دیکھا تھا اس کے بعد ان کے زندہ رہنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ آبی اور گل زمان ابھی زندہ ہیں۔

میرا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مر سکتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ایسے ایسے تندرست اور توانا انسانوں کو یوں پل بھر میں مرتے دیکھا تھا جیسے ہوا کا ایک جھونکا پورے اعتماد سے جلتے ہوئے چراغ کی لو کو بجھا دیتا ہے۔ زندگی کو میں نے ہمیشہ پانی کے بلبلے کی طرح بے اعتبار اور بے ثبات پایا ہے، پھر بھی میں نے اس وقت تک ان دونوں کی موت کا یقین نہیں کیا تھا جب تک اخبار میں اس المناک خبر کی پوری تفصیل نہیں پڑھ لی تھی۔

اخبارات میں اس واقعے کی خبر جس طرح شائع ہوئی تھی اسے پڑھ کر مجھے کوئی حیرت اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے وہی کچھ لکھا تھا جو فیکٹری کی انتظامیہ اور پولیس نے انہیں بتایا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"رات کو نصف شب کے قریب بدنام ڈاکو غلام جیلانی نے سائٹ کے علاقے میں ایک فیکٹری کو لوٹنے کی کوشش کی جو فیکٹری کے نگراں عملے کی بروقت مداخلت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ ڈاکو بہت بڑی تعداد میں دستی بموں اور دیگر خطرناک قسم کے آتشیں اسلحے سے لیس ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے فیکٹری میں گھسنے کے لیے ایک جانب کی دیوار توڑ کر نقب لگا لی تھی لیکن وہ ابھی اندر گھسنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ فیکٹری کے نگراں عملے کی ایک گشتی پارٹی وہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کو للکارا تو ڈاکوؤں نے ان کی گاڑیوں پر راکٹ لانچر کے ذریعے گولے برسانا شروع کر دیے جس کے نتیجے میں نگراں عملے کی گاڑی تباہ ہو گئی اور اس میں سوار پانچ نگراں بھی ہلاک ہو گئے۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سن کر فیکٹری کی نگرانی پر مامور عملہ چار گاڑیوں میں بھر کر اس طرف دوڑ پڑا جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے دو طرف سے ڈاکوؤں کو گھیرنے کی کوشش کی مگر ڈاکوؤں نے ان چاروں گاڑیوں کو بھی راکٹ لانچر سے راکٹ برسا کر تباہ کر دیا اور عملے کے بیس افراد کو ہلاک کر ڈالا۔ اس زبردست تباہی کے بعد ڈاکوؤں نے جائے واردات سے فرار ہونے کی کوشش کی تو انتظامیہ نے جو پولیس کو ٹیلیفون پر اطلاع دے چکی تھی ٹرک کے دونوں طرف پانچ ٹرک کھڑے کر کے ڈاکوؤں کو پولیس کی آمد تک وہاں روکے رکھنے کی کوشش کی مگر ڈاکوؤں نے دستی بموں اور راکٹوں کے ذریعے ان ٹرکوں کو بھی تباہ کر دیا اور گولیاں برساتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ساری کارروائی کے دوران فیکٹری کے نگراں عملے کے پچیس افراد جاں بحق ہو گئے جبکہ پندرہ ڈاکو ہلاک ہوئے جن میں ایک کے سوا باقی سبھی مختلف جرائم کی سزا کے طور پر جیل میں رہ چکے تھے۔ ایک ڈاکو کی شناخت نہیں ہو سکی۔ ہلاک ہونے والے ڈاکوؤں میں راولپنڈی جیل کا ایک مفرور مجرم اسلم آبی بھی شامل ہے۔ خیال رہے کہ اسلم آبی لاہور کے خطرناک ڈاکو اور سزائے موت کی کوٹھری سے مفرور مجرم غلام جیلانی کا دستِ راست تھا۔ اس کی لاش کو شناخت کرنے کے بعد ہی پولیس یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے کہ یہ واردات غلام جیلانی کے گروہ نے کی ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ کئی ماہ سے غلام جیلانی اور اسلم آبی کا نام کراچی میں ہونے والی کئی قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں کے سلسلے میں اخبارات میں آ رہا ہے۔ گزشتہ دنوں وہ دونوں کراچی ریلوے اسٹیشن پر غلام جیلانی کی بہن آسیہ کو پولیس کی تحویل سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ غلام جیلانی اور اسلم آبی کی طرح آسیہ بھی قتل اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب ہے۔"

پولیس اور اخبارات نے اس ساری کارروائی کو ڈاکا زنی کی واردات قرار دیا تھا اور فیکٹری کی انتظامیہ نے اپنے پالتو غنڈوں کو میرا ساتھی ٹھہرا کر ان کی ہلاکت کو ڈاکوؤں کی ہلاکت بتا کر اپنے محافظوں کا کارنامہ قرار دیا تھا۔ حالانکہ مرنے والوں میں آبی اور گل زمان کے سوا ہمارا کوئی آدمی شامل نہیں تھا۔ مرنے والوں کی کل تعداد چالیس تھی جن میں اڑتیس آدمی ان کے اور دو ہمارے تھے مگر ان لوگوں نے اس حقیقت کو بالکل الٹ دیا تھا۔ پندرہ آدمی ہمارے کھاتے میں ڈال کر وہ پولیس کے سامنے اس جواب دہی سے بچ گئے تھے کہ انہوں نے ایک چھوٹی سی فیکٹری کی حفاظت کے لیے اتنی بڑی فوج کیوں رکھی ہوئی ہے۔ فیکٹری میں ایسی کیا چیز ہے جس کی حفاظت کے لیے انہیں اتنے سارے محافظوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ مرنے والے وہ تیرہ افراد مختلف جرائم میں سزا یافتہ تھے جن کا ریکارڈ پولیس کے پاس موجود تھا۔ اگر وہ انہیں اپنا آدمی تسلیم کر لیتے تو انہیں یہ جواب دہی بھی کرنا پڑتی کہ ایسے مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث افراد کو فیکٹری کی نگرانی کے لیے کیوں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ فیکٹری کی انتظامیہ نے ان سب کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر خود کو ہر قسم کی جواب دہی سے بچا کر قانون کی حمایت حاصل کر لی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بیان کی تردید کرنے ہم نہ تو پولیس کے سامنے جائیں گے اور نہ ہی اخبارات کے دفاتر کے چکر لگانا پسند کریں گے لہٰذا انہوں نے سب کچھ ہمارے سر منڈھ کر خود کو مظلوم ثابت کر دیا تھا۔

میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی کہ انہوں نے پولیس کو کیا بیان دیا تھا۔ میرا جو اعمال نامہ پولیس نے تیار کر رکھا تھا اس میں پتا نہیں کتنے کردہ اور ناکردہ گناہ درج کر رکھے تھے اس نے۔ جن کی اگر میں تردید بھی کرتا تو کوئی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا لہٰذا میں اس چکر میں پڑتا ہی نہیں تھا۔ میں موت کی کوٹھری سے بھاگا ہوا ایک ایسا مجرم تھا جسے عدالت سزائے موت کا حکم سنا چکی تھی اور جب بھی میں پولیس کے ہاتھ لگ جاتا اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے مجھے سیدھا تختۂ دار پر لے جانا تھا لہٰذا میرے لیے اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ انہوں نے میری فائل کے صفحات کس طرح سیاہ کر رکھے ہیں۔

میں ایک کمرے میں منہ چھپائے پڑا آبی کا سوگ منا رہا تھا۔ اور لڑکی میرے وطن کے دشمن آرزک کی تلاش میں ادھر اُدھر شب خون مارتی پھر رہی تھی۔ اس دوران اس نے بڑی تباہی مچائی تھی، کئی خونریز مقابلوں میں آرزک کو اتنا شدید نقصان پہنچایا تھا اس نے کہ کراچی کی حد تک تو تنظیم تقریباً تباہ و برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب اور حیران کن بات یہ تھی کہ شرافت علی، انور کمال اور خان ـــــ کے علاوہ ان معرکوں میں آسیہ بھی اس کے ساتھ شریک رہی تھی۔ وہ اب اس جدوجہد میں آبی کا انتقام لینے کی غرض سے شریک ہوگئی تھی یہ بات صرف میں ہی جانتا تھا، ورنہ دوسروں کا تو شاید یہی خیال رہا ہوگا کہ وہ میری وجہ سے ان کے ساتھ شریک ہوئی ہے۔

دو ہفتے کے بعد میری حالت کچھ بہتر ہونے لگی، سچ کہتے ہیں لوگ کہ مرنے والوں کا غم دیرپا نہیں ہوتا آخر کار صبر آ ہی جاتا ہے ان پر، اور مجھے بھی صبر آ ہی گیا تھا اور اب میں دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر کچھ ہنسنے بولنے لگا تھا۔ ایک دن جب میں آسیہ اور فردوسی بیگم کے ساتھ خوشگوار موڈ میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ فاطمہ بھی آ کر ہماری گفتگو میں شریک ہو گئی۔ میں اسے کئی دن سے کچھ فکرمند دیکھ رہا تھا مگر اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت

بھی وہ باتیں تو ہمارے ساتھ ہی کر رہی تھی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس دوران اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے اچانک کسی سوچ میں گم ہو جاتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا: "کیا بات ہے فاطمہ! میں تمہیں دو چار دن سے کچھ فکرمند اور پریشان سا دیکھ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے نا؟"

اس نے یوں چونک کر مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو اس سے جس کی مجھ سے توقع نہیں رہی ہو اسے۔ چند ثانیے ایسی ہی نظروں سے وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی: "آپ نے تو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، آپ کو اب کسی بات کی کیا پروا ہے؟"

"تم نے غلط اندازہ لگایا ہے میرے بارے میں۔ کنارہ کشی تو میں نے کسی طرح بھی اختیار نہیں کی ہے اور نہ ہی ایسا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں، حالانکہ آپ کے کسی عمل سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے اور دنیا سے آپ کی ساری دلچسپی صرف آبی کی زندگی تک ہی تھی۔ اس کے بعد نہ تو آپ نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں اور نہ ہی اپنے کسی بھی عمل سے یہ ظاہر کیا ہے کہ آپ کے لیے دنیا میں کوئی دلچسپی باقی ہے ابھی، آپ نے تو یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کبھی کہ جس نیک مقصد کے لیے آبی نے اور گل زمان نے اور فیروز نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں اس کا اب بنا کیا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "بہت ناراض معلوم ہوتی ہو تم مجھ سے اس بات پر۔ کیوں؟"

"نہیں، غلط اندازہ لگایا ہے یہ آپ نے۔ میں کیوں ناراض ہوں گی آپ سے، مجھے حق کیا ہے اس کا؟" وہ اداسی سے بولی۔

میں اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا اور بولا: "اوہ، تم تو واقعی بہت ناراض ہو بھئی۔ آخر کچھ وجہ بھی تو بتاؤ اس کی؟"

اس کے بجائے آسیہ نے کہا، "بھائی جان! آپ نے جس طرح خود کو ہر معاملے سے الگ تھلگ کر کے ایک کمرے تک محدود کر لیا ہے، اس بات نے آپ کے سب ہی دوستوں اور بہی خواہوں کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ سب لوگ آپ سے کس قدر محبت کرتے ہیں، کتنا چاہتے ہیں یہ آپ کو، اور اب آپ کے بغیر یہ لوگ اپنے آپ کو کتنا بے سہارا، بے امان سمجھنے لگے ہیں۔ اس دوران انہوں نے دشمن کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ خوب مقابلہ کیا ہے اس کا اور کمر توڑ کر رکھ دی ہے تنظیم کی کراچی میں۔ لیکن اس سارے وقت میں یہی محسوس ہوتا رہا ہے کہ جیسے کوئی فوج بغیر سالار کے میدان میں اتر پڑی ہے یا جیسے بھیڑ بکریوں کا یہ ایسا ریوڑ ہے جسے کسی گلہ بان، کسی گڈریے کے بغیر ہی ہانک دیا گیا ہے جنگل کی طرف۔ لہٰذا اب ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ آپ دوبارہ اس جہاد میں پہلے جیسی دلچسپی کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ فاطمہ اس وقت یہی کہنا چاہ رہی ہیں آپ سے۔"

"تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ میں تم لوگوں سے الگ تو نہیں ہوا ہوں۔ تم لوگ خود ہی پتا نہیں کیوں دور دور رہنے لگے ہو مجھ سے، اپنے کسی معاملے میں بات تک نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی پروگرام بتاتے ہو۔ بالا ہی بالا تمام کام کرتے رہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ الٹا ہمیں ہی الزام دے رہے ہیں۔ آپ کی گوشہ نشینی اور زندگی سے بیزاری دیکھ کر کون کچھ کہنے کی ہمت کرتا آپ سے؟" فاطمہ بولی۔

"اچھا اچھا، چلو چھوڑو اس قصے کو۔ اب کہو کیا بات کہنا چاہتی ہو۔ کون سا اہم مسئلہ درپیش ہے اس وقت تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سب سے اہم تو وہ آٹزک ہی ہے فی الحال۔ یہاں کراچی میں تو ہم نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور اب میں چاہتی ہوں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو سکے اس کا قصہ پاک کر دینا چاہیے ہمیں ورنہ وہ یہ شہر چھوڑ کر بھاگ جائے گا اور ہمیں اس کے تعاقب میں خیبر کے اس پار تک جانا پڑے گا پھر، اور پھر بھی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہاتھ آ ہی جائے گا ہمارے۔" فاطمہ نے مجھے آمادہ دیکھ کر کہا۔

"تم پروا نہیں کرو فاطمہ! اس کتے کو مارنے کے لیے مجھے خیبر تو کیا دنیا کے دوسرے کنارے تک بھی جانا پڑا تو ضرور جاؤں گا میں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن یہ تم نے خیبر کے اس پار جانے والی کیا بات کی ہے۔ وہ خیبر پار کیوں جائے گا؟ یہاں سے بھاگ کر تو اسرائیل جانا چاہیے اسے؟"

"ہزیمت اٹھانے کے بعد وہ اسرائیل کی طرف رخ بھی نہیں کرے گا جناب عالی! وہ واپس جا کر اپنی قوم کا سامنا نہیں کر سکے گا۔ جس قدر نقصان ہم نے پہنچایا ہے تنظیم کو یہاں، اس نقصان کا تو انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس کی تمام تر ذمے داری آٹزک ہی پر ڈالی جائے گی اور ممکن ہے حکومت کی طرف سے اسے کوئی سزا بھی دے دی جائے۔ چنانچہ وہ اسرائیل جانے کے بجائے یہیں رہ کر ان نقصانات کی تلافی کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ ان دنوں خیبر پار کوہ سفید کے علاقے میں واقع تنظیم کے زیرِ انتظام چلنے والی اس فیکٹری میں موجود ہیں جو کچھ ہی عرصہ قبل ہیروئن تیار کرنے کے لیے وہاں لگائی

گئی ہے۔" فاطمہ نے بتایا۔

اس کے اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے حیرانی سے تکتے ہوئے کہا: "آج سے پہلے تم نے اس فیکٹری کا ذکر نہیں کیا کبھی۔"

وہ بولی: "اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے خود بھی اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ آج ہی معلوم ہوا ہے مجھے بھی، محض اتفاقاً۔"

"لیکن آرنک وہاں جا کر کیا کرے گا؟ اور اس کے وہاں جانے کا ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کی وہاں موجودگی سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت گہرا تعلق ہے۔ ڈاکٹر دھمن اور آرنک ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔ وہ دھمن سے مدد کی درخواست کر سکتا ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ڈاکٹر دھمن اس کی درخواست مسترد نہیں کرے گا۔ وہ اس کی مدد کے لیے یہاں ضرور آئے گا۔ لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے ہی آرنک کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور اس کے لیے آپ کا میدانِ عمل میں ہونا بے حد ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

"ہوں" میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا: "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی فاطمہ! دھمن پاکستان آنے کے بعد پورا ملک عبور کر کے کوہ سفید تک چلا گیا اور اپنے اس عزیز ترین دوست سے ملنا تک پسند نہیں کیا۔ آخر ایسا کیوں کیا اس نے؟"

وہ بولی: "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا جنابِ عالی! کہ وہ یہاں آیا تھا؟ وہ کراچی نہیں آیا تھا۔"

"پھر... پھر....؟ کراچی آئے بغیر تو اس کا وہاں پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کراچی نہیں آیا تھا تو پاکستان کے اس آخری کونے تک کس طرح جا پہنچا؟ کیا کوئی اور بھی راستہ ہے وہاں پہنچنے کا جس کا مجھے علم نہیں ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کمال ہے آپ نہیں جانتے اس راستے کو۔" وہ بولی: "وہ افغانستان کے راستے سے پہنچا ہے وہاں۔ سمجھے آپ؟"

"اوہ، ہاں، اس کا تو بالکل بھی خیال نہیں تھا مجھے۔" میں چونک کر سنبھلتے ہوئے بولا: "کیا تم اسے کسی طرح کراچی نہیں بلا سکتیں فاطمہ؟"

"کیوں؟ آپ اسے یہاں کیوں بلانا چاہتے ہیں؟ اس کا کراچی آنا ہمارے لیے اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ وہ آرنک کا مددگار، اس کا حمایتی بن کر ہمارے مقابل کھڑا ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لیں وہ اور آرنک یکجا ہو گئے تو ایک اور ایک مل کر گیارہ ہو جائیں گے وہ۔" فاطمہ بولی۔

"اس کی تم پروا نہیں کرو۔ اس بار اسے جانا نہیں چاہیے۔ کسی طرح بھی اسے یہاں لانا ہے۔ مجھے اپنا حساب برابر کرنا ہے اس سے۔" میں بولا۔

"اگر ایسا ہے تو اسے یہاں بلانے کے بجائے ہم خود چلے چلتے ہیں اس کے پاس۔ لیکن پہلے آرنک کا کام تمام کر لیں ہم۔" فاطمہ نے کہا۔

"اس سے نمٹنے میں اگر دیر ہو گئی تو وہ دھمن ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آرنک تو یہیں ہے ہم اس سے بعد میں بھی نمٹ سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر دھمن بھی وہیں رہے گا۔ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں، وہ کہیں نہیں جائے گا، کیوں کہ اسے اس فیکٹری کا انچارج بنا کر بھیجا گیا ہے، فیکٹری کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کی ذمّے داری سونپی گئی ہے اسے۔ اس کام کے لیے تو اسے مستقل یہیں رہنا پڑے گا۔" فاطمہ نے کہا۔

"یہ تم نے پہلے نہیں بتایا تھا مجھے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک بات بتا کر لطف لیتی ہو تم، ایک ہی بار میں ساری بات نہیں بتاتیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے، پہلے ہم اس یہودی کتّے سے نمٹ لیتے ہیں۔ آج کل وہ کہاں ہے کچھ پتا ہے تمہیں؟" میں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"جہاں کہیں بھی ہو گا جلد ہی پتا لگ جائے گا ہمیں، بس آپ تیار رہیں۔ اس بار ہم نے چھوڑنا نہیں ہے اسے۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

"چھوڑیں گے کیسے، آخر ہمیں آپی کا اور گل زمان کا انتقام بھی تو لینا ہے۔ ہم تو اس کی جڑیں بنیادیں تک اکھاڑ پھینکیں گے یہاں سے۔" آسیہ بولی۔ "اور اس دھمن اور اس کی بیوی عالیہ کو بھی ضرور دیکھنا ہے، چھوڑنا انہیں بھی نہیں ہے۔ ہمیں برباد کرنے والے تو وہی ہیں۔"

"تم اس کی فکر نہیں کرو آسیہ! دھمن کی اسرائیل نوازی کی وجہ سے تو عالیہ بھی اس سے نفرت کرنے لگی۔ وہ بھی اس کے خلاف ہمارا ساتھ دے گی۔ ہم اسی کی مدد سے دھمن کی گردن ناپنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ فیکٹری بھی نہیں رہنے دیں گے ہم وہاں۔" فاطمہ نے کہا۔

"تم کیا بات کر رہی ہو، وہ عالیہ تو اس کی خاص دست راست ہے۔ وہ اس کے خلاف ہمارا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے!" آسیہ نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں آسیہ؟ اب ایسا نہیں ہے۔ تم کو پتا نہیں ہے، وہ دھمن کی یہود نوازی کی وجہ سے اس کے خلاف ہو چکی ہے۔ اس نے سان فرانسسکو میں بھی میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ یہ فاطمہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں اس کا تعاون حاصل رہے گا۔" میں نے آسیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، یہ تو بہت ہی حیرت کی بات ہے۔ وہ خونخوار عورت اگر خلاف ہو گئی ہے دھمن کے تو سمجھ لو اس دھمن کا بُرا وقت آن پہنچا ہے۔" آسیہ بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک کہا ہے تم نے، اس کی تقدیر کی گردش ہی اسے اس بار یہاں کھینچ لائی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"کس کو کہہ رہے ہو بھئی، کس کی تقدیر گردش میں آ گئی ہے، مجھے بھی تو بتاؤ کچھ؟" شرافت علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آؤ آؤ یار شرافت علی! کہاں رہتے ہو آج کل، تمہاری تو شکل ہی دکھائی نہیں دیتی ہے؟" میں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شرافت علی ایک دنیا دار انسان ہے بھائی! دنیا کے معاملات میں الجھائے رکھتا ہے اپنے آپ کو، حالانکہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے، ... کا کچھ بھی سامان نہیں چھوڑا ہے ظالموں نے اس کے لیے، مگر ... بھی اس نے زندگی کا ایک مقصد ایک مصرف نکال ہی لیا ہے۔ ... تمہاری طرح درویشی لے کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کی ہے۔ پھر درویشوں ... دنیا دار لوگ دکھائی کہاں دیتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

میرے دل پر چوٹ سی پڑی تھی اس کی بات سن کر۔ یہ بات ... شاید سب سے زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تو صرف ایک ... کو کھویا تھا اور یوں دنیا سے بے زار ہو کر بیٹھ گیا تھا، اس کا تو سب کچھ چھن گیا تھا، پوری کی پوری نسل ختم ہو گئی تھی اس کی، نام مٹ گیا تھا صفحۂ ہستی سے اس کے باپ دادا کا لیکن اس کے باوجود ... میری طرح ہمت ہار کر نہیں بیٹھ گیا تھا، اپنے اس عظیم مقصد کو نہیں بھولا تھا جس کے لیے اتنی عظیم قربانی دی تھی اس نے اپنے وطن اور ... ارضِ پاک کی سلامتی کی خاطر وہ یہ صدمۂ جانکاہ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ سہہ گیا تھا۔ دل ہی دل میں اپنی اس کم ہمتی پر میں اپنے ... کو سخت سست کہے بغیر نہیں رہ سکا اور میرا سر جھک گیا۔ آنکھیں ... ہو گئیں اس کے سامنے۔ میں نے خجل ہو کر دھیمی آواز میں کہا: "مجھے شرمندہ نہ کر میرے بھائی! مجھے احساس ہے کہ میں بہت خود غرض ثابت ہوا ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر یار! یہ میرے اختیار کی چیز تو نہیں تھی، آپی کی موت نے سوچنے سمجھنے کی طاقت ختم کر دی تھی میری۔"

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا جیلانی! میں تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا یار!" وہ ... سے بولا۔

"مجھے پتا ہے یار! اعتراف ہے مجھے تیرے خلوص اور میری محبت کا۔ میں کوئی شکوہ تو نہیں کر رہا ہوں تجھ سے۔ جن کے دل میں پیار ہوتا ہے، چاہت ہوتی ہے کسی کے لیے، وہی محسوس کرتے ہیں آدمی کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو۔ تجھ سے پہلے یہ فاطمہ بھی مجھے یہی احساس دلا رہی تھی۔ میں نے سچ مچ آپی کا غم سینے سے لگا کر خود کو مُردوں میں شامل کر لیا تھا۔ زندگی کو اور زندہ لوگوں کو بھول ہی بیٹھا تھا میں۔ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا جو مجھے اس موت کی نیند سے بیدار کر کے میری ذمّے داری، میرے فرض کا احساس دلایا مجھے۔" میں نے اس سے کہا۔

"اچھا اچھا، اب ختم کرو ان دل جلانے والی باتوں کو۔ میں ان باتوں کے لیے نہیں آیا ہوں اس وقت۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے ماں جی کے عمرے کے لیے جانے کا انتظام مکمل کر دیا ہے۔ اب تم ان سے بات کر کے مجھے بتا دو تو ان کے لیے جہاز میں سیٹ بک کرا لی جائے۔" وہ بولا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا شرافت علی! یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ آسیہ! تو جا کے ماں جی کو بلا لا، ہم ان سے ابھی بات کر لیتے ہیں بلکہ میں ان سے کہہ دیتا ہوں آج سے ٹھیک ساتویں دن ان کی روانگی ہے۔ سارا انتظام ہو چکا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ بالکل ٹھیک بات کہی ہے آپ نے بھائی جان! آپ ہی کہیں ان سے۔" آسیہ نے کہا اور اٹھ کر ماں جی کو بلانے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد فاطمہ بولی: "ماں جی کی طرف سے تو اطمینان ہو جائے گا جنابِ عالی اس طرح، مگر آپ نے فردوسی بیگم کے لیے بھی سوچا ہے کچھ؟"

میں نے اور فردوسی بیگم نے ایک ساتھ چونک کر اسے دیکھا اور میں نے پوچھا: "کیا مطلب ہے تمہارا، میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ فردوسی بیگم کو کیا ہوا ہے؟ اس کے بارے میں کیا پریشانی ہے؟ کیوں فردوسی! کیا بات ہے؟" میں نے فردوسی کو بھی مخاطب کیا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں جیلانی! انہی سے پوچھیں آپ۔ میں تو خود نہیں سمجھ سکی ہوں یہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔" فردوسی بیگم نے جواب دیا۔

"کیوں فاطمہ، کیا بات ہے؟ صاف بات کرو، کون سی گرہ ہے تمہارے دل میں فردوسی بیگم کی طرف سے؟" میں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"گرہ ورہ کوئی نہیں ہے جنابِ عالی! آپ شک نہ کریں کسی قسم کا بھی۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ ماں جی کا تو آپ لوگوں نے معقول انتظام کر دیا ہے لیکن کیا فردوسی بیگم کا بھی کچھ خیال کیا ہے آپ نے۔ آرنک سے جو خطرہ ماں جی کو ہو سکتا ہے وہی ان کو بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی حفاظت کی بھی اتنی ہی ذمّے داری ہے ہمارے کاندھوں پر لہٰذا ان کی حفاظت کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔" فاطمہ

وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن یہ خیال کیوں آیا ہے تمہارے دل میں؟ کیا تمہارے خیال میں انہیں یہاں ہمارے ساتھ کوئی خطرہ ہے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تو انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے شرافت بھائی! لیکن میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو اب آئندہ حالات یہ نہیں رہ سکیں گے۔ بہت جلد ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا ہے ہمیں اور اس کا انجام کیا ہوگا یہ تو ابھی کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ اس جہاد میں ہم سب ہی کام آ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ان کا کیا بنے گا؟" فاطمہ نے کہا۔

فردوسی بیگم جلدی سے بولی: "اس سلسلے میں آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنی تقدیر کو آپ لوگوں کی تقدیر سے وابستہ کر چکی ہوں۔ جو کچھ آپ سب کے ساتھ ہوگا وہی میرے ساتھ ہوگا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ میں کوئی تنہا تو نہیں ہوں نا۔"

"یہ فاطمہ ٹھیک کہہ رہی ہیں فردوسی بیگم! یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ حالتِ جنگ میں ہیں اس وقت اور کس وقت کس لمحے کیا ہو جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔ چنانچہ ان غیر یقینی حالات میں آپ کا ہمارے ساتھ رہنا دانشمندی نہیں ہے۔" شرافت علی بولا۔

"دیکھیں شرافت بھائی! یہ دل دکھانے والی باتیں نہیں کریں مجھ سے۔ میرا ہے ہی کون اس دنیا میں آپ لوگوں کے سوا، یہاں رہ کر اور آپ لوگوں کی خدمت کر کے جو خوشی مجھے حاصل ہوتی ہے اور جو دلی سکون ملتا ہے مجھے، وہ کیوں چھین لینا چاہتے ہیں آپ لوگ مجھ سے؟ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں، مجھ سے یہ خوشی نہ چھینیں جو زندگی میں پہلی بار حاصل ہوئی ہے مجھ کو۔ میں آپ لوگوں پر بوجھ ثابت نہیں ہوں گی۔ خدمت کرتی رہوں گی آپ سب کی۔ آخر میدانِ جنگ میں بھی تو خدمت گاروں کی ضرورت ہوتی ہے نا۔" وہ عاجزی سے بولی۔

اسی وقت ماں جی اور آسیہ آ گئیں وہاں۔ میں ماں جی کی موجودگی میں اس بحث کو جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا انہیں دیکھ کر اس موضوع کو ٹالتے ہوئے ماں جی سے مخاطب ہو کر بولا: "آئیں ماں جی! آئیں، ادھر آ جائیں میرے پاس۔"

وہ میری طرف آ کر میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولیں: "کیسا ہے تو پُتر! کس لیے بلایا ہے اس وقت تو نے مجھے؟"

"وہ ماں جی! میں نے آپ کو یہ بتانے کو بلایا تھا کہ جس مقصد کی خاطر میں نے کراچی بلایا تھا آپ کو، وہ مقصد پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔" میں نے کہا: "سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔ بس اب آپ تیار ہو جائیں۔ ٹھیک ساتویں دن روانگی ہے آپ کی۔"

"وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں: "یہ تو کیا کہہ رہا ہے بیٹے! میری تو سمجھ ہی نہیں آئی کچھ۔ یہ تو کہاں بھیج رہا ہے مجھے ساتویں دن؟"

"وہیں ماں جی! جہاں جانے کے لیے ہر صاحبِ ایمان مسلمان بے چین رہتا ہے۔ میں نے بتایا نہیں تھا آپ کو کہ عمرے کے لیے بھیجنے کا بندوبست کر رہا ہوں میں آپ کے لیے، اب وہ بندوبست ہو گیا۔ اسی کی بات کر رہا ہوں میں۔" میں نے انہیں بتایا۔

ماں جی کا چہرہ کھل اٹھا یہ سن کر۔ وہ مسرت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں: "یہ تو بہت اچھا کام کیا ہے تو نے بیٹے! بڑی خواہش تھی مجھے مکہ اور مدینہ دیکھنے کی، اس آستانے پر حاضری دینے کی اور اللہ کے اس گھر کا طواف کرنے کی۔ وہاں جا کر میں تیرے لیے اس سوہنے رب سے دعا بھی کروں گی۔ سنتے ہیں اس گھر میں مانگی جانے والی دعائیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں۔ میں بھی دعا کروں گی سوہنے رب سے کہ وہ اپنے حبیب کے صدقے میں تیری ساری مشکلیں آسان کر دے۔ تیرے اور اس پاک سرزمین کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے اور تم دونوں بہن بھائی کی بگڑی ہوئی تقدیریں سنوار دے۔"

"اور ماں جی! میرے لیے؟ کیا میرے لیے کوئی دعا نہیں کریں گی آپ؟" شرافت علی نے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں کروں گی بیٹا! تم سب میرے بچے ہو، آسیہ اور جیلانی کی طرح۔ تم سب کے لیے دعا کروں گی میں اور تم لوگ بھی بہن بھائیوں کی طرح رہنا ہمیشہ۔ کبھی تفرقہ نہ ڈالنے دینا اپنے درمیان کسی کو بھی۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، حالات کیسے بھی ہو جائیں، شکایتیں کتنی بھی پیدا ہو جائیں ایک دوسرے سے مگر ساتھ کبھی نہ چھوڑنا ایک دوسرے کا، اپنی شکایتیں مل بیٹھ کر دور کر لینا۔ دشمن پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم میں سے کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے بچو! ہر کسی سے خطا سرزد ہو سکتی ہے، ہر کوئی غلطی کر سکتا ہے مگر جو لوگ کسی کی غلطی کو اختلافی مسئلہ کبھی نہیں بناتے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ جلدی برباد ہو جاتے ہیں کیونکہ دشمن ہمیشہ کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ جہاں بھی شگاف دیکھتا ہے ادھر ہی سے تمہاری ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ ایک کی غلطی کو دوسرے کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور اختلاف کی ہلکی سی دراڑ کو بڑا شگاف بنا کر محبت اتحاد کی دیوار کو توڑنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ دیوار اسی وقت تک گھر کی حفاظت کر سکتی ہے جب تک اس کی تمام اینٹیں باہم مضبوطی سے ایک دوسرے میں پیوست رہتی ہیں، ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہیں اور جب ایک بھی اینٹ اپنی جگہ سے ہل جائے تو ایک ایک کر کے ساری اینٹیں آہستہ آہستہ اپنی گرفت کمزور کرتی چلی جاتی ہیں، اپنی جگہ چھوڑتی چلی جاتی ہیں اور پھر ایک دن اس دیوار کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ پھر جس کا منہ اٹھتا ہے بے دھڑک گھر میں گھسا چلا آتا ہے — کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی پھر، نہ دھن دولت نہ مال نہ متاع، نہ عزت آبرو اور نہ ہی زندگی۔ سمجھ لو کہ گھر اسی وقت تک گھر ہے جب تک دیواریں سلامت ہیں، اینٹیں ایک دوسرے کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن اینٹیں منتشر ہو گئیں، دیواریں گر گئیں، اسی دن وہ گھر راہ گزر بن جاتا ہے۔ جہاں سے ہر گزرنے والا بلا روک ٹوک گزرنے لگتا ہے۔ میرے بچو! اپنے گھر کو گھر ہی رکھنا، گزرگاہ نہ بنا دینا۔"

"ماں جی! آپ مطمئن رہیں، انشاء اللہ ہم ہمیشہ یوں ہی متحد رہیں گے اور اپنے گھر کو کبھی راہ گزر نہیں بننے دیں گے، یہ دیوار کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ دشمن اس دیوار کی کسی اینٹ کو ہلا نہیں سکے گا اپنی جگہ سے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے آپ سے۔" شرافت علی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ہاں ماں جی! آپ بالکل بے فکر رہیں، ہمارے اتحاد کی دیوار کوئی نہیں گرا سکے گا۔" میں نے ماں جی کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کی نصیحت پر پورا پورا عمل کریں گے ماں جی!" آسیہ اور فاطمہ یک زبان ہو کر بولی تھیں۔

"اور ماں جی! انہیں یہ بھی تاکید کر دیں کہ کبھی اور کسی حال میں بھی مجھے اپنے سے الگ نہ کریں۔ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھیں ہمیشہ اور یہ جو سعادت حاصل ہے مجھے ان سب کی خدمت کرنے کی، اسے نہ چھینیں مجھ سے۔" فردوسی بیگم نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"نہ نہ بیٹی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تجھے کون نکال رہا ہے یہاں سے، میری ایسی خدمت گزار اور محبت کرنے والی بیٹی کو کس کی مجال ہے جو نکال دے یہاں سے۔ تیرے دل میں یہ خیال کیوں آیا بیٹی! کسی نے کچھ کہا ہے تجھے؟" انہوں نے فردوسی بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کہا تو نہیں ہے ماں جی کسی نے کچھ بھی، بس یوں ہی خیال آیا تھا میرے دل میں کہ آپ کے بعد . . ." فردوسی بیگم کہنے لگی تھی۔

میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا: "بے کار کے خیالوں کو دل میں جگہ نہ دیا کرو فردوسی بیگم! آدمی کا خالی دماغ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے اور وہ وہاں بیٹھ کر آدمی کو ورغلاتا رہتا ہے ہر دم۔ آدمی غلام بن کے رہ جاتا ہے اس کا۔ لہٰذا دماغ کو خالی مت رکھا کرو۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جیلانی بیٹا! اپنے دماغ کی باتوں پر کان نہ دھرا کر اور لاحول پڑھتی رہا کر ہر دم۔" ماں جی نے کہا۔

آسیہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولی: "آپ کو یہ پتا ہے ماں جی! آپ کے لیے سعودی عرب جانے کا بندوبست کس نے کیا ہے؟ آپ سمجھ رہی ہوں گی کہ بھائی جان نے کیا ہے یہ سارا کام؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"یہ لے! اب تو مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہے کہ میں تیری بات کا یقین کر لوں گی۔ جیلانی نے یہ سارا کام نہیں کیا ہے تو کیا تو نے کیا ہے؟ لے بھلا، کل کی بچی مجھے اُلو بنانے لگی ہے اب۔" ماں جی نے اسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

شرافت علی نے جلدی سے کہا: "ہاں ماں جی! بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ یہ آسیہ تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی آپ سے۔"

میں نے کہا: "نہیں ماں جی! اس شرافت علی کی بات کا یقین نہ کرنا آپ، آسیہ نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔ یہ کام میں نے نہیں آپ کے اس بیٹے شرافت علی نے ہی کیا ہے۔ اس کے ایک عزیز ہیں وہاں جدہ میں، آپ وہیں ٹھہریں گی جا کر، اور وہاں آپ کے سارے معاملات اور ضروریات بھی انہی کے ذمے ہیں۔ جو کچھ وہ خرچ کریں گے وہاں، وہ شرافت علی نے یہاں ان کے گھر والوں کو دے دیا ہے۔ پورے چھ مہینے کے اخراجات پہلے ہی دے دیے ہیں اس نے۔ ضرورت پڑی تو اور دے دیے جائیں گے۔"

ماں جی حیران حیران سی شرافت علی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولا: "میں بھی تو بیٹا ہی ہوں نا ماں جی آپ کا، اور یہ جیلانی بھائی ہے میرا، اس رشتے سے میرا جو کچھ ہے وہ جیلانی ہی کا ہے۔ میرا اور اس کا الگ الگ تو نہیں ہے۔"

ماں جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھیں اور شرافت علی کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں: "ہاں، میرے بچے! میرے پُتر! کیوں نہیں، تو بھی میرا ہی بیٹا ہے۔"

پھر چھ دن ماں جی کے سفر کی تیاریوں میں اس طرح گزر گئے کہ کچھ پتا ہی نہیں چل سکا۔ ساتویں دن کی صبح جب مسجدوں میں مؤذن یہ بتا رہا تھا کہ اے مومنو! نماز نیند سے پیاری ہے، فوراً اٹھو اور نماز کی طرف چلے آؤ۔ عین اس وقت پی آئی اے کا ایک دیوہیکل جمبو جیٹ ماں جی کو سوئے حرم لیے چلا جا رہا تھا۔ اس مقدس، محفوظ اور مامون مقام کی جانب جہاں تک میرے دشمن کا تصور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نگاہوں سے دور ہوتی ہوئی، آسمان میں جلتی بجھتی سرخ اور سبز روشنیوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اس وقت تک جب وہ نظر آتی رہیں۔ ان کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد میں نے ایک لمبی مطمئن سانس لی اور واپسی کے راستے کی طرف مُڑ کر آہستہ آہستہ سب کے

ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔

عین اس لمحے جب میں کار کا دروازہ کھول کر اندر پاؤں دھر چکا تھا کسی نے پیچھے سے میرا کندھا پکڑ کر دبایا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے آسیہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اس کی نظریں ایئرپورٹ کی عمارت کی طرف کسی چیز پر مرکوز تھیں اور میرے شانے پر اس کی گرفت آہستہ آہستہ اس طرح سخت ہوتی جا رہی تھی جیسے وہ اندر ہی اندر کسی اضطراب میں مبتلا ہو۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہاں وہ عالیہ ہی تھی۔ سو فی صد، سرمو فرق نہیں تھا اور شبہے کی اگر کوئی گنجائش ہوتی بھی تو اس کے ساتھ آٹزک کی موجودگی نے اسے یکسر ختم کر دیا تھا۔ یقیناً اسی وقت آنے والی کسی پرواز سے عالیہ کراچی پہنچی تھی اور آٹزک اسے خود ریسیو کرنے کے لیے وہاں آیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے کار پارکنگ کی طرف ہی چلے آرہے تھے اور ان کے آگے آگے ایک شخص دونوں ہاتھوں میں دو بھاری سوٹ کیس اٹھائے چلا آرہا تھا۔ میں نے پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوئی کاروں کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہاں آٹزک کی کار کون سی ہو سکتی ہے۔ وہاں اس وقت آٹھ دس کاریں موجود تھیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں آٹزک کی کار کون سی ہو سکتی ہے۔ لیکن سوٹ کیس اٹھا کر ان دونوں کے آگے آگے آنے والے شخص نے جلد ہی میری یہ مشکل آسان کر دی۔ اس نے پارکنگ ایریا میں داخل ہوتے ہی ہمارے بائیں جانب ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز بینز کے پیچھے جا کر دونوں سوٹ کیسوں کو زمین پر رکھ کر کار کی ڈکی کھولی۔ میں نے جلدی سے اپنی کار میں گھستے ہوئے فاطمہ سے کہا۔ ”جلدی سے اندر آجاؤ، وہ دونوں بہت قریب آگئے ہیں، تم پر نظر نہیں پڑنا چاہیے ان میں سے کسی کی بھی۔“

فاطمہ نے تیزی سے کار کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر اندر گھستے ہوئے کہا۔ ”کیا خوب اتفاق ہے یہ بھی۔“

”لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار کوئی نہیں ہے اس لمحے۔ ورنہ یہ بہترین موقع ملا تھا ہمیں۔“ میں نے افسوس سے کہا۔

”کیا ہوا، کون دکھائی دے گیا ہے تم لوگوں کو جس کے لیے ہتھیار یاد آگئے ہیں؟ آٹزک تو نہیں ہے کہیں؟“ شرافت علی نے پوچھا۔

”ہاں وہی ہے۔ وہ سامنے بائیں طرف جو سیاہ مرسیڈیز بینز دکھائی دے رہی ہے، وہ اسی کی ہے، اسے نظر میں رکھنا۔“

”کہاں ہے وہ یہودی کتا؟ مجھے بھی دکھائیں ذرا؟“ آسیہ نے عقبی نشست سے گردن اچکا کر باہر دیکھتے ہوئے پوچھا تو اسے عالیہ دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھتے ہی حیرانی سے بولی۔ ”ارے، تو عالیہ ہے بھائی جان! اسے نہیں دیکھا آپ نے؟“

”ہاں، دیکھ چکا ہوں میں اسے بھی اور اس کے ساتھ جو شخص ہے وہی آٹزک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ اس کے بارے میں تو آپ نے بتایا تھا کہ وہ سرحدی علاقے میں ہیروئن تیار کرنے والی کسی فیکٹری میں ہے اور ڈاکٹر دھمن اس فیکٹری کا نگراں ہو کر ... ہوا ہے۔ یہ دونوں افغانستان کے راستے آئے ہیں یہاں؟“ آسیہ نے سوال کیا۔

”اس کی تم فکر نہیں کرو، یہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا ہمیں کہ عالیہ کے کراچی آنے کا مقصد کیا ہے۔ پہلے تو ہمیں ان کی کار کا تعاقب کر کے آٹزک کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ اب کیا کیا جائے۔“ فاطمہ نے آسیہ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

شرافت علی بولا۔ ”یار! وہ اپنا آبی مرحوم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ ہمیں ہتھیار کے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے کچھ پتا نہیں کس وقت کن حالات کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ اب اس وقت ہتھیار ہوتے ہمارے پاس تو آٹزک بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔“

”ہاں، وہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا اس وقت تو ہم یوں بالکل نہتے نہ ہوتے۔ وہ مسجد جانے کے لیے بھی ہتھیار ساتھ لے کر نکلتا تھا۔“ میں نے کہا۔

”آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے وہ بڑا پکا نمازی تھا، میرا تو خیال ہے کبھی عید کی نماز بھی نہیں پڑھی ہوگی اس نے۔“ فاطمہ بولی۔

”ایسا نہیں کہو فاطمہ! تم اسے جان نہیں سکی ہو، وہ بڑا ... آدمی تھا۔ اس کے سینے میں جو دل تھا وہ بہت ہی خوبصورت ... بڑا ہی گداز تھا۔ بہ ظاہر جتنا سخت گیر دکھائی دیتا تھا وہ اتنا سخت نہیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ پتا نہیں کتنی بیواؤں اور کتنے ناداروں کا سہارا تھا وہ۔ ان غریبوں مسکینوں اور افلاس کے ماروں سے پوچھو اس کی اصلیت جن کے دکھ بانٹ رکھے تھے اس نے۔“ میں نے فاطمہ کو بتایا۔

وہ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو آپ نے بڑے عجیب انکشافات کیے ہیں جناب عالی! اپنے انداز و اطوار سے ایسا تو نہیں تھا وہ۔“

”یہ تو واقعی تم نے حیرت انگیز باتیں بتائی ہیں آبی کے بارے میں۔“ شرافت علی بولا۔ ”اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ بات بات پر آگ بگولا ہو جانے والا اور خون کا کھیل کھیلنے والا وہ شخص ایسا دردمند دل رکھتا تھا اپنے سینے کے اندر۔“

”آدمی کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے شرافت علی! اس کے ظاہر و باطن میں بڑے تضادات ہوتے ہیں۔ یہ دعویٰ کوئی نہیں رکھ سکتا کہ کسی انسان کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے اس نے۔ انسان سے زیادہ پیچیدہ تو کوئی مخلوق بنائی ہی نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ آبی کے ذکر نے میرے سینے کے زخم ہرے کر دیے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر پھرنے لگی تھی اس وقت۔

شرافت علی نے مجھے زیادہ دیر اس کیفیت میں مبتلا نہیں رہنے دیا۔ وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ لوگ روانہ ہو رہے ہیں۔“

”آں کون، کون لوگ روانہ ہو رہے ہیں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ آبی کے تصور نے آٹزک اور عالیہ کو میرے ذہن سے نکال دیا تھا اس لمحے۔

”کہاں پہنچے ہوئے ہو یار تم؟ میں اس آٹزک اور عالیہ کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ وہ دیکھو ان کی کار پارکنگ ایریا سے باہر نکل رہی ہے۔“ وہ بولا۔

”اوہ ہاں، تو کھڑے کیوں ہو، اس کا پیچھا کرو نا یار۔ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا ان کی کار کو۔“ میں نے آٹزک کی کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ، ذرا مجھے یہ دیکھ لینے دو کہ کوئی اور تو ان کے پیچھے نہیں ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اپنی حفاظت کا انتظام کیے بغیر چلا آیا ہو وہ ایئرپورٹ تک۔ اتنا بے پروا یا بے جگرا تو ہو نہیں سکتا ہے یہ ابن یہودہ۔“ شرافت علی نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اس کے ساتھ اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کئی ٹیکسیاں اور کاریں ادھر ادھر سے نکل کر آٹزک کی کار کے پیچھے اسٹار گیٹ کی طرف جا رہی تھیں لیکن ان میں ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آسکی تھی جسے شرافت علی کے خیال کے مطابق آٹزک کے محافظوں کی کار کہا جا سکتا۔ شرافت علی بھی کسی ایسی کار کا سراغ پانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ وہ کار کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”حیرت ہے! کوئی گاڑی ایسی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اتنے سویرے ادھر آتے ہوئے اس نے اس کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ اس وقت بے ضرورت تو کسی کے گھر سے نکلنے کا امکان بھی نہیں ہوتا، سب ہی گہری نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ ہم تو محض اتفاقاً ہی توقع کے بالکل خلاف یہاں موجود ہیں اس وقت۔“

”ہاں ممکن ہے تمہارا خیال ہی درست ہو۔“ شرافت علی نے جواب دیا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی فاطمہ بولی۔ ”آٹزک جیسے لومڑی کی فطرت رکھنے والوں سے ایسی توقع کبھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض خیال ہے آپ کا۔ وہ دیکھیں، ادھر پارکنگ سے باہر سڑک کے کنارے اس درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ایک کار ہمارے پیچھے روانہ ہو رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے اور شرافت علی نے ایک ساتھ اس سمت دیکھا۔ واقعی ایک کار اس گھنے درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو فاطمہ! کہ یہ کار ہمارے پیچھے آرہی ہے، اور یہ ہمارے دشمن کی کار ہے؟“

”وہ جس طرح اچانک تاریکی سے نمودار ہوئی ہے، اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے، ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہی ہو۔“ فاطمہ بولی۔

”ٹھیک ہے، تم اس گاڑی کا خیال رکھو، ہم آٹزک کی کار کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔“ میں نے اس سے کہا۔

آٹزک کی کار ہم سے بہت آگے نکل چکی تھی، ہمیں خاصی دیر ہو گئی تھی نکلنے میں، اس کے باوجود اسٹار گیٹ پہنچنے تک ہم نے اس کی کار کو جا لیا تھا۔ اسٹار گیٹ سے نکل کر شارع فیصل پر کچھ دور چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ آگے جانے والی آٹزک کی کار کچھ سست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، وہ سڑک کے بالکل کنارے چل رہی تھی اور پیچھے سے آنے والی گاڑیاں تیزی سے اسے اوورٹیک کرتی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔ میں نے شرافت علی سے کہا۔ ”تم نے کچھ محسوس کیا شرافت علی! یہ آٹزک کی کار کی رفتار سست نہیں ہے؟“

”ہاں، میں محسوس کر چکا ہوں، اس بات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے جیلانی! کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ چکے ہیں اور موقع دیکھ کر کسی نسبتاً ویران جگہ پر ہمیں گھیرنا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ہمیں اب بھی ان کے پیچھے چلنا چاہیے یا بچ کے نکل جانا چاہیے ان سے؟“ شرافت نے پوچھا۔

”کیا بات کرتے ہو تم۔ ہاتھ آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دینا چاہتے ہو تم۔ چلے چلو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”نہیں جناب عالی! یہ مناسب نہیں ہے۔ اس وقت تو ہمیں نکل ہی چلنا چاہیے۔ وہ لوگ یقیناً پوری طرح مسلح ہوں گے، اس وقت خالی ہاتھ بیروں سے ان کا مقابلہ کرنا خودکشی

کرنے کے مترادف ہوگا۔" فاطمہ نے شرافت علی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے فاطمہ! لیکن اس طرح ہم آنرک کو کھو دیں گے۔ دوبارہ اس کا ملنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے اس سے کہا۔

"عالیہ یہاں آچکی ہے، اب آنرک کو ڈھونڈ نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا ہمارے لیے۔ آپ بے فکر رہیں، ہم جب چاہیں گے اس کی گردن دبوچ لیں گے جاکر۔ یہ کیوں بھول رہے ہیں آپ کہ عالیہ اس کے خلاف ہمارا ساتھ دے گی۔ پھر اب وہ غائب کہاں ہوسکتا ہے۔" فاطمہ نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات ٹھیک ہی تھی۔ عالیہ کا کراچی آنا ہمارے حق میں ہی تھا۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرناک قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے شرافت علی سے کہا: "یہ ٹھیک کہتی ہے یار! فی الحال تو نکل ہی چلو ان سے بچ کر۔ خواہ مخواہ خطرات سے کھیلنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

اس وقت ہماری کار ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اسٹیشن کے بالکل سامنے سے ایک ذیلی سڑک ڈرائیو اِن سینما کی طرف جارہی تھی۔ آنرک کی کار سیدھی نکلی چلی گئی تھی۔ شرافت علی نے تیزی سے اپنی گاڑی اس ذیلی سڑک پر موڑ کر اس کی رفتار بڑھادی۔ آنرک کو تو ہم ڈاج دے کر نکل آئے تھے لیکن ہمارے پیچھے جو کار آرہی تھی اس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہمارے اس سڑک پر مڑتے ہی وہ بھی اُدھر ہی مڑ گئی تھی۔ میں نے اس کار کو پیچھے آتے دیکھ کر کہا: "بے بھئی، ہم تو کمبل کو چھوڑ رہے ہیں مگر کمبل ہمیں نہیں چھوڑ رہا ہے۔"

شرافت علی نے کار کی رفتار میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں آگے ڈرائیو اِن کے موڑ پر اس کمبل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ بھی پتا نہیں ہے کہ اس گاڑی میں ہیں کتنے لوگ۔ کچھ معلوم ہوتا تو لڑ بھڑ کے انھیں قابو کرنے کی ہی کوشش کرتے۔"

"وہ کس طرح بھئی؟ بغیر ہتھیاروں کے کس طرح قابو کرلو گے تم انھیں؟ ویسے کم از کم چار آدمی تو ہوں گے ہی وہ۔" میں نے کہا۔

"چار تو ہم بھی ہیں یار! مگر انھیں ہتھیاروں کی وجہ سے فوقیت حاصل ہے ہم پر۔ ہتھیار نہ ہو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

فاطمہ بولی: "آگے جو نشیب دکھائی دے رہا ہے سڑک کے کنارے، وہاں ایک دم بریک لگا دینا۔ میں اس نشیب میں لڑھک جاؤں گی اور تم رکے بغیر آگے نکل جانا۔ وہ لوگ مجھے گاڑی سے گرتے دیکھ کر اگر وہاں رُک گئے تو مسئلہ ہی حل ہوجائے گا سارا۔"

"مگر تم کرو گی کیا اس طرح؟ یہ تو بہت ہی خطرناک کام ہے۔ چلتی ہوئی کار سے باہر لڑھکنا ہی کیا کم خطرناک ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ تم بریک لگاؤ شرافت" فاطمہ نے یہ کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا۔

کار بالکل اس مقام پر تھی جہاں فاطمہ نے بریک لگانے کو کہا تھا۔ لہٰذا سوچنے سمجھنے یا سوال جواب کرنے کا ذرا بھی وقت نہیں تھا، شرافت علی نے فاطمہ کی ہدایت کے مطابق ایک دم پوری قوت سے بریک لگا دیے۔ گاڑی نے ایک زبردست جھٹکا کھایا۔ ٹائروں کے سڑک پر گھسٹنے کی آواز اس ویرانے میں گونج کر رہ گئی۔ بس ایک لمحے کے لیے گاڑی لہرائی تھی۔ انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے تیزی سے دوڑتی ہوئی کار کے سامنے اچانک کوئی آگیا ہو اور ڈرائیور کو اسے بچانے کی خاطر بریک لگانا پڑے ہوں۔ ایک لمحے میں فاطمہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل کر نشیب میں لڑھکتی چلی گئی تھی اور کار پھر سیدھی ہوکر سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ کچھ دور جاکر اس نے پھر بریک لگائے اور گاڑی کو روک دیا۔ میں نے پوچھا: "کیا بات ہے، اب کیوں روکی ہے گاڑی؟"

وہ مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور کیا کرتا پھر؟ کیا ... کو یہیں چھوڑ جانے کا ارادہ ہے؟ بیزار ہوگئے ہو کیا ..."

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پیچھے دیکھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والی کار اس جگہ رک گئی تھی ... فاطمہ گری تھی اور کار سے دو آدمی اتر کر نشیب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شرافت علی نے جلدی سے ریورس گیئر ڈال کر گاڑی کو پیچھے ... ہم جب اس مقام پر پہنچے جہاں تعاقب کرنے والی کار کھڑی تھی تو وہ دونوں نشیب میں اتر رہے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی کار سے دو اور آدمی ہاتھوں میں ریوالور لیے نکل کر تیزی سے دائیں بائیں آ ٹھہرے اور للکار کر بولے: "خبردار، کار سے ... نکلو اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہوجاؤ۔"

اتنی دیر میں ہم دونوں اپنی طرف کے دروازے ... چکے تھے۔ وہ دونوں جیسے ہی لپکتے ہوئے نزدیک آئے، ہم ... ایک ساتھ پوری قوت سے دروازے کھول کر ان سے ٹکرا ... وہ اس اچانک حادثے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ٹکر لگنے سے ... کھو بیٹھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر سیدھے ہوتے ... سی تیزی سے باہر نکل کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ... اپنے مقابل کے منہ پر ایک ہاتھ مارا، اور دوسرا ہاتھ اس کے ریوالور والے ہاتھ پر مار کر اس کے ہاتھ سے ریوالور ... اسی لمحے وہ دونوں جو نشیب میں اترے تھے، یوں ایک ... کر سڑک کے کنارے آکر گرے جیسے کسی طاقت ور اسپرنگ نے انھیں اچھال پھینکا ہو اوپر۔ وہ سنبھل کر اٹھ رہے تھے ...

اپنے مقابل کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر ان دونوں پر پھینک دیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ ڈھیر ہوگئے زمین پر، اور وہ جسے میں نے ان پر پھینکا تھا ان کے اوپر سے پھسل کر نشیب میں لڑھک گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گرا ہوا ریوالور تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آسیہ نے فوراً کہا: "وہ ریوالور میرے پاس ہے بھائی جان! آپ اسے تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کریں۔"

اس نے ریوالور گرتے ہی کار سے نکل کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اسے ہاتھ میں لیے کار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگیا جنھیں فاطمہ نے نیچے سے پھینکا تھا۔ وہ اتنی دیر میں سنبھل کر کھڑے ہوگئے تھے اور اگر مجھے ان کی طرف متوجہ ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہوجاتی تو وہ مجھے رگید کر رکھ دیتے۔ ان دونوں نے ایک ساتھ مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں انھیں چھلانگ لگاتے دیکھ کر جھکائی دے کے ایک طرف ہوگیا۔ وہ دونوں اپنے ہی زور میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر اوندھے منہ نیچے جا گرے۔ ان کے سر بُری طرح پختہ سڑک سے ٹکرائے تھے، لیکن وہ گرتے ہی پلٹا کھا کر سیدھے ہوگئے۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر ایک کے منہ پر ٹھوکر مار کے دوبارہ گرا دیا۔ اور دوسرے کا ایک ہاتھ تھام کر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالتے ہوئے جھٹکا دیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ کا جوڑ کہنی پر سے اکھڑ گیا اور وہ چیخ مار کر اکھڑا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ اس اثنا میں اس کا دوسرا ساتھی اپنے لہولہان چہرے کی پروا کیے بغیر اٹھ کر میرے مقابل کھڑا ہوچکا تھا۔ اس کے ماتھے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھیں اس کی جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ اور ان میں شعلے سے لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کسی خونخوار چیتے کی طرح غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ غصے کی شدت نے اسے پاگل کر رکھا تھا، وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے یوں دیوانوں کی طرح اپنے اوپر جھپٹتے دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور جیسے ہی وہ میری زد میں آیا اس کی ٹانگوں میں اپنی بائیں ٹانگ اڑا دی۔

وہ اُچھل کر آگے گرا مگر آگے ہماری کار کھڑی تھی، اس کا سر پورے زور سے کار کی کھڑکی سے ٹکرایا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہی لمحے وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلاتا ہوا اپنے اکھڑے ہوئے ہاتھ کو گھٹنوں میں دبائے سڑک پر لوٹ رہا تھا۔ ان دونوں سے نمٹ کر میں نے سر اٹھایا تو مجھے فاطمہ نشیب سے اوپر آتی دکھائی دی۔ اس نے اوپر آکر اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا: "اچھا تو آپ نے بھی ان دونوں کا کام کردیا ہے۔ وہ چوتھا کدھر ہے؟"

"یہ اِدھر لیٹا ہے۔ بے چارے کو نیند بہت آرہی تھی۔ شاید کچی نیند سے جگا کر لے آئے تھے یہ لوگ اسے۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

میں نے فاطمہ سے پوچھا: "اس کا کیا بنا جسے نیچے بھیجا تھا میں نے، تمھارے پاس؟"

"بننا کیا تھا اس کا، وہ نیچے پڑا ہے ایک چھوٹے سے گڑھے میں۔ میرا خیال ہے ان تینوں کو بھی وہیں ڈال دیتے ہیں ہم تاکہ ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ دکھ بانٹ سکیں آپس میں مل جل کر۔ ہمدردی کی بہت ضرورت ہے انھیں اس وقت۔" فاطمہ طنز سے بولی۔

"یہ تم ٹھیک کہتی ہو لیکن نیچے ڈالنے کے بعد ان چاروں کی مشکلیں ضرور آسان کردینا۔ اتنی ہمدردی تو ضرور کرو تم بھی ان سے کہ سسک سسک کر مرنے کے لیے نہ چھوڑو، چاروں کے سینوں میں ایک ایک گولی اتار دو۔" میں نے فاطمہ سے کہا۔

"مگر گولی کیسے ماریں گے ہم انھیں، ہمارے پاس تو ایک بھی پستول یا ریوالور نہیں ہے؟" فاطمہ نے کہا۔

"ان چاروں کے ریوالور کس کام آئیں گے؟ اسی بُرے وقت کے لیے تو یہ ریوالور ساتھ لے کر نکلے تھے اس سمے!" میں نے کہا۔

"ایک ریوالور تو میرے پاس ہے، ایک اُدھر شرافت بھائی کی طرف والے کا شاید ان کے پاس ہوگا۔" آسیہ نے قریب

آکر کہا۔

"ہاں، یہ اُدھر بھی پڑا ہے ایک ریوالور فاطمہ بہن۔ سائیلنسر بھی چڑھا ہوا اس پر۔" شرافت علی نے ادھر سے آواز دے کر کہا "لیکن ان دونوں کے ریوالور دکھائی نہیں دے رہے ہیں، شاید نشیب میں گرے ہوں گے۔" آسیہ میرے ہاتھوں مار کھانے والوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔"جب یہ نیچے سے آکر گرے تھے یہاں تو ان کے ہاتھ خالی ہی تھے اس وقت؟"

میں نے کہا۔"لعنت بھیجو ان پر یہ دو ہی بہت ہیں صرف چار گولیاں ہی تو چاہئیں ہمیں ان کے لیے۔"

ہم نے ان تینوں کو باری باری ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ پکڑ کر اٹھایا اور جھولے دے دے کر نیچے پھینک دیا۔ وہ دونوں جن کے میں نے ہاتھ اکھاڑے تھے، بہت چیخے چلّائے، تڑپے، مچلے مگر ہم نے انھیں پھینک ہی دیا اٹھا کر۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اور شرافت علی ریوالور لے کر نشیب میں جانے لگے تھے کہ فاطمہ نے آواز دے کر کہا۔" ایک منٹ ٹھہریں جنابِ عالی! کوئی گاڑی آرہی ہے اِدھر۔"

میں نے گردن موڑ کر اُدھر دیکھا۔ جدھر سے ہم آئے تھے، اسی طرف سے ایک کار کی قریب آتی ہوئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کار خاصی دور تھی۔ ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ لیکن ابھی روشنی اتنی نہیں تھی کہ دور کی چیز صاف طور پر دیکھی جا سکے۔ لیکن جیسے جیسے وہ کار قریب آرہی تھی آہستہ آہستہ صاف اور واضح ہوتی جا رہی تھی اور پھر ہم نے اسے پہچان لیا۔ وہ آئزک کی وہی سیاہ مرسیڈیز بینز تھی جس کے تعاقب میں ہم ایئرپورٹ سے چلے تھے۔ شاید اسے کافی آگے جانے کے بعد یہ احساس ہوا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والی کار غائب ہے لہٰذا وہ اسے تلاش کرنے کے لیے واپس پلٹا تھا اور ڈھونڈتا ہوا اِدھر آنکلا تھا۔ اس کی کار کو پہچانتے ہی میں نے آسیہ اور فاطمہ سے کہا۔"تم دونوں جلدی سے کار میں گھس جاؤ۔ اس کی موت شاید اسے اِدھر کھینچ لائی ہے۔ شرافت علی! تم بھی کار میں جا بیٹھو، یہ مجھے اکیلے دیکھے گا تو گاڑی روک کر نیچے آجائے گا۔ پھر اس کی موت یقینی سمجھو۔"

وہ تینوں جلدی جلدی کار میں جا گھسے۔ آئزک کی کار تیزی سے بڑھی چلی آرہی تھی اور اب وہ اتنی قریب آچکی تھی کہ میں اس کے ڈرائیور کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ آئزک اور عالیہ عقبی نشست پر تھے اور آئزک کھڑکی سے سر باہر نکال کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی پشت پر کر لیے تھے تاکہ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور اسے دکھائی نہ دے سکے۔ لیکن وہ اسرائیل زادہ میری توقع سے کہیں زیادہ عیار تھا۔ اس نے میرے قریب آکر کار روک کر نیچے اترنے کے بجائے کار کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے گولی مارنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کی کار کی رفتار سست ہونے لگی تھی اور اس کی تمام تر توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس کے اس ہاتھ کی حرکت کو نہ دیکھ سکا جس میں اس نے ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس ہاتھ کو آہستہ آہستہ باہر لا کر مجھ پر گولی چلانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کے ہاتھ سے ریوالور اچھل کر دور جا گرا اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کار کے اندر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کار کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ ہوا کیا ہے اچانک۔ لیکن اس کی کار کی اس کھڑکی سے جہاں چند ثانیے قبل اس کا چہرہ نظر آرہا تھا، خون کی لکیر نیچے کی طرف بہتی دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ اسے کسی نے بے آواز ریوالور سے نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بے آواز ریوالور یہاں میرے اور شرافت علی کے سوا کسی اور کے پاس نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میں نے جھنجلا کر شرافت علی کو دیکھا۔ مگر وہ آئزک کی کار کو فرار ہوتے دیکھ کر اپنی کار اس کے تعاقب میں دوڑا چکا تھا۔ میں جلدی سے اس کار میں جا گھسا جس میں آئزک کے آدمی ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک آئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی ان کے پیچھے پوری رفتار سے کار کو دوڑا رہا تھا۔ لیکن ہماری وہ ہلکی پھلکی جاپانی کاریں مرسیڈیز بینز کی رفتار کا مقابلہ کہاں کر سکتی تھیں۔ منٹوں میں آئزک کی مرسیڈیز ہماری پہنچ سے بہت دور نکل گئی اور پھر جلد ہی وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ہم نیشنل اسٹیڈیم تک پوری رفتار کے ساتھ اپنی کاریں دوڑاتے رہے اور پھر مایوس ہو کر اسٹیڈیم کے سامنے شرافت علی نے اپنی کار روک دی۔ میں نے بھی اس کے بالکل پیچھے کار روک دی اور اس میں سے باہر نکل کر اپنی کار میں جا گھسا۔ اس کار کو ساتھ لیے پھرنا حماقت ہی تھا۔ میں کچھ کچھ آئزک کی فطرت سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ گھر پہنچتے ہی پولیس کو اس کار کی گمشدگی کی اطلاع دے کر ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر دیتا۔ لہٰذا اس سے جان چھڑا لینا ہی بہتر تھا میرے لیے۔ شرافت علی نے میرے بیٹھتے ہی کار کو دوبارہ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اُسے سرزنش کرنے کے انداز میں کہا۔

"یہ تم نے کیا حماقت کی تھی بھئی؟ اس کے گاڑی روک کر نیچے اترنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور گولی چلا دی اس پر۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ حیرت سے بولا۔"تم اس کے گاڑی سے اترنے کی آس لگائے ہوئے تھے اور اب تک یہی سمجھ رہے ہو کہ وہ تمھارے قریب کار روک کر باہر آجاتا گاڑی سے۔ میرے

ہوتے بادشاہ! اگر ایک لمحہ بھی اور مل جاتا اسے تو اس کی چلائی ہوئی گولی تمھارا سینہ چھید چکی ہوتی اور تم خاک اور خون میں لوٹ گئے ہوتے۔ شکر کرو کہ میری نظر پڑ گئی اس پر عین وقت پر۔"

"اوہ، تو کیا وہ چلتی کار میں سے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر کس طرح؟ میں نے دیکھا ہی نہیں کچھ۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔" وہ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ کو صرف اتنا باہر لایا تھا کہ گولی چلا سکے تم پر۔ تم اسے دیکھ رہے تھے، تم نے اس کے ہاتھ کی یہ پوشیدہ حرکت نہیں دیکھی۔ اس نے بڑی مکاری سے کام لیا تھا۔ مجھے فاطمہ نے اس طرف متوجہ کیا تھا ورنہ میں بھی نہیں دیکھ پاتا اسے۔"

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا۔"بڑے ہی مکار دشمن سے واسطہ پڑا ہے یار شرافت علی! اس کے سامنے سے ٹلنے کے بعد ہر بار ایک نئی زندگی پانے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے ٹکر لینے کے لیے آدمی کو اپنے بدن کے ہر حصّے پر ایک آنکھ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس کی حرکات کی نگرانی کے لیے دو آنکھیں تو بالکل ناکافی ہیں یار!"

"اس میں شک نہیں ہے جنابِ عالی! اس کی عیّارانہ چالوں کو سمجھنے کے لیے اسی جیسا مکّار اور عیّار ہونا ضروری ہے۔"

"ہاں، اور تم نے ہمارے اندر کی یہ کمی پوری کر دی ہے۔ آخر تو تم بھی اسی اسکول کی نکلی ہوئی ہو جہاں اس نے مکّاری کا یہ سبق پڑھا ہے۔ تمھارے اور اس کے استاد تو ایک ہی ہیں نا۔ اسی لیے تم اس کی ہر چال اسے لوٹا دیتی ہو۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

وہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "ہم ان چاروں سورماؤں کو یوں ہی پڑا چھوڑ آئے ہیں، جلدی میں انھیں موت کی نیند سلانے کا موقع نہیں مل سکا ہمیں۔ ان کی زندگی ابھی باقی تھی، کچھ دن کی مہلت اور ہے ابھی ان کے پاس۔"

"ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔ ویسے جو حال کر دیا ہے ہم لوگوں نے ان کا، وہ بھول نہیں سکیں گے کبھی بھی۔" میں نے جواب دیا۔

آسیہ بولی۔" ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ کوئی مصیبت کھڑی کر دیں ہمارے لیے۔ انھیں یوں چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔"

"آسیہ بی بی! جب اوپر والے کا بلاوا ہی نہ آیا ہو تو آدمی کے کرنے کا کام تو نہیں ہے نا یہ۔ ہم نے بہت چاہا تھا اور اگر وہ آئزک نہ آگیا ہوتا تو ان چاروں کے دلوں کو چھید بھی ڈالتے ہم لیکن اس مالک کی مرضی نہیں تھی، ابھی ان کے ناموں کے پتّے نہیں جھڑے تھے اور جب تک ایسا نہ ہو کوئی کسی کو مار نہیں سکتا۔ وہ آئزک ہی کو دیکھو نکل گیا بچ کر اور میں بھی تمھارے درمیان موجود رہ گیا ہوں۔ لہٰذا اب ان چاروں کا خیال دل سے نکال دو۔ اور مصیبت وہ ہمارے لیے کیا کھڑی کریں گے۔ ابھی تو کچھ دن انھیں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں ہی لگ جائیں گے جس میں ہم انھیں مبتلا کر آئے ہیں۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔" یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے ہمارے لیے مسئلہ تو یہ ہے کہ اب آئزک کو کہاں تلاش کیا جائے؟ وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح ہر بار ہاتھ میں آکر پھسل جاتا ہے۔ اب کوئی ایسا انتظام کرنے کی ضرورت ہے کہ آئندہ کبھی وہ ہاتھ میں آنے کے بعد پھسل نہ سکے۔ اس کی چکناہٹ دور کرنا ہوگی کسی طرح۔"

"اس کا تو بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے بھائی جان! بس اسی طرح اس قصّے کو ختم کیا جاسکتا ہے۔" آسیہ نے کہا۔

"کون سا طریقہ سمجھ میں آیا ہے تمھاری؟ مجھے بتاؤ کس طرح اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"صرف ایک طریقے سے، ہم میں سے ہر شخص ہتھیار ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے پاس رکھے اور جیسے ہی وہ دکھائی دے کسی جگہ فوراً گولی مار دی جائے اسے۔ وقت اور موقع کا خیال کیے بغیر، اس کی پروا کیے بغیر کہ خود گولی مارنے والے کا انجام کیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"تمھیں پتا نہیں ہے آسیہ! ہم میں سے ہر شخص اس کے لیے ایسا ہی جذبہ رکھتا ہے۔ ہر کوئی اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کی جان لے لینا چاہتا ہے۔ مگر وہ لومڑی کی اولاد ہر مرتبہ کسی نہ کسی وجہ سے بچ کر نکل جاتا ہے۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"اس کے لیے تو یہی کہا جاسکتا ہے پھر کہ ابھی اس کا وقت پورا نہیں ہوا ہے، پتا نہیں جھڑا ہے اس کے نام کا۔" آسیہ نے میرے انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے، مگر ایک بات سن لو میری، اس کی موت لکھی ہمارے ہی کھاتے میں گئی ہے۔ جب پتا جھڑے گا اس کے نام کا، اسے ہم میں سے ہی کسی نہ کسی کے ہاتھوں موت کا مزہ چکھنا ہوگا۔ اسی لیے ہم اس کی تاک میں رہتے ہیں ہر دم۔" میں نے کہا۔

گھر واپس پہنچتے ہی فاطمہ ٹیلی فون پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی جگہوں پر ٹیلی فون کر کے عالیہ اور آئزک کے بارے میں معلوم کیا مگر ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا اسے۔

"ہم عالیہ کے بارے میں بالکل بے خبر ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کراچی آ گئی ہے۔"

فاطمہ نے ہر ایک کو ہدایت کی کہ ان دونوں کے بارے میں معلوم کر کے اسے جلد از جلد اطلاع دی جائے۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ میں نے اس کی کار کی اس کھڑکی سے جہاں سے وہ سر نکال کر مجھے دیکھ رہا تھا، خون بہتا ہوا دیکھا تھا۔ میں نے یہ خیال آتے ہی فاطمہ سے کہا۔ "فاطمہ! میں نے اس کے بھاگتے وقت کار پر خون بہتے دیکھا تھا اس کی شاید شرافت علی کی چلائی ہوئی گولی کارگر رہی تھی، وہ زخمی ہو چکا ہے اور اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے، کسی ایسی جگہ تلاش کرو اسے جہاں وہ طبی امداد کے لیے جا سکتا ہے میرا خیال ہے جس کلینک میں جیرالڈ کو رکھا گیا تھا، یا اسی قسم کے کسی دوسرے کلینک میں تمہیں تو پتا ہو گا نا؟"

"اوہ جنابِ عالی! یہ بات اب بتا رہے ہیں مجھے۔ یہ تو اسی وقت بتانا چاہیے تھا آپ کو۔ ہم یہاں آنے کے بجائے پہلے وہیں جاتے سیدھے۔ خیر میں پتا کرتی ہوں، ویسے اب کسی ایسی جگہ ملنے کی امید کم ہی ہے اس کے۔ اگر زخم معمولی ہوا تو اب تک تو وہ بینڈیج وغیرہ سے فارغ ہو کر جا بھی چکا ہو گا ہاں اگر مہلک زخم آیا ہے تو ممکن ہے کہ مل ہی جائے کلینک میں۔" فاطمہ نے جواب دیا اور دوبارہ ٹیلی فون اٹھا کر مطلوبہ کلینک کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اس نے باری باری تین جگہ ٹیلی فون ملایا۔ تیسری جگہ سے اسے معلوم ہوا کہ وہ وہاں خود تو نہیں پہنچا تھا البتہ ایک ڈاکٹر کو اس نے اپنے گھر بلایا ہے جو ابھی تک واپس نہیں آیا۔ فاطمہ نے فوراً پوچھا۔ "کون سے گھر بلایا ہے، مجھے بتاؤ جلدی سے۔"

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے جواب سنتی رہی پھر بولی ــــ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، لیکن اس ہدایت کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا ہے۔ جلدی بتاؤ، مجھے بے حد اہم بات کرنا ہے اس سے، اس کا ملنا بہت ضروری ہے اس وقت۔"

چند لمحے دوسری طرف کا جواب سننے کے بعد وہ بولی۔

"ٹھیک ہے شکریہ۔ کسی اور کو اب یہ پتا مت بتانا۔"

وہ ریسیور کریڈل پر پٹخ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیس جنابِ عالی! مل گیا پتا اس کا۔ اب دیکھیں گے کتنی مہلت زندگی نے اسے اور دے رکھی ہے۔ اس کے نام کا پتا اب بھی جھڑا ہے یا نہیں۔ نہیں جھڑا ہو گا تو ہم خود جھاڑ دیں گے اب اسے۔"

"خدائی دعوے نہ کرو بی بی! اپنے کاموں میں بندوں کی مداخلت برداشت نہیں کرتا ہے وہ۔ ایسا نہ ہو تمہارا اپنا پتا جھڑ کر گر جائے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی نے بھی اسے سمجھایا۔ "ایسی باتیں نہیں کرتے۔ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم بندوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی کی جان لے سکیں یا کسی کو زندگی دے سکیں۔ ایسی باتیں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔ اللہ کو بندوں کی زبان سے نکلی ہوئی ایسی کوئی بات پسند نہیں آتی۔ وہ مختارِ کل ہے اگر وہ نہ چاہے تو ہماری حیثیت ہی کیا ہے، ہم تو ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتے اس کی مرضی کے بغیر۔"

"یہ آپ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی میں نے اپنی حیثیت سے بہت زیادہ بکواس کر دی ہے۔ توبہ کرتی ہوں میں، آئندہ ایسی کوئی بات نہیں نکالوں گی زبان سے اپنی۔ یہ سب ان ذلیل یہودیوں کی صحبت کا اثر ہے۔ وہ لوگ ہر وقت ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ خود کو دنیا میں افضل ترین سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات انہیں منتقل کر دیے ہیں۔" فاطمہ نے اپنے رخساروں پر طمانچے لگاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "چلو، اس کا پتا مل گیا ہے تو چل کر اس کا مزاج پرسی کر لیں ہم۔ عالیہ سے ملاقات ہو جائے گی وہاں ہماری۔"

"ابھی نہیں یار! اب تو دن کا اجالا خوب پھیل چکا ہے۔ ایسے کام کے لیے یہ وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔ رات ہونے کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا اب ہمیں۔" شرافت علی نے کہا۔ "اس دوران اس کا انتظام کر لیں ہم کہ وہ نکل کر بھاگ نہ سکے کسی طرف سے بھی۔"

"یار اکرنے تو ہم ہمیشہ یہی ہیں، اپنی دانست میں تو سارے ہی راستے بند کر دیتے ہیں اس کے فرار کے۔ اس کے باوجود وہ نکل ہی بھاگتا ہے کسی نہ کسی طرح۔ عیاری اور مکاری میں اسے ہم پر برتری حاصل ہے شرافت علی! وہ ہر جگہ فرار کا راستہ پہلے ہی بنا کر رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر ہم بھی جونک بن کر چمٹ گئے ہیں اس کی جان کو۔ آخر کب تک بھاگتا رہے گا، ایک نہ ایک دن تو ہمارے ہاتھ آئے گا ہی۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ایک نہ ایک دن تو اسے چھری کے نیچے آنا ہی ہے۔" شرافت علی مسکراتے ہوئے بولا۔

فاطمہ بولی۔ "شرافت علی! ٹیلی فون ڈائریکٹری لا دو کہیں سے مجھے۔ میں اس میں ٹیلی فون نمبر تلاش کرنے کی کوشش کروں گی اس کا۔"

"کیوں؟ کیا اب ٹیلی فون پر خیریت دریافت کرو گی اس کی؟ مگر اس طرح تو وہ چوکنا ہو جائے گا اور وہ جگہ چھوڑ دے گا۔"

"نہیں جنابِ عالی! اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں میں کہ اس سے بات کروں گی ٹیلی فون پر۔ میں ذرا عالیہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہاں، یہ بہت اچھی بات سوجھی ہے تمھیں۔ اس سے ضرور بات کرو اور اسے کہو کہ وہ آئزک کو نکلنے نہ دے وہاں سے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

وہ بولی "یہی کہنا چاہتی ہوں میں بھی اسے۔ اگر اس کا تعاون حاصل ہو گیا ہمیں تو سمجھو آج آئزک سے جان چھوٹ گئی ہماری۔ ممکن ہے قدرت نے اسے ہماری مدد کے لیے ہی بھیجا ہو اس وقت یہاں۔ ہاں شرافت علی! وہ ٹیلی فون ڈائرکٹری ۔ ۔ ۔ ۔"

شرافت علی اس کی بات کاٹ کر بولا "یہاں تو ڈائرکٹری سے نہیں مل سکے گی۔ میں کہیں سے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔"

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ کسی سے ڈائرکٹری مانگ کر لے آیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ہم مطلوبہ ٹیلی فون نمبر تلاش کرنے میں آخر کامیاب ہو ہی گئے۔ نمبر مل جانے کے بعد یہ طے ہوا کہ فردوسی بیگم یا آسیہ میں سے کوئی وہ نمبر ملائے اور رابطہ ہونے کے بعد عالیہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرے، اگر فون اٹھانے والا اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرے تو وہ اپنا نام وردہ بتا دے۔ لہٰذا آسیہ نے فون اپنے آگے کھینچ کر آئزک کے نمبر ڈائل کیے، دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے پر اس نے حسبِ ہدایت ڈاکٹر عالیہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو توقع کے مطابق دوسری طرف سے اس کا نام معلوم کیا گیا۔ جواب میں اس نے کہا "میں وردہ بول رہی ہوں۔"

"لیکن یہاں تو ڈاکٹر عالیہ نام کی کوئی خاتون نہیں رہتیں۔ میرا خیال ہے آپ نے غلط نمبر ڈائل کر دیا ہے۔" ادھر سے کہا گیا۔

"جی! تو کیا یہ نمبر نہیں ہے یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" آسیہ نے نمبر دہراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، نمبر تو یہی ہے لیکن اس نام کی کوئی خاتون نہیں ہیں یہاں آپ کو کسی نے غلط نمبر دے دیا ہے۔" جواب دیا گیا۔

"اوہ، مگر وہ یہاں رہتی تو نہیں ہیں، آج صبح ہی آئی ہیں پشاور سے۔" آسیہ نے اس سے کہا۔

"ارے تو یوں کہیں نا آپ ان ڈاکٹر صاحبہ کو پوچھ رہی ہیں جو صاحب کے دوست اسحاق صاحب کے پاس آئی ہیں صبح۔" اس نے کہا۔

"ہاں ہاں، میں انھی کو پوچھ رہی ہوں، ڈاکٹر عالیہ انھی کا نام ہے۔ کیا تمھیں ان کا نام معلوم نہیں؟" آسیہ نے کہا۔

"ہاں بی بی! نام تو مجھے معلوم نہیں تھا ان کا۔ یہاں تو سب ڈاکٹر ڈاکٹر ہی کہہ رہے ہیں انھیں۔ وہ تو جی ابھی کوئی دس منٹ ہوئے کہیں چلی گئی ہیں۔ وہ جو ڈاکٹر صاحب آئے تھے، اسحاق صاحب کے ہاتھ کی پٹی کرنے ان کے ساتھ گئی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا، یہ اسحاق صاحب کے ہاتھ کو کیا ہوا ہے، پٹی کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی انھیں؟ کل تک تو بالکل ٹھیک تھے نا۔"

"پتا نہیں بی بی! صبح جب وہ ڈاکٹر صاحبہ کو لے کر آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں رومال لپٹا ہوا تھا جو خون سے تر ہو رہا تھا۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟ کیا وہ ڈاکٹر عالیہ کے ساتھ کہیں گئے ہوئے ہیں؟" آسیہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں جی، وہ اپنے کمرے میں ہیں، انھیں ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کو کہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر عالیہ کب تک آئیں گی کچھ پتا ہے تمھیں؟" آسیہ نے دریافت کیا۔

"نہیں جی، یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہم نوکر لوگ کسی سے پوچھ تو نہیں سکتے نا کہ وہ کب واپس آئے گا۔ مالک لوگ جو کچھ بتا دیتے ہیں بس اتنا ہی پتا ہوتا ہے جی ہمیں تو۔ آپ کو کچھ کہنا ہے تو بتا دیں، وہ آئیں گی تو بتا دوں گا میں انھیں۔" اس نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو میں ابھی بتاتی ہوں تمھیں۔" آسیہ نے اس سے کہا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اس سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتانے کے بعد پوچھا "اب بتائیں میں اس سے کیا کہوں؟ کیا کوئی پیغام دینا ہے عالیہ کے لیے؟"

فاطمہ بولی "نہیں بھئی ایسی کوئی حماقت نہ کرنا۔ لاؤ ریسیور مجھے دو میں بات کرتی ہوں اس سے۔ شاید کوئی کام کی بات اگل دے وہ۔"

آسیہ نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا "کمال ہے تمھارے صاحب کیسے آدمی ہیں۔ اپنے ملازمین کو کچھ بھی نہیں بتاتے۔ اگر ان کی عدم موجودگی میں کوئی مہمان آ جائے تو تم کیا کرتے ہو پھر؟ تمھیں تو بڑی پریشانی ہوتی ہو گی ایسے وقت؟"

وہ ہنس کر بولا "نا جی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ صاحب بیگم صاحبہ جب جاتے ہیں کہیں تو مجھے سب کچھ بتا کر جاتے ہیں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ مگر آپ نے تو مجھ سے صاحب کے مہمان کی مہمان کے بارے میں پوچھا ہے، ان کے بارے میں مجھے کچھ جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ہاں، یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ یہ اسحاق صاحب کب سے مہمان ہیں تمھارے صاحب کے ہاں۔" فاطمہ نے اپنائیت سے پوچھا۔

"یہی کوئی ایک ہفتہ ہوا ہے انھیں آئے ہوئے۔ پہلے کبھی کبھو آتے تھے تھوڑی دیر کو صرف ملنے کے لیے۔ ایک ہفتے سے یہیں ڈیرا ڈالے پڑے ہیں۔ مگر یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں جی، آپ کا کیا تعلق ہے اس سے؟" اس نے بولتے بولتے ایک دم لہجہ بدل کر سوال کر ڈالا تھا۔

میں ریسیور کے قریب کان رکھے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اچانک کسی خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا شاید کہ اس کی زبان کچھ بے تکی سی چل پڑی ہے۔ فاطمہ کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا لہٰذا اس نے اسے مطمئن کرنے کے لیے جلدی سے کہا "ارے تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی تم اطمینان رکھو۔ میں نے تو اس لیے پوچھا تھا اسحاق صاحب کے بارے میں کہ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ تمھارے صاحب کے ہاں ایک ہفتے سے مہمان ہیں۔ تم خود ہی بتاؤ، کیا یہ حیرانی ہونے والی بات نہیں ہے، جس آدمی کی یہاں اسی شہر میں کوئی درجن بھر کوٹھیاں اور بنگلے خالی پڑے ہوں اور ان میں نوکر چاکر عیش کر رہے ہوں، وہ خود ہفتے بھر سے کسی کا مہمان بنا پڑا ہے، کیوں، ہے نا حیرت والی بات؟ مجھے تو یہ آدمی کبھی اچھا نہیں لگا۔"

وہ شاید فاطمہ کی باتوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔ بولا "اچھا تو آپ بھی جانتی ہیں انھیں۔ آدمی تو وہ سچ مچ اچھا نہیں لگتا۔ یہاں رہتا تو مہمانوں کی طرح ہے۔ آیا بھی مہمان ہی بن کر ہے مگر ہر ایک پر حکم یوں چلاتا ہے جیسے وہ اس گھر کا مالک ہے اور سب لوگ اس کے غلام ہیں۔"

"اچھا! کیا تمھارے صاحب اور بیگم اسے منع نہیں کرتے ایسا کرنے سے؟" فاطمہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیا کہیں گے، وہ دونوں تو خود اس کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے خدمت گار ہوں وہ بھی اس کے۔"

"اچھا! حالانکہ ڈاکٹر عالیہ کے سامنے وہ خود بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔" فاطمہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"وہ تو جی مجھے پتا نہیں ہے۔ میں نے انھیں آج سے پہلے نہیں دیکھا کبھی۔ وہ بھی بس کوئی آدھے گھنٹے ہی رکی تھیں۔ اتنی دیر میں کیا اندازہ ہو سکتا ہے جی۔" پھر وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا "وہ شاید کوئی آ رہا ہے ادھر، میں فون رکھ رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔

فاطمہ نے بھی ریسیور رکھتے ہوئے کہا "بے کار ہی وقت برباد کیا میں نے بھی، اسے شاید کوئی ایسی بات معلوم ہی نہیں ہے کوئی بے ضرر اور بے وقوف سا ملازم ہے وہ۔"

"تم کیا سمجھ رہی تھیں، کیا وہ کوئی اہم بات بھی جانتا ہو گا۔ ایک معمولی ملازم سے کیا کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی بھلا!"

"آپ نہیں جانتے جنابِ عالی! یہ معمولی قسم کے گھریلو ملازم دراصل گھر کے بھیدی ہوتے ہیں۔ جب کبھی دو چار گھروں کے ملازم کہیں یکجا ہو جائیں پھر ان کے درمیان ہونے والی باتیں سنیں آپ۔ کیسے کیسے رازہائے سربستہ سے پردے اٹھاتے ہیں اپنے اپنے مالکان کے۔ گھر کے ایک ایک فرد کے رازوں کا ایک دوسرے سے ایسے مزے لے لے کر تبادلہ کرتے ہیں کہ سن کر آنکھیں پھٹی رہ جائیں آدمی کی۔ کبھی کوئی رانگ نمبر لگ جائے اور گھر میں کوئی نہ ہو تو بعض باتونی ملازم محض اپنی بوریت دور کرنے کے لیے فون اٹھانے کے بعد یہ معلوم ہوتے ہی کہ کسی کا رانگ نمبر لگ گیا ہے، بے تکان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور باتوں باتوں میں وہ سب کچھ اگل دیتے ہیں جو اگر کسی غلط کان میں پڑ جائے تو ان کے مالک کی بربادی کا سامان ہو سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی اسی قسم کا ملازم ہے اور میں اسے باتوں میں لگا کر آئزک کے آئندہ منصوبے کے بارے میں کچھ معلوم کر لوں گی لیکن لگتا ہے وہ لوگ بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں اور ملازمین کو اتنی دور رکھتے ہیں کہ ان کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑ سکے ان کے کسی پروگرام کی۔"

میں نے کہا "چلو مٹی ڈالو اس پر اب اور تم کسی نہ کسی طرح عالیہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے، آخر ہمیں اس وطن فروش، بے ضمیر اور بے دین ڈاکٹر دشمن کے وجود سے اس دھرتی کو پاک کرنا ہے۔ اس کے لیے عالیہ کا تعاون ضروری ہے۔"

"اس کی فکر نہ کریں آپ، بہت جلد ان سے رابطہ ہو جائے گا ہمارا۔ صبح کی جھڑپ کے بعد انھیں یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ ہم دونوں آئزک کے خلاف کھل کر میدانِ عمل میں آ چکے ہیں چنانچہ مجھے کامل یقین ہے وہ خود ہم سے رابطہ قائم کرنے کو بے چین ہوں گی۔ وہ خود تلاش کر رہی ہوں گی ہمیں۔ ابھی انھیں زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، ایک دو گھنٹے کے بعد جب میں اپنے لوگوں کو کال کروں گی تو کہیں نہ کہیں سے ان کا کوئی پیغام یا ان کی سرگرمیوں کے بارے میں ضرور اطلاع ملے گی۔ اس کے بعد ہم بآسانی رابطہ قائم کر سکیں گے ان سے۔" فاطمہ نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فاطمہ کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد

اس نے جہاں ٹیلی فون کیا وہاں سے اسے پہلی اطلاع یہی ملی تھی کہ عالیہ اس کو تلاش کر رہی ہے، وہ جہاں جاتی ہے وہاں سے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کسی نے اسے اس کے متعلق کچھ بتایا نہیں ہے، چونکہ سب جانتے ہیں وہ آئزک کی مہمان ہے اور اسی کے ایما سے فاطمہ کا کھوج لگاتی پھر رہی ہے۔ فاطمہ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد انھیں ٹیلی فون کرتی رہے گی۔ عالیہ اگر وہاں آئے تو اسے روک لیا جائے وہیں۔ اور اسے اپنا دوست ہی سمجھا جائے۔

اس کے باوجود شام تک عالیہ سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ وہ کسی جگہ ایک بار جانے کے بعد دوبارہ اُدھر نہیں گئی۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی کہ اسے ہمارے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی تنظیم کے جن لوگوں سے وہ مل رہی ہے ان میں سے کون کون ہمارا دوست اور بہی خواہ ہے اور کون کون دشمن ہے ہمارا۔ اس کے خیال کے مطابق تو وہ سب ہی ہمارے دشمن تھے جنھوں نے اس کے پوچھنے پر ہمارے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اسے اگر یہ پتا چل جاتا کہ ان میں سے بہت سے لوگ اسے دشمن جان کر کسی قسم کی اطلاع فراہم کرنے سے کترا رہے ہیں تو وہ دوبارہ بلکہ بار بار ان کے پاس جاتی اور انھیں اپنے بارے میں ہر طرح سے مطمئن کر کے ہمارا پتا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی۔

رات ہونے لگی تھی اور ہمارے پاس عالیہ کو تلاش کرنے سے زیادہ ضروری کام اسرائیلی کتے آئزک کے ناپاک وجود سے اس دھرتی کو پاک کرنے کا تھا چنانچہ ہم نے فی الحال یہ کام ملتوی کر کے پوری توجہ اس آپریشن کے انتظامات پر مرکوز کر دی جو آئزک کے سلسلے میں کرنے جا رہے تھے ہم۔ اس رات ہم نے اس خبیث کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ دن میں، انور کمال، شرافت علی اور میں اپنی تاریک شیشوں والی کار میں اس مکان کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر خوب اچھی طرح دیکھ آئے تھے۔ ہم نے وہاں کی ایک ایک گلی کو اچھی طرح دیکھا تھا اور جدھر بھی کوئی ایسی جگہ دکھائی دی جہاں سے کسی کے بچ نکلنے کا شبہ بھی ہمیں ہوا تھا، ہم نے اسے نظر میں رکھ لیا تھا۔ اور پلاننگ کرتے وقت ایسی تمام جگہوں پر نگراں مقرر کر کے انھیں سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان کے گرد و پیش حالات کیسے ہی کیوں نہ ہو جائیں، وہ اپنی جگہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک انھیں ایسا کرنے کا اشارہ نہ دیا جائے۔ مکان کی چھت ایسی تھی کہ وہاں کسی ہیلی کاپٹر کے اترنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ اس کے باوجود ہم نے ... کی مدد حاصل کرنے کے امکان کو مسترد نہیں کیا تھا اور ... آگے اور پیچھے دونوں طرف دو گاڑیوں میں تین تین آدمی اس ... کے لیے بٹھا دیے تھے کہ اگر ہیلی کاپٹر وہاں آئے اور وہ ... سیڑھی پھینک کر آئزک کو نکالنے کی کوشش کرے تو وہ اس ... کو کامیاب نہ ہونے دیں اور اس ہیلی کاپٹر کو مار گرانے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے دو آدمیوں کو مشین گنیں اور ایک ... کو راکٹ لانچر فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ سارا اسلحہ ... آدمی شرافت علی نے فراہم کیے تھے۔ رات کے پہلے پہر ... مغرب کے بعد اندھیرا پھیلتے ہی اس مکان کی نگرانی شروع کر ... گئی تھی اور وہاں آنے جانے والوں پر سختی سے نگاہ رکھی جا ... تھی، یہ بات ہمارے لیے طمانیت کا باعث بھی تھی اور حیرا... کن بھی کہ اس مکان کی حفاظت کے لیے وہاں کوئی دربان ... نہیں تھا۔ میں نے اس بات پر اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہو... فاطمہ اور شرافت علی سے کہا تھا۔ ”کیا یہ بات عجیب نہیں لگتی ... لوگوں کہ یہاں کوئی دربان تک نہیں ہے اور نہ ہی اس مکان کی ... حفاظت کا کوئی اور متبادل بندوبست کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ... غیر محفوظ مکان میں آئزک کیسے رہ رہا ہے؟“

”یہ بھی اس کی کوئی چال ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح ... ہمیں یہ تاثر دینا چاہتا ہے شاید کہ یہ ایک غیر محفوظ اور غیر ... ہے۔ اس جیسا محافظوں کے ہجوم میں گھر کر رہنے والا شخص ... نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں اپنے کسی ذریعے سے یہ پتا ملا ہوتا ... آکر اور یہ صورت دیکھ کر ہم کبھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو... کہ آئزک کبھی قدم بھی رکھ سکتا ہے اس مکان میں۔ ہم... یہاں ٹیلی فون کر کے تصدیق بھی کر لی ہے اس کی اس گھر میں ... کی۔ پھر اب شک و شبے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے“ فاطمہ ... جواب دیا۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب میں نے اس مکان کے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل جا دبائی۔ میرے ساتھ شرافت ... فاطمہ اور آسیہ بھی تھیں۔ انور کمال اور خان کو ہم نے باہر ہی چھوڑ... تھا اور انھیں ہدایت کر دی تھی کہ اندر اگر صورت حال زیادہ خر... ہوئی تو انھیں سگنل دے دیا جائے گا، وہ باہر موجود لوگوں ... ساتھ لے کر پوری قوت سے چڑھ دوڑیں اور کسی کو بچ... کا موقع نہ دیں۔

چند ثانیے انتظار کے بعد دروازہ کھول کر ایک ... سالہ لڑکے نے سر باہر نکال کر پوچھا۔ ”کون ہے، کس سے ... ہے جی آپ نے؟“

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے کر دیا اور کھلے ہوئے دروازے سے اندر پاؤں دھرتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "اوئے پرے ہٹ جا بندر کی اولاد، ہمیں جس سے ملنا ہوگا خود ہی مل لیں گے ہم۔ تو کون ہے بھئی ہم سے پوچھنے والا؟"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اچھی بدمعاشی ہے بھئی یہ تمھاری۔ زبردستی اندر گھسے چلے آرہے ہو؟"

میں نے ریوالور نکال کر اس کی نال سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے کیوں اپنی موت کو آواز دے رہا ہے۔ چل ہٹ پرے۔ زیادہ ٹر ٹر کرے گا تو گولی اتار دوں گا سینے میں؟"

میرے غضب ناک لہجے اور ریوالور کو دیکھ کر وہ بری طرح سہم گیا "ڈا..... ڈا ..... ڈاکو... ہائے میری ماں... ٹھیک ہے .... ٹھیک ہے... مم... مم... میں کچھ... کچھ نہیں کہتا جی... یہ لیں... مم... میں ہٹ گیا... ہٹ گیا میں آپ کے سامنے سے ڈاکو صاحب......"

"اوئے ڈاکو صاحب کے بچے! ڈاکو ہوگا تو، تیرا باپ۔ ہم ڈاکو نظر آتے ہیں تجھے الو کے پٹھے؟" میں نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کر کے کہا۔

"اچھا جناب! معاف کر دیں غلطی ہوگئی مجھ سے جو آپ کہتے ہیں وہی ٹھیک ہوگا، مگر ماریں تو نہیں مجھے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گھگیاتے ہوئے بولا۔

"چل اب آگے لگ ہمارے اور بتا ہمیں اس گھر میں کون کون ہے اس وقت۔ جھوٹ نہ بولنا سمجھا۔" میں نے اسے آگے دھکیل کر کہا۔

اسی وقت اندر سے کسی نے آواز دے کر پوچھا "ابے او شیدے کے بچے! کون آیا ہے، کس سے لڑ رہا ہے تو یہ؟"

"یہ جی....." اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے جلدی سے اس کا منہ پکڑ کر دبا دیا۔

"خبردار! اگر کچھ بھی بولا تو جان سے مار دوں گا۔" میں نے اسے دھمکی دے کر پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے شرافت علی سے دھیمی آواز میں کہا "اسے یار! اسے سنبھال تو۔ میں اندر سے بولنے والے کو دیکھتا ہوں جاکر۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

یہ کہہ کر میں گر بہ قدم مگر تیزی سے لپک کر اس کمرے کے دروازے پر جا پہنچا جہاں سے اس لڑکے شیدے کو آواز دی گئی تھی۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے اندر سے کسی عورت کی مدھم آواز سنائی دی "پتا نہیں کون ہے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ سی لگتی ہے ذرا تم دیکھو جاکر۔"

"فضول باتیں مت کیا کرو ہر وقت۔ وہم ہے تمھارا گڑبڑ کیا ہوسکتی ہے یہاں؟" کسی مرد نے کہا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں چلا کر شیدے کو آواز دی "ابے او شیدے الو کے پٹھے! گیا ہے تو؟ بتاتا کیوں نہیں آکر، کون آیا ہے اس وقت"

میں نے دروازے کو زور سے دھکا دے کر کھولا اور سے اندر گھس کر ریوالور ان کی طرف سیدھا کر کے کہا "کیوں پھاڑ رہا ہے کتے کے بچے۔ ہم آئے ہیں تیرے بہت ہی قریبی، پہچانتا ہے نا تو ہمیں؟"

وہ دونوں، عورت اور مرد شوہر اور بیوی لگتے تھے۔ کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ پینتیس اور چالیس کے اندر تھے دونوں۔ قد کاٹھ ان کا بس درمیانہ ہی تھا۔ ایک پر ساتھ ساتھ بیٹھے وی سی آر پر کوئی بھارتی فلم دیکھ رہے تھے۔ مجھے یوں ریوالور بدست اپنے سامنے دیکھ کر ایک دم بوکھلا کر کھڑے ہوگئے۔ عورت کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دکھائی دینے لگی تھیں، رنگت میں اس کی یوں لگتا تھا جیسے ہلدی گھول دی ہو۔ اچانک اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے مرد کا بازو تھام کر آہستہ آہستہ اس کے پیچھے کر دیا۔ البتہ مرد کے لیے لگتا تھا یہ صورت حال نئی نہیں تھی۔ نے بہت جلد اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پالیا تھا۔ اس نے اپنے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟ کیوں گھس آئے یہاں؟ جانتے....."

وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں عقب میں جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، میرے پیچھے فاطمہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور وہ فاطمہ کو دیکھ کر اچانک خاموش ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فاطمہ سے واقف تھا اور اسے دیکھ کر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جو شخص آٹزک کے لیے کام کر رہا ہو اس کے اس قدر قریب ہو کہ وہ اس کے گھر میں مہمان بنا ہوا ہو اور وہ شخص فاطمہ کو نہ جانتا ہو۔ البتہ فاطمہ کے انداز سے صاف تھا کہ وہ اس شخص کو نہیں جانتی ہے۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا اور یہ بات وہ بھی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ غصے سے بولا "بتایا نہیں تم نے کون ہو تم اور کیوں آئے ہو؟ یہ لڑکی کون ہے تمھارے ساتھ؟" یہ سوال اس نے یہی تاثر دینے کے لیے کیا تھا کہ وہ فاطمہ سے واقف نہیں۔

میں نے گرج کر کہا "بک نہیں اوئے یہودی کی اولاد، ہے ہم کون ہیں اور کیوں آئے ہیں یہاں۔ سیدھی طرح بتا دے ہے وہ تیرا اسرائیلی استاد! کہاں چھپا رکھا ہے تو نے"

"کیا بک رہے ہو تم۔ میں نے تمھیں آج سے پہلے نہیں دیکھا، پھر میں کیسے جان سکتا ہوں کہ تم کون ہو اور کس کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟" وہ تلخی سے بولا "شاید تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی اسرائیلی کو نہیں جانتا ہوں۔ جاؤ کہیں اور تلاش کرو جاکر۔"

"واہ بھئی واہ کیا بات ہے یار تیری۔ سلطان راہی کی نقل مار لیتا ہے تو۔ مگر یہ کسی فلم کا سیٹ نہیں ہے نہ ہم کسی فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ اداکاری فلم والوں کے لیے سنبھال رکھ اور ہمیں اس کا جواب صحیح صحیح دے دے جو ہم پوچھ رہے ہیں تجھ سے۔" میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا تم کیا پوچھ رہے ہو مجھ سے۔ میں بھی پاکستان کا ایک مسلمان شہری ہوں، میرا کسی اسرائیلی سے کیا تعلق؟" وہ اسی تلخی سے بولا۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مار کر کہا "بک نہیں اوئے کتے، اپنے آپ کو پاکستانی اور مسلمان کہہ کر توہین نہ کر ہم مسلمانوں اور پاک سرزمین کے باسیوں کی۔ اب اگر تو نے مسلمان یا پاکستانی کہا اپنے آپ کو تو زبان کھینچ کر پھینک دوں گا گدی سے۔"

میرا ہاتھ اتنی طاقت سے پڑا تھا اس کے منہ پر کہ وہ لڑکھڑا کر صوفے پر جا گرا تھا، اور جب اس نے گردن اٹھا کر مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور لہو کی ایک پتلی سی لکیر بہتی ہوئی نیچے ٹھوڑی کی طرف چلی آرہی تھی۔ اس کی بیوی نے جلدی سے جھک کر اسے سہارا دیتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا "ارے ظالم کیوں مار رہے ہو اس غریب کو۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمھارا؟"

"تجھ کو پتا نہیں ہے کیا بگاڑا ہے اس نے ہمارا، اتنی ہی بھولی ہے تو۔ تجھے کچھ پتا نہیں ہے کیا کرتا ہے یہ تیرا مجازی خدا؟" میں نے طنز یہ کہا۔

"پتا کیوں نہیں ہے۔ بیوی کو یہ پتا نہیں ہوگا کہ اس کا شوہر کیا کرتا ہے تو پھر کیا محلے والوں کو پتا ہوگا؟" وہ بھی ترکی بہ ترکی بولی تھی۔

"بہت خوب بھئی، واہ، تیری زبان تو خوب چلتی ہے۔ چل پھر تجھے ہی بتا دے ذرا ہمیں بھی کیا کرتا ہے یہ؟" میں نے مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ملازمت کرتے ہیں ایک ادارے میں سینئر کلرک ہیں۔ بارہ سو روپے تنخواہ ہے ان کی۔" وہ بڑے ہی فخریہ انداز میں بولی۔

"اور تمھارے گھر کا کل خرچ کتنا ہے۔ نوکر کتنے ہیں گھر میں تمھارے اور انہیں کتنی تنخواہ دیتی ہو تم؟" میں نے سوال کیا۔

"لے لو، خرچ ہی کیا ہے ہمارا۔ کل تین تو نوکر ہیں۔ ایک شیدا اوپر کا کام کرنے کے لیے، ایک کاکی صفائی وغیرہ کے لیے اور خانساماں، اور تینوں کو کل ملا کے سترہ سو روپے دیتے ہیں ہم۔ اور ہمارا خرچ ہی کیا ہے..." وہ بے تکان بولتی جا رہی تھی۔

اس کے شوہر نے اسے ڈانٹ کر چپ رہنے کے لیے کہا "کیسی بے وقوف عورت ہے، بغیر سوچے سمجھے بولتی جاتی ہے۔ کیا ضرورت ہے تجھے ان کے سامنے اپنے گھریلو معاملات پیش کرنے کی۔ چپ بیٹھ بالکل، زبان سے ایک لفظ نہ نکلے تیری۔"

وہ سہم کر بولی "لو میں نے خود تو نہیں کہا ہے کچھ بھی۔ انھوں نے پوچھا تھا جبھی تو بتا رہی تھی میں۔"

"انھوں نے پوچھا تھا تو بتا رہی تھی۔" وہ چڑ کر اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا "کون ہوتے ہیں یہ ایسی باتیں پوچھنے والے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس بے چاری پر کیوں ناراض ہوتا ہے یار! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے یہ، میں نے پوچھا تھا اس سے۔"

"میں کہتا ہوں تم ہو کون؟ اور کیوں ہمارے ذاتی معاملات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے فاطمہ سے مخاطب ہو کر کہا "تم آسیہ اور شرافت اس یہودی کتے کو دیکھو جاکر کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ۔ دیکھتے ہی گولی مار دینا اسے۔ ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرنا۔ اگر ذرا بھی دیر کی تو پھر ڈھونڈتے ہی پھریں گے ہم اسے۔"

"ٹھیک ہے آپ ان دونوں کو سنبھالیں میں جاتی ہوں ان کے ساتھ تلاش کرنے اسے۔ ویسے وہ دونوں اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے گئے ہوئے ہیں اس لڑکے شیدے کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں وہ۔" فاطمہ یہ کہہ کر تیزی سے مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

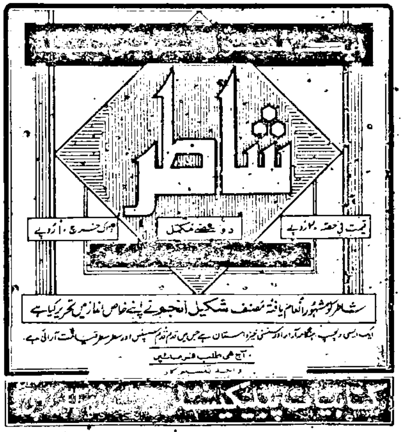

اس کے جانے کے بعد میں نے اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور زان کی طرف متوجہ ہو کر بولا "ہاں بھئی اب بولو، کیا بات ہے؟ تم نہیں جانتے ہو مجھے بالکل اور تمھیں یہ بھی پتا نہیں ہے کہ ہم یہاں کس کو تلاش کرنے آئے ہیں؟"

وہ مجھے غصّے سے گھورتے ہوئے غضب ناک نظروں سے دیکھتا رہا لیکن بولا نہیں۔ میں نے اس کے ان تیوروں کی پروا کیے بغیر کہا "تنخواہ تیری بارہ سو روپے ہے، اور تو اپنے نوکروں کو ستر سو روپے دیتا ہے یعنی اپنی تنخواہ سے پانچ سو روپے زیادہ تو نوکروں کو دے دیتا ہے اپنے اور جس ٹھاٹ باٹ کی تو زندگی گزار رہا ہے، اس پر بھی کم از کم آٹھ ہزار تو خرچ ہو ہی جاتے ہوں گے ہر مہینے۔ تو یہ اتنے روپے تجھے کہاں سے ملتے ہیں؟ کون دیتا ہے یہ پیسے تجھے۔ کیوں بی بی! کبھی تو نے یہ بھی پوچھا ہے اپنے اس ناخدا سے؟"

"ارے واہ میں کیوں پوچھوں، مجھے اس سے کیا؟ یہ تو ان کی ذمے داری ہے۔ گھر کے اخراجات تو انھیں پورے کرنا ہوتے ہیں کچھ بھی کریں کہیں سے بھی کریں، مجھے تو جی دس ہزار چاہئیں مہینے کے اور وہ میں ان سے لے لیتی ہوں۔" وہ فوراً بولی۔

تجھے دس ہزار چاہئیں چاہے یہ خود کو بیچ کر لائے، اپنے ضمیر کو بیچے یا ملک اور قوم کا سودا کر کے دام کھرے کر لائے تجھے دس ہزار چاہئیں جبکہ تجھے یہ بھی پتا ہے کہ تنخواہ اس کی صرف بارہ سو روپے ہے کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تنخواہ سے کیا ہوتا ہے سوکھی تنخواہ میں کوئی گزارہ ہوتا ہے کسی کا۔ آدمی کو آمدنی بڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولی۔

"اور اگر یہ تجھے ہر مہینے دس ہزار روپے نہ دے سکے تو پھر؟ پھر کیا کرے گی تو؟" میں نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں دیں گے یہ دس ہزار روپے مہینہ مجھے جب اتنا خرچ ہے تو وہ تو دینا ہی پڑیں گے انھیں۔ خرچہ اٹھانے کی ذمے داری جو قبول کی ہے انھوں نے۔ اگر نہیں دے سکتے تو سنبھالیں خود ہی اپنا گھر بار میں ان سے کم میں گھر نہیں چلا سکتی۔"

اس رات اس عورت کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس رات پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ لوگ رشوت، اسمگلنگ، منشیات فروشی اور وطن فروشی جیسے ذلیل کام کرنے پر کیوں کر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں ہماری اکثریت نے حرام اور حلال کی تمیز کھو دی ہے۔ اور آدمی بیوی بچوں کے ناجائز مطالبات کے آگے کس طرح بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ نادان عورت اپنے عیش اور آرام کی خاطر اپنے شوہر کو ہلاکت کی راہ پر ڈالتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتی۔ یہ ایک عورت ان تمام عورتوں کی اور ان کے انداز فکر کی ترجمانی کر رہی تھی جن کی اس منفی سوچ کی وجہ سے پورا معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور حرص و طمع تیزی سے محبت اور اخوت کی جگہ لے رہی ہے۔ کسی کو پروا ہی نہیں ہے اس بات کی کہ ان کے دلوں کو سیاہ سے سیاہ تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ ان کا تشخص اور ان کی شناخت مٹتی جا رہی ہے اور بحیثیت قوم وہ تیزی سے تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بے حسی اور بے فکری کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اس شعر کی تفسیر نظر آنے لگا ہے کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

میرا خون بری طرح کھول اٹھا تھا۔ دماغ کی شریانیں پھٹتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ غصّے سے بے قابو ہو کر میں نے آگے بڑھ کے اس خود غرض سیاہ دل عورت کے بال مٹھی میں جکڑ کے انھیں جھٹکے دیتے ہوئے کہا "شیطان کی بچی، تجھے اس بات سے غرض ہی نہیں ہے کوئی کہ تیرے نفس کی تسکین کے لیے یہ شخص وطن فروشی جیسے ذلیل کام کے لیے آمادہ ہو چکا ہے۔"

وہ تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے مجھے گالیاں بکنے لگی "کمینے، کتّے، مردود شرم نہیں آتی تجھے، ایک کمزور عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار کے کہا "ذلیل کتیا! تجھ جیسی عورت کو زندہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ حق نہیں ہے تجھے اس دنیا میں رہنے کا۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔ اور ریوالور سیدھا کر کے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔

اس کے سینے سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھ کر اس کا وطن فروش، کمینہ شوہر اس کی طرف لپکا تو میں نے ایک گولی اس کے سینے میں بھی اتار دی اور ان دونوں کو تڑپتا چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ ان دونوں کو مار کر بھی میرا سینہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسٹین گن لے کر نکلوں اور ایک ایک وطن فروش کو بھون کر رکھ دوں۔ چن چن کر مار دوں ایک ایک کو۔ اسی وقت اگر آئزک نظر آ جاتا مجھے تو اس کی بوٹیاں کر کے آوارہ کتوں کو کھلا دیتا۔ مگر اس ابن بیہودہ کو پتا نہیں کیوں ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہا تھا میرا سوہنا رب۔ اس کی ... کھینچ ہی نہیں رہا تھا وہ اور وہ یہودی اس ڈھیل کو اپنی ذہانت اور چالاکی سے تعبیر کر رہا تھا۔ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ اس کا کارنامہ ہے کہ ہر بار میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل جاتا ہے وہ۔ ہم نے اس مکان کا ایک ایک کونا کھنگال ڈالا، ایک ایک کونا چھان کر رکھ دیا مگر وہ اسرائیل زادہ ہمیں نہیں مل سکا۔ پتا نہیں کب اور کیسے وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مکان کی اور یہاں آنے جانے والوں کی سخت نگرانی کی جا رہی تھی اور اس دوران ہمیں کسی کے گھر سے باہر جانے کی اطلاع نہیں ملی تھی کہ ہم یہ سمجھ لیتے کہ وہ جا نکلا ہو گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہی تھی جسے دو ڈھائی گھنٹے وہاں گزار کر اور مکان کے چپے چپے کو کھنگال لینے کے بعد آخر ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ بات جب شرافت علی نے مجھ سے کہی کہ یار جیلانی! آج بھی لگتا ہے ہم نے اپنا وقت ہی برباد کیا ہے اس ذلیل آدمی کی تلاش میں۔ پتا نہیں کب اور کیسے نکل گیا وہ یہاں سے؟ شرافت علی کی بات سن کر رشیدا جو خاموشی کے ساتھ ان کے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا جلدی سے بولا "کیا تم لوگ کسی کو ڈھونڈنے آئے ہو یہاں؟"

"ہاں، اور تو کیا سمجھ رہا تھا اتنی دیر سے، کیا ہم پورے گھر میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اتنی دیر سے؟" شرافت علی جھنجلا کر بولا۔

"وہ جی اگر کسی آدمی کی تلاش تھی تو مجھ سے پوچھ لیا ہوتا جی! میں بتا دیتا آپ کو۔" اس نے کہا۔

میں نے اور شرافت علی نے ایک دم چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا جیسے اپنی اس حماقت پر ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا چاہتے ہوں لیکن پھر دونوں ہی ایک ساتھ ہنس پڑے۔ میں نے کہا "اوئے شرافت علی! یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے یار! اتنے سامنے کی بات بھلا کر خواہ مخواہ ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتے پھر رہے ہیں ہم۔ اس سے معلوم کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ہمیں۔"

وہ بولا "ہاں یار! یہ بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔ یہ تو شروع سے ہی ساتھ ہے ہمارے، اس گھر کے بھیدی کا خیال نہیں رہا ہمیں۔"

میں نے رشیدے سے پوچھا "پچھلے ایک ہفتے سے اسحاق نامی ایک شخص مہمان بنا ہوا تھا تیرے صاحب کے پاس۔ تجھے پتا ہے وہ کہاں ہے اس وقت؟ ہم اسے ہی تلاش کر رہے ہیں۔ تو بتا سکتا ہے وہ کہاں چھپا ہوا ہے؟"

"ارے صاحب! اس کو تلاش کرنے آئے ہیں آپ! وہ آدمی تو لگتا ہی نہیں ہے جی وہ تو کوئی اور ہی شے ہے، اس کو کیا کریں گے آپ؟" وہ بولا۔

"اوئے تو تو یار بہت ہی بے زار لگتا ہے اس سے۔ معلوم ہوتا ہے بہت دل دکھایا ہے اس نے تیرا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ارے آپ دل دکھانے کی بات کر رہے ہیں، اس نے تو میری جان ہی لے لی تھی آج! اگر وہ بیگم صاحبہ بیچ میں نہ آ جاتی تو۔" وہ نفرت سے منہ بنا کر بولا "بیگم صاحبہ نے بڑی منت سماجت کر کے اور رو دھو کے معافی دلائی ہے مجھے کہ میں زندہ نظر آ رہا ہوں اس وقت۔"

"اچھا! مگر کیوں، وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا؟ کیا بگاڑا تھا تم نے اس کا؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے رشیدے سے پوچھا۔

"بس جی غلطی مجھ سے اتنی سی ہوئی تھی کہ صبح کسی عورت نے فون کر کے ڈاکٹر... وہ کیا نام تھا اس کا" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "... آں آں... ہاں یاد آیا عالیہ ... ہاں جی ڈاکٹر عالیہ کو پوچھا تھا اس عورت نے، میں نے اس کو بتا دیا کہ وہ تھوڑی دیر ہوئی کہیں چلی گئی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ ڈاکٹر عالیہ ہمارے صاحب کی مہمان ہے، میں نے اس کو بتایا کہ وہ صاحب کی نہیں بلکہ صاحب کے مہمان اسحاق صاحب کی مہمان ہے۔ وہ عورت بھی کوئی عجیب ہی شے لگتی تھی مجھے میں نے اسحاق صاحب کا بتایا تو اس نے ان کے ہی بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کب سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کے اپنے بہت سارے مکان ہیں شہر میں، انھیں چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب مجھے کیا معلوم تھا، اس سلسلے میں اسے کیا بتاتا میں۔ میں اس سے بات کر رہا تھا کہ وہ اسحاق صاحب آ گئے ادھر۔ حالاں کہ انھیں ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہوا تھا، مگر پتا نہیں کیوں نکل آئے تھے وہ اس وقت اپنے کمرے سے۔ آتے ہی پوچھنے لگے کس کا فون تھا؟ کس سے بات کر رہا تھا میں؟ میں نے صاف بتا دیا کہ کوئی عورت تھی ڈاکٹر عالیہ کو پوچھ رہی تھی۔ وہ ایک دم چونک کر بولا۔ کون عورت پوچھ رہی تھی ڈاکٹر عالیہ کو، کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا؟ میں نے کہا نام تو اس نے اپنا نہیں بتایا تھا۔ اور میں نے بھی نہیں پوچھا اس سے۔ اس نے جی یہ سنتے ہی میرے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ مار دیا بولا۔ الو کے پٹھے، ساری بکواس کر دی اور نام تک نہیں پوچھا اس کا۔ اس کا تھپڑ اتنی زور سے لگا تھا کہ میں رو پڑا تھا۔ میں نے روتے ہوئے صاحب اور بیگم صاحبہ کو آوازیں دیں تو وہ دونوں دوڑتے ہوئے آئے تھے مگر اس جانور کو لال پیلا ہوتے دیکھ کر یوں ٹھٹک گئے جیسے کوئی درندہ دیکھ لیا ہو انھوں نے۔ پھر پتا نہیں وہ لوگ اس سے کیوں اتنا ڈرتے ہیں۔ مہمانوں سے پہلے تو کبھی میں نے انھیں ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور پھر مہمان تو بس مہمان ہی ہوتے ہیں ان سے کون ڈرتا ہے۔ مگر صاحب کا تو یہ حال ہو جاتا ہے اس کے سامنے جیسے وہ مالک ہو ان کا اور صاحب نوکر ہوں۔ بالکل یوں سہم جاتے ہیں جیسے بکری شیر کو دیکھ کر سہم جاتی ہے... بیگم صاحبہ کو بھی آواز نہیں نکالنے دیتے اس کے سامنے۔ انھوں نے

نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔ کیا ہوا جناب! کیا غلطی ہو گئی ہے اس سے؟ کیوں ناراض ہو رہے ہیں آپ؟ اس نے لہراتے ہوئے کہا۔ تم خود ہی پوچھو اس اُلّو کے پٹھے سے' اس نے ٹیلی فون پر کسی عورت کے ساتھ کیا بکواس کی ہے، صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ساری بات سچ سچ بتا دی انھیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اس نے مجھے صرف اتنی سی بات پر مارا ہے کہ میں نے اس عورت کا نام کیوں نہیں معلوم کیا۔ صاحب نے اس سے کہا۔ چھوڑیں جناب! بے وقوف ہے یہ' اتنی سمجھ نہیں ہے اس میں' معاف کر دیں اسے۔ مگر وہ تو جی آپے سے باہر ہو رہا تھا لال لال آنکھیں نکال کر بولا' یہ بہت خطرناک لڑکا ہے۔ پتا نہیں کس کس کو کیا کیا بتا چکا ہے یہ فون پر، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ گولی مار دوں گا میں اسے، اور جی اس نے سچ مچ پستول نکال لیا مجھ پر۔ کہتا تھا' میں اس کے دشمنوں سے مل گیا ہوں۔ انھیں اس کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا ہوں۔ وہ مجھے گولی مارنے ہی والا تھا مگر بیگم صاحبہ ایک دم میرے سامنے آ گئیں۔ شاید آج پہلی بار وہ اس کے سامنے یوں سینہ تان کر کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے غصّے سے کہا' یہ نہیں ہو سکتا، میں اپنے گھر میں خون خرابہ بالکل پسند نہیں کروں گی اور پھر اس غریب بچّے نے کیا کیا ہے جو اس کی جان کے دشمن ہو گئے تم۔ ٹیلی فون سننا اس کی ذمّے داری ہے۔ ہر فون یہی ریسیو کرتا ہے اور اطلاع دیتا ہے اسے جس کا فون ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی ٹیلیفون پر سوال جواب شروع کر دے تو یہ اس کا تو قصور نہیں ہے' لیکن اس نے معلومات فراہم کی ہیں اُسے۔ وہ غصّے سے بولا' کوئی معلومات فراہم نہیں کی ہیں اس نے۔ اسے معلوم ہی کیا ہے جو یہ کچھ بتائے گا کسی کو۔ اور پھر اگر کسی کے سوالوں کے اگر جواب دیے بھی اس نے تو کسی نے اس کو منع تو نہیں کیا تھا اس کے لیے۔ کسی نے کہا تو نہیں تھا کہ کوئی اگر کچھ پوچھے تو اسے بتانا نہیں کچھ۔ جب کسی نے کچھ کہا نہیں' کوئی ہدایت ہی نہیں کی تو اس بے چارے کو قصوروار ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟' وہ غصّے سے ترکی بہ ترکی اس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔ اور اس کا بُرا حال تھا غصّے کے مارے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بیگم صاحبہ کی حمایت کرتے ہوئے بولے' ٹھیک کہہ رہی ہے سرا! اس غریب پر رحم کریں۔ آئندہ ایسی حماقت نہیں کرے گا یہ'۔

'آئندہ' تم آئندہ کی بات کر رہے ہو، اب میں ایک منٹ بھی تمھارے اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے یقین ہے' وہ عورت جس نے فون کیا تھا اُلٹا سی ہی تھی۔ اور اس نے میرے دشمنوں کو بتا دیا ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔ اب یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی ہے میرے لیے۔ میں جا رہا ہوں یہاں سے'۔

اس نے صاحب سے کہا اور اپنا پستول واپس جیب میں ڈال کر جانے کے لیے پلٹ پڑا۔ صاحب اسے عاجزی سے سمجھانے اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل دیے کہ اسے ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کے دشمنوں کو کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ لیکن اس نے صاحب کی ایک نہیں سنی۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ یہاں سے چلا گیا اور اس کے کوئی تین گھنٹے بعد دو آدمی ایک وین میں آئے تھے اور اس کا مختصر سا سامان اٹھا کر لے گئے تھے۔ یوں اس کے جانے سے میری جان بھی بچ گئی ورنہ وہ کچھ دن اور رہ جاتا یہاں تو یقین کریں میں اس کے ہاتھوں ضرور مارا جاتا ایک دن۔ بیگم صاحبہ ہمیشہ تو نہیں بچا سکتی تھیں مجھے۔ آپ اسے کیوں تلاش کر رہے ہیں؟"

"ہم اسے اسی لیے تلاش کر رہے ہیں کہ تم جیسے سیدھے سادے اور مظلوم لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلا دیں۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ وہ درندہ ہے، بے شمار لوگ اس کی درندگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ لوگ چھپتے پھرتے ہیں اس کے خوف سے۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ خوش ہو کر بولا' "لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور وہ آپ سے خوف زدہ رہتا ہے۔ آپ ہی کے ڈر سے وہ یہاں چھپا تھا آ کر۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ وہ گیدڑ ہے سالا اور خواہ مخواہ خود کو شیر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیر کسی سے ڈرتا تو نہیں ہے۔"

فاطمہ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا' "تم بھی تو نہیں ڈرتے ہو نا اس سے۔ شاباش پھر بتاؤ وہ کہاں گیا ہے یہاں سے؟"

"یہ مجھے بھی نہیں پتا ہے جی! اگر پتا ہوتا تو میں ضرور بتا دیتا آپ کو۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں' کوئی اس کمینے کو ختم کر دے بالکل ہی؟"

"اچھا، کسی اور کو بھی معلوم نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے صفائی والی کو یا خانساماں کو؟ کسی کو تو معلوم ہو گا یار؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے خانساماں کو پتا ہو۔ اس کی بڑی دوستی ہے اس سے۔ خوب ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں وہ دونوں۔ یا پھر صاحب کو اور بیگم صاحبہ کو پتا ہو گا، ان سے پتا کریں آپ، وہ ضرور بتا دیں گے۔" اس نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات بتائی تھی مجھے۔

وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا وہ وطن فروش صاحب اور عیش پرست بیگم اپنے ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہی تھی کہ وہ واقعی اپنے اسی ڈرائنگ روم میں موجود تھے اب بھی، جہاں میں نے انھیں پایا تھا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک پُرتعیش زندگی گزارنے کی خواہش کی تکمیل میں کتنے سنگین جرائم میں ملوث ہو چکے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنے ہم عصروں' عزیزوں اور دوستوں میں سب سے ممتاز نظر آنے کی خاطر انھوں نے اپنے ملک اور پوری قوم کے مستقبل کا سودا کر ڈالا تھا۔ انھیں کوڑیوں کے دام بیچ دیے تھے وہ' لہٰذا میں نے ان کے وجود سے اس دھرتی کو پاک کر دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا' "وہ خانساماں کہاں ہے اس وقت؟"

"وہ تو جی اپنے گھر چلا جاتا ہے رات کا کھانا کھلانے کے بعد، اب تو صبح فجر کے بعد ہی آئے گا وہ۔" شیدے نے جواب دیا۔

"اور گھر کہاں ہے اس کا؟ پتا ہے تجھے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ تو مجھے نہیں معلوم جی! کبھی جانا ہی نہیں ہوا ہے ادھر میرا۔ آپ صاحب سے پتا کر لیں نا' وہ بتا دیں گے آپ کو۔" وہ بولا۔

"نہیں یار! مجھے افسوس ہے' وہ تیرا صاحب اب کسی کو بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ اب تو خانساماں ہی کو ڈھونڈنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں جی، کیوں نہیں بتا سکتے صاحب اب کسی کو بھی؟ آپ میرے ساتھ چلیں' میں بیگم صاحبہ سے کہوں گا، وہ صاحب کو راضی کر لیں گی۔ آپ کو پتا نہیں ہے' صاحب ان کی بات کبھی نہیں ٹالتے۔ وہ اگر کہیں گی تو ضرور بتا دیں گے وہ۔" شیدا اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔

میں نے اسے آواز دے کر کہا' "بے کار ہے شیدے یار! تیرا ان کے پاس جانا فضول ہے، اب وہ کسی کو بھی کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔"

وہ چلتے چلتے رک کر میری طرف مڑا اور غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا' "کیا مطلب ہے آپ کا؟ کہیں آپ نے ان دونوں کو۔۔۔"

"ہاں شیدے! ٹھیک سمجھا ہے تو۔ وہ تیرا صاحب جس راہ پر چل پڑا تھا' اس کا انجام یہی ہونا تھا اس کے بعد۔ اور اگر میں آج اسے زندہ چھوڑ کر چلا جاتا یہاں سے تو کل اس ملک اور اس پوری قوم کے قتل کا ماتم کرنے والا بھی نہ ہوتا کوئی۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

ان دونوں کے مرنے کا سن کر اس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ وہ مضمحل اور پژمردہ سا دکھائی دینے لگا تھا۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا یہ جان کر۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا واپس آ کر پھر وہیں بیٹھ گیا جہاں سے چند لمحے پہلے اٹھ کر گیا تھا اور بولا۔ "یہ آپ نے کیا کر دیا صاحب جی! آپ نے تو میرے سر پر سایہ ہی نہیں چھوڑا ہے۔ اب میرا کیا بنے گا، میں کہاں جاؤں گا؟ میرا تو اس گھر کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی نہیں ہے' کوئی مجھے سہارا دینے والا، میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا تک نہیں ہے۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"کیا مطلب ہے یار تیرا؟ یہ کوئی تیرے عزیز رشتے دار تو نہیں تھے نا، نوکر ہی تو تھا تو ان کے گھر میں؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں جی' تھا تو میں نوکر ہی ان کا مگر اس اتنی بڑی دنیا میں ان کے سوا میرا تھا ہی کون، میرے تو ماں باپ، بہن بھائی' عزیز اور رشتے دار جو کچھ تھے بس یہی تھے۔ پانچ سال کی عمر سے ہوں میں ان کے پاس۔ اب میں کس کے پاس جاؤں گا؟" وہ سسکتے ہوئے بولا۔

میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑتی چلی گئی۔ اس رات پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ دنیا کا بدترین آدمی اتنا بُرا اور ناکارہ نہیں ہوتا کہ اسے بے سوچے سمجھے، کچھ جانے بوجھے بغیر حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالا جائے۔ وہ بُرے لوگ بھی آخر کسی کی مانگ کا سندور اور کسی کے سر کا سائبان ہوتے ہیں۔ انھیں ضرورت ہوتی ہے ان کی۔ وہ بدکار، بے ضمیر اور عاقبت نااندیش لوگ اپنی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر جب چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آ کر پسے جاتے ہیں تو کچھ بے گناہ' معصوم' بے قصور بھی پس جاتے ہیں ان کے ساتھ۔ میں اداسی سے شیدے کی شکل تکتا رہ گیا تھا۔ میری زبان ایسی گنگ ہوئی تھی کہ اس کے لیے ہمدردی اور دلاسے کے الفاظ تک ادا نہیں ہو رہے تھے مجھ سے۔ میرے ساتھ اوروں کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی اس گھڑی۔ آخر شرافت علی نے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا' "پریشان نہ ہو میرے بچّے! تو بے سہارا نہیں ہے۔ آج سے تو بھی ہمارے ساتھ رہے گا، ہمارے خاندان کے ایک فرد کی طرح۔ فکر نہ کر بیٹے! ہم اپنے بچّوں کی طرح رکھیں گے تجھے۔"

یہ منظر بڑا ہی رقت انگیز تھا۔ ہم میں سے ہر شخص بے حد اداس اور مضمحل دکھائی دینے لگا تھا اور شرافت علی کی حالت تو بس دیدنی تھی اس سمے۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب سا رواں تھا۔ اس کے سارے زخم کھل گئے تھے شاید، ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ اپنی زندگی کے ہم سفر اور اپنے جگر گوشوں کا ماتم کر کے بیٹھا تھا، اس کے سینے کے زخم ابھی پوری طرح مندمل

کہاں ہوتے تھے ۔ اور دکھی تو ہم سب ہی تھے ۔ ان چند دنوں نے ہمارے کتنے پیارے چھین لیے تھے ہم سے، شرافت علی کی دنیا لٹ گئی تھی، فیروز جیسا مخلص اور باوفا ہم میں نہیں رہا تھا، آبی اور گل بدمان جیسے جاں نثار ہماری آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں لوٹ گئے تھے اور ہم ان کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکے تھے حتیٰ کہ ان کی لاشیں تک اٹھا کر نہیں لا سکے تھے، انہیں بے گور و کفن چھوڑ آئے تھے انھیں جیسے ہمارا کوئی تعلق ہی نہ ہو ان سے۔ آدمی کتنا مجبور اور بے بس ہے کہ کبھی کبھی ایسے کام بھی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا وہ۔ آبی مجھے کتنا عزیز تھا، اس کی چند دن کی جدائی سے دنیا خالی خالی سی لگنے لگی تھی مجھے، زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سان فرانسسکو جیسے دور دراز علاقے میں بھی میں اس سے غافل نہیں ہو سکا تھا اور اس کی رہائی کے منصوبے بناتا رہا تھا وہاں بھی، دھمن جیسے گھٹیا اور رذیل شخص سے دوستی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا محض اس کی خاطر۔ میں تو کیا کوئی بھی ایسا شخص جو میرے اور آبی کے تعلق سے واقف تھا یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کبھی کہ آبی جب اس بے وفا دنیا سے رخصت ہو رہا ہو گا تو میں اسے اس طرح سسکتا ہوا چھوڑ کر بھاگ آؤں گا۔ میں عین اس لمحے اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا جب فرشتۂ اجل اس کے سر پر کھڑا اس کی روح کھینچ رہا ہو گا۔ کبھی نہیں سوچا ہو گا ایسا کسی نے مگر ایسا ہو گیا تھا۔ مصلحتوں اور مجبوریوں نے مجھ سے یہ کام بھی کرا لیا تھا۔ محرومیوں کا عذاب کتنا سخت، کیسا جان لیوا ہوتا ہے یہ ان چند دنوں نے مجھے ہی نہیں ہم سب کو اچھی طرح بتا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت شیدے کے بے سہارا ہو جانے کے احساس نے ہم سب کو ملول کر دیا تھا اور شرافت علی نے بے اختیار بڑھ کر اسے سینے میں سمیٹ لیا تھا اپنے۔ اس کی عمر ایسی کہاں تھی کہ اسے حوادث کی تند و تیز آندھی سے لڑنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جاتا۔ وہ پندرہ سولہ برس کا بچہ ان تیز آندھیوں میں قدم جما کر کھڑا تک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اسے اڑا کر نہ جانے کہاں کہاں لے جاتیں، نہ جانے کیسے کیسے راستوں پر اڑاتے اڑاتے پھرتیں اسے، راستے میں حائل پتا نہیں کیسے کیسے درختوں، چٹانوں اور پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر کیا حال کر دیتیں اس کا اور نہیں معلوم کہاں اور کس حال میں پھینک کر آگے بڑھ جاتیں۔ ابھی اس کی عمر دنیا کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور سنبھل سنبھل کر قدم آگے بڑھانے کی تھی۔ طوفانوں میں راہ بنا کر چلنے کی نہ اسے عادت تھی اور نہ ہی تجربہ۔ ابھی سیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کے دن تھے اس کے۔

میں نے بھی اس کی ہمت بندھانے کی خاطر شرافت علی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا، ”ہاں ہاں، تو فکر کیوں کرتا ہے میرے یار! ہم تجھے اپنے ساتھ رکھیں گے، اور کسی طرح کی بھی ذرا سی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ تو چل یار ہمارے ساتھ۔ یہ لوگ جن کے ساتھ تو رہا تھا اب تک، ان کا تو ایک دن انجام یہی ہونا تھا۔ آگ سے کھیلنے والے کو ایک دن تو جلنا ہی ہوتا ہے۔ اپنی چالاکی اور مکاری سے آخر کب تک بچا رہ سکتا ہے وہ۔ تیرے صاحب نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ اسی مقام پر ختم ہوتا تھا آ کے، اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے بھائی، تو کسی کو الزام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا کیوں کہ اس نے خود انتخاب کیا تھا اس راہ کا۔“

شیدے نے روتے ہوئے کہا، ”اگر کوئی غلط کام کیا تھا تو وہ صاحب نے کیا تھا آپ کو سزا بھی انھیں ہی دینا چاہیے تھی۔ آپ نے ان کے ساتھ بیگم صاحبہ کو کیوں مار دیا؟ وہ تو ایک گھر کی چار دیواری میں بند رہنے والی سیدھی سادی عورت تھی بے چاری، وہ ان بداعمالیوں کی ذمے دار تو نہیں تھی جس کی سزا آپ نے اسے دی ہے۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا اس میں۔“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے بیٹے؟ سارا قصور تو اسی کا تھا، اپنے شوہر کے سارے برے اعمال کی ذمے دار وہ ہی تو تھی۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیسے جی، میں نے تو کبھی انھیں کوئی ایسا ویسا کام کرتے نہیں دیکھا۔ انھیں اپنے گھر بار سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی اتنی؟“ وہ بولا۔

”میرے بچے! تو نہیں سمجھ سکتا ان باتوں کو، تجھے تو وہ سیدھی سادی سی گھریلو عورت ہی دکھائی دیتی تھی مگر وہ اس کا خاوند جو کچھ کر رہا تھا اسی گھر میں بیٹھنے والی سیدھی سادی عورت کی وجہ سے ہی کر رہا تھا۔ اگر وہ اس کی حلال کمائی کے بارہ سو روپے میں گزارا کرنے کو تیار ہو جاتی، وہ اس غریبی میں صبر و شکر کے ساتھ سکون سے رہنے دیتی اپنے شوہر کو تو کبھی حرام کا مال حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کرتا وہ۔ تو خود بتا بابا تیرے صاحب کی تنخواہ تو صرف بارہ سو روپے تھی اور یہ بات اس کی اس گھریلو قسم کی بیوی کو بھی معلوم تھی، پھر وہ اس سے ہر مہینے دس ہزار روپے کیوں طلب کرتی تھی؟ کیوں کہتی تھی کہ اس سے کم میں اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ کیا وہ عورتیں نہیں ہیں جو چار پانچ سو میں اپنے کئی کئی بچوں کے ساتھ گزارا کر رہی ہیں، اپنے شوہروں کی حلال کی کمائی کی روکھی سوکھی کھا کر صبح و شام اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہیں اور کبھی شکایت نہیں کرتیں تنگ دستی

تیری وہ بیگم صاحبہ بھی ایسا کر سکتی تھی۔ اس میں کون سے [...]خاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ وہ دس ہزار روپے مہینہ سے [...]یں گزارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس عورت کے بے جا مطالبات [...]نے اس شخص کو اتنا گرا دیا تھا۔ ایسی ہی عورتیں اس معاشرے [...]بربادی کی ذمے دار ہیں شیدے، ان کے تقاضے اور فرمائشیں [...]ری کرنے کے لیے ہی مرد رشوت، اسمگلنگ، چور بازاری [...]ر منشیات فروشی جیسے ذلیل کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے [...]ر جسے یہ سب کرنے کا موقع نہیں ملتا وہ تیرے صاحب کی [...]رح وطن فروشی کی راہ پر نکل جاتا ہے، اپنی چند روزہ زندگی [...]یں رنگ آمیزی کی خاطر پوری قوم کا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے [...]ن عاقبت نا اندیش لوگوں نے۔“

”یہ تو بڑی عجیب بات بتائی ہے جی آپ نے۔ صاحب ایسے لگتے تو بالکل بھی نہیں تھے۔“ شیدا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”ہاں یار! یہی تو مشکل ہے ہماری کہ ہم آدمی کے دل کا بھید نہیں پا سکتے۔ اسی بات نے تو آدمی کو شہ دے رکھی ہے۔ وہ اپنے چہرے پر پاکیزگی اور شرافت کا خول چڑھا کر ساری دنیا کو زندگی بھر دھوکے دیتا رہتا ہے۔ اس کی پروا کیے بغیر کہ آخر ایک دن اسے ایسی عدالت میں بھی حاضر ہونا ہے جہاں اس کا ایک ایک عضو خود بولے گا اور ایک ایک عیب گنا دے گا اس منصفِ اعظم کو جس سے زیادہ انصاف کرنے والا پوری کائنات میں دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اور اس عدالت سے جو سزا تجویز ہو گی اس کے لیے، اس سے بڑی سزا بھی دنیا کی کوئی عدالت نہیں دے سکتی کسی کو۔ یہ جانتا تو ہر شخص ہی ہے مگر اس کی پروا کوئی کوئی کرتا ہے۔“ میں نے دکھ کے ساتھ کہا۔

ہم اس شیدے کے ساتھ ایسے الجھے کہ آئزک یاد ہی نہیں رہا ہمیں۔ آسیہ نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا، ”یہ آپ کن باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے آنے کا یہ مقصد تو نہیں تھا۔ جلد از جلد اس خانساماں کا پتا کریں اور اس آئزک کو پکڑنے میں جلدی کریں۔“

میں نے چونک کر کہا، ”ہاں بھئی ٹھیک ہی تو کہتی ہے یہ آسیہ، ہمیں جلد از جلد اس یہودی کی اولاد کو پکڑنا چاہیے چل کر۔“

فاطمہ بولی، ”وہ تو ٹھیک ہے جناب عالی! لیکن اسے ہم پکڑیں گے کہاں؟ کچھ پتا ٹھکانا تو معلوم ہونا چاہیے اس کا۔“

شرافت علی نے شیدے سے کہا، ”شیدے! یاد کر میرے بچے، اس خانساماں تک آخر کیسے پہنچ سکتے ہیں ہم؟“

”میں کیا یاد کروں جی! مجھے تو پتا ہی نہیں ہے کچھ بھی۔ یہی ہو سکتا ہے اب تو کہ صبح تک انتظار کر لیں اس کا۔ اذانوں کے بعد آ جائے گا وہ۔ جب سے صاحب نے نوکر رکھا ہے اسے، پابندی کے ساتھ اسی وقت آتا ہے، کبھی ناغہ تو کرتا ہی نہیں ہے وہ۔“ شیدے نے معصومیت سے کہا۔

”اچھا، کب رکھا تھا اسے تیرے صاحب نے؟ میرا

مطلب ہے کب سے کام کر رہا ہے وہ یہاں؟" فاطمہ نے اس سے پوچھا۔

"یہی کوئی چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب سے ان کے حالات کچھ ٹھیک ہوئے ہیں تبھی سے نوکر شوکر رکھنے کی سوچی ہے انھوں نے، اس سے پہلے تو ان کے پاس گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ بیگم صاحبہ خود ہی سارے کام کرتی تھیں اپنے ہاتھوں سے، اور صبح و شام لڑائی ہوتی تھی صاحب سے ان کی، میری دو وقت کی روٹی بھی بھاری لگتی تھی انھیں۔" شیدے نے اسے بتایا۔

فاطمہ میری طرف مڑ کر بولی "اس کا مطلب ہے یہ ابھی نیا ہی پھنسا تھا آئزک کے جال میں اور شاید ابھی انڈر ٹریننگ ہی تھا۔"

"پھر اب کیا کریں ہم؟ وہ خانساماں مل جاتا کسی طرح تو شاید اس کے نئے ٹھکانے کا پتا چل جاتا ہمیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھہریں میں اپنے آدمیوں کو فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔ شاید ان میں سے کسی کو پتا چل گیا ہو کہ وہ کہاں ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے چلو ادھر ان کے ڈرائنگ روم میں رکھا ہے ٹیلی فون۔" میں نے اٹھ کر قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور یار شرافت علی! تم ذرا باہر جا کر خان اور انور کمال کو ساری صورتِ حال بتا دو اور ان لوگوں کو اب واپس ہی بھیج دو جو اِدھر اُدھر ناکا بندی کیے کھڑے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں باہر جا کر کہہ دیتا ہوں ان سے لیکن انھیں واپس کیوں کر رہے ہو؟ اگر اس کا پتا چل گیا تو ان کی ضرورت دوبارہ ہوگی ہمیں۔ میرا خیال ہے انھیں رہنے ہی دیا جائے ابھی۔" شرافت علی میرے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔

"نہیں یار! اگر اس کا پتا چل گیا تو ہم خود ہی دیکھ لیں گے چل کر اسے۔ اتنی رات کو زیادہ بھیڑ لے کر چلنا ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بھی پتا نہیں ہے کہ اس نئی جگہ پر کن حالات سے دوچار ہونا پڑے ہمیں۔" شرافت علی نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر، جیسی تیری مرضی ہو ویسا کر لے یار! میری تو عقل کام نہیں کر رہی ہے اس وقت۔" میں نے چلتے چلتے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

شرافت علی باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا اور میں فاطمہ، آسیہ اور شیدے کے ساتھ اس کمرے میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ یہاں ان دونوں کی خون سے لت پت لاشیں بھی پڑی تھیں۔ شیدے نے ان لاشوں کو دیکھا تو ایک دم جھرجھری لے کر اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ فاطمہ ٹیلی فون اٹھا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے شیدے کے پاس جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے بھئی یہ منہ کیوں چھپا لیا ہے تو نے؟ یہ دونوں تیرے لیے کوئی نئے تو نہیں ہیں یار!"

وہ منہ چھپائے چھپائے کمرے سے باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "نا جی نا، مجھ سے نہیں دیکھا جاتا انھیں اس حال میں۔ مجھے باہر جانے دیں بس۔"

میں اس کے پیچھے لپکتے ہوئے بولا "اوئے تو کیسا بزدل آدمی ہے یار! ان مرے ہوئے لوگوں سے بھی ڈر رہا ہے تجھے۔"

"مرے ہوئے لوگوں سے میں نہیں ڈرتا ہوں، مگر جس طرح خون میں ڈوبے ہوئے پڑے ہیں یہ نہیں دیکھ سکتا میں۔ اور پھر ان کے خون کی جو بو پھیلی ہوئی ہے یہاں، برداشت نہیں ہو رہی ہے مجھ سے، چکر آنے لگے ہیں۔" وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

یہ بات اس کی ٹھیک ہی لگی تھی مجھے، انسانی خون کی بو برداشت کرنا کسی اس جیسے لڑکے کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ تو ہم جیسے برداشت کر سکتے ہیں جو عادی ہو چکے ہوں کشت و خون کے۔ کمزور دل آدمی تو بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے ایسے موقعوں پر۔ لہٰذا میں نے بھی اسے اسی کمرے میں روکے رکھنے کی ضد نہیں کی۔ میرے پیچھے پیچھے آسیہ بھی آئی تھی وہاں سے۔ میں نے اس سے کہا "آسیہ! ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے ہیں، ذرا تازہ ہوا لینے کے لیے، تم جا کر ان دونوں کی لاشوں کو کسی کپڑے سے ڈھانپ دو اور کمرے کے آس پاس صوفوں کو اس طرح ڈال دو کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً نظر نہ پڑے ان پر۔" آسیہ واپس چلی گئی۔ میں شیدے کو ساتھ لے کر برآمدے کے ایک کونے میں پڑی ہوئی ایک کی چارپائی پر آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد شرافت علی بھی آگیا، اس کے ساتھ خان اور انور کمال بھی تھے۔ خان نے میرے ساتھ ہی بیٹھتے ہوئے کہا "یار جیلانی! یہ سالا آئزک کا بچہ تو لگتا ہے چھلاوہ ہے کوئی۔ کسی طرح ہاتھ ہی نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "فکر نہ کر یار! تقدیر کب تک ساتھ دے گی اس کا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہمارے ہاتھ آنا ہے، بس اسی دن حساب کتاب صاف کر دیں گے سارا۔ یہ بھاگ دوڑ ہماری یونہی ضائع نہیں جائے گی پیارے، اس کا صلہ ضرور ملے گا ہمیں۔"

"نہیں بھئی، نا امید تو نہیں ہوا ہوں میں، ایک بات کہی تھی میں نے تو۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ اس ابلیس کی موت ہمارے نامۂ اعمال میں جائے گی۔ یہی تو ایک نیکی ہوگی جو ہمارے کام آئے گی حشر کے دن۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اس کی بات سُن کر ہم سب ہنس پڑے۔ ابھی وقت آسیہ اور فاطمہ بھی وہاں آگئیں۔ فاطمہ بولی "کیا بات ہے بھئی، آپ لوگ تو اس طرح اطمینان کے ساتھ یہاں بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں جیسے کسی تقریب میں آئے ہوئے ہوں؟"

خان جلدی سے بولا "ارے بی بی! یہ کیا بات کہی ہے تم نے؟ یہ جو کچھ ہم کرتے پھر رہے ہیں یہ بھی تو ایک تقریب... ہی ہے۔"

آسیہ بولی "ان کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ لوگ تمام رات یہیں بیٹھے رہیں گے یا واپس جانے کا بھی ارادہ..... ہے کوئی؟"

"واپس تو ہم چلیں گے مگر پہلے یہ تو پتا چل جائے کہ وہ کتے کا بچہ جس کی خاطر ہم دوڑے آئے ہیں یہاں، اب کہاں ہے؟ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی تو یہ فیصلہ کریں گے ہم کہ اب کہاں جانا چاہیے ہمیں؟" میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو ہم واپس اپنے ٹھکانے پر ہی چلتے ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے، رات میں کسی وقت بھی یہ معلوم ہو جائے گا ہمیں کہ وہ کس جگہ پناہ گزیں ہے آج کی رات۔ اس کا پتا ملتے ہی ہم وہاں جا پہنچیں گے جہاں وہ موجود ہے۔"

"مگر وہ خانساماں، وہ تو صبح سویرے ہی آجائے گا یہاں۔ اگر وہ ہمیں آئزک کی پناہ گاہ کا پتا چلنے سے پہلے ہی مل گیا تو ہماری اس وقت کی ساری کارروائی کا علم ہو جائے گا آئزک کو۔ پھر ہو سکتا ہے وہ کوئی چال چل جائے ہمارے خلاف اس جگہ کو بھی چھوڑ دے فوراً ہی۔ لہٰذا خانساماں کے آنے تک یہاں موجود رہنا چاہیے تاکہ اس کو قابو کر کے ہم آئزک کو ہوشیار نہ ہونے دیں۔" میں نے کہا۔

فاطمہ بولی "یہ تو اسی صورت میں ممکن ہوگا نا جب کہ خانساماں واقعی آئزک کا آدمی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہمارا یہاں ساری رات پڑے رہنا بے کار ہی ہوگا نا۔ اور پھر میں نے جن لوگوں کو آئزک کی تلاش پر مامور کیا ہے انھیں اطلاع دینے کے لیے اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر دیا ہے، وہ اپنی جستجو کے نتیجے سے اسی فون پر آگاہ کریں گے چنانچہ میرا وہاں ہونا بے حد ضروری ہے۔"

"پھر یوں کرو کہ میں انور کمال کے ساتھ یہاں رہ جاتا ہوں۔ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ یہاں کا ٹیلی فون نمبر تم نوٹ کر لو اپنے پاس اور جیسے ہی اس کی خبر ملے مجھے یہاں ٹیلی فون کر کے بتا دینا، ہم دونوں بلکہ تینوں فوراً ہی پہنچ جائیں گے تمھارے پاس۔"

"تینوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟ تیسرا کون ہوگا آپ کے ساتھ انور کمال کے علاوہ؟" فاطمہ نے سوال کر ڈالا۔

"تیسرا یہ اپنا یار شیدا ہوگا بھئی۔ تم اسے ابھی سے بھول رہی ہو۔" میں نے شیدے کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تو یہ بھی یہیں رہے گا آپ دونوں کے ساتھ؟ مگر اس کا کوئی کام تو نہیں ہے یہاں۔" خان نے جلدی سے کہا۔

"اس کا تو بہت اہم کام ہے یہاں برادر! اس خانساماں کو ہم نے تو دیکھا تک نہیں ہے کبھی، وہ آئے گا تو ہم کیسے پہچانیں گے اسے؟ اور پھر وہ دروازہ کھلتے ہی ہمیں سامنے دیکھ کر بھڑک نہیں اٹھے گا اگر وہ واقعی آئزک کا بندہ ہوا تو؟" میں نے سوال کیا۔

خان خاموش ہو گیا۔ فاطمہ بولی "یہ تجویز ٹھیک ہے آپ کی، آپ دونوں شیدے کے ساتھ یہاں رکیں، ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"ہاں، تم لوگ چلے جاؤ، ہم اس خانساماں کو ساتھ لے کر ہی آئیں گے اگر اس دوران تمھاری طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو۔" میں نے کہا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے شیدے سے کہا۔ "اوئے شیدے یار! جا بھائی اس کمرے کو بند کر دے بالکل چاروں طرف سے، جہاں ان دونوں جہنمی انسانوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اب ہم اس کمرے میں واپس نہیں جائیں گے۔ اسے تو ہمارے جانے کے بعد پولیس ہی کھولے گی آکر۔"

"نہ جی نہ۔ میں وہاں نہیں جا سکتا۔ بڑی حالت خراب ہونے لگتی ہے میری ان کی حالت دیکھ کر۔" شیدے اپنے کان پکڑ کر بولا۔

"او نہیں یار! جا، اب کچھ نہیں ہو گا تجھے۔ ان دونوں کی لاشیں تو چھپا دی ہیں آسیہ نے۔ تجھے صرف دروازے کھڑکیاں بند کرنا ہیں اس کمرے کی، ان کی لاشیں اٹھانے کو تو نہیں کہا ہے تجھے میں نے۔ جا شاباش، دوڑ جا جلدی سے۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ کچھ متذبذب سا مجھے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے اوپر بڑا جبر کر کے اٹھ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر انور کمال بولا "یار شیدے! دیکھنے میں تو تُو پہاڑ لگتا ہے پر تیرے سینے میں دل بالکل چڑیا جتنا ہے۔ اب بے ان مرے ہوئے لوگوں سے ڈرتا ہے یار، کیسا آدمی ہے تُو؟ چل بیٹھ جا ادھر ہی، میں کمرہ بند کر آتا ہوں جا کر۔" وہ اٹھنے لگا۔

میں نے اس کا کندھا پکڑ کر دوبارہ اسے بٹھاتے ہوئے کہا "نہیں یار! تو بیٹھ ادھر ہی، یہ شیدا ہی جائے گا، وہ کمرہ بند کرنے، یہ بزدل نہیں ہے، تو نے بالکل غلط اندازہ لگایا ہے اس کے بارے میں۔ اسے تو صرف ان کی لاشیں دیکھ کر کراہیت محسوس ہو رہی ہے بس۔"

میں نے انور کمال کو دوبارہ بٹھا دیا تو شیدا طوعاً و کرہاً اُٹھ کر کمرہ بند کرنے چلا گیا۔ انور کمال بولا "اس کی جان نکلتی ہوئی سی لگ رہی ہے، دل بند نہ ہو جائے کہیں اس کا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا ہے اس وقت اسے وہاں بھیج کر۔"

"لعنت بھیج یار اس پر، میں نے اسے یہاں سے ہٹانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اس کے سامنے ہم کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس پر اعتبار کر کے غافل نہ ہو جانا اس کی طرف سے۔ سختی سے نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے اس پر۔ اس کی یہ معصومیت فریب بھی ہو سکتی ہے، اس دور میں اور کراچی جیسے شہر میں رہنے والا کوئی بندہ اتنا سیدھا ہو سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے یار! ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، بہت ہی چوکنا اور ہوشیار رہنا ہو گا ہمیں۔" میں نے کہا۔

"اوہ، میں تو خود حیران ہو رہا تھا کہ آپ نے اس کی معصومیت دیکھ کر اتنی جلدی اعتبار کیسے کر لیا ہے اس پر۔ میں مناسب موقع دیکھ کر اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی میری الجھن دور کر دی۔" انور کمال نے جواب دیا۔

"پہلے تو میں سچ مچ دھوکا کھا گیا تھا۔ اس کے معصومانہ انداز سے میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی بینڈو ہے بے چارہ — نیا نیا شہر میں آ کر پھنس گیا ہے لیکن جب اس نے بتایا کہ بہت کم عمری سے ان لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہے تو میں چوکنا ہو گیا اس کی طرف سے۔" میں نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو آپ نے اسے اکیلے بھیج کر ایک اور غلطی کی ہے۔ وہ اکیلے میں موقع غنیمت جان کر ٹیلی فون پر اطلاع دے سکتا ہے کسی کو۔ اسے نظروں سے اوجھل تو ہونے ہی نہیں دینا چاہیے۔" انور کمال نے کہا اور ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"او یار! یہ تو بالکل ٹھیک کہا ہے تو نے، جلدی جا کر دیکھ بھائی! کہیں وہ سچ مچ ہماری اس غلطی کی سزا تو نہیں دینے لگا ہے ہمیں۔" میں نے انور کمال سے کہا اور خود بھی اٹھ کر قدموں کی آواز پیدا کیے بغیر تیزی سے اُدھر لپکا جدھر وہ گیا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ جس میں لاشیں پڑی تھیں ہنوز کھلا ہی ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب رک کر محتاط انداز میں اندر جھانکا مگر شیدا مجھے وہاں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے انور کمال کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن ہلا کر اسے کمرے کے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے خود اندر گھس پڑا۔ کمرہ بالکل خالی پڑا تھا، شیدے کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا۔ پورا کمرہ دیکھنے کے بعد میں نے انور کمال سے کہا "دیکھو یار اس فریبی کتے کو، ادھر ہی گھر میں کہیں ہو گا وہ۔ باہر تو جا نہیں سکتا ہے، ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے باہر جانے والا دروازہ ہمیں صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس دروازے سے وہ ہماری نگاہ میں آئے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا، اور ہم نے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا اسے۔ کیا تم نے کسی کو دیکھا تھا ادھر سے جاتے ہوئے؟" میں نے انور کمال سے پوچھا۔

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ میں نے اگر کسی کو جاتے دیکھا ہوتا تو میں اسی وقت آپ سے کہہ دیتا۔ آئیں دیکھیں کہیں وہ سچ مچ ڈر کے مارے ادھر آنے کے بجائے کسی اور کمرے میں نہ جا چھپا ہو۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے چل پڑا۔ ہم نے پورا مکان ایک ایک کمرہ باتھ روم اور کچن سمیت دیکھ ڈالا مگر اس کا کہیں سراغ تک نہ مل سکا، ایسا لگتا تھا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو اس گھر میں۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے انور کمال سے کہا "اب ہمارا یہاں رُکے رہنا خطرناک

ہو سکتا ہے انور کمال! وہ سالا یہودی ہمیں جُل دے گیا ہے۔ جلدی نکل چلو یہاں سے۔"

"بہت دیر میں ہوش آیا ہے تمھیں غلام جیلانی! اب تو تمھارے باہر جانے کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔" کسی نے میرے پیچھے سے کہا۔

میں اور انور کمال ایک ساتھ چونک کر پلٹ پڑے تھے۔ میری آنکھیں آئزک کو اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے وا ہو گئیں۔ وہ ریوالور ہاتھ میں پکڑے اس دروازے کے درمیان میں کھڑا طنزیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جس سے گزر کر ہمیں باہر جانا تھا۔ اس سمے ہم ایک کمرے میں تھے جو اس مکان کا بالکل آخری کمرہ تھا اور اس کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جس میں آئزک ریوالور بدست کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا جسے اس نے اپنے گلے میں ایک لمبی پٹی ڈال کر اس کے سہارے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بائیں ہاتھ میں اس کے ریوالور تھا اور جس طرح وہ اس ریوالور کو سنبھالے ہوئے تھا اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ اس ہاتھ سے ریوالور ٹھیک نشانہ لے کر نہیں چلا سکتا تھا لیکن پھر بھی گولی چلا تو سکتا تھا لیکن ضروری نہیں ہے ریوالور کی گولی صحیح نشانے پر لگ کر کارگر ثابت ہو۔ وہ جسم کے جس حصے پر بھی لگتی، مہلک زخم تو بہرحال پہنچا ہی سکتی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں اس لمحے ریوالور نہیں تھے۔ ہم نے اپنے ریوالور جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ وہ ہنوز طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "کیا بات ہے مسٹر غلام جیلانی! تم میری ہی تلاش میں آئے تھے نا یہاں، پھر مجھے اپنے سامنے دیکھ کر گم صُم کیوں ہو گئے؟ کیا خوشی نہیں ہوئی مجھ سے مل کر؟"

"خوشی تو مجھے اس دن ہو گی جس دن میں تجھے اپنے سامنے مٹی میں ملتے ہوئے دیکھوں گا۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"مٹی میں تو ایک دن سب کو ہی مل جانا ہے جیلانی! میں ضرور خاک ہو جاؤں گا اِک روز، مگر افسوس کہ تم یہ منظر نہیں دیکھ سکو گے۔ وہ دن آنے تک تو تمھاری خاک بھی ہوا میں اڑ چکی ہو گی۔ میرا مشورہ مانو تو یہ خیالِ خام دل سے نکال ہی دو تو اچھا ہے کیوں کہ اب خود تمھاری زندگی کی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ دعا دو اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر دھمن کو، ان کی خواہش ہے کہ تمھیں زندہ ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ تمھاری ایک ایک بوٹی ہر روز کاٹ کاٹ کر تمھارے سامنے اپنے پالتو چیتے کو کھلا سکیں۔ اس بار ان کی بیگم عالیہ نے جو چیتا پالا ہے وہ انسانی گوشت بڑی رغبت سے کھاتا ہے۔" وہ مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا، پھر دروازے کے ایک طرف ہٹ کر بولا "آجاؤ تم دونوں، اور ان دونوں کا پارسل بنا کر لے چلو انھیں۔"

اس کے اتنا کہتے ہی دو نہایت قدآور اور گینڈے جیسے تن و توش کے مالک حبشی دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ ان کا اندھیری سیاہ رات جیسا رنگ پگھلے ہوئے کولتار کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کے چٹان جیسے چوڑے اور سخت سینے اور مضبوط بازو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان سے مقابلہ کر کے انھیں زیر کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ ان کے اندر آنے کے بعد آئزک بولا "میں نے تمھاری شہ زوری کی بڑی داستانیں سنی ہیں جیلانی! یہ دونوں تمھیں پکڑنے آئے ہیں، یا تو یہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائیں گے یا تم انھیں زیر کر کے نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تم لوگوں کے درمیان بالکل بھی مداخلت نہیں کروں گا۔ یہ لو، یہ ریوالور بھی واپس رکھ لیا ہے میں نے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ریوالور پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ "اگر تم جیت گئے تو میں خود کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

اسے بڑا مان تھا اپنے ان دونوں گینڈوں پر، اسے میرے مخصوص حربوں کا پتا نہیں تھا۔ جانتا نہیں تھا وہ کہ میری انگلی آدمی کی رگِ احساس کو تلاش کر لینے میں کس قدر مہارت رکھتی ہے اور جب وہ اس رگ سے ملتی ہے تو بڑے سے بڑا پہلوان، پہاڑ جیسی جسامت کا مالک آدمی بھی کسی مُردہ چوہے کی طرح پٹ سے زمین پر آ رہتا ہے۔ میرے لیے اس کی یہ پیش کش بہت ہی خوش آئند تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو مخاطب کر کے کہا "لے بھئی جیلانی! مولا کریم نے تیرے لیے بہترین موقع فراہم کر دیا ہے، اس اسرائیلی کتے کی لگتا ہے موت یہاں کھینچ لائی ہے اس سمے۔ ان دونوں سے نمٹنے کے بعد اس کی گردن بھی ناپ ڈال آج۔"

میں نے آئزک کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تمھاری یہ پیش کش منظور ہے، مگر بعد میں اپنی زبان سے پھر نہ جانا تم۔"

"تم اطمینان رکھو میں وعدہ کرتا ہوں اگر تم نے انھیں شکست دے دی تو میں خود کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔" آئزک پورے اعتماد سے بولا۔

"چلو کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں، ویسے کسی یہودی کے

وعدے کا اعتبار کوئی نہیں ہوتا۔ تم لوگ تو اپنے رب سے وعدہ کر کے بھی پھر جاتے ہو۔ تاریخ تمھاری یہی بتاتی ہے اور اسی لیے تم اللہ کی سب سے زیادہ نافرمان قوم کہلاتے ہو۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم لوگ، ہم تو اللہ کی سب سے محبوب قوم ہیں۔ اسی لیے اس نے دنیا میں افضل ترین قرار دیا ہے ہمیں۔" وہ بولا۔

"چلو اب چند منٹ میں بات کھل جائے گی کہ کون سچا ہے کون جھوٹا۔" میں نے اس سے کہا پھر انور کمال کو مخاطب کر کے اسے ہدایت کی "لے یار انور کمال تو ذرا ایک طرف ہو جا بھائی۔ بولنا بالکل نہیں ہمارے درمیان میں بس تماشا دیکھتے رہنا خاموشی سے۔"

وہ دونوں سیاہ فام مجھے انور کمال سے بات کرتے دیکھ کر شاید یہ سمجھے تھے کہ میں ان کی طرف سے غافل ہوں لہٰذا ان میں سے ایک نے کسی چیتے کی طرح مجھ پر جست لگا دی۔ لیکن یہ اس کا خیالِ خام ہی تھا کہ اس طرح وہ مجھے دبوچ سکے گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں ایک بار بھی ان کی گرفت میں آ گیا تو میری ہڈیوں تک کا سرمہ بنا کر رکھ دیں گے لہٰذا میں ان کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھا، ایک لمحے کے لیے ان پر سے توجہ نہیں ہٹائی تھی میں نے۔ چنانچہ وہ جیسے ہی اپنی جگہ سے اچھلا، میں ذرا سا ایک جانب ہو گیا اور اس کے قریب آتے ہی دونوں ہاتھوں کی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلیاں سیدھی کر کے اس کے پیٹ میں مار دیں۔ وہ بلبلاتا ہوا جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کر نیچے بیٹھ گیا۔ یہ فن مجھے گل زمان نے سکھایا تھا اور یہ اتنا خطرناک تھا کہ کسی عام سے آدمی کا تو ایک ہی دفعہ میں پیٹ چاک ہو سکتا تھا اس طرح۔ دونوں انگلیاں سختی کے ساتھ سیدھی کر کے مخصوص انداز میں مارنے سے وہ قینچی کے نوکیلے پھل کی طرح پیٹ میں اتر جاتی ہیں۔ پھر انھیں موڑ کر باہر کھینچنے کا موقع اگر مل جائے تو آنتیں تک کھینچ کر لے آتی ہیں باہر اس کے لیے انگلیوں کی ایک خاص قسم کی ورزش کرنا پڑتی ہے اور گل زمان نے جب میں جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ وغیرہ کے خطرناک داؤ پیچ سیکھ رہا تھا تو اس نے اس طرح کی بہت سی ورزشیں مجھے کرائی تھیں۔ وہ دونوں سیاہ فام گینڈے جنھیں آئزک نے میرے مقابل کیا تھا کوئی عام آدمی نہیں تھے وہ۔ انھوں نے بڑی محنت سے اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔ بہت سے سخت مراحل سے گزار کر خود کو فولادی بنانے کی کوشش کی تھی وہ اتنی آسانی سے زخم کھانے والے نہیں تھے۔

اپنے ساتھی کو پیٹ پکڑ کر نیچے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر دوسرے سیاہ فام نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے پھرتی سے ایک طرف ہو کر ٹانگ چلا دی، مگر وہ اپنے ساتھی کے حشر سے کچھ سیکھ چکا تھا اور پوری طرح چوکنا تھا لہٰذا میرے اپنی جگہ سے ہٹتے ہی وہ بھی جہاں تھا وہاں ایک دم جیسے جم کر رہ گیا تھا، لہٰذا وہ میری ٹانگ کی زد میں آنے سے بچ گیا، مگر میں نے دوبارہ اپنی طرف آنے سے پہلے ہی اسے لاتوں پر رکھ لیا اور تیزی سے پھرکی کی طرح گھوم گھوم کر اس پر لاتیں برسانا شروع کر دیں۔ اس نے دو لاتیں تو اپنے سینے پر برداشت کیں مگر پھر فوراً ہی اچھل کر میری ٹانگوں کی زد سے دور ہو گیا۔ اور پھر جیسے ہی میں رکا اس کی فلائنگ کک نے مجھے زمین بوس کر دیا۔ میں زمین پر گرتے ہی بجلی کی سی تیزی سے لیٹے لیٹے لوٹ لگا کر اس جگہ سے دور چلا گیا۔ اگر ذرا سی بھی دیر کی ہوتی میں نے اس جگہ سے ہٹنے میں تو وہ میرے اوپر گر کر مجھے چھاپ چکا ہوتا۔ میرے وہاں سے ہٹتے ہی وہ سیاہ گینڈا اوندھے منہ وہاں آ کر گرا تھا اور اس کا ماتھا بری طرح پختہ فرش سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ مگر وہ فوراً اچھل کر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ماتھے کی چوٹ نے اس کالے حبشی کی کھوپڑی الٹ دی تھی شاید، وہ اٹھتے ہی کسی جنگلی بھینسے کی طرح سر آگے جھکا کر اندھا دھند میری طرف لپکا۔ اس کا یہ حملہ اس قدر تیز اور شدید تھا کہ اگر میں اس کی زد میں آ جاتا تو میرے سینے کا پنجر سلامت نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آیا میں زور سے اوپر اچھلا اور اس کے اوپر سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ جھونک میں آگے نکلا چلا جاتا اور پورے زور سے اس کا سر اس دیوار سے ٹکرا جاتا جو میری پشت پر موجود تھی لیکن میرے اس کے اوپر سے گزرتے ہی وہ سنبھل کر پلٹ پڑا تھا اور جب میں اس کا انجام دیکھنے کے لیے واپس مڑا تو وہ خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں بروقت اس کی طرف مڑا تھا۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر کر دی ہوتی میں نے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا اور اسے دونوں ہاتھوں پر سنبھال کر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر جا گرا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھتا میں بیٹھے ہی بیٹھے جست کر کے اس کے اوپر جا بیٹھا۔ میں نے اس کے اوپر پہنچتے ہی پھرتی سے اس کی گردن دبوچ کر پلک

جھپکتے میں اس کی رگِ احساس مسل ڈالی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ نڈھال ہو کر کسی مردہ چوہے کی طرح بے دم اور بے حرکت ہو کر رہ گیا۔ میں اسے چھوڑ کر اس کے دوسرے ساتھی کی طرف پلٹا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ساتھی کے ہاتھوں ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاؤں گا اور اس کے درمیان میں آنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ یا پھر اس نے انور کمال کو الگ کھڑے دیکھ کر خود بھی ہمارے درمیان مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا ہو لیکن اپنے ساتھی کو بے سدھ پڑے دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اس کی اور آئزک کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئی تھیں میں نے انھیں حیرت زدہ دیکھ کر طنز سے پوچھا "کیوں مسٹر آئزک ابھی تمھیں اپنے اس گینڈے کے انجام پر یقین نہیں آ رہا ہے کیا؟"

"یہ مر گیا ہے کیا؟" وہ حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا "نہیں نہیں... یہ نہیں ہو سکتا... یہ مر نہیں سکتا..."

"ٹھیک کہا تم نے۔ یہ بھی تمھاری طرح بہت بے غیرت مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اتنی آسانی سے مر نہیں سکتا ہے یہ، ہاں اگر تم چاہو تو ابھی اسے ملکِ عدم کو روانہ کیے دیتا ہوں میں، یوں بھی اب اس میں اور کسی مردے میں زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ دوسرا حبشی غصے سے جبڑے بھینچ کر میری طرف بڑھتے ہوئے بولا "میں تیرا خون پی جاؤں گا کتے، تو نے سمجھا کیا ہے خود کو؟"

میں نے اسے طیش دلانے کے لیے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا "ضرور ضرور، تیرا یہ ساتھی اسی نیت سے آیا تھا میرے پاس مگر بے چارہ اپنے ہی خون کے گھونٹ پی رہا ہے۔ تو بھی کوشش کر لے شاید کامیابی ہو جائے۔"

میری کوشش رائیگاں نہیں گئی، میری بات سنتے ہی وہ غضب ناک انداز میں مجھ پر جھپٹا تھا۔ اس بار میں نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی، صرف اسے دھوکا دینے کے لیے بائیں جانب ذرا سی حرکت کی تھی، وہ سمجھا کہ میں اس کے حملے سے بچنے کے لیے بائیں طرف جا رہا ہوں چنانچہ وہ تیزی سے ادھر ہی گیا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس پر چھلانگ لگا کر اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ خیال یہی تھا میرا کہ گردن پر ہاتھ پڑتے ہی اس کی بھی رگِ احساس مسل ڈالوں گا، مگر وہ بھی کچھ کم پھرتیلا نہیں تھا۔ اس کے تو جیسے سارے بدن میں بجلی کوند رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا، اس نے پتا نہیں کس طرح اپنی کمر کو جھٹکا دیا کہ میں اس کے اوپر سے ہوتا ہوا الٹ کر سامنے جا گرا۔ میرے سر میں ایسی زوردار چوٹ لگی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا مگر یہ وقت تکلیف کی طرف دھیان دینے کا نہیں تھا، اگر میں اس طرف دھیان دیتا تو وہ سیاہ فام دیو میرا ایک ایک عضو الگ کر کے رکھ دیتا۔ لہٰذا میں نے چوٹ کی پروا کیے بغیر نیچے فرش پر گرتے ہی تیزی کے ساتھ لوٹ لگا دی۔ اس دوران وہ کالا دیو مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور میں فرش پر اوندھے منہ گرا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا تو میرے سر سے ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ میں زور سے سر کو جھٹکا دے کر اس کی طرف مڑا تو میری کراہ نکل گئی۔ چوٹ بہت شدید لگی تھی مجھے۔ سر اٹھایا نہیں جا رہا تھا مجھ سے۔ اس صورتِ حال میں مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ میں نے درد کی شدت سے نڈھال ہو کر دوبارہ زمین پر سر ٹکا دیا۔ اسی وقت ایک سایہ سا مجھے اپنے اوپر بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی تناور درخت مجھ پر گر رہا ہو، بے اختیار میں نے اپنے پیر سمیٹ کر گھٹنے یوں اوپر اٹھا دیے جیسے اس تناور درخت کو پیروں پر روک لینا چاہتا ہوں۔ میری یہ اضطراری کوشش ہی اس لمحے میری زندگی کی ضمانت بن گئی۔ وہ جسے میں نے تناور درخت سمجھ کر اپنے پیروں پر روکنے کی کوشش کی تھی وہ دراصل وہی کالا دیو تھا جس نے مجھے اس طرح پھینکا تھا کہ مجھ میں دوبارہ اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے مجھے گرا ہوا دیکھ کر مجھ پر پورے زور سے چھلانگ لگائی تھی تاکہ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی میری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالے مگر میرے اٹھے ہوئے گھٹنوں نے اس کی یہ حسرت پوری نہ ہونے دی۔ وہ پیٹ کے بل میرے گھٹنوں پر آ کر گرا اور کسی جنگلی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت کر کے سر اوپر اٹھایا اور ایک ہاتھ سے سر کے پچھلے حصے پر لگی ہوئی چوٹ کو دبا کر دوسرے ہاتھ کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کالا دیو بھی مجھ سے صرف چار قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا اسے بھی اندرونی طور پر شدید قسم کی چوٹ آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا اور تیزی سے اٹھ کر اس پر جا پڑا، لیکن اس عالم میں بھی اس نے میرے ہاتھوں کو اتنی مہلت نہیں دی کہ میں اس کی رگِ احساس مسل سکتا۔ اس نے اپنے کندھے جھٹک کر مجھے اپنے اوپر سے یوں جھاڑ دیا جیسے کوئی ننھا سا کیڑا اس پر آ گرا ہو۔ میں اس کے اوپر سے لڑھک کر نیچے آیا تو اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے سرعت سے اٹھ کر اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما اور اپنے مخصوص انداز میں اس کی کلائی پر دباؤ ڈال کر ایک زوردار جھٹکا دیا، کڑک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے جو کراہ نکلی وہ

بہت تیز تھی۔ میں نے جس تیزی سے ہاتھ کو جھٹکا دیا تھا، اسی تیزی کے ساتھ اُسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ اُس نے اپنا پیٹ چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس اُکھڑے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ اور غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں اُس سے کہا۔ "اُٹھو جنگلی بیل، اپنے یہودی آقا کے حکم کی تعمیل نہیں کرو گے، یہ تو بڑے مان کے ساتھ لے کر آیا ہے تم دونوں کو میرے مقابلے پر۔ کچھ خیال کر دیار! ایسی بے وفائی تو نہ کرو اس بے چارے کے ساتھ۔"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے جنگلی کبوتر جیسی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگا۔ اُس کا اُکھڑا ہوا ہاتھ بہت تکلیف دے رہا تھا اُسے اور اس کے علاوہ اُس کے پیٹ کی تکلیف بھی ختم نہیں ہوئی تھی شاید ابھی۔ اُس کی گردن کی رگیں جس طرح پھُول رہی تھیں اور جس طرح تمام پٹھے اکڑا کر وہ آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا اس سے صاف عیاں تھا کہ وہ شدید اذیت میں مُبتلا ہے اس سمے اور اُسے برداشت کرتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے آئزک کو دیکھا، وہ ابھی تک دروازے کے ساتھ دیوار سے لگا کھڑا تھا، حیرت کی زیادتی کے سبب اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "لے بھئی فرزندِ اسرائیل! تیرے یہ سورما تو ہاتھ پاؤں چھوڑنے لگے ہیں، یاران مٹی کے شیروں کو ساتھ لاتے ہوئے یہ تو سوچ لیا ہوتا تو نے کہ انھیں کس کام کے لیے کس کے سامنے لے جا رہا ہے تو۔ یہ بالکل ریت کی دیوار ثابت ہوئے ہیں۔"

اُسی وقت انور کمال نے چلّا کر کہا۔ "ہوشیار جیلانی بھائی! بچیں جلدی سے۔"

میں نے جلدی سے گردن موڑ کر اس زخمی گینڈے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو گرز کی طرح گھماتا ہوا میری طرف آ رہا تھا لیکن اس کی رفتار بہت سُست تھی، قدم اُس کے زمین پر جم نہیں رہے تھے، وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میری زد میں آیا، میں نے پھرتی سے گھوم کر پہلے بائیں اور پھر دائیں لات پورے زور سے چلائی۔ ایک لات اُس کے منہ پر اور دوسری سینے پر پڑی تھی۔ سینے پر لات پڑتے ہی وہ اُلٹ کر پیچھے جا پڑا۔ گرتے ہی اس نے خون کی اُلٹی کی اور پھر وہ یوں ہاتھ پیر اکڑانے اور بدن کو اینٹھنے لگا جیسے کسی اندرونی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں ابھی اسی کی طرف متوجہ تھا کہ آئزک کی کڑک دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "بس، اب بند کرو یہ تماشا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو، ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا تمھاری۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ریوالور مجھ پر سیدھا کیے کھڑا، قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا یہ انداز دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے اس ذلیل یہودی سے یہی توقع تھی۔ میرے اندازے کے مطابق تو اسے اسی وقت ریوالور نکال کر مجھے للکار دینا چاہیے تھا جب میں نے اس جنگلی بیل کا ہاتھ اکھاڑ کر اسے ناکارہ کیا تھا۔ وعدہ خلافی اور عہد شکنی ہی تو ان یہودیوں کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں اس کے یہودی ہونے پر شبہ کرنے لگتا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے تم سے یہی توقع تھی آئزک! میں جانتا تھا تو بالآخر یہی کچھ کرے گا۔ کسی یہودی سے بھلائی کی توقع کوئی بے وقوف ہی کر سکتا ہے، یا پھر وہ جو تیری قوم کی سرشت سے واقف نہ ہو۔"

اُس نے مجھے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ "ٹَھک" کی مدھم آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا۔ میں نے اور آئزک نے ایک ساتھ چونک کر انور کمال کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں سائیلنسر لگا ریوالور پکڑے، حقارت بھری نظروں سے آئزک کو دیکھ رہا تھا، اس کے ریوالور کی نال سے دھواں نکلتے دیکھ کر مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے ہی اپنے بے آواز ریوالور سے فائر کر کے آئزک کے ہاتھ سے پستول نکالا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "یہ تم نے کیا کِیا انور کمال؟"

وہ بولا۔ "میں نے وہی کیا ہے جیلانی بھائی! جو مجھے کرنا چاہیے تھا اس وقت۔ کاش میں اس ذلیل آدمی کے سینے میں گولی اتار سکتا۔"

اُس نے ایسے حسرت بھرے انداز میں یہ بات کہی تھی کہ میرا بے اختیار دل چاہا وہ سچ مچ اس کے سینے میں گولی اتار دے۔ میں نے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم نے گولی اس کے سینے میں ہی کیوں نہیں اتار دی؟"

"نہیں جناب! یہ کام شرافت بھائی کو ہی کرنا ہے۔ اس نے اُن کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کی زندگی اس کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اُن کے دل کی آگ کچھ نہ کچھ تو سرد ہو ہی جائے گی اس ذلیل آدمی کو اپنے ہاتھوں جہنم واصل کر کے۔" انور کمال بولا۔

کیسا خلوص بھرا دل لیے پھرتا تھا وہ باوفا اپنے سینے میں۔ اُس کے اس جذبے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آفرین ہے یار تجھ پر، جس مُلک میں تیرے جیسے محبِ وطن اور باضمیر لوگ موجود ہوں اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے پھر اب چل! اس یہودی کُتے کو چل کر شرافت علی کے حوالے کر دیتے ہیں ہم۔"

یہ کہہ کر میں آئزک کی طرف پلٹا۔ وہ مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جیلانی! جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"اگر یہ مشکل کام ہے کوئی تو، تو فکر نہ کر اس کی، مجھے مشکلیں آسان کرنے کا بڑا تجربہ ہے۔ اور مزہ بھی مشکلوں سے لڑنے میں ہی آتا ہے۔ پھر تیری موت تو میری زندگی کا اوّلین مقصد ہے میرے بچّے، اس کے لیے تو میں جان سے گزرنے کو بھی تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ فی الحال تم ہی جان سے گزر جاؤ جیلانی! میرا ابھی مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" اس نے کہا اور تیزی سے پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

انور کمال نے جو اس پر ریوالور تانے کھڑا تھا، اس کے مُڑتے ہی اس پر فائر کر کے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ ریوالور کی گولی اس تک پہنچتی، وہ باہر نکل گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ ہو گیا تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ہم دونوں دروازے کی طرف لپکے اور جب ہم نے وہ دروازہ پار کیا تو وہ ہمیں اُس کمرے کے بائیں جانب ایک دروازے میں غائب ہوتا دکھائی دیا تھا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے اس دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے مگر وہ وہاں سے بھی نکل چکا تھا۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے، ایک سے ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے اور دوسرا دروازہ بالکل ہمارے سامنے تھا مگر وہ اس وقت بند نظر آ رہا تھا ہمیں۔ ہم دوڑتے ہوئے اس دروازے پر پہنچے اور اسے کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ باہر سے بند تھا۔ آئزک نے جاتے ہوئے اسے بند کر دیا تھا شاید۔ میں نے انور کمال سے کہا۔ "اس پر وقت ضائع نہ کرو، وہ نکل جائے گا۔ واپس آؤ دوسرے کمرے سے باہر نکلتے ہیں۔"

میں پلٹ کر واپس دوسرے کمرے میں پہنچا لیکن اس کمرے کا دوسرا دروازہ جس سے ہم باہر نکل سکتے تھے اتنی دیر میں باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔ یہ حرکت اس ذلیل آئزک ہی کی تھی۔ ابھی چند لمحے قبل [illegible] ہم آئزک [illegible] کرتے ہوئے اس کمرے میں آئے تھے تو یہ دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ عیّار اور مکّار شخص اس دوسرے کمرے کی طرف اسی لیے گیا تھا کہ ادھر کا دروازہ بند کر کے جتنی دیر میں ہم پلٹ کر ادھر آئیں، وہ یہ دروازہ بھی بند کر دے۔ انور کمال بولا۔ "جیلانی صاحب! لگتا ہے وہ ایک بار پھر ہمارے ہاتھوں سے نکل کر پھسل گیا ہے۔"

میں نے تیزی سے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "کوئی کھڑکی دیکھو یار! ہم کھڑکی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

میں نے اس کمرے میں ایک کھڑکی دیکھ کر اُدھر دوڑ لگا دی مگر بدقسمتی سے اس میں لوہے کی مضبوط گِرل ہمارا راستہ روکے کھڑی تھی۔ ہم دوڑتے ہوئے پھر اُس کمرے میں آئے جہاں سے آئزک باہر گیا تھا۔ اس کمرے میں بھی دو کھڑکیاں موجود تھیں۔ مگر ان میں بھی مضبوط گرل [illegible] ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ [illegible] یہاں بند کر کے نکل گیا ہے انور کمال! یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو جلدی [illegible] فون کر دے گا کہ ہم یہاں بند ہیں۔"

انور کمال بولا۔ "یہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہمیں پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے، ورنہ اگر اس نے ان دو لاشوں کے ساتھ ہمیں پکڑ لیا یہاں سے تو پھر چھوٹنا مشکل ہو جائے گا ہمارا۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو یار! مگر وہ کیسا کمینہ انسان ہے، اپنے جن دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا تھا انھیں ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔ اس کی بھی پروا نہیں کی اُس نے کہ ہم غصّے اور جھنجلاہٹ میں ان دونوں کو بالکل ختم بھی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو قربانی کے دُنبے ہیں جیلانی بھائی! یہ تو ہوتے ہی آگے رکھ کر مروانے کے لیے ہیں۔ ان کی اسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔" انور کمال بولا۔

"ٹھیک ہے یار، لعنت بھیجو ان پر، کوئی ایسی چیز تلاش کرو یہاں جس کی مدد سے کھڑکیوں میں لگی ہوئی یہ گرل کاٹی یا اکھاڑی جا سکے۔"

ہم جس کمرے میں کھڑے تھے وہ ایک خواب گاہ تھی، وہاں ایک ڈبل بیڈ اور سنگھار میز کے علاوہ ایک لکڑی کی الماری اور کچھ ہلکا پھلکا فرنیچر پڑا تھا۔ ہم دونوں نے پورا کمرہ دیکھ ڈالا لیکن کوئی ایسی چیز ہمیں نہیں مل سکی وہاں جو ہمارے کام آ سکتی۔ ادھر سے مایوس ہو کر میں نے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے انور کمال سے کہا۔ "یار! ذرا ان دونوں کو بھی دیکھ لیں چل کر۔ انھیں اگر ہوش آ گیا تو ہمارے لیے ایک اور پریشانی کھڑی ہو جائے گی اور وہ آئزک اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔"

انور کمال نے میرے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے جیلانی صاحب! میں کافی دیر سے غور کر رہا ہوں اس پر۔"

"کون سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تیرے؟ کس بات پر غور کر رہا ہے تو برادر؟" میں نے اُس کی طرف مُڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آئزک اچانک یہاں کیسے آ گیا؟ اور کیا وہ صرف ان دو آدمیوں کو ہی ساتھ لایا تھا اپنے؟" انور کمال نے پوچھا۔

"یار بات تو ٹھیک ہی سوجھی ہے تجھے۔ اس شیدے کو ہمارے پاس سے اُٹھے ہوئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی۔ ایسا تو نہیں ہے کہ وہ یہاں کسی قریبی عمارت میں ہی موجود رہا ہو اور وہ شیدا ہمارے پاس سے اٹھ کر سیدھا اس کے پاس ہی جا پہنچا ہو۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے، اس کے سوا کوئی اور بات [illegible] اور پھر وہ شیدا [illegible] تو [illegible] دیا ہے [illegible]۔" انور کمال نے کہا۔

"ہوں!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات اور بھی ہے، اگر وہ قریب ہی کی کسی عمارت میں موجود تھا تو اس کے ساتھ ایک پوری فوج ہونا چاہیے تھی، صرف دو ہی آدمی نہیں ہوتے اس کے ساتھ اور پھر اسے ہمیں بند کر کے بھاگنا نہیں پڑتا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادہ آدمی موجود ہی نہ ہوں اس وقت۔ صرف انھی دو کو محافظ کے طور پر ساتھ رکھا ہوا ہو اس نے۔"

"ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا اور مڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "بہر حال جو کچھ بھی ہو، آؤ پہلے اُن دونوں کی خبر لیں، پھر کوئی تدبیر کریں گے یہاں سے نکلنے کی۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان دونوں کو اس کمرے میں ہی بند کر دینا چاہیے تاکہ بے فکری ہو جائے اُن کی طرف سے۔"

ہم دونوں واپس اُس کمرے میں پہنچے جہاں وہ دونوں سیاہ فام پڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اب تک یوں ہی بے سُدھ پڑے تھے جیسے ہم انھیں چھوڑ کر گئے تھے۔ پہلے تو میں نے اُس کا جائزہ لیا جس کی رگِ احساس مسل کر ڈال گیا تھا میں۔ وہ ہنوز بے ہوش تھا اور آثار سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی مزید کم از کم آدھے گھنٹے اس کا ہوش میں آنے کا ارادہ نہیں ہے پھر بھی میں نے احتیاطاً اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر ایک بار اور اس کی پھولی ہوئی رگِ احساس ذرا سخت ہاتھ سے مسل ڈالی۔ گو یہ ایک خطرناک کام تھا اُس عالم میں دوبارہ اور سختی سے رگِ احساس مسلنے کے نتیجے میں اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی مگر مجھے اس کی زندگی سے دلچسپی ہی کیا تھی کہ اس بات کا خیال کرتا میں۔ سچ پوچھیں تو چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ مر ہی جائے۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی طرف توجہ کی۔ اس کا جسم بے ترتیبی سے مڑا تڑا پڑا تھا اور ناک اور منہ سے نیلا نیلا پانی بہہ رہا تھا۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ زندگی کی نیرنگیوں کو چھوڑ چکا ہے۔ پھر بھی میں نے اطمینان کرنے کی خاطر اس کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کے بدن میں سے حرارت ابھی بالکل ختم نہیں ہوئی تھی مگر رگ پٹھے اس کے بُری طرح اکڑے ہوئے تھے جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ شدید اذیت سے دوچار رہا تھا۔ وہ جس وقت پیٹ کے بل میرے گھٹنوں پر گرا تھا اس کے پیٹ میں شدید چوٹ آئی تھی اور شاید اس شدید ضرب سے اس کا پتا پھٹ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی طرف سے مکمل اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ہم نے اس کمرے میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جو ہمارے کام آ سکتی اس لمحے۔ اس تلاش کے دوران اچانک انور کمال بولا۔ "جیلانی بھائی! یہ . . . یہ روشن دان دیکھا آپ نے؟"

"کون سا روشن دان یار! یہ تجھے روشن دان دکھانے کی کیا سوجھ رہی ہے اس وقت؟" میں نے اُس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کمرے کی عقبی دیوار کے اوپر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دیکھیں تو سہی اسے، ساری بات خود ہی سمجھ میں آ جائے گی۔"

میں نے اس کے کہنے پر اوپر نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ دیوار میں چھت سے کوئی ایک ڈیڑھ فٹ نیچے ایک روشن دان موجود تھا جو بالکل مربع شکل کا تھا اور اس کی لمبائی چوڑائی ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ ہو گی۔ اسے دیکھ کر میں نے سوچا، اگر کسی طرح اس روشن دان تک پہنچنے کی کوئی سبیل ہو جائے تو مجھ جیسا آدمی سکڑ سمٹ کر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کے دوسری طرف نکل سکتا ہے۔ میں نے انور کمال سے کہا۔ "ہاں، اس سے باہر تو جایا جا سکتا ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو اس تک پہنچنے کا ہے۔ ہم روشن دان تک پہنچیں گے کیسے؟"

وہ بولا۔ "اُدھر برابر والے کمرے میں ایک لکڑی کا صوفہ پڑا دیکھا ہے میں نے۔ ہم اُسے سیڑھی کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔"

"اوہ، ہاں یار! یہ تو بہت اچھی بات بتائی تو نے۔ چل بھائی جلدی کر، وہ صوفہ اٹھا کر لے آئیں ہم۔" میں نے تیزی سے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں وہ صوفہ پڑا ہوا تھا تو انور کمال بولا۔ "جیلانی بھائی! کیوں نہ ہم ان دونوں کمروں کے دروازے اندر سے بھی بند کر دیں۔ کیوں کہ ہمیں یہاں بند ہوئے اچھی خاصی دیر ہو چکی ہے اور آئزک نے اگر ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے تو اب کسی بھی لمحے اس کا نتیجہ سامنے آتا ہی ہو گا۔"

بات اس کی معقول ہی تھی چنانچہ ہم نے جلدی جلدی دونوں کمروں کے دروازوں کی اندر سے چٹخنیاں چڑھا دیں اور صوفہ اٹھا کر اُس کمرے کی طرف چل دیے جہاں روشن دان تھا۔ عین اُسی لمحے باہر کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی، اس کے ساتھ ہی کسی نے باہر سے دروازہ کھول کر اسے اندر دھکا دیا۔ انور کمال جلدی سے بولا۔ "جلدی، جلدی کریں، وہ لوگ واپس آ گئے ہیں شاید۔"

چند لمحے باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے کے بعد کسی نے آواز دے کر کہا۔ "غلام جیلانی! دروازہ کھول دو۔ اب تم زیادہ دیر بچ نہیں سکو گے ہم سے، ہم نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہر طرف پولیس موجود ہے۔ تمھارا تو اس مکان سے نکلنا بھی ممکن نہیں ہے اب۔ بہتری اسی میں ہے کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔"

انور کمال کو بہت ہی بروقت دروازوں کو اندر سے بند کر لینے کا خیال آیا تھا۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہیں دلاتا تو آج پولیس نے اس چوہے دان میں مجھ پر ضرور قابو پا لینا تھا۔ اس مکار یہودی نے ایسا کام کیا تھا اس رات کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس نے مجھے یہاں بند کر کے گمنام فون کے ذریعے پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ اور پولیس کے لیے میرے نام میں ایسی زبردست کشش تھی کہ وہ فوراً دوڑی چلی آئی تھی وہاں۔ اور اس کی یہ بھاگ دوڑ، یہ محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ یہاں آتے ہی اُس نے دو لاشیں تو دریافت کر ہی لی تھیں اور وہ ہمارے ساتھ پڑی تھیں، اس کمرے میں جسے وہ ذلیل اسرائیل زادہ ہمارا چوہے دان بنا گیا تھا۔ میرے نامۂ اعمال میں اب تو جگہ بھی نہیں رہی ہو گی۔ ان چاروں کو میرے کھاتے میں کسی نہ کسی طرح پھر بھی درج کر ہی دیا جانا تھا۔ پولیس کی وارننگ سُن کر میں نے چونک کر انور کمال کو دیکھا۔

وہ بولا۔ "جلدی کریں، وقت ضائع نہ کریں۔ وہ لوگ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد دروازہ توڑنے کی کوشش کریں گے۔"

ہم دونوں جلدی سے صوفے کو اٹھائے ہوئے کمرے میں گھس گئے اور اسے دیوار سے لگا کر اس طرح کھڑا کر دیا کہ اس پر چڑھ کر روشن دان تک پہنچ سکیں۔ صوفہ کھڑا کر کے میں تیزی سے اس پر جا چڑھا۔ روشن دان میں اسے بند کرنے والا پٹ نہیں تھا یا تھا تو شاید ٹوٹ چکا تھا، وہ یا ممکن ہے اس مکان کے مکینوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو۔ میں صوفے پر چڑھنے کے بعد اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ چھت بہت نیچی لگنے لگی تھی مجھے اور سیدھا کھڑا ابھی نہیں ہو سکتا تھا میں۔ میں نے روشن دان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر باہر نکال کے دیکھا تو اپنی خوش بختی کو اپنے ساتھ دیکھ کر میری باچھیں کھل اٹھیں۔ مکان کے عقب میں ایک تنگ گلی تھی۔ ایسی گلیاں عموماً کچرا کوڑا ڈالنے کے لیے ہوتی ہیں۔ میں نے اس گلی کو بھی ایسا ہی سمجھا تھا۔ اس علاقے کے نقشے میں یقیناً اس گلی کی چوڑائی چار یا پانچ فٹ رہی ہو گی مگر یار لوگوں نے اس کا بڑا حصہ اپنے مکانوں میں شامل کر کے اس کی چوڑائی دو فٹ سے زیادہ نہیں رہنے دی تھی اور اس روشن دان کے سامنے جو مکان تھا اس مکان کے مالک کو اپنا مکان بنواتے وقت شاید یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایک دن مجھ پر ایسا بھی بُرا وقت آئے گا اور مجھے اس روشندان سے نکلنا پڑے گا لہٰذا اس نے اس مشکل گھڑی کے لیے اپنے مکان میں اس طرف ایک چھجا سا نکال دیا تھا کہ میں روشن دان سے نکلتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس چھجے کو تھام لوں اور اس کا سہارا لے کر آرام سے باہر نکل آؤں۔ چنانچہ میں نے اس کے تعاون کا شکریہ دل سے ادا کرتے ہوئے دونوں ہاتھ روشندان سے گزار کر مضبوطی سے اس چھجے کو تھاما اور باہر نکل کر اُسی چھجے سے لٹک گیا۔ پہلے میرا ارادہ

شگفتہ سیریز
اُردو کے تفریحی ادب کا ایک نیا رُخ
طنز و مزاح سے بھرپور، چٹکلے چٹکلے رومانی ناول
آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اشر نعمانی کے قلم سے
گھر کی مرغی
حکیمی ٹیکسی
آپ کے سر پر
شرارت
بے وقوف
بی وی کی تلاش
اُلو کی دُم
مسٹر مداری
اور بھی...
رونا چھوڑیں، مُسکرانا سیکھیں
تمام کتابیں آج ہی منگوائیں

موسیقی کی ا، ب، ت کا قاعدہ
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب

ابجدِ موسیقی
برصغیر کے نامور گلوکار مہدی حسن کہتے ہیں کہ:
موسیقی کے اُستاد نظام الدین خان کہتے ہیں کہ:
معروف ادیب و صحافی شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ:
جواں نسل کے معروف شاعر جمال احسانی کہتے ہیں کہ:

گلی میں کود جانے کا تھا مگر چھجے سے لٹکنے کے بعد مجھے اچانک خیال آیا کہ پتا نہیں جس جگہ میں لٹکا ہوا ہوں وہاں سے زمین کا فاصلہ کتنا ہے اور نیچے زمین ہی ہے یا کوئی کھلا ہوا گٹر منہ کھولے مجھے نگل لینے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اس جگہ تاریکی اتنی تھی کہ نیچے زمین بالکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "بیٹے جیلانی! نیچے ہرگز نہ کودنا، ایسا نہ ہو کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی مثال تجھ پر صادق آجائے۔"

یہ خیال آتے ہی میں نے نیچے کودنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس چھجے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی میں اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔ انور کمال جو میرے بعد روشندان سے نکلا تھا، اس نے مجھے چھجے پر چڑھتے دیکھا تو وہ سیدھا ادھر ہی آگیا تھا۔ اس طرح وہ لٹکنے کے بعد اوپر چڑھنے کی مشقت سے بچ گیا تھا۔ چھجے سے گزر کر ہم گربہ قدم چلتے اس چھت پر جا پہنچے جس کا یہ چھجا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ چھت باتھ روم یا کچن کی جسے مکان کے رہائشی حصے سے الگ تھلگ بنایا گیا تھا۔ کیوں کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا، جس کے بعد دو دروازے دکھائی دے رہے تھے اور دونوں ہی بند تھے۔ بائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ ایک زینہ اوپر جا رہا تھا۔ مکان کی اوپری منزل ابھی زیر تعمیر تھی، وہاں کمروں کی صرف دیواریں کھڑی تھیں، جن میں نہ کھڑکیاں تھیں، نہ دروازے تھے اور نہ ہی چھت پڑی تھی۔ میں نے سرگوشی میں انور کمال سے کہا "نیچے اتر کر ادھر سیڑھیوں سے اوپر چل کے دیکھتے ہیں، شاید اس طرف کی گلی سے ہمیں نکلنے کا موقع مل جائے۔"

انور کمال بولا "چلیں دیکھتے ہیں، ویسے امکان کم ہی ہے ہمارے بچ نکلنے کا۔ بہرحال کوشش تو کرنا ہی چاہیے ہمیں۔"

"کیوں، یہ تم کیسے کہہ رہے ہو کہ بچ نکلنے کا امکان کم ہے؟" میں نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو بالکل ظاہر ہے جی! وہ جس نے دروازے کے باہر سے وارننگ دی تھی ہمیں، اُس نے یہی کہا تھا کہ اس پورے علاقے کا انھوں نے محاصرہ کرلیا ہے ناکا بندی کردی ہے انھوں نے! اس پورے علاقے کی۔ یقیناً ہر گلی، ہر موڑ پر پولیس موجود ہوگی۔" وہ بولا۔

"اوئے تو بھی کس کی بات پر یقین کر بیٹھا ہے یار! جانتا نہیں ہے تو ان پولیسیوں کو، یہ ایسے ہی بڑکیں مارا کرتے ہیں، رعب ڈالنے اور آدمی کو نروس کرنے کے لیے۔ تیرے جیسے نادان، سیدھے سادے لوگ چکر میں آجاتے ہیں ان کے۔ میں جانتا ہوں انھیں اچھی طرح سے، بڑا پرانا یارانہ ہے میرا ان سے، مجھ پر یہ نفسیاتی حربے کارگر نہیں ہوتے پیارے! چل اُتر نیچے یہاں سے۔" میں نے اُسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور دیکھ بھائی اُس طرح اُترنا کہ دھمک بالکل نہ ہو پیروں کی۔ مکینوں کو ذرا بھی آہٹ نہیں ملنا چاہیے۔"

وہ چھت سے صحن کی طرف پھسل کر نیچے لٹک گیا، مگر پھر بھی اُس کے پاؤں فرش سے اتنے اونچے تھے کہ اس کے کودنے سے دھمک ہوسکتی تھی۔ میں نے جلدی سے چھت پہ پیٹ کے بل لیٹ کر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر اسے آہستہ آہستہ نیچے سرکا کر اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ اس طرح وہ فرش کے بہت قریب پہنچ گیا اور جب میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑا تو وہ ہلکی سی آواز پیدا کیے بغیر آرام سے فرش پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد میں بھی اسی کی طرح چھت کا کونا تھام کر نیچے پھسل گیا۔ میں چونکہ تیزی سے نیچے پھسلا تھا اس لیے اپنے پاؤں پر میرا توازن قائم نہیں رہ سکا اور میرے پیر ہوا میں لہرا گئے۔ شکر یہ ہوا کہ اس باتھ روم کا دروازہ بند نہیں تھا ورنہ میرا بایاں پاؤں اس کے ساتھ ضرور ٹکرا جاتا اور اس سے خاصی تیز آواز پیدا ہوسکتی تھی۔ ایسا ہو جاتا تو ہماری ساری احتیاط دھری رہ جاتی۔ انور کمال نے جلدی سے بڑھ کر مجھے سنبھالا اور اپنے بازوؤں میں بھر کر آرام سے زمین پر دھر دیا۔ نیچے اُترتے ہی ہم دونوں پنجوں کے بل چلتے ہوئے زینے پر جا پہنچے۔ ابھی ہم نے آدھے ہی زینے طے کیے ہوں گے کہ صحن میں کھلنے والے ایک دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ آواز سنتے ہی ہم دونوں جیسے اُڑتے ہوئے آخری سیڑھی تک پہنچے تھے، اوپر پہنچتے ہی ہم نے سرعت کے ساتھ ایک دیوار کی آڑ پکڑ لی۔ اسی لمحے نیچے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "دیکھو کون ہے یہاں۔ یوں ہی وہم میں مبتلا رہتی ہو ہر وقت۔ خواہ مخواہ نیند خراب کرتی ہو دوسرے کی۔"

جواب میں کسی عورت نے کہا "لو تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے، مجھے شک سا ہوا تھا، یوں لگا تھا جیسے باتھ روم کی چھت سے کوئی پھسل کر نیچے آیا ہے۔ اچھا ہے نا اب دیکھ لیا تو شک رفع ہوگیا، نہیں تو رات بھر بے چینی رہتی اور نیند بھی نہیں آتی ٹھیک سے۔ یہ انگریز جو پیچھے والوں کے ہاں آیا ہوا ہے، یہ مجھے کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا۔ اس کے پاس آنے جانے والے بڑے خوف ناک قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں اور وہ دونوں میاں بیوی جن کا وہ مہمان ہے یوں اُس کے سامنے ڈرے سہمے، بارش بھیگی بلی بنے رہتے ہیں جیسے اس کے تابع دار غلام ہوں۔ میں تو اس کے ان کے ساتھ رہنے سے ہی خوف زدہ رہتی تھی کہ آج صبح ربانی صاحب نے اپنا مکان کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اب تو وہ بالکل ہمارے سر پر آ بیٹھا ہے۔"

"تم تو خواہ مخواہ اس شریف آ[illegible] کے پیچھے پڑ گئی ہو صبح سے۔" مرد نے یہ کہتے ہوئے دُ[illegible] زہ دوبارہ [illegible] یا تھا۔ جس کی وجہ سے

ہی ہلکی ہلکی آواز تو میرے کانوں میں پڑ رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

میں نے انور کمال کی طرف دیکھ کر ہلکے سے سرگوشی کی۔ "کچھ سنا ہے تو نے برادر! کیا یہ لوگ آٹزک کے بارے میں باتیں نہیں کر رہے ہیں؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ شاید اُس نے ان لوگوں کے گھر سے نکل کر یہیں آس پاس کوئی کرائے کا مکان لے لیا ہے۔" انور کمال نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک سمجھا ہے تُو نے میرے یار! اور وہ اسی لیے اتنی جلدی ہم تک پہنچ گیا تھا۔ اس شیدے کو پتا تھا اس کا نیا ٹھکانا۔ ہمیں چکر دے رہا تھا وہ سالا۔ لگتا ہے وہ بھی وہاں آٹزک ہی کا مقرر کردہ تھا اور وہ جس سے فاطمہ نے ٹیلی فون پر بات کی تھی وہ کوئی اور ہی رہا ہوگا جسے آٹزک نے اب تک ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ ان لوگوں کی باتوں سے پتا یہ چلتا ہے کہ اس کے مکان کے دائیں بائیں یا سامنے والے مکان میں آٹزک موجود ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو وہ اپنے مکان کے کسی حصے سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ اور اب تک وہ ہمیں دیکھ بھی چکا ہوگا۔" انور کمال نے کہا۔

"نہیں، شاید وہ ہمیں وہاں بند کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دے کر مطمئن ہو بیٹھا ہے۔ اگر اس نے نگرانی کی ہوگی تو پولیس کے آنے تک مکان کے سامنے والے حصے کی نگرانی کی ہوگی تاکہ ہم کسی طرح دروازہ کھول کر یا توڑ کر باہر نکلیں تو وہ ہمیں دوبارہ کسی مشکل میں گرفتار کرسکے۔ یہ تو تصور بھی نہیں کیا ہوگا اس نے کہ ہم روشندان کے راستے بھی نکل سکتے ہیں اور پولیس کے آنے کے بعد ادھر سے بھی وہ یا اُس کے آدمی ہٹ گئے ہوں گے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟ آٹزک کا نیا ٹھکانا تلاش کریں گے یا خاموشی سے نکل چلیں یہاں سے؟" انور کمال نے معلوم کیا۔

"یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہے، اُسے چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا میں۔ میری تو زندگی کا اب مقصد ہی یہ رہ گیا ہے دوست! آٹزک اور اس کے گرگوں کا خاتمہ کرنے کے بعد مجھے یوں لگتا ہے کہ میں روزِ حشر سرخرو ہو جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ہمیں یہ پتا کیسے چلے گا کہ وہ ہے کس مکان میں؟ کیا ہم ایک ایک مکان میں جھانک کر دیکھیں گے؟" انور کمال نے پوچھا۔

میں نے تاروں کی چھاؤں میں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرا اندازہ ہے اس وقت دو سے کم تو نہیں بجے ہوں گے۔ رات کے اس پہر میں ہر گھر میں اندھیرا ہوگا کیوں کہ سارے ہی گھروں کے لوگ بے خبر سو رہے ہوں گے۔ سب اپنے اپنے بستروں میں غافل پڑے ہوں گے دنیا جہان سے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ روشنی کس گھر میں ہو رہی ہے۔ جہاں روشنی ہوگی وہیں وہ موجود ہوگا۔"

"یہ نہ کہیں آپ جیلانی بھائی!" انور کمال نے کہا "وہ کوئی چھوٹا موٹا، اناڑی مجرم نہیں ہے۔ باقاعدہ تربیت یافتہ اور ایک بڑی تنظیم کا سربراہ ہے وہ۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہ بات اُس نے بھی سوچی ہوگی لہٰذا یہ خیال دل سے نکال دیں۔"

"ہاں یار! کہتا تو ٹھیک ہی ہے تُو۔ پھر تیرا کیا خیال ہے۔ ہم کس طرح تلاش کریں اُسے؟" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے تو ہمیں یہاں سے نکل کر کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کرنا چاہیے جہاں ہم پولیس سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر جب یہ اطمینان ہو جائے گا کہ پولیس مایوس ہو کر چلی گئی ہے یہاں سے، تب ہم اس کے مکان کو تلاش کریں گے۔ یہ وقت موزوں نہیں ہے اس کام کے لیے۔"

"یہ بات تُو نے بالکل ٹھیک کہی ہے یار! میری تو کھوپڑی میں لگتا ہے بھُس بھر گیا ہے اس وقت، کوئی صحیح بات سُوجھ ہی نہیں رہی ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ آٹزک آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اس کے سوا ہر بات ذہن سے نکل گئی ہے میرے۔" میں نے اس سے کہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کی دلی کیفیت کو۔ مگر اس وقت ہم اسے تلاش کرکے اس سے بھڑ جانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ پتا نہیں کتنی تعداد میں پولیس یہاں موجود ہے۔ اگر اس وقت آٹزک ہمیں مل بھی گیا اور ہمارے درمیان مقابلہ ہوگیا، جس کی سو فی صد توقع ہے، کیونکہ آٹزک کسی پتھر کے مجسمے کا نام نہیں ہے۔ وہ ہمارا سامنا ہوتے ہی مرنے مارنے پر اُتر آئے گا اور پھر پولیس بھی اس طرف متوجہ ہو جائے گی۔ پولیس درمیان میں آگئی تو وہ مظلوم قرار دے دیا جائے گا، اور ہم پر یہ الزام بھی لگ جائے گا کہ ہم نے اس کے گھر میں گھس کر اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی، ایک اور ناکردہ گناہ آپ کے نامۂ اعمال میں درج کر دیں گے یہ پولیس والے۔" انور کمال نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے تُو میرے یار! مگر اس ابلیس زادے کو یُوں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا ہے میرا..." میں نے بڑی بے دلی سے کہا۔

ہم جس مکان کی زیرِ تعمیر دوسری منزل پر کھڑے تھے اس کے

دائیں طرف والا مکان تین منزلہ تھا اور بائیں جانب والا سنگل اسٹوری تھا۔ البتہ اس کے ساتھ والا مکان دو منزلہ تھا۔ انور کمال سے باتیں کرتے ہوئے میری نظریں یوں ہی بلا وجہ اُس مکان کی چھت کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ اس مکان کے سامنے بجلی کا پول کھڑا تھا اور اس میں لگے روشن بلب کی روشنی چھت پر اس طرح پڑ رہی تھی کہ چھت کا ایک حصّہ بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ عین اس وقت جب میری نظر چھت کے اس حصّے پر پڑی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہاں کوئی کھڑا تھا اور میری نگاہ اُدھر اُٹھتے ہی وہ نیچے بیٹھ گیا ہے۔ چھت سے چاروں طرف کوئی تین فٹ اُونچی باؤنڈری وال کھنچی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں بیٹھا ہُوا شخص اس جگہ سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا جہاں میں کھڑا تھا۔ میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑتی چلی گئی۔ دل نے فوراً سوال کیا، یہ کون ہو سکتا ہے؟ کون تھا وہ؟ رات کے اس پہر میں کسی کو اپنے مکان کی چھت پر جانے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟ میں نے فوراً انور کمال کا بازو تھام کر مدھم سرگوشی میں کہا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے پیارے تو آئزک کو میں نے تلاش کر لیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" انور کمال نے چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا وہ نظر آیا ہے یہاں کہیں آپ کو؟"

"نظر تو نہیں آیا ہے وہ لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ جو برابر والے مکان کے ساتھ دو منزلہ مکان ہے اسی میں ہے وہ ـــ" میں نے جواب دیا۔

"لیکن یہ اندازہ کیسے لگا لیا آپ نے یہاں کھڑے کھڑے۔ کوئی وجہ تو ہو گی نا اس کی؟" انور کمال نے سوال کیا۔

"ابھی میں نے اس مکان کی چھت پر کسی شخص کو دیکھا ہے۔ وہ وہاں کھڑا تھا مگر جیسے ہی میری نگاہ اُدھر اُٹھی، وہ فوراً ہی نیچے بیٹھ گیا۔"

"آپ نے اس نیم تاریکی میں اتنی دُور کھڑے ہوئے شخص کی محض ایک جھلک دیکھ کر یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ آئزک ہی ہے؟" انور کمال نے پوچھا۔

"او یار! تُو نے تو وکیلوں کی طرح جرح شروع کر دی ہے۔ میں نے کہا نا کہ یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں جھنجلا کر بولا۔

"بُرا نہ مانیں جیلانی بھائی! اس طرح بحث کر کے ہم اس اندازے کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں یہی بات تو پُوچھ رہا ہوں آپ سے کہ اتنی دُور سے یہ اندازہ کیسے قائم کیا ہے آپ نے؟" انور کمال نے مجھے سمجھاتے ہوئے پُوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے پیارے! اتنی رات کو کوئی ... کسی کی

چھت پر کیوں چڑھے گا بھلا؟ کیا ضرورت ہے کسی کو اپنی نیند ... کر کے اُوپر جانے کی؟ اسی وجہ سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ ... ہے اور وہ یہ دیکھنے کے لیے اُوپر چڑھا ہے کہ اس نے ہمیں جس ... پھنسایا تھا اس میں اسے کامیابی ہوئی ہے یا نہیں۔ یقیناً وہ اُوپر ... پولیس کی ساری نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہو گا۔" میں نے ... کو بتایا۔

"اگر ایسا ہے تو ہم اس پر نگاہ رکھتے ہیں، وہ آئزک ہی ہے اور آپ کے اندازے کے مطابق پولیس کی کارروائی کا نتیجہ جاننے کے لیے اُوپر چڑھا ہے تو وہ دوبارہ پھر دکھائی دے گا لیکن ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رُکے رہنا چاہیے۔ اگر پولیس نے ابھی اس علاقے کی ناکا بندی نہیں کی ہے تو جیسے ہی اُسے پتا چلے گا کہ ہم وہاں سے نکل بھاگے ہیں ... پُورے علاقے کو گھیر لے گی۔ پھر ہمارا یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا بلکہ میرا مشورہ اگر آپ مانیں تو یہاں سے نکل ہی چلیں فوراً۔ یہ خطرہ ٹل جانے کے بعد ہم کسی رات بھی واپس آ کر آئزک کو گھیر سکتے ہیں۔"

میں نے چند ثانیے اس کے مشورے پر غور کرنے کے بعد کہا۔ "ٹھیک کہتا ہے میرے یار! اس عورت کی بات سے یہ تو پتا چل گیا ہے نا کہ وہ کسی ربّانی کے مکان میں چھُپا بیٹھا ہے۔ ہم دن ... کسی طریقے سے ربّانی کا مکان معلوم کر لیں گے، اور پھر وہاں پر چڑھیں گے۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا تھا۔ اب آپ نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ آئیں پھر نکلیں یہاں سے اب۔" انور کمال تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

ہم دونوں نے آگے جا کر بڑے محتاط انداز میں گلی میں جھانکا۔ گلی بالکل سنسان تھی مگر روشنی وہاں اتنی تھی کہ اگر گلی کے کسی بھی سرے پر پولیس کا کوئی آدمی موجود تھا تو ہم دُور سے ہی اُسے نظر آ جاتے۔ گلی خاصی کشادہ تھی مگر وہاں چھُپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، اور یہاں کے مکین اتنے فیاض تھے کہ تقریباً ہر گھر کے باہر ایک بلب روشن نظر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ کے ای ایس سی نے وہاں گلی کے دونوں سروں کے درمیان میں تین پول کھڑے کر کے ان میں ٹیوب لائٹوں کے ذریعے گلی کو منوّر کرنے کا معقول انتظام کر رکھا تھا، مگر شاید گلی والوں کو کے ای ایس سی والوں پر اعتبار نہیں تھا۔ ان کا خیال ہو گا کہ اس محکمے کا کوئی بھی بے ایمان اہلکار چوروں سے مل کر یہ ٹیوب ایک دو گھنٹے کے لیے بجھا سکتا ہے اور ایک دو گھنٹے کی تاریکی چوروں کی چاندی کر سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے خود بھی گلی کو روشن رکھنے کا مناسب اور معقول انتظام کر رکھا تھا۔

میں نے انور سے کہا۔ "لے بھئی، یہاں تو دن نکلا ہوا ہے۔ لوگوں نے لگتا ہے دیوالی منانا شروع کر دی ہے۔"

"یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔ اتنی تیز روشنی میں تو ہم دُور ہی سے دیکھ لیے جائیں گے۔" انور کمال کچھ پریشان ہو کر بولا۔

"یہ تو یہ خطرے ہی والی بات لیکن نکلنا تو ہمیں ہے یہاں سے۔ دریا جانا بھی اسی طرف سے ہے کیونکہ پیچھے والی گلی کا کوئی بھروسا نہیں ہے، وہ اندھی گلی پتا نہیں کہاں لے جائے ہمیں۔ کیا پتا ہم اس سے باہر نکل بھی سکیں گے یا صبح کوئی جمعدار کسی گٹر سے ہماری لاشیں برآمد کرے گا۔" میں نے کچھ اور آگے جھک کر اُس گلی کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

انور کمال بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ ہمت کر کے اُتر جاتے ہیں اسی گلی میں۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ رات بھر یہاں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے نا ہم۔ اور اگر ہم دونوں نے یہاں رات گزار بھی دی تو پھر دن کی روشنی میں تو ہمارے بچ نکلنے کا امکان ایک فی صد بھی نہیں رہے گا۔"

"ہاں یار، لگتا ہے کہ یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ ویسے اس برابر والے سنگل اسٹوری مکان میں ٹیلی فون کی لائن جاتی دکھائی دے رہی ہے مجھے، کیوں نہ ہم ٹیلی فون کر کے شرافت علی وغیرہ کو اطلاع دے دیں اور انھیں اپنی مدد کے لیے بُلا لیں۔ اس طرح ہم لگے ہاتھوں اس اسرائیل زادے آئزک سے بھی نمٹتے چلیں گے۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ ذرا حیران ہو کر میری شکل کو تکتے ہوئے بولا۔ "مگر ہم ٹیلی فون تک پہنچیں گے کیسے؟ اور کیا اس کے مکین ہمیں اجازت دے دیں گے، ٹیلی فون کرنے کی؟ میرا تو خیال ہے کہ اتنی رات گئے وہ دو اجنبیوں کو اپنے گھر میں قدم تک نہیں رکھنے دیں گے۔"

"ارے نہیں یار! اس بات کی تُو بالکل فکر نہ کر، بس تُو اپنا ریوالور ہاتھ میں رکھنا، پھر تجھے کوئی نہیں روکے گا کسی کام سے بھی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے کہ زور زبردستی والا فارمولا ہی استعمال کیا جائے۔ چلیں ٹھیک ہے، پھر آئیں اِدھر ہی چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

ان دونوں مکانوں کی چھتیں ملی ہُوئی تھیں۔ اس پُوری گلی میں جتنے بھی مکان تھے وہ سب ایک ہی برابر کے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید یہاں سارے پلاٹ ایک ہی سائز کے کاٹے گئے تھے۔ لہٰذا مکان بھی تقریباً ایک جیسے لگ رہے تھے۔ جس مکان میں ٹیلی فون کی لائن جاتے دیکھی تھی میں نے وہ بھی بالکل ایسا ہی بنا ہُوا تھا جیسا یہ مکان تھا جس کی چھت پر ہم کھڑے تھے۔ میں نے اس کے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ اِدھر بھی دو کمروں کے دروازے موجود تھے مگر وہ دونوں بند نہیں تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ کھلا ہُوا تھا اور اس میں سے زیرو پاور کے بلب کی مدھم سی سُرخ روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی کی خواب گاہ تھی۔ سامنے نیچے جانے کے لیے زینہ بھی دکھائی دے رہا تھا، مگر اس تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس مکان کی پُوری چھت عبور کرنا پڑی۔ ہم بہت محتاط انداز سے چلتے ہوئے کہ ہمارے قدموں کی دھمک نیچے والوں کو سنائی نہ دے سکے، زینے تک پہنچے اور اسی احتیاط کے ساتھ نیچے صحن میں پہنچ گئے۔

کھُلے ہوئے دروازے سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا، وہاں ایک بیڈ پر کوئی شخص دروازے کی طرف پُشت کیے بے خبر سو رہا تھا۔ اس دروازے کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہُوا تھا ـــ میں کوئی ہلکی سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ سونے والا اس گھڑی بہت ہی گہری نیند میں تھا۔ اس کا مُنہ دیوار کی طرف تھا۔ میں گربہ قدم چلتا دونوں کمروں کے درمیانی دروازے تک پہنچا اور اس پر پڑا ہُوا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر دوسری طرف جھانکا۔ اس کمرے میں بھی زیرو پاور کے سُرخ بلب کی مدھم روشنی نے کمرے کی ہر چیز پر سُرخی بکھیری ہوئی تھی۔ یہاں دو بیڈ پڑے ہُوئے تھے۔ ایک پر ایک خاصی موٹی تگڑی عورت سوئی ہوئی تھی اور دوسرے پر ایک منحنی سا شخص گہری نیند میں ڈوبا پڑا تھا۔ اس کمرے کے جس دروازے میں اس گھڑی میں کھڑا تھا، اس سے کوئی ڈھائی تین فٹ کے فاصلے پر بائیں طرف کی دیوار میں ایک اور پردہ لٹکا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے انور کمال کے کان پر مُنہ رکھ کر اسے ریوالور لے کر اپنی جگہ کھڑے ہونے کی ہدایت کی اور آہستہ سے اس کمرے میں رینگ گیا۔ میں نے اس دُوسرے پردے کے پاس جا کر اس کے دُوسری طرف جھانکا مگر اُدھر ایک دَم گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اُدھر۔ میں نے وہ پردہ پُورا سمیٹ کر اِدھر کی مدھم روشنی کو اس طرف پہنچنے کا راستہ دے کر دیکھا۔ اب اس کمرے کا ماحول قدرے واضح ہو گیا تھا۔ یہ ان کا ڈرائنگ رُوم تھا۔ دُوسرے بیڈ رُوم میں سوئے ہوئے جوڑے کو دیکھنے کے بعد میرا خیال تھا کہ کسی کمرے میں ان کے بچّے بھی سوئے ہوئے ہوں گے لیکن میں نے ڈرائنگ رُوم کی لائٹ جلا کر اس کے ساتھ والا کمرا بھی دیکھ ڈالا مگر اس مکان میں ان تینوں کے سوا اور کوئی فرد نہیں تھا۔ مکان میں صرف چار ہی کمرے تھے۔ ٹیلی فون میں ڈرائنگ رُوم میں رکھا ہوا دیکھ چکا تھا۔ سارے کمرے دیکھنے اور ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اشارے سے انور کمال کو ڈرائنگ رُوم میں بُلا کر کہا۔ "تم ذرا ان لوگوں پر نگاہ رکھو، میں ان کی نیند خراب کیے بغیر ٹیلی فون کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر اس دوران ان میں سے کوئی جاگ جائے تو تم اسے سنبھال لینا۔"

"ٹھیک ہے آپ بات کریں فون پر، میں خیال رکھوں گا ان کا، لیکن پھر ان لوگوں کو جگانا تو پڑے گا ہی ہمیں۔ انھیں سوتے ہوئے چھوڑ کر تو ہم ان کا بیرُونی دروازہ کھول کر باہر نہیں جا سکتے۔ یہ تو

ان لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی والی بات ہو گی۔" انور کمال نے کہا۔

"بالکل بالکل یار! ہم یہاں انھیں کوئی نقصان پہنچانے تو نہیں آئے ہیں،" میں نے جواب دیا۔

وہ اپنا ریوالور سنبھال کر دروازے میں لٹکے ہوئے پردے کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ دُوسری گھنٹی بجتے ہی اُس طرف سے ریسیور اُٹھا لیا گیا۔ وہ شرافت علی تھا۔ میں نے دبی دبی آواز میں اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری ساری بات سُننے کے بعد بولا "یہ تو بہت بُرا ہُوا یار! اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذلیل یہودی کہیں گیا نہیں تھا وہاں سے۔ وہ وہیں کہیں چھُپ کر بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا اور اس نے اصلی شیدے کو وہاں سے ہٹا کر اُس کی جگہ اپنے ہی کسی آدمی کو بٹھا رکھا تھا۔"

"ہاں، اور وہ ابھی اسی جگہ موجود ہے۔ تم لوگ جتنی بھی جلدی ہو سکے یہاں پہنچو لیکن اس انتظام کے ساتھ آنا کہ یہاں آرتھر کے علاوہ پولیس بھی موجود ہے، اور ہمیں بیک وقت ان دونوں سے ہی نمٹنا ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اور انور کمال کہاں مل سکتے ہیں انھیں۔

میں نے اس سے گفتگو کر کے ریسیور رکھا ہی تھا کہ انور کمال نے مجھے اشارے سے اپنی طرف آنے کے لیے کہا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے نزدیک پہنچتا وہ اپنا ریوالور سیدھا کر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُدھر جاتے ہوئے اُس نے بڑے مہذب انداز میں کسی سے کہا تھا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ابھی تھوڑی دیر میں واپس چلے جائیں گے ہم۔"

اس کا جملہ پُورا ہونے سے پہلے ہی میں بھی اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں زن و شوہر جنھیں ہم نے اس کمرے میں سوتے دیکھا تھا، بیدار ہو چکے تھے۔ وہ موٹی عورت اپنے منحنی سے ہسبینڈ یعنی شوہرِ نامدار کے بیڈ کے پاس کھڑی خوفزدہ نظروں سے انور کمال کو دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ شاید جس وقت میں ٹیلی فون پر شرافت علی سے بات چیت کر رہا تھا، میں اپنی آواز کا گلا گھونٹنے کے باوجود اسے اس کے کانوں تک پہنچنے سے نہیں روک سکا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی آدمی کے کان تک پہنچ جاتی ہے اور اگر کوئی ہوشیار نیند سونے والا ہو تو وہ آواز اس کی نیند اُڑا دیتی ہے۔ وہ عورت بھی شاید ایسی ہی چوکیدار والی نیند سونے کی عادی تھی۔ اس نے اپنے گھر میں غیر معمولی اور پُراسرار ... کا احساس ہوتے ہی اپنے ہسبینڈ کو جگا دیا تھا۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب انور کمال ریوالور بدست ان کے سامنے آ گیا تھا۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی ان دونوں زن و شوہر کے چہروں پر ہلدی کھنڈ گئی تھی، اور شاید ان کی گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ چند ثانیے وہ ہمیں خوفزدہ نگاہوں سے تکتے رہے۔ پھر اس منحنی سے ادھیڑ عمر شخص نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے تھرتھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کون... کون ہو تم... اور..."

میں نے اس کی بات کاٹ کر تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں بڑے بھائی، ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے اور نہ ہی تمھیں لُوٹنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں، تمھیں ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کیا ہماری شکلیں خوفناک لگ رہی ہیں تمھیں؟"

"شکل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل تو بُرے اور بھلے، شریف اور بدمعاش میں فرق ہی نہیں رہا ہے سب ایک ہی جیسے لگتے ہیں، اور پھر کوئی شریف آدمی آدھی رات کو کسی کے گھر میں گھس کر گھر والوں پر اس طرح ریوالور نہیں تانتا ہے،" منحنی شخص ہمت کر کے بولا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا ہے برادر! کبھی کبھی آدمی کو کوئی ناپسندیدہ کام بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ ہمیں حالات نے تمھارے مکان میں لا ڈالا ہے لیکن تم فکر نہ کرو، اگر تم نے ہمیں کسی مشکل میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی تو میں وعدہ کرتا ہُوں کہ ہم تمھیں کسی بھی طرح کا گزند پہنچائے بغیر تھوڑی دیر میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمیں صرف ایک ٹیلی فون کرنا تھا جس کے لیے تم لوگوں کی نیند خراب کرنا اچھا نہیں لگا ہمیں۔"

"اور ڈاکوؤں کی طرح ریوالور لے کر میرے گھر میں گھس آئے صرف ٹیلی فون کرنے کی خاطر کیوں؟" میری باتوں نے اس کا ذرا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور اس کا خوف بھی بڑی حد تک دُور ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کے لہجے میں طنز آمیز تلخی گھُل گئی تھی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈال کر بڑے سخت لہجے میں پُوچھا "میرا خیال ہے کہ ٹیلی فون تو کر ہی لیا ہے آپ نے، اب واپس جانے کا ارادہ کب کا ہے؟"

"تُو تو یار خواہ مخواہ بُرا مانتا ہے۔ تُو خود اُٹھ کر دیکھ لے اپنی طرف سے، ہم نے ٹیلی فون کے سوا تیرے گھر کی کسی بھی چیز کو چھُوا تک نہیں ہے۔ کیا یہ بات ہماری نیک نیتی کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے؟" میں نے اسے اطمینان دلانے کی خاطر کہا۔

مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ شرافت کی زبان سُن کر گیدڑ بھی شیر ہو جاتا ہے اور اپنی حیثیت کو بھول کر تحقیر آمیز انداز میں باتیں کرنے لگتا ہے تو یہ کچھ ایسا غلط نہیں ہے یارو! وہ منحنی سا گیدڑ جو ابھی چند لمحے پیشتر تھر تھر کانپ رہا تھا اور لرزہ میں مبتلا شخص کی طرح میرا دیکھ...

اور انکسارانہ انداز دیکھ کر جامے سے باہر نکلنے لگا تھا۔ وہ میری بات سُن کر تلخی سے بولا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ زبان سنبھال کر تمیز سے بات کرو مجھ سے، میں اجنبیوں سے زیادہ بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا ہوں۔ تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اب تم چُپ چاپ نکل جاؤ میرے گھر میں سے۔"

وہ اتنی اُونچی آواز میں بول رہا تھا کہ برابر والے کمرے میں سویا ہوا دوسرا آدمی بھی جاگ گیا۔ اس نے اپنے بستر میں لیٹے لیٹے ہی آواز دے کر پُوچھا "کیا بات ہے ربّانی بیٹے! کون آیا ہے؟ یہ تم کس سے اتنے غصّے میں بات کر رہے ہو؟"

"پتا نہیں بابا کون بدمعاش چور اُچکے گھس آئے ہیں گھر میں۔ کہتے ہیں ٹیلی فون..."

اس کی زبان سے بدمعاش اور چور اُچکے جیسے الفاظ سُن کر میں برداشت نہ کر سکا، اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے مُنہ پر ایک اُلٹا ہاتھ رسید کر کے بولا "زبان کو لگام دے اپنی کُتّے! تُو جانتا نہیں ہے مجھے تیرے جیسے جانوروں کو سدھانا خوب آتا ہے مجھ کو۔"

میرا ہاتھ اتنا سخت پڑا تھا اس کے مُنہ پر کہ بولتے بولتے الفاظ اس کے حلق میں پھنس کے رہ گئے تھے، اور وہ اُلٹ کر اپنے بیڈ پر گر پڑا تھا۔ میرے غضب ناک تیور دیکھ کر اس کی وہ آٹے کی بوری نما زوجہ بڑی بے تابی سے آگے بڑھ کر میرے اور اس کے درمیان حائل ہو گئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی کرتے ہوئے بولی "تمھیں خدا رسول کا واسطہ انھیں مارو نہیں۔ یہ پہلے ہی لمبی بیماری جھیل کر اُٹھے ہیں۔"

اس نے یہ بات اس طرح گھگیا کر کہی تھی کہ میرا سارا غصّہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ماتھے پر بل ڈال کر غصّے سے کہا "مجھ کو کیا کہتی ہے مائی! اس کو سمجھا اپنے شوہرِ نامُراد کو کہ یہ اپنی زبان کو غلاظت چاٹنے سے روکے۔ اگر اب اس نے کوئی ایسی ویسی بات نکالی زبان سے تو زبان باہر کھینچ کے پھینک دوں گا سالے کی۔"

پھر میں نے انور کمال سے کہا "ادھر جا یار! اس بابے کو دیکھ اور اسے سمجھا کہ اگر سلامتی چاہتا ہے وہ اپنی اور ان دونوں کی تو چُپ چاپ بستر میں پڑا رہے اپنے۔"

انور کمال نے ادھر جاتے ہوئے میرے کان کے پاس مُنہ رکھ کے سرگوشی میں کہا "آپ نے سُنا نہیں جیلانی بھائی! اس بابے نے اسے ربّانی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ پتا کریں اگر یہ وہی ربّانی ہے جس کے بارے میں وہ عورت کہہ رہی تھی کہ اس نے آرتھر کو اپنا مکان دے دیا ہے تو..."

میں اس کا مطلب سمجھ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ فکر نہیں کر تو یار، ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

انور کمال اس بابے کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس منحنی شخص کو مخاطب کر کے کہا "اچھا تو تیرا نام ہے ربّانی؟ کیا تیرے علاوہ کوئی اور ربّانی نام کا شخص بھی رہتا ہے۔ آس پاس کہیں؟"

اس کے بجائے اس کی بیوی بولی "ان کے علاوہ تو اس محلے میں کوئی بھی اس نام کا آدمی نہیں رہتا۔ مگر تم یہ کیوں پُوچھ رہے ہو؟"

"میں نے سُنا تھا کہ یہاں ربّانی نامی کسی شخص نے اپنا مکان کسی انگریز کو کرائے پر دیا ہے... آج مگر تمھارے مکان میں تو کوئی انگریز نہیں ملا مجھے۔"

"آج تو ہم نے نہیں دیا ہے مکان کسی انگریز کو، وہ تو پندرہ دن ہوئے جب دیا تھا۔ وہ آئے آج ہیں وہاں،" عورت نے جواب دیا۔

ربّانی نے اپنی بیوی کو گھورتے ہوئے کہا "مگر تم انھیں یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو؟ میں نے کسی کو بھی اپنا مکان دیا ہو، انھیں کیا غرض ہے اس سے، یہ پُوچھنے والے کون ہوتے ہیں اس کے بارے میں؟" وہ بہت ہی چِڑا ہُوا لگ رہا تھا مجھ سے۔

عورت بولی "تم چُپ رہو جی۔ یہ کچھ بھی پُوچھیں ہمیں اس سے کیا، ہماری کوئی رشتے داری تو نہیں ہے اُس بندر کی شکل والے سے۔"

میں نے عورت ہی کو مخاطب کیا "اں باؤ! تم مجھے بہت سمجھ دار لگتی ہو مسز ربّانی! تمھارا یہ شوہر تو بڑا ہی کم عقل اور ناسمجھ آدمی ہے۔ اب دیکھو نا، جب ہم نے وعدہ کر لیا ہے کہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے تو خواہ مخواہ جھگڑا کرنے کا فائدہ؟ ہاں تو بی بی! وہ کون سا مکان ہے جسے تم نے کرائے پر چڑھایا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ مکان تو نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے میں دیکھ چکا ہُوں۔ یہاں تم لوگوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

"یہ برابر میں دو منزلہ مکان ہے نا، یہ ہمارا ہی مکان ہے۔ اس مکان کی نیچے والی منزل ہم نے فیاض صاحب کو دی ہوئی ہے۔ انھی کی ضمانت پر اُوپر کا مکان مسٹر اسمتھ کو دیا ہے ہم نے۔ فیاض صاحب ضمانت نہیں لیتے تو ہم کسی تنہا آدمی کو مکان کبھی نہیں دیتے،" اُس نے بتایا۔

"یہ مسٹر اسمتھ وہ تو نہیں ہیں جو گزشتہ کئی روز ادھر بچھلی گلی میں ایک صاحب کے یہاں مہمان تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ نہیں ہیں، ان کا نام تو اسمتھ نہیں... وہ... وہ..."

وہ دماغ پر زور دے کر اس کا نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی، پھر وہ اپنے شوہر ربّانی کی طرف مڑ کر پُوچھنے لگی "اے جی کیا نام ہے جی اس کا؟ آپ تو مل چکے ہیں نا اس سے۔ وہ بھی تو فیاض صاحب کا جاننے والا ہے۔

ان کے پاس ہر روز آتا ہے ملنے کے لیے۔ کمبخت نام ہی یاد نہیں آرہا ہے مجھے تو۔"

"بکواس نہیں کرو، میں نہیں جانتا کسی کو بھی۔ میں کہتا ہوں ان فضول باتوں سے ان کا کیا تعلق ہے؟ یہ کیوں پوچھنا چاہتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں؟ ان کو کہو بیگم یہ ہمارے گھر سے چلے جائیں فوراً، اچھی تھانیداری ہے یہ، ایک تو بغیر اجازت کے گھر میں گھس آئے۔۔۔"

دوسرے کمرے میں موجود بابے کو شاید انور کمال ہموار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے ربانی کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میاں کیوں خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ مہمان تو رحمتِ خداوندی ہوتا ہے گھر میں آئے ہوئے ہر شخص کو چاہے وہ بلایا ہوا ہو یا بے بلایا مہمان ہی سمجھنا چاہیے۔ جاؤ بیٹی! تم ان لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کو لے کر آؤ جلدی سے۔"

"نہیں نہیں باباجی! ایسی کوئی ضرورت نہیں محسوس کر رہے ہم۔ آپ لوگ تکلیف نہ کریں بالکل بھی۔ بس اتنی مہربانی کریں آپ اس ربانی کو کہیں یہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھے اور ہمیں سچ سچ بتا دے اس نے اپنا مکان کس کو چڑھایا ہے کرائے پر؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"مگر بیٹا! تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔ ربانی اپنا مکان کسی کو بھی دے تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے آخر؟" باباجی نے پوچھا۔

میں نے سوچا یہ بات وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے ربانی یا اس کے مکان سے کیا دلچسپی ہے اگر میں انھیں یہ بتا دوں تو ان کی ساری الجھن اور پریشانی ختم ہو جائے گی اور پھر یہ میرے ہر سوال کا جواب بے جھجک اور ٹھیک ٹھیک دیتے رہیں گے، آئزک کے سلسلے میں اگر یہ لوگ مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو گئے تو میں آسانی سے اس تک پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر ان کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے باباجی! آئیں آپ ادھر بیٹھیں، میں آپ لوگوں کو ساری بات بتا دیتا ہوں، لگتا ہے حقیقت جانے بغیر آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے ہمارے ساتھ۔ لیکن ایک وعدہ آپ کو کرنا ہوگا ہمارے ساتھ۔ ہم آپ کو جو کچھ بتائیں گے وہ آپ لوگ اپنے تک ہی رکھیں گے۔ آپ تینوں کے سوا کسی چوتھے آدمی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم بالکل بے فکر رہو، تمھارے راز کی حفاظت ہم بالکل اپنے راز کی طرح کریں گے۔ کسی کو یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ تم یہاں آئے تھے آج رات کو، تم دونوں بھی کان کھول کر سن لو ربانی! وعدہ خلافی نہیں ہونا چاہیے۔" باباجی نے ربانی کی بیوی کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "باباجی! یہ کوئی ہمارا ہی ذاتی معاملہ نہیں ہے یہ پورے ملک، پوری قوم کی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم سے تعاون کر کے آپ اپنے ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ آپ کو پتا ہے نا جب سے ہمارا ملک وجود میں آیا ہے، کچھ دشمن دن و رات ہمیں برباد کر کے ہماری اس سوہنی دھرتی پر قبضہ کر لینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ عالمِ اسلام کی بھلائی کے سلسلے میں ہمارا کردار بھی بہت سی حکومتوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا ہے۔ خصوصاً اسرائیل کو ہمارا وجود بُری طرح کھٹک رہا ہے چنانچہ وہ ہمارے دشمن کی پشت پناہی کے ساتھ ساتھ ہماری قومی یک جہتی کو بھی پارہ پارہ کر دینا چاہتا ہے ـــ تاکہ ہم منتشر ہو کر دشمن کے لیے لقمۂ تر بن جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس مقصد کے لیے اسرائیل نے یہاں اپنے ایجنٹوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اتفاق سے مجھے ان کے سربراہ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور اب ہم اس تنظیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے ہیں۔ ہم نے اب تک انھیں بہت بھاری نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے بہت سے آدمیوں کو ٹھکانے لگا چکے ہیں مگر وہ کمینہ، ذلیل آئزک بار بار ہمارے ہاتھوں میں آنے کے بعد چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل جاتا ہے۔ وہ بے اندازہ وسائل رکھتے ہوئے بھی ہم سے خوفزدہ ہیں اور اپنی تمام پاکستان دشمن سرگرمیاں ترک کر کے پوری قوت میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف جمع کر کے پہلے ہمیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ کے پیچھے والے مکان میں ان کا سرغنہ آئزک چھپا ہوا ہے لہٰذا ہم نے وہاں چھاپا مارا تھا آج، لیکن اسے کسی طرح پہلے ہی ہمارے ارادے کی خبر ہو گئی اور ہمارے آنے سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گیا ہے، تھوڑی دیر پہلے ہمیں پتا چلا تھا کہ آج صبح ربانی نے اپنا مکان ایک انگریز کو کرائے پر چڑھایا ہے لہٰذا ہم یہ معلوم کرنے آئے ہیں اس وقت کہ وہ انگریز ہمارا مطلوبہ شخص تو نہیں ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ پولیس یا خفیہ محکمے کے آدمی ہو۔ تو بیٹا! یہ بات پہلے ہی بتا دی ہوتی تم نے ہمیں۔" بابا نے کہا۔

"نہیں جی نہیں، ہمارا کسی بھی سرکاری محکمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو آپ ہی جیسے عام لوگ ہیں اور اپنے طور پر اپنے ہی وسائل سے سب کچھ کر رہے ہیں۔ پولیس والیس کا آدمی نہ سمجھیں آپ ہمیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑی عجیب بات ہے بھئی۔ ایسا خطرناک کام آپ لوگ خود ہی اپنے طور پر نمٹانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آپ حکومت کے ذمے دار لوگوں کو ان کے بارے میں بتا دیں، پھر حکومت خود سمجھ لے گی ان سے تا آپ لوگ اپنی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالے ہوتے ہیں؟"

"باباجی! مشکل تو یہی ہے۔ ان کی پہنچ بہت دور دور تک ہے۔ ہماری بات پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ اس قسم کا کام کرنے والے لوگ یہ انتظام پہلے ہی کر لیتے ہیں۔ وہ یا تو کچھ بااثر مگر بے ضمیر لوگوں کو خرید لیتے ہیں یا رشوت وغیرہ کے ذریعے اپنے خاص آدمی اعلیٰ عہدوں تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ لوگ ان کی سرگرمیوں پر پردے ڈالتے رہتے ہیں ـــ"

"ہاں جی، یہ تو ہے، اس خرابی سے سبھی واقف ہیں ـــ خیر جی، دفع کریں اس قصے کو۔" بابا نے کہا۔ پھر وہ ربانی سے بولا۔ "ربانی! یہ لوگ تو سر پر بٹھانے کے قابل ہیں بیٹے! بہت عظیم لوگ ہیں یہ، اس دور میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، حیرت ہو رہی ہے مجھے یہ جان کر۔ تمھارا فرض ہے کہ ان کے ساتھ ہر طرح تعاون کرو، ان کے ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دیتے جاؤ۔"

ربانی جو اب تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا، بولا۔ "مگر اس کا نام آئزک تو نہیں۔ مسٹر اسمتھ کا وہ دوست جو فرقان صاحب کا مہمان تھا جرمن نومسلم ہے اور اس کا اسلامی نام اسحاق ہے۔ تمھیں غلط فہمی ہوتی ہے کچھ۔"

"اگر اس کا نام اسحاق ہے تو یقین کرو، مجھے بالکل بھی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔ یہ وہی آئزک ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ تم اس بہروپیے کو جانتے نہیں ہو۔ اسے جب میں نے پہلی بار دیکھا تو اس وقت اس نے خدا کے نیک اور عامل کامل قسم کے بندوں کا روپ دھار رکھا تھا اور ادھر منگھو پیر کی پہاڑیوں میں ایک خانقاہ بنا کر رہتا تھا۔ اس خانقاہ میں چرس، ہیروئن اور اس قسم کی دوسری منشیات کے علاوہ جدید طرز کے اسلحہ کا انبار لگا رکھا تھا اس نے۔ وہ سب کچھ ہم نے ہی برباد کیا تھا۔ تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ کیا وہ اب تمھارے مکان میں ہے؟ اس برابر والے مکان میں؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

ربانی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "حیرت انگیز باتیں کر رہے ہو تم، یقین نہیں آتا۔ ایسا شریف صورت آدمی، ہر وقت اللہ رسول کی باتیں کرنے اور نیک عمل کی ہدایت کرنے والا آدمی ایسا بھی ہو

زندگی کے نشیب و فراز

گناہ و ثواب

اندھیروں اور اجالوں

وقت اور حالات کے بھنور میں جنم لینے والی ایک

بصیرت افروز کہانی۔

غلام روحیں

میاں شاہد علی کی داستانِ حیات۔ سب رنگ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سلسلہ وار کہانی جو پہلی بار کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ ایک مجبور اور بے بس شخص کی الم انگیز کہانی ـ اس نے جرم و گناہ کے راستوں کو اپنانے سے انکار کیا تو مجرم بنا کر اسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا۔ قسمت نے اُسے گھر بار اور والدین کے سائے سے محروم کر دیا ـ!!

وہ جیل سے رہا ہو کر باہر آیا تو اُس کا سینہ فگار تھا۔ انتقام کے شعلے اُس کے وجود کو جھلسا رہے تھے۔ لیکن ـــ ایک دوست نے اس کی رہنمائی ایک مردِ کامل کے آستانے تک کر دی ـ!!

وہ عشقِ حقیقی میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو قلب روشن ہو گیا ـ لیکن ایک اچانک حادثے نے ماضی کے زخموں کو کرید کر پھر ہرا کر دیا تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول لیں ـ!!

تاریک راہوں کی گھٹن سے ابھرنے والی ایک خوبصورت اور عبرت انگیز داستان۔

قیمت :- ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ

کتابیات ...

سکتا ہے مسٹر اسمتھ اور فیاض صاحب تو اس کی پارسائی کی قسمیں کھاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے اس اسمتھ کے علاوہ تمھارا کرائے دار فیاض بھی آنرک کا خاص آدمی ہے۔ اور شاید اس مکان کو انھوں نے اپنی خفیہ سرگرمیوں اور ضرورت پڑنے پر ایک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ہی حاصل کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے بیٹے ربانی! تم نے بغیر تحقیق کیے ایسے لوگوں کو مکان دے رکھا ہے اپنا۔ میں کہتا ہوں فوراً پولیس کو اطلاع کر دو۔ میاں لعنت بھیجو ایسے پیسے پر۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا اُتنا کرایہ یہ لوگ یوں ہی نہیں دے رہے ہیں مگر تم نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھو میرا خدشہ درست ثابت ہوا نا۔ تم لوگ پتا نہیں کیوں ہمارے تجربات کو تسلیم نہیں کرتے ہو۔" بابا نے ربانی سے کہا۔

"چھوڑیں ابا! آپ کو تو بس بہانہ چاہیے ہوتا ہے انھیں کچھ نہ کچھ کہنے کا۔ آخر تو بندہ بشر ہے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اب ان کی اصلیت معلوم ہو گئی ہے تو انھیں رہنے نہیں دیں گے ہم اپنے مکان میں۔ آپ صبح ہی انھیں مکان خالی کرنے کو کہہ دیں ربانی! بلکہ فوراً خالی کرالیں ان سے مکان۔ ہماری بلا سے کہیں بھی جائیں وہ ہم نے ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے کسی کا۔ ایسے آدمیوں کو تو ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتے ہم۔ بس فوراً چلتا کریں جی انھیں۔" ربانی کی بیوی نے ربانی سے کہا۔

میں اس عورت کی سادگی پہ ہنس پڑا۔ میں نے کہا "بی بی! یہ تو کیا کر رہی ہے، انھیں جانا کہاں ہے اب۔ یہ گھر چھوڑ کر تو وہ اب سیدھے جہنم ہی کو سدھاریں گے۔ تیرا مکالمہ رانگ سائڈ پر چل پڑا ہے اسے روک لے۔ ہم نے تو اب اس ابن ابلیس کو دنیا ہی سے چلتا کر دینا ہے، اور اس کام کے لیے اندھیرا چھٹنے کا انتظار نہیں کریں گے ہم۔ کل کا سورج نہیں دیکھ سکے گا اب وہ۔"

عین اسی لمحے میں نے گلی میں کسی کار کی آواز سنی۔ اس آواز کو سنتے ہی میں نے انور کمال سے کہا "ذرا باہر جھانک کر دیکھ یار! شاید شرافت وغیرہ آگئے ہیں۔ اطمینان کیے بغیر باہر نہ نکل پڑنا۔ یہ کار دشمن کی بھی ہو سکتی ہے خیال رکھنا۔"

ربانی بولا "باہر جعفری لگی ہے۔ روشنی کیے بغیر وہاں سے باہر دیکھو گے تو باہر والے تمھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ بابا آپ چلے جائیں ان کے ساتھ۔"

"ہاں، آؤ بیٹے! میں لے چلتا ہوں تمھیں جعفری میں۔" باباجی نے ربانی کی بات سن کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

انور کمال اس کے پیچھے چلا تو میں نے اس سے کہا "اگر شرافت علی وغیرہ ہوں تو انھیں اپنے ساتھ یہیں لے آنا مگر خیال رکھنا اُدھر ساتھ والے مکان سے کوئی جھانکتا نہ ہو باہر۔ بلکہ تم باہر جانے کے بجائے باباجی کو باہر بھیج کر بلا لینا انھیں۔"

اس کے جانے کے بعد ربانی کی بیوی بولی "یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو یہاں کیوں بلایا ہے آپ نے؟"

"یہ بہت ضروری ہے بی بی! اگر ہم باہر نکلے تو آنرک وغیرہ ہوشیار ہو جائیں گے۔ میں نے اُدھر تمھاری چھت پر سے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آتے ہوئے دیکھا تھا کہ برابر والے مکان کی اوپری منزل پر جو گیلری سی ہے وہ اس چھت کے بالکل ساتھ ہے۔ ہم اُدھر سے کسی دشواری کے بغیر اس مکان میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بے خبری میں ان پر جا پڑیں گے تو کوئی بچ کر نہیں جا سکے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے تو کیا اب آپ لوگ خون خرابہ کریں گے یہاں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ قانون شکنی نہیں کریں آپ۔۔!"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اس کی تو فکر نہ کر بی بی! یہ بات میرے لیے نئی نہیں ہے بڑے بندے مارے ہیں ان کے اور اپنے پیاروں کو قربان بھی ہوتے دیکھا ہے۔ اسے خون خرابہ کہہ کر توقیر نہ گھٹا ان کی۔ یہ تو جہاد ہے بی بی جہاد، اس میں مر کر ہم شہید کہلائیں گے مردہ نہیں۔"

اسی وقت انور کمال واپس آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے شرافت علی، فاطمہ، آسیہ اور خان بھی تھے اور چاروں پوری طرح مسلح تھے۔

فاطمہ نے آتے ہی کہا "آپ ٹھیک تو ہیں نا جناب عالی! کیا یہ صحیح ہے کہ ہمارے جانے کے بعد آنرک نے دو غنڈوں کے ساتھ آپ کو آگھیرا تھا؟"

"ہاں، ان دونوں کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے اور اب ہم چل کر اس کتے کا بھی قصہ پاک کر دیتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا تم نے یہ پتا کر لیا ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟" شرافت علی نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"ہاں، وہ برابر والے مکان میں موجود ہے۔" میں نے اُسے بتایا "ہم اس مکان کی چھت پر سے اس گھر میں گھس سکتے ہیں۔"

"آپ نے ان لوگوں سے تعارف نہیں کرایا جناب عالی! یہ کون لوگ ہیں جن کے مکان میں آپ موجود ہیں اس ت؟" فاطمہ نے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے آتے ہی سوالات کی دھار پہ رکھ لیا مجھے۔ مہلت ہی کہاں دی تعارف انے کی۔"

میں نے ربانی، باباجی اور ربانی کی بیوی سے ان سب تعارف کرایا۔ ربانی بولا "ان سب سے تو تم نے ہمارا تعارف دیا لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں جود ہو مگر اپنا تعارف اب تک نہیں کرایا ہے تم نے۔"

"اوہ، اس کا تو خیال ہی نہیں آیا مجھے۔" میں نے کہا اور پنا تعارف بھی کرا دیا ان تینوں سے۔

ربانی میرا نام سن کر بولا "تم وہ لاہور والے غلام جیلانی نہیں ہو کہیں۔ جس کا ذکر گزشتہ دنوں اخبارات میں بہت رہا ہے۔ اور ایک موقع پر تو کئی بڑے اخباروں نے ریے بھی لکھے تھے اس کے بارے میں۔"

میرے بولنے سے پہلے ہی خان بول پڑا "بالکل ٹھیک چانا ہے تم نے۔ یہ وہی مشہور و معروف غلام جیلانی ہیں۔ ر یہ آسیہ ان کی بہن ہیں۔ انھی کو پولیس سے چھڑایا تھا انھوں جس پر اخباروں نے اداریے لکھے تھے۔"

ربانی کی بیوی محبت سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے بولی "ہائے تنی پیاری لڑکی کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ ذرا بھی رحم نہیں آیا نھیں اس بچی پر۔ یہ ایسی پیاری صورت جیلوں میں بند کرنے لیے ہے کوئی۔ کیا ہوا تھا، کیوں پکڑا تھا پولیس نے انھیں؟"

ربانی بولا "انھیں دیکھ کر یقین نہیں آتا ایسی نازک اندام کی قتل اور ڈاکے جیسے سنگین جرم کر سکتی ہے۔"

آسیہ ہنس کر بولی "آپ لوگ حیران نہ ہوں۔ وقت بڑی ظالم شے ہے، یہ ایسے ایسے لوگوں سے وہ وہ کام کرا لیتا ہے جن کا عام حالات میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کالج کے زمانے میں ایک چوہا بھی نہیں مارا جاتا تھا مجھ سے۔ چیونٹی بھی اگر مر جاتی تھی میرے پاؤں کے نیچے آ کے تو میرا دل اداس ہو جاتا تھا اور گھنٹوں افسوس کرتی رہتی تھی میں۔ اب آدمی کو مار ر ذرا افسوس نہیں ہوتا مجھے۔"

"ہاں بیٹیا! تم ٹھیک کہتی ہو۔ وقت انسان کو پتھر بنا دیتا ہے۔ یہ بات وہی جانتا ہے جس پہ گزرتی ہے کہ وہ انسان سے درندہ کیسے بن گیا۔ کوئی جان بوجھ کر اس راہ پر نہیں چلتا۔ وقت اور حالات اسے ڈھکیلتے ہیں درندگی کی راہ پر۔" باباجی نے کہا۔

ربانی بولا "وہ تمھارے ساتھ ایک اور نام بھی پڑھا ہے میں نے اکثر اخباروں میں، اسلم آپی۔ اخباروں کے مطابق تو تم دونوں ہمیشہ ہر جگہ ساتھ ہوتے ہو، مگر اس وقت اسلم آپی نہیں ہے تمھارے ساتھ۔ کیا اس جہاد کے موقع پر وہ تم سے الگ ہو گیا ہے؟"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے بھائی ربانی! وہ تو میرا بڑا جگری یار تھا۔ میرے پسینے کی جگہ اپنا خون گرایا ہے اس نے۔ اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچ یار! بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے۔ وہ تو اس جہاد میں شریک ہو کر ابدی حیات پا چکا ہے، شہادت کا درجہ حاصل کر لیا ہے اس نے۔ اسی ذلیل یہودی آنرک کے ساتھ معرکے میں یہ مقام حاصل ہوا ہے اسے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

فاطمہ جلدی سے بولی "چھوڑیں جناب عالی! آئیں اُدھر چلیں اس آنرک کی طرف۔ ہمیں بتائیں کدھر چلنا ہے اور کس کو کیا کرنا ہے؟"

میں نے انور کمال سے کہا "تم ادھر ہی رہو اور ان لوگوں کا خیال رکھو، ان کی حفاظت کی ذمے داری تمھاری ہے۔ آپریشن کے دوران ان میں سے کوئی اِدھر آکر انھیں پریشان کرنے کی کوشش کرے تو بے جھجک گولی مار دینا۔ یہ بھی خیال رکھنا کوئی نکل کر جانے نہ پائے اس طرف سے۔"

انور کمال نے اپنا ریوالور نکالتے ہوئے کہا "آپ بالکل مطمئن ہو جائیں جو بھی اِدھر آئے گا زندہ نہیں جائے گا بچ کے۔"

میں نے بقیہ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر میں نے شرافت علی سے کہا۔ "تم سب لوگ ادھر زینے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں، میدان صاف ہوا تو اشارہ دے دوں گا، تم لوگ بھی اوپر آ جانا لیکن بہت محتاط انداز میں، کسی کے بھی قدموں کی ہلکی سی آہٹ تک نہیں ہونا چاہیے۔ وہ لوگ غافل نہیں ہوں گے ہماری طرف سے۔"

میں گربہ قدم اوپر پہنچا، زینے کے ساتھ اس مکان کی گیلری تھی جس کا رخ آنگن کی طرف تھا۔ اس کے گرد گرل لگی ہوئی تھی جو تین فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے گرل پکڑ کر گیلری میں نظر دوڑائی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور ان کے ساتھ ہی نیچے جانے کا زینہ تھا۔ اس کے بعد ایک کمرے کی کھڑکی اور اس سے کوئی دو فٹ آگے دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس دروازے سے کچھ آگے ایک اور کمرے کا دروازہ تھا۔ اس کے آس پاس کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ دونوں دروازے اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ دروازوں میں فرش تک پردے لٹکے ہوتے تھے اور دوسرے

دروازے کے پردے کے پیچھے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک گیلری اس مکان کے سامنے کی طرف بھی تھی۔ اِدھر کا جائزہ لینے کے بعد میں اُدھر گیا۔ ادھر بھی بالکل صحن والی گیلری کی طرح ہی تھا سب کچھ البتہ اس طرف نیچے یا اوپر جانے کے لیے کوئی زینہ وغیرہ نہیں تھا اور کمروں کی کھڑکیاں بھی چار دکھائی دے رہی تھیں اس طرف۔ اور ادھر کے کسی بھی دروازے یا کھڑکی میں روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ادھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھے۔ میں نے واپس پلٹ کر نیچے شرافت علی کے پاس جا کے اس سے کہا۔ ”اوپر ایک کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ شاید وہ لوگ وہیں جمع ہیں۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر تم نیچے جا کر دیکھو اگر وہاں کوئی ہو تو اسے قابو کر لینا۔ بلکہ بے دریغ گولی ہی مار دینا سالے کو۔ اور خان! تم اوپر جا کر چھت پر دیکھنا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک شخص کو دیکھا تھا لہٰذا تمھیں وہاں جو کوئی دکھائی دے تم اُسے وہیں ختم کر دینا۔ کوشش سب لوگ یہی کرنا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور استعمال کیے جائیں۔ اسٹین گنیں ناگزیر حالات میں استعمال کرنا۔ یہ متوسط طبقے کے لوگوں کی بستی ہے، گولی کی آواز سے دور دور تک کے لوگ بیدار ہو کر گھروں سے نکل آئیں گے۔ ایسے میں یہاں سے نکلنے کے لیے خواہ مخواہ بے گناہ شہریوں کا خون بہانا پڑے گا ہمیں۔ تم لوگ جاؤ، تمھارے بعد میں، آسیہ اور فاطمہ کے ساتھ اس روشن کمرے کی طرف جاؤں گا۔“

شرافت علی اور خان سائیلنسر چڑھے ریوالور ہاتھوں میں سنبھال کر بے آواز چلتے ہوئے اوپر جا کر باری باری گیلری پر سے گزر کر دوسری طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے کوئی آدھے منٹ بعد میں آگے بڑھا۔ آسیہ اور فاطمہ بھی ریوالور سنبھالے میرے ساتھ تھیں۔ ہم تینوں گرل کے پاس پہنچے تو میری نظر سیدھی پہلے کمرے کے دروازے پر جا پڑی۔ اس پر پڑا ہوا پردہ بہت آہستگی سے ایک طرف سرک رہا تھا۔ میں پردے کو سرکتے دیکھ کر ایک دیوار سے چپک گیا اور فاطمہ اور آسیہ کو بھی ہاتھ کے اشارے سے دیوار کے ساتھ لگ جانے کو کہا۔ وہ دونوں بھی میری تقلید میں دیوار کے ساتھ لگ گئیں۔ خان اور شرافت علی کو آگے بھیج کر نصف منٹ کا جو وقفہ دیا تھا میں نے، وہی اس گھڑی کام آ گیا تھا میرے۔ شاید ان لوگوں نے خطرے کی بُو محسوس کر لی تھی اور آہٹوں پر کان دھرے بیٹھے تھے۔ خان اور شرافت علی بالکل بے آواز اترے تھے اُدھر، اس کے باوجود کسی کے کانوں نے ان کی آمد کا اعلان سن لیا تھا! اور اب ان میں سے کوئی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے بعد میں نے دوبارہ احتیاط سے ادھر جھانکا۔ وہ شخص اب پردے سے باہر آ چکا تھا! اور پنجوں کے بل بے آواز چلتا ہوا اس روشن کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اپنا [illegible] اوپر اٹھا کر اس کی پشت کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ مگر عین اس لمحے جب میں نے لبلبی پر دباؤ ڈالا، ایک اور شخص پردہ اٹھا کر باہر نکل آیا اور میری چلائی ہوئی گولی آگے جانے والے کے بجائے اس کے بدن میں گھس گئی۔ وہ کراہ کر تیزی سے پلٹا اور دوسرے ہی لمحے دوبارہ کمرے میں گھس گیا۔ اس کی کراہ سن کر آگے جانے والا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے مڑا تھا مگر میں نے اسے کچھ سمجھنے کی مہلت نہیں دی اور فوراً ہی لبلبی دبا کر دوسری گولی چلا دی۔ اس بار میری چلائی ہوئی گولی کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا لہٰذا وہ سیدھی جا کر اس کے پیٹ میں دھنس گئی تھی۔ وہ زوردار آواز میں کراہ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام کے نیچے بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے کراہنے کی آوازیں سن کر روشن کمرے کے دروازے سے ریوالور ہاتھ میں لیے آتزک نمودار ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنے ریوالور کی لبلبی دبائی مگر اس سے پہلے کہ ریوالور کی نال سے گولی نکلتی وہ تشویش ناک انداز میں، کیا ہوا، کیا ہوا کہتا ہوا اس شخص کے قریب بیٹھ چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری چلائی ہوئی گولی سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی۔ گولی کی سنسناہٹ نے اسے ایک پل میں سب کچھ سمجھا دیا تھا چنانچہ وہ تیزی سے فرش پر گرا اور لوٹ لگا کر جس دروازے سے برآمد ہوا تھا، دوبارہ وہیں جا گھسا۔ اسی وقت مجھے اپنے قریب سے کھٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے پہلے کمرے کے پردے کے پیچھے سے کراہ کی آواز کے ساتھ کوئی شخص کٹے ہوئے درخت کی طرح باہر آ کر گرا، اور ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ آسیہ تھی۔ اس نے پردے کے پیچھے کسی حرکت محسوس ہوتے ہی گولی چلا دی تھی جو بالکل ٹھیک نشانے پر جا کر لگی تھی۔ میں آسیہ کی طرف ہی متوجہ تھا کہ اس نے دوسری گولی چلا دی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا، مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتا، وہ گرل پکڑ کر اچھلی اور دوسرے ہی لمحے گیلری میں جا پہنچی۔ ادھر جاتے ہی وہ نیچے جانے والے زینے کے ساتھ دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے فاطمہ کو دیکھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سائیلنسر چڑھے ہوئے ریوالور تھامے، اور ان کا رُخ گیلری میں کھلنے والے دروازوں کی طرف کیے کھڑی تھی۔ اس نے تیز سرگوشی میں آسیہ سے کہا۔ ”دیوار سے لگے لگے آگے بڑھتی رہو، میں دیکھ رہی ہوں۔

کسی نے بھی تم پر گولی چلانے کی کوشش کی تو میں گولی مار دوں گی اسے۔“

آسیہ نے اپنا ریوالور والا ہاتھ آگے کیا اور بہت چوکنا انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ میں نے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو، کوئی بھی اچانک کسی دروازے سے نکل کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتا ہے۔ اسے اس طرح آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔“

”اس سے پہلے ہی میں ایسی کوئی حرکت کرنے والے کو گولی مار دوں گی۔ آپ خاموش رہیں، باتیں کر کے میری توجہ نہ ہٹائیں ادھر سے۔“ وہ بولی۔

میں نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی اور گرل پکڑ کر تیزی سے اس پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ جس کے پیٹ میں میری چلائی ہوئی گولی لگی تھی، وہ اب فرش پر گرا پڑا تھا اور یا تو بے ہوش ہو گیا تھا یا جان سے ہی گزر گیا تھا شاید۔ آسیہ اس کے قریب سے گزر کر روشن کمرے کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم جست لگا کے دروازے کے سامنے سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔ دوسری طرف پہنچ کر وہ دروازے کے بالکل ساتھ دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت تک میں بھی دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں دم سادھ کر اندر سے کسی بھی قسم کی آہٹ سننے کی کوشش کرتے رہے، مگر اندر مکمل سناٹا تھا، کسی بھی طرح کی کوئی ہلکی سی آواز بھی سنائی نہیں دے سکی تھی۔ چند ثانیے بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ آتزک سامنے والی گیلری میں نکل کر نیچے نہ اتر گیا ہو کسی طرح۔ ادھر بھی ایسی ہی مضبوط لوہے کی گرل تھی، جس میں رسّی باندھ کر آسانی سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے کمرے میں گھسنے کے لیے قدم آگے بڑھایا لیکن اس نے تیزی سے اپنی ٹانگ آگے کر کے مجھے روک دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے اشارے سے مجھے سمجھایا کہ یوں ایک دم اندر گھس پڑنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اگر وہ اندر کہیں چھپا بیٹھا ہے تو اس کے ریوالور کا رُخ دروازے کی جانب ہو گا تاکہ جیسے ہی ہم میں سے کوئی شخص اندر داخل ہو، اس کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ اس کی بات خاصی معقول تھی، یہ تو خود مجھے بھی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ آتزک جیسا شاطر اور مکار آدمی کمرے کے کسی کونے کھدرے میں نہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ مگر اس گھڑی اس کے نکل جانے کے خیال نے مجھے مضطرب کر دیا تھا اور ہر بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ ساری کی ساری مصلحتیں اور احتیاطیں بھلا بیٹھا تھا میں اس گھڑی اور اگر آسیہ روک نہ لیتی مجھے تو میں نے موت کی وادی میں قدم دھر ہی دیا تھا۔ آسیہ کے روکنے پر میں ذرا ٹھٹکا، پھر آسیہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے تم یہیں رکو، میں اُدھر سامنے کی طرف دیکھتا ہوں جا کر۔“

میں تیزی سے پلٹ کر بھاگا اور گرل پر چڑھ کر دوبارہ اس چھت پر جا اترا۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، واپس کیوں آ گئے آپ؟“

میں نے کہا۔ ”وہ ادھر سامنے والی گیلری.... وہ ادھر سے نکل سکتا ہے..“

میں نے اسے سرسری انداز میں بتایا اور بھاگتا ہوا اُدھر چلا گیا جدھر سے اس گیلری میں اترا جا سکتا تھا۔ میں بہت ہی بروقت پہنچا تھا وہاں۔ آتزک ایک اور شخص کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ شاید بیڈ شیٹ کو رسّی کے بجائے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بیڈ شیٹ کا ایک سرا گرل میں باندھ کر بیڈ شیٹ کو نیچے لٹکا دیا تھا اور اس وقت آتزک گرل پر چڑھ رہا تھا۔ ان دونوں کی پوری توجہ کمرے کے دروازے کی طرف تھی جسے انھوں نے باہر سے بند کر رکھا تھا۔ پھر انھیں ہمارے ادھر سے آ جانے کا خدشہ تھا، دوسرا شخص ریوالور لیے دروازے پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور آتزک کی نظریں بھی گرل پر چڑھتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اسے ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی، فوراً ریوالور سیدھا کر کے گولی چلا دی۔ گولی اس کی ران میں دھنس گئی تھی اور وہ تیز سسکاری لے کر واپس گیلری میں الٹ گیا تھا۔ اس کا ساتھی اس کے گرتے ہی میری طرف مڑا مگر میں نے اس کے فائر کرنے سے پہلے ایک گولی اس کے نام کی بھی روانہ کر دی اور وہ جو سیدھی اس کے حلق میں جا اتری، اس کے منہ سے کراہ تک نہیں نکل سکی تھی۔ آتزک کی ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب وہ ادھر سے نیچے نہیں اتر سکے گا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اپنی زخمی ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا وہ کمرے میں بند ہو کر اپنی جان بچانا چاہتا تھا شاید۔ میں نے اسے بڑھتے دیکھ کر ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر کے لبلبی دبا دی مگر ریوالور سے ہلکی سی ٹھک کی آواز کے سوا کچھ نہیں نکل سکا۔ میں نے جلدی جلدی دو تین بار لبلبی کو دبایا لیکن ریوالور میں گولی تھی ہی نہیں تو نکلتی کیسے۔ اس دوران آتزک دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تھا۔ میں اسے جاتے دیکھ کر گرل کے اوپر چڑھ کر گیلری میں کود گیا اور اسی وقت آتزک کسی سے الجھا ہوا دوبارہ گیلری میں آ گرا۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ آتزک اس طرح آ کر گرا تھا ادھر کہ اس کے ساتھ دروازے میں پڑا پردہ بھی لپٹ کر آ گیا تھا۔ پردہ جھٹکے سے تقریباً پورا ہی نکل گیا تھا اپنی جگہ سے، اس کا صرف ایک کونا اوپر پھنسا

رہ گیا تھا اندر کی روشنی بھی پردہ ہٹ جانے کی وجہ سے باہر آنے لگی تھی۔ آئزک گیلری میں آکر چت گرا تھا اور وہ لڑکا جو ہمیں اُدھر دوسرے مکان میں شید ابن کر ملا تھا آئزک کے سینے پر سے آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ اس کے سر اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور جس طرح وہ اُٹھ رہا تھا اس سے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ اسے زبردست مار پڑ چکی ہے اور اس مارنے والے نے آئزک کو اندر آتے دیکھ کر اسے اٹھا کے آئزک کے اوپر پھینک دیا تھا ان دونوں کے ادھر آکر گرنے کے چند لمحے بعد ہی آسیہ دروازے میں دکھائی دی مجھے۔ اس نے آتے ہی شید کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر رسید کی۔ شید کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلاتا ہوا اچھل کر لوہے کی گرل سے ٹکرایا اور دونوں ہاتھوں سے گرل کو تھام کر اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ آسیہ نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر حقارت سے آئزک کو دیکھتے ہوئے کہا "یہودی کتے! تو سمجھتا تھا کہ ہمیشہ موت کو دھوکا دے کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہوتا رہے گا ۔ اب بھاگ کے دکھا یہاں سے میں دیکھتی ہوں تو کتنا تیز بھاگ سکتا ہے۔"

آئزک گنگیاتے ہوئے بولا "تم آخر مجھے کیوں مارنا چاہتی ہو کیا ملے گا تم لوگوں کو مجھے مار کر۔ تمھارے ملک میں جتنے سنگین الزامات ہیں تم پر، مجھے مارنے کے بعد بھی تم دونوں بہن بھائی ان الزامات سے بری نہیں ہو سکو گے۔ میرا ساتھ دو، میں تمھیں ہر الزام سے نہ صرف بری کرادوں گا بلکہ بے شمار دولت دے کر تم دونوں کو یورپ کے جس ملک کو تم پسند کرو گے وہاں کی شہریت بھی دلوا دوں گا زندگی بھر عیش سے رہنا وہاں، کوئی انگلی نہیں اٹھا سکے گا تمھاری طرف ... میری بات مانو، ہم سے دوستی کر لو بہت فائدے میں رہو گے۔"

"موت کو سامنے دیکھ کر دوستی کرنے کا خیال آیا ہے تجھے۔ بزدل، مکار! چالاکی دکھانا چاہتا ہے مجھے۔" آسیہ غصے سے بولی۔

"مجھے غلط مت سمجھو آسیہ! میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جیلانی کی ناراضگی دور کر کے اس کے ساتھ دوستی دوبارہ بحال کر لی جائے۔ مجھے اگر اس کی ضرورت نہ ہوتی تو جتنا نقصان اس نے پہنچایا ہمیں اب تک اس کے بعد تو کوئی رعایت کی ہی نہیں جا سکتی اس کے ساتھ۔ اور اسے راستے سے ہٹانا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا میرے ایک اشارے پر اس کا جسم کہیں بھی گولیوں سے چھلنی کر کے ڈال دیا جاتا، اس کی کار کو بموں سے اڑا کر اسے ختم کر دیا جاتا، اس مکان کو جس میں تم لوگ جمع رہتے ... تجھے ملبے کا ڈھیر بنا کر تم سب کو دفن کر دیا جاتا اس ملبے کے ڈھیر میں۔ یہ کام یعنی ہم اگر تم لوگوں کو مارنا چاہتے تو کسی بھی وقت کر سکتے تھے۔ مگر

ہم نے اتنا نقصان برداشت کرنے کے بعد بھی تم لوگوں کو دوست بنانے کی خواہش ترک نہیں کی۔ ورنہ جس طرح شرافت علی کا خاندان ختم ہوا، جس طرح اس کی نسلیں تک مٹا ڈالیں ہم نے جیلانی کے ساتھ بھی یہی سب کچھ کر سکتے تھے۔ کون روک سکتا تھا ہمیں اس سے ...!"

"لیکن تم نے بھائی جان کی دوستی حاصل کرنے کے لیے اتنی قربانی کیوں دی ہے۔ ایسی کیا بات ہے ان میں؟" آسیہ نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتیں آسیہ! جیلانی جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اس شخص میں۔ یہ تمھارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ اس کی صلاحیتیں ملک کے مفاد میں استعمال کرنے کے بجائے اسے دولت کی بھینٹ چڑھا کر غلط راستے کی طرف موڑ دیا گیا۔ زندہ اور زمانہ شناس قومیں اپنے باصلاحیت نوجوانوں کو یوں ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ یہ تو سب سے بڑا، سب سے قیمتی بلکہ انمول خزانہ ہوتے ہیں، ملک و قوم کا۔ جنھیں تمھارے یہاں سکوں میں تول کر کچرے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ مجھے اگر یہ پتا چل جاتا کہ جیلانی ہم سے کیوں ناراض ہوا ہے، اس نے کس وجہ سے ہم سے دوستی کا ناتا توڑ کر دشمنی کا راستہ استوار کیا ہے تو میں کبھی کا اسے منا چکا ہوتا، اس کی ہر شکایت، ساری غلط فہمی دور کر دیتا، مگر افسوس تو اسی بات کا ہے کہ مجھے اس کی ناراضگی کا سبب معلوم نہیں ہے۔" آئزک نے عاجزی سے کہا "تم سمجھاؤ اسے، ہم سے دوستی کر کے بہت فائدے میں رہے گا، دشمنی ہماری اسے راس نہیں آ سکے گی۔ بے شک تم لوگ مجھے مار سکتے ہو، میں تمھارے بس میں ہوں ... لیکن اگر تنظیم نے تمھاری طرف سے مایوس ہو کر تمھارے خلاف فیصلہ دے دیا تو زمین تنگ ہو جائے گی تم لوگوں کے لیے، اس پوری دنیا میں جائے پناہ نہیں مل سکے گی تم کو، جیلانی کو پتا ہے اس بات کا۔"

"ہماری تم پروا نہیں کرو، ہمارے لیے تو یوں بھی اب کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے تیری اس دنیا میں۔ میرے ملک کے لوگوں کو اگر کچھ دن کے لیے بھی تجھ جیسے خبیث سے نجات مل جائے تو میں اسے بھی بہت سمجھوں گا۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا اور آسیہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا "آسیہ اپنا ریوالور دے مجھے تاکہ میں اس کا ٹکا سا کر کے یہ قصہ ختم کر دوں۔ میرے ریوالور میں گولیاں نہیں رہی ہیں۔"

"نہیں بھائی جان! اس کی جان اتنی آسانی سے تو نہیں نکلے گی۔ اسے تو میں اسی طرح تڑپا تڑپا کر مارنا ہے جیسے تڑپ تڑپ کر آپ نے جان دی تھی۔ جیسے کل زمان کی جان نکلی تھی ...

خون میں لوٹ لوٹ کر، سسک سسک کر۔“ آسیہ نے حقارت سے کہا۔

اس دوران آئزک کی ٹانگ کے زخم سے خون اچھی خاصی مقدار میں ضائع ہوگیا تھا اور اس پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی، چہرے پر اس کے ہلدی پھری ہوئی لگنے لگی تھی۔ آسیہ نے جھک کر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے چلی۔ میں نے پہلے جھک کر اس جعلی شیدے کو دیکھا جو گرل کے ساتھ لگا بے سدھ پڑا تھا اب تک۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا مزید مار سے بچنے کے لیے مکر کیے پڑا تھا۔ اس کے بعد میں اس شخص کی طرف متوجہ ہوا جسے میں نے آئزک کے ساتھ گولی ماری تھی۔ وہ اس جہاں کے سارے غموں سے آزاد ہو چکا تھا۔ ریوالور اس کا اس کے پاس ہی پڑا تھا اُس پر بھی سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کا چیمبر کھول کر دیکھا، وہ گولیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک بھی گولی نہیں چلائی گئی تھی اس سے۔ میں ریوالور ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں پھر شیدے کی طرف پلٹا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری حرکات کا جائزہ لیتا رہا ہو اور مجھے اپنی طرف پلٹتے دیکھ کر اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لی ہوں۔ میں نے ایک لمحے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کہیں میرا فریبِ نظر نہ ہو، پھر آگے بڑھ کر اس کے سر میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”او ئے اُٹھ جا، اب زیادہ مکر نہ کر مجھ سے۔ پتا ہے مجھے تو مرا نہیں ہے ابھی۔“

ٹھوکر لگتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکل گئی اور اس نے آنکھیں کھول کر میرے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”مم... مم... معاف کر دو بڑے بھائی!... میں... میں.... میں نے کچھ نہیں کیا ہے..“

”جب تو نے کیا کچھ نہیں ہے تو معافی کس بات کی مانگ رہا ہے تو؟ چل اٹھ ادھر سے اندر چل کمرے میں۔“ میں نے کہا۔

وہ اُٹھ کر سہما ہوا سا میرے آگے آگے چلتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں مائی باپ میں نے... دیکھو میں تمھیں سب کچھ سچ بتا دوں گا جو کچھ مجھے معلوم ہے۔ ایک بات... نہیں چھپاؤں گا میں... تم... تم مارو گے تو نہیں نہ مجھے؟“

”بکواس نہیں کراوئے چوہڑے، زبان بند رکھ کے چل نہیں تو کھوپڑی میں ہول بنا دوں گا سالے کی۔“ میں نے اسے آگے دھکا دے کر کہا۔

آسیہ اس ذلیل یہودی آئزک کو ٹانگ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گئی تھی۔ آئزک میں اب مزاحمت کی قوت بالکل بھی نہیں رہی تھی، وہ کسی بے جان شے کی طرح زمین پر گھسٹتا چلا گیا تھا۔ اس طرح کھینچے جانے سے جو تکلیف ہو رہی تھی اسے اس کی وجہ سے اُس کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔ آسیہ کا دل ایسا پتھر ہو چکا تھا کہ اسے آئزک پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا اس نے اس کو گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں ڈال دیا۔

عین اسی لمحے عقبی برآمدے سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اور آسیہ نے پھرتی سے اپنے اپنے ریوالور سیدھے کر لیے مگر آنے والوں کو دیکھ کر ہمارے ریوالور نیچے جھک گئے۔ وہ شرافت علی اور فاطمہ تھے۔ ان دونوں کی کمرے میں گھستے ہی نظر آئزک پر گئی جو کمرے کے بیچوں بیچ فرش پر بے دم سا پڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں ٹھٹک کر یوں رک گئے جیسے انھوں نے کوئی عجیب اور غیر متوقع چیز دیکھ لی ہو۔ آسیہ نے انھیں رکتے دیکھ کر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں، یہ اب کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

میں نے شرافت علی سے پوچھا۔ ”تم کو تو میں نے نیچے بھیجا تھا شرافت علی! کیا وہاں کوئی نہیں ہے؟“

”دو آدمی تھے نیچے اور ایک کوئی پینتیس چالیس سالہ عورت تھی۔ ہم نے ان تینوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ ایک شخص اوپر چھت پر چڑھا دوربین سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا، اُسے خان نے وہیں گولی مار دی ہے۔“ شرافت علی جواب دے کر بولا۔ ”اور یہ تم دونوں نے اس یہودی کی اولاد کو قابو کر ہی لیا ہے تو اسے زندہ کیوں رکھا گیا ہے اب تک؟“

”اس لیے کہ موت اس کے جرائم کی مناسب سزا نہیں ہے۔ میں اسے اس کے جرائم کی مناسب اور معقول سزا دینا چاہتی ہوں۔“ آسیہ نے اُسے جواب دے کر کہا۔ ”کوئی چاقو تلاش کرو فاطمہ یہاں۔ ہم اس کی بوٹیاں بنائیں گے۔“

”ہاں، تجویز اچھی ہے تمھاری لیکن میرا خیال ہے اس کام کے لیے اسے پیچھے لے چلو، یہاں تو اس کے ڈکرانے کی آوازیں دُور دُور تک جائیں گی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے میں زیادہ دیر نہیں رہی ہے۔ پوری طرح اُجالا پھیلنے سے پہلے نکل چلنا ہے یہاں سے ہمیں۔ اور پچھلی گلی میں پولیس کی موجودگی کا بھی خیال رکھنا ہے اس کی بوٹیاں بناتے ہوئے۔“ شرافت علی نے کہا۔

میں نے آسیہ سے کہا۔ ”چھوڑو بھئی آسیہ! لعنت بھیج اس کتے پر، اس طرح تو ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔ یوں کرو اس کے منہ پر پٹی باندھ دو اور ہاتھ پاؤں باندھ کے گاڑی میں ڈال لو، اپنے ساتھ ہی لے چلو اسے۔ پھر جو چاہے کرتے رہنا اس کے ساتھ۔“

یہ تجویز سب کو پسند آئی چنانچہ جلدی جلدی آئزک کو باندھ کر نیچے لے جا کے کار کی ڈکی میں ڈال دیا گیا۔ وہاں موجود اس کے سارے ساتھی پہلے ہی مارے جا چکے تھے، ایک وہ جعلی شیدا بچا تھا میں

تو اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر شرافت علی نے کہا۔ ”نہیں یار! یہ خواہ مخواہ کی مصیبت ساتھ نہ لگاؤ، ان سپنولیوں کو ساتھ لیے پھرنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کو ادھر ہی ڈال جاؤ بس۔“

اس نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر کے اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر گولی اُتار دی۔ اور پھر اس کے ٹھنڈا ہوتے کا انتظار کیے بغیر وہاں سے نکل آئے ہم۔ انور کمال کو آسیہ بلا کر پہلے ہی لے آئی تھی۔ ربانی اور اس کے گھر کے دیگر افراد کو انھوں نے سمجھا دیا تھا کہ پولیس ان سے پوچھ گچھ کرنے آئے تو وہ صاف صاف بتا دیں اسے کہ یہ قتلِ عام غلام جیلانی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم لوگ انھیں ریوالور دکھا کر بے بس کر دینے کے بعد انہی کی طرف سے اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ البتہ وہاں مارے جانے والے سبھی لوگوں کی وہاں موجودگی سے لاعلمی ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے دفاع میں وہ جو بھی مناسب سمجھیں بیان دے دیں، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی ان سے۔

گھر پہنچ کر آئزک کو کار کی ڈکی کھول کر باہر نکالا تو اس کی سانس اکھڑ چکی تھی اور نبضیں اس کی ڈوبنے لگی تھیں۔ اس کی ران کے زخم سے خون اب بہنے کے بجائے رِس رہا تھا۔ خان نے ڈکی سے خون گرنے سے روکنے کے لیے وہیں سے روئی کا ایک گدا اُٹھا کر ڈکی میں ڈال دیا تھا اور آئزک کو اس گدے پر ڈالنے کی وجہ سے خون ڈکی سے باہر نہیں ٹپکا تھا، اس گدے ہی میں جذب ہوتا رہا تھا لیکن کسی نے بھی اس کے زخم سے بہتے ہوئے خون کو روکنے یا زخم کو دیکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی جس کی وجہ سے تمام وقت اس زخم سے خون پوری رفتار کے ساتھ بہتا رہا تھا اور ڈکی میں بند ہونے کی وجہ سے اُسے ہوا بھی پوری طرح نہیں مل سکی تھی۔ بدن کا سارا خون بہہ جانے اور ہوا نہ ملنے کی وجہ سے آئزک کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ قریب المرگ تھا بالکل۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا۔ ”اس کے اندر تو اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے یارو! یہ تو مر رہا ہے اب۔“

فاطمہ بولی۔ ”اس کی حالت پر نہ جائیں جنابِ عالی! یہ حبسِ دم کا ماہر ہے۔ اس طرح سانس روک لیتا ہے کہ نبض نہیں ملتی کبھی کبھی تو۔“

”مگر بی بی! سانس روکنے کے لیے جسم میں طاقت اور توانائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی بڑی مقدار میں اس کے بدن سے خون بہہ چکا ہے اس کے بعد حبسِ دم کا تو مطلب تک یاد نہیں رہا ہوگا اسے۔ دیکھو اب تو زخم سے خون بوند بوند ہی نکل رہا ہے۔ سارا خون بہہ چکا ہے اس کا۔ جس آدمی کے بدن میں خون ہی نہ رہے اس میں جان کہاں رہ سکتی ہے۔“ میں نے آئزک کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

آسیہ بولی۔ ”یہ تو ٹھیک نہیں ہوا ہے... تو اسے سسکا سسکا کر مارنا چاہتی تھی مگر آپ لوگوں کی بے پروائی نے اس کی ساری مشکل آسان کر دی ہے۔“

”مشکل کہاں آسان ہوتی ہے اس کی۔ اذیت سے نجات تو نہیں ملی ہے اسے۔ قدم قدم موت کی طرف بڑھ رہا ہے یہ۔ بوند بوند کر کے جان نکل رہی اس کی، کیا یہ اذیت کم ہے اس کے لیے کہ کان اس کے ہر آواز کو سن رہے اور دل و دماغ میں کچوکے لگا رہے ہیں لیکن زبان میں حرکت کرنے کی بھی سکت نہیں رہی ہے، اپنی تکلیف کا اظہار کرنے کی بھی قوت نہیں رہی ہے اس میں۔“ میں نے آسیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس حالت میں جبکہ یہ ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے اسے کوئی بھی اذیت دے کر تم اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین نہیں پہنچا سکو گی۔“

”آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں بھائی جان!“ آسیہ اداسی سے بولی۔ ”دفع کریں، لعنت بھیجیں اب اس پر اور پھنکوا دیں کسی ایسے ویرانے میں جہاں اس کی لاش کو چیل کوّے گدھ، کتّے اور دوسرے جانور نوچ نوچ کر کھا جائیں۔“

میں نے شرافت علی سے کہا۔ ”ڈلوا دے یار! اسے کسی ویرانے میں مگر اس سے پہلے یہ یقین کر لینا کہ اس کی جان بالکل نکل چکی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم فکر مت کرو، اب یہ دوبارہ کبھی کسی کے لیے بھی پریشانی کا باعث نہیں بن سکے گا۔“ شرافت علی نے جواب دیا۔

آئزک کی موت کے بعد فاطمہ نے کراچی میں تنظیم کے باغی افراد کے تعاون سے یہاں ایک ایک اہم اور تنظیم کے وفادار شخص کا تین دن میں خاتمہ کر دیا تھا اور کراچی شہر کو یہودیوں کی سازشوں سے بالکل پاک کر دیا تھا۔ تین دن اور دو راتیں غائب رہنے کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ عالیہ بھی تھی۔ عالیہ نے اس آپریشن میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ اس کے بارے میں فاطمہ ٹیلی فون پر ہمیں بتاتی رہی تھی۔ آسیہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ دھمن کی بیوی عالیہ نے دھمن سے باغی ہو کر ہمارا ساتھ دینا شروع کر دیا ہے تو اسے اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بھی دھمن اور عالیہ کی ڈسی ہوئی تھی، ان دونوں نے اس کا بھی ایک گردہ نکال کر بیچ کھایا تھا اور اب تک وہ جن جن خوفناک اور اذیت ناک قسم کے مراحل سے گزرتی رہی تھی اس کی داغ بیل انہی دونوں نے ڈالی تھی۔ چنانچہ وہ یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ عیبوں بھری عالیہ بھی اپنے سینے میں ایک ایسا دل رکھتی ہو گی

جو وطن کی محبت سے معمور ہوگا۔ میں نے بتایا تھا کہ عالیہ اب وہ عالیہ نہیں رہی ہے جس سے کبھی لاہور میں ہمارا واسطہ پڑا تھا۔ وہ اب بالکل بدل چکی ہے اور اس کے بدلنے کی وجہ بھی میں نے اسے بتا دی تھی۔ میں نے کہا تھا "آسیہ! اگر آدمی کا ضمیر بالکل ہی نہ مر گیا ہو تو وہ کسی وقت بھی دینے گناہوں سے تائب ہو کر راہِ راست اختیار کر سکتا ہے۔ عالیہ کا معاملہ بھی ایسا ہی سمجھو۔"

"ہاں، یہ آپ نے ٹھیک کہا ہے بھائی جان! لیکن وہ ڈھمن ایسا آدمی نہیں ہے جو گناہوں پر شرمندہ ہو سکے کبھی بھی۔ اس سے کبھی بھی اس کی توقع نہ کرنا آپ، اور اب میرا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمیں اپنا حساب صاف کر ہی لینا چاہیے۔" آسیہ بولی۔

"ہاں، ہاں۔ بالکل بالکل۔ فاطمہ یہاں سے فارغ ہو کر عالیہ کو اپنے ساتھ ہمارے پاس لے کر آئے گی تو ڈھمن کا پتا ٹھکانا اس سے معلوم کر لیں گے ہم اور پھر اس گردہ فروش، بے ضمیر ایمان فروش پر جا پڑیں گے اپنے ان دوستوں کے ساتھ۔ اب ہم بھی ایک مضبوط اور ناقابلِ تسخیر ٹیم رکھتے ہیں اپنے ساتھ۔ آٹزک جیسے موذی کو جس نے جہنم واصل کر دیا ہے، اللہ نے چاہا تو ڈھمن کا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اس بار وہ بھاگ نہیں سکے گا یہاں سے۔" میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

عالیہ جب فاطمہ کے ساتھ آئی اور اس کا سامنا آسیہ سے ہوا تو وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی اور رقت آمیز لہجے میں بولی "آسیہ! میں تمھاری گناہ گار ہوں، بڑا ظلم کیا ہے میں نے تم پر۔ تمھاری زندگی میں انگارے بھرنے کی ذمے دار میں ہوں، میں نے ڈھمن کی محبت میں خسارے کے بہت سے سودے کیے ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے معاف کر دیا جائے اور نہ ہی میرے گناہ ایسے ہیں کہ انھیں درگزر کر دیا جائے۔ پھر بھی میں تم سے معافی کی خواستگار ہوں۔ لیکن یہ تمھاری مرضی ہے اگر چاہو تو معاف کر دو، ورنہ جو دل چاہے سزا دے لو مجھے۔ میں تمھارے ہر فیصلے کو خندہ پیشانی سے قبول کر لوں گی۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو آسیہ اس کی ندامت اور شرمساری کی پروا کیے بغیر اس کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دیتی۔ لیکن میں چونکہ اسے پہلے ہی عالیہ کی بدلی ہوئی شخصیت کے بارے میں بتا چکا تھا اور اس نے جو تعاون کیا تھا ہمارے ساتھ، اس کے بارے میں بھی جانتی تھی وہ۔

چنانچہ عالیہ کو اس طرح اپنے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے نادم اور شرمسار سر جھکائے کھڑا دیکھ کر وہ بے تابی سے آگے بڑھی اور بے اختیار عالیہ کو اپنے سینے سے لگا کر بولی "اوہ، عالیہ! میری بہن، بھول جاؤ ان پرانی باتوں کو۔ یہ سمجھو کہ وہ جو کچھ ہوا مقدر تھا وہ ہمارا۔ لکھ دیا گیا تھا وہ ہمارے نام میں۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تمھیں اپنے گناہوں کا احساس بہت جلد ہوگیا اور تمھیں توبہ کرنے کا موقع میسر آگیا۔"

آسیہ کی یہ والہانہ محبت دیکھ کر عالیہ کا دل بھر آیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ آسیہ کے شانے پر سر ٹکا کر سسکنے لگی۔ آسیہ نے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر تسلیاں دینے اور اسے چپ کرانے کی جس قدر کوشش کی اسی قدر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ امنڈ کر آتا رہا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں تو آسیہ نے اسے محبت سے سہارا دے کر صوفے پر لے جا کر بٹھا دیا۔

فاطمہ بولی "میں تو عالیہ کو بہت ہی سخت دل اور بہادر عورت سمجھتی تھی آج تک مگر آج تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ سارا بھرم کھو دیا اپنا۔"

"محبت میں آگ سے کئی گنا زیادہ حرارت ہوتی ہے۔ اس کے قریب جاتے ہی سخت سے سخت انسان موم کی طرح پگھلنے لگتا ہے۔ ہاں اگر کسی نے اپنے اوپر اسٹین لیس اسٹیل کا خول چڑھا رکھا ہو تو دوسری بات ہے۔" آسیہ نے محبت سے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اس سے ایک بات تو معلوم ہوگئی کہ عالیہ بیگم نے اپنے دل پر اسٹین لیس اسٹیل کا خول نہیں چڑھایا ہے۔" شرافت علی نے مزاحیہ انداز میں کہا "حالانکہ ڈاکٹر ڈھمن نے کوشش بہت کی ہوگی انھیں ہیٹ پروف بنانے کی۔ کیوں عالیہ بیگم ٹھیک کہا نا میں نے؟"

عالیہ اس کی بات سن کر روتے روتے ہنس پڑی۔ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کا تو تمھیں بھی بہت اچھی طرح تجربہ ہے شرافت علی! تم بھی تو ڈاکٹر ڈھمن کے بہت قریب رہے ہو، بلکہ اس کے خاص الخاص رہے ہو یہاں کراچی میں۔"

عالیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "انھیں اس راہ پر ڈالنے والے بھی ڈھمن ہیں۔ اس سے پہلے تو یہ ایک بہت ہی سیدھے سادے، کلرک قسم کے آدمی ہوا کرتے تھے۔ ڈھمن کی تربیت نے ہی انھیں موقع پرستی اور زمانہ شناسی کے قابل بنایا ہے۔"

میں نے کہا "عالیہ بیگم! ہم نے آٹزک جیسے موذی سے تو نجات حاصل کر لی ہے جو میری اطلاع کے مطابق ڈھمن کا بھی استاد تھا۔ ڈھمن کو گردے فروشی کے کاروبار میں ڈال کر موجودہ مقام تک پہنچانے میں نمایاں کردار اسی نے ادا کیا تھا۔ اب اس کی موت کے بعد تمھیں پتا ہے ہماری دوسری منزل کہاں ہے۔ یا یوں کہو کہ دوسرا نشانہ کون ہے ہمارا؟"

"میں جانتی ہوں جیلانی! آٹزک کے بعد دوسرا نشانہ ڈھمن ہی ہے تمھارا، اور اگر نہیں ہے تو میں کہوں گی کہ ہونا چاہیے۔" وہ بولی۔

آسیہ نے کہا "مگر کیا ڈھمن کے خلاف تم ہمارا ساتھ دے سکو گی؟ یہ تمھارے سہاگ کا بھی سوال ہے عالیہ! تم بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا جو بھی کرو۔ اور جو فیصلہ کر لو اس پر نیک نیتی سے عمل بھی کرنا۔ اس کی پروا نہ کرنا کہ ہم کیا کہیں گے یا کیا سوچیں گے۔ میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ ہم مجبور بالکل نہیں کریں گے تمھیں۔ تم چاہو تو ڈھمن کا ساتھ بھی دے سکتی ہو، غیر جانبدار بھی رہ سکتی ہو اور...."

عالیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ بولی "تم لوگ اپنے دلوں میں کسی بدگمانی کو جگہ نہ دو۔ بے شک ڈھمن میرے شوہر ہیں اور میں انھیں اسی طرح چاہتی بھی ہوں جس طرح ایک بیوی کو اپنے شوہر کو چاہنا چاہیے۔ یہ محض ان کی محبت ہی تھی جس نے ہر معاملے میں مجھے ان کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ کیا۔ آپ لوگ یقین کریں، مجھے ان انسانیت سوز معاملات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہوئے یا ان سے تعاون کرتے ہوئے کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ بس اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے بادلِ ناخواستہ ان کا ساتھ دیتی رہی ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ اب تم یہ رشتہ توڑنے کے لیے تیار ہوگئی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا جیلانی! ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کبھی۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم اس کا ساتھ بھی چھوڑنا نہیں چاہتی ہو اور اس کے خلاف ہماری مدد بھی کرنا چاہتی ہو بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ مدد کیا کرتی رہی ہو۔ وہاں سان فرانسسکو میں تم اگر میرا ساتھ نہ دیتیں تو شاید ملک کیا میری لاش بھی واپس نہ آتی یہاں۔ تم نے ڈھمن اور اس کے حواریوں کے کسی ناگہانی اقدام سے مجھے بچانے کے لیے اپنی طلسمی انگوٹھی تک مجھے دے دی تھی جو ڈھمن نے تمھاری سلامتی کے خیال سے بے شمار دولت خرچ کر کے بنوائی تھی۔ اور تمھارے تعاون ہی سے میں دوبارہ اپنے دیس کی دھرتی پر قدم رکھ سکا تھا۔ آخر تم یہ دونوں کشتیوں پر سوار کیوں رہنا چاہتی ہو۔ ایک طرف کیوں نہیں ہو جاتیں؟"

"کوئی شخص جب دو چیزوں کو یکساں انداز میں چاہتا ہو۔ دونوں سے ایک ہی جیسی محبت رکھتا ہو تو وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف کس طرح فیصلہ دے سکتا ہے جیلانی؟ میرے دل میں ڈھمن اور پاکستان دونوں کے لیے ایک ہی جیسی محبت ہے، میں دونوں میں سے ایک کو بھی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے سان فرانسسکو میں تمھارے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ اسی لیے کیا تھا کہ تم وہاں سے صحیح سلامت یہاں آ کر ملک کے خلاف کام کرنے والوں کا کوئی مناسب بندوبست کر سکو، اور لزی کو تمھارے ساتھ بھیجنے کا بھی یہی مقصد تھا کہ وہ یہاں موجود غداروں اور دشمن کے ایجنٹوں کی نشاندہی کر سکے اور ضرورت پڑنے پر تمھاری مدد بھی کرتی رہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے میری توقع کے مطابق تمھارا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ اب ڈھمن ہمارے

مقبول ناول نگار ایچ اقبال کی دو نئی کتابیں۔ ہر کتاب میں دو مکمل ناول

عمران سیریز
ایک جلد میں
عجیب ہنگامے
پانچواں کالم
صفحات: ۳۲۰۔ قیمت -/۲۵ روپے

پرمود سیریز
ایک جلد میں
ریکارڈ کی چوری
موت کا راستہ
صفحات: ۳۲۰۔ قیمت -/۲۵ روپے

ڈاک خرچ فی ناول ۱۰ روپے ـــ دونوں ناول ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ

ملک کے دشمنوں کے لیے کام کر رہا ہے یہاں۔ اور اس کے خلاف تمھارا ساتھ دینا پڑ رہا ہے مجھے، لیکن ایک بات میں ابھی سے واضح کر دینا چاہتی ہوں، تم لوگ دھمن کے مقاصد کو کامیاب نہ ہونے دو، اسے جس طرح چاہو اس کام سے روک دو لیکن اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ اسے قتل نہ کرنا، اس کی موت کا غم میں برداشت نہ کر سکوں گی۔"

یہ اس نے بڑی عجیب بات کہہ دی تھی۔ دھمن جیسے بے ضمیر آدمی کو زندہ رکھ کر اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے بےہودہ مقاصد سے باز آجائے گا، یا تائب ہو کر سیدھی راہ پر آجائے گا، بے وقوفی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ دھمن زر پرستی میں اتنا دور جا چکا تھا کہ اب واپسی کی تمام راہیں وہ خود گم کر چکا تھا۔ پہلے تو یہ ہی ممکن نہیں تھا کہ اسے اپنے گناہوں کی سنگینی کا کسی طرح بھی احساس دلایا جا سکے۔ اس کی ہوسِ زر اس قدر بڑھ چکی تھی کہ دنیا بھر کی ساری دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینے کے باوجود اسے مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دولت کے انبار میں غرق ہو جانے کے بعد بھی اس کے دل سے ھل من مزید ہی کی صدائیں بلند ہوتی رہتیں۔ وہ لوگ جو ہر پل پیسہ حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے کسی بھی طریقے پر عمل کرنے میں کوئی برائی نہیں محسوس کرتے، وہ بالآخر دولت ہی کو خدا مان کر اس کی پرستش میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دولت کے سوا کسی کے نہیں رہتے، سارے رشتے ناتے، دوستیاں اور محبتیں ان کے دل سے مٹ جاتی ہیں۔ دھمن بھی اسی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ حصولِ زر کے سوا اس کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں رہا تھا۔ ایسے شخص کو موت کے سوا اپنے ارادوں کی تکمیل سے کون روک سکتا تھا، اور عالیہ کہہ رہی تھی اس سے اس کی موت کا غم برداشت نہیں ہو سکے گا۔ وہ اسے ہم سب سے زیادہ جانتی تھی اور ہم سب سے زیادہ عجیب اور انوکھی خواہش رکھتی تھی اس کے لیے اپنے دل میں۔ عجیب مخمصے میں پھنسا دیا تھا اس نے ہمیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ اس کی بات کا جواب ہم میں سے کسی کے بھی پاس تھا ہی نہیں۔ ہم میں سے کوئی دھمن کو زندہ چھوڑ دینے کے حق میں نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ انتہائی موذی قسم کا آستین میں بیٹھا ہوا سانپ ہے۔ اسے ہلاک نہ کرنا خودکشی کر لینے کے برابر تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو [redacted] کرتی ان کی کمزوری اور اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ احسان اور حسنِ سلوک کے ذریعے اس کی سوچ بدل سکتی ہے، میں عالیہ سے جھوٹ بول کر اسے وقتی طور پر مطمئن کر سکتا تھا کہ ٹھیک ہے، ہم دھمن کو کچھ نہیں کہیں گے، اس پر قابو پانے کے بعد اس کی جان بخشی کر دیں گے۔ اس کے بعد جب وقت آتا تو ہم یہ وعدہ فراموش کر سکتے تھے لیکن میں نے اس سے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ تو بہت گھٹیا، بڑی ہی نیچ حرکت ہوتی یارو! اگر میں اسے جھوٹ بول کر وقتی طور پر فریب میں مبتلا کر دیتا محض اس کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے۔ وہ جس کی زندگی کے بے شمار سال جھوٹ، فریب اور مکر و ریا کے سہارے گزرے تھے اس نے اس نازک موڑ پر دل کھول کر رکھ دیا تھا ہمارے سامنے۔ تو کیا میں اتنا ذلیل، اتنا پست ذہن تھا کہ اس کے ساتھ ایسے موقع پر فریب کرتا۔ جھوٹ بول کر اسے استعمال کرتا اس کے شوہر کے خلاف۔

میں نے کافی سوچ بچار کے بعد اس سے کہا۔ "تم نے بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے عالیہ ہمیں۔ میں تمھیں اس کا جواب کل دے سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم خوب سمجھ کر، باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر دو اس بارے میں۔ میں بھی جلدی نہیں کرنا چاہتی۔" عالیہ نے کہا۔

اس رات ہم آدھی رات تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ فاطمہ اور خان کا خیال تھا کہ ہمیں دھمن کی زندگی کی ضمانت دے دینا چاہیے، میرا، شرافت علی کا اور آسیہ کا خیال تھا کہ دھمن جیسے آدمی کو زندہ رکھ کر ہم ظلم کریں گے اپنے آپ پر بھی اور اس ملک اور اس کے باشندوں پر بھی۔ بالآخر فردوسی بیگم نے ایک ایسی تجویز پیش کی جو ہم سب کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ اس نے کہا "جیلانی! اگر آپ لوگ میری بات مانیں تو اسے یہ کہہ دیں کہ اگر دھمن نے اپنے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ ایک شریفانہ زندگی گزارنے کا وعدہ کر لیا تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن اگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنی موجودہ روش پر ہی قائم رہا تو پھر اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

فاطمہ بولی۔ "یہ بہت اچھی تجویز ہے جنابِ عالی! میں اس کی تائید کرتی ہوں، اور میرا خیال ہے کہ عالیہ کو بھی اعتراض نہیں ہو گا اس پر۔"

"ہے تو اچھی تجویز یہ لیکن تم اس شیطان کے بچے کو نہیں جانتی ہو، وہ وعدہ کر کے پھر بھی سکتا ہے، اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" میں بولا۔

"اس کی ضمانت عالیہ کو دینا ہو گی۔ وہی اس سے وعدہ لے گی اور وہی اس کا خیال بھی رکھے گی کہ وہ وعدہ خلافی نہ کرے۔" شرافت علی بولا۔

بات مناسب اور معقول تھی لہٰذا سب کا اتفاق ہو گیا اس پر۔ دوسرے روز میں نے عالیہ کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ وہ میری بات سن کر خوش ہو گئی۔ بولی۔ "بالکل یہی بات میرے ذہن میں تھی۔ اگر تم لوگ یہ تجویز نہیں رکھتے تو میں خود یہی تجویز رکھتی تمھارے سامنے۔"

"تو پھر یہ طے ہو گیا کہ تم دھمن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو گی اور ناکامی کی صورت میں ہم آزاد ہوں گے اس کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرنے کے لیے۔ اور پھر تمھاری پوزیشن کیا ہو گی؟ میرا مطلب ہے تم پھر تو دھمن کا ساتھ نہیں دو گی نا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جہاں تک ان کی موجودہ سرگرمیوں کا تعلق ہے، میں اس میں ان کا ساتھ نہیں دوں گی بلکہ شدید مخالفت کروں گی۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے تو اب تم واپس چلی جاؤ دھمن کے پاس اور اسے توبہ کرنے پر آمادہ کرو جا کر۔ ہم سے رابطہ قائم کرنا ہو تو لاہور میں کرنا، اب یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا ہے، ہم ایک دو دن میں لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں ولسن سے بھی ہمیں کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ جیلانی! میں تمھارے ہاتھ میں وہ انگوٹھی نہیں دیکھ رہی ہوں جو میں نے ناگہانی آفات سے بچنے کے لیے دی تھی تمھیں۔ کیا وہ تم نے کسی اور کو دے دی ہے، یا کہیں ڈال دی ہے غیر ضروری سمجھ کر؟" عالیہ نے میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ انگوٹھی، وہ پتا نہیں کہاں گم کر بیٹھا ہوں۔" میں نے اس طرح کہا جیسے اس کے گم ہو جانے کی مجھے کوئی پروا ہی نہ ہو۔

"گم کر بیٹھے ہو کہیں اسے!" عالیہ نے حیرت سے دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بات تم یوں کہہ رہے ہو جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو تمھارے نزدیک، کوئی پروا ہی نہ ہو تمھیں اس کی۔"

"او یار دفع کرو، اب کیا میں اس کے سوگ میں منہ لپیٹ کر پڑ جاؤں، ہنسنا بولنا اور کھانا پینا چھوڑ دوں اس کے لیے؟" میں نے کہا۔ "عالیہ بیگم! موت اور زیست پر کسی کو ذرا سا بھی اختیار نہیں دیا ہے اس ربِ کریم نے۔ یہ اختیار تو اس نے اپنے ہی پاس رکھا ہے، اور آدمی کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ اسے کب تک اور کس طرح رہنا ہے اس دنیا میں۔ اس میں ایک پل بھی زیادہ یا کم نہیں ہوتا ہے۔ تمھاری وہ انگوٹھی کھو جانے کے بعد بھی میں اب تک جی رہا ہوں، جبکہ دشمن نے کوئی رعایت نہیں کی میرے ساتھ۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا ہے جیلانی! میرا بھی ایمان ہے اس پر۔ موت کا جو وقت معین ہے اس سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا، یہ بات ہر آدمی جانتا ہے لیکن پھر بھی کوئی شخص چلتے چلتے اچانک گر کر مر جانا پسند نہیں کرتا، اپنی حفاظت کی سیکڑوں تدبیریں کرتا ہے آدمی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے تمھاری بات لیکن اب جب کہ وہ خود ہی گم ہو گئی ہے کہیں تو میں کیا کروں اب اس کے لیے۔" میں نے کہا۔

فردوسی بیگم ہماری باتیں سن کر بولی۔ "کس انگوٹھی کی بات کر رہے ہیں آپ لوگ۔ مجھے بتائیں، شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں؟"

میں نے حیرت سے فردوسی بیگم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا تمھارے پاس ہے وہ انگوٹھی؟"

"تم نے بھی کمال کی بات کی ہے جیلانی! مجھے تو یہی پتا نہیں ہے کہ تم کس انگوٹھی کا ذکر کر رہے ہو اور وہ کب کھوئی ہے تم نے۔ پھر میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ وہ انگوٹھی میرے پاس ہے۔ تم نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا شاید کسی سے بھی اپنی انگوٹھی کھو جانے کا۔"

"ذکر تو میں نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس کے بارے میں آبی کے سوا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ آبی جانتا تھا اس کی خصوصیات اور اس کو میں نے بتا دیا تھا اس کی گمشدگی کے بارے میں بھی۔ وہ بظاہر تو ایک عام سی ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ شاید تم نے دیکھی ہو میرے ہاتھ میں۔"

"میں نے اگر کبھی دیکھی ہوتی آپ کے ہاتھ میں تو اسی وقت میں آپ کو دے دیتی جب وہ ملی تھی مجھے۔ جس مکان میں آبی کو زخمی حالت میں رکھا تھا آپ نے، اسی مکان کے لان میں مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی پڑی ملی تھی۔ میں نے اسے دو دن اپنی انگلی میں ڈالے رکھا تھا، اس خیال سے کہ آپ لوگوں میں سے کسی کی ہو گی تو وہ اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر فوراً خود مانگ لے گا۔ اگر کوئی کہے گا کہ اس کی انگوٹھی گم ہو گئی ہے تو اسے دکھا دوں گی اور وہ پہچان کر لے لے گا۔ مگر دو دن تک کسی نے بھی اس پر دعویٰ نہیں کیا تو میں نے وہ اتار کر اٹیچی میں ڈال دی۔ اور چونکہ آج سے پہلے کسی انگوٹھی کے گم ہو جانے کا ذکر تک نہیں کیا تھا لہٰذا وہ انگوٹھی اب تک میری اٹیچی ہی میں پڑی ہے۔"

"ارے، تم نے کم از کم مجھے تو بتایا ہوتا۔ وہ بڑی طلسم ہوشربا قسم کی انگوٹھی ہے یار! وہ اگر ہوتی میرے ہاتھ میں تو میں آبی اور گل زمان کو زخمی حالت میں چھوڑ کر کبھی نہ آتا، کم از کم ان کی میت کو کندھا تو دے ہی سکتے تھے ہم۔ لاؤ ذرا جلدی سے لا کر دکھاؤ وہ انگوٹھی۔"

فردوسی بیگم اٹھ کر انگوٹھی لینے چلی گئی۔ شرافت علی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ "تم نے تو کمال ہی کر دیا یار جیلانی! ہیرے کی انگوٹھی کھو دی اور کسی کو بتایا تک نہیں۔ کیا قیمت ہو گی اس کی؟"

"قیمت اس کی کئی لاکھ امریکی ڈالرز ہے پیارے بھائی! کوئی معمولی قسم کی انگوٹھی نہیں ہے وہ۔" میں نے جواب دیا۔

"کئی لاکھ امریکی ڈالرز! ایک انگوٹھی کی قیمت!" وہ حیرت سے بولا۔ "کیا مصر کے آثارِ قدیمہ سے تعلق ہے اس کا؟"

"آثارِ قدیمہ نہیں برادر! بہت ہی زیادہ آثارِ جدیدہ سے تعلق رکھتی ہے وہ۔ جدید سائنسی تحقیق کا نادر شاہکار کہو اسے۔ اگر سائنس اس تجربے میں بڑے پیمانے پر کامیاب ہوگئی تو ہتھیاروں کی موجودہ دوڑ خود بخود رک جائے گی، سارے خوفناک ہتھیار ناکارہ ہوکر رہ جائیں گے۔ دنیا تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔" میں نے اسے بتایا۔

فاطمہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔" صرف ایک انگوٹھی سے سارے ہتھیار ناکارہ ہوجائیں گے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جنابِ عالی! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میری تو عقل حیران ہے آپ کی اس بات پر؟"

"تمھیں یاد ہے؟ جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم سمیت بہت سے لوگ مجھے کوئی مافوق الفطرت چیز سمجھتے تھے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ ریوالور، بندوق اور اسٹین گن جیسے ہتھیار میرے سامنے جام ہوکر کیوں رہ جاتے ہیں۔ اچھے خاصے کام کرتے ہوئے ہتھیاروں کو جب مجھ پر گولی چلانے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو ان سے گولی نہیں نکلتی تھی۔ تم نے بھی بارہا اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر میں ہمیشہ ٹال جاتا تھا تمھیں۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں ہاں، مجھے یاد ہے اچھی طرح سے، یہ بات مجھے ہمیشہ پریشان کیے رہتی تھی لیکن پھر میں نے جب دیکھا کہ ہتھیار آپ پر بھی اسی طرح اثر کررہے ہیں جیسے دوسروں پر تو میں نے اُسے محض اتفاق سمجھ کر بھلا دیا۔ ابتدا میں میرا خیال تھا کہ آپ میں کوئی خاص صلاحیت ہے کہ آپ ہتھیاروں کو جام کردیتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتی تھی تو آپ اسے اتفاق ہی قرار دے دیا کرتے تھے۔ تو جب میں نے آپ پر فائرنگ ہوتے دیکھی اور دیکھا کہ آپ دشمن کی گولیوں سے بچنے کی کوشش بھی دوسروں کی طرح ہی کرتے ہیں تو آپ کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ لیکن اس انگوٹھی سے اس بات کا کیا تعلق ہے۔ یہ ذکر کیوں چھیڑا اس وقت آپ نے؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"بہت گہرا تعلق ہے اس بات کا اس انگوٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے وہ اس انگوٹھی ہی کا کرشمہ تھا بی بی کہ میں بے دھڑک برستی ہوئی گولیوں میں اور آگ اگلتے ہوئے ہتھیاروں کے سامنے سینہ تان کر چلا جاتا تھا۔ میرے سامنے آتے ہی وہ ہتھیار آگ اگلنا بھول جاتے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے ان میں اچانک زنگ لگ گیا ہو اور ان میں سے نکلنے والی گولیاں جام ہوکر رہ گئی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے یار! کیا اتنا ہی اُلو سمجھتے ہو تم ہمیں کہ ہم تمھاری ہر اوندھی سیدھی بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیں گے۔ ایک انگوٹھی کی وجہ سے ہتھیار جام ہوجائیں، تصور تو بہت اچھا پیش کیا ہے تم نے مگر افسوس یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کسی طرح بھی۔ انگوٹھی کے بجائے اگر تم کہتے کہ ایسا کوئی تعویز تھا تمھارے پاس تو میں شاید یقین کرلیتا۔" شرافت علی بولا۔

"نہ کر یار تو یقین میری بات پر۔ فردوسی بیگم کو آجانے دے، اگر وہ انگوٹھی وہی ہوئی تو پھر دیکھوں گا تو کیسے یقین نہیں کرے گا۔ تیرے تو ہوش اڑ جائیں گے اس کی جادوگری دیکھ کر۔ ایسی باتیں کرنا بھول جائے گا تو۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! سچی بات ہے یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا ہے آپ کی اس بات پر۔" آسیہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

خان بولا۔" اور مجھے تو تمھارے اس مذاق پر ہنسی تک نہیں آئی، اگر یہ کوئی لطیفہ سنایا ہے تم نے تو بڑا بور لطیفہ تھا یہ۔"

عالیہ بولی۔" آپ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں لیکن یہ نہ کوئی مذاق ہے نہ لطیفہ۔ یہ ایک ناقابلِ یقین اور حیران کن حقیقت ہے۔"

اسی لمحے فردوسی بیگم انگوٹھی لے کر واپس آگئی۔ اُس نے انگوٹھی کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔ وہ میری وہی گمشدہ طلسمی انگوٹھی تھی جو عالیہ نے گفٹ کی تھی مجھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔" بے شک یہ وہی انگوٹھی ہے۔ لے بھئی شرافت علی! اب تو چاہے تو میری بات کی تصدیق کرسکتا ہے۔"

"وہ کس طرح بھئی؟ ذرا ترکیب بھی بتادو کس طرح تصدیق ہوسکتی ہے اس کی؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"اسے تو بھی لگتا ہے اوپر سے خالی ہوچکا ہے بالکل میرے بھائی۔ ریوالور اٹھا کر گولی چلا مجھ پر، ابھی ہوجاتی ہے تصدیق۔"

نہیں بھائی نہیں، میں یونہی مان لیتا ہوں تمھاری بات۔ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالو اتنی سی بات کے لیے۔" وہ بولا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی خودکشی کرنے کا شوق ہے مجھے۔ تم بے فکر ہوکر چلادو گولی اگر ریوالور یہ کام کرسکے تو۔" میں نے کہا۔

انور کمال بولا۔" جیلانی بھائی! ایسی باتیں نہ کریں، ابھی ہمیں ضرورت ہے آپ کی۔ زندگی اتنی سستی چیز نہیں ہوتی کہ اسے اتنی چھوٹی سی بات کے لیے ضائع کردیا جاتے۔ آپ ایک انہونی بات کو منوانے کے لیے اس قدر سنجیدہ ہوگئے ہیں۔ یہ تو کمال ہی کررہے ہیں آپ۔"

میں نے کہا۔" اوئے یار! کیسے بے اعتبارے لوگ ہو تم۔ میں کہہ رہا ہوں ایک بات پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اور تم لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کچھ۔ او یارو! اگر میں جھوٹا ہوں تو آزما لینے میں کیا ہرج ہے؟ آخر ایسا اُلو کیوں سمجھ رہے ہو تم لوگ مجھے۔"

عالیہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔" اصل میں انھیں یہ خوف ہے جیلانی کہ تم کو نقصان نہ پہنچ جائے کہیں۔" پھر

[اُس] نے شرافت علی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔" لاؤ یہ ریوالور مجھے دو، [م]یں گولی چلا کر بتاتی ہوں۔"

شرافت علی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔" لگتا ہے یا تو تم [دو]نوں پاگل ہوگئے ہو، احساس ہی نہیں ہے تمھیں کہ کس بات کے لیے ضد کررہے ہو تم۔ یا پھر تم کسی طرح جیلانی کو بے وقوف [ب]نانے میں کامیاب ہوگئی ہو اور اس طرح اس کی جان لینا چاہتی ہو۔"

عالیہ نے کہا۔" اچھا تم یوں کرو، جیلانی انگوٹھی اتار کر سامنے [ف]رش پر یا جہاں تم کہو رکھ دیتے ہیں۔ بلکہ تم خود ہی کہیں رکھ دو اپنے [ہا]تھ سے اور پھر اسے نشانہ بنا کر گولی چلاؤ اس پر، اگر ایک بھی فائر [ت]م اس کی طرف کرنے میں کامیاب ہوگئے تو جو تم کہو گے، وہی انعام [د]وں گی میں تمھیں۔ لو لو، یہ تو منظور ہے نا۔ اس طرح تو کسی کی بھی جان [ک]و خطرہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں، یہ بات ٹھیک ہے تمھاری۔" فاطمہ بولی۔" آپ انگوٹھی اُدھر فرش پر ڈال دیں جنابِ عالی! میں چلاتی ہوں گولی اس پر۔"

میں نے انگوٹھی کو اپنی انگلی سے اتار کر فرش پر ڈال دیا اور [ا]ٹھ کر شرافت علی کے پاس جا بیٹھا۔ اتنی دیر میں فاطمہ ریوالور نکال کر انگوٹھی کا نشانہ لے چکی تھی۔ میرے ادھر آتے ہی اس نے لبلبی دبا [د]ی، اور پھر وہ مسلسل بار بار لبلبی دباتی چلی گئی مگر ریوالور سے ایک بھی گولی برآمد نہ ہوسکی۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ پھر ریوالور کا چیمبر کھول کر اُسے دیکھا۔ ریوالور گولیوں سے بھرا ہوا تھا، چیمبر کا ایک بھی خانہ خالی نہیں تھا۔ اس نے گولیاں اپنی ہتھیلی پر اُلٹ کر خالی چیمبر اور ریوالور کی نال کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اسے [د]وبارہ لوڈ کیا اور اس پر سائیلنسر چڑھا کر انگوٹھی کے مخالف سمت میں فائر کیا۔ گولی نکل کر سامنے کی دیوار پر لگی اور وہاں سے پلستر اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر اس طرف فائر کرنے کی کوشش کی جہاں انگوٹھی پڑی تھی، ریوالور نے ایک بار پھر گولی اُگلنے سے انکار کردیا۔ وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی اس انگوٹھی کو دیکھتی تھی اور بار بار اس پر گولی چلانے کی کوشش کرتی تھی لیکن ایک بار بھی کامیاب نہیں ہوسکی تھی وہ۔

عالیہ نے اس کی ناکامی پر ہلکا سا قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔" بس کر رہنے دو بس الزبتھ! تم اس پر فائر نہیں کرسکو گی، ہار مان لو اپنی۔" پھر وہ شرافت علی کی طرف مڑ کر بولی۔" تم بھی حسرت پوری کرلو اپنی، دیکھو تمھارا ریوالور شاید کام کرجائے اپنا۔"

شرافت علی کی حالت دیدنی تھی اس گھڑی، اس کی دونوں آنکھیں داتھیں اور منہ کسی مین ہول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ عالیہ کے مخاطب کرنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔" حیرت انگیز... ناقابلِ یقین حد تک حیرت انگیز... آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں نے تو کبھی تصور میں بھی ایسی کوئی انگوٹھی نہیں دیکھی۔"

میں نے آگے بڑھ کر انگوٹھی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔" ایک اسٹین گن دو ذرا مجھے۔"

انور کمال نے جلدی سے دوسرے کمرے سے ایک اسٹین گن اٹھا کر مجھے لادی۔ میں نے انگوٹھی فاطمہ کو دے کر کہا۔" تم یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈال کر ادھر دیوار سے لگ کے کھڑی ہوجاؤ۔ تم دیکھو گی کہ ریوالور ہی نہیں اسٹین گن بھی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔"

ان لوگوں کے دل سے خوف اب تقریباً ختم ہوچکا تھا اور اب میری بات انھیں قابلِ اعتبار لگنے لگی تھی۔ چنانچہ فاطمہ نے بے جھجک انگلی میں انگوٹھی ڈال لی اور جاکر دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اسٹین گن اس کی طرف سیدھی کرکے اس کی لبلبی دبانا شروع کی لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ اسٹین گن سے ایک بھی گولی نہیں نکل سکی۔ میں نے اسٹین گن شرافت علی کی طرف بڑھا کر کہا۔" یہ لو، اب تم بھی تجربہ کرلو، اور بھی جس کا دل چاہے آزما کر دیکھ لے اس انگوٹھی کی کرامات کو۔"

باری باری ان سب نے ہی اسٹین گن اٹھا کر اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لی اور پھر اسٹین گن رکھ کر شکست تسلیم کرکر کے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ فاطمہ کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ وہ مسرور لہجے میں بولی۔" یہ تو بڑے کمال کی انگوٹھی ہے جنابِ عالی!"

شرافت علی بولا۔" اور ایسی حیرت انگیز چیز کو کھو کر تمھیں ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا جیلانی! کمال آدمی ہو یار تم بھی۔ اب مجھے یاد آیا اُدھر لاکھو لاشاری کی حویلی میں تمھیں فائرنگ کے تبادلے کے دوران میں نے کھلے میدان میں نکل نکل کر لاکھو کے آدمیوں پر جھپٹتے ہوئے دیکھا تھا اور کئی موقعوں پر تنی ہوئی رائفلیں تم پر فائر نہیں کرسکی تھیں۔ میں نے تم سے اس کی وجہ بھی جاننا چاہی تھی شاید مگر اس وقت تم نے مجھے ٹال دیا تھا۔ لیکن حیرت ہے یار! یہ انگوٹھی کس طرح بنائی گئی۔ کیا چیز ہے اس میں ایسی۔"

عالیہ نے کہا۔" اس انگوٹھی کا کمال نہیں ہے یہ۔ بلکہ کمال سارا اس پتھر کا ہے جو اس میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ یہ پتھر ایک سائنسدان کی دریافت ہے... دریافت نہیں بلکہ ایجاد کہو یہ اس کی۔ ادھر سان فرانسسکو میں ایک سائنسدان ہے جو اپنے علم کو تعمیر کے بجائے تخریب کے لیے استعمال کررہا ہے۔ ویسے بے شمار ایسے سائنسداں ہیں جنھوں نے اپنے علم اور تجربات سے انسانیت اور انسان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اسے ساری دنیا کو ڈرانے، سہمانے اور خوف زدہ کرکے اپنے سامنے جھکائے رکھنے کے لیے استعمال کیا ہے اور اب بھی کررہے ہیں۔ یہ

جدید ترین اور مہلک ہتھیار ایسے ہی سائنسدانوں کی ایجاد ہیں۔ انھوں نے ایسی بھیانک اور تباہ کن ایجادات کے ذریعے اپنے اپنے ملکوں کو دنیا بھر میں کھلی غنڈہ گردی کی چھوٹ دے کر اپنے لیے قانون کا تحفظ حاصل کر لیا ہے۔ اب ان پر کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

حکومتوں کے علاوہ کئی ممالک میں ایسے بھی بہت سے سائنسدان موجود ہیں جو جرائم پیشہ افراد کی کئی بین الاقوامی تنظیموں کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وہ ان کے لیے چھوٹے چھوٹے مگر انتہائی خوف ناک ہتھیار بنانے میں مصروف ہیں اور نت نئے تجربات کر کے ان ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے کے لیے بھی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایسے ہی ایک سائنسداں نے مختلف قسم کی بہت ساری دھاتوں کو ملا کر یہ پتھر بنا دیا ہے جو اس انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے۔ اس سے دھمن نے ایک ایسی شفاف اور سخت ترین دھات یا کوئی ایسی چیز بنانے کے لیے کہا تھا جس کو آدمی خول کی طرح اپنے گرد منڈھ لے یا اس کا لباس بنا کر پہن لے تو اس پر، آگ، پانی، ہوا، گولی یا کوئی بھی چیز اثر نہ کر سکے۔ جس کے اندر محفوظ رہتے ہوئے آدمی اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مصروف رہے اور کسی طرف سے کسی بھی طرح کا کوئی خطرہ نہ رہے اسے۔ چنانچہ وہ سائنسداں دو سال کے تجربے اور خطیر رقم خرچ کرنے کے بعد یہ ایک پتھر کے چند ٹکڑے بنانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ نہ جانے کن دھاتوں کو کئی قسم کی بوٹیوں کے ساتھ ملانے، تپانے پکانے اور پتا نہیں کن کن مراحل سے گزارنے کے بعد وہ انھیں اس شکل میں لا سکا تھا۔ اس نے ٹکڑوں کو آگ میں ڈال کر دیکھا کئی دن دہکتی ہوئی آگ میں پڑے رہنے کے بعد بھی ان میں کوئی تبدیلی نہ آسکی تو پانی میں ڈال دیا گیا انھیں۔ جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو انھیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف طریقے استعمال کرنے کے بعد انھیں توڑا نہیں جا سکا تو اس نے گولی مار کر ایک پتھر کو توڑنے کا فیصلہ کیا اور جب اس پر گولی چلانے کی کوشش کی گئی تب یہ انکشاف ہوا کہ ریوالور، اسٹین گن وغیرہ کی نال کا رُخ اس کی طرف ہو تو اس نال سے گولی باہر نہیں آسکتی۔ یہ بات دھمن کو معلوم ہوئی تو اس نے وہ پتھر لے کر انھیں انگوٹھیوں میں جڑوا لیا ہے۔ ایک انگوٹھی وہ پہنے رہتا ہے ہر وقت ایک یہ میری انگلی میں ہے۔" اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کی درمیانی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی دکھائی۔" اور ایک جیلانی کو دے دی تھی میں نے جب یہ سان فرانسسکو میں تھے اور شاید دو ایک انگوٹھیاں دھمن نے کہیں محفوظ کر رکھی ہیں۔ یہ پتھر حاصل کرنے کے بعد ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں، اب وہ بڑے سے بڑا کام بے دھڑک کر گزرتے ہیں۔ وہ سائنسداں بے انتہا کوشش کے باوجود ابھی تک یہ سراغ حاصل نہیں کر سکا ہے کہ اس پتھر میں وہ کون سی چیز ہے جس نے اس میں یہ صفت پیدا کی ہے۔ البتہ گزشتہ دنوں وہ اس کا توڑ دریافت کر چکا تھا۔ اس نے ایک ریوالور بنا کر دیا ہے دھمن کو جس میں گولی کی جگہ شعاعیں استعمال ہوتی ہیں۔ ٹرائیگر دباتے ہی روشنی کا ایک جھماکا ہوتا ہے۔ بالکل کیمروں میں استعمال ہونے والی فلش گن کے جھماکے کی طرح، بس ایک ننھا سا شعلہ لپکتا دکھائی دیتا ہے اس کی طرف جسے نشانہ بنایا جائے اور وہ پل بھر میں جلا ہوا کوئلے کا مجسمہ بن کر رہ جاتا ہے اسی جگہ۔ اس شعلے کو یہ پتھر بے اثر نہیں کر سکتا۔ البتہ اس پر اس شعلے کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ پوری انگوٹھی پانی ہو کر اُڑ جاتی ہے اور یہ پتھر زمین پر گر جاتا ہے۔ اس وقت یہ انگارے کی طرح گرم ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن اس سے اس کی کارکردگی میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔"

"کمال کی چیز بنائی ہے بھئی اس سائنسدان نے یہ۔ واقعی اگر وہ اسے بڑے پیمانے پر بنانے میں کامیاب ہو جائے تو سارے ہتھیار جو اب تک بنائے جا چکے ہیں ناکارہ ہو کر رہ جائیں گے۔" شرافت علی نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

"ویسے یہ سائنسدان ہوتے بڑے عجیب لوگ ہیں۔ اتنی اچھی چیز بنا لینے کے بعد اسے وہ شعاعیں پھینکنے والا پستول بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیسا شخص ہے وہ ایک ہاتھ سے زندگی دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے موت تقسیم کرتا ہے۔" انور کمال نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"اور عالیہ بیگم! جب تمھیں یہ معلوم تھا کہ دھمن کے پاس ایسا پستول بھی ہے جو اس انگوٹھی کا اثر قبول نہیں کرتا اور پل بھر میں آدمی کو کوئلہ کر دیتا ہے تو تم نے اس انگوٹھی کا ذکر ہی کیوں کیا تھا۔ اب اس کی دھمن کے سامنے حیثیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ یہ اس کے مقابلے میں دفاع تو نہیں کر سکے گی نا میرا؟ جبکہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کی انگوٹھی کو بے اثر کر سکے۔" میں نے عالیہ سے کہا۔

عالیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی فاطمہ بول پڑی۔" اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ انگوٹھی دھمن کے علاوہ تو ہر شخص کے ناگہانی شر سے محفوظ رکھے گی آپ کو۔ رہا دھمن کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے اس سے کسی خونی مقابلے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ کیوں عالیہ ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟"

عالیہ بولی۔" ہاں کیوں نہیں۔ میں نے وعدہ کیا ہے آپ لوگوں سے انھیں سمجھا بجھا کر اس ناپاک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے کا۔ تو میں اپنی سی ہر کوشش کروں گی، ویسے جو اللہ کو منظور ہو۔ آپ لوگ دعا کریں میری کامیابی کی۔"

"ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ دھمن آج کل دَرّہ خیبر کے اس طرف افغانستان

سرحد کے قریب کسی جگہ ہیروئن تیار کرنے والی کوئی فیکٹری چلا رہا ہے۔ تم بھی شاید اس کے ساتھ ہی تھیں؟"

"ہاں یہ اطلاع صحیح ہے تمھاری۔" عالیہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے اب تم خاصے وسیع ذرائع کے مالک بن چکے ہو۔"

"ہاں، یہ صحیح ہے۔ اب میں وہ گاؤں گاؤں تم لوگوں سے بچنے کے لیے چھپتے پھرنے والا جیلانی نہیں رہا ہوں۔ اور یہ بات بھی تم سمجھا دینا اس دھمن کو اپنے۔ ملک چھوڑ کر بھاگنے پر تو میں نے اسے اس وقت بھی مجبور کر دیا تھا جب وہ اور قانون دونوں ہی میری جان کے لاگو رہتے تھے اور میرے ساتھ آپی اور خدا کے سوا کوئی نہ تھا، اوپر وہ تھا اور نیچے آپی۔ اس وقت اپنے سائے سے بھی چوکنا رہنا پڑتا تھا مجھے۔ اس کو بتا دینا اب وہ مجھ سے اُلجھنے کی کوشش کرے گا تو مصیبت ڈال دوں گا میں اس پر، دنیا سے بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔" میں نے عالیہ سے کہا۔ "اور یہ جو تم یہاں آئی ہو تو کیا دھمن نے بھیجا ہے تم کو یا بس یونہی اپنی مرضی سے چلی آئی ہو؟"

"آنا تو میں خود ہی چاہتی تھی لیکن کوئی معقول بہانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا میرے۔ پھر دھمن نے کام بتا دیا اور مجھے موقع مل گیا آنے کا۔ میں یہی معلوم کرنے کے لیے آنا چاہتی تھی کہ تم نے اور لزی نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ ہمیں جو رپورٹیں مل رہی تھیں وہ میرے لیے قابلِ اطمینان نہیں تھیں۔ ان میں یہ ذکر بھی نہیں کیا گیا کبھی کہ لزی تنظیم سے باغی ہو چکی ہے۔ تمھارے بارے میں صرف یہ اطلاع بھیجی گئی تھی کہ جبیر اللہ نے تمھارے ساتھ ہتک آمیز رویّہ اختیار کر رکھا تھا جس کی وجہ سے تم اس کے خلاف ہو گئے۔ تم دونوں کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی جس سے نقصان تنظیم کو پہنچ رہا ہے۔ پھر پتا چلا کہ تم نے کچھ لوگوں کے ساتھ جبیر اللہ کے تعاقب میں تنظیم کے ایک اہم اور خفیہ اڈّے پر پہنچ کر اسے تباہ کر دیا ہے جس سے تنظیم کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا ہے لہٰذا لزی نے اس جھگڑے کو نمٹانے کے لیے جبیر اللہ کو زہر کا انجکشن دے کر ختم کر دیا ہے کیونکہ اس ساری بربادی کا اصل ذمّے دار وہی تھا۔ اس کے بعد صرف یہی خبریں ملتی رہیں کہ تم ہنوز ناراض ہو اور تمھیں منانے اور دوبارہ تنظیم میں شامل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

فاطمہ نے عالیہ سے کہا۔" عالیہ! ایک بات کا خیال رکھو، جب تمھیں معلوم ہے کہ میرا اصل نام لزی یا الزبتھ نہیں فاطمہ ہے اور اب میں کھل کر تنظیم کے خلاف میدان میں اتر چکی ہوں تو اب تم مجھے یہودیوں کے دیے ہوئے نام لزی یا الزبتھ سے مخاطب نہیں کیا کرو، فاطمہ کہا کرو مجھے صرف۔ جس نام سے تم مخاطب کر رہی ہو یہ گالی لگتا ہے اب مجھے۔"

"اوہ، سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم نے اب یہ نام ترک کر دیا ہے۔ آئندہ خیال رکھوں گی اس بات کا۔" عالیہ معذرت کرتے ہوئے بولی۔

"دھمن نے تمھیں کیا کام بتا کر بھیجا تھا کراچی؟" میں نے عالیہ سے اپنی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے پوچھا۔

"انھیں تمھاری طرف سے فکر ہی رہتی ہے ہر وقت۔ آئزک نے تراں کے پاکستان آنے کے بعد بھی کوئی تمھارے خلاف رپورٹ نہیں بھیجی تھی لیکن یہاں دیگر ذرائع سے ان تک جو خبریں پہنچیں وہ خاصی تشویش ناک تھیں۔ کشمیر خاں نے شکایت کی تھی کہ تم نے اس کے آدمی کو بھی غائب کر دیا ہے۔ دھمن کے جو پرانے ساتھی یہاں ہیں انھوں نے خبر دی تھی کہ تمھاری اصل جنگ آئزک کے خلاف ہے اور تم نے شرافت علی کا بھی تعاون حاصل کر لیا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں تمھارے ساتھ اور آئزک اب تم سے چھپتا پھر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ یہ خبریں ملنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کراچی آ کر صحیح صورتِ حال معلوم کر کے انھیں رپورٹ دوں۔" عالیہ نے بتایا۔

"یہاں آنے کے بعد تم اسے رپورٹ بھیجنے کے بجائے خود بھی اس جہاد میں شریک ہو گئیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اپنے گناہوں کا کچھ بوجھ ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔ اور شکر گزار ہوں میں اپنے رب کی کہ اس نے یہ موقع عطا کیا مجھ جیسی معصیت کار کو۔ خدا دھمن کو عقل دے اور وہ بھی سیدھی راہ پر آ جائے تو میں سمجھوں گی کہ مجھے اس دنیا ہی میں جنّت مل گئی ہے۔ لیکن لگتا ہے یہ میری آرزو پوری ہونے کے لیے نہیں ہے شاید۔" وہ اداسی سے بولی۔

"دل چھوٹا نہیں کرو، نا امید نہ ہو اس ربِ دو جہاں کی ذات سے۔ وہ اگر چاہے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلّی دی۔

عالیہ کو اسی رات کی فلائٹ سے پشاور جانا تھا لہٰذا وہ ہم سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فاطمہ نے کہا۔ "جنابِ عالی! یہاں کا قصّہ تو ختم ہو گیا، اب آپ لاہور کب چل رہے ہیں؟ میرا تو خیال ہے یہاں بے کار وقت ضائع کرنے کے بجائے جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔"

میں نے شرافت علی سے کہا۔" کیا خیال ہے تمھارا تم چلو گے ہمارے ساتھ یا بس یہیں تک ساتھ تھا ہمارا تمھارا؟"

"کیسی بات کرتے ہو یار جیلانی! ایسا سمجھتے ہو تم مجھے۔ اب تو یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے دوست جب تک زندہ ہوں اس وقت تک تو تمھارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یوں بھی یہاں اب رکھا ہی کیا ہے

میرے لیے۔ دنیا تو بہت کمالی اور نتیجہ بھی دیکھ لیا اس کا۔ اب کچھ عاقبت سدھارنے کے کام ہی کر لینے دو۔ میرے نامۂ اعمال میں کچھ تو نیکیاں لکھوا دو یار!" اس نے درد بھری آواز میں کہا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا جیلانی بھائی! مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہیں کریں گے آپ۔" انور کمال جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے بھئی ضرور چلو، مجھے کیا اعتراض ہے۔" میں نے انور کمال سے کہا۔ پھر خان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "اور تم کیا کہتے ہو خان؟"

"چلنے سے مجھے بھی انکار نہیں ہے کوئی لیکن ذرا وقت لگے گا مجھے۔ کیوں کہ یہاں جو کاروبار پھیلا رکھا ہے میں نے، اس کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر کچھ دن رک جائیں تو میں ضرور چلوں گا آپ کے ساتھ۔" خان نے جواب دیا۔

"اندازاً کتنے دن لگیں گے تمھیں اپنے معاملات کا بندوبست کرنے میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہی کوئی دو یا تین ہفتے تو لگ ہی جائیں گے اس کام میں۔" خان نے جواب دیا۔

"دو تین ہفتے!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تو بہت ہوتے ہیں یار! اتنے دن ہم یہاں بے کار پڑے رہیں گے۔ نہیں بھئی، پتا نہیں اتنے دن میں حالات کیا رُخ اختیار کر جائیں۔ کراچی میں تنظیم کے خاتمے کی اطلاع ان کے ہیڈ کوارٹر کو ہو جائے گی تو وہ خاموش تو نہیں بیٹھ جائیں گے، اتنے بڑے نقصان کو چپ چپاتے تو برداشت نہیں کرلیں گے وہ۔ میں چاہتا ہوں اس سے پہلے کہ وہ یہاں کسی اور شخص کو بھیج کر دوبارہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کریں، انھیں لاہور سے اپنی جڑیں اکھڑ جانے کی اطلاع مل جائے، اسی دوران ہم دشمن کا قصّہ ختم کر دیں۔ متواتر ایسی تباہ کن خبریں انھیں پہنچیں گی تو شاید وہ ادھر کا رُخ نہ کریں پھر یا ایک لمبے عرصے کے لیے ہمارے ملک کا خیال دل سے نکال دیں۔ ایک بار ہم نے انھیں بُری طرح اکھاڑ دیا اگر یہاں سے تو دوبارہ قدم جمانے میں برسوں لگ جائیں گے ان کو۔ ایک طویل مدّت درکار ہو گی پھر اس کام کے لیے۔ اس عرصے میں ممکن ہے، یہاں کے حالات مکمل طور پر ان کے خلاف ہو جائیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں خان! تم اگر ابھی نہیں چل سکتے تو ہم لوگوں کو چلنے دو۔ اپنے معاملات سے فارغ ہو کر اگر چاہو تو ہمارے پاس آ جانا تم بھی اور اگر نہ بھی آسکے کسی وجہ سے تو ہمیں کوئی شکایت نہیں ہو گی تم سے۔" شرافت علی نے کہا۔

"ہاں ہاں، بالکل بالکل۔ تم آزاد ہو اپنے بارے میں جو بھی فیصلہ کرو گے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا اس پر۔" میں نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ لوگ جائیں، میں لاہور میں آ ملوں گا آپ کے ساتھ جب بھی فراغت پاؤں گا۔" خان نے فیصلہ سنا دیا اپنا۔

میں نے فردوسی بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا "اور تم فردوسی! میرا خیال ہے کہ اب تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی ہے لہٰذا تم صبح اپنے فلیٹ میں منتقل ہو جاؤ۔"

"کیا بات کہہ رہے ہیں آپ جیلانی! میں بھی ساتھ چلوں گی آپ لوگوں کے۔ اب اس فلیٹ میں تنہا نہیں رہا جائے گا مجھ سے آپ لوگوں سے علیحدگی تو میرے لیے ناسور بن جائے گی۔ ایسا نہ کیجیے آپ۔" فردوسی بیگم ایک دم اداس ہو کر بولی۔

"یہ تو نے کیسے سمجھ لیا بی بی کہ ہم تجھے جدا کر رہے ہیں اپنے آپ سے۔ ہم واپس آئیں گے یہیں، اپنا کام ختم کرنے کے بعد اپنی بقیہ عمر اسی شہرِ نگاراں میں گزارنے کا فیصلہ کر چکا ہوں میں۔ اور میرے ساتھ یہ سب لوگ بھی یہیں رہیں گے۔ تو یہاں انتظار کرنا ہمارا اور دعائیں کرنا ہمارے لیے نمازیں پڑھ پڑھ کے۔ اور وہ ماں جی جب واپس آئیں گی تو ان کی دیکھ بھال کرنا تو۔ یہاں کوئی نہیں ہو گا تو وہ کہاں رہیں گی، کس کے پاس جائیں گی وہ؟ کوئی گھر تو ہونا چاہیے نا یہاں ان کے لیے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

میں نے ماں جی کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد کچھ کہنے کو نہیں رہا تھا فردوسی کے پاس۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، کوئی مضبوط دلیل رکھتی تھی وہ مجھے قائل کرنے کے لیے لیکن جو دلیل میں نے دے دی تھی اسے وہ اتنی بھاری تھی کہ اس کے کھلتے ہوئے ہونٹ دوبارہ بند ہو گئے، اس کے چہرے پر گہری پژمردگی چھا گئی تھی اس نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اسے یقیناً بہت دکھ ہوا تھا یہ جان کر کہ میں ایک بار پھر اسے تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ لیکن اس کو خدا نے صبر کرنے کی بڑی طاقت عطا کی تھی۔ اس نے میرے فیصلے کو صبر و شکر کے ساتھ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا اور دوبارہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے شرافت علی نے سعودیہ میں مقیم اپنے اس دوست کو جس کے ذریعے ماں جی کے لیے سعودی عرب کے مقدس شہروں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہائش اور دیگر آسائشوں کا انتظام کیا تھا، خط لکھ کر یہ اطلاع دے دی تھی کہ ہم لوگ لاہور جا رہے ہیں، اس دوران اگر ماں جی کی واپسی ہو تو اس پتے پر اطلاع دے دی جائے۔ اور اس کے لیے پتا اور ٹیلی فون نمبر فردوسی بیگم کا لکھ دیا تھا اس نے۔ اس کے علاوہ شرافت علی نے جوڈو، کراٹے، کنگفو اور مارشل آرٹ وغیرہ کی تربیت جن جوانوں کو دلائی تھی، ان میں سے دو نوجوان مجھے بہت پسند آئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام شہباز اور دوسرے کا دلاور تھا۔ دونوں کے قد چھ فٹ سے نکلتے ہوتے تھے اور جسم ان کے سانچے

میں ڈھلے ہوتے لگتے تھے۔ بڑی سخت ورزش اور محنت سے اپنے ایک ایک عضو کو تیار کیا تھا ان دونوں نے۔ رنگ ان کے گندمی تھے اور لڑنے کے فن میں ثانی نہیں رکھتے تھے اپنا۔ جب وہ دشمن کے مقابل آتے تھے تو ان پر نظریں ٹکائے رکھنا مشکل ہو جاتا تھا، بجلی کی طرح کوند کوند کر لپکتے تھے مخالف پر۔ میں نے ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا روانہ ہوتے وقت۔ یوں ہم سات افراد کا قافلہ شرافت علی کی ان کاروں میں بھر کر عازمِ لاہور ہوا تھا جو اس نے خصوصی طور پر تیار کرائی تھیں۔

کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر ہم لوگ بخیریت تمام لاہور پہنچ گئے۔ میں ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر سیدھا گلبرگ میں اپنی کوٹھی پر پہنچا تھا جہاں کبری اور ڈرائیور نظام دین نے نہایت ہی خندہ پیشانی سے استقبال کیا تھا ہمارا۔ انھیں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی مجھے کہ وہ دونوں اب تک وہیں موجود تھے اور کوٹھی کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا دل میں اپنے کہ کوٹھی ویران اور اُجاڑ پڑی ہو گی، بیشتر سامان کبری نے اپنی افیون حاصل کرنے کے لیے اونے پونے کسی کباڑی کی نظر کر دیا ہو گا اور نظام دین بھوک اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر کسی اور ڈال پہ جا بیٹھا ہو گا۔ آخر میری اس سے کوئی رشتے داری تو نہیں تھی کہ وہ یہاں پڑا دیمک لگاتا رہتا اپنے آپ کو۔ آج جو دور گزر رہا ہے اس دور میں تو رشتے دار بھی ایسا نہیں کرتے۔ جب اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہ دیتا ہو تو دوسرے کی خیریت تک معلوم کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ مبادا اس کی حالتِ زار قابلِ رحم ہو اور ہم اُس پر رحم کھا کر اس کی مدد کر بیٹھیں۔ لیکن وہ خلوص کے سمندر سے نکلا ہوا محبت میں شرابور بندہ اب تک میرے گھر میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ کبری کے بقول وہ ہر لمحے میری کار کو تیل وغیرہ دے کر چمکاتے رکھتا تھا کہ پتا نہیں کب میں کہیں سے ٹیلی فون کر کے اسے کہہ دوں کہ کار لے کر فلاں جگہ آ جا مجھے لینے کو۔

میں نے ان دونوں سے پوچھا۔ "اوئے تم لوگ کھاتے پیتے کیا رہے اب تک؟ یہاں کوئی من و سلویٰ تو نہیں اترتا رہا تھا تمھارے لیے؟"

"نہیں جناب سردار صاحب! آپ کے گھر میں بھلا کھانے پینے کے سامان کی کمی کیا ہے؟ ڈھیروں سامان بھرا پڑا ہے جی۔ اور ہم کوئی قوم بنی اسرائیل سے تو نہیں ہیں کہ خدا کا امتحان لینے بیٹھ جاتے۔ ماں جی جاتے ہوئے ہمیں اتنا دے گئی تھیں کہ ہم مزید سال بھر تک ایسے ہی بیٹھ کر انتظار کر سکتے تھے آپ کا۔" کبری کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی تھی۔

وہ بڑے ہی مہذب انداز میں باتیں کر رہا تھا مجھ سے۔ لگتا تھا مالک اور ملازم کی تفریق قبول کر لی تھی اس نے۔ آہو کے در پہ نگہبانی کرتے ہوئے جس طرح ملاکتا تھا، وہ انداز اب اس میں دُور دُور نظر نہیں آتا تھا مجھے۔ میں نے اس سے کہا۔ "اوئے کبری! یہ جو لوگ میرے ساتھ آئے ہیں، یہ سب مہمان ہیں میرے، خیال رکھنا انھیں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے یہاں۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں سردار صاحب! کسی کو اگر ذرا سی بھی تکلیف پہنچے ہم سے تو بے شک آپ گردن مار دیں ہماری۔"

ایک دن آرام کرنے کے بعد دوسرے روز میں شرافت علی کو ساتھ لے کر ولسن کی تلاش میں نکل گیا۔ مشکل یہ تھی میرے لیے کہ مجھے اس کوٹھی کا پتا نہیں معلوم تھا جہاں وہ ولسن سکونت پذیر تھا اپنی مسز کے ساتھ۔ وہ لوگ مجھے سوتی جاگتی حالت میں جب ولسن کے پاس لے گئے تھے تو مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ میں لاہور کی کن سڑکوں، گلیوں اور بازاروں سے گزر کر وہاں پہنچا تھا۔ نہ وہ علاقہ میری سمجھ میں آسکا تھا اس گھڑی جہاں اس کی وہ جدید سہولتوں سے آراستہ کوٹھی واقع تھی۔ ہم نے لاہور کے سارے ہی فیشن ایبل علاقے دیکھ ڈالے۔ گلبرگ، سمن آباد، گارڈن ٹاؤن، شادمان اور ماڈل ٹاؤن کی ایک ایک گلی اور ایک ایک مکان دیکھ ڈالا تھا، صبح سے شام کر دی تھی اسی جستجو میں مگر وہ کوٹھی تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اس شیطان کے بچے ولسن نے اتنی زیادہ مقدار میں میرے پھیپھڑوں میں گیس چڑھا دی تھی کہ یہاں سے کراچی تک مجھے اپنی کچھ خبر نہیں مل سکی تھی۔ اور جب میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا تو کراچی ایئرپورٹ نزدیک آچکا تھا۔ میں نے کئی جگہ رُک کر ولسن کے بارے میں معلوم بھی کیا کچھ لوگوں سے لیکن کسی سے ذرا سا سراغ بھی نہ مل سکا اس کا۔ دوسرے دن پھر ہم دونوں اس مہم پر نکل پڑے۔ اس روز میں سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک ایک شخص کو گھورتا رہا تھا۔ اپنے ذہن کی اسکرین پر ان سب کی تصویریں ابھار رکھی تھیں جنھیں میں نے ولسن کی کوٹھی میں دیکھا تھا اور جو مجھے گوجرانوالہ اسٹیشن سے بے ہوشی کی حالت میں اس کی کوٹھی تک لے کر گئے تھے۔ استاد اللہ نواز خان، فرزند علی، عابدی۔ اور پولیس کے محکمے سے دھکے دے کر نکالا ہوا جانِ عالم اور ولسن کا وہ حبشی ملازم جس نے اللہ نواز خان کی کار کے لیے ولسن کی کوٹھی کا گیٹ کھولا تھا اس روز جب وہ لوگ مجھے وہاں لے کر پہنچے تھے۔ ڈرائیونگ میں نے شرافت علی کے سپرد کر دی تھی اور خود راہ گیروں کے چہرے دیکھتا جا رہا تھا لیکن لاہور کوئی چھوٹا موٹا چند سو یا ہزار کی آبادی کا شہر تو نہیں ہے جو میں اس طرح کسی خاص چہرے کو ڈھونڈ نکالتا وہاں سے اچانک مجھے خیال آیا کہ جانِ عالم کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ

اُدھر مریدکے میں کوئی کیمیکلز فیکٹری تھی جہاں مختلف گیسیں تیار کی جاتی تھیں، اس فیکٹری میں شیئر تھا ولسن کا۔ یہ یاد آتے ہی میں نے شرافت علی سے کہا۔ "اوئے شرافت! یار اُدھر گوجرانوالہ جانے والے روڈ پر گاڑی ڈال دے۔ میں بھی کیسا بھُس بھرے دماغ کا آدمی ہوں۔ بھول ہی بیٹھا تھا اس بات کو۔"

"کون سی بات بھول گئے تھے تم؟ کیا یہ کہ وہ گوجرانوالہ میں رہتا ہے؟" شرافت علی بریک لگا کے گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

"نہیں یار! گوجرانوالہ نہیں جانا ہے ہمیں۔ ادھر گوجرانوالہ والے روڈ پر کوئی پچاس پچپن میل پر ایک جگہ ہے مریدکے، وہاں ایک کیمیکلز فیکٹری ہے جس میں ولسن کا بھی حصہ ہے۔ وہاں سے پتا مل سکتا ہے ہمیں اس کا۔" میں نے اسے بتایا۔

"پچاس پچپن میل!" شرافت علی آنکھیں وا کرکے حیرت سے بولا۔ "شام کے پانچ بج رہے ہیں اس وقت۔ اب ہم وہاں جائیں گے تو واپسی کب تک ہو سکے گی؟ یہ بھی خیال ہے تمھیں؟ اور شام تک ہم واپس گھر میں نہ پہنچے تو وہاں لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ کتنے پریشان ہوں گے وہ؟"

"ہاں یار! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے تُو۔ چل پھر پہلے گھر واپس چل، اس کے بعد مریدکے چلیں گے ہم۔" میں نے اس سے کہا۔

شرافت علی مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میری دماغی صحت پر شک کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ "تیرا دماغ ٹھیک کام کر رہا ہے نا جیلانی؟"

"ہاں ہاں، بالکل۔ تجھے اس پر شک کیوں ہو رہا ہے۔ کیا میں نے کوئی ایسی ہی بات کہہ دی ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"او پاگل آدمی! یہ وقت ہے اتنے لمبے سفر کا۔ رات کو وہاں پہنچ کر تو کیا فیکٹریوں کے گیٹ کھڑکاتا پھرے گا۔ کون بتائے گا تجھے ولسن کا پتا؟ کون ایسا آدمی بیٹھا ہوگا آٹھ نو بجے رات کو وہاں جسے پتا معلوم ہوگا اس کا؟" شرافت علی نے میرے ہی انداز میں جواب دیا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ولسن کی فیکٹری کے بارے میں یاد آتے ہی میں ہر بات بھول کر جلد از جلد وہاں پہنچنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ اس کی بات سن کر مجھے اس کا خیال آیا کہ یہ وقت کسی ایسے کام کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے مسکراتے ہوئے شرافت علی کو دیکھ کر کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے یار! میرا دماغ الٹ گیا تھا شاید اس لمحے۔ اسی لیے تو تجھے ساتھ لے کر نکلا تھا میں گھر سے کہ تو بھٹکنے نہیں دے گا مجھے۔"

صبح ہم دونوں کو مریدکے جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر فاطمہ بولی۔ "آج میں بھی آپ کے ساتھ چل رہی ہوں جنابِ عالی!"

"کیوں بھئی، ایسی کیا خاص بات ہو گئی ہے آج؟" میں نے اس کی بات سُن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں ولسن کی موجودگی کا امکان بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا آج میرا بھی ساتھ جانا ضروری ہے۔ اپنے چہرے مہرے اور رنگ روپ کی بنا پر میں یورپین لگتی ہوں اور جب میں اس فیکٹری میں جا کر ولسن کے بارے میں معلوم کرلوں گی تو کوئی ذرا بھی شبہ نہیں کرے گا مجھ پر اور آسانی سے اس کا پتا مل جائے گا مجھے۔ جبکہ کوئی مقامی شخص اس کا پتا معلوم کرے گا تو اس سے بے شمار سوالات کیے جائیں گے۔ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں ملنا چاہتے ہو ولسن صاحب سے؟ کیا کام ہے تمھیں ان سے؟ کس نے بھیجا ہے تمھیں؟ کیا نام ہے تمھارا؟ اس طرح کے بیسیوں سوالات کرکے پہلے آپ کا مکمل جغرافیہ معلوم کیا جائے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مطمئن ہو گئے تو پتا بتائیں گے ورنہ کہہ دیا جائے گا، پیغام چھوڑ جایئے اپنا، ہم ولسن صاحب تک آپ کا پیغام پہنچا دیں گے۔ انھوں نے ضروری سمجھا تو مل لیں گے وہ آپ سے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں اس کا پتا معلوم کرنے کے لیے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا جبکہ تمھارے لیے یورپ کے کسی بھی ملک کا نام لے کر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ تم وہاں سے آئی ہو اس سے ملنے کے لیے۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے بھئی چلو پھر تم بھی تیار ہو جاؤ جلدی سے۔ آج یہ کام بھی نمٹا ہی لینا چاہیے ہمیں۔"

مریدکے میں دو ہی کیمیکلز فیکٹریاں تھیں اور دوسری فیکٹری ولسن کیمیکلز کے نام سے ہی صاف ظاہر تھا کہ یہی وہ فیکٹری ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ فاطمہ کار سے اُتر کر فیکٹری کے اندر چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے واپس آکر بتایا۔ "لیں جنابِ عالی! یہ تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا یہاں آنے سے۔ آپ خواہ مخواہ ہی لاہور شہر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ وہ جس کی آپ کو تلاش تھی، وہ تو یہاں چھپا بیٹھا ہے، پھر لاہور میں کیسے مل سکتا تھا وہ آپ کو۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینے سے وہ فیکٹری کے احاطے کے اندر ہی ایک بنگلے میں رہ رہا ہے۔"

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے تلاش کر لیا ہے اسے:" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا یار شرافت علی! اور تم پر اسے کسی طرح کا شک تو نہیں ہو سکا ہے فاطمہ؟ ہوشیار تو نہیں ہو گیا ہے وہ؟"

"اس کا فی الحال تو سوال نہیں پیدا ہو سکتا جنابِ عالی! کیونکہ ابھی اسے ہمارے یہاں آنے کی خبر نہیں ہو سکی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے؟ کیا وہ ملا نہیں تمھیں یا تم نے...؟" میں نے

اس سے پوچھنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

"وہ یہاں ہے نہیں اس وقت، لاہور گیا ہوا ہے، رات تک واپس آئے گا۔ گھر میں صرف مسز ولسن ہے۔"

"پھر تو ہمیں لاہور سے واپس آتے ہوئے راستے ہی میں دھر لینا چاہیے اسے۔ گھر تک پہنچنے میں خطرات زیادہ بڑھ جائیں گے۔ وہ فیکٹری میں رہتا ہے جہاں ہر وقت کام کرنے والوں اور نگہبانوں کا ہجوم رہتا ہے، اگر نوبت مقابلے کی آگئی تو اس کے مددگار بہت سے جمع ہو جائیں گے وہاں، لہٰذا جان بوجھ کر خطرے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔" میں نے کہا۔

"فیکٹری میں صبح سات بجے سے رات گیارہ بجے تک کام ہوتا ہے۔ گیارہ بجے کے بعد وہاں لیبر اور اسٹاف نہیں رہتا۔ صبح کے سات بجے تک صرف دربان ہوتے ہیں جن سے نمٹنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ چار چھ آدمی خطرہ نہیں بن سکتے ہیں ہمارے لیے۔ لیکن پھر بھی یہ زیادہ بہتر ہے کہ اسے لاہور اور مریدکے کے درمیان ہی کسی مقام پر روک لیا جائے۔" وہ بولی۔

"یہاں سے کوئی دس بارہ میل پر ہم نے ایک گھنا جنگل سا دیکھا تھا، میرا خیال ہے اسے وہیں روکا جائے۔" شرافت علی بولا۔

"ہاں، وہ جگہ میرے ذہن میں بھی محفوظ تھی، بہترین جگہ ہے وہ، سالے کو مار کر جنگل میں ڈال دیں گے، صبح تک جنگلی جانور اس کی لاش کو شناخت کے قابل بھی نہیں رہنے دیں گے اور جب تک اس کی شناخت ہو گی ہم اس کے بہت سے ساتھیوں کے کریا کرم سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ کیا خیال ہے فاطمہ تمھارا؟" میں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"بہت اچھا خیال ہے۔ فتح اسی کو نصیب ہوتی ہے جو حملے میں پہل کر جاتا ہے۔" فاطمہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرکے واپسی کے لیے موڑی تو اچانک عقب نما آئینے میں مسز ولسن کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ میں نے جلدی سے فاطمہ سے کہا۔ "یہ لو، یہ مسز ولسن آرہی ہے ہماری طرف۔ شاید جن لوگوں سے تم نے بات کی تھی فیکٹری کے اندر ان میں سے کسی نے اس کو اطلاع دے دی ہے تمھارے بارے میں۔ تم اس سے بات کرکے تسلی کرا دو اس کی ورنہ یہ ولسن کو ہوشیار نہ کر دے لاہور ٹیلی فون کرکے۔ ولسن کے مشاغل کا اسے علم ہے اچھی طرح سے اور اس کے دوستوں اور دشمنوں کو بھی جانتی ہے یہ لہٰذا اس کو مطمئن کرنا بے حد ضروری ہے۔ گاڑی کے قریب نہ آنے دینا اسے، یہ مجھے پہچانتی ہے۔ سان فرانسسکو بھیجنے کے لیے میرا پارسل بناتے وقت یہ بھی موجود تھی ولسن کے ساتھ۔ اس کا خیال رکھنا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے مجھے کوئی جواب دیے بغیر اپنی جانب کا دروازہ کھول کر پیر باہر نکال دیا گاڑی سے نیچے اترنے کے لیے۔ میں نے فوراً ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ فاطمہ کار سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتی مسز ولسن کے پاس جا پہنچی۔ میں عقب نما آئینے میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس طرح والہانہ انداز میں ملی تھیں ایک دوسرے سے جیسے کہ شناسا ہوں ایک دوسرے کی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ایسی ہی خوشی اور مسرّت کا اظہار کیا تھا جیسے دو بچھڑے ہوئے پرانے دوست یا عزیز اچانک ملنے پر کرتے ہیں۔ شرافت علی بھی گردن موڑے انہی دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "لے بھائی جیلانی! اب جان نہیں چھوٹنے کی تیری۔ یہ دونوں تو بہت پرانی واقف لگتی ہیں ایک دوسرے کی۔ مسز ولسن اب چھوڑے گی نہیں فاطمہ کو۔"

میں نے کہا۔ "لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے یار! اس سے پہلے کہ وہ دونوں اِدھر آئیں، تم گاڑی سے اُتر کر خود ہی ان کے پاس پہنچ جاؤ۔ لگتا ہے فاطمہ کو اسے یہاں آنے سے روکنے میں بہت دشواری ہو گی۔ تم جا کر مشکل آسان کر دو یار اس کی۔"

شرافت علی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھائی! اب تو مجھے ہی جانا پڑے گا ان کی طرف۔"

وہ کار سے اُتر کر ان کی طرف چل دیا۔ قریب پہنچنے پر فاطمہ نے شاید اس کا تعارف کرایا تھا مسز ولسن سے۔ مسز ولسن نے مسکراتے ہوئے اس سے کچھ کہہ کر شرافت علی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس سے مصافحہ کرنے کے بعد ایک منٹ تک شرافت علی ان دونوں کے ساتھ کھڑا کچھ باتیں کرتا رہا، پھر خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر واپس پلٹ پڑا۔ فاطمہ اور مسز ولسن محبت سے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر فیکٹری کے گیٹ کی طرف چل دیں۔ شرافت علی نے واپس آکر کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو یار بھائی! اب تو فاطمہ کے بغیر ہی جانا پڑے گا تمھیں۔ وہ دونوں سچ مچ بہت گہری دوست ہیں اور چونکہ کئی سال بعد ملی ہیں لہٰذا مسز ولسن اُسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے کسی قیمت پر بھی۔ وہ چند دن اسے ساتھ رکھنا چاہتی ہے اپنے۔"

میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو یقیناً ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے بھی واقف ہوں گی وہ؟"

"ہو سکتا ہے تمھارا خیال درست ہو۔ ناممکن تو نہیں ہے یہ۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"پھر تو یار ہمیں مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے فاطمہ کی طرف سے۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ یہ خیال کیسے آیا تمھارے دل میں؟ اس کی خطرے

والی کیا بات ہے فاطمہ کے لیے ؟" شرافت علی نے حیرانی سے پوچھا۔

" سیدھی سی بات ہے یار! دونوں کی سرگرمیاں ایک ہی جیسی ہیں۔ دونوں کا تعلق ایک ہی تنظیم سے ہے۔ تو کیا مسٹر ولسن کو فاطمہ کے منحرف ہو جانے کی اطلاع نہیں ملی ہوگی؟ دونوں کی دوستی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، تنظیم کا مفاد اور اس سے وفاداری ہر تعلق سے برتر ہے ان کے لیے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ کوئی شخص تنظیم کو نقصان پہنچا رہا ہے یا اس سے باغی ہو گیا ہے...."

شرافت علی میری بات کاٹ کر بولا "میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کہہ رہے ہو۔ لیکن ایک بات بھول رہے ہو تم۔ آئزک آخری وقت تک یہ نہیں جان سکا تھا کہ فاطمہ باغی ہو چکی ہے تنظیم سے۔ اس نے ہیڈ کوارٹر کو جو رپورٹیں بھیجی تھیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ شبہ تک ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ فاطمہ کے ساتھ وہ اپنے اقتدار کی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اور جب اُسے حقیقت کا علم ہوا تو کسی کو کچھ بتانے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی اسے۔ اب تم بتاؤ مسٹر ولسن کیا جانتی ہو گی اس کے بارے میں؟" شرافت علی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

" ہو سکتا ہے آئزک کے خلاف اس کی بغاوت ہی کی خبر ملی ہو اسے۔ میرا مطلب ہے، آئزک یہاں کا سربراہ تھا۔ یہ سب لوگ ماتحت تھے اُس کے۔ اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ انھیں فاطمہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا حکم دے سکے۔ چنانچہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اس نے فاطمہ کے خلاف استعمال کیا تھا ان میں سے کسی کے ذریعے ولسن کو ان کے درمیان ہونے والی جنگ کی اطلاع مل گئی ہو اور اب وہ فاطمہ کو اپنے سامنے دیکھ کر کوئی کارروائی کر بیٹھے اس کے خلاف۔" میں نے اس سے کہا۔

" لگتا ہے تم سچ مچ دل ہار بیٹھے ہو اس سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فاطمہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے، اسے قابو کرنے کے لیے اچھی خاصی تربیت یافتہ فوج کا ایک دستہ چاہیے، تم اس کے بارے میں اس طرح سوچ رہے ہو۔ عشق نے تمھاری عقل خراب کر دی ہے۔ ایسے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے بھائی! اچھے اچھوں کی مت مار دیتا ہے یہ عشق خانہ خراب۔ اس مرض میں سب کا یہی حال ہوتا ہے پیارے! اس میں تمھارا قصور بالکل نہیں ہے۔ تمھیں کوئی الزام نہیں دوں گا میں۔" وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

" ادئے زبان کو لگام دے کے رکھ اپنی! یہ کیا یاوہ گوئی کرنے لگا ہے تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟ میں نے بھڑک کر کہا۔

" میری طبیعت کی فکر نہ کر برادر سا اپنی نبض دکھا دے چل کر کسی حکیم حاذق کو۔ تیرا مرض لاعلاج ہونے لگا ہے شاید...."

" بک نہیں ادئے۔ دماغ نہیں خراب کر میرا، نہیں تو یہ گاڑی ٹکرا دوں گا ابھی کسی درخت سے۔" میں نے غصّے سے کہا۔

وہ ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر بولا "نہ.... نہ یار! ایسا نہیں کرنا۔ ابھی بڑے کام باقی ہیں اس دنیا میں میرے اور تیرے کرنے کے لیے۔ ابھی تو دشمن بھی زندہ ہے اپنے چاروں گردوں کے ساتھ۔"

اس نے یہ بات اس طرح کہی تھی کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی میں نے کہا "یار شرافت علی! آدمی تو تو بھی اچھا خاصا ہی ذلیل ہے۔ میں تو پہلے ہی دن سے کہہ رہا ہوں کہ تیرا یہ نام بہت ہی غلط رکھا گیا ہے۔ بالکل نہیں سجتا یہ تیری شخصیت پر۔ اور خبیث آدمی یہ تو نے اس دشمن کے چار گردے کب دریافت کر لیے تھے، وہ کون سی ایکسرے مشین ہے تیرے پاس جس نے بیٹھے بیٹھے یہ رپورٹ ارسال کر دی ہے تجھے؟"

" ایسی باتیں دماغ کی ایکسرے مشین بتاتی ہے بشرطیکہ وہ موجود ہو کسی کے دماغ میں۔ کچھ دماغ ایسے ہوتے ہیں جن میں بس بھیجا ہی ہوتا ہے۔ خالی خولی گنڈیری کے پھوک کی طرح کا۔ جو کام دشمن کرتا پھرتا ہے وہ کسی عام سے آدمی کے بس کے نہیں ہیں، ان کے لیے بڑے دل گردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ گردے نکال لینے کے فن میں طاق ہے وہ۔ للہذا اودفاضل گردے اپنے جسم میں داخل کر لینا اس کے لیے کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے دل بھی دو لگائے پھرتا ہو وہ۔"

" بات تو تیری کسی حد تک ٹھیک ہی لگتی ہے یار! جب بھی ہاتھ آگیا وہ ہمارے اسے کھول کر دیکھیں گے ضرور۔" میں نے کہا۔

" اور وہ عالیہ بیگم سے وعدہ کر لیا ہے آپ نے اس کی توڑ پھوڑ نہ کرنے کا، اس کا کیا ہوگا؟" شرافت علی بولا۔

" وعدہ توڑ پھوڑ نہ کرنے کے سلسلے میں تھا، جب کہ میں نے تم سے کھول کے دیکھنے کی بات کی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

" یہ تم جا کدھر رہے ہو؟ یہ وہ راستہ تو نہیں ہے جس سے ہم آئے تھے؟" شرافت علی چونک کر بولا۔

" فکر نہ کر یار! میں تجھے اغوا کر کے نہیں لے جا رہا ہوں کہیں۔ جہاں بھی جائیں گے ہم دونوں برضا و رغبت ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔

" وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو پتا ہونا چاہیے کہ ہم دونوں آخر جائیں گے کہاں؟" اس نے کہا

" تمھارا کیا خیال ہے۔ ولسن کی واپسی تو رات تک ہوگی۔ اب کیا ہم رات تک فیکٹری کے سامنے ہی کھڑے رہیں اس کے انتظار میں؟ میں تو ایسا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا کسی ایسے ہوٹل شوٹل کی تلاش میں جا رہا ہوں جہاں انتظار کے یہ بور گھنٹے گزر سکیں آسانی سے۔"

" میرا خیال ہے یہاں کوئی معقول جگہ تو ہوگی نہیں ایسی جہاں یہ وقت گزارا جا سکے۔ ابھی صرف ڈھائی بجے ہیں۔" شرافت علی بولا۔

" کیوں نہ کسی سینما ہال میں چل کر بیٹھا جائے۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے یار فلم دیکھے ہوئے۔ اس بہانے فلم ہی دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا۔

" ہاں، یہ ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ یہاں سینما ہال تو ہوگا ہی، میٹنی شو دیکھ لیتے ہیں چل کر۔" شرافت علی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک پکچر ہاؤس دکھائی دے گیا ہمیں۔ فلم شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں نے بالکنی کی دو ٹکٹیں لیں اور باہر نکل آئے۔ بھوک بہت زور سے لگ رہی تھی ہم دونوں کو ہی۔ پکچر ہاؤس کے سامنے ایک چھوٹا سا لیکن ذرا صاف ستھرا ہوٹل دیکھ کر ہم وہاں جا گھسے۔ ہوٹل میں رش بالکل بھی نہیں تھا۔ دور دور تین میزوں پر کچھ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، دو میزوں پر تو مقامی آدمی تھے۔ کلرک قسم کے لوگ لگتے تھے وہ، شاید کسی فیکٹری میں ملازمت کرتے ہوں گے، ایک میز پر ایک ہپّی قسم کا یورپین جوڑا بیٹھا تھا۔ میلے کچیلے لباس میں ملبوس لمبی بکرے جیسی داڑھی اور الجھی ہوئی لمبی لمبی سنہری زلفوں والا سرخ و سفید نوجوان جس کی عمر بیس یا بائیس سال سے کسی طرح زیادہ نہیں لگتی تھی، اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ عمر میں اس سے چار پانچ سال چھوٹی لگتی تھی۔ لباس اس کا بھی میلا کچیلا ہی تھا لیکن بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے جن کی دو چوٹیاں بنا کر اس نے دونوں شانوں پر آگے کی طرف ڈال رکھی تھیں۔ چہرے پر بھی اس کے نوجوان کے مقابلے میں خاصی شادابی تھی۔ رخساروں سے خون جھلک رہا تھا۔ چہرے سے کم سنی کا کچا پن اور آنکھوں سے معصومیت جھانکتی نظر آتی تھی۔ ہم دونوں ان کے پیچھے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے، ان دونوں کے سامنے کچھ کیک اور بسکٹ وغیرہ رکھے تھے اور دو پیالیوں میں چائے بھی رکھی تھی جس سے تیز بھاپ اٹھ رہی تھی، وہ بسکٹ کھاتے ہوئے کسی مسئلے پر بحث میں مصروف تھے، ان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں لڑکی کی زبان سے مسٹر ولسن کا نام سن کر چونکا تھا۔ اور پھر فوراً ان کے پیچھے والی میز پر جم گیا تھا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے کان ان دونوں کی آوازوں پر لگا دیے، وہ انگریزی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ شرافت علی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے اور قریب بیٹھے ہوئے نوجوان جوڑے کی باتیں توجہ سے سننے کا اشارہ کیا، اس نے ایک لمحے کو چونک کر مجھے دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے لڑکی کے الفاظ نے اسے ان کی طرف متوجہ کر دیا۔

لڑکی کہہ رہی تھی "یہاں کے لوگ میری سمجھ میں نہیں آئے ہیں راجر! انھیں اپنے وعدوں کا ذرا بھی پاس لحاظ نہیں ہے، اب یہ کشمیر خان وعدے کے مطابق ہمیں کراچی ہی میں مال دے دیتا تو اب تک ہم جرمنی واپس پہنچ چکے ہوتے اور...."

اس کا ساتھی جسے اس نے راجر کے نام سے مخاطب کیا تھا، اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "اوہ ہیلن ڈیئر! ایسی باتیں نہیں کرو، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، یہ پہلا موقع ہے کہ ہمیں مسٹر آئزک کا اسٹاک برباد ہو جانے کی وجہ سے پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے، ہمیشہ کشمیر خان مقررہ وقت سے پہلے ہی مسٹر آئزک کے پاس مال پہنچا دیا کرتا تھا اور ہم کراچی پہنچتے ہی مسٹر آئزک سے مال لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ مسٹر آئزک کے کسی دشمن نے ان کا سارا اسٹاک برباد کر کے انھیں اور ان کے تقریباً سارے ہی ساتھیوں کو ختم کر دیا تو پریشانی ہوئی ہے ہمیں۔ وہ تو شکر کرو ربانی نے ہمیں مسٹر ولسن کا ایڈریس دے کر یہاں بھیج دیا نہیں تو اس بار خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑتا ہمیں۔ میں صرف تمھاری وجہ سے یہاں تک آیا ہوں ورنہ مجھے یوں دھکے کھانے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ واپسی پر رپورٹ دے دیتا کہ ادھر یہ گڑبڑ ہو گئی ہے جس کی وجہ سے مال نہیں ملا ہے مجھے۔"

" میری وجہ سے کیوں دھکے کھا رہے ہو؟ میں نے تو نہیں کہا تھا تم سے کہ مال لے کر ہی چلنا ہے واپس؟" لڑکی جس کا نام ہیلن لیا تھا راجر نے، بولی۔

" تم ابھی نئی ہو، تمھیں معلوم نہیں ہے اس طرح کے دھندے کرنے والے کس قدر توہم پرست ہوتے ہیں۔ تم پہلی بار آئی ہو میرے ساتھ چنانچہ ہم مال لیے بغیر واپس چلے جاتے تو اس ناکامی کا ذمے دار تمھیں ٹھہرا دیا جاتا۔ تم منحوس قرار دے دی جاتیں۔ کیوں کہ تم اپنے پہلے ہی ٹرپ سے ناکام جاتیں لہٰذا اوپر والے بے جھجک تمھاری موت کا حکم صادر کر دیتے۔" راجر نے اسے بتایا۔

لڑکی کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ وہ سہم کر بولی "لیکن کیوں؟ میرا کیا قصور تھا اس میں؟"

" بات قصور کی نہیں ہے ہیلن ڈیئر! پہلے چوں کہ کبھی ایسا

نہیں ہوا تھا لیکن تمھارے پہلی بار آتے ہی ایسا ہو گیا لہٰذا اسے تمھاری نحوست ہی کہا جاتا اور کسی منحوس ہستی کو اپنے درمیان رکھنا ان کے نزدیک اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے چنانچہ تمھارا قصہ ختم کر کے وہ اپنے آپ کو اور اپنے کاروبار کو برباد ہونے سے بچا لیتے۔" راجر نے اسے بتایا۔

"یہ بڑی جہالت والی بات ہے اگر وہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ یہ اتفاق تو کبھی بھی ہو سکتا تھا۔" وہ بولی۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہو، وہ لوگ اس طرح نہیں سوچتے ہیں۔ میں تمھیں اتنی کم عمری میں موت کے منہ میں جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہیلن! تم نے ابھی تو آنکھ کھول کر دنیا کو دیکھنا شروع ہی کیا ہے۔ یہ عمر دنیا چھوڑ جانے کی نہیں ہوتی۔"

ہیلن خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اسے فکرمند دیکھ کر راجر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر مت کرو ڈارلنگ! ہم خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے امید ہے مسٹر ولسن ہماری مشکل آسان کر دیں گے۔ ربانی نے بتایا تھا کہ وہ آئزک کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا خط دیکھتے ہی وہ ہماری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ چلو اب جلدی سے چائے پی لو پھر ہم چلتے ہیں مسٹر ولسن کی فیکٹری پر۔"

اس کے بعد انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی۔ وہ دونوں سر جھکا کر کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ ہیلن بہت آہستہ آہستہ کھا رہی تھی، لگتا تھا راجر کی باتوں نے اسے بہت ہی خوفزدہ اور فکرمند کر دیا تھا۔ ہمارا کھانا بھی آ چکا تھا اور ہم دونوں بھی کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کراچی سے کسی ربانی نامی شخص نے ولسن کے نام خط دے کر یہاں بھیجا ہے۔ یہ ربانی کون ہے؟ کہیں یہ وہی ربانی تو نہیں ہے جس کے گھر سے ہم نے آئزک کے خلاف کارروائی کی تھی؟ میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا منظر ابھر آیا، جب ہم نے ربانی کے گھر میں اسے، اس کی بیوی اور باپ کو آئزک کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ سب کچھ جان لینے کے بعد ربانی ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر اس کے باپ نے ہماری حمایت نہ کی ہوتی اور اس کی بیوی ہمارا ساتھ نہ دیتی تو وہ شاید کبھی بھی ہمیں اپنے مکان میں برداشت نہیں کرتا۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے انور کمال کو ایک عدد اسٹین گن کے ساتھ اس کے سر پر مسلط کر دیا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ جب ہم آئزک اور اس کے چیلوں سے نمٹنے میں مصروف تھے وہ پیچھے سے ہم پر آ پڑتا اور بازی الٹ کر رکھ دیتا ہماری۔

میں نے فیصلہ کیا کہ راجر اور ہیلن کو شیشے میں اتار کر ان سے ربانی کے بارے میں مزید معلوم کروں گا اور اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ وہی ربانی ہے تو دشمن سے نمٹنے کے بعد اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنانے کے لیے ایک بار پھر کراچی جاؤں گا۔

جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ہوٹل والے کو پیسے پکڑائے اور شرافت علی کو بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے باہر لے آیا۔ شرافت علی میری اس حرکت پر حیران ہو رہا تھا۔ بولا۔

"بازو تو چھوڑ و بھائی میرا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے، ابھی پندرہ منٹ ہیں فلم۔۔۔"

"اوئے لعنت بھیجو یار اس فلم پر۔" باہر آ کر میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم نے ان دونوں کی باتیں نہیں سنیں؟"

"اوہ یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ان کی باتیں سننے کے بعد بھی فلم دیکھنے کی اتنی جلدی ہے تمھیں کہ انھیں وہیں چھوڑ کر نکل آئے ہوٹل سے۔ میرا خیال ہے یہ اسی ربانی کا ذکر کر رہے تھے جس نے اپنا مکان آئزک کو اپنے حصے کی سانسیں پوری کرنے کو دیا تھا۔"

"ہاں یار! مجھے بھی یہی شک ہو رہا ہے ان کی باتوں سے۔ ہوٹل سے میں اس لیے نکل آیا ہوں کہ ان دونوں کو کسی طرح اپنی کار میں ڈال کر لاہور لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں جا کر دیکھیں گے ہم کہ انھیں لیٹر کس ربانی نے دیا ہے ولسن کے نام اور کیا لکھا ہے اس میں اس نے۔ اگر اس لیٹر کے ذریعے ولسن کو آئزک کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے تو اس کو ولسن تک نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"اگر صرف اطلاع ہی دینا ہوتا تو وہ ٹیلی فون کے ذریعے بھی دی جا سکتی تھی، اس کے لیے راجر جیسے شخص کو یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا خیال ہے اس کو صرف یہ لیٹر دے کر بھیجا گیا ہے کہ ولسن اسے مال فراہم کر دے۔ وہ محض سفارشی لیٹر ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو، مگر پھر بھی ہمیں اس لیٹر کو دیکھنا ضرور چاہیے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ ایسے معاملے کی اطلاع دینے کے لیے ٹیلی فون کا استعمال مناسب نہیں سمجھا ہو اس نے۔ فون پر بات غیر متعلقہ کانوں تک بھی پہنچنے کا امکان رہتا ہے۔ ایسے نازک اور خوف ناک قسم کے مسئلے ٹیلی فون یا خط و کتابت میں نہیں چھیڑے جاتے۔ یار کیا ہوا ہے تجھے؟ کیسی عجیب عجیب باتیں کرنے لگا ہے تو؟" میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں یار! بات تو ٹھیک ہی لگتی ہے تمھاری جیلانی! حیرت ہے یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں سما سکی تھی۔" شرافت علی بولا۔ "اس کا تو یہ مطلب ہے کہ اس وقت ہمارا ادھر آنا کافی فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ یہ لوگ ہمیں نہیں ملتے تو ہم اندھیرے میں ہی ہاتھ پیر مارتے رہ جاتے۔ یہی سمجھتے رہتے ہم کہ ولسن کو کچھ معلوم نہیں ہے فاطمہ کے بارے میں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ اب تم کسی طرح ان دونوں کو اپنی کار میں ٹھونسنے کی کوشش کرو شرافت علی!" میں نے اس سے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو یہ دونوں یہاں سے اٹھ کر ولسن کیمیکلز فیکٹری کی طرف ہی جائیں گے۔ تم جاؤ جلدی سے کار ادھر لے آؤ اور ذرا فاصلے پر رک کر انتظار کرو، وہ دونوں جب میرے قریب پہنچیں تو تم فوراً گاڑی میرے پاس روک دینا اور مجھ سے کہنا جلدی کرو ولسن صاحب ناراض ہوں گے دیر ہو گئی تو۔ ولسن کا نام ان کے کانوں تک پہنچے گا تو وہ ضرور چونکیں گے اور امید ہے ہم سے ولسن کے بارے میں پتا کریں۔ پھر میں انھیں سنبھال لوں گا۔"

میں سمجھ گیا وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا جلدی جلدی اس جگہ پہنچا جہاں ہم نے کار کھڑی کی تھی۔ کار اسٹارٹ کر کے موڑتے ہوئے میں نے ان دونوں کو ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ادھر ہی جا رہے تھے جدھر شرافت علی کھڑا تھا۔ میں تیزی سے کار دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا اور شرافت علی سے چند قدم آگے پوری قوت سے بریک لگا کر گاڑی روک دی اور کھڑکی میں جھک کر زور سے چلایا۔ "جلدی آؤ بھئی ولسن صاحب جان سے مار دیں گے اگر دیر ہو گئی ہمیں وہاں پہنچنے میں تو۔"

میری آواز سن کر وہ دونوں چونک کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ متوجہ تو وہ اسی وقت ہو گئے تھے جب میری کار کے بریک زوردار آواز سے چیخے تھے۔ البتہ میری زبانی ولسن کا نام سن کر ان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا ردعمل عین شرافت علی کی توقع کے مطابق تھا۔ راجر ایک لمحے کو ٹھٹکا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ میری گاڑی کی طرف لپکتے ہوئے چلا کر بولا۔ "ہے مسٹر۔۔۔!"

میں نے اور شرافت علی نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا۔ "پلیز کیا آپ ہمیں مسٹر ولسن کا پتا بتا سکتے ہیں؟ ولسن کیمیکلز والے مسٹر ولسن کا۔ آپ لوگ جانتے ہیں نا انھیں؟"

شرافت علی بولا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" پھر وہ ہیلن کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں راجر اور ہیلن ہو؟"

اس وقت تک ہیلن بھی اس کے پاس پہنچ چکی تھی شرافت علی کی زبانی اپنا نام سن کر دونوں نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ راجر نے کہا۔ "آپ لوگ جانتے ہیں ہمیں۔ حیرت ہے میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"دیکھا تو میں نے بھی نہیں تھا پہلے کبھی تمھیں۔ ابھی چند منٹ پہلے ہوٹل میں دیکھا تھا پہلی بار لیکن اس وقت میں نہیں پہچان سکا تھا تمھیں۔ اب بھی اگر تم مسٹر ولسن کا پتا نہیں پوچھتے تو میں نہیں پہچان سکتا تھا کہ تم کون ہو۔" شرافت علی بولا۔

"اوہ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر ولسن کو ہمارے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔" راجر نے مطمئن انداز میں کہا۔

"ہاں، کل کراچی سے ربانی کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تم کوئی رپورٹ لے کر آ رہے ہو یہاں۔ آؤ بیٹھو۔" شرافت علی نے کہتے ہوئے بڑھ کر کار کی عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

وہ دونوں شرافت علی کا شکریہ ادا کر کے کار میں بیٹھ گئے۔ شرافت علی کے بیٹھتے ہی میں نے کار آگے بڑھا دی۔ راجر بولا۔ "ہماری قسمت اچھی تھی کہ آپ لوگوں سے یوں ملاقات ہو گئی اور ہم دھکے کھانے سے بچ گئے۔"

"ہاں، اس میں تو شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ تقدیر نے اس وقت تمھیں بڑی خواری سے بچا لیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ تم ہمیں ایسے وقت مل گئے ہو جب ہم خود بھی مسٹر ولسن ہی کے پاس جا رہے ہیں۔ اگر یہ اتفاق نہ ہوتا تو ابھی کم از کم دو دن تو تم نہیں مل سکتے تھے مسٹر ولسن سے، اور یہ دو دن تمھیں کسی درخت کے سائے میں گزارنا پڑتے۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

"کیوں؟ دو دن کیوں نہیں مل سکتے تھے ہم مسٹر ولسن سے اور یہ دو دن درخت کے نیچے کیوں گزارنا پڑتے ہمیں؟" اس نے پوچھا۔

"وجہ اس کی یہ ہے میرے بچے کہ مسٹر ولسن یہاں نہیں ہیں۔ تم فیکٹری پر جاتے تو تم کو جواب ملتا۔ سوری! مسٹر ولسن تو لاہور گئے ہوئے ہیں، آپ لوگ دو روز بعد آئیں۔ یہ جواب سن کر تم کہاں جاتے مسٹر راجر؟"

"اوہ، تو کیا مسٹر ولسن یہاں نہیں ہیں؟ پھر ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ تم تو کہہ رہے تھے۔۔۔" راجر نے کہا۔

شرافت علی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "گھبراؤ نہیں، ہم مسٹر ولسن کے پاس لاہور جا رہے ہیں۔ وہیں ملا دیں گے ان سے تمھیں۔ ویسے اگر تم لاہور جا کر نہیں ملنا چاہتے ان سے تو پھر ہم تمھیں اتار دیتے ہیں یہیں، دو دن بعد جب وہ آئیں تو مل لینا۔"

"نہیں نہیں مسٹر! آپ شاید بُرا مان گئے۔ اگر مسٹر ولسن لاہور میں ہیں تو ہم وہاں ضرور چلیں گے۔" راجر نے جلدی سے کہا۔

"میں نے کہا تو ہے نا کہ مسٹر ولسن لاہور میں ہیں اور ہم ان کے پاس ہی جا رہے ہیں۔" شرافت علی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوہ مسٹر! آپ راجر کی بات کا بُرا نہ منائیں، اس کی تو عادت ہے فضول بکواس کرنے کی۔ ہم یہاں مسٹر ولسن کے پاس ایک میسج لے کر آئے ہیں کراچی سے اور ہمیں بھی ان سے بے حد ضروری کام ہے، آپ ہمیں ساتھ لے چلیں اپنے۔" ہیلن عاجزی سے بولی۔

"ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے کون سا ضروری کام ہے تمھیں مسٹر ولسن سے۔ اطمینان رکھو، تم جتنی چاہو گے ہیروئن مل جائے گی تمھیں، لیکن اسے یہاں سے کراچی اور پھر وہاں سے جہاں بھی لے جانا ہو، اپنی ہی ذمّے داری پر لے جانا ہوگا تمھیں۔ مال دینے کے بعد ہماری کوئی ذمّے داری نہیں ہوگی۔ یہ بات اس ربانی نے بتائی تھی تمھیں یا نہیں؟" میں نے اس کے دل میں اپنے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو ختم کر دینے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کی، جیسے ہمیں ان کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ میری بات سُن کر راجر جلدی سے بولا تھا "اوہ نو، مسٹر! آپ مسٹر ولسن کو بتا دیں، ہم انھیں بالکل تکلیف نہیں دیں گے، حالاں کہ پہلے کبھی ہم نے مال کے ساتھ پاکستان کے اندر سفر نہیں کیا ہے، پھر مجھے امید ہے کہ ہم مال لے کر چلے جائیں گے، کوئی ایسی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی ہمیں۔"

میں نے کہا "وہ رپورٹ کہاں ہے جو ربانی نے بھیجی ہے تمھارے ہاتھ؟"

"رپورٹ؟ کیسی رپورٹ؟ کس رپورٹ کی بات کر رہے ہیں آپ۔ ہمیں رپورٹ تو کوئی نہیں دی ربانی نے، صرف لیٹر دیا ہے مسٹر ولسن کے نام انھوں نے تعارفی لیٹر ہم دونوں کے بارے میں۔" راجر نے قدرے حیران ہو کر جواب دیا۔

"ہاں ہاں، یہ اس لیٹر ہی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، تم سے لاؤ وہ دے دو ہمیں۔" شرافت علی نے جلدی سے کہا۔

"لیکن وہ تو مسٹر ولسن کے نام ہے، ربانی نے کہا تھا لیٹر ہم مسٹر ولسن ہی کو دیں ـــ" راجر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ایک ہی بات ہے، مسٹر ولسن کو تم براہِ راست نہیں دے سکو گے لیٹر۔ وہ تم ہمیں ہی دو گے، ہم لیٹر لے جا کر مسٹر ولسن کو دیں گے اور اس کو پڑھنے کے بعد وہ ملنا چاہیں گے تم سے، تب ہی ان سے مل سکو گے تم۔ ورنہ مال دے کر رخصت کر دیا جائے گا تم دونوں کو، ضروری نہیں ہے کہ مسٹر ولسن ملاقات کر ہی لیں تم سے۔" شرافت علی نے اس سے کہا۔

"اوہ، لیکن ربانی نے تو کہا تھا....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

مگر میں نے اسے پوری بات کرنے کا موقع نہیں دیا اور غصّے کا اظہار کرتے ہوئے بولا "بھول جاؤ اسے کہ ربانی نے تم سے کیا کہا تھا۔ ہم کوئی تابعدار نہیں ہیں اس کے کہ وہی کریں جو اس نے تمھیں کہا تھا۔ مسٹر ولسن کوئی ربانی یا آئزک نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے منہ اٹھائے چلا جائے ان کے پاس۔ تمھیں اگر مال لینا ہے تو جیسا ہم کہتے ہیں کرو، ورنہ اُتر جاؤ کار سے۔"

میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ شاید اس خیال سے خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں ہم سچ مچ ہی انھیں اپنی کار سے نہ اُتار دیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم ولسن کے بہت ہی خاص آدمی ہیں اور انھیں لے کر ولسن کے پاس ہی جا رہے ہیں، وہ یہ کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے کہ ہم انھیں وہیں دھکّے کھانے کے لیے چھوڑ کر چلے جائیں۔ لہٰذا وہ سہمے ہوئے انداز میں جلدی سے بولا "میرا مطلب یہ تو نہیں تھا..... میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، میں لیٹر آپ کو ہی دے دیتا ہوں۔" اس نے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیں، آپ لے لیں یہ۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ مسٹر ربانی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ لیٹر میں ولسن کے ہی ہاتھ میں دوں۔"

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے لفافہ لے کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "اس نے صرف ولسن صاحب کا نام ہی سنا ہے، ابھی دیکھا نہیں ہے انھیں۔ اس کو پتا نہیں ہے، مسٹر ولسن کے پاس پہنچنا کتنا مشکل ہوتا ہے، ان لوگوں کے لیے جن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ان سے۔ تمھاری قسمت اچھی تھی کہ ہم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم تمھیں ولسن صاحب کے پاس لے جا رہے ہیں، یہ بھی احسان ہے ہمارا۔"

"بالکل بالکل، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر۔" راجر بولتے بولتے رک گیا، پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا "وہ جناب، آپ دونوں ہمارے ناموں سے پہلے ہی واقف تھے، مگر یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے محسنوں کے ناموں سے واقف نہیں ہیں۔ کس طرح مخاطب کریں آپ کو؟"

"ہاں ہاں، یہ صحیح ہے اور یہ غلطی ہے ہماری، ہمیں اپنا تعارف پہلے ہی کرا دینا چاہیے تھا۔ میرا نام ہاشم خاں ہے اور یہ شرافت علی ہیں۔ یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اتنے اچھے کہ محض میری ہی وجہ سے یہ مسٹر ولسن کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں۔ ورنہ تو شاید ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے کبھی۔ اس سے پہلے کراچی میں اچھا خاصا کام تھا ان کا۔ آئزک کے بہت ہی قریبی اور خاص آدمی رہے ہیں یہ۔"

"اچھا اچھا، پھر تو بڑی خوشی ہو رہی آپ لوگوں سے مل کر۔ میں اکثر مسٹر آئزک سے مال لیتا رہا ہوں۔ اس بار بھی انھی کے پاس آئے تھے ہم مال لینے کے لیے لیکن پتا نہیں ان کے دشمن اتنے طاقت ور کیسے ہو گئے کہ ان کا سب کچھ برباد کر دیا انھوں نے۔ ابھی چند مہینے پہلے جب میں آیا تھا تو تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اگلی بار میں انھیں دیکھ تک نہیں سکوں گا۔" راجر نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں، یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ کام ہی ایسا ہے، اس کاروبار میں کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کل بھی اپنی جگہ موجود ہوگا۔ تم شاید نئے ہو ابھی اس لائن میں ورنہ ایسی بات نہیں کہتے، اور یہ تمھاری ساتھی مس ہیلن اناڑی ٹرینگ لگتی ہے۔" میں نے راجر سے کہا۔

"آپ خاصے تجربے کار لگتے ہیں مسٹر ہاشم خاں! یہ بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے، مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اسمگلنگ کرتے ہوئے اور مس ہیلن کا تو یہ پہلا ٹرپ ہے، تربیت تو تین سال سے کی جا رہی تھی ان کی۔ یوں سمجھیں، تربیت کے بعد یہ آزمائشی دور شروع ہوا ہے ان کا۔" راجر نے جواب دیا۔

"بالکل یہی خیال تھا میرا بھی ان کے بارے میں، مرید کے کب پہنچے تھے تم دونوں؟" میں نے موضوع بدل کر اچانک سوال کیا۔

"زیادہ دیر نہیں ہوئی، آپ لوگوں سے ملاقات ہونے سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی آئے تھے ہم۔ جاتے تو ہم سیدھے ولسن کیمیکلز فیکٹری پر ہی لیکن یہ جو ٹیکسی ڈرائیور ہوتے ہیں آپ کے ملک کے، یہ بڑی شاہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ اپنی مرضی سے کرایہ وصول کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے ہی جب اور جہاں چاہتے ہیں، پسنجر کو گاڑی سے اُتار دیتے ہیں۔ ہم جس ٹیکسی میں گئے تھے لاہور سے، اس کے ڈرائیور نے وہاں پہنچ کر اعلان کر دیا کہ اب اس کی گاڑی مزید چند گز آگے بھی نہیں جا سکتی کیوں کہ انجن بہت گرم ہو چکا ہے، اگر اس نے چند سیکنڈ بھی انجن اور چلتے رہنے دیا تو اس میں آگ لگ جائے گی۔ مجبوراً ہم نے وہیں اتر کر اسے کرائے کی ادائیگی کر دی۔ کرایہ ملتے ہی اس نے ایک اور شخص سے لاہور جانے کا کرایہ طے کیا اور اسے بٹھا کر فوراً ہی واپس لاہور کی طرف مڑ گیا۔ ہمارے جانے تک کا انتظار نہیں کیا اس نے۔ کتنی عجیب بات ہے، اس نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا اور اسے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔" راجر نے بتایا۔

"یہ یورپ نہیں ہے مسٹر راجر! جہاں لوگ ایک دوسرے سے اپنے اپنے عیب چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم بہت کھرے اور صاف دل لوگ ہیں، جو کرتے ہیں اعلانیہ کرتے ہیں۔

اب دیکھیں نا، ٹیکسی کا مالک وہ تھا، تم تو نہیں تھے جو وہ تمھاری مرضی سے چلتا۔" میں نے کہا۔

شرافت علی بولا "باتیں چھوڑو یار! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔ ہمیں شام تک واپس بھی آنا ہے، فاطمہ دشمنوں کے درمیان اکیلی ہے۔"

میں نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "اس کی فکر تم نہیں کرو۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا کوئی۔ اور شام تک ہم ہر حالت میں واپس آ جائیں گے۔"

ان دونوں کو لے کر میں سیدھا اپنی کوٹھی پہنچا لیکن یہاں پہنچتے ہی میں اور شرافت علی ایک ساتھ چونکے تھے، میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑتی چلی گئی۔ کوٹھی کا مین گیٹ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور گیٹ کے اندر ایک سیاہ رنگ کی سیڈان کار کھڑی تھی۔ شرافت علی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا، وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ سیاہ سیڈان کار کس کی ہے؟ کون ہے جو اس قیمتی کار میں میری کوٹھی پر آیا ہے؟ لیکن میں اسے کیا بتا سکتا تھا، میں نے وہ کار پہلی بار ہی دیکھی تھی! اور میں اپنے کسی ایسے دوست یا میل ملاقاتی کو نہیں جانتا تھا جو ایسی کار رکھنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ میں نے گیٹ کے باہر ہی اپنی کار روک دی اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کوٹھی کے اندر میرا انتظار کرنے والا میرا دوست ہو سکتا ہے یا دشمن؟ لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ لہٰذا ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر کے میں کار کو اندر لے گیا۔

کار کے اندر داخل ہوتے ہی ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔ "بس غلام جیلانی! کار کو یہیں روک دو اور سب لوگ اپنے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر کار سے باہر نکل آؤ۔ خبردار، کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا، تم لوگ چاروں طرف سے زد میں ہو۔ ہماری اور تمھاری بہن اور ملازمین ہمارے قبضے میں ہیں۔"

میں نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ میرا یار سارنگی نواز اللہ نواز خان اپنے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو مجھ پر تانے کھڑا حقارت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ تھوڑے سے فاصلے پر جانِ عالم بھی موجود تھا، ریوالور کا بوجھ اس نے بھی اٹھا رکھا تھا ہاتھ میں اپنے۔ میری گاڑی کے پیچھے بھی دو آدمی اسٹین گنیں سیدھی کیے کھڑے تھے، انھوں نے کار کے اندر آتے ہی کھلا ہوا گیٹ بند کر دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں گیٹ کھول کر بیٹھے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے شرافت علی کی طرف دیکھے بغیر اس سے کہا "لے پیارے شرافت علی! ہم تو خواہ مخواہ جھک مارتے پھر

رہے تھے وہ تو خود ہی آ گیا یہاں جس کے لیے سارا لاہور چھان مارا ہم نے۔"

اللہ نواز خان نے کڑک کر کہا۔ "جلدی، جلدی کرو، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پہلے ہی دو گھنٹے انتظار کرا لیا ہے تم نے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آ رہا ہوں یار! ایسی بھی جلدی کیا ہے؟ دو ہی گھنٹے میں بور ہو گئے تم۔ مجھے دیکھو، آج چوتھا دن ہے تم لوگوں کو تلاش کرتے ہوئے سارا لاہور الٹ پلٹ کرنے کے بعد ابھی سید ھا مرید کے سے چلا آ رہا ہوں میں۔"

عقبی نشست سے ہیلن کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون لوگ ہیں یہ ہاشم خان! یہ گنیں کیوں اٹھا رکھی ہیں انھوں نے؟"

میں نے اس کی طرف مڑے بغیر جواب دیا۔ "فکر نہ کر بی بی تو، یہ سب اپنے یار بیلی ہیں، ایسے ہی مذاق کرنے کے موڈ میں آ گئے اس ویلے۔"

میں نے یہ بات اُردو میں کہی تھی اس سے جو ظاہر ہے اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ وہ بولی۔ "کیا کہا آپ نے؟ میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کار کا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر پاؤں کار سے باہر دھرتے ہوئے شرافت علی سے کہا۔ "یار شرافت علی! میری بات کا انگریزی ترجمہ سنا دے اس کو اور ان دونوں کے ساتھ تو بھی باہر آ جا گاڑی سے۔ مہمانوں کی تواضع بھی تو کرنا ہے ابھی ہمیں۔"

میرے کمرے میں قدم دھرتے ہی مجھے ولسن کی آواز سنائی دی۔ "اچھا تو آپ تشریف لے ہی آئے مسٹر غلام جیلانی! آئیے آئیے بڑا انتظار کرایا ہے آپ نے ہمیں۔ میں تو اب ناامید ہونے لگا تھا۔"

وہ ایک صوفے پر بڑے آرام سے بیٹھا ہوا تھا، جلتا ہوا سگریٹ ہاتھ میں تھا اس کے اور عالیہ اور انور کمال اس کے سامنے فرش پر بندھے ہوئے پڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی نظام دین اور کبڑی مسمسی صورت بنائے بیٹھے تھے، آنکھوں سے ان کی خوف جھانک رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی طرف بڑھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "ارے، یہ ان لوگوں کو باندھ کے کیوں ڈالا ہوا ہے بھئی؟ کچھ میزبانی کا موقع تو دیا ہوتا انھیں۔"

میں نے آسیہ کے پاس بیٹھ کر اس کے جکڑ بند کھولنا شروع کر دیے۔ ولسن میری اس حرکت پر بُری طرح بوکھلا اٹھا۔ "ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم، الگ ہٹو اس کے پاس سے نہیں تو گولی مار دوں گا۔ ہٹو جلدی سے۔"

میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا اپنے۔ میں نے کہا۔ "اوئے چھوڑ یار! ایسی بھی کیا ناراضگی ہے، میں تو چار دن سے تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تیری مغفرت کرانے کے خیال سے اور تو ایسا کٹھور ہے یار کہ انھیں باندھ رکھا ہے تو نے۔"

میرے اس بے تکلفانہ اور بے نیازانہ انداز نے ولسن کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں میری بات کا مطلب نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا میں نے آسیہ کو آزاد کر کے اس سے انور کمال کے جکڑ بند کھولنے کو کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران جانِ عالم اور اللہ نواز شرافت علی کے ساتھ راجر اور ہیلن کو لے کر وہاں آ چکے تھے مگر یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر وہ لوگ بھی حیران پریشان کھڑے کبھی مجھے اور کبھی ولسن کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ولسن کی طرف بڑھتے ہوئے شرافت علی سے کہا۔ "آ یار شرافت علی! تو بھی مل اپنے اس یار ولسن سے، بڑا یار ملد قسم کا آدمی ہے یہ۔ تو نے ایسی کتّی شے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔"

میری یہ بات سُن کر ولسن اچھل کر کھڑا ہو گیا اپنی جگہ سے اور ریوالور مجھ پر تان کر گرجا۔ "خبردار جیلانی! جہاں ہو وہیں رُک جاؤ، میرے نزدیک آنے کی کوشش کی تو گولی مارنے میں بالکل تکلف نہیں کروں گا۔"

میری وہ طلسمی انگوٹھی مجھے واپس مل چکی تھی اور اس گھڑی وہ میرے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں موجود تھی لہٰذا اس کے ریوالور کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ البتہ یہ خدشہ ضرور تھا کہ ولسن یا اس کے ان چاروں آدمیوں میں سے کوئی میرے کسی ساتھی پر گولی نہ چلا دے لیکن ایسے موقعوں پر رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ مجھ سے الجھے رہیں، کسی کا دھیان دوسری طرف نہ جا سکے۔ لہٰذا میں نے مسکراتے ہوئے ولسن کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اوئے چھوڑ یار! کیوں مذاق کرتا ہے خواہ مخواہ خالی ریوالور لے کر مجھے دھمکا رہا ہے۔"

ولسن کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اس نے جھنجلا کر ریوالور کی لبلبی دبا دی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے اسے دباتا ہی چلا گیا لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس کے ریوالور سے ایک بھی گولی برآمد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "میں تو پہلے ہی جانتا تھا بیارے، تو خالی ریوالور لے کر میرے ساتھ مخول کر رہا ہے۔ چل جلدی سے لا مجھے دے دے۔"

میں اس کے اس قدر قریب پہنچ چکا تھا کہ میں نے بڑی سے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اور اسے دھکا دے کر صوفے پر گرا دیا۔ میری اس حرکت پر اللہ نواز نے مجھے للکارتے ہوئے کہا۔ "خبردار جیلانی! باس کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ۔ اب اگر تم نے ان کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تو گولی سے چھلنی کر دیا جائے گا تمھیں۔ ہماری اسٹین گنیں اور ریوالور خالی نہیں ہیں اور نہ ہم یہاں مذاق کرنے آئے ہیں تم سے۔"

"تو چپ کر جا اوئے سالے سارنگی نواز۔ ہتھیار چلانے اور سارنگی بجانے میں بہت فرق ہوتا ہے، یہ کام تیرے بس کا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اوئے ایک نہیں اوئے، تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟" اللہ نواز طیش میں آ کر دہاڑا، اور اپنا ریوالور سیدھا کر کے اس کی لبلبی دبا دی۔ اس کی حیرت اس سمے دیدنی تھی۔ وہ بار بار ریوالور کی لبلبی دباتا اور پھر استعجابیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ کئی بار کی ناکام کوشش کے بعد اس نے اسٹین گن برداروں کی طرف مڑ کر کہا۔ "کھڑے ہوئے منہ کیا دیکھ رہے ہو، اڑا دو سالے کو گولیوں سے۔"

ایک اسٹین گن والے نے فوراً کہا۔ "تمھارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے اللہ نواز! دیکھتے نہیں ہو یہ باس کے پاس ہی کھڑا ہے، اگر ہم نے اس وقت گولی چلائی تو وہ بہک کر باس کو بھی لگ سکتی ہے۔ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک طرف سے شرافت علی اور دوسری طرف سے انور کمال نے جسے اتنی دیر میں آسیہ آزاد کر چکی تھی، دونوں اسٹین گن والوں پر جست کر کے ایک ساتھ انھیں دبوچ لیا اور ساتھ لیے ہوئے نیچے گر پڑے۔ عین اسی لمحے آسیہ بھی ہوا میں اچھل کر کسی شکاری باز کی طرح جانِ عالم پر جا پڑی تھی۔ میں ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر چند ثانیے کے لیے ولسن کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اس نے میری اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سنبھل کر میرے اس ہاتھ پر جس میں اس کا ریوالور دبا ہوا تھا زور کی لات ماری۔ اس اچانک اور زوردار ضرب سے میرے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے ولسن مجھ سے الجھ کر مجھے رگیدتا ہوا کچھ دور تک لے گیا۔ کیونکہ میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا سنبھلنے کی کوشش کے باوجود پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مگر جلد ہی میرے قدم زمین پر پوری طرح جم گئے۔ میں نے قدم جماتے ہی خونخوار نظروں سے ولسن کو دیکھا۔ وہ مجھ سے بُری طرح چمٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ تو بُری طرح کمبل ہو کر رہ گیا تھا، کسی طرح چھوڑ ہی نہیں رہا تھا مجھے۔ میری ہر کوشش کے باوجود وہ مجھے چھوڑ کر علیحدہ نہ ہوا تو میں نے جھنجلا کر دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنے سر سے زوردار ٹکر اس کی ناک پر ماری۔ وہ بُری طرح بلبلا اٹھا اور مجھے چھوڑ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اس کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا تھا شاید اور خون تیزی سے بہہ کر اس کے ہاتھوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے اس کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے آگے بڑھ کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے انتہائی سرعت کے ساتھ اس کی رگ احساس مسل ڈالی۔ وہ ایک دم کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گرا، میں نے اسے سنبھالنے کی بالکل کوشش نہیں کی اور پلٹ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آسیہ، انور کمال اور شرافت علی اپنے اپنے حریفوں سے الجھے ہوئے تھے۔ اللہ نواز نے اپنا ریوالور پھینک کر اسٹین گن اٹھالی تھی اور اسے میری طرف کر کے اس کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ وہ شاید اپنے تینوں ساتھیوں کو نظرانداز کر کے میرے ہاتھوں سے ولسن کو بچانا چاہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے مجھ پر اسٹین گن تانی تھی، مگر اتنی ہی دیر میں میں ولسن سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ راجر

جسے قارئین آج تک نہیں بھولے

۳ حصوں میں (مکمل)

قیمت فی حصہ ۲۰/۰۰ روپے | ڈاک خرچ فی حصہ ۱۰/۰۰ روپے

□ پُراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے
□ طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لیے
□ جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لیے

ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!

کتابی شکل میں، تیار ہے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے منگوائیں

تینوں حصے ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ ہمارے ذمہ

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

اور ہیلن سہمے ہوئے دروازے کے ساتھ دیوار سے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے انھیں نظرانداز کر کے اللہ نواز کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے گرج کر کہا: "یہ اسٹین گن زمین پر ڈال دے، اللہ نواز سارنگی نواز! تم لوگوں کا کھیل ختم ہو چکا ہے اب!"

اللہ نواز نے میری تنبیہ کی پروا کیے بغیر اسٹین گن کی لبلبی دبا کر مجھ پر فائر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹین گن تو میری انگلی میں پڑی ہوئی طلسمی انگوٹھی کے زیرِ اثر آ چکی تھی، وہ مجھ پر گولیاں کس طرح اُگل دیتی۔ اللہ نواز چند لمحے فائر کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا اور جب اس گن سے کسی طرح بھی کوئی گولی نہیں نکل سکی تو اس نے جھنجلاہٹ کے انداز میں اسٹین گن مجھ پر پھینک مارنے کے لیے اوپر اٹھا لی لیکن فوراً ہی اپنا ارادہ ملتوی کر کے اسے مجھ پر پھینکنے کے بجائے نال سے پکڑ کر مجھے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اسٹین گن مجھ پر پھینک کر مارنے کی کوشش کرے گا چنانچہ میں اس کی زد سے بچنے کے لیے حرکت میں آ چکا تھا۔ لیکن اس نے اچانک ارادہ بدل کر اسٹین گن سے مجھ پر حملہ کیا تو مجھے سنبھل کر اس کے حملے سے بچنے کی مہلت نہیں مل سکی، میں نے بہت تیزی سے اسے جھکائی دے کر نکل جانے کی کوشش کی تھی اس کی زد سے، اس کے باوجود بھاری اسٹین گن میری پشت پر پڑی اور میں لڑکھڑا کر منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ پشت پر لگنے والی ضرب خاصی شدید تھی لیکن میرے پاس اس کی شدت کو سمجھنے اور چوٹ کا اندازہ لگانے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں تھا۔ لہٰذا موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر میں نیچے گرتے ہی دائیں طرف لوٹیں لگا کر اس کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ اللہ نواز نے میرے گرتے ہی دوسرا وار کیا تھا، اگر مجھے اس جگہ سے ہٹنے میں ایک پل کی بھی دیر ہو جاتی تو میں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کبھی۔ میری موت اتنی آسان تو نہیں تھی یارو! کہ میں اس گیدڑ کے بچے کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو میری داستانِ حیات اتنا طول کبھی نہ کھینچتی اور میں اب سے بہت پہلے مٹی میں مل چکا ہوتا۔ میرے ذمے تو اس ربِ دوجہاں نے اپنے اس وطنِ عزیز کی کچھ خدمت ڈال رکھی تھی اور اس ذمے داری کو پورا کیے بغیر وہ مجھے کیسے اٹھا لیتا دنیا سے۔ اب تک میں جن مراحل سے گزرتا آیا تھا وہ تو سارے کے سارے تربیتی مرحلے تھے جو ایسے کاموں کی تربیت کے دوران ہر ایک کو پیش آتے ہیں۔ بس ذرا میری تربیت کچھ زیادہ سخت کر دی گئی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرا کام بھی دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔

اللہ نواز کا وہ وار خالی گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرے وار کے لیے تیار ہوتا میں سنبھل چکا تھا۔ میری پشت میں اس وقت بہت ہی شدید قسم کی تکلیف ہو رہی تھی لیکن یہ وقت اس تکلیف پر توجہ دینے کا نہیں تھا۔ وہ اسٹین گن کو دونوں ہاتھوں میں تولتا ہوا میرے سر پر پہنچ چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ حرکت میں آتے میری ٹانگ چل گئی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے پورے زور سے ایک ٹانگ سیدھی کر کے پنجے پر اپنا پورا وزن سہار کے لٹھ کی طرح اس کی ٹانگوں میں ٹانگ ماری تھی، اس طرح ٹانگ مارنے کا یہ ایک خاص فن ہے جو مجھے گل زمان نے سکھایا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید اور بھرپور ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ ٹانگ لگتے ہی اللہ نواز یوں اچھل کر گرا تھا جیسے اچانک اس کی ٹانگوں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو۔ وہ جیسے ہی نیچے گرا میں ایک دم اس کے اوپر جا پڑا اور پھرتی سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ہر احساس سے عاری کر دیا اسے۔ وہ اٹھنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا لیکن میرے رگِ احساس کو ملتے ہی اس کی ساری جدوجہد ختم ہو گئی اور وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو پھیلا کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

میری پشت بے انتہا تکلیف دے رہی تھی، اس تکلیف کا احساس مجھے اس وقت تک نہیں ہو سکا تھا جب تک اللہ نواز سے مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ یہ خطرہ ٹلتے ہی اس تکلیف کے احساس نے آگھیرا تھا۔ اور اب مجھ کو حرکت کرنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ میں بمشکل اللہ نواز سے پھسل کر نیچے اترا اور اس کے نزدیک پڑی ہوئی اسٹین گن اٹھا کر دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ انور کمال اور شرافت علی اپنے اپنے حریفوں کو بُری طرح رگید رگید کر مار رہے تھے لیکن آسیہ، جانِ عالم کے مقابلے میں بے بس سی دکھائی دے رہی تھی مجھے۔ وہ زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی، اور جانِ عالم اس کی پشت پر چڑھا اس کے بال پکڑ کر اس کا سر زور زور سے زمین سے ٹکرا رہا تھا۔ آسیہ کو اس عالم میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے جانِ عالم کو گولی مارنے کے لیے اسٹین گن سیدھی کی لیکن فوراً ہی مجھے خیال آ گیا یہ میرا اپنا گھر تھا۔ لاہور میں ہماری واحد پناہ گاہ۔ یہاں گولیاں چلتیں اور ان کی آوازوں پر پولیس ادھر متوجہ ہو جاتی تو ہم فوری طور پر کسی دوسری جگہ منتقل بھی نہیں ہو سکتے تھے اس کے علاوہ لاہور کی پولیس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میں لاہور واپس آ چکا ہوں تو ہمارے لیے آزادی کے ساتھ کام کرنا بھی مشکل ہو جاتا لہٰذا میں نے گولی مارنے کا ارادہ تبدیل کر کے ایک بار پھر اپنی تمام قوت کو مجتمع کیا، اپنے عضلات کو اکڑا کر تکلیف کے احساس کو ذہن سے جھٹکا اور اسٹین گن کو نال کی طرف سے تھام کر آگے بڑھ کے پوری قوت سے جانِ عالم کی کنپٹی پر وار کیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کی کنپٹی کی ہڈی ٹوٹ کر اندر گھس گئی اور وہ آسیہ کے اوپر سے اچھل کر الگ جا پڑا۔ اس کی کنپٹی سے سیاہی مائل گاڑھا خون پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ کسی پتھر کے بے جان مجسمے کی طرح ساکت پڑا تھا۔ کنپٹی پر پڑنے والی ضرب نے اسے تڑپنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

اس کے اوپر سے ہٹتے ہی آسیہ پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔ میری پشت میں جیسے انگارے دہک رہے تھے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اتنی شدید کہ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیوار کا سہارا لینے کے لیے اُدھر قدم اٹھایا تو بُری طرح ڈگمگانے لگا، میرا توازن بالکل بگڑ گیا تھا اور اگر آسیہ فوراً ہی مجھے سہارا نہ دے دیتی تو میں یقیناً نیچے گر جاتا۔ اس نے اسٹین گن میرے ہاتھ سے لے لی اور سہارا دے کر مجھے صوفے پر لے جا کر بٹھا دیا۔ میں نے آہستہ سے اس سے کہا: "خبردار! گولی نہ چلانا، گولی کی آواز سن کر باہر والے ادھر متوجہ ہو جائیں گے۔"

میں نڈھال ہو کر صوفے پر لڑھک گیا۔ آسیہ کا ماتھا بھی لہولہان ہو رہا تھا لیکن اس پر جنون سوار تھا اس لمحے، اگر میں اسے گولی چلانے سے منع نہیں کر دیتا تو یقیناً وہ ان سب کے جسم چھلنی کر ڈالتی اسٹین گن سے۔ میرے منع کرنے پر اسے بھی شاید موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ اس نے اپنی قمیص کے دامن سے ماتھے سے بہہ بہہ کر آنکھوں اور چہرے پر آ جانے والا لہو صاف کر کے شرافت علی اور انور کمال سے کہا: "بس کریں اب، انھیں چھوڑ کر الگ ہو جائیں آپ دونوں۔"

انور کمال اور شرافت علی نے ایک ساتھ مڑ کر آسیہ کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑی تھی، وہ اپنے اپنے حریفوں کو چھوڑ کر تیزی سے میری طرف لپکتے ہوئے بیک زبان چلائے: "ارے! یہ انھیں کیا ہوا؟"

وہ دونوں میرے پاس پہنچ کر میرا سینہ اور پیٹ ٹٹولنے لگے۔ میں نے کہا: "کوئی خاص بات نہیں ہے یار! میری پیٹھ میں چوٹ آ گئی ہے، فکر کی کوئی بات نہیں ہے، تم لوگ ان سب کو باندھ کر ادھر تہ خانے میں ڈال دو لے جا کر۔ اوئے کبری!" میں نے کبری کو آواز دی۔

وہ جلدی سے میرے قریب آ کر بولا: "جی سردار صاحب! فرمائیں جی جنابِ عالی! خادم حاضر ہے؟"

"اوئے خادم کے بچے، رسّی لا کر دے انھیں اور وہ تہ خانہ بتا، ان کے ساتھ جا کر۔" میں نے کبری سے کہا۔ "اور نظام دین کو کہہ ان کی گاڑی ادھر پیچھے والے گیراج میں لے جا کر بند کر دے۔ سالے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر گھس آئے تھے یہاں۔"

"بہت اچھا جی! اگر آپ حکم دیں تو اُدھر تہ خانے میں ہی ان کی قبریں بھی تیار کر دوں میں۔" کبری تابعداری سے بولا۔

"اوئے نہیں، فضول نہیں بکا کر۔ بس جو میں نے کہا ہے وہی کر جا کر۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں جنھیں انور کمال اور شرافت علی نے سنبھال رکھا تھا، بہت ہی نڈھال ہو رہے تھے۔ حالت ان کی اتنی ابتر تھی کہ ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ زمین پر چت پڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ کبری ان سب کو باندھنے کے لیے رسّی لینے چلا گیا تھا۔ نظام دین کو اس نے ولسن کی سیاہ سیڈان گیراج میں لے جانے کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ راجر اور ہیلن اب تک اسی جگہ دیوار سے لگے کھڑے حیرت اور بے یقینی سے ایک ایک کو تک رہے تھے۔ شرافت علی نے میری قمیص پشت کی طرف سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا: "ذرا اپنی پیٹھ دکھاؤ مجھے، چوٹ زیادہ شدید تو نہیں ہے؟ اگر چوٹ زیادہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا ہمیں۔"

میں نے کہا: "نہیں یار! کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے، تم فکر نہیں کرو اس کی۔ اور ڈاکٹر شاکٹر کے چکر میں نہیں پڑو بالکل بھی۔"

میرے منع کرنے کے باوجود اس نے میری بات نہیں مانی اور پشت پر سے قمیص اوپر اٹھا دی۔ چوٹ کو دیکھ کر وہ تشویش زدہ آواز میں بولا: "اوہ، یہ تو بہت شدید چوٹ ہے بھئی، پوری پیٹھ پر لگتا ہے نیلے رنگ سے اسٹین گن چھاپ دی گئی ہے نال کے بغیر۔ اور تم کہتے ہو فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ لگتا ہے کوئی ہڈی بھی متاثر ہوئی ہے، سوجن ہو گئی ہے اچھی خاصی۔"

انور کمال نے آگے بڑھ کر چوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا: "اس کے لیے تو کسی ڈاکٹر ہی کی ضرورت ہے۔ وہی کچھ کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "پہلے ان لوگوں کو دیکھو یار! کس مسئلے میں اُلجھ گئے ہو تم۔ اگر ان میں سے کوئی سنبھل گیا تو ایک بار پھر۔۔"

"ان کی آپ فکر نہ کریں بھائی جان!" آسیہ میری بات کاٹ کر بولی: "اگر ذرا بھی جنبش کی کسی نے، تو بھیجا نکال دوں گی اُس کا میں۔"

اسی لمحے کبری نائیلون کی ایک مضبوط سی رسّی لے کر آ گیا۔ ان لوگوں نے پہلے ان دونوں نڈھال پڑے ہوئے آدمیوں کو باندھا جن کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں، پھر انھیں اٹھا کر تہ خانے کی طرف لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد راجر اور ہیلن میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ راجر میری پیٹھ کو دیکھتے ہوئے بولا: "آپ کو چوٹ بہت شدید آئی ہے مسٹر ہاشم خان! کسی ڈاکٹر کی مدد ضرور

حاصل کریں آپ۔ ویسے آپ نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ خالی ہاتھوں سے ریوالوروں اور اسٹین گنوں سے مسلح افراد کو جس طرح زیر کیا ہے آپ لوگوں نے، مَیں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بڑا حوصلہ اور ہمت ہے آپ لوگوں میں۔ ویسے یہ ہیں کون لوگ، جنھوں نے اس طرح آپ کو آ گھیرا تھا۔ یہ شخص تو مجھے یورپین نظر آتا ہے اور شاید آپ نے اسے ولسن کہہ کر مخاطب کیا تھا کیا یہ وہی ولسن تو نہیں ہے جس کے پاس آپ لے کر آئے ہیں ہمیں؟" اس نے ولسن کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں دوست! ہے تو یہ وہی ولسن لیکن لگتا ہے اس کے دماغ سے ایک بار پھر بغاوت کا بھوت چمٹ گیا ہے۔ یہ دورہ اسے ایک بار پہلے بھی پڑ چکا ہے۔ مَیں تو اسی وقت اس کا پتہ صاف کر دیتا مگر اس نے اوپر والوں کو معافی تلافی کر کے ایک موقع اور دینے پر راضی کر لیا تھا بہرحال اس بار یہ بچ نہیں سکے گا میرے ہاتھوں سے۔" مَیں نے آسیہ کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے اس سے کہا۔

"حیرت ہے آپ کے بڑے اتنے نرم دل لوگ ہیں، ایسے خطرناک لوگوں کو بھی معاف کر دیتے ہیں۔ ہمارا باس تو کسی کی معمولی سی غلطی بھی معاف نہیں کرتا، اور غلطی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، موت کے سوا کوئی دوسری سزا کبھی نہیں دی اُس نے کسی کو بھی۔" راجر بولا۔

جانِ عالم کی لاش سمیت سب لوگوں کو تہ خانے میں پہنچا دیا گیا تو مَیں نے انور کمال سے کہا "یار! یہ جو دو مہمان آئے ہیں ہمارے ساتھ ان کو ادھر ہی مہمان خانے میں پہنچا دے ایسا نہ ہو کہ کسی لمحے یہ بھی مصیبت کھڑی کر دیں کوئی اور ان کے جکڑ بند ذرا مضبوط رکھنا کھل گئے اگر تو دوسروں کو بھی آزاد کر دیں گے یہ۔ بلکہ زیادہ اچھا یہ ہے کہ ان لوگوں سے الگ، پیچھے والے گیراج میں ڈال دو انھیں۔"

اتنی دیر میں یہ اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اردو نہیں جانتا تھا۔ آزاد میں انھیں چھوڑ نہیں سکتا تھا کیوں کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کا تعلق سچ مچ منشیات اسمگل کرنے والے کسی چھوٹے موٹے گروہ سے ہی تھا یا وہ آئزک کے ساتھیوں میں سے تھے، جو ولسن کے پاس کراچی سے تنظیم کی تباہی کی داستان لے کر آئے تھے۔ انور کمال نے میری بات کا مطلب سمجھ کر ان دونوں سے کہا "تم دونوں میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں تمھارے کمرے دکھا دوں۔ لمبے سفر سے آئے ہو آرام کی ضرورت ہو گی تمھیں۔"

راجر جلدی سے بولا "نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ہماری فکر چھوڑیں اور جلدی سے کسی ڈاکٹر کا انتظام کریں۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں، یہ مسٹر ہاشم خان کس حال میں ہیں؟ انھیں فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

"اوہو، تم میری فکر نہیں کرو۔ ڈاکٹر ابھی آتا ہی ہو گا، تم دونوں جا کر آرام کرو، تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" مَیں نے کہا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا "اوہ، اگر ایسی کوئی بات ہے تو ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں یہاں سے۔ آؤ ہیلن۔"

وہ دونوں انور کمال کے ساتھ چلے گئے۔ مَیں نے شرافت علی کو بھی ان کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی ان کے پیچھے چل دیا۔ ان کے جانے کے بعد آسیہ میرے پاس بیٹھ کر میری پشت کو دیکھتے ہوئے بولی "چوٹ بہت گہری ہے، ڈاکٹر کے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

"ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ درد کی ٹیسیں بہت شدید ہیں۔ کبری کسی ایسے ڈاکٹر کو ضرور جانتا ہو گا جو اس موقع پر کیوں اور کیسے کے جھگڑے میں پڑے بغیر مدد کر دے گا ہماری۔ وہ آہو کے پاس بہت دن رہا ہے اور آہو کو ایسے ڈاکٹروں کی ضرورت ہمیشہ رہتی تھی۔ وہاں آنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو کبری اچھی طرح جانتا ہے۔" مَیں نے آسیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں سفید فام کون ہیں، انھیں آپ کہاں سے پکڑ لائے ہیں؟ یہ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دیں ہمارے لیے؟" آسیہ نے پوچھا۔

"کون دونوں؟" مَیں نے پوچھا "کہیں تم راجر اور ہیلن کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہی ہو؟"

"ہاں، مَیں اسی نوجوان جوڑے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ لڑکی تو بہت ہی کم سن اور کچی لگتی ہے۔" آسیہ نے کہا۔

"یوں تو وہ تربیت یافتہ ہے لیکن اس اعتبار سے اسے کچی کہہ سکتی ہو تم کہ یہ اس کا پہلا پھیرا ہے۔ پریکٹیکل لائف میں پہلا قدم ہے یہ اس کا۔ یہ دونوں جرمنی کی کسی سنڈیکیٹ کے لیے ہیروئن لینے آئے تھے کراچی آئزک کے پاس۔ اور وہ جو ربانی ہے نا، جس کے مکان میں آئزک کو گھیر کر اس کا کام تمام کیا تھا ہم نے، وہ بھی آئزک ہی کا کارندہ ہے آسیہ۔" مَیں نے آسیہ کو بتایا۔

"اچھا!" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی "مگر اس نے تو ہمارے ساتھ تعاون کیا تھا، آئزک کے خلاف کارروائی کرنے میں۔"

"نہیں، اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو ہمیں چکر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے باپ اور بیوی نے ہمارا ساتھ دے کر اُس

کی چلنے نہیں دی تھی۔ وہ مجبور ہو گیا تھا، فرار کا راستہ نہیں رہا تھا اس کے لیے۔" مَیں نے اسے بتایا۔

"حیرت ہے مگر اس وقت تو آپ نے کچھ نہیں کہا تھا اس سلسلے میں۔ کیا اب اچانک یہ انکشاف ہوا ہے آپ پر؟" وہ بولی۔

"ہاں، ان دونوں کو اُسی نے بھیجا ہے یہاں لاہور، ایک خط دے کر ولسن کے نام۔ یہ دیکھو، یہ خط پڑھو کیا لکھا ہے اس ذلیل آدمی نے۔ ذرا مجھے بھی سناؤ اس کو پڑھ کر۔" میں نے اپنی جیب سے خط نکال کر آسیہ کی طرف بڑھا دیا۔

آسیہ نے میرے ہاتھ سے خط لے کر اُسے کھولا اور بلند آواز سے پڑھنے لگی۔

اس کمینے، ذلیل ربانی نے ولسن کو آئزک کے مارے جانے اور کراچی میں اس یہودی کُتّے کی مکمل تباہی کی داستان لکھی تھی اور یہ اطلاع بھی دی تھی اُسے کہ مَیں آئزک کا خاتمہ کرنے کے بعد لاہور پہنچ چکا ہوں لہٰذا وہ میری طرف سے ہوشیار رہے۔ اس نے لاہور میں ولسن کو فون کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر معلوم ہوا کہ وہ اپنی رہائش تبدیل کر چکا ہے وہاں سے اور چونکہ اُس کا موجودہ پتا ربانی کو نہیں معلوم تھا لہٰذا اُس نے ایک پرانے گاہک کو یہ خط دے کر اس کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے راجر اور ہیلن کے بارے میں ولسن کو لکھا کہ وہ جرمنی سے آئے ہوئے ان کے پرانے گاہک ہیں مگر چونکہ کراچی میں وہ لوگ بُری طرح تباہ ہو چکے ہیں، کروڑوں روپے کا مال ضائع ہونے کے علاوہ اب ان کے پاس نہ تو کوئی اڈا رہا تھا، جہاں سے وہ مال کی سپلائی کا نظام جاری رکھ سکتے اور نہ ہی فی الحال ان کے پاس مال ہے لہٰذا بیرونِ ملک اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ولسن انھیں ان کی طلب کے مطابق مال فراہم کر دے اور اس وقت تک جب تک کراچی میں دوبارہ کوئی انتظام نہ ہو جائے، وہ تمام بیرونی منڈیوں کے ایجنٹوں کو اس کے پاس بھیجتا رہے گا۔ ولسن اُنھیں مال سپلائی کرتا رہے اور ربانی کا..... کمیشن اُسے کراچی بھیج دیا کرے۔ میرے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ میں اب وہ جیلانی نہیں رہا ہوں جسے اُس نے پچھلی بار پارسل بنا کر بھیج دیا تھا لاہور سے۔ میرے ساتھ اب پوری ایک ٹیم ہے جس کا ہر فرد اپنی جگہ اس طرح فٹ ہے کہ اُسے وہاں سے اکھاڑنا ناممکن ہو گیا ہے اس کے علاوہ ہمارا ایک بے حد ذہین اور باصلاحیت ساتھی شرافت علی اور امریکا سے آنے والی ایک اہم رکن الزبتھ فینیلی ہم سے ٹوٹ کر غلام جیلانی کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی وجہ سے ہمیں اتنے بڑے نقصان کے علاوہ آئزک جیسے سرپرست سے محروم ہونا پڑا ہے۔ اور ہمارے تقریباً تمام ہی ساتھی اور سارے اڈے غلام جیلانی کی نظروں میں آ کر برباد ہو گئے ہیں ان دونوں آستین کے سانپوں نے اہم رول ادا کیا ہے ہمیں تباہ کرنے میں۔

آسیہ نے خط ختم کیا ہی تھا کہ شرافت علی اور انور کمال واپس آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے کبری اور نظام دین بھی تھے۔ شرافت علی نے کمرے میں قدم دھرتے ہوئے کہا "یہ کن آستین کے سانپوں کا ذکر ہو رہا ہے بھئی آسیہ بیگم؟"

آسیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط شرافت علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لیں آپ بھی پڑھ لیں۔ یہ خط پڑھ کر سُنا رہی تھی میں۔"

"اوہ اچھا۔ یہ شاید وہی خط ہے جو ربانی نے کراچی سے بھیجا ہے راجر کے ہاتھ ولسن کے لیے؟" وہ خط لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں، وہی ہے۔" آسیہ نے کہا "لیکن خط پڑھنے سے پہلے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔ بھائی جان کی پیٹھ پر ورم بہت ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ انھیں جلد از جلد میڈیکل ایڈ ملنا چاہیے۔"

مَیں نے کبری کو مخاطب کر کے کہا "اوئے کبری بچّے! وہ تیرے مرحوم و مغفور آقا آہو کا جاننے والا کوئی ڈاکٹر ایسا ہے تیری نظر میں، جو پولیس اور تھانوں کے چکر میں پڑے بغیر صرف اپنی فیس سے کام رکھتا ہو؟"

"کیوں نہیں جی سردار صاحب! ایسے تین ڈاکٹروں کو میں جانتا ہوں اچھی طرح۔ آپ حکم کریں، ابھی لے کر آتا ہوں کسی کو۔"

"تو پھر جا شاباش جلدی سے پکڑ لا کسی کو۔ اور اس نظام دین کو ساتھ لے جا، گاڑی میں جانا اور اپنے ساتھ ہی بٹھا کر لے آنا ڈاکٹر کو۔ کہنا اُسی گاڑی میں واپس پہنچا بھی دیا جائے گا اسے۔" مَیں نے کبری سے کہا۔

وہ فوراً ہی نظام دین کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ مَیں نے شرافت علی سے پوچھا "سب کو باندھ کے ڈال دیا ہے نا، کوئی گڑبڑ تو نہیں کی تھی کسی نے؟ وہ دونوں قابو آ گئے تھے آسانی کے ساتھ؟"

"ہاں، تم ان کی فکر نہیں کرو۔ ان میں سے کسی کی طرف سے بھی کسی گڑبڑ کا بالکل امکان نہیں رہا ہے کوئی۔" شرافت علی جواب دے کر خط پڑھنے لگا۔

مَیں نے انور کمال سے پوچھا "یہ لوگ کس طرح آپڑے تھے تم لوگوں پر۔ اور تم پر قابو کیسے پا لیا انھوں نے؟"

"بس کیا بتاؤں آپ کو جیلانی بھائی! دھوکے سے مار کھا گئے ہم۔ یہاں ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر غافل ہو گئے تھے ہم لوگ اور اس غفلت سے ہی فائدہ اٹھا گئے یہ اسلحہ

اپنا ہم نے الگ کر دیا تھا اپنے پاس سے۔ ان لوگوں نے یوں اچانک چڑھائی کی تھی یہاں کہ ہمیں اپنا اسلحہ لینے کی مہلت نہیں مل سکی جب کہ یہ لوگ پوری طرح مسلح تھے۔"

شرافت علی بولا۔ "یہ بھی ٹھیک ہی ہوا یار۔ ہم لوگوں کو قابو کرنے کے بعد وہ ہمارا انتظار کرتے رہتے اگر تم بھی ہتھیار سنبھال کر مقابلے پر آجاتے ان کے تو یہ دو ایک لاشیں یہاں چھوڑ کر بھاگ جاتے اور ہم ایک بار پھر ان کی تلاش میں خاک چھانتے پھرتے لاہور تا مریدکے۔ اور وہ فاطمہ جو دلسن کو حالات سے بے خبر جان کر ادھر مریدکے میں اس کے گھر پر بیٹھی رہ گئی ہے اندھیرے میں ماری جاتی۔"

آسیہ بولی۔ "ارے تو آپ لوگ اسے وہاں کیوں چھوڑ آئے ہیں دشمن کے گھر میں، خطرات کے درمیان میں؟"

میری پشت میں جیسے انگارے دہک رہے تھے، تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں بڑی مشکل سے ہونٹ بھینچ بھینچ کر حلق تک آنے والی کراہوں کو روک رہا تھا لیکن شاید میرے چہرے کے تاثرات میری اندرونی کیفیت کی چغلی کھا رہے تھے۔

انور کمال میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے جیلانی بھائی! معلوم ہوتا ہے تکلیف بہت بڑھ گئی ہے؟"

اس کی بات سن کر آسیہ اور شرافت علی نے چونک کر مجھے دیکھا اور دونوں ایک ساتھ مجھ پر جھک پڑے۔ آسیہ میرے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "تھوڑی سی ہمت سے کام لیں بھائی جان! کبری ڈاکٹر کو لے کر بس آتا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... تو پریشان نہ ہو میری بہن... میں بالکل ٹھیک ہوں..." میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

شرافت علی ہنس کر بولا۔ "بڑا جی دار ہے بھئی شیر میرا۔ ایسی چوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ بی بی تو فکر نہ کر اس کی۔"

باہر سے کار کی آواز سن کر آسیہ جلدی سے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "وہ آگیا کبری ڈاکٹر کو لے کر۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "اتنی جلدی کیسے آگیا وہ؟ جا یار شرافت علی! آگے بڑھ کے دیکھ کبری ہی ہے نا، کوئی مصیبت تو نہیں ہے۔"

شرافت علی سے پہلے انور کمال جھپٹ کر دروازے سے جا لگا اور جھانک کر باہر دیکھنے کے بعد بولا۔ "کبری ہی ہے جیلانی بھائی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی ہے مگر یہ کار جس میں سے یہ لوگ اترے ہیں، اپنی نہیں ہے اور وہ نظام دین بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"تم لوگ اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر ادھر اس صوفے کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ جس پر میں لیٹا ہوں۔ کوئی گڑبڑ والی بات ہو تو بے دریغ گولی مار دینا اس سالے ڈاکٹر کو۔ مگر ریوالور سائیلنسر والا استعمال کرنا، آواز نہ ہو گولی چلنے کی بالکل بھی۔" میں نے کہا۔

یہ محض احتیاطی تدبیر تھی ورنہ مجھے امید نہیں تھی کہ کبری ڈاکٹر کے بجائے کسی دشمن کو ساتھ لے آیا ہوگا۔ وہ ڈاکٹر ہی تھا جو کبری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے میری پشت کا معائنہ کر کے بتایا کہ ہڈی تو کوئی بھی متاثر نہیں ہوئی ہے البتہ گوشت کچلا گیا ہے جس کی وجہ سے مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کم از کم دو ہفتے ضرور لگیں گے۔ اس نے کچھ دوائیں دیں اور انجکشن لگا کر ایک ہفتے مکمل بیڈ ریسٹ کی ہدایت دے کر واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد شرافت علی اور آسیہ وغیرہ نے مجھے سہارا دے کر بیڈ پر پہنچا دیا۔

میری زخمی پیٹھ نے مجھے چلنے پھرنے سے بالکل معذور کر کے رکھ دیا تھا لیکن میرے وہ جاں نثار دوست، ساتھی، ہمدم جن کے سینے مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے اور جو اپنا سب کچھ اس سوہنی دھرتی پر قربان کر دینے کا عہد کر چکے تھے، اس دوران بھی خاموش نہیں بیٹھے رہے تھے۔ شرافت علی اور انور کمال مریدکے جا کر فاطمہ کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔ ان لوگوں نے دلسن کی بیوی کو اور ان تمام کارندوں کو جو وہاں موجود تھے، ٹھکانے لگانے کے بعد دلسن کیمیکل فیکٹری میں آگ لگا کر اسے خاکستر کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد جب تک میں بستر پر پڑا رہا، وہ لاہور اور اس کے نواح میں دشمن کے ایک ایک ایجنٹ کو تلاش کر کر کے ٹھکانے لگاتے رہے۔ راجر اور ہیلن کو دوسرے ہی روز مار دیا تھا فاطمہ نے البتہ دلسن، اللہ نواز اور رجانِ عالم کو وہ سسکا سسکا کر مار رہی تھی۔ فاطمہ نے ان پر تشدد کے وہ سارے حربے استعمال کر ڈالے تھے جن کی یہودیوں نے اسے تربیت دی تھی۔ اس طرح اس نے ان کے تمام ساتھیوں، سارے ٹھکانوں اور ان لوگوں کے نام پتے تک حاصل کر لیے تھے جو باقاعدہ ان کے ساتھی نہیں تھے مگر ضرورت پڑنے پر انہیں بھاری رقم دے کر کوئی بھی کام کرایا جا سکتا تھا ان سے۔ جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اس وقت تک ان تینوں کے سوا کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ ان کی حالت بھی مُردوں سے بدتر تھی۔ فاطمہ نے بڑی بے رحمی سے انہیں تختۂ مشق بنایا تھا۔ ان کے جسموں سے جگہ جگہ سے گوشت کٹا ہوا تھا اور جگہ جگہ سے ان کے جسموں کو اس طرح داغا گیا تھا کہ ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو ان کی بس سانسیں چل رہی تھیں جس سے ان کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا تھا بس ورنہ ان میں زندہ انسانوں والی کوئی بات رہی نہیں تھی۔ انہیں دیکھ کر کراہیت آتی تھی۔ انہیں میں نے رات کے وقت اپنی کوٹھی کے لان میں گڑھا کھدوا کر اس میں ڈلوا کے اوپر سے مٹی ڈلوا دی۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا ان کے لیے۔

ڈاکٹر نے بڑی توجہ اور لگن سے میرا علاج کیا تھا اور یہ اس کی مسیحائی ہی تھی کہ تیسرے ہفتے میں بالکل بھلا چنگا ہو چکا تھا۔ وہ آہو کا پرانا شناسا تھا لیکن میں نے تین دن میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اصل میں وہ صرف پیسے سے شناسائی رکھنے والا شخص تھا۔ اس کی محبوب ترین شے پیسہ تھا جو اس کی جیب نوٹوں سے بھر سکتا تھا اس سے وہ کبھی ناآشنائی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کی خدمت ہی اس کا ایمان تھا۔ اچھے اور برے لوگ کہاں نہیں ہوتے، ہر پیشے اور ہر شعبۂ زندگی میں ایسے کچھ لوگ مل ہی جاتے ہیں جو کڑکڑاتے نوٹوں کی بو پر کھنچے چلے آتے ہیں ہر جگہ۔ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے بہت رہا ہے۔ ایسے لوگ نہ ہوں تو مجھ جیسے اپنی موت آپ مر جائیں۔ چور، ڈاکو، قاتل، اسمگلر وہ لوگ ہیں جن کی کامیاب زندگی انہی لوگوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے، ان کا تعاون حاصل نہ ہو تو وہ لوگ کسی بھی وقت کسی گندے نالے یا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ پولیس انہیں قانون سے بچائے رکھتی ہے اور یہ زر کے دیوانے ڈاکٹر انہیں ملک الموت کی نظروں سے بچائے رکھتے ہیں۔ اب یہی دیکھیں نا اس وقت یہ ڈاکٹر نیازی دستیاب نہ ہو جاتا مجھے تو پتا نہیں میں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہو سکتا یا نہیں۔ اس کی مسیحائی نے تیسرے ہفتے مجھے اس قابل کر دیا کہ میرے سینے میں دشمن کے خلاف لاوا پکنے لگا تھا۔

دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ موسم سرما پوری طرح لاہور شہر کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ دن کے دس بج رہے تھے، میں اپنی کوٹھی کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا سورج کی تمازت کو اپنے جسم میں سمیٹ کر موسم کی شدت سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لمحے دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں براہِ راست جسم میں اتر کر جسم کو فرحت بخش حرارت مہیا کر رہی تھیں، میں آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے ٹکا اس حرارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اپنے قریب ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنے والا کبری تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اوئے آ بھئی کبری پہلوان! بیٹھ جا یار، تو بھی ادھر ہی بیٹھ کے غسل کر لے سورج کی ان حیات آفریں کرنوں سے، نہیں تو پالا مار جائے گا تجھے۔"

وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے نزدیک آ کر میرے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "نہیں جی سردار صاحب، غلام حاضر ہو گیا ہے۔ مگر جنابِ عالی! میں اس ویلے سورج کی کرنوں کا غسل کرنے نہیں آیا ہوں آپ کے پاس۔"

"اچھا۔ پھر کیوں آیا ہے یہاں؟ کیا کوئی بہت ہی خاص کام پڑا ہے مجھ سے تجھے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ جناب، ایک پیغام آپ کو پہنچانے کے لیے کہا تھا آہو صاحب کی بیگم نے لیکن آپ لاہور آتے ہی اتنے الجھ کر رہ گئے تھے کہ مجھے موقع ہی نہیں مل سکا آپ سے کچھ کہنے کا۔ آج ذرا سا موقع ملا ہے تو میں آپ کے پاس آگیا ہوں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"سروری خانم کا پیغام لے کر آیا ہے تو؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر تو نے تو بتایا تھا وہ جیل میں بند ہے ان دنوں، آہو کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اس پر۔ پھر تجھے وہ کب اور کہاں مل گئی؟"

"ہے تو وہ اب بھی جیل میں ہی جناب! آپ کے لاہور واپس آنے سے دو دن پہلے ہی عدالت نے اس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا ہے۔ اس نے عمر قید کی سزا سنائی ہے اس کو۔ آہو صاحب کی بڑی پہنچ تھی جی، آپ کو تو پتا ہی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے یارانہ تھا ان کا۔ ان سب لوگوں نے پورا پورا زور لگایا تھا اس مقدمے میں، کوشش انہوں نے بھی کی تھی کہ خانم پھانسی چڑھا دی جائے۔ انہی کی کوششوں سے مقدمہ اتنی جلدی نمٹا دیا گیا لیکن ججوں نے عورت ہونے کی رعایت دیتے ہوئے اسے عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ فیصلے والے دن میں بھی عدالت میں موجود تھا اور فیصلے کے بعد خانم سے ملا بھی تھا۔ اسی وقت اس نے یہ پیغام دیا تھا مجھے۔"

"سزا سننے کے بعد تو اس کی حالت بہت خراب ہو گئی ہوگی۔ بڑی اداس، مضمحل اور دل گرفتہ ہو گی وہ؟" میں نے کہا۔ "بڑے ظلم توڑے تھے اس عورت پر تیرے اس آہو صاحب نے۔ زندگی میں بھی اسے چین نہیں لینے دیا تھا اور مرنے کے بعد بھی سکون نہیں لینے دیا اس غریب کو۔ کیسی پھول بدن، حورِ مجسم عورت تھی، ظالموں کو ذرا بھی ترس نہیں آیا اس پر، زندگی بھر کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا اسے۔"

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "حیرت کی بات ہے جناب یہ میرے لیے۔ ترس تو کبھی آپ نے بھی نہیں کھایا اس پر، کیسی کیسی سخت سزاؤں سے گزارا ہے آپ نے اسے۔ وہ لگتا ہے ٹھیک ہی کہتی تھی کہ آپ کے دل میں بڑی چاہ ہے اس کے لیے۔"

"اچھا! ایسا کہتی تھی وہ تجھ سے؟" میں نے اس کی طرف جھک کر حیرانی سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

"یقین کریں جناب! وہ بھی پرستش کرتی ہے آپ کی۔ بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں آپ سے اس نے۔" کبری نے کہا۔ "وہ کہتی تھی آپ اوپر سے کیسے بھی دکھائی دیں، اندر سے دل آپ کا شیشے کی طرح صاف اور موم کی طرح نرم ہے اور آپ کے دل میں اس کے لیے بڑی ہمدردی ہے، اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کریں گے آپ۔"

"اچھا، ایسا کہتی تھی وہ تجھ سے۔ مگر وہ ایسا کیوں سمجھتی ہے۔ میں نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی اس سے؟" میں نے کہا۔

"یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! کوئی تو بات ہوگی جو اسے اتنا اعتماد ہے آپ پر۔ کہتے ہیں عورت کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ

آدمی کے دل میں اتر کر اپنے بارے میں وہاں لکھی تحریر بھی پڑھ لیتی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"اچھا خیر، پڑھ لیتی ہوگی، میں تیرے تجربے کو جھٹلاؤں گا نہیں یہ بتا کیا پیغام دیا ہے اس نے تجھے میرے لیے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے کہا ہے جناب کہ میں نے آہو کا کانٹا نکال کر آپ کے راستے کی ساری دشواریاں دور کر دی ہیں۔ میری اب بس یہی خواہش ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیں۔ اسے باپ کی شفقت سے محروم نہ کریں۔ وہ مسند آرا بیگم کے پاس ہے، اور میں آپ کی منت کرتی ہوں، اپنی زندگی کو صحیح رخ پر لے آئیں، مسند آرا اب تک آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے پاس جا کر اس کا ہاتھ تھام لیں۔ سہارا بن جائیں اس کی زندگی کا۔ مجھے امید ہے، وہ آپ کے بیٹے کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے کبریٰ کو تکتا رہ گیا۔ اس کے الفاظ میرے سینے پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ وہ سارے زخم جو میں بڑی مشکل سے، بڑی جدوجہد کے بعد مندمل کر پایا تھا، ایک ایک کر کے ٹیس دینے لگے تھے۔ کبریٰ میری اس کیفیت سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں کبھی زندگی کی تمام رعنائیوں سے بھرپور اس مسند آرا کا سراپا ابھر آتا تھا جسے میں نے پہلی بار آہو کے گھر کے ایک دریچے سے جھانکتے دیکھا تھا اور کبھی آہو کے جور و ستم سے تباہ حال، موت و زندگی کے دوراہے پر کھڑی وہ مسند آرا ابھر آتی تھی جسے اپنے قدموں میں جھکا کر آہو اس کی زمینیں اور جائداد ہتھیا لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کی وہ بے پناہ عنایات اور لطف و کرم میرے دل و دماغ پر چھا جاتا تھا اور کبھی اس کی نفرت سے شعلہ بار نگاہیں میرے دل پر آرے چلانے لگتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کبریٰ سے کیا کہوں۔ کیا جواب دوں اسے —— سروری خانم کے پیغام سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو میرے نام سے منسوب کر کے ہی مسند آرا کی جھولی میں ڈالا ہے اور اگر یہ درست تھا تو میں اب مسند آرا سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔ اپنی بے وفائی کا جیتا جاگتا ثبوت اس کے سامنے رکھ کر میں اسے اپنی وفا کا یقین کس طرح دلا سکتا تھا۔ بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا مجھے اس سروری خانم نے۔ وہ اگر میرے سامنے ہوتی اور اسے عمر بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ ڈال دیا گیا ہوتا تو میں اسے حسب سابق ایک بار پھر دھتکار کر بھگا دیتا لیکن وہ اپنے جس انجام سے دوچار تھی اس کے بعد اس کو دھتکارنا تو کجا اس کی خواہش کو رد کر دینا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

کبریٰ نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ "کیا ہوا جناب سردار صاحب! کیا خانم کی یہ خواہش....؟"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کبریٰ! کیا سروری سے جیل میں ملاقات ہو سکتی ہے کسی طرح؟"

"کیوں نہیں جناب! آپ کو تو پتا ہے، پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ آپ حکم کریں تو وہ آپ سے ملنے یہاں آپ کی اس کوٹھی میں بھی لائی جا سکتی ہے۔" کبریٰ نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے تو تم اس کا بندوبست کرو، میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا اور سرد آہ بھر کر آنکھیں بند کر کے ماضی کی تلخ و شیریں یادوں میں گم ہو گیا۔

دنیا

بھر میں یہ بات مشہور ہے اور شاید ہر شخص اسے تسلیم بھی کرتا ہے کہ اسمگلر کا کوئی وطن نہیں ہوتا، اس کے سینے میں نہ کسی مذہب کی محبت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی خطۂ زمین کی، مگر میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ اسمگلر سے بھی زیادہ ظالم، بے حس اور بے ضمیر ایک راشی سرکاری اہلکار ہوتا ہے۔ دراصل سینہ تو اس کا محبت اور ہمدردی کے ہر جذبے سے خالی ہوتا ہے۔ اسمگلر تو صرف کوشش کرتا ہے چور دروازے سے مال نکال لینے کی، اسے اس کوشش میں کامیاب تو وہ راشی افسر ہی کرتا ہے جو کڑکڑاتے نوٹوں سے اپنی جیب بھر کے ایک اسمگلر کو بچ کر نکل جانے کی راہ دیتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر راشی اہلکار نہ ہوں تو دنیا کی کوئی بڑی یا چھوٹی برائی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ سر اٹھاتے ہی اس کی گردن ماری جا سکتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کے اصل دشمن اور دنیا کے سب سے بڑے تخریب کار تو یہ راشی اہلکار ہی ہیں جن کی گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ بقول شاعر۔ "لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا" والے نظام میں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔

تیسرے دن کبریٰ نے دولت کی طاقت کا وہ کرشمہ دکھایا مجھے، جو باضمیر اور وطن سے محبت رکھنے والوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور عبرت ناک تھا۔ یہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ راشی اہلکاروں نے میرے ملک کے قانون اور عدالتوں کو کیسا مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے تماشے اس چرخ نیلی فام نے پہلے کہاں دیکھے ہوں گے جو اب اس سرزمین پاک پر جابجا بکھرے پڑے ہیں اور قدم قدم پر چشم بینا کے لیے نظارۂ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ راشی اہلکاروں کی ایسی فرض ناشناسی شاید کسی بدقسمت اور پسماندہ ترین ملک میں بھی دیکھنے میں نہ آ سکے گی۔ کو مغرب کی اذان سننے کے بعد کبریٰ میری کار لے کر نظام دین کے ساتھ گھر سے نکلا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب وہ واپس پلٹا تو سروری خانم اس کے ساتھ تھی۔ جی ہاں وہی سروری خانم جسے عدالت نے اپنے شوہر شیر دل آہو کی قاتلہ قرار دے کر عمر بھر کے لیے جیل کی چار دیواری تک محدود کر دیا تھا۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ روپے کی طاقت کے ایسے کرشمے یہاں عام ہیں۔ بڑے بڑے اسمگلر اور عادی مجرموں کو رشوت کی عنایت سے یہ سہولتیں مہیا ہو جاتی ہیں کہ وہ دن جیل میں گزارنے کے بجائے راتیں اپنے گھر پہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام دہ بستر پہ گزاریں اور صبح ہوتے ہی واپس جیل پہنچ جائیں۔ جہاں کا چلن ہی یہ ہو وہاں کسی عمر قید کی مجرمہ کا یوں میرے پاس آ جانا کوئی حیرت ناک واقعہ تو نہیں ہو سکتا۔ شیر دل آہو نے لاہور جیل میں ایسے لوگ پال رکھے تھے جو ضرورت کے وقت اس کے آدمیوں کو ہر سہولت فراہم کر دیتے تھے۔ آہو نے تو مجھے ایک بار آسیہ کے بارے میں یہاں تک کہا تھا کہ وہ جیل کے کاغذات میں اسے مردہ قرار دلوا کر ہمیشہ کے لیے جیل سے نکلوا سکتا ہے۔ کبریٰ بھی آہو کے ساتھ رہ کر اس کے ان تنخواہ دار کارکنوں سے واقف ہو چکا تھا، لہٰذا انہی کے تعاون سے آج وہ سروری خانم کو جیل سے نکال کر میرے پاس لے آیا تھا۔ کتنا آسان ہو گیا تھا، اس طرح میرا سروری سے ملنا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے لیے یہ ملاقات بہت مشکل ہو جاتی۔ پولیس اور خصوصاً لاہور کی پولیس میرے خون کی جس طرح پیاسی ہو رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر میں کسی نہ کسی طرح سروری سے ملنے جیل چلا جاتا تو واپس بھی آ سکتا تھا یا نہیں۔ مجھ سے تو ان کی ذاتی دشمنی بندھ گئی تھی، بڑی سے بڑی رشوت لینے کے بعد بھی اگر مجھے پہچان لیا جاتا تو مجھے واپسی کا راستہ بالکل نہیں دیتے وہ۔ آہو اگر اس جیسے پتا نہیں کتنے لوگوں کے لیے نہ جانے کب سے یہ خدمت انجام دیتے آ رہے تھے وہ لوگ، لیکن میرے لیے ان کے پاس ایسی کسی رعایت کی گنجائش بالکل بھی نہیں تھی۔ اگر میں کوئی جرائم پیشہ شخص ہوتا اور باقاعدہ قتل و غارت گری کی قیمت انہیں دیتا ہوتا تو مجھے بھی ساری مراعات حاصل ہوتیں۔ ہر طرح تحفظ مل جاتا مجھ کو کسی بات کا خوف ہی نہ ہوتا میرے لیے لیکن میں نے نہ صرف ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ ان کے جبڑوں میں ہاتھ دے بیٹھا تھا۔ میں بے شمار آدمی مار چکے تھے میں نے ان کے اور اب میری پشت پناہ کسی بڑے کا ہاتھ بھی نہیں۔ آہو تھا پھر وہ کیوں، نظریہ ہے کہ نکل جانے دیتے مجھے، مگر آہو کے دیرینہ تعلقات اور روپے کے زور پر میں ان تمام خطرات سے محفوظ ہو گیا تھا۔ انھوں نے یہ جانے بغیر کہ کبریٰ اس مجرمہ کو کہاں لے جائے گا، کس سے ملوائے گا اسے، کسی کے پاس اس کی بخشش کے لیے دعا کرائے گا لے جا کر یا کسی اور کی قبر آباد کرانے کا سامان کرے گا اس کے ذریعے۔ اسے کبریٰ کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

میں نے سروری خانم کو دیکھا تو میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ میرے سامنے جو عورت اس لمحے کھڑی تھی، وہ اس سروری خانم سے بہت مختلف تھی جسے میں شیر دل آہو کی اہلیہ کی حیثیت سے [illegible] رہا تھا۔ وہ بلا خیز حسن کی مالک، سراپا قیامت سروری خانم جس کے کمال آفریں جلووں سے نظریں خیرہ ہو جایا کرتی تھیں، جس کے حسین چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ ماہ تاباں [illegible] کی ٹھنڈی چاندنی میں کچھ دیر ستانے کی آرزو پتا نہیں کتنے دلوں میں انگڑائیاں لیتی رہی تھی۔ آج اس کی ساری چمک دمک ماند پڑ چکی تھی۔ بجھے بجھے پژمردہ چہرے پر جو کبھی کھلے ہوئے گلاب کی طرح تر و تازہ دکھائی دیتا تھا، ہلدی پھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس گھڑی اسے دیکھ کر کوئی یہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ کل تک یہ عورت زمانے کو اپنی ٹھوکروں میں روندتی رہی تھی۔ غرور حسن سے اس کی گردن اکڑی رہتی تھی اور زاہد صد سالہ کے لیے بھی اس کے حضور دل سنبھالے رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ سارا طنطنہ، سارا کا سارا کر و فر نہ جانے کہاں گم کر آئی تھی وہ۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا تھا۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "او سروری! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی، کیا ہوا ہے یہ تمھیں؟... تم... تم تو... پہچانی نہیں جا رہی ہو... کس کی نظر کھا گئی ہے یہ تمھیں؟"

"کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے مجھے... میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں... مجھے کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"میرا خیال ہے تم نے آئینہ نہیں دیکھا ہے بہت عرصے سے جبھی ایسی بات کہہ رہی ہو۔ ارے کبریٰ جا ذرا خانم کو آئینہ لا کر دکھا۔ حیرت ہے انھیں اپنی حالت تک کی خبر نہیں ہے کچھ بھی۔" میں نے کبریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں آپ آئینہ نہ منگائیں، مجھے پتا ہے سب کچھ۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جیلانی۔ نظر دل کسی کو نہیں لگتی کسی کی بلا دیر جو تغیر و تبدل دکھائی دیتا ہے انسانوں میں، یہ تو آدمی کی عمر کا عطیہ ہوتا ہے یا خود اس

دنیا کے حیرت انگیز فن تحریر شناسی کی مدد سے
دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں

تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر و رہنما کتاب

تحریر اور شخصیت

قیمت ۵/ روپے — ڈاک خرچ ۱/ روپے

○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے اپنی کمزوریاں اور خامیاں کیسے دور کی جا سکتی ہیں؟

ملنے کا پتہ: مکتبہ نفسیات ○ پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

کا اپنا بویا ہوا ہوتا ہے یہ۔ میں بھی اپنی تیار کردہ فصل کاٹ رہی ہوں اب۔ وقت بڑی ظالم اور بے رحم شے ہے جیلانی! یہ کبھی معاف نہیں کرتا کسی کو بھی۔ یہ جب مہربان ہوتا ہے کسی پر تو وہ شخص لگتا ہے زمین کی مخلوق ہی نہیں ہے۔ کیا سے کیا بنا دیتا ہے آدمی کو یہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا، اور یہ منہ پھیرتا ہے کسی کی طرف سے تو آسمان کی بلندیوں کو چھونے والا اس بُری طرح زمین بوس ہوتا ہے کہ دیکھنے والے عبرت پکڑنے لگتے ہیں اس کے انجام سے۔ آدمی بڑا کوتاہ بین ہے جیلانی! وقت کو مہربان پا کر اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے اور اتنی بلندی پر آ جانے لگتا ہے کہ زمین پر چلنے پھرنے والے دوسرے انسان اسے کیڑے مکوڑے دکھائی دینے لگتے ہیں اور وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ دنیا ہمیشہ اسی طرح اس کے قدموں میں پڑی رہے گی اور وہ اس کے ساتھ جیسا چاہے گا سلوک کرتا رہے گا۔ اپنی بے بضاعتی کا اندازہ تو اسے اس وقت ہوتا ہے جب تقدیر اپنے پر سمیٹتی ہے۔ اس وقت اُسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی یہ پرواز کسی کے سہارے کی محتاج تھی، لیکن پھر اس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے اس کی کاشت کی ہوئی فصل تیار کھڑی ہوتی ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا اس کے لیے کہ خاموشی سے اپنی فصل کاٹنے میں مصروف ہو جائے۔ منصب، مرتبہ، دولت و حشمت کچھ بھی تو اس کے کام نہیں آتا اس بُری گھڑی میں۔ ہر چیز اپنا حساب مانگتی دکھائی دیتی ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے سروری خانم! آدمی اگر زندگی کے روشن دنوں میں عقل و ہوش سے بے گانہ نہ ہو جائے تو تقدیر اُسے تماشا نہیں بنا سکتی کبھی بھی۔ یہ تو آدمی کے اپنے اعمال ہوتے ہیں جو اُسے خود اپنی نظر سے گرا دیتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حقیقت کو ہر شخص تسلیم بھی کرتا ہے مگر پھر بھی غلطیاں کر کے چوٹ کھا جاتا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا ہے اس وقت تمھیں اس حال میں دیکھ کر۔"

"نہیں جیلانی! آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ میں نے اور آہو نے آپ کے راستے میں بہت کانٹے بچھائے ہیں۔ ہم نے تو کبھی بھی ترس نہیں کھایا آپ پر اور آپ کی قسمت کی ماری بہن پر۔ کبھی کوئی بھلائی نہیں کی آپ کے ساتھ ہم نے اور اگر کبھی کوئی اچھی بات کی بھی ہے تو اس کے پیچھے بھی اپنا ہی مفاد رہا ہے۔ آپ کی بھلائی جب بھی نہیں رہی ہمارے پیشِ نظر۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"خیر... خیر... یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے خانم! ایسے مواقع حساب کتاب کرنے کے نہیں ہوتے ہیں۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو آپ ایسا کہتے ہیں جیلانی! دنیا میں سارے ہی لوگ آپ جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ لوگ تو ایسے موقعوں کا انتظار کرتے ہیں اور ایک ایک لمحے ایک ایک پل کا حساب چکانے آ جاتے ہیں۔ اس موقع پر...!" وہ بولی۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں خانم! مجھے ان میں شمار نہیں کرو تم۔"

"میں آپ کو ان میں شمار کہاں کر رہی ہوں، آپ کو تو پہلے ہی الگ کر دیا ہے میں نے اُن سے۔ خیر چھوڑیں اس قصے کو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، صرف ایک گھنٹے کے لیے آزادی ملی ہے مجھے آپ بتائیں کس لیے بلایا ہے آپ نے؟"

"وہ تم نے کبری کے ذریعے کوئی پیغام بھیجا تھا میرے پاس اسی سلسلے میں تم سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا میں۔" میں نے کہا۔

"اسے میری خواہش یا درخواست سمجھیں آپ... ایک عاجزانہ درخواست ہے یہ میری آپ سے۔ آہو نے مجھے حرص و ہوس کی دلدل میں اتار کر بہت ذلیل کیا تھا، یقین کریں میرے دل میں دولت اور جائداد کی ہوس کبھی بھی نہیں رہی۔ میری غلطی صرف اتنی تھی کہ میں نے آہو کو پوری طرح سمجھے بغیر شادی کر لی اس سے۔ ہادی علی میرے والد نہیں تھے اور نہ ہی ان کی دولت اور جائداد پر کوئی حق بنتا تھا میرا۔ انھوں نے میری ماں سے جس طرح بھی شادی کی وہ اگر کوئی غلط حرکت تھی تو یہ غلطی ان سے زیادہ خود میری ماں کی تھی۔ وہ اگر ان کا ساتھ نہیں دیتیں اُن کی حوصلہ افزائی نہ کرتیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوا ان کی مرضی، ان کی پسند، ان کی شہ پر، ان کی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے ہادی علی کو کبھی بھی قصوروار نہیں سمجھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور حالات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوئی ہوں، میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو ہی مجرم سمجھا ہے۔ اور اگر وہ میرے بچپن ہی میں فوت نہ ہو گئی ہوتی تو آپ یقین کریں آج میں آہو کے قتل کے جرم میں جیل جانے کے بجائے برسوں پہلے اپنی ماں کو قتل کر کے اس کی سزا پا چکی ہوتی۔ میری داستان آج سے بالکل مختلف ہوتی اور اس میں آپ کا کہیں ذکر تک نہ ہوتا۔ ہادی علی کو میں نے ہمیشہ اپنا محسن سمجھا ہے۔ انھوں نے مجھے کبھی بھی والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ لیکن اس ہوس کے نرم آہو نے مجھے اپنے محسن کے بارے میں بدخواہی پر مجبور کر دیا تھا۔ میں تو اپنے گھر کو بربادی سے بچائے رکھنے کے لیے اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ میری تمام تر قربانیوں کے باوجود وہ میرے ساتھ بھی مخلص نہیں ہے تو میں نے دنیا کو اس کی پلیدیت سے نجات دلا دی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آپ یقین کریں جیلانی! وہ مسند آرا کی ساری دولت اور جائداد ہتھیانے کے بعد میرے اور اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا۔ اب میں تو اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن میں چاہتی ہوں مسند آرا اللہ آپ کا بیٹا سکون اور عافیت کے ساتھ زندگی گزاریں۔ آہو سے میں نے انھیں نجات دلا دی ہے، اس سنگدل اور بے رحم دنیا سے آپ انھیں محفوظ رکھنے کی ذمے داری قبول کر لیں۔ مسند آرا اب تک آپ کے نام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی پہلی اور آخری محبت آپ اور صرف

آپ ہیں۔ اس نے اپنی زندگی آپ کے نام کر دی ہے اور وہ کسی اور کو اس میں حصے دار بنانے کو کبھی تیار نہیں ہو گی۔ میں نے اس کے ساتھ بڑا وقت گزارا ہے۔ اس کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ جو فیصلہ ایک بار کر لیتی ہے اُسے دنیا کی کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ آپ اس کے پاس چلے جائیں۔ چھوڑیں یہ سب کچھ۔ یہ پُرخطر زندگی ترک کر دیں، کیا ملتا ہے اس میں آپ کو؟ ہر دم سولی پر جان رہتی ہے ہر لمحے قانون اور پولیس کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مسند آرا کے پاس بہت کچھ ہے آپ کو بالکل بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہو گی کبھی بھی۔ بس سرپرست بن کر دیکھ بھال کرتے رہیں اس کی اور اس کی زمین جائداد کی۔"

میں نے کہا۔ "بات یہ نہیں خانم! مسئلہ کچھ کرنے اور نہ کرنے کا نہیں ہے۔ میرے پاس بھی سوہنے رب کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ یہ عالیشان کوٹھی کار اور لاکھوں کا بینک بیلنس۔ میں اب وہ مفلس اور کنگال غلام جیلانی نہیں ہوں جو ایک رات اپنے گھر سے صرف ایک لاکھ روپے کے لیے کسی کی تجوری توڑنے، کسی کے گھر میں نقب لگانے یا کسی کا گلا دبانے کی نیت سے نکلا تھا اور پھر واپسی کا راستہ بھول گیا تھا۔ تمھیں پتا نہیں ہے خانم! میں اب بے وجہ پولیس کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگا پھرنے والا جیلانی نہیں رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک نصب العین ہے اب، ایک مقصد ہے اور ایک مقام کو اپنی منزل قرار دے چکا ہوں میں۔ وہاں تک پہنچے بغیر اب میں کسی اور سمت نظر بھی نہیں ڈال سکتا۔ ہاں اس کے بعد اگر زندگی نے مہلت دی تو میں مسند آرا کی طرف ضرور جاؤں گا۔ اس سے ایک آخری ملاقات کی خواہش تو میرے دل میں بھی موجود ہے اور اگر اس نے پسند کیا تو اپنی بقیہ زندگی اسی کے نام کر دوں گا میں۔ بشرطیکہ اس نے قبول کیا۔ جس کی امید کم ہی ہے مجھے۔"

"نہیں، آپ ناامید نہ ہوں، میں اس سے بات کر چکی ہوں، اسے سب کچھ بتا اور سمجھا چکی ہوں۔ جو پردے حائل تھے آپ دونوں کے درمیان۔ جن کی وجہ سے بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں مسند کے دل میں، وہ سارے پردے اُٹھا دیے ہیں میں نے۔ اس کے دل میں آہو نے جو زہر بھر دیا تھا آپ کے خلاف اُسے میں نے بالکل صاف کر دیا ہے۔ اب وہ اُدھر کوٹ اکبر میں آپ کی منتظر بیٹھی ہے۔ آپ وہاں جائیں گے تو سر آنکھوں پر بٹھائے گی وہ آپ کو۔ پرستش کرتی ہے وہ تو آپ کی، بڑا مقام دے رکھا ہے اس نے اپنے دل میں آپ کو۔"

اس کی باتیں میرے قدموں میں لرزش پیدا کرنے لگی تھیں۔ وہ مجھے جو لالچ دے رہی تھی، جس ہیرے کی چکاچوند سے میری آنکھوں کو خیرہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، کوئی اور وقت ہوتا تو میں ضرور اس کی باتوں میں آ جاتا اور اس کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسند آرا کی طرف دوڑ جاتا۔ وہ میری زندگی کا حاصل تھی۔ اس کے ملنے کی صرف امید ہی میری زندگی میں انقلاب بپا کر سکتی تھی اور اس لمحے تو سروری خانم میرے سامنے بیٹھی مجھے نوید دے رہی تھی کہ مسند آرا، میری زندگی، اب میرے لیے وقف ہو گئی ہے۔ میں چاہوں تو ابھی جا کر اسے اپنی ملکیت میں لے سکتا ہوں، لیکن جس راہ کا میں نے اپنے لیے انتخاب کیا ہوا تھا اس پر ایسے جذباتی رشتوں کا گزر نہیں تھا۔ اور میں جس قدر آگے جا چکا تھا، منزل کے جتنا قریب پہنچ چکا تھا، وہاں سے واپسی بھی اب ممکن نہیں رہی تھی میرے لیے، اگر واپس جانا چاہتا تب بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا میں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "میں تمھاری کسی بات پر شک نہیں کرتا خانم، جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ حرف بحرف ٹھیک ہے لیکن میں نے تمھیں بتایا نا کہ جو ذمے داری میں نے قبول کی ہوئی ہے اس کی تکمیل کے بغیر اب میں مسند آرا کی طرف نہیں جا سکتا۔ دعا کرو زندگی مجھ سے منہ نہ موڑے تاکہ میں اس دنیا میں اپنی ایک آرزو کی تکمیل تو دیکھ سکوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ موجودہ ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد میں مسند آرا کو اپنانے میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گا، ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر سیدھا اس کے پاس پہنچوں گا۔"

"ٹھیک ہے جیلانی!" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ "میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک بھی جیوں گی یہی دعا کرتی رہوں گی کہ ربِ کریم آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی دے اور آپ اپنی دلی مرادیں پا کر بقیہ زندگی عافیت کے ساتھ بسر کریں۔" پھر وہ کبری کی طرف مڑ کر بولی۔ "کبری! اب چل یہاں سے، مجھے واپس چھوڑ آ جہاں سے لے کر آیا تھا۔"

کبری نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے افسردگی سے کہا۔ "ٹھیک ہے کبری، جا، واپس لے جا انھیں۔ اور دیکھ، ان سے ملنے کے لیے باقاعدگی سے جایا کر جیل میں اور ان کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا کر۔"

"اس کی تکلیف نہ کریں جیلانی! میری اب کوئی ضرورت کوئی خواہش باقی نہیں رہی ہے۔ آپ کبری کو اب کبھی نہ بھیجیں میرے پاس۔ میں جیل کی کوٹھڑی میں اپنی بقیہ زندگی اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے گزارنا چاہتی ہوں۔ بس ایک بار جب آپ مسند کو اپنی پناہ میں لے لیں تو آج ہی کی طرح مجھے چند گھڑیوں کے لیے اپنے پاس بلا لیں، میں آپ دونوں کو ایک بار ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں بس۔ اس کے سوا اور کوئی آرزو نہیں ہے میرے دل میں اب۔" سروری نے کہا اور باہر نکل گئی۔

وہ چلی گئی اور میں حیران حیران کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا جس سے وہ گئی تھی۔ وقت بھی کیا شے ہے اور کیسی کیسی کروٹیں بدلتا ہے یہ کہ آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ وہی سروری خانم تھی جو پہلی بار مسند آرا کو میرے ساتھ دیکھ کر بُری طرح مشتعل ہو گئی تھی اور جس کے بارے میں مسند آرا نے کہا تھا کہ اس نے خود تو شیر دل آہو سے عشق

رشا کے شادی کی تھی، اپنی اور آہو کی عمروں کے تفاوت کی پروا کیے بغیر اسے اپنا مجازی خدا تسلیم کرلیا تھا اور اب کسے یہ حق دینے کو تیار نہیں تھی۔ یہ وہی سروری خانم تھی جو کبھی مجھے شکار کرنے کے لیے میری گھات لگا کر بیٹھی رہتی تھی اور اب اس کے لیے یہ ضد تھی کہ میں جلد از جلد کوٹ اکبر جا کر مسند آرا کو اپنی زوجیت میں لے لوں اور اس کے جس بیٹے کو آہو نے اپنا نام دینے سے صاف انکار کردیا تھا، اسے میں اپنا نام دے کر اس دنیا میں اس کی شناخت بن جاؤں۔ وہ خود اعتراف کرچکی تھی کہ اس نے اگر کبھی میری بھلائی کی کوئی بات کی ہے تو اس کے پس پردہ بھی اس کا اپنا ہی کوئی مفاد رہا ہے آج اس نے جو کچھ کہا تھا اس میں بھی اس کا مفاد پوشیدہ تھا۔

*

میں اب مکمل طور پر صحت یاب ہوچکا تھا اور لاہور میں اب ہمارے لیے کوئی کام بھی نہیں رہا تھا لہٰذا ہم نے اگلے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اس بار ہمارا ٹارگٹ بے ضمیر، وطن فروش دشمن تھا۔ وہ خیبر کے اس پار فلک بوس دشوار گزار پہاڑوں کے دامن میں کسی جگہ چھپا بیٹھا تھا اور میرے ملک کے جوانوں کو میری قوم کے تازہ اور جوان خون کو برباد کرنے کا سامان کر رہا تھا اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ حالانکہ اس کی طرف میرا اپنا پرانا حساب باقی تھا، اپنے شب و روز اور ماضی حال مستقبل کے بے شمار ایسے دنوں کا مجھے اس سے حساب لینا تھا جنھیں اس نے سیاہی پھیر کر میری زندگی سے نکال دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ دن جب لوگ اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے، میں نے اپنی آزادی اپنی بقا کی جنگ کرتے گزار دیے تھے، اگر وہ ابلیس زادہ میری راہ میں نہ آیا ہوتا تو آج میں بھی اوروں کی طرح سر اٹھا کر اور سینہ تان کے اپنے ملک، اپنے شہر، اپنی دھرتی پر دوسروں کے شانہ بہ شانہ چل پھر رہا ہوتا۔ یوں اپنی شناخت مٹا کے منہ چھپائے نہ پھر رہا ہوتا میں۔ اس ذلیل دشمن نے میری حیات کا مقصد ہی بھلا دیا تھا مجھے۔ پھر بھی شاید میں اس تندہی سے اس کو تلاش نہ کرتا، اس کی زندگی کا چراغ بجھانے کے لیے اتنا مضطرب اور بے چین نہ ہوتا اگر وہ میری اس سوہنی دھرتی سے دشمنی کا جرم نہ کرتا۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جو دنیا کے سارے جرائم پر بھاری تھا۔ وہ کروڑوں پاکستانیوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آباد گھروں کی رونقیں چھین لینا چاہتا تھا اور انسانوں سے آباد اور ہنستی بولتی بستیوں کو ویران کردینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ میں کیسے برداشت کر لیتا۔ اس کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا میں اسے لہٰذا میں ہر طرف سے فارغ ہونے کے بعد اب اسی دشمن کی کمین گاہ پر جا چڑھنا چاہتا تھا، اس سے ایک آخری معرکہ کرنے کے لیے۔ یہ میں فیصلہ کرچکا تھا کہ یہ معرکہ میرا اور اس کا آخری معرکہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم دونوں میں سے کسی ایک ہی کو زندہ رہنا تھا اور وہ ایک کون ہے، اس کا فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس کی حیات کے دن ختم ہوچکے ہیں، کس کی عمر کی فصل پک کر تیار ہوچکی ہے یہی جاننے اور اسی کا فیصلہ کرنے کے لیے میں ان پہاڑوں میں جا اترنا چاہتا تھا جن کے درمیان دشمن کہیں چھپا بیٹھا تھا۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے ہمیں کچھ ہلکے پھلکے کام نمٹانا تھے۔ راجر اور ہیلن جنھیں ہم نے تہ خانے میں ڈال رکھا تھا اب تک ان کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ راجر اور ہیلن سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ دونوں منشیات کے اسمگلر تھے لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی چھوٹے موٹے عام اسمگلر کے لیے کام کر رہے تھے یا ان کا تعلق بھی یہودہ سے ہی تھا۔ ایک تو ہمارے پاس نہ اتنا وقت تھا، نہ ایسے وسائل کہ ہم ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش کے بعد کوئی فیصلہ کرتے۔ لہٰذا سب نے متفقہ طور پر ایک ہی بات کہی کہ ان دونوں کا تعلق یہودہ سے ہو یا نہ ہو، منشیات کا زہر پھیلا کر معصوم اور بے گناہ لوگوں کو زندہ درگور کردینے والے سفاک اور شقی القلب لوگوں کے گروہ سے تو بہرحال ان کا تعلق ہے۔ اور یہ دونوں بھی انسانوں اور انسانیت کے اتنے ہی بڑے دشمن ہیں جتنی یہودہ یا اس کی کوئی ذیلی شاخ ہے۔ دانستہ یا نادانستہ یہ دونوں بھی یہودیوں ہی کے کاز کے لیے کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ انھی کی طرح کے مجرم ہیں اور انھیں بھی وہی سزا ملنا چاہیے جو آرنک اور ولسن وغیرہ کو دی گئی۔ انھیں اپنی ان شیطانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے زندہ چھوڑ دینا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا ان ہلاکت خیز اشیا کا کاروبار کرنا۔ چنانچہ ان دونوں کو زندہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد ان دونوں کو شرافت علی اور انور کمال کے سپرد کردیا گیا جنھوں نے انھیں ہلاک کرکے ان کی لاشوں کو راوی کے حوالے کردیا۔

ان کا قصہ ختم کرنے کے بعد شرافت نے مجھ سے کہا "جیلانی، دشمن کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اس ذلیل ربانی کا بھی کوئی بندوبست کرنا چاہیے ہمیں۔ وہ تو بہت ذلیل آدمی ثابت ہوا ہے یار۔ دیکھنے میں کیسا معصوم دکھائی دیتا تھا۔"

"چھوڑ یار، لعنت بھیج اس کتے پر۔ یہ چھوٹے موٹے تھڑ چھنے میں وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے تو ہم بعد میں بھی نمٹتے رہیں گے۔ پہلے اوپر والوں کا صفایا کرنا چاہیے۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"نہیں جیلانی۔ مجھے اتفاق نہیں ہے تم سے۔ ایک تنکے کو بھی حقیر جان کر نظر انداز نہیں کرو۔ ہوسکتا ہے وہی کسی وقت اڑ کر آنکھ میں گر پڑے تو مشکل پیدا کردے گا ہمارے لیے۔ اور تم دیکھ ہی چکے ہو، اگر اتفاقاً مریدکے میں راجر اور ہیلن ہمیں نہ مل گئے ہوتے تو اس نے اپنا کام کردیا تھا۔ وہ اگر ولسن سے ملنے میں کامیاب ہوجاتے تو شاید نقشہ دوسرا ہی ہوتا آج۔"

"یار! تو بھی کہتا تو ٹھیک ہی ہے برادر۔ پھر یوں کر کہ کراچی میں اپنے آدمیوں کو فون کرکے کہہ دے، وہ اس کو دیکھ لیں گے۔"

"نہیں، وہ لوگ اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکیں گے۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے کسی سمجھ دار آدمی کی ضرورت ہوگی۔" شرافت علی نے کہا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "اچھا تو پھر میں خان کو فون کرکے اس سے بات کرتا ہوں، اگر وہ راضی ہوجائے تو یہ کام ہوسکتا ہے۔ حالانکہ فیروز مرحوم نے مجھے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق تو آدمی وہ بھی کوئی نیک طینت، پاک باطن قسم کا نہیں ہے اس کا تعلق بھی پیشہ ور مجرموں کے گروہ سے ہی ہے لیکن چونکہ پڑھا لکھا باشعور آدمی ہے لہٰذا جرائم میں اپنی ضروریات پوری کرنے کی حد تک ہی ملوث ہوتا ہے اور ایسے افراد ہی اس کا نشانہ بنتے ہیں جو نقصان برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ کمزور دل اور مظلوموں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا وہ اور نہ ہی ملک اور قوم کے مجموعی مفاد کے خلاف کوئی کام کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر اسی کو ٹیلی فون کرکے اس سے کہو اس بدذات کا قصہ ختم کردے۔" شرافت علی نے کہا۔

میں نے اسی وقت کراچی ٹیلی فون کیا اور میری خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی مل بھی گیا۔ میری آواز سنتے ہی وہ خوش دلی سے بولا "ارے بھائی جان! خیریت سے تو ہو نا، یہ آج میں کیسے یاد آگیا ہوں تمھیں؟"

"بس یار! شکر ہے اس رب کائنات کا، بالکل ٹھیک ہوں میں۔ تم سناؤ تم تو ٹھیک ہو نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بالکل بالکل، دعا ہے تمھاری۔ وہ شرافت علی تو ٹھیک ہیں نا؟" اس نے جواب دے کر کہا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں اور ہم جس کام سے لاہور آئے تھے وہ بھی بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے اب آگے جا رہے ہیں ہم۔"

"چلو مبارک ہو یہ کامیابی تم سب لوگوں کو۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ کیا کسی خاص کام سے فون کیا ہے تم نے مجھے یا بس یوں ہی خیریت معلوم کرنے اور اپنی کامیابی کی اطلاع دینے کے لیے۔" خان نے سوال کیا۔

"دراصل ایک بے حد اہم معاملے میں تمھاری مدد کی ضرورت پیش آگئی ہے۔۔۔" میں نے کہا۔

وہ میری بات کاٹ کر بولا "ایسا کون سا اہم مسئلہ درپیش ہے؟ کیا مجھے لاہور آنا پڑے گا؟"

"نہیں نہیں، لاہور نہیں بلا رہا ہوں میں تمھیں، وہیں کراچی میں ایک چھوٹا سا کام ہے۔ یہاں کا مسئلہ ہوتا تو میں خود ہی نمٹ لیتا اس سے۔ اور اب بھی اگر مجھے آگے نہ جانا ہوتا تو خود کراچی آکر نمٹ لیتا اس کتے سے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو کیا کسی ذات کمین کے کان کھینچنا ہیں؟ ٹھیک بتاؤ، کون ہے وہ کمینہ کتا جس نے تمھیں چھیڑا ہے؟" وہ فوراً بولا۔

"یار! وہ خبیث یہودی آرنک کو تو ہم نے جہنم واصل کردیا اور اس کے سارے کل پرزے بھی ٹھکانے لگا دیے تھے لیکن ایک دھوکا دے کر نکل گیا ہے ہماری ناک کے نیچے سے۔ اس کی خباثت کے بارے میں ہمیں یہاں آنے کے بعد ہی پتا چلا ہے۔ اس نے کراچی میں بیٹھے بیٹھے یہاں لاہور میں ہمارے گرد جال بُننے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو خدا کا بڑا کرم ہوا کہ ہمیں بروقت پتا چل گیا۔۔"

"کون بدبخت ایسا ہے یہاں؟ مجھے بتاؤ کسے اپنی زندگی بوجھ لگنے لگی ہے؟" وہ میری بات کاٹ کر خونخوار انداز میں بولا۔

"اس ربانی کی بات کر رہا ہوں یار میں جس کے مکان سے ہم نے آرنک کے خلاف کامیاب کارروائی کی۔" میں نے اس سے کہا۔

"اوہ، مگر اس نے۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار، اس نے تو اس رات ہم سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ تمھیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے کچھ یا کسی نے کوئی غلط اطلاع دی ہے تمھیں اس کے بارے میں۔ وہ تو بڑا بے ضرر آدمی لگتا ہے یار۔" خان نے سحر زدہ لہجے میں کہا۔

"کیسی غلط فہمی یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ سالا بڑا گُرو، مسکین لگتا ہے شکل سے لیکن اندر کھوپڑی میں اس کی لومڑی کا بھیجا رکھا ہے۔" میں نے اس کے بارے میں ساری تفصیل کے ساتھ خان کو بتا کر کہا "آئی کچھ سمجھ؟ کیسا بے ضرر ہے وہ؟"

"حیرت ہے یار۔ ایسا بدباطن شخص ہے وہ، اس رات تو بڑا تعاون کیا تھا اس نے ہمارے ساتھ۔" خان کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

"نہیں یار۔ تعاون تو اس رات بھی نہیں کیا تھا اس نے ہم سے۔ بس چپ سادھ گیا تھا وہ اپنے باپ اور بیوی کے سامنے، کھل کر سامنے نہیں آسکا تھا ہمارے۔ تعاون تو اس کی بیوی اور باپ نے کیا تھا۔ اس رات کی ساری صورت حال پر دوبارہ غور کرو تم خود جان جاؤ گے، وہ تو مختلف حیلے بہانوں سے ہمیں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ہم لوگ جلدی اور جوش میں تھے، اس وقت اس پر توجہ نہیں دے سکے تھے۔ بعد میں جب اس کا باپ اور بیوی ہم سے متفق ہوگئے تو وہ خاموش ہوگیا تھا، جسے ہم نے اپنے طور پر اس کا تعاون سمجھ لیا۔ حالانکہ اس کی وہ خاموشی مصلحت آمیز تھی۔ وہ اپنی بیوی اور باپ کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے کالے کرتوتوں کی خبر ان لوگوں کو ہوجائے۔ اگر وہ دونوں نہ ہوتے یا وہ ہماری حمایت نہ کرتے تو ربانی اس رات بھی ہمارے راستے کی دیوار بن جاتا۔ راجر اور ہیلن کو وہ تحفے کر ولسن کے پاس نہ بھیجتا تو اس کی اصلیت کا اب بھی پتا نہیں چلتا

ہیں۔" میں نے اُسے بتایا۔

"کمال ہے یار، بہت ہی ذلیل آدمی ثابت ہوا ہے یہ ربّانی تو۔ ایسی معصوم صورت اور یہ کرتوت ہیں اس کے۔ میری تو عقل حیران ہے، سمجھ میں نہیں آتا آدمی کس پر اعتبار کرے، کسے وکیل کرے، کس سے منصفی چاہے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا، مجھے بتا دیا اس کے بارے میں، اب بچ نہیں سکے گا وہ میرے ہاتھوں سے۔ آج ہی جھٹکا کر دوں گا اس سالے کا۔ اس کے علاوہ کسی اور بھی ایسے آستین کے سانپ کے بارے میں معلوم ہو تمھیں تب مجھے بتا دو... کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے بڑے ہی جوشیلے انداز میں کہا۔

"فی الحال تو ربّانی ہی ہے۔ اگر کبھی کسی کے بارے میں پتا چلا تو ضرور بتاؤں گا تمھیں۔ اب جتنی جلدی ہو سکے اس موذی سے نجات دلا دو دنیا کو اور اگر مدد کی ضرورت پڑے تو کراچی میں شرافت علی کے آدمی موجود ہیں، ان سے مدد لے سکتے ہو تم۔" میں نے کہا۔

"نہیں یار! یہاں کراچی میں میرے پاس ہر طرح کے لوگ ہیں۔ کسی کی مدد کی ضرورت بالکل نہیں پڑے گی، تم بے فکر ہو جاؤ اب۔" وہ بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر اب میں سلسلہ منقطع کر دوں، کچھ اور تو نہیں کہنا تمھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بس، اور تو کچھ نہیں کہنا مجھے۔ وہ فردوسی بیگم بہت یاد کرتی ہے تمھیں۔ اس کی خیریت لے لیا کرو کبھی کبھی۔" وہ بولا۔

"اوہ، کیا وہ ملی تھی تمھیں؟" میں نے فردوسی کا نام سنتے ہی چونک کر پوچھا۔

"میں جاتا رہتا ہوں دوسرے تیسرے دن اس کے پاس۔ یار، بڑی محبت کرنے والی، پُرخلوص عورت ہے وہ۔" خان نے کہا۔

"ہاں، ہے تو مگر تم اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس کے خلوص کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لینا کبھی۔"

"نہیں یار، کیسی بات کرتے ہو، کسی بدگمانی کو جگہ نہ دو دل میں اپنے۔ اس نے میری زندگی میں ایک بہن کی کمی پوری کر دی ہے، اب مجھے اس کا دُکھ نہیں رہا ہے کہ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ خدا نے بڑی اچھی بہن دی ہے مجھے، میں تو اس کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو، ایسی اچھی بہن مل جانے پر۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں یار۔ بس اس اوپر والے کی مہربانی ہے سب۔ دین ہے اس کی، جب جس کو جو کچھ بھی چاہتا ہے دے دیتا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے، پیارے شکر ادا کرتا رہ اب تو اس ربِّ دو جہاں کا۔ ایک آدھ دن میں موقع ملتے ہی میں تیری اس بہن کو بھی فون کروں گا۔ اب وہ اپنے آفس تو جانے لگی ہے نا؟ چھٹیاں تو نہیں کر رہی ہے اب تک؟"

"نہیں بھئی، چھٹیاں شٹیاں اب بالکل نہیں کر رہی ہے وہ، بڑی باقاعدگی سے آفس جا رہی ہے آجکل۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر میں اُسے کسی بھی روز شام کے وقت ٹیلی فون کروں گا، دعا کرو یار! مولا ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی عطا کرے۔ فردوسی بیگم سے ملاقات ہو تو اسے کہنا، وہ بھی ہمارے لیے دعا کرتی رہا کرے۔" میں نے خان سے کہا۔

"میری دعائیں تم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ تمھیں کامیاب و کامران واپس لائے۔ اور وہ فردوسی بیگم تو ہر دم تمھاری اور سب لوگوں کی خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ اب تو پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز بھی پڑھنے لگی ہے وہ، کچھ پتا ہے تمھیں؟"

"اچھا! یہ تو بہت اچھی بات ہے یار، بڑی نیک بی بی ہے وہ۔ اللہ اس کی مرادیں بھی ضرور پوری کرے گا ایک دن۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

سب لوگ اپنے اپنے نرم گرم بستروں میں گھسے ہوئے نیند کے مزے لے رہے تھے۔ لاہور میں اب کوئی ایسا دشمن باقی نہیں بچا تھا جس سے ہمیں کوئی خطرہ ہوتا۔ ولسن گروپ کا ہم نے مکمل طور پر صفایا کر دیا تھا۔ آہو کو سوری بیگم نے ملکِ عدم رخصت کر دیا تھا۔ ایک پولیس تھی جو میری اور آسیہ کی بُو سونگھتی پھر رہی تھی لیکن اسے ہماری لاہور میں موجودگی کی خبر نہیں تھی۔ اُسے تو یہی معلوم تھا کہ میں اور آسیہ کراچی بس ہیں۔ اگر اسے ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ ہم دونوں بہن بھائی میں سے کوئی ایک بھی لاہور میں ہے تو اب تک انھوں نے لاہور کے چپّے چپّے پر پہرے بٹھا دیے ہوتے اور جگہ جگہ ہماری تلاش میں چھاپے مارتی پھر رہی ہوتی۔ لہٰذا ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر ہم چین کی نیند سو رہے تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد مجھے ایسی نیند سونا نصیب ہوا تھا لیکن یہ لبِ خیال ہی تھا میرا کہ لاہور میں آج کی رات میں ہر خطرے سے محفوظ ہوں۔ آدھی رات کے بعد مجھے کسی نے بڑے زور سے ہلا ڈالا۔ میں ایک دم چونک کر بیدار ہوا مگر نیند اتنی گہری تھی کہ کئی لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا۔ میں ابھی یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے سچ مچ جھنجوڑ کر مجھے اٹھایا ہے یا یہ کوئی خواب تھا جس کے دوران میں اچانک اُٹھ گیا ہوں۔ اسی وقت میرے کانوں نے کبری کی آواز سُنی۔ وہ کہہ رہا تھا "اجی جناب سردار صاحب، اُٹھ جائیں، ٹیلی فون ہے آپ کا۔"

میں نے آنکھیں مل کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ حیرت کی بات تھی، رات کے اس لمحے میں وہ کون تھا جسے میری یاد نے اتنا بے چین کیا تھا کہ وہ صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکا تھا۔ "کون ہے بھئی؟ کس کا فون آ گیا ہے اس وقت؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوئی خاتون ہیں جناب! عالیہ نام بتاتی ہیں اپنا۔" کبری نے بڑے ہی مہذّب انداز میں جواب دیا۔

عالیہ کا نام سنتے ہی میرے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ میں اُچھل کر بستر سے نکل کر سیدھا ٹیلی فون کے پاس پہنچا اور جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولا "ہیلو عالیہ! خیر تو ہے نا، آتی رات کو ایسی کون سی اہم بات ہو گئی ہے بھئی؟"

"بہت ہی اہم بات ہے۔ اسی لیے سوتے سے اٹھوا لیا ہے آپ کو۔ جتنی جلدی ہو سکے آپ اپنے لوگوں کو لے کر اس مکان سے نکل جائیں۔ صرف بیس منٹ کا وقت ہے آپ کے پاس۔ دو بجکر تیس منٹ پر دھمن کے آدمی ریڈ کر رہے ہیں وہاں۔" اُس نے آواز دبا کر کہا۔

"کیا... کیا... کیا مطلب... دھمن کے آدمی یہاں کہاں سے آ گئے؟ اور تم کہاں سے بول رہی ہو؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"آج ہی رات کو دس بجے ہم لوگ لاہور پہنچے ہیں۔ آڑنگ اور ولسن کے بارے میں ساری اطلاعات دھمن کو پہنچ چکی ہیں۔ وہ غصّے سے پاگل ہو رہا ہے اور یہ قسم کھا کر آیا ہے کہ اب آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا اور اس وقت تک بستر پر نہیں لیٹے گا جب تک آپ کا قصّہ ختم نہ کر دے۔ اُس نے لاہور پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر دیا ہے اور تمام تیاریوں کے بعد دو بجکر تیس منٹ پر آپ کے مکان پہ حملے کا پروگرام بنا کر دو آدمی آپ کے مکان کی نگرانی پر لگا دیے ہیں تاکہ اگر آپ کہیں جائیں یا وہاں کوئی نقل و حرکت نظر آئے تو فوراً اسے خبر ہو جائے۔"

"اور تم ایسی صورت میں جبکہ باہر دو نگراں موجود ہیں، مجھے کوٹھی چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہی ہو، کیا ہمارے باہر نکلتے ہی وہ لوگ دھمن کو اس کی خبر نہیں کر دیں گے اور ہم لوگ جہاں بھی جائیں گے، اسے اس کی اطلاع نہیں ہو جائے گی؟" میں نے اس سے کہا۔

"اب میں آپ کو اتنا بھی نادان نہیں سمجھتی کہ ساری بات معلوم ہو جانے کے بعد آپ ان دونوں کو اپنے ساتھ لگا کر لیے پھریں گے۔"

"مگر اب تو میرے پاس وقت بھی نہیں رہا ہے۔ اتنی جلدی ہم کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ تم نے اطلاع دینے میں بہت دیر کر دی عالیہ۔"

"میرا خیال ہے آپ کوٹھی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے شاید، ورنہ وقت اتنا تو ہے کہ آپ لوگ کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو بی بی! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ ابلیس زادہ خود ہی یہاں آ گیا ہے۔ اس نے مجھے بڑی خواری سے بچا لیا ہے لاہور اگر وہ نہ آتا تو ہم لوگ ایک دو دن میں اس کی تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ بہرحال تمھارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے بروقت اطلاع دے کر مجھے ہوشیار کر دیا۔ کیا اس حملے کی قیادت وہ خود کرے گا؟ میرا مطلب ہے اپنے گرگوں کے ساتھ وہ بھی آئے گا، تا میری کوٹھی پر شب خون مارنے کے لیے اور تم بھی ساتھ ہو گی اس کے؟"

"ہاں، وہ خود آئیں گے لیکن مجھے شاید ساتھ لے کر نہیں آئیں گے وہ۔" عالیہ نے جواب دیا۔

"پھر تو مزہ ہی کچھ نہیں آئے گا عالیہ بیگم! تم ضرور آنا اس کے ساتھ، نہیں تو تمھیں اس کے انجام کی خبر کس طرح ہو سکے گی۔" میں نے کہا۔

"میری آپ سے ایک درخواست ہے جیلانی! کیا آپ میری بات مانیں گے؟" اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں، کہو کیا بات ہے؟ اگر کوئی ماننے والی بات ہو گی تو ضرور مانوں گا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا، زبان کھولنے سے پہلے یہ دھیان رکھنا کہ کسی غدارِ وطن، کسی ملت فروش کی جاں بخشی کی بات نہ کرنا۔" میں نے اس سے کہا۔

"نہیں جیلانی! ایسا نہ کہیں، یہ بھی سوچیں کہ وہ میرا سہاگ بھی ہے۔ بے شک وہ مجسّم شیطان ہے لیکن ہے تو میرا شوہر نا۔ میری خاطر آپ اسے کچھ بھی رعایت نہیں دے سکتے۔ بے شک سخت سے سخت سزا دیں آپ اُسے مگر جان سے نہ ماریں، یہی میری التجا ہے۔" وہ بولی۔

اس نے اس انداز سے کہا کہ میرا دل لرز کر رہ گیا۔ ایک لمحے کو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں اس کی بات مان لوں، اس کی التجا کو نہ ٹھکراؤں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود بھی کوئی پارسا عورت نہیں تھی۔ دھمن کے ساتھ وہ بھی گلے گلے تک دھنسی ہوئی تھی دلدل میں۔ لیکن اس کے سینے میں اپنے ملک، اپنی سوہنی دھرتی کی جو محبت تھی اس نے دھمن کی وطن فروشی میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی کوئی عابد زاہد اور نیک نام شخص نہیں تھا۔ میرا نامۂ اعمال بھی پوری طرح سیاہ تھا۔ ان گنت قتل اور ڈاکے میرے نام کے آگے درج تھے، ایک وقت تھا جب میں دشمنوں کی فصل اُگاتا چلتا تھا، تباہیاں اور بربادیاں میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا کرتی تھیں۔ ایک طرف دشمنوں کی فوجِ ظفر موج تھی جو جگہ جگہ گھات لگائے بیٹھی تھی اور دوسری جانب ملکی قانون تھا جو آہنی زیور پہنانے کے لیے میرے پیچھے پیچھے تھا لیکن جب بات میرے ملک، میرے وطن، میرے سوہنے دیس کی آئی تو میں سب کچھ بھول کر مادرِ وطن کی خدمت کے لیے، اس کی بقا، اس کی سلامتی کی جدوجہد کے لیے میدان میں نکل آیا۔ بالکل یہی کچھ عالیہ نے بھی کیا تھا۔ اس اعتبار سے میں اور وہ ایک ہی کشتی کے سوار تھے، ایک ہی راہ کے مسافر تھے لیکن اب وہ اپنے سہاگ کی سلامتی طلب کر رہی تھی، اس ننگِ وطن کی زندگی مانگ رہی تھی جس نے پہلے مجھ جیسے نہ جانے کتنوں کو دھوکے فریب سے ایک ایک گرمے سے محروم کیا، پھر میری قوم کے نئے اور گرم خون میں منشیات کا زہر بھر کے اس کی ساری توانائی، ساری حرارت ختم کر دی اور اب اس ملک، اس قوم کی سلامتی کا بھی سودا کر رہا تھا۔ میں ایسے ذلیل، ملک دشمن کو زندہ رہنے کا حق کس طرح دے دیتا کیسی

عجیب، کیسی انوکھی بات کر رہی تھی وہ۔ تھی نا آخر ایک مشرقی عورت! وفا اور شوہر پرستی اس کے خمیر میں شامل تھی۔ آخر تو اس کی تعمیر میں یہی مٹی استعمال کی گئی تھی۔ میں اس کی اس بات کو منظور نہیں کر سکتا تھا لیکن صاف طور پر انکار کر کے اس کا دل توڑنے کے گناہ کا ارتکاب بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا اس نے مجھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا جواب دوں۔ کافی دیر میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں جیلانی! میں نے آپ کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ مجھے تسلیم ہے، وہ شخص جس کی جاں بخشی میں کرانا چاہتی ہوں، ایسا ہے نہیں کہ اسے زندہ رہنے کا موقع دے دیا جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے، اگر آپ نے اسے معاف کر بھی دیا تب بھی وہ اسے آپ کا احسان ہرگز تسلیم نہیں کرے گا، وہ آپ کی عنایات اور مہربانی کو بھی اپنا ہی کوئی کارنامہ قرار دے کر اکڑتا پھرے گا لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں آپ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں جیلانی! آپ ...آپ... میرا دل رکھنے کو ہی ایسا کہہ دیں..."

میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "نہیں، ایسی باتیں نہیں کرو عالیہ! میں تم سے وعدہ کر رہا ہوں، اگر اس نے خود ہی اپنی موت کا سامان نہ کر دیا تو میں کوشش کروں گا کہ تمھارا سہاگ اجڑنے نہ پائے۔ بس اب تو تم مطمئن ہو گئی ہو نا؟"

"اوہ، شکریہ، بہت بہت شکریہ جیلانی! آپ نے میری بات مان کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ بولی۔

"کیا وہ لوگ میری طرف روانہ ہو چکے ہیں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"بس چند منٹ میں روانہ ہونے والے ہیں۔ گاڑیاں تیار ہو چکی ہیں، دھمن اپنے کمرے میں تیار ہو رہے ہیں، اسی وجہ سے مجھے آپ کو فون کرنے کے لیے تھوڑا سا وقت مل گیا ہے اس وقت، میری بات مان لیں، فی الحال یہ مکان چھوڑ دیں۔" اس نے ایک بار پھر فکرمندی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو میں ایسا ہی کروں گا، لیکن اگر ہو سکے تو تم اسی وقت دھمن کو ادھر آنے سے روک دو کسی طرح۔ اس کے آدمی بے شک آئیں۔ اُن سے ہم بآسانی نمٹ لیں گے، بس دھمن کو نہ آنے دو۔ وہ لوگ جو یہاں شب خون مارنے آئیں گے، ان کی تعداد کتنی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"دھمن کے علاوہ بیس آدمی ہیں۔ بے حد جنگجو قسم کے۔ دھمن انھیں اپنے ساتھ ہی لے کر آئے ہیں، یہاں کے غنڈے نہیں ہیں وہ۔" اس نے بتایا۔ "میں دھمن کو روکنے کی کوشش تو دیر سے کر رہی ہوں لیکن وہ میری بات مان ہی نہیں رہے ہیں کسی طرح۔ بہرحال پھر کوشش کرتی ہوں۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے تیزی کے ساتھ ایک ایک کو اٹھا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ روشنی میں نے بالکل نہیں کرنے دی تھی کسی کو تاکہ باہر موجود نگرانی کرنے والوں کو اندر کسی بھی قسم کی نقل و حرکت کا احساس نہ ہو سکے۔ ہم سب اسٹین گنیں، رائفلیں اور پستولیں لے کر کوٹھی کے لان میں مختلف جھاڑیوں کے پیچھے جا چھپے تھے اور طے یہ ہوا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تیز آواز والے ہتھیاروں کے استعمال سے احتراز کیا جائے گا۔ دشمن کو اتنا موقع دیا جائے گا کہ پستول کے نشانے کی زد میں آجائے۔ اس کے بعد اس کو سائیلنسر لگے پستول سے نشانہ بنایا جائے۔ اسٹین گن یا رائفل انتہائی ناگزیر حالت میں ہی استعمال کی جائے گی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ عالیہ کی کوششیں بارآور ہو جائیں، وہ دھمن کو روکنے میں کامیاب ہو جائے۔ دھمن کے ساتھ نہ آنے کی صورت میں تو میں بیس کیا ایک سو بیس افراد سے بھی تنہا نمٹ سکتا تھا۔ میری وہ طلسمی انگوٹھی مجھے مل چکی تھی، اس کی موجودگی میں کوئی دشمن گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی جبکہ میری اسٹین گن لمحوں میں ان سب کو چاٹ جاتی۔ البتہ دھمن کی موجودگی میں یہ مشکل آپڑتی کہ ان کی طرح ہم میں سے بھی کوئی ان پر گولی چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ چاہتا میں یہ تھا کہ آج رات دھمن کے ان سارے آدمیوں کا بالکل صفایا کرنے کے بعد کل میں دھمن کی کمین گاہ میں جا گھسوں تو وہاں زیادہ لوگ میرا راستہ روکنے کے لیے موجود نہ ہوں۔

میں ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے بیٹھا انھی خیالوں میں گم تھا کہ میرے کانوں نے کوٹھی کے باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنی۔ میں نے فوراً چوکنا ہو کر کان ادھر لگا دیے۔ رات کے اس سمے میں ہر سو سناٹا طاری تھا اور اس سناٹے میں ہلکی سی آواز اچھی خاصی تیز سنائی دیتی تھی۔ چند ہی لمحے کے بعد ایک اور کار کے رُکنے کی آواز سنائی دی، پھر کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ میں ان آوازوں کو سننے کے بعد اپنا چُپ شاہ دائیں ہاتھ میں سنبھال کر اپنی جگہ سے نکل کر بے آواز، پنجوں کے بل دوڑتا ہوا کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ گیٹ کے قریب کوٹھری میں ڈرائیور نظام دین سو رہا تھا۔ اگر آہٹ سن کر وہ صورتِ حال جاننے کے لیے باہر نکل آیا تو خواہ مخواہ بے موت مارا جائے گا۔ وہ سیدھا سادا، معصوم اور بے ضرر شخص جس میں اطاعت گزاری اور وفاشعاری کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ تو کسی کو گالی تک نہیں دے سکتا تھا، وہ غریب ان مسلح اشخاص کے مقابلے میں اپنا دفاع کیونکر کر سکتا تھا۔ میں ابھی گیٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میں نے باہر کاروں کے دروازے بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ میں نے تیزی سے گیٹ کی بغلی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا۔ کوٹھی کے گیٹ کے بالکل سامنے سیاہ رنگ کی دو لمبی لمبی کاریں ایک دوسرے

کے آگے پیچھے کھڑی تھیں اور کئی قدآور قسم کے خاصے گرانڈیل اشخاص ہاتھوں میں ریوالور تھامے کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ ان کے شانوں سے اسٹین گنیں لٹک رہی تھیں اور کمر سے کارتوس کی پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سروں پر بڑے بڑے پگڑ تھے جن کے کچھ حصے کو ڈھاٹے کی طرح اپنے چہروں پر لپیٹ رکھا تھا اور وہ سارے کے سارے سیاہ شلواریں اور قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کھول کر جیسے ہی انھیں دیکھا، اپنا پستول سیدھا کر کے، ان سب سے آگے آنے والے پر گولی داغ دی۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی وہ شخص ٹھٹک کر ایک دم رکا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا کر دُہرا ہوتا ہوا زمین پر آرہا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے حلق سے کراہ تک خارج نہیں ہوئی تھی۔ اُسے گرتے دیکھ کر اس کے پیچھے آنے والے ٹھٹک کر اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ کر سکتے، میں نے تیزی سے ان میں سے دو کو اوپر نیچے گرا دیا۔ تین آدمیوں کے گرنے کے بعد یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی کہ یوں کھلی جگہ میں کھڑے رہنا اُن کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ جس دشمن کو غافل سمجھ کر بے دھڑک یہاں تک چلے آئے ہیں، وہ حقیقتاً غافل نہیں ہے اور ان کے استقبال کے لیے بالکل تیار ہے۔ لہٰذا باقی لوگ تیزی سے اپنی گاڑیوں کی طرف پلٹ پڑے۔ عین اسی لمحے میں نے اُن میں سے ایک اور شخص کو لڑکھڑا کر پیچھے گرتے اور ایک شخص کو یوں اُچھل کر لنگڑاتے ہوئے بھاگتے دیکھا جیسے اس کی ٹانگ زخمی ہو گئی ہو۔ ان دونوں پر میں نے گولی نہیں چلائی تھی چنانچہ مجھے حیرت ہوئی کہ انھیں کس نے اور کہاں سے نشانہ بنایا تھا۔ لیکن وہ وقت ایسا نہیں تھا۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا، میرے لیے یہی کافی تھا کہ دشمن کے چار آدمی گولیاں کھا کر زمین پر گر گئے تھے اور ایک زخمی ہو چکا تھا۔ اس زخمی کے علاوہ پانچ افراد اور تھے جو دونوں کاروں کے پیچھے پناہ لینے میں کامیاب ہو چکے تھے چونکہ ان لوگوں پر ہمارے پستول کارگر ہو رہے تھے۔ لہٰذا مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اُن کے ساتھ دھمن نہیں ہے۔ اگر وہ اس طرف ہوتا تو یہ پستول کبھی گولیاں اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ میں انھیں بھاگنے کا موقع بالکل نہیں دینا چاہتا تھا چنانچہ جیسے ہی میں نے کاروں کے پیچھے انھیں چھپتے ہوئے دیکھا، دونوں کاروں کے ایک ایک وھیل کا نشانہ لے کر انھیں پھاڑ ڈالا۔ اور گیٹ کی بغلی کھڑکی پوری کھول کر باہر قدم دھر دیا۔ لیکن میرے پاؤں باہر نکالتے ہی آسیہ نے میرا بازو تھام کر مجھے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتے ہو بھائی جان! اس طرح باہر نکل کر جان..."

میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور پیار سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "تو فکر نہ کر مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ مگر تُو باہر نہ نکلنا۔"

"کیوں؟ آپ کو کیوں نہیں ہوگا کچھ؟ کیا آپ نے انھیں منع کر دیا ہے کہ وہ آپ پر گولی نہ چلائیں۔ اور انھوں نے مان لی ہے آپ کی بات؟"

"او ... بہن میری، تو بھول رہی ہے شاید میرے ہاتھ میں وہ طلسمی انگوٹھی موجود ہے جس کی موجودگی میں آتشی اسلحہ بے کار ہو جاتا ہے۔ آئی سمجھ، میرے اوپر ان کے ہتھیار گولیاں نہیں اُگل سکیں گے۔ اور ہاں یہ میرا پستول رکھ لے تُو اپنے پاس، اس میں صرف ایک ہی گولی باقی بچی ہے، اسے دوبارہ لوڈ کر لینا، مجھے اپنا پستول دے دے اس میں تو گولیاں پوری ہیں نا؟" میں نے اپنا پستول اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

اُس نے میرا پستول لے کر اپنا مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ٹھہریں، میں اُسے بھی لوڈ کر کے دے دیتی ہوں آپ کو۔ ایک پستول کافی نہیں ہوگا!"

"ٹھیک ہے میں ان لوگوں کو سنبھالے ہوئے ہوں، جب تک تو یہ پستول لوڈ کر کے مجھے دے دے اور شرافت علی اور انور کمال کو کہہ دے کہ گاڑی تیار رکھیں یہ لوگ جان بچا کر بھاگیں گے تو ہم ان کا پیچھا کرتے ہوئے دھمن تک جا پہنچیں گے۔ میں چاہتا ہوں آج کی رات ہی فیصلہ کُن ثابت ہو جائے۔ اسے سنبھل کر پاؤں جمانے کی مہلت بالکل نہیں دینا چاہتا ہوں۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس دوران اس نے ریوالور میں دوبارہ گولیاں ڈال دیں اور اُسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے بھائی جان! میں ان دونوں کو آپ کا پیغام دے دیتی ہوں۔ لیکن آپ نے ان کی دونوں گاڑیوں

علمِ رُوحیت پر ایک بے حد کارآمد کتاب

ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی

اپنا پیغام دُوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے اور
اُن کے دلوں کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ

قیمت ❁ ۲۰/- روپے

کے ٹائر تو پھاڑ ڈالے ہیں۔ وہ لوگ دشمن کے پاس واپس جائیں گے کس طرح؟ آپ نے انھیں بھاگنے کے قابل تو چھوڑا ہی نہیں ہے؟"

"ارے نہیں، میں نے صرف ان دو گاڑیوں کو ناکارہ کیا ہے جو ہماری کوٹھی کے گیٹ پر کھڑی ہیں، دوسری دو گاڑیاں جو یہاں سے کچھ دور کھڑی کی ہیں انھوں نے وہ ان کے بھاگنے کے لیے بالکل محفوظ ہیں۔" میں نے پستول آسیہ کے ہاتھ سے لے کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

عین اسی لمحے میں نے اسٹین گن چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھی کے لان میں کھڑے نیم کے گھنے درخت کی شاخوں میں سے کسی کی کراہ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے ادھر سے بھی جواب میں اسٹین گن کا برسٹ مارا گیا تھا۔ گولیاں اس تواتر کے ساتھ برسائی گئی تھیں کہ دور کھڑی ہوئی دشمن کی گاڑیوں کی جانب سے جہاں سے کوٹھی کی طرف اسٹین گن سے فائر کیا گیا تھا، بیک وقت کئی چیخیں ابھر کر رات کے سناٹے میں دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ شاید شرافت علی یا انور کمال میں سے کسی نے نیم کے اس درخت کو مورچا بنایا تھا اور میری چلائی ہوئی گولیوں سے گرنے والے دو حملہ آوروں کے بعد جو ایک اور شخص گولی کھا کر گرا تھا اور ٹانگ میں گولی لگنے سے لنگڑاتا ہوا بھاگ کر گاڑی کے پیچھے چھپا تھا، وہ اسی کی چلائی ہوئی گولیوں کا نتیجہ تھا۔ دور کھڑی ہوئی گاڑی میں موجود لوگوں نے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگا کر جواباً اس طرف فائر کیا تھا۔ اس کے کراہنے کی آواز سے مجھے یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ گولی نے اسے زخمی ضرور کر دیا، وہ زخم کتنا گہرا اور موثر تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن جس طرح اس نے فوراً جوابی کارروائی کی اس کے بعد مجھے ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ زخمی نہیں تھا۔

میری ساری احتیاط دھری رہ گئی تھی۔ میں نے فائرنگ کی آوازوں کو دبانے کے لیے سائلینسر لگے ہوئے پستول استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میں فائرنگ کی آوازوں سے علاقے کا سکون غارت کر کے عام لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنا اور پولیس کو ادھر متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے اسٹین گنوں سے فائرنگ کر کے پورے علاقے کو چونکا کر دیا تھا۔ لہٰذا میں اب انھیں زیادہ دیر یہاں ہنگامہ آرائی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، پولیس کے یہاں آنے سے پہلے ہی اس قصے کو ختم کر دینا چاہتا تھا میں۔ لہٰذا میں پستول سنبھال کر تقریباً دوڑتا ہوا ان کے سروں پر جا پہنچا۔ زخمی کے علاوہ وہاں چار افراد اور تھے۔ انھوں نے بھی اپنے ہاتھوں میں... اسٹین گنیں سنبھال رکھی تھیں اور کاروں کے عقب میں پوزیشن لیے فائرنگ کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ مجھے یوں بے دھڑک اپنے سامنے دیکھ کر ان چاروں نے مشینی انداز میں اپنی اپنی اسٹین گنوں کا رخ میری طرف کر کے بیک وقت مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کے یہ آگ اگلنے والے ہتھیار جن پر انھیں بڑا ناز تھا، میرے سامنے اپنی کارکردگی دکھانے سے معذور رہیں۔ ان کے آقا دشمن نے انھیں میری طرف بھیجتے ہوئے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی نصف بہتر عالیہ نے مجھے بھی وہ انگوٹھی دے رکھی ہے جس کے بل پر وہ بے دھڑک اپنے دشمنوں کے ہجوم میں گھسا چلا جاتا ہے، ریوالوروں، رائفلوں اور خوفناک ترین آتشیں اسلحہ کی پروا کیے بغیر ہر جگہ بے خوف ہو کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی اپنی رائفلوں سے الجھتے رہے اور میں نے انھیں کوئی موقع دیے بغیر تیزی سے ان میں سے ایک کے سینے میں اپنے ریوالور کی گولی اتار دی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں دوسرے شخص کا نشانہ لے کر پستول کی لبلبی دباتا، اس نے بجلی کی سی تیزی سے اسٹین گن پھینک کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں اسے جست کرتے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے دائیں طرف ہٹ گیا تھا۔ نتیجتاً وہ مجھ پر آنے کے بجائے اوندھے منہ نیچے پختہ سڑک پر گرا۔ اس کا ماتھا اور منہ بہت زور سے زمین سے ٹکرایا تھا، یقیناً ماتھا پھٹ گیا ہوگا اور ممکن ہے ناک اور دانت بھی لہو میں ڈوب گئے ہوں لیکن میرے پاس یہ سب کچھ دیکھنے اور جاننے کی فرصت بالکل نہیں تھی۔ وہ جیسے ہی نیچے گرا تھا، میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کے سر کے پچھلے حصے میں پستول کی گولی اتار دی۔ اسے گولی مار کر میں پلٹا ہی تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی مجھ پر آ پڑا، میں اس کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا وہ مجھے رگیدتا ہوا دور تک لے گیا لیکن جلد ہی میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ قدم جمتے ہی میں نے سنبھل کر پوری قوت سے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا۔ وہ خاصا گرانڈیل اور طاقتور تھا لیکن میرے گھٹنے کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بلبلا اٹھا اور مجھے چھوڑ کر دونوں ہاتھوں کو رانوں کے درمیان دبا کر نیچے گر کے ماہی بے آب کی طرح لوٹیں لگا لگا کر تڑپنے لگا۔ وہ جس زور سے آ کر مجھ سے ٹکرایا تھا اس کے جھٹکے سے میرے ایک ہاتھ سے پستول نکل کر کہیں گر گیا تھا مگر وہ وقت گرے ہوئے پستول کو ڈھونڈنے کا نہیں تھا کیونکہ میں نے ابھی ایک حریف سے نجات حاصل کی ہی تھی کہ ایک اور شخص اپنی اسٹین گن کو لاٹھی کی طرح تولتے ہوئے میری طرف لپکا وہ میرے بہت نزدیک آ چکا تھا اور اگر ایک لمحے اور میں اسے نہیں دیکھتا تو اس نے میری کھوپڑی کے دو حصے کر دیے تھے۔ میں اسے دیکھتے ہی جھکائی دے کر بائیں طرف نکل گیا۔ اس نے اسٹین گن کو نال کی طرف سے پکڑ کر اس کا بٹ میرے سر پر مارا تھا جو میرے نشانے سے ہٹ جانے کی وجہ سے اس شخص کے سر پر پڑا جو عین اسی لمحے پیچھے سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے سر پر کتنی شدید چوٹ آئی تھی، یہ اس کے سر پر بندھے بھاری پگڑ کی وجہ سے معلوم نہیں ہو سکا مجھے۔ لیکن چوٹ کھانے کے بعد میں نے اسے اس طرح نیچے گرتے دیکھا تھا کہ پھر اس میں دوبارہ اٹھنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلا کر بالکل ساکت پڑا رہ گیا تھا۔ میں فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا جس نے

میرا سر پاش پاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ میرے بجائے اپنے ہاتھوں اپنے ہی ایک ساتھی کا عبرت ناک انجام دیکھ کر غصّے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسٹین گن کو مجھے مارنے کے لیے اوپر اُٹھایا مگر عین اُسی وقت مَیں نے فاطمہ کو دیکھا جو فضا میں اُڑتی ہوئی آئی تھی اور پلک جھپکتے ہی اس کے منہ پر ٹھوکر مارتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ٹھوکر کھا کر وہ شخص اُلٹ کر پیچھے گرا تو اسٹین گن اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ مَیں اُس کے گرتے ہی جھپٹ کر اس پر جا پڑا اور ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رگِ احساس مَسل ڈالی۔ اس سے فارغ ہو کر مَیں فاطمہ کی طرف پلٹا مگر اتنی ہی دیر میں وہ دو دشمنوں کو بے دم کر کے زمین پر ڈال چکی تھی اور دشمن کے دو جیالے بھاگتے ہوئے اُن دو کاروں کی طرف جا رہے تھے جو اس جگہ سے دور کھڑی کی گئی تھیں۔ اِن دونوں گاڑیوں میں جو لوگ تھے وہ شاید اس صورتِ حال کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے سوچا تک نہیں ہو گا کہ یہاں انھیں کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک بار گولیوں کے ہلکے سے تبادلے کے بعد وہ لوگ یہ تو سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اپنی حفاظت کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔ اسی لیے اُن کی پوری توجّہ اسی طرف مرکوز رہی ہو گی جدھر سے اُن پر فائرنگ کی گئی تھی۔ انھوں نے جوابی فائرنگ اُسی طرف کی تھی۔ مَیں نے چونکہ بے آواز پستول استعمال کیا تھا اور اس کے بعد مقابلہ دُو بدو ہوا تھا جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اختتام پزیر ہو گیا۔ چنانچہ فاصلہ ہونے اور ناکافی روشنی کی وجہ سے صحیح صورتِ حال سمجھنے میں انھیں دشواری ہوئی ہو گی، ورنہ اپنے آدمیوں کی دُرگت بننے کا تماشا نہ دیکھتے رہتے وہ۔ انھیں تو حقیقت کا علم اُس وقت ہوا جب ان دو بھاگنے والوں کو اسٹین گن کا برسٹ مار کر گرایا آسیہ نے۔ وہ شاید فاطمہ کے پیچھے ہی پیچھے میرے پاس آ پہنچی تھی۔ ان دونوں کے گرتے ہی دُور کھڑی ہوئی دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں اور وہ دونوں گاڑیاں تیزی سے ہماری طرف لپکیں۔ ان دونوں کاروں سے میری کوٹھی کی طرف اندھا دُھند گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ عین اُسی لمحے کوٹھی کے گیٹ سے شرافت علی کی گاڑی نکل کر پوری رفتار کے ساتھ ان دونوں کاروں کی طرف لپکی اور دوسرے لمحے اس نے آگے والی کار پر راکٹ فائر کر دیا جو سیدھا کار کے انجن والے حصّے میں لگا اور کار کے پرخچے اُڑ گئے۔ آگے آنے والی کار کو اپنے سواروں سمیت ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر فضا میں منتشر ہوتے دیکھ کر دوسری کار والوں کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ اُن کے لیے ہمارا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اُن کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ ہم کس قدر خوف ناک اور تباہ کن انداز میں اُن کا استقبال کریں گے۔ اُن کی تین کاریں اور اُن میں سوار تقریباً سارے ہی لوگ کام آ گئے تھے اور جو بچ گئے تھے اُن کی زندگی بھی زیادہ نہیں رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے برق رفتاری کے ساتھ اپنی کار کا رُخ موڑ کر واپس بھاگنے کی کوشش کی، لیکن انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ شرافت علی اور انور کمال جو کار لے کر کوٹھی سے برآمد ہوئے ہیں، وہ کن کن خوبیوں کی مالک ہے۔ اُن کی کار ابھی پوری طرح مڑ بھی نہیں سکی تھی کہ شرافت علی کی کار نے پوری قوت سے ٹکر مار کر اُس کو اُلٹ دیا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ کار الٹ کر دور تک گھسٹتی چلی گئی تھی اور اُس کے دھماکے سے پورا علاقہ لرز کر رہ گیا تھا۔ جب کہ شرافت علی کی کار کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔ مَیں آسیہ اور فاطمہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اُلٹنے والی کار کے پاس جا پہنچا تاکہ اگر کوئی اس کار میں سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو اُس کو سنبھالا جا سکے مگر وہ انتہائی تربیت یافتہ اور تجربے کار لوگ تھے۔ انھیں ہر قسم کی حالت سے نمٹنے اور بدترین حالات میں بھی ہوش و حواس قائم رکھ کر اپنے آپ کو بچا کر نکل جانے کی تربیت دی گئی تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اتنی زبردست ٹکر کے بعد کار کے اُلٹتے ہی اپنی جان بچانے کے لیے کار سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا لیکن انھوں نے باہر نکلنے کی جدّو جہد کرنے کے بجائے وہیں اپنی اپنی جگہ ساکت ہو کر اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ مَیں اور فاطمہ کار کے ایک طرف جا پہنچے تھے جب کہ آسیہ نے دوسری طرف سے جا کر اُلٹی ہوئی کار کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تھی اور اس کی یہی غلطی اُسے کھا گئی تھی۔ وہ جیسے ہی نیچے جھکی اسٹین گن کے..... پورے برسٹ نے اُس کی کھوپڑی اور چہرے کو بُری طرح چھید کر رکھ دیا۔ گردن سے اوپر اُس کا پورا چہرہ اور سر اِس طرح مسخ ہو کر رہ گیا تھا کہ اُسے پہچاننا ناممکن تھا۔ وہ اُلٹ کر پیچھے جا گری تھی۔ اُس کی اِس کیفیت سے بے خبر دوسری جانب سے مَیں نے اور فاطمہ نے اپنی اپنی اسٹین گنوں کے دہانے کھول دیے تھے اور اُس وقت تک آگ اُگلتے رہے تھے جب تک ہمیں مکمل طور پر کار میں موجود ایک ایک شخص کی ہلاکت کا یقین نہیں ہو گیا۔ اُن سے فارغ ہو کر مَیں اُدھر گیا، جس طرف آسیہ گئی تھی تو اُسے دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے اسٹین گن چھوٹ کر گر پڑی۔ مَیں تڑپ کر اُس کے پاس پہنچا اور اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر سسک پڑا۔ "اوہ میری بہن! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اِس حال کو کس نے پہنچایا ہے تجھے؟"

اُس کی نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کمزوری اور نقا[illegible] کے مارے بات کرنا مشکل تھا اِس کے لیے اُس نے بمشکل

اپنی طاقت کو مجتمع کر کے کہا "بھائی! میرا . . . آخری . . . وقت . . . آ . . . آ . . . پہنچا ہے . . . اب . . . میر . . . ی . . . وجہ سے جو . . . جو آفتیں . . . آپ . . . پر . . . آئی تھیں . . . و . . . و . . . وہ سب . . . ختم . . . ہو . . . ہو . . . جائیں . . . گی . . . سس . . . سس . . . سارے . . . دل . . . دلدر . . . دو . . . دو . . . دور . . . ہو . . . جا . . . ئیں . . . گے . . . میری . . . نہ . . . نہ . . . نحو . . . س . . . س . . . ت . . . مم . . . مم . . . میرے . . . ساتھ . . . ہی . . . چلی جا . . . جا . . . جا . . . آ . . . آ . . . ئے . . . گگ . . . گگ . . . گی . . ." کہتے کہتے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میرے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی . . . بے اختیار میرے حلق سے چیخ کے سے انداز میں کراہ نکل گئی اور میں اس کے بے جان جسم کو سینے سے لگا کر بلک کر رو پڑا۔ "اے لوگو! دیکھو یہ کیا ہو گیا . . . میری بہن . . . میری معصوم بہن نے تو ابھی سہاگ کا جوڑا بھی نہیں پہنا تھا . . . لوگو! یہ تو ابھی دُلہن بھی نہیں بن سکی تھی۔ میں کیسا بدنصیب بھائی ہوں کہ اپنی بہن کو سہاگن بنانے نکلا تو گھر کا راستہ ہی گم کر بیٹھا اور . . . اور آج یہ میری بہن . . . سہاگ کا جوڑا پہنے بغیر ہی . . . مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ خدا کے لیے اسے روک لو . . . اس سے کہو . . . یہ یوں روٹھ کر نہ جائے مجھ سے۔ ایک ہی تو یہ میری بہن ہے . . . یہ . . . یہ بھی روٹھ کر چلی گئی تو میں کیا کروں گا . . . کس کو بہن کہوں گا؟ ماں جی کو کیا جواب دوں گا۔ وہ تو . . . وہ تو آتے ہی پوچھیں گی، او بے غلام جیلانی میری آسیہ کدھر [illegible]۔ اُسے تُو نے کدھر گم کر دیا ہے۔ بول . . . بولو . . . میں [illegible] جواب دوں گا ماں جی کو . . . مَیں کہاں سے لا کر دوں گا [illegible] اُن کی بیٹی . . ." میں نہیں جانتا کب تک کیا کیا کہتا ر[illegible] سب لوگ جمع ہو گئے تھے میرے گرد۔ وہ مجھے اپنے اپنے [illegible] پر تسلیاں اور دلاسے دے رہے تھے لیکن میرا دل کسی کی [illegible] ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اور مَیں کیسے کسی کی بات مان لیتا۔ [illegible] میرا تو سب کچھ لُٹ گیا تھا۔ میری وہ بہن جس کی خاطر [illegible] نے [illegible] دکھ کانٹوں کے ہار کی طرح پہن رکھا تھا آج وہ بھی کہا جاتا [illegible] چھوڑ گئی تھی۔ پھر اب مَیں کس کے لیے زندہ رہتا؟ کون بھی سمجھ میں نعم البدل عطا کرتا۔

زندگی بڑے بڑے زبردست مقابلہ ہوا تھا، گولیاں چلی تھیں اور دھماکوں اکڑ لے کے چلنے والا [illegible] دور تک لوگوں کو بیدار کر دیا تھا مگر اتنی ہمّت کسی میں بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر سے نکل کر صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ ہاں ہر گھر سے پولیس کو ٹیلی فون ضرور کیے گئے ہوں گے۔ علاقے میں امن بحال کرنے کی غرض سے ہر ایک نے اسی ایک محکمے کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو گا۔ لیکن اِس محکمے کے لوگ بھی آخر انسان ہیں۔ انھیں بھی اپنی جانیں اتنی ہی عزیز ہیں جتنی دوسروں کو ہو سکتی ہیں۔ بے شک امن و امان قائم رکھنے کی ذمّے داری انھیں سونپی گئی ہے۔ وہ اپنی اِس ذمّے داری کو قبول بھی کرتے ہیں اور اسی کام کی تنخواہ بھی لیتے ہیں محکمے سے، لیکن لوگ اگر مرنے مارنے پر ہی تُل جائیں، تو برستی ہوئی گولیوں کے درمیان گھس کر تو امن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جان دے کر تو وہ کسی کو مرنے سے نہیں بچا سکتے۔ اب ایسے بھی بے وقوف تو نہیں ہیں نا وہ لوگ، اور پھر ذمّے داری کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اور بھی بہت سے محکموں نے قبول کر رکھی ہے لیکن ان ذمّے داریوں کو پورا کون کرتا ہے، جو پولیس سے لوگ ایسی غیر ذمّے دارانہ توقعات قائم کر لیتے ہیں۔

مجھ پر تو آسیہ کی موت نے جنون سا طاری کر دیا تھا۔ چنانچہ مَیں نے اسٹین گن اٹھا کر دشمن کے ہر شخص کو یہ تمیز کیے بغیر کہ وہ مر چکا ہے یا محض بے ہوش ہے، ایک طرف سے چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ ایک ایک کے سینے میں کئی کئی گولیاں اتار دیں تاکہ کسی کے بھی زندہ رہ جانے کا امکان تک باقی نہ رہے۔ شرافت علی، انور کمال اور فاطمہ نے بڑی مشکل سے مجھے قابو کر کے اسٹین گن میرے ہاتھ سے چھینی تھی۔ اتنا ہنگامہ ہو جانے کے بعد پولیس کا وہاں پہنچنا ضروری ہو گیا تھا! چنانچہ اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ ہم واپس اپنی کوٹھی میں چلے جاتے۔ پولیس جب تفتیش کی غرض سے ادھر آتی تو میری کوٹھی میں ضرور قدم رنجہ فرماتی۔ یہ بات علاقے کے لوگوں سے چھپی نہیں رہی تھی کہ حملہ آوروں کا نشانہ میری کوٹھی ہی تھی لہٰذا صحیح صورتِ حال انھیں وہیں سے معلوم ہو سکتی تھی۔ اور اگر پولیس وہاں آ کر مجھے دیکھ لیتی تو سب کچھ میرے اعمال نامے میں ڈال کر میرے ساتھ انور کمال، شرافت علی اور فاطمہ کو بھی ساتھ لے جاتی اپنے۔

اِن سب باتوں کا مجھے تو ہوش نہیں تھا اس وقت لیکن فاطمہ اور شرافت علی نے یہ سب کچھ سوچ لیا تھا لہٰذا انھوں نے کوٹھی میں واپس جانے کے بجائے کسی ہوٹل وغیرہ میں جا کر پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اُن کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں تھا۔ میرے ذہن پر تو اس لمحے آسیہ کا خون سوار تھا اور میرا سر مونے تن انتقام انتقام پکار رہا تھا۔ دشمن سے آسیہ کے خون کا انتقام لینے کے

سوا کسی بات کا ہوش نہیں تھا مجھے۔ ایک کار میں اُن لوگوں نے آسیہ کی لاش ڈالی۔ کبری اور نظام دین کو اس کے ساتھ بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ انور کمال نے سنبھال لی۔ شرافت علی اور فاطمہ نے مجھے اپنے ساتھ دوسری کار میں زبردستی گھسیٹا تھا لیکن کاروں کے روانہ ہونے سے پہلے ہی کبری اپنی کار سے اُتر کر میرے پاس آ کے بولا" صاب جی! اب ہم اس حال میں کہاں جائیں گے؟"

میرے بجائے شرافت علی نے اُسے جواب دیا۔" کوئی نہ کوئی ٹھکانہ مل ہی جائے گا یار! تم کیوں فکر مند ہوتے ہو، کہیں ٹھکانہ بنانے سے پہلے تو ہمیں آسیہ کی تدفین کا انتظام کرنا ہے۔ اس کی لاش کو لے کر تو ہم کسی ہوٹل میں بھی نہیں جا سکتے۔"

"اسی لیے تو مَیں نے آپ سے پوچھا ہے کہ اب کہاں جائیں گے۔" پھر وہ مجھ سے بولا" اگر میری بات مانیں سردار صاحب، تو سیدھے آہو صاحب کی حویلی پر چلے جائیں۔ اس سے بہتر اور پناہ گاہ ہمیں پورے لاہور میں نہیں مل سکے گی اس وقت۔ وہیں آسیہ بی بی کی تدفین بھی ہو جائے گی۔"

"کون آہو صاحب؟ وہی تو نہیں جن کی بیوی جیبل سے ملنے کے لیے آئی تھی جیلانی سے؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ہاں جی وہی۔ انھی کی حویلی کی بات کر رہا ہوں میں۔" کبری نے جواب دیا۔

"مگر وہاں کون ہوگا اس وقت جو ہماری مدد کرے گا۔ آہو کو تو اس کی بیوی نے قتل کر دیا ہے اور وہ خود جیل میں پڑی سزا کاٹ رہی ہے۔ ان دونوں کے بعد وہ حویلی تو ویران ہی پڑی ہوگی آج کل؟" شرافت علی نے کہا۔

"جی ہاں حویلی بالکل خالی ہے۔ جبھی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اس وقت ہمارے بہت کام آ سکتی ہے۔ حویلی میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہی اُدھر کسی کے آنے کا خدشہ ہے۔ چابی اُس کی میرے پاس ہے۔ خانم نے مجھے دے رکھی ہے وہ تاکہ مَیں وہاں جا کر حویلی کی صفائی وغیرہ کرا دیا کروں کبھی کبھی۔ اگر ہو سکے تو کسی اچھے خاندان کو کرائے پر بھی اٹھا دوں اُسے۔" کبری نے جواب دیا۔

فاطمہ نے فوراً کہا" یہ تو بہت اچھی بات بتائی ہے تم نے۔ وہاں تو ہم ساری مصیبتوں سے بچ جائیں گے۔"

شرافت علی نے اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا" ٹھیک ہے، تم آؤ اِدھر بیٹھو میرے ساتھ اور مجھے بتاؤ کدھر چلنا ہے۔"

ہماری گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ مگر آگے جا کر پہلے ہی موڑ پر ایک اور مصیبت منتظر تھی ہماری۔ وہاں پولیس والوں نے سڑک کے بیچوں بیچ اپنی جیپ آڑی کھڑی کر کے سڑک بلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ پتا نہیں پولیس کے محکمے میں ایسا جیالا کون آ گیا تھا جس نے یہ حرکت کی تھی۔ یہ تو سراسر اس محکمے کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ یہ لوگ ملزمان کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا خطرہ کبھی مول نہیں لیتے ہیں۔ ایسے ملزمان جو بات بات پر گولیاں چلانے کے عادی ہوں، اُن کا راستہ اس طرح روکنے کی کوشش کبھی نہیں کی جاتی۔ وہ تو موقعِ واردات پر بھی اُس وقت تک نہیں پہنچتے، جب تک انھیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ گولیاں چلانے والے خطرناک لوگ اپنا کام ختم کر کے جا چکے ہیں۔ جیپ اس طرح کھڑی کی گئی تھی کہ اس سے بچ کر نکلنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا شرافت علی نے اس سے بھڑنے کے بجائے نہایت سُرعت کے ساتھ اپنی کار کو ایک گلی میں موڑ دیا تھا۔ راستہ روکنے والوں نے ہمیں اس طرف جاتے دیکھا تو بے دریغ فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ شکر یہ ہوا کہ ہم اس وقت ان کاروں میں سوار تھے جنھیں شرافت علی نے مخصوص طور پر تیار کروایا تھا۔ ان کاروں کی باڈی اور شیشے فائر پروف تھے لہٰذا برستی ہوئی گولیوں کے درمیان سے دونوں کاریں بہ عافیت گزر آئی تھیں۔ فائرنگ کی آواز سُن کر مَیں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے سڑک کے درمیان آڑی کھڑی ہوئی جیپ کی اگلی نشست پر دھمن بیٹھا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ کمینہ ہمیں گھیرنے کے لیے پولیس جیسی جیپ اور انھی کی یونیفارم پہن کر آیا تھا۔ اگر اس وقت شرافت علی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کار کو گلی میں نہ موڑ دیا ہوتا تو وہ یہودی کُتا اپنے ارادے میں کامیاب ضرور ہو گیا ہوتا۔ ادھر سے ہونے والی فائرنگ کا جواب دینے کے لیے فاطمہ نے اسٹین گن سنبھال کر اس کی نال کھڑکی سے باہر نکالی مگر میں نے اُس کو روکتے ہوئے کہا" یہ مت کرو۔ بے کار گولیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جیپ میں پولیس نہیں دھمن اور اُس کے آدمی ہیں اور دھمن گولی سے مرنے والی چیز نہیں ہے۔"

"لیکن اس طرح انھیں کم از کم پیچھے آنے سے تو روکا جا سکتا ہے۔ پھر اُن کی یہ فائرنگ ہمیں کسی اور مصیبت میں نہ پھنسا دے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جب تم اس پر گولی چلا ہی نہیں سکتیں تو بے مقصد کوشش کرنے کا فائدہ؟ اس کی انگلی میں بھی ایک ایسی ہی انگوٹھی موجود ہے جیسی یہ میرے پاس ہے۔ تم نے جانتی ہو اس انگوٹھی کے سامنے یہ آتشیں ہتھیار بےکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

"اوہ، اس کا مجھے خیال نہیں رہا تھا۔" پھر اُس نے بمشکل واپس اپنی گود میں دھرتے ہوئے کہا۔

اس دوران ہم گلی کو عبور کر کے ایک دوسری سڑک پر نکل آئے تھے۔ گلی سے باہر نکلنے سے پہلے شرافت علی نے کار کی ہیڈ لائٹس سمیت اندر اور باہر کی تمام لائٹس بجھا دی تھیں۔ اس کی دیکھا دیکھی انور کمال نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ دونوں کاریں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی مختلف گلیوں میں چکراتی ہوئی مال روڈ پر نکل آئیں۔ لاہور کی یہ مصروف ترین شاہراہ اس وقت بالکل سنسان پڑی تھی۔ ہماری گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح اُڑتی چلی جا رہی تھیں۔ دھمن کی جیپ کا دور دور کہیں پتا نہیں تھا۔ شرافت علی اُسے ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کبری نے کہا" بھائی جی! یوں مین روڈ پر نہ چلیں۔ اس طرح تو دشمن ہمیں دور سے بھی دیکھ سکتا ہے اور ہماری سمت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ میری بات مانو تو گلیوں گلیوں نکل چلو۔ میں راستہ بتاتا چلوں گا۔ اس طرح کسی کی نگاہ میں آئے بغیر ہم حویلی پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے بتاؤ اب کدھر چلنا ہے، دشمن کو تو ہم ڈاج دے ہی آئے ہیں۔" شرافت علی نے کہا۔

کبری اس کی رہنمائی کرنے لگا اور جلد ہی ہم آہو کی حویلی جا پہنچے۔

آسیہ کی موت کے بعد میرے دل میں جینے کی بالکل بھی تمنا نہیں رہی تھی۔ جی یہی کرتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر ویرانوں میں جا بسیرا کروں، انسانوں کو بھول کر چرند پرند سے دوستیاں اور ناتے جوڑ لوں کہ وہ کم از کم انسانوں کی طرح بدفطرت اور بے اعتبار تو نہیں ہوتے۔ ان سب کی اپنی اپنی ایک ہی فطرت ہوتی ہے۔ زندگی کا ایک ہی انداز اور روز و شب کے ایک ہی سے اطوار ہوتے ہیں۔ انسان تو بڑی ہی الجھی ہوئی گتھی ہے، سلجھنے میں ہی نہیں آتا ہے یہ کسی طرح۔ کوئی سرا ہی نہیں ملتا ہے اس کا۔ میں نے دنیا میں انسان سے زیادہ خود غرض، بے وفا اور ناقابلِ اعتبار کسی کو نہیں پایا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے زیادہ مخلص، باوفا اور قابلِ اعتبار بھی کوئی نہیں ہے۔ قدرت نے انسان کے روپ میں کیا شے تخلیق کی ہے یہ سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہ جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، ایسا گورکھ دھندا ہے جو آج تک اس کی اپنی بھی سمجھ میں نہیں آ سکا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ تمام زندگی بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے کر گردن اکڑا کے چلنے والا، دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھنے والا اپنی پیدائش اور موت کے سلسلے میں کتنا لاچار اور مجبور ہے۔ اس کی تخلیق اور تکمیل کا جو عمل قدرت نے مقرر کر دیا ہے اس سے بال برابر بھی ہٹنے کی طاقت نہیں ہے اس میں اور جو وقت اس کی موت کا مقرر ہے، اس میں ایک لمحے کا بھی اضافہ کرنے سے معذور ہے۔ پھر وعدے ایسے کرتا ہے جیسے دنیا کا سارا نظام بس اسی کے تابع ہے اور یہ نہ ہو تو کائنات کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے ــ وہ عقل جس کی وجہ سے یہ افضل قرار پایا ہے تمام مخلوق میں اُس کو یہ ہمیشہ اپنی بربادی کے لیے ہی استعمال کرتا رہا ہے۔

آسیہ کی تدفین میں کبری اور نظام دین نے بہت مدد کی تھی میری۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو میرا خیال ہے اسے قبر بھی نصیب نہ ہوتی۔ چیل کوّے اور مردار خور جانور ہی اسے نوچ نوچ کر کھا جاتے۔ ان دونوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کے لیے قبرستان میں دو گز زمین حاصل کر کے اسے اس کے اندر اتار ہی دیا تھا کسی نہ کسی طرح۔ اسے لحد میں اتارنے کے بعد میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ وہ تھا دھمن کے خون سے اپنے انتقام کی آگ سرد کرنا۔ میرے دل و دماغ میں انتقام .... انتقام کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گو دھمن سے میری دشمنی کی ابتدا آج تو نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بنیاد تو اسی دن رکھ دی گئی تھی جب اس نے میرا ایک

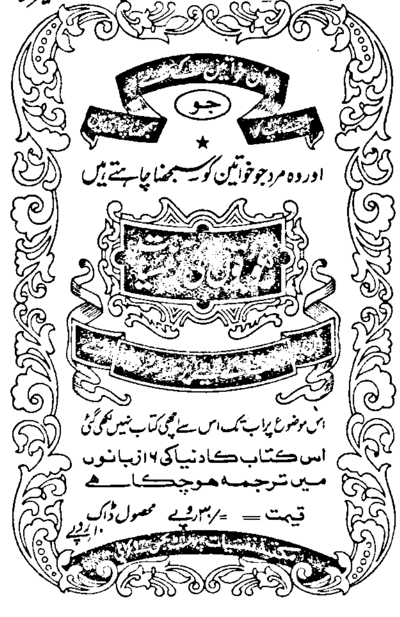

گردہ نکال کر اس کے دام کھرے کر لیے تھے۔ اور پھر اس کے بعد اس نے میری بہن آسیہ کو گھر سے اٹھوا کر میرے چھوٹے سے گھر کے سکون کو آگ لگا دی تھی۔ اس دن سے آج تک ہم دونوں بہن بھائی کیسے کیسے مراحل سے گزرتے رہے تھے، کون کون سے عذاب سہتے رہے تھے، اس کی تفصیل دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے جن مصائب کی ابتدا کی تھی اب ان کی انتہا ہونے کو تھی۔ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ میرا انجام بہت قریب آپہنچا ہے اور میری دلی خواہش تھی کہ اس سے پہلے پہلے میں اس موذی دھمن کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔

میں شرافت علی، انور کمال اور فاطمہ کو ساتھ لیے تمام دن لاہور کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ محض اس لیے کہ کہیں مجھے دھمن کی جھلک نظر آجائے یا اس کا پتا معلوم ہو جائے تو اپنے سینے میں دہکتی ہوئی آگ کو بجھا سکوں۔ مشکل یہ تھی کہ کوٹھی چھوڑ دینے کے بعد عالیہ کے پاس بھی کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی سے رابطہ قائم کر کے دھمن کے آئندہ منصوبے، یا اس کے پتے کے بارے میں کچھ بتا سکتی۔ کئی روز کی بھاگ دوڑ بے نتیجہ ثابت ہونے کے بعد فاطمہ نے کہا۔ "جنابِ عالی! میرا تو خیال ہے کہ دھمن ہمیں ولسن کی کیمیکل فیکٹری والی قیام گاہ میں ہی مل سکے گا۔ وہ وہیں ٹھہرا ہوا ہے شاید۔"

میں نے جیسے خواب سے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے بالکل سچ کہا تھا۔ اس سے زیادہ محفوظ ٹھکانہ اور کوئی نہیں تھا اس کے لیے۔ میں نے کہا۔ "یہ تو بالکل صاف بات ہے، حیرت ہے ہم میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آیا۔ ہمیں فوراً مریدکے چلنا چاہیے۔"

حالاں کہ شام ہو چکی تھی لیکن میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وقت کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دھمن تک پہنچنے کے لیے تو اگر آدھی رات کو بھی مجھے کوئی اشارہ ملتا تو میں فوراً اٹھ کر دوڑ پڑتا۔ چنانچہ ہم نے فوراً گاڑی نکالی اور تیزی سے گوجرانوالہ کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔

رات پوری طرح اپنا تسلط قائم کر چکی تھی جب ہم ولسن کیمیکل فیکٹری کے سامنے پہنچے۔ فیکٹری کا مین گیٹ اس وقت بند تھا اور گیٹ کے دونوں طرف طاقت ور بلب روشن تھے، جن کی روشنی میں وہاں موجود ہر شے صاف اور نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ مین گیٹ کے دونوں طرف مزدوروں کے آنے جانے کے لیے دو دروازے اور تھے لیکن اس وقت وہ دونوں بھی بند تھے۔ میں نے انور کمال سے کہا۔ "تم جا کر گیٹ کھلواؤ اور چوکیدار سے معلوم کرو کہ دھمن اور عالیہ یہاں موجود ہیں یا نہیں۔"

فاطمہ جلدی سے بولی۔ "نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ولسن کا بنگلا اس فیکٹری کے عقبی حصے میں ہے۔ وہ دونوں ہوں گے اگر یہاں تو اسی بنگلے میں ہوں گے۔ وہاں رہنے والوں کے بارے میں اس طرف موجود دربانوں کو علم نہیں ہوتا۔ فیکٹری کے عقب میں بھی ایک سڑک موجود ہے۔ بنگلے کا گیٹ ادھر ہی ہے اور بنگلے والوں کی آمد و رفت بھی ادھر ہی سے رہتی ہے۔ لہٰذا گاڑی اُدھر ہی لے چلو۔"

شرافت علی نے کار آگے بڑھا دی اور چکر کاٹ کے فیکٹری کے پیچھے والی سڑک پر لے گیا۔ اس طرف دو اور بھی فیکٹریوں کے احاطے تھے۔ ان دونوں کی بھی اس طرف عقبی دیواریں ہی تھیں جن کے پیچھے سے مشینوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ ولسن کیمیکل فیکٹری کی عقبی دیوار میں ... ایک چھوٹا سا لوہے کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دروازہ صرف اتنا ہی بڑا تھا کہ اس میں سے کار گزر سکتی تھی۔ دروازے کے دونوں طرف دو بلب یہاں بھی روشن تھے لیکن ان کی روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ بہت دور تک جا سکتی۔ شرافت علی نے گیٹ سے خاصے فاصلے پر نیم تاریکی میں گاڑی روک دی اور ہم چاروں کار سے نکل کر دیوار کے سائے میں گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

گیٹ تو اس طرف کا بھی بند تھا لیکن شرافت علی نے انگلی سے اس کو بجایا تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا اور ایک لمبی لمبی گھنی مونچھوں والے دراز قد شخص نے جس کے بائیں شانے سے بندوق لٹک رہی تھی، باہر جھانک کر شرافت علی کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کڑک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کس کو ملنا ہے تمھیں؟"

شرافت علی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی فاطمہ آگے بڑھ کر اس کے سامنے آگئی اور بولی۔ "مسز ولسن کو بتاؤ جا کر، ان سے ملنے آئی ہے۔"

وہ فاطمہ کو دیکھتے ہی ایک دم نرم پڑ گیا تھا۔ شاید وہ جب ایک رات مسز ولسن کے ساتھ یہاں رہی تھی تو اس نے اسے دیکھا تھا یہاں۔ اسی لیے اسے پہچان کر اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ وہ بولا۔ "ارے مس صاحبہ! وہ بیگم صاحب تو چلی گئی یہاں سے۔ آپ کو پتا نہیں، اس کے صاحب کا قتل ہو گیا تھا اُدھر لاہور میں، وہ تو اسی روز یہاں سے چلی گئی تھی جس روز آپ گئی تھیں۔"

"اچھا!" فاطمہ قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تو بڑی افسوس ناک خبر سنائی ہے تم نے۔ وہ کہاں گئی ہے یہاں سے؟"

"یہ تو جی ہم کو پتا نہیں ہے۔ جب سے گئی ہے پھر واپس نہیں آئی ہے۔" دربان نے جواب دیا۔

"اچھا! تو پھر اب فیکٹری کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ کوئی نیا منیجر تو آیا ہی ہو گا نا؟" فاطمہ نے اس سے پوچھا۔

"نام تو مجھ کو پتا نہیں ہے مس صاحب، ان کا۔ نئے منیجر صاحب ہیں کوئی مقامی ہی آدمی مگر ہیں بہت سخت۔ ان کے سامنے کسی کو بات تک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ بالکل نواب لگتے ہیں جی وہ۔ اور ان کی بیگم ملکہ لگتی ہے۔" وہ فوراً بولا۔

"اچھا وہ جو کوئی بھی ہیں، میں ملنا چاہتی ہوں ان سے۔ وہ گھر میں ہی ہیں نا اس وقت؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"ہیں تو گھر میں ہی، مگر اس وقت کسی سے ملیں گے بالکل نہیں وہ۔ آپ صبح آجائیں۔" دربان نے جواب دیا۔

"ارے واہ۔ میں لاہور سے آرہی ہوں پتا ہے تمھیں۔ بے حد ضروری کام ہے۔ اتنی رات کو واپس لاہور جانا پھر صبح آنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ تم جاؤ انھیں خبر کرو، لاہور سے کچھ مہمان آئے ہیں۔ فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔" فاطمہ بولی۔

"وہ تو آپ کا کہنا ٹھیک ہے بی بی! مگر صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ کوئی بھی، کتنے ہی ضروری کام سے کیوں نہ آئے، اسے کہو، میں صبح سے پہلے نہیں مل سکتا کسی سے بھی۔ اب اگر میں نے انھیں اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے جی۔" وہ بولا۔

وہ کسی طرح بات مان کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ نہ تو خود اندر جا کر اطلاع دینے پر آمادہ ہوتا تھا اور نہ ہی فاطمہ اور شرافت علی میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ میں اس کے مسلسل انکار سے عاجز آکر اچانک ان کے قریب جا پہنچا اور فاطمہ سے کہا۔ "تم خوامخواہ اس کی خوشامد کر رہی ہو۔ تمھیں پتا ہے نا لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔ اس سالے کو اُٹھا کر باہر پھینکو اور اندر چلے جاؤ تم لوگ۔"

"اوئے میاں خاں! تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں میں نے باہر پھینکنے والے۔ سالا بدمعاشی دکھاتا ہے۔" اس نے اپنے شانے سے لٹکی بندوق کو اتارتے ہوئے کہا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ ادھر سے نہیں تو ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔"

اس نے بندوق سیدھی کرنا چاہی۔ عین اسی لمحے میں نے طیش میں آکر الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلا گیا۔ آدمی خاصا جاندار تھا۔ میں نے جتنی طاقت سے ہاتھ مارا تھا اسے، کوئی عام آدمی ہوتا تو اُلٹ کر دور جا گرتا لیکن وہ صرف لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے سنبھل کر بندوق سیدھی کر کے اس کی نال میرے سینے سے لگا دی، مگر میں نے ایک جھٹکا دے کر نال کو پرے کرتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں پورے زور سے ٹانگ مار دی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ بندوق کی نال سینے پر دیکھ کر میں اپنے اوسان گم کر دوں گا اور وہ آسانی سے مجھے شکار کر لے گا۔ میرے ٹانگ مارتے ہی اس کے قدم زمین سے اُکھڑ گئے اور وہ لہرا کر نیچے جا گرا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے گرتے ہی میں اس پر جھپٹا اور بجلی کی سی تیزی سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے رگِ احساس مسل ڈالی اس کی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی ساری مدافعت دم توڑ چکی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر سیدھا ہو ہی رہا تھا کہ ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔ "خبردار! کوئی بھی حرکت نہ کرنا اپنی جگہ سے اور اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیے جاؤ گے۔"

میں نے اس للکارنے والے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ دو افراد تھے۔ دونوں ہی خاصے تن و توش کے مالک تھے۔ قد ان کے چھ چھ فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھے اور بدن ان کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے لگتے تھے۔ فولادی بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی ہوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔ لگتا تھا انھیں ایسے ہی موقعوں کے لیے خصوصی طور پر پالا گیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے جن پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ریوالوروں کے رُخ ہماری طرف کر رکھے تھے اور خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ ہماری طرح بڑھ رہے تھے۔ ان کی پشت پر ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں شاید اسی کمرے میں سے برآمد ہوئے تھے دربان کے گرنے کی آواز سن کر۔ میں دربان پر سے ہٹ کر الگ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ان دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ایک مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر بولا۔ "اوئے سنا نہیں تو نے، میں نے کیا کہا تھا۔ جانتا نہیں ہے تو مجھے، میں حکم عدولی کرنے والے کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہیں کرتا ہوں۔"

میں نے اس کی دھمکی کی پروا کیے بغیر کہا۔ "میں ذرا اونچا سنتا ہوں پہلوان جی! میں نے سنا ہی نہیں کہ آپ نے حکم کیا دیا تھا مجھے؟"

وہ اپنا ریوالور میری طرف سیدھا کر کے بولا۔ "اگر تو سن نہیں سکتا ہے تو تجھے زندہ رہنے کا حق کس نے دے دیا ہے؟ چل چھٹی کر تو اب۔"

یہ کہہ کر وہ ریوالور کی لبلبی سے زور آزمائی کرنے لگا لیکن اس کا ریوالور اس کا حکم ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا کسی طرح۔ میں نے اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔ "اوئے چڑی مار کی دُم! تو تو کہتا تھا، حکم عدولی برداشت نہیں کرتا ہے تو۔ اور حال یہ ہے تیرا کہ تیرے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور تک تیرا حکم نہیں مان رہا ہے۔ کچھ تیل شیل بھی دیا تھا اس میں کبھی؟

زنگ شنگ تو نہیں لگ گیا ہے اس میں؟"

اس کے ریوالور کو ناکارہ ہوتے دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی نے مجھ پہ گولی چلانے کی کوشش کی لیکن اس کے ریوالور کا بھی وہی حشر ہوا تھا جو اس کے پہلے ساتھی کے ریوالور کا ہوا تھا۔ گولی اس میں سے بھی انتہائی کوشش کے باوجود برآمد نہیں ہو سکی تھی۔ وہ دونوں ایک دم پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دونوں ریوالور ایک ساتھ ناکارہ کیوں کر ہو گئے تھے۔ ان دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک مجھے گھورتے ہوئے بولا "اوئے تو کون ہے بھئی اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہے تیرا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کسی شکست خوردہ کو فاتح سے یہ پوچھنے کا حق نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ تمھاری باری ختم ہو چکی ہے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم دونوں کون ہو، بنگلے میں کون مقیم ہے اور تم کس کی حفاظت کر رہے ہو؟"

"اوئے تو یہ نہ سمجھ لینا کہ ریوالور بے کار ہو جانے سے ہم دونوں بھی بے کار ہو گئے ہیں۔ ہم خالی ہاتھوں پیروں سے بھی تمھارا سُرمہ بنا سکتے ہیں۔ سمجھا کیا ہے تو نے اپنے آپ کو؟" وہ یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ ہم میں سے کسی کے بھی ہاتھوں میں کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہتے ہی ان دونوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ سے جست کی اور اُڑتے ہوئے میری طرف آئے۔

میں ان دونوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ انھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر پھرتی سے بائیں طرف تھوڑا سا ہٹا تاکہ ان کا نشانہ خطا ہو جائے۔ میرے ہٹ جانے کی وجہ سے ان کا حملہ ناکام ہو گیا تھا لیکن ان کے پیر زمین پہ ٹکتے ہی میں شکاری باز کی طرح اپنے قریب والے شخص پہ جا پڑا۔ کوشش تو میری یہ تھی کہ میں اس کی رگِ احساس مسل ڈالوں لیکن وہ بھی کچھ کم پھرتیلا نہیں تھا۔ میرا ہاتھ گردن پر پڑتے ہی وہ تڑپ کر چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو فاطمہ نے سنبھال لیا تھا۔ اس نے میری طرح اس کی گردن پکڑنے کے بجائے نیچے آتے ہی ایک ٹانگ پکڑ کر اسے جھٹکے سے اُلٹ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ سر کے بل زمین پر گرا تھا۔ فاطمہ نے اس کے گرنے کے بعد بھی ٹانگ نہیں چھوڑی تھی اس کی۔ اس نے پھرتی سے اس کی دوسری ٹانگ بھی پکڑ کر اسے چکر دینا شروع کر دیے تھے۔ اس کا دوسرا ساتھی جو میرے ہاتھوں سے نکل کر الگ جا کھڑا ہوا تھا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر فاطمہ کو دیکھ رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ اس کے ساتھی کو تیزی سے چکر دیتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا پورا جسم اوپر اُٹھ گیا اور اسی لمحے فاطمہ نے اس کی ٹانگیں اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیں۔ وہ چھ فٹ کا بھاری بھرکم آدمی اس کے ہاتھوں سے یوں نکلا جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے اور سیدھا جا کر سر کے بل پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرا گیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور وہ شخص نیچے گر کر کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔

اپنے ساتھی کی یہ دُرگت دیکھ کر دوسرے شخص پر ایک دم جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح دانت کچکچا کر غراتا ہوا فاطمہ کی طرف لپکا مگر میں نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ میری ٹانگ سے اُلجھ کر اوندھے مُنہ فرش پر گرا۔ اس کے گرتے ہی میں نے اسے چھاپ لیا اور اس بار اس کی رگِ احساس مسلنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی تھی میں نے۔

ان دونوں کے ساتھ کافی دھما چوکڑی ہوئی تھی جس کی آوازیں یقیناً اندر بنگلے میں بھی پہنچی ہوں گی، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اندر سے کسی نے باہر جھانک کر بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان دونوں سے نمٹنے کے بعد میں نے فاطمہ سے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے ہماری یہ ساری محنت ضائع ہی گئی ہے۔ بنگلے میں شاید کوئی بھی موجود نہیں ہے۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا جنابِ عالی! جبکہ دربان نے کہا تھا نئے منیجر نے اسے حکم دیا ہے کوئی بھی آئے تو وہ کہہ دے صاحب آرام کر رہے ہیں۔ یہی تو کہا تھا اس نے کہ وہ صاحب کے آرام میں خلل ڈالے گا تو وہ ناراض ہوں گے۔"

"ہاں کہا تو یہی تھا اس نے مگر اتنے ہنگامے کے باوجود اندر ذرا سی بھی ہلچل نہیں ہوئی ہے۔ کسی نے یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی کہ باہر ہو کیا رہا ہے آخر؟ اگر اندر کوئی ہوتا تو وہ باہر کے حالات سے اس قدر بے تعلق تو نہیں رہ سکتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ چند لمحے سوچ کر بولی "ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ اندر موجود لوگ اس خیال سے دم سادھ کے بیٹھ گئے ہوں کہ اندر کی ویرانی سے ہم یہی اندازہ لگا کر واپس چلے جائیں کہ بنگلے میں کوئی نہیں ہے۔"

اس کی بات نہایت مناسب اور معقول تھی۔ شرافت علی بولا "یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں جیلانی! ہمیں بنگلے کو پوری طرح چیک کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہیے۔ آؤ چلو اندر چل کر دیکھتے ہیں ہم۔ لیکن پہلے ان دونوں بے ہوش پڑے ہوئے آدمیوں کو گیٹ کے سامنے سے ہٹا دو۔"

ہم نے ان دونوں کو اسی کمرے میں لے جا کر ڈال دیا جس میں سے وہ دونوں برآمد ہوئے تھے۔ ان میں ایک فاطمہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میں نے ایک اچھے خاصے صحت مند اور جنگجو شخص کو فاطمہ کے ہاتھوں اس طرح مرتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے اس نے جانو کا بھی یہی حشر کیا تھا۔ اس بظاہر نرم و نازک دکھائی دینے والی لڑکی کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ آدمی کو یوں لٹو کی طرح گھما کر مار سکتی ہے۔ بڑی عجیب لڑکی تھی وہ، میں نے ایسی لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی اس سے پہلے۔

دونوں بے ہوش افراد کو کمرے میں بند کر کے انور کمال کو گیٹ پر نگرانی کے لیے چھوڑا اور ہم تینوں بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔ قریب پہنچ کر فاطمہ سرگوشی میں بولی "ہم دونوں اس طرف سے چلتے ہیں جنابِ عالی! جو راستہ فیکٹری کی طرف ہے اور شرافت علی تم ادھر سے اندر جاؤ اور میرا تو خیال ہے تم انور کمال کو بھی اپنے ساتھ لے لو کیوں کہ وہاں گیٹ پر کسی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ احتیاطاً گیٹ بند کر دو۔"

شرافت علی واپس مڑ کر انور کمال کو بلانے چلا گیا اور ہم دونوں بنگلے کا چکر کاٹ کر پیچھے کی طرف چل دیے۔ ہم موڑ کاٹ کر دوسری طرف پہنچے تو ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے روشنی باہر آتی دیکھ کر ٹھٹک کے رُک گئے۔ اسی لمحے میں نے عالیہ کی آواز سُنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں تمھیں پھر سمجھا رہی ہوں دشمن! تم سب کچھ کرو لیکن یہ وطن فروشی کا کام مت کرو۔ اس ملک کے معصوم اور مظلوم کروڑوں بے گناہ انسانوں کا سکون غارت مت کرو۔ اتنے بہت سارے انسانوں کی آہ تمھیں برباد کر دے گی اور یوں بھی جن کی خاطر تم اپنے ملک، اپنی قوم کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہو، اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد وہ تمھیں بھی چھوڑیں گے نہیں۔ تاریخ گواہ ہے، فاتح اقوام نے ان لوگوں کو سب سے پہلے ختم کیا ہے جنھوں نے اپنے وطن سے غداری کر کے ان کی فتح کا راستہ ہموار کیا ہے۔ یہ بات تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟"

"ہونہہ، وطن، قوم، ملک، یہ سب بکواس ہے۔ آدمی کے پاس دولت ہو تو ہر ملک، ہر قوم اُسے گلے لگانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ دولت سے دنیا کے کسی بھی حصے میں اتنی زمین حاصل کی جا سکتی ہے جہاں آدمی آرام اور سکون سے زندگی گزار سکتا ہے۔ عالیہ! تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے تمھارے دماغ میں یہ وطن پرستی کے جراثیم گھس گئے ہیں۔ تمھیں معلوم نہیں، میری طرح اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی دولت دنیا کے مختلف ممالک کے بینکوں میں محفوظ ہے اور اب بھی وہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت حاصل کر کر کے باہر بھیج رہے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت یا کسی بھی بُرے وقت میں وہ یہاں سے کہیں بھی جا کر پناہ حاصل کر سکیں اور اپنی زندگی سکون سے بسر کر سکیں۔ عقل کے ناخن لو عالیہ! بھول جاؤ اس ملک کو، یہاں کچھ نہیں رکھا ہے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ یہ زمین جس کی مٹی سے ہماری تعمیر ہوئی، یہ وطن جہاں ہم آزادی کا سانس لیتے ہیں، جس کی خاطر ہمارے آباؤ اجداد نے بے شمار قربانیاں دیں، اپنی ایک پوری نسل کے خون سے غسل دے کر اسے پاک کیا اور ایک نسل اس تعمیر میں کام آ گئی۔ آپ کہتے ہیں کیا رکھا ہے اس ملک میں۔ کیا ہزاروں جانیں اسی وقت کے لیے دی گئی تھیں، کیا لاکھوں گھر اسی لیے جلے تھے کہ ایک روز تم جیسے بے ضمیر اور زر پرست اُٹھ کر اس ملک کو نیلام کر دیں اور کہیں کہ کیا رکھا ہے یہاں...؟"

"ارے ارے تم تو بہت ہی جذباتی ہو گئی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمھیں پاکستان سے اتنی محبت ہے۔ بہرحال اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں جس مقام پر پہنچ چکا ہوں وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا عالیہ بیگم! اگر تم نہیں چاہتیں تو میں تمھیں آزاد کر دینے کو تیار ہوں۔ تم چاہو تو اس دھرتی میں اس مٹی میں مل کر خود بھی فنا ہو سکتی ہو، میں تمھیں روکوں گا بالکل نہیں۔"

"لیکن میں تمھیں ضرور روکوں گی دشمن! میری زندگی میں تم میرے ملک، میرے وطن کا سودا نہیں کر سکو گے۔"

آئندہ ماہ کے ناول

کرنل پرویز سیریز نمبر ۱۹
بین الاقوامی سازش پر مبنی سنسنی خیز ناول
پکارتی لاشیں
کیا لاشیں پکار سکتی ہیں۔ جی ہاں! لاشیں پکار رہی تھیں۔ اس عمارت میں زبردست دھماکا ہوا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ سدو بھائی کو ایک شخص نے گہرے سمندر میں پھینک دیا! ایک خوبصورت لڑکی جو زہریلی ناگن تھی!!!

کرنل پرویز سیریز نمبر ۲۰
خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہولناک ناول
جہنم کی بلائیں
فیصل، زندیں اور سدو بھائی جہنم کی بلاؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس ویران حویلی میں ایک بہت بڑا اژدہا برآمد ہوا اور سدو بھائی کو اپنی مٹھی میں دبا کر لے گیا۔ سدو بھائی کا کیا حشر ہوا یہ بات تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے!!

قیمت فی کتاب -/۱۰ روپے

قالبوط سیریز نمبر
مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور
مسٹر چکرم
وہ عجیب شخص تھا جو سر کے بل کھڑا ہو کر کتے کی طرح بھونکتا تھا۔ قالبوط بھی اس بھونک میں شریک ہو گیا۔ پھر محمود، فرحانہ اور لولو سب ہی بھونکنے لگے۔ قہقہوں کا طوفان جو آپکے پیٹ میں بھی بَل ڈال دیگا اور ہو سکتا ہے آپ بھی...

قالبوط سیریز نمبر ۵
قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول
تیسرا روپ
اس کے تین رُوپ تھے اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف اور سنسنی خیز۔ انسپکٹر خورشید مرزا اس ہولناک مجرم کی تلاش میں۔ سنجیدہ اغوا ہو گئی، اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔ محمود، فرحانہ اور لولو پر قیامت ٹوٹ پڑی!!!

"اوہ، تو تم روکو گی مجھے، مجھ سے ٹکراؤ گی تم؟ اس کا انجام جانتی ہو کیا ہوگا؟" وہ بہت زور سے ہنسا۔

"انجام کی اب مجھے کوئی پروا نہیں رہی ہے دھمن! یہ یاد رکھو، میں مر کر بھی تمھیں یہ ذلیل کام نہیں کرنے دوں گی۔ فنا ہوتے ہوتے بھی تمھیں ضرور فنا کر جاؤں گی۔ میں نے غلام جیلانی کو تمھارے کالے کرتوتوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ وہ تمھیں زندہ سلامت جانے نہیں دے گا یہاں سے اب۔ سمجھے وطن فروش، بے ضمیر، ملت کے سوداگر!"

دھمن غضب ناک ہو کر بولا۔ "اوہ تو یہ تو ہے میری آستین میں سانپ بن کر رہنے والی۔ ذلیل کتیا! تیری وجہ سے اس رات میرا مشن ناکام ہوا تھا اور میرے اتنے سارے بہترین تربیت یافتہ آدمی اپنی جان سے چلے گئے تھے۔ تُو نے اطلاع دی تھی جیلانی کو اس منصوبے کی۔ میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا اب۔ افسوس یہ ہے کہ تو اپنے اس غلام جیلانی کا انجام نہیں دیکھ سکے گی۔"

"خبردار! اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر خود کو ہمارے حوالے کر دو دھمن! تمھارا کھیل اب ختم ہو چکا ہے۔" مجھے شرافت علی کی آواز سنائی دی۔

اُس کی آواز سُن کر میں پریشان ہو گیا۔ اُس نے یوں دھمن کے سامنے جا کر بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا اس وقت، شاید وہ عالیہ کی جان خطرے میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکا تھا، اور بغیر سوچے سمجھے دھمن کے سامنے جا کر اسے للکار بیٹھا تھا۔ میرے علاوہ فاطمہ بھی بے چین ہو گئی تھی اس کی آواز سن کر۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور پنجوں کے بل بے آواز چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا پہنچی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ کھڑکی زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔ اور اس میں گرل وغیرہ قسم کی کوئی چیز بھی نہیں لگی تھی۔ اس پر چڑھ کر آسانی سے کمرے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے کھلی ہوئی کھڑکی سے گردن اونچی کر کے کمرے میں جھانکا۔ دھمن اور عالیہ ایک ڈبل بیڈ پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ان دونوں کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ ان سے تھوڑا سا دائیں طرف وہ دروازہ تھا جہاں شرافت علی اور انور کمال اپنی اسٹین گنیں لیے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ شاید دھمن اور عالیہ کو بھی انھیں وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ پھر عالیہ ایک دم چونک کر بولی۔ "یہ تم لوگ کیا حماقت کر رہے ہو۔ فوراً واپس جاؤ۔ دیوار کی آڑ پکڑ لو ورنہ . . ."

اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دھمن جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اُس کا منہ بند کر دیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوسرا ہاتھ بستر پر رکھے ہوئے تکیے کے نیچے ڈال کر ایک ننھا سا پستول نکال لیا اور پھر اس سے پہلے کہ انور کمال اور شرافت علی کچھ سمجھتے، اس کے پستول سے ایک شعلہ لپک کر شرافت علی کو خاکستر کر گیا۔ ایک لمحے میں شرافت علی جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ انور کمال حیرت زدہ سا اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک بار پھر شعلہ لپکا اور انور کمال بھی حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر جلے ہوئے درخت کی طرح نیچے جا گرا۔

عالیہ نے ان دونوں کو گرتے دیکھا تو ایک دم بھڑک کر جنونی انداز میں دھمن سے لپٹ کر اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دھمن کا پستول والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اسے زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے اس کے بازو کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ ان دونوں کو گتھم گتھا ہوتے دیکھ کر فاطمہ تیزی سے کھڑکی پر چڑھی اور دوسری طرف کود گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی، فاطمہ نے برق رفتاری سے ان کے قریب پہنچ کر دھمن کے اس ہاتھ پر جس میں پستول تھا، اپنی کھڑی ہتھیلی کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس کا ہاتھ چونکہ پہلے ہی عالیہ کے ہاتھوں میں تھا اور دونوں زور آزمائی کر رہے تھے۔ فاطمہ کے ہاتھ کی ضرب اتنی شدید اور بھرپور تھی کہ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا جسے عالیہ نے فوراً ہی اٹھایا اور اچھل کر بیڈ سے دور چلی گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دھمن کے بال پکڑ کے اسے گھسیٹ کر نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔ "دھمن! بہت ناز تھا تجھے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں پر اور حرام کی کمائی ہوئی بے اندازہ دولت پر۔ بڑے حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے تو نے اور سمجھ یہ لیا تھا کہ اب فرشتۂ اجل بھی تیرے نزدیک نہیں آ سکے گا لیکن یہ تو بھول گیا تھا بچے کہ ملک الموت جب کسی کو شکار کرنے نکلتا ہے تو سارے حفاظتی انتظامات، سارے منصوبے، سارا کرّوفر دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ کوئی جاں نثار کوئی وفادار اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ ایک انگوٹھی بنوا کر تُو نے سمجھ لیا کسی کی گولی تجھ تک نہیں پہنچ سکے گی اور ایک آگ اُگلنے والا کھلونا حاصل کر کے تو مطمئن ہو گیا تھا کہ اب کوئی تیری روح قبض کرنے تیرے پاس نہیں آ سکے گا مگر تُو نے دیکھا، موت کس کس طرح، کس کس روپ میں، کیسے کیسے راستوں سے آدمی تک جا پہنچتی ہے۔"

وہ ایک ہاتھ سے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو سہارا دیتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو جیلانی! آدمی بہت دُور تک دیکھتا اور دُور کی سوچ کر مرگِ ناگہانی سے محفوظ کر لیتا ہے اپنے آپ کو لیکن اسے اپنے نزدیک، اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے سانپ بچھو دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری یہ دستِ راست، میری زندگی کی شریک بھی کبھی مجھ سے بغاوت کر سکتی ہے۔ اگر میں پہلے سے جان لیتا یہ بات تو اس ناگن کا سر بہت پہلے ہی کچل دیتا۔ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا اسے جس دن اس نے وہ انگوٹھی نہیں دی تھی لیکن افسوس میں اس کے اعتبار کا شکار ہو گیا۔"

"ایسے ہی نہ جانے کتنے لوگ تیرے اعتبار کا شکار ہو کر زندگیاں گنوا چکے ہوں گے۔ یہ دنیا کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتی میرے بچے! آدمی کو اس کے اعمال کا صلہ ضرور دیتی ہے۔ اسی کو تو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ کبھی سنا ہے تو نے اس کے بارے میں؟"

فاطمہ نے کہا۔ "جنابِ عالی! باتوں میں وقت نہ ضائع کریں۔ یہ خیال رکھیں، ہم دشمن کی کچھار میں ہیں۔ کہیں سے بھی کسی بھی وقت دیواریں اس کے حمایتی اگل سکتی ہیں۔ لہٰذا جلد از جلد اس کا قصہ پاک کر دیں۔"

میں نے عالیہ کی طرف دیکھا۔ وہ دھمن کا آتشی پستول ہاتھ میں لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ یقیناً اس کے دل کی حالت ابتر ہو گی اس وقت۔ میں نے کہا۔ "میں نے عالیہ کو زبان دی ہے فاطمہ! کہ میں دھمن کی جان نہیں لوں گا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں ہے کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ اگر ہم نے اسے معاف کر دیا تو یہ خوف ناک ناگ ایک بار پھر پلٹ کر ڈسنے کی کوشش کرے گا۔"

فاطمہ بولی۔ "تو پھر اب اس کا فیصلہ عالیہ ہی پر چھوڑ دیں۔ یہ جو چاہے سزا تجویز کر دے اس کے لیے۔"

میں دھمن کے پاس سے ہٹ کر فاطمہ کے پاس جا کھڑا ہوا اور عالیہ سے بولا۔ "ٹھیک ہے عالیہ! اب تم خود فیصلہ کر دو اس کا۔"

عالیہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پہلے میرا خیال تھا کہ میرے سمجھانے بجھانے سے شاید یہ راہِ راست پر آ جائے گا۔ میں سمجھتی تھی یہ مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ چاہتا ہے، میری بات کو رد نہیں کرے گا اور جب بات مجھ سے جدائی کی حد تک جا پہنچے گی تو یہ میرے حق میں فیصلہ دے دے گا۔ لیکن اب میری یہ خوش فہمی دور ہو چکی ہے۔ اسے دولت سے زیادہ کوئی بھی چیز عزیز نہیں ہے، یہ کبھی بھی اپنی اصلاح نہیں کر سکتا جیلانی! کبھی بھی نہیں . . . ." بولتے بولتے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "مم . . . مم . . . میرا . . . فیصلہ . . . یہ ہے . . ." اس نے اٹک اٹک کر بمشکل کہا اور اپنے ہاتھ میں دبے آتشی پستول کو دھمن کی طرف سیدھا کر دیا۔

"نن . . . نن . . . نہیں . . . تم . . . یہ . . . نہیں . . . ."

دھمن نے خوف سے آنکھیں پھاڑ کر گھگھیاتے ہوئے کہنا چاہا مگر عالیہ نے اسے مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی۔ آتشی پستول سے ایک شعلہ نکلا اور دوسرے ہی لمحے نہ جانے کتنوں کو خاکستر کرنے والا دھمن خود بھی خاک ہو گیا۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے والا بالآخر ایک عبرت ناک انجام سے دوچار ہو گیا تھا۔

میں نے عالیہ کے اس فیصلے پر اسے داد دینے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس آتشی پستول کی نال اپنے سینے پر رکھ چکی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو عالیہ؟"

اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کر کے کہا۔ "دھمن اپنے انجام کو پہنچ گیا جیلانی! اور میں نے اس کے ساتھ زندہ رہنے اور ساتھ ہی مرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اب مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے دو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کی لبلبی دبا دی۔

میں اور فاطمہ حیران حیران نگاہوں سے اس کی سوختہ لاش کو دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ اس الم ناک منظر نے ہم پر جیسے سکتہ ساطاری کر دیا تھا۔ چند ثانیے کے لیے تو جیسے ذہن سُن ہو کر رہ گیا تھا، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیا ہے آخر۔

چند ثانیے بعد میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور فاطمہ کا بازو تھام کر واپسی کے لیے دروازے کی طرف مُڑ گیا۔

سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ آسیہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں کہا تھا کہ بھائی جان! ہمارے مصائب کی ابتدا اس دن ہوئی تھی جس روز ہمارے اس لالچی تایا نے میری ڈولی اٹھانے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے مقرر کیا تھا۔ بدنصیب میں تھی، میری وجہ سے میرے ویر کی زندگی بھی عذاب بن کر رہ گئی۔ اب میں ختم ہو رہی ہوں، میرے بعد یہ الم ناک داستان بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ ساری نحوستیں میری وجہ سے تھیں۔ میں نہیں رہوں گی تو یہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ وہ میری پیاری بہن تھی، میری ماں جائی، میں اس کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا، میں اسے کسی طرح بھی ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ بے شک تایا نے

اس کی ڈولی اٹھانے کے لیے ایک لاکھ روپے کی شرط رکھ دی تھی ہمارے سامنے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اس کا یہ مطالبہ پورا کرنے کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ اس نے تو اصل میں یہ شرط اس لیے رکھی تھی کہ اس طرح اسے برسوں کا جوڑا ہوا یہ رشتہ توڑنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔ لیکن میں نے اسے اپنی جھوٹی انا کا مسئلہ بنا لیا، حالانکہ میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا اور ماں کو بھی معلوم تھا کہ ہم تایا کا یہ مطالبہ کسی طرح بھی پورا نہیں کر سکتے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم تایا سے معذرت کر کے یہ رشتہ ختم کر دیتے۔ آسیہ کے مقدر میں سہاگ کا جوڑا ہوتا تو اسے کوئی اور شریف گھرانہ مل جاتا جہاں وہ عزت کے ساتھ دلہن بن کر چلی جاتی، تایا جی کو اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے ایک دولت مند لڑکی چاہیے تھی جو انھوں نے حاصل کر ہی لی، ہم عقل کے اندھوں نے اس رشتے کی خاطر جو کچھ کیا اس کے نتیجے میں رشتہ تو ہمیں نہیں مل سکا البتہ زمانے بھر کی رسوائیاں اور جرائم کی ایک طویل فہرست ہمارے ناموں کے ساتھ منسلک ضرور ہو گئی۔ ٹوٹنے والا تعلق تو بہر حال ٹوٹ ہی گیا کیوں کہ اسے ٹوٹنا ہی تھا۔ تقدیر کے لکھے کو آدمی تدبیر سے مٹا دینے میں کامیاب ہو جایا کرے تو لوگوں کا تقدیر پر سے ایمان بالکل اُٹھ نہ جائے۔ ہم نے غلطی یہی کی تھی کہ تقدیر کے آگے سر جھکا دینے کے بجائے اس کے ساتھ پنجہ لڑا بیٹھے تھے۔ جوان خون کی گرمی کے باعث جب دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہونے لگتا ہے تو آدمی کی عقل بالکل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ پھر وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اندھا دھند اقدامات کرتا چلا جاتا ہے۔ تقدیر بار بار اسے اٹھا اٹھا کر پٹختی رہتی ہے لیکن پھر وہ دوبارہ اُٹھ کر اس کے ساتھ بھڑ جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے بھی تقدیر کو زیر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ہاتھوں شکست پر شکست اٹھاتا رہا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ایسے کاموں کا ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ نہ وہ عزت رہی جس کی خاطر میں نے تایا جی کا چیلنج قبول کرنے کی حماقت کی تھی، نہ میری بہن آسیہ کو سہاگن بننا نصیب ہو سکا۔ ذلت کا طوق اس کے گلے میں بھی پڑ گیا اور میرے گلے میں بھی۔ زندگی کو نہ وہ سلیقے سے گزار سکی نہ میں۔ زندگی کے کھوئے ہوئے دنوں کو پکڑنے کے لیے بھاگتے بھاگتے ہم دونوں کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ مگر وہ ساعتیں، وہ گھڑیاں پھر ہمارے ہاتھ نہ آسکیں۔ راحت اور سکون کا ایک پل بھی تو ہم دوبارہ نہیں پا سکے۔ بالآخر آسیہ تھک کے گر گئی۔ اس کے بعد میں نے دشمن کو بھی کیفر کردار کو پہنچا دیا اور عالیہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ میں ابھی باقی تھا، زندگی نے ابھی مجھ سے منہ نہیں موڑا تھا لیکن ملک بھر کی پولیس کو میری تلاش تھی۔ میں سزائے موت کی کوٹھری سے بھاگا ہوا مجرم تھا اور کسی دن بھی یا تو کوئی گولی میری داستان حیات کا یہ آخری باب تمام کر سکتی تھی یا پولیس پکڑ کر سیدھی تختۂ دار پر لے جا کر کھڑا کر دیتی۔ یہی ہونا تھا میرے ساتھ ایک نہ ایک دن۔ میری تمام تر تگ و دو اور ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ بہر حال یہی نکلنا تھا۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن یہاں سے واپس بھی ضرور جانا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا۔ ہر شخص اپنے انجام سے آگاہ ہے مگر پھر بھی وہ کوشش یہی کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دن یہاں گزار لے۔ ہو سکے تو کسی کی زندگی کے دن اپنے نام کرا کے اپنی عمر میں تھوڑا سا اضافہ کر لے۔ میری بھی یہی خواہش تھی۔ میں بھی ابھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے میرے ہمدرد، دوست اور جاں نثار ختم ہوتے جا رہے تھے۔ آبی، گل زمان، آسیہ، انور کمال، شرافت علی۔ یہ سب میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے لیکن ابھی فاطمہ باقی تھی، فردوسی بیگم تھی جو اُدھر کراچی میں بیٹھی میری راہ تک رہی تھی۔ اور سروری خانم نے بتایا تھا کہ اُدھر اپنے گاؤں میں میری سب سے زیادہ عزیز جان ہستی مند آرا میری منتظر بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ دشمن سے نمٹنے کے بعد میں مند آرا کے پاس ضرور جاؤں گا۔ مند آرا کا خیال آتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ دل نے کہا۔ ”جیلانی! تو نے سروری سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر۔ اب تیرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی، تجھے فوراً مند آرا کے پاس پہنچنا چاہیے۔“

دماغ نے کہا۔ ”بے وقوف آدمی جلد بازی نہ کر، اگر تو مند آرا کے پاس چلا گیا تو وہ بے چاری فاطمہ جس نے اپنی آنکھوں میں نہ جانے کیسے، کیسے سپنے سجا رکھے ہیں۔ جس نے تیرا بڑا ساتھ دیا تیرے ساتھ آگ کا سمندر عبور کیا ہے اس نے، اس کا کیا ہو گا، یہ بھی سوچا تو نے؟ اور فردوسی بیگم! وہ وفا پیشہ، خلوص کی ماری، وہ بھی تو نظریں لگائے بیٹھی ہے تیری طرف۔ اسے کیا جواب دے گا تو؟“

ایک جنگ تھی جو میرے دل و دماغ میں جاری تھی۔ اس کا کوئی نتیجہ کسی طرح برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کدھر جاؤں، کیا کروں؟ اور شاید میں کبھی بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا اگر فاطمہ میری مدد نہ کرتی۔ ایک روز صبح ہی صبح ناشتا کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”جیلانی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن آپ کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے ہمت نہیں ہو پا رہی ہے۔ اپنے عزیز ترین ساتھیوں اور بہن سے بچھڑ جانے کا دکھ واقعی کم نہیں ہوتا۔ اتنے سارے لوگ ایک ساتھ ساتھ چھوڑ جائیں تو آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے، ہمت جواب دے جاتی ہے اور جینے کا حوصلہ نہیں رہتا، زندگی ایک بوجھ، ایک بے مقصد بار محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حقائق کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے، زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح چلانا ہی پڑتا ہے۔ مرنے والوں کے

ساتھ مر انہیں جا سکتا اور نہ ہی دنیا تیاگ دینے سے وہ لوگ جو دنیا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، واپس آسکتے ہیں۔ آپ کے لیے کیا یہ بات قابلِ اطمینان نہیں ہے کہ آپ کے عزیزوں کا خون رائیگاں نہیں گیا، اُن کی موت بے مقصد نہیں ہوئی۔ وہ جس مقصد پر قربان ہوئے ہیں جس کی خاطر انھوں نے جانیں دی ہیں' وہ مقصد تو بہرحال حاصل ہوگیا۔"

میں اس کے اندازِ تخاطب پر چونک پڑا۔ اس سے میری جب سے ملاقات ہوئی تھی' وہ ہمیشہ مجھے جنابِ عالی کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی لیکن آج وہ جیلانی کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اس کے اس بدلے ہوئے انداز نے مجھے حیران کر دیا تھا لیکن میں نے اس پر حیرت کا اظہار کیے بغیر کہا۔ "ہاں، یہ بات تم نے ٹھیک کہی ہے فاطمہ، بے شک ہمارے بہت سے عزیز ترین ساتھی ہمارے ساتھ نہیں رہے لیکن اب ہمارے دشمن بھی اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ اس اعتبار سے تو حساب کتاب برابر ہی ہوگیا ہے۔ بہرحال برسوں کے رفیق بچھڑ جائیں تو دکھ تو ہوتا ہی ہے نا۔ تم کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ وہ کون سی بات ہے جسے کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے تمھیں۔ جو کچھ کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہہ ڈالو میں سب کچھ سننے کو تیار ہوں۔"

"دیکھیں آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ زندگی ایک طویل سفر کی طرح ہے۔ دورانِ سفر بے شمار لوگ ملتے اور بچھڑتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی منزل پر پہنچ کر جدا ہو جاتے ہیں اور کچھ کی راہیں جدا ہوتی ہیں اس لیے راستے میں کہیں نہ کہیں انھیں بھی خدا حافظ کہنا ہی پڑتا ہے...."

"ہاں، ہاں۔ میں تسلیم کر رہا ہوں یہ سب کچھ۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کیا تم یہی کہنا چاہتی تھیں بس؟"

"نہیں، میں دراصل یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کا کام اب ختم ہو چکا ہے۔ آپ اپنا مقصد حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے اور آپ کے ملک کے دشمنوں کا صفایا ہو چکا ہے، یا یوں کہیے کہ جو کچھ ہم لوگ کر سکتے تھے وہ ہم نے کر دیا۔ اب بظاہر ہمارے کرنے کا کوئی ایسا کام نہیں رہا جس کے لیے ہماری ضرورت ہو۔ جبکہ میرے حصے کا ابھی بہت کام باقی ہے۔ میرے ملک اور میری قوم کو میری اشد ضرورت ہے۔ یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا اصل مرکز تو وہ خطۂ زمین ہی ہے جہاں میرے باپ دادا نے جنم لیا، جہاں میرے خاندان کے بچے کھچے لوگ اب بھی آباد ہیں، لہٰذا میں آپ سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ یہاں اب میری ضرورت نہیں رہی ہو تو میں اپنے آبائی وطن واپس چلی جاؤں۔"

"اوہ، تو تم اب مصر واپس جانا چاہتی ہو؟ مگر یہ فیصلہ کیوں کیا ہے تم نے؟" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں اب تک جن لوگوں میں رہی اور جن کے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے کام کرتی رہی ہوں، وہ میرے، میرے ملک کے اور میری قوم کے بدترین دشمن ہیں، انھوں نے اپنی مکّاری اور عیّاری سے مجھے میرے ہی لوگوں کے خلاف استعمال کیا ہے۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب میں حقیقت سے بے خبر تھی۔ اب اپنے ملک کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں، اپنی بقیہ زندگی اپنی قوم کے نام کر دینا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے یہ۔ میں تمھارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں اور اس نیک مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ اگر ممکن ہوتا تو میں خود بھی تمھارے ساتھ چلتا اور تمھارے شانہ بشانہ یہودیوں کے خلاف جہاد میں حصّہ لیتا، مگر ابھی یہاں میری کچھ لوگوں کو ضرورت ہے۔ ماں جی کا میرے سوا کوئی نہیں ہے اب، ان کے علاوہ...."

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "میں جانتی ہوں، میں سب کچھ جانتی ہوں۔ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے تنہا جانے کی بات کی ہے، ورنہ میں آپ سے خود کہتی کہ آپ میرے ساتھ چل کر میرے ملک کے لیے' میری قوم کے لیے کچھ کریں۔"

"ہاں بی بی! یہ تو نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تجھے ایسا کہنا چاہیے تھا، حق بنتا ہے یہ تیرا۔ بہرحال یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے، اگر کبھی تجھے میری ضرورت محسوس ہوئی تو جب بھی تُو پکارے گی مجھے میں سر کے بل پہنچوں گا تیرے پاس، بس شرط یہ ہے کہ زندہ اور آزاد ہوا میں۔"

"ایسی ناامیدی کی باتیں نہ کریں آپ۔ اللہ نے چاہا تو ابھی بہت دن جیئں گے آپ۔ اور جو کچھ آپ نے اپنے ملک اور قوم کی خاطر کیا ہے' مجھے امید ہے' اس کے صلے میں آپ کی حکومت آپ کے سارے جرائم معاف کر دے گی۔" اس نے میرا حوصلہ بڑھانے کو کہا۔

"اوہ بی بی! چھوڑ اس بات کو، میرے ملک کی پولیس سے تُو واقف نہیں ہے۔ بڑے بڑے قومی ہیرو اس کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ اگر کسی فرشتے کو بھی سزا دینے کا تہیہ کر لے تو وہ بھی بچ نہیں سکتا اس کے ہتھکنڈوں سے۔ بڑے جادوگر قسم کے لوگ جمع ہیں اس محکمے میں، اگر یہ چھ ماہ کے غوں غوں کرتے ہوئے بچے کو پکڑ کر پیش کر دیں اور الزام لگا دیں اس پر قتل، ڈکیتی یا تخریب کاری کا۔ تو ان کے پیش کیے ہوئے ثبوت اور گواہوں کو دنیا کی کوئی عدالت جھٹلا نہیں سکتی ہے۔ انھوں نے کبھی مجھے پکڑ لیا تو تم یقین کرو' اور پر والوں کو تو میری گرفتاری کی خبر بھی اس وقت ہوگی جب میں پھانسی چڑھ چکا ہوں گا۔ اور زیادہ امکان تو یہ ہے کہ شاید پھانسی کے تختے تک پہنچنے کی تو نوبت ہی نہ آئے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے اور اوپر یہ رپورٹ بھیج دیں گے کہ مسمّی غلام جیلانی' اشتہاری مجرم ایک پولیس مقابلے میں گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا ہے۔ لہٰذا اس کا فائل اسے متوفی قرار دے کر بند کر دیا جائے۔"

"اوہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا آپ کے ملک کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"تو کس قانون کی بات کرتی ہے بی بی! قانون کوئی آسمانی صحیفہ تو نہیں ہے' اس میں تبدیلی ہر وقت ہو سکتی ہے اور پھر ہمارے ہاں ایک مراعات یافتہ طبقہ بھی ہوتا ہے جس کا کوئی عمل قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔ اگر کسی شخص کو کسی مراعات یافتہ شخص کی حمایت حاصل ہو جائے تو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، وہ علی الاعلان جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو' خواہ مخواہ جی جلانے سے فائدہ۔ تم یہ بتاؤ' کب اور کہاں جانا چاہتی ہو؟" میں نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"میرے پاس پاسپورٹ تو امریکا کا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ مجھے مصری پاسپورٹ مل جائے اور میں اپنے ملک میں اپنے ہی ملک کے پاسپورٹ پر داخل ہوں۔ میرا ارادہ یہاں مصری سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کا ہے۔ مجھے امید ہے' وہ لوگ میری ضرور مدد کریں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ اس کے لیے تمھیں اسلام آباد جانا پڑے گا۔ مشکل یہ ہے کہ میں تمھاری طرح آزادانہ باہر نہیں نکل سکتا، خود کو پولیس کی نظروں سے بچا کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ میں اسلام آباد چل کر خود مصری سفارت خانے لے جاتا تمھیں۔" میں نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کریں آپ، میں چلی جاؤں گی تنہا وہاں، مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر تم کب جا رہی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جتنی جلدی آپ اجازت دیں، اگر کوئی اعتراض نہ ہو آپ کو اور سیٹ مل جائے تو آج ہی کسی وقت ورنہ کل....!" وہ بولی۔

"مجھے بالکل بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم ایئرپورٹ فون کر کے انکوائری سے معلوم کر لو یا خود چلی جاؤ۔ اور جو بھی پہلی فلائٹ ملے اسی سے چلی جاؤ۔ جب جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو، وقت برباد نہیں کرنا چاہیے تمھیں۔" میں نے جواب دیا۔

اسی رات دس بجے کی فلائٹ میں فاطمہ کو سیٹ مل گئی۔ میں اسے رخصت کرنے ایئرپورٹ تک گیا تھا لیکن ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر ہی کار میں بیٹھے ہی بیٹھے اس کو خدا حافظ کہہ کر واپس آگیا تھا۔ کار سے اتر کر اس کے ساتھ عمارت کے اندر جانا اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہاں بے شمار نگراں آنکھیں میرا احاطہ کر سکتی تھیں اور اگر ان میں سے کوئی بھی مجھے پہچان لیتا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور پھر فاطمہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتی۔ اسے رخصت کر کے میں آہو کی حویلی میں واپس پہنچ گیا۔

فاطمہ کے جانے کے بعد میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے جو فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اب اس میں آسانی ہوگئی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں نے سان فرانسسکو سے روانہ ہونے سے پہلے اس سے شادی کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اب تک پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر قائم ہوگی۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے' اس وقت کے حالات کے تحت میں نے اسے شیشے میں اتارنے کے لیے اس سے جھوٹ بولا تھا لیکن بعد میں جو حقائق سامنے آئے تھے اس کے بعد میں اس کے سلسلے میں سنجیدہ ہوگیا تھا۔ خود اس نے بھی اپنے کسی بھی انداز سے کسی موقع پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدہ نہیں ہے۔ ایسے میں اسے مایوس کرنے کو میں خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ سردری خانم نے مجھ سے مل کر مہ نسا آرا کے بارے میں بات نہ کی ہوتی اور مجھ پر زور نہ ڈالا ہوتا تو میں شاید فاطمہ کو اس طرح نہ جانے دیتا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں مہ نسا آرا کے پاس ضرور جاؤں گا۔

چنانچہ میں نے کبریٰ کو بلا کر اس سے کہا۔ "کبریٰ کیا تُو آہو کی موت کے بعد مہ نسا آرا سے ملا ہے کبھی؟ تو نے اسے دیکھا ہے اس دوران میں؟"

"ہاں جی سردار صاحب! آہو صاحب کی موت کے بعد میں ہی خانم کے بچے کو ان کے پاس لے کر گیا تھا۔ پھر مقدمے کے دوران مہ نسا آرا بی بی ہر پیشی پر یہاں آتی رہی ہیں۔ مگر سردار صاحب! سچ پوچھیں تو وہ مہ نسا آرا بی بی جو کبھی آہو صاحب کے گھر میں آپ سے ملا کرتی تھیں' وہ میں نے ایک عرصے سے نہیں دیکھیں۔ ان کی وہ ہرنی جیسی چال، وہ بات بات پر

کھلکھلانا، بہلنے بہانے قہقہے لگانا وہ سب تو جیسے خواب تھا جو اس کے بعد کبھی دکھائی نہیں دیا۔ اب تو وہ بجھی بجھی، افسردہ افسردہ بس کسی بے جان مجسّمے کی طرح دکھائی پڑتی ہیں۔ یوں جیسے کسی بڑی سی پلاسٹک کی گڑیا کو چابی بھر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ اِدھر اُدھر پورے گھر میں گھومتی پھر رہی ہے۔"

"تیری خانم نے کہا ہے کہ میں مسند آرا کے پاس جا کر اس سے شادی کر لوں۔ تیرا کیا خیال ہے، وہ میرے ساتھ شادی کرلے گی؟"

"کیوں نہیں کرے گی جناب! وہ تو آپ سے پہلے بھی چھپ چھپ کر ملا کرتی تھی۔ وہ تو بڑی خوشی سے راضی ہو جائے گی سرکار!"

"تجھے پتا ہے کہ میں نے آہو کے کہنے سے اس کے باپ ہادی علی کو قتل کر دیا تھا اور یہ بات مسند آرا بھی جانتی ہے۔ کیا یہ جاننے کے باوجود وہ مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی؟" میں نے اسے ہادی علی کے قتل کا واقعہ یاد دلا کر پوچھا۔

"ہاں جی، یہ بات تو ہے۔ مگر جب خانم کہتی ہے تو اس کی بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ شاید اس نے راضی کر لیا ہو مسند آرا بی بی کو۔ آپ وہاں جا کر دیکھیں، شاید خانم ٹھیک ہی کہتی ہو، پھر اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" کبری نے جواب دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے یار! تو کہتا ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں میں۔ ایک بار اس سے مل لینے میں ہرج تو کوئی نہیں نا۔" میں نے کہا۔

صبح میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی گاڑی نکالی اور اکبر کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اکبر کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہادی علی کی عالی شان حویلی دکھائی دینے لگتی تھی۔ اس حویلی کی آن بان اور دبدبہ اب بھی اسی طرح تھا جیسا ہادی علی کے زمانے میں تھا۔ اس کی فلک بوس دیواروں کے سائے سے اب بھی لوگ لرزاں رہتے تھے اور اِدھر سے گزرتے ہوئے نظریں جھکا کے دبے پاؤں گزرا کرتے تھے۔ حالاں کہ اب وہاں ظالم و جابر ہادی علی کے بجائے نرم و نازک، رحم دل اور مہربان مسند آرا رہتی تھی جو اس علاقے کی جاگیردار کم اور غریب ہاریوں کی بہن زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آتی تھی۔ ان کے دکھ درد، اور دیگر مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتی تھی۔ لیکن لوگوں کے دلوں میں ہادی علی کے زمانے کا خوف اب تک بیٹھا ہوا تھا۔ جنھوں نے ہادی علی کے مظالم دیکھے تھے، وہ اب بھی اس حویلی کے در و دیوار سے خوف زدہ رہتے تھے۔ مسند آرا کا وہ بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے سینے...

اس کی محبت سے بھرے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ جہاں اُدھر سے گزرتے ہوئے فرطِ عقیدت سے ان کی نظریں جھک جایا کرتی تھیں، وہیں ہادی علی کے ظلم کا تصور کر کے ان کے دل کانپ اُٹھتے تھے۔

میری کار اس حویلی کے بُلند و بالا دروازے کے سامنے پہنچی تو فوراً ہی ایک تندرست اور توانا ادھیڑ عمر شخص میری کار کے سامنے آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی کار حویلی کے دروازے سے اِدھر ہی روک لینا پڑی۔ وہ میرے قریب آکر جھک کے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "کدھر چلے ہو باؤ! کیدے نال ملاقات کرنا چاہندے ہو۔ کچھ سانوں وی تو دسو بادشاہو۔ اساں اِدھر کس واسطے کھلوتے نے؟"

اس کا لہجہ بہت ہی اکھڑ اور تضحیک آمیز تھا۔ بولنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی زبان پنجابی نہیں تھی مگر وہ پنجابی بولنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔ میں نے اس سے بہت ہی نرم لہجے میں کہا "تم کون ہو اور یہاں کس نے کھڑا کیا ہے تمھیں؟"

"میں کون آں...؟ واہ میرے سوہنے بادشاہ، بڑی عجیب گل کی ہے۔ اجی میں محافظ ہوں اس حویلی دا۔ اس دے مکینوں دا۔ افضل خان ناں ہے میرا۔ ساڈی اجازت دے بغیر تو پرندہ پر نئیں مار سکدا حویلی دے وِچ۔ ہون تسی دسو کون ہو، کیدر سے آئے ہو، کس دے نال ملنا چاہندے ہو۔ مالکن دا حکم ہے شناخت کرائے بغیر کوئی اندر نئیں جا سکدا..."

"چنگا جی افضل خاں صاحب! خیر تساں اپنی مالکن نوں دس دو جا کے غلام جیلانی آیا ہے غلام جیلانی لاہور سے۔" میں نے اپنے نام غلام جیلانی اور لاہور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اے ہوئی ناں گل۔ ہون تسی سن لو کان کھول کے۔ مالکن دا حکم ہے لاہور سے جو آدمی آئے اس کو اندر نہ آنے دو۔ بھلے وہ گورنر دا پتر کیوں نئیں ہووے۔ تساں تو سانوں گورنر دے پتر نئیں لگدے۔"

میں نے کہا کہ تم جا کر اپنی مالکن سے کہو تو کہ غلام جیلانی تم سے ملنے آیا ہے۔ اگر وہ نہیں ملنا چاہے گی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"نہ جی نا۔ میں کوئی ایڈا بے وکوف نئیں ہیں نوں مالکن دا حکم ہے ایک منٹ دی گیٹ چھوڑ کے نہ جاؤ۔ بس فیر میں تو اندر جائی نئیں سکدا۔ اندر جان دی تو میں نوں یوں دی اجازت نئیں..."

وہ مجھ سے اُلجھ ہی رہا تھا کہ میں نے حویلی کے کھلے ہوئے دروازے سے ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی کو باہر نکل کر اپنی کار کی طرف آتے دیکھا۔ وہ کار کے قریب آکر بولی "اے ودّو، کون آیا ہے اس گاڑی میں؟"

اس کی آواز سن کر ادھیڑ عمر دربان تیزی سے پیچھے پلٹ کر بولا "او ٹے رجّو! تو مانتی نئیں ہے۔ میں نے کتنی واری منع کیا ہے تو نے۔ سانوں ودّو نہ آکھیا کر۔ او ٹے سوہنیئے ساڈے نال مخول نہ کیا کر..."

"وہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر میری گاڑی کے پاس آکر کھڑکی میں جھک گئی اور اپنی گول گول آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔ "کی گل اے باؤ؟"

"میں تیری مالکن سے ملنے آیا ہوں لاہور سے۔ اس کو بتا دے جا کر۔ بس اتنی سی بات ہے۔" میں نے اس کی طرح شوخ لہجے میں کہا۔

"پر مالکن تو کسی دے نال ملدی نئیں باؤ! تو نے بکار ہی اتنی دور آنے دی..." پھر وہ ایک دم چپ ہو کر ایک لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولی "کی ناں ہے تیرا باؤ... زیلانی..."

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "زیلانی نئیں او ٹے کڑیے۔ غلام جیلانی، آئی سمجھ؟"

"ہا... گلام... زیلانی..." اس نے کہتے کہتے ایک دم اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر منہ بند کر کے اپنے آپ کو بولنے سے اس طرح روک دیا جیسے اس کے منہ سے نادانستگی میں کوئی ایسی بات نکلنے لگی ہو جو اسے کہنا نہیں چاہیے۔ اور اپنی اس سنگین غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے فوراً منہ بند کر لیا ہو۔ پھر وہ واپس پلٹ کر حویلی کے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے بلند آواز سے بولی "ٹھیک ہے جی تسی رکو، میں ہون ای آئی۔"

وہ دوڑتی ہوئی حویلی کے اندر چلی گئی پھر کوئی ایک منٹ کے بعد ہی وہ دوبارہ دکھائی دی اور حویلی کے دروازے ہی سے مجھے کار اندر لے آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں نے اس کا اشارہ پاتے ہی کار کو آگے بڑھا دیا اور اسے لیے ہوئے حویلی کے اندر چلا گیا۔

گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد ہی دائیں طرف ایک کشادہ پورچ میں دو مرسیڈیز گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنی کار ان کے پیچھے لے جا کر روک دی۔ اور کار سے باہر نکلتے ہوئے لڑکی سے جو اس دوران بھاگتی ہوئی میری کار کے نزدیک آچکی تھی، پوچھا "کیا اندر کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں؟ میرا مطلب ہے کوئی مہمان وغیرہ؟"

"نہ جی، اُدھر کوئی مہمان شمان نئیں آتا۔ مالکن کسی کو اندر آنے ای نئیں دیتی ہے۔ تم پہلے آدمی ہو جس کو اس نے اندر بلایا ہے؟"

"اچھا تو کیا تیری مالکن بالکل ہی گوشہ نشین ہو کر رہ گئی ہے؟ کسی کو حویلی میں آنے تک کی اجازت نہیں دیتی ہے؟"

"پتا نئی جی۔ تواڈی زبان ساڈی سمجھ وِچ نئیں آندی، جو کچھ پوچھنا ہے مالکن نال پوچھ لینا۔" وہ پنجابی کو اردو میں ملا کر بولی تھی۔

اس نے مجھے ایک خاصے کشادہ اور صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا اور خود اندر چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر بہت پرانے طرز کا تھا۔ دیواروں پر ہرن، بارہ سنگے، اور اسی قسم کے مختلف جانوروں کے سر سلیقے اور ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب کئی بندوقیں دیوار میں سجی ہوئی تھیں، یہ سب چیزیں ہادی علی کے زمانے کی ہی ہوں گی۔

وہ شکار کا بے حد شوقین تھا۔ ہر قسم کے شکار کا، جانوروں سے لے کر انسانوں تک کا شکار بڑے شوق سے کرتا تھا وہ۔ میں ہادی علی کے شکار کیے ہوئے جانوروں اور ان ہتھیاروں کا جن سے وہ شکار کیے گئے تھے، دلچسپی کے ساتھ معائنہ کرنے میں مصروف تھا کہ مسند آرا اس کمرے کے دروازے سے نمودار ہوئی جس میں ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکی غائب

خواب سب دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟
سچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی تشریحات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیریں کیا ہیں؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی رہنمائی سے مستقبل کی تعمیریں کیا بدلی جا سکتی ہے؟ کیا وہ ہماری الجھنوں کے عکاس ہوتے ہیں؟
یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں ماہرین کی کیا رائے ہے؟
خوابوں کے بارے میں مذاہبِ عالم کیا کہتے ہیں؟ یہ اور ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لئے ——— پڑھیے!

خوابوں کے اسرار

قیمت ۱۵ روپے
ڈاک خرچ ۱۰ روپے

اے ایس صدیقی کے قلم سے
اردو میں پہلی بار ——— ایک بھرپور اور منفرد کتاب
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

ہوئی تھی جو مجھے یہاں تک لے کر آئی تھی۔ مسند آرا سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس انتہائی باوقار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے انداز، اس کے چہرے اور اس کی چال میں جو وقار اور دبدبہ تھا اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں بے اختیار اس کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے مسند آرا کا یہ روپ آج پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلی بار میں نے جس مسند آرا کو دیکھا تھا وہ ایک زندگی سے بھرپور لڑکی تھی، اس کے سینے میں ایک ارمانوں بھرا دل تھا اور اس دل میں زندگی کے حسین ترین رنگ دیکھنے اور اس میں نت نئے رنگ بھرنے کی شدید خواہش تھی۔ دوسری بار ایک مظلوم اور مجبور مسند آرا ملی تھی مجھے، ایک لاغر اندام آزردہ اور زندگی سے بالکل خالی خالی مسند آرا جو زندگی سے زیادہ موت کی آرزومند تھی۔ زندگی اسے ایک بارِ گراں معلوم ہوتی تھی۔ اور اس بوجھ کو اٹھانے کی .... بالکل بھی طاقت نہیں رہی تھی اس میں۔ آج جو مسند آرا میری آنکھوں کے سامنے تھی وہ ان دونوں سے مختلف بالکل ہی نئی مسند آرا تھی، وقت نے اس کے چہرے پر خاصی پختگی پیدا کر دی تھی، آنکھوں میں اس کی دور دور تک میرے لیے شناسائی کی کوئی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات کے اظہار سے عاری تھا۔ میں ہونقوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں پھاڑے کھڑا اسے تک رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر ایک آرام کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے سنجیدہ اور پُروقار انداز میں بولی "بیٹھیں، آپ کھڑے کیوں ہو گئے ہیں؟"

وہ آرام کرسی میں دھنس سی گئی تو میں بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں بولا "آپ ٹھیک تو ہیں نا مسند آرا؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا میں آپ کو کچھ بیمار دکھائی دے رہی ہوں...؟" وہ بولی۔

"نہیں نہیں، اللہ نہ کرے کہ آپ بیمار ہوں۔ میں نے تو اس لیے پوچھا تھا کہ آپ آج ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھائی دے رہی ہیں۔"

"اوہ، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ میری طرف سے بالکل بھی فکرمند نہ ہوں۔ مجھے بتائیں، آج آپ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟ کیا آپ کی مصروفیات ختم ہو چکی ہیں؟" اس نے موضوع بدل کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ میری تمام مصروفیات ختم ہو گئی ہیں، اور میں نے سروری خانم سے وعدہ کیا تھا کہ... فرصت ملتے ہی میں سیدھا آپ کے پاس پہنچوں گا اور اپنی بقیہ زندگی آپ کے نام وقف کر دوں گا۔" میں نے بھی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو باجی سے ملاقات ہو چکی ہے آپ کی۔" وہ بولی۔

"ہاں، میں ان سے مل چکا ہوں۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کیسی طرح دار عورت کس حالت کو پہنچ گئی...."

وہ میری بات کاٹ کر بولی "لیکن مجھے ان کی حالت پر نہ حیرت ہوئی تھی اور نہ ہی دُکھ پہنچا ہے۔ وہ جس راہ پر چل رہی تھیں، جس راستے کا انتخاب انھوں نے اپنے لیے کیا تھا اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ انوکھی اور انہونی بات نہیں تھی۔ حیرت مجھے اس وقت ہوتی جب یہ سب کچھ نہیں ہوتا ان کے ساتھ۔ جو فصل انھوں نے بوئی تھی وہی تو کاٹی بھی ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں ہوا ہے نا ان کے ساتھ؟"

میں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے حیرت ہے تم اپنی بہن کے لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

"آپ جانتے ہیں جیلانی! میں نے زندگی کے کسی بھی حصے میں حقیقت کو جھٹلانے یا اس سے نظریں چرانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ جو کچھ جیسا اور جس حال میں ہوتا ہے، اسے ویسا ہی دیکھتی اور دکھاتی ہوں ہر ایک کو۔ اس کا رنگ روپ بدلنے اور اس پر ملمع سازی کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی۔ باجی نے اور ان کے شوہر نامدار نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے آپ اس سے بے خبر تو نہیں ہیں۔ دولت اور جائداد کی ان کے پاس کیا کمی تھی کہ انھوں نے میری اس جاگیر کو حاصل کرنے کے لیے میرے والد کو راستے سے ہٹایا پھر مجھے مختلف طریقوں سے زندہ درگور کر دیا۔ آپ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کی گئیں، آپ کی ایسی شکل میرے سامنے پیش کی گئی کہ میں آپ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد مجھے ان سے یا ان کے حالات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بھلا۔ انھوں نے اپنے گناہوں میں آپ کو

بھی شریک کر لیا تھا۔ آباجی کی ہلاکت آپ کے ہاتھوں ایک سازش کے تحت ہوئی تھی، اس طرح آہو مجھے آپ سے بدظن کر کے اپنے دام میں لانا چاہتا تھا۔ باجی نے آپ کی حیثیت ختم کرنے کے لیے اپنے بچے کو آپ کے نام سے منسوب کر دیا تاکہ میں آپ کو بے وفا جان کر ہمیشہ کے لیے آپ سے کنارہ کر لوں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنستے چلے گئے اور بالآخر خدا نے مجھے ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ کر دیا۔"

"لیکن سروری خانم نے تو کہا تھا کہ اس کا بچہ آپ کے پاس ہے۔ آپ اس کی پرورش کر رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ وہ بچہ میرے ہی پاس ہے۔ اس کے والدین نے جو کچھ کیا ہے اس میں اس معصوم کا تو کوئی قصور نہیں ہے نا؟ پھر اسے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیتا تو اس کے ساتھ ظلم ہی ہوتا نا؟" وہ بولی "لیکن میں ایک بات کی تصدیق آپ سے ضرور کرنا چاہوں گی اور مجھے امید ہے آپ اس کا جواب بالکل سچ سچ دیں گے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو، میں وعدہ کرتا ہوں جو کچھ کہوں گا بالکل سچ سچ کہوں گا۔"

"کیا یہ بچہ سچ مچ آپ کا ہی ہے جیلانی؟" وہ چہرے سے کسی طرح کا بھی تاثر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

میں چند لمحے اس کو تکتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ میرے جواب کا کیا ردِ عمل ہو گا اس پر۔ لیکن اس کی شکل اور انداز سے کچھ بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کو اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں بڑا ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ بالآخر میں نے کہا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا مسند آرا۔ ایک بار غصے اور انتقامی کیفیت کے ہاتھوں اندھا ہو کر مجھ سے کچھ زیادتی ضرور ہوئی تھی اس کے ساتھ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس دیوانگی کی یہ سزا دی ہو گی مجھے اس ربِ کریم نے۔"

"ہوں۔" اس نے میری بات سُن کر ایک ٹھنڈی سانس لے کے گردن جھکالی اور چند ثانیے کچھ سوچتے رہنے کے بعد وہ بولی "خیر چھوڑیں اس قصے کو۔ جو کچھ بھی ہو۔ بچہ آپ کا ہو یا آہو کا قصوروار وہ نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کی سزا اس کو نہیں ملنا چاہیے۔ اب آپ مجھے بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں۔ کیا فیصلہ کر کے آئے ہیں آپ یہاں؟"

میں نے کہا "مسند آرا! میں تمھیں آج بھی اسی طرح، اسی قدر چاہتا ہوں۔ میرے دل میں تمھارا مقام اب بھی

کیا

آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کے لیے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی طرح مشقیں نہیں کرنا پڑتیں؛

جدید اور سائنٹیفک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب

مقناطیسیت

آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

::: اس کتاب کا مطالعہ کیجیے :::
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجیے!

قیمت -/۲۰ رُوپے

مکتبۂ نفسیات
پوسٹ بکس ۴۴۹۴ کراچی

وہی ہے جو پہلی ملاقات کے وقت تھا۔ لہٰذا آج میں تم سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرنے کی غرض سے آیا ہوں، اب میرے سامنے کوئی رکاوٹ کوئی دشواری نہیں ہے، میری وہ بہن آسیہ جس کی خاطر، جس کی خوشیوں کو تاراج ہونے سے بچانے کی خاطر میں جہنم میں کود پڑا تھا، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ دھمن اور عالیہ جنھوں نے میرے سینے میں نفرت اور انتقام کا بیج بویا تھا وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں، لہٰذا اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی باقی زندگی تمھارے نام کر دوں۔ لیکن اس میں تمھاری رضامندی بھی ضروری ہے۔"

وہ ایک بار پھر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس بار وہ ان الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی شاید جن کے ذریعے اپنے دلی جذبات کو وہ مجھ تک منتقل کر سکے، ایک یا ڈیڑھ منٹ تک ہمارے درمیان مکمل خاموشی رہی پھر وہ بولی "دیکھیں جیلانی! چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ اور محض اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے اب تک کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے۔ میرے دل و دماغ میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میری آنکھوں میں صرف اور صرف آپ کی تصویر ہے۔ میں جب بھی کینوس پر برش چلاتی ہوں غیر ارادی طور پر ہمیشہ آپ کی تصویر بنا دیتی ہوں، لیکن میں چاہتی ہوں کہ جب آپ میری زندگی میں داخل ہوں۔ جب آپ میری زندگی کے مالک و مختار بن کر میرے پاس آئیں تو میرے دل میں کوئی خدشہ کوئی وسوسہ بالکل نہ ہو، میں آپ کی ہمراہی میں ایک مکمل اور آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ ہر خوف اور ہر طرح کے خطرے سے آزاد زندگی۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا تھا مسند آرا! اور اسی لیے اس سے پہلے میں نے تمھارے پاس آنے کی کوشش نہیں کی کبھی۔ اب جو میں تمھارے پاس آیا ہوں تو ان سارے خدشات اور خطرات کو ختم کر کے ہی آیا ہوں۔ اب میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

وہ اداس نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "آپ ایک بہت ہی اہم بات بھول رہے ہیں جیلانی! یا شاید جان بوجھ کر صرف نظر کر رہے ہیں اس سے۔ میری اطلاعات کے مطابق آپ ابھی تمام خطرات سے آزاد نہیں ہوئے ہیں، آپ خود مختار نہیں ہیں ابھی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو مسند آرا! مجھے تو اب کوئی خطرہ نظر نہیں آتا اپنے آس پاس کہیں بھی۔"

"میں نے کہا،" آپ اس خطرے کو بھول گئے ہیں، آپ کو یاد نہیں رہا ہے کہ ابھی قانون نے آپ کو معافی نہیں دی ہے۔ اسے آپ کی ضرورت اب بھی ہے۔ وہ اب بھی آپ کی تلاش میں سرگرداں ہے، اور میں چاہتی ہوں کہ آپ جب میرا ہاتھ تھامیں تو میرے سوا کسی کو آپ کی ضرورت نہ ہو، میرے علاوہ کوئی بھی آپ کا دعویدار نہ ہو، کوئی آپ کو مجھ سے چھیننے، مجھ سے جدا کرنے نہ آ سکے۔ لہٰذا میرا پُرخلوص مشورہ یہی ہے جیلانی کہ اب آپ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں، میں آپ کے لیے بہترین وکیل کا انتظام کروں گی۔ آپ کو آزاد کرانے کے لیے اگر مجھے اپنی جاگیر بھی بیچنا پڑی تو میں اس سے بھی دریغ نہیں کروں گی لیکن جب تک قانون آپ کو معاف نہیں کر دیتا میں آپ کو اپنی زندگی میں داخل نہیں کر سکتی۔ میں تمام عمر آپ کے انتظار میں بے کیف زندگی گزارنے کو تیار ہوں مگر چند روزہ... رفاقت کے بعد دوبارہ جدائی کا تصور بھی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ اس آخری مرحلے سے اور گزر جائیں جیلانی۔ یہ آپ یقین کریں کہ زندگی کے جس حصے میں بھی آپ یہاں آئیں گے، مجھے اسی طرح اپنا منتظر پائیں گے، یہ میرا وعدہ ہے، مسند آرا کا وعدہ۔"

میں حیرانی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا، اس نے بڑی عجیب شرط رکھ دی تھی میرے سامنے۔ میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو کون جانتا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ آسمان دیکھنے کی بھی مہلت دیتے یا نہ دیتے، عدالت ایک بار سزائے موت سنا چکی تھی مجھے۔ لہٰذا میری گرفتاری کے بعد اب دوبارہ مجھے عدالت کے سامنے پیش کرنا ضروری نہیں، یہ بھی تو ممکن تھا کہ مجھے پکڑنے والے سیدھے تختۂ دار پر ہی لے جاتے مجھے "تمھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہے مسند آرا۔ اگر میں نے تمھارے کہنے کے مطابق اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا تو یہ یقین کر لو دوبارہ تم مجھے دیکھ نہیں سکو گی، وہ لوگ مجھے پکڑتے ہی موت کی سزا پر عمل درآمد کر دیں گے...!"

"کوئی بات نہیں جیلانی! وہ جیسی چاہیں سزا دے دیں، آپ کو یہ چوہے بلی والی کھیل بہرحال ختم کر دینا چاہیے اب۔ قانون کے ہاتھ بہت دور تک پہنچ جاتے ہیں آپ اس سے بچ تو نہیں سکتے، ایک نہ ایک دن تو اس کے ہاتھ آ ہی جائیں گے، سزا اس کے بعد بھی وہ آپ کو ضرور دے گا، پھر اس بے مقصد بھاگ دوڑ سے فائدہ؟ جو کچھ لکھ دیا گیا ہے آپ کے اور میرے لیے اسے ہم دونوں میں سے کوئی بھی مٹا نہیں سکتا۔ آپ میری بات مان لیں اور تقدیر پر چھوڑ دیں سب کچھ کہ آخر کار ایک دن ہونا وہی ہے جو لکھا جا چکا ہے۔"

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ تقدیر سے کوئی بھی نہیں لڑ سکتا ہے، میں ایک سزا یافتہ جیل توڑ کر بھاگا ہوا قیدی تھا۔ پولیس کو میری تلاش تھی، وہ جگہ جگہ میری گھات لگائے بیٹھی تھی۔ میرا انجام وہی ہونا تھا جو عدالت نے میرے نام کے آگے لکھ دیا تھا پھر میں یہ سب کچھ بھول کر کیوں چلا آیا تھا مسند آرا کے پاس۔ وہ آلام اور مصائب کی چکّی میں بہت پسی گئی تھی۔ اب اسے سکون اور اطمینان کی چند گھڑیاں میسّر آئی تھیں تو میں اپنا منحوس سایہ لے کر اس کی پُرسکون دنیا برباد کرنے چلا آیا تھا۔ آج اگر وہ میری بات مان کر میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتی۔ اپنے جان و دل کا مالک تسلیم کر لیتی مجھے، تب بھی اس کی کیا ضمانت تھی میرے پاس کہ میں زندگی بھر اس کا ساتھ نباہ سکتا۔ میں تو خود اپنی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کب میری بُو سونگھتی ہوئی پولیس وہاں پہنچ جاتی اور میرے ساتھ مسند آرا کی زندگی بھی زہر آلود ہو کر رہ جاتی۔ نہ ملنے کا غم اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا شدید مل کے بچھڑ جانے کا غم ہوتا ہے۔ مجھے اس کی بات خاصی وزنی لگ رہی تھی اس گھڑی۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولی "کیا بات ہے جیلانی! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ اگر میری بات اچھی نہیں لگی ہے آپ کو تو میں مجبور نہیں کر رہی ہوں، آپ آزاد ہیں اپنے بارے میں جو بہتر سمجھیں فیصلہ کریں بس اتنا خیال رکھنا کہ اگر مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اوّلین شرط یہی ہے۔"

میں نے ایک اُداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تمھاری شرط منظور ہے مسند آرا۔ میں خود بھی اب بہت تھک چکا ہوں بھاگتے بھاگتے۔ اور اب میرا رہا بھی کون ہے اس دنیا میں جس کے لیے یہ تگ و دو کروں گا میں، تم نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے کہ مجھے تقدیر کے آگے ہتھیار پھینک کر شکست قبول کر لینا چاہیے اپنی، کہ آخر تو ایک دن یہی ہونا بھی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی، اب جائیں آپ جلدی سے جا کر پولیس کے حوالے کر دیں اپنے آپ کو۔" وہ بولی۔

"وہ تو اب میں کر ہی دوں گا لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنی لاہور والی کوٹھی اور تمام روپیہ تمھارے نام منتقل کر دوں تاکہ میرے بعد کوئی اور اس کا دعوے دار نہ کھڑا ہو جائے۔"

"لیکن میری بات مانیں تو اپنا کُل اثاثہ آپ کسی یتیم خانے یا کسی فلاحی ادارے کے نام کر دیں، یہ زیادہ بہتر ہو گا، میرے پاس پہلے ہی کیا کمی ہے جو آپ مزید اضافہ کر دینا چاہتے ہیں اس میں، جو کچھ میرے پاس ہے اسی کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے مجھے تو۔"

میں نے کہا "مسند آرا! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے، تم اب تک ناراض ہو مجھ سے۔ میری کسی بات سے اتفاق ہی نہیں کر رہی ہو تم۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، ماضی میں جو کچھ بھی ہوا اُس کے بارے میں اب کوئی بات راز نہیں رہی ہے، آپ نے آہو کے دباؤ میں آ کر انجانے میں میرے ابا جی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس میں آپ کا اتنا قصور نہیں تھا۔ آہو کی نمک حرامی کے ساتھ ساتھ ابا جی کے اپنے اعمالوں کی سزا تھی وہ۔ پھر بھی آپ کو اگر ان کی حیثیت کا علم ہوتا تو شاید آپ وہ کچھ نہیں کرتے چنانچہ اب میں آپ کو ملزم نہیں سمجھتی، پھر ناراضی کا کیا سوال ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے؟ تم آخر میری کوئی بھی بات ماننے کے لیے تیار کیوں نہیں ہو؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔

وہ ایک لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر گردن جھکا کر بولی "دیکھیں جیلانی! میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں یا تو اسی طرح زندگی گزار دوں گی جس طرح آج گزار رہی ہوں، زندگی

میں کسی تبدیلی کو میں اس وقت ہی قبول کروں گی جب سارا خوف، سارے خدشات مٹ جائیں گے۔ میں نے اس دولت اور اس جائداد پر جس طرح بھوکے گدھوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے، اس سے مجھے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ میں اس جنجال سے دور بھاگنے لگی ہوں۔ میں یہ بالکل نہیں چاہوں گی کہ اس کی خاطر پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ یہاں ضرورت مندوں کی کمی نہیں ہے آپ اپنی جمع پونجی اور کوٹھی کسی ضرورت مند کو دے کر اس کی دعائیں حاصل کرنے کی کوشش کریں، شاید وہ ہمارے کام آجائیں۔ ہماری زندگی میں بس انہی کی تو کمی ہے نا۔ کسی کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں ہی کی ضرورت ہے ہمیں جیلانی! آپ دل نہ چھوٹا کریں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے پھر میں اب چلتا ہوں، واپس جا کر کچھ کام نمٹانا ہیں مجھے۔ اس کے بعد تم اخبارات میں یہ خبر بھی پڑھ لوگی کہ مشہور اشتہاری مجرم غلام جیلانی گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"اب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ آج رات یہاں رُک کر آرام کریں، صبح چلے جائیے۔ اتنے لمبے سفر سے آئے ہیں آرام کی ضرورت ہوگی آپ کو۔"

"نہیں مسند آرا! میں چاہتا ہوں جو کچھ بھی ہونا ہے جلد از جلد ہو جائے۔ دیر ہونے کی صورت میں ممکن ہے میرا ارادہ بدل جائے، دل میں بے ایمانی آجائے اور میں پھر کسی اور طرف نکل جاؤں۔ کیوں کہ شیطان کسی کو راہِ راست اختیار کرنے نہیں دیتا آسانی سے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آپ سے رکنے کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔ جائیں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ کسی بھی مشکل گھڑی میں آپ جب بھی میری ضرورت محسوس کریں، بے جھجک بلا لیں مجھے۔ میں سر کے بل آؤں گی آپ کے پاس۔"

میں اکبر کوٹ سے واپس آگیا۔ وہاں جا کر مایوسی اور بددلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا میرے۔ میرا خیال تھا کہ مسند آرا نے نہایت ہی خوب صورتی کے ساتھ مجھے ٹال دیا تھا۔ وہ جانتی تھی اور اسے یقین تھا کہ جو شرط اس نے رکھی تھی اسے پورا کرنے کے بعد میں کبھی بھی دوبارہ اس کے پاس نہیں پہنچ سکوں گا۔ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ میں عام لوگوں سے بالکل مختلف سا کوئی ایسا شخص ہوں جس کے معاملے میں انسانوں کے بارے میں سارے قاعدے قانون، تمام کے تمام قواعد و ضوابط دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میں نے زندگی کے بے شمار دن سایوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزار دیے تھے۔ میں سراب کے تعاقب میں دوڑتا رہا تھا آج تک، اور اب تہی دست اور تہی دامن کھڑا ایک ایک شخص کو حیرت اور حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ فاطمہ واپس چلی گئی تھی کیوں کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک اعلیٰ و ارفع مقصد تھا۔ وہ اپنے آبائی وطن کو عیار اور مکار یہودیوں کی ریشہ دوانیوں سے بچانا چاہتی تھی، وہ میرے ساتھ رہ کر اپنے ملک، اپنی قوم سے غداری کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ اس کے ہم وطن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، وہ ان کے لیے کچھ نہ بھی کرتی تو کوئی اسے الزام دینے والا نہیں تھا لیکن اس کا اپنا ضمیر تو تھا، وہ تو اس کی اصلیت سے واقف تھا، وہ اُسے کہاں چین لینے دیتا۔ ضمیر کی خلش تو آدمی کو زندگی بھر بے چین رکھتی ہے۔ اسے جانا ہی چاہیے تھا اور وہ چلی گئی تھی۔

مسند آرا کو میں کوئی الزام اس لیے نہیں دے سکتا تھا کہ اس کے ساتھ محبت کے زبانی دعووں کے سوا میں نے کیا ہی کیا تھا۔ اس کے دکھ درد میں کتنا حصّہ بٹایا تھا میں نے۔ اور نادانستگی میں جو کچھ کر چکا تھا میں اس کے ساتھ، اس کے بعد تو مجھے اس کے سامنے بھی نہیں جانا چاہیے تھا۔ اور شاید سرداری خانم اگر مجبور نہ کرتی مجھے تو میں ادھر کا کبھی بھی رُخ نہ کرتا۔ آخر میں نے کون سی بھلائی کی تھی اس کے ساتھ جو امیدیں اور ارمان لے کر اس کے در پر جا پہنچا تھا۔ بہت ہی شرافت کا ثبوت دیا تھا اس نے کہ مجھے عزت سے بٹھا کر میری بات سن لی تھی۔ اسے تو چاہیے تھا حویلی کے اندر پاؤں نہ رکھنے دیتی وہ مجھے اور باہر ہی سے کھڑے کھڑے رخصت کر دیتی۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی، کوئی حق بھی تو نہیں تھا مجھے اس سے شکوے شکایت کرنے کا۔ میری ساری جدّوجہد، تمام کی تمام تگ و دو آسیہ کے لیے تھی۔ اسی سے ابتدا کی تھی میں نے اور اسی پر آکر انتہا ہو گئی تھی۔ وہ آسیہ ہی تھی جس کی خاطر میں نے ایک سیدھی اور سچی راہ چھوڑ کر اس راہِ پُرخار میں قدم دھر دیا تھا۔ وہ آسیہ اب کہاں تھی۔ اپنے بچّے کو سینے سے لگا کر پیار کرنے کی حسرت دل میں لیے کوچ کر گئی تھی اس جہانِ فانی سے۔ ایک حرص کے بندے کے چند بول میرے سارے خاندان کو کھا گئے تھے۔ اور میرا خاندان کوئی پہلا خاندان تو نہیں تھا جو اِن طمع کے بندوں کی بنائی ہوئی ایک رسم پر قربان ہو گیا تھا۔ ایسے پتا نہیں کتنے خاندانوں کو مٹی میں ملا دیا ہوگا اس رسم نے۔ دولت کے ان پجاریوں نے پتا نہیں کتنے گھر اجاڑے ہوں گے، اس کا تو کسی نے حساب بھی نہیں رکھا ہوگا۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی ہوگی کبھی کہ وہ جو زخم دے کر جا رہا ہے کسی غریب کے سینے پر، وہ اسے جانبر بھی ہونے دے گا یا نہیں۔ میرے باپ کا وہ بھائی۔ وہ میرا لالچ سے بھرا ہوا تایا اگر اپنے ڈاکٹر بیٹے کی قیمت نہ لگاتا تو میں کبھی گمراہ نہ ہوتا، وہ سیاہ رات ہی میری زندگی میں نہ آئی ہوتی کبھی جس کے اندھیرے میں اپنی راہیں گم کر بیٹھا تھا میں۔ بدبختی کی انتہا تو یہ ہے کہ وہ آسیہ، میری بہن، میری ماں جائی جس کی حیات کے کانٹے چُنتے چُنتے میں نے خود کو لہولہان کر لیا تھا۔ اپنی زندگی کو کانٹوں سے بھرے ہوئے ایک جنگل میں اتار دیا تھا، وہ پھر بھی آندھیوں کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکی تھی۔ میں نے اس کے لیے پھول چُننے کی کوشش کی لیکن اس کی زندگی کانٹوں ہی میں الجھتی چلی گئی۔ ہم دونوں ہی بہن بھائی سیاہ بخت تھے۔ ہمارے حصّے کی پُرسکون گھڑیاں تو اسی دن تمام ہو گئی تھیں جس روز ہمارا اپنا خون بے وفائی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ جس روز ہمارے تایا نے سارے رشتے ناتے توڑ کر حرص و طمع کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھا لی تھی۔ جب خون ہی پانی ہو جائے۔ اس میں شناخت کی بُو نہ رہے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ انھوں نے آسیہ کو سہاگ کا جوڑا پہنانے کی بہت بھاری قیمت طلب کر لی تھی اور میں نے وہ قیمت دینے کے لیے اپنی سیدھی سادی زندگی کو ایک الم ناک داستان بنا دیا تھا۔ اس داستان کے سارے ہی کردار ایک ایک کر کے رخصت ہوتے چلے گئے تھے۔ آسیہ اپنی ناکام حسرتوں پر ماتم کناں دنیا سے اُٹھ گئی۔ میرا وہ یارِ وفادار آبی جو میرے حصّے کے دکھ بٹاتا اور قدم قدم پر مجھے جینے کا حوصلہ دیتا تھا اور جس نے دنیا کو جاں نثاری کا صحیح مفہوم سمجھایا تھا اور دوستی، محبت اور خلوص کے معنی سمجھائے تھے۔ قیامت تک کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ فیروز، شرافت علی، گل زمان اور انور کمال جیسے انسان دوست، وطن دوست مجاہد وطن کی سلامتی اور قوم کی آزادی پر قربان ہو چکے تھے۔ اور اب میرے پاس اپنی سیاہ بختیوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔ اب نہ میرا کوئی گھر بار تھا، نہ کنبہ نہ رشتے ناتے والے۔ میرا کوئی مستقبل نہیں تھا، ایسے میں کسی اور کے مستقبل کی کیا ضمانت دے سکتا تھا میں۔ میرے لیے اس دنیا میں کیا کشش رہ گئی تھی، بس حادثات و سانحات کے عطا کردہ کچھ تجربات تھے۔ کتنے تلخ تجربات حاصل ہوئے تھے مجھے یہاں۔ کتنی بار مرا تھا میں اور کتنی بار زندگی میں نے موت کے منہ میں ہاتھ ڈال کر چھینی تھی، اس کا کوئی حساب نہیں تھا، نہ میرے پاس اور نہ کسی اور کے پاس۔ قانون تو بہت پہلے ہی مجھ سے زندہ رہنے کا حق چھین چکا تھا اور اسے میری تلاش تھی تختۂ دار پر لٹکانے کے لیے، صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے لیے اور میں اس سے بھاگتا پھر رہا تھا، اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا اور اب مجھ میں مزید ہمت نہیں رہی تھی بھاگنے کی۔ میں تھک کے چُور ہو چکا تھا، پاؤں میرے لہولہان ہو چکے تھے۔ آخر کوئی حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ کتنا طویل عرصہ ہو گیا تھا مجھے قانون کے ساتھ آنکھ مچولی کا یہ کھیل کھیلتے ہوئے۔ میرے پاؤں شل ہو چکے تھے اور قدم بُری طرح لڑکھڑانے لگے تھے اور اس سے پہلے کہ میں تھک کر کہیں گر پڑتا۔ اور فرصت کے سارے لمحے ختم ہو جاتے میں باقی رہ جانے والا کام بھی نمٹا لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا سب کچھ فردوسی بیگم کو سونپ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خلوص و وفا کی بندی نے جس محبت اور بے لوثی کے ساتھ ہماری خدمت کی تھی، اس کا کچھ نہ کچھ صلہ تو ملنا چاہیے تھا اسے۔ حالانکہ اس نے اپنی آنکھوں میں بڑے سہانے سپنے سجا رکھے تھے۔ مجھے اپنے تصوّر میں اپنے ساتھ پتا نہیں کس کس زاویے سے بٹھا بٹھا کر دیکھا کرتی تھی وہ۔ اس کی آنکھیں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے دروازے پر لگی رہتی ہوں گی اور کان اس دروازے کے باہر اُبھرنے والی ہر آہٹ پر لگے رہتے ہوں گے۔ پتا نہیں اس دیوانی کو میری بدنصیبی کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ وہ مجسمۂ خلوص و وفا اپنی ساری زندگی میرے نام لگا دینے پر تل گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرشتۂ اجل ہر دم میرے ساتھ لگا رہتا ہے، میری جھولی میں انگاروں کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے لیے۔ میری معیّت میں وہ سکون و عافیت کا ایک لمحہ بھی

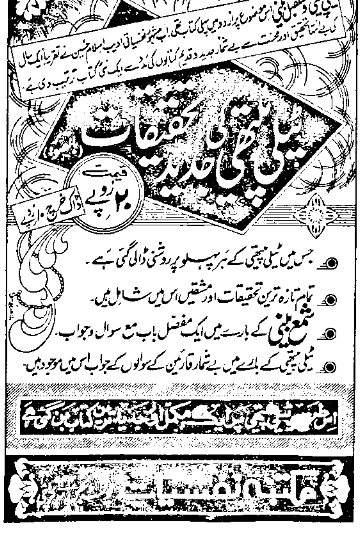

نہیں گزار سکتی ہے۔

میں نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے مختلف بینکوں میں ہاشم خاں اور سردار کریم نواز کے نام سے جمع شدہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ اور گلبرگ کی کوٹھی فردوسی بیگم کے نام منتقل کر کے اس کے سارے کاغذات کراچی میں فردوسی بیگم کو بھیج دیے۔ ماں جی کے بارے میں اس کو تاکید کر دی کہ وہ کوشش کر کے ان کی سکونت کا انتظام سعودیہ ہی میں کرا دے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو انھیں کراچی میں اپنے پاس ہی رکھ لے۔ میں نے اس سے ٹیلی فون پر بات اس لیے نہیں کی کہ مجھ میں اب اس سے براہِ راست گفتگو کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کے سوالوں کو سننے اور ان کے جواب دینے کی طاقت نہیں تھی مجھ میں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کبری سے کہا۔ "کبری! یار ذرا تھانے کو فون کر کے ڈیوٹی پر موجود ایس ایچ او یا اے ایس آئی کو میرے بارے میں اطلاع دے دے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ بلکہ یوں کر کہ کسی بہت بڑے افسر کو فون کر دے تاکہ میری گرفتاری پر جو پچاس ہزار روپے انعام رکھا گیا ہے وہ تجھے مل جائے۔ تاکہ تو اپنی بقیہ عمر سکون سے گزار سکے۔ جا یار جلدی کر ایسا نہ ہو میں اپنا ارادہ تبدیل کر دوں تو تجھے پچاس ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔"

کبری حیرت سے منہ پھاڑ کر مجھے تکتا رہا، پھر بولا۔ "سردار صاحب! کیوں مخول کر رہے ہیں آپ، میں تو ایسی نمک حرامی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کبھی۔ کسی نے آپ کو میرے بارے میں بھڑکانے کی کوشش کی ہے شاید۔"

"اوئے کیا بکتا ہے۔ مجھے بھڑکانے کی کوشش کوئی کیوں کرے گا؟ میں جو کہہ رہا ہوں ویسا ہی کر، چل اُٹھ جلدی سے۔" میں نے کہا۔

"مم... مم... مگر... سردار صاحب!...... ایسا کیوں کروں جی میں؟... کیا ضرورت ہے...؟"

میں نے اس کی بات کاٹ کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اوئے کبری کے بچے! بکواس نہ کر، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ویسا ہی کر۔"

وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ حیرانی اور خوف کے ملے جلے انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کبھی ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی اسے واپس کھینچ لیتا تھا۔ بالآخر میرے ڈرانے دھمکانے سے مجبور ہو کر اس نے ایک اعلیٰ افسر کو ٹیلی فون کر ہی دیا۔ اس کے ٹیلی فون کرنے کے پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر پولیس کے مسلح دستوں نے آہو کی حویلی کو گھیرے میں لے کر مجھے یوں گرفتار کر لیا جیسے یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو انھوں نے۔

دوسرے روز صبح کے اخبارات پولیس کے اس عظیم الشان کارنامے سے بھرے پڑے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس میں کہیں بھی کبری کا نام تک نہیں تھا۔ سارا کریڈٹ پولیس نے اپنے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

میری داستان کا یہ المناک باب ختم ہوا۔ قانون مجھے جو چاہے سزا دے، مجھے اس کی اب بالکل بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں اور کن حالات میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کے سیاہ دور کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ عدالت کے فیصلے سے قطعِ نظر آپ کا فیصلہ کیا ہے، مجھے اس سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا مقصد تو آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کے رشتے طے کرنے کے لیے جہیز اور نقد رقم کی صورت میں لڑکوں کی قیمت طلب کرنے کا جو رجحان روز بروز بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے، اس کے نتائج سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کر کے یہ سمجھاؤں کہ اس سنگدلانہ رسم کی وجہ سے خاندانوں پر کیسی کیسی افتاد ٹوٹ رہی ہے۔ بھرے پُرے گھر کس طرح برباد ہو رہے ہیں کبھی اس بارے میں بھی سوچنے کی زحمت کر لیا کریں۔"

انداز بیاں گرچہ مرا شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

ختم شُد